جھرنے
ایم اے راحت
1

نیلے رنگ کی بینسز سی اسٹیشن کے پارکنگ لاٹ پر جا کھڑی ہوئی اور شہاب شیشے چڑھا کر نیچے اتر آئے، دروازہ لاک کیا اور چابی جھلاتے ہوئے نپے تلے قدموں سے اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ٹرین کے آنے میں تھوڑی ہی دیر باقی رہ گئی تھی۔ ویٹنگ ہال میں کچرا گھر بنا ہوا تھا۔ کپڑوں کی گٹھریاں ہولڈال، اٹیچی کیس، ٹین کے صندوق اُن پر بیٹھے ہوئے کالے پیلے بچے گنڈیریاں چوستے ہوئے، کیلے کھاتے ہوئے، چھلکے پھینکتے ہوئے۔ شہاب صاحب ایک بے نیاز مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھے اور گیٹ سے اندر داخل ہو گئے... اُنھیں پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹکٹ چیکر ایسے لوگوں سے ٹکٹ یا پلیٹ فارم نہیں مانگتے۔

تفسیر کی مجبوری وہ سمجھتے تھے حالانکہ اُنھوں نے کہا تھا تفسیر سے کہ وہ جہاز سے کراچی آ جائے یہاں سے اُس کی مطلوبہ جگہ کار سے جایا جا سکتا ہے لیکن تفسیر نے جواب دیا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے اُسے ٹرین ہی سے سفر کرنا پڑے گا کچھ ایسی ہی اہم باتیں ہیں۔

تفسیر، شہاب صاحب کا جگری دوست تھا اگر اُسے اسٹیشن پر ریسیو نہ کرتے تو بگڑ جاتا اس لئے نہ جانے کتنے عرصے کے بعد اُنھوں نے ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا تھا۔

پلیٹ فارم بھی اِسی قسم کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شہاب صاحب ان حشرات الارض سے بچتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ گہرے کلر کے قیمتی سوٹ میں اُن کی شخصیت ایک انوکھی بہار دکھا رہی تھی۔ اکرگن کے گوشہ قدیم کی عینک ناک پر جمی ہوئی تھی۔ ایک جگہ رک کر اُنھوں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ٹرین شاید لیٹ ہے۔ سونے کا سگریٹ کیس نکال کر اُنھوں نے سگریٹ نکالا اور سگریٹ کیس کے ایک کونے سے بلند ہونے والے شعلے سے سُلگا کر اُسے جیب میں رکھ لیا۔ ابھی سگریٹ کے دو تین کش ہی لئے تھے کہ ایک شکل نظر آگئی۔ یہ احتشام سالک تھا۔ جیم خانے کا شناسا۔ سالک نے بھی شہاب صاحب کو دیکھ لیا تھا۔ مسکراتا ہوا قریب پہنچ گیا۔

"شہاب صاحب! آپ یہاں؟" اُس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو سالک!" شہاب صاحب نے مسرور لہجے میں کہا۔

"خیریت تو ہے؟"

"تم پریشان کیوں ہو؟" شہاب صاحب بدستور مسرور لہجے میں بولے

"نہیں میرا مطلب ہے کہیں جا رہے ہیں یا کہیں سے آ رہے ہیں؟"

"لوہے کی پٹریوں پر رینگنے والے ان ڈبوں میں میں نہ کہیں آتا ہوں نہ کہیں جاتا ہوں۔"

"اسی لئے تو حیرانی ہوئی تھی مجھے لیکن پھر...؟"

"عجیب انسان ہو۔ ضروری ہے کہ میں تمھیں یہاں آنے کے سلسلے میں سب کچھ بتا دوں۔"

"کسی کا انتظار ہے شاید۔ میں جانتا ہوں یہ بوریت کیوں سوار ہے اس ماحول سے پریشان ہو رہے ہیں۔ واقعی بڑی بدانتظامی ہے یہاں ریلوے والے صرف ٹرینیں چلانا اور ٹکٹ بیچنا جانتے ہیں لوگوں کو۔"

"بور مت کرو یار، جس کام سے آئے ہو وہ کرو۔ اب ریلوے ہی کیا ہوائی اڈے بھی ان کیڑے مکوڑوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ دبئی شارجہ اور لندن جانے اور وہاں سے آنے والوں کو دیکھو انھوں نے ائیر پورٹ بھی ریلوے اسٹیشن بنا دیئے۔"

"ٹرین آ گئی" سالک نے کہا اور پھر مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اتنی بڑی شخصیت ہاتھ ہی ملا لے تو تقدیر کھل جاتی ہے لیکن شہاب صاحب کے ہاتھ ملانے کی بڑی قیمت تھی۔ انھوں نے سالک کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی پذیرائی نہیں کی۔

"ڈاکٹری اصولوں کے خلاف ہے اس طرح جراثیم منتقل ہوتے ہیں۔ سوری۔"

"اوہ ہاں واقعی عجیب رسم ایجاد ہوئی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" سالک آگے بڑھ گیا۔ بڑے دل گردے کا مالک تھا سب کچھ ہضم کر گیا تھا اور پیشانی پر بل بھی نہیں آیا تھا کہیں۔ وہ کاروباری آدمی تھا اور یہ باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ فولاد کے بدنما ڈبوں نے انسان اگلنا شروع کر دئے۔ شہاب صاحب کی نگاہیں ائیر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹس کے دروازوں پر بھٹک رہی تھیں۔ ٹرین خالی ہوتی جا رہی تھی۔ قلی پاگلوں کی طرح بھاگ دوڑ کرتے پھر رہے تھے کچھ دوسرے پاگل بھی ان کے شریک تھے۔ یہ وہ تھے جو اپنا سامان ان کے سروں پر دیکھ کر ان کے پیچھے دوڑ لگا رہے تھے۔

"تفسیر نظر نہیں آیا۔ وہ کسی بھی کمپارٹمنٹ سے نہیں اترا تھا۔" شہاب صاحب کا پارہ چڑھنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا، کہاں مر گیا یہ جاہل آدمی۔ کوئی اطلاع تو دے سکتا تھا۔ ان کی نگاہیں بھٹکتی رہیں اور پھر وہ سست رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ ٹھیلے والے، قلی اور دوسرے لوگ مسلسل بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ تبھی ان کی نگاہ ایک سمت اٹھ گئی۔ کالی چادر اوڑھے ہوئے ایک نسوانی وجود گھڑیال کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کی گود میں پانچ چھ ماہ کا ایک بچہ نظر آ رہا تھا جسے وہ بے ڈھنگے انداز میں شانے سے لگائے ہوئے تھی۔ چہرے کا کافی حصہ ڈھکا ہوا تھا لیکن جو ہاتھ اس بچے کو سنبھالے ہوئے تھے وہ چغلی کھا رہے تھے کہ اس کالی چادر میں آسمانی بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اتنی حسین کلائیاں اتنی نازک انگلیاں تھیں کہ سنگ مرمر کی تراش لگتی تھیں۔ بڑی سی کالی چادر بڑے اسرار کی حامل تھی۔

شہاب صاحب کی بھوری آنکھوں میں ایک انوکھی چمک نمودار ہوئی۔ انھوں نے رخ بدل لیا اور چور نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی آنکھیں اطراف میں بھی بھٹک رہی تھیں۔ اس کے ساتھ کون ہے؟

لیکن ان کی عقابی نگاہوں نے جلد ہی تاڑ لیا کہ وہ تنہا تھی۔ وہ تفسیر کو بھول گئے اور اپنی جگہ سے ہٹ کر اس کی نگرانی کرنے لگے۔ بھیڑ بالکل چھٹ گئی تو وہ آگے بڑھی۔ چلنے سے پہلے بھی انداز بدلنے لگے اور ہوائیں بجلی کر نمایاں کرنے لگیں۔ شہاب صاحب کے بھینچے بھینچے ہونٹ کپکپائے اور اس سے تھوڑا فاصلہ کر کے وہ اس کے پیچھے چل پڑے۔

سیاہ چادر گیٹ سے نکلی۔ ٹکٹ چیکر جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس لئے گیٹ خالی پڑا تھا۔ شہاب صاحب نے سوچا شاید اس کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ ایک لمحے میں انھوں نے آئندہ اقدام کا فیصلہ کر لیا۔ جونہی وہ ہال سے گزر کر سیڑھیوں تک پہنچی شہاب صاحب اس کے قریب پہنچ گئے۔

"معاف کیجئے محترمہ! آپ نے ٹکٹ نہیں چیک کرایا؟" وہ ٹھٹھک گئی۔ اس نے شہاب صاحب کو دیکھا اور پھر بچے کو سنبھالتے ہوئے چادر میں چھپا پرس نکالا۔

"گیٹ پر کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ یہ ٹکٹ۔ اس میں سے میں کیسے نکالوں؟" آواز میں جلترنگ چھنک رہے تھے چہرے کے کچھ حصے بھی نمایاں ہوئے تھے۔ عنابی رنگوں سے پاک گلاب کی پنکھڑیاں متحرک تھیں۔

"یقیناً ہوگا ویسے بھی میں چیکر نہیں ہوں میرا تعلق انتظامیہ سے ہے۔"

"پولیس سے...؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"غضب پولیس سے۔" شہاب صاحب نے کہا اور پھر جلدی سے بولے۔

"آپ تنہا ہیں؟"

"جی... جی ہاں۔"

"کہاں سے تشریف لائی ہیں۔ چلئے آگے چلئے کسی شریف خاتون کو اس طرح راستے میں روک کر بات کرنا معیوب بات ہے لیکن آپ ہماری مجبوریاں سمجھتی ہیں۔ آئیے پلیز..." شہاب

صاحب کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولے اور وہ لرزتے قدموں سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ "کہاں سے تشریف لائی ہیں آپ؟"

"لاہور سے۔"

"کہاں جائیں گی؟"

"کسی ہوٹل میں۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ اور شہاب صاحب کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"کون سے ہوٹل...؟"

"کسی بھی اچھے ہوٹل میں کراچی کے ہوٹلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ بتا سکتے ہیں؟"

"یقیناً۔ آپ شریف خاتون ہیں اور یہ انتظامیہ کا فرض ہے آئیے۔" شہاب صاحب نے کار کے قریب پہنچ کر دروازہ کھول دیا۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی حسین لڑکی نے متوحش نگاہوں سے کار کو دیکھا پھر بولی۔

"آپ مجھے کوئی ٹیکسی دلوا دیں۔ پلیز! اور کسی ہوٹل کی نشاندہی کر دیں۔"

"براہ کرم تکلف نہ کریں۔ ٹیکسیوں کے بارے میں شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے کیوں خود کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ تشریف رکھئے۔" ابھی لڑکی تذبذب کا شکار تھی کہ دفعتاً سفید رنگ کی ریکارڈ مرسی ان کے عین سامنے آ کر رکی ساتھ ہی ایک چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اوہ انکل! آپ کیا آپ گلوریا کو لینے آئے تھے۔ اوہ انکل مجھے دیر ہو گئی۔ کہاں ہے وہ؟" شہاب صاحب کی روح فنا ہو گئی تھی۔ یہ ان کی بھتیجی ثنا تھی۔ کار وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ پیچھے ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا وہ نہیں آئی انکل؟"

"نہیں..." شہاب صاحب نے دل ہی دل میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

"لعنت ہے۔ یہ انگریز صرف وقت کی پابندی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ یہ کون ہیں انکل! ہیلو آپ کون ہیں؟" ثنا نے سیاہ چادر میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تم کار خود چلا رہی ہو۔ اس کی اجازت تمھیں کب ملی؟" شہاب صاحب کرخت لہجے میں بولے اور پھر وہ ڈرائیور سے ڈپٹ کر بولے "اور تو اندر بیٹھا کیا کر رہا ہے؟" ڈرائیور دم بخود تھا۔ پھرتی سے دروازہ کھول کر دوسری طرف اتر گیا۔

ثنا کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے بوکھلاہٹ دوڑ گئی۔ پھر اس نے شہاب صاحب کو نظرانداز کر کے پوچھا: "آپ نے بتایا نہیں آپ کون ہیں؟"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی نے کہا۔

"جی...؟" ثنا حیرت سے بولی: "آپ یہاں انکل کی کار کے قریب کھڑی میری مدد کا انتظار کر رہی تھیں اور ذرا اس ہیرو کو دیکھئے شاید یہ آپ کا بچہ ہے؟" ثنا کی نگاہ بچے کی طرف اٹھ گئی تھی۔ خوبصورت بچے اس کی کمزوری تھے اس لئے ذہنی رو ایک دم بھٹک گئی۔ اس نے بچے کو گود میں لے لیا: "ہائے پھول ہے یہ تو۔ انکل دیکھئے..." ثنا نے خوش ہو کر کہا۔

"ثنا! کیا حماقت ہے۔ تم دوسروں کو نہیں دیکھ رہیں؟" شہاب صاحب غرائے۔

"نہیں پیارے بدمعاش۔ دھت تیرے کی۔" ثنا بچے کی ٹھوڑی کو انگلی لگا کر بولی۔ شہاب صاحب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بات بگڑ گئی ہے۔ اور اب اس کے بننے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک صرف ایک بات کے علاوہ اور کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو خطرناک ہوتی۔ اگر ثنا مردود درمیان میں نہ ٹپک پڑتی تو چادر میں لپٹی لڑکی ہوٹل ہی جاتی لیکن اس ہوٹل میں جہاں شہاب صاحب کے پاس ایک مستقل کمرہ موجود تھا اور سارا اسٹاف ان کا شناسا۔

"تم جس طرح چاہیں ان کی مدد کرو ثنا۔ بے چاری پریشان معلوم ہوتی ہیں مجھے جلدی ہے۔ پلیز!" وہ اسٹیئرنگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ اور پھر ان کی مرسڈیز نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"کمال ہے کیا انکل عجیب نہیں ہیں۔ آپ جانتی ہیں انھیں۔ ارے اوہ... او بے ایمان" ثنا بچے کو ایک دم دودھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا...؟" چادر میں لپٹی لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"جو ہونا چاہیئے۔ بہت تیز معلوم ہوتے ہیں یہ حضرت۔" ثنا ہنستی ہوئی بولی۔

"معاف کیجئے۔" لڑکی ندامت سے بولی "اس نے آپ کو گندہ کر دیا۔" اس نے بچے کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

"رہنے دیں۔ رہنے دیں۔ آیئے گاڑی میں بیٹھیں۔ اصغر چلو تم آگے بیٹھو گاڑی چلاؤ۔ میں پیچھے ہی بیٹھوں گی۔" ثنا نے دروازہ کھولا اور چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی جھجکتی ہوئی اندر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی اور اسے ریورس کرنے لگا لیکن دوسرے لمحے ثنا پھر چیخ پڑی۔

"ارے روکو، روکو... او بے وقوف آدمی روکو۔ میں تو بھول گئی تھی تمہارا دماغ بھی خراب ہو گیا ہے۔" ڈرائیور نے پھرتی سے کار کو بریک لگا دیا تھا۔

"یہ گلوریا کم بخت ستیاناس اُس کا۔ میں تو اتنا اچھا پروگرام چھوڑ کر اُس کے لئے بھاگی ہوں وہ آئی ہی نہیں۔ انکل نے کہا تھا کہ وہ نہیں آئی۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے کیا گلوریا نہیں آئی یا انکل جھوٹ بول رہے تھے۔" اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی بے بسی سے اُس کی صورت دیکھ کر رہ گئی تھی پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"میں نہیں جانتی گلوریا کو۔ میں بالکل نہیں جانتی۔"

"اوہ... انکل تھامس کی بیٹی ہے یورپ سے آئی ہوئی ہے۔ اِن دنوں سوات کالام اور دوسرے علاقوں کی سیر کرنے گئی ہوئی تھی۔ مجھے ٹیلی گرام دیا تھا کہ آ رہی ہوں۔ ٹرین اور وقت بھی لکھا تھا لیکن ابھی تک تو اُس کا پتہ نہیں ہے سنو۔ تم سنو۔ ذرا پکڑو اس کو میں ایک نظر پلیٹ فارم پر دیکھ آؤں ممکن ہے وہاں موجود ہو۔" اُس نے بچے کو سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی کی گود میں دے دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگی لیکن پھر رُک گئی اور جھینپے ہوئے انداز میں بولی۔

"لیکن لیکن... میرے کپڑے تو بالکل خراب ہیں۔ شاید گلوریا آئی ہی نہیں ورنہ انکل مجھے مِس گائیڈ نہ کرتے۔" چند لمحات وہ خود کلامی کے انداز میں اسی قسم کی باتیں کرتی رہی اور پھر جھنجلا کر انداز بیٹھتی ہوئی بولی۔

"ہُنہ... اگر آئی گئی ہے تو پہنچ جائے گی کسی نہ کسی طرح۔ میں جھوٹ تھوڑا ہی بول رہی ہوں اُسے لینے اسٹیشن آئی تھی۔ جب وہ ملی ہی نہیں تو میں کیا کروں۔ اصغر چلو۔" اس نے دروازہ زور دار آواز کے ساتھ بند کر لیا۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی لڑکی کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پھیکی سی لکیر نمودار ہوئی تھی! اس کے بعد معدوم ہو گئی تھی شاید ابھی اس کے مسکرانے کے دن نہیں تھے چنانچہ اس اچانک آ جانے والی مسکراہٹ کو اس نے اپنے ہونٹوں میں ہی دفن کر دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹیشن سے باہر نکال لی اور سیدھی سڑک پر دوڑنے لگا۔ دفعتاً ثنا کو پھر لڑکی کا خیال آیا اور اُس نے کہا۔

"ہاں... ہاں تم نے کہا تھا میں تمہاری کچھ مدد کروں۔ بولو بولو کیا چاہتی ہو؟"

"مجھے کسی مناسب سے ہوٹل میں پہنچا دیجئے۔ دراصل کراچی کے ہوٹلوں کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی۔ بس کوئی ایسا ہوٹل ہو جہاں میرے لئے کوئی پریشانی نہ ہو۔ پیسے وغیرہ میرے پاس موجود ہیں اِس کی کوئی وقت نہیں ہوگی آپ کو؟" ثنا نے چونک کر لڑکی کو دیکھا اور پھر بولی۔

"ذرا یہ چادر تو تھوڑی سی پیچھے کر دو یہ کیا گھونگٹ سا نکال رکھا ہے۔ قدیم زمانے کی بیگمات کی مانند۔" چادر سے جو چہرہ نمودار ہوا اُسے دیکھ کر ثنا آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی تھی۔ ڈرائیور خاموشی سے سڑک پر نگاہیں جمائے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کئی منٹ کے بعد ثنا نے کہا۔

"تم اکیلی ہوٹل میں ٹھہرو گی؟"

"ہاں! مجبوری ہے۔" لڑکی نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"کیا مجبوری ہے۔" ثنا نے پوچھا اور وہ ایک دم چونک پڑی۔

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ بس میں میرا مطلب ہے میں اِس بچے کے ساتھ تنہا ہی ہوں یہاں میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔"

"ہوں... میں بھی نہیں ہوں۔" ثنا عجیب سے لہجے میں بولی اور لڑکی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"میں نہیں سمجھی۔"

"میں آپ کی شناسا نہیں ہوں جب انکل آپ کے شناسا ہیں تو پھر میں نہ ہوئی؟"

"وہ آپ کے انکل تھے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ہاں! انکل شہاب! ڈیڈی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بچپن سے غیر شادی شدہ ہیں۔ اور شاید بڑھاپے تک غیر شادی شدہ ہی رہیں گے۔ بڑے مزے کی چیز ہیں۔ بہرحال تم ہوٹل میں نہیں ٹھہرو۔ میرا یہی مشورہ ہے میرے ساتھ چلو نا۔"

"تمہارے ساتھ...؟" لڑکی کی آواز لرز گئی۔

"ہاں! میں بھیڑیا نہیں ہوں جو تمہیں کھا جاؤں گی اور پھر اتنی خوبصورت لڑکیوں کو تو بھیڑیا بھی نہیں کھائے گا... بھلا کس دل سے کھا سکے گا۔ اصغر گھر چلو۔" ثنا نے خود ہی فیصلہ کر لیا لڑکی کے ہونٹ بے بسی سے ایک لمحے کے لئے کھلے اور اس کے بعد بند ہو گئے تھے شاید اُس نے ثنا پر بھروسہ کر لیا تھا۔

ریکارڈ ڈیفنس کی ایک خوبصورت کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ سیاہ چادر میں سہمی ہوئی لڑکی نے باہر قدم رکھا۔ اُس کے وجود پر لرزشیں طاری تھیں۔

"لاؤ اِس ہیرو کو مجھے دے دو۔ ارے ہاں نام کیا ہے اِس کا۔" ثنا نے سوتے ہوئے بچے کو پھر گود میں لے لیا۔

"تیمور..." لڑکی کی آواز اُبھری۔

"اور تمہارا...؟"

"ردا..." اُس نے جواب دیا۔

"آؤ اندر آ جاؤ۔ اِس وقت میں تمہیں کسی سے نہیں ملاؤں گی کل صبح سب کو سرپرائز دوں گی۔ اُدھر سے نہیں اِس طرف سے آؤ۔ میں نے کچھ چور دروازے بنا رکھے ہیں۔ ارے یہ منحوس کہاں سے آ مرا۔"

ایک نوجوان لڑکا اِسی طرف آ رہا تھا۔ ثنا کو دیکھ کر وہ رُک گیا۔

"وہ ثنا بی بی میں نے..."

"فانوس کے فیوز بلب بدل دئے؟" ثنا نے اُس کی بات اُچک لی ساتھ ہی وہ تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی اور سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔

"نہیں جی وہ..." لڑکا بولا۔

"بلب نہیں بدلے؟" ثنا دانت پیس کر بولی۔

"بدل دئے جی وہ۔"

"دفعان ہو جاؤ..." ثنا دہاڑی اور لڑکا رُک گیا۔ دونوں آگے بڑھ کر ایک بغلی راہداری سے اندر داخل ہو گئیں۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی ردا اِس کوٹھی کی شان و شوکت دیکھ رہی تھی اور بار بار خشک گلابی ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتی اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہراس تھا۔

ثنا اُسے اپنے بیڈروم میں لے آئی "اب یہ چادر اُتار دو۔" اس نے کہا۔ اور لڑکی نے جھجکتے ہوئے چادر اُتار دی۔ ثنا حسن و جمال کے اِس پیکر کو دیکھتی رہ گئی۔ دودھ اور میدے کی آمیزش سے تشکیل پایا کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں چہرے کے نقوش میں تمکنت۔ ساتھ ہی پریشانی کی لکیریں اخروٹی رنگت کے اُلجھے اُلجھے بال۔

"ہیرو کا کوئی نیا ڈریس ہے؟" ثنا نے پوچھا۔

"نہیں... میں نے سوچا تھا یہیں خرید لوں گی۔" ردا کی آواز اُبھری۔

"تم غسل کر لو ردا! میں کچھ انتظام کر لوں گی۔ جاؤ پلیز اب اِس کی فکر مت کرو۔ وہ ٹوائیلٹ ہے۔" ثنا نے کہا۔ اور ردا غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ ثنا نے کنول جیسے کھلے ہوئے بچے کو گود میں اُٹھایا اور اُسے جُھلاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ طویل راہداری سے گھوم کر جب وہ سامنے کے حصے میں پہنچی تو شامت کی ماری عارفہ بیگم سامنے آ گئیں۔ عارفہ بیگم کوٹھی کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ تھیں۔ پان کھانے اور اِدھر کی اُدھر کرنے کے علاوہ اُنھیں اور کوئی کام نہیں تھا۔ اِس وقت بھی چھالیوں کی پُڑیا ہاتھ میں لئے جا رہی تھیں۔ بچے کی آواز سُن کر رُک گئیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھا اور قریب آ کر بولیں۔

"کس کا بچہ ہے یہ؟ ثنا کس کا بچہ ہے؟"

"میرا..." ثنا نے اُسے چومتے ہوئے کہا اور چھالیوں کی پُڑیا عارفہ بیگم کے ہاتھ سے گر گئی۔

☼

"خدا غارت کرے تجھے۔" شوکت جہاں سوتے سوتے بڑبڑائیں اور سی کی آواز نکال کر اُٹھ بیٹھیں۔ پنڈلی اور گھٹنے کے جوڑ کے پاس ایک موٹا سا ددوڑا پڑ گیا تھا۔ دیر تک نندا سی آنکھوں کو ملتے ہوئے ددوڑے کو کھجاتی رہیں پھر مجرم کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں لیکن مجرم اناڑی نہیں تھا کاٹ کر فوراً کھڑے بالوں میں گھس گیا ہوگا۔ لاکھوں پناہ گاہیں تھیں اُس کے لئے۔ بدن کے مختلف حصوں میں کھجلی ہونے لگی تو پتہ چلا کہ مجرم تو بہت دیر سے وارداتیں کر رہا ہے۔ نیند کچھ ایسی گہری تھی کہ پتہ نہیں چل سکا لیکن اب انتقام کا وقت تھا۔ آنکھ کھل گئی تو اُن مجرموں کی سرکوبی ضروری تھی۔ اُنھوں نے جُھک کر پائنتی پڑی ہوئی جوتی اُٹھائی۔ پلنگ سے نیچے اُتریں اور اُس کے پائے پکڑ کر زور سے زمین پر دے مارے۔ پُورا خاندان نیچے گر پڑا اور وہ جوتے کے تلے کو زمین پر گھسنے لگیں۔ خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں لیکن معلوم نہیں اِن میں اصل مجرم تھا یا نہیں۔ یہی ہوتا ہے واردات کرنے والا تو ہوشیار ہوتا ہے۔ بے گناہ مارے جاتے ہیں لیکن اِن میں کوئی بے گناہ نہیں تھا۔ سب کے سب خونی تھے۔

حالانکہ دن بھر چارپائیاں دُھوپ میں پڑی رہتی تھیں لیکن غریب گھر کے کھٹمل بھی موسم کی شدت کے عادی ہو جاتے ہیں اپنا ٹھکانہ کون چھوڑے۔ گھر کے مکین روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ وہ بے چارے بھی دن بھر دُھوپ کھاتے رات کو پتلا پانی جیسا خون چوس کر گزارہ کر لیتے۔

شوکت جہاں کی نیند اُڑ گئی تھی۔ اُنھوں نے گہری سانس لی۔ ایک دیوار پر مدھم سا اُجالا دیکھ کر چونک پڑیں۔ "تف ہے اِن کمبختوں پر پھر لالٹین بجھانا بھول گئیں کس قدر لاپروا ہیں باپ کی پریشانیوں کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ دل تو چاہا کر دونوں کی چوٹیاں کھینچ کر اُٹھا دیں لیکن نہ جانے کیا سوچ کر رُک گئیں۔ ایک کراہ کے ساتھ دوبارہ چارپائی سے نیچے اُتریں اور دالان کے تخت کی طرف بڑھ گئیں۔ تخت کے برابر ٹمٹماتی لالٹین کا مہرہ اُٹھا کر پھونک مار دی تاریکی کچھ اور بڑھ گئی پھر وہ لالٹین رکھ کر اندازے سے قدم اُٹھاتی ہوئی چارپائی کی طرف بڑھیں تو اس وقت عائشہ کی آواز سنائی پڑی

"دُلہن! کیا لالٹین تم نے بجھائی ہے؟"
"ہاں، اماں بی! یہ لڑکیاں تو کسی بات کا خیال ہی نہیں رکھتیں۔"

"میں نے کہا تھا اُن سے کہ لالٹین ہی چھوڑ دیا کرو۔ مگر تمہیں کہاں گوارا ہے۔ رات میں اُٹھتی ہوں تو کتنی ٹھوکریں کھاتی ہوں۔ گر پڑی تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ یہی چاہتی ہو نا؟"
"تیل کی بوتل سوا روپے کی ہوگئی ہے اماں بی۔ رات بھر میں خاک ہو جاتی ہے۔ اتنی دولت کہاں سے آئے؟"
"ہاں ساری دولت مجھ پر ہی تو خرچ ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہتیں کہ اتنا تنگ ہو مجھ بوڑھی سے سارے زہر منگوا دو تھوڑے بہت سے خرچ کم ہو جائیں گے۔" اماں بی نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔
"اماں بی خُدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ نے لالٹین جلانے رکھنے کے لئے کہا تھا۔ میں ابھی جلائے دیتی ہوں۔" شوکت جہاں خود بھی اندھوں کی طرح ٹٹولتی ہوئی باورچی خانے گئیں، ماچس لائیں اور لالٹین روشن کر کے بتی ذرا نیچے سرکا دی۔ انہیں غلام احمد کا خیال تھا جن کے خراٹے اُبھر رہے تھے۔ جانتی تھیں کہ اگر اماں بی شروع ہو گئیں تو ساری رات جاری رہیں گی اور غلام احمد کی نیند ادھوری رہ جائے گی۔ اُن کی شکایتی نگاہیں شوکت جہاں کے بدن میں چبھتی رہیں گی۔ غلام احمد کی زبان بند ہو گئی تھی لیکن آنکھیں بولنے لگی تھیں۔ ماں کی زیادتی ہوتی تو اُن کی شکل تکتے رہتے۔ بیوی جھنجلا جاتی تو اُن کی آنکھوں میں شکایت اُبھر آتی۔ یہی غلام احمد تھے، محفلوں کی جان۔ جن کے قہقہے گھن گرج ہوتے لیکن وقت نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔

لالٹین کی دُھندلی روشنی میں اُنھوں نے غلام احمد کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ بے سدھ ہو کر سو رہے تھے۔ دن کے بارہ گھنٹے ڈیوٹی دیتے ہیں۔ صبح پانچ بجے اُٹھنا ہوتا ہے۔ باہر نل پر گھڑوں کی لائن لگی ہوتی ہے۔ نلوں میں پانی پانچ بجے آتا ہے اور اُسی وقت سے گھڑے کنستر بجنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ذرا سی دیر ہو جائے تو دس بجے تک نمبر نہ آئے۔ اس لئے غلام احمد ٹھیک پانچ بجے اُٹھ کر پانی بھرنے کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

خُدا بھلا کرے اماں بی کا خاموش ہو گئی تھیں... شاید نیند میں بول اُٹھی تھیں اگر پوری طرح جاگ گئی ہوتیں تو اتنی جلدی زبان بند نہ ہو پاتی۔ وہ دبے قدموں چارپائی پر جا لیٹیں۔

○

"باجی!" ندرت نے عصمت کے بدن میں انگلی چبھوئی اور عصمت اُچھل پڑی۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی آواز خوف زدہ سی تھی۔
"کیا مصیبت نازل ہو گئی تجھ پر۔ کتنی بار کہا ہے کہ گدگدی مت کیا کر کسی دن ہاتھ جڑ دوں گی۔" عصمت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
"خُدا قسم باجی! کوئی صحن میں کودا ہے۔ میں نے ابھی آواز سُنی تھی۔"
"سو جا خاموشی سے امّی نے چارپائی جھٹکی تھی۔ میری آنکھ بھی اسی سے کھُل گئی۔" عصمت نے کہا۔
"ہائے کوئی چور نہیں تھا۔ باجی اگر واقعی ہمارے گھر میں کوئی چور گھس آئے تو...؟"
"واپس جا کر بیوی کی پٹائی کرے گا کہ کام پر جاتے وقت اُس نے اپنی شکل کیوں دکھا دی تھی۔ کوئی ہمدرد ہُوا تو دوسرے دن پھر آئے گا اور کچھ چیزیں چھوڑ جائے گا اور بس۔" عصمت نے کہا اور ہنس پڑی۔ ندرت کچھ سوچنے لگی تھی۔ کسی ایسے چور کی کہانی جو بہت خوبصورت ہوتا ہے، بہت ہمدرد ہوتا ہے۔ اُس نے عصمت کے سینے میں سر گھسیڑ لیا اور بہن کے دل میں اِس لمس سے محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ اُس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ سب کچھ یاد تھا اُسے لیکن بدنصیب ندرت نے اِس آفت زدہ گھر میں ہی ہوش سنبھالا تھا۔

بہت دن پہلے وہ مشرقی پاکستان میں رہتے تھے... پٹوا ٹولی میں غلام احمد کا نصابی کورس کا کاروبار تھا۔ لاکھوں کی کمائی تھی، وارے نیارے تھے۔ غلام احمد کا خاندان پٹنہ سے آ کر مشرقی پاکستان میں آباد ہُوا تھا۔ اُس کے اجداد بہت کچھ لائے تھے وہاں سے اور بہت کچھ کیا تھا اُنھوں نے لیکن تقدیر نے کروٹ بدلی۔ سب کچھ چھن گیا اور غلام احمد بمشکل بیوی اور دو بچیوں کو بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گیا تھا۔ لاکھوں روپے کی جائداد۔ لاکھوں کا بینک بیلنس وہیں چھوڑ آیا تھا۔ ریڈ کراس کے ایک رکن کو اُس نے اپنے حسابات سونپے تھے لیکن ایسی افراتفری کے عالم میں کہ اپنے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جان ہی بھاری پڑ رہی تھی۔ مشرقی پاکستان سے ہندوستان اور وہاں سے پاکستان۔ موت کا سفر تھا اور اِس سفر میں وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اپنی حیثیت اپنا مال و اسباب سب کچھ۔

اور اب صرف یہ زندگی تھی۔ اچھے دن دیکھنے والے بُرے دن دیکھ رہے تھے۔ شخصیتیں ہی بدل گئی تھیں۔ اماں بی بے حد ہنس مکھ تھیں۔ بڑی کشادہ دل۔ اتنی نرم خُو اور رکھ رکھاؤ والی تھیں لیکن اب

وہ جس ماحول میں تھے۔ اُسی کے باسی بن گئے تھے۔ اورنگی ٹاؤن میں پناہ گزینوں کے لئے جھونپڑیاں پڑی تھیں۔ غلام احمد کو بھی تھوڑی سی زمین مل گئی تھی اور اُس نے نہ جانے کیا کیا جتن کر کے اُس جھونپڑی کو دیواریں اور ٹین کی چھت دے دی تھی۔

عرصہ دراز تک تو وہ بے روزگار رہا تھا پھر ایک جگہ ڈرائیور کی نوکری مل گئی تھی۔ اپنی کار چلاتا رہا تھا۔ اِس وقت یہ تجربہ ہی کام آیا تھا۔ صبح نو بجے سے رات کو آٹھ بجے تک ڈیوٹی ہوتی تھی۔ ایک گھنٹہ آنے جانے میں خرچ ہو جاتا تھا پھر زندگی کے دوسرے مسائل۔ بوڑھی ماں، بیوی اور دو بیٹیاں مشرقی پاکستان سے آیا تھا تو ندرت صرف دو سال کی تھی اور عصمت بارہ سال کی چند روز میں یہ سوکھی لکڑیاں اب سرسبز پتوں سے ڈھک گئی تھیں۔ جوانی اُن کا قصور نہیں تھی لیکن یہ غلام احمد کا قصور بن گئی تھی۔ بھری آنکھوں دیکھتا بھی نہیں تھا انھیں۔

عصمت کو پھر بھی ہوش تھا لیکن ندرت۔ اُس کے وجود میں پارہ بھرا ہُوا تھا۔ شرارتوں کی پتلی عمر کے بوجھ کو خاطر میں نہ لانے والی۔ دادی اماں یعنی اماں بی اور امّی کی کڑی نگاہ نہ ہوتی تو اب تک اِس محلّے میں دو چار خون ہو گئے ہوتے لیکن دونوں کے تجربے اُس کی سرکشی کو روکے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ سانولے سلونے رنگ پر ایسے تیکھے اور حسین نقوش جاگے تھے کہ دیکھنے والوں کی آنکھ نہ ٹکتی تھی۔ یوں زندگی گزر رہی تھی۔ قلیل آمدنی میں اِن بیلوں کو منڈھے چڑھانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور غلام احمد اُن سے بُری طرح خوفزدہ تھا۔ بھولی بھٹکی نگاہ بیٹیوں پر پڑ جاتی تو بدن کانپنے لگتا تھا۔ کیسے اور کہاں سے یہ دو بوجھ سر سے اُتارے گا۔ زمانہ خراب تھا جس علاقے میں رہتا تھا۔ وہاں کے ماحول میں خطرات ہی خطرات تھے۔ ماں اور بیوی فرض نبھا تو رہی تھیں لیکن۔

صبح کے پانچ بجے پُورا گھر جاگ گیا۔ باہر نل پر برتن کھٹکنے لگے تھے۔ شوکت جہاں نے جھاڑو سنبھال لی۔ عصمت گیلی لکڑیاں سُلگانے لگی۔ ٹال والا ان لکڑیوں کی آبیاری کرتا رہتا تھا تا کہ اُن کا وزن بڑھ جائے جلانے والوں کی بینائی جاتی رہے۔ اُس کی بلا سے۔

دودھ والے کی آواز سُنائی دی تو ندرت نے برتن اُٹھا لیا۔ اور دروازے پر پہنچ گئی۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو دودھ والے کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے ناپ کے برتن کو واپس دودھ کے بڑے ڈبے میں پلٹ لیا اور سائیکل سے لٹکے چھوٹے ڈبے سے دُودھ نکال کر برتن بھر دیا۔ یہ نئی بات نہیں تھی۔ عموماً دُودھ شوکت جہاں ہی لیتی تھیں لیکن جب بھی کبھی ندرت دُودھ لیتی تو دُودھ کا مزا ہی کچھ اور ہوتا تھا۔
"آج چائے مزیدار ہے۔" اماں بی نے کہا۔
"یہ دُودھ والا بھی خوب ہے۔ کبھی پتلا پانی جیسا دودھ لاتا ہے اور کبھی یہ گاڑھا۔"
"مجھے وہ ہمیشہ چھوٹے ڈبے سے دُودھ دیتا ہے۔" ندرت بول پڑی اور غلام احمد کے اوپر اُٹھتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔
"کیا مطلب؟"
"آج بھی مجھے دیکھ کر اُس نے بڑے ڈبے کا دُودھ واپس پلٹ لیا اور چھوٹے ڈبے سے دودھ نکال کر دیا۔" ندرت نے سادگی سے کہا۔ غلام احمد نے بیوی کی طرف دیکھا پھر باہر جاتے ہوئے اُس نے کہا۔
"آئندہ صرف تم دُودھ لیا کرو۔"
غلام احمد زمانہ شناس تھا۔ وقت نے اُسے بڑا تجربہ دیا تھا۔ اپنی فکر نہیں تھی لیکن اپنے گھر کو زمانے کے ہاتھوں غیر محفوظ سمجھتا تھا غریب کی عزت تو لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہوتی ہے۔
عصمت نے ندرت سے کہا۔ "تو بالکل ہی جنگلی ہے ندرت؟"
"کیوں باجی؟"
"دُودھ کی بات اباجی کے سامنے کیوں کہی تھی؟"
"کوئی خاص بات ہو گئی باجی؟" ندرت نے تعجب سے پوچھا
"اس کھوپڑی میں صرف شرارتیں بھری ہیں اور کچھ بھی نہیں۔" عصمت نے دانت پیس کر کہا اور ندرت پُرخیال انداز میں کھوپڑی گھمانے لگی۔
اُسی شام غلام احمد کچھ جلدی واپس آ گیا۔ گلی میں داخل ہُوا تو ڈھاکہ سوئٹ مرچنٹ کے سامنے لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اُن کے قریب پہنچ گیا۔ مجمع کے درمیان رحمن دہاڑ رہا تھا۔
"سدھر جاؤ ایک ایک سدھر جاؤ۔ اپنی کھوپڑی پہلے سے زیادہ گرم ہو گئی ہے۔ ادھا کی سارا کڑھائی پیچھو گلی میں لے جاؤ اور اُدھر صفائی کرو۔ اِدھر پانی کا ایک قطرہ دیکھا تو دُکان میں آگ لگا دوں گا کیا سمجھا؟"
"خیال رکھوں گا رحمن بھائی! آپ کا حکم نہ مانوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سوئٹ مرچنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کڑھائی میں [illegible] لڑکے کی کمر پر لات جما کر بولا۔ "آگے سارا کڑھائی پیچھے محلے کا چیمپئن آگیا ہے اس کا حکم مانو۔ اٹھاؤ کڑھائی۔"
جیسے ہی [illegible] نے ایک [illegible] کو دیکھا تھا اُس کی نظر میں غلام احمد

پہنچ گئیں۔ اور اُس کی باچھیں کھل اُٹھیں: "سلام علیکم ڈرائیور جی، کیسے حال ہیں۔ سر پر ہاتھ رکھو۔ تمھاری دُعاؤں سے ایک مہینے کی کم ہوئی۔ میرے لائق کوئی خدمت؟"

غلام احمد کا ہاتھ مشینی انداز میں رحمٰن کے سر پر پہنچ گیا۔ کچھ کہنے کے لئے اُس نے کہا: "تمھاری صحت تو پہلے سے اچھی ہوگئی ہے رحمٰن۔"

"بس تمھاری دُعائیں ہیں چچا!" رحمٰن نے غلام احمد کا ہاتھ پکڑا اور اُس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا: "بس بہت کچھ سوچا ہے چچا۔ والدین کی قسم اللہ تعالیٰ نے نیک ہدایت دے دی ہے۔ اب فیصلہ کیا ہے کہ سارے دھندے چھوڑ دوں گا۔ کل سے نماز بھی شروع کر رہا ہوں۔ گزارے کے لئے ریڑھی لگا لوں گا۔ چار پیسے کمانا اچھا ہے۔ ویسے اللہ کا دیا اپنے پاس سب کچھ ہے۔"

رحمٰن غلام احمد کے ساتھ ساتھ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا حالانکہ غلام احمد کو اُس کا ساتھ چلنا ناگوار گزر رہا تھا۔ بمشکل تمام اُس نے کہا۔

"ہاں! بہت اچھی بات ہے رحمٰن! محنت کی کمائی میں مزا ہے۔"

"اس بار جیل میں ایک مولوی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ بڑا سمجھایا اُنھوں نے مجھے۔ بڑے پہنچے ہوئے تھے۔ بس چچا! اُن کی دُعا ہوگئی۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں۔ سوچ رہا ہوں گھر بسا لوں کوئی نیک بخت آئے گی تو ذمے داری بھی آ پڑے گی کندھوں پر اور پھر کسی بُرے دھندے کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں والدین کی قسم۔"

"بڑا اچھا خیال ہے کسی اچھے گھر میں رشتہ کرلو۔" غلام احمد نے جان چھڑانے کے لئے کہا۔ مکان قریب آگیا تھا اور رحمٰن ساتھ نہیں چھوڑ رہا تھا اس لئے وہ رُک گیا۔ رحمٰن نے عقیدت سے جھومتے ہوئے کہا۔

"ہاں چچا! بس تم ہی بڑے ہو۔ تم سے زیادہ تو میرے لئے اور کون بہتر سوچ سکتا ہے۔" وہ گردن گھمانے لگا۔

"اچھا رحمٰن میاں! بڑی خوشی ہوئی تمھارے خیالات سُن کر۔ خدا تمھیں ہدایت دے۔ اب اجازت دے دو۔"

"ابھی تو چچی کو سلام کرنا ہے۔ دو مہینے کے بعد آیا ہوں۔ مجھے دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔" رحمٰن نے ہنستے ہوئے کہا اور غلام احمد کی آنکھیں عجیب سے انداز میں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اُن آنکھوں میں بے بسی تھی۔ وہ خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ گھر کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ اُس نے اشارے سے شوکت جہاں کو قریب بلایا اور وہ نزدیک پہنچ گئی۔

"وہ رحمٰن آیا ہے تمھیں سلام کرنے۔" اُنھوں نے مُردہ سے لہجے میں کہا۔

"کون رحمٰن! وہ غنڈا؟"

"ہاں! تین مہینے کی سزا ہوئی تھی دو مہینے میں چھوٹ گیا ہے کم بخت گلی میں مل گیا تھا۔ پیچھے لگ گیا۔ جاؤ پردے کے پیچھے اُس سے سلام دُعا کرلو۔ ہوشیاری سے ٹال دینا۔"

"میں نے تو کبھی بات بھی نہیں کی اس منحوس سے۔ اب کیا کروں۔ تم کیوں ساتھ لگا لائے اسے؟" شوکت جہاں نے پریشانی سے کہا۔

"خود ہی لگ رہا ہے بدبخت! بس ایسے ہی گفتگو کرکے ٹال دو۔" غلام احمد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور شوکت جہاں پریشانی سے پردے کے قریب پہنچ گئیں۔

"کیسے ہو رحمٰن؟" اُنھوں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اوہ... چاچی! سلام علیکم۔ بس سلام کرنے چلا آیا تھا۔ پڑوس کی بات ہے بالکل اپنا سمجھتا ہوں۔ آپ لوگوں کو کوئی تکلیف ہو جائے تو مجھ سے کہہ دیا کرو۔" رحمٰن نے لجاجت سے کہا۔

"تمھاری مہربانی ہے بھیا۔"

"نہیں چاچی! میں تو تمھارا اپنا بچہ ہوں۔ اچار ہے دو تو کبھی کبھی آجایا کروں۔ بہت محبت ہے مجھے تمھارے گھر سے۔" رحمٰن نے کہا۔

اس دوران شوکت جہاں کئی بار محسوس کرچکی تھیں کہ رحمٰن بار بار اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُنھوں نے لرزتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھیا... ذرا ہنڈی چولہے پر رکھی ہے۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔" یہ کہہ کر وہ پردے کے پاس سے ہٹ آئیں۔ غلام احمد اُن سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ شوکت جہاں اور رحمٰن کی باتیں سُن رہا تھا۔ آہستہ سے کہا۔

"چلا جائے گا خود ہی۔"

"مگر یہ مردار یہاں آیا کیوں تھا؟"

"بس کیا بتائیں ایسے لوگوں کا اپنی عزت خود سنبھال کر رکھو۔ بچیوں کو کبھی دروازے پر کھڑا نہ ہونے دیا کرو۔" غلام احمد نے کہا اور اندر چلا گیا لیکن اُس رات اُسے نیند نہیں آئی تھی۔ لالٹین کی مدھم سی روشنی میں کئی بار شوکت جہاں نے بھی محسوس کیا تھا کہ غلام احمد جاگ رہا ہے۔ لیکن کیا کرتی؟ کیا کہتی؟

●

دوسرے ہی دن غلام احمد کو رحمٰن کی ایک اور عنایت سے دوچار ہونا پڑا۔ دن کو دس گیارہ بجے تک چارپائی پر اینٹھنے والا رحمٰن نہ جانے کس طرح صبح چار بجے اُٹھ کر نل پر آگیا تھا۔ بے چارہ غلام احمد اپنی باری کے انتظار میں کھڑا تھا کہ وہ قریب پہنچ گیا۔

"ارے ڈرائیور چچا تم کیسے؟" اُس نے سوال کیا۔

"پانی کے لئے کھڑا ہوں رحمٰن۔" غلام احمد نے جواب دیا۔

"والدین کی قسم لعنت ہے رحمان پر۔ وہ زندہ ہو اور اُس کا چچا پانی کے لئے کھڑا رہے۔ کون سے گھڑے ہیں تمھارے چچا؟" رحمان نے گھڑوں کی لائن پر نگاہ ڈالی اور بے اختیار غلام احمد نے اپنے گھڑوں کی طرف اشارہ کردیا۔

رحمان نے آگے بڑھ کر دونوں گھڑے اُٹھا لئے اور انھیں لائن سے نکال کر نل کے پاس پہنچ گیا۔

"ہٹا بے ہٹا..." اُس نے کہا اور جو شخص اپنی باری پر پانی بھر رہا تھا اُس نے جلدی سے نل کے نیچے سے آدھا بھرا ہُوا کنستر ہٹا لیا۔ رحمان نے گھڑا نل کے نیچے لگا دیا۔

"ارے نہیں رحمان! یہ غلط ہے جس کا نمبر ہے اُسے بھرنے دو۔" غلام احمد آگے بڑھ کر بولا۔

"رہنے دو چچا! والدین کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔ مجال ہے دوسرے پانی بھریں اور تم انتظار کرو۔ سُن لو بے۔ کل سے چچا کا پانی اُن کے گھر پہنچے گا۔ اپنے گھڑوں کی خیر چاہتے ہو تو سب سے پہلے چچا کے گھڑے بھر کر اُن کے گھر پہنچا دیا کرو ورنہ والدین کی قسم تم سب کو ٹیلسکوپ دکھا دوں گا۔" رحمان کا یہ جملہ سُن کر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ غلام احمد نے کوشش کی کہ رحمان باز آجائے لیکن اُسے باز رکھنا ناممکن تھا۔ اُس نے دونوں گھڑے بھر کر اُٹھا لئے اور غلام احمد کے گھر کی طرف چلا۔

"ارے... ارے رحمان! اب اتنا شرمندہ مت کرو۔ لاؤ، مجھے دے دو۔ لاؤ رحمان!" غلام احمد نے کہا۔

"والدین کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا چچا!" رحمان دروازے پر پہنچ گیا اور پھر اُس نے آواز دی۔

"پردہ کرلو چچی! میں اندر آرہا ہوں۔" اور اُس کے ساتھ ہی وہ پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوگیا۔ گھر میں بھگدڑ مچ گئی تھی جس کو جہاں جگہ ملی گھس گیا اور رحمان نے گھڑے گھڑونچی پر رکھ دیئے اور پھر گردن جھکائے باہر نکل گیا۔

غلام احمد گُنگ ہوگیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے کیا کرے۔ رحمان نے احسان کیا تھا اُس کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا لیکن یہ احسان اُس کے لئے عذاب بن گیا۔ اب وہ پڑوسیوں کی نفرت کا شکار ہوگیا تھا۔ صبح کو اُس کے گھڑے سب سے پہلے بھر جاتے رحمان کے بہت سے چمچے تھے۔ جو اُس کی ہدایت پر عمل کرتے لیکن اب لوگوں نے غلام احمد سے دُعا سلام بھی چھوڑ دی تھی۔

چھٹی کے دن ایک پڑوسی سے ملاقات ہوگئی۔ غلام احمد کسی کام سے باہر نکلا تھا۔ اُس نے سلام کیا تو پڑوسی کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"کچھ ناراض ہیں معظم بھائی؟" غلام احمد نے پُوچھا۔

"ارے میاں! تم سے ناراض ہو کر کیسے زندہ رہ سکتے ہیں تمھاری تو لاٹری نکل آئی ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔" غلام احمد نے تعجب سے کہا۔

"میاں... بُرا تو مانو گے لیکن یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ محلے کے ایک غنڈے کا سہارا لے کر تم نے دوسروں پر حکومت شروع کردی ہے۔ رحمان کی کیا ہے آج باہر ہے کل اندر چلا جائے گا مگر تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ بیٹیاں بوجھ ضرور ہوتی ہیں لیکن ایسا بوجھ بھی نہیں کہ اُنھیں گھورے پر پھینک دیا جائے۔"

"بیٹیاں...؟" غلام احمد کے بدن میں سرسراہٹیں دوڑنے لگی تھیں۔

"غلام احمد! سب کو معلوم ہے تمھاری دو بیٹیاں ہیں۔ رحمان تمھارے گھر کو علی الاعلان سُسرال کہتا ہے۔" معظم نے کہا اور غلام احمد کی رگوں میں خون جم گیا۔ معظم بھائی تو آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن غلام احمد پاگلوں کی طرح دیر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ اُس کے وجود میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

گھر کے اندر پہنچ کر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"شوکت... کیا کبھی میری غیر موجودگی میں رحمان گھر میں آیا ہے؟"

"اندر...؟" شوکت جہاں نے پُوچھا۔

"اندر... یا دروازے پر...؟"

"سامنے والے کھمبے کے نیچے اکثر بیٹھا رہتا ہے۔ دو تین دن سے دو چار مسٹنڈے بھی ساتھ ہوتے ہیں مگر کوئی خاص بات ہے کیا؟" شوکت جہاں نے غلام احمد کی پریشانی محسوس کرلی تھی۔ غلام احمد نے پوری تفصیل اُنھیں سُنا دی اور شوکت جہاں کا رنگ بھی اُتر گیا۔

"اِس کا مطلب ہے... اِس کا مطلب ہے کہ اوہ... رشیدہ خالہ کی بات اب میری سمجھ میں آئی۔" شوکت جہاں نے کہا۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟" غلام احمد نے پُوچھا۔

"رحمان کی تعریفیں کر رہی تھیں کہ بہت اچھا ہے کوئی سرپرست نہیں تھا اِس لئے غلط راستوں پر پڑ گیا۔ شادی ہو جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گا اور پھر اُنھوں نے ندرت اور عصمت کے بارے میں پُوچھا تھا۔ مجھے یقین ہے رحمان ہی نے اُنھیں بھیجا ہوگا۔"

غلام احمد خاموش ہوگیا۔ یہ خاموشی تمام دن اُس پر طاری رہی ساری رات وہ ایک لمحے کے لئے بھی سو نہ سکا۔ شوکت جہاں صاف محسوس کر رہی تھیں لیکن خود اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شوہر سے کیا کہیں۔ البتہ اِس صبح غلام احمد نے رحمان کے کسی چمچے کو گھڑے نہ اُٹھانے دیئے۔ دوسروں سے بھی اُس نے بات نہیں کی تھی پھر وقت سے کچھ پہلے ہی گھر سے نکل گیا اور شام کو واپس بھی جلد ہی آگیا۔ رحمان اُس کے گھر کے سامنے بجلی کے کھمبے سے ٹکا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔ غلام احمد کو دیکھ کر اُس نے ماؤتھ آرگن جلدی سے جیب میں ڈال لیا۔

"سلام چچا... آج اس وقت کیسے نظر آرہے ہو؟" اُس نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"تم سے بات کرنی ہے۔ اِن لوگوں کو واپس بھیج دو" غلام احمد نے دوسرے لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو بے! چچا سے بات کرنی ہے پھوٹو۔" رحمان نے کہا اور دوسرے لڑکے چمپت ہوگئے۔

"میرے گھر چلو چچا! یہاں دھوپ میں..."

"یہیں بات کروں گا رحمان!" غلام احمد کے لہجے میں سختی تھی

"کیا بات ہے چچا؟" رحمان نے اُنھیں گہری نگاہوں سے دیکھا

"کیا یہ حقیقت ہے رحمان کہ تم میرے گھر کو سُسرال کہتے ہو؟" رحمان ایک لمحے کے لئے سپٹا کر رہ گیا پھر بولا۔

"دل کی بات تم تک پہنچ ہی گئی ہے تو اب مجھے اپنا بیٹا بنا ہی لو۔ والدین کی قسم زندگی بھر غلام رہوں گا۔ میں کماؤں گا تم کھانا گھر بھر دوں گا ایسا داماد تمھیں دوسرا نہیں ملے گا چچا۔ ریڑھی بن گئی ہے دو ایک روز میں مل جائے گی اور میں کاروبار شروع کر دوں گا" غلام احمد کے دماغ میں آگ روشن ہوگئی تھی' شعلے نکل رہے تھے اُس کی آنکھوں سے' اُس کی انگلیاں تشنج کا شکار ہوگئی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ رحمان کی گردن دبا دے۔ اُس کی آنکھیں باہر نکال دے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا سارا گھر بے سہارا ہو جائے گا۔ بوڑھی ماں ٹھوکریں کھا کر گرے گی اور مر جائے گی۔ شوکت جہاں اندھی ہو جائیں گی اور اُن کی عزت اُن کی عزت دردر ٹھوکریں کھاتی پھرے گی... ندرت' عصمت گھر گھر مزدوری کریں گی۔ یہ سارے مناظر غلام احمد کی نگاہوں میں گھوم گئے اور اُس کی انگلیوں کا تشنج ختم ہوگیا۔ اُس نے ٹھنڈی نگاہوں سے رحمان کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"کسی کی عزت کو یوں اُچھالنا اچھی بات ہے رحمان؟"

"دیکھو چچا... رحمان شادی کرنا چاہتا ہے۔ تمھاری بیٹی سے لے کر تو نہیں بھاگا۔ کوئی خرابی ہو رحمان میں تو بتاؤ نہیں نہ کہیں تو تم اُن کی شادی کرو گے؟"

"ہوں... ٹھیک کہتے ہو... ٹھیک کہتے ہو" غلام احمد نے کہا اور خاموشی سے گھر واپس آگیا۔ یہ رات بھی جاگتے ہی گزری تھی۔ دوسرے دن صبح جب وہ احسان صاحب کو اُن کے گھر سے دفتر لے جا رہا تھا تو دو تین جگہ اُس کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکا۔ احسان صاحب نے چونک کر غلام احمد کو دیکھا تھا پھر جب وہ دفتر کے دروازے پر اُترے تو اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"کل دن میں بھی دو تین بار میں نے محسوس کیا تھا اور آج بھی اِس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تم کچھ پریشان ہو۔ گاڑی چلاتے ہوئے تم نے دو تین بار غلطی کی تھی۔ کیا بات ہے غلام احمد؟" غلام احمد کے دل میں ایک لمحے کے لئے روشنی چمکی۔ اُس نے عجیب سی آنکھوں سے احسان صاحب کو دیکھا اور پھر اُن آنکھوں میں نمی آگئی۔ احسان صاحب بہت متحمل مزاج اور نیک سیرت انسان تھے۔ آج تک اُنھوں نے کبھی غلام احمد سے سخت لہجے میں گفتگو نہیں کی تھی۔ اصولوں کے پابند تھے اور اپنے کام سے کام رکھنا جانتے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر اُن کے چہرے پر ہمدردی اُبھر آئی۔

"تم ہمارے ایک اچھے ساتھی ہو کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتاؤ۔ مجھے تمھارے کام آ کر خوشی ہوگی۔"

"جناب... بے انتہا پریشانی کا شکار ہوں۔ اورنگی ٹاؤن میں رہتا ہوں۔ جس جگہ رہتا ہوں وہاں ایک غنڈے سے جان آفت میں آئی ہوئی ہے۔ عزت بچانا مشکل ہوگئی ہے۔ دو جوان بیٹیوں کا باپ ہوں۔ ایک ماں اور ایک بیوی میرے ساتھ ہے۔ صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ اب میرے لئے زندگی وبال بن گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"مکان اپنا ہے؟" احسان صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں! بڑی مشکل سے دیواریں کھڑی کر کے جھونپڑی بنائی ہے۔"

"جس چہار دیواری میں عزت خطرے میں ہو غلام احمد اُس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ تم اگر پریشان ہو تو میری کوٹھی میں آجاؤ۔ ملازموں کے کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر تمھیں دے دیا جائے گا شاید تم جب ملازمت کے لئے آئے تھے تب بھی میں نے تمھیں یہ پیش کش کی تھی۔ تم ایک اچھے انسان ہو میں تمھیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" غلام احمد کے سر سے جیسے ایک دم پہاڑ ہٹ گیا ہو

اُس کی آنکھوں میں مسرت پھوٹ آئی۔

"کیا یہ ممکن ہے جناب؟ کیا یہ ممکن ہے؟"

"ہاں! کیوں نہیں۔ آج ہی شام اپنا سامان اُٹھا کر گھر آجاؤ بلکہ میرا خیال ہے اب تم چھٹی کر لو اور شام تک اپنے سامان کے ساتھ میرے پاس پہنچ جاؤ" غلام احمد خوشی سے دیوانہ ہوگیا تھا۔ وہ پاگلوں کے سے انداز میں آگے بڑھا۔ اُس نے احسان صاحب کے ہاتھ پکڑ کر چوم لئے۔

"معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے مجھے اور میرے خاندان کو نئی زندگی دی ہے۔ نہ جانے کیا کیا ہو جاتا۔ نہ جانے کیا ہو جاتا۔"

"کوئی بات نہیں جاؤ اور یہ کچھ پیسے رکھ لو۔ ممکن ہے ضرورت پیش آجائے" احسان صاحب نے جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر غلام احمد کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ غلام احمد دوڑتا ہوا باہر نکلا تھا۔ گھر پہنچ کر اُس نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ شوکت جہاں ہونق سی ہوگئی تھیں' اماں بی بھی پریشان تھیں' دونوں بیٹیاں تعجب سے باپ کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ غلام احمد مسرت سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

"تیاری کرو۔ تیاری کرو۔ ہماری ساری مصیبتیں ختم ہوگئیں۔ ہمارے سارے عذاب دُور ہوگئے۔ تیاری کرو۔ ایک گھنٹے بعد وہ ایک ٹرک میں بیٹھے ہوئے احسان صاحب کی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ سارا سامان ٹرک میں لدا ہوا تھا۔ رحمان شاید اِس وقت محلّے میں موجود نہیں تھا ورنہ مشکلیں پیش آتیں اور یہ غیبی امداد تھی جو غلام احمد کو حاصل ہوئی تھی ورنہ زندگی کے اِس عذاب سے نکلنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔

● انسانی تاریخ کے اس المناک دور میں جب رشتوں ناتوں کا تصور صرف روایتی حیثیت میں رہ گیا ہے ایسی کسی جگہ کو خوابوں کی سرزمین ہی کہا جا سکتا تھا جہاں رشتوں میں اتنی یگانگت ہو جہاں دولت محبّتوں کے آڑے نہ آتی ہو۔ احسان احمد کی یہ حسین کوٹھی ایسی ہی مثالوں کی امین تھی۔ اس کی تعمیر ہی شاید اِن جذبوں کی بنیاد پر کی گئی تھی... وسیع و عریض خطۂ زمین میں ایک بہت بڑا احاطہ تھا اِس احاطے کے بالکل آخری حصّے میں ایک حسین عمارت بنی ہوئی تھی اور اُس کے دونوں بازوؤں سے منسلک دو منزلہ عمارت دروازے تک چلی آتی تھی جس میں اُوپر نیچے چار چار کمروں کے مکانات تعمیر کئے گئے تھے اور اُن مکانوں میں احسان احمد کے وہ رشتے دار رہتے تھے جو کسی بھی طور مالی کمزوریوں کا شکار تھے۔ احسان احمد نے اُن پر دل کے دروازے کھول دئے تھے۔ خاصا بڑا خاندان تھا اُن میں جو خوشحال اور صاحبِ حیثیت تھے وہ اپنی مرضی سے کہیں بھی زندگی گزار سکتے تھے لیکن جنھیں ذرا بھی مالی مشکلات درپیش ہوتیں وہ احسان احمد کی طرف رُخ کرتے تھے اور احسان احمد نے اس سے بڑے فائدے حاصل کئے تھے۔

بے شمار افراد کی تقدیریں اُن سے وابستہ ہوگئی تھیں جن کی بنیاد پر کاروبار میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی۔ اچھے بُرے ہر قسم کے لوگ ہر خاندان میں ہوتے ہیں۔ احسان احمد کا خاندان بھی اُن انسانی کمزوریوں سے مبرّا نہیں تھا۔ کچھ جلنے جُھلنے والے بھی تھے جو احسان احمد کی اس حاتمی طبیعت پر طنز کرتے رہتے تھے۔ اپنوں ہی میں کچھ بُرے لوگ بھی شامل تھے جو دل میں کینہ رکھتے تھے لیکن احسان احمد ان تمام باتوں سے بے نیاز انسانی حقوق کی ادائیگی کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

کوٹھی میں رہنے والے اپنے اپنے طور پر اپنی زندگی میں آزاد تھے جس کا جو دل چاہتا تھا کرتا یہاں ایسے بھی تھے جو مختلف جگہوں پر سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتیں بھی کرتے تھے جسے کوئی ملازمت نہ ملتی اور وہ احسان احمد کے ساتھ کام کرنے کا خواہش مند ہوتا تو احسان احمد اُسے خوشی سے خوش آمدید کہتے۔ سب کو اپنے اپنے طور پر زندگی گزارنے کی اجازت تھی روشن خیال آدمی تھے اور گھر میں بالکل ہی دقیانوسی ماحول نہیں تھا ہاں جو بالکل قریبی تھے اُن کے لئے کچھ ہدایات تھیں۔ مثلاً زیب النساء خاتون اُس گھیر دار غرارے اور ڈھیلے ڈھالے کُرتے میں نظر آتیں جو اِس خاندان کی عورتوں کا قدیم لباس تھا۔ اُن سے کم عمر والی خواتین شلواروں اور کچھ غراروں میں ملبوس ہوتیں۔ بیگم احسان ساڑی یا شلوار قمیض میں نظر آتیں۔ لڑکیاں بالیاں اپنی اپنی پسند کے جدید فیشن کے لباس پہن لیتیں لیکن خاندان کی کچھ روایات کو ضرور مدِنظر رکھا جاتا تھا۔

پردے کا رواج نہیں رہ گیا تھا اِس لئے اب یہاں کی پارٹیوں میں خواتین بھی بے دھڑک شرکت کرتی تھیں اور آنے والوں سے بے تکلف ہو جاتی تھیں لیکن یہ بے تکلفی ادب کے دائرے میں تھی۔ کوئی لڑکی بے لگام نہیں ہو سکتی تھی۔

جہاندیدہ زیب النساء خاتون نے جو احسان احمد اور شہاب احمد کی والدہ تھیں کبھی اپنی بزرگی کا غلط استعمال نہیں کیا تھا اور بچّوں کے لئے دردِ سر نہیں بنی تھیں۔ اُن کی خوشی میں خوشی سے شریک ہوتی تھیں۔ دوسروں کے لئے اپنی دولت کے دروازے کھول دینے والے احسان احمد بھلا اپنے بھائی

شہاب احمد کو کیوں نہ چاہتے کاروبار میں برابر کا شریک کر رکھا تھا گو شہاب احمد کچھ عجیب طبیعت کے مالک تھے اور اُن کی حرکات پُراسرار تھیں لیکن بھائی کے سامنے سر اُٹھانے کی مجال نہیں رکھتے تھے اور اپنی پوشیدہ تفریحات کو صرف اپنے بھائی سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے غالباً ماں کی تربیت اِس سرکشی کے باوجود اُن پر حاوی تھی۔ شادی نہیں کی تھی اُنھوں نے۔ اور اس سلسلے میں بڑی عاجزی سے بھائی سے درخواست کی تھی کہ اُنھیں مجبور نہ کیا جائے۔ اِس کے لئے اُنھوں نے ایک کہانی گھڑ لی تھی جس میں کسی رومان کا قصہ تھا چہرے مہرے، قد و قامت اور فیشن سے کہیں بھی یہ اظہار نہ ہوتا کہ اُن کی زندگی میں کوئی روگ ہے۔ سُرخ و سفید وجود چھریرا بدن، خوش لباسی انتہا کو پہنچی ہوئی، دیکھنے میں نہایت اسمارٹ نظر آتے تھے۔ بھائی کی نسبت کسی قدر مغرور تھے۔ اور زمین کے دوسرے بسنے والوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن یہ ساری باتیں اُن کی اپنی ذات میں پوشیدہ تھیں۔ کبھی احسان احمد کے کسی اقدام پر نکتہ چینی نہیں کی خاندان کے کچھ ناپسندیدہ لوگ بھی کوٹھی میں آکر رہنے لگے تھے لیکن چونکہ احسان احمد اُنھیں لائے تھے اِس لئے شہاب صاحب نے کبھی اُن پر کوئی اُنگلی نہیں اُٹھائی تھی اور جب بھی گھلنے ملنے کا کوئی موقع آتا وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے اُن میں شامل ہو جاتے کہ بھائی کو ناگوار نہ گزرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اگر کوئی بات ہو سو ہو۔ وہ کبھی زبان پر نہیں آئی تھی اور نہ ہی رویّے سے اُس کا اظہار ہُوا تھا۔

اِس ماحول کی تشکیل میں احسان احمد کے سینے میں کون سے جذبے پوشیدہ تھے اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ احسان احمد صاحب خود بھی اچھی صحت اور تندرستی کے مالک تھے اور خوش و خرّم نظر آتے تھے۔ ہاں، ذکیہ خاتون کو کبھی کبھی اُداس دیکھا جاتا تھا اور اس اُداسی کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔

احسان احمد تو بار بار کہتے کہ بلا وجہ پریشانی ذہن پر لادنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ثنا ہمارے لئے بہت کچھ ہے خاندان ہی کے کسی لڑکے سے اُس کی شادی کریں گے اور وہ اسی کوٹھی میں رہے گی پھر تردّد کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن تردّد تو تھا یہ دوسری بات ہے کہ ذکیہ خاتون کبھی کبھی بند کمرے میں اُداس ہو جایا کرتی تھیں اور جب سے شوہر کو اس بات کا پتہ چلا تھا اُنھوں نے احتیاط شروع کر دی تھی۔ احسان احمد کا ماضی بہت خراب نہیں تھا یہ دوسری بات ہے کہ ابتدا ایک چھوٹے موٹے کاروبار سے ہوئی تھی جس میں زیب النساء کے زیورات اور ذکیہ خاتون کے جہیز کی تمام قیمتی چیزیں شامل کر دی گئی تھیں۔ احسان صاحب نے محنت و ذہانت سے اتنا کچھ کر لیا تھا کہ چند ہی سالوں کے اندر اندر ماں اور بیوی کا قرضہ ادا کرنے کے بعد اُنھوں نے ایک نہایت شاندار زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ کاروباری آدمی تھے، ذہانت بھی رکھتے تھے۔ تعلقات بنانے میں ملکہ حاصل تھا چنانچہ ترقی کے تمام راستے کھلے ہوئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈیفنس کے اِس خوبصورت علاقے میں یہ کوٹھی وجود میں آگئی تھی اور اُس کے بعد وہ جو بے اعتنائی کرتے تھے وہ جو توجہ نہیں دیتے تھے احسان احمد کے بہی خواہ اور مدّاح بن گئے کیونکہ اُن کے لئے احسان احمد نے دل کے دروازے کھول دیئے تھے۔ یہ تھا اس کوٹھی کا تعارف۔ یہاں ہر اُس مظلوم کے لئے جگہ تھی جو زندگی کے عذاب میں گرفتار ہو بس اُن کا احسان احمد تک پہنچنا شرط تھا۔ ثناء کی فطرت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خاندان کے بے شمار لڑکے لڑکیاں یہاں موجود تھے۔ ثنا سب ہی سے گھلی ملی رہتی تھی۔ احسان احمد نے بیٹی کو خاص طور سے سمجھایا تھا کہ خود کو کبھی کسی سے منفرد نہ سمجھے۔ خُدا اس سے ناراض ہوتا ہے جس طرح دوسرے لوگ رہتے ہیں۔ اُسی طرح وہ بھی رہے حالانکہ ثنا کو یہ باتیں سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی اُس کی طبیعت میں غرور قسم کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

شوخ کھلنڈری زندگی میں دلچسپیاں لینے والی نت نئے لباسوں کی شوقین اور پھر جب سے شہاب کے غیر ملکی دوست تھامس کی بیٹی گلوریا، تفریحی دورے پر یہاں آئی تھی۔ ثنا کے ذہن میں کچھ نئی نئی باتیں پیدا ہونے لگی تھیں۔ گلوریا کے خوبصورت تراشے ہوئے بال اُسے بے حد پسند آئے تھے۔ اُس کے اپنے بال لمبے لمبے گھنے اور کسی شاعر کی نگاہ میں کالی گھٹاؤں کی مانند تھے لیکن یہ کالی گھٹائیں اب ہر وقت اُس کے ذہن پر برستی رہتی تھیں۔ گلوریا کے ساتھ کراچی اور اُس کے نواحی مقامات کی تو خوب سیر ہوئی تھی لیکن گلوریا اس سے زیادہ کی خواہش مند تھی وہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کو بھی دیکھنا چاہتی تھی اور جب اُس نے اِس کی فرمائش کی تو احسان صاحب نے اپنے اصولوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اُس کے ساتھ دو ملازم اور ایک خادمہ کر دی۔

گلوریا اس بات کی خواہش مند تھی کہ یہاں سے وہ ثنا کو اپنے ساتھ لے جائے کچھ دوسرے لوگ بھی ساتھ ہوں تو زیادہ اچھا ہے لیکن احسان صاحب نے اس کی اجازت نہیں دی تھی اور پیار سے گلوریا کو سمجھا دیا تھا کہ اُن کے ہاں کچھ اصول ہیں۔ جن کی پابندی سب پر لازم ہے چنانچہ اُن دنوں گلوریا سرحدی علاقوں کی سیر کے لئے گئی ہوئی تھی اور اُس رات اُس کی واپسی متوقع تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ ٹرین سے آرہی ہے۔ دوسرے لوگوں کو اس سلسلے میں ہوا نہیں لگی تھی ثنا خود ہی اُس کو لینے پہنچ گئی تھی لیکن اُس کے بجائے وہ ردا کو لے آئی تھی۔

اپنی شوخ فطرت کی بنا پر اُس نے ردا کے مسئلے کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا بس ایک خوبصورت لڑکی جو پریشانیوں کا شکار تھی۔ اُسے پسند آگئی تھی اور وہ ورثے میں ملنے والے ہمدردی کے جذبوں کی بنیاد پر ردا کو لے آئی تھی۔ کسی اور سے اُس کا تذکرہ اِس لئے نہیں کیا تھا کہ لُطف لینا چاہتی تھی۔ عارفہ بیگم، ثنا کی زبانی یہ عجیب و غریب انکشاف سُننے کے بعد پیٹ پکڑے پکڑے پھر رہی تھیں یہ اسی خاندان کی ایک خاتون تھیں اُن کمزوریوں کا شکار جو اکثر عورتوں میں ہوتی ہے۔ ثنا کے بارے میں زبان کھولتے ہوئے دہشت زدہ بھی تھیں لیکن پیٹ تھا کہ پھولتا ہی چلا جا رہا تھا نہ جانے کس طرح رات گزاری۔

صُبح کو اُن کے شوہر نے اُن کی شکل دیکھی تو پریشان لہجے میں بولے۔

"کچھ بیمار ہو۔ چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے۔"

"کچھ نہیں کچھ نہیں... کچھ بھی تو نہیں۔ کیا کہوں، کیا بتاؤں تم سے کیا ہو گیا؟"

"ارے ارے خیریت تو ہے ایسی کیا بات ہو گئی جس نے تمھاری یہ حالت بنا ڈالی ہے؟"

"تم... تم کسی سے کہو گے تو نہیں۔ وعدہ کرو، یہ بات کسی سے کہی تو نہیں جائے گی اگر ایسا ہو گیا تو خواہ مخواہ ہمیں پریشانیاں اُٹھانی پڑیں گی۔" ناصر صاحب متحیرانہ انداز میں بیوی کی شکل دیکھنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسی کیا بات ہو گئی۔ بمشکل تمام بیوی کو بہلایا پھسلایا اور اس سے حقیقتِ حال پوچھنے لگے۔

"ثناء... ثنا ایک بچے کی ماں ہے۔" انکشاف واقعی ایسا زبردست تھا کہ ناصر صاحب بھی گنگ رہ گئے بیوی کو گھورتے رہے، حالات پر غور کرتے رہے اور پھر جھلا کر بولے۔

"بالکل ہی کھسک گئی ہو کیا؟ دماغ کی کچھ چولیں ڈھیلی ہو گئی ہیں۔ ابھی ایسا بڑھاپا تو نہیں ہے کہ سنک جاؤ۔ کیا فضول بکواس کر رہی ہو۔"

"اُس نے... اُس نے خود بتایا تھا مجھے۔"

"کیا مطلب، تفصیل بتاؤ۔" ناصر صاحب سخت لہجے میں بولے۔ اور عارفہ بیگم نے رات کا واقعہ سُنا دیا۔ ناصر صاحب کے چہرے پر غصّے کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ اُنھوں نے نفرت زدہ نگاہوں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جیسی عورت سے ایسی ہی حماقتوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بے وقوف عورت میں تو ہمیشہ تیری طرف سے خوف زدہ رہتا ہوں کہ کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ تیرے تمام مشاغل میرے علم میں ہیں خود اگر شادی نہیں کی تو کیا برائیں بھی نہیں دیکھیں۔ کتنا بڑا تھا وہ بچہ؟" بیوی شوہر کی لعنت و ملامت سے کسی قدر خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ سوچ کر بولیں۔

"میں نے اندازہ نہیں لگایا۔ چار چھ مہینے کا ضرور ہو گا۔"

"اے زیب النساء، چار چھ مہینے کا بچہ ہے اور اب تک کسی کو پتہ نہیں چلا توبہ توبہ معصوم بچّی پر الزام لگا رہی ہے؟"

"میں لگا رہی ہوں الزام۔ اُس نے خود ہی مجھ سے کہا تھا۔"

"ہوں... تم سے کہا تھا اور اِس دوران وہ کوٹھی میں نہیں تھی۔ ارے خُدا کی بندی احسان بھائی نے سُن لیا تو کیا کہیں گے سوچیں گے کہ اپنی عنایتوں کا یہ صلہ ملا ہے اُنھیں۔ کیا ایسی کوئی بات ہوتی تو اس عمارت کے دوسرے لوگوں کو پتہ نہیں چلتا۔ ثنا اطمینان سے بچے کو کھلاتی ہوئی میدان میں آجاتی اور لوگوں سے کہتی کہ یہ اُس کا بچہ ہے۔"

"مگر وہ بچہ... بالکل اجنبی ہے کیا کوٹھی کے رہنے والوں کو میں نہیں جانتی۔"

"تو ایک اجنبی بچہ صرف ثنا ہی کا ہو سکتا ہے کیوں؟ اُس شوخ لڑکی کی شوخیوں سے تم واقف ہو عارفہ بیگم۔ اور کسی سے کہنے کی حماقت بھی نہ کر ڈالنا۔ ارے کہیں اور کسی سے کہہ تو نہیں دیا تم نے کچھ۔"

"ن... نہیں۔ میں نے نہیں کہا۔ م... مگر آخر وہ بچہ کہاں سے آیا؟"

"ہاں... تحقیقات کرو، اُس کی جاسوس اعظم ہونا۔ جاؤ، جاؤ کانوں میں کھسر پھسر کرتی پھرو اور اُس کے بعد کان پکڑ کر یہاں سے نکال دی جاؤ گی۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے اِس شاندار کوٹھی سے دل بھر گیا ہے میں کہتا ہوں زبان نکال کر ہاتھ پر رکھ دوں گا... اگر کسی کے سامنے مُنہ بھی کھولا۔" عارفہ بیگم سر جھکا کر خاموش ہو گئی تھیں۔ شوہر سے ہمیشہ ڈرتی تھیں کبھی اُن کے سامنے زبان کھولنے کی جراءت نہیں ہوئی تھی۔ بڑی سخت گیر طبیعت کے مالک تھے ناصر صاحب۔

بہر طور وہ بیوی کو لعنت ملامت کر کے چلے گئے لیکن عارفہ بیگم اپنا تجسس نہیں روک سکیں وہاں سے نکلیں۔ کوٹھی پہنچ گئیں خاندان کی خواتین کیلئے کوٹھی میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی

جس کا دل چاہتا اندر پہنچ جاتا اور اپنی اپنی مصروفیات میں مگن رہتا۔

ثنا کو بھی شاید لمبی ہی شرارت سوجھ گئی تھی۔ کوئی اور مشغلہ نہیں تھا ان دنوں تو ردا ہی ہاتھ آ گئی تھی۔ اُس نے ردا کو اطمینان سے اپنے بیڈ روم میں سُلا دیا تھا۔ ابھی تک کسی کو اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بچے کے سلسلے میں کچھ کپڑوں کا حصول اُس کے لئے مشکل نہیں ہوا تھا کیونکہ کوٹھی کے منسلک مکانوں میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی موجود تھے اور اُن کے لباس پچھلی راہداری کی الگنیوں پر سوکھتے رہتے تھے۔ بس ثنا کو اُن میں سے اپنی پسند کے دو جوڑے چُرانے پڑے تھے۔ خود ہی استری کر کے یہ دونوں جوڑے اُس نے تیمور کے لئے محفوظ کر لئے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے تو کام آ ہی سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ قلعہ بند ہو گئی تھی۔ کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا ردا سے دیر تک باتیں ہوتی رہی تھیں لیکن ردا نے اُسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور ثنا نے یہ سوچ کر خاموشی اختیار کر لی تھی کہ بہر طور اب نہ سہی کبھی نہ کبھی ردا اپنے بارے میں بتلانے پر مجبور ہو جائے گی۔

دوسری صبح جاگ کر اُس نے ردا کو سمجھایا کہ جب تک وہ نہ کہے اُسے کمرے سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہی رکھے یہ ضروری ہے۔ ردا نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ثنا! تم میرے لئے اتنی پریشانیاں کیوں اُٹھا رہی ہو یقین کرو مجھے اپنی زندگی گزارنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تمہاری اِس مہربانی کا شکریہ کہ تم نے مجھے رات کو دربدر نہ ہونے دیا۔ بس اب میرے لئے یہ انتظام کر دو کہ کسی مناسب ہوٹل میں مجھے ایک کمرہ دلوا دو باقی کام میں خود سنبھال لوں گی۔" ثنا نے سختی سے کہا۔

"دیکھئے مس ردا بے شک آپ بڑی پُراسرار ہیں... بڑی خوبصورت ہیں لیکن یہ خوبصورتی آپ کے لئے مصیبت بن گئی ہے میں آپ پر عاشق ہو گئی ہوں اور کسی بھی طرح آپ کو اپنے چنگل سے نہیں نکلنے دوں گی۔ کان دبا کر یہاں بیٹھی رہیئے۔ میں آپ کے لئے ناشتے وغیرہ کا انتظام کرتی ہوں۔" ردا مُنہ کھول کر رہ گئی تھی۔ بہر طور ثنا کی باتوں پر ابھی تو عمل کرنا ضروری تھا وہ خود بھی ایسی طبیعت کی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرے۔ ثنا باہر نکل کر سیدھی کچن میں پہنچی۔ باورچی سے ناشتہ طلب کیا۔ ثنا کی بات تھی اِس لئے باورچی نے انکار نہیں کیا اور ثنا خود ہی کھانے پینے کی اشیا ٹرالی میں سجا کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اصل تفریح کا وقت شروع ہوتا تھا اُس نے ردا سے پوچھا۔

"میں اِس ہیرو کو لے جاؤں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔"

ردا خاموشی سے اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ ثنا نے باہر نکلتے ہوئے اُس سے کہا کہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لے اور پھر وہ خوبصورت تیمور کو گود میں کھلاتی ہوئی شان بے اعتنائی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

بدقسمتی سے پہلی ملاقات شہاب صاحب ہی سے ہو گئی تھی۔ شہاب صاحب اپنے کمرے سے نکل رہے تھے کہ اُن کی نگاہ ثنا پر پڑ گئی۔ عام حالات ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اُس کی گود میں بچہ دیکھ کر وہ بُری طرح اُچھل پڑے۔ تیزی سے چلتے ہوئے وہ اُس کے قریب آئے اور بچے کو غور سے دیکھنے لگے۔

"یہ... یہ کون ہے؟"

"تیمور ہے اِس کا نام۔" ثنا نے جواب دیا۔

"کیا یہ... کیا یہ... وہی بچہ ہے میرا مطلب ہے وہ لڑکی وہ خاتون کون سے ہوٹل میں ٹھہرایا تھا تم نے اُنھیں؟"

"ہوٹل میٹروپول میں۔ کیوں؟"

"اوہ... تم... مگر یہ بچہ کس کا ہے؟"

"میرا ہے..." ثنا نے سادگی سے جواب دیا۔

"جھوٹ مت بولو مجھے بتاؤ۔ کیا تم اُس لڑکی کو یہاں لے آئی ہو؟"

"ارے ارے بھلا مجھے کیا ضرورت تھی اُسے یہاں لانے کی خواہ مخواہ انکل آپ بے کار باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اب اس گھر کو میں چڑیا گھر تو بنانے سے رہی۔" ثنا بولی اور آگے بڑھ گئی۔ شہاب صاحب پریشانی سے اُسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ حالات پر غور کیا تو یاد آیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ لڑکی سے اُنھوں نے کوئی ایسی بات تو کہی نہیں تھی جو قابلِ گرفت ہو مگر ثنا اُسے لے بھی آئی ہے تو کوئی ایسی بات نہیں۔ ثنا نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ چند لمحات کھڑے کچھ سوچتے رہے پھر اپنے کام سے چل پڑے۔

ثنا بڑے پیار سے بچے کو سینے سے لگائے آگے بڑھتی رہی اور بدقسمتی سے اِس بار بھی عارفہ بیگم ہی سامنے آ گئیں۔ اُن کی نند فرزانہ بیگم اُن سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھیں۔ اُنھوں نے بھی ثنا کو دیکھ لیا۔ دل میں کوئی خیال نہ آیا آگے بڑھ کر ثنا کے پاس پہنچ گئیں۔

"کون ہے یہ ثنا! کتنا پیارا بچہ ہے۔ دکھاؤ تو..."

"باپ کے نقوش ہیں پھپھو! امی بس آنکھیں مجھ پر پڑی ہیں۔" ثنا نے بچے کو سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"کس کا ہے؟ کوئی آیا ہے کیا؟"

"ارے آپ اِس کی شکل نہیں دیکھ رہیں پھپھو اماں میرا ہے میرے بیٹے کو آپ..."

"ایں..." فرزانہ بیگم بھی ہونق ہو گئیں۔ ایک لمحے سوچتی رہیں پھر ہنس پڑیں "بکے جا رہی ہے شیطان کہیں کی۔ سوچ بھی رہی ہے کہ کیا بک رہی ہے؟"

"نہیں پھپھو اماں! پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ آج غربت اور امارت کے درمیان یہ دیوار ڈھائی ہے مجھے بے چارہ صائم کب تک زمانے کی روایتوں کا شکار رہے گا۔ وہ غریب کس قدر پریشان ہے۔ آپ لوگ کیا جانیں۔"

"کون صائم؟ کیا کہہ رہی ہو۔" فرزانہ بیگم پھر بوکھلا گئیں لیکن ثنا کے چہرے پر ایک سنگین سنجیدگی تھی۔

"اِس بچے کا باپ۔ اور کون...؟"

"تمہارا اُس سے کیا تعلق ہے؟"

"یہ بچہ میرا ہے اور صائم اس کا باپ ہے تعلق کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔" ثنا نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ فرزانہ بیگم بے وقوفوں کی طرح کھڑی رہ گئی تھیں۔ اُن پر نہ جانے کیا بیت رہی تھی۔ اُس وقت چونکیں جب عارفہ بیگم نے اُن کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میں نے اِسے رات کو دیکھا تھا۔" وہ اپنی اہمیت بڑھانے لگیں۔

"کسے...؟"

"بچے کو..." اُس نے رات ہی کو مجھے بتا دیا تھا۔

"مگر...؟"

"بُرا وقت آ گیا ہے اِس کوٹھی پر۔ ہونا ہی تھا۔ احسان بھائی نے لڑکیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ آزادی کی ایک حد ہوتی ہے۔ لان پر پارٹیاں ہوتی ہیں۔ باجے بجتے ہیں اور سب لڑکے لڑکیاں کدکڑے مچاتے پھرتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ اور کیا ہوتا۔"

"عارفہ بیگم خدا سے ڈرو۔"

"خُدا کا خوف ہی تو نکل گیا ہے لوگوں کے دل سے۔ میں تو اپنے مالک سے ڈر کر ہی یہ سب کچھ کہہ رہی ہوں۔ بی بی پوری کوٹھی جوان لڑکیوں سے بھری پڑی ہے۔ سب کا مستقبل سامنے ہے۔ ایک بار کوٹھی بدنام ہو گئی تو ہر آنکھ میں شبہ ہوگا کوئی لڑکی پاک دامن..."

"نہ جانے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" فرزانہ بیگم نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئیں۔ عارفہ بیگم بولیں۔

"نہ سوچو میری کون سی لڑکیاں بیٹھی ہیں اپنیوں کے بارے میں سوچو..."

فرزانہ بیگم زمانہ ساز تھیں۔ جو کچھ سُنا تھا اُس سے دل دہل رہا تھا۔ جا کسی اور کام سے رہی تھیں لیکن وہاں سے سیدھی زیب النساء بیگم کے پاس پہنچیں۔

"سمانی جان! کچھ کہنے آئی ہوں۔" اُنھوں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"کیا بات ہے فرزانہ؟"

"یہ ثنا نہ جانے کیا کیا لغویت بکتی پھر رہی ہے۔ آپ اُسے بُلائیے ذرا۔"

زیب النساء بیگم مُسکرا دیں۔ "تمہارے بارے میں کچھ کہہ رہی ہے خود ہی ڈانٹ دیتیں تمہاری بچی ہے۔"

"بات میری نہیں ہے۔ آپ بس اُسے بلوائیے کسی سے۔" فرزانہ بیگم نے پریشانی سے کہا۔

"اچھا کسی کو بُلا تو دو۔ دیکھو باہر کوئی ہے؟" زیب النساء بیگم نے کہا اور فرزانہ بیگم باہر نکل گئیں ایک خادمہ سامنے ہی نظر آ گئی تھی اُسی کو اندر بُلایا۔ "ثنا جہاں کہیں بھی ہو اُسے بُلا لاؤ۔" زیب النساء بیگم نے کہا اور خادمہ گردن خم کر کے باہر نکل گئی۔

ثنا باہر لان پر ملی جہاں وہ محمد دین کو بچے کے لئے فیڈر اور دوسری چیزیں لانے کے لئے بھیج رہی تھی۔ زیب النساء بیگم کا پیغام سُن کر اُس نے گردن ہلا دی اور پھر بچے کو شانے سے لگائے اکڑتی ہوئی اندر چل پڑی۔ عارفہ بیگم چھپ کر اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ثنا اندر داخل ہو گئی۔ زیب النساء بیگم نے اُسے دیکھا اور پھر بچے کو دیکھ کر چونک پڑیں۔

"کس کا بچہ ہے ثنا؟"

"آپ ہی کا ہے دادی جان! دیکھئے کیسا ہے؟" ثنا نے بچہ اُن کے سامنے کر لیا۔ دادی جان خود چھوٹے بچوں سے پیار کرتی تھیں۔ بے اختیار بازو پھیلا دیئے اور بچہ آغوش میں لے لیا۔ ایک لمحے کے لئے فرزانہ بیگم باتوں کو بھول گئی تھیں۔

"ہائے فرزانہ دیکھو کیسا چاند کا ٹکڑا ہے۔ کس کا ہے ثنا پہلے تو کبھی نہیں دیکھا اسے۔" دادی جان خوش ہو کر بولیں۔

"میں نے اسے زمانے کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا ہے دادی جان۔ یہ نہایت ظالم ہے..."

"ہے کون دیوانی؟"

"آپ تو پر دادی ہوئیں اس کی۔ کیوں پھپھو جان؟"

"پردادی...؟" فرزانہ بیگم کے بجائے دادی جان بول اُٹھیں۔

اُن کا مُنہ تعجب سے کھُل گیا تھا۔

"میں نے اِس کا نام تیمور رکھا ہے دادی جان۔ کیسا ہے؟"

"بچّہ کس کا ہے؟" دادی جان پریشانی سے بولیں۔

"میرا..."

چند لمحات دادی جان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔

اُسی وقت فرزانہ بیگم بولیں۔

"مجھ سے بھی اِس نے یہی کہا تھا۔ عارفہ نے بھی سُنا تھا آپ تو جانتی ہیں عارفہ کیا چیز ہیں۔"

"میں کب تک اپنے لعل کو زمانے کی نگاہوں سے چھپائے رکھوں۔ پھپھو جان اِس کوٹھی میں اِسے بھی اِس کا حق ملنا چاہئیے۔ میرے لائق اور کوئی خدمت دادی جان۔ تیمور کے دودھ کا وقت ہوگیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔" شنا نے کہا اور دروازے کی طرف مڑ گئی۔

"شرارت کر رہی ہے تم تو اِسے جانتی ہی ہو۔" دادی جان جیسے خود سے بولیں۔

"مجھ سے کچھ اور بھی کہہ رہی تھی۔"

"کیا...؟" دادی جان نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا۔

"کہہ رہی تھی... کہہ رہی تھی۔ پانی سر سے اُونچا ہوگیا ہے آج غربت و امارت کے درمیان یہ دیوار ڈھانی پڑے گی۔ بے چارہ صائم کب تک زمانے کی روایتوں کا شکار رہے گا؟"

"صائم ...؟"

"ہاں!" میں نے پُوچھا تو کہنے لگی "اِس بچّے کا باپ۔ میں نے پُوچھا کہ تمھارا اِس سے کیا تعلق ہے تو کہنے لگی۔ صائم اِس بچّے کا باپ ہے اور میں ماں تعلق کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔"

"ہیں..." دادی جان پھنسی پھنسی آواز میں بولیں "جھوٹ بول رہی ہوگی، مذاق کر رہی ہوگی۔ وہ شیطان ہے لیکن ایسی نہیں ہو سکتی۔ واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" دادی جان کی آواز رندھ گئی تھی "تم بتاؤ فرزانہ ایسا ہو سکتا ہے کبھی؟" اُنھوں نے آنکھوں سے نکل پڑنے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ نہیں ہو سکتا ممانی جان۔ کیا کروں۔ مجھے بتائیے کیا کروں؟"

"دوڑ کر ذکیہ کو بُلا لاؤ۔ کچھ کہنا نہیں۔ اِس فتنی کو رد کو معلوم کرو گھر میں کون آیا ہے۔ چُپکے چُپکے یہ سب کچھ کرنا فرزانہ۔ اے اللہ رحم کر! اے معبود!" زیب النسا خاتون کا بدن کانپنے لگا۔ فرزانہ بیگم باہر نکل گئی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر عارفہ بیگم کن سوئیاں لے رہی تھیں فرزانہ بیگم کے پیچھے لپکیں۔

"کیا ہوا؟" اُنھوں نے پُوچھا۔

"اِس وقت آپ اپنے فلیٹ میں چلی جائیے عارفہ بیگم ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔" فرزانہ بیگم نے غصے سے کہا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئیں۔

شنا بچّے کو گھماتی پھر رہی تھی پھر جب اُس کا فیڈر وغیرہ آ گیا تو وہ واپس اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ ردا نے اُس کی ہدایت کے مطابق دروازہ بند رکھا تھا۔ شنا کی آواز پر اُس نے دروازہ کھول دیا اور شنا اندر داخل ہوگئی۔

"پوری کوٹھی گھما دی ہے مسٹر تیمور کو۔ یقیناً اِنھیں پسند آئی ہوگی۔ تمھیں دودھ بنانا آتا ہے؟"

"ہاں میں ہی تو بناتی ہوں۔"

"تو پھر جلدی کرو۔ مسٹر تیمور دیر سے پرندوں کی آوازیں نکال رہے ہیں۔" شنا نے کہا اور ردا مصروف ہوگئی۔ اب اُس کی حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ شنا اُس کے سارے کاموں میں ہاتھ بٹا رہی تھی ردا نے تیمور کو دودھ پلاتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں آپ نے اپنے گھر والوں کو کیا بتایا؟"

"پاگل نہیں ہوں کہ کچھ بتاتی پھرتی۔" شنا مُنہ بنا کر بولی۔

"اوہ... کیوں؟"

"کچھ معلوم ہے مجھے؟"

"ناراض ہو اِس بات پر؟" ردا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک تو خُدا نے تمھاری شکل ایسی بنا دی ہے کہ غصّہ ہی نہیں آتا تم پر پُوچھ رہی ہیں ناراض ہو؟" شنا مُنہ بنا کر بولی۔

"ناراض نہ ہو شنا پلیز..." ردا نے لجاجت سے کہا۔

"تو پھر کیوں پُوچھ رہی ہو کہ میں نے اِس کے بارے میں کسی کو کیا بتایا۔ آخر کیا بتاتی؟"

"لوگوں نے پُوچھا تو ہوگا؟"

"پوچھا تھا۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"جو دل چاہا کہہ دیا۔" شنا نے جواب دیا اور ردا خاموش ہوگئی۔ رات کو بھی شنا اُس کے بارے میں کریدتی رہی تھی لیکن ردا نے معذرت کر لی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ "شنا کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں نہ سُنانا ہی بہتر ہوتا ہے مجھے میری ذات میں رہنے دو۔ تمھارا دوسرا احسان ہوگا۔" اُس نے کہا تھا۔ "شنا کل دن میں مَیں یہاں سے چلی جاؤں گی اور کوشش کروں گی کہ دوبارہ تمھارے سامنے نہ آؤں۔ میری ابتدائی کہانی کی شنا سا تم ہی ہو اِس کے بعد لوگ مجھ سے کچھ نہ پُوچھیں گے۔" شنا نے چڑ کر کہا۔

"پچھل پیری دیکھی ہے تم نے۔ میں اُس سے بھی زیادہ خطرناک

ہوں جس سے چمٹ جاتی ہوں۔ آسانی سے نہیں چھوڑتی تم کچھ نہ بتاؤ ایک دن تمھاری کہانی میں خود تمھیں سُناؤں گی۔"

"شنا..." تھوڑی دیر کے بعد ردا نے اُسے پکارا۔

"فرمائیے۔"

"اپنے بارے میں اِس گھر کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتاؤ گی مجھے۔"

"جس جگہ سے تمھیں چلے جانا ہے اُس کے بارے میں پُوچھ کر کیا کرو گی؟"

"یاد رکھوں گی اپنی محسنہ کو۔ اگر تقدیر نے میرا ساتھ دیا تو واپس بھی آؤں گی۔"

"میں جانتی ہوں تم کبھی نہیں آؤ گی۔" شنا نے کہا۔

"نہیں شنا، اتنی ناسپاس نہیں ہوں۔"

"لیکن میں دعویٰ کرتی ہوں تم کبھی نہیں آؤ گی۔" شنا نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"آخر کیوں؟ کیوں نہ آؤں گی میں۔"

"جب جاؤ گی ہی نہیں تو آؤ گی کیسے؟" شنا نے کہا اور ہنس پڑی۔ ردا پھیکے سے انداز میں مُسکرا دی تھی اُسی وقت باہر دستک سُنائی دی اور شنا اُچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر کوئی فیصلہ کرتے ہوئے دروازے کے پاس پہنچ گئی۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولو شنا۔" آواز ذکیہ بیگم کی تھی۔

"کیا بات ہے امّی؟"

"دروازہ کھولو۔"

"سوری امّی! تیمور دُودھ پی رہا ہے اُٹھوں گی تو جاگ جائے گا۔"

"دروازہ کھولتی ہو کہ نہیں۔" ذکیہ بیگم ڈپٹ کر بولیں۔

"اُفوہ... آہستہ بولئے امّی! صائم رات کو دیر تک جاگتے رہے ہیں اُن کی آنکھ کھُل جائے گی۔ پلیز ابھی جائیے۔" باہر سناٹا چھا گیا تھا پھر دوبارہ دستک اُبھری۔

"ایک بار کہہ دیا دروازہ نہیں کھولوں گی بس۔" شنا دروازے کے پاس سے ہٹ آئی وہ مُنہ بنا کر ہنس رہی تھی۔ دستک پھر نہ سُنائی دی۔

"کون تھا؟" ردا نے سرگوشی کی۔

"امّی..."

"تم نے اُن سے کیا کہا تھا صائم سو رہے ہیں۔" ردا بولی اور شنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تنگ کروں گی اِنھیں۔ مجھے گلوریا کے ساتھ نہیں جانے دیا۔ کتنا مزا آ رہا ہوگا اُسے۔ دیکھ لو آئی نہیں۔ خوب گھوم رہی ہوگی مجھے پنڈی سے فون کیا تھا کہ فلاں دن، فلاں ٹرین سے پہنچ جائے گی۔ رات کو میں اُسے لینے ہی تو گئی تھی۔"

"مگر صائم...؟"

"سوری... میں نے تیمور کے ڈیڈی کا نام صائم رکھ دیا ہے تم محسوس نہ کرنا۔"

"کیا...؟" ردا کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔

"میری مرضی۔ تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا میرے دل میں جو کچھ آیا میں نے سب کو بتا دیا۔"

"کیا بتا دیا...؟" ردا رو دینے والے انداز میں بولی۔

"یہی کہ تیمور میرا بیٹا ہے۔ میں نے چھُپ کر شادی کر لی ہے اور صائم میرے شوہر ہیں وغیرہ... ایمان سے اب باہر کھلبلی مچ رہی ہوگی ہم دوپہر تک دروازہ نہیں کھولیں گے۔ کوئی آئے تو تم خاموش رہنا ردا..."

"خُدا کی پناہ...!" ردا کے حلق سے گھُٹی گھُٹی آواز نکلی... وہ پریشان نگاہوں سے شنا کو دیکھ رہی تھی۔

باہر واقعی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دادی جان نے یہ داستان ذکیہ بیگم کو سُنائی تھی اور ذکیہ بیگم اُنھیں دیکھتی رہ گئی تھیں پھر اُنھوں نے کہا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں امّی؟ شنا کو تو آپ جانتی ہیں؟"

"جانتی تو ہوں مگر... وہ بچّہ کس کا ہے کوئی اُسے نہیں جانتا میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا کچھ معلوم تو کرو۔" ذکیہ بیگم کو اِن باتوں کا ذرا بھی تردّد نہیں تھا۔ شنا کی ماں تھیں۔ خُدا پر اور پھر خود پر اعتماد تھا اُن کی تربیت اُن کا خون ایسا نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی صُورتِ حال معلوم کرنے کے لئے چل پڑیں۔ شنا کی باتیں سُنیں اور پھر وہاں سے ہٹ گئیں۔ اب وہ کوئی دوسری ترکیب سوچ رہی تھیں۔

کھلبلی مچانے والی عارفہ بیگم تھیں جو مُنہ سے بات بھی نہیں نکالنا چاہتی تھیں لیکن پیٹ کا درد بھی دبائے نہیں دب رہا تھا۔

"بے چاری ذکیہ بے حد پریشان ہیں۔" اُنھوں نے شمسہ خالہ سے کہا۔

"اللہ خیر کیا ہوگیا؟"

"شنا کچھ کر بیٹھی ہے۔ اب دروازہ بند کئے بیٹھی ہے۔" ذکیہ بیگم بھی دروازہ نہیں کھُلوا سکیں۔

"اے خُدایا...! کیا کر بیٹھی ہے؟" بوڑھی شمسہ خالہ نے پُوچھا۔

"کیا پتہ؟ ہمیں تو غیر سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بتلائے تو پتہ چلے..."

عارفہ بیگم نے کہا۔

"میں معلوم کرتی ہوں ابھی" شمسہ خالہ چل پڑیں پھر شمسہ خالہ سے زمانی بیگم اور وہانی بیگم سے رقیہ خاتون اور رفتہ رفتہ سب کو پتہ چل گیا کہ ثنا کچھ کر بیٹھی ہے۔ لیکن براہ راست ذکیہ بیگم یا زیب النساء خاتون سے پوچھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

ذکیہ بیگم نے زیب النساء سے کہا" آپ پریشان نہ ہوں امی! میں اُسے جانتی ہوں اُس کی آواز اور لہجہ پہچانتی ہوں۔ کوئی شرارت سوار ہے ذہن پر اور کچھ بھی نہیں۔"

"تمہیں کچھ بتایا؟"

"دروازہ ہی نہیں کھول رہی ہے کہتی ہے صائم سو رہے ہیں اور تیمور دودھ پی رہا ہے۔"

"اے اللہ رحم۔ یہی نام اُس نے فرزانہ کو بھی بتایا تھا۔ کچھ کرو اُس سے دروازہ تو کھلواؤ، بچہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"باپ کی سر چڑھائی ہوئی ہے۔ میں کیا کروں؟"

"تمہیں ذرا بھی فکر نہیں ہے؟"

"نہ جانے آپ کیوں اتنی پریشان ہیں۔ اُسے جانتی نہیں ہیں۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"مگر... بچہ کہاں سے آیا؟"

"وہ بھی پتہ چل جائے گا۔"

"میری مانو تو احسان کو فون کر کے بُلا لو۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔" دادی جان نے کہا۔ ذکیہ بیگم کچھ بول بھی نہیں پائی تھیں کہ شہاب آ گئے

"بھابی وہ..."

"بات سُنو شہاب! ایک پریشانی ہے۔ بیٹے اِنھیں کہہ دوں۔" زیب النساء خاتون نے کہا۔

"اے واہ... مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں۔"

"خیریت امی جان؟" شہاب نے حیرت سے کہا۔

"بیٹے وہ... ثنا نہ جانے کیا کر رہی ہے۔ اُس نے سب کو پریشان کر ڈالا ہے۔ نہ جانے کیا اول فول بک رہی ہے۔ ایک بچہ اُٹھا لائی ہے کہیں سے۔ کہہ رہی ہے میرا بچہ ہے اور..."

"بچہ...؟"

"ہاں ایسا خوبصورت بچہ ہے۔ گول مٹول چاند جیسا۔ اور اُس کے نقوش، اے اللہ اس کی آنکھیں تو بالکل ثنا سے ملتی ہیں۔ سب کو بتا رہی ہے کہ وہ اُس کا بچہ ہے۔"

"اوہ...!" شہاب بے اختیار مُسکرا پڑے لیکن پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔

"دروازہ بند کئے بیٹھی ہے کہہ رہی ہے۔ صائم سو رہے ہیں جاگ جائیں گے۔" دادی نے کہا۔

"صائم...!" شہاب صاحب نے تعجب سے کہا اور پھر بے اختیار ہنس پڑے۔

"ارے تم دانت پھاڑ رہے ہو یہاں سب کی جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"اور وہ دروازہ نہیں کھول رہی۔"

"ہاں ذکیہ! خود کوشش کر چکی ہیں۔"

"آئیے...!" شہاب نے کہا اور دادی جان جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں "کیا کرو گے؟"

"دروازہ کھلواؤں گا۔ بچے کو اور صائم صاحب کو دیکھوں گا۔" شہاب نے کہا۔ اُن کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دادی جان نے سرد سے لہجے میں کہا۔

"ذہن کو ذرا قابو میں رکھنا بیٹے۔ الٰہی خیر۔" ذکیہ بیگم بھی ساتھ تھیں۔ دوسرے لوگ کائی کی طرح چھٹ گئے تھے جب کہ اس سے قبل ثنا کے کمرے والی راہداری میں کئی خواتین کھڑی ہوئی تھیں۔

شہاب صاحب دروازے پر پہنچ گئے۔

"ثنا... دروازہ کھولو۔" شہاب کرخت لہجے میں بولے۔ چند لمحات اندر خاموشی طاری رہی پھر ثنا کی آواز دروازے کے پاس سُنائی دی۔

"پتہ نہیں کس قسم کے لوگ ہیں آپ۔ میں بتا چکی ہوں صائم سو رہے ہیں۔ صبح سے پہلے دروازہ نہیں کھلے گا۔"

"میں کہہ رہا ہوں دروازہ کھولو۔"

"اسٹیشن پر... مرسڈیز کے پاس۔ انکل شہاب کسی مظلومہ کی مدد کر رہے تھے۔" اندر سے آواز آئی اور شہاب صاحب ایک لمحے کے لئے بوکھلا گئے۔ اُنھوں نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ماں اور بھابی کی طرف دیکھا۔ دونوں کو کچھ نہیں معلوم تھا اس لئے وہ کچھ نہ سمجھیں۔ شہاب صاحب نے خود کو سنبھالا اور پھر بولے۔

"ثنا سنجیدہ ہو جاؤ باہر پولیس انسپکٹر آیا بیٹھا ہے۔ تم نے کل اپنی کار سے ایکسیڈنٹ کیا تھا۔ بوڑھے مزدور کو زخمی کیا تھا وہ اسپتال میں چل بسا ہے۔ ڈرائیور نے تمہارے خلاف بیان دے دیا ہے۔" دروازے کا پٹ پوری قوت سے کھلا تھا۔

"مر گیا؟" ثنا کی ڈوبتی آواز سُنائی دی۔ پھر اس نے پریشان نگاہوں سے ماں اور دادی جان کو دیکھا۔ شہاب صاحب بالکل

سنجیدہ چہرہ بنائے ہوئے تھے۔

"اوپری چوٹ نہیں تھی لیکن پسلی ٹوٹ کر دل میں گھس گئی تھی جس کی وجہ سے موت واقع ہو گئی۔ چلو انسپکٹر کو بیان دے دو۔" اُنھوں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"میں... میں کیوں دوں گی بیان۔ وہ خود ہی مر گیا ہو گا۔ اور پھر گاڑی..." "گاڑی تو خان محمد چلا رہا تھا" ثنا ندھی آواز میں بولی۔

"پریشانی تو یہی ہے خان محمد نے بیان دیا ہے کہ اُس وقت گاڑی تم چلا رہی تھیں اور تم نے زبردستی اُسے پیچھے بٹھا دیا تھا۔ وہ غریب بھی اپنی جگہ درست ہے اگر وہ یہ جُرم اپنے سر لے لیتا تو پھانسی اُسے ہو گی۔"

"مر گئے پھانسی دینے والے۔ میں پھانسی وانسی نہیں چڑھوں گی بھگا دو انسپکٹر کو۔ اُس سے کہہ دو یہاں کوئی ثنا ونا نہیں رہتی۔"

"تم یوں کرو ذرا اپنے شوہر کو باہر بھیجو۔"

"کسے؟" ثنا چیختے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ابھی میں نے سُنا ہے۔ ذرا اس سلسلے میں، میں صائم صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" شہاب صاحب نے کہا۔

"اللہ قسم کوئی صائم وائم نہیں ہے یہاں تو بس ردا ہے۔ آپ دیکھ لیں وہ تو میں نے..."

"مگر سب تو یہی بتا رہے ہیں۔ پتہ نہیں بچہ۔ صائم کیا کیا؟"

"ارے وہ ردا کا بچہ ہے آپ لوگ خود دیکھ لیں اور وہ انسپکٹر میں پھانسی پر نہیں چڑھوں گی۔ ہائے اللہ گردن کا ستیاناس ہو جائے گا۔" ثنا نے روتے ہوئے کہا۔ شہاب صاحب نے گردن خم کی اور ماں اور بھابی سے بولے۔

"جائیے اپنا مسئلہ حل کر لیجئے خادم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔" اور پھر وہ واپس مُڑتے ہوئے بولے "اور اگر وہ کوئی جوابی کارروائی کرے تو براہِ کرم مجھے نہ گھسیٹیے۔ خدا حافظ۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

زیب النساء بیگم اور ذکیہ بیگم اندر داخل ہو گئیں۔ اُنھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں دیکھا اور اُنھیں ردا نظر آ گئی۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے حسین چہرے کو دیکھ کر ذکیہ بیگم تو ششدر رہ گئیں۔ آگے بڑھیں اور اس کے قریب پہنچ گئیں۔

"کون ہو بیٹی تم؟"

"ردا۔"

"کون؟"

"رُدا ہے میرا نام"

"یہ بچّہ۔ تمہارا ہے؟"

"جی ہاں"

"خدا زندگی دے۔ امّاں بی مسئلہ حل ہوگیا سمجھ گئیں آپ؟" ذکیہ بیگم نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"اس ثنا کو تو تم پولیس کے حوالے کر ہی دو۔ بُلالو انسپکٹر کو اندر" دادی جان نے دانت کے بجائے مسوڑھے پیستے ہوئے کہا۔ ان کا دِل ابھی تک مچل رہا تھا۔

"ارے واہ۔ کوئی بُلا کر تو دیکھے وہ مزدور تھا یا چوہا بس ذراسی ٹکر تو لگی تھی۔ مر گیا میں کیا کروں۔ امّی وہ مجھے پھانسی دیدیں گے" ثنا چیختی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔

"گاڑی چلائی تھی تم نے؟"

"تھوڑی سی چلائی تھی بس۔ ہائے خُدا غارت کرے اس خان محمد کو ہمارے لئے ذراسی پھانسی بھی نہیں چڑھ سکتا۔ اسے فوراً نکلوادوں گی مگر پھانسی۔۔"

"چلو میں معاملہ برابر کردوں گی۔ تم فکر مت کرو" ذکیہ بیگم نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اور دفعتاً ثنا کو عقل آگئی۔ اگر پولیس انسپکٹر آیا ہوتا تو یہ لوگ اتنے مطمئن نہ ہوتے تو بھر بمالات اُس کے دفاع میں آگئے اور اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اُس نے مشتبہ نگاہوں سے ماں اور دادی کو دیکھا پھر مسرور لہجے میں بولی۔

"یہ انکل شہاب کہاں گئے؟"

"گئے ہوں گے کہیں۔ رُدا بیٹی آؤ باہر آؤ۔ اس نے شاید تمھیں یہاں قید کر رکھا ہے۔ آؤ بیٹی نہ جانے کیسے کیسے یہ تمھیں پریشان کرتی پھری ہوگی"

ثنا تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی وہ انسپکٹر اور شہاب صاحب کو تلاش کر رہی تھی۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم رُدا کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ تیمور کو دادی امّاں نے اُٹھالیا تھا۔

ذکیہ بیگم جھجکتی سہمتی رُدا کو لے کر اپنے کمرے میں داخل ہوگئیں۔

رُدا نے کہا۔

"ثنا کی شرارت سے آپ لوگوں کو بہت پریشانی ہوئی"

"جان عاجز ہے اس سے۔ اور اس گھر کے لوگ۔۔۔ بس کیا کہوں انھیں۔ اسے جانتے ہیں اور پھر بھی اس کی باتوں میں آجاتے ہیں امّاں جی آپ بھی"

"نئی زندگی ہی ہے مجھے تو دُلھن۔ ہائے اس شیطان نے تو جان ہی نکال لی تھی" امّاں جی ہنستے ہوئے بولیں اور پھر تیمور کے رُخسار پر پیار کرکے بولیں "اے ذکیہ اس بچّے کو دیکھو۔ مجھے دیکھ کر مُسکرائے جارہا ہے"

"تم کون ہو رُدا۔ پہلے کبھی ہمارے ہاں نہیں آئیں" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"زمانے کی ستائی ہوئی ہے خُدا نے مجھے فرشتہ بناکر بھیجدیا ورنہ نہ جانے کیا ہوجاتا۔ پوچھئے اس مظلومہ سے کیا کہہ رہے تھے انکل شہاب اس سے پوچھئے پوچھئے قسم بھی دے دیجئے تاکہ جھوٹ نہ بول سکے" ثنا آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی تھی اور بہت طیش میں نظر آرہی تھی۔

"آگیا طوفان" دادی امّاں بولیں۔

"طوفان تو اس بے چاری کی زندگی میں آنے والا تھا کیوں رُدا خاموش کیوں ہو اسٹیشن کے واقعات بتاؤ؟ مگر ایک شریف لڑکی زبان کیسے کھول سکتی ہے مجھ سے سُنئیے یہ انکل شہاب کا شکار ہے"

"لڑکی تو بالکل ہی دیوانی ہوگئی ہے کیا۔ بکے جارہی ہے رُدا بیٹی تم بتاؤ اپنے بارے میں" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"جی وہ۔۔۔ میں لاہور سے آئی ہوں" رُدا نے آہستہ سے کہا۔

"خُوب، وہیں رہتی ہو۔ ثنا سے کب ملاقات ہوئی؟"

"جی پچھلی رات۔ میں ٹرین سے اُتری تھی کراچی پہلی بار آئی ہوں کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہتی تھی لیکن۔۔"

"انکل شہاب انھیں اپنی کار میں بٹھاکر ہوٹل لے جانا چاہتے تھے کہ میں پہنچ گئی اور میں نے انھیں بچالیا۔ پھر میں انھیں اپنے ساتھ لے آئی۔ اور اس وقت سے۔۔"

"کیا یہ سچ ہے رُدا" ذکیہ بیگم نے پُوچھا۔

"جی ہاں" رُدا نے جواب دیا۔

"کوئی ایسی ویسی بات کہی شہاب نے؟" دادی جان نے پُوچھا۔

"ایک دم کیسے کہہ دیتے۔ پہلے ہوٹل لے جاتے پھر بہلانے کی کوشش کرتے۔ ارے آپ کیا سمجھتی ہیں اپنے لاڈلے کو" ثنا نے کہا۔

"ثنا! باہر جاؤ" ذکیہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔

"گویا انصاف نہیں ہوگا"

"ثنا! باہر جاؤ" اس بار ذکیہ بیگم کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ثنا تیزی سے آگے بڑھی تیمور کو دادی جان کی گود سے جھپٹا اور باہر نکل گئی۔ ذکیہ بیگم نے ندامت سے رُدا کو دیکھا اور بولیں۔

"تم خیال نہ کرنا رُدا اس لڑکی سے پُورا گھر عاجز ہے بس بکتی رہتی ہے کچھ نہ کچھ سوچے سمجھے بغیر اب وہ شہاب کی دُشمن ہورہی ہے جبتک بدلہ نہ لے لے گی سکون سے نہ بیٹھے گی اس نے انسپکٹر کے نام سے جوڑ دیا تھا۔

"جی" رُدا نے آہستہ سے کہا۔

"اس سے پہلے کبھی ثنا سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں۔ بس رات کا وقت تھا اور میں کراچی سے ناواقف ہوں اس لئے آپ لوگوں کو زحمت دی۔ بس میں ابھی چلی جاؤں گی" رُدا نے کہا۔

"اس گفتگو میں جانے کا ذِکر کہاں سے نکل آیا۔ ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی کیوں امّی" ذکیہ بیگم نے زیب النساء بیگم سے کہا۔

"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی بس میں۔۔" رُدا گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

"ضرور چلی جانا بیٹی۔ بلکہ جہاں تم کہو گی ہم خود پہنچا دیں گے اگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ پریشان کیوں ہو رہی ہو" ذکیہ بیگم نے ہمدردی سے کہا۔

"شہاب نے واقعی تم سے بدتمیزی کی تھی اسٹیشن پر۔۔۔" دادی جان کے دِل میں بات چُبھ رہی تھی۔

"جی۔۔۔ جی نہیں۔ بالکل نہیں" رُدا نے جواب دیا۔

"آپ ثنا کی بات پر جا رہی ہیں امّی۔ چھوڑیئے ان باتوں کو وہ آپ کی سر چڑھائی ہوئی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے دو دن میں ٹھیک کردوں" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"خُدا کا احسان ہے" دادی جان نے آہستہ سے کہا۔ پھر وہ رُدا سے بولیں "بیٹی۔ ابھی تم نے کہا ہے کہ تم کراچی سے ناواقف ہو کراچی ناواقف اور واقف دونوں کے لئے خطرناک ہے۔ اگر تم یہاں کسی رشتے دار کے ہاں آئی ہو تو بتادو تمھیں وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ تنہا سفر کرنا یا کسی کو تلاش کرنا تمھارے لئے پریشان کُن ہوسکتا ہے"

رُدا نے گردن جُھکالی۔ وہ اپنی سفید لانبی اُنگلیوں کو مضطربانہ انداز میں مسل رہی تھی۔

"اپنی اُلجھن ہم سے کہہ دو بیٹی! ہم لوگ بھی صاحبِ اولاد ہیں پریشان ہو تو بتادو انسان کو ایک دوسرے کی مدد لینی ہی ہوتی ہے۔ کوئی رشتے دار ہے کراچی میں۔۔۔؟"

"نہیں" رُدا کی آنسو بھری آواز اُبھری۔ اور سچّے موتی اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ ذکیہ بیگم نے ہمدردی سے اس کے لمبے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بالکل فِکر نہ کرو۔ کراچی کیسے آنا ہُوا؟"

"میرے خیال میں ابھی کچھ نہ پُوچھو ذکیہ۔ اسے آرام کرنے دو۔ دل چاہے گا تو خود بتادے گی۔ ہاں بیٹی لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لو۔ جب تک ہمیں تمھاری صحیح جگہ نہیں معلوم ہوجائے گی ہم تمھیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ اس گھر کے بارے میں تم نہیں جانتیں لیکن بس اتنا سمجھ لو کہ یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی تمھیں صرف اس لئے روکا جارہا ہے کہ کراچی کی فضا کسی تنہا لڑکی کے لئے سازگار نہیں ہے"

"عدالت کی کارروائی ختم ہوگئی ہو تو میں اندر آجاؤں" دروازے سے ثنا کی آواز سُنائی دی۔ اور کسی کا جواب نہ پاکر وہ اندر داخل ہو گئی۔ تیمور نئے خوبصورت سُوٹ میں ملبُوس تھا۔

"مُلزم کو لے جاسکتی ہوں" ثنا نے پھر پُوچھا۔

"زہریلی لڑکی! تیرے مُنہ سے کبھی کوئی میٹھی بات بھی نکلتی ہے" دادی جان نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں آپ کے سُورما۔ میرا نام بھی ثنا ہے یہ ضرور بتادیں اُنھیں" ثنا نے کہا "آؤ رُدا" وہ بولی اور رُدا کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا۔ "رُدا تمھیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے"

"جی۔۔۔ وہ۔۔" رُدا چونک کر بولی۔

"دیکھو میں بہت اچھی انسان ہوں۔ بس ذرا مزاج کی بہت تیز ہوں ورنہ دِل اندر سے بالکل موم ہے۔ میں تمھارے لئے ذرا بھی نقصان دہ نہیں ثابت ہوں گی۔ مجھ پر اعتماد کرو"

"ثنا! مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ واقعی آپ بہت اچھی ہیں" رُدا نے کہا۔

"دوسری بات، مجھے منافقت بالکل پسند نہیں۔ مجھ سے جو بات کہو دِل سے کہو خواہ وہ اچھی ہو یا بُری" اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوگئی۔ برابر کے کمرے سے کھسر پُسر کی آوازیں آرہی تھیں۔ ثنا نے کہا۔

"برابر کا کمرہ تمھارے لئے دُرست ہو رہا ہے۔ میں نے ملازموں کو ہدایت دے دی ہے"

"تم۔۔۔ میرے لئے۔۔۔" رُدا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ تمھارے لئے۔ تم میرے برابر والے کمرے ہی میں رہوگی اگر یہ کمرہ پسند بھی نہ آئے تو کچھ دِن یہاں ضرور قیام کرنا۔ پہلے میں تمھیں اس گھر سے روشناس کرادوں اس کے بعد تمھاری مرضی ہے جہاں دِل چاہے رہو" ثنا نے لاپرواہی کے انداز میں کہا اور پھر تیمور کو چومتی ہوئی بولی۔

"اور مسٹر تیمور کو ہم آدھا آدھا بانٹ لیتے ہیں"

"جی۔۔" رُدا چونک کر بولی۔

"بھئی تم چاہو تو دن کے چند حصے کر لو اور اگر تم چاہو تو آدھا دن میرے پاس اور آدھا دن تمھارے پاس لیکن رات کا مسئلہ رہ جاتا ہے چلو اس کا فیصلہ یوں کر لیتے ہیں کہ ایک رات یہ میرے پاس اور ایک رات تمھارے پاس۔"

رِدا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیوں! کیا تمھیں یہ منظور نہیں ہے۔ بھئی دیکھو تیمور تمھارا بیٹا ہے لیکن آج سے یہ تھوڑا بہت ہمارا بھی ہو گیا ہے بہت سے لوگوں کو تو اب تک شاید پتہ بھی نہیں چل سکا ہو گا کہ یہ کس کا...؟"

ثناء بے اختیار ہنسنے لگی پھر بولی۔

"خاص طور سے عارفہ بیگم۔ اللہ بچائے۔ پیٹ کی بڑی ہلکی ہیں نجانے کیا کیا کہانیاں گڑھ کر سنا چکی ہوں گی۔"

رِدا کچھ دیر کے لئے اپنی پریشانی بھول گئی تھی مسکرا کر بولی۔

"ثناء آپ نے بھی تو...۔"

"ہاں... ہاں میں نے بھی تو... میں نے بھی تو کیا کیا۔ بولیئے ذرا" ثناء نے کہا۔

"نہیں نہیں کچھ نہیں۔ میرا مقصد ہے کہ آپ نے یہ محسوس نہیں کیا کہ آپ کے یہ الفاظ لوگوں کو کتنا پریشان کر دیں گے۔"

"ہائے میرا دل تو چاہتا ہے کہ یہ سارا گھر ہر وقت بے معنی پریشانیوں کا شکار رہے" ثناء آنکھیں بھینچ کر بولی۔

"جی" رِدا حیرت سے دیکھنے لگی۔

"جی ہاں۔ بڑے کائیاں لوگ ہیں یہاں کے اور انکل شہاب خدا کی قسم تم دیکھنا رِدا انکل شہاب کو ناکوں چنے نہ چبوا دیئے تو میرا نام بھی ثناء نہیں" ثناء دانت پیس کر بولی۔

"انھوں نے آپ کو انسپکٹر کے نام سے ڈرایا تھا۔"

"بھئی۔ ان پولیس والوں کی اتنی کہانیاں سنی ہیں میں نے کہ ان سے واقعی ڈر لگتا ہے اب تم دیکھو نا جیل میں بند کرتے ہیں۔ مار لگاتے ہیں اور پھر مار بھی ڈالتے ہیں۔ اب آدمی آسانی سے مرنا تو پسند نہیں کرتا۔"

"لیکن آپ کیوں ڈر رہی ہیں؟"

"کیا آپ آپ لگا رکھی ہے؟ تم نہیں کہہ سکتیں۔ خواہ مخواہ مجھے بوڑھا بنائے دے رہی ہو۔ بات دراصل یہ ہو گئی تھی کہ یہ جو ہماری دادی اماں ہیں نا کیا کہوں ان کو، درختوں کے دور کی انسان ہیں۔ انھیں تو پہاڑوں اور غاروں میں ہونا چاہیئے تھا۔ لڑکیوں پر پابندیاں لگانے کی بہت شوقین ہیں۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ ایسا نہ کرو ویسا نہ کرو۔ مجھے کار نہیں چلانے دی جاتی لیکن انھیں پتہ بھی نہیں ہے کہ میں نے خاموشی سے کار چلانا سیکھ لی ہے اور جب بھی ڈرائیور کبھی تنہا میرے ہاتھ لگ جاتا ہے تو میں اُسے پیچھے ہٹا کر کار خود چلاتی ہوں۔ کل بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ بڑے میاں اچانک ہی گاڑی کے سامنے آ گئے۔ ہلکی سی ٹکر لگ گئی۔ میں نے پچاس روپے کا نوٹ دیدیا بے چارے خوش ہو کر چلے گئے۔ پتہ نہیں انکل شہاب کو اس بارے میں کیسے معلوم ہو گیا۔ ارے میں سمجھ گئی اس کم بخت ڈرائیور نے بتایا ہو گا ٹھیک ہے اس کی بھی شامت۔ حالانکہ میں اُسے پچھلے ہفتے ہی سو روپے دے چکی ہوں" ثناء بولی۔ رِدا ہنس رہی تھی اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلیئے... آپ دونوں کو معاف کر دیجئے ثناء۔ کیا فائدہ؟"

"مگر تمھیں معاف نہیں کروں گی پھر آپ کہا مجھے!"

"سوری۔"

"ٹھیک ہے اب تم ایک بات سن لو۔ پہلی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے بارے میں پوری تفصیل بتا دو میں ہوں آدمی ذرا دوسری قسم کی۔ نہیں بتاؤ گی تو ناراض ہو جاؤں گی تم سے، اور تمھارے اس تیمور کو یہاں سے لے کر فرار ہو جاؤں گی۔ ڈھونڈتی پھرنا ایسی جگہ جا کر چھپوں گی کہ کوئی بھی مجھے تلاش نہ کر سکے گا۔ یہی تمھاری سزا ہے سمجھیں؟"

"نہیں... نہیں اتنی بڑی سزا مجھے نہ دیجئے ثناء۔"

"تو پھر آپ کو ہمیں اپنے بارے میں بتانا ہو گا محترمہ رِدا صاحبہ۔ ہاں کچھ وعدے کئے جا سکتے ہیں آپ سے کہ آپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا جائے گا آپ کا راز صرف ہمارے پاس رہے گا۔"

"اب آپ مجھے آپ کہنے لگیں ثناء۔"

"جی ہاں۔ جوابی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔ مگر کچھ اُلجھنوں کا شکار ہوں دادی اماں کہہ رہی تھیں کہ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جا سکوں گی جب تک کہ انھیں میرے رشتے داروں کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو جائیں۔"

"یہ کہہ رہی تھیں دادی اماں" ثناء آنکھیں نکال کر بولی۔

"جی ہاں۔ میں اس کی وجہ سے اُلجھن کا شکار ہوں۔"

"دادی اماں سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔ مجال ہے کسی کی جو تمھیں یہاں سے جانے دے یعنی اگر رشتہ داروں کا پتہ چل بھی جائے گا تو کیا تمھارے خیال میں، میں تمھیں یہاں سے جانے دوں گی۔" ثناء بولی۔

"نہیں ثناء۔ پلیز میرے یہاں رہنے کا کیا جواز ہے؟"

"جواز پیدا کر لیا جائے گا۔ آپ اس موضوع کو ذہن سے نکال دیں۔"

"سنو تو سہی ثناء! میں آج ہی جانا چاہتی ہوں دراصل دادی اماں کی اس بات سے مجھے اختلاف ہے میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں آپ لوگوں پر یا کسی پر میں بار نہیں بننا چاہتی۔"

"عجیب طبیعت کی انسان ہو۔ کسی کی محبت کو قبول ہی نہیں کرتیں۔ ناراض ہو گئی تو سوچ لینا زندگی بھر مناتی رہیں پھر بھی نہیں مانوں گی۔ میں تمھیں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم خود بتاؤ کیا ایک لڑکی کا تمھارے یہاں رہنا مناسب ہے جس کا نہ تو تم سے کوئی رشتہ ہے اور جسے تم نے پہلی بار دیکھا ہے میں کون ہوں، کیا ہوں؟ اس بارے میں تمھیں کچھ نہیں معلوم۔ ممکن ہے میں غلط ہوں۔ ممکن ہے میرے نام کے ساتھ کوئی ایسی بات وابستہ ہو جو تمھارے خاندان کی بدنامی کا باعث بن جائے۔ بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ثناء کہ میں یہاں سے تمھاری قیمتی چیزیں سمیٹوں اور نکل جاؤں۔ ایسی حالت میں تم لوگوں کو کسی اجنبی انسان پر اتنا بھروسہ نہیں کر لینا چاہیئے یہ کوئی عقل کی بات تو نہیں ہے۔"

"آپ ہمیں عقل سکھانے آئی ہیں جی۔ اب ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ انسانوں کو بھی نہیں سمجھ پاتے۔ ٹھیک ہے ہم اس بات کے لئے تیار ہیں کہ آپ یہاں سے ہماری قیمتی ترین چیزیں لے کر چلتی بنیں۔ میں آپ کو بہت جلد ان تمام قیمتی چیزوں کی جگہوں کے بارے میں ایک معلوماتی فہرست فراہم کر دوں گی اور اگر ممکن ہو سکا تو ان انتہائی قیمتی چیزوں کی چابیاں بھی۔ آپ انھیں اُٹھائیں اور یہاں سے رفوچکر ہو جائیں لیکن ہمیں اس بارے میں نہ بتائیں ہم نے جب آپ پر اعتماد کیا ہے مس رِدا! تو آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ اعتماد ہمیشہ قائم رہے گا آپ اسے توڑنے کے لئے چاہے ہتھوڑے ہی کیوں نہ استعمال کریں۔ توڑ نہیں پائیں گی۔"

رِدا کا سر جھک گیا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیرنے لگی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے گردن اُٹھائی تو ثناء اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر چونک گئی۔

"رو رہی ہو" وہ جلدی سے اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔

"ثناء... ثناء... میں بے سہارا ہوں۔ ثناء میرا اس دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں تنہا ہوں بالکل۔ بالکل تنہا ہوں۔ میں کسی کی اتنی محبتوں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی مجھے جانے دو پلیز مجھے جانے دو۔"

ثناء خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"دیکھو رِدا! میں کبھی روتی نہیں ہوں اگر تم نے مجھے رُلا دیا نا تو پھر ساری دُنیا سے منہ چھپائے چھپائے پھروں گی کیونکہ کوئی ایک ایک سے کہ ہاں میں کمزور دل کی مالک ہوں میں روئی تھی۔ تم میرے اس مان کو مت توڑو۔ کیسی باتیں کر رہی ہو میں بہت اچھے الفاظ میں اپنا آپ ظاہر نہیں کر سکتی لیکن صرف چند جملوں میں اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش ضرور کروں گی۔ یہ بتاؤ کیا دُنیا اتنی ہی سخت ہے کیا دُنیا اتنی ہی بے ضمیر ہے کہ کسی انسان کے بارے میں یہ جاننے کے باوجود کہ وہ تنہا ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لے گی رِدا پلیز۔ اس بات کو انسانی ہمدردی یا محبت کے جذبات، یا انسانی کمزوری کچھ بھی سمجھ لو، ہم تمھیں اچھی زندگی دے سکتے ہیں ہمارے پاس اس کی گنجائش ہے۔"

"اس گھر کے بارے میں جان لو پہلے میرے ڈیڈی کا نام احسان علی ہے ہمارا بہت اچھا کاروبار ہے اس گھر میں تمھیں جتنے پرندے چہکتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ ہمارے پاس کے اور دور کے رشتے دار ہیں۔ وہ رشتہ دار، جو بہت اچھی حیثیت نہیں رکھتے۔ ڈیڈی نے انھیں اپنے پاس رکھا ہے۔ ڈیڈی کا کہنا ہے کہ مذہبی طور پر سب سے پہلا حق عزیزوں اور پڑوسیوں کا ہوتا ہے چنانچہ جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے ہم ان کے لئے کر رہے ہیں یہ سارا گھر ان لوگوں سے بھرا پڑا ہے یہاں انسانوں کے لئے بہت گنجائش ہے رِدا۔ اگر تم واقعی بے سہارا ہو تو اس غریب خانے کو قبول کر لو۔ جب تمھیں اپنی زندگی کا کوئی محور مل جائے جب تم محسوس کرو کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی ہو تو ہم پر لعنت بھیج دینا اس وقت ہم تمھیں نہیں روکیں گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے اور اس سے زیادہ جذباتی گفتگو شاید میں زندگی میں کبھی نہیں کر سکتی۔ میں تمھاری اس بات پر تم سے ناراض ہو گئی ہوں کہ تم ہم لوگوں کی محبتوں کو قبول نہیں کر رہیں۔ بے شک محبتیں کرنے کے لئے شاید لمبی شناسائی اور طویل عرصہ درکار ہوتا ہے لیکن کیا ایسے واقعات نہیں ہوتے کہ ایک لمحے میں انسان اس طرح آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتا ہے کہ پھر نکالے نہیں نکلتا۔ رِدا تمھاری حیثیت بھی میرے لئے یہی ہے میں تمھیں اپنی بہن کی مانند چاہتی ہوں اس سے زیادہ شاید میں کوئی لفظ ادا نہ کر سکوں" ثناء بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی اس نے منہ پھلا لیا تھا رِدا چند لمحے آنسو بھری آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی اور ایک دم ہنس پڑی۔

"ثنا، پلیز! تم مجھ سے ناراض نہ ہو۔"

"ارے کیوں ناراض نہ ہوؤں۔ اتنی خوشامدیں کر رہی ہوں، اتنی محبت کر رہی ہوں اور یہ تمہارا ہیرو ہے نا یہ بس یوں سمجھ لو کہ میرا ہیرو ہے۔ میری زندگی میں یہ پہلا مرد آیا ہے جسے اچانک ہی میں چاہنے لگی ہوں اسے چھین کر لے جاؤ گی مجھ سے۔۔" ثناء نے ننھے تیمور کی طرف دیکھ کر کہا اور رُدا ایک بار پھر ہنس پڑی۔

"تو یہ تمہاری زندگی کا پہلا مرد ہے۔"

"سو فیصدی پہلا، دوسرا ثابت کر دو گی تو جو چور کی سزا وہ میری۔ میں قبول کر لوں گی۔" ثناء نے کہا اور پھر بے اختیار ہنس پڑی۔

"ہیرو! تم مجھے چھوڑ جاؤ گے۔" ننھا سا تیمور مسکرا دیا تھا رُدا ممنونیت کی نگاہ سے ثناء کو دیکھ رہی تھی پھر وہ بولی۔

"ثناء! اگر کچھ دن کے لئے مجھے اس گھر میں سہارا مِل جائے تو یوں سمجھو کہ میری تقدیر میں روشنی پھیل جائے۔ میں واقعی تمہارے اس شہر سے ناواقف ہوں۔ یہاں اپنے قدم جمانا چاہتی ہوں اور اپنی زندگی کے لئے کچھ کرنے کی خواہش مند ہوں میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد تعلیمی سلسلہ جاری نہیں رکھ سکی۔ میں کوئی عُمدہ سی ملازمت کروں گی اور اپنی زندگی کو ایک راستے پر لگاؤں گی۔ اگر مجھے یہاں واقعی تمہارا مضبوط سہارا مل جاتا ہے ثناء۔ تو یُوں سمجھ لو کہ مجھے تقدیر سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ بہت سے شکوے ختم ہو جائیں گے میرے اس دُنیا سے۔" رُدا جذباتی انداز میں کہہ رہی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے دُنیا سے اپنے تمام شکوے ختم کر دو تم یہیں رہو گی۔ یہیں، میں تمہیں اپنے ڈیڈی کے بارے میں بتا رہی تھی لیکن جذبات کی رو میں بھٹک گئی۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ ہمارا خاندان ہمارے ہاں رہتا ہے اس کے علاوہ میں اپنے ڈیڈی کی اکلوتی بیٹی ہوں بس ذرا غلط طبیعت کی انسان ہوں بہت سے لوگ ہیں یہاں اور ان میں تمہارا با آسانی گزارا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس بارے میں مت سوچو ہاں اگر تمہیں اپنی زندگی کے لئے کچھ راستے تبدیل کرنے پڑے تو میں تمہارے شانہ بشانہ رہوں گی۔"

"ٹھیک ہے ثناء۔ میرے لئے اپنے اِس گھر میں جگہ پیدا کرو۔" رُدا نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"جگہ تو لد ہو چکی ہے، برابر کا کمرہ آپ کے لئے صاف کیا جا رہا ہے۔ آپ وہیں قیام کریں گی۔ اور ہاں وہ اپنے بارے میں نانے والی بات۔"

"اس کے لئے مجھے کچھ مہلت دے دو۔"

"مہلت دی جاتی ہے۔" ثناء نے کہا اور تیمور کو گود میں لے کر ہلانے لگی۔

★★

غلام احمد کی زندگی کو گویا نیا سہارا مل گیا تھا۔ احسان احمد صاحب اسمِ با مسمیٰ تھے۔ اُنھوں نے واقعی اتنا بڑا احسان کیا تھا غلام احمد پر کہ وہ زندگی بھر ان کے احسان سے سر نہیں اُٹھا سکتا تھا کم از کم یہاں تحفظ کا ماحول تو مِل گیا تھا۔

شوکت جہاں۔ اماں بی۔ عصمت اور ندرت اس نئے گھر میں آکر بے حد خوش تھیں جو ہر لحاظ سے اس جھونپڑے سے بدرجہا بہتر تھا جس میں اُنھوں نے گزر بسر کی تھی۔ زندگی کے وہ تمام حسن ان کی نگاہوں سے روپوش ہو گئے تھے جن میں اُنھوں نے ہوش سنبھالا تھا۔ کیا نہیں تھا گھر میں نوکر چاکر۔ بہترین زندگی۔ خوبصورت مکان، لیکن تقدیر کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ لڑکیاں اس وقت پوری طرح باہوش نہیں تھیں لیکن کچھ مٹے مٹے سے نقوش ذہن میں واضح تھے۔

البتہ ندرت تو بالکل ہی معصوم تھی اس وقت جب وہ مشرقی پاکستان سے یہاں آئے تھے۔ غلام احمد بھول گئے تھے کہ کبھی وہ بھی اتنی ہی حسین زندگی گزار چکے ہیں جو یہاں کے لوگوں کو میسر تھی۔

بہر طور اس ماحول میں اُنھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح ضم کر لیا تھا۔ بیوی۔ ماں اور بیٹیوں کو چند ہدایات دی تھیں کہ کس طرح انہیں یہاں زندگی گزارنی ہے۔ سرونٹ کوارٹر میں تین کمرے تھے صحن تھا۔ بجلی۔ پانی ضرورت کی تمام چیزیں تھیں۔ اماں بی باہر کے ماحول کو دیکھتیں تو آبدیدہ ہو جاتیں۔

"دُلھن اپنا سا گھر نہیں لگتا بس صرف ہمارے رہنے کی جگہ بدل گئی ہے۔ پہلے ہمارے ملازم بھی ایسے ہی کوارٹروں میں رہتے تھے۔ وہ لڑکی یاد ہے تمہیں سندو؟"

"سب کچھ یاد ہے اماں بی۔ لیکن خُدا کا احسان ہے اس جہنم سے نجات ملی۔ کم از کم یہاں کا ماحول تو اچھا ہے۔"

"ہاں شکر ہے معبُود کا جس حال میں بھی رکھے۔ وہاں رہ کر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ہماری دُنیا اتنی بدل گئی ہے۔ یہاں آکر سب کچھ یاد آگیا ہے۔" اماں بی نے کہا۔

"وقت سے سمجھوتہ کریں اماں بی۔"

ندرت یہاں آکر سب سے زیادہ خوش تھی۔ "باجی یہ سب لوگ کتنے خوش و خرم رہتے ہیں۔ وہ لان ہے نا وہاں۔ لڑکیاں ٹینس کھیلتی ہیں کتنی آزاد ہیں وہ۔ جب ہم یہاں رہتے ہیں باجی تو ان سے دوستی کیوں نہ کی جائے۔"

"فرق ہے اُن میں اور ہم میں ندرت۔ ایسی کوئی کوشش نہ کرنا اباّ میاں کی ہدایات بھول گئیں۔"

"وہ فرق سمجھا دیں باجی مان لُوں گی۔"

"اب اتنی بچی بھی نہیں ہو، سب کچھ جانتی ہو۔"

"گویا ہم ملازم ہیں اور ہمیں ملازموں کی طرح رہنا چاہیئے۔"

"ہاں۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔"

"نہیں باجی مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہاں صرف اباّ میاں ملازم ہیں ہم سب کیسے ہو گئے۔ نہ تمہارا نام بی شبراتن ہے نہ میرا... اللہ رکھی۔ ہم آزاد شہری ہیں اور ہمیں بھی آزادی ملنی چاہیئے۔"

"اباّ میاں سے بات کر لینا۔" عصمت نے ہنس کر کہا۔

"اُن تک پہنچنے کے لئے بوڑھی گنگا اور پدما کے پُل عبور کرنے پڑتے ہیں۔"

"کیا... ؟"

"اماں بی... اور امّی۔ اماں جی گنگا کا پُل ہیں لمبا چوڑا جس پر چلتے ہوئے پاؤں دُکھ جائیں اور امّی پدما کا چھوٹا سا پُل ہیں جو لمبا تو نہیں لیکن پُل تو ہے۔"

"کہدوں ان دونوں سے ؟"

"سچ باجی! اس سے تو وہ محلہ اچھا تھا کبھی کبھی تاک جھانک کا موقع تو مل جاتا تھا۔"

"اس تاک جھانک کی وجہ سے تو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ بچ گئی ورنہ رحمٰن میاں کے پلّے بندھ جاتی۔"

"میں ؟" ندرت آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"اور کیا میں ؟"

"ایکٹنگ کر رہی ہو۔ بڑی تم ہو۔ پہلے تمہاری باری آتی۔ ہائے دُولہا بھائی کی مُونچھیں۔"

"دیکھو کون ہے دروازے پر ؟" عصمت نے دروازے پر ہونے والی دستک سُن کر کہا۔ اور ندرت دروازہ کھولنے چلی گئی۔ برابر کے کوارٹر کی خاتون تھیں۔

"جی۔ فرمایئے ؟"

"وہ... وہ میں تو... میں تو اس گھر کے لوگوں سے ملنے آئی تھی۔ سُنا ہے یہاں ڈلیور صاحب آگئے ہیں۔" خاتون نے کہا۔

"آپ کون ہیں ؟"

"جمن کی ماں ہوں۔ تین نمبر میں رہتی ہوں۔"

"آیئے۔" ندرت نے کہا۔ شکل سے وہ کسی ملازم کی بیٹی نہیں نظر آتی تھی اس لئے جمن کی ماں دھوکا کھا گئی تھیں۔

"تم کون ہو بیٹا ؟"

"اللہ رکھی۔ ڈلیور صاحب کی بیٹی ہوں۔ امی نئے ماحول کا پہلا ہیں سنبھالئے۔" ندرت نے کہا اور ہنستی ہوئی واپس عصمت کے پاس پہنچ گئی۔ دیر تک دونوں اُن خاتون پر ہنستی رہی تھیں۔

دوسری طرف جمن کی ماں کہہ رہی تھیں۔ "شکلیں تو بالکل بڑی بیبیوں کی سی پائی ہیں اللہ رکھے کتنی بیٹیاں ہیں ؟"

"دو۔" اماں بی نے کہا۔

"اللہ رکھی نے دروازہ کھولا تھا۔ میں تو حیران رہ گئی ایسا لگا تھا جیسے بڑی بیبیوں میں سے کوئی ہو ؟"

"کون اللہ رکھی ؟"

"اے لو تمہاری بٹیا اور کون۔ اُس نے تو دروازہ کھولا تھا۔" اماں بی حیرت سے شوکت جہاں کو دیکھنے لگیں۔

"وہی چھوٹی ہو گی اماں بی۔" شوکت جہاں نے کہا۔ ندرت کے بارے میں وہ جانتی تھیں۔

"اپنا جمن باورچی ہے کوٹھی میں۔ اٹھائیس سال کا ہے ابھی مگر دیسی اور ولایتی سارے کھانے پکا لیوے ہے۔ بس اب شادی کرنی ہے اُس کی بڑے سرکار نے بھی کہہ دیا ہے خرچہ وہ کر مل گے۔"

"ضرور کریں۔" شوکت جہاں نے کہا۔

"بس بی بی دُعا کرو کوئی اچھی سی لڑکی مِل جائے۔ ذرا نگاہ رکھنا۔"

"جی !" شوکت جہاں نے کہا۔ اُن کا مُنہ بگڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پڑوسن چلی گئیں۔

"کچھ غور کیا شوکت جہاں ؟" اماں بی نے کہا۔

"ہاں اماں بی۔ اب تو دماغ پھٹنے لگا ہے۔" شوکت جہاں نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"ایک ہی طریقہ ہے کسی کو مُنہ ہی نہ لگاؤ۔ دروازے سے بات کرو اور ٹال دو ہماری اوقات اب یہی رہ گئی ہے۔"

"جی اماں بی۔" شوکت جہاں نے آہستہ سے کہا۔

جمن کی ماں البتہ اپنے دِل میں بہت سے خیالات لے کر گئی تھیں۔ اللہ نے گھر بیٹھے ایسی خوبصورت بہو دے دی تھی۔ رات کو یہ خوشخبری اُنھوں نے جمن کو سُنا دی۔

"ڈلیور صاحب کو جانے ہے ؟"

"کون ڈلیور اماں ؟"

"ارے وہی بڑے صاحب کے ڈلیور۔ اپنے برابر دو نمبر میں آگئے ہیں۔"

"ہاں سامان تو میں نے بھی آتے ہوئے دیکھا تھا۔ پر کیا ہوا؟"

"بڑی خوبصورت بیٹی ہے اُن کی اللہ رکھی۔"

"او ہو۔ اچھا اماں۔ کب دیکھا تو نے؟"

"آج ہی۔ لگتی ہی نہیں ہے کہ کسی ڈلیور کی لونڈیا ہے۔ میں نے کچھ سوچا ہے اس کے بارے میں۔"

"ضرور سوچ اماں۔ مجھے دکھا دے ایک بیری۔"

"صبر کر ابھی جلد بازی بُری ہووے ہے۔ تیرے ابا سے بات کروں گی پتہ تو لگے ہیں کہاں کے رہنے والے۔ ابھی تیل دیکھ تیل کی دھار دیکھ۔"

"تو تین بیری دھار لگا بیٹھی ہے اماں۔ اس بار تو کچھ کر ہی لے۔" جمن نے کہا۔

"بس اب جان مت کھا میری۔ تجھ سے تو کہنا ہی غضب ہوگیا۔" جمن کی ماں نے کہا۔

"لیکن اب تیل میں گیا تیل اس بیری تو اپنا کام کر ہی لے اماں۔" جمن ماں کی خوشامد کرنے لگا۔

دوسرے دِن جمن کی ماں بہت سے لوازمات لے کر ندرت کے گھر پہنچ گئی۔ یہ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ جمن نے پکائی تھیں۔

"دستر خوان ای کا ہوتا ہے گھر بھر دیا ہے اس نے تو۔ اے دُنیا جہان کی چیزیں اُٹھا لاتا ہے تنخواہ تو لیس نام کی ہے آٹا سبزیاں پھل بھرے رہتے ہیں گھر میں اور پھر سگھڑ اتنا کہ نہ پوچھو۔ باورچی خانے کا وہ کیا ہووے ہے ٹھنڈا کرنے والا ڈبہ۔ اے وہ جو سفید صندوق جیسا ہووے ہے۔"

"ڈیپ فریزر۔" شوکت جہاں نے بتایا۔

"اے ہاں بھاڑ میں جائے یہ موئی گٹ پٹ۔ وہی انگریزی ڈبہ تو جمن نے خراب کر دیا اسے۔ اس کا ہاتھ لگ جائے اور چیز ٹھیک ہو جائے سارے ستری سر توڑ کر مر گئے بڑے صاحب نے کہا۔ میاں جمن باہر پھینکو اسے دوسرا آجائے گا۔ اور بی بی تمہارا جمن اسے اُٹھا لایا۔ لکڑی گھمائی اور ٹھیک کر لیا۔ اب دُنیا جہان کی چیزیں بھرے ہیں اس میں۔ جو لونڈیا آئے گی میرے گھر عیش کریگی، راج رچے گی۔"

"جی۔ مگر یہ چیزیں آپ یہاں کیوں لائی ہیں۔" اماں بی نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"ارے وہ۔ اپنی اللہ رکھی کے لئے لائی ہوں۔" جمن کی ماں نے کہا۔

"جمن کی ماں! ہم لوگ چوری کی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ خُدا کے فضل و کرم سے ہم کوشش کرتے ہیں کہ کوئی حرام مال ہمارے سینوں میں نہ اُترنے پائے۔ آپ براہ کرم ان تمام چیزوں کو لیجائیے اور ایک بات کان کھول کر سُن لیجئے آئندہ آپ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گی۔"

جمن کی ماں کا مُنہ حیرت سے کُھلا کا کُھلا رہ گیا کچھ دیر وہ متعجبانہ انداز میں اماں بی کو دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"اے لو بی بی اگھر آئی نعمت کو ٹھکرا رہی ہو۔ بڑی آن بان والی بنتی ہو یہ چوری کا مال ہے۔ بی بی آدمی جہاں کام کرتا ہے وہاں کی چیزوں پر اس کا حق ہووے ہی ہے۔ بھلا یہ چوری کہاں سے ہوگئی۔ ایک بار ہمارے گھر تو آؤ آنکھیں کھل جائیں گی تم نے جمن کو کوئی گرا پڑا سمجھ رکھا ہے۔ اے میں تو کہوں اگر میں کوشش کروں تو بڑی بڑی پڑھی لکھی لڑکیاں مل جاویں گی میرے جمن کیلئے۔ آج کل لوگ گھر دیکھیں ہیں اور کچھ نہ دیکھے ہیں۔"

"یقیناً یقیناً۔ ہم جاہلوں کو تو آپ معاف ہی کیجئے جمن کی ماں۔ ہمارا یہ چھوٹا سا گھر اور اس میں جو کچھ ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے اور ہمارا کوئی جمن بھی نہیں ہے۔" شوکت جہاں نے جواب دیا۔

"بوا! میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اچھی بچیاں ہیں ایک میرے گھر میں ڈھک جائے گی بس مجھے اچھی لگی تھی وہ اللہ رکھی سو دل میں خیال آگیا لیکن تمھارے تو نخرے ہی بڑے اُونچے ہیں۔ بی بی تم بھی تو ڈلیور کی بیوی ہو۔ ہمارے ہی جیسے نوکروں کے کوارٹر میں رہتی ہو تو پھر نوکروں جیسی باتیں کرو میں ذرا زبان کی کھری ہوں۔ بڑی بات برداشت ہووے کون سی حرام کی کمائی ہے یہ۔ جمن نہ لائے گا تو دوسرے لوگ لے آئیں گے اے میں کہوں ڈلیور صاحب کو سب کچھ مل جائے تو کیا وہ چھوڑیں گے۔ سوچ لو بوا۔ اچھی طرح سوچ لو، ابھی مجھے غصہ نہیں آیا اور ایک بات اور بھی سوچ لو کہ جمن بڑے صاحب کا مُنہ لگا ہے ایک بار جو بات زبان سے نکال دیوے ہے پُوری کرا لیوے ہے۔ بڑے صاحب بھی بڑی جان چھڑکیں ہیں اس پر۔ خواہ مخواہ ڈلیور صاحب نے گڑبڑ کی تو ان کی نوکری چلی جا ئیگی ہاں۔" جمن کی ماں سامان اُٹھا کر دروازے سے باہر نکلیں تو ندرت کا پاؤں ان کے پاؤں میں اُلجھا اور وہ بڑی سی ٹرے سمیت اوندھے مُنہ زمین پر آرہیں۔

"ارے ارے خالہ جان! کیا ہوگیا؟ کیا ہو گیا؟" ندرت نے ان کے بال پکڑ کر انھیں زور سے کھڑا کر دیا اور خالہ جان کی چیخ فضا میں لہرا گئی۔ وہ چیخیں تو ندرت نے جلدی سے انھیں پھر چھوڑ دیا۔

سیدھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں سیدھی ہی سالن کے ڈونگے میں جا گریں۔ اور آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں۔

"اے خُدا غارت کرے۔ اے تیرا ستیاناس۔ ہائے موئی کلموہی۔ ہائے میری آنکھیں۔ ہائے میری آنکھیں۔" لوگ دوڑ پڑے شوکت جہاں نے پانی کے چھینٹے جمن کی ماں کی آنکھوں میں مارے صُورتحال دریافت کی گئی تو ندرت نے رُوکھے لہجے میں کہا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ خالہ جان باہر نکل رہی ہیں۔ میں نے جلدی سے دروازے سے اندر داخل ہونا چاہا تو ان کے پاؤں میرے پاؤں میں اُلجھ گئے اور یہ گر پڑیں۔ میں نے یہ سوچ کر اُٹھایا کہ کہیں چوٹ نہ لگ گئی ہو تو بدحواسی میں اُن کے بال میرے ہاتھ میں آگئے۔ اور جب یہ چیخیں تو پھر میں نے ڈر کر اُن کے بال چھوڑ دیئے اور اُن کا مُنہ سالن کے ڈونگے میں جا پڑا۔ اب مجھے بتاؤ میرا کیا قصور ہے؟"

"ہائے میرے تو پورے چہرے میں آگ لگ رہی ہے اے مرگئی۔ کچھ کرو۔ خُدا کے لئے کچھ کرو۔"

اماں بی کے کہنے پر گھی کی مالش جمن کی اماں کے چہرے پر کی گئی سالن آنکھوں میں گیا اور پورے کپڑے شوربے میں بھیگ گئے۔ بدن میں بھی جگہ جگہ مرچیں لگ رہی تھیں۔ بہرطور بمشکل تمام انھیں اُن کے گھر پہنچایا گیا۔ کھانے پینے کی چیزیں تو زمین بوس ہو ہی گئی تھیں۔ ندرت بڑی شرمساری کا مظاہرہ کر رہی تھی لیکن اماں بی شوکت جہاں اور عصمت یہ بات جانتی تھیں کہ ندرت کا پاؤں بلاوجہ ہی آگے نہیں بڑھا تھا اور جمن کی ماں زبردستی سالن میں نہیں جا گری تھیں۔ لیکن سب ہی خاموش رہے اور کسی نے اُسے کو سرزنش نہ کی۔ رات کو عصمت نے ندرت سے پُوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"نہیں باجی! میں بزرگوں کے ساتھ ایسا مذاق نہیں کرتی۔"

"ارے تو... تو مجھ سے اُڑ رہی ہے۔ تجھے میری قسم سچ سچ بتا۔" عصمت نے کہا اور ندرت شرارت آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"آپ نے کمرے میں ہونے والی گفتگو نہیں سُنی باجی جو وہ اللہ رکھی کے بارے میں کر رہی تھیں۔ خیر سے جمن میاں شاہی باورچی ہیں ڈیپ فریزر بھر لا رہے ہیں باورچی خانے سے اور وہ اب ان کے گھر میں ہے بقول اُن کے گھر بھر دیا ہے۔ باجی! کیا اس گھر کے رہنے والے اندھے ہیں جو اس باورچی کو اس طرح من مانی کا موقعہ دے رہے ہیں۔"

"تو پھر تو اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ جمن کی ماں کے ساتھ یہ سلوک تو نے ہی کیا تھا۔" عصمت بولی۔

"باجی جمن کی ماں اگر کپڑے پھاڑ کر پُوری کوٹھی میں ناچتی پھرے تو میرا نام بھی ندرت نہیں ہے۔ کیا سمجھا ہوا ہے انھوں نے آپ نے وہ تو ابا میاں نے مجھے گھونٹ کر رکھا ہوا ہے اگر ذرا سی آزادی مل جائے تو پھر تماشہ دکھاؤں آپ کو۔" ندرت دانت بھینچ کر بولی وہ عصمت ہنسنے لگی پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"دیکھ ندرت! نیا ماحول ہے نئے لوگ ہیں۔ اگر ہمارا یہ ٹھکانہ بھی چھن گیا تو ابا جی پر مصیبتیں آپڑیں گی۔"

"مگر باجی! تم دیکھنا تھوڑے دِن پہلے وہ گلہری کا بچہ دروازے کے چکر کاٹنے لگا تھا اس سے پہلے دُودھ والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی تھی اور وہ کمبخت تھوڑے ڈبے سے دُودھ دے جاتا تھا۔ وراس کے بعد یہ جمن باورچی۔ کیا ہماری تقدیریں اتنی سیاہ ہوگئی ہیں باجی۔ ایک بات ذہن نشین کر لو۔ حالات کچھ بھی ہوں کیسی بھی شکل اختیار کر جائیں میں کسی جمن تھو یا خیراتی کے گھر نہیں جاؤنگی۔ ابا جی کو اپنے ذہن سے یہ خیال نکالنا ہی پڑے گا کہ ہم دونوں ان پر بار گراں بنی ہوئی ہیں۔"

عصمت پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی تھی۔

★★

رِدا نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا گو یہ عارضی سمجھوتہ تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہاں پاؤں ٹکا کر باہر کی دُنیا کا جائزہ لے گی اور پھر اس جگہ کو خیرباد کہہ دے گی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ یہاں کے رہنے والے اچھے لوگ ہیں۔ عیش و عشرت کے گہوارے میں جھولنے والے زمانے کی اُلجھنوں سے بے نیاز۔

اس کا کمرہ ثنا کے کمرے کے برابر تھا۔ تیمور زیادہ تر ثنا کے پاس رہتا تھا۔ ثنا اُس کے لئے پاگل ہوگئی تھی۔ ڈھیروں سوٹ آگئے تھے تیمور کے اور رِدا کو شرمندگی ہوتی تھی۔

"ثنا پلیز! اتنا کچھ نہ کرو اس کے لئے۔"

"رِدا۔ یہ میرے مستقبل کی زندگی کا مالک ہے آج اسے چاہونگی تو کل یہ مجھے چاہے گا۔"

"مستقبل کی زندگی کا مالک۔"

"ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا... ؟"

"یہی کہ یہ جوان ہو جائے گا تو میں اس سے شادی کرلونگی وہ تم میری ساس بن جاؤگی۔"

"بھئی تم ثنا... تمہاری زبان کے آگے کون ٹھہرے۔" رِدا نے ندرت ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بس نہیں ہے ساس صاحبہ ... تیمور ... جو ...

ہوئے کہا۔

"کل تم اسے اپنا بیٹا کہہ رہی تھیں۔"

"زمانے نے میرے نیک جذبوں کی قدر نہیں کی میں کیا کروں۔ چنانچہ میں نے اپنا خیال بدل دیا۔" ثناء ہنستی ہوئی بولی۔ اسی وقت ایک ملازمہ نے فون کی اطلاع دی۔

"اوہ۔ ٹھیرو آؤ دیکھیں کون ہے؟" ثناء نے کہا اور اپنے کمرے میں فون سننے چلی گئی۔

"عجیب کھلنڈری لڑکی ہے بے تکان بولتی ہے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے۔" ردا نے سوچا۔ ثناء کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ثناء واپس آگئی۔

"کمینی گلوریا کا فون تھا۔ آج آ رہی ہے۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ اب مجھے اُس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کون ہے گلوریا...؟"

"میری دوست ہے۔ اندرونی علاقے گھومنے گئی تھی۔ اُس رات میں اُسے لینے ہی تو گئی تھی لیکن وعدہ کر کے نہیں آئی۔ مجھے جھوٹے وعدوں سے سخت نفرت ہے۔ خوب ناراض ہوؤں گی اُس پر۔"

"چلو معاف کر دو بے چاری کو تمہاری مہمان ہے۔" ردا نے کہا۔

"بڑی سوئٹ ہے۔ مجھے اس کی دو چیزیں بہت پسند ہیں۔"

"کیا کیا...؟"

"گہری نیلی آنکھیں اور سنہری بال۔ اُس نے بال اتنے خوبصورت سیٹ کرائے ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔ ایک ہماری دادی اماں ہیں کہتی ہیں لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح بال نہیں کٹوانے چاہئیں۔"

"میرا تو خیال ہے کہ تم لوگوں کو یہاں کافی آزادی ہے بڑے جدید لباس نظر آتے ہیں سب کے بدن پر۔"

"دادی اماں کا پیراشوٹ نہیں دیکھا۔ ردا بی بی بتاؤ یہ غرارہ پیراشوٹ ہی کی ایک شکل نہیں ہے۔ اگر کوئی غرارہ خاتون کسی جہاز سے نیچے گر پڑیں تو آسانی سے زمین پر آجائیں گی ہے ناں؟" ردا بے اختیار ہنس پڑی۔ "توبہ ہے تم سے ثناء۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے دادی اماں پر بہت غصہ آتا ہے۔ یہ جو لباس کچھ جدید ہو گئے ہیں نا۔ یہ بس انہی کی وجہ سے ہیں ورنہ دادی جان تو اس گھر کو سو سال پیچھے لے جائیں۔ اب تم دیکھو نا ردا۔ میرے بال یا تو تمہاری طرح لمبے ہوتے۔ نہ لمبے نہ چھوٹے اگر میں انھیں گلوریا اسٹائل میں کٹوا دوں تو... اوہ۔ گلوریا۔ میں اُس سے ناراض ضرور ہوں مگر کمبخت بہت اچھی لگتی ہے مجھے یقین کرو ردا۔ جیسے مغرب میں وہ پسند آئی ہے اور مشرق میں تم۔"

"میں بھی...؟" ردا نے کہا۔

"ہاں تم زمانہ قدیم کا حسن پیش کرتی ہو۔ پُرتمکنت پُروقار مونالیزا کی سی مسکراہٹ مغلئی چہرہ چغتائی آرٹ کا شاہکار اور وہ..."

"بس خدا کے لئے بس..." ردا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹھیرو انھیں بتا دو ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ ارے وہ گلوریا پھر رہ گئی اب کمبخت کے لئے کچھ اہتمام تو کرنا ہی ہوگا۔ میں ذرا ممی کو کچھ ہدایات دے آؤں۔ بس ایک منٹ۔" وہ تیمور کو سنبھالے باہر نکل گئی۔

ردا اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ معصوم اور بے باک لڑکی اندر باہر سے یکساں نظر آنے والی۔ وہ قابلِ قدر تھی۔ لیکن وہ خود...؟ ثناء کو گئے دیر ہو گئی تھی۔ ردا باہر نکل آئی۔ عموماً کمرے میں رہتی تھی ابھی وقت ہی کتنا ہوا تھا یہاں آئے ہوئے کسی سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ باہر نکلی تو سب سے پہلی ملاقات عارفہ بیگم سے ہوئی۔ عارفہ بیگم کو ایک ہی شوق تھا اِدھر اُدھر کی ٹوہ لگانے کا۔ اس ارادے سے تو اس طرف نہیں آئی تھیں لیکن ردا نظر پڑ گئی تو کہاں چھوڑنے والی تھیں۔ پہلے تو بڑے پیار سے مسکرائیں پھر ردا کے پاس پہنچ گئیں۔

"کیا کر رہی ہو بیٹی...؟"

"جی کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔"

"آؤ میں تمہیں کوٹھی دکھاؤں۔ بیٹھے بیٹھے اُوبھ گئی ہوگی باہر نکلا کرو۔ آؤ۔"

"آپ میرے کمرے میں ہی آجائیے۔ تیمور آتا ہوگا اُس کے دودھ کا وقت ہے۔"

عارفہ بیگم نے ثناء کے کمرے کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "ثناء کہاں ہے؟"

"وہ موجود نہیں ہیں اپنے کمرے میں۔"

"آؤ..." عارفہ بیگم نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ثناء اس پورے گھر کے لئے سخت خطرہ تھی اور یہاں کے بڑے لوگ صرف اس سے کانپتے تھے۔ اس وقت وہ موجود نہیں تھی اس لئے عارفہ بیگم ردا کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"سنا ہے لاہور سے آئی ہو؟"

"جی ہاں تشریف رکھئے۔"

"ثناء کی پرانی سہیلی ہوگی؟"

"نئی ہوں۔" ردا نے سادگی سے کہا۔

"کہاں میل ملاقات ہوئی؟"

"ریلوے اسٹیشن پر۔"

"کب...؟"

"پرسوں۔"

"اچھا اسی دن ملی تھیں؟"

"اکیلی آگئیں بھلا ہو رہے میاں ساتھ نہیں آئے۔"

"جی نہیں۔"

"کیا کرتے ہیں؟"

"بس اپنا کاروبار۔"

"خدا خوش رکھے یہاں کچھ رشتے دار بھی ہوں گے؟"

"جی کوئی نہیں ہے۔"

"ایں۔ کوئی نہیں ہے۔ ثناء پرانی سہیلی بھی نہیں ہے اتفاق سے مل گئی تھی پھر یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟"

"نوکری کرنے۔" ردا نے جواب دیا۔ اور عارفہ بیگم عارفانہ انداز میں اُسے دیکھنے لگیں۔ پھر اُنھوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں سمجھ گئی۔ میاں سے لڑکے آئی ہو۔"

"جی نہیں۔ میرا خیال ہے کافی انٹرویو لے چکیں آپ میرا اور کوئی خدمت میرے لئے۔" ردا کا لہجہ خشک ہو گیا تھا۔

"لے لو بولو میں کیوں انٹرویو لیتی۔ لیکن..." اُسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی اور ثناء اندر آگئی۔ اُس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن عارفہ بیگم کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

"ہیلو...!" اُس نے شرارت آمیز انداز میں عارفہ بیگم سے کہا۔

"اکیلی... اکیلی باہر گھوم رہی تھی۔ میں نے سوچا بچی کا کچھ دل ہی بہلاؤں۔" عارفہ بیگم کھسیں نکال کر بولیں۔

"خدا حافظ۔" ثناء نے کہا۔

"ہاں جا رہی ہوں۔ جا تو رہی ہوں۔ اللہ حافظ۔" عارفہ بیگم نے کہا اور جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"یہ اس چڑیا گھر کی ایک دلچسپ مخلوق ہیں لیکن ان سے ہوشیار رہنا ضروری ہے کسی بات کی پبلسٹی کرنی ہو تو ان کے سامنے کہہ دو۔ کیا باتیں کر رہی تھیں؟"

"کوئی خاص نہیں مجھ سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔"

"شام کو گلوریا آ رہی ہے اس کے بعد گھومنے پھرنے کے پروگرام بنائیں گے۔ ایک بات تو میرے ذہن میں ضرورت سے زیادہ چبھ رہی ہے ردا پوچھ لوں؟"

"پوچھ لو۔"

"لاہور سے تمہاری آمد کچھ ایسے ہی حالات میں ہوئی ہے۔ تمہارے پاس کوئی سامان بھی نہیں تھا۔"

"ہاں۔ تمہارا خیال درست ہے۔" ردا نے جواب دیا۔

"دیکھو ردا اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ چکی ہوں۔ میں نے تمہیں مہلت دیدی ہے تم سے تمہارے بارے میں پوچھنے کا ارادہ ترک نہیں کیا اور مجھ میں ایک اور خامی بھی ہے کسی کو بہت کم چاہتی ہوں لیکن جب چاہتی ہوں تو پھر صرف وہ کرتی ہوں جو میرا دل چاہتا ہے۔ ٹھیرو بے تو خیر میری زندگی وابستہ ہے لیکن تمہاری ہونے کے ناطے تمہارا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو آخر...؟"

"اپنے لباس بناؤ اور جب تک اُن کا انتظام نہیں ہو جاتا میرے کپڑے پہنو بس۔" ثناء نے کہا۔ اور خوف زدہ نگاہوں سے ردا کو دیکھنے لگی۔

"پہن لوں گی۔" ردا آہستہ سے بولی۔

"ایمان سے۔ ہائے میں کتنا ڈر رہی تھی یہ کہتے ہوئے۔"

"یہ سب کچھ... یہ سب کچھ میری ضرورت ہے ثناء۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ خود پر ملمع نہیں رکھ سکتی کیونکہ... کیونکہ اس ملمع کو نباہ نہیں سکتی۔ تمہارا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے تمہاری فطرت، اس گھر کی پُرچشمی نے مجھے سہارا دیا ہے۔ میں تمہیں بتا دوں ثناء میرے پاس چھ ہزار روپے ہیں صرف، میرا پروگرام تھا ایک ماہ ہوٹل میں رہوں گی اور کوئی ملازمت تلاش کروں گی۔ کراچی میں ایسے بہت سے اداروں کے بارے میں سنا ہے جو چھوٹے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ تیمور کو میں ایسے ہی کسی ادارے کے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ ملازمت سے واپسی پر میں تیمور کو وہاں سے لے لوں گی۔ اور پھر کسی مکان میں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہنے لگوں گی۔ اسی طرح مجھے تیمور کی پرورش کرنی ہے۔ یہی میری زندگی کا مسلک ہے اور سنو ثناء یہاں آ کر میں بہت خوش ہوں اسے تقدیر کی دین سمجھتی ہوں۔ اجنبی کراچی میں مجھے ایک ایسا گھر مل گیا جہاں چند روز رُک کر مجھے کراچی کو سمجھنے کا موقع تو ملے گا۔ کچھ خرچ بھی نہیں ہو رہا میرا۔ یہ سب کچھ میں تمہارا احسان سمجھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ کبھی یہ احسان اُتار نہیں سکتی۔ میں اس پوزیشن میں ہوں ثناء کہ ہر امداد قبول کر لوں۔ تم جو کچھ مجھے دو گی میں ضرور لے لوں گی۔"

"ہائے ردا، خدا کی قسم میرا کوئی احسان نہیں ہے تم پر۔ میں

تمھیں اپنی بہن سمجھتی ہوں۔"

"یہ تمھاری بڑائی ہے۔"

"تم نے یہ سب کچھ کیسے سوچ لیا رُدا؟"

"کیا...؟"

"ہوٹل، ملازمت، بچّوں کی دیکھ بھال کرنے والے ادارے۔ اور پھر پے اِنگ گیسٹ وغیرہ۔"

"خوب غور کیا ہے میں نے اس سلسلے میں۔"

"اتنا سب کچھ تمھیں یقین تھا کہ یہ سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق کرلوگی...؟"

"ہاں میں کرلوں گی شناء۔" رُدا نے کہا۔

"جی چاہ رہا ہے کہ تم سے لاہور کی بہت سی باتیں پُوچھوں۔ لیکن معاہدہ معاہدہ ہے۔"

"جلدی نہ کرنا اس سلسلے میں، ورنہ میں جھُوٹ بولوں گی صرف جھُوٹ۔"

"ٹھیک ہے میں جلدی نہیں کروں گی۔"

"شکریہ شناء! اس کے لئے صرف دُعائیں دے سکتی ہوں جن کی کوئی کمی نہیں ہے میرے پاس۔ مجھے اپنے کپڑے دے دو البتہ ایک درخواست ضرور کروں گی۔"

"ہاں۔ کیا...؟" شناء نے پُوچھا۔

"مجھے صرف سادہ کپڑے دینا، شوخ یا قیمتی کپڑے میں نہیں لُونگی۔" رُدا نے جواب دیا۔

"تمھارے اندازِ گفتگو میں میں نے ایک بڑی پیاری بات پائی ہے۔ کچھ کہتے ہوئے تمھارا لہجہ آخری ہوتا ہے جیسے اس کے بعد تم کچھ نہ سنوگی۔" شناء نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں شناء! شاید اب ایسا نہ ہوسکے۔" رُدا نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب...؟" شناء نے پُوچھا۔

"میرا مطلب ہے تم جیسی پیاری لڑکی اور دوست کے سامنے اب میں کوئی بات آخری بار نہیں کہہ سکتی۔" رُدا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

شام کو گلوریا آگئی۔ شناء نے سردمہری سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن گلوریا اس سے لپٹ گئی واقعی حسین خدوخال کی مالک تھی۔

"مجھے وعدہ خلافوں سے نفرت ہے۔" شناء نے کہا۔

"تمھاری سردمہری سے اندازہ ہورہا ہے۔ بس کیا بتاؤں بالکل اچانک ڈیڈی کے ایک دوست کے خاندان سے ملاقات ہوگئی وہ بھی سیاحت کے لئے آئے ہوئے ہیں اُن کی لڑکیاں وغیرہ بھی تھیں کچھ ایسی ضد کی اُنھوں نے کہ میں مجبُور ہوگئی۔"

"گھر فون نہیں کرسکتی تھیں؟"

"کیا تھا لیکن نہ جانے کون تھا فون پر، میری بات ہی نہیں سمجھ سکا کچھ اوٹ پٹانگ اس نے بکا کچھ میں نے اور پھر فون بند کردیا گیا۔" گلوریا نے جواب دیا۔

"یہ رُدا ہیں۔"

"ریڈا۔ ہیلو۔" گلوریا نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ یہ ردا ہیں اور رُدا رہیں گی تم انھیں ریڈا نہیں بناؤگی۔ اگر صحیح نام لے سکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ خبردار جو کبھی نام بھی لیا۔"

"بہت خوبصورت ہیں یہ بالکل ایسٹرن پرنسس کی مانند۔"

"چلو اس بات پر میں خوش ہوگئی اور تمھیں معاف کردیا۔ رُدا میں نے گلوریا کے بارے میں کیا کہا تھا۔"

"ہاں ہی کیا یہ تو مکمل حسین ہیں۔" رُدا نے شستہ انگریزی میں کہا اور شناء ایک لمحے کے لئے چونک پڑی گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اور شناء کو اس لئے ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ رُدا انگریزی جانتی ہے کہ نہیں۔ لیکن اب جو اس نے رُدا کی بات اور اس کا انگریزی کا لہجہ سُنا تو حیران رہ گئی۔

گلوریا کی آمد کی وجہ سے کچھ خصُوصی اہتمام کئے گئے تھے۔ اُس کی پسند کے مشرقی کھانے پکائے گئے تھے۔ رات کو شناء نے رُدا سے خصُوصی طور پر کہا کہ وہ ڈنر میں شریک ہو۔

"سب لوگوں کے ساتھ...؟" رُدا آہستہ سے بولی۔

"کون سب لوگ، امّی ہوں گی ابّو ہوں گے۔ کچھ لڑکیاں ہونگی اور میں۔"

"تم کہہ رہی ہو تو ٹھیک ہے۔"

"شکریہ رُدا! اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اب تم یہ اجنبیت توڑ دو رُدا۔ تم ہم میں سے ایک ہو۔ یہاں کے ماحول میں تمھیں کوئی گھٹن نہیں ہوگی یہ بس ابتدائی حجاب ہے۔ جب تک خود کو لئے دیئے رکھوگی قائم رہے گا۔"

"ہاں۔" رُدا نے کہا۔ دِل میں اُس نے سوچا تھا کہ اچھے لوگو میرا تم پر کیا حق ہے تم میری منزل کی ابتداء کے ساتھی ہو۔ تمھارے خلوص نے مجھے دربدری سے بچا لیا ہے۔ لیکن میں تمھاری اس شرافت سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھاؤں گی۔

شناء احمق نہیں تھی۔ کھلنڈری اور بے باک ضرور تھی عُمر کے لحاظ سے عقل تھی رُدا کے اندر اس نے ایک انوکھا رکھ رکھاؤ ایک انوکھی تمکنت پائی تھی وہ جانتی تھی کہ رُدا ضرورت سے زیادہ عنایات قبُول نہیں کرے گی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ رُدا ڈِنر کے لئے نئے کپڑے قبُول کرے لیکن ہمت نہیں پڑی تھی۔ ویسے جو سادہ کپڑے اُس نے پسند کئے تھے اُن میں بھی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ کھانے کی میز پر گلوریا چہک رہی تھی اور پاکستان کے اندرُونی علاقوں کے حُسن کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہی تھی۔ ابّو ابھی نہیں آئے تھے امّاں بی ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے چہرے دیکھ رہی تھیں ملازمین کھانا لگا رہے تھے۔

دوسری چند لڑکیاں جو اسی کوٹھی میں رہتی تھیں رشک بھری نگاہوں سے کبھی رُدا کو اور کبھی گلوریا کو دیکھ رہی تھیں گلوریا اگر مغربی حُسن کا نمونہ تھی اور یورپ کی نمائندگی کرتی تھی تو رُدا کو مشرقی سحر سے بھرپُور کہا جاسکتا تھا اس کے لانبے لانبے گھنے بالوں کی موٹی سی چوٹی پنڈلیوں تک آتی تھی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں ایسی انوکھی کشش تھی کہ ایک بار جس کی جانب اُٹھ جائیں وہ سحرزدہ ہو جائے۔ چہرے کی بناوٹ میں درحقیقت مغلئی آرٹ جھلکتا تھا اس طرح سے اس کے پُورے وجُود میں کشش تھی۔

حسین شناء بھی تھی لیکن اس کے چہرے میں ایک شوخی ایک کھلنڈراپن پایا جاتا تھا دادی امّاں کی نگاہیں خاص طور سے کئی بار رُدا کی طرف اُٹھی تھیں تیمُور کو اس وقت گھر کی ایک ملازمہ کی تحویل میں دے دیا تھا اور شناء نے اسے ہدایات دے دی تھیں کہ اس کے ہیرو کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

تھوڑی دیر میں احسان صاحب کمرے میں داخل ہوئے لیکن اُن کے عقب میں شہاب صاحب بھی تھے۔ ڈِنر سُوٹ میں ملبوس نفیس ترین تراش کے لباس میں شہاب کی شخصیت نکھری ہوئی تھی بڑے باقاعدہ آدمی معلوم ہوتے تھے حالانکہ گھر کے ماحول میں تکلف نہیں ہوتا لیکن وہ ہمیشہ گھر کے ڈِنر میں بھی ڈِنر سُوٹ پہن کر ہی آتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوکر انھوں نے بڑی بے تکلفی سے ہیلو گلوریا کہا۔ اور پھر سب پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے میز کی جانب بڑھ گئے لیکن جب اُن کی نگاہ رُدا پر پہنچی تو وہ ایک لمحے کے لئے رُکے تھے اور پھر وہ چالاکی سے خود کو سنبھال کر کرسی گھسیٹ کر آبیٹھے تھے احسان صاحب نے گلوریا کی خیریت پُوچھی اور پھر اُنھوں نے بھی رُدا کو دیکھا ایک لمحے کو دیکھتے رہے اور پھر شناء سے بولے۔

"شناء! یہ کون ہیں؟"

"رُدا ہیں ابّو میری دو۔ ہے جانے کا پروگرام طے پایا تھا۔

"پہلی بار دیکھا ہے اس۔ تھا اس لئے شناء جمن کو خصُوصی

توہیں؟ انے میں پہنچ گئی۔

"جی۔" رُدا نے آہستہ سے جواب ہے ہیں دو گھنٹے کے اندر اندر

کی شخصیت میں کچھ ایسی ہی بات نظر آئی رہے پر نیازمندی کے آثار

"کراچی ہی میں رہتی ہو بیٹے۔"

"جی ابّو۔ نہ صرف کراچی میں۔ بلکہ ہمارے نا ہے دو گھنٹے کیا ڈیڑھ

"اوہ۔ اچھا۔ بھئی کیا بتائیں رُدا بیٹے۔"

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کبھی آگئے تو لوگوں سے تعارف ہو کر کھانے معلوم ہوگئیں ورنہ اس کاروبار کو چلانے کے لئے ہماری ڈیوٹی دی گئی ہے کہ جاؤ اور دولت کماؤ۔" احسان صاحب نے کہا اور پھر کھانے میں مصرُوف ہوگئے۔ شناء کی نگاہیں بار بار شہاب کی طرف اُٹھ جاتی تھیں اور اُس کی آنکھوں میں کینہ پروری کے تاثرات نظر آنے لگتے تھے۔ شہاب صاحب نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا جب سے اُسے پولیس کی دھمکی دے کر بھاگے تھے گھر میں نہیں گھُسے تھے یا اگر گھُسے تھے تو شناء کے سامنے نہیں آئے تھے شاید انھیں بتا دیا گیا تھا کہ شناء اُن کے انتقام میں پاگل ہورہی ہے۔

شہاب صاحب احمق آدمی نہیں تھے رُدا کو دیکھ کر ان کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے لیکن کھانے کی میز پر وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ مصنوعی طور پر رُدا کی طرف متوجہ ہیں البتہ دِل ہی دِل میں انھوں نے رُدا کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔

کھانا خاموشی سے جاری رہا اور اس کے بعد احسان صاحب نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"بھئی ہم اجازت چاہتے ہیں اور ہاں شناء! ہماری رُدا بیٹی کو ہمارے گھر میں کوئی تکلیف ہوئی تو اس کا حساب ہم تم سے لیں گے اس بچّی سے کبھی تفصیلی تعارف حاصل کرلیں گے لیکن یُوں سمجھ لو کہ یہ ہمارے دل کو بھاگئی ہے۔" یہ کہہ کر احسان صاحب باہر نکل گئے۔

کھانے کے بعد کافی کا دَور ضرور چلتا تھا لیکن احسان صاحب کافی نہیں پیتے تھے کوئی بھی کھانے کی میز سے نہ ہٹا ملازموں نے البتہ برتن اُٹھانے شروع کردیئے تھے۔

شناء کو موقعہ مل گیا اور اس نے شہاب صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اس بات کو ذہن نشین کرلیجئے انکل کہ آپ کی وہ حرکت آپ پر قرض ہے میں اس کا بدلہ لئے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔"

تمھیں اپنی بہن سمجھتی ہوں۔"

"یہ تمھاری بڑائی ہے ۔ ۔ی ہو ہم تو بھول ہی گئے ۔ ۔"

"تم نے یہ سب کچھ کیسے سوچ ۔چ لیجئے اچھی طرح غور کر لیجئے۔ میرا

کیا ۔ ۔ ۔؟"

"ہوٹل، ملازمت، بچوں"

پھر پے انگ گیسٹ وغیر ۔ال دیں تو" شہاب صاحب نے کہا۔

"خوب غور کیا۔ پ کو بہت کچھ کرنا ہوگا۔"

"اتنا سب ۔ی جا سکتی ہے۔ کیوں اماں بی" انھوں نے ۔یکھ کر کہا۔

کرلوگی ۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ں جانو۔ مجھے کیوں بیچ میں گھسیٹ رہے ہو" دادی اماں ۔ب دیا۔

"چلو ٹھیک ہے، تو بھئی ہمیں اپنی حرکت کا کیا معاوضہ ادا کرنا ہوگا مس ثناء احسان" شہاب صاحب نے پوچھا۔

"آپ نے جس بات پر مجھے بلیک میل کیا تھا اب اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، میں باقاعدہ ڈرائیونگ سیکھنا چاہتی ہوں اور اس کا انتظام آپ کو کرنا ہوگا۔"

"اگر بھابی جان اور اماں بی اجازت دے دیں تو بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہاں بہت سے ڈرائیونگ اسکول ہیں۔ جن میں لیڈی انسٹرکٹر ہوتی ہیں۔ سینکڑوں لڑکیاں ڈرائیونگ سیکھ رہی ہیں اب باقی معاملات آپ کی امی جان اور دادی پر ہیں۔"

"بیٹا! سینکڑوں لڑکیاں کاریں چلا رہی ہیں کراچی کی سڑکوں پر کیا حرج ہے۔ مگر احسان کی بیٹی کو ذرا منفرد ہی ہونا چاہئیے۔ بجائے کار چلانے کے اگر یہ سڑکوں پر گھوڑے دوڑائے تو کیا حرج ہے۔ تم یوں کرو بیٹا اسے ایک گھوڑا خرید دو ذرا اُونچا سا عُمدہ سا ۔ ۔ ۔ اور چھوڑ دو کراچی کی سڑکوں پر۔ اے میں کہتی ہوں تم لوگ فیشن کی زد میں آکر کیا دیوانے ہوگئے ہو۔ لڑکیاں کاریں چلاتی پھر رہی ہیں گی اور لڑکے اُن کے پیچھے کاریں دوڑاتے پھر رہے گے میں کہتی ہوں یہ ماحول ہے یہاں کا ۔ ۔ ۔ مجھ بوڑھی کو باہر نکلتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"ارے ارے دادی اماں۔ اب ایسا بھی کیا آپ خواہ مخواہ غلط فہمیوں کا شکار ہو رہی ہیں" ثناء نے کہا اور ہنسنے لگی۔

"دیکھ لڑکی! میں ذرا مختلف ہوں لاڈلی ہوگی تو اپنے باوا کی۔ مجھ سے مُنہ مت لڑانا۔"

"توبہ توبہ دادی اماں۔ آپ سے مُنہ لڑا کر کیا مجھے جہنم میں جانا ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ آپ دیکھیئے نا آخر وہ بھی تو لڑکیاں ہی ہیں جو کاریں چلاتی ہیں۔"

"ہاں بی بی! چلاتی ہیں اور حادثے بھی خوب کرتی ہیں۔"

"جی نہیں۔ اخبارات میں روزانہ سینکڑوں حادثوں کی خبریں چھپتی ہیں ذرا مجھے بتائیے کبھی کسی لڑکی نے ایکسیڈنٹ کیا ہے دراصل لوگ خود ہی خیال کر لیتے ہیں کہ محترمہ کار چلا رہی ہیں ذرا احتیاط رکھی جائے۔"

"اے میں کہتی ہوں جو بیچاریاں مجبوراً گاڑیاں سڑکوں پر لے کر نکل آئی ہیں تمھارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے ڈرائیور رکھوا دیا۔ شان سے پیچھے بیٹھ کر سفر کرو کیا مصیبت پڑی ہے تم پر کہ کاریں دوڑاؤ۔"

"جی نہیں۔ ہر جگہ ڈرائیور کو ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ میں اب اس سلسلے میں ابو سے بات کروں گی۔"

"دیکھوں تو سہی کیسے اجازت دیتا ہے احسان تجھے۔ آخر میری بھی کوئی حیثیت ہے یہاں۔ تو گاڑی نہیں چلائے گی۔"

ثناء کو بھی غصہ آگیا وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کہنے لگی۔

"آپ لوگ غور کر لیجئے۔ مجھ پر جہاں بھی پابندی عائد کی جاتی ہے وہاں میں بغاوت کرتی ہوں اور یہ اعلانِ بغاوت آج اس کمرے میں کر کے یہاں سے جا رہی ہوں اُٹھو ردا۔"

"کافی تو پی لو" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"جی نہیں۔ کافی میں اپنے کمرے میں پیوں گی۔ مجھے بہت سی پلاننگ کرنی ہے" ثناء نے کہا اور ردا اور گلوریا کو ساتھ لیکر نکل گئی۔

تین پیالی کافی کوٹھی کے پائیں باغ میں پہنچا دی گئی تھی۔ سنگِ مرمر کی نشست پر بیٹھ کر تینوں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ گلوریا نے ردا کے بارے میں پوچھا۔

"ثناء! ان سے تفصیلی تعارف نہیں ہوا؟"

"یہ خاتون میری بہت ہی عزیز دوست ہیں لاہور سے تشریف لائی ہیں ان کے ہمراہ میری زندگی کا مالک میرا سب کچھ۔ میرا سرتاج بھی ہے۔ ارے ہاں! میرا امیر کہاں ہے؟ اے فریدہ۔ اِدھر آؤ" اس نے تھوڑے فاصلے پر گزرتی ہوئی ایک ملازمہ کو آواز دی اور ملازمہ جلدی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔

"حسینہ کے پاس تیمور ہوگا اُسے یہاں لے آؤ" ثناء نے ہدایت کی اور ملازمہ دوڑ گئی۔ تب ثناء گلوریا کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"ہاں بھئی! یہ بتاؤ کراچی کی سیر کا کیا پروگرام ہے تمھارا؟"

"جس طرح تم پسند کرو۔"

"ردا بھی پہلی بار کراچی آئی ہیں۔ اور کراچی کے چپے چپے کا معائنہ کیا جائیے گا۔ اور وہ ڈرائیور۔ ارے ہاں اس کم بخت پر بھی تو میرا حساب باقی ہے۔ ٹھیک ہے کل نمٹ لوں گی" ثناء کو ڈرائیور یاد آگیا تھا جس نے یقیناً شہاب صاحب کو یہ بات بتائی تھی کہ ثناء نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک بوڑھے کو ٹکر مار دی تھی۔ ثناء کا ذہن کچھ اس قسم کا تھا بھولتی تو بھول جاتی اور اگر یاد رہتا تو پھر جان کے پیچھے پڑ جاتی تھی۔

بہر طور دوسرے دن کا پروگرام طے ہوگیا تھا کافی پینے کے بعد گلوریا نے کہا۔

"بھئی۔ آج میں زیادہ دیر تک تمھارا ساتھ نہیں دے سکوں گی ثناء۔ ٹرین کے سفر میں مزا تو آتا ہے لیکن تکلیف بہت ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تیمور سے مل لو اس کے بعد چلی جانا" تھوڑی دیر کے بعد ملازمہ تیمور کو گود میں لئے ہوئے اُن کے قریب پہنچ گئی۔ حسین بچے کو دیکھ کر گلوریا کو بھی بہت خوشی ہوئی تھی۔

"کون ہے یہ ۔ ۔ ۔؟ کتنا سوئٹ ہے" اس نے تیمور کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ردا کا بیٹا ہے" ثناء نے جواب دیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ اس کا مقصد ہے کہ ردا شادی شدہ ہیں۔ میں تو اب تک انھیں یونہی سمجھتی تھی۔ تیمور کے فادر کہاں ہیں کیا نام ہے اُن کا ۔ ۔؟"

"وہ لاہور میں ہیں اور مصروف آدمی ہیں" ثناء نے فوراً ہی بات بنا دی۔

"ردا کے ساتھ نہیں آئے" گلوریا نے پوچھا۔ ردا کا تلفظ اب وہ صحیح ادا کرنے لگی تھی اور شاید اس دوران میں مشق کرتی رہی تھی۔

"ہاں۔ میں نے کہا نا مصروفیت کی وجہ سے وہ ساتھ نہیں آئے" ثناء نے جواب دیا۔

مزید کچھ دیر بیٹھنے کے بعد تینوں وہاں سے اُٹھ گئیں ثناء تیمور کو گود میں لئے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ پھر اُس نے ردا سے کہا۔

شاید تم بھی کچھ تکلف محسوس کر رہی ہو ردا۔ آرام کرو۔ اسے میں اپنے پاس ہی سلا لوں۔"

"اگر سو جائے تو ضرور سلا لو" ردا مسکرا کر بولی۔

"ٹرائی کرتی ہوں اگر گڑبڑ کی تو پھر تمھارے حوالے کر دونگی۔" ثناء اپنے کمرے میں چلی گئی اور ردا اپنے کمرے میں آگئی۔

دوسرے دن ہاکس بے جانے کا پروگرام طے پایا تھا۔ دوپہر کا کھانا چونکہ وہیں کھانا تھا اس لئے ثناء، جمن کو خصوصی ہدایات دینے کے لئے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔

"جمن ہم لوگ پکنک پر جا رہے ہیں دو گھنٹے کے اندر اندر ہمیں بہترین کھانا چاہئیے" جمن کے چہرے پر نیاز مندی کے آثار اُبھر آئے اس نے بڑی مستعدی سے کہا۔

"بی بی۔ آپ حکم تو دیجئے کیا کیا لے جانا ہے دو گھنٹے کیا ڈیڑھ گھنٹے میں پکا کر رکھ دوں گا جمن ہے میرا نام۔"

"تو پھر نوٹ کر لو" ثناء نے کہا اور اسے دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے لگی جمن نے تمام ہدایات سُننے کے بعد کہا۔

"وہ بی بی جی! آپ سے ایک کام تھا۔"

"مجھ سے ۔ ۔"

"جی بی بی جی۔"

"کیا پیسے چاہئیں؟"

"نہیں چھوٹی بی بی۔ آپ کا ہی دیا کھاتا ہوں خدا کے فضل سے صاحب ہی مجھے اتنا دے دیتے ہیں کہ پیسوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"جی پوری زندگی کا سوال ہے" جمن نے مسمسی سی شکل بناتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے کیا ہوگیا تیری زندگی کو اچھا خاصا ہٹا کٹا تو ہے۔"

"جی ہٹا کٹا ہوں۔ مگر اب بڑا ہوگیا ہوں۔"

"اچھا۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ تو بڑا ہوگیا ہے" ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہوگیا ہوں نا بی بی، اب میرا کام کرا ہی دیں" وہ بولا۔

"تیرا کام تمام تو کرایا جا سکتا ہے باقی کیا کام ہے یہ مجھے نہیں معلوم" ثناء بولی۔

"شادی کرنی ہے جی۔"

"ایں" ثناء اُچھل پڑی "تجھے ۔ ۔ ۔؟"

"ہاں بی بی۔ ہر شخص ہی کرتا ہے میں کون سی نئی بات کہہ رہا ہوں۔"

"تو کر لے بھائی! میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں تو جو کچھ مجھ سے چاہے گا وہ میں کر دوں گی تو اطمینان رکھ۔"

"وعدہ کرتی ہیں بی بی جی۔"

"ہاں۔"

"تو پھر دادی اماں کو تیار کر لیجئے۔ میرا کون ہے اس دُنیا میں آپ لوگوں کے سوا۔"

"ارے ارے۔ اپنے ماں باپ کو کیوں کوس رہا ہے۔" ثناء بولی۔

"کوس نہیں رہا جی۔ مگر دادی اماں کی اجازت کے بغیر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے اس کوٹھی میں وہی ہو سکتا ہے جس کی اجازت دادی اماں دے دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دادی اماں سے تجھے اس کی اجازت دلوا دُونگی۔"

"صرف اجازت ہی نہیں بی بی جی۔ بلکہ کچھ اور کام بھی ہے۔"

"اب مُنہ سے پھُوٹ لے ورنہ پھر میرا پارا چڑھ جائے گا۔ جو بکنا ہے جلدی بک دے مجھے دیر ہو رہی ہے تیاریاں کرنی ہیں۔"

"وہ جی ڈبلیو ر صاحب کے گھر جانا ہے اُن سے بات کرنی ہے۔"

"ڈبلیو ر صاحب۔ یہ کیا چیز ہیں؟"

"وہ جی غلام احمد صاحب جو ہیں اُن کی بیٹی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہوں۔ تو گُل کھلائے جا رہے ہیں۔"

"نہیں جی، اللہ قسم کوئی گُل وُل نہیں کھلا۔ بس اماں کہہ رہی تھی کہ وہ بڑی خوبصورت لڑکی ہے تو بی بی اُنہیں تیار کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ اماں کہہ رہی تھی کہ بات کر لینا بڑے صاحب سے۔ مگر بی بی جی! میں تو آپ کا خادم ہوں نا آپ مجھ پر عنایتیں کرتی رہتی ہیں۔" جمن لجائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اچھا۔ اچھا مکھن مت لگا ڈبلیو ر غلام احمد کی لڑکی۔ مگر وہ۔۔"

"یہیں تو رہتی ہیں جی۔ دو نمبر میں۔"

"ارے ہاں۔ سُنا تو تھا کہ غلام احمد کی فیملی ہمارے گھر میں ہی آ گئی ہے۔ کبھی ملی نہیں ہوں میں اُن لوگوں سے لڑکی واقعی خوب صُورت ہے؟"

"میں نے نہیں دیکھا جی۔۔۔"

"اچھا۔ اچھا چل ٹھیک ہے آج شام کو ہی اس سلسلے میں کچھ کارروائی کی جائے گی مگر ایک شرط ہے کہ کھانا اتنا اچھا ہونا چاہئے کہ گلوریا کو مزا آ جائے۔ سمجھ گئے۔"

"یہ بات طے ہو گئی بی بی جی۔ ایسا ہی ہو گا۔" جمن نے خوش ہو کر کہا اور ثناء باہر نکل گئی۔

بینڈ رووَر میں آٹھ لڑکیاں تھیں اور ایک بزرگ خاتون جنھیں دادی اماں کی طرف سے خصُوصی ہدایات دی گئی تھیں بچیوں کو پانی میں نہ جانے دیا جائے ایک ایک لمحہ ان کی نگرانی کی جائے وغیرہ۔ لیکن ثناء کو سمندر سے عشق تھا۔ بھلا سمندر کے کنارے جا کر پانی سے دُور کیسے رہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان بزرگ خاتون کے لئے اس نے معقول بندوبست کر لیا تھا۔ قسمت کے مارے خان محمد کو بھی اس پکنک کے لئے مخصُوص کیا گیا تھا۔ ثناء بھی یہی چاہتی تھی بہرحال لینڈ رووَر فاصلے طے کرتی ہوئی بالآخر گل بائی تک پہنچ گئی ثناء اس دوران تیمور کو گود میں بٹھائے کبھی اس سے اور کبھی دوسرے لوگوں سے باتیں کرتی رہی تھی۔ گل بائی سے کچھ آگے نکل کر اس نے خان محمد سے کہا۔

"خان محمد گاڑی کنارے لگا دو۔"

"اچھا جی۔" خان محمد نے تعمیل کی۔

"چلو پیچھے جاؤ۔"

"آپ۔۔۔ آپ چلائیں گی۔۔۔" خان محمد گھبرا کر بولا۔

"سُنا نہیں تم نے۔" ثناء غرّائی اور خان محمد جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے اُتر گیا۔ رِدا مسکرا رہی تھی۔

"یہ انتہا پسند ہے۔" گلوریا نے رِدا کے کان میں کہا۔ ثناء نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ خان محمد پیچھے سے بولا۔

"ثناء بی بی! مجھے آگے بٹھا لیں۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ تو مصیبت بن جائے گی۔"

"تم میری بات کا جواب دو۔ اس رات جب ہم سٹی اسٹیشن جا رہے تھے اور ایک بُوڑھا سامنے آ گیا تھا یاد ہے نا۔۔۔"

"جی!"

"انکل شہاب کو اس بارے میں کس نے بتایا تھا؟"

"جی وہ۔۔۔ اُنھوں نے۔۔۔ اُنھوں نے کہیں دیکھ لیا تھا۔" خان محمد کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

"صرف سچ بولو خان محمد۔ جھُوٹ کی سزا الگ دُوں گی۔" ثناء نے بدستُور غرّاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی وہ۔۔۔ اُنھوں نے کچھ ایسے پُوچھا تھا مجھ سے، جیسے اُنھیں اس کے بارے میں پہلے سے معلوم ہُو میں نے یہی سمجھا تھا بی بی، ورنہ میں آپ کے خلاف زبان نہ کھولتا۔" خان محمد نے کہا۔

"بکواس کرتے ہو، وہ اتنے ذہین کہاں سے ہو گئے۔ تم نے اگر انھیں یہ بتا دیا تھا کہ میں نے گاڑی چلائی ہے تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے کسی بُوڑھے آدمی کو ٹکر بھی ماری تھی۔ یہ بتاؤ اس راز کو کھولنے کی قیمت کیا ملی تھی تمھیں؟"

"جی بی بی آپ۔۔۔ آپ۔۔۔!"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" ثناء نے جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔

خان محمد کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اُسے خدشہ تھا کہ کہیں لینڈ رووَر کسی نئی بس وغیرہ سے ٹکرا نہ جائے، سڑک پتلی تھی اور راستہ خطرناک۔ لیکن ثناء اپنے طور پر گاڑی چلانے کی خاصی مشق کر چکی تھی۔ بس اتنا سا فرق تھا کہ وہ پوری طرح مشاق نہیں ہو سکی تھی ٹول ٹیکس پر پہنچنے کے بعد اُس نے گاڑی روکی اور ٹیکس کی پرچی لے کر ایک بار پھر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ تقریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد اُس نے گاڑی روک دی۔

"خان محمد اِدھر آؤ۔" اُس نے کہا اور خان محمد جلدی سے دروازہ کھول کر اُس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"یہاں سے ہوکس بے تک کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں ہے اور میں تمھارے ساتھ صرف اتنی رعایت کر سکتی ہوں کہ اس سزا پر بات ختم کر دُوں۔ خبردار یہاں سے واپسی کی کوشش تمھارے لئے جس قدر خطرناک ہو سکتی ہے، تم جانتے ہو۔ پیدل وہاں تک پہنچو، ہمارا ہٹ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے سیدھے وہیں آ جانا۔"

"جی وہ ثناء بی بی خُدا کی قسم میرے پاؤں میں تکلیف ہے۔ مر جاؤں گا۔"

"اور تم نے جو تکلیف مجھے پہنچائی ہے اُس کا کیا حساب ہو گا۔" ثناء نے کہا اور گاڑی گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی خان محمد چیختا رہ گیا تھا۔ لیکن ثناء ان چیخوں سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ رِدا نے خان محمد کی سفارش کی۔

"ارے ثناء نہیں، پلیز نہیں، پتہ نہیں کتنا فاصلہ ہے۔ کیسے پہنچے گا وہاں۔۔۔؟"

"ارے رِدا تم نہیں جانتیں، اس شخص نے مصیبت کر دی تھی میرے لئے اگر سچ مچ پولیس آ گئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ بھلا یہ بات انکل شہاب سے کہنے کی تھی۔" ثناء نے جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔ دوسرے لوگ ہنستے رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سب سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔

یہاں احسان صاحب کا اپنا خوبصورت ہٹ موجود تھا۔ جس میں تمام سامان بار کیا گیا۔ رشتے دار لڑکیاں وہ تھیں جو ثناء سے کسی قدر بے تکلف تھیں اور ثناء انھیں اپنے ساتھ شامل کر لیا کرتی تھی، لیکن اُن کی بے تکلفی اتنی نہیں تھی کہ وہ کسی طور ثناء کے مُنہ لگنے کی کوشش کرتیں۔

تھوڑی دیر تک وہ کنارے پر چہل قدمی کرتی رہیں سمندر کی شائق لڑکی بھلا سمندر سے دُور کیسے رہ سکتی تھی اُس نے ثناء سے کہا تو ثناء اپنے ہاتھ کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا ہمیں۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"ہر بات کا مطلب بتایا نہیں جاتا، بس تھوڑا سا انتظار کرو۔"

کنارے پر چہل قدمی کرتے ہوئے وہ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہٹ پر پہنچ گئیں، نگران خاتون مسلسل اُن پر نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔ اور انھیں ثناء سے یہ شکایت نہیں ہوئی تھی کہ اُس نے پانی میں پاؤں بھی رکھا ہے۔

"چائے کا دور چلے گا۔" ثناء نے کہا اور فوراً ہی چائے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ثناء نے اپنے ہاتھ سے اپنی نگران خاتون کو چائے پیش کی اور وہ مزے لے کر چائے پینے لگیں لیکن ابھی شاید چائے کی پیالی پُوری ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھیں چکر آنے لگے اور اُنھوں نے پیالی زمین پر رکھ دی۔

"مجھے۔۔۔ مجھے چکر آ رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، آپ آرام سے لیٹ جائیے۔"

"مگر نجانے کیوں۔ نجانے کیوں۔" خاتون نے کہا اور اس کے بعد وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں، اُن کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک رشتہ دار لڑکی نے اس سلسلے میں سوال کیا تو ثناء نے کہا۔

"اِن کا سونا ضروری تھا۔ میں نے ان کی چائے میں خواب آور گولیوں کا سفوف اچھی خاصی مقدار میں ملا دیا تھا۔ تاکہ یہ ہماری۔۔ تفریحات میں مخل نہ ہو سکیں۔" ثناء نے جواب دیا۔

بزرگ خاتون تھوڑی دیر کے بعد ہی انٹا غفیل ہو گئیں اور اس کے بعد ساحل سمندر پر وہ دھما چوکڑی مچی کہ خُدا کی پناہ، صرف ایک رِدا تھی جو تھوڑے سے پانی میں ثناء کے ساتھ گئی تھی۔ اور اس کے بعد اس نے انتہائی عاجزی سے معذرت کی تھی کہ چونکہ وہ سمندر سے واقف نہیں ہے۔ اس لئے اُسے مجبُور نہ کیا جائے۔ البتہ ثناء نے تیمور کو نہیں چھوڑا تھا۔۔۔ وہ اُسے پانی میں اپنے ساتھ شامل کئے رہی تھی اور تیمور بھی سمندر سے ایسا خوش ہُوا کہ اس کی قلقاریاں فضا میں گونجتی رہیں۔ خان محمد مصیبت کا مارا دو گھنٹے میں پہنچا تھا اور ہٹ کے کنارے بیٹھ کر ہانپنے لگا تھا، وہ بُری طرح تھک گیا تھا اور اُس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ کسی سے کچھ کہہ سکے۔

تھوڑی دیر تک سمندر میں نہانے کے بعد کھانے کا پروگرام بنا۔ جمن نے واقعی کمال کیا تھا۔ ثناء نے خان محمد کو کھانا دیتے ہوئے کہا۔

"اگر چاہو تو اس بات کی شکایت بھی کسی سے کر سکتے ہو۔ لیکن اس کے بعد بات یہیں ختم نہیں ہو جائے گی۔"

"ارے مجھے کیا پڑی ہے بی بی! کسی کی شکایت کرنے کی۔ آپ جانیں اور آپ کا کام۔ مجھے تو اُوپر سے جو ہدایات ملی ہیں اُنہیں پر عمل کرتا ہوں۔ آپ بھی مالک ہیں" خان محمد تھکن سے چُور تھا اور بُری طرح بیزار ہو رہا تھا۔

نگران خاتون بڑے اطمینان سے سو رہی تھیں، رَدا نے آہستہ سے کہا۔

"شناء! ان بے چاری کو تو کھانا بھی نہیں ملے گا۔"

"اللہ کی مرضی، جس کی تقدیر میں نہیں ہے اُس کے لئے کوئی کیا کر سکتا ہے" شناء نے کہا۔ چار بجے کے قریب بڑی بی کو ہوش آیا تھا۔ لیکن اس وقت تک لڑکیاں اپنے لباس وغیرہ خشک کر کے اطمینان سے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔"

"اے مجھے کیا ہُوا تھا؟ کیسی کم بخت نیند آئی۔ خدا غارت کرے اِس نیند کو" نگران خاتون نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ تو ہماری نگرانی کرنے آئی تھیں، تائی امّاں یہاں آکر آرام سے سوگئیں۔"

"اے بی بی! پیٹ میں چُوہے دوڑ رہے ہیں۔ تم لوگوں نے کھانا وغیرہ کھالیا کیا...؟"

"اتنا جگایا آپ کو۔ لیکن یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو آج طویل عرصے کے بعد گہری نیند نصیب ہوئی ہو۔ چلو انھیں کھانا دو۔" شناء نے ایک ساتھی لڑکی سے کہا اور نگران خاتون کے سامنے کھانا پیش کر دیا گیا، بہترین تفریح رہی تھی، رَدا بھی سمندر کے کنارے آکر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ پھر واپسی کا پروگرام بن گیا۔ جلدی جلدی تیاریاں کی گئیں۔ اس بار شناء نے ڈرائیونگ نہیں سنبھالی تھی چونکہ شام کا وقت تھا اور سڑکوں پر خاصا رش ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ سمندر کی تھکن بھی مانع تھی چنانچہ اس نے خان محمد کو پریشان نہیں کیا۔

سب لوگ کوٹھی واپس پہنچ گئے ذکیہ بیگم اور زیب النساء بیگم ان سب کی منتظر تھیں۔ نگران خاتون نے انھیں بتایا کہ کسی قسم کی کوئی حرکت نہیں کی گئی۔ بہر طور بچیوں کی واپسی سے وہ خوش نظر آ رہی تھیں اس وقت شام کے تقریباً سات بجے تھے کہ جمّن گردن جُھکائے شناء کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک پر شناء نے دروازہ کھولا اور جمّن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔"

"وہ بی بی جی۔ وعدہ یاد دلانے آیا ہوں۔"

"ارے.... اوہ... اچھا۔ تجھ پر تو واقعی شادی کا بھوت سوار ہوگیا ہے۔"

"بس بی بی جی آپ ہی یہ کام کرا سکتی ہیں۔ ورنہ غریب کی اوقات کیا..."

"دوسروں سے بھی پُوچھ لیا ہے۔"

"امّاں سے میں نے کہا تھا کہ شناء بی بی ہماری مدد کیلئے تیار ہوگئی ہیں۔ بس آپ مل لیں جی اُن سے سارا کام بن جائے گا" جمّن نے عاجزی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ذرا ابھی تیار ہو جاؤں پھر جاؤں گی وہاں" شناء نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے رَدا کو آواز دی اور تیمور کو گود میں لے کر غلام احمد کے کوارٹر کی جانب چل پڑی جہاں پہلے سے ایک آفت موجود تھی اور اس کے بعد یقینی طور پر کچھ نئے گل کھلنے والے تھے۔

جمّن نے خود بھی دونوں بیبیوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے پہلے سے آکر ماں کو بتا دیا تھا کہ شناء بی بی لڑکی دیکھنے آ رہی ہیں وہ خود ہی اللہ رکھی کی ماں سے بات بھی کریں گی۔ جمّن کی ماں خوش ہوگئی تھی۔ حالانکہ ایک تجربہ غلط ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کافی جلن ہوتی رہی تھی اس کے علاوہ شوکت جہاں نے بھی خُوب کھری کھری سُنائی تھیں۔ لیکن جمّن کی ماں کو ضد ہوگئی تھی۔ سمجھتی کیا ہیں خود کو۔ ان سب مالکوں کا کہا ٹال کر دیکھیں ڈرائیور صاحب کی نوکری بھی چلی جائے گی۔ وہ بڑی چاہت سے شناء کا انتظار کرنے لگیں۔ جمّن پہلے اُن دونوں کو تین نمبر میں ہی لایا تھا۔ جمّن کی ماں اُن دونوں کے آگے بچھ گیئں۔

"چاند سُورج اُتر آئے ہیں میرے گھر میں، سمجھ میں نہیں آتا کہاں بٹھاؤں خُدا سلامت رکھے شناء بی بی۔ بڑے لوگوں کی سی تو شان ہی نہیں ہے تم میں۔ تم ہم غریبوں کے گھر آؤ گی کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اے جمّن، مُنہ کیا دیکھ رہا ہے موئے کرسیاں تو لا۔"

"آپ لڑکی دیکھنے چلیں خالہ جان۔ یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے" شناء نے کہا۔

"دو باتیں کرنی ہیں بی بی تم سے۔ بس دو منٹ بیٹھ جاؤ" جمّن کی ماں نے عاجزی سے کہا۔ شناء اور رَدا کرسیوں پر بیٹھ گیئں۔ تیمور کو جمّن نے گود میں لے لیا تھا۔

"جی کیا باتیں کرنی ہیں؟" شناء نے پُوچھا۔

"میں جا چکی ہوں ڈرائیور صاحب کے گھر۔ دو بیٹیاں ہیں، اُن کی ایک ماں اور ایک بیوی ہیں۔"

"ہیں... ؟" شناء نے شوخی سے کہا۔

"ہاں۔ مگر ذرا خود کو کچھ سمجھتی ہیں۔ بڑی رُکھائی سے بات کی مجھ سے۔ مگر بی بی میں بھی ہٹ کی پکی ہوں۔ اے ہیں تو آخر ڈرائیور کی بیٹیاں۔ شکل اچھی ہے تو کیا ہُوا کون سے کسی بابو سے بیاہ دیں گی۔ بی بی تم بھی ذرا کڑک ہو جانا۔ کہہ دینا اگر نوکری کرنی ہے، دو نمبر میں رہنا ہے تو مالکوں کی بات کو ٹالنے کی کوشش نہ کریں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

"اوہ۔ تو آپ مل چکی ہیں اُن سے ؟"

"ہاں دو نمبر میں گئی تھی ایک بار کھانا لے گئی تھی تو مُنہ پر مار دیا میرے۔ اے بی بی آخر یہی نمک کھاتے ہیں ہم سب۔"

شناء نے رَدا کی طرف دیکھا اور رَدا بے اختیار مُسکرا دی۔ صُورتِ حال کافی حد تک سمجھ میں آگئی تھی شناء نے سوچا کیا حرج ہے اُن لوگوں سے مل تو لیا جائے۔

"چلیں خالہ جان ؟"

"چلو بیٹی۔ میں نے بات تمھارے کان میں ڈال دی ہے۔ ذرا کس کر بولنا مالک کی بیٹی بات ٹالے اور کوئی ٹال دے۔"

"آئیے" شناء نے کہا۔ اور رَدا اُٹھ گئی۔ خالہ جان نے شاید مٹھائی منگوالی تھی یا پھر گھر میں رکھی تھی۔ ڈبہ بغل میں دبایا اور دونوں کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ جانا ہی کہاں تھا برابر والے گھر میں لیکن کوئی اِس بات سے واقف نہیں تھا کہ یہاں ہونے والی گفتگو دوسرے گھر میں سُن لی گئی ہے اور سُننے والی نُدرت ہے۔

شناء نے دروازے پر دستک دی۔ اور چند لمحات کے بعد دروازہ کُھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی عصمت تھی۔ شناء اور رَدا نے چونک کر اُسے دیکھا تھا۔ یہ شکل واقعی چونکا دینے والی تھی۔

"تشریف لائیے" عصمت دروازے سے ہٹ گئی۔

"تم... آپ کون ہیں ؟" شناء نے پُوچھا۔

"غلام احمد کی بیٹی ہُوں۔ آئیے" عصمت تہذیب کا پیکر تھی۔ شناء حیران سی اندر داخل ہوگئی۔

"ماں کہاں ہیں تمھاری...؟" جمّن کی ماں نے پُوچھا۔

"آپ لوگ اندر آئیے۔ وہ سامنے والے کمرے میں ہیں۔" عصمت نے شناء کی رہنمائی کی۔ اور اُنھیں ماں کے کمرے میں پہنچا دیا۔ امّاں بی شوکت جہاں کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں ان لوگوں کو آنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اچانک یہ لوگ پہنچیں تو وہ حیران رہ گیئں۔

"چھوٹی بی بی ہیں۔ مالک کی بیٹی" جمّن کی ماں نے فخریہ انداز میں کہا۔

"اوہ۔ آئیے۔ آئیے۔ ہم آپ کو صرف آنکھوں سے احترام دے سکتے ہیں۔ باقی جو کچھ ہے اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔" شوکت جہاں نے مُسکراتے ہوئے اُن سب کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔ شناء بُری طرح متاثر ہوگئی تھی رَدا بھی دلچسپ آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ جمّن کی ماں نے مٹھائی کا ڈبہ امّاں بی کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"شناء بی بی میرے کام سے آئی ہیں۔ اب تمھیں اِنکار کرنے کی ہمت ہے تو ضرور کر دو۔"

"یہ کیا ہے ؟" امّاں بی نے پُوچھا۔

"مٹھائی۔ جمّن کا رشتہ لائی ہوں" جمّن کی ماں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ سے اِس بارے میں پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے۔" شوکت جہاں سنجیدگی سے بولیں۔

"کہاں ہوئی ہے وہ تو سرسری بات تھی اور پھر لڑکی والے پہلے نخرے کرتے ہی ہیں" جمّن کی ماں بیہودگی سے بولی۔

"خالہ جان! کتنی بیٹیاں ہیں آپ کی ؟" شناء نے پُوچھا۔

"دو ہیں۔"

"مل سکتی ہوں اُن سے ؟"

"ضرور۔ عصمت۔ نُدرت اندر آؤ" شوکت جہاں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا عصمت باہر ہی تھی اندر آگئی۔ "یہ میری بڑی بیٹی عصمت ہے۔"

"مل چکی ہوں اِن سے اور دوسری...؟"

"وہ امّی... نُدرت آج پھر..."

"کیا ہُوا ؟" امّی نے تعجب سے پُوچھا۔

"وہی کیفیت ہے" عصمت بولی۔ اور اُسی وقت باہر سے ایک ہیبتناک چیخ سُنائی دی۔ پھر دروازہ طوفانی انداز میں کُھلا اور نُدرت عجیب حالت میں اندر گُھس آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر جگہ جگہ خُون لگا ہُوا تھا۔ دانت سیاہ کوئلہ ہو رہے تھے لباس بے ترتیب تھا اور آنکھیں وحشت زدہ انداز میں پھٹی ہوئی تھیں۔

"شنبم شا شنبم شا" اس نے تخت پر چھلانگ لگائی پھر وہاں سے امّاں بی کی چارپائی۔ اور اس کے بعد نہایت پُھرتی سے پلٹ کر وہ رَدا کے سامنے آگئی۔ "آسمان گول ہے۔

زمین چاٹی۔ اور تم... تم... اس نے رَدا کے گال پر اُنگلی لگائی اور ہنس پڑی "شفق کو میدے میں گھول کر اسے شبنم سے گوندھ دو تو تمہارے نقوش تشکیل ہو جائیں گے۔ شمم مکاشا..." وہ زور سے چیخی اور رَدا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ندرت نے دوسری چھلانگ لگائی اور دروازے کے پاس پہنچ گئی۔

"الٰہی خیر۔ الٰہی خیر" اماں بی بے چاری اُٹھنے کی کوشش میں گر پڑیں۔ ندرت اب ثناء کے سامنے تھی۔ ثناء نے جلدی سے جمن کی ماں کے پیچھے پناہ لی اور جونہی ندرت اس کی طرف لپکی ثناء نے جمن کی ماں کو آگے دھکیل دیا۔ ندرت نے جمن کی ماں کے بال پکڑ لئے۔

"اے بے وقوف نوجوان تیری ڈاڑھی اُلٹ گئی ہے۔ سیدھی کر لے ساری شخصیت خراب ہو گئی ہے۔" ندرت خود ہی جمن کی ماں کی ڈاڑھی سیدھی کرنے لگی۔

"اے میرے مولا" جمن کی ماں کے حلق سے بکرے کی سی آواز نکلی۔ ندرت کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ جمن کی ماں کے بہت سے بال اُکھڑ گئے اور پھر وہ اوندھے مُنہ نیچے گر پڑی "ارے جمن کے ابا! مر گئی۔ بچاؤ ہائے مر گئی"

"ڈاڑھی ڈاڑھی کی جگہ ہونی چاہیئے۔ مونچھیں ہی ہی۔ ہو۔ آ ہی ہی ہو۔ آہ" ندرت وحشیانہ انداز میں بولی۔ عصمت کا چہرہ آگ کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔

رَدا نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور جونہی دروازہ کھلا ثناء بھی اس کے پیچھے جھپٹ پڑی۔ اندر سے جمن کی ماں کی دل دوز چیخیں اُبھر رہی تھیں۔

دونوں لڑکیاں کوارٹر سے باہر نکل آئی تھیں۔ آئی تو دوڑتی ہوئی تھیں لیکن باہر نکلنے کے بعد رَدا سنبھل گئی۔ تیمور اس بھاگ دوڑ سے کچھ پریشان نظر آ رہا تھا اس نے مُنہ بسورا لیکن ثناء کی تھپکیوں پر کچھ خاموش ہو گیا۔

"نکل چلو رَدا۔ نکل چلو، آگے بڑھو" ثناء نے کہا اور رَدا ثناء کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی۔ ثناء نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔ اُنھیں اب اس بات کی خبر لینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ جمن کی ماں پر کیا بیتی اور ان کا کیا حشر کیا گیا۔ ڈاڑھی سیدھی ہوئی یا نہیں۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ثناء پھر ہنس پڑی۔

"بھئی خُوب گئے ہم جمن کی شادی کا پیغام لیکر۔ کیا خیال ہے؟" ردا پھر بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ ثناء کو اس کی ہنسی بہت اچھی لگی تھی۔ اس سے قبل کبھی رَدا اس طرح کھل کر نہیں ہنسی تھی۔ وہ دوبارہ بولی۔

"واہ رَدا خوش کر دیا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اِسی طرح ہنستی رہو۔"

"تو کل ہم لوگ پھر یہاں جمن کی شادی کا پیغام لیکر آئیں گے" رَدا نے ہنستے ہوئے کہا اور ثناء نے قہقہہ لگایا۔ دونوں پائیں باغ میں پہنچ گئی تھیں۔

"آؤ ادھر آؤ۔ بیٹھیں گے تھوڑی دیر" ثناء بولی اور رَدا اس کے ساتھ بنچ کی جانب بڑھ گئی۔ اُن کی نگاہیں کوارٹر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ چند ہی لمحات کے بعد جمن کی ماں بُرے احوال باہر نکلیں۔ بال نُچے ہوئے تھے، حُلیہ خراب تھا۔ وہ غڑاپ سے تین نمبر میں گھس گئیں۔ ثناء نے پھر قہقہہ لگایا تھا۔

دیر تک دونوں پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستی رہیں اور پھر اعتدال پر آگئیں۔ تیمور گھاس پر کھیلنے لگا تھا۔

"مگر معاملہ خاصا گمبھیر ہے رَدا، کیا خیال ہے تمہارا؟"

"سو فیصد نہیں بلکہ دو سو فیصد" رَدا نے جواب دیا۔

"گویا تم مجھ سے متفق ہو؟"

"میں نے کہا نا ہاں"

"مگر کس بات پر؟"

"اس بات پر جو تم سوچ رہی ہو..." رَدا نے جواب دیا۔

"ہُوں" ثناء پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی پھر بولی "ڈرائیور غلام احمد کو میں نے دیکھا ہے، سنجیدہ، متین سا آدمی ہے۔ کبھی غور ہی نہیں کیا اس پر کہ اُس کی شخصیت کیا ہے۔ لیکن آج اس کا گھر دیکھنے کے بعد میرے دل میں کچھ عجیب سے احساسات پیدا ہوئے ہیں"

"یقیناً۔ وقت کے مارے ہوئے لوگ ہیں ثناء"

"دونوں لڑکیوں کا چہرہ دیکھا تھا تم نے۔ وہ لڑکی تو خاصی خونخوار نظر آ رہی تھی جس نے جمن کی اماں کی ڈاڑھی سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دوسری لڑکی کیسے ملیح چہرے کی مالک تھی۔ خاصی شستہ لگتی ہیں۔ اور پھر دونوں بزرگ خواتین۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا"

"یہ لوگ کیا نئے آئے ہیں یہاں پر؟" رَدا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے کسی سے سُنا تھا کہ دو نمبر کے کوارٹر میں غلام احمد کے گھر والے آ گئے ہیں۔ لیکن کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ میرا خیال ہے اُنھیں آئے ہوئے ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ سے زیادہ نہیں گزرا"

"یہی وجہ ہے۔ بہر طور میں تمھیں بتا دوں ثناء کہ یہ سارا

ڈرامہ تھا اور وہ لڑکی خاصی تیز و طرار معلوم ہوتی ہے۔ تم نے جمن کی ماں کی گفتگو بھی سُن لی تھی۔ بھلا کسی کو مجبور کر کے کبھی رشتے ہوتے ہیں، اب تم دیکھو نا، جمن کی ماں نے تو ہمیں اپنے گھر میں ہی بتا دیا تھا کہ پہلے اُنھوں نے جب رشتے کی بات کی تھی تو ان کے ساتھ بہتر سلوک نہیں کیا گیا اور اب وہ مالکوں کا سہارا لے رہی تھیں۔ اس سلسلے میں تو میرا خیال ہے کوئی بھی ان لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا"

"ارے وہ جمن باورچی۔ گدھا کہیں کا بھلا وہ ان لڑکیوں کے قابل ہے؟ دونوں میں سے ایک بھی اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کی دوسروں پر مصیبت ڈالنا، افسوس ہم بھی اس میں شریک ہو گئے"

"چلو کوئی بات نہیں ہے۔ تھوڑی سی تفریح ہو گئی۔ اب پروگرام کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ اندر چلتے ہیں اب، یا پھر کیا خیال ہے جمن کی ماں کی خبر لے لیں"

"کیا مناسب ہوگا؟" رَدا نے پوچھا۔

"ارے آؤ، تفریح ہی رہے گی۔ ویسے اس گھر میں ابھی نہیں جائیں گے، جب تک کہ صورت حال معلوم نہ ہو جائے"

ایک بار پھر وہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ کر جمن کی ماں کے گھر چلی گئیں۔ دروازے پر دستک دی تو جمن نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ اس کا چہرہ ہونق نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"آئیے آئیے۔ ان کم بخت لوگوں نے تو اماں کا مار مار کر بُرا حشر کر دیا" جمن نے کہا۔

"ارے توبہ توبہ۔ مارا بھی ہے؟ بھئی معاف کرنا جمن ہم تمہاری ماں کی کوئی مدد نہیں کر سکے۔ لیکن تم نے ہمیں یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی پاگل لڑکی بھی رہتی ہے" ثناء نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اجی مجھے کیا معلوم، اللہ کی قسم، اماں کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خود ہی گھستی پھرتی ہے دوسروں کے گھروں میں۔ اب بھلا دیکھو نا ایک پاگل خاندان میں میرا رشتہ لے کر گئی تھیں مگر یہ ذرا ڈرائیور غلام احمد مل تو جائیں مجھے، یہ گھر ہے پاگل خانہ نہیں ہے یہاں کسی پاگل کو نہیں رکھا جا سکتا" جمن جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ بات تو پہلے تمہاری اماں کو سوچنی چاہیئے تھی۔ ہمیں بھی خواہ مخواہ پریشان کرایا" ثناء غصیلے انداز میں بولی۔

جمن کی ماں سامنے ہی برآمدے کے تخت پر بیٹھی ہوئی اپنا حُلیہ درست کر رہی تھی۔

"مر گئی بی بی! اے میرے مولا مر گئی، کم بخت نے ہڈیاں توڑ کر رکھ دیں میری، ہائے خدا ستیاناس کرے اس کا، اے موئی پاگل کب ہو گئی مجھے تو پتہ ہی نہ چلا، پہلے تو ٹھیک ٹھاک تھی۔ اچھی خاصی مسٹنڈی تھی، میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا"

"کیا کہہ رہی تھیں وہ لوگ، کسی نے آپ کو بچانے کی کوشش نہیں کی؟"

"اے بُوا اس مسٹنڈی سے کیا بچا سکتی تھیں وہ بوڑھیاں بھی کوشش کرتی رہیں۔ مگر اس نے تو میرا چونڈا ہی ہلا ڈالا۔ کم بخت کہہ رہی تھی یہ ڈاڑھی ہے اسے سیدھی کر دوں گی" جمن کی ماں نے اس طرح کہا کہ ثناء اور رَدا بے اختیار ہنس پڑیں۔

"اے تم ہنس رہی ہو بی بی، میرے سر میں جگہ جگہ خون نکل آیا ہے"

"مگر جمن کی اماں آپ کو پہلے سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ لوگ کیسے ہیں، کیا ہیں؟"

"لو بی بی! کل تک تو ٹھیک تھی آج ہی پاگل ہو گئی۔ گرمی چڑھ گئی کم بخت کو۔ ارے مار مار کر میری ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ اللہ غارت کرے، نہیں رہنے دوں گی ان کو اب اس کوارٹر میں بالکل نہیں رہنے دوں گی"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں جمن کی اماں۔ ابا میاں نے اُنھیں اجازت دی ہے رہنے کی۔ آپ کیسے نکال سکتی ہیں اُنھیں" ثناء نے غصیلے لہجے میں کہا اور جمن کی اماں سنبھل گئیں۔

"اے بی بی! مگر میرا حال تو دیکھو"

"ٹھیک ہے آپ کا حال دیکھ لیا۔ ان لوگوں سے بھی معلوم کروں گی بے چاری لڑکی پر پتہ نہیں کب سے یہ پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ ویسے آپ نے کون سی لڑکی کا انتخاب کیا تھا؟"

"اب تو لعنت بھیجو بی بی، گھر میں ایک پاگل ہو تو دوسرے بھی ہو سکتے ہیں، کیا کہا جا سکتا ہے"

"تو گویا آپ نے لعنت بھیج دی۔ میرا خیال تھا کہ اس دوسری لڑکی کے بارے میں آپ ٹرائی کریں"

"اے اللہ کی پناہ اب تو دو نمبر کے سامنے سے گزرنے والے

پربھی لعنت ہے"۔ جمن کی ماں نے کہا۔

بہرطور کافی دیر تک یہ لوگ ہنستی رہیں۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ثناء نے رَدا سے کہا۔

"کیا خیال ہے رَدا! ایک چکر اس گھر کا بھی لگا لیا جائے"۔

"نہیں بھئی۔ میں ذرا ڈرپوک ہوں اِس مسئلے میں۔ اگر وہ واقعی پاگل ہوئی تو کہیں اس بار وہ ہماری ڈاڑھیاں سیدھی کرنے کی کوشش نہ کرلے"۔ رَدا نے کہا اور ثناء ہنسنے لگی۔

دونوں واپس کوٹھی میں آگئیں۔ گلوریا انھیں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔

"ثناء! میں تمھارے رویّے میں نمایاں تبدیلی پارہی ہوں اس لڑکی سے رقابت ہوتی جارہی ہے مجھے۔ پہلے تم میری ہی جانب متوجہ تھیں لیکن اب۔ ؟"

"اے انگریز لڑکی! ہم مشرقی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ تم تو پھر بھی غیر ہو"۔ ثناء نے کہا اور رَدا عجیب سی نظروں سے ثناء کو دیکھنے لگی۔ لیکن گلوریا نے اس بات کا بُرا نہیں مانا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ہم بھی کسی نہ کسی سے دوستی کرہی لیں گے، بلکہ کوشش کریں گے کہ تمھاری اس رَدا کو ہی تم سے چھین لیا جائے"۔ گلوریا نے ہنستے ہوئے کہا اس نے ثناء کی بات کا بالکل بُرا نہیں مانا تھا۔

○

عارفہ بیگم فطرتاً دو موئی تھیں۔ اِدھر کی اُدھر لگانا اُن کی عادت تھی۔ گو اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا لیکن بس اپنی طبیعت کو کیا کرتیں۔

رَدا کا انٹرویو کرنے کے بعد انھوں نے اپنے دِل میں ... سے خیالات قائم کئے تھے اور اب پیٹ پکڑے پکڑے بیٹھی تھیں، کچھ ایسا قدم اُٹھانا چاہتی تھیں جو مؤثر ہو اور جس سے کچھ بات بن سکے۔ اپنی اہمیت ہمیشہ پیشِ نگاہ رکھتی تھیں جو معلومات اُس وقت انھوں نے حاصل کی تھیں اُس کے تحت اپنی یہ عظیم تفتیش وہ کسی معمولی آدمی کو نہیں بتانا چاہتی تھیں بلکہ ان کی نگاہ انتخاب ایسے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی جن کے ذریعے پوری پوری داد مل سکے۔ اور آخری فیصلہ دادی اماں کے حق میں ہُوا۔

زیب النساء بیگم اس وقت بڑا سا پاندان سامنے رکھے ہوئے چھالیہ کترنے میں مصروف تھیں کہ عارفہ بیگم ان کے پاس پہنچ گئیں۔

"سلام ممانی جان"۔

"آؤ عارفہ! کیسی ہو؟" زیب النساء بیگم نے پُروقار لہجے میں پُوچھا۔ عارفہ بیگم کی فطرت سے وہ بھی واقف تھیں لیکن بُردبار خاتون تھیں اور یہاں رہنے والے ہر شخص کی پذیرائی کرتی تھیں بیٹے کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھیں، احسان احمد خاندان کے لوگوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے درمیان رہ کر بہت خوش نظر آتے تھے، جس کی وجہ سے زیب النساء بیگم بھی یہاں موجود لوگوں کو خاص اہمیت دیتی تھیں اور ان سے اپنائیت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ ویسے بھی یہ دُور کے لوگ نہیں تھے۔ عارفہ بیگم ان کے سامنے آکر بیٹھ گئیں۔

"پان کھاؤ گی؟"

"آپ کے ہاتھ کا پان تو بہت بڑی نعمت ہے میرے لئے"۔ عارفہ بیگم نے کہا اور زیب النساء بیگم نے ایک بڑا سا پان کا پتہ کتھے چونے میں لپیٹ کر چھالی ڈال کر اُن کے سامنے پیش کردیا۔

"خُدا اس گھر کو زندہ سلامت رکھے، چار چاند لگائے اس گھر کی رونق میں۔ ہم سب کو اس طرح سنبھال لیا ہے اس گھر نے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کسی غیر جگہ ہیں"۔

"کیوں محسوس ہوگا عارفہ! ظاہر ہے یہ غیر جگہ تو نہیں ہے"۔ زیب النساء بیگم نے کہا۔

"اللہ نہ کرے ممانی جان اللہ نہ کرے اس جگہ کو غیر سمجھنے والے نمک حرام ہی ہوسکتے ہیں"۔

"کہو اور کیا کیا حالات چل رہے ہیں آج کل؟"

"بس زندگی گزر رہی ہے۔ ہر بات پر نگاہ رکھتی ہوں۔ سارے بچے میرے اپنے ہی ہیں، کچھ معصوم ہیں کچھ بے وقوف ہیں کچھ سمجھ دار ہیں۔ جو معصوم ہیں ان کی خبرگیری کرنا بزرگوں کا ہی فرض ہے، مجھ سے جو کچھ بن پڑتا ہے کردیتی ہوں"۔

"کوئی خاص بات تو نہیں ہے"۔ زیب النساء بیگم نے اُن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہے ممانی جان"۔

"خیریت۔ کیا بات ہے؟"

"ممانی جان! اس گھر کے ایک ایک فرد کے دِل میں انسانی ہمدردی اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ کوئی کسی کی پریشانی دیکھ ہی نہیں سکتا، لیکن اس بات کا اندازہ بھی رکھنا چاہیئے دِل میں کہ کوئی بھی شخص یہاں کے لوگوں کی رحم‌دلی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے"۔

"ہمارا کوئی کیا لے جائے گا بی بی، سب کو خُدا ہی دیتا ہے، سب کو اُن کی تقدیروں کا مِلتا ہے، ہم نے تو کبھی اس بارے

میں سوچا بھی نہیں"۔

"اس لئے تو میں پریشان رہتی ہوں۔ ایک بات ہے اگر اجازت ہو تو کہوں؟" عارفہ بیگم نے کہا۔

"ہاں ہاں کہو، پریشان کیوں ہو؟" زیب النساء بیگم نے اُن کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"اس لڑکی رَدا کے بارے میں کچھ سوچا ہے آپ نے؟" عارفہ بیگم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا سوچنا ہے اس بے چاری کے بارے میں؟"

"کون ہے یہ، کہاں سے آئی ہے؟"

"ثناء کہتی ہے کہ لاہور سے آئی ہے"۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ پتہ چل سکا کہ کس کی بیٹی ہے۔ اکیلی لاہور سے کیوں آئی ہے بچّے کا باپ کون ہے؟ قصّہ کیا ہے، کچھ معلومات حاصل ہیں آپ کو اس بارے میں؟"

"ضرورت نہیں محسوس کی گئی اس کی۔ بچّی شکل سے معصوم اور شریف نظر آتی ہے اور تم تو جانتی ہی ہو ہم لوگوں کی عادت، جب بتانا چاہے گی اپنے بارے میں بتادے گی ہم نے اُسے مجبور کرنے کی کوشش نہیں کی"۔

"ممانی جان! میں مِلی تھی اُس سے اور سچّی بات ہے کہ مِل کر مشکوک ہوگئی ہوں"۔

"کیوں، کیا ہُوا؟"

"ممانی جان! ثناء بچّی ہے، ابھی اُس نے اس دُنیا میں دیکھا ہی کیا ہے، معصوم صُورتیں تو ہمیشہ دھوکا دیتی ہیں۔ رَدا جتنی معصوم نظر آتی۔ ہے اتنی معصوم ہے نہیں۔ کیا گُل کھلا کر آئی ہے لاہور میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بچّہ بھی ہے ایک، شادی ہوگئی ہے یا نہیں، ماں باپ کا جو ناک کاٹ کر آئی ہے، یا کسی کے ساتھ بھاگ کر، جو اس کا سامان وغیرہ لے کر فرار ہوگیا ہو، میں نے سُنا ہے ممانی جان کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کل کلاں کو اگر پولیس میں اس کے بارے میں رپورٹ درج کردی جاتی ہے تو آپ سمجھ لیں کہ کیا ہوگا؟ وہ یہاں سے برآمد ہوگی ہمارے اُوپر کیا کیا الزامات آئیں گے۔ احسان احمد بھائی کی ساری عزت خاک میں مِل جائے گی۔ یہ تمام چیزیں آج کل مجھے پریشان کئے ہوئے ہیں۔ بہت غور و خوض کیا اس بارے میں یہ بھی سوچا کہ کہیں میرے اس خلوص کو غلط شکل نہ دے دی جائے لیکن ممانی جان دِل نہ مانا اور آپ کے پاس چلی آئی۔ معافی چاہتی ہوں ممانی جان۔ صرف نمک کا حق ادا کررہی ہوں میں"۔

زیب النساء کا مُنہ پان چباتے چباتے رُک گیا عارفہ بیگم کی باتیں قابلِ غور تھیں واقعی یہ بات بھی تو ہوسکتی تھی۔ رَدا کی حیثیت مشکوک ہے۔ چھوٹا سا معصوم بچّہ نومولود نہیں ہے۔ اس کی ایک سال کی عُمر ہے۔ لیکن اُس کے حالات کیا ہیں۔ یہ بات تو نہیں سوچی جاسکتی کہ رَدا بچّے کو جنم دیتے ہی لاہور سے فرار ہوکر یہاں پہنچ گئی ہے۔ اس کے باوجود کم از کم اس کے شوہر اس کے گھرانے کے بارے میں معلومات تو حاصل ہونی چاہئیں، کہیں واقعی کوئی اُونچ نیچ بات نہ ہوجائے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد انھوں نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا عارفہ بیگم! اچھا ہُوا تم نے یہ بات میرے کانوں میں ڈال دی۔ بات کروں گی ذکیہ بیگم سے اس سلسلے میں اور کہوں گی کہ رَدا سے اس کے بارے میں کم از کم معلومات تو حاصل کرہی لی جائیں۔ ثناء کو تو تم جانتی ہو، آفت کی پرکالہ ہے۔ رَدا پر جان چھڑکتی ہے، کہیں یوں نہ ہو کہ اس پوچھ گچھ کا وہ بُرا مان جائے۔ میں ترکیب سے کام کروں گی، البتہ اس دوران تم رَدا پر نگاہ رکھنا اور اگر ہوسکے تو اس سے اس مسئلے کی کرید کرنا"۔

"ہائے ممانی جان! سچّی بات ہے میرے تو ہوش گُم ہوتے ہیں ثناء سے۔ اللہ رکھے مزاج کی تیز ہے۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوگئی تو پھر میرا تو خُدا ہی حافظ"۔

"ارے نہیں وہ شوخ ضرور ہے لیکن بدتمیز نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنے رشتے داروں کو نقصان پہنچانا پسند کرے گی"۔

اس سے زیادہ کچھ کہنا عارفہ بیگم کے لئے ممکن نہیں تھا۔ بہرطور زیب النساء بیگم سے اس بات کی اجازت مِل گئی تھی کہ رَدا پر نگاہ رکھی جائے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس مشغلے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیں گی۔

◆◆

نُدرت نے جی بھر کے دِل کی بھڑاس نکالی تھی درحقیقت اس وقت صحن کی چھوٹی دیوار سے اس نے اور عصمت دونوں نے جمن کی ماں کی گفتگو سُن لی تھی۔ ان دونوں کو یہ اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ جمن کی ماں کے ساتھ آنے والیاں کون ہیں لیکن یہ گفتگو سُننے کے بعد نُدرت نے دانت پیستے ہوئے عصمت سے کہا تھا۔

"باجی! کیا اب بھی ہمیں خاموشی اختیار کرلینی چاہیئے؟"

"مم، مطلب؟" عصمت نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

"دیکھو باجی! اس دُنیا میں جینے کے لئے ایک ہی انسان کو ہر طرح کے بوجھ تلے نہیں دبنا چاہیئے، اب ہم لوگ اتنے بچے بھی نہیں ہیں کہ یہ بات ہمیں معلوم نہ ہوسکے کہ ابّو نے وہ مکان کیوں چھوڑا تھا؟ اس کم بخت رحمٰن بدمعاش کی وجہ سے جو ہم تم دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اگر یہاں بھی ہم جمن کا شکار ہوگئے تو پھر بتاؤ ابّو ہمیں لے کر کہاں بھاگیں گے؟ کیا ساری زندگی انھیں اس بات پر مجبور کیا جاتا رہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے رہیں۔ اس قسم کے حملوں کا مُنہ توڑ جواب دینا ضروری ہوگا باجی۔ اور یہ ذمہ داری اب ہمیں سنبھالنی چاہیئے۔"

"اے ندرت! دیکھ یہاں کوئی ایسی گڑبڑ مت کرنا جو ہمارے لئے بدنامی کا باعث بنے، تیرے ہی حملے ہیں کہ ابّو ہمیں لئے لئے کہاں کہاں بھاگتے پھریں گے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو پھر کیا ابّو کو یہاں سے نہیں بھاگنا پڑے گا۔"

"نہیں باجی۔ کم از کم ایسی ویسی بات اس انداز کی نہیں ہوگی، بلکہ دشمن کو مُنہ توڑ جواب دیا جارہا ہے۔ میرے خیال میں باجی آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنی تیاریاں مکمل کرلوں۔"

"مگر کرے گی کیا؟"

"جمن کی ماں کا شایانِ شان استقبال۔" ندرت نے کہا اور عصمت کو وہیں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس سے قبل کہ عصمت کچھ بولتی، دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد یہ سارے واقعات پیش آئے تھے، جو عصمت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ اس نے دورے والی بات تو بس ایسے ہی کہہ دی تھی صرف یہ سوچ کر کہ اگر ندرت ان لوگوں سے کوئی بدتمیزی کرے تو یہ کہہ دیا جائے کہ اس کی طبیعت کچھ اچانک خراب ہوگئی ہے۔ لیکن ندرت اتنا بڑا ڈرامہ کردیگی۔ اس کا عصمت کو بھی یقین نہیں تھا۔ امّاں بی اور شوکت جہاں بیگم تو سچ مچ پریشان ہوگئی تھیں۔ ندرت نے جمن کی ماں کو خوب اچھی طرح کوٹا پیٹا تھا۔ وہ دونوں لڑکیاں تو بھاگ گئی تھیں جو جمن کی ماں کے ساتھ رشتہ لے کر آئی تھیں۔ ویسے عصمت کے ذہن میں ان دونوں کی شکلیں موجود تھیں۔ بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ظاہر ہے کوٹھی سے تعلق رکھتی تھیں۔ پتہ نہیں کون تھیں۔ عصمت کو ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ بڑی مشکل سے شوکت جہاں بیگم نے ندرت کو جمن کی ماں کے اُوپر سے ہٹایا تھا۔ اور اس کے بعد جو جمن کی ماں بھاگی تھیں تو انھوں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

شوکت جہاں نے ندرت کو پیچھے سے پکڑا ہوا تھا اور چیخ رہی تھیں۔

"ارے اسے پکڑو، رسّی سے باندھ دو، آخر ہوا کیا میری بچی کو۔ کیا ہوگیا میری بچی کو؟"

عصمت کو اندازہ تھا کہ اُن کی بچی کو کچھ نہیں ہوا۔ چنانچہ اُس نے سب سے پہلے باہر آکر دروازہ بند کیا اور پھر اس کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ جس میں ابھی تک شوکت جہاں ندرت کو پکڑے ہوئے تھیں پھر اس نے کہا۔

"امّی جان! چھوڑ دیں اسے، اب میں اِس کا بھوت اُتاروں گی۔"

شوکت جہاں نے حیرت سے عصمت کی طرف دیکھا۔ عصمت اپنے آپ پر نجانے کس طرح قابو پائے ہوئے تھی اس کے بعد سے جو اس نے ہنسنا شروع کیا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چہرہ سُرخ ہوگیا۔ ندرت ایک گوشے میں جا بیٹھی تھی۔ امّاں بی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ دونوں ہی بے چاری بُری طرح ہول گئی تھیں۔ امّاں بی آہستہ سے ندرت کے پاس پہنچیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"ندرت بیٹی کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں امّاں بی اللہ کے فضل سے۔" ندرت نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور امّاں بی چونک پڑیں۔

"کک، کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمارے نئے بننے والے رشتہ داروں کی کیفیت آپ نے دیکھ لی۔ میرا خیال ہے یہ ڈوز اُن کے لئے کافی ہوگا۔"

"تت تو تو... تو... تو..." شوکت جہاں نے ندرت کو متحیرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے امّی، جوتی اُٹھائیے اور دس میرے سر پر مار دیجئے۔ لیکن میرا قصور بتا دیجئے۔ آپ نے کتنی رسانیت سے کہا تھا جمن کی امّاں سے کہ آپ کو اس قسم کی کوئی حماقت منظور نہیں ہے، کہا تھا نا آپ نے؟" شوکت جہاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب ندرت دوبارہ بولی۔

"اس کے بعد انھیں کیا حق پہنچتا تھا کہ اپنے حمائتیوں کو لیکر یہاں آئیں۔ دراصل امّاں بی۔ میں نے دوسرے کوارٹر میں ہونے والی باتیں سُن لی تھیں۔ جمن کی ماں ایسی ایسی باتیں کر رہی تھی کہ میرا غصّہ عروج پر پہنچ گیا۔ میں نے سوچا اور تو کوئی ترکیب نہیں ہے۔ لڑائی جھگڑا ہم شریفوں کا کام نہیں ہے چنانچہ میرے اُوپر بھوت آجانا چاہیئے۔ چنانچہ اب جو یہ بھوت میرے سر پہ آیا ہے نا یہ جمن کی ماں کو ہمیشہ کے لئے درست کرکے رکھ دے گا۔"

"اے تجھے خدا سمجھے ندرت، تو یہ سب ڈرامہ کیا تھا تُو نے۔ بچی تُو اتنی تیز کیسے ہوگئی؟ اے دیکھ رہی ہو شوکت جہاں، کیا اس نے سب کو پاگل بنا کر نہیں رکھ دیا؟"

"میں تو سوچ رہی ہوں جوتی اُتار کر اس کی پٹائی شروع کردوں۔"

"نہیں نہیں امّی! یہ بھوت کافی خطرناک ہے، اگر دوبارہ آگیا تو آپ ہی لوگوں کو پریشانی ہوگی۔ سیدھی جمن کی امّاں کے گھر جا گھسوں گی، امّی! آپ خود سوچیئے ان لوگوں کو کیا حق ہے کہ ہمیں گائے بکریاں سمجھ کر جب چاہیں ہماری گردن میں رسّی ڈالنے کی کوشش کریں۔ ابّو بھی انسان ہیں جیسا کہ آپ لوگ بتاتے ہیں، ہم اپنے حالات کا شکار ہیں تو کیا ہماری حیثیت اتنی گرگئی ہے کہ چوکیدار اور باورچی ہمارے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کریں۔ امّاں بی! آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں باہر نکلوں اور ابّو کا ہاتھ بٹاؤں بہت عرصہ ہوگیا ہمیں احمقوں کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ ہمارے دلوں میں بھی بہت کچھ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر غلام احمد کی نوکری بھی قائم رہنی چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو تمھاری وجہ سے کوئی اونچ نیچ ہوجائے۔"

"بس امّاں بی! خُدا کے لئے تھوڑی سی اجازت دِلوا دیجئے ہم لوگ بہت عرصے تک قید کی زندگی گزار چکے ہیں۔ ہمارے دِلوں، ہمارے دماغوں میں بھی بہت کچھ ہے کرنے کے لئے۔ اب اتنا تو نہ پیسیں ہمیں کہ ہم اپنی ساری صلاحیتیں کھو بیٹھیں۔"

شوکت جہاں کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں، لیکن روتے روتے اچانک وہ ہنس پڑیں "خُدا ہی سمجھے۔"

"گویا اجازت۔" ندرت نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اس کا شوخ چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ عصمت کا ہاتھ پکڑ کر وہ باہر نکل آئی۔

"آپ نے دیکھا باجی! امّاں بی اور امّی تیار ہوگئی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ابّو کو سنبھال لیں گی۔"

"اس کے باوجود ندرت ہمیں احتیاط سے کام لینا ہے۔ ابّو کے مسائل بڑھنے نہیں چاہیئے۔" عصمت نے کہا۔

"ارے اب تو ابّو کے مسائل گھٹنا شروع ہوں گے۔ اب ندرت میدانِ عمل میں آگئی ہے۔ سمجھیں آپ۔" ندرت نے سینہ ٹھونک کر کہا اور عصمت ہنسنے لگی۔ تھوڑی دیر تک دونوں بہنوں میں باتیں ہوتی رہیں پھر ندرت نے غسل خانے میں جاکر اپنا حلیہ درست کیا اور بال وغیرہ سنبھال کر باہر نکل آئی۔ عصمت کمرے میں چلی گئی تھی اور کمرے کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہوگئی تھی ندرت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"باجی! اب ہمیں اس کوٹھی سے باہر بھی نکلنا چاہیئے میرے خیال میں تمام ہی ملازمین کی خواتین بڑی آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں کوئی پابندی نہیں ہے ان پر؟"

"کرے گی کیا باہر نکل کر۔ کیا پروگرام ہے تیرا؟"

"بس کچھ نہیں باجی۔ ظاہر ہے میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ لیکن ہم اپنے گھر کو اتنا مظلوم نہیں بننے دیں گے مجھے بھی دوسرے لوگوں سے شناسائی حاصل کرنی چاہیئے۔ میرا مطلب ہے ہمیں بھی آزادی کی زندگی میسر ہونی چاہیئے اپنا وقار اپنی آزادی، اپنا رکھ رکھاؤ قائم رکھیں گے اور کم از کم ایسا ماحول پیدا کریں گے اپنے لئے کہ یہ جمن اور بدھو خیراتی کو ہماری طرف آنکھ اُٹھانے کی جُرأت نہ ہوسکے۔ ویسے باجی ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا تھا تم نے خدا کی قسم چاند سورج کی جوڑی تھی۔ واقعی اس سلسلے میں کم از کم جمن کی امّاں نے غلط نہیں کہا تھا وہ بچہ کتنا پیارا تھا اس لڑکی کی گود میں پتہ نہیں ان دونوں کا نام کیا تھا۔ ایک لمحے کیلئے تو میرا جی چاہا تھا کہ جمن کی ماں کو چھوڑ کر ذرا ان سے گفتگو کروں۔" ندرت بولی اور عصمت نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"ان دونوں کے تو حلیئے ہی خراب ہوگئے تھے۔ آئی تھیں جمن کی ماں کی حمایتی بن کر لیکن خود ایسی پلٹ کر بھاگیں کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔"

"پتہ نہیں کون تھیں؟ کیا کیا نام تھے؟ یقیناً کوٹھی ہی کی رہنے والی ہوں گی۔ جمن کی ماں اُنھیں مالکوں میں سے کہہ رہی تھی مگر باجی بلاشبہ حسین لڑکیاں تھیں۔ کیا خیال ہے ہمیں اُن کی دوستی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے؟"

"نہیں ندرت۔ دیکھو اس سلسلے میں، میں تمھیں ہدایت کرتی ہوں کہ خیالوں کی دُنیا میں جانے کی کوشش مت کرنا۔ فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ تمھیں وہ حیثیت کبھی نہیں مل سکے گی جو ان لوگوں کے دوستوں کی ہوسکتی ہے۔ بلاوجہ بددل ہوجاؤ گی اور دُکھوں کا شکار ہوگی۔"

"باجی! میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔ اپنی حیثیت بھی

ساتھ ہی ہوں اور دوسروں کی بھی۔ مجھے بھی کسی سے کسی مراعات کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ تم اطمینان رکھو۔ اگر دوستوں کی سی حیثیت ملی تو ٹھیک ہے ورنہ اپنے کام سے کام۔ کیا خیال ہے آج شام کو ذرا پائیں باغ میں ٹہلنے چلیں؟ ہائے کتنی خوبصورت جگہ ہے۔ میرا تو دل ترستا ہے وہاں جانے کیلئے جب کہ سارے دن تم عصمت وہاں گھسے رہتے ہیں۔"

"اس کے لئے اماں بی اور امی کی اجازت ضروری ہوگی۔"

"تو پھر باجی۔ اس سلسلے میں تم بھی کچھ مدد کرو نا میری" ندرت نے عاجزی سے کہا۔

"بھئی سیدھی سیدھی بات کرلیتے ہیں گے اماں بی سے۔ وہ کبھی کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گی کہ ہم یہاں زیادہ گھومیں پھریں۔ بات اگر جمن کی ماں کی ہوتی تو اس سلسلے میں بھی تمہاری اچھی خاصی کھنچائی ہوجاتی لیکن جمن کی ماں نے جرأت ہی ایسی کی تھی بھلا کبھی زبردستی کسی کو ایسے کاموں کے لئے ہو کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے اماں بی اور امی خاموش رہیں ورنہ ندرت شامت ہی آجاتی تیری۔"

"تم کوشش تو کرو باجی پلیز،" ندرت نے کہا اور عصمت نے گردن ہلا دی۔

▼▼

شہاب صاحب اس پوری کوٹھی میں کافی بدلے ہوئے انسان تھے۔ احسان احمد کی فطرت میں سادگی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر شخص کو پیار کی نگاہ سے دیکھنے والا یہ آدمی دل میں محبت کا نور لئے ہوئے پیدا ہوا تھا۔ کسی بھی پریشان حال شخص کو وہ پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا جو بھی اس کے سامنے آجاتا احسان احمد اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا لیکن شہاب مختلف انسان تھے۔

آنکھ کھولی تو دولت کے انبار دیکھے۔ باپ کے انتقال کے بعد بڑا بھائی ہی باپ کی جگہ تھا۔ شہاب صاحب نے ہمیشہ احسان احمد کا احترام کیا تھا لیکن جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی اس نے انھیں خودسر اور مغرور بنا دیا تھا۔ احسان احمد کے برعکس وہ بہت مختلف طبیعت کے مالک تھے۔ کسی کم حیثیت انسان کو اپنے قریب کھڑے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ نفیس لباسوں میں ملبوس رہتے۔

عظیم الشان کاروبار میں سے اُنھوں نے کچھ ذمہ داریاں اپنے لئے رکھی تھیں۔ احسان احمد نے تو کبھی نہیں چاہا تھا کہ بھائی کو کسی قسم کا بوجھ اُٹھانا پڑے۔ ہر طرح کی سہولتیں شہاب صاحب کو مہیا تھیں لیکن شہاب صاحب نے اپنی پسند کے مطابق کچھ شعبے خود ہی منتخب کر لئے تھے۔ کھانے پینے کے دلدادہ اور سیر سپاٹے اور محفلیں جمانے کے شائق تھے چنانچہ چند ایسے دوستوں کی صحبت بھی حاصل تھی جو باپ کی دولت پر عیش کر رہے تھے۔ ان میں ایک تفسیر بھی تھا۔

تفسیر ایک بڑے باپ کا بیٹا تھا لیکن اس بہت بڑے باپ کا نام سوسائٹی میں کچھ مشکوک حیثیت رکھتا تھا۔ ہر چند کہ تفسیر کے والد توقیر صاحب کے تعلقات شہر کے اعلیٰ حکام سے تھے اور بڑی عالی شان حیثیت کے مالک تھے وہ لیکن درپردہ ان کے بارے میں یہ بات عام تھی کہ وہ اسمگلنگ جیسے کاروبار میں ملوث ہیں اور اس سلسلے میں ان کی کارروائیاں بڑی پُراسرار ہیں۔

شہاب صاحب کو ابھی ان راستوں کی ہوا تو نہیں لگی تھی لیکن زندگی کی تمام تر دلچسپیوں میں وہ حصہ لیتے تھے۔ کاروبار کا جو شعبہ اُنھوں نے سنبھالا تھا اس میں بھی اُنھیں باہر جانے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کاروبار میں دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ دنیا کے کئی ملکوں کو انھوں نے اچھی طرح دیکھا تھا اور وہاں خوب گُل کھیلے تھے۔ ان کی فطرت میں اوباشی تھی لیکن ذرا رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے چنانچہ ہر کام میں احتیاط برتنا چاہتے تھے۔

اس رات جب وہ تفسیر کو لینے اسٹیشن پر گئے تھے تو اُن کی فطرت کی بناء پر ہی ان کی توجہ رَدا کی جانب نہیں ہوئی تھی بلکہ رَدا کے رُوپ میں انھوں نے جس حسین صورت کو دیکھا تھا وہ ان کے لئے قابل توجہ تھی۔

رَدا کے بارے میں فوراً ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ گھر سے بھاگی ہوئی یا کسی حادثے کا شکار کوئی لڑکی ہے چنانچہ شہاب صاحب نے فوراً ہی اس سے ہمدردی جتا کر اس کے لئے آسانیاں فراہم کرنے کی پیشکش کردی تھی۔ وہ کسی قسم کے فوری اقدام کے قائل نہیں تھے لیکن ایسے ہتھکنڈوں سے رَدا کو قابو میں کرنے کی کوشش ضرور کرتے جو بظاہر کسی کی سمجھ میں نہ آتے۔ یہ تو ان کی بدقسمتی تھی کہ ثناء عین وقت پر اپنی دوست گلوریا کو تلاش کرتی وہاں پہنچ گئی اور رَدا اس کے ہاتھ لگ گئی۔

بہرطور شہاب صاحب اس بات پر ہی خوش تھے کہ کم از کم ثناء کو کسی بات کا احساس نہیں ہو سکا لیکن ثناء کی اس وقت کی گفتگو سے انھوں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ کسی حد تک

ان کی دوہری شخصیت سے واقف ہے اور ان کے لئے اپنے دل میں کچھ شکوک و شبہات رکھتی ہے۔ ورنہ وہ بلیک میلنگ کے وہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہ کرتی جو اس نے کہے تھے۔

شہاب صاحب کو بھتیجی سے بھی پیار تھا لیکن بس اپنی فطرت کے رکھ رکھاؤ کو وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس سے زیادہ کسی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رَدا کو اس وجہ سے اُنھوں نے اپنے ذہن سے نکال دیا تھا کہ وہ ثناء کی پناہ میں آچکی تھی لیکن اس رات ڈنر میں رَدا کو دیکھ کر ان کے دل پر پھر ایک بوجھ سا آپڑا تھا۔ سادہ سے لباس میں وہ لڑکی اتنی حسین لگ رہی تھی کہ شہاب صاحب کو اپنی اب تک کی زندگی بے وقعت محسوس ہونے لگی۔ اُنھوں نے سوچا کہ ملک میں اور غیر ممالک میں جو حُسن اُنھوں نے دیکھا ہے وہ رَدا کے سامنے کچھ نہیں تھا چنانچہ رَدا کے لئے وہ اپنے دل میں کچھ عجیب سا چور پلنے لگا اور اس بات کو ذہن سے نکال نہیں سکے کہ رَدا کو ان کی طرف متوجہ ہونا ہی چاہیئے۔

البتہ ثناء کی وجہ سے وہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اُٹھانا چاہتے تھے کیونکہ ثناء کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ زہر کی پڑیا ہے اگر سنک گئی تو شہاب صاحب کے لئے مصیبت بن جائے گی۔

بہت غور خوض کر رہے تھے اُن دنوں وہ رَدا کے بارے میں اپنی شخصیت کو بالکل ہی تبدیل کرکے وہ رَدا کے سامنے آنا چاہتے تھے تاکہ رَدا کو یا ثناء کو کوئی شبہ نہ ہو سکے۔

بارہا اُنھوں نے سوچا کہ کوٹھی میں اس سلسلے میں کسی کو رازدار بنائیں لیکن پہلے کبھی اس کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی۔ اُنھوں نے ہر قدم احتیاط کے ساتھ اُٹھایا تھا اور ان کی شخصیت کسی کی نگاہوں میں مشکوک نہیں ہو سکی تھی ہاں کچھ ایسی باتیں گھر والوں کے علم میں ضرور تھیں جن کی بناء پر ان کی طبیعت کے بارے میں کچھ لوگوں کو تھوڑا بہت اندازہ تھا لیکن اتنا نہیں کہ شہاب صاحب کو بُرا انسان سمجھا جاسکے۔

اس شام اتفاق سے گلوریا کو اپنی کسی غیر ملکی دوست سے ملنے مڈوے ہاؤس جانا پڑا۔ ثناء کو وہ ضد کرکے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ حالانکہ ثناء رَدا کو لے کر جانا چاہتی تھی لیکن رَدا نے انتہائی معذرت کرتے ہوئے کہا تھا "ثناء ابھی میں ان تمام معاملات میں براہِ راست حصہ نہیں لے سکتی کچھ وقت گزر جانے دو میں ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گی۔"

گلوریا کا معاملہ تھا اس کی جو دوست اس کے ملک سے آئی ہوئی تھی اسے اس رات واپس بھی جانا تھا اور گلوریا کچھ پیغام اسے اپنے گھر کے لئے دینا چاہتی تھی۔ اس لئے ثناء کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔

رَدا تیمور کو گود میں لئے پائیں باغ میں نکل آئی تھی۔ اتفاق کی بات کہ شہاب صاحب نے اُوپری منزل سے رَدا کو تنہا دیکھ لیا۔ گلوریا کے بارے میں اُنھیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اور نہ ہی ثناء کی غیر موجودگی کے بارے میں کچھ علم تھا البتہ اُنھوں نے رَدا کے اطراف میں دُور دُور تک نگاہیں دوڑائیں کوئی نہیں تھا چنانچہ اس موقع کو غنیمت جان کر وہ پھرتی سے نیچے اُتر آئے۔

وہ بڑی احتیاط کے ساتھ ٹہلنے کے سے انداز میں لان پر آگئے اور اس طرح آگے بڑھے جیسے رَدا کی موجودگی کا اُنھیں علم ہی نہ ہو۔ پھر تیمور کی قلقاریاں سُن کر وہ اس طرح چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ابھی اُنھوں نے اُسے دیکھا ہو۔ رَدا اتفاق سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شہاب صاحب آہستہ سے مسکرائے اور آگے بڑھ کر تیمور کے قریب پہنچ گئے۔

"ہیلو۔ کیا ہو رہا ہے؟" اُنھوں نے تیمور کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ تیمور مُسکراتی نگاہوں سے اُنھیں دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی مُسکراتی اُنگلیاں شہاب صاحب کے چہرے کی طرف اُٹھا دیں اور شہاب صاحب تھوڑے سے جُھک گئے تیمور نے ان کے گال پر چٹکی بھر لی تھی۔

"بھئی واہ۔ رَدا۔ آپ کے صاحب زادے تو بہت تربیت یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔" شہاب صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بدتمیز ہے۔ سوری شہاب صاحب۔" رَدا نے آگے بڑھ کر تیمور کو اُٹھا لیا۔

"ارے ارے بھئی کچھ لوگوں پر سب کے حقوق ہوتے ہیں۔ تنہا کسی ایک کے نہیں اور پھر بچے تو اس کائنات کے وہ خوشنما پُھول ہیں جن کی طرف ہر شخص ہی راغب ہوتا ہے آپ نے ہم سے اس پُھول کو الگ کرکے زیادتی کی ہے رَدا صاحبہ۔"

"نہیں بدتمیزی کر رہا تھا آپ کے ساتھ اس لئے پلیز محسوس نہ کیجئے۔"

"ارے نہیں بھئی۔ آپ خواہ مخواہ سنجیدہ ہوگئیں مِس رَدا۔ ویسے ہماری بدقسمتی ہے مِس رَدا کہ آپ کے چہرے کو وہ روشنی"

دے سکے جو اس کا حق ہے پتہ نہیں کن اُلجھنوں کا شکار ہیں آپ۔ معاف کیجئے گا مس رِدا، میں آپ سے ذرا بھی بے تکلف نہیں ہوں غالباً آپ سے ایک یا دو سرسری سی ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن اپنے بارے میں آپ کو چند باتیں ضرور بتا دوں اس لئے کہ آپ بھی اس گھر کی ایک فرد ہیں۔ میں ذرا بے تکلف اور منہ پھٹ قسم کا آدمی ہوں کسی سے گفتگو کرتے ہوئے کچھ سوچتا نہیں ہوں اگر دل چاہتا ہے تو کہہ بھی دیتا ہوں، بلاشبہ میری یہ عادت آپ کو پسند نہیں آئے گی لیکن کیا کیا جائے ایک انسان کی کمزوری سمجھ کر معاف کر دیں۔"

"میں کچھ نہیں شہاب صاحب" رِدا نے کہا۔

"اب دیکھئے نا کتنی بے تکلفی سے آپ سے مخاطب ہو گیا ہوں حالانکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ میری آمد سے کچھ جھجک رہی ہیں۔"

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" رِدا نے مضبوطی سے کہا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے اگر آپ کہتی ہیں تو مانے لیتا ہوں لیکن مس رِدا، میری وہ بات اب بھی رہ گئی ہم ایسی کون سی کوشش کریں کہ آپ کو ایک شاداب زندگی دے سکیں۔ آپ کے حالات، آپ کی زندگی کچھ بھی ہو ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ہمارے لئے بس اتنی ہی بات کافی ہے کہ آپ ہمارے گھر کی ایک فرد ہیں ہم میں سے ہیں اور آپ یقین کیجئے اس سلسلے میں اس کوٹھی کو آپ پاگل خانہ کہہ سکتی ہیں۔ ہم سب ٹوٹ کر چاہتے ہیں جسے بھی چاہتے ہیں اور کبھی اسے اجنبی نہیں سمجھتے۔"

"آپ یہ باتیں مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں شہاب صاحب میں محسوس کرتی ہوں۔"

"محسوس کرتی ہیں مگر قبول نہیں کرتیں۔" شہاب نے نہایت چالاکی سے اپنا کام شروع کر دیا۔

"میں نہیں سمجھی۔"

"اب دیکھئے نا ہم تو اتنی اپنائیت محسوس کرتے ہیں آپ میں اور آپ اپنے آپ کو ابھی تک ایک بند کتاب کی مانند رکھے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا کوئی ورق ایک بار بھی نہیں کھلا کہ اس پر لکھی ہوئی تحریر دیکھی جا سکے۔"

رِدا کی گردن جھک گئی وہ جوتے کی ٹھوکر سے گھاس کرید رہی تھی شہاب صاحب نے کہا۔

"سوری رِدا یقیناً میری باتیں تمھیں پسند نہیں آئی ہوں گی لیکن ان میں صرف خلوص ہے۔"

"نہیں شہاب صاحب۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے اس میں نہ پسند آنے والی کون سی بات تھی حقیقتیں ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں۔"

"اگر ان حقیقتوں کو آپ تسلیم کرتی ہیں تو صرف اتنا بتا دیجئے کہ آپ نے اپنے آپ کو ہم سے چھپانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اگر آپ کی زندگی کا کوئی پس منظر ہے تو آپ یقین کریں ہم اس میں آپ کے طرفدار آپ کے ساتھی ہیں۔ کوئی ایسی بات کسی قیمت پر نہیں برداشت کی جائے گی جو آپ کے خلاف ہو کسی بھی الجھن کا شکار ہوں آپ۔ ہم اسے دُور کرنے میں آپ کی مدد کریں گے رِدا صاحبہ! انسان کو انسان کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔"

"میں... میں واقعی اس بات کا شدید احساس کر رہی ہوں شہاب صاحب۔ براہ کرم آپ محسوس نہ کریں۔"

"اگر احساس کر رہی ہیں تو اپنے بارے میں کچھ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟"

"کیا جاننا چاہتے ہیں آپ میرے بارے میں؟"

"یہی کہ آپ کون ہیں؟"

"اگر میں ابھی یہ سب کچھ آپ کو نہ بتانا چاہوں تو...؟"

"کوئی مجبور نہیں کرے گا آپ کو۔ بس اپنے چہرے کو شگفتہ رکھیئے، اپنے آپ کو یہاں کی زندگی میں پوری طرح ضم کر لیجئے ہنسئے بولئے اس طرح جس طرح ثناء سب میں خوش رہتی ہے۔ ہم لوگ آپ کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں آپ کے لئے ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔"

"مجھے یقین ہے یہ گھر میرے لئے جنت سے کم نہیں ہے شہاب صاحب۔ میں کوشش کروں گی کہ اس جنت میں خوش رہوں۔"

"شکریہ رِدا صاحبہ۔ آپ نے یہ الفاظ کہہ کر کم از کم مجھے مایوس نہیں کیا۔ اچھا بھئی تیمور! ہم چلتے ہیں۔ آپ کی ممی ہماری آمد سے کچھ گھبرا گئی ہیں۔" شہاب صاحب نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے تو رِدا جلدی سے بولی۔

"نہیں۔ آپ نے یہ کیسے محسوس کیا شہاب صاحب کہ میں آپ کی آمد سے کچھ گھبرا گئی ہوں۔"

"بدستور اُلجھی اُلجھی ہیں آپ۔"

"آپ نے جو اتنی باتیں کی ہیں نا شہاب صاحب میں ان کے بارے میں غور کرنے لگی ہوں۔"

"تو پھر غور کیجئے۔ کچھ کیجئے تو سہی کم از کم۔"

"آپ میری کچھ مدد کر سکیں گے؟" رِدا نے کہا۔

"کمال ہے اب تک یہی پیشکش تو کر رہا ہوں آپ کو کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"شہاب صاحب! درحقیقت کراچی میرے لئے اجنبی ہے آپ لوگوں کے درمیان پہنچنے کے بعد اس اجنبیت کا تمام احساس ختم ہو گیا ہے لیکن اس گھر کی حد تک۔ باہر کی دُنیا سے میں ابھی ناواقف ہوں۔ بہت جلد میں اس سلسلے میں اقدامات کرنے والی ہوں۔ آپ کو علم ہوگا کہ جب اسٹیشن پر میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں کسی ہوٹل میں قیام کرنے کی خواہش مند ہوں۔"

"جی ہاں مجھے یاد ہے اس لئے تو آپ میری نگاہوں میں پُراسرار ہیں رِدا۔ میں نہیں جانتا کہ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کے ساتھ آپ ہوٹل میں کیوں رہنا چاہتی تھیں۔ دوسرے لوگ ساتھ کیوں نہیں ہیں یعنی آپ کا شوہر آپ کے والدین آپ کے سسرال والے۔ دیکھیں نا انسان تو انسان ہی ہے کسی بھی شخصیت کے بارے میں اس کے ذہن میں یہ تجسس پیدا ہو سکتا ہے۔"

"میں پہلے ہی آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ مجھے اس کا احساس ہے لیکن وقت سے پہلے میں کسی کو کچھ بھی بتانا پسند نہیں کروں گی۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے میں اپنے آپ کو ابھی تاریکی میں رکھنے پر مجبور ہوں۔"

"تو جناب آپ سے یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ کو کوئی اس سلسلے میں مجبور نہیں کر سکے گا آپ کیا مدد چاہتی ہیں مجھ سے؟"

"میں کوئی ملازمت کرنا چاہتی ہوں شہاب صاحب۔" رِدا نے کہا اور شہاب گہری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"کیوں؟ اس گھر میں کوئی تکلیف محسوس کر رہی ہیں آپ...؟"

"جی نہیں۔ اس گھر سے میرا صرف محبت کا رشتہ ہے اور یہ محبت شاید زندگی کی آخری سانس تک کے لئے میرے دل و دماغ میں محفوظ ہو چکی ہے لیکن انسان کی اپنی ایک انا بھی ہوتی ہے۔ ایک ذات بھی ہوتی ہے۔ میرا آپ لوگوں سے محبت کا رشتہ ہے۔ خون کا رشتہ نہیں ہے یہاں جو لوگ رہتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح آپ کے عزیز و اقارب ہیں یا پھر آپ کے ملازم۔ میں ان دونوں میں سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی چنانچہ رشتے قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کسی پر مسلّط رہے۔ میں اپنی ایک الگ دُنیا چاہتی ہوں ان محبتوں کے ناتے جو آپ لوگوں کے دلوں میں میرے لئے ہے میں آپ سے یہ امداد قبول کرنے میں عار نہیں محسوس کرتی کہ آپ ملازمت کے حصول کے لئے میری مدد کریں۔ میں نوکری کروں گی کوئی چھوٹا سا مکان لے کر رہوں گی اور اس کے ساتھ ساتھ میں آپ لوگوں سے محبتوں کے رشتے قائم رکھوں گی۔ اس میں مجھے زیادہ لطف آئیگا اس وقت جیسا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ میرے چہرے پر وہ ہنسی وہ شگفتگی نہیں ہے جو ہونی چاہیئے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میں اپنے آپ کو یہاں ایک عجیب سی کیفیت میں محسوس کرتی ہوں۔ ثناء بہت اچھی ہے۔ دادی ماں اور امی اور تمام لوگ بہت اچھے ہیں اور آپ بہت اچھے ہیں۔ احسان احمد صاحب بہت نفیس انسان ہیں۔ میں اُن کی فراخ دلی اور اُن کی عظمت کو اچھی طرح محسوس کرتی ہوں۔ لیکن شہاب صاحب! میں بھی انسان ہوں میری اپنی ذات میں بھی ایک چھوٹی سی انا پوشیدہ ہے کیا آپ اس انا کو مُردہ دیکھنا پسند کریں گے؟ کیا میرے دل میں اپنی ذات کے لئے کوئی وقار پیدا نہیں ہو سکتا؟ کیا میں یہ نہیں چاہ سکتی کہ آپ لوگوں سے بے غرض ہو کر ملوں؟ بتلائیے۔ پلیز جواب دیجئے۔"

شہاب صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "اس سلسلے میں ثناء سے مشورہ کیا ہے آپ نے؟"

"جی نہیں۔ آپ نے اتنی گفتگو کی تو میری یہ ہمت پڑ گئی ورنہ ثناء سے میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی میں جانتی ہوں کہ وہ اس کے جواب میں کیا باتیں کہے گی۔ لیکن شہاب صاحب" اپنی ذات میں زندہ رہنے کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے یہ عارضی سہارا میرے لئے بہت قیمتی ہے اور آپ لوگوں کے اس احسان کو میں زندگی کی آخری سانسوں تک نہیں بھول سکوں گی۔ لیکن میری انا زندہ رکھنے کے لئے آپ میری مدد ضرور کیجئے۔"

"ہوں۔ تعلیم یافتہ ہیں آپ؟" شہاب صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بی ایس سی کیا ہے میں نے۔"

"گڈ۔ بہرطور مس رِدا! جو ذمہ داری آپ مجھے سونپنا چاہتی ہیں ان میں چھپے ہوئے خطرات کا جائزہ لیا ہے آپ نے؟"

"خطرات؟" رِدا نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ سب سے پہلا اور سب سے بڑا خطرہ ثناء ہے۔ میں نے اگر اس سلسلے میں اپنے طور پر کوئی قدم اٹھا لیا اور ثناء کو اس بات کا علم ہو گیا کہ اس سلسلے میں میری خدمات شامل ہیں تو جانتی ہیں کہ وہ میری بدترین دُشمن ہو جائے گی۔"

ثناء مسکرادی۔ اُس نے کہا: ہاں۔ میں جانتی ہوں لیکن آپ ایسا کریں کہ ثناء کو اس سلسلے میں کچھ نہ بتائیں۔ میرے لئے کوئی اچھی سی ملازمت تلاش کر کے مجھے بتادیں۔ ثناء سے میں خود بات کرلوں گی۔"

"بہتر ہے۔ لیکن میرا خیال ہے اس سے قبل آپ کراچی سے روشناس ہوجائیں جیساکہ آپ نے کہا۔ یہاں گھومیئے پھریئے۔ ان لوگوں کو اچھی طرح دیکھئے، اس سلسلے میں میری جو خدمات ہوسکتی ہیں حاضر ہیں۔ ثناء کے علم میں لاکر نہ سہی در پردہ میں آپ کو کراچی کے صنعتی علاقوں سے روشناس کراؤں گا۔ اگر آپ پسند کریں گی۔"

"آپ کے ساتھ میں باہر نکلنا بالکل بُرا نہیں سمجھتی شہاب صاحب آپ انتہائی شریف النفس انسان ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے آپ غور کرلیجئے۔ اس کے بعد اس سلسلے میں ہم کوئی پروگرام ترتیب دے لیں گے۔ آپ جب بھی حکم دیں گی میں آپ کی اس خدمت کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔ یوں تو ہمارے اپنے ہاں بے شمار جگہیں نکل سکتی ہیں لیکن رُدا! ہم آپ کا احترام کرتے ہیں۔ آپ کو اپنے ہاں ملازم رکھنے کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتے ہم۔ میں آپ کے شایانِ شان کوئی ملازمت تلاش کردوں گا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا لیکن اس سے پہلے میں نے جو آپ سے کہا ہے آپ وہی کریں۔"

"میں بہت جلد آپ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کردوں گی۔" رُدا نے کہا۔

"مجھے اجازت دیجئے۔ زیادہ دیر آپ کے پاس رُکنا میرے خیال میں ٹھیک نہیں ہے۔" شہاب نے کہا اور وہاں سے واپس چلا آیا۔

دل ہی دل میں وہ مسکرا رہا تھا۔ بات بڑے شاندار پیمانے پر بن گئی تھی۔

رُدا کا قرب حاصل کرنے کیلئے اس کی اَنا جگائے رکھنا بے حد ضروری تھا تاکہ وہ اُن کے ساتھ بے روک ٹوک آجاسکے۔

▼

ثناء گلوریا کے ساتھ واپس آگئی۔ وہ کچھ اُداس تھی۔ اور اُس کی وجہ گلوریا کو ملنے والا ایک پیغام تھا۔ گلوریا تو اپنی دوست کیتھی کو اپنے ڈیڈی کیلئے پیغام دینے گئی تھی لیکن کیتھی سے معلوم ہوا کہ گلوریا کے ڈیڈی کی طبیعت کافی خراب ہے۔ اُنھوں نے گلوریا کو اس لئے اطلاع نہیں دی کہ وہ پریشان ہو جائے گی۔

اُنھوں نے سوچا کہ کچھ دن کے بعد تو گلوریا واپس آہی جائے گی۔ کیتھی نے بتایا تھا کہ گلوریا کے ڈیڈی ہاسپٹل میں داخل ہیں اور گلوریا نے فوری واپسی کا پروگرام بنالیا تھا۔ رُدا کو اس نے یہ تمام تفصیل بتائی تو رُدا بھی اداس ہوگئی۔

"واقعی مس گلوریا کے ساتھ تو ہم لوگ ذرا بھی وقت نہیں گزار سکے۔"

"سوری ڈیئر۔ ڈیڈی صحت یاب ہوجائیں گے تو ایک بار پھر میں یہاں آؤں گی۔ مجھے تم سب لوگ اور تمہارا یہ علاقہ بے حد پسند آیا ہے۔ مجبوری ہے کیا کیا جاسکتا ہے۔" گلوریا نے جواب دیا۔

رات گئے تک تینوں ساتھ رہی تھیں اور گلوریا کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی تھی۔

رات کے کھانے پر احسان احمد صاحب کو اس بات سے آگاہ کیا گیا اور احسان صاحب بھی افسوس کا اظہار کرنے لگے۔

دوسرے دن گلوریا کے تمام کام مکمل کرادیئے گئے تھے۔

تیسرے دن دوپہر کو ایک بجے کی فلائٹ سے اس کی سیٹ بھی بک کرادی گئی تھی۔

اور پھر ثناء، رُدا اور دوسرے لوگ ایئرپورٹ پر گلوریا کو چھوڑنے آئے۔ جاتے ہوئے ثناء نے گلوریا کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"گلوریا! میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گی۔"

گلوریا کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آرہی تھی جب اُس کا طیارہ فضا میں بلند ہوگیا تو ثناء ٹھنڈی سانس لے کر رُدا کے ساتھ واپس چل پڑی۔

"حسین لڑکی تھی۔ مجھے بہت متاثر کیا تھا اس نے۔"

رُدا خاموش رہی تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھی پہنچ گئی تھیں۔ ثناء اور رُدا ساتھ ساتھ ہی کمرے میں گھُسی بیٹھی رہی تھیں۔

شام کو پانچ بجے کے قریب وہ تیمور کو لان پر چہل قدمی کرانے کے لئے باہر لے آئیں۔ اتفاقیہ طور پر ہی اُن کی نگاہیں ملازموں کے کوارٹر کی طرف اُٹھ گئیں اور دفعتاً ہی رُدا چونک پڑی۔

"ارے ثناء۔ اِدھر دیکھو اللہ رکھی۔" ثناء نے رُدا کے اشارے کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔

اللہ رکھی اور اس کی بہن دونوں ہی اس کی سمت چلی آرہی تھیں۔

"بُلاؤ بُلاؤ۔ انھیں اِدھر بُلاؤ۔ باہر تو نکلیں یہ لوگ۔

"جو اس کا تصور کرے گا اُسے ہی کوٹھی سے نکال دیا جائے گا۔" ثناء نے سینہ تان کر کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو تم لوگ جمن کی ماں کے کفن دفن کی تیاری کرلو ساتھیو۔ آغاز جنگ کیوں مالک کی بیٹی؟" ندرت نے گردن ٹیڑھی کرکے ثناء کو دیکھا۔

"بالکل اللہ رکھی۔" ثناء نے بھی اُسی انداز میں کہا۔ رُدا اور عصمت ہنستی رہی تھیں۔ کافی دیر تک چاروں ساتھ رہیں اور اُس کے بعد کچھ پروگرام بنے پھر عصمت نے اجازت مانگ لی۔ رُدا اور ثناء انھیں جاتے دیکھتی رہی تھیں۔

"کیا خیال ہے رُدا۔۔۔؟"

"واقعی بے چاریوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ بہت نفیس لڑکیاں ہیں۔"

"میں ڈرائیور غلام احمد کے بارے میں سوچ رہی ہوں یُوں لگتا ہے جیسے خاصے اچھے لوگ ہوں۔ ممکن ہے کسی حادثے کا شکار ہوکر اس حال کو پہنچے ہوں۔"

"سو فیصدی ایسی ہی بات ہے۔"

"کبھی موقع ملا تو پہلے ندرت سے پوچھوں گی۔ ویسے رُدا! شاندار لڑکی ہے۔"

"ہاں۔ عام لڑکیاں کبھی اپنے سے بڑے لوگوں سے اس طرح بے تکلف نہیں ہوسکتیں۔ بہرحال وہ اتنی بیباک ہے کہ بغیر کسی وقت کے سب کچھ بتا دے گی۔"

"ہاں! کسی اور نے بھی ہم سے کچھ وعدہ کیا ہے۔" ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور رُدا تیمور کی طرف دیکھنے لگی۔

* *

ثناء رُدا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تیمور کے ساتھ وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی آنکھ کھل گئی غسل خانے میں جاکر مُنہ ہاتھ دھویا اور پھر کچھ اور سُوجھا تو رُدا کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ شام کے چار بجے تھے۔ لیکن رُدا کمرے میں نہیں تھی۔ غسل خانہ میں جھانکا اور باہر نکل آئی۔ اور پھر اس کے بارے میں پُوچھ گچھ کرنے لگی۔

لیکن رُدا کا کہیں پتہ نہیں چل سکا تھا۔ "کہاں گئی یہ رُدا۔۔۔؟" اس نے پریشانی سے سوچا۔

"جی وہ دو بجے کے قریب باہر گئی تھیں۔" ایک ملازم نے کہا۔

"باہر۔۔۔؟ کہاں باہر۔۔۔؟"

"کوٹھی سے باہر۔ میں نے انھیں رکشہ میں بیٹھتے دیکھا تھا۔" ملازم نے جواب دیا۔ ثناء حیران رہ گئی تھی۔ لیکن ملازم سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا کسی اور سے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ واپس تیمور کے پاس پہنچ گئی۔ وہ کسی قدر پریشان ہوگئی تھی۔ رُدا نے پہلی بار ایسا کیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد رُدا واپس آگئی وہ سیدھی ثناء کے کمرے میں گئی تھی۔ پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی ہاتھ میں شاپنگ بیگ دبے ہوئے تھے۔

"رُدا!" ثناء نے تعجب سے کہا۔

"کچھ خریداری کرنے گئی تھی۔"

"اکیلی کیوں گئی تھیں؟"

"اس لئے کہ تم مجھے وہ نہ کرنے دیتیں جو میں چاہتی تھی۔" رُدا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سمجھ رہی ہوں۔ لیکن رکشہ لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ راستہ بھٹک جاتیں تو کیا ہوتا؟"

"کیوں تم اتنی گمنام ہو۔ احسان صاحب ایسے اجنبی ہیں اس شہر کے لئے کہ میں یہاں نہ پہنچ سکتی۔" رُدا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ثناء ہنس پڑی۔

"رُدا بی بی! یہ کراچی ہے۔ یہاں ہر دوسرے مکان میں ایک احسان احمد رہتے ہیں یہ اس شہر کی شان ہے۔ روایت ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بے تعلقی کو بھی اپنی عظمت سمجھتے ہیں۔ اس بھول میں نہ رہنا کہ صرف احسان احمد صاحب کا نام لے دینا کافی ہوگا۔"

"میری پیاری سی ثناء۔ لاہور چھوڑ چکی ہوں کراچی آباد کرنا ہے مجھے۔ اس سے واقف ہونا ضروری ہے سمجھیں تم۔ دو چار بار بھٹکوں گی پھر سب راستے یاد ہو جائیں گے۔"

"بعض اوقات بھٹکنے والے مشکلات کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔" ثناء نے کہا۔

"زندگی مشکلات کا دوسرا نام ہے۔" رُدا نے کہا۔

"لیکن آئندہ آپ جائیں تو گاڑی میں جائیں جب گاڑی موجود ہے تو۔۔۔" ثناء نے کہا۔ رُدا کے الفاظ نے اسے ایک لمحے کے لئے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لاہور چھوڑ چکی ہوں کراچی آباد کرنا ہے کیا تھا۔۔۔ لیکن اس نے کچھ پُوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ رُدا کو وہ بہت چاہنے لگی تھی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ رُدا جب تک خود اپنے بارے میں نہیں بتائے گی وہ کچھ نہیں پوچھے گی۔

"کیا خرید لائیں؟" اس نے کہا۔ اور رُدا نے ساتھ لائے ہوئے بنڈل اس کے سامنے کھول دیئے۔ یہ سلے ہوئے لباس تھے سادہ لیکن اسٹائلش۔ ثناء رُدا کا دِل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

اس کے پاس سینکڑوں ایسے جوڑے پڑے ہوئے تھے جو اُن کپڑوں سے کہیں قیمتی، کہیں خوبصورت تھے جنہیں ایک آدھ بار پہن کر اس نے پھینک دیا تھا لیکن رُدا کی اپنی دُنیا تھی وہ اسے اُترن کیسے دے سکتی تھی۔

"خُوب ۔ لاجواب۔ تمھاری پسند شاندار ہے۔"

"یہ ... یہ میں تمھارے لئے ..." رُدا نے ایک پیکٹ نکالا۔ اور اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ ثناء نے ایک لمحے میں محسوس کر لیا تھا کہ رُدا کی کیا کیفیت ہے۔

"جل رہی تھی اب تک جھلس رہی تھی ان کپڑوں کو دیکھ کر۔ نہ لاتیں میرے لئے کچھ پھر تماشہ دیکھتیں۔ ایک بھی جو پہننے دیتی ان میں سے تمھیں" ثناء نے کہا اور بنڈل جھپٹ لیا۔ اسے کھولا۔ اُن تمام لباسوں سے خوبصورت ایک سوٹ تھا۔ ثناء نے اُسے اپنے بدن سے لگا کر دیکھا آئینے کے سامنے گئی اُس کی آنکھوں سے مسرت ٹپک رہی تھی۔

"کرم، نوازش، شکریہ" اس نے گردن خم کر کے کہا۔ رُدا اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "شکریہ قبول فرمائیے خاتون" ثناء پھر بولی۔ اور رُدا مسکرا دی۔

"بہت بڑی ہو ثناء۔ واقعی بہت بڑی ہو۔ تم نے ایک گھٹیا سے تحفے کی پذیرائی کی ہے۔"

"نہیں رُدا۔ بہت چھوٹی ہوں۔ بہت گھٹیا ہوں کہ ابھی تک تمھارا اعتماد نہیں حاصل کر سکی" ثناء نے جواب دیا۔ اور رُدا چونک پڑی۔ اسی وقت ایک ملازمہ کی آمد نے ماحول بدل دیا۔

"جی وہ۔ اللہ رکھی آپ سے ملنے آئی ہے" ملازمہ نے اطلاع دی۔

"اللہ رکھی" ثناء نے کہا اور پھر ہنس پڑی "کہاں ہے وہ؟"

"باہر کھڑی ہوں" دروازے سے آواز آئی۔ اور ثناء جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ارے آؤ نُدرت۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ آؤ پلیز" ثناء نے کہا۔

"مالک کی بیٹی! میں جھوٹے کو حد تک پہنچانے کی قائل ہوں دوستی کا دعوٰی کر کے اس طرح غائب ہو گئیں کہ شکل بھی نہ دکھائی۔ کیا غلطی کا احساس ہو گیا؟"

"اے بیوقوف لڑکی عرف اللہ رکھی۔ اس کے بعد ایسی کوئی فضول بات نہ کرنا سزا پائے گی" ثناء نے کہا۔

"پھر یہ پُراسرار گمشدگی کیا معنی ..." نُدرت نے کہا۔

"آنے والے تھے ہم شام کو تمھارے گھر" ثناء نے کہا۔

"خُدا حافظ" نُدرت کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو بھئی۔ تمھاری ڈرامائی صلاحیتوں کے تو ہم پہلے ہی قائل ہیں" ثناء نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"مونالیزا! تم صرف مسکراتی ہو یا کچھ اور کام بھی کر لیتی ہو؟" اس بار ندرت رُدا کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میں اس آفت النساء کو دیکھ رہی ہوں جس کی زبان کے سامنے قینچی شرماتی ہے" رُدا نے کہا۔

"شکریہ بندی کس قابل ہے" ندرت نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

"سُناؤ نُدرت تمھاری ہونے والی ساس کا کیا حال ہے؟" ثناء نے کہا۔

"ابھی تک پتہ نہیں چل سکا۔ دراصل میرے وسائل محدود ہیں کام چالو کرنے کے لئے کچھ اوزار درکار ہیں لیکن"

"اوزار ..." ثناء ہنس کر بولی۔

"کچھ اشیاء درکار ہوں گی جیسے کالے بکرے کی سری کلیجی وغیرہ"

"ان کا کیا کرو گی؟"

"ساس صاحبہ کی خدمت میں پیش کروں گی۔ بھوتوں کی خاص دلچسپی ہوتی ہے ان چیزوں سے۔ عزیزہ خوشدامن کا کھیل دیکھنا ہو تو ان چیزوں کی فراہمی ضروری ہے۔"

"منگوا دی جائیں گی" ثناء نے کہا۔

"کیا فائدہ ثناء۔ اب وہ بے چاری تو یہ کہہ چکی ہیں تو پھر انھیں کیوں پریشان کرتی ہو۔ خود کوئی حرکت کریں تو دوسری بات ہے۔"

"ارے واہ۔ زنگ لگا لیں خود کو۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔ کل کوئی مالی منہ اُٹھائے چلا آئے گا۔ دُشمن کو شہر پناہ کے دروازے سے دُور ہی روک دو، ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے" ندرت بولی۔

"میں تمھارا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں نُدرت" رُدا نے کہا۔

"میرے گھر چلو تمھیں کچھ چائے وغیرہ پلواؤں۔ اس خشک جگہ سے کچھ نہیں ملے گا" ندرت نے بیباکی سے کہا۔

"توبہ ہے۔ یہ لڑکی تو واقعی بڑی مُنہ پھٹ ہے۔ چلو رُدا باہر چلیں لان پر ہی چائے پئیں گے۔ دُھوپ ڈھل چکی ہے۔"

"تیمور سو رہے ابھی؟"

"میں جگاؤں گی۔ تم دونوں چلو۔ میں اسے لیکر اور چائے کے لئے کہہ کر آتی ہوں" ثناء نے کہا۔ رُدا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ثناء اور رُدا کچھ سنجیدہ ہو گئی تھیں لیکن ندرت کی آمد نے یہ سنجیدگی یکلخت ختم کر دی تھی۔ رُدا ندرت کے ساتھ باہر لان پر آ گئی۔

"آپ کا جغرافیہ کیا ہے مونالیزا" ندرت نے راستے میں پوچھا۔

"ایک گمشدہ براعظم ہوں جسے ابھی دریافت نہیں کیا جا سکا۔"

"بڑے کھوجی ہیں ہم۔ واسکوڈی گاما کی ایسی تیسی" ندرت نے کہا۔ دونوں لان پر پہنچ گئیں۔

"عصمت کہاں ہیں؟" رُدا نے پوچھا۔

"باجی میری بکواس سے نالاں ہیں۔ ڈر کے مارے سوم نکلتا رہتا ہے اُن کا۔ ان کے خیال میں بڑے لوگوں سے گفتگو کے آداب ہونے چاہئیں احتیاط رکھنی چاہئے۔ اُن کے سامنے بھلا امیروں اور غریبوں کا کیا جوڑ۔ اب دیکھو نا رُدا۔ تم میرے سامنے اپنی ساری دولت کے انبار لگا دو۔ اور میں حقارت سے کہوں۔ جی نہیں صرف ایک پیالی چائے۔ تو کیا میں چھوٹی ہوئی ...؟"

"ہرگز نہیں" رُدا نے کہا۔

"میں ایسی ہی ہوں بس" نُدرت بولی۔ سامنے سے ثناء تیمور کو اُٹھائے ہوئے آ رہی تھی۔ دونوں اُسے دیکھنے لگیں۔

"انٹرویو شروع تو نہیں ہوا؟" اُس نے آتے ہی پوچھا۔

"نہیں، تمھارا انتظار تھا ویسے ثناء ندرت نے ایک بڑی پیاری بات کہی ہے۔"

"کیا؟" ثناء نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اور رُدا نُدرت کی کہی ہوئی بات بتانے لگی۔ ثناء نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"ہاں ندرت میں تم سے سو فیصدی متفق ہوں۔ خُدا کے فضل سے یہ گھر ابھی جانوروں کا باڑہ نہیں بنا۔ یہاں صرف انسان رہتے ہیں تم کبھی یہ خیال دل میں نہ لانا۔"

"تم کون ہو ندرت؟" رُدا نے پوچھا۔

"اللہ رکھی۔"

"پلیز سنجیدہ ہو جاؤ چند لمحات کے لئے" ثناء نے لجاجت سے کہا۔

"میں صرف ندرت ہوں ثناء۔ اور کچھ نہیں غلام احمد ڈرائیور کی بیٹی۔ گزرے ہوئے کل کی روشنی میں صرف کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہم آج ہیں صرف آج۔ اور آج اہمیت رکھتا ہے۔ جو گزر گیا سو کل عمر رسیدہ لوگ کل کی لکیر پیٹ کر سوگ مناتے ہیں مگر میں نے صرف آج دیکھا ہے۔ میں آج کی قائل ہوں۔ ہاں آنے والے کل کے لئے میرے دل میں امنگیں ہیں اور میں آنے والے کل کے راستوں پر دوڑنا چاہتی ہوں۔ میرے گزرے ہوئے کل میں پریشان حال غلام احمد کی کہانیاں ہیں۔ جو چھوٹے ڈپٹے سے دُودھ دینے والے سے خوفزدہ تھے، جو رحمان غنڈے سے دہشت زدہ تھے جس نے برے کام چھوڑ کر ریڑھی لگانے کا وعدہ کیا تھا اور اُن سے ہمارا رشتہ ماز کا تھا۔ میرے پریشان حال ابو جن کی صرف ایک آواز تھی کہ ان کی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں کون سمجھائے ثناء۔ ان لوگوں کو کہ اپنی اولاد پر بھی بھروسہ کرو۔ انھیں میدانِ عمل میں لاؤ۔ وہ اب صرف ریوڑ میں چلنے والی بکریاں نہیں ہیں۔ وہ تمھاری دستِ راست ہیں وہ تمھارا ساتھ دے سکتی ہیں وہ تمھارے مسائل میں تمھیں مشورہ دے سکتی ہیں لیکن ماضی کی آگ میں جلے ہوئے حال کی راکھ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ اس میں بھی چنگاریاں چھپی ہوں گی۔" ندرت بول رہی تھی او ثناء اور رُدا تعجب سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

نُدرت خاموش ہو گئی۔ چند لمحات یہ خاموشی سب پر طاری رہی، پھر ثناء نے کہا "تم نے تعلیم کتنی حاصل کی ہے ندرت؟"

"اگر یہ سوال ان الفاظ کی روشنی میں کیا گیا ہے ثناء تو یوں سمجھ لو کہ احساسات تعلیم کے تابع نہیں ہیں۔ میں ہوں اور عصمت باجی ہیں۔ ہم لوگ اورنگی ٹاؤن کی ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ اس جگہ کو جھونپڑی کہنا ہی مناسب ہے جہاں نہ بجلی کی روشنی تھی نہ پانی کی سہولت جہاں ایسے لوگوں سے رابطہ رکھنا پڑتا تھا جو انسان ہی تھے لیکن انسانی اقدار سے ناآشنا لیکن سمجھ لو اُن کے درمیان ہم اُن جیسے نہیں تھے ورنہ شاید کبھی اس ماحول کے بارے میں نہ سوچتے۔ طویل عرصہ ہم نے وہاں گزارا لیکن عصمت باجی کی دوستی اور اہلِ خاندان یعنی اماں بی اور ان کی سوچ میں یہ احساس پایا کہ ہم اس علاقے سے مختلف ہیں۔ اور ہم مختلف رہے اپنے باپ کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی رہتا تھا کہ ہم کسی انفرادیت کا اظہار نہ کریں۔ ہمارا تعاون جاری تھا کہ قدرت نے ہمیں ان مصائب سے نکال لیا۔ اُس وقت تک ہم بجھے نہیں تھے ثناء، ہم زندہ ہیں۔ اور زندگی پا کر زندگی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔"

"رُدا تم نے ایک بات محسوس کی؟" ثناء بولی۔

"کیا ...؟" رُدا چونک پڑی۔

"کیا یہ لڑکی بے پناہ صلاحیتوں کی مالک نہیں ہے؟"

"وہ تو ہے۔ لیکن اس وقت تم کونسی صلاحیتوں کا ذکر کر رہی ہو؟" رِدا نے کہا۔

"میں نے اُس سے سوال کیا تھا کہ نُدرت تم کیا ہو؟"

"یقیناً"

"اور اس کے جواب میں یہ مسلسل بول رہی ہے لیکن کیا اُس نے ہماری بات کا جواب دے دیا ہے؟"

رِدا کچھ سوچنے لگی پھر ہنس پڑی یہ نہیں نُدرت بھی مُسکرانے لگی تھی۔ اس نے کہا۔

"دیکھو مالک کی بیٹی۔ میں نے اپنے بارے میں سارے جوابات دے دیئے جو بات دوسروں سے تعلق رکھتی ہے اس کے بارے میں نہ تو میری معلومات زیادہ ہیں اور نہ میں کچھ بتا سکتی ہوں۔"

"تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟"

"مشرقی پاکستان سے آئے تھے ہم لوگ۔ مگر اُس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ اس لئے مزید کچھ نہیں جانتی" نُدرت نے جواب دیا۔

"غلام احمد وہاں کیا کرتے تھے؟"

"کار چلاتے ہوں گے ورنہ اس لائن کا تجربہ کیسے ہوتا؟"

"اچھی...؟" ثناء نے کہا۔

"خدا جانے۔"

"چھوڑو ثناء تم بھی بس ایک بات کے پیچھے پڑ جاتی ہو ہم نُدرت سے واقف ہو چکے ہیں اتنا ہی کافی ہے۔ یہ ہماری دوست ہے۔ دوستی کے قابل ہے اس لئے دُرست ہے۔ باقی سب ٹھیک ہے۔" رِدا نے کہا۔

"نہیں رِدا۔ بس مجھے حیرت ہے اس لئے پُوچھ رہی تھی۔ چلو ٹھیک ہے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے سامنے اس سے بڑے بڑے مسئلے ہیں۔" ثناء نے شرارت آمیز نگاہوں سے رِدا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اور رِدا نے جھینپتے ہوئے انداز میں گردن جھکالی۔

رِدا کافی اُلجھن میں تھی۔ ثناء کی شخصیت اور اُس کی کوٹھی کے لوگوں سے وہ اچھی طرح واقف ہوتی جا رہی تھی۔ اب یہاں رہنے والوں کے بارے میں بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا احسان احمد بڑے بزنس مین ہونے کے باوجود نیک فطرت انسان تھے۔ اہل خاندان کو جمع کر کے اُن کی ہر طرح امداد کرنا اس دور کی بات نہیں ہے لیکن اس کوٹھی میں بلاتفریق ایسا ہو رہا تھا ثناء کی ہم عمر بہت سی لڑکیاں یہاں تھیں ثناء کسی کے لئے بُری نہیں تھی لیکن وہ بس اپنی فطرت سے میل کھاتی لڑکیوں سے دوستی رکھتی تھی باقیوں سے واجبی سی ملتی تھی احسان احمد کی اکلوتی ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت کی اہمیت تھی۔ چنانچہ رِدا اگر پوری زندگی یہاں رہنا چاہتی تو اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ آخر کوئی جواز تو ہو۔ ہر چند کہ ثناء اُسے بہت چاہتی تھی اُس کا احترام کرتی تھی۔ لیکن اگر غور کیا جائے یا کوئی اس بارے میں سوچے تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ رِدا ثناء کی دوستی کے سہارے اُس کے ٹکڑوں پر پل رہی ہے اور یہ بات رِدا کو گوارہ نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اُس نے کوئی فیصلہ کیا تو ثناء کہرام مچا دے گی، زمین آسمان سر پر اُٹھا لے گی اور اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ وہ ثناء کی دوستی سے محروم ہو جائے حقیقت یہ تھی کہ رِدا خود بھی کراچی کی ویران تنہائیوں میں ثناء کا سہارا پاکر اپنے آپ پر مغرور ہو گئی تھی اور وہ خود بھی ثناء کی دوستی اور محبت کا شکار ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی تیمور کا مستقبل اور اپنی زندگی کو کسی صحیح راستے پر لانا اُس کا مسئلہ تھا اور وہ اپنے آپ کو اس کے لئے معطل نہیں کر سکتی تھی، کچھ بھی ہو جائے کتنی ہی مشکلات سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ اُسے اپنی ایک الگ دُنیا درکار تھی وقتی بات دوسری تھی۔ لیکن تعطل کا شکار ہو کر بیٹھ جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ بہت کچھ سوچ رہی تھی اس سلسلے میں اچھی طرح جانتی تھی کہ معصوم ثناء کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں اُبھرا ہوگا کہ رِدا اُسے چھوڑ جائے گی۔ بڑا تعاون کر رہی تھی وہ رِدا کے ساتھ، ورنہ اس کی متنوع طبیعت کبھی اس بات کی متحمل نہ ہوتی وہ رِدا کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش نہ کرتی۔ لیکن اُس نے اپنی طبیعت کے خلاف رِدا کو یہ موقع دیا تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتائے بغیر اپنی دوستی جاری رکھے بے شک رِدا کو ثناء سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس کے لئے ابھی یہ مناسب وقت نہیں تھا۔ اپنی ذات کو وہ کسی بھی قیمت پر کسی کے سامنے ہلکا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کراچی آتے ہوئے اُس نے سوچا تھا کہ کچھ دن کسی ہوٹل میں قیام کرے گی اور پھر ملازمت کی تلاش میں نکلے گی، ہر چند کہ اُسے اس سلسلے میں تمام مصائب کا احساس تھا لیکن بہرطور اُس نے ہمت کی تھی، اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ ہمت یہاں آکر پست ہو گئی تھی۔ اسٹیشن پر پہلے شہاب صاحب اور پھر ثناء مل گئی تھی اور سب کچھ غیر متوقع طور پر ہی ہوا تھا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ثناء اتنی اچھی طبیعت کی مالک ہوگی۔ اس نے وقتی طور پر یہ سوچا تھا کہ چلو اگر ہوٹل میں نہ سہی، کسی گھر میں اُسے ایک رات کے لئے پناہ مل جائے تو دوسرے دن وہ اپنے مقصد کے لئے کام کرے گی، لیکن یہاں آکر وہ کچھ ایسی پھنسی تھی کہ نکلنا تو کجا اس کا ذکر تک نہ کرنے پائی تھی۔ اس نے پہلا قدم اُٹھایا تھا کہ تنہا اپنے کپڑوں کی خریداری کے لئے نکل گئی تھی۔

ثناء کی محبت کو ٹھکرانا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ثناء نے اُس کی ذات پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا تھا اُس وقت اُس کے پاس کوئی کپڑے نہیں تھے سوائے بدن کے ایک جوڑے کے جب ثناء نے اپنا لباس اُسے دیا تھا۔ رِدا اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر وہ ذرا سی چھوٹ دے تو ثناء اُس کے سامنے لباسوں کے انبار لگا دے۔ لیکن یہ سب کچھ جائز تو نہیں تھا۔ تیمور پر تو ثناء نے اپنا حق جما لیا تھا۔ اگر اب رِدا کو اس کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے بھی ندامت ہوتی تھی اور تیمور کے لباس وغیرہ کی مشکل کو ثناء نے خود ہی حل کر لیا تھا۔ بہرطور رِدا کے دل میں اب یہ خواہش شدت پکڑتی جا رہی تھی کہ کسی بھی طرح ممکن ہو سکے اپنے مقصد کی تکمیل کرلے۔ بعض معاملات میں وہ خاصی ٹھوس طبیعت کی مالک تھی اور اگر کوئی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیتی تو پھر حالات کی پرواہ کئے بغیر اُس پر عمل کر ڈالتی تھی تیمور کے معاملے نہ ہوتے تو شاید اب تک وہ یہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہوتی لیکن یہاں تو ثناء کے پیار نے بیسیوں زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ اس زنجیر کی کچھ کڑیاں ڈھیلی کر کے کم از کم ملازمت کا بندوبست تو کر ہی لینا چاہیئے، شہاب صاحب نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی بالکل درست تھا، بلاشبہ اُن کے ہاں رِدا کو بہترین نوکری مل سکتی تھی۔ لیکن ان حالات میں رِدا خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ ثناء کے باپ کی ملازم بن کر رہے۔ چنانچہ اب وہ اس موقع کی تلاش میں تھی کہ کسی بھی طرح شہاب صاحب سے کہہ کر اپنے لئے ملازمت کا بندوبست کرے۔

ابھی تک وہ اس سلسلے میں شہاب صاحب سے دوبارہ رابطہ قائم نہیں کر سکی تھی۔ معمولات جوں کے توں چل رہے تھے۔

اُس شام ثناء نے اپنی شہری دوستوں کو بُلا کر ایک چھوٹی موٹی سی پارٹی کا بندوبست کیا تھا۔ لان پر رنگین کُرسیاں بچھا کر ان کے درمیان میزیں ڈال دی گئی تھیں۔ چمن اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانے پکانے میں مصروف تھا۔ نُدرت اور عصمت کو خاص طور سے اس پارٹی میں دعوت دی گئی تھی اور شام کو اچھی خاصی ہنگامہ خیزیاں ہو گئی تھیں۔ ثناء کی شوخ طبیعت کا یہاں بھی اظہار ہو رہا تھا۔ تیمور کو اپنا بچہ کہہ کر وہ لڑکیوں کو حیرت میں ڈال رہی تھی۔ اس پارٹی میں بزرگوں کو شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ ثناء کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔

ندیمہ ابراہیم علی نے جس کی شادی ابھی چند ماہ پہلے ہوئی تھی تیمور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے ثناء کس کا بچہ ہے یہ۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس کے نقوش تم سے ملتے جلتے ہیں۔"

"ارے جناب آپ ہی کا بچہ ہے یہ۔" ثناء نے گردن خم کر کے کہا۔

"کک۔ کیا مطلب...؟"

"بھئی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو وقت سے پہلے کسی کو نہیں بتائی جا سکتیں لیکن اب تم نے پُوچھ ہی لیا ہے تو تمہیں یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ یہ میرا پہلا بچہ ہے۔" ندیمہ ابراہیم علی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔

"سبحان اللہ گویا آپ نے شادی سے پہلے ہی اس شوق کی تکمیل کرلی؟"

"جی ہاں جی ہاں۔ میں ذرا متنوع طبیعت کی مالک ہوں۔ بہرطور مجھے اُمید ہے کہ آپ اس سلسلے میں تفصیلات کے لئے پریشان نہیں ہوں گی۔" ثناء نے تیمور کے رخسار پر بوسہ دیا اور وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

لڑکیوں نے ثناء کو گھیر لیا تھا کیونکہ ندیمہ ابراہیم علی نے چند اور لڑکیوں کو بھی یہ بات بتا دی تھی۔

"بھئی ثناء کیا بدتمیزی ہے یہ تم خواہ مخواہ اپنا کیریکٹر خراب کر رہی ہو۔"

"اتنے خوب صورت بچے کے لئے کیریکٹر کیا زندگی خراب کی جا سکتی ہے۔ تم کو اس کیا کر رہی ہو" ثناء نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بہرطور بچہ ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ کچھ لڑکیوں نے مذاق ہی مذاق میں تیمور کو پیسے دینا بھی شروع کر دیئے اور ثناء نے خوشدلی کے ساتھ ان کی دی ہوئی رقومات قبول کرلیں۔ اُس نے آخر تک کسی کو یہ نہیں بتایا کہ بچہ رِدا کا ہے۔ نُدرت اور عصمت بھی خاموشی سے مُسکراتی رہی تھیں۔ اس پارٹی میں وہ پوری طرح دلچسپی لے رہی تھیں، عصمت تو پھر بھی کچھ جھینپی جھینپی سی تھی۔ لیکن نُدرت کے انداز سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس قسم کی پارٹیوں کی پوری

طرح اہلیت رکھتی ہو اور یہ سب کچھ اُس کے لئے اجنبی نہ ہو۔ بعض اوقات تو ندرت کی یہ کیفیت دیکھ کر عصمت کو بھی تعجب ہونے لگتا تھا۔ اورنگی ٹاؤن کے ایک چھوٹے سے بدنما مکان میں ہوش سنبھال کر وہیں پرورش پانے والی یہ لڑکی ان آداب سے کس طرح واقف ہوگئی۔ لیکن شاید کتابیں اس کی معاون تھیں یا پھر عصمت کی دوستی، کیونکہ عصمت نے اُسے زندگی کے رکھ رکھاؤ کے بارے میں تمام باتیں بتائی تھیں۔ اپنے بارے میں بھی بتایا تھا اور اُسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ اس ماحول کی تخلیق نہیں ہے۔ جس میں سانسیں لے رہی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کا ندرت پر اس قدر خوشگوار اثر ہوگا۔ اس کی عصمت کو بھی توقع نہیں تھی۔

ندرت کو اس ماحول میں رچا بسا دیکھ کر وہ بڑی بہن کی حیثیت سے بے پناہ خوش تھی کہ کم از کم اس کی بہن کسی کمپلکس کا شکار نہیں ہے اور کسی بھی جگہ ان لوگوں سے کمتر نظر نہیں آ رہی۔ ثناء نے رِدا کے شانے میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"رِدا تم اس ندرت کو دیکھ رہی ہو۔ کیا کہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی ڈرائیور کی بیٹی ہے"

"سچ بات یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوں آخر غلام احمد صاحب کی زندگی کیا ہے اس کے بارے میں معلوم کرنا ہی پڑے گا"

ثناء نے اُس کی بھرپور تائید کی، رات گئے یہ ہنگامہ خیزیاں ختم ہوئیں۔ ندرت اور عصمت تمام کام کو سمٹانے میں مصروف تھیں۔ کہ ثناء نے ندرت کو پکارا۔

"اللہ رکھی یہ ساری ذمّہ داریاں تمہارے شانوں پر ہیں۔ تمام کام ضرورت کے مطابق ہی کرنا، اور ہاں میں ایک خاص بات کی طرف تمہاری توجہ مبذول کرانا چاہتی ہوں"

"ارشاد، ارشاد..." ندرت نے کہا۔

"جمن آج کی اس محفل کا ہیرو ہے"

"سُبحان اللہ اور ہیروئن کون ہے"

"اب ہم اس بارے میں کیا کہیں، چھوٹا مُنہ بڑی بات ہوگی۔ لیکن واقعی کھانے پکانے کے سلسلے میں اُس نے کمال کیا ہے۔ میرا خیال ہے تم خصوصی طور پر اس کا شکریہ ادا کر دو"

"میں" ندرت نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمہارا شکریہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ندرت" ثناء نے شرارت آمیز انداز میں کہا اور ندرت اُسے بغور دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"او کے مالک کی بیٹی ٹھیک ہے۔ میں اُس کا خصوصاً شکریہ ادا کردوں گی" ندرت کے ذہن میں شاید کوئی شرارت پروان چڑھ چکی تھی۔ بہر طور سامان سمٹواتے ہوئے وہ کچن میں پہنچ گئی۔ جمن وہاں موجود تھا۔ گو ندرت اُسے نہیں پہچانتی تھی، لیکن ایک بار اُس نے جمن کو تین نمبر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہی جمن ہو سکتا ہے۔

جمن نے شاید ندرت کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ندرت کچن میں اُس کے قریب پہنچ گئی۔

"آج تو... آپ نے کمال ہی کر دیا مسٹر جمن" اس نے نرم اور شیریں لہجے میں کہا اور جمن مُنہ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔

"جی بی بی جی! میں نہیں سمجھا"

"میں بی بی جی نہیں ہوں" ندرت نے کہا اور جمن کے ہاتھ سے کفگیر چھوٹ گیا۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ندرت خاموشی سے کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

"کیوں آپ پریشان کیوں ہوگئے مسٹر جمن؟"

"مسٹر جمن..." جمن ہکلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں"

"آپ آپ۔ دو نمبر میں رہتی ہیں"

"ہاں بھئی۔ کمال ہے میں تو آپ کو روز چھپ چھپ کر دیکھا کرتی ہوں۔ اور آپ مجھے پہچانتے بھی نہیں"

"اللہ... اللہ"

"کیا اللہ اللہ لگا رکھی ہے، کیا ہوگیا آپ کو؟"

"مم میرا مطلب ہے آپ اللہ رکھی ہیں"

"میں نے خود آپ کو اپنا نام بتایا ہے"

"اور دو نمبر میں..." جمن نے جواب دیا۔

"ہاں۔ بہرحال میں صرف آپ کے کھانوں کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ آج کی اس محفل میں آپ نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ خدا حافظ" ندرت نے کہا اور جمن کو ہکا بکا چھوڑ کر واپس آگئی۔

ثناء سے بھلا کہاں ضبط ہو سکتا تھا۔ اس وقت جب ندرت جمن کو گھس رہی تھی۔ ثناء کچن کے دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوئی تھی، رِدا کو بھی اُس نے اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن رِدا نے کہا تھا کہ بھئی مجھے صرف ان معاملات کے بارے میں بتا دیا کرو، میں ابھی ان باتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ تمہاری ہی کوٹھی کے لوگ نجانے کیا کیا سوچیں گے۔

جب ندرت کچن کے دروازے سے باہر نکلی تو ثناء تیزی

سے واپس پلٹ کر ایک ستون کی آڑ میں ہوگئی۔ وہ تماشہ دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن جمن بے چارے میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ باہر نکل کر ندرت کا پیچھا کرتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ثناء ندرت کے قریب پہنچ گئی۔

"تیرا ستیاناس اللہ رکھی، مار دیا تُو نے بے چارے جمن کو"

"ارے ارے کیا ہُوا بھئی، کیوں پریشان ہو"

"مسٹر جمن۔ خُدا کی پناہ، اُسے زندگی میں کبھی کسی نے اتنی محبت سے مخاطب نہیں کیا ہوگا اور پھر تو دو نمبر کا حوالہ بھی دے آئی ہے۔ گیا بے چارہ جمن، مارا گیا"

"ٹھیک ہے ان دونوں ماں بیٹے کو تو ایسے مارا جائے کہ انھیں مزا ہی آ جائے" ندرت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

آج کی پارٹی میں ثناء کی کئی اچھی دوست آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض تو نہایت ماڈرن لباسوں میں ملبوس تھیں۔ ثناء نے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد لان پر ہی چائے پینے کا پروگرام بنایا۔ پارٹی سے کچھ تھکن ہوگئی تھی۔ چائے کی اس محفل میں رِدا، ثناء، ندرت اور عصمت کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ دوسری لڑکیاں ان لوگوں میں بہت زیادہ گھلنے ملنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں... ہاں ان کی دوسری بات تھی جنہیں ثناء خود بھی اہمیت دیتی تھی۔ چنانچہ اس وقت ان چاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

"کیا خیال ہے ندرت مزا آیا۔ کیوں رِدا"

"ہاں واقعی۔ بڑی اچھی دوست ہیں تمہاری"

"جی نہیں جناب۔ یہ سب فیشن شو میں شریک ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہ سب شہر کے معقول لوگوں کی بیٹیاں ہیں لیکن اس قسم کی تقاریب میں شرکت کرتے ہوئے ان کے ذہن میں کسی سے ملنے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یہ سب اپنے اپنے لباسوں کی نمائش اور آرائش کے اظہار کے لئے اس قسم کی پارٹیاں اٹینڈ کرتی ہیں"

"خیر یہ تو اس طبقے کا معمول ہے ثناء ایسی کوئی خاص بات نہیں" رِدا نے جواب دیا۔

"وہ مسز طاہرہ فرقان کو دیکھا تھا تم نے" ثناء رِدا سے بولی۔

"کونسی، وہی اخروٹی رنگت کے بالوں والی"

"بالکل وہی۔ تم یقین کرو انتہائی بدشکل لڑکی تھی مگر کیا نکھارا ہے اپنے آپ کو شادی کے بعد۔ طاہرہ سے میری بہت زیادہ دوستی تو کبھی نہیں رہی۔ لیکن میں نے اُس کے انداز میں ہمیشہ ایک سلیقہ پایا ہے۔ آج بھی واقعی پوری محفل کی جان لگ رہی تھی بہت حسین لباس پہنا ہُوا تھا۔ اُس نے اور بالوں کی تراش... بس کیا کہوں ان دادی امّاں کو۔ اُنھوں نے میرے لئے بہت سے عذاب پیدا کر دیئے ہیں"

"کیا مطلب۔ دادی امّاں نے کیا کیا ہے" رِدا نے سوال کیا۔

"بھئی رِدا! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اگر بال تمہارے جیسے ہوں۔ تو انسان ضرور انھیں اپنے شانے پر بوجھ بنائے رکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر میرے جیسے بال ہوں تو اُن کے ساتھ یہ زیادتی ہے کہ اُنھیں اُن کی اصل شکل میں چھوڑ دیا جائے۔ میں بارہا اس خواہش کا اظہار کر چکی ہوں کہ مجھے بالوں کو تراشنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن دادی امّاں، دادی امّاں کہتی ہیں کہ زمین آسمان ایک ہو جائے لیکن میرے بال نہیں کٹیں گے، یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا"

"لیکن ثناء میں نے تو یہاں کئی لڑکیوں کے بال کٹے ہوئے دیکھے ہیں۔ جو تم لوگوں میں رہتی ہیں" ندرت کہنے لگی۔

"ہاں بے شک۔ ظاہر ہے دادی امّاں ہر شخص پر تو پابندی نہیں لگا سکتیں اور پھر ہمارے ابّو جان نے ایک درخواست کی ہے اُن سے کہ جن رشتہ داروں کو اُنھوں نے عزت و احترام کے ساتھ لا کر یہاں رکھا ہے۔ ان سب کا یہاں رہنا باعثِ برکت ہے، اُن پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالا جائے، جو انہیں ناگوار گزرے، ورنہ وہ محسوس کرنے لگیں گے کہ ہم ان پر احسان کر کے انھیں اپنا مطیع کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دوسروں کے معاملے میں دادی امّاں کیا مداخلت کر سکتی ہیں"

"ہُوں، تو تم بال کٹوانے کی خواہشمند ہو" ندرت نے پُوچھا۔

"میرانی صاحبہ! آپ ہی کوئی ترکیب بتایئے، آپ کی کھوپڑی اِن معاملات میں خاصی تیز چلتی ہے"

"ہو جائے گا، ہو جائے گا بچی، تیرا کام ہو جائے گا" ندرت نے شانِ بے اعتنائی سے کہا اور ثناء اس کے قریب آ بیٹھی۔

"اے ندرت! کوئی ایسی حرکت مت کر بیٹھنا تم، جس سے کسی کو نقصان پہنچ جائے، تم واقعی خطرناک لڑکی ہو" رِدا نے کہا۔

"مونالیزا! بس تم صرف مسکراتی رہا کرو۔ تمہارا نصیحتیں کرنا اچھا نہیں لگتا" ندرت بولی اور رِدا ہنسنے لگی۔ عصمت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ثناء اور رِدا آپ نے اس لڑکی کو اتنا مُنہ چڑھا لیا ہے کہ اب یہ بے لگام ہوگئی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ..."

"کچھ نہیں ہوگا باجی، آپ کیوں پریشان ہیں۔ اور سُنیئے آپ بلاوجہ خود کو اتنا لئے دیئے رہتی ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ اپنی عمر بڑھا رہی ہیں۔

ہم لوگوں میں شریک ہو جائیں۔ سال دو سال کا ہی تو فرق ہوگا ہماری اور آپ کی عُمروں میں کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ کو ان تمام تکلفات کی اجازت دی جا سکے۔ سمجھیں آپ؟" ثناء بولی اور عصمت ہنسنے لگی۔

دوسرے ہی دِن ثناء صبح ہی صبح نُدرت کے گھر پہنچ گئی۔ اُسے نُدرت کی طرف سے کسی اسکیم کا انتظار تھا۔ نُدرت گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد غسل کر کے تیار ہی ہوئی تھی کہ ثناء کی آمد کی اطلاع ملی اور وہ اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھ گئی۔ گھر کی رسمی باتوں کے بعد ثناء نُدرت کو ساتھ لے کر ایک کمرے میں گھس گئی۔

"کیوں بیرانی صاحبہ؟ کچھ سوچا اس خادمہ کے بارے میں؟"

"ہم نے کہا تھا تجھ سے کہ لڑکی کام ہو جائے گا تیرا؟"

"کب ہوگا؟" ثناء نے مُنہ پھُلاتے ہوئے کہا اور نُدرت آہستہ آہستہ اُسے کچھ بتانے لگی۔ ثناء کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اُسے نُدرت کی یہ تجویز پسند آئی ہے، بعد میں جب وہ نُدرت کے کمرے سے نکلی تو اُس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔

دوسرے دِن صبح ہی صبح وہ فضل خان مالی کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ فضل خان نمبر سات میں رہتا تھا۔ فضل خان کی بیٹی خیرن کے سر میں جوؤں کا کھیت تھا۔ اور اکثر اُس کی بیوی اس کھیت میں شکار کرتی رہتی تھی۔ شکار کے دوران میں وہ دھم دھم خیرن کو پیٹتی جاتی تھی اور جوئیں نکالتی جاتی تھی۔ اُس وقت خیرن کی بھوں بھوں قابل دید ہوتی تھی۔ یہ منظر کئی بار ثناء کی نگاہوں سے گزرا تھا لیکن اُس نے کبھی توجہ بھی نہیں دی تھی۔

البتہ نُدرت کی اِس تجویز پر اُس نے حیرت سے یہ بات سوچی تھی کہ نُدرت اطراف کے ماحول پر بھی پوری پوری نگاہ رکھتی ہے۔

فضل خان کی بیوی نُدرت کو دیکھ کر خیرن کو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے چچی جان...؟"

"اے بیٹی میں صدقے، میں واری۔ اِدھر کیسے آئیں؟ بس کیا بتاؤں اس کم بخت خیرن کے سر میں تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے جوئیں اُگتی ہیں۔ ارے صبح و شام دیکھتی ہوں۔ مارتی ہوں مگر جوؤں کی جتنی پیداوار اس کے سر میں ہے میں نے کہیں اور نہیں دیکھی،" فضل دین کی بیوی نے جواب دیا۔

"کمال ہے چچی جان، میں نے اتنی کوشش کی لیکن میرے سر سے کبھی ایک جوں بھی نہیں نکلتی۔"

"اے اللہ نہ کرے تمہارے سر میں جوئیں کیسے پڑیں گی بی بی! بڑی موذی چیز ہوتی ہے دماغ کا سارا خون چوس جاتی ہے۔"

"مجھے کچھ جوؤں کی ضرورت ہے چچی جان،" ثناء نے کہا۔ اور فضل خان کی بیوی حیرت سے مُنہ کھول کر رہ گئی پھر وہ ہنس پڑی۔

"اے بچی۔ مجھ سے شرارت کر رہی ہو، جیتی رہو۔"

"جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ بالکل درست ہے چچی جان، آپ ایک روپیہ فی جوں کے حساب سے روزآنہ دس جوئیں میرے ہاتھ بیچ دیا کریں۔ یہ لیں دس روپے کا نوٹ دس جوؤں کی ایڈوانس رقم،" ثناء نے دس روپے کا نوٹ نکال کر فضل خان کی بیوی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور فضل خان کی بیوی مزید حیران ہو گئی۔

"لیکن بی بی! کیا کرو گی ان جوؤں کا؟"

"دیکھئے دس روپے دس جوؤں کی ایڈوانس رقم اور یہ مزید دس روپے اس بات کے کہ آپ اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیں گی۔ بھول کر بھی کبھی کسی سے تذکرہ نہیں کریں گی کہ میں نے آپ سے جوئیں خریدی تھیں،" ثناء نے ہدایت کی۔

"تمہاری مرضی۔ مگر تعجب ہے کرو گی کیا...؟"

"میں کچھ بھی کروں۔ میں نے کہا نا آپ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیئے۔"

"تو پھر بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

"دس جوئیں،" ثناء نے کہا اور فضل خان کی بیوی نے فوراً ہی دس جانور اپنی جاگیر سے پکڑ لئے۔ ثناء نے خاموشی سے سر جھکا دیا تھا اس نے ایک آنکھ بند کر کے اشارہ کیا کہ جوئیں اس کے سر میں چھوڑ دی جائیں۔ بے چاری فضل خان کی بیوی پاگل ہوئی جا رہی تھی اس نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو ثناء نے سخت لہجے میں کہا کہ وہ ایڈوانس رقم وصول کر چکی ہے چنانچہ اپنا کام کرے فضل خان کی بیوی نے دس جوئیں گن کر اس کے سر میں چھوڑ دیں۔

دوپہر کو کھانے کی میز پر ثناء بُری طرح سر کھجا رہی تھی۔ حالانکہ وہ نفاست پسند تھی اور شرارتیں اپنی جگہ لیکن اس قسم کی بدسلیقگی کا مظاہرہ اس سے قبل اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ ذکیہ بیگم اور زیب النساء بیگم نے متعجبانہ انداز میں اسے دیکھا بہر طور اتفاق تھا اس لئے خاموش ہو گئیں لیکن شام تک ثناء نے اپنا سر دُھن کر رکھ دیا تھا۔ خاص طور سے وہ آج دادی اماں اور ذکیہ بیگم کے سامنے رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ثناء؟ سر میں بہت کھجلی ہو رہی ہے تمہارے؟"

"پتہ نہیں امی، بس کھجلی ہوئی جا رہی ہے،" اُسی وقت عارفہ بیگم سامنے آ گئیں اور اُنھوں نے بھی یہ باتیں سُنیں۔

"ذرا سر تو دکھاؤ،" عارفہ بیگم بولیں اور پھر گن کر پوری دس جوئیں اُنھوں نے ثناء کے سر سے نکال کر مار دیں۔

"یہ تمہارے سر میں جوئیں کہاں سے ہو گئیں؟" ذکیہ بیگم نے متعجبانہ انداز میں کہا۔

"پتہ نہیں امی، آپ خود دیکھتی ہیں، میں تو ذرا بھی گندی نہیں رہتی۔"

دو دِن کے وقفے کے بعد تیسرے دِن پھر دس روپے کا نوٹ معہ زبان بندی کے دس روپوں کے فضل خان کی بیوی کے پاس پہنچ گیا اور پھر دوسرا دن کھجلی کا دِن تھا۔ وہ چیختی چلاتی عارفہ بیگم کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ذکیہ بیگم اور دادی جان نے بھی اپنی آنکھوں سے دس جوؤں کی گرفتاری کا منظر دیکھا اور متعجب رہ گئیں۔

غرض چار پانچ دِن کی کوششوں کے بعد بالآخر یہی فیصلہ کیا گیا کہ سر کے بال چھوٹے کرا دیئے جائیں۔ کیس اصلی تھا اِس لئے دادی جان بھی خاموش ہو گئیں اور رات کو آٹھ بجے ثناء مسرت سے مُسکراتی ہوئی رِدا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ رِدا کو صحیح صُورت حال کا علم نہیں تھا۔ ثناء کے کٹے ہوئے بال دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔

"یہ... یہ..."

"کیسی لگ رہی ہوں ایمانداری سے بتاؤ رِدا؟" ثناء نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"خُدا کی قسم بے حد حسین۔ بڑی خوب صورت تراش ہے بالوں کی، تم تو بالکل ہی تبدیل ہو گئیں،" رِدا خوش ہو کر بولی۔

"آداب۔ آداب۔ خُدا پیرانی کو زندہ سلامت رکھے۔"

"نُدرت،" رِدا نے تعجب سے کہا۔ "یہ نُدرت کا کمال ہے؟"

"یقیناً۔ پیرانی کی تجویز پر چھ دِن عمل کیا خُدا کے فضل سے افاقہ ہو گیا۔"

رِدا ہنس پڑی، "کیا کیا۔ یہ تو بتاؤ۔"

اور ثناء اسے اپنی کارروائی کے بارے میں بتانے لگی۔

"خُدا تمہیں سمجھے ثناء۔ اور یہ نُدرت، اس آفت کو تو میں اچھی طرح جان گئی ہوں قیامت ہے پوری قیامت۔"

"بھئی اب پیرانی کا دِل سے قائل ہونا پڑا ہے۔ واقعی دیکھو اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب ہو سکتی تھی تم خود بتاؤ رِدا۔"

"نہیں، واقعی۔ نُدرت آفت کی پرکالہ ہے،" رِدا نے جواب دیا۔

"اب مزا آئے گا ایمان سے، دِلی خواہش تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ دادی جان قیامت تک اس کی اجازت نہیں دیں گی اور مجھے اُسی طرح رہنا پڑے گا اب یہ بال تو اِسی طرح ترشتے رہیں گے بس ایک بار اجازت مِل گئی۔ کافی ہے۔" رِدا ہنستی رہی تھی۔

کوٹھی کے معاملات میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تمام کام جوں کے توں چل رہے تھے۔ تیمور ثناء کے پاس رہتا تھا اور اس سے پوری طرح مانوس ہو گیا تھا۔ رِدا کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی عارفہ بیگم اگر رِدا کی ٹوہ میں تھیں۔ تو اتنی کامیابی سے اپنا کام انجام دے رہی تھیں کہ رِدا کو ابھی تک کسی قسم کا شُبہ نہیں ہو سکا تھا اور نہ ہی کوئی اور اس بات کو سمجھ سکا تھا۔

فطرتاً عارفہ بیگم تجسس پسند تھیں اور جس کے پیچھے پڑ جاتیں اس کی ٹوہ میں زمین آسمان ایک کر دیتی تھیں بہر طور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رِدا کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا جا رہا تھا کہ اب اس کا اس خاندان پر بوجھ بنے رہنا مناسب نہیں ہے۔ اُس کی اپنی ذات بُری طرح پاش پاش ہوئی جا رہی ہے۔

شہاب صاحب نے بھی اس کے بعد رِدا کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی وہ اُونچے کھلاڑی تھے اور شکار کو آرام آرام سے ہلاک کرنے کے قائل تھے وہ جانتے تھے کہ جو پھلجھڑی اُنھوں نے چھوڑی ہے وہ رنگ لائے گی۔ رِدا خود ہی اُن کی جانب متوجہ ہو گی یوں بھی اُن کی زندگی میں تفریحات کی کمی نہیں تھی چنانچہ کسی بڑے خطرے کو مول لینے کے قائل نہیں تھے۔

رِدا نے ابتدائی قدم کے طور پر اخبارات کا خصوصی مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ خاص طور سے وہ ضرورت ہے کے اشتہارات دیکھتی رہتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ اپنا یہ عمل بھی جاری رکھے ہوئے تھی کہ کبھی کبھی موقعہ پا کر باہر نکل جاتی رکشہ میں بیٹھتی اور کسی بھری پُری سڑک پر اُتر جاتی وہاں سے پیدل سفر کرتی رہتی۔ اور اب اُسے کراچی کی سڑکوں کا بخوبی اندازہ ہوتا جا رہا تھا وہ یہ جان چکی تھی کہ اُسے یہاں کس کیفیت میں زندگی گزارنا ہو گی۔

ثناء کو کئی بار معلوم ہو چکا تھا کہ رِدا کبھی کبھی باہر نکل جاتی ہے لیکن اب اُس نے رِدا سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ رِدا پر بہت زیادہ بوجھ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ نُدرت کے ساتھ اُس کی تفریحات جاری رہتیں کبھی کبھی رِدا بھی اس میں شریک ہو جاتی پھر ایک دِن رِدا نے خصوصاً شہاب صاحب کو تلاش کیا۔

شہاب صاحب اُس وقت نہ ملے لیکن رات کو آٹھ بجے کے قریب رَدا نے اُن کو جالیا۔

"آپ شاید اپنا وعدہ بھول گئے شہاب صاحب" وہ بولی۔

"اوہ رَدا! آیئے پلیز۔ کون سے وعدے کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ ملازمت کیلئے میری مدد کریں گے۔"

"ہاں۔ کہا تھا لیکن آپ نے فرمایا تھا کہ آپ خود ہی اِس سلسلے میں مجھے اِس وقت سے آگاہ کریں گی جب میں اِس کی کوشش کروں؟"

"تو آپ سمجھ لیجئے کہ میں اِس وقت آپ کو آگاہ کرنے آئی ہوں۔"

"رَدا! آپ نے ثناء وغیرہ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا ہے" شہاب صاحب نے پُوچھا۔

"شہاب صاحب! میں آپ کو اپنے خیالات بتا چکی ہوں اس پُرمحبت ماحول میں کون کافر ہے جو خوش نہ رہ سکے لیکن رُوح کی خوشی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کی ذات پر بوجھ نہ بنا جائے۔ آپ براہِ کرم میری مدد کیجئے، خُدا آپ کو اِس کا اجر دے گا۔"

"تو پھر میری پوزیشن کا بھی آپ کو خیال رکھنا پڑے گا۔ اگر کسی کو یہ پتہ چل گیا کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے تو آپ جانتی ہیں کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟"

"نہیں پلیز۔ آپ اس بات سے بالکل مطمئن رہیئے۔ میں کسی کو اِس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔" رَدا نے کہا۔

"تو پھر کل گیارہ بجے آپ کوٹھی سے نکل جایئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر خیابانِ شمشیر ہے وہاں میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ نے وہ جگہ دیکھی ہے؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ اچھی طرح، آپ کو علم ہے یہاں سے نکلتی رہتی ہوں۔"

"تو پھر آپ تشریف لے آیئے گا۔ میں آپ کو لے چلوں گا اور ہاں ذرا لباس وغیرہ پلیز۔ دیکھئے زمانہ اِس قسم کا ہے۔" شہاب صاحب نے کہا اور رَدا نے گردن ہلا دی۔

دوسرے دِن پونے گیارہ بجے وہ پروگرام بنا کر گھر سے نکل آئی۔ تھوڑی دیر تک پیدل سفر کرتی رہی اس کے بعد ایک رکشہ میں بیٹھ کر مطلوبہ جگہ کے لئے چل پڑی۔

خیابانِ شمشیر کے سامنے شہاب صاحب کی مرسڈیز کھڑی ہوئی تھی۔ رَدا نے رکشہ رُکوایا اور نیچے اُتر کر مرسڈیز کی جانب بڑھ گئی۔ رکشہ ڈرائیور معنی خیز نگاہوں سے یہ منظر دیکھتا رہا تھا شہاب صاحب نے مرسڈیز کا دروازہ کھولا اور رَدا اندر بیٹھ گئی۔ مرسڈیز اسٹارٹ ہو کر چل پڑی تھی۔ شہاب صاحب نے بظاہر رَدا کو گہری نگاہ سے نہیں دیکھا تھا لیکن یہ دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوئے تھے کہ رَدا ایک حسین، سادہ مگر پُروقار لباس میں ملبوس ہے اور اِس لباس میں اس کی شخصیت مزید نکھر آئی ہے۔

مرسڈیز چل پڑی۔ شہاب صاحب رَدا کو لے کر ایک خُوب صُورت ہوٹل میں پہنچ گئے تھے۔ یہ ہوٹل خاصی اچھی شہرت رکھتا تھا۔ اس کے ایئرکنڈیشنڈ ہال کے ایک گوشے میں اُنھوں نے رَدا کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔ رَدا کی طبیعت میں کچھ اُلجھن تھی لیکن اس وقت وہ سب کچھ برداشت کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

"یہاں، شہاب صاحب...؟"

"ہاں رَدا، بہت ساری باتیں کرنی ہیں آپ سے۔ کچھ تفصیلی گفتگو ہوگی" شہاب صاحب نے کہا اور کچھ کھانے پینے کا آرڈر دے دیا۔ وہ رَدا کے ساتھ بہت نرمی اور شفقت سے پیش آ رہے تھے

"سب سے پہلے میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں رَدا کہ آخر آپ کیسے حالات کا شکار ہیں کچھ تو کم از کم اپنے بارے میں بتایئے۔ اصل میں یہ ساری باتیں میں اس لئے پُوچھ رہا ہوں کہ آپ کے بارے میں فیصلہ کرنے میں مجھے آسانی ہو۔"

"اِن تمام باتوں کے جواب میں ایک بار پھر اتنا ہی عرض کروں گی شہاب صاحب کہ یوں سمجھ لیجئے میرا اس دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بالکل تنہا ہوں۔ بس ایک بچہ ہے جس کی ذات کیلئے میں سب کچھ کرنا چاہتی ہوں مجھے اس کا مستقبل سنوارنا ہے۔"

"آپ کے شوہر، میرا مطلب ہے معاف کیجئے گا کیا وہ زندہ ہے؟"

"نہیں" رَدا نے جواب دیا۔

"افسوس ہُوا یہ سُن کر۔ بہرطور آپ کس قسم کی ملازمت چاہتی ہیں؟" شہاب صاحب اس کی بیوگی کا سُن کر کچھ مطمئن سے ہو گئے تھے۔

"میں آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ میں نے بی ایس سی کیا ہے"

"دیکھئے رَدا، فی الحال تو کسی دفتر میں کلرک وغیرہ کی ہی ملازمت مِل سکتی ہے کیا آپ کو یہ ملازمت پسند ہوگی؟"

"بالکل پسند ہوگی۔ میں جانتی ہوں کہ اس سے زیادہ میری کوئی اہمیت نہیں ہے"

"خیر اہمیت تو آپ کی بہت زیادہ ہے رَدا، آپ کی شخصیت میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ میں

خود بھی آپ سے بے حد متاثر ہوں اور اس جذبے کے تحت آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں" آخری الفاظ میں شہاب صاحب نے اپنے کہے ہوئے الفاظ کو موم میں لپیٹ دیا تھا۔ رَدا نے کوئی خیال نہیں کیا تھا وہ اپنی ہی دُھن میں بولے گئی۔

"میں نہیں کہہ سکتی کہ ملازمت حاصل کرنے کے بعد کیا کیفیت ہوگی۔ یقیناً ثناء مجھ سے ناراض ہو جائے گی لیکن میں اُسے مناؤں گی۔ میں کہہ دُوں گی کہ تیمور کو میں اپنی ملازمت سے پرورش کرنا چاہتی ہوں کہیں یوں نہ ہو کہ بڑا ہو کر وہ یہ سوچے کہ میں نے اُسے بھی دوسروں کے رحم و کرم پر ڈال دیا تھا اور اس کی پرورش میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

"یقیناً۔ یہ ایک پُروقار بات ہے بلکہ رَدا اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لئے قیام گاہ کا بندوبست بھی کر سکتا ہوں میں آپ سے اتنا متاثر ہوں کہ میرا دِل چاہتا ہے کہ آپ کے لئے سب کچھ کر دُوں۔"

"تو پھر آپ سب سے پہلے میرے لئے ملازمت کا بندوبست کر دیں اُس کے بعد رفتہ رفتہ میں سب لوگوں کو اس کے لئے تیار کر لوں گی کہ مجھے الگ رہنے کی اجازت بھی دے دی جائے۔ جہاں تک اس گھر سے تعلق کا سوال ہے تو میرا خیال ہے ثناء اور دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑنا اب میرے لئے ممکن نہیں رہا ہے۔ ضروری تو نہیں ہے کہ میں ان کی گود میں بیٹھ کر ہی اُن سے پیار کرتی رہوں۔"

"یقیناً۔ یقیناً۔ میں آپ کو چند جگہوں پر لے چلتا ہوں آپ بالکل اس چیز کا اظہار نہ کیجئے گا کہ آپ کو ملازمت کی ضرورت ہے۔ بس میں ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو اُن سب سے روشناس کراؤں گا پھر آپ جگہ کا تعین کر لیں اور اس کے بعد میں آپ کو وہاں فکس اَپ کر دُوں گا۔"

رَدا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

پھر کچھ دیر بعد وہ رَدا کو لے کر وہاں سے اُٹھ گئے تھے۔

ان کے دوست تفسیر کا یہاں ایک باقاعدہ دفتر موجود تھا۔ جس میں وہ رہتا تھا۔ فرم توقیر صاحب ہی کی تھی شہاب صاحب نے یہی سوچا تھا کہ رَدا کو تفسیر کے ہاں ملازم کرا دیا جائے اور اس کے بعد وہ دونوں رَدا کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ تفسیر سے ملنے سے پہلے وہ ایسی دو تین جگہوں پر رَدا کو لے گئے جہاں ان کے ملاقاتی موجود ہوتے تھے وہاں رَدا کو ماحول دِکھانے کے بعد آخر میں شہاب صاحب اسے تفسیر کے پاس لے گئے۔

تفسیر کا یہ دفتر نہایت شاندار تھا۔ پورا دفتر ایئرکنڈیشنڈ اور صاف و شفاف تھا۔ جس کیبن کے سامنے شہاب صاحب رَدا کو لے کر رُکے اس پر چیئرمین کی تختی لگی ہوئی تھی۔ شہاب صاحب نے بے تکلفی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ تفسیر کو اُنھوں نے پہلے سے صُورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا تھا کیونکہ یہ سب کچھ اچانک ہی ہُوا تھا۔

تفسیر نے پُرجوش انداز میں شہاب صاحب کا استقبال کیا تھا اور شہاب صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے ہوشیار رہنے کے لئے کہا۔

"یہ میری عزیزہ رَدا ہیں۔ ملازمت کی متلاشی ہیں۔ اور اِن کے لئے کسی بہتر ملازمت کا بندوبست کرنا نہ صرف میرا بلکہ تمہارا بھی فرض ہے تفسیر۔"

"شرمندہ کر رہے ہیں شہاب صاحب۔ آپ کی کوئی عزیزہ اور ملازمت کے لئے پریشان ہوں۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بہرطور یہ سمجھ لیجئے آپ مسٹر تفسیر کہ رَدا ملازمت چاہتی ہیں۔"

"کیا تعلیم ہے ان کی؟" تفسیر نے پوچھا۔

"بی ایس سی کیا ہے۔"

"ملازمت کیا کرنا چاہتی ہیں؟"

"بھئی اِس کا فیصلہ کیا مجھے کرنا ہوگا؟"

"نہیں۔ میں کئے لیتا ہوں۔ لیکن رَدا کو میری پیشکش پسند ہو یا نہ ہو..."

"میں صرف ملازمت کرنا چاہتی ہوں میری پسند یا ناپسند کا کوئی سوال نہیں ہے۔"

"یہ فرم آپ نے دیکھ لی مس رَدا۔ آپ کو یہاں ملازمت کرنے میں کوئی دِقت تو نہیں ہوگی؟"

"جی نہیں" رَدا نے جواب دیا۔

"تو پھر میں آپ کو پرچیز آفیسر کی پوسٹ پیش کر سکتا ہوں۔ اتفاقیہ طور پر ہمارا پرچیز آفیسر ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ اور ہمیں اُس کی جگہ نئے آدمی کی ضرورت تھی میں اشتہار دینے والا تھا لیکن اب آپ شہاب صاحب کے ساتھ تشریف لائی ہیں تو یہ ذمہ داری آپ کو سونپی جا سکتی ہے معاف کیجئے گا جب شہاب صاحب نے یہ بات کہہ دی کہ آپ کو ملازمت کرنا ہی ہے تو میں آپ کو دوسرے کوائف سے بھی آگاہ کر دُوں۔ آپ کی ابتدائی تنخواہ تقریباً ساڑھے تین ہزار روپے ماہوار ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر آپ اپنی صلاحیتوں سے کچھ حاصل کر لیتی ہیں تو فرم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

آپ کو ایک اسٹینوگرافر اور ایک اسسٹنٹ لڑکی دی جائے گی جو آپ کے ساتھ کام کرے گی۔ وہ سامنے آپ کا الگ کیبن ہے ہمارے ہاں آپ کو کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

رُدا یہ تمام باتیں سُن کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ تو کسی ہزار بارہ سو روپے کی کلرکی کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن یہاں جو صُورت حال اس کے سامنے آئی تھی وہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ بڑھ کر تھی۔ اس نے پھُولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"معاف کیجئے گا ایک بات میں آپ سے عرض کرنا چاہتی ہوں یہ میری زندگی کی پہلی ملازمت ہے مجھے کسی چیز کا کوئی تجربہ نہیں ہے اگر میں اپنی ذمّہ داری ابتداء میں بخوبی نہ سنبھال سکی تو کہیں مجھے شرمندگی اُٹھانا نہ پڑے۔"

رُدا صاحبہ! آپ میرے عزیز ترین دوست کے ساتھ تشریف لائی ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ جو کچھ آپ نہ سمجھ پائیں گی وہ آپ کو سمجھا دیا جائے گا۔" تفسیر نے جواب دیا۔

"تب میں اس کے لئے آپ کی اور شہاب صاحب کی مشکور ہوں۔"

"آج ستائیس تاریخ ہے مِس رُدا، بہتر یہ ہوگا کہ آپ پہلی تاریخ سے اپنی ذمّہ داری سنبھال لیں اس دوران میں آپ اپنے آپ کو مکمل طور سے تیار بھی کرلیں گی۔"

"یقیناً۔" رُدا نے جواب دیا۔

"میرے لئے اور کوئی خدمت شہاب صاحب؟" تفسیر نے مُسکرا کر شہاب سے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ میں جانتا تھا کہ رُدا کو یہ جگہ پسند آئے گی دو تین جگہ اور بھی لے گیا تھا میں انھیں، لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اُن کے دِل میں وہاں کے لئے پسندیدگی نہیں ہے اب میں یہ نہیں کہوں گا مسٹر تفسیر کہ آپ خصوصاً اِن کا خیال رکھئے گا آپ کی اپنی بھی بہت ذمّہ داریاں ہیں۔"

"آپ اطمینان رکھیں شہاب صاحب۔"

تھوڑی دیر تک یہ لوگ تفسیر کے پاس بیٹھے رہے اس نے انھیں کافی پلائی تھی اور اس کے بعد شہاب رُدا کو لے کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ باہر نکل کر رُدا نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں تو... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی شہاب صاحب کہ مجھے اتنی اچھی ملازمت مل جائے گی۔"

"ہم سے خدمت لیتی رہیئے رُدا صاحبہ۔ ہم آپ کے بہت اچھے ساتھی ثابت ہوں گے۔"

"میں آپ کا کس مُنہ سے شُکریہ ادا کروں شہاب صاحب۔"

"جی نہیں۔ صرف شُکریہ سے کام نہیں چلے گا وقت آنے دیجئے ہم آپ سے اپنی ان کاوشوں کا صلہ بھی مانگ لیں گے۔" شہاب صاحب نے کہا اور رُدا ایک نگاہ اُنھیں دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

شہاب صاحب نے رُدا کو مرسڈیز میں بٹھایا اور کہنے لگے۔

"اب کیا حکم ہے؟"

"پلیز، مجھے کسی ایسی جگہ اُتار دیجئے جہاں سے میں رکشہ کرکے گھر چلی جاؤں۔"

شہاب صاحب نے گردن ہلا دی آج کے لئے وہ صرف اتنا ہی کافی سمجھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے ایک مناسب جگہ رُدا کو اُتار دیا۔ رُدا نے مشکورانہ انداز میں شہاب صاحب کو دیکھا اور پھر ایک رکشہ کی طرف بڑھ گئی۔

قیامت ہی ہوگئی تھی پتہ نہیں رُدا کی بدقسمتی تھی یا شہاب صاحب کی۔ یا عارفہ کی خوش قسمتی تھی کہ عارفہ بیگم نے عین اُس وقت جب رُدا شہاب صاحب کی کار سے اُتر کر رکشہ کی طرف بڑھ رہی تھی اُسے اور شہاب صاحب کو دیکھ لیا وہ اپنی کسی ملنے والی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ یہ گھر اُسی علاقے میں تھا ملنے والی ایک فلیٹ میں رہتی تھیں۔ وہاں کھڑی عارفہ بیگم رکشہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھیں کہ اُن کی نگاہ ایک خالی رکشہ پر پڑی لیکن ابھی وہ اس کی طرف بڑھنے بھی نہیں پائی تھیں کہ اُنھوں نے شہاب صاحب کی کار پہچان لی۔ وہ کار رُکی اور اس سے رُدا نیچے اُتر آئی اور اس سے قبل کہ عارفہ بیگم خود اس رکشہ کو پکڑتیں۔ رُدا اُس رکشہ میں بیٹھ گئی۔ شہاب صاحب رُدا کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے تھے۔

عارفہ بیگم نے دونوں ہاتھوں سے دِل پکڑ لیا اور اُن کے مُنہ سے بدحواسی کے عالم میں نکلا۔

"ہائے میرے خُدایا۔ یہ... یہ تو شہاب میاں تھے اور یہ رُدا۔ لو وہی ہُوا نا جس کا خدشہ تھا۔ ایک راہگیر چلتے چلتے اُن کے پاس رُک گیا۔

"امّاں آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"کیا... کیا۔ دماغ خراب ہے تیرا۔ امّاں لگتی ہوں تجھے شکل سے۔ جا، چل اپنا کام کر۔" عارفہ بیگم جھلّاتے ہوئے انداز میں بولیں اور راہگیر اُنھیں عجیب سے انداز میں دیکھتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔

عارفہ بیگم کے سامنے سے کئی خالی رکشہ گزر گئے لیکن وہ کچھ اس طرح بدحواس ہوئی تھیں کہ رکشہ بھی نہ روک سکیں اُن کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے نجانے کیا کیا سوچ لیا تھا اُنھوں نے۔

بہرحال ہوش آیا تو اُنھوں نے ایک رکشہ روکا اور کوٹھی کی جانب چل پڑیں۔ لیکن راستے میں بڑے بُرے بُرے خیالات اُن کے دِل میں آرہے تھے۔

"تو یہ معاملہ ہے۔ رُدا بی بی یہ ہیں اصل میں اسے میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے اب کیا کرنا چاہئیے؟ خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ گھر تک پہنچی تھیں اور پھر رکشہ والے کو کرایہ دے کر وہ اپنے رہائشی حصّے کی جانب چل پڑیں۔ اِس سلسلے میں خُوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا۔

شوہر گھر میں موجود نہیں تھے اکیلی ہی کمرے میں بیٹھی سوچتی رہیں پھر پان کھایا اور پان کھانے کے دوران بھی اُن کے ذہن پر مسلسل یہی سوچ طاری رہی۔ دادی امّاں نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ رُدا پر نگاہ رکھیں کوٹھی میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جس پر اُنھیں کوئی شُبہ ہوتا۔

رُدا ثناء کے ساتھ نظر آتی تھی اور کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوئی تھی جس کی اطلاع دادی امّاں یا ذکیہ بیگم تک پہنچائی جاسکے لیکن یہ گُل کھلائے جارہے ہیں تو یہ چکر شہاب میاں کا چلایا ہُوا ہے۔ اُن کے ذہن نے بہت کچھ سوچا۔ یہ بھی خیال آیا اُنھیں کہ کہیں شہاب ہی نے یہ چکر چلا کر اپنی کسی مُلّتی کو اس طرح کوٹھی میں لاکر نہ رکھا ہو۔ اور یہ بچّہ... یہ بچّہ شہاب کا بھی ہوسکتا ہے۔

عارفہ بیگم طبیعت کی بہت ہلکی تھیں خیالات کے تانے بانے بننا ان کا بہترین مشغلہ تھا ایک لمحے کے لئے اُنھوں نے سوچا کہ شوہر سے بھی اِس بارے میں مشورہ کرلیا جائے لیکن شوہر کی عادت کو جانتی تھیں۔ وہ یہی کہیں گے کہ نیک بخت کیوں سر چھُپانے کی جگہ چھیننا چاہتی ہے۔ خبردار کسی سے یہ بات کہی تو۔ لیکن ایسا تو نہیں ہوسکتا تھا عارفہ بیگم کا فرض تھا کہ وہ سب لوگوں کو بلکہ کوٹھی کے ملازمین تک کو ان حالات سے آگاہ کریں۔

اگر شروع میں ہی زبان بندی کردی گئی تو پھر کچھ کہنا شوہر کی نافرمانی کرنا ہوگا اس لئے بہتر یہی ہے کہ شوہر کے آنے سے پہلے ہی تمام کام کرلیا جائے۔ بہت سی باتیں سوچی تھیں اُنھوں نے، پتہ نہیں کیا کیا خیال آگئے تھے اُن کے دِل میں۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اِس سلسلے میں نشانہ سب سے پہلے کس کو بنایا جائے۔ ذکیہ بیگم بلاشُبہ بہت زیادہ موڈرن خیالات کی مالک نہیں تھی لیکن اِس کے ساتھ ہی ان میں درگزر کرنے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ کسی بھی مسئلے کی بہت زیادہ گہرائی تک نہیں پہنچتی تھیں۔ البتہ دادی امّاں کو خاندان کے وقار اور اس کی آن بان کا پُورا پُورا خیال رہتا تھا۔ اور پھر سچی بات یہ ہے کہ ذکیہ بیگم کو دیوروں سے اتنی دلچسپی ہو بھی نہیں سکتی تھی جو شہاب صاحب کی ماں کو اپنے بیٹے سے ہوتی۔

چنانچہ فیصلہ یہ کیا عارفہ بیگم نے کہ براہِ راست دادی امّاں تک ہی پہنچا جائے۔ زیب النساء بیگم کو اس سلسلے میں تمام تر حالات سے آگاہ کرنا اُن کا فرض تھا۔ اور ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اُس وقت وہاں کوئی اور نہ ہو۔

چنانچہ وہ کوٹھی کی جانب چل پڑیں اور تھوڑی دیر کے بعد اندر داخل ہوگئیں اُن کی خوش قسمتی تھی کہ ذکیہ بیگم اُسی وقت باہر نکلیں اور کار میں بیٹھ کر ڈرائیور کے ساتھ چلی گئیں۔ گویا میدان صاف ہے۔ ثناء کے کمرے کو جھانک لینا بھی ضروری تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ ثناء راستے میں مزاحم ہو۔ ثناء اس وقت اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی وہ شاید نُدرت کے ساتھ کسی چکر میں مصروف تھی۔ البتہ رُدا کو اُنھوں نے اپنے کمرے ہی میں دیکھا تھا۔ تیمور اُس وقت اُسی کے پاس تھا۔

چاروں طرف سے اطمینان کرنے کے بعد عارفہ بیگم زیب النساء بیگم کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔ وہ آرام سے لیٹی ہوئی تھیں۔

"آؤ عارفہ۔ کہو خیریت؟"

"آپ آرام کررہی تھیں ممانی جان۔" عارفہ بیگم نے کہا۔

"ہاں۔ کوئی کام نہیں تھا لیٹ گئی تھی صبح سے کمر میں کچھ درد سا محسوس ہورہا ہے۔"

"میں دبا دوں۔" عارفہ بیگم نے کہا۔

"تمھاری مہربانی۔ آؤ تھوڑا سا دبا دو۔" زیب النساء بیگم نے عارفہ بیگم کو یہ اعزاز بخشا تھا۔ عارفہ بیگم تو اس وقت ان کی تمام ہمدردیاں حاصل کرنے کی خواہاں تھیں۔ چنانچہ کمر دبانے بیٹھ گئیں لیکن کمر دباتے دباتے اچانک اپنی جگہ سے اُٹھیں اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

"خیریت تو ہے؟"

"کیا بتاؤں ممانی جان، میرا تو دِل ہول رہا ہے۔ آپ دیکھیں ہاتھ کیسے کپکپا رہے ہیں۔" اُنھوں نے اپنے دونوں ہاتھ دادی امّاں کے سامنے ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں خیریت تو ہے بیٹھو۔ کمر کو رہنے دو کسی ملازمہ سے دبوا لوں گی۔"

"نہیں۔ نہیں یہ تو میرا فرض ہے آخر اس گھر نے مجھے بھی سہارا

دیا ہے میرے اُوپر بھی تو کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔" عارفہ بیگم نے آغازِ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"خُدا خوش رکھے تم سب کو۔ بڑا اُبھرا پُرا ماحول ہے تم سب کی وجہ سے جو رونق ہے وہ بھلا کسے بُری لگے گی۔" زیب النساء بیگم نے جواب میں کہا اور پھر چونک کر بولیں "مگر مسئلہ کیا ہے؟ مجھے تم کچھ پریشان پریشان سی نظر آ رہی ہو!"

"کیا بتاؤں ممانی جان، آج اِن گنہگار آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھ لیا ہے کہ دِل اور دماغ قابو میں نہیں ہے۔"

"اے بی ہُوا کیا؟ تم تو مجھے بھی ہولائے دے رہی ہو..." زیب النساء بیگم پریشان لہجے میں بولیں۔

"ممانی جان! ہمارا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔ بات بہت گہری ہے۔ اور سچی بات ہے کہ اگر حقِ نمک ادا کرنے کا خیال نہ ہوتا تو میں مرتے دم تک ایسی بات مُنہ سے نہ نکالتی۔ میں جانتی ہوں کہ اس کے بعد میری پوزیشن بڑی خراب ہو جائے گی۔"

"تم بے دھڑک کہو کیا معاملہ ہے؟" زیب النساء بیگم کا تجسس عروج پر پہنچ چکا تھا۔

"میں آپ کی ہدایت کے مطابق اس رَدا پر نگاہ رکھے ہوئے تھی لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ اس کم بخت کے نیچے اتنے گہرے گڑھے ہوں گے۔ مختصر بات یہ ہے کہ آج میں رفعت جہاں کے ہاں گئی تھی۔ تھوڑی دیر اُن کے فلیٹ میں بیٹھی رہی اللہ رکھے اِن کا بیٹا دوبئی چلا گیا ہے گھر بھر کے رکھ دیا ہے۔ اے ممانی جان کیا بتاؤں تمھیں فریج ٹیپ ریکارڈر، واشنگ مشین۔ وی۔سی۔آر، رنگین ٹیلیویژن کیا کچھ نہیں ہے گھر میں اور تو اور ٹیلی فون بھی گھر میں لگوا لیا ہے۔ اور رفعت جہاں، جو کل تک ڈھنگ سے کپڑے بھی پہننا نہیں جانتی تھیں آج ٹیلیفون کا چونگا مُنہ سے لگا کر انگریزی میں ہلو ہلو کرتی ہیں۔"

"تم اصل بات سے مسلسل ہٹ رہی ہو۔ عارفہ! میں تم سے کہتی ہوں جو دیکھا ہے وہ بتاؤ۔" زیب النساء بیگم نے بے چین ہو کر کہا۔

"ہاں ممانی جان، وہی بتانے جا رہی تھی۔ فلیٹ سے اُتر کر رکشہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی کہ میں نے شہاب میاں کی گاڑی دیکھی۔ گاڑی رُکی۔ اور اُس میں سے رَدا نیچے اُتر آئی۔"

"کیا؟" زیب النساء بیگم تکیئے کا سہارا لے کر اُٹھ بیٹھیں۔

"ہاں اِن گنہگار آنکھوں نے اپنے ہوش و حواس کے ساتھ دیکھا ہے۔ رَدا نیچے اُتری شہاب میاں نے ہاتھ ہِلا کر اُسے الوداع کہا وہ مسکراتی ہوئی رکشہ میں بیٹھی اور گھر آ گئی۔"

"کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟" زیب النساء بیگم نے سوال کیا۔

"یہی کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ ہوگیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو گھر پہنچی ہوں۔ رکشہ ملنے میں دیر ہو گئی تھی۔"

"تمھیں کوئی دھوکا تو نہیں ہُوا عارفہ بیگم؟"

"ممانی جان، اتنی بڑی بات ایسے ہی مُنہ سے نہ نکال دیتی۔ اچھی طرح دیکھا ہے میں نے۔"

"رَدا اِس وقت کہاں ہے؟" زیب النساء بیگم نے سوال کیا۔

"کمرے میں ہے اپنے۔ ارے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ثناء بٹیا اپنی سادگی میں نقصان اُٹھا بیٹھے گی۔ غور کرو ممانی جان تو بات بڑی دُور تک جاتی ہے کس پر الزام لگاؤں کس کو کیا کہوں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ چچا بھتیجی کی آپس کی سازش ہو لیکن کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

"عارفہ بیگم جو کچھ کہنا چاہتی ہو کُھل کر کہو۔"

"بُرا مت مانئے ممانی جان، مجبُور ہو کر سب کچھ کہہ رہی ہوں کسی بات کو بھروسے سے نہیں کہا جا سکتا ہم صرف سوچ سکتے ہیں۔"

"کیا خیال ہے تمھارے ذہن میں خُدا کی بندی یہ بتاؤ۔"

"میرے مُنہ میں خاک یہ شہاب میاں کی بیوی تو نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے ممانی جان کہ شہاب چالاکی سے اسے ثناء کے ذریعے یہاں لے آئے ہوں۔ آپ ذرا اس کے بچے کے چہرے پر غور کریں ارے میں کہتی ہوں کہ اب تک کیوں نہ سوچا ہم لوگوں نے۔ بچّے کے خدوخال شہاب میاں سے کتنے ملتے جلتے ہیں۔"

"عارفہ بیگم خُدا کا خوف کر کے بات کرو۔" زیب النساء بیگم نے کہا۔

"مر جاؤں مَیں۔ خُدا مجھے موت دیدے۔ جو اتنی بُری بات سوچ رہی ہوں ممانی جان آپ نے دُنیا دیکھی آپ جانتی ہیں کہ یہ چڑیلیں پھیلی ہوئی ہیں، دولت مند گھرانوں کے مرد دیکھ کر کس طرح پنجے جھاڑ کر اُن کے پیچھے پڑ جاتی ہیں اور وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں جو اُنھوں نے کبھی نہ کیا ہو۔ اے ممانی جان! میں کہتی ہوں کہ آپ نے اس کم بخت کی شکل دیکھی ہے کیسی معصومیت ہے چہرے پر۔ مگر کرتوت دیکھ لیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس میں اپنے شہاب میاں کا کوئی قصُور نہیں ہے۔ یہ سارا جال اسی موئی کا پھیلایا ہُوا ہے پہلے شہاب میاں پر اپنے حُسن و جمال کے ڈورے ڈالے ہوں گے اور ان سے رقمیں کھینچی ہوں گی۔ اور پھر جال پورا کر کے یہاں تک پہنچ گئی۔ ابھی اپنے آپ کو چھپائے ہوئے

ہے کل صاف صاف کہہ دے گی کہ وہ شہاب میاں کی بیوی ہے اُن کے بچے کی ماں ہے۔ میرا دماغ بہت دُور تک سوچتا ہے، ممانی جان، صاف صاف کہہ دیتی ہوں کہ آپ مصیبت میں پھنس گئیں۔ غور کریں کہ اب آپ کو کیا کرنا ہے نکالیں اس گھر سے کل موہی کو۔ کوئی ایسی چال چلیں۔ کوئی ایسی ترکیب کریں کہ اس کا پتہ آسانی سے کٹ جائے۔ میں اس گھر کی تباہی نہیں دیکھ سکتی پہلے ہی سوچتی تھی کہ شہاب میاں کو ایسے چھوڑ دینا مناسب نہیں۔"

"عارفہ بیگم میں تو مری ہی جا رہی ہوں اس خیال سے۔ یہ کیا ہوگیا؟ احسان میاں سُنیں گے تو کیا سوچیں گے بھائی کے بارے میں۔ اب تک دونوں میں بنی ہوئی ہے کل کو بگڑ گئی تو کیا ہوگا؟ اے میرے خُدا یہ کیا آفت پڑ گئی ہم لوگوں پر، نظر لگ گئی ہمارے اس گھر کو، ارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بات یہاں تک ہو سکتی ہے۔ کوئی مشورہ دو عارفہ بیگم۔ کیا کروں؟"

عارفہ بیگم تھوڑی دیر تک خاموشی سے سوچتی رہیں اس وقت زیب النساء بیگم کی محبت اور ہمدردیاں حاصل کرنے کا بہترین موقع تھا۔ ایسے ہی لمحات ہوتے ہیں جب عزت بنائی جاتی ہے۔ اور دولت گھسیٹی جا سکتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنھوں نے کہا۔

"ہمت سے اور صبر سے کام لینا ہوگا ممانی جان۔ ایک دم مُنہ کھول کر سب کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ پہلے تو اسی کے مُنہ سے بات نکلوائیں پوچھیں تو سہی ذرا اس سے۔ کہ یہ بچّہ کہاں سے آیا اس کے پاس۔ شوہر کہاں مر گیا۔ ماں باپ کہاں دفن ہو گئے۔ بے کون۔ کہتی ہے لاہور سے آئی ہوں۔ لاہور میں کہاں رہتی ہے؟ کوئی تو ہوگا جو اسے جانتا ہوگا۔ گھر میں آ گئی مگر یہ کسی کو نہیں معلوم کہ کہاں سے آئی ہے۔ معلوم کر لینا ممانی جان عارفہ جو کچھ کہہ رہی ہے اسے پتھر کی لکیر سمجھو۔ کسی ایسے ہی گھرانے کی لڑکی ہے جس کے رہنے والے اپنی اولادوں کے ذریعے بڑے آدمیوں کا شکار کرتے ہیں۔ بڑی مشکل سے پیچھا چھوٹے گا اس سے۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اُٹھائیں۔ عارفہ کی جان آپ کے لئے حاضر ہے۔ جس کی ضرورت پیش آئے تو جب چاہیں مانگ لیں۔"

"خُدا تمھیں خوش رکھے عارفہ بیگم۔ بڑی ڈھارس بندھائی ہے میری۔ اب جو کچھ کروں گی تمھاری ہی مرضی سے کروں گی۔ مگر خُدا کے واسطے ابھی کسی سے کچھ کہنا نہیں۔"

"نہیں کہوں گی۔ بھلا مجھے اس گھر کی رُسوائی کیسے گوارا ہوگی۔ میں زبان بند رکھوں گی مگر ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی۔" عارفہ بیگم نے کہا۔

"کیا؟" زیب النساء بیگم نے سوال کیا۔

"خُدا کے لئے میری ناک چوٹی کا خیال رکھیئے گا۔ اگر شہاب میاں کو یا ثناء بٹیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ راز میں نے کھولا ہے تو پھر عارفہ بیگم کا اس گھر میں ٹھکانہ نہیں۔ شہاب میاں خود بھی غصّے کے تیز ہیں اور ثناء، وہ تو مجھے کچا چبا جائے گی۔ ناک چوٹی کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دے گی میری، اسے رَدا نے خُوب چکر میں پھانسا ہوا ہے۔"

"میں موجود ہوں اس گھر میں عارفہ بیگم۔ مجال ہے کسی کی جو تمھاری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے، اب تم جاؤ مجھے سوچنے دو۔ بہت سوچ سمجھ کر مجھے فیصلہ کرنا ہے۔ خُدایا یہ کیسی آگ لگ گئی میرے گھر کو۔ لیکن کچھ بھی ہو جائے میں ایسی کسی کم بخت کو اپنی زندگی میں تو اس کوٹھی میں گھُسنے نہیں دُوں گی۔ میرے احسان میاں نے پتہ نہیں کیا کیا جتن کر کے اپنی عزت بنائی ہے ایسے تو نہیں لُٹنے دُوں گی اسے۔"

عارفہ بیگم اجازت پا کر باہر نکل گئیں۔ پیٹ تھا کہ پھولتا چلا جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ در و دیوار سے اُن تمام واقعات کا تذکرہ کریں کہ اس وقت صُورتِ حال مختلف تھی۔ وعدہ زیب النساء بیگم سے کیا تھا اور یہ جانتی تھیں کہ بات اگر ان کے مُنہ سے نکل گئی تو پھر زیب النساء بیگم کی ہمدردیاں بھی کھو بیٹھیں گی۔ اور اس کے بعد بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چنانچہ سیدھی اپنی رہائش گاہ پر پہنچیں اور کمرہ بند کر کے بیٹھ گئیں۔ پیٹ کے درد کا علاج اُن کے پاس کوئی نہیں تھا۔ شوہر کو اب بھی کچھ نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ جب یہ بات طے ہو گئی تھی کہ خود زیب النساء بیگم بھی ان کا نام نہیں لیں گی تو پھر کسی کو کچھ بتانا خطرناک ہی ہو سکتا تھا۔ زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ اگر ثناء کو یہ پتہ چل جائے کہ رَدا کا راز اُنھوں نے فاش کیا ہے تو ثناء انتقام لئے بغیر نہیں چھوڑے گی۔ ان تمام باتوں کا خیال بھی اُنھیں رکھنا تھا۔ اِدھر یہ کارروائیاں ہو رہی تھیں اُدھر بے چاری رَدا اُن تمام باتوں سے بے خبر آنے والے وقت کے خیال میں گُم تھی۔ بہت سے پیچیدہ مسائل تھے مثلاً یہ کہ ابھی کسی نئی جگہ رہائش اختیار نہیں کی جا سکتی تھی۔ تیمور ثناء سے ہل گیا تھا اور ثناء بآسانی اُسے چھوڑنے پر رضامند نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر کسی نئی جگہ پہنچ کر تیمور کو کس کے ہاتھوں میں سونپا جاتا۔ ظاہر ہے فوراً ہی بندوبست نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے کسی ادارے کے سپرد کر دیا جائے۔ تین دن کے بعد ملازمت پہ جانا تھا۔ ثناء کسی طور اس کو ملازمت کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ ایسے حالات میں رَدا کے لئے بے انتہا پریشانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ثناء کی خوشامد کر کے کسی طرح

اُسے اِس بات پر آمادہ کرلے کہ وہ رِدا کو ملازمت کی اجازت دیدے۔ دفعتاً اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ نُدرت کا شیطانی ذہن کسی پیچیدہ مسئلہ کے حل کی تلاش میں بہت تیزی سے کام کرتا تھا کیوں نہ اِس معاملہ میں بھی نُدرت سے ہی مدد لی جائے۔ نُدرت واقعی اس سلسلے میں کارآمد ثابت ہوسکتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود بھی صاحبِ ظرف تھی اور رِدا کے مسائل کو سمجھ سکتی تھی اس سے قبل کہ ثناء اس تک پہنچ جائے بہتر ہے کہ نُدرت سے گفتگو کرلی جائے چنانچہ وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔ ثناء اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ یہ تو نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں گئی ہے لیکن بہرحال کسی بھی طرح بچتی بچاتی نُدرت تک پہنچ گئی۔ دو نمبر کے دروازے پر دستک دی تو عصمت نے دروازہ کھول دیا۔

"ارے آپ۔ آیئے" عصمت خوش ہوگئی تھی۔ رِدا بے تکلفی سے اندر داخل ہوگئی۔

"نُدرت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اندر موجود ہے۔ آپ بیٹھنا" وہ رِدا کے ساتھ اماں جی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ شوکت جہاں کچن میں کچھ پکا رہی تھیں۔ رِدا نے اماں جی کو سلام کیا اور عصمت اس کا تعارف کرانے لگی۔ چند منٹ ہی اماں جی کے ساتھ گزرے تھے کہ باہر سے نُدرت کی آواز سُنائی دی۔

"باجی دروازہ کس نے بجایا تھا؟"

"اندر آؤ نُدرت دیکھو کون آیا ہے" عصمت بولی اور نُدرت اندر آگئی۔

"ارے مونا لیزا تم؟" وہ مسرت سے چونک پڑی۔ اور پھر وہ اماں جی سے بولی "اماں جی یکا شو کی مونا لیزا کیا اس سے زیادہ خوب صورت ہے! رِدا ذرا مُسکراؤ۔"

"سُن رہی ہیں آپ اماں جی اس کی باتیں۔ لاکھ بار منع کرچکی ہوں کہ گفتگو میں آداب کو مدِ نگاہ رکھے لیکن اس کے بولنے کے انداز میں ہمیشہ یہی گستاخی ہوتی ہے۔"

"کیا نام بتایا تم نے بیٹی کا؟" اماں جی نے پوچھا۔

"رِدا ہے میرا نام" رِدا نے خود جواب دیا۔

"بیٹی! اس کی گستاخی کی سزا ہم سب کو نہ دینا۔ بے لگام ہے جو دل میں آتا ہے کرتی ہے۔"

"نہیں محترم خاتون! آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ نُدرت۔ تم ذرا میرے ساتھ آؤ ایک ضروری کام ہے تم سے۔" رِدا نے کہا۔ اور پھر عصمت کی طرف دیکھ کر بولی "باجی پلیز آپ مائنڈ نہ کریں۔"

"نہیں بھئی۔ مگر باہر نہیں جانے دُوں گی چائے بناتی ہوں تمہارے لئے اس کمرے میں چلی جاؤ۔"

"تھینک یو باجی" رِدا نے کہا۔ نُدرت اسے لئے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔ اس نے رِدا کو بیٹھنے کی پیشکش کی پھر مسکراتی ہوئی بولی۔

"قصور ہمارا نہیں مونا لیزا۔ اب جیسی بھی جگہ ہے تمہیں ورنہ سجالیں گے۔"

"دیکھو بھئی مجھے اعتراف ہے کہ تمہارے سامنے میری زبان کچھ بھی نہیں۔ مجھ پر رعب ڈالنے کے بجائے اس وقت ایک مسئلے میں میری مدد کرو۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"میں سنجیدہ ہوں" نُدرت نے کہا۔

"نُدرت! میں ایک مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ اور اس کی وجہ ثناء ہے۔ بتاؤ کیا تم جانتی ہو کہ ثناء سے میرا کیا رشتہ ہے؟"

"جانتی ہوں" نُدرت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ...؟"

"تم اُس کی محبوب ہو۔"

"غلط۔ وہ میری محبوب ہے اِس لئے کہ وہ اتنی ہی اچھی ہے۔" رِدا نے کہا۔

"خیر بُرے تو ہم بھی نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آئے۔"

"میں تمہاری عزت کرتی ہوں نُدرت اس وقت تمہارے پاس آنا اسی کا اظہار ہے۔"

"خوش ہوئے ہم۔ کہو کیا بات ہے؟"

"نُدرت! ایک اتفاق مجھے ثناء تک لے آیا ہے۔ چند پریشانیوں کا شکار ہوکر میں لاہور سے کراچی آئی تھی۔ ہوٹل میں قیام کرنے کا ارادہ تھا کہ ثناء مل گئی اور مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ ثناء بہت پیاری ہے۔ نُدرت یہ گھرانہ فرشتوں کا گھرانہ ہے لیکن مجھے بتاؤ محبت کے سودے انا کی قیمت پر کئے جاسکتے ہیں؟"

"ادبی جُملہ ہے مگر مبہم" نُدرت نے کہا۔

"ثناء کے پیار نے مجھے پناہ دی ہے لیکن کیا ساری زندگی محبت کی قیمت وصول کرتی رہوں یہاں خُدا کا دیا بہت کچھ ہے یہ لوگ بغیر کسی دِقت کے میری اور تیمور کی پرورش کرسکتے ہیں لیکن کیا یہ میرے لئے جائز ہے؟ اس طرح میں اپنی نگاہ میں ہی نہ گرتی جاؤں گی۔ تمہیں اپنے جُملے یاد ہیں نُدرت تم نے کہا تھا کہ ایک پیالی چائے کے علاوہ تمہیں کائنات کی کسی دولت سے دلچسپی نہیں ہے میرے لئے تم کیا فیصلہ کروگی؟"

"اوہ" نُدرت واقعی سنجیدہ ہوگئی۔ پھر بولی "تو تم کیا چاہتی ہو؟"

"ملازمت کرنا چاہتی ہوں" رِدا نے کہا۔ نُدرت سوچ میں ڈوب گئی پھر بولی۔

"میں صورتِ حال سمجھ رہی ہوں گمبھیر معاملہ ہے۔ تمہارے خیال میں ثناء اس کی اجازت دیدے گی؟"

"نہیں دے گی۔"

"اور تم اجازت حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"نصف نصف پر فیصلہ ہوسکتا ہے رِدا؟"

"کیا مطلب...؟"

"نوکری کہاں کروگی؟"

"ثناء کے ابو کے علاوہ کہیں بھی۔"

"جیتی رہو۔ مقصد یہ ہے کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ تم نوکری کہیں بھی کرو رہو اسی جگہ کم از کم اُس وقت تک جب تک مضبوط پوزیشن نہ حاصل کرلو۔ رفتہ رفتہ ثناء کو اس کے لئے بھی تیار کیا جاسکتا ہے۔" نُدرت نے کہا۔

"عجیب نہیں لگے گا نُدرت" رِدا پریشان لہجے میں بولی۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ اس میں عجیب لگنے کی کیا بات ہے تم اُس وقت تک یہاں رہوگی جب تک اپنے لئے کسی بہتر رہائش گاہ کا بندوبست نہ کرلو۔ ثناء کسی قیمت پر تمہیں ملازمت کی اجازت نہیں دے گی اور جب یہ سُنے گی کہ تم یہاں سے جانا چاہتی ہو تو ظاہر ہے کر تو کچھ نہیں سکتی صرف تم سے ناراض ہو جائے گی۔ میں بہت زیادہ ہمہ دانی کا مظاہرہ نہیں کر رہی لیکن ثناء جیسی لڑکی کے بارے میں، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اگر وہ ناراض ہوگئی تو اُسے منانا تمہارے لئے مشکل ہوگا۔"

رِدا گہری سوچ میں ڈوب گئی تھوڑی دیر تک وہ گردن جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اُس نے کہا۔

"چلو۔ ٹھیک ہے۔ اس حد تک معاملہ کرلو۔"

"میں کرلوں گی" نُدرت نے جواب دیا۔

"پورے وثوق سے کہہ رہی ہو یہ بات؟"

"ہاں ظاہر ہے۔ نُدرت کبھی کوئی کچی بات نہیں کرتی۔ تم اطمینان رکھو تمہارا یہ کام میں کرلوں گی ویسے ملازمت تلاش کرلی ہے کوئی؟"

"ہاں۔"

"جیتی رہو۔ دوبارہ بھی جیتی رہو کہاں ملازمت حاصل کی ہے؟"

"بس کرلی ہے ابھی اس بارے میں نہیں بتاؤں گی۔"

"خیر۔ بتایا تو تم نے کسی بھی بارے میں نہیں ہے لیکن میں پُوچھنا بھی نہیں چاہتی۔ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ لوگ کسی اپنے قریب ترین انسان کو بھی بتانا پسند نہیں کرتے تم نے جو کچھ مناسب سمجھا مجھے بتا دیا۔ جو نہیں بتلایا اس کے لئے مجھے تمہیں مجبور بھی نہیں کرنا چاہیئے۔" نُدرت نے کہا۔

"نُدرت! تم واقعی آنکھوں کے راستے دِل میں اُترتی جا رہی ہو۔"

"کانوں کے راستے کہو فی الحال۔ میرا خیال ہے اِس وقت تم صرف میری گفتگو پر غور کر رہی ہو۔"

"میں نے کہا نا بھئی لفظوں میں تم سے میں نہیں جیت سکتی۔"

"ثناء سے ذرا اور دو دو ہاتھ کرلوں دیکھتی ہوں کہ وہ لفظوں میں مجھ سے کس طرح جیت جاتی ہے۔"

"تو میں اطمینان رکھوں؟" رِدا نے پوچھا۔

"ہاں۔ انشاء اللہ میں تمہیں کوئی مناسب جواب دُوں گی۔" نُدرت نے کہا اُسی وقت عصمت چائے لے کر اندر آگئی۔

"معافی چاہتی ہوں خواتین مداخلت کی ہے اس وقت۔"

"شکریہ، شکریہ عصمت آپا۔ ویسے آپ چاہیں تو اپنی چائے کی پیالی بھی یہیں لاسکتی ہیں۔"

"نہیں بھئی جب تک مجھے اپنی گفتگو میں دعوت نہیں دی جائے گی میں نہیں آؤں گی آخر میرا بھی کوئی مقام ہے کوئی وقار ہے۔" عصمت بولی۔

"اوہ۔ سوری عصمت آپا۔ بات اصل میں یہ نہیں ہے نُدرت سے ایک خاص سلسلے میں ایک مشورہ کرنا تھا۔"

"تو کرو بھئی۔ ہم کب منع کرتے ہیں ہمیں تو تم لوگوں نے آپا، باجی کہہ کہہ کر بوڑھا کر دیا ہے" عصمت نے ہنستے ہوئے کہا اور باہر چلی گئی۔

"نُدرت تمہاری باجی بہت شاندار ہیں۔"

"لو۔ ابھی ہمارے بارے میں صحیح فیصلہ ہُوا نہیں اور باجی کو شاندار قرار دے دیا گیا۔ تم ہو کافی مکھن باز، باجی نے چائے پلا دی تو باجی کو مکھن لگانے لگیں۔"

"حالات کا شکار ہوں نُدرت جی چاہتا ہے ساری دُنیا کو مکھن

رگاؤں تاکہ وہ مجھے اپنے درمیان جگہ دے دیں۔" رِدا نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اے مونالیزا! صرف مُسکراتی رہو اگر تمہاری آنکھوں سے ایک بھی آنسو ٹپکا تو تمہاری ساری تصویر خراب ہو جائے گی۔" نُدرت نے کہا اور رِدا مُسکرا دی۔

"شکریہ، شکریہ۔ دیکھو نا کہنا ماننے والی بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ویسے یہ ثناء ہے کہاں؟"

"پتہ نہیں کہاں چلی گئی میں ذرا گئی ہوئی تھی۔"

"ٹھیک، ٹھیک۔ کوئی بات نہیں ہے میں یقینی طور پر ثناء سے آج ہی اس سلسلے میں بات کر لوں گی تم بالکل فکر نہ کرو۔" چلنے پینے کے بعد رِدا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا، اب میں چلتی ہوں۔"

"خدا حافظ۔ ممکن ہُوا تو رات ہی کو ملاقات ہو گی۔" نُدرت نے جواب دیا اور رِدا ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل گئی رِدا جانتی تھی کہ نُدرت یقیناً اس معاملے کو سنبھال لے گی اور نُدرت کو اپنا کیس سونپنے کے بعد وہ خاصی حد تک مطمئن ہو گئی۔

★★

اپنے کمرے میں آ کر رِدا بستر پر لیٹ گئی۔ تیمور کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ ثناء بھی غائب تھی، تیمور کو لے کر ہی کہیں نکل گئی ہو گی۔ عموماً ایسا ہوتا تھا اُس نے رِدا کو تیمور سے تقریباً بے نیاز کر دیا تھا۔

بہت زیادہ دیر نہیں گزری تھی اُسے اپنے کمرے میں آئے ہوئے کہ ثناء تیمور کے ساتھ اندر داخل ہو گئی اس کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی چھائی ہوئی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں دُور سے آئی ہے تیمور کو ایک صوفے پر بٹھانے کے بعد وہ خود دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تیمور! ہم کسی سے نہیں پوچھیں گے کہ کوئی کہاں گیا تھا تم بتاؤ کیا تم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہو؟"

رِدا پیار بھری نگاہوں سے ثناء کو دیکھ رہی تھی ثناء نے اس وقت رِدا کا ایک لباس پہنا ہُوا تھا وہ لباس جو رِدا خرید کر لائی تھی، اور جو اس نے خود اپنے استعمال کے لئے الماری میں ٹانگ لیا تھا پتہ نہیں کب ثناء نے یہ لباس اُس کی الماری سے نکالا اور پہن لیا تھا۔ لیکن اس اپنائیت پر رِدا کی آنکھوں میں آنسو آئے جا رہے تھے۔ ثناء نے ذرا بھی اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ وہ رِدا سے اس کے لباس کے بارے میں پُوچھ ہی لے۔ درحقیقت اس اپنائیت کے جواب میں رِدا ثناء کو کچھ نہیں دے رہی تھی۔

"تیمور! تمہارے اندر بس ایک خرابی ہے یہ تمہاری زبان کب چلنا شروع ہو گی ہم حالِ دل سُنائے جاتے ہیں اور آپ بیٹھے شکل دیکھتے رہتے ہیں اب بتاؤ نا جواب دو پوچھنا چاہیئے کہ نہیں۔"

رِدا آگے بڑھی اور ثناء کے قریب پہنچ گئی۔ "جناب! مجھ سے بھی گفتگو کی جا سکتی ہے۔"

"ہرگز۔ ہرگز نہیں۔ بھلا وہ شخص جو اپنے آپ میں اس قدر گم ہو جائے گا۔ کیا وہ گفتگو کرنے کے قابل ہے؟"

"کیا ہم کسی ہمدرد سے اس دُعا کی اپیل بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ہمیں اپنے آپ سے نکلنے کی دُعا دے۔"

"بے کار باتیں مت کرو۔ کہاں گئی تھیں جواب دو مجھے؟"

"ایک کام سے گئی تھی ثناء۔"

"ہاں۔ ہاں کہہ دو کہ پُوچھنا نہیں کس کام سے گئی تھی۔ تم نے تو اتنی پابندیاں لگا دی ہیں مجھ پر رِدا کہ بس اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں ثناء۔" رِدا نے گردن جُھکا کر کہا اور چونک کر اُسے دیکھنے لگی رِدا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"جان سے مار دُوں گی۔ اگر اس کے بعد ایک بھی آنسو بہایا۔ لو غضب خُدا کا، یہ عورتوں والے چلتر عورتوں پر ہی آزمائے جا رہے ہیں۔ زبان بند کرنے کا کوئی اور طریقہ اس کے علاوہ ایجاد نہیں ہُوا کیا۔" ثناء نے غصیلے لہجے میں کہا اور رِدا سچ مچ پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی تھی۔

"ارے ارے او دیوانی۔ دیکھ مجھے بدتمیزی پر آمادہ مت کر میں فطرتاً بہت جنگلی واقع ہوئی ہوں۔ دو گھونسے لگاؤں گی پیٹھ پر اور تمام رونا دھونا بھول جائے گی۔ ہائے ہائے کرتی پھرو گی۔ دیکھو مت رو پلیز رِدا خُدا کے واسطے تجھے میری قسم۔ پلیز مجھے، مجھے شرم آ رہی ہے اس انداز میں گفتگو کرتے ہوئے۔ مگر رونے کی نہیں ہو رہی۔" ثناء کی آواز میں ایک ہلکی سی گھبراہٹ محسوس کر کے رِدا نے چہرہ اٹھایا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ثناء! صرف ایک دُعا کرتی ہوں خُدا سے کہ خُدا مجھے تمہاری محبت کا جواب دینے کی قُدرت عطا فرما دے۔"

"سنجیدہ باتوں کی میں ذرا بھی متحمل نہیں ہو سکتی کوئی پریشانی ہے رِدا اب بتاؤ سنجیدگی سے بتاؤ۔" ثناء نے کہا۔

"نہیں کوئی خاص نہیں۔ بس ثناء ذرا سی پریشان ہوں۔"

"ذرا سی۔ میں سمجھتی ہوں تم بہت پریشان ہو اور انسان کو پریشان ہونا چاہیئے کم از کم اپنے آپ میں بند رہ کر انسان کسی سے اپنے لئے ہمدردیاں نہیں حاصل کر سکتا مجھے بتاؤ تو سہی کیا مصیبت نازل ہوئی ہے تم پر۔ کیا پریشانی ہے؟"

"جاؤ۔ نُدرت سے مل لو۔" رِدا نے کہا۔

"ایں۔ کیا نُدرت کو کوئی تکلیف ہو گئی ہے؟" ثناء نے اس انداز میں پُوچھا کہ رِدا بے اختیار مُسکرا پڑی۔

"نہیں۔ وہ تمہیں تلاش کرتی ہوئی دو تین دفعہ یہاں آ چکی ہے کوئی ایسا ہی مسئلہ ہے۔"

"ایمان سے۔ کیا ہُوا؟ کیا جمن نے کوئی گڑبڑ کر دی؟" ثناء چونک کر بولی پھر اُٹھ کر کہنے لگی۔

"آؤ تیمور! ذرا دیکھیں۔ آؤ رِدا تم بھی آؤ۔"

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی کچھ مصروف ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں لیٹنے میں مصروف تھیں۔ شاید تم۔ مگر تعجب کی بات ہے نُدرت پر کوئی مصیبت پڑی ہے اور تم ایسے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔"

"میں کہتی ہوں تم جاؤ نُدرت سے مل لو۔ نُدرت سے بات کر لو۔"

"کوئی تمہارے سلسلے میں بات ہے؟" ثناء نے حالات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہے بس میں کہتی ہوں جاؤ نُدرت سے مل لو۔"

"لعنت ہے بھئی۔ آؤ تیمور چلیں۔" ثناء نے تیمور کو گود میں اُٹھایا اور رِدا کو گھورتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رِدا گہری گہری سانسیں لینے لگی تھی۔

ثناء کافی دیر تک واپس نہیں آئی۔ رِدا بے چینی سے اُس کا انتظار کرتی رہی۔ اسے طوفان کا انتظار تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد نُدرت اور ثناء دونوں ہی واپس آ گئیں۔ رِدا نے سہمی ہوئی نگاہوں سے نُدرت کو دیکھا لیکن نُدرت مُسکرا رہی تھی۔

"فکر مت کرو مونالیزا! ہم تمہارے لئے خوشخبری کے علاوہ اور کیا لا سکتے ہیں۔"

"سچ۔" رِدا مسرت سے اُچھل پڑی۔ ثناء کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ بات اتنی اہم نہیں تھی جس کے لئے آپ اتنی تگ و دو کرتیں مس رِدا۔ ایک بار ذرا ترش لہجے میں کہہ دیا ہوتا کہ ثناء اپنے کام سے کام رکھو ہمیں کیا پڑی تھی جو خواہ مخواہ کسی کو پریشان کرتے۔"

"ثناء میری بہن پلیز۔" نُدرت نے جو کچھ کہا ہے تم نے اس

پر غور کر لیا ہو گا۔"

"دیکھو ثناء! تم وعدہ کر چکی ہو کہ بگڑے ہوئے موڈ کا مظاہرہ نہیں کرو گی ہمیں حالات پر پوری طرح نگاہ رکھتے ہوئے سوچنا چاہیئے۔ سچ ہی کہتی ہیں رِدا، بے شک یہاں تم ہو، احسان احمد کے بارے میں، میں زیادہ نہیں جانتی لیکن اس گھر کو دیکھ کر ان کے بارے میں اندازہ لگا سکتی ہوں بلاشبہ یہ حسین دل والے لوگوں کی بستی ہے لیکن سب کو زندہ رہنے کی اجازت دی جائے۔" نُدرت نے کہا۔

"تو کون اُن کا گلا گھونٹے دے رہا ہے۔" ثناء نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ثناء! تم نے میری اس خواہش کا بُرا تو نہیں مانا؟"

"نہیں رِدا۔ میں تمہیں رنجیدہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ میری محبت تمہاری زندگی کی خواہش مند ہے۔" ثناء نے بہت زیادہ سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن دوسری بات کو میں کسی طور نہیں مانوں گی تمہیں۔ کسی قیمت پر یہ نہیں ہو گا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ جب اس قسم کا موقع آئے گا تو میں تم سے بات کروں گی۔ فی الحال یہ نہیں ہونا چاہیئے۔"

"نہیں ہو گا۔" رِدا نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

عارفہ بیگم جو فتنہ جگا گئی تھیں وہ معمولی نہیں تھا زیب النساء بیگم کا دم اُلٹ رہا تھا۔ وہ ایک خوفناک طوفان کی منتظر تھیں ایک ایسے طوفان کی جو اس کوٹھی کی عزت کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائیگا۔ شہاب کی ماں تھیں دونوں بیٹوں کے مزاج کے فرق کو سمجھتی تھیں شہاب صاحب کے بارے میں کوئی غلط خبر تو اُنھیں نہیں ملی تھی لیکن جہاندیدہ تھیں بیٹے کی فطرت سے ناواقف نہیں تھیں شہاب نے شادی نہیں کی تھی وہ خود پر بہت نازاں تھا اور ہمیشہ اُس نے ایک ہی جواب دیا تھا کہ جب تک اُس کے شایانِ شان لڑکی نہیں ملے گی وہ اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

یہ کوشش ناکام ہوگئی تھی لیکن اب یہ سب کچھ ... تو یہ تھی اُس کے شایانِ شان لڑکی۔

صُورتِ حال بہت خوفناک تھی اُن کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کیا کرنا چاہئیے۔ احسان احمد کو تو ابھی اس راز میں کسی طرح شریک نہیں کر سکتی تھیں دونوں بھائیوں کو آمنے سامنے کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا لیکن ذکیہ بیگم پر پُورا اعتماد تھا جو ہمدرد تھی اور قابلِ اعتماد بھی۔ چنانچہ بہت غور و خوض کے بعد انھوں نے ذکیہ بیگم کو بلوا بھیجا۔ ذکیہ بیگم ساس کا بلاوا پاکر فوراً آگئیں۔ بڑا احترام کرتی تھیں وہ ساس کا۔

"جی امی۔ کیا بات ہے خیریت۔ کچھ نڈھال سی نظر آرہی ہیں۔ طبیعت کیسی ہے؟"

"دروازہ بند کردو ذکیہ" دادی جان نے کہا۔ اور ذکیہ بیگم نے اُٹھ کر دروازہ بند کردیا۔

"کیا بات ہے آخر۔ آپ کا تو رنگ پیلا ہو رہا ہے؟"

"ایک بپتا آپڑی ہے ہم سب پر ذکیہ۔ کوئی حل سوچو ورنہ یہ گھر اب جہنم بننے کو ہے؟"

"امی خدا کے لئے جلدی بتائیں کیا بات ہے" ذکیہ بیگم بھی پریشان ہوگئیں۔

"یہ ... یہ رَدا جو ہے نا۔ یہ ..."

"ہاں کیا ہوا؟"

"یہ شہاب کی داشتہ ہے۔ اور اس کا بچّہ شہاب کا بچّہ ہے خُدا جانے نکاح بھی کیا ہے کمبخت نے یا نہیں" دادی جان نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا اور ذکیہ بیگم سنّاٹے میں رہ گئیں۔ وہ ٹکر ٹکر دادی جان کی شکل دیکھتی رہیں منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا تھا۔ بڑی دیر میں اُنھوں نے خود پر قابو پایا اور بولیں۔

"کیا کہہ رہی ہیں امی؟"

"وہی جو تم نے سُنا"

"یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟" ذکیہ بیگم نے پوچھا۔

"حالات پر غور کرو۔ میرے خیال میں تو ثناء بھی اِس بات سے واقف ہے"

"صرف حالات سے اندازہ لگایا ہے آپ نے یا اور کوئی ذریعہ بھی ہے؟" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"عارفہ نے خود دونوں کو بازار میں ساتھ دیکھا ہے۔ شہاب اُسے لئے ہوئے کار میں گھوم رہا تھا اور پھر اُس نے اُسے رکشہ میں بٹھا کر گھر بھیج دیا"

"یہ بات آپ کو عارفہ بیگم نے بتائی ہے" ذکیہ بیگم کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔

"ہاں ذکیہ نا۔ عارفہ کو میں بھی جانتی ہوں لیکن اتنی بڑی بات کہتے ہوئے اُس کا دم بھی نکل جاتا۔ اتنی بڑی بات وہ جھوٹ نہیں کہہ سکتی ہے۔ کچھ ہے ضرور ہے"

بات ذکیہ بیگم کی سمجھ میں بھی آرہی تھی، لیکن جوں جوں غور کر رہی تھیں اُن کی حالت بھی خراب ہوتی جارہی تھی۔ اب اُس بات کی تصدیق کیسے ہو...؟

ساس بہُو کے چہرے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُس نیک نام خاندان کے لئے یہ بات بہت بڑی تھی۔ خاندان کا ساتھ تھا۔ بالآخر سب کو پتہ چل جائے گا کہ شہاب صاحب نے کیا گُل کھلایا ہے اور اُس کے بعد تھو تھو ہوگی۔

"مگر اب کیا کیا جائے؟"

"شہاب بھیا سے بات کی جائے" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"کی جاسکتی ہے لیکن وہ کاہے کو قبولے گا" زیب النساء بیگم نے کہا۔

"اگر کوئی پروگرام ہے اُن کے ذہن میں تو انکار نہیں کریں گے" ذکیہ بیگم بولیں۔

"میرے دماغ میں ایک اور خیال ہے"

"کیا...؟"

"سیدھے سیدھے رَدا سے بات کرو۔ اُس سے پوچھو وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے اُس کی کہانی کیا ہے، بچّے کا باپ کون ہے۔ اُس کے آگے ہاتھ جوڑو کہ بی بی بہت مہمانداری ہوگئی اب چلتی بنو۔ اگر وہ اقرار کرے تو بات کُھل جائے گی اُس کے بعد احسان کو بتانا ہی پڑے گا کیونکہ کوئی معمولی بات نہیں ہوگی۔ منع کرتی ہے تو یہاں سے چلی جائے گی یا پھر شہاب ہی کُھلیں گے"

ذکیہ بیگم سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر اُنھوں نے گردن موڑ کر کہا۔

"ٹھیک ہے امی۔ جیسے آپ پسند کریں"

"مگر بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟"

"میں امی۔ آپ فکرمند نہ ہوں"

"اوّل تو ثناء ہے جو اُس سے بہت لگی ہے اور پھر شہاب الٰہی خیر کرتا" زیب النساء بیگم نے کہا۔

"یہ سب کچھ اتنا معمولی نہیں ہے کہ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھا جائے۔ ہمیں اِس سلسلے میں سختی سے کام کرنا ہوگا امی۔ میں اُسے آپ کے کمرے میں ہی بُلا لیتی ہوں"

"جیسا تم پسند کرو" زیب النساء گہری گہری سانسیں لیتی ہوئی بولیں۔ اور ذکیہ بیگم اُٹھ گئیں۔ باہر آکر اُنھوں نے ایک ملازمہ کو طلب کیا اور کہا کہ رَدا کو دادی جان کے کمرے میں بھیج دے۔

اُس وقت رَدا ثناء کے کمرے میں تھی۔ ملازمہ نے وہیں وہ پیغام رَدا کو دیدیا۔

"دادی جان نے بُلایا ہے" ثناء چونک کر بولی۔

"جی نہیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ رَدا بی بی کو دادی جان کے کمرے میں بھیج دو۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ" ثناء نے کہا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر بولی۔ "آؤ رَدا دیکھیں"

رَدا سادگی سے اُٹھ گئی۔ ثناء نے تیمور کو گود میں لیا اور رَدا کے ساتھ دادی جان کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ذکیہ بیگم بھی وہاں موجود تھیں۔ دونوں نے کڑی نگاہوں سے ثناء کو دیکھا۔

"میں نے صرف رَدا کو بُلایا تھا" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"کیا مطلب؟" ثناء تعجب سے بولی۔

"تم باہر جاؤ" ذکیہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔

"کوئی خاص بات ہے امی؟"

"ہاں" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"رَدا سے کوئی شکایت ہوئی ہے؟"

"تم نے سُنا نہیں ثناء۔ باہر جاؤ اور سُنو تیمور کو ہر وقت گود میں چڑھائے رکھنا اچھا نہیں لگتا۔ کنواری لڑکیوں کو کنواری لڑکیوں کی طرح رہنا چاہیئے"

"اوہ۔ گویا صورتِ حال کچھ گڑبڑ ہے۔ سوری امی جان رَدا کو تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا"

"ثناء!" ذکیہ بیگم غرّائیں

"جی فرمائیے" ثناء نے سخت لہجے میں کہا۔

"باہر جاؤ"

"چلو رَدا۔ کم آن" ثناء نے تیمور کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔

ذکیہ بیگم کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اُنھوں نے خونخوار نگاہوں سے ثناء کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ثناء تمھاری بے باکی اب بدتمیزی کی حدود میں داخل ہوگئی ہے، تمھارا کیا خیال ہے، کیا اِس بدتمیزی کو برداشت کیا جاسکتا ہے؟"

"ہر چیز کے کہیں داخل ہونے کا کوئی راستہ ہوتا ہے امی جان۔ آپ بزرگ لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ بچّے آپ کے مسائل میں شریک نہیں ہوسکتے۔ رَدا کے سلسلے میں آپ کا رویّہ مجھے کچھ سخت محسوس ہو رہا ہے۔ اور رَدا میری دوست ہے۔ ممکن ہے آپ لوگ پُرانے وقتوں میں ایسے نامساعد حالات کی بنیاد پر اپنی دوستوں کو تنہا چھوڑ دیتی ہوں۔ رَدا سے آپ کو جو کچھ کہنا ہے جو کچھ پُوچھنا ہے میرے سامنے پوچھیے۔ میرے بغیر کوئی بھی اُس سے ایک لفظ پوچھنے یا سوال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ سمجھیں آپ۔ اس سلسلے میں آپ جو کارروائی کرنا چاہتی ہیں کرلیں۔ جہاں تک میری بدتمیزی کا تعلق ہے آپ اُس کی مجھے سزا دے سکتی ہیں۔ آپ کو یہ حق حاصل ہے۔ لیکن جہاں تک رَدا کے ساتھ کسی قسم کے غلط سلوک کا تعلق ہے تو میں اِس گھر کے کسی فرد کو اِس کی اجازت نہیں دُوں گی۔ سمجھ لیا آپ نے" ثناء کا لہجہ بھی اُتنا ہی سخت ہوگیا تھا۔

"ثناء! پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے مجھے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، یہ سب... یہ سب" رَدا نے کہا۔

"خاموش ہوجاؤ رَدا، اپنے گھرانے کو میں تم سے زیادہ بہتر سمجھتی ہوں" ثناء نے کہا۔

زیب النساء بیگم نے اِس معاملے میں مداخلت کرنا ضروری سمجھا اور بولیں۔

"کوئی بات نہیں ہے دُلھن، رہنے دو اسے بھی۔ دروازہ بند کردو"

رَدا کے بدن میں ہلکی سی تھرتھری دوڑ گئی تھی اُس کا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کون سے عوامل ہیں جنھوں نے ان مہربان بزرگوں کو اتنا سخت کر دیا ہے، اِس سے قبل تو کسی کے چہرے پر کوئی شکن پیدا نہیں ہوئی تھی اُس کی موجودگی سے۔ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اُن لوگوں کو ناگوار گزری ہے

ذکیہ بیگم نے دروازہ بند کردیا۔ اور ثناء کو گھورتی ہوئی ایک نشست گاہ پر آبیٹھیں۔ زیب النساء بیگم گردن جُھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔ ثناء بڑی لاپرواہی کے انداز میں تیمور سے کھیل رہی تھی اور رَدا خوفزدہ نگاہوں سے اُن دونوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ تب ذکیہ بیگم نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھو رَدا! تمھیں یہاں آئے ہوئے جتنے بھی دن ہوئے ہیں۔

اتنے دنوں میں تم نے کم از کم ایک اندازہ ضرور لگایا ہوگا۔ وہ یہ کہ یہاں کوئی بھی تمہارے حق میں بُرا نہیں ہے یا بُرا نہیں رہا۔"

"آپ نے درست فرمایا امی جان۔" رِدا نے کہا۔

"اس کے علاوہ رِدا اس گھر کے کچھ اصول ہیں یہاں بے شمار لوگ رہتے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے احسان احمد کی اس کوٹھی میں کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ تم کسی بھی طور ہمارے لئے ناقابلِ قبول نہیں ہو۔ ہم سب بخوشی تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن رِدا ہمارا یہ حق ہے کہ ہم تم سے تمہارے بارے میں پوچھیں۔ یہ جان لیں کہ تم کون ہو۔ یہاں جتنے لوگ آرام و آسائش سے زندگی بسر کر رہے ہیں وہ سب ہم پر عیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کون کیا ہے کس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ کس کی زندگی کیا ہے، اگر کوئی شخص اُن میں ایسا ہو جس سے ہمیں اختلاف ہو یا ہم یہ اندازہ لگا لیں کہ اُس کی وجہ سے ہمارے خاندان کی نیک نامی پر حرف آسکتا ہے تو پھر ہمارا یہ حق ہے کہ ہم اُسے یہاں سے ہٹا دیں۔ رِدا، ہم تمہارے بارے میں جاننے کے خواہشمند ہیں۔"

"جی ...؟"

"ہاں۔ تم اپنی طرف سے ہمیں مطمئن کر دو ہمارے سارے گلے ختم ہو جائیں گے لیکن اگر تم ایک بند کتاب کی مانند رہیں اور تم پہ نہ کھل سکیں، تو ہم اس بات کے لئے مجبور ہوں گے کہ تمہیں یہاں رہنے کی اجازت نہ دیں۔"

"امی جان! رِدا کو اِس کے لئے ابھی کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔" ثناء تیزی سے بولی۔

"میں مجبور کر سکتی ہوں۔ تو بھی کیا ہے خود کو۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"نتائج جانتی ہیں آپ؟" ثناء نے ناگواری سے کہا۔

"ذکیہ! او ذکیہ! یہ کیا انداز ہے بھئی، اپنے آپ کو قابو میں رکھو میں گفتگو کر رہی ہوں، خاموش ہو جاؤ تم سب، بڑی ہوں میں تم سب سے۔" زیب النساء بیگم نے درمیان میں مداخلت کی اور ذکیہ بیگم بل کھا کر رہ گئیں۔

"کیوں ثناء، رِدا تمہاری دوست ہے تو تم نے ہمیں دشمنوں میں کیوں شمار کر لیا؟"

"دادی جان! رِدا سے جو کچھ پوچھا جائے وہ اُس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ بتائے یا نہ بتائے۔"

"نہیں ثناء، اس گھر میں غلط کاروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، خواہ اس کے لئے ہمیں کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔"

"رِدا غلط کار ہے؟" ثناء دانت پیستے ہوئے بولی۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ لیکن اپنے آپ کو چھپائے ہوئے کیوں ہے؟"

زیب النساء بیگم بولیں۔

"مجھے بھی بولنے کا موقع دیا جائے۔" رِدا نے آہستہ سے کہا۔ اُس کے اندر ایک سختی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب غم و اندوہ کے آثار نظر نہیں آرہے تھے بلکہ تھوڑی سی کرختگی تھی۔ تب اُس نے کہا۔

"میں آج تک اس لئے خاموش تھی کہ اپنے آپ کو عریاں نہیں کرنا چاہتی تھی، آپ لوگ۔ امی جان آپ اور دادی جان آپ دونوں سُن لیں کہ اسٹیشن پر میری ملاقات شہاب صاحب سے ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو انتظامیہ کا ایک فرد ظاہر کر کے مجھ سے میری تنہائی کی وجہ پوچھی تھی۔ کیونکہ میں تنہا ہی اسٹیشن پر اتری تھی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہتی ہوں اور انھوں نے مجھے پیش کش کی کہ ایک ذمّہ دار افسر ہونے کی وجہ سے وہ میری مدد کرنے کے خواہشمند ہیں وہ مجھے اپنی کار تک لائے تھے کہ ثناء مل گئی۔ اور اُس کے بعد ثناء مجھے یہاں لے آئی۔ رات کا وقت تھا میں نے سوچا تھا کہ اس ہمدرد لڑکی کی ہمدردی سے فائدہ اُٹھا لینا چاہیئے۔ رات گزار کر دِن کی روشنی میں اپنے لئے کوئی مناسب رہائش گاہ تلاش کر لوں گی لیکن یہ بات آپ ثناء سے پوچھ سکتی ہیں کہ انھوں نے انتہائی اصرار کر کے مجھے یہاں سے جانے سے روک دیا اور اُن کے محبت بھرے اصرار نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُن کی بات مان لوں ایک اجنبی جگہ میں رہنے کے لئے نہیں آئی تھی امی جان اور کسی اجنبی جگہ میں اپنے بارے میں کچھ بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ثناء کی محبت۔ آپ لوگوں کا پیار اپنی جگہ تھا لیکن انسان کی اپنی ذات میں کچھ ایسی چیزیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جنھیں وہ دوسروں کے سامنے نہیں لا سکتا آپ میرے بارے میں پوچھنا ہی چاہتی ہیں تو اِن چند دنوں کی رفاقت اور اِن لمحات کی محبت کی بنا پر میں آپ کو اُس سے لاعلم نہیں رکھوں گی۔ سُنیئے دادی جان! جیسا کہ میں آپ لوگوں سے عرض کر چکی ہوں۔ میرا تعلق لاہور سے ہے، لاہور کے ایک معزز خاندان سے۔ ہم لوگ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن ہمارا شمار غریب لوگوں میں ہوتا ہے حالات کی ستمگری نے ہمیں ایک ایسے خاندان سے روشناس کرا دیا جو ہم سے زیادہ صاحب حیثیت تھا اور میری شادی اُس خاندان میں کر دی گئی۔

میرے شوہر بہت اچھے انسان تھے مجھے اُس گھرانے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن تقدیر نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ میرے شوہر ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گئے۔ تیمور بہت چھوٹا سا تھا۔ میرے اُوپر اُس کی پرورش کی ذمّہ داری آ پڑی تھی۔ جبکہ میرے والدین موجود نہیں تھے۔ میرے والد کا انتقال تو بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ میری ماں زندہ تھیں لیکن بیماری کی وجہ سے وہ بھی جانبر نہ ہو سکیں اور میں صرف سُسرال

کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اُن لوگوں کا رویّہ میرے ساتھ بہتر نہیں رہا۔ وہ اپنی دولت اور امارت کے زعم میں تھے ..
سُسرال میں میرا ایک جیٹھ بھی تھا جو نیم پاگل قسم کا آدمی ہے اُس کی شادی اس وجہ سے نہیں ہوئی تھی کہ اُس کا دماغی توازن موسم گرما میں شدید خراب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میرے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ میری شادی میرے اِس پاگل جیٹھ سے کر دی جائے۔ میں نے اِس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ اور وہ لوگ سختی پر آمادہ ہو گئے۔ میرے ساتھ انتہائی سخت گیری کا سلوک کیا گیا اور مجھے اس بات پر مجبور کیا جاتا رہا کہ میں اپنے جیٹھ سے شادی کر لوں۔"

"میں نے جب صورتِ حال ناگزیر پائی اور اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ میں وہاں سے بے یار و مددگاری کے عالم میں فرار ہو جاؤں تو پھر میں نے وہی کیا۔ میں نے خاموشی سے تیمور کو اُٹھایا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ وہاں سے بے سر و سامانی کے عالم میں کراچی آنے والی ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اور کراچی پہنچ گئی۔ میرے دل میں یہی خیال تھا کہ کراچی آنے کے بعد میں کسی ہوٹل میں قیام کروں گی۔ پھر کہیں ملازمت تلاش کرونگی اور اِس طرح اپنے رہنے کے لئے جگہ بھی۔ یہ ہے میری کہانی۔ اِس کہانی میں جتنے اسرار و رموز پوشیدہ ہیں میرے کردار کی جتنی بدنمائی اِس میں واضح ہے آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ فیصلہ آپ کر لیں گی۔"

رِدا کے لہجے میں اتنی بے باکی اتنی صاف گوئی تھی کہ دادی جان اور ذکیہ بیگم کے تمام تر خیالات مدہم پڑ گئے۔ وہ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔ ثناء خاموش بیٹھی ہوئی تھی اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اُن تاثرات میں انتہائی سختی تھی۔ تب زیب النساء بیگم نے کہا۔

"اِس بات کا کیا ثبوت ہے رِدا کہ تم نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے؟"

"کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔"

"لیکن تم ثبوت مہیا کر سکتی ہو۔"

"کس طرح؟"

"اُس خاندان کا پتہ بتا کر جہاں کی تم بہو تھیں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اِس طرح آپ اُن لوگوں سے تصدیق کریں گی اور میری صورتِ حال واضح ہو جائے گی میں کسی بھی قیمت پر آپ لوگوں کو اِس کا حق دینے پر تیار نہیں ہوں دادی جان کہ آپ میری تقدیر پر سیاہی پھیر دیں۔ آپ صرف اِس لئے مجھ سے یہ سوالات کر رہی ہیں تاکہ میں آپ کے گھر میں رہ رہی ہوں ثناء سے بات کیجئے اِس سے پُوچھئے کہ میں نے کب یہاں رہنا چاہا۔ اِس نے کس کس طرح مجھے مجبور کیا یہاں رہنے پر اور میں بالکل مجبوری کے عالم میں آپ کی اِس کوٹھی میں رُک گئی۔ ورنہ معاف کیجئے گا مجھے کوٹھیوں میں رہنے کا شوق نہیں ہے۔"

"ایک آخری بات اور رِدا۔" دادی جان نے کہا۔

"جی جی، فرمایئے آپ کو حق حاصل ہے میں اتنے دن کے قیام، ثناء کی محبت۔ آپ کی عنایتوں اور آپ کے نمک کی پوری پوری قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔" رِدا نے کہا۔

"اس انداز میں نہ سوچو، خود کو ہماری جگہ رکھو تو تمہیں یہ احساس ہو جائے گا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ اتنا غلط نہیں ہے کہ تم اِس پر چراغ پا ہو جاؤ۔"

"جی نہیں، میں آپ کو غلط نہیں کہہ رہی۔ میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ آپ کو اِس کا حق ہے۔" رِدا نے کہا۔

"تم شہاب کے ساتھ کہاں گھومتی پھرتی ہو؟" دادی جان نے براہِ راست سوال کیا اور رِدا کا چہرہ آگ کی طرح سُرخ ہو گیا۔

"مطلب ...؟"

"تمہیں شہاب کی کار میں دیکھا گیا ہے۔" دادی جان نے کہا اور رِدا نے گردن خم کر دی۔

"ٹھیک ہے جس نے بھی مجھے شہاب صاحب کی کار میں دیکھا ہے اُس نے آپ سے غلط نہیں کہا۔ لیکن معاف کیجئے گا دادی جان، یہ سوال آپ مجھ سے کیوں کر رہی ہیں؟"

دادی جان کا مُنہ حیرت سے ایک لمحے کے لئے کھل گیا۔ انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے ذکیہ بیگم کی طرف دیکھا اور بولیں۔

"کیا مطلب ...؟"

"یہ سوال کیا آپ شہاب صاحب سے نہیں کر سکتی تھیں؟" رِدا نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں۔ اُس سے بھی پُوچھا جائے گا۔"

"تو پھر اِس سوال کا جواب آپ کو شہاب صاحب ہی دیں گے۔"

"جی نہیں آپ کو دینا ہوگا رِدا صاحبہ۔" ذکیہ بیگم نے زہریلے لہجے میں کہا اور ثناء اُٹھ کھڑی ہوئی اور رِدا سے بولی۔

"کیا تم انکل شہاب کی کار میں اُس کے بعد بیٹھی تھیں؟"

"ہاں بیٹھی تھی۔" رِدا نے جواب دیا۔

"کب ...؟"

"کل صرف کل۔"

"کیوں ...؟"

"میں نے کہا نا اِس کا جواب میں نہیں دوں گی" رِدا تلخ لہجے میں بولی۔

"اِس کا جواب ذرا مشکل ہی سے دیا جا سکتا ہے ثناء" ذکیہ بیگم اب دلیری سے بول رہی تھیں۔

"مطلب امی؟"

"مطلب یہ کہ یہ پوری کہانی غلط ہے، اِس کے پسِ پردہ کوئی اور ہی کہانی ہے" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"اوہ، واقعی۔ انکل شہاب اِس سلسلے میں بہتر طور پر جواب دے سکیں گے۔ رِدا کو اِس کا جواب دینے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔"

"وہ تمہارے سامنے اقرار کر چکی ہے کہ وہ شہاب کی کار میں تھی۔"

"میں جانتی ہوں کہ رِدا نے جو کچھ کہا ہے غلط نہیں کہا وہ اگر چاہتی تو انحراف بھی کر سکتی تھی۔ لیکن آپ لوگ جس انداز میں سوچ رہے ہیں، مجھے معاف کیجئے گا، یہ پرانی سوچ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کسی لڑکی کو کسی مرد سے ملتے دیکھ کر صرف یہی سوچا جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی رمز پوشیدہ ہے" ثناء کا لہجہ خاصا گستاخانہ تھا "اٹھو، او میرے ساتھ چلو" اُس نے رِدا کو مخاطب کیا۔

"رِدا! سوچ لینا اچھی طرح سے سوچ لینا ہمارے گھر کو کوئی نقصان آسانی سے نہیں پہنچایا جا سکتا" ذکیہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

رِدا نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ثناء دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔

"تم باہر نہیں نکلو گی رِدا" رِدا کو یوں محسوس ہوا جیسے اگر اُس نے ثناء کی بات نہ مانی تو کوئی بڑی بات نہ ہو جائے چنانچہ وہ اُٹھی اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ ثناء اُس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہوئی اُس کے کمرے میں آ گئی۔ رِدا کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی، وہ عجیب سے انداز میں ثناء کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور پھر اُس نے پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا

"بات کچھ اتفاقیہ طور پر بگڑ گئی ہے ثناء۔ امی جان یا دادی جان بُری نہیں ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے شہاب صاحب کے ساتھ کار میں کس نے دیکھا تھا؟"

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی رِدا۔ آج جب تم نے اپنے آپ کو امی اور دادی جان کے سامنے کھول دیا ہے تو مجھے اپنی شخصیت بڑی ہلکی محسوس ہو رہی ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات تھی۔ ارے رِدا یہ تو تمہاری مظلومیت کی داستان تھی اس میں تمہاری تضحیک کا پہلو کہاں سے نکلتا ہے، اِس میں تمہاری توہین کہاں سے ہوتی ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی ہے تمہارے ساتھ، ایسا کچھ ہو رہا تھا۔ تو تمہیں اُس کا پورا پورا حق تھا کہ تم اپنی زندگی ایک پاگل کے ساتھ منسوب کرنے کی بجائے اپنے طور پر تنہا گزارو۔ میں اگر یہ بات سُن لیتی تو اس میں کون سا نقصان ہو جاتا۔ کیا تم مجھے اتنے چھوٹے دِل کا مالک سمجھتی ہو کہ میں تمہاری مظلومیت کی اِس داستان کو سُن کر میں تمہارے بارے میں کوئی بُری رائے قائم کرتی۔ رِدا مجھے بتاؤ تو سہی۔ ایسا کیوں سوچا تم نے۔ چلو چھوڑو۔ اب یہ بھی نہیں بتاؤ گی مجھے کہ انکل شہاب کے ساتھ کار میں کیوں گئی تھیں؟"

"ملازمت کے لئے ثناء، میں جانتی تھی کہ تم اس سلسلے میں مجھے کبھی اجازت نہیں دو گی۔ لیکن ثناء! جیسا کہ میں تم سے کہہ چکی ہوں اور بار بار نہیں دوہرانا چاہتی کہ تم جیسی محبت کرنے والی بہن کی ذات پر میں کوئی آنچ نہیں دیکھنا چاہتی۔ ثناء میں ملازمت کروں گی۔ تم سے ملتی رہوں گی۔ میری تمہاری محبت میں کبھی کوئی رخنہ اندازی نہیں ہو گی۔ اب دیکھو نا، نجانے کس طرح یہ بات منظرِ عام پر آئی اور کس شکل میں آئی۔ دادی جان اور امی جان اتنی بُری انسان نہیں ہیں لیکن کہنے والے نے کچھ اس انداز میں کہا ہے اُن سے کہ وہ برگشتہ ہو گئی ہیں۔ تم یہ بات اپنے انکل شہاب سے پوچھ سکتی ہو۔ میں نے اُن سے درخواست کی تھی کہ میرے لئے وہ کوئی ملازمت تلاش کریں اور انھوں نے کل مجھے اپنے کچھ دوستوں سے ملایا اور بالآخر ایک ملازمت میرے لئے مخصوص کر دی گئی۔ میں پہلی تاریخ سے اپنی اس ملازمت پر جا رہی ہوں ثناء۔ تمہیں اس سلسلے میں میری مدد کرنی چاہیئے۔"

"مگر تم نے انکل شہاب سے یہ بات کیوں کہی؟"

"انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میری کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس بے یار و مددگاری کے عالم میں کم از کم اس عالم میں جب کہ تم کہیں بھی مجھے کوئی کام نہ کرنے دو گی جس طرح بھی ممکن ہو سکے میں پہلے کوئی ملازمت تلاش کر لوں۔ تم جانتی ہی ہو کہ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوتا چنانچہ میں نے شہاب صاحب کے رویّے کو غنیمت جانا اور اُن کے ذریعے نوکری حاصل کر لی۔"

"اوّل بات تو یہ ہے رِدا کہ انکل شہاب بہت اچھے انسان نہیں ہیں۔ میں تمہیں یہ بات کھل کر بتا دینا چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے گھر کے ایک بُرے فرد ہیں۔ اُن کے نام کے ساتھ کوئی بدنامی تو وابستہ نہیں ہے۔ لیکن میں لڑکی ہوں اور میری نگاہ اتنی کمزور بھی نہیں ہے کہ میں مرد کے چہرے پر پھیلی ہوئی کیفیات نہ سمجھ سکوں۔ انکل مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ اس گھر کے لئے بہت اچھے انسان ہیں۔ لیکن باہر کی دُنیا میں وہ اچھے انسان نہیں ہیں رِدا، اِس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا، انکل شہاب کی زیادہ قربت تمہارے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ یہی بات ہے کہ امی اور دادی جان بھی اس قدر

برگشتہ ہوئیں اگر تم یہاں کے کسی اور فرد کے ساتھ دیکھی جاتیں تو شاید یہ لوگ اس انداز میں نہ سوچتے۔ انکل شہاب کا ریکارڈ بہت اچھا نہیں ہے۔ کئی شکایتیں اُن کی امی اور دادی جان کے کانوں تک پہنچ چکی ہیں۔ صرف اس بات پر میرے رویّے میں ذرا سی نرمی پیدا ہو گئی ہے کہ معاملہ انکل شہاب کا ہے اور جو کچھ اُن سے کہا گیا ہے وہ اتفاق سے غلط نہیں ہے تمہاری بات کو میں بالکل سچ مانتی ہوں، یقیناً ایسا ہی ہُوا ہو گا۔ لیکن ایک نصیحت میں تمہیں کرتی ہوں۔ وہ یہ کہ آئندہ انکل شہاب پر بہت زیادہ بھروسہ مت کرنا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہو گا کہ یہ ملازمت ہی نہ کرو۔ تاکہ انکل شہاب کا احسان تم پر نہ رہے۔"

"نہیں ثناء! کیا ان حالات میں بھی تم یہی مناسب سمجھتی ہو کہ میں یہیں رہوں؟ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ان لوگوں نے کیا کہا ہے؟"

"ٹھیک ہے اگر تم اِس گھر میں نہیں رہو گی تو ثناء بھی نہیں رہے گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے" ثناء نے کہا اور اُٹھ کر تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

"ثناء! سنو تو سہی رُکو تو سہی" رِدا نے اُسے روکنا چاہا لیکن ثناء باہر جا چکی تھی۔

ثناء شدید غم و غصّے کا شکار تھی تنتناتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ رِدا کے ساتھ جو بھی بیتی تھی اُس کے بعد رِدا جیسی نازک طبع اور حساس لڑکی کیلئے واقعی اِس کوٹھی میں رُکنا مشکل تھا۔ ثناء کو رِدا کے ایک ایک لفظ پر یقین تھا وہ جانتی تھی کہ رِدا نے صرف حالات کے تحت شہاب صاحب سے رابطہ قائم کیا ہو گا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی ماں اور دادی جان ابھی تک رِدا کی طرف سے مشکوک تھیں ثناء کو سب سے زیادہ تشویش اِس بات کی تھی کہ یہ لگائی بجھائی کس نے کی۔ ذہن میں لاتعداد خیالات آ رہے تھے اور اُس نے بہت کچھ سوچا تھا اِس موضوع پر۔ وہ لان میں جا کر بیٹھ گئی تھی اور سوچتی رہی تھی ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ نُدرت نظر آئی اور ثناء چونک پڑی۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے نُدرت کو قریب بُلایا اور نُدرت جلدی سے اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"مالک کی بیٹی! تنہا کیا کر رہی ہو یہاں؟"

"بات بہت بگڑ گئی ہے نُدرت، صورتِ حال بہت خراب ہو گئی ہے۔"

"ارے ارے تمہارے چہرے پر تو باقاعدہ تشویش کے آثار نظر آ رہے ہیں لیکن ہر مرض کی دوا ہے۔ کہو کیا بیماری ہوئی ہے تم کو مالک کی بیٹی؟"

"بھئی سنجیدگی۔ اِس وقت بالکل مذاق برداشت نہیں کیا جائیگا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ مالکوں کا حکم ماننا فرض ہے کہو کیا مصیبت نازل ہوئی ہے تم پر؟"

"نُدرت! رِدا خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

"کیوں کیوں۔ خیریت۔ کیا خطرہ لاحق ہوا ہے اُسے؟" نُدرت نے پوچھا اور ثناء نے ساری کہانی اُسے سُنا دی نُدرت بھی گہری تشویش کا شکار ہو گئی تھی۔

"بات اتنے بڑے لوگوں کی ہے مالک کی بیٹی کہ غور کرنا ہی پڑیگا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون بدبخت ہے جس نے فوراً ہی آ کر یہ خبر پھونک دی۔ رِدا کا کہا غلط نہیں ہو سکتا میرا اپنا تجربہ بھی ہے۔ بعض لوگوں کے بارے میں۔ مونالیزا جس معصومیت سے مسکراتی ہے اُس کے تحت یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُس کے کہے ہوئے الفاظ غلط نہیں ہوں گے لیکن اُن بزرگوں کو کون سمجھائے؟"

"میں نے بھی کافی بدتمیزی کر لی ہے اُن سے تھوڑا سا افسوس بھی ہو رہا ہے مگر رِدا کے ساتھ میں کوئی سختی برداشت نہیں کر سکتی اب سوچنا یہ ہے کہ آگے کیا ہو گا امی اور دادی جان کو تو میں اچھی طرح سنبھال سکتی ہوں ذرا آج ابو آ جائیں رات کے کھانے پر میں اِس کا فیصلہ کر دوں گی ابو ذرا مختلف قسم کے انسان ہیں وہ ساری باتیں ٹھیک کر لیں گے لیکن اِن سب باتوں کے باوجود رِدا کا مسئلہ سب سے مشکل ہے رِدا اِن حالات میں یہاں کیسے رُک سکے گی اُسے روکنے کی کوئی ترکیب بتاؤ نُدرت۔ دیکھوں تمہاری ذہانت کیا گُل کِھلاتی ہے۔" نُدرت بہت دیر تک سوچتی رہی اور پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ترکیب ذہن میں آ گئی ہے۔ لیکن اُس کا معاوضہ کیا..؟"

"جو کچھ تم کہو گی۔"

"تو پھر کان اِدھر لاؤ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں میں زور سے یہ بات نہیں کہہ سکتی" نُدرت نے کہا اور ثناء نے اپنا کان نُدرت کے چہرے کے قریب کر دیا۔ نُدرت اُسے کچھ بتاتی رہی ثناء کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک تھی۔

"آئیڈیا بُرا نہیں ہے اللہ رکھی۔ تجھے اللہ رکھے، بات واقعی کام کی ہے۔ کیا خیال ہے ڈیڈی کے سامنے یہ معاملہ لانے کے بجائے میں خود ہی یہ کارروائی کر ڈالوں۔"

"رات کو کھانے کی میز پر یہ آئیڈیا کیسا ہے؟"

"ذرا ڈیڈی کے سامنے کوئی ڈرامہ کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہ دوسری طبیعت کے انسان ہیں۔"

"تو پھر رات کا پروگرام ملتوی کر دو۔ کل دِن میں یہ کھیل ٹھیک رہے گا لیکن رِدا کے سامنے نہیں اُسے دوسرے ہی ذرائع سے پتا چلنا چاہیئے۔"

"او کے، ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ندرت ایک ڈیوٹی اور ہے تمہارے سپرد"۔

"کیا... ؟"

"یہ کیسے پتا لگایا جائے کہ کس نے انکل شہاب والی بات دادی جان اور امی جان تک پہنچائی ہے"۔

"یہ تمہارا کام ہے ثناء گھر کے لوگوں کا جائزہ لو اور ایسے لوگوں کے بارے میں اندازہ لگاؤ جو ردا کے سلسلے میں زیادہ ہی پریشان ہوں"۔ ندرت نے کہا اور دفعتاً ثناء چونک پڑی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ گئے تھے۔

"پکڑ لیا، پکڑ لیا ندرت، پکڑ لیا"۔

"کون ہے؟" ندرت نے چونک کر پوچھا۔

"صرف ایک ہی ہیں ہوسکتا ہے ایسا اور وہ ہیں محترمہ عارفہ بیگم۔ ردا کا انٹرویو کر رہی تھیں یقینی طور پر انھیں دادی اماں اور امی جان کی طرف سے جاسوسی پر مامور کیا گیا ہے۔ خدا کی قسم ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں"۔

"ہوں۔ کیا وہ اس ٹائپ کی خاتون ہیں؟"

"وہ صرف اسی ٹائپ کی خاتون ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خاتون ہیں ہی نہیں۔ لیکن اگر انھوں نے یہ حرکت کی ہے تو یقین کرو ندرت کہ چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گی ان کو۔ میرا نام بھی ثناء ہے"۔

"ساتویں آٹھویں کا دودھ بھی یاد دلا دوں گی تم بالکل فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں"۔ ندرت نے سینہ تان کر کہا۔

"تو پھر عارفہ بیگم کے خلاف یہ کارروائی شروع کی جاتی ہے"۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ ثناء نے کہا۔

"ردا کو سنبھالنا بہت ضروری ہے اگر تم سے ملاقات ہو جائے اور وہ تم سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ کرنا چاہے تو تم اس سے یہی کہنا کہ اگر وہ یہاں سے چلی گئی تو ثناء کی حالت خراب ہو جائے گی ممکن ہے وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے"۔

"ابھی یہ سب کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ ویسے میرے خیال میں اسے ملازمت کرنے دی جائے جہاں تک یہاں سے جانے کا سوال ہے تو ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟"

"ارے تم کہو تو سہی۔ اللہ رکھی تمہاری بات کا اور برا مانا جائے؟" ثناء نے خوش ہو کر کہا۔

"اگر تم پسند کرو اور ردا مناسب سمجھے تو اسے یہاں ملازموں کے کوارٹر میں بھیج دو۔ میرا غریب خانہ اس کے لئے حاضر ہے کوٹھی کے معاملات میں ذرا مشکلات پیش آتی رہیں گی۔ یہاں وہ آرام سے رہ سکتی ہے"۔

"نہیں نہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے ندرت۔ کسی بھی طور۔ خدا کی قسم میں تمہیں بھی اپنے دوستوں کا درجہ دیتی ہوں اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم یہاں رہو لیکن پھر میں سوچتی ہوں کہ تمہارے لئے بڑی مشکلات پیش آ جائیں گی"۔

"نہیں ثناء! پلیز اس سلسلے میں کبھی غور مت کرنا۔ میں یہاں بالکل خوش ہوں تم دیکھو نا میرے ابو جو ہیں نا وہ بھی بہت ہی صاف طبیعت کے مالک ہیں کسی بھی طور وہ اس سے زیادہ مراعات لینا پسند نہیں کریں گے تم ہمارے بارے میں ایسا تو سوچو بھی نہیں اور پھر ہماری دوستی زندہ رہے۔ مکانوں کا کیا ہے"۔ ندرت نے کہا اور ثناء خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک دونوں باتیں کرتی رہیں اور اس کے بعد ثناء رخصت ہو گئی۔

ذکیہ بیگم اور زیب النساء ان دونوں کے نکل جانے کے بعد دیر تک خاموش بیٹھی رہی تھیں دونوں کے دلوں میں عجیب سے احساسات تھے زردا بچی بھی معلوم ہوتی تھی اور اس کی باتیں مشکوک بھی تھیں بہر طور یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ عارفہ بیگم نے جھوٹ نہیں بولا تھا کم از کم عارفہ بیگم کا کردار اس سلسلے میں صاف ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد زیب النساء بیگم نے کہا۔

"کیا کہتی ہو ذکیہ؟"

"میں اس ثناء کی بدتمیزی پر غور کر رہی ہوں میرا خیال ہے مجھے ثناء کے سلسلے میں مزید سخت ہونا پڑے گا اکلوتی ہے تو کیا... باپ کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے اس نے ہم سب کو پاؤں کی جوتی سمجھ لیا ہے تو کیا نہیں کہہ گئی ہمیں... تمام بزرگوں کو ذلیل کر چکی ہے"۔

"اونہہ چھوڑو ان باتوں کو اس کی زبان کے آگے لگام کہاں ہے غصے میں بک گئی سب کچھ اب اس پر کیا توجہ دینا"۔

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب ردا کے سلسلے میں کیا کیا جائے؟"

"اس کی باتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے اب یہ کیسے معلوم ہو کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے"۔

"میرا خیال ہے شہاب سے پوچھ لینا بھی ضروری ہے۔ ردا نے یہ بات تسلیم کر لی کہ شہاب اسے کار میں لے کر گیا تھا لیکن کیوں گیا تھا شہاب کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے یہ بات تو ابھی تک شبہے میں ڈال رہی ہے نا"۔

"امی! اگر آپ مناسب سمجھتی ہیں تو شہاب سے بھی اس سلسلے

میں بات کر لیں"۔

"ذرا دیکھواؤ کسی سے وہ اپنے کمرے میں ہے یا نہیں"۔

"میں کوشش کرتی ہوں"۔ ذکیہ بیگم نے کہا۔

شہاب صاحب اس وقت تو موجود نہ ملے لیکن دوپہر کے کھانے پر وہ آئے تھے ان کی کار جیسے ہی داخل ہوئی ملازم نے جا کر ذکیہ بیگم کو اس بارے میں اطلاع دے دی اور ذکیہ بیگم نے زیب النساء بیگم کو چنانچہ شہاب صاحب کو فوراً ہی کمرے میں طلب کر لیا گیا وہ متعجب سے اندر پہنچے تھے بھابی اور ماں کو عجیب سے عالم میں دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔

"خیریت امی! کیسے طلب کیا آپ نے مجھے؟"

"بیٹھ جاؤ"۔ زیب النساء بیگم نے کہا اور شہاب صاحب بیٹھ گئے۔

"کیا بات ہے؟"

"شہاب! میں ماں ہوں تمہاری۔ جو کچھ پوچھوں گی کیا زندگی میں ایک بار اس کا صحیح جواب دے سکتے ہو؟"

"ایک بار میں کوئی حرج نہیں ہے امی پوچھئے"۔ شہاب صاحب نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"ردا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"کس سے؟" شہاب صاحب چونک پڑے۔

"بننے کی کوشش مت کرو۔ ردا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"خیریت امی۔ یہ آپ کو اچانک کیسے خیال آ گیا کہ ردا میری کوئی رشتہ دار ہو سکتی ہے"۔

"شہاب! ماں ہوں تمہاری۔ جو کچھ پوچھ رہی ہوں صحیح جواب دے ورنہ خودکشی کر لوں گی"۔

"ارے ارے خدا نہ کرے امی سنجیدہ کیوں ہو گئیں آپ۔ معاملہ کیا ہے؟"

"میں تجھ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتی ہوں کہ ردا سے تیرا کیا رشتہ ہے وہ بچہ کس کا ہے؟"

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" شہاب احمد چونک پڑے۔

"کیا ردا تیری منکوحہ نہیں ہے۔ کیا وہ بچہ تیرا نہیں ہے..."۔ زیب النساء بیگم نے براہ راست سوال کیا اور شہاب صاحب سناٹے میں رہ گئے۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کس نے کہی یہ بات آپ سے؟" انھوں نے سرد لہجے میں کہا۔

"مجھے صرف جواب چاہئے"۔

"ایسی فضول بات آپ نے کیوں سوچی۔ کس ذلیل انسان نے اس معصوم لڑکی پر یہ الزام لگایا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے سمجھیں آپ"۔ شہاب صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تو پھر کل وہ تیرے ساتھ کار میں کیا کر رہی تھی؟" زیب النساء بیگم نے شہاب صاحب کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ شہاب صاحب اوچھے کھلاڑی تھے بھلا ان معصوم سی بزرگ خاتون کو وہ کیا خاطر میں لاتے، ان کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی سچائی اپنانا ضروری سمجھا چنانچہ کہنے لگے۔

"اس نے مجھ سے نوکری کی درخواست کی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس گھر پر بار نہیں بننا چاہتی ثناء کی محبت اسے کچھ نہ کرنے دے گی۔ ثناء کبھی یہ پسند نہ کرے گی کہ وہ ملازمت کرے اس لئے وہ مجھ سے درخواست کرنے پر مجبور ہوئی تھی امی۔ اور میں نے صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس کے لئے ایک ملازمت تلاش کر دی ہے پہلی تاریخ سے وہ اپنی نوکری پر جائے گی۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کے لئے کسی الگ مکان کا بندوبست بھی کر دیا جائے تاکہ وہ آرام و سکون سے رہ سکے"۔

"اور اس خواہش کا اظہار اس نے صرف تم سے کیا۔ کیوں؟" زیب النساء بیگم بولیں۔

"خدا کے خوف سے ڈریئے امی۔ خدا بھی کوئی چیز ہے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بزرگ ہیں آپ اپنی بزرگی کو اس طرح مجروح نہ کیجئے خدا کی قسم اس کے علاوہ اس نے مجھ سے اور کچھ نہیں کہا صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر صرف انسانی رشتوں کی بنیاد پر... اور میں نے بھی جو کچھ کیا ہے وہ اس ہمدردی کی بنیاد پر کیونکہ ثناء کی طبیعت کو میں اچھی طرح جان چکا ہوں۔ لیکن جس ذلیل انسان نے آپ سے اس سلسلے میں بات کی ہے۔ اس نے انتہائی کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے اس کا نام بتلائیے"۔ ذکیہ بیگم اور زیب النساء بیگم اب ذرا گھبرا گئی تھیں۔ شہاب کے لہجے میں بھی سچائی جھلک رہی تھی اور ردا بھی کسی قدر بے گناہ ہی ثابت ہوئی تھی، چنانچہ انھیں شرمندگی ہونے لگی۔ بے چاری عارفہ بیگم نے بھی غلط تو نہیں کہا تھا یہ دادی جان کی ہی کوششیں تھیں جن کی بناء پر عارفہ بیگم کو ردا کے پیچھے لگایا گیا تھا لیکن اس کے نتائج بڑے الٹے نکل آئے تھے۔

"خیر چھوڑو شہاب ان باتوں کو۔ لیکن اس کے لئے اتنی زیادہ ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں دراصل ہم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے"۔

"تعجب ہے سخت تعجب ہے مجھے اور نہایت افسوس"۔ شہاب

صاحب نے کہا اور غصیلے انداز میں باہر نکل آئے۔ ذکیہ بیگم اور زیب النساء بیگم پھر ایک دوسرے کی شکل دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"یہ تو کچھ نہ نکلا۔ کیا خیال ہے تمہارا اُن تمام باتوں کو سچ مان لیا جائے؟"

"اب اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟"

"کھیل تو بگڑ ہی گیا ہے۔ اس بے چاری لڑکی کو خواہ مخواہ ہم نے اتنا سخت و سُست کہا ذرا سا حالات پر غور کر لیتے تو شاید ٹھیک ٹھاک ہو جاتا اتنی جلد بازی کرنا مناسب نہیں تھی۔"

"میں کیا کہوں امّی؟"

"ٹھیک ہے بھئی اب جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔"

رات کے کھانے پر سب لوگ جمع ہوتے تھے احسان احمد کے بارے میں شام کے پانچ بجے ٹیلی فون ملا کہ وہ کسی کام سے اسلام آباد جا رہے ہیں اس لئے گھر واپس نہیں آئیں گے۔ چنانچہ احسان احمد صاحب تو رات کے کھانے پر موجود نہیں تھے باقی تمام لوگ جمع ہو گئے تھے۔ رِدا بھی رات کے کھانے میں شریک ہوتی تھی، ثناء بھی ہوتی تھی لیکن ان دونوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد کھانا شروع ہو گیا نہ ذکیہ بیگم کی ہمت پڑی تھی کہ ثناء کو بلائیں اور نہ ہی زیب النساء بیگم کی۔ کھانا بددلی سے کھایا گیا۔

ثناء نے رات کا کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا تھا اور اس کے بعد اُس نے رِدا کو بھی طلب کر لیا۔ رِدا مُسکراتی ہوئی اندر آ گئی تھی اُس کے چہرے پر اب تازگی تھی۔ ثناء نے اُسے بغور دیکھا اور اس کے بعد کھانے کا اشارہ کیا۔

"میں جانتی تھی کہ آج تم کھانے میں شریک نہیں ہوگی۔" رِدا بولی۔

"اُن لوگوں پر شدید غصّہ آ رہا ہے۔" ثناء نے کہا۔

"ثناء انتہا پسندی اچھی چیز نہیں ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ امّی اور دادی جان کے ذہن میں ایسی بُری بات کیوں آئی؟"

"تعجب کی بات نہیں ہے رِدا۔ میں چور پکڑ چکی ہوں۔"

"کک... کون... کون ہے چور...؟"

"عارفہ بیگم۔ اور ان عارفہ بیگم کا مقدر اتنا خراب ہو گیا ہے اب کہ آنے والے وقت میں تم دیکھ لوگی۔"

"چھوڑو۔ پتا نہیں کیوں۔ انھیں ہم سے دشمنی ہو گئی۔ بہرطور ان تمام باتوں کا ایک حل موجود ہے ہم کیوں نہ اُس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں۔ تم خود دیکھو آج یہ بات نکلی ہے خدا کرے اُن لوگوں کے ذہنوں سے یہ خیال دُور ہو جائے لیکن کل کوئی اور بات نکل سکتی ہے۔ ثناء! کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم میری ایک مدد کر دو۔"

"کیا...؟" ثناء نے پوچھا۔

"کوئی ایسی جگہ منتخب کر دو میرے لئے جو تمہاری پہنچ سے دُور بھی نہ ہو۔ ہم روز ملیں ساتھ اُٹھیں بیٹھیں۔ میں اپنی ملازمت انجام دُوں اور تم اپنے کام کرو اور اُس کے بعد ہماری اور تمہاری ملاقات ہُوا کرے بڑی اچھی بات رہے گی یہ ثناء، کم از کم اُن لوگوں کے ذہنوں سے یہ کوفت دُور ہو جائے گی اور میں بھی ثناء اِس گھر میں رہنے پر مجبور نہیں ہوؤں گی جہاں شکوک و شبہات ہوں تمہاری محبت سر آنکھوں پر یہ سب لوگ بھی میرے لئے اب اجنبی نہیں ہیں لیکن ثناء مجھے میری ذات میں زندہ رہنے دو۔"

"دیکھو رِدا۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ ساری باتیں میں نے مان لیں لیکن یہاں سے جانے کی بات میں نہیں مانوں گی۔"

"ثناء پلیز۔"

"نہیں رِدا نہیں۔" ثناء نے آخری لہجے میں کہا رِدا اُسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی اُس کے چہرے پر پتھریلا پن اُبھر آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی کھانا خاموشی سے ختم ہو گیا اور اُس کے بعد کافی پیتے ہوئے ثناء نے کہا۔

"کیا تم نے اپنی جو کہانی سُنائی تھی وہ سچ تھی۔ رِدا کیا واقعی تمہارے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک ہُوا تھا؟"

"ہرگز نہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" رِدا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا...؟" ثناء چونک پڑی۔

"وہ کہانی ایک افسانہ تھی۔"

"مطلب...؟"

"مطلب یہ کہ میں نے اُن لوگوں کو ایک افسانہ سُنایا تھا۔"

"تو... تو... یہ... یہ سب کچھ...؟"

"ہاں۔ یہ سب کچھ افسانہ تھا۔"

"اور حقیقت کیا ہے؟"

"وہ ابھی نہیں بتائی جا سکتی۔" رِدا نے جواب دیا۔

"مجھے بھی نہیں۔"

"ہاں تمہیں بھی نہیں۔" رِدا نے جواب دیا اور ثناء چڑ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرتی رہو اور چھپاتی رہو مجھ سے... میں بھی... میں بھی...۔" اس کے بعد اُس نے کچھ نہ کہا وہ روہانسی سی ہو گئی۔ رِدا تھوڑی دیر تک اس کی شکل دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"اب مجھے اجازت دوگی ثناء۔"

"جا سکتی ہو۔" ثناء غصیلے انداز میں بولی اور رِدا اُٹھ کر کمرے

سے باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے ایک صوفے پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں کم از کم اس نے اپنے دل کا ایک بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ ثناء کو اُس نے حقیقت نہیں بتائی تھی لیکن جو کہانی اُس نے اُن لوگوں کو سُنائی تھی اس کی تصدیق بھی نہیں کی تھی کیونکہ وہ جھُوٹی کہانی تھی۔ اور کم از کم اُس نے ثناء سے ایک ایمانداری برتی تھی کہ اُسے دوسرے لوگوں میں شمار نہیں کیا تھا جہاں تک ثناء کی اُس وقت دل آزاری کا سوال تھا اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ثناء کے دل میں اپنے لئے کچھ نفرت پیدا کرنا چاہتی تھی۔ ثناء کو چڑانا چاہتی تھی اِس بات پر کہ وہ اب بھی ثناء پر اعتبار نہیں کر رہی اور اُسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا رہی۔ شاید اِسی طرح ثناء اُسے اس گھر سے دُور جانے کی اجازت دے دے۔

درحقیقت وہ اِس ماحول میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ بہت بڑے لوگ تھے یہ... بہت اچھا ماحول تھا بہت اچھی زندگی تھی۔ یہاں کی لیکن رِدا کو اپنی الگ زندگی درکار تھی، اسے اپنے سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا وہ اپنے مستقبل کو تعمیر کرنے کے ارادے رکھتی تھی اُس کے اپنے دل میں کچھ عزائم تھے جن کی تکمیل کر کے وہ اپنی زندگی کے راستوں کا انتخاب کرنا چاہتی تھی۔ یہاں رہ کر وہ معطل ہو گئی تھی۔ دوسروں کے رحم و کرم پر پڑے رہنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ جب وہ عمل کی دُنیا میں آئی ہے تو اُسے عملی طور پر بھی کچھ کرنا تھا اور ثناء اِس سلسلے میں اُس کی رکاوٹ تھی۔

وہ جانتی تھی کہ ثناء کسی بھی قیمت پر اُسے یہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں دے گی ہر چند کہ اُس نے ثناء کی یہ بات وقتی طور پر مان لی تھی لیکن حالات کا یہ رُخ اُس کے لئے معاون تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ انھیں حالات کے سہارے یہاں سے نکل جائے۔ ثناء کی محبت اُس کے دِل میں بھی تھی اُس کا پیار اور اُس کی یگانگت رِدا کو خوابوں کی وادی میں لے جاتی تھی لیکن جب خواب ٹوٹتے تھے تو رِدا کو احساس ہوتا تھا کہ اس کے سامنے ایک وسیع مستقبل ہے جس کی تکمیل کے لئے اُسے ثناء کے گھر کا سہارا نہیں لینا چاہئے اپنی عملی زندگی میں بھی قدم رکھنا اُس کے لئے ضروری تھا چونکہ اُس کا یہی وقت تھا آنے والے وقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ حالات کیا رُخ اختیار کریں اگر ابھی سے وہ اپنے پیروں کو مضبُوط کر لے تو اُس کے مستقبل کے لئے بہتر ہوگا۔

چنانچہ اُس چیز کا سہارا لے کر ہی وہ یہاں سے نکل جانے کی خواہش مند تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ثناء اُس کے اِس وقت کے رویّے سے کس حد تک بددِل ہو جاتی ہے کاش وہ مجھے یہاں سے نکل جانے کی اجازت دے دے۔ اُس نے سوچا اور صوفے کی پُشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دادی امّاں اور ذکیہ بیگم کی باتیں کافی سخت تھیں انھوں نے جس طرح شبہات کا اظہار کیا تھا وہ رِدا کے لئے بہت زیادہ تشویشناک تھے لیکن بہرطور رِدا نے اپنے آپ کو ان تمام چیزوں کے لئے پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عمل کی دُنیا میں قدم رکھنے کے لئے ایک مضبُوط شخصیت کی ضرورت ہے اگر یہ مضبُوط شخصیت ٹوٹ گئی تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا اُس کے سامنے تیمور کا مستقبل تھا ایک طویل مستقبل وہ تیمور کو ایک بہتر زندگی دینا چاہتی تھی ایک ایسی زندگی جس میں تیمور گردن اُٹھا کر جی سکے اُس کو اپنی زندگی پر ناز ہو۔

دوسرا دِن کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ شہاب صاحب صبح ہی صبح نکل گئے تھے احسان احمد اسلام آباد گئے ہوئے تھے گھر کے تمام لوگ معمُول کے مطابق تھے۔ لیکن ثناء کی اپنی کارروائیاں جاری تھیں وہ اپنے طور پر اُس ڈرامے کے لئے تیار ہو چکی تھی جو اُسے کرنا تھا۔

دِن کو گیارہ بجے کے قریب ایک ملازمہ ہانپتی کانپتی ذکیہ بیگم کے کمرے میں پہنچی۔

"وہ... بیگم صاحبہ... ثناء بی بی... ثناء بی بی۔" اُس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا اور ذکیہ بیگم چونک پڑیں۔

"کیا ہُوا؟ کیا ہُوا؟"

"جی وہ اپنے کمرے میں عجیب سی حالت میں پڑی ہوئی ہیں فرش پر۔ فرش پر اُلٹی سیدھی سی پڑی ہیں اور اُن کے مُنہ سے سفید سفید جھاگ بہہ رہا ہے۔"

"خُدایا۔" ذکیہ بیگم ہول اُٹھیں۔ وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلیں اور زیب النساء بیگم کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ زیب النساء بیگم جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں۔

"کیا ہُوا؟ کیا ہُوا دُلھن؟" اُنھوں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"ثناء۔ ثناء۔ جلدی آئیے۔" ذکیہ بیگم نے کہا اور دوڑتی ہوئی ثناء کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ثناء کے ہاتھ پاؤں مُڑے ہوئے تھے اس کے مُنہ سے جھاگ بہہ رہا تھا آنکھیں بند تھیں اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی اُکھڑے اُکھڑے سانس۔

"خُدایا۔ خُدایا کیا ہوگا۔ ثناء۔ ثناء بیٹی ارے ڈاکٹر کو بلاؤ، جلدی سے ڈاکٹر کو بُلاؤ۔" زیب النساء بیگم بُری طرح ہول رہی تھیں ذکیہ بیگم بھی بولا گئی تھیں اُن دونوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑے جا رہے تھے، یہ کیا ہُوا۔ یہ کیا ہو گیا۔

ذرا سی دیر میں پورا گھر ثناء کے گرد جمع ہوگیا۔ رِدا بھی تھی۔ دوسرے تمام لوگ تھے۔ عارفہ بیگم بھی تھیں سب کے سب تھے۔ ثناء کو اُٹھا کر بستر پر لٹا یا گیا۔

ڈاکٹر کو فون کر دیا گیا تھا چنانچہ چند ہی منٹوں میں ڈاکٹر بھی پہنچ گیا اُس نے ثناء کی نبض دیکھی دل کی دھڑکنوں کو چیک کیا اُس کے منہ سے بہتے ہوئے جھاگوں کا جائزہ لیا منہ کھولنے کی کوشش کی گئی تو ثناء کے دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر بھنچے ہوئے تھے ڈاکٹر اس سلسلے میں ناکام رہا اس نے پریشان کن لہجے میں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تشویش کی کوئی بات نہیں ہے آپ لوگ اطمینان رکھئے۔ میں ذرا ایک انجکشن دے دُوں یہ انجکشن دیا گیا اور ثناء کی سانسیں معتدل ہونے لگیں۔ سب لوگ بُری طرح سے خوف و ہراس کا شکار ہو گئے تھے۔ پوری کوٹھی میں کہرام مچ گیا تھا۔

ڈاکٹر آدھے گھنٹے تک ثناء کے پاس بیٹھا بار بار اُس کی نبض دیکھتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں شاید صورتِ حال نہیں آ رہی تھی پھر اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اب حالت تشویشناک نہیں ہے ہوش میں آجائیں تو مجھے اطلاع دیجئے گا۔ اگر دو گھنٹے تک ہوش نہ آئے تب بھی براہ کرم مجھے بتا دیجئے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد لوگوں کی بھیڑ ہٹائی جانے لگی تاکہ ثناء کو ہوا لگتی رہے۔ رِدا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ذکیہ بیگم اور دادی جان بے حد پریشان تھیں۔ اُن کے چہروں پر خجالت کے آثار تھے وہ جانتی تھیں کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ آہستہ آہستہ تمام لوگوں کو ہٹا دیا گیا لیکن رِدا کو یہاں سے نہیں ہٹایا گیا تھا۔ رِدا ثناء کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ تیمور اپنے کمرے میں تھا اور رِدا کو اُس کی خبر بھی نہیں تھی۔ دادی جان نے رِدا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولیں۔

"تم جانتی ہو کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟"

رِدا نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اُن کی طرف اُٹھائیں اور دادی جان کا دل پگھل گیا۔

"بیٹی، بیٹی، ہم سے غلطی ہوئی ہے ہمیں معاف کر دو تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی۔ میں نے بہت کچھ سوچا اس بارے میں بڑی شرمسار ہوں میں شرمندہ ہوں خُدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔"

"نہیں دادی جان۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ذلیل کر رہی ہیں آپ مجھے۔ آپ بزرگ ہیں جو آپ چاہیں کہہ لیں مجھے خُدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔"

ذکیہ بیگم نے کہا۔ "ثناء نے تمہاری وجہ سے یہ سب کیا ہے۔ خُدا اُسے محفوظ رکھے پتہ نہیں کیا کھا لیا اُس نے۔ خُدا کے لئے رِدا واقعی ہمیں معاف کر دو۔ بڑی غلطی ہوئی ہم سے۔ لیکن ہمارے شکوک و شبہات۔"

"آپ اپنی جگہ حق بجانب ہیں لیکن امی خُدا کی قسم آپ یقین کر لیجئے کہ میں غلط انسان نہیں ہوں۔ میں نے آپ کے گھر میں ذرا بھی نمک حرامی نہیں کی شہاب صاحب میرے لئے میرے چچا کی مانند ہیں۔ آپ خود سوچئے میں صرف اُن کا احترام کر سکتی ہوں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے میرے ذہن میں۔"

"معاف کر دو بیٹی۔ خُدا کے لئے معاف کر دو۔ ہمیں سبق مل گیا ہے۔"

"بار بار یہ الفاظ کہہ کر آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔" رِدا نے کہا۔ وہ خاصی اُلجھ گئی تھی۔ ثناء یہ سب کچھ کرے گی اُسے یہ اُمید نہیں تھی۔ اب اُس کے لئے مشکلات پیدا ہو گئی تھیں بہرطور ثناء کی حالت سدھر جائے اس وقت اس کے علاوہ کسی اور چیز کی پرواہ نہیں تھی اُس نے دادی امّاں سے کہا۔

"آپ لوگ آرام کر لیجئے میں ثناء کے پاس موجود ہوں۔" دادی امّاں اور ذکیہ بیگم ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ اور اُس کے بعد دادی امّاں نے کہا۔

"ذکیہ تم یہیں رُکو ممکن ہے رِدا کو تمہاری ضرورت پیش آجائے۔" ذکیہ بیگم نے گردن ہلا دی اور دادی امّاں باہر نکل گئیں۔ تقریباً پندرہ منٹ تک یہی عالم رہا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ثناء کے ہونٹ ہلنے لگے تھے۔

"رِدا! وعدہ کرو کہ تم نہیں جاؤ گی۔ وعدہ کرو رِدا۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میں... میں مر رہی ہوں۔ میں مر رہی ہوں۔" رِدا نے بے اختیار ہو کر ثناء کے سینے پر سر ٹکا دیا۔

"میں نہیں جاؤں گی ثناء تیری قسم میں نہیں جاؤں گی۔ خواہ میرے ساتھ کچھ بھی ہو۔ کچھ بھی کیا جائے میرے ساتھ میں نہیں جاؤں گی۔ ثناء تو ہوش میں آجا۔ تو ٹھیک ہو جا کبھی نہیں جاؤں گی۔ تیمور کی قسم۔" رِدا نے بے اختیار ہو کر کہا۔ اور ثناء نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ویران نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ذکیہ بیگم بھی اُس کے یہ الفاظ سن چکی تھیں اور اُن کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے تھے اُنھوں نے ثناء کے بازو پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"رِدا کہیں نہیں جائے گی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ ثناء۔"

"نہیں امی! آپ نے رِدا پر بہت بڑا الزام لگایا ہے۔ بہت کچھ کہا ہے آپ نے رِدا کو۔"

"ثناء تم ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ یہ میری بھی تو امی ہیں۔ میں نے اُن کی بات کا بُرا نہیں مانا۔ بس تم کچھ نہ سوچو اس بارے میں۔"

"امی۔ آپ بتائیے۔ آپ نکال دیں گی اُسے۔ بتائیے۔ آپ رِدا کے کردار پر شک کرتی ہیں۔"

"نہیں بیٹی، حماقت ہوگئی ہم سے۔ اُس کی اس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی ہے خُدا کی قسم۔ اب رِدا کے لئے ہمارے دل میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔ ثناء نے گہری سانسیں لیں اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "پانی۔" رِدا پانی لینے کے لئے اُٹھ گئی۔ پانی پینے کے بعد ثناء کی حالت اعتدال پر آگئی تھی۔ اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"میں... میں بچ کیسے گئی۔" اس نے تعجبانہ انداز میں پوچھا۔

"ہماری دعاؤں سے بیٹی۔ خُدا کا فضل ہے۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"امی آپ آرام کریں۔ میں رِدا سے کچھ باتیں کروں گی۔" ثناء بولی۔ اور ذکیہ بیگم مطمئن انداز میں سر ہلا کر باہر نکل گئیں۔ اُنھوں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"ذرا خیال رکھنا رِدا۔ کوئی بات ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

"آپ اطمینان رکھیں امی۔" رِدا نے جواب دیا اور ذکیہ بیگم کمرے سے باہر چلی گئیں۔ رِدا نے ثناء کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ثناء مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

"تم لوگ میرے ساتھ جو دل چاہے کرتے رہو۔ کیوں؟" ثناء نے رِدا کو شکایتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے ثناء، مجھے بتاؤ تو سہی؟"

"جا رہی تھیں نا تم یہاں سے۔ چلی جاؤ تمہارے پیچھے ہی پیچھے میری موت کی خبر نہ پہنچے تو لعنت بھیج دینا ثناء پر۔ رِدا میں بھی ہٹ کی پکی ہوں۔"

"مگر تو نے ثناء۔ اتنی سی بات پہ خودکشی کی کوشش کر ڈالی۔"

"خودکشی۔" ثناء نے قہقہہ لگایا۔ اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ رِدا تعجب سے اُسے دیکھنے لگی تھی، جو کیفیت ایک لمحہ قبل تھی وہ بالکل ختم ہوگئی تھی رِدا کے فرشتوں کو بھی اِس بات کا گمان نہیں تھا کہ ثناء نے یہ سب اداکاری کی ہے۔

"کچھ بھی کھا لیا تھا مرنے کی کوشش کی تھی میں نے۔ بلکہ یہ سمجھو کہ مرنے کی ریہرسل کی تھی۔ یہ تو ایک نمونہ تھا۔ اصل بات کا تو تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب تم تیمور کی قسم کھا چکی ہو جانے کی بات تو نہیں کرو گی یہاں سے؟"

"ثناء۔ اچھا نہیں کیا یہ سب کچھ تم نے۔ بس میں کیا کہوں تم سے۔"

"دیکھو رِدا، میں نے تم سے ہر طرح کا تعاون کیا۔ تم خود سوچو میری طبیعت کے بارے میں اندازہ لگاؤ۔ کیا میں اس ٹائپ کی لڑکی ہوں کہ کسی کے بارے میں جانے بغیر اُس پر مکمل اعتماد کر لوں مگر میں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ تمھیں سونپ دیا۔ میں نے اپنی ساری محبتیں تمہارے لئے وقف کر دیں بس تم سے پیار ہو گیا ہے مجھے۔ اور عارفہ بیگم سے تو میں خُوب نمٹوں گی۔"

"نہیں ثناء۔ وہ ہمارے اپنے ہیں کچھ بھی ہو جائے وہ سب ہمارے اپنے ہی تو ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر اپنوں کو بھی تو دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیئے اپنی بزرگی ہم پر کیوں ٹھونستے ہیں میں تمہیں بالکل بے قصور سمجھتی ہوں رِدا۔ میں تم پر مکمل اعتماد کرتی ہوں بس کافی ہے۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ میری اتنی سی چاہت کا احترام نہیں کیا جاسکتا تمہیں یہاں رہنا ہوگا کوئی بھی تمہیں اِس جگہ سے نہیں نکال سکتا۔"

"ٹھیک ہے اور جب تمہاری شادی ہو جائے گی تب؟"

"تب تم میرے ساتھ جاؤ گی۔" ثناء نے کہا اور پھر وہ ایک دم ہنس پڑی۔

"یہ بتاؤ تم نے کھایا کیا تھا؟"

"سوڈا منٹ ٹکیہ۔"

"کیا...؟" رِدا نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ جھاگ پیدا کرنے والی گولیاں اور بس۔"

"گک... کیا مطلب... اور وہ بے ہوشی اور وہ کیفیت؟"

"میں نے کہا نا۔ یہ تو صرف ریہرسل تھی اداکاری کی تھی میں نے۔ اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے تم دیکھ لو ڈاکٹر صاحب بھی بے وقوف بن گئے۔"

"تجھے میری قسم۔ جھوٹ تو نہیں بول رہی۔"

"تیمور کی قسم۔ جھوٹ نہیں بول رہی۔" ثناء نے جواب دیا اور رِدا نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"خُدا تمھیں نیک ہدایت دے ثناء تو نے ہم سب کو اَدھ مرا کر دیا۔"

"ہاں۔ میں نے دیکھا تھا۔ تم سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ کیوں رو رہی تھیں میرے لئے۔" ثناء نے آنکھیں نکال کر کہا اور رِدا نے ثناء کو سینے سے بھینچ لیا۔

"ثناء۔ میں بھی تو... میں بھی تو کمزور ہو گئی ہوں تیرے سامنے میں بھی تو محتاج ہو گئی ہوں تیری۔ میں کیا بتاؤں تجھے اب کیا بتاؤں۔"

"بس۔ تو پھر ٹھیک ہے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے محتاج

ہیں ساری باتیں اسی خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہوں گی تمھیں جس کی ضرورت پیش آئے کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاؤ گی۔ میرے ساتھ رہو گی۔ میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی باقی سب کچھ حالات پر چھوڑ دیتے ہیں ہم لوگ۔ حالات جو کچھ بھی کہیں گے وہی کیا جائے گا لیکن کم از کم فی الحال تو ہمارے اور اپنے درمیان فاصلے مت پیدا کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ وعدہ کرتی ہوں۔ اب یہاں سے جانے کا نام نہیں لوں گی۔" ردا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے بہت کچھ کیا تھا لیکن ثناء بڑی ثابت قدم تھی بہت سخت گیر تھی وہ۔ وہ واقعی سب کچھ کر سکتی تھی۔ ابھی اس نے صرف اداکاری کی تھی۔ تو آئندہ یہ اداکاری حقیقت کی شکل بھی اختیار کر سکتی تھی اور ردا کسی بھی قیمت پر ثناء کی زندگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ ٹھیک ہے میں اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلیاں پیدا کر لوں گی لیکن ثناء کو نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔ ردا نے سوچا۔ ثناء تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"جو بات میں نے تمھیں بتا دی ہے اس کا تذکرہ دوسروں سے نہیں ہونا چاہیئے۔"

"نہیں ہو گا۔ اب کیا تذکرہ ہو گا کسی سے۔۔۔ لیکن تم نے یہ حرکت۔"

"استاد اللہ رکھی زندہ باد۔" ثناء نے کہا اور ردا اچھل پڑی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"مطلب یہ کہ ہر مرض کی دوا ہیں استاد اللہ رکھی۔ انھوں نے ہی یہ مشورہ بھی دیا تھا۔"

"ندرت نے؟" ردا چیخ پڑی۔

"سو فیصدی۔ اس قسم کے معاملات میں اس کی کھوپڑی سب سے زیادہ تیز ہے چنانچہ یہ سارے انتظامات اسی نے کئے تھے۔"

"اس ندرت کی بچی کو تو میں خود بھی اچھی طرح دیکھ لوں گی سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ سمجھ گئی میں۔ اسی لئے اس نے ابھی تک ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا ہے۔ ٹھیک ہے تم دونوں۔۔۔ تم دونوں کو اچھی طرح دیکھوں گی میں۔" ردا مسکراتی ہوئی بولی۔

شام تک اچھی خاصی محنت کرنی پڑی تھی اُسے، اپنی اداکاری کے لئے سب لوگ بار بار اسے دیکھنے آتے رہے تھے ڈاکٹر کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ اب اس کی حالت بہتر ہے تاہم شام کو آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر پھر آیا اور ثناء کو اس سے ایک انجکشن لینا پڑا۔ انجکشن لیتے ہوئے اس نے بڑی شکایت آمیز نگاہوں سے ردا کی طرف دیکھا تھا اور ردا کے چہرے پر شرمندگی کے آثار ابھر آئے تھے۔ گھر کے لوگ اب ثناء کی کیفیت سے مطمئن ہو گئے تھے۔ دادی اماں اور ذکیہ بیگم کو بات بنانی مشکل ہو رہی تھی لیکن بہر طور کسی کی یہ جرأت نہیں تھی کہ ان سے ثناء کے بارے میں استفسار کر سکے ہاں۔ ہلکی ہلکی سرگوشیاں چاروں طرف ابھر رہی تھیں ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ ثناء کو کیا ہوا۔

ردا اپنے طور پر سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اس نے تو بھرپور کوشش کر ڈالی تھی۔۔۔ کہ ثناء کے دل میں اپنے لئے نفرت کا بیج بو دے اور اس طرح ثناء اس سے برگشتہ ہو جائے اور اسے کہیں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن ثناء بہت چالاک تھی اور اس کے ساتھ ہی پُرمحبت بھی۔ اس نے ایسا قدم اٹھا ڈالا تھا کہ ردا کو بے اختیار تیمور کی قسم کھا کر اُسے یقین دلانا پڑا تھا اور اب یہ قسم ردا کے لئے بہت بڑی چیز بن گئی تھی ذکیہ بیگم اور زیب النساء بیگم کا رویّہ بھی ذرا بدلا ہوا نظر آ رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی طرح یہ احساس اُن کے ذہن سے نکل گیا کہ ردا کا کیریکٹر مشکوک ہے۔ چنانچہ ردا نے بھی رات کی سوچ میں اپنے فیصلے میں تبدیلی پیدا کی تھی اور سوچا تھا کہ اگر تقدیر اس بات پر مصر ہے کہ اُسے یہاں رہنا پڑے۔ تو پھر ٹھیک ہے دیکھا جائے گا۔ زندگی میں یہ تبدیلی ہی سہی بدلے ہوئے حالات وقت میں تبدیلیاں پیدا کریں گے ثناء کسی نہ کسی وقت تو اُسے اجازت دے ہی دے گی کہ وہ یہاں سے چلی جائے اس وقت تک اُسے اپنے لئے یہیں بندوبست کرنا ہو گا جہاں تک ملازمت کی بات ہے تو ندرت کی چالاکی سے اس نے یہ بات ثناء کے کانوں تک پہنچا دی تھی اور اس نے منوا بھی لیا تھا کہ وہ ملازمت کر لے۔

کم از کم ایک مرحلہ تو طے ہو گیا تھا باقی رہی شہاب صاحب کی پوزیشن تو گھر کے لوگ اگر شہاب صاحب کے سلسلے میں اس حد تک مشکوک ہو سکتے ہیں تو آئندہ اُن سے احتیاط رکھنا ضروری ہے چنانچہ ردا نے اپنے دل میں بہت سے فیصلے کر لئے تھے۔

دوسرا دن پُرسکون تھا آج مہینے کی آخری تاریخ تھی کل سے ردا کو اپنی ڈیوٹی جوائن کرنا تھی دوپہر کو ندرت سے ملاقات ہو گئی ندرت نے آنکھ بچا کر نکلنے کی کوشش کی تھی لیکن ردا نے اسے پکڑ ہی لیا۔

"اے ندرت! اب یہ بتا کہ تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" ردا غصے سے بولی۔

"وہی جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا۔" ندرت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا تو کس قسم کی لڑکی ہے اللہ رکھی ایک طرف مجھے مشورے دیتی ہے تو دوسری طرف ثناء کو بھی تو نے ہی مشورہ دیا تھا۔"

"تو تمھارا کیا خیال ہے مونالیزا۔ کیا ایک وکیل صرف ایک موکل

کو مشورے دے سکتا ہے بھئی مجھ سے جو اپنی مشکلات کا حل پوچھے گا میں اُسے اس کا جواب دوں گی۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔" ندرت نے کہا۔

"خدا کی قسم ندرت، کل تو ہم ہی گئے تھے ہم سب لوگ۔"

"اپنی کہو۔ سنا ہے تیمور کی قسم کھا لی ہے؟"

"ہوں۔ تو رپورٹ تیرے کانوں تک پہنچ گئی؟"

"یار ردا۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں تو دبھی انتہا پسند نہیں ہوں دیکھو جان۔ دنیا کو اتنے جذباتی انداز میں مت دیکھو کہ جگہ جگہ دل توڑنا پڑے۔ ہر شخص اپنی اپنی سوچ رکھتا ہے، اپنا اپنا مزاج رکھتا ہے، ہمیں زندگی میں سب ایسے ہی نہیں مل سکتے جو ہماری سوچ سے مطابقت رکھتے ہوں ہمیں خود سے مختلف لوگوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے اور قدم قدم پر ہمیں اس کا سامنا کرنا پڑے گا تو اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کیوں نہ کیا جائے۔ پتہ نہیں تم مجھ سے متفق ہو یا نہیں ردا۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ دنیا میں ہر شخص سے تعاون کیا جائے۔ بُرے لوگوں سے بھی اچھے لوگوں سے بھی۔ اپنی ذات کو برائیوں سے بچایا جائے اور الجھنوں میں نہ پڑنے دیا جائے باقی اگر کوئی کسی بات سے خوش ہوتا ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے طرح طرح کی باتیں ہوتی ہیں اس دنیا میں۔ لوگ اگر الزام تراشی بھی کرتے ہیں بُرے انداز میں بھی دیکھتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ ہماری اپنی ذات اگر اُن برائیوں سے پاک ہے تو کم از کم ہم اندر سے تو مطمئن ہوتے ہیں۔ اس دنیا کو باہر کی نگاہ سے دیکھو اور اپنے آپ کو اندر کی نگاہ سے۔ سمجھیں۔ بس یہی ایک چیز اس دنیا میں رہنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔"

"مجھے تعجب ہے یہ بقراط کی روح تجھ میں کہاں سے سما گئی؟" ردا نے تعجب سے کہا۔

"اور کوئی مشکل پارٹنر کسی اور مشکل کا حل پوچھنا ہو تو پوچھ لو۔ یہ وکیل بے فیس حاضر ہے۔" ندرت نے گردن خم کر کے کہا۔

دُور سے ثناء آتی ہوئی نظر آئی وہ اُن دونوں کو گھورتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

"لیجئے طوفان نازل ہو گیا ہے۔" ندرت نے کہا۔ ثناء اُن کے قریب پہنچ گئی۔

"پھر کوئی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ ندرت تو سب کے لئے ہی خوفناک چیز ہے۔" ثناء نے کہا۔

"اچھا۔ ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں۔ یعنی ہم خوفناک ہو گئے اب، جب مصیبت پڑتی ہے تو سب لوگ اللہ رکھی کے گھر کا ہی رُخ کرتے ہیں۔ میں کہتی ہوں آخر تم لوگوں نے نمبر دو کو کیا سمجھ رکھا ہے۔" ندرت نے کہا اور ثناء بے اختیار ہنس پڑی۔

"اس گھر کا نام نمبر دو خوب پڑا ہے۔"

"کیوں نہ پڑے واہ۔ ہماری ساس نے رکھا ہے۔" ندرت گردن مٹکا کر بولی۔

"ارے ہاں۔ اس ساس کا کیا کیا تو نے۔۔۔ ہم"

"ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ کیس پینڈنگ میں ہے۔" ندرت نے جواب دیا۔

"ہوں۔ اس وقت تو کئی کیس پینڈنگ میں چلے گئے ہیں سب سے پہلے عارفہ بیگم کا تیا پانچہ کرنا ہے۔ اس کے لئے۔ تمھارے زرخیز ذہن سے کوئی تجویز۔۔۔؟"

"یار و۔ کم از کم یہ بات ثابت تو ہو جائے کہ عارفہ بیگم ہی اس داستان گوئی کی محرک تھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بے قصور نکلیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ویسے تمھارا کہنا بھی درست ہے۔ ایسا کرتے ہیں پہلے ان عارفہ بیگم کا حساب کتاب چکتا کر لیا جائے کیوں؟"

"میری مانو ثناء۔ تو چھوڑ دو ان بے چاری کو۔ آخر تمھاری بزرگ ہیں۔"

"تمھاری۔ مانیں جب نا۔ ہم کیوں مانیں تمھاری۔ تم ہو آخر کیا چیز؟" ثناء نے ردا کو گھورتے ہوئے کہا۔ اور ردا ہنسنے لگی پھر بولی۔

"بہر طور میری سفارش ہے کہ اُن کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی جائے۔"

"پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ عارفہ بیگم نے یہ تمام تر کارروائی کی کس طرح۔۔۔؟"

"اس کے لئے کوئی ترکیب ہے تمھارے ذہن میں؟" ندرت نے پوچھا۔

"کمال ہے جب اللہ رکھی موجود ہو تو ہم کیوں سوچیں ان تمام باتوں کے بارے میں۔"

"ہوں۔ تو سب سے پہلے اس دن کے سلسلے میں عارفہ بیگم کی مصروفیات معلوم کرو جس دن ردا شہاب صاحب کے ساتھ گئی تھی اگر عارفہ بیگم گھر ہی میں پائی جائیں تو اس کا مقصد ہے کہ وہ بے قصور ہیں اور اگر اُن کا باہر جانا ثابت ہو جائے تو پھر۔۔۔ تو پھر۔۔۔ میرا خیال ہے ثناء اس سلسلے میں تم ہی بہتر اقدامات کر سکتی ہو۔"

"وہ کیا۔۔۔؟"

"تم بڑی چاہت بڑے پیار سے عارفہ بیگم سے اس بارے میں معلومات حاصل کرو مجھے یقین ہے کہ تمھاری ذرا سی کوشش اُن کا منہ کھلوا دے گی۔"

"ہوں۔" ثناء پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی پھر بولی۔

"کام بن جائے گا دوستوں۔۔۔ میں عارفہ بیگم کی زبان کھلوا لوں گی بس ذرا یہ بات معلوم کر لوں کہ وہ اس دن گھر میں موجود تھیں یا نہیں؟"

"ملازموں سے معلوم ہو جائے گا۔ اس میں کون سی دقت کی بات ہے۔"

"تم دونوں... تم دونوں... بس کیا کہوں تم سے۔" زُدا نے کہا۔

"آپ تو بس چُپ رہیں اللہ کی رحمتِ خاص۔ آپ کی خاموشی ہی مناسب ہوتی ہے۔" ثناء نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ اور پھر نُدرت کی طرف رُخ کر کے بولی۔

"اب یہ کل سے ملازمت پر جائے گی۔ کس وقت سے کس وقت تک ڈیوٹی ہے تمہاری؟"

"میرا خیال ہے نو بجے سے پانچ بجے تک۔" زُدا نے جواب دیا۔

"اور ہم کیا کریں گے اس دوران؟" ثناء نے پُوچھا۔

"شرارتیں۔" زُدا ہنس کر بولی۔

"ٹھیک ہے ہم بھی اپنے آپ کو کسی طرح سنبھال ہی لیں گے تم کیا سمجھتی ہو کیا تمہارے آنے سے پہلے ہم زندہ نہیں تھے۔" ثناء نے جواب دیا۔

"میری اچھی بہن میری پیاری سی ثناء میرے مسائل پر بھی تو غور کرو تمہیں اطمینان ہو جائے گا کہ میں غلط نہیں سوچ رہی ہوں۔"

"مسائل ہمارے سامنے ہوں تب نا۔"

"بس تھوڑے دن کی بات اور ہے صرف تھوڑے دن کہ اُس کے بعد میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں گی۔"

"دے دی ہے۔ دے دی ہے۔ یہی چیز تو بس ایسی ہے جو تجھ سے غیریت کا احساس دلاتی ہے اور اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ ابھی ہمارے اور تمہارے درمیان فاصلے باقی ہیں۔"

"ثناء پلیز۔"

"اب فضول باتیں مت کرو۔ ہاں تو اللہ رکھی۔ عارفہ بیگم۔"

"بالکل عارفہ بیگم۔" نُدرت نے گھونسہ فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔

ثناء جس کام پر آمادہ ہو جائے اُس میں بھلا اُسے کیا دقت ہو سکتی تھی۔ رحیم خان نے بتادیا کہ عارفہ بیگم پرسوں کہیں گئی ہوئی تھیں۔ اور دوپہر کے بعد واپس آئی تھیں اس کا مقصد ہے کہ عارفہ بیگم ہی اس مخبری کی ذمّہ دار تھیں۔ ثناء اپنے کمرے سے نکلی اور عارفہ بیگم کے کمرے کے سامنے سے گزرتی چلی گئی دوسری یا تیسری بار۔ اور پھر اُس نے ایک ہلکی سی دستک دی عارفہ بیگم نے دروازہ کھول دیا تھا۔ ثناء کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اُن کا چہرہ اُتر گیا اور پھر محبت سے بولیں۔

"اے بیٹیا! آؤ اندر آؤ۔ کیا بات ہے؟ خیریت؟"

"آپ سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔"

"ہاں... ہاں آؤ اندر آؤ۔ میں حاضر ہوں میری بچی۔" عارفہ بیگم نے مجسّمِ اخلاق بن کر کہا اور ثناء اندر داخل ہو گئی وہ بڑی اپنائیت سے سامنے پڑی ہوئی مسہری پر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا بتاؤں چچی جان۔ بڑی اُلجھنوں کا شکار ہوں ان دنوں۔"

"کیا ہوا بچی۔ خیریت تو ہے۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ دراصل آپ سے بہتر اور کوئی شخصیت مجھے نظر نہیں آئی جس سے اس سلسلے میں کچھ مشورہ کر سکوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"آپ کو علم ہے کہ میں نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔"

"ہاں۔ دشمنوں کی نگاہ لگی تھی میری بچی کو۔ خدا ہر آفت سے محفوظ رکھے مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تُو نے ایسا کیوں کیا تھا۔"

"زُدا کی وجہ سے۔ میں اُسے بہت چاہتی تھی نا۔ لیکن مجھے بعد میں احساس ہُوا کہ میں حرام موت مر رہی تھی آپ یقین کریں چچی جان بس کیا بتاؤں۔ کتنا رونا آتا ہے اپنی حماقت پر۔"

"اوہ۔ کیا کوئی بات ہو گئی زُدا سے۔ بڑی اچھی بچی ہے بےچاری بڑی پیاری من موہنی سی۔"

"صورت سے ہی ایسی نظر آتی ہے وہ اندر سے وہ نہیں ہے چچی جان۔ بس آپ یوں سمجھ لیں کہ مجھے اُس کی شخصیت کے سلسلے میں بڑا دھوکہ ہُوا۔ آپ خود غور کریں چچی جان کہ انسان جس تھالی میں کھائے، اُسی میں اُسے سوراخ کرنا چاہئے؟"

"اے کوئی بات ہو گئی کیا؟" عارفہ بیگم نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"جی ہاں۔ شاید آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ زُدا صاحبہ چچا جان سے عشق لڑا رہی ہیں۔" عارفہ بیگم کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو بات میں آنکھوں سے دیکھتی ہوں پھر دُنیا کی کوئی قوت اُسے جھٹلانے کی کوشش کرے میں نہیں مانتی۔ آپ بتائیے رات کو ایک بجے کے قریب آخر چچا جان کے کمرے سے نکلنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"ایک بجے؟" عارفہ بیگم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جی ہاں چچی جان۔ ٹھیک ایک بجے ارے وہ تو اتفاق تھا کہ میں اچانک باہر نکل آئی نیند نہیں آرہی تھی مجھے۔ باہر نکل کر میں نے یہ تماشہ دیکھا آپ یقین کریں زُدا میری نگاہوں سے گر گئی ہے اُسے کم از کم ہمارے گھر آکر یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اور پھر اُس کی شخصیت اب تو میری نگاہوں میں اُس کی شخصیت مشکوک ہو گئی ہے۔"

"بی بی۔ اللہ نے تمہاری آنکھیں کھول دیں بڑا ہی اچھا ہُوا ایسا کیا اور میری بساط کیا۔ کون مانتا ہے میری بات۔ میں نے خود اُسے دیکھا تھا ارے اُس دن کی بات ہے تین چار دن ہو گئے وہ کار میں سے اُتر رہی تھی شہاب صاحب کی، پھر وہاں سے اُس نے ایک رکشہ لیا۔

اور رکشے میں بیٹھ کر یہاں واپس آئی میں کہتی ہوں آخر وہ شہاب میاں کے ساتھ کیوں گھوم رہی تھی غضب خُدا کا تم یقین کرو۔ میں نے تو یہاں تک کہہ دیا مامی جان سے کہ بی بی مجھے تو یہ لڑکی بالکل ہرجائی نظر آتی ہے ہو سکتا ہے یہ بچہ بھی شہاب کا ہی ہو۔" عارفہ بیگم نے کہا۔

"آپ نے بڑا اچھا کیا جو آپ نے یہ بات دادی اماں کو بتادی تھی۔"

"ہاں بی بی میری ذمّہ داری بھی نمک کھاتی ہوں اس گھر کا۔ تو نمک حرامی کبھی نہیں کروں گی۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے بہرطور اب آپ کی ذمّہ داری ہے کہ آپ بھی پوری طرح نگاہ رکھئے ان دونوں پر۔ لیکن ایک بات کا وعدہ کرنا ہوگا آپ کو چچی جان۔"

"کیا بی بی، کہو میری بچی؟"

"خبردار میری اس گفتگو کا کبھی تذکرہ کیا کسی سے تو آپ یہ سمجھئے کہ آپ سے رُوٹھ جاؤں گی اور کبھی منانے نہیں منوں گی۔"

"خُدا نہ کرے۔ تو منع کر رہی ہے تو پھر میں کسی سے کیوں کہوں گی۔ لیکن تُو پرواہ مت کر۔ اُن دونوں پر ایسی کڑی نگاہ رکھوں گی میں کہتی ہوں بیٹی۔ اُسے جانے کیوں نہیں دیتی یہاں سے۔"

"ابھی۔ ایسے نہیں جانے دوں گی چچی جان ذرا اس کا کچا چٹھا تو کھول دوں سب کے سامنے۔ یہ تو بتا دوں کہ اس معصوم سی صورت کے پیچھے کیسی مکروہ شکل چھپی ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں پرواہ مت کر۔" عارفہ بیگم نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔

"اچھا چچی جان۔ میں چلتی ہوں۔" ثناء نے گردن خم کر کے کہا اور پھر مُڑ کر بولی۔

"آپ کو روپے پیسے کی تو کوئی تکلیف نہیں ہے چچی جان۔"

"اے بیٹی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے بھلا مجھے تم لوگوں کے ہوتے ہوئے کیا تکلیف ہوگی۔"

"پھر بھی چچی جان۔ یہ پچاس روپے کا نوٹ رکھ لیجئے پان چھالی کے کام ہی آئیگا۔" ثناء نے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر عارفہ بیگم کو دیتے ہوئے کہا۔ اور عارفہ بیگم چٹا چٹ ثناء کی بلائیں لینے لگیں۔ ثناء اُنھیں سلام کر کے باہر نکل آئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی باہر نکلتے ہوئے اُس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"عارفہ بیگم۔ اگر میں ابھی آپ سے اپنی برہمی کا اظہار کر دیتی تو آپ ہوشیار ہو جاتیں۔ ایسی جگہ ماروں گی آپ کو جہاں پانی بھی نہ مل سکے۔"

★ ★

شہاب صاحب نے تفسیر سے فون پر بات کی۔ "ہیلو تفسیر۔"

"کون شہاب؟"

"میں ہی بول رہا ہوں۔"

"خیریت، رات کو کلب نہیں آئے؟"

"مصروف تھا بہرحال آج وعدہ ہی ہے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"پروگرام میں کچھ تبدیلی کرنی ہے۔"

"کیا؟"

"کم از کم ایک ماہ دینا ہے اُسے اُس کے بارے میں جلد بازی خطرناک ہوگی۔"

"وجہ؟"

"یار گھر میں اُس کی پوزیشن بہت مضبوط ہے اور یہ مِری ہی نے یہ بات گھر میں بتادی ہے کہ میں نے اُسے تمہارے ہاں ملازمت دلائی ہے۔ اب یہ سب کچھ تو ہو ہی گیا ہے لیکن مجھ پر نگاہ رکھی جائے گی۔ زُدا خود بھی کچھ نہ کچھ مشکوک ہو گئی ہوگی اب اگر ہماری طرف سے کوئی کوشش ہوئی تو پکڑے جائیں گے اور کھیل بگڑ جائے گا اور پھر بدنامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"تو پھر اس کی نوکری کینسل؟"

"بونگے ہو یار۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اُسے ریزروا شاک میں رکھو ہم دونوں دُنیا کے سب سے شریف آدمی ہیں یہ بات ہمیں ثابت کرنی ہے۔ اُس کے ذہن سے ہر شک مٹ جانا چاہیئے اس کے علاوہ بات اُس کی ہی نہیں دوسرے لوگوں کی بھی ہے۔"

"ایک بات کہوں شہاب؟" تفسیر نے کہا۔

"کہو۔"

"تمہارے کانات کُھلی ہے نظر دکیوں ہول لے سے ہو؟"

"یہ تمہارے پینے کی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے بھائی تمہارے لئے نہ جانے کس کس کی ناز برداری کرنی پڑے گی کریں گے۔"

"او کے تفسیر۔" شہاب صاحب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

زُدا دفتر جانے کے لئے تیار تھی۔ ثناء کا مُنہ پھُولا ہُوا تھا لیکن اُس نے زُدا سے کچھ نہیں کہا تھا ہاں نُدرت وہ جلی کٹی باتیں کئے جا رہی تھی۔

"مبارک ہو نیرو اب تمہاری مِل کی نوکری لگ گئی ہے اُسے پیسے ملیں گے وہ تمہارے لئے مٹھائی لائے گی اچھے اچھے کپڑے بنائے گی تمہارے لئے اب تمہاری غربت دُور ہو جائے گی کتنے غریب لوگ ہیں

تھے تم، چلو تمہاری پریشانیاں بھی دُور ہو جائیں گی۔"

رِدا ہنس پڑی۔ اُس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "ثناء ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"دیکھ رہے ہو میرو۔ لوگ ہنستے بھی ہیں۔"

"میری ہمت نہیں بندھاؤ گی ثناء۔ میرے موقف کو قبول کر چکی ہو پھر ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ ثناء میری پہلی نوکری ہے میں نروس ہوں۔ مجھے حوصلے کی ضرورت ہے" رِدا کی آواز لرز گئی۔

"ہاں رو پڑو اب۔ خود کردہ را علاج نیست۔ اِس پہلی نوکری کی ضرورت تمہیں ہی پیش آئی تھی۔ چلو اب دوسروں کے احکامات مانو مجھے ذلیل کراؤ۔" ثناء نے کہا۔

"میری اچھی بہن۔"

"چلو میں چھوڑ کر آؤں گی تمہیں اپنے میرو کے ساتھ۔"

"نہیں ثناء۔ میں خود جاؤں گی۔"

"جاؤ بھاڑ میں جاؤ بس۔ میرا دماغ خراب مت کرو۔" ثناء پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ رِدا اُسے جاتے دیکھتی رہی تھی پھر اُس نے گہری سانس لیکر گردن جھٹکی اور باہر نکل آئی۔ اُسے بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا نوکری کرنے جا رہی تھی وہ۔ بمشکل تمام اُس نے خود کو سنبھالا راستوں کے بارے میں پہلے ہی معلومات حاصل کر چکی تھی رکشہ روکا اور اُس میں بیٹھ کر چل پڑی۔

تفسیر نے اپنے دفتر میں اُس کا پُرخلوص استقبال کیا تھا۔ "کیسے مزاج ہیں مِس رِدا؟"

"ٹھیک ہوں سر" رِدا نے جواب دیا۔

"کیا فرمایا آپ نے سر؟" تفسیر چونک کر بولا۔

"جی؟"

"محترمہ رِدا! یہ جو شہاب ہے نا میرے بچپن کا دوست ہے لاابالی کی عادت اِسے بچپن ہی سے ہے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو افہام و تفہیم نہیں کرتا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے کیا آپ یہ سب کچھ پسند کریں گی؟"

"میں سمجھی نہیں سر؟"

"خدا کے لئے رِدا۔ اس کے بعد مجھے سر نہ کہیں۔ ورنہ وہ میرا سر توڑ دے گا۔ آپ اُس کی عزیزہ ہیں میرے لئے قابلِ احترام ہیں میرا نام تفسیر ہے اگر تکلف کرنا چاہتی ہیں تو مسٹر تفسیر کہہ لیا کریں اور بس۔"

"اوہ شکریہ . . ." رِدا پھر سرکنے کی تنگ سی گئی۔

"آئیے آپ کو آپ کے دفتر لے چلوں۔" تفسیر اُٹھ گیا۔ رِدا کو وہ اُس کے کیبن میں لے آیا۔ نہایت خوبصورت ائیرکنڈیشنڈ کیبن تھا جہاں

رِدا کے لئے ایک لمبی میز لگی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک شیشہ تھا جس کے دوسری طرف اُس کی سیکریٹری اور ٹائپسٹ موجود تھے "آپ اپنی سیٹ پر تشریف رکھیں" تفسیر بولا اور خود اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"نیچے بٹن لگا ہو گا دبائیے۔"

رِدا نے بٹن دبایا اور معمر چپراسی اندر داخل ہو گیا۔

"مِس فاروق کو بُلاؤ" تفسیر نے کہا۔ فیشن ایبل سیکریٹری مسکراتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

"مِس فاروق آپ کی نئی آفیسر۔ اِن کے پاس بیٹھ کر آپ تمام فائل اُنھیں چیک کرا دیں ایک ایک تفصیل بتا دیں اور جہاں بھی مِس رِدا کو اُلجھن پیش آئے اُسے دُور کریں۔"

"اوکے سر" مِس فاروق نے کہا۔

"مِس رِدا کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔"

"یس سر" مِس فاروق نے کہا اور تفسیر اُٹھ گیا۔

"اوکے مِس رِدا! کام شروع کریں" وہ باہر نکل گیا اور رِدا مِس فاروق کو دیکھنے لگی۔

"ہمارا کام بالکل نارمل ہے میڈم کوئی ایسا کیس نہیں ہے جو اُلجھن کا باعث ہو۔ اس وقت صرف چھ فائل کھلے ہوئے ہیں میں آپ کو اُن کی تفصیل بتاتی ہوں۔"

پانچ یوں بج گئے کہ رِدا کو احساس بھی نہیں ہوا۔ چپراسی ہر ایک گھنٹے کے بعد چائے لا رہا تھا۔ دوبارہ چائے پینے کے بعد رِدا نے کہا "بس اب شام کو جانے سے چائے لانا میرے لئے۔" دوپہر کا کھانا بھی رِدا نے واپس کر دیا۔ مِس فاروق پانچ بجے پرس سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

"میڈم! پانچ بج گئے ہیں۔" رِدا ہنس پڑی پھر وہ بھی اُٹھ گئی تھی جا چکا تھا۔ رِدا نے چپراسی سے رکشہ لانے کے لئے کہا اور پھر واپس چل پڑی اُس کا دل مسرت سے دھڑک رہا تھا نئی زندگی کا آغاز بے حد حسین تھا معقول تنخواہ تھی اُس کی آنکھوں میں حسین خواب رقصاں تھے تیمور کا مستقبل، اپنا گھر، نہ جانے کیا . . . رکشہ کوٹھی کے سامنے رُکا۔ اور وہ بِل ادا کر کے نیچے اُتر آئی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو ٹھٹھک گئی۔ سامنے ہی ثناء، نُدرت اور تیمور موجود تھے۔ تیمور ایک نئے لباس میں تھا ثناء کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

"ہیلو ثناء، ہیلو اللہ رکھی" نُدرت مسکرا دی ثناء مُنہ بنا کر دالیں پلٹ پڑی۔ اُس نے کہا۔

"تیمور ایسے لوگوں سے کیا ملنا جو اب صرف چند گھنٹوں کے لئے آیا کریں گے۔ اُن سے زیادہ تعلقات نہیں رکھے جا سکتے" رِدا آگے بڑھ کر اُس کے قریب پہنچ گئی۔

"تیمور! اپنی ممی کو سمجھاؤ کسی کی مجبوریوں پر اُس سے نفرت نہیں کی جا سکتی" اُس نے تیمور کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تیمور! اِن سے کہہ دو کہ مجبوری کے نام سے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا" ثناء نے بدستور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"تیمور اِن دونوں سے کہہ دو کہ اُن کے درمیان ایک بے وقوف ہستی موجود ہے جس کی طرف توجہ ہی نہیں دی جا رہی اور اب اُس کا پارہ چڑھنے والا ہے" نُدرت نے غصیلے لہجے میں کہا اور ثناء رُک گئی۔

"سب تیرا کیا دھرا ہے اللہ رکھی۔ سارا دن کیسی بور رہی ہوں۔ اِس کا اندازہ ہے تجھے تو نے ہی سفارش کی تھی کہ رِدا کو نوکری کرنے دی جائے۔"

"چائے کی خوشبو باورچی خانے سے یہاں تک آ رہی ہے۔ یہ مسٹر جمن چائے کے جادوگر ہیں آہ اُن کی کون کون سی صفت بیان کی جائے" نُدرت نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

ثناء سنجیدگی قائم نہ رکھ سکی۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ اُس نے نُدرت سے کہا "اب تو ہی جا اللہ رکھی اور جمن سے چائے کے لئے کہہ کر آ۔ تیمور! اِن خاتون سے کہو کہ لان پر چلیں چائے وہیں پی جائے گی۔"

"تیمور! یہ بات تم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ ہم اِن ڈائرکٹ ہونے کبھی نہیں قبول کرتے اِس لئے خدا حافظ" رِدا نے تیز قدموں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ثناء نے عقب سے اُس کی چوٹی پکڑ لی۔

"یہ بال جو ٹخنوں تک جا رہے ہیں قسم کھا رہی ہوں سب میرے ہاتھ میں رہ جائیں گے اے اللہ رکھی تو نے سُنا نہیں۔"

"جمن کی وجہ سے جا رہے ہیں اُس کے رخِ سیاہ کی ایک جھلک نصیب ہو جائے گی۔ ورنہ ہم کب کسی کو خاطر میں لانے والوں میں سے ہیں" نُدرت نے کہا اور کوٹھی کی طرف بڑھ گئی۔

رِدا ثناء کے ساتھ لان پر آ گئی۔ کُرسیاں اور میز ہر شام ہی لان پر لگا دی جاتی تھیں دونوں کُرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ تیمور کو گھاس پر چھوڑ دیا گیا اور وہ گھٹنوں چلتا ہوا دُور نکل گیا۔

"خدا کی قسم اتنی بور ہوئی ہوں دن بھر کہ بتا نہیں سکتی" ثناء نے شکایت کی۔

"اور میں تو جیسے خوش رہی ہوں دن بھر۔"

"تم پر خود ہی تو قیامت ٹوٹی ہے کسی کا کیا قصور ہے۔ میں کہتی ہوں اب بھی باز آ جاؤ۔ کل سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں ثناء مجھے ہر قیمت پر ملازمت کرنی ہے تمہاری سوچ بیکار ہے غور کرو آنے والے وقت میں میری کیا پوزیشن ہوگی۔ تمہاری عنایات کے سہارے کب تک جیوں گی۔ مجھے اپنی زندگی بنانے کی جدوجہد کرنے دو تمہاری اِس محبت کے سہارے کچھ بن گئی تو تمہیں بھی خوشی

ہو گی۔ چند روز کی بات ہے، ہم لوگ اپنے معمولات میں ایڈجسٹ ہو جائیں گے اور پھر چند گھنٹوں کی بات تو ہے اب میں رات کے بارہ بجے تک تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"دفتر کا ماحول کیسا ہے؟"

"شہاب صاحب کے اس احسان کو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ وہاں مجھے اُن کی عزیزہ کی حیثیت سے بڑی عزت دی گئی۔"

نُدرت تیز تیز قدموں سے دوڑتی آ رہی تھی۔ ثناء مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی جب وہ قریب پہنچی تو ثناء نے کہا "وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔"

"کیا؟" نُدرت حیرت سے بولی۔

"جمن نے اظہارِ عشق کر دیا نا تیری حالت بتا رہی ہے۔"

"ہائے کاش ایسا ہوتا۔ بے جمن تو لاجونتی کے پھول ہیں مجھے دیکھ کر وحشت زدہ ہو گئے چائے گرتے گرتے بچی ہے" نُدرت نے کہا اور رِدا ہنسنے لگی "میں تو اِس لئے بھاگی بھاگی آئی ہوں کہ تم دونوں نصابیں شروع کر دی ہوں گی۔"

جمن چائے لاتا نظر آیا تھا "کیا شاہانہ چال ہے۔ کیا جاہ و جلال ہے قربان ہو جاؤں" نُدرت نے کہا اور رِدا اور ثناء ہنس ہنس کر لوٹ ہو گئیں۔ جمن اُن کی ہنسی سے ڈگمگا گیا تھا۔ بمشکل تمام اُس نے برتن میز پر رکھے۔ نُدرت بولی۔

"ایک پیالی چائے آپ اپنے ہاتھ سے بنا دیں مسٹر جمن۔ لیکن صرف ایک پیالی۔"

"اور ہماری چائے کون بنائے گا؟" ثناء نے کہا۔

"اللہ جانے" نُدرت نے سوکھے سے مُنہ سے کہا۔ رِدا کا قہقہہ چھوٹ گیا تھا۔ جمن ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ شرما کر اِس طرح بھاگا کہ نیچے کھیلتے ہوئے تیمور میں اُلجھ گیا اُسے بچانے کے لئے پلٹا تو چاروں شانے چت تھا۔

"ہائے مسٹر جمن" نُدرت نے نعرہ لگایا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن جمن اُس سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا اور اُس کے بعد وہ اس طرح بھاگا کہ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تیمور رونے لگا تھا۔ نُدرت نے آگے بڑھ کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ رِدا اور ثناء ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی تھیں۔ نُدرت تیمور کو بہلا رہی تھی۔ چند لمحات کے بعد ثناء نے پیٹ پکڑے پکڑے کہا۔

"تو ختم کر دے گی بے چارے جمن کو۔ اُس کی ماں کو اُس کی فاتحہ پڑھ لینی چاہیئے۔"

"لے اے، مالک کی بیٹی، کیا کہہ رہی ہو تم۔ وہ میرا ہے ۔۔۔ لا

سہاگ ہے اور تم اُس کی فاتحہ پڑھ رہی ہو" ندرت نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا۔ دیر تک قہقہے گونجتے رہے۔ ندرت اُس دوران میں چائے بنانے لگی تھی۔ وہ بالکل سنجیدہ نظر آ رہی تھی اور اُس کی اِس سنجیدگی کو دیکھ کر اُن دونوں کو اور زیادہ ہنسی آ رہی تھی۔

دیر تک یہ دلچسپ مشغلہ جاری رہا، پھر دوسرے موضوع پر گفتگو شروع ہوگئی۔ ثناء نے کہا۔

" ہماری اس کوٹھی میں چند واقعے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً ندرت اور جمن کا عشق، رِدا کی ملازمت اور عارفہ بیگم کی شامت۔ یہ تینوں واقعات ہم تین افراد سے منسلک ہیں۔ رِدا کی نوکری سے تو مجھے خیر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو کچھ اُس نے کیا ہے صحیح معنوں میں وہ دوستی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ یہ کچھ بھی کہتی رہے میں اس بات سے ہمیشہ منحرف رہوں گی کہ ملازمت اس کی کوئی اہم ضرورت تھی بہرحال ہم ہر شخص کو اپنی پسند کے مطابق نہیں ڈھال سکتے۔ میں نے یہ سوچ کر یہ ساری باتیں برداشت کر لی ہیں کہ ابھی رِدا پر میرے بہت زیادہ اثرات نہیں ہیں۔ جب میں اس قابل ہو جاؤں گی کہ اس سے اپنی بات منوا سکوں تو سب سے پہلا کام اُسے یہی کرنا ہوگا کہ یہ ملازمت چھوڑ دے۔"

رِدا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، تو ثناء جلدی سے بولی۔

" یہ بس ایک تذکرہ تھا۔ اس پر تبصرہ نہیں چاہتی۔ دوسری اہم خبر یہ ہے کہ ہم نے وہ چور پکڑ لیا ہے ندرت، جس نے یہ سارا چکر ہمارے خلاف چلایا تھا۔"

" کیا واقعی۔ تجھے اللہ قسم، سارا دن ہضم کئے رہی اِس بات کو۔ میں جانتی ہوں کیوں۔ مونا لیزا کے انتظار میں تا" ندرت نے کہا۔

" ہاں بھئی اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی۔ تب تمھیں بتا دیتی ندرت، لیکن میں نے سوچا کہ تمام باتیں رِدا کے سامنے ہی ہوں۔"

" کون تھا وہ ؟"

" نام لے چکی ہوں، عارفہ بیگم۔ پہلے بھی شُبہ تھا مجھے اب کوئی شُبہ نہیں ہے۔"

" کیسے پتہ چلا ؟" رِدا نے دلچسپی سے پوچھا اور ثناء نے ساری تفصیل اُسے بتا دی۔

رِدا مسکرانے لگی تھی۔ ندرت تھوڑی کھیا رہی تھی۔ پھر رِدا نے کہا۔

" تو پھر ثناء۔ حصہ عارفہ بیگم کا تو نہ ہوا۔ اُن بے چاری کو تو ڈیوٹی پر لگایا گیا تھا۔ وہ صرف نمک حلالی کر رہی تھیں۔"

" میں انھیں حلال کر دوں گی۔ تم دیکھتی تو رہو تماشا" ثناء نے کہا۔

" نہیں ثناء پلیز، معاف کر دو انھیں، وہ تمھاری اپنی ہیں خواہ مخواہ اُنھیں تنگ کرنے سے کیا فائدہ ؟"

" میں آپ سے مشورہ نہیں مانگ رہی مس رِدا جب آپ مجھ سے تعاون نہیں کر سکتیں۔ تو پھر میں آپ سے کیوں کسی قسم کا تعاون کروں۔ ہاں بھئی اُستاد گرامی عارفہ بیگم کے لئے کیا سزا تجویز کی جاتی ہے ؟"

" دیکھو بھئی ویسے تو ہم مُفت کے وکیل ہیں۔ کسی کو کسی بھی سلسلے میں مشورہ دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ سوچتے ہیں کہ سب اپنے ہی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو اُن پر خرچ کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن عارفہ بیگم کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے ذرا عجیب سا لگتا ہے کیونکہ مالک کی بیٹی کے رشتے سے ہم اُن کا احترام کرنے پر مجبور ہیں"

" خیر اب تم جو اداکاری کر رہی ہونا۔ میں اُس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خود ہی کوئی پروگرام بناؤں گی اور خود ہی کوئی کام کروں گی۔ تم لوگ کیا سمجھتے ہو مجھے بالکل ہی ناکارہ ہوں کیا" ثناء نے کہا۔

" نہیں بھئی نہیں ایسی بات نہیں۔ بہتر یہ ہوگا ثناء کہ انھیں معاف کر دو۔ دیکھو میرا کیا بگڑ گیا۔ بس امی اور دادی اماں نے ذرا سی چھان بین ہی تو کی تھی۔ میں نے تو اُن کے ساتھ کونسی بے وفائی برتی ہے، جھوٹی کہانی سنا کر انھیں اطمینان دلا دیا ہے۔ بات تو برابر ہوگئی" رِدا نے کہا اور ثناء دانت پیس کر اُسے گھورنے لگی۔

" رِدا تجھ سے مجھے بڑی شکایتیں ہیں۔ بس بار بار کہنا پڑتی ہیں تو مجھے محسوس ہوتی ہیں۔"

رِدا نے خاموشی سے گردن جھکا لی تھی۔

دوسرے دن رِدا حسبِ معمول اپنی ڈیوٹی پر چلی گئی، ثناء کو کچھ ضروری کام کرنے تھے، چنانچہ وہ بھی باہر نکل گئی۔ غلام احمد صاحب کے گھر میں اماں بی اور شوکت جہاں میں کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ عصمت گھر کے کاموں میں مصروف تھی ندرت حسبِ معمول اُس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ عصمت نے کہا۔

" تیرا تو یہاں خوب دل لگ گیا ہے ندرت۔ میں نے ایک پروگرام بنایا ہے۔ میرا خیال ہے تو اس کی تائید کرے گی۔"

" کیا ؟" ندرت نے سوال کیا۔

" کیوں نہ میں اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دوں۔ میرے دل میں بڑی اُمنگ تھی پڑھنے کی۔ لیکن حالات نے ساتھ نہیں دیا تھا اب ہم کسی حد تک بہتر پوزیشن میں آ گئے ہیں۔ یہاں رہنے سے بہت سے فائدے ہوئے ہیں۔ سب لوگ خوش ہیں۔ چنانچہ کیوں نہ میں اِس سے فائدہ اُٹھاؤں ؟"

" خیال تو بُرا نہیں ہے باجی، کیا کالج اٹینڈ کریں گی ؟" ندرت نے پوچھا ...؟

" ہاں، یہی سوچ رہی ہوں۔"

" کوئی حرج نہیں ہے، ابا جی کی اجازت ہے ؟"

" اجازت لے لوں گی، تجھے بھی میری مدد کرنا ہوگی۔"

" پڑھنے کے بعد کیا کرو گی ؟"

" بھئی دیکھا جائے گا۔ اب اگر تو یہ سوچ رہی ہے کہ میں شرما کر یہ کہوں گی کہ جو ماں باپ چاہیں گے۔ تو یہ تیری حماقت ہے، آخر تیری بہن ہوں۔ شرم و حیا سے میرا کیا واسطہ۔ اگر ابا جی نے ملازمت کی اجازت دے دی تو ملازمت کروں گی اور اگر شادی کر دی۔ تو پھر شادی کر لوں گی۔"

" ہائے باجی تمھاری شادی میں کتنا مزا آئے گا" ندرت نے شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ اُسی وقت اماں بی کی آواز سنائی دی۔

" عصمت بیٹی ذرا ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دو" اور عصمت پانی لے کر اُن کے کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحات کے بعد واپس لوٹی تو ندرت سے کہنے لگی۔

" اماں بی اور امی جان کسی پُراسرار قسم کی گفتگو میں مصروف ہیں۔"

" خیریت کچھ اندازہ ہوا ؟"

" نہیں۔ بس ہم دونوں کی نہ نکالنے ہی تھے۔"

" اونہہ۔ اُن دونوں کو اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ میں ذرا چلتی ہوں باجی۔"

" کہاں ؟"

" بس ایسے ہی، ذرا ثناء کی طرف جا رہی ہوں" ندرت نے کہا حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ ثناء گھر میں موجود نہیں ہے۔ لیکن بس شرارت ذہن میں در آئی تھی۔ جمن کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہتی تھی اِس لئے یہ موقع اِسے غنیمت نظر آیا تھا۔

تین نمبر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُسے جمن کی ماں یاد آئی اور ندرت کے پیٹ میں قہقہے مچلنے لگے، لیکن ابھی اِن خاتون کو تنگ کرنا مناسب نہیں تھا۔ جانتی تھی کہ جمن باورچی خانے میں ہوگا۔ اور دوپہر کے کھانے کی تیاریاں کر رہا ہوگا۔ کوٹھی میں اُس کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی اب وہ اِس میں جھجک محسوس کرتی تھی۔ سب لوگ بہت اچھے تھے یہاں پر ... اور درحقیقت ندرت کو اِس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ احسان احمد صاحب کا گھرانہ انتہائی شریف لوگوں کا گھرانہ ہے اور یہ لوگ قابلِ عزت ہیں۔

ندرت پُراطمینان قدموں سے چلتی ہوئی باورچی خانے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اندر جمن موجود تھا تنہا ہی تھا اور دیگچی میں کفگیر چلا رہا تھا۔

" مسٹر جمن" ندرت نے آواز دی اور جمن نے تیزی سے کفگیر باہر نکال لیا۔ شاید دیگچی میں گھی تھا کفگیر اِس طرح نکالنے سے گھی کی چھینٹیں اُڑیں اور جمن اپنی جگہ ناچ کر رہ گیا۔ لیکن ندرت کو دیکھ کر اُس کی باچھیں کِھل گئی تھیں وہ گھی کی جلن بھول گیا جس کی چھینٹیں اُس کے جسم کے مختلف حصوں پر پڑی تھیں اور اُس کی آنکھوں میں کیف و سرور سمٹ آیا۔

" ندرت۔ ندرت بی بی۔"

" ارے جمن تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا ؟"

" لگ کیوں نہ معلوم ہوتا ندرت بی بی۔ انسان جس چیز کے بارے میں معلوم کرنا چاہے بھلا کیوں نہ معلوم کرے گا" جمن نے مہذب بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" ہوں۔ تب تو تمھیں بہت سی باتیں معلوم ہوں گی جمن ؟"

" کیسی باتیں" جمن نے کہا۔ اور پھر دفعتاً وہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے سے باہر آ کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اندر آ گیا۔

" کیسی باتیں" اُس نے پھر سوال کیا۔

" چھوڑو، مجھے شرم آتی ہے" ندرت بولی۔

" ارے نہیں۔ بشش شرم کی کیا بات ہے، یہاں میرے علاوہ اور ہے کون ؟"

" بس جمن ایسے ہی تمھاری امی نے ہمارے گھر کچھ باتیں کی تھیں۔"

" ہاں کی تھیں۔ کیا میرے کو پتہ نہیں ہے" جمن نے کہا اور پھر چونک کر بولا "لیکن ... لیکن آپ کی طبیعت اب کیسی ہے ندرت بی بی ... ؟"

" کونسی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہے ہو ؟"

" وہ بس اماں نے کچھ عجیب عجیب سی باتیں کی تھیں۔ اُس ٹیم میں نے تو آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ بس اماں ہی نے دیکھا تھا اور جب میں نے دیکھ لیا تو مجھے ... بس کیا بتاؤں راتوں کو نیندیں نہیں آتیں، آسمان کے نیچے لیٹا تارے گنتا رہتا ہوں ایک دو، تین چار پانچ چھ۔"

" گڈ گڈ۔ کہاں تک گنتی آتی ہے تمھیں ؟"

" لو جہاں تک گنتی ہوتی ہے۔ وہاں تک آتی ہے، چھ جماعتیں پڑھا ہوں۔ بس ساتویں جماعت میں ایک مرتبہ تگڑی پٹائی ہوگئی تھی اس لئے بھاگ لیا۔ ورنہ آج بی اے پاس ہوتا" جمن اکڑ کر بولا۔

" اوہو جمن مجھے انتہائی افسوس ہے، تم نے بی اے تک نہیں کیا۔"

" ہاں بی بی۔ بس بی اے رہ گیا" جمن نے افسوسناک انداز میں جواب دیا۔ پھر بولا "لیکن لیکن آپ کی طبیعت ..."

" میری طبیعت پہلے بھی ٹھیک تھی جمن اور اب بھی ٹھیک ہے۔

میں کہہ رہی ہوں نا، پہلے میں نے تمھیں دیکھا نہیں تھا اگر میں تمھیں دیکھ لیتی تو کبھی یہ بہانہ نہ کرتی۔ دراصل میں کسی ایسے شخص سے... میرا مطلب ہے... میرا مطلب ہے۔" ندرت نے زبان روک لی اور پھر آہستہ سے بولی۔

"ارے میرے باپ۔ تب تو... تب تو میرے ساتھ بڑی زیادتی ہوگئی۔ اب تو اماں ایسے بدک گئی ہے کہ اُسے سنبھالنا بیحد مشکل ہوگا۔"

"حالات خود بخود اپنے لئے راستہ تلاش کر لیتے ہیں جمن۔ میرے اور تمھارے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔"

"میں ہر رکاوٹ کو دُور کر دُوں گا۔ میں پہاڑوں پر سے چھلانگیں لگا دُوں گا۔ زمین کو لپیٹ کر بغل میں دبا لُوں گا۔ تم ایک بار، تم ایک بار محبت کا امتحان تو لو۔" جمن نے آج تک کی دیکھی ہوئی فلموں کے سارے ڈائیلاگ گڈمڈ کر دیئے۔ ندرت بمشکل تمام قہقہے ہضم کر پا رہی تھی۔ اُس نے کنکھیوں سے جمن کے چہرے کا جائزہ لیا۔ جو جوشِ جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا۔ پھر سنجیدگی سے بولی۔

"امتحان دوگے جمن؟"

"کک۔ کونسی کلاس کا؟" جمن نے گھبرا کر پوچھا

"کلاس کی بات کر رہے ہو یا محبت کی؟"

"مم میں محبت کی بات ہی کر رہا تھا۔ ندرت بی بی۔"

"جمن ابھی اپنی امی سے کسی بھی بات کا تذکرہ مت کرو۔ پہلے میرے خوابوں کی تعبیر تو بن جاؤ۔ پہلے اپنے آپ کو اُس شکل میں تو میرے سامنے پیش کردو۔ جس شکل میں میں اپنی زندگی کے ساتھی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔" ندرت نے سنجیدگی سے کہا۔

جمن کے ہوش خراب ہوگئے تھے۔ ہانڈی میں پڑی ہوئی تمام پیاز جل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ اور اُس سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ ندرت نے جمن کو جان بُوجھ کر اُس کی جانب متوجہ نہیں کیا اور کہنے لگی۔

"میں تمھیں ایک ایسی شکل میں دیکھنا چاہتی ہوں جمن جو میرے خوابوں میں بسی ہوئی ہے۔"

"کک کونسی شکل ہے وہ۔ مجھے بتادو۔" جمن نے کہا۔

"میرے خوابوں کا شہزادہ ایک حسین سُوٹ میں ملبوس ایک اعلیٰ سوسائٹی کا فرد ہے۔ اور جمن میں اُسی کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔"

"تت تو پھر مجھے کیوں دھوکہ دے رہی ہو۔" جمن ناک سے شُوں شُوں کی آواز نکالتا ہوا بولا۔

"دھوکہ؟" ندرت نے متعجبانہ انداز میں کہا۔

"میں تو... میں تو باورچی ہوں ندرت بی بی اور ساری زندگی باورچی ہی رہوں گا۔"

"میں تمھیں باورچی نہیں رہنے دُوں گی۔ میں تمھیں وہ بناؤں گی جمن، جو میں چاہتی ہوں۔"

"مم مجھے بناؤ گی؟" جمن نے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔ تم تھوڑا سا وقت نکالا کرو اپنے لئے بھی۔ یہ کیا ساری زندگی تم یونہی چُولھے کے پاس کھڑے کھڑے گزار دوگے۔ پارٹیز اٹینڈ کرو، محفلوں میں جاؤ۔ اُٹھنے بیٹھنے کے آداب سیکھو۔ مجھے تمھاری دولت سے دلچسپی تھوڑی ہوگی میں تو تمھاری شخصیت کو بنانا چاہتی ہوں۔"

"میں پارٹی میں جاؤں۔ گھر میں جو پارٹی ہوتی ہے اُس میں تو ضرور شامل ہوتا ہوں۔"

"ہاں۔ لیکن ایک باورچی کی حیثیت سے۔" ندرت نے کہا اور جمن کے چہرے پر شرمساری کے سائے پھیل گئے۔

"تو پھر کیا کرنا چاہیئے مجھے۔ کم از کم تم ہی بتادو۔" جمن خود بھی بے تکلف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ندرت تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی، پھر اُس نے کہا۔

"جو کچھ میں بتاؤں گی جمن وہ کروگے؟"

"کیوں نہیں کروں گا۔ بالکل کروں گا۔"

"تو پھر میں تمھیں کوئی بہترین پروگرام بتاؤں گی۔ لیکن تمھیں کرنا وہی ہوگا، جو میں کہوں۔"

"اب تو... اب تو میری زندگی تبدیل ہوگئی ہے' ایک نیا رنگ آگیا اِس جیون میں۔ ہائے میری تیا نیا کیسے پار لگے گی۔" جمن نے سر پر ہاتھ رکھ کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس وقت ندرت نے باہر کسی کے قدموں کی آواز سُنی، چنانچہ خاموشی سے دروازے سے باہر نکل آئی۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا تھا لیکن اب واپس جمن کے پاس جانا مناسب نہیں تھا۔ آج کے لئے اتنی ہی خوراک کافی تھی! جمن کی باتیں یاد کر کے پیٹ میں بل پڑے جا رہے تھے۔ لیکن خود کو سنبھالے ہوئے وہاں سے نکل آئی اور پھر اپنے کوارٹر میں ہی آکر دم لیا۔ عصمت کو اِس سلسلے میں بتانا مناسب نہیں تھا۔ وہ ذرا نصیحت بی بی تھیں۔ اِس لئے ندرت اپنے معاملات کو اُن سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔

ردا کو دفتر آتے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اب وہ زیادہ مطمئن اور زیادہ پُرسکون انداز میں اپنی ڈیوٹی پر آتی تھی ثناء وغیرہ کو اُس نے اچھی طرح سنبھال لیا تھا۔ کوٹھی کے معاملات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دادی اماں اور زیب النساء بیگم اُس کے بعد بالکل خاموش ہوگئی تھیں۔ عارفہ بیگم البتہ اِس چکر میں تھیں کہ کب ثناء اُن کے سامنے کوئی ترکیب پیش کرے اور کب ردا کا کچا چٹھا سامنے لایا جائے۔ دادی اماں اور ذکیہ بیگم نے اُن سے کچھ کہا نہیں تھا لیکن عارفہ بیگم

جانتی تھیں کہ یہ ناکامی اُن کے حق میں بہتر نہیں ہوئی۔ ثناء نے انھیں اچھی طرح احمق بنا لیا تھا۔

بہرطور ردا اب اپنی زندگی سے کسی حد تک مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ دفتری معاملات اُس نے انتہائی خوش اسلوبی سے سمجھ لئے تھے۔ اُس دوران میں تفسیر کے پاس ایک بار بھی شہاب صاحب کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ البتہ تفسیر کئی بار ردا سے مل چکا تھا۔ لیکن اُس کے انداز میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی تھی جو ردا کو پریشان کرتی۔ اُس نے ایک انتہائی شریف آدمی کی حیثیت سے ردا کی نگاہوں میں اپنا مقام بنایا تھا۔ البتہ اپنے طور پر اب وہ کچھ غیر مطمئن ہوگیا تھا۔ یہ فرم تنہا اُس کی نہیں تھی بلکہ اُس کے والد کے دوست بھی اُس میں حصہ دار تھے اور زیادہ سرمایہ اُنہی کا لگایا ہُوا تھا۔ تفسیر کو اپنے باپ کی طرف سے یہ فرم سنبھالنے کی ہدایت ملی تھی اور بہرطور اپنے کاروبار کے سلسلے میں اُسے کوئی پردہ بھی درکار تھا۔ اور یہ فرم اُس کی بہت پردہ پوشی کرتی تھی۔ ردا کا اپوائنٹمنٹ سو فیصدی اُس کی اپنی کوشش تھی حالانکہ اِس ذمّے داری کو کافی عرصے سے وہ خود ہی سنبھالے ہوئے تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر اِس بارے میں اُس سے کوئی پُوچھ گچھ ہوگئی تو وہ بڑے اطمینان سے بات بنا دے گا۔ چونکہ تمام کارروائی باقاعدہ کی گئی تھی۔ اور یہ شُبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ردا کو کسی خاص وجہ سے یہاں رکھا گیا ہے۔ لیکن اب تفسیر ردا کے سلسلے میں کسی قدر بے چین ہوگیا تھا۔ شروع شروع میں جب ردا اُس کے سامنے آئی تھی تو کچھ اِس طرح گھبرائی ہوئی تھی کہ اُس کی اصل حیثیت اور شخصیت تفسیر کی نگاہوں میں نہیں آسکی تھی، لیکن اب جب وہ مطمئن تھی تو اُس کے چہرے پر پھُول ہی پھُول کھلے ہوئے تھے اور اُس گلستان کو نظر انداز کرنا تفسیر جیسے شخص کے لئے ممکن نہیں تھا۔ کئی دن سے وہ شہاب صاحب سے گفتگو کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، لیکن اُسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ شہاب سے اِس موضوع پر کس طرح گفتگو کی جائے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے آفس میں آرام کر رہا تھا کہ شہاب اندر داخل ہوگئے۔ تفسیر انھیں دیکھ کر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔

"کمال ہے یار تم تو ایسے غائب ہوگئے جیسے کسی کے سر سے وہ..." شہاب صاحب نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بس بھائی۔ میری اپنی مصروفیات بھی ہیں۔ ظاہر ہے اُن سے بھی نپٹنا ہوتا ہے، تم سناؤ کیسی چل رہی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ وہ تمھاری محترمہ باقاعدگی سے کام کر رہی ہیں اُن کے بارے میں ذرا اُلجھن میں ہوں۔"

"کیوں؟" شہاب صاحب نے پُوچھا۔

"بھئی تم نے ایک جیسے کی جو پابندی لگادی ہے اُس پر عمل کر رہا ہوں لیکن یار شہاب، معاف کرنا اور بُرا نہ ماننا بہت حسین سو برلڑکی ہے۔ ایسی تمکنت ایسا وقار ایسا بانکپن ہے اُس میں کہ جب بھی اُسے دیکھتا ہوں تو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔"

"ہوش میں آؤ صاحبزادے، وہ میری امانت ہے تمھارے پاس۔"

"وہ تو... وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔ تم بہت سی قیمتی چیزیں مجھے بخش دیا کرتے ہو۔ پہلے مجھے اُس کا حدود اربعہ بتاؤ، یہ بتاؤ کہ تمھارے ذہن میں اُس کے لئے کیا جذبات ہیں۔ کیا رشتہ ہے تمھارا اُس سے؟ کم از کم اِن باتوں کا اندازہ لگانے کے بعد تم سے کوئی بات تو کی جائے۔"

"فضول باتیں بالکل سُننا پسند نہیں کروں گا۔ ویسے تم اپنے طور پر چاہو تو اُس سے راہ و رسم بڑھا سکتے ہو لیکن۔"

"اوہ۔ زندہ باد۔ زندہ باد۔ یہی تو چاہتا تھا میں بس اتنا ہی چاہتا تھا۔ اب ضروری تو نہیں ہے کہ ہر پسندیدہ لڑکی کی طرف دوڑ لگادی جائے۔"

"ٹھیک ہے اُس کے بدلے میں تم سے بھی کچھ طلب کیا جائے گا۔"

"جو کچھ خادم کے پاس ہے حاضر ہے۔" تفسیر نے گردن خم کر کے کہا۔

"دراصل میرے لئے تو وہ خطرناک ہوگئی ہے، بات معمولی پیمانے پر ہوتی تو کوئی حرج نہیں تھا۔ دراصل امی جان اور بھابی صاحبہ دونوں ہی کو ایک عجیب و غریب شُبہ ہوگیا تھا۔ وہ یہ کہ اُس لڑکی سے میرا کوئی بہت گہرا تعلق ہے، اور میں اُسے کسی تعلق کی بنیاد پر ہی کوٹھی میں لایا ہوں جبکہ ایسی بات نہیں تھی تفسیر تمھیں تو بتا ہی چکا ہوں۔"

"ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں اُس سے اُس کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں گا۔" تفسیر نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن... ایک بات کا خیال رکھنا کہ راہ تم میرے لئے ہی ہموار کروگے اپنی ٹانگ بیچ میں نہ پھنسا بیٹھنا۔"

"عجیب آدمی ہو۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ ایک بات پر جمتے ہی نہیں۔" تفسیر نے اُس کے لئے چائے منگائی۔

"نیاز حاصل ہو سکیں گے اُس کے؟" شہاب صاحب نے پوچھا۔

"ارے ہاں کیوں نہیں۔ ایک منٹ رُک جاؤ۔ میرا خیال ہے یہ پیالیاں دھلوالو۔ چائے دوبارہ اُس کے ساتھ ہی پی جائے گی۔" تفسیر نے کہا اور چپراسی کو بُلوا کر پہلے پیالیاں دھلوالیں۔ چائے اور منگائی گئی اور اُس کے بعد تفسیر نے ردا کو ٹیلیفون کیا۔

"مس ردا! براہِ کرم آپ ذرا تشریف لے آئیے۔"

ردا کے دل میں کوئی بات نہیں تھی۔ تفسیر نے اُس دوران

میں ایک بار بھی اُسے نہیں بُلایا تھا۔ بلکہ اُس کے رونے کی رِدا ممنون تھی۔ چنانچہ وہ سادگی سے اُٹھی اور تفسیر کے آفس تک پہنچ گئی۔ یہاں شہاب صاحب کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ہیلو رِدا۔"

"جی! کیسے مزاج ہیں آپ کے شہاب صاحب؟" رِدا نے سوال کیا۔

"بھئی ٹھیک ہوں کوٹھی میں تو تم سے ملاقات ہی نہیں ہوتی میری اپنی مصروفیات بھی بے پناہ ہیں۔ اور پھر وہاں تم سے ملنے میں ذرا خوف بھی محسوس ہوتا ہے، ہمارے گھر کے لوگ ذرا دقیانوسی ہیں سمجھو، میں نے سوچا کہ تمہارے ساتھ ایک کپ چائے ہی پی لی جائے تفسیر سے تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اُس نے تو تمہاری تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیئے ہیں۔"

"تفسیر صاحب خود بھی بہت اچھے انسان ہیں اور اچھا انسان دوسرے کو اچھا ہی سمجھتا ہے خواہ اُس میں کتنی ہی خامیاں ہوں۔"

"مگر آپ اپنی کوئی خامی ہمیں بتا تو دیجئے رِدا صاحبہ۔ تاکہ کبھی اُس سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔" تفسیر نے کہا اور رِدا ہنسنے لگی وہ پُر اطمینان انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ شہاب صاحب نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر سب سے پہلے اُسے پیش کی اور پھر تفسیر کو۔

"اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ یہ خدمت مجھے انجام دینی چاہیئے تھی۔"

"آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق لکھنؤ سے تو نہیں تھا۔ آپ کی گفتگو میں بے پناہ تکلف ہوتا ہے۔"

"میں اپنی حیثیت کو مدِ نگاہ رکھنا چاہتی ہوں شہاب صاحب۔"

"اوہو۔ اپنی حیثیت کا تعین آپ نے خود ہی کر لیا۔ بھئی انسان سب کچھ خود ہی تو نہیں کر لیتا۔ کچھ کام دوسروں پر بھی چھوڑ دینے چاہئیں۔ ہماری نگاہوں میں آپ کی جو حیثیت ہے ہم تو اُسے کبھی تبدیل نہیں کریں گے۔"

"آپ کا شکریہ۔" رِدا نے خاموشی سے چائے کی پیالی اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ تفسیر کہنے لگا۔

"بھئی شہاب صاحب رِدا بہت ریزرو خاتون ہیں آپ کی عزیزہ ہیں اس لئے میرے لئے قابلِ احترام ہیں۔ لیکن اب اتنا بھی نہیں کہ انسان اپنے آپ کو بالکل ہی لئے دیئے رہے۔ آپ ذرا مس رِدا سے یہ تو کہہ دیں کہ تفسیر کوئی بُرا آدمی نہیں ہے۔"

"ہاں رِدا میں نے تمہیں غلط جگہ نہیں بھیجا۔"

"نہیں نہیں پلیز آپ ایسا کوئی خیال دل میں نہ لائیں میں تفسیر صاحب کی دل سے عزت کرتی ہوں۔"

"کیا یہ عزت دوستی میں نہیں بدل سکتی۔ معاف کیجئے میرا مطلب ہے کہ تکلفات کی یہ دیواریں درمیان سے ہٹ جائیں تو بہتر ہے۔ آپ کسی بھی مرحلے پر بے تکلفی اور بے خوفی سے مجھ سے گفتگو کریں تاکہ کسی بھی بات کو آپ سے کہتے ہوئے جھجک نہ محسوس کروں میرے اور شہاب کے درمیان جو تعلقات ہیں میں وہی تعلقات آپ سے بھی قائم کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کی ممنون ہوں یہ کافی نہیں ہے۔" رِدا نے جواب دیا۔

"بھئی رِدا یہ شخص کبھی کبھار فضول گفتگو بھی کرنے لگتا ہے جبکہ اُس بکواس کا کوئی مفہوم خود اُس کے ذہن میں بھی نہیں ہوتا تم کہاں اُس کی باتوں میں پڑ رہی ہو چائے پیو۔" شہاب صاحب نے کہا اور تفسیر نے خاموشی سے کرسی کی پُشت سے سر ٹکا دیا، چائے پینے کے بعد شہاب صاحب اُٹھتے ہوئے بولے۔

"اچھا بھئی تفسیر میں تو چلتا ہوں۔ اوکے رِدا۔ ویسے کوٹھی میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"بار بار آپ یہ سوال کر کے مجھے شرمندہ کرتے ہیں شہاب صاحب۔ آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔" رِدا نے کہا اور خود بھی اُٹھ گئی۔ اپنے کیبن میں آ کر وہ کسی قدر اُلجھی سی گئی تھی۔ تفسیر کی گفتگو میں بہت بے باکی تھی۔ بھلا مالکان اور ملازم کے درمیان دوستی کیا معنی رکھتی ہے۔ ہاں یگانگت کا رشتہ تو فطری ہوتا ہے، لیکن تفسیر نے بڑی بے تکلفی سے اُسے دوستی کی پیشکش کر دی تھی، یہ دوستی کس قسم کی ہو سکتی ہے؟ شہاب صاحب نے بھی اُن کے اُن الفاظ پر کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُن کے گھر کے ماحول میں تو ایسی بے باکی نہیں تھی۔ ثناء کے دوستوں میں بھی کوئی لڑکا نہیں نظر آیا تھا۔ تو پھر ثناء میں اور اُس میں یہ ہلکا سا فرق کیوں محسوس کیا گیا۔ اِس کا جواب رِدا کو خود ہی مل گیا تھا ہے ثناء اُس گھر کی بیٹی تھی، اُسے کسی ملازمت کی ضرورت نہیں تھی اور جو لڑکی ملازمت کی تلاش میں نکل آئے، اُس کا وہ مقام نہیں ہو سکتا تھا تو کیا مجھے حالات کے اِس رُخ سے بھی گزرنا ہوگا؟ اُس نے پریشان انداز میں سوچا۔ ملازمت بہت اچھی تھی۔ اور کام باقاعدہ تھا، اور کسی ایسی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا جس سے وہ یہ محسوس کرے کہ اُن لوگوں نے اُسے صرف تفریح کا ذریعہ بنایا ہے، تفسیر کے جملوں پر شہاب صاحب کی مکمل خاموشی بھی کسی قدر تشویش کا باعث تھی۔ اور وہ رِدا کے لئے ایسے ہی انسانی جذبات رکھتے ہیں تو پھر انہیں اِن جملوں پر تفسیر سے پُرسش کرنی چاہیئے تھی، ثناء کے الفاظ رِدا کے کانوں میں گونجے۔ "انکل شہاب قابلِ بھروسہ انسان نہیں ہیں اُن کی فطرت میں کچھ خرابیاں پائی جاتی ہیں۔"

رِدا اُن خرابیوں پر غور کرنے لگی۔ ابھی تک بظاہر اُسے شہاب صاحب کی طرف سے ایسی کسی بات کا احساس نہیں ہوا تھا۔

شام تک اُس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو اپنے مستقبل کا دفاع کرے گی۔ ابھی اُس جگہ سے یا اُن لوگوں سے بددل ہونا مناسب نہیں ہے۔ شام کے معمولات جوں کے توں تھے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے دن وہ پھر دفتر آ گئی تفسیر نے اُسے تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں بُلا لیا ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ رِدا اُس کے کمرے میں پہنچی تو اُس نے کچھ کاغذات خصوصی طور پر اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"رِدا! آپ کو تھوڑا سا میرا کام بھی سنبھالنا ہوگا۔ میری مصروفیات کچھ بڑھ گئی ہیں۔ آپ پر بار تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں نہیں۔ کام کے لئے میں کبھی کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔"

"حالانکہ دل چاہتا ہے کہ آپ کو سکون سے آپ کے آفس میں بیٹھے رہنے دیا جائے کوئی کام نہ کرنا پڑے آپ کو لیکن میرا خیال ہے اِس طرح آپ خود بھی بور ہو جائیں گی۔"

"ہاں یقیناً بیٹھے رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔" رِدا نے سادگی سے جواب دیا۔

"شہاب سے آپ کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ہو سکیں رِدا۔ اُن سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ یہ بات آپ اُن سے ہی پوچھیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ اگر نہ بتانا چاہو تو میں ضد نہیں کروں گا، بھئی آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ خواہ مخواہ دل میں تجسس پیدا ہوتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی خود پر غور کیا ہے رِدا؟"

"ہر شخص خود پر ہمیشہ غور کرتا ہے۔" رِدا گول مول لہجے میں بولی۔

"شاید ایسا نہیں ہے۔ میں نے تو کبھی اپنے آپ پر غور نہیں کیا۔ بس ایک عام سی زندگی ہے میری صبح جاگتا ہوں، دن گزارتا ہوں اور رات کو سو جاتا ہوں۔ زندگی میں کوئی جولانی، کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ البتہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ کچھ دوست ہوں، کچھ ساتھی ہوں اُن کے ساتھ اُٹھا بیٹھا جائے زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لیا جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے رِدا اِس بارے میں؟"

"یقیناً! انسان کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں۔"

"آپ کے دل میں کبھی ایسی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوتی؟"

"جی نہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے شہاب صاحب کی کوٹھی میں دوستیاں حاصل ہیں۔ ثناء میری دوست ہیں۔ اور بھی چند لڑکیاں ہیں جن کے ساتھ میرا بہتر وقت گزرتا ہے۔"

"آپ کسی کے بارے میں ہمدردی سے سوچنے کی قائل ہی نہیں ہیں؟"

"میں نہیں سمجھی کس کے بارے میں؟" رِدا نے کہا۔

"مثلاً میں۔ بتا چکا ہوں آپ کو کہ بے کیف زندگی گزار رہا ہوں۔ اگر اِس زندگی میں کسی دوست کی خواہش محسوس ہو تو کیا غلط ہے؟"

"شہاب صاحب سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟" رِدا نے پوچھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"رشتہ... رشتہ نہیں دوستی ہے۔" تفسیر بے اختیار بولا۔

"آپ تو فرما رہے ہیں کہ آپ دوستوں سے محروم ہیں۔ اور اب آپ اعلان کر رہے ہیں کہ شہاب صاحب سے آپ کی دوستی ہے۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے ایسے بہت سے دوست ہیں۔ لیکن۔ لیکن..."

"کیا آپ شہاب صاحب کی دوستی سے غیر مطمئن ہیں؟" رِدا نے دوسرا وار کیا۔

"نہیں۔ ایسی بات بھی نہیں ہے بس۔" تفسیر چند لمحات کے لئے لاجواب ہو گیا تھا اُسے اِس معصوم سی لڑکی سے ایسی لفظی گرفت کی توقع نہیں تھی۔ رِدا سنجیدگی سے بولی۔

"تفسیر صاحب! میں اپنے دائرے میں رہنے والوں میں سے ہوں۔ میری زندگی کا ایک معمول ہے اور میں اُس معمول میں تبدیلیاں نہیں پیدا کر سکتی۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ میرے [illegible] میں اپنی حیثیت سے بڑے لوگوں سے دوستی کی قائل بھی نہیں ہوں اور پھر دوستی کا لفظ میں صرف اپنی صنف کے لئے مخصوص سمجھتی ہوں۔ مرد دوستوں سے نہ کبھی میں متعارف ہوئی ہوں اور نہ آئندہ زندگی میں یہ ایسا کوئی خیال ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میرے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ کر لیجئے۔"

تفسیر ششدر رہ گیا تھا۔ یہ سیدھی سادی لڑکی اتنی زیرک اور محتاط ہوگی اِس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ رِدا اُس سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تفسیر نے ٹیلی فون پر شہاب کو تلاش کرنا شروع کر دیا لیکن شہاب سے اُس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اُسی رات کھانے پر شہاب تفسیر کو مل گیا۔

"کہاں مر گئے تھے یار آج دن بھر تمہیں مختلف جگہوں پر فون کرتا رہا۔"

"خیریت کیا ضرورت پیش آ گئی میری؟"

"بھائی گھپلا ہو گیا میرے خیال میں۔" تفسیر نے کہا۔

"کیا مطلب؟" شہاب صاحب نے پوچھا اور تفسیر نے اپنی اور ردا کی گفتگو سنا دی۔ شہاب صاحب چند لمحات سوچتے رہے پھر غصیلے انداز میں بولے۔

"مجھے تم سے اتنی جلدبازی کی توقع نہیں تھی تفسیر۔ خواہ مخواہ میری پوزیشن خراب کر دی۔ ردا نے اگر یہاں تک سوچ لیا ہے تو پھر یہ بھی سوچا ہوگا اُس نے کہ میں بہرطور تمہارا دوست ہوں اور میری مرضی کے بغیر تم اُس سے اِس حد تک گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔"

"مگر پاپا میں نے تو کوئی ایسی ویسی بات کہی ہی نہیں تھی۔"

"تفسیر! تمہیں ابھی خاموشی اختیار کرنی تھی، بہرحال اب تو جو کر بیٹھے ہو اُسے بھگتنا ہوگا۔ اب اپنے رویے میں پہلی جیسی تبدیلی کر لو۔ جو تنخواہ تم اُسے دیتے رہے ہو اگر وہ ناگوار گزر رہی ہے تو اُس کی ادائیگی میرے ذمے۔"

"نہیں پاپا ایسی کوئی بات نہیں ہے بس۔ شاید واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی ابھی تو اُسے کچھ دن بھی نہیں گزرے۔"

"اِس غلطی کو نبھاؤ میری پوزیشن بھی اس میں شامل ہے۔" شہاب صاحب نے کہا اور تفسیر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

■

دو نمبر کے صحن میں ایک چھوٹا سا پتھر گرا اور عصمت چونک پڑی۔ یہ پتھر کس نے پھینکا۔ وہ باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ امّی اور امّاں بی اندرونی کمرے میں تھیں۔ ندرت سامنے بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ عصمت تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر واپس باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی کہ اُتنا ہی بڑا ایک اور پتھر اندر آ گیا اور اتفاق سے ندرت کے بالکل قریب گرا۔ اِس بار عصمت نے پتھر کی سمت دیکھ لی تھی۔ یہ تین نمبر کے صحن سے پھینکا گیا تھا۔

ندرت چاول کی ٹرے رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہ جمن کی ماں اب اوچھی حرکتوں پر اُتر آئی ہے۔ دیکھو یہ دوسرا پتھر ہے۔" عصمت نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ندرت نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر عصمت کو خاموش رہنے کے لئے کہا اور پھر چارپائی دیوار کے سہارے کھڑی کر کے اُس پر چڑھ گئی۔ صحن میں جمن تیسرا پتھر لئے تیار کھڑا تھا۔

ندرت نے سرگوشی کی۔ "ارے۔ کیا کر رہے ہو؟"

"سلام محبت۔" جمن نے گردن خم کر کے کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے جمن۔"

"امّاں خالہ شیرا کے گھر گئی ہیں۔"

"تو پھر...؟"

"کل آئیں گی۔ ہی ہی ہی۔" جمن نے ہنس کر کہا۔

"پتھر کسی کے لگ جاتا تو؟"

"بہت چھوٹا تھا۔" جمن بولا۔

"پھر بھی۔ آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔"

"آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"اِس وقت؟"

"پھر کس وقت امّاں خالہ۔" جمن نے کہنا چاہا لیکن ندرت نے اُس کی بات کاٹ دی۔

"میری امّی کسی خالہ کے ہاں نہیں گئیں۔ رات کو کوارٹر کے پیچھے املی کے درخت کے پاس آ جانا دس بجے کے بعد۔"

"انتظار کروں گا۔"

"خدا حافظ۔" ندرت نے کہا۔ عصمت چارپائی سے لگی کھڑی تھی وہ بار بار اندرونی کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں امّاں بی وغیرہ موجود تھیں اور اُس کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ندرت نیچے اُتری تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"کون تھا؟" بمشکل اُس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"مسٹر جمن۔" ندرت نے کہا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر باورچی خانے میں لے آئی۔ "یہ تمہارا حال کیوں خراب ہو رہا ہے باجی۔"

"یہ سب... یہ سب کیا ہے ندرت؟" عصمت نے کہا۔ ندرت چاولوں کی ٹرے باورچی خانے میں ہی لے آئی تھی۔

"لطف آ رہا ہے باجی۔ خدا کی قسم بڑا لطف آ رہا ہے۔" ندرت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہے۔ دماغ خراب ہوا ہے تیرا۔"

"پوری بات تو سُن لو باجی، بعد میں ڈانٹ لینا۔ جمن سے میرا افیئر چل رہا ہے۔" ندرت نے کہا۔ اور عصمت اُسے گھورنے لگی۔ چند لمحات وہ خاموشی سے ندرت کو دیکھتی رہی اور پھر اُس نے نفرت بھرے انداز میں کہا۔

"تیرے یہ جملے کتنے گھٹیا ہیں ندرت اِس پر غور کیا تو نے...؟"

"تو ہم کون سے بڑھیا ہیں باجی۔ جس ماحول کے لوگ ہیں اُسی ماحول کی زبان استعمال کرنی چاہئے ہمیں، تمہارا کیا خیال ہے مجھے یہ الفاظ مہذب انداز میں کس طرح کہنے چاہئے تھے؟"

"ندرت! تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" عصمت ہول کر بولی۔

"ہاں۔ پاگل ہوگئی ہوں میں مسٹر جمن کے لئے۔"

"ندرت... ندرت... خدا کے لئے... خدا کے لئے کیا حماقت کر رہی ہے۔ کیا وہ ہمارے معیار کا آدمی ہے کیا... کیا ایک باورچی اِس قابل ہو سکتا ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے بیوقوف لڑکی؟"

"آہ... اُسے باورچی نہ کہو وہ خانساماں ہے، اور آپ جانتی ہیں باجی کہ خانساماں کیا چیز ہوتا ہے، یہ تو موجودہ دور کی ناقدری ہے۔ اِس وقت جب جام اور نائی ہیئر ڈریسر اور ہیئر آرٹسٹ بن گئے ہیں، باورچی بیچارہ... باورچی ہی رہا۔ کاش اُس کے لئے بھی کوئی گنجائش نکالی جاتی۔" ندرت بولی۔

"ندرت! یہ اگر کوئی مذاق ہے تو تیری قسم اِسے بند کر دے ورنہ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔" عصمت نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"تمہارا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے باجی! کیا فضول باتیں کئے جا رہی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے میں اُس منحوس باورچی اور اُس کی ماں کو کسی عزت کی نگاہ سے دیکھوں گی جو بدتمیزیاں اُن لوگوں نے کی ہیں، جو توہین ہماری کی گئی ہے، کیا اُسے آسانی سے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔" ندرت نے کہا اور عصمت پھر چونک پڑی۔

"تو پھر...؟"

"ذرا انسان بن کر سوچو اپنی بہن کے بارے میں یہ بدگمانی اچھی تو نہیں، ندرت کو جانتی ہو اور اُس کے بعد ایسی باتیں کر رہی ہو۔"

"مگر ندرت، یہ سب کچھ... آخر اُس کی اتنی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تفصیل پوچھنا چاہتی ہو تو چائے پلاؤ عمدہ سی۔" ندرت نے آنکھیں بند کر کے کہا اور عصمت اُسے گھورنے لگی۔

"پاگل کر دیا ہے تو نے مجھے تیری اِن حرکتوں نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ کیا کروں کیسے تجھ سے نجات حاصل کروں۔"

"شادی کرا دو باجی میری۔ کسی اچھی سی جگہ، خود بخود نجات حاصل ہو جائے گی۔" ندرت نے کہا اور عصمت بے اختیار مسکرانے لگی۔

"اگر یہ بات میرے بس میں ہو تو سب سے پہلے یہی کروں۔"

"چلو چائے کا پانی رکھو ورنہ کچھ نہیں بتاؤں گی۔" ندرت نے ضدی انداز میں کہا اور عصمت نے گہری سانس لے کر چھوٹی سی دیگچی میں چائے کا پانی چڑھا دیا۔

"ہُنہ۔ جب تم اُس میں پتی ڈالو گی باجی اور اُس کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں منتشر ہوگی تو میری زبان کھلے گی۔"

"یہ بدتمیزی آخر اُس نے کیوں کی؟"

"میں نے شہہ دی تھی اُسے۔"

"کیا مطلب...؟"

"مطلب یہ کہ مسٹر جمن اِن دنوں میرے بارے میں سوچ رہے تھے، اُن کی ماں نے ہمارے لئے اپنے بیٹے کا پیغام دینے کی کوشش کی تھی اور اِس کے بعد جو انھوں نے حرکتیں کی تھیں کیا آپ کے خیال میں باجی انھیں اُس کی سزا نہیں ملنی چاہئے تھی۔"

"سزا تو دے دی تھی ہم نے، اب کون سی سزا باقی رہ گئی۔ اب اُس کی جرأت کبھی نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ جو کچھ تو کر رہی ہے ندرت یہ بہت خطرناک ہے۔"

"ارے چھوڑو باجی خطرناک... خطرناک کیا سمجھ رکھا ہے تم نے آخر کیسے خطرناک ہے کوئی ہماری توہین کر کے صاف نکل جائے مجال ہے کسی کی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ندرت مگر جمن کو... جمن کو...!" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"پانی کھول رہا ہے پتی ڈالو۔" ندرت نے کہا اور عصمت نے چائے کی پتی دیگچی میں ڈال دی، ندرت گہری گہری سانسیں لیتی ہوئی بولی۔

"آہ... وہ ایک حسین شام تھی۔ جب کچن میں میری ملاقات جمن صاحب سے ہوئی، کتنے حسین لگ رہے تھے وہ۔ دیگچی میں کفگیر چلاتے ہوئے کیا شخصیت ہے کیا انداز ہے، اور مسٹر جمن یہ معلوم کر کے ششدر رہ گئے کہ میں وہی لڑکی ہوں جس کے لئے اُن کی ماں نے رشتہ دیا تھا، اور جس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔"

عصمت کبھی ہنس رہی تھی اور کبھی پریشان ہو جاتی تھی۔ ندرت اپنی دُھن میں مسلسل بولے جا رہی تھی۔

"میں نے مسٹر جمن سے کہا کہ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ حسین شخصیت اُن کی ہے، جس کے لئے میری زندگی بھر کی رفاقت مانگی گئی تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ مجھے اب اِس رشتے کے ٹھکرانے کا بڑا افسوس ہے۔ اِس کے بعد میری مسٹر جمن سے تین چار ملاقاتیں اور ہوئی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا ہے کہ اُن کی شخصیت میں جو بانکپن ہے۔ میں اُسے اُس کے اصل رُوپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور جب مسٹر جمن میرے خوابوں کے شہزادے بن کر میرے سامنے آئیں گے تو میں... تو میں... ہائے باجی ذرا یہ چاول چننا۔" ندرت نے چاولوں کی ٹرے عصمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بک... بک مت کر خواہ مخواہ میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے تو نے۔" عصمت نے ٹرے اُس کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا اور چائے کا برتن صاف کرنے لگی۔

"کمال ہے یار ذرا سے چاول نہیں چن سکتیں میرے حصے کے۔" ندرت نے منہ بناتے ہوئے چاولوں کی ٹرے پھر اپنے قریب سرکالی۔

"تیرے حصے میں کام ہی کیا آتا ہے۔ بس مفت خوری کی عادت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔" عصمت نے کہا۔

"ہائے باجی، راج کر رہی ہوں آپ کے زیرِ سایہ۔ کل کو اپنے گھر کی ہو جائیں گی تو پھر یہ ساری مصیبتیں میرے ہی کندھوں پر تو آ پڑیں گی اور پھر ایسے کام۔ توبہ توبہ چاول چُننا آٹا گوندھنا جھاڑو لگانا تم غور کرو باجی مجھ جیسی سیماب صفت لڑکی ایسے کاموں کے لئے ہے؟"

"پھر کونسے کام کریں گی حضور؟"

"ہوائی جہاز اُڑا دالو۔ محاذِ جنگ پر بھیج دو دیکھو تمھیں کیا کر کے دکھاتی ہوں۔ کسی خلائی مشن پر بھیج دو دیکھنے والے دیکھیں گے نُدرت کو۔" نُدرت نے سینہ تان کر کہا۔

عصمت نے چائے تیار کر کے اُس کے سامنے رکھ دی اور نُدرت نے چاولوں کی ٹرے پھر اُس کی طرف سرکا دی۔

"تیری یہ حرکتیں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں نُدرت۔ بہت تیزی سے دوڑ رہی ہے ٹھوکر نہ کھا جائے۔"

"ایک وعدہ کرتی ہوں باجی ٹھوکر کھا کر گری بھی تو کسی کے اوپر ہی گروں گی مجھے چوٹ نہیں آئے گی۔"

"خدا کرے تجھے زندگی میں کبھی چوٹ نہ آئے۔"

"ہائے باجی چائے کی خوشبو۔" نُدرت نے چائے سے اُٹھنے والی بھاپ کو سونگھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اُڑانے کی کوشش مت کر نُدرت واقعی تیرے پریشان ہو گئی ہوں۔"

"اب آپ کو پریشانیاں مول لینے کا شوق ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

عصمت کی آنکھوں میں بے چینی کے تاثرات منجمد تھے۔ نُدرت چائے کے گھونٹ لیتی ہوئی بولی، "جمن کی ماں اور مسٹر جمن کو سزا ملنی چاہیے باجی، اور میں نے اس پروگرام پر کام شروع کر دیا ہے۔"

"یہ چھپکلی اُسی پروگرام کا حصّہ تھی؟" عصمت نے طنزیہ کہا۔

"بالکل۔ سو فیصدی۔"

"ابو جی یا اماں بی صحن میں ہوتے تو...؟"

"جمن کو تین نمبر سے باہر گھسیٹ کر مار لگائی جاتی۔ اس میں میرا کیا قصور؟"

"اور اگر وہ تمھارا نام لے دیتا تو؟"

"ہائے باجی میرا جمن ایسا نہیں ہے۔" نُدرت نے جلدی سے کہا۔ اور عصمت جھلاہٹ کے باوجود ہنس پڑی۔

"کیوں ابو کی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے نُدرت! بدنام ہو گئے تو سر چھپانے کا یہ ٹھکانہ بھی جائے گا اب کہاں جائے گی یہاں سے؟"

"ارے واہ۔ ایسے ہی بدنام ہو جائیں گے یہ دو کوڑی کے لوگ ہمارے گھر آ کر ہماری توہین کریں اور ہم خاموش بیٹھے صبر کرتے رہیں۔ معاف کرنا باجی اب یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تو اِن باتوں کو نہیں جانتی نُدرت۔ لڑکی کی عزت بڑی نازک چیز ہوتی ہے۔ ذرا بھی بال پڑ جائے تو..."

"میری عزت بہت مضبوط ہے۔ اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ جمن کو معاف نہیں کیا جائے گا اور پھر دادا اور شناء بھی میرے ساتھ ہیں۔ تم پریشان نہ ہو باجی یہ دوسری بات ہے کہ ابو ہمیشہ سے دبے رہے ہیں لیکن اب یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔"

"خدا تجھے عقل دے تو رات کو اس سے ملے گی؟"

"کیوں نہیں ملوں گی باجی؟"

"اور اگر کسی نے دیکھ لیا؟"

"دیکھ لے۔ کیا انسان کسی سے ملتا نہیں؟"

"ابو کو پتہ چل گیا تو؟"

"چلنا نہیں چاہیے۔ اور پھر اگر ایسا ہو بھی گیا باجی تو تم فکر مت کرو یہ میرا کھیل ہے مجھے کھیلنے دو۔" نُدرت نے کہا۔ عصمت اُسے جانتی تھی چنانچہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

شام ہو گئی۔ رات کو بادل چھا گئے تھے پھر پونے دس بجے کے قریب ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ غلام احمد اپنے کمرے میں جا کر سو گئے تھے۔ نُدرت ٹھیک دس بجے کوارٹر کے پیچھے پہنچ گئی... جمن یہاں موجود تھا۔

"ہیلو جمن۔"

"جج۔ جی۔ آپ آ گئیں اللہ رکھی؟"

"یقین نہیں تھا؟"

"نہیں۔" جمن نے کہا۔

"موسم کتنا خوشگوار ہے۔" نُدرت نے کہا۔

"ہاں آسمان سے بجلیاں برس رہی ہیں۔ اور وہ فضاؤں میں گنے کا رس۔ مم میرا مطلب ہے رس لڑھک رہا ہے۔" جمن نے ڈائیلاگ شروع کر دیئے۔

"گنے کا رس؟" نُدرت حیرت سے بولی۔

"نن نہیں۔ وہ ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔"

"کیا نکل گیا؟"

"گگ گنے کا رس۔" جمن گھگھیا کر بولا۔

"اوہ تو کیا تم گنے کا رس پی کر آئے ہو؟" نُدرت پریشان لہجے میں بولی۔

"نن نہیں تو...؟"

"پھر منہ سے کیسے نکل گیا؟"

"پپ پتہ نہیں۔"

"جمن! تم بہت گھبرائے ہوئے ہو۔"

"ہاں یہ میری زندگی میں پہلی بہار آئی ہے آپ جیسی خوبصورت اللہ رکھی میری زندگی کی..."

"گاہک بن گئی ہے۔" نُدرت نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں وہی وہی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ برف پر قلابازیاں کھاؤں اور کوئی گانا گاؤں۔ آپ دوڑتی ہوئی میرے پاس آؤ اور میں چھپ جاؤں۔ پھر آپ مجھے ڈھونڈو آپ کی آنکھوں میں آنسو ہوں اور وہ۔ ہائے کوئی مجھے جنگلی کہے ہو ہا۔" جمن لرزتی آواز میں بولا۔

"یہ کونسی فلم کا سین ہے؟"

"یہ میری ذاتی فلم کا سین ہے۔"

"گڈ ویری گڈ۔ جمن میں تمھیں آسمان کی بلندیوں پر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"آسمان کی بلندیوں پر۔"

"وہاں تو میں راکٹ میں بیٹھ کر ہی جا سکتا ہوں وہ جو خلا ورجاتے ہیں۔" جمن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھے خاصے ذہین انسان ہو۔ تمھاری معلومات شاندار ہیں۔ فکر نہ کرو میں نے تمھیں آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے کا معقول انتظام کر لیا ہے۔" نُدرت نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں ہر جگہ تمھارے ساتھ جاؤں گا اللہ رکھی۔" جمن جذباتی لہجے میں بولا۔

"خدا نہ کرے۔" نُدرت جلدی سے بولی۔ اور پھر کہنے لگی۔ "تم نے اپنے آپ کو سنوارنے کا کوئی انتظام کیا؟"

"کیسا انتظام؟"

"اعلیٰ سوسائٹی میں اُٹھنے بیٹھنے سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے تمھاری شکل و صورت بے حد شاندار ہے اعلیٰ قسم کے لباس پہنو تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم باورچی ہو گے۔"

"اعلیٰ قسم کے لباس؟"

"سوٹ کوٹ پینٹ!"

"اوہ۔" جمن کے حلق میں تھوک اٹک گیا۔ "وہ میں کہاں سے لاؤں گا؟"

"تم جیسے ذہین انسان کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی جمن۔ کہیں سے لمبا چوڑا ڈیپ فریزر لا سکتے ہو گھر سے سوٹ نہیں۔ ذرا سی ہمت کرو شہاب صاحب کے سوٹ تمھارے بدن پر بالکل فٹ ہوں گے دو چار سوٹ لے آؤ، کونسا مشکل کام ہے؟" نُدرت نے کہا۔

جمن سوچ میں ڈوب گیا۔ شاید وہ اُس پروگرام پر غور کر رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ "ٹھیک ہے اللہ رکھی، میں خود کو تمھارے قابل بناؤں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

"سوٹ حاصل کرو گے؟"

"بس تماشہ دیکھو۔" جمن نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"یہ ہوئی مردوں والی بات۔ تم سوٹ جمع کر لو اُس کے بعد میں تمھیں دوسرا پروگرام بتاؤں گی مگر سنو، سوٹ شاندار ہونے چاہئیں۔ بالکل نئے اور اُن کے ساتھ قمیص اور ٹائی بھی۔"

"فکر ہی نہ کرو، جمن ایسے کام چٹکی بجاتے کر لیتا ہے۔" جمن نے کہا۔

"بس اب جاؤ جمن، بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"ابھی سے...؟"

"ہاں جاؤ درختوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری محبت کا راز وقت سے پہلے کھل جائے۔ خدا حافظ۔"

"محبت۔" جمن نے وفورِ مسرت سے آنکھیں بند کر لیں۔ نُدرت پھرتی سے اُٹھ کر بے آواز دوڑ پڑی۔ جمن آنکھیں بند کئے بڑبڑا رہا تھا الفاظ نُدرت کی سمجھ میں نہیں آئے تھے کیونکہ وہ اُن کی آن میں دُور نکل آئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ ہنسی روکنا اب مشکل ہو گیا تھا۔ کمرے میں عصمت موجود نہ تھی۔ وہ عصمت کا انتظار کرنے لگی شاید باتھ روم میں ہو۔ عصمت چند لمحات کے بعد اُس کے پاس آ گئی۔ اُس کا چہرہ بھی سُرخ ہو رہا تھا۔

"خدا تجھے نیکی دے نُدرت۔ مار دیا تو نے بے چارے جمن کو۔" اُس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"ارے تم۔ تم باجی۔ کیا تم وہاں موجود تھیں؟" نُدرت نے کہا۔

"تو خود دیکھ لے میرے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔"

"یہ معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں باجی۔ خطرہ تو مول لینا ہی ہوتا ہے۔" نُدرت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اور پھر بے اختیار ہنس پڑی۔

"ہائے باجی اِن شہاب صاحب کے بارے میں کچھ سنا ہے تم نے؟"

"کیا؟ وہ احسان صاحب کے بھائی ہیں۔"

"فطرت میں قصائی ہیں۔ اِس کوٹھی کی واحد مغرور، بد دماغ شخصیت۔ نوکروں کی جان نکلتی ہے اُن سے نہ صرف نوکر بلکہ اِس

کوٹھی میں پلنے والے عزیز واقارب بھی اگر یہاں کسی سے خوفزدہ ہیں تو نہ صرف شہاب صاحب سے۔ کوئی اُن کے سامنے زور سے ہنستا بھی نہیں۔ اور میرا بہادر جمن اُن کے سوٹ چرائے گا۔ ہائے کیا بات ہے میرے جمن کی۔" ندرت نے ہنستے ہوئے کہا۔ عصمت کے پاس اب کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

◆

ردا بے حد پریشان تھی۔ گھر میں وہ ہنستی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ رات تک کسی کو اپنی اندرونی کیفیت کا احساس نہیں ہونے دیا تھا لیکن جب بستر پر پہنچی تو بہت سے بھیانک سوالات اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ تفسیر کا انداز اچھا نہیں تھا۔ لفظ دوستی کیا معنی رکھتا ہے؟ بے تکلفی کا یہ انداز کسی شریف انسان کا نہیں تھا۔ ملازمین کو دوست بنانا کیا معنی رکھتا ہے۔ ہر چند یہ اُس کی پہلی ملازمت تھی لیکن وہ دُنیا سے ناواقف نہیں تھی۔ بہت کچھ پڑھا تھا، بہت کچھ سیکھا تھا اُس نے دُنیا سے۔ بہت گہرائی سے سوچ رہی تھی وہ۔ شہاب صاحب کے بارے میں ثناء نے اچھے الفاظ نہیں کہے تھے۔ وہ خود کو محفوظ رکھنا جانتی تھی لیکن یہ دوسری چال تھی۔ شہاب صاحب نے اُس پر احسان لاد دیا تھا۔ اور وہ تفسیر۔۔ وہ اُن کا دوست تھا۔ اگر کوئی گہری چال چل کر انھوں نے اُسے پھنسانے کی کوشش کی تو؟ تفسیر نے جس طرح شہاب صاحب کے کہنے پر نوکری دے دی تھی اور اتنی شاندار پوسٹ دے دی تھی جو مشکل ہی سے ملتی ہے، اِس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شہاب صاحب کا گہرا دوست ہے اور اُن کا احترام کرتا ہے۔ اِس کے بعد اُس کی یہ جرأت نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ اور اُس نے جرأت کی تو اِس کا مطلب ہے کہ اُسے شہاب صاحب کی طرف سے چھوٹ ملی تھی۔

"اب کیا کروں؟ پہلے ہی تجربے میں ناکام ہوگئی تو ہمت ٹوٹ جائے گی اِس کے بعد تو ملازمت کرتے ہوئے خوف محسوس ہوگا۔ میرے سامنے ایک مقدرت۔ ایک طویل زندگی ہے۔ اِس طرح ڈر گئی تو، تو؟" ایک عزم اُس کے دل میں اُبھرا۔ لاہور سے چلی تھی تو اُن تمام باتوں کے بارے میں سوچا تھا۔ ہوٹل میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا، معمولی بات نہیں تھی۔ تیمور کو سنبھالنا، نوکری کرنا۔ یہ سب کچھ کرنا تھا مجھے تو، اور اب اتنی سی بات سے خوفزدہ ہوں۔ مجھے ہمت کرنی ہوگی۔ دیکھتی ہوں دونوں میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ باقاعدہ ملازمت ملی ہے، اپائنٹمنٹ لیٹر ہے میرے پاس۔ مقابلہ کروں گی جب تک زندہ ہوں مقابلہ کروں گی۔ ثناء سے اِس سلسلے میں ذکر کرنا مناسب نہیں ہوگا وہ نہ جانے کیا کر ڈالے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پُرسکون ہوگئی۔ اُس نے فیصلہ کرلیا تھا اور اُس سے مطمئن تھی۔

دوسرے دن وہ تیار ہوکر نکل آئی۔ رکشہ کی تلاش میں نگاہ دوڑا رہی تھی کہ عقب سے شہاب صاحب کی کار قریب آگئی۔

"اوہ مس ردا۔ آفس جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آئیے۔ مجھے بھی تفسیر کے پاس جانا ہے۔"

"جی۔" اُس نے کہا اور کار میں بیٹھ گئی۔ شہاب صاحب کو خود بھی تشویش تھی۔ بات گمبھیر تھی اور وہ جانتے تھے کہ ردا ثناء کی دوست تھی اور شہاب اگر کسی سے خوف زدہ تھے۔ تو وہ صرف ثناء تھی۔ بے حد خطرناک لڑکی تھی ایک منٹ میں عزت اُتار دیتی تھی۔ اُنھیں اچانک اِس خطرناک کھیل کا احساس ہوا تھا۔ ردا اتنی حسین لگی تھی انھیں اتنی پُرکشش تھی وہ کہ شہاب صاحب بے اختیار ہو گئے تھے لیکن اب انھیں احساس ہو رہا تھا کہ انھوں نے ثناء کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ردا کی شخصیت پر بھی غور نہیں کیا تھا۔ اور اب کھیل بگڑ گیا تھا۔ تفسیر جلد بازی کر بیٹھا تھا اور اُن کی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ صورتِ حال فوراً سنبھالنا ضروری تھا۔ اِسی لئے وہ ردا کے پیچھے نکلے تھے۔ اُنھیں خدشہ تھا کہ کہیں ردا اُن کے ساتھ بیٹھنے کی پیشکش مسترد نہ کردے۔ لیکن یہ ایک امتحان بھی تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ تفسیر کی گفتگو کا ردا پر کیا ردِ عمل ہوا ہے۔ ردا بے چون و چرا اُن کے ساتھ مرسڈیز میں بیٹھ گئی تھی۔ اُس سے اُنھیں ایک گونہ سکون ہوا تھا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد انھوں نے نرم اور شائستہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ اِس ملازمت سے مطمئن تو ہیں ردا؟"

ردا چند لمحات خاموش رہی پھر بولی۔ "شہاب صاحب! میرے غیر مطمئن ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ آپ سے میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ ملازمت کے لئے کہا تھا۔ اور اُس اعتماد کی بنیاد بہت کچھ تھی، جس گھر تک مجھے سہارا ملا ہے۔ وہ گھر میرے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کا اندازہ مجھ جیسی بے سہارا لڑکیاں ہی کر سکتی ہیں۔ کوئی اور نہیں۔ اِس گھر کے مکینوں کو مہربان اور انسان پایا تو اِس گھر کی گرویدہ ہوگئی۔ اور اِسی اعتماد سے میں نے آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔ آپ نے جو جگہ میرے لئے منتخب کی ہے وہ یقیناً اِس قابل ہوگی کہ میں وہاں ملازمت کر سکوں، شاید یہ میری خوش فہمی ہو لیکن اپنے طور پر تو میں یہی سمجھتی ہوں، کہ آپ نے مجھے دوسری حیثیت سے ثناء کا درجہ دیا ہوگا۔ ثناء آپ کے لئے جو مقام رکھتی ہے

شہاب صاحب اُس کا اندازہ اوّل تو مجھے ہے اور پھر ثناء کی کچھ باتوں سے مزید ہوگیا ہے، ظاہر ہے آپ اُس کی دوست یا اُس جیسی کے لئے کسی غلط جگہ کا انتخاب نہیں کر سکتے۔"

شہاب صاحب کو اپنے سر پر جوتے پڑتے محسوس ہو رہے تھے ردا اگر گہرائی میں بول رہی ہے تو یقیناً اُس سے زیادہ بھگو بھگو کر جوتے نہیں مارے جا سکتے تھے، وہ اُن پر طنز کر رہی تھی۔ اپنے آپ کو اُن کی نگاہ میں ثناء کا درجہ دے کر وہ اپنی دانست میں اپنی طرف بڑھنے کے تمام راستے روک رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے انھیں جھنجلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ انھوں نے ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر ردا کا چہرہ دیکھا۔ لیکن اُس چہرے پر انھیں سادگی نظر آئی۔ ردا سامنے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے خود کو سنبھالا۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"یقیناً ردا، آپ کو مطمئن دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی دلجمعی سے اپنا کام کرتی رہیئے، آپ کا کہنا بالکل درست ہے کہ میں نے آپ کو جس جگہ بھیجا ہے، اُسے محفوظ ترین تصور کیا ہے۔ تفسیر کے بارے میں آپ کو کچھ تفصیل بتا دوں۔ عجیب سا انسان ہے بچپن میں ماں کے سائے سے محروم ہوگیا تھا، باپ کی پوری توجہ اُس پر نہیں تھی، کھانا پینا عیش و عشرت، ملازم اور جو تعیشاتِ زندگی انسان کے لئے ہو سکتے ہیں، وہ سب اُسے مہیا تھے، لیکن محبتوں سے خالی تھا اور یہ اُس کی عادت ہے کہ ہر انسان میں قربت تلاش کرتا ہے، ہر انسان سے اپنائیت کا خواہاں ہوتا ہے اور اِس سلسلے میں بہت تیز رو ہے، دوڑنے لگتا ہے وہ۔ میں نے کتنی ہی بار اُسے سمجھایا کہ دوڑنا اچھی بات نہیں ہوتی لیکن اپنی عادت سے مجبور ہے، آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر کبھی اُس کی کوئی بات غلط انداز میں محسوس ہو تو براہِ کرم اُسے غلط نہ سمجھیں یہ اُس کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے شہاب صاحب۔ تفسیر صاحب سے میرا رابطہ رہا ہے۔ مجھے بھی دوستی کی پیشکش کر رہے تھے لیکن میں نے انھیں اپنے بارے میں بتا دیا کہ میں احترام کو اوّلیت دیتی ہوں، دوستی بہت سی خرابیاں پیدا کر سکتی ہے۔ بیچارے خاموش ہوگئے، پتہ نہیں انھوں نے میری بات کا بُرا مانا ہوگا۔ یا اُسے ایک عام سی بات سمجھ کر نظر انداز کردیا ہوگا۔"

"ارے نہیں نہیں وہ اِس ٹائپ کا آدمی نہیں ہے۔ بالکل بُرا نہیں مانا ہوگا اُس نے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" شہاب صاحب نے کسی قدر مطمئن ہو کر کہا۔ انھیں اب اطمینان ہوتا جا رہا تھا کہ ردا نے اُس بات کو گہری سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا، تھوڑی دیر کے بعد وہ تفسیر کے آفس میں پہنچ گئے۔ ردا اپنے کیبن کی طرف چلی گئی۔ اور شہاب صاحب تفسیر کے کیبن میں پہنچ گئے۔ تفسیر موجود تھا اُس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے شہاب صاحب نے اُسے دیکھا، اور ہنس پڑے۔ "تم انتہائی بیہودہ آدمی ہو، ابھی میں ردا کے ساتھ آیا ہوں۔"

"یار بس۔ فضول باتیں نہ کرو سارا موڈ چوپٹ کرکے رکھدیا ہے اِن والد صاحب قبلہ نے۔" تفسیر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں خیریت یہ والد صاحب درمیان میں کہاں سے آٹپکے؟"

"مجھے حکم ملا ہے کہ سویڈن چلا جاؤں کاروباری مسئلہ ہے۔ کاغذات تیار کرا دیئے گئے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً دو ڈھائی مہینے کا پروگرام ہے۔ والد صاحب قبلہ طویل عرصے سے اِس سودے کی پلاننگ کر رہے تھے، دو مہینے کے بعد وہ خود بھی میرے پاس پہنچ جائیں گے، اور پھر وہاں سے نیا پروگرام ترتیب دے دیا جائے گا، گویا لمبے نکل گئے یہاں سے۔"

"ارے اچانک ہی یہ سب کچھ ہوا؟" شہاب صاحب بولے۔

"ہاں۔ میرے لئے اچانک ہے، لیکن یہ جو باپ قسم کے لوگ ہوتے ہیں نا یہ اپنی اولادوں کے سلسلے میں خود ہی فیصلے کرلیا کرتے ہیں۔ اُن سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ میں نے حیل و حجت کی تو بس آؤٹ ہوگئے، بڑی بُری عادت ہے یار اُن کی، فوراً ہی مغلظات پر اُتر آتے ہیں، ساری دُنیا میں بس ایک ہی شخصیت ایسی ہے جسے میں کنٹرول نہیں کر پاتا، اب بتاؤ کیا کروں؟"

"تو مصیبت کیا نازل ہوئی ہے تجھ پر یار۔ سویڈن چلا جا ابھی تو والد صاحب تیرے ساتھ نہیں جا رہے، دو مہینے بہت ہوتے ہیں عیش کرنے کے لئے۔"

"جی نہیں۔ عیش کا کوئی چانس نہیں ہے جن بزرگوار کے پاس مجھے بھیجا جا رہا ہے، وہ ایک قدامت پسند آدمی ہیں اور والد صاحب بھی اُن کا احترام کرتے ہیں۔ سمجھ لو اِس قابلِ احترام ہستی کے ساتھ کیسی عیش کی گزرے گی، بس بور بیٹھا ہوا ہوں۔"

"احمق ہے بالکل۔ کیا وہ ہر وقت تمہارے ساتھ لگے رہیں گے، بہرحال اب جانا ہے۔ تو بہتر ہے چلے جاؤ خواہ مخواہ موڈ خراب کرنے سے کیا فائدہ؟"

"شہاب! تمھیں سیٹھ باگڑیا یاد ہے نا، اُن کا پروگرام جس انداز میں چل رہا ہے، اُسی طرح جاری رہنا چاہیئے ورنہ اگر یہ پارٹی ہاتھ سے نکل گئی تو ایک بڑی رقم سے محروم ہو جائیں گے۔"

شہاب صاحب نے تفسیر کو دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
"کیا یہ بات سیٹھ بگٹر یا جانتے ہیں، کہ میں تمہارے ساتھ نہ یک ہوں"
"کمال ہے پہلے ہی دن انھیں یہ بات بتادی گئی تھی یہ دوسری بات ہے کہ کبھی اِس سلسلے میں تمہاری ضرورت نہیں پیش آئی، تمام گودام تمہارے چیک کئے ہوئے ہیں، میرے بعد سیٹھ باگٹریا تم سے ہی رابطہ قائم کر ملتے گے اور تم انھیں ہینڈل کروگے میرا خیال ہے ابتدائی تین سپلائی نارمل رہنی چاہئیں اور اُس کے بعد پروگرام شروع کر دینا، سارا کام تمہارے علم میں ہے، ہمیں اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا، تقریباً اٹھائیس لاکھ کا نقصان ہو جائے گا۔"
"خیر تم اِس کی تو فکر ہی نہ کرو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"
شہاب صاحب نے جواب دیا، تفسیر آہستہ سے بولا۔
"اور اُن محترمہ کا کیا ہوگا؟"
"پاگل ہوگیا ہے یار تو بلکہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے خیال یہ تھا کہ رِدا آسان لڑکی ہے لیکن تو نے تو اندازہ لگا لیا ہوگا کہ خاصی مشکل ہے۔ اور پھر ذرا سی یہ بات ذہن سے نکل گئی تھی کہ اُسے ثناء کی دوستی حاصل ہے۔ اور ثناء انتہائی خطرناک لڑکی ہے۔"
"تو پھر بھائی اب کیا ہوگا؟"
"کچھ نہیں۔ اُسے ملازمت کرنے دو۔ اچھا ہے تمہاری غیر موجودگی میں مطمئن ہو جائے گی۔"
"بس بس۔ میں جانتا ہوں آپ کو شہاب صاحب، ٹھیک ہے بھائی ہمارا کیا ہے ہم تو دوست ہیں۔"
"فضول باتوں سے گریز کرو۔" شہاب صاحب نے آہستہ سے کہا۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو کر باہر آگئے، رِدا اپنے کیبن میں شہاب صاحب کی گفتگو پر غور کر رہی تھی۔ بہت سے نئے نکات تھے اُن تمام باتوں کے، ممکن ہے شہاب صاحب گزرے ہوئے دِن کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ملاقات کی کڑیاں تو کچھ اسی طرح ملتی ہیں۔
یُوں ہی وہ گھر سے نکلی شہاب صاحب بھی کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔ اُسے راستے سے لیا اور پھر یہ تمام باتیں سمجھائیں، لیکن ایک اور تصور بھی ذہن میں آجاتا تھا کہ ممکن ہے یہ صرف اتفاق ہی ہو۔ اور شہاب صاحب کی گفتگو کا تفسیر کی پیشکش سے کوئی تعلق نہ ہو کچھ بھی ہے محتاط رہنا ضروری ہے، اور یہ ملازمت؟ اِسے تو اُس وقت تک چھوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جب تک حالات ناگزیر نہ ہو جائیں۔ رِدا اُن دونوں حضرات سے بھرپور مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی۔ اور اِس طرح اُسے ذہنی سکون

مہیا ہو ا تھا، کم از کم اس سے اپنی آزمائش ہو جائے گی، یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اِس دُنیا سے لڑنے کی کہاں تک سکت رکھتی ہے، اور جو عزم اُس کے سینے میں پنہاں ہے اُس میں کہاں تک اُسے کامیابی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ دِل جمعی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

۱۵

ثناء نمبر دو میں داخل ہوگئی۔ تیمور گود میں تھا۔ ملاقات اماں بی سے ہوئی تھی۔ اماں بی اب اُسے پہچان گئی تھیں۔ ثناء نے سلام کیا تو اماں بی نے سینکڑوں دُعائیں دے ڈالیں۔
"نُدرت کہاں ہے اماں بی؟ عصمت باجی بھی نہیں نظر آ رہیں؟"
ثناء نے کہا۔
"غلام احمد اپنے ساتھ لے گئے ہیں دونوں کو۔ عصمت یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے گئی ہے۔ مالک نے کوشش کی ہے پڑھنا چاہتی ہے آج داخلہ ہو جائے گا۔ بیٹھو بیٹی۔"
"چائے پلوائیے اماں بی تب بیٹھوں گی۔" ثناء نے کہا۔
"ابھی لو، انیس! اے انیس، دیکھو کون آیا ہے چائے بناؤ ثناء کیلئے۔"
"ثناء آئی ہیں؟" اندر سے شوکت جہاں کی آواز سنائی دی۔ اور وہ باہر نکل آئیں۔ ثناء سے سلام دُعا کی۔
"اماں بی! آپ کو اس کوارٹر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"
"بہت خوش ہیں بیٹی کوئی تکلیف نہیں ہے یہاں۔ خدا سب کو خوش رکھے۔" اماں بی نے ممنون لہجے میں کہا۔ شوکت جہاں چائے اور بسکٹ لے کر آ گئیں۔ ثناء نے بسکٹ اُٹھا کر تیمور کو دیتے ہوئے کہا۔
"لو تیمور تمہاری بھی خدا نے سُن لی۔" اور پھر وہ چائے بنانے لگی۔ اُسی وقت باہر سے آواز سُنائی دی۔
"ہائے چائے!" ثناء اُچھل پڑی نُدرت۔ ہائے بے درماں کی طرح اندر داخل ہو گئی تھی۔ "اوہ ثناء بی۔" اُس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ اور پھر آگے بڑھ کر تیمور کو گود میں اُٹھا لیا۔ لنگڑے شہنشاہ بسکٹ ٹھونس رہے ہو ہمیں بھی کھلاؤ۔ اُس نے منہ کھول لیا اور تیمور نے مسکرا کر بسکٹ کا ٹکڑا اُس کے منہ میں رکھ دیا۔
"دیکھا اماں بی۔ نام کا اثر ہے دِل کا شہنشاہ ہے لنگڑا ہے تو کیا۔"
"ارے ارے بکے جا رہی ہے اللہ نہ کرے وہ لنگڑا کیوں ہوتا!"
اماں بی نے نُدرت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
"چائے کی پیالی پاؤں تو عرض کروں جہاں پناہ۔" نُدرت نے گردن خم کر کے کہا۔ اور اُس کے لئے بھی چائے آگئی "عصمت باجی یونیورسٹی

میں رُک گئی ہیں ابّو مجھے گھر چھوڑ گئے۔"
"کام ہو گیا عصمت کا؟" اماں بی نے پوچھا۔
"کام تمام ہی ہو گیا سمجھو، اور پھر احسان چچا جو کام کرائیں وہ کیسے نہ ہوگا۔"
"دیکھا اماں بی۔ یہ لڑکی میرا جی خوش کرتی ہے۔" ثناء بولی۔ چائے سے فارغ ہو کر ثناء اُٹھ گئی۔ اور پھر نُدرت کے ساتھ باہر نکل آئی۔ دونوں باغ کے ایک گوشے میں جا بیٹھیں۔
"یار نُدرت۔ آج کل کچھ بوریت نہیں ہو گئی؟"
"کسی حد تک۔"
"رِدا نے ہم سب کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ بلا وجہ اپنی جان کو عذاب مول لیا ہے۔ پتہ نہیں کیا کرے گی پیسے کما کر۔"
"نہیں ثناء۔ اُس کی پوزیشن واقعی خراب تھی تم سنجیدگی سے غور کرو تو تمہیں خود بھی احساس ہو جائے گا۔" نُدرت نے کہا۔
"تم اُس سے زیادہ بقراط ہو۔ کوئی تفریح ہی نہیں رہی، مارننگ کا کیس بھی پینڈنگ میں پڑا ہوا ہے۔ کوئی ترکیب ہی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"
"معافی مل سکتی ہے انھیں؟" نُدرت نے کہا۔
"ہرگز نہیں۔ انھوں نے میری رِدا کو رُسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں انھیں معاف نہیں کر سکتی۔"
"سزا کی قسم؟"
"بس تڑپ کر رہ جائیں۔ دوسروں کو رُسوا کرنے کا خمیازہ بھگتیں کوئی شاندار پروگرام بناؤ۔ تمہاری کھوپڑی آجکل ڈل کیوں ہے؟"
"جمن میں مصروف ہوں۔" نُدرت نے کہا۔ اور ثناء اُچھل پڑی۔
"یہ مصروفیت میرے علم میں کیوں نہیں ہے؟"
"آج لائی جانے والی تھی۔ میں نے مسٹر جمن کو اس ظالم سماج کے خلاف کھڑا کر لیا ہے کیا ضروری ہے کہ وہ ساری عمر ایک باورچی کی زندگی گزاریں اِس دُنیا میں اُن کا بھی ایک مقام ہے۔ میں انھیں اعلیٰ سوسائٹی کا ایک فرد دیکھنا چاہتی ہوں اور اِس کی ابتداء ہو گئی ہے۔"
"کیا کیا؟" ثناء نے دلچسپی سے پوچھا۔
"ہم دونوں کی غربت اِس کی اجازت نہیں دیتی کہ جمن اپنے لئے عمدہ سوٹ بنائے چنانچہ ابتداء میں انکل شہاب کے سوٹ اُڑائے جائیں گے۔ جمن اِن کاموں میں ماہر ہے۔"
"انکل کے سوٹ۔ ہائے نُدرت وہ جلاد ہیں۔ پتہ چل گیا تو قتل ہی کر دیں گے اُسے۔" ثناء نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔
"یہ قتل نہیں ہوگا۔ شہادت ہوگی میرے جمن کی۔ وہ سماج کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے شہید ہوگا۔ وہ اِس دُنیا سے اپنا حق مانگتے ہوئے شہید ہوگا، اور میں ایک شہید کی بیوہ کہلانے میں فخر محسوس کروں گی۔" نُدرت نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ اور ثناء قہقہے لگانے لگی۔
اُسی وقت کوٹھی کے صدر دروازے سے جمن برآمد ہوا تھا۔

تفسیر کی خوش قسمتی تھی یا رِدا کی یا پھر شہاب صاحب کی کہ تفسیر کو سوئیڈن جانا پڑ گیا۔ اِسے تفسیر کی خوش قسمتی اِس لئے کہا جا سکتا تھا کہ وہ جلد بازی کا عادی تھا اور اُس نے جس رفتار سے قدم بڑھائے تھے اُسی رفتار سے اُس کی شامت آسکتی تھی۔ رِدا معصوم ضرور تھی اِس دُنیا سے گھبراتی تھی لیکن جو عزم اُس کی ذات میں پایا جاتا وہ ناقابلِ تسخیر تھا۔ رِدا نوکری نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اور اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تفسیر نے کوئی غلط قدم اُٹھایا تو اُسے مزا چکھا دے گی۔ رِدا کی خوش بختی یہ تھی کہ اُسے یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑا تھا۔ اور شہاب صاحب کی خوش بختی یہ تھی کہ جو کچھ بھی ہوتا وہ اُس کی لپیٹ میں آنے سے نہیں بچ سکتے تھے۔
بہرطور تفسیر سوئیڈن روانہ ہو گیا۔ رِدا کو جو حیثیت حاصل ہو گئی تھی وہ اُس کے لئے اطمینان بخش تھی لیکن اِس حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے اُسے تفسیر کی غیر موجودگی میں بہت کام کرنا پڑا تھا ایک طرح سے وہ تفسیر کی سیکریٹری تھی اور اُسے تمام کاروباری امور نبھانے ہوتے تھے۔ وہ شدید محنت سے اُن تمام معاملات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دفتر کے تمام لوگوں کا تعاون اُسے حاصل تھا۔ چنانچہ کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی ایسے متعلقہ اور غیر متعلقہ تمام ہی کاغذات اُس کی نگاہ سے گزر چکے تھے اور اُس نے اُن پر پوری توجہ دی تھی۔ تفسیر کے والد توقیر صاحب ہیر پھیر کے آدمی تھے لیکن باپ بیٹے کے درمیان آڑ تھی۔ توقیر صاحب جو کچھ کرتے تھے الگ ہٹ کر کرتے تھے اور ابھی تک انھیں تفسیر کی کارکردگی کے بارے میں نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ یہ فرم انھوں نے صاف ستھرے کاموں کے لئے بنائی تھی تاکہ اُن کی پوزیشن سنبھلی رہے لیکن تفسیر نے یہیں کھیل شروع کر رکھا تھا جس کا توقیر صاحب کو بھی علم نہیں تھا۔ فرم میں کئی شیئرز ہولڈر تھے اور اسٹاف اُن کے بارے میں جانتا تھا اُس اسٹاف میں صرف دو افراد ایسے تھے جو تفسیر کے لئے کام کرتے تھے اِن میں سے ایک داؤد تھا دوسرا عظمت یہ دونوں تفسیر کے ذاتی کام سنبھالتے تھے اور اُنہی کاموں میں شہاب صاحب کی شرکت بھی تھی۔
تفسیر کی عدم موجودگی میں توقیر صاحب کو کوئی ضرورت پیش آگئی اور وہ ایک دِن آفس میں آگئے۔ مینیجر اور متعلقہ لوگ اُن

کے گردچی ہوگئے تھے۔ جن کاغذات کی توقیر صاحب کو تلاش تھی وہ کسی کے ذریعے فراہم نہ ہو سکے اور توقیر صاحب نے دفتر ہلا ڈالا۔ انھیں کاغذات کی فوری ضرورت تھی۔ دوپہر تک سب لوگ ہلکان رہے پھر طے کیا گیا کہ تفسیر سے سوئیڈن میں فوری رابطہ قائم کیا جائے۔ لیکن اس سے قبل ہی منیجر کو رِدا کا خیال آگیا اور اُس نے آخری کوشش کے طور پر رِدا کو طلب کرلیا۔

"یہ کون ہے ؟" توقیر صاحب نے رِدا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ تفسیر صاحب کے معاون کے طور پر کام کرتی ہیں"۔

متعلقہ کاغذات کے بارے میں رِدا سے پوچھا گیا تو اُس نے فوراً جواب دیا۔

"آپ کو وہ کاغذات رابسن جونیئرز کے فائل میں مل سکتے ہیں کیونکہ بعد میں اُس فرم کے معاملات رابسن جونیئرز نے سنبھال لئے تھے"۔ رابسن جونیئرز کا فائل بھی فائلوں کے انبار میں موجود تھا لیکن اُسے سرسری دیکھا گیا تھا کیونکہ وہ غیر متعلق تھا۔

کاغذات اُس فائل میں دستیاب ہوگئے۔ توقیر صاحب نے انھیں دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ اور پھر اُنھوں نے فائلوں کے بقیہ انبار اپنے سامنے سے ہٹوا دیئے۔ سب لوگ جانے لگے تو انھوں نے رِدا کو ہاتھ اُٹھا کر روک لیا۔

"تم رُکو، بیٹھ جاؤ"۔ اور رِدا اُن کے سامنے بیٹھ گئی۔ توقیر صاحب دیر تک فون پر مختلف لوگوں سے باتیں کرتے رہے پھر فارغ ہو کر اُنھوں نے فون رکھ دیا۔

"کیا نام ہے تمھارا ؟" توقیر صاحب نے پوچھا۔

"رِدا"۔

"کب سے کام کر رہی ہو ؟" اُنھوں نے پوچھا اور رِدا نے بتا دیا۔

"تمھیں اِس سلسلے میں پہلے ہی میری مدد کرنی چاہیئے تھی۔ جانتی ہو اگر چند گھنٹوں تک یہ کاغذات مجھے نہ ملتے تو میرا کتنا بڑا نقصان ہوتا"۔

"مجھ سے اِس سلسلے میں رجوع نہیں کیا گیا تھا سر۔ نہ ہی مجھے معلوم ہو سکا کہ آپ کچھ کاغذات تلاش کر رہے ہیں"۔ رِدا پُروقار انداز میں بولی۔

توقیر صاحب نے فون کر کے متعلقہ لوگوں سے رِدا کا فائل طلب کرلیا۔ رِدا اُس دوران خاموش بیٹھی توقیر صاحب کو دیکھتی رہی تھی وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ توقیر صاحب اُس سے ناراض ہیں یا خوش۔ فائل توقیر صاحب کے سامنے پہنچا تو اُنھوں نے اُس کی ورق گردانی کی اور پھر آہستہ سے بولے۔

"بیٹے! تم نے اِس وقت مجھے بہت بڑا فائدہ پہنچایا ہے، تمھارے فائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمھاری یہ تمام تر ذمّہ داریاں بھی نہیں ہو سکتیں پھر تمھیں کیسے علم ہُوا کہ یہ کاغذات اُس فائل میں مل سکتے ہیں ؟"

"سر میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنی ذمّہ داریوں سے واقف رہوں اب یہ ضروری تو نہیں ہے کہ جو کام میرا نہ ہو میں اُس کی طرف سے بالکل ہی آنکھیں بند کر لوں"۔

"بات یہ ہے رِدا بیٹی کہ میں تمھاری اِس بروقت مدد سے بہت خوش ہُوا ہوں اور ذمّہ دار لوگوں کو میں دل سے پسند کرتا ہوں تم جو کوئی بھی ہو، جو بھی حیثیت ہے تمھاری۔ میں تمھیں اپنے طور پر بھی کچھ ذمّہ داریاں سونپنا چاہتا ہوں کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم میرے ساتھ کام کرو"۔

"میں جانتی ہوں سر آپ میرے باس کے والد ہیں پھر میں تو ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو اِس فرم کے تحت مجھے سونپا جائے جیسا آپ پسند کریں"۔ رِدا نے جواب دیا۔ توقیر صاحب تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔

"خیر، اِس سلسلے میں بھی فیصلہ کرلیا جائے گا فی الحال میں تمھیں کچھ خصوصی انکریمنٹ دینا چاہتا ہوں۔ میری طرف سے تمھاری تنخواہ میں ایک ہزار روپے کا اضافہ اور اگر میں نے تمھیں اپنے ساتھ شامل کرلیا تو پھر نئے سرے سے اِس موضوع پر گفتگو ہوگی"۔

"میں شکر گزار ہوں جناب"۔ رِدا نے حسبِ عادت پُروقار انداز میں کہا۔ توقیر صاحب تھوڑی دیر کے بعد چلے گئے اُنھوں نے منیجر اور متعلقہ افراد کو رِدا کے بارے میں ہدایات دے دی تھیں۔ فطری طور پر رِدا بھی اِس ہمّت افزائی سے خوش تھی اور اِس کے ساتھ ساتھ ہی اُس کے ذہن میں ایک اور خیال بھی اُبھرا تھا۔ تفسیر کی شخصیت اور شہاب صاحب کا اُس سے گٹھ جوڑ رِدا کیلئے تشویش کا باعث تھا۔ اور بار بار اُس نے اِس انداز میں سوچا کہ اگر وہ اُن لوگوں کے معیار پر پُوری نہ اُتری تو کیا اُس کی یہ ملازمت برقرار رہ سکتی ہے ؟ اِس احساس سے وہ شدید ذہنی کرب کا شکار ہو جاتی تھی کہ جس ذمّہ داری اور حوصلے کے ساتھ اُس نے یہ ملازمت اختیار کی تھی۔ اگر وہ برقرار نہ رہ سکا تو ثناء کی لعن طعن کا شکار ہوگی اور نُدرت وغیرہ کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے گی۔ ہر چند کہ وہ بہت اچھی فطرت کی مالک تھیں۔ اُس کی دوست تھیں لیکن اِس کے باوجود رِدا اُن کے درمیان بھی اپنا ایک مقام رکھنا چاہتی تھی اور اُن کے مذاق کا نشانہ بننے سے ڈرتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اگر توقیر صاحب کا ہاتھ اُس کے سر پر پہنچ گیا ہے تو پھر تفسیر بھی بے بس ہو جائے گا اور وہ دلجمعی سے اپنا کام کرتی رہے گی۔ اِس احساس نے

اُسے بہت مسرور کر دیا تھا۔ اور چھٹی ہونے کے بعد جب وہ گھر پہنچی تو سرشاری کا یہ عالم اُس کے چہرے پر طاری تھا۔ ثناء ہی سے ملاقات ہوئی تھی وہ تیمور کو گود میں لئے ہوئے ہمیشہ ہی اُس وقت اُس کا انتظار کرتی تھی۔ لیکن چند لمحات تک اُس کے چہرے پر کبیدگی ضرور طاری رہتی تھی۔ رِدا کو خوش دیکھ کر اُس نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

"خُوب۔ خُوب، یہ اظہار ہوتا ہے، ہم پہ تیمور کہ محترمہ اپنی نوکری سے بہت خوش ہیں چلو ٹھیک ہے ہمارا کیا جاتا ہے زندگی کا ساتھ تو ہم دونوں کو نبھانا ہے یہ رِدا کب تک ہمارے درمیان رہے گی"۔

"اے ثناء! آج میں کوئی فضول بات نہیں سُنوں گی پتہ ہے آج مجھے خصوصی انکریمنٹ ملا ہے"۔

"بس جانے دو رِدا اِن باتوں کو، اگر میں تم سے پوچھوں گی کہ وہ کتنا ہے تو ہزار دو ہزار کا حوالہ دے دو گی اور اگر میں اُس سے حقارت کا اظہار کروں گی تو پھر مُنہ بنا لوگی یہ سوچ کر کہ میرا اور تمھارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ ایک ایک دگ سمجھتی ہوں تمھاری میں۔ چلو تیمور اپنی ان عجیب و غریب ممی سے کہو کہ مُنہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جائیں، چائے لگائی جا رہی ہے"۔

"ابھی آئی"۔ رِدا نے جواب دیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہاں سے نکلی تو لان پر کرسیاں پڑی ہوئی تھیں نُدرت بھلا وہاں کیوں نہ موجود ہوتی۔ رِدا مُسکراتی ہوئی اُن کے قریب پہنچ گئی۔ ثناء نُدرت کو یہ صُورتِ حال بتا چکی تھی چنانچہ نُدرت نے رِدا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج مونالیزا اپنی اصلی شکل میں مُسکرا رہی ہے"۔

"اور تم لوگ مجھے ہمیشہ کی طرح اُداس بلیاں لگ رہی ہو۔ میں پوچھتی ہوں یہ اُداسیاں تم لوگوں نے کیوں خود پر طاری کر رکھی ہیں ؟"

"ہم دونوں بے روزگار جو ہیں"۔ ثناء نے مُنہ بنا کر کہا اور رِدا ہنسنے لگی۔ نُدرت بولی۔

"مونالیزا! ثناء کا کہنا ہے کہ تمھارے اِس طرح دِن بھر غائب رہنے سے ہمارے سارے پروگرام چوپٹ ہو جاتے ہیں تمھارے آنے کے بعد ہم لوگ کوئی ہنگامہ خیزی اِس لئے نہیں کر سکتے... کہ تمھاری تھکن کا احساس ہوتا ہے"۔

"جنابِ عالی! میں پتھر کوٹنے نہیں جاتی۔ نہ ہی مزدوری کرتی ہوں۔ ایک شاندار دفتر میں بیٹھ کر صرف دفتری کام کرتی ہوں جو قطعی تھکا دینے والے نہیں ہوتے چنانچہ آپ لوگ اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیں اور جو صُورتِ حال ہو اُس سے مجھے آگاہ کریں بلکہ آپ لوگوں کو تو یہ چاہیئے کہ مجھے دِن بھر کی رپورٹ دیں"۔

"جی ہاں۔ جیسے آپ چیف لگی ہوئی ہیں ہماری۔ ارے کام کی نہ کاج کی۔ مَن بھر اناج کی۔ صبح سے جاتی ہے شام کو آتی ہے۔ اور اِس کے بعد انھیں دِن بھر کی رپورٹ پیش کی جائے"۔ ثناء نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔

"رپورٹ تو پیش کرنا ہی ہوگی۔ ثناء صاحبہ نتیجہ کچھ بھی ہو..." رِدا ہنستی ہوئی بولی۔

"رپورٹ کچھ خاص نہیں ہے۔ ثناء کا خیال ہے کہ اِن دنوں کوٹھی میں اُلّو بول رہے ہیں"۔

"نہیں نہیں ثناء۔ نُدرت تو بہت اچھی لڑکی ہے ذہین بھی ہے"۔ رِدا نے شرارت آمیز نگاہوں سے نُدرت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھیئے مس رِدا! یہ نُدرت جس کا نام ہے تابڑی کمینی شخصیت ہے آپ اُسے اُلّو کہہ کر اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی ہیں"۔

"نہیں بھئی کیسے بچا سکتی ہوں آپ کی ٹولی میں جو شامل ہوں"۔

"یہ نُدرت اب ٹھس ہوتی جا رہی ہے ابھی تک عارفہ بیگم کے لئے اُس نے کوئی پروگرام نہیں بنایا اپنے ہی چکروں میں پڑی ہوئی ہے"۔

"ہائے ثناء! تو کیا جانے ؟" نُدرت نے جھومتے ہوئے لہک کے کہا۔

"کیا نہیں جانتی ؟" ثناء اُسے گھورنے لگی۔

"تو نہیں جانتی کہ لذّتِ عشق کیا ہے۔ چمن شہید شہادت کی پوری پوری تیاریاں کر چکے ہیں اور اب وہ بہت جلد ہمیں ایک نئی شخصیت میں نظر آئیں گے۔ یہ قصہ بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے"۔

"اور عارفہ بیگم یُونہی دندناتی پھریں گی۔ میں کہتی ہوں اگر تم لوگ اُن کے بارے میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو کسی دِن میں خود ہی مورچہ سنبھال لوں گی"۔ ثناء بولی۔

"یعنی ؟"

"ابھی تک اِن کے لئے میں کچھ بھی نہیں کر سکی اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے تم لوگوں پر انحصار کیا ہے بس اب ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت میں خود ہی پھٹ پڑوں اور اپنے دِل کو سکون بخشوں"۔

"یہ مالک کی بیٹی کچھ کھسکی ہوئی ہے رِدا۔ ایک طرف یہ تم سے بے زاری کا اظہار کرتی ہے دوسری طرف یہ تمھاری توہین کا انتقام لینے کے لئے پاگل ہوئی جا رہی ہے کیا خیال ہے تمھارا ؟"

"بھئی اگر میں ثناء سے کوئی سفارش کرسکتی تو وہ عارفہ بیگم ہی کی ہوسکتی ہے۔"

"جی نہیں۔ اِس گھر میں سفارشیں نہیں مانی جاتیں۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیئے" ثناء نے تیکھے انداز میں کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے جو تمھارا دِل چاہے کرو۔ اور یہ اپنے جمن میاں نئی شخصیت میں کب ہمارے سامنے جلوہ گر ہورہے ہیں؟"

"بہت جلد۔ بہت جلد یہ شاہکار آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے گا۔ خواتین وحضرات بلکہ صرف خواتین" ندرت نے جواب دیا عصمت اُس طرف آتی ہوئی نظر آئی تو ندرت جلدی سے بولی۔

"یہ عصمت باجی آج کل نیکیوں کے راستے پر سفر کررہی ہیں اُن کے سامنے جمن کا ذِکر نہ کیا جائے۔"

عصمت مُسکراتی ہوئی قریب پہنچ گئی تھی "ہیلو۔ مجھے آپ لوگوں سے شدید شکایات ہیں۔"

"کیوں عصمت باجی؟" رَدا نے پوچھا۔

"بھئی ٹھیک ہے ہم شکل صورت کے ذرا میٹھے ہیں۔ لیکن اب ایسے بھی نہیں کہ تم لوگوں کے درمیان بیٹھ کر تبرکے بجو معلوم ہوں۔ چنانچہ اگر اپنی اِس چائے میں کبھی کبھی ہمیں بھی شریک کرلیا کرو تو کیا حرج ہے؟"

"او ہو عصمت باجی، آپ ذلیل کررہی ہیں مجھے بس ہم آپ کا احترام کرتے ہیں اور ہماری زبانیں رُکتیں نہیں اِسلئے آپ کو زحمت دیتے ہوئے ذرا جھجک ہوتی ہے۔" ثناء بولی۔

"جی ہاں۔ ایک آپ ہیں کہ ہمارا احترام ہماری عزت کرتی ہیں اور یہ ایک ہماری سسٹر ہیں کہ ہمیں کسی خاطر میں نہیں لاتیں" عصمت نے کہا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"چلئے ہم بھی پئیں گے" تھوڑی دیر کے بعد ملازموں نے چائے لگادی۔ اِس دوران میں خاموشی ہی رہی تھی۔ عصمت نے اُنھیں گھورتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ایک کپ چائے پی لینے دو پھر چلی جاتی ہوں۔"

"کیوں عصمت باجی۔ کیوں؟"

"اِس لئے کہ تم سب کو چُپ لگ گئی ہے۔"

"ارے نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ تفریحی مشغلے زیرِ بحث تھے۔ ہاں عصمت باجی آپ کی یونیورسٹی کیسی چل رہی ہے؟"

"اپنی جگہ قائم ہے ایک انچ بھی نہیں کھسکی" عصمت نے جواب دیا۔ ثناء ہنسنے لگی پھر بولی۔

"یہ رَدا صاحبہ آج ترقی کی خبر لے کر آئی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اُن سے مٹھائی وغیرہ کھا سکتی ہیں ہمارے اُن کے درمیان تو ایسا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔"

"اچھا واقعی۔ بھئی رَدا، بہت خوش نصیب ہو تم اِتنے مُختصر سے وقت میں ترقی حاصل کرلی میری طرف سے دلی مُبارکباد قبول کرو۔"

دیر تک اُن کے درمیان گفتگو ہوتی رہی اور اِس کے بعد عصمت اُن سے معذرت کرکے اُٹھ گئی۔

"بات واقعی کچھ ذرا عجیب سی لگ رہی ہے ندرت کیوں نہ عصمت باجی کو بھی اپنے معمولات میں شریک کرلیا جائے۔"

"ہائے اللہ اور اُوئی اللہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرینگی۔ سمجھیں۔ بلکہ اُن سے خطرات ہی پیش آسکتے ہیں۔ ویسے جمن کے مسئلے میں میں نے اُنھیں شریک کرلیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بس یہ واقعات سے خود بخود واقف ہوگئی ہیں۔" ندرت نے تھپڑ والا واقعہ اور پھر رات کو جمن سے ملاقات کی تفصیل بتائی اور ندرت اور رَدا بُری طرح ہنسنے لگیں۔

"تب پھر ٹھیک ہے عصمت باجی سے یہ بات طے کرلی جائے کہ اگر اُنھوں نے ہم سے غداری کی تو پھر ہم اُن سے بولنا چھوڑ دینگے لیکن اُنھیں اپنے درمیان شریک کرلیا جائے اچھا ہے تین سے چار بھلے ہوتے ہیں۔"

"اچھا اب چلو۔ خاصی رات ہوگئی ہے جاؤ اللہ رکھی تم اپنے گھونسلے میں جاؤ۔ ہم لوگ اپنے گھونسلوں کی جانب پرواز کررہے ہیں" ثناء، لولی اور تیمور کو لے کر پرواز کرنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگی۔ رَدا اُس کے پیچھے پیچھے ہی کوٹھی میں داخل ہوگئی تھی۔

عصمت یونیورسٹی چلی گئی تھی۔ اِن دِنوں گھر کے تمام کام ندرت نے خوش اسلوبی سے سنبھال لئے تھے۔ وہ عصمت کو اپنی زندگی بنانے کا پورا پورا موقع دینا چاہتی تھی اور اُس کی خواہش تھی کہ عصمت کو ذرا بھی احساس نہ ہوسکے کہ اُس کی وجہ سے گھر کے معاملات میں کچھ تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے معمولات تبدیل کر لئے تھے۔ یوں بھی آزاد فطرت تھی اور کوئی خاص کام نہیں تھا جو کام ہاتھ آیا اُسے دھڑ ادھڑ کرکے رکھ دیا۔ چنانچہ اُس وقت وہ اپنے کمرے میں آرام کررہی تھی کہ جمن کی ماں کی آوازیں سنائی دیں پھر وہ دیوار پر آگئی۔

"اے میں کہتی ہوں تم لوگوں کے کان بند ہوگئے ہیں کیا؟ اِتنی دیر سے شور مچارہی ہوں کوئی سُنتا ہی نہیں۔"

شوکت جہاں جو کمرے میں بیٹھی کچھ سلائی کررہی تھیں۔ ہانپتی کانپتی باہر نکل آئیں۔ جمن کی ماں شاید پلنگ پر کھڑی دیوار سے جھانک رہی تھیں۔

"کیا ہُوا جمن کی ماں؟" شوکت جہاں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"میں کہتی ہوں کبھی کسی ڈھنگ کے گھر میں رہنا نصیب ہُوا ہے یا نہیں۔ سلیقہ سیکھا ہے تم لوگوں میں سے کسی نے، گھر کا گھر ہی بگڑا ہُوا ہے۔ پاگل خانہ بنادیا ہے اِن کوارٹروں کو، اے میں کہتی ہوں تین نمبر والیوں! ہوش میں آجاؤ۔ ورنہ میں بہت بُری عورت ہوں . . ."

ندرت چونک کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ شوکت جہاں بےچاری نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مگر ہُوا کیا جمن کی ماں؟ آپ کے چیخنے کی آوازیں ضرور آرہی تھیں، مگر ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کو ہم سے کوئی شکایت ہوگئی ہے۔"

"معصومیت تو تم لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، میں کہتی ہوں یہ پیاز کے چھلکے میرے دروازے پر کیوں پھینکے گئے: جان بُوجھ کر تم لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہو جس سے مجھے پریشانی ہو، اے خُدا کی مار تم پر، جس دِن سے آئی ہو کوارٹر میں گندگی ہی گندگی نظر آنے لگی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ آخر کس قسم کے ہو۔"

"پیاز کے چھلکے . . . وہ تو میں نے باہر پھینکے تھے ہَوا سے اُڑ کر آپ کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں گے۔"

"تو بی بی ہَوا کو منع کردو کہ اُدھر سے اِدھر نہ چلا کرے۔ میرا ہی دروازہ رہ گیا ہے، تمھیں معلوم تھا کہ ہَوا سے یہ چھلکے اُڑ کر میرے دروازے پر آجائیں گے۔ دِن میں چند مرتبہ جھاڑو دیتی ہوں میں دروازے کے سامنے، صرف تمھاری وجہ سے۔ اِس سے پہلے بھی تو تین نمبر تھا، خالی پڑا رہتا تھا۔ مگر صفائی ہی صفائی ہوتی تھی۔"

"ہم آئندہ خیال رکھیں گے، اب آپ کو اور کوئی تکلیف نہیں ہونے پائے گی۔" شوکت جہاں نے کہا۔ لیکن ندرت اُسی وقت باہر نکل آئی۔ اُس نے آنکھیں ٹیڑھی کی ہوئی تھیں۔

دوسرے لمحے وہ دیوار کی طرف اُچھلی اور جمن کی ماں شاید چارپائی پر سے لُڑھک پڑیں۔ دھم کی آواز آئی اور اُس کے بعد اُن کے چیخنے اور چلانے کی آواز۔

"اے خُدا ستیاناس کرے تمھارا۔ کیا پاگل خانہ بسادیا ہے بڑے صاحب نے بھی، اُن سے بات کروں گی، بات کروں گی اُن سے کہ اِس گھر میں پاگل رہتے ہیں، ہم سب کی جان کو خطرہ ہے، اے لو خُدا ماری نے کمر ہی توڑ کر رکھ دی میری ستیاناس جائے اُس کا۔"

شوکت جہاں نے ندرت کی طرف دیکھا اور غصیلے انداز میں بولیں۔

"ندرت! یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"تو میں نے کیا کیا ہے امّی۔ بس ایسے ہی باہر آئی تھی، ذرا سی اُچھلی تو وہ نیچے جا پڑیں، اِس میں میرا کیا قصور ہے، میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اُنھیں" ندرت نے معصومیت سے کہا۔

"تم نے ڈرایا ہے اُنھیں ندرت۔ ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"وہ جو باتیں کررہی تھیں، وہ اچھی تھیں؟"

"پھر بھی ہمیں ہر ایک کے مُنہ نہیں لگنا چاہیئے اب تم خود سوچو اگر احسان صاحب کے کانوں تک بات پہنچی تو کیا ہوگا ساری عزت خاک میں مِل جائے گی۔"

"تو پھر پیاز کے چھلکے چُن لایئے۔ تمام کوارٹروں کے بیچ سے۔ خواہ مخواہ اِتنی خوفزدہ ہوتی ہیں۔ کچھ نہیں کہیں گے احسان صاحب اور اب اگر آپ اُس جمن کی ماں کو میرے ہاتھوں سے بچانا چاہتی ہیں تو اُس سے کہہ دیجئے کہ اِس کے بعد کوئی بدتمیزی نہ کرے ورنہ نقصان اُٹھا جائے گی۔" ندرت نے آہستہ سے کہا۔ جمن کی ماں تو پہلے ہی حملے میں فرار ہوگئی تھیں۔ اُنھیں ندرت کے پاگل پن سے بہت خوف آتا تھا بلکہ اب تو وہ دروازہ بھی بند کرلیتی تھیں۔ پاگلوں کا کیا ٹھکانہ، کس وقت گھر میں گھس آئیں۔

جمن سے ابھی تک اُنھوں نے اِس سلسلے میں کوئی خاص تذکرہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس شام جب جمن واپس آیا تو اُنھوں نے جمن سے کہا۔

"اے جمن بیٹا! صاحب سے بات کرو، یہ نمبر تین میں جو مصیبت آئی ہے اِس نے تو ہمارا ناک میں دم کررکھا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے امّاں، کیسی باتیں کررہی ہے وہ شریف لوگ تو کسی کا بھی کوئی نقصان نہیں کرتے۔"

"اے شریف کے بچے! تو بھی تو شریف ہے، اے میں کہتی ہوں یہ پاگل لڑکی کسی دِن میرے بال نوچ کر مجھے گنجا کردے گی۔ امّاں باوا نے پال رکھا ہے مسٹنڈی کو، یہ نہیں کہ پاگل خانے میں داخل کرادیں۔ گھر میں گندگی کرتے ہیں، دروازے کے سامنے گندگی کرتے

ہیں اور اُس کے اُوپر۔"

"امّاں! ہوش کی باتیں کرو۔ وہ سب لوگ شریف ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ پیاز کے چھلکے اُڑ کر آ گئے ہوں گے، تمھارے دروازے کے سامنے، بلاوجہ سب سے لڑتی رہتی ہو۔ سوچ لو اگر آئندہ ایسی باتیں کیں تو میں نوکری چھوڑ دوں گا اور پھر در بدر بھٹکتی پھرو گی۔" جمّن نے غصیلے لہجے میں کہا۔ عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، بھلا اب اللہ رکھی کے بارے میں کوئی بات جمّن سُن سکتا تھا۔ اُس کی ماں حیرت سے اُس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

"لے بیٹا تو، تو اُلٹا مجھ پر ہی برس پڑا۔ قصور اُن کا اور کہہ رہا ہے مجھے۔ ارے تیری غیرت بالکل ہی مٹ گئی ہے کیا۔ اُنھوں نے تیرا رشتہ ٹھکرا دیا۔ ہمارے ساتھ اِتنا بُرا سلوک کیا اور تو... ارے تو اُنہی کی حمایت لے رہا ہے۔"

"تم نے بات ہی غلط طریقے سے کی ہوگی امّاں۔ غلام احمد صاحب تو بڑے ہی شریف آدمی ہیں۔ تھوڑا سا صبر کرو۔ کسی اچھے وقت میں پھر بات کرتا اُن سے۔"

"خُدا تجھے نیکی دے، اب بھی بات کرنے کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے جمّن، ہائے تو میری اکلوتی اولاد ہو کر میرے ہی خلاف باتیں کر رہا ہے، ارے اُس پاگل کو لاؤں گی میں گھر میں۔ جو آتے ہی میرا جھونڈا مونڈ دے گی۔ جمّن کیا ہو گیا ہے تجھے، کسی پاگل لڑکی سے شادی کرنے کے بجائے اچھا یہ ہے کہ تو کسی کنوئیں میں ڈوب مرجا کر۔"

"ارے چھوڑ امّاں۔ بلاوجہ کی باتیں کرتی ہو تم خاموش ہو جاؤ، بس میں نے ایک بات کہہ دی ہے تم سے، اب تین نمبر والوں سے لڑائی نہ ہو، جس دِن ایسا ہُوا۔ میں یہ گھر چھوڑ دوں گا اللہ کی قسم۔"

جمّن کی ماں خاموش ہو گئیں۔ اکلوتے بیٹے پر ہی زندگی کا انحصار تھا۔ لیکن بیٹے کی یہ حمایت اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے لئے جو پاگل تھی اور جس کے ماں باپ نے جمّن کے رشتے کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ ظاہر ہے اللہ رکھی نہ سہی اُس کی بڑی بہن کا رشتہ قبول کیا جا سکتا تھا۔ لیکن... لیکن... جمّن کی ماں کو خاموشی کے سوا کچھ نہ بن پڑا لیکن ندرت کو پیاز کے چھلکے مِل گئے تھے۔ اُن چھلکوں سے وہ جمّن کی ماں کا ناک میں دم کر سکتی تھی۔ ابھی تو پہلے ہی جمّن کا کیس اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس کے بعد پیاز کے چھلکوں کا مسئلہ بھی کر ہی لیا جائے گا، جمّن کی امّاں کو پیاز کی قبر میں دفن نہ کیا تو میرا نام نہیں ہے، ندرت نے سوچا تھا۔

ذکیہ خاتون کو فیصل آباد سے ایک خط ملا، دِل کی نرم تھیں، خط کی تحریر نے شاید کچھ زیادہ ہی متاثر کر دیا تھا۔ کیونکہ اُس کے بعد سے اُن کے چہرے پر مسلسل اُداسی چھائی رہی تھی۔

زیب النساء بیگم بہُو سے کافی پیار کرتی تھیں۔ ویسے بھی جہاندیدہ عورت تھیں اور دُنیا کی نگاہیں پہچانتی تھیں، کمرے میں پہنچ کر بہُو کو گھیر بیٹھیں۔

"دُلھن! مجھ سے بھی چھپاؤ گی۔ کیا بات ہے اِتنی اُداس کیوں ہو، کیا پریشانی ہے؟ تمھیں یاد ہو گا دُلھن، کتنی چھوٹی سی تھیں تم، جب اِس گھر میں آئی تھیں اور یہ بھی یاد ہو گا کہ اُس کے بعد سے میں نے کبھی تمھارے ساتھ ساس کا سلوک نہیں کیا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ امّی جان؟ کوئی بدبخت یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے آپ سے کبھی کوئی شکایت ہوئی ہے۔" ذکیہ خاتون نے کہا۔

"تو پھر اُداس کیوں ہو۔ کون سی ایسی بات ہوئی ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں امّی جان، بہت عرصے کے بعد طفیلی بیگم کا خط آیا ہے۔"

"طفیلی بیگم! ارے وہ تمھاری پھوپھی زاد بہن؟ وہ جو..."

"ہاں اُنہی کی بات کر رہی ہوں۔"

"کیا لکھا ہے خط میں، وہ تو میرا خیال ہے فیصل آباد میں تھیں؟"

"ہاں امّی جان۔ دراصل وہ بذاتِ خود اِتنی بُری خاتون نہیں تھیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ لگائی بُجھائی کی عادت تھی اُن میں لیکن دراصل اُن کے شوہر مرحوم ذرا شتری فطرت کے مالک تھے۔"

"مرحوم؟ تو کیا زمان خان کا انتقال ہو گیا؟"

"جی ہاں خط میں یہی لکھا ہے۔"

"کب ہوا بے چارے کا انتقال۔" زیب النساء بیگم نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے چھ سات مہینے گزر گئے، بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ بیوہ ہو چکی ہیں۔ ایک ہی بیٹا ہے رشید خان۔ وہ بھی کہیں کام دھندا نہیں کرتا، کوئی نوکری ہی نہیں ملی۔ جوان ہو گیا ہو گا، اب تو ہمیں اُن سے مِلے ہوئے بھی طویل عرصہ گزر گیا۔ بہرحال بہت درد بھرا خط لکھا ہے۔ لکھتی ہیں کہ ساری اَنا ٹوٹ چکی ہے اور نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ سڑکوں پر آ جائیں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ

پھیلائیں۔ تو ہاتھ پھیلانے کے لئے اپنے غیروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے مجھ سے مدد کی درخواست کی ہے، اُنھوں نے لکھا ہے کہ اگر فی سبیل اللہ اُن کی کچھ مدد کی جا سکے، تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"لو خُدا کا غضب یہاں کتنے بلّیاں پل رہے ہیں اور اُن کی عزّت افزائی ہو رہی ہے۔ طفیلی بیگم کسی بھی رشتے سے سہی، ہیں تو ہماری عزیز، خود ہی ناک لگائی تھی اُنھوں نے، مگر چلو کوئی بات نہیں۔ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا، اب اُن پر بپتا پڑی ہے بیٹی تو اُن کی پوری پوری مدد کرو۔"

"سوچ رہی ہوں امّی جان کیا کروں؟"

"اے کرو گی کیا۔ لے آؤ اُنھیں جا کر، یہاں پیار اور عزّت کے ساتھ لانا، کسی ٹوٹے ہوئے کو سنبھالنا بہت بڑا ثواب ہے۔ جو پہلے سے سنبھلے ہوئے ہوتے ہیں اُن پر توجہ نہ دو، خُدا ناراض نہیں ہوتا۔"

"لیکن میں ڈرتی ہوں امّی جان، کیونکہ... کیونکہ...؟"

"ہاں کیونکہ وہ تمھاری رشتہ دار ہیں۔ یہی بات ہے نا؟ دیکھو بیٹی! یہ بات ذرا غلط راستے پر چلی جاتی ہے۔"

"نہیں نہیں خُدا کی قسم، ایسا میں نہیں سوچ رہی بس اُن کی عادت سے خوفزدہ ہوں۔"

"سنبھل گئی ہوں گی۔ جب ایسا لکھا ہے تو اپنے آپ کو سنبھالیں گی ہی۔ اور پھر بی بی کون فرشتہ ہوتا ہے، ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہی ہے۔ اب ہمارے اِس گھر میں ہی دیکھ لو نا، بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ احسان کا کھاتے ہیں اور اُس پر طنز بھی کرتے ہیں، چھوڑو اِن باتوں کو... نیکی کرنے کے لئے یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ جس کے ساتھ نیکی کی جا رہی ہے وہ کون اور کیا ہے۔ [illegible] آنکھیں بند کر کے کر دو۔"

"پھوپھی امّی جان! میں ذرا سوچوں گی اِس بارے میں اگر ایسی کوئی شکل ہو سکی کہ اُنھیں کچھ تھوڑا بہت لے دے کر وہیں پر اُن کے گزارے کا بندوبست ہو جائے تو ایسا کر لیں گے۔"

"احسان سے مشورہ کر لینا، احسان جو کچھ بھی کہیں گے وہی صحیح ہو گا۔"

"مجھے براہِ کرم تھوڑا سا وقت دے دیجئے فیصلہ کر لوں گی۔" ذکیہ خاتون نے کہا۔

حقیقت یہی تھی، طفیلی بیگم تھیں تو اُن کی پھوپھی زاد بہن، لیکن سگی پھوپھی زاد بہن نہیں تھیں، باپ کے رشتے کی کوئی بہن تھیں، لیکن ذرا تنک چڑھی اور اِدھر کی اُدھر کرنے والیوں میں سے تھیں۔ اُن کے شوہر زمان خان بہت ہی شتری فطرت کے آدمی تھے اور خواہ مخواہ لڑائی جھگڑے مول لیتے پھرتے تھے۔ ایک بار احسان صاحب نے اُنھیں بھی فیصل آباد سے یہیں آ جانے کی پیشکش کی تھی، یہ گھر تو تھا ہی سرکاری یتیم خانہ، چنانچہ ہر طرح کے رشتے داروں کو یہاں جمع کیا گیا تھا، لیکن زمان خان نے بڑے طنزیہ انداز میں احسان احمد سے کہا تھا "فقیروں اور سرداروں میں فرق ہوتا ہے احسان احمد صاحب، میں پٹھان ہوں، اور پٹھان اپنے بازوؤں کے بل پر کھاتے ہیں، وہ کسی کے در پر فقیر بننا پسند نہیں کرتے۔"

احسان احمد نے بڑی نرمی سے اُنھیں سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ بھائی صاحب اِس گھر میں کوئی فقیر نہیں ہے۔ عزیزوں کو ایک جگہ یکجا کرنا ایک چھوٹی سی آرزو تھی میری اور اِس آرزو کو پورا کرنے کے لئے میں نے اپنوں کو اپنے نزدیک جمع کر لیا ہے، اِس میں بُرا ماننے کی بات نہیں ہے۔

لیکن زمان خان نے بدستور وہی حقارت آمیز رویہ اختیار کیا تھا تو احسان احمد صاحب بھی خاموش ہو گئے تھے۔ بیوی کے رشتہ داروں کا معاملہ تھا، ذرا بھی ایک لفظ زبان پر نہیں لائے تھے۔ حالانکہ ذکیہ بیگم کو زمان خان کے یہ الفاظ بہت بُرے محسوس ہوئے تھے، بس اُس کے بعد سے اَن بَن سی چل رہی تھی۔ نہ زمان خان نے اُن کی شکل دیکھی تھی اور نہ ہی احسان احمد نے زمان خان یا طفیلی بیگم کی۔ کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ اور اب اِتنے عرصے کے بعد حساس طبیعت ذکیہ خاتون کے سامنے طفیلی بیگم کا یہ خط آیا تھا تو وہ آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ اُنھوں نے احسان احمد صاحب سے کوئی ذِکر نہیں کیا۔ لیکن احسان احمد کی والدہ نے اُن سے اِس موضوع پر گفتگو کی اور احسان احمد صاحب متحیّرانہ انداز میں بولے۔

"تو امّاں جان! مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت ہے، اِس گھر میں اللہ تعالیٰ نے بڑی گنجائش دی ہے، جس کا دِل چاہے آ جائے، بہتر یہ ہو گا کہ اُنھیں فوراً بلوا لیا جائے۔"

"ذکیہ کہہ رہی تھی کہ اگر اُنھیں وہیں کچھ لے دے کر رشید کو کوئی کاروبار کرا دیا جائے تو کیا حرج ہے؟"

"اگر ذکیہ ایسا پسند کرتی ہیں تو وہ یہی کر لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن بہتر یہی ہے امّاں جان کہ وہ یہاں آ جائیں۔ کھانے پینے کی کیا کمی ہے، اور پھر اُن کا بیٹا تو اب بڑا ہو گیا ہو گا، اُسے کسی نوکری پر لگا دیں گے۔ کام کرتا رہے گا اور یہ احساس بھی

نہیں رہے گا اُن کے دِل میں کہ ہماری احسان مند ہیں۔ مرحوم زمان خان کو اِس بات کا بڑی شدت سے احساس تھا۔ میں اُن کی رُوح کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ بہتر یہ ہوگا کہ ذکیہ کو آپ روانہ کر دیں۔ اور اُنھیں یہیں لے آئیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کل میں ذکیہ کو ٹرین میں سوار کرا دوں گی جب کسی کو لانا ہی ہے تو پہلے وہاں جائے اور عزت کے ساتھ لے کر آجائے۔ پُرسہ بھی ہو جائے گا اور طفیلی بیگم یہ محسوس نہیں کریں گی کہ ہم نے اُن پر توجہ نہیں دی۔"

"نہایت مناسب تجویز ہے۔ آپ فوراً اُنھیں بُلوالیں۔" احسان احمد صاحب نے کہا اور دوسرے دن صبح کو زیب النساء بیگم بانپتی کانپتی بہو کے کمرے میں پہنچ گئیں۔

"دُلھن، بات کی احسان سے۔" ذکیہ بیگم کا چہرہ جُھک گیا۔

"نہیں کی نا۔" زیب النساء بیگم نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں امّی، میری ہمت نہیں پڑ سکی۔"

"اچھا چلو تیار ہو جاؤ۔ تمھیں فیصل آباد جانا ہے۔"

"جی۔۔۔؟"

"ہاں میں نے بات کر لی ہے۔"

"مم مگر میں۔۔۔ میں کیا کروں گی جا کر۔ میں کیسے جاؤں گی۔"

"تمھارے جانے کا بندوبست ہم کریں گے۔ فضل خان ساتھ چلا جائے گا۔ اور اگر چاہو تو اپنے ساتھ عارفہ بیگم کو بھی لے لو۔ پہلے جا کر پُرسہ دو۔ اس کے بعد اُن کا سامان بندھواؤ اور یہاں لے آؤ۔"

"مگر۔۔۔؟"

"اب مجھ سے بحث کرو گی۔" زیب النساء بیگم نے اپنے تمام تر حقوق استعمال کرتے ہوئے کہا اور ذکیہ بیگم کی گردن جُھک گئی۔

"نہیں امّی۔"

"بس تو پھر تیاریاں کرو۔"

ٹرین کے ٹکٹ بُک ہونے میں بھلا کیا دقتیں پیش آسکتی تھیں۔ فیصل آباد کے تین ٹکٹ حاصل کر لئے گئے۔ عارفہ بیگم کو اِس کے بارے میں بتایا بھی نہیں گیا تھا۔ روانگی سے کوئی ایک گھنٹہ قبل زیب النساء بیگم نے عارفہ بیگم کو طلب کر لیا اور عارفہ بیگم سراپا نیاز بنی ہوئی اُن کے سامنے پہنچ گئیں۔

"عارفہ بیگم تمھیں دُلھن کے ساتھ فیصل آباد جانا ہے۔ کیا ناصر علی گھر پر موجود ہیں؟"

"نہیں تو۔۔۔ مگر فیصل آباد کیوں؟"

"ذکیہ جا رہی ہیں۔ اُن کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے، بے چاری طفیلی بیگم بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہیں اُنھیں یہاں لے آؤ۔ احسان احمد نے یہی کہا ہے۔"

"طفیلی بیگم ممانی جان۔ طفیلی بیگم کو آپ یہاں بُلوا رہی ہیں۔" عارفہ بیگم نے کہا۔ طفیلی بیگم سے اُن کی ایک پُرانی رنجش تھی، خود طفیلی بیگم بھی بڑی سرکش تھیں اپنے زمانے میں۔ اب پتہ نہیں کیا حال تھا۔ لیکن عارفہ بیگم کے دِل سے آج تک کدورت نہیں نکلی تھی۔

"ہاں بھئی کیوں، کیا بات ہے۔ تمھیں کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں ممانی جان، میں اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہوں بس طفیلی بیگم کی عادتیں کچھ اچھی نہیں تھیں۔"

"تھیں۔۔۔ ہیں نہیں۔ اب تو وہ بے چاری بیوہ ہو چکی ہیں۔ ایک بچہ ہے اور وہ ہیں۔ احسان احمد کو تم جانتی ہو عارفہ، کہ وہ کسی کا دُکھ برداشت نہیں کر پاتے۔ چنانچہ اُنھوں نے یہی کہا ہے تمھیں کوئی اعتراض ہو تو بتا دو۔ میں اس پر غور کر دوں گی۔" زیب النسا بیگم نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ اور عارفہ بیگم ایک دم چونک گئیں پھر بولیں۔

"نہیں ممانی جان۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بھلا آپ حُکم دیں اور میں نہ مانوں۔ بس ناصر علی سے اجازت نہیں لی تھی۔"

"اُن سے میں کہہ دوں گی تمھارے بارے میں، جاؤ دو جوڑے کپڑے بیگ میں رکھ کر تیار ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد تمھیں یہاں سے چل پڑنا ہے۔"

عارفہ بیگم بادل نخواستہ باہر نکل گئیں، اور کوئی مسئلہ نہیں تھا، ناصر علی کو تو خود ممانی جان سنبھال لیں گی لیکن طفیلی بیگم کا اِس گھر میں آنا اُنھیں پسند نہیں تھا۔ بہرطور اُن کے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا جس سے وہ طفیلی بیگم کو یہاں آنے سے روک دیتیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگ میں دو جوڑے کپڑے ڈال کر وہ زیب النساء بیگم کے پاس پہنچ گئیں۔ فضل خان اور ذکیہ بیگم تیار ہو چکے تھے۔

☐

جمن کی آنکھیں اللہ رکھی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ حالانکہ دو نمبر اور تین نمبر کی دیواریں جُڑی ہوئی تھیں۔ لیکن جمن اِتنا زیادہ باہمت نہیں تھا کہ کوئی اُونچا کھیل کھیلنے کی کوشش کر سکتا تانکا جھانکی کے لئے بھی لاتعداد خطرات مول

لینا پڑتے ہیں۔ بہرطور وہ اب ہر وقت اللہ رکھی کے خیالوں میں گُم رہنے لگا تھا۔ نجانے کیا کیا منصوبے بنا لئے تھے اُس نے اپنی زندگی کے لئے۔

اللہ رکھی خود ہی اُس کی طرف مائل تھی تو وہ کیا کرتا صُورتِ حال بھی اُس کے علم میں اللہ رکھی کی زبانی آچکی تھی۔ کہ اُس کا رشتہ کیوں نامنظور کیا گیا ہے۔ اور کیوں اللہ رکھی نے پاگل پن کا ڈھونگ رچایا۔

ابھی ماں کو اِس سلسلے میں راز دار بنانا مناسب نہیں تھا ماں کی کیفیت ذرا مختلف تھی۔ جس سے پرخاش رکھتی۔ تو اُس سے دِل صاف کرنا ماں کے لئے مشکل ہوتا تھا اِس کے علاوہ جمن نے سوچا تھا کہ اللہ رکھی ٹھیک ہی کہتی ہے، ایک باورچی کے ساتھ وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ یقینی طور پر اُسے اللہ رکھی کی خاطر اپنا حُلیہ بدلنا پڑے گا۔ کوئی ایسا مشکل مسئلہ بھی نہیں تھا۔ ہر وقت کوٹھی میں رہتا تھا۔ شہاب صاحب کے کمرے میں داخلہ اُس کے لئے مشکل بھی نہیں تھا، بس کسی وقت موقع مِل جائے اور وہ اپنا کام کر دِکھائے اللہ رکھی خوش ہو جائے اِس سے بڑی خوشی جمن کی زندگی میں اور کیا ہو سکتی تھی

پھر ایک دِن اُسے موقع مِل گیا۔ شہاب صاحب کو اُس نے اپنی کار میں بیٹھ کر باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ باہر جاتے تھے۔ تو کئی کئی گھنٹوں کے بعد واپس آتے تھے۔ باورچی خانے سے فراغت تھی گھر کے لوگ دوپہر کو آرام کے لئے لیٹ چُکے تھے چنانچہ جمن جی کڑا کر کے شہاب صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

یہاں کمروں کے دروازوں میں تالے لگائے جانے کا رواج نہیں تھا۔ اِس لئے شہاب صاحب کے کمرے کا دروازہ بھی کُھلا ہُوا تھا۔ گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں، باورچی خانے سے کھانے پینے کی چیزیں پار کر کے لے جانا دوسری بات تھی۔ لیکن جمن جو کچھ آج کر رہا تھا وہ باقاعدہ چوری میں شمار ہوتا تھا۔ ہاتھ کی صفائی اور عقل کی کوششوں سے اُس نے اُس کوٹھی سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ لیکن یہ طریقۂ کار بالکل ہی مختلف تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اُس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر اُس الماری پر اُس کی نگاہ جا لگی۔ جو شہاب صاحب کے کپڑوں کی الماری تھی۔ الماری کے قریب پہنچ کر اُس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو ہینڈل نیچے جُھک گیا۔

جمن نے الماری کا دروازہ کھول کر اندر نگاہ ڈالی اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ یہاں سوٹوں کی کمی تھی بھلا، ایک سے ایک شاندار کپڑے کے سوٹ، بڑی ترتیب اور خوش سلیقگی کے ساتھ ہینگروں میں لٹکے ہوئے تھے، سب سے حسین رنگ منتخب کر کے جمن نے دو سوٹ نکال لئے۔ الماری کے نچلے خانے میں کچھ رقم بھی رکھی ہوئی تھی جسے دیکھ کر جمن کا دِل ایک دم دھک سے ہو گیا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ یہ چوری کی بجائے ڈاکہ ہو جائے گا۔ صرف ضرورت کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ اگر دو سوٹوں کا ہی معاملہ ہوا تو ممکن ہے زیادہ شور نہ مچے، لیکن رقم غائب ہوئی تو پھر چور کو پکڑنے کی کوششیں بھی کی جائیں گی اور پھر سوٹوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی۔ کہ ممکن تھا شہاب کو اُن کا خیال ہی نہ آتا۔ پھر جمن نے دونوں سوٹ جو ٹائی اور قمیض سمیت ہینگروں میں ٹنگے ہوئے تھے، ہینگروں سے اُتار لئے اور اِس کے بعد اُنھیں پتلی سی تہہ میں لپیٹنے لگا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے میز سے ایک رسالہ اُٹھایا اور بڑے سے رسالے میں حتی الامکان یہ دونوں سوٹ سنبھالے ہوئے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور میدان صاف پا کر باہر نکل آیا سب سے پہلے وہ باورچی خانے میں پہنچا تھا۔ یہاں اُس نے اُن چیزوں کو الماری میں چُھپا دیا اور خوفزدہ دِل پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب دِل کی حالت کسی حد تک معتدل ہو گئی، تو اُس نے سوچا کہ اِس سوختے میں یہاں سے نکل جانا چاہیئے ورنہ یہ بنڈل لے جاتے ہوئے اُسے دیکھا بھی جا سکتا ہے۔

بنڈل بغل میں دبائے ہوئے وہ بڑی احتیاط کے ساتھ باہر نکلا اور پھر اُس نے دو نمبر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ماں سے بھی حالات کو پوشیدہ رکھنا تھا۔ لیکن وقت ایسا تھا کہ ماں بھی سو رہی تھی۔ دروازہ بجانے کی بجائے وہ پچھلی کھڑکی سے اندر داخل ہُوا جو ایسے کاموں کے لئے موزوں ترین تھی۔ یہ کھڑکی اُسی کے کمرے کے دروازے میں کُھلتی تھی اور جمن نے کسی بُرے وقت کے لئے اُسے سلاخوں سے محروم کر دیا تھا۔ ورنہ باقی مکانات کی کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر پہنچ کر اُس نے اپنی سانسوں پر قابو پایا اور پھر سوٹوں کو اپنے صندوق میں چُھپا دیا۔ یہاں یہ چیزیں ہر خطرے سے بے نیاز ہوتی تھیں، چونکہ ماں کو اجازت نہیں تھی کہ اُس کا صندوق ٹٹولے۔

پھر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور اب اُس کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ دِل ہی دِل میں وہ نجانے کتنے جُملے یاد کرنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ دونوں سوٹ پہن کر کہے گا کہ دیکھ اللہ رکھی یہ ہے تیرے خوابوں کی تعبیر۔ چشمِ تصور میں اُس نے بہت ساری فلموں کے مناظر دیکھ ڈالے۔ جب خوابوں کا کوئی شہزادہ گھوڑے پر بیٹھ کر کسی حسینہ کی بند آنکھوں میں تیر جاتا ہے، دفعتاً ایک خوشگوار اور

لطیف دھوئیں سے رچی ہوتی ہے اور حسینہ کی حسین مسکراہٹیں فضاؤں میں پھول ہی پھول کھلا دیتی ہیں۔ بہت سے خواب اُس کی آنکھوں میں آ بجے تھے، لیکن باورچی خانے میں واپس جانا بھی ضرور تھا کیونکہ شام کا بہت سا کام باقی تھا۔ اپنی حالت کو معتدل کرنے کے بعد وہ دوبارہ کوٹھی میں چلا گیا اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ دل کا چور مسلسل ہر آہٹ کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ شہاب صاحب کے کمرے میں ہونے والی واردات کا علم کسی کو ہوا یا نہیں؟

شہاب صاحب کی مرسڈیز ابھی تک غائب تھی۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ نہیں آئے۔ لیکن پانچ بجے کے قریب شہاب صاحب واپس آ گئے اور جمن انتظار کرنے لگا پھر جب معمولاتِ زندگی جُوں کے تُوں رہے اور رات ہوگئی تو اُس کے دِل کو کچھ قرار آیا۔ اِس کا مقصد ہے کہ کام بن گیا۔ اور خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

تمام ضروریات سے فارغ ہوتے ہوتے ساڑھے نو دس بج جاتے تھے۔ وہ ٹھیک دس بجے اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ آنکھیں اللہ رکھی کو تلاش کر رہی تھیں اور یہ خوش بختی ہی تھی اُس کی کہ نُدرت اُس وقت رَدا اور ثناء کے پاس سے اُٹھ کر آئی تھی اور کوارٹر کے دروازے پر کھڑی عصمت سے پُوچھ رہی تھی کہ امّاں بی سو گئیں یا نہیں۔ صرف امّاں بی تھیں جو ایسے معاملات میں شدت سے ٹانگ اَڑایا کرتی تھیں اور نُدرت کو بار بار یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ لڑکیوں میں ہی سہی لیکن رات کو دیر تک اُس کا گھر سے باہر رہنا مناسب نہیں ہے۔ جمن نے نُدرت کو دیکھا اور بھونڈے انداز میں اُسے اشارے کرنے لگا۔ نُدرت نے شاید عصمت سے آہستہ سے کچھ کہا تھا اور اُس کے بعد جمن کی طرف چلی آئی تھی۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے احوال پوچھا تو جمن نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”وہیں۔ اُسی جگہ۔۔۔“

”کس وقت؟“

”بس ساڑھے گیارہ بجے تک۔“

”میں آجاؤں گی۔“ نُدرت نے جواب دیا اور غڑاپ سے کوارٹر میں داخل ہوگئی۔

جمن کے قدم مستانہ وار اپنے کوارٹر کی طرف اُٹھ گئے تھے۔ اُس کے دِل میں خوشیوں کا طوفان اُبل رہا تھا۔ معاملات بڑی آسانی سے طے ہوگئے تھے۔ اللہ رکھی کی ایک خواہش تو وہ پوری کر چکا تھا اور اب اُس کا صلہ چاہتا تھا۔

گیارہ بجے وہ اپنی کھڑکی سے کُود کر باہر نکل آیا۔ کوارٹر کا ماحول پُرسکون تھا دروازے پر چوکیدار پہرہ دے رہا تھا۔ اور اندر کی خاموشی سے احساس ہوتا تھا کہ سب لوگ سونے کے لئے اپنے کمرے میں جا چکے ہیں۔

اپنی مخصوص جگہ پہنچ کر جمن انتظار کرنے لگا اور ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اُس نے اللہ رکھی کے قدموں کی چاپ سُنی۔ اللہ رکھی درختوں کے پیچھے پہنچ گئی تھی۔ جمن والہانہ انداز میں آگے بڑھ آیا۔

”تم آگئیں اللہ رکھی۔ اللہ قسم میں شاید سارے آسمان کے تارے گن چکا ہوں۔“

”جمن! جھوٹ بولنے لگے ہو تم اب مجھ سے۔“ نُدرت نے بھنویں اُچکا کر کہا۔

”نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ چاہے جیسی قسم لے لو۔“

”اُوپر دیکھو۔“ نُدرت نے آسمان کی طرف رُخ کر کے کہا۔

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا نظر آیا۔۔۔؟“

”بس درختوں کی چوٹیوں، مم میرا مطلب ہے پتّوں کی۔۔۔ تم کیا دِکھانا چاہتی ہو مجھے۔۔۔؟“

”آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ تم نے تارے کہاں سے گن لئے۔۔۔؟“

”ایں، ارے، او ہاں۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے بادل نہیں تھے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، چلو یہ بتاؤ مجھ سے کیا کام تھا تمھیں؟“

”ایک چیز دِکھانا چاہتا تھا۔“ جمن نے جواب دیا اور نُدرت کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔

”کک۔ کیا سوٹ۔۔۔“ اُس نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔ نُدرت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس سوٹ کو دیکھنے لگی تھی۔ جو جمن پہن کر آیا تھا۔ نُدرت نے انتہائی پُرمسرت لہجے میں کہا۔

”ہائے جمن تم۔۔۔ تم۔۔۔ میں تمھیں اِن سوٹوں میں دیکھ رہی ہوں، کتنے اچھے لگ رہے ہو تم انھیں پہن کر۔“

”بڑی مشکل سے یہ کام کیا ہے میں نے۔۔۔ اللہ قسم دِل یُوں لگتا تھا جیسے سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا مگر تمھارے لئے تو میں نجانے کیا کچھ کر سکتا ہوں۔“

شہاب صاحب لمبے چوڑے آدمی تھے۔ اُن کا سوٹ جمن کے ڈھیلا بھی تھا اور لمبا بھی، کمر پر سے بھی ڈھیلا تھا جسے جمن بار بار سنبھال رہا تھا۔

لیکن نُدرت نے اُسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں، انداز ایسا تھا جیسے اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھ کر وہ خوابوں میں گم ہو گئی ہو۔

لیکن درحقیقت آنکھیں بند کر کے اُس نے بمشکل تمام قہقہہ ہضم کیا تھا۔ پھر اُس نے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے بولی۔

”جمن تم کیا لگ رہے ہو میں تمھیں کیا بتاؤں؟“

”پتلون ڈھیلی ہے۔“ جمن آہستہ سے بولا۔

”اوہ نہیں بے وقوف آدمی، تمھیں جدید فیشن کا پتہ ہی نہیں ہے، آج کل تو ایسی ڈھیلی پتلونیں ہی پہنی جا رہی ہیں، جن لوگوں کے پاس ٹائٹ پتلونیں ہیں لوگ اُنھیں قدامت پسند تصوّر کرتے ہیں۔ یہ پتلون تو تمھارے بدن پر ایسی فِٹ آئی ہے کہ بس یُوں لگتا ہے جیسے تمھیں سامنے رکھ کر سی گئی ہو۔“

نُدرت کے لئے ہنسی برداشت کرنا مشکل ہوگئی۔ وہ بُری طرح کھانسنے لگی، ہنسی کی آواز کو وہ کھانسی میں چھپانا چاہتی تھی، ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی پتلے سے بانس پر کوئی سوٹ سکھانے کے لئے ٹانگ دیا گیا ہو، قمیص بھی ڈھیلی تھی اور کالر گردن سے تقریباً دو دو انچ آگے نکلے ہوئے تھے۔

”آئینہ ہے تمھارے پاس؟“ اُس نے سوال کیا۔

”نن نہیں۔“

”جمن تم اِس لباس میں دُنیا کے عظیم ترین انسان لگ رہے ہو، خُدا کے کام بھی عجیب ہیں۔ جن لوگوں کے پاس جامہ زیبی ہوتی ہے۔ اُنھیں دولت نہیں دیتا اور جنھیں دولت دیتا ہے وہ شکل سے فقیر لگتا ہے جیسے شہاب صاحب تمھارے لباس چوری کر کے پہنتے رہے ہوں۔“

”مم مگر مجھے تو یہ بڑے ڈھیلے لگ رہے ہیں۔“

”فیشن یہی ہے آج کل۔۔۔ ٹھہرو تم ٹائی کیسے باندھو گے، ارے یہ چپلیں، چھی چھی۔ جُوتے کہاں ہیں تمھارے؟“

”جُوتے۔۔۔ جُوتے تو نہیں ہیں۔“

”تو کیا اِتنے بھی پیسے نہیں ہیں تمھارے پاس کہ تم جُوتے بازار سے خرید لاؤ۔“

”نن، نہیں، نہیں ایسی بات تو نہیں ہے، خرید لاؤں گا۔“

”اور ایک جوڑی موزے بھی۔“ نُدرت نے کہا۔

”موزے بھی لے آؤں گا۔ مگر یہ لباس؟“

”بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بس مجھے اچھا لگ رہا ہے تو تم کیوں پرواہ کر رہے ہو اُس کی۔ اُسے پہن کر کسی محفل یا کسی پارٹی میں شریک ہو کر تو دیکھو، لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمھاری طرف دیکھیں گے، سب کے سب شرمندہ ہو جائیں گے تمھارے سامنے۔“

”کیا واقعی اللہ رکھی؟“

”اللہ رکھی تم سے جھوٹ بول سکتی ہے جمن؟ اپنے جمن سے۔“

”اوہ اللہ رکھی۔ مم میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔“ اِس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

”بس کچھ نہ کہو جمن، کل ایک جُوتا ضرور خرید لینا، میں اِس کے بعد تمھیں آئندہ پروگرام بتاؤں گی۔“

”پپ، پروگرام۔۔۔؟“

”جی ہاں، آپ کو یہ سوٹ پہن کر کسی ایسی محفل میں شریک ہونا ہوگا جہاں بڑے بڑے لوگ ہوں، میں دِکھانا چاہتی ہوں اِس دُنیا کو کہ ایک باورچی پیدائشی باورچی نہیں ہوتا۔ وہ ایک حسین نوجوان بھی ہو سکتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وقت نے اُسے باورچی بنا دیا ہو۔“ بہت ہی پُرجوش جملے تھے اور جمن کو پُرجوش فلمیں بہت پسند تھیں، چنانچہ وہ بھی زمانے کی اِس قدر ناشناسی پر پیچ و تاب کھانے لگا۔ پھر اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

”میں ایسا ہی کروں گا اللہ رکھی، میں ایسا ہی کروں گا، تم اطمینان رکھو۔“

”بس اب جاؤ۔ لیکن سوٹوں کو سنبھال کر رکھنا، میں تمھیں دِن کی روشنی میں بھی اِسی لباس میں دیکھنا چاہتی ہوں لیکن کسی مناسب وقت پر، کیونکہ بہرطور یہ سوٹ تمھارے نہیں ہیں۔“

”ہاں بس یہی تو گھپلا ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو اللہ رکھی فی الحال انہی سوٹوں سے کام چلاتا ہوں اُس کے بعد میں اپنے لئے خود سوٹ سلواؤں گا۔ اب ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے یہ۔“ جمن کی آنکھوں میں شہاب صاحب کی الماری میں رکھے ہوئے نوٹ گھوم گئے تھے، بلاشبہ سوٹ پکڑے جا سکتے ہیں لیکن نوٹ۔۔۔ اگر رقم مِل جائے تو پھر سوٹ سلوانا مشکل کام نہیں ہوگا۔ کافی دیر تک وہ نُدرت سے باتیں کرتا رہا اور اِس کے بعد جب کوئی آہٹ انھیں سُنائی دی تو نُدرت جلدی سے واپسی کے لئے پلٹ پڑی۔

جمن اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا تھا۔ واپس پہنچی تو عصمت نُدرت کا انتظار کر رہی تھی۔

”یہ تم ہی تھیں تا باجی۔۔۔ درختوں کے پیچھے ہماری باتیں سُن رہی تھیں۔“

”نُدرت، تُو جو کھیل کھیل رہی ہے اب وہ خطرناک حدود میں داخل ہوگیا ہے۔“

”میں خود بھی بہت زیادہ خطرناک ہوں باجی آپ اِس کی فکر نہ کریں۔“

”اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو لوگ مجھ سے کہیں گے کہ تم بڑی بہن تھیں، تمھیں سب کچھ معلوم تھا اور اِس کے بعد تم نے نُدرت کو نہ روکا۔“

"یہ نوبت آئی باجی تو تم اطمینان رکھو، میں ساری ذمہ داری اپنے ہی سر لے لوں گی، خواہ مخواہ بے کار باتیں نہ کیا کرو، کیوں میری تفریح خراب کر رہی ہو؟" ندرت نے کہا اور عصمت خاموش ہو گئی۔

ندرت کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے، بار بار وہ قہقہے لگانے لگتی تھی، اور عصمت چونک چونک کر اُسے دیکھنے لگتی تھی۔

"کیا مصیبت نازل ہو رہی ہے تجھ پر، سوئے گی نہیں؟"

"ہائے باجی! اگر تم میرے جمن کو اُس سُوٹ میں دیکھ لیتیں، بلکہ دیکھ لیا ہو گا تم نے سچ بتانا باجی کیسا لگ رہا تھا میرا پیارا جمن۔" ندرت نے کہا اور عصمت ہنسی نہ روک سکی۔ اور اس کے بعد تو جیسے دونوں پر ہنسی کے دورے پڑ گئے۔ عصمت بھی ہنس رہی تھی اور ندرت بھی، اور امّاں بی بے چاری جو شاید باتھ روم جانے کے لئے اُٹھی تھیں اُن کے قہقہے سُن کر اُن کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ روشنی بجھی ہوئی تھی اور اندھیرے میں دونوں کے قہقہے اُبل رہے تھے۔ تب اُنھوں نے زور زور سے ندرت اور عصمت کو آوازیں دیں۔ لیکن اِن دونوں نے اپنے قہقہے بند کر لئے تھے۔ تب امّاں بی بڑبڑاتی ہوئی واپس چل پڑیں۔

"یہ جوانی بھی عجیب چیز ہوتی ہے، سوتے میں ہنس رہی ہیں دونوں کی دونوں۔" اُن کی آواز سُن کر ندرت نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی تھی، دیر تک دونوں ہنستی رہیں۔

صبح کو عصمت تو یونیورسٹی چلی گئی۔ لیکن ندرت سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ دوڑی دوڑی ثناء کے پاس پہنچ گئی۔ ثناء تیمور کا لباس استری کر رہی تھی۔ ندرت کو دیکھا تو مُسکرا کر بولی۔

"آؤ اللہ رکھی، خیریت...؟"

"ہائے ثناء! یوں سمجھ لو۔ یہ اللہ رکھی اِس دُنیا میں تمہارے لئے فرشتہ بن کر آئی ہے۔ اِتنے قہقہے سجا دیئے ہیں میں نے تمہارے چہرے پر کہ گاندھی گارڈن معلوم ہوتی ہو۔ ایک بڑی قہقہہ بار خبر لائی ہوں۔"

"ایک منٹ ایک منٹ۔ اے تیمور چلو کپڑے پہنو۔" ثناء نے کہا اور تیمور کو گود میں بٹھا کر اُس کے کپڑے تبدیل کرانے لگی۔

"ہاں اب اُگل دو اللہ رکھی۔"

"مالک کی بیٹی! جو کام تم نے کہا تھا وہ کر دکھایا۔ تم نے تصویروں میں تاج محل دیکھا ہو گا۔ سُنا ہے کہ یہ ایک شہنشاہ کی محبت کا تحفہ تھا اپنی محبوبہ کے لئے۔ لیکن میرے جمن نے شہاب صاحب کے سُوٹ چُرا کر اُس سے کہیں زیادہ بلندی کا ثبوت دیا ہے۔"

"سچ سچ، چُرا لئے؟" ثناء نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"جمن کو کیا سمجھتی ہو، اِس دُنیا کا عظیم انسان ہے وہ بھلا ایسے کام اُس کے لئے کیا مشکل ہو سکتے ہیں۔"

"پھانسی ہی چڑھا دیں گے انکل اُس کم بخت کو، میں سچ سچ بتا رہی ہوں ندرت تجھے کہ جمن بُری طرح مارا جائے گا اِس بُری طرح کہ اُسے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔"

"تو مارا جائے، مجھے کیا۔ شادی کرے گا مجھ سے، عشق کرتا ہے مجھ سے۔ دیکھو ثناء میں یہ ساری باتیں سُننے کے لئے نہیں آئی یہ بتاؤ کہ مسٹر جمن کو اِس سوٹ میں شہاب صاحب کے سامنے کیسے پہنچایا جائے۔"

ثناء پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی پھر ایک دم چونک پڑی۔

"بن گیا کام۔" اُس نے چٹکی بجا کر کہا۔

"کیا کام بن گیا؟"

"پرسوں ہمیں صائمہ روشن علی کی سالگرہ میں جانا ہے۔ پورے گھر کے لئے دعوت نامہ آیا ہے، سب ہی لوگ جائیں گے اور خاص طور سے انکل شہاب۔"

"خاص طور سے انکل شہاب کیوں؟"

"اِس لئے کہ آج کل روشن علی صاحب سے اُن کے کچھ کاروباری معاملات چل رہے ہیں۔"

"ویری گڈ، تم بھی جاؤ گی؟"

"ہاں اور تم بھی جاؤ گی۔"

"میں کیسے جاؤں گی؟"

"صائمہ نے خاص طور سے تمہارے اور رِدا کے لئے کہا ہے۔ اُس دِن ملاقات ہوئی تھی نا تم سے، اُس نے ٹیلی فون کر کے مجھے کہا ہے کہ تم دونوں کو ضرور ساتھ لاؤں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی تم کیا سمجھتی ہو۔ میں تمھیں کسی ایسی جگہ لے جاؤں گی۔ جہاں تمھیں بن بُلایا مہمان سمجھا جائے؟"

"لیکن ثناء! گڑبڑ ہو جائے گی، انکل اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں اجازت لے لوں گی غلام احمد چچا سے، تم تو اِس کی فکر ہی نہ کرو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اپنے جمن کو کیسے تیار کرو گی؟"

"غور کرنے دو مجھے۔ سوچنا پڑے گا اِس سلسلے میں۔ صورتحال اچانک ہی میرے علم میں آئی ہے۔" ندرت گال کھجاتی ہوئی بولی اور پھر چند لمحات کے بعد اُس نے ثناء سے کہا۔

"ثناء! یہ صائمہ تمہاری بے تکلف سہیلی ہے نا؟"

"ہاں، بالکل... صائمہ سے جو بھی کام ہم لینا چاہیں گے وہ بخوشی کرے گی۔"

"ہرگز نہیں، قطعی نہیں، کوئی ایسی ویسی حرکت بالکل نہیں کرنا، کسی کو ہمارے اِس راز میں شریک نہیں ہونا چاہیئے سوائے

رِدا کے۔ صائمہ سے تم ایک سادہ کارڈ منگوا لو یہ کہہ کر کہ اپنی کسی دوست کو لانا چاہتی ہو، بعد میں اُس سے یہ کہہ دینا کہ وہ دوست آ نہیں سکی۔ یہ کارڈ مسٹر جمن کے لئے ہو گا۔"

"منگوا لوں گی۔ آج ہی منگوا لوں گی، لیکن جمن کو دعوت نامہ دیا کیسے جائے گا؟"

"بس یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میرا جمن بڑا معصوم انسان ہے، جو کچھ میں اُس سے کہوں گی، وہ فوراً ہی مان لے گا۔ اِس کی تو تُو فکر ہی نہ کر مالک کی بیٹی۔" ندرت ہنستے ہوئے بولی اور ثناء بھی ہنسنے لگی، دیر تک دونوں اِس موضوع پر گفتگو کرتی رہیں۔ اِس کے بعد ندرت اُٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا بھئی اجازت، کارڈ منگوا لینا، آج ہی رات میں یہ دعوت نامہ اپنے جمن کو پہنچا دوں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔ کیونکہ گھر کے کچھ کام وغیرہ بھی کرتے ہیں۔" ندرت ثناء سے رُخصت ہو کر اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑی۔

❋

توقیر صاحب کی ہمت افزائی نے رِدا کا دِل بڑھا دیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ توقیر صاحب تفسیر کے والد تھے اور چونکہ اب وہ اُن کی نگاہوں میں آ چکی تھی اِس لئے تفسیر یا شہاب صاحب براہِ راست اُس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے، یہ ملازمت رِدا کو عزیز تھی، کیونکہ یہاں سے اُس نے اپنے اُس مستقبل کا آغاز کیا تھا جس کا تصوّر ذہن میں بسائے وہ ایک عزم کے ساتھ لاہور سے سفر کر کے کراچی تک پہنچی تھی۔ اگر پہلے ہی مرحلے پر وہ زمانے کی ہولناکیوں کا شکار ہو گئی تو آگے بڑھتے ہوئے قدم ہمیشہ کے لئے رُک جائیں گے۔ وہ خود کو روکنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ تیمور کا مستقبل اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ثناء نے تیمور کو بہت پیار سے اپنی تحویل میں لے لیا تھا لیکن رِدا حقیقتوں کو زیادہ اہمیت دیتی تھی آنے والا کوئی بھی کل ثناء کو اِس گھر سے دُور لے جائے گا۔ اور اِس کے بعد تیمور کی تمامتر ذمہ داری رِدا ہی پر ہو گی۔ یوں بھی یہ ایک وقتی کھیل تھا کہ ثناء نے تیمور کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ آنے والے وقت میں یہ ذمہ داری بہرطور رِدا ہی کو نبھانی تھی وہ اُس اچھی ملازمت کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی اور اِس کے لئے اُس کے ذہن میں بہت سے منصوبے ترتیب پا رہے تھے، وہ چاہتی تھی کہ توقیر صاحب کو چند مزید ایسے کام کر کے دکھائے جس سے اُن کی نگاہوں میں اُس کی عزت بڑھ جائے، تنخواہ میں ایک ہزار روپے کا اضافہ اِتنی بڑی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

بہرطور اُس کے لئے مناسب موقع کی تلاش ہی جاری رکھنی تھی، خود آگے بڑھ کر کوئی قدم اُٹھانا موزوں نہیں تھا اور یہ اُس کے وقار کے منافی تھا۔

دفتر میں معمولات کے مطابق کام شروع ہو گیا۔ رِدا فائلوں میں ڈوب گئی اور اُس کے بعد اُسے اپنے اطراف کا کوئی ہوش نہ رہا وہ اپنی میز پر تمام فائلوں کے ایک ایک کاغذ کو بغور دیکھ رہی تھی جس پر کوئی نوٹ لکھنا ہوتا تھا، وہ نوٹ لکھ دیتی تھی اور چپراسی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر متعلقہ فائل اُس میز تک پہنچا دیتا تھا جہاں اُسے جانا ہوتا تھا۔ نیلے رنگ کی ایک خوبصورت فائل کو اُس نے کھولا تو کچھ کاغذات اُسے اُوپر ہی رکھے ہوئے ملے۔ یہ ذرا غیر متوقع بات تھی کیونکہ فائل پوری ترتیب کے ساتھ اُس کے پاس آتے تھے، اُس نے کاغذات اُٹھا کر دیکھنا شروع کر دیئے، سب سے پہلے ہی کاغذ پر اُسے فرینڈس آرگنائزیشن کے نام سے ایک لیٹر ہیڈ پر کچھ ایسی تحریر نظر آئی جو چونکا دینے والی تھی یہ ایک لیٹر تھا جس کی ڈپلی کیٹ اِن کاغذات میں لگائی گئی تھی اور لیٹر کسی سیٹھ کریم احمد باگڑیا کے نام تھا۔ جس میں اُنھیں اُن کی سپلائی کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ اِس سپلائی کی تفصیلات بھی نیچے نمبروں کے ساتھ درج تھیں اور اِتنے دِنوں میں رِدا نے جتنے فائل دیکھے تھے اُن میں سیٹھ باگڑیا کے ساتھ کاروبار کا کوئی کاغذ نہیں دیکھا تھا، جب کہ اُس کی گہری نگاہ اُس تمام کاروبار پر تھی جو اُس فرم کے تحت ہو رہا تھا یا تو یہ کاغذات غلطی سے یہاں آ گئے تھے، یا پھر... لیکن لیٹر ہیڈ پر نیچے تفسیر کے دستخط دیکھ کر اُسے پھر سوچنا پڑا، اُس نے جلدی جلدی دوسرے کاغذات دیکھنا شروع کر دیئے اور اُن کاغذات میں کچھ ایسی چیزیں اُس کی نگاہوں کے سامنے آئیں جو اُس کیلئے انتہائی سنسنی خیز تھیں۔ فرینڈز آرگنائزیشن کے نام سے کچھ اور خطوط اُن کاغذات میں موجود تھے۔ جن میں کچھ ایسی چیزوں کی فراہمی کی خواہش ظاہر کی گئی تھیں جو قانونی حیثیت نہیں رکھتی تھیں، لطف کی بات یہ تھی کہ اُن پر پتہ اُسی فرم کا درج تھا جس میں وہ کام کر رہی تھی۔ یقینی طور پر یہ کاغذات کسی قسم کی سازش کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔

آخری کاغذ دیکھ کر اُس نے اُن کاغذات کو فائل میں لگایا، اور اُسی طرح دوسری فائلوں کے نیچے رکھ دیا، جس طرح اُنھیں اُس کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

چند لمحات کے لئے قلم رکھ کر وہ سوچنے لگی کہ اُسے اِس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے، فرینڈس آرگنائزیشن کیا ہے؟ اِس بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری تھا، حالانکہ ایسی کسی فرم میں پہلے

اُس نے یہ ملازمت کی تھی لیکن اُس کے اندر ذہانت کی کمی نہیں تھی اور وہ اُن کاغذات کو دیکھ کر چونک پڑی تھی، یہ اُس کی ذمّہ داری تھی کہ مالکان کو اُس بات سے آگاہ کرے۔

جب فرینڈس آرگنائزیشن کا اُس پتے پر کوئی وجود نہیں ہے تو پھر یہ کیسی خط و کتابت تھی جو یہاں سے کی جا رہی تھی؟ اِس میں عملے کے کچھ افراد ملوث تھے یا پھر خود مالکان؟ اِس احساس نے اُسے ایک لمحے کے لئے سنسنی کا شکار کر دیا کہ اگر یہ سب کچھ خود اُس فرم کے مالکان کر رہے ہیں تو کیا اُس کی مداخلت مناسب ہوگی۔ اور کیا اِس مداخلت کی بناء پر اُس کے لئے خطرات نہیں پیدا ہو سکتے؟

وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ دفعتاً دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور وہ چونک کر سنبھل گئی اُس نے ایک دوسرا فائل اُٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور پھر بھاری لہجے میں دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی یہ شخص اُسی فرم کا ایک ملازم عظمت تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس نے بے صبری کی نگاہوں سے فائلوں کے اِس ڈھیر کی طرف دیکھا جو تھوڑی دیر پہلے داؤد نامی ایک آدمی یہاں رکھ گیا تھا، رُدا نے اپنے آپ پر قابو پاکر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”جی وہ . . . وہ کچھ فائل غلط آ گئے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں دیکھ لوں۔“

”ہوں۔“ رُدا نے گردن سے اشارہ کیا اور اپنے سامنے رکھے ہوئے فائل پر جھک گئی لیکن اُس کی جھکی ہوئی نگاہیں بھی صورتِ حال کا جائزہ لے رہی تھیں، عظمت نے وہی فائل نکالا جس میں رُدا نے وہ کاغذات رکھے دیکھے تھے اور پھر آہستہ سے بولا۔

”میڈم! اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ فائل لے جا رہا ہوں ابھی چند منٹ کے بعد آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔“

”ہوں۔“ رُدا نے پھر اُسی انداز میں کہا، عظمت سے وہ نگاہیں نہیں ملانا چاہتی تھی کہ کہیں وہ اُس کے چہرے پر چھائے ہوئے تاثرات سے یہ اندازہ نہ لگا لے کہ وہ فائل پڑھ چکی ہے۔ عظمت فائل لے کر نکل گیا تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا، اِس کا مقصد ہے اُس کا شبہ بالکل درست تھا، لیکن اِتنا بڑا فراڈ اِس اچھی نامی نیک نام فرم کے پتے سے فرینڈس آرگنائزیشن نامی کوئی اور جعلی فرم کام کر رہی تھی اُس کا ذمّہ دار کون ہے، کیا عظمت تنہا یا پھر اِس فرم کے مالکان . . . بات بہت زیادہ اہم نہیں تھی لیکن رُدا اپنے طور پر مخلصانہ انداز میں کام کر رہی تھی۔ توقیر صاحب نے اُسے بڑی عزت دی تھی اور وہ اِس احسان کا بدلہ چُکانا چاہتی تھی۔ لیکن اگر یہ کام خود مالکان ہی کر رہے ہیں تو اُس کی یہ مداخلت اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا رُدا کے لئے۔ کیا خاموشی اختیار کر لی جائے یا؟ پھر اُس نے سوچا کہ جلد بازی کسی طور مناسب نہیں ہے، فی الحال بے تعلقی کا اظہار ہی موزوں ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ فرینڈس آرگنائزیشن کے نام کے خطوط پر نگاہ رکھی جائے۔

اِس کے بعد اُس سے کام نہیں ہو سکا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد داؤد دوبارہ اپنی فائل لے آیا اور اُس نے اُسے دوسرے فائلوں میں شامل کر لیا۔ رُدا نے چور نگاہوں سے داؤد کو باہر جاتے دیکھا اور جونہی وہ باہر نکلا اُس نے جلدی سے فائل اُٹھا لیا اُسے کھول کر دیکھا کاغذات اب اُس میں موجود نہیں تھے۔ اِس کا مطلب ہے کہ داؤد بھی مشکوک شخصیت ہے، دل یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔ ایک عجیب سا خوف رگ و پے میں اُتر رہا تھا۔ یہ سب کچھ . . .؟ اِس میں ملوث ہونا بھی چاہیئے یا نہیں۔ اِس کے لئے تو کسی سے مشورہ بھی نہیں کیا جا سکتا ندرت سے بھی نہیں۔ دیر تک اُس کی یہی کیفیت رہی پھر اُس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ابھی خاموشی ہی بہتر ہے لیکن اِس کی چھان بین کرنی ہوگی . . . اگر مالکان خود یہ سب کچھ کر رہے ہیں تو پھر فرینڈس آرگنائزیشن کو بھول جایا جائے گا۔ مجھے کیا پڑی ہے اِس معاملے میں گھسنے کی اور اگر . . .؟

داؤد پھر کسی کام سے آیا ایک فائل اُس کے ہاتھ میں تھا اُس نے فائل کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں جو بے سرو پا تھیں رُدا نے محسوس کیا کہ داؤد اُسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے غالباً کوئی اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد عظمت بھی مشکوک انداز میں اندر آیا اور اُوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے چلا گیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دونوں بوکھلائے ہوئے تھے۔

شام کو وہ دفتر سے واپس چل پڑی۔ اُس کا ذہن اُلجھا ہُوا تھا اِن حالات میں اُس کا کردار کیا ہونا چاہیئے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے تمام خیالات ذہن سے جھٹک دیئے۔ اُن کا خیال لڑکیوں کے سامنے کسی اُلجھن کا اظہار مزید اُلجھنوں کو جنم دے گا۔

لڑکیوں کے مسائل جُوں کے تُوں تھے۔ اطلاع ملی کہ ذکیہ بیگم عارفہ بیگم اور فضل خاں کے ساتھ فیصل آباد گئی ہیں۔ رات کے کھانے پر شہاب صاحب بھی موجود تھے۔ نرم روی اور خوش اخلاقی سے گفتگو کرتے رہے لاڈلی بھتیجی سے اُس کی مصروفیات پوچھتے رہے پھر صائمہ روشن علی کی سالگرہ کا ذکر نکل آیا۔

”تم لوگ جاؤ گی؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ میرے ساتھ رُدا بھی جائیں گی۔“

”ہاں کیوں نہیں رُدا ہمارے خاندان کی ایک فرد ہیں اُنہیں دوسروں سے بھی روشناس ہونا چاہیئے۔“ شہاب صاحب نے کہا۔ اُن کی گفتگو میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

ندرت اور ثناء نے رُدا کو سالگرہ والے دِن کے خصوصی پروگرام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ رُدا نے ڈِنر کے بعد ثناء سے کہا . . .

”صائمہ کی سالگرہ میں میرا جانا ضروری ہے؟“

”ہاں۔ اور تمہیں ساڑھی پہننی ہے۔ ہلکے سُرمئی کلر کی وہ ساڑھی جو اُس دِن تم . . .“

”نہیں بھئی میں . . . میں نہیں جانا چاہتی۔ میں . . .“

”بور کرو گی . . .“ ثناء آنکھیں نکال کر بولی۔

”ثناء میں . . . دراصل۔“ رُدا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”تجھے بور کرتے رہنا چاہتی ہوں۔ بہرحال شکریہ۔ سُرمئی ساڑھی ہی باندھی جائے گی۔ خیال رکھنا۔“ ثناء نے سرد لہجے میں کہا۔ رُدا نے اُس سے بحث مناسب نہیں سمجھی۔

رات کو بستر پر بھی وہ اُلجھی رہی۔ اور پھر لیٹے لیٹے خود بخود مُسکرا دی۔ انسانی زندگی بھی کیا ہے۔ مسائل مسائل مسائل۔ بس اُلجھے رہو، ایک کے بعد ایک مسئلے میں اُلجھے رہو۔ بہتر یہ ہے کہ اُلجھو ضرور لیکن مصروف رہو۔ ہر کام وقت پر خود بخود ہو جاتا ہے۔

صبح کو وہ حسبِ معمول دفتر چل پڑی۔ وقت پر پہنچی تھی لیکن اپنے کمرے کے سامان کو دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ بظاہر کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اُسے ایک نگاہ میں اندازہ ہو گیا کہ اُس کی میز کی درازوں۔ فائل کیبنٹ اور دوسرے سامان کی تلاشی لی گئی ہے۔

خوف کا ایک ہلکا سا احساس اُس کی رگوں میں سرد لہر بن کر دوڑ گیا اور دیر تک وہ اِس احساس کے زیرِ اثر رہی۔ اِس کے بعد اُس نے خود کو سنبھال لیا اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی لیکن ذہن میں مسلسل کوئی شے چُبھ رہی تھی۔ پھر نہ جانے اُس میں کہاں سے ہمت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور تفسیر کے دفتر کی طرف چل پڑی۔ تفسیر کے معاملات کی خصوصی نگرانی کے لئے اُسے اُس کی غیر موجودگی میں بھی اکثر اُس کے کمرے میں جانا پڑتا تھا چنانچہ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اندر داخل ہو کر اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر تفسیر کی میز کی درازوں کی تلاشی لینے لگی۔ اُس کے تمام کاغذات دیکھ ڈالے پھر دوسری چیزیں بھی۔ ایک الماری کے کاغذات دیکھتے ہوئے اُسے الماری کے ایک گوشے میں لگا ہُوا سیاہ رنگ کا ایک بٹن نظر آیا۔ اُس بٹن کی یہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ رُدا نے بٹن دبایا تو الماری میں ایک خفیہ خانہ بنا ہُوا تھا۔ اور اُس خفیہ خانے میں سُرخ رنگ کا ایک فائل موجود تھا۔

رُدا کو چکر سا آ گیا تھا۔ چند لمحات وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس فائل کو دیکھتی رہی پھر لرزتے ہاتھوں سے اُسے اُٹھا لیا اور چند لمحات کے بعد وہ فائل چھپائے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر فائل کھولا۔ اور اُس کے پہلے ہی صفحے پر فرینڈس آرگنائزیشن کے الفاظ دیکھ کر اُسے بند کر دیا۔ پھر اُس نے فائل احتیاط سے نیچے کی دراز میں رکھ دیا اور کُرسی کی پُشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح دِن گزرا تھا۔ وقت ختم ہوتے ہی وہ اُٹھ گئی اور فائل اپنے لباس میں چھپائے باہر نکل آئی اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے، فائل بڑی احتیاط سے لئے ہوئے وہ کوٹھی میں داخل ہو گئی پھر اُسی رات اُس نے سب کے سو جانے کے بعد فائل کھول لیا۔ اور دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے اُس میں لگے ہوئے کاغذات پڑھنے لگی۔

یہ کاغذات فرینڈس آرگنائزیشن کا کچا چٹھا تھے اور اُن کے ذریعہ اُس پر ایسے انکشافات ہوئے تھے کہ اُس کا سر گھوم گھوم گیا تھا۔ شہاب صاحب اور تفسیر کی دوستی بھی اُن کاغذات میں چھپی ہوئی تھی اور یہ کاغذات شہاب صاحب کے چہرے کی نقاب اُتار رہے تھے۔ اِتنا کچھ معلوم ہو گیا تھا رُدا کو کہ شاید ہی اُن دونوں کے سوا کسی کو معلوم ہو۔

آدھی رات تک وہ اُن کاغذات کے طلسم میں کھوئی رہی۔ پھر اُس نے سوچا کہ اُس اچانک دریافت سے اُسے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ اپنی زندگی کے لئے یہ خطرہ مول لینا مناسب ہے یا نہیں۔ اندر سے ایک آواز اُبھری رُدا اِس دُنیا میں اپنے لئے ایک جگہ بنانی ہے تو اپنے پاؤں مضبوط کرنے ہوں گے، دِل مضبوط کرنا ہوگا۔ تیمور کا مستقبل سامنے ہے اُسے ایک اچھی زندگی دینے کے لئے۔ جو منصوبے بنائے ہیں وہ دوسروں کے شانوں پر سوار ہو کر پورے نہیں ہو سکتے۔ وقتی سہارے زندگی کے لئے معاون ضرور ہوتے ہیں لیکن پائدار نہیں ہوتے۔ ثناء کی اُلفت نے تیرے پاؤں کمزور کر دیئے ہیں۔ اُنہی مضبوط قدموں سے آگے کا سفر طے کر جن سے چل کر لاہور ریلوے اسٹیشن تک کا سفر طے کیا تھا۔ اُس عزم کو زندہ کر جو کراچی آتے ہوئے تیرے سینے میں تھا۔ ثناء کے پیار سے اُس وقت تک فائدہ ضرور اُٹھایا جا سکتا ہے جب تک تجھے ایک ٹھوس زندگی نہ مل جائے اِس سے زیادہ کا تصوّر فضول ہے۔ جو کچھ کرنا ہے خود آگے بڑھ کر کرنا ہوگا۔

اس نے سوچا۔ تفسیر نے اُسے ملازمت دی ہے۔ خود تفسیر فرینڈس آرگنائزیشن کا بانی ہے اِس لئے اُس فراڈ فرم کے بارے میں کسی کو بتانا تو فضول ہے۔ ہاں اِس نام کو اپنی بقا کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کون جانے اِس کی آڑ میں توقیر صاحب کا چہرہ نظر آجائے۔ زیادہ وفاداری خوفناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اِس لئے اِن معلومات کو ایک مہلک ہتھیار کی مانند ساتھ رکھا جائے اور وقت آنے پر یہ ہتھیار استعمال کیا جائے اِس کے لئے کوئی جلد بازی خطرناک ہوگی۔

صبح کو ثناء نے کہا "آفس جانا ضروری ہے۔"

"کیا مطلب... ڈیوٹی از ڈیوٹی۔"

"ایک دِن کی چھٹی بھی تو لی جاسکتی ہے۔"

"لیکن اِس کی ضرورت کیا ہے ملکہ عالیہ؟"

"تیاریاں کریں گے ذرا لطف رہے گا" ثناء نے کہا۔

"اگر آپ یہ حکم ایک دِن پہلے دے دیتیں تو تعمیل ارشاد ہوتی۔ لیکن اب سارے کام یونہی چھوڑ آئی ہوں ویسے بھی میرا باس اِن دِنوں ملک سے باہر ہے۔"

"کوئی بات بانتی ہو میری؟" ثناء نے شکایتی انداز میں کہا۔

"اوہ میری اچھی ثناء صرف حاضری لگا آؤں۔ دوپہر تک واپس آجاؤں گی۔"

"اور اگر نہ آئیں؟"

"تو ہر سزا قابلِ قبول ہوگی" ندا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ثناء نے اجازت دے دی اور رَدا باہر نکل آئی۔ رات کے فیصلے کے تحت اُسے بہت سے کام کرنے تھے چنانچہ آج سیدھے دفتر جانے کے بجائے اُس نے صدر میں اُتر کر ایک فوٹو اسٹیٹ شاپ کا رُخ کیا اور پھر نہایت احتیاط سے اُس فائل کے ایک ایک کاغذ کی فوٹو اسٹیٹ بنوائی اور وہیں سے ایک فائل کور خرید کر تمام نقول اُس میں لگالیں بڑی ہمت اور ہوشیاری کا کام تھا۔ اُن دونوں فائلوں کو چھپائے ہوئے وہ دفتر میں داخل ہوئی تھی۔ اُس کی کیفیت چوروں جیسی تھی لیکن دفتر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ایک بار پھر وہ تفسیر کے دفتر میں داخل ہوئی اور فائل واپس الماری میں اُسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اُسے اُٹھایا تھا۔ حتی الامکان اُس نے یہی کوشش کی تھی کہ فائل کی ترتیب جُوں کی توں رہے اور کسی کو اِس بارے میں کوئی شبہہ نہ ہوسکے۔

اپنے دفتر میں آکر وہ دیر تک چڑھے ہوئے سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ دفتر کی ایک رکن میڈم بُرہانی کسی کام سے اُس کے پاس آئیں تو اُنھوں نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے مس رَدا آپ کی کچھ طبیعت خراب ہے؟"

"ہاں سخت درد ہے سر میں۔ سوچ رہی تھی ختم ہوجائیگا لیکن؟"

"تو براہِ کرم آرام کرلیں، اِس حالت میں کام کیسے کرسکیں گی؟"

"یہی سوچ رہی ہوں میڈم۔ کوئی پوچھے تو براہِ کرم آپ بتا دیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"آپ چلی جائیں" میڈم بُرہانی نے کہا اور پھر وہ باہر چلی گئیں۔

رَدا فائل چھپائے باہر نکل آئی تھی۔ اُس قیمتی فائل کے بارے میں اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی بینک کے لاکر میں رکھوا دے گی۔ کوٹھی میں اُس کا کمرہ اُس قیمتی تحفے کو چھپانے کے لئے غیر محفوظ تھا کیونکہ بات صرف دفتر کی نہیں تھی بلکہ خود شہاب صاحب کے بارے میں بھی کچھ اشارات ملے تھے۔

واپسی میں وہ بالکل گُم صُم رہی تھی۔ ذہن سوچ کے سمندر میں غرق تھا دِل میں خوف کا احساس بھی تھا اور دوسرے خیالات بھی۔ یہ سب کچھ کر تو بیٹھی ہوں لیکن اِس کے بعد کیا کروں گی؟ اُن کاغذات کا استعمال کیا ہے؟ ہاں اُن سے ایک فائدہ ضرور ہوسکتا ہے اگر کبھی تفسیر یا شہاب صاحب درپے آزار ہوئے تو... تو انھیں روکا جاسکتا ہے اُن کاغذات کے ذریعہ اُن کے قدموں کو روکا جاسکتا ہے دِل میں بار بار توقیر صاحب کا خیال بھی آرہا تھا شفیق انسان تھے اُس کی ذراسی محنت کا صلہ دے گئے تھے تفسیر اُن کا بیٹا ہے۔ یہ غیر قانونی کام کسی مصیبت کا باعث بھی بن سکتا ہے اگر انھیں آگاہ کردوں تو؟

لیکن اِس خیال کے ساتھ ہی اوسان خطا ہونے لگتے تھے اِس کے بعد تفسیر کی دُشمنی مول لینا پڑے گی۔ اور صرف تفسیر ہی نہیں شہاب صاحب بھی تو ملوث تھے۔ نہیں، خاموشی بہتر ہے ہاں اُس فائل کو لاکر میں رکھنا بھی ضروری ہے حالات کو ہمت ہی سے قابو کیا جاسکتا ہے۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے اپنا ذہن صاف کرلیا تھا۔

طفیلی بیگم گُنوں کی پوری تھیں زمانہ ساز اور مکار فطرت کی مالک جوڑ توڑ کی ماہر دو دِلوں میں فرق پیدا کرا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا انتہائی موقع شناس تھیں اور ایک لمحے میں صورتِ حال سمجھ لیتی تھیں۔ شوہر بے حد اکڑ فوں والے تھے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے یہی وجہ تھی کہ احسان احمد کے گھر کی بہتی گنگا میں طفیلی بیگم کو ہاتھ دھونے کا موقع نہیں مل سکا تھا حالانکہ دعوت اُنھیں بھی ملی تھی احسان احمد کی طرف سے لیکن زمان خاں کا جواب بہت تیکھا تھا اُنھوں نے احسان احمد کی پیش کش کے جواب میں کہا تھا۔

"میاں احسان! تمہارے محل میں ہم جی نہیں سکیں گے۔

کیونکہ ہمیں جھونپڑے میں رہنے کی عادت ہے ہاں اگر کبھی تمہارے اُونچے محل میں زلزلہ آجائے تو بے تکلفی سے ہمارے جھونپڑے میں آکر پناہ لے لینا۔"

طفیلی بیگم اُس وقت بھی شوہر سے متفق نہیں تھیں لیکن زمان خاں کے سامنے نہیں چلتی تھی وہ ذرا ہاتھ چھٹ آدمی تھے۔ اِس کے بعد تو اُنھوں نے رشتے بھی ختم کردیئے تھے اور اُن لوگوں کو بے غیرت کہتے تھے جو احسان احمد کے ساتھ رہتے تھے۔ زمان خاں کے خیال میں احسان احمد نے مصاحب جمع کئے تھے۔ بہر حال طفیلی بیگم کے جو خیالات بھی ہوں انحراف کی مجال نہیں تھی شوہر کی موت کے بعد بھی بہت دِن تک تو احسان احمد کا خیال بھی نہیں آیا۔ سارے رشتے ختم ہوگئے تھے۔ کچھ بھول گئی تھیں لیکن جب مالی پریشانیاں حد سے گزر گئیں اور فاقوں تک نوبت آگئی تو ایک دِن اچانک ذکیہ بیگم کا خیال آگیا۔ دو دِن تک تو صرف غور ہی کرتی رہی تھیں پھر بیٹے سے تذکرہ کردیا۔

زمان خاں اور طفیلی بیگم کے گھر میں بھی ایک ہی پھول کھلا تھا اور وہ تھا رشید خاں۔ اکلوتا رشید خاں ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ آٹھویں کلاس کے بعد پڑھ کر نہ دیا۔ شکل و صورت کا بھی اچھا تھا۔ اور بدن کا بھی۔ ورزش کرنے کا شوق تھا۔ بدن خوب پل گیا تھا۔ جھگڑالو باپ کا اکھڑ پن اور چالاک ماں کی فطرت دونوں چیزیں اُس میں موجود تھیں اور پھر گھر سے آزادی، کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا اُس پر۔ اِس لئے کچھ نہ بن سکا سوائے نکمے کے، باپ کی زندگی میں ایک پیسہ نہ کمایا بعد میں کیا کرتا۔ کچھ بھی تو نہیں آتا تھا لیکن چالاک اور چرب زبان تھا۔ اِن دِنوں کسی سینما میں لائن لگواتا تھا معمولی سی تنخواہ ملتی تھی۔ اور نئی فلم لگنے پر کچھ ٹکٹ بلیک کرکے کما لیتا تھا ماں کو آٹے دال سے زیادہ پیسہ دینا اُس کے بس کی بات نہیں تھی لیکن آٹے دال سے زندگی نہیں بسر ہوتی۔ طفیلی بیگم نے بہت سوچ سمجھ کر ذکیہ بیگم کو ایک درد بھرا خط لکھ ڈالا تھا اور جواب میں ذکیہ بیگم کا تار ملا تھا کہ وہ آرہی ہیں۔ بیٹے کو اُنھوں نے خوب سمجھایا تھا اور پوری تفصیل سُن کر رشید نے کہا تھا۔

"امّاں! تو ہے بڑے کام کی چیز مگر ہر بات دیر سے سوچتی ہے۔ پہلے سوچنا تھا یہ سب کچھ اِتنا ٹائم نکال دیا" رشید کا لہجہ غیر مہذب تھا۔

"سُنو رشید! ذکیہ سے میرا رشتہ زیادہ گہرا نہیں ہے مگر جب دوسرے لوگ پل رہے ہیں تو تم کیوں نہ فائدہ اُٹھائیں۔ تمہارے ابا پہلے میری مان لیتے تو آج رنگ دوسرے ہوتے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم کس طرح اُن لوگوں کو ہاتھ میں لیتے ہو۔"

"اُنھیں تو تم مٹھی میں بند سمجھو" رشید نے مٹھی بند کرکے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اِتنا آسان نہیں ہے بیٹا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں اختیار والے ہیں کوئی ہلکی بات گلے تک پھنس جائے گی پہلے تم اپنے رنگ ڈھنگ بدل لو۔"

"کیسے بدل لوں۔ بولو کیا کروں؟"

"گفتگو کرنے کا انداز۔ چال ڈھال۔ یہ بالوں میں تیل گلے میں رُومال یہ سب کچھ نہیں چل سکتا" طفیلی بیگم نے کہا۔

"تو آپ فرمایئے نا امّی جان۔ خادم کو کیا کرنا چاہیئے۔ اللہ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا" رشید نے لچکتے ہوئے کہا۔

"اب زنخا بننے کی بھی ضرورت نہیں ہے پٹھان کا بیٹا ہے تو پٹھان بن" طفیلی بیگم نے کہا۔

"امّاں تو یہ اپنی دوغلی پالیسی میرے ساتھ مت چلا کر۔ تیزی سے بات کی تو زنخا بنادیا پٹھان کا بیٹا ہوں قسم اللہ کی لوگ خاں صاحب کہہ کر بات کرتے ہیں۔"

"اپنے عادات و اطوار درمیانہ رکھتے ہیں۔ نگاہ جُھکا کر بات کرنا لہجے میں شائستگی ہونی چاہیئے۔ یہی چیزیں انسان کو متاثر کرتی ہیں۔"

"آج تو تیری آواز بھی بدلی ہوئی ہے امّاں۔ ٹھیک ہے۔ امّی جان آپ میرے بارے میں فکرمند نہ ہوں میں حالات سنبھال لوں گا" رشید نے کہا۔

"بالکل بالکل۔ بس یہ انداز ٹھیک ہے" طفیلی بیگم نے کہا۔ پھر اُنھیں تار ملا تو وہ مسرت سے دیوانی ہوگئیں۔ رشید نے چولا بدل لیا۔ اور دونوں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔

عرصۂ دراز ہوگیا تھا لیکن طفیلی بیگم اور ذکیہ بیگم دونوں ہی نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ طفیلی بیگم نے ذکیہ بیگم کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے تھے۔

"خود کو سنبھالو طفیلی۔ چلو گھر چلیں۔ یہ رشید ہے" رشید نے ادب سے ذکیہ بیگم کو سلام کیا۔ پھر بولا۔

"معاف کیجئے خالہ جان آپ کا نالائق بھانجہ آپ کے لئے گاڑی مہیا نہ کرسکا تانگے سے سفر کرنا ہوگا آپ کو۔"

"کوئی بات نہیں ہے بیٹے تانگہ کرلو" ذکیہ بیگم نے کہا۔ عارفہ بیگم گہری نگاہوں سے طفیلی بیگم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ خود طفیلی بیگم نے ایک لمحے میں اُنھیں پہچان لیا تھا۔ عارفہ بیگم کو اِس تھتے میں دیکھ کر بُری طرح سلگ گئی تھیں لیکن عقل نے فوراً لائحہ عمل مرتب کرلیا۔ حیران تھیں کہ عارفہ بیگم اِس قدر مُنہ چڑھ گئی ہیں کہ ساتھ لگی چلی آئیں۔ اِس لئے سمجھداری کا تقاضا ہے کہ بلی کے گُتے سے بھی پیار کرو اور بعد میں اُس کی دُم اُکھاڑ کر ہاتھ پر رکھ دو۔ عارفہ بیگم پر تو اُن کے بہت سے حساب باقی تھے۔"

رشید دو تانگے لایا تھا۔ ایک پر اُس نے سامان رکھا اور فضل خاں کو ساتھ بٹھا لیا۔ دوسرے پر اُن لوگوں کو سوار ہونے کے لئے کہا تو ذکیہ بیگم نے کہا۔

"ارے رشید میاں دو تانگوں کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ کے رتبے کا خیال جو رکھنا ہے مجھے خالہ جان۔ میں آپ کے ملازم کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔ آپ تشریف رکھیے۔" رشید نے کہا اور خود دوسرے تانگے پر جا بیٹھا۔

"رشید ماشاء اللہ بہت شائستہ مزاج بچہ ہے۔ ارے ہاں طفیلی بیگم تم نے عارفہ بیگم سے سلام دُعا نہیں کی؟"

"عارفہ بیگم؟ کون ناصر علی کی بیوی۔ یہ عارفہ بیگم ہیں؟" طفیلی بیگم نے کہا۔

"ذکیہ بیگم کو تو تم نے ریل سے اُترتے ہی پہچان لیا طفیلی بیگم۔" عارفہ بیگم بولیں۔

"ہائے عارفہ آپا۔ آپ کو کیا ہو گیا؟ یہ صحت کیسی ہو گئی آپ کی؟ ارے آپ کے گال تو ٹماٹر کی طرح سُرخ رہتے تھے، مثالیں دیتے تھے، ہم آپ کی صحت کی یہ کیا حال بنا لیا آپ نے اپنا؟" طفیلی بیگم عارفہ بیگم سے چمٹ گئیں۔ اور عارفہ بیگم مشکل میں پڑ گئیں۔ اب اِس خلوص کے جواب میں دھکا تو نہیں دیا جا سکتا تھا اخلاق بھی کوئی چیز ہے اور پھر طفیلی بیگم کے الفاظ بہت متاثر کُن تھے۔ اِس سے پہلے کبھی کسی نے اُن کے گالوں کو ٹماٹر کی طرح سُرخ نہیں کہا تھا نہ اُنھوں نے کسی کی زبانی اپنی صحت کی مثال سُنی تھی دِل خواہ مخواہ نرم ہو گیا چنانچہ وہ آہستہ سے بولیں۔

"حالت تو تمھاری بھی بہت خراب ہو گئی ہے طفیلی بیگم۔"

"زندہ ہیں یہی بہت ہے عارفہ آپا۔ کیا کیا بیتی ہے تمھاری طفیلی پر، سُنو گی تو رو پڑو گی۔"

تانگے طفیلی بیگم کے گھر پر پہنچ گئے۔ چھوٹا سا گندا سا گھر تھا۔ رشید نے تالا کھولا اور سب کو اندر لے گیا۔

"کچھ کہنا نہیں ذکیہ اِس گھر کو دیکھ کر بس اندازہ لگا لینا ہماری زندگی کا۔" طفیلی بیگم نے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو طفیلی؟" ذکیہ بیگم نے دلسوزی سے کہا۔ رشید اُن کی خاطر مدارت کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ مقدور بھر کوششیں کی گئیں رشید نے وہ ردل ادا کیا کہ طفیلی بیگم سرشار ہو گئیں اپنی تربیت پر ناز ہونے لگا اُنھیں۔

رات ہو گئی۔ دِن تو چٹکی بجاتے گزر گیا تھا۔ دالان میں تخت بچھے ہوئے تھے اُنھیں پر بستر لگ گئے رشید کھانے میں شریک رہا اس کے بعد باہر چلا گیا اُسے کام کرنا تھا۔ طفیلی بیگم نے کہا۔

"مجھے تمھارے آجانے کی اُمید نہیں تھی ذکیہ۔ تار دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رشید کہہ رہا تھا کہ امی اتنے بڑے لوگ اتنے سادہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ دراگر ایسے تھے تو اب تک کہاں تھے؟"

"ہمارا جتنا قصور ہے تمھیں معلوم ہے طفیلی۔ مرحوم زمان بھائی نے کبھی دِل نرم نہ کیا، رہی احسان کی بات تو تم شاید یقین نہ کرو کہ وہ بے حد صاف دِل کے انسان ہیں تمھارے خط کے بارے میں سُنا تو سب کچھ بھول کر فوراً بولے کہ جاؤ اُن لوگوں کو یہاں لے آؤ۔"

"ہائے کس مُنہ سے جاؤں گی اُن کے سامنے...؟"

"مِل تو لینا ہی طفیلی اگر کراچی نہ رہنا چاہو تو کہہ دینا یہیں فیصل آباد میں کوئی دوکان وغیرہ کروا دیں گے رشید کو۔" عارفہ بیگم زہر افشانی سے باز نہ رہ سکیں۔

"ہاں عارفہ ہم اُس جگہ رہنے کے قابل کہاں ہیں۔" طفیلی بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا لیکن اِس سانس میں گرم بھپکے چھپے ہوئے تھے جنھیں ابھی کوئی نہیں محسوس کر سکا تھا۔

"نہیں طفیلی بس اب تمھیں میرے پاس رہنا ہو گا۔ صبح اُٹھتے ہی سامان باندھ لو اکیلی فیصل آباد میں رہ کر کیا کرو گی رشید کا مستقبل تمھارے سامنے ہے۔ بڑا نفیس بچّہ ہے مجھے تعجب ہے اِس کے اندر زمان بھائی جیسا اکھڑ پن نہیں ہے۔"

"جیسی تمھاری مرضی۔" طفیلی بیگم نے کہا۔ اور عارفہ بیگم بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں۔ یہ احساس بھی تھا کہ طفیلی خود ذکیہ بیگم کی عزیز ہے اِس لئے کچھ زیادہ بولیں تو کہیں ذکیہ بُرا نہ مان جائیں۔

دوسری صبح فضل خاں کو ریلوے اسٹیشن بھیج دیا گیا اور سب کے لئے ٹکٹ منگوائے گئے دوسرے دِن کے ٹکٹ ملے تھے رشید کو معلوم ہوا تو اُس نے گردن خم کر دی "میرے بڑوں نے کوئی فیصلہ کیا ہے تو میں کیا بول سکتا ہوں۔"

"وہاں پہنچ کر تمھیں خوشی ہو گی بیٹے۔ کبھی کراچی گئے ہو اِس دوران؟"

"نہیں خالہ جان۔ کنوئیں کا مینڈک ہوں صرف ایک بار لاہور گیا تھا اور بس باقی زندگی فیصل آباد ہی میں گزری ہے۔"

"اب کراچی کی زندگی دیکھو۔"

"جی!" رشید نے گردن خم کر دی۔

عارفہ بیگم کی لاعلمی میں ذکیہ بیگم نے طفیلی بیگم کو ایک معقول رقم دی اور کہا کہ رشید کے لئے اور اپنے لئے کچھ ریڈی میڈ جوڑے خرید لیں۔ باقی انتظامات وہاں جا کر ہو جائیں گے۔ طفیلی بیگم نے آنسو بھری آنکھوں سے یہ رقم قبول کر لی تھی اور پھر رشید کو ہدایات دے کر باہر بھیج دیا گیا۔

دوسرے دِن وہ سب کراچی چل پڑے۔ عارفہ بیگم گم صُم تھیں

رشید دِل میں مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا ذکیہ بیگم طفیلی بیگم سے باتیں کر رہی تھیں طفیلی بیگم نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ عارفہ بیگم تنگ ہی ہیں اُنھوں نے سوچ لیا تھا کہ عارفہ میرا نام بھی طفیلی ہے ناکوں چنے نہ چبوا دیئے تو نام بدل لوں گی اپنا۔

ٹرین کا سفر جاری تھا پھر وہ کسی اسٹیشن پر رُکی اور رشید دروازے پر کھڑا ہو کر باہر کا نظارہ کرنے لگا پھر سگنل ہوا اور ٹرین چل پڑی رشید واپس پلٹ آیا اور ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ زیادہ سفر نہیں طے ہوا تھا کہ باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی اور کوئی اندر گھس آیا۔ آنے والے کا حلیہ عجیب سا تھا۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی بال بکھرے ہوئے بوسیدہ سی پتلون جس کی قمیص باہر نکلی ہوئی تھی۔ اُس کے پیچھے ہی چیکر اندر آ گیا تھا۔

"معاف کیجئے گا آپ لوگ ڈسٹرب ہوئے۔" چیکر نے اُن لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا اور آگے بڑھ کر نوجوان کی قمیص کا کالر پکڑ لیا۔ "باہر نکلتا ہے کہ لگاؤں ایک ہاتھ۔"

"ریل بابو۔ ہم غریب آدمی ہیں جی۔ قمیص چھوڑ دو پھٹ جائیگی۔ گاڑی رُکی تو اُتر جائیں گے ہمارا تو سامان بھی دوسرے ڈبے میں ہے۔" نوجوان نے کہا۔

"تم اِس کمپارٹمنٹ میں چڑھے ہی کیوں...؟"

"پانی پی رہے تھے جی ریل چھوٹ گئی۔ ہم نے آواز بھی لگائی کہ روک کے اُستاد اب تم نے روکی نہیں تو ہم کیا کرتے دیکھ لو قمیص بھیگ رہی ہے نلکے میں اوپر سے پانی نکل رہا تھا جی معاف کر دو ریل بابو۔"

"چلو باہر نکلو۔" چیکر نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تم دھکا دے دو گے جی۔ ریل رُکے گی تو ہم خود اُتر جائیں گے۔" نوجوان نے ایک سیٹ پکڑ لی۔

"رہنے دو چیکر۔ کوئی بات نہیں ہے کسی دوسرے اسٹیشن پر اُتر جائے گا۔"

"آپ نہیں جانتیں بیگم صاحبہ۔ آج کل اِس قسم کے لوگ ٹرینوں میں وارداتیں کرتے ہیں مجھے یقین ہے کہ یہ کسی بُری نیت سے اِس کمپارٹمنٹ میں آیا ہے۔"

"چھوڑ دو اِسے پلیز۔ یہ غیر انسانی سلوک ہے۔ اِس کا کالر چھوڑ دو۔"

"ہماری ڈیوٹی ہے بیگم صاحبہ۔" چیکر نے کہا اور پھر نوجوان کو گھسیٹنے لگا

"ریلوے کا قانون بھی جانتی ہوں۔ تم قانوناً بھی اِس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتے۔ چھوڑ دو اِسے۔" ذکیہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا اور چیکر نے نوجوان کا کالر چھوڑ دیا۔

"ٹکٹ کہاں ہے تیرا...؟" وہ بولا۔

"یہ ہے جی۔" نوجوان نے جیب سے ٹکٹ نکال کر چیکر کے سامنے کر دیا۔

"چل باہر نکل کر بیٹھ جا۔" چیکر غُصیلے لہجے میں بولا۔

"بہتر ہے اِسے یہیں رہنے دو۔"

"کمال ہے بی بی۔ یہ لے کے ہے اور اِس کے پاس ٹکٹ نہیں لِسے ایک منٹ بھی یہاں نہیں چھوڑوں گا۔"

"یہ لو اِس کا ٹکٹ بنا دو۔ یہ بھی قانون ہے۔" ذکیہ بیگم نے پرس سے نوٹ نکال کر چیکر کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"ٹھیک ہے کسی واردات کے ذمّہ دار ہم نہیں ہوں گے۔" چیکر نے جھٹکے دار آواز میں کہا اور ٹکٹ بنانے لگا۔ کراچی تک کا ٹکٹ تھا چیکر ٹکٹ اُن کے ہاتھ میں تھما کر باہر نکل گیا۔

"وہ ضرور ہمیں باہر دھکا دے دیتا بیگم صاحبہ۔ وہ تو ہم نے ریل کے ڈنڈے پکڑ لئے۔" نوجوان نے کہا۔

"تم نیچے اُترے کیوں تھے؟"

"پیاس لگ رہی تھی جی۔" اُس نے معصومیت سے جواب دیا اور ذکیہ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شکل سے اُچکا ہی لگتا ہے کیا مصیبت پال لی تم نے ذکیہ بیگم۔" عارفہ بیگم نے سرگوشی کی لیکن ذکیہ بیگم نے اُس پر توجہ نہیں دی تھی۔

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"خیر دین ولد بشیر دین۔"

"ولد بشیر دین بھی؟" ذکیہ بیگم ہنس پڑیں۔

"پورا نام یہی ہے جی۔"

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں سے جی۔"

"کونسا گاؤں ہے تمھارا؟"

"خدا پھیری چک نمبر اٹھارہ ضلع گجرانوالہ جی۔" نوجوان نے فٹافٹ جواب دیا۔

"کہاں جا رہے تھے؟"

"نوکری کرنے۔"

"کراچی؟"

"ہاں جی۔"

"کیا نوکری کرو گے؟" ذکیہ بیگم نے کہا اور نوجوان سر کھجانے لگا۔ پھر اُس نے باری باری ذکیہ بیگم، عارفہ بیگم، فضل خاں، رشید اور پھر طفیلی بیگم کی شکل دیکھی پھر بولا۔

"نہیں معلوم جی۔"

"کوئی کام آتا ہے؟"

"ہاں جی۔"

"کیا آتا ہے؟"

"وہ جی بھینسوں کو نہلا لیتے ہیں۔ دُودھ نکال لیتے ہیں اور جی چوکیداری بھی کر لیتے ہیں سب کر لیتے ہیں ہم۔" آخر میں اُس کا لہجہ فخریہ ہو گیا جیسے اپنے ہرفن مولا ہونے پر اُسے فخر ہو۔

"ہوں۔ کمال ہے۔" ذکیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انھیں اِس معصوم نوجوان پر پیار سا آنے لگا تھا۔ پھر اُنھوں نے کہا۔ "تم تو واقعی شاندار آدمی ہو خیر دین کراچی میں کوئی جاننے والا ہے؟"

"کوئی نہیں ہے جی، بس اللہ مالک ہے۔"

"میرے ساتھ چلو میں تمھیں نوکری دُوں گی۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔ اور رشید چونک کر اُنھیں دیکھنے لگا۔ خیر دین کا مُنہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔ بمشکل تمام اُس نے کہا۔

"آپ جی۔ آپ... آپ کے پاس نوکری ہے؟"

"ہاں ہے۔" ذکیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا اور خیر دین اُچھل کر اُن پر آ رہا تھا اُس نے ذکیہ بیگم کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔

"ارے ارے۔ سُنو۔ خیر دین نہیں بھئی۔ چھوڑو میرے پاؤں..." ذکیہ بیگم بوکھلا کر بولیں۔ رشید سے برداشت نہیں ہو سکا تھا۔ اُس نے غصّے ہوئے انداز میں خیر دین کی کمر پکڑ لی لیکن اپنے تمام تن و توش کے باوجود وہ اُسے ہلا بھی نہیں سکا تھا۔

"آپ نے ہمیں دروانے در بھٹکنے سے بچا لیا جی۔ ہم آپ کی غلامی کریں گے بیگم جی۔ آپ کے لئے جان دے دیں گے جی۔" وہ ذکیہ بیگم کے پاؤں پکڑے پکڑے بولا۔

"میرا حکم بھی مانو گے؟" ذکیہ بیگم بولیں۔

"مانیں گے جی۔" وہ بولا۔

"تو فوراً میرے پاؤں چھوڑ دو۔ یہ میرا حکم ہے۔" ذکیہ بیگم نے کہا اور اُس نے ذکیہ بیگم کے پاؤں چھوڑ دیئے۔ "اب وہاں جا بیٹھو۔" اُنھوں نے ایک طرف اشارہ کیا اور خیر دین دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔ رشید نے کہا۔

"میں آپ کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دینا چاہتا خالہ جان لیکن ایسے لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ آدمی۔ اتنا معصوم نہیں لگتا جتنا نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"نہیں رشید، یہ معصوم ہے۔ کسی سادہ کاغذ کی مانند نوکری کی تلاش میں نکلا ہے۔ پہلی بار کراچی جا رہا ہے اور کراچی؟ تم اِس کے بارے میں نہیں جانتے رشید، دیکھو گے تو جانو گے۔ اچھا ہے مجھے مل گیا۔ ورنہ واقعی نہ جانے کہاں بھٹکتا پھرتا۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

رشید خاموش ہو گیا۔

کافی دیر کے بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر رُکی تو ذکیہ بیگم نے اُس سے اپنا سامان لانے کے لئے کہا اور وہ پھرتی سے دوسرے ڈبے میں جا کر ایک بوسیدہ سا تھیلا اُٹھا لایا۔

❀

ثناء نے نُدرت کو دعوت نامہ دے دیا تھا اور نُدرت نے اُس پر مسٹر جمن کا نام لکھ لیا تھا۔ دوپہر کو نُدرت باورچی خانے کی طرف نکل گئی اُسے دیکھ کر جمن کی آنکھوں میں ستارے اُتر آئے تھے۔

"وہ خُدا کی قُدرت سے ہمارے باورچی خانے میں آئیں۔ اور۔ اور..." جمن پورا شعر یاد کرنے لگا۔

"اور ہم اُنھیں چائے نہ پلائیں۔" نُدرت نے شعر پورا کر دیا۔

"ایں... ہاں ضرور۔ شاید کچھ اور تھا۔" جمن سر کھجاتا ہوا بولا۔

"یعنی اِس شعر میں چائے نہیں تھی؟"

"ایک نہیں دو پیالیاں تھیں۔ ابھی بناتا ہوں۔" جمن نے مسرُور لہجے میں کہا اور نُدرت کو اسٹول پیش کر دیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"کفگیر چل رہا ہے اللہ کے فضل سے۔"

"کب تک چلتا رہے گا؟"

"بس پیاز لال ہو جائے۔" جمن ترکی بہ ترکی بولا اور نُدرت نے کھانس کر قہقہہ دبا لیا۔

"جانتے ہو میں کیوں آئی ہوں؟"

"اے جذبہ دل گر تو چاہے۔" جمن نے پھر شعر پڑھنے کی کوشش کی۔

"میں چاہوں۔" نُدرت نے تصحیح کی۔

"چلئے آپ ہی سہی۔ ایک ہی بات ہے۔" جمن بولا اور نُدرت کے آنسو نکل آئے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جمن نے چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔

"اِس وقت میں جذبۂ دل کی چاہت کے تحت نہیں آئی۔"

"پھر...؟"

"کمال کے آدمی ہو جمن۔ دعوے بھول جاتے ہو۔ کچھ کہا تھا میں نے تم سے۔"

"ایں... کب...؟" جمن نے پوچھا۔

"یہ کارڈ ہے تمھارے لئے پڑھوا ہے۔" نُدرت نے کارڈ اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"مم... مسٹر جمن۔ ہی ہی ہی کیا ہے؟"

"سالگرہ کا دعوت نامہ ہے تمھارے لئے۔"

"کس کا ہے؟"

"صائمہ روشن علی کا۔"

"ارے باپ رے۔ وہ تو... وہ تو بہت بڑی آدمی ہیں۔"

"جی نہیں، وہ ایک اکیس سالہ لڑکی ہے۔"

"میرا مطلب ہے میرے لئے یہ دعوت نامہ کیوں دیا اُنھوں نے۔ کیا سالگرہ میں کچھ پکوانا ہے؟"

"پھر وہی باورچی پن کی باتیں۔"

"مگر...؟"

"تمھیں معلوم ہے سہیلیاں ایک دوسرے کی راز دار ہوتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔"

"فلموں میں دیکھا ہے۔"

"بالکل ویسا ہی۔ صائمہ کو میرے دِل کا حال معلوم ہو چکا ہے۔"

"دِل کا بھی۔ ہی ہی ہی۔" جمن نے شرما کر کہا۔

"بس اِسی لئے تمھیں دعوت نامہ بھجوایا گیا ہے۔"

"وہاں... مجھے گانا بھی گانا پڑے گا کیا؟" جمن خوابوں میں کھو گیا۔

"کیا...؟" نُدرت نے آنکھیں پھاڑ دیں۔

"سب کہیں گے گاؤ۔ میں منع کر دُوں گا کہ میرا گلا خراب ہے پھر سب تم سے کہیں گے اور آپ مجھ سے کہو گی۔ گا دو نا۔ اور میں۔"

"خُدا کے لئے جمن عزیز۔ کوئی کتنا بھی کہے تم نہ گاتا تمھیں خُدا کا واسطہ۔" نُدرت نے بے تحاشہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اور جمن چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"کیوں... کیوں نہ گاؤں میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں...؟" جمن بولا۔

"تمھیں اپنی اکلوتی ماں کی قسم جمن۔ ایسا نہ کرنا۔"

"آپ رُسوا ہو جاؤ گی اللہ رکھی۔" جمن نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔ بالکل یہی بات ہے ڈیئر جمن۔ دیکھو پانی پک گیا ہے..." نُدرت نے کہا۔ جمن نے چائے کی پتی ڈالی اور بدستور مسکراتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے میں منع کر دُوں گا۔"

"خُدا کا شکر ہے۔" نُدرت گہری سانس لے کر بولی پھر بولی۔ "جُوتے اور موزے خرید لئے تم نے۔"

"آج رات کو تمھیں دکھانے والا تھا۔ باٹا کی دوکان سے خریدا ہے پورے دو سو دس روپے کا۔"

"اب اُن کا موقع نہیں ہے۔ وہیں دیکھوں گی تم ٹھیک سات بجے پہنچ جانا۔ ٹائی تو باندھ لو گے نا؟"

"کیوں نہیں۔ میں نے پریکٹس کر لی ہے۔" جمن نے جواب دیا۔ نُدرت نے پرچ میں ڈال کر چائے سڑپی اور پھر تیزی سے وہاں سے نکل آئی۔

اُس کا چہرہ لعل بھبوکا ہو رہا تھا ثناء کے کمرے میں داخل ہو کر وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ رِدا بھی وہیں موجود تھی۔ نُدرت نے جمن سے ہونے والی پوری گفتگو اُن دونوں کو سُنائی اور سنجیدہ رِدا بھی قہقہے نہ روک سکی۔ اِس کے بعد شوکت جہاں سے نُدرت کے لئے اجازت کا مسئلہ تھا جس کیلئے رِدا اور ثناء دونوں ہی تین نمبر میں پہنچ گئی تھیں۔ شوکت جہاں نے کہا۔

"میں منع نہیں کرتی بیٹی لیکن..."

"لیکن کیا خالہ جان؟"

"نُدرت وہاں کھپ سکے گی؟"

"خالہ جان! آپ کے ذہن سے یہ احساس نکالنے کے لئے پتہ نہیں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ نُدرت میری دوست ہے آپ یُوں سمجھ لیں کہ اُس کی توہین مجھے آپ کی زبانی بھی پسند نہیں۔"

"کہیں کوئی بات ہو گئی ثناء تو تمھیں ہی سنبھالنی ہو گی۔ ہم تو خاموشی سے اِس کوارٹر سے چلے جائیں گے۔"

"اگر آپ مجھ پر یہ اعتماد کر لیں تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اتنا اعتماد تو کریں مجھ پر۔" ثناء نے کہا اور شوکت جہاں لاجواب ہو گئیں۔

رِدا سُرمئی ساڑھی میں آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ ثناء نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا تھا اور نُدرت پیازی رنگ کے لباس میں کھل رہی تھی۔ صائمہ روشن علی کی کوٹھی میں وہ لوگ اُتریں تو بہت سے چراغ بجھ گئے۔ ایک گوشے میں شہاب صاحب اپنے ایک بے تکلف دوست سے باتیں کر رہے تھے۔ رِدا کو دیکھ کر گُم صُم ہو گئے۔ اُن کے دوست تنویر نے اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آپ کے اہلِ خانہ ہیں شہاب؟"

"ایں۔ ہاں۔" شہاب صاحب سنبھل گئے۔

"سُرمئی رنگ شاید آپ کو بہت پسند ہے۔" تنویر مسکرایا۔

"دوستی کے کچھ آداب ہوتے ہیں تنویر۔ وہ میرے گھر کے لوگ ہیں۔" شہاب صاحب ناخوشگوار لہجے میں بولے۔

"سوری یار، ثناء کو میں جانتا ہوں تمھاری بھتیجی ہے یہ دونوں میرے لئے اجنبی ہیں میں نے تمھاری آنکھیں سُرمئی رنگ پر رُکتے ہوئے دیکھی تھیں۔"

"وہ بھی میری عزیز ہے۔" شہاب صاحب نے کہا اور پھر تنویر کو چھوڑ کر اُن لوگوں کی طرف بڑھ گئے۔ "ہیلو ثناء۔ ہیلو۔" اُنھوں نے رِدا اور نُدرت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہیلو انکل، بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں آپ۔" ثناء نے کہا۔

"شکریہ۔ اور کوئی نہیں آیا؟"

"کس کی تلاش تھی آپ کو؟" ثناء نے شرارت سے پوچھا اور شہاب صاحب کو کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اسی وقت صائمہ اُن کے قریب پہنچ گئی۔ رُدا کو اُس نے بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا اور پھر بے اختیار مسکرا پڑی تھی۔ اُس نے لوگوں کو خوش آمدید کہا اور اُن کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

"چند خواتین سے آپ لوگوں کو متعارف کرا دوں۔ وہ دیکھئے وہ سیاہ اور سُرخ لباس میں ملبوس نیلا حُسن ہے وہ آپ لوگوں کو خوشگوار انداز میں نہیں دیکھے گی۔ اور وہ ارشا حیات ہے وہ ایک خوبصورت تراش کے لباس میں اُس طرف جس کے بال سُنہرے ہیں اور تیسری شخصیت سمیرا نعمت کی ہے۔ وہ سفید پری جو فضاؤں میں اُڑتی پھر رہی ہے وہی باقی سب خیریت ہے۔"

"اِس پُراسرار گفتگو کا ترجمہ کون کرے گا؟" ثناء نے کہا۔

"وقت۔" صائمہ نے کہا اور پھر اُنھیں اپنی دوسری دوستوں سے متعارف کرانے لگی۔ ثناء کی بہت سی شناسا لڑکیاں تھیں سب آپس میں گھل مل گئیں۔ رُدا بھی سب سے ہنس ہنس کر گفتگو کر رہی تھی اور بہت سے گوشوں سے شہاب صاحب اُسے دیکھتے رہے تھے۔ اور بے شمار نگاہوں کا مرکز بن رہی تھی۔ درحقیقت وہ قدیم دور کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی چند معمر خواتین نے بھی اُس کے نیاز حاصل کئے تھے اور دوسروں سے اُس کے بارے میں پوچھتی رہی تھیں۔ سالگرہ کا کیک کاٹا گیا اور دلچسپیوں کا دور شروع ہو گیا۔ نُدرت کی نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔

دفعتاً اُس کا دل اُچھل کر حلق تک آ گیا۔ جمن نظر آ گیا تھا اس طرح اندر آیا تھا جیسے کسی اُلّو کو روشنی میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ اُس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ نُدرت نے ثناء کے بازو پر چٹکی لے کر کہا۔

"ہائے میرا جمن۔"

"آ گیا؟" ثناء اُچھل پڑی۔

"وہ دیکھو۔ وہ رہا۔" نُدرت نے اشارہ کیا۔ اور ثناء جمن کو دیکھنے لگی پھر اُس نے دونوں ہاتھ مُنہ پر رکھ لئے۔ شہاب صاحب قوی ہیکل آدمی تھے اُن کا سُوٹ جمن جیسے شخص کے بدن پر جس طرح آ سکتا تھا اُسی طرح آیا تھا۔ کوٹ بے حد ڈھیلا۔ پینٹ کی بیلٹ پیٹ باندھ کر کسی گئی تھی۔ قمیص کی بھی یہی حالت تھی ٹائی جُوتے اور موزے۔ پتلون کے پائنچوں کو کئی بار موڑا گیا تھا تب جُوتوں تک آئے تھے۔

"خُدا تجھے غارت کرے اللہ رکھی۔" ثناء پیٹ پکڑ کر بولی۔

"شکریہ۔ ویری شکریہ۔ میں کس قابل ہوں۔" نُدرت نے نیازمندی سے کہا۔

"ارے بھاگ رہا ہے روک دے۔" ثناء نے ایک دم کہا۔ جمن پریشان نظر آ رہا تھا اور شاید یہاں سے بھاگ جانے کے چکر میں تھا۔

"ابھی لو۔" نُدرت نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ ثناء رُدا کو جمن کی تفصیل بتانے لگی اور رُدا کا چہرہ بھی سُرخ ہو گیا۔ اُس نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

"زیادتی کی ہے بے چارے کے ساتھ، انسان کی یہ تذلیل مناسب نہیں ہے ثناء۔"

"ارے دیکھو تو سہی، دیکھو تو سہی۔ کیا لُطف آ رہا ہے، خُدا کی قسم رُدا مزا آ گیا۔" ثناء نے اُس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ نُدرت جمن کے قریب پہنچ گئی تھی۔ جمن نے اُسے دیکھا اور اُس کی جان میں جان آئی۔

"ہیلو اللہ... اللہ!"

"رکھی۔" نُدرت نے جلدی سے اُس کا جُملہ پُورا کر دیا۔

"ہاں وہی۔ ہم مگر لگ کہاں پھنسا دیا۔ یہاں تو سب کے سب، سب کے سب بڑے آدمی ہیں۔"

"آہ جمن، تم نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا، یہ بتاؤ یہ لباس پہن کر آئینے کے سامنے گئے تھے یا نہیں؟"

"مُنہ دیکھا تھا آئینے میں، لباس تو نظر ہی نہ آ سکا چھوٹا سا آئینہ تھا نا۔" جمن نے جواب دیا۔

"تو پھر میری آنکھوں میں دیکھو اپنے آپ کو۔ کیا لگ رہے ہو تم جمن کیا لگ رہے ہو۔ میرے خیال میں اِس وقت اِس پورے مجمع میں تم سے زیادہ حسین انسان کوئی نہیں ہے، یہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے جمن، یہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔" نُدرت نے انتہائی پُرمسرت لہجے میں کہا اور جمن کے بدن میں جیسے جان پڑ گئی۔

"میں تو... میں تو بہت گھبرا رہا تھا۔"

"بس اِسی گھبراہٹ پر قابو پانا ہی تو بڑائی ہے جمن۔ ورنہ تم خود سوچو اُن بڑے آدمیوں میں اور کون سی خاص بات ہے، دو ہاتھ دو پاؤں، ویسا ہی جسم، ویسا ہی حُلیہ، بس یہ گھبراتے نہیں ہیں۔"

"تب تو ٹھیک ہے، میں بھی نہیں گھبراؤں گا۔ وہ جو کہتے ہیں نا، تنگی وقت سے نہ گھبرا اے عقاب۔"

"ہاں بالکل بالکل یہی سب کچھ کہتے ہیں۔ اُن تمام لوگوں میں گھل مل جاؤ، اِس طرح گھومو پھرو، جیسے تم ایک معزز مہمان ہو، میں دُور سے تمھیں دیکھوں گی۔"

"دُور سے کیوں؟" جمن بوکھلا کر بولا۔

"نہیں جمن ابھی ہم اپنی محبت کی رُسوائی نہیں چاہتے تم سمجھتے ہو۔"

"او ہاں ہاں۔ واقعی دُنیا کی نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں اور ظالم سماج دو دلوں کے بیچ میں گھپلا کر دیتا ہے۔"

"ارے تم تو بہت سمجھدار ہو جمن، یہ گھپلے والی بات بھی جانتے ہو۔"

"بالکل جانتا ہوں اللہ رکھی۔" جمن نے جواب دیا۔

"تو کیا میں یقین رکھوں کہ اب تم یہاں کی دلچسپیوں میں پوری طرح حصّہ لو گے؟ کوئی تم سے تمھارا نام پوچھے تو تم اپنا نام جمیل احمد بتا سکتے ہو۔"

"کک کیا...؟"

"جمیل احمد عُرف جمن۔ لیکن عُرفیت بتانے کی ضرورت نہیں تم صرف اتنا کہہ دینا کہ خادم کو جمیل احمد کہتے ہیں۔" نُدرت نے کہا اور جمن سر ہلانے لگا۔

"خادم کو جمیل احمد کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے اللہ رکھی تب یہی کہوں گا۔"

"ویری گُڈ۔ ویری گُڈ۔ کیا بانکپن ہے اِس انداز میں۔ بالکل ایسا ہی میں چاہتی ہوں۔" نُدرت نے کہا اور جمن نے گردن ہلا دی، نُدرت سادگی سے گردن جُھکا کر پلٹ پڑی تھی، لیکن اُس کے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو رہی تھی۔

جمن کی حالت اب بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ نُدرت نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر شہاب صاحب کو تلاش کیا لیکن شہاب صاحب کسی دُور دراز گوشے میں تھے، اِس لئے اُسے نظر نہیں آ سکے، بہرطور ابھی جمن کی خیریت ہی رہنی چاہیئے اگر شہاب صاحب پر نگاہ پڑ گئی تو اُس کی حالت ویسے ہی خراب ہو جائے گی۔

وہ واپس رُدا اور ثناء کے پاس پہنچ گئی۔ رُدا اور ثناء کے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو چکی ہیں ہنسی روکنا بھی ضروری تھا۔ مجمع عام میں اِس طرح ہنسنا بدتمیزی میں شمار ہو جاتا ہے، لیکن دِل میں اور پیٹ میں مچلتے ہوئے قہقہوں کا وہ کیا کرتیں۔ تو چہرے سُرخ کئے دے رہے تھے۔

"کیا کیفیت ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" نُدرت بولی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" ثناء نے پوچھا اور نُدرت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کہتا کیا بے چارہ، وہ اِس قابل ہی کب ہے۔ بس گھبرا رہا تھا میں اُسے معجون مقوی خاص دے آئی ہوں، اُس کے زیرِ اثر اب اُسے قوتیں حاصل ہو گئی ہیں اور وہ اِس دُنیا کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہے۔" نُدرت نے جواب دیا۔

"بڑی انتہاپسند ہو نُدرت، اپنی حد تک بات رہتی تو ٹھیک تھی لیکن بھئی تم تو یوں لگتا ہے جیسے ہرکولیس ہو، بڑی ہمت کی تم نے واقعی۔ عام انسان اِتنی دلیری سے یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔" رُدا نے کہا۔

"مزا آیا تا مونا لیزا، تم آج مُسکرانے کی بجائے ہنس رہی ہو، بس یوں سمجھ لو کہ ہماری محنت وصُول ہو گئی۔" نُدرت نے کہا۔

"مگر بھئی بے چارہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔"

"ہونا چاہیئے۔ آپ کو اُس سے نہیں مجھ سے دلچسپی ہونی چاہیئے، ذرا سوچئے رُدا صاحبہ اگر اُس کا رشتہ آپ کے لئے پہنچ جاتا تو آپ کی ذہنی حالت کیا ہوتی۔" نُدرت جھلا کر بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے نُدرت، لیکن انتقام کچھ زیادہ ہی سخت ہو گیا ہے۔"

"ابھی کیا ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔" نُدرت نے کہا۔ صائمہ ایک بار پھر اُن کے قریب آ گئی اور اُس کے بعد وہ دوسری رنگ رلیوں میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن نگاہیں بچا بچا کر وہ جمن کو دیکھ لیا کرتی تھیں اور پھر صائمہ نے پُوچھ ہی لیا۔

"یہ صاحب کون ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آئے، عجیب کارٹون سی شخصیت ہے اُن کی۔"

رُدا، ثناء اور نُدرت تینوں اُچھل پڑی تھیں "کس کی طرف اشارہ ہے تمھارا؟" ثناء نے پوچھا۔

"وہ... وہ دیکھو، بہت ڈھیلا ڈھالا لباس، جیسے کسی کا مانگ کر پہن آئے ہیں، میں تو پہچانتی نہیں۔"

"سُنو ڈیئر یہ وہی شخصیت ہے جس کے لئے میں نے تم سے سادہ کارڈ طلب کیا تھا۔" ثناء نے کہا۔

"کیا مطلب...؟"

"منگوایا تھا نا ایک کارڈ میں نے تم سے۔"

"ہاں۔"

"تو یہ شخصیت جناب جمن صاحب کی ہے۔"

"مگر یہ ہیں کون؟"

"تمھارے آج کے پروگرام کے ہیرو، سچ بتانا صائمہ اُس سے عُمدہ شخصیت کسی اور کی لگ رہی ہے۔" صائمہ بے اختیار ہنس پڑی، اُس نے ثناء سے کہا۔

"ثناء تجھے تو میں اچھی طرح جانتی ہوں، مگر یہ کون بے چارہ ہے، کس بانگڑو کو پکڑ لائی ہے، مقصد کیا ہے تیرا؟"

"تفریح صرف تفریح۔ تمھاری اِس انجمن کو گُل و گلزار بنانے کے لئے ہم نے اِس شخصیت کا انتخاب کیا ہے سمجھیں، یہ بتاؤ مزا آ رہا ہے یا نہیں؟"

"لوگ اِس کے بارے میں چہ مگوئیاں کر رہے ہیں لیکن ظاہر ہے تہذیب اِس کی اجازت نہیں دیتی کہ اُس سے تعارف حاصل کیا جائے۔ وہ اب تم نے مجھے بتا دیا بڑا اچھا کیا، اُس کا خاص طور سے خیال رکھا جائے گا۔ مگر خُدا کے واسطے یہ تو بتا دو کہ وہ ہے کون؟"

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں، آپ کی وہ پُراسرار مُسکراہٹ، وہ پُراسرار

الفاظ، جن کی تشریح وقت کرے گا، ہمیں یاد ہیں۔ اِس کی شخصیت کی رُونمائی بھی وقت ہی کرے گا۔" ثناء نے جواب دیا۔

"بہرطور مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، تمہارا طلب کیا ہُوا مہمان ہے اور میرے لئے باعثِ عزت" صائمہ روشن علی نے کہا اور ثناء نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

جمن بے چارہ کسی سے کیا گھل مِل کے بیٹھتا، البتہ کچھ شرارت پسند نوجوان خود ہی اُسے گھیر کر بیٹھ گئے تھے۔ تینوں کی نگاہیں اس طرف جمی ہوئی تھیں اور اُنھیں بے حد لطف آ رہا تھا۔

جمن شاید اپنے آپ کو بڑا آدمی بتانے کے لئے پوری طرح کوشاں تھا کیونکہ اُن لوگوں کے قہقہوں کے باوجود وہ اُن لوگوں سے گفتگو کرتا جا رہا تھا۔ ندرت نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"اپنے جمن میں صلاحیتیں موجود ہیں تم لوگ دیکھ لینا ایک دن۔"

"بس کر خدا کے لئے بس کر اللہ رکھی اب تو پیٹ میں درد ہونے لگا ہے۔" ثناء نے کہا۔ رُدا بھی ہنس رہی تھی۔

"مجھ سے تو اُس بے چارے کی طرف دیکھا بھی نہیں جاتا۔" رُدا بولی۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے جل رہی ہو تم سب میرے جمن سے دیکھنا وہ ایک دن اِسی زمین پر کیا بن کر اُبھرتا ہے۔" ندرت نے جواب دیا۔

سالگرہ میں بہت سی دلچسپیاں رکھی گئی تھیں کھانے کے بعد آخری پروگرام ہُوا۔ صائمہ روشن علی کے بڑے بھائی نے تمام لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"خواتین و حضرات اپنی بہن کی سالگرہ میں، میں آپ لوگوں کی شرکت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ہمیشہ کی طرح آپ نے اس بار بھی ہماری عزت افزائی کی ہے سالگرہ کی تقریب اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ اور آخری مرحلہ آپ کی دلچسپی کے لئے اب پیش کیا جاتا ہے۔ آج کی محفل میں ہم نے ایک خفیہ جیوری ترتیب دی تھی جس کا کام یہ تھا کہ اپنے معزز مہمانوں میں سب سے جامہ زیب اور سب سے حسین شخصیت کا انتخاب کیا جائے، اِس کے لئے ہم نے ایک خاتون اور ایک مرد کا انتخاب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جیوری نے ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کر دیا ہے اور اب ہم جیوری کے اِس فیصلے کا اعلان کرتے ہیں۔"

نیلا حسن نے مُسکرا کر صائمہ روشن علی کے بھائی مہتاب روشن علی کو دیکھا اور پھر فخریہ نگاہوں سے اپنے اطراف میں دیکھنے لگی، بلاشبہ اپنے جدید فیشن ایبل لباس میں وہ حسین نظر آ رہی تھی، لیکن پُراُمید رُشنا حیات بھی تھی۔ جس کے سُنہرے بال اُس کے چہرے پر سونا بکھیر رہے تھے سفید لباس میں سمیرا نعمت بلاشبہ بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ اُس کے لباس میں ایک خاص جدت تھی اور یہ لباس پیرس سے سلوا کر منگوایا گیا تھا۔ بالکل پریوں کا سا لباس تھا اور جب ہلکی ہَوا چلتی تو سمیرا نعمت واقعی آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق لگتی تھی مہتاب روشن علی نے دلچسپ نگاہوں سے مہمانوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ہستی جسے ہم نے آج کی سب سے جامہ زیب اور سب سے پُراثر شخصیت منتخب کیا ہے ہمارے لئے اتنی ہی قابلِ احترام ہے جتنی میری نگاہوں میں میری بہن صائمہ۔ اِس لئے اُس کا انتخاب صرف اِس تقریب کی ایک جدت سمجھا جائے اُس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے ہم اُس مقدس بہن کو آواز دیتے ہیں جو ہمارے لئے قابلِ احترام ہے لیکن جس کا ہم نے انتخاب کیا ہے۔ اور اُن خاتون کا نام ہے۔ مس رُدا۔"

بے شمار نگاہیں اِدھر اُدھر اُٹھنے لگیں۔ رُدا اپنی جگہ دھک سے رہ گئی تھی۔ ندرت اور ثناء بھی حیران رہ گئی تھیں، رُدا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ مہتاب روشن علی کی آواز اُبھری۔

"برائے کرم مس رُدا تشریف لائیں اور یہ چھوٹا سا تحفہ قبول فرمائیں!"

ثناء نے رُدا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی "میں جانتی ہوں یہ صائمہ کی شرارت ہے اور اُس کے اُن پُراسرار الفاظ کا مفہوم اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ لیکن رُدا کوئی خاص بات نہیں ہے۔ جاؤ اپنا تحفہ وصول کر لو۔"

"ثناء..." رُدا کی آواز میں ایک ایسی کیفیت تھی کہ اُس سے زیادہ ثناء کچھ نہ بول سکی۔ ندرت نے اِس موقع پر بھی انتہائی بے باکی کا ثبوت دیا تھا اور اُس لڑکی کا پسِ منظر جاننے کے بعد اُس کی شخصیت میں یہ فولادی کیفیت بہت عجیب محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اور مہتاب روشن علی کے پاس پہنچ گئی، اطراف میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تالیاں بجائی تھیں اُن میں جمن کی تالیاں شاید سب سے زیادہ بلند تھیں۔ مہتاب روشن علی کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہو گئے تھے ندرت نے مائیک مہتاب کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

"حضرات غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، جن خاتون کا انتخاب کیا گیا ہے وہ میں نہیں ہوں بلکہ میری عزیز دوست رُدا اُس گوشے میں بیٹھی ہوئی ہیں، فطرت ہر انسان کی مختلف ہوتی ہے، رُدا ایسے ہنگاموں میں بہت کم شریک ہوتی ہیں اور فطرتاً شرمیلی ہیں، اگر آپ لوگ اُنہیں دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو اُس سمت دیکھ لیجئے۔ سُرخی سارھی میں ملبوس وہ لڑکی رُدا ہے۔"

لوگ گردنیں اُچکا اُچکا کر ندرت کے اشارے کی سمت دیکھنے لگے اور رُدا جیسے زمین میں گڑ گئی۔ مہتاب روشن علی نے کہا۔

"محترمہ آپ کا شکریہ آپ نے میری مدد کی ہے لیکن مس رُدا کو ایک بہن کی حیثیت سے اُس کا بھائی طلب کر رہا ہے اور یہاں یہ سارے لوگ ہمارے اپنے ساتھی ہیں کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ مس رُدا خود اپنا یہ تحفہ قبول کریں۔"

نجانے رُدا کو کیا سُوجھی کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گئی اور بھاری قدم اُٹھاتی ہوئی مہتاب روشن علی کے پاس پہنچ گئی۔ مہتاب نے ہاتھ بلند کر کے تالیاں بجائیں تو ایک بار پھر تالیاں گونج اُٹھیں۔ نیلا حسن، سمیرا نعمت رُشنا حیات کے مُنہ بگڑ گئے تھے۔ رُدا نے تحفہ وصول کرنے کے بعد شکریہ ادا کیا اور سنجیدگی سے واپس اپنی جگہ آ بیٹھی۔ ثناء مجرمانہ سی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ اُسے صائمہ کی اِس حرکت کا پہلے سے علم نہیں ہو سکا تھا۔ ورنہ شاید وہ صائمہ کو یہ سب کچھ کرنے سے روک دیتی۔

مہتاب روشن علی نے مُسکراتے ہوئے کہا "مردوں میں ہم نے جن حضرت کا انتخاب کیا ہے اُن کی شخصیت بلاشبہ ایسی ہے کہ آج کی تقریب میں بے شمار افراد صرف اُن کی جانب متوجہ رہے ہیں۔ مجھے اُن کا نام موصول ہُوا ہے "جمیل احمد عُرف جمن۔"

یہ دوسرا دھماکہ تھا جو صائمہ روشن علی نے کیا تھا۔ ثناء نے ندرت کی شکل دیکھی اور پھر بے اختیار اُس کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ رُدا بھی اپنی موجودہ کیفیت سے نکل آئی تھی۔ ایک گوشے میں جمن بیٹھا ہُوا اُلوؤں کی طرح دیدے پھاڑ رہا تھا۔ اُس کی خوش قسمتی تھی۔ یا شاید اُن لوگوں کی کہ اب تک شہاب صاحب نے اُسے نہیں دیکھا تھا اور ندرت سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ وار بے کار ہی نہ جائے لیکن صائمہ روشن علی نے اُس کی یہ مشکل حل کر دی تھی۔

لوگ پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ تب مہتاب نے صائمہ کو اشارہ کیا۔ اور صائمہ آگے بڑھ کر جمن کے پاس پہنچ گئی۔ اُس نے نجانے کیا کہہ کر جمن کو اُٹھایا اور اُس جگہ لے آئی جہاں مہتاب روشن علی کھڑا ہُوا تھا۔

قہقہوں کا طوفان عظیم اُٹھا، ہر شخص بُری طرح ہنس رہا تھا اور جمن اِس طرح چونک چونک کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی طرف سے شیر نکل آنے کا اندیشہ ہو۔ مہتاب روشن علی نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"تو یہ حضرت ہیں ہمارے آج کے معزز مہمان۔ جناب جمیل احمد عُرف جمن۔ اُن کی خدمت میں آج کی سب سے دلچسپ شخصیت کا تحفہ پیش کیا جاتا ہے ایک چھوٹا سا پیکٹ مہتاب نے جمن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جمن وہیں کھڑا رہا تھا اور قہقہے اُبل رہے تھے لیکن ثناء کی نگاہیں شہاب صاحب کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں جو آنکھیں پھاڑے

ادھورا ادھوری

جن کی تحریریں ہمارے معاشرے کے قریب ترین ہوتی ہیں۔ اس تحریر میں اُنھوں نے ایک انتہائی نازک موضوع پر قلم اُٹھایا ہے جس کا ہماری آج کل کی زندگی کیسا تو بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک لڑکی لڑکا بن کر بھی نامکمل، اَدھوری۔ آخر کیوں؟

تبدیلیٔ جنس کی ایک انوکھی کہانی

دیکھ رہے تھے غور کر رہے تھے۔

جمن سے جب درخواست کی گئی کہ اب وہ جا سکتا ہے تب وہ اپنی جگہ سے ہٹا تھا۔ دو تین جگہ وہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے بچا۔ شہاب صاحب کی آنکھوں میں اب غُصّے کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ ثناء نے ندرت کو کہنی ماری اور ندرت نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ ڈھک لیا۔

"مزا آ گیا۔ اس صائمہ روشن علی سے میرا شکریہ ضرور ادا کر دینا۔ میرے جمن کو یہ اعزاز دلا کر اُس نے میری سات پشتوں پر احسان کیا ہے۔" ندرت نے کہا، رُدا ہنس رہی تھی اور ثناء اِس بات سے خوش تھی کہ کم از کم اِس طرح رُدا کی وہ کیفیت کم ہو گئی تھی۔

لوگ رُخصت ہونے لگے، بہت سے نوجوانوں نے بڑے احترام سے جمن سے مصافحہ کیا تھا۔ ندرت، رُدا اور ثناء جمن کے پاس پہنچ گئیں۔ اور ندرت نے اُس سے کہا۔

"بس اب واپس چلو جمن۔ پارٹی ختم ہو چکی ہے۔"

لیکن اُسی وقت عقب سے شہاب صاحب کی آواز اُبھری۔

"آپ لوگ جائیے، یہ میرے ساتھ آ جائے گا۔" تینوں نے چونک کر شہاب صاحب کو دیکھا تھا اور پھر جمن کو، جس کا گویا دم ہی نکل گیا تھا۔ تحفہ اُس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے جا گرا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہاب صاحب کو دیکھ رہا تھا، اور پھر یوں محسوس ہُوا جیسے وہ دوڑ لگا دے گا لیکن شہاب صاحب نے مضبوطی سے اُس کا بازو پکڑ لیا تھا اور پھر وہ غُراتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"میرے ساتھ چلنا ہے تمھیں۔"

جمن نے الوداعی نگاہوں سے ندرت کو دیکھا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو اللہ رکھی دُنیا میں اِتنے ہی دِن کے لئے آیا تھا، اگر ہو سکے تو میری کوئی یادگار ضرور تعمیر کر دینا۔ شہاب صاحب جمن کو گویا گھسیٹتے ہوئے گاڑی تک لے گئے تھے۔ ثناء نے ندرت سے تعزیت کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے افسوس، بڑا بانکا جوان تھا، مرحوم کی زندگی کے اِتنے ہی دِن تھے۔"

"ہونہہ شادی کرے گا۔ آؤ چلیں۔" نُدرت نے ناک چڑھا کر کہا۔

صائمہ روشن علی انھیں رُخصت کرنے کے لئے اُن کی کار تک آئی تھی اُس نے آگے بڑھ کر رَدا کے رُخسار کو بوسے دیتے ہوئے کہا۔

"ہماری آئندہ مُلاقاتیں بھی ہوتی رہنی چاہیں رَدا، یہ حقیقت ہے کہ تم آج کی محفل میں سب سے نمایاں تھیں اور جیوری نے تمھارے لئے مُخلصانہ فیصلہ دیا۔"

رَدا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ لوگ کار میں بیٹھ گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کار کوٹھی کی جانب چل پڑی۔

شہاب صاحب کی مرسڈیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس وقت کچھ عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اگر رَدا کا یہ مسئلہ درمیان میں نہ آتا تو جمن کی حالت پر قہقہوں پر قہقہے لگائے جا رہے ہوتے۔ لیکن رَدا کے بارے میں نُدرت اور ثناء کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ اپنی اُس تشہیر پر خوش نہیں ہوئی ہوگی کیونکہ وہ انتہائی سنجیدہ مزاج تھی اور ایسی ہلکی باتوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی تاہم رَدا نے کسی برہمی کا اِظہار بھی نہیں کیا تھا لیکن راستے میں ثناء نے کہا۔

"رَدا کچھ بولو تو سہی، تمھاری خاموشی پر ہم لوگوں کی دوہری کیفیت ہے، جو بے چارے جمن کی اِنکل کے ساتھ ہوگی اپنی کسی رائے کا اظہار تو کرو۔ پلیز رَدا قسم لے لو تمھاری قسم، اپنے ہیرو کی قسم، میں نے یا نُدرت نے صائمہ روشن علی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور یہ ہمارے علم میں بھی نہیں تھا کہ صائمہ اِس قسم کی کوئی حرکت کرے گی۔ ویسے اگر غور کرو رَدا تو یہ سچائی ہے کہ صائمہ کی نیت میں بھی کوئی فتور نہیں تھا بس اُس نے اُن پروگراموں کو دلچسپ بنانے کے لئے اپنے طور پر یہ جدت کی تھی، عموماً بعض پروگراموں میں ایسی دلچسپ حرکتیں کی جاتی ہیں۔ بات کچھ اتنی بُری بھی نہیں تھی۔ لیکن تمھاری شخصیت سے یہ خوف ہے ہمیں کہ کہیں تم نے اُس بات کا بُرا نہ منایا ہو۔"

"نہیں ثناء اب ظاہر ہے میں تم سے کیا کہہ سکتی ہوں اِس سلسلے میں جدید سوسائٹی میں یہ ساری باتیں معیوب بھی نہیں سمجھی جاتیں لیکن مجھے ایسا ماحول کبھی نہیں مِلا، میری کیفیت اُس کوّے کی سی ہے جو ہنس کی چال چل رہا ہے بس اپنی چال بھول جانے کا خوف ہے۔ تمھارے ساتھ ظاہر ہے تمھاری ہی سطح کے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ یقین کرو ثناء میں انھیں کسی بھی طرح بُرا نہیں سمجھتی اور نہ ہی اُن پر کوئی تنقید کرتی ہوں۔ لیکن اپنی حیثیت سے خوفزدہ ہوں بلاوجہ جب لوگوں کو میرے بارے میں تفصیلات معلوم ہوں گی تو مجھے طنز کا نشانہ بننا پڑے گا۔ اب تم دیکھو نا میں نے آج تک اِس میں بھی تعرض نہیں کیا تھا حالانکہ اِس سے قبل میں نے کبھی خود نمائی کا کوئی ایسا انعام وصُول نہیں کیا۔ چلو چھوڑو جانے دو، کوئی اتنا بڑا جُرم بھی نہیں کر ڈالا ہے کسی نے بات میری جھجک کی تھی لیکن اب شاید تمھارے ساتھ اِس قسم کے مواقع ملتے ہی رہیں، اپنے آپ کو اِس سوسائٹی میں ڈھالنے کی کوشش کروں گی۔"

"طنز کر رہی ہو رَدا؟"

"نہیں۔ میں تم پر طنز نہیں کر سکتی ثناء یقین کرو۔"

"مونالیزا سنجیدہ ہونے کی نہیں ہو رہی۔ خُدا کی قسم وہاں تم سے حسین کوئی نہیں تھا جو کچھ ہُوا اُس میں تمھیں نشانہ نہیں بنایا گیا اپنی اپنی باتیں سب کر رہے ہیں کوئی میرے جمن کے لئے بھی تو سوچو۔"

"جو ہوگا۔ سامنے آہی جائے گا۔"

"ہائے مگر میں سو کیسے سکوں گی۔" نُدرت بسورتی ہوئی بولی۔

"تب تم سب لوگ میرے کمرے میں آکر بیٹھو۔ باہر کی کھڑکی کھولے دیتی ہوں وہ لوگ واپس آئیں گے تو اندازہ ہو جائے گا۔" ثناء نے کہا اور سب اُس کے کمرے کی طرف چل پڑے۔"

* جمن پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ شہاب صاحب اُسے گھسیٹتے ہوئے کار تک لائے تھے اُنھوں نے عقبی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھیئے۔" اور جمن اندر گھُس گیا شہاب صاحب نے کار میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی جمن خاموش بیٹھا ہُوا تھا۔ کار دوڑتی رہی تھوڑی دیر کے بعد وہ ہل پارک میں داخل ہو گئی۔ پارکنگ پر شہاب صاحب نے کار روکی اور نیچے اُتر آئے۔ "تشریف لائیے حضُور والا۔"

جمن نیچے اُتر آیا۔ ہل پارک میں رش نہیں تھا۔ شہاب صاحب اُسے ایک گوشے میں لے آئے۔ "جی۔ اب زبان کھول دیجئے۔" اُنھوں نے کہا اور جمن نے مُنہ کھول کر زبان نکال دی۔ شہاب صاحب ایک لمحے تو نہ سمجھ سکے لیکن پھر اپنے الفاظ اور جمن کی حرکت پر غور کیا تو مُسکراہٹ نہ روک سکے غُصّہ اُتر گیا تھا لیکن جمن کو معاف نہیں کیا جا سکتا تھا اُنھوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"مذاق فرما رہے ہیں آپ۔" مُنہ بند کرو۔ اور جمن نے جلدی سے مُنہ بند کر لیا۔

"یہ سُوٹ کِس کا ہے؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"آپ کا۔"

"آپ کے پاس کہاں سے آیا؟"

"الماری سے نکالا تھا۔"

"کِس کی الماری سے؟"

"آپ کی۔۔۔ آپ کی۔" جمن نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خُوب۔ کتنے سُوٹ نکالے ہیں؟"

"دو۔"

"اِس سے قبل کیا کیا چُرا چکے ہو؟"

"دو سو روپے۔ آپ کی اُس پتلون سے جو آپ نے لانڈری بھرائی تھی۔ آپ کے سگریٹوں کے چار پیکٹ۔ اور ایک دفعہ۔ ایک دفعہ آپ کی گھڑی چُرا کر چار سو روپے میں بیچی تھی۔"

"خُدا غارت کرے تجھے۔ وہ گھڑی تین ہزار کی تھی۔" شہاب صاحب بڑبڑائے۔ بس مُوڈ بدل گیا تھا اِس لئے جمن ابھی تک بچا ہُوا تھا ورنہ وہ ہاتھوں کے استعمال سے نہیں چوکتے تھے۔ "اور کچھ؟"

"آپ کی بس یہی چیزیں تھیں۔" جمن روہانسے لہجے میں بولا۔

"دوسروں پر بھی مشق فرمائی ہوگی آپ نے۔ اِس پارٹی میں کیسے گھس آئے تھے؟"

"دعوت نامہ مِلا تھا۔"

"کیا؟" شہاب صاحب حیرت سے بولے۔

"یہ موجود ہے۔" جمن نے جیب سے دوہرا کیا ہُوا کارڈ نکال کر اُن کے سامنے کر دیا۔

"کہاں سے آیا تھا یہ؟"

"مِلا تھا مجھے۔"

"کِس نے دیا تھا؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا۔" جمن نے ایک عزم سے کہا۔ اور شہاب صاحب حیرت سے اُسے دیکھنے لگے۔

"کیوں نہیں بتلائے گا؟"

"وعدے وفا کے بھُلا تو نہ دوگے، تم میرا مطلب ہے کہ۔۔۔ کہ میری پوری زندگی کا سوال ہے۔"

"تو یہاں سے زندہ جا سکے گا؟" شہاب صاحب غرّائے۔

"زندہ باد۔ اے محبت زندہ باد۔ ہم راہِ عشق میں شہید ہوئے زندہ باد۔" جمن نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور شہاب صاحب کو پھر ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ جمن کے چہرے پر ایسے ہی آثار تھے جیسے وہ راہِ محبت میں شہید ہونے آیا ہو۔ شہاب صاحب کے غُصّے سے سبھی واقف تھے لیکن جمن اپنی اللہ رکھی کو مر کر بھی بدنام نہیں کر سکتا تھا۔ اور اُس وقت موت بھی قبُول کرنے کے لئے تیار تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"کیا تو صائمہ روشن علی سے محبت کرتا ہے؟"

"لعنت ہے صاحب۔" جمن نے کہا۔

"پھر وہ کون ہے؟"

"پردے میں رہنے دو۔ پردہ نہ اُٹھاؤ۔" جمن نے کہا اور شہاب صاحب کا اُلٹا ہاتھ اُس کے مُنہ پر پڑا۔ جمن اُلٹ کر نیچے جا گرا تھا شہاب صاحب نے گریبان سے پکڑ کر اُسے کھڑا کر دیا۔

"ہاں اب پردہ ہٹاؤ۔"

"وفا کی راہ میں دشمن شہید ہوتی ہے، یہی عاشقوں کی عید ہوتی ہے۔" جمن بدستور رجز یہ اشعار پڑھ رہا تھا شہاب صاحب کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی بہرحال غُصّے کی حدود سے نکل کر اب وہ تفریحی مُوڈ میں آ گئے تھے لیکن اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ گدھا کس کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے اور صائمہ روشن علی کا کارڈ اُس کے پاس کہاں سے آ گیا۔

"اگر تو مجھے اپنی محبوبہ کا نام بتا دے تو میں تجھے اِس حرکت پر معاف بھی کر سکتا ہوں۔"

"نہیں بتاؤں گا صاحب۔ بسم اللہ کیجئے۔" جمن نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور شہاب صاحب اُسے گھورتے رہے پھر بولے۔

"بسم اللہ آپ کیجئے جمیل احمد صاحب۔"

"کک۔۔۔ کیا کروں؟"

"اُتار دیجئے۔" وہ بولے اور پھر جمن کے گلے سے ٹائی گھسیٹ لی۔ جمن نے خاموشی سے کوٹ اُتارا پھر قمیص جس کے نیچے بنیان نہیں تھی۔ پھر اُس نے تھوک نگلتے ہوئے شہاب صاحب کی طرف دیکھا۔ "بسم اللہ جاری رکھیئے۔" شہاب صاحب بولے اور جمن نے پتلون بھی اُتار دی۔ اب وہ ایک دھاری دار جانگیے میں رہ گیا تھا۔ شہاب صاحب کے اشارے پر اُس نے سوٹ لپیٹ کر شہاب صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ "آئیے۔" شہاب صاحب بولے اور اُسے کار تک لے گئے پھر اُنھوں نے اُس کا پرانا اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا خُدا حافظ جمیل احمد صاحب۔"

"خُدا حافظ۔" جمن نے لرزتی آواز میں کہا۔ اور شہاب صاحب نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ جمن وہیں کھڑا کار کی روشنیاں دیکھتا رہا تھا۔ ہل پارک سے ڈیفنس تک کا فاصلہ بدن پر صرف جانگیہ اور جیب غائب پیسے کہاں ہوتے۔ نوکری تو گئی تھی اب اُس ملازمت کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔ مسئلہ گھر تک پہنچنے کا تھا۔ ایک بار کوٹھی تو جانا ہی تھا چنانچہ وہ اندھیروں کی آڑ میں چل پڑا۔

*

شہاب صاحب کی مرسڈیز اندر داخل ہوئی تو وہ چونک پڑیں۔ مرسڈیز پورچ میں رُک گئی تھی لیکن صرف شہاب صاحب نیچے اُترے۔ جمن موجود نہیں تھا۔ ثناء نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اللہ رکھی۔ تو بیوہ ہو گئی۔" اور نُدرت پھُس پھُس کر کے رونے لگی۔

"خُدا سے ڈرو تم لوگ۔ کیا شہاب صاحب اتنے درندہ صفت ہو سکتے ہیں کہ اِتنی سی بات پر کسی کو قتل کر دیں۔" رَدا نے کہا۔

”انکل سے کچھ بعید نہیں ہے۔ ویسے یکھ لو تم لوگ جمن خیریت سے نہ ہوگا“ ثناء نے کہا۔

”بہت بُرا کیا ہے تم لوگوں نے اُس کے ساتھ۔ اس حد تک نہیں جانا چاہیئے تھا۔“

”اور اُن لوگوں نے اچھا کیا تھا مونا لیزا“ ندرت آنکھیں نکال کر بولی۔

”پھر بھی۔ نہ جانے بے چارے کا کیا ہُوا۔ ثناء تم شہاب صاحب سے اُس کے بارے میں پُوچھ بھی نہیں سکتیں؟“

”آج کل مشکل ہے اُن کا کوئی کمزور پہلو بہت دن سے میرے علم میں نہیں آیا۔ ہم لوگ صرف ایک دوسرے کو بلیک میل ہی کر سکتے ہیں۔ اور پھر اگر میں اس بارے میں پوچھوں گی تو انکل مجھے ہی اِس شرارت کا ذمّہ دار خیال کریں گے نا۔ بابا مشکل ہے۔“

”اب کیا کریں؟“

”انتظار۔۔ صرف انتظار“ ثناء نے کہا۔

”میں چائے بنالاؤں؟“ ندرت نے پوچھا۔

”بنالاؤ۔ اِس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے“ ثناء نے کہا اور ندرت اُٹھ کر چلی گئی۔ ثناء رِدا کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”رِدا تم ناراض تو نہیں ہو؟“

”نہیں ثناء۔ میں پاگل بھی نہیں ہوں کہ بلا وجہ ناراض ہونے لگوں لیکن میری اچھی ثناء ایک درخواست ضرور کروں گی تجھ سے۔“

”کیا؟“

”دیکھ ثناء بس ایک بار۔ صرف ایک بار مجھ پر غور کرلے میرے حالات کو دیکھ لے مجھے بتا کیا میں اِس اُونچی سوسائٹی کی متحمل ہوں۔ کیا مستقبل تک میں اپنی یہ حیثیت برقرار رکھ سکتی ہوں یہ سب کچھ اعلیٰ طبقے میں معیوب نہیں ہے۔ میں بھی ان تفریحی مشغلوں کو بُرا نہیں سمجھتی صائمہ کے بھائی نے نہایت اچھے الفاظ میں مجھے بُلایا تھا۔ کل کا دِن اگر ان میں سے کسی پر یہ ظاہر کرے کہ میں صرف ایک ملازمت پیشہ لڑکی ہوں تو لوگ مُجھ پر ہنسیں گے نہیں۔ نیک انسانوں کی اِس جنت میں میں کب تک رہ سکتی ہوں۔ خود تیرا گھر بھی نہیں ہے یہ کہ میں تیرے سہارے زندگی گزار لوں۔ تجھے بھی دوسری جگہ جانا ہے میرے سامنے تیمور ہے، میں تو صرف ایک ذمّہ داری ہوں ثناء۔ اُن تمام چیزوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے مجھے تو اِس ہولناک دُنیا کا نہ جانے کس طرح مقابلہ کرنا ہے۔ میری اچھی ثناء تُو نے اگر مجھے اِس گھر کا ایک گوشہ دے دیا ہے تو بس مجھے اس کی پناہ میں رہنے دے۔ یہ سب کچھ میرے لئے بہت ہے۔“

ثناء کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ وہ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔

”اگر میرے ڈیڈی تمھیں اپنی بیٹی بنالیں تو۔۔۔؟“

”پگلی ہے تو۔ مجھے اب بھی تو یہی حیثیت حاصل ہے۔“

”تو پھر مستقبل کے لئے اِتنی پریشان کیوں ہو۔ مجھے اگر اِس گھر سے جانا پڑا تو میں تمھارے لئے بات کرکے جاؤں گی۔ اِس کے علاوہ۔ اِس کے علاوہ رِدا تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائی بھی تو نہیں ہو آن لوگوں کو جو کہانی سُنائی تھی مجھے بھی اُسی میں اُلجھا رہنے دیتیں تو کیا حرج تھا۔ میرے ذہن کے لئے ایک گُریہ چھوڑ دی ہے تم نے آخر کیوں؟“

”تو اتنی پیاری ہے ثناء کہ تجھ سے جھوٹ بول کر میں خود سے بھی شرمندہ رہتی۔“

”سب کچھ ہوں لیکن تمھاری راز دار نہیں بن سکتی۔“

”یہ میرا راز نہیں ہے جانم۔ ایک امانت ہے میرے پاس یہ سب کچھ ایک ایسی ہستی کی امانت جو۔ جواب اِس دُنیا میں نہیں ہے میں نے مرتے ہوئے اُس سے کچھ وعدے کئے تھے۔ اور مرتے وقت تک میں اُن وعدوں کو نبھانا چاہتی ہوں۔“

”اوہ“ ثناء آہستہ سے بولی ”وہ ہستی تمھاری کوئی عزیز تھی؟“

”ہاں۔ اِس کائنات میں وہ مجھے سب سے عزیز تھی“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کون تھی وہ؟“ ثناء پُرخیال انداز میں بولی ”اچھا یہ بتادو تیمور تمھارا بیٹا ہے؟“

”نہیں“ رِدا کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اُسی وقت ندرت چائے بناکر لے آئی تھی اِس لئے یہ گفتگو ختم ہوگئی۔ ندرت ناک سے شُوں شُوں کرتے ہوئے بولی۔

”کلیجہ مُنہ کو آگیا باورچی خانے میں۔ ہر لمحہ جمن یاد آرہا تھا ہائے کیسے دیگچی میں کفگیر چلاتا تھا مرحوم۔ کس طرح مجھے چائے بناکر دیتا تھا ہائے جمن تم سے یہ اُمید نہیں تھی یوں تنہا چھوڑ جاؤ گے“ ندرت نے روتے ہوئے چائے کی پیالی مُنہ سے لگالی۔

دفعتاً ثناء چونک پڑی ”اری۔۔۔ اری ندرت وہ دیکھ ارے جمن ہی ہے ہائے ندرت“ ثناء بے اختیار ہنسنے لگی۔ رِدا اور ندرت بھی بے اختیار اُدھر دیکھنے لگیں۔ جمن ہی تھا چوکیدار اُس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جمن کے بدن پر صرف جانگیہ تھا۔ رِدا کو پھندا لگ گیا اور وہ چائے کی پیالی رکھ کر آنسو پونچھنے لگی۔

”کوئی دوا ہو تو دیدو ثناء۔ میں اُس کے زخم دیکھوں گی“ ندرت نے دلسوزی سے کہا۔

”اِس وقت اُس کے پاس جانا مناسب نہیں ہوگا۔ بیٹھی رہو“ ثناء نے کہا اور ندرت ایک ٹھنڈی سانس لے کر رُک گئی۔

دوسری صبح ثناء نے رِدا کو خبر سُنائی ”جمن باورچی خانے میں نہیں ہے۔ ناشتہ فلاں بی بی تیار کررہی ہے۔“

”اوہ جمن کے بارے میں کچھ معلوم ہُوا؟“

”ابھی تک نہیں۔ میں نے اُس کے بارے میں کسی سے معلومات بھی نہیں کیں اب بتاؤ کیا کروں؟“

”ندرت تو نہیں آئی؟“

”نہیں۔“

”تو پریشان کیوں ہو معلوم ہوجائے گا۔“

”میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ انکل نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

”تھوڑا بہت اندازہ تو رات کو ہی ہوگیا تھا۔“

”وہ کچھ نہیں تھا انکل اِتنے نرم مزاج نہیں ہیں مجھے خطرہ ہے کہ انکل نے اُسے نوکری سے نہ نکال دیا ہو۔“

”یہ نہیں ہونا چاہیئے ثناء“ رِدا نے کہا۔

”خیر ایسا نہیں ہونے دوں گی میں اِس گھر میں کسی کو نکالنے کا رواج ہی نہیں ہے اگر انکل نے ایسا کردیا تو پھر ڈیڈی حضور کام آئینگے اِس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ بس یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہیں سے ٹوٹ پھوٹ تو نہیں گیا۔“

”ندرت ہی سے معلوم ہوسکے گا۔“

”تم تو آفس جارہی ہوگی۔“

”ظاہر ہے، مگر شام کو تم مجھے رپورٹ دوگی۔“

”نوکر ہوں تمھاری۔ ہونہہ رپورٹ دوگی آج کا دِن اتنا مزیدار ہے اور محترمہ آفس میں جاکر مریں گی۔“

”اب کچھ کھلانا پلانا ہے تو کھلا دو ورنہ میں چلی جاؤں گی“ رِدا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

”ناشتہ فلاں بی بی تیار کررہی ہیں جو کچھ تیار ہو جاکر دیکھ لو۔ میرا مُوڈ خراب ہوگیا ہے“ ثناء نے کہا اور رِدا مُسکراتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ ثناء بُرے بُرے مُنہ بناکر اُسے دیکھتی رہی۔ ابھی تک وہ رِدا کی ملازمت سے متفق نہیں ہوسکی تھی، چند منٹ تک اِسی طرح کھڑے رہنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ تیمور کو گود میں اُٹھایا اور ندرت کی طرف چل پڑی۔ دو نمبر میں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ وہ تین نمبر کے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔ امّاں بی سامنے چوکی پر بیٹھی کلام پاک پڑھ رہی تھیں عصمت یونیورسٹی جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ شوکت جہاں اندر کمروں کی صفائی میں مصروف تھیں ندرت باورچی خانے میں تھی۔ ثناء باورچی خانے میں پہنچ گئی۔

”ناشتہ یہیں کروں گی“ اُس نے کہا۔

”تیار ہے حضور“ ندرت نے شرارت آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج جمن کام پر نہیں آیا“ ثناء نے کہا۔ ندرت کے ہاتھ رُکے۔ لیکن اُسی وقت شوکت جہاں آگئی تھیں۔ ثناء نے چوکی پر بیٹھ کر سب کے ساتھ ناشتہ کیا عصمت ناشتے کے بعد یونیورسٹی چلی گئی اور ندرت ثناء کو ساتھ لے کر کمرے میں آگئی۔

”کچھ معلوم ہوسکا؟“

”میں تجھ سے پوچھنے آئی ہوں۔“

”سناٹا ہے دوسری طرف“ ندرت نے کہا۔

”میں نے بھی محسوس کیا ہے۔“

”وہ کیوں نہیں آئے“ ندرت نے اُداسی سے پوچھا اور ثناء کو اُچھو ہوگیا۔ ندرت کا انداز ایسا ہی تھا۔

”قیامت ہے تو کمبخت۔ مجھے کیا معلوم“ ثناء نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”تو معلوم کرو مالک کی بیٹی یہ تو پُوچھ سکتی ہو جاکر کہ جمن باورچی کیوں نہیں آیا“ ندرت نے کہا اور ثناء اُسے گھورنے لگی، پھر مُسکراکر بولی۔

”تُو بھی چل۔“

”ہائے، میں ایسے کیسے جاسکتی ہوں۔ میرے وہاں جانے کے سلسلے میں تو بڑے اہتمام کرنے پڑیں گے میرے۔ جمن کو تو ذرا جاکر دیکھ کہ اب وہ اِس قابل رہا بھی ہے یا نہیں“ ندرت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور ثناء ہنسنے لگی پھر بولی۔

”اچھا میں تیمور کو یہیں چھوڑے جاتی ہوں اِسے سنبھالنا ابھی آتی تھوڑی دیر میں۔“

”ٹھیک ہے۔ آیئے تیمور صاحب“ ندرت نے تیمور کو گود میں لے لیا اور ثناء تین نمبر سے باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دو نمبر کے دروازے پر دستک دی تھی۔ دروازہ جمن کی ماں نے کھولا، چہرہ دُھواں دُھواں ہورہا تھا ثناء کو دیکھ کر چونک پڑی اور پھر خوش اخلاقی سے اُسے اندر لے گئی۔

”خیریت تو ہے بی بی۔ آپ کیسے آگئیں۔“

”جمن آج کام پر نہیں پہنچا کیا بات ہے خیریت تو ہے دراصل اُس کے ہاتھ کا ناشتہ نہ کروں تو یوں لگتا ہے جیسے ناشتہ ہی نہیں کیا“ ثناء نے گردن اُٹھا کر اندر دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیمار پڑا ہے کمبخت مارا، پتہ نہیں کیا اول فول بک رہا ہے بخار کے عالم میں، رات کو تو ایسا بخار چڑھا ہُوا تھا جیسے تندور سے نکل کر آیا ہو۔ عجیب حلیے میں تھا بی بی۔ میں تو ہول کر رہ گئی ہوں پتہ نہیں کیا

ہوگیا اُسے"۔

"کیوں، کیسا حلیہ تھا؟"

"اے موا جانگیہ پہن کر اندر آیا تھا، پتہ نہیں کپڑے کہاں پھینک آیا۔ خُدا رحم کرے ثناء بی بی مجھے تو شبہ ہے کہیں اُس نے کوئی نشہ وشہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہو، وہ آج کل موئی کمبخت کیا چل رہی ہے وہ جو فلموں میں ہوتی ہے۔ مجھے تو نام بھی نہیں آتا"

"ہیروئن؟" ثناء نے سوال کیا۔

"ہاں... ہاں وہی۔ کہیں وہی پینا نہ شروع کر دی ہو"

"ہے کہاں۔ میں ذرا اُسے دیکھوں گی"

"خُدا تمھیں خوش رکھے بی بی، پتہ نہیں کیسے ہو تم لوگ ذرا بھی غرور نہیں ہے، نوکروں سے اتنی دلچسپی رکھتے ہو۔ اللہ اجر دے گا تمھیں۔ اندر کمرے میں ہے جاؤ دیکھ لو"

"آپ یہیں رُکیں میں اُس سے معلوم کروں گی کہ اُس کی بیماری کی وجہ کیا ہے"

"ذرا پوچھ لینا موئے مارے سے کہ نشہ وشہ تو نہیں شروع کر دیا۔" جمن کی ماں نے کہا اور ثناء اندر داخل ہوگئی۔ جمن چارپائی پر چادر اوڑھے ہوئے لیٹا ہوا تھا آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں لیکن گہری سُرخ ہو رہی تھیں۔ ثناء کو دیکھ کر اُچھل کر بیٹھ گیا۔ بدن بدستور ننگا تھا، یہ خیال آیا تو جلدی سے لیٹ کر پھر چادر اوڑھ لی۔ ثناء اُس کے قریب پہنچ گئی۔

"کیسے ہو جمن؟"

"ٹھیک ہوں ثناء بی بی۔ اللہ کا فضل ہے"

"ہوا کیا تھیں۔ اور کل تو میں تمھیں دیکھ کر حیران رہ گئی جمن۔ کل تم وہاں اُس پارٹی میں کیسے پہنچ گئے"

"بس بی بی جی۔ دعوت نامہ ملا تھا مجھے وہاں سے میرا بھی دِل چاہا۔ اور میں چلا گیا"

"انکل شہاب نے تمھیں کیوں پکڑ لیا تھا"

"سُوٹ چُرایا تھا میں نے اُن کا پارٹی میں جانے کے لئے، آپ جانتی ہیں کہ میں سُوٹ بنانے کے قابل نہیں ہوں"

"مگر تمھیں پارٹی کا کارڈ بھیجا کس نے"

"اللہ ہی جانے کہاں سے آ گیا۔ مجھے کارڈ ملا تو میں نے سوچا کہ چلو دیکھوں تو سہی امیروں کی دُنیا کیسی ہوتی ہے۔ اور پھر... اور پھر بی بی جی آپ نے بھی دیکھا تھا، اُن لوگوں نے مجھے پرائز دیا تھا۔ مذاق اُڑایا ہو گا میرا۔ میں نہیں جانتا مگر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی، انسان کا دِل ہی تو ہے۔ میں وہاں چلا گیا"

"میں نہیں مانتی جمن۔ کسی نے ضرور تمھیں وہاں جانے کیلئے اُکسایا تھا۔" جمن نے چور نگاہوں سے ثناء کو دیکھا پھر بولا۔

"لو بی بی جی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"ہو سکتا ہے۔ انکل شہاب نے مجھے ساری تفصیل بتائی ہے"

"کک... کیا۔ جمن پھر چادر پھینک کر اُٹھ بیٹھا لیکن پھر اپنے برہنہ بدن کا خیال آیا تو جلدی سے چادر اوڑھ کر دوبارہ لیٹ گیا"

"کک... کیا بتایا ہے اُنھوں نے"

"یہی کہ تمھیں کس نے اُکسایا تھا"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ... آپ... میرا مطلب ہے بی بی جی میں نے تو کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں نے تو صاحب سے کہہ دیا تھا کہ صاحب قتل کر دو مجھے، ٹکڑے کر دو میرے مگر کیا مجال جو مُنہ کھول جاؤں۔ بی بی جی مجھے کسی نے وہاں نہیں بھیجا بس کارڈ مل گیا تھا کہیں سے تو صاحب کے کپڑے چُرا لئے، بڑا شرمندہ ہوں اِس بات پر کیا مجھے نوکری سے نکال دیا گیا"

"واہ۔ تمھیں نوکری سے کون نکالے گا جمن مگر یہ تو بتاؤ انکل شہاب نے تمھارے ساتھ سلوک کیا کیا"

"کچھ نہیں جی۔ ایک باغ میں لے گئے وہ جو پہاڑی پر بنا ہوا ہے، وہاں جاکر مجھ سے پوچھتے رہے کہ بتاؤ تم وہاں کیسے پہنچے۔ کیا بتاتا بی بی جی اُنھیں بس یہی کہہ دیا کہ صاحب جو دِل چاہے کر لو مگر یہ سب کچھ نہ پوچھو، اور پھر صاحب باتیں کرتے رہے"

"کیا مارا بھی تھا انھیں"

"نہیں بی بی جی، پتہ نہیں کیوں رحم آ گیا اُنھیں مجھ پر مگر کپڑے اُتروا لائے تھے، ایک پیسہ بھی جیب میں نہیں تھا۔ وہاں سے گھر تک پیدل ہی پہنچا، راستے میں تین دفعہ پولیس والے ملے اور دو دفعہ کتے پیچھے لگ گئے، نہ جانے کیسے بچ کر یہاں پہنچا" جمن نے جواب دیا اور ندرت نے بڑی مشکل سے قہقہہ ہضم کیا، پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"جمن مجھے بھی نہیں بتاؤ گے کہ تمھیں یہ کارڈ کس نے بھیجا تھا"

"مجھے معلوم ہو تو بتاؤں بی بی جی۔ آپ یقین کریں مجھے کچھ نہیں معلوم"۔ جمن نے جواب دیا۔

"خیر۔ اور تو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے"

"ہے جی۔ جمن آہستہ سے بولا۔

"کہو کیا بات ہے"

"مجھے نوکری سے نکلنے سے بچا لیں بی بی جی۔ صاحب کے کپڑے سُوٹ واپس کر دُوں گا اور... اور..."

"ٹھیک ہے۔ تم بے فکر رہو۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے تو کام پر آجانا اگر انکل نے تمھیں نکالنے کی کوشش کی تو میں اُنھیں ایسا نہیں کرنے

دُوں گی"۔ جمن کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار اُبھر آئے تھے، ثناء چند لمحات وہاں رُکی اور پھر باہر نکل آئی باہر جمن کی ماں دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اندر کی باتیں سُنی ہوں یا نہ سُنی ہوں لیکن ثناء کا انتظار ضرور کر رہی تھی سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا تو ثناء نے کہا۔

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جمن کی ماں، بس آوارہ گردی کے لئے نکل گیا تھا۔ پولیس والوں نے پکڑ لیا وہ سمجھے کوئی چور وور ہو گا اور پھر اُس کے کپڑے وغیرہ بھی اُتار لئے"

"اتنی راتوں کو آوارہ گردی کرنے نکلتا ہی کیوں ہے کمبخت مارا۔ مجھے تو کچھ بتاتا ہی نہیں سو ایسے نشے وشے کی تو کوئی بات نہیں ہے"

"نہیں جمن کی ماں۔ میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے آپ بھی اطمینان رکھیں"

"خُدا تمھیں خوش رکھے" جمن کی ماں نے کہا۔ ثناء نے جیب سے پچاس پچاس کے دو نوٹ نکال کر اُنھیں دیتے ہوئے کہا۔

"ذرا جمن کی اچھی خبر گیری کیجئے، اگر کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو جاکر دوا لے آیئے، اگر آپ چاہیں تو میں کسی ڈاکٹر کو بُلا دُوں"

"خُدا تمھیں خوش رکھے میں خود جاکر دوا لے آؤں گی، تم کہاں تکلیف کرو گی بی بی جی" جمن کی ماں نے کہا اور ثناء دو نمبر سے باہر نکل آئی۔ تین نمبر میں ندرت اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ ثناء کے داخل ہوتے ہی اُس پر جھپٹ پڑی۔ اور ثناء نے اُسے تمام صورتِ حال بتا دی۔

"تم کہتی تھیں کہ انکل شہاب یہ کریں گے وہ کریں گے، کچھ بھی نہیں کیا اُنھوں نے تو، کپڑے اُتار لینے سے کیا بنتا ہے" ندرت نے مُنہ بنا کر کہا۔

"ہائے ندرت تو یقیناً چنگیز خان کی رُوح اپنے اندر رکھتی ہے۔ سوچ تو سہی کتنا اذیت ناک سفر طے کرنا پڑا ہو گا جمن کو جانگیے میں، اور تو کہہ رہی ہے کچھ ہوا ہی نہیں، ویسے مجھے خود بھی حیرت ہے کہ انکل اتنے نرم دِل کب سے ہو گئے"

"بہر حال۔ میری طبیعت ابھی سیر نہیں ہوئی۔ اِس کا مقصد ہے کہ جمن میاں پر ابھی کچھ اور پولش کرنا پڑے گی"

"مروا کر ہی چھوڑے گی بیچارے کو۔ معاف نہیں کر سکتی تو اُسے"

"کر دُوں گی... کر دُوں گی ابھی جلدی کیا ہے، ویسے اگر تم بور ہوگئی ہو تو دوسری بات ہے کوئی اور تفریح پکڑ لیتے ہیں" ندرت نے کہا۔

"نہیں میرا خیال ہے ابھی جمن چلے گا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ ذرا سخت منصوبہ ہو گیا تھا۔ انکل شہاب واقعی خطرناک آدمی ہیں پتہ نہیں، کس مُوڈ میں تھے جو جمن کو معاف کر دیا اور بات اِسی حد تک رہی ورنہ اِتنی نرمی کے امکانات نہیں تھے۔ میں تو اِسے جمن کی خوش بختی ہی کہوں گی، بہر حال جمن کو اب اُن کے ہاتھ نہ لگنے دینا ورنہ واقعی وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا"

"ٹھیک ہے لیکن ابھی جمن میاں سے میرا رشتہ نہیں ٹوٹے گا، ابھی تو اُسے کافی دِن تک مجھ سے عشق کرنا ہو گا"

ثناء دیر تک ندرت سے باتیں کرتی رہی۔ اور پھر اُٹھتی ہوئی بولی "اب چلتی ہوں تمھیں بھی کام کرنے ہوں گے"

"ہاں یار یہ عصمت باجی چوٹ دے گئیں۔ اُنھوں نے تو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور مجھے اِس ککنگ انسٹی ٹیوٹ میں داخل کر گئیں"

"اچھا ہے کھانا پکانا آجائے گا جمن کے ساتھ تمھیں بھی باورچی خانے میں نوکری مل ہی جائے گی میں سفارش کر دُوں گی"

"ملک کی بیٹی۔ اُستاد سے بات کر رہی ہے ذرا ہوش میں" ندرت نے آنکھیں نکال کر کہا اور ثناء ہنستی ہوئی کوٹھی کی طرف چل پڑی ابھی کمرے میں داخل ہی ہو رہی تھی کہ شہاب صاحب نظر آئے مُسکراتے ہوئے اُسی کی طرف آرہے تھے۔

"ہیلو ثناء" اُنھوں نے کہا۔

"ہیلو انکل" ثناء نے رُک کر کہا۔

"کیا بات ہے آج کل ہم سے کچھ ناراض لگتی ہو؟"

"اوہ نہیں۔ اتنے سوئٹ سوئٹ انکل سے بھلا کون ناراض ہو سکتا ہے" ثناء نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"سُبحان اللہ سُبحان اللہ۔ اِس کا مطلب ہے کہ ہم خطرے میں ہیں" شہاب صاحب بولے اور ثناء کے ساتھ اُس کے کمرے میں داخل ہو گئے

"کچھ ایسی ہی بات مجھے محسوس ہو رہی ہے انکل" ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم سے کچھ معلوم کرنا ہے ثناء" شہاب صاحب نے کہا۔

"جی انکل بیٹھے پلیز" ثناء بولی۔ اور تیمور کو فرش پر چھوڑ دیا۔

"جمن کو صائمہ روشن علی کی سالگرہ کا کارڈ کس نے دیا تھا؟"

"ارے ہاں انکل میں خود بھی آپ سے اِس بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ آپ اُسے وہاں سے اپنے ساتھ لے گئے تھے اور غصّے میں معلوم ہوتے تھے۔ کیا آپ نے اسے نوکری سے نکال دیا"

"پہلے میری بات کا جواب دو"

"آپ یقین کریں انکل مجھے نہیں معلوم۔ میں نے بھی اُسے اُسی وقت دیکھا تھا جب وہ شہاب روشن علی سے پرائز وصول کرنے آیا تھا۔ نہ جانے کمبخت کس کا سُوٹ مار لایا تھا"

"بچا سے اُڑ رہی ہو بھتیجی۔ لیکن سوچ لو ہمارا نام بھی شہاب ہے۔ معلوم کر ہی لیں گے ویسے تمھاری شرارت ہمیں پسند آئی... لو یہ لو۔

بھابی جان کا تار آیا ہے آج آ رہی ہیں فیصل آباد سے۔ تم اُنھیں ملازموں کے ساتھ جا کر رسیو کر لینا" شہاب صاحب نے کہا اور تار ثناء کو دے کر باہر نکل گئے۔ ثناء کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

✿

ذکیہ خاتون ٹرین سے اُتر آئیں۔ ثناء دوڑ کر اُن سے لپٹ گئی تھی۔ سچ ہے انسان جب پاس نہیں ہوتا تب اُس کی کمی کا احساس ہوتا ہے،

"میری کمی کا احساس ہوا تھا؟"

"بہت" ثناء نے کہا اور پھر عارفہ بیگم کو دیکھنے لگی۔ عارفہ بیگم آگے بڑھیں تو ثناء چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ عارفہ بیگم خجل ہو گئی تھیں۔

"ہم یاد نہیں آئے تمھیں ثناء بیٹی" اُنھوں نے جھینپ مٹانے کے لئے کہا۔

"ارے آپ بھی گئی تھیں امی کے ساتھ۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا" ثناء نے کہا۔ طفیلی بیگم بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ اُن کی ہنسی پر عارفہ بیگم تو جل کر کباب ہو گئیں ثناء چونک کر اُنھیں دیکھنے لگی۔

"یہ کون ہیں امی؟"

"میں تمھاری خالہ ہوں ثناء۔ ایک بھولی بسری کہانی - بہت چھوٹا سا دیکھا تھا تمھیں"

"اوہ۔ آپ طفیلی بیگم ہیں آپ ہی کے شوہر کا انتقال ہوا تھا" ثناء نے پوچھا۔

"ہاں بیٹی میں ہی وہ بدنصیب ہوں" طفیلی بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ثناء کے ساتھ آتے ہوئے ملازموں نے سامان اُٹھا لیا تھا۔ رشید اور خیر دین اُن کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ جب وہ بھی اُن کے ساتھ آگے بڑھے تو ثناء چونک کر بولی۔

"کیا یہ بھی ہمارے ساتھ ہیں؟"

"ہاں ثناء۔ یہ رشید ہے۔ طفیلی بیگم کا بیٹا۔ اور یہ خیر دین ہے"

"دو بیٹے ہیں آپ کے؟"

"خیر دین طفیلی بیگم کا بیٹا نہیں ہے"

"نوکر ہیں آپ کے جی۔ نئی نئی نوکری ملی ہے ہمیں" خیر دین نے آگے بڑھ کر کہا۔

"خوب" ثناء باری باری رشید اور خیر دین کو دیکھنے لگی۔ کار کے قریب پہنچ کر ثناء نے کہا "قاسم تم ایک ٹیکسی کر لو ایک گاڑی میں سب ہیں آ سکتے" اور ملازم ٹیکسی لینے دوڑ گیا۔

"تمھیں ہمارے آنے سے تکلیف تو ہو گی بیٹی" طفیلی بیگم بولیں۔

"نہیں خالہ جان مجھے کسی کے آنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے"

- دِل والے باپ کی دِل والی بیٹی ہونا۔ خدا نصیب اچھا کرے" سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ گئے رشید اور خیر دین کو ٹیکسی میں جگہ ملی تھی۔ خیر دین ہونقوں کی طرح مُنہ پھاڑے سڑک کے ٹریفک اور عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کمال ہو گیا جی رشید صاحب۔ یہاں تو گاڑیاں ایک دوسرے سے لگ کر چلتی ہیں۔ کمال ہو گیا جی"

"خاموش بیٹھو" رشید نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

"دوستی کر لو جی۔ فائدے میں رہو گے۔ تم لوگوں کو بھی نئی نئی نوکری ملی ہے کیا؟" خیر دین نے کہا۔

"بکواس بند نہیں کرو گے" رشید غرّایا۔

"تمھاری مرضی جی۔ ہم تو تمھارے فائدے کی بات کر رہے تھے" خیر دین نے کہا اور رُخ بدل لیا۔ پھر رشید کو کھسکتا ہوا بولا "تھوڑا سا پیچھے سر کو پھیلتے ہی جا رہے ہو کونسی چکی کا پسا کھاتے ہو" رشید خونخوار نگاہوں سے خیر دین کو گھورنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"اطمینان سے بتاؤں گا دوست کہ کونسی چکی کا پسا کھاتا ہوں۔۔"

خیر دین نے اُس کے الفاظ سُنے بھی نہیں تھے۔ گاڑیاں کوٹھی پہنچ گئیں۔ اور ذکیہ بیگم نیچے اُتر کر نئے مہمانوں کو اندر لے گئیں۔ عارفہ بیگم بھی پیچھے لگی لگی تھیں۔ ذکیہ بیگم نے ساس کے کمرے کا رُخ کیا اور دادی اماں کے پاس پہنچ گئیں۔ دادی اماں نے طفیلی بیگم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔

"دُنیا آنی جانی ہے طفیلی بیگم۔ کوئی کسی کو نہیں روک سکتا - بڑا افسوس ہوا تمھاری بیوگی کا سُن کر اللہ مرحوم کو جنت میں جگہ دے۔ تم نے ہمیں اطلاع دے کر عقلمندی کا ثبوت دیا"

"اِس میں کوئی شک نہیں ہے ممانی جان"، عارفہ بیگم جھٹ سے بول اُٹھیں "طفیلی بیگم نے تاکا خوب"

"نہیں عارفہ یہ اُس کا حق ہے اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں یہ تمھارے بیٹے ہیں طفیلی"

"صرف میں ہوں اماں جی۔ یہ نوکر ہے" رشید نے جلدی سے کہا۔

"اچھا میاں جیتے رہو۔ کیا نام ہے؟"

"رشید خاں"

"خوش رہو اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ کوئی تکلف مت کرنا"

"طفیلی بیگم کو چاہیئے کہ پُرانی عادت چھوڑ دیں یہ کوٹھی جنت ہے لگائی بجھائی کسی میں نہیں ہے کوئی ایسا کام نہ کریں میاں آخری ٹرین تو صرف اللہ اللہ کرنی چاہیئے" عارفہ بیگم نے کہا۔

"ہاں طفیلی اسے اپنا گھر سمجھ کر رہنا۔ مل جل کر رہنا بہت اچھی بات ہے" زیب النساء بیگم خود بھی طفیلی بیگم سے واقف تھیں۔

"مجھ بیوہ کا کیا ہے خالہ جان ایک کونے میں پڑی رہوں گی آپ

اطمینان رکھیں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی"

"دُلھن طفیلی کے لئے کوئی انتظام کیا؟"

"کل کر دوں گی امی جان آج انھیں اُوپر کے کمرے میں سُلا دیں گے" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"ٹھیک ہے طفیلی جاؤ نہا دھو لو۔ اور تم بھی میاں کیا نام ہے تمھارا"

"جی رشید خاں"

"ہاں تم بھی جاؤ"

"اور میں کیا کروں جی؟" خیر دین نے پوچھا۔

"تو میرے پاس بیٹھ بیٹا۔ تجھ سے تو ابھی بات کروں گی" "ذکیہ تم چھوڑ آؤ ان لوگوں کو۔ ذکیہ بیگم چلی گئیں تو دادی اماں خیر دین سے مخاطب ہوئیں "ہاں اب تو بتا تیرا کیا نام ہے؟"

"خیر دین ولد بشیر دین چک اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ جی"

"بڑا لمبا نام ہے تیرا۔ نوکری کرنے آیا ہے؟"

"ہاں جی۔ تابعدار ہوں آپ کا"

"ٹھیک ہے بیٹا اِس گھر میں کوئی کسی کا نوکر نہیں ہے سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں تو بھی خود کو نوکر مت سمجھنا تیرے چک میں کون کون ہے؟"

"بہت سے لوگ ہیں جی۔ میرے پڑوس میں کاکا بدلو رہتے ہیں۔ دُودھ کا کاروبار ہے اُن کا ایک حج کر کے آئے تو دو سیر دُودھ میں ایک سیر پانی ملانے لگے دو حج کئے تو اب ایک سیر دُودھ میں ایک سیر پانی اور پاؤ بھر سنگھاڑے کا آٹا ملاتے ہیں کھیتے ہاتھ چاچا مُرلو علی رہتے ہیں۔ جو تعویذ گنڈوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ سامنے والے مکان میں۔۔۔"

"ارے بس بس۔ میں تیرے گھر والوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں"

"اپنا گھر والی کوئی نہیں ہے جی۔ کالو خاں کے پاس لوہار کا کام کرتے تھے اُس نے نوکری سے نکال دیا تو چل پڑے پنڈ چھوڑ کر"

"ماں باپ بہن بھائی؟"

"نام سُنے ہیں جی اُن کے۔ دیکھا کسی کو نہیں"

"اچھا۔ اچھا۔ فکر مت کر اب سب کو دیکھ لے۔ یہ تیرا گھر ہے، جو کام تجھے دیا جائے دِل لگا کر کرنا سب کو خوش رکھنا آرام سے رہے گا"

"ٹھیک ہے جی"

"جا باہر جا کسی کو بُلا لا" دادی اماں نے کہا۔ اور خیر دین باہر نکل گیا۔ سامنے ہی فرزانہ بیگم نظر آ گئیں تو خیر دین نے اُنھیں آواز دے لی۔

"چاچی جی۔ بڑی اماں بُلا رہی ہیں" فرزانہ بیگم اندر آ گئی تھیں۔

"اوہ۔ فرزانہ۔ ذرا ابدال علی سے کہہ کر اِسے کسی کوارٹر میں بھجوا دو۔ یہاں کام کرنے آیا ہے۔ ابدال علی سے کہہ دینا اِسے کوئی تکلیف نہ ہو"

"آؤ" فرزانہ بیگم نے کہا۔ اور خیر دین کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

اُوپری منزل کے ایک خوبصورت کمرے میں طفیلی بیگم اور رشید ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ذکیہ بیگم غسل خانہ دِکھا گئی تھیں اور ملازم نے اُن لوگوں کا سامان کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

"اماں۔ ابا کی کھوپڑی کو کیا ہو گیا تھا کہ۔"

"باہر تو جھانک لے بے وقوف۔ کوئی قریب نہ ہو" طفیلی بیگم نے آواز بھینچ کر کہا اور رشید جلدی سے اُٹھ گیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا راہداری سُنسان پڑی تھی وہ اندر آ گیا۔

"یہاں تو ہمیں بہت پہلے آ جانا چاہیئے تھا"

"بس مرحوم ایسے ہی آدمی تھے۔ اب کیا کہوں اُن کے مرنے کے بعد"

"قسم اللہ کی بالکل فلموں والا گھر ہے ایسی کوٹھیاں تو صرف پکچروں میں ہوتی ہیں"

"احسان احمد اب تک آدمی ہیں"

"کمال ہو گئی۔ ہم اب تک اِس کوٹھی سے دُور وہاں فیصل آباد میں رہے لعنت ہے ہم پر"

"یہاں پاؤں جمانے ہوں گے رشید اور اِس کے لئے بڑی سمجھداری کی ضرورت ہے" طفیلی بیگم نے کہا۔

"اب تک سمجھداری نہیں دکھائی کیا؟"

"کیوں نہیں۔ میں حیران رہ گئی ہوں" ذکیہ بیگم تو بڑی تعریفیں کر رہی تھیں۔

"بہت کچھ کرنا پڑے گا اماں ابھی تو۔ ایسے چانس مقدر والوں کو ہی ملتے ہیں مگر اماں یہ عارفہ کون ہے؟ کچھ ٹیڑھی نظر آتی ہے"

"فکر مت کرو بیٹا میرا نام بھی طفیلی ہے بڑے بڑے ٹیڑھوں کو ٹھیک کر دیا ہے میں نے مگر صبر۔ ٹھنڈا کر کے کھانا اچھا ہوتا ہے"

"ایک ایک کو ٹھنڈا کر کے کھا جاؤں گا اماں۔ رشید خاں ہے میرا نام کیا سمجھی" رشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر نہانے کیلئے اُٹھ گیا۔ فرشتہ صفت احسان احمد کی جنت میں شیطانوں نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔

توقیر صاحب اکثر ردا سے ملاقات کرتے رہتے تھے جب بھی دفتر آتے اُسے بُلا لیتے اور دفتری اُمور کے بارے میں پوچھتے رہتے۔ ردا اُن کا بہت ادب کرتی تھی لیکن اُن کی شخصیت کا ابھی وہ صحیح تجزیہ نہیں کر سکی تھی۔ تفسیر کے دفتر سے برآمد ہونے والا فائل اُس نے لاکر میں رکھوا دیا تھا اُس کے بعد سے اب تک اِس سلسلے میں مزید کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اِن معاملات کی کھوج نہیں کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن اُسے کیا کرتی کہ یہ معاملات

خود بخود اُس کے سامنے آ رہے تھے۔

توقیر صاحب نے ایک اور فائل اُس سے طلب کیا تھا اور وہ اُسے تلاش کرتی ہوئی عظمت وغیرہ کے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ اور فائل کو تلاش کرتے ہوئے پھر کچھ ایسے کاغذات اُسے مِل گئے جن کا تعلق فرینڈس آرگنائزیشن سے تھا۔ اور اُس میں سیٹھ تسلیم الدین باگڑیا کا نام نمایاں تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود رِدا اُن کاغذات کو دیکھنے پر مجبور ہو گئی اور اُنھیں پڑھ کر یہ بات اُس کے علم میں آ گئی کہ شہاب صاحب اور تفسیر مل کر سیٹھ باگڑیا سے فراڈ کر رہے ہیں اور اُسے تقریباً ۹۰ لاکھ کا نقصان پہنچانے والے ہیں۔

رِدا کو چکر آ گئے۔ وہ دیر تک سَر تھامے بیٹھی رہی فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کیا کرے۔ توقیر صاحب کی شخصیت اُلجھی ہوئی تھی وہ تفسیر کے باپ تھے بیٹے کے خلاف کوئی بات کیسے برداشت کر سکتے تھے اور پھر ان بڑے لوگوں کے بارے میں رِدا کے تاثرات کچھ اچھے نہیں تھے کیا پتہ توقیر صاحب خود بھی اِس چکر میں شامل ہوں۔ لیکن اِس کا نتیجہ بہرطور اچھا نہیں ہونے والا تھا۔ شہاب صاحب بھی پوری طرح ملوث تھے یہ مسئلہ سب سے ٹیڑھا تھا۔ ثناء کے چچا تھے وہ اگر اُن کے خلاف کچھ کرے گی تو دوسرے لوگ اِس سے خوش نہیں ہوں گے خاموشی بھی اختیار کی جا سکتی تھی لیکن اِس سے ایک اور خوف اُبھرتا تھا کہیں کوئی بڑا مسئلہ نہ بن جائے کیونکہ اب اُس کی پوزیشن بھی دوسری ہو گئی تھی توقیر صاحب نے جو ذمّہ داریاں اُس کے سپرد کی تھیں اُن کے تحت اُسے فرم کے بہت سے معاملات دیکھنے ہوتے تھے اور یہ کیس سامنے آتا تو اُس کی شخصیت بھی اُس میں ملوث ہو سکتی تھی دیر تک وہ پریشان بیٹھی رہی۔ ملازمت ضروری تھی اُسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

شام کو کوٹھی واپس پہنچی تو مضمحل تھی۔ ثناء حسبِ معمول تیمور کو لادے ہوئے لان پر اُس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اُس نے رِدا کو اشارہ کیا۔ اور رِدا اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"ہیلو رِدا۔ آؤ تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔"

"قطعی نہیں آپ اپنی نگاہوں کے زاویئے درست کرلیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" رِدا نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُس کے قریب بیٹھ گئی۔

"کیا رپورٹس ہیں؟"

"بس جی کمال ہو گئی ہے۔" ثناء نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"سُبحان اللہ اُردو بہتر ہوتی جا رہی ہے تمھاری۔"

"تھوڑے دن انتظار کرلو۔ تمھاری اُردو بھی بہترین ہو جائیگی۔"

"کیا مطلب؟"

"اپنے خیر دین کو جانتی ہو نا۔ مجھے تو وہ بہت بڑا دانشور معلوم ہوتا ہے بڑی عالمانہ گفتگو کرتا ہے آج کل اُسی کی اُردو بولنے کی مشق کی جا رہی ہے پوری کوٹھی میں۔"

"خوب! ندرت کہاں ہے؟"

"اندر ہی ہے جی۔ کچھ کام کر رہی ہوگی۔ چائے منگوالوں؟"

"نہانے کی اجازت نہیں دوگی؟"

"او جاؤ جی نہاؤ رج کے نہاؤ بادشاہو۔" ثناء نے کہا اور رِدا ہنستی ہوئی اندر چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد لباس وغیرہ تبدیل کر کے باہر نکلی تو جمن نظر آ گیا جو باورچی خانے سے نکل رہا تھا۔ رِدا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لان پر ثناء اُس کی منتظر تھی۔

"ندرت نہیں آئی ثناء؟"

"دو دفعہ بلوا چکی ہوں نہیں آئی تو میں کیا کروں۔"

"جمن ڈیوٹی پر واپس آ گیا۔" رِدا نے پوچھا۔

"ہاں۔ انکل کا موڈ زیادہ خراب نہیں ہوا مجھے حیرت ہے اُنھوں نے کوئی ایکشن ہی نہیں لیا۔" ثناء نے جواب دیا۔

"چلو اچھا ہے ورنہ ندرت نے تو اُسے مروا ہی دیا تھا۔" رِدا نے ہنستے ہوئے کہا۔ چائے آ گئی اور دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئیں۔

"کیا بات ہے رِدا آج کچھ کھوئی کھوئی سی ہو۔" ثناء نے پوچھا۔

"سُبحان اللہ کیا شاعری شروع کر دی ہے؟"

رِدا نے سنبھلتے ہوئے کہا ثناء کی تیز نگاہوں کی وہ دِل سے قائل ہو گئی تھی خود اُسے آئینے میں دیکھ کر یہ احساس نہیں ہُوا تھا کہ اُس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار ہیں حالانکہ وہ اُلجھی ہوئی تھی اُن ہی کاغذات میں جن کا تعلق فرینڈز آرگنائزیشن سے تھا

"خیر شاعری تو ہمارا ہیرو کرتا ہے دِن بھر۔ ویسے ایک بات کہوں رِدا کچھ محسوس نہیں کرنا میری بات سے کیا تم اپنے ہیرو سے بالکل غافل نہیں ہو گئی ہو؟"

"نہیں ثناء تم یہ نہیں کہہ سکتیں، دراصل میری ذمّہ داریاں تم نے سنبھال لی ہیں، اور میں یہ محسوس کر چکی ہوں کہ تیمور کی مجھ سے زیادہ دیکھ بھال تم کرلیتی ہو۔ بس میں اپنی ذمّہ داریاں تمھیں سونپ کر مطمئن ہو گئی ہوں، باقی اور کوئی بات نہیں ہے کیا کوئی ایسی بات ہو گئی ہے؟" رِدا نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں میں اپنے مستقبل کے لئے فکرمند ہوں۔" ثناء بولی۔

"کیا مطلب؟"

"بھئی لوگ کیا کہیں گے، سوچیں گے کہ پہلے پال پوس کر جوان کیا۔ اور اِس کے بعد شادی کر بیٹھی ویسے یہ بات طے ہے کہ میں نے اپنے لئے لڑکا منتخب کر لیا ہے۔"

ثناء حسبِ عادت سوچے سمجھے بغیر بک بک کرنے لگی۔

"چلو ٹھیک ہے کم از کم اب میرے اور تمھارے درمیان ساس بہو کا رشتہ تو قائم ہو گیا بہو کی حیثیت سے تم میرا خیال زیادہ رکھو گی اور ساس کی حیثیت سے اگر کبھی میں تمھیں ڈانٹ ڈپٹ بھی کر دونگی تو کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔" رِدا ہنستی ہوئی بولی۔

"لیکن میں جعلی ساس کا کوئی احترام نہیں کروں گی محترمہ یہ بات آپ نوٹ کرلیجئے آپ نے خود ہی مجھ سے اعتراف کیا ہے کہ تیمور آپ کا بیٹا نہیں ہے۔"

"اب دیکھو نا ایک چھوٹی سی بات زبان سے نکل گئی تھی تو یار لوگ اِس سے فائدہ اُٹھانے پر تُل گئے اگر مزید تفصیلات بتا دوں گی تو نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔"

"ارے چھوڑو چھوڑو تفصیلات تو تم ہاتھ جوڑ کر مجھے بتاؤ گی بس ذرا وقت کا انتظار کر رہی ہوں لو دیکھو وہ نمودار ہو گئیں غالباً اُنھیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اب چائے آنے والی ہے۔"

ثناء نے ایک دم کوارٹروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا رِدا نے بھی ندرت کو دیکھ لیا تھا ندرت اِسی سمت چلی آ رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد وہ اُن کے قریب پہنچ گئی۔

"ہیلو مونالیزا۔ اُس نے رِدا کو دیکھتے ہوئے کہا۔"

"ہیلو اللہ رکھی کیسے مزاج ہیں؟"

"خوش گوار موڈ میں نظر آ رہی ہو، خیریت۔" ندرت نے پوچھا۔

"ذرا اِن خاتون کو سمجھاؤ جو شاعری فرمانے کی کوششیں کر رہی ہیں کہہ رہی تھیں میں کچھ اُلجھی اُلجھی سی ہوں۔"

"خیر تم جس طرح اُلجھی ہوئی گتھی کی مانند ہمارے سامنے آئی ہو۔ مونالیزا اِس گتھی کو سلجھانا تو شاید ہم میں سے کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"اور میں نے محسوس کیا ہے اللہ رکھی کہ تھالی کا بینگن تمھارے سامنے بیکار ہے کبھی اِدھر کبھی اُدھر اُس کے لئے کم از کم تھالی کے سرے تو جھکائے جاتے ہیں لیکن تم تو اِس سپاٹ لان پر بھی ایک لمحہ میں اِدھر سے اُدھر لڑھک جاتی ہو۔"

"چھوڑو کیا غیر شاعرانہ گفتگو کر رہی ہو کچھ عشق و محبت کی بات کرو کچھ دِل کے معاملے کہو تاکہ دِل لگے۔" ندرت نے اُن کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا اور تیمور کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ جو اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"اے اے مسٹر آپ کسی کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ برائے کرم اپنی حسین آنکھوں سے مجھے دیکھ کر نہ مسکرائیں خواہ مخواہ میرے جمن کو آپ سے رقابت پیدا ہو جائے گی۔"

تیمور قلقاری مار کر ہنس پڑا تھا ثناء دلچسپ نگاہوں سے تیمور کو دیکھ رہی تھی رِدا بھی تیمور کی اِس کیفیت سے مسرور تھی ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں میں تجھے قتل کر دونگی اللہ رکھی اگر تُو نے کبھی بُری نگاہ سے میرے ہیرو کو دیکھا تو"

"توبہ توبہ تمھارا ہیرو بھلا میرے ہیرو کے مقابلے میں ابھی کیا حیثیت رکھتا ہے میرا ہیرو تو ایوارڈ یافتہ ہے۔"

"چھوڑو ندرت تمھارا وار خالی گیا، تمھارا تو خیال تھا کہ جمن کے ساتھ کوئی بہت ہی سخت کارروائی ہو جائے گی۔ لیکن یوں لگتا ہے انکل شہاب نے جمن سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

"اور کیا کرو گی ثناء۔ نوکر تو ہو گیا تھا بے چارے کو اللہ کی پناہ اِتنا لمبا راستہ طے کر کے ننگے بدن یہاں تک پہنچا تھا۔"

"ہاں ندرت جمن تو باورچی خانے میں کام کر رہا ہے۔ شہاب صاحب کچھ بھی تو نہیں بولے اُس سے۔" رِدا نے کہا۔

"یہ لو سوپ تو سوپ چھلنی بھی بولی۔ بی بی اللہ کی نگاہ سیدھی تھی۔ اور پھر یہ سب کچھ میری دعاؤں کا طفیل ہے کہ تو بیٹھی تھی اُس بیچارے کے خلاف لیکن دِل کیسا کیسا ملا رہا تھا ہائے ہائے چائے وغیرہ نہیں آئی ابھی۔" ندرت نے کہا۔

"جی ہاں وہ تو میں سمجھ ہی گئی تھی آپ کو اِتنی مرتبہ بلوا کر بھیجا لیکن آپ تشریف نہیں لائیں اب آپ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ لان پر چائے آنے والی ہے۔" ثناء نے کہا۔

"دیکھو نا بھائی انسان کو فضولیات میں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیئے کوئی کام کی بات ہو تو ٹھیک ہے اگر تم اُس بُلاوے کے ساتھ ساتھ یہ اطلاع بھی بھجوا دیتیں کہ بہترین قسم کی چائے پلاؤ گی تو پھر بھلا کون کافر نہ آتا ویسے یار زندگی کچھ عذاب سی ہو گئی ہے اپنی تو کھانا پکایئے گھر صاف کیجئے میرا خیال ہے مجھے بھی یونیورسٹی میں داخلہ لے لینا چاہیئے جمن اگر اجازت دے دے تو۔" ندرت نے کہا اور رِدا بے اختیار ہنس پڑی۔

"جمن کی اجازت ابھی سے ضروری ہو گئی۔"

"ہاں بھئی مجھے ایک اچھے مستقبل کی تعمیر کرنا ہے جمن کی اجازت کے بغیر تو میں اپنے کوارٹر سے قدم بھی نہیں نکال سکتی۔"

"کیسی چل رہی ہے؟" رِدا نے پوچھا۔

"چلی ہی کہاں ہے ابھی تک اُس وقت سے لے کر ابھی تک جمن میرے قریب بھی نہیں پھٹکا ویسے ہوشیار آدمی ہے۔ اُسے یقیناً یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شہاب صاحب اُس شخصیت کی تلاش میں ہیں جس نے

جمن کو دعوت نامہ فراہم کیا تھا۔

"میں تمھیں بتا چکی ہوں کہ انکل مجھ سے بھی پوچھ چکے ہیں" ثناء نے کہا۔

"ہاں۔ مگر شہاب صاحب تو چھپے رستم نکلے خدا کی پناہ اتنے قیمتی سوٹ چرائے گئے اور انھوں نے کچھ بھی نہ کہا" ندرت نے ثناء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو چھوڑو۔ بھئی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے"

"وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے" ثناء نے کہا۔

"لیکن خدا کو بھی چائے منظور نہیں ہے کہا کسی سے؟"

"ہم یہاں بیٹھے ہیں مجال ہے جو چائے نہ آئے" ثناء نے کہا۔

"ارے چھوڑو چھوڑو ثناء تمھارے گھر پر اب اتنے لوگوں کا قبضہ ہو چکا ہے کہ تمھاری اب کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے"

"کیا بکواس ہے" ثناء نے ندرت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں دیکھ لو ابھی تک . . ." ندرت اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ سامنے سے خیر دین آتا ہوا نظر آیا اُس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔

"لو سنبھالو خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گجرانوالہ تشریف لا رہے ہیں" ندرت نے کہا اور ثناء دلچسپ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"بھئی یہ آدمی مجھے مزیدار لگ رہا ہے دل چاہ رہا ہے کہ اسے بھی اپنی منڈلی میں شامل کیا جائے"

"ارے ارے کیا فضول بات ہے" رُدا نے جلدی سے کہا۔ خیر دین تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نزدیک آگیا تھا۔

"سلام علیکم۔" اُس نے بھونڈے انداز میں منہ کھول کر کہا۔

"وعلیکم السلام" ندرت بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ بولی۔

"چا حاضر ہے جی"

"کیا حاضر ہے؟" ندرت نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"چا جی چا۔ چا دودھ چینی تے پتی" خیر دین نے جواب دیا اور ٹرے اُن کے سامنے رکھ دی۔

"بیٹھو خیر دین۔ بیٹھو کیا تم چائے نہیں پیتے؟"

"ناجی نا ہمیں تو لسّی پسند ہے لسّی پیو تے جان بناؤ آپ لوگوں میں رکھا ہی کیا ہے ناک پکڑو تو دم نکل جائے گا ایسے ایسے" خیر دین ناک پکڑ کر لٹکنے لگا۔

"اے اے خیر دین تم بہت زیادہ فری ہونے کی کوشش کر رہے ہو" ثناء نے غصیلے لہجہ میں کہا۔

"لوجی لوجی یہ فری کیسے ہوتے ہیں"

"مطلب یہ ہے کہ بے تکلف ہو رہے ہو"

"تو بی بی ہمارے تمھارے درمیان کوئی تکلف ہے تو بتاؤ آخر کیا تکلف ہے ہم بھی انسان تم بھی انسان ہمارے بھی دو ہاتھ دو پاؤں تمھارے بھی دو ہاتھ دو پاؤں پھر بتاؤ جی ہمارے اور تمھارے درمیان جب کوئی فرق ہی نہیں ہے تو پھر تکلف اور بلا تکلف کیا ہوتا ہے۔ کیوں بی بی جی تم بتاؤ" اِس بار خیر دین رُدا کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ رُدا ہنس کر خاموش ہو گئی تھی ندرت نے کہا۔

"تم چائے کیسے لے آئے خیر دین؟"

"بس جی ٹرے میں پیالیاں رکھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑیں اور لے آئے اِس میں کونسی مشکل ہے"

"میرا مطلب ہے جمن کیوں نہیں آیا؟"

"او جی وہ بڑا شرمیلا آدمی ہے لڑکیوں کو چائے دیتے ہوئے شرماتا ہے ہم ذرا دوسرے قسم کے آدمی ہیں"

"کیا کہہ رہا تھا وہ تم سے"

"نہیں جی۔ کسی کا راز راز رکھنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ ہم اُس کی کوئی بات نہیں بتا سکتے آپ کو"

"کیا مطلب کچھ کہہ رہا تھا تم سے؟"

"کہا ناجی ہم کچھ نہیں بتائیں گے"

"میں پوچھ رہی ہوں تم سے میری بات بھی نہیں مانو گے"

"نہ بی بی رازداری کا وعدہ جس سے کر لو پھر اُس کے لئے کسی کی بات نہ مانو چلے ہم" خیر دین واپس مڑتے ہوئے بولا۔

"خیر دین" ثناء دہاڑی۔

"جی بی بی" خیر دین رک گیا۔

"جمن کیا کہہ رہا تھا تم سے؟"

"کہہ رہا تھا جی رات کے کھانے میں لوٹ پوٹ پکانے گا وہ بی آپ نے کبھی چنے کے کھیت میں جا کر لوٹ کھائے ہیں اُن کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو اچھا جاؤ ٹھیک ہے میں تمھیں اِس بات کی سزا دوں گی"

"نہ بی بی جی یہ کام تمھارے بس کا نہیں ہے خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گجرانوالہ کسی لڑکی کے ہاتھ سے کبھی سزا قبول نہیں کر سکتا سمجھے جی آپ لوگ خیر دین جھک جائے گا مگر ٹوٹے گا نہیں یاد ہے یہ کونسی فلم کا ڈائیلاگ ہے؟"

"نہیں"

"خیر لتے بشیرا"

خیر دین نے کہا اور پلٹ کر واپس چلا گیا رُدا ہنس رہی تھی ندرت معنی خیز نگاہوں سے ثناء کو دیکھ رہی تھی اور ثناء جاتے ہوئے خیر دین کو گھور رہی تھی۔

"کمبخت بڑا سرکش ہے کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا" ثناء نے چائے کی پیالی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ اُس کی خوبی ہے اسے خامی نہ تصور کرو ثناء اور ویسے بھی تم اِس فطرت کی مالک نہیں ہو کہ ملازموں کو ملازموں کے انداز میں دیکھو میرا خیال ہے ہمیں اُس کی سرکشی کو زندہ رکھنا چاہیئے" رُدا نے کہا۔

"سُنا آپ نے یہاں کچھ عرصے کے بعد سرکشوں کا ایک مجمع ہوگا" ندرت نے اپنی چائے کی پیالی اُٹھا کر چائے سڑپتے ہوئے کہا۔

"خیر چھوڑو اِن باتوں کو ہاں تم یہ بتاؤ تمھارے حسن کی موجودہ کیفیت کیا ہے؟"

"کہا نا ابھی تک میری طرف رُخ ہی نہیں کیا۔ دیکھ نہیں رہیں میرے چہرے کی کیا کیفیت ہو رہی ہے اماں جی بار بار پوچھتی ہیں کہ تیرا چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے اب میں کیا بتاؤں انھیں" ندرت نے جواب دیا۔

اُس کے بعد وہ تینوں کافی دیر تک اِسی قسم کی تفریحی گفتگو کرتی رہی تھیں۔

—٥—

"شہاب صاحب کو تفسیر کا ایک تفصیلی خط موصول ہوا تھا اور اُس وقت سے شہاب صاحب اپنے کمرے میں پریشان بیٹھے اُس خط کو بار بار پڑھ رہے تھے خط میں لکھا تھا۔

"ڈیئر شہاب! میں خیریت سے ہوں تمھاری خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم ہمارے مخصوص کام میں کچھ لاپرواہی برت رہے ہو۔ یار عشق و محبت اپنی جگہ پر زندگی کی اِن حقیقتوں سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ مس رُدا آہستہ آہستہ بلندی کی جانب پرواز کر رہی ہیں۔ تم اُن کی طرف سے اتنے غافل کیوں ہو کیا تم جانتے ہو رُدا کے علم میں فرینڈز آرگنائزیشن کی تفصیلات آگئی ہیں یہ حماقت دادا اور عظمت کی وجہ سے ہوئی وہ غلطی سے رُدا کے پاس ایک ایسا فائل چھوڑ آئے تھے جس میں فرینڈز آرگنائزیشن سے متعلق کچھ کاغذات تھے جب انھیں اِس غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے فوری طور پر یہ فائل دوبارہ حاصل کر لیا عظمت نے مجھے لکھا تھا کہ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فائل رُدا نہیں دیکھ سکی لیکن بعد کے حالات سے انھیں شبہ ہوا ہے کہ فائل رُدا کے علم میں آچکا ہے ایک اور خوفناک صورتحال کا علم بھی ہوا ہے وہ یہ کہ ڈیڈی نے رُدا کی تنخواہ میں ایک ہزار روپے ماہوار کا اضافہ کر دیا ہے اور اُسے مزید کچھ اختیارات دے دیئے ہیں اِس کی کیا بنیاد ہے، عزیزم شہاب میاں آپ کے دِل میں رُدا کیلئے جتنی لچک ہے میں جانتا ہوں لیکن اگر رُدا نے یہ اِنکریمنٹ فرینڈز آرگنائزیشن کی تفصیلات بتا کر حاصل کیا ہے تو پھر یوں سمجھ لو کہ اپنی تو چھٹی ہو گئی۔ ڈیڈی خود بھی بہت سے پوشیدہ کام کرتے ہیں یہ بات میرے علم میں ہے لیکن تمھارا کیا خیال ہے۔ کیا میں ڈیڈی کو فرینڈز آرگنائزیشن کے سلسلے میں بلیک میل کر سکوں گا فوری طور پر حالات کا گہری نگاہ سے جائزہ لو اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ رُدا فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں کیا جانتی ہے اِس کے علاوہ شہاب تمھیں وہ جگہ معلوم ہے جہاں ہمارے خفیہ کاغذات رکھے رہتے ہیں میرا مطلب ہے میرے آفس میں۔ میں سُرخ فائل اُسی جگہ چھوڑ آیا ہوں اندازہ یہ تھا کہ کسی کی وہاں تک پہنچ نہیں ہو سکے گی لیکن رُدا کو اِس کے مواقع حاصل ہیں کہ وہ ہر جگہ کی تلاشی لے سکتی ہے۔ وہ لڑکی نہایت پُراسرار ہے میں اُس کا اندازہ لگا چکا ہوں چنانچہ بہتر یہ ہوگا کہ سُرخ فائل تم اپنی تحویل میں لے لو اُس کے بعد ڈیڈی سے ملاقات کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرو کیا رُدا نے اُنھیں فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں بتا دیا ہے یا پھر کوئی اور بات ہے۔ آخر اُسے کسی بُنیاد پر تو اِتنا بڑا اِنکریمنٹ ملا ہوگا جبکہ والد بزرگوار بہت زیادہ فراخ دِل انسان بھی نہیں ہیں باقی یہاں کے حالات کیا لکھوں میں نے تمھیں بتایا تھا کہ یہاں والد صاحب کے دستِ راست بلکہ دستِ لیفٹ بھی موجود ہیں اور شاید انھیں یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ میں یہاں کی رنگ رلیوں میں مصروف نہ ہو سکوں اِس لئے مجھ پر بے شمار بوڑھے نگاہ رکھتے ہیں عجیب زندگی گزر رہی ہے ممکن ہے کسی دن یہاں

سے فرار ہو جاؤں اور کچھ عرصہ کے لئے یورپ کی رنگین فضاؤں میں گم رہوں پھر اپنے آپ کو برآمد کرادوں۔
ویسے اِس سلسلے میں مَیں خاصا پریشان ہوگیا ہوں برائے کرم جلد از جلد مجھے اطلاع دو کہ صورتحال کیا ہے۔"
تمہارا تفسیر

شہاب صاحب یہ خط کئی بار پڑھ چکے تھے آج ہی کی ڈاک سے اُنھیں موصول ہُوا تھا خط پڑھنے کے بعد اُن کی ذہنی کیفیت عجیب سی ہوگئی تھی بات صرف تفسیر کی حد تک ہی نہیں تھی وہ معمولی انسان نہیں تھے بہت کچھ ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے تھے اُنھوں نے اُن کی زندگی کے مشاغل بھی ابھی تک عام نگاہوں سے پوشیدہ تھے بظاہر یہی محسوس کیا جاتا تھا کہ احسان صاحب کے احسان تلے دبے ہوئے ہیں اور کسی مسئلے سے دوچار نہیں ہیں بھائی کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں اور وہ عیش کر رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسی بات نہیں تھی شہاب صاحب خود اپنی ایک پوشیدہ حیثیت بنائے ہوئے تھے اور دوہرے رُوپ کے حامل تھے اِس خط نے اُنھیں پریشان کر دیا تھا کیونکہ بات رُدا کی تھی جو اِسی کوٹھی سے تعلق رکھتی تھی اور نہ صرف تعلق رکھتی تھی بلکہ یہاں کی ایک مقبول شخصیت تھی اِس پر اعتبار کیا جاتا تھا چنانچہ اگر اُس کی زبان کھُل گئی تو شہاب صاحب کو کافی مشکلات سے گزرنا ہوگا۔ رُدا کے بارے میں جُوں جُوں وہ سوچتے تھے اُلجھن کا شکار ہو جاتے تھے ویسے اپنی فطرت کے تحت رُدا اُنھیں قدیم مُغلیہ آرٹ کا ایک نمونہ نظر آتی تھی اور وہ ہر قسم کے نوادرات کو اپنے قریب دیکھنا پسند کرتے تھے لیکن چھوٹی چھوٹی دو تین کوششوں سے اُنھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ رُدا مضبوط پُشت رکھتی ہے اور شناء کو اُس نے پوری طرح سے جکڑ لیا ہے نہ صرف شناء کو بلکہ اِس کے ذریعے کوٹھی کے دوسرے افراد کو بھی چنانچہ اُس پر کسی اوچھے انداز میں وار کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

اُنھوں نے یہ کیس پینڈینگ میں ڈال دیا تھا اور یہی سوچا تھا کہ مناسب وقت کا انتظار کریں لیکن اِن حالات میں اُن کیلئے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ اب رُدا کو اچھی طرح ٹٹول لیا جائے اور اگر واقعی وہ فرینڈز آرگنائزیشن سے واقف ہوگئی ہے تو پھر اُس کے لئے کوئی ایسا بندوبست کیا جائے کہ وہ پھر زبان نہ کھول سکے وہ اِس وقت اِسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی رات ہو چکی تھی اِس لئے اُس وقت تو کسی کارروائی کا موقع ہی نہیں تھا لیکن اُنھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دوسرے دن صبح سے اِس سلسلے میں آغاز کر دیں گے اور جس قدر معلومات حاصل ہو سکیں معلوم کریں گے چنانچہ دوسرے دن تقریباً نو ساڑھے نو بجے وہ توقیر صاحب کی رہائش گاہ کی جانب چل پڑے تفسیر کے دوست کی حیثیت سے توقیر صاحب اُن سے روشناس تھے اور بات تفسیر ہی کی نہیں تھی شہاب صاحب احسان صاحب کے بھائی کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے تھے چنانچہ جب اُنھوں نے اپنا کارڈ توقیر صاحب کیلئے بھجوایا تو توقیر صاحب نے اُنھیں فوراً اندر بُلوالیا۔

"ارے میاں اپنوں کو بھی کہیں کارڈ وغیرہ بھجوا کر آنے کی ضرورت ہوتی ہے تم سیدھے چلے آتے تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

"شکریہ توقیر صاحب۔ بس تفسیر کے جانے کے بعد آپ سے کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تفسیر مجھ سے کہہ گئے تھے کہ آپ سب کا تھوڑا بہت خیال رکھا جائے یُوں تو ماشاءاللہ بے شمار افراد آپ کا خیال رکھنے کے لئے موجود ہیں لیکن میرے دوست نے میری جو ذمّہ داریاں لگائی تھیں اُن کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔"

"بھئی واہ بڑی جلدی آگئے ویسے خُدا کے فضل سے میں ٹھیک ٹھاک ہوں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے سُناؤ احسان کیسے ہیں؟"

"بھائی جان تو بس مشینی انداز میں اپنی زندگی کو مصروف رکھے ہوئے ہیں پتہ نہیں توقیر صاحب انسان کیوں اِتنی دولت کمانے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔"

شہاب صاحب چالاکی سے توقیر صاحب کو اُن راستوں پر لا رہے تھے کہ اگر اُن کے علم میں کوئی بات ہو تو اُسے کھول دیں۔

"بھئی یہ انسان کی عادت ہوتی ہے ابتداء اچھے حالات پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہے اور اِس کے بعد باقی سب کچھ عادت کے مطابق ہوتا ہے اب احسان صاحب دو کے چار بنائے بغیر نہیں رہ سکتے ظاہر ہے ہر کاروباری اِسی انداز میں سوچتا ہے۔"

"مگر میرے خیال میں توقیر صاحب آپ اِس انداز میں نہیں سوچتے آپ کو میں نے مختلف قسم کی پارٹیوں میں دیکھا ہے آپ کئی کام کرتے ہیں لیکن اِس کے باوجود آپ کی مصروفیت بہت زیادہ نہیں ہے۔"

"دراصل میرے کام کرنے کا طریقہ کار ذرا مختلف ہے۔ میں زیادہ توجہ اچھے ساتھیوں کی طرف دیتا ہوں اگر کاروباری اُمور میں کچھ اچھے ساتھی حاصل ہو جائیں تو یہ تمام مسائل آسان ہو جاتے ہیں۔"

"جی ہاں جی ہاں مجھے آپ کی فیاضی کی اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میرے گھر میں ایک لڑکی رہتی ہے ہماری عزیز تو نہیں ہے بس یُوں کہیئے کہ ایک بے سہارا لڑکی ہے جو لاہور سے کراچی آئی یہاں اُس

کا کوئی نہیں تھا اُسے کوٹھی میں رکھ لیا گیا خوددار تھی ہمارے ٹکڑوں پر پلنا پسند نہیں کیا ملازمت کی خواہش کی تو میں نے تفسیر کے ہاں اُسے سیکریٹری کی حیثیت سے لگوا دیا۔"

"رُدا کی بات کر رہے ہو؟" توقیر صاحب نے کہا۔

"واہ آپ تو اُس کا نام بھی جانتے ہیں۔"

"بھئی بہت ہی ذہین لڑکی ہے بڑی اعلیٰ کارکردگی کی حامل۔ میں نے اُسے ایک ہزار روپے کا خصوصی انکریمنٹ دیا ہے کچھ کاغذات کی تلاش تھی مجھے میرے ذمّہ دار ترین لوگ اُن سے لاعلم رہے اگر وہ اُن کاغذات کی نشاندھی نہ کر دیتی تو بڑا نقصان ہو جاتا بس سمجھ لو اِسی بات پر خوش ہو کر میں نے اُسے ایک ہزار روپے کا انکریمنٹ دے دیا مجھے لاکھوں روپے کا نقصان ہو سکتا تھا اُن کاغذات کی گمشدگی سے جب کہ تمام کاغذات ایک بالکل غیر متعلق فائل میں لگا دیئے گئے تھے چلو اچھا ہے کہ وہ تمہاری سفارش پر رکھی گئی ہے ویسے وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنا کام انجام دے رہی ہے اور بہت ذہین بچی ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں لیکن بعض اوقات ذہانتیں خطرناک رُخ بھی اختیار کر جاتی ہیں توقیر صاحب۔"

شہاب صاحب نے توقیر صاحب کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ویسے وہ دِل ہی دِل میں مطمئن تھے کہ توقیر صاحب کے انداز میں کوئی خاص بات نہیں ہے جب کہ فرینڈز آرگنائزیشن کے کاغذات کا اگر مطالعہ کیا جاتا تو تفسیر کے ساتھ ساتھ شہاب صاحب کا چہرہ بھی سامنے آجاتا تھا ایسی حالت میں توقیر صاحب اُسے اِس طرح نظرانداز نہیں کرتے لیکن اُن کے اندر ایسی کوئی بات نہیں پائی گئی چنانچہ شہاب صاحب ایک حد تک تو مطمئن ہوگئے اگر رُدا اِن حالات سے واقف ہو بھی گئی ہے تو کم از کم اُس نے توقیر صاحب تک بات نہیں پہنچائی اور اِس کی ترقی کی وجہ یہ انکشاف نہیں تھا یہاں سے مطمئن ہونے کے بعد شہاب صاحب باہر آگئے اور پھر اُن کی شاندار مرسڈیز تفسیر کے دفتر کی سمت دوڑنے لگی تفسیر موجود نہیں تھا لیکن اُس کا دفتر باقاعدگی سے کھُلتا تھا اور توقیر صاحب کبھی کبھی یہاں آجاتے تھے شہاب صاحب تفسیر کی غیر موجودگی میں جب بھی کبھی یہاں آتے اُن کے لئے کوئی روک ٹوک نہ کی جاتی تفسیر نے خاص طور سے اپنے اسٹاف کو ہدایت کر دی تھی کہ شہاب صاحب کو کبھی دفتر میں داخل ہونے سے نہ روکا جائے۔

اکثر شہاب صاحب تفسیر کی غیر موجودگی میں بھی یہاں آجاتے تھے اور گھنٹوں بیٹھ کر کام کیا کرتے تھے گو اُس کام کا تعلق فرینڈز آرگنائزیشن

سے ہوتا تھا چنانچہ اُس وقت بھی جب وہ تفسیر کے دفتر کے سامنے پہنچے تو اردلی نے جلدی سے دفتر کا دروازہ کھول دیا شہاب صاحب تفسیر کی کرسی پر جا بیٹھے اور اُنھوں نے گھنٹی بجائی اردلی جلدی سے اندر داخل ہو کر اُن کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا۔

"میرے لئے کافی بھجوا دو اور کسی کو اندر نہیں آنے دینا آج توقیر صاحب تو نہیں آئیں گے؟"

"نہیں صاحب کوئی اطلاع نہیں ہے۔"

اردلی نے جواب دیا اور شہاب صاحب نے گردن ہلا دی جب اردلی کافی لے آیا تو شہاب صاحب نے اُسے دوبارہ ہدایت کی کہ وہ مستعد رہے اور کوئی اندر نہ آنے پائے اردلی گردن خم کر کے باہر نکل گیا تھا شہاب صاحب خاموشی سے کافی کے گھونٹ لیتے رہے اور پھر جب اُنھیں اطمینان ہوگیا کہ اُس وقت کوئی اندر نہیں آئے گا تو اُنھوں نے وہ خفیہ دراز ٹٹولی جس میں سُرخ فائل موجود ہوتا تھا لیکن اُن کے ہاتھ خالی دراز سے ٹکرائے تھے ایک لمحے کے لئے اُن کا دِل دھک سے ہوگیا اُنھوں نے پریشانی کے انداز میں پوری دراز ٹٹول ڈالی تفسیر نے واضح طور پر اِس فائل کو اُس کی جگہ موجود ہونے کے بارے میں کہا تھا تو پھر اُس کی گمشدگی کیا معنی رکھتی ہے۔ شہاب صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا فائل کے بارے میں اُن کی معلومات بھی کم نہیں تھیں وہ جانتے تھے کہ اِس میں فرینڈز آرگنائزیشن کی مکمل تفصیلات موجود ہیں اگر یہ فائل کسی غلط ہاتھ میں پہنچ گیا تو... وہ بدحواس ہو گئے تھے فائل اگر توقیر صاحب کے ہاتھ لگتا تو توقیر صاحب کم از کم شہاب صاحب کے سامنے اِتنی عمدہ اداکاری نہیں کر سکتے تھے تو پھر کس نے وہ فائل یہاں سے غائب کیا۔ اُنھوں نے ایک بار پھر اردلی کو طلب کر لیا اور وہ جھجکتا ہُوا اندر آگیا۔

"یہ بتاؤ یہاں اِس آفس میں کون کون آتا رہتا ہے کیا تفسیر کی غیر موجودگی میں بھی آفس کھُلا رہتا ہے؟"

"جی ہاں صاحب بڑے صاحب کا حکم ہے کہ آفس کھُلا رکھا جائے وہ خود بھی کبھی آکر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"اور؟"

"اور تو کوئی نہیں آتا صاحب"

"غور کرکے بتاؤ کوئی کسی کام سے یا اتفاقی طور پر بھی اِس آفس میں داخل نہیں ہوا"

"نہیں صاحب بڑے صاحب کے علاوہ اور تو کوئی نہیں آتا" اردلی نے یاد کرتے ہوئے کہا اور پھر سہمے ہوئے انداز میں بولا۔

"کوئی بات ہوگئی ہے صاحب"

"تم سے جتنی گفتگو کی جارہی ہے صرف اُسی کا جواب دو بہت اچھی طرح غور کرکے بتاؤ ایک ہفتے پندرہ دِن یا بیس دِن کے اندر اندر کوئی توقیر صاحب کے علاوہ بھی اِس آفس میں داخل ہوا ہے۔ خواہ چند لمحات کے لئے ہی سہی" اردلی دیر تک سوچتا رہا پھر ایک دم چونک کر بولا۔

"جی ہاں صاحب سیکریٹری صاحبہ ایک دو بار کسی کام سے اندر آئی ہیں"

"کون سیکریٹری؟"

"وہی بی بی جو کیبن میں بیٹھتی ہیں" اردلی نے جواب دیا۔ اور شہاب صاحب پریشانی سے رُخسار کھجانے لگے پھر اُنھوں نے اردلی کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ باہر چلا گیا ریوالونگ چیئر پر پیچھے کی جانب جھکے ہوئے وہ دیر تک اِس بارے میں سوچتے رہے، یہ تو بُرا ہوا کہ فائل رُدا کے ہاتھ لگ گیا کیا رُدا نے اُس فائل کو تلاش کیا تھا اُس خفیہ دراز تک اُس کی رسائی کیسے ہوئی رُدا ہے کیا چیز جب بھی کبھی غور کرتے اُن کے ذہن میں اُلجھنیں بیدار ہو جاتیں اُنھیں یُوں محسوس ہوتا جیسے رُدا کوئی پُراسرار ہستی ہے حالانکہ یہ بات بھی اُن کے ذہن میں بارہا آچکی تھی کہ اگر اُس دِن وہ تفسیر کو لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن نہ جاتے تو رُدا اُنھیں نہ ملتی وہ کہیں سے بھی آئی تھی؛ کہیں بھی چلی جاتی؟ اُنھوں نے تو خود ہی اپنی شیطانی فطرت کے تحت اُسے دعوت دی تھی اور پھر یہ اتفاق تھا کہ تفسیر عین وقت پر وہاں پہنچ گئی تھی اور اُس نے رُدا کو اُچک لیا تھا یعنی رُدا خاص طور سے اُن تک پہنچنے کے لئے نہیں آئی تھی لیکن اُس کے بعد کے حالات کیا تھے رُدا اتفاقی طور پر ہی ہی فرینڈز آرگنائزیشن سے واقف ہو گئی تھی کیا اِس کے بعد وہ اُس کی کھوج میں لگ گئی ہے اور اگر سُرخ فائل اُس کے ہاتھ لگ گیا ہے تو وہ اُس کا کیا کرے گی وہ فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد کیا کارروائی کرنا چاہتی ہے۔ بے شمار اُلجھنیں پیدا ہوگئی تھیں شہاب صاحب کے ذہن میں، تھوڑی دیر تک وہ سوچتے رہے اور اِس کے بعد اُنھوں نے ایک بار پھر اردلی کو بُلایا اور اُس سے عظمت کو بُلانے کے لئے کہا عظمت بادلِ نخواستہ اندر آگیا تھا اُس نے ادب سے شہاب صاحب کو سلام کیا اور شہاب صاحب نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا عظمت جھجکتا ہوا بیٹھ گیا تھا لیکن اُس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ لئے تھے اور مودب تھا۔

"تفسیر کو تم نے کچھ لکھا تھا"

"جی ہاں صاحب بس وہ ایک بار غلطی ہوگئی تھی مجھ سے۔ بڑے خوفزدہ ہیں ہم لوگ آپ یقین نہیں کریں گے کہ ہمارے اُوپر کھانا پینا حرام ہوگیا ہے ہر وقت یہی خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں۔۔۔"

"کم بات کرو جو پُوچھ رہا ہوں صرف اُس کا جواب دو کون سا فائل تھا جو رُدا نے دیکھا تھا"

"وہ جناب کچھ کاغذات سیٹھ باگڑیا سے متعلق تھے۔ کچھ اُس شپمنٹ کے تھے جس میں دوائیں جارہی تھیں ایسے ہی کچھ کاغذات غلطی سے اُس فائل میں لگے رہ گئے تھے اور وہ فائل بالکل اتفاقیہ طور پر سیکریٹری صاحبہ کی میز پر پہنچ گیا تھا"

"تو پھر تمھیں جب یہ احساس ہوا تو تم نے کیا کیا"

"فوراً ہی سیکریٹری صاحبہ کے کمرے میں پہنچ گیا تھا صاحب یہ بھی سچ ہے کہ وہ فائل اُس وقت تک بظاہر سیکریٹری صاحبہ نے نہیں دیکھا تھا اور وہ دوسرے کئی فائلوں کے نیچے دبا ہوا تھا میں اُسے معذرت کرکے واپس لے آیا اور کاغذات نکال کر اُنھیں وہ فائل دوبارہ پہنچا دیا لیکن مجھے شبہ ہے صاحب سیکریٹری صاحبہ اُن کاغذات کو دیکھ چکی تھیں کیونکہ اُس کے بعد ہمارے اپنے دفتر میں کئی بار تلاشی ہوچکی ہے ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سیکریٹری صاحبہ نے کچھ اور کاغذات ہمارے آفس میں آکر دیکھ لئے تھے ہم نے آج سب سے پہلا کام یہی کیا ہے صاحب کہ تمام کاغذات اکٹھے کرکے اُنھیں الگ کرلیا ہے، میرا خیال ہے جب تک چھوٹے صاحب واپس نہیں آجائیں گے فرینڈز آرگنائزیشن کے تمام کاغذات ہم یہاں سے دُور رکھیں گے"

"اور کام کیسے کروگے" شہاب صاحب نے سوال کیا؟

"اِس کے لئے جب تک آپ کا یا تفسیر صاحب کا کوئی حکم نامہ موصول نہیں ہوگا ہم کچھ نہیں کرسکتے ہم خود بھی بال بچوں والے ہیں صاحب ہمیں بھی خوف ہوتا ہے کہیں کسی مصیبت کا شکار نہ ہوجائیں"

"ہوں تفسیر کو تم نے تمام واقعات لکھ بھیجے تھے؟"

"جی ہاں"

"اُس کا خط مِلا ہے مجھے بہرطور تم اپنا کام احتیاط سے جاری رکھو کام رُکنا نہیں چاہئے اب تمام کاغذات کے لئے مجھ سے رابطہ رکھا کرو میرا ٹیلی فون نمبر نوٹ کرلو کوئی بھی مسئلہ ہوا مجھے اُس کے

بارے میں فوراً اطلاع دینا"

"جیسا حکم جناب ویسے یہ بات ہم جانتے ہیں کہ آپ۔۔"

"میں نے کہا نا کم بات کرو جتنا تم سے کہا جائے صرف اُتنا ہی کرو" شہاب صاحب کرخت لہجے میں بولے اور عظمت جلدی سے اُٹھ گیا عظمت کے جانے کے بعد بھی شہاب صاحب کی کوئی تسلی نہیں ہوئی تھی چنانچہ اُنھوں نے دِل ہی دِل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اب براہِ راست رُدا سے رابطہ قائم کرلینا مناسب ہے اگر یُوں ہی گول مول انداز میں بات چلتی رہی تو کہیں کوئی خوفناک حادثہ نہ ہو جائے۔

رُدا سے گفتگو کرنے کے لئے وہ وقت کے بارے میں سوچنے لگے ابھی اِس مسئلے پر نظرِ ثانی کی جائے یا گفتگو اِسی وقت کرلی جائے اُنھوں نے سوچا اب یہاں آ تو بیٹھے ہیں بلاوجہ وقت کا انتظار کیوں کریں اور پھر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ رُدا کب اُنھیں تنہا دستیاب ہوسکے کوٹھی میں تو خیر اِس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا چنانچہ اُنھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ رُدا سے ابھی اور اِسی وقت بات کرلی جائے اردلی کو ایک بار پھر تکلیف دی گئی اور سیکریٹری صاحبہ کو بُلانے کا حکم دے کر شہاب صاحب خود کو رُدا سے گفتگو کرنے کیلئے تیار کرنے لگے تھوڑی دیر کے بعد رُدا اندر آگئی آسمانی رنگ کے سادہ سے سُوٹ اور دوپٹے میں ملبوس وہی پُروقار چہرہ وہی تمکنت وہی سادگی چہرہ پر میک اَپ کا نام نِشان نہیں تھا لیکن رُدا کو اُس کی ضرورت بھی نہیں تھی میک اَپ کے بغیر ہی اُس کا چہرہ کُندن کی طرح چمکتا تھا اُس نے سادگی سے شہاب صاحب کو سلام کیا اور میز کے قریب پہنچ گئی۔

"جی آپ نے بُلایا تھا مجھے"

"بیٹھو رُدا" شہاب صاحب نے نرم لہجے میں کہا اور رُدا شکریہ ادا کرکے بیٹھ گئی۔

"تفسیر سے میرے جس طرح کے تعلقات ہیں تمھیں بخوبی اِس کا علم ہے رُدا میں اُس کے کاروبار سے بھی اِتنی دلچسپی رکھتا ہوں جتنی وہ خود اور اکثر اُس کے معاملات میں طے کرتا رہتا ہوں میری بہت قدیم دوستی ہے اُس سے اور تم دیکھ لو کہ وہ خود بھی کس طرح میری پاس داری کرتا ہے ویسے اکثر دِل چاہتا ہے رُدا کہ تم سے ملاقات کی جاتی رہے لیکن کوٹھی کے حالات ذہن میں رکھنا ہوتے ہیں میں تو سادہ دِل اور سادہ طبیعت سے تم سے مِلوں لیکن لوگ بس کیا بتاؤں بعض اوقات لوگ ایسی فضول باتیں کرتے ہیں کہ دماغ کھول کر رہ جاتا ہے تمھیں اندازہ ہوگا کہ کچھ دِن پہلے تم سے کس قسم کی بازپُرس شروع کردی گئی تھی"

"اِس میں اُن لوگوں کا قصور بھی نہیں ہے شہاب صاحب ظاہر ہے میرے حالات ایسے ہی تھے کوئی بھی اِس قسم کی بات سوچ سکتا ہے" رُدا نے کہا۔

"ارے نہیں رُدا کیا دُنیا میں صرف بُرائیوں کے رشتے ہی رہ گئے ہیں بعض اوقات ایسے لوگ بھی مِل جاتے ہیں جو بے لوث ہو۔ بےغرض دوستی کرتے ہیں کوئی لالچ کوئی فریب نہیں ہوتا اُن کے دِل میں بس دُنیا نے اِس انداز میں سوچنا چھوڑ دیا ہے"

"بہرطور جس نے میرے بارے میں جو کچھ سوچا وہ اِس میں حق بجانب تھا اور مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے"

"یہ تو تمھاری بڑائی ہے رُدا ویسے میں درحقیقت خود کو بہت ذہین سمجھتا تھا لیکن تمھارے مسئلے میں قطعی احمق ثابت ہوا"

"جی؟" رُدا نے نگاہیں اُٹھا کر شہاب صاحب کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھئی مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ تم کون ہو کہاں سے آئی ہو تمھارا ماضی کیا ہے"

"اِس کے لئے اگر آپ اپنا اطمینان چاہتے ہیں تو صرف چند الفاظ ہی کہہ سکتی ہوں کہ میرے ماضی میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو بعد میں آپ کے خاندان کے لئے بدنامی کا باعث بن جائے"

"یہ بات تمھیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے رُدا تمھاری شخصیت تو چیخ چیخ کر اِس بات کا اعلان بار بار کر چکی ہے"

"شکریہ پھر بھی آپ کو مطمئن رہنا چاہئیے اور اِس کے بعد میرے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئیے"

"نہیں بھئی یہ تو تم غلط کہہ رہی ہو انسان اپنے قریبی لوگوں کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتا ہے"

"اِس وقت کیا آپ نے مجھے میرا ماضی جاننے کے لئے ہی یہاں بُلوایا ہے" رُدا نے سوال کیا۔

"نہیں میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم یہاں مطمئن ہو دراصل ایک اور ملازمت میرے علم میں آئی ہے جو اِس سے کہیں بہتر ہے معقول تنخواہ ہے دیگر آسانیاں بھی حاصل ہیں۔ میں نے سوچا تم سے اِس بارے میں معلومات حاصل کرلوں۔ پسند کروگی"

"اچھی ملازمت کا خواہشمند کون نہیں ہوتا اگر آپ مجھ پر مزید احسانات کرنا چاہتے ہیں اور اُس جگہ کو بہتر سمجھتے ہیں تو مجھے اِس کی تفصیلات بتا دیجئے گا" رُدا نے کہا۔

"ہاں یقیناً بس ابھی کچھ وقت لگے گا اُس میں اُس وقت تک تم یہاں تو کام کر رہی ہو ویسے مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کے کام سے تم مطمئن نہیں ہو؟"

"غیر مطمئن بھی نہیں ہوں توقیر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ شاید یہ بات آپ کے علم میں آئی ہو کہ اچانک انھوں نے میری تنخواہ میں بہت بڑا اضافہ کر دیا ہے۔"

"ہاں ایک ہزار روپے کا لیکن جس جگہ کے بارے میں میں تم سے بات کر رہا ہوں وہ تمھاری اِس مجموعی تنخواہ سے کہیں زیادہ تنخواہ تمھیں دے گی۔"

"تو پھر آپ میرے لئے ضرور بات کیجئے بس مجھے ایک باعزت اور پُرسکون ماحول چاہیئے۔"

"یقیناً ملے گا یقیناً ملے گا ویسے رُدا اپنے طور پر میں تم سے کچھ اور بھی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور۔"

"مجھے عظمت اور داؤد نے بتایا ہے کہ تم نے کچھ ایسے کاغذات دیکھ لئے ہیں جو تمھارے علم میں نہیں آنا چاہیئے تھے۔"

"شہاب صاحب کے لئے اِس کے سِوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ وہ براہِ راست رُدا سے اِس سلسلے میں سوال کر ڈالیں رُدا گہری نگاہوں سے شہاب صاحب کو دیکھنے لگی اُس کی خوبصورت آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی اُس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ میری زبان سے فرینڈز آرگنائزیشن کا نام سُننا چاہتے ہیں تو میں آپ سے عرض کر دوں شہاب صاحب کہ واقعی میں نے وہ کاغذات دیکھ لئے ہیں۔"

فرینڈز آرگنائزیشن کا نام لینے کا مطلب یہی تھا کہ عظمت اور داؤد کا شبہ بالکل درست ہے شہاب صاحب بھی شاطر آدمی تھے انھوں نے اپنے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں پیدا ہونے دیئے اور سرد لہجے میں بولے۔

"رُدا! آپ کو یہ سب نہیں دیکھنا چاہیئے تھا۔"

"کمال ہے دونوں آنکھوں کے لئے میں کیا کرتی آپ بتلایئے شہاب صاحب"؟ رُدا نے سادہ سے انداز میں کہا۔

"کیا کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں تمھیں فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں؟"

"جو کچھ اِس آرگنائزیشن کی کارکردگی ہے آپ یُوں سمجھ لیجئے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔"

"کسی سے تذکرہ کیا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اِس لئے شہاب صاحب کہ آپ بھی اِس میں ملوث ہیں۔"

رُدا نے بغیر کسی جھجک کے کہا اور شہاب صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"بہت زیادہ معلومات حاصل کرنا بعض اوقات زندگی کے لئے خطرناک بھی ہو جاتا ہے رُدا۔"

"تو ٹھیک ہے آپ لوگ مجھے قتل کر دیجئے لیکن جو کچھ میرے علم میں آچکا ہے اُس کے لئے میں نے جدوجہد نہیں کی تھی وہ صرف اتفاق تھا کہ فرینڈز آرگنائزیشن کے کاغذات میرے سامنے آگئے تھے میں نے وہ فائل دیکھا اور اُس سے واقف ہو گئی۔"

"واقف ہو جانا دوسری بات ہے اور اُس کی کھوج میں لگے رہنا اور چیز ہے۔"

"جی ہاں میں نے اُس کی کھوج کی اور بہت ساری معلومات حاصل کر لی ہیں اُس کے بارے میں۔"

"شاید اُس دفتر سے وہ سُرخ فائل بھی تم نے ہی حاصل کیا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" رُدا نے جواب دیا اور شہاب صاحب کے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں۔

اُن کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں رُدا کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ گستاخی پر آمادہ ہے شہاب صاحب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے پھر اُنھوں نے اپنے آپ کو کسی حد تک سنبھالا اور آہستہ سے بولے۔

"اِن تمام باتوں سے تمھارا مقصد کیا ہے رُدا کیا چاہتی ہو۔"

"کچھ نہیں شہاب صاحب کچھ بھی نہیں میں آپ کو جو حقیقت ہے وہ بتا چکی ہوں۔"

"تمھیں یہاں صرف ملازمت کرنی چاہیئے تھی رُدا کیا میں نے تمھیں یہاں اِس لئے ملازمت دِلائی تھی کہ تم بلیک میلنگ کی کوشش شروع کر دو اِس طرح تو تمھاری شخصیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اور اِس کے بعد میرے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ میں تمھارے ماضی کی چھان بین کروں۔" شہاب صاحب بولے۔

"میں نے آپ کو اِس سے منع نہیں کیا شہاب صاحب آپ جس طرح چاہیں میرے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں خود آپ کی کوئی مدد نہیں کروں گی۔"

"رُدا بہت زیادہ بُلند پروازی کی کوشش نہ کرو بعض اوقات اِس سے نقصان ہو جاتا ہے وہ فائل کہاں ہے؟"

"سوری! میں اُس کے بارے میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

"کیوں آخر کیوں تمھیں اِس کا کیا حق پہنچتا ہے۔"

"شہاب صاحب مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا اور آپ یقین کیجئے کہ میں اُس فائل کے ذریعے آپ کو یا توقیر کو بلیک میل قطعی نہیں کروں گی

آپ یہ بھی یقین کر لیجئے کہ اِس میں میری اپنی کوششوں کو دخل نہیں تھا میں صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے صرف ایک۔"

"میں کوئی بات نہیں سُننا چاہتا سب سے پہلے تم مجھے اُس فائل کے بارے میں بتاؤ اور یہ بتاؤ کہ اِس سِلسلے میں تم کس قدر معلومات حاصل کر سکی ہو ویسے تم اِس پر یقین کر لو رُدا کہ تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں تم ہم دونوں میں سے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

"میں کچھ نہیں کرنا چاہتی شہاب صاحب میں کچھ نہیں بگاڑنا چاہتی بس ایک بات چاہتی ہوں صرف ایک بات اور وہ آپ کو کرنا ہوگی آپ کان کھول کر سُن لیجئے جو کچھ میں چاہتی ہوں وہ کرنا آپ کی ذمہ داری ہے ورنہ میرے ہاتھوں آپ کو کوئی بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

شہاب صاحب بُری طرح تلملا رہے تھے اُن کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ خوبصورت رُدا کی گردن اِسی جگہ مروڑ کر پھینک دیتے دیر تک وہ اپنے آپ کو معتدل کرنے کی کوشش کرتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔

"جی فرمایئے کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"آپ فرینڈز آرگنائزیشن سے الگ ہو جایئے آپ اِس خوفناک کاروبار سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیجئے فائل آپ کے سامنے ضائع کر دیا جائیگا اور میری زبان قیامت تک اِس سلسلے میں نہیں کُھلے گی میں صرف یہ چاہتی ہوں شہاب صاحب کہ آپ اِس گھناؤنے کاروبار سے بالکل الگ ہو جایئے۔"

"آپ یہ کیوں چاہتی ہیں؟" شہاب صاحب بدستور طنزیہ انداز میں بولے۔

"جی ہاں اِس کی وجہ ہے جس گھر میں میں رہ رہی ہوں اُس گھر کے مجھ پر بے پناہ احسانات ہیں دُنیا کے بارے میں میں نے بہت زیادہ معلومات نہیں حاصل کیں میں نہیں جانتی کہ انسانوں کے گروہ زندہ رہنے کے لئے کون کون سی گھناؤنی حرکتیں کرتے ہیں اِتنا جانتی ہوں کہ اِس قسم کے معاملات کی انتہا اچھی نہیں ہوتی احسان صاحب نے اپنی کوٹھی کے ماحول کو جو رنگ دیا ہے اُس سے اظہار ہوتا ہے کہ وہ انتہائی نیک فطرت اور خدا ترس ہیں شہاب صاحب، اِس ناجائز کاروبار کی بناء پر اگر آپ کسی حادثے کا شکار ہو گئے۔ تو اِس کے اثرات پوری کوٹھی پر مرتب ہوں گے میں کوٹھی کے رہنے والوں کو اُس خوشگوار ماحول کو اُسی انداز میں زندہ رکھنا چاہتی ہوں جس طرح وہ ہیں اِس کے لئے آپ کو اپنی شخصیت بدلنا ہوگی۔"

"عجیب باتیں کر رہی ہو رُدا تمھارے کہنے سے یہ سب کچھ ہو جائیگا تم نے اپنی اہمیت اِس قدر کیسے سمجھ لی تم مجھے نصیحت کرنے کا کیا حق رکھتی ہو تم اُس کوٹھی کے رہنے والوں کے لئے پریشان کیوں ہو بی بی اسٹیشن پر آئیں تھیں گود میں بچہ تھا بیوقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں میں نے انتظامیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے تمھیں اپنے ساتھ لیجانے کی کوشش کی تھی اگر میں غلط انسان ہوتا تو تم اندازہ کر سکتی ہو کہ اِس وقت تم کہاں ہوتیں ثناء بلاشبہ اتفاقی طور پر وہاں آگئی تھی۔ لیکن اگر میں چاہتا تو اُسے کوئی بھی چکمہ دے سکتا تھا تمھیں ایک گھر ملا ایک چھت ملی میری اور ثناء کی وجہ سے اور اُس کے بعد میں نے تمھاری یہ خواہش بھی پوری کر دی کہ تم ایک باعزت ملازمت کرو اِن تمام چیزوں کے صِلے میں تم مجھے یہ سب کچھ دے رہی ہو۔"

"بے شک میں اِن ہی احسانات کی وجہ سے اُس گھر میں کوئی حادثہ نہیں چاہتی شہاب صاحب میں اُس گھر میں کوئی ایسا کام نہیں ہونے دینا چاہتی جس کی وجہ سے ہنستے مُسکراتے لوگوں کے چہرے سکڑ جائیں غم و یاس کی تصویر بن جائیں۔"

"ڈرامہ مت کرو میرے سامنے رُدا ڈرامہ مت کرو میں دوسری فطرت کا انسان ہوں تم کچھ تو نقصان اُٹھاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے اگر نقصان ہی میری تقدیر میں لکھا ہُوا تو اُٹھاؤں گی کیا کریں گے زیادہ سے زیادہ آپ مجھے قتل کر دیں گے یہ ہوگا کہ مار دیں گے اور کوئی ایسا حادثہ ہو جائے گا میری زندگی میں جو مجھے تباہ و برباد کر دے۔ یا اِس کے علاوہ کوئی اور ترکیب بھی ہے آپ کے ذہن میں نہیں شہاب صاحب میں اُن لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو بھٹک جاتی ہیں اسٹیشن پر اگر آپ مجھے نہ مِلتے میں اگر یہ سہولتیں حاصل نہ کر پاتی تو آپ ذہن نشین کر لیجئے کہ آج بھی میں باعزت طریقے ہی سے کہیں رہ رہی ہوتی گو اِس میں مجھے زیادہ مشکلات اُٹھانی پڑتیں۔ زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی لیکن مجھے جُھکانا آسان کام نہیں ہوتا میں اُن فلمی کہانیوں کی مانند اپنی کہانی آگے نہ بڑھنے دیتی جن میں ایک بے سہارا لڑکی ریلوے اسٹیشن پر اُترتی ہے غنڈوں کے ہاتھ لگ جاتی ہے وہ اُسے طرح طرح سے تباہ و برباد کرتے ہیں کبھی وہ اُسے بالا خانے تک پہنچا دیتے ہیں اور کبھی قحبہ خانے تک نہیں شہاب صاحب فلمی کہانیوں کو صرف فلمی کہانی رہنے دیجئے اُن میں کچھ کہانیاں حقیقت کا رُوپ بھی اختیار کر جاتی ہیں لیکن اُن کمزور ہستیوں کے ساتھ جنھوں نے دُنیا میں کچھ نہیں دیکھا ہوتا آپ ایک بات ذہن نشین کر لیں کہیں بھی مجھ کو اتنا کمزور نہیں پائیں گے میں دُنیا سے لڑنے کی خواہشمند نہیں ہوں لیکن جب خود پر بن جائے گی تو دُنیا مجھ سے لڑ نہ پائے گی۔ رُدا کے چہرے پر ایک ایسی تمتماہٹ ایک ایسا دبدبہ ایک ایسا جوش پیدا ہو گیا تھا کہ شہاب صاحب کوشش کے باوجود اُس چہرے پر نگاہ نہ جما سکے

اُس کی حسین اُبھری ہوئی آنکھوں میں اُس وقت قہر و غضب کی بجلیاں ٹوٹ رہی تھیں شہاب صاحب سناٹے میں رہ گئے۔ اِس کمزور سی معصوم سی لڑکی کے اندر ایک ایسی خوفناک قوت پوشیدہ ہے اُنھوں نے اِس سے قبل سوچا بھی نہیں تھا دل ہی دِل میں وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ ابتداء میں اُنھیں اِس خوفناک لڑکی سے نبرد آزما نہ ہونا پڑا پریشان بھی تھے اور رُدا کی اِس کیفیت سے خوفزدہ بھی ہوگئے تھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں بالآخر اُنھوں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں تمھیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں رُدا غور کرلینا اِس بات پر۔"

"مجھے غور نہیں کرنا شہاب صاحب نہ غور کرنے کی گنجائش ہے ایک بہت معمولی سی بات چاہتی ہوں آپ سے وہ یہ کہ آپ فرینڈز آرگنائزیشن کے ہر کاروبار سے الگ ہوجائیں تفسیر سے وہ تمام چیزیں حاصل کرلیں جو آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں مجھے نہیں۔ اِس کے علاوہ میں کچھ نہیں چاہتی آپ اطمینان رکھیئے مرتے وقت تک یہ بات میری زبان سے کبھی کسی کے سامنے نہیں نکلے گی کہ آپ نے اِس قسم کے کسی کاروبار میں کبھی شرکت کی تھی میرا خیال ہے مجھے اجازت دیتے اور ہاں آپ کو آزادی ہے میں ٹھیک پانچ بجے یہاں سے نیچے اُتروں گی اگر آپ چاہیں تو کسی بھی شخص کو میرے قتل کے لئے متعین کرسکتے ہیں تیمور عموماً تنہا اُس کے پاس رہتا ہے ظاہر ہے آپ سمجھتے ہیں کہ وہی میری کائنات ہے اور اُسی کے لئے میں سرگرداں ہوں آپ چاہیں تو اُسے اغواء کرکے کہیں لے جائیں قتل کردیں یا پھر اُسے قید کردیں اور اُس کے عوض مجھ سے وہ فائل طلب کریں۔ کبھی نہیں دُوں گی شہاب صاحب رُدا ہے میرا نام کسی قیمت پر نہیں دُوں گی خواہ دُنیا تہس نہس ہوجائے میں صرف ایک مطالبہ کرتی ہوں آپ سے کہ آپ فرینڈز آرگنائزیشن سے بالکل علیحدہ ہوجائیں اور اِس بات کا ثبوت پیش کردیں کہ اب آپ کا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

رُدا اُٹھی اور کمرہ سے باہر نکل گئی شہاب صاحب کھوپڑی کھُجانے لگے تھے اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے رُدا نے اپنے لئے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا وہ۔ ۔ ۔ وہ۔ ۔ ۔ وہ بس یہ چاہتی تھی کہ شہاب صاحب کسی چکر میں نہ پھنسیں کیوں آخر کیوں لیکن یہ بات وہ نہیں جانتی تھی صرف شہاب صاحب جانتے تھے کہ بات صرف اِتنی سی نہیں ہے وہ کہاں کہاں اُنھیں اِس قسم کے معاملات سے روکے گی آج کی بات تو نہیں تھی شہاب صاحب تو اپنی زندگی کا طویل وقت ایسے کاموں میں گزار چکے تھے اُن کے ہاتھ جہاں ملوث تھے رُدا کو اُن کی بھنک بھی نہیں لگ سکتی تھی۔

اُنھوں نے زور سے گردن جھٹکی اور خود اپنی حماقت پر مُسکرانے لگے کیا وہ ایک بیوقوف لڑکی سے خوفزدہ ہوگئے تھے وہ حیثیت ہی کیا رکھتی ہے گردن مروڑ کر ایک طرف ڈال دی جائے گی اور نام و نشان بھی نہیں ملے گا اُس کا لیکن ہے واقعی عجیب بہت ہی احمق۔

●●

ذکیہ بیگم خیردین کو فیصل آباد سے لائی تھیں اُن کے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں تھی اِس سادہ نوجوان کے لئے بس ایسے ہی اُس کی سادگی پر پیار آگیا تھا لیکن خیردین نے اُس کوٹھی میں داخل ہوکر سب ہی کی توجہ حاصل کرلی تھی اور اِس کی وجہ اُس کی دلچسپ اور انتہائی سادہ شخصیت تھی ہر شخص کے لئے مرمٹنے پر آمادہ دُنیا کا مشکل سے مشکل کام اُس کے حوالے کردو اُسے کرنے کے لئے تیار ہوجاتا تھا۔ مجال ہے جو کبھی کسی کے کام کو منع کیا ہو اور اِس کے ساتھ ہی اُس کی دلچسپ گفتگو ہر شخص اُس سے تقریباً خوش ہی تھا سوائے رشید خان اور طفیلی بیگم کے وہ دونوں اُسے کینہ توز نگاہوں سے دیکھتے تھے غالباً اُس کی ہر دِل عزیزی سے جلنے لگے تھے خیردین میں ایک بات اور تھی وہ یہ کہ انتہائی صاف گو تھا کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا جو بات دِل میں آئی زبان تک پہنچ گئی مجال ہے جو اُس کی زبان کے آگے آڑ ہو سب سے زیادہ وہ دادی جان کا پیارا بن گیا تھا اِس کے لئے اُس نے خاص طور سے کوئی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی وہ اِس فطرت کا آدمی تھا کہ دادی جان کا انتخاب کسی خاص وجہ سے کرتا بس اُس شام کوئی چیز لے کر اُن کے کمرے میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ دادی جان مسہری پر بیٹھی خود اپنے ہاتھوں سے اپنی پنڈلیاں دبا رہی تھیں بزرگی تھی۔ بہت سی تکلیفیں تھیں لیکن کسی کا احسان لینے کی قائل نہیں تھیں حالانکہ کوٹھی میں بے شمار نوکر تھے کئی بار کچھ خادماؤں سے پاؤں دلوائے لیکن یہ محسوس کیا کہ اِس خدمت میں بددلی زیادہ ہوتی ہے چنانچہ اُنھوں نے یہ سلسلہ ترک کردیا لیکن پنڈلیوں کی تکلیف بہرطور اُنھیں تھی خیردین جس کام سے آیا تھا اُس کی تکمیل کے بعد باہر چلا گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر واپس آگیا دادی جان مسہری پر نیم دراز تھیں۔ وہ اُچک کر مسہری پر چڑھا تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھیں۔

"کیوں خیریت کیا بات ہے خیردین؟"

"کچھ نہیں جی تم لیٹی رہو۔"

خیردین نے اُن کا ایک پاؤں اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور دادی جان تعجب سے اُسے دیکھنے لگیں پھر خیردین کے مضبوط توی ہیکل ہاتھ اُن کی پنڈلیاں دبانے لگے تو وہ ہنس کر بولیں۔

"ارے ارے او بیوقوف رہنے دے رہنے دے۔"

"نہیں جی رکھا رہنے دو اِسے ہماری گود میں تم دیکھو سارا درد نکال کر باہر پھینک دیں گے۔"

"مگر۔"

"نہ جی تا کچھ نہیں سُنیں گے ہم بہرے ہیں۔" خیردین نے کہا۔

دادی جان کو عجیب سا احساس ہوا تھا لیکن خیردین کی محبت کے آگے کچھ نہ بول سکیں اور پھر وہ پاؤں اِس انداز میں دبا رہا تھا اس میں بھرپور قوت صرف ہورہی تھی کہ دادی جان کو خود بھی اچھا لگنے لگا۔ چنانچہ اُنھوں نے خیردین کو پاؤں دبانے دیئے وہ محبت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھیں کیسا خوبصورت نوجوان ہے کیسے اچھے تن و توش کا مالک اگر جاہل اور غریب نہ ہوتا تو کیا شخصیت ہوتی اُس کی وہ سوچ رہی تھیں خیردین کافی دیر تک اُن کے پاؤں دباتا رہا اور پھر دادی جان نے اُسے دُعائیں دیتے ہوئے پاؤں دبانے سے روک دیا۔

"بس بیٹے میرے پیروں کا درد بند ہوگیا ہے۔"

"نا جی ابھی تھوڑی دیر اور دبانے دو ہم نے سُنا ہے بزرگوں کی خدمت کرکے انسان کو جنت مِل جاتی ہے تو جی اِتنا سا کام کرنے کے بدلے اگر ہمیں جنت مِل جائے تو کیا حرج ہے آپ بولو۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ تجھے اِس زمین پر ہی جنت دے لیکن بس اب میرے پیروں کا درد بند ہوگیا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی اِس وقت بند ہوگیا ہے کوئی بات نہیں ہے۔ کل تو ہوگا اب ہم روز تمھارے پاؤں دبائیں گے اور جنت لے کر ہی دم لیں گے۔" خیردین نے کہا اور چلا گیا اُس کے بعد اُس کا معمول بن گیا تھا روزانہ شام میں پہنچ جاتا اور ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تک دادی جان کے پیر دباتا دادی جان کا چہیتا کیوں نہ ہوتا ویسے بھی دِن میں اُن کے بہت سے کام کرتا تھا ابھی تک کسی نے بھی اُس کی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ اُس وقت بھی طفیلی بیگم چھالیہ کاٹ رہی تھیں دادی جان مسہری پر لیٹی ہوئی تھیں اور خیردین اُن کے پاؤں دبا رہا تھا طفیلی بیگم شاید کسی گہری سوچ میں تھیں دادی جان دیر تک اُن سے باتیں کرتی رہی تھیں لیکن اُس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ دفعتاً دادی جان نے خیردین سے کہا۔

"لے خیردین اب دوسرا پاؤں دبا دے۔"

"ٹھیک ہے جی۔"

خیردین نے دوسرا پاؤں اُٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ دادی جان کہنے لگیں۔

"تیرے بارے میں ہمیں کوئی تفصیل نہیں معلوم ہوئی کبھی اپنی کہانی سُنا مجھے خیردین۔"

"اوہ جی کہانی۔ ۔ ۔ کہانی تو ہمیں ایسی ایسی آتی ہیں کہ بس آپ دانتوں بیچ اُنگلی دبا کر رہ جاؤ گی۔ آپ نے چڑیا چڑے کی کہانی سُنی ہے۔"

"دھت تیرے کی دُنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور تو آج تک چڑیا چڑے کی کہانی لئے بیٹھا ہے میں کہہ رہی تھی میں تیری اپنی کہانی سُنوں گی۔"

"ہماری تو کوئی کہانی نہیں ہے جی بس چڑیا چڑے کی کہانی ہمیں بہت اچھی لگتی ہے دُنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے دادی جان مگر چڑیا چڑے اپنی جگہ موجود ہیں یہ دُنیا آج تک چڑیا چڑے کو نہیں بھولی۔ تم بتاؤ جی بچہ جب پہلی بار کہانی کی فرمائش کرتا ہے تو سب کو چڑیا چڑا ہی کیوں یاد آتا ہے۔"

"ہاں یہ تو تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"چڑیا چڑے کی کہانی ایسی نہیں ہے دادی جان کہ کبھی ختم ہوجائے سُناؤں آپ کو؟"

"اچھا اچھا سُنا سُنا فلسفی ہے تو تو۔ ۔ ۔"

"ایک چڑا تھا جی اور ایک چڑیا تو ایک دِن دونوں کو سُوجھی کہ کھچڑی پکائیں تو دادی جان دونوں چل پڑے چڑیا چاول کا دانہ لائی تے چڑا دال کا۔ ایک بات بتاؤں جی۔ دادی جان چڑا مرد تھا۔ چاول کا دانہ لانے کے لئے وہ چڑیا کو کیوں ساتھ لے گیا خود بھی دونوں چیزیں لا سکتا تھا یہ مردوں میں حرام خوری کی عادت بہت پیدا ہوگئی ہے میں کہتا ہوں گھر کی ذمہ داری چڑیا پر ہوتی ہے اور باہر کی چڑے پر۔ تو دونوں چیزیں اُسے لانی چاہیئے تھیں مگر اُس وقت تو اُسے ساتھ لے گیا مگر گھر آکر بولا کھچڑی پکا۔ اب بتاؤ جی کھچڑی بھی دونوں کو مل کر ہی پکانی چاہیئے تھی۔ نہ وہ چڑیا کو کھچڑی پکانے کا بول کر نہانے جاتا نہ چڑیا کے دِل میں بدی آتی دونوں مِل کر پکاتے دونوں مِل کر کھاتے بات غلط ہے دادی جان ہونا یہ چاہیئے کہ گھر کا ایک ایک کام ایک ایک آدمی سنبھال لے مرد کی ذمہ داری باہر کی ہونی چاہیئے اور عورت کی اندر کی چڑیا نے اگر کھچڑی کھائی تو ایسی کوئی بات نہیں تھی جس کی وجہ سے اُس کی جان چلی جاتی۔" ارے واہ۔ دادی ماں بُری طرح ہنس رہی تھیں۔

"ارے او فلاسفر تو تو فلسفہ بگھارنے بیٹھ گیا۔"

"نہیں جی ہمیں تو دال بگھارنی نہیں آتی ہم فلسفہ کیا بگھاریں گے پر بات بالکل صحیح ہے چڑیا چڑے کی کہانی سے ہمیں ہمیشہ یہ اختلاف رہا ہے نانا قمر دین سُناتے تھے تو ہم اُن کو یہی کہتے تھے جی کہ چاول اور دال چڑے کو لانے چاہیئے تھے جھگڑا ہی ختم ہوجاتا بلکہ جو اُلٹی سیدھی

کہانیاں بنا لیتے ہیں۔۔۔ آپ نے نکٹے بھالو کی کہانی سُنی ہے جی۔

"نہیں بھئی اب میں کوئی کہانی نہیں سُنوں گی کہانی کے ساتھ ساتھ تیرا فلسفہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے جی آج نہیں کل ہم آپ کو نکٹے بھالو کی کہانی سُنائیں گے۔" خیر دین نے دھمکی دی۔

دادی جان کے پاؤں کا درد ٹھیک ہو گیا تھا اُنھوں نے حسبِ معمول اُسے دُعائیں دیتے ہوئے رُخصت کر دیا۔ طفیلی بیگم نے سر و تلیچے رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا خیر دین دُور جا چکا تھا پھر وہ دادی امّاں کی طرف رُخ کر کے بولی۔

"اِس لڑکے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے خالہ جان؟"

"بڑا نیک بچّہ ہے خُدا اِسے زندگی دے بہت ہی اچھی طبیعت کا مالک ہے۔"

"دراصل کچھ ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں خالہ جان کہ میں تو ملازموں سے ڈرتی ہوں بڑے میٹھے بڑے خدمت گزار بنتے ہیں اور موقع پاتے ہی مالکوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر کے لُوٹ مار کر کے بھاگ جاتے ہیں۔"

"خُدا کے فضل سے ہمارے ہاں ایسا کوئی واقعہ کبھی نہیں ہُوا طفیلی بیگم۔"

"چھان بین کریں خالہ جان تو آپ کے گھر موجود ملازم عام طور سے پُشتینی نکلیں گے بہت عرصے سے کام کرتے ہوئے لیکن ذکیہ بہن جس طرح ایک غیر آدمی کو ریل سے اُٹھا کر گھر لے آئیں اُس پر مجھے پہلے ہی تشویش ہوئی تھی اللہ رکھے آپ کا رشید بڑی گہری نگاہ رکھتا ہے دُنیا کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ یہ آدمی اچھا نہیں ہے جوان جہان لڑکیوں کا گھر ہے اوّل تو اِس قسم کے آدمیوں کو گھر میں رکھنا ہی نہیں چاہیئے اِس کے علاوہ کوئی پتہ ٹھکانہ بھی نہیں ہے اپنا جو پتہ رٹا ہُوا ہے۔ اُس نے اللہ جانے اِس میں سچائی ہے بھی یا نہیں کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"تم بلاوجہ اِس کے لئے پریشان ہو رہی ہو طفیلی ایسی بات نہیں ہے ہم نے بھی دُنیا دیکھی ہے بچّہ بُرا نہیں ہے اور نہ ہی کوئی چال چل رہا ہے ویسے تم نے اچھا کیا ہے بتا دیا ہے اِس بات کا بھی خیال رکھا جائے گا گھر میں جوان بچیاں ضرور ہیں لیکن بہت سے نوکر بھی ہیں خُدا کے فضل سے اِس گھر پر اللہ کی نظر سیدھی ہے اطمینان رکھو اِس گھر کو کوئی تکلیف کسی کی ذات سے نہیں پہنچ سکتی۔"

"بس نمک کھا رہی ہوں یہاں کا تو دِل کو دھڑکا لگا رہتا ہے ہر شخص کا کہیں کچھ ہو نا جائے۔" طفیلی بیگم نے کہا۔

"کیسی نمک مرچ کی باتیں ہو رہی ہیں؟"

عارفہ بیگم طفیلی بیگم کو دادی امّاں کے ساتھ کمرے میں تنہا دیکھ کر فوراً گھس آئیں۔

"نا بی ہم نمک مرچ کے قائل نہیں ہیں ہم تو محبت سے اِس گھر میں آئے ہیں کسی کو نمک مرچ لگانے سے ہمیں کیا ملے گا۔" طفیلی بیگم نے کہا۔

"اے لو بوا گویا نمک مرچ کی بات ہم نے تمھارے لئے کہی ہے خُدا لگتی کہنا ممانی جان میں نے کوئی ایسی ویسی بات کہی اِن کے بارے میں مگر میں محسوس کرتی ہوں کہ یہ طفیلی بیگم ہمیشہ مجھ پر آنکھ لگائے بیٹھی رہتی ہیں جہاں میرے مُنہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکلی اُچک لی اور سارے میں پھیلا دی اِن سے پُوچھتی ہوں یہ میرے بارے میں دِل میں کینہ کیوں رکھتی ہیں۔"

"ہائے ہائے لُٹ گئے عارفہ بیگم تمھارے بارے میں دِل میں کینہ رکھنے سے مجھے کیا ملے گا غور کرنے کی بات ہے اگر ذرا سی عقل سے سوچو تو میری اور تمھاری حیثیتوں میں بڑا فرق ہے۔ بہن میں جو کچھ بھی ہوں مجھے اپنا مقام معلوم ہے اور تم جو کچھ ہو وہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں اِس کے باوجود کہ ذکیہ مجھے اِتنا چاہتی ہیں کہ بیان سے باہر ہے لیکن میں ذرا دوسری قسم کی انسان ہوں اور میرے بیٹے کو تم اچھی طرح نہیں جانتیں اِتنا خود دار ہے وہ کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا ابھی کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ امّاں آخر ہم کب تک یہاں رہیں گے خالہ جان ہم پر بے حد مہربان ہیں ہر وقت ہماری دلجوئی کرتی رہتی ہیں لیکن اِس کے باوجود کیا زندگی اُنھیں کے ٹکڑوں پر گزار دینے کا ارادہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مہمان کی حیثیت سے آئے ہیں اور مہمان کی حیثیت سے چلے جائیں۔"

"مطلب تمھارا یہ ہُوا طفیلی بیگم کہ ہم ساری زندگی کے لئے اِس گھر کے ٹکڑوں پر پڑے ہوئے ہیں اور رشتے کی جو تم بات کر رہی ہو بی بی تو ذرا خود ہی اپنے گریبان میں مُنہ ڈال لو زمان خان تو زندگی بھر دُشمن بنے رہے اِس خاندان کے اور اب تم اور تمھارا بیٹا دوستی کا پیغام لے کر یہاں آ گئے ہیں تو کیا پُرانی باتوں کو بُھلایا جا سکتا ہے۔"

"نہ بی بی نا کوشش کرو ذکیہ اِن باتوں کو نہ بُھلا سکیں تمھاری دال روٹی اِسی میں چلے گی تمھیں پہلے بھی نوابوں کے یہاں مغلانیاں ہُوا کرتی تھیں یہی سب کچھ کیا کرتی تھیں اگر نہ کرتیں تو بیگمات کی محبتیں اور ہمدردیاں کیسے حاصل کرتیں عارفہ بیگم مجھے تو تعجب ہے کہ تمھارے اندر یہ مغلانیوں جیسی حرکتیں کہاں سے پیدا ہو گئیں۔ خُدا نخواستہ کہیں کسی جگہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی خاندان میں۔"

"اے اے طفیلی بیگم ذرا زبان سنبھالو میں جواب دینا بھی جانتی

ہوں دیکھ رہی ہیں آپ ممانی جان کیا کہہ رہی ہیں یہ طفیلی بیگم مجھے، آپ لوگوں کی مُنہ چڑھی ہوں گی تو ہوں گی میں تو ٹھیک کر دُوں گی اِن کا سارا دماغ۔" عارفہ بیگم آگ بگولہ ہو گئیں۔

"ارے ہاں بی بی ہاں بے شک کوشش کر لینا اور اِس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو وہ بھی دیکھ لینا۔"

طفیلی بیگم نے سروتہ زور سے زمین پر مارتے ہوئے کہا دادی جان اُٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"ارے ارے کیا حماقتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے کیا فضول باتیں ہیں۔" یہ اُسی وقت ثناء دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی۔

"جاری رہنے دیں دادی جان جاری رہنے دیں کبھی کبھی تو یہ کلاسیکل باتیں سُننے کو ملتی ہیں۔" اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

تیمور مسلسل اُس کی گود میں چڑھا ہُوا تھا اور شاید وہ دیر سے اُن دونوں کی گُفتگو سُن رہی تھی۔

"اے ثناء بے وقوف ہو تم خواہ مخواہ اُن دونوں کے درمیان تلخی پیدا ہوتی جا رہی ہے چلو طفیلی بُری بات ہے کوئی کسی کے لئے طنزیہ جملے نہ استعمال کیا کرو بات کہاں ہو رہی تھی اور کہاں سے کہاں جا پہنچی۔" دادی جان نے کہا۔

"خالہ جان یہ تو بات پہنچانے والوں کی خُوبیاں ہیں بہر حال عارفہ بیگم نے میرے مُنہ لگ کر اچھا نہیں کیا اِس کا نتیجہ اُنھیں بُھگتنا ہوگا۔"

"ایک بات سُن لو طفیلی بیگم اگر کسی پر ناز کرتی ہو تو کبھی نہ کرنا۔ بعض اوقات خُدا کو یہ غرور بہت بُرا لگ جاتا ہے۔"

عارفہ بیگم نے کہا اور دادی جان کے کمرے سے باہر نکل گئیں طفیلی بیگم کھڑی ہو گئیں تھیں۔

"دیکھ لیا آپ نے خالہ جان چوٹ کر کے گئیں ہیں مجھ پر میں کہتی ہوں میں تو اُن کے دِل میں اُس وقت سے کھٹک رہی ہوں جب سے ذکیہ بیگم مجھے فیصل آباد سے لائی ہیں نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا ہوگا، دِل میں نہ جانے کیا کیا منصوبے بنا رکھے ہوں گے سوچا ہوگا کہ ذکیہ کو ہمیشہ بیوقوف بنا کر کھاتی رہیں گی میں نے تو کبھی غور بھی نہیں کیا اِس پر لیکن اب ذرا اِن بی بی کی خبر گیری کرنی پڑے گی۔"

"نہیں طفیلی بیگم سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے اِس کوٹھی میں کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف دِل میں کینہ رکھے یا کچھ کرے تمھیں بھی یہ اجازت نہیں دی جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ جو کچھ ہُوا ہے اُسے بھول جاؤ ایسی چھوٹی موٹی باتیں گھروں میں ہو ہی جاتی ہیں تمھیں خبردار کوئی کسی قسم کی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی رشید سے اِس بارے میں کچھ کہنا میری ہدایت ہے تمھیں۔"

"بزرگ کی حیثیت سے آپ کی باتیں سر آنکھوں پر لیکن ذرا اِن عارفہ بیگم کو بھی ایک بار سمجھا دیجئے میں بھی گئی گزری نہیں ہوں وقت بگڑ لے تو کیا ذات نہیں بگڑی جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"بالکل نہیں بالکل نہیں بھئی نہ تمھارا وقت بگڑا ہے نہ تمھاری ذات بگڑی ہے جاؤ آرام کرو میں ذرا ثناء سے باتیں کروں گی۔" دادی جان نے کہا۔

اور طفیلی بیگم پاندان اُٹھا کر باہر نکل گئیں اُن کے چہرے پر شدید غُصّے کے آثار نظر آ رہے تھے ثناء دادی جان کو دیکھنے لگی۔

"جی دادی جان فرمایئے؟"

دادی جان کی نگاہیں تیمور کی طرف اُٹھ گئی تھیں اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"ثناء تمھارا اپنا تو اب کوئی مشغلہ ہی نہیں رہا ہے گھر میں گھسی رہتی ہو یا تیمور کو سنبھالے رہتی ہو یہ سب کیا ہے؟"

"مطلب کی بات کیجئے محترمہ دادی جان مطلب کی اِس خادمہ سے کیا چاہتی ہیں جہاں تک تیمور کا مسئلہ ہے اُس کے بارے میں آپ کو علم ہے۔"

"کیا علم ہے؟"

"بھئی اولاد ہے میری ظاہر ہے اُسے گود میں اُٹھائے نہ پھروں گی تو کیا کروں گی۔"

"یہ لفظ تمھارے مُنہ سے ابھی اچھا نہیں لگتا بچیوں کی بھولی بھالی باتیں ہی اُن کے چہروں کو بھولا رہنے دیتی ہیں ورنہ پھٹکار برسنے لگتی ہے۔"

"یہ پھٹکار کیا چیز ہوتی ہے دادی جان کیا پھٹکری کی قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے میں نے تو کبھی اِسے برستے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"ہر بات میں مذاق ہر بات میں مذاق سچ کہتی ہوں اچھا نہیں لگتا ہر وقت یہ تمھاری گود میں چڑھا ہُوا۔"

"دادی جان پلیز تیمور میری زندگی ہے میری رُوح ہے آپ کو نہیں معلوم میرا سارا مستقبل اِس سے وابستہ ہے خُدا کے لئے اِس کے بارے میں کچھ نہ کہا کریں میں جذباتی ہو جاتی ہوں۔"

"فضول باتوں سے پرہیز کیا کرو ثناء تمھارے لئے مجھے احسان سے بات کرنا ہوگی۔"

"کمال ہے دھمکیاں دینے کے لئے آپ نے مجھے اپنے کمرے میں روکا ہے کبھی کبھی تو آ جاتی ہوں آپ کی صُورت دیکھنے کے لئے لیکن ایسی باتیں سُننے کے بعد کس کا دِل چاہے گا۔"

"بھئی میں نے تم سے کوئی غلط بات نہیں کہی بچیوں کے زندگی گزارنے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں تھوڑی سی سادگی اور بھولپن ضروری

ہوتا ہے تم اگر ایسی بکی بکی باتیں کروگی تو تم خود بتاؤ آنے والا وقت کیا کہے گا۔"

• بالکل بے مقصد اور بے معنی بات وقت کی زبان کسی نے سُنی ہے وقت کی کوئی زبان ہوئی ہے میں نے تو کبھی کسی وقت کو بولتے ہوئے نہیں دیکھا بلاوجہ دادی جان آپ کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہیں چلو تیمور بلاوجہ ہم اِس طرف نکل آئے یہ جگہ اِس قابل ہی نہیں ہے" شناء نے کہا۔ اور تیمور کو سنبھالے ہوئے چھپاک سے باہر نکل گئی دادی جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

• وقت بولتا ہے بیٹی وقت ہر وقت بولتا ہے اُس کی آواز سُننے کے لئے تجربہ ضروری ہے۔ خدا تجھے کبھی وقت کے تجربے کا شکار نہ کرے۔"

شہاب صاحب سخت پریشانی کا شکار تھے بعض اوقات بہت بڑا آدمی بہت چھوٹے آدمی کے جال میں پھنس جاتا ہے اُس وقت یہی کیفیت تھی اُن کے اہلِ خاندان اُن کی کاوشوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے حالانکہ شہاب صاحب خاصے چلت پھرت کے انسان تھے بہت بار ایسے پریشان کُن واقعات میں گھر گئے تھے جو مصیبت کا باعث بن سکتے تھے لیکن اُنھوں نے اپنی ذہانت ہوشیاری اور اختیارات سے کام لے کر اُن حالات کو اپنے بس میں کر لیا تھا لیکن ایک خوبصورت سی معمولی سی لڑکی اُن کے سامنے سینہ سپر ہو گئی تھی۔ اُنھوں نے بہت کچھ غور کیا تھا رَدا کے بارے میں اور یہ اندازہ لگانے میں اُنھیں دِقت نہیں ہوئی تھی کہ رَدا کسی بھی طور اُن کا بُرا نہیں چاہتی وہ صرف جذبات کے ہاتھوں کھیل رہی ہے اور اُس کا مقصد اُن میں سے کسی کو بلیک میل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ شہاب صاحب کو اُن ہنگاموں سے بچانا چاہتی ہے اور اِس کے لئے رَدا کے دِل میں صرف وہی جذبہ ہے جو ایک اپنائیت کا جذبہ ہو سکتا ہے لیکن شہاب صاحب ایسی احمقانہ اپنائیت کے قائل نہیں تھے بات صرف اِسی حد تک تو نہیں تھی وہ تو زندگی میں بہت سے کھیل کھیل چکے تھے اور اپنے تمام کھیل جاری رکھنا چاہتے تھے سُرخ فائل کسی طرح رَدا کے قبضہ سے نکل آتے تو اُس کے بعد اُنھیں زیادہ فکر نہیں تھی لیکن ایک ایسی اہم چیز اُس کے قبضہ میں تھی کہ وہ پریشان تھے بہت غور و خوض کیا تھا اُنھوں نے رَدا کو قابو میں کرنے کا کوئی ذریعہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کسی اندھے قدم سے وہ بچنا چاہتے تھے حالانکہ اُن کے لئے مشکل نہیں تھا کہ رَدا کو غائب کر کے قصہ ہی ختم کر دیں لیکن اِس طرح وہ خود خطرات میں گھر جاتے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رَدا نے فائل کے بارے میں کچھ دوسرے لوگوں کو بھی بتا دیا ہو اُن میں شناء بھی ہو سکتی تھی اور کوئی بھی ہو سکتا تھا ایسی حالت میں سُرخ فائل اُن کے لئے حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ وہ کوئی ایسی ترکیب کرنے میں کوشاں تھے جس کی بناء پر اُنھیں کامیابی حاصل ہو جائے رَدا کو نہایت آسانی سے تفسیر کی فرم سے نکلوایا جا سکتا تھا لیکن یہ بھی کوئی عقلمندی کا کام نہیں تھا بلکہ اُن حالات میں تو اور زیادہ خطرات پیدا ہو سکتے تھے رَدا اُس فائل کے حوالے سے سیٹھ باگڑیا سے بھی مِل سکتی تھی اور سیٹھ باگڑیا اُسے اچھی سے اچھی ملازمت دے سکتا تھا یہ خطرہ مسلسل شہاب صاحب کے ذہن میں موجود تھا کہ رَدا کہیں سیٹھ باگڑیا سے رابطہ قائم نہ کر لے۔

سارا کھیل چوپٹ ہو جائے گا سب سے زیادہ پریشان کُن بات یہ تھی کہ رَدا شناء کی چہیتی تھی اور شناء سے بہر طور خود شہاب صاحب کو بھی پیار تھا وہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے رَدا پہلے ہی اِس بات کا اظہار کر چکی تھی کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔ تیمور کو اغواء کر لیا جائے چنانچہ تیمور کو اگر کوئی نقصان پہنچا تو اُن کے علاوہ اور کسی پر شک نہیں کیا جا سکتا رَدا نے یقینی طور پر تمام راستے بند کر دیئے ہوں گے چنانچہ کسی احمقانہ اقدام کے بجائے کوئی ایسی کارروائی ضروری ہے جو موثر ہو اور یہ موثر کارروائی ابھی تک اُن کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

اُس شام وہ لان کی چائے پر موجود تھے اور تقریباً تمام ہی لوگ آج موسم کی خوشگوار کیفیت کے زیرِ اثر لان پر آ گئے تھے یہاں تک کہ احسان صاحب بھی موجود تھے خیر دین اور رحمن شام کی چائے کا اہتمام کر رہے تھے شہاب صاحب کی نگاہ رشید کی طرف اُٹھ گئی رشید کے بارے میں اُنھیں معلوم ہو چکا تھا کہ طفیلی بیگم کا بیٹا ہے اور طفیلی بیگم ذکیہ بھابی کی دُور کی بہن تھیں ایسی باتوں پر شہاب کبھی توجہ نہیں دیتے تھے گھر کے معاملات سے اُنھیں واجبی ہی سا سروکار تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے رشید پر بھی توجہ نہیں دی تھی لیکن اُس وقت رشید عین اُن کے سامنے بیٹھا ہُوا تھا اور شہاب صاحب کی نگاہیں کئی بار اُس کی طرف اُٹھ چکی تھیں اُن کی زیرک نگاہوں نے رشید کے خدوخال میں کوئی خاص بات تلاش کر لی تھی حالانکہ وہ بہت معصوم اور مؤدب بنا رہتا تھا چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے شہاب صاحب پیالی کی آڑ سے رشید کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر اُنھوں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے اِس خیال کو آخری شکل دے دی رشید کو قابو میں کیا جا سکتا ہے بس تھوڑا سا ٹٹولنا پڑے گا اُسے اور وہ چائے کی یہ نشست ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے اُنھوں نے ایک منصوبہ ذہن میں ترتیب دے لیا تھا چائے کے دوران خیر دین کے چٹکلے جاری رہے اور اِس کے بعد چائے کی محفل ختم ہو گئی شہاب صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ کر اندرونی حصے کی طرف چل پڑے اُنھوں نے رشید کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا جیب سے پرس نکال کر اُنھوں نے ہاتھ میں لے لیا اور پھر رشید کے قریب سے اِس طرح تیزی سے آگے بڑھے کہ رشید کو اُن کے آگے بڑھنے کا اندازہ ہو جائے اِس کے ساتھ ہی اُنھوں نے پرس زمین پر گرا دیا تھا دس پندرہ قدم چلنے کے بعد اُنھوں نے پلٹ کر دیکھا رشید پرس اُٹھا چکا تھا لیکن ابھی وہ اُسے اپنی جیب میں منتقل نہیں کر سکا تھا کہ اُس نے شہاب صاحب کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا اور پھر وہ تیزی سے شہاب صاحب کی طرف بڑھ گیا۔

• یہ آپ کا پرس۔ اُس نے پرس آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

• اوہ، شہاب صاحب جلدی جلدی جیبیں ٹٹولنے لگے، پھر اُنھوں نے شکرگزاری کے انداز میں رشید کو دیکھا اور آہستہ سے بولے۔

"شکریہ رشید بہت بہت شکریہ۔"

• وہ ابھی آپ کی جیب سے گر پڑا تھا۔

• ہاں میں جیب میں سگریٹ کا پیکٹ تلاش کر رہا تھا نکل گیا ہوگا لیکن ظاہر ہے بھئی اِس گھر میں سب اپنے ہی ہوتے ہیں جاتا کہاں۔"

• جی جناب دُرست فرمایا آپ نے۔

• بھئی تم سے تو اب تک گفتگو ہی نہیں ہو سکی رشید آؤ۔"

شہاب صاحب نے کہا اور رشید نیازمندانہ انداز میں آگے بڑھ گیا وہ خاموش نہیں بیٹھا ہُوا تھا کوٹھی کے بارے میں اُس نے معلومات حاصل کرنا شروع کر دی تھیں یہاں کی ایک ایک شخصیت سے تعارف حاصل کر رہا تھا یہاں موجود لوگوں کی حیثیت کا جائزہ لے رہا تھا اور اُسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ احسان صاحب کے چھوٹے بھائی شہاب صاحب نہایت غصّہ ور اور مغرور انسان ہیں اُس کوٹھی میں وہ چند افراد کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اُن کے غصّہ کی کہانیاں بہت مشہور ہیں اور وہ سب سے منفرد شخصیت کے مالک ہیں شہاب صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں رشید نے فیصلہ کیا تھا کہ ایسے لوگوں سے بنا کر رکھنے ہی میں عافیت ہے بلکہ ایسے لوگ کسی طرح سے ہاتھ میں آ جائیں تو اُسے اپنے کام میں آسانی ہو سکتی ہے اور اپنا کام اُس کے ذہن میں بڑی اہمیت رکھتا تھا وہ طفیلی بیگم سے کہہ چکا تھا کہ تماشا دیکھتی رہیں اِس عمارت میں اُس کا راج ہوگا یہ الفاظ اُس نے پتہ نہیں کس نظریئے کے تحت کہے تھے لیکن طفیلی بیگم کو بھی بیٹے پر بہت اعتماد تھا شہاب صاحب کے ساتھ چلتا ہُوا وہ اندرونی حصے میں پہنچ گیا شہاب صاحب اُسے اپنے کمرے میں لے گئے تھے۔

"تم غالباً زمان صاحب کے بیٹے ہو میں نے زمان صاحب کے بارے میں یہاں پر کچھ باتیں سُنی تھیں بہرطور انسان کا خوددار ہونا اچھی بات ہے میں اُن لوگوں سے متفق نہیں ہوں جو زمان کو مغرور کہتے ہیں۔"

• جی جناب اب آپ دیکھئے نا انسان کا اپنا بھی کوئی مقام ہوتا ہے اُس مقام کو کھو کر کسی کا طفیلی بنا رہنا اچھی بات تو نہیں ہے خالہ جان محبت سے ہمارے پاس فیصل آباد گئی تھیں اُنھوں نے ضد کی تو میری اماں تیار ہو گئیں میں نے بہت سمجھایا لیکن رو رو کر آنکھیں سُرخ کر لیں کہنے لگیں ساری زندگی تیرے باپ نے مجھے بہن سے دُور رکھا ہے اور اب جو تھوڑی بہت زندگی رہ گئی ہے اُس میں اب تو مجھے بہن سے دُور نہ رکھ اب آپ دیکھئے نا بھائی صاحب کون کہتا ہے بہن سے الگ رہو لیکن بہن کے ہاں مستقل پڑے رہنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔"

• نہیں رشید میاں ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ گھر بھائی صاحب کا ہے میرا بھی ہے بھابی کا بھی ہے ہم سب کا ہے اور تم ہم سب سے مختلف نہیں ہو آرام سے رہو کسی قسم کے احساسِ کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے یہاں تو ایسے لوگ پڑے ہوئے ہیں جن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن وہ اپنوں کی مانند رہ رہے ہیں۔"

• ہاں جی یہ تو میں نے دیکھا ہے اِس گھر کو واقعی چڑیا گھر بنا دیا گیا ہے۔" رشید نے کہا اور شہاب صاحب چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

• میرا مطلب ہے اپنے لوگوں کے علاوہ نوکر بھی عیش کر رہے ہیں مالی بھی عیش کر رہا ہے چوکیدار بھی عیش کر رہا ہے اور نہ جانے کون کون یہاں آباد ہے لیکن احسان خالو ہیں کہ اُن کے دِل میں ذرا بھی کوئی میل نہیں ہے بڑی بات ہے اِس زمانے میں ایسا کچھ کرنا۔"

• چھوڑو کس چکر میں پڑ گئے ہو رشید اپنے بارے میں بتاؤ فیصل آباد میں کیا کرتے تھے؟"

"اوہ بس بھائی صاحب ابا کچھ چھوڑ گئے تھے وہی خرچ کرتے رہے تھے صحبت اچھی نہیں تھی وہاں پر ہماری، بُرے لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ مگر کیا کرتے حالات ہی ایسے تھے اب دیکھو نا وہاں پر نوکریاں وغیرہ تو ہیں نہیں کہ نوکری کرتے کراچی کی بات اور ہے یہاں ہم سوچ رہے ہیں کہ کچھ کر سکیں آپ بُرا نہ مانیں مگر ہمیں کسی کے ٹکڑوں پر پڑنا اچھا نہیں لگتا۔"

• واہ یہ کوئی بُرا ماننے کی بات ہے رشید یہ تو اچھی بات ہے کچھ کرنا چاہتے ہو تو اچھی بات ہے میں تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

• اگر یہ بات ہے بھائی صاحب تو آپ جو کام چاہیں میرے لئے منتخب کر دیں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر تو زندگی بے مزہ ہو جاتی ہے۔"

" فی الحال تو میں تمھیں خود اپنے لئے مصروف کر سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے میرے بارے میں جان لینا ضروری ہے "

" کیا مطلب بھائی صاحب ؟ " رشید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

" فرض کرو میں تمھیں دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ دیتا ہوں کیسا لگے گا تمھیں ؟ "

" کمال ہے صاحب دو ہزار روپے ماہوار کیسے بُرے لگیں گے، لیکن تنخواہ دیں گے کس بات کی آپ ؟ " رشید نے سوال کیا۔

" بھئی کچھ گھریلو کام لینے ہیں تم سے مثلاً اب یہ کوٹھی ہے بہت سے لوگ ہیں اس میں طرح طرح کے لوگ ہیں میں کسی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں تم چونکہ دن بھر کوٹھی میں رہتے ہو اس لئے یہ کام تمھارے لئے مشکل نہیں ہوگا میں تم سے یہ کام لے سکتا ہوں۔ تنخواہ دو ہزار روپے ماہوار اور دلچسپ بات یہ کہ کسی سے اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوگا بھول کر بھی کسی کو یہ نہ بتانا کہ میرا تم سے کوئی واسطہ ہے "

رشید کی آنکھوں میں روشنی آگئی تھی اس سے اچھی تو کوئی بات ہی نہیں تھی شہاب صاحب شیشے میں اُتر رہے تھے اگر کوئی ایسا پوائنٹ آجائے جس کی وجہ سے شہاب صاحب اُس کی مٹھی میں آجائیں تو اُس کا مقصد ہے کہ اِس کوٹھی کے ایک اہم ستون پر اُس نے قبضہ جما لیا کم از کم شہاب صاحب کے دل کی بات تو معلوم ہو اُس کے بعد جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ اُس نے گہری نگاہوں سے شہاب صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" بھائی صاحب آپ نے جو کچھ کہا معاف کیجئے گا اِس میں بڑے آدمیوں کی زبان جھلکتی ہے آپ میرے خالو کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ غریب رشتے دار رشتے دار کہلانے کا حق نہیں رکھتے ہم لوگ تو وہ ہیں جنھیں از راہِ خُدا ترسی رشتہ دار بھی کہا جا سکتا ہے میں شکایت نہیں کر رہا آپ سے بس حالات ہی ایسے ہیں کیا کیا جائے آپ مجھے کوئی حیثیت نہیں دیجئے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا خالہ جان یہاں لے آئی ہیں جب تک ماں کا دل لگا ہے گا یہاں رہوں گا اور ایک بات کا آپ اطمینان رکھ لیجئے کہ جب اُن کا دل یہاں سے بھر جائے گا تو اِس کوٹھی سے ایک پائی لئے بغیر کہیں بھی چلا جاؤں گا اور کچھ بھی کر لوں گا آپ نے دو ہزار روپے کی بات کر کے میرا دل دُکھا لیا ہے اگر کوئی کام ہے ایسا مجھ سے تو آپ دوستی اور رشتہ داری کے حوالے سے یہ نہیں کہہ سکتے میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا بھائی صاحب جو کام آپ میرے سپرد کر دیں گے اُس کے لئے وعدہ کرتا ہوں کہ پوری ذمہ داری سے انجام دوں گا لیکن اُس کا معاوضہ ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو صرف معاوضے والی بات پر "

" او ہو رشید بہت بہت شکریہ بھئی واقعی شاید مجھ سے غلطی ہو گئی معاوضہ کی بات مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن کیا کروں تم سے دوستی بھی تو نہیں تھی اب تک بس ایک دو بار دیکھا تھا بھابی نے کبھی تم سے تعارف کرایا اور نہ ہی تم سے کبھی تنہائی میں ملاقات ہوئی۔ بہر طور دوست یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے ضرورتیں ہر انسان کے ساتھ ہوتی ہیں میں نے اسی لئے سوچا تھا کہ تم سے باقاعدہ معاملے کی بات کی جائے اگر دوستی کی بات کرتے ہو تو پھر خاموشی سے یہ رقم رکھ لو۔

" شہاب صاحب نے کوٹ کی اندرونی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور رشید کے حوالے کر دیئے رشید نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو شہاب صاحب ہاتھ اُٹھا کر بولے۔

" دوستی کی بات کر چکے ہو رشتہ داری بعد میں دوستی پہلے چنانچہ اِن پیسوں کے لئے اعتراض نہیں کرو گے "

رشید نے خاموشی سے پیسے لے کر جیب میں رکھ لئے پھر آہستہ سے بولا۔

" ایک بات کا وعدہ کرنا ہوگا رشید میاں وہ یہ کہ جان چلی جائے مگر آن نہ جائے جو کام میں تمھارے سپرد کر دوں وہ کیسا ہی ہو کوئی بھی کام ہو لیکن کسی کے سامنے زبان نہ کھلے تمھاری "

" وعدہ رہا بھروسہ کر لو رشید پر " رشید نے جواب دیا۔ شہاب صاحب کی عقابی نگاہیں رشید کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں گھر میں وہ بہت ہی مغرور مشہور تھے شاید ہی کبھی کسی سے انھوں نے سیدھے منہ بات کی ہو رشید جیسے آدمی کو تو وہ پاس کھڑے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے لیکن اس وقت صورتِ حال ایسی ہی ہوگئی تھی وہ گھر کے کسی آدمی کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ بہت دن سے یہ خیال اُن کے ذہن میں تھا کہ گھر میں کوئی ایسا شخص ہو۔ جو خالص اُن کا آدمی ہو اور اُس کیلئے رشید انھیں مناسب ترین نظر آیا تھا اور انھوں نے اپنی سطح سے تھوڑا سا نیچے اُترنا پسند کر لیا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ کیا پہلے ہی مرحلے پر رشید سے حقیقت کا اظہار کر دیں یا انتظار کریں انتظار کا موقعہ نہیں تھا زردا سُرخ فائل کی مالک تھی اور اِس کی کارروائیوں کے بارے میں شہاب صاحب فوراً آگاہ ہونا چاہتے تھے چنانچہ تھوڑی دیر غور و خوض کے بعد انھوں نے کہا

" بھئی رشید صاحب صورتِ حال یہ ہے کہ میں اِس کوٹھی میں ذرا مختلف طبیعت کا مالک ہوں یہاں کے کچھ اصول مجھے ناپسند ہیں بھائی صاحب کو ہر طرح کا مجمع لگانے کا شوق ہے اور

وہ بغیر سوچے سمجھے جس کو جی چاہتا ہے یہاں لے آتے ہیں یہی کیفیت دوسرے لوگوں کی بھی ہے "

" بالکل بالکل اِس کا ایک ثبوت تو میرے پاس موجود ہے اِس خیر دین کو دیکھا ہے آپ نے شہاب صاحب ؟ "

" کون خیر دین ؟ "

" وہ جو نیا ملازم ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بک بک کر رہا تھا اور جو ضرورت سے زیادہ بولتا ہے "

" اوہ چک نمبر اٹھارہ " شہاب صاحب بے اختیار مسکرا پڑے۔

" جی ہاں اُسی کی بات کر رہا ہوں میں نے بھی دُنیا دیکھی ہے بھائی صاحب انسان کی نگاہ پہچانتا ہوں یہ آدمی اُس وقت ریل میں ملا تھا۔ جب خالہ جان کے ساتھ میں یہاں آ رہا تھا چکنی چپڑی باتوں سے اُس نے خالہ جان کا دل اپنے قبضہ میں لے لیا اور خالہ جان اسے یہاں لے آئیں لیکن کیا آپ نے اس قسم کے لاتعداد واقعات نہیں سُنے کہ کسی بھی شخص کا اعتبار کر کے گھر لے آیا گیا اور وہی چونا لگا کر نکل گیا "

" ہاں ہوتا ہے ایسا ہوتا ہے لیکن اِس کوٹھی میں کسی کو چونا لگانا ذرا مشکل ہی کام ہے اور چونا لگانے والے کو آسانی سے نکلنے نہیں دیا جائے گا "

" وہ تو ٹھیک ہے مگر خطرہ ہی کیوں مول لیا جائے "

" اب ظاہر ہے یہ اِس کوٹھی کے لوگوں کا شوق ہے تو کوئی کیسے روک سکتا ہے "

" ٹھیک ہے یہ ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی ہے جوں ہی میں نے اُس شخص کو کسی غلط کام میں ملوث دیکھا اُس کی گردن ناپ لوں گا میں اُس کی تاک میں ہوں "

" ہم مطلب کی بات سے ہٹ گئے ہیں رشید۔ خیر دین کے معاملے کو تم جانو اور تمھارا کام اِسی طرح سے بہت سے لوگ موجود ہیں یہاں پر میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کے بارے میں میرے پاس خفیہ معلومات اکٹھی رہیں اور تمھیں یہی کام کرنا ہیں "

" اُن لوگوں کے نام بتا دیجئے آپ مجھے " رشید نے کہا۔

" فی الحال میں جس شخصیت کا تذکرہ تم سے کر رہا ہوں اُس کا نام زردا ہے "

" او ہو میں سمجھ گیا وہ خوبصورت سی بی بی جن کے بارے میں اماں بتا رہی تھیں کہ صرف ثنا کی دوست ہیں "

" ہاں اُسی کی بات کر رہا ہوں "

" ٹھیک ہے اُن کے بارے میں مجھے کیا معلوم کرنا ہے " رشید نے

سوال کیا۔

" رشید وہ بہت پُر اسرار لڑکی ہے رفتہ رفتہ میں تمھیں اِس کے بارے میں بہت سی باتیں بتا دوں گا لیکن جو پہلا کام تمھیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت انتہائی احتیاط سے اُس کے کمرے میں داخل ہو جاؤ اور کمرے کی ایک ایک چیز کی تلاشی لے ڈالو اُس کے پاس سُرخ جلد کا ایک فائل موجود ہے جو اُس نے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔ مجھے اُس فائل کی تلاش ہے اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اگر تمھارے ذریعے مجھے وہ فائل حاصل ہو گیا تو میں تمھیں اُس کی بھاری قیمت ادا کروں گا جو تمھارے تصور سے بھی زیادہ ہوگی " شہاب صاحب نے کہا اور رشید معنی خیز انداز میں گردن ہلانے لگا۔ اُس کے خیال میں بات بن رہی تھی اور حالات اُسے خود بخود اُس راستے پر لے جا رہے تھے جس کے لئے وہ تیاریاں کر رہا تھا۔

رشید گہری نگاہوں سے شہاب صاحب کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

”اِس فائل میں کیا ہے شہاب بھائی؟“

”دوسری بات“۔ شہاب صاحب کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ”اُس وقت تک تم کسی بات کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے جب تک خود میں تمھیں کچھ نہ بتاؤں اِسے میری مجبوری سمجھ لو۔“

رشید نے اُن کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ شہاب صاحب کو اُس کا یہ سوال ناگوار گزرا ہے۔ وہ کھیل خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اِس لئے اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”آپ کو یقین ہے کہ سُرخ فائل اُس کے کمرے میں موجود ہے؟“

”دعوے سے نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اُس کے کمرے میں نہ ہو تو پھر اُسے اُس کے دوستوں کے پاس تلاش کرنا ہوگا۔ اور اِس کا پتہ تمھیں ہی لگانا ہے اُس کا تعاقب کرو پتہ لگاؤ وہ کس کس سے ملتی ہے۔ مثلاً اُس کی دوست ہے اور احسان صاحب کے ڈرائیور غلام علی کی بیٹی نُدرت سے بھی اُس کے تعلقات ہیں۔ تمھیں پتہ لگانا ہوگا رشید کہ اگر فائل اُس کے کمرے میں نہیں ہے تو کہاں ہے۔“

”میرے اختیارات کیا ہوں گے؟“ رشید نے سوال کیا۔

”مطلب۔۔۔؟“

”اگر یہ چھان بین کسی کو ناگوار گزری تو۔۔۔؟“

”کوشش کرنا ایسا نہ ہونے پائے۔“

”ضرور کروں گا لیکن اگر ایسا اتفاق ہو جائے تو۔۔۔؟“

”سنبھال لیا جائے گا۔“

”تب آپ اطمینان رکھیں میں رِدا کو دیکھ لوں گا۔“ رشید نے کہا۔

”نہیں، غلط کام کسی قیمت پر نہیں ہونا چاہیئے تم نہیں جانتے وہ ثناء کی کتنی گہری سہیلی ہے۔“

”یہ بھی ممکن ہے شہاب صاحب کہ اُس کے اور ثناء کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو جائے۔“ رشید زیرِ لب مسکرا کر بولا۔

”احمق پن کی بات مت کرو رشید تمھیں بس اِتنا ہی کرنا ہے، جتنا میں کہہ رہا ہوں۔ فی الحال فائل رِدا کے کمرے میں تلاش کرو۔ اور اگر نہیں ملے تو مجھے اِس کی اطلاع دو اُس کے ساتھ ہی ساتھ تم دِن بھر گھر تک اُن لوگوں پر نگاہ رکھا کرو فی الحال تمھارے یہ دو کام ہیں بہت تیز رفتاری اختیار کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ہمیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

رشید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

”اطمینان رکھو بھائی صاحب رشید کے ذریعے اگر آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو اُس کی مکمل ذمہ داری رشید پر ہوگی۔ میں اِتنی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہوں۔“

”اِس کے علاوہ رشید ہماری مُلاقات خفیہ طور پر ہوا کرے گی میں یہاں کوٹھی میں رہنے والوں سے بہت زیادہ ربط نہیں رکھتا اگر تمھیں میرے قریب زیادہ دیکھا گیا تو لوگ شکوک و شبہات کا شکار ہو سکتے ہیں چنانچہ جب بھی تمھیں مجھ سے مِلنا ہو بہت اچھی طرح وقت اور موقعہ کی نزاکت کا خیال کر کے مجھ سے مُلاقات کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ رشید نے جواب دیا۔

”بس اب تم خاموشی سے نکل جاؤ اگر کوئی تم سے اتفاق سے پُوچھ بھی لے کہ میرے کمرے میں مجھ سے کیا باتیں کر رہے تھے تو کہہ دینا کہ۔۔۔“

”یہ سب کچھ میں کہہ دُوں گا آپ بالکل اطمینان رکھیں۔“ رشید نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

شہاب صاحب اُس کے جانے کے بعد گہری سوچ میں ڈُوب گئے وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں میں نے خود تو جلد بازی نہیں کر ڈالی ہے۔ رشید کی فِطرت سے پوری طرح واقف ہوتے بغیر یہ کام اُس کے سُپرد کر دینا دانشمندی نہیں تھی لیکن اِس کے علاوہ کیا بھی کیا جا سکتا تھا شہاب صاحب خود یہ تمام کارروائی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ رِدا اُن کی طرف سے ہوشیار تھی۔ دوسری بات یہ کہ کسی ایسے مُعاملے میں وہ اپنی شخصیت کو ہلکا بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بہرطور اب تو قدم اُٹھا ہی چُکے تھے اُس کے نتیجے کا انتظار کرنا تھا۔ رہی رشید کی بات تو وہ شہاب صاحب کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اگر یہ شخص کسی بھی وقت پٹری سے اُترا تو اُسے اُٹھا کر پٹری پر رکھا جا سکتا ہے۔

**

ثناء کے ذہن میں بہت سے منصوبے جنم لے رہے تھے اُس وقت دادی جان کے کمرے سے نکلتے ہوئے اُس نے بہت کچھ سوچا تھا طفیلی بیگم اور عارفہ بیگم کے درمیان جو نوک جھونک ہوئی تھی وہ ثناء کے لئے بہت دلچسپ تھی عارفہ بیگم کو معاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اُنھوں نے ثناء کی پیاری رِدا کے لئے جاسوسی کی تھی اور رِدا کو ذلیل و خوار کرایا تھا دراصل ثناء کو رِدا سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی ہر چند کہ وہ رِدا کی ملازمت کی وجہ سے اُس سے بددل تھی اور اُسے بُرا بھلا ہی کہتی رہتی تھی لیکن حالات کی گہرائیوں میں ڈُوب کر اُس نے سوچا تھا تو رِدا کے اُس اقدام نے اُس کے دِل میں رِدا کی عزت اور بڑھا دی تھی رِدا خود دار بھی تھی غیور تھی۔ اور اِس عمارت میں بسنے والے بے شمار انسانوں کی طرح اپنے آپ کو اُن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ یُوں بھی اگر رِدا پر غور کیا جاتا تو یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ رِدا بے حد نفیس طبیعت کی مالک ہے پتہ نہیں کن حالات میں لاہور سے یہاں تک پہنچی تھی لیکن اُس کا عزم ناقابلِ

تسخیر تھا چھوٹے سے بچے کو لے کر وہ ایک ہوٹل میں قیام کرنا چاہتی تھی اور یہاں اپنے لئے جگہ بنانے کی خواہش مند تھی۔ اِس بات کا ثناء کو یقین تھا کہ رِدا یہ کام کر سکتی تھی اُس کے ذہن میں جو پلاننگ تھی وہ اِتنی زیادہ مشکل نہیں تھی اگر ثناء کی نیت آڑے نہ آتی تو یقیناً رِدا چند گھنٹوں سے زیادہ اُس کوٹھی میں قیام نہیں کرتی اُن باتوں نے ثناء کو رِدا کا اور بھی گرویدہ بنا دیا تھا عارفہ بیگم نے رِدا پر جو گھناؤنے الزامات لگائے تھے اُن کا خمیازہ عارفہ بیگم کو بُھگتنا ہی تھا رِدا اپنی فراخ دِلی سے کام لے کر اگر انہیں معاف کر چکی ہو تو دوسری بات ہے ثناء میں اِتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ عارفہ بیگم کو بُھول جاتی یہ دوسری بات ہے کہ اب تک کوئی بہتر منصوبہ اُس کے ہاتھ نہیں لگا تھا نُدرت بہت ذہین تھی اور شیطانی چکر چلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی لیکن عارفہ بیگم کے سِلسلے میں اُس نے بھی اب تک خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی لیکن اب ثناء کو ایک موقعہ مل گیا تھا اُس وقت طفیلی بیگم اور عارفہ بیگم کی نوک جھونک سُننے کے بعد اُس نے بہت کچھ سوچا تھا طفیلی بیگم بمقابلہ عارفہ بیگم لُطف آ جائے گا۔ لیکن وقت سے پہلے وہ اُن لڑکیوں کو اُس بارے میں بتلائے یا نہ بتائے یہ فیصلہ ثناء نہیں کر پا رہی تھی۔ پیٹ میں لڈو پھُوٹ رہے تھے اور طبیعت نہیں چاہ رہی تھی کہ اِس سِلسلے میں خاموش رہے۔ بہت غور و خوض کرنے کے بعد بالآخر اُس نے فیصلہ کیا کہ کم از کم نُدرت کو اپنے اِس پروگرام میں شریک کر لیا جائے نُدرت بہترین کارکن تھی اور ثناء کی بھرپور مدد کر سکتی تھی چنانچہ ثناء تیمور کو گود میں لئے نُدرت کے کوارٹر میں پہنچ گئی۔ نُدرت صحن کی جھاڑو لگا رہی تھی ثناء کو دیکھ کر اُس نے جھاڑو ایک سمت ڈالی اور ہاتھ جھاڑتی ہوئی بولی۔

”مالک کی بیٹی دیکھ لے میرا حال بھلا یہ حسین مخروطی اُنگلیاں جنھیں میرا جمن مجنوں کی پسلیاں کہتا ہے اِس قابل ہیں کہ ہاتھ میں تنکوں کی یہ بھدی جھاڑو پکڑ کر پورے صحن میں جھاڑو لگائیں یہ عصمت بی بس کیا کہوں اُنھیں یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اُنھوں نے ایسا داؤ مارا ہے مجھ پر کہ میں تلملا کر رہ گئی ہوں۔“

”ارے واہ، یہ بھی کوئی کام ہے خوش قسمت ہو تم کہ ایسے کام کرتی ہو اور میں جھاڑو دیئے دیتی ہوں یہ کون سی بڑی بات ہے۔“

”بہت زیادہ اعلیٰ ظرف بننے کی کوشش مت کرو مالک کی بیٹی، جھاڑو دینا آسان کام نہیں ہے دس روپے کے حساب سے جو تم خرید کر پھینک ڈال سکتی ہو یہ معمولی سا کام بھلا تم سے کیسے ہو سکے گا؟“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے لاؤ میں جھاڑو لگاؤں“ ثناء نے کہا اور نُدرت نے اطمینان سے جھاڑو چھوڑ دی ثناء کو بھی بس چڑھ ہی گئی تھی تیمور کو ایک طرف بٹھا کر اُس نے جھاڑو سنبھالی اور برق رفتاری سے صحن کی صفائی کرنے لگی اُسی وقت شوکت جہاں کمرے سے باہر نکل آئیں اُنھوں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا اور پریشان ہو کر آگے بڑھیں۔

”ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو یہ کیا ہو گیا تجھے نُدرت کیا کرا رہی ہو ثناء بیٹا سے؟“

”کچھ نہیں امی جھاڑو دینے دو اِسے۔ اِسے بھی تو پتہ چلے کہ غریب اِس زمین پر کس طرح رہتے ہیں پتہ نہیں چلے گا تو اُس کے دِل میں گداز نہیں پیدا ہوگا۔ اور یہ غربت و امارت کا فرق نہیں جان سکے گی۔“

”پاگل ہو گئی ہے بالکل۔۔۔ بالکل ہی دیوانی ہو گئی ہے کیا لاؤ ثناء جھاڑو مجھے دے دو بیٹی، کسی نے دیکھ لیا تو ہماری شامت آ جائے گی۔“ شوکت جہاں نے کہا۔

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔ دیکھا غریب کس طرح دولت سے ڈرتا ہے یہ ہے فرق جو میں تجھے بتانا چاہتی تھی مالک کی بیٹی۔“ نُدرت نے کہا۔

”چھوڑ دیجئے چچی جان چھوڑ دیجئے مجھے زور دے کر رہوں گی۔ کیا سمجھتی ہے یہ خود کو بلا وجہ جب دیکھئے ہر وقت مجھے دولت کا طعنہ دیتی رہتی ہے دولت میرے باپ کی ہے میری نہیں ہے کیا قصور ہے اِس میں۔“ ثناء بھولے پن سے بولی اُس کی آنکھوں میں غصہ کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔

”بیٹی ہم کچھ نہیں کہیں گے تمھارے بارے میں سوائے اِس کے کہ تم واقعی بڑے لوگ ہو، واقعی تم بڑے لوگ ہو تمھیں حق ہے کہ تم بڑے رہو لاؤ بیٹی مجھے دے دو پلیز۔“ شوکت جہاں نے کہا۔

”بیگمی جان خُدا کی قسم جھاڑو دینے دیجئے ورنہ میرا دماغ گھوم جائے گا بس جھاڑو دینے دیجئے۔“ ثناء نے اِس انداز میں کہا کہ شوکت جہاں بے چاری پریشان ہو کر رہ گئیں۔

بہرطور ثناء نے پورے صحن کی جھاڑو لگائی اور اُس کے بعد جھاڑو ایک طرف پھینک کر نُدرت کو دیکھنے لگی۔

”ہاں اب بول اللہ رکھی کیا کہتی ہے مجھے؟“

”یار! لڑکی تو تُو ٹھیک ٹھاک ہے اگر اپنا کوئی بھائی وغیرہ ہوتا تو ہم تیرے لئے ضرور رشتہ دے دیتے مگر بدقسمتی ہے چل ٹھیک ہے۔ جھاڑو لگ گئی امی میرے لئے اور کوئی کام تو نہیں ہے؟“ نُدرت نے شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں نہیں بھئی کوئی کام نہیں ہے تم جہاں جانا چاہو چلی جاؤ۔“ شوکت جہاں نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ اُنھیں خطرہ تھا کہ کہیں نُدرت پھر ثناء کو نہ چڑھا دے، وہ آخر مالک کی بیٹی تھی کتنے ہی شریف لوگ کیوں نہ ہوں اِس حد تک تو برداشت نہیں کر سکتے تھے نُدرت نے موقعہ غنیمت جانا اور ثناء کے ساتھ کوارٹر سے باہر نکل آئی۔

دونوں ٹہلتی ہوئی لان پر پہنچ گئیں اور پھر ایک گھنے درخت

کے نیچے پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئیں۔ ندرت گہری نگاہوں سے ثناء کو دیکھ رہی تھی اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی اُلجھن ہے مالک کی بیٹی یقیناً کچھ کہنا چاہتی ہو۔"

"اُلجھن نہیں بھئی تم سے مشورہ کرنا ہے دراصل تم ہماری مفت کی وکیل ہو ہر قسم کا مشورہ لیتے ہوئے تمہاری ہی طرف ذہن جاتا ہے۔"

"ارشاد ارشاد کہیئے کیا تکلیف ہے آپ کو۔۔"

"یار! ندرت بات کچھ بنتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے تم نے تو عارفہ بیگم کو بالکل نظر انداز کر دیا اور ابھی تک کوئی ترکیب نہیں بتائی لیکن میں نے خود ہی یہ کوشش کر ڈالی ہے۔"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ ویسے ذہن آپ کا بھی خاصا شیطانی ہے۔ شیطان سے خاصی قربت ہے آپ کی۔" ندرت نے کہا۔

"ہاں اِس میں تو کوئی شک نہیں ہے اب دیکھ لو نا صرف چند فٹ کے فاصلے پر ہی موجود ہے۔" ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آگے بڑھو ہم اِس وقت جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہیں۔"

"طفیلی بیگم کو دیکھا ہے ندرت؟"

"ہم کسی طفیلی وفیلی کو نہیں دیکھتے، ہمیں براہِ راست قسم کے لوگ پسند ہیں۔"

"نہیں، سچ بتاؤ وہ جو فیصل آباد سے آئی ہیں۔"

"ہاں ہاں اِتنا زیادہ تعارف کرانے کی کیا ضرورت ہے میری نگاہ بہت گہری ہے۔" ندرت نے کہا۔

"مزے کی چیز ہیں یہ آتش فشاں خاتون میرا خیال ہے کہ عارفہ بیگم کی ٹکر کی ہیں۔"

"اوہ اچھا اچھا۔ تو پھر۔۔۔" ندرت نے پوری طرح ثناء کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"ندرت! اگر طفیلی بیگم کو عارفہ بیگم سے بھڑا دیا جائے تو۔۔۔؟ میرا خیال ہے دلچسپ معرکہ رہے گا دادی جان کے کمرے میں دونوں میں نوک جھونک چل گئی تھی میں نے محسوس کیا کہ دونوں میں سے کوئی کسی سے کم نہیں ہے بلکہ طفیلی بیگم کا پلہ کچھ بھاری ہی نظر آتا تھا عمدہ قسم کے داؤ پیچ کی ماہر معلوم ہوتی ہیں۔ دلچسپ محاورے استعمال کرتی ہیں میرا خیال ہے وہ کسی بھی طور عارفہ بیگم سے ہار نہیں مانیں گی امّی کی رشتہ دار ہیں اور یہاں امّی کے رشتہ دار بہت کم ہیں اِس لئے جو ہیں اُن کی بڑی قدر و منزلت ہے تو کیوں نہ اُستادِ اعظم ہم طفیلی بیگم کو عارفہ بیگم سے بھڑا دیں۔"

"آئیڈیا اچھا ہے واقعی اچھا آئیڈیا ہے لیکن اِس کا طریقہ کار کیا ہو گا؟" ندرت نے پُر خیال انداز میں تھوڑی کھجاتے ہوئے پوچھا۔

"اُسی کے لئے تو تمہارے پاس آئی ہوں۔" ثناء نے کہا۔

"بھئی اپنا ذہن اِن دنوں کچھ کُند ہے لیکن ترکیب کوئی ایسی ہونی چاہیے جس سے معرکہ زبردست ہو کوئی چھوٹی موٹی بات اگر ہم اُن دونوں کے درمیان لے آئیں تو بات زیادہ دلچسپ نہیں ہو گی ویسے تمہارا کیا خیال ہے ثناء کیا طفیلی بیگم یہ بات محسوس کرتی ہیں کہ عارفہ بیگم اُن کے مدِ مقابل ہیں۔"

"اگر نہیں کرتی ہوں گی تو اب کرنے لگی ہوں گی کیونکہ دونوں میں ایک عجیب قسم کی رقابت پائی جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہارے بیان سے یُوں اندازہ ہوتا ہے۔ کہ دونوں پہلوان اکھاڑے کے شیر ہیں لیکن اُنھیں کسی ایسے مسئلے میں پھانسا جائے کہ صُورتِ حال پر گرفت مضبوط ہے۔" ندرت نے کہا۔ اور ثناء ایک دم چونک پڑی۔

"سُنو ندرت! تمہارے ساتھ بیٹھ کر تو یُوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے خیالات اُڑ اُڑ کر ذہن میں آ رہے ہوں۔ دادی امّاں عارفہ بیگم کی طرفدار ہیں اِس میں کوئی شک نہیں کہ امّی جان کے مُنہ سے وہ طفیلی بیگم کے ساتھ بھی بہتر سلوک کر رہی ہیں اور ویسے دادی امّاں بذاتِ خود کسی سے پرخاش رکھنے کی عادی بھی نہیں ہیں لیکن ہم اِس بات کو نہیں بھول سکتے کہ عارفہ بیگم نے دادی امّاں کے اشارے پر ندا اور انکل شہاب پر نگاہ رکھنا شروع کی تھی چنانچہ عارفہ بیگم کو دادی امّاں ہی سے تنفر کیا جائے۔"

"مطلب۔۔۔؟"

"ایک تجویز آئی ہے میرے ذہن میں دادی امّاں جب نماز پڑھتی ہیں نا تو سونے کی وہ چوڑیاں اُتار کر رکھ دیتی ہیں جنھیں عموماً اپنے ہاتھوں میں ڈالے رہتی ہیں اور آج کل بھی سونے کی چاروں چوڑیاں اُن کے ہاتھ میں ہیں اُن چوڑیوں کی مالیت تقریباً تیس بتیس ہزار روپے ہے عارفہ بیگم کے لئے کافی دِلکش ہو سکتی ہیں کیوں نہ دادی امّاں کی چوڑیاں چُرا کر عارفہ بیگم کے پاس پہنچا دی جائیں۔"

"مگر اِس سے فائدہ؟ اِس سے تو زیادہ سے زیادہ عارفہ بیگم چور ثابت ہو جائیں گی طفیلی بیگم کا اِن معاملات سے کیا تعلق ہو گا؟"

"ہاں، اُستاد اُسی کی تفصیل بتانے جا رہی ہوں میرا خیال ہے تمہارے لئے یہ مشکل نہیں ہے کہ تم طفیلی بیگم سے رابطہ قائم کر لو ہم دونوں ایک ایک مورچہ سنبھال لیتے ہیں میں عارفہ بیگم کو سپورٹ کرتی ہوں اور تم طفیلی بیگم کو۔"

"احمقانہ بات ہے مالک کی بیٹی، بھلا میں طفیلی بیگم کو سپورٹ کروں گی تو اُس کی کیا حیثیت ہو گی میری اپنی اوقات ہی کیا ہے۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو یار۔ یہاں اوقات کا مسئلہ نہیں۔

تم طفیلی بیگم کا کنٹرول سنبھال لو اور اُنھیں گائیڈ کرو۔ یہ چوڑیاں دادی جان کے پاس سے غائب ہو جائیں گی۔ اور عارفہ بیگم کے صندوق میں موجود ہوں گی۔ لیکن طفیلی بیگم کو تمہارے ذریعے یہ پتہ چلے گا کہ عارفہ بیگم نے یہ چوڑیاں اپنے لئے نہیں بلکہ اُن کے لئے چُرائی ہیں اور ایک یا دو دِن کے بعد یہ چوڑیاں طفیلی بیگم کے بکس سے برآمد ہونے والی ہیں عارفہ بیگم اِس تاک میں لگی ہوئی ہیں اور تم نے اتفاق سے اُن کی یہ تجویز کہیں سُن لی ہے میرا مطلب ہے اُن ہی کی زبانی وہ کسی سے بھی اُس کا تذکرہ کر رہی تھیں مثلاً اپنے شوہر ناصر علی سے چنانچہ یہ بات تم از راہِ ہمدردی طفیلی بیگم کو بتا رہی ہو۔ اُنھیں اِتنا گرم کر دو کہ فوراً ہی کوئی ایکشن لینے پر تُل جائیں چوڑیاں عارفہ بیگم ہی کے صندوق سے برآمد ہوں گی اِس طرح دادی امّاں کو یہ پتہ چل جائے گا کہ عارفہ بیگم نے یہ چوڑیاں چُرائی ہیں اور طفیلی بیگم کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ عارفہ بیگم اُنھیں ذلیل و خوار کرنا چاہتی ہیں کیسی رہے گی؟" ثناء نے کہا۔

"ندرت تعجب سے ثناء کو دیکھنے لگی، پھر بولی۔" اور اِس کے بعد بھی تو اپنے آپ کو معصوم کہتی ہے مالک کی بیٹی تیرا ذہن ہے یا شیطانی چرخہ۔ عارفہ بیگم کے پاس سے اگر چوڑیاں برآمد ہو بھی گئیں تو وہ چور ہو جائیں گی چاہے طفیلی بیگم کی بات سامنے آئے یا نہیں لیکن تو ایک تیر سے دو شکار کر رہی ہے۔ کمال کی بات ہے، یہ تو نہیں کہوں گی میں تجھ سے کہ عارفہ بیگم کو معاف کر دے کیونکہ اُنھوں نے ہماری ندا کو ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عارفہ بیگم کے خلاف یہ ایکشن بہت سخت ہو گا۔ اِس میں رعایت نہیں ہو سکتی؟"

"بالکل نہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ندا کو جس طرح عدالت میں طلب کر لیا گیا تھا اور جس طرح اُسے اپنی صفائی پیش کرنی پڑی تھی۔ اُسے میں آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔ اُسی وقت سے میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ میں اُنھیں ٹھیک کر کے رہوں گی۔" ثناء نے مُٹھی بھینچ کر چہرہ تنا لیا اور ندرت نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کی کلائی پکڑ لی اور بولی۔

"رحم، عالم پناہ رحم! عارفہ بیگم ایک ضعیف خاتون ہیں آپ کے غصّے کی تاب نہیں لا سکیں گی۔"

"ہرگز نہیں اُنھیں معاف نہیں کیا جا سکتا ویسے میں تمہاری طرف سے تصدیق چاہتی ہوں اِس پروگرام کے لئے۔"

"ٹھیک ہے اگر اُن کی تقدیر میں یہی سب کچھ لکھا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔" ندرت نے جواب دیا۔

ثناء شرارت آمیز انداز میں مُسکرانے لگی پھر اُس نے کہا۔

"یار ندرت! اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جتنی شیطانی ترکیبیں ذہن میں آتی ہیں تیرے سامنے پہنچ کر ہی آتی ہیں۔ ورنہ میں بذاتِ خود اِس سلسلے میں بہت کچھ غور کرتی رہتی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔"

"بزرگوں کا فیض ہوتا ہے۔ انسانی ذہن بزرگوں کے سامنے آ کر ہی کُھلتا ہے آئندہ بھی اگر کسی بات کی اُلجھن ہو تو ہمارے پاس آ جانا پہلے تین نمبر کے صحن میں جھاڑو لگانا اور اِس کے بعد اپنی مشکل کا حل پا لینا۔" ندرت نے جواب دیا۔ اور ثناء ہنستی ہوئی اُٹھ گئی۔

"تو پھر مجھے یہ کام فوری طور پر انجام دے لینا چاہیئے اِس لئے مجھے اجازت۔"

"جاؤ آسمان سے تمہاری مدد ہو گی۔" ندرت نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا اور ثناء تیور کو سنبھالے ہوئے کوٹھی کی جانب چل پڑی۔

* *

"صائمہ روشن علی نے کوٹھی میں فون کیا۔ شہاب صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ فون اُنھوں نے ہی ریسیو کیا تھا۔

"صائمہ بول رہی ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

"ہیلو صائمہ! میں شہاب ہوں۔"

"اوہ شہاب صاحب ایک کام تھا۔ اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

"جی کہیئے کیا بات ہے؟"

"شہاب صاحب! اُس دن تقریب میں کچھ لڑکیاں آئی تھیں جن میں وہ ایوارڈ یافتہ ندا بھی تھی۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔"

"اگر ممکن ہو سکے تو ثناء اور ندا وغیرہ کو آج شام کھانے پر ہمارے ہاں بھیج دیں۔ میری کچھ دوست یورپ سے آئی ہوئی ہیں اُن کے اعزاز میں میں نے یہ تقریب رکھی ہے۔ اچانک یہ پروگرام بنا تھا اِس لئے پہلے سے اطلاع نہیں دے سکی ثناء موجود نہیں ہے کیا؟"

"ہاں ثناء کہیں گئی ہوئی ہے۔" شہاب صاحب نے جواب دیا۔

"تو پلیز آپ اُسے میرا یہ پیغام ضرور دے دیجئے اور اُس سے کہیئے کہ میں انتظار کروں گی ایسا نہ ہو کہ وہ گول ہو جائے۔"

"بالکل نہیں ہو گی آپ مطمئن رہیں۔" شہاب صاحب نے کہا۔ اور صائمہ روشن علی نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ شہاب صاحب ریسیور رکھ کر کچھ سوچنے لگے تھے ایک لمحے کے لئے اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے، پھر اُنھوں نے گہری سانس لے کر گردن ہلائی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر باہر نکل آئے تھوڑی دیر تک وہ کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں ٹہلتے رہے پھر اُس وقت چونکے جب ثناء کی کار پورٹیکو میں رُکی۔

نیچے اُتر کر وہ برآمدے کی جانب بڑھی تو شہاب صاحب اُس کی

طرف چل پڑے۔

"ہیلو انکل" ثناء نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو ثناء، بھئی تمہارے لئے صائمہ روشن علی کا ایک پیغام ہے۔ فون آیا تھا اُس کا"

"کیا پیغام ہے؟"

"اُس کی کچھ دوست یورپ سے آئی ہوئی ہیں اُس نے انتہائی اصرار کے ساتھ تمہیں، رِدا کو اور اُس لڑکی کو جو اُس دن تمہارے ساتھ تھی رات کے کھانے پر بُلایا ہے اور سخت تاکید کی ہے کہ تمہیں ضرور پہنچنا ہے"

"او ہو اچھا اچھا لیکن رِدا تو آفس گئی ہوئی ہے" ثناء نے پریشانی سے کہا۔

"تو رات کو جانا ہے تمہیں ایسا کون سا مشکل مرحلہ ہے کیا پروگرام ہے تمہارا جاؤ گی یا نہیں۔ میں صائمہ کو اِس کے بارے میں کیا جواب دُوں اُسی طرف جا رہا ہوں"

"جاؤں گی انکل ضرور جاؤں گی صائمہ کے ہاں کی پارٹیاں خاصی دلچسپ ہوتی ہیں" ثناء نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا اور شہاب صاحب ہنسنے لگے۔

"ہاں واقعی وہاں کی پارٹیاں کافی دلچسپ ہوتی ہیں" اُنھوں نے کہا۔

"کچھ یاد آ رہا ہے انکل" ثناء بولی۔

"جی ہاں، یاد آ رہا ہے اور آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ کی اُس شرارت کو نہیں بھول سکوں گا"

"انکل، ویسے معاف کیجئے گا آپ کچھ کمزور پڑ گئے ہیں آپ کے غصّے کی اب وہ کیفیت نہیں رہی"

"کیوں بے چارے جمن کی شامت بُلانا چاہتی ہو، بہر طور میں نے خود بھی اُس پروگرام سے لُطف اُٹھایا تھا اِس لئے جمن کو معاف کر دیا گیا" شہاب صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

"چلئے اب اِس سلسلے میں کیا کہا جا سکتا ہے سوائے اِس کے کہ جمن ہی خوش نصیب ہے" ثناء نے کہا اور ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔

شہاب صاحب دیر تک اُسی جگہ کھڑے مُسکراتے رہے۔ آج وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کر لینا چاہتے تھے۔ موقعہ اچھا تھا۔ اِس کے بعد وہ ہوشیاری سے ثناء کی کارروائیوں کا جائزہ لیتے رہے۔

شام کو رِدا اپنی ملازمت سے واپس لوٹی تو ثناء اُس کے پاس پہنچ گئی اُن کے درمیان گفتگو ہوئی پھر دونوں ملازموں کے کوارٹر کی طرف گئیں جہاں وہ تیسری لڑکی رہتی تھی۔

شہاب صاحب اُن تمام کارروائیوں کو گہری نگاہ سے دیکھتے رہے تھے پھر جب وہ تینوں تیار ہو کر ڈرائیور کے ساتھ نکل گئیں تو شہاب صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔ اب اُنھیں رشید کی تلاش ہوئی ملازموں سے رشید کے بارے میں کچھ پوچھنا نہیں چاہتے تھے، اِس لئے خود ہی اُس کی تلاش میں چل پڑے۔

⧉⧉

رشید اُنھیں حفیظہ بیگم کے کمرے سے نکلتا ہُوا نظر آیا تھا۔ اُنھیں دیکھ کر وہ ٹھٹھکا تو شہاب صاحب اُسے اشارہ کر کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑے، تھوڑی دیر کے بعد رشید اُن کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا اُس نے شہاب صاحب کو سلام کیا تھا۔

"کیا رپورٹ ہے رشید؟"

"کوئی خاص نہیں چیف، ابھی تھوڑی دیر میں تینوں لڑکیاں تیار ہو کر کہیں گئی ہیں"

"ہوں۔ اور تو کوئی خاص بات نہیں؟"

"نہیں چیف بس ایک پرابلم ہے"

"کیا...؟"

"اپنے پاس کنوینس نہیں ہے۔ اگر ایک موٹر سائیکل ہی کا بندوبست ہو جاتا تو باہر بھی اُن پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی یہ پتہ چلایا جا سکتا تھا کہ کون کہاں جاتا ہے۔ کنوینس کے بغیر ہر کام کچھ مشکل ہو گیا ہے۔ چیف کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے لئے ایک موٹر سائیکل کا بندوبست کر دیں؟"

"ہوں۔ موٹر سائیکل کا بندوبست ہو جائے گا ایک آدھ دن میں تمہیں اُس کی چابی مل جائے گی"

"گڈ چیف، پھر آپ دیکھئے دُنیا کا کوئی بھی کام رشید کے بس سے باہر نہیں ہوگا"

"فی الحال تمہیں آج رات اپنا کام دِکھانا ہے"

"کیا مطلب؟"

"چونکہ آج وہ تینوں موجود نہیں ہیں اِس لئے تمہیں رِدا کے کمرے کی تلاشی لینے میں کوئی دِقت نہیں ہوگی"

"اوکے چیف، آج رات ٹھیک نو بجے میں رِدا کے کمرے میں داخل ہو جاؤں گا"

"نہایت ہوشیاری سے، تمہیں اِس بات کا اندازہ رکھنا ہوگا کہ فائل جیسی چیز کہاں چھپائی جا سکتی ہے"

"آپ فکر ہی نہ کریں، میں موقع کا منتظر ہی تھا اور آپ شاید اِس بات پر یقین نہ کریں کہ جب میں نے اُن لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو میرا دِل یہی چاہا تھا کہ مجھے اُن کے پروگرام کے بارے میں معلوم ہو جائے تاکہ میں اپنا کام کر لوں"

"اِس قسم کے انتظامات بھی رکھو رشید کہ اُن کے پروگراموں کے بارے میں تمہیں معلوم ہو جائے"

"ہاں چیف، انتہائی کوشش کر رہا ہوں آپ فکر نہ کریں آہستہ آہستہ حالات پر قابو پا لُوں گا دراصل نئی جگہ ہے ابھی تمام لوگوں سے شناسائی نہیں ہے لیکن میں قدم جما رہا ہوں آپ کا یہ خادم آسمان میں سُوراخ کر کے وہاں کی بھی خبر لے آئے گا آپ بس اُسے چند روز کا موقعہ تو دیں"

"آج اپنا کام احتیاط کے ساتھ کر لو تاکہ ایک طرف سے ہم لوگ مطمئن ہو جائیں"

"اوکے چیف" رشید نے جواب دیا۔

"بس اب خاموشی سے نکل جاؤ۔ اِس بات کا خاص طور سے خیال رکھو کہ کوئی تمہیں میرے پاس آتے یا یہاں سے جاتے نہ دیکھ پائے"

"اوکے چیف" رشید نے جواب دیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

نو بج کر دس منٹ ہوئے تھے جب رشید چوروں کی طرح چلتا ہُوا رِدا کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اُس کے پاس دروازے کا تالا کھولنے کے اوزار تھے لیکن اُسے یہ اوزار استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی چونکہ رِدا کے کمرے میں تالا نہیں لگا ہُوا تھا۔

"دھت تیرے کی اب تک بلاوجہ ہی بیوقوف بنتا رہا ورنہ یہ کام تو کبھی کا ہو چکا ہوتا" رشید نے دِل ہی دِل میں سوچا اور کمرے میں داخل ہُوا تھا۔

لیکن وہ اِس بات سے بے خبر تھا کہ دو آنکھیں دُور سے اُس کی اِس کارروائی کو حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اُس نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی۔ کمرے کا دروازہ اُس نے بند نہیں کیا تھا تاکہ ذرا بھی باہر آہٹ ہو تو وہ آسانی سے کمرے سے نکل جائے، ویسے خطرناک کام تھا اُس کوٹھی میں اُسے اپنی پوزیشن مضبوط سے مضبوط تر بنانی تھی کیونکہ اُس کے بعد نہ جانے اُسے کیا کیا کرنا تھا پنسل ٹارچ کی مدد سے وہ کمرے کی ایک ایک شئے کو غور سے دیکھنے لگا۔ کمرے میں مختصر سامان تھا۔ ایک الماری جس میں کپڑے ٹنگے ہوئے تھے ایک رائٹنگ ٹیبل ایک مسہری چند کُرسیاں یہی اِس کمرے کی کُل کائنات تھی کچھ ڈیکوریشن پیس رکھے تھے ایک بڑی سی تصویر دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ رشید گہری نگاہوں سے پورے کمرے کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اُس نے تلاشی لینا شروع کر دی تقریباً دس منٹ تک وہ کمرے کی ایک ایک چیز کو ٹٹولتا رہا لیکن سُرخ فائل کا کہیں وجود نہیں تھا۔ رشید کو یقین ہو گیا تھا کہ سُرخ فائل اُس کمرے میں نہیں ہے، اپنی ناکامی کا اُسے افسوس بھی ہُوا تھا لیکن بہر طور جب کوئی چیز کمرے میں ہے ہی نہیں تو اُسے کہاں سے برآمد کیا جا سکتا ہے وہ اطمینان سے اپنا کام انجام دینے کے بعد دروازے کی طرف بڑھا پھر اُس نے دروازے کا پٹ آہستہ سے کھولا تھوڑا سا پٹ کھول کر اُس نے باہر گردن نکال کر جھانکا، اور اُسی وقت اُس کی تھوڑی پر ایک زوردار گھونسہ پڑا۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ کمرے کے وسط میں آ گرا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا اور اندھیرے ہی میں کوئی سایہ اُس کی طرف بڑھا ایسا نپا تُلا اندازہ تھا کہ تاریکی کے باوجود سائے نے رشید کو آ لیا اور دوسرے لمحے اُسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا رشید نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو سائے نے ایک اور گھونسہ اُس کے چہرے پر رسید کر دیا کیا زوردار گھونسہ تھا رشید کے جبڑے ہل گئے تھے بدقسمتی سے اُس وقت چاقو وغیرہ بھی اُس کے پاس موجود نہیں تھا ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی اُسے کیا پتہ تھا کہ کوئی اِس طرح اچانک ہی کمرے میں آ جائے گا اور پھر یہ اچھا ہی ہُوا۔ بگڑے دماغ کا آدمی تھا اگر چاقو وغیرہ ہوتا تو شاید سائے پر حملہ ہی کر دیتا لیکن اِس بار اُس نے بھی سائے سے لپٹ جانے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے سائے کی کمر پکڑ لی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ اُسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکا تھا سائے کا گھٹنا اُس کے پیٹ پر لگا اور اُس کے مُنہ سے اوغ کی آواز نکل گئی دوسرے لمحے ایک زوردار گھونسہ پھر اُس کی تھوڑی پر پڑا، اور وہ اِس بار بھی قلابازی کھا گیا۔ اب اُس کے حواس جواب دیتے جا رہے تھے سائے نے آگے بڑھ کر اُس کی ٹانگ پکڑ لی اور رشید خوفزدہ لہجے میں چیخا۔

"ارے ارے یہ میں ہوں رشید خاں تم کون ہو بھائی؟"

لیکن سائے نے اُس کی ٹانگ پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اور رشید اوندھا ہو گیا اُس کی تھوڑی چھل گئی تھی اور ناک سے خون نکل آیا تھا سائے نے اُسے اُٹھا کر نے کے بعد پیچھے سے بالوں سے پکڑا اور اُٹھا کر اُسی طرح دیوار کے قریب پہنچ گیا اور پھر کھٹ کی آواز کے ساتھ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی رشید کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے بند ہو گئی تھیں لیکن دوسرے لمحے اُس نے خوفزدہ نگاہوں سے سائے کو دیکھا اور پھر اُس کی حالت قابلِ دید ہو گئی چہرہ غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا آنکھیں آگ اُگلنے لگیں کیونکہ سامنے کھڑا ہُوا شخص خیر دین تھا۔

خیر دین بھی بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا پھر وہ گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ارے س... سرکار آپ، آپ...؟"

"کمینے، ذلیل تُو نے مجھ پر ہاتھ اُٹھایا ہے" رشید غُراتے ہوئے لہجے میں بولا اور خیر دین کی طرف بڑھا اُس نے پوری قوت سے خیر دین کے مُنہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن خیر دین نے اطمینان سے اُس کی کلائی پکڑ لی تھی۔

"نہیں بابو جی، تھپڑ مارنے کا حق تمہیں بھی نہیں پہنچتا، ذرا یہ تو بتاؤ

کمرے میں کیوں داخل ہوتے تھے ؟" خیر دین نے سوال کیا۔

"تو کمینے . . ." رشید آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے جی آپ کا جو دل چاہے ہمیں کہہ لو ابھی آپ کا گریبان پکڑ کر لئے جاتے ہیں دادی اماں کے سامنے کہیں گے کہ چوروں کی طرح گھس کر پورے کمرے کی کھکھوڑ بازی کر رہا تھا ہم کیا جانیں کہ کون تھا اندھیرے میں ہم نے چور ہی سمجھا سو پٹائی کر دی مگر تم سے بھی پوچھا جائے گا کہ کمرے میں کیوں گھسے تھے کیا چاہیئے تھا تمہیں ؟"

خیر دین کی بات وزن دار تھی۔ رشید نے سوچا کہ اپنے غصّہ پر قابو پانا چاہیئے ورنہ اس وقت صورتِ حال خراب ہو جائے گی۔

"میں . . . میں رِدا صاحبہ، میرا مطلب ہے رِدا صاحبہ"

"تم، رِدا صاحبہ" خیر دین نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔ اور رشید نے چہرے کے تاثرات بدل لئے اُس کے چہرے پر غم کے آثار نظر آنے لگے تھے پھر اُس نے چونک کر کہا

"خیر دین! باہر آؤ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں"

"چلو جی چلو ہمیں کسی کے کمرے میں گھسنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ آجاؤ بادشاہو" خیر دین نے کہا۔ اور بتی بجھا کر رشید کے ساتھ باہر نکل آیا رشید کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ خیر دین کی بوٹیاں بوٹیاں کر دے لیکن اُس وقت صورتحال اُس کے خلاف تھی اِس لئے اُس نے چالاکی سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا وہ خیر دین کو ساتھ لئے ہوئے ایک سمت بڑھ گیا۔ اور تھوڑی دُور پہنچ کر آہستہ سے بولا۔

"آؤ چلو باغ میں چلتے ہیں"

"جدھر دل چاہے چلو جی اپنا نام خیر دین ہے ڈرتے نہیں ہیں کسی سے"

خیر دین نے اکڑ کر کہا۔ اور رشید کے ساتھ لان پر نکل آیا۔ رشید نے ایسا کل ہی چولا بدل لیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے غم جھانک رہا تھا اور چہرہ اُداس ہو گیا تھا۔

"خیر دین! تم انوکھے انسان ہو میں جب بھی تمہارے بارے میں سوچتا ہوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہونے لگتا ہے"

"او جی ہم احساس وحساس کچھ نہیں جانتے، پہلے تم یہ بتاؤ کہ رِدا بی بی کے کمرے میں کیوں گھسے تھے ؟ دیکھو نا جی، ہم بھی اِس گھر کا نمک کھا رہے ہیں اب یہاں کی ایک ایک چیز سے ہمیں دلچسپی ہے اور ہماری ذمہ داری ہے اب ہم یہ تو بتائے بغیر نہیں رہیں گے لوگوں کو کہ تم رِدا کے کمرے میں چوری کر رہے تھے"

"کیا فضول بکواس کر رہے ہو خیر دین۔ میں تمہیں شکل سے چور نظر آتا ہوں" رشید جھلّائے ہوئے لہجے میں بولا۔

خیر دین نے غور سے اُسے دیکھا پھر مُنہ دبا کر ہنس پڑا "اب آپ کے سامنے کیا کہیں جی، مگر آپ کمرے میں گھسے ہی کیوں تھے ؟"

"مجھے رِدا کی کسی تصویر کی تلاش تھی"

"جی . . ." خیر دین نے کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ہاں خیر دین، میرا مذاق مت اڑاؤ جب سے اِس گھر میں داخل ہوا ہوں پاگل ہو گیا ہوں۔ رِدا ایک عجیب سی حیثیت اختیار کر گئی ہے میرے لئے، پتہ نہیں مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں صدیوں سے اُسے خوابوں میں دیکھتا آیا ہوں" رشید نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

خیر دین آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہوئی جی آپ خوابوں میں صرف رِدا بی بی کو دیکھتے آ رہے ہیں کوئی اور نظر نہیں آیا آپ کو . . ."

"نہیں خیر دین۔ مجھے اُس سے عشق ہو گیا ہے"

"ارے وہ . . . وہ فلم لیلیٰ مجنوں والا، ہی ہی ہی۔ مگر صاحب آپ کو لیلیٰ ہو گئی ہے یا نہیں . . ."

"فضول باتیں مت کرو خیر دین۔ تمہیں مجھ سے ہمدردی کرنا چاہیئے تم نے گھونسے مار مار کر میرے جبڑے توڑ دیئے ہیں تم آدمی ہو یا فولاد"

"او جی گھن چلاتے رہے ہیں۔ لوہار کی دکان پر اپنے یہ ہاتھ بھی کسی ہتھوڑے سے کم نہیں ہیں۔ پہلے ہی بتا دینا تھا تمہیں تم نے کہا تھا ورنہ کر لو نہیں تو نقصان میں رہو گے"

"ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی خیر دین۔ تمہیں واقعی میرا دوست ہونا چاہیئے مگر اب یہ بتاؤ میں کیا کروں ؟"

"بس جی ایک نسخہ ہے ہمارے پاس۔ سونٹھ سمجھتے ہو، وہ جو ادرک سکھا کر بنائی جاتی ہے۔ اُسے سل پر پیس لو اُس میں کالا زیرہ ملاؤ اور تھوڑا سا نمک بس تین چیزیں کافی ہیں رات کو سوتے وقت پھنکی لگاؤ اور آدھا پاؤ دودھ پی لو، پیٹ صاف رہے گا اور جب پیٹ صاف رہے گا تو خواب بھی نہیں آئیں گے پھر نہ لیلیٰ ہو گی نہ مجنوں ہو گی" خیر دین نے مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے لیلیٰ، مجنوں کی جنس ہی تبدیل کر ڈالی تھی۔

"نہیں خیر دین، یہ عشق پیٹ کی خرابی کا نتیجہ نہیں ہے"

"تو پھر دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہو گا، عشق والی بات میں تو دماغ کی خرابی ہی نظر آتی ہے صاحب۔ اب دیکھو نا ایک فلم دیکھی تھی ہم نے لیلیٰ کے تھیلا بس جی مجنوں کو کوئی کام دھندا نہیں تھا اگر کوئی کام کرتا کسی دفتر میں نوکری کرتا تو سارا عشق کا دھندا ختم ہو جاتا۔ حرام خور بھاجی سارا دن جنگل میں مارا مارا پھرتا اور لیلیٰ لیلیٰ شور مچاتا پھرتا ارے بھائی کام دھندا کرے پھر لیلیٰ کا نام لیتا۔ اُس کے لئے گھر بناتا اور اُس کے باپ کو رشتہ دیتا اب تم خود سوچو جی کوئی کسی نکمے کو اپنی بیٹی کا رشتہ کیسے دے سکتا ہے سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا جی۔ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کا تو یہی کہنا ہے عشق کرنا ہے تو کرو بھئی کون منع کرتا ہے مگر کوئی کام دھندا بھی تو کرو، کچھ کر کے تو دکھاؤ خالی عشق سے تو پیٹ نہیں بھر جاتا۔ ہمیں تو اُس مجنوں کو فلم میں دیکھ کر بڑا غصّہ آیا تھا جی پھٹے ہوئے کپڑے، بُرا حال داڑھی بڑھی ہوئی دماغ خراب اور چلا تھا عشق کرنے ایک اچھی خاصی شریف لڑکی کو بدنام کر کے رکھ دیا۔ نہیں بابو جی ہم تو تمہیں یہی بتاتے ہیں پہلے کام دھندا کرو اپنی حیثیت بناؤ اور اُس کے بعد عشق کرو"

رشید غصیلی نگاہوں سے خیر دین کو دیکھ رہا تھا پھر اُس نے خود کو سنبھال کر آہستہ سے کہا۔

"تمہارا یہ مشورہ بھی درست ہے لیکن میں کیا کروں مجھے ہر وقت رِدا یاد آتی رہتی ہے یہی سوچ کر اُس کے کمرے میں گھسا تھا کہ اُس کی کوئی تصویر حاصل کر لوں اُسے اپنے سینے کے پاس سجاؤں اور دل کو تسلی دے لیا کروں"

"رہے نا مجنوں کے بھائی، یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ کر کے اُسے حاصل کرو"

خیر دین ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"اگر تم یہ کہتے ہو تو ٹھیک ہے، پہلے میں اپنے آپ کو اِس قابل بناؤں گا کہ رِدا کے لئے ایک بہترین زندگی کا تصور پیش کر سکوں۔ اُس کے بعد اُس کی بات کروں گا، میرے دوست میرے محسن تم نے واقعی میری آنکھیں کھول دی ہیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے کام کے آدمی ہو"

"خیر دین ولد بشیر دین ایسے ہی آدمی ہیں" خیر دین نے سینہ تانتے ہوئے گردن ہلائی۔

"مگر خیر دین کوئی ترکیب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟"

"اجی ترکیب معلوم ہوتی ہمیں تو ہم خود کہیں بڑی نوکری پر نہ لگے ہوتے ہاں جو کچھ تم سے کہا ہے اُس پر غور کر لینا"

"ٹھیک ہے میں آج سے تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں"

"اچھا یہ بتاؤ رِدا بی بی کو تمہارے دل کا حال معلوم ہے" خیر دین نے پوچھا۔

"نہیں . . . نہیں، میں بتانا بھی نہیں چاہتا میں ہوں کس قابل تمہارا کہنا درست ہے۔ پہلے آدمی کسی قابل بن جائے پھر کوئی بڑی بات زبان سے نکالے"

"بالکل ٹھیک ہے"

"مگر خیر دین! میرے اِس راز کو ہمیشہ راز میں رکھنا۔ دوستی کی ہے تو دوستی نبھانا۔ کیا تم مجھے یہ یقین دلاتے ہو کہ تم میری اس حرکت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے ؟"

"چلو ٹھیک ہے، نہیں بتائیں گے مگر ذرا خیال رکھنا ہمارا بھی"

"تم فکر ہی نہیں کرو اب تو تم دوست بن گئے ہو"

"ہاں۔ ہمیں دنیا میں سب سے بُری بات یہی لگتی ہے کہ کوئی ہمارا راستہ کاٹنے کی کوشش کرے۔ بس باقی سب ٹھیک ہے" خیر دین نے کہا اور رشید نے گردن ہلا دی۔

جبڑے ابھی تک درد کر رہے تھے لیکن دل پر جبر کئے ہوئے اُس صورتِ حال سے نمٹ رہا تھا اگر اس حماقت کی اطلاع شہاب صاحب کو ہو گئی تو اچھی خاصی آمدنی ماری جائے گی اور وہ اُس کی طرف سے بددل ہو جائیں گے اِس لئے خیر دین کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں نے ہاتھ ملایا اور رشید اندرونی حصے کی طرف چل پڑا۔ اب اُسے شہاب صاحب کو یہ اطلاع دینی تھی کہ فائل رِدا کے کمرے میں نہیں ہے۔

∨

نُدرت طفیلی بیگم کی تاک میں لگ گئی تھی۔ رات کو واپسی میں ثناء نے اُس سے اِس سلسلے میں مزید گفتگو کی تھی اور کہا تھا کہ وہ اپنا کام کسی بھی وقت انجام دے سکتی ہے۔ اِس لئے اُس سے پہلے ہی نُدرت کو طفیلی بیگم سے دوستی گانٹھ لینی چاہیئے۔ یہ گفتگو رِدا کی لاعلمی میں ہوئی تھی۔ رِدا کو اِس پروگرام کے بارے کچھ نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ وہ مختلف قسم کی لڑکی تھی اور خواہ مخواہ نصیحتیں کرنے لگتی تھی۔

دوسرے دن نُدرت اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اُس کے لئے اندرونی عمارت میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ثناء اُس وقت تیمور کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی جب نُدرت نے طفیلی بیگم کو جا لیا اُس نے بڑے ادب سے طفیلی بیگم کو سلام کیا۔ طفیلی بیگم بارہا نُدرت کو دیکھ چکی تھیں لیکن باقاعدہ تعارف کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ انھوں نے توجہ ہی نہیں دی تھی کیونکہ نُدرت ملازموں کے کوارٹروں میں رہتی تھی لیکن اُس وقت اُس نے جس احترام و ادب سے طفیلی بیگم کو سلام کیا تھا۔ اُس سے انھیں خوشی ہوئی تھی۔

"آؤ بی بی آؤ تمہارا تو نام ہی نہیں معلوم ہو سکا مجھے ثناء کی دوست ہو ؟" انھوں نے سلام کا جواب دے کر کہا۔

"نہیں بیگم صاحبہ، ایک ڈرائیور کی بیٹی ہوں بس یہ ثناء بی بی کی محبت ہے کہ وہ مجھے گھاس ڈال دیتی ہیں ورنہ میں خود تو اِس کا حق نہیں رکھتی"

"یہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں اور چھوٹے لوگوں کو تو مغرور ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ ثناء ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی ہے" طفیلی بیگم نے کہا۔

"خالہ جان! آپ اِس سے پہلے کہاں رہتی تھیں آپ کو تعجب ہو گا کہ میں دل ہی دل میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ دراصل آپ کی

شکل و صورت کی میری بھی ایک خالہ تھیں بہت ہی اچھی انسان تھیں وہ بالکل آپ کی طرح ۔۔"

"اچھا اچھا" طفیلی بیگم خوش ہو کر بولیں۔ "آؤ، اندر آ جاؤ بیٹھو کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"کام ہے، یوں سمجھ لیجئے آپ ہی کے پاس آئی تھی"

"ارے، میرے پاس؟ اچھا اچھا آؤ"

طفیلی بیگم ندرت کو اندر لے گئیں۔ ندرت گنوں کی پکی تھی وہ کسی پر جادو چلائے اور وہ بچ جائے، چنانچہ طفیلی بیگم بھی اُس خوبصورت سی لڑکی کے لئے دل میں ہمدردی پا رہی تھیں۔

"تو پھر کیا ہوا تمھاری اُن خالہ جان کو" انھوں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس ناراض ہو گئی ہیں ہم سے، ویسے وہ اِن دنوں ملتان میں ہیں۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے اُن سے ملنے کے لئے مگر اماں اجازت ہی نہیں دیتیں"

"ہاں بھئی خاندانی جھگڑے بھی عجیب ہوتے ہیں"

"خالہ جان! اِس وقت میں آپ کے پاس ایک اہم کام سے آئی تھی"

"کہو۔ بے تکلفی سے کہو" طفیلی بیگم نے کہا۔

"خالہ جان! بات بڑی عجیب ہے اتنی پریشان رہی ہوں میں اِس دوران کہ آپ کو بتا نہیں سکتی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آپ کے پاس آنے کی کیونکہ آپ میری حیثیت سے اچھی طرح واقف ہیں چھوٹا منہ بڑی بات ہے"

"کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو خاص ہی بات ہے اگر آپ میری خالہ کی ہمشکل نہ ہوتیں تو معاف کیجئے گا میں یہ سوچتی ۔۔۔۔ کہ آپ لوگوں کے معاملات آپ لوگ ہی جانیں۔ بھلا ہم ملازموں کو اِن باتوں سے کیا سروکار لیکن میری بدنصیبی ہے کہ آپ میری خالہ جان کی ہمشکل ہیں۔ میں آپ کے خلاف کوئی کام ہوتے نہیں دیکھ سکتی"

"میرے خلاف" طفیلی بیگم گہری نگاہوں سے ندرت کو دیکھنے لگیں۔

"ایک بات پوچھوں خالہ جان جواب دیں گی؟"

"ہاں ضرور" طفیلی بیگم نے کہا۔

"جو کچھ میں کہوں گی کیا آپ اُس پر یقین کر سکتی ہیں؟"

"کیوں نہیں، تم بھلا مجھ سے جھوٹ کیوں بولو گی اگر میرے خلاف کوئی بات تمھارے علم میں آئی ہے تو مجھے بتانی چاہیئے"

"آپ عارفہ خالہ کو جانتی ہیں؟"

"عارفہ بیگم" طفیلی بیگم نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں" ندرت بولی۔

"اچھی طرح جانتی ہوں، حرفوں کی بنی ہوئی ہیں۔ سُنا ہے یہاں خاصا اثر قائم کر رکھا ہے اپنا، خاص طور سے ذکیہ کی ساس پر"

"بالکل درست ہے آپ کا کہنا۔ حالانکہ دادی جان سیدھی سادی انسان ہیں، ہر شخص کے ساتھ اُن کا سلوک یکساں ہے لیکن عارفہ خالہ اِس سلوک سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھاتی ہیں اور اُن کے اندر ایک اور سب سے بُری بات ہے"

"کیا" طفیلی بیگم نے دلچسپی سے پوچھا۔ عارفہ کی بُرائی اُن کے کانوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

"وہ کسی اور کی دادی جان سے قربت نہیں دیکھ سکتیں شاید ان دنوں آپ کی دادی جان سے ٹھیک ٹھاک گھٹ رہی ہے اِس لئے وہ دل ہی دل میں آپ کے خلاف ہو گئی ہیں"

"تو ہوتی رہیں بی بی میرا کیا بگاڑ لیں گی؟"

"نہیں خالہ جان۔ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیئے یہی بہتر نقصان دہ ہو جاتی ہے"

"تو ہوا۔ کیا وہ میری دشمن بن گئیں مگر ایک بات کان کھول کر یاد رکھیں کہ طفیلی بیگم کی دشمنی انھیں راس نہیں آئے گی"

"خالہ جان! آپ پوری بات نہیں سُن رہیں آپ صورت حال کی نزاکت کا احساس نہیں کر رہیں۔ دشمن وار کر چکا ہے اور آپ ابھی تک اپنی معصومیت میں وقت گزار رہی ہیں۔ میں اگر خود کچھ کر سکتی ضرور کر دیتی اور آپ کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتی لیکن آپ میری حیثیت سے واقف ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی"

"مگر ہوا کیا ہے؟"

"ایک سازش میرے علم میں آئی ہے۔ ایک ایسی سازش جس پر آپ اِس وقت شاید یقین نہ کریں لیکن آنے والا وقت آپ کو اِس حقیقت کا یقین دِلا دے گا"

"میں۔ میرے خلاف سازش، کیا سازش ہے میری بچی مجھے بتاؤ، تم نے تو مجھے ہولا دیا ہے"

"آپ ذرا یہ تصور کریں خالہ جان کہ اگر دادی جان کی کوئی چیز چوری ہو جائے اور وہ آپ کے کمرے میں آپ کے سامان سے برآمد ہو جائے تو آپ کی کیا پوزیشن ہو گی دادی جان کی نگاہوں میں؟"

"ہیں" طفیلی بیگم کا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "کیا کہہ رہی ہو بچی؟ خدا کے واسطے ذرا تفصیل سے بتا۔ مجھے اپنی عزت بڑی پیاری ہے۔ غریب ہوں اور غریبوں کی سب سے قیمتی شے اُن کی عزت ہی ہوتی ہے ہر شخص اُسے توڑنے کے درپے رہتا ہے"

"تو پھر میری ایک بات پر یقین کر لیجئے آپ کو نگاہ رکھنا ہو گی عارفہ بیگم پر، عارفہ بیگم کے کچھ الفاظ اتفاقیہ طور پر میرے کانوں میں پڑے ہیں وہ یہ منصوبہ بنا رہی ہیں کہ دادی جان کی کوئی شے اُن کے کمرے سے چرائیں اور آپ کے سامان سے برآمد کرا دیں۔ یہ منصوبہ وہ اپنے شوہر ناصر علی صاحب کے ساتھ مل کر بنا رہی تھیں حالانکہ اُن کے شوہر ناصر علی صاحب نے سختی سے اُنھیں ڈانٹ ڈپٹ کر منع کر دیا تھا لیکن میں جانتی ہوں کہ عارفہ بیگم باز نہیں آئیں گی"

"خدا غارت کرے اُس بڈھی کھوسٹ کو، یہ عمر اور یہ حرکتیں، میں اُس کی چوٹی کاٹ کر اُس کے ہاتھ پر نہ رکھ دُوں تو میرا نام بھی طفیلی بیگم نہیں ہے"

"نہیں خالہ جان! اگر آپ میری بات مانیں تو فوری طور پر کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں کہ عارفہ بیگم کو آپ کی طرف سے محتاط ہونے کا موقع مل جائے، میرا فرض تھا کہ میں آپ کو صورت حال سے آگاہ کر دُوں۔ اب آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ اُن پر کڑی نگاہ رکھیں اور اُن کی کسی ایسی حرکت کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ میں ایک بات کا وعدہ آپ سے کرتی ہوں کہ وہ آپ کے خلاف آسانی سے کوئی سازش نہیں کر سکیں گی۔ اگر انھوں نے ایسی کوئی حرکت کر ڈالی تو میں آپ کو فوراً اُس کی اطلاع دُوں گی، بس یہی فرض پورا کرنے کے لئے میں آپ سے ملنے آئی تھی۔ ایک گذارش ہے آپ سے کبھی کبھی مجھے ملتی رہا کریں میری آنکھوں کی تسکین ہو جاتی ہے آپ کو دیکھ کر"

طفیلی بیگم اِس اطلاع سے حیران رہ گئی تھیں اور پریشانی کے عالم میں سوچ رہی تھیں کہ کیا واقعی عارفہ بیگم ایسی کوئی حرکت کرنے پر تلی ہوئی ہیں اُنھیں رنگے ہاتھوں پکڑنا ضروری ہے، اِس لڑکی کا دم اُنھیں غنیمت محسوس ہُوا تھا، چنانچہ اُنھوں نے ندرت کو آگے بڑھ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا:

"بچی! تو نے وہ کام کیا ہے جو اپنے بھی نہیں کر سکتے تو اطمینان رکھ، تیرا نام کسی سلسلے میں نہیں آئے گا لیکن میری بچی میری مدد کرنا، عزت بڑی چیز ہوتی ہے اگر ایک بار چلی گئی تو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا"

"بالکل بالکل! میں جانتی ہوں لیکن وقت سے پہلے کوئی قدم نہ اُٹھائیں میں آپ کو صحیح صورتحال کی اطلاع دُوں گی"

"تو مجھے ہولا کر جا رہی ہے لیکن خیال رکھنا کہیں چوک نہ ہو جائے تجھ سے"

"آپ اطمینان رکھیں میں بہت جلد آپ کو اُن کی کسی دوسری حرکت کے بارے میں اطلاع دُوں گی۔ میں خود بھی آپ کی بے عزتی دیکھنا چاہتی ہوں خالہ جان"

طفیلی بیگم نے ندرت کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ندرت کمرے سے باہر نکل آئی۔ اِس کے بعد وہ ٹہلتی ہوئی ایک راہداری میں گئی اور پھر ثناء کے کمرے کی جانب مُڑ گئی ثناء ندرت کا بے چینی سے انتظار ہی کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر ثناء نے آنکھ دبائی۔ ندرت نے سوالیہ انداز میں گردن ہلا کر اُس سے پوچھا تو ثناء نے آنکھیں بند کر کے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"گویا کام مکمل؟"

"بالکل، اب ثناء کو اتنا احمق بھی نہیں سمجھو تم صبح فجر کی نماز میں اپنا کام دکھا چکی ہوں"

"اور وہ چیز گئی کہاں؟"

"عارفہ بیگم کے صندوق میں پیلے رنگ کا ایک صندوق اُن کی مسہری کے نیچے رکھا ہوا ہے میں نے دادی جان کی چاروں چوڑیاں اُس صندوق میں پہنچا دی ہیں"

"خدا کی پناہ، اِس کا مطلب ہے مالک کی بیٹی کہ تو چوری وغیرہ کے سلسلے میں خاصی ایکسپرٹ ہے"

"اب فضول باتیں منہ سے نہ نکالو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں تم کیا کر کے آئی ہو؟"

"پورا کھیل مکمل کر دیا ہے میں نے طفیلی بیگم ہکا بکا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے اُنھیں صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے"

"مجھ سے مل کر جاتیں تو میں تمھیں یہ بھی بتا دیتی کہ کام ہو چکا ہے"

"ہاں یہ ذرا سی گڑبڑ ہو گئی لیکن فکر مت کرو میں دوبارہ اُن سے مل لوں گی"

"تو پھر مل لو، میرا خیال ہے یہ کام ہو جانا چاہیئے"

"ٹھیک ہے" ندرت نے کہا اور ثناء کے کمرے سے باہر نکل آئی ابھی وہ راہداری عبور کر کے عمارت کے دوسرے حصے میں پہنچی تھی کہ طفیلی بیگم نظر آ گئیں۔ دادی اماں کے کمرے کی جانب جا رہی تھیں ندرت نے اشارہ کیا تو وہ رُک گئیں اور آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی ندرت کے پاس پہنچ گئیں۔

"میں ذرا ذکیہ کی ساس کے کمرے میں جا رہی تھی اُن سے بات تو کروں، عارفہ بیگم کے بارے میں۔ دُنیا کھا رہی ہے احسان کا اگر میں یہاں آ گئی تو کون سی بُری بات ہو گئی میری بہن کا گھر ہے میں چاہتی ہوں کہ خالہ جان کے کانوں میں عارفہ بیگم کے کرتوت ڈال دوں"

"صرف کرتوت ہی نہیں خالہ جان، بلکہ اُنھیں یہ بھی بتا دیں کہ عارفہ بیگم اپنا کام کر چکی ہیں اور اب چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ آپ کے خلاف ایک عظیم کارروائی کا آغاز کر دیں گی"

"کیا مطلب؟"

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُن کی ٹوہ میں لگی رہوں گی ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ اپنا کام کر چکی ہیں۔"

"ہائے ہائے، کیا کام...؟"

"دیکھئے خالہ جان! میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے، اگر آپ نے کسی سے میرا نام لے دیا تو میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ صاف مکر جاؤں گی اور کہہ دوں گی کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں کیونکہ مجھے اپنے ماں باپ کو بھی منہ دکھانا ہے، میرے باپ بے چارے غریب آدمی ہیں اور احسان صاحب کی کار ڈرائیو کرتے ہیں مجھے تو آسانی سے کان پکڑ کے نکال دیا جائے گا جب کہ آپ لوگوں کا معاملہ رشتہ داری کا ہے۔"

"میں تجھ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں بچی کہ تو مجھ پر پورا پورا اطمینان رکھ، مجال ہے کسی کی جو تیری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ جائے میں تیرا نام کبھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔"

"تو سنیئے! آج فجر کی نماز میں عارفہ بیگم نے دادی امّاں کی سونے کی چار چوڑیاں چُرالی ہیں اُن کا پروگرام یہ ہے کہ یہ چوڑیاں آپ کے سامان سے برآمد ہوں۔ دادی امّاں تھوڑی دیر کے بعد اس حقیقت سے واقف ہو جائیں گی کہ اُن کی چوڑیاں گم ہو گئی ہیں یا ممکن ہے ہو بھی چکی ہوں چنانچہ اب جب اُن کی تلاش ہوگی تو عارفہ بیگم یقینی طور پر یہی کہیں گی کہ چوڑیاں آپ کے پاس ہیں اور اس دوران میں وہ اپنا کام کر چکی ہوں گی۔"

"اے خدا غارت کرے اس عارفہ کو اب میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں آپ دادی امّاں کے کمرے میں جا رہی ہیں نا؟"

"ہاں!"

"تو پھر آغاز وہیں سے کیجئے دادی امّاں کو بتا دیجئے کہ آپ نے عارفہ بیگم کی باتیں سُن لی ہیں اور چوڑیاں عارفہ بیگم کے پاس موجود ہیں۔" نُدرت نے کہا۔

"لے، میں ابھی جا رہی ہوں یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو اب آئے گا مزہ وہی جو کہتے ہیں نا کسی کے لئے گڑھا کھودو اور خود اُس میں گر جاؤ۔ ارے خدا غارت کرے اس عارفہ کو اُس نے تو میری ناک چوٹی کاٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"تو پھر جائیے خدا حافظ" نُدرت نے کہا اور برق رفتاری سے پلٹ کر چل دی۔ تھوڑے فاصلے پر ثناء کھڑی ہوئی یہ تمام باتیں سُن رہی تھی دونوں کی گٹھ جوڑ تھی اس لئے ثناء بھلا اس موقع پر کہاں چوکنے والی تھی چنانچہ وہ بھی پھرتی سے دادی امّاں کے کمرے کی طرف چل پڑی اُس نے آنکھ سے نُدرت کو اشارہ کر دیا تھا طفیلی بیگم کے پیچھے ہی پیچھے ثناء بھی اندر داخل ہوئی تھی طفیلی بیگم شعلہ جوالا بنی ہوئی دادی امّاں کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"خالہ جان! ایک بات پوچھنے آئی ہوں آپ سے" طفیلی بیگم نے غصّے سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور دادی امّاں چونک کر اُنھیں دیکھنے لگیں۔

"کیا بات ہے طفیلی؟"

"میں جانتی ہوں کہ میرا بگڑا ہُوا وقت ہے، تم ماں بیٹے زمانے کے ستائے ہوئے ہیں یقین کریں اپنی اسی دُنیا میں مست پڑے رہتے لیکن آخری وقت میں، میں نے سوچا کہ رشید اس دُنیا میں اکیلا نہ رہ جائے میرا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن صرف رشید کو اُس کے رشتہ داروں میں سنبھالنے کے لئے میں نے ذکیہ بیگم کو خط لکھا تھا۔"

"تو بہت اچھا کیا تھا طفیلی، ہُوا کیا؟"

"ذرا ذکیہ کو اور بُلوا لیجئے" طفیلی بیگم نے کہا۔

"ارے کمال ہے، اے ثناء ذرا تو اپنی ماں کو تو بُلا لا" دادی نے ثناء کو دیکھ کر کہا۔ اور ثناء بڑی سعادت مندی سے واپس مُڑ گئی دوسرے لمحے وہ ذکیہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

"امّی! کوئی گھپلا ہو گیا ہے شاید" اُس نے ذکیہ بیگم سے کہا اور ذکیہ بیگم چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔

"کیا کر ڈالا، تُو نے ہی کچھ کیا ہوگا۔"

"نہیں امّی دادی امّاں آپ کو فوراً بُلا رہی ہیں۔"

"مگر ہُوا کیا کچھ بتا تو سہی" ذکیہ بیگم نے کہا۔ اور پھر اُٹھ کر برق رفتاری سے دادی امّاں کے کمرے کی جانب چل پڑیں طفیلی بیگم نے اس دوران میں خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ جب ذکیہ بیگم کمرے میں داخل ہوگئیں تو اُنھوں نے کہا۔

"ذکیہ! تمھاری سسرال کے جتنے لوگ تمھارے گھر میں پل رہے ہیں اس پر تم نے کبھی اعتراض کیا ہے؟"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ طفیلی بیگم؟" ذکیہ بیگم نے تعجب سے کہا۔

"نہیں، مجھے جواب دو اور ایک بات اور بھی بتاؤ میں نے تمھیں خط ضرور لکھا تھا مگر کیا تم مجھے یہاں بلا کر ناخوش ہو؟"

"خدا نہ کرے۔ ایسی کیا بات ہے آپ بے چارے میرا کیا لے رہی ہیں دو آدمیوں کی بات ہے اپنے حال میں مست رہتے ہیں مجھے تو خوشی ہوتی ہے اس قسم کے کام کرکے۔ کوئی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے؟"

"نہیں بی بی! تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی لیکن کچھ لوگوں کو یہاں موجودگی بُری طرح کھٹک رہی ہے اور ان میں سرفہرست عارفہ بیگم کا ہے۔"

"اُدہو کیا ہُوا آخر" ذکیہ بیگم نے پریشانی سے پوچھا۔

"بی بی! جو حرکت اُنھوں نے کی ہے میرا خدا ہی مجھ پر مہربان تھا کہ میرے علم میں وقت سے پہلے آگئی ورنہ نہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہتیں اور نہ میں، بس یہ نہ پوچھنا مجھ سے کہ مجھے کیسے علم ہو گیا تھا الہام ہُوا تھا مجھ پر، فرشتے آئے تھے میرے پاس اور اُنھوں نے میری عزت بچالی قربان جاؤں اپنے مولا کے۔"

"لیکن ہُوا کیا؟" دادی امّاں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"یہ بتائیے خالہ جان آپ نے صبح کو جو چوڑیاں ہاتھوں میں پہنی ہوئی تھیں وہ کہاں ہیں؟"

"اوہ تمھیں اُن کے بارے میں کیسے معلوم ہُوا میں نے وضو کرنے کے لئے غسل خانے میں رکھی تھیں اُس کے بعد اُن کا پتہ نہیں چل سکا۔" دادی امّاں نے کہا۔

"آپ وضو کرنے کے بعد کہاں گئی تھیں؟"

"نماز پڑھنے۔"

"اس دوران میں کوئی آپ کے کمرے میں آیا تھا؟"

"ہاں کوئی آیا تھا مگر چونکہ میں نماز پڑھ رہی تھی اس لئے میں نے اُسے دیکھا نہیں۔"

"تو سُنیں بی بی، عارفہ بیگم تھیں وہ میں آپ کو پچاس ثبوت دِلا سکتی ہوں کہ وہ عارفہ بیگم تھیں اور عارفہ بیگم نے آپ کی وہ چوڑیاں غائب کیں، اس لئے نہیں کہ اُن کو اُن چوڑیوں کی ضرورت تھی۔"

"طفیلی بیگم کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" ذکیہ بیگم نے پریشان لہجہ میں کہا۔

"ہاں بی بی! بس یوں سمجھ لو اللہ نے میری لاج رکھی ہے ورنہ میں بھی ذلیل ہوتی اور تم بھی۔ عارفہ بیگم اپنے میاں سے باتیں کر رہی تھیں جو میرے کانوں تک پہنچ گئیں۔ اُنھوں نے چوڑیاں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ جیسے ہی موقع ملے اُنھیں میرے سامان میں رکھ دیں اور اس کے بعد شور مچا دیں کہ میں نے خالہ جان کی چوڑیاں چُرالی ہیں یہ پلاننگ تھی اُن کی لیکن قربان جاؤں اپنے اللہ کے اتفاقیہ طور پر یہ باتیں میرے کانوں تک پہنچ گئیں۔"

ذکیہ بیگم پریشان نگاہوں سے دادی امّاں کو دیکھ رہی تھیں۔ اور دادی امّاں خود بھی حیران تھیں پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"اگر عارفہ نے ایسی کوئی حرکت کی ہے یا ایسا کوئی ارادہ رکھتی ہے تو میرے خیال میں یہ انتہائی کمینے پن کی بات ہے، ایسا تو نہیں ہونا چاہئیے۔"

"ہو چکا ہے، ہو چکا ہے، میرے لئے جو حکم ہو مجھے بتا دو۔ وہ میں کر دوں۔"

"نہیں ہم اس سلسلے میں معلومات کئے لیتے ہیں آپ اطمینان رکھیں، کوئی آپ کو اگر بدنام کرنے کی کوشش کرے گا تو اُسے کامیابی نہیں ہوگی" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"ہرگز نہیں امّی اگر یہ الزام ہے تو عارفہ خالہ کو اس الزام سے بری ہونا چاہئیے اور اگر اس میں حقیقت ہے تو پھر اُن کی اصلیت سامنے آنی چاہئیے" ثناء نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"نہیں ثناء سُنو تو سہی کوئی ایسی ویسی بات۔"

"ہرگز نہیں امّی، اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا میں عارفہ خالہ پر سے اس الزام کو دُور کر کے رہوں گی" ثناء نے کہا اور غصیلے انداز میں باہر نکل آئی لیکن یہ اُس کی پلاننگ تھی تھوڑے فاصلے پر فرزانہ بیگم نظر آئیں تو اُس نے اُنھیں روک کر کہا۔

"سُنا آپ نے فرزانہ خالہ، عارفہ خالہ نے دادی امّاں کی چوڑیاں چُرائی ہیں اور اُن کے ذریعے طفیلی بیگم پر الزام لگانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

"کیا...؟"

"ہاں، آئیے دوسرے لوگوں کو بھی بُلا لیجئے۔ دُودھ کا دُودھ، پانی کا پانی ہونا چاہئیے" ثناء نے کہا۔

ذکیہ بیگم دادی امّاں اور طفیلی بیگم ثناء کے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ لیکن ثناء اُن سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے آگے بڑھی چلی جا رہی تھی اور ایک ایک کو اس بات سے آگاہ کرتی جا رہی تھی، چند لمحات میں اُس نے کافی لوگوں کو جمع کر لیا پھر یہ پورا مجمع عارفہ بیگم کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ عارفہ بیگم بے چاری اِن حالات سے بے خبر اپنے کمرے میں موجود تھیں کہ یہ غول بیابانی اُن کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دستک دی گئی اور اُنھوں نے دروازہ کھول دیا اُن سب کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیل گئے تھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس لئے بوکھلا بھی گئی تھیں اور یہ بوکھلاہٹ خواہ مخواہ اُنھیں مُجرم بنا رہی تھی۔ ثناء نے یہاں بھی تکلف سے کام نہیں لیا اور اُنھیں گھورتی ہوئی بولی۔

"عارفہ خالہ۔ آپ پر الزام لگایا گیا ہے کہ آپ نے دادی امّاں کی چوڑیاں چُرالی ہیں۔" اُس نے کہا۔ اور عارفہ بیگم دھک سے رہ گئیں۔

"کیا... کیا کہہ رہی ہو تم؟" اُنھوں نے بمشکل کہا۔

"آپ کو اپنے سامان کی تلاشی دینا ہوگی میں دُودھ کا دُودھ، پانی کا پانی کرنا چاہتی ہوں۔"

"اے ثناء بیٹا! اس بڑھاپے میں یہی کسر رہ گئی تھی بس ٹھیک ہے لگا تو میرے منہ پر کالک خدا غارت کرے مجھے، میں امّاں جان کی چوڑیاں چُراؤں۔"

"سُنیں عارفہ بیگم! حالات جس طرح بھی ہمارے علم میں آئے ہیں۔"

ان کے بارے میں آپ کو نہیں بتایا جائے گا ویسے یہ حقیقت ہے کہ امی جان کی چوڑیاں گم ہوئی ہیں آج ہی صبح ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ وہ آپ کے پاس موجود ہیں۔ آپ اُن کا کیا کرنے والی تھیں یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن آپ یہ بتایئے کیا ایسی بات ہوئی ہے؟“ ذکیہ بیگم نے کہا۔

●

عارفہ بیگم نے دوپٹہ آنکھوں پر رکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بین کرتی جا رہی تھیں، ذکیہ بیگم نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دادی جان کی طرف دیکھا اور دادی جان کہنے لگیں۔

”اب جب یہاں تک آ ہی گئی ہو تو اس بے چاری کی عزت کا جنازہ بھی نکال دو، جاؤ اُس کے سامان کی تلاشی لو۔“

دادی جان خود بھی کسی قدر اُصول پرست تھیں۔ اور بات چونکہ اس حد تک آگے بڑھ گئی تھی کہ اُسے روکنا اب اُن کے بس کی بات نہیں تھی ورنہ وہ بے چاری تو خود ہی کچھ نہ کچھ کارروائی کر لیتیں لیکن ثناء نے اُنھیں کسی کارروائی کا موقعہ نہیں دیا، چند لوگوں کا انتخاب کیا گیا الماری کے تالے کھلوائے گئے۔ الماریاں ٹٹول ٹٹول کر دیکھی گئیں اور ساتھ ہی ساتھ ثناء کی آوازیں اُبھرتی رہیں۔

”جی نہیں۔ اس میں بھی نہیں ہیں انشاء اللہ تعالیٰ عارفہ خالہ کی پوزیشن صاف ہو کر رہے گی اور ان پر الزام لگانے والوں کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

طفیلی بیگم کی بھی اب ہوا کھسکنے لگی تھی۔ بات نُدرت کی بتائی ہوئی تھی جو ایک غیر لڑکی تھی انھوں نے خود آنکھوں سے تو سب کچھ نہیں دیکھا تھا اگر چوڑیاں برآمد نہ ہوئیں تو پھر طفیلی بیگم کی شامت تھی چنانچہ وہ بھی پریشان نظر آ رہی تھیں اُنھوں نے خود بھی آگے بڑھنا چاہا تو ذکیہ بیگم نے اُنھیں روک دیا۔

”نہیں طفیلی تم پیچھے ہی رہو گی کسی بھی سامان کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی ورنہ تمھاری اپنی پوزیشن بھی مشکوک ہو جائے گی۔“

طفیلی بیگم پیچھے ہٹ گئیں۔ ثناء فرزانہ بیگم رقیہ خاتون اور دوسری چند خواتین سامان کی تلاشی لے رہی تھیں ثناء نے عارفہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ تو اور کوئی سامان نہیں ہے آپ کے پاس عارفہ خالہ؟“

”نہیں بیٹا! ہاں وہ ایک صندوق اور رکھا ہے پلنگ کے نیچے اُس بدقسمت کو بھی دیکھ لو“ عارفہ بیگم نے بدستور آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ اور کسی نے آگے بڑھ کر وہ صندوق کھینچ لیا۔ صندوق میں اُلٹے سیدھے کپڑے بھرے ہوئے تھے چند کپڑوں کی تہیں کھولی گئیں اور دفعتاً سب لوگ دنگ سے رہ گئے ذکیہ بیگم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، دادی اماں حیرت سے صندوق کو گھورنے لگیں۔ دو کپڑوں کے نیچے چاروں چوڑیاں جگمگا رہی تھیں۔ تلاشی لینے والی فرزانہ بیگم تھیں، چنانچہ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گئیں۔ سب کے چہرے ساکت ہو گئے تھے اور عارفہ بیگم کے تو جیسے پورے بدن کا خون ہی خشک ہو گیا تھا۔ وہ زور سے چکرائیں اور دھڑام سے زمین پر آ رہیں۔ طفیلی بیگم نے دادی اماں کو سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اب اُن کا کام ختم ہو گیا تھا۔ نُدرت پر اُن کا دل نچھاور ہو رہا تھا۔ یہ بات ثابت ہو یا نہ ہو کہ یہ چوڑیاں اُن کے کمرے میں رکھی جانے والی تھیں لیکن کم از کم چوڑیاں تو مل گئیں اور اس سے اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ عارفہ بیگم کو تمام نوک جھونک کا بدلہ مل گیا تھا۔ اور وہ اس طرح ذلیل ہو گئی تھیں کہ اُن کا اب اس کوٹھی میں ٹکنا مشکل تھا۔ عارفہ بیگم سچ مچ بیہوش ہو گئی تھیں یا مکر کر رہی تھیں۔ یہ تو اللہ ہی جانتا تھا لیکن اس وقت جو کچھ ہو گیا تھا اس کا اُنھیں خواب میں بھی گمان نہ ہو گا۔

☆☆☆

ناصر علی صاحب موجود نہیں تھے ویسے ناصر علی کا نام بھی اس سلسلے میں شامل کر لیا گیا تھا جو ذرا خطرناک بات تھی وہ بالکل ہی مختلف طبیعت کے مالک تھے عارفہ بیگم جو اِدھر کی اُدھر کرتی رہتی تھیں اس سے ناصر علی بھی نالاں تھے اب جب بیوی پر اس الزام کا پتہ چلے گا تو نہ جانے کیا ہو گا۔ بہرطور ثناء کا دل ٹھنڈا ہو گیا تھا عارفہ بیگم نے زندگی بھر جو مذموم الزامات لگائے تھے آج اُن کا حساب سود در سود وصول کر لیا گیا تھا۔ دوسری طرف طفیلی بیگم بھی مسرور تھیں اُنھوں نے روزِ اوّل سے ہی محسوس کر لیا تھا کہ عارفہ بیگم اُن کی کاٹ میں لگی ہوئی ہیں۔ بالآخر اُنھوں نے عارفہ بیگم پر زبردست فتح حاصل کی تھی۔

دادی اماں بے چاری صلح جو خاتون تھیں اور پھر کسی کی عزت کو اُچھالنا اُنھیں پسند بھی نہیں تھا۔ اُنھوں نے وہاں موجود لوگوں کو ہدایت کی کہ اس کے بعد چوڑیوں کی گمشدگی کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے جتنے لوگ یہاں موجود ہیں اُن کے احکامات کی پابندی کریں، ”اگر کہیں اس واقعہ کا ذکر بھی نکلا تو اچھا نہیں ہو گا۔ یہ بات میں تمام لوگوں سے نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں میرا معاملہ ہے میں اس سے جس طرح چاہوں نمٹوں گی کسی کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اس موضوع کو اپنائے اس بات کا خیال رکھا جائے۔“

اور اس کے بعد شاید کسی کی مجال نہیں تھی جو اس حکم سے انحراف کرتا۔ ثناء چلی آئی، طفیلی بیگم کو ثناء کی گفتگو سے یہی احساس ہوا تھا کہ ثناء دل سے عارفہ بیگم کے ساتھ ہے اس لئے باہر نکل کر اُنھوں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے ثناء کو دیکھا اور ثناء بھی آنکھیں بند کر کے مسکرا دی اُس کے بعد وہ اطمینان سے تیوری کو اُچھالتی ہوئی ایک طرف

جا چکی تھی طفیلی بیگم کو نُدرت کی تلاش تھی وہ نُدرت کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھیں۔ نُدرت اُس وقت اپنے کوارٹر ہی میں تھی طفیلی بیگم نے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور تین نمبر میں جا پہنچیں دروازے پر دستک دی تو نُدرت ہی نے دروازہ کھولا تھا طفیلی بیگم کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے اور دوسرے لمحے وہ خود باہر نکل آئی۔

”اماں بی سو رہی ہیں۔ امی ابھی باورچی خانے کا کام کر کے فارغ ہوئی ہیں کوئی خاص کام تو نہیں ہے خالہ جان؟“

”نہیں بیٹی بس تمھارے پاس چلی آئی تھی تمھیں اطلاع دینی تھی کہ اللہ نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا ہے۔“

”کر دیا؟“ نُدرت نے گردن ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ذرا تماشہ جا کر دیکھو عارفہ بیگم کا بے ہوش پڑی ہوئی ہیں۔ اے میں کہتی ہوں مکر کر رہی ہیں اب اس کے علاوہ کچھ کرنے کو اور رہ کیا گیا تھا۔“

ⓔ

”مُبارک ہو خالہ جان لیکن آپ کو فوراً میرے پاس نہیں آنا چاہئے تھا دُشمن کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے چند روز ہم آپ الگ الگ رہیں گے تاکہ کسی کو مجھ پر شبہ نہ ہو سکے آپ میری پوزیشن سمجھتی ہیں نا؟“

”اچھی طرح سمجھتی ہوں بچی۔ بس دل چاہا کہ جا کر تیری پیشانی چوم آؤں تُو نے آج جس طرح سُرخرو کیا ہے اللہ تجھے ہمیشہ اسی طرح سُرخرو کرتا رہے۔ میں جا رہی ہوں پھر کسی وقت تمھاری امی سے ملنے آؤں گی بس یوں سمجھ لو کہ کام ہو گیا۔“

”خُدا حافظ۔“ نُدرت نے کہا اور غڑاپ سے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆

اِن معاملات کو وہ اپنے گھر تک نہیں آنے دینا چاہتی تھی اگر امی جان کو بھنک مل گئی تو شاید اُس کا گھر سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا جائے۔

طفیلی بیگم چند لمحات کھڑی سوچتی رہیں اور اس کے بعد واپس پلٹی تھیں کہ دو نمبر کا دروازہ کھلا اور چمن کی ماں نے گردن نکال کر جھانکا اُنھوں نے بڑی محبت سے طفیلی بیگم کو سلام کیا تھا۔

”وعلیکم سلام، تم کون ہو بی بی؟“

”چمن کی ماں ہوں جی آپ کا باورچی جو ہے۔“ چمن کی ماں نے کہا۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ طفیلی بیگم کو یہ بات بڑی پسند آئی تھی کہ چمن کی ماں نے چمن کو اُن کا باورچی کہا تھا۔

”اگر ناگوار نہ ہو تو اندر آ جائیں آپا جان ہم غریب لوگ ضرور ہیں مگر انسان تو ہیں۔“

”اے ہاں ہاں بھئی کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ طفیلی بیگم چمن کے کوارٹر میں پہنچ گئیں۔

”تین نمبر میں کسی کام سے آئی تھیں آپ؟ بیٹھئے۔“ چمن کی ماں نے طفیلی بیگم کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔ اور وہ چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

”ہاں بس ایسے ہی گھومتی ہوئی نکل آئی تھی۔ بڑے اچھے لوگ رہتے ہیں تمھارے پڑوس میں۔“

”ہونہہ اچھے لوگ، ہم سے پوچھئے زندگی کس طرح گزارا کر رہے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کس طرح بڑے صاحب سے اُن کے بارے میں کہیں۔ اے پاگل خانہ ہے پورا گھر پاگل خانہ۔“

”کیا مطلب؟“ طفیلی بیگم اُس وقت نُدرت کی کوئی بُرائی نہیں سن سکتی تھیں۔

”مطلب یہ کہ چھوٹی بیٹی پاگل بڑی بیٹی پاگل ماں بھی پاگل اور تو اور وہ ایک بڑی بی ہیں جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہیں اے اللہ کی مار ان تمام لوگوں پر۔“

”کیا بک رہی ہو تم، دماغ تو صحیح ہے تمھارا۔ اُن لوگوں کو بُرا کہہ رہی ہو جو فرشتہ صفت ہیں توبہ توبہ میں تو تمھارے گھر ایک سیکنڈ بھی نہیں بیٹھ سکتی۔“

”اے بہن آپ سُنیں تو سہی دراصل بات یہ ہے کہ...“

”بیکار باتیں نہ کریں آپ۔ میں نچلے درجے کے لوگوں کو منہ لگانے کی عادی نہیں ہوں۔“ طفیلی بیگم نے کہا اور فوراً چارپائی سے اُٹھ کر دو نمبر سے باہر نکل آئیں۔ بھلا نُدرت کی بُرائی اب وہ کیسے سن سکتی تھیں اپنے کمرے میں پہنچیں تو رشید موجود تھا۔ وہ طفیلی بیگم کی صورت دیکھنے لگا تو طفیلی بیگم مُسکرا دیں۔

”اے رشید۔ بس کمال ہو گیا ہے یوں سمجھ لے تو...“

”کیا ہو گیا اماں؟“ رشید نے سوال کیا۔

اور طفیلی بیگم اُسے پوری کہانی سُنانے لگیں رشید کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیل گئے تھے اُس نے گہری نگاہوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں تو ہمارے خلاف یہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ اماں تم ہی مجھے روکتی رہتی ہو ورنہ یہاں موجود ایک ایک کا دماغ ٹھیک کر کے رکھ دوں۔“

”بیٹا! عقل کے ناخن لے شریف آدمی بن کر رہ جو چولا بدلا ہے اُسی میں رہ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”دیکھیں؟“ رشید نے سوالیہ نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

”ہاں کیوں، دیکھتے تو رہو تمھاری ماں کس طرح آسمان میں پیوند لگاتی ہے۔“

”آخر ماں کس کی ہو؟“ رشید مُسکرا کر بولا اور طفیلی بیگم قہقہے مار مار کر ہنسنے لگیں۔ عارفہ بیگم کے تذکرے نے انھیں بہت لطف پہنچایا تھا رشید بھی

ان کی خوشی میں شریک رہا۔

توقیر صاحب بہت بڑے کاروباری تھے۔ دولت جمع کرنے کے لئے زندگی میں بڑے ہیر پھیر کئے تھے، بہت سے ایسے کام بھی کئے تھے، جن کی حیثیت غیر قانونی تھی اور ایسے کاموں سے انھوں نے لاکھوں روپے کمائے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے لاکھوں روپے خرچ کئے تھے کہ قانون اُن کی گرفت نہ کر سکے لیکن یہ پرانی بات تھی۔ اب وہ بوڑھے شیر تھے۔ صاف ستھرا کاروبار کرتے تھے۔ اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ اولاد کے مستقبل کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا چنانچہ اب توبہ کر لی تھی۔ اپنے بیٹوں کا کاروبار صاف ستھرا دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ الٹ پھیر کے مضمرات سے واقف تھے۔

لیکن اچانک اُنھیں ایک پریشانی لاحق ہو گئی تھی اور یہ پریشانی سیٹھ عظیم الدین باگڑیا نے اُن پر مسلط کی تھی۔ سیٹھ باگڑیا نے اُنھیں فون کر کے اُن سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور یہ ملاقات توقیر صاحب کی کوٹھی پر ہی ہوئی تھی۔

رسمی گفتگو کے بعد سیٹھ باگڑیا نے کہا۔ "ایک عجیب صورتحال درپیش ہے توقیر صاحب جس کی وجہ سے میں پریشان ہوں۔"

"خیریت؟" توقیر صاحب نے پوچھا۔

"آپ کو علم ہے کہ میں بے شمار اشیاء مختلف فرموں کے تحت بھی امپورٹ کرتا ہوں۔ میرے اپنے کاروبار کا ایک انداز ہے مغربی جرمنی سے کچھ اشیاء کے امپورٹ کے لئے میں نے فرینڈز آرگنائزیشن کو منتخب کیا تھا۔ اس فرم کے نمائندوں نے مجھ سے ملاقات کر کے ضمانتی بانڈ بھرا تھا۔ اپنے حلقے سے مجھے معلوم ہوا کہ میری کمپنی فرینڈز آرگنائزیشن کے تحت اس سے پہلے بھی کام کرتی رہی ہے۔ چنانچہ میں نے اس فرم کو محسوس کر کے مطلوبہ امپورٹ کی اجازت اُسے ہی دے دی۔ اور اپنے لائسنس اس کے حوالے کر دیئے، اُن کی مالیت کروڑوں تک جاتی ہے۔ لیکن اطلاعات کے مطابق مغربی جرمنی سے میرے لائسنس پر جو مال خریدا گیا ہے اور جو یہاں پہنچ بھی چکا ہے، وہ نہ تو میرا مطلوبہ مال ہے اور نہ ہی اُس کی ڈیلیوری مجھے دی گئی ہے۔ امپورٹ کی مقررہ تاریخ ابھی نہیں گزری ہے... اور فرینڈز آرگنائزیشن کے گزشتہ ریکارڈ کے مطابق مجھے اب بھی اس بات کی اُمید ہے کہ میرا مطلوبہ سامان شاید مجھ تک پہنچ جائے لیکن امپورٹ لائسنس پر یہ گڑبڑ میرے لئے بے حد خطرناک ہے چونکہ جو اشیاء میرے لائسنس پر خریدی گئی ہیں وہ خاصی مشکوک قسم کی چیزیں ہیں۔ اور اُن سے میری حیثیت متاثر ہوتی ہے، میرے لئے یہ مسئلہ اسی وجہ سے باعث تشویش بنا۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو توقیر صاحب کہ جو اشیاء میرے امپورٹ لائسنس پر منگوائی گئی ہیں اُن کی قیمت یہاں پہنچنے کے بعد بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور کسی عام فرم کے تحت یا کسی عام فرم کے امپورٹ لائسنس پر وہ اشیاء درآمد نہیں کی جا سکتیں بلکہ اس کے لئے کوئی مستحکم فرم ہی ضروری ہو سکتی ہے قانونی طور پر ان اشیاء کی درآمد پر پابندی بھی ہے اور ان کا تمام ریکارڈ حکومت کو پیش کرنا ہوتا ہے میں نے جب اس قسم کی چیزیں منگوائی ہی نہیں تو پھر ان کا ریکارڈ پیش کرنے کا کیا جواز بنتا ہے، آپ غالباً میری بات سمجھ رہے ہوں گے، ان اشیاء کو منگوانے کے بعد اگر یہاں کی مارکیٹ میں فروخت کر دیا جائے، تو ان سے لاکھوں کیا بلکہ شاید ایک کروڑ کے لگ بھگ آمدنی ہو سکتی ہے اور کسی اور بونس واؤچر پر میری مطلوبہ اشیاء منگوا کر مجھے سپلائی کی جا سکتی ہیں لیکن اس کے بعد جب میرے امپورٹ لائسنس پر منگوائی ہوئی اشیاء کا حساب مجھ سے طلب کیا جائے گا، تو میرے پاس بھلا وہ حساب دینے کے لئے کیا ہوگا۔ میں اس مسئلے میں پھنستا ہوں لیکن دو چار سال کے بعد۔ یہ منصوبہ بہت ہی جامع ہے اور بڑی ذہانت سے یہ کارروائی کی گئی ہے۔ درحقیقت مجھے اس کی اطلاع سالہا سال نہیں ملتی اور یہ فرینڈز آرگنائزیشن میری مطلوبہ اشیاء باآسانی مجھے فراہم کر دیتی لیکن بعد میں میری گردن بُری طرح پھنس جاتی یہ سازش ابھی کسی طور پر نہ کھلتی اگر مغربی جرمنی میں مقیم میرے چند کاروباری نمائندے مجھے اس کی اطلاع نہیں دے دیتے۔ جب یہ اطلاع مجھے ملی تو میں نے متعلقہ ریکارڈ طلب کر لیا اور مجھے فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں انتہائی مشکوک خبریں ملیں، یہ کارروائی صرف چند نمائندوں کے تحت ہو رہی ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے توقیر صاحب کہ فرینڈز آرگنائزیشن کا تعلق آپ سے ہے۔"

"کیا؟" توقیر صاحب اُچھل پڑے۔

"اسی لئے تو آپ کو زحمت دی ہے، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں جو کارروائی کی گئی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟"

"مسٹر باگڑیا! بات میری سمجھ میں نہیں آئی، یہ فرینڈز آرگنائزیشن کا تعلق آپ نے مجھ سے کیونکر قائم کر دیا؟"

"گویا توقیر صاحب آپ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے؟"

"میاں تفصیل بتاؤ۔ ورنہ میں ذرا اوچھی طبیعت کا آدمی ہوں۔ یہ جملے کہنے سے پہلے تم نے اچھی طرح غور بھی کر لیا تھا؟"

توقیر صاحب بگڑے ہوئے لہجے میں بولے، لیکن عظیم الدین باگڑیا ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے، انھوں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"توقیر صاحب! ہم لوگ آج کے نہیں، بہت پرانے وقت کے ساتھی ہیں، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے ہر طرح کے کاروبار کئے ہیں

اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیشہ ہی ہمارے ہاتھ صاف رہے ہیں مجھے خود حیرت ہوئی تھی یہ سوچ کر کہ آپ نے اتنے کچے انداز میں کام کیوں کیا؟"

"ایک بار پھر میں تمھیں وارننگ دے رہا ہوں سیٹھ باگڑیا، گفتگو کرتے وقت احتیاط برتو۔"

"یار اس سے زیادہ مہذب الفاظ مجھے مل نہیں رہے ہیں۔ اپنے آپ کو بھی اسی راستے کا راہی بنا چکا ہوں بھائی۔ اکیلے تم پر ہی الزام نہیں لگا رہا۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ فرینڈز آرگنائزیشن کا جو تمام کاروبار ہے وہ تمھاری ہی فرم کے پتے سے ہے اُس فرم کے پتے سے جسے تمھارا بیٹا تفسیر چلاتا ہے۔" باگڑیا صاحب نے کہا اور پھر اپنے ساتھ لائے ہوئے بریف کیس میں سے دو تین فائل نکال کر توقیر صاحب کے سامنے ڈال دیئے۔

"یہ دیکھو، یہ اگلا اور پچھلا تمام ریکارڈ موجود ہے اور اس میں جو پتہ درج ہے ذرا اُس پر بھی غور کر لو پرانا امپورٹ بھی اسی پتے سے کیا گیا ہے اور نیا بانڈ بھی اسی پتے سے بھرا گیا ہے۔" توقیر صاحب بے اختیارانہ انداز میں فائلوں پر جھک گئے اور پھر اُس وقت تک انھوں نے گردن نہ اُٹھائی جب تک کہ ایک ایک فائل نہ دیکھ لیا، وہ سخت ذہنی ہیجان کا شکار ہو گئے تھے۔ عظیم الدین باگڑیا نے کہا۔

"اگر بات صرف اسی امپورٹ کی ہوتی تو شاید میں کسی اور انداز میں سوچتا لیکن ان حالات سے واقف ہونے کے بعد میں نے چند ایسی دوسری کمپنیوں سے رابطے قائم کئے جو میری ہی مانند کام کرتی ہیں اور ان میں سے چھ کمپنیاں مجھے ایسی ملی ہیں جنھوں نے فرینڈز آرگنائزیشن کے تحت کام کیا ہے اور ان سب کے پاس جو پتہ موجود ہے وہ تمھارا ہی ہے میں نے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی کہ یہ سب کچھ کس وجہ سے کیا جا رہا ہے کیونکہ میری تمھاری پرانی دوستی ہے میں نے سوچا پہلے تم سے اس موضوع پر بات کر لوں، اُس کے بعد مزید کوئی کارروائی کروں۔"

توقیر صاحب کی آنکھوں کے نیچے تاریکی پھیل گئی تھی فرینڈز آرگنائزیشن کے نام سے جعلسازی کا جو کاروبار کیا جا رہا تھا۔ اُس میں سو فیصدی تفسیر کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ ایک جعلی نام سے فرم قائم کر کے باقاعدہ اُس کے لئے کارروائی معمولی پیمانے پر نہیں کی جا سکتی تھی اور جس انداز میں یہ کام کیا جا رہا تھا، وہ بیشک جہالت سے بھرپور تھا لیکن عارضی تھا اور جب بھی اُس کی پول کھلتی وہ سب مصیبتوں کا شکار ہو سکتے تھے، وہ آنکھیں بند کئے بیٹھے سوچتے رہے، پھر انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"جو اشیاء تمھارے لائسنس پر امپورٹ کی گئی ہیں۔ میں تمھیں اُن کا پورا پورا حساب مہیا کروں گا عظیم الدین ابھی اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہ کرنا۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا توقیر صاحب۔ میں نے تو آپ کو محتاط کر دیا، اگر مجھ سے اس سپلائی کے بارے میں تفصیلات بھی طلب کی گئیں تو کہیں نہ کہیں سے مہیا کر دوں گا۔ دس بیس لاکھ ہی خرچ ہو جائیں گے تمھارے نام پر یہ چھوٹی سی رقم خرچ کر دینا کون سا مشکل کام ہے میرے لئے لیکن بس تم کو محتاط کرنا ضروری سمجھا میں نے۔"

☆☆☆

"بہت بہت شکریہ عظیم الدین۔ اور تم زحمت کرو یہ دس بیس لاکھ بھی تمھارے خرچ نہیں ہوں گے۔ بلکہ اب اس کی تمام تر ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔"

عظیم الدین تو رخصت ہو گئے لیکن توقیر صاحب کا خون خشک ہوا جا رہا تھا۔ وہ پاگل ہوئے جا رہے تھے، نہ جانے یہ فرم اور کیا کچھ کر چکی ہے، تفسیر کے لئے جان بچانا مشکل ہو جائے گی اور اُن کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی۔ چنانچہ تیار ہو کر پاگلوں کی طرح دفتر کی طرف دوڑ گئے جس انداز میں وہ دفتر پہنچے تھے وہ دفتر کے لوگوں کے لئے ذرا اجنبی سا تھا۔ توقیر صاحب کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ پورے دفتر کو کس طرح سیل کر دیں، اور کیسے ان تمام کاغذات کو اپنے قبضے میں لے لیں جو فرینڈز آرگنائزیشن سے تعلق رکھتے ہیں بس وہ دیوانگی کے عالم میں دوڑے چلے آئے تھے تھوڑی دیر تک اپنی میز پر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد انھوں نے ردا کے بارے میں سوچا اور گھنٹی بجا کر اس لڑکی کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ ردا حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھی۔ توقیر صاحب کی طلبی پر اُن کے پاس پہنچی اور سلام کر کے اُن کے سامنے بیٹھ گئی۔ توقیر صاحب نے ردا سے کہا تھا کہ وہ دروازہ بند کر دے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد انھوں نے ردا کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولے۔

"بیٹی! تمھیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"نہیں سر، آپ لوگوں کی مہربانیوں کے سہارے بھلا مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔"

"بیٹی ردا! ایک ایسا مرحلہ درپیش ہے، مجھے جس سے میری عزت پر بن آئی ہے، تمھاری مدد چاہتا ہوں۔"

"جی... جی... فرمائیے۔"

"فرینڈز آرگنائزیشن کیا ہے، یہ سوال میں تم سے اس لئے کر رہا ہوں کہ تم جتنی محتاط اور مستعد لڑکی ہو تو یہ سب کچھ تمھاری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوگا ایک ایسا مسئلہ آ پھنسا ہے۔ جس سے ہم سب کی عزت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

ردا کا لہو خشک ہو گیا تھا۔ وہ ہراساں نگاہوں سے توقیر صاحب کو دیکھنے لگی تھی۔ توقیر صاحب نے اُسے مختصر الفاظ میں سیٹھ باگڑیا کی آمد اور پھر بعد کے حالات سے آگاہ کر دیا اور پھر بولے۔

"اگر خود تمہارا ہاتھ بھی اس کارروائی میں ملوث ہے تو مجھے پوری تفصیلات بتادو۔ میں کوشش کروں گا کہ معاملات کو کسی نہ کسی شکل میں دبا دوں۔"

"نہیں توقیر صاحب۔ میرا اس کارروائی میں بھلا کیا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ آپ خود بھی غور کر لیجئے۔ لیکن آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے تو میں بس مختصر نشاندہی کر سکتی ہوں فرینڈز آرگنائزیشن کا کاروبار خفیہ طور پر یہیں سے جاری ہے اور اس سلسلے میں میرے علم میں صرف دو افراد آئے ہیں جن میں سے ایک کا نام عظمت اور دوسرے کا داؤد ہے۔ اس سے زیادہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی لیکن اس بات کی توقع رکھتی ہوں میں کہ آپ میرا نام کسی بھی قیمت پر نہیں آنے دیں گے۔ میں ایک بے سہارا لڑکی ہوں۔ کچھ لوگوں کی عنایت سے اُن کے گھر پر رہ رہی ہوں۔ لیکن اتنی کمزور ہوں کہ ہوا کا ایک تند جھونکا بھی مجھے زندگی سے دُور کر سکتا ہے۔ ہاں، ایک پیشکش ضرور ہے آپ کو میری طرف سے کہ اگر واقعات یہ ثابت کر دیں کہ خود میں بھی کسی شکل میں اس فرم سے متعلق رہی ہوں تو پھر آپ میرے ساتھ کوئی رعایت نہ برتیے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

توقیر صاحب سوچتے رہے پھر انھوں نے گردن ہلا کر کہا۔

"نہیں بیٹی! مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔ تم جاؤ اور اطمینان رکھو۔ اس سلسلے میں تمہارا نام کسی قیمت پر نہیں لیا جائے گا۔"

ردا کو واپس بھیجنے کے بعد وہ پریشانی سے گردن ہلانے لگے۔ ردا کے ذریعے دو نام اُن کے علم میں آچکے تھے لیکن انھیں یقین تھا کہ تفسیر کی لاعلمی میں یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہوگا۔ یقیناً تفسیر بھی اس کاروبار میں پوری طرح ملوث ہوگا۔ کیا کرنا چاہیئے؟ بہت دیر تک وہ پریشانی سے سوچتے رہے اور پھر انھوں نے اردلی کو بلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ اردلی آیا تو انھوں نے سخت لہجے میں کہا۔

"عظمت اور داؤد کو میرے پاس بھیج دو۔"

★★

توقیر صاحب کے پاس سے واپس آنے کے بعد ردا کو خود پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ اُس کے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ . . فرینڈز آرگنائزیشن کا راز بالآخر کھل گیا۔ کس طرح کھلا یہ اُسے نہیں معلوم تھا لیکن بس اتنا ہی کافی تھا کہ توقیر صاحب اُس کے بارے میں جان گئے تھے، اُس نے بدحواسی کے عالم میں عظمت اور داؤد کا نام لے دیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتی تھی۔ لیکن اب تفسیر اور شہاب صاحب کی خیر نہیں تھی ظاہر ہے عظمت اور داؤد کیا حیثیت رکھتے تھے، اپنی گردن پھنستی دیکھ کر وہ اُن دونوں کو بھی منظر عام پر لے آئیں گے اور پھر . .

"لیکن میں کیوں ڈر رہی ہوں۔ میں نے تو یہ انکشاف نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ لوگ میرے خلاف کیا کر سکتے ہیں، مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ میں نے تو یہ سب کچھ نہیں کیا، نہیں مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

دوپہر کو لنچ میں اُسے معلوم ہوا کہ توقیر صاحب عظمت اور داؤد کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ریکارڈ روم میں تالا لگا کر چابی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ یہ ساری خبریں اُسے پریشان کر رہی تھیں۔ آج کام میں بھی اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی اور پانچ بجے وہ دفتر سے نکل بھاگی۔ ذہن بحرانی کیفیت کا شکار تھا۔ آٹو رکشہ کی تلاش میں نگاہ دوڑانے لگی، اسی وقت کوئی اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو" ردا نے چونک کر دیکھا اور رشید کو پہچان لیا۔

"گھر جا رہی ہیں؟" رشید نے پوچھا۔

"ہاں" ردا نے جواب دیا۔

"شاید مجھے پہچانا نہیں آپ نے، میں رشید ہوں۔"

"کون رشید؟" ردا سرد لہجے میں بولی۔

"ارے کمال ہے اُس شام کو آپ نے ہمارے ساتھ چائے پی تھی۔ میں ذکیہ خالہ کا بھانجہ ہوں۔"

"اچھا۔ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"بس ایسے ہی گھوم رہا تھا کہ آپ نظر آگئیں۔ رکشہ تلاش کر رہی ہیں شاید...؟"

"ہاں۔"

"آپ گھر سے گاڑی کیوں نہیں منگوا لیتیں، اتنی گاڑیاں ہیں، میں خالہ جان سے بات کروں گا۔"

"آپ گاڑی لائے ہیں؟" ردا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ مجھے ضرورت نہیں تھی۔ آئیے یہاں تو دُور دُور تک رکشہ نہیں ہے کیوں نہ کہیں بیٹھ کر ایک کپ چائے پئیں۔"

"فیصل آباد سے آئے ہیں آپ؟" ردا نے غیر متوقع سوال کیا۔

"ایں... ہاں" رشید بوکھلا کر بولا۔

"تعجب ہے۔ لگتا تو یوں ہے جیسے گدو بندر سے آئے ہوں۔ جائیے اپنا کام کیجئے۔" آخر میں ردا کا لہجہ سخت ہوگیا۔

"میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی ردا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے شناسا ہیں۔ تم میری خالہ کی کوٹھی میں پناہ گزین ہو۔ تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

"آپ جاتے ہیں یہاں سے کہ میں لوگوں کو آواز دوں؟" ردا غرائی۔

"توہین کی ہے آپ نے میری ردا۔ اور ...." رشید نے اُسے گھورتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ ردا شدید غصے کے عالم میں آگے چل پڑی تھی

تھوڑی دیر کے بعد اُسے رکشہ مل گیا۔ اور وہ اُس میں بیٹھ کر چل پڑی۔ اُس کا خون کھول رہا تھا۔ رشید نے غنڈوں جیسی حرکت کی تھی۔ اُس کے جواب میں کیا کرنا چاہیئے۔ اگر ثناء سے تذکرہ کر دیا جائے تو...؟

کوٹھی پہنچتے پہنچتے اُس نے ذہن کو پرسکون کر لیا۔ آخری فیصلہ اُس نے یہی کیا تھا کہ بات بڑھانی نہیں چاہیئے۔ ہاں اگر رشید نے دوبارہ ایسی کوئی حرکت کی تو خیر نہیں۔

کوٹھی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تمام معمولات جوں کے توں تھے۔ ثناء اپنے کمرے میں تھی۔ وہ ثناء کے کمرے کی طرف چل پڑی، تیمور تو اب ثناء سے اتنا مل گیا تھا کہ ردا کو بھول ہی گیا تھا۔

"لو تیمور، مس ردا آگئیں۔ ہیلو کہو۔"

"ہیلو ثناء" ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تیمور! برسر روزگار خاتون سے کہو کچھ قرض درکار ہے اپنی نیک کمائی میں سے ہماری مدد کریں۔"

"تیمور! اپنی مسز کو جواب دو کہ ساس بہو میں قرض نہیں چلتا جو کچھ ہے حاضر ہے۔"

"تیمور! اپنی ممی کو بتاؤ کہ پہلے وہ اپنا ساس ہونا ثابت کریں اُس کے بعد یہ رشتہ قائم ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔"

"یہ ہوتا ہے چھوٹے بڑے کا فرق۔ مالکن بیگم ہیں اور ایک ڈرائیور کی بیٹی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آہ ظالم سماج آہ، اے بدنما معاشرے تو نے انسانوں میں کتنی تفریق کر دی ہے۔" دروازے سے ندرت کی آواز اُبھری اور دونوں چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔

"کوئی حد بھی ہو تیمور، ڈرائیور کی بیٹی باورچی کی محبوبہ کو کوئی کیسے برداشت کرے۔" ثناء نے کہا۔

"اے، ہوش میں رہنا۔ اگر میرے باورچی کے بارے میں کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا۔ میں ویسے ہی اُداس ہوں۔" ندرت بولی۔

"کیوں اُداس ہو ندرت؟"

"تم لوگوں نے سازش کر کے میرا اجمن چھین لیا ہے مجھ سے۔ آج کئی روز گزر گئے اُس نے تین نمبر میں ایک بھی پتھر نہیں پھینکا ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ ظالم سماج کس کس طرح ہماری راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے، ابھی میں طفیلی خالہ سے مل کر آرہی ہوں۔ بڑے اچھے تعلقات قائم ہو گئے ہیں ہمارے درمیان۔"

"ایں واللہ، یہ تو نئی ندرت ہے ردا، آؤ ندرت چائے پیو گی۔" ثناء نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"شکریہ شکریہ۔ ردا کو سنا دیا؟" ندرت نے کہا۔

"ابھی تو آئی ہے، تم اپنی مبارک زبان سے سناؤ۔" ثناء نے کہا۔

"کوئی خاص بات ہوگئی کیا؟" ردا نے پوچھا۔

"خاص ہی سمجھو۔ خدا نے میری طفیلی خالہ کی عزت بچالی ورنہ ان عارفہ بیگم نے تو کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"ہوا کیا؟" ردا نے دلچسپی سے پوچھا۔ ان دو شیطانوں کے درمیان آکر وہ اپنی اُلجھن بھول گئی تھی۔ ندرت نے مزے لے لے کر ساری کہانی سنا ڈالی اور ردا منہ پھاڑ کر رہ گئی۔

"خدا ہی سمجھے تم دونوں کو۔ دو کوڑی کی عزت کر دی تم نے عارفہ بیگم کی، مجھے افسوس ہوا ہے۔"

"اسی لئے آپ کو اس پروگرام میں شریک نہیں کیا گیا تھا ویسے ندرت، عارفہ بیگم اُس وقت سے کوارٹر میں ہی گھسی ہوئی ہیں پتہ نہیں ناصر علی کو حالات کا علم ہوا یا نہیں۔"

"پتہ نہیں۔ بزرگوں کا کیا حال ہے؟"

"نارمل ہیں" ثناء نے جواب دیا۔

چائے ثناء کے کمرے میں پی گئی اُس وقت ندرت طفیلی بیگم کے تاثرات سناتی رہی۔ کوٹھی کی فضا گھمبیر تھی۔ حالانکہ دادی اماں نے اس موضوع کو سختی سے ختم کر دیا تھا لیکن ثناء کی کوششوں سے سب کو یہ کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ دبی دبی سرگوشیاں دن بھر جاری رہی تھیں۔

رات کے کھانے کے بعد بھی طویل نشست رہی ندرت اور ثناء یہ جاننے کے لئے کوشاں رہی تھیں کہ ناصر علی پر کیا ردِ عمل ہوا، اور عارفہ بیگم کی موجودہ پوزیشن کیا ہے لیکن اس بارے میں کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔

تقریباً گیارہ بجے ردا کو فرصت ملی۔ اب تک اُس نے ذہن بٹا رکھا تھا لیکن اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کے ذہن کو پھر دن کے پریشان کن خیالات نے گھیر لیا۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ دروازہ بند کر کے روشنی کی اور دفعتاً اُس کے دل کی دھڑکن رک گئی۔ سامنے ہی ایک کرسی پر اُسے شہاب صاحب نظر آئے تھے جو خونخوار نگاہوں سے اُسے گھور رہے تھے۔

ردا دہشت سے کانپنے لگی۔ دن کے واقعات ذہن میں تھے ثناء اور ندرت کی وجہ سے ذہن کچھ بٹ گیا تھا لیکن اُس وقت یہی سب کچھ سوچتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی اور پھر شہاب صاحب۔ وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

"آؤ ردا دروازہ بند کر دو" شہاب صاحب کی گونجدار آواز اُبھری۔ اور ردا کے اوسان اور بھی خطا ہو گئے۔

"کیوں؟ کیوں؟" اُس کے منہ سے بمشکل تمام نکلا۔

"اس لئے ردا کہ ہماری گفتگو کوئی اور نہ سن سکے۔ پلیز دروازہ بند کر دو۔ تم جانتی ہو کہ یہ گھر تمہاری پناہ گاہ ہے یہاں کے لوگوں نے تمہیں اپنے عزیزوں کا درجہ دیا ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں اتنے عرصے کے بعد تم لوگوں

پر بھروسہ ہو جانا چاہیئے"

"میں... میں... ڈرتی تو نہیں..."

"ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے رِدا، اگر تم اِس گھر کے ماحول کو اِتنا ہی بُرا تصور کرتیں تو یہاں قیام نہ کرتیں۔ براہِ کرم دروازہ بند کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو یہاں میری آمد معلوم ہو۔ لیکن تم نے مجھے اِس کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ رِدا چند لمحات اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی اور اِس کے بعد اُس نے خود کو سنبھال کر دروازہ بند کر دیا لیکن لاک نہیں کیا تھا۔

"تم جانتی ہو رِدا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں" شہاب صاحب بولے۔

"میں نہیں جانتی" رِدا نے خود کو کافی حد تک مطمئن کر لیا۔

"نہیں رِدا، یہ مت کہو، تمہارے چہرے سے یہ بات عیاں ہے، ویسے مجھے تمہاری اِن حرکات پر تشویش کے ساتھ حیرت بھی ہے، میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں رِدا، پلیز بیٹھ جاؤ۔ میں یہاں کسی غیر مناسب ارادے سے نہیں آیا۔ بلکہ مجبوری نے مجھے اِس طرح یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔ بیٹھ جاؤ پلیز بیٹھ جاؤ" اور رِدا تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"پہلا سوال میں تم سے یہ کرنا چاہتا ہوں رِدا کہ وہ کون سا جذبہ ہے جس نے تمہیں میرے خلاف لا کھڑا کیا ہے"

"نہیں میں آپ کے خلاف تو نہیں ہوں" رِدا نے آہستہ سے کہا۔

"میں نہیں سمجھتا رِدا کہ جو کچھ تم کر رہی ہو اِس کے پسِ پردہ کون ہے لیکن میرا ذہن مختلف لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا ہے، رِدا اِس میں کوئی شک نہیں کہ بظاہر تم بالکل اتفاقیہ طور پر اِس کوٹھی تک پہنچی ہو لیکن بعض منصوبے ایسے ہوتے ہیں کہ اِنسان اُن پر حیرت ہی کرتا رہ جاتا ہے اور یہ سوچ بھی نہیں پاتا کہ کوئی پسِ پردہ کیا حیثیت رکھتا ہے اب تو مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے رِدا جیسے میرے کچھ خفیہ دشمنوں نے ایک اِنتہائی جامع اور موثر اسکیم بنائی اور تمہیں اِس مکان تک بھیج دیا۔ میں اِس کے علاوہ اور کچھ کیسے سوچ سکتا ہوں تم خود بتاؤ میرے بارے میں تم شاید صحیح طور پر نہیں جانتیں میں اپنے راستے کے ہر کانٹے کو ہٹا دینے کا عادی ہوں۔ خود کسی سے پرخاش نہیں رکھتا لیکن اگر کوئی شخص میرے ذہن کو پراگندہ کرنے کی کوشش کرے تو پھر اُسے مُعاف بھی نہیں کر سکتا۔ رِدا اِس گھر نے تمہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ دیا ہے، ایک باعزت زندگی دی ہے۔ میں نے اِس ملازمت کے حصُول کے لئے تمہاری مدد کی ہے اِس کے بعد کیا وجوہات ہیں کہ تم میرے خلاف مُسلسل سرگرمِ عمل ہو؟"

"شہاب صاحب بلاشُبہ یہ تمام حقیقتیں ہیں جن سے میں اِنکار نہیں کر سکتی۔ اور میں آپ کو اپنی اِس کارروائی کی وجہ بتا بھی چکی ہوں۔ ملازمت بیشک میرے لئے ایک اہمیت رکھتی ہے کیونکہ میں اپنا مُستقبل اپنے ہاتھوں سے تعمیر کرنے کی خواہش مند ہوں لیکن اگر آپ کا نام اِس سلسلے میں ملوث نہ ہوتا تو میں خاموشی سے اِس ملازمت پر لعنت بھیج کر واپس آجاتی۔ ثناء ویسے بھی میری ملازمت سے ملال ہے، یہ دوسری بات ہے کہ میں اُس کی بات نہ مانتے ہوئے دوسری ملازمت تلاش کرتی، لیکن یہ اِس گھر کی عنایتیں ہی ہیں مجھ پر جن کی بناء پر میں آپ کو نادانیوں سے باز رکھنا چاہتی ہوں۔ شہاب صاحب آپ ثناء کے انکل ہیں۔ میرے ذہن میں وہی محبت اور وہی جذبہ آپ کے لئے موجود ہے جو ثناء کے ذہن میں ہے۔ میں نے ہمیشہ آپ کو احترام کی نگاہوں سے دیکھا ہے، اور اِس گھر سے مجھے بڑی محبت ہے بُرائیوں کا اختتام خوفناک تباہی ہوتا ہے اور یہ دُنیا کی تاریخ ہے، آپ دولت مند لوگ ہیں شہاب صاحب، دولت کا حصُول مختلف ذرائع سے آپ کے بس میں ہے تو پھر یہ غلط ذرائع کیوں اختیار کئے آپ نے تفسیر کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اگر آپ کو کوئی نُقصان پہنچا تو یہ پُورا گھر غموں کا شکار ہو جائے گا۔ میں صِرف آپ کا تحفظ چاہتی ہوں۔ اُنہی تمام نیک جذبوں کے ساتھ جو ثناء کے دِل میں آپ کے لئے ہو سکتے ہیں"

"تم اِس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتیں رِدا، بہت چھوٹی سی ذہنیت کی مالک ہو تم۔ اِتفاقات اور حالات نے تمہیں طاقتور بنا دیا ہے، لیکن تمہاری یہ طاقت ایک لمحے میں مُنتشر ہو سکتی ہے"

"میں نے اِس سے اِنکار تو نہیں کیا شہاب صاحب، بلاشُبہ میں کمزور ہوں بے سہارا ہوں۔ آپ لوگوں کے رحم وکرم پر ہوں لیکن اگر میرے جذبوں کی سچائی پر آپ غور کریں گے تو آپ کو اِن میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آئے گی"

"میں اِس بات کو نہیں مانتا، تم بہت گہری ہو رِدا، اور بار بار میرا دل یہ سوال کرنے کو چاہتا ہے کہ کم از کم اِتنا تو بتا دو کہ کس کے اِیماء پر تم یہاں آئی ہو، رِدا اِس گھر کی سادگی کا اندازہ تم لگا چکی ہو۔ میں نے، میرے بھائی اِحسان صاحب نے، ثناء نے یا ہمارے اہلِ خاندان نے کبھی یہ بات معلوم کرنے کی کھوج نہیں کی کہ تم کون ہو، چلو یہ مان لیا کہ لاہور سے آئی ہو۔ لیکن کیوں؟ تمہارے ساتھ موجود بچے کا باپ کون ہے، وہ بچہ مشکوک حیثیت کا حامل ہے لیکن ثناء اُسے اپنے سینے سے لگائے پھرتی ہے ہم بہت فراخدل ہیں رِدا اور ہم شاید تمہارے بارے میں کبھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اگر تم اپنی بہتر زندگی اور بہتر مُستقبل کی خواہاں ہو تو یہاں سے تمہیں اِس کے لئے مدد بھی مل سکتی ہے، پھر کم از کم مجھے نُقصان پہنچانے کی کوشش تو نہ کرو، اِس کیلئے مجبُور تو نہ کرو کہ میں تمہارے بارے میں سُراغ لگاؤں اور تمہاری حقیقت منظرِ عام پر لے آؤں۔" رِدا ایک بار پھر کانپ گئی تھی۔ شہاب صاحب کے اَلفاظ ذو معنی تھے۔ تیمُور کی شخصیت کو مشکوک قرار دے کر اُنھوں نے ایک اور سمت اِشارہ کیا تھا لیکن رِدا اِس اِشارے کو پی گئی۔ اُس کے اندر ایک عجیب سی کشمکش بیدار ہو گئی تھی۔ بڑی توہین کا اِحساس ہو گیا تھا اُسے لیکن شہاب صاحب کی ذہنی کیفیت وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ جو کچھ بھی کریں گے شہاب صاحب اُس کے لئے میں آپ کو روک تو نہیں سکتی، لیکن ایک بات آپ بھی ذہن نشین کر لیں کہ میری گہرائیوں سے آپ کو جو کچھ بھی ملے گا، اُس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکے گا۔ اگر تیمور کی شخصیت مشکوک ہے تو ٹھیک ہے اِس کا سُراغ لگائیے اور مجھے سُولی پر چڑھوا دیجئے"

"نہیں رِدا میں نے تو صِرف ایک بات کہی ہے کہ ہمارے ذہن میں تمہارے لئے بھی تو تجسُس پیدا ہو سکتا ہے آخر تم فرینڈز آرگنائزیشن کے سلسلے میں اِتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہی ہو"

"اِس کی مختلف وجوہات ہیں شہاب صاحب، زبان پر کبھی یہ الفاظ نہیں لانا چاہتی تھی، لیکن اگر آپ مجبُور کر رہے ہیں تو آپ سے عرض کر دُوں کہ لاہور سے آتے ہوئے میں نے یہی سوچا تھا کہ کسی ہوٹل میں قیام کرُوں گی۔ ملازمت حاصِل کرُوں گی تیمُور کی پرورش بھی کرُوں گی۔ آپ خود غور کر لیجئے کہ یہ کتنی سخت ذمّہ داریاں تھیں۔ اور اِس سے کتنے مسائل ذہن میں آتے تھے لیکن میں اُن تمام مسائل سے نِمٹنے کا عزم کر کے یہاں پہنچی تھی۔ یہ گھر مجھے پناہ نہ دیتا تو بھی میں زندہ رہتی اور آج بھی میں اب آپ کو اِس کے لئے مُستعد پاتی ہوں زمانے سے بیشک مجھے ڈر لگتا ہے شہاب صاحب، نوکری کرتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔ لیکن اب اِس کی عادی ہو گئی۔ اور اِسی طرح اِس زمانے کے خِلاف ہر مرحلے پر میں اپنے آپ کو مُستعد رکھُوں گی۔ مجھ پر قابو پانا اِتنا آسان نہیں ہوگا جتنا تصوّر کر لیا گیا ہے باقی رہا فرینڈز آرگنائزیشن کا معاملہ تو اِس کے لئے میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ شہاب صاحب آپ نے یقیناً نیک نیّتی سے مجھے یہ ملازمت دِلائی لیکن تفسیر صاحب کے رویّے نے اِس بات کا اظہار کر دیا کہ اُن کی نیّت میرے سلسلے میں صاف نہیں تھی۔ وہ مجھے کبھی دوست بنانا چاہتے تھے اور کبھی کچھ اور۔ یہ تمام باتیں محسُوس کر کے میں نے سوچا تھا کہ ملازمت چھوڑ دُوں اور کہیں اور قسمت آزمائی کرُوں لیکن فرینڈز آرگنائزیشن کا مسئلہ میری ملازمت کی ضمانت بن گیا۔ آپ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں۔ اِس بات پر غور کر لیجئے کہ میں اِتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔ ملازمت میں سیٹھ باگڑیا کے ہاں بھی حاصِل کر سکتی ہوں۔ وہ سُرخ فائل اُن کے حوالے کر کے، لیکن اَیسا میں زندگی کی قیمت پر بھی نہیں کرُوں گی۔ شہاب صاحب میرے ذہن میں صِرف ایک ہی تصور ایک جذبہ ہے اور اگر آپ اِس کے لئے عمل کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر میں آپ سے تعاون کر سکتی ہوں"

"عظمت اور داؤد کا نام تم نے توقیر صاحب کے سامنے لیا تھا"

"ہاں۔ اُن کے بجائے میں آپ کا اور تفسیر صاحب کا نام بھی لے سکتی تھی، اِسی سے آپ میری نیّت کا اندازہ لگا لیجئے اگر آپ کے وہ گرگے آپ لوگوں کے بارے میں توقیر صاحب کو تفصیل بتا دیں تو میں مجبُور ہوں لیکن میری طرف سے یہ وعدہ بھی ہے کہ میں خود کبھی آپ لوگوں کا نام زبان پر نہیں لاؤں گی۔ لیکن سُرخ فائل اُس وقت تک میرے قبضے میں رہے گا جب تک کہ آپ فرینڈز آرگنائزیشن سے بالکل الگ نہ ہو جائیں"

"ہونہہ۔ اور یہ سب کچھ تمہارا کہنا ہے کہ تم اِس گھر کی بہتری کیلئے کرنا چاہتی ہو"

"سو فیصدی۔ اگر اِس کی تہہ میں کوئی اور شخصیت نکل آئے تو پھر میں آپ کی مُجرم ہوں"

"رِدا، اپنی تمام تر فطرت کے باوُجود تمہارے اِن الفاظ میں جو جذبہ پنہاں ہے وہ میرے لئے قابلِ قدر ہے، بات آج کی نہیں ہے رِدا بہت عرصے سے میں اپنے آپ کو ایک مقام پر لانے کے لئے کوشاں ہوں اِس دَور میں بُرائی کے سینکڑوں راستے ملتے ہیں۔ بھلائی کی طرف لے جانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ میرا دل تو چاہتا ہے رِدا کہ تمہیں بھی فرینڈز آرگنائزیشن میں شمولیت کی پیشکش کر دُوں۔ تم اپنا مستقبل تعمیر کرنا چاہتی ہو، تیمور کو اچھی زندگی دینے کی خواہاں ہو، تم اگر چاہو تو ہماری ساتھی بن جاؤ"

"بھُول کر بھی یہ نہ سوچئے شہاب صاحب کہ جس غلاظت سے میں آپ کو نکالنے کی کوشش کر رہی ہوں اُس میں خود پھنسنا پسند کرُوں گی"

"مجھے یقین ہے رِدا بلاشُبہ تم اعلیٰ فِطرت کی مالک ہو۔ لیکن رِدا سُرخ فائل مجھے واپس کر دو۔ وہ میرے لئے ایک خوف بنی ہوئی ہے، اور میں کسی خوف کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تمہارے جذبوں کی سچائی کو سراہتا ہوں رِدا بلاشُبہ تم کوئی بھی ہو لیکن تمہاری رگوں میں شریف خون دَوڑ رہا ہے تم کسی کے اِحسانات کا صِلہ ادا کرنے کی صلاحیتیں بھی رکھتی ہو۔ جو کچھ میں کہوں گا اُس پر یقین کر لو گی"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ شہاب صاحب" رِدا نے سوال کیا۔

"رِدا سُرخ فائل مجھے دے دو۔ میں فرینڈز آرگنائزیشن کے کاروبار سے الگ ہوا جاتا ہوں"

"اِس کے لئے آپ کو مجھے ایک تحریر دینی ہوگی شہاب صاحب"

"کیا مطلب؟"

"اِس تحریر میں آپ یہ اعتراف کریں گے کہ فرینڈز آرگنائزیشن سے آپ کا براہِ راست تعلق تھا اور آپ اور تفسیر اِس کاروبار میں ملوث تھے اور آج سے آپ اِس سلسلے میں توبہ کررہے ہیں اور اِس توبہ کی وجہ وہ کاغذات ہیں جو آپ کی گردن پھنسا سکتے ہیں۔ یہ تحریر اگر آپ مجھے دے دیں گے تو میں سُرخ فائل آپ کے حوالے کردوں گی۔"

"اِس تحریر کا کیا کروگی تم؟" شہاب صاحب کا موڈ تبدیل ہوگیا۔ اب وہ مسکرارہے تھے۔

"میں اِسے اپنے پاس محفوظ رکھوں گی تاکہ اگر آپ کو دوبارہ فرینڈز آرگنائزیشن کے معاملات میں ملوث پایا تو آپ کے خلاف کارروائی کرسکوں۔"

"وہ کارروائی کس حد تک ہوگی ردا؟" شہاب صاحب مسکراتے ہوئے بولے، اُنھوں نے جیب سے سگار نکال کر دانتوں میں دبالیا تھا۔

"صرف اِس حد تک کہ میں آپ کا یہ کارنامہ احسان صاحب کے حوالے کردوں۔"

"ارے... ارے بڑی خوفناک سوچ رکھتی ہو بھئی چلو ٹھیک ہے جب تم پر اعتماد کرلیا تو یہ تحریر بھی تم کو دے دی جائے گی۔ اب ذرا سُرخ فائل نکال دو۔"

"نہیں میں کھرے سودے کی عادی ہوں، سُرخ فائل آپ کو اُسی وقت ملے گا جب تحریر میرے پاس پہنچ جائے گی۔"

"تو پھر اِس کے لئے صبح کا وقت رکھو، صبح کو میں تمھیں یہ تحریر لکھ کر دستخط کرکے دے دوں گا۔ ویسے اِس بات کا مجھے اعتراف ہے ردا کہ تم یہ سب کچھ اِس گھر کے لئے میرے لئے ہی کررہی ہو۔"

"ہاں۔ اِس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے شہاب صاحب خُدا کے لئے اِس عظیم گھرانے کی عزت کا پاس کیجئے۔ جو ایسے بے سہارا لوگوں کو سہارا دے دیتا ہے جو زندگی میں صرف ٹھوکریں ہی کھاتے رہے ہوں براہِ کرم اپنے ہاتھوں کو اِس گندگی سے پاک رکھیئے ورنہ اِس کی چھینٹیں گھر کے ہر فرد پر پڑیں گی، ثناء کا مستقبل خطرے میں... پڑجائے گا۔ احسان صاحب کی عزت خاک میں مِل جائے گی۔ یہ سب آپ کے ذریعے نہیں ہونا چاہیئے شہاب صاحب۔"

"ٹھیک ہے۔ میں صبح کو تمھیں یہ تحریر دے دوں گا، لیکن تم یہ اعتبار کرو فائل میرے حوالے کردو اب ہمارے درمیان کم از کم اِس حد تک تو اعتماد کی فضا رہنی ہی چاہیئے۔"

"مجھے آپ پر اعتماد ہے اور ایک بات اور سُن لیجئے فائل یہاں اِس کوٹھی میں نہیں ہے۔ میں آپ کو کل دِن میں وہ فائل فراہم کردوں گی۔"

"ٹھیک ہے ردا، براہِ کرم میری اِس طرح آمد کو محسوس نہ کرنا میں سخت غصے کے عالم میں یہاں آیا تھا لیکن احساس ہوا ہے کہ تمھاری کاوشیں ہمارے خلاف نہیں ہیں۔ اِس بات نے تمھاری عزت میری نگاہ میں بہت زیادہ بڑھادی ہے۔ صبح کو میں تمھیں تحریر دے دوں گا۔ لیکن براہِ کرم کل صبح ہی صبح آفس مت نکل جانا پہلے مجھے وہ فائل دے دینا اس کے بعد دفتر جوائن کرنا اور ہاں یہ بھی سُنو تفسیر کے ہاں تمھاری ملازمت پکی ہے۔ اِسے کوئی زوال نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ فائل میرے حوالے کردوگی۔ تو میرے اور تمھارے درمیان سے اختلاف بالکل ختم ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے میرا صرف اِتنا ہی مقصد تھا اِس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتی۔"

"شکریہ ردا خُدا حافظ" شہاب صاحب نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

ردا اب بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی اِس دوران اُس نے خود کو انتہائی حد تک سنبھالا تھا ورنہ شہاب صاحب کی اِس طرح آمد اُس کے لئے بے حد سنسنی خیز تھی اُن کی فطرت کے بارے میں وہ بہت سی کہانیاں سُن چکی تھی۔ کون کیا بگاڑ سکتا تھا اُن کا اگر وہ ردا کے ساتھ کوئی سختی یا زیادتی کرڈالتے۔ اِس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ سارا ہی معاشرہ ردا کے لئے ہولناک تھا ثناء کی محبت نے اُسے تقویت بخشی تھی۔ ورنہ اُس کی اوقات ہی کیا تھی۔ شہاب صاحب جیسے لوگوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ دولت ہر جُرم چھپا لیتی ہے۔ بات اپنوں ہی کی طرف جھکنے میں اُس کا کون تھا جو اُس کے تحفظ کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ سُرخ فائل غائب کرنے اور فرینڈز آرگنائزیشن کو فیل کرنے کے پس پردہ یہی جذبہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے سر چھپانے کے ٹھکانے دینے والے دُکھ سے دوچار نہ ہونے دے ثناء کی آنکھوں میں آنسو نہ آسکیں۔ اِس سے زیادہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اُن لوگوں کے احسانات کا بدلہ دینے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ دِل میں اِس گھر کے لئے بہت سے جذبے پروان چڑھا رہی تھی۔ شہاب صاحب کے الفاظ یاد آئے تو دفعتاً اُس کے دِل میں مسرت کی لہریں اُٹھنے لگیں اُسے سُرخ فائل کا کیا کرنا تھا ظاہر ہے وہ اُن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچانے کے لئے تو اُسے استعمال نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ یہ خوف مسلسل اُس کے دِل میں جاگزیں رہا تھا کہ بہرطور اِس قسم کا کاروبار کرنے والے اِتنے کچے ذہن بھی نہیں ہوتے کہ اپنے دشمنوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں شہاب صاحب

اگر پوری تندہی سے اُس کے خلاف سرگرم عمل ہوگئے تو پھر ردا کے لئے جائے پناہ مشکل ہی تھی۔ وہ مرد تھے کوئی بھی پروگرام بنا سکتے تھے۔ اُس کے خلاف کوئی بھی سازش کرسکتے تھے اِس طرح کم از کم اُسے شہاب صاحب کے عتاب سے نجات مِل گئی تھی۔ اِس سے زیادہ وہ کچھ اور چاہتی بھی نہیں تھی۔ ملازمت بیشک اُس کی زندگی کے لئے ایک اہم چیز تھی۔ اور وہ اُسے جاری رکھنا چاہتی تھی کیونکہ اب وہاں کا کاروبار بھی سمجھ چکی تھی۔ اور پھر تو تفسیر صاحب کی محبت اُسے حاصل تھی۔ اگر اِس طرح اُسے اپنی عزت کا تحفظ ہی مِل جائے تو یہ خوش قسمتی ہی تھی۔ چنانچہ اُس رات وہ کافی پُرسکون رہی۔ صبح کو دفتر ٹیلیفون کردیا کہ آج دیر سے آئے گی۔ معاملات جوں کے توں تھے، اُن میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں تھی۔ چنانچہ معمول کے مطابق ہی گھر سے نکلی۔ اُسے یقین تھا کہ شہاب صاحب اُس کی طرف سے غافل نہیں ہوں گے چنانچہ جب وہ اُس جگہ پہنچی۔ جہاں سے اُسے آفس جانے کے لئے رکشا وغیرہ مِل جایا کرتی تھی۔ تو شہاب صاحب کی کار اُس کے پیچھے ہی پیچھے پہنچ گئی تھی۔ مرسڈیز ردا کے قریب پہنچ کر اُنھوں نے دروازہ کھول دیا اور ردا خاموشی سے اندر بیٹھ گئی۔ شہاب صاحب نے مرسڈیز آگے بڑھادی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مرسڈیز ایک خوبصورت ریسٹورنٹ کے سامنے رُک گئی۔ شہاب صاحب نے دروازہ بند کیا۔ ردا بے چوں و چرا نیچے اُتر آئی تھی۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہوکر شہاب صاحب نے ایک میز سنبھال لی، کافی منگوائی اور پھر جیب سے ایک کاغذ نکال کر ردا کے حوالے کردیا۔ اِس میں وہ اعتراف نامہ موجود تھا جو فرینڈز آرگنائزیشن کے سلسلے میں ردا کی مرضی کے خلاف تھا ردا نے اُسے پڑھا اور مطمئن انداز میں گردن ہلادی۔ تب شہاب صاحب نے اُس پر ردا کے سامنے دستخط کردیئے ردا نے مطمئن انداز میں اعتراف نامہ اپنے پاس رکھ لیا۔

"کافی پینے کے بعد اُٹھ جایئے شہاب صاحب، سُرخ فائل ایک بینک لاکر میں پوشیدہ ہے۔"

"اوہ" شہاب صاحب نے عجیب سے انداز میں کہا اور پھر ہنس پڑے۔

"بڑی چالاک ہو ردا، اگر ہمارے ساتھ فرینڈز آرگنائزیشن میں شامل ہوجاتیں تو یقیناً لاکھوں کماتیں لیکن تم نے تو ہم سے بھی لاکھوں چھین لئے۔"

"نہیں شہاب صاحب پلیز یہ اندازِ فکر چھوڑ دیجئے خُدا نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے اپنی عزت کو قائم رکھیئے میں اِس گھر کو ہمیشہ باعزت دیکھنا چاہتی ہوں۔ اِس کے لئے میری تمام دُعائیں ہیں۔ میں اِس حرکت کے لئے آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ لیکن میرے پاس اِس گھر کو دینے کے لئے اور ہے بھی کیا۔"

"اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی ردا، تمھارے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی تمھاری عُمر اور تمھاری فطرت مجھے تمھارے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے ردا اب جب کہ ہم دوست بن گئے ہیں تو تم چاہو تو اپنا درد مجھے بتا سکتی ہو۔ اپنے کرب سے مجھے آگاہ کرسکتی ہو۔ ممکن ہے میں تمھارے کسی کام آ سکوں۔"

"میرے دل میں کوئی درد کوئی کرب نہیں ہے شہاب صاحب، اپنی تسلی کے لئے بس اتنا سُن لیجئے کہ زمانے کی ستائی ہوئی ہوں کچھ لوگوں نے میری انا کو مجروح کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے انھیں ٹھکرا دیا۔ اور اپنی تنہا زندگی کے لئے سہاروں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے مایوس نہیں کیا ہے۔ ہاں ایک وعدہ ہے آپ سے اگر زندگی میں کوئی ایسی مشکل درپیش آئی جسے میں اپنے طور پر حل نہ کرسکی تو آپ سے مدد لوں گی۔"

"مدد کیا بھائی اب تو ہم ہمیشہ آپ کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہیں گے۔"

"نہیں شہاب صاحب۔ خدا کی قسم بس مجھے اطمینان ہو جانے دیجئے کہ آپ نے یہ تمام چکر ختم کر دیئے ہیں۔ میں یہ اعتراف نامہ آپ کے حوالے کر دوں گی۔" شہاب صاحب مسکراتے رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے۔

"بس اب اُٹھو۔ فائل میرے حوالے کر دو۔ تاکہ میں تفسیر کو بھی مطمئن کر دوں۔ وہ مسلسل مجھ سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے۔"

"ہو سکے تو تفسیر کو بھی اِن کاموں سے باز رکھنے کی کوشش کیجئے۔ تفسیر صاحب اچھے انسان ہیں۔"

شہاب صاحب کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں تھا۔ یہاں سے ردا شہاب صاحب کے ساتھ سیدھی اُس بینک میں پہنچی جس کے لاکر میں سُرخ فائل موجود تھا۔ اُس نے سُرخ فائل نکالا اور شہاب صاحب کے حوالے کر دیا۔ شہاب صاحب کار میں بیٹھے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے کار میں بیٹھے ہی بیٹھے فائل کھول لیا۔ اس کی ورق گردانی کرتے رہے پھر گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"بڑی خوفناک چیز پر ہاتھ ڈالا تھا تم نے ردا تعجب ہے مجھے واقعی تعجب ہے۔"

"مگر اب اس سلسلے میں کیا ہوگا شہاب صاحب باگڑیا کو اس کا علم ہو چکا ہے، وہ کوئی کارروائی تو نہیں کرے گا۔"

شہاب صاحب ایک بار پھر مسکرانے لگے۔ "ردا ابھی تو تم نے ملازمت کا آغاز کیا ہے، بلکہ اگر میں یوں کہوں کہ ابھی تم نے دُنیا میں عملی زندگی کا آغاز کیا ہے، تو کچھ تجربات حاصل کرو، دولت کا حصول اِس دَور میں جائز طریقوں سے ممکن نہیں رہا ہے، ہر شخص اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرتا ہے، سیٹھ باگڑیا کے ہاتھ بھی بالکل ہی صاف نہیں ہیں۔ یہ تمام لوگ ایک دُوسرے سے رابطہ رکھتے ہیں اور ایک دُوسرے کے نقصان جھیلتے بھی ہیں، باگڑیا کا نقصان پُورا ہو جائے گا اِس سے غرض نہیں ہوگی کہ کیا کیا گیا۔"

"لیکن پھر بھی تفسیر صاحب یا آپ کی ذِمّہ داریاں کس طرح ختم ہوتی ہیں۔"

"ختم ہو چکی ہیں ردا، اب اُن میں کیا رکھا ہے۔ میں نے کہا نا ابھی تمھیں طویل ترین تجربات کی ضرورت ہے، تمھاری اطلاع کیلئے میں تمھیں بتا دُوں کہ داؤد اور عظمت نے فرینڈز آرگنائزیشن کے تمام معاملات اپنے اُوپر لے لئے ہیں۔ اور اُنھوں نے بتایا ہے کہ صرف وہ دونوں ہی اِس کاروبار کو اس جعلی پتے پر چلا رہے تھے اور اُس کے تحت کام کر رہے تھے، یہ فائل ہماری نشاندہی کرسکتا تھا لیکن اب یہ فائل تلف ہو جائے گا، چُنانچہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔"

"لیکن داؤد اور عظمت نے یہ اعتراف کیوں کر لیا۔" ردا نے پوچھا۔

"اس کے عوض انھیں پانچ پانچ لاکھ روپے کی نقد رقم ادا کی جائے گی۔" شہاب صاحب نے جواب دیا اور ردا نے آنکھیں بند کر کے گاڑی کی پُشت سے سر ٹکا دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ ابھی وہ اِن ہتھکنڈوں سے واقف نہیں تھی۔

⧉⧉

نُدرت اور طفیلی کی خُوب گھٹ رہی تھی۔ اکثر دونوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ طفیلی بیگم نے نُدرت کو چاندی کے چند چھلّے بطور تحفہ پیش کئے تھے، اکثر وہ نُدرت کے گھر بھی آ جایا کرتی تھیں۔ امّاں بی اور شوکت جہاں سے بھی اُن کی خوب سلام دُعا ہو چکی تھی۔

عارفہ بیگم کا کیس دادی امّاں کی ہدایت پر بہت زیادہ نمایاں نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن اب اِس کوٹھی کے رہنے والے یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ عارفہ بیگم نے دادی امّاں کی چوڑیاں چُرائی ہیں۔

ناصر علی کا رویّہ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ یا تو حیرت انگیز طور پر بات اُن تک نہیں پہنچی تھی۔ یا پھر عارفہ بیگم نے قسمیں وغیرہ کھا کر انھیں یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ یہ حرکت اُنھوں نے نہیں کی۔ بہرطور اُن دِنوں عارفہ بیگم بہت زیادہ اُداس نظر آتی تھیں۔ زیادہ تر اپنی رہائش گاہ میں ہی رہتی تھیں۔ اُنھوں نے باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ حالانکہ فطرتاً وہ ایسی نہیں تھیں اور اگر کچھ عرصے اور اسی طرح رہتیں تو

شاید بیمار پڑ جاتیں، اِدھر کی اُدھر کرنے کی عادت سے تنگ آ گئی ہوئی تھیں۔

تمام معمولات جُوں کے تُوں چل رہے تھے، اور اِن دِنوں کوئی خاص ہنگامہ خیزی نہیں تھی۔ نُدرت سے بھلا یہ کیفیت کیسے برداشت ہو سکتی تھی۔ جُمّن سے کئی بار ٹکراؤ ہوا تھا۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ کبھی تنہائی میں اُس سے گفتگو کرنے کا موقعہ نہیں مِلا تھا، پتہ نہیں جُمّن کے عشق کا بھُوت اُتر گیا تھا یا پھر وہ مصلحتاً خاموش تھا کیونکہ اُن دِنوں اُس کی پوزیشن بھی بہت خراب ہو چکی تھی۔ لیکن نُدرت اب اِس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتی تھی۔ اِس وقت بھی وہ موقعہ دیکھ کر باورچی خانے میں گھُس گئی۔ جُمّن سبزی کاٹ رہا تھا۔ نُدرت کو دیکھ کر اُس کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ چہرے پر خوف کے آثار اُبھر آئے تھے، نُدرت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے قریب پہنچ گئی، اُس کے چہرے پر حُزن و ملال کے آثار نظر آ رہے تھے، پھر اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"جُمّن . . ."

"اللہ . . . اللہ . . . اللہ . . ." جُمّن کے مُنہ سے پُورا جملہ تک نہیں نِکل سکا تھا۔

"ہُوں۔ تو اللہ والے ہو گئے ہو۔" نُدرت نے اُسے گھُورتے ہوئے کہا۔

"اوہ اللہ رکھی . . . اللہ رکھی چلی جاؤ یہاں سے کوئی آ گیا، کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔"

"ارے ارے تمھیں کیا ہو گیا ہے جُمّن آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"بس اللہ رکھی تقدیر خراب ہے، ہماری قسمت میں کبھی آپس میں مِلنا نہیں ہے۔"

"ہے جُمّن . . . آج رات کو وہیں اُسی جگہ . . ."

"امّاں مجھے رات کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔" جُمّن سرد آہ بھر کے بولا۔

"تو کیا امّاں رات بھر جاگتی رہتی ہے؟" نُدرت نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"نن نہیں۔ جاگتی تو نہیں رہتی، سو جاتی ہے، بس بس مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اوہ جُمّن، جُمّن تم اِس قدر بُزدل نکلو گے مجھے اس کی اُمید نہیں تھی . . ."

"میں . . . میں بُزدِل تو نہیں ہُوں اللہ رکھی۔ مگر اُس دِن، اُس دِن جو کچھ ہو چکا ہے اُس کے بعد میری ہمّت نہیں رہی ہے۔ میں نے سوا پانچ روپے کی نیاز کروائی تھی اِس مُصیبت سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے بعد اور دِل میں توبہ بھی کی تھی کہ آئندہ کبھی . . ."

"عشق نہیں کرو گے۔"

"نہیں، چوری نہیں کروں گا۔" جُمّن نے جواب دیا۔

"عشق تو کرو گے۔"

"وہ تو . . . وہ تو ہو گیا ہے اللہ رکھی۔ اُسے میں کیسے دِل سے نکال سکتا ہوں، وہ جو ایک گانا ہے نا وہ۔

ع تو پیار کرے یا ٹھکرائے ہم تو ہیں تیرے پروانوں میں۔"

"پروانوں میں نہیں دیوانوں میں۔"

"وہی سہی، مگر تم کیسے دیوانے ہو جُمّن کہ اُس دِن کے بعد تم نے پلٹ کر بھی میری خبر نہیں لی تمھیں کیا معلوم کہ میں کس طرح دِن گزار رہی ہوں، میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں تم کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہو گئے۔"

"غلط فہمی نہیں۔ میں مُصیبت کا شکار ہو گیا تھا۔"

"اب تو نہیں ہو۔"

"نہیں۔ اب تو اللہ کا فضل ہے۔"

"تو پھر مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے، پتھر بھی نہیں پھینکا۔"

"میں نے کہا نا، امّاں میری سخت نگرانی کرتی ہیں اِن دِنوں تو وہ بھی جاگتی ہی رہتی ہیں۔ عجیب مُصیبت میں پھنس گیا ہُوں۔"

"عشق مُصیبتوں ہی کا نام ہے جُمّن شاید تم نے عشق کی داستانیں نہیں سُنیں۔ کیا تمھیں یاد ہے کہ سوہنی کچے گھڑے پر سوار ہو کر دریا پار کرتی تھی کیا تمھیں یاد ہے کہ فرہاد نے پہاڑ کھود کر رکھ دیا تھا، کیا تم نہیں جانتے کہ مجنوں نے ساری زندگی صحراؤں میں گزار دی تھی، تمھیں کم از کم اِس کے بارے میں تو معلوم ہونا چاہیئے۔"

"لو اللہ کی قسم معلوم ہے، میں نے تینوں فلمیں دیکھی ہیں۔" جُمّن نے جواب دیا۔

"اور اِس کے باوجود تم ہمّت نہیں کر سکے۔"

"بس کیا بتاؤں، بس نجانے کیوں دِل ڈرنے لگا ہے آج کل، گھبرایا گھبرایا سا رہتا ہُوں، شرمایا شرمایا سا رہتا ہُوں۔"

"بس بس شاعری شروع کر دی۔ آؤ گے نا آج رات۔"

"ہاں آؤں گا، امّاں سو گئیں تو ضرور آؤں گا۔"

"اور اگر نہ سوئیں تو . . ."

"تو . . . تو بھی آؤں گا۔" جُمّن نے محبت بھری نگاہوں سے نُدرت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں . . . میں تمھارا انتظار کروں گی جُمّن۔" نُدرت اُداس لہجے میں بولی۔ اور باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ جُمّن سے ملاقات ہمیشہ ہی طبیعت شگفتہ کر دیتی تھی۔ چُنانچہ اِس وقت بھی اُس کا جی خوش ہو گیا تھا۔ شناء کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ کوئی اور مشغلہ نہیں تھا چنانچہ گھر میں واپس آ گئی۔

معمولات حسبِ دستور تھے، یہاں آنے کے بعد احمد علی کو بہت سکون ہو گیا تھا۔ ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے امّاں بی بھی خوش تھیں اور شوکت جہاں بھی۔ اِس کوٹھی کے لوگ فرشتہ صفت تھے

اور کسی کو یہاں آنے کے بعد کوئی تردد نہیں رہتا تھا۔

شام کو حسبِ معمول نشست رہی لیکن ندرت نے شناء اور ردا کو اس سلسلے میں ہوا بھی نہ لگنے دی تھی۔ اُن دونوں سے خطرہ تھا کہ وہ ٹانگ ضرور اَڑائیں گی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی اور اُس کے بعد ندرت کو اُس کے کمرے میں واپس آگئی۔ اُسے بے چینی سے رات کا انتظار تھا اُس نے بہت سے منصوبے ترتیب دے لئے تھے۔ اور پورا لائحہ عمل بنالیا تھا۔

رات کو وہ چوروں کی طرح اُٹھی اور گھر سے باہر نکل آئی اپنی شرارت میں اُس نے اپنی عزت بھی داؤ پر لگادی تھی۔ گھر والوں کو ہی اگر علم ہوگیا تو بے چارے مُنہ دِکھانے کے قابل نہیں رہیں گے، یا پھر باہر کسی نے دیکھ لیا تو حقیقت تو صرف دو ہی لڑکیاں جانتی تھیں یعنی رِدا اور شناء، وہ بھی ایسے موقع پر ندرت کی کوئی خاص مدد نہیں کرسکتی تھیں۔ لیکن ندرت کی اَلھڑ فطرت اُن تمام گہرائیوں کو نہیں سوچتی تھی۔ وہ تو بس شرارت کی پُڑیا تھی۔ اور اپنی شرارت میں ہر اَندھا قدم اُٹھانے کی عادی۔

جمن ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ انتظار کرتی رہی، اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے جمن کو آتے ہوئے دیکھا۔ ندرت کے ذہن میں شرارتیں مچل رہی تھیں۔ جمن درخت کے نیچے پہنچ گیا۔

"اللہ رکھی ... ؟"

"جمن..." ندرت نے والہانہ انداز میں کہا۔

"میں آگیا ہوں اللہ رکھی میں آگیا ہوں۔ ظالم سماج کی تمام دیواریں توڑ کر اور وہ جو کہتے ہیں نا کیا کہتے ہیں ایسے موقع پر... "

"ارے تو کیا تم نے اپنے کوارٹر کی دیوار توڑ دی؟" ندرت نے چونک کر کہا۔

"نن نہیں تو، کس نے کہا؟"

"میرا مطلب ہے ابھی تم کسی دیوار کے توڑنے کی بات کر رہے تھے؟"

"نہیں میرا مقصد ہے کہ وہ جو ظالم سماج ہوتا ہے نا، وہ جو معاشرہ، یعنی باپ، خطرناک امیر آدمی غریب دولت عورت، میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے:"

"بس بس۔ میں سمجھ گئی، سمجھ گئی" ندرت ہاتھ اُٹھا کر بولی۔

"تم ظالم سماج کی بات کر رہے ہو نا ٹھیک ہے جمن، محبتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے، ہاں اماں سو گئیں کیا تمھاری؟"

"ہاں وہی تو جاگ رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے اتنی دیر ہوگئی۔"

"کیا پریشانی لاحق ہے اُسے؟"

"بس نگاہ رکھتی ہے اُس دن سے مجھ پر جب تک میں نہیں سو جاتا تو وہ بھی نہیں سوتی۔ آج بھی میں نے بہت دیر تک سونے کی اداکاری کی اور سچ مچ ہی نیند آنے لگی مجھے پر اماں نہیں سوئی۔ اب جب وہ سو گئی، تب میں اُٹھ کر آیا ہوں۔"

"آہ جمن یہ ظالم سماج ہمارے ساتھ کب تک یہ سلوک کرتا رہے گا؟"

"پتہ نہیں" جمن نے پُرخیال انداز میں گردن کھجائی۔

"تم کچھ کرو نا جمن؟"

"کیا کروں، کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔"

"اُس دن تمھارے ساتھ جو کچھ ہُوا، اُس کے لئے میرا دل خون کے آنسو رو تا رہا ہے۔"

"تمھارا دل تو خون کے آنسو رو تا رہا ہے اور میرا خون ہوتے ہوتے بچ گیا۔ وہ تو پتہ نہیں اللہ میاں نے شہاب صاحب کے دل میں کیا ہمدردی ڈال دی کہ انھوں نے بس کپڑے اُتروا کر چھوڑ دیا۔ ورنہ۔ ورنہ... تم نہیں جانتیں شہاب صاحب کتنے خطرناک آدمی ہیں پستول رکھتے ہیں جیب میں ہمیشہ، دو تین گولیاں مار دیتے تو اپنا تو کباڑہ ہو گیا تھا۔ ارے باپ رے" جمن کا لہجہ خوفزدہ ہوگیا۔

ندرت جھلائے ہوئے انداز میں اُسے دیکھنے لگی "اِس کا مقصد ہے کہ اب تم ڈر گئے ہو، تب پھر مجھے تمھاری طرف سے مایوس ہو جانا چاہئیے۔"

"نہیں اللہ رکھی، یہ بات نہیں ہے۔ اللہ قسم میں ڈرا تو بالکل نہیں ہوں۔ بس یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا ترکیب کرنی چاہئیے اب دیکھو نا تمھاری اماں نے بھی رشتہ ٹھکرا دیا، ورنہ کوئی مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا"

"جمن تم نہیں سمجھتے، یقیناً ہمارے درمیان روڑے اٹکانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔"

"کون کر رہا ہے یہ کوشش؟" جمن نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"دشمن کا پتہ ہی تو نہیں چل سکا۔ لیکن دشمن کی ساری چالیں ناکام بنانے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے جمن۔"

"میں کیا کروں آخر، مجھے بتاؤ میں کیا کروں کیا کرنا چاہئیے۔ کیا اماں کو تیار کر کے بھیجوں تمھارے گھر رشتے کے لئے؟"

"نہیں نہیں۔ خُدا کے لئے ابھی ایسا مت کرنا، اگر تم نے جلتے پر تیل چھڑکا تو آگ اور بھڑکے گی۔"

"تو اب پھر... تم خود ہی مجھے بتاؤ میں کیا کروں...؟"

"جمن مجھے کچھ وظائف آتے ہیں۔ ایسے وظیفے جنھیں پڑھنے کے بعد ہمارے راستے کی تمام رکاوٹیں دُور ہو جائیں گی۔ تم کیا سمجھتے ہو، شہاب صاحب نے ایسے ہی تمھیں چھوڑ دیا۔ ارے جس وقت میں نے دیکھا کہ شہاب صاحب نے اپنا سُوٹ پہچان لیا ہے تو میں نے فوراً ہی ایک وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا تھا اور یہ اُسی کا اثر تھا کہ تم زندہ سلامت واپس آگئے۔"

"کیا واقعی...؟" جمن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں

"کیا میں جھوٹ بولوں گی تم سے...؟" ندرت نے آنکھیں نکالیں۔

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا وظیفہ تمھیں معلوم ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"بہت عرصے پہلے کی بات ہے۔ ہم جس جگہ رہتے تھے وہاں ہمارے پڑوس میں ایک بشیر صاحب رہتے تھے۔ میرا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن محلے کی ایک لڑکی ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ اور اُسے حاصل کرنا چاہتی تھی، لڑکا بھی تیار تھا اور لڑکی بھی۔ لیکن اُن کے گھر والے آپس میں راضی نہیں تھے اور اِس سلسلے میں اُن کے درمیان آپس میں دشمنی سی ہوگئی تھی۔ بس پھر لڑکے نے وظیفہ پڑھا اور لڑکی نے بھی وظیفہ پڑھا تم تعجب کروگے کہ چند ہی روز میں سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔"

"ہوگیا...؟" جمن اُچھل پڑا۔

"ہاں بالکل۔"

"تو پھر...؟"

"بس پھر وہ وظیفہ میں نے اتفاقیہ طور پر اُس لڑکی سے معلوم کرلیا جو مجھے آج تک یاد ہے۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے، مگر کوئی ایسا جلالی وظیفہ تو نہیں ہے، میں نے ایک دفعہ ایک آدمی کو دیکھا تھا جو وظیفہ پڑھ کر پاگل ہوگیا تھا۔"

"ارے نہیں نہیں یہ وظیفہ خود پاگل ہونے کے لئے نہیں ہے بلکہ دوسروں کو پاگل بنانے کے لئے ہے۔"

"تو پھر بتاؤ اللہ رکھی۔ تم یقین کرو میں بھی تمھارے فراق میں جل رہا ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں جل جل کے، جل جل کے، جل جل کے۔"

"ہاں ہاں ہاں بس اتنا ہی جلنا کافی ہے، زیادہ جل گئے تو کوئلہ ہو جاؤ گے جمن" ندرت ہمدردی سے بولی۔

"ہاں ٹھیک ہے" جمن نے بے چارگی کے انداز میں کہا۔ پھر بولا۔

"وظیفہ تو بتاؤ مجھے؟"

"بس چند لفظ پڑھنا پڑھتے ہیں لیکن اس کے لئے دوسری کارروائیاں بھی کرنا پڑتی ہیں۔"

"کیا...؟"

"مثلاً پیاز کے چھلکے" ندرت نے کہا۔

"ایں" جمن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

"ہاں جمن، یہ وظیفہ پیاز کے چھلکوں پر ہی پڑھا جاتا ہے جس قدر پیاز کے چھلکے جمع کر سکو ضرور کرلو، وظیفہ ابتداء میں تین دن، پھر تین دن کا وقفہ اور پھر تین دن۔ اِس دَوران پیاز کے چھلکوں پر تمھیں یہ وظیفہ پڑھ کر پھونکنا ہوگا۔ اور پھر یہ چھلکے پُورے گھر میں پھیلا دینے ہوں گے، تھوڑے سے چھلکے انتہائی احتیاط سے اپنی اماں کے صندوق میں، پاندان میں اور جہاں جہاں اُن کے ہاتھ لگتے ہوں، وہاں رکھنا ہوں گے، وہ اِن پیاز کے چھلکوں پر چلتی رہیں تو ہمارا کام بہت آسان ہوجائے گا۔ جہاں بھی ہاتھ ڈالیں انھیں پیاز کے چھلکے نظر آنے چاہئیں۔ اگر تم اِس میں کامیاب ہوگئے تو پھر یہ سمجھ لو ہماری زندگی بہت اچھی گُزرے گی۔"

"مگر تعجب ہے۔ میں نے تو پہلی بار ہی سُنا ہے۔"

"تو پھر کیا تم اِس سے پہلے بھی کسی کے لئے وظیفہ کرتے رہے ہو؟"

"ارے نہیں نہیں اللہ رکھی، یہ مطلب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پیاز کے چھلکے۔"

"بس بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جو اپنی الگ حیثیت اور اہمیت رکھتی ہیں۔"

"تو چلو ٹھیک ہے۔ میں نے پیاز کے چھلکوں پر یہ وظیفہ پڑھا اور اماں کے چاروں طرف پیاز کے چھلکے پھیلا دیئے، مگر تم کیا کرو گی؟"

"مجھے بھی پڑھنا پڑے گا۔"

"کیا پیاز کے چھلکوں پر ہی...؟"

"نہیں۔ میرا وظیفہ پیاز کے چھلکوں پر نہیں ہوگا۔ بلکہ اِس کے لئے مجھے مٹر کے دانے پڑھنے پڑیں گے۔"

"اوہو ہو ہو۔ گویا اپنے گھر والوں کو موم کرنے کے لئے تمھیں یہ وظیفہ مٹر کے دانوں پر پڑھنا پڑے گا اور مٹر کے دانے پورے گھر میں پھیلانے پڑیں گے۔"

"ہاں بالکل۔"

"تو ٹھیک ہے، تم مجھے وظیفہ بتادو، تم دیکھنا تو سہی کہ جمن کیا کرتا ہے۔" جمن خوش ہوکر بولا۔ اور ندرت نے بڑے اطمینان سے اُسے چند جُملے رٹا دیئے جو بے تُکے تھے۔ "اور سُنو جمن رات کو جب اماں سو جائیں تو تم یہ وظیفہ پڑھ کر پہلے تو پیاز کے چھلکے پھیلانا اور پھر اُن کے مُنہ پر بھی دو تین پھونکیں مار دینا لیکن زور زور سے..."

"ٹھیک ہے اللہ رکھی، میں یہ کام کرلوں گا۔"

"بس جمن میں تو دن رات تمھارے گھر آنے کے خواب دیکھتی رہتی ہوں۔"

"اور میں بھی تو دیکھتا ہوں۔"

"نہیں۔ تمھارے اُوپر مجھے کچھ شک ہوگیا ہے۔"

"ارے اَرے وہ کیوں؟ اللہ قسم شک کیا تو جان دے دُوں گا۔" جمن لپک کر بولا۔

"نہیں نہیں جمن ایسا مت کرنا۔ تمھاری زندگی میرے لئے بہت قیمتی ہے۔"

"اللہ قسم میں مر جاؤں" جمّن دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بولا۔

"اب جاؤ جمّن۔ ہمیں جلد از جلد اپنا کام شروع کر دینا چاہیئے، اِس وظیفے میں کامیابی پر ہی ہماری کامیابی کا اِنحصار ہے"

"ٹھیک ہے پرواہ مت کرو" جمّن نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد نُدرت واپس اپنے کوارٹر میں آگئی۔ اُس کے پیٹ میں قہقہے اُبل رہے تھے، جمّن کی اماں پیاز کے چھلکوں سے ویسے ہی چڑتی تھی اب لُطف آئے گا اور اگر کبھی حقیقت آشکارا بھی ہوگئی تو جمّن کی ماں اِس بات کی شکایت کسی سے نہیں کر سکتی تھی کہ یہ چھلکے تین نمبر سے پھینکے گئے ہیں۔ جمّن خود ہی اُن کا اِعتراف کرے گا۔ بہر طور کچھ نہ کچھ جاری رہنا چاہیئے۔ تفریحات کے بہت سے ذرائع ختم ہوگئے تھے اور اب نئے نئے ہنگاموں کی ضرورت تھی، عصمت تو اپنی پڑھائی میں اب پُوری طرح مصروف ہوگئی تھی، لیکن نُدرت کے لئے بس یہی تفریح تھی کہ وہ کوٹھی میں کسی نہ کسی قسم کا ہنگامہ کراتی رہے۔

***

اِحسان صاحب گھریلو مُعاملات میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ زیادہ تر وہ کاروباری اُمور میں اُلجھے رہتے تھے۔ لیکن اِتنے بھی نہیں کہ گھر والوں کو اُن سے شکایت پیدا ہو جائے۔ وہ بس گھریلو قسم کی تقاریب سے بچتے تھے اور دُوسرے مُعاملات میں بھی اُلجھنا پسند نہیں کرتے تھے اُس وقت بھی وہ کہیں باہر سے آئے تھے، ذکیہ بیگم نے اُن سے دیر سے آنے کی وجہ پُوچھی تو کہنے لگے۔

"بس بھئی کچھ مُعاملات میں اُلجھا ہُوا تھا تم لوگ کھانا تو کھا چکے ہوگے؟"

"ہاں کھانا تو وقت پر ہی لگ گیا تھا۔ لیکن آپ کے لئے نکلوائے دیتی ہوں۔۔"

"نہیں بھئی معاف کرنا تمھیں فون پر اِطلاع نہیں دے سکا۔ کچھ ایسے ہی لوگ آگئے تھے۔ ایک پیغام بھی آیا ہے سُنو گی تو تمام شکایات دُور ہو جائیں گی"

"کیسا پیغام۔۔۔؟"

"عادل بھائی یاد ہیں نا۔۔۔؟"

"عادل بھائی بھی بھولنے کی چیز ہیں۔ خیریت؟ کیا بات ہے؟"

"خالد اور اختر آرہے ہیں"

"ارے کب۔۔۔؟" ذکیہ بیگم خوش ہوگئیں۔

"کل دِن میں پہنچ جائیں گے، تقریباً ڈھائی بجے میں شباب میاں کی ڈیوٹی لگائے دیتا ہُوں وہ اُنھیں ایئرپورٹ پر ریسیو کرلیں گے"

"خُدا کی قسم جی خوش ہوگیا۔ بڑا جی چاہ رہا تھا دونوں بچّوں کو دیکھنے کے لئے۔ میرا خیال ہے چھ سات سال تو ہو گئے جب آخری بار عادل بھائی بچّوں کے ساتھ آئے تھے، بے چارے کتنے غمزدہ تھے بھابی کے اِنتقال کا تو یقین ہی نہیں آتا تھا"

"ہاں بہر طور بہت شریف اِنسان ہیں میں جب بھی کبھی کینیڈا جاتا ہوں تو تم نہیں جانتیں کہ کس طرح میرے آگے بچھے جاتے ہیں"

"تو کیوں نہ بچھیں گے، بہت بڑا رشتہ ہے ہمارے اور اُن کے درمیان"

"ہاں یہ تو ہے، لیکن ذکیہ بیگم بدلتے ہوئے حالات کو نظر انداز کرنا حماقت ہے۔ میرا خیال ہے اِس مذاق کو اپنے طور پر بہت زیادہ اہمیت مت دینا" اِحسان صاحب پُرخیال انداز میں بولے۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"کون سے رشتے کی بات کر رہی ہو تم۔۔۔؟"

"ارے وہی جو ہمارے اور اُن کے درمیان طے ہو چُکا ہے اِس میں غور کرنے کی کیا بات ہے، دِلی خواہش ہے میری کہ میں ثناء کو خالد کی دُلھن بناؤں" ذکیہ بیگم بولیں۔

"ٹھیک ہے ذکیہ بیگم، میں بھی اُسے اچھی طرح جانتا ہُوں تمھیں تو اُسے دیکھے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ درحقیقت نفیس نوجوان ہے تم اُسے دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ مغربی ملک میں رہنے کے باوجود وہ کس قدر سادہ طبیعت کا اِنسان ہے حیرانی ہوتی ہے"

"لیکن یہ تو بتایئے اِس دوران عادل بھائی نے اِس قسم کا کوئی تذکرہ کیا؟"

"نہیں بھئی ہم دونوں کے درمیان جو محبت قائم ہے اُس کے تحت کیا یہ ضروری ہے کہ یاد دہانی کی جاتی رہے، عادل کے دِل میں یقیناً یہ بات زندہ ہے، لیکن میں خود ہی کترا رہا ہُوں"

"کیوں؟" ذکیہ بیگم نے حیرانی سے پُوچھا۔

"ثناء کی فطرت سے تم اچھی طرح واقف ہو، وہ دُوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے اور میں فلمی قسم کا باپ نہیں ہُوں کہ اپنی کسی ضد پر اَڑ جاؤں"

"میرا خیال ہے کہ ثناء ضدی ہونے کے باوجود۔۔"

"جی نہیں آپ اپنا خیال رہنے دیں اب آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہُوں میں"

"جی جی کہیئے"

"ذرہ برابر تذکرہ نہیں ہونا چاہیئے اِس بات کا کہ ہماری دِلوں میں کوئی خیال جاگزیں ہے بلکہ بہتر ہے پہلے ثناء سے کوئی ذِکر تو نہیں کیا گیا؟"

"نہیں کون ذِکر کرتا، بات تو میرے، بھائی کے، آپ کے علاوہ علم

"ہُوں یہ انداز ذرا بہتر ہے چلوں تمھارے ساتھ چائے پلاؤ گی"

"تو تو واقعی بڑی کمینی ہے۔ میں تیرے گھر آئی ہُوں۔ تجھے مجھے چائے پلانی چاہیئے، نہ کہ اُلٹا کہہ رہی ہے کہ میں واپس چلوں اور تجھے چائے پلاؤں"

"او ہو تو بیٹھو ابھی بنا کر لاتی ہوں چائے، یہ عصمت باجی خدا کرے فیل ہو جائیں اور مُسلسل فیل ہوتی رہیں۔ جب سے گھر چھوڑ کر بھاگی ہیں۔ میری تو جان مُصیبت میں آگئی ہے" نُدرت نے کہا اور کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔ راستے ہی میں شوکت جہاں نظر آگئی تھیں۔

"کہاں نُدرت؟"

"وہ امی ثناء آئی ہیں نا، اُنھیں چائے پلانی ہے۔ بے چاری اکیلی بیٹھی ہے، آپ ہی اُس سے باتیں کرلیں تاکہ میں چائے بناؤں یا پھر"

"ہُوں، اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں چائے لا رہی ہُوں۔۔۔" شوکت جہاں نے کہا اور نُدرت خوشی خوشی واپس آگئی۔

"کیوں کیا دُودھ پتی ختم ہوگئی؟" ثناء نے پوچھا۔

"نہیں بھئی امی بے چاری بہت اچھی ہیں۔ ابھی لا رہی ہیں چائے تمھارے لئے" نُدرت نے کہا اور ثناء کے سامنے بیٹھ گئی۔ دفعتاً نُدرت سر اُٹھا کر بولی۔

"ارے واہ، ایک بات بتاؤ، بٹیریں لڑاؤ گی؟"

"کیا؟" ثناء نے حیرت سے پُوچھا۔

"بٹیریں لڑاؤ گی؟"

"کیا بکواس ہے کونسی بٹیریں؟"

"تمھاری بٹیر عارفہ خالہ، میری بٹیر طفیلی بیگم دونوں کو لڑائیں گے۔ لیکن کچھ شرط رکھ کر، جس کی بٹیر جیت گئی وہ دُوسرے کو۔۔۔ دُوسرے کو۔"

"ارے واہ، تجویز ہی شاندار ہے لڑائیں گے ضرور لڑائیں گے۔ جو شرط چاہے بدلو" ثناء نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

"گُڈ ویری گُڈ۔ بٹیریں لڑیں گی اور ضرور لڑیں گی، سُنو ثناء۔ پروگرام سُنو۔ ذرا آگے آجاؤ یار، امی چائے لے کر آنے والی ہیں سُن لیا تو مُصیبت آجائے گی" اور ثناء اُس کے قریب ہوگئی۔

"میں طفیلی بیگم کو چڑھاؤں اور تم عارفہ خالہ کو چڑھاؤ۔ عارفہ خالہ کو پالش کرنا تمھارا کام ہے اور طفیلی بیگم کو پالش کرنا میرا کام ہے۔ اور پھر لے آتے ہیں اِن دونوں کو میدان میں۔ ذرا دیکھیں تو سہی کون جیتتا ہے۔ اور کون ہارتا ہے"

"طے!" ثناء نے ہاتھ پھیلا دیا اور نُدرت نے اُس سے پُرجوش انداز میں ہاتھ ملایا۔

"مگر اِس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟" ثناء کہنے لگی۔

"بس عارفہ بیگم کو احساس دلاؤ کہ طفیلی بیگم نے اُن پر بھرپور وار کیا ہے، اور دادی اماں کی چوڑیاں اُن کے پاس سے برآمد کرکے اُن کی عزت دو کوڑی کی کر دی ہے۔ طفیلی بیگم ہر شخص کو یہ بتاتی پھر رہی ہیں کہ عارفہ بیگم نے دادی اماں کی چوڑیاں چُرائی ہیں۔ دُوسری طرف میں کچھ کارروائی کرتی ہُوں۔ بس میری کارروائی بھی شاندار ہوگی لُطف آجائے گا تمھیں"

"کیا کارروائی ہوگی تمھاری؟"

"بس آج کل مجھ پر تعویذوں کا بھوت سوار ہے" نُدرت نے جواب دیا۔

"کاہے کا بھوت؟"

"تعویذوں کا بھوت، جمّن سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے لئے وظیفہ پڑھنا شروع کرے گا اور یہ وظیفہ پیاز کے چھلکوں پر پڑھا جائے گا"

"کیا کیا کیا؟" ثناء نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا اور نُدرت پیاز کے چھلکوں کا پُورا لطیفہ ثناء کو سنانے لگی، ثناء کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ نُدرت نے کہا۔ "اور اب دو نمبر کے ہر گوشے میں پیاز کے چھلکے نظر آئیں گے۔ ہائے میرا جمّن"

"واہ یہ ہوئی نا بات، مزا آجائے گا۔ مجھے بھی شریک کر لینا بلکہ میں اب خود ہی جمّن کے وظیفے کا نتیجہ دیکھنے آؤں گی۔ مگر تم نے تعویذ کی کیا بات کہی تھی؟"

"طفیلی خالہ کے گھر سے تعویذ برآمد ہوں گے اور یہ تعویذ اُن کے کمرے سے اُن کے سامان سے اور یہ تعویذ بھلا عارفہ خالہ کے علاوہ اور کون کرا سکتا ہے اور میں یہ ثابت کر دُوں گی کہ تعویذ خالہ عارفہ نے کرائے ہیں اور اِس کے بعد ظاہر ہے طفیلی بیگم بھلا عارفہ خالہ کو کیوں چھوڑنے لگیں۔ لُطف رہے گا ثناء لُطف آجائے گا"

"یہ ہُوئی نا بات، ٹھیک ہے میں تو اپنا کام آج ہی سے شروع کر دُوں گی"

"اور میں کون سا پیچھے رہُوں گی" نُدرت نے کہا اُسی وقت کمرے کے دروازے پر آہٹ محسوس ہُوئی اور وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ شوکت جہاں بیگم چائے لے کر اندر آگئی تھیں، چائے پینے کے بعد ثناء اُٹھ کھڑی ہوئی، اب اُس کا رُخ کوٹھی کی جانب تھا۔

**

ثناء نُدرت سے خصوصی ہدایات لے چکی تھی۔ کوٹھی کے اندرونی معاملات کا جائزہ لینے کے بعد وہ سیدھی عارفہ خالہ کی جانب چل پڑی۔ عارفہ بیگم اُس وقت بھی معمول کے مطابق اپنے کمرے میں موجود تھیں۔ ثناء نے دروازے پر دستک دی تو اُنھوں نے خود ہی دروازہ کھولا اور پھر ثناء کو دیکھ کر دُعائیں دینے لگیں۔

"آؤ ثناء اندر آجاؤ بیٹی" اُنھوں نے کہا اور ثناء تشویش زدہ شکل بنائے ہوئے اندر پہنچ گئی۔

"خالہ کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو؟ میں آپ یقین کریں آپ کے لئے ہمیشہ پریشان رہتی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں، یہاں اس پوری کوٹھی میں اگر مجھے کسی سے تھوڑا بہت دِلی لگاؤ ہے تو بس آپ ہی سے ہے۔ باقی سارے کے سارے تو بس کیا کہوں چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔"

"بیٹی۔ محبت ہے تمھاری، اور کیا کہوں؟ کاش میں اس قابل ہوتی کہ تمھیں تمھاری اِس محبت کا صلہ دے سکتی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں خالہ جان۔ کیا آپ کی دُعائیں بہت بڑی چیز نہیں ہیں میرے لئے؟"

"بیٹی دِلوں کا حال تو خُدا جانتا ہے۔ بس اِتنا کہوں گی زبان سے کہ تمھیں دیکھ کر روشنی اُترتی ہے آنکھوں میں۔"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ آج کل زیادہ تر گم صم رہتی ہیں۔ کیا بات ہے کچھ طبیعت تو ناساز نہیں ہے؟ کسی قسم کی کوئی پریشانی؟ ناصر خالو بھی نظر نہیں آتے۔ ویسے تو وہ بہت کم ہی ہم لوگوں میں بیٹھتے ہیں۔"

"بی بی! بس حالات نے عزت چھین لی ہے اور کیا کہا جائے۔"

"دیکھیے خالہ میں ناراض ہو جاؤں گی آپ سے۔ کون مردود کہتا ہے کہ آپ کی عزت چھن گئی ہے۔ اگر آپ کی مُراد طفیلی بیگم سے ہے۔ تو اِن طفیلی بیگم کو دیکھ دیکھ کر تو میری آنکھوں میں خون اُترتا ہے۔ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں عارفہ خالہ میں قیامت تک یہ بات نہیں مان سکتی کہ آپ جیسی نیک اور دین دار خاتون کوئی ایسی حرکت کر سکتی ہے۔"

"بیٹی۔ پُوری کوٹھی کی زبان پر ایک ہی بات ہے۔ تمھارے کہنے نہ کہنے سے کیا ہو گا۔"

"کمال کی بات ہے آخر یہ پُوری کوٹھی میں یہ بات پھیلی کیسے؟ جبکہ دادی اماں نے سختی سے حکم دیا تھا کہ اس مسئلے کو یہیں ختم کر دیا جائے اور پھر کس کی اتنی ہمت ہوئی کہ دادی اماں کے حکم کو ٹال سکے اور آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کرے۔"

"سچ کہوں گی تو یہی سمجھا جائے گا کہ دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے، ارے اس طفیلی بیگم کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے ایسا جو اس بات کو مزے لے لے کر دُوسروں کے سامنے بیان کرے سب مجھ سے ہمدردی کرتے ہیں۔ سب ہی مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ کس کی مجال تھی جو اس سے پہلے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کر جائے، ارے بس کیا کہوں تم سے بیٹی طفیلی کے رنگ ڈھنگ تو مجھے فیصل آباد ہی میں نظر آ گئے تھے اور تم کیا سمجھتی ہو، ماں خان آج تو نہیں مرے عرصہ ہو گیا اُنھیں مرے ہوئے طفیلی بیگم کو اتنے عرصے کے بعد بہن کیوں یاد آ گئیں؟ اور پھر وہ بہن جن پر ہمیشہ تھوکا جاتا رہا جن کی دولت سے ہمیشہ حسد کیا جاتا رہا، میں تمھیں ایک بات بتا دوں ثناء۔ ذرا خیال رکھنا میری بات کا۔ مجھے تم سے یہ سب کچھ کہنا نہیں چاہیئے لیکن دِل میں درد اُٹھتا ہے ٹیسیں اُٹھتی ہیں تو کیا کروں؟ کس سے کہوں پھر۔ یہ طفیلی بیگم یہاں کوئی اور ہی منصوبہ لے کر آئی ہیں۔ جتنی محبت جتنا پیار ذکیہ بیگم سے جتایا جا رہا ہے یہ پیار کہاں سو گیا تھا؟"

"کیا منصوبہ ہو سکتا ہے اُن کا خالہ جان؟" ثناء نے پُوچھا۔

"بیٹی! ایک بات کا وعدہ کر لو مجھ سے... مجھ نصیبوں جلی کی زبان سے اگر کچھ پھوٹے تو اُسے پھیلا مت دینا۔ اور تو کچھ نہیں ہو گا۔ میرے میاں میری چوٹی کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دیں گے۔ اللہ کے فضل و کرم سے چڑیلیں والی بات ابھی تک اُن کے کانوں میں نہیں پہنچی۔ اُن کی مصروفیت ہے، یا پھر دُشمنوں کو توجہ دینے کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ ضرور اُن کے کانوں میں یہ بات پھونک دیتے۔ تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر میں نے مُنہ سے کچھ نکال دیا اور تمھیں بُرا لگ گیا اور تم نے اس سلسلے میں واویلا کی تو پھر یُوں سمجھ لو کہ عارفہ کی زندگی مشکل ہو جائے گی۔ خودکشی ہی کرنی پڑ جائے گی مجھے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں خالہ جان۔ میری زندگی میں یہ ممکن ہے۔ آپ کھلے دِل سے کہیئے کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔ طفیلی بیگم کا منصوبہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"بیٹی اُس کے بیٹے کو دیکھا ہے تم نے؟"

"رشید کو...؟"

"ہاں، خالہ زاد بھائی ہے تمھارا۔"

"لعنت ہے ایسے خالہ زاد بھائی پر مجھے تو اُس کی شکل سے گھن آتی ہے۔ میں نے تو کبھی سیدھے مُنہ اُس سے آج تک بات نہیں کی نہ ہی وہ اِس قابل ہے، لچا لفنگا کہیں کا، اپنے آپ کو مہذب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آپ نے محسوس کیا ہو گا خالہ جان کہ میں تو اُسے نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں۔ اگر ایک بار بھی سیدھے مُنہ اُس سے بات کر لیتی تو میں جانتی ہوں کہ پیچھے ہی لگ جاتا۔ بہرطور میرا اُس سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہے۔"

"مگر... طفیلی بیگم کے دِل میں تو بڑے لڈو پھوٹ رہے ہیں۔ کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔" عارفہ بیگم نے کہا۔

"جی... " ثناء حیرت سے بولی۔ درحقیقت اُسے عارفہ بیگم سے ایسے کسی اِنکشاف کی توقع نہیں تھی۔

"ہاں بی بی دُنیا دیکھی ہے، دُھوپ میں بیٹھ کر عُمر نہیں گزاری طفیلی بیگم کی آنکھوں میں جو روشنیاں جگمگا رہی ہیں ناں۔ اُن کی گہرائی کچھ اور ہی ہے۔ بہن بہنوئی پر قبضہ جمانے کے بعد اُن کی دولت کی مالک بننے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔"

"مگر کیسے؟ عارفہ خالہ آخر کیسے...؟" ثناء حیرت سے بولی۔

"رشید کے ذریعے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ رشید کس کس طرح ذکیہ بیگم

کے اردگرد پھرتا ہے۔ میں فیصل آباد گئی تھی ذکیہ بیگم کے ساتھ۔ اللہ معاف کرے مجھے غرور سے توبہ تو یہ گھر تھا کہ غسل خانہ معلوم ہوتا تھا۔ بلکہ غسل خانے بھی بڑے صاف ستھرے ہوتے ہوں گے۔ بی بی غربت الگ چیز ہے اور غیرت الگ چیز ہے۔ ہاتھ پاؤں ہلاؤ تو گھورے کو بھی گھر بنا لو۔ مگر وہ گھر گھورے سے بھی بدتر تھا اور یہ رشید میاں ارے ان کا چولا بدل گیا ہے۔ ورنہ ایک زبان میں ہزار تو گالیاں بکتے تھے بس خالہ جان کو مکھن لگایا گیا اور وہ بھی اس نقریئے کے تحت کہ خالہ کے گھر میں گھس کر ہاتھ پاؤں پھیلائیں اور پھر مکڑی کی طرح جالا بُنتے رہیں۔ ارے ثناء بیٹی اِس رشید کی آنکھوں میں بس تیرے لئے عجیب سے آثار دیکھ چکی ہُوں میں۔ تُو تو بچی ہے سمجھتی نہیں ہے نا ان باتوں کو، مگر ابھی زبان نہیں کھلی اُن لوگوں کی تھوڑے دِن ہو جائیں تو زبان بھی کھل جائے گی۔"

"آخر کیا کہنا چاہتی ہیں آپ عارفہ خالہ خُدا کے لئے کُھل کر کہیئے۔"

"بیٹی۔ اللہ کے واسطے بُرا مت ماننا میری بات کا۔ طفیلی بیگم کے دِل میں ضرور یہ خیال ہو گا کہ بیٹے کو اِس گھر کا داماد بنا دیں۔"

"کیا بنا دیں؟"

"داماد، داماد۔" عارفہ خالہ نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ اور ثناء تعجب سے اُن کی صُورت دیکھنے لگی۔ وہ کچھ سوچنے لگی تھی پھر وہ چونک کر بولی۔

"کیا مطلب... کیا مطلب عارفہ خالہ...؟"

"ہاں بیٹی میں تیرے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہہ سکتی۔" عارفہ بیگم نے کہا اور ثناء پھر سوچ میں ڈوب گئی ممکن ہے اس بات کی کوئی حقیقت بھی ہو کیونکہ طفیلی بیگم جیسی عورتوں سے یہ بات بعید بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن عارفہ بیگم جیسی عورتوں کے سامنے برہمی کا اظہار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

"عارفہ خالہ ان طفیلی بیگم کو اگر ناکوں چنے نہ چبوا دیئے تو میرا نام بھی ثناء نہیں ہے اگر ان کے دماغ میں یہ خناس ہے۔ رہے تو چلنے دیجئے مجھے اِس کی پرواہ نہیں ہے۔ فی الحال تو میں اُن سے آپ کا بدلہ لینا چاہتی ہوں۔ اُنھوں نے آپ کو بدنام کرنے کی جس طرح سازش کی ہے۔ اِس کی اُنھیں کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنی چاہیئے۔"

"بیٹی میں نے تو اپنا معاملہ خُدا کے سُپرد کر دیا ہے۔ خُدا ہی اُن سے میری بے عزتی کا بدلہ لے گا۔"

"گویا آپ اُن سے ہار مان چکی ہیں عارفہ خالہ۔" ثناء نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"ہار تو بیٹی خیر میں نے دُنیا میں کسی سے نہیں مانی۔ مگر جو کچھ ہُوا ہے اِس کے لئے میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

"آپ مجھے حکم دیں عارفہ خالہ میں آپ کے لئے کچھ کروں۔"

"کیا کرو گی تم؟"

"عارفہ خالہ! اِتفاق کی بات ہے کہ میری ایک دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ دوست بیچاری ذرا ایسے ہی خاندان کی ہے۔ اِس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ چُنانچہ اُس نے ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ سے رابطہ قائم کیا۔ بزرگ نے اُس کو چند تعویذ دیئے اور کہا کہ یہ تعویذ اپنے دُشمنوں تک پہنچا دے حقیقت کُھل کر سامنے آ جائے گی۔ بس خالہ میں تو حیران رہ گئی۔ تعویذوں کا پڑھنا تھا کہ آہستہ آہستہ سارے مسئلے حل ہوتے چلے گئے اور دُشمنوں نے اپنے مُنہ سے دُشمنی کا اظہار کیا۔ اور کیفرِ کردار تک پہنچ گئے۔ یُوں ہی بیٹھے بیٹھے ذہن میں خیال آیا خالہ کہ کیوں نہ آپ بھی طفیلی بیگم سے خود ہی اُن کی اِس حرکت کا کچا چٹھا دُوسروں کو سنوائیں۔"

"اے بیٹی تعویذوں کے ذریعے۔" عارفہ خالہ نے اِنتہائی دلچسپی سے پُوچھا۔

"ہاں عارفہ خالہ یہ کام میں کر لوں گی کہ تعویذ حاصل کر لوں۔ باقی اُنھیں اپنے دُشمنوں تک پہنچانا آپ کا کام ہے۔ لیکن خالہ ایک بات سے ڈرتی ہوں۔"

"کیا...؟"

"مجھے آپ کے ساتھ اگر کسی سازش میں شریک سمجھا گیا تو میرے لئے مُشکل ہو جائے گی۔"

"لو۔ میں تو تمھاری ہزار بلائیں اپنے سر لینے کو تیار ہُوں ثناء بیٹی۔ کس کو پتہ چل سکتا ہے۔ اگر تم مجھ غریب کے ساتھ کچھ کرنا چاہتی ہو تو اللہ کے واسطے میرے لئے تعویذ لا دو۔ میں طفیلی بیگم کو ذلیل و خوار کرنا چاہتی ہُوں۔"

"ہو جائے گا یہ کام خالہ جان، یہ کون سا مُشکل ہے بس ایسا ہے کہ میرا نام بھی سامنے نہ آئے۔"

"مر جاؤں گی بیٹی تمھارا نام کسی کے سامنے نہیں لُوں گی یہ تمھاری خالہ کا وعدہ ہے۔"

"تو پھر آپ کی بھانجی کا بھی یہ وعدہ ہے کہ وہ تعویذ حاصل کر کے رہے گی، کوئی پریشانی ہو تو یہ پیسے رکھ لیجئے خالہ جان میری طرف سے۔" ثناء نے سو کا نوٹ نکال کر عارفہ خالہ کو دیا۔

"ارے نہیں بیٹی۔ تم لوگوں کے ہم پہ ویسے ہی کیا کم اِحسانات ہیں۔ تم سے لیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔"

"ارے چھوڑیئے عارفہ خالہ اپنوں میں کہیں تکلف ہوتا ہے۔

رکھ لیجیے" ثناء بولی اور عارفہ خالہ نے لاکھوں دُعائیں دیتے ہوئے سوا روپے کا یہ نوٹ قبول کر لیا۔ ثناء نے یہاں معاملہ پکا کر لیا تھا اب تعویذ وہ خود مہیا کرے گی۔ اور عارفہ بیگم انھیں طفیلی بیگم کے گھر پہنچائیں گی۔ دُوسری طرف ثناء ندرت کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ ندرت یقیناً ایسا چکر چلائے گی کہ طفیلی بیگم چاروں شانے چت ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکیں گی۔ واہ مزا آئے گا۔ اب یہ نیا گیم۔ ثناء دلچسپی سے مسکراتی ہوئی عارفہ بیگم کے کمرے سے باہر نکل آئی کام مکمل ہو گیا تھا۔ اور اب ایک نئی تفریح تیار تھی۔ بس ذرا تعویذوں کا مسئلہ حل کرنا تھا۔ جو کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کسی بھی کاغذ پر اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر ہندسے وغیرہ لکھ تعویذ بنائے جا سکتے تھے، اور ثناء تو ایسے کاموں میں ماہر تھی۔ وہ اندرونی حصّے میں پہنچ گئی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اُس نے آخری سرے کے کمروں کے سامنے کچھ گہما گہمی دیکھی اور رُک کر اِدھر دیکھنے لگی۔ ملازم اندر باہر دوڑ رہے تھے۔ خود ذکیہ بیگم نگرانی کر رہی تھیں نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ آؤ یار تیمور ذرا چل کر دیکھیں" ثناء نے گود میں لئے ہوئے تیمور سے کہا۔ اور تیمور نے بے نیازی سے گردن ہلا دی۔ ثناء تھوڑی دیر بعد ذکیہ بیگم کے سامنے پہنچ گئی تھی۔

"کیا بات ہے امّی جان کیا کسی نجومی نے قیامت کی پیشنگوئی کی ہے؟" اُس نے سنجیدگی سے سوال کیا اور ذکیہ بیگم مسکرا دیں۔

"نہیں بھئی فضول باتیں منہ سے مت نکالا کرو کچھ مہمان آ رہے ہیں۔"

"ارے اور ہمیں علم تک نہیں ہے۔ یعنی ہمارے گھر میں مہمان آئیں اور ہمیں ہی پتہ نہ ہو، کیا یہ زیادتی نہیں ہے امّی جان۔"

"نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہیں اطلاع دے دی جاتی عادل چچا یاد ہیں؟"

"وہ نوشیرواں عادل جو داستانِ امیر حمزہ میں تھے۔"

"بک بک کئے بغیر تو تیرا گزر ہی نہیں ہوتا۔ ارے کینیڈا والے عادل چچا۔"

"ہاں... ہاں... کچھ یاد تو ہے۔ اکثر اُن کا تذکرہ گھر میں رہتا ہے۔"

"صرف اِتنا ہی یاد ہے تجھے۔ وہ خالد اور اختر یاد نہیں ہیں۔"

"امّی میری یادداشت ہمیشہ سے خراب رہی ہے۔ خالد اور اختر یہ غالباً عادل چچا کے کچھ رشتہ دار وغیرہ ہوں گے۔"

"ابھی سات سال پہلے ہی کی بات تو ہے، دونوں آئے تھے ثناء، خاصے دِن تک رہے تھے یہاں، اُس وقت جب عادل صاحب کی بیگم کا انتقال ہوا تھا۔"

"ارے ہاں۔ وہ [illegible] نوں غمزدہ مُرغے۔ بیشک بیشک مجھے یاد ہے" ثناء نے کہا۔

"ثناء... ثناء زبان کے آگے کچھ تو لگام ہونی چاہیئے تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے ڈیڈی کے عادل چچا سے کیسے تعلقات تھے۔ وہ تو یوں کہو کہ وہ کینیڈا چلے گئے اگر نہ گئے ہوتے تو میں دعوے سے کہتی ہوں کہ اِسی کوٹھی میں اُن کا قیام ہوتا۔"

"ارے کمال ہے اِس میں دعویٰ کرنے کی کیا بات ہے امّی ہمارے تمام ہی تو جان پہچان والے اِس کوٹھی میں موجود ہیں۔"

"عادل صاحب کی بات اور تھی بے وقوف، وہ اِن لوگوں کی طرح اِس کوٹھی میں تھوڑی ہوتے، خود اتنے دولت مند ہیں کہ ایسی ایسی دس کوٹھیاں خرید سکتے ہیں۔"

"اوہ۔ گڈ۔ ویری گڈ۔ گویا یہ پہلی پارٹی ہے جو خود بھی محفوظ ملکیت کی مالک ہے" ثناء نے کہا۔

"بالکل ہی بھول گئی اُن لوگوں کو تُو تو، میرا تو خیال تھا کہ خالد اور اختر تو تجھے ضرور ہی یاد ہوں گے۔"

"اگر یاد رکھنے کی چیز ہوتے امّی تو ضرور یاد رکھتی۔ میرے ذہن میں اُن کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ بس ایسے ہی ہلکے ہلکے خاکے سے محفوظ ہیں۔"

"بہرحال خالد اور اختر یہاں آ رہے ہیں اور یہاں کافی دِن قیام کریں گے۔ تم دُوسرے لوگوں کے ساتھ جس طرح بھی پیش آتی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن اِس بات کا خاص خیال رکھنا کہ عادل چچا تمھارے ڈیڈی کے بچپن کے دوست ہیں اور شاید تمھارے ڈیڈی زندگی میں اگر کسی سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ تو وہ عادل صاحب ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے دوستوں میں چنانچہ تمھیں بھی اختر اور خالد کا خیال رکھنا ہے۔ اُن کے ساتھ کوئی شرارت نہ ہو، عزت و احترام سے پیش آنا۔"

"ہُوں۔ کوشش کروں گی ویسے اُنھیں بھی ہدایت کر دی جائے کہ میرے ساتھ کوئی شرارت نہ کریں۔ میں تو صرف جواب دیتی ہُوں ممی ڈارلنگ" ثناء نے اٹھلاتے ہوئے کہا اور وہاں سے چل پڑی۔

اُسے کسی خالد یا اختر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اُن لوگوں کی رسیا تھی۔ جو اُس کے من کو بھا جائیں باقی تو خاندان کے بے شمار لوگ یہاں بسے تھے۔ سب سے ہی سلام دُعا تھی اُس کی اور کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی تھی لیکن تفریح کا مسئلہ دُوسرا تھا۔ لوگ خود ہی ذریعہ تفریح بن جائیں تو پھر وہ کیسے اُنھیں نظر انداز کر سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے اِس بات پر کوئی توجہ بھی نہیں دی جب کہ ذکیہ بیگم اور احسان صاحب کے دِل میں کچھ اور ہی منصوبے تھے۔

جمّن کی ماں نے صحن میں قدم رکھا اور اُچھل پڑی۔ پُورے صحن میں پیاز کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

اور پھر وہ وہیں سے دہاڑی۔

"ارے تین نمبر والو! ارے خدا تمھیں غارت کرے۔ جینا حرام کر رکھا ہے۔ میں کہتی ہوں تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو۔ ہیں۔ ذرا دیکھو تو سہی۔ خدا کی مار لوگوں کو پڑوس میں رہنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اے میں ابھی جاتی ہوں بڑی بی کے پاس اور بتاتی ہُوں کہ کس طرح اِن تین نمبر والوں نے ہماری زندگی حرام کر رکھی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ دروازہ تو گندہ کرنا شروع کیا ہی تھا۔ اب یہ گھر میں بھی پیاز کے چھلکے آنے لگے۔ ارے سُنتی ہو کہاں مر گئے سب کے سب۔ کیا سانپ سونگھ گیا ہے حرکتیں کرتے ہو اور اُس کے بعد منہ چھپا کر بیٹھ جاتے ہو۔ خدا کی مار توبہ توبہ پورے صحن میں پیاز کے چھلکے بکھیر دیئے ہیں۔ یہ تو دیوار ہی سے پھینکے گئے ہوں گے۔ ارے تین نمبر والی پڑوسن ...." وہ دیوار کے کنارے بنی ہوئی گھڑونچی پر چڑھ گئیں اور تین نمبر میں جھانکنے لگیں۔ اماں بی بیٹھی ہوئی تھیں۔

"اے بُوا کچھ بگاڑا ہے ہم نے تمھارا، کون سا تیر مار دیا دُنیا جہان میں یہ سب کچھ ہوتا ہی ہے۔ رشتہ لے کر آئی تھی تمھارے گھر بھیک مانگنے تو نہیں آئی تھی۔ یا ہم پھینکنے تو نہیں آئی تھی۔ اُس دِن سے تم لوگوں نے ایسا بیر باندھ رکھا ہے کہ زندگی ہی عذاب کر دی ہے۔ یہ پیاز کے چھلکے میرے گھر میں کیوں پھینکے گئے ہیں؟"

"کیا کہہ رہی ہو جمّن کی ماں۔ کس نے پھینکے ہیں پیاز کے چھلکے؟"

"تمھارے علاوہ کوئی ہو سکتا ہے، اُس دِن گھر کے دروازے پر پھینک دیئے تھے، ہوا سے اُڑ کر سب اِدھر آ گئے۔ اور اب صحن میں پھینک دیئے۔ اب بھی کہہ دو کہ ہوا چلی ہوگی۔ یہ تنگ کرنے والی بات ہے۔ صرف تنگ کرنے والی۔"

"جمّن کی ماں تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے، ہمارے گھر میں تو صبح سے پیاز استعمال ہی نہیں ہوئی۔"

"تو پھر شام کو استعمال ہوئی ہوگی۔ اور صبح کو چھلکے پھینکے گئے ہوں گے، اچھا بیر باندھ رکھا ہے تم لوگوں نے ہم سے کوئی ایسی بات ہم نے تو نہیں کی آج تک یہ آخر تم لوگوں کا مقصد کیا ہے۔" بے چاری شوکت جہاں بھی باہر نکل آئیں۔ ندرت اندر موجود تھی اور پیٹ پکڑے ہنس رہی تھی۔ لیکن جمّن کی ماں کی بدتمیزی اُس سے برداشت نہیں ہو سکی۔ شوکت جہاں نرم لہجے میں جمّن کی ماں کو سمجھا رہی تھیں کہ پیاز کا ایک بھی چھلکا دیوار کی دُوسری طرف نہیں پھینکا گیا ہے لیکن جمّن کی ماں اِس بات پر اصرار کر رہی تھیں کہ پیاز کے چھلکے اِدھر ہی سے آئے ہیں۔ جمّن غالباً چلا گیا تھا۔ ورنہ اِس جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ چند لمحات تک تو ندرت انتظار کرتی رہی اور

اِس کے بعد وہ باہر نکل آئی۔ جمّن کی ماں اُسے دیکھ کر ہمیشہ کچی پڑ جاتی تھی۔ ندرت کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر صحن میں کھڑی ہو گئی۔

"امّی کیا ہو گیا ہے اِس عورت کو؟" اُس نے شوکت جہاں سے سوال کیا۔

"تو اندر جا ندرت، بڑوں سے ایسے بات نہیں کرتے۔"

"آئے ہائے ہائے بڑوں سے۔ ہم بڑے ہیں اِس کے، ارے یہ ہمیں بڑا سمجھتی تو اِس طرح ذلیل نہ کرتی ہمیں۔ اِس کے علاوہ اور کسی کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً اِسی نے پھینکے ہوں گے یہ پیاز کے چھلکے۔"

"پیاز کے چھلکے؟" ندرت نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں اور پھر آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھ گئی۔ دیوار کے سہارے جھاڑو رکھی ہوئی تھی۔ اُس نے جھاڑو اُٹھائی اور جمّن کی ماں دیوار سے پیچھے ہٹنے لگی۔ ندرت آنکھیں ٹیڑھی کئے اُن کی طرف آ رہی تھی۔ جمّن کی ماں بولی۔

"لو غضب خدا کا، یہ شریف لوگ ہیں۔ اپنے آپ کو شریف کہتے ہیں۔ ارے ذرا لچھن دیکھو، یہ لڑکی ہے کہ آفت کی پرکالا۔ جھاڑو سے مارے گی مجھے، آنے دے آج جمّن کو آج فیصلہ کر کے ہی رہوں گی، کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور دو نمبر اور تین نمبر میں۔"

"لو کمال ہے بھئی ہم لوگوں نے تو چھلکے پھینکے بھی نہیں۔ ندرت کیا بدتمیزی ہے جھاڑو کیوں اُٹھائی ہے تم نے؟" شوکت جہاں ندرت کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"نہیں امّی میں بھلا کوئی بدتمیزی کر سکتی ہوں۔ بلاوجہ یہ خاتون ہم لوگوں سے بگڑی ہوئی رہتی ہیں۔ بزرگ ہیں اِس لئے میں احترام کرتی ہُوں۔ کیا جواب دُوں۔ ذرا صحن میں جھاڑو لگا آتی ہوں اُن کے تاکہ اُن کی پریشانی دُور ہو جائے، پتہ نہیں پیاز کے چھلکوں سے کیوں چڑتی ہیں" ندرت نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ شوکت جہاں کو حیرت ہوئی تھی۔ ندرت اِتنی نرم مزاج تو نہیں تھی۔ بہرطور اگر اُس کے دِل میں کوئی نیکی آئی تھی تو ایسی کوئی بُری بات بھی نہیں تھی۔ ندرت دو نمبر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اُس نے جھاڑو اِس طرح ہاتھ میں سنبھالی کہ اُس کا سامنے کا سرا اُس کی مُٹھی میں دبا ہوا تھا اور پچھلا حصّہ آگے تھا۔ پھر وہ ٹیڑھی شکل بنائے ہوئے آہستہ آہستہ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں آ گئی۔ جمّن کی ماں ابھی گھڑونچی سے نیچے ہی اُتری تھی کہ ندرت کو دیکھ کر اُس کے حلق سے دہشت بھری آواز نکلی۔

"ہائے میرے مولا یہ کیا... کیا۔ تو میرے گھر میں کیوں گھس آئی۔

کیوں... کیوں گھس آئی؟" ندرت کی آنکھیں بالکل بھینگی ہو رہی تھیں دانت باہر نکلے ہوئے تھے، اور وہ اِنتہائی خوفناک شکل بنائے ہوئے اُلٹی جھاڑو پکڑے جمّن کی ماں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ارے بچاؤ۔ ارے بچاؤ مجھے مار ڈالا۔ بچاؤ" جمّن کی ماں بھاگ

کر کمرے میں گھس گئی اور اُنھوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چیخ پکار کی آواز سن کر شوکت جہاں بیگم بیچاری ہانپتی کانپتی کسی طرح دیوار پر چڑھیں لیکن ندرت کو اندازہ تھا کہ اس کے بعد یہی ہوگا۔ چنانچہ جلدی سے جھاڑو سیدھی کر کے صحن میں جھاڑو لگانے لگی۔ شوکت جہاں نے یہ منظر دیکھا تو اُن کی آنکھیں عجیب سے انداز میں پھیل گئیں۔

"ندرت، جمن کی ماں چیخ کیوں رہی ہیں؟"

"ان کچھ کھسکی ہوئی معلوم ہوتی ہے ظاہر ہے ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتی ہیں۔ بس ابھی آئی صحن میں جھاڑو لگا کر۔" ندرت نے جواب دیا۔ اور پھر بیچ صحن میں پڑے ہوئے پیاز کے چھلکے سمیٹ کر ایک کونے میں لگائے اور وہاں سے نکل آئی۔ جانتی تھی کہ جمن کی اماں اُس وقت تک دروازہ نہیں کھولیں گی۔ جب تک اُنھیں یقین نہ ہو جائے کہ ندرت چلی گئی ہے۔ وہ اِس پاگل لڑکی سے بے حد خوفزدہ رہتی تھیں۔ اور شاید اِس خوف ہی کی وجہ سے آج تک کھل کر کبھی مقابلے پر نہیں آئی تھیں۔ ورنہ وہ مرنے مارنے والوں میں شمار ہوتی تھی۔ جمن کی ماں بڑی دیر تک کمرے میں بند رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ندرت واپس جا چکی تھی وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں اور بھاگ کر سب سے پہلے بیرونی دروازہ بند کیا لیکن صحن سے پیاز کے چھلکے صاف دیکھ کر انھیں بھی ذرا سی حیرت ہوئی تھی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور اب اس بات کا خطرہ نہیں تھا کہ ندرت دوبارہ گھس آئے گی۔ چنانچہ پھر وہ بک بک۔ جھک جھک کرنے لگیں۔

"اِس سے کیا ہوتا ہے بی بی۔ پہلے تو پورے صحن میں پیاز کے چھلکے پھینک دیئے اور اس کے بعد صفائی کر گئیں۔ گھروں میں رہنے کا طریقہ ہوتا ہے سلیقہ ہوتا ہے اور یہ لڑکی مجھے تو یہ پاگل نظر نہیں آتی۔ چالاک بے کمبخت کہیں کی۔ خُدا غارت کرے جس دِن سے اِس گھر میں آئی ہیں سکون غارت کر کے رکھ دیا۔" وہ چیختی چلاتی برآمدے کی جانب بڑھ گئیں۔ برآمدے میں بیٹھ کر پاندان کھولا پان کھانے کی حد سے زیادہ شوقین تھیں اور کسی بھی مسئلے کا حل اُن کے نزدیک صرف یہی ہوتا تھا کہ پان کھا لیں۔ لیکن پاندان کا ڈھکنا اُٹھایا ہی تھا کہ بیشمار پیاز کے چھلکے باہر بکھر گئے۔ پیاز کے چھلکے پاندان میں اُوپر تک بھر دیئے گئے تھے۔ ایک بار پھر اُن کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکل گئی اور انھوں نے خوفزدہ ہو کر پاندان پیچھے کھسکا دیا۔ یہ کیا قصہ ہے تین نمبر کی عورتوں میں سے کوئی دو نمبر میں نہیں آتا تھا اگر پیاز کے چھلکے صحن میں ڈالے گئے تھے تو پھر یہ پاندان میں کہاں سے آ گھسے چند لمحات وہ خوفزدہ انداز میں پاندان کو گھورتی رہیں۔ اب اُنھیں احساس ہو رہا تھا کہ مسئلہ کچھ اور ہی ہے پاندان کو تو کوئی غیر آدمی ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُن کے دِل میں شرمندگی کا احساس اُبھرا۔ بلا وجہ پیاز کے چھلکوں کی الزام تراشی تین نمبر والوں پر کر دی تھی۔ تین نمبر والوں میں سے کوئی کم ازکم اُن کے پاندان میں تو پیاز کے چھلکے نہیں گھسا سکتا تھا لیکن بہرطور پاندان میں پیاز کے چھلکے موجود تھے، بے حد پریشان ہو گئیں۔ دِل میں سوچنے لگیں کہ یہ سب کیا قصہ ہے کوئی آسیبی چکر معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ پیاز کے چھلکے پاندان میں اِس گھر میں تو کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن پاندان کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی دیر تک اپنے آپ کو سمجھاتی اور بہلاتی رہیں۔ تین نمبر میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ بہرطور جب ذرا حواس بحال ہوئے تو انھوں نے پاندان میں سے پیاز کے چھلکے سمیٹے اور اُنھیں لے کر وہیں گھورے پر ڈال آئیں دِل ہی دِل میں کانپ رہی تھیں۔ خوفزدہ تھیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ کوئی چور اگر گھر میں گھسا تو بھلا اُسے پیاز کے چھلکے پاندان میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا طلب بہت بڑھی تو بالآخر خوف کو دِل سے نکال کر پان کا ایک ٹکڑا لگایا اور مُنہ میں دبا لیا۔ دن میں گھر کے بہت سے کام ہوتے تھے کھانے پینے کا مسئلہ تو تھا نہیں۔ جمن خود ہی کھانے پینے کی چیزیں کافی مقدار میں لے آتا تھا۔ لیکن صفائی ستھرائی بھی تھی چنانچہ اُنھوں نے اندر کے کمروں وغیرہ کی جھاڑو لگائی اور پھر چھلکے اُٹھا کر باہر ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔ کافی دیر تک وہ اِس سلسلے میں غور کرتی رہی تھیں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر کسی کام سے وہ صندوق کے قریب پہنچی، اِزار بند میں چابی بندھی ہوئی تھی۔ تالا کھولا، صندوق کا ڈھکنا ابھی اُٹھایا ہی تھا کہ چیخ مار کر پیچھے لڑھک گئیں۔ صندوق میں پیاز کے چھلکے بھرے ہُوئے تھے یہ سب کچھ کسی انسان کا کارنامہ نہیں لگ رہا تھا۔ یقیناً دو نمبر پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا تھا اُنھوں نے صندوق کو کُھلا چھوڑ دیا، اور چیختی ہوئی صحن میں نکل آئیں تین نمبر والوں سے ابھی ابھی کھٹ پٹ ہو چکی تھی اور وہ بھی پیاز کے چھلکوں ہی کی وجہ سے چنانچہ اُنھیں بھی اپنا احوال نہیں سُنا سکتی تھیں۔ دروازے سے باہر نکلیں اور دروازہ بھیڑ کر چار نمبر کی طرف چلی گئیں۔ جہاں ایک خاندان اور رہتا تھا۔ اُن لوگوں کو حال سُنایا لیکن جس نے سُنا اُس نے مذاق ہی اُڑایا دو نمبر میں اِس سے پہلے تو کبھی آسیب کا سایہ نہیں تھا گھر میں گھستے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ جمن کی ماں کو۔۔۔ ہانپتی کانپتی کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف چل پڑیں جہاں پر وہ شاذونادر ہی جاتی تھیں۔ اور پھر جمن کے پاس پہنچ گئیں۔ بیٹے کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ جمن بدستور اپنے کام میں مصروف تھا ماں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"ارے اماں! تو یہاں کیوں چلی آئی؟"

"اے جمن بیٹا بڑے صاحب سے بات کرو، دو نمبر میں آسیب گھس آئے ہیں میں اب وہاں نہیں جانے کی۔"

"کیا ہُوا اماں۔ کیا ہو گیا تجھے، دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تیرا؟"

"بیٹا چل کر تو دیکھ ذرا پُورے صحن میں پیاز کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے پاندان میں پیاز کے چھلکے بکسے میں پیاز کے چھلکے کسی اِنسان کا کام نہیں ہے بیٹا یہ، آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔"

"اماں! بالکل ہی سٹھیا گئی ہے کیا۔ پیاز کے چھلکے میں نے رکھے تھے تو مجھ سے خواہ مخواہ کی باتیں مت کیا کر۔"

"ایں ... تو نے ..."

"ہاں میں نے ..."

"تو کیا بیٹا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا تیرا۔ بھلا میرے پاندان میں پیاز کے چھلکے کیوں بھرے تھے تُو نے؟"

"بس مَیں تجھے اِس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"نہیں بیٹا نہیں۔ میں تیری بات نہیں مان سکتی۔ مجھے سمجھانے کے لئے کہہ رہا ہے۔"

"ہاں، جیسے تیری سمجھ میں آ ہی جائے گا سب کچھ، جا آرام کر۔ میں تجھ سے کہہ چکا ہُوں کہ پیاز کے چھلکے میں نے صحن میں پھیلائے تھے۔ میں نے تیرے پاندان میں رکھے تھے، اور میں نے ہی تیرے ٹرنک میں بھی رکھے، بلا وجہ ڈر رہی ہے، ایک وجہ تھی اِس کی ..."

"بیٹا کیا وجہ تھی، بتا تو دے کم ازکم ..."

"وہ اماں رات کو دراصل مچھر کاٹتے ہیں۔ کسی نے بتایا تھا کہ پیاز کے چھلکے گھر پڑے ہوں تو مچھر نہیں آتے بس اب تو جا مجھے کام کرنے دے، خواہ مخواہ، یُوں نہیں تو ..." جمن کی ماں، جمن کے پاس سے واپس آ گئی، لیکن دِل میں خدشہ تھا یقیناً جمن اُسے سمجھانے کے لئے یا تسلی دینے کے لئے یہ الفاظ کہہ رہا تھا ورنہ مچھروں کو کبھی پیاز کے چھلکوں کی بُو سے بھاگتے ہوئے دیکھا ہے، اِس سے پہلے تو کبھی سُنا بھی نہیں تھا یقیناً کوئی اور ہی گڑبڑ ہے، شام کو جب جمن واپس پہنچا تو بھی جمن کی ماں اُسے قسمیں دیتی رہی اور پُوچھتی رہی کیا واقعی پیاز کے چھلکے اُس نے رکھے تھے۔

"میں نے نہیں رکھے تو پھر کسی آسیب ہی نے رکھے ہوں گے، اور کون آتا ہے تیرے اِس کوارٹر میں۔"

"بیٹا دیکھ صاحب سے بات کر لے آج تو یہ چھوٹی سی بات ہے کل کو بڑی بات بھی ہو سکتی ہے۔"

"جب بڑی بات ہو گی تو دیکھ لیں گے۔ تو میرا دماغ نہ خراب کر۔" جمن نے اُسے ٹال دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی ماں پیاز کے چھلکوں پر ہنگامہ ضرور کرے گی۔ لیکن اُس کے لئے تو یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا اللہ رکھی کو چھوڑنا جمن کے بس کی بات نہیں تھی، رات کو اُس نے بڑی مُشکل سے اپنی ماں کو سُلایا اور پھر خود وظیفہ پڑھنے بیٹھ گیا۔ وظیفہ پڑھنے کے بعد اُسے ماں کے چہرے پر پھُونکیں بھی مارنی تھیں۔ احتیاط سے اُس کی چارپائی کے سرہانے پہنچا۔ پھُونکیں ذرا زوردار طریقے سے مارنی تھیں ندرت نے یہی ہدایت کی تھی۔ لیکن جُوں ہی اُس نے پہلی پھُونک ماری جمن کی ماں کے حلق سے ایک دِلخراش چیخ نکلی اور جمن خود بھی دہشت سے اُچھل پڑا۔ دُوسری پھُونک مارنا بھُول گیا۔ کیونکہ جمن کی ماں بُری طرح کانپ رہی تھی اور آنکھیں بند کئے چیخیں مار رہی تھی۔ برابر کے کوارٹروں میں بھی جگار ہو گئی، اور تھوڑی ہی دیر کے بعد دو نمبر کے کوارٹر کے دروازے پر زور زور سے دستک دی جانے لگی جمن پریشان ہو گیا تھا اُس کی ماں مُسلسل چیخے جا رہی تھی۔

"بھ... بھو... بھُوت ... بچاؤ... بچاؤ۔" جمن پہلے تو اُسے جھنجھوڑتا رہا اور جب وہ مُسلسل چیختی رہی تو پھر وہ خود ہی باہر نکل آیا۔ ایک نمبر اور تین نمبر کے لوگ دروازے پر موجود تھے اور اِس چیخ پکار کی وجہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔

"کچھ نہیں ہُوا۔ اماں سوتے میں ڈر گئی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"اوہو، بہت زور زور سے چیخ رہی ہیں پانی وغیرہ پلایا اُنھیں" غلام احمد صاحب نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ ابھی پلاتا ہوں۔ آپ لوگ آرام کریں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔" جمن نے بمشکل تمام اُن لوگوں کو ٹالا۔ لیکن وہ خود بھی جھنجھلایا ہُوا تھا۔ یہ اماں تو بس پاگل ہے میری۔ ذرا سا وظیفہ بھی نہیں پڑھنے دیتی۔ کیا مُصیبت پھیلا دی اُس نے۔ وہ اندر آیا۔ اور ماں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا بمشکل تمام جمن کی ماں اعتدال پر اُتر آئی تھیں۔ بہرطور احسان صاحب کی اِس خوبصورت کوٹھی میں بھانت بھانت کے جانور پل رہے تھے اور اُن جانوروں میں اِضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ڈھائی بجے دو کینیڈین یہاں آنے والے تھے اُن کے ساتھ نجانے کیا کیا دلچسپیاں آ رہی تھیں۔

ثناء عارفہ بیگم کے پاس سے ہٹی تو اُس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ عارفہ بیگم نے پھر ایک چنگاری لگا دی تھی۔ ثناء نے اپنا کام تو کر دیا تھا، یعنی عارفہ بیگم کو اِس بات پر آمادہ کر دیا تھا۔ کہ وہ طفیلی بیگم کے دروازے پر تعویذ گاڑ دیں۔ لیکن عارفہ بیگم نے جو نیا شوشہ چھوڑا تھا۔ اُس نے ثناء کو چونکا دیا تھا۔ اگر طفیلی بیگم کے ذہن

میں یہ خناس پروان چڑھ رہا ہے. تو بلاشبہ وہ پھانسی پر لٹکائے جانے کے قابل ہیں. ثناء اچھی طرح جانتی تھی. کہ وہ اپنے گھر میں محفوظ ہے. اور اُس کے والدین کبھی اُس کے لئے کوئی ایسا غلط فیصلہ نہیں کریں گے. جو بعد میں المیہ بن جائے. ذکیہ بیگم بھی جہاندیدہ خاتون تھیں. اور احسان صاحب ثناء سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے، چنانچہ کوئی خاندانی مسئلہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا. جو ثناء کی زندگی پر اثر انداز ہو. اور پھر رشید تو اوقات ہی کیا رکھتا تھا. شکل و صورت ہی سے لفنگا نظر آنے والا یہ شخص کوٹھی میں کسی کی نگاہوں میں کوئی مقبولیت نہیں حاصل کر سکا تھا. اُس کی شخصیت ہی اتنی کرخت اور بے اثر تھی کہ اُس کی جانب ذہن راغب ہی نہ ہو سکا تھا. اپنے طور پر وہ بہت کچھ کر رہا تھا. اور اپنا مقام بنانے میں کوشاں تھا. لیکن آج تک کسی نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی تھی. ایسے شخص کا نام ثناء کے ساتھ ملوث کرنا بھی جُرم کی حیثیت رکھتا تھا. طفیلی بیگم نے یہ بات سوچی تو اُنھوں نے ثناء کی بدترین توہین کی تھی. اور ثناء اپنی توہین کرنے والوں کو معاف کرنا نہیں جانتی تھی. لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ سمجھدار بھی تھی. اور یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ عارفہ بیگم اپنا ذہنی بخار نکالنے کے لئے کوئی بھی تدبیر کر سکتی ہیں. چنانچہ جب تک اِس بات کی تصدیق نہ ہو جائے کہ طفیلی بیگم کے ذہن نے ایسا ناپاک منصوبہ سوچا. ثناء فوری طور پر طفیلی بیگم کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتی تھی. اور اس سلسلے میں اُستاد سے زیادہ مددگار اور کون ہو سکتا تھا. چنانچہ وہ وہاں سے سیدھی اُستاد کے پاس پہنچ گئی. بار بار غلام احمد صاحب کے کوارٹر میں جانا مناسب نہیں تھا. کوٹھی کے ماحول کو اچھی طرح جانتی تھی. طرح طرح کی باتیں ہونے لگتیں. اُسے اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی. کہ لوگ اُس کے بارے میں کیا کہتے ہیں. لیکن ندرت کی پوزیشن خراب ہو جاتی، دشمن ندرت کو نقصان پہنچا سکتے تھے. اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ ندرت جیسی دوست کو کوئی ذہنی صدمہ پہنچے، چنانچہ اُس نے ایک ملازم کے ذریعے ندرت کو طلب کر لیا. اور پھر باغ کے ایک گوشے میں جا بیٹھی. ندرت غالباً فارغ ہی تھی اُس کے پاس پہنچ گئی. اُس نے غور سے تیمور کو دیکھا اور پھر ثناء کو دیکھنے لگی پھر وہ تیمور سے بولی.

"تیمور، مالک کی بیٹی کچھ پریشان نظر آتی ہے. ویسے یار تم نے بڑی اچھی جگہ ہاتھ مارا ہے. اتنی کم سنی میں تمھارے شکار کرنے کا یہ عالم ہے تو جوان ہو کر کیا کرو گے"

"ندرت سنجیدگی" ثناء نے کہا.

"اوہو. مالک کی بیٹی خیریت؟"

"نہیں خیریت نہیں ہے"

"ارے تو یہ الفاظ کہہ رہی ہے تو. . .؟"

"ہاں، بیٹھ. فضول باتوں سے گریز کیا کر. کبھی کبھی سنجیدگی بھی طاری ہونی چاہیئے انسان پر"

"اچھا اچھا، اِس کا جواب بعد میں دے دُوں گی. پہلے یہ بتا. کس مُصیبت کا شکار ہو گئی ہے؟"

"مُصیبت نہیں ندرت، بلکہ میرا خیال ہے، ایک نیا مشغلہ ہمارے ہاتھ آنے والا ہے"

"خُوب خُوب، یقیناً دلچسپ مشغلہ ہو گا؟"

"ہاں. ہے تو دلچسپ. ایک اور مُجرم سزا پانے کے لئے ہماری عدالت میں آ رہا ہے"

"آنے دو، آنے دو" ندرت نے آنکھیں بند کر کے گردن ٹیڑھی کی.

"اچھا پہلی بات یہ کہ میں عارفہ خالہ کو بانس پر چڑھا آئی ہوں"

"خُوب. مطلب؟" ندرت نے سوال کیا.

"وہ طفیلی بیگم کے دروازے پر تعویذ گاڑیں گی. وقت اور موقعہ کا تعین بعد میں کیا جائے گا. اور تجھے اِس کی اطلاع دے دی جائے گی. یعنی میں نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے. اور اب تیرا کام شروع ہوتا ہے"

"ٹھیک ہے. میں اپنی طفیلی خالہ کو بھلا تنہا چھوڑ سکتی ہوں . ." ندرت نے پیار بھرے انداز میں کہا.

"بالکل نہیں، بالکل نہیں. لیکن کام شروع ہو جانا چاہیئے"

"ہو جائے گا جیف، ہو جائے گا. آگے بولو وہ نیا مُجرم کون سا ہے؟ بھئی اِس کوٹھی میں ہمارے شکاروں کی تعداد اب بہت کم رہ گئی ہے. بار بار ایک ہی شکار کو گھسیٹے رہنا ذرا عجیب سا لگتا ہے، کتنے تیر لگائیں اُس پر یا اُس پر کتنی گولیاں چلائیں، چھلنی ہو کر رہ جاتے ہیں بے چارے اب دیکھو نا جمن کی ماں کو. جمن بے چارہ آج کل تعویذ گنڈوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے. وظیفے پڑھ رہا ہے رات ہی کو ہنگامہ ہو گیا تھا"

"کیسا ہنگامہ؟"

"بس، جمن نے وظیفہ پڑھ کر اپنی ماں کے چہرے پر پھونکا اور اُس کی ماں بھوت بھوت چلا کر شور مچانے لگی. نتیجے میں بہت لوگ جمع ہو گئے تھے"

"ارے کیسا وظیفہ. ذرا تفصیل تو بتا" ثناء نے ہنس کر کہا اور ندرت ثناء کو تفصیل بتانے لگی. ثناء ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی تھی پھر اُس نے کہا

"لیکن ندرت تجھ سے اتنا فاصلہ ہے کہ ایسے دلچسپ مناظر کو میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی. کاش میں بھی تیرے ساتھ کوارٹر میں رہ سکتی"

"ظاہر ہے یہ ممکن نہیں ہے چنانچہ ایسی فضول باتوں کا تذکرہ بھی بے مقصد ہے"

"پھر بھی دل تو چاہتا ہی ہے. تو اکیلی اکیلی ایسے مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہتی ہے. بڑی حسرت ہوتی ہے بعض اوقات مجھے"

"تو کیا فرق پڑتا ہے. ایک کوارٹر اپنے لئے بھی متعین کر لے خالی پڑا ہوا ہے"

"غور کریں گے اِس مسئلے پر، سنجیدگی سے غور کریں گے. ارے واہ کیا بات کی ہے ندرت. واقعی ایک کوارٹر خالی تو پڑا ہوا ہے. اور وہ دو نمبر سے قریب بھی ہے. میرا مطلب پانچ نمبر سے ہے دو نمبر کے سامنے پڑتا ہے نا"

"پانچ نمبر ہاں شاید"

"واہ ندرت کیا آئیڈیا دیا ہے تو نے، اگر یہ پانچ نمبر آسیب زدہ ہو جائے تو"

"کیا مطلب؟" ندرت نے آنکھیں پھاڑ دیں.

"مطلب یہ کہ پانچ نمبر میں آسیب کا بسیرا ہو جائے راتوں کو وہاں سے قہقہے اُبھریں. موم بتیاں اِدھر سے اُدھر رقص کرتی نظر آئیں. اور . . . ایک حُسن مجسم دوشیزہ چراغ ہاتھ میں لئے کسی کا اِنتظار کرتی ہوئی پائی جائے. تو کیا دو نمبر والوں کے عیش نہیں ہو جائیں گے." ندرت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ثناء کو دیکھنے لگی. اور پھر بے اختیار ہنس پڑی"

"دو نمبر کے علاوہ اور بھی ملازم متاثر ہو سکتے ہیں"

"ہو سکتے ہیں تو ہوتے رہیں. یہ بھوت صرف دو نمبر والوں کو نقصان پہنچائے گا. باقی کا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا"

"دوسرے لوگ بھی متوجہ ہو جائیں گے، اِس بات کو سوچ لے"

"پلان بنائیں گے پورا پورا. ابھی تو کافی وقت ہے"

"اچھا چھوڑو اِن باتوں کو. اور یہ بتاؤ کہ نئے مُجرم کی کیا بات کر رہی تھیں تم"

"ہاں. عارفہ خالہ نے ایک اِنکشاف کیا ہے ندرت. لیکن قابلِ تحقیق ہے. عارفہ خالہ نے مجھے بتایا ہے کہ طفیلی بیگم اپنے طور پر بہت کچھ سوچ رہی ہیں"

"کیا سوچ رہی ہیں؟"

"اِس دولت، اِس جائیداد، اِس عمارت پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں"

"اچھا، کھانے میں ذرا پرہیز کریں ٹھیک ہو جائیں گی" ندرت نے کہا.

"نہیں ندرت سنجیدگی سے. طفیلی ظاہر ہے اِس سلسلے میں اگر کوئی کارروائی کرتی ہیں. تو ظاہر ہے اُنھیں مُنہ کی کھانی پڑے گی. ذلیل ہوں گی. بلکہ شاید یہاں سے نکال بھی دی جائیں. لیکن ایسا ہُوا تو یہ اُن کی سوچ کا صحیح جواب تو نہیں ہو گا. اُنھوں نے اگر یہ بات سوچی ہے تو اِس کے لئے اُنھیں بدترین سزا ملنی چاہیئے"

"مگر سوچا کیا ہے سرکار، یہ بات ابھی تک صیغۂ راز میں ہے"

"وہ رشید دیکھا ہے تم نے؟"

"طفیلی بیگم کے صاحبزادے؟" ندرت نے سوال کیا.

"جی ہاں. اُن ہی کے بارے میں عرض کر رہی ہوں جہاں پناہ"

"ہوں. آگے بڑھو، آگے بڑھو" ندرت نے حکیمانہ انداز میں کہا.

"طفیلی بیگم کا بقول عارفہ خالہ کے خیال ہے کہ رشید کو اِتو جان کی فرزندی میں دے دیں. اور میری شوہری میں. سمجھیں آپ"

"ارے" ندرت اُچھل پڑی.

"کیا واقعی؟"

"ہاں، ہاں. میں نے کہا ناں کہ یہ اِنکشاف عارفہ خالہ نے کیا ہے. اور ندرت بات ذرا دل کو لگتی بھی ہے، طفیلی بیگم جیسی عورتوں کی ذہنیت کے بارے میں شاید تمھیں کوئی اندازہ نہ ہو. لیکن میں عارفہ خالہ کے اِس انکشاف کے بعد اِس پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہوں. ممکن ہے اُن کے ذہن میں یہ منصوبہ ہو"

"اگر واقعی اُنھوں نے ایسی بات سوچی بھی ہے تو قابلِ گردن زدنی ہے، لیکن اِس بات کے امکانات بھی ہیں کہ یہ صرف عارفہ خالہ کی سازش ہو. اور اُنھوں نے اِس طرح طفیلی بیگم پر ایک وار کیا ہو"

"ہاں، ہاں. میں نے اِس بات کو نظر انداز نہیں کیا ہے، ہو سکتا ہے ایسا ہو. لیکن اِس کی تحقیق ظاہر ہے. میں نہیں کر سکتی طفیلی بیگم سے ذرا تمھارا قریبی رشتہ ہے. اُن کا دل بھی ٹٹول لینا. اور اگر یہ بات سچ نکل آئی تو" ثناء نے آنکھیں ٹیڑھی کر کے دانت پیسے"

"تو پھر طفیلی بیگم سے اور اُن حضرت رشید سے اچھی طرح نمٹ لیا جائے گا" ندرت نے کہا.

"جیتی رہ، جیتی رہ، یہ ہی میرا مقصد تھا. تو اب یہ دونوں کام تیری ذمہ داری ہے"

"فکر ہی نہیں کرو. یہ بھی کوئی بات ہوئی. کوئی بڑا کام بتاؤ تم اپنی اللہ رکھی کو"

"بس اللہ رکھی، فی الحال یہ کام کر لے اِس کے بعد تم . ."

ثناء نے ابھی اِتنا ہی کہا تھا. کہ بیرونی دروازے سے ایک کار اندر آتی نظر آئی. شہاب صاحب کی مرسڈیز کار تھی. لیکن اُس میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے. ثناء اور ندرت خاموشی سے کار کا جائزہ لیتی رہیں. کار پورچ میں رُکی. اور اُس سے دو نوجوان نیچے اُترآئے. خوبصورت سُوٹوں میں ملبوس ہنستے مسکراتے حسین نوجوان

تھے، نُدرت نے بھنوئیں اُٹھا کر ثناء کو دیکھا۔ اور گردن ہلانے لگی۔

• اوہو میں سمجھ گئی۔ تو کینیڈین پکڑ لائے ہیں ابو نے۔ ہمارے ایک بہت قریبی شناسا عادل صاحب کے بیٹے ہیں۔ غالباً اختر اور خالد کہا جاتا ہے کہ میں بچپن میں اُن کے ساتھ کافی رہی ہوں بزرگوں کی بات تو تم جانتی ہی ہو۔ اُن کی یادداشت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی اولادیں بھی اُن کی طرح جانتی ہیں۔ چنانچہ والدہ مجھ سے فرما رہی تھیں۔ کہ عادل چچا کے دونوں بیٹوں کو میں جانتی ہوں یا نہیں۔ کچھ عرصے پہلے یہ لوگ آئے تھے لیکن غالباً میں نے اُن کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

• تو اب یہ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں؟

• بس کچھ عرصہ قیام کریں گے۔ عادل چچا ابو کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بلکہ ہیں، بیچی جان کا انتقال ہو چکا ہے۔ کینیڈا میں رہتے ہیں۔ اور سُنا ہے کافی بڑے بزنس مین ہیں۔ یہ دونوں حضرات یہاں کچھ عرصہ قیام کے لئے تشریف لائے ہیں۔

• ہوں، اِس کا مقصد ہے کہ کوٹھی میں نئے مہمانوں کی آمد ہوئی ہے۔

• آتے جاتے رہتے ہیں۔ دیکھیں گے کس ٹائپ کے لوگ ہیں۔ اگر اپنے مطلب کے ہوئے تو ٹھیک ہے ورنہ لعنت بھیجی۔ ثناء نے کہا۔ شہاب صاحب اُن دونوں کو لے کر اندر داخل ہو چکے تھے۔

• تم طفیلی بیگم کا جائزہ لے لو۔ اب میں چلتی ہوں۔ ثناء نے کہا اور تیمور کو گود میں اُٹھا کر وہاں سے چل پڑی۔

نُدرت اپنی جگہ کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ اور پھر اُس کا رُخ طفیلی بیگم کی جانب ہو گیا۔ طفیلی بیگم اپنے کمرے میں تنہا تھیں نُدرت نے دستک دی۔ تو اُنھوں نے روا روی میں کہا۔

• آجاؤ بُوا۔ نُدرت اندر داخل ہوئی تو طفیلی بیگم کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

• آؤ، میری بچی آؤ۔ خیریت ہے؟

• ہاں۔ آپ کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔

• لو، میں خود ہی آجاتی۔ چلو تم آ گئیں اچھا کیا آؤ بیٹھو۔ اُن کے لہجے میں رس گھل گیا۔ وہ محبت بھری نگاہوں سے نُدرت کو دیکھ رہی تھیں۔ نُدرت نے بہرطور اُن کے لئے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اِس لئے طفیلی بیگم کے دل میں اُس کا پیار پیدا ہو گیا تھا۔

• سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟

• بس خالہ، ہم لوگوں کی جیسی گزر سکتی ہے۔ گزر رہی ہے۔

• خدا تمھاری تقدیریں کھولے تمھیں زندگی کا ہر سُکھ نصیب کرے۔

• شکریہ خالہ! آپ جیسی مہربان بزرگ ہی دُعائیں دے سکتی ہیں۔ اور آپ کی دُعاؤں سے ہی سب کچھ ہو گا۔

• خدا نے چاہا تو بیٹی راج کرو گی اپنے گھر میں۔

• آپ کیا کر رہی ہیں یہاں کمرے میں؟ سُنا ہے کچھ مہمان آئے ہیں۔

• ہاں۔ سُنا تو میں نے بھی ہے۔ اُوپر کے کمروں کی صفائی ہو رہی ہے۔

• کون لوگ ہیں؟

• میں نہیں جانتی بیٹا۔ دراصل میں بہت محتاط ہوں بیٹا۔ ذکیہ بیگم سے میرا بہناپا ہے۔ بڑا پیار کرتی ہیں بے چاری مجھ سے۔ سب ہی محبت کرتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود میں ہمیشہ یہ خیال رکھتی ہوں۔ کہ بڑے لوگوں کے بہت زیادہ سامنے نہ جاؤں۔ ارے یہ کیا کم احسان ہے اُن کا کہ اُنھوں نے ہمیں اپنا سمجھ کر اپنے گھر میں جگہ دی ہے۔ دُشمنوں کو تو ہمارا ایک گوشے میں پڑا رہنا بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

• تو دُشمن آپ کا بگاڑ کیا سکتے ہیں خالہ جان؟

• ہاں بی بی۔ بس اللہ کی نگاہ سیدھی چاہیئے۔ اب تک تو دُشمنوں کو مُنہ کی ہی کھانی پڑی ہے۔

• اور کھاتے رہیں گے خالہ جان۔ کھاتے رہیں گے۔ آپ کی یہ بھانجی جب تک زندہ ہے۔ آپ کے دُشمنوں کو آپ کے خلاف کامیاب نہیں ہونے دے گی۔

• بس بیٹی دُعائیں دیتے دیتے مُنہ تھکتا ہے تمھیں تو۔ سچ تو یہ ہے تم نے مجھے ایک ایسے خطرے سے بچا لیا، جو اگر نہ بی بی نہ اللہ بچائے اگر عارفہ بیگم اپنی کرنی میں کامیاب ہو جاتیں تو تم خود سوچو کیا رہتی میری۔ ارے دُنیا یہ ہی کہتی کہ بیوہ ہے، نکھٹو بیٹے کی ماں ہے۔ سوچا ہو گا کہ چلو اِسی طرح کچھ دولت اکٹھی کی جائے۔ دُنیا کی زبان کوئی نہیں روک سکتا بی بی۔ دُنیا بڑی ظالم ہے۔ اب تم دیکھو نا اِن عارفہ بیگم کو۔ میں کہتی ہوں کوٹھی میں اِتنے بہت سارے لوگ ہیں۔ سب اللہ کا دیا کھاتے ہیں۔ احسان میاں بذاتِ خود اتنے اچھے انسان ہیں کبھی یہ بھی نہیں پوچھتے کہ وہ کس طرح زندگی گزار رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنا دل کُشادہ کر دیا ہے۔ ذکیہ بیگم، اماں بی۔ سب کے سب ہی اللہ کے نیک بندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ہی بات بی بی کہ تیلی کا تیل جلے اور... اور بس کیا کہوں۔ طفیلی بیگم خاموش ہو گئیں۔

• خالہ! دُشمن کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیئے وہ کام جو آپ کو کرنا چاہیئے میں انجام دے رہی ہوں۔

• ہاں بی بی۔ سچ کہتی ہو۔ مگر تم بھی تو میری اپنی ہی ہو۔ جو میں نہیں کر پا رہی وہ تم کر رہی ہو۔

• خالہ! اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو آج یہ خبر لے کر آپ کے پاس کیوں آتی۔

• کیسی خبر؟ طفیلی بیگم چونک کر بولیں۔

• خالہ دُشمنوں کو بدترین شکست ہوئی ہے۔ بُرا حال ہو گیا ہے اُن کا۔ جو حال وہ آپ کا بنانا چاہتی تھیں نا۔ وہ ہی اُن کا ہوا۔ وہ جو کہتے ہیں نا۔ کہ دوسروں کے لئے گڑھا کھودو اور خود اُس میں جا پڑو۔ تو عارفہ بیگم کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ لیکن خالہ جان چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں۔ عارفہ خالہ مسلسل لگی ہوئی ہیں آپ کے پیچھے۔

• بی بی! کوئی خاص بات ہوئی کیا؟

• ہاں، ورنہ میں اِس وقت یہاں آتی کیوں؟

• اے اللہ! تجھے بُری نظر سے بچائے۔ کیا ہوا، جلدی بتا۔ میرا تو کلیجہ ہول رہا ہے۔

• عارفہ خالہ کی کوششیں تو ناکام ہو گئیں۔ اب تعویذ گنڈوں پر اُتر آئی ہیں۔

• کس کے لئے تعویذ کرا رہی ہیں وہ؟

• آپ کے لئے اور کس کے لئے۔

• اُس پر خدا کی مار۔ اے اللہ نیکی دے اِس عارفہ بیگم کو۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں بگاڑا اُس کا۔ بی بی یہ ایسے تو نہیں ملنے کی۔ وہ ایسے تو نہیں ملنے کی۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا اُس کے لئے۔

• فی الحال تو آپ ایک کام کریں طفیلی خالہ۔ جو میں کہہ رہی ہوں۔

• کیا؟

• ہوشیار رہیں۔ آپ کو پتہ ہے۔ کہ عارفہ بیگم آپ کیلئے کیا کاروائی کر رہی ہیں؟

• بی بی مجھے نہیں معلوم۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔

• اُنھوں نے تعویذ کرائے ہیں۔ آپ کے لئے۔ اور اب کسی مناسب موقعہ پر یہ تعویذ آپ کی چوکھٹ پر گاڑے جائیں گے۔ خون تھوکیں گی آپ اور آپ کا بیٹا۔

• خدا میرے دُشمنوں کو خون تھوکائے۔ کیسے پتہ تجھے؟

• میں ہر وقت تاک میں لگی رہتی ہوں۔ بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک میلی کچیلی سی عورت سے، عارفہ خالہ نے عورت کو پچاس روپے دیئے اور عورت نے تعویذ عارفہ خالہ کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ کہیں سے تعویذ کرا کر لائی تھی۔ یقیناً سِفلی عمل ہو گا۔

• آئے ہائے اللہ۔ طفیلی خالہ کانپتی ہوئی بولیں۔

• اور اس کے بعد اُس عورت نے اُنھیں ترکیب استعمال بتائی۔ اُس نے کہا کہ وہ یہ تعویذ اپنے دُشمن کی چوکھٹ پر گاڑ دیں اور تماشہ دیکھیں۔ خون تھوک تھوک کر مرے گا اُن کا دُشمن۔

• اللہ میری اور میرے بچے کی حفاظت کرے۔ عارفہ بیگم اب اِس حد تک اُتر آئی ہیں۔ لیکن بیٹی یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ تعویذ میرے ہی لئے لئے گئے ہیں۔

• عارفہ خالہ نے اِسی انداز میں کہا تھا خالہ۔ اُنھوں نے کہا تھا۔ کہ اب دیکھتی ہوں طفیلی بیگم کو۔ اِس کے بعد بات صاف ہو گئی۔

• ہوں۔ ٹھیک ہے بی بی۔ اچھا کیا تم نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اِس کا صلہ تو تمھیں اللہ ہی دے گا۔ میں بے چاری کیا دے سکتی ہوں، لیکن عارفہ بیگم کو اِس بار بھی مُنہ کی کھانی پڑے گی۔ بس نظر رکھوں گی۔ دیکھوں گی کیا کرتی ہیں۔ میرا نام بھی طفیلی بیگم ہے۔ وہ تو میں رشید کو نہیں بھڑانا چاہتی اُن لوگوں سے۔ ورنہ دو منٹ میں تیا پانچا کر کے رکھ دے گا۔ بڑا غصہ ور ہے۔ کسی سے نہیں اُلجھتا بی بی۔ کسی کو بُرا نہیں کہتا۔ لیکن جب کوئی دُشمنی پر آمادہ ہو تو اپنے دُشمن کو چھوڑتا وہ بھی نہیں۔

• رشید تو بہت شریف اور سادہ دِل نوجوان ہے۔ طفیلی خالہ پتہ نہیں کیوں میرے دِل میں بار بار ایک خیال آتا ہے۔

• کیسا خیال؟

• ایسے ہی رشید کے بارے میں سوچتی ہوں۔ آپ لوگوں کا بڑی بیگم صاحبہ اور چھوٹی بیگم صاحبہ سے بڑا گہرا رشتہ ہے لیکن غربت بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ آپ فیصل آباد میں رہیں۔ اور یہاں دولت لوٹنے والے تاک لگا کر بیٹھ گئے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ بڑے صاحب کے بارے میں۔ بڑے صاحب بے چارے اِتنے سادہ دل ہیں کہ اپنے دوستوں اور دُشمنوں پر نگاہ ہی نہیں رکھتے۔ یہاں تو بس ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے اور جس کا دِل چاہتا ہے اُس میں سے پانی لے لیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو صاف ستھرا کر لیتا ہے۔ وہ کسی کی طرف نگاہ بھی نہیں کرتے۔ لیکن اُن کے دُشمن یقینی طور پر اُن کی تاک میں رہتے ہوں گے۔ آپ جانتی ہیں کھاتے پینے والوں کے نظریات کیا ہوتے ہیں۔ میں تو آپ کو ایک مشورہ دُوں گی خالہ۔

• کیا؟

• کیوں نہ رشید کو ثناء سے منسوب کر دیجئے۔ آپ دیکھئے نا ثناء احسان صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ قریب کے رشتہ داروں میں میرے خیال سے آپ سے زیادہ قریبی رشتہ دار اور کوئی نہیں ہے۔ تو رشید

ہر لحاظ سے اچھے نک سک سے درست ہاتھ پاؤں سے اچھے اگر کسی کام دھندے میں لگایا جائے گا تو آرام سے کریں گے۔ بھلا اتنی بڑی دولت کا سنبھالنے والا کوئی بھی تو نہیں ہے۔ بے شمار لوگ یہاں موجود ہیں۔ سب کے سب پتہ نہیں کیا کیا پیشکشیں کر رہے ہوں گے لیکن سچی بات یہ ہے کہ مخلص کوئی نہیں ہے۔ اب بھلا بتلائیے آپ سے زیادہ مخلص اور کوئی ہو سکتا ہے۔ اور پھر ثناء کے لئے ظاہر ہے، کہیں نہ کہیں رشتہ درکار ہوگا ہی۔ کیوں نہ یہ رشتہ اپنے ہی گھر میں ہو تو کیا بات بہتر نہیں رہے گی" طفیلی خالہ چونک کر ندرت کو دیکھنے لگی تھیں۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے، پھر وہ دروازے کے قریب پہنچیں۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھرتی سے دروازہ بند کر کے ندرت کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کے دُور اُفتادہ گوشے میں جا بیٹھیں۔

"بیٹی! آج تُو نے وہ بات کہی ہے جو میرے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھی۔ کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔ کیسا اچھا سوچتی ہے، تُو یقین کر خود میرے دل میں پہلے دن ہی سے یہ ہی خواہش ہے، اور ثناء کو دیکھ کر دل لوٹ لوٹ ہو گیا ہے۔ رشید بھی اُس پر جان چھڑکتا ہے، کہتا ہے کہ ماں ہم غریب ہیں۔ اور وہ امیر، ہم ذرّے ہیں اور وہ آسمان یہ ذرہ آسمان تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔"

"کمال کرتی ہیں آپ طفیلی خالہ۔ بھلا اپنے رشتے داروں میں بھی ذرّہ اور آسمان دیکھا جاتا ہے۔ آپ دونوں تو برابر کی حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ نے کبھی تذکرہ کیا ہے بیگم صاحبہ سے؟"

"نہیں بی بی، ابھی ہمیں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں۔ ذکیہ بیگم بھی کیا سوچیں گی کہ آتے ہی کیا چکر چلا دیا۔ ذرا حالات دیکھیں، ماحول دیکھیں اور اُس کے بعد اس بات کو زبان سے نکالیں۔ اب جب کہ تم نے ایک بات کہہ دی ہے۔ تو بیٹی ذرا میرا ایک کام کر دو۔"

"ایک نہیں خالہ جان، آپ مجھ سے ہزار کام کہیں۔ آپ کا کام کر کے مجھے جو دلی مسرت ہوگی آپ اُس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

"بیٹی! بس میں اِس منہ سے کیا کہوں۔ بس میرے دل کی خواہشات پُوری ہو جائیں۔ تجھے تو میں اپنی اولاد کی طرح رُخصت کروں گی یُوں سمجھ لے کہ تیری شادی اور تیرے گھر کا سارا خرچہ میرے ہی ذمہ ہوگا۔"

"ارے نہیں طفیلی خالہ، یہ کیسے کر سکتی ہیں آپ، اور پھر میں ایسی بات آپ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں لالچی انسان نہیں ہوں۔"

"لالچ کی بات نہیں ہے بیٹی۔ اپنا ہی اپنوں کے لئے کچھ کرتا ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اپنا ہی اپنوں کے لئے کچھ کرتا ہے۔ غلام احمد ڈرائیوری کرتے ہیں۔ دو بہنیں ہیں۔ دو ماں بیٹیاں ہیں وہ، غلام احمد ہیں۔

کہاں بچتے ہوں گے پیسے۔ دونوں بچیوں کے جہیز کے لئے۔ لیکن فکر مت کرو، میرا یہ کام ہو جائے تو سمجھ لینا کہ تمھارے بھی دلدّر دُور ہو گئے۔"

"وہ کیسے طفیلی خالہ" ندرت نے معصومیت سے پُوچھا۔

"بیٹی! ذرا سوچ تو سہی۔ اگر رشید کی شادی ثناء سے ہو جاتی ہے تو پھر اتنی بڑی جائیداد، اِتنے بڑے کاروبار کا مالک کون ہوگا، رشید۔ اور تُو رشید کی کون ہوئی؟"

"بہن" ندرت نے جلدی سے کہا۔

"بالکل، بالکل جب میری بھانجی ہے تو رشید کی بہن۔ چنانچہ بھائی اپنی بہن کے لئے کیا کچھ نہ کرے گا۔"

"ہاں خالہ، یہ بات تو آپ نے بالکل ٹھیک کہی۔ بہرحال یہ ساری باتیں بعد کی ہیں۔ میں لالچی نہیں ہُوں۔ آپ مجھ سے کسی کام کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں۔ ذرا ثناء کا جائزہ لے لے، معلوم کر کہ اس کے دل میں رشید کی محبت ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں ہے۔ تو ندرت بیٹی ایک کام کر، کسی بھی طرح ثناء کو رشید کی طرف مائل کر دے، اُسے مجبُور کر دے کہ وہ رشید کے بارے میں سوچے۔ بیٹی یہ کام تُو ہی کر سکتی ہے۔ ثناء سے تیری جتنی دوستی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، اُسے بتا کہ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ بس یہ کام ذرا طریقے سے کرنا ہوگا۔"

"ہُوں طفیلی خالہ بہت بڑی ذمہ داری ڈالی ہے آپ نے میرے اُوپر۔ سوچ لیجئے۔ میری حیثیت اِس گھر میں کیا ہے۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا۔ یا کوئی ایسی ویسی بات ہوئی۔ تو ابا جی کو نوکری سے نِکال دیا جائے گا۔ اور اِس کے بعد ہم دربدر ہو جائیں گے۔"

"نہیں بیٹی اللہ نہ کرے، ایسا ہو۔ لیکن تجھے یہ کام اپنی خالہ کیلئے کرنا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں ثناء سے پہلے تو اِس سلسلے میں بات کرونگی۔ اُس کا جائزہ لُوں گی۔ اور پھر کوشش کروں گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اِس کوشش میں مجھے کامیابی ہو یا نہ ہو۔"

"وہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں میں۔"

"لیکن پھر بھی آپ ذکیہ بیگم صاحبہ سے گفتگو تو کریں اِس سلسلے میں۔"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو ذرا وقت چاہیئے۔ ایسی بات اِتنی جلدی نہیں کی جاتی۔"

"ٹھیک ہے خالہ جان۔ لیکن آپ نے عارفہ بیگم کے بارے میں اچھی طرح سوچ لیا ہے نا۔"

"عارفہ بیگم کی تو اب تم فکر ہی مت کرو۔ وہ ہمارا بُرا چاہ رہی ہے تم دیکھ لینا۔ اِسی طرح اُس کا بھی بُرا ہوگا۔ اب چونکہ تم نے یہ بات مجھے

بتا بھی دی ہے۔ تو میں ایک ایک لمحہ ہوشیار رہُوں گی۔ اور رنگے ہاتھوں نہ دبواؤں عارفہ بیگم کو تو میرا نام بھی طفیلی بیگم نہیں۔"

"میں اب چلتی ہُوں۔ دراصل میں اِس بات سے بھی ڈرتی ہُوں۔ کہ کہیں مجھے آپ کے قریب دیکھ کر کسی کے دِل میں کوئی شُبہ نہ پیدا ہو۔ غریب کی عزت بڑی چیز ہوتی ہے طفیلی خالہ۔"

"بیٹی تیری عزت اور میری عزت میں اب کوئی فرق نہیں ہے۔ اب بھلا تجھ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے اِس گھر میں میرے لئے۔"

"اچھا میں چلوں خالہ۔"

"اچھا خدا حافظ۔ اللہ تجھے خوش رکھے" طفیلی خالہ نے کہا۔ اور ندرت باہر نکل آئی۔

اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ بیرونی برآمدے کی جانب چل پڑی۔ دفعتاً ہی اُسے جمن کا خیال آیا۔ وہ کچھ سوچ کر کچن کی جانب چل پڑی۔ جمن کچن میں مصرُوف تھا۔ اور آج گھر کے دو ملازم بھی اُس کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ندرت اندر داخل ہوئی تو اُن دونوں ملازموں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ جمن اُن کی طرف دیکھنے لگا تھا وہ خود بھی کچھ جھینپا جھینپا سا نظر آ رہا تھا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"آؤ۔ اللہ رکھی۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے جمن میاں۔ بس ایسے ہی ذرا دیکھنے آ گئی تھی کیا ہو رہا ہے؟ آج تو کام بہت زیادہ معلوم ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔ کچھ مہمان آئے ہیں نا باہر سے۔ اُن کے لئے کچھ کھانے خاص طور سے تیار کئے جا رہے ہیں۔"

"وہ دراصل تمھیں وہ پیپ درخت کے نیچے اُن صاحب نے بلایا تھا۔"

"درخت کے نیچے کن صاحب نے" جمن نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دوسرے ملازموں کی طرف دیکھا۔

"وہی تمھارے دوست۔ جو اکثر تم سے ملاقات کرتے رہتے ہیں۔"

"میرا دوست، میرا تو کوئی دوست کسی درخت کے اُوپر۔ مم میرا مطلب ہے درخت کے نیچے" جمن نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، اگر تم نہیں پہچان رہے اپنے دوست کو تو پھر میں کیا کہہ سکتی ہُوں۔ ویسے دُنیا میں تمھارا ایک ہی دوست ہے، ارے وہی دوست۔ جس نے تمھیں پارٹی میں شرکت کی دعوت دی تھی۔"

"دوست۔۔" جمن پُرخیال انداز میں کھوپڑی کھجلانے لگا۔ ندرت ہونٹ بھینچے اُسے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً جمن کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اور پھر وہ حیرت سے مُنہ پھاڑ کر ہنس پڑا۔

"ارے وہ میرا دوست" اُس نے کہا۔

"ہاں وہی۔ رات کو گیارہ بجے تم سے ملاقات کرے گا کیا سمجھے؟"

ندرت نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اُس سے کہہ دینا۔ ہم چلے آئیں گے دِل کے ہاتھوں مجبُور ہو کر اور وہ دروازے پر میرا مقصد ہے کہ کھلا رکھنا۔ کہا تھا نا وہ۔۔۔"

ندرت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے چل دی تھی۔

دونوں ملازموں کے سامنے وہ کھُلی بکواس نہیں کر سکتی تھی اپنی پوزیشن بھی بہرحال محفوظ رکھنی تھی۔ بہرطور اب اُس کی بیٹر بھی تیار ہو گئی تھی۔ اور اب دونوں بیٹریں لڑیں گی۔ لُطف آ جائے گا۔ اُس نے سوچا اور اپنے کوارٹر کی جانب چل پڑی۔

٭ ٭

ڈائننگ ہال آج خصُوصی طور پر آراستہ تھا۔ خیر دین اور دوسرے تمام لوگ سروس کر رہے تھے۔ احسان صاحب خود بھی موجود تھے اور شہاب صاحب بھی تھے۔ ذکیہ بیگم اور دادی اماں بھی تھیں۔ وہ خصُوصی اہتمام خالد اور اختر کے لئے کیا گیا تھا۔ وہ دونوں برابر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہی تر و تازہ اور خوبصُورت نوجوان تھے۔ بھرے بھرے بدن کے مالک دونوں ہی کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہ کون دوسرے سے زیادہ خوبصُورت ہے۔

ثناء ابھی نہیں آئی تھی۔ اور ایک ملازمہ ثناء کو بلانے گئی ہوئی تھی۔ چند لمحات کے بعد ثناء اور ردا کمرے میں داخل ہوئیں۔ ثناء نے ردا کو زبردستی گھسیٹ لیا تھا۔ حالانکہ اُس نے کافی مزاحمت کی تھی۔ تیمور ایک خوبصُورت سُوٹ میں ملبُوس تھا۔ حسبِ معمُول ثناء کی گود میں لدا ہوا تھا۔ دادی اماں اور ذکیہ بیگم نے تشویش کی نگاہ سے ثناء کو دیکھا اُن کے ذہنوں میں جو کچھ بھی تھا۔ اُس کے تحت کم از کم اُس وقت ثناء کو تیمور کے ساتھ نہیں آنا چاہیئے تھا۔ ردا بے چاری شرمائی لجائی سی ساتھ آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ثناء کے خصُوصی مہمانوں میں وہ خود جا گھسے، لیکن ثناء نے آج تک اُس کی کوئی ضد نہیں چلنے دی تھی۔ زبردستی ہی ردا کو گھسیٹ لائی تھی۔ بہرطور سب نے خوش دلی سے ردا کا بھی استقبال کیا۔ خالد اور اختر گہری نگاہوں سے اُن دونوں خواتین کو دیکھ رہے تھے۔

"آؤ بھئی ثناء سُنا ہے کہ دوپہر سے اب تک تم نے اِن دونوں سے ملاقات نہیں کی" احسان صاحب بولے۔

اُن کی پیشانی پر نہ ردا کو دیکھ کر کوئی شکن نمودار ہوئی تھی اور نہ تیمور کو دیکھ کر۔ وہ ذرا دوسری طبیعت کے انسان تھے۔ اور دُنیا کو بہت صاف نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے، پھر اُنھوں نے خالد اور اختر سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"بھئی ثناء کو تو تم لوگ پہچان گئے ہوگے - یہ ردا ہے۔ ثناء کی گہری دوست اور ہمارے لئے بیٹیوں کی مانند، ہمارے ساتھ ہی اس کا قیام ہے۔ بہت ہی نفیس بچی ہے۔ بیٹھو بیٹے، بیٹھ جاؤ ویسے ثناء تمھاری یادداشت کا امتحان لیا جانا چاہیئے بتا سکتی ہو کہ ان میں اختر کون ہے اور خالد کون ؟"

ثناء نے ایک نگاہ اُن دونوں پر ڈالی اور پھر جلدی سے بولی۔

"خالد" اُن میں سے ایک نوجوان نے چونک کر گردن اُٹھائی اور بے اختیار بول پڑا۔

"جی" ثناء کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے احسان صاحب کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"ابّو! وہ اختر صاحب ہیں" اُس نے دوسرے نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو یقینی طور پر اختر ہو سکتا تھا۔

کیونکہ خالد ثناء کے بے اختیار پکارنے پر بول پڑا تھا احسان صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ذکیہ بیگم بھی مسکرا پڑیں۔ دادی اماں کی سمجھ میں شاید بات نہیں آئی تھی۔ احسان صاحب نے کہا۔

"واہ ثناء واہ۔ اور واہ اختر میاں واہ۔ پتہ نہیں تم دونوں میں سے کس کو داد دی جائے"

"چلئے انکل داد آپ ثناء ہی کو دے دیجیئے" اُس نوجوان نے جو خالد کے نام پر بولا تھا۔ شاہانہ انداز میں کہا۔

"مطلب" ثناء اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

"محترمہ! خادم کو اختر کہتے ہیں۔ اور خالد صاحب جو ہیں وہ ہمیشہ بولنے میں دیر لگاتے ہیں۔ ویسے آپ کی ترکیب میں سمجھ گیا تھا"

ثناء دوسری بار چونک کر اُن دونوں کو دیکھنے لگی جس نوجوان نے خالد کے نام پر گردن اُٹھائی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت نظر آ رہی تھی۔ جب کہ دوسرا کافی حد تک سنجیدہ اور پُروقار شخصیت کا مالک تھا۔

"یا ابّو مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں اختر و خالد صاحب یا آپ دونوں"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا نام خالد ہے" دوسرے نوجوان نے جو نہیں بولا تھا۔ آہستہ سے کہا۔

"تو پھر آپ خالد کے نام پر کیوں بولے تھے" ثناء نے غصیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اختر سے کہا۔

"محترمہ! خادم خوش قسمتی سے ماہر نفسیات ہے اور ایک مکمل ماہر نفسیات کو اپنے مدِمقابل کے ہر فعل سے ایک لمحے میں آگاہ ہو جانا چاہیئے۔ انکل نے آپ سے ہم دونوں کے بارے میں سوال کیا۔ اگر آپ شرافت سے جواب دے دیتیں۔ تو کوئی حرج نہیں تھا۔ کم از کم یہ ہی کہہ سکتی تھیں۔ کہ آپ ہم دونوں کو نہیں پہچان سکیں۔ لیکن آپ نے جس برق رفتاری سے سوال کر دیا۔ اب ایک ماہر نفسیات اُسی برق رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتا تو پھر اُسے ماہر نفسیات کون کہتا۔ فدوی نے نفسیات پر بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ میں خالد بھائی سے پہلے بول اُٹھا۔ اور میرا اندازہ درست نکلا۔ آپ نے فوراً شناخت کر لیا ہم دونوں کو"

ثناء نے جھلّاتے ہوئے انداز میں پلیٹ اپنے سامنے کھسکا لی۔ اور پھر تیمور کی طرف رُخ کر کے بولی۔

"تیمور! چلو شروع کرو۔ کھانا کھاتے ہوئے۔ فضول باتوں سے گریز کرنا چاہیئے"

اختر نے ایک گھن گرج قہقہہ لگایا تھا۔ قریب بیٹھے خالد نے اُس کے بازو کو زور سے دبایا۔ اور پھر ثناء کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ثناء! شاید اختر آپ کو یاد نہ ہو۔ لیکن اُس کی شرارتیں کم ہی لوگ بھول پاتے ہیں"

"آپ کیا لینا پسند کریں گے" ثناء نے ایک ڈش اُٹھا کر خالد کی طرف بڑھائی۔

"شکریہ، شکریہ" احسان صاحب مسکرا رہے تھے اور اس کے بعد کھانا شروع ہو گیا۔

ردا نے بھی اپنی پلیٹ میں تھوڑا بہت کھانا نکال لیا تھا۔ ثناء اپنے ساتھ ساتھ تیمور کو بھی کھلاتی جا رہی تھی۔ دونوں مہمانوں نے کئی بار چور نگاہوں سے ثناء کی تیمور کی جانب یہ توجہ دیکھی لیکن کوئی کچھ نہ بولا۔ اختر کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیلی رہی تھی۔ اور اس وقت بھی یہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر منجمد تھی ثناء نے ایک دو بار اُسے دیکھا۔ اور ہر بار اُسے اختر پر غصّہ آنے لگا۔ اُس سے زیادہ تیزی اور طرّاری کا مظاہرہ کر کے اختر نے اُس سے دشمنی مول لے لی تھی۔ ویسے ایک لمحے کے لئے اُس نے سوچا بھی تھا کہ یہ اختر بہت زیادہ چالاک معلوم ہوتا ہے۔ خالد کے نام پر فوراً ہی بول پڑا تھا۔ جب کہ اصل خالد صرف کسمسا کر رہ گیا تھا۔ ویسے یہ خالد ذرا سنجیدہ طبیعت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال اختر میاں بھِڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے تم نے۔ معذرت کرنا پڑے گی۔ دشمنی اسٹارٹ۔ ثناء نے دل ہی دل میں سوچا۔ اور اس کے بعد وہ خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ احسان صاحب کھانے کے دوران میں بھی اختر یا خالد سے کوئی سوال کر دیا کرتے تھے۔ ذکیہ بیگم بھی خوش تھیں۔ دادی اماں بے چاری سادگی سے کھانے میں مصروف تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا ختم ہو گیا۔ اور پھر وہیں پر کافی کا دور چلا۔ اس دوران میں ردا نے ایک دو بار اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ثناء نے اُسے زبردستی بٹھا لیا۔ اختر نے ردا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا نام بے مثال ہے۔ لیکن آپ کسی چادر میں لپٹے ہوئے خرگوش کی مانند نظر آتی ہیں۔ جس کے اوپر زبردستی چادر ڈال دی گئی ہو"

ثناء نے ایک بار پھر اختر کو گھور کر دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"ردا بے چاری جواب نہیں دے سکتی اختر صاحب"

"کیوں آپ اُنھیں جواب دینے دیجئے"

"میں نے غلط تو نہیں کہا"

"کیوں آپ کسی کا مذاق اُڑا رہی ہیں"

"ردا گونگی ہے" ثناء نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور اختر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اوہ، میں معافی چاہتا ہوں۔ خدا کی قسم اندازہ نہیں تھا مجھے، سوری مس ردا۔ بہت بہت شرمندہ ہوں میں آپ۔ دیکھئے نا یہ... یہ بات تو ثناء کو مجھے پہلے ہی بتا دینی چاہیئے تھی" اختر اس طرح شرمندہ نظر آ رہا تھا کہ ردا کے قہقہے چھوٹنے لگے تھے۔

ثناء نے ایک لمحہ بھی تو صبر نہیں کیا۔ فوراً ہی اختر سے بدلہ لے لیا۔ احسان صاحب مسکرا رہے تھے، دادی اماں منہ کھولے ہوئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور ذکیہ بیگم غصیلی نگاہوں سے ثناء کو دیکھ رہی تھیں۔ اُنھوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو احسان صاحب نے اُنھیں آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ کبھی کبھی ہی گھر میں ہوا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی ہی اُنھیں ایسی محفلیں میسّر آیا کرتی تھیں۔ چنانچہ ان حالات سے وہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دادی اماں بھی کچھ نہ بولیں۔ اور اختر کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ردا بے زبان ہے۔ خالد بھی ہمدردی کی نگاہوں سے ردا کو دیکھ رہے تھے، شاید سوچ رہے ہوں کہ کتنی خوبصورت لڑکی اور گونگی۔ ماحول پر ایک دم سنجیدگی سی طاری ہو گئی تھی۔ اور بزرگ بھی اس تفریح میں شریک ہو گئے تھے، ثناء کی یہ شرارت اُنھیں پسند آئی تھی۔ ردا نے ثناء کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُٹھنے کی اجازت مانگی تو ثناء نے آہستہ سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے ردا، آرام کرو۔ میں صبح کو تم سے ملاقات کروں گی"

ردا خاموشی سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ ثناء کی شرارت پر اُسے بھی ہنسی آ رہی تھی۔ بے چارہ اختر جس طرح معذرت کر رہا تھا۔ دیکھنے کے قابل تھا۔ ردا کے ہونٹوں پر بار بار مسکراہٹ آئی تھی کیونکہ ثناء نے اُسے گونگا بتایا تھا۔ اور اختر سے اُس کی چھوٹی سی جھڑپ ہو چکی تھی۔ اس لئے ردا بھی ثناء کی حمایت میں خاموش رہی۔ دوسری طرف ثناء بالکل سنجیدگی سے اُن لوگوں سے گفتگو کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اُس نے رسمی طور پر عادل چچا کی خیریت معلوم کی چچی جان کے انتقال پر ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر اُن دونوں سے معذرت کرتی ہوئی بولی۔

"میرا بچہ جمائیاں لے رہا ہے۔ میرا خیال ہے اسے نیند آ رہی ہے۔ اس لئے آپ لوگ اجازت دیں"

"جب... بچہ" اختر نے ایک بار پھر بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ اور ثناء عجیب سی نگاہوں سے اُسے گھورنے لگی۔

"خیریت! بچوں کے بارے میں سن کر آپ کو کچھ حیرت ہوتی ہے اچھا خدا حافظ" اُس نے اختر کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور باہر نکل گئی۔ خالد بھی ہونق بنا ثناء کو دیکھ رہا تھا۔ تب دادی اماں نے فوراً ہی وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔

"اے بیٹے اختر اور خالد! کس شیطان کے چکر میں پڑ گئے ہو تم۔ یہ ثناء ہے۔ پوری کوٹھی اس کی شرارتوں سے خوفزدہ رہتی ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی شرارت، ہر وقت کوئی نہ کوئی حرکت اور بس ہی کیا اس کے پاس۔ ماشاء اللہ اکلوتی ہونے کی وجہ سے ماں اور باپ دونوں کی لاڈلی ہے۔ شرارتوں میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ سب اُس کے چہرے کی شگفتگی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی زندگی میں انسان کو نہ جانے کیسے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے خوشیوں کے جو بھی لمحات اُسے میسّر آ جائیں چھیننے نہیں چاہئیں"

"میں سمجھا نہیں دادی جان" اختر نے کہا۔

"بھئی وہ بچہ ردا کا ہے۔ بس ثناء کے پاس رہتا ہے اور ثناء اُسے بہت زیادہ چاہتی ہے۔ اپنا ہی بچہ کہتی ہے۔ یہ بھی بس شرارت میں کرتی ہے۔ اُس کی تمام حرکتیں نرالی ہیں" خالد کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اور اختر کھوپڑی کھجانے لگا تھا۔

✡

گیارہ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ کوٹھی کے اندرونی حصے میں ابھی رونق نظر آ رہی تھی۔ یہ غالباً مہمانوں کی آمد کی وجہ سے تھی لیکن کوارٹروں میں مکمل سنّاٹا چھا چکا تھا۔ ندرت دبے پاؤں باہر نکلی اور کوارٹر کا دروازہ کھول کر پائیں باغ کی جانب چل پڑی جہاں اُس نے جمن کو دعوت دی تھی۔ بیس منٹ دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اُس درخت کے نیچے پہنچ گئی۔ جہاں جمن درخت کے تنے کی آڑ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ندرت کے قدموں کی چاپ سن کر وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اتنی دیر لگا دی ہیر" اُس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"ہیر کون ہیر" ندرت نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمھیں ہی کہہ رہا ہوں۔ یقین کرو اللہ رکھی جی چاہ رہا تھا کوئی

بانسری ہوتی اور میں ہونٹوں سے لگا کر درد بھرے نغمے بجاتا ۔"

"اوہو۔ کسی درخت کی شاخ توڑلی ہوتی" ندرت نے آہستہ سے کہا۔

"ہم۔۔۔ مگر اُس میں سُوراخ کیسے کرتا۔ بغیر سُوراخوں کے بانسری تھوڑی بجتی ہے۔ اور پھر اگر بانسری بجاتا تو کیا دوسرے لوگ نہ سُن لیتے؟"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ لیکن کیا تمھیں بانسری بجانا آتی ہے؟"

"آتی تو نہیں ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جذبۂ دل چاہے تو اللہ میاں میرا مطلب ہے کچے دھاگے جس میں لپٹ کر۔۔"

"گولا کباب بنائے جاتے ہیں" ندرت نے جلدی سے کہا۔

"ایں؟"

"میں نے کبابوں پر دھاگے لپٹے ہوئے دیکھے ہیں۔ اور وہ کچے دھاگے ہی ہوتے ہیں۔"

"ارے نہیں۔ میں شعر پڑھ رہا تھا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں سمجھی کباب پکاتے ہیں شاید آج تم نے" ندرت نے کہا۔

"کباب پکائے تھے مگر شاہی۔ اور ذرا بوجھو تو، ہم تمھارے لئے کیا لائے ہیں؟" جمن نے کہا۔

"آپ میرے لئے کیا لائے ہیں؟" ندرت نے لپکتے ہوئے سوال کیا۔ اور جمن نے درخت کے عقب میں ہاتھ ڈال کر ایک دسترخوان اُٹھالیا۔ جس میں دجانے کیا کیا الم غلم لپٹا ہُوا تھا۔ کھانوں کی خوشبو اُس سے بلند ہو رہی تھی۔ جمن نے دسترخوان کھول دیا اور پھر پلیٹیں سجانے لگا۔

"یہ کیا ہے؟"

"کھانا۔ کیا بتاؤں اللہ رکھی۔ کتنا شاندار کھانا پکایا تھا آج میں نے۔ ذرا چکھ کر دیکھو۔"

"نہیں جمن۔ یہ میری محبت کی توہین ہے" ندرت نے کہا۔

"کک۔۔ کیا مطلب کیسے توہین ہے۔ میرا مطلب ہے تمھیں ڈائننگ ٹیبل۔۔"

"نہیں۔ اگر میں تم سے اِن باتوں کی خواہش کرنے لگوں تو پھر میری محبت داغدار ہوجاتی ہے۔"

"ارے نہیں اللہ رکھی۔ کھاؤ، کھاؤ، وہ جو کہتے ہیں نا کہ محبوب کی مہندی، میرا مطلب ہے مہندی نہیں تحفہ تحفہ۔"

"تو تحفے میں تم میرے لئے یہ کھانا لائے ہو۔"

"تحفے میں نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ میں نے خود بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔"

"اطمینان سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ میں چلتی ہُوں۔"

"ارے ارے ناراض کیوں ہوگئیں۔ اس میں ایسی کون سی بُری بات تھی؟"

"نہیں۔ میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ میں کھانا کھا چکی ہُوں۔"

"اوہ۔ مگر میرے ساتھ۔۔۔ میرے ساتھ تھوڑا بہت۔"

"نہیں جمن۔ تم اِس قِسم کی تکلیف آئندہ کبھی مت کرنا، مجھے بس تمھاری محبت عزیز ہے، تمھارا پکایا ہُوا کھانا نہیں۔"

"محبت محبت" جمن کے حلق میں جیسے کوئی چیز پھنسنے لگی۔

"ہاں۔ تم نے کھانا یہاں لاکر میری توہین کی ہے۔"

"آئندہ نہیں کروں گا اللہ قسم، پتہ نہیں کیوں غلطی ہوگئی۔ بس ہوگئی۔"

"تو پھر اسے لپیٹ کر پیچھے رکھو" ندرت نے کہا۔

درحقیقت اوّل تو وہ کھانا کھا چکی تھی دوسری بات یہ کہ اِس طرح وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ ظاہر ہے جمن یہ کھانا باورچی خانے سے چُرا کر لایا ہوگا۔ یا ممکن ہے اپنی ماں کے لئے لایا ہو۔ لیکن ندرت اِس قِسم کی لڑکی نہیں تھی۔ تفریح اپنی جگہ، یہ ساری چیزیں وہ فضول سمجھتی تھی۔ جمن نے فوراً کھانا دسترخوان میں لپیٹ کر اپنے عقب میں رکھ دیا۔ اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"کھانا میں نے نہیں کھایا تھا۔"

"تو میں کب تمھیں منع کر رہی ہوں کھانے سے۔"

"ارے نہیں، اب گھر جاکر کھالوں گا۔ تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں جُڑ جائے گا۔ اور سُناؤ کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"بس کچھ نہیں، وہ وظیفہ پڑھ رہا ہُوں لیکن امّاں پھونکنے نہیں دیتیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پیاز کے چھلکے تو میں نے ہر جگہ ڈال دیئے تھے اُس دن پھڈا ہوگیا تھا۔ میں نے پیاز کے چھلکے ڈالے تھے اور امّاں تم لوگوں سے لڑنے لگیں۔ پھر میں نے واپس آکر سمجھایا کہ یہ کام تم لوگوں نے نہیں بلکہ میں نے کیا تھا۔"

"اوہو۔ پوچھا نہیں اُنھوں نے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"بتا دیتا تو پھر محبت کہاں رہتی" جمن نے کہا۔

"وہ جو کہتے ہیں نا عشق سُولی پر بھی چڑھ کر مردانہ وار رہتا ہے۔ محبت کبھی مِٹ نہیں سکتی بناوٹ کے میرا مطلب ہے پھُول، دھت تیرے کی" جمن نے پیشانی پر دوہتڑ مارا۔

"تو تم رانجھا بنے ہوئے تھے آج۔"

"ہاں، بانسری بجانے کو دِل چاہ رہا تھا۔"

"اور بانسری بجا کر سب لوگوں کو اکٹھا کرلیتے کیوں؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔ اِسی لئے تو نہیں بجائی۔"

"بے وقت کی بانسری اچھی چیز نہیں ہوتی۔ تم یہ بتاؤ کہ وظیفہ کہاں تک پہنچا؟"

"باقی سارا کام تو مکمل ہوگیا ہے۔ اُس دِن پیاز کے چھلکے بھی ڈالے تھے، پھر کسی دِن اور ڈالوں گا۔ لیکن امّاں پھونکنے نہیں دیتیں پھونکا تھا تو ڈر گئیں تھیں۔ اور سب لوگ جمع ہوگئے تھے، وہ بھی آگئے تھے۔ میرا مطلب ہے، سس بشیر میاں۔"

"کون میاں؟"

"سس۔۔ بشیر میاں۔"

"یہ کون ہیں؟"

"تمھارے ابّا" جمن نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور ندرت نے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ غالباً جُوتی اُتارنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر رُک گئی۔

"کک۔۔۔ کیوں کیا ہُوا؟"

"کچھ نہیں پیر میں کسی نے کاٹ لیا تھا" ندرت نے جواب دیا۔

"کانٹا چُبھا ہو تو نکال دُوں" جمن نے بڑے پیار سے کہا۔

"نہیں بھئی جُوتا پہنے ہوئے ہُوں۔ کانٹا کہاں سے چُبھ جائے گا۔ آرام سے بیٹھو" ندرت نے اُسے ڈانٹنے والے انداز میں کہا پھر بولی۔

"جمن وظیفہ ذرا سخت پڑھنا پڑے گا۔ تمھاری ماں قابو میں نہیں آرہی ہے۔"

"ہاں۔ میں بھی محسوس کر رہا ہُوں کہ کوئی فرق نہیں پڑا۔ امّاں میں اب تک۔۔۔ اب تک تو کچھ نہ کچھ ہونا ہی چاہیئے تھا۔ میں بھی اب زیادہ انتظار نہیں کرسکتا اللہ رکھی۔ بس ہماری محبت کی گاڑی اب کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جانا چاہیئے۔"

"اِنشاءاللہ پہنچ جائے گی۔ اِتنی دُور پہنچ جائے گی کہ تم تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔"

"آمین، آمین" جمن نے جواب دیا پھر بولا۔

"مگر اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"میں اُن بزرگ سے مِل کر کوئی دُوسرا وظیفہ معلوم کروں گی۔ اِس لئے کہ یہ وظیفہ تو کارآمد ثابت نہیں ہُوا۔"

"ایسا ہی لگ رہا ہے۔ تم ضرور اُن سے ملاقات کرو اللہ رکھی۔"

"اچھا اب میں چلتی ہوں" ندرت نے کہا۔

"ابھی سے، ابھی نہ جاؤ توڑ کر کہ دِل ابھی بھرا نہیں۔"

"جُڑ جائے گا بس میں اب چلتی ہُوں" ندرت نے کہا۔ اور وہاں سے واپس پلٹ گئی۔

جمن کچھ دُور تک اُسے چھوڑنے آیا۔ لیکن ندرت نے اُسے منع کردیا۔ اور پھر وہ اپنے کوارٹر میں داخل ہوگئی۔ ابھی اُس نے دروازہ بند ہی کیا تھا۔ کہ سامنے اُسے عصمت کھڑی نظر آئی۔ اور ندرت اُچھل پڑی اور پھر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"ارے آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں عصمت باجی۔"

"ندرت تم سے کچھ بات کرنی ہے مجھے۔"

"جی باجی کہیئے۔"

"آؤ میرے ساتھ آؤ" عصمت نے کہا اور ندرت خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑی۔

"دیکھو ندرت۔ تمھارے بارے میں میں جانتی ہوں امّی جانتی ہیں۔ امّاں بی جانتی ہیں۔ ابّو جانتے ہیں۔ سب لوگ تمھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ تمھاری شرارت پسند فطرت سے سب ہی واقف ہیں لیکن دُنیا بڑی غلیظ جگہ ہے ندرت۔ دُنیا کسی کی بُرائی کو، کسی کی ذرا سی لغزش کو اِتنا اُونچا اُچھالتی ہے کہ پھر واپسی مشکل ہوجاتی ہے۔ تم جو تفریح کر رہی ہو۔ میں اُس سے اچھی طرح واقف ہُوں۔ یہ شرارتیں بلاشبہ تمھاری عمر سے مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن اِس طرح رات کی تاریکی میں تمھیں اور جمن کو دیکھ لیا گیا۔ تو پھر بات بنائے نہیں بن سکے گی۔ میں تمھیں شرارت سے نہیں روک رہی کیونکہ میں جانتی ہُوں کہ یہ تمھاری فطرت ہے۔ لیکن رات گئے اِس طرح باہر مت جایا کرو اگر تمھیں اِس حالت میں ابّو بھی دیکھ لیں تو خود کو یقین نہ دِلا سکیں گے۔"

ندرت نے عصمت کی طرف دیکھا۔ عصمت کی آنکھوں سے محبت پھُوٹ رہی تھی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے باجی۔ جمن کے ساتھ تفریح تو جاری رکھی جاسکتی ہے۔"

"ہاں۔ دِن کی روشنی میں جِس طرح بھی چاہو۔ لیکن رات کی تاریکی میں اِس طرح کبھی اُس سے مِلنے مت جانا۔"

"نہیں جاؤں گی بھئی چلو مان لیا۔"

"سچے دل سے۔"

"ہاں۔ آپ کے سامنے جھُوٹ کون کافر بول سکتا ہے" ندرت نے جواب دیا۔

"تھینک یو ندرت۔ بہت بہت شکریہ! دراصل تم جانتی ہو کہ ہم لوگ کتنے نازک دَور سے گزر رہے ہیں۔ ہماری اپنی حیثیت تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ یہاں اِس کوٹھی میں ہمیں عزت اور وقار سے رکھا جاتا ہے۔ اگر یہ بات منظرِ عام پر آگئی۔ تو لوگ ہماری طرف عجیب سی

رہا ہوں سے دیکھیں گے اور جانتی ہو اُس وقت الو کے لئے کیا گنجائش رہ جائے گی ؟"

"سوری باجی۔ واقعی مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی اور آپ لوگوں کو کوئی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گی۔"

"میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں" عصمت نے کہا۔ اور نُدرت عصمت کے قریب ہی بستر پر لیٹ گئی۔

پھر وہ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہی تھیں پھر جب نُدرت کی آواز بھاری ہونے لگی تو عصمت خاموش ہو گئی۔

اختر اور خالد اپنی خوابگاہ میں آگئے تھے، دونوں کے لئے الگ الگ کمرہ مخصوص کیا گیا تھا۔ لیکن واپسی میں اختر خالد ہی کے کمرے میں آگھسا تھا۔

"نیند آ رہی ہے میرے پیارے بھائی" اختر نے سوال کیا۔

"کیوں یہ تمھاری آنکھوں میں شرارتیں کیوں ناچ رہی ہیں ؟"

"کمال ہے خالد بھائی۔ اُردو زبان کے محاورے اور یہ مثالیں آج تک میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں نے تو کبھی کسی کی آنکھوں میں کسی بھی شئے کو ناچتے نہیں دیکھا۔ آنکھیں صرف دیکھنے کی چیز ہیں۔ سو دیکھتی ہیں۔ لیکن کسی کی آنکھوں میں شرارت ناچتی ہے، کسی کی نگاہوں میں شیطنت ناچتی ہے، اور کسی کی آنکھوں میں محبت، میں نے یہ رقص آج تک نہیں دیکھا۔ اس کو دیکھنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے ؟"

"بیٹھ جا بھائی منطقی بیٹھ جا۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ تو میری کھوپڑی کھانے کے موڈ میں ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ انسانی بھیجہ مجھے قطعی ناپسند ہے۔ ویسے اپنے احسان چچا کا باورچی عمدہ چیز ہے۔ غالباً وہ بکری کے بھیجے تھے۔ جو ہم نے کھائے تھے۔"

"بھیا! بھیجا کھانے سے اگر دماغی قوتیں بڑھتی ہیں۔ تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تُو اپنی صلاحیتوں کو صبح تک کے لئے محفوظ کر لے اور مجھے سو جانے دے۔"

"نہیں بھائی جان۔ معافی چاہتا ہوں۔ انسان اپنی معصوم معصوم خواہشوں کا پتلا ہے۔ معاف کیجئے گا۔ آپ ہی کی اُردو بول رہا ہوں۔ منطق کی رُو سے۔"

"بول، بول، بولتا رہ" خالد نے اپنا سُوٹ اُتارتے ہوئے کہا۔

تو عرض کر رہا تھا کہ یہ بھابی حضور۔ میرا مطلب ہے محترمہ شناء صاحبہ

ذرا کچھ آگے کی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ بھیا! انسان کو ہر بات پر غور کر چاہئیے۔ اچھی طرح جائزہ لے لیجئے اِن خاتون کا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُنگلیوں پر نچا دیں۔ اب دیکھئے نا ایسے ایسے جملے بولنا پڑے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے۔ ایران کے یا مہابھارت نے بھی کسی انسان کو اپنی اُنگلیوں پر نہیں نچایا ہو گا۔ یہ محاورہ بڑے زور شور سے بولا جاتا ہے۔ منطق کی رُو سے کیا یہ نہیں ہے ؟"

"اختر! ہوش و حواس کے ناخن لے۔ میں ایک لمحے کے لئے فض باتیں نہیں سُننا چاہتا۔"

"مگر میں جو باتیں کر رہا ہوں وہ تمھاری زندگی سے تعلق رکھتی اور پھر ذرا غور کرو۔ کیا چھوٹے بھائی کا بڑے بھائی پر اتنا بھی حق ہو تاکہ وہ اُس کی زندگی کے بارے میں صحیح طور پر فیصلہ کرنے میں کی مدد کرے۔"

"ہُوں" خالد نے بستر پر بیٹھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا

"یہ بھی شکر ہے، کہ تیرا کمرہ دوسرا رکھا گیا ہے۔ ورنہ یہاں تو منطق کی رُو سے نہ جانے میرا کیا حال کر ڈالتا۔"

"منطق کی رُو سے غلط ہے بھیا۔ انسان کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ وہ خود ایک معصوم چیز ہے۔"

"تو پھر تیری اِس بات کی تردید تو خود بخود ہو گئی۔ اگر شناء زیادہ تیز و طرار ہے۔ تو میرا کیا بگاڑ سکتی ہے ؟"

"زندہ باد۔ یہ ہی جائزہ لینا چاہتا تھا۔ کہ کہیں آپ اُس کی طراری سے مرعوب تو نہیں ہو گئے۔ دیکھئے نا کسی سے متاثر ہو جانے کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ یا تو انسان اُسے اپنے آپ سے زیادہ ذہین سمجھ کر اُس سے کترانا شروع کر دیتا ہے یا پھر اُس سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے۔ اور یہ دونوں رُوپ ہی انسانی فطرت سے الگ نہیں ہوتے۔ اگر کترانا شروع کر دے۔ تو اُس کا مقصد ہے۔ کہ زندگی میں یگانگت کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک خواہ مخواہ کی اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے اور راستے میں بے شمار دیواریں آجاتی ہیں۔ لیکن اگر وہ اُس شخصیت سے متاثر ہو جائے۔ تو پھر آپ یقین کریں بھیا کہ ایک بے پناہ محبت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جو کتابوں میں درج کئے جانے قابل ہوتی ہے۔"

"میرے پیارے بھائی! معدہ سینے تک پُر ہو چکا ہے اور آنکھوں کی جانب دوڑ رہی ہے۔ سونے نہیں دے گا مجھے۔"

"بھیا! افسوس تو یہی ہے کہ تم نے آج تک مجھے اپنی قربت بخشی۔ اگر تم کھلے دل سے اِس بات کا اعتراف کر لو کہ اب بند آنکھ

میں کسی کی تصویر سجا کر اُس سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔ یہ تعاون کہلاتا ہے، اور منطق کی رُو سے تعاون ہی دِل میں محبت جگاتا ہے۔ جب کہ ہمارے درمیان خونی رشتہ بھی ہے۔ ویسے یہ خونی رشتہ بھی عجیب چیز ہے کیوں بھیا کیا خیال ہے تمھارا۔ خونی سے ذہن میں ایک خوفناک تصور بھی اُبھرتا ہے۔ بولنے کا فرق ہے خون کا رشتہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آسان اُردو میں۔"

"اختر، اختر باز آجا یار، باز آجا۔"

"ہُوں! اِس کا مقصد ہے کہ تاثر قوی ہے۔ ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن صبح اِس موضوع پر آپ سے گفتگو کی جائے گی اور ہاں یہ بھی سُن لیجئے۔ آپ حسب معمول وقت مقررہ پر جاگ جائیں گے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہاں ڈیڈی موجود نہیں ہیں۔ اور آپ اب آرام کر سکتے ہیں۔"

"تجھ سے پہلے جاگ جاؤں گا۔ بس اب نکل جا ورنہ گدّی میں ہاتھ ڈال کر دروازے سے باہر چھوڑ آؤں گا۔"

"کمال ہے اِن لوگوں کو ایک کمرے میں ہم دونوں کے لئے اِنتظام کرنا چاہیئے تھا۔ ظاہر ہے اجنبی ہیں اکیلے میں ڈر بھی سکتے ہیں۔ لیکن جناب لوگ اپنی اَمارت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایسے ایسے شگوفے چھوڑتے ہیں۔" اختر نے کہا اور خالد اپنی جگہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے اختر کا گریبان پکڑا اور اُسے دروازے کے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

اختر تھوڑی دیر تک دروازے پر کھڑا اُسے گھورتا رہا اور پھر مُسکراتا ہُوا برابر والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

بہت ہی خوش مزاج اور شریر فطرت کا مالک تھا یہ لڑکا۔ کینیڈا میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن عادل صاحب کی تربیت نے اُن دونوں کو مثالی نوجوان بنایا تھا۔ ملک سے باہر رہ کر کردار سازی بے حد مشکل کام ہے۔ لیکن رگوں میں دَوڑتا ہُوا خُون اگر اچھا ہو تو بعض اَوقات ماحول کے اثرات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں عادل صاحب ایک مطمئن اور مسرور زندگی گزار رہے تھے۔ بچوں کو اُنھوں نے دوستوں کی مانند رکھا تھا صرف دو بیٹے تھے۔ اور ایک محبت کرنے والی بیوی۔ لیکن بیوی داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ اِس دوران میں عادل صاحب اختر اور خالد کی تربیت کر چکے تھے اور دونوں بچوں کی طرف سے بے حد مطمئن تھے۔ بہت ابتداء میں احسان صاحب سے شناء کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ اور بزرگوں نے اِس بات کو ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ عادل صاحب کے لئے اِس سے زیادہ اچھی اور کوئی بات نہیں تھی کہ اپنے قدیم دوست احسان کی بیٹی کو گھر کی بہو بنائیں۔ احسان صاحب اور ذکیہ بیگم کی فطرت سے وہ اچھی طرح

واقف تھے۔ اور جانتے تھے کہ انتہائی دولتمند ہونے کے باوجود یہ لوگ بگڑے ہوئے نہیں ہیں۔ چنانچہ دِل میں اُس تصور کو زندہ رکھا تھا۔ اور پھر یہ اُن کی مرحومہ بیگم کی خواہش بھی تھی۔ اُنھوں نے خالد سے اِس خواہش کا اظہار کیا۔ تو خالد نے احمق نوجوانوں کی طرح شرمانے لجانے کی کوشش کی۔ اور نہ ہی اِس سلسلے میں بہت زیادہ ایڈوانس بننے کی۔ اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ڈیڈی! کیونکہ یہ مسئلہ بھی زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ میرے دِل میں عام انسانوں سے مختلف زندگی گزارنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ چنانچہ جیسا آپ پسند کریں۔ میں حاضر ہُوں۔"

"بالکل یہی جواب میرے ذہن میں تھا خالد میاں۔ خدا کے فضل و کرم سے تم لوگوں کی سعادت مندی نے میری زندگی سنبھال لی ہے۔ ورنہ اور بھی نہ جانے کیسے کیسے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا۔ احسان کے گھر چلے جاؤ۔ اِس کے باوجود کہ میں اپنے ذہن میں یہ تصور رکھتا ہُوں۔ لیکن میری طرف سے تمھیں یہ دوستانہ پیش کش ہے کہ جاؤ احسان کی بیٹی کا جائزہ لو، اُس پر غور کرو۔ اور اگر ذہن میں کوئی ایسا تصور اُبھرے جو ناخوشگوار ہو تو خود بات کرنے کی بجائے مجھے اِس کی اطلاع دے دو۔ اگر حالات بہتر ہوتے ہیں۔ اور ہم لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ تو پھر میں احسان سے کھُل کر بات کروں گا۔"

خالد خوش مزاج نوجوان تھا۔ زندگی کی تفریحات میں پوری طرح دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن فطرت میں بے باکی نہیں تھی۔ اور اختر کی نسبت بہت سنجیدہ تھا۔ جب کہ اختر زندگی کی لطافتوں سے پوری طرح لُطف اندوز ہونے والوں میں تھا۔ لیکن ایک اچھے کردار کے انسان کی حیثیت سے۔ اُس کی فطرت میں شوخی اور شرارت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور یہ شوخی کسی کے لئے تکلیف دہ نہیں ہوتی تھی۔

دونوں بھائی یہاں آگئے تھے، دونوں ہی ایک دُوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ یہاں کے ماحول کو دیکھے ہوئے ابھی چند ہی گھنٹے گزرے تھے۔ لیکن اختر کی رگ شرارت مسلسل پھڑک رہی تھی کمرے میں آنے کے بعد وہ اپنے بستر میں جا لیٹا۔ اور نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ شناء کو اُس نے ایک نگاہ دیکھا تھا۔ بھابی کی حیثیت سے ایک تصور اُس کے ذہن میں بسا ہُوا تھا۔ لیکن وہ روایتی قسم کی بھابی نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اُسے ایک شوخ۔ ہنس مُکھ دوست قسم کی بھابی درکار تھی۔ جس سے دُنیا کی ہر بات کہی جا سکے۔ شناء کے رُوپ میں اُس نے اپنی آئیڈیل بھابی دیکھ لی تھی۔ لیکن شناء سے بے تکلفی بھی ضروری تھی۔ تاکہ اُس کی ذہنی کیفیات بھی معلوم ہو سکے، ابھی پوری طرح حالات

سے باخبر نہیں ہُوا تھا۔ کوٹھی میں بے شمار افراد دیکھے تھے، وہ کون تھے کیا تھے؟ اِس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ کھانے کی میز پر افرادی طاقت محدُود تھی۔ گویا یہاں درجہ بندی تھی۔ اور یہاں رہنے والے تمام ہی لوگ ایک میز پر جمع نہیں ہوتے تھے۔ لیکن یہ قابلِ مداخلت بات نہیں تھی اور نہ ہی اِس پر بہت زیادہ غور کرنے کی ضرورت تھی۔ البتہ دُوسری صبح کے لئے اُس نے منصُوبے بنا لئے تھے، اور فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ ثناء کا تعاقب کرے گا۔ اور اُس کی مصرُوفیات کا جائزہ لے گا۔ ثناء نے بڑی بے باکی سے اُس چھوٹے سے خوبصُورت بچّے کو اپنا بچّہ کہہ دیا تھا۔ اگر کوئی عام ذہن ہوتا تو نہ جانے کیسے کیسے شُبہات کا شکار ہو جاتا۔ لیکن حقیقت معلوم ہونے پر خالد اور اختر دونوں ہی لُطف اندوز ہوئے تھے۔

رات کے نہ جانے کون سے حصّے میں اختر کو نیند آ گئی لیکن صُبح کو وہ حسبِ معمُول جلد ہی جاگ گیا تھا۔ ملحقہ غسل خانے میں غسل کرنے کے بعد لباس پہنا اور بھائی کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خالد کے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہُوا تھا۔ اور خالد بیٹھا ہُوا صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو بھائی جان۔ کہیئے رات کیسی گزری؟"

"پُرسکُون۔"

"کمال ہے۔" اختر نے متعجبانہ انداز میں کہا۔

"کیوں تم نہیں سو سکے کیا؟"

"ہاں، یہ سوچ کر کہ آپ کو نیند نہیں آئی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟" خالد نے اُسے گھُورتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! اگر آپ کو نیند آ گئی ہے۔ تو قابلِ تشویش بات ہو گی۔"

"پھر وہی سوال کروں گا۔ مطلب؟"

"بھئی ہم نے شادی نہیں کی۔ لیکن براتیں تو دیکھی ہیں ایک ایسے گھر میں جہاں انسان کو یہ احساس ہو کہ وہاں اُس کی زندگی کا ہونے والا ساتھی موجود ہے اور پھر پہلی بار اُس سے تفصیلی ملاقات ہو بچپن کی بات چھوڑ دیجئے۔ تو انسان کو نیند نہیں آنی چاہیئے۔ اور اگر نیند آ گئی ہے۔ تو اِس کا مقصد ہے، کہ اُس شخصیت نے کوئی گہرا تاثر نہیں چھوڑا۔ دیکھئے نا منطق کی رُو سے دراصل۔"

"او منطقی بھائی۔ اللہ کے واسطے میری جان بخشی کر دے، یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہاں تیری منطق نہ جانے کیا گُل کھلائے گی۔"

"گُل ہی کھلائے گی۔ خار تو نہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"بس، بس، شاید کوئی ہے۔" خالد نے دروازے کے قریب قدموں کی چاپ سُن کر کہا۔ ایک نوجوان آدمی نے گردن اندر ڈال کر جھانکا تھا۔

"تشریف لائیے تشریف لائیے۔" اختر نے خوش اخلاقی سے کہا، اور وہ اندر آ گیا۔

"کون ہیں آپ؟"

"خیر دین۔ ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ۔"

"جی؟" اختر نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"وہ جی آپ... آپ بیڈ ٹی لیں گے؟"

"توبہ۔ توبہ، ہمیں ہمیشہ اچھی چائے پسند ہے۔ بیڈ ٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اختر نے کہا۔

"اچھا جی۔ میں آپ کے لئے اچھی چائے لے آتا ہُوں۔" خیر دین واپس مُڑتے ہوئے بولا۔

"بھائی بات تو سُنو، یہ اچھی چائے ہم ناشتے ہی کے کمرے میں پیئیں گے ویسے تم آدمی بڑے دلچسپ معلوم ہوتے ہو۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ..." خیر دین نے کہا۔

"یہ تمہارا نام ہے؟"

"ہاں جی۔"

"کمال ہے۔ اگر تمہیں پُکارنا ہو تو آدمی آدھے گھنٹے تک تو تمہارے نام کی مشق ہی کرتا رہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ جب آپ مشق کر لیں۔ تو پھر ہمیں پُکار لیا کریں" خیر دین نے جواب دیا۔

"ویری گُڈ، ویری گُڈ۔ خیر دین ذرا یہ تو بتاؤ۔ کہ یہاں ناشتہ کس وقت لگتا ہے؟"

"ساڑھے آٹھ بجے جی۔" خیر دین نے جواب دیا۔

"تو تمہارا نام خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ ہے۔"

"ہاں جی۔"

"کیا ہم تمہیں صرف ضلع گوجرانوالہ نہیں کہہ سکتے؟" اختر نے پُوچھا۔

"نہیں جی۔ بالکل نہیں۔ آپ یا تو مجھے خیر دین کہہ سکتے ہیں یا پھر پُورا نام لے سکتے ہیں جی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ میرا خیال ہے خیر دین سے ہی کام چل جائے گا۔ کیوں بھائی جان؟"

"تم جاؤ دوست ہم ناشتہ پر ہی چائے بھی پیئیں گے۔ ہاں ناشتے پر ہمیں بُلا لینا۔"

"جو حُکم جی۔" خیر دین نے کہا اور واپس پلٹ گیا۔ اختر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔

"یہ حرکتیں ہیں۔ ہمارے ہاں کے لوگوں کی۔ اب دیکھئے نا کینیڈا میں سات بجے صبح ہو جاتی ہے ساڑھے سات بجے ناشتے سے فارغ ہو لیا جاتا ہے۔ اور اِس کے بعد بقیہ دن زندگی کی مصرُوفیات میں خواہ کسی بھی سطح کا آدمی ہو۔ لیکن یہاں ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ ہو گا۔ نو بجے تک ناشتے کی میز پر گفتگو ہو گی۔ دس بجے وہاں سے اُٹھا جائے گا ساڑھے دس بجے پونے گیارہ بجے تک تیاریاں ہوں گی۔ اور اِس کے بعد صبح کا آغاز ہو گا۔ گویا آدھا دن ختم۔"

"ہاں۔ یہ طریقِ کار بُرا ہے۔"

"منطق کی رُو سے صرف بُرا ہی نہیں بلکہ تباہ کُن ہے۔" اختر نے جواب دیا۔

"اب فضُول منطق نہ لڑا مجھ سے، کوئی کام کی بات کر۔"

"ہاں، ہاں۔ کام کی بات یہ تھی کہ وہ ثناء بھابی۔"

"اختر! کیا تو اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکتا؟"

"مطلب بھیا! جو کچھ کہا ہے غلط تو نہیں کہا ہے میں نے۔"

"بالکل غلط کہا ہے۔ ابھی اِس جُملے کو مُنہ پر نہ لا بھائی کہیں مُصیبت کا شکار نہ ہو جائیں ہم لوگ۔"

"بھیا! تمہاری فطرت کے بارے میں مَیں اچھی طرح جانتا ہُوں۔ اچھے اچھوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ بے لاگ رائے دیتے ہو اگر ایک سوال کر ڈالوں دوست کی حیثیت سے تو جواب دو گے؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔"

"ثناء بھابی، اُم... میرا مطلب ہے، مس ثناء آپ کو کیسی لگیں؟"

"اچھی لڑکی ہے بظاہر اچھی ہے۔" خالد نے بے ساختہ جواب دیا۔

"اور اُس کی گود میں دبا ہُوا بچّہ؟"

"بچّے تو نور (پھُولوں) کی مانند ہوتے ہیں۔ کہیں بھی ہوں، کسی کے بھی ہوں۔ اگر انسان انھیں پیار نہ کرے تو اُس کی اِنسانیت میں کمی محسوس ہوتی ہے، تم جانتے ہو، مجھے بھی چھوٹے بچّوں سے پیار ہے۔"

"ہُوں۔ بس ٹھیک ہے بات بن گئی۔ ڈیڈی کو فون کر دُوں گا۔"

"میں جانتا ہُوں کہ تو حماقت کی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔"

"منطق کی رُو سے..." اختر نے ابھی اِتنا ہی کہا تھا کہ خالد نے میز پر رکھا ہُوا پیپر ویٹ اُٹھا لیا اور بولا۔

"میں اِسے منطق کی رُو سے تیرے سر پر ماروں گا مجھے اخبار پڑھنے دے۔"

"ہُوں۔ درمیان کا صفحہ مجھے دے دیجئے۔" اختر نے کہا، اور خالد نے جلدی سے اخبار کا درمیانی صفحہ نکال کر اُسے دے دیا۔ ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ دونوں ساڑھے آٹھ بجنے کا انتظار کرنے لگے پھر ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے خیر دین اُنھیں ناشتے کے لئے بُلانے آ گیا۔

ناشتے کے کمرے میں ثناء موجود نہیں تھی۔ شہاب صاحب۔ اِحسان صاحب اور ذکیہ بیگم کے علاوہ دادی اماں تھیں۔ اُن دونوں کو خوش آمدید کہا گیا۔ اور اِس کے بعد ناشتہ شروع ہو گیا۔ ناشتے کے بعد احسان صاحب نے کہا۔

"بھئی رسمیات ہیں، لیکن انسان کو مطمئن کرنے کے لئے الفاظ کا استعمال بھی ضروری ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں محسوس کرتا۔ لیکن کہہ رہا ہُوں کہ یہ گھر تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ اِس کا ایک ایک گوشہ تمہارا اپنا ہے۔ اطمینان سے رہنا۔ اور کسی قسم کا کوئی تکلّف نہیں کرنا۔ ثناء اور دُوسرے بچّے تمہارے لئے پروگرام ترتیب دیں گے، آج تو شہاب بھی گھر پر ہیں۔ اور میں بھی بس تھوڑی دیر کے لئے اجازت چاہُوں گا۔ دوپہر کے کھانے پر تم سے یقیناً ملاقات ہو گی۔ اِس دوران میں آج کا دن ہنسی خوشی گزارو ذکیہ! میرے بچّوں کا پُورا پُورا خیال رکھا جائے، کوئی تکلیف نہ ہو انھیں۔"

"کوئی تکلیف نہیں ہو گی اُنھیں۔ آپ مطمئن رہیں۔" ذکیہ بیگم نے احسان صاحب کو جواب دیا۔ اختر کہنے لگا۔

"انکل! ہم سے یہ ہی کہا گیا تھا۔ کہ یہاں ہمیں کسی قسم کا تکلّف نہیں کرنا پڑے گا۔ اور پھر یہ جگہ ہمارے لئے اجنبی تو نہیں ہے۔ آپ ہماری طرف سے ذرا بھی فکرمند نہ ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹے، بہت بہت شُکریہ۔" احسان صاحب نے کہا اور پھر شہاب صاحب خالد سے بولے۔

"بھئی خالد میاں۔ آپ سے کچھ گفتگو رہے گی۔ اصل میں آج میں نے صرف آپ کے لئے فُرصت نکالی ہے۔"

"میں حاضر ہُوں اَنکل۔" خالد نے جواب دیا۔

"تو پھر آؤ۔ تھوڑی دیر میرے ساتھ رہو۔ اور بھئی اختر میاں آپ ذرا تھوڑی دیر گھوم پھر لیجئے۔ اِس کوٹھی سے آپ کی واقفیت ضروری ہے۔"

"بہت بہت شُکریہ اَنکل۔" اختر نے جواب دیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر باہر نکل آیا۔

درحقیقت اُسے بزرگوں کے درمیان سنجیدہ گفتگو ناپسند تھی۔ اور پھر اُس جیسے نوجوان کے لئے ضروری نہیں تھا کہ کسی کا سہارا لیا جائے۔ چنانچہ وہ بیرُونی حصّے میں پہنچ گیا۔ اُس کی نگاہیں ثناء کو تلاش کر رہی تھیں۔ رات کی دلچسپ ملاقات اُسے یاد تھی ناشتے کی میز پر وہ موجود نہیں تھی۔ اور نہ ہی اختر نے اُس کے بارے میں کسی سے کوئی سوال کیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک بیرونی برآمدے میں نگاہیں دوڑاتا رہا اور پھر وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اُسے شناء نظر آئی جو تیمور کو گود میں اُٹھائے ایک سمت بڑھ رہی تھی۔ اختر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے ایک ستون کی اوٹ میں پناہ لی تھی۔ شناء باہر نکلی تو وہ انتہائی احتیاط سے اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ اُس نے چاروں طرف کا جائزہ لے لیا تھا۔ اور یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ آس پاس کوئی موجود نہیں ہے سب کی نگاہوں سے بچ کر ہی اُسے شناء کا تعاقب کرنا تھا۔ اُس وقت یہ تعاقب کسی خاص مقصد کے لئے نہیں تھا بس شرارت عود کر آئی تھی۔

شناء اسے نہیں دیکھ پائی۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد اُس نے پائیں باغ کے ایک حصّے کا رُخ کیا۔ اور اختر کے لئے اب یہ آسانی ہوگئی۔ کہ وہ بخوبی اُس کا تعاقب کر سکتا تھا۔ پھر شناء نے ایک ملازم کو آواز دے کر اپنے قریب بُلایا اور اُس سے کچھ کہا۔ اختر نہیں سُن سکا تھا۔ کہ اُس نے ملازم سے کیا کہا ہے۔ تیمور کو اُس نے گھاس پر چھوڑ دیا تھا۔ اور خود گھاس پر بیٹھ کر زمین کُریدنے لگی۔ اختر اُس کے عقب میں پھُولوں کے جھاڑ میں پوشیدہ ہوگیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ملازم کو اُس نے ملازموں ہی کے کوارٹروں کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ تقریباً سات آٹھ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ اور پھر ایک خوبصورت سی لڑکی اُس طرف آتی نظر آئی۔ اختر اُس لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو شناء کی کوئی دوست ہی ہو سکتی تھی۔ اچھے لباس میں ملبوس تھی۔ اور خدوخال اِنتہائی پُرکشش تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شناء کے پاس پہنچ گئی۔

"ہیلو اللہ رکھی" شناء نے اُسے مخاطب کیا اور اختر چونک پڑا۔ اللہ رکھی! پھر اُسے یاد آیا۔ کہ یہ اللہ رکھی ملازموں کے کوارٹروں کی طرف سے آئی ہے لیکن شکل وصُورت سے تو اللہ رکھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"ہیلو مالک کی بیٹی، کیا ہو رہا ہے؟"

"مزے" شناء نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، مزے کرتی رہو تمہاری تقدیر میں تو مزے ہی لکھے ہیں"

"اور تم پر کیا مُصیبت ٹوٹی ہے؟"

"کچھ نہیں عصمت آپا سے جھگڑا کرنا ہی پڑے گا۔ تم دیکھو نا یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ ساری ذمّہ داریاں مجھے ہی سونپ دی گئی ہیں۔ یقین کرو بعض اَوقات تو کام کرتے ہوئے مجھے اپنی شخصیت ہی بدلی بدلی محسُوس ہوتی ہے"

"گھر کے کاموں سے اِتنا اُکتایا نہیں کرتے ندرت۔ میں نے بارہا یہ بات محسُوس کی ہے"

"ارے جاؤ، ایک دِن صحن کی جھاڑو کیا دے ڈالی نخرے کرنے بیٹھ گئیں"

"ندرت" اختر نے دِل ہی دِل میں سوچا۔ اِس کا مطلب ہے اللہ رکھی صرف اللہ رکھی نہیں بلکہ ندرت بھی ہے۔ دُوسری طرف شناء ندرت سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں سُناؤ۔ تمھاری ہیر کا کیا حال ہے؟"

"تیار ہے جس وقت چاہو مقابلے کے لئے لے آؤ" ندرت نے جواب دیا۔

"ہوں۔ گویا گفتگو ہو چکی ہے"

"سو فیصدی مکمل"

"اور دُوسرے مسئلے میں؟"

"ہائے دُوسرا مسئلہ۔ خُدا کی قسم شناء مزہ ہی آگیا۔ کیا پُرلطف بات ہے۔ بھیّا رشید اور ہمارے، ہمارے۔۔۔"

"ندرت! مذاق میں بھی۔ میں بدتمیزی سُننا پسند نہیں کرونگی"

"ارے کمال ہے۔ اِدھر تو میری طفیلی خالہ دُعاؤں کے ٹوکرے بھرے بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا گفتگو کر ڈالی ہے اُنھوں نے مجھ سے، اور اُدھر تم میرے بھیّا کا اِس انداز میں نام لے رہی ہو"

"بھیّا" شناء نے کہا اور ہنس پڑی۔

"اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"دراصل اللہ رکھی وہ کمبخت شکل سے تیرا بھیّا ہی معلوم ہوتا ہے"

"اے۔ اے مالک کی بیٹی ذرا ہوش میں۔ جس سے بھی میں نے تھوڑا بہت رشتہ باندھا۔ تم رقابت پر اُتر آئیں میرا بھیّا ہے نہیں اِس سے کیا۔۔۔؟"

"لعنت ہے تجھ پر اور تیرے بھیّا پر۔ ایک کو بے وقوف بنا رکھا ہے، اور اب دُوسرے کو بھی بے وقوف بنانے پر تُلی ہوئی ہے"

"کمال ہے تمہارے لئے کیا کیا نہیں کیا۔ اور تم ہو کہ بس، ٹھیک ہے بھئی۔ بڑے لوگوں کے انداز اگر ایسے نہ ہوں تو پھر اُن کی بڑائی نہ ختم ہو جائے"

"اچھا میں پُوچھ رہی ہُوں کیا گفتگو ہوئی طفیلی بیگم کی تجھ سے"

"میں نے ہیر کو عارفہ بیگم کے لئے پُوری طرح تیار کر لیا ہے۔ اور جیسا کہ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ جس وقت چاہو دونوں ہیروں کو میدان میں چھوڑ دو۔ باقی وہ اُس سلسلے میں بات تو طفیلی بیگم کے دِل میں شدّت سے اُس کی خواہش ہے۔ میں نے بڑی چالاکی سے اُنھیں ٹٹولا ہے۔ اُنھوں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ مجھ سے یہ بات کہی ہے۔ رشید کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن مخالف پارٹی کو تیار کرنا میرا کام ہے"

"کیا؟" شناء غصیلے انداز میں بولی۔

"ہاں۔ اور اب تو میری یہ ذِمّہ داری ہو گئی ہے شناء کہ تمہارے دِل میں اپنے بھیّا کا پیار جگاؤں"

"میں تیری آنکھوں میں مرچیں نہیں بھر دُوں گی۔ اور تیرے مُنہ میں۔۔" شناء غُرّاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ارے، ارے کیا فضُول باتیں شروع کر دیں تم نے۔ یہ تو زندگی کے معاملات ہیں۔ سوچ لو سمجھ لو۔ میرا خیال ہے۔ رشید بھیّا بُرے نہیں ہیں۔ دیکھو نا کیا مردانگی ہے فطرت میں۔ سینہ ہر وقت تنا رہتا ہے۔ گریبان کھُلا رہتا ہے۔ اور ہونٹوں پر ایسی مُسکراہٹ چھائی رہتی ہے جیسے پُوری دُنیا فتح کرنے کے بعد اپنے قلمرو میں چہل قدمی کر رہے ہوں۔ عورت کو دو مضبُوط بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو اُسے اپنی پناہ میں رکھ سکیں بلکہ میرا خیال ہے کہ بھیّا تو پُورا سائبان ہیں"

"بس بس۔ میں نے اِس لئے تجھ سے یہ الفاظ نہیں کہے تھے۔ کہ تو مجھے ہی بے وقوف بنانے پر آمادہ ہو جائے اللہ رکھی سوچ لے تجھ سے زیادہ نہیں تو کم بھی ثابت نہیں ہُوں گی"

"تم تو بگڑ گئیں مالک کی بیٹی۔ اب یہ تو تمھاری مرضی پر منحصر ہے طفیلی خالہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہارے دِل میں رشید بھیّا کا پیار ڈالوں۔ تو کوشش تو کروں گی۔ ناکام رہی تو مجبُوری ہے"

"لعنت بھیج۔ ویسے اِس کا مطلب ہے کہ طفیلی بیگم کو یہاں کی آب وہوا راس نہیں آرہی۔ اب وہ میرے لئے باقاعدہ چیلنج بن گئی ہیں"

"کمال ہے شناء، عارفہ خالہ تمھارے لئے چیلنج اور اب طفیلی خالہ تمھارے لئے چیلنج بن گئی ہیں۔ کِس کِس سے مُقابلہ ہوگی"

"ساری دُنیا سے لڑوں گی۔ کوئی ذرا غلط راہیں تو اختیار کر کے دیکھے۔ اِس کا مطلب ہے کہ طفیلی بیگم کو تو نے تیار کر لیا ہے۔ ٹھیک ہے پہلا معرکہ ہو ہی جانا چاہئیے۔ مگر آج نہیں"

"کیوں آج کیوں نہیں؟" ندرت نے آنکھیں نکال کر پُوچھا۔

"ارے بھئی ہمارے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ آج شاید ڈیڈی بھی گھر پر رہیں اور انکل شہاب بھی۔ اِن دونوں کی موجودگی ذرا مناسب نہیں ہے"

"ہاں، ہاں۔ اُن مہمانوں کے بارے میں تو بتاؤ کیا شئے ہیں؟ طبیعتاً کیسے ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ ابھی تک تو کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ ویسے اُن میں سے ایک خاصا تیز لگ رہا تھا"

"ہُوں۔ کیا تیزی دِکھائی اُس نے مالک کی بیٹی؟"

"کچھ نہیں۔ دراصل بچپن میں اُنھیں دیکھ چکی ہُوں۔ امّی، ابّو کہتے ہیں۔ کہ چھ سات سال پہلے بھی وہ آئے تھے، لیکن میرے ذہن میں دونوں میں سے کسی کی صُورت نہیں ہے یا پھر یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ میں نے توجہ ہی نہ دی ہو۔ مجھ سے پُوچھا گیا کہ بتاؤ اِن میں خالد کون ہے۔ اور اختر کون؟ تو میں نے بے اختیار خالد کا نام لے لیا۔ اور خالد کے بجائے اختر بول اُٹھا۔ میں یہ ہی سمجھی کہ وہ ہی خالد ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ اختر ہے۔ گویا میری معلومات کو دھوکہ دیا"

"ہُوں، ہُوں، گویا اِعلانِ جنگ کیا ہے اُنھوں نے"

"نہیں بھئی اُن بے چاروں سے کیا جنگ کرنا۔ ابّو کے ایک بہت ہی چہیتے دوست کے بیٹے ہیں۔ کتنے دِن رہیں گے یہاں۔ وہ شوخ فطرت کا لڑکا البتہ کچھ بلند پرواز نظر آتا ہے لیکن تم جانتی ہو کہ میں زیادہ اُونچے اُڑنے والوں کے پَر کاٹ دیتی ہُوں۔ اِس لئے وہ بے چارہ میرے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے اگر حد سے آگے بڑھا تو تھوڑی بہت گوشمالی کر ڈالوں گی۔ ورنہ جانے دو کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال آج ہم اپنا پروگرام ملتوی کرتے ہیں۔ کل جب ڈیڈی اور انکل چلے جائیں گے تو ہیریں لڑائیں گے۔ میرا خیال ہے کل کا دِن ہی طے کر لیا جائے بس میں یہ اطلاع دے دُوں گی، کہ حالات کیا ہیں"

"اوکے۔۔۔ اوکے، ویسے اور کوئی منصوبہ؟ اور کوئی حُکم میرے لئے؟"

"ارے ہاں جمن کا کیا حال ہے؟"

"اپنا جمن اپنے ہاتھ سے نِکلتا نظر آرہا ہے۔ کوئی وظیفہ کارگر ہی نہیں ہو رہا۔ پورے دو نمبر میں پیاز کے چھلکے ہی چھلکے بکھرا دیئے گئے، اور میں تجھے بتا چکی ہُوں کہ جمن جب بھی پھُونک مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کی ماں بھُوت بھُوت چلانے لگتی ہے چنانچہ وظیفہ مکمل نہیں ہو پارہا۔ ویسے رات کو ملاقات ہوئی تھی اُس سے البتہ اب راتوں کی یہ مُلاقاتیں ختم ہی سمجھو"

"کیا مطلب؟"

"عِصمت باجی نے درخواست کی ہے۔ کہ یہ سِلسلہ ترک کر دیا جائے کیونکہ ابّو کی عزت بہت نازک ہے"

"اُونہہ عصمت باجی تو وہی بوڑھوں کی سی گفتگو کرتی ہیں۔ ارے بھوتوں کی بات کر کے تو نے مجھے یاد دِلایا۔ یہ پانچ نمبر میں بھُوت کب آرہے ہیں؟"

"پانچ نمبر کے بھُوت" ندرت نے کہا اور ہنس پڑی۔

"ہاں۔ کیا پروگرام ملتوی کر دیا، بھئی تھوڑی سی تفریح بڑھنی

چاہیئے۔ آج کل پتہ نہیں کیوں طبیعت کچھ سُست سُست سی ہے۔"
"تو پھر پروگرام بنالو۔ دو نمبر والوں کا سکون سے رہنا حرام کردیا جائے"
"آؤ ذرا دیکھیں۔ پانچ نمبر کا جائزہ لے لیں۔ کیا کیفیت رہتی ہے۔ پانچ نمبر کو بھوت گھر بنانے کے لئے کچھ انتظامات کرنے پڑیں گے۔"
"چلو" ندرت نے کہا اور دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ گئیں۔ ثناء نے تیمور کو بھی اُٹھالیا تھا۔ اور پھر وہ ملازموں کے کوارٹروں کی جانب جارہی تھیں۔

اور اختر حیرانی سے اپنی جگہ بیٹھا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں تو بہت آگے کی چیز تھیں۔ اُن کی گفتگو سے تو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں ہی کوٹھی میں شرارتیں کرتی رہتی ہیں۔ بہت سی باتیں اختر کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ لیکن جو گفتگو اُن کے درمیان ہوئی تھی۔ اُس سے اختر نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ دونوں کسی چکر میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ "بیٹر مس طفیلی بیگم، رشید بھیا، عارفہ خالہ، محبت اور پانچ نمبر کے بھوت"، اختر نے دل ہی دل میں سوچا۔

"خواتین! آپ لوگوں کو یقیناً ایک ورکنگ پارٹنر کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے لئے بہت جلد میں اپنی خدمات آپ کو پیش کر دوں گا۔ لیکن پہلے آپ کا اعتماد حاصل کرنا بہت ضروری ہے اور یہ جائزہ بھی لینا ہے کہ آخر آپ لوگوں کے مشاغل کیا ہیں۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دونوں لڑکیاں کافی آگے جاچکی تھیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے نکل آیا اور چھپتے چھپاتے اُن کا تعاقب کرنے لگا۔ ملازموں کے کوارٹروں کے سامنے، جس کوارٹر پر وہ لڑکیاں پہنچی تھیں۔ اُس پر پانچ ہی پڑا ہوا تھا۔ اختر نے عقبی سمت اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ایسی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا جس کو باہر کی طرف دھکیلنے سے تھوڑی سی درز پیدا ہوگئی تھی۔ کھڑکی میں سلاخیں نہیں لگی ہوئی تھیں۔ بس پٹ تھے جنھیں کھول کر اندر داخل ہوا جاسکتا تھا۔ لیکن اختر نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اندر سے اُن لوگوں کے قدموں کی چاپ اُبھرنے کا انتظار کرتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد قدموں کی چاپ اُسی جگہ آگئی جہاں کھڑکی کے پیچھے اختر چھپا ہوا تھا۔ ندرت اور ثناء جائزہ لے رہی تھیں کہ کوارٹر کو بھوت گھر بنانے کے لئے کیا کیا کارروائیاں کرنا ہوں گی۔ اور اختر دلچسپی سے اُن کی یہ تمام گفتگو سن رہا تھا۔ بات اِن الفاظ پر ختم ہوئی تھی۔ کہ رات کو یہاں کچھ کارروائی کی جائے گی۔ اب وہ کارروائی کیا ہوگی۔ اِس کا اندازہ اختر کو نہیں تھا چلتے ہوئے ثناء نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب میں تمھارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ مہمانوں کی وجہ سے ممکن ہے رات کو دیر تک لوگ جاگتے رہیں۔ اِس لئے تھوڑی دیر ہوجائے تو فکر مت کرنا۔"
"ٹھیک ہے، رات کو ہم اِس جگہ کو بھوت گھر بنادیں گے۔ اور پھر یہاں سے جمن کی ماں کا تماشہ دیکھا جائے۔"

پھر وہ دونوں وہاں سے باہر نکل گئیں۔ اختر بھی جلدی سے کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔ اُسے اُن دونوں کی اِس کارروائی میں بہت لُطف آرہا تھا۔ اور اُس کا اپنا ذہن کچھ اور منصوبے سوچ رہا تھا۔

☆

طفیلی بیگم رشید سے گفتگو کررہی تھیں۔
"کافی دن ہوگئے ہمیں یہاں آئے ہوئے رشید، کوٹھی کے لوگوں کو تو بھی اچھی طرح جان چکا ہوگا۔ اب کچھ کام کی بات ہونی چاہیئے۔"
"کون سے کام کی بات کررہی ہو اماں؟" رشید نے ماں کو تیکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اے بیٹا! یہاں سب کے سب احسان میاں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ روٹی کھاتے ہیں۔ گھروں میں رہتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی اپنا کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتا ہے۔ تو بھی مُفت خوروں میں شمار نہ ہو اب تو بہت دن ہوگئے۔ کراچی میں اچھی طرح گھوم پھر لیا ہے۔ اپنے لئے بھی کوئی کام دھندا تلاش کر، اور خود کو کام کا آدمی بنا کر پیش کر۔"
"واہ اماں! کیا مزے دار باتیں کررہی ہو۔ کام دھندا کرنے کیلئے کراچی آنا ضروری تھا؟"
"اے تو تیرا کیا مطلب ہے؟ کیا یُوں ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے گا؟"
"کھانے کو مل رہا ہے۔ کپڑے اپنے موجود ہیں، تھوڑی بہت رقم بھی اپنے پاس موجود ہے، پھر کیوں گھبرائی جارہی ہو؟"
"گھبرا رہی ہُوں تیرے لئے، کیا اِسی طرح زندگی گزار دے گا۔ میرے دِل میں کچھ اَرمان نہیں ہیں تیرے لئے؟"
"وہ تو ہوں گے اماں، مگر تم کچھ سوچو، جن لوگوں کے درمیان ہم موجود ہیں۔ وہاں کوئی ہلکا آدمی نظر آتا ہے تمھیں؟ سب کے سب ٹھاٹ باٹ والے، بہترین گاڑیاں رکھتے ہیں، بہترین زندگی گزارتے ہیں۔ اور یہ جو دُوسرے لوگ ہیں۔ احسان خالو کے ٹکڑوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ جو کچھ بھی چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں اُس سے کیا تمھارے خیال میں اِن کی عزت ہوتی ہوگی؟"
"تو کہنا کیا چاہتا ہے رشید؟"
"دیکھو اماں! میرے بارے میں تم اچھی طرح جانتی ہو۔ زیادہ سے زیادہ کیا کام کرسکتا ہُوں میں کوئی بھی چھوٹا موٹا کام۔ کیا ملے گا

اور کیا حیثیت ہوگی میری۔ کیا اُن لوگوں کی نظروں سے گِرانا چاہتی ہو مجھے؟"
"نظروں سے تو تو ویسے بھی گِر جائے گا بیٹا، اگر صرف اُن کے ٹکڑوں پر پڑا رہے گا۔"
"اماں! یہ لوگ ہمیں روٹی ضرور کھلا رہے ہیں اور اُنھوں نے ہمیں اپنے گھر میں ضرور رکھا ہُوا ہے۔ لیکن مہمان بنا کر۔ ہم کسی سے کچھ مانگتے تو نہیں ہیں نا۔ عزت بنی ہوئی ہے تم نے کیوں نہیں رہنے دیتیں۔ جہاں تک کمائی کا تعلق ہے اماں تو میں کسی دفتر میں چپراسی گیری کرکے تو زندگی نہیں گزاروں گا۔ اُن لوگوں کے درمیان آیا ہوں۔ تو کوئی بڑا ہی ہاتھ ماروں گا۔ اور تم اِس کی فکر مت کرو میں نے آسامی تاڑلی ہے۔"
"کیسی آسامی؟" طفیلی بیگم نے تعجب سے پُوچھا۔
"بزرگوں کا کہنا ہے کہ دِل کی بات کبھی کسی سے مت کہو۔ مگر تم ماں ہو اور میرے لئے پریشان بھی۔ اِس لئے تمھیں تھوڑی بہت بات بتائے دیتا ہُوں۔ لیکن خیال رکھنا۔ زبان سے نہ نکلنے پائے۔"
"پاگل ہُوا ہے کیا۔ دشمن ہُوں میں تیری۔ کم از کم مجھے بتا تو سہی کہ یہ آسامی کا کیا قصہ ہے۔ اَرے کوئی ایسا ویسا کام نہ کر بیٹھیو رشید۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے چوٹی پکڑ کر اِس گھر سے نکال باہر کیا جائے۔ میں تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی ہُوں تیرے لئے۔"
"نہیں اماں، تم اپنے رشید پر بھروسہ رکھو۔ میں نے ایسی اُونچی چیز پر ہاتھ ڈالا ہے۔ کہ تم بھی سُنو گی تو دانتوں میں اُنگلی دبا کر رہ جاؤ گی۔"
"کون ہے وہ اُونچی چیز بیٹا؟"
"شہاب چچا! کیا خیال ہے تمھارا کیسے آدمی ہیں وہ؟"
"شہاب میاں، احسان کے بھائی، وہ آسامی ہے تیری؟"
"ہاں اماں، میرے اور اُن کے درمیان بڑی دوستی ہوچکی ہے خفیہ طور پر۔ شہاب چچا نے مجھے اپنا راز دار دوست بنالیا ہے۔ ہم جیسوں ویسوں کی کوئی فکر نہیں ہے۔ کہہ دیا ہے اُنھوں نے کہ رشید میاں۔ اِس سلسلے میں تکلف مت کرنا۔ بس اُن کا کام ہوتا رہے اماں۔ پہلی کوشش میں میں ناکام رہا ہُوں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ تم اطمینان رکھو کچھ نہ کچھ کرکے دِکھاؤں گا تمھیں۔"
"لیکن بیٹا یہ تو بتا کہ شہاب میاں تجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟"
"اب یہ سب کچھ نہیں بتاؤں گا اماں یہ سب ناجائز بات ہوگی، اور روزی کو تھوڑا بہت جائز کرکے کھانا چاہیئے۔"
"ہُوں۔ لیکن رشید بہت بڑے لوگوں کی دوستی بھی بعض اوقات نقصان دہ ہوجاتی ہے۔ اپنا دِل نہ کھولیو اُن کے سامنے کبھی کہیں ایسا نہ ہو وقت سے پہلے بات مُنہ سے نکل جائے، اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔"
"نہیں اماں، کہہ تو چکا ہُوں تم سے، بلا وجہ میرا مغز مت کھاؤ جو کچھ کروں گا ٹھیک ہی کروں گا۔"
"اِس کے علاوہ بھی تجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ میں تجھ سے پہلے بھی کہہ چکی ہُوں۔ مگر تیری طرف سے ابھی تک کوئی کام شروع نہیں ہُوا۔"
"وہ کیا اماں؟" رشید نے جھلاتے ہوئے انداز میں پُوچھا۔
"کچھ ثناء کی بھی خبر ہے؟"
"اُس کی تو ایسی خبر لُوں گا اماں کہ زندگی بھر یاد کرے گی۔ تو بس دیکھتی رہ۔" رشید طفیلی بیگم کی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔
"اَرے کچھ باؤلا ہُوا ہے کیا۔ اُلٹی سیدھی ہانکے جارہا ہے۔ میں کچھ رہی ہُوں تُو کچھ رہا ہے۔"
"تم نے ہی تو کہا تھا اماں کہ وہ ہمارے دُشمنوں کی دوست ہے اور وہ کیا نام ہے اِس بُڑھی اماں کا، عارفہ بیگم ہاں عارفہ بیگم اُس کی طرفداری کررہی ہے۔"
"وہ جو کچھ کررہی ہے اُسے کرنے دے بیٹا۔ تجھے جو کچھ کرنا ہے اُس کے بارے میں سوچ۔"
"کوئی اور بات ہے تمھارے دِل میں اماں؟" رشید نے کہا اور طفیلی بیگم پُراسرار انداز میں مسکرانے لگیں۔
رشید اُلجھی ہوئی نگاہوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "ایک تو تُو جب سیاست دان بننے کی کوشش کرتی ہے تو مجھے بہت غصّہ آتا ہے تجھ پر۔"
"میری سیاست چل گئی رشید تو زندگی بھر دُعا دے گا مجھے۔ میں تجھے اِس گھر کا داماد بنانا چاہتی ہُوں۔ ساری زندگی ٹھکانے لگ جائے گی۔ راج کریں گے راج، کیا سمجھا، حکومت چلے گی ہماری اِس کوٹھی پر۔ جس کو چاہیں گے یہاں رکھیں گے، جس کو چاہیں گے باہر نکال پھینکیں گے، اور پھر گھر کا داماد تو یُوں سمجھ لے کہ گھر کا مالک ہوتا ہے۔ داماد اور وہ بھی اِکلوتی بیٹی کا۔ احسان میاں کی کوئی اور اولاد نہیں ہے۔ شہاب میں تو اُن کا نگ دھڑنگ ہے۔ بھتیجی سے الگ تھوڑی جائیں گے اور شادی وادی اُنھوں نے کی نہیں ہے، اور اب کیا کریں گے۔ چنانچہ یُوں سمجھ لے اب کہ یہ سب کچھ ثناء ہی کا ہے۔"
"ہُوں، تو تُو ابھی تک یہی سوچ رہی ہے۔"
"کیا مطلب؟" طفیلی بیگم چونک پڑیں۔
"اماں! یہ دِل کمبخت کو جانتی ہے تو، بڑی انوکھی چیز ہے، تجھے پتہ ہے کہ دِل کے ہاتھوں بڑے بڑے راجاؤں نے اپنی راجدھانیاں

چھوڑ دی ہیں۔ اور گلیوں سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ امّاں میرا دل بھی مجھ سے بغاوت کر رہا ہے۔"

"اے کیا بک رہا ہے بیٹا، مجھ سے ذرا صاف لہجے میں بات کر، تاکہ کچھ میری بھی تو سمجھ میں آئے۔"

"تو نے رِدا کو دیکھا ہے امّاں؟"

"کون رِدا؟"

"ارے وہی ثناء کی سہیلی۔ جس کا ایک بچّہ ہے۔"

"ہاں، ہاں دیکھا ہے۔"

"امّاں! وہ میرے دل میں آگھسی ہے۔"

"کیا؟" طفیلی بیگم بُری طرح اُچھل پڑیں۔

"ہاں امّاں! وہ بڑی انوکھی لڑکی ہے، حالانکہ میں ایک دوسرے کام سے اُس کی طرف متوجّہ ہوا تھا۔ اور خواہ مخواہ ہی میرے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی کہ..."

"ہاں کہ..." طفیلی بیگم نے غصیلی نگاہوں سے رشید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ... میں رِدا سے محبت کرتا ہوں۔ مگر امّاں وہ الفاظ تو ایسے معلوم ہوئے تھے جیسے کسی اچھے وقت پر منہ سے نکلے تھے، بس اُس کے بعد سے نہ جانے کیوں دل میں عجیب سے خیالات آنے لگے تھے رات کو سوتے ہوئے میں اُس کی تصویر دیکھتا ہوں، اور دل چاہتا ہے کہ اُس کے پاس بیٹھ کر اُس سے بہت سی باتیں کروں۔"

"رشید، رشید تیرا ستیاناس جائے۔ تیرے باپ نے کچھ نہیں کیا۔ ساری زندگی میں دَر دَر کی ٹھوکریں کھلائیں۔ اور اب تُو بھی... میرے ہاتھوں سے نکل رہا ہے، اَرے اِس کمبخت ماری کا ایک بچّہ بھی ہے۔ اور اس بچّے کے باپ کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ بدکردار لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا کچھ کرتی پھرتی ہے۔ صبح کو گھر سے نکلتی ہے۔ پھر شام کو واپس آتی ہے۔ بچّہ ثناء کے پاس رہتا ہے۔ بھلا وہ بھی کوئی لڑکی ہے سُنا ہے نوکری کرتی ہے کہیں پر۔ ہزار پانچ سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ اور تُو کروڑوں روپے کی جائیداد چھوڑ کر اُس کی طرف متوجّہ ہوا ہے۔ رشید کیا تو بھی زندگی بھر اسی طرح رہنا چاہتا ہے۔ کبھی کوئی سکھ بھی دیکھوں گی میں زندگی میں یا نہیں۔ تیرے باپ کے ہاتھوں جیتی کُڑھتی رہی۔ اور اب تو میرے سارے ارمانوں کو مٹّی میں ملائے دے رہا ہے۔"

"دل کی باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں امّاں۔ میں نے بہت سی فلمیں دیکھی ہیں۔ سارے ماں باپ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں مگر وہ جو کہتے ہیں۔ دل تو ہے دل کا اعتبار کیا کیجئے۔"

"میں جوتیاں مار مار کر تیرا بھیجا باہر نکال دوں گی۔ رشید یہ نہیں ہو سکتا۔ کمبخت گر ابھی تو کوئلے کے ڈبّے میں۔ اے میں کہتی ہوں کہ وہ شادی شدہ ہے ممکن ہے طلاق یافتہ ہو کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے اور تو اُس پر ریجھا ہوا ہے۔ کہاں تو اور کہاں وہ۔"

"ٹھیک ہے امّاں! میں نے دل کی بات تجھ سے کہہ دی ہے اور تو جانتی ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہی کرتا بھی ہوں کوئی مجھے میری مرضی کے خلاف مجبور نہیں کر سکتا۔"

طفیلی بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔ وہ کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھیں۔ رشید کے ذریعے وہ اِس مملکت پر راج کرنا چاہتی تھیں۔ اور نہ جانے کیوں انھیں یقین تھا کہ ذکیہ بیگم مرتے ہوئے چھوٹی بہن کی بات نہیں ٹالیں گی۔ گو سوتیلی بہن ہی سہی۔ لیکن ذکیہ بیگم طفیلی بیگم کا بڑا خیال کرتی تھیں۔ اور انھوں نے طفیلی بیگم کو ایک خاص مقام دیا تھا۔ اور طفیلی بیگم اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھیں۔ دل میں بہت کچھ تھا اُن کے لیکن رشید ہی کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی خواہاں تھیں۔ اور اب رشید ہی کندھے جھٹکنے لگا تھا۔ دیر تک بیٹے کو تشویش زدہ نگاہوں سے دیکھتی رہیں پھر ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ اور وہ لہجہ بدل کر بولیں۔

"سیاست بھی کوئی چیز ہوتی ہے رشید، دیکھتا ہے سیاست دان مجمع میں کھڑے ہو کر کچھ کہتے ہیں۔ اور دل میں اُن کے کچھ اور ہوتا ہے، تو ایسا کیوں نہیں کرتا۔"

"تمھارے امّاں تمھارا ہے، تو خود بھی مجھے بہت بڑی سیاستدان معلوم ہوتی ہے۔" رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیٹا ایک بار ثناء سے شادی ہو جائے۔ ایک بار تو اس دولت کا مالک بن جائے تو بھلا اُس کے بعد تجھے روکنے والا کون ہوگا۔ وہ رِدا جو ہے وہ تو اس گھر کی طفیلی ہے یہاں پڑی ہوئی ہے اور لگتا یہ ہے کہ یہاں سے کہیں جانے کی نہیں۔ ثناء کو لپیٹ تو بُوہیں کر لے۔ اَرے یہ تو مردوں کا کھیل ہے ایک سے دل لگائے یا چار سے اُس کے بعد رِدا بھی تیری ملکیت ہوگی۔ کوٹھی میں جو کچھ بھی ہے تیرا ہی تو ہوگا۔ اور تجھے روکنے والا کون ہوگا۔" رشید گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اور پھر مسکراتی نگاہوں سے اُس نے ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"امّاں! تو واقعی سیاستدان ہے۔ بات تیری میرے دل کو ذرا جمتی ہے۔ مگر ایک خطرہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر تیرے کہنے سے میں ثناء سے شادی کر لوں۔ تو رِدا کا دل ٹوٹ نہیں جائے گا میری طرف سے وہ کیا سوچے گی کہ میں کیسا ہرجائی ہوں۔ اُس کے بعد وہ بھلا میری طرف متوجّہ ہوگی۔"

"اچھا تو ایک بات بتا۔ کیا رِدا تجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"ابھی کہاں امّاں! ابھی تو میں کھیل شروع کرنے والا ہوں۔"

"ابھی نہ کر بیٹے! پہلے ثناء کو شیشے میں اُتار لے۔ یہ مسئلہ طے ہو جانے دے۔ اِس کے بعد میں بتاؤں گی کہ رِدا کو کیسے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔"

"تو تو میری اُستاد بنی ہوئی ہے امّاں" رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بننا پڑے گا بیٹا، یہ بے حیائی مول لینی پڑے گی" حالانکہ ماں بیٹوں میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ مگر کیا کروں تو نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میری مان رِدا کی طرف سے ذہن ہٹا اور ثناء کے بارے میں سوچ۔"

"اچھا ٹھیک ہے امّاں سوچوں گا۔ پریشان مت کر مجھے۔" رشید نے کہا۔ اور طفیلی بیگم خوفزدہ نگاہوں سے رشید کی طرف دیکھنے لگیں۔ بیٹے کا یہ رُجحان تشویشناک تھا۔

● ثناء دوپہر کو لنچ میں بھی شریک نہیں ہوئی تھی۔ کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس تیمور سے اُلجھی ہوئی تھی۔ ملازمہ نے کھانے کے لئے بلایا تو اُس نے انکار کر دیا۔ اور کہلوا دیا کہ ابھی وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ لیکن رات کو ڈنر میں اُسے شریک ہونا پڑا تھا۔ چونکہ شہاب صاحب خود ہی پہنچ گئے تھے۔

"کہاں ہو بھئی تم۔ دوپہر کو بھی نظر نہیں آئیں۔"

"او ہو انکل! آپ کو میری طلب کب سے ہو گئی؟"

"کیوں بھئی مجھے تمھاری طلب کب نہیں تھی۔"

"نہیں انکل یہ بات نہیں ہے۔ آپ تو مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ بس کچھ پابندیاں آپ نے زبردستی عائد کر رکھی ہیں مجھ پر۔ میں کہتی ہوں انکل، آپ یہ پابندی ہٹا لیں۔ ورنہ میرے اور آپ کے درمیان اب باقاعدہ جنگ چل جائے گی۔"

"آؤ ڈنر پر چل رہے ہیں۔ ویسے یہ کون سی پابندیوں کا ذکر ہو رہا ہے، ممکن ہے ہمارے علم ہی میں نہ ہو۔"

"کار ڈرائیونگ۔ یہ صرف انکل آپ ہیں جنھوں نے میرے اوپر یہ پابندی عائد کرائی ہے۔ آپ بتائیے کیا میں کار نہیں چلا سکتی۔"

"چلا تو سکتی ہو۔ لیکن لوگوں کی اپنی زندگی بچانا مشکل ہو جائے گی۔"

"اَرے واہ۔ چلئے بے کار باتیں کرتے ہیں۔ مقابلہ کر لیجئے مجھ سے اگر میرے مقابلے میں کار دوڑا سکے تو پھر ہار مان لوں گی۔"

"ٹھیک ہے مقابلہ بھی کر لیا جائے گا۔ اور اگر تم مقابلے میں کامیاب ہو گئیں۔ تو پھر دیکھ لیں گے۔" انکل شہاب نے کہا اور ثناء اُن کے ساتھ ڈائننگ روم کی جانب چل پڑی۔

تمام لوگ کھانے کی میز پر پہنچ چکے تھے۔ اختر اور خالد بھی موجود تھے۔ غالباً اُن دونوں کی وجہ سے ہی ثناء کو خاص طور سے ڈنر میں شریک کیا گیا تھا۔ کیونکہ اُن سے مسلسل اجتناب بداخلاقی میں شمار ہو سکتا تھا۔ اختر سنجیدہ سی شکل بنائے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے نگاہ اُٹھا کر ثناء کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ خالد نے ایک نگاہ اُس پر ڈالی۔ اور ثناء خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی کھانا خاموشی ہی سے شروع ہوا تھا۔ ثناء نے سلاد کی پلیٹ اپنے سامنے سرکائی۔ اور نمک دانی سے اُس پر نمک چھڑکنے لگی۔ نمک دانی میز کی سطح پر رکھی تو شاید زور سے ہاتھ پڑ گیا کیونکہ کافی زوردار آواز ہوئی تھی سب نے چونک کر ثناء کی طرف دیکھا۔ ثناء کو خود بھی احساس نہیں تھا کہ اتنی آہستگی سے نمک دانی رکھنے کے باوجود اتنی تیز آواز کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ معذرت آمیز انداز میں سب کو دیکھ کر کھانے میں مصروف ہو گئی پھر اُس نے پلیٹ سے چمچہ اُٹھایا تو کافی زوردار آواز ہوئی تھی ثناء چونک پڑی دوسرے لوگوں نے سرسری سی نگاہ ثناء پر ڈالی اور پھر کھانے میں مصروف ہو گئے لیکن جب پانی کا گلاس بھی اسی قوت سے میز پر پڑا تو ثناء کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، وہ خود تو یہ سب کچھ نہیں کر رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ اُس نے گھبراہٹ کے انداز میں دوبارہ گلاس اُٹھایا اور پانی منہ سے لگا لیا۔ لیکن پانی کی غٹ غٹ کی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ سب حیرت سے ثناء کو دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے بیٹی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" دادی امّاں نے سوال کیا۔

"جی... جی۔ دادی امّاں۔ سوری ویری سوری۔" ثناء نے کہا اور گلاس میز پر رکھا۔ لیکن اِس بار پہلے سے زیادہ زوردار آواز ہوئی تھی۔ ثناء کُرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔" انکل شہاب نے کہا اور ثناء متحیّرانہ انداز میں باہر نکل آئی۔

یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کہ اُسے کیا ہو گیا ہے، خود تو وہ اِس طرح کام نہیں کر رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اعصاب کشیدہ تھے، دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اور کھلی ہوا میں خود کو معتدل کرنے کی کوششیں کرنے لگی۔ اس وقت تیمور رِدا کے پاس تھا کیونکہ انکل شہاب اُسے ڈنر کے لئے گھسیٹ لائے تھے، اِس لئے رِدا کو اپنے ساتھ نہیں لا سکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رِدا کے پاس پہنچ گئی۔ رِدا تیمور کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ثناء کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تم سے تو تعلقات تقریباً منقطع ہوتے جا رہے ہیں۔" ثناء نے کہا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کوئی بھی کام کبھی یکطرفہ نہیں ہوتا۔"

"بہرحال دیکھتی ہوں، اپنے صبر کو آزماتی ہوں۔ کب تک صبر کر سکوں گی۔"

"صبر کرنا اچھی بات ہے۔"

"آؤ تیمور۔ ایسے بور لوگوں سے زیادہ بات چیت نہیں کی جا سکتی۔" ثنا نے کہا۔ اور تیمور کو ساتھ لے کر باہر نکل آئی۔

آج رات کو اُس کا منصوبہ نُدرت کے ساتھ پانچ نمبر کو بھوت گھر بنانے کا تھا۔ اِس لئے وہ اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر تک کھلی ہوا میں تیمور کے ساتھ ٹہلتی رہی، گردن جھٹکتی رہی۔ میز پر ہونے والے واقعات اُس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے وہ آوازیں بڑی حیرت انگیز تھیں۔ جبکہ ثنا ہم آہنگی سے کام کر رہی تھی۔ بلکہ بعد میں تو اُس نے اِس بات کا خیال بھی رکھا تھا۔ کہ زیادہ تیز آوازیں نہ ہوں، دیر تک وہ ٹہلتی رہی اور پھر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی ساڑھے نو ہی بجے تھے۔ پروگرام گیارہ بجے شروع ہونا تھا۔ وہ تیمور کو لئے ٹہلتی ہوئی دادی اماں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ دادی اماں کے کمرے میں قدم رکھا تو اُس کے ہونٹ سکڑ گئے، اختر وہاں موجود تھا اور خیر دین دادی اماں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ذکیہ بیگم بھی تھیں، لیکن شہاب صاحب اور احسان صاحب شاید خالد سے محوِ گفتگو تھے۔

"آؤ ثنا آؤ۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔ اور ثنا تیمور کو اچھالتی ہوئی ایک طرف بیٹھ گئی۔

"ہاں خیر دین۔ تو کہانی جاری رکھو۔" دادی اماں نے کہا۔

"تو دادی اماں جی یہ کہانی نہیں ہے، بلکہ نصیحت بھی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں ہمارے چچا فرزند علی سب لوگوں سے یہ ہی کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ کچھ دے تو اُسے سنبھال کر رکھا جائے اور انھوں نے ہی ہمیں یہ واقعہ سنایا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کسی امیر آدمی کے ہاں آٹھ آدمی ملازم تھے۔ جو اُس کی پالکی اٹھاتے تھے، پالکی سمجھتی ہیں نا آپ جی۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔"

"مجھے بھی سمجھا دو خیر دین پالکی کیا چیز ہوتی ہے۔" اختر نے کہا۔

"اختر میاں تم تو کینیڈا میں رہے ہو۔ وہاں بھلا ان چیزوں کی کہاں گنجائش ہوگی۔ پرانے زمانے میں دلھنوں کو رخصت کرنے کے لئے اور اس سے پہلے سنا ہے، ہر گھر میں ایک پالکی ہوتی تھی۔ بیبیاں پالکی میں بیٹھتی تھیں اور کہار اٹھا کر چلتے تھے بعض امیر آدمی بھی ان میں سفر کرتے تھے، اب ایسی چیزوں کا رواج کہاں۔" دادی اماں نے کہا۔

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔"

"دیکھو جی خاک ٹھیک ہے، جب بھی ہم کہانی شروع کرتے ہیں آپ بیچ میں بول دیتے ہیں۔"

"اب نہیں بولوں گا بھائی خیر دین اب نہیں بولوں گا تم اپنی کہانی جاری رکھو۔" اختر نے کہا۔

"ہاں جی تو ہم کہہ رہے تھے کہ آٹھ آدمی اُس امیر آدمی نے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن اُس امیر آدمی نے اپنے ایک نوکر سے کہا کہ جا بھائی بازار سے تھوڑا سا نمک خرید لا۔ نوکر بولا کہ دوسرے آدمی سے منگوا لو۔ اور دوسرے نے تیسرے آدمی کا نام لیا۔ جب آٹھوں نے انکار کر دیا۔ تو امیر آدمی نے آٹھوں سے کہا کہ بھائی تم لوگ میرا ایک اتنا سا کام نہیں کر سکتے جب کہ میں تمھیں پوری تنخواہ دیتا ہوں۔ تو وہ بولے جی۔ کہ ہم تو پالکی اٹھانے والوں میں سے ہیں۔ نمک ہم کیونکر لائیں گے، امیر آدمی کو غصہ آ گیا۔ اور اُس نے کہا ٹھیک ہے ٹھیک ہے نمک میں خود ہی خرید کر لے آتا ہوں چلو تم لوگ مجھے لے کر چلو، بس جی آٹھوں آدمیوں نے پالکی تیار کی۔ اور امیر آدمی اُس میں بیٹھ کر چل پڑا۔ وہ پورے بازار میں گھومتا پھرا۔ ایک جگہ بھی نمک پسند نہیں آیا۔ یہاں تک کہ اُس نے چار گھنٹے تک اپنی پسند کا نمک تلاش کیا۔ اور کہاروں کا چل چل کر برا حال ہو گیا۔ امیر آدمی نے کہا کہ کوئی کام نہ کرنا اُس سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ کیا سمجھے جی آپ اختر میاں۔"

"بھائی میں ابھی تک پالکی نہیں سمجھ سکا۔ تو باقی بات کیا سمجھوں گا۔" اختر آہستہ سے بولا۔ اور ثنا کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لو جی کمال کر دیا۔ ساری تفصیل تو بتا دی تھی۔ بڑی بیگم صاحبہ نے بس یوں سمجھ لو کہ جیسے تمہارے اوپر ایک چادر ڈال دی جائے اور تمہاری بغلوں میں ایک ڈنڈا رکھ دیا جائے، پھر ایک ڈنڈا ہم اپنے کندھے پر رکھیں۔ اور ایک ڈنڈا۔ اپنا کرم دین چوکیدار۔ اور دونوں ڈنڈا ڈولی کرکے تمھیں لے چلیں سمجھو پالکی بن گئی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے بن گئی۔ بالکل بن گئی۔ اب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اختر نے کہا اور دادی اماں زور سے ہنس پڑیں۔

"بس خیر دین، اب تو جا، بہت بہت شکریہ، میرے پیروں کا درد دور ہو چکا ہے۔" دادی اماں نے کہا اور خیر دین انھیں سلام کرکے باہر نکل گیا۔

"بڑا دلچسپ آدمی ہے یہ دادی اماں۔" اختر نے کہا۔

"ارے بس نہ پوچھو کیسا کیسا ہے، اللہ اسے زندہ سلامت رکھے۔"

"ثنا صاحبہ آپ کا اِس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"لغو اور بے ہودہ۔" ثنا نے منہ بنا کر اختر کو جواب دیا۔

"کیوں؟"

"آپ یہ بتلائیے کہ ایک امیر آدمی جو آٹھ آدمیوں کو ملازم رکھ سکتا ہے کیا اُس کے گھر میں نمک کی ایسی کمی پڑ گئی کہ اُسے نمک کی فوری ضرورت آ گئی۔ آپ بھی، ایسے لوگ تو باقاعدہ اسٹور رکھتے ہیں۔ فضول اور لغو کہانیاں نہ جانے ان پرانے لوگوں کو ان فضول باتیں کرنے کی فرصت کہاں سے مل جاتی تھی۔ چلو تیمور چلیں۔" ثنا نے کہا اور تیمور کو اٹھا کر وہاں سے باہر نکل آئی۔

اُس کے ذہن میں رات کی منصوبہ بندیاں گردش کر رہی تھیں۔ اور وہ رات کے گیارہ بجنے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اختر، ذکیہ بیگم اور دادی اماں نے اُس کے اِس انداز کے بارے میں کچھ بھی سوچا ہو۔ اُس نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہیں کی تھی۔

دادی اماں کے کمرے سے اٹھ کر اختر اپنی خواب گاہ کی طرف چل پڑا۔ اِس کوٹھی کے ماحول سے وہ بہت خوش تھا۔ دلچسپ لوگوں کی دنیا آباد تھی، ہر کردار ایک نئی خوبی کا حامل، خالد ابھی تک اپنے کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ شہاب صاحب کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اختر نے لباس تبدیل کیا۔ اور بستر پر پہنچ گیا لیکن ابھی لیٹا بھی نہیں تھا کہ اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ نفیس اور بے آواز دروازے تھے لیکن اختر کے کمرے کے دروازے سے ایسی آوازیں بلند ہونے لگیں جیسے اُسے برسوں بعد کھولا گیا ہو چوں چرر چرر۔ دروازہ کھولنے والا خالد تھا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے کہا۔ "ہوں تو تم جاگ رہے ہو۔"

"یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے بھائی جان۔"

"تمہاری شرارتیں عروج پر ہیں۔" خالد نے ایک کرسی گھسیٹی لیکن اتنی زوردار آواز ہوئی تھی کہ خود خالد بھی چونک پڑا۔ پھر اُس نے اختر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھی خاصی بے عزتی کر دی اُس بے چاری کی۔"

"کس کی بھائی جان؟"

"سب حیرت سے اُسے دیکھ رہے تھے اور وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔" خالد نے کہا۔

"نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ثنا کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ۔ بھابی حضور میں نے کیا کیا؟"

"ایک بات بتا دوں اختر۔ وہ کافی تیز معلوم ہوتی ہے اگر اُسے علم ہو جائے کہ وہ آوازیں تمہارے منہ سے نکلی ہیں تو تمہارے لئے خیر نہیں چھوڑے گی۔"

"کون سی آوازیں بھائی جان۔" اختر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھ سے اُڑو گے۔ کیا ابھی کرسی کی چوں چوں تمہارے منہ سے نہیں نکلی تھی۔ اور کرسی کی آواز۔ اِسی طرح وہ بے چاری ڈنر ٹیبل پر پانی پی رہی تھی تو غٹ غٹ تم کر رہے تھے۔ میں جانتا ہوں۔ وہ تمام آوازیں تمہاری تھیں۔"

"کمال ہے بھائی جان، ابھی شادی ہوئی نہیں۔ اور آپ نے میرے اور بھابی بیگم کے درمیان اختلاف کرانا شروع کرا دیا۔ بھلا مجھے کیا ضرورت تھی، خود بھابی بیگم کے اعصاب ہی کشیدہ تھے۔" اختر نے بھولا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بدمعاش آدمی! تیری اِس صلاحیت کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تو منہ سے ہر طرح کی آوازیں نکال سکتا ہے اور اس طرح کہ دوسروں کو قطعی شبہ نہ ہو سکے۔ [illegible] کی کوشش کر رہا ہے۔ سوچ لے، بتا دوں گا ثنا کو۔"

"نہیں بھائی جان آپ کو خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ کریں۔ ذرا چلنے دیں۔ بھابی اور دیور کے درمیان، ویسے بھائی جان ایک بات میں آپ کو بتا دوں۔ لڑکی مجھے پسند ہے۔"

"ہُوں۔ مُمکن لگتا ہے مجھے لیکن ایک شرط ہوگی میری۔"

"کیا؟" اختر نے سوال کیا۔

"بھئی! باقی کسی کو اگر تو گھسنا چاہے تو میں اعتراض نہیں کروں گا لیکن شناء کا معاملہ ذرا مختلف ہے، خواہ مخواہ بیچاری پریشانی کا شکار ہو جائے گی۔"

کیا کہوں ان الفاظ پر بھائی جان کیا کہوں، بہرطور کم از کم یہ بات تو معلوم ہوئی کہ آپ کے دل میں بھابی بیگم کے لئے بڑی جگہ پیدا ہو گئی ہے۔"

"اب تو اپنا لیا ہے تجھ سے کیا چھپانا شناء، واقعی مجھے پسند آئی ہے۔" خالد نے کہا۔

"پسند تو مجھے بھی آئی ہے بھائی جان، لیکن بھابی اور دیور کے درمیان یہ راستے روکنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مجھے پسند نہیں آئے گا۔ اور بھابی بیگم تو پھر ہری مرچ ہیں۔ ہری مرچ۔ ذرا اس ہری مرچ کو ستانے میں لطف آئے گا۔ ایک وعدہ کریں بھائی جان، آپ اُن لوگوں کو میرا مطلب ہے یہاں اس کوٹھی میں کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائیں گے۔"

"کون سی بات؟"

"ارے یہی جس پر آپ اعتراض کر رہے ہیں۔"

"لیکن اگر کسی کو نقصان پہنچا تو۔ ۔ ۔"

"اس کا وعدہ، نقصان نہیں پہنچے گا۔" اختر نے کہا اور خالد مسکرانے لگا، اختر کی اس حیرت انگیز صلاحیت کے بارے میں خالد کو مکمل معلومات حاصل تھیں۔ کینیڈا میں اپنے ایک افریقی دوست سے اختر نے یہ فن سیکھا تھا۔ دنیا کی کوئی بھی شئے ہو، کوئی بھی جانور ہو اُس کی آوازیں حلق سے نکالنا اختر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ ہر طرح کی آوازیں اس طرح نکال لیتا تھا کہ دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ آواز کہاں سے آئی۔ اُس کی ہر جنبش کی ایک آواز پیدا کرنا اختر کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اور اس میں اختر کو کافی مہارت حاصل ہو گئی تھی چنانچہ ڈنر کی میز پر شناء کو جو حیرانی ہوئی تھی وہ اُس کے اعصاب کی کشیدگی نہیں تھی بلکہ گلاس میز پر ٹپکنے کی آواز، پانی کی غٹ غٹ درحقیقت اختر کے حلق سے نکل رہی تھی۔ اور شناء یہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ آوازیں اُس کی وجہ سے بلند ہو رہی ہیں اور یہی اختر کے فن کا کمال تھا۔ وہ اِن آوازوں کو اس خوبی سے نکالتا تھا کہ سننے والوں کے فرشتوں کو بھی اس کا گمان نہ ہو سکے۔ بارہا لطیفے ہوئے تھے، ایک بہت ہی مغرور قسم کی معزز انگریز خاتون جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ ایک بہت بڑی تقریب میں بیوقوفوں کی طرح اچھلتی کودتی پھر رہی تھیں۔ اور جہاں بھی اُن کے پاؤں پڑتے، وہاں اس طرح آواز آتی جیسے بلی کا کوئی بچہ اُن کے قدموں میں روندا جا رہا ہو۔ یہاں تک کہ وہ خاتون گر کر بیہوش ہو گئی تھیں لیکن درحقیقت یہ اختر کی طرف سے ایک سزا تھی اُن کے لئے جو خود کو بہت ہی اعلیٰ پائے کا انسان سمجھتی تھیں۔ اس قسم کے بے شمار واقعات تھے کوئی پاؤں زمین پر رکھے تو دفعتاً اُسے ایسی آواز سنائی دے جیسے پاؤں کے نیچے چوہا آگیا ہے، یا بلی کا بچہ آگیا ہے۔ ایسے موقع پر مضبوط سے مضبوط اعصاب کا انسان بھی بُری طرح اچھل پڑتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے خالد نے جو دروازہ کھولا تھا۔ اُس میں سے آواز نکلنے کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آواز درحقیقت اختر کے منہ سے بلند ہوئی تھی۔ اس طرح کی بے شمار شرارتیں اختر کی فطرت میں شامل تھیں۔ لیکن یہ سب کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں تھا بس وہ شوخ فطرت کا مالک تھا۔

"کیا باتیں رہیں شہاب صاحب سے بھائی جان؟" اختر نے موضوع بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"کوئی خاص نہیں بس مجھ سے میری مصروفیات کے بارے میں پوچھتے رہے۔ خاصے ذہین انسان ہیں کاروباری ذہن کے مالک۔"

"ہُوں! آپ کے کون ہوئے یہ؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے شادی کے بعد یقیناً وہ آپ کے چچیا سسر ہو لگے، اماں۔ بھائی جان بات پھر ذہن میں آجاتی ہے، یہ چچیا۔ بھلا بتایئے کوئی لفظ ہے چچیا بھی اور پھر سسر بھی توبہ توبہ رشتے کے نام اس انداز میں رکھے گئے ہیں کہ آدمی خود بخود عجیب و غریب بن جاتا ہے۔ منطق کی رُو سے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تجھے نیند آ رہی ہے، اس لئے اب تو مجھے یہاں سے بھگانا چاہتا ہے۔"

"کمال ہے بھائی جان منطق کی رُو سے آدمی کو اتنا ذہین نہیں ہونا چاہیئے۔"

"شب بخیر۔" خالد نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اختر پھرتی سے اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور اُس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ کہ خالد جلد از جلد اپنی خواب گاہ میں پہنچ جائے، کیونکہ آج رات کو پانچ نمبر میں ڈرامہ ہونے والا تھا۔ اور اختر اس ڈرامے سے الگ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خالد کے کمرے کی لائٹ آف ہو گئی تو اختر برق رفتاری سے اپنی جگہ سے اُٹھا

دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ کوٹھی کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ وقت تمام لوگوں کے اپنے کمرے میں جا گھسنے کا تھا لیکن اختر جانتا تھا کہ دو شخصیتیں ایسی ضرور ہیں جو کم از کم ابھی تک سونے کے لئے نہیں لیٹی ہوں گی۔ تاہم وہ یہاں رہ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ برق رفتاری سے تاریک گوشوں کا سہارا لیتا ہوا کوٹھی کے بیرونی حصے میں نکل آیا۔ اور پھر کوارٹروں کی اس قطار کی جانب چل پڑا جہاں کوٹھی کے ملازمین رہتے تھے۔ پانچ نمبر کا وہ اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں معزز خواتین بیرونی دروازے سے آئیں گی۔ کیونکہ اُن کے لئے کوئی مشکل نہیں تھی۔ لیکن خود اختر اسی عقبی کھڑکی کے نزدیک پہنچ گیا جسے وہ دیکھ چکا تھا۔ اور پھر کھڑکی سے اندر داخل ہونے میں اُسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک تاریک سی جگہ پناہ لے لی۔ اور اُن لوگوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باہر ہلکی ہلکی آہٹیں اُبھریں اور اختر چوکنا ہو گیا۔ پھر ایک مخصوص قسم کی ٹارچ کی روشنی کوارٹر میں نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی کچھ آوازیں اُبھریں۔

"میرا خیال ہے، یہ فٹنگ تھوڑی دیر میں مکمل کر لی جائے گی۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے ندرت کہ چمن کی ماں کو ہم کس طرح گھیر کر یہاں تک لائیں۔"

"اُس کی ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بس ذرا عصمت آپا سے ڈر لگتا ہے، وہ فوراً ہی ابو کی عزت یا ندان سے نکال کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے چمن کی ماں کو شیشے میں اُتارنا اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح انہیں پانچ نمبر کی طرف متوجہ کرنا ہی ہوگا۔"

"ارے میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔" ندرت نے دفعتاً چونک کر کہا۔ ٹارچ کی روشنی چاروں طرف بھٹک رہی تھی اختر کو اپنی جگہ تبدیل کرنی پڑی۔ پھر اُسے شناء کی آواز سنائی دی۔

"کیا ترکیب ذہن میں آئی ہے؟"

"ایک بات بتاؤ شناء کیا ضروری ہے کہ آج ہی چمن کی ماں کو یہاں کوارٹر میں کھینچ کر بلوا لیا جائے۔"

"نہیں بھئی ضروری تو نہیں ہے۔"

"تو پھر طفیلی خالہ زندہ باد۔" ندرت نے کہا۔

"مطلب! میں نہیں سمجھی۔"

"طفیلی خالہ ہماری معاونت کریں گی، اُن کے ذریعے چمن کی ماں کو یہاں بلوایا جا سکتا ہے۔"

"لیکن کیسے؟"

"اس کی ترکیب کر لی جائے گی۔ بعد میں دیکھیں گے پہلے اپنا کام مکمل کرو۔"

اختر کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کیا کام کر رہی ہیں۔ لیکن اُن کی گفتگو اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اور پھر اُسے علم ہو گیا کہ دیواروں پر مائیکروفون فٹ کئے جا رہے ہیں۔ اور یقیناً اُن سے آوازیں نشر کی جائیں گی۔ اب اُسے اس بھوت گھر کے بارے میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا لڑکیاں اس سلسلے میں کافی محنت کر رہی تھیں اور اُن کی شرارتوں کا شکار چمن کی ماں تھی۔ کافی دیر تک وہ مصروف رہیں پھر اپنی کاوشوں کا تجزیہ کرنے کے لئے انہوں نے پہلا اقدام کیا شناء کے حلق سے ایک بھیانک قہقہہ آزاد ہوا جو پورے مکان میں پھیل گیا۔ یہ بھوت کی آواز تھی چمن کی ماں کو یہاں بلا کر اس طرح ڈرایا جانا تھا۔ بہرطور اس پہلے قہقہے کے بعد طرح طرح کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں، کچھ آوازیں عجیب و غریب قدموں کی چاپ اور اختر اپنے کام کے لئے تیار ہو گیا شناء آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہی تھی۔

"میرا نام عبدالجلیل ہے عبدالجلیل جن۔ او رائے عورت تو نے میری آرام گاہ میں دخل اندازی کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب میں زندگی بھر تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ ہا ہا ہا۔" شناء نے خوفناک آواز میں قہقہہ لگایا۔

لیکن اُس وقت کوارٹر کی تاریک ہولناک فضا میں ایک اور قہقہہ اُبھرا جو مردانہ آواز میں تھا۔ یہ آواز نہ شناء کی تھی اور نہ ندرت کی۔ قہقہہ بے حد بھیانک تھا۔ اور دیر تک گونجتا رہا تھا۔ شناء اور ندرت چونک کر خاموش ہو گئی تھیں پھر ندرت کی آواز اُبھری۔

"شناء! یہ آواز کیا تیری تھی؟"

"ن نہیں تو۔ خدا کی قسم یہ تو مردانہ آواز تھی۔" شناء نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"مگر کس کی؟" ندرت نے کہا۔ ۔ ۔ اُسی وقت ۔ ۔ ۔

ایک اذیت ناک آواز آئی۔ جیسے کسی نے چھری گھونپ دی ہو۔ پھر ایک غرغراتی آواز سنائی دی۔

"عبدالجلیل حاضر ہے آپ کو۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے۔" یہ آواز بھیانک اور اجنبی تھی۔ ندرت نے ایک ہی چھلانگ لگائی تھی اُس کا جوتا اُتر کر پاؤں سے نکل گیا تھا۔ شناء اُس کے پیچھے دوڑ رہی تھی دونوں بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے سے ٹکراتی نکل بھاگی تھیں۔ دونوں کے ہوش خراب تھے، انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اختر کے پیٹ میں قہقہے مچل رہے تھے۔ "واہ بھابی بیگم واہ۔"

"بس اللہ کی۔ آپ نے تو عبدالجلیل سے ملاقات بھی نہیں کی۔"

اُس نے ندرت کا جوتا اُٹھایا اور چھپتا چھپاتا کوٹھی کی جانب چل پڑا۔ دونوں لڑکیوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔
اپنی خواب گاہ میں آکر اُس نے ندرت کے جوتے کو ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیا اور پھر بستر پر دراز ہو کر آپ ہی آپ دیر تک ہنستا رہا۔

●

فرینڈز آرگنائزیشن کا کاروبار ختم ہو گیا تھا۔ اور تفسیر کو اُس کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ تفسیر نے جواب میں لکھا تھا کہ فی الحال یہ کارروائیاں بند ہو گئی ہیں لیکن کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لیا جائے گا۔
شہاب صاحب چند روز تو ندا کی طرف سے مشکوک رہے تھے لیکن پھر اُنھیں یقین ہو گیا تھا کہ ندا اُن کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اُن کے ذہن و دل پر ندا کے کردار کا چھوٹا سا اثر ضرور پڑا تھا۔ لیکن جس ٹائپ کے آدمی تھے وہ ذرا مختلف تھا۔ وہ ندا کو ہر طور اپنے نقصان کا ذمّہ دار سمجھتے تھے بہت دیر تک اُنھوں نے یہ سوچا تھا کہ ندا اُن کی ایک کمزوری سے واقف ہو گئی ہے کسی ایسے مرحلے پر جہاں ندا سے اُن کا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اپنی زبان کھول بھی سکتی ہے چنانچہ اُس کے لئے کیا کرنا چاہئے لیکن اِس بات کو اُنھوں نے بہت زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ بس ذہن میں رکھ لیا تھا حالانکہ احسان صاحب کی طرف سے اُن پر کوئی ذمّہ داری عائد نہیں کی گئی تھی کاروبار کے جس شعبے کو وہ سنبھالنا چاہتے، اُسے نہایت خلوص اور اعتماد کے ساتھ اُن کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اور احسان صاحب پلٹ کر یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ شہاب صاحب نے اِس سلسلے میں کیا کیا۔ بھائی کا معاملہ تھا۔ شہاب صاحب کچھ بھی تھے لیکن کم از کم بھائی کا احترام کرتے تھے البتہ اُنھیں احسان صاحب کی اِس فراخدلی سے اختلاف تھا۔ اور وہ کوٹھی کو بھانت بھانت کے جانوروں کا چڑیا گھر بنانے کے حق میں نہیں تھے، لیکن یہ احسان صاحب کا شوق تھا۔ اور شاید واحد شوق اِس لئے کبھی کوئی اعتراض نہیں کر سکے تھے اور رفتہ رفتہ خود بھی اُن کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے تھے، لیکن صرف اِس حد تک کہ اُنھیں اِس سے غرض نہ ہوتی کہ کوٹھی میں کون کون آگیا ہے اور کتنے لوگوں کا اضافہ ہو گیا ہے وسیع و عریض جگہ تھی۔ اور اُنھیں خود کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی ویسے بھی کوٹھی سے اُن کا واسطہ بس واجبی سا تھا لیکن اپنے طور پر اُن کے ذہن میں ایک خیال ضرور تھا کہ وہ خود بھی اپنی کاوشوں سے بے پناہ دولت کمائیں اور اِس جذبے نے اُنھیں نیک و بد کی تمیز بھلا دی تھی۔ تفسیر جیسے بے شمار دوستوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے، ہر چند کہ خود بھی ذہین اور زیرک تھے اور جس کام میں ہاتھ ڈالتے اُس میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے تھے لیکن پھر بھی دوستوں کی مروت بعض اوقات آڑے آجاتی تھی۔ اُس وقت وہ اپنے کمرے میں بیٹھے فائل کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اور اجازت ملنے پر جو شخصیت اندر داخل ہوئی اُسے شہاب صاحب نے پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔
یہ رشید تھا! ہر چند کہ رشید نے اپنے حلیے میں نمایاں تبدیلیاں کر لی تھیں لیکن پھر بھی وہ اجنبی اجنبی سا نظر آتا تھا شکل و صورت کو تبدیل کرنا بہرصورت اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔
شہاب صاحب نے اپنے رویّے کو تھوڑا سا تبدیل کیا۔ اور خلافِ فطرت ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔
"آؤ رشید کہو خیریت تو ہے؟"
"جی شہاب بھائی! آپ کی بادشاہت میں بھلا ہم لوگوں کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ لیکن آپ نے تو ہمیں بھلا ہی دیا۔"
"بیٹھو کس کام سے آئے ہو میرے پاس؟" شہاب صاحب فضول باتوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے۔
"جی شہاب بھائی۔ کافی کام ہیں۔ اِس دُنیا میں لیکن آپ سے شکایت ہے۔ دوستی کی۔ رشید نے وفاداری کا وعدہ کیا۔ لیکن آپ نے اِس طرح بھلا دیا جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔"
"کوئی کام ہے مجھ سے؟" شہاب صاحب نے بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔
"دُنیا میں کس کو کس سے کام نہیں ہے شہاب بھائی اور پھر ایک نوجوان آدمی کے لئے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا گالی کے برابر ہوتا ہے، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے انسان کو، مگر رشید کی فطرت نہ تو کلرکی کے قابل ہے اور نہ ہی کسی چھوٹے موٹے دھندے کی، کوئی بڑا ہی ہاتھ مارنا چاہتا ہوں۔"
"مگر رشید میں نے جو کام تمھارے سپرد کیا تھا۔ اُسے تو تم نہیں کر سکے۔"
"صاحب ایک کام نہ کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدمی کسی قابل ہی نہ ہو۔ آپ کسی بھی دھندے سے لگا کر تو دیکھئے۔ آپ کا رشید ناکام نہیں رہے گا اور اگر اِس بار بھی ناکام رہے تو پھر سمجھئے کہ کسی کام کا آدمی نہیں ہے۔"
"ہوں!" شہاب صاحب گہری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ اِس آدمی کے بارے میں اُنھوں نے کئی بار سوچا تھا۔ شکل سے شاطر نظر آتا تھا۔ لیکن شہاب صاحب بس اِس بات سے خوفزدہ تھے کہ

اُس کا تعلق کوٹھی سے تھا اور وہ ذکیہ بھابی کا رشتہ دار تھا۔ اگر کبھی کسی سلسلے میں زبان کھول بیٹھا تو شہاب صاحب کے لئے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا، یہ سوچ کر ہی شہاب صاحب خاموش ہو گئے تھے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُنھوں نے کہا۔
"رشید مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
"خدمت آپ نہیں کریں گے شہاب بھائی۔ خدمت تو ہم کریں گے کوئی بھی کام بتائیے۔ دراصل اپنا دھندا ابھی چوپٹ پڑا ہوا ہے۔ جیب خرچ تک نہیں مل رہا کہیں سے، پریشانی کی تو بات ہے۔"
"کچھ پیسوں کی ضرورت ہے، کتنے پیسے چاہئیں؟"
"وہ شہاب بھائی اللہ کا دیا اور آپ کی عنایت سے ویسے تو سب ٹھیک ٹھاک ہے، پیسوں کی ضرورت کسے نہیں رہتی۔ بس کچھ نہ کچھ ملتے ہی رہنا چاہئے، مگر قسم اللہ کی حرام کمانے کو دل نہیں چاہتا۔ امداد نہیں چاہئے کوئی کام دیجئے۔"
"بھئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کام کر سکو گے میرا؟"
"ہمیں آپ نے سمجھ تو لیا ہے، اب گھر کی لڑکی تھی وہ ندا، اُس پر سختیاں کیا کرتے آپ خود بتاؤ، نرمی سے ہی کام چلانے کی کوشش کی تھی، پھر آپ کی بات بن گئی ہمیں اِس کا اندازہ ہو چکا ہے۔ کسی دُشمن کا پتہ بتاؤ۔ اور پھر رشید کے ہاتھ دیکھو۔" شہاب صاحب پُرخیال انداز میں تھوڑی کھجانے لگے پھر اُنھوں نے کہا۔
"نہیں رشید ابھی ایسا کوئی کام میرے پاس نہیں ہے۔ ویسے ذکیہ بھابی کے عزیز ہونے کی حیثیت سے تم میرے لئے بھی اہمیت رکھتے ہو، یہ کچھ پیسے رکھ لو اپنی جیب میں ضرورت پڑے تو اور مانگ لینا۔ تمھارے لئے کوئی کام نکالوں گا، لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی کام اگر میں تمھارے سپرد کروں تو تم اُسے انجام دے لو گے۔"
"کہا ناجی ایک چانس اور دیں، اُس کے بعد دیکھ لینا رشید پھر دوبارہ آپ سے اِس بارے میں نہیں کہے گا۔"
"میرا مسئلہ ندا ہی ہے رشید۔" شہاب صاحب نے کہا۔ اور رشید چونک پڑا۔
"کیوں اور کوئی خاص بات ہوئی ہے؟"
"نہیں، اگر تم نے کوٹھی کے معاملات پر گہری نگاہ رکھی ہے تو تمھیں یہ بات ضرور معلوم ہو چکی ہو گی کہ ندا ہمارے لئے اجنبی ہے۔ اِس کا ہم لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بس انیقہ کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اور اُس وقت سے یہیں رہ رہی ہے۔ شانہ کی دوست ہے اِس لئے اُس کا احترام بھی کیا جاتا ہے، لیکن وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ اِس کے بارے میں ابھی تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ تم اگر اِس کے بارے میں یہ معلوم کر لو کہ ندا کون ہے، اور اُس کا تعلق کہاں سے ہے تو میں تمھیں اِس کے لئے ایک معقول معاوضہ ادا کروں گا۔"
"یہ چھوٹی سی بات ہے یعنی جاسوسی کرنی پڑے گی۔ کر لیں گے۔ شہاب بھائی کریں گے آپ اطمینان رکھو۔ بھلا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے بس ذرا دیر لگ جائے گی۔"
"اِس کی پرواہ نہیں۔ بس میں چاہتا ہوں کہ ندا کا کوئی کمزور پہلو میرے ہاتھ میں رہے تاکہ اگر کبھی وہ میرے مدمقابل آنے کی کوشش کرے تو میں بھی اُس کی گردن پر انگوٹھا رکھ سکوں۔"
رشید نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ "بس تو یہ اپنا کام ہے آپ فکر ہی نہ کرو۔"
شہاب صاحب کے دیئے ہوئے نوٹ رشید نے جیب میں رکھ لئے تھے اور اِس کے بعد وہ سلام کر کے شہاب صاحب کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اُس نے ندا کے بارے میں سوچا۔ یہ حقیقت تھی کہ جب شہاب صاحب نے پہلی بار اُسے سرخ فائل کے لئے مخصوص کیا تھا تو اُس کے دل میں ندا کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ خیر دین نے اُسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ اور اُس نے خیر دین سے بہانہ کر دیا تھا کہ وہ ندا سے محبت کرتا ہے اور اُس کی تصویر کی تلاش کے لئے اُس کے کمرے میں آیا تھا۔ لیکن اُس کے بعد نجانے کیوں رشید کے دل میں ندا کے لئے گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔ ویسے بھی ندا ایک عجیب و غریب حُسن کا نمونہ تھی۔ اُسے دیکھنے والے اُس پر غور کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، نہایت حسین خدوخال اور انتہائی متناسب جسم اُس کی شخصیت میں ایک پُروقار تمکنت پیدا کرتا تھا۔ اور رشید کو جب اِس پر غور کرنے کا موقع مِلا تو اُسے احساس ہُوا کہ وہ نہایت حسین لڑکی ہے۔ طفیلی بیگم سے جو کچھ اُس نے کہا تھا غلط نہیں کہا تھا۔ جُوں جُوں وہ ندا کے بارے میں سوچتا۔ ندا اُسے اپنے ذہن میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی لیکن بہرطور جاہل سا آدمی تھا۔ اپنے آپ کو سمجھنے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتا تھا جو زندگی اُس نے گزاری تھی اُس میں کہیں کسی سنجیدگی کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ اِس مسئلے کو بھی وہ اُسی انداز میں دیکھ رہا تھا اور جب شہاب صاحب نے چند نوٹ اُس کے حوالے کر کے اُسے ندا کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے کہا تو اُس نے اُسے بُرا بھی نہ محسوس کیا۔ ندا کے بارے میں جتنا کچھ معلوم ہو چکا تھا اُس سے زیادہ معلوم کرنے کی خواہش خود اُس کے دل میں بیدار ہو گئی۔ اور وہ یہ سوچتا ہُوا اپنے کمرے میں آگیا کہ ندا کے بارے میں حقیقت کیسے جانی جائے۔"

طفیلی بیگم موجود تھیں۔ انھوں نے سنجیدہ نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا۔ کوئی جوڑ توڑ کام نہیں کر رہا تھا۔ ابھی تک کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ بس ذکیہ بیگم کی عنایتوں کے سائے میں پروان چڑھ رہی تھیں۔ کھانا پینا، اخراجات اور کچھ دوسری ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ لیکن یہی سب کچھ زندگی تو نہیں تھی۔ البتہ زمانہ ساز تھیں۔ دنیا کو اچھی طرح جانتی تھیں اس لئے کوئی ٹھوس حیثیت اختیار کئے بغیر احمقانہ انداز میں ذکیہ بیگم سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں اگر رشید کسی طرح ثناء کو قبضے میں کر لے تو پھر اُن کے گفتگو کرنے کا انداز بدل سکتا تھا اور وہ ذکیہ بیگم سے کہہ سکتی تھیں کہ بی بی عزت برقرار رکھنی ہے تو وہی کرو جو ہم چاہتے ہیں ورنہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو جائے گی۔ لیکن اتنا وہ بھی جانتی تھیں کہ اس راستے تک آنے کے لئے انھیں بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑے گا۔ چنانچہ ٹھنڈا کر کے کھانے کی خواہش مند تھیں۔ رشید اندر پہنچا تو انھوں نے گہری نگاہوں سے رشید کو دیکھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو مجنوں؟" اُن کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"واہ امّاں، تُو تو دلوں تک جھانک لیتی ہے۔ صحیح نام رکھا ہے تُو نے میرا۔" رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیٹا مجنوں بنو لیکن صحیح لیلیٰ کا انتخاب تو کر لو۔"

"ارے ماں تیرا بیٹا ہوں، کچھ دیکھ کر ہی کروں گا۔ تُو پروا کیوں کرتی ہے؟"

"اچھا، تو تُو نے اپنا ارادہ بدل لیا نا؟"

"دیکھ امّاں، جو بات تُو نے کہی تھی وہ میرے دل کو بھا گئی۔ سچی بات یہ ہے کہ پہلے دولت پھر محبت۔ ندا مجھے اچھی ضرور لگتی ہے امّاں۔ لیکن اس بے چاری کے پاس رکھا کیا ہے۔ جب کہ ثناء سے شادی کرنے کے بعد میں ایسی دس ندائیں پال سکتا ہوں، لیکن امّاں کچھ باتیں ضرور ہیں۔ اور تجھے میری مدد کرنا ہو گی اس سلسلے میں۔"

"تُو میرے کہنے پر چلے گا تو کیا نہیں کروں گی تیرے لئے۔" طفیلی بیگم نے رشید کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"امّاں! ثناء پر تو میں نے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں۔ اور تُو اس بات کا اطمینان کر لے کہ رشید جس کام میں ہاتھ لگائے گا اُسے پورا کر کے ہی چھوڑے گا مگر ایک اور مسئلہ ہے جس میں تجھے میری مدد کرنی ہے۔"

"ہاں، ہاں بول بول۔" طفیلی بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

"امّاں! ندا کے بارے میں کچھ معلوم ہے تجھے؟"

"پھر ندا... تب ہی تو کہوں تجھے ندا سے کرنا کیا ہے بیٹا... ایک بچے کی ماں ہے۔ ممکن ہے شوہر بھی زندہ ہو۔ گھر سے بھاگ آئی ہو۔ ممکن ہے شوہر پسند نہ ہو۔ ارے مجھے تو بڑی خبطی لڑکی لگتی ہے وہ۔ کیوں بار بار اُس کا نام میرے سامنے لیتا ہے؟"

"دیکھو امّاں! ابھی تُو نے وعدہ کیا تھا۔ میں تیرے لئے کام کر رہا ہوں تو میرے لئے کام کر۔ یہ بہت ضروری ہے امّاں۔ بات ندا سے محبت کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ معاملہ ہے بس پورا کاروباری۔"

"کاروباری؟" طفیلی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں کتنی بار بولوں تجھے۔ اب تو میرا دماغ خراب کر رہی ہے۔ کھسک گیا تو الٹی سیدھی سنا کر رکھ دوں گا۔"

"کون سا کاروبار کر رہا ہے تُو؟"

"یہ تجھے بتانے کی بات نہیں ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر۔ کیا کبھی کسی سے ندا کے بارے میں بات چیت ہوئی ہے تیری؟"

"بہت سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

"میرا مطلب ہے کسی کو یہ پتہ نہیں ہے کہ وہ کون ہے، اور کہاں سے آئی ہے۔ بچے کا باپ کہاں مر گیا۔ اُس کا کوئی ہے یا نہیں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں معلوم ہوئی اور نہ کسی نے اس کی کرید کی ہے۔ توبہ!" طفیلی بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہی کام تجھے کرنا ہے امّاں، میرے لئے ضروری ہے۔ اگر تجھے پانچ سو روپے مل جائیں تو کیا تو اس کام کو کرنا پسند نہیں کرے گی؟"

"کون دے گا بیٹا؟"

"میں دوں گا تجھے۔ بشرطیکہ تُو یہ معلوم کر لے کہ ندا کے ماں باپ کون ہیں اور اُس کا شوہر کہاں گیا۔ یہ بات تو معلوم کر لے امّاں۔ پانچ سو روپے کھرے بلکہ تُو چاہے تو میں تجھے سو روپے ایڈوانس بھی دے سکتا ہوں۔"

"تُو دے۔" طفیلی بیگم نے بیٹے کی طرف للچائی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور رشید نے جیب سے سو روپے کا کڑکڑاتا نوٹ نکال کر طفیلی بیگم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ارے سچ مچ... سچ کہہ رہا ہے تُو! نوٹ تو اصلی ہے نا؟"

"تجھے جعلی نوٹ دوں گا امّاں! کھسک گئی ہے اللہ قسم ساٹھ سال کی ہو گئی ہے تو۔"

"ہاں بیٹا اپنے ہی یہ باتیں نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا۔ ارے تجھ سے عمر میں چودہ سال بڑی ہوں۔ اب جتنی سال کی چاہے کہہ دے، ساٹھ کی کہہ دے ستر کی کہہ دے، وقت نے بوڑھا کر دیا ہے بیٹا ورنہ آنکھوں سے اچھی ہوتی اب بھی۔ پر ٹھیک ہے جو اللہ کی مرضی۔

زمان دنیا سے گئے تو دنیا ہی لے گئے۔ چھوڑ ان باتوں کو یہ بتا پیسے کہاں سے آ گئے؟"

"پھر تُو نے بک بک لگائی۔ یہ تیرے پوچھنے کی باتیں ہیں۔ بس دھندا ہے اپنا۔ ندا کے لئے میں نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے وہ کر اور اُس کے بعد چار سو روپے کے نوٹ اور لے لے مجھ سے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، میں فوراً ہی کوشش کروں گی۔" طفیلی بیگم نے سنجیدگی سے کہا اور رشید مسکرانے لگا۔

ثناء اور ندرت پانچ نمبر سے نکل کر ایسی بھاگیں کہ پھر کوٹھی میں آ کر ہی دم لیا۔ دونوں کے سانس پھولے ہوئے تھے۔ یہ تو شکر تھا کہ رات کا وقت تھا اور کوٹھی کے تمام لوگ سو رہے تھے ورنہ خواہ مخواہ ان کے گرد مجمع جمع ہو جاتا۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ ندرت ثناء کے کمرے میں آ کر ایک صوفے پر دھڑام سے گر پڑی ثناء خود اپنے بستر پر جا بیٹھی تھی۔ سانس دھونکنی بنے ہوئے تھے۔ چند لمحات وہ اپنی سانسوں کو اعتدال پر لاتی رہیں پھر ندرت نے ثناء کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کیا تھا ثناء... یہ سب کیا تھا؟"

"اللہ جانے خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔ پانچ نمبر میں۔ پانچ نمبر میں تو کبھی ایسی کوئی بات سنی بھی نہیں تھی۔"

"لیکن کچھ نہ کچھ تھا ضرور! ارے وہ آواز تُو نے نہیں سنی تھی ثناء! وہ کہہ رہا تھا کہ عبدالجلیل حاضر ہے۔ مرد کی آواز تھی اور کیسی بھیانک تھی۔"

"بالکل، میں نے اچھی طرح سنی تھی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے، میں نے ہی اپنے آپ کو عبدالجلیل جن ہی کہا تھا اور وہاں سچ مچ کسی عبدالجلیل ہی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ندرت، میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا...."

ندرت پریشان بیٹھی ثناء کو دیکھتی رہی پھر تعجب سے بولی۔

"کبھی ایسی کوئی بات سننے میں بھی نہیں آئی۔ پانچ نمبر کافی عرصے سے خالی پڑا ہے لیکن کچھ بھی تو نہیں سنا۔ آخر ہم بھی تو سامنے ہی رہ رہے ہیں۔ دروازے پر تالا ضرور پڑا رہتا ہے مگر کبھی کوئی ایسی ویسی بات آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔"

"واقعی ندرت!" ثناء گہری سانس لے کر بولی۔

"تعجب ہے، بے حد تعجب ہے۔" ندرت خاموش ہو کر قالین کو گھورتی رہی اور پھر آہستہ سے بولی۔ "ثناء یہ کسی کی شرارت تو نہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟" ثناء چونک کر بولی۔

"ہم نے جن کی ماں کے لئے یہ ساری تیاریاں کی تھیں۔ لیکن کیا کوئی اور ہمارے اس راز سے واقف ہو گیا ہے؟"

"اس کوٹھی میں... اس کوٹھی میں کسی کی یہ مجال ہے کہ ثناء سے ٹکرا سکے۔" ثناء تمتما کر بولی۔

"بی بی تم کچھ بھی کہو عبدالجلیل جن تو تم سے ٹکرا ہی گیا...." ندرت نے مسخرے پن سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ندرت، یہ چکر ہے ضرور۔ ورنہ پانچ نمبر یقیناً آسیب زدہ ہے۔"

"ہائے میرا جوتا بھی وہیں رہ گیا۔" ندرت نے اپنے اکلوتے جوتے کو دیکھتے ہوئے کہا جسے پہن کر تیز بھاگتے ہوئے کافی دقت ہوئی تھی۔

"جوتے کے لئے مت مری جا۔ کل نکال لیں گے۔"

"کون، ہم نکال لیں گے؟" ندرت نے سوال کیا اور آنکھیں پھاڑنے لگی۔ "کیا تم دوبارہ اس کوارٹر میں داخل ہونے کی ہمت کر سکتی ہو؟"

"دن کی روشنی میں کیا ہے، ویسے وہاں اور جو کچھ چھوڑ آئے ہیں اسے وہاں سے ہٹانا ضروری ہے۔ ورنہ لوگ اس کے بارے میں سوچیں گے اور پھر قیمتی چیزیں ہیں۔" وہ بولی۔

"مگر ثناء سچی بات ہے کہ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔"

"ارے واہ لڑکی۔ بس اتنی ہی ہمت ہے ایک جن سے ڈر گئی۔"

"رات کا وقت ہے ثناء اور تو جانتی ہے کہ یہ آتشی مخلوق دروازوں سے بھی پار ہو سکتی ہے اس کی توہین مت کرو۔" ندرت نے کہا اور ثناء درحقیقت خوف زدہ ہو گئی۔

"نم... میں توہین کب کر رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے مگر تعجب ہے۔"

"غور کرنا پڑے گا ثناء، ایک بات دل کو کھٹک رہی ہے۔ آخر ہمارے منہ سے عبدالجلیل ہی کا نام کیوں نکلا اور اس نے اپنا نام عبدالجلیل ہی کیوں بتایا؟"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں یار ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی خود میری بھی حالت خراب ہے۔ بہرطور یہ مذاق ہمیں مہنگا بھی پڑ سکتا تھا۔ اگر وہ جن بھائی کسی اور چکر میں مبتلا ہو جاتے تو نکلنا بھی مشکل ہو جاتا۔" ندرت نے کہا۔

"ارے واہ! اب ایسا بھی نہیں ہے۔" ثناء پھر اکڑ کر بولی۔

"پھر بولی تو... پھر بولی۔" ندرت نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"تو میں کوئی برا تھوڑی ہی کہہ رہی ہوں۔" ثناء خوف زدہ

نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ کر کہنے لگی اور ندرت کے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔

"دانت پھاڑے جا رہی ہے۔ میں کہتی ہوں آخر یہ سب کیا تھا۔ کس طرح معلوم کیا جائے۔ کون ہو سکتا ہے اگر کسی کی شرارت ہوئی تو؟"

"خدا جانے بہرطور ہم تحقیقات ضرور کریں گے کہ کون ہمارے اس راز کا شریک بن گیا؟" شناء نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ندرت کہنے لگی۔

"تو مجھے چھوڑنے چلے گی کوارٹر تک۔ میں تو واقعی مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔"

"نہ بابا میں نہیں جاؤں گی مجھے وہاں سے اکیلے واپس آنا پڑے گا۔"

"تو میں یہاں سے اکیلی جاؤں گی اور پھر اس حالت میں ایک جوتا پاؤں میں ہے دوسرا غائب ہے۔ عصمت باجی پچھلی رات ہی مجھے سرزنش کر چکی ہیں۔ خیر انھیں تو یقین دلادوں گی کہ چمن سے ملنے نہیں گئی تھی بلکہ شناء کے پاس گئی تھی۔ لیکن یار شناء ہمت کر ذرا سی۔ مجھے میرے کوارٹر تک چھوڑ دے یا پھر ایسا کر تو بھی رات کو میرے کوارٹر ہی میں سو جا۔"

"سونے میں کوئی اعتراض نہیں ہے ندرت لیکن قسم خدا کی اکیلی واپس نہیں آسکوں گی وہاں سے، یار ایسا کیوں نہیں کرتی کہ تو یہیں رہ جا۔"

"قتل کر دی جاؤں گی صبح کو۔" ندرت نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"بھئی میری پوزیشن مشکوک ہے اپنے چمن کی وجہ سے سچ کہوں گی لیکن جھوٹ سمجھا جائے گا۔ عصمت آپا سنجیدہ ہو جائیں گی۔ اور میں یہ نہیں چاہتی۔"

"اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ میں باہر دروازے پر کھڑی رہوں گی۔ جب تو اندر داخل ہو جائے گی تو واپس چلی آؤں گی۔"

"چل ٹھیک ہے یہی صحیح اب میں چلوں بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"مجھے... مجھے تو اب کمرے میں بھی ڈر لگے گا۔" شناء نے کہا۔

"ہمت کر یار ہمت کر چل مجھے چھوڑ دے ورنہ میری مصیبت آجائے گی۔" شناء ندرت کے ساتھ باہر نکل آئی اور پھر وہ گیٹ پر کھڑی رہی تھی۔ جب ندرت اپنے کوارٹر میں داخل ہو گئی تو شناء بھی واپس چلی آئی تھی لیکن اس کے [illegible]ے پر غور و فکر کے آثار تھے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پانچ [illegible] آسیب زدہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی اس کا تذکرہ ضرور کرتا اور پھر عبدالجلیل جن یہ تو بہت عجیب و غریب بات تھی۔ رات کو شناء کو ٹھیک سے نیند بھی نہیں آسکی تھی صبح پانچ بجے سوئی تو نو بجے جاگی۔ ناشتہ بھی نہیں کر سکی دوسرے لوگوں کے ساتھ۔ اس کی ہدایت تھی کہ اگر وہ گہری نیند سو رہی ہو تو کوئی اسے جگانے کی کوشش نہ کرے اور بہرطور بعض اوقات اس کی یہ بات مان بھی لی جاتی تھی بلکہ زیادہ تر مان لی جاتی تھی۔ کیونکہ اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی اور احسان صاحب بھی اس کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ نو بجے اٹھی تو طبیعت پر کسل طاری تھی۔ غسل خانے میں جا کر غسل کیا تو رات کے واقعات یاد آگئے اور وہ خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی لیکن عبدالجلیل کا کہیں وجود نہیں تھا۔ پھر اس نے گردن جھٹکی اور باہر نکل آئی اب ذرا ہوش کے عالم میں سوچ سکتی تھی۔ ملازمہ نے دروازے سے جھانک کر چائے کے لئے پوچھا تو شناء نے کہا کہ پورا ناشتہ یہیں لے آیا جائے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے میں ناشتہ کر رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے تیمور کو جگایا جو خود بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھلا کر ناشتہ کرایا اور پھر اسے گود میں لادے ہوئے باہر نکل آئی۔ دور سے پانچ نمبر کو دیکھا تو چہرے پر غور و فکر کے آثار پھیل گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ندرت کے کوارٹر کے نزدیک پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ندرت کو آواز دی اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی ندرت صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔

"آؤ شناء آؤ بیٹھو۔ بس ابھی دو منٹ میں فارغ ہوئی۔" ندرت سنجیدگی سے بولی۔ شوکت جہاں شناء سے سب کی خیریت پوچھنے لگیں اور شناء انھیں ادب سے جواب دیتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ندرت فارغ ہو گئی تھی۔ وہ شناء کے ساتھ اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"کوئی حل ملا شناء؟" ندرت نے سوال کیا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ رات کو بھی ٹھیک سے نیند تک نہیں آئی۔ کچھ ہونا چاہیئے ندرت، یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔"

"بھئی میں بھی تم یقین کرو رات بھر سکون کی نیند نہیں ہو سکی اس وقت بھی سر میں شدید درد ہو رہا ہے، چائے بنا کر لاؤں شناء؟"

"بیٹھو یار چائے وائے بعد میں پی لیں گے، پہلے یہ بتاؤ اب کیا پروگرام ہے۔ چلو گی پانچ نمبر میں؟"

"ہمت تو نہیں پڑ رہی۔" ندرت نے کہا۔

"لیکن ہمت کرنی ہوگی، کم از کم وہاں سے سامان تو نکال لیا جائے۔"

"ہاں بھئی دن کا وقت ہے ممکن ہے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ تمہاری

مرضی ہے، آؤ چلتے ہیں۔" ندرت نے ہمت کر کے کہا اور دونوں کوارٹر سے باہر نکل آئیں۔ پانچ نمبر چند گز کے فاصلے ہی پر تھا۔ دروازے تک پہنچتے ہوئے ان کے قدم بُری طرح لڑکھڑا رہے تھے، لیکن بہرطور ہمت کر کے شناء نے دروازہ کھولا اور تیمور کو سینے میں بھینچے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ جان نکلی جا رہی تھی کوارٹر سنسان اور خاموش تھا۔ ہر لمحے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ابھی کسی طرف سے کوئی نکل کر آئے گا اور ان کی گردنیں دبوچ لے گا لیکن دونوں ہی ہمت کر رہی تھیں۔ پھر وہ کوارٹر کے اس کمرے میں پہنچیں جہاں انھوں نے مائیکروفون لگائے تھے، ندرت اپنا جوتا تلاش کرنے لگی۔ لیکن پورا کوارٹر چھان مارا گیا۔ اور اسے جوتا نہیں ملا۔ شناء تیمور کو ایک جگہ بٹھا کر وہ مائیکروفون سمیٹنے لگی تھی جو وہ یہاں لائی تھی۔ ندرت نے دفعتاً کہا۔

"شناء ذرا ادھر آؤ۔" اور شناء چونک کر اسے دیکھنے لگی اس نے جلدی سے تیمور کو اٹھایا اور ندرت کے قریب پہنچ گئی۔ ندرت عقبی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ کھڑکی اندر سے بند نہیں تھی؟"

"کیا مطلب؟"

"اس کھڑکی سے کوئی بھی آسانی سے اندر آسکتا ہے۔"

"ہوں! آ تو سکتا ہے ایک منٹ۔" شناء نے کہا اور ندرت کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا۔

"کیا ہوا... کیا ہوا؟" ندرت خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"رکو... رکو اپنی جگہ رکو۔" شناء نے کہا اور کھڑکی کے نزدیک بیٹھ کر فرش کو دیکھنے لگی۔ فرش پر جوتوں کے نشان نمایاں تھے اور یہ مردانہ جوتے ہی تھے، ندرت بھی اب اس جانب متوجہ ہو گئی اور پھر وہ دونوں جوتوں کے نشانات پورے کوارٹر میں تلاش کرتی پھریں۔ کافی دن سے کوارٹر استعمال نہیں ہوا تھا اس لئے فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی اور اس تہہ پر انھیں جوتوں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ انھوں نے اپنے قدموں کے نشانات بھی دیکھے اور پھر یہ اندازہ لگانے میں انھیں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ کوئی اس کھڑکی کے راستے اندر آیا انھیں دہشت زدہ کیا اور یہاں سے واپس چلا گیا۔ لیکن کون؟ کس کی اتنی جرأت ہو سکتی تھی اب ان کے ذہن سے خوف کسی قدر نکل گیا تھا۔ ندرت پُرخیال انداز میں رخسار کھجا رہی تھی۔ اور شناء جوتے کی ٹھوکر سے فرش کو رگڑ رہی تھی۔ چند لمحات کے بعد شناء نے کہا۔

"ہمارا یہ خیال غلط ہے ندرت کہ کوارٹر آسیب زدہ ہے بلکہ بس یوں سمجھ لو کہ ہمارے راز کا انکشاف ہو گیا ہے، اور کسی نے... کسی نے"

اور شناء جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کون ہو سکتا ہے۔ کس کی اتنی مجال ہوئی اس سے پہلے تو یہاں کوئی اتنا باہمت نہیں تھا۔"

"کھوج لگانا پڑے گا شناء، کھوج لگانا پڑے گا۔" ندرت دوبارہ بولی اور شناء ایک بار پھر رک کر جوتوں کے نشانات کو غور سے دیکھنے لگی۔ "کمبخت اندازہ نہیں ہوتا کہ کس قسم کے جوتے ہیں۔ ذرا ان کا سائز تو ناپو ندرت۔" شناء نے کہا۔ ندرت نے اپنے لباس میں سے ایک دھاگہ نکالا اور جوتے کا سائز ناپنے لگی پھر اس نے دھاگہ اس جگہ سے توڑا۔ اور اسے لپیٹ کر شناء کے حوالے کر دیا۔

"سراغ لگایا جائے گا اور جس کسی نے بھی یہ حرکت کی ہے بس یہ سمجھو اس کی شامت آگئی۔"

"تو پھر اب اس پروگرام کے بارے میں کیا خیال ہے۔" ندرت نے پوچھا۔

"نہیں ندرت ابھی اس پروگرام کو ملتوی کرنا پڑے گا کیونکہ کوئی اور بھی ہمارے راز سے واقف ہو گیا ہے، سارا کیا دھرا چوپٹ ہو جائے گا۔ پہلے تو یہ پتہ لگانا چاہیئے کہ یہ صاحب کون ہیں؟"

"ذہن دوڑاؤ کس کے بارے میں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے۔"

"میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ دراصل کوٹھی کے تمام لوگ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے میرے منہ لگنے کی کوشش کی تو منہ کی کھائیں گے۔ پھر یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔" کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھیں یہ دونوں پانچ نمبر سے باہر نکل آئیں چمن کی ماں دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ ندرت کو دیکھ کر منہ بنایا اور واپس اندر چلی گئی۔ شناء کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"یہ ساس صاحبہ تو تم سے ابھی سے سخت ناراض ہیں آگے نہ جانے کیا ہوگا؟"

"لعنت بھیجو ان پر ان کی تو ایسی طبیعت ہری کی جائے گی کہ یاد رکھیں گی زندگی بھر لیکن پہلے اس گستاخ کے بارے میں ہمیں اطلاع ملنی چاہیئے جس نے ہمارے اس پروگرام کو فیل کر کے اپنی موت کو آواز دی ہے۔"

"گھر میں کوئی کام ہے؟"

"نہیں صبح سے لگی ہوئی ہوں۔ سب کچھ کر کے رکھ دیا ہے کیوں؟"

"آؤ گھاس پر چل کر بیٹھیں گے۔" شناء نے کہا اور ندرت گردن ہلا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ کافی دیر تک وہ دونوں بیٹھی اس موضوع پر گفتگو کرتی رہی تھیں۔

۱۵ سُرخ فائل کا مسئلہ حل ہونے کے بعد تفسیر کے دفتر میں رُدا کے لئے کوئی مشکل باقی نہیں رہی تھی وہ اپنا کام اور زیادہ محنت اور ہمت سے کرنے لگی تھی فرینڈز آرگنائزیشن کا مسئلہ تقریباً ختم ہوگیا تھا کئی بار رُدا نے اِس سلسلے میں کوششیں کیں کہ نئی صُورتِ حال معلوم کرے تفسیر کے خطوط بھی آتے رہتے تھے اُس نے مجرمانہ انداز میں اُن خطوط کو کھول کر دیکھا تھا لیکن فرینڈز آرگنائزیشن کے سلسلے میں کوئی بات دوبارہ اُس کے علم میں نہیں آئی تھی۔ بہرطور اُسے خوشی تھی کہ کم از کم شہاب صاحب کو اِس اُلجھن سے نکالنے میں اُس نے نہایت نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ اگر کوئی دِقت پیش آجاتی تو پورا گھر بدنام ہو جاتا اور ثناء کے گھر کے لئے کوئی بدنامی وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

بہرطور اب اُسے مکمل طور سے سکون تھا البتہ اپنے مستقبل کے بارے میں کبھی کبھی وہ خاصی مُضطرب ہو جاتی تھی لیکن یہ بات بھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کراچی آنے کے بعد اگر اُسے احسان صاحب کا گھرانہ نہ ملتا تب بھی بہرطور ملازمت تو کرنی ہی تھی یہ دُوسری بات ہے کہ وہاں سے بہت سے منصُوبے لے کر آئی تھی اور سوچا تھا کہ کراچی جا کر دولت کے انبار لگا لے گی۔ فی الحال اِس ملازمت پر ہی اکتفا کرنی پڑ رہی تھی۔ اکثر دفتر میں بیٹھ کر وہ سوچتے سوچتے گم ہو جاتی۔ یہ تصوّر اُس کے ذہن میں اُبھرتا کہ تیمور کے اچھے مستقبل کے لئے اِحسان صاحب کے گھرانے کا اِحسان ساری زندگی تو نہیں لیا جا سکتا خود بھی کچھ کرنا ہوگا۔ تنخواہ پُوری کی پُوری بچ جاتی تھی کیونکہ تمام اخراجات کوٹھی ہی سے پُورے ہو جاتے تھے بس اگر کچھ خریداری کی تو تیمور کیلئے چند جوڑے کپڑے اور اپنے لئے ایک آدھ جوڑا اور جیسا جوڑا وہ اپنے لئے لیتی تھی ویسا ہی ثناء کے لئے بھی خرید لیتی تھی اِس بار اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ نُدرت کو بھی کچھ تحفہ دے گی۔ زندگی ابھی اِس انداز میں گزر رہی تھی اور اُس کے سامنے ایسا کوئی راستہ نہیں آیا تھا۔ جس پر وہ آگے بڑھ کر کسی شاندار مستقبل کا آغاز کرتی۔ لیکن مایُوس نہیں تھی۔ بارہا یہ بھی سوچا اُس نے کہ شہاب صاحب سے اپنی اِس خواہش کا اِظہار کرے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ شہاب صاحب اُسے بلیک میلنگ بھی کچھ سکتے ہیں۔ وہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اُن سے کی جانے والی فرمائش میں کوئی گہرائی پوشیدہ نہ ہو چنانچہ یہ سوچ کر اُس نے آج تک شہاب صاحب سے دِل کی بات نہیں کہی تھی۔ رقم بینک میں جمع ہو رہی تھی لیکن ابھی وہ اِتنی نہیں تھی کہ اُس سے کچھ کیا جا سکتا۔ اُس شام جب وہ دفتر سے باہر نکلی تو سڑک پر پھر رشید ٹکرا گیا، سلام کر کے اُس کے نزدیک آکھڑا ہُوا تھا۔ رُدا کو نہ جانے کیوں اُس شخص سے چِڑ سی ہو گئی تھی۔ صُورت شکل سے تو ٹھیک لگتا ہی تھا لیکن بے غیرت بھی تھا رُدا نے جس طرح اُس کی پذیرائی کی تھی اُس کے بعد رشید کو اُس کے نزدیک آنا بھی نہیں چاہیئے تھا لیکن کوٹھی میں بھی رُدا کئی بار محسوس کر چکی تھی کہ رشید ضرورت سے زیادہ اُس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوٹھی کے مُعاملات میں رُدا کی کیفیت بالکل مختلف تھی ثناء اُسے اکثر ڈنر یا لنچ میں اپنے ساتھ گھسیٹ لیتی تھی لیکن رُدا اِس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ وہاں لوگوں کا تعین کر لیا گیا تھا۔ کھانے کی میز پر کسی خصُوصی پروگرام کے تحت ہی دُوسرے لوگ شامل ہو جاتے تھے۔ ورنہ کوٹھی کے مخصُوص لوگ ہُوا کرتے تھے۔ باقی افراد کے لئے الگ الگ اِنتظامات تھے، اور رشید کو ایک آدھ بار کے علاوہ کبھی کھانے میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ یہی کیفیت طفیلی بیگم اور دُوسرے افراد کی تھی لیکن رشید کوٹھی میں دندناتا پھرتا تھا بارہا رُدا نے اُسے اپنے کمرے کے دروازے کے قریب دیکھا تھا۔ اُس وقت رشید کو اپنے قریب دیکھ کر اُس کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔ رشید نے حسبِ عادت سلام کیا تھا۔ رُدا نے سلام کا جواب دیا اور پھر رکشا کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگی۔

"رکشا میں تلاش کر کے لا دُوں مِس رُدا؟"

"کیوں؟ آپ کو کیا تکلیف ہے؟" رُدا نے سوال کیا۔

"رُدا! نہ جانے کیوں آپ مجھ سے ہمیشہ ایسی ہی جلی کٹی گفتگو کرتی ہیں۔ میری سمجھ میں اُس کی وجہ نہیں آئی۔"

"رشید صاحب! میں دفتر سے نکلی ہُوں اور گھر جا رہی ہُوں۔ کوئی شناسا اگر مل جاتا ہے تو سلام دُعا کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایسی جگہوں پر اِتنی طویل گفتگو کوئی شریف آدمی نہیں کرتا۔"

"ٹھیک بات ہے۔ لیکن میں یہ کب کہتا ہُوں کہ یہ گفتگو سڑکوں پر کی جائے، ریستوران میں، ہوٹل میں اور ایسی بہت سی جگہ موجود ہیں جہاں بیٹھ کر بات چیت کی جا سکتی ہے۔" رشید ڈھٹائی سے بولا۔

"افسوس! میں آپ کو پاگل سمجھتی ہُوں اور کسی پاگل آدمی کے ساتھ کوئی سخت کلامی بھی نہیں کی جا سکتی اِس لئے آپ سے اِن الفاظ کے جواب میں کیا کہوں۔"

"مِس رُدا! آپ مجھے جو کچھ بھی سمجھتی ہوں میں اِس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو جو کچھ سمجھتا ہُوں کبھی اُس پر بھی ضرور غور کریں۔ آپ کی مرضی ہے اِدھر سے گزر رہا تھا کہ آپ نظر آ گئیں اور اب تو جی چاہتا ہے کہ ہر شام اِدھر سے گزروں ممکن ہے کبھی آپ کو احساس ہو جائے کہ میرا آپ سے کوئی تعلق ہے" رشید

نے درد بھری آواز بنا کر کہا اُسی وقت ایک رکشا اُدھر سے گزرا اور رُدا نے اِشارہ کر کے اُسے روک لیا۔ پھر وہ رکشا میں بیٹھ کر چل پڑی اور رشید پیچھے کھڑا رکشا کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ رُدا ذہنی طور پر کافی اُلجھ گئی تھی۔ راستے بھر وہ رشید کے بارے میں سوچتی آئی یہ شخص حد سے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے علم تھا کہ رشید ثناء کا خالہ زاد بھائی ہے لیکن ثناء خود بھی اُس کی جانب متوجہ نہیں تھی اگر رشید نے بدتمیزی کی تو ثناء سے اُس کا تذکرہ کرنا ہی پڑے گا اور ثناء کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کسی کو معاف کرنے والوں میں سے نہیں ہے، بہرطور کوٹھی میں داخل ہوتے ہُوئے اُس نے اپنا موڈ بحال کر لیا تھا۔ ثناء یا نُدرت سے ملاقات نہیں ہُوئی پتہ نہیں ثناء کہاں نکل گئی تھی۔ رُدا نے اُس کے کمرے میں جھانکا لیکن ثناء موجود نہیں تھی۔ تیمور بھی نہیں تھا۔ رُدا اپنے کمرے میں داخل ہو گئی، غسل وغیرہ کرنے کے بعد وہ باہر نکلی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ثناء کہاں گئی ہے۔ عام طور سے وہ رُدا کی واپسی کے وقت تیمور کے ساتھ رُدا کا اِنتظار کرتی تھی۔ رُدا کو تیمور کی ہُڑک بھی اُٹھ رہی تھی۔ پُورا دِن اُس سے جُدا رہنے کے بعد شام کو وہ جب تک تیمور کو چُوم نہ لیتی تھی۔ اُس کے دِل کو سکون نہیں ملتا تھا باہر نکلی تو ایک ملازمہ نظر آ گئی۔ اُس نے آواز دے کر ملازمہ کو روکا۔ اور ثناء کے بارے میں پُوچھنے لگی۔

"ثناء بی بی شاپنگ کے لئے گئی ہیں ابھی تک واپس نہیں آئیں۔" ملازمہ نے جواب دیا۔

"کس وقت گئی تھیں؟" رُدا نے سوال کیا۔

"جی! کوئی دو گھنٹے ہو گئے، میرا خیال ہے آنے ہی والی ہونگی۔" ملازمہ بولی اور رُدا گردن ہلا کر وہاں سے آگے بڑھ گئی لیکن چند ہی قدم کے فاصلے پر اختر کھڑا اُسے متعجبانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ رُدا نے اُسے دیکھا ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکی۔ اختر سے تعارف تو ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ نہیں۔ بس ایک سرسری سی ملاقات ہُوئی تھی۔ اُس نے کترا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اختر اُس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"منطق کی رُو سے دو معزز اِنسانوں کو ایک دُوسرے کو اِس طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، اور پھر وہ جو مہمان ہوتے ہیں۔ بڑے نازک طبع ہوتے ہیں۔ کسی کی ہلکی سی بے اِعتنائی اُنہیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ممکن ہے کہ اُن کی آمد کسی کو ناگوار گزری ہو۔" اختر نے کہا اور رُدا اُسے دیکھنے لگی۔

"نہیں پلیز! بھلا مجھے آپ کی آمد کیوں ناگوار گزرے گی۔" اُس نے غمگین آواز میں کہا۔

"ویسے آج اِس حقیقت کا اِعتراف کرنا پڑے گا کہ ایشیائی فلموں میں جو حادثات پیش کئے جاتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ غالباً میری شخصیت آپ کے لئے کوئی ایسا دھماکہ ثابت ہُوئی جس نے آپ کے اعصاب کو متاثر کیا اور آپ کو قوتِ گویائی واپس مِل گئی۔" اختر شرارت آمیز لہجہ میں بولا اور رُدا ایک لمحے کے لئے دھک سے رہ گئی۔ ثناء نے اُس کا تعارف کراتے ہُوئے کہہ دیا تھا کہ وہ گُونگی ہے اور اُس وقت اُس نے بے خیالی میں اختر سے گفتگو کر لی تھی... رُدا بوکھلا سی گئی۔ اُس نے شرمسار نگاہوں سے اختر کو دیکھا تو اختر جلدی سے بولا۔

"خاص بات نہیں ہے، اگر آپ گُونگی رہنا چاہتی ہیں تو ظاہر ہے مجھے اِس پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن میں گُونگا نہیں ہُوں۔ چنانچہ آپ سے مزید کچھ گفتگو کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ بہت ہی کسی ضروری کام سے جا رہی ہیں تو میں کم از کم آپ کے ساتھ چلتے ہُوئے آپ سے بات چیت کر سکتا ہوں۔ ورنہ اچھے اِنسانوں کی طرح مجھے چند لمحات کے لئے اپنے کمرے میں مدعو کیجئے، چلئے نہ سہی چائے وغیرہ، اِنسان کم از کم شیریں بیانی سے تو کام لے سکتا ہے۔ منطق کی رُو سے۔"

"اختر صاحب! میں... میں"

"جی ہاں، آپ... آپ آئیے پلیز آئیے۔" اختر بہت تیز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ رُدا کو بے اختیارانہ قدم اُٹھانے پڑے اور اختر اُس کے ساتھ کمرے میں آ گیا، پھر وہ ایک کرسی پر بیٹھتا ہُوا بولا۔

"مِس رُدا تشریف رکھیئے، ممکن ہے آپ اِس حقیقت کو تسلیم نہ کریں کہ میں آپ کا مہمان ہُوں لیکن یکطرفہ طور پر میں یہی سمجھتا ہُوں۔ اب دیکھئے نا منطق کی رُو سے اِنسان مجبور ہے ایک دُوسرے سے گفتگو کرنے کے لئے اور اگر کسی پر یہ اِنکشاف ہو کہ گُونگا اچانک بول اُٹھا ہے تو پھر اُس کا تجسّس تو عرُوج پر پہنچ ہی جانا چاہیئے، چُنانچہ میں اپنے اِس تجسّس کو رفع کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤنگا۔" رُدا نے اختر کو دیکھا اُس کے چہرے پر پھیلی ہُوئی شرارت بڑی اچھی لگی تھی چُنانچہ وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"شکریہ! اِس ہنسی سے اِس بات کا اِظہار ہوتا ہے کہ کم از کم میرے سے آپ کے دِل میں ناپسندیدگی کے جذبات نہیں اُبھرے اور پھر دیکھئے نا کسی بھی شخص کے دِل میں اگر خلوص ہو تو اُسے چھوٹے بھائیوں کی حیثیت سے ٹریٹ کیا جا سکتا ہے اور منطق کی رُو سے اِنسان کو اپنی نیت کے اِظہار کے لئے اُن الفاظ کا سہارا لینا چاہیئے جو

دُوسرے کو فوراً ہی متاثر کر دیں یعنی میں اگر آپ کو بہن کہوں تو یقیناً آپ کے دل میں اپنے چھوٹے بھائی کے لئے ایک جذبہ پیدا ہو جائے گا اور دیکھئے رُدا بہن مشرقی لڑکیاں اِن رشتوں کو اہمیت دیتی ہیں۔ چنانچہ اب میں نے آپ کو بہن کہہ دیا ہے آپ مجھے جس انداز میں چاہیں ٹریٹ کریں۔" رُدا عجیب سی نگاہوں سے اختر کو دیکھنے لگی اُسے اَچانک ہی اپنے دل میں ایک ہلکی سی محبت کا اِحساس ہُوا تھا۔ اختر نے اُسے بھرے مُنہ سے بہن کہا تھا اور الفاظ ہی تو زندگی میں سب سے بڑی حیثیت رکھتے ہیں الفاظ جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اور یہ لفظ رُدا کو بہت ہی پیارا لگا تھا اُس کی نگاہوں میں نہ جانے کیا کیا مناظر گھوم گئے تھے۔ یہ لفظ ابھی تک کسی نے اِس انداز میں اُس سے نہیں کہا تھا اُس نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور بولی۔

"ٹھیک ہے اختر بھیا، جو رشتہ تم نے مجھ سے قائم کر لیا اُسے دُنیا کی کوئی بہن نہیں توڑ سکتی۔"

"بہت بہت شکریہ۔ میرا یہ رشتہ قبول کرنے کا تو رُدا بہن پہلی بات تو یہ فرمائیے کہ گونگی کا کیا قصہ تھا۔"

"بھئی اب کیا کہوں۔ کسی کی غیبت بھی تو نہیں کر سکتی۔"

"جی نہیں، آپ کو غیبت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ محترمہ ثناء صاحبہ کو میں اچھی طرح پہچان چکا ہُوں۔ انھوں نے غالباً مجھ سے اُس بات کا بدلہ لیا تھا جو میں نے خود کو خالد کہہ کر انھیں چوٹ دی تھی۔"

"سو فیصدی یہی بات تھی۔"

"لیکن آپ نے تردید کیوں نہیں کی؟"

"اِس لئے کہ میں ثناء کی کسی بات کی تردید نہیں کرتی۔"

"لیکن اِس طرح تو آپ کو ہمیشہ میرے سامنے گونگا رہنا پڑتا۔"

"تو رہتی۔"

"خُوب... خُوب، اِس کا مقصد ہے کہ آپ کے اندر منطق کی رُو سے وفاداری موجود ہے۔ ثناء صرف آپ کی دوست ہے نا۔"

"صرف نہیں۔" رُدا نے جواب دیا۔

"ہاں۔ میں جائزہ لے چکا ہُوں اِس بات کا۔ تھوڑی بہت معلومات بھی حاصل کی ہے اور دیکھئے نا اِس معلومات کے حصول میں کوئی بُرا اِرادہ شامل نہیں تھا منطق کی رُو سے بلکہ انسان جس جگہ کچھ عرصہ قیام کرتا ہے اُس سے واقف ہونے کی جستجو اُسے رہتی ہی ہے۔ تو یہ ثناء صاحبہ جو ہیں نا میں اِن کی بُرائی نہیں کر رہا لیکن یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے شیطان سے اِن کے خاصے قریبی تعلقات ہیں۔" رُدا ہنسنے لگی پھر اُس نے کہا۔

"ہاں اُس کی طبیعت میں بچپنا ہے۔"

"خیر بچے تو ہم بھی ہیں ابھی عُمر ہی کتنی ہے لیکن یہ ثناء صاحبہ اگر ہمارے تعاون سے کام نہیں کریں گی تو اِن کے لئے ذرا مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ کیونکہ اب دیکھئے نا شرارتیں تو ہمیں بھی کرنا آتی ہیں اور اگر شرارتوں کا مقابلہ ہو گیا تو پھر بہت سے لوگوں کو مشکلات سے گزرنا ہوگا۔" رُدا ہنستی رہی۔ اختر کی باتیں اُسے دلچسپ لگ رہی تھیں۔ پھر اُس نے کہا۔

"اور اب تم بتا دو گے کہ میں تمھیں اپنے گونگے نہ ہونے کی بات بتا چکی ہُوں۔"

"قطعی نہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ آپ سب کے سامنے اِسی بات کا اظہار کرتی رہیئے کہ آپ نے مجھے حقیقت نہیں بتائی۔ میں بھی اگر خود ثناء صاحبہ کے مُنہ سے یہ بات نہ کہلوا دوں کہ آپ گونگی نہیں ہیں تو میرا نام اختر نہیں ہے۔"

"اوہ! جیسی تمھاری مرضی۔ تم نے مجھ سے ایسا رشتہ قائم کر لیا ہے کہ اب تو تمھاری بات بھی ماننی ہی پڑے گی۔"

"شکریہ! ویسے رُدا بہن آپ کے بارے میں کچھ تفصیل نہیں معلوم ہو سکی ذرا تعارف ہو جائے تو کیا حرج ہے دیکھئے جب بہن بھائی کا رشتہ قائم ہو ہی گیا ہے تو پھر پورے خلوص سے اِسے تسلیم کیجئے۔"

"میں اِس گھر کی ممنون کرم ہُوں بس اِس سے زیادہ اپنے بارے میں کیا بتاؤں انتہائی حالات سے آئی تھی۔ پریشان حال تھی تیمور میرے ساتھ تھا۔ ثناء نے بہت بُرے وقت میں میرا ساتھ دیا۔ اپنے گھر لے آئی۔ اب ملازمت کرتی ہُوں ایک فرم میں لیکن وہ بھی اپنی خوشی اور اپنی انا کے لئے ورنہ ثناء یہ سب کچھ نہیں چاہتی اور میں یہ جانتی ہُوں کہ یہ پورا گھر محبت کرنے والے عظیم لوگوں کا گھر ہے۔ مجھے پوری زندگی یہاں پناہ مل سکتی ہے لیکن انسان کے کچھ اپنے بھی فرائض ہوتے ہیں۔ میں یہ کوشش کر رہی ہُوں کہ تھوڑی سی رقم پس انداز کر کے ثناء کی نیکیوں کو تھوڑا سا ہی کہیں اور منتقل ہو جاؤں۔ حالانکہ یہ بہت کٹھن مسئلہ ہے۔ اور ثناء یقیناً مجھے اُس وقت تک کہیں نہیں جانے دے گی جب تک اُس کی شادی نہ ہو جائے۔"

"تو آپ یہاں سے جانے کی خواہش مند ہیں؟"

"بھائی ہو بھائی کے انداز میں سوچو۔ کیا کسی کے گھر پڑے رہنا اچھی بات ہے نسبتیں، دوستیاں، احسانات بلاشبہ ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر تمھارے ساتھ پاؤں موجود ہیں

اور تم اپنے وجود سے کسی پر بار نہیں بننا چاہتے تو کیا تمھیں یہ منظور ہوگا کہ تم صرف نسبتوں کے سہارے زندگی گزار دو۔ تیمور میرے ساتھ ہے اور مجھے اُس کے مستقبل کا خیال کرنا ہے۔ اگر اِنہی لوگوں کے بل پر اُس نے تعلیم حاصل کی اور پروان چڑھا تو کیا کبھی بڑا ہونے کے بعد وہ اپنی سُبکی محسوس نہیں کرے گا۔ بس اختر بھیا صرف اور صرف یہی اِحساس ہے۔ جو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ بالآخر ثناء کے جُدا ہو جانے کے بعد میں تیمور کو لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"تیمور کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔"

"ہاں۔" رُدا نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"تو رُدا بہن دُنیا کا کوئی فرد آپ سے یہ پُوچھنے کی جُراٴت کر سکے یا نہ کر سکے لیکن منطق کی رُو سے آپ کا بھائی ہونے کی وجہ سے میں تو آپ سے یہ سوال کر سکتا ہُوں کہ تیمور کے ابو کہاں ہیں؟"

"اِس بارے میں مَیں نے اپنی زبان بند کر لی ہے اختر بھیا۔ ثناء جیسی پیاری دوست کو میں نے اِس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ یُوں سمجھو کہ یہ میرا راز ہے جو اگر افشاء ہو گیا تو پھر میں تم لوگوں کے درمیان نہیں رہ سکوں گی۔ چنانچہ میری اِلتجا ہے کہ اِس بات کو مجھ سے نہ پُوچھو۔"

"منطق کی رُو سے ہمیں مان لینا چاہیئے۔ چلئے نہیں پوچھتے لیکن آپ کی ایک مشکل حل کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔"

"کون سی مشکل؟" رُدا نے اختر کو دیکھتے ہوئے کہا؟

"یہی کہ آپ کو اِس کوٹھی سے نکلنے کے مواقع ہم فراہم کریں گے البتہ شرط یہی ہے کہ راز راز ہی رہے گا۔ جب تک کہ ہم آپ سے کہہ نہ دیں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن کون سا راز؟" رُدا نے تعجب سے پُوچھا۔

"میں کہہ رہا تھا نا ابھی کہ میں ثناء کو آپ سے جُدا کرنے کا کام انجام دُوں گا۔ دراصل رُدا بہن، ثناء اور میرے بھائی خالد کے درمیان رشتے کا مسئلہ ہمارے والدین کے ذہن میں تھا۔ میری ماں کا اِنتقال ہو چکا ہے، والد صاحب کینیڈا میں ہیں اور اب اِس رشتے کی تکمیل کے لئے ہم دونوں کو یہاں بھیجا گیا ہے۔ خالد بھائی سے کہا گیا ہے کہ وہ ثناء کا جائزہ لے لیں اور احسان چچا نے اپنے طور پر خاموشی اختیار کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر ثناء بھی خالد کو پسند کرتی ہے تو پھر رشتے کی تکمیل میں اُنھیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔" رُدا کے چہرے پر بے اختیارانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اچانک ہی خوش نظر آنے لگی تھی۔

"اَرے واقعی یہ تو بڑا دِلکش اِنکشاف ہے اور میرا خیال ہے ابھی میرے علاوہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔"

"بس چند ہی افراد یہ بات جانتے ہیں لیکن رُدا بہن ابھی نہیں پلیز۔"

"ٹھیک ہے اختر تم اطمینان رکھو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن یُوں سمجھو کہ اب میں تمھاری رازدار ہُوں۔ مجھے بھی اپنے کاموں کے سلسلے میں استعمال کرتے رہنا۔"

"منطق کی رُو سے بعض اوقات اتفاقات ایسے دلچسپ ہو جاتے ہیں کہ اِنسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے یقیناً کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جسے میں اپنا رازدار بنا سکوں اور پھر راز تو بہت سے ہیں میرے سینے میں۔ آپ سے بہت سی باتیں کروں گا رُدا بہن لیکن سب ایک ساتھ نہیں۔ آیئے باہر چلیں۔"

"تم جاؤ اختر میں پھر تم سے ملاقات کروں گی۔"

"ایک اجازت چاہتا ہُوں۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"اب بھائی کو اِتنی اجازت تو ہونی چاہیئے کہ وہ جب چاہے بہن کے پاس پہنچ جائے۔"

"خلوص دل سے تم جب چاہو آ سکتے ہو۔"

"شکریہ! خدا حافظ۔" اختر نے کہا اور باہر نکل گیا۔ رُدا بیٹھی مُسکراتی رہی تھی اُس کی آنکھوں میں خوشی کی پرچھائیاں تھیں۔ خالد کا چہرہ اُس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا اب تک اُن مہمانوں پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اختر کے اِس اِنکشاف کے بعد رُدا کے لئے خالد کی شخصیت بھی دِلچسپ حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے سے ثناء کی آواز سُنائی دی۔

"تیمور وہ تمھاری ملازمت پیشہ آ گئی ہوگی ذرا دیر ہو گئی یار ہماری طرف سے اُس سے بھی معذرت کر لینا۔" ثناء کمرے میں داخل ہو گئی۔ اور تیمور کو رُدا کی گود میں دے دیا۔ رُدا حسبِ معمول تیمور کو چُومنے لگی تھی ثناء ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی۔ پھر اُس نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"تیمور اگر حالات یہی رہے تو ممکن ہے میرے اور تیرے درمیان رقابت پیدا ہو جائے۔ میں کبھی یہ پسند نہیں کر سکتی کہ کوئی تجھے مجھ پر فوقیت دے۔ کیا سمجھا میں اِسی قسم کی انسان ہُوں۔"

"تو آؤ تمھیں کس نے منع کیا ہے۔ تیمور تو جب تک میری گود میں آ جاتا ہے اور تم جب دیکھو جلی کٹی سناتی رہتی ہو۔" رُدا اپنی جگہ سے اُٹھی اور ثناء کے قریب پہنچ گئی پھر اُس نے ثناء کے سر کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

"چلے گا تیمور چلے گا یہ بھی چلے گا۔" ثناء نے مسخرے انداز میں کہا

اور رُدا ہنسنے لگی۔ وہ گہری نگاہوں سے ثناء کا جائزہ لے رہی تھی آج اُس کی آنکھوں میں کچھ اور مُسکراہٹیں جگمگا رہی تھیں اِس تصوّر کے ساتھ کہ بالآخر ثناء کی زندگی میں وہ دِن آنے والا ہے جب وہ اپنی زندگی کی دُوسری مسرتوں سے ہمکنار ہوگی۔

●

رُدا دِن بھر کی مصرُوفیت کے بعد دفتر سے باہر نِکلی آسمان ابر آلُود تھا اور باریک باریک بوندیں زمین تک پہنچ رہی تھیں۔ رُدا نے پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا، بارش اگر تیز ہوگئی تو کیا ہوگا۔ اِس سے پہلے ہی اُسے رکشا مِل جانا چاہیئے، لیکن دفتروں کے چھوٹنے کا وقت ہوتا تھا اور عموماً رکشا بھرے ہوئے گُزرتے تھے، روزانہ ہی مُشکِل ہوتی تھی۔ کوئی بس یہاں سے براہِ راست اُس علاقے تک نہیں جاتی تھی جہاں اِحسان صاحب کی کوٹھی تھی بلکہ کافی دُور بس اسٹاپ تھا اور اُس کے بعد کوٹھی سے بھی کافی دُور پیچھے اُترنا پڑتا تھا چنانچہ رُدا رکشا ہی اِستعمال کرتی تھی وہ اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگی لوگ اپنے اپنے معمولاتِ زندگی میں مصرُوف تھے، بظاہر بارش کے تیز ہونے کے آثار نہیں تھے وہ بے چین نِگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اور اُسی وقت اُس کی نِگاہ خود سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک شخص پر پڑی قمیض اور پتلون میں ملبُوس چھریرے سے بدن کا آدمی تھا۔ لمبا قد۔ خوبصُورت بال لیکن اب وہ بال جگہ جگہ سے سفیدی اختیار کر چکے تھے رُدا نے اُس کا چہرہ دیکھا اور دُوسرے لمحے اُس کا دِل دَھک سے رہ گیا اور اُسی وقت اُس آدمی نے رُدا کی صُورت دیکھ لی وہ بھی اِسی طرح چونکا تھا پھر وہ برق رفتاری سے رُدا کی طرف بڑھا۔ اور رُدا پتھر کے بُت کی مانند ساکت ہوگئی۔

"تم... تم رُدا تم یہاں" اُس شخص کے مُنہ سے بمشکِل تمام نِکلا۔ رُدا کے مُنہ سے تو آواز بھی نہیں نِکل سکی تھی اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں شدید خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

"آہ رُدا... رُدا تم... تم، میں کہاں کہاں تلاش کرتا رہا تمہیں رُدا تم اَچانک کراچی کیسے آگئیں تم... تم" رُدا نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور پیچھے ہٹ گئی۔

"کون ہیں آپ؟" اُس نے غم و غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں پُوچھا۔

"رُدا... رُدا میں ثاقب ہُوں ثاقب۔ تم اوہ... مجھے نہ پہچاننے کا اِظہار کر کے کیا تم میرے اور اپنے درمیان کے رشتے توڑنا چاہتی ہو۔ نہیں رُدا نہیں۔ مُجھ میں اب غم برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ رُدا میں اُلسر کا مریض ہو چُکا ہُوں۔ شدید اُلسر ہے مجھے شدید اُلسر" اُس شخص نے لرزتی ہُوئی آواز میں کہا۔

"میں آپ کو نہیں جانتی" رُدا سخت لہجے میں بولی اور تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل پڑی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک رکشا آ کر رُکا تھا رُدا کانپتے ہوئے بدن کو سنبھال کر رکشا میں بیٹھ گئی اور اُس نے رکشا ڈرائیور کو مطلوبہ جگہ کا پتہ بتا دیا۔ رکشا چل پڑا تھا لیکن رُدا کے بدن میں بدستور سنسناہٹیں دوڑ رہی تھیں۔ اُس کا دِل دہشت سے دھڑک رہا تھا۔ آہ یہ... یہ کیا ہو گیا؟ یہ تو اچھا نہیں ہُوا یہ تو اچھا نہیں ہُوا وہ سوچ رہی تھی اور اُس کا بدن مُسلسل کانپے جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی شخصیت تھی جس نے رُدا کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔

رشید پر رُدا سوار ہو گئی تھی۔ اُس رات جب وہ رُدا کے کمرے میں سُرخ فائل کی تلاش میں داخل ہُوا تھا اور کمبخت خیر دین اَچانک وہاں پہنچ گیا تھا۔ تو رشید نے صرف اپنی جان بچانے کے لئے رُدا سے محبت کا حوالہ دیا تھا۔ لیکن وہ کوئی ایسا ہی لمحہ تھا۔ جس میں مُنہ سے نکلی ہُوئی بات دِل پر نقش ہو جاتی ہے۔ رشید کو ایک دم رُدا سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جوان آدمی تھا ہر چند کہ بُری صُحبتوں کا شِکار رہ چُکا تھا۔ لیکن دِل کی دُنیا میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ سچ تھا کہ ثناء کی نِسبت اُسے رُدا زیادہ پسند تھی۔ جب کہ طفیلی بیگم چاہتی تھیں کہ ثناء اُن کی ملکیت بن جائے۔ اور اِس کوٹھی میں اُنھیں خاتونِ اوّل کی حیثیت مِل جائے۔ بھلا اُس کے بعد کون اُن کا مدِمقابل ہو سکتا تھا۔ لیکن رشید نے اُن کی بات صِرف اِس لئے مان لی تھی کہ ماں تھیں۔ البتہ اپنی کمینگی کے باعث اُس نے طفیلی بیگم کی اِس بات سے اتفاق کیا تھا کہ رُدا کی نِسبت ثناء سے شادی زیادہ منافع بخش ہو سکتی ہے۔ اور ثناء سے شادی کرنے کے بعد جس طرح دِل چاہے رُدا پر قبضہ جمایا جا سکتا ہے۔ شہاب صاحب بھی رُدا ہی کے چکر میں تھے۔ رشید اپنے ذہن میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ رُدا سے محبت کرتا ہے۔ یا صِرف شہاب صاحب کی خواہش پر کچھ

دولت کمانے کے لئے اُس کا دِل رُدا کی جانب راغب ہُوا ہے۔ کچھ بھی سہی وہ رُدا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا خواہش مند ضرور تھا۔ اور اسی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ روزانہ تو نہیں۔ لیکن جب بھی کبھی وقت مِلتا۔ وہ رُدا کے دفتر کے سامنے پہنچ جاتا۔ خاص طور سے اُس کی چُھٹی کے وقت۔ رُدا نے ایک بار بھی اُس سے سیدھے مُنہ بات نہیں کی تھی۔ لیکن رشید نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ آج بھی وہ عین اُس وقت وہاں پہنچا تھا جب رُدا اپنے دفتر سے نِکل کر باہر آئی تھی۔ رُدا نے اُسے نہیں دیکھا تھا

چند لمحات اُس کا تعاقب کرتا رہا۔ پھر وہ رُدا کے سامنے جانے ہی والا تھا کہ اُس نے اُس شخص کو دیکھا جس کا اَچانک ہی رُدا سے سامنا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو رشید کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اُس نے سوچا ممکن ہے یہ شخص رُدا کو پریشان کرنا چاہتا ہو۔ اور اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو رشید اِس وقت رُدا کی توجہ حاصل کر لینے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ بالکل اُن فلمی نوجوانوں کی مانند۔ جو عین وقت پر کسی ایسی لڑکی کی مدد کرتے ہیں۔ اور اُسے چھیڑنے والوں کو مار پیٹ کر بالآخر لڑکی کی توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن پھر وہ ٹھٹھک گیا۔ رُدا کے قریب آنے والا شخص، اُس سے کچھ عجیب سی گفتگو کر رہا تھا۔ وہ رُدا سے شناسائی کا اظہار کر رہا تھا۔ اور رُدا بوکھلائی ہُوئی تھی۔ رشید رُدا کے سامنے تو نہیں گیا۔ لیکن اُس نے تمام صُورتِ حال کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا تھا۔ اور اب اِتنا احمق بھی نہیں تھا کہ رُدا کے چہرے کے تاثرات سے یہ بات نہ سمجھ سکتا کہ رُدا اُس شخص کو بخوبی جانتی ہے اور وہ رُدا کو، اُس نے لاہور کا حوالہ بھی دیا تھا اور رشید یہ بات جانتا تھا کہ رُدا اپنے بچّے کے ساتھ لاہور ہی سے آئی ہے۔ لیکن رُدا نے مکمل طور پر اُس شخص سے اجنبیت کا اظہار کر دیا تھا۔ اُس شخص نے اپنا نام ثاقب بتایا تھا۔

پھر اتفاقاً رُدا کو رکشہ مِل گیا۔ اور وہ شخص ہاتھ اُٹھائے رہ گیا۔ رشید چونکہ گہری نِگاہ سے اِس کارروائی کا جائزہ لیتا رہا تھا اِس لئے فوراً ہی اُس کے ذہن میں ایک منصُوبہ آیا۔ یہ شخص یقیناً کسی نہ کسی طور رُدا کا شناسا ہے۔ اور شاید رُدا کے بارے میں اُس سے زیادہ معلومات کسی اور سے حاصِل نہ ہو سکیں۔ اِس لئے فوراً ہی کام کرنا چاہیئے۔ رُدا کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اُس سے تو جب چاہے کوٹھی میں ملاقات کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ شخص؟ رشید نے فوراً ہی اِس شخص سے مِل بیٹھنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ اپنی منصُوبہ بندی کے تحت وہ اِس بات کا انتظار کرنے لگا کہ یہ شخص اگر کہیں جائے تو وہ اِس کا تعاقب کرے۔

وہ شخص اَدھیڑ عُمر کا تھا۔ جو شکل و صُورت سے کافی خوبصُورت نظر آتا تھا۔ چند لمحے کھڑا رُدا کو دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اُس نے گردن جھٹکی اور پیدل ہی ایک سمت چل پڑا۔ اُس کی چال میں تھکن پائی جاتی تھی۔ رشید نے اُس کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ معمُولی سے لباس میں ملبُوس بڑھے ہُوئے شیو کے ساتھ وہ کوئی مفلوک الحال معلوم ہوتا تھا۔ پیروں میں جُوتے تھے لیکن کسی بھی قسم کی پالش سے بے نیاز گرد آلود۔ وہ کافی دُور تک پیدل سفر کرتا رہا۔ اور اُس کے بعد ایک جگہ رُک گیا۔ سامنے ہی ایک ریستوران نظر آ رہا تھا۔ درمیانے درجے کے اِس ریستوران کے سامنے وہ شخص کھڑا ہو کر دیر تک ریستوران کی طرف دیکھتا رہا۔ رشید کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دِقت نہیں ہُوئی کہ وہ بُھوکا ہے چند لمحات انتظار کے بعد رشید اُس کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر اَدھیڑ عُمر شخص کے پاس پہنچ کر اُس نے بڑے پُرتپاک لہجے میں کہا۔

"آہا! ثاقب صاحب! السّلام علیکم! پہچانا آپ نے مجھے؟"

اَدھیڑ عُمر شخص چونک کر رشید کو دیکھنے لگا تھا۔ چند لمحے وہ بغور رشید کو دیکھتا رہا۔ اور پھر آہستہ سے نفی میں گردن ہِلا کر بولا۔

"نہیں بھائی! بدقسمتی ہے نہیں پہچان سکا۔ یادداشت بہت زیادہ اچھی نہیں رہی ہے۔"

"کمال ہے! رشید ہے میرا نام بھائی۔"

"بہرطور! تم نے مجھے پہچان لیا یہی کافی ہے۔ کہو کیسے مزاج ہیں؟" اُس کے لہجے سے بیزاری مترشح تھی۔

"میاں مزاج کی بات کر رہے ہیں آپ۔ آیئے کچھ دیر بیٹھ کر گپیں شپیں ہوں گی۔ آیئں اندر آیئں" رشید نے اُسے ریستوران میں چلنے کی پیشکش کی۔ اور وہ شخص فوراً ہی تیار ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد رشید اُس کے ساتھ گرد آلود کرسیوں پر بیٹھا تھا۔

"بہت کمزور ہو گئے ہیں آپ ثاقب صاحب! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"ہاں بس! فِکرِ روزگار، حالات، معاشی اُلجھنیں، پریشانیاں اگر انھیں خیریت کا نام دے سکتے ہو تو سب خیریت ہے۔"

"واقعی! اِس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن آپ کی حالت کافی ابتر ہو چکی ہے ثاقب صاحب! میں نے جب آپ کو پہلے دیکھا تھا تو آپ تر و تازہ تھے۔ تاہم آپ دیکھ لیجئے کہ پھر بھی پہچان لیا۔"

"کسی مشاعرے میں دیکھا تھا؟" ثاقب نے بایاں ہاتھ اُٹھا کر پُوچھا۔

"مُشاعرے میں بھی دیکھا تھا اور ویسے بھی۔ ویسے مُشاعروں کا کیا حال ہے آج کل؟"

"بس اپنے لئے کہہ لیتے ہیں۔ ہم جیسوں کو پُوچھتا ہی کون ہے۔ شعر کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے اچھے شُعرا اسکولوں میں ٹیچری کر رہے ہیں۔ دفتروں میں کلرکی کرتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اُنھیں کسی مشاعرے تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں مِلتا۔ چونکہ مشاعروں میں وہ شُعرا جاتے ہیں۔ جو خود بھی مشاعرے کرا سکتے ہیں۔ ضیافتیں دے سکتے ہیں۔ اچھے اچھے ہوٹلوں میں کلبوں میں۔ یا پھر اپنی ہی دولت کے بل پر۔ اپنے ایسے مدّاح پیدا کر سکتے ہیں۔

جو نہ صرف اُنھیں شعر کی داد دیں بلکہ اُن کے لئے مشاعرے بھی کرائیں۔ میاں چھوٹے چھوٹے شعرا تو بس چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں بیٹھ کر کاغذوں پر قلم گھِس لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اگر کوئی سخن فہم مل جائے تو اُسے چائے کی ایک آدھ پیالی پلا کر اپنے دِل کی بھڑاس نکال لیں۔ چھوڑو کہاں شاعروں کا ذکر لیکر بیٹھ گئے۔ وہ مشاعرہ جو پیٹ کے اندر ہوتا ہے۔ زیادہ دِلکش ہوتا ہے، کچھ کھِلاؤ پلاؤ میں بھوکا ہُوں۔"

"ہاں ہاں! کیوں نہیں بھئی! ویٹر!" رشید نے ویٹر کو آواز دی اور پھر ثاقب صاحب سے پُوچھا۔

"کیا کھانا پسند کریں گے ثاقب صاحب؟"

"کھانے کا وقت تو نہیں ہے بھائی! لیکن اِتنا کھِلا دو کہ پیٹ کے شُعرا خاموش ہو جائیں۔"

رشید نے ویٹر کو کچھ آرڈر دیئے۔

اور جلد ہی مطلوبہ اشیاء اُن کے سامنے آگئیں۔ رشید نے خود تو کچھ نہیں لیا تھا۔ صرف چائے پی تھی لیکن ثاقب صاحب سامنے آئی ہُوئی ہر شئے کو ہڑپ کر گئے۔ اور اُس کے بعد اُنھوں نے رشید سے فرمائش کی کہ چائے کی ایک اور پیالی منگوالی جائے اچھی طرح کھِلانے پلانے کے بعد رشید مطلب پر آگیا۔

"یہاں کراچی میں کب آنا ہُوا ثاقب صاحب؟"

"کافی عرصہ ہوگیا۔ بہت دن سے اِس حسین شہر کی روشنیوں کو دیکھ رہا ہُوں۔ لیکن روشنیوں کے اِس شہر میں زندگی اندر سخت ہے۔ کوئی شخص رُک کر یہ سُننے کو تیار نہیں ہوتا کہ کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہاں تو ہر شخص شاعر ہے سامعین کوئی نہیں ہے" ثاقب صاحب نے جواب دیا۔

"کہاں رہ رہے ہیں؟"

"بس! حسین عالی شان کوٹھیوں کے زیرِ سایہ۔ جہاں بھی سایہ مِلتا ہے پڑے رہتے ہیں۔ ہم بھی غالبؔ کی طرح بے در و دیوار کے گھر کے قائل ہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اپنا۔"

"اوہ! بڑی افسوسناک کیفیت ہے۔ رَدا کا کیا حال ہے؟" رشید نے پُوچھا اور ثاقب صاحب چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ اُن کی آنکھیں اب دُھندلاہٹوں سے نکل آئی تھیں۔ اور اُن میں اب ایک روشنی سی نمودار ہوگئی تھی۔ چند لمحات وہ رشید کا جائزہ لیتے رہے۔ سوچتے رہے پھر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میاں! کچھ اپنی باتیں بھی کرو۔ پتہ نہیں کس کیفیت کا شکار ہُوں میں۔"

"ہاں شاید آپ کو اُلسر کی شکایت ہے۔" رشید غچّا کھا گیا۔ اور ثاقب صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اُنھوں نے خود ہی اِس مسکراہٹ کو دَبا لیا۔

"بالکل ٹھیک! چہرے ہی سے اُلسر کا مریض لگتا ہُوں گا۔ لیکن عِلاج! ہم جیسے لوگوں کا عِلاج تو صرف مُوت ہوتی ہے۔ شاید تم اِس بات پر یقین نہ کرو کہ ہمارا عِلاج ہو سکتا ہے۔ لیکن اشعار سے نہیں۔ اور دوا کے لئے پیسے درکار ہوتے ہیں۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟ غالباً رشید! ایک دَور تھا جب بہت سے ملاح تھے اِس دُنیا میں۔ بہت سے شناسا تھے۔ بہت سے پیار کرنے والے تھے۔ لیکن وقت بہت کچھ چھین لیتا ہے کیا تم ماضی یاد دِلانا پسند کروگے مجھے؟"

"میں سمجھا نہیں ثاقب صاحب۔"

"کیا تم ایک ایسے شاعر کو زندہ رکھنا پسند نہیں کروگے جِس کے اشعار تمھیں دوبارہ اُس کے پاس پہنچا سکتے ہیں...؟ بولو رشید! جواب دو! کیا میری زندگی تمھیں پسند نہ ہوگی؟"

"کیوں نہیں کیوں نہیں۔" رشید اب کسی قدر سٹپٹا سا گیا تھا۔

"مجھے کچھ رقم درکار ہے رشید! مجھے کچھ رقم درکار ہے اور اِس رقم سے میں رَدا کے چہرے کی مُسکراہٹیں بھی واپس لانا چاہتا ہُوں۔ میں اُسے اپنی دُنیا میں سمیٹ لینا چاہتا ہُوں۔ کچھ مِلے گا تم سے؟ ہے کچھ تمھارے پاس؟"

"وہ! اِس وقت تو صرف دو تین سو روپے پڑے ہُوئے ہیں۔"

"آہ رشید! بعض اوقات انسان اپنی سطح سے اِتنا گِر جاتا ہے کہ بھیک مانگنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ تم اِسے بھیک ہی تصور کرلو۔ لاؤ مجھے پیسے دو۔ میری ضرورت ہے۔ شدید ضرورت اور ہاں تم رَدا کے بارے میں پُوچھ رہے تھے نا" ثاقب صاحب نے ایک بار پھر رشید کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ رشید کا ہاتھ جلدی سے جیب میں پہنچ گیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ثاقب پٹری سے نہیں اُترا ہے۔ اور رَدا کے بارے میں اُسے تفصیل ضرور بتائے گا۔ اور اِس وقت اگر تھوڑی بہت رقم قُربان کر دی جائے تو ممکن ہے کوئی کام کی بات ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے تین سو روپے نکال کر ثاقب کے حوالے کر دیئے سو روپے کا نوٹ اُس نے بِل کی ادائیگی کے لئے اپنے پاس محفوظ رہنے دیا تھا۔ ثاقب صاحب نے نوٹ جیب میں رکھے۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر کرسی کی پُشت سے گردن ٹِکا دی۔ ویٹر نے بِل لاکر رکھ دیا تھا۔ رشید نے سو روپے کا نوٹ

ں کی پلیٹ میں رکھا اور پھر ثاقب صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

"کِس سوچ میں گُم ہوگئے ثاقب صاحب؟"

"بس میاں! انسانی فِطرت بھی بہت عجیب ہے۔ پیٹ کا مشاعرہ ختم ہُوا۔ تو اب ذہن میں اشعار گردش کرنے لگے۔ ایک شعر سُناؤں؟"

"نہیں! اِس وقت شعر نہیں۔ میں آپ کے لئے بڑی تشویش کا شِکار ہوگیا ہُوں ثاقب صاحب۔"

"اچھا" ثاقب صاحب سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔

"میں سوچ رہا ہُوں کہ آپ کے لئے کسی رہائش گاہ کا بندوبست کروں۔ بڑے مسائل ہیں آپ کی زندگی میں۔ میرا خیال ہے رَدا..." رشید نے جملہ اَدھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں آپ کا خیال ہے رَدا..." ثاقب صاحب نے پُوچھا۔

"میرا مطلب ہے آپ نے رَدا کے بارے میں کچھ تفصیلات نہیں بتائیں۔"

"رَدا ایک خوبصورت لفظ ہے۔ مختلف جگہوں پر مختلف انداز میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس لفظ کے بارے میں آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"میں لفظ کے بارے میں نہیں جاننا چاہتا ثاقب صاحب۔ بلکہ اُس رَدا کے بارے میں جاننا چاہتا ہُوں۔ جِس کا تعلق آپ سے ہے ثاقب صاحب۔"

"آہ! رَدا سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں رَدا سے محروم ہُوں۔ محرومِ اُلفت۔"

"ایک مِنٹ ثاقب صاحب ایک مِنٹ۔ میں اُس لڑکی کی بات کر رہا ہُوں جِس سے آپ نے ابھی چند لمحات قبل ملاقات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور جو آپ کو نظر انداز کر کے رکشہ میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔"

"وہ لڑکی تھی۔" ثاقب صاحب نے مصنوعی سی ہنسی ہنستے ہُوئے کہا۔ پھر خود ہی بولے۔

"ممکن ہے لڑکی ہو۔ جب پیٹ کچھ مانگتا ہے تو انسان جنس کی شناخت بھول جاتا ہے۔ میں نے شاید کچھ دیر قبل کسی لڑکی سے مدد کی درخواست کی تھی۔ لیکن اِس دُنیا میں کون کس کا مددگار ہوتا ہے۔ وہ نخوت سے میری بات کو رد کر کے چلی گئی۔ بس اِس سے زیادہ میں اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ! آپ نے اُس سے جو گفتگو کی تھی۔ وہ تو... وہ تو..."

"آپ نے بڑے غور سے ہماری گفتگو سُنی تھی رشید صاحب۔ اِس کی وجہ پُوچھ سکتا ہُوں؟" ثاقب صاحب نے کہا۔

"نہیں نہیں! وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے۔ بس ایسے ہی میں نے سوچا کہ رَدا کے بارے میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کروں۔"

"آپ رَدا کو کیسے جانتے ہیں؟" ثاقب نے پُوچھا۔

"اوہو! اِس کا مطلب آپ نے تسلیم کرلیا کہ اُس لڑکی کا نام رَدا تھا۔"

"آپ کی زبانی معلوم ہُوا ہے۔"

"نجانے کیوں آپ مجھ سے اپنے اور اُس کے درمیانی تعلقات کو چُھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ثاقب صاحب میں تو آپ کا مددگار ہو سکتا ہُوں۔"

"بھائی! تم نے میری جتنی مدد کر دی۔ بس وہی کافی ہے۔ اب اُٹھو یہاں سے جانا چاہتا ہُوں میں نجانے کتنے عرصے کے بعد پیٹ بھرا ہے۔ تو اب جی چاہ رہا ہے کہ کہیں جاکر سو جاؤں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ثاقب صاحب۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آپ سے رَدا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ آپ یقین کیجئے کہ رَدا سے آپ کا کوئی بھی تعلق ہو۔ میں آپ کیلئے ایک اچھا ساتھی ثابت ہو سکتا ہُوں۔ رشید آپ کا معاون بنے گا ثاقب صاحب! آپ اُس سے کہہ رہے تھے کہ... کہ!"

"اچھا میاں! خُدا حافظ! ہم چلے۔ اب شہر کا کوئی ایسا خیراتی پارک ہمارے سکون کا سہارا بنے گا۔ جِس کے اِردگرد ہم جیسے لوگ پناہ لیتے ہیں۔" ثاقب صاحب اُٹھ گئے۔ رشید کو ایک دم غصہ آگیا تھا۔ تقریباً تین سو اٹھائیس روپے خرچ ہوگئے تھے۔ وہ اُنھیں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ثاقب صاحب! بیٹھ جائیے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ رَدا کے بارے میں آپ کو بتانا ہی ہوگا۔ میں نے اچھی طرح آپ لوگوں کے الفاظ سُنے تھے۔ آپ نے اُس سے کہا تھا کہ وہ کراچی کب آگئی۔ اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا نام ثاقب ہے رَدا۔ میں ثاقب ہُوں۔ اور اُلسر کا مریض ہو چُکا ہُوں۔ اب مجھ سے غم برداشت نہیں ہوتے۔ میں اُن غموں کے بارے میں جاننا چاہتا ہُوں ثاقب صاحب۔ آپ کو بتانا ہوگا۔ ورنہ آپ نقصان بھی اُٹھا سکتے ہیں۔"

"کیا نقصان اُٹھائیں گے ہم میاں تم سے۔ ذرا اِس کا اظہار بھی کر دو۔" ثاقب صاحب نے کہا۔

"آپ کی جیب میں میرے تین سو روپے ہیں۔ فوراً واپس نکال دیجئے۔ وہ صرف اس لئے آپ کو دیئے گئے تھے کہ آپ رِدا کے بارے میں بتا دیں"

"ارے واہ! بڑے معصوم ہو میاں! ابھی دُنیا دیکھو۔ یہاں صرف شطرنج کی چالیں چلی جاتی ہیں۔ کہیں چھوٹے پیمانے پر کہیں بڑے پیمانے پر۔ انسان اپنی غرض پوری کرنے کے لئے یہ چالیں چلنے پر مجبور ہے۔ کیا اُن تین سو روپوں پر تمہارا نام لکھا ہوا ہے؟ جاؤ میاں جاؤ۔ میں ایک کمزور آدمی ہوں۔ بوڑھا اور بیمار۔ اگر میں ابھی شور مچا دوں کہ تم میری جیب سے میرے تین سو روپے نکالنا چاہتے ہو۔ تو پولیس تمہیں پکڑ لے گی۔ خواہ مخواہ حوالات پہنچ جاؤ گے۔ ہنگامہ ہو گا۔ عزت دار آدمی لگتے ہو شکل و صورت سے۔ جاؤ بیٹے جاؤ۔ کیسی رِدا؟ کہاں کی رِدا؟ ہم تو بے سہارا لوگ ہیں۔ ہم سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا"

ثاقب صاحب اُٹھ کر باہر نکل گئے۔ لیکن رشید کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ وہ آسانی سے اس بوڑھے شخص سے اپنے پیسے وصول کر سکتا تھا۔ لیکن عقل نے سہارا دیا کہ جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں ہے۔ واقعی کسی قسم کی ہاتھا پائی خود اُس کے اپنے حق میں بہتر نہیں ہوگی۔ ثاقب صاحب نے ٹھیک کہا تھا۔ تین سو روپوں پر اُس کا نام تو نہیں لکھا۔ بھلا کسی سے کیسے کہہ سکے گا کہ یہ تین سو روپے اُس کی جیب سے نکل کر ثاقب صاحب کی جیب میں منتقل ہوئے ہیں۔ لیکن یہ چالاک بوڑھا۔ یہ شخص رِدا کے بارے میں چھپانا کیوں چاہتا ہے۔ رِدا سے اِس کا کیا تعلق ہے؟ رِدا نے اِس کے تعارف کو قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ثاقب کو جانتی ہے اچھی طرح جانتی ہے۔ کیا یہ شخص درست کہہ رہا ہے۔ کیا یہ فٹ پاتھوں پر زندگی بسر کرتا ہے؟ حلیے سے تو ایسا نہیں لگتا۔

ثاقب صاحب ریستوران سے باہر نکل گئے تھے۔ رشید چند لمحات سوچتا رہا اور پھر وہ خود بھی ریستوران سے باہر نکل آیا۔ اور تھوڑا فاصلہ دے کر ثاقب صاحب کا تعاقب کرنے لگا۔ ثاقب صاحب کا کہنا غلط نہیں تھا۔ وہاں سے وہ گرومندر کے بس اسٹاپ پہ پہنچے اور اُس کے عقبی پارک میں ایک درخت کے نیچے دراز ہو گئے۔ اُنھوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ رشید نے غصے سے گردن ہلائی اور پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے بڑے میاں! اپنا نام بھی رشید ہے۔ ہمیں چونا لگانے والے عام طور سے خوش نہیں رہتے" وہ وہاں سے واپس چل پڑا۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا تھا کہ اس فٹ پاتھ کو دوبارہ تلاش کر لینا مشکل کام نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی سو اُس نے کہ شہاب صاحب کے لئے بہرطور یہ ایک دلچسپ ہوگی۔ اور اب جو کچھ کیا جائے گا اُن کی ہدایت کی روشنی میں جائے گا۔ ممکن ہے یہ شخص دوبارہ رِدا سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں بھی یہ سوال آیا کہ رِدا دوبارہ آتے اُسی علاقے میں نظر آ سکتی ہے۔ رشید نے ہار نہیں مانی تھی۔

رِدا معمول کے مطابق کوٹھی میں داخل ہوئی۔ لیکن اُس کے بدن پر لرزشیں طاری تھیں۔ چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ وہ سیدھی اندر داخل ہوگئی۔ شکر تھا کہ ثناء نظر نہیں آئی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ اور پھر دیر تک نہاتی رہی۔ وہ اپنی لرزشوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کافی دیر تک نہاتے رہنے کے بعد اُس نے آئینے میں چہرہ دیکھا۔ بال سنوارے اور لباس پہن کر باہر نکل آئی۔ ثناء تیمور کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔

"ہیلو ثناء!" اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"خیریت! یہ تمہارے چہرے کو کیا ہو رہا ہے؟" ثناء نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"پتہ نہیں کیسی لگ رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں ثناء! آج صبح ہی سے طبیعت کچھ خراب ہے۔"

"صبح سے شام تک فائلوں میں سر کھپاتی رہو گی تو کیا طبیعت اچھی رہے گی۔ میں کہتی ہوں تم کم از کم ایک آدھ ہفتے کی چھٹی تو لے سکتی ہو" ثناء نے کہا۔

"ہاں! چھٹی لے لوں گی میں واقعی بہت تھکن محسوس کر رہی ہوں ثناء"

"گڈ ویری گڈ! بس یوں سمجھ لو کہ کل سے تمہاری چھٹی" ثناء نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اور کیا ہو رہا ہے؟" رِدا نے موضوع بدلنے کیلئے سوال کیا۔

"کچھ نہیں! بھلا اس کوٹھی میں عام معمولات کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ لیکن رِدا ہم کل اپنے معمولات میں کچھ تبدیلی کر رہے ہیں۔ میں ویسے بھی تم سے چھٹی کے لئے کہنے والی تھی۔ کل کا پروگرام طے پا گیا ہے"

"کیسا پروگرام؟"

"پکنک کا! کل ہم پکنک پر چل رہے ہیں"

"اوہ! مم... میں بھی جاؤں گی کیا؟" رِدا نے سوال کیا اور ثناء اُسے گھورنے لگی۔

"کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیسے اِس جنگل کے جانور کو انسان بناؤں؟"

"نہیں نہیں پلیز! بُرا مت مانو۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ میں تو ویسے ہی بیمار ہوں"

"تمہیں غالباً ٹھنڈا بخار ہے۔ کیوں؟" ثناء نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ثناء! میرا مذاق مت اُڑاؤ" رِدا نجانے کیوں روہانسی ہوگئی۔

"ارے ارے! یہ کیا ہو رہا ہے بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا مصیبت نازل ہوئی ہے تم پہ آخر کچھ تو بتاؤ۔ رِدا خدا کیلئے کچھ تو بتاؤ۔ خُدا کے لئے اپنے دل کے اِس بند تہہ خانے کو کم از کم ثناء کے سامنے تو کھول دو۔ تمہیں دُکھ کیا ہے۔ کیا پریشانی ہے؟ کیوں اِس دُنیا سے ڈری ڈری سی رہتی ہو؟"

"نن... نہیں ثناء! ایسی کوئی بات نہیں ہے بس میں..."

رِدا نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"رِدا! بس الفاظ ہی اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور میں اپنے سارے لفظ تم پر خرچ کر چکی ہوں۔ اب تم اُن میں سے کوئی بات قبول نہیں کرتیں۔ تو پھر یہ تو مجبوری ہی ہے۔ جیسا تم پسند کرو۔ کل پکنک پہ نہیں جانا چاہتیں۔ ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ مجھ پر اپنے دل کا راز نہیں کھولنا چاہتیں وعدہ کرتی ہوں کہ آج سے تم سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ میں تو تمہیں اِس کوٹھی میں روکتی بھی نہیں۔ لیکن کیا کروں۔ تیمور سے اِتنا پیار ہو گیا ہے مجھے کہ... کہ اب غیروں کو اپنا تو نہیں بنایا جا سکتا"

ثناء کہہ رہی تھی اور رِدا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ثناء اُسے گھورتی رہی۔ سخت غصہ آ رہا تھا اُسے رِدا پر لیکن اِس وقت اپنے غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اُٹھی اور تیمور کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ یہ پہلا سخت ردِ عمل تھا جو اُس نے ظاہر کیا تھا۔ ورنہ تیمور تو ہر وقت ہی اُس کی گود سے لگا رہتا تھا۔ رِدا نے ثناء کو دروازے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ تیمور کو دیکھا جو ٹُکر ٹُکر ثناء کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ثناء آج واقعی ناراض ہوگئی تھی۔ تیمور ثناء سے اِتنا مانوس ہو گیا کہ رِدا کو بھولتا ہی جا رہا تھا۔ ثناء چلی گئی تو وہ بھی رونے لگا۔ اور رِدا نے آگے بڑھ کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ پھر اُس نے تیمور کو سینے سے لگا اور اُس کی سسکیاں تیز ہوگئیں۔

ثناء شاید زیادہ دُور نہیں گئی تھی۔ چند ہی لمحات کے بعد اُس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اور پھر اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ اندر یہ سب کچھ ہونے لگے گا۔ دفعتاً ہی اُسے سخت شرمندگی احساس ہوا۔ رِدا سے اِس قدر ناراضگی کا اظہار واقعی مناسب نہیں تھا۔ کہ تیمور کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ اُس نے جلدی سے آ بڑھ کر تیمور کو رِدا کی گود سے چھین لیا۔ اور پھر اُسے سینے سے لگا رِدا کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"رُدا! بھئی یہ کیا! یہ کیا رُدا؟ اَرے کمال ہے۔ تم تو... تم بالکل ہی احمق ہو۔ اَے واہ! دیکھو خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ اے تیمور کے بچے! میرا ساتھ نہیں دے رہا تو بھی روتے جارہا ہے چُپ ہو جاؤ بھئی دیکھو۔ مجھے تو رونا بھی نہیں آتا۔ کاش میں بھی اِس وقت تمہارا ساتھ دے سکتی۔ بڑی غلطی ہو گئی رُدا۔ سوری یار! کم از کم تم پر تو اِتنا ناراض ہونے کا حق ہے مجھے۔ رُدا پلیز رُدا"!

لیکن رُدا کی سسکیاں نہیں رُکی تھیں۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا تھا اور سسکے جارہی تھی۔ ثناء پریشانی سے کمرے میں ناچنے لگی۔ اُسی وقت اختر نے دروازے سے منہ نکال کر اندر جھانکا۔ اور پھر دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

"کمال ہے کمال ہے خیریت۔ کوئی حادثہ ہوگیا"؟ ثناء اختر کو دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ رُدا نے بھی گردن اُٹھا کر اختر کو دیکھا۔ اور اختر بوکھلائے ہُوئے انداز میں بولا۔

"دو... دونوں خواتین سے معافی چاہتا ہُوں۔ دراصل کچھ ایسی دھما چوکڑی ہو رہی تھی۔ اندر کہ میں نے سوچا خُدا جانے کیا بات ہوگئی۔ ویری سوری۔ ویری سوری"!

"معافی مانگ لی آپ نے"؟ ثناء نے اُسے گھورتے ہُوئے کہا۔

"مم میرا خیال ہے کہ مانگ لی کیوں"؟ اختر اُسے دیکھتا ہُوا بولا۔

"تو اب باہر تشریف لے جائیے۔ کیا آپ کا اِس طرح گھس آنا مناسب ہے"؟

"قطعی مُناسب نہیں۔ لیکن میں اِن ہنگاموں کی وجہ جاننا چاہتا ہُوں"۔

"اختر صاحب"! ثناء غرّائے ہُوئے لہجے میں بولی۔

"جی ہاں۔ جی ہاں! خادم کو اختر ہی کہتے ہیں۔ لیکن واقعہ کیا ہُوا تھا منطق کی رُو سے"۔

"دیکھئے! اختر صاحب آپ ہمارے مہمان ہیں"۔

"شکریہ بے حد شکریہ! لیکن وہ واقعہ"؟

"میں کہتی ہُوں آپ چلے جائیے"۔

"جی ہاں آپ یہ ہی کہہ رہی ہیں۔ لیکن اصل واقعہ کیا ہے"؟ اختر نے کہا اور ثناء اُسے گھورنے لگی۔

"آپ بتائیے رُدا صاحبہ! اصل واقعہ کیا ہے"؟ اختر نے رُدا کی طرف دیکھا لیکن رُدا کچھ نہیں بولی تھی۔

"رُدا! آؤ باہر چلیں۔ یہ تو عجیب بات ہے۔ تم بتاؤ کیا اِس طرح اختر صاحب کو تمہارے کمرے میں آنا چاہیئے تھا"؟

"میں کیا بتاؤں"؟ رُدا نے آنسو خشک کرتے ہُوئے کہا۔ دفعتاً ہی ثناء اُچھل پڑی۔ اُس نے اختر سے کہا تھا کہ رُدا گونگی ہے۔ لیکن اِس وقت وہ اِس بات کو بھول گئی تھی۔ اور اُس نے خود ہی رُدا سے سوال کر دیا تھا۔ اب رُدا بول پڑی تھی تو ثناء چونک کر اختر کو دیکھنے لگی تھی۔

"سُبحان اللہ! سُبحان اللہ! میں اِس قسم کے بہت سے واقعات سے واقف ہُوں۔ جب کسی جذباتی حادثے کی وجہ سے کوئی بھی گونگا بول سکتا ہے منطق کی رُو سے"۔

"اختر صاحب"! ثناء غرّائے ہُوئے لہجے میں بولی۔

"جی فرمائیے! کیا خدمت کر سکتا ہُوں میں آپ کی"؟

"فی الحال صرف یہ خدمت ہے کہ آپ باہر تشریف لے جائیے۔ میں اِس طرح آپ کا کمرے میں گھس آنا پسند نہیں کرتی"۔

"مم مگر میرے خیال میں تو یہ مس رُدا کا کمرہ ہے"۔

"جس کا بھی ہو آپ چلے جائیے۔ پلیز آپ چلے جائیے"۔

"آئیے! پھر باہر چل کر بیٹھتے ہیں"۔ اختر نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ثناء نہ جانے کیوں مُسکرا پڑی تھی۔ رُدا نے بھی اپنے آنسو خُشک کر لئے تھے۔ ثناء اُس کی طرف بڑھتے ہُوئے بولی۔

"کمال ہے رُدا! اِس وقت تم نے... تم نے کمال ہی کر دیا۔ آؤ باہر آؤ۔ میں اُداس ہوگئی ہُوں۔ سچ مچ اُداس ہو گئی ہُوں۔ اور زندگی میں پہلی بار میں اِتنی اُداس ہُوئی ہُوں۔ آؤ رُدا۔ پلیز آؤ"۔

وہ دروازے سے باہر نکلی تو اختر موجود تھا۔

"وہ دراصل میں یہ کہنے حاضر ہُوا تھا کہ... کہ..."۔

"میں آپ کی کوئی بات سُننا نہیں چاہتی۔ ویسے یہ اچھی بات نہیں ہے۔ زبردستی کسی کے سر پر سوار ہونا تو مناسب نہیں ہے"۔

"سس... سر پر! اوہ معاف کیجئے گا"۔ اختر نے اپنے آپ کو دیکھتے ہُوئے کہا۔ لیکن ثناء رُدا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ اُسے لئے ہُوئے باہر نکل آئی۔

"رُدا! کیا میں نے کوئی واقعی سخت بات کہہ دی تھی... یار دیکھو جو کچھ بھی کہتی ہُوں تمہاری محبت میں کہتی ہُوں۔ اِتنا بُرا مان گئیں۔ میری بات کا"! ثناء لجاجت سے بولی۔ اور رُدا اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے ثناء کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"نہیں ثناء! خُدا کی قسم میں تمہاری بات کا بُرا نہیں مانی وہ تو بس ویسے ہی رونے کو جی چاہا تھا۔ تم مجھ سے ناراض نہ ہونا ثناء! تم مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ تم شاید صرف اِتنا ہی سمجھتی ہو گی

کہ تمہاری محبت یکطرفہ ہے۔ نہیں ثناء! انسان اِتنا ناسپاس نہیں ہوتا۔ اِتنا ناشکرا نہیں ہوتا۔ تم نے کیا نہیں دیا اِس گھر میں اِتنی محبت اِتنا پیار کہ شاید زندگی میں کوئی مجھے اپنا بھی نہ دے سکتا۔ میں... میں ثناء تمہاری ذرا بھی بے رُخی برداشت نہیں کر سکتی۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں تمہیں اِس کائنات میں۔ ایک بڑی ہستی کا درجہ دیتی ہُوں۔ بہت چاہتی ہُوں تمہیں۔ بڑا ناز ہے مجھے تم پر ثناء، بڑا ناز ہے"۔

"تو یار! کم از کم معافی کا دروازہ تو کھلا رہنا چاہیئے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو کیا وہ ناقابلِ معافی ہے"۔

"نہیں! بس ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں نے کہا تھا ناکہ میری طبیعت خراب ہے اور... اور بس۔ پتہ نہیں کیوں اندر سے گھبراہٹ سی طاری ہے مجھ پر۔ اِس لئے تمہاری اِتنی سی بے رُخی برداشت نہ ہو سکی۔ اور کوئی خاص بات تو نہیں تھی"۔

رُدا واقعی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

وہ دونوں دیر تک باہر گھاس پر بیٹھی رہیں۔ ندرت کو شاید اُن کی یہاں موجودگی کا پتہ نہیں چلا تھا۔ ورنہ وہ اَور یہاں نہ پہنچ جاتی۔ ثناء نے ایک ملازم کو اشارہ کر کے چائے لانے کو کہا۔ اور چائے کی ٹرے کے ساتھ ساتھ ہی ندرت کی صُورت بھی نظر آئی۔ وہ تیر کی طرح اِسی طرف آ رہی تھی۔

"اِس کمبخت کا چائے سے جنم جنم کا رشتہ ہے" آ گئی دیکھ لو"۔

"ہیلو خواتین! اکیلے اکیلے چائے پینا حرام ہوتا ہے۔ آپ کو اِس بات کا علم ہے"؟

"ہم اکیلے کہاں پی رہے تھے۔ بس انتظار کر رہے تھے۔ کہ چائے کی خوشبو تمہاری ناک تک پہنچے اور تم یہاں پہنچ جاؤ"۔

"شکریہ شکریہ! میں حاضر ہو گئی۔ کہیئے کیسے مزاج ہیں آپ دونوں خواتین کے"؟ ندرت نے چائے کی ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہُوئے کہا۔ اور پھر اُس نے سب کو چائے بنا کر پیش کی۔ اور خود بھی اپنی پیالی لے کر بیٹھ گئی۔

"بالکل ٹھیک ہیں" کیا تیاریاں ہو رہی ہیں کل کے لئے"؟

"بندی کو کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ بس سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر وہ عصمت آپا شاید کل نہ جا سکیں"۔

"عصمت آپا کو لے بھی کون جا رہا ہے۔ وہ کب ہمارا ساتھ دیتی ہیں"؟ ثناء نے کہا۔

"ہاں یہ کہا ہے۔ خواہ مخواہ اُن کا احترام کرنا پڑتا ہے..."۔ ندرت نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"کیا واقعی تم لوگ کل کہیں پکنک کا پروگرام رکھتی ہو"؟

"جی ہاں! تم لوگ سے آپ کی کیا مُراد ہے؟ آپ بھی تو جا رہی ہیں"۔

"ہاں ظاہر ہے۔ میں کیسے منع کر سکتی ہُوں"۔

"دیکھو نا ندرت! کبھی کبھی تو یہ رُدا اِتنی پیاری باتیں کرتی ہے کہ اِس پر قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ اب یہ اگر خواہ مخواہ نخرے دِکھاتی تو ہم لوگوں کا موڈ خراب ہوتا۔ کل کے لئے کتنا اچھا پروگرام بنا ہے"۔

"جا کہاں رہی ہو"؟ رُدا نے مُسکراتے ہُوئے سوال کیا۔

"کہیں بھی نکل جائیں گے۔ بس ایک پُرسکون گوشہ چاہیئے جہاں سمندر لہریں لے رہا ہو" ثناء نے کہا۔

"کون کون جا رہا ہے"؟ رُدا نے پُوچھا۔

"ماشاءاللہ! تمام لوگ! ویسے یہ سمندر گردی یا پھر پکنک مہمانوں کے اعزاز میں منائی جا رہی ہے۔ آخر کچھ نہ کچھ تو گھاس کھلانی ہی ہے اُنھیں"۔ ثناء نے جواب دیا اور پھر بولی۔

"گڈانی کیسی جگہ ہے؟ میرا خیال ہے سمندر کا حسین ترین کنارا ہے۔ بس ہٹس یا درخت وغیرہ نہیں ہیں۔ یہی ایک خرابی ہے"۔

"ہٹ تو ضرور ہونی چاہئیں ورنہ سارا دِن کھلے سُورج کے نیچے تو نہیں گزارا جا سکتا"۔ ندرت نے کہا۔

"ارباب طرب نے خیموں کا بندوبست کیا ہے۔ وہاں باقاعدہ شامیانہ لگایا جائے گا"۔ ثناء بولی۔

"تب پھر ٹھیک ہے"۔ ندرت نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

رُدا خاموشی سے اُن دونوں کی گفتگو میں بہل گئی تھی۔ لیکن اُس کا دِل اندر سے بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہونٹ خشک ہوئے جارہے تھے۔ چائے کی دُوسری پیالی بھی اُس نے ندرت سے طلب کر لی۔ لیکن چائے نے اُسے تسکین نہیں دی تھی۔ ایک عجیب سا خوف اُس کے وجود پر مُسلط تھا۔ وہ اِس خوف سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ رات کو اُس سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ اور وہ معمول سے کچھ جلد اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ بستر پر لیٹ کر اُس نے چھت پر نگاہیں گاڑ دی تھیں چہرے پر عجیب سا سکوت چھایا ہُوا تھا۔ وہ اُس شخص کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اُسے مِلا تھا۔ نجانے رات کو کتنی دیر تک جاگتی رہی اور پھر رات کے کون سے پہر اُسے نیند آئی۔ لیکن صبح ہی صبح ندرت اور ثناء نے اُسے آکر جگا دیا تھا۔

"بیگم صاحبہ! صبح ہو چکی ہے اور تیز دھوپ میں کسی پکنک پوائنٹ پر جانا حماقت ہے۔ سب لوگ تیاریاں کر چکے ہیں براہِ کرم

آپ جلدی سے تیار ہو جائیے۔ فوراً چلو ندرت! بیگم صاحبہ کا لباس وغیرہ منتخب کرو۔"

"اُسے میں اُٹھتی ہوں۔ بس پانچ منٹ میں تیار ہوئی جاتی ہوں۔ تم لوگ خواہ مخواہ فضول حرکتیں مت کرو۔" ردا نے کہا۔

"ندرت! لباس کا انتخاب" ثناء کھردرے لہجے میں بولی اور ندرت، ردا کی الماری کی جانب بڑھ گئی۔ اُس نے اپنی پسند سے ایک بھڑکیلا سا لباس نکالا۔ اور اُسے ردا کے حوالے کرتی ہوئی بولی۔

"جائیے غسل خانہ کھلا ہوا ہے۔" ردا پھیکے انداز میں مسکراتی ہوئی غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ باہر نکلی تو اُسی کے کمرے میں وہ دونوں ناشتے کی ٹرے سجائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ تیمور کو ایک بہت ہی خوبصورت لباس پہنایا گیا تھا۔ جو پکنک کے مطابق تھا۔ ردا اُن کے ساتھ ناشتے میں شامل ہو گئی۔ باہر تمام تیاریاں ہو چکی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اختر نے پھر احمقوں کی طرح دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"سب لوگ! سب لوگ باہر انتظار کر رہے ہیں۔"

"اوہو! اختر صاحب! آئیے آئیے۔" ندرت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اختر اندر آ گیا۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے ردا اور ثناء کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب تو یہ مسلسل بول رہی ہوں گی۔" اُس نے ثناء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں بول رہی ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف ہے؟" ثناء نے پوچھا۔

"ارے آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ میں نے دادی اماں سے چورن لے کر کھا لیا تھا۔" اختر بولا۔

"چورن؟" ندرت نے دلچسپی سے کہا۔

"جی ہاں! براہِ کرم ایک پیالی چائے میرے لئے بھی بنا دیجئے۔" یہ کہتے ہوئے اختر اُن کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ ثناء نے اُسے گھور کر دیکھا۔ لیکن اختر اُس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ ندرت نے چائے بنا کر اُسے دے دی۔

"جی ہاں چورن! بات چورن ہی کی ہو رہی تھی نا۔ وہ اپنا خیر دین ہے نا بڑی نفیس شئے ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اِس کوٹھی میں سب سے اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے۔"

"خوب خوب! امریکہ لے جائیے اُسے اپنے ساتھ۔" ثناء نے کہا۔

"خدا کی قسم اگر آپ لوگ دے دیں تو میں اُسے ضرور لے جاؤں۔ کیا شئے ہے بھئی! کہنے لگا چورن کھانے سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"مگر غلط کیا ہو گیا تھا؟" ندرت نے پوچھا۔

"یہ پیٹ! یہ پاپی پیٹ! رات کا کھانا بہت زیادہ کھا گیا۔ ویسے اب ٹھیک ہوں۔" ردا بے اختیار مسکرا پڑی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اختر اُن کے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا۔ باہر تیاریاں تھیں۔ خیر دین۔ خالد، رشید صاحب اور دُوسرے تمام افراد گاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے سب کے سب اِن ہی لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ رشید صاحب بھی جا رہے ہیں؟" ثناء نے ہونٹ بھینچ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے اِسی خاندان کے ایک فرد ہیں کیوں نہ جائیں؟" ندرت بولی۔ اور ردا بے اختیار مسکرا پڑی۔ طفیلی بیگم کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ اور جانتی تھی کہ آج کل ثناء رشید کی دُشمن ہے۔

وہ سب ایک گاڑی میں ساتھ ہی بیٹھی تھیں جب کہ اختر، رشید، خیر دین اور دُوسرے افراد دُوسری گاڑیوں میں تھے۔ ثناء نے گڈانی کے بارے میں فیصلہ دے دیا تھا اور کسی کو اعتراض نہیں ہوا تھا۔ چند ملازمین بھی ساتھ لے لئے گئے تھے شہاب صاحب یا احسان صاحب نے اِن لوگوں کے ساتھ جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ کچھ بزرگ خواتین کی حسرت بھری آنکھیں اُن لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ لیکن اُنھیں لفٹ نہیں دی گئی تھی۔ گاڑیاں گڈانی کی جانب سفر کرنے لگیں۔ خاصا طویل راستہ تھا راستے میں خوب چونچیں ہوتی رہیں۔ اچھا خاصا تفریحی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اور ردا کچھ دیر کے لئے اپنی پریشانی بھول گئی تھی بالآخر گاڑیاں گڈانی پہنچ گئیں۔ سمندر تا حدِ نگاہ لہریں لے رہا تھا ساحل کی پہاڑی چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں۔ دُور دُور تک سمندر پھیلا ہوا تھا۔ چونکہ عام دن تھا۔ اِس لئے گڈانی پر زیادہ لوگ نہیں آئے تھے۔ صرف چند افراد اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک چٹانی سلسلے کے قریب ایک بہت بڑا شامیانہ لگا دیا گیا۔ نیچے دریاں بچھائی گئیں۔ ایک طرف کچن بنایا گیا۔ اور ملازمین اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ سمندر کے رسیا سمندر کی جانب دوڑ گئے تھے۔ خالد بھی ایک خوبصورت سوئمنگ ڈریس میں سمندر کے کنارے کی جانب چل پڑا۔ اور اختر نے بھی یورپ کا بنا ہوا ڈریس پہن لیا تھا۔

"اِن بے شرموں کو دیکھو معلوم ہوتا ہے اب بھی اپنے آپ کو یورپ میں سمجھ رہے ہیں۔" ثناء نے اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"زندگی تو یہی ہے ثناء! کاش ہم بھی... ہم بھی۔" ندرت بولی۔

"اے اللہ رکھی! اگر اللہ تجھے رکھے تو ہوش میں رہ۔

زیادہ آگے بڑھنا حماقت ہوتی ہے۔" ثناء نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں ردا! تمھارا کیا خیال ہے؟" ندرت نے ردا کا سہارا لینا چاہا تھا۔

"مجھے تو پانی ہی سے وحشت ہوتی ہے میں تو دریا کے کنارے بھی نہیں بیٹھ سکتی۔"

"ہائے اللہ! تمھیں تو انسانوں سے بھی وحشت ہوتی ہو گی۔ کیوں نہ تم کسی ویران صحرا میں جا کر دھونی رما کر بیٹھ جاؤ...." ندرت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اور ردا ہنسنے لگی۔

"بھئی اب یہاں بیٹھنے کے لئے تو نہیں آئے۔ آؤ چہل قدمی کریں۔ دیکھو وہ اختر اور خالد تو پانی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔ ارے وہ اپنے خیر دین کو بھی دیکھو۔" "اللہ خیر!" ثناء نے کہا۔ خیر دین کی کھوپڑی بہت دُور پانی میں اُبھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"کہیں خیر سے ہم خیر دین سے محروم ہی نہ ہو جائیں۔" ثناء پھر بولی۔

لڑکیاں سمندر کے کنارے چہل قدمی کرنے لگیں رشید صاحب بھی اپنے طور پر سرمستیاں کر رہے تھے۔ غرض کہ ہر شخص اپنی اپنی پسند کی تفریح میں مشغول ہو گیا تھا۔ تیمور رونے لگا تو ثناء دوڑی چلی آئی۔ اور اُس نے آ کر تیمور کو اُٹھا لیا۔

"ارے ہیرو! کیا خیال ہے؟ پانی کیسا لگتا ہے تمھیں؟ مگر یار تم تو لاہور کی مخلوق ہو۔ اور وہاں سمندر نہیں ہے۔ آؤ ذرا تمھیں سمندر دکھائیں۔" ثناء تیمور کو لے کر ایک طرف بڑھ گئی۔ ندرت کو دُور سے جمن نظر آیا۔ اور وہ تفریح کے لئے مچل اُٹھی۔ چنانچہ وہ جمن کی جانب چل پڑی تھی۔ ردا تنہا رہ گئی تھی۔ وہ پانی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو کر سمندر کی لہروں کو دیکھنے لگی۔ پھر یونہی چہل قدمی کرتی ہوئی اُن پتھریلی چٹانوں کی طرف بڑھ گئی۔ جن کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا نجانے کیوں اُسے یہ ماحول بہت سکون بخش محسوس ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اِن چٹانوں پر چڑھتی ہوئی کافی بلندی پر پہنچ گئی۔ ایک جگہ اُسے ایک عجیب سا نظارہ دیکھنے کو ملا۔ چٹانوں کے نیچے ایک پیالے نما حصے میں چھوٹا سا سوراخ تھا۔ سمندر کا پانی جب اِس سوراخ سے ٹکراتا تو قوت کے ساتھ اُوپر بلند ہوتا اور فضا میں ایک فوارہ سا چھوٹتا نظر آتا۔ ردا کو یہ منظر اِتنا حسین لگا کہ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ باقی لوگ نیچے اپنی اپنی تفریحات میں مشغول تھے۔ اُسے بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دفعتاً اُس نے قدموں کی آہٹیں سُنیں۔ اور چونک کر پیچھے دیکھنے لگی۔ لیکن رشید کو دیکھ کر اُس کا منہ بگڑ گیا تھا۔ یہ جانور کہاں سے آ گیا۔ اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا اور سپاٹ نگاہوں سے رشید کو دیکھتی رہی۔

"میں جانتا تھا کہ مجھے تمھارے ساتھ تنہائی کا موقع ضرور ملے گا۔ یقین کرو مجھے اِس تفریح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو ردا بس تمھاری قربت کے لئے یہاں تک آیا تھا۔" ردا اب بھی سپاٹ نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ رشید اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ردا نے وہاں سے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ویسے تو وہ چند الفاظ میں رشید سے بہت کچھ کہہ چکی تھی۔ لیکن اِس بے غیرت شخص کے لئے مہذب الفاظ شاید کافی نہیں تھے۔ چنانچہ اُس نے آج اُسے اچھی طرح جھاڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔

"کچھ بولو گی نہیں ردا؟" رشید نے کہا۔

"رشید صاحب! کاش آپ ثناء کے رشتے دار نہ ہوتے تو میں پولیس اسٹیشن جا کر آپ کے بارے میں رپورٹ لکھوا دیتی۔ اور اِس میں یہ ہی کہتی کہ ایک غنڈہ مسلسل مجھے پریشان کر رہا ہے۔"

"تو گویا آپ دبے الفاظ میں مجھے غنڈہ کہنا چاہتی ہیں؟"

"کیا میری آواز آپ کے کانوں تک نہیں پہنچی؟ آپ اِن الفاظ کو دبے الفاظ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"خوب! یہ مجھ پر ابھی انکشاف ہوا ہے کہ میں غنڈہ بھی ہوں۔ حالانکہ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھ سے زیادہ شریف آدمی پوری زمین پر دُوسرا نہیں پیدا ہوا۔"

"کاش! آپ لوگوں کے خیال پر ایک فیصد بھی پورے اُتر سکتے۔ رشید صاحب میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"بھئی سیدھی سی بات ہے تمھیں چاہتے ہیں۔ کیا سمجھیں۔" رشید نے ڈھٹائی سے کہا۔

"آپ اِن تمام لوگوں کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں جو اِس وقت یہاں موجود ہیں؟ کیا آپ نے مجھے بے سہارا سمجھ لیا ہے؟ ایسی بات نہیں ہے رشید صاحب ثناء ہی آپ کے سر پر اِتنے جوتے لگا سکتی ہے کہ آپ اُنھیں گن بھی نہ پائیں۔ میں نہیں چاہتی رشید صاحب کہ میری وجہ سے کسی کو اِس عمارت میں تکلیف پہنچے۔ میں یہاں اِن سب کی ممنون ہوں۔ لیکن آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اپنی فطرت کے خلاف کچھ کروں۔"

"ہاں! میں تمھیں مجبور کرنا چاہتا ہوں ردا۔ کہ تم اپنی فطرت کے خلاف کچھ کرو۔ اور اُس کے بعد مجھے بھی جواب دینے کا موقع مل جائے۔"

"آپ آخر کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟"

"اس کی وجہ بتا چکا ہوں ندا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے سب کو دیکھا۔ لیکن تمہاری شخصیت مجھے سب سے دلکش نظر آئی۔ میں اپنے ذہن میں تمہارے لئے جگہ پاتا ہوں۔ اور یہ شاید تمہاری خوش بختی ہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے گنجائش پیدا ہوگئی۔ ورنہ ندا میں بالکل ہی مختلف قسم کا انسان ہوں۔ بہت کچھ کہہ سکتا ہوں میں تمہارے بارے میں۔ بہت کچھ جانتا ہوں۔ میرے علم میں ہے کہ تم ایک بچے کی ماں ہو۔ یہ بات بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس بچے کا باپ لاپتہ ہے۔ اور اگر اس عمارت کے رہنے والوں کو یہ حقیقت معلوم ہو جائے کہ سرے سے اس بچے کا کوئی باپ تھا ہی نہیں تو تم جانتی ہو کہ تمہارے ساتھ یہاں کیا ہوگا؟"

"میں اس بات کا جواب بھی دینا پسند نہیں کرتی ذلیل انسان۔ کچھ نہیں کہوں گی میں۔ کچھ نہیں کہوں گی۔" ندا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے زیادہ برداشت کرنا اُس کے بس سے باہر تھا۔

"نہیں ندا! سنو! کچھ کہو یا نہ کہو۔ لیکن سنو ضرور۔ میں تمہاری تمام کمی کے باوجود تمہیں اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ کون ماں کا لال ایسا ہوگا جو یہ بات جاننے کے باوجود کہ تم ایک ایسے بچے کی ماں ہو جس کے باپ کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ تمہیں اپنانے کی کوشش کریگا۔ لیکن میں بہت چوڑا سینہ رکھتا ہوں۔ میں یہ کام کروں گا ندا! مجھ سے تعاون کرو۔" ندا نے کوئی جواب نہیں دیا وہ واپسی کے لئے مڑ گئی تھی۔ تب رشید نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم مجھے میری بات کا جواب نہ دو۔ لیکن تم سے کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا میں۔ ثاقب صاحب کے بارے میں۔" ندا اس طرح اُچھلی جیسے اُس کی پُشت میں گولی لگی ہو۔ وہ پلٹ کر دہشت زدہ نگاہوں سے رشید کو دیکھنے لگی۔ رشید کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رشید کو دیکھنے لگی۔

"ہاں ندا! میں ثاقب صاحب کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" ندا کے پیروں کی جیسے جان نکل گئی تھی رشید کی زبانی ثاقب کا نام سن کر اُس پر واقعی بہت بھیانک ردِ عمل ہوا تھا۔ وہ بیٹھتی چلی گئی۔ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ رشید چند قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

"کل ندا! جب تم دفتر سے نکل کر رکشہ کی تلاش میں جا رہی تھیں۔ اتفاق سے میں وہیں موجود تھا اور جب ثاقب صاحب نے تم سے ملاقات کی اور تمہیں کچھ بتانا چاہا تو اتفاق سے میں نے اُن کے الفاظ سن لئے۔ تم نے بیشک اس بات کا اظہار کیا تھا کہ تم ثاقب کو نہیں جانتیں۔ لیکن ثاقب صاحب نے یہ بات سیدھی نہیں کی تھی۔ میں ندا مسلسل تمہاری ٹوہ میں رہتا ہوں۔ بھلا اس موقع کو کیسے ہاتھ سے گنوا سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ثاقب صاحب سے ایک ریستوران میں ملاقات کی۔ خاصی رقم خرچ کی اُن پر اور پھر اُن کی زبان بالآخر تمہارے بارے میں کھلوالی۔" ندا نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اُس پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ رشید نے کہا۔

"لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ندا۔ اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ اپنے ہی اپنوں کے راز، راز رکھتے ہیں۔ تم اس بات پر پُورا پُورا یقین رکھو کہ میں اپنی زبان کبھی نہیں کھولوں گا میرا خیال ہے تم سے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے۔ باقی گفتگو کے لئے اگر رات کا وقت رکھا جائے تو کیسا رہے گا۔" ندا نے آنکھیں کھول کر بے بسی سے رشید کو دیکھا تو رشید کہنے لگا۔

"ہاں ندا! میری روح میری زندگی! کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہو۔ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ رشید کو اپنا ساتھی بنالو اپنا دوست بنالو۔ ضروری نہیں ہے کہ ہماری محبت کی داستانیں عام ہوں۔ بس ہم ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے۔ میں تمہارے راز کو اپنی زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔ مجھ پر پُورا پُورا بھروسہ کرو ندا۔ رات کو میں تمہارے پاس آؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ تمہیں مجھ پر یقین آجائے۔" رشید یہ کہتا ہوا آگے بڑھ کر ندا کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ ندا کی جانب بڑھائے لیکن اُسی وقت اُس کی کھوپڑی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک پتھر اُس کے سر پر آکر لگا تھا اور اس زور سے لگا تھا کہ ایک لمحے کیلئے اُسے چکر سے آگئے۔ اُس نے بمشکل تمام خود کو گرنے سے بچایا تھا ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ دوسرا پتھر اُس کے بالوں کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ رشید نے چوٹ کی جگہ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ خون نہیں نکلا تھا لیکن پتھر اتنی زور سے لگا تھا کہ ابھی تک اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا تھوڑے ہی فاصلے پر خیر دین ہاتھ میں غلیل لئے نشانہ بازی کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ آسمان پر اُڑتے ہوئے کوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اُس نے گھوم کر ایک اور کوّے پر غلّہ چلایا۔ لیکن یہ غلّہ رشید کی کمر میں آکر لگا تھا۔ اور رشید تلملا اُٹھا۔

"او گدھے! او بے غیرت! کیا کر رہا ہے یہ؟ خیر دین او خیر دین۔" خیر دین نے چونک کر رشید کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔

"اِدھر آجاؤ جی! کوؤں کا شکار کر رہے ہیں ہم۔ خدا قسم بڑا

مزہ آتا ہے۔ اِدھر آجاؤ رشید بھائی!" خیر دین ہاتھ ہلاتا ہوا بولا اور رشید غصے سے بپھرا ہوا اُس کی جانب چل پڑا۔ رفتہ رفتہ اُس کے سر پر ایک دوسرا سر نمودار ہوتا جا رہا تھا۔ خیر دین کے قریب پہنچ کر اُس نے خیر دین کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن خیر دین نے ایک کوّے پر غلیل چلاتے ہوئے اپنی جگہ تبدیل کرلی۔ بظاہر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ خیر دین نے جان بوجھ کر یہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ لیکن رشید اپنے جھونک میں اوندھے منہ نیچے جا پڑا۔ اور اس بار اُس کے دانت بال بال بچے تھے اگر دونوں ہاتھ پُوری قوت سے زمین پر نہ ٹک جاتے تو یقیناً منہ اُس اُبھری ہوئی چٹان سے ٹکراتا جس پر وہ گرا تھا۔ خیر دین نے غالباً اس بار کوّے کو نشانہ بنا ہی لیا تھا۔ وہ خوشی سے چیختا ہوا کوّے کی جانب دوڑ گیا اور پھر زخمی کوّے کو اُٹھا لایا۔

"ہاہا، دیکھا نشانہ رشید بھائی۔ قسم خدا کی اپنے پنڈ میں اپنے نشانے کا جواب نہیں تھا۔ یہ دیکھو سالے کی دونوں ٹنگڑیاں ٹوٹ گئی ہیں۔" اُس نے کوّا رشید کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رشید جو غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا کوّے کی لاش کو ہاتھوں میں لئے خونخوار نگاہوں سے خیر دین کو گھورتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا خیر دین کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ خیر دین خود کافی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پتہ نہیں یہ معصومیت تھی یا کوئی سوچی سمجھی بات۔ کوؤں کے غول نے مُردہ کوّے کو رشید کے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا اور کوؤں کی یہ خصلت ہے کہ اپنے کسی ساتھی کی موت کو وہ کبھی معاف نہیں کرتے۔ خیر دین تو تھوڑا سا نیچے اُتر گیا تھا لیکن رشید کی شامت آگئی۔ کوّے بُری طرح چیختے ہوئے اُس کے چاروں طرف منڈلانے لگے تھے اور پھر وہ انتہائی غصے سے اُس پر حملہ آور ہوئے اور رشید کے سر اور شانوں پر چونچیں مارنے لگے۔ اب رشید کو احساس ہوا کہ صورتِ حال کیا ہوگئی ہے۔ دوسرے لمحے اُس نے کوّے کی لاش اپنے ہاتھ سے دُور پھینک دی اور بدحواسی کے انداز میں نیچے اُترنے لگا۔ لیکن کوّے اُسے معاف کرنے والے نہیں تھے۔ وہ مسلسل رشید کا تعاقب کرتے ہوئے اُسے چونچیں مار رہے تھے۔ رشید کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ بدحواسی کے عالم میں وہ کئی بار گرا۔ پھر اُٹھا اور پھر گر پڑا اُس کے گھٹنے اور کہنیاں وغیرہ بُری طرح چھل گئی تھیں۔ خیر دین کا کہیں پتہ نہیں تھا اور ندا دُور کھڑی ہوئی متعجبانہ انداز میں یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی وہ ذہنی طور پر اس وقت قطعی معطل تھی کیونکہ رشید نے جو کچھ اُس سے کہا تھا وہ انتہائی سنسنی خیز تھا اِدھر بے چارہ رشید اس مصیبت کا شکار ہوگیا تھا اور اُدھر ساحل پر خاصی دھماچوکڑی مچی ہوئی تھی۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر تفریحات کر رہے تھے۔ ثنا دیمور کے ساتھ پانی میں بہت خوش تھی۔ ندرت کا رُخ جمن کی جانب تھا جو ملازم ہونے کی وجہ سے ابھی انتظامی معاملات ہی میں مصروف تھا۔

دفعتاً ندرت کی نگاہ سمندر کے کنارے چلتے ہوئے پانی میں اُبھری ہوئی کسی چیز پر پڑی اور وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی ایک جُوتا تھا جو سطح سمندر سے چند انچ اُوپر اُٹھا ہوا تھا غالباً کسی لکڑی میں اٹکا ہوا تھا۔ بات کچھ بھی نہیں تھی لیکن دفعتاً ہی ندرت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ جُوتا... یہ جُوتا! وہ بُری طرح بوکھلا گئی۔ اُس نے خوف زدہ نگاہوں سے جُوتے کو دیکھا جُوتا کبھی نیچے ہو جاتا تھا کبھی تھوڑا سا اُوپر لیکن یہ ندرت ہی کا جُوتا تھا وہی ایک جُوتا جو پانچ نمبر میں چھوڑ بھاگی تھی۔ اُس کی نگاہیں دھوکہ نہیں کھا رہی تھیں۔ یقیناً یہ اُس کا جُوتا تھا۔ لیکن یہاں وہ پریشان نگاہوں سے اپنی جگہ ٹھٹک کر جُوتے کو دیکھنے لگی۔ اور پھر رفتہ رفتہ اُسے یہ احساس ہوا کہ جُوتا کسی لکڑی میں اٹکا ہوا ہے اور لکڑی کسی کے ہاتھ میں ہے جس کے ہاتھ میں بھی لکڑی تھی۔ وہ بار بار جُوتے کو اُوپر اُٹھاتا اور اس کے بعد نیچے اُتر جاتا لیکن اُس کی صُورت نظر نہیں آرہی تھی۔ ندرت کے ذہن میں ایک لمحے کے اندر اندر نہ جانے کتنے خیالات آئے اور وہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ اب اُسے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ بالآخر عبدالجلیل جن پکڑا گیا۔ یقیناً یہ وہی شخصیت ہو سکتی تھی جس نے پانچ نمبر میں اُنہیں ڈرایا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھی تھی کہ پانچ نمبر آسیب زدہ ہے۔ لیکن بعد میں پانچ نمبر کے فرش پر قدموں کے نشانات نے یہ بات واضح کردی تھی کہ کسی نے اُن کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ اور اب یہاں یہ جُوتا، دفعتاً جُوتا پانی کی سطح پر تیرنے لگا۔ ندرت نے صاف محسوس کیا تھا کہ کوئی پانی کے نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا دُور نکل گیا ہے گویا وہ جُوتا اُسی جگہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ لیکن جائے گا کہاں بالآخر اُسے پانی سے نکلنا پڑے گا۔ ندرت نے اس طرح رُخ تبدیل کرلیا۔ جیسے وہ اب اُدھر دیکھ ہی نہ رہی ہو لیکن چور نگاہوں سے وہ پانی ہی میں دیکھ رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد عین اُس جگہ جہاں خالد پانی میں نہا رہا تھا۔ ایک سر اُبھرا اور پھر اختر، خالد کے نزدیک پانی کی سطح سے اُبھر آیا۔ ندرت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اختر! ہزاروں خیالات اُس کے ذہن میں کوند گئے۔ ثناء نے اختر کی شرارت کے بارے میں بتایا تھا۔ اور یہ اختر، یقیناً اختر۔

سو فیصدی اختر بھلا کوٹھی کے اندر رہنے والے کسی شخص کی یہ جرأت کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ شناء کو ڈرانے کی کوشش کرتا۔ تو یہ غیر ملکی نوجوان، ہُوں! اُس نے بڑے غلط لوگوں سے ٹکر لی ہے۔ نُدرت نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب اُسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی۔ کہ پانچ نمبر میں عبدالجلیل کون تھا۔ اختر یقیناً شرارتاً جُوتا بھی یہاں ساتھ لے آیا تھا۔ اور اب اُس نے وہ جُوتا خصوصاً نُدرت کے سامنے پیش کیا تھا۔ غالباً وہ اُن لوگوں کو یہاں بھی ڈرانا چاہتا تھا۔ لیکن نُدرت وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اختر کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں ہوگا کہ وہ لوگ صُورتِ حال سے واقف ہو گئے ہیں۔ چند لمحات نُدرت کھڑی سوچتی رہی پھر وہ جُوتے کو نظرانداز کر کے وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جمن کے قریب پہنچ گئی۔ ذہن میں بے شمار منصوبے بن رہے تھے غلطی اختر کی تھی۔ اُس نے اُنھیں للکارا تھا تو پھر اب بھلا اُسے جواب کیوں نہ دیا جاتا۔ جمن نُدرت کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ بے چارہ کاموں میں مصرُوف تھا اور گرمی کی وجہ سے پسینے میں نہایا ہُوا تھا۔

"ارے جمن! تم تو پانی میں نہیں گئے؟"

"پانی میں نہیں گیا۔ مم... میرا مطلب ہے۔ ہاں نہیں گیا۔"

"لیکن بھیگ تو اس طرح رہے ہو تم جیسے سمندر سے نکل کر آئے ہو۔"

"یہ تو... یہ تو پسینہ ہے وہ جو کہتے ہیں نا کہ حلال روزی تھوڑا سا ایمان ہوتی ہے۔ پتہ نہیں کتنا..."

"نصف... نصف..."

"ہاں، ہاں وہی وہی۔ تو میں اپنی روزی حلال کر رہا ہُوں۔" جمن نے جواب دیا۔

"رے دہی نوکر کے نوکر، یہاں آنے کے بعد نہ کوئی ملازم ہے نہ کوئی مالک۔ یہ سمندر کسی کی میراث نہیں ہے۔ تم بھی اُس میں جا سکتے ہو جمن۔ کام ختم ہو گیا ہو گا۔ چلو میں تمہیں بھی اُنھیں بہادروں کے ساتھ دیکھنا چاہتی ہُوں جو پانی سے نہیں ڈرتے۔"

"ارے بپ... باپ رے۔ مم... مگر میں..." جمن تھوک نگل کر بولا۔

"کیوں، کیا ہُوا؟"

"دراصل، دراصل وہ میں نے طوطے سے فال نکلوائی تھی ایک بار۔"

"کیا؟"

"ہاں طوطا بہت اچھی فال نکالتا ہے۔ اُس میں یہی لکھا تھا کہ تمھاری مُوت پانی میں ڈوبنے سے ہوگی۔ بس اُس دن سے ڈر گیا ہُوں۔"

"کمال ہے! یہ طوطا نجومی کب سے ہو گیا؟"

"نجومی دُوسرا ہوتا ہے وہ طوطے کو تربیت دیتا ہے طوطا لفافہ نکالتا ہے اور پھر نجومی لفافہ کھولتا ہے۔ مم... میرا مطلب ہے مجھے ویسے بھی پانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو جمن۔ تم... تم اور ڈر میرے خیال میں تو یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔"

"وہ تو ہیں... مم... مگر پانی ویسے بھی ابھی بہت کم ہیں۔ کھانا تیار نہیں ہُوا۔ اب دیکھو نا یہ شناء بی بی بھی عجیب سی ٹانگ پھنساتی ہیں۔ اگر کھانا گھر ہی سے پک کر آجاتا تو کیا حرج تھا یہاں ہوا میں ٹھیک سے آگ بھی نہیں جل رہی۔ شرط یہ تھی کہ کھانا سمندر کے کنارے ہی پکایا جائے گا۔ میں بھی کھانے میں مٹی شامل کردُونگا۔ پھر دیکھوں گا کیسا مزہ آتا ہے۔ بھلا میرا کیا قصور، ہوا چل رہی ہے۔ مٹی اُڑ رہی ہے۔"

"ارے نہیں نہیں جمن۔ کھانا تو میں بھی کھاؤں گی۔" نُدرت جلدی سے بولی۔

"آئیں۔ مار دیا نا۔ تمھاری وجہ سے نہ جانے کتنی بار زیرِ انتقال ہوگا۔"

"واہ! کیا خوبصورت ڈائیلاگ بولا ہے تم نے...!"

"خُوب... خوبصورت، کیا واقعی؟" جمن کی آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں۔

"ہاں بے شک۔ مگر تم کھانے میں مٹی مت مِلانا پلیز۔ جمن مجھ سے تو کرکری چیز ذرا بھی نہیں کھائی جاتی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے تمھارے طفیل میں سب کو معاف کر دیا۔"

"جمن کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہُوں تم سے۔"

"کہو کہو یہاں تو بہت موقع ہے سب لوگ اپنی اپنی تفریحوں میں لگے ہُوئے ہیں۔ کہو جو دِل چاہے کہو۔" جمن نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے کہا۔

"تمھارا پیار خطرے میں ہے جمن۔"

"کون خطرے میں ہے؟" جمن خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"پیار... پیار..."

"پیار! اچھا اچھا، مطلب یہ کہ ہمارا عشق۔"

"بالکل بالکل وہ سخت خطرے میں ہے۔"

"کیوں! کیا خطرہ پیش آ گیا ہے۔"

"رقیبِ روسیاہ۔"

"کون رقیب روسیاہ؟" جمن سینہ پُھلا کر بولا۔

"اُدھر دیکھو۔ اُدھر سمندر میں۔"

"سمندر میں رقیب میرا مطلب ہے وہ تو نہیں جو جانور مچھلی ہوتی ہے جیانہ۔"

"کیا فضول باتیں کرتے ہو جمن وہ دیکھو اُدھر تمھیں دو افراد نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"کون ہیں وہ؟"

"وہ تو مہمان ہیں۔ ولایت سے آنے والے۔"

"اُنھی میں سے ایک مہمان آجکل مجھ پر ڈورے ڈالنے کی فکر میں ہے۔"

"کیا ڈالنے کی فکر میں ہے؟"

"ڈورے ڈورے، ہر بات کو بار بار دوہرانا پڑتا ہے۔"

"نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اُسے قتل کر دوں گا۔ اُس کے ٹکڑے کر کے اُسے سمندر میں بہا دُوں گا۔"

"گڈ... گڈ۔ یہی جذبہ تو چاہیئے نا مجھے، وہ تم نے فلمیں تو دیکھی ہی ہوں گی۔ اُس میں ایک محبوب ہوتا ہے اور دوسرا وِلن میرا مطلب ہے ہیرو کے ساتھ وِلن ہوتا ہے نا۔"

"بالکل ہوتا ہے اور آخر میں ہیرو وِلن کو پہاڑیوں میں مارتا ہے۔ ریلی کو پٹڑی میں مارتا ہے۔ ہر جگہ مارتا ہے اور وِلن بالآخر مر جاتا ہے۔" جمن نے کہا۔

"ہُوں۔ اِس وِلن کی مُوت بھی قریب آ گئی ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہُوں کہ اُس کی مُوت تمھارے ہاتھوں لکھی ہے۔"

"مم... میرے ہاتھوں مگر یہ تو فلمی وِلن نہیں ہے اور پھر فلمی وِلن تو صرف فلموں میں کام کرتے ہیں اصل میں تھوڑی ہی مارتے ہیں اگر میں اُسے مار دُوں گا تو کیا مجھے پھانسی نہیں ہو جائے گی؟"

"پھر وہی بُزدلی کی باتیں۔ میں یہ کب کہہ رہی ہُوں کہ تم اُسے جان سے مار دو۔ لیکن کوئی تمھاری محبت پر جال ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے اور تم اُسے معاف کر دوگے۔"

"ہرگز نہیں معاف کروں گا۔ اُس کی پلیٹ میں اِتنی مٹی... مِلاؤں گا کہ اُس کے پیٹ میں پتھری پتھر اُگ آئیں۔" جمن نے غصیلے لہجے میں کہا اور نُدرت نے بمشکل تمام قہقہہ ہضم کیا۔

"اِس سے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ دُوسری پلیٹ میں سالن لے لے گا۔ میرا خیال ہے یہ حرکت مت کرنا تم ابھی اپنے آپ پر ضبط کرو لیکن کوٹھی میں کوئی مُناسب موقعہ دیکھ کر تم اُس سے نمٹ لینا۔ یہ سمجھ لو یہ تمھارا امتحان ہے۔"

"تم فکر مت کرو اللہ رکھی۔ جمن ایک غیرت مند عاشق ہے کون سا ہے اُن میں سے۔"

"وہ دُوسرا والا جو سُرخ لباس پہنے ہُوئے ہے اختر ہے اُس کا نام۔"

"ٹھیک ہے۔ اب اختر کی شامت دُور نہیں ہے۔ میں اُس سے ڈبل لڑوں گا۔ بالکل ڈبل۔"

"کیا لڑو گے؟"

"ارے ڈبل۔ ڈبل وہ فلم نہیں دیکھی تھی تم نے کیا نام تھا اُس کا۔ دیوانہ دیوانہ پاگل۔ ہاں بالکل یہی نام تھا۔ اُس میں دو آدمی ڈبل لڑتے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے پستول نکال کر ایک دُوسرے پر چلاتے ہیں اور بالآخر اُن میں سے ایک مر جاتا ہے۔ بعض اوقات دونوں بھی مر جاتے ہیں۔"

"نہیں جمن نہیں۔ تم نہیں مرو گے تم بالکل نہیں مرو گے۔"

"ارے تو میں کہاں مر رہا ہُوں۔ میں تو اُسے مار دُوں گا۔"

"بالکل نہیں۔ کھیل اس قسم کا نہیں ہونا چاہیئے۔ اور پھر تمھارے پاس پستول بھی تو نہیں ہیں۔"

"ہاں بس یہ کھیلنا ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ دیکھوں گا کہ میں اُس سے کیا سلوک کر سکتا ہُوں۔ میں اُس سے پُوچھوں گا کہ وہ تو بعد میں آیا ہے پہلا حق میرا ہے اللہ رکھی پر۔"

"بالکل، بالکل، لیکن احتیاط سے کسی اور کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔"

"تم فکر مت کرو اللہ رکھی۔ جمن غیرت مند ہے اور... اور..."

ابھی جمن نے اِتنا ہی جُملہ کہا تھا کہ دفعتاً چیخ و پُکار کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ رشید بُری طرح پہاڑیوں کی طرف سے بھاگا آ رہا تھا۔ اور کوّوں کا ایک غول اُس پر جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہا تھا۔ پُرلطف بات یہ تھی کہ عقب سے خیر دین اُن کوّوں پر غلیل سے نشانے لگا رہا تھا۔ اور وہ بھی رشید ہی کی طرح چیختا چلا آ رہا تھا۔ سب ہی اِس چیخ و پُکار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کوّے مسلسل رشید پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ رشید دوڑتا ہُوا شامیانے کے نیچے پہنچ گیا۔ اور یہاں آ کر بُری طرح زمین پر گر پڑا۔ اُس کے چہرے پر بازوؤں پر اور گردن پر کوّوں کی ٹھونگوں کے نشان تھے۔ اور تقریباً سبھی جگہ سے خُون بہہ رہا تھا۔ شامیانے کے نیچے پہنچنے کے بعد اُسے پناہ مِلی لیکن کوّے شامیانے کے اُوپر چکر لگانے لگے تھے۔ تمام لوگ رشید کی جانب دوڑ پڑے۔ رشید کی بہت بُری حالت تھی۔

خیر دین پیچھے ہی رُک گیا تھا۔ کوؤں نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور مسلسل شامیانے کے اُوپری حصّے پر چکر لگا رہے تھے۔ رِدا کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ لیکن ثناء بھی دَوڑتی ہُوئی آگئی۔ نُدرت بھی شامیانے میں پہنچ چکی اور چند لمحات کے بعد اختر اور خالد بھی وہاں آ گئے۔ سب ہی رشید کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ رشید میں اب کھڑے ہونے کی سکت بھی نہیں تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے ہُوئے لیٹا تھا چہرے کا ڈیزائن ہی بگڑ گیا تھا اوّل تو غلیل کے غلّوں نے پیشانی پر دو سَر نمودار کر دیئے تھے۔ اور پھر کوؤں کی ٹھونگوں نے جہاں جہاں گُل کاری کی تھی وہ جگہیں سُوجتی آ رہی تھیں۔ چُنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے رشید کا چہرہ ناقابلِ شناخت ہو گیا۔

”لیکن یہ ہُوا کیسے؟ کیا ہو گیا؟ کیا ہُوا تھا؟“ ثناء نے پُوچھا۔

اِتنی دیر میں خیر دین اندر داخل ہو گیا۔ اُسے دیکھتے ہی رشید پھُرتی سے اُٹھا اور اُس نے غرّاتے ہُوئے خیر دین پر چھلانگ لگا دی۔ خیر دین نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رشید کا گھونسا اُس کے جبڑے پر پڑا اور وہ نیچے گِر پڑا۔

”یہ لو، یہ لو۔ اَرے رشید بھائی ہم نے... ہم نے کیا کیا ہے؟“ رشید نے جُھک کر خیر دین کا گریبان پکڑا۔ لیکن جمن، خالد اور اختر درمیان میں آگئے اور بمشکل تمام اُنھوں نے خیر دین کو چُھڑایا۔ ثناء غصیلے انداز میں رشید کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے رشید بھائی، آخر ہُوا کیا؟ کیا اِس طرح ہاتھا پائی کرنے کے لئے آپ ہمارے ساتھ آئے تھے؟ کیا ہُوا؟ خیر دین نے اِس سلسلے میں کیا کیا؟“

”اِس نے... اِس نے“ رشید ہانپتا ہُوا بولا۔

”لو جی وہی بات آگئی کہ نیکی کر اور گڑھے میں جا پڑو۔ ہم نے تو... ہم نے تو رشید بھائی کو کوؤں سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیوں اُنھوں نے ہمارا ہی جبڑا ٹیڑھا کر دیا۔ آپ دیکھیئے نا ثناء بی بی جی ہم تو اُنھیں کوؤں سے بچا رہے تھے۔“

”کیسے کوّے؟ اَرے یہ خیمے کے اُوپر کوّے کیوں چکر لگا رہے ہیں؟“

”یہ سب اِس کی کارستانی ہے۔ اِس نے غلیل سے ایک کوّا شکار کیا۔ اور اُس کی لاش میرے ہاتھ میں تھما دی۔ بس اُس کے بعد کمبخت کوّے میرے پیچھے پڑ گئے۔ میں وہاں سے بھاگا تو اِس نے پیچھے سے مجھ پر غلّے چلائے۔“

”لو جی کمال ہو گئی ثناء بی بی۔ قسم لے لو ہم سے۔ جو ہم نے ایک غلّہ بھی اِن پر چلایا ہو۔ ہم تو کوؤں کو مار رہے تھے۔“

”وہ کوؤں کو مار رہا تھا کمینے کہ تمام غلّے میرے لگ رہے تھے۔ میری پُشت پر کندھوں پر نشانات پڑ گئے ہوں گے۔ تُو نے جان بُوجھ کر مجھ پر ہی غلّے چلائے تھے۔“ رشید نے غرّا کر کہا اور وہاں پر موجود تمام لوگ فلک شگاف قہقہے لگانے لگے۔ صُورتِ حال اب اُن کی سمجھ میں آئی تھی۔ رشید بھنّا کر بولا۔

”مذاق کرنا میں بھی جانتا ہُوں اور میرا مذاق تم لوگوں سے برداشت نہیں ہو گا۔“ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور غُصّے سے پاؤں پٹختا ہُوا شامیانے سے باہر نکل گیا۔ لیکن صُورتِ حال کا اُسے اندازہ نہیں تھا۔ کوؤں نے اُسے دیکھا تو ایک بار پھر اُس کی طرف جھپٹے لیکن اب رشید نے شامیانے کی طرف آنے کے بجائے سمندر کی طرف دَوڑ لگا دی تھی۔ کوّے مُسلسل اُس کا تعاقب کر رہے تھے اور وہ زمین پر جُھک جُھک کر اُن پر ریت پھینک رہا تھا۔ بالآخر وہ سمندر میں کُود گیا۔ لوگ بے تحاشہ قہقہے لگا رہے تھے۔ پانی میں رشید کی جان کوؤں سے بچ سکتی تھی۔ اُدھر خیمے میں خیر دین سے صُورتِ حال معلوم کی جا رہی تھی۔

”لو جی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کبھی جھُوٹ بولتے ہیں۔ ہم تو جی سب لوگوں سے الگ تھلگ مالکوں سے دُور شکار کر رہے تھے۔ غلیل اپنے ساتھ لائے تھے ہم جی۔ ہم نے کوؤں پر غلّے چلائے ایک کوّا مر گیا۔ بس ہم نے اپنا شکار ہی رشید بھائی کو دکھایا تھا کہ کوّے اُن پر چڑھ دَوڑے۔ اب ہم خود تو کوؤں کا نشانہ بن نہیں سکتے تھے جی جب رشید بھائی وہاں سے بھاگے تو ہم بھی اُن کے پیچھے بھاگے آخر انسان کی مدد کرنا انسان کا فرض ہے جی۔ ہمیں کیا معلوم کہ غلّے کوؤں کو لگ رہے ہیں یا رشید بھائی کے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ کوؤں ہی نے رشید بھائی کو مارا ہے۔“ خیر دین کے اندازِ بیان پر قہقہے اور تیز ہو گئے تھے اب تو ہر شخص ہی ہنس رہا تھا۔ ثناء چونک کر نُدرت سے بولی۔

”ارے یہ رِدا کہاں گئی؟“

”ایں، رِدا! پتہ نہیں بڑی دیر سے نہیں دیکھا اُسے۔“ نُدرت بولی اور ثناء کو تشویش ہونے لگی۔ اُس نے چیخ چیخ کر رِدا کو آوازیں دیں۔ تب اُس نے رِدا کو پہاڑیوں سے نیچے اُترتے ہُوئے دیکھا۔

”سُبحان اللہ سُبحان اللہ۔ یہ کوہ پیما اُوپر کہاں چڑھ گئی تھیں۔ رِدا نیچے آؤ پلیز جلدی آؤ“ ثناء اور نُدرت اِن سب کو ہنستا ہُوا چھوڑ کر پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ گئیں۔ رِدا نیچے اُتر آئی تھی لیکن اُس کی حالت اب بھی بہتر نہیں تھی۔

”اُوپر کیوں چلی گئی تھیں تم؟“

”بس ایسے ہی اُوپر کا منظر کافی حسین ہے۔“ رِدا نے نڈھال لہجے میں کہا۔

”تم اپنی زندگی کے پیچھے پڑ گئی ہو رِدا۔ اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی وہاں پر اور پھر اتنی دھان پان سی تو ہو تم۔ بھلا یہ تمہیں جُوئی کی کیا سُوجھی تھی۔“

”کچھ نہیں بھئی، چلو“ رِدا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ثناء اور نُدرت واپسی میں اُسے رشید کی کہانی سُنانے لگیں۔ رِدا ہر چند کہ بدحواس تھی۔ پریشان تھی لیکن اُس کے ہونٹوں پر بھی بے اختیار مُسکراہٹ آگئی تھی۔ البتہ اُس نے اِس سلسلے میں کوئی ریمارک نہیں دیا تھا۔ دوپہر ہو گئی۔ کھانا تیار ہو چکا تھا۔ دریاں صاف کی گئیں اُس کے بعد ملازموں نے دسترخوان لگا دیا۔

”ارے وہ رشید بھائی پانی میں گل نہ گئے ہوں“ نُدرت نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”نہیں نکلے جب سے اب تک؟“

”نہیں بھئی! دیکھو نظر بھی آ رہے ہیں یا چل بسے“ ثناء ہنستے ہُوئے بولی۔

”کوؤں کا غول تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ ہائے بے چارے رشید بھائی“ نُدرت غم زدہ سی آواز میں بولی۔

”ارے واقعی، کہاں گئے یہ رشید“ ثناء کہنے لگی۔ رِدا نے مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ تب اختر نے ایک سمت اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

”وہ اُس طرف اُس چٹان کے نیچے۔“

”دبے ہُوئے ہیں؟“ نُدرت نے بے ساختہ پُوچھا اور سب ہنس پڑے۔

”نظر تو چٹان کے کنارے آ رہے ہیں۔“

”بُلاؤ بھئی اُنھیں بھی بُلاؤ۔ دیکھو کیا کہتے ہیں کیسے ہیں جاؤ۔ جمن تم چلے جاؤ۔ جاؤ رشید صاحب کو کھانے پر بُلا لاؤ“ ثناء نے کہا اور جمن نے تیز رفتاری سے دوڑ لگائی سب لوگ اُدھر ہی دیکھ رہے تھے۔ جمن چٹان کے قریب پہنچ کر تھوڑی دیر تک کھڑا رہا سَر کھجاتا رہا اُس کے بعد اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر مایُوس ہو کر واپس چلا آیا۔ وہ سب تعجب سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جمن کی رشید سے کوئی بات نہیں ہُوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا۔

”نہیں جی، وہاں نہیں ہیں“ اُس نے جواب دیا۔

”کیا! کون نہیں ہے وہاں؟“

”وہ جی، رشید صاحب جن کو بُلانے بھیجا تھا آپ نے“ جمن بولا۔

”ہاں۔“

”مگر وہ وہاں نہیں ہیں۔ وہاں تو کوئی اور ہی بیٹھا ہُوا ہے۔“

”کیا!“ ثناء اور نُدرت حیرت سے بولیں۔

”ہاں جی، رشید صاحب اُدھر نہیں ہیں۔ ابھی دیکھ کر آیا ہُوں اُن کو۔ وہ کوئی اور آدمی ہے“ جمن نے جواب دیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو جمن۔ جاؤ رشید بھائی کو دیکھو“ ثناء نے ایک اور ملازم کو رشید کی طرف دوڑا دیا۔ ملازم رشید کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرتا رہا اور پھر اُس نے واپس آ کر کہا۔

”وہ نہیں آتے جی۔“

”وہ رشید ہی ہیں نا؟“

”ہاں جی رشید صاحب ہی ہیں۔ مگر وہ کہہ رہے ہیں کہ اُنھیں بھوک نہیں ہے۔“

”وہ رشید ہیں؟“ جمن نے تعجب سے پُوچھا۔

”تو اور کیا جی۔ رشید ہی ہیں وہ لیکن پُورا چہرہ سُوجا ہُوا ہے۔ کوؤں نے مار مار کے موٹا کر دیا ہے“ ملازم نے سادگی سے جواب دیا۔

بہرطور رشید کو بلانے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اُس نے کہہ دیا تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ ثناء بھی غصیلی لڑکی تھی اُس نے کھانا چُنوا دیا۔ رشید کافی دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور اُس کے بعد ٹہلتا ہُوا دُور نکل گیا۔

”کیا یہ واپس بھی ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟“ ثناء نے پُوچھا۔

”اب اُن کی مرضی ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے“ نُدرت کہنے لگی۔

شام تک ہنگامہ خیزیاں رہی تھیں۔ رشید ایک بار بھی اُن لوگوں کے قریب نہیں آیا تھا۔ پھر جب شامیانہ تہہ کیا جانے لگا تو وہ واپس پہنچ گیا۔ اُس نے آ کر کہا۔

”تم لوگوں کے ساتھ جانا مجبوری ہے کیونکہ یہاں سے واپسی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔“

”ہاں رشید بھائی آپ کی صحت تو کافی اچھی ہو گئی“ ثناء نے قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا اور رشید خُونی نگاہوں سے ثناء کو دیکھنے لگا۔ اُس نے اِس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”جمن کا کہنا درُست ہی تھا۔ بھلا رشید بھائی کو اب کون پہچان سکتا ہے۔ طفیلی خالہ دیکھیں گی تو باغ باغ ہو جائیں گی۔“

”میں تم سے منع کر رہا ہُوں کہ میرا مذاق مت اُڑاؤ تم لوگوں کو اِس کے سنگین نتائج برداشت کرنا ہوں گے۔“

"ہائے، رشید بھائی فی الحال تو آپ ہی کافی سنگین ہو رہے ہیں" ندرت نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بھلا کہاں چپ رہنے والی تھی۔ اختر اور خالد بھی اس تفریح میں پوری پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ رشید کو راستے میں بھی تختۂ مشق بنایا جاتا رہا لیکن نہ جانے کیوں اس نے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا سوچ تھی۔ کینہ پرور آدمی تھا۔ اور یقیناً اب خیر دین کی خیر نہیں تھی۔

یہ قافلہ کوٹھی واپس پہنچ گیا۔ طفیل بیگم کے ردِ عمل کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ رشید گاڑی سے اترنے کے بعد اپنی رہائش گاہ میں چلا گیا تھا اور اس کے بعد ماں بیٹے دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے تھے۔ واقعہ دوسرے لوگوں کو بھی سنا دیا گیا تھا لیکن اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی ردا کا اس سلسلے میں کوئی ردِ عمل نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی اس نے کسی کو رشید کی حرکت کے بارے میں بتایا تھا... پکنک کی ہنگامہ خیزیوں سے سب ہی تھک گئے تھے غسل وغیرہ کیا گیا تھا۔ چائے پی گئی تھی اور اس کے بعد سب آرام کرنے لیٹ گئے تھے رات کا کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا گیا۔ ردا نے تو کھانے سے انکار ہی کر دیا تھا۔ بہر طور اس کے بعد سب لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں میں گھس گئے۔ ردا بھی مسہری پر آ کر لیٹ گئی تھی۔ تیمور تو ثناء کے پاس ہی رہتا تھا۔ اور اب وہ تیمور سے تقریباً لاتعلق ہی ہو گئی تھی۔ لیکن صرف ظاہری طور پر تیمور سے اس کا جو تعلق تھا وہ تو اس کے سینے میں تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ باہر کے سناٹے سے احساس ہوتا تھا کہ رات کافی ہو گئی ہے۔ ردا کو تھکن کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں کروٹیں بدل رہے تھے اور وہ کافی خوف زدہ تھی دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے رشید کے الفاظ یاد آ گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ رات کو وہ آئے گا ردا مسہری پر پڑی تھر تھر کانپتی رہی۔ دستک دوسری بار پھر تیسری بار بھی سنائی دی۔ ردا کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھتی رہی پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اٹھی اور دروازے کے قریب پہنچ گئی۔"

"کون ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"دروازہ کھولئے جی۔ میں ہوں خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ" باہر سے آواز آئی اور ردا کی جان میں جان آئی اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ خیر دین سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت خیر دین کی آمد سے وہ سخت حیران ہوئی تھی ویسے اس دوران دو تین بار ردا نے خیر دین کے بارے میں بھی سوچا تھا۔

پتہ نہیں خیر دین اس وقت اتفاقیہ طور سے پہاڑی پر پہنچ گیا تھا اور اس نے اپنی معصومیت میں رشید کی یہ درگت بنائی تھی۔ یا جان بوجھ کر اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ دل میں ایک بار خیال آیا تھا کہ خیر دین سے اس بارے میں پوچھے لیکن ہوش و حواس درست نہیں تھے۔ اس لئے سوچ کر ہی رہ گئی تھی۔ بہر طور اس وقت خیر دین کی آمد اسے ناگوار نہیں گزری تھی۔ یہ معصوم آدمی اس کے لئے بے ضرر تھا بلکہ ایک طرح سے خیر دین کے آ جانے سے اسے کچھ سکون ہوا تھا۔ اگر خیر دین کو اس کے کمرے میں دیکھ لیا جائے تو یقیناً کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ اتنا ہی معصوم صفت تھا اور اگر اس دوران رشید بھی آ جائے تو پھر خیر دین کو دیکھ کر اس کی جرأت نہیں ہوگی لیکن کمبخت رشید تو خیر دین کا ہی دشمن ہو رہا تھا خیر دین اندر داخل ہو گیا۔ ردا نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا پھر اس نے خود کو سنبھالا کر پوچھا۔

"خیریت خیر دین، کوئی خاص بات ہے۔ کیا وقت ہوا ہے؟"

"پونا ایک بجا ہے جی" خیر دین نے جواب دیا۔

"اوہو! اتنا وقت ہو گیا اور تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔ اس وقت ادھر کیسے نکل آئے؟ کوئی کام ہے مجھ سے؟" ردا نے سوال کیا۔

"ہاں جی کام ہی تھا آپ سے اسی وجہ سے نیند بھی نہیں آئی"

خیر دین نے جواب دیا۔

"بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔ کیا کام ہے بتاؤ"

"آپ کیوں نہیں سوئیں ردا بی بی" خیر دین بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں مجھے دیر ہی سے نیند آتی ہے" ردا نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔

"افسوس میں تمہاری کوئی خاطر بھی نہیں کر سکتی۔ تم پہلی بار میرے کمرے میں آئے ہو"

"نہیں ردا بی بی جی۔ ہم تو درجنوں بار آپ کے کمرے میں صفائی کر چکے ہیں" خیر دین مسکرا کر بولا۔

"صفائی کرنے والی بات دوسری ہے اس وقت تو تم میرے پاس آئے ہو میرے مہمان کی حیثیت سے"

"چھوڑو ردا بی بی۔ تکلفات میں انسان کی زندگی اتنی تلخ ہو گئی ہے کہ اب اسے خود بھی ان تکلفات سے نفرت ہونے لگی ہے" خیر دین نے کہا اور ردا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ معصوم دیہاتی فلسفہ بول رہا تھا۔ لیکن اس نے خیر دین کی ہمت افزائی کے لئے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو خیر دین بس میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔ ظاہر ہے تم اس وقت میرے لئے ایک مہمان کی حیثیت رکھتے ہو"

صفائی ستھرائی کے لئے کمرے میں آنا دوسری بات ہے"

"ایک رات ہم اور بھی آپ کے کمرے میں آ چکے ہیں بی بی جی۔ اس وقت جب رشید ایک چھوٹی سی پنسل ٹارچ کی روشنی میں آپ کے کمرے کی تلاشی لے رہا تھا" خیر دین کے الفاظ میں نمایاں تغیر تھا اس وقت اس کا لہجہ بھی صاف ہو گیا تھا۔ ردا نے چونک کر خیر دین کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا مطلب؟ کیا کہہ رہے ہو؟"

"درست عرض کر رہے ہیں بی بی جی۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک رات رشید آپ کے کمرے میں چوروں کی طرح گھسا ہوا کوئی چیز تلاش کر رہا تھا اور ہم نے عین وقت پر اس کی گردن ناپ لی تھی۔ جب ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ ردا کے کمرے میں کیا چیز چوری کر رہا ہے تو اس نے بڑی عاجزی سے جواب دیا کہ درحقیقت اسے ردا سے محبت ہو گئی ہے اور وہ ردا کی کوئی ایسی تصویر تلاش کر رہا ہے جسے اپنے پاس رکھ سکے۔ ردا بی بی رشید جیسے لوگوں کا تجربہ شاید آپ کو نہ ہو لیکن ہم ان لوگوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ دولت مند رشتہ داروں کے گھروں میں یہ لوگ صرف اسی غرض سے گھستے ہیں کہ وہاں سے کچھ حاصل کر سکیں۔ کچھ محدود مقصد ہوتے ہیں اور کچھ لامحدود ہوتے ہیں رشید میرے خیال میں لامحدود قسم کے لوگوں میں سے ہے۔ وہ اپنا دائرہ عمل وسیع سے وسیع تر کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے اسے کوٹھی میں موجود لوگوں کے خلاف ایسا مواد درکار ہے جس کے ذریعے وہ اپنی گرفت قائم کر سکے۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی تک اسے کچھ نہیں ملا۔ ثناء صاحبہ ایک معصوم کردار ہے۔ باقی لوگ بھی کم از کم قانون کے لئے بے ضرر ہیں۔ لیکن ایک شخصیت ایسی ضرور ہے یہاں ردا صاحبہ جو مشکوک ہے۔ اور جس سے شاید قانون دلچسپی لے سکتا ہے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کم از کم آپ میرے ان الفاظ سے انکار نہیں کر سکیں۔"

ردا ایک بار پھر بھونچکی رہ گئی تھی۔ یہ خیر دین بول رہا ہے۔ وہ خیر دین جو دادی اماں کو بے تکی کہانیاں سناتا تھا۔ وہ جو گھر میں لوگوں کے لئے تفریح کا باعث تھا۔ اپنی سادگی اور معصومیت کی بنیاد پر لیکن اس وقت اس کا لہجہ اس کے الفاظ کیا کہہ رہے تھے اور پھر اس نے رشید کے بارے میں جو انکشاف کیا تھا وہ کیا معنی رکھتا تھا۔ ردا کی زبان بند ہو گئی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر خیر دین کو گھورے جا رہی تھی جس کے خد و خال میں بھی اب نہ جانے کیوں اسے تبدیلی محسوس ہونے لگی تھی۔ خیر دین چند لمحات اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"آئی ایم سوری ٹو ڈسٹرب یو۔ آل دی بیسٹ مس ردا۔" ردا ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ لیکن خیر دین کسی گہری سوچ میں گم تھا پھر اس نے دوبارہ کہا۔

"ڈو یو بلیو اِن تم ون۔" اس کی سوالیہ نگاہیں ردا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ردا کے ہونٹ آہستہ سے ہلے لیکن منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔

خیر دین سرد نگاہوں سے ردا کو دیکھ رہا تھا۔ ردا کے کان سنسنا رہے تھے جو کچھ سنا تھا ناقابلِ یقین تھا۔ خیر دین چند لمحات اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر بولا۔

"آپ کو ضرور حیرت ہوئی ہوگی مس ردا۔ لیکن یقین کریں۔ میں آپ کو حیران نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں خود تسلیم کرتا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں جو یہاں کے رہنے والے سمجھتے ہیں۔ اگر میں چاہتا تو آپ کو کسی اور طریقے سے یہ تمام باتیں بتا سکتا تھا۔ لیکن مس ردا میں نے آپ پر غور کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ یہاں غیر اہم نہیں ہیں ثناء آپ کو چاہتی ہیں گھر کے دوسرے لوگ بھی آپ سے لاتعلق نہیں ہیں لیکن آپ کی نیک نفسی آپ کو احساس دلاتی رہتی ہے کہ آپ بہرحال ان میں سے نہیں ہیں۔ انسانوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں مس ردا۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خود کچھ نہیں کرنا چاہتے دوسروں کی تاک میں رہتے ہیں۔ اگر انہیں موقع مل جائے تو وہ انہیں کنگال کر دیں۔ جو ان کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ لیکن مس ردا آپ ان لوگوں سے مختلف ہیں۔ آپ ملازمت کر رہی ہیں تاکہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکیں یہ جذبہ قابلِ قدر ہوتا ہے اور شاید آپ کی اس فطرت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنے ذہن میں آپ کو سب سے الگ مقام دوں اور اس جذبے کا اظہار میں نے اس طرح کیا ہے مس ردا۔ خود میرا بھی آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے آپ کے پاس آتے ہوئے میں نے بھی بہت کچھ سوچا ہے۔ یوں سمجھیں میں آپ کے پاس آنے کے لئے علیحدہ ہو گیا تھا"

ردا نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ ہونٹ ہلے اور پھر آپس میں چپک گئے۔ آواز ہی نہ نکل سکی تھی۔ تب خیر دین نے کہا۔

"ہاں مس ردا! میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو دنیا سے اس طرح نہیں ڈرنا چاہیئے۔ ہر انسان کا ایک ماضی ہوتا ہے۔ ایک حال ہوتا ہے اور ایک مستقبل ہوتا ہے۔ ماضی کی کچھ تلخیاں ہوتی ہیں۔ حال میں ان یادوں سے بعض اوقات خوف کا شکار بھی رہنا ہوتا ہے۔ اور مستقبل صرف انتظار کا نام ہے، اور

جس چیز کے لئے انتظار کیا جا رہا ہو اُس کا یقین کہیں نہیں ہے اگر یہ تینوں چیزیں ایسی ہی بے معنی ہیں تو اِن پر اِنحصار کیوں کیا جائے۔ اپنے وجود کو ریزہ ریزہ کیوں کیا جائے۔ رَدا میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر جانتا ہوتا تو پُورے اِعتماد کے ساتھ آپ کو یہ بات بھی بتا دیتا کہ میں سب کچھ جانتا ہُوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم مس رَدا آپ کے بارے میں لیکن ایک اَندازہ ضرور قائم کیا ہے میں نے۔ آپ جیسی شخصیت گُناہ گار نہیں ہو سکتی۔ یہ دُوسری بات ہے کہ آپ کو کسی گُناہ میں لپیٹ لیا گیا ہو اور یہ خوف دِلایا گیا ہو کہ اُس گُناہ کے اِنکشاف سے آپ کی شخصیت تباہ کر دی جائے گی۔ مس رَدا اِتنا ضرور جانتا ہُوں آپ کے بارے میں کہ آپ کہیں اور سے یہاں آئیں۔ ثناء نے آپ کو اپنی دوست کی حیثیت دی۔ اور مجبُور کر دیا کہ آپ اُس کے ساتھ ہی رہیں۔ آپ نے ملازمت کی صِرف اِسی لئے کہ آپ کسی کے احسانات پر تکیہ نہیں کر سکتی تھیں۔ ثناء کی اِس اُلفت کو آپ نے دوست کی حیثیت سے ضرور قبُول کیا لیکن آپ کے دِل میں اِس وقت یہی جذبہ ہے کہ کسی بھی طرح اپنی ایک الگ دُنیا بسائیں، جو خاتون اِس انداز میں سوچ سکتی ہے رَدا، کم از کم میں اُن کے لئے یہ دعویٰ کر سکتا ہُوں کہ وہ داغدار ماضی کی مالک نہیں ہو سکتیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں مس رَدا کہ میں آپ سے آپ کا ماضی پُوچھنے آیا ہُوں۔ بس ایک اِنسان کی حیثیت سے میرے سینے میں آپ کے لئے کچھ جذبے جاگے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اِس دُنیا سے اِس قدر سہمی سہمی سی رہیں آپ کو خود بھی اندازہ ہو گا۔ اور یہ اندازہ میرے اعتماد کی تصدیق ہے۔ مس رَدا کہ آپ مُجرم نہیں ہیں کسی کی مُجرم نہیں ہیں۔ پھر اگر کچھ لوگ آپ کو زبردستی مُجرم بنا کر کسی اور کے مسلّط کئے ہُوئے خوف کا شِکار بنائیں تو آپ یہ کیوں قبُول کرتی ہیں۔ آپ اِس کوٹھی کو چھوڑنا چاہتی ہیں۔ ثناء کے اِحسان کو زیادہ دیر تک خود پر مُسلّط رکھنے کی خواہش مند نہیں ہیں نا، تو پھر دُنیا سے کیوں ڈرتی ہیں۔ مس رَدا، مَیں اگر چاہتا تو آپ سے بہت کچھ معلومات حاصِل کر سکتا تھا اور یہ معلومات میرے لئے کارآمد ہوتیں۔ لیکن میں آپ کو مجبُور نہیں کرُوں گا۔ آپ کے خوف میں اِضافہ نہیں کرُوں گا۔ میں صِرف ایک اچھے دوست، ملازم یا جو کچھ بھی آپ سمجھ لیں، کی حیثیت سے آپ سے صِرف ایک درخواست کرنے آیا ہُوں۔ کسی سے خوف نہ کھائیں۔ ذرّہ برابر خوف نہ کھائیں اور اگر کہیں کوئی دُشواری محسوس کریں تو براہِ کرم مجھے بتا دیں۔ میں آپ کا تحفّظ کرُونگا۔ اُسی طرح جس طرح آج میں نے بدبخت رشید کا حُلیہ بگاڑ دیا تھا۔ میں نے جان بُوجھ کر وہ سب کچھ کیا تھا مس رَدا۔ میں اُس کی نِگاہیں دیکھ رہا تھا اور اُن نِگاہوں سے مجھے شُبہ ہُوا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی شرارت کرنے پر آمادہ ہے۔ بس میں وہاں پہنچ گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ آپ سے کیا چاہتا ہے۔ میں نہیں پُوچھتا کہ وہ آپ سے کیا چاہتا ہے۔ لیکن بس اِتنا کہنا تھا مجھے آپ سے کہ خُدا کیلئے آپ کسی سے ڈرنا چھوڑ دیجئے، اگر آپ اپنے آپ کو تنہا سمجھتی ہیں تو خُدا کے لئے مجھے اپنا ہمدرد دیکھ لیں۔ میں ہر لمحہ آپ کا تحفّظ کرُوں گا۔ آپ کی نگرانی کرُوں گا۔ کیوں؟ اِس کا جواب مجھ سے طلب نہ کریں۔ کیوں کہ اِس کا جواب ہے ہی نہیں، معافی چاہتا ہُوں یہ بات بھی میں نے سُن لی تھی کہ رشید نے آپ کو آج رات کو آپ کے کمرے میں آنے کی دھمکی دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ آپ جاگ رہی ہوں گی۔ میں آپ کو یہ بھی بتانے آیا تھا کہ رشید اپنے کمرے میں پڑا کراہ رہا ہے۔ غُلیل کی یہ چوٹ معمُولی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے دو چار دِن وہ پُرسکون رہے گا۔ اُس کے بعد شاید وہ آپ کی طرف توجّہ دے۔ لیکن آپ اِس بات کا بھی اطمینان رکھیں کہ وہ آپ کو کوئی نُقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اِس سے زیادہ آپ کے کمرے میں ٹھہر کر میں آپ کو پریشان کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ دِل نے بڑی کشمکش کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ کم از کم آپ کو اِس بات کی اطلاع دے دُوں۔ کہ آپ اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھیں۔ دو اور دو آنکھیں آپ کی نِگرانی کر رہی ہیں۔ اور وہ آپ کو پریشان کرنے والوں کو، بس بی بی جی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کو آپ سے صِرف اِتنا ہی کہنا تھا۔" خیر دین اپنی جگہ سے اُٹھا اور دروازے کی جانب چل پڑا۔ لیکن رَدا کے پُورے وجُود میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی اُس کے پاس تو اب حیرت کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا تھا خیر دین کو آواز دینے کے لئے اُس کے ہونٹ کُھلے لیکن مُنہ سے آواز نہیں نِکل سکی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نِگاہوں سے کُھلے ہُوئے دروازے کو دیکھ رہی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

صبح کے معمُولات شروع ہو گئے، ثناء حسبِ معمُول تیمُور کی … ناز برداری سے فراغت حاصِل کر کے باہر نِکل آئی۔ رُخ نُدرت ہی کی جانب ہونا چاہیئے تھا۔ نُدرت بھی گھر کے کاموں سے فراغت حاصِل کر چکی تھی۔ عِصمت حسبِ معمُول یونیورسٹی چلی گئی تھی۔ دونوں کمرے میں جا بیٹھیں۔ تیمُور کو کھیلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ پچھلے دِن کی پکنک کے بارے میں تبصرے ہو رہے تھے۔ رشید زیرِ بحث تھا۔ جس کی خیریت کی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں مِل سکی تھی۔ نُدرت نے کہا۔

"ارے کم از کم اُن کی عیادت کے لئے تو جانا چاہیئے، پتہ نہیں کوؤں سے کیوں دُشمنی مول لے لی تھی۔ اُنھوں نے ویسے خیر دین نے بھی کمال کیا۔ کافی غُلّے لگائے اُن کی پُشت پر۔"

"یقین کرو نُدرت، خیر دین کو اِس سِلسلے میں کوئی ایوارڈ مِلنا چاہیئے، رشید کی صُورت دیکھ کر دِل میں نفرت اُبھرتی ہے اوّل تو میں اِس بات ہی کی مُخالف تھی کہ اُسے پکنک پر لے جایا جائے۔ پتہ نہیں کس قماش کا آدمی ہے۔"

"چیف! ایک اور انکشاف کرنا ہے تمہارے سامنے پتہ نہیں کتنی مشکل سے اب تک برداشت کرتی رہی ہُوں۔"

"ہاں ہاں کہو کہو۔" ثناء نے نُدرت کو گھُورتے ہُوئے کہا۔

"چیف! عبدُالجلیل جِن کا پتہ لگا لیا گیا ہے۔"

"تجھے خُدا کی قسم کیا واقعی؟" ثناء نے دِلچسپی سے پُوچھا۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو یقیناً میں نے عبدُالجلیل کے بارے میں معلومات حاصِل کر لی ہیں۔ کم از کم اِس بات سے تو تمھیں بھی اتفاق ہو گا کہ جِن وغیرہ کا کوئی چکّر نہیں تھا۔ اور پانچ نمبر میں ہماری اِسکیم فیل کرنے والی کوئی اور ہی شخصیت تھی۔"

"سو فیصدی، مجھے اِس بات پر یقین ہے لیکن ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔"

"میرے خیال میں تمہارا پہلا اندازہ ہی دُرست تھا۔ اِس کوٹھی میں کسی کی یہ مجال نہیں کہ ثناء کا راستہ کاٹنے کی کوشش کرے، یہ کوئی ایسا ہی اجنبی ہو سکتا تھا۔ جسے ثناء کی شخصیت سے پُوری طرح واقفیت حاصِل نہیں ہے۔"

"مگر کون ہے وہ، کیوں پہیلیاں بُجھا رہی ہے۔"

"کل سمندر کے پانی میں مَیں نے ایک عجیب و غریب شئے دیکھی۔ غور کیا تو وہ میرا گُم شُدہ جُوتا تھا۔ جسے میں پانچ نمبر میں چھوڑ بھاگی تھی۔ اور بعد میں وہ ہمیں نہیں مِلا تھا۔"

"وہ تجھے سمندر میں نظر آیا تھا۔"

"ہاں کسی لکڑی میں اَڑسا ہُوا تھا اور مجھے ہی دِکھایا جا رہا تھا۔"

"کیا بکواس کر رہی ہے۔"

"سچ کہہ رہی ہُوں۔ دیر تک جُوتا سمندر کی سطح پر تیرتا رہا اور جو شخص اُسے لکڑی میں اُڑسے ہُوئے تھا۔ وہ نیچے ہی نیچے تیرتا ہُوا غائب ہو گیا۔ لیکن میری نِگاہیں دُور دُور تک بھٹکتی رہی تھیں۔ اور پھر میں نے اختر صاحب کو پانی کی سطح پر بُلند ہوتے ہُوئے دیکھا تھا۔"

"اختر کو؟" ثناء چیخ پڑی۔

"تم جانتے ہو چیف۔ میں تم سے جھُوٹ نہیں بول سکتی۔" نُدرت نے سنجیدگی سے کہا اور ثناء پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی۔

"سو فیصدی نُدرت، سو فیصدی، بات سمجھ میں آتی ہے۔

یہ اختر صاحب ایک دو بار پہلے بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چُکے ہیں۔ اُنھوں نے اِس بات کا پتہ بھی چالاکی سے چلا لیا ہے کہ رَدا گُونگی نہیں ہے، سو فیصدی، سو فیصدی، کسی طرح اُسے ہماری اِسکیم کے بارے میں معلومات حاصِل ہو گئی ہوں گی اور وہ خود بھی پانچ نمبر میں پہنچ گیا ہو گا۔"

"میں نے اُس پر توجّہ نہیں دی تھی۔ پانی ہی میں پڑا رہ گیا تھا۔"

"ہُوں۔ تو اختر صاحب ہیں۔ ارے میں کہتی ہُوں اِس بد بسی چُوہے کو ہمارے سامنے آنے کی جُرأت کیسے ہُوئی۔ بس ایسا ہی لگتا ہے جیسے چُوہا شراب پی کر دُم کے بل کھڑا ہو گیا ہو بلّی کے سامنے۔ لیکن اِس کی دُم کاٹنا ضروری ہے۔ بھلا یہ کیسے مُمکن ہو سکتا ہے کہ کوئی ہمیں چیلنج کرے اور ہم اُسے چھوڑ دیں۔ سوچو اللہ رکھی کچھ سوچو۔"

"ایک بات سوچی ہے میں نے اور اُس کی تھوڑی سی ابتدا بھی کر دی ہے۔"

"کیا؟" ثناء نے دِلچسپی سے پُوچھا۔

"کیوں نا جمن کو اختر صاحب کے پیچھے لگا دیا جائے؟"

"کیا!" ثناء تعجب سے بولی۔

"جمن، اپنا جمن، اپنا پیارا جمن۔ بھلا وہ یہ بات کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اُس کی موجودگی میں کوئی اور اُس کی اللہ رکھی کی طرف نِگاہ بھر کر دیکھے۔ کل میری اُس سے گفتگو ہُوئی تھی۔ وہ اختر کے ساتھ ڈبل لڑنے کے لئے تیار ہے۔"

"کیا لڑنے کے لئے تیار ہے؟"

"ڈوئل کو وہ ڈبل ہی کہتا ہے۔ میں نے سوچا کیا فرق پڑتا ہے، بہرطور وہ کسی بھی وقت اختر سے ڈوئل لڑ سکتا ہے۔ بس میرے اشارے کی ضرورت ہو گی۔"

"ہُوں۔ میرا خیال ہے اللہ رکھی۔ پلان کمزور ہے تیرا۔"

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ جمن تو بذاتِ خود ایک بے وقوف آدمی ہے۔ اختر اُسے چٹکیوں میں اُڑا کر رکھ دے گا۔ بھلا وہ اختر سے کیا لڑ سکتا ہے بلکہ میرے خیال میں تُو نے تو اُس سے تذکرہ کر کے بھی اچھا نہیں کیا۔ جاہل آدمی ہے کسی بھی وقت مُصیبت بن سکتا ہے۔ اور پھر اِس لڑائی کی بُنیاد بھی سب کے سامنے آئے گی۔ اختر کی پوزیشن کافی مضبُوط ہے۔ جناب احسان صاحب کے عزیز ترین دوست کا بیٹا، ایک ملازم اُس کے منہ آیا تو میرا خیال ہے پھر جمن کے لئے بچنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ نہیں یار یہ پلان غلط ہے۔۔ جمن بے چارے کی گردن میں پھانسی کا پھندہ کیوں ڈال رہی ہو۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ اختر تو اُس سے

ذرا بلند سطح کا آدمی ہے۔ اُس کے لئے ذرا بلندی پر کھڑے ہو کر ہی کام کرنا پڑے گا۔ اور پھر جب جمن اور اختر کی لڑائی کی بنیاد سامنے آئے گی تو تو رسوا ہو جائے گی۔ اور یہ بات کسی طور مناسب نہیں ہے ندرت۔ تفریحات اپنی جگہ۔ ہمارے اپنے کردار محفوظ رہنے چاہئیں" ثناء کی گفتگو پر ندرت بھی سوچ میں ڈوب گئی۔ اور پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اب تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ بہرحال جمن کو سمجھا دینا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ لیکن اِن اختر صاحب کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

"خود ہی سوچو، خود ہی کوئی کارروائی سوچو، اختر نے جو کچھ کیا ہے وہ ناقابلِ معافی تو نہیں ہے۔ لیکن بہرطور اُسے اِس بات کا احساس دلانا ہو گا کہ غلط لوگوں سے بھڑا ہے وہ۔ اور اُسے نقصان اُٹھانا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے چیف، پھر کوئی تدبیر کرتے ہیں" ندرت نے پُرخیال انداز میں رخسار کھجاتے ہوئے کہا۔ اِس موضوع پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی پھر وہ دونوں باہر نکل آئیں۔ باہر آنے کے بعد چہل قدمی کے انداز میں وہ لان کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ کہ دور سے رَدا نظر آئی اور ثناء اور ندرت اُچھل پڑیں۔

"یہ آج کیا ہو گیا۔ وہ رَدا ہے رَدا" ندرت نے کہا اور ثناء آنکھیں میچ میچ کر کھولنے لگی۔

"لگ تو وہی رہی ہے۔"

"مگر آج غیر متوقع بات کیسی ہے" رَدا اُسی سمت آ رہی تھی۔ اب وہ کافی پُرسکون تھی۔ اور اُس کے چہرے کی کیفیت بحال ہو گئی تھی۔ ثناء نے ندرت سے کہا۔

"وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ چند روز آرام کرے گی۔"

"اچھا فیصلہ کیا ہے اُس نے، تمام صحت تباہ کر کے رکھ دی ہے، کیا شگفتہ چہرہ ہے لیکن وہ خود ہی اپنی صورت کے پیچھے پڑ گئی ہے۔" رَدا اُن کے قریب پہنچی تو دونوں نے مسخرے انداز میں فرشی سلام شروع کر دیئے۔

"جمی ہوئی ہے تم دونوں کی، یقیناً کسی نہ کسی کے خلاف سازشیں ہو رہی ہوں گی۔"

"کم از کم وہ تمہارے خلاف نہیں ہیں" ندرت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم اِس وقت نظر کیسے آ رہی ہو تیمور انہیں پہچانتے ہو۔ میرا خیال ہے دن کی روشنی میں تیمور اب تمہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ شام کو جو ایک ہستی آتی ہے اور اُس کے ساتھ مذاق کرتی ہے، وہ رَدا ہے۔"

"اب تیمور کو تم نے ہی سنبھال رکھا ہے تو میری کیا ضرورت۔"

"میں تو اپنا مستقبل بنا رہی ہوں۔ اپنے ہیرو کو پال پوس کر جوان کروں گی اور پھر اُس سے شادی کر لوں گی۔ اِس سے زیادہ پاکیزہ شخص اور اعلیٰ کردار کا مالک شوہر مجھے اور کون سا مل سکتا ہے" ثناء نے کہا۔

"ثناء کی بک بک بالکل بے موقع ہوتی ہے۔"

"اے ساس صاحبہ ارادہ بدل کر دیکھو حشر کر دوں گی تمہارا۔ میرے تیمور کو مجھ سے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی۔"

"بابا بس زبان بند کر لے کون چھین رہا ہے تجھ سے تیرے تیمور کو۔"

"ویسے مونالیزا آج پھر مسکرا رہی ہے۔ غالباً حالات کافی بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ کہو۔ کل کے پکنک کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں تم پر۔"

"مجھ پر کیا اثرات مرتب ہوں گے میں تو بالکل ٹھیک ہوں"

"ارے ہاں جن پر اثرات مرتب ہونے تھے اُن پر ہوئے ہیں۔ بھئی ثناء آخر وہ تمہارا خالہ زاد بھائی ہے۔ طفیلی بیگم کو شکایت ہو گی اِس بات پر کہ اُن سے عیادت نہیں کی گئی۔ آؤ یار تفریحاً ہی چلیں۔ ذرا رشید بھائی کو دیکھ لیا جائے" ندرت نے تجویز پیش کی۔

"فضول باتیں مت کرو۔ طفیلی بیگم سے ویسے بھی میری جلی ہوئی ہے۔ میں نہیں جاؤں گی" ثناء نے کہا۔

"ارے ثناء تبدیلی کے لئے صرف صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے، چلو یار آؤ رَدا چلتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی" رَدا نے کہا۔

"بھئی عجیب لوگ ہو تم۔ کوئی تجویز پیش کی جائے تو مخالفت کر دی جاتی ہے۔ میں کہتی ہوں حرج ہی کیا ہے اِس میں، آؤ ذرا دیکھ لیں یار مزہ آئے گا" ندرت نے اِس طرح اُن دونوں کو مجبور کیا کہ بالآخر وہ طفیلی بیگم کی طرف چلنے کو تیار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ندرت طفیلی بیگم کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ دروازہ طفیلی بیگم ہی نے کھولا تھا۔ سب سے پہلے ندرت کی شکل دیکھی۔

"آؤ بیٹا اندر آؤ" پھر اُن کی نگاہ ثناء اور رَدا پر پڑی۔ اور اُن کا چہرہ ایک دم سکڑ گیا۔ لیکن جانتی تھیں کہ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اِس سکڑے ہوئے چہرے کو پھر سے پھیلاتی ہوئی بولیں۔

"ارے ارے تم دونوں بھی ہو آ جاؤ اندر آ جاؤ" ندرت سب

سے پہلے اندر داخل ہوئی تھی اور پھر ثناء اور رَدا۔ رَدا تو رشید کے چہرے پر تھوکنے کی بھی روادار نہیں تھی لیکن دوسروں پر اپنی کیفیت کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اِس لئے اُس نے شدت سے مخالفت نہیں کی اور اِن دونوں کے ساتھ آ گئی۔ البتہ کمرے میں رشید کو نہ دیکھ کر اُسے کسی قدر سکون ہوا تھا۔

"رشید بھائی کہاں گئے۔ کل تو بے چارے کے ساتھ بڑی بُری ہوئی تھی۔"

"ستیاناس کر دیا تم نے میرے بچّے کا۔ کسی نے بھی خیال نہ رکھا اُس معصوم جان کا۔ میں کہتی ہوں اُن کمبخت کوؤں کو رشید ہی نظر آیا کوئی اور نہیں چڑھا اُن کی نظر میں۔"

"حالانکہ رشید بھائی اتنے کالے بھی نہیں ہیں" ثناء نے سنجیدگی سے کہا اور رَدا بے اختیار ہنس پڑی۔

"کیا مطلب ہے بی بی تمہارا" طفیلی بیگم نے ناک چڑھا کر کہا۔

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ رشید بھائی شکل سے کوے تو نہیں لگتے کہ کوے انہیں اپنا ساتھی بنا لیتے" ثناء نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اب جو بھی کہہ لو بی بی تمہارا خون ہے۔ الگ نہیں ہے تم سے" طفیلی بیگم نے کہا۔

"رشید بھائی گئے کہاں خالہ جان، ہم لوگ تو انہیں دیکھنے آئے تھے" ندرت نے جلدی سے صورتِ حال سنبھالی یہاں تو ایک نیا ہی محاذ کھلا جا رہا تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہی اُس نے ثناء کو آنکھ بھی مار دی تھی۔ طفیلی بیگم بدستور جلے کٹے لہجے میں بولیں۔

"اللہ کی نگاہ سیدھی چاہئیے بی بی! دُشمن تو کرنی میں کسر نہیں چھوڑتے۔ پتہ نہیں کیا ہوا میرے بچّے کے ساتھ؟ کتنے نازوں سے پالا ہے میں نے اُسے۔ لیکن میرا بس چلے تو اُن سارے کوؤں کو گولی مار دوں۔"

"بالکل مار دینی چاہئیے خالہ جان! بلکہ اتفاق سے ہمارے پاس گولیاں نہیں تھیں۔ ورنہ ہم وہیں مار دیتے" ندرت نے جلدی سے کہا۔ اور پھر بولی۔

"لیکن یہ رشید بھائی گئے کہاں؟"

"بس بیٹا! مرد بچّہ ہے۔ بہادری میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ دُنیا کی ناقدری کا شکار ہے۔ ورنہ اُس جیسا تو ہونا مشکل ہے۔ کیسی تکلیف، کاہے کی تکلیف، تیار ہوا اور گھر سے باہر نکل گیا۔"

"خالہ جان! میں آپ کی بات سے بالکل اتفاق کرتی ہوں۔ درحقیقت اِس میں بھی دُشمنوں ہی کی چال ہے۔ ویسے رشید بھائی نے اِس بارے میں کچھ بتایا نہیں؟"

"کیا بتاتا بی بی وہ ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا۔ کوے پیچھے پڑ گئے اور بس اُن سے جان بچانا مشکل ہو گیا۔ ارے تم لوگوں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو گا۔"

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے خالہ جان! کہ کوے پیچھے کیسے پڑ گئے؟ آپ نے رشید بھائی کا پورا بدن تو ٹٹول لیا تھا؟"

"کیا مطلب؟" طفیلی بیگم چونک کر بولیں۔

"میں کہتی ہوں آخر کوے اُن ہی کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔۔۔؟ کوئی نہ کوئی تو وجہ ہو گی۔ کہیں دُشمنوں نے کوئی کارروائی تو نہیں کی؟ کوئی ایسا تعویذ وغیرہ تو نہیں باندھ دیا گیا اُن کے بدن پر کہ کوؤں کو وہ ہی نظر آ گئے" طفیلی بیگم نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے ثناء اور پھر رَدا کی طرف دیکھا۔ اور پھر بولیں۔

"خدا جانے۔"

"تعویذ کون باندھے گا رشید بھائی کے؟ کسے اتنی فرصت ہے کہ اُن کے چکر میں پڑے۔"

"خیر یہ بات نہ کہو بی بی! دُشمن بڑے حاسد ہوتے ہیں۔ کسی کو سکون سے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اُسے کیا نہیں کیا اِن عارفہ بیگم نے میرے لئے۔ اور کیا نہیں کرائیں۔ مجھے دوسروں کی نگاہوں سے گرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اللہ نے خود ہی انہیں گرا دیا۔ میں تو شریف ہوں۔ دوسروں کا درد رکھتی ہوں اپنے دل میں۔ ورنہ کوے نے بدنام کر دیتی اِن عارفہ بیگم کو اور آج بھی کسے معلوم نہیں ہے کہ جس تھالی میں کھایا اُسی میں سوراخ کیا۔ شریف لوگ ہیں۔ زبان بند کر کے بیٹھ گئے تو اِس کا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ داغ دُھل گئے۔"

"عارفہ خالہ پر یہ الزام ہے خالہ جان" ثناء نے کہا۔

"ہاں بی بی! اب آنکھوں دیکھے مکھی نگل لی جائے تو کوئی کیا کہے۔ یہ کیسا الزام ہے بی بی! کہ جو چیز اُن کے پاس سے ملی اُس سے بھی نگاہیں چرا لی جائیں۔ بیٹی! تم مجھ سے الگ نہیں ہو۔ میرے ہی جگر کا ٹکڑا ہو۔ تمہارے سامنے مُنہ کھولنے کی مجال نہیں رکھتی۔ لیکن بڑی ہونے کی حیثیت سے ایک بات ضرور کہتی ہوں۔ کہ یہ غریب رشتہ دار امیروں پر اپنا جال مضبوط رکھنے کے لئے نجانے کیا کیا کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ ندرت بیٹا! انہیں عارفہ کے چنگل سے بچاؤ۔ وہ تعویذ گنڈے والی عورت ہے۔ پتہ نہیں میری ثناء کو کیا کر دیا کہ میرا خون ہی مجھ سے باغی ہو گیا۔"

"خون۔۔۔ خون۔۔۔ کون سے خون کی بات کر رہی

ہیں آپ طفیلی بیگم! بلاوجہ ہمارا آپ کا کون سا سگا رشتہ ہے۔ وہ تو بس یُوں کہیئے کہ امّی جان بھی خواہ مخواہ کی حرکتیں کرتی ہیں۔"

"بیٹا! یہ تم نہیں بول رہیں۔ ہماری غربت بول رہی ہے۔ اپنی ماں سے بات کرو۔ اِتنی دُور جاکر پیار سے لے کر آئیں تھیں۔ ورنہ زندگی تو گزار ہی رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے طفیلی خالہ! غلطی امّی نے کی ہے۔ اِس میں باقی لوگوں کا کیا قصوُر ہے؟ اور اب جب آپ یہاں آ ہی گئی ہیں تو کِسی سے دُشمنی کے بغیر رہیں۔ آؤ رَدا چلتے ہیں۔" ثناء نے کہا اور رَدا کا ہاتھ پکڑ کر باہر نِکل آئی۔ ندرت طفیلی بیگم کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ طفیلی بیگم غم زدہ سی شکل بنائے دروازے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اور پھر آنکھوں میں جھوٹ موٹ کے آنسو بھر کر بولیں۔

"دیکھا تم نے! عارفہ کا جادُو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اَرے کوئی بچاؤ میری بچّی کو۔ یہ اُس نے مجھ سے کہا ہے۔ مجھ سے اپنی سگی خالہ سے۔ کہہ رہی ہے ہم اُس کا خون ہی نہیں ہیں۔ ندرت بیٹا! کیا کر رہی ہو تم؟ یہ عارفہ تو کامیابیوں پر کامیابیاں حاصِل کرتی چلی جارہی ہے۔ اور ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ کیسے یہ بیل منڈھے چڑھے گی؟"

"چڑھ جائے گی خالہ جان چڑھ جائے گی۔ آپ فِکرمند کیوں ہوتی ہیں؟ البتہ ایک بات میں آپ کو بتادوں۔ آپ بڑی ہیں آپ کو مشورہ دینے کا حق نہیں رکھتی۔ لیکن پھر بھی دِل چاہتا ہے کہ آپ کی ہر جگہ مدد کروں۔"

"بتاؤ بیٹی بتاؤ! بڑے چھوٹے کا خیال چھوڑ دو۔ بعض اَوقات بچّے بھی بڑوں کو ایسی سمجھا دیتے ہیں کہ بڑوں کے خود اپنے دماغ میں نہیں آتی۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ ثناء کتنے ناز سے پَلی ہُوئی ہے۔ ہر شخص اُس سے پیار سے بات کرتا ہے اور کوئی بھی اُس کا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اِس لئے ذرا زیادہ ہی مُنہ لگی ہے۔ آپ اُس سے پیار ہی سے بات کیا کریں۔ مُنہ زور گھوڑے کو پیار سے رام کیا جاتا ہے۔ ابھی اُس کے دِل میں آپ کی طرف سے بُرائی ڈال دی گئی ہے چنانچہ وہ آپ سے ایسی جلی کٹی باتیں کرتی ہے۔ لیکن آپ اِس بُرائی کے جواب میں میٹھی ہی رہا کریں۔"

"تو لو بی بی! میں نے کچھ کہا اُس سے؟ اب دیکھ لو بھرے مُنہ کہہ گئی کہ ہمارا تمہارا کوئی خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کہنا چاہیئے تھی۔ اُسے یہ بات؟"

"آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ یہ وہ نہیں بول رہی۔ عارفہ خالہ بول رہی ہیں۔"

"ہاں سچ کہتی ہوں بیٹا، وہی لعنت ہماری کاٹ میں لگی ہُوئی ہے۔"

"آپ کو ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا طفیلی خالہ۔ آپ کے ذہن میں جو منصُوبہ ہے وہ ایسے نہیں پروان چڑھے گا۔ اور پھر رشید بھائی تو کچھ کر ہی نہیں رہے۔ اب آپ دیکھیئے نا پکنک پر گئے تھے۔ لیکن ثناء سے اِتنی دُور رہے۔ کوئی بات ہی نہیں کی اُس سے۔ بس اپنی دُھن میں مست رہے۔"

"اَرے سدا کا نکما ہے کمبخت۔ کتنا کہہ چکی ہوں... مگر وہ ہے کہ... کہ..."

"ہاں! کہ کیا؟" ندرت نے پُوچھا۔

"کیا بتاؤں بیٹی! زبان کھولنے سے بھی اپنے پیر کُھلتے ہیں۔ اپنا ہی بدن ننگا ہوتا ہے۔"

"آپ کی مرضی ہے خالہ جان۔ میں کوئی بات ایسی نہیں کہُوں گی آپ سے جو آپ کو تکلیف دے۔ بتانے کی کوئی بات ہو تو مجھے ضرور بتادیا کریں۔"

"بیٹا کیا بتاؤں؟ اِس کمبخت سرپھرے کو نجانے رَدا کا کیا سَودا سما گیا ہے۔ ایک بچّے کی ماں ہے۔ اور وہ بھی ایسے بچّے کی جس کے باپ کا کوئی پتہ نہیں۔ مگر رشید ہے کہ اُس کی جان کو لگا ہُوا ہے۔"

"رَدا کی؟" ندرت نے چیختے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں! کہتا ہے وہی اُس کے مَن کو بھائی ہے۔ اب بتاؤ بیٹی! خالی چہروں سے کیا ہوتا ہے۔ اُس کے پاس ہے کیا؟ اور پھر مریل سی شکل بنائے رہتی ہے۔ نہ کسی سے بات نہ چیت، نہ ہنسنا نہ مُسکرانا۔ ایک تم بھی تو ہو ندرت بیٹا۔ چہرے پر پھُول ہی پھُول کِھلے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں اِس کمبخت رشید کو کیا ہوگیا ہے؟ کھُل کر کہہ رہا تھا مجھ سے کہ اُسے رَدا پسند ہے۔"

"اوہ ہو! خالہ جان! یہ مسئلہ ہے۔ درحقیقت رشید بھائی غلطی کر رہے ہیں۔ اُنھیں ثناء کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اب میں سمجھ گئی پکنک پر بھی وہ رَدا ہی کے پیچھے پیچھے لگے ہُوئے تھے۔ اَرے خدا کی پناہ وہاں پہاڑیوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور جب کوؤں نے اُنھیں دَوڑایا تھا۔ تو تھوڑی دیر کے بعد رَدا بھی وہیں سے آئی تھی۔"

"وہیں سے آئی تھی؟" طفیلی بیگم نے چیختے ہُوئے کہا۔

"سو فیصدی خالہ جان سو فیصدی۔ وہ بھی پہاڑیوں ہی سے نیچے اُتری تھی۔ رشید بھائی کو تو کوؤں نے اُتارا تھا۔ لیکن رَدا اپنے قدموں پر چل کر آئی تھی۔ میرا مطلب ہے اپنی مرضی سے۔"

"ہُوں! تو یہ قِصّہ تھا۔ یہ کوّے رَدا ہی نے اُس کے پیچھے لگائے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر بتا بیٹا! میں کیا کروں؟ اِس کمبخت کا دِل کیسے بدلوں؟"

"بدل جائے گا۔ خود بخود بدل جائے گا۔ آپ کو بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ رشید بھائی کو بالآخر خود ہی عقل آجائے گی۔ اچھا اب میں چلتی ہُوں۔"

"بیٹھ بیٹا! وہ دونوں تو چلی گئیں۔ تو کہاں جارہی ہے؟"

"نہیں خالہ! سوچیں گی کہ میں نے اُنھیں چھوڑ دیا۔ ذرا مِل لُوں اُن سے۔ ثناء کا دِل صاف کرنے کی کوشش کرتی ہُوں۔ ویسے آئندہ جب بھی آپ ثناء سے ملیں۔ ذرا اپنا رویّہ نرم ہی رکھا کریں۔ تھوڑے دِن کی بات ہے جب وہ آپ کی بہو بن جائے گی تو پھر... تو پھر..." ندرت خاموش ہوگئی۔

"ایسی گھاٹ نکالوُں گی اُس کی بیٹا۔ کہ دیکھنے والے دیکھیں گے اَرے میرا بیٹا پُوری طرح میرے بس میں ہے۔ بس اِس رَدا کے چکر سے نِکل جائے ذرا۔ اِس رَدا کو کہیں ٹھکانے لگا دُو ندرت بیٹا اِس کی یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟ اِس سے تو ہمارا کوئی دُور کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ پُوچھو تو سہی اِس سے۔ کِس کی اَولاد لیئے لئے پھرتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ رشید تو بُری طرح میرے پیچھے پڑا ہُوا ہے کہ رَدا کے بارے میں تفصیلات اُسے بتادی جائیں۔ اُس نے اِس کے لئے مجھے لالچ بھی دیا ہے۔ مگر بیٹا میں بھی کوئی بے وقوف تھوڑی ہُوں۔ میں کسی بھی طرح رَدا کو اُس کی مرضی میں کامیاب نہیں ہونے دُوں گی۔"

"تو کیا رشید بھائی کے سلسلے میں رَدا کی مرضی بھی ہے؟"

"اَے تالی کبھی ایک ہاتھ سے بجتی ہے بیٹی تُو خود سوچ۔"

"ہاں تالی تو دونوں ہی ہاتھوں سے بجتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی تالی بجتی ہُوئی نہیں دیکھی۔"

"ایسی لڑکیاں بڑی گھُنّی ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کِس بیچارے کو بے وقوف بنایا تھا۔ اور اُسے چھوڑ بھاگی ہے۔ بہر طور ندرت بیٹا! ہمارا اِس دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اپنے بھی غیر ہوگئے ہیں۔ تم نے ثناء کی بات سُن لی ہوگی۔ تمھیں اللّٰہ نے فرشتہ بنایا ہے ہمارے لئے۔ تو اب تو ہم تم سے یہ ہی کہتے ہیں کہ ہمارا پُورا پُورا خیال رکھنا۔ دُشمنوں سے ہمیں بچائے رکھنا۔"

"آپ بالکل اطمینان رکھیں طفیلی خالہ۔ میں آپ کی ہر طرح کی نگرانی کر رہی ہُوں۔ عارفہ بیگم کی تاک میں ہُوں کہ کب وہ آپ کے دروازے پر تعویذ گاڑتی ہیں۔ اور کب میں آکر آپ کو اِس کی اطلاع دیتی ہُوں۔"

"ہاں بیٹا! بس خیال رکھنا۔ اِس عارفہ نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ میں تو چاہتی ہُوں کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ لیکن وہ مجھے مجبُور کر رہی ہے کہ میں اپنی اصلی شکل میں آجاؤں۔"

"ابھی نہیں طفیلی خالہ ابھی نہیں۔ جب تک میں آپ کو ہدایت نہ دُوں آپ اپنی اصلی شکل میں بالکل نہ آئیں۔" ندرت نے کہا اور پھر طفیلی سے رُخصت ہوکر باہر نکل آئی۔ ثناء اور رَدا بہت دُور پائیں باغ کے ایک گوشے میں نظر آرہی تھیں ندرت اُن ہی کی جانب چل پڑی۔

★★

خالد نے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالی۔ اور اُسے سُلگا کر ایک آرام کرسی میں دراز ہوگیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ رُخ ایک دیوار کی جانب تھا۔ جہاں کھُلی ہُوئی کھڑکی سے دُوسری طرف پائیں باغ کے جھُومتے ہُوئے درخت نظر آرہے تھے۔ یہ منظر اُسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ قریب ہی رکھی ہُوئی ایش ٹرے میں اُس نے چٹکی بجاکر سگریٹ کا گل جھاڑا۔ تو چٹکی کی آواز پُورے کمرے میں گوُنج کر رہ گئی خالد اِس آواز پر چونک پڑا تھا۔ اُس نے دوبارہ چٹکی بجائی۔ تو اِس بار بھی آواز کسی پٹاخے ہی کی طرح اُبھری تھی۔ دفعتاً ہی اُس کی گردن گھُوم گئی۔ دروازے پر اختر کھڑا ہُوا تھا۔ خالد کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ حرکتیں میرے ساتھ بھی شروع کردیں تم نے۔" خالد نے کرُسی گھُمائی تو پایوں کی رگڑ اِس طرح محسوس ہُوئی جیسے توپیں گرج رہی ہوں۔ واقعی اختر اِس سِلسلے میں کمال رکھتا تھا انسانی آواز سے کئی گُنا بڑی آوازیں نکالنا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ خالد ہنسنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ انتہا پسندی کے مُوڈ میں ہو۔"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے منطِق کی رُو سے۔" اختر نے جواب دیا۔

"اَے منطقی شخص! خیریت تو ہے کِس لئے تشریف آئی ہے یہاں؟"

"بس کچھ گفتگو کرنی تھی۔ دراصل بھائی جان آپ کو معلوم ہے کہ میں متحرک انسان ہُوں۔ اور مجھے سُست رفتاری بالکل ناپسند ہے۔"

"مطلب! ترجمہ بھی کرتے چلے جاؤ۔" خالد نے اُسے کرُسی کی طرف بیٹھنے کا اِشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ آپ کے بارے میں کچھ تو معلوم ہو۔ ابھی تک

تو آپ کی کتاب بند ہے ۔ اور پھر ڈیڈی نے یہ ذمّہ داری مجھ پر عائد کی تھی ۔ کہ آپ کا خیال رکھوں اور آپ کے نظریات کا جائزہ لیتا رہوں ۔ چنانچہ منطق کی رُو سے "

" بس بس ! اَے منطقی بھائی تو میرا خیال رکھ رہا ہے یا نہیں "

" رکھ رہا ہوں ۔ جب ہی تو تشویش کا شکار ہوں . . " اختر نے کہا ۔

" ترجمہ ترجمہ پلیز ! اپنی اس پُراسرار گفتگو کا ٹرانسلیشن کرتے رہا کرو " خالد مسکرا کر بولا ۔

" بھابی بیگم ابھی تک آپ سے بائیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں ۔ اور مجھے اس دَوران اس فاصلے میں ایک میٹر کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی "

" تمہارا کیا خیال ہے ۔ میں اُس سے چپک جاؤں " خالد نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا ۔ اور اختر نے شرما کر نظریں جھکا لیں ۔

" بَب ... بھائی جان ! مجھ سے ایسی گفتگو نہ کیا کریں "

" او سوّر ! میرا مطلب ... میرا مطلب . کیا بکواس کر رہا ہے ۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا ۔ چپک جانے سے مُراد یہ بھی تھی کہ اگر وہ مجھ سے دُور رہتی ہے تو پھر میں کیا کروں " خالد نے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا ۔

" نہیں بھائی جان ! پہلی بات تو یہ کہ آپ نے اپنی رائے کا کسی حد تک اظہار کر دیا ہے مجھ پر " یعنی یہ کہ لڑکی آپ کو ناپسند نہیں ہے ۔ اگر وہ آپ کو پسند ہے تو پھر آپ یہ بائیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیوں نہیں کرتے ۔ آگے بڑھیئے ۔ مرد میدان کی حیثیت سے آگے بڑھیئے ۔ اور منطق کی رُو سے بھابی بیگم کے قریب پہنچ جائیے "

" بھائی ! مجھ میں یہ صلاحیتیں نہیں ہیں ۔ بس ثناء کے بارے میں اگر میری رائے پُوچھی جائے ۔ تو میں نہایت اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں ۔ کہ وہ ایک اچھی لڑکی ہے ۔ اور ڈیڈی اگر اُسے میری زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں ۔ تو مجھے اس بات کی خوشی ہوگی "

" زندہ باد ! یہ بات کہی ہے آپ نے بھائیوں والی منطق کی رُو سے ۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے "

" کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا اختر ! تم خود بتاؤ میری طبیعت میں تم نے چھچھورا پَن کہاں سے پایا ۔ اگر ڈیڈی میرا رشتہ احسان صاحب کی بیٹی ثناء سے کرنا چاہتے ہیں ۔ تو کیا اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں کسی فلمی ہیرو کی مانند وقت سے پہلے ثناء کے قریب پہنچ جاؤں ۔ اُس سے اظہارِ عشق کروں ۔ اُس کے ساتھ درختوں اور کھیتوں میں چھلانگیں لگاتا پھروں ۔ فلمی گانے گاؤں اور پھر اپنی محبت کا اعلان کر دوں ۔ تم بتاؤ ۔ کیا ان تمام باتوں کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق ہے ؟ مجھے یہاں بھیج کر ثناء کے بارے میں میری رائے پُوچھی گئی ۔ اور میں نے اس رائے کا اظہار تم پر کر دیا ۔ تم اگر چاہو تو ڈیڈی کو میری رائے لکھ سکتے ہو ۔ باقی اس سے زیادہ میں کچھ کرنے کا قائل نہیں ہوں ۔ ثناء کی مرضی بھی اس میں شامل ہوگی ۔ ممکن ہے وہ اس حیثیت سے مجھے قبول کرنا پسند نہ کرے ۔ اور میرے محترم چھوٹے بھائی ! اگر ثناء نے اس سلسلے میں انکار کر دیا تو تم یقین کرو کہ میں ایک دن بھی شیو بنانے کا ناغہ نہیں کروں گا ۔ اور نہ ہی کوئی درد بھرا شعر گنگنانے کی کوشش کروں گا " یہ میرا وعدہ ہے "

" یار کمال ہے ۔ بھائی جان ! ایسے خشک قسم کے دُولہا دُلھن میں نے کبھی نہیں دیکھے " خالد نے ہنستے ہوئے کہا ۔

" تو پھر اب دیکھ لو ۔ میں کوئی فضول حرکت کبھی نہیں کرونگا ۔ ہاں اگر ثناء کبھی میری طرف متوجہ ہوئی یا یہ بات اُس کے کانوں تک پہنچی اور اُس نے اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو میں اُس سے ضرور گفتگو کروں گا ۔ ویسے مجموعی طور پر مجھے وہ لڑکی پسند ہے کیونکہ اس دَوران اُس نے نہ ہی کبھی میری طرف مُسکرا کر دیکھا ۔ نہ اُس کی آنکھوں میں حجاب پیدا ہوا ۔ بالکل دوستوں کی طرح یا شناساؤں کی طرح مجھ سے ملتی ہے ۔ سلام دُعا کی حد تک بات رہتی ہے ۔ اور اس سے زیادہ وہ باتیں کر بھی کیا سکتی ہے "

" کمال ہے بھائی جان ! میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں ۔ جب آپ کو زندگی کے ان راستوں پر قدم بڑھانا ہے تو پھر ثناء سے مِل کر اُس کی ذاتی رائے بھی دریافت کریں ۔ اُس کے معمولات ، اُس کی پسند ، اُس کا شوق "

" نہیں بھائی نہیں ! اللہ کے واسطے مجھے اس امتحان سے دُور رکھو ۔ میرا ٹائپ یہ نہیں ہے ۔ میرے لئے بس یہ ہی کافی ہے کہ ثناء ایک سادہ سی لڑکی ہے ۔ خوش مزاج ہے ۔ پُرمذاق ہے ۔ شرارتیں کرتی ہے ۔ اور یہ ساری باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں ۔ لیکن میں خود نہ ان شرارتوں میں شامل ہو سکتا ہوں ۔ نہ اُسے لطیفے سُنا سکتا ہوں ۔ نہ اُسے ساتھ لے کر کہیں چہل قدمی یا لانگ جمپ اور ہائی جمپ کے مظاہرے کر سکتا ہوں ۔ بس ٹھیک ہے اگر سب لوگوں نے منظور کیا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا "

" منطق کی رُو سے " اختر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا ۔

" ہاں ! ویسے یار اختر ایک بات اور میرے ذہن میں آئی ہے "

" کیا ؟ ارشاد ارشاد " اختر نے خالد کو دیکھتے ہوئے کہا ۔

" یہاں کچھ اور بھی نظر آ رہا ہے مجھے " اگر ہم دونوں بھائی ہی اس عمارت سے منسلک ہو جائیں تو کیا حرج ہے "

" سمجھ رہا ہوں بھائی جان ! یہ جوابی کارروائی ہے ۔ کریں کریں ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ اور نہ ہی لڑکیوں کی باتیں کرتے ہوئے مجھے کوئی شرم آتی ہے ۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اچھا لگتا ہے ۔ آپ کے ذہن میں اگر کچھ ہے تو بتائیں "

" ابھی تک تو کچھ نہیں ۔ لیکن یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تم ان لوگوں میں خاصے گھلتے ملتے جا رہے ہو "

" کوشش کر رہا ہوں بھائی جان ! لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ساری کی ساری خواتین اپنے آپ کو لئے دیئے رکھنے کی عادی ہیں ۔ ویسے یہ دلچسپ بات ہے کہ اس گھر میں ہمارا مدِ مقابل کوئی نہیں ہے "

" مطلب ؟ "

" مطلب یہ کہ پہلے سے کوئی سائیڈ ہیرو یہاں موجود نہیں ہے جو کوئی رُکاوٹ ڈالے ۔ آپ سمجھتے ہیں نا ! یہ سائیڈ ہیرو ٹائپ کی چیزیں اکثر ان اطراف میں موجود ہوتی ہیں جیسے ہندوستانی فلموں میں امول پالیکر ۔ کیا سمجھے ؟ لیکن یہاں کوئی امول پالیکر نہیں ہے ایک اپنے وہ رشید بھائی ہیں کوّے والے ۔ مگر اُن کی مونچھوں کی نوکیں اتنی زبردست ہیں کہ خواتین کی نگاہ میں چُبھ کر رہ جاتی ہیں ۔ چنانچہ اُن سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں ہے ۔ باقی اور کون ہے "

" ہوں ہوں ! گویا تمہیں یہاں کسی رقیبِ رُوسیاہ کا سامنا نہیں ہے "

" معاف کیجئے گا بھائی جان ! گستاخی نہ تصوّر کریں اب دوستی کی ہے تو اُسے نباہ بھی دیں ۔ دراصل یہاں کوئی ہیروئن ہی نہیں ہے جو رقابت کا مُعاملہ ہو "

" ہوں ! بہرطور تمہاری تو خُوب گزر رہی ہے "

" ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے ۔ کچھ لوگوں سے واقعی اچھی چلے گی ۔ لیکن ابھی دُشمن مقابلے پر نہیں آیا ہے "

" مطلب ؟ "

" مطلب منطق کی رُو سے بتایا نہیں جا سکتا . . " اختر نے ہنستے ہوئے کہا ۔

" کوئی گڑبڑ نہیں کرنا یار ! میرا مُعاملہ کھٹائی میں نہیں پڑنا چاہیئے "

" مٹھائی ہی مٹھائی ہوگی ۔ آپ فکر نہ کریں ۔ بس اختر زندہ باد کے نعرے لگاتے رہا کریں ... ویسے بھائی جان ! اب میں سنجیدہ ہوں ۔ واقعی آپ کو ثناء کی قُربت حاصل کرنی چاہیئے ۔ کم از کم سادہ ہی سے ہی سہی ۔ آپ کو اور اُسے ایک دُوسرے کی طرف متوجّہ تو ہونا ہی چاہیئے ۔ یہ کیا کہ ثناء کے دل میں ابھی تک آپ کا کوئی تصوّر ہی بیدار نہ ہُوا ہو "

" اختر پلیز ! تو یقین کر مجھے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں ہے "

" تو پھر اختر کوچنگ سینٹر میں داخل ہو جائیے ۔ ہم آپ کو تربیت دیں گے "

" داخلہ فیس کیا ہوگی ؟ " خالد نے سوال کیا ۔

" پہلے داخلہ فارم حاصل کر لیجئے ۔ اُس پر تمام کوائف درج ہونگے " اختر بھی مُسکرا کر بولا ۔ اور خالد ہنسنے لگا ۔

" اور کوئی کام تو نہیں ہے مجھ سے ؟ "

" جی نہیں ! بس یہ ہی پُوچھنا تھا ۔ ویسے آپ کو آج ہی سے آغاز کر لینا چاہیئے ۔ بھابی بیگم کی قُربت حاصل کرنے کا "

" بتادو بھائی وہ کیسے . . "

" آج شام کی چائے پر آپ اُنھیں پائیں باغ میں ٹہلنے کی دعوت دیجئے ۔ کوشش کر کے دیکھ لیجئے کیا حرج ہے ۔ میرا خیال ہے تھوڑی بہت گفتگو بھی ہو جائے لیکن یہ آپ کی صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ بھابی بیگم اس کے لئے آمادہ ہو جائیں ۔ ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ بہت زیادہ کسی سے گھلتی ملتی نہیں ہیں ۔ صرف وہ ایک تدرت ہے جو اللہ رکھی کے نام سے پُکاری جاتی ہے یا وہ ایک میڈم مونالیزا ہیں ۔ جن کی مُسکراہٹ واقعی مونالیزا کی مُسکراہٹ سے بھی زیادہ حسین ہے ۔ وہ جو ایک بچّے کی ماں ہیں اور جن کا بچّہ بھابی بیگم نے گود لے رکھا ہے "

" رُدا کی بات کر رہے ہو "

" ہاں ! ویسے بڑی پاکیزہ فطرت کی مالک لڑکی ہے ۔ آپ یقین کیجئے مجھے اُس سے پیار ہے ۔ ثناء نے کہا تھا کہ وہ گونگی ہے لیکن اُس کا گونگا پن میں نے ختم کر دیا ۔ مجھے بھائی کہنے لگی ہے "

" گڈ گڈ ! اس کا مقصد ہے کہ تم یہاں خاصے تعلقات پیدا کرتے جا رہے ہو "

" اب آپ کے لئے تو پتہ نہیں کیا کیا کچھ کرنا ہوگا ؛ بہرحال بھائی جان ! آپ میری ہدایات پر عمل کیجئے ۔ آج شام کی چائے کے بعد بھابی بیگم کو چہل قدمی کی دعوت اور پھر یہ چہل قدمی اگر کوٹھی سے باہر تک ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے ۔ اور اُس کے بعد کسی خوبصورت سے علاقے میں ۔ علاقے کی تلاش میں کر دُوں گا ۔

آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ویسے میرا خیال ہے سمندر کے کنارے آپ کو یہ کارروائی کرنی تھی۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ نہ سمندر دُور ہے۔ اور نہ بھابی بیگم۔"

"بس اب تم جاؤ منطق کی رُو سے۔" خالد نے کہا۔

"ہاں! میرے جانے کا وقت بھی ہو گیا ہے منطق کی رُو سے۔ کچھ لوگوں سے ذرا دلچسپ مُعاملات چل رہے ہیں۔ اُن کی کھوج بھی ضروری ہے۔ ویسے میں اِن دونوں خواتین کی گفتگو بڑی توجہ سے سنتا ہُوں۔" خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اختر مُسکراتا ہُوا باہر نِکل گیا تھا۔

سُرخ فائل کے مُعاملے کے خاتمے کے بعد شہاب صاحب کو رَدا سے اور کوئی شِکایت نہیں ہُوئی تھی۔ نہ ہی رَدا کے سِلسلے میں وہ بہت زیادہ پریشان تھے۔ بات صِرف اُس وقت تک کی تھی۔ جب تک کہ رَدا کو فرینڈز آرگنائزیشنز کی حقیقت معلوم تھی، اور سُرخ فائل اُس کے قبضے میں تھی۔ جِس انداز میں اُس نے شہاب صاحب کی یقین دہانی کے بعد سُرخ فائل اُن کے حوالے کر دی تھی اُس سے یہ بھی احساس ہوتا تھا۔ کہ اُس کے ذہن میں اور کچھ نہیں ہے۔ تاہم شہاب صاحب کو یہ بات اکثر کھٹکتی رہتی تھی کہ رَدا اُن کے ایک کمزور پہلو سے واقف ہے۔ اگر رشید درمیان میں نہ آتا۔ اور ضرورت سے زیادہ دِلچسپی نہ لیتا تو شاید شہاب صاحب اِس سِلسلے میں زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ لیکن رشید کے اُکسانے پر یہ بات اُن کے ذہن میں بھی پیدا ہو گئی تھی۔ کہ اگر رَدا کی حقیقت اُن کے علم میں آجائے۔ تو کم از کم اُسے کسی ایسے موقع کے لئے محفوظ رکھیں جب رَدا بگڑ جائے۔ ویسے اُن کے ذہن میں رَدا کے لئے جو ضرور تھا بہت گہرے آدمی تھے۔ گھر میں معصُوم اور پاکیزہ بنے رہتے تھے۔ لیکن باہر کی دُنیا وسیع تھی۔ اُن کے شوق اِتنے پُراسرار تھے کہ لوگوں کو اُن کی ہَوا بھی نہیں لگنے پائی تھی۔ گھر میں رہتے تو ہر طرح سے ایک پُروقار شخصیت نظر آتے۔ لیکن بہت سے کردار ایسے تھے جن کے لئے شہاب صاحب ایک انتہائی خطرناک شخصیت کے مالک تھے۔ گھوڑوں کا شوق تھا اور دُنیا کے مختلف حِصّوں میں ہونے والی ریسوں پر بڑے بڑے داؤ لگاتے رہتے تھے، اِس کے علاوہ بھی نجانے کیا کیا چکر چلائے ہُوئے تھے اُنھوں نے۔ جس کی تفصیل ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ اپنے حِصّے کی دولت کا تصور کبھی اُنھوں نے کیا بھی نہیں تھا۔ احسان صاحب کا احترام کرتے تھے۔ اور پھر اِس کی ضرورت بھی نہیں پیش آئی تھی اُن کے اپنے اکاؤنٹس تھے اور احسان صاحب نے کبھی اُنھیں موقعہ نہیں دیا تھا۔ کہ وہ بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ بلکہ احسان صاحب اپنے ذرائع سے کام لے کر اُن کا بیلنس بھی منگواتے رہتے تھے۔ اور پھر اُن کے حساب میں خود بخود بڑی بڑی رقمیں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ یہ احسان صاحب کا کردار تھا۔ اور شہاب صاحب کو کبھی بھائی سے شکایت کا موقعہ نہیں ہُوا تھا۔ بہرطور وہ اپنے طور پر زندگی گزار رہے تھے۔ اور شاید اُسے ہی بہتر سمجھتے تھے۔ وہ لباس وغیرہ تبدیل کر کے، پرفیوم لگا کر شاید کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ رشید اُن کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈیزائن بگڑا ہُوا تھا چہرے پر جگہ جگہ نشانات نظر آرہے تھے۔ شہاب صاحب اُسے دیکھ کر چونک پڑے، ایک لمحے کے لئے تو وہ رشید کو پہچان بھی نہیں سکے تھے۔ پھر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہُوں! رشید کیا ہو گیا بھئی یہ؟ کسی باقاعدہ گروہ سے جا بھڑے تھے کیا؟"

"نہیں جناب! بس ایسے ہی کل پکنک پر گئے تھے نا۔ کمبخت کوّے پیچھے لگ گئے۔ اور اُنھوں نے ٹھونگیں مار مار کر بُرا حال کر دیا!"

"سُبحان اللہ صاحب سُبحان اللہ۔ گویا اب انسانوں کے علاوہ پرندوں سے بھی آپ کی جنگ ہونے لگی ہے۔"

"بس اتفاق تھا شہاب بھائی۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"ٹھیک ہُوں۔ کوئی کام ہے مجھ سے؟ کچھ چاہیئے؟"

"نہیں نہیں۔ بار بار پیسوں کے لئے ہاتھ پھیلانا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ میں اِس وقت بالکل پیسے مانگنے نہیں آیا۔ بلکہ ایک دِلچسپ اِطلاع لے کر آیا ہُوں آپ کے لئے۔"

"خُوب خُوب! اور وہ رَدا کے بارے میں ہو گی۔" شہاب صاحب نے مُسکرا کر کہا۔

"سو فیصدی۔" رشید نے کہا۔ دروازے کے پاس آکر باہر جھانکا اور پھر شہاب صاحب کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ویسے یار رشید! تم اُس بیچاری رَدا کے پیچھے کیوں پڑے ہُوئے ہو؟"

"میں ...؟ نہیں تو شہاب بھائی۔ دراصل میں تو آپ کا نمک اَدا کرنا چاہتا ہُوں۔"

"میں نے تمھیں کبھی نمک نہیں کِھلایا بھائی۔ بس جو کچھ ہو رہا ہے یاری دوستی میں ہو رہا ہے۔ تم جانتے ہو میں کسی سے دوستی کرنے کا قائل نہیں ہُوں۔ لیکن میں نے تمھیں ذرا دُوسروں سے الگ پایا ہے۔ اِس لئے تمھاری دوستی اپنا لی ہے۔"

"یہ تو میری خوش بختی ہے شہاب بھائی۔ ورنہ میں کہاں اور آپ کہاں؟"

"کہو رَدا کے بارے میں کیا بتانے آئے تھے؟"

"آپ نے جو ڈیوٹی میرے سپرد کی تھی۔ میں اُس کے لئے مُسلسل کام میں معرُوف ہُوں۔ اپنے طور پر جو کچھ کر سکتا ہُوں۔ پرسوں ایک دِلچسپ واقعہ پیش آیا۔"

"سُناؤ سُناؤ۔" شہاب صاحب دِلچسپی سے بولے۔

"رَدا حسبِ معمُول دفتر سے نکلی تھی۔ رکشہ میں بیٹھ کر آتی ہے۔ میں دو تین بار اُس سے ملاقات کر چکا ہُوں۔ اُس دِن بھی اِسی غرض سے گیا تھا۔ کہ رَدا سے کچھ بات چیت ہو جائے۔ دراصل دُشمن کو دوست بنا کر اُس کے بارے میں کارروائی کرنا دانشمندی ہوتی ہے لیکن میں ابھی رَدا تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک تقریباً ادھیڑ عُمر آدمی شکل و صُورت سے ٹھیک ٹھاک نظر آتا تھا۔ اچھی شکل و صُورت کا مالک تھا۔ بوسیدہ سا لباس پہنے ہُوئے مفلوکُ الحال نظر آتا تھا۔ رَدا کو دیکھ کر چونک پڑا۔ اور پھر اُس نے رَدا کہہ کر مخاطب کیا۔ اور حیرت سے یہ بات پُوچھی کہ وہ کراچی کب آئی؟ رَدا کچھ بدحواس سی ہو گئی تھی۔ اُس نے بدحواسی ہی کے انداز میں اُس سے کہا کہ وہ اُسے نہیں جانتی۔ تب اُس شخص نے رَدا سے کہا کہ رَدا میں ثاقب ہُوں۔ مجھے السّر ہو گیا ہے۔ میں مریض ہو گیا ہُوں رَدا۔ اُس کے لہجے میں عجیب سی کیفیت تھی۔ شہاب بھائی۔ جیسے وہ رَدا سے کچھ طلب کرنا چاہتا ہو۔ رَدا سے اِتنی بے تکلفی سے گفتگو کرنے والا وہ پہلا اجنبی ہے جو ہمارے علم میں آیا ہے۔ بہرطور رَدا ایک رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اُس شخص کو پہچان گئی ہے۔ لیکن اُس کی بدحواسی یہ بتاتی تھی کہ وہ اُس شخص کو دیکھ کر پریشان ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً ہی اُس سے رابطہ قائم کیا۔ اور اُسے دوست بنانے کی کوشش بھی کی۔ کمبخت چالاک آدمی تھا۔ میرا خیال ہے پیسے ویسے نہیں تھے اُس کی جیب میں۔ بھُوکا بھی تھا۔ میں نے اُسے ایک ہوٹل میں جا کر کھانا کِھلایا۔ اُس وقت تک وہ ذلیل رَدا سے ناواقفیت کا اِظہار نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اُس نے ایسا گول مول سا انداز اختیار کیا تھا۔ جیسے کھانے کے بعد وہ مجھے رَدا کے بارے میں تفصیلات بتائیگا۔ اور اِس سِلسلے میں اُس نے مجھ سے تھوڑی سی رقم بھی اَینٹھ لی۔ اُس نے یہ رقم اپنی مفلوکُ الحالی کا اِظہار کر کے مجھ سے مانگی تھی اور میں نے یہ سوچ کر اُسے پیسے دیئے تھے کہ ممکن ہے رَدا کے بارے میں مجھے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو آپ کے لئے کارآمد ہو۔ لیکن کھانے پینے کے بعد وہ کمبخت بالکل ہی بدل گیا۔ کہنے لگا کون رَدا وہ کسی رَدا کو نہیں جانتا۔ آپ یقین کیجئے اگر مُعاملہ رَدا کا نہ ہوتا۔ تو گریبان پکڑ کر دو دیں دے پٹختا۔ لیکن میں نے سوچا کہ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ یہ بات تو حقیقت تھی کہ وہ رَدا کا کوئی شناسا ہے اور یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ رَدا اِس سے پہلے کراچی میں نہیں تھی۔ میں نے اُس شخص سے اُس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تو پتہ چلا کہ فُٹ پاتھیہ ہے۔ اور اِس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ کھانے پینے کے بعد گُرو مندر کے عقبی پارک میں جا کر آرام سے گھاس پر لیٹ کر سو گیا تھا۔ میرا خیال ہے شہاب صاحب کہ اُس شخص کو تلاش کر لینا اِتنا مشکل کام نہیں ہو گا۔ ہم اُس سے رَدا کے بارے میں یقینی معلومات حاصِل کر سکتے ہیں۔ میں نے پہلے یہ اِطلاع آپ کو دے دینا ضروری سمجھی۔ چالاک آدمی ہے۔ کچھ رقم بھی خرچ کرنی پڑے گی اُس کے لئے اور میرا خیال ہے۔ رقم کے لئے وہ زبان ضرور کھول دے گا۔" شہاب صاحب دِلچسپی سے یہ بات سُن رہے تھے۔ اُنھیں اب رشید کی باتوں میں واقعی دِلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

"گڈ ویری گڈ۔ اگر کوئی ایسا شخص جو رَدا کے بارے میں اُس کے یہاں آنے سے پہلے کی باتیں جانتا ہو۔ ہمارے ہاتھ لگ جائے تو ہم یقیناً رَدا کے بارے میں بہت سی تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔"

"یہ ہی میرا بھی خیال ہے شہاب بھائی۔"

"تو پھر اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ مشورہ لینے آیا ہُوں۔"

"ہُوں! ایسا کرو اگر کوئی وقت نہ ہو تو آؤ میرے ساتھ چلو۔ مجھے تھوڑا سا کام ہے۔ اُس کے بعد ہم اُس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر واقعی فُٹ پاتھیہ ہے تو یقیناً شہر کے کسی نہ کسی عِلاقے میں نظر آجائے گا۔ ممکن ہے گُرو مندر کے عقبی پارک میں ہی مِل جائے۔ وہ جگہ بہت سے لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔"

"میں حاضِر ہُوں شہاب بھائی! بھلا اِس میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر جاؤ پھُرتی سے کپڑے بدل کر آجاؤ۔"

"میرے کپڑے تو ٹھیک ہیں شہاب بھائی۔ آپ تیار ہو جائیے۔"

"ہُوں! چلو پھر چلتے ہیں۔ بلکہ ایسا کرو کہ تم میرے ساتھ باہر نہیں نِکلو۔ تم چلے جاؤ۔ اور کوٹھی سے تھوڑے فاصِلے پر کھڑے ہو کر میرا انتظار کرو۔ میں آرہا ہُوں سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ یہاں سے نکلنا مناسب بات نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دُوسروں کو ہماری اِس قُربت کا عِلم ہو۔ ویسے بھی میں نے تمھیں اپنے لئے پرائیویٹ جاسُوس منتخب کیا ہُوا ہے۔ اور کوٹھی میں ہونے والے مُعاملات سے تمھارے ذریعے آگاہی حاصِل کرنا چاہتا ہُوں۔ ابھی تو کوئی

ایسا مسئلہ درپیش نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ مجھے تمھاری ضرورت پیش آ جائے۔"

"رشید سے اچھا دوست آپ کو دوسرا کوئی نہیں ملے گا۔ شہاب بھائی۔ اچھا میں چلتا ہوں کوٹھی سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر آپ سے ملاقات کروں گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" شہاب صاحب نے کہا اور رشید باہر نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد شہاب صاحب اُس کی گفتگو کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ رَدا کے بارے میں اگر واقعی کوئی بات معلوم ہو رہی ہے تو اُس کا معلوم کرنا ضروری ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن کی مرسڈیز کوٹھی سے باہر نکل رہی تھی۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر انھیں رشید کھڑا ہوا نظر آیا۔ اور انھوں نے رشید کو گاڑی میں بٹھا لیا۔ انھیں کئی کام تھے۔ چنانچہ وہ اپنے کاموں کے سلسلے میں مختلف لوگوں سے ملتے رہے۔ اور تقریباً ایک بجے اس کام سے فراغت ہوئی۔ پھر انھوں نے رشید کو ایک بہت عمدہ سے ہوٹل میں اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ رشید پھولا نہیں سما رہا تھا شہاب صاحب کے بارے میں اُسے کوٹھی میں رہ کر کافی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ بے حد مغرور قسم کے آدمی تھے۔ اور کسی بھی نچلی سطح کے شخص کو منہ لگانے کے قائل نہیں تھے۔ لیکن رشید پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی نظرِ عنایت ہو گئی تھی۔ اور رشید اس بات سے بہت خوش تھا۔ شاندار سے ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد شہاب صاحب باہر نکلے اور پھر ثاقب کی تلاش شروع ہو گئی گرومندر کے پارک میں دیکھا گیا۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اُس کے بعد اُسی تمام جگہیں دیکھ ڈالی گئیں۔ جہاں اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لیکن ثاقب کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ رشید مایوس ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً شہاب صاحب نے کہا۔

"رشید! ایسے تو اس شخص کا ملنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر تم کہتے ہو کہ وہ رَدا سے اتنی ہی دلچسپی رکھتا ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دوبارہ رَدا کو اُسی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرے جہاں اُس نے اُسے دیکھا تھا:"

"امکانات ہیں شہاب بھائی۔ سو فیصدی امکانات ہیں۔"

"لیکن اُس کے لئے تو ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"آپ جیسا مناسب سمجھیں۔" رشید نے جواب دیا اور شہاب صاحب کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر انھوں نے کہا۔

"رشید! میں تمھارے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔" رشید شہاب صاحب کے اس لہجے پر چونک کر انھیں دیکھنے لگا تھا۔

"کیا جاننا چاہتے ہیں شہاب بھائی؟"

"چلو کہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔" شہاب صاحب نے کار آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک فیشن ایبل علاقے میں داخل ہو گئے۔ معقول لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ حسین ترین بنگلے پھیلے ہوئے تھے۔ ایک خوبصورت بنگلے کے گیٹ کے سامنے شہاب صاحب نے کار روکی اور ہارن بجایا۔ چوکیدار نے جھانک کر دیکھا۔ اور پھر جلدی سے مؤدب ہو کر گیٹ کھول دیا۔ شہاب صاحب کار اندر لے گئے تھے۔ پورٹیکو میں کار روکنے کے بعد وہ نیچے اُترے رشید بھی دوسری طرف سے اُتر آیا تھا۔ شہاب صاحب اُسے لئے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ ایک ائر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچ کر انھوں نے رشید کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ کمرہ آفس کی طرح بنا ہوا تھا ایک حسین اور وسیع و عریض میز پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے پیچھے ریوالونگ چیئر۔ بہترین ڈیکوریشن تھی۔ انتہائی خوبصورت ریک لگے ہوئے تھے۔ فائل کیبنٹ تھے۔ اور نجانے کیا۔ شہاب صاحب نے رشید کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولے

"یہ عمارت میری ہے رشید۔"

"آپ کی۔" رشید نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! اور میں نے تمھیں اپنا رازدار بنانے کا فیصلہ کافی غور کر کے کیا ہے۔ کیا تم میرے کاروبار میں شریک ہونا پسند کرو گے؟"

"شہاب بھائی! کتنی عنایتیں کریں گے مجھ پر؟ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔ تو میری اس سے زیادہ خوش نصیبی کیا ہوگی۔"

"رشید! کچھ باتیں تمھیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ قانونی حیثیت نہیں رکھتا۔ بہت سے غیر قانونی کام ہیں۔ جو مجھے کرنے ہوتے ہیں۔ اور میرے ساتھی بھی وہ ہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ جو میری مرضی پر چلتے ہوں۔ لیکن میرا شریکِ کار بننے کے بعد اُن پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ جن میں سب سے بڑی ذمہ داری رازداری اور زبان بندی کی ہے۔ دوسری ذمہ داری مستعدی کی؟ اور تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ جو کام سپرد کیا جائے اُسے آنکھیں بند کر کے انجام دینا ہوتا ہے۔"

"میں یہ تینوں ذمہ داریاں بخوبی نباہ سکتا ہوں شہاب بھائی۔ میں بھی زندگی میں کچھ بننا چاہتا ہوں۔ اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہزار بارہ سو کی نوکری انسان کو کبھی کچھ نہیں بننے دیتی۔ بننے کے راستے ذرا مختلف ہی ہوتے ہیں۔"

"میں تمھیں بہت کچھ بنا دوں گا رشید۔ لیکن تمھیں ہر طرح سے میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"اس کے لئے شہاب بھائی جس طرح سے چاہیں آپ اپنا

اطمینان کر سکتے ہیں۔"

"ہاں! کاروبار، کاروبار ہے اور اس میں اصول پسندی پہلی شرط ہوتی ہے۔" شہاب صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے۔ ایک فائل کیبنٹ سے انھوں نے کچھ کاغذات نکالے اور انھیں لئے ہوئے اپنی میز پر پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے رشید کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور رشید اُن کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ کاغذ لو اس پر اپنے دستخط کرو۔" انھوں نے ایک سادہ کاغذ رشید کے سامنے رکھا۔ اور قلم اُس کے ہاتھ میں دے دیا رشید نے صرف ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا تھا۔ لیکن شہاب صاحب کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ اُس نے کاغذ پر دس بارہ جگہ دستخط کئے پھر اُسے شہاب صاحب کی طرف بڑھا دیا شہاب صاحب یہ دستخط دیکھنے لگے۔ پھر انھوں نے ایک فائل رشید کے سامنے کر دیا۔ جس میں پانچ چھ کاغذ لگے ہوئے تھے۔ یہ تمام کاغذ بھی سادہ تھے۔ انھوں نے ایک جگہ نشان لگا کر کہا۔

"ان تمام کاغذات پر دستخط کرو۔ اِس نشان پر۔" رشید کے دل میں ایک لمحے کے لئے ہول پیدا ہوا تھا۔ لیکن پھر اُس نے شہاب صاحب کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور تمام کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ شہاب صاحب بے حد چالاک آدمی تھے۔ پہلے رشید سے انھوں نے دستخطوں کا نمونہ لیا تھا۔ اور اُس کے بعد اِن کاغذات پر دستخط کرائے تھے۔ فائل اپنے قبضے میں کرنے کے بعد انھوں نے میز کی ایک نچلی دراز سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ سو سو کے نوٹوں کی پوری گڈی تھی۔ گویا دس ہزار۔ یہ گڈی انھوں نے رشید کی طرف اُچھال دی۔ اور بولے۔

"اِسے رکھو اور اپنی پسند کے مطابق خرچ کرو۔"

"یہ... یہ... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ بہت زیادہ ہیں یہ:"

"نہیں! تم نے کہا تھا نہ رشید کہ تم کچھ بننا چاہتے ہو۔ میں تمھیں کچھ بنانا چاہتا ہوں۔ اور وہ لوگ جو کچھ بن جاتے ہیں وہ سو دو سو اور پانچ سو کی حد میں نہیں رہتے۔ بلکہ اُن کے اخراجات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ یہ دس ہزار روپے تم جتنے دن میں چاہو خرچ کر لو۔ اور جب خرچ ہو جائیں تو مجھ سے مزید لے لینا کیا سمجھے؟ یوں سمجھو کہ آج سے تم میرے کاروبار کے شریک ہو۔"

"ب بہت۔ بہت بہت۔ بہت۔ بہت شکریہ شہاب بھائی۔ آپ نے تو واقعی میری تقدیر ہی بدل دی۔"

"ابھی نہیں رشید ابھی نہیں۔ تمھاری تقدیر میں کیا کیا ہے۔ اس کا اندازہ تو تمھیں کچھ دن کے بعد ہوگا۔" شہاب صاحب مسکرا کر بولے۔ رشید کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ساری زندگی میں دس ہزار روپے کبھی اکٹھے نہیں دیکھے تھے۔ اور وہ بھی اپنی ملکیت، اور پھر شہاب صاحب کی طرف سے اجازت کہ جس طرح چاہیں خرچ کئے جائیں۔ یہ اُس کی زندگی کا سب سے سنہرا دن تھا اور اب اُسے سادہ کاغذات پر دستخط کرنے کا بھی خوف نہیں رہا تھا۔ دس ہزار روپے یکمشت۔ وہ تو دس ہزار روپے کے لئے دس ہزار کاغذات پر دستخط کر سکتا تھا۔ اور پھر شہاب صاحب کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ ظاہر ہے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنے ذہن کو پُرسکون کر لیا۔ شہاب صاحب مسکرا رہے تھے۔ چند لمحات کے بعد انھوں نے کہا۔

"رشید! اس عمارت کے بارے میں کبھی کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے: تمھیں آئندہ بھی جو ذمہ داری میں سونپوں اُس کے بارے میں کسی سے کچھ مت کہنا۔ ہو سکتا ہے میں تمھیں ملک سے باہر جانے کے مواقع بھی مہیا کروں۔ لیکن اس کے لئے ابھی تمھیں تربیت دینا ہوگی۔ بس یوں سمجھ لو کہ تم میرے دستِ راست ہو۔ ہاں اگر کبھی تم نے کوئی بدعہدی کرنے کی کوشش کی۔ تو پھر میرے اور تمھارے درمیان صرف دشمنی کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ میں اسی قسم کا آدمی ہوں۔ معمول کے مطابق خود کو مجھ سے الگ تھلگ رکھا کرو۔ اور اگر کبھی تمھیں کوئی ہدایت ملے تو اس عمارت کو ذہن نشین کر لو۔ ہماری تمھاری ملاقاتیں یہیں ہوا کریں گی۔"

"بہت بہتر چیف بہت بہتر۔" رشید نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ شہاب صاحب کافی دیر تک وہاں مصروف رہے تھے انھوں نے رشید سے بہت سی باتیں بھی کی تھیں۔ لیکن اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ کاروبار کیا ہوگا۔ رشید نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنے سینے کے قریب نوٹوں کی گڈی کا دباؤ محسوس کر کے مسرور ہوتا رہا تھا۔ نجانے کیا منصوبے بنا ڈالے تھے اُس نے اپنے ذہن میں۔ طفیلی بیگم کو سو روپے ایڈوانس دے کر اُس کو اس بات کے لئے مخصوص کیا تھا۔ کہ وہ رَدا کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اور اس کے عوض وہ انھیں مزید چار سو روپے ادا کرے گا۔ لیکن اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ماں کو نہال کر دیگا وہ۔ شام کو پانچ بجے شہاب صاحب گھڑی دیکھ کر اُٹھ گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ رشید کے ساتھ تفسیر کے دفتر کی جانب جا رہے تھے جہاں رَدا کے ملنے کے امکانات ہوا کرتے تھے یہ بات نہ رشید کو معلوم تھی نہ شہاب صاحب کو کہ رَدا آج دفتر نہیں آئی۔ رشید کی بتائی جگہ پر کھڑے ہو کر وہ رَدا کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی

7067989

رشید کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں دفعتاً وہ دبی دبی آواز میں چیخا۔

"وہ رہا۔ وہ رہا"۔ اُس کا اشارہ ثاقب ہی کی طرف تھا۔ ثاقب کہیں سے چلتا ہُوا فٹ پاتھ پر آ کھڑا ہُوا تھا۔ اور اب اُس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں رشید نے بے صبری سے نیچے اُترنے کی کوشش کی۔ تو شہاب صاحب نے اُس کے شانے پر دباؤ ڈال کر کہا۔

"بیٹھے رہو۔ بیٹھے رہو"۔ رشید رُک گیا۔ تفسیر کے دفتر کا تقریباً تمام ہی اسٹاف باہر نکل چکا تھا۔ لیکن رُدا نظر نہیں آئی تھی۔ رشید نے شہاب صاحب سے کہا۔

"رُدا اِس وقت تک باہر نکل آتی ہے"۔ ممکن ہے آج دفتر ہی نہ آئی ہو؟

"ہمیں رُدا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر وہ دفتر نہیں آئی تو کوئی بات نہیں۔ اِس شخص پر نِگاہ رکھو بس"۔ تھوڑی دیر کے بعد ثاقب مایوسی سے آگے بڑھتا ہُوا دُور نِکل گیا۔ اور شہاب صاحب نے مرسڈیز اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ چند لمحات کے بعد وہ ثاقب کے قریب پہنچ گئے تھے۔ رشید نے شہاب صاحب کے اِشارے پر کھڑکی سے گردن نکال کر کہا۔

"اوہ ثاقب صاحب! السّلام علیکم"۔ ثاقب نے چونک کر دیکھا۔ شہاب صاحب کی گہری نگاہیں اُس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بلاشبہ جوانی میں بیحد خوبصورت نوجوان ہوگا۔ لیکن اب ایک مفلوک الحال شخص نظر آتا تھا۔ وہ رُک کر رشید کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس کی نگاہوں نے مرسڈیز کا جائزہ لیا اور وہ قریب آگیا۔

"ہیلو! کہیئے آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

"کہاں جا رہے ہیں ثاقب صاحب؟"

"بس ایسے ہی۔ ۔" "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہماری زندگی تو یہ فٹ پاتھ ہیں"۔

"آیئے بیٹھیئے! آج ہم آپ کو ایک بہت ہی خوبصورت فٹ پاتھ کا نظارہ کرائیں"۔ رشید نے پچھلا دروازہ کھولتے ہُوئے کہا۔ اور ثاقب جُھک کر شہاب صاحب کی صُورت دیکھنے لگا۔

"آیئے ثاقب صاحب تشریف رکھیئے رشید نے آپ کو دعوت دی ہے"۔ ثاقب نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا اور پھر مرسڈیز کے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ شہاب صاحب نے مرسڈیز آگے بڑھا دی تھی۔ اُس کے بعد وہ اُس وقت تک نہ رُکے جب تک کہ ساحلِ سمندر پر نہ پہنچ گئے۔ ثاقب نے راستے میں کچھ سوالات بھی کیئے تھے چند لمحات کے لئے اُس کے چہرے پر گھبراہٹ بھی نظر آئی تھی۔ لیکن اِن سوالات کے رشید نے تسلی بخش جواب دے دیئے تھے ساحل پر پہنچ کر شہاب صاحب ایک ویران سے حصّے کی جانب چل پڑے اور پھر اُنھوں نے مرسڈیز روک دی۔

"آیئے ثاقب صاحب کچھ باتیں ہو جائیں"۔

"لل۔ ۔ لیکن! آپ لوگ، آپ لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ثاقب صاحب۔ آپ ایک معزز شخص ہیں۔ اور ہم دوستوں ہی کی مانند آپ کو یہاں لے آئے ہیں۔ اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"حوادثِ زمانہ نے اِتنا پریشان کیا ہے کہ اب تو اپنے سائے پر بھی شک گزرتا ہے"۔

"بڑی خوبصورت اُردو بولتے ہیں آپ"۔ شہاب صاحب بھی مُسکرا کر بولے۔

"اُردو میری زندگی ہے۔ میں نے اُردو کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے مجھے اِس سے پیار ہے"۔ ثاقب نے جواب دیا۔

"مشغلہ کیا رہا ہے آپ کا ثاقب صاحب؟" شہاب صاحب نے پُوچھا اور پھر چونک کر بولے۔

"معاف کیجئے گا! میں نے اپنی پسند سے یہ جگہ منتخب کی ہے۔ اگر آپ کو یہاں کوئی اُلجھن ہو رہی ہو تو پھر آپ کی پسندیدہ جگہ چلوں"۔ ثاقب کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اُس نے رشید کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"اِنسان کی ذات سے ایک ہی مجبوری چسپاں ہے یعنی پیٹ۔ اور ہم توازل سے بھُوکے ہیں۔ چنانچہ ہمارے لئے بہترین جگہ وہ ہی ہوتی ہے جہاں ہمارے سامنے کچھ موجود ہو"۔

"اوہ!" شہاب صاحب مُسکرا کر بولے اور پھر اُنھوں نے کہا۔

"تو معاف کیجئے گا آیئے"۔ ایک بار مرسڈیز پھر واپس چل پڑی۔

جاری ہے

اس دلچسپ کہانی کے بقیہ واقعات دوسرے حصّے میں ملاحظہ فرمائیں

ایم اے راحت
۲
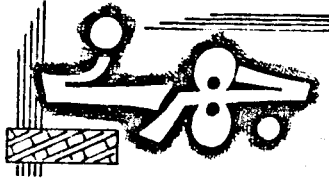
تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوٹل کولمبس میں پہنچ گئے۔ کولمبس کے لان پر میزیں لگی ہوئی تھیں۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ چند ہی افراد وہاں موجود تھے۔ چنانچہ شہاب صاحب، رشید اور ثاقب ایک میز کی جانب بڑھ گئے۔

"کھانے کا وقت تو نہیں ہے۔ اسنیکس منگواتا ہوں آپ کے لئے۔" شہاب صاحب نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ویٹر نے میز بھر دی۔ ثاقب گہری نگاہوں سے شہاب صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اُس نے شہاب صاحب کی حیثیت کا اندازہ تو مرسڈیز دیکھ کر ہی لگا لیا تھا۔ اور اپنے طور پر وہ کسی بھی طرح پریشان نہیں تھا۔ شہاب صاحب نے اپنے لئے کافی بنائی اور اُس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر ثاقب کو کھاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ رشید بھی مسکرا رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ثاقب نے شہاب صاحب کی طرف دیکھا اور بولا۔

"جدید دور نے بہت سے مسئلے پیدا کر دیئے ہیں۔ اور اب وہ شخص جس نے زندگی میں کبھی کسی کا احسان قبول نہ کیا ہو۔ اپنی اقدار جیب میں رکھ کر ایسے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جو اُسے اُس کے مسئلے سے نجات دلا دیں۔ معاف کیجئے گا۔ آپ حضرات اگر دل چاہے تو مجھے ایک ماڈرن بھکاری کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ میرے سینے کی گہرائیوں میں جھانکیں گے تو میں اپنے آپ کو بھکاری نہیں سمجھتا۔ ضرورت انسان کو تھوڑا سا پست کر دیتی ہے لیکن اگر کبھی میری ضرورت پوری ہو گئی تو شاید میں اسی ہوٹل میں اسی میز پر بیٹھ کر آپ سے درخواست کروں گا کہ میرے ساتھ ایک پیالی چائے پیئیں۔"

"یقیناً یقیناً ثاقب صاحب کیوں نہیں۔ ویسے رشید نے اتفاقیہ طور پر آپ کا تذکرہ کیا تھا۔ اور اِس وقت آپ نظر آ گئے تو دل چاہا کہ آپ سے ملاقات کی جائے۔"

"میں ایسا قابلِ ذکر تو نہ تھا۔ اور رشید صاحب انھیں تو میرا خیال ہے مجھ سے ایک تلخ تجربہ بھی ہُوا ہے۔"

"وہ کیا؟" شہاب صاحب نے دلچسپی سے پُوچھا۔

"رشید صاحب نے شاید آپ سے اُس کا تذکرہ نہیں کیا۔"

"ہاں میرا خیال ہے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس رشید صاحب کہنے لگے کہ یہ ثاقب ہیں۔ اور میں نے سوچا کہ آپ سے ملاقات کر لی جائے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ ثاقب ہیں نہیں کبھی تھے۔ اب تو ایک آوارہ رُوح ہے۔ جو سڑکوں پر بھٹکتی پھرتی ہے۔ نہ ڈر نہ جھٹکا نہ۔ لیکن چلتا ہے اِس دُنیا میں سب چلتا ہے۔ ہم تنہا ہی تو نہیں ہیں۔"

"ایک اور چھوٹا سا واسطہ تھا آپ سے ثاقب صاحب، جس کی وجہ سے آپ میں دلچسپی محسوس ہُوئی۔"

"کمال ہے! ہمارا تو یہ خیال تھا کہ اِس دُنیا نے اب ہم سے سارے واسطے ترک کر دیئے ہیں۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ ہم سے بھی کسی کا کوئی واسطہ ہے بھلا کیا؟ کچھ پتہ تو چلے۔"

"میں نے بھی آپ سے رَدا کے بارے میں کچھ پُوچھا تھا ثاقب صاحب۔ لیکن نجانے کیوں آپ اِتنے محتاط ہو گئے۔ اور آپ نے وہ انداز اختیار کیا۔ حالانکہ اِس میں ہمارا ہی نہیں آپ کا بھی فائدہ تھا۔" رشید نے فوراً بات اُچک لی۔ اور شہاب صاحب نے اِس بات پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"رَدا"! ہاں رَدا کا میری زندگی سے ایک تعلق ہے۔ بلکہ یُوں سمجھو کہ گہرا تعلق ہے۔ لیکن افسوس میں رَدا کو عام نہیں کر سکتا اُس کے بارے میں گفتگو کرتے ہُوئے میرے ذہن میں بہت سے تصورات ہوتے ہیں۔ یہ تصورات فروخت نہیں کئے جا سکتے۔ رشید صاحب! اُس دِن بھی شاید آپ کو اِس سلسلے میں مایوسی ہُوئی تھی اور آج بھی افسوس آپ لوگ مایُوس رہیں گے۔" ثاقب کے لہجے میں پتھروں کی سی سختی تھی۔ شہاب صاحب نے گہری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"ثاقب صاحب! ابھی آپ نے کہا تھا کہ کسی سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیا آپ نے کبھی اِس کی وجوہات پر بھی غور کیا؟"

"میں سمجھا نہیں جناب! ویسے افسوس آپ لوگوں سے مکمل تعارف نہیں حاصل ہو سکا۔"

"آپ مجھے شہاب کہہ سکتے ہیں اور رشید تو شاید اپنا تعارف آپ سے کرا ہی چکے ہوں۔"

"جی ہاں... جی ہاں! تو میں سمجھا نہیں شہاب صاحب۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ آپ نے دُنیا کو اپنی قربت کا موقعہ ہی نہ دیا ہو۔ بھئی کسی بھی شخص کی دُنیا والوں سے دُوری خود اُس کی اپنی کسی بُرائی کی بُنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں... ہاں! انسان اپنی بُرائیوں کا خود محاسب نہیں ہوتا۔ اِس کی نشاندہی تو دُوسرے ہی کرتے ہیں۔"

"تو پھر دیکھئے نا! آپ نے اپنی رَدا سے کسی واسطے کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ہم آپ سے اُس کے بارے میں پُوچھنا چاہتے ہیں تو پھر یہ اِس قدر اجتناب کیوں؟ بلا شُبہ اِس بات کے امکانات ہیں کہ رَدا کا آپ سے کوئی گہرا ربط ہو۔ کوئی گہرا تعلق ہو لیکن جو لوگ اِس تعلق کو جاننا چاہتے ہوں وہ بھی تو اُس سے سی بھی شکل میں منسلک ہو سکتے ہیں۔" ثاقب کی آنکھوں میں چند لمحات کے لئے گہری سوچ اُبھر آئی پھر اُس نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ہاں اِس بات کے امکانات تو ہیں۔ افسوس میں نے اِس پر غور نہیں کیا تھا لیکن کیا آپ لوگ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ رَدا سے کس طرح منسلک ہیں؟"

"رَدا ہمارے ساتھ رہتی ہے ہمارے گھر میں وہ ہم لوگوں کیلئے ایک مُحترم شخصیت ہے۔ ہم سب اُس سے محبت کرتے ہیں وہ اپنی مرضی سے ملازمت کرتی ہے جب کہ اُس کے لئے کوئی مجبُوری نہیں ہے۔ ہم اِتنے بے حیثیت بھی نہیں کہ رَدا اور اُس کے بچے کو پرورش نہ کر سکیں لیکن ہم اُس کی اَنا کو ٹھیس بھی نہیں پہنچنے دینا چاہتے۔ آپ یقین کیجئے ثاقب صاحب۔ رَدا جب سے ہمارے درمیان آئی ہے ہم نے اُسے بھرپُور اعتماد دیا ہے لیکن اُس کے بارے میں بہت سی باتیں ابھی تک ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ ہم آپ سے اُس کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُس کی وجہ صرف ہماری محبت ہے۔ رَدا سے ہمارا اُنس ہے۔ ہم اُس کے چہرے پر زندگی کی مُسکراہٹیں واپس لانے کے خواہاں ہیں۔ اگر آپ رَدا سے کوئی محبت کا رشتہ رکھتے ہیں تو میرے خیال میں آپ کو ہماری مدد کرنی چاہیئے۔ رَدا سے آپ کا کیا رابطہ ہے؟ رَدا کون ہے؟ اور اُس کے اہلِ خاندان کہاں ہیں؟ اِس بارے میں ثاقب صاحب اگر آپ ہماری کچھ مدد کر سکتے ہوں تو آپ کو کرنی چاہیئے اِس کا تعلق رَدا ہی کی خوشیوں سے ہے۔" ثاقب سنجیدہ نگاہوں سے شہاب صاحب کو دیکھتا رہا تھا۔ شہاب صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ بات کو زیادہ گھمانے پھرانے کے بجائے ثاقب سے براہِ راست ہی گفتگو کی جائے لیکن اُنھیں اِس بات کی اُمید نہیں تھی کہ ثاقب اِس طرح اُنھیں چوٹ دے دے گا۔ ایسی ہی چوٹ تو اُس نے رشید کو بھی دی تھی اور تین سو روپے مار دیئے تھے۔ ثاقب نے چند لمحات کی خاموشی کے بعد پُوچھا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں؟" شہاب صاحب نے احسان صاحب کی کوٹھی کا پتہ بتا دیا اور ثاقب گردن ہلاتے ہُوئے بولا۔

"رَدا میرے لئے صرف ایک شناسا کی حیثیت رکھتی ہے اور اِس کے علاوہ زندگی کے کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں دوستو جنہیں زبان کی گرفت سے آزاد کرنا نہ جانے کس کس کے حق میں بُرا ہوتا ہے۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے مجھ سے

رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن شعر کا انتخاب بڑا مشکل کام ہے۔ میں اِس شعر پر پُورا پُورا اعتماد رکھتا ہُوں۔ و اُمید کرتا ہُوں کہ آپ میری خاموشی کا بُرا نہیں مانیں گے۔"

"گویا ثاقب صاحب آپ رَدا کے بارے میں کچھ بتانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔"

"جب رَدا نے آپ لوگوں کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو میں اُس سے معمُولی سی واقفیت رکھنے والا بھلا آپ کو کیا بتا سکتا ہُوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ اُس پر اپنے احسانات کے صِلے میں اُس سے اُس کے بارے میں پُوچھیں۔ وہی سب کچھ بتا دے گی۔ آپ کو، خُدا حافظ۔" ثاقب اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ شہاب صاحب اور رشید دونوں بھونچکے سے رہ گئے تھے۔ پھر شہاب صاحب نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ثاقب صاحب آپ بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ کوشش آپ کے حق میں خطرناک ہو گی۔"

"بھائی مست مولا ہیں اِس دُنیا کو اِتنا زیادہ دیکھ چکے ہیں کہ اب مزید دیکھنے کی آرزو باقی نہیں رہی ہے۔ ناراض ہو جاؤ اور یہ ناراضگی ناقابلِ برداشت ہو جائے تو ہماری مُشکل آسان کر دینا۔ دُعا دیں گے خُدا حافظ۔" ثاقب آہستہ قدموں سے باہر نکل گیا۔ شہاب صاحب اور رشید ایک دُوسرے کی صُورت دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ پھر شہاب صاحب نے غُراتے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"جائے گا کہاں کمبخت بچ کر کہاں جائے گا۔ بہت چالاک بنتا ہے۔ بہت کچھ سمجھتا ہے اپنے آپ کو جاؤ رشید اُس کے پیچھے جاؤ ہر اُس جگہ اُس کا تعاقب کرو جہاں کا یہ رُخ کرے جاؤ۔ رات کو تم سے ملاقات ہو گی۔" رشید اپنی جگہ سے اُٹھ گیا تھا۔

ہ

"شناء نے نُدرت کو اِس بات کے لئے منع کر دیا تھا کہ جُمن کو اختر سے نہ بھڑائے۔ اِس میں اُس کی بدنامی بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اتفاق سے نُدرت کو جُمن سے ملاقات کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ جب کہ جُمن آتشِ رقابت میں جُھلس رہا تھا۔ نُدرت نے اُسے جو کچھ بتایا تھا سمندر کے کنارے جُمن اُسے برداشت نہیں کر سکا تھا۔ ابھی تک اُسے اختر سے کسی تنہا جگہ ملاقات کا موقعہ نہیں ملا تھا لیکن جہاں بھی اختر اُس کی نظر پڑتا۔ جُمن کی آنکھوں میں نفرت کے آثار اُبھر آتے تھے اور وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتا رہتا تھا عموماً جُمن کہتا تھا۔

"بیٹے جُمن ہے میرا نام، میری محبت پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتے۔ میں تمھیں فنا کے پانی میں دھکیل دُوں گا۔ ابھی جُمن کو جانتے نہیں ہو۔" اِسی طرح کی مختلف باتیں آہستہ آہستہ کہہ کر وہ اپنے دِل کی بھڑاس کم کر لیتا تھا لیکن آج اتفاقیہ طور پر اُس وقت جب اختر پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ جُمن کا اُس سے سامنا ہو گیا اور جُمن اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ اختر سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"جی فرمائیے۔"

"جُمن ہے اپنا نام۔"

"جمعہ کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔"

"کیا...؟" جُمن اُسے گھورتا ہُوا بولا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ بہرطور آپ جُمن ہیں۔"

"ہاں جی جُمن ہُوں اور کالے ناگ سے زیادہ خطرناک ہُوں۔"

"اچھا! مگر رنگ تو آپ کا اچھا خاصا ہے۔"

"رنگ سے کیا ہوتا ہے۔ مجھ سے دُشمنی تمھیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"اوہ! میں... میں مہنگی چیزوں سے بچتا ہُوں چنانچہ آپ سے دُشمنی مول لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ویسے آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہو گئی کہ میں آپ سے دُشمنی چاہتا ہُوں جُمن صاحب۔"

"باتوں میں اُڑانے کی کوشش مت کرو۔ ہم نے بھی بہت عرصے کبوتر بازی کی ہے۔"

"اَماں واللہ کیا واقعی؟ لقہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"کس کے بارے میں؟"

"کبوتر کی ایک قسم ہوتی ہے۔"

"قسم اللہ کی کبوتر و بوتر کی بات نہیں کرنے آئے ہم آپ سے۔ ہم سے دُشمنی چھوڑ دو بھائی صاحب، ورنہ بُرا حشر ہو جائے گا۔ باورچی ہیں ہم یہاں۔ پیٹ کا ستیاناس مار کر رکھ دیں گے۔ ہر کھانے میں جمال گوٹا ہو گا۔"

"میاں تم تو واقعی کلاسیکل آدمی ہو، مگر ہُوا کیا منطق کی رُو سے؟ ہمیں بتاؤ تو سہی۔"

"کک... کیا کہا منطق، گالی دے رہے ہو۔"

"اوہ! جُمن میاں کیا بات ہے؟ باورچی خانے میں گرمی زیادہ تھی کچھ۔"

"نہیں جی! باورچی خانہ تو بہت کُشادہ اور بڑی کھڑکیاں ہیں اُس میں۔ مگر آپ سمندر کے کنارے اللہ رکھی سے کیا کہہ رہے تھے۔"

"کس سے؟" اختر نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"بہت پُرانی چل رہی ہے ہماری اُس سے اور جیون میں میرا مطلب ہے زندگی میں پہلا عشق کیا ہے ہم نے۔ بڑے وظیفے کئے ہیں تب

پیاز کے چھلکے بھی ڈالے۔ سب کچھ کرلیا ہے بس یُوں سمجھیں اللہ نے چاہا تو بات بن جائے گی۔ مگر آپ بیچ میں کیوں کُود رہے ہیں"

"بھائی جمن! آپ باورچی ہیں نا اور آپ میرا پیٹ خراب کر دیں گے لیکن میرے خیال میں آپ کی یہ دُشمنی کسی غلط فہمی کی بُنیاد پر ہے۔ میں کسی اللہ رکھی کو نہیں جانتا۔ آپ کی اللہ رکھی آپ کو مُبارک، پتہ نہیں آپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہوگئی"

"باہر سے آئے ہو نا جی۔ ہمیں باتوں میں پَرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اللہ رکھی نے خود ہم سے کہا تھا اور وہ جُھوٹ نہیں بولتی۔ ہماری محبت پر ڈاکہ نہ ڈالو مہربان شاہ۔ دیکھو ہمیں بھی جینے دو، جینے دو ہمیں بھی۔ ورنہ تمھاری اور اپنی جان ایک کر ڈالیں گے۔ آئندہ اگر تم نے اللہ رکھی کو محبت بھری نظر سے دیکھا تو یہ سمجھ لو یا تو ہم خودکشی کرلیں گے یا تمھیں مار دیں گے"

"ارے ارے جمن میاں ایسا مت کرنا۔ ویسے ایک کام کرو، دوست ذرا مجھے اُس اللہ رکھی کی زیارت کرا دو۔ کیا اُس نے تم سے شکایت کی ہے"

"تو اور کیا؟ ہم پاگل تو نہیں ہیں۔ اللہ رکھی کہہ رہی تھی کہ اپنی محبت کی حفاظت کرو۔ اور ہم اپنے عشق کی حفاظت کریں گے۔ تیر و تلوار جو بھی چلانی پڑی چلالیں گے تم ہم سے ڈبل لڑلو۔ کیا سمجھے؟"

"کیا لڑلوں بھائی صاحب؟" اختر نے متعجبانہ انداز میں کہا۔

"ڈبل... ڈبل۔ ایک پستول تمھاری ٹانگوں میں ہو ایک ہماری ٹانگوں میں"

"پستول ٹانگوں میں؟"

"ارے ہاں وہی جو کمر سے لٹکا ہوتا ہے۔ دیواز پاٹا کی طرح یا پھر وگر ینگو گر ینگو"

"اچھا، اچھا، آپ ڈوئل لڑنے کے لئے کہہ رہے ہیں مجھ سے"

"ڈوئل کہہ لو یا ڈبل کہہ لو، بات تو ایک ہی ہوتی ہے نا، ہمیں انگریزی وِنگریزی نہیں آتی۔ باورچی ہیں ہم تو"

"تو پھر حضور باورچی خانے جائیے۔ مجھ سے ڈبل لڑ کر کیا کرینگے آپ اور پھر پستول آپ کے بس کی بات نہیں اگر آپ واقعی ڈبل لڑ کر کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو دو کفگیر لے کر میدان میں آجائیے۔ چمٹوں سے بھی کام چل سکتا ہے"

"اُڑا لیجئے آپ ہمارا مذاق۔ کچھ بھی کرلیجئے، آپ بڑے آدمی ہیں بابو جی مگر ہم چھوٹے آدمیوں کو بھی جینے کا حق ہے وہ جو کہتے ہیں نا کہ پھونکوں سے یہ چراغ نہیں بجھ سکتا"

"بھائی میری سمجھ میں شروع ہی سے کچھ نہیں آیا" اختر نے کہا۔

اور دفعتاً جمن کو اپنے عقب میں بطخ کی سی آواز سُنائی دی چخ چخ، وہ چونک کر اپنے پیروں کے پاس دیکھنے لگا لیکن پلٹا تھا کہ دفعتاً کوئی کُتا زور سے بھونکا اور یُوں محسوس ہُوا جیسے اُس سے لپٹ جائے گا۔ جمن اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"کیا ہوگیا جمن میاں، کیا ہوگیا؟"

"کک... کُتا... بطخ"

"سُبحان اللہ.. سُبحان اللہ۔ بلّی اور چُوہے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" اختر نے کہا۔ اُس وقت دُور سے جمن کی ماں کی آواز سُنائی دی۔

"جمن ارے او جمن اِدھر آ کمبخت مارے کیا کر رہا ہے دو گھنٹے سے اِنتظار کر رہی ہُوں تیرا"

"آرہا ہُوں اماں آرہا ہُوں" جمن نے ہاتھ اُٹھا کر کہا اور پھر اختر کی طرف سینہ تان کر بولا "سمجھ لینا جی.."

"سمجھ لیں گے بھائی سمجھ لیں گے۔ مگر بات سُنو ایک دفعہ لڑکی کی صُورت تو دیکھا دو۔ ہم نے غلط فہمی میں ایسا کیا ہو۔ اگر تمھاری اللہ رکھی تم سے محبت کرتی ہے تو ہم قسم کھاتے ہیں کہ کبھی نگاہ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں" جمن اختر کی صُورت دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

"وعدہ کرتے ہو جی"

"بالکل وعدہ جمن۔ کب دِکھا رہے ہو اللہ رکھی کو؟"

"تین نمبر میں تو رہتی ہے۔ ہمارے گھر کے بالکل برابر بابو جی ہم تمھارا بڑا احسان سمجھیں گے"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ پہلے اُس سے ملاقات کرادو، ایک بار اُس کے بعد میں تمھیں مطمئن کر دُوں گا" اختر نے کہا اور جمن شکریہ ادا کرکے واپس چلا گیا۔ اختر مضحکہ خیز نگاہوں سے جمن کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا لیکن وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ پائین باغ کے اُس گوشے میں جہاں وہ چہل قدمی کر رہا ہے رَدا بھی موجود ہے۔ اُس نے بے اختیار ہنسی کی آواز سُنی تو چونک کر پلٹا۔ رَدا بے تحاشہ ہنس رہی تھی اِس سے پہلے غالباً کوٹھی کے کسی فرد نے اُسے اِس طرح ہنستے ہُوئے نہیں دیکھا تھا۔ اختر کمر پر ہاتھ رکھ کر اُس کی صُورت دیکھنے لگا اور پھر خود بھی اُسی طرف چل پڑا۔ جہاں رَدا موجود تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے مہندی کی ایک باڑ کو عبُور کرنا ضروری تھا۔

"ہُوں! تو یہ آپ کی کارستانی ہے سِسٹر"

"نہیں اختر نہیں، پلیز! یقین کرو میں نے تو ابھی یہ باتیں سُنی ہیں"

"مگر یہ اللہ رکھی کون صاحبہ ہیں؟"

"نُدرت کو نہیں جانتے؟"

"افسوس نہیں جانتا"

"ارے وہ جو ثناء کے ساتھ گھومتا نظر آتی ہے"

"او ہو، او ہو، وہ اللہ رکھی ہیں"

"ہاں، بہت ہی تیز ہے وہ۔ بے حد شریر۔ یہ ثناء اور نُدرت جو ہیں نا اُن کا کام ہی دِن رات شرارتیں کرنا ہے۔ نُدرت آفت کی پرکالا ہے تو ثناء اُس کی اُستاد۔ دونوں ہی کوئی نہ کوئی ترکیب سوچتی رہتی ہیں کوئی نہ کوئی حرکت کرتی رہتی ہیں"

"مگر یہ جمن نُدرت پر قابض کیسے ہوگیا؟"

"بس اُس کی شرارت، پتہ نہیں اُس بے چارے کو کیا کیا بنا دیا ہے اُس نے خواہ مخواہ غلط فہمیوں کا شکار ہوگیا ہے۔ نُدرت چٹکیوں میں اُڑاتی رہتی ہے اُسے۔ بس بے وقوف بنا رہی ہے۔ شرارت اور صرف شرارت"

"لیکن سِسٹر یہ سب کچھ تو ٹھیک نہیں ہے غریب ملازم ہے بے چارہ، اگر واقعی سنجیدہ ہوگیا تو کیا ہوگا"

"سمجھاتی ہُوں اُن دونوں بے وقوفوں کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ اب دیکھو نا مجھے گُونگا ہی بنا دیا۔ خواہ مخواہ مجھے بھی خاموش ہونا پڑا تھا"

"چلئے اللہ نے آپ کو تو زبان دے دی لیکن یہ نُدرت صاحبہ ثناء کا تو خیر مسئلہ ہی دُوسرا ہے میں آپ کو بتا چُکا ہُوں کہ اپنی بھابی ہے جو کچھ بھی کرے گی چل جائے گا۔ لیکن یہ محترمہ نُدرت۔ ٹھیک ہے اِن کی شرارتوں پر ذرا گہری نگاہ رکھنی پڑے گی"

"کم تو تم بھی نہیں ہو اختر۔ خالد میرا خیال ہے تمھاری نِسبت سنجیدہ ہیں"

"منطق سے گھبراتے ہیں۔ حالانکہ منطق کی رُو سے ہنسی اِنسان کے تمام اعضاء کے لئے اوور ہالنگ کا کام دیتی ہے۔ آپ ذرا ہنس کر دیکھئے، اوہو بلکہ آپ تو اُس وقت تو بے تحاشہ ہنس رہی تھیں۔ آپ دیکھئے آپ کو اپنی جسمانی کیفیت میں کس قدر تبدیلی محسوس ہوتی ہے"

"اچھا بھئی چل رہی ہُوں۔ ثناء اور نُدرت نے مجھے تم سے باتیں کرتے ہُوئے دیکھ لیا تو سوچیں گی کہ پتہ نہیں میں تمھارے ساتھ کیا سازش کر رہی ہُوں"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے سِسٹر، آپ جائیے۔ میں ذرا اُس اللہ رکھی کو دیکھوں گا" اختر نے کہا اور رَدا مُسکراتی ہُوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

توقیر صاحب کا فون شہاب صاحب نے ریسیو کیا تھا "شہاب میاں رَدا تو خیریت سے ہے؟"

"جی ہاں۔ ٹھیک ہیں کوئی خاص بات انکل؟"

"بُلا دو ذرا" توقیر صاحب نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فون پر آگئی۔

"ہیلو سَر! خیریت؟"

"بالکل نہیں رَدا، اگر طبیعت ٹھیک ہے تو بس تھوڑی دیر کیلئے آجاؤ۔ تم نے اِس طرح میری باگ ڈور سنبھالی ہے کہ میں کسی کام کا نہیں رہا۔ تمھارے بغیر کچھ کر ہی نہیں پاتا۔ کئی ایسے کام ہیں جو تمھارے بغیر بُری طرح اٹکے ہُوئے ہیں"

"حاضر ہو رہی ہُوں سَر ابھی پہنچ جاتی ہُوں"

"بہت بہت شکریہ" توقیر صاحب نے کہا اور فون بند کر دیا رَدا خاموشی سے واپس پلٹ پڑی تھی۔ شہاب صاحب اُس دوران وہیں موجود رہے تھے لیکن رَدا نے اِتنا موقعہ نہیں دیا کہ وہ اُس سے کوئی سوال کرتے۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آئی اور تیار ہو کر باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک رکشہ میں بیٹھی توقیر صاحب کی طرف جا رہی تھی۔

توقیر صاحب دفتر ہی میں موجود تھے... انھوں نے رَدا کا استقبال کیا اور اُسے دیکھتے ہُوئے بولے۔

"صُورت سے واقعی بیمار لگتی ہو۔ کیا طبیعت خراب ہوگئی؟"

"بس سَر، کچھ تھکن سی محسوس کر رہی تھی"

"سوری رَدا! لیکن یہ دو تین فائل ایسے ہیں جن میں تمھاری راہنمائی کے بغیر میں خود بھی کام آگے نہیں بڑھا سکتا۔ بس تھوڑی دیر پلیز، اُس کے بعد تم چاہو تو چلی جانا"

"نہیں سَر! اب میں بالکل ٹھیک ہُوں" رَدا نے کہا اور پھر وہ توقیر صاحب کے ساتھ اُن فائلوں پر مصرُوف ہوگئی۔

وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔ فائلوں کے مُعاملات کچھ ایسے ہی تھے کہ رَدا کو اُن کے سلسلے میں کام کرنا پڑا اور پھر جب توقیر صاحب کی نگاہ گھڑی پر پہنچی تو پانچ بجنے میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔ وہ بُری طرح چونک پڑے۔

"رَدا تمھاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟"

"جی!" رَدا نے چونک کر کہا۔

"گھڑی دیکھو بھئی"

"اوہ پونے پانچ بج رہے ہیں۔ بلکہ صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں"

"کمال ہے! میں نے وقت کو اِتنی تیزی سے گزرتے ہُوئے کبھی نہیں دیکھا۔ بھئی معاف کرنا۔ تم بھی سوچو گی کہ کیا عجیب آدمی ہے۔ اپنے مقصد کے لئے پُورا دِن گزار دیا"

"نہیں سر۔ میں آگئی تھی تو اب کام مکمل کئے بغیر تو واپسی ممکن نہیں تھی۔ لیکن کیا آپ اِن کا غذات کی تیاری سے مطمئن ہیں؟"

"مطمئن ہُوں یا یُوں کہو کہ تم نے میری بہت بڑی مشکل حل کردی ہے۔ اب اِس کے بعد اگر تم چاہو تو مزید چار دِن میری طرف سے آرام کر سکتی ہو۔ ہاں اگر ایسی کوئی ضرورت ہُوئی تو تمھیں تکلیف دے دُوں گا۔"

"نہیں سَر۔ میرا خیال ہے میں کل سے دفتر آہی جاتی ہُوں۔"

"نہیں نہیں بھئی۔ کم از کم چار دِن کی چھُٹی لازمی اور ضروری ہے" توقیر صاحب نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور اُس کے بعد رَدا وہاں سے نکل آئی۔ باہر نِکل کر چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ عقب سے کسی نے پکارا۔

"رَدا" پلٹ کر دیکھا تو ساری جان سے لرز گئی۔ ثاقب ہی تھا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے ثاقب کو دیکھنے لگی۔ اِن نگاہوں میں نہ نفرت تھی نہ محبت کوئی جذبہ نہیں تھا بس ایک عجیب سی کیفیت تھی ثاقب آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"رَدا! مجھ سے تھوڑی دیر بات چیت بھی نہیں کروگی؟" رَدا نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"کیا میں اِس قابل ہُوں کہ مجھ سے صرف سڑکوں پر ہی مِلو۔"

"تو پھر کوئی مکان ہے آپ کا کوئی جگہ ہے آپ کے پاس جہاں میں آپ سے مِلوں؟" رَدا نے سوال کیا۔

"نہیں رَدا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ آؤ تو سہی میرے ساتھ کہیں۔۔۔ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے تھوڑی دیر۔ براہِ کرم تھوڑی دیر" رَدا نے کلائی پر بندھی ہُوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ اگر وہ ثاقب کے ساتھ تھوڑی بہت دیر گزار دیتی تو اُسے دیر ہو سکتی تھی۔ بہر طور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ چند لمحات کے بعد اُس نے اُلجھے ہُوئے انداز میں کہا۔

"میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ معذرت خواہ ہُوں۔"

"رَدا! میں وہاں بھی آسکتا ہُوں جہاں تم رہتی ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم کسی کی اُنگلیوں کے اِشاروں کا نِشانہ بنو۔ بہتر یہ نہیں ہوگا کہ مجھ سے کہیں کسی بھی جگہ تھوڑی دیر گفتگو کرلو۔"

"آئیے" رَدا نے جھٹکے دار آواز میں کہا اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ثاقب اُس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا کافی دُور نِکلنے کے بعد ایک ذرا ڈھنگ کا ریستوران نظر آیا۔ جہاں تھوڑی بہت دیر بات کی جا سکتی تھی۔ رَدا اِن چیزوں کی عادی نہیں تھی لیکن ثاقب نے اُسے مجبور کردیا تھا چنانچہ وہ ریستوران کی ایک میز پر آبیٹھے رَدا کے چہرے پر بے حد پریشانی کے آثار تھے۔ ثاقب نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب یہاں بیٹھے ہیں تو کچھ پینا بھی پڑے گا میری طرف سے سہی۔"

"ہُوں، بہتر" رَدا بولی اور ثاقب نے کولڈ ڈرنک منگوالی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اَلسَر کا مریض ہو گیا ہُوں شدید اَلسَر کا۔ سخت بیمار ہُوں اور اپنی اِس بیماری کے لئے مجھے۔۔"

"رقم درکار ہوگی۔ یہی نا۔۔"

"ہاں مجبُوری ہے رَدا انتہائی مجبُوری ہے۔"

"یہ مجبُوری آپ نے خود پر خود ہی مُسلّط کی ہے۔ مجھے تو تعجب ہے کہ شراب نے ابھی تک آپ کے پھیپھڑے سالم کیوں رہنے دیئے۔ سانس کیسے لیتے ہیں آپ، صرف اَلسَر کے مریض ہُوئے ہیں آپ۔ میں کہتی ہُوں اگر آپ اپنا میڈیکل چیک اَپ کرائیں تو شاید آپ کا دِل آپ کے پھیپھڑے کوئی چیز سلامت نہیں ہوگی۔"

"اب جو کچھ بھی ہے رَدا، زندگی کے اِس بوجھ کو گھسیٹ رہا ہُوں تو کچھ ضرورتیں بھی ہوتی ہیں اور تم جانتی ہو کہ مجھ جیسا شخص اب کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہے۔ دراصل رَدا مجھے اِس بات کی اُمید نہیں تھی کہ تم کراچی میں مِل جاؤگی۔ تصوّر بھی نہیں کیا تھا میں نے۔ میں تو بس نہ جانے کِس کِس طرح یہاں تک پہنچا تھا لیکن یہاں میں قطعی طور پہ بے سہارا ہُوں اور شاید یہ میری تقدیر ہی ہے کہ مجھے تمھارا سہارا مِل گیا۔"

"آپ سے صرف ایک عرض کرنا چاہتی ہُوں وہ یہ کہ مشکل تمام انتہائی مشکل حالات میں مَیں نے اپنے لئے ایک ٹھکانہ بنایا ہے۔ میری آپ کی دُشمنی جو کچھ بھی ہو لیکن کم از کم میرا یہ ٹھکانہ تو برقرار رہنے دیجئے۔ کیا آپ کو زندگی کے کسی حصّے میں کسی ہستی پر رحم نہیں آیا؟"

"نہیں رَدا ایسی باتیں نہ کرو درحقیقت ایک بے بس انسان سے تو ویسے بھی ہمدردی کی جاتی ہے۔ میں قطعی طور پر تم سے وہ ٹھکانہ چھیننا نہیں چاہتا۔ حالانکہ میری مُلاقات شہاب صاحب سے اور رشید صاحب سے ہو چکی ہے۔ اُنھوں نے مجھ سے تمھارے بارے میں پُوچھنے کی انتہائی کوشش کی لیکن رَدا میں نے زبان نہیں کھولی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم نے اُنھیں اپنے بارے میں کیا بتایا تھا اِس لئے میں نے اُنھیں چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ بہت چالاک لوگ ہیں اور جہاں تک میرا اندازہ ہے دوبارہ بھی مجھ سے مِلنے کی کوشش کریں گے تمھاری کوٹھی پہنچا تو یقیناً اُن لوگوں سے بھی مُلاقات ہوگی۔ ویسے رَدا سکوُن سے تو گزار رہی ہو مجھے سب

کچھ پتہ چل گیا ہے۔ تم صرف اپنی اَنا کی تسکین کے لئے مُلازمت کر رہی ہو ورنہ وہ لوگ تمھاری کِفالت کرنے کے لئے تیار ہیں بھئی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جہاں رہو خوش رہو لیکن دوسروں کی خُوشیوں پر بھی نِگاہ رکھا کرو۔ میرا تمھارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے رَدا، بتاؤ میں کیسے زندگی گُزاروں گا؟"

"آپ کو کتنی رقم درکار ہے؟"

"فی الحال جتنی بھی ہو کام چل جائے گا۔ سوچتا ہُوں کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے رُجوع کروں۔ ممکن ہے میرے اَلسَر کا علاج ہو جائے۔ باقی اگر کچھ اور بیماریاں بھی ہیں میرے بدن میں تو ظاہر ہے کہ سب کی سب تو ٹھیک نہیں ہو سکتیں لیکن سینے کی اِس جلن نے مجھے زندگی سے بے زار کر رکھا ہے۔ رَدا فی الحال دس پانچ ہزار ہی مِل جائیں۔"

"جی نہیں، معافی چاہتی ہُوں۔ دس پانچ ہزار میں آپ کو کہیں سے بھی نہیں دے سکتی۔"

"تو پھر جِتنا بھی ممکن ہو۔"

"آج تو میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکوں گی۔ کل اِسی وقت اِسی جگہ مِل جائیے میں کچھ رقم آپ کو دے دُوں گی۔"

"بہت بہت شُکریہ رَدا، فی الحال میرے پاس سو ڈیڑھ سو روپے پڑے ہُوئے ہیں دو ایک دِن گزار لُوں گا۔ لیکن اگر تم نے کل رقم نہ دی تو مجبُوراً مجھے تمھارے پاس آنا پڑے گا۔ مجبُوراً مجھے اُن لوگوں سے مدد مانگنی پڑے گی جو تمھاری کِفالت کر رہے ہیں بڑے اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں بے چارے ورنہ اِس دُنیا میں کون کسی کو اِتنی اِمداد دیتا ہے۔ تو پھر رَدا" لیکن رَدا نے پُوری بات نہیں سُنی تھی۔ وہ تیزی سے اُٹھی۔ بِل کی رقم میز پر پٹکی اور باہر نِکل آئی۔ اُس کے بدن پر تھرتھری سی طاری تھی۔ جو کچھ ثاقب نے کہا تھا وہ توقع سے کہیں زیادہ تھا اُس کے لئے!

بہر طور تھوڑی دیر کے بعد اُسے رکشہ مِل گئی۔ اور وہ رکشہ میں بیٹھ کر چل پڑی لیکن سَر چکرا رہا تھا۔ بُری طرح پریشان تھی۔ اِس انکشاف نے اُسے بو کھلا کر دیا تھا کہ ثاقب کی مُلاقات شہاب صاحب اور رشید سے ہو گئی ہے۔ اُن دونوں ہی کے بارے میں رَدا کے خیالات اچھے نہیں تھے بلکہ اِس عمارت میں جہاں وہ رہ رہی تھی اُن دونوں کے علاوہ اُسے اور کوئی دُشمن نظر نہیں آتا تھا۔ شہاب صاحب، رشید۔۔۔ رشید، شہاب صاحب! اُس کو چکر آتے رہے اور رکشہ کا سفر جاری رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ احسان صاحب کی کوٹھی کے سامنے رُک گئی۔ رکشہ کا کرایہ ادا کیا اور اندر چل پڑی۔ خوش قسمتی تھی کہ کوئی راستے میں نہیں مِلا اِس وقت، وہ اپنے کمرے میں جا کر آنکھیں بند کرکے لیٹ جانا چاہتی تھی اور اِس میں اُسے کوئی دِقت نہیں ہُوئی۔ دروازہ بند کیا اور دھم سے مسہری پر گِر پڑی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ بہت پریشان تھی وہ بے حد پریشان! پریشان تو وہ اُسی دِن سے تھی جس دِن ثاقب کی صُورت نظر آئی تھی۔ اور بدبخت رشید نے اُسے گفتگو کرتے ہُوئے دیکھ لیا تھا۔ پکنک پر رشید نے اِس کا اظہار کرکے رَدا کو زندہ درگور کر دیا تھا۔

حالانکہ دفتر سے مُستقل چھُٹی کرنے کا ارادہ نہیں تھا مگر ثاقب سے مُلاقات کے بعد وہ کچھ ذہنی طور پر پریشان ہوگئی تھی کہ ایک آدھ دِن آرام کرنا چاہتی تھی لیکن رشید کی اِس بکواس کے بعد اُس کی کیفیت مزید خراب ہوگئی تھی اور وہ اپنے آپ کو دفتر جانے کے قابل نہیں پا رہی تھی۔ ایک آدھ دِن اُس نے اِسی طرح گزارا۔ اُس رات خیر دین سے مُلاقات ہُوئی اور خیر دین اُس کے ذہن پر ایک نیا چرکا لگا کر چلا گیا۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ بڑا مشکل تھا اُسے کسی کے سِلسلے میں فیصلہ کرنا۔ زندگی میں دفعتاً ہی بہت سی تبدیلیاں رُونما ہُوئی تھیں۔ اختر، جس نے اُسے بہن بنایا تھا۔ رشید جو بلاوجہ اُس کی جان کا دُشمن بن گیا تھا اور پھر ثاقب۔۔۔ ثاقب اور اُن سب کے بعد خیر دین جو اپنی شخصیت سے بالکل مختلف نظر آیا تھا۔ بھلا رَدا بے چاری میں اِتنی ہمّت کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ خیر دین کی اُس نئی شخصیت کے بارے میں کسی کو بتاتی یا کسی سے کچھ کہتی وہ تو اپنے ہی مصائب کا شکار تھی۔ ڈھیٹ بننے کی کوشش کی تھی۔ خود کو اِن حالات سے پریشان ہونے سے بچانے کے لئے اُس نے کوٹھی کے دوسرے معاملات میں دِلچسپی لینی شروع کی تھی اور پچھلی شام اختر اور رحمن کی گفتگو سُن کر بھی اُسے بے اختیار ہنسی آگئی تھی۔ ہنسنے سے واقعی طبیعت میں ذرا سی شگفتگی پیدا ہوگئی تھی لیکن اِس کو کیا کرتی کہ تقدیر اُسے مُسکراتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اِس وقت تو دِل کچھ زیادہ ہی گھبرا گیا تھا۔ کیا کرے۔ کِس سے کہے۔ سب ہمدرد تھے محبت کرنے والے تھے لیکن جو کچھ اُس کی زندگی سے وابستہ تھا اُس میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔۔۔ تب اُس کے کانوں میں ایک جُملہ گُونجا: ہر انسان کو زندگی میں ایک دوست کی ضرورت ہوتی ہے کیا تم دُنیا میں کسی پر بھروسہ کر سکتی ہو؟ یہ الفاظ اِس تاریکی میں روشنی کی مانند تھے اور پھر آہستہ آہستہ یہ روشنی اُس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ اُس کے ہونٹوں سے آہستہ سے نِکلا۔

"خیر دین... خیر دین تم! کیا یہ سب کچھ میری ہی تقدیر میں لکھا گیا ہے۔ ہر شخص میرے سامنے ایک نئی شکل میں آتا ہے۔ ہر شخص لا کیا تم قابلِ بھروسہ ہو خیر دین؟ ذہنی قوتیں ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ چاروں طرف گھور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اِس تاریکی میں خیر دین کے نام سے روشنی کھلی تھی۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ خیر دین سب کے لئے ایک نامعلوم دیہاتی تھا لیکن رَدا اُس کا ایک انوکھا رُوپ دیکھ چکی تھی۔ کبھی نہ دیکھ پاتی اگر خیر دین خود ہی اپنے آپ کو ظاہر نہ کر دیتا۔ پُوری کوٹھی میں اُس نے صرف رَدا کو ہی اِس قابل دیکھا تھا۔

*

سکون کہاں تھا۔ شناء تیمور کو لے کر آگئی تھی۔ رَدا نے نہ جانے کس دِل سے اُس کا استقبال کیا تھا۔

"ہیلو رَدا! تمھاری طبیعت تو واقعی خراب معلوم ہوتی ہے۔ کسی ڈاکٹر کو دِکھا دو نا۔"

"خدا خیر کرے۔ مجھے کیا ہو گیا؟" رَدا نے کہا۔

"کچھ ہو تو گیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم سے یہ بات چھپائی جاتی ہے۔ ایسے کیوں لیٹی ہوئی تھیں روشنی بھی نہیں کی۔"

"بس یُونہی تاریکی اچھی لگ رہی تھی۔"

"آؤ باہر چلو۔ مجھے یقین ہے کہ کسی صبح تمھارے کمرے سے تمھاری لاش ہی برآمد ہو گی گھٹتی رہو دِل میں، یہی حال ہو گا۔"

"خیر اب اتنی جلدی بھی نہیں مروں گی۔ چلو چائے پلواؤ۔" رَدا نے خود کو سنبھال لیا۔

باہر لان پر نُدرت بھی موجود تھی۔ آج وہ عِصمت کو بھی گھیر لائی تھی۔ "سُبحان اللہ آج تو ہمارے ہاں مہمان آئے ہُوئے ہیں۔" شناء نے عِصمت کو دیکھ کر کہا۔

"کیسی ہو شناء؟" عِصمت نے کہا۔

"مت پُوچھیں مُجھ سے۔ کبھی کبھی مِلنے والوں سے میں بات نہیں کرتی۔" رَدا نے شکایتی انداز میں کہا۔

"ہم کیا کریں۔ ہمیں بُلایا ہی کبھی کبھی جاتا ہے۔" عِصمت نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"اِس میں کسی کا قصُور نہیں۔ آپ خود ہی الگ الگ رہتی ہیں۔"

"عِصمت باجی تم لوگوں کی طرح بے کار تو ہیں نہیں کہ تمھارے ساتھ ہنگاموں میں حصّہ لیتی رہیں۔ بلاوجہ تم اُن کی گرِفت کر رہی ہو۔" رَدا نے اِس موقع پر عِصمت کی مدد کی اور شناء اُسے گھورنے لگی۔

"جی ہاں! ایک آپ مصرُوف ہیں اور دوسری عِصمت باجی۔ آپ پیٹ کے چکّر میں پڑی ہُوئی ہیں۔ کمائیں گی نہیں تو کھائیں گی کیا اور عِصمت باجی تعلیم مکمل کر رہی ہیں تاکہ شادی ہونے کے بعد ملازمت کر کے شوہر کو اطمینان سے بٹھا کر کھلائیں۔" شناء نے کہا اور سب ہنس پڑے۔

"آئیڈیا تو بُرا نہیں شناء اگر شوہر کو گھر میں بٹھا کر کھلایا جائے تو شوہر بھی پاؤں دھو دھو کر پئے گا۔ ویسے صدیوں سے چلنے والی یہ ریت بدلنی ہی چاہیئے۔ عورت کے نام کے ساتھ گھر کی چہار دیواری کا تصوّر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ ہر چیز میں تغیّر پیدا ہو رہا ہے ہر اقدار میں تبدیلی لائی جا رہی ہے تو پھر اب زمانہ اپنی روش بدل کیوں نہ دے۔ عورتوں کو وہ مقام حاصِل ہو جائے جو مردوں کو ہے مرد غیرت مند باحیا، باشرم ہو جائیں گھروں میں بیٹھیں، صفائی کریں، کھانا پکائیں بیوی کا انتظار کریں وہ آئے تو چائے بنا کر دیں۔ وہ تمام کام کریں جو آج تک عورتوں پر لاگو رکھے گئے ہیں اور عورتیں باہر نِکل کر کمائیں اِس طرح عورتوں کی زندگی میں تبدیلی بھی پیدا ہو۔ اور ممکن ہے دُنیا کی حالت کچھ بہتر ہو جائے۔ اب تم دیکھو نا مرد زیادہ خطرناک ہوتا ہے دُنیا کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھالنے کے بعد اُس نے اپنی وحشی فِطرت کے تحت ہتھیاروں کی ایجاد پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی۔ اپنی اُس وحشی ذہانت سے کام لے کر اُس نے دُنیا کو تباہ کرنے کے لئے لاکھوں چیزیں ایجاد کر دیں جب کہ عورتیں اَمن کی علمبردار ہوتی ہیں وہ نہیں چاہتیں کہ دُنیا تباہی کے کنارے تک جائے سو واقعی اگر عورتوں کو یہ سب کچھ قوتیں مِل جاتیں جو مردوں کو حاصِل ہیں تو اِس دُنیا میں تخریب کاری نہ ہوتی بلکہ... بلکہ" شناء نے نُدرت کی بات کاٹ دی۔

"بس بس زیادہ بڑھ چڑھ کر مت بولو۔ اِس طرح بہت سے مسائل سامنے آتے جو تم عورتوں کے حل کرنے سے حل نہیں ہوتے۔"

"خُوب! بھئی دلچسپ مباحثہ ہے۔ مجھے تو یُوں لگ رہا ہے۔ جیسے اب تک میں نے آپ لوگوں میں شریک نہ ہو کر غلطی کی ہے۔" عِصمت نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"عِصمت باجی، آپ لوگ سُنا کریں اِن کی باتیں۔ بڑا وقت ہے اِن لوگوں کے پاس فضُول باتیں کرنے کے لئے۔ کام کی ایک بھی نہیں ہے۔" رَدا نے کہا۔

"ہاں ہاں بس کام کی صرف رَدا صاحبہ ہیں۔ دیکھو نا برسرِ روزگار ہیں اور ہم سب... ٹھیک ہے جو کچھ نہ کہیں کم ہے۔" شناء بس رَدا کی نوکری کے پیچھے پڑی رہتی تھی۔

کافی دلچسپ گفتگو رہی۔ مختلف موضوعات زیرِ بحث آئے اور اُس کے بعد وہ سب وہاں سے اُٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے رَدا کی

طبیعت بہل گئی تھی۔ لیکن اُن سب سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو پھر وہی ہَول سوار ہو گیا۔ ثاقِب نے جو دھمکیاں دی تھیں۔ وہ بے حد خوفناک تھیں۔ اگر وہ اِس کوٹھی تک پہنچ گیا اور اُس نے یہاں اپنی بُری فِطرت کا مظاہرہ کیا تو پھر رَدا کے لئے خودکشی کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔ وہ رَدا کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ رقم کی طلبی اِس بات کی مظہر تھی۔ رَدا کے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے تھے لیکن ثاقِب کا پیٹ کس طرح بھرا جا سکتا ہے کوئی اور بندوبست ہونا ضروری ہے چنانچہ اُس نے آخری فیصلہ کیا کہ خیر دین سے اِس سِلسلے میں مشورہ کر لیا جائے۔ ممکن ہے وہ کسی طرح اُس کا مددگار ثابت ہو سکے۔ رَدا نے اِس سِلسلے میں بہت غور کیا تھا بالآخر وہ خیر دین کی تلاش میں چل پڑی اور رات کے اِس حصّے میں خیر دین بھلا دادی امّاں کے کمرے کے علاوہ اور کہاں مِل سکتا تھا دادی امّاں کے پاؤں دبائے جا رہے تھے اور رہریالے طوطے کی کہانی سُنائی جا رہی تھی جسے اختر بھی بیٹھا بڑی دِلچسپی سے سُن رہا تھا۔ ذکیہ بیگم بھی تھیں اور عارفہ خالہ بھی۔ عارفہ خالہ کو خیر دین کی کہانی میں سب سے زیادہ مزہ آ رہا تھا۔ رَدا اندر داخل ہُوئی تو عارفہ خالہ نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"اَے خیر دین بیٹا ذرا یہ تو بتاؤ شہزادی گُل فِشاں کا کیا ہوا؟ وہ تو موئی جب سے قید ہوئی جنّات کے قبضے میں قید ہی ہے۔ وہ کیسے نِکلے گی؟"

"آپ نکال لائیں عارفہ خالہ۔" خیر دین نے کہا۔

"اَے لو بیٹا! میں کیسے نکال لاؤں۔ مجھے تو جِنوں سے ویسے ہی بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"تو پھر خاموش بیٹھئے جب وقت آئے گا گُل فِشاں خود ہی نِکل آئے گی۔" خیر دین نے بُرا مانتے ہُوئے کہا۔ دادی امّاں ہنس کر بولیں۔

"تم خیر دین کو کہانی کے درمیان ٹوکنے سے باز نہیں رہتیں عارفہ، اور خیر دین بار بار یہی احتجاج کرتا ہے کہ عارفہ خالہ کہانی پوری نہیں ہونے دیتیں۔"

سب رَدا کو دیکھ کر چونک پڑے تھے خیر دین کے ہاتھ دادی امّاں کے پاؤں پر رُک گئے۔ ایک لمحے کے لئے رَدا نے خیر دین کی صُورت دیکھی اور پھر ذکیہ بیگم کو سلام کیا اور دادی امّاں کے پاس آ بیٹھی۔

"آؤ بیٹی آؤ۔ آج ہمارے درمیان آنے کو کیسے دِل چاہ گیا۔"

"تھک گئی ہُوں دادی امّاں۔ ہر چیز سے تھک گئی ہُوں۔" رَدا نے ٹُوٹے ہُوئے لہجے میں کہا۔ ذکیہ بیگم گہری نِگاہوں سے رَدا کو دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔

"کیا بات ہے؟ کچھ طبیعت خراب تھی تمھاری۔ اب کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔" رَدا نے کہا۔

"پھر وہی بیگم صاحبہ، اَرے میں کہتی ہُوں اِتنے دِن کے بعد مِلتی ہو یہ بھی بھُول جاتی ہو کہ اِس سے پہلے کیا کہتی تھیں۔"

"معافی چاہتی ہُوں۔"

"یہ کیا کیا تم نے کہ تھک گئی ہُوں۔ بُری طرح تھک گئی ہُوں۔ کام سے تھک گئی ہو یا؟"

"نہیں نہیں! بس ایسے ہی یہ جُملہ مُنہ سے نِکل گیا تھا۔ اکیلے انسان کہاں تک رہ سکتا ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ کبھی کبھی بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو منع کس نے کیا ہے بیٹے۔ آ جایا کرو۔" دادی امّاں کہنے لگیں۔

"جی حاضر ہُوا کروں گی۔" رَدا نے کہا۔ پھر خیر دین سے بولی۔

"خیر دین تمھیں جس وقت فرصت ہو جائے میرے پاس آ جانا بازار سے کچھ چیزیں منگوانی ہیں۔"

"آ جائیں گے جی۔ جب آپ حُکم کرو گی۔ ابھی تو دادی امّاں کے پیر دبا رہے ہیں۔" خیر دین نے اپنے مخصُوص لہجے میں کہا۔ اور رَدا نے گردن ہلا دی۔

"اپنی کہانی تو اب بھاڑ چُولھے میں چلی ہی گئی۔ اب ہم کہانی نہیں سُنائیں گے۔"

"اَرے نہیں نہیں! اللہ کے واسطے گُل فِشاں کو تو جِنوں کے قبضے سے نکال لو" عارفہ خالہ بے چین ہو کر بولیں۔

"نِکال لیں گے جی جب فُرصت ہو گی ابھی ہمیں بہت سے کام ہیں۔" خیر دین بُرا ماننے والے انداز میں بولا۔

"معاف کرنا خیر دین، میں نے تمھاری کہانی میں مداخلت کی۔"

"ٹھیک ہے جی ٹھیک ہے آپ ہی کی کیا بات ہے سارے ہی لوگ کرتے رہتے ہیں وہ تو خیر دین ہی ایسے ہیں کہ کسی کی بات کا بُرا نہیں مانتے۔ اچھا دادی امّاں ہم جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا جیتے رہو۔" دادی امّاں نے کہا۔ اور خیر دین اُٹھ کر باہر نِکل گیا۔ رَدا تھوڑی دیر تک اُن لوگوں کے پاس بیٹھی اُن سے باتیں کرتی رہی۔ عارفہ خالہ کی طنز بھری باتیں مسلسل جاری تھیں۔ وہ فِطرتاً ہی ایسی تھیں کہ کسی سے سیدھے مُنہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ہاں اگر چھینٹے بازی کرنے کا موقع مِل جائے تو کبھی نہیں چوکتی تھیں۔ رَدا سے اُس کے بارے میں چند سوالات کئے۔ لیکن سارے کے سارے سوالات چُبھتے ہُوئے تھے۔ رَدا اُن کی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ چنانچہ بُرا مانے بغیر اُنھیں ایسے جواب دیئے کہ اُس کے بعد عارفہ خالہ نے کچھ نہ پُوچھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ

اجازت لے کر اُن کے کمرے سے چلی آئی تھی اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے تیز روشنی جلادی اور بیٹھ کر ایک کتاب کا مطالعہ کرنے لگی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ خیر دین نے دروازے پر دستک دی اور رُدا نے اُسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ خیر دین اندر آ گیا تھا۔ رُدا نے مُسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور چند لمحات خاموشی سے اُسی طرح اُسے دیکھتی رہی۔ خیر دین بھی خاموش کھڑا تھا۔

"لیجئے جی آپ کی ہدایت کے مطابق خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ حاضر ہیں کہئے آپ کو کیا منگوانا ہے بازار سے"

"خیر دین اگر میں تم سے کہوں کہ بیٹھ جاؤ تو بیٹھ جاؤ گے"

"کیوں نہیں بیٹھیں گے جی آخر اِدھر اُدھر بیٹھتے ہی ہیں" خیر دین نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رُدا ہنس پڑی تھی۔ خیر دین کی یہ حرکت اُسے پسند آئی تھی۔ اُس نے خیر دین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"انگریزی میں بات کرو مجھ سے" خیر دین نے چونک کر رُدا کی صورت دیکھی۔ پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور آہستہ سے بولا۔

"کیوں نوکری سے نکلوانے کی کوشش کر رہی ہیں رُدا بی بی"

"تو پھر تم کم از کم مجھ پر کیوں نہیں کُھل جاتے خیر دین۔ سب لوگوں کو تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے وہ ٹھیک ہے جب تم نے مجھ سے ایسی باتیں کی ہیں تو پھر کم از کم مجھے خود سے لاعلم نہ رکھو"

"لو جی اِس میں لاعلم رکھنے کی کیا بات ہے۔ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ اگر تھوڑی بہت انگریزی میں گٹ پٹ کر لیتے ہیں تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر آپ لوگوں کے ساتھ رہے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کی نوکری کی ہے ہم نے۔ تھوڑی بہت تو انگریزی آنی ہی چاہیئے اِس میں چھپانے کی کیا بات ہے"

"اور کسی فلسفی کے ساتھ بھی رہے ہو جس کی وجہ سے فلسفہ بولنا آ گیا ہے۔ کسی منطقی کے ساتھ بھی رہے ہو جس کی وجہ سے منطق سے بھی خاصی واقفیت ہو گئی ہے۔ کسی نفسیات داں کے ساتھ بھی رہے ہو جس کی وجہ سے ماہر نفسیات ہو گئے ہو"

"ارے ارے آپ تو ہم سے بھی زیادہ انگریزی جانتی ہیں رُدا بی بی" خیر دین نے کہا اور رُدا مسکرانے لگی۔

"خیر تمہارے آنے سے ذہن کو ایک فرحت کا احساس ہونے لگا ہے خیر دین، خاص طور سے اِس تصور کے ساتھ کہ تم نے مجھے باقی لوگوں سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ میں شاید تم سے بے تکلفی سے بول کر بعد میں شرمندگی ہی اُٹھاؤں پتہ نہیں تم کیا نکلو۔ لیکن بس میں اِس سلسلے میں قطعی قصور وار نہیں ہوں گی تم جو کچھ بھی اور جیسی شخصیت کے مالک ہو میں تو تمہیں صرف خیر دین ہی سمجھتی ہوں اور خیر دین اِس گھر کا ملازم نہیں بلکہ ایک انسان ہے جس نے مجھ سے چند ایسے الفاظ کہے ہیں جو میرے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں"

"کون سے الفاظ؟" خیر دین نے رُدا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے کہا تھا خیر دین کہ ہر انسان کو زندگی میں ایک دوست کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تم کسی انسان پر بھروسہ کر سکتی ہو؟"

"ہاں جی کہے تھے۔ یہ جملہ کسی سے سُنا تھا۔ شاید کسی فلم میں کسی وِلن نے ہیرو سے کہا تھا یا پھر ہیرو نے وِلن سے" خیر دین بولا۔

"اگر بھاگنا چاہتے ہو اپنے الفاظ سے تو رُدا میں اِتنی ہمت کہاں کہ کسی کو کسی کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکے"

"نہیں جی اِس جملے کا مطلب ہم نے بعد میں سمجھ لیا تھا اور اچھی طرح یاد کر لیا تھا اُسے اور پھر سوچا کہ کسی ایسی شخصیت سے یہ جملہ کہیں گے جو کسی پریشانی کا شکار ہو اور اُس سے کہیں گے کہ اپنی پریشانیاں ہمیں دے دے"

"خیر دین میں پریشان ہوں"

"تو پھر دے دو پریشانیاں ہمیں۔ ہم سب ٹھیک کر لیں گے" خیر دین نے مستانہ انداز میں کہا۔

"کیا تم سنجیدگی سے میری بات سُن رہے ہو؟"

"دیکھو جی خیر دین کے اندر ایک ہی خوبی ہے جو بھی سُنتا ہے سنجیدگی سے سُنتا ہے اور جس سے جو کچھ بھی کہتا ہے سنجیدگی سے کہتا ہے۔ بس ہم نے آپ سے کہہ دیا اگر آپ پریشان ہیں تو اپنی پریشانیاں ہمیں دے دیں ہم سب سنبھال لیں گے"

"اور تم مجھ سے اُن پریشانیوں کے سلسلے میں سوالات کرو گے خیر دین"

"مطلب جی! جو آپ بتائیں گی اُس کے بارے میں تو پوچھنا ہی پڑے گا"

"لیکن اُس کی گہرائیوں میں بھی اُترنے کی کوشش کرو گے"

"نہیں جی! زیادہ گہرائیوں سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ پاؤں پھسل گیا تو دھم سے نیچے جا گرے سر پھٹ گیا۔ ٹانگ ٹوٹ گئی نہیں جی ہم گہرائیوں میں نہیں اُتریں گے وعدہ" خیر دین نے کہا اور رُدا کو ہنسی آ گئی اِس شخص کے سلسلے میں صحیح فیصلہ کرنا دُنیا کا سب سے مشکل کام تھا بڑی جیتی ایسی کہ مذاق ہی مذاق میں سب کچھ کہہ جائے۔ عجیب سی شخصیت تھی لیکن رُدا کو اِس شخصیت کی گہرائیوں میں خود بھی نہیں جھانکنا تھا وہ خیر دین سے جلد از جلد اپنے دِل کا حال کہہ دینا چاہتی تھی ممکن ہے صحیح مشورہ دے سکے۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہارا انتخاب کیا ہے خیر دین میرا

شناء مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ ثمرت بھی مجھے چاہتی ہے۔ دوسرے لوگ بھی ایسے نہیں ہیں۔۔ میری کسی بات سے انحراف کریں۔ لیکن جس اُلجھن کا شکار میں ہوں اُسے میں اِن سب سے دُور رکھنا چاہتی ہوں۔ اور بہت سوچ سمجھنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ خیر دین کہ اِس کے لئے تمہارا سہارا لوں"

"شکریہ رُدا بی بی! آپ نے بہت اچھا کیا۔ ہم ظاہر ہے اِن میں سے نہیں ہیں بلکہ اِن سے الگ کی چیز ہیں چنانچہ ہم آپ کے جس طرح ہمدرد ہو سکتے ہیں دوسرے نہیں۔ آپ بے تکلفی سے کہہ دیجئے ممکن ہے آپ کے کہنے سے پہلے کوئی بھٹک کر اِس طرف نکل آئے بلکہ ذرا ایک منٹ رُکیئے۔ میں باہر کا جائزہ لے لوں" خیر دین نے کہا۔ اور اُٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے سے باہر جھانکنے کے بعد وہ دوبارہ اندر آ بیٹھا تھا پھر اُس نے رُدا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی کہیئے! ضرور کوئی ایسی ہی بات ہے جسے آپ راز میں رکھنا چاہتی ہیں"

"ہاں خیر دین! ایک شخص ہے جس کا نام ثاقب ہے میں جب دفتر جاتی ہوں تو وہ مجھے دفتر کے باہر فٹ پاتھ پر ملتا ہے ایک طرح سے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ میرا شناسا ہے خیر دین ایک ایسا شناسا جسے میں اپنی شناسائی سے الگ بھی نہیں قرار دے سکتی۔ کچھ ایسی اُلجھنیں ہیں میرے اور اُس کے درمیان جنھیں وہ مزید اُلجھا سکتا ہے اور مجھے پریشان کر سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بیمار ظاہر کر کے مجھ سے رقمیں بھی اینٹھنا چاہتا ہے۔ اور سب سے زیادہ پریشان کُن بات یہ ہے کہ وہ شہاب صاحب تک پہنچ گیا ہے۔ اُس نے شہاب صاحب کے ذریعے یہ بات معلوم کر لی ہے کہ میں یہاں رہتی ہوں اُس نے مجھے یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے اُس کی ضرورتیں پوری نہ کیں تو وہ اِس کوٹھی میں آ جائے گا۔ یہاں مجھے عزت ملی ہے خیر دین۔ اِن سب نے میرے بارے میں کچھ نظریات قائم کئے ہیں۔ یہ مجھے اچھا بھی کہتے ہیں اِن حالات میں میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں آ کر مجھے رُسوا کرے۔ میں اُس کی وجہ سے سخت پریشان ہوں خیر دین۔ اگر وہ یہاں تک پہنچ گیا تو کیا ہو گا؟ بڑی مشکل پیش آ جائے گی مجھے۔ بہت ہی مشکل۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں تک آئے"

"اوہ! لیکن رُدا بی بی۔ وہ آپ کو بلیک میل کس سلسلے میں کر رہا ہے؟"

"یہ سب کچھ میں کسی کو نہیں بتانا چاہتی"

"صرف ایک بات تو بتا دیجئے کیا اُس کے پاس آپ کے خلاف کوئی ایسا مواد موجود ہے جس سے وہ آپ کو بلیک میل کر سکتا ہے یا یہاں آ کر دوسرے لوگوں کو آپ کی حقیقت بتا سکتا ہے"

"ہاں، ہے"

"کیا تحریری شکل میں؟"

"نہیں" رُدا نے جواب دیا۔

"ہوں! لو جی یہ تو کوئی معاملہ ہی نہیں۔ آپ نے خیر دین سے کوئی بڑی بات کہی ہوتی بی بی جی" خیر دین کا لہجہ ایک دم پھر بدل گیا۔ اب تک وہ انتہائی شُستہ اور صاف بلکہ بدلے ہوئے لہجے میں رُدا سے سوالات کرتا رہا تھا لیکن ایک بار پھر خیر دین کے لہجے پر آ گیا تھا۔ رُدا تعجب سے اُسے دیکھتی رہی۔ خیر دین بولا۔

"ہاں جی! آپ نے بڑا اچھا کیا ہمیں بتا دیا پھر یہ اور بتا دیجئے ہمارا اُس کا تعارف کیسے ہو گا؟"

"ہوں، خیر دین! میں کل دو ہزار روپے اُسے دینا چاہتی ہوں یہ پیسے میں بینک سے نکال لوں گی شام کو وہ مجھے ملے گا اور میں یہ رقم اُس کے حوالے کر دوں گی۔ تمہیں اگر فرصت مِل سکے تو پانچ بجے وہاں آ جانا۔ میرا مطلب ہے میرے دفتر کے پاس۔ جس شخص کو میں رقم دوں گی اُسے دیکھ لینا۔ میں اُس کے خلاف کوئی ایسی کارروائی نہیں چاہتی خیر دین جو اُسے شدید نقصان پہنچا دے۔ بس میں چاہتی ہوں کہ وہ۔۔۔ وہ مجھے بلیک میل نہ کرے۔ وہ یہاں تک نہ پہنچے اِس کے لئے کوئی ترکیب بتاؤ۔ کوئی تجویز بتاؤ۔ کیا کرو گے تم اُس کا؟"

"بس جی اب یہ تو بعد ہی میں بتائیں گے آپ کو۔ پہلے تو کل ہمیں اُس کی شکل دِکھا دیجئے" خیر دین نے کہا اور رُدا اُسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُس نے خیر دین سے کہا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا خیر دین کہ میرے اور اُس کے درمیان کیا مسئلہ ہے؟ ایسی کون سی بات ہے" خیر دین نے مسکراتی نگاہوں سے رُدا کو دیکھا اور بولا۔

"بازار سے بھی کچھ منگانا ہے جی۔ اگر منگانا ہے تو بتایئے ورنہ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ"

"بس۔۔۔ بس بس، ضلع گوجرانوالہ" رُدا نے کہا اور ہنس پڑی۔ خیر دین عجیب سی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی رُدا نہ جانے اُسے کیسی لگی تھی۔ نہ جانے اُس نے اُس میں کیا دیکھا تھا۔ وہ چند لمحات اُسی طرح کھڑا رہا پھر رُدا نے کہا۔

"بس تو پھر کل پانچ بجے۔۔"

"ہاں جی۔ سلام وعلیکم!" خیر دین نے ہاتھ سَر کو لگا کر کہا۔ اور پھر دروازے سے باہر نکل آیا۔ نہ جانے کیوں رِدا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے سینے پر سے ایک سِل سی ہٹ گئی ہو۔ حالانکہ خیر دین کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اپنا راز نہ جانے کیوں اُس نے خیر دین کو سونپ دیا تھا۔ شاید یہ اُن الفاظ کی سچائی تھی جو خیر دین نے اُس سے ادا کئے تھے۔ یعنی انسان کو دُنیا میں ایک دوست کی ضرورت ضرور پیش آتی ہے۔ کیا تم مجھے اپنا دوست بنانا پسند کرو گی۔ اور رِدا نے شاید اُسے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ خیر دین کے صرف ایک ہی جُملے نے ثناء کی محبتوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ رِدا ثناء کو اپنا راز دار نہیں بنا سکی تھی یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اُسے ثناء کی فِطرت پر بھروسہ نہ ہو وہ کھلنڈری طبیعت کی مالک تھی۔ بھلا وہ اِس سلسلے میں کیا کر سکتی اور ویسے بھی ثناء اِس سلسلے میں خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ نہ جانے وہ اِس انکشاف پر کیا کر ڈالتی۔

☐

"احسان صاحب کی کوٹھی دِلچسپ لوگوں کا اکھاڑہ بنی ہُوئی تھی ہر شخص اپنی اپنی دُھن میں مست۔ ہر ایک کے اپنے اپنے مسائل لیکن ہر فرد خوش۔ کسی پر کوئی ایسا بوجھ نہیں تھا جس کی وجہ سے اُس کے چہرے پر افسردگی نظر آئے۔ رِدا کا معاملہ بس اتفاق ہی سے بگڑ گیا تھا ورنہ جب تک ثاقب اُس کی زندگی میں نہیں آیا تھا یا کم از کم یہاں نظر نہیں آیا تھا۔ رِدا بھی خوش تھی اور اپنے معاملات میں مصروف۔ خالد اور اختر یہاں آ کر یہاں کی دِلچسپیوں میں گُم ہو گئے تھے۔ خالد ذرا ریزرو آدمی تھا جب کہ اختر ہر وقت دِلچسپیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ اِس وقت بھی خالد کسی کام سے باہر گیا ہُوا تھا اور اختر کو آزادی تھی۔ وہ کوٹھی کے مختلف حصّوں میں چکراتا ہُوا نہ جانے کس طرح کچن کی طرف جا نِکلا۔ اور کچن کو محسوس کرتے ہوئے اُسے جمن یاد آیا۔ اللہ رکھی کا عاشقِ زار۔ وہ کچن میں داخل ہو گیا۔ جمن وہیں موجود تھا۔ وہ ہانڈی چلا رہا تھا۔ قدموں کی چاپ پر پلٹ کر اُس نے اختر کو دیکھا اور دوسرے لمحے اُچھل پڑا۔

"تم... آپ" اُس نے تعجب سے کہا۔

"ہاں جمن بھائی جس وقت سے تم نے وہ گفتگو کی ہے میں پریشان ہُوں تمھارے لئے۔ دراصل میں نے زندگی میں کبھی کسی کو دُشمن نہیں بنایا لیکن تم مُجھ سے ڈبل لڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور وہ بھی کسی اللہ رکھی کے لئے تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اللہ رکھی کی صُورت دِکھا دو گے۔ جانتے ہو میں نے تم سے یہ بات کیوں کہی تھی۔

"نہیں جانتے جی ہم" جمن نے کہا۔

"اِس لئے کہ اگر کبھی اتفاق سے میں غلط فہمی کی بنیاد پر بھی اللہ رکھی کو دیکھ کر مُسکرا دُوں گا تو تم بُرا مانو گے۔ مجھے ایک بار اُس کی صُورت دِکھا دو۔ وعدہ کرتا ہُوں کہ اُسے دیکھ کر مُسکراؤں گا بھی نہیں"

"کیا واقعی؟" جمن نے تعجب سے پُوچھا۔

"ہاں بھائی۔ اگر کسی نے تمھیں میری طرف سے بھڑکانے کی کوشش کی ہے تو اب تم ہی بتاؤ میں اِس سلسلے میں کیا کر سکتا ہُوں"

"مگر یہ بات ہم سے اللہ رکھی نے کہی تھی۔ اُس نے ہم سے فریاد کی تھی کہ اے دِلِ ناداں سنبھل تیری پتہ نہیں کیا"

"چلو کوئی بات نہیں۔ جو بات پتہ نہیں ہو اُس کے لئے پریشان ہونا مناسب نہیں ہوتا۔ تو اللہ رکھی نے تم سے اِس بارے میں کہا تھا"

"اگر وہ نہ کہتی کوئی اور کہتا تو ہم توجہ بھی نہیں دیتے"

"ٹھیک ہے، ہو سکتا ہے تمھاری اللہ رکھی کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو لیکن تم مجھے اُس کی صُورت تو دِکھا دینا"

"ارے وہ تم نے دیکھا نہیں ہے۔ تین نمبر میں رہتی ہے خوبصورت سی، نازک سی، لچک لچک کمر کمر، یُوں، یُوں" جمن نے ایک انگوٹھا کمر پر رکھتے ہُوئے لچکتے ہُوئے کہا۔

"اچھا یُوں، یُوں" اختر نے بھی اُسی کے انداز میں لچکنے کی کوشش کی۔

"بالکل یُوں، یُوں، مگر تم ایسا مت کرو کیونکہ اللہ رکھی اپنی ذاتی ملکیت ہے"

"تو بھائی میں تم سے کب تمھاری جائیداد چھین رہا ہُوں۔ بہرطور میرے سلسلے میں تم ہر بُرا خیال دِل سے نِکال دو۔ ارے ہاں یار ذرا یہ تو بتاؤ کہ اللہ رکھی سے تمھارا عشق کب جاری ہُوا"

"آہ، عشق نہ پُوچھے ذات۔ مم... میرا مطلب ہے۔ کہ وہ جو ٹائم ٹائم کی بات ہوتی ہے نا پتہ نہیں بس یُوں سمجھ لو جب سے پیدا ہُوا ہُوں اللہ رکھی سے عشق کر رہا ہُوں"

"اوہو، تو گویا یہ پیدائشی عشق ہے"

"جی ہاں جی ہاں بالکل، آپ کا کیا نام ہے بھائی صاحب"

"ارے تم مجھے نہیں جانتے، اختر ہے میرا نام"

"جی ہاں جانتا ہُوں جی جانتا ہُوں۔ مگر بس مالکوں کے نام کون پُوچھے ہے۔ تو اختر بھائی میں اِتنے عرصے سے اُس کا عاشق ہُوں اور ہمارے راستے میں کوئی پتھر نہیں آیا۔ کوئی چٹان سنگل سنگل، وہ جو کہتے ہیں نا سنگل للاخ"

"ہاں ہاں کہتے ہیں کہتے ہیں"

"وہ بھی نہیں آئی اور ہماری محبت کی گاڑی بڑی تیزی سے

روڈ پر دوڑ رہی تھی کہ تم درمیان میں آ گئے"

"کہاں آ گیا یار۔ سڑک پار کر رہا ہُوں گا تم سمجھے کہ میں درمیان میں آ گیا ہُوں"

"سڑک پار کر رہے ہو گے۔ ارے واہ کیا مزے دار بات کہی ہے چائے پلاؤں" جمن نے کہا۔

"ضرور پلاؤ۔ جب دوستی کرنی ہے تو پھر یہی سب کچھ ہوتا ہے اور تم کیا سمجھتے ہو کہ اختر اِتنا ہی کمینہ انسان ہے کہ اپنے دوست کی دوستی میں ٹانگ اڑائے گا"

"نہیں جی۔ شکل سے تم تو بہت اچھے آدمی لگتے ہو"

"ہو سکتا ہے اللہ رکھی کو ہی غلط فہمی ہُوئی ہو"

"سو فیصدی غلط فہمی ہُوئی ہے اختر بھائی"

"چائے میں ذرا شکر زیادہ ڈال دینا"

"حلوہ کھاؤ گے جی؟"

"نہیں نہیں۔ حلوہ وغیرہ نہیں کھاؤں گا۔ بس تم مجھے اپنے عشق کی میٹھی میٹھی داستان سُنا دو۔ حلوے کا کام دے جائے گی"

"آہ! میں نہیں جانتا کہ وہ چشمِ فلک نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ جب میں نے اُسے دیکھا اُس نے مجھے دیکھا۔ اُس نے مجھے دیکھا۔ میں نے اُسے دیکھا اور ایکسیڈنٹ ہو گیا"

"ہیں ہیں بھئی یہ حادثہ کب ہُوا اور کہاں؟ کوئی چوٹ ووٹ تو نہیں آئی"

"نہیں جی، وہ تو بس گانا ہے تو مطلب یہ ہُوا کہ وہ بھی میرے تیرِ نظر کا شکار ہو گئی۔ کہنے لگی جمن کاش تم باورچی نہ ہوتے۔ میں نے کہا اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو وہ ہُوں جو لوگوں کا پیٹ بھرتا ہُوں۔ داتا اَن داتا۔ ڈِھشوں، ڈِھشوں" جمن نے دونوں ہاتھوں سے رائفل کی شکل بنائی اور دو گولیاں چلا دیں۔ اختر جلدی سے اُس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

"یہ فائرنگ کیوں شروع کر دی تم نے جمن بھائی"

"نہیں نہیں، وہ ایسی کوئی بات نہیں فلم اَن داتا یاد آ گئی تھی۔"

"اچھا اچھا کوئی بات نہیں ہے۔ دیکھو میرا خیال ہے چائے کا پانی کھول گیا ہے" اختر نے کہا اور جمن چائے کے پانی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پھر اُس نے نہایت نفاست سے چائے کی ایک پیالی بنا کر اختر کو پیش کی اور کہنے لگا۔

"بس ہماری ملاقاتیں جاری رہیں۔ اُس نے کہا کہ کسی کو اِس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے لیکن اختر بھائی تم پہلے آدمی ہو جو میری محبت کے راز دار ہو۔ وہ چاہتی ہے کہ میں ایک شاندار آدمی بن جاؤں۔ میں نے دو تین سوٹ چوراۓ۔ ارے مم... میرا مطلب ہے چورائے ورائے بالکل نہیں بس وہ تو ایسے ہی شہاب صاحب سے مانگ لئے تھے۔ پھر ایک پارٹی میں شریک ہُوا اور وہاں مجھے مسٹر پارٹی کا خطاب دیا گیا لیکن شہاب بھائی!"

"ہاں ہاں، کیا ہُوا؟"

"بس کوئی خاص بات نہیں ہُوئی مطلب یہ کہ وہ اب بھی ملتی ہے مُجھ سے۔ مگر اماں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے ایک مرتبہ رشتے لے کر گئی تھیں تین نمبر میں۔ اُن لوگوں نے منع کر دیا تو بس اماں کا دماغ خراب ہو گیا۔ اب تعویذ گنڈے کرا رہا ہُوں۔ اماں کا دماغ صحیح ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ رکھی کا کہنا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو تیار کر لے گی۔ مگر درمیان میں تم آ گئے اختر بھائی اور ہماری گاڑی رُک گئی۔"

"ارے میرے پیارے بھائی کہہ تو چُکا ہُوں کہ سڑک پار کر رہا ہُوں گا تم سمجھے کہ بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا ہُوں"

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ تو تمھارے دِل میں اللہ رکھی کے لئے کوئی جگہ تو نہیں ہے"

"بالکل نہیں۔ میرے دِل میں نسیں ہیں۔ والوِ ہیں اور اسی ٹائپ کی دوسری چیزیں ہیں۔ جگہ وغیرہ میرا خیال ہے بالکل نہیں ہے"

"تب ٹھیک ہے۔ میں... میں مطمئن ہو گیا میرا دِل صاف ہو گیا"

"بڑی اچھی بات ہے لیکن جمن میرا خیال ہے تم اپنے اِس عشق میں کامیاب نہیں ہو سکو گے"

"کیوں؟" جمن غم زدہ لہجے میں بولا۔

"اِس لئے کہ تمھیں عشق کرنا نہیں آتا"

"ارے واہ، کوئی ڈیڑھ سو فلمیں دیکھی ہیں میں نے اور اُن میں ہیرو نے جس طرح ہیروئن سے عشق کیا ہے وہ ساری باتیں مجھے یاد ہیں۔ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہُوں"

"فلموں کی بات مت کرو یار، فلموں میں تو ہمیشہ لوگوں کو غلط شورے دیئے جاتے ہیں"

"اچھا!" جمن نے حیرت سے کہا۔

"بالکل بالکل، بھلا اِس طرح بھی کہیں عشق ہوتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو میری تربیت میں آ جاؤ۔ اختر ٹریننگ سینٹر میں داخلہ لے لو"

"کک... کہاں؟"

"نہیں نہیں۔ تم نہیں سمجھو گے۔ بس یُوں سمجھو کہ اگر تمھیں اللہ رکھی کے عشق کو کامیاب بنانا ہے تو پھر مُجھ سے بات کرو۔ میں تمھیں ایسے مشورے، ایسے راستے دِکھاؤں گا کہ یُوں سمجھو کہ محبوب تمھارے قدموں

میں... اختر نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا اور جمن اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"اختر بھائی زندگی بھر تمھارا احسان مانوں گا۔ زندگی بھر وہ جو کہتے ہیں ناجیون بھر ساتھ نبھائیں گے ہم دونوں۔"

"ارے ارے میں اور تم نہیں بلکہ تم اور رالنّد رکھی۔"

"ہاں ہاں۔ وہی تو میرا مطلب ہے۔ وہی ہم دونوں۔" جمن نے جلدی سے اختر کے بازو چھوڑ دیئے۔ اور اختر چائے کی پیالی نیچے رکھ کر جمن کو دیکھنے لگا۔

"تو ٹھیک ہے مسٹر جمن آج سے میری ڈائریکشن میں تمھارا عشق شروع۔ میں صورتحال کا جائزہ لوں گا۔ گائیڈ کروں گا۔ اور پھر دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے۔"

"زندہ باد اختر بھائی زندہ باد۔" جمن نے خوش ہو کر کہا۔

"اب میں چلتا ہوں۔ کہیں دُنیا ہماری سازش سے باخبر نا ہوجائے۔"

"نہیں۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دُوں گا اختر بھائی جایئے خُدا حافظ، رب راکھا۔" جمن نے کہا اور اختر مسکراتا ہُوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

اچھی تفریح ہاتھ آئی تھی۔ نُدرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر چُکا تھا۔ کچھ زُوا سے معلوم ہُوا تھا۔ کچھ اپنی ذاتی معلومات تھیں۔ پتہ چلا تھا کہ بہت ہی شوخ و شریر قسم کی لڑکی ہے۔ شرارتیں کرنے میں ماہر۔ دیکھنا یہ تھا کہ کون اپنے آپ کو اُستاد ثابت کرتا ہے۔ اور کون شاگرد بن جاتا ہے۔ اختر کوٹھی میں چکراتا رہا۔ اُسے نُدرت کی تلاش تھی اور پائیں باغ کے ایک بڑے درخت کے پیچھے اُسے نُدرت نظر آئی ثناء بھی موجود تھی۔ اختر کے لئے چھپتے چھپاتے وہاں پہنچ جانا مشکل نہ ہُوا اُس نے ثناء اور نُدرت کی کھُسر پھُسر سُنی۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں اور اُن کے الفاظ اختر کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ اختر کی آنکھوں میں شرارت ناچنے لگی۔ اور وہ تیار ہوگیا۔ نُدرت سے مقابلے کا ایک موقعہ میسّر ہُوا تھا۔ چنانچہ اختر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ اُس سے سُپر ہے۔

⁂

عارفہ خالہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہُوئی اُس جگہ پہنچ گئیں جہاں طفیلی بیگم کی رہائش گاہ تھی۔ اُنھوں نے برق رفتاری سے لوہے کے ایک نوک دار اوزار سے گڑھا کھودا اور اُس میں وہ تعویذ دبا دیئے جو ثناء نے اُنھیں لاکر دیئے تھے یہ کام اُنھوں نے اتنی برق رفتاری سے کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو سکی۔ مٹی برابر کرنے کے بعد اُنھوں نے سیمنٹ کی اُکھڑی ہُوئی پپڑیاں اُس کی جگہ جمائیں اور پھر تیزی سے واپس چل پڑیں۔ نُدرت کو ذرا سی دیر ہوگئی تھی۔ طفیلی بیگم کے کانوں تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ بالآخر عارفہ بیگم تعویذوں کے حصول میں کامیاب ہوگئی ہیں اور کسی بھی وقت اپنا کام کر سکتی ہیں۔ لیکن عارفہ بیگم پھُرتی سے اپنا کام کر گئی تھیں۔ اور اُنھیں رنگے ہاتھوں نہیں پکڑا جا سکا تھا۔ طفیلی بیگم جب وقت کا اندازہ لگا کر باہر نکلیں تو عارفہ بیگم اُنھیں دُور جاتی ہُوئی نظر آئیں۔ اُنھوں نے خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کے آگے کھُدی ہُوئی زمین کو دیکھا اور سَر پکڑ کر رہ گئیں۔ نُدرت نے اُنھیں یہ سب کچھ تو بتا دیا تھا لیکن طفیلی بیگم کو خود ہی دیر ہوگئی تھی۔ تاہم اُنھوں نے موقع سے فائدہ نہ اُٹھانا حماقت سمجھی۔ عارفہ بیگم تو چلی گئی تھیں۔ لیکن طفیلی بیگم واویلا کرتی ہُوئی اندر پہنچ گئیں۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں اور گزرنے والے اُنھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ روتی پیٹتی وہ دادی امّاں کے کمرے میں پہنچیں۔ ذکیہ بیگم بھی یہیں موجود تھیں طفیلی بیگم کو سب اِس حال میں دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے۔ ذکیہ بیگم نے پریشان لہجے میں پُوچھا۔

"طفیلی آپا کیا ہُوا؟ اللہ کے واسطے جلدی سے بتائیں میرا کلیجہ دہل رہا ہے۔ کیا ہُوا؟ اللہ نہ کرے۔ رشید تو ٹھیک ہے۔ سُنا ہے کچھ بیمار ہوگیا تھا پکنک سے آنے کے بعد۔"

"اے بی بی! خُدا اُس دِن کو غارت کر دیتا جب زمان اِس دُنیا سے رُخصت ہُوئے تھے اور میں زندہ بچ گئی تھی۔ ہائے اپنوں میں آکر یہ سوچا کہ اطمینان سے زندگی بسر کروں گی اپنے تو اپنے ہیں۔ اُن کی پیشانی پر تو شکن بھی نہیں آتی لیکن خُدا غارت کرے اِدھر اُدھر والوں کو کیا حشر بنانے چلے ہیں میرا۔ ذکیہ بہن... ذکیہ بہن اللہ کے واسطے... اللہ کے واسطے مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دو۔ میں تو جس دِن سے یہاں آئی ہُوں لوگوں کی دُشمنی کا شکار بن گئی ہُوں۔"

"پھر کچھ ہوگیا؟" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"دُشمن اپنی تاک میں لگا ہُوا ہے۔ وار پر وار کر رہا ہے کیا کروں کیا ہوگا۔ ایک ہی بچہ ہے۔ زمان کی نشانی رشید بچہ ہے لیکن... لیکن مجھے تو یُوں لگتا ہے کہ جیسے دُشمن اُس کی جان لئے بغیر بھی نہیں رہ سکیں گے۔"

"اب آپ کچھ بتائیں تو پتہ بھی چلے۔ آپ نے تو خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے۔"

"بی بی، عارفہ بیگم میری جان کی لاگو ہوگئی ہیں۔ ابھی تعویذوں کا یہ موٹا گٹھا لے کر آئیں۔ فرش کھودا۔ زمین توڑی اور اُنھیں دبا کر چلی گئیں۔ یہ سب کچھ کرتی پھر رہی ہیں عارفہ بیگم۔ تم نے دیکھ لیا پہلے بھی کیا ہو چُکا ہے تم سب جانتے ہو۔ ہائے اِن عارفہ بیگم سے یہ تو پُوچھو کہ آخر میری اُن کی کونسی پشتینی دُشمنی چل رہی ہے۔ میں نے تو اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ دیکھو ذکیہ بیگم میرا فیصلہ کر دو۔ ورنہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ سوچوں گی کہ تم نے مجھے گھر بُلا کر ذلیل کیا آخر کچھ تو کہو دُشمنوں سے۔ کوئی بات کہو۔ کچھ تو پتہ چلے کہ یہ سب ہو کیوں رہا ہے؟"

"تعویذ گاڑ گئیں ہیں وہ آپ کے دروازے پر؟"

"ہاں۔"

"تو آپ اُنھیں نکال کر پھینک دیجئے آپ کا کیا بگڑے گا؟"

"لو بی بی! مجھ سے یہی بات کہہ رہی ہو اُن سے کچھ نہیں کہو گی؟"

"چلیں چلیں۔ دیکھیں تو سہی۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔ دادی امّاں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ اِن دونوں کی نوک جھونک اب اُن کیلئے پریشان کُن نہیں رہی تھی بلکہ وہ اِس میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ ظاہر ہے یہ احمق لوگ لڑ جھگڑ کر بھی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اِن کے لڑائی جھگڑے سے بھلا بھلا لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ باہر نکلیں تو ثناء بھی مل گئی۔ وہ پہلے سے تاک میں تھی۔ اُس نے تعجب سے صُورتحال پُوچھی۔ طفیلی بیگم سے سوالات کئے اور پھر بگڑ کر بولی۔

"میں تو کہتی ہُوں کہ طفیلی خالہ جھُوٹ بول رہی ہیں۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بیٹی تم جو کچھ بھی کہہ لو۔ گھروالی ہو نا۔ ذلیل کر لو طفیلی کو خُدا ہی نے یہ سب کچھ تقدیر میں رکھ دیا ہے تو بھلا میں کیا کر سکتی ہُوں؟"

"لیکن طفیلی خالہ آخر عارفہ پھُوپھی کو آپ سے کیا دُشمنی ہے؟"

"اللہ جانے بیٹی کیا دُشمنی ہے۔ بس یہی پتہ چل جائے معافی تو مانگ لُوں۔ یہ تو کہوں کہ بی بی ہماری جان بخش دیں۔ ہم تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

اِتنی دیر میں نُدرت بھی وہاں آگئی اور یہ پُورا قافلہ عارفہ بیگم کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ عارفہ بیگم کیونکہ کام کر کے آئی تھیں اِس لئے بدحواس ہوگئیں۔ پتہ نہیں طفیلی بیگم کو یہ بات فوراً ہی کیسے پتہ چل گئی۔ آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔ صاف ظاہر ہُوا کہ اُن کے ذہن میں چور ہے۔ اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"م... میں تو کمرے سے نکلی بھی نہیں طفیلی بیگم اگر بہتان لگانے پر تُلی ہُوئی ہیں تو میں کیا کر سکتی ہُوں مجھے تو پتہ بھی نہیں ہے۔"

"اے بی بی اگر پتہ نہیں ہے تو چلو اور اُس گڑھے کو کھود کر وہ تعویذ اپنے ہاتھ ہی سے نکال لو جو جا کر گاڑے ہیں۔"

"تعویذ کیسے تعویذ میں نے تو نہیں گاڑے مگر ایسی بات ہے تو آپ اُنھیں خود ہی نکال کر پھینک دیں۔"

"نہیں آپا! تمھیں چلنا ہوگا طفیلی بیگم کے دِل میں اگر شک ہے تو تم چلو۔ گڑھا کھودو اور وہ تعویذ نکال کر پھینک دو۔"

"م... مجھے تو بِلاوجہ ہی پکڑا جا رہا ہے..." عارفہ بیگم نے دادی امّاں سے کہا۔

"میں کہہ رہی ہُوں چلو کم از کم طفیلی بیگم کا شک تو دُور ہو جائے۔" عارفہ بیگم بے چاری گھسیٹتی ہُوئی وہاں پہنچی تھیں۔ بلاشبہ گڑھا کھودنے کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے ذکیہ بیگم نے دلچسپی سے اُس گڑھے کو دیکھا اور پھر عارفہ سے بولیں۔

"چلیئے آپ اِس گڑھے کو خالی کیجئے۔"

"یہ مجھ پر ظلم ہو رہا ہے۔"

"جو کچھ بھی آپ سمجھیں۔ اب آپ سے جیسے کہا جا رہا ہے تو آپ کر لیں۔" ذکیہ بیگم کو یقین ہوگیا کہ گڑھے میں کوئی نہ کوئی چیز دبائی ضرور گئی ہے۔ اور یہ عارفہ ہی کا کام ہے چنانچہ وہ عارفہ بیگم سے کچھ سخت ہوگئیں اور اب عارفہ بیگم کے لئے اِس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ خود ہی گڑھا کھودیں۔ چنانچہ اُنھوں نے نیچے بیٹھ کر گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ پلاسٹر کی پپڑیاں ہٹائی گئیں اور اُس کے بعد مٹی نکالی جانے لگی۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن... لیکن دفعتاً اُس میں کوئی چیز نظر آئی۔ اور عارفہ بیگم نے اُسے پکڑ کر کھینچ لیا۔ یہ ایک جُوتا تھا۔ ایک زنانہ جُوتا۔

نُدرت، ثناء، ذکیہ بیگم، دادی امّاں اور دوسرے بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ جُوتا گڑھے سے نکال لیا گیا۔ نُدرت کے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی تھی۔ یہ کیا... یہ کیا؟ اُس نے دیکھا کہ وہی جُوتا ہے جو پانچ نمبر سے غائب ہُوا تھا۔ اور پھر سمندر میں تیرتا ہُوا نظر آیا تھا اور پھر اختر پر شبہ ہُوا تھا۔ اور... اور ابھی تھوڑی دیر پہلے یقیناً عارفہ بیگم نے اِس گڑھے میں سفید کاغذ کے تعویذ دبائے تھے۔ لیکن اب ایک بھی تعویذ اِس گڑھے میں موجود نہیں تھا اور اُس گڑھے سے صرف یہ جُوتا برآمد ہُوا تھا نُدرت کو دفعتاً احساس ہُوا کہ اگر جُوتا شناخت کر لیا گیا تو خود اُس کی اپنی کیفیت کیا ہوگی اِس احساس سے اُس کے بدن سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا۔

ذکیہ بیگم نے طفیلی بیگم کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولیں۔

"یہ تعویذ ہیں، طفیلی بیگم!"

"نہیں بی بی! یہ تو جُوتا ہے۔"

"کیا جُوتا بھی کسی کو اِس طرح نقصان پہنچا سکتا ہے؟" جتنا

"رُدا! کام کیا تم نے میرا؟"

"یہ دو ہزار روپے ہیں۔ انھیں رکھ لو۔ موقعہ ہوا تو اور بھی کچھ کروں گی۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اگر کبھی اُس عمارت کی طرف رُخ کیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ جب میں ہی اِس دُنیا میں نہیں ہوں گی۔ تو پھر... تو پھر تم کسی سے کیا لوگے؟"

"اوہ نہیں رُدا! ایسا کبھی مت کرنا۔ تم سے تو تم سے تو..."

"میں فضول باتیں نہیں سُننا چاہتی۔ بس اب یہاں سے آگے بڑھ جاؤ۔"

"بہت تھوڑی سی رقم ہے یہ۔ کتنا ساتھ دے گی ایک بیمار انسان کا۔ بہتر ہے مجھے زندہ رکھو رُدا! پتہ نہیں کھوٹے سکے کی طرح کس وقت تمھارے کام آجاؤں۔"

رُدا نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے اور ایک گزرتے ہوئے آٹو رکشہ کو روک لیا۔ پھر وہ ثاقب کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آٹو رکشہ میں بیٹھ کر چل پڑی۔ اُس کا ذہن مسلسل زخمی تھا۔ خیر دین تو کہیں آس پاس نظر نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں پہنچ بھی سکا یا نہیں۔ پہنچ بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ کیا کرلے گا اُس بیچارے کے اپنے وسائل۔ لیکن پھر رُدا کو خود ہی اپنے اِس خیال کی تردید کرنی پڑی۔ خیر دین نے اپنے آپ کو جو کچھ ظاہر کیا ہے اگر در حقیقت وہ نہیں ہے تو پھر کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی کرلے گا۔ یہ ایک موہوم سی اُمید تھی جو رُدا کے سینے میں روشن ہو گئی تھی۔ بقیہ وقت اُس نے خیر دین کے بارے میں سوچتے ہوئے ہی کاٹا۔ اور آٹو رکشہ سے کوٹھی کے دروازے پر اُتر گئی۔ خیر دین نجانے کیا چیز ہے۔ اگر وہ صرف ایک ملازم ہے۔ پڑھا لکھا ہے اور یہ حیثیت اِس لئے اختیار کی ہے کہ اپنی ملازمت کو اپنی پسند کے مطابق جاری رکھے تو بہر طور یہ ایک عجیب بات ہے۔ اور اگر اُس کے پسِ پردہ کوئی اور شخصیت پوشیدہ ہے تو پھر وہ کیا ہو سکتی ہے۔ اپنے آپ کو بہلاتی رہی۔ کوٹھی کے معمولات جوں کے توں تھے۔ پھر اُسے ثناء اور ندرت کے ساتھ اُس میٹنگ میں شریک ہونا پڑا جو خفیہ تھی۔ اِس میٹنگ میں خاص طور سے اُسے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ زیرِ بحث جوتا تھا جو ندرت کی ملکیت تھا۔ رُدا کو معلوم ہوا کہ آج دن میں طفیلی بیگم اور عارفہ بیگم کے درمیان ایک معرکہ ہو چکا ہے۔ اور اِس معرکے کے نتائج نے سب ہی کو حیران کر دیا ہے۔ ثناء نے تفصیل سے رُدا کو جوتے کی کہانی سُنائی۔ اور رُدا بے اختیار ہنس پڑی۔ اختر کی شخصیت سے یہ دونوں واقف ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن وہ ضرور اختر کو جان گئی تھی۔ اختر نے یہ بھی کہا تھا کہ ذرا دیکھیں گے اِن شرارت کی پتلیوں کو۔ کتنی آگے کی چیزیں ہیں۔ یقیناً اُس وقت جب عارفہ بیگم تعویذ گاڑ گئی ہوں گی۔ اختر کہیں آس پاس ہی چھپا ہو گا اور اُس نے ندرت کی تجویز اُسی پر اُلٹ دی۔ بے شک وہ بے حد شریر تھا لیکن رُدا کے پاس اُس کی شخصیت ایک اَمانت کے طور پر تھی۔ اختر نے اُسے بہن بھی کہا تھا۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ ثناء کے لئے خالد کا مسئلہ موجود ہے۔ رُدا کی یہ عادت نہیں تھی کہ بات اِدھر کی اُدھر کرتی رہے۔ جب سب لوگوں کے سامنے بات آئے گی تو اُنھیں بھی معلوم ہو جائے گا۔ بہر طور وہ اُن کی دلچسپ گفتگو میں اُلجھی رہی۔ اختر کے بارے میں طرح طرح کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ رُدا اختر کو بچانے پر تُل جائے گی۔

ندرت نے فیصلہ کیا تھا کہ اب جمن اور اختر کو بھڑا دیا جائے۔ بلکہ دونوں کی ڈبل کراہی دی جائے۔ اور اِس کے لئے اُس نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا تھا۔ لیکن یہ منصوبہ بہر طور اختر تک تو پہنچنا ہی تھا۔ کیونکہ اب یہ رُدا کی ذمّہ داری ہو گئی تھی۔ رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ تو رُدا نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ خیر دین ہی تھا۔ اندر آگیا۔ رُدا نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہو خیر دین! کیا صورتِ حال رہی؟ وہ مجھے ملا تھا۔ میں نے اُسے پیسے دے دیئے۔ دوبارہ ملاقات کی دھمکی بھی دے گیا ہے۔ لیکن تم تو وہاں موجود نہیں تھے۔"

"اگر آپ کو میری وہاں موجودگی کا پتہ چل جاتا۔ رُدا بیگم! تو پھر بات ہی کیا تھی۔" خیر دین نے بے تکلفی سے کہا۔

"گویا تم وہاں موجود تھے؟"

"اوہ جی خیر دین ولد بشیر دین۔"

"چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ۔ بس بس، آگے کی بات کرو!" رُدا نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"ہاں بی بی جی! ہم وہاں موجود تھے اور ہم نے پکڑ لیا آپ کے چور کو۔"

"کیا مطلب؟" رُدا کے لہجے میں ایک دم خوف بیدار ہو گیا۔

"میرا مطلب ہے جی! اُس بلیک میلر کو، اور اب آپ اطمینان رکھیئے۔ رُدا بی بی! وہ اب آپ کو دوبارہ نظر نہیں آئے گا۔"

"کیا مطلب؟" رُدا ایک بار پھر چونک پڑی۔

"اوہ جی! یہ ہی چاہتی تھیں نا آپ کہ وہ آپ کو آئندہ بلیک میل نہ کرے۔ پریشان نہ کرے۔ اِس کوٹھی تک نہ پہنچے۔ تو آپ نے یہ کیسے

واویلا آپ کر رہی تھیں۔" ذکیہ بیگم نے سوال کیا۔

"اب لو بی بی! مجھے کیا معلوم یہ... یہ جوتا یہ تو صرف جوتا ہے۔"

"دیکھ لیجئے گڑھے میں جھانک کر کوئی تعویذ وغیرہ تو نہیں ہے۔"

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گڑھا کھود کر یہ جوتا دبایا کس نے؟" دادی اماں نے سوال کیا۔

"اور یہ جوتا ہے کس کا؟" ذکیہ بیگم بولیں۔ ثناء نے ندرت کی طرف دیکھا۔ ندرت اُس وقت واقعی نروس ہو گئی تھی۔ ایک بات جو سمجھ میں آرہی ہو ذکیہ بیگم خود ہی بولیں۔

"پہلے یہ پتہ چلا لیا جائے کہ جوتا کس کا ہے۔ اُس کے بعد بقیہ کارروائی کی جا سکتی ہے۔ تعویذ نہ سہی۔ جوتا سہی۔ کس نے طفیلی بیگم کے کمرے کے دروازے پر یہ جوتا دبایا۔ آخر کیوں؟ اور اِس کی وجہ کیا تھی ہلاؤ یہ جوتا مجھے دے دو۔ میں تحقیقات کروں گی کہ کس کا ہے۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔ اور جوتا ایک کاغذ میں لپیٹ کر اُن کے حوالے کر دیا گیا۔

"کسی کو بلا کر کہو کہ اِس گڑھے کو بھر کر یہاں سیمنٹ لگا دے۔ لوگ اپنے اپنے جھگڑوں میں پتہ نہیں کیا کیا حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ عارفہ بیگم! طفیلی بیگم سے دوستی کر لیجئے۔ یہ سب کچھ مناسب نہیں ہے۔ یہاں سب لوگ سکون سے رہتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ بھی دوستی کر کے سکون سے رہیں۔"

"تو بی بی! میں نے کب دشمنی کا آغاز کیا۔ اب تم خود ہی دیکھ لو۔ میرے نام سے طرح طرح کے بہانے گھڑے جاتے ہیں۔ نجانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔"

"نہیں، جائے گا کوئی نہیں یہاں سے۔ احسان کسی کو نہیں جانے دیں گے۔ لیکن آپ ہی لوگوں کے حق میں یہ بہتر ہو گا کہ آپس کی رنجشیں چھوڑ کر محبت سے یہاں رہیں۔ میری خواہش ہے کہ آج کے بعد آپ میں اور طفیلی بیگم میں کبھی کوئی جھگڑا نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں۔ بلکہ میں خود اِس بات کی نگرانی کروں گی کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ عارفہ بیگم آپ بھی اور طفیلی بیگم آپ بھی! دونوں کو ایک دوسرے کے لئے دِل میں لچک پیدا کرنی چاہیئے۔" دونوں خاموش ہو گئیں۔ عارفہ بیگم خود ششدر تھیں۔ در حقیقت تھوڑی دیر قبل وہ تعویذ گاڑ کر گئی تھیں۔ اگر تعویذ برآمد ہو جاتے تو اُن کی گردن پکڑی گئی تھی۔ لیکن یہاں مسئلہ ہی دوسرا نکل آیا تھا۔ سب لوگ ششدر ہو گئے۔ ثناء اور ندرت بھی وہاں سے واپس چل پڑیں۔ تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر ندرت نے کہا۔

"مالک کی بیٹی! یہ سب کچھ کیا ہے؟ اگر کوئی ہمیں اِس طرح بے وقوف بنا جائے۔ تو پھر یوں سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ ہمیں خودکشی کر لینی چاہیئے۔ میں کہتی ہوں۔ یہ جوتا یہاں پہنچا کہاں سے؟"

"کیا پتہ؟ میں نے تو عارفہ بیگم کو تعویذ ہی دیئے تھے۔"

"اور میں نے طفیلی کو تیار کر دیا تھا۔ اوّل تو عارفہ بیگم کی کامیابی اور پھر اِتنے سے وقفے میں تعویذ غائب اور جوتا حاضر۔"

"اَرے خدا کے لئے۔ مجھے تو جانے دو۔ دوسرا جوتا میرے کمرے ہی میں رکھا ہوا ہے۔ تحقیقات بھی ذکیہ بیگم کر رہی ہیں۔ اگر کسی طرح مجھ تک پہنچ ہو گئی۔ تو میری تو شامت آئی..." ندرت نے کہا۔

"بے وقوف لڑکی! تو اُس جوتے سے جلدی سے ہاتھ دھو لے۔ جا اُسے کسی طرح غائب کر دے۔ اور یہ ظاہر مت کرنا کہ وہ تیرا ہے۔ بعد میں باتیں کریں گے۔" ثناء نے کہا اور ندرت اپنے کوارٹر کی جانب دوڑ گئی۔ لیکن اُس کے ذہن میں بھنور سے پڑ رہے تھے۔ یہ جوتا سو فیصدی... سو فیصدی اختر ہی کے پاس تھا۔ اِس بات پر اُسے شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اختر نے تعویذ نکال کر جوتا اُس جگہ گاڑ دیا۔ کب اور کیسے؟ یہ بات حیرت انگیز تھی لیکن اختر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ندرت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ڈیئر اختر! تمھیں اگر ٹھیک نہ کر دیا تو میرا نام بھی ندرت نہیں ہے۔" بہر طور اپنے کوارٹر میں جا کر اُس نے خاموشی سے جوتا نکالا اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک کاغذ میں لپیٹ لیا۔ پھر اُس کے بعد اُس نے کوٹھی سے بہت دُور ایک کوڑے دان میں وہ جوتا پھینک دیا تھا۔

*

رُدا نے اپنے اکاؤنٹ سے صبح ہی دو ہزار روپے نکال لئے تھے۔ اُسے ہر طرح کا خوف تھا۔ رشید اور شہاب صاحب اُس کے خیال میں مل گئے تھے۔ اور اُس کے لئے کارروائی کر رہے تھے۔ خاص طور سے کمینہ رشید تو مسلسل اُس کی تاک میں رہتا تھا۔ رُدا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رشید کے لئے کیا کرے۔ بہر حال وقتِ مقررہ پر وہ اپنے دفتر سے باہر نکلی۔ تھوڑی دُور ہی چلی تھی۔ کہ ثاقب بھکاریوں کی سی شکل بنائے اُس کے قریب پہنچ گیا۔ رُدا کا بدن کانپ اُٹھا تھا۔ اُس نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ آس پاس کوئی شناسا صورت نظر نہیں آرہی تھی خیر دین بھی موجود نہیں تھا۔ اور نہ ہی رشید کی صورت نظر آئی تھی ثاقب نے رُدا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ہمارے حوالے کیا۔ اور ہم نے اُسے حل کر دیا۔ اب اگر وہ آپ کے سامنے آجائے تو چور کی سزا وہ خیر دین کی۔ کوٹھی تک پہنچنے کا تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"لیکن کیسے خیر دین کیسے؟ کیا کیا تم نے اُس کے ساتھ؟"

"ادہ جی ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ سمندر میں ڈال آئے ہیں ہم اُسے۔"

"نہیں؟" رُدا دہشت سے کانپ اُٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے خوف ٹپک رہا تھا۔

"کیا ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا رُدا جی؟" خیر دین نے پوچھا۔

"ن... نہیں خیر دین نہیں! کسی کی جان لینا تو... تو... تو... یہ"

"اگر آپ کہتی ہیں کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا تو ہم نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کیوں ڈر رہی ہیں؟"

"تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ بتاؤ سچ بتاؤ تمھیں میری قسم۔ کیا کیا تم نے اُس کے ساتھ؟"

"دیکھئے رُدا بی بی! ابھی آپ ہمارے لئے کوئی ایسی حیثیت نہیں اختیار کر سکی ہیں کہ ہم آپ کی قسم سُن کر سب کچھ اُگل دیں۔ ہمیں ایسی قسم ہی نہ دِلائیں۔ یا اگر قسم دِلاتی ہیں۔ تو پہلے ہمیں اِس بات کا احساس دِلائیں کہ آپ ہمارے لئے کیا ہیں اور ہم آپ کے لئے کیا ہیں۔ دیکھئے نا جی! ایک ملازم قسم کا آدمی مالکوں سے اِتنی ہی محبت کر سکتا ہے کہ اُن کا کام کر دے۔ اب اپنی ذاتی باتیں تو وہ نہیں بتا سکتا۔ اُسے روکنے کے لئے ہم نے کوئی ایسا ہی کام کیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ دوبارہ آپ تک نہ آسکے۔ چلیئے ٹھیک ہے ہم اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے اُسے قتل نہیں کیا۔ لیکن جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ آپ کو بتائیں گے نہیں۔"

"خیر دین! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ کیا ثاقب اب میری طرف نہیں آئے گا؟"

"میں نے کہا نا جی کہ اب وہ اگر آجائے تو آپ ہمیں چوری کے الزام میں گرفتار کرا دیں۔"

"نہیں! خدا نہ کرے۔ میں ایسا کیوں کروں گی لیکن خیر دین میں حیران رہوں گی کہ تم نے کیا کیا۔"

"اب آپ کچھ نہ کچھ رہنا ہی چاہتی ہیں رُدا بی بی! تو ہم اِس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ آپ نے جو کام ہمارے سپرد کیا ہم نے اُسے کر دیا۔ بس اِس سے زیادہ کی باتیں بیکار ہیں۔"

"بیٹھو تو سہی۔ کھڑے کیوں ہو؟"

"ٹھیک ہے جی بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ نے اتنی اجازت دے دی ہے۔ تو ہم یہ جُرات کر لیتے ہیں۔ نہ دیتیں تو کبھی آپ کے سامنے بیٹھنے کی ہمت نہ کرتے۔"

"نہیں بھائی! میں اِس گھر کی مالک کہاں ہوں تم تو سب کچھ جانتے ہو۔"

"کہاں جانتے ہیں رُدا بی بی! کچھ بھی تو نہیں جانتے۔ جاننے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ جو لوگ جاننے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تو بھلا خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔"

رُدا پھیکے سے انداز میں مُسکرانے لگی۔ پھر اُس نے کہا۔ "خیر دین! واقعی اگر تم نے میرا یہ کام کر دیا ہے تو یُوں سمجھ لو تم نے مجھے خرید لیا۔"

"نہ بی بی جی نہ! ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم ادنا آپ کو خریدیں گے؟"

خیر دین کے لہجے میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی جسے رُدا محسوس نہ کر سکی۔ دفعتاً رُدا نے کہا۔

"ایک بات مجھے نہیں بتاؤ گے خیر دین؟"

"پُوچھو بی بی پُوچھو۔" خیر دین نے کہا۔

"تم کون ہو؟ درحقیقت تم کون ہو؟ دیکھو خیر دین! تم وہ تو نہیں ہو جو خود کو ظاہر کرتے ہو۔ تم ایک تعلیم یافتہ آدمی ہو۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ۔ تم... تم مجھے بتاؤ خیر دین تم کون ہو؟"

"واہ بی بی جی واہ! کیسے مزے کی بات ہے۔ خیر دین سے مستقل یہ پُوچھا جا رہا ہے کہ وہ کون ہے۔ اُس نے ثاقب کے سلسلے میں کیا کیا۔ کیوں آخر کیوں؟ خیر دین آپ کو یہ باتیں کیوں بتا دے؟ اِس کی کوئی بُنیاد بھی تو ہو۔ کون ہیں آپ خیر دین کی؟ کیا حیثیت رکھتا ہے خیر دین آپ کی نِگاہ میں؟ پہلے اِس کا تعین کر دیں۔ رُدا بی بی! اُس کے بعد خیر دین اپنی تمام حقیقتیں آپ پر کھول دے گا۔"

"مطلب؟"

"آپ کون ہیں رُدا بی بی! آپ کون ہیں؟ آپ کا قصّہ کیا ہے؟ کیا یہ بات آپ نے خیر دین کو بتائی؟"

"اوہ خیر دین! میں... میں..."

"ہاں ہاں کوئی بات نہیں جی! خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ بڑا ہی فراخ دِل ہے۔" وہ نہ آپ سے کچھ پُوچھے گا نہ آپ اُس سے کچھ پُوچھئے۔ البتہ ایسے چھوٹے موٹے کام اُس کے حوالے کرنے میں کبھی کوئی تکلف نہ کیا کریں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں اُس دِن بھی ہم نے آپ سے کہا تھا رُدا بی بی کہ خیر دین کو دوست بنالیں۔ فائدے میں رہیں گی۔ آج بھی یہ ہی کہہ رہے ہیں۔ جب بھی کسی

مشکل کا شکار ہوں خیر دین کو یاد کریں۔ اور ہاں ذرا یہ تو بتلایئے۔ رشید نے آپ کے کمرے میں آنے کی کوشش تو نہیں کی آج تک؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" رُدا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ خیر دین کے الفاظ کی گہرائیوں کو وہ محسوس کر رہی تھی۔ اور ایک عجیب سی خلش اُس کے ذہن میں بیدار ہوگئی تھی۔ اُس نے نجانے کیوں آج گہری نگاہوں سے خیر دین کو دیکھا تھا۔ اور اپنے ذہن میں اُس کے لئے ایک تاثر قائم کیا تھا۔ اِس سے پہلے تو خیر دین اُسے صِرف ولد بشیر دین اور چک نمبر اٹھارہ ہی نظر آیا تھا۔ لیکن آج اُس نے خیر دین کے خدوخال میں اُس کے چہرے مُہرے میں کچھ عجیب سی کیفیتیں پائی تھیں۔ حماقتوں کا لبادہ اُس کے چہرے پر پڑا رہتا تھا۔ بولنے کے انداز میں تبدیلی کر کے وہ اپنے آپ کو مزید احمق اور سادہ لوح ثابت کرتا تھا۔ لیکن درحقیقت اِن خدوخال کے پسِ پردہ ایک ذہین اور تیز قسم کا انسان نظر آتا تھا۔ جو دِلکش بھی تھا۔ لیکن جس کی دِلکشی قطعی قابلِ توجہ نہیں تھی۔ کیونکہ وہ ایک معمولی قسم کا ملازم تھا۔ جو لوری اماں کے پاؤں دبایا تھا۔ اُنھیں قصّہ طوطا مینا سُنایا کرتا تھا۔ رُدا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ خیر دین خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اِس دیکھنے میں بھی رُدا کو ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہُوا۔ اور اُس نے خیر دین کے چہرے پر سے نِگاہیں ہٹالیں۔

"اچھا خیر دین اب تم جاؤ۔ ظاہر ہے نہ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے اور نہ میں تمھیں اپنے بارے میں۔"

"ہاں جی ٹھیک ہے گاڑی ایسے ہی چلتی رہنے دی جائے۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ اچھا جی خدا حافظ۔"

رُدا کے دِل میں ایک بار پھر خیال آیا تھا کہ خیر دین سے پُوچھے کہ آخر اُس نے ثاقب کے لئے کیا کیا ہے۔ لیکن بیکار تھا۔ بہرطور اب دیکھنا یہ تھا کہ خیر دین نے جو دعویٰ کیا ہے وہ سچ ہے یا غلط! اُس نے تیز روشنی بند کی اور مسہری پر جا لیٹی۔ اُس کے ذہن میں خیر دین کی صُورت اُبھر آئی۔ یہ شخص کافی پُراسرار ہے۔ کون ہے یہ۔ کوٹھی میں کس مقصد سے آیا ہے۔ کیا کھیل ہے اِس کا؟ ابھی زیادہ سوچ بھی نہیں پائی تھی کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہُوئی۔ رُدا نے یہ ہی سمجھا کہ خیر دین کچھ سوچ کر واپس آیا ہے۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ لیکن رشید کی صُورت دیکھ کر کانپ گئی۔ رشید مُسکراتا ہُوا اندر گھس آیا تھا۔ رُدا نے جلدی سے سوئچ دبا کر تیز روشنی جلا دی۔

"یہ... یہ کیا بدتمیزی ہے رشید صاحب؟" اُس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں مس رُدا! بہتر ہے کہ لہجہ مدھم رکھیں۔ جو بات جس وقت تک راز میں رہے۔ انسان کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔"

"آپ لوگ... آپ لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے۔ کیوں آئے ہو یہاں؟ کیا چاہتے ہو؟"

"میں نے تو تم سے پہلے بھی کہا تھا رُدا! کہ میں آؤں گا تمھارے پاس۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس دِن اُس دِن ایک حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔"

"میں قطعی نہیں چاہتی کہ تم میرے کمرے میں داخل ہُوا کرو۔"

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چاہے بغیر بھی ہو جاتی ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم مدھم روشنی میں گفتگو کریں۔"

"میں کہتی ہُوں کہ فوراً کمرے سے باہر نکل جاؤ۔ تم حد سے آگے بڑھ رہے ہو۔"

"نہیں مس رُدا! میری حد مقرر کرنے والی آپ کون ہوتی ہیں؟ درحقیقت میں آپ سے ثاقب کے بارے میں ٹھوس گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں کہتی ہُوں کہ تم ہوتے کون ہو مجھ سے گفتگو کرنے والے؟ دیکھو رشید! میں نے اِس عمارت میں پناہ لی ہے۔ میں بے سہارا ہوں۔ میں... میں تیمور کے ساتھ یہاں کچھ وقت گزارنا چاہتی ہُوں لیکن اگر تم نے مجھے پریشان کیا تو پھر میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکوں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہی ہوگا نا کہ مجھے اِس عمارت سے نِکال دیا جائے گا۔ میں پہلے بھی اِس عمارت میں رہنے کا تصوّر نہیں رکھتی تھی یہ تو صرف ثناء کی محبت تھی جس نے میرے پاؤں جکڑ لیئے۔"

"کون بدبخت چاہتا ہے کہ تم یہاں سے جاؤ۔ رُدا! لیکن جس کے دِل میں کسی کے لئے پیار بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ خود بھی چین سے نہیں سوتا پھر دوسرے کو کیسے چین سے سونے دے۔"

دفعتاً ہی ایک گوشے سے کوّے کی آواز اُبھری۔ اور رشید چونک کر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ایں یہ آواز کہاں سے آئی؟" آواز دوبارہ سُنائی دی۔ اور رشید پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"یہ کمبخت کوّے... م... مگر یہاں تمھارے کمرے میں۔ کک... کوئی روشندان بھی نہیں ہے۔" رُدا خود بھی چونک کر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔ جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ لیکن کمرے کا ایک سادہ سا گوشہ تھا۔ وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ آواز بند ہوگئی۔ رشید نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر ایک کرسی کی جانب بڑھ گیا۔

"ہاں مس رُدا! تو میں آپ سے کہہ رہا تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ اُسے محسوس ہُوا جیسے اُس کے نیچے کوئی کُتیا کا پلّا دب گیا ہو۔

ٹیوں ٹیوں کی زوردار اور کرب ناک آواز اُبھری تھی۔ رشید اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے جلدی سے کُرسی کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں اب حیرت کے نقوش نظر آرہے تھے۔ دفعتاً ہی اُس کی گردن پر کوئی سخت چیز لگی اور وہ اُچھل پڑا۔ اِس کے ساتھ ہی کوّے کی آواز پھر سُنائی دی تھی۔

"اَرے اَرے بب بلپ سے" رشید نے گردن سَہلاتے ہُوئے کہا۔ نہ جانے کیوں وہ بدحواس ہوگیا تھا۔ ساحلِ سمندر پر کوؤں نے اُس کی جو دُرگت بنائی تھی۔ وہ اُس کے لئے بہت زیادہ خوفناک تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس نے کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔ کوّے کی آواز کے ساتھ ہی گردن پر لگنے والی ضرب نے اُسے حواس باختہ کر دیا۔ اور وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہُوا دروازے کی جانب دوڑا۔ رِدا تعجب سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری بار پھر اُس کی گردن پر کوئی چیز لگی۔ اور رشید برق رفتاری سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اب اُس نے راہداری میں دوڑ لگادی تھی۔ حالانکہ پُورے ہوش و حواس سے وہ یہاں آیا تھا۔ لیکن اِس عجیب و غریب واقعے نے اُس کے حواس گم کر دیئے تھے۔ رِدا خود بھی چونک کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ رشید نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ تو ایک گوشے سے اختر باہر نِکلا اور رِدا کے دروازے پر آگیا۔ رِدا چونکہ دروازے پر آکھڑی ہُوئی تھی۔ اِس لئے اُس نے اختر کو دیکھ لیا۔ اختر نے مُسکرا کر رِدا کو سلام کیا تھا رِدا بھی مُسکرادی۔

"اختر تم ..." اُس نے حیرت زدہ مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بس جی چاہا تھا ذرا سسٹر کے پاس آنے کے لئے مگر رشید صاحب یہاں آکر کچھ دھمکیاں وغیرہ دے رہے تھے۔"

"لل... لیکن وہ کوّے، اور وہ... اور وہ رشید..."

"رشید صاحب کو کوّوں کا خوف لاحق ہوگیا ہے۔ کوّے کی آواز تو میرے مُنہ سے نِکلی تھی۔ اور وہ چھوٹی چیز جو اُن کی گردن سے ٹکرائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دو پتھر تھے۔ جو بہ حالتِ مجبوری میں نے اُن کی گردن پر مارے تھے تاکہ کوّوں کا ڈرامہ پُورا ہو جائے۔ آپ یقین کیجئے۔ اگر اِس وقت شیر کی دہاڑ سُنائی دیتی۔ تو رشید صاحب کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ لیکن کوّوں کی آواز نے اُن کے حواس ہمیشہ کے لئے چھین لئے ہیں۔"

"اور وہ کک کُتّے کے بچّے کی آواز...؟"

"اب آپ اپنے اِس چھوٹے سے بھائی کو کیا سمجھتی ہیں۔ کُتّا، بلّی، چُوہا، خرگوش، ہر قسم کی آواز بس اِس گلے میں قید ہیں۔" اختر نے کہا۔

"اوہ اختر! خدا کی پناہ تم... تم..."

"ہاں سسٹر! آپ کا یہ ننھا سا بھائی ہم... میرا مطلب ہے اب اِتنا ننھا بھی نہ سمجھیں۔ آپ کے لئے بہت بڑی ڈھال ہے۔ بشرطیکہ اُس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ رشید صاحب کیا فضُول بکواس کر رہے تھے۔ کون ثاقب کیسا ثاقب؟ کسی ثاقب کے نام پر وہ آپ کو ڈرا رہے تھے۔"

"تو تم نے وہ باتیں سُن لیں؟"

"ہاں۔"

"بس اختر! یہ رشید مجھے پریشان کرتا ہے بے سہارا ہُوں نا اِس گھر میں۔ ہر شخص ہی میری جان کا لاگو ہوگیا ہے۔"

"نام لکھوا دیں۔ ایک ایک کو ٹھیک کرکے نہ رکھ دیا تو اختر نام نہیں۔" اختر نے اکڑ کر کہا۔ اور رِدا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ نہ جانے کیوں اُسے ایک عجیب سا احساس ہُوا تھا۔ وہ تنہا نہیں ہے۔ خیر دین اُس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ اختر اُسے بہن کہتا ہے۔ اور اُس کے لئے سینہ تان کر بات کر رہا ہے۔

"آؤ اختر اندر آؤ۔"

"حاضر۔" اختر نے کہا اور اندر پہنچ گیا۔ رِدا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس نے غُصیلے انداز میں کہا۔

"دیکھیے سسٹر! مجھے رونے والے پسند نہیں۔ میں رُلانے والوں سے دلچسپی رکھتا ہُوں۔ اگر آپ پسند کریں تو اختر کو اپنا رازدار بنائیں۔ آخر بھائی بہن کے درمیان کوئی راز، راز کیوں رہنا چاہیئے آپ بتلایئے۔"

"نہیں نہیں اختر! بس کچھ ایسے معاملات ہیں جن کے لئے میں پریشان ہُوں۔ اور یہ رشید مجھے اُن کے لئے تنگ کرتا ہے۔"

"رشید صاحب کا تو جینا حرام کر دُوں گا۔ کل سے کوّے اگر اُن کی جان کے لاگو نہ ہو جائیں تو میرا نام بھی اختر نہیں ہے۔" رِدا روتے روتے ہنس پڑی۔

"تم نے کوّوں کی آواز خُوب نِکالی مُنہ سے۔ واقعی رشید کا حُلیہ خراب ہوگیا تھا۔"

"ابھی تو آپ دیکھتی رہیئے۔ خیر دین نے جو کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُس کی تکمیل میں کروں گا۔" اختر نے کہا اور رِدا مُسکرانے لگی ایک دم سے اُس کے ذہن سے ساری کدُورت دُھل گئی تھی پھر اُس نے کہا۔

"مگر اختر تمہیں بھی خطرہ ہے۔"

"کیسا خطرہ سسٹر؟"

"ندرت کا جُوتا کیا سمجھے؟"

"ندرت کا جُوتا۔ ندرت کا جُوتا ہو سکتا ہے۔ میں کیا سمجھوں گا۔"

"مجھ سے بھی اُڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا اُس گدھے

میں جُوتا تمہارے ذریعے نہیں پہنچا تھا؟"

"اَرے میرے ذریعے تو نیل آرم اسٹرانگ چاند پر پہنچا تھا۔ آپ کیا سمجھتی ہیں اپنے بھائی کو۔" اختر نے سینہ تانتے ہُوئے کہا۔

"ندرت پریشان ہوگئی ہے۔ اور اُس کا سو فیصدی یقین تمہاری ہی طرف ہے۔ کیونکہ اُس دِن سمندر میں اُس نے تمہیں دیکھ لیا تھا جب تم جُوتے کو غالباً پانی پر تیرا رہے تھے۔"

"ہُوں! تو یہ صُورتِ حال ہے مس اللہ رکھی! اللہ تمہیں رکھے۔ ٹھیک ہے۔ گویا اب ندرت صاحبہ میرے مقابلے پر باقاعدہ آرہی ہیں؟"

"ہاں۔"

"کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟"

"میرا خیال ہے جمن تم سے بِھڑ جائے گا۔ جاہل سا آدمی ہے۔ خواہ مخواہ تمہیں پریشان کر دے گا۔ خیال رکھنا۔"

"اِطلاع کا شُکریہ! لیکن آپ نے رشید کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"جانے دو اختر! اِن فضُول باتوں کو۔ میرا معاملہ ہے خود ہی نمٹ لُوں گی۔"

"آپ کی مرضی سسٹر! لیکن آپ خود سوچ لیجئے۔ اگر کبھی بھائی کی ضرورت پیش آئی۔ اور آپ نے تکلف کیا تو پھر میں سمجھوں گا کہ آپ کو بہن بنانا قطعی بیکار ثابت ہُوا، ویسے اِس عمارت کے معاملات کافی پُراسرار ہیں۔"

"اچھا اب تم جاؤ۔ آرام کرو۔ کافی وقت ہو چُکا ہے۔" رِدا نے کہا اور اختر نے گردن ہلادی۔ وہ بھی باہر نِکل گیا تو رِدا نے جلدی سے روشنی بند کی اور بستر پر آلیٹی۔ پتہ نہیں کیسی کیسی کیفیت ہو رہی تھی اُس کی۔ عجیب خیالات کا شکار تھی۔ کبھی اختر ذہن میں آتا تو کبھی خیر دین۔ اور اُس کے بعد رشید!

★★

ندرت جمن کی تاک میں تھی طفیلی بیگم کا منصُوبہ جس طرح فیل کیا گیا تھا۔ اُس نے ندرت کو چیلنج کر دیا۔ اور ندرت کو یقین تھا کہ اختر کے علاوہ کوئی اور شخصیت ایسی نہیں ہو سکتی جو یہ حرکت کرے۔ چنانچہ وہ جمن کو چڑھانے پر تُلی ہُوئی تھی۔ جمن باورچی خانے ہی میں مِلا۔ ندرت اُس کے پاس پہنچ گئی۔ جمن اُسے دیکھ کر کِھل اُٹھا تھا۔

"آؤ اللہ رکھی آؤ۔ کیسے آگیئں؟"

"لعنت ہے تم پر۔ بس تم سے یہ کہنے آئی ہُوں کہ میرے اور تمہارے درمیان محبت کے سارے رشتے ختم ہونے ہی والے ہیں۔"

"اَرے نہ نہ! تیرے بِنا کیسے جی سکیں گے ہم۔ لالالا... لالالا۔" جمن نے کہا۔

"اولالا کے بچّے! میں پُوچھتی ہُوں تجھ سے کہ تُو نے اختر کا کیا کیا؟"

"کک... کیوں؟ کیا ہوگیا اختر بھائی کو؟"

"ہُوں، اختر بھائی! تو اختر اب تیرے بھائی بن گئے ہیں اور وہ جو میری جان کے پیچھے پڑے ہُوئے ہیں تو؟"

"نہیں اللہ رکھی! تجھے ضرور غلط فہمی ہُوئی ہے۔ میں تو قسم کھا سکتا ہُوں کہ اختر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ تجھے ضرور اُن کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی ہے اللہ رکھی! اپنی اِس غلط فہمی کو دُور کر لے۔ اختر بھائی تو ہمارے پیار کے رکھوالے ہیں۔" جمن کا تو لہجہ ہی بدلا ہُوا تھا۔ ندرت کو غصّہ آگیا۔

"اور میں جو کہہ رہی ہُوں تجھ سے وہ تیری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا۔"

"آتو رہا ہے۔ مگر اختر بھائی سے میری ملاقات ہُوئی تھی میں سچ کہتا ہُوں وہ تیری صُورت تک سے واقف نہیں ہیں۔"

"یہ سب مکّاریاں ہیں جمن! وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ اُس نے تجھے چٹکیوں میں اُڑا دیا ہوگا۔"

"کک... کہاں اُڑا دیا ہوگا؟" جمن نے تعجب سے پُوچھا۔

"میرا مطلب ہے تجھے بے وقوف بنا دیا ہو گا۔ حالانکہ وہ مسلسل مجھے پیار بھری نظروں سے گھُورتا ہے۔"

"غلط، میں نہیں مانتا۔ پھر بھی اگر تو کہہ رہی ہے تو میں اِس سِلسلے میں اختر بھائی سے معلومات حاصِل کر لُوں گا۔ بلکہ اللہ رکھی ایک کام کر آج رات گیارہ بجے وہیں مِل جا مجھے۔ میں اختر بھائی سے تیری غلط فہمی دُور کرا دُوں گا۔"

"بکواس مت کرو۔ جمن! جو کچھ میں کہہ رہی ہُوں۔ تمہیں وہ ہی کرنا ہے۔"

"کیا؟" جمن نے پُوچھا۔

"اختر کے کھانے میں جمال گوٹا مِلا دو۔ ایسا حال کرو اُس کا کہ اُسے بھی نانی یاد آجائے۔"

"اَرے نہیں نہیں! پردیسی ہے بیچارہ۔" جمن نے کہا۔

"تمہیں مجھ سے زیادہ اُس سے ہمدردی ہے۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اگر یہی بات ہے تو میں خود ہی اپنا فیصلہ کر لُوں گی۔" ندرت نے کہا اور پاؤں پٹختی ہُوئی باہر نِکل گئی۔ اُسے جمن پر شدید غصّہ آیا تھا۔ اختر کے خلاف کارروائی کرنے کا ایک ذریعہ جمن ہی تھا۔ حالانکہ شنو نے اُس کے لئے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ جمن میں اور اختر میں

کبھی کوئی گڑبڑ ہوئی تو نُدرت اُس سے براہِ راست متاثر ہوگی لیکن جُوتے کی جو کارروائی اختر نے کی تھی۔ اُس کے بعد نُدرت کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اختر کو معاف کردے۔ لیکن جمن کے سلسلے میں اُسے مایُوسی ہُوئی تھی۔ اِس کا مقصد ہے کہ اختر اُس سے پہلے ہی جمن کے پاس پہنچ گیا تھا اور اُس نے صُورتِ حال ہموار کرلی تھی۔ دیکھوں گی اختر تم کتنے پانی میں ہو۔ اُس نے دانت پیستے ہُوئے کہا۔ اور پھر کسی دوسری کارروائی کے لئے پلاننگ کرنے لگی۔ اختر کو چھوڑ تو نہیں سکتی تھی وہ۔ دوسری طرف جمن نُدرت کے جانے کے بعد عجیب سے احساسات کا شکار ہوگیا تھا۔ اختر سے اُس کی جو بات ہُوئی تھی وہ کافی متاثر کرنے والی تھی۔ جمن نے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ اُس بیچارے سے۔ آخر مالک تھا۔ بلکہ مالک کے دوست کا بیٹا تھا۔ اگر اُس کی شکایت کردیتا تو آسانی سے جمن کی چلی پھری ہوجاتی۔ بھلا احسان صاحب یہ بات کیوں کر برداشت کرسکتے تھے لیکن اختر نے ایسا نہیں کیا تھا۔ بلکہ جمن کو پیار سے سمجھایا تھا کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہے۔ اب جمن دوہری کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔ ایک طرف تو نُدرت اور دوسری طرف اختر۔ کس کے بارے میں فیصلہ کرے۔ بہرطور اختر کے ساتھ یہ سلوک خطرناک بھی ہوسکتا تھا۔ جمن بے وقوف ضرور تھا لیکن اِتنا بھی نہیں کہ نُدرت کے کہنے سے فوراً ہی کوئی کارروائی کرڈالتا۔ اُس نے اختر سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ دوپہر کے کھانے پر اختر موجود تھا۔ اور جمن خود بھی ڈائننگ ہال ہی میں رہا تھا کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اختر جب باہر نکلا تو جمن بھی باہر نکل آیا۔

"وہ اختر بھائی! آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔"

"ہاں جمن! میں بھی تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ افسوس بڑے بدنصیب ہو۔ بڑی بُری قسمت لے کر پیدا ہُوئے ہو۔"

"کیوں اختر بھائی!"

"تم مجُھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ مجھے وقت تو دیں اختر بھائی! کہاں بات کروں آپ سے؟"

"دِل چاہے تو میرے کمرے میں آجاؤ۔"

"تھوڑی دیر کے بعد آؤں گا۔ ذرا اور لوگوں کو کھانا وغیرہ کِھلادُوں۔ امّاں کو کھانا پہنچادُوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمھارا انتظار کروں گا۔" اختر نے کہا۔

جمن تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اختر کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہُوا تھا۔ اُس نے دستک دی تو اختر نے اُسے اندر بُلالیا۔ اُس کے پاس ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہُوا تھا۔ جس پر ایک کیسٹ لگا ہُوا تھا۔ اُس نے جمن کو بڑے پیار سے بیٹھنے کی پیش کش کی۔

"نہیں اختر بھائی! ہم باورچی ہیں۔ ہمیں آپ کے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگے گا۔"

"بیٹھ جاؤ جمن! میں تمھیں جب دوست کی حیثیت دے چُکا ہُوں تو پھر ان باتوں میں کیا رکھا ہے: بیٹھو پلیز بیٹھ جاؤ۔۔" اور جمن بیٹھ گیا۔

"ہاں! تم مجُھ سے کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"وہ اختر بھائی! اللہ رکھی آئی تھی میرے پاس۔ اُس کا خیال ہے کہ آپ۔۔۔ آپ مسلسل اُس سے۔۔۔"

"ہُوں! اللہ رکھی وہ ہی لڑکی ہے نا جو ثناء بی بی کے ساتھ رہتی ہے؟"

"ہاں جی وہ ہی۔ بالکل وہ ہی۔"

"افسوس جمن! تم نے کبھی حالات پر غور ہی نہیں کیا۔ جب سے تم سے میری گفتگو ہُوئی۔ میں نے اِس بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کردیں۔ دوست اگر دوست کے کام نہ آئے تو پھر ایسی دوستی پر لعنت ہے۔"

"بالکل لعنت ہے۔" وہ جو کہتے ہیں تا۔ ہم کو تو دُنیا سے مطلب ہے۔ تم۔۔۔ میرا مطلب ہے دوستی سے۔ کوئی گانا تھا نا ایسا کسی فلم میں۔ یہ دوستی ہم نہ چھوڑیں گے۔"

"تمھیں فلموں کے گانے بہت یاد آتے رہتے ہیں۔ جمن!"

"ہاں جی! بس اپنی تعلیم یہیں تک ہے۔" جمن نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"لیکن میرے دوست! تم نے فلموں ہی میں اِس قسم کی کہانیاں نہیں دیکھیں کہ کوئی دولت مند کسی غریب کو بیوقوف بنا رہا ہو۔ جمن! تمھیں احمق بنایا گیا ہے۔ تمھاری پوری زندگی برباد کر دی گئی ہے۔ نُدرت ہے اُس لڑکی کا نام اللہ رکھی نہیں۔ کیا سمجھے۔"

"ہاں جی! سُنا تو ہم نے بھی ہے مگر ہم اُسے اللہ رکھی ہی کہتے ہیں۔"

"یہ صرف تمھیں بے وقوف بنانے کا ایک نام ہے جمن! ورنہ نُدرت ثناء کی دوست ہے۔ اور دولت سے کھیلتی ہے وہ ملازموں کے کوارٹر میں ضرور رہتی ہے۔ لیکن تم کیا سمجھتے ہو اگر وہ ثناء کے ساتھ رہنا چاہے تو کوئی اُسے کوٹھی میں رہنے سے منع کرسکتا ہے۔"

"پ۔۔۔ پتہ نہیں اختر بھائی!" جمن نے کچھ نہ سمجھتے ہُوئے کہا۔

"آہ جمن! میں تمھیں حقیقتوں سے رُوشناس کرنا چاہتا ہُوں۔ میں نے اِس سلسلے میں جہاں تک معلومات حاصل کی ہیں پہلے میں تمھیں اُن کے بارے میں بتادُوں۔ نُدرت نے یعنی اللہ رکھی نے تم سے محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ تمھاری ماں نے تمھارے ایماء پر اُس کا رشتہ اُس کی ماں کو دیا اور تمھاری ماں کو ذلیل کر دیا گیا۔ دو کوڑی کی عزت کردی گئی اُس شریف عورت کی جو صرف اپنے بیٹے

کا رشتہ مانگنے گئی تھی۔ کوڑی سمجھتے ہو؟" اختر نے رُک کر پُوچھا۔

"ایں۔ ہاں۔ کیوں نہیں؟ پچیسی کھیلنے والی۔ وہ پو بارہ۔۔"

"کیا کھیلنے والی؟"

"پچیسی کبھی نہیں کھیلے اختر بھائی؟"

"نہیں پیارے بھائی۔ یہاں مار کھا گیا لیکن کوئی بات نہیں تم کوڑی نہیں سمجھتے میں پچیسی نہیں سمجھتا بات برابر مگر آہ تمھاری ماں آہ"! اختر کی آواز رُندھ گئی۔ اور جمن گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہوگیا اماں کو؟" اُس نے وحشت سے پُوچھا۔ اور اختر غصیلے انداز میں اُسے گھورنے لگا۔ کمال کی چیز تھی اُس کے سامنے۔ بہرحال اُس وقت وہ جمن کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ نُدرت کی چال اُسی پر اُلٹنے کے لئے اِس سے بہتر موقع اُسے اور نہیں مِل سکتا تھا۔

آخر چند لمحات غصیلے انداز میں جمن کو گھورتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم اِتنے بے وقوف انسان ہو جمن کہ بعض اوقات تم پر رحم آتا ہے اور بعض اوقات سخت غصہ۔ تمھیں اِس کا اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ کون تمھارا دشمن ہے اور کون دوست۔ تمھاری ماں کو ابھی کچھ نہیں ہُوا لیکن اطمینان رکھو بہت جلد کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ وہ لڑکی تمھیں پُوری طرح قبضے میں کرچکی ہے اور اُس کی وجہ سے تم اپنی ماں کے بھی دُشمن ہوگئے ہو۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں جی! مگر اماں کا بھی قصُور تھا۔"

"سُنتے رہو۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہُوں سُنتے رہو۔ اُس کے بعد نُدرت تمھیں مُسلسل احمق بناتی رہی تم سے تعویذ گنڈے کرائے۔ کیا یہ غلط ہے؟"

"ن نہیں جی! مگر آپ کو کیسے معلوم؟"

"سُنتے رہو۔ صرف سُنتے رہو۔ درمیان میں بولو مت۔" اختر نے کہا۔

"جی جی۔۔۔"

"منطق کی رُو سے جمن! تمھیں پہلے ہی سمجھ جانا چاہیئے تھا۔ پھر نُدرت نے تمھیں مجبور کیا کہ تم شہاب صاحب کے کپڑے چُراؤ۔ اور اُنھیں پہن کر ایک پارٹی میں شریک ہو۔ کیوں یہ بات ہے نا؟"

"ہاں جی ہے۔"

"اور تم نے ایسا ہی کیا؟"

"کیا جی بالکل کیا۔"

"کیا اُس کے بعد شہاب صاحب نے تمھاری شدید بے عزتی نہیں کی تھی؟"

"کی تھی جی، کی تھی۔"

"پھر بھی تم نہیں سمجھے کہ یہ سب کچھ تمھیں ذلیل کرنے کے لئے تھا جمن! تمھیں ذلیل کرنے کے لئے۔"

"نہیں اختر بھائی! وہ بھی آپ کی طرف سے غلط فہمی کا شکار ہے۔ اور آپ کی بھی وہی کیفیت ہے۔"

"نہیں جمن! میں جو کام کرتا ہُوں۔ ٹھوس بُنیاد پر کرتا ہُوں۔ کیا سمجھے؟"

"ٹھ۔۔۔ ٹھوس۔ بُنیاد۔ وہ ہم نہیں سمجھتے جی۔" جمن نے کہا۔

"ٹھہرو! میں تمھیں سب کچھ بتاتا ہُوں۔ حقیقت حال تم پر واضح ہوجائے گی۔" اختر نے کہا اور اُس کے بعد اُس نے ٹیپ ریکارڈر آن کردیا۔ چند لمحات سرسراہٹ کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ پھر نُدرت کی آواز سُنائی دی۔

"اے ثنا! کیا کررہی ہو؟"

"کچھ نہیں! آؤ بیٹھو۔ کیا بات ہے؟"

"اُس بے وقوف جمن کے بارے میں کچھ کہنا ہے تم سے۔" نُدرت کی آواز اُبھری اور جمن اُچھل پڑا۔

"یہ، یہ، یہ۔۔۔"

"میں کہتا ہُوں خاموش رہو۔ سُنتے رہو۔" اختر نے اُسے ڈانٹا اور جمن خاموش ہوگیا۔

"کیوں اِس بیچارے جمن کے پیچھے پڑی ہو تم نُدرت! تم جانتی ہو غریب آدمی ہے۔ مارا جائے گا۔"

"میں چاہتی ہُوں کہ وہ مارا جائے۔"

"مگر کیوں؟ تمھیں اُس سے کیا دشمنی ہے؟"

"کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم خود سوچو۔ باورچی ہوکر مجھ سے شادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"مگر تم بھی تو اُس سے پیار کرتی ہو۔"

"پیار؟ کیسی بے وقوفی کی باتیں کررہی ہو۔ ثنا! میں بھلا اُس سے پیار کرسکتی ہُوں۔ وہ دو ٹکے کا آدمی۔ میں تو اُسے صرف بے وقوف بنا رہی ہُوں۔ تم نے دیکھا نہیں میں نے کس طرح اُسے شہاب صاحب کے ہاتھوں ذلیل کرایا اور کس طرح اُس کی دُرگت بنائی۔ وہ میرے لئے تفریح کا ایک ذریعہ ہے اور

اب جانتی ہو میں کیا کرنے والی ہوں؟"

"کیا کرنے والی ہو؟"

"جمّن کو اختر سے بھڑائے دیتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جمّن نوکری سے نکالا جائے۔" ندرت نے جواب دیا۔

"ارے نہیں نہیں، بے چارے کی نوکری کے کیوں پیچھے پڑی ہوئی ہو؟"

"بس مجھے اُس کی ماں سے بھی نفرت ہے اور اُس سے بھی۔ یُوں سمجھ لو، شنا کہ میں اُسے محبت کا جھانسہ دے کر بالکل ہی گدھا بنا دُوں گی۔" ندرت نے کہا۔

"اب یہ تمھاری مرضی ہے۔ لیکن اختر سے اُسے کیوں بھڑا رہی ہو؟"

"بس ذرا تفریح رہے گی۔ اختر اگر جمّن سے بھڑ جائے گا تو جمّن کو آسانی سے نکال دیا جائے گا۔ میں یہی چاہتی ہوں۔"

"تمھاری مرضی، میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ جمّن کے پاس جا رہی ہوں۔ اُسے اختر کے خلاف بھڑکاؤں گی۔"

آوازیں بند ہوگئیں۔ جمّن کے چہرے پر عجیب سی مُردنی چھا گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اختر کو دیکھ رہا تھا۔ اختر نے دوبارہ کیسٹ ریوائنڈ کیا اور پھر وہی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ تین بار یہ آوازیں سُنانے کے بعد اختر نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر سے نکال لیا۔ اور جمّن سے مخاطب ہُوا۔

"اور اِس کے بعد تم سے کچھ کہنا بیکار ہے جمّن۔ تم واقعی احمق ہو۔ کیوں بلا وجہ ایک ایسی شریر لڑکی کے چکر میں پڑ گئے۔ تمھیں تو خود سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ کسی طور تمھاری نہیں ہو سکتی۔"

"مم... میں میں۔ خوش... خوشی... مم... میرا مطلب ہے خودکشی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کُود کر خودکشی کر لی جاتی ہے میرا مطلب ہے آدمی مر جاتا ہے۔ گلے میں پھندا ڈال کر سڑک پر لیٹ کر... وہ، وہ..."

"تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں! اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

"بے وقوف ہو جمّن! دشمن سے بدلہ لینا چاہیئے۔ ایسا انتقام لینا چاہیئے کہ دُشمن بھی یاد کرے۔ اِس لڑکی نے تمھاری پُوری زندگی برباد کر دی۔ دیکھ لیا، سُن لیا تم نے اُس کی بات کو؟"

"ہاں سُن لیا۔ اور سوچ بھی لیا۔ سمجھ بھی لیا۔ یعنی کہ وہ جو کہتے ہیں نا کہ اے اللہ اب ہم کہاں جائیں۔" جمّن نے دردناک لہجے میں کہا۔ اور اختر کو بڑے زور سے کھانسی آگئی۔ درحقیقت اپنی ہنسی کو اُس نے کھانسی میں تبدیل کر لیا تھا۔ جمّن تھوڑی دیر غم زدہ بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے گردن جھٹکتے ہُوئے کہا۔

"لیکن ہم بھی مرد ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ وہ جو بے وفا نکلی۔ اُس کو بھول جانا ہی اچھا۔ ٹھیک ہے جی! وہ مالکوں کی دوست ہے اور ہم باورچی۔ آپ نے ہمارے اُوپر بڑا احسان کیا اختر بھائی کہ ہمیں اُس کی حقیقت بتا دی۔"

"عورت کی چال کو تم نہیں سمجھتے۔ میرے بھولے بھالے جمّن! وہ تمھیں اب بھی بے وقوف بنانے کی۔ مسلسل بے وقوف بناتی رہے گی۔ کیا سمجھے۔"

"ارے اُس کی ایسی تیسی۔ اگر تین نمبر میں اُس کا جینا نہ حرام کر دیا تو اپنا نام بھی جمّن نہیں ہے۔"

"سُنو! کھانا وانا خراب مت کرنا اُس کا۔ کیونکہ دوسرے بھی اُس کا شکار ہوں گے جو کچھ میں کہہ رہا ہُوں۔ وہی کرنا جمّن! صرف وہی۔"

"ٹھیک ہے جی بالکل ٹھیک ہے۔ اب ملے تو ہی ذرا وہ ہم سے۔ دیکھیں ہم اُس کا کیا حشر کرتے ہیں۔"

"نہیں! اُس کے خلاف بھی کوئی کارروائی مت کرنا ورنہ خواہ مخواہ شنا سے کہہ کر تمھیں نوکری سے نکلوا دے گی۔"

"ہاں جی! بس یہی تو پریشانی ہے۔ مگر آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ بڑا اچھا کیا۔ وہ جو ایک گانا ہے نا کسی فلم میں کسی شاعر کا۔ پتہ نہیں کیا گانا ہے؟ ٹھیک ہے اختر بھائی اب ہم چلتے ہیں۔ ہمارا دل آپ کی طرف سے صاف ہو گیا اور ہماری آنکھیں بھی کُھل گئی ہیں۔"

"وعدہ کرو جمّن کہ اب تم اللہ رکھی کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔"

"ہم تو اُدھر مُنہ کر کے تھوکیں گے بھی نہیں جی! اب دیکھتے جایئے آپ پیاز کے سارے چھلکے اگر تین نمبر میں نہ ہوں تو میرا نام بھی جمّن نہیں ہے۔"

"یہ ہُوئی نا بات۔ انتقام کا کوئی ایسا ہی طریقہ رائج ہونا چاہیئے۔ سُنو جمّن! تم یہ کام بآسانی کر سکتے ہو۔ میں تمھیں مسلسل گائیڈ کرتا رہوں گا۔"

"کیا کرتے رہیں گے جی؟" جمّن نے پُوچھا۔

"نہیں نہیں... میرا مطلب ہے سمجھاتا رہوں گا۔"

"السلام علیکم اختر بھائی! خدا حافظ۔" جمّن نے جھٹکے دار

لہجے میں کہا۔ اور باہر نکل گیا۔ اختر گہری سانس لے کر آسُودہ انداز میں مُنہ سے سیٹی بجانے لگا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

شام کے تقریباً ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ رُدا دفتر سے آچُکی تھی۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اختر نے پائیں باغ ہی سے اُسے دیکھا تھا۔ وہ پائیں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ دفعتاً اُسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور وہ چونک کر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم ہی اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ آنے والی نُدرت تھی۔ جس کا چہرہ لال بھبُو کا بنا ہُوا تھا۔ وہ اختر کے سامنے پہنچ گئی۔ اختر کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔

"خادمہ کو اللہ رکھی کہتے ہیں۔"

"خُوب کہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ بچپن میں، ایسے خوبصُورت نام کیسے رکھ لیتے ہیں جو عمر کی آخری منزل تک انسان سے چپکے رہتے ہیں۔ منطق کی رُو سے۔"

"میں ذرا مختلف قسم کی آدمی ہُوں۔"

"ہاں! عام طور سے اللہ رکھی قسم کے نام کسی عام لڑکی کے نہیں ہوتے۔"

"میں اِس بات کا بھی خیال نہیں کرتی کہ جو کچھ میں کر رہی ہُوں۔ اُس کے نتائج کیا ہوں گے۔" نُدرت نے غُصیلے انداز میں کہا۔

"چلیں کوئی خاص بات نہیں۔ عام طور سے خواتین... ناقصُ العقل ہوتی ہیں۔ منطق کی رُو سے۔"

"میں ساری منطق ٹھیک کر کے رکھ دوں گی۔ کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے۔"

"آپ نے ابھی ابھی سمجھایا ہے نا۔ آپ کا نام اللہ رکھی ہے۔ اِس کے علاوہ بھلا میں آپ کو اور کیا سمجھ سکتا ہُوں۔"

"آپ نے وہ جوتا اُس گڑھے میں کیوں دفن کیا تھا؟"

"جی! آپ صرف اللہ رکھی ہیں یا میرا مطلب ہے اُوپر سے کھسکی ہُوئی بھی ہیں۔"

"دیکھئے اختر صاحب! میری اور آپ کی حیثیت میں بڑا فرق ہے۔ بیشک آپ احسان صاحب کے بہت اچھے دوست کے بیٹے ہیں۔ پُروقار ہیں۔ باعزت ہیں۔ اور میں صرف ایک ڈرائیور کی بیٹی ہُوں۔ لیکن میری اپنی ذات میں اِنفرادیت ہے۔ ہم لوگ بھی اِتنے گئے گُزرے نہیں تھے۔

بس وقت نے ہمیں یہاں لا پھینکا ہے۔ لیکن اگر بات میری ذات تک پہنچی تو میں کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں کروں گی۔"

"کیا آپ بیٹھنا پسند کریں گی؟"

"نہیں۔"

"میرے کمرے میں آنا چاہیں گی؟"

"کیا مطلب ہُوا اِس بات کا؟"

"اگر یہ دونوں باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں تو میں آپ سے کوئی گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہُوں۔"

"آپ کو گفتگو کرنا ہوگی۔"

"میرا نام اختر ہے محترمہ اختر۔ کیا سمجھیں آپ؟ کیوں بلا وجہ مجھ سے بھڑ رہی ہیں۔ میں اگر اُنگلیاں ٹیڑھی کر دُوں تو..."

"ہاں ہاں! ہمیں یہاں سے نِکلوا دیں گے نا۔"

"اِنتہائی احمقانہ بات سوچی ہے آپ نے۔ بھلا دُشمنی میری

اور آپ کی ہے۔ معاملات دوسروں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ نہیں محترمہ! ایسی کوئی بات کبھی نہیں ہوگی۔ میرا اور آپ کا جھگڑا میری اور آپ کی ذات تک ہی رہے گا۔ ویسے اس جھگڑے کی ابتدا چونکہ آپ نے کی ہے اس لئے مجھے...“

”میں نے کی ہے جھگڑے کی ابتداء۔ پانچ نمبر میں کون گھسا تھا؟“

”اوّل تو آپ کی اُردو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جوتا گڈھے میں گاڑنے کا مسئلہ، پانچ نمبر میں گھسنے کا مسئلہ۔ میرا خیال ہے یہ تمام باتیں سرِ راہ نہیں طے ہونی چاہئیں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں آپ کو اپنے کمرے میں آنے کی۔ کسی بھی وقت تشریف لے آئیے میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”نہیں! میرا وہاں آنا ممکن نہیں ہے۔“

”تو میرا یہاں رہنا ممکن نہیں ہے۔ سمجھیں آپ۔“ اختر نے کہا اور واپسی کے لئے مُڑ گیا۔

نُدرت غصیلی نگاہوں سے اُسے گھورتی رہی تھی۔ لیکن پھر اُسی رات تقریباً ساڑھے دس بجے نُدرت چوروں کی طرح اختر کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اختر اُس کے استقبال کے لئے تیار تھا۔ نُدرت نے اندر قدم رکھا تو اختر کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہاں میری آمد میرے لئے خطرناک بھی ہو سکتی ہے لیکن آپ نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا اختر صاحب کہ میں بُزدل لڑکی نہیں ہُوں۔“

”یہ اندازہ تو میں بہت پہلے لگا چُکا تھا۔ دو لڑکیاں پانچ نمبر میں بھُوتوں کا ڈرامہ کریں اور اُنھیں بُزدل کہا جائے۔ توبہ توبہ۔“

”آپ نے تو کہا تھا کہ آپ پانچ نمبر کے بارے میں کچھ نہیں سمجھے۔“

”وہ اُس وقت کی بات ہوگی۔ میں اِس وقت کی بات کر رہا ہُوں۔“

”جمن سے آپ نے کیا کہا ہے میرے بارے میں؟“

”جمن نے آپ سے کیا کہا ہے آپ کے بارے میں؟“ اختر نے ترکی بہ ترکی سوال کیا۔ نُدرت ایک جھٹکے سے کُرسی پر بیٹھ گئی۔

”وہ بالکل ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھ سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ بات ہی نہیں کر رہا۔ اور اِس کی وجہ میں اچھی طرح جانتی ہُوں۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ سے اُس کی ملاقات ہُوئی ہے۔“

”ہاں ہاں! کیا میرا اُس سے ملنا مناسب نہیں تھا؟ آخر میں انسان ہوں۔ میں بھی جمن سے محبت کر سکتا ہوں۔ میرا بھی جمن پر دل آ سکتا ہے۔“

”آپ نے۔ آپ نے اختر صاحب! آپ نے براہِ راست مجھ پر حملہ کیا ہے۔“

”معاف کیجئے گا محترمہ! اگر میں آپ پر حملہ کرتا تو آپ کی یہ دونوں ٹانگیں آپ کی بغل میں ہوتیں اور آپ کی کھوپڑی آپ کے شانوں سے الگ پڑی ہوتی۔ کیا سمجھیں آپ؟ کس قسم کے حملے کی بات کر رہی ہیں؟“

”اختر صاحب! آپ آپ بہت...“

”بدتمیز ہُوں۔ یہی نا۔“

”کاش میں یہ الفاظ آپ سے کہہ سکتی۔“

”ذہن میں تو ہیں آپ کے؟“

”میرے ذہن میں تو بہت کچھ ہے۔ مجھے آپ بتایئے کہ میرا جوتا سمندر میں کہاں سے پہنچا تھا؟“

”آپ کا جوتا میرے پاس کہاں سے پہنچا تھا پہلے آپ اِس بات کا جواب دیجئے۔“ اختر نے کہا۔

”میں اُسے پانچ نمبر میں چھوڑ بھاگی تھی۔“

”سُبحان اللہ! بیچارے جمن کی کو پریشان کرنے کے لئے آپ نے ایک پلاننگ کی۔ اُس کے بعد جوتا چھوڑ بھاگیں۔ اب اگر وہ جوتا میرے ہاتھ لگ گیا تو اِس میں میرا کیا قصور۔ میں تو آپ کے کوارٹر میں نہیں گھُسا تھا آپ کا جُوتا چُرانے کے لئے۔“

”آپ نے وہ جوتا اپنے پاس کیوں رکھا؟“

”میں ذاتی سوالات کا جواب نہیں دیتا۔“ اختر نے کہا۔

”اور پھر آپ نے وہ جوتا گڈھے میں گاڑ دیا۔“

”اگر گڈھے سے تعویذ برآمد ہوتے تو بے چاری عارفہ بلاوجہ پریشان ہوتیں۔ میں نے عارفہ کا ساتھ دیا تھا۔“

”ہُوں! تو آپ اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں؟“

”سو فیصدی کرتا ہُوں۔ کیا بُزدل سمجھا ہُوا ہے آپ نے مجھے۔“

”لیکن آپ نے۔ آپ نے جمن سے کیا کہا آخر؟“

”محترمہ نُدرت! کیا آپ کو اِس بات کا حق پہنچتا ہے کہ آپ ایک معصوم سیدھے سادے باورچی کو بے وقوف بنائیں۔“

”میں کہتی ہُوں آپ کو ان باتوں سے کیا غرض؟“

”غرض ہے کیونکہ میں بھی اِسی کوٹھی میں موجود ہُوں۔“

”لیکن آپ مہمان ہیں۔“

”تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مہمانوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جس جگہ رہیں وہاں کے ماحول کو پُرسکون رکھیں۔“

”آپ یہ تو بتایئے کہ آپ نے آخر جمن سے کیا کہا؟“

”کیا آپ جمن سے واقعی محبت کرنے لگی ہیں؟“

”لعنت ہے آپ پر۔“ نُدرت کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

”شکریہ شکریہ! ویسے منطق کی رُو سے یہ الفاظ شکست کا مظہر ہوتے ہیں۔“ اختر نے کہا۔

نُدرت غصّے میں یہ الفاظ کہہ تو گئی تھی لیکن ایک لمحے میں اُس کے حواس ٹھکانے آ گئے تھے۔ یہ جملے بہت سخت تھے۔ لیکن اختر نے اُن کا بُرا نہیں مانا تھا۔ نُدرت کے مُنہ سے اُس کے بعد کوئی آواز نہ نکل سکی۔ دفعتاً اختر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے ٹیپ ریکارڈر سامنے رکھا اور پھر اُس میں وہ کیسٹ لگا دیا جو اُس نے جمن کو سُنایا تھا۔ دونوں آوازیں اُبھرنے لگیں۔ نُدرت کی آنکھیں شدّتِ حیرت سے پھیل گئیں۔ جب یہ آوازیں ختم ہُوئیں تو اُس نے روہانسے انداز میں چیختے ہُوئے کہا۔

”غ... خُدا کی قسم۔ یہ جملے۔ یہ جُملے! میں نے اور ثنا نے کبھی یہ گفتگو نہیں کی۔“

”تو میں کب کہتا ہُوں کہ یہ گفتگو آپ لوگوں نے کی ہے۔“

”تو پھر یہ میری آواز، ثنا کی آواز؟“

”خادم کو کیا سمجھتی ہیں آپ محترمہ نُدرت! کیا عبدالجلیل جن! میرا مطلب ہے۔ اُس کے ساتھ ساتھ دوسری آوازیں آپ نے اُن پر غور نہیں کیا؟“

”اختر! اختر! آپ... آپ...“

”جی ہاں! صرف میں ہُوں۔ اور کوئی بھی شرارت کسی بھی جگہ میری ہدایات کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ محترمہ نُدرت! تربیت لیجئے آپ مجھ سے۔ اُستاد مان لیجئے اور اِسی میں آپ کی عافیت ہے۔“

”ذرا ایک بار پھر مجھے یہ آوازیں سُنایئے۔“ نُدرت نے کہا اور اختر نے دوبارہ ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ کیسٹ ریوائنڈ کر کے اُس نے یہ آوازیں پھر سُنائیں۔ دوسری اور تیسری بار یہ آوازیں سُننے کے بعد نُدرت نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”خُدا کی قسم میں نے یہ گفتگو کبھی نہیں کی۔ یہ میری آواز جیسی ضرور ہے لیکن میری نہیں ہے۔“

”میں آپ سے کہہ رہا ہُوں کہ یہ آپ کی آواز نہیں ہے اور نہ ہی ثنا کی آواز ہے۔“

”تو پھر کس کی آواز ہے یہ؟“

”میری۔“

”آپ کی؟“

”ہاں محترمہ نُدرت! صرف میری۔“

”اختر! خُدا کے واسطے۔ خُدا کے واسطے سچ بتا دیجئے۔“

”کمال کی بات ہے۔ کیا آپ اب میرے مُنہ سے اپنی آواز سُننا چاہتی ہیں؟“

”ہاں...!“

”تو پھر بتلایئے کہاں سے شروع کروں؟ طفیلی بیگم کے واقعے سے یا کہیں اور سے؟ اور ویسے بھی ثنا آپ کی گہری دوست ہیں۔ ثنا کے اور آپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سُناؤں آپ کو؟“ اختر نے نُدرت کی آواز میں کہا اور اُس کے بعد وہ نُدرت اور ثنا کی آواز میں بولنے لگا۔ سوال و جواب ہو رہے تھے۔ اور نُدرت کی پھٹی پھٹی آنکھیں اختر پر جمی ہُوئی تھیں۔ جب اختر خاموش ہُوا تو نُدرت قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”ٹھیک ہے۔ یہ بھی میری خوبی ہے اختر صاحب! کہ اگر کبھی کسی سے شکست مانتی ہُوں تو اُس کا اعتراف کر لیتی ہُوں۔“

”تو پھر اعتراف کر لیجئے آپ کی جان بچ جائے گی۔“

”کبھی نہیں ہُوا زندگی میں۔ خُدا کی قسم کبھی نہیں ہُوا۔ لیکن چلئے آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ آیئے دوستی کر لیں۔“

اختر نے ایکدم ہاتھ بڑھا دیا اور نُدرت نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اختر کے ہاتھ کا لمس بہت عجیب سی کیفیت رکھتا تھا۔ نُدرت کا بدن ایک لمحے کے لئے کانپ گیا۔ بے تکلفی سے اُس نے اپنا ہاتھ اختر کے ہاتھ میں تو دے دیا تھا لیکن جب اُس نے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تو اختر کی گرفت اُس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی۔

”قدیم روایات ہیں کہ اگر کوئی لڑکی اپنی مرضی سے اپنا ہاتھ کسی نوجوان کے ہاتھ میں دے دے تو پھر اُس پر بہت سی ذمّے داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔“

نُدرت نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اختر کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ اُس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اُسے احساس ہُوا تھا کہ وہ لڑکی ہے اور اُس کے سامنے کوئی نوجوان کھڑا ہُوا ہے۔

"اچھا میں چلتی ہُوں۔"

"شکریہ، خُدا حافظ۔" اختر نے جواب دیا اور نُدرت لڑ کھڑاتے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اُس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اور اختر مُسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

ثنا، خالد کو پسند تھی۔ حالانکہ وہ کسی قدر سنجیدہ فطرت کا مالک تھا۔ اور ثنا، شوخ و شریر۔ لیکن ثنا، کی ذات میں کچھ ایسی خوبیاں بھی پوشیدہ تھیں جو خالد کو بے حد پسند آئی تھیں۔ اِس کے علاوہ بھی شادی کے سِلسلے میں اُس نے اپنے طور پر بہت سے نظریات قائم نہیں کئے تھے۔ بلکہ اگر کبھی سوچا بھی اِس بارے میں تو یہی فیصلہ کیا کہ ایسے مسئلے اگر والدین نمٹالیں تو زیادہ آسان ہوتے ہیں۔ اِس طرح اُن کی خوشیاں بھی برقرار رہتی ہیں اور اُن کے والدین ہونے کا مان قائم رہتا ہے۔ اور انسان کی اپنی پرکھ کا بھی امتحان نہیں ہوتا۔ عورت اگر فطرتًا بہتر ہے تو بیوی بننے کے بعد شوہر کی پسند کے مطابق ایڈجسٹ ہو ہی جاتی ہے۔ خواہ کوئی بھی ہو۔ اگر آپ اپنے طور پر اُس میں خوبیاں تلاش کرنے کے لئے نِکلیں تو ظاہر ہے کوئی بھی اپنے آپ کو مختصر وقت میں دوسرے کے سامنے نہیں کھول دیتا۔ ثنا، کے سِلسلے میں اختر سے خالد نے اپنی پسند کا اظہار کر دیا تھا۔ لیکن اِس لئے کوئی شک نہیں تھا کہ خود ثنا، کا نظریہ خالد کو کسی بھی طور نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ بارہا اُس نے ثنا، کی قُربت حاصِل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور دل میں سوچا تھا کہ اگر ایک بار وہ تنہائی میں مِل جائے تو اُس سے اُس کے دل کا حال پُوچھے۔ لیکن ثنا، ایک چھلاوہ تھی۔ کبھی مِلتی بھی تو اِس طرح کہ خالد کی جُرأت ہی نہ ہو پاتی۔ دوسری طرف اختر تھا کہ اُس کی جان کھائے ہُوئے تھا۔ اور کئی بار کہہ چُکا تھا کہ آخر وہ اپنے والد کو خط لکھے تو کیا لِکھے۔ خالد کی پسند کا اظہار کر دے یا... ناپسندیدگی کا۔ اور ایسے لمحات میں خالد کو اُس سے مُہلت طلب کرنی پڑتی تھی۔ بالآخر ایک دن اختر نے خود ہی یہ مسئلہ حل کیا۔

خالد عقبی باغ کے ایک گوشے میں فوّارے کے نزدیک بیٹھا ہُوا تھا کہ ثنا، اختر کو مِل گئی۔ تیمور کو گود میں اُٹھائے یونہی آوارہ گردی کے انداز میں نِکلی تھی کہ اختر نے بڑے دست بستہ انداز سے اُسے سلام کیا۔ ثنا، اختر کے بارے میں زیادہ اچھے خیالات نہیں رکھتی تھی۔ چُنانچہ اُس نے تیکھی نِگاہوں سے اختر کو دیکھا۔ اور اختر جلدی سے بولا۔

"آپ یہاں موجود ہیں ثنا، صاحبہ! اور وہاں آپ کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ براہِ کرم جلدی پہنچئے۔ ورنہ نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"کہاں؟" ثنا، بے اختیار بولی۔

"اُرے بھئی باغ میں فوّارے کے نزدیک۔ پلیز آپ اُدھر جائیے۔" اختر نے کہا۔ اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ ثنا، اُسے دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار پائیں باغ کے قریب پہنچ گئی۔ فوّارے کے نزدیک اُس نے خالد کو بیٹھے ہُوئے دیکھا تھا پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اور اُس کے بعد آہستہ آہستہ خالد کے قریب پہنچ گئی۔

"کیا ہو گیا آپ کو؟ کیا بات ہے؟" ثنا، کی آواز سُن کر خالد چونک پڑا تھا۔ اُس نے حیرت سے ثنا، کو دیکھا۔ اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"وہ آپ کے بھائی صاحب مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ یہاں مجھے تلاش کیا جا رہا ہے۔ اور اگر میں نہ پہنچی تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ دیکھئے مسٹر خالد! اِس شخص کو سمجھا لیجئے۔ میں آپ لوگوں کا بڑا احترام کرتی ہُوں۔ خاص طور سے اِس لئے کہ آپ ڈیڈی کے دوست کے بیٹے ہیں لیکن شرارتوں میں مَیں خود سے آگے کسی کو نہیں دیکھ سکتی۔ یہ اختر صاحب آگے بڑھ رہے ہیں۔"

"اوہ... ثنا، آئیے! ویسے آپ نے اِس دوران دل شکنی کے بہت سے انداز اختیار کر لئے ہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہُوں کہ اُن کی مشق بھی کی ہے۔ آپ صرف اِس لئے میرا احترام کرتی ہیں کہ میں آپ کے ڈیڈی کے دوست کا بیٹا ہُوں۔ حالانکہ اِس سے پہلے ثنا! ہم کافی عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہ چکے ہیں۔"

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ مگر اِن الفاظ میں آپ کے لئے بے عزّتی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ بس اختر! وہ نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ اُن کی شرارتیں۔"

"وہ اختر کا اور آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اپنے طور پر آپ سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتا تھا ثنا، صاحبہ۔"

"تو کیا آپ نے مجھے یہاں بُلایا تھا؟" ثنا، نے سوال کیا۔

"نہیں! یہ اختر ہی کی شرارت تھی۔ لیکن میں چاہتا ضرور تھا کہ آپ سے کسی وقت تنہائی میں ملاقات ہو۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بال بچّوں والی عورت ہُوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ تیمور ہی میرا پیچھا کہاں چھوڑتا ہے بھلا تنہائی میں کسی سے کیسے مِل سکتی ہُوں۔ اگر کوئی کام ہے تو جلدی سے بتا دیجئے۔ مجھے تیمور کے لئے کچھ چیزیں بازار سے

منگوانی ہیں۔" خالد نے گہری نِگاہوں سے ثنا، کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"میرا خیال ہے میں چند روز کے اندر یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔"

"اللہ آپ کو خیریت سے لے جائے۔ میرے لئے کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔"

"ہاں ایک خدمت تھی آپ کے لئے ثنا، ظاہر ہے یہ بچّہ آپ کا نہیں ہے۔ اور آپ اپنے آپ کو بال بچّوں والی کہہ کر کم از کم مجھے احمق نہیں بنا سکتیں۔ ڈیڈی نے درحقیقت اِس ہم دونوں کو یہاں بھیجا تھا کہ ہم آپ سے ملاقات کر لیں۔ اور ڈیڈی میری اور آپ کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور شاید اِن صاحب سے بھی اِس بارے میں کوئی گفتگو ہو چکی ہے کم از کم میں اپنی حد تک وہی کروں گا جو میرے ڈیڈی کی خواہش ہوگی۔ آپ کے بارے میں نہیں جانتا کہ شادی کے سِلسلے میں آپ کا کیا نظریہ ہے۔ لیکن ثنا، میں آپ سے یہ سوال چاہتا تھا۔ یہاں سے جانے سے پہلے یہ ضرور پُوچھنا چاہتا تھا کیا آپ اِس شادی کو پسند کریں گی؟ یہ سوال میں صرف اِس لئے کرنا چاہتا ہُوں ثنا، کہ درحقیقت مجھے آپ کے خیالات معلوم ہو جائیں ہمارے درمیان عِشق نہیں ہے۔ ہم ایک سادہ سی گفتگو کر رہے ہیں۔ اِس میں صاف گوئی زیادہ بہتر رہتی ہے۔ اگر آپ اِس چیز کو ناپسند کریں گی تو آپ یقین کیجئے کہ میں آپ کا نام نہیں آنے دُوں گا۔ خود ہی اِس سے اِنکار کر دوں گا۔" ثنا، خالد کی اِس صاف گوئی پر بھونچکی رہ گئی تھی۔ وہ عجیب سی نِگاہوں سے خالد کو دیکھ رہی تھی۔ تیوریاں چڑھی ہُوئی تھیں۔ اور انداز ایسا ہی تھا جیسے خالد کے بجائے کوئی عجوبہ اُس کے سامنے ہو۔ پھر اُس نے شانے ہلاتے ہُوئے کہا۔

"عجیب بات ہے۔ میں کیا جواب دُوں اِس بات کا؟"

"بس ثنا،! جتنی صاف گو آپ ہیں اور جتنی بے تکلّفی سے ہر بات کہہ دیتی ہیں۔ میں اِس وقت بھی آپ سے اُسی بے تکلّفی کی توقع رکھتا ہُوں۔"

"اَرے مگر مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ دیکھئے نا میرا بچّہ ہے۔ اِس کی دیکھ بھال اِس کی پرورش کرنی ہوگی مجھے۔ میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں اِس بارے میں۔ اور ایک بات بتاؤں۔ ایک آدمی میرا شکار جلد از جلد ہونے والا ہے کیونکہ اُس کے ذہن میں مجھ سے شادی کا سودا سمایا ہے۔"

"کیا وہ میں ہُوں؟" خالد نے مُسکرا کر پُوچھا۔

"نہیں نہیں! آپ کے بارے میں تو ایسی بات اِس سے پہلے میرے علم میں کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ رشید ہے۔ وہ کمبخت بڑ مچّل۔ جس کی شکل دیکھ کر غصّہ تو آ سکتا ہے۔ اُس سے شادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مگر خالد صاحب! آپ ایک بات بتائیے۔ آپ کے ڈیڈی کیوں چاہتے ہیں کہ آپ کی شادی مجھ سے ہو جائے؟"

"اِتفاق سے میں ڈیڈی سے یہ بات نہیں پُوچھ سکا۔"

"آپ کو پُوچھ لینا چاہئے تھی۔"

"کبھی اُن کا موڈ بہتر پایا تو آپ کی خواہش پر ضرور پُوچھ لُوں گا۔ لیکن آپ نے اِس سِلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا۔"

"آپ یقین کیجئے مجھ پر۔ بائی گاڈ میں نے شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ بلکہ ایک طرح سے غصّہ آتا ہے یہ تصور کر کے کہ ایک آدمی کو اپنی ذات پر مسلّط کر لو۔ وہ تم پر بیٹھ کر حکم چلائے۔ اور خواہ مخواہ تمہیں اُس کی ہر بات ماننی پڑے۔ میں دُلہن بھی نہیں بننا چاہتی۔ کیونکہ دُلہن کے اُوپر جو بے تُکی چیزیں لاد دی جاتی ہیں۔ وہ مجھے قطعی ناپسند ہیں۔ وقتی طور پر اچھی ضرور لگتی ہے مگر بے وقوف لگتی ہے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے آپ نے کبھی کسی دُلہن کو دیکھا ہے؟"

"نہیں! لیکن دیکھنے کی آرزو ضرور ہے۔" خالد نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"تو ابھی جانے کی جلدی کیا پڑی ہے آپ کو۔ ذرا رُک جائیے۔ اب کے جہاں بھی کہیں شادی ہُوئی آپ کو ضرور لے جاؤں گی۔ ذرا آپ دیکھ کر مجھے بتائیں۔ دُلہن بنی ہُوئی لڑکی اچھی خاصی احمق لگتی ہے۔ بالکل ہی بے وقوف۔"

"بہرطور ثنا،! میرا یہ سوال آپ پر قرض ہے۔ اگر آپ مجھے جواب دے دیں گی تو میں زیادہ خوش ہو کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"اور اگر وہ جواب نہیں میں ہُوا تو...؟" ثنا، نے پُوچھا۔

"یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے ثنا،! ظاہر ہے آپ کا جواب آپ کے ہونٹوں سے نِکلے گا۔ کوئی آپ کو اِس کے لئے مجبور تو نہیں کر سکتا۔"

"ہُوں! ذرا سوچنے کی بات ہے خالد صاحب! ویسے سچ ایک بات آپ ذہن نشین کر لیجئے۔ وعدہ کر رہی ہُوں۔ میں شادی نہیں کروں گی۔ اور اگر کبھی مجھے اِس کے لئے بہت

زیادہ مجبور کیا گیا تو پھر آپ سے شادی کر لوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اب میں جاؤں؟" ثنا نے کہا۔

خالد کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے عجیب سا تاثر پیدا ہُوا تھا۔ ثنا کی یہ نرم روی واقعی شاید خود ثنا کے لئے بھی حیرت انگیز ہو۔ لیکن خالد کو اُس میں نہ جانے کیا کچھ نظر آیا تھا۔ ثنا وہاں سے چلی گئی۔ اور خالد مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ پھر وہ اُسی بینچ پر بیٹھا جس پر تھوڑی دیر قبل بیٹھا ہُوا تھا۔ اور ثنا کو رُخصت کرنے کے لئے اُٹھ گیا تھا تو دفعتاً ہی اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کے نیچے کوئی مینڈک آ گیا ہو۔ مینڈک کی ٹرٹراہٹ سُنائی دی۔ اور خالد اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن پھر فوراً ہی اُس کی گردن گھومی اختر تھوڑے فاصلے پر موجود تھا۔ لکھنوی انداز میں خالد کو سلام کرتے ہُوئے بولا۔

"مُبارک ہو حضور، سلامت ہو۔ اللہ جوڑی بنائے رکھے۔ یہ آتش فشاں بیگم جس نرم روی سے آپ سے وعدہ کر کے گئی ہیں کہ اگر اُنھیں شادی کے لئے مجبور کر ہی دیا گیا تو وہ اطمینان سے آپ سے شادی کر لیں گی۔ اِس سے آپ کی تقدیر کے روشن ہونے کا ثبوت مِلتا ہے۔ بس اِن کا اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کیونکہ اِس سے پہلے کوئی خوش نصیب ایسا نہیں تھا۔ جس سے اُنھوں نے سیدھے مُنہ بات کی ہو۔ کیا سمجھے آپ؟"

"بدمعاش آدمی! تم مجھے بھی نہیں چھوڑتے۔"

"منطق کی رُو سے آپ کے سوا میرا اِس دُنیا میں ہے ہی کون۔ آپ کو بھی چھوڑ دُوں تو پھر کہاں جاؤں گا؟"

"میرا مطلب ہے یہ مینڈک کی آواز؟"

"یہ تو اختر کی آمد کا نشان ہے۔ آپ اِسے اپنا ٹریڈ مارک سمجھ سکتے ہیں۔" اختر نے شانِ بے نیازی سے کہا۔ اور خالد نے اُسے پکڑ کر اُس کی پُشت پر گھونسہ رسید کر دیا۔ ویسے خالد کے چہرے پر مسرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ثنا نے جس طرح اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا وہ بڑی حیثیت رکھتا تھا شاید تھوڑی دیر قبل خود اُس کے اپنے ذہن میں بھی نہ ہو کہ اُسے اِس بات کا کیا جواب دینا ہے۔

▼

رشید کی شہاب صاحب سے خوب گھُٹ رہی تھی۔ اور بات رشید کے تصوّر سے کہیں آگے پہنچ چکی تھی۔ شہاب صاحب نے رشید کا اکاؤنٹ کھُلوا دیا تھا۔ اِس اکاؤنٹ کی پاس بُک خود شہاب صاحب کے پاس تھی۔ اور چیک بُک لی ہی نہیں گئی تھی۔ رشید کو بڑی بڑی رقمیں اپنے اکاؤنٹ میں ڈالنے کے لئے ملتیں۔ بہت سے چیک اُس کے نام پر جمع ہونے لگے تھے۔ اِس کے علاوہ اُسے اپنے ذاتی اخراجات کے لئے عظیم الشان رقمیں مِل جاتی تھیں۔ بہت سے ایسے معاملات تھے جن کے بارے میں رشید کچھ جانتا بھی نہیں تھا۔ لیکن شہاب صاحب اُس کے رہنما تھے۔ اُنھوں نے رشید کی زندگی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آہستہ آہستہ وہ اُس کی زندگی بنا رہے تھے۔ رشید اب باقاعدگی سے اُس عمارت میں جانے لگا تھا۔ جہاں شہاب صاحب کا کاروبار ہوتا تھا۔ کئی بار اِس عمارت میں مختلف لوگوں سے رشید کی ملاقات بھی کرائی گئی تھی۔ اور اِس ملاقات میں جو گفتگو ہوتی، وہ رشید کی اپنی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھی۔ لیکن سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شہاب صاحب اُسے بہت بڑا آدمی بنانے کا وعدہ کر چکے ہیں اور اِنہی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اِس دوران رَدا بھی زیرِ بحث رہتی تھی۔ رشید نے بہت کھُل کر شہاب صاحب سے اِس بارے میں گفتگو کی تھی۔ اور یہ تک بتا دیا تھا کہ اُس کے اپنے ذہن میں رَدا ہے۔ لیکن اُس کی ماں احمقانہ انداز میں سوچ رہی ہے۔ اور اُس کا خیال ہے کہ اگر ثنا سے اُس کی نسبت ہو جائے تو یہ بہت اچھا رہے گا۔ شہاب صاحب پر اندرونی طور پر اِن الفاظ کا کیا ردِعمل ہُوا۔ یہ تو رشید نہیں جان سکا لیکن چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُنھوں نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا تھا۔

"خیر کسی جاہل آدمی کی سوچ کو ہم اُس کے ذہن سے نہیں نکال سکتے۔ یہ تصوّر بھی احمقانہ ہے کہ ثنا تم سے منسُوب ہو گی لیکن میرے خیال میں رشید، رَدا، ثنا سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ ایک مکمل اور حسین تخلیق۔ بہتر تو یہ ہو گا کہ تم رَدا ہی کو ذہن میں رکھو۔ ایک بچّے کی ماں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پتہ نہیں کن حالات کا شکار ہے۔ اور پھر اُسے قابو میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔ میں اِس بات کا وعدہ کر سکتا ہُوں تم سے کہ رَدا کو تم سے منسُوب کرا دوں۔ اور کچھ عرصے کے بعد رَدا بھی اپنی اِس خوش بختی پر ناز کرے گی۔ کیونکہ مستقبل میں تم بے شمار افراد سے کہیں اچھی حیثیت کے مالک ہو گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شہاب بھائی! لیکن یہ ثاقب کیا چیز ہے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ رَدا کا شوہر نہیں ہو سکتا؟"

"لگتا کچھ ایسا ہی ہے۔ کسی حادثے کے تحت رَدا اپنی عمر سے کہیں بڑی عمر والے شخص کے ساتھ منسُوب ہو گئی۔ لیکن اُس

کے بعد رَدا نے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اب ثاقب اُسے صرف اِسی بات کے لئے بلیک میل کر رہا ہے کہ وہ کسی کو یہ بات نہ بتائے کہ وہ رَدا کا شوہر ہے۔ کچھ اُلجھا ہُوا معاملہ ہے مگر یہ ثاقب مر کہاں گیا؟"

"پتہ نہیں! ہر اُس جگہ تلاش کر چکا ہُوں اُسے جہاں اُس کے ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ شہر ہی چھوڑ کر چلا گیا۔"

"اور اُس کے شہر چھوڑ کر چلے جانے کی وجہ؟" شہاب صاحب نے پُوچھا۔

"اللہ جانے۔ ویسے یہ رَدا بڑی پُراسرار شخصیت کی مالک ہے۔ میں نے کئی بار اُس سے ملنے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی نہ کوئی ایسا اَڑنگا اَڑ جاتا ہے کہ میری اُس سے بات چیت ہی نہیں ہو پاتی۔"

"ہُوں! بہرحال رشید، وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو تمہارے لئے پریشانی کا باعث ہو۔ ایک عورت حیثیت ہی کیا رکھتی ہے۔ تم اگر اُسے پسند کرتے ہو تو یہ میرا فرض ہے کہ میں تمھیں اُس کا حصول آسان بنا دُوں۔ فی الحال کام کی جانب توجہ دو۔ میں تمھارے لئے ایک ایسی مصروفیت منتخب کر رہا ہُوں۔ جس کی تکمیل کے بعد تم رشید سیٹھ ہو گے۔ ویسے بے شمار لوگ اب تمھیں رشید سیٹھ کے نام سے جانتے ہیں اور فرینڈز آرگنائزیشن کا ایک بہت بڑا حصہ تمھارے نام ہو چکا ہے۔"

"یہ فرینڈز آرگنائزیشن کیا ہے؟" رشید نے سوال کیا۔

"جو کچھ بھی ہے۔ تمھیں بہت جلد اُس کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ ہانگ کانگ جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"کہاں؟" رشید اُچھل پڑا۔

"ہانگ کانگ۔"

"میں نے ہانگ کانگ کی بڑی کہانیاں سُنی ہیں شہاب بھائی! لیکن کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں خود وہاں تک جا سکوں گا۔"

"کیوں؟ یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔ ہانگ کانگ جانا ویسے تو بہت آسان ہے۔ لیکن اب تم جب ہانگ کانگ جاؤ گے تو تمھاری حیثیت ہی بدلی ہُوئی ہو گی۔ وہاں بے شمار افراد تمھارا استقبال کریں گے۔ اور رشید سیٹھ کی حیثیت سے تمھیں بہت بڑا مقام دیا جائے گا۔"

"مگر مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہو گا؟"

"کچھ نہیں چند کاغذات سائن کرنا ہوں گے۔ اور کچھ فائلیں یہاں سے لے جانی ہوں گی۔ جن کے بارے میں میں تمھیں تفصیلات بتا دُوں گا۔"

"اور آنے جانے کے اخراجات؟"

"کیا احمقانہ گفتگو کر رہے ہو رشید! اخراجات بھلا کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ سارا انتظام فرینڈز آرگنائزیشن کرے گی۔"

"تو پھر میں کب جا رہا ہُوں وہاں؟"

"اِس سلسلے میں تمھیں بہت جلد اطلاع دے دی جائے گی۔ بس اپنے آپ کو مضبوطی سے اپنے پروگرام پر قائم رکھو۔"

"میں بھلا کب انکار کر سکتا ہُوں شہاب بھائی! آپ نے مجھ ناچیز ذرّے کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔"

"اب تم ناچیز ذرّہ نہیں، بہت کچھ ہو۔ میں تم سے اِس کا وعدہ کر چکا ہُوں۔" شہاب صاحب نے کہا۔ رشید مسرُور ہو گیا تھا۔ موضوع پھر تبدیل ہُوا۔ اور رَدا زیرِ بحث آ گئی۔ شہاب صاحب نے بُرا سا مُنہ بناتے ہُوئے کہا۔

"کوئی مسئلہ ہی نہیں یار! اُس بے وقوف شخص سے رَدا کے لئے طلاق نامہ حاصل کر لینا مشکل کام نہیں ہو گا۔ پیسوں کا کُتا ہے۔ ایک آدھ لاکھ رُوپے اُس کو دے دیئے گئے تو وہ ایک لاکھ بار بھی رَدا کو طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ بچے کو کسی یتیم خانے میں داخل کرا دینا۔ مسئلہ ہی نہیں رہتا کوئی۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔" رشید نے کہا۔ گھر واپس آیا تو پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی ماں تو بے وقوف ہے۔ ظاہر ہے ثنا کا مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تصوّر ذہن سے نکال دینا چاہیئے کہ وہ احسان صاحب کا داماد بن سکتا ہے۔ ماں کو یہ سنک لگی ہُوئی تھی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس دن بھی ذکیہ بیگم کے سامنے بات ڈالیں گی۔ ٹکا سا جواب مِل جائے گا۔ اور خود بخود درست ہو جائیں گی۔ چنانچہ اُسے اِس چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ اب اگر طفیلی بیگم اُس سے ثنا کا تذکرہ بھی کرتیں تو وہ اِس موضوع کو کبھی کا مٹا نہیں تھا۔ اُس کی اپنی ذات ہی اب اِتنی بلند ہوتی جا رہی تھی کہ وہ بھلا کسے خاطر میں لاتا۔ اُس نے اپنی دانست میں وہ جگہ تلاش کر لی تھی جس کی اُسے جستجو تھی۔ تقریباً ایک ہفتے تک شہاب صاحب کاروباری اُمور میں مصروف

ہے۔ اور پھر ایک دن اُنھوں نے رشید سے کہہ دیا کہ کل شام کی فلائیٹ سے ہانگ کانگ روانہ ہو جانا ہے۔ شام کو سات بجے اُس کا جہاز پرواز کر جائے گا۔ چار بجے اُسے اُسی عمارت میں پہنچ جانا چاہیئے۔ جہاں اُن کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ رشید نے طفیلی بیگم کو بتایا تھا کہ وہ ایک ضروری سلسلے میں چند روز مصروف رہے گا۔ جس کی وجہ سے شاید گھر پر بھی نہ آسکے۔ طفیلی بیگم نے اِس کے بارے میں سوال کیا تو رشید نے پانچ ہزار روپے اُن کے ہاتھ پر رکھتے ہُوئے کہا کہ اِس سوال کا جواب یہ ہے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر تو طفیلی بیگم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئی تھیں۔

"یہ ... یہ ..."

"اماں! کہا تھا نا تجھ سے ایک دن کچھ بن کے دکھاؤں گا۔ بس دُعا کرتی رہ میرے لئے۔ جب تو ُشتا سے میری شادی کی بات کرے گی نا۔ تو کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔ میں اِسی کے لئے کوشش کر رہا ہُوں۔" طفیلی بیگم تو پانچ ہزار روپے کے نوٹوں کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ اِس کے بعد بھلا رشید سے کیا پُوچھتیں۔ پُروگرام کے مطابق رشید چار بجے وہاں پہنچ گیا --- دو افراد کو اُس کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ جن سے شہاب صاحب نے اُس کی ملاقات کرادی۔ اور اُس کے بعد شہاب صاحب نے رشید کو تمام تفصیلات بتائیں کہ اُسے ہانگ کانگ جا کر کیا کرنا ہے۔ کس سے ملنا ہے۔ یہ دونوں آدمی اُس کے خُفیہ مُعاون تھے۔ جنھیں بظاہر اُس کے ساتھ نہیں رہنا تھا لیکن اُسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ ایک ایک لمحہ اُس کی نگرانی کریں گے اور اُسے کسی مُصیبت میں نہیں پھنسنے دیں گے۔ رشید بہت مطمئن تھا۔ خود بھی اِسی فطرت کا مالک تھا۔ اور یہ تمام کام اُس کی مرضی کے مطابق تھا۔ زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا تھا۔ چنانچہ تمام ہدایات لینے کے بعد وہ خوشی خوشی ایئرپورٹ چل پڑا۔ شہاب صاحب نے اُسے یہیں خُدا حافظ کہہ دیا تھا۔

"ندرت! کیا بات ہے؟ نیند کیوں نہیں آرہی آج؟" وہ چونک کر عصمت کو دیکھنے لگی پھر جلدی سے بولی۔

"پتہ نہیں آپا! بس نہ جانے کیوں نیند نہیں آرہی۔"

"ہاں میں بہت دیر سے محسوس کر رہی ہُوں کہ تو سونے کی کوشش میں ناکام ہے۔"

"کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے آپا! اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"ہے ندرت، ہے۔" عصمت نے سنجیدگی سے کہا اور ندرت چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"سُبحان اللہ! کافی منطقی ہو گئی ہیں آپ۔" ندرت نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"نہیں ندرت! بڑی بہن ہُوں تیری۔ جتنا میں تجھے جانتی ہُوں۔ اتنا کوئی دوسرا کہاں سمجھ سکتا ہے۔ کیا اُلجھن ہے تجھے بتا؟"

"ارے ارے۔ زبردستی۔ میرا مُوڈ اِس وقت کسی اُلجھن کے گھڑنے کا نہیں ہے۔ ورنہ کوئی خوبصُورت سی کہانی سُنا دیتی آپ کو۔"

"کہانیوں کی تیرے پاس کمی ہو سکتی ہے؟ اور اگر اِس وقت تو کوئی کہانی نہیں سُنا پا رہی ہے تو اِس کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ تیرا ذہن منتشر ہے۔" عصمت نے کہا۔

"کمال ہے عصمت آپا! آپ نے تو جب سے یونیورسٹی جانا شروع کیا ہے اپنا چولا ہی بدل لیا ہے۔ خیر سے ماہرِ نفسیات بھی ہوتی جا رہی ہیں۔ سو جائیں بی بی سو جائیں۔ ہم درویشوں کے مُنہ لگنا اچھی بات نہیں ہوتی۔" ندرت نے کہا اور عصمت آہستہ سے ہنس پڑی۔

"تھکے ہُوئے ذہن کی تھکی تھکی باتیں کر رہی ہے تو، مجھے بتا کیا پریشانی ہے کیا بات ہے؟ کیا اُلجھن درپیش ہے؟ جمن کا کوئی مسئلہ ہے؟ ویسے میرا خیال ہے تُو نے اب جمن کو احمق بنانا ترک کر دیا ہے۔"

"جوتوں سمیت آنکھوں میں گُھسی جا رہی ہیں عصمت آپا! سو جائیے۔ جتنی نیند آرہی تھی۔ اتنی ہی غائب کر دی آپ نے۔ اور سُنیں کان کھول کر سُن لیں۔ یہ جو اُلجھن نام کی چیز ہے نا یہ کبھی ندرت کے پاس نہیں آسکتی۔ میں اُلجھن پروف ہُوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر اتنی ضد کر رہی ہے تو یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی جو مجھے بتانے والی نہ ہو۔ لیکن اِس وقت خاموش ہو رہی ہُوں۔ کبھی آزما کر دیکھنا۔ بڑی بہن ہی ثابت ہُوں گی تیرے لئے۔"

"اللہ حافظ۔ پاکستان پائندہ باد۔" ندرت نے کہا اور عصمت کی طرف سے کروٹ بدل لی لیکن آج اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اِس سے پہلے کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ جب کسی نے کوئی بات کی۔ اُسے چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ لیکن آج نہ جانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زمانے بھر کے لئے چور بن گئی ہو۔ اُس کے انداز سے چوری کا اظہار ہوتا تھا۔ جبکہ چوری اُس نے کوئی نہیں کی تھی۔ یہ کمبخت اختر۔ خُدا اِسے غارت کر دے۔ خواہ مخواہ میرے راستے میں آگیا۔ ایسی حرکتیں کیں۔ ایسی حرکتیں کیں کہ مجھے پریشان کر کے ہی چھوڑا۔ کمبخت کی حرکتیں تو دیکھو۔ میری آواز کی نقل میرے سامنے ہی اُتار کر رکھ دی۔ اور نہ صرف میری بلکہ شنا کی آواز کی بھی۔ شنا کاش اُس کیسٹ کو سُن لیتی تو ششدر رہ جاتی۔ سوچتی کہ یہ گفتگو میں نے اور اُس نے کب کی ہے۔ نقلی تو لگتی ہی نہیں تھی۔ اور پھر اُس کی آنکھیں۔ اور... اور اُس کے ہاتھ کا لمس۔ ندرت کو اپنے بدن میں پھُریریاں سی دوڑتی محسوس ہُوئیں۔ کیسا بدبخت آدمی ہے۔ کہنے لگا کہ جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جاتا ہے۔ اُس سے ہاتھ چھُڑایا نہیں جاتا۔ خالص رومانی ڈائیلاگ تھا لیکن میں نے اُسے اِس کا جواب کیوں نہیں دیا۔ میرے اندر یہ جھجک کیوں پیدا ہو گئی۔ کیا کہیں وہ دل کے کسی گوشے میں رینگ تو نہیں آیا۔ کھُرچ کر پھینک دُوں گی کمبخت کو۔ صُورت بگاڑ دُوں گی اُس کی۔ لعنت ہے مجھ پر۔ میں اور رومان میں اور کسی مرد کا تصور۔ نہیں، ناممکن۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو خود مرد ہُوں۔ ابّو نے خواہ مخواہ مجھے لڑکی بنا کر پرورش کیا ہے۔ سارا کیریئر ستیاناس کر دیا۔ کاش ایک بار وہ مجھے اپنا بیٹا تسلیم کر لیتے۔ اور مجھے آزادی مِل جاتی تو آج یہ کمی میرے اندر نہ ہوتی۔ لیکن اختر ویسے ہے شریر آدمی۔ میرا جوتا اُس نے پانچ نمبر سے پار کر دیا۔ اور پانچ نمبر میں وہ نہ جانے کیسے گھُس گیا۔ ہماری ٹوہ میں معلوم ہوتا ہے۔ اور جمن کمبخت پر اُس نے کیسی پالش کر دی۔ ویسے ایک طرح سے بہتر ہی ہُوا۔ کیونکہ جمن اب دردِ سر بنتا جا رہا تھا۔ بلاشبہ ابتدائی تفریح ایک الگ حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اب جمن بیکار چیز بن کر رہ گیا تھا۔ دوسروں کے علم میں یہ بات آجاتی اور خاص طور سے ابّو کے علم میں! تو پریشانی تو بہرحال ہوتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بھی تسلیم نہ کرتا کہ میں نے جمن کو کوئی حیثیت دی تھی۔ ارے، مگر لاحول ولا قوت۔ یہ نیند کیوں نہیں آرہی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ سر پر ٹھنڈا پانی اُنڈیلا۔ دو گلاس پانی پیا۔ اور کھوپڑی کو ہتھیلی سے ٹھوکتی ہُوئی۔ دوبارہ چارپائی پر آکر لیٹ گئی۔ لیٹی تو عصمت کی آواز سُنائی دی۔

"ایک ایک حرکت دیکھ رہی ہُوں تیری۔ ایک ایک حرکت!"

"عصمت آپا! تمھیں خُدا کی قسم۔ حقیقت کم از کم اپنی بہن کو تو بتا دو۔ ازراہ اخلاق میں تم سے کچھ پُوچھ نہیں رہی تو اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم مجھے بالکل ہی بیکار سمجھ لو۔"

"کیا مطلب؟" عصمت چونک کر بولی۔

"نیند تمھیں نہیں آرہی ہے۔ کیا سمجھیں عصمت آپا! یونیورسٹی کے ماحول کے بارے میں مجھے اچھی طرح علم ہے۔ اور حق بھی ہے تمھارا۔ دیکھو ایک بات سُن لو جو کچھ بھی کہو گی۔ حلفیہ طور پر اُسے راز رکھوں گی۔ البتہ کوشش یہ کروں گی کہ کسی دانشمندانہ طریقے سے ابّو کے کانوں تک بات پہنچا دُوں۔ اور تمھارا کام بنا دُوں۔"

"اے اے ندرت! یاد رکھنا۔ تھپڑ مار مار کر مُنہ لال کر دُوں گی میرے بارے میں اگر کوئی فضول بات کہی تو۔"

"کیوں نہیں سو رہی میری پیاری بہن؟ کیوں نہیں سو رہی۔ آئیں تجھے کلیجے سے لگا کر سُلا دُوں۔" ندرت نے عصمت کا سر اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ اور اُسے زور زور سے دبانے لگی عصمت پہلے تو اُس سے سر چھُڑانے کی جدوجہد کرتی رہی۔ لیکن ندرت اُس سے کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ تب عصمت نے ہنس کر اُس کی گود میں سر چھُپا لیا۔ ندرت کو نہ جانے کیوں ایک عجیب سا سکون ہُوا تھا۔ دل کی وہ دھڑکنیں جو بے ربط ہو رہی تھیں۔ عصمت کے سر کے بوجھ سے کسی قدر اعتدال پر آنے لگیں۔ لیکن آنکھوں میں وہی چہرہ بار بار اُبھر رہا تھا۔ رات کے نہ جانے کون سے حصے میں اُسے نیند آگئی۔ لیکن سوتے میں بھی اُس نے کئی بار اختر کو خواب میں دیکھا۔ صبح اُٹھی تو طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی۔ عصمت تیاریاں کر کے یونیورسٹی جانے کے لئے جوتے پہن رہی تھی۔ اُس نے معنی خیز نگاہوں سے ندرت کو دیکھا۔ اور پھر چائے کی پیالی لے کر اُس کے سامنے پہنچ گئی۔

"سوچ لینا۔ غور کر لینا اچھی طرح۔ مجھے بتانے میں فائدہ ہی رہے گا۔"

ندرت نے اِس طرح مُنہ میں چائے بھر کر اُس کی طرف مُنہ بڑھایا جیسے چائے کی کلی اُس پر کرنا چاہتی ہو۔ عصمت خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ کیونکہ اُس نے نیا لباس یونیورسٹی جانے کے لئے پہنا تھا۔ پھر وہ ہنستی ہُوئی باہر نکل گئی اور ندرت بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کرنے لگی۔ یہ فیصلہ تو اُس نے کر لیا تھا کہ اختر ہوں یا اُن کے والد صاحب۔ عشق وغیرہ تو وہ کسی سے کرے گی نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی تُک ہے۔ جاہل لڑکیوں کی

طرح عشق و محبت کا ڈرامہ شروع کر دو۔ اور پھر فضول کی حرکتیں کرنے لگو۔ نہیں جناب ہرگز نہیں۔ میں لڑکی ہُوں ہی نہیں۔

کافی دیر تک وہ اِسی طرح بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اماں بی کی آواز سُن کر جلدی سے اُٹھ گئی۔ اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ لیکن یہ کام اُس کی سوچ میں حارج نہیں ہُوئے تھے۔ اختر اُس کی جان سے بُری طرح چمٹ گیا تھا۔ البتہ اِس وقت سوچنے کا انداز ذرا مختلف تھا۔ اختر نے جو کچھ کہا تھا۔ اُس کے بعد کم ازکم اُس سے دشمنی تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر دلچسپیوں میں اُس کا ساتھ قبول کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ ہاں جب دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تو پھر دُشمنی نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اختر کے لئے وہ تصور ذہن میں نہ بسایا جائے جو شرمندگی کا باعث ہو۔ ویسے اُس بے چارے نے تو اِس سِلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ یہ تو صرف میری اپنی ہی سوچ ہے۔ اِس میں اُس کا کیا قصُور؟

تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ ثنا کی تلاش میں باہر نکلی۔ لیکن ثنا اِس وقت باہر موجود نہیں تھی۔ اب اُس کی تلاش کے لئے اندر ہی جانا ہوگا۔ رَدا تو آج کل باقاعدگی سے ڈیوٹی پر جانے لگی تھی۔ پچھلے دنوں جو اُس نے کچھ چھٹیاں کر ڈالی تھیں۔ اب اُن کا خاتمہ ہو چُکا تھا۔ کوٹھی کی جانب بڑھ ہی رہی تھی کہ دفعتاً دل دھک سے رہ گیا۔ اختر اچانک ہی باہر نکلا تھا۔ نُدرت کے قدم ایک لمحے کے لئے جم سے گئے۔ اختر کی مُسکراتی نگاہیں اُس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لیکن پھر وہ سنبھل کر آگے بڑھی۔ اور جُونہی اُس نے آگے قدم رکھا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے پاؤں کے نیچے پٹاخا آ گیا ہو۔ اچھی خاصی آواز تھی۔ اُس نے چونک کر پاؤں اُٹھایا۔ لیکن نیچے کچھ نہیں تھا۔ دوبارہ پاؤں رکھا تو پھر ویسی ہی آواز سُنائی دی۔ اور وہ حیرانی سے اپنی جگہ ناچنے لگی۔ اختر آہستہ آہستہ اُس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

"خیریت، خیریت۔ کیا آپ راک اینڈ رول کی مشق کر رہی ہیں؟"

"پپ، پپ... پتہ نہیں۔ پتہ نہیں۔ کک... کیا ہو گیا؟" نُدرت نے اپنے پیروں کے نیچے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"کسی کا دِل وِل تو نہیں آ گیا۔ میرا مطلب ہے آپ کے پیروں کے نیچے؟" اختر نے کہا۔

"مم، مذاق نہیں اختر صاحب! بالکل یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے پیروں کے نیچے پٹاخے چھُوٹ رہے ہوں۔"

"صرف نیچے۔ ذرا سر کے قریب محسوس کریں۔" اختر نے کہا۔ اور دوسرے لمحے نُدرت کو یُوں لگا جیسے بالوں کے نزدیک کوئی چیز چھُوٹتی ہُوئی نکل گئی ہو۔ اِس کے ساتھ ہی آواز بھی سُنائی دی تھی۔

"ارے، ارے۔" وہ گھبرا کر بولی۔ اور اختر نے قہقہہ لگایا۔

"یہ اختر ہی کا کمال ہے۔ تشریف لائیے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ تشریف لائیے بس۔ اِس بات کا مطلب صرف اتنا ہی ہے۔"

"میں تو ذرا ثنا کے پاس جا رہی تھی۔"

"خُدا کی حمد و ثنا اچھی بات ہے لیکن انسانوں کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارنا چاہیئے۔"

"میں حمد و ثنا کی نہیں صرف ثنا کی بات کر رہی تھی۔"

"اچھا، اچھا۔ آئیے ثنا کو بھی علم کے زور پر بُلا ہی لیا جائے گا۔" اختر نے کہا۔ اور اِس طرح آگے بڑھا جیسے نُدرت کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہو۔ نُدرت بوکھلا کر پیچھے ہٹی تھی لیکن اختر اطمینان سے آگے بڑھ گیا۔ یہ صرف نُدرت کو غلط فہمی ہُوئی تھی۔ ایک لمحے تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اور پھر اُس کے قدم اختر کے پیچھے پیچھے اُٹھ گئے۔ اختر کوٹھی کے بغلی حصے میں آ گیا۔ نُدرت اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"آپ کی اِس خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ خود پر فضول قسم کی پابندیاں نہیں لادے ہُوئے ہیں۔"

"کیسی پابندیاں؟"

"بھئی یہی کہ اطمینان سے میرے ساتھ چلی آئیں۔ نہ شرمائیں، نہ لجائیں۔ مقامی لڑکیوں میں اگر کمی ہے تو بس یہی کہ وہ کوئی کام خود اعتمادی سے نہیں کرتیں۔"

"بھلا آپ بھی ایسی چیز ہیں کہ آپ کے سامنے شرمایا، یا لجایا جائے۔" نُدرت نے کہا۔ اور اختر چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ میں ایسی کوئی خاص بات ہی نہیں ہے کہ آپ سے شرم آئے۔"

"اوہو... واقعی، واقعی۔ اِن الفاظ کو میں اپنے پاس محفوظ رکھوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ دراصل اتنی گاڑھی اُردو تو مجھے نہیں آتی۔ منطق کی رُو سے

لیکن اگر کِسی کے ساتھ حجاب کھُل جائے تو اُسے تو بہت زیادہ اپنوں میں شمار کیا جاتا ہے نا۔ منطق کی رُو سے۔"

"اِے مسٹر منطقی! آپ خود مُعاہدہ توڑ رہے ہیں..." نُدرت نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دوستی کو دُشمنی میں تبدیل کرنا مناسب نہیں ہے۔ میرے بارے میں اِس قسم کے الفاظ آپ نہیں کہہ سکتے۔"

"کیا میں نے کوئی غلط لفظ کہہ دیا ہے۔ منطق کی رُو سے؟" اختر نے رازدارانہ انداز میں پُوچھا۔

"چھوڑیئے اِن فضول باتوں کو۔ یہ پٹاخے کیسے تھے۔ اب اِس کا جواب دیجئے۔ ویسے آپ حیرت انگیز آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے کِسی سرکس وغیرہ میں کام کرتے رہے ہیں۔"

"ہُوں۔ یہ خیال آپ نے کیسے قائم کیا؟"

"بھئی آپ مختلف قسم کی آوازیں مُنہ سے نکال لیتے ہیں۔ لوگوں کو خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ یہ پٹاخے اب آپ بتائیے۔ یہ پٹاخے مجھے اپنے پیروں کے نیچے کیسے محسوس ہُوئے تھے؟"

"کیا آپ یہ فن سیکھنا چاہتی ہیں؟"

"خُدا کی قسم، دُنیا کو نچا کر رکھ دُوں اگر میں اِتنی باصلاحیت ہو جاؤں تو۔"

"وری گڈ، وری گڈ! بھئی ہم اپنی حیثیت محسوس کرتے جا رہے ہیں۔ گویا ہم آپ کے نزدیک بے حد باصلاحیت ہیں۔"

"اب بہت زیادہ بلندی پر پرواز نہ کیجئے۔ سچ بتائیے اختر! یہ آوازیں کیسی تھیں؟"

"میرے مُنہ سے نکلی تھیں۔ دُنیا کی ہر قسم کی آوازیں اپنے مُنہ سے نکال سکتا ہُوں۔ اور آپ کو یہ محسوس ہو جیسے آپ کے اپنے پاس وہ آواز ہُوئی ہو۔"

"ہائے اللہ! یہ فن آپ نے کہاں سے سیکھا؟"

"بس سیکھ لیا۔"

"مجھے سِکھا دیں گے؟"

"ابھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اِس فن کے لئے کم ازکم دس سال کی قُربت ضروری ہے۔ کیا آپ دس سال میرے ساتھ تنہا رہ سکتی ہیں؟"

"پھر بیکار باتوں پر اُتر آئے آپ۔"

"کمال ہے، آپ تو کِسی سمت رُخ ہی نہیں کرتیں بھائی ایک معمولی سی بات ہے کہ یہ فن کم ازکم دس سال میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی سخت ریاض کرنا پڑتا ہے اِس کے لئے۔ اب بتائیے، میرا اور آپ کا دس سال ساتھ کِس طرح ہو سکتا ہے۔ اِس کی صرف ایک ہی ترکیب ہے۔" نُدرت نے عجیب سی نگاہوں سے اختر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بے اختیارانہ مُسکراہٹ نہیں روک سکی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔

"اچھا چھوڑیئے۔ مجھے اِس قسم کے فضول فنون سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اور بھی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو میں آپ کو سِکھا سکتا ہُوں۔ ہر فن کے لئے دس دس سال مخصوص کر لیجئے ایسے چار پانچ فن جانتا ہُوں میں۔ گویا پچاس سال ساتھ ہمارا اور آپ کا ہونا ہی چاہیئے۔ باقی اُس کے بعد ممکن ہے میں کچھ اور نئے فنون سیکھ لُوں۔"

"اچھا اب میں جاؤں۔ یا کچھ اور کہنا ہے آپ کو۔"

"اوہو... نہیں! اب میں اِتنا بے شرم بھی نہیں ہُوں۔" اختر نے لجائے ہُوئے انداز میں کہا۔ اور نُدرت ایک بار پھر آنکھیں پھاڑنے لگی۔

"کک... کیا مطلب؟" وہ بوکھلا کر بولی۔

"جو کچھ اور کہنا ہے مجھے اب اتنی جلدی تو نہیں کہہ سکتا نا۔" اختر نے اُسی انداز میں کہا۔ اور نُدرت کے حلق سے بے اختیار ایک قہقہہ نکل گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن الفاظ نہیں مِل رہے تھے اُسے۔ ایک دم وہ اُٹھی۔ پلٹی اور تیزی سے کوٹھی کی جانب چل پڑی۔ یہ اختر، یہ اختر تو شیطان ہے پُورا۔ مکمل شیطان۔ اختر مُسکراتی نِگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ثنا کے پاس پہنچ گئی۔ لیکن ذہن بھٹکا ہُوا تھا۔ ثنا کے پاس جس مقصد کے لئے آئی تھی۔ اُسے بھُول گئی تھی۔ البتہ ثنا نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

"آ گئی اللہ رکھی! بڑی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے تیری۔ بہت ہی سخت ضرورت۔" ثنا کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ نُدرت نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اگر ثنا کو کچھ شک ہو گیا تو پھر وہ جان ہی لے ڈالے گی۔ ایسی ہی لڑکی تھی وہ۔ ابھی نُدرت اُسے کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔ ثنا اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ تیمُور مسلسل اُس کے پاس تھا۔

"نُدرت! بڑا گھپلا ہو گیا ہے۔ بہت بڑا گھپلا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"ارے ارے خیریت! مالک کی بیٹی اتنی پریشان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

"ہُوں، پریشان میری جوتی ہوتی ہے۔ تم جانتی ہو جس لفظ کا نام پریشانی ہے۔ اُس کا مجھ سے کوئی رِشتہ نہیں ہے۔ لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کے بارے میں سوچنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے سوچا کہ تم سے مشورہ کر لُوں"

"حاضر، حاضر۔ ویسے بھی ہمارے درمیان یہ مُعاہدہ ہے کہ ایک دوسرے کی پریشانی میں مشورہ کیا ہی جائے گا۔"

"یہ خالد کیسا آدمی ہے؟" ثنا نے کہا۔ اور نُدرت چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"خالد؟"

"ہاں بھئی۔ وہی خالد! ویسے تو میرا بچپن کا ساتھی ہے لیکن تم جانتی ہو کہ جو میرے پاس نہیں ہوتا، اُسے میں کبھی یاد نہیں کرتی۔ تم بتاؤ ذرا کیسا لگتا ہے یہ؟"

"ارے ارے مالک کی بیٹی! ایک نوجوان کے بارے میں تم مجھ سے یہ پُوچھ رہی ہو کہ وہ مجھے کیسا لگتا ہے۔"

"اِسے اِسے۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور شاید تمھیں یہ بات معلوم نہ ہو کہ وہ اِسی لئے یہاں آیا بھی ہے۔" ثنا نے کہا۔ اور نُدرت اُچھل پڑی۔

"ارے۔ کیا واقعی۔ تمھیں کیسے معلوم؟"

"خود خالد نے بتایا ہے مجھے۔ اِس سے پہلے تو میرے ذہن میں یہ تصوّر بھی نہیں تھا۔ بڑی عجیب و غریب باتیں کر رہا تھا۔ اُلجھی اُلجھی سی۔ میں اُلجھی ہُوئی باتیں تو نہیں سمجھتی۔ لیکن میں اُس کا مفہوم سمجھ گئی۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں سوچ کر جواب دُوں گی کہ میں اُس سے شادی کر سکتی ہُوں یا نہیں۔ دراصل اُسے اپنے ڈیڈی کو خط لکھنا ہے۔ جس میں ہاں یا نا کی بات ہوگی۔ میرا خیال ہے یہ بات میرے ڈیڈی وغیرہ کو بھی معلوم ہے۔" ثنا اِس بے تکلفی سے یہ مسئلہ نُدرت کے سامنے بیان کر رہی تھی کہ نُدرت حیران رہ گئی۔ ویسے تو ثنا کے بارے میں اُس کا اندازہ تھا کہ وہ اِنتہائی معصوم قسم کی چالاک لڑکی ہے جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے کے باوجود کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اِس مسئلے میں وہ اتنی احمقانہ گفتگو کرے گی۔ اِس کا نُدرت کے ذہن میں تصوّر بھی نہیں تھا۔ وہ شرارت آمیز نگاہوں سے ثنا کو دیکھتی رہی۔ ثنا باقاعدہ فکرمند نظر آ رہی تھی۔

"پُورا واقعہ تو سُناؤ۔ ہُوا کیا؟"

"ارے بھئی ہُوا کیا۔ وہ جو اختر ہے نا اُس کا بھائی میرا مطلب ہے ہمارا دُشمن۔ اُس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ فوّارے کے پاس کچھ لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچی تو وہاں صرف خالد تھا۔ مجھ سے ملا اور عجیب و غریب باتیں کرنے لگا۔ صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہیں ہیں۔ لیکن اُس نے میرے لئے ایک لمحۂ فکریہ چھوڑ دیا تھا۔ کہنے لگا اُسے اپنے باپ کو جواب دینا ہے کہ ہم لوگوں کی کیا رائے ہے۔ اگر میں اِس بات کو پسند کروں تو وہ مجھ سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے۔ اب تم بتاؤ نُدرت! کیا کرنا چاہیئے؟" نُدرت بے اختیار ہنس پڑی۔ اور ثنا اُسے گھُورنے لگی۔

"میں نے اتنے سنجیدہ مسئلے میں تمھیں شریک کرنے کی کوشش کی۔ اور تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو۔ بھئی دیکھو پچھلے دِنوں تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ بدتمیز اور منحوس شکل والا رشید اِس چکر میں اپنی ماں کے ساتھ یہاں پہنچا ہے کہ مجھ پر تسلّط جمائے۔ پچھلے کئی بار میں یہ بات سُن چکی ہُوں کہ امّی اور ابّو۔ میرا مطلب ہے ہمارے ڈیڈی بُزرگوار۔ میری شادی کے سِلسلے میں بارہا سوچ چکے ہیں۔ سچ کہہ رہی ہُوں نُدرت! میرے ذہن میں تو یہ تصوّر ہی کچھ عجیب سی حیثیت رکھتا ہے اچھا خاصا گھر میں وقت گزار رہے ہیں۔ ایک گدھے کو دولہا بنا کر اپنی ذات پر مسلّط کر لو۔ اُس کے احکامات کی تکمیل کرو۔ اُس کے حُکم پر چلتے رہو۔ اور اپنی اچھی خاصی زندگی کو ترک کر دو۔ میں نے خالد سے کہا کہ میں تو بال بچّوں والی ہُوں۔ مجھے بھلا اِن تمام باتوں کے بارے میں سوچنے کی کہاں فرصت ہے تو وہ مُسکرانے لگا۔ بہرطور نُدرت بات ذرا سوچنے کی ہے۔ اگر واقعی مجھے کبھی شادی کے سِلسلے میں فیصلہ کرنا ہی پڑے تو تمھارا کیا خیال ہے۔ یہ خالد کیسا رہے گا؟"

"بہت اچھا ثنا! بہت اچھا۔"

"ذرا ٹھیک ٹھاک طریقے سے جائزہ لینا چاہیئے جلدبازی اچھی نہیں ہوتی۔ ویسے کچھ اور لوگوں سے مشورہ کر لینا بھی مناسب ہوگا۔"

"مثلاً۔ وہ کچھ اور لوگ کون؟" نُدرت نے پُوچھا لیکن ثنا کسی خیال میں ڈُوبی رہی تھی پھر اُس نے گردن جھٹک کر کہا۔

"نہیں بھئی۔ کون مُصیبت میں پڑے۔ اپنا یہ تیمُور بھلا مجھے اجازت دے گا۔ میں کہہ دوں گی کہ میں تو شادی کا فیصلہ کر چکی ہُوں۔ بس ذرا تیمُور بڑا ہو جائے۔ بلکہ میرا خیال ہے

مجھے اِس سِلسلے میں رَدا سے بات بھی کر لینی چاہیئے کہ کم از کم ہماری منگنی وغیرہ ہی کر دے۔"

"تیمُور سے؟"

"ہاں یار! اور کیا کہوں۔ اب بھلا تیمُور اپنا دیکھا بھالا نوجوان ہے۔ میں تو اِسے پہلے ہی ہیرو کہتی ہُوں۔ اور پھر اپنی گود میں پرورش پا رہا ہے۔ ہر اچھائی بُرائی میرے علم میں ہے۔ تیمُور سے زیادہ اچھا شوہر میری زندگی میں اور کوئی نہیں ہوگا۔"

"بکواس مت کر۔ یہ بتا کیا واقعی خالد نے تیرے ذہن میں کوئی جگہ پائی ہے۔"

"میرے دماغ میں اِتنا بڑا بھیجہ ہے کہ کسی اور چیز کی گُنجائش قطعی نہیں ہے۔ نُدرت صاحبہ! اِس لئے کسی اور شئے کا میرے ذہن میں جگہ پانا ممکن نہیں ہے۔ بس ایسے ہی سوچا تھا کہ مشورہ کر لُوں تجھ سے۔" ثنا نے اکڑ کر کہا۔

نُدرت اُسے بغور دیکھتی رہی۔ اُس نے اپنا مسئلہ ثنا کے سامنے بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بہرحال دونوں سر جوڑے بیٹھی رہیں۔ نُدرت نے تو فیصلہ کر دیا تھا کہ اگر شادی کرنی ہی ہے تو خالد سے اچھا اور کوئی نوجوان نہیں ہو سکتا۔ نہ کرنی ہو تو اُسے صاف صاف جواب دے دیا جائے۔

"یار! پہلے اِس سِلسلے میں حالات کا جائزہ لے لیا جائے ویسے ایمان سے بالکل سچ کہہ رہی ہُوں۔ شادی وغیرہ کرنے کا تو تصوّر بھی میرے ذہن میں نہیں آتا۔ لیکن یہاں باپ نہ جانے کیوں بیٹیوں کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں ذرا بڑھیں اور اِن پر مُصیبت سوار ہو گئی کہ اب شادی کرو۔ بہرحال اِس مسئلے کا حل مجھے ہی تلاش کرنا ہوگا۔" ثنا پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی۔

⊕

چار پانچ دن تو صرف اِسی انتظار میں گزر گئے کہ ثاقب کی صُورت نظر آئے۔ لیکن جب چھٹا اور پھر ساتواں دن بھی گزر گیا تو رَدا کو شدید حیرت ہُوئی۔ خیر دین نے یہی کہا تھا کہ اب ثاقب اُسے نظر نہیں آئے گا۔ اِس سِلسلے میں خیر دین نے اُلٹی سیدھی باتیں کہی تھیں۔ جن پر رَدا کو خود بھی یقین نہیں آیا تھا۔ خیر دین جس ٹائپ کا انسان تھا۔ کِسی کو قتل کرنے کا تصوّر تو اُس کے ساتھ وابستہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن پھر وہ کون سی ایسی ترکیب تھی جس کے تحت اُس نے ثاقب کو اُس کی زندگی سے نکال دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ ثاقب کے ٹل جانے سے رَدا کو اپنی سانس گلے میں اٹکتی محسوس ہوتی رہی۔ اُن دِنوں جب ثاقب اُس سے مُلاقاتیں کر رہا تھا۔ اور اُسے طرح طرح کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ رَدا کو یُوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اُس کی وہ خوشگوار زندگی جس کی ابھی ابتدا ہی ہوئی ہے۔ اب اختتام کو پہنچنے والی ہے۔ اور کوئی بھی دن ایسا آ جائے گا۔ جب اُسے اِس کوٹھی سے ہی نکلنا پڑ جائے گا۔ اگر ثاقب کے قدم یہاں تک پہنچ گئے تو پھر اِس کوٹھی میں رُکنا ایک دن بھی ممکن نہیں ہوگا۔ ثاقب کی بے غیرت فِطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ ثاقب کو اِس بات سے کوئی غرض نہیں ہوگی کہ رَدا کِس حیثیت سے یہاں رہتی ہے۔ وہ صرف اور صرف رقم حاصل کرنے کے چکر میں پڑ جائے گا۔ اور یہاں ظاہر ہے رَدا کو اپنی حیثیت سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

لیکن خیر دین انسان ہے یا جن! آخر اُس نے کون سا ایسا چکر چلایا۔ جس کی بنا پر ثاقب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ رَدا اکثر تنہائی میں خیر دین کے بارے میں سوچنے لگتی تھی۔ اب اُسے اِس بات پر تو کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ خیر دین درحقیقت وہ نہیں ہے۔ جو نظر آتا ہے۔ اُس کی ذات میں کوئی بہت ہی گہری بات پوشیدہ ہے۔ کئی بار اُس کے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے خیالات بھی آئے خیر دین اگر اتنا تعلیم یافتہ ہے تو پھر اِس کوٹھی میں ایک گھٹیا سے ملازم کی حیثیت کیوں اختیار کئے ہُوئے ہے۔ اِس کے پس پردہ کوئی ایسی بات تو نہیں جو اِس کوٹھی میں رہنے والوں کے لئے خطرناک ہو لیکن اِس بات کا اظہار بھی رَدا کے لئے گناہِ عظیم تھا۔ خیر دین اُس کا ہمدرد تھا۔ بلکہ اب تو یہ احساس ہوتا تھا کہ اگر کئی اہم موقعوں پر خیر دین اُس کی مدد نہ کرتا تو نہ جانے اُس کی کیا کیفیت ہوتی۔ آخری اِحسان اُس نے ثاقب سے رَدا کو نجات دِلا کر کیا تھا۔ ایسے شخص کے بارے میں اگر کسی پر یہ اظہار کیا جائے کہ اُس کی اصلیت وہ نہیں ہے جو وہ ظاہر کرتا ہے۔ اور خیر دین کو اِس کا علم ہو جائے تو وہ اپنے دل میں رَدا کے بارے میں کیا سوچے گا۔ لیکن رَدا پریشان بھی تھی۔ خیر دین اپنے آپ کو کیوں چھپائے ہُوئے تھا؟

ایک دِن بیٹھے بیٹھے اُس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ خیر دین ہی سے اِس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ اِس سے پہلے خیر دین سے یہ بات ہو چکی تھی۔ لیکن اِس کے جواب میں اُس نے یہی کہا تھا کہ اگر رَدا اُسے اپنے بارے میں کچھ بتانے پر

تیار نہیں ہے تو اُس کے بارے میں کیوں پوچھنا چاہتی ہے۔ بات وزن دار تھی۔ رَدا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا لیکن اب اِس کے بعد اُس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں بار بار اُس کے ذہن میں خیر دین کا خیال آچکا تھا۔ اور نہ جانے کیا کیا احساسات اُس کے ذہن میں پرورش پا رہے تھے۔ خیر دین کے معمولات جُوں کے تُوں تھے۔ وہ زیادہ تر دادی اماں کے پاس رہتا تھا۔ کسی کی بُرائی میں اُس نے کبھی کوئی حصّہ نہیں لیا تھا بلکہ اب تو وہ کوٹھی کے تقریباً تمام ہی افراد کا منظورِ نظر تھا۔ اکثر عارفہ خالہ بلکہ طفیلی بیگم بھی اُسے اپنے کاموں کے لئے یاد کر لیا کرتی تھیں۔ حالانکہ رشید سے خیر دین کی نہیں بنتی تھی لیکن یہ جھگڑا طفیلی بیگم کے کانوں تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ خیر دین کو تلاش کرنا مشکل کام نہیں ہُوا۔ ثنا اور نُدرت کے معمولات تو رَدا کے علم میں تھے ہی۔ رَدا نے اپنے طور پر خیر دین سے ایک بار پھر رابطہ قائم کیا۔ اور اُسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ اُس دِن کے بعد سے آج تک خیر دین نے رَدا کے کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن آج جب رَدا نے اُسے بُلایا تو وہ حسبِ معمول سادہ سی صُورت بنائے اُس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ رَدا اُسے عجیب سی نِگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔

ہُنک... کوئی چیز چوری ہوگئی آپ کے کمرے سے رَدا بی بی؟ خیر دین نے سوال کیا۔

"بیٹھ جاؤ" رَدا بولی اور خیر دین پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"دیکھو خیر دین! جھگڑا ہو جائے گا تم سے۔ جب کہ میں کسی سے لڑنے کی عادی نہیں ہُوں" رَدا نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا۔

"جی رَدا بی بی! جو غلطی ہوگئی ہو بتا دیں۔ معافی مانگ لیں گے" خیر دین بولا۔

"اوپر بیٹھو۔ کم از کم میرے سامنے اِس قسم کی اداکاری مت کیا کرو"

"اداکاری؟ وہ بی بی جی؟ ہمیں اداکاری کہاں آتی ہے جی۔ اداکار تو بہت بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو چُھپانے کے لئے نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ وہ خیر دین ولد بشیر دین تو ایک سیدھا سادہ سا انسان ہے"

"جی ہاں! آپ جس قدر سیدھے ہیں میں آپ کو اچھی طرح پہچان چکی ہُوں"

"بس جی! آپ کی مہربانی ہے۔ ورنہ خیر دین کس قابل ہے"

"اب فضول باتیں ترک کرو گے یا نہیں؟"

"کمال ہے جی۔ ہم تو اچھی باتیں کرنے کے بعد بھی فضول ہی کہلاتے ہیں"

"یہ بتاؤ تم نے ثاقب کا کیا کیا؟"

"وہ جی اب تو گل کر تیار بھی ہو چُکا ہوگا۔ چکھیں گی آپ؟"

"میں ثاقب کے بارے میں پُوچھ رہی ہُوں" رَدا نے کچھ نہ سمجھتے ہُوئے کہا۔

"ہم بھی اُسی کے بارے میں آپ کو بتا رہے ہیں رَدا بی بی جی! اَچار ڈال دیا تھا ہم نے اُس کا۔ بس تھوڑا سا سرکہ، نمک اور ایسی ہی کچھ چٹپٹی چیزیں ایک مرتبان میں ڈال کر ثاقب کو نہلا دُھلا کر اُس میں ڈال دیا۔ روزانہ دُھوپ میں رکھ دیتے ہیں" خیر دین نے جواب دیا اور رَدا غُصیلی نِگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"اچھی بات ہے مت بتاؤ تم! میں بھی تم سے ناراض ہو جاؤں گی" خیر دین رَدا کی صُورت دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نظر آئی تھی لیکن پھر وہ سنجیدہ ہوگیا۔ چند لمحات کے بعد اُس نے کہا۔

"کم از کم اِتنا تو بتا دیں رَدا بی بی! کہ آپ ہم سے یہ انداز کس حیثیت سے اختیار کرتی ہیں۔ گھر کے نوکر کی حیثیت سے یا دوست کی حیثیت سے؟ آپ نے کہا تھا کہ آپ نے ہمارا شمار دوستوں میں کیا ہے"

رَدا بھی سنجیدہ ہوگئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "خیر دین! اگر تم نوکر ہو تو اِس کوٹھی کے، احسان صاحب کے، ثنا کے۔ میری حیثیت سے تو تم اچھی طرح واقف ہو میں بھلا تمہیں نوکر کیسے سمجھ سکتی ہُوں"

"تو پھر کُھل کر کیوں نہیں کہتیں کہ دوست سمجھتی ہیں"

"ہاں خیر دین! جب میں نے اپنا مسئلہ تمہارے سامنے پیش کیا تھا تو تمہارے وہی الفاظ میرے رہبر بنے تھے۔ اور میں نے اُن ہی کی روشنی میں تم سے اپنی مُصیبت بیان کی تھی"

"دوستی کے بھی کچھ درجے ہوتے ہیں رَدا بی بی! کچھ دوست عارضی طور پر بنا لئے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن پر اعتماد کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ اور جی ہی کے حوالے سے اُن پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ لیکن دوستی کی کوئی نہ کوئی منزل تو ضرور ہوتی ہے

بی بی! آپ ہمیں یہ بتا دیجئے کہ ہم کون سی منزل میں ہیں" رَدا نے ایک بار پھر حیران نِگاہوں سے خیر دین کو دیکھا۔ اور آہستہ سے بولی۔

"خیر دین! اِس کوٹھی میں مَیں جس طرح پہنچی تھی تمہیں یقیناً اُس کا علم ہو چُکا ہے۔ ایک بہت اچھی بہت مخلص دوست ثنا ہے۔ جس کے رویّے سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ مجھ پر رحم کھا کر نہیں۔ بلکہ خالص دوستانہ بُنیاد پر مجھے یہاں لائی تھی۔ اور اُس کے بعد سے آج تک اپنی دوستی نبھا رہی ہے۔ میں درحقیقت کسی بھی طرح اُس کی دوستی کے قابل نہیں ہُوں۔ ہاں اگر میں نے تمہیں اپنے دوست کا درجہ دیا تو اِس کی بنیاد یہ ہے خیر دین کہ تم میری سطح کے انسان ہو۔ اور اپنی سطح کے انسانوں سے زیادہ کُھل کر بات کی جا سکتی ہے"

"لیکن معاف کیجئے رَدا بی بی! آپ نے مجھے تو اپنا دوست بنا لیا لیکن خود میری دوست نہیں بن سکیں"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو خیر دین؟"

"یہی کہ مجھے کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ میں تو آپ کا۔ آپ کی سطح کا دوست ہُوں رَدا بی بی! مجھ سے آپ کو کیا خطرہ پیش آسکتا ہے۔ آپ مجھے اپنے بارے میں کیوں نہیں بتاتیں"

"خیر دین! کیا دوستی کسی ایسے جذبے سے بے نیاز ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ تم آخر میرے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"صِرف اِس لئے رَدا بی بی کہ چاروں طرف سے آپ کے گرد ایک حِصار قائم کر دُوں۔ اتنا محفوظ کر دُوں آپ کو کہ آپ عدمِ تحفظ کے احساس سے عاری ہو جائیں۔ آپ کو یوں محسوس ہو کہ آپ ایک فولادی خول میں بند ہیں۔ اور یہ فولادی خول مَیں اپنی ذات کو بنانا چاہتا ہُوں۔ اور اِس کے لئے آپ کے بارے میں جان لینا بے حد ضروری ہے" رَدا چونک کر خیر دین کو دیکھنے لگی تھی۔ خیر دین کا چہرہ اِس وقت پھر بدل گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک تھی۔ اُس کے ہونٹ عجیب سے انداز میں کپکپا رہے تھے۔ اور نہ جانے کیوں رَدا کو یہ چمکتی آنکھیں، یہ کپکپاتے ہونٹ بے حد عجیب محسوس ہُوئے۔ اُسے خیر دین اِس وقت بہت ہی اچھا لگا تھا۔ کافی خوبصُورت تھا وہ۔ اگر اپنا حُلیہ بگاڑے نہ رہتا۔ آنکھوں میں کاجل نہ ہوتا۔ اور چہرے کے انداز میں ایسی احمقانہ کیفیت شامل نہ ہوتی تو اُسے ایک حسین نوجوان کہا جا سکتا تھا۔ چوڑے چکلے بدن کا مالک۔ شاندار شخصیت جو اُس سے اِن الفاظ میں باتیں کر رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مُسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"خیر دین! مجھے کچھ وقت بھی نہیں دو گے؟" اُس کے انداز میں ایسی یگانگت ایسی اپنائیت تھی کہ خیر دین چونک کر سنبھل گیا۔

"لو جی! آپ نے خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھاراں ضلع گوجرانوالہ کو اتنا ہی تنگ دل سمجھ رکھا ہے۔ ایسے بھی کر بات کر کے جی! آپ ساری زندگی ہمیں کچھ نہ بتائیں۔ تب بھی ہم نہ پُوچھیں گے"

"بس بس۔ اب ایسی باتیں مت کرو پلیز!" رَدا نے جھینپے ہُوئے انداز میں کہا۔

"او جی ٹھیک ہے جی! نہیں پُوچھیں گے۔ اپنے دل کو سمجھا لیں گے۔ اور کہہ دیں گے کہ ہم تو دل سے رَدا بی بی کے دوست ہیں۔ پر اُنہیں کچھ وقت لگے گا۔ ٹھیک ہے جی ٹھیک ہے آپ ہمیں ہمارا کام بتائیں"

"کام؟" رَدا چونک پڑی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں خیر دین! کوئی خاص کام نہیں تھا۔ بس اُس دِن سے ثاقب نظر نہیں آیا۔ میں نے سوچا اُس کے بارے میں تم سے معلوم تو کر لُوں۔ تم نے بڑی دل ہلا دینے والی باتیں کی تھیں۔ میں جانتی ہُوں کہ تم کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔ لیکن ثاقب کو تم نے کہاں غائب کر دیا؟ آخر کچھ تو بتاؤ؟"

"وہ جی محفوظ ہے۔ جب بھی آپ اُسے مانگیں گی ہم اُسے آپ کو دے دیں گے۔ لیکن جب تک آپ نہیں چاہو گی نا وہ اطمینان سے رہے گا۔ اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی"

"وہ اَلسر کا مریض ہے"

"ہم نے اُس کا چیک اَپ کرا لیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شراب زیادہ پینے کی وجہ سے اُس کے معدے میں ایسڈیٹی ہوگئی ہے۔ جسے وہ اَلسر سمجھتا ہے۔ شراب بند کر دی ہے ہم نے اُس کی۔ بس ٹھیک ٹھاک جی رہا ہے۔ ممکن ہے کچھ عرصے میں ٹھیک ہو جائے" رَدا نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"اِس کا مقصد ہے کہ تمہارے اور بھی بہت سے مسائل ہیں"

"بس جی خیردین ولد بشیردین کی تو بات ہی کیا ہے؟"

"کاش اپنے بارے میں تمہیں بتا کر میں تم سے تمہارے بارے میں پوچھ سکتی۔"

"نہیں جی! جب بھی کبھی ہم سے اس لہجے میں پوچھو گی ہم جواب دے دیں گے۔ ہم ایسے ہی بے وقوف آدمی ہیں" خیردین نے کہا۔ ردا ہنسنے لگی پھر بولی۔

"کاش میرا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا خیردین! کاش وہاں میں ایسی حیثیت رکھتی کہ جو دل چاہتا وہ میں کر سکتی تو اس وقت پھر میں تمہیں چائے پلاتی۔ پھر کہتی کہ میرے ساتھ رات کا کھانا کھاؤ۔ میں تمہیں کافی دن اپنے ساتھ رکھتی خیردین! پتہ نہیں کیوں میرے دل میں یہ آرزو بار بار پیدا ہوتی ہے کہ میں یہاں سے الگ ہو جاؤں۔ ثنا مجھے جانے نہیں دیتی۔ میں خیردین! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اگر اپنی زندگی کی کہانی سنانے کا موقع ملا تو تم وہ پہلے آدمی ہو گے جسے میں یہ کہانی سناؤں گی جسے اپنی حقیقت بتاؤں گی۔ اور اس کے بعد یہ کہانی کسی دوسرے کے کانوں تک جائے گی۔ میں ناسپاس نہیں ہوں۔ ثنا کی حیثیت کو کم نہیں کرنا چاہتی خیردین! لیکن، لیکن۔ بس یہ میری آرزو ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں۔ صرف تمہیں اور اس کے بعد تم جس کو دل چاہے جو بات سنا دو۔ سمجھے خیردین! اپنے جذبات کا اظہار میں اس سے زیادہ مناسب الفاظ میں نہیں کر سکتی۔ بس پلیز مجھ پر بھروسہ کر لو۔ مجھ پر بھروسہ کر لو۔"

"مجھے آپ پر بھروسہ ہے ردا بی بی! مکمل بھروسہ ہے۔ لیکن کچھ ایسی الجھنیں راستے میں آجاتی ہیں کہ مجھے رکنا پڑتا ہے۔"

"مطلب؟"

"آپ کی کچھ اصول پسندیاں، آپ کی کچھ مجبوریاں کچھ ایسی باتیں جو آپ کے علم میں ہیں لیکن جنہیں بتاتے ہوئے آپ، آپ نہ جانے کیسے کیسے خیالات سے گزریں۔ ردا بی بی! میں اپنے کسی ذاتی مقصد کے لئے آپ کو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اگر آپ میرے لئے اپنے ذہن میں کچھ اور لچک کچھ اور نرمی پیدا کر لیں تو چند سوالات آپ سے ضرور پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"اگر وہ سوالات میری زندگی سے متعلق نہیں ہیں خیردین! تو تم یقین کرو کہ میں تمہیں ہر سوال کا جواب دوں گی۔ میں اپنے آپ کو بس ایک مخصوص وقت تک محدود رکھنا چاہتی ہوں۔ اس وقت تک جب تک ثنا کی شادی نہ ہو جائے۔ اس وقت تک جب تک یہ لوگ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہ دے دیں۔ میری زندگی میں کوئی ایسا جرم نہیں ہے خیردین! جو مجھے شرمندہ کرتا ہو۔ جو مجھے خوفزدہ کرتا ہو۔ تم یقین کرو، میں بے داغ زندگی کی مالک ہوں۔ بس کچھ ایسے واقعات میری زندگی سے وابستہ ہیں۔ جنہیں میں دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں جب اپنے آپ کو اس جگہ پاؤں گی جہاں میں جانا چاہتی ہوں تو پھر میں خود سے متعلق ایک بات بھی نہیں چھپاؤں گی۔ لیکن تم خیردین! کیا تم بھی کسی ایسی ہی الجھن کا شکار ہو؟"

"دیکھو جی ردا بی بی! خیردین ولد بشیردین شکل سے بے وقوف ضرور نظر آتے ہیں۔ لیکن بڑے چالاک ہیں جی! ہم اس وقت تک آپ کو اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں بتائیں گے۔ جب تک آپ زبان نہیں کھولیں گی۔ چاہے آدھی آدمی ہی کیوں نہ سہی۔ آدھی کہانی آپ ہمیں اپنی سنا دو تو آدھی کہانی ہم آپ کو اپنی سنا دیں گے۔ بس یہی رعایت ہو سکتی ہے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان۔" ردا ہنسنے لگی پھر بولی۔

"بہت چالاک ہو تم خیردین! تم سے اس انداز میں گفتگو کرتے ہوئے شرم بھی آتی ہے۔ پتہ نہیں بعد میں کیا نکلو؟"

"نہیں جی! ایک بھروسہ اور کر لیں آپ ہم پر۔ ہم جو بھی نکلے۔ آپ کے لئے خیردین ہی رہیں گے۔ کم از کم اپنے طور پر آپ کا جو دل چاہے سمجھ لینا۔ مگر خیردین ولد بشیردین صرف خیردین ہی رہیں گے۔"

"تمہاری زبان کھلوانا بہت مشکل ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ تم ضرور مجھے اپنے بارے میں بتا دو گے۔"

"ہاں جی! بتا دیں گے۔ اور وعدہ کرتے ہیں کہ جب بھی کبھی اپنے بارے میں بتانے کا موقع آیا تو سب سے پہلے آپ ہی کو بتائیں گے۔" خیردین نے کہا۔ اور ردا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس طرح اُسے ہنستے ہوئے بہت کم دیکھا گیا تھا۔ خیردین عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ ان نگاہوں میں وہی پُراسرار چمک تھی۔ بے پناہ پسندیدگی، محبت اور چاہت کے لاتعداد جذبے ان آنکھوں میں جگمگا رہے تھے۔ اور ردا، ردا ابھی شاید اتنا پختہ ذہن نہیں رکھتی تھی کہ ان جذبوں کی زبان کو پڑھ سکے۔

"ہم جائیں جی؟"

"جاؤ جاؤ۔ کون روک رہا ہے تمہیں۔ لیکن تم مجھے وہیں چھوڑ کر جا رہے ہو جہاں سے میں نے ابتدا کی تھی۔"

"بلی بی جی! یہ تو دکانداری ہے۔ سودا دو دام لو، دام دو سودا لو۔ برابر برابر۔ ففٹی ففٹی۔ خدا حافظ۔" خیردین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور باہر نکل گیا۔ نہ جانے کیوں ردا کو اس کی یہ ادا بے حد بھائی تھی۔ وہ چشم تصور سے دروازے کے قریب کھڑے خیردین کو دیکھ رہی تھی۔

"ففٹی ففٹی۔ سودا دو، دام لو۔ دام دو سودا لو۔ ففٹی ففٹی، ففٹی ففٹی۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خیردین آج ایک نئے انداز میں اس کے سامنے آیا تھا۔ اس کے اندر شوخی تھی۔ شرارت تھی، ذہانت تھی۔ سچائی تھی اور ادھر کشش بھی تھی۔

"اونہہ... کیا فضول باتوں میں پڑ گئی میں۔ وقت بہت ہو چکا ہے۔ اس نے دیوار میں لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر دروازہ بند کر کے غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔

▼

ندرت، اختر سے کترا رہی تھی۔ اس شخص نے اُسے کئی دن سے پریشان کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس دن کے بعد سے اب تک کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں ندرت کو اختر کے سامنے جاتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ جمن خود بخود کٹ گیا تھا۔ اس نے ندرت کو خوب جلی کٹی سنائی تھیں۔ اور کہا تھا کہ وہ بہت ہی ظالم زمانہ تھے۔ اور جمن اس سے نفرت کرنے لگا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ابھی تک جمن کی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس وقت دن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ کوٹھی کے معمولات ہمیشہ کے مطابق تھے۔ احسان صاحب کسی کاروباری دورے پر ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ شباب صاحب کے معمولات بھی جوں کے توں تھے چنانچہ کوٹھی میں کوئی خاص ہنگامہ نہیں تھا۔ خالد بھی کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اختر پائیں باغ کی جانب نکل آیا۔ اور پھر اتفاقیہ طور پر ہی اس کی نگاہ ندرت پر پڑ گئی۔ جو شاید ثنا کی تلاش میں تین نمبر سے نکل کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب جا رہی تھی۔ اختر نے آگے بڑھ کر اُسے سلام کیا۔ اور ندرت بھونچکی سی ہو کر رک گئی۔

"ذرا تشریف لائیے۔" اختر نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ندرت پر اس سے پہلے کبھی ایسی بوکھلاہٹ نہیں طاری ہوئی تھی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"جی فرمائیے۔"

"شرافت سے آجاؤ دوست! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" اختر نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ اور ندرت کو یہ الفاظ بھی عجیب سے لگے۔ اختر پلٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ یہ خود اعتمادی حیران کن تھی۔ لیکن ندرت سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ اس کی بات نہ مانتی۔ اختر بغلی لان کی جانب چل پڑا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ندرت بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔

"مجھ سے کوئی کام ہے اختر صاحب؟"

"لڑکیاں بہت کم دغاباز ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ہوتی ہیں تو پھر پیٹ بھر کر۔ آپ کے بارے میں کیا فیصلہ کروں میں ندرت؟"

"بہت زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہے ہیں آپ۔"

"جی ہاں! آپ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔"

"مگر کیوں؟"

"کمال ہے یعنی اس دن اتنی یگانگت اور محبت اور اس کے بعد پھر وہی بے اعتنائی۔ ندرت صاحبہ! مان لیا کہ آپ بے حد خوبصورت ہیں۔ ذہین ہیں۔ لیکن ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ آپ بڑی مشکل سے جڑتے ہوئے رشتے کو پھر سے توڑنا چاہتی ہیں؟"

"مگر کون سے رشتے کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"وہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کا رشتہ۔"

"منہ دھو رکھئے اختر صاحب! میں ایسی احمقانہ باتوں کو اہمیت نہیں دیتی۔"

"ٹھیک ہے باس! لیکن اختر اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے۔ صرف ایک بات بتا دیجئے آپ۔ اس کے بعد آپ کی چھٹی۔"

"جی جی فرمائیے۔" ندرت نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"گوشۂ دل میں کسی اور کا بسیرا ہے یا کتاب کے تمام اوراق سادہ ہیں۔ اگر کسی ورق پر کوئی نام درج کر دیا ہے تو اختر شریفانہ انداز میں گردن جھکا کر واپس لوٹ جائے گا۔ لیکن اگر اوراق سادہ ہیں تو یہ قلم قبول فرمائیے۔ اور اختر کا نام لکھ لیجئے۔"

اس نے جیب سے ایک فاؤنٹین پین نکال کر ندرت کی جانب بڑھا دیا۔ اظہارِ محبت کا یہ بے باکانہ انداز کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ فاصلے جو نہ جانے کتنی خلیجوں کو عبور کرنے کے بعد طے کئے جاتے ہیں۔ ایک ہی چھلانگ مار کر پار کر لینا۔ اور اتنی آسانی سے مقصد کا اظہار کر دینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ندرت پاگلوں کی طرح

اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے الفاظ اور اُن کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اور مُنہ کھل گیا۔ فاؤنٹین پین والا ہاتھ آگے بڑھا ہُوا تھا۔ اُس نے بوکھلائے ہُوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پریشان لہجے میں بولی۔

" پاگل، پاگل ہی ہو گئے ہیں آپ بالکل۔ یہ یہ کیا بدتمیزی ہے ہم... میرا مطلب ہے ہم... مُعاف کیجئے گا۔ یہ تو حماقت ہے۔ کیا یہ حماقت نہیں ہے؟"

" نہیں! حماقت نہیں بلکہ محبّت ہے۔ ہر چند کہ دونوں ہم قافیہ لفظ ہیں۔ لیکن دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ ویسے آپ اگر کتابی باتیں کرنا چاہتی ہیں تو کتابوں میں محبّت کو حماقت بعض جگہ لکھا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا ہے نہیں۔ محبّت محبّت ہے۔ اور حماقت حماقت ہے منطق کی رُو سے۔"

" اختر صاحب! آپ آپ شاید مجھ سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

" اَرے نہیں بھائی! محبّت کا لفظ سمجھانے میں آپ کو بڑی دقت پیش آ رہی ہے۔ نہ جانے کیا کیا مفہوم دیتی جا رہی ہیں آپ اُسے۔ سیدھے سادے الفاظ میں ایک بات نہیں بتا سکتیں آپ۔ کسی اور کو چاہتی ہیں یا نہیں۔"

دفعتاً ہی نُدرت نے اپنے کو سنبھالا۔ یہ اختر تو جو تول سیَیت آنکھوں میں گھُسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نہ جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ اِتنی اِتنی آسانی سے کسی کو اپنے لئے تختۂ مشق بنا لینا۔ واہ یہ کیسے ممکن ہے۔ چنانچہ اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

" آہ... آپ نے میرے اور جمن کے درمیان جو خلیج پیدا کر دی ہے اختر صاحب! میں اُس پر انتہائی افسُردہ ہُوں۔"

" نہال خانۂ دل میں محبّت کی ایک دُنیا آباد ہوتی ہے اور اِس دُنیا میں ضرورتِ زندگی کی تمام ہی چیزیں درکار ہیں۔ اگر اس کائنات میں آپ کو ایک باورچی کی ضرورت ہے تو اُس باورچی کو دوبارہ لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اختر اپنے مقام کے بارے میں کُچھ رہا ہے۔"

پھر وہی فضول باتیں۔"

" دیکھو بھئی ایک بات کان کھول کر سُن لو ہم ذرا مختلف قسم کے آدمی ہیں۔ کسی بھی مسئلے میں شرارت اور دلچسپیاں اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی سنجیدہ مُعاملہ درپیش ہو تو پھر ذرا گفتگو میں تبدیلی آ جانی چاہیئے۔ ہمیں آپ کی شرارتیں بڑی بھائی ہیں نُدرت! آپ کی شخصیت آپ کی حیثیت۔ آپ کی کیفیت یہ سب کچھ اچھی طرح پرکھی ہیں۔ اور اُس کے بعد اپنے ذہن میں آپ کے لئے جگہ تلاش کی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ آپ نے تو ہمارے وجود کے تین چوتھائی سے زیادہ حصّے پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اب نُدرت صاحبہ ایک شخص اگر اِس قدر پھنس چُکا ہو تو اُس کے نکلنے کا کوئی طریقہ بتا دیں۔ ورنہ پھر یہ فاؤنٹین پین قبول کریں۔" نہ جانے کیوں نُدرت کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔

نُدرت سراسیمگی سے اختر کو دیکھ رہی تھی۔ دِل کی دھڑکنیں بے قابو ہُوئی جا رہی تھیں۔ آج دل کچھ عجیب انداز میں دھڑکا تھا۔ اختر کے الفاظ نہ جانے کیوں اجنبی اجنبی سے محسوس ہُوئے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے زندگی میں اِس سے پہلے کبھی یہ لہجہ یہ زبان نہ سُنی ہو۔ کچھ دیر وہ اِسی کیفیت کا شکار رہی۔ اور پھر دفعتاً اُس کی فِطرت جاگ اُٹھی۔ اُس نے اختر کے ہاتھ میں دیئے ہُوئے قلم کو دیکھ کر کہا۔

" خوبصُورت ہے۔ اگر اِس کی نمائش مقصُود تھی تو اُس کے اور طریقے ہو سکتے تھے۔ آپ کی زبان سے اختر صاحب! یہ الفاظ معاف کیجئے کچھ احمقانہ سے لگے۔"

اختر کے ہونٹوں پر وہی دِل آویز مُسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی۔ کمبخت نے کسی طور مرعوب ہونا نہیں سیکھا تھا۔ رات کی تنہائیوں میں نُدرت نے جب اختر کے بارے میں سوچا تھا۔ تو یہ ہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ صِرف مذاق کر سکتا ہے۔ کسی ایسے مسئلے میں سنجیدگی کیا معنی رکھتی ہے۔ اور پھر حرفوں کا بنا ہے۔ شرارتوں میں اُتنا ہی شدت پسند جتنی وہ خود تھی۔ اگر اُس نے یہ شرارت سنجیدگی سے کی ہے تو اِس کا جواب بھی اُسے اِسی انداز میں ملنا چاہیئے۔ لیکن نہ جانے ذہن کیوں بھٹک رہا تھا۔ جو کچھ کہنا چاہتی تھی وہ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ یا پھر ذہن میں اُس کی ترتیب نہیں تھی۔

" ہاں ہو سکتا ہے کہ میرے یہ الفاظ آپ کو احمقانہ لگے ہوں۔ لیکن دُنیا میں اظہار کے جو طریقے رائج ہیں۔ میں نے اُن ہی کے مطابق آپ سے وارداتِ دِل کہی ہے۔ نُدرت! سچ کہہ رہا ہُوں۔ اِس سے زیادہ نہ کہلواؤ۔ تمہیں اختیار ہے کہ مجھے دھتکار دو۔ کسی ایسے لہجے میں مخاطب کرو۔ جس سے مجھے اپنی توہین کا احساس ہو۔

براہِ کرم یہ کام میری درخواست پر ضرور کر ڈالو۔ یُوں نہ سمجھو کہ اِس کے بعد میرے اور تمہارے درمیان رابطے ختم ہو جائیں گے۔ ہاں کم از کم جب تمہارا لہجہ یاد آئے گا تو دِل میں پیدا ہونے والی کسک کچھ مدہم پڑ جائے گی۔ اِتنا تو حق رکھتا ہُوں نا" اختر نے نُدرت کو بغور دیکھتے ہُوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

" اگر آپ کوئی سنجیدہ مذاق کر رہے ہیں اختر صاحب! تو میں آپ سے درخواست کروں گی کہ کم از کم ایسا مذاق مجھ سے نہ کیجئے۔ یہ ساری باتیں فضول باتیں ہیں۔ جمن کی شخصیت کچھ اور تھی اُس سے کچھ کہتے ہُوئے کوئی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو میری اور اُس کی حیثیت یکساں تھی کچھ لوگ مالکوں کے مُنہ چڑھے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مالک تو نہیں بن جاتے۔ جتنے تو وہی ہیں۔ جو اُن کی حیثیت ہوتی ہے۔ میرے والد غلام احمد صاحب اِس کوٹھی میں مُلازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور میں تین نمبر کی باسی ہوں۔ کیا سمجھے آپ!"

" سمجھ رہا ہُوں۔ اِس کے علاوہ بھی کچھ کہئیے۔"

" آپ یہ دِلچسپ مذاق کر کے اپنی توہین کر رہے ہیں اختر صاحب! میرا کیا جاتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ بڑے لوگ ازراہِ مذاق کسی معمُولی سی لڑکی سے ایسے الفاظ کہہ دیتے ہیں کہ وہ بیچاری اپنی اوقات بھُول جاتی ہے۔ لیکن اِس کے جواب میں آپ سے ایک عرض کر دوں کہ ہم حالات کے مارے ہُوئے ہیں۔ اُس سطح کے لوگ نہیں ہیں جس سطح پر آپ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ میرے والد مشرقی پاکستان میں تھے۔ بہت اچھا کاروبار تھا ہمارا۔ دولت مند لوگ تھے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میرے والد نے صِرف ڈرائیوری کی ہو۔ اپنی گاڑی چلاتے ہُوئے اُنھوں نے گاڑی چلانا سیکھی تھی۔ حالات کے مارے ہُوئے ضرور ہیں۔ لیکن وہ نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ براہِ کرم آپ اپنا وہی رویّہ برقرار رکھیئے۔ اِس عمارت کے رہنے والے بہت اچھے ہیں۔ شناء نے مجھے اپنی سہیلی کی سی حیثیت دی ہے۔ آپ کیوں میرا مذاق اُڑانے پر تُلے ہُوئے ہیں؟"

نُدرت ذہنی طور پر بھٹک رہی تھی۔ اُسے پُورا پُورا احساس تھا کہ وہ کہنا کچھ اور چاہتی ہے لیکن دِل کی گہرائیوں سے نکلنے والے الفاظ کوئی اور ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُس کے لہجے میں ایک شکایت سی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک اضطراب اور بے چینی سی مترشح تھی۔ اُس کی آواز میں جیسے چاہتی ہو کہ اُسے دلاسے دیئے جائیں۔ اُس سے کہا جائے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہی ہے۔ ساری شوخی ساری طرّاری ہَوا ہو گئی تھی۔ نہ جانے یہ کون سا لہجہ تھا۔ نہ جانے یہ کیسے بول تھے کہ اُس نے اُس سے اُس کی شخصیت چھین لی تھی اُس کے اندر ایک عجیب سی بے کلی پیدا ہو گئی تھی۔ اور اختر کی پُرسکون مُسکراہٹ اُس کی فِطرت کو تہہ و بالا کر رہی تھی۔ جب وہ سب کچھ کہہ چُکی تو اختر نے کہا۔

" اِس تعارف کا مزید شُکریہ۔ یہ قلم قبول کر لیجئے نا۔"

" اختر صاحب! آپ نے جو کچھ زبان سے کہا اُس کی پاسداری نہ کی۔ آپ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن شاید آپ کسی کو دوست نہیں بنا سکتے۔ شاید آپ نے مجھ پر غور کر لیا ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے مُڑی اور سامنے ہی شناء نظر آ گئی۔ اِس وقت نُدرت کی کیفیت بہت عجیب ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں دِل اندر سے ڈُوبا ڈُوبا سا محسوس ہو رہا تھا۔ شناء ہی کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ لیکن اِس وقت شناء کا نظر آ جانا اُس کے لئے وبال بن گیا تھا۔ کسی تنہا گوشے میں جانا چاہتی تھی اپنے آپ کو پُرسکون کرنا چاہتی تھی لیکن شناء نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ اب بھلا اِس بات کی کیا گنجائش تھی کہ وہ شناء سے نگاہیں بچا کر کہیں نکل جائے بلکہ اپنے آپ کو سنبھالنا ضروری تھا۔ کہیں اُس کی یہ کیفیت شناء کی نگاہوں میں نہ آ جائے شناء تو اُسے تنگ کر ڈالے گی جمن کی بات دوسری تھی وہ ایک کھُلا کھُلا مذاق تھا۔ لیکن اختر اور جمن میں بہت بڑا فرق تھا۔ اختر کے الفاظ کا ردِّعمل براہِ راست اُس کی اپنی ذات پر ہُوا تھا۔ جب کہ جمن تفریح کا ایک عام ذریعہ تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ اور شناء بھی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ " ہیلو اللہ رکھی!"

" ہیلو مالک کی بیٹی!" اُس نے اپنی آواز کو حتّی الامکان قابو میں رکھتے ہُوئے کہا۔

" اختر سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

" کوئی خاص بات نہیں شناء۔ بس تمہارے مہمان ہیں۔ اِس لئے معاف کر دیتی ہُوں۔ ورنہ مزہ چکھا دُوں حضرت کو۔"

" یہ شخص مجھے بھی ضرورت سے آگے ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیا کروں خالہ کا بھائی ہے۔ ورنہ... ورنہ...!"

نُدرت کی آنکھوں میں ایک دم شرارت اُبھر آئی۔

" مطلب؟"

" مطلب یہ کہ... یہ کہ... بس کیا کروں اِس کے ساتھ۔ عجیب سی حرکتیں کرتا ہے۔ سوچتی ہُوں چند روز کے مہمان ہیں یہ کیا یاد کریں گے کہ کسی نے معاف کر دیا تھا ورنہ ناکوں چنے چبوا دُوں حضرت کو۔"

" مگر آپ نے ایک خاص بات کہی ہے ملکہ عالیہ" نُدرت شناء

گو کسی طور یہ احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ اُس کی اپنی حالت بھی اِس وقت کچھ گڑبڑ ہے۔

"کیا خاص بات کہی ہے میں نے" ثناء نے بھویں سکوڑتے ہوئے کہا۔

"آپ نے فرمایا ہے کہ یہ خالد کا بھائی ہے بِاس لئے معاف کئے دیتی ہوں ورنہ۔ اِس کا مطلب ہے کہ دیور صاحب کے ساتھ رعایت کی جا رہی ہے۔"

"لاحول ولا قوت۔ کیا عجیب لفظ استعمال کیا ہے تم نے ارے مجھے اِس لفظ کا مطلب تو سمجھا دو۔ دیور۔ دے ور۔ کیا مطلب ہوا اِس بات کا، احمق آدمی دیکھو کیسے گھورے جا رہا ہے ہمیں۔ ندرت! کم از کم اِس کے جانے سے پہلے اِسے کوئی ایسا سبق تو دے دو کہ یہ بھی واپس جانے کے بعد ہمیں یاد کرتا رہے۔"

"ہوں" ندرت نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اجازت ہے مالک کی بیٹی؟"

"سو فیصدی اجازت ہے۔ بس اِسے کوئی نقصان نہ پہنچے لیکن ایسا کر دو کہ یاد رکھے زندگی بھر۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ کی ہدایت ہے تو ہو جائے گا یہ کام بھی۔۔۔" ندرت نے کہا اور ثناء مسکرانے لگی۔ پھر بولی۔

"آؤ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ اِس شخص کو اِس وقت اپنے اُوپر مسلط نہیں کرنا ہے۔"

"تو پھر اپنے کمرے ہی میں چلو" ندرت نے نہ جانے کس خوف کے تحت کہا۔ اختر کی نگاہیں اُسے اپنے وجود میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ثناء نے اِنکار نہیں کیا۔ اور دونوں کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑیں۔

• •

خالد نے اختر کو اپنے کمرے میں بُلایا۔ خالد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرچہ اختر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور اختر نے دلچسپی سے اُسے کھولا۔

"کیا بات ہے۔ آخر ثناء بھابی نے ہتھیار ڈال دیئے نا" وہ مسکراتا ہوا بولا۔ لیکن پرچہ کھولنے کے بعد اُس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ یہ خط ملول حسین صاحب کا تھا کینیڈا سے آیا تھا۔ اور اِس میں اُن سے کہا گیا تھا کہ اب چونکہ اُنھیں وہاں کافی دن ہو گئے ہیں چنانچہ وہ واپس آ جائیں۔ کچھ ایسے معاملات ہیں جن کی تکمیل ضروری ہے۔ اختر نے کچھ عجیب سی کیفیات کا شکار ہو کر خالد کی طرف دیکھا۔ اور خالد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا خیال ہے اپنی ثناء بھابی کے اِس خط کے بارے میں؟"

"سبحان اللہ! گویا آپ بھی اب پُر مذاق ہو گئے ہیں منطق کی رُو سے" اختر فوراً ہی خود کو سنبھال کر بولا۔

"ہاں بھئی کبھی کبھی خوش مزاجی کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔"

"ہاں ہاں یقیناً اور خاص طور سے ایسے لمحوں میں جب دِل پر قیامت بیت گئی ہو۔ اور اپنے آپ کو دوسروں سے چھپانا بھی مقصود ہو" اختر بولا اور خالد جھینپ گیا۔

"بکواس کرنے میں کبھی تم سے جیتا ہوں۔ میں نے تو ہمیشہ ہی شکست مانی ہے" خالد بولا۔

"بس گڑبڑ ہو گئی۔ اگر میں ڈاکٹر ہوتا تو مرض کی تشخیص میں اپنا ثانی نہ رکھتا۔ دیکھ لیجیے صرف اُس نس پر ہاتھ رکھتا ہوں۔ جو وجہ تکلیف ہوتی ہے۔ بہرحال بڑے بھائی یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے درد کی دوا کیسے کرتے ہیں۔"

"اوہ ڈاکٹر کے بچے میں تجھ سے فضول باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اب یہ بتاؤ واپسی کا کیا پروگرام رہے گا؟"

"اماں بڑے بھائی! والد صاحب قبلہ نے یہ تھوڑی کہا ہے کہ اِس خط کو تار سمجھو اور خود لیٹر بکس میں گھس جاؤ۔ یعنی واپسی کے لئے ٹھیک ہے جانا تو ہمیں تھا۔ لیکن جس مقصد کے تحت آئے تھے اُس کی وضاحت نہیں ہو سکی۔"

"مطلب؟" خالد نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ثناء بھابی کا جواب، میرا مطلب ہے ثناء صاحبہ کا جواب۔ آخر آپ والد صاحب کو کیا جواب دیں گے؟"

"دیکھو اختر! میں خود بھی ضرورت سے زیادہ میاں کا قائل نہیں ہوں۔ تمہارا کیا خیال تھا کیا میں یہاں اِس لئے آیا تھا کہ میں والد صاحب کے اشارے پر ایک عدد عشق کر ڈالوں۔ ثناء کو لے کر کبھی سمندر کی لہروں پر اور کبھی کسی باغ میں چھلانگیں لگاتا پھروں۔ اور فلمی گانے گاؤں۔ اور اُس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے پیمانِ وفا کریں۔ اور پھر اِس پیمان کی تکمیل کی جائے۔ ثناء ایک حقیقت پسند لڑکی ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جس ماحول کی پروردہ ہے اُس کے مطابق اُس نے خود کو ڈھالا ہے نہ خود میں کوئی ایسی انفرادیت پیدا کی ہے۔ جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ احسان صاحب کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے دوسرے ہی اُس سے لاڈ کرتے ہیں۔ لیکن شاید تم نے محسوس کیا ہو کہ اِس لاڈ سے اُس کی طبیعت میں کوئی ایسی بات نہیں پیدا ہو سکی ہے جو گھناؤنی ہو۔ وہ ایک نارمل لڑکی ہے۔ تفریح پسند ہے آزاد ہے۔ ہنگاموں اور شوخیوں سے دلچسپی رکھتی ہے۔ اب ظاہر ہے میں نے اُس سے باقاعدہ اظہارِ عشق تو نہیں کیا۔

سیدھی سیدھی بات کر لی۔ اور اُس نے بڑی سادگی سے اپنے ذہن کے مُطابق جواب دے دیا۔ کیا یہ الفاظ تم کم سمجھتے ہو۔ اُس جیسی لڑکی کی زبان سے کہ اگر شادی کرنا ہی پڑی۔ تو پھر وہ مجھ سے شادی کرے گی۔ بس یہ جواب قبلہ وکعبہ کے لئے کافی ہے بِاس کے بعد کے جواب بزرگ جانیں۔"

"ایک سوال کر لوں بڑے بھائی؟"

"کیا بڑے بھائی بڑے بھائی لگا رکھی ہے۔ تمیز سے بات کرو۔"

"سوری مسٹر خالد صاحب! ایک سوال کر لوں؟"

"بکو" خالد نے کہا۔

"فرض کیجیے محترمہ ثناء صاحبہ شادی سے یکسر اِنکار کر دیتی ہیں۔ تو آپ پر کیا ردِعمل ہو گا؟"

"اطمینان رکھو۔ گلی کوچوں میں المیہ نغمے نہیں گاتا پھروں گا۔" خالد نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"ہوں! بہر طور خُدا بہتر کرے۔ تو اِس خادم کے لئے اب کیا حکم ہے؟"

"طے کر و کہ کب روانہ ہونا ہے۔ میرا خیال ہے ہم احسان صاحب کی واپسی کا انتظار تو کریں گے ہی۔ وہ آج کل شاید یہاں موجود نہیں ہیں۔"

"ہاں! باہر گئے ہوئے ہیں کسی کاروباری سلسلے میں۔"

"یہ معلوم کر لیں گے رات کو کہ اُن کی واپسی کب تک متوقع ہے۔ مِل کر تو جانا چاہیئے۔ ممکن ہے ڈیڈی کے لئے کوئی پیغام بھیجیں۔"

"ارے ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اور ویسے بھی یہ نالائقی ہو گی۔ آخر سُسر صاحب کی دُعائیں ساتھ لے جانا ضروری ہے۔ اور پھر ممکن ہے جس پیغام کی آپ توقع کر رہے ہوں۔ وہ بھی مِل ہی جائے منطق کی رُو سے" اختر نے بدستور شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ اور خالد مُسکرانے لگا۔

"تجھ سے باتیں کرتے ہوئے واقعی ذہن کو بڑا قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ جیسے مقامی سڑکوں پر گاڑی چلاتے ہوئے" خالد نے کہا اور اختر ہنسنے لگا۔

"بس ہمارے تمہارے درمیان صرف کاروباری ملاقات ہی رہنی چاہیئے۔ اِس سے زیادہ موزوں نہیں ہوتا چنانچہ گیٹ آؤٹ۔"

اختر ہنستا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ خالد کی اِس اطلاع پر اُسے بھی ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ کینیڈا کی رنگین زندگی میں جہاں عورت کی بے وقعتی ضرب المثال ہے یہ ماحول ایک عجیب و غریب حیثیت کا حامل تھا۔ یہاں اقدار کی بلندیاں تھیں رشتوں کا تقدس تھا صنف کی حرمت تھی اور یہ سب کچھ بہت عرصے سے اُن کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اُنھیں یہ ہی محسوس ہوا تھا جیسے ایک طویل دورے کے بعد اپنی دُنیا، اپنے گھر میں واپس آئے ہوں۔ حالانکہ یہ جگہ اُن کا گھر نہیں تھی لیکن یہاں کے ماحول میں آ کر شاید کسی کو بھی اجنبیت کا احساس نہ ہو سکتا ہو۔ سب ہی ایک دوسرے سے یگانگت اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں، دِلچسپ چٹکلے، تفریحی ماحول اور اِن تمام چیزوں میں ایک پاکیزگی، ایک تقدس جو انسانی فِطرت کی ازل سے خواہش رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کو مختلف راستوں پر موڑ کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ تاہم وہ پیاس، یہ شدت محسوس کی جاتی رہی ہے جو اِس فِطرت کا خاصہ ہے۔ یورپ میں اِن چیزوں کا فقدان تھا اِس لئے وہاں بے رُخی پھیلی ہوئی تھی۔ اِن دونوں نے بالغ نظری سے اِن تمام چیزوں کا جائزہ لیا تھا۔ اور اِس پر اچھی طرح سوچا تھا۔ فطرتاً دونوں نیک طبع تھے اِس لئے اِس ماحول سے اُنھیں عشق سا ہو گیا۔

اختر کے ذہن کی گہرائیوں میں واقعی ندرت کا تصور جاگزیں ہو گیا تھا۔ اور یہ کوئی تفریحی گفتگو نہیں تھی۔ خالد کو تو باقاعدہ یہاں اِس لئے بھیجا گیا تھا کہ احسان صاحب کی بیٹی سے اُس کی بچپن کی نسبت تھی۔ لیکن اختر کا معاملہ بالکل مختلف ہو گیا تھا۔ ندرت کی شوخ طبیعت دِل کو بھا گئی تھی۔ اور اُس لڑکی کے اندر اختر کو کچھ ایسی چیزیں نظر آئی تھیں۔ جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھیں۔۔۔ یہ بات اِس خاندان میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی کہ کون کس حیثیت کا مالک ہے۔ کبھی اِس موضوع پر کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی تھی۔ طبقاتی فرق کا تصور بھی کبھی زیرِ گفتگو نہیں آیا تھا۔ اِس لئے اختر نے اِس بات پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ ندرت کون ہے۔ ندرت نے آج کی گفتگو میں اِس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ کسی پس ماندہ خاندان کی لڑکی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی تھی اپنی ذات میں بہت کچھ تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر اختر دیر تک اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ جانے کیوں اُس کی شریر فطرت میں ایک سنجیدگی کی لہر آ گئی تھی۔ ابھی خالد کے سامنے وہ اپنے مزاج کے مطابق گفتگو کرتا رہا تھا۔ لیکن اپنے کمرے میں پہنچ کر اور اُس خط کا مضمون دیکھ کر جو اُن کے باپ نے اُنھیں لکھا تھا۔ اختر کو ایک عجیب سی بے کلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اگر یہاں سے اِسی طرح واپس چلا جایا جائے۔ تو نہ جانے کیا ہو۔

ایک بار پھر اُس نے اپنے ذہن کو ٹٹولا۔ کیا ندرت سے یہ

سگاؤ وقتی تو نہیں ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ اِس ماحول سے متاثر ہوگیا ہو۔ اور آئندہ زندگی میں یہ سب کچھ اُس کے ذہن سے نکل جائے۔ دِل میں کبھی اِس سے پہلے یہ احساس نہیں جاگا تھا۔ اور اب جاگا تھا تو ہمیشہ کے لئے جاگ اُٹھا تھا۔ نہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ کیا کیا جائے؟ یہ کافی غور کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ کافی دیر کمرے میں تنہا بیٹھے بیٹھے گزر گئی تھی۔ طبیعت اُوبھنے لگی۔ اپنی جگہ سے اُٹھا اور باہر نکل آیا۔ باہر کے حصے میں خاموشی اور سناٹا پھیلا ہُوا تھا۔ کوٹھی کے مکین اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اُس کی نگاہ کوارٹروں کی طرف اُٹھ گئی۔ اور پھر نہ جانے کیوں اُس کے قدم خود بخود آگے بڑھ گئے۔ احسان صاحب کیونکہ ملک سے باہر تھے اِس لئے غلام احمد صاحب گھر پر ہی تھے۔

تین نمبر کے سامنے اُس کے پاؤں رُکے۔ اور دوسرے لمحے نہ جانے کیوں اُس نے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ یہ ایک خطرناک قدم تھا۔ لیکن اب جو کچھ کرنا تھا کر ہی چکا تھا۔ دروازہ غلام احمد صاحب نے کھولا تھا۔ عصمت یونیورسٹی گئی ہُوئی تھی۔۔۔ ندرت باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ اماں بی اور شوکت جہاں اندر کے بڑے کمرے میں تھیں۔ غلام احمد صاحب اختر کو جانتے تھے۔ کسی نے اِن دونوں بھائیوں کے بارے میں اُنھیں بتا دیا تھا۔ اختر کو وہاں کھڑے دیکھ کر بھونچکے ہوگئے۔ اور جلدی سے مستعد ہو کر بولے۔

• او ہو اختر صاحب! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میرے لئے پیغام بھجوا دیا ہوتا۔ میں حاضر ہو جاتا۔ معافی چاہتا ہُوں دراصل۔"

• ارے ارے انکل! آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ میں آپ کو کیوں بُلواتا۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔"

• کہیں جانا ہے اختر میاں، معاف کیجئے ذرا بے تکلفی سے بول رہا ہُوں لیکن کیا کریں ہم لوگوں کی تہذیب ہی یہی ہے۔"

• اور میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ نہ جانے کیوں اِس طرح اُلجھ گئے ہیں۔ بس ٹہلتا ہُوا اِس طرف نکل آیا تھا۔ یہ علم تھا کہ احسان چچا کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ گھر پر ہی موجود ہیں۔۔۔ دراصل باہر کی زندگی میں انسان کو کچھ بُری عادتیں لگ جاتی ہیں۔ جن میں سے ایک بُری عادت اپنے ہم وطنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش بھی ہے۔ میں کینیڈا واپس جا رہا ہُوں۔ سب لوگوں سے ملاقات کرنا تھی۔ ابتداء آپ سے کی ہے۔" اختر بات بنانا جانتا تھا۔ چنانچہ بات نبھا گیا غلام احمد صاحب کے چہرے پر عجیب تاثرات پھیل گئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے جھجک کا احساس ہُوا۔ لیکن پھر فطری خودداری اُبھر آئی۔ اور اُنھوں نے دروازے سے ہٹ کر کہا۔

• تو پھر میں آپ کو اندر آنے کی دعوت بھی دُوں گا۔"

"بھئی۔ آپ کی کیا مُراد ہے، آیا اِسی لئے ہُوں کہ آپ سے کچھ دیر باتیں کروں۔" اختر نے دروازے کے اندر قدم رکھتے ہُوئے جواب دیا۔

غلام احمد صاحب اُسے لئے ہُوئے برآمدے میں پہنچ گئے جہاں نشست کے لئے کچھ کرسیاں وغیرہ رکھی ہُوئی تھیں۔ ندرت اچانک ہی باورچی خانے سے باہر آئی تھی۔ اور اختر کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ششدر رہ گئی تھی۔ دوسرے لمحے وہ پھر باورچی خانے میں گھس گئی۔ اُس کے ذہن میں کیا تھا اِس کا اندازہ مشکل تھا۔ لیکن اختر نے اُس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

برآمدے کی کرسیوں پر اختر کو بٹھانے کے بعد غلام احمد صاحب خود بھی اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اِس اجنبی مہمان سے کیا گفتگو کریں۔ اختر نے اُن کی یہ ہچکچاہٹ محسوس کر کے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

• دراصل محترم۔ میں انسانی نفسیات پر بھی تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر چکا ہُوں۔ اور لوگوں کا تجزیہ میرا شوق ہے۔ آپ انکل احسان کے ڈرائیور ہیں۔ معاف کیجئے گا میں طبقاتی فرق کو دُنیا کی سب سے گھناؤنی شے قرار دیتا ہُوں۔ لیکن بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی فطرت میں رچ جاتے ہیں اور جو شخص اپنے پیشے سے ذرا بھی مختلف نظر آتا ہے اُس پر حیرت ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے محترم! کہ آپ کم از کم ذہنی طور پر ڈرائیور نہیں ہیں۔ اِس کی وجہ جان سکتا ہُوں؟" غلام احمد صاحب کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُنھوں نے کہا۔

• اختر میاں! آپ ایک ایسے ملک میں قیام پذیر ہیں جہاں جذباتیت کے بجائے حقیقت اور سچّائی کو مانا جاتا ہے۔ اور میں ذاتی طور پر اِس کا قائل ہُوں کہ انسان کو ہمیشہ اپنی حقیقت قبول کرنی چاہیئے۔ ماضی ایک دِلچسپ کہانی کی مانند ہوتا ہے۔ جو فلم کی طرح نگاہوں سے گزرتی رہتی ہے اِس میں بہت سے ٹلٹ پھیر بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں حال کا پُجاری ہونا چاہیئے۔ میں اِس وقت صرف اور صرف ڈرائیور ہُوں۔ اور میرا خیال ہے میری مختصر سی بقیہ زندگی ڈرائیور کی حیثیت سے ہی گزرے گی۔ ماضی کے بارے میں اگر کچھ جاننا چاہتے ہو تو اِس سے کوئی فائدہ تو نہیں ہوگا۔ بس یہ کافی ہے کہ تمھاری بڑائی تمھیں اِس کوارٹر تک لے آئی۔ ہاں اگر کبھی کسی نے مُجھ سے کچھ بڑے آدمیوں کے بارے میں پُوچھا۔ تو میں اِن میں تمھارا نام ضرور شامل کر لوں گا۔"

• اور یہ الفاظ میری اِس بات کی تصدیق کرتے ہیں محترم! کہ آپ۔۔۔ آپ ماضی میں بہت کچھ رہ چکے ہیں۔"

• لاتعداد انسان ماضی میں بہت کچھ رہ چکے ہیں لیکن حال میں کچھ نہیں ہیں۔ جب کہ حال ہی ایک اصل اور ٹھوس حقیقت ہے۔"

• اِس میں کوئی شک نہیں۔ میں اِس بات کو تسلیم کرتا ہُوں۔ تاہم اگر آپ میری یہ خواہش پُوری نہیں کرنا چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔"

"میرے ماضی کے بارے میں جان کر تمھیں کوئی فائدہ بھی تو نہیں ہوگا۔"

• میں کسی فائدے کے حصُول کے لئے آپ کی خدمت میں نہیں حاضر ہُوا۔"

• اچھا ٹھیک ہے بتا دُوں گا میں۔ اگر اتنی ہی فراخدلانہ طبیعت رکھتے ہیں آپ تو پھر یہ بتائیے کیا پئیں گے۔ اور کچھ پینا پسند کریں گے اِس گھر میں یا۔۔۔"

• چلئے۔" اختر نے جواب دیا۔

"ندرت! مہمان آئے ہیں چلئے لے آؤ بیٹے۔" غلام احمد صاحب نے باورچی خانے کی طرف آواز لگا کر کہا۔ اور اُس کے بعد اختر کی جانب متوجہ ہوگئے۔

• ہاں اختر میاں! اگر تُم بھی نہ جانے کیوں دِل چاہ رہا ہے کہ تم سے ذرا بے تکلفی سے گفتگو کی جائے۔ میرے اہل خانہ سے ملنا پسند کرو گے؟"

• بالکل! اگر آپ اِس قابل سمجھیں۔" اختر نے جواب دیا۔ اور غلام احمد صاحب نے شوکت جہاں اور اماں بی کو آوازیں دے لیں۔ جو دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ کسی ایسے مہمان کی آمد اُن کے لئے حیران کُن تھی۔ وہ دونوں اندر آگئیں۔ اختر نے دست بستہ اُنھیں سلام کیا۔ اور غلام احمد صاحب اُن کا تعارف کرانے لگے تھے۔ شوکت جہاں بولیں۔

• ہاں مجھے اِن بچوں کی آمد کا علم ہے۔ احسان صاحب کے بہت گہرے دوست کے بیٹے ہیں کسی نے تذکرہ کیا تھا۔"

• اور اب یہ واپس جا رہے ہیں۔ ہم سے مِلنے آئے ہیں۔"

• خدا اِن کی عمر دراز کرے۔" شوکت جہاں نے کہا۔

• چچی جان! بعض لوگ مُجھ جیسے بھی ہوتے ہیں۔ جو زبردستی کسی کے گھر میں گھس آتے ہیں۔ آپ خیال نہ کیجئے گا۔"

• نہیں بیٹے! ہم جانتے ہیں کہ اِس کوٹھی کے رہنے والے کیسے لوگ ہیں۔ اور اچھے لوگوں کے ساتھی بھی اچھے ہی ہوتے ہیں۔"

• ہاں تو چچا جان! آپ مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

• بھئی مشرقی پاکستان میں آباد تھے ہم لوگ۔ بس تقدیر نے کچھ فیصلے کئے۔ اور ہم سے وہ علاقہ چھن گیا۔ وہاں سے بڑی پریشان کُن حالت میں یہاں پہنچے۔ حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ یہاں آکر گزر بسر کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ احسان صاحب کے ہاں ملازمت مل گئی۔ ایک بہت بُرے علاقے میں رہتے تھے۔ لیکن احسان صاحب نے احسان کرتے ہُوئے ہمیں یہ جگہ بھی دے دی۔ اب یہاں مطمئن اور مسرور زندگی گزر رہی ہے۔"

• مشرقی پاکستان میں آپ کا کیا کاروبار تھا؟"

”خاصہ بہتر کاروبار تھا۔ لیکن جب حالات تباہ ہوئے تو میں نے اُس کاروبار کو فروخت کر دیا۔ کافی بڑی رقم حاصل ہوئی تھی۔ لیکن اُسے لانا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ انٹرنیشنل ریڈکراس کے چند نمائندوں کے حوالے اپنا سرمایہ کر دیا۔ کچھ ایسی افراتفری پھیلی ہوئی تھی کہ تمام تفصیلات طے نہ ہو سکیں۔ اور ہم اُس سرمائے سے محروم ہو گئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُن بیچاروں نے میری تلاش نہ کی ہوگی۔ میں نے اپنے ذرائع سے کچھ کوششیں بھی کیں۔ اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ لیکن اُن سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب تو مایوس ہو گیا ہوں۔ درحقیقت وہ بھی تو میری شناخت میں ناکام رہیں گے۔ ہاں اگر انفرادی طور پر اُن دو افراد سے میرا سامنا ہو جاتا۔ تو شاید وہ مجھے پہچان لیتے۔ اور اُس کے بعد میری مشکل حل ہو جاتی۔ لیکن اُن کا کوئی سُراغ نہیں مل سکا۔“

”کون لوگ تھے وہ؟ کم از کم کچھ تو پتہ چلے۔“

”ایک خاتون تھیں مسز پال نائیڈو۔ اور ایک صاحب مسٹر ایلس براؤن سن تھے۔ اِن ہی دونوں کے حوالے میں نے اپنا سرمایہ کیا تھا۔ لیکن میں نے بین الاقوامی ریڈکراس سے رابطہ قائم کر کے کوششیں کیں۔ اُنھوں نے نہایت ہمدردانہ جوابات دیئے۔ لیکن ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تسلی بخش بات نہیں پتہ چل سکی۔“

”ہوں! بہر طور محترم! میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان کو سکون کی زندگی کے لمحات کسی بھی حیثیت سے میسر آ جائیں۔ وہ بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ آپ جس ہمت اور استقلال سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ قابلِ ستائش ہے۔“

کچھ دیر بعد نُدرت چائے کی ٹرے سجائے ہوئے اندر آ گئی چہرے پر بے پناہ سنجیدگی طاری تھی۔ اختر نے ایک نگاہ اُس پر ڈالی۔ اور غلام احمد صاحب جلدی سے بولے۔

”میری چھوٹی بیٹی ہے نُدرت۔ اِس وقت چہرے پر سنجیدگی سجائے ہوئے ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کتنی نٹ کھٹ ہے۔“

”جی“ اختر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”ایک اور بیٹی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کر رہی ہے۔“ اختر نے چائے کی پیالی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی تھی تھوڑی دیر تک وہ اُن لوگوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اور اُس کے بعد غلام احمد کو سلام کر کے وہاں سے باہر نکل آیا۔ اِن لوگوں پر وہ عجیب سا تاثر چھوڑ آیا تھا۔ اِس وقت تین نمبر میں آنے کا مقصد قطعی یہ نہیں تھا کہ غلام احمد صاحب یا اُن کے اہلِ خاندان سے ملاقات کرے۔

پکی بات تو یہ تھی کہ اُس کے قدم ہی اِس طرف اُٹھ گئے تھے۔ لیکن اب چونکہ غلام احمد صاحب سے مِل ہی تھا۔ اِس لئے دو نمبر کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی ضروری تھا۔ تاکہ جو کچھ وہاں کہنا ہے اُس کی تصدیق ہو جائے۔ جمن کی ماں نے دروازہ کھولا تھا۔ اختر کو دیکھ کر وہ سمٹ گئی۔

”کہو میاں! کیا بات ہے؟“

”آپ کا مہمان ہوں خالہ جان! اِسی کوٹھی میں رہتا ہوں۔ اختر ہے میرا نام۔“

”اچھا میاں اچھا۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے۔ کیسے آنا ہوا؟ جمن تو وہیں اندر رہی ہے۔ باورچی خانے میں ہوگا اُس سے کوئی کام تھا؟“

”نہیں آپ کو سلام کرنے آیا تھا۔ آخر آپ بھی تو بزرگ ہیں۔“

”اچھا! آؤ پھر اندر آ جاؤ میاں! وعلیکم السلام۔ کہو کیسے ہو؟“

”ٹھیک ہوں خالہ جان! آپ سُنائیے جمن کے بارے میں کچھ بتائیے۔ جمن تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور میں بھی انھیں۔“

”ارے کیا بتاؤں اُس کمبخت مارے کا حال۔ دماغ اُلٹ کر رہ گیا ہے۔ بس بھیا کیسے بتاؤں تمھیں۔ کیا ہو گیا ہے اُس مردود کو۔ ارے خُدا غارت کرے اِن تین نمبر والوں کو۔ جنھوں نے میرے جمن کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔“

اچھا اچھا خالہ جان! بڑا افسوس ہوا یہ سُن کر۔ کیا خرابی پیدا ہو گئی جمن میں؟“

”بس بھیا کیا بتاؤں۔ اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا ہے۔ تعویذ گنڈوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ ارے قسمت کی ماری تھی۔ میں جو تین نمبر والوں کو رشتہ دے بیٹھی۔ سوچا تھا کہ ڈرائیور کی بٹیا سے شادی ہو جائے گی۔ مگر بھائی کہاں۔ اُن کے تو دماغ ہی ساتویں آسمان پر ہیں جو منع کر دیا۔ اور اُس کے بعد دُشمنی بھی باندھ لی۔ اب بتاؤ بھیا! جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ دُشمنی کی کیا ضرورت تھی۔ نہ جانے کیا کر ڈالا ہے میرے جمن کو۔ لیکن اب اللہ کے فضل سے وہ کچھ کچھ ٹھیک نظر آ رہا ہے۔“

”آپ اُس کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں خالہ جان؟“

”ہاں بیٹا اِسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہوں آج کل۔ اُس کے اُوپر سے عشق کا بھوت تو اُسی وقت اُترے گا۔ جب اُس کی شادی کسی اچھی جگہ ہو جائے گی۔ ارے میں اِن تین نمبر والوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔ لڑکیاں ہیں کہ ببول کا درخت کانٹے ہی کانٹے۔“

اختر دلچسپ نگاہوں سے جمن کی ماں کو دیکھ رہا تھا پھر اُس نے کہا۔ ”اچھا خالہ جان! بس سلام کرنے آیا تھا۔ جا رہا ہوں

خُدا حافظ۔“ وہ دو نمبر سے نکل آیا۔ . . . اور اُس کے بعد اُس میں یہاں رُکنے کی سکت نہیں تھی۔ باہر کا ماحول پہلے کی مانند ہی سُنسان تھا۔ نہ جانے کیوں کمرے میں جانے کو جی نہیں چاہا۔ اور وہ پائیں باغ کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ دِل کو واقعی کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ یہاں سے جانے کا تصور تکلیف دہ تھا۔ طبیعت پر ایک اضمحلال طاری ہو گیا تھا۔ لیکن جانا تو تھا ہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ خالہ سے اِس بارے میں گفتگو کر سکتا تھا لیکن کیا یہ گفتگو قبل از وقت نہیں ہوگی؟ کیا کرے کیا سوچے؟ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن پھر دفعتاً ہی اُس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ اور اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

”واقعی یہ مُہرہ سب سے زیادہ کارآمد ہے۔ اور کچھ نہ سہی۔ تو کم از کم حالِ دِل تو پہنچ جائے گا کسی تک۔ اور ممکن ہے رَدا کچھ کام آ سکے۔ ہاں یقیناً رَدا سے اِس سلسلے میں تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ وہ ہی میری مصیبتوں کا حل بن سکتی ہے۔“ اختر کو اپنی اِس سوچ پر خوشی ہونے لگی۔ پھر اُس نے دو نام ذہن میں دُہرائے۔ پال نائیڈو اور مسٹر ایلس براؤن سن۔ ریڈکراس کے اِن نمائندوں کی تلاش بھی ضروری تھی۔ ممکن ہے غلام احمد صاحب کا کچھ کام بن ہی جائے۔ اِس طرح رابطہ بھی رکھا جا سکتا ہے۔ ”گڈ“ دیری گڈ۔“ اُس نے مسرور انداز میں سوچا۔ اُس کا دُور رَس ذہن نتائج اخذ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اور اب اُسے رَدا کی واپسی کا انتظار تھا۔ شام ہو گئی۔ ساڑھے پانچ بجے اُس نے رَدا کو کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ باہر کے حصّے میں رونق ہو گئی تھی۔ لیکن یہ جلدبازی کسی طور نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ معمولات میں مصروف رہا نُدرت بھی لان میں پہنچ گئی تھی۔ رَدا اور ثناء بھی تھیں۔ لیکن وہ خود اُن کے درمیان نہیں پہنچا۔

کوٹھی کے ہنگامے بدستور جاری رہے۔ رات کے کھانے پر ثناء سے ملاقات ہوئی۔ رَدا کھانے پر موجود نہیں تھی۔ بقیہ افراد معمول کے مطابق تھے۔ کھانے سے فراغت ہو گئی۔ چہل قدمی اور دوسری تفریحات رہیں۔ اِس دوران کوئی اور خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر جب کافی رات ہو گئی اور اختر کو یقین ہو گیا کہ سب لوگ اپنی اپنی آرام گاہوں میں جا چکے ہیں۔ تو وہ اُٹھا اور دھڑکتے دِل کے ساتھ رَدا کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ تو رَدا نے دروازہ کھولا۔ وہ جاگ رہی تھی اختر کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہیلو۔ آؤ“ اُس نے کہا۔

”مُعاف کیجئے گا رَدا بہن! یہاں کے حالات گو خراب نہیں ہیں۔ لیکن بعض اوقات میں ایسے ناوقت آپ پر نازل ہو جاتا ہوں۔ کہ آپ بھی کیا سوچتی ہوں گی۔“

”نہیں۔ اب میں اِتنی بزدل بھی نہیں ہوں میرے اور تمہارے ذہن میں جو کچھ ہے۔ بس وُہی کافی ہے۔ آؤ اندر آؤ باہر کیوں کھڑے ہوئے ہو؟“ رَدا نے کہا اور اختر اندر پہنچ گیا۔

”بیٹھو! کہو اِس وقت کیسے نِکل پڑے اپنے کمرے سے۔ نیند کیوں نہیں آئی؟“

”میں جانتا تھا رَدا بہن! کہ آپ یہی سوال کریں گی مجھ سے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ اِتنی رات گئے تک نیند نہ آئے تو اُس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہونی ہی چاہیئے۔ اور میرے نیند نہ آنے کی ایک وجہ ہے۔ جسے بتانے کے لئے ہی میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔“

”سُبحان اللہ۔ مگر اِس وقت میں تمہاری کوئی خاطر نہیں کر سکتی۔ خیر۔ بتاؤ کیا وجہ ہے نیند نہ آنے کی؟“

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی رَدا بہن کہ مٹی کی اِس تخلیق میں سارے جراثیم یکساں ہی کیوں ہوتے ہیں۔ انسان اپنی ذات کو احمقانہ سوچوں سے نکالنے کے لئے کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کرے کہیں نہ کہیں شکار ہو جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ آپ بتا سکتی ہیں۔“

”یہ ہی سوال کرنے کے لئے تم یہاں آئے تھے؟“

”ہاں۔“

”مگر افسوس کہ میں اِتنی ذہین نہیں ہوں کہ اِس کا مفہوم سمجھ سکوں۔ حقیقت یہی ہے کہ مٹی کی یہ تخلیق ہر جگہ یکساں ہے۔ اپنی ذات پر خول چڑھانے کی کوششیں کی جاتی ہیں لیکن کامیابی شاید ہی کسی کو نصیب ہوتی ہو۔ لیکن تم اِس وقت کون سے المیے کا شکار ہو۔ اور کون سی ایسی سوچ تم پر نازل ہو گئی ہے جس نے تمہاری نیندیں چھین لیں؟“ رَدا اختر سے بہت بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگی تھی۔ وہ اُسے پسند کرتی تھی۔

”رَدا بہن! مجھے عشق ہو گیا ہے۔“ اختر نے کہا۔ اور رَدا بے اختیار ہنس پڑی۔

”دیکھو اختر! مذاق کی نہیں ہو رہی۔“

”کون سی قسم کھاؤں۔ مجھے تو قسمیں کھانا بھی نہیں آتیں۔“

”کیا واقعی ایسی کوئی بات ہو گئی ہے؟“ رَدا نے بے یقینی سے پُوچھا۔

"ہاں رُدا بہن! واقعی ہوگئی ہے۔ زندگی میں یہ پہلی بیماری لگی ہے مجھے۔ ورنہ آپ یقین کیجئے۔ کبھی کھانسی تک نہیں ہوئی۔"

"ہوں، لیکن یہ بیماری تو بے شمار بیماریوں کا مجموعہ ہے۔"

"اب جو کچھ بھی ہے۔ بہر حال بیماری لگ گئی ہے مجھے بتایئے کیا کروں؟"

"آہستہ آہستہ! اب یہ بتاؤ کہ عشق کس سے ہوگیا ہے؟"

"اللہ رکھی سے۔" اختر نے جواب دیا۔ اور رُدا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس کا مُنہ ایک لمحے کے لئے کُھلا کا کُھلا رہ گیا تھا۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ دبا لیا۔ وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ اختر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ رُدا ہنستی ہُوئی بولی۔

"اختر! اتنی رات گئے بھی تم شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ پلیز بتاؤ واقعی کیا معاملہ ہے؟"

"بس زندگی میں پہلی بار سنجیدہ ہُوا ہُوں رُدا بہن! آپ کو میری بات پُوری سنجیدگی سے سُننا ہوگی۔ اُس پر غور کرنا ہوگا۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"سچ کہہ رہا ہُوں۔ مجھے عشق ہوگیا ہے ندرت سے۔"

"ارے ارے بے شرم آدمی۔ اس طرح اظہار کرتے ہیں۔"

"اس سے پہلے کبھی عشق ہُوا ہو تو اظہار کے آداب بھی آتے ہوں۔ میں تو کچھ نہیں جانتا اِس بارے میں۔ بس مجھے عشق ہوگیا ہے۔"

"اختر! تمہیں خُدا کا واسطہ سنجیدہ ہو جاؤ۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو بڑا عجیب ہے میرے لئے بہت ہی عجیب۔"

"ہوگا میں کیا کروں۔ مجھے عشق ہوگیا ہے اور میں کسی اور کو نہیں بتا سکتا۔ یہاں ایک واحد بہن ملی ہے۔ اور سُنا ہے بہنیں بڑی رحمدل ہوتی ہیں اور بھائیوں کے لئے بڑی قربانیاں دیتی ہیں۔ چنانچہ میں آپ کو قُربان کرنے آیا ہُوں رُدا بہن!"

رُدا پھر ہنس پڑی تھی "میں تو تمھارے لئے قُربان ہونے کو تیار ہُوں میرے پیارے بھیّا! لیکن یہ سب کچھ کیسے ہُوا؟"

"یہ ہی تو پتہ نہیں چل سکا۔ بس ہوگیا۔" اختر نے جواب دیا۔

"دیکھو اختر! شرارت کر رہے ہو تو ایمان سے ماروں گی۔ کہے دے رہی ہُوں۔"

"اگر شرارت کروں تو ماریں گی نا۔ میں شرارت نہیں کر رہا۔ مجھے واقعی یہ پتہ چلا ہے کہ مجھے ندرت سے عشق ہوگیا ہے۔"

"کب پتہ چلا؟"

"زیادہ دیر نہیں ہُوئی۔"

"سوتے میں پتہ چلا؟"

"نہیں جاگتے میں۔" اختر نے کہا۔

"یہ تو بڑی سنجیدہ بات ہے۔"

"ہے اور دوسری سنجیدہ بات یہ ہے کہ میں واپس جا رہا ہُوں۔"

"ارے کب؟"

"شاید بہت جلد۔ ڈیڈی نے بُلایا ہے۔ واپس جانا پڑے گا۔ صُورتِ حال سے میں آپ کو کافی حد تک واقف کر چُکا ہُوں خالد بھائی نے ثناء سے گفتگو کی تھی اِس سلسلے میں۔ ثناء بیگم نے وعدہ کر لیا ہے کہ اگر کبھی شادی کرنے کا خیال دِل میں آیا تو پھر وہ خالد بھائی سے شادی کریں گی۔ اور خالد بھائی اِس جُملے سے بہت مطمئن ہیں۔ لیکن میں، میرا مسئلہ بڑا اٹکا ہُوا ہے۔"

"اگر تم واقعی سنجیدہ ہو اختر! تو مسئلہ کیا اٹکا ہُوا ہے۔ میرا خیال ہے اگر تم طبقاتی فرق کو نظر انداز کر دو۔ تو یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔"

"ارے لعنت بھیجئے طبقاتی فرق پر۔ پاگل ہُوں میں۔ صرف انسانوں کے ایک ہی طبقے سے واقف ہُوں۔ اور وہ ہیں انسان۔ محبت کرتے ہیں لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں روتے پیٹتے ہیں کھاتے پیتے ہیں سوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ بتایئے اِس کے علاوہ کوئی طبقہ کچھ اور کرتا ہے۔ جب یہ سب کچھ نہیں کرتا تو پھر طبقاتی فرق کا لفظ ہی کیوں ایجاد ہُوا۔"

"گویا گویا تم ندرت سے شادی کر سکتے ہو؟"

"سو فیصدی کر سکتا ہُوں جی۔ اِس میں بھلا سوچنے سمجھنے کی کیا بات ہے۔"

"تمھیں اِس بات کا علم ہے کہ غلام احمد صاحب احسان صاحب کے ڈرائیور ہیں؟"

"تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر وہ احسان صاحب کی گاڑی چلاتے ہیں۔ اور جو کسی کی گاڑی چلاتا ہے وہ بہت بڑی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ ورنہ گاڑی رُک جائے تو آپ جانتی ہیں کہ کیا ہو جاتا ہے؟"

"ہوں! مجھے تو بس یہی خوف ہے کہ کہیں تم غیر سنجیدہ نہ ہو۔"

"اگر میں غیر سنجیدہ ہوتا تو آپ کے پاس آنے کے بجائے عارفہ خالہ کے پاس چلا جاتا۔" اختر نے کہا۔ اور رُدا ہنس پڑی۔

"بھئی بڑا پریشان کر دیا تم نے اختر! بات یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنا حالِ دِل مجھ سے کہہ ڈالا۔ بلکہ نہ جانے کیوں بس اِس اُلجھن کا شکار ہُوں کہ کہیں یہ تمھارا کوئی مذاق نہ ہو۔"

"رُدا بہن! اِس وقت اتنی رات گئے کوئی شریف آدمی اپنی بہن کو اِس لئے پریشان کرنے کے لئے اُس کے کمرے میں نہیں آئے گا کہ اُسے کوئی مذاق سُوجھا ہے۔ نہ جانے آپ کیوں مجھے انسانوں سے الگ سمجھ رہی ہیں۔ رُدا بہن! بس یُوں سمجھ لیجئے کہ آپ کو بہت کچھ سمجھ کر آپ کے پاس آیا ہُوں۔ اگر مجھے کچھ عرصے یہاں رہنے کی مزید مُہلت مِل جاتی تو شاید اپنے معاملات خود ہی طے کر لیتا لیکن اب جا رہا ہُوں نا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر موجودگی میں کوئی گھپلا ہو جائے۔ ثناء صاحبہ پر ابھی تک کوئی تاثر نہیں قائم کر سکا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ میری بات کو سنجیدگی سے سُنتی بھی نہیں۔ کیونکہ میرے اور اُن کے درمیان ابھی راستے استوار نہیں ہو سکے ہیں لیکن آپ اِس بات کو کان کھول کر سُن لیجئے کہ ندرت کو اپنی امانت کے طور پر آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہُوں۔ راستے میں کوئی رُکاوٹ آئے، تو اُسے دُور کرنا آپ کی ذمّہ داری ہوگی۔ مجھ سے رابطہ رکھیئے گا۔ اور مجھے اُس کے بارے میں اطلاع دیتی رہیئے گا۔ بس اِسی لئے آپ کے پاس حاضر ہُوا تھا۔ والسلام۔ خیر اندیش اختر۔" اختر اُٹھتا ہُوا بولا۔

"ارے بیٹھو۔ بیٹھو تو سہی۔ یہ بتاؤ ندرت کو بھی اِس واردات کا علم ہے؟"

"میں نے کہہ دیا تھا۔ اب پتہ نہیں وہ بھی سنجیدہ ہُوئی یا نہیں۔ لیکن ایک اجازت آپ کو دی جا سکتی ہے۔ اور پُورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہ اگر ندرت کا ذہن میری جانب راغب نہ ہو۔ تو آپ کی چُھٹی۔ میرا مطلب ہے پھر اُسے مجبور نہ کیا جائے۔ البتہ اِس دوران میں ذرا اُسے بھی ٹٹول لیجئے گا۔ اور ضروری امور سے مجھے آگاہ کرتی رہیں۔ خُدا کی قسم رُدا بہن، میں کسی پر مُسلّط ہونے کا عادی نہیں ہُوں۔ اگر یہ کام آسانی سے ہو جائے اور ندرت کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ تو پھر آپ ذرا میرے مسئلے میں دلچسپی لیجئے۔ لیکن ایک خاتون ہونے کی حیثیت سے اگر آپ کسی بھی لمحے محسوس کریں کہ ندرت میرے نام سے اُلجھتی ہے تو پھر میرا خیال ہے دوسری یا تیسری بار میرا ذکر بھی نہ کیجئے گا اُس سے، بس اب میں جاؤں گا۔"

"جلدی کیا ہے بیٹھو بھئی۔"

"نہیں۔ ذرا تنہائی میں اپنی اِس حماقت کے بارے میں سوچنا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ مجھ جیسا آدمی جب حماقت کرتا ہے تو ذرا پریشانی ہی ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا کروں یہ حماقت ہوگئی۔" اختر بولا اور اُس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ درحقیقت ذہنی طور پر وہ اُلجھا ہی ہُوا تھا۔ اُس کی شوخ و شنگ زندگی میں ایک رُکاوٹ آگئی تھی۔ جسے عبُور کرنے میں کچھ مشکلات درپیش تھیں۔ لیکن اب وہ اِس سے مُنہ نہیں موڑنا چاہتا تھا۔ ہاں اگر ندرت کی طرف سے کچھ پس و پیش ہو تو دوسری بات ہے۔

دوسرے دِن احسان صاحب واپس آگئے۔ دوپہر کے کھانے پر خالد نے عادل صاحب کا خط احسان صاحب کے سامنے رکھ دیا اور احسان صاحب یہ خط پڑھنے لگے پھر بولے۔

"بھئی کچھ جلدی کی ہے عادل نے۔ ابھی تم لوگوں کو آئے ہُوئے دِن ہی کتنے گزرے ہیں۔ پتہ نہیں عادل کو تمھاری کیا ضرورت پیش آگئی۔ میری خواہش ہے کہ کچھ اور وقت یہاں گزارو لیکن اگر کوئی مجبوری کا مسئلہ ہے تو پھر میں تمھیں نہیں روکوں گا جانتا ہُوں کہ اولاد کی محبت کیا چیز ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے چچا جان! اب ہمیں چلا جانا چاہیئے۔ پھر جب آپ حکم دیں گے حاضر ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں انتظامات کئے دیتا ہُوں۔"

گھر میں اختر اور خالد کی آمد سے کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہُوئی تھی جو قابلِ ذکر ہوتی۔ یہ گھر تو مہمان خانہ ہی تھا لیکن اِس کے باوجود لوگ کسی حد تک اُداس ہوگئے تھے۔ اِن دونوں کے جانے کی خبر تقریباً تمام افراد کو دے دی گئی تھی ویسے بھی سب سے کوئی گہرا رشتہ نہیں تھا صرف احسان صاحب کے دوست کے بیٹے تھے۔ ردِّعمل کے طور پر ثناء خالد کے کمرے میں داخل ہوگئی اور یہ شاید پہلا ہی موقعہ تھا کہ وہ اِس طرح دندناتی چلی آئی تھی۔ خالد ثناء کو دیکھ کر چونک اُٹھا۔ اور پھر اُس نے مُسکراتے ہُوئے اُس کا خیر مقدم کیا۔

"تو جا رہے ہیں؟"

"جی ثناء، جانا تو تھا ہی۔"

"میں اُداس نہیں ہُوں یا شاید ہُوں۔ البتہ کچھ عجیب سی صُورتِ حال ہے۔ میں اُس کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ آپ پھر آئیں گا خالد صاحب، ضرور آئیے گا۔"

"جی ثناء، میں ضرور آؤں گا وعدہ کرتا ہُوں۔"

"وہ آپ نے جو کچھ کہا تھا نا میں نے اُس کا بُرا تو نہیں مانا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا میں نے بُرا مانا تھا؟"

"کاش میں آپ کے دِل کا حال پڑھ سکتا۔ لیکن مجھے یہ فن نہیں آتا۔"

"تو پھر کسی طوطے سے فال نکلوا لیجئے۔ وہ جو سڑک پر بیٹھے ہوتے ہیں۔" ثناء ہنس کر بولی۔

"جو کام ہم خود کر سکتے ہیں ثناء، اُس کے لئے کسی معصوم پرندے

کا سہارا لینا کیا معنی رکھتا ہے ؟"

"مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ میں نے آپ سے جو سوال کیا تھا۔ اُس کا جواب آپ کے پاس موجود تھا۔ آپ نے دینا پسند نہیں کیا۔ میں آپ کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا ۔"

"لو جواب دیا تو تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا نا کہ اگر کوئی ایسی مجبوری آہی پڑی تو پھر میں صرف آپ سے شادی کروں گی ۔"

"آپ بہت اچھی ہیں شناء، بہت اچھی۔ اتنی اچھی کہ اس سے پہلے آپ مجھے کبھی اتنی اچھی نہیں لگی تھیں۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ میں آپ کی شخصیت کو بگاڑنا پسند نہیں کروں گا۔ میرے ڈیڈی نے اس بارے میں سوچا تھا۔ شاید بچپن میں کچھ گفتگو بھی ہوئی تھی۔ آپ کو اندازہ نہیں یہ بزرگ زبان کی بڑی پابندی کرتے ہیں۔ میرے ڈیڈی یہ بات کبھی نہیں بھول سکے۔ اور ہمیشہ میرے سامنے آپ کا نام لیا جاتا رہا۔ تاہم جب میری شادی کا ذکر نکلا۔ اور اُس میں باقاعدگی آئی تو ڈیڈی نے مجھ سے آپ کا تذکرہ کیا۔ میں وہیں اُسی جگہ آپ کے بارے میں اپنی رضامندی کا اظہار کر سکتا تھا۔ لیکن صرف آپ کی وجہ سے، صرف آپ کے خیالات جاننے کے لئے میں نے ڈیڈی سے یہ درخواست کی کہ مجھے یہاں آنے کا موقعہ دیا جائے۔ اور اُنھوں نے میری یہ درخواست منظور کر لی۔ آپ نے مذاق ہی میں سہی۔ لیکن یہ الفاظ کہہ کر میری دانست میں کم از کم اِس بات کا اظہار کر دیا ہے کہ آپ مجھے ناپسند نہیں کرتیں باقی معاملات آپ پر منحصر ہیں شناء۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے آپ کو ٹٹول لیتیں کیونکہ واپسی میں مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا۔ جواب دیتے ہوئے مجھے تھوڑی سی پریشانی لاحق رہے گی ۔"

"اُفوہ یہ تو بڑا مسئلہ بن گیا۔ اب میں کیا بتاؤں آپ کو۔ آپ یقین کیجئے میں نے کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ بڑی عجیب سی چیز ہے حالانکہ سب لوگ کرتے ہیں۔ لیکن آپ غور کیجئے گھر کی اچھی خاصی زندگی چھوڑ کر آدمی چلا جائے۔ اور پھر عجیب و غریب حرکتیں کرے۔ بہرحال آپ یوں کریں کہ تھوڑے دن انتظار کر لیں۔ جب آپ چلے جائیں گے نا یہاں سے تو میں تنہائی میں اِس بارے میں غور کروں گی۔ اگر آپ مجھے یاد آئے۔ اور۔۔۔ اور میں نے یہ محسوس کیا کہ آپ کے جانے سے میں اُداس ہو گئی ہوں تو پھر آپ کو خط لکھ دوں گی۔ وعدہ کر رہی ہوں۔ اِس میں کوئی بخل نہیں کروں گی ۔"

خالد ہنس پڑا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا "ٹھیک ہے آپ [illegible] خط لکھ دیجئے گا۔" شناء چند لمحات خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"اچھا، اب میں چلتی ہوں۔"

خالد نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک شناء کے بارے میں سوچ سوچ کر مسکراتا رہا تھا۔

تیاریاں مکمل ہو گئیں تھیں۔ اور اِن دونوں کی روانگی کا وقت آ گیا تھا۔ سب ہی لوگوں نے خدا حافظ کہا تھا۔ اختر اور خالد بھی کچھ اداس تھے۔ یہاں سے جانے کو دونوں میں سے کسی کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن جانا ضروری تھا۔ ایئرپورٹ جانے کے لئے سب ہی تیار ہو گئے۔ رَدا نے بھی دفتر سے چھٹی کر لی تھی۔ شناء نے ندرت کو بھی ساتھ گھسیٹا تھا۔ اور بالآخر امیگریشن کے لئے انھیں اندر داخل ہونا پڑا۔ چلتے ہوئے اختر نے ندرت پر اور خالد نے شناء پر نگاہ ڈالی تھی۔ ندرت نے اِس دوران میں ایک بار بھی اختر سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن کا طیارہ فضاء میں پرواز کر گیا۔ ندرت اور شناء کے بارے میں تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کبھی سنجیدہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن اِس وقت اُن کے چہرے بالکل اُترے تھے۔ اور رَدا مسکراتی نگاہوں سے اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

کوٹھی واپس آنے کے بعد بھی ماحول پر افسردگی سی طاری رہی۔ رَدا ہی نے لان پر بیٹھنے کی پیش کش کی تھی۔ اور ندرت اور شناء نے انکار نہیں کیا تھا۔ رَدا مسکراتی ہوئی بولی۔

"بھئی تم لوگوں کی یہ افسردگی میرے لئے قابلِ تعجب ہے ۔"

"افسردگی ؟ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے۔ کوئی جاتا ہے تو دُکھ ہوتا ہی ہے۔" شناء نے کہا۔

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں۔ دونوں ہی بےحد پیارے تھے۔ جس دن سے آئے ایک لمحے کے لئے اجنبی نہ محسوس ہوئے۔ پوری طرح گھل مل گئے تھے سب لوگوں میں۔ واقعی میں تم لوگوں کی بات تو نہیں کہہ رہی۔ لیکن میں اُن کے جانے سے اُداس ہوں۔"

"اے خاتون اللہ رکھی، آپ کو اللہ رکھے۔ آپ بھی کچھ گڑبڑ نظر آ رہی ہیں۔" رَدا نے ندرت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اور ندرت چونک کر سنبھل گئی۔

"سبحان اللہ کبھی کبھی آپ کے منہ سے ایسے جملے سن کر دل کو جو مسرت ہوتی ہے وہ ناقابلِ بیان ہوتی ہے آپ کو بھی اللہ رکھے۔ ویسے دونوں میں سے کس کے جانے کا دُکھ زیادہ ہے آپ کو؟"

"اختر کے۔" رَدا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اُس کی نگاہیں ندرت

کی آنکھوں میں تھیں۔ اور نہ جانے کیوں ندرت کو ایک لمحے کے لئے بوکھلاہٹ کا سا احساس ہوا۔ اُسے یوں لگا جیسے رَدا اِن آنکھوں کے راستے سینے کی گہرائیوں تک جانا چاہتی ہے۔ سنبھالے نہ سنبھال سکی تھی وہ اپنے آپ کو۔ رَدا نے خود ہی کہا۔

"اِس لئے کہ اختر نے بڑے بھرے منہ سے مجھے بہن کہا تھا۔ اور جاتے ہوئے کچھ ذمہ داریاں بھی مجھے سونپ گیا تھا ۔"

"ذمہ داریاں ؟" ندرت کے بجائے شناء نے پوچھا۔

"ہاں بھئی! کہہ گیا تھا اِس گھر کا خیال رکھنا کسی کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ اور یہاں جو کوئی بھی ہے اُسے موجود رہنا چاہیئے کسی کی کمی واقع نہ ہو اِس گھر میں ۔"

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" شناء کہنے لگی۔

"بولنے دو بولنے دو شناء، رَدا کبھی کبھی ہی تو بولتی ہیں۔ آج بول رہی ہیں تو تم اُن کی باتوں کو سمجھنے دو شناء، تم کیوں بیچ میں ٹانگ اڑا رہی ہو۔"

"دیکھو مونالیزا! جو بات میری سمجھ میں نہ آئے۔ وہ کہی ہی نہیں جانی چاہیئے ۔"

"تو تم کون سا ہمیں اپنے رازوں میں شریک کر لیتی ہو۔ اب کم از کم یہ تو بتاؤ کہ خالد کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے ؟"

"میری تو تم فکر ہی مت کرو مونالیزا! میں تو تمھاری فکر میں دُبلی ہوئی جا رہی ہوں۔ تیمور بڑا ہو رہا ہے اور اب تمھارا اُس سے کوئی واسطہ بھی نہیں رہا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ تم کب تک اِس طرح نوکری کر کے پیٹ پالتی رہو گی۔ کوئی اچھا لڑکا مِل جائے تو تمھارے دو بول پڑھوا دوں۔ بھئی کچھ بھی ہو بالآخر ساس ہو۔ اَے ندرت! یہ اپنا خیر دین کیسا رہے گا رَدا کے لئے اچھے خاصے ہاتھ پیروں کا آدمی ہے۔ بس ذرا کاجل زیادہ لگا لیتا ہے، اگر اِس کا حلیہ درست کر دیا جائے تو ٹھیک ٹھاک آدمی بن جائے گا۔ بھئی مجھے تو پسند ہے سسر کی حیثیت سے ۔"

ندرت ہنسنے لگی تھی۔ کوئی اور موقعہ ہوتا تو شاید اِن الفاظ کو باقاعدہ ایک تفریح کا ذریعہ بنا لیا جاتا۔ لیکن اِس وقت ذہنوں پر اُداسی طاری تھی۔ اِس لئے اِس گفتگو میں زیادہ دلچسپی نہیں لی جا سکی۔ طفیلی خالہ سامنے پڑ گئیں تو تینوں کی گفتگو بند ہو گئی۔ طفیلی خالہ بھی اِسی طرف آ گئی تھیں۔ کچھ پریشان سی تھیں۔ تینوں لڑکیوں نے انھیں سلام کیا۔ تو وہ دُعائیں دیتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ اور پھر ندرت سے بولیں۔

"اَے ندرت بی بی، تو بھی کئی دن سے میری طرف نہیں آئی۔ شکل ہی نہیں دکھائی دی تیری۔ اور یہ میری شناء اور رَدا بیٹی بھی کبھی مجھ سے بےتکلف نہیں ہوئیں۔ بھئی سچی بات ہے بڑھاپے کی اِس عمر میں تو تم ہی لوگوں کو دیکھ کر جیا جا سکتا ہے پریشان ہوں دو تین دن سے۔ خواب میں زمان آئے تھے اور کچھ عجیب سی کیفیت چھوڑ گئے دماغ پر۔ پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کر رہے تھے۔ میں کبھی خواب دیکھتی نہیں ہوں۔ لیکن جب دیکھتی ہوں تو بہت دِن تک پریشان رہتی ہوں۔ رشید کے بارے میں بھی پتہ نہیں چل سکا۔ کوئی خط وط بھی نہیں آیا۔ شہاب میاں کی تلاش میں گئی تھی۔ ملے ہی نہیں۔ رشید کہتا تھا کہ شہاب میاں کسی کام سے جا رہا ہے۔ پتہ نہیں کب واپس آئے گا۔ بس دِل بُرا ہو رہا ہے ۔"

"بیٹھئے طفیلی خالہ، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اتفاق ہے کہ میں آپ کی طرف نہیں آ سکی۔ اور پھر کچھ مہمان بھی واپس جا رہے تھے۔ سوچا انھیں رخصت کر دیا جائے ۔"

"اَرے ہاں وہ بڑے اچھے بچے تھے بیچارے دونوں ہنس مکھ۔ خدا اُن کی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ ولایت سے آئے تھے نا ؟"

"جی ہاں۔" ندرت نے جواب دیا۔

"اَے بچیو! تم مجھ سے بات نہیں کرو گی۔ بھئی میں کہتی ہوں۔ بزرگوں سے کوئی ناراضگی اچھی تو نہیں ہوتی ۔"

"نہیں طفیلی خالہ، بھلا ہماری آپ سے کیا ناراضگی ہو سکتی ہے ؟" رَدا نے کہا۔

"شناء بٹیا! تو ضرور ناراض رہتی ہے مجھ سے مگر مجھ نصیبوں جلی کی سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ خون خون سے کیسے جدا ہو گیا۔"

"آپ کی اُردو اگر ہماری سمجھ میں آئے طفیلی خالہ، تو ہم آپ کو کچھ جواب بھی دیں۔ آپ کے محاورے اور آپ کی باتیں سمجھنے کے لئے ذرا دماغ پر زور دینا پڑتا ہے۔ اِس لئے ہم زور ہی دیتے رہ جاتے ہیں۔ جواب کہاں سے دیں۔" شناء نے کہا۔ طفیلی خالہ بےتکے انداز میں ہنسنے لگی تھیں۔ ابھی انھیں آئے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ عارفہ بیگم بھی آ پہنچیں۔ اور شناء نے ندرت کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"کورم پورا ہو گیا بسم اللہ ہو جائے۔" اُس نے یہ الفاظ اِس طرح ادا کئے تھے کہ طفیلی بیگم نہ سن سکیں۔ عارفہ بیگم نزدیک آ گئیں۔

"اوہو، یہاں مس کوٹ ہو رہی ہے۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ذرا ہم بھی تو سنیں ۔"

"آ گئیں صبر نہ ہوا دو منٹ۔ بیٹھو بی بی بیٹھو تمھاری بُرائیاں نہیں ہو رہیں۔ پوچھ لو اِن بچیوں کو قسم دے کر۔ اور پھر میں تو پیچھے بُرائیاں کرنے والوں میں سے ہوں ہی نہیں ۔"

"جو مُرے نہیں ہوتے اُن کی بُرائیاں کہاں سے نکالی جائیں۔ بی بی! تم کوشش بھی کروگی تو اللہ نے چاہا تو تمھیں کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔"

"تم ساری عمر بدُدعائیں ہی دیتی رہنا مجھے۔ یہ نہیں ہے۔ کبھی محبت کے دو بول ہی بول لو۔"

"تم موقع تو دو اِس کا۔ جب سے آئی ہو صرف میرا ہی غم کھائے جارہا ہے تمھیں۔"

"لو خُدا کی سُنو۔ بی بی غم کھائے تمھیں، غم ہو تمھیں، مجھے بھلا تمھارا غم کیوں ہوتا۔ تم ہو کس گنتی میں۔ اوقات کیا ہے تمھاری۔ احسان میاں کے سر پڑی ہو۔ میرا تو بہن کا رشتہ ہے۔ ذرا اپنا رشتہ تو بتلادو۔ اور میں کیوں تمھارے غم میں دُبلی ہُوئی جاؤں گی۔ ابھی مجھے آئے دِن ہی کتنے ہُوئے ہیں۔ تم تو پتہ نہیں کب سے یہاں مر رہی ہو۔"

"مُوں میرے دُشمن۔ مرو تم طفیلی بیگم، سازشوں کا جال پھیلا کر یہاں پہنچی ہو۔ اِس سے پہلے کون سے زمان تمھیں یہاں آنے دیتے تھے۔ یا کون سے تمھارے تعلقات تھے۔ اب جب سر پر پڑی۔ تو بہن یاد آگئیں۔ اِس سے پہلے کہاں تھیں۔ کون سی ہمدردیاں کون سی محبتیں کیں بہن کے ساتھ۔ یُوں کہہ کہ روٹیوں کا لالچ کھینچ لایا اور بہن کی محبت جگا کر گھس گئیں یہاں۔"

"خُدا سمجھے تمھیں عارفہ بیگم! میں تو چلو ٹھیک ہے جب تک گزر سکی گُذارتی رہی۔ تم کیوں جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ تمھارے تو میاں زندہ ہیں۔ یہاں کیوں آپڑیں۔ میں کہتی ہُوں غیرت شرم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ احسان میاں کی ذرا سی محبت اور ہمدردی پائی تو یہیں آکر پڑ رہیں۔ ارے زمان تو غیرت مند تھے خود دار تھے۔ اُنھوں نے ایک ذرا سی بات پر کنارہ کشی اختیار کرلی۔ مرتے مرگئے۔ لیکن اِدھر کا رُخ نہ کیا جہاں سے مُنہ موڑ لیا تھا۔ مگر تم اپنی شناؤ ناصر زندہ ہیں۔ تم اُن کی زندگی ہی میں یہاں کیسے آپڑیں؟ میں تو بیوہ ہُوں۔ ایک بچّے کا سہارا ہے۔ چلو ٹھیک ہے بہن کے ہاں پناہ لے لی۔ مگر تم تو شوہر والی ہو۔ شوہر کی موجودگی ہی میں کیوں بیوہ ہوگئیں؟"

"دیکھو طفیلی! زبان سنبھال اپنا۔ تم بار بار مجھے بیوہ کہہ رہی ہو۔ اچھا نہیں ہوگا۔"

"اے تو تم کیا کرلوگی میرا۔ ہیں" طفیلی خالہ آنکھیں نکال کر بولیں۔ رِدا اپنے پاؤں سمیٹنے لگی تھی۔ ندرت اور ثناء کی آنکھوں میں وہ ہی شوخی واپس لوٹ آئی تھی۔ جو اختر اور خالد کے جانے کے بعد کسی قدر مدہم پڑگئی تھی۔ دونوں بے اختیار مُسکرانے لگی تھیں۔

"تم تو ہو ہی بس زمانے بھر کی چھاکٹا۔ میں تمھارا کیا کرُوں گی سوائے اِس کے کہ واپس چلی جاؤں" عارفہ بیگم طفیلی بیگم کے تیوروں سے شاید ڈر گیئں۔

"زبان سنبھال کر بات کیا کرو میرے سامنے عارفہ بیگم! میں ذرا دوسری قسم کی انسان ہُوں۔ نہ ہُوا رشید ورنہ وہ تمھاری یہ بدتمیزی برداشت تھوڑی کرتا۔ آنے دو اُسے بتاؤں گی تمھارے کرتوت۔ اور پھر دیکھ لیا جائے گا ناصر کو بھی" عارفہ بیگم نے رحم طلب نگاہوں سے ثناء کو دیکھا۔ ثناء اُن کی طرفدار تھی۔ لیکن جس طرح وہ طرفدار تھی وہ چند ہی لوگوں کو معلوم تھا۔ تاہم ثناء نے عارفہ بیگم کو میدان چھوڑ کر نہ بھاگنے دیا۔

"طفیلی خالہ! آپ زیادتی کر رہی ہیں عارفہ پھوپھی کے ساتھ۔ اب ذرا دیکھئے نا عارفہ پھوپھی آپ سے کمزور تو نہیں ہیں۔ یہ تو صرف نہ جانے کیوں وہ شرافت برت رہی ہیں۔ عارفہ پھوپھی! آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔ جواب دیجئے۔"

"بی بی کیا جواب دُوں۔ عزّت دار اپنی عزّت سے ڈرتا ہے۔ اور جس کے پاس عزّت نہ ہو وہ کس چیز سے ڈرے گا" عارفہ بیگم نے کہا۔

"میں کہتی ہُوں عارفہ، زبان سنبھال لو ورنہ اچھا نہیں ہوگا" طفیلی خالہ کھڑی ہوگیئں۔

"ہاں ہاں یہ کوئی بات ہُوئی جو دِل چاہا کہا۔ اور پھر شریف بن کر بھاگ گیئں" ندرت نے لُقمہ دیا۔

"اَرے واہ۔ بھاگ کہاں گیئں۔ وہ تو شاید کچھ لینے جارہی ہیں" ثناء بولی۔

"کیا لینے جارہی ہیں چھُری چاقو بندوق یا توپ۔ کون سی چیز سے قتل کریں گی میری طفیلی خالہ کو" ندرت نے آنکھیں نکالتے ہُوئے کہا۔

"اَے بی بی! جُوتیاں مار مار کر بھیجہ باہر نکال پھینکوں گی۔ سمجھتی کیا ہیں اپنے آپ کو۔"

"ہاں یہ ہُوئی نا بات۔ دیکھا مردِ میدان اِسے کہتے ہیں۔۔" ندرت نے کہا۔ عارفہ بیگم ایک لمحے کے لئے رُکیں۔ اور پھر تیزی سے پیچھے ہٹتی ہُوئی بولیں۔

"فیصلہ کرکے رہُوں گی۔ خُدا کی قسم فیصلہ کرکے رہُوں گی طفیلی نے مجھ پر جُوتی اُٹھائی ہے۔ اِس گھر میں طفیلی رہے گی یا میں۔"

"بالکل ٹھیک عارفہ پھوپھی! دیکھ لیں گے ہم اِن تمام لوگوں کو" ثناء نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ لیکن عارفہ بیگم کو روکنے کی کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ طفیلی خالہ کے تیور خراب تھے۔

اور عارفہ بیگم کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اب صُورتِ حال حدُود سے باہر نکل سکتی تھی چنانچہ وہ سیدھی اپنے رہائشی حصّے کی طرف دوڑ گئی تھیں۔ طفیلی بیگم نے ثناء کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولیں۔

"اور تمھارا تو بی بی جیسے میرا بچپن کا بَیر ہے۔ تم نے تو ہمیشہ ہی میری کاٹ کی۔ مگر سوچ لو یہ تمھارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ خُدا ہر ایک کو موقع دیتا ہے مجھے بھی دے گا۔"

"اَرے اَرے طفیلی خالہ! میں نے کیا کیا۔ آپ لوگ آپس میں ہی تو لڑ رہی تھیں۔ کیوں ندرت، تم بتاؤ اِس میں میرا کیا قصُور تھا؟"

"ہاں طفیلی خالہ! ثناء نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو عارفہ بیگم ہی بگڑ رہی تھیں" طفیلی خالہ نے حیرت سے ندرت کی صُورت دیکھی۔ رِدا نے رُخ بدل لیا تھا۔ ہنسی روکنے کی کوشش میں اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ طفیلی خالہ کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ چنانچہ وہ بڑبڑاتی ہُوئی وہاں سے واپس پلٹ گیئں۔ ندرت اور ثناء اُنھیں جاتے ہُوئے دیکھ رہی تھیں۔ پھر ثناء نے دانت بھینچتے ہُوئے کہا۔

"یہ کمبخت میری مُرغی تو بڑی ہی بُزدل نکلی۔ کیسے کیسے بادام پیس پیس کر کھلائے تھے۔ لیکن معرکہ ہُوا تو میدان چھوڑ کر بھاگ گیئں۔"

"اپنی مُرغی کی بات ہی کیا ہے۔ خیر پھر سہی۔ اِس دوران تم اپنی مُرغی کو ذرا کھلا پلا کر تیار کرو" ندرت نے کہا۔

"خُدا تمھیں سمجھے۔ بُزرگوں کا تماشہ بناتے ہُوئے تمھیں شرم نہیں آتی" رِدا نے بے اختیار ہنستے ہُوئے کہا۔

"بس چُپ رہو رِدا بی بی! خواہ مخواہ کی باتیں۔ سارے گھر پر بوریّت لاد کر رکھ دی ہے۔ ذرا اِن ہی کے دم کی رونق باقی رہ گئی ہے۔ ورنہ اب کیا رکھا ہے اِس گھر میں" ثناء نے بُرا سا مُنہ بناتے ہُوئے کہا۔ اور رِدا معنی خیز انداز میں ہنس پڑی۔

"چلو شُکر ہے تم نے بوریّت کا اقرار کیا۔ ویسے یہ بوریّت اِس سے پہلے تو تمھارے ذہنوں پر سوار نہیں ہُوئی تھی۔"

"کیا مطلب؟" ندرت نے چونک کر پُوچھا۔

"بھئی کچھ نہیں۔ ذرا اپنے اپنے دِلوں میں جھانک کر یہ بتاؤ کہ اِس بوریّت کی وجہ کیا ہے؟"

"سُبحان اللہ۔ آپ شاید کسی قسم کا مذاق فرمانے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

"نہیں بلکہ تمھارے ذہنوں میں چھُپے ہُوئے چور کو تلاش کر رہی ہُوں۔ ویسے اِس میں کوئی شک نہیں کہ خالد بھی اپنی ذات میں بے مثال تھا۔ اور اختر بھی۔ دونوں کے جانے سے بِلاشُبہ ایک سُونے سُونے پَن کا احساس ہو رہا ہے۔"

"سُبحان اللہ سُبحان اللہ۔ چلئے ہم آپ کا یہ بے تُکا مذاق اِس لئے برداشت کئے لیتے ہیں کہ آپ کبھی کبھی تو مذاق کرنے کی کوشش کرتی ہیں" ندرت نے کہا۔ ثناء ہنسنے لگی تھی۔ پھر بولی۔

"بھئی اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اُن دونوں کے جانے کے بعد یہ احساس ہو رہا ہے کہ اُن کا دم غنیمت تھا۔ اور وہ ہمارے لئے تفریح کا ذریعہ بنے ہُوئے تھے۔ لیکن مہمان مہمان ہی ہوتا ہے۔ چلو ذرا دیکھیں اندر کیا ہو رہا ہے" ثناء نے کہا۔

"میں تو چلتی ہُوں اب۔ بہت دیر سے گھر سے غائب ہُوں۔ عِصمت آپا آگئی ہوں گی۔ میری تلاش جاری ہوگی" نُصرت نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ ملازموں کو ہر وقت مالکوں کے ہمراہ نہیں رہنا چاہیئے۔ زیادہ مُنہ لگنا بھی اچھا نہیں ہوتا" ثناء نے کہا اور ندرت ہنستی ہُوئی واپس پلٹ پڑی۔ ثناء، رِدا کو ساتھ لے کر اندر چل پڑی تھی۔ رِدا نے اندر داخل ہوتے ہُوئے ثناء سے کہا۔

"آؤ ثناء، یا تم بھی جارہی ہو؟"

"نہیں نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ چلو" ثناء نے کہا۔ اور رِدا، ثناء کو لئے اپنے کمرے میں آگئی۔

"ثناء! جیسا کہ تم جانتی ہو کہ میں اپنی حدُود میں رہنے کی قائل ہُوں۔ اور بہت زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتی۔ لیکن تم سے محبت کی بناء پر ایک سوال کرنا چاہتی ہُوں۔"

"جی فرمائیے" ثناء نے کہا۔

"خالد کے مسئلے میں تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"یہ خالد اور اختر کیوں ذہن پر سوار ہوگئے ہیں تمھارے؟" ثناء بولی۔

"اِس لئے کہ مجھے تم سے پیار ہے۔"

"منطق کی رُو سے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ہاں بڑا اچھا بچہ تھا۔ قسم خُدا کی میرے دِل میں اُس کے لئے بڑا پیار جاگ اُٹھا ہے۔ خالد اُس کی نسبت سنجیدہ تھے لیکن اختر نے ہم لوگوں کے دِلوں میں واقعی گھر بنالیا ہے۔"

"لوگوں کے دِلوں میں یا صِرف اپنے دِل کی بات کر رہی ہو؟"

"میں نہیں کہتی کہ ہم میں سے کون اُسے ناپسند کرتا تھا وہ بہت ہی اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ میرے لئے وہ ایک سگے بھائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے اِتنے پیار سے بہن کہا تھا۔ یقین کرو میں اُس کی بہن نہیں ہُوں۔ اور بے تکے رشتوں کی قائل بھی نہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں

اُس کا جب تصور آتا ہے۔ تو ایک ہُوک سی اُٹھنے لگتی ہے واقعی بھائی دُنیا میں بڑی نعمت ہوتا ہے۔"

"موضوع سے ہٹ رہی ہو" شناء بولی۔

"آ رہی ہُوں۔ اُسی موضوع پر آ رہی ہُوں۔ بات اختر کی طرف نکل گئی تھی نا" رَدا نے کہا۔ اور شناء آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔

"بھئی واہ۔ جب مذاق کرتی ہو تو بہت اچھا کر لیتی ہو آج تو تم کچھ ذرا زیادہ ہی جھِجک رہی ہو۔"

"جھجک نہیں رہی ہُوں شناء، اگر اِس قابل سمجھو تو بتا دو کہ خالد کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کیا ہی ہوگا تم نے۔"

شناء کسی سوچ میں ڈُوب گئی تھی پھر وہ آہستہ سے بولی "رَدا! اب تم سے کیا چُھپانا۔ یقین کرو میرے ذہن میں خالد وغیرہ کے بارے میں کوئی تصوّر نہیں تھا۔ لیکن خالد نے عجیب سے لہجے عجیب سے انداز میں مجھ سے یہ بات کہی کہ اُس کے ڈیڈی نے اُسے اِس مقصد کے لئے یہاں بھیجا ہے کہ شادی کے سلسلے میں میری رائے معلوم کر لی جائے۔ دیکھو میرا مذاق مت اُڑانا رَدا! یہ حقیقت ہے کہ میں نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے جس انداز میں میری خواہشات کی تکمیل ہُوئی ہے۔ میں اُن کی عادی ہو گئی ہُوں۔ اُنھیں نگاہ میں رکھتے ہُوئے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ کبھی کسی مرحلے پر اگر میری دِل شکنی کی گئی۔ یا میری ذات پر مُسلط ہونے کی کوشش کی۔ تو کیا میں اُسے برداشت کر سکوں گی۔ میں بچّی نہیں ہُوں۔ بے شک میں نے اپنے آپ کو آج تک دُنیا کے جھگڑوں سے دُور رکھا ہے۔ لیکن حقیقتیں تو خود بخود ذہن تک پہنچتی ہیں۔ میں جانتی ہُوں کہ میری شادی ضرور کی جائے گی۔ میرے والدین میرے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ اِس سلسلے میں وہ ذمّے دار ہیں کہ جو بھی فیصلہ کریں میری شخصیت کو مدِ نگاہ رکھ کر کریں۔ اُن کے پاس وسائل ہیں۔ وہ چاہیں تو یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دِل شادی کرنے کے لئے نہیں چاہتا۔ میں بعض اوقات سوچتی ہُوں کہ جب مجھ پر اِس سلسلے میں زور ڈالا جائے گا تو میں کس طرح مُدافعت کروں گی۔ کیا کہہ کر اُن لوگوں کو روکوں گی۔ وہ ہنسیں گے مُسکرائیں گے۔ حوالے دیں گے اِس بات کے کہ دُنیا میں آج تک یہی ہوتا آیا ہے۔ میں اُنھیں کیا جواب دُوں گی۔ اور بچّی بات یہ بھی ہے کہ انسان کی تکمیل اِسی طرح ہوتی ہے۔ دُنیا اِسی انداز میں آگے بڑھتی ہے اور آگے بڑھ جائے گی۔ تو پھر میں اپنے اندر انفرادیت کیسے پیدا کر سکتی ہُوں۔ خالد کا معاملہ جہاں تک ہے۔ اپنے مزاج، اپنی باتوں سے اپنی طبیعت سے اور اپنی مالی حیثیت سے وہ ٹھیک ٹھاک ہی نظر آتا ہے۔ میں تمھیں خلوصِ دِل سے یہ بات بتا رہی ہُوں کہ میرے دِل میں اُس کا عشق بیدار نہیں ہُوا ہے۔ ہاں اُس کے گفتگو کرنے کا انداز مجھے بے حد بھایا ہے۔ رَدا! مجھے فیصلہ کر لینے دو۔ میں تمھیں اِس فیصلے سے ضرور آگاہ کر دُوں گی۔ میرا خیال ہے میں خالد سے شادی کر لوں گی۔ لیکن اگر یہ معاملہ ٹل سکتا ہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ بلکہ پہلے میں کوشش کروں گی کہ جب میری شادی کا ذکر آئے۔ تو میں اِنکار کر دُوں۔ مگر جب زیادہ دباؤ ڈالا گیا۔ تو پھر کہہ دُوں گی کہ ٹھیک ہے خالد سے میری شادی کر دی جائے۔"

رَدا ہنس پڑی تھی۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر شناء کو گلے سے لپٹا لیا

"شناء تم بہت اچھی ہو بہت ہی اچھی۔ مگر ایک بات سُن لو۔ ایک بات سمجھ لو۔ شادی تمھیں کرنا ہوگی۔ اِس سلسلے میں کسی قسم کی حماقت بیکار ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب یہ بات آگے بڑھے تو تم خاموشی اختیار کر لینا۔"

"تم یہ مشورے کرتی رہو گی نا بس کہہ دیا" شناء نے آہستہ سے کہا۔ اور رَدا کی آنکھوں میں مسرت ناچنے لگی۔

"گڈ ویری گڈ۔ بے چارے خالد کو یہ خوشخبری سُنا دیتیں تو خوش خوش ہی جاتا۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ اور تم بھی سُنو کوئی خط وغیرہ مت لکھ دینا اُن لوگوں کو۔ کیا سمجھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وعدہ ایسی کوئی حرکت میں نہیں کروں گی۔ لیکن میرا خیال ہے خالد بد دِل ہو کر نہیں گیا۔ بلکہ تو نے اُسے جو جواب دیا تھا۔ ممکن ہے اُس جواب کو اُس نے پسند کیا ہو۔"

شناء کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر تک رَدا کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ واپس چلی گئی۔ رَدا مسرُور انداز میں مُسکراتی رہی تھی۔ اب اُس کی تمام دلچسپیاں، تمام محبّتیں اِن ہی لوگوں میں بٹ کر رہ گئی تھیں۔ ماضی جو کچھ بھی تھا۔ شاید وہ اُسے فراموش کر بیٹھی تھی۔ بہت دیر تک حالات پر غور کرتی رہی۔ پھر ذہن میں اختر آ گیا۔ اختر نے اُس پر ایک ذِمّہ داری ڈالی تھی۔ چنانچہ وہ اِس ذِمّہ داری سے بھی نمٹ لینا چاہتی تھی۔ لیکن آج اُس کا موقعہ نہیں تھا۔

دوسرے دِن اُس نے نُدرت کو تنہائی میں جا پکڑا۔ شناء تیمُور کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کہیں باہر گئی تھی۔ تیمور کا معاملہ تو اب مکمل طور پر شناء نے اپنے ذِمّے لے لیا تھا۔ اور رَدا سے اُسے لاتعلق سا کر دیا تھا۔ نُدرت کسی کام سے تین نمبر سے نکلی تھی کہ رَدا نے اُسے روک لیا۔

"کیا کر رہی ہو آؤ؟"

"چلو بھئی، ہم تو ہیں ہی آوارہ گرد۔ یہ شناء کہاں گئی ہے؟"

"پتہ نہیں۔ کہیں شاپنگ وغیرہ کے لئے گئی ہوگی" رَدا نے جواب دیا۔

"ہُوں۔ ویسے آج کل تم بہت شگفتہ نظر آ رہی ہو مونا لیزا، کیا بات ہے؟ اُن دونوں کے جانے کے بعد تمھاری طبیعت میں ایک عجیب سی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔"

"ذِمّہ داری سمجھ کر مُسکرا رہی ہُوں" رَدا نے کہا۔

"ویری گڈ، یہ اُلجھے ہُوئے جُملے بھی بولنے لگی ہو۔"

"نہیں۔ جو کچھ میں نے کہا سچ کہا ہے۔ میں ذِمّہ داری سمجھ کر مُسکرا رہی ہُوں۔ اور ذِمّہ داری یہ ہے کہ تم دونوں کے دِلوں کو اُن دُکھوں سے روکوں جو اُن میں جا گزیں ہو گئے ہیں۔"

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ ذرا اِس منطق کی بھی تشریح کر دی جائے۔"

"آؤ اُدھر بیٹھیں گے۔" رَدا نے کہا اور نُدرت اُس کے ساتھ چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پائیں باغ کے پُرسکون گوشے میں بیٹھی تھیں۔

"وضاحت پلیز!" نُدرت نے شوخی سے کہا۔

"بھئی تم دونوں میری زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہو۔ میری دوست ہو، میری ساتھی ہو۔ تمھارے بارے میں نہ جانوں گی تو پھر کس کے بارے میں جانوں گی۔ میں جانتی ہُوں کہ خالد کے جانے کی وجہ سے شناء کچھ افسُردہ ہو گئی ہے۔ اور تمھارا ذہن بھی اختر کے تصوّر سے خالی نہیں ہے۔"

"مونا لیزا! عقل لازم ہے دِل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔" نُدرت نے غرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔

"اسے جانے دے اللہ رکھی، نہ جانے کیا سمجھ رکھا ہے تم لوگوں نے رَدا کو۔ نہ جانے کیا سمجھنا چاہتی ہو تم اُسے۔ چھوڑ اُس کے ماضی کو آواز نہ دے۔ اُسے اپنی حیثیت کا اظہار کرنے پر مجبُور مت کر... دوست بن، دوست رہ۔ بس یہ کافی ہے" رَدا نے ایسے عجیب لہجے میں کہا کہ نُدرت کی آنکھیں پھیل گئیں، رَدا کے چہرے سے جیسے ایک نقاب سرک گیا ہو۔ اِن الفاظ میں وہ نُدرت کو بہت عجیب نظر آئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ رَدا کسی خیالی نقطے پر نِگاہ جمائے ہُوئے تھی۔ پھر اُس کی حالت نارمل ہو گئی۔ اور اُس نے گہری نگاہوں سے نُدرت کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"قسم کھائے گی میری کہ تیرے ذہن میں اختر کے لئے کوئی تصوّر نہیں ہے؟"

"وہ تو بعد میں کھا لُوں گی۔ لیکن یہ بتا مونا لیزا! تیرے الفاظ کیا تھے؟"

"بات ٹالنے کی کوشش مت کرو نُدرت! میں سنجیدہ ہُوں۔ تم سے جو کچھ پوچھ رہی ہُوں اگر اُس کا جواب تم نے سنجیدگی سے نہ دیا۔ تو خُدا کی قسم تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔ اور قسم کھانے کے بعد میں قسم کبھی نہیں توڑتی۔"

"بلاوجہ دھمکیاں دیئے جا رہی ہو۔ میں کہتی ہُوں تمھارا مقصد کیا ہے؟"

"جو کچھ میں پُوچھوں اُس کا صحیح صحیح جواب دو۔"

"کمال کی بات ہے چلو پُوچھو" نُدرت نے کہا۔

"سوال برقرار ہے۔ اختر کے لئے تیرے دِل میں کیا تصوّر ہے؟"

"کیا یہ عجیب سوال نہیں ہے رَدا؟" نُدرت نے کہا۔

"ہے۔ لیکن یہ سوال رَدا تجھ سے کر رہی ہے۔ بس اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔"

"بات سُنو رَدا، احمقانہ بات ہے۔ خُدا کی قسم احمقانہ تصوّر ہے۔ تم ہماری حیثیت دیکھو، ہماری اوقات دیکھو، اِس میں کوئی شُبہ نہیں ہے کہ میرے والدین بہت اچھی زندگی گزار چکے ہیں۔ میں نے تو خیر اُس زندگی سے کوئی استفادہ نہیں حاصل کیا لیکن عِصمت آپا اچھا وقت دیکھے ہُوئے ہیں۔ وہ گئی گُزری باتیں ہیں۔ ہم اب جو کچھ ہیں۔ ہمیں اُس پر نِگاہ رکھنی چاہیئے۔ اختر خالد کے بھائی ہیں۔ عادل صاحب کے بیٹے ہیں۔ اور عادل صاحب وہ ہیں۔ جو اپنے بیٹے سے شناء کی شادی کے خواہش مند ہیں۔ اور شناء وہ ہے۔ جو کروڑ پتی والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ بھلا اِس تمام ڈرامے میں نُدرت کی پیوندکاری کہاں کی جا سکتی ہے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے نُدرت! جو کچھ میں نے تجھ سے پُوچھا ہے مجھے صرف اُس کا جواب درکار ہے۔"

"رَدا! ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میری کچھ راتیں اختر کے خیالوں میں گُزری ہیں۔ لیکن میں حقیقت پسند ہُوں۔ میں اپنے آپ کو اُن مسرت نصیبوں میں شامل نہیں کرنا چاہتی۔ جو زندگی میں ایک داغ لگا لیتے ہیں۔ اور اُس کے بعد اُس داغ کی خلش لئے ہُوئے جیتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو سمجھا رہی ہُوں کہ یہ تصوّر ایک غلطی ہے۔ یہ غلطی نہ کی جائے۔ اور کیا پُوچھنا چاہتی ہو؟"

"بس صرف اِتنا ہی۔"

"مونا لیزا! تمھاری قسم ختم ہو گئی نا۔ میں نے تمھیں جواب دے دیا۔ اب ایک سوال میں تم سے کروں؟"

"ہاں ایک کیا ہزار سوال کرو۔"

"تمھارے ذہن میں یہ تصوّر کیسے پیدا ہُوا۔ تم نے کیونکر جانا کہ میں؟"

"مجھ سے اختر نے کہا تھا۔ تم جانتی ہو کہ مجھے بہن کہنے لگا تھا وہ،"

اچھا شوخ اور شریر سا بھائی تھا وہ میرا۔ خُدا اُس کی عمر دراز کرے۔ مَیں نہیں جانتی کہ مستقبل میں وہ مجھے ملے گا یا نہیں۔ لیکن جو ایک نام وہ مجھے دے گیا۔ وہ نام ساری زندگی میرے سینے میں رہے گا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ندرت کا خیال رکھوں۔ وہ مجھ سے کہہ کر گیا تھا ندرت! کہ وہ تم سے محبت کرنے لگا ہے اور تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا خواہاں ہے۔ اُس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اُس کی محبت کا جواب اُسے نہیں ملا۔ وہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ میں کوشش کروں کہ اُس کی زندگی بھی کارآمد ہو جائے۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اِس سلسلے میں تم سے سوال کروں اور ندرت۔ نہ جانے کیوں میرے دل کو یقین ہے کہ تمہاری کہانی میں کوئی ڈرامائی سچوئیشن نہیں پیدا ہوگی۔ میں نہیں جانتی کہ اِس کا طریقۂ کار کیا ہوگا لیکن اختر بہت ذہین نوجوان ہے۔ خالد کی نسبت وہ بہت تیز ہے۔ وہ یقیناً ایسا ذریعہ نکال لے گا کہ تمھیں اُس کی زندگی میں شامل کر دیا جائے۔ تم اپنے آپ کو اِس کے لئے تیار رکھنا سُنا! میں نے کبھی زندگی میں آگے بڑھ کر کوئی بہت بڑا قدم نہیں اُٹھایا لیکن اپنے اُس بھائی کا یہ کام ضرور کروں گی۔ جس نے زندگی میں پہلی بار اِس خلوص سے مجھے بہن کہا تھا۔"

ندرت بُری طرح مسحور ہوگئی تھی۔ وہ رِدا کی صورت دیکھ رہی تھی۔ رِدا کے چہرے پہ نہ جانے اِس وقت کیسے کیسے کنول کھِلے ہوئے تھے۔ ندرت نے آہستہ سے کہا۔

"رِدا! یہ سب کچھ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔ میری مُسکراہٹیں بھی چھین لینا چاہتی ہو تم۔ پلیز رِدا پلیز! اِس سلسلے میں کوئی بہت بڑا قدم اُٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ میں جانتی ہُوں یہ سب کچھ نہیں ہوگا!"

"یہ سب کچھ ہوگا ندرت، یہ سب کچھ ہونا چاہیئے۔ اور اگر نہ ہو سکا تو میں اِسے دو انسانوں کی شدید بدنصیبی قرار دُوں گی۔ بس اِتنا کافی ہے۔ اور تُو ایک بات کا اطمینان رکھ۔ اگر تو چاہے گی تو میں دُنیا کے کسی دوسرے فرد سے اِس کا تذکرہ نہیں کروں گی۔ اُس وقت تک جب تک کہ اِس کے لئے کوئی مناسب حل نہ نِکل آئے۔"

"ہُوں۔ مونا لیزا! خُدا کی قسم خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تو اِتنی خطرناک نِکلے گی۔ ارے باپ رے تو تو... تو تو..."

"بس بس مجھے خوشیوں میں ڈُوبا رہنے دے۔ کم از کم میں اختر کو اب یہ جواب تو دے سکوں گی کہ اُس کے دِل کی دُنیا ویران نہیں ہوگی۔"

"ہُوں، تو سوال و جواب کا یہ سلسلہ بھی جاری رہے گا؟"

"کیوں نہیں، مَیں اختر کو خطوط لِکھوں گی۔"

"اور اگر وہ خطوط اُس کے والدین کے ہاتھ لگ گئے تو؟"

"نہیں۔ میں ابھی اُس وقت تک کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گی۔ جب تک کہ اختر یا اُن لوگوں کی طرف سے کوئی آغاز نہ ہو۔"

"مگر یہ آغاز کیسے ہوگا؟" ندرت نے بے اختیارانہ انداز میں کہا۔ اور رِدا ہنس پڑی۔

"ہو جائے گا پریشان مت ہو۔"

"میرا مقصد یہ تھوڑی ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تم خط میں... کیا فضول بکواس ہے۔ بس اب میں چلتی ہُوں بھاڑ میں گئی نی ہے۔ امّاں بی جُوتی لئے بیٹھی ہوں گی۔" ندرت نے کہا اور رِدا کے بغیر تیزی سے وہاں سے چل پڑی۔ رِدا محبت بھری نِگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

۞

معمولاتِ زندگی جُوں کے تُوں جاری تھے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اِس شام اِس پُرسکون کوٹھی کی فضاء میں کچھ ہلچل پیدا ہوگئی۔ احسان صاحب گھر کے معاملات سے بری الذمّہ آدمی تھے۔ یہاں کی تمام ذمّہ داریاں گھر والوں نے سنبھالی ہُوئی تھیں۔ اور وہ زیادہ تر کاروباری امُور میں مصرُوف رہتے تھے۔

شام کو تقریباً سات بجے وہ گھر پہنچے تو اُن کے چہرے پر پریشانی کی جھلکیاں تھیں۔ اُنھوں نے کوٹھی کے صدر گیٹ سے داخل ہوتے ہی پورچ پر نِگاہیں دوڑائی تھیں۔ نہ جانے کیا تلاش کیا تھا اُنھوں نے پھر گاڑی سے اُتر کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے۔ ایک ملازم کو طلب کیا اور کہنے لگے۔

"شہاب کہاں ہیں؟"

"جی شہاب صاحب تو دوپہر سے گئے ہُوئے ہیں۔"

"ہُوں۔ ذرا ذکیہ کو بھیج دو میرے پاس۔" اُنھوں نے کہا۔ اور ملازم گردن خم کر کے چلا گیا۔ ذکیہ بیگم خود ہی آنے والی تھیں۔ ملازم نے طلبی کی اطلاع دی تو ذرا تیز قدموں سے شوہر کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ اور ہمیشہ کی مانِند مُسکراتی نِگاہوں سے اُنھیں دیکھا۔ لیکن ایک لمحے ہی میں اُنھیں احساس ہوگیا تھا کہ احسان صاحب کچھ پریشان ہیں۔

"ذکیہ! شہاب کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں، دوپہر سے گئے ہُوئے ہیں۔ کھانے کے بعد نِکل گئے تھے۔ کیوں خیریت تو ہے؟"

"اُوں۔ شاید خیریت نہیں ہے ذکیہ؟" احسان صاحب نے

اُلجھے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"خُدا خیر کرے۔ کیا بات ہے۔ پریشان نظر آ رہے ہیں۔ اللہ نہ کرے شہاب کو..."

"نہیں، ابھی کچھ نہیں ہُوا ہے۔ میں تو خود اُس کے بارے میں جاننا چاہتا ہُوں۔ وہ کہاں ہے۔ کسی کو اطلاع ہوتی ہے۔ اُس کے بارے میں؟"

"نہیں، کبھی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔"

"اوہ۔ ذکیہ! جو کچھ میں تم سے پُوچھ رہا ہُوں۔ اُس کی تشہیر نہیں ہونی چاہیئے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دِل میں کسی قسم کا خیال نہیں لاؤ گی۔"

"کیا بات ہے۔ آپ نے اِس لہجے میں آج تک کبھی گفتگو نہیں کی۔ میرا دِل ہَول رہا ہے۔"

"احمقوں کی سی باتیں مت کرو۔ بھلا دِل ہَولنے کا کیا سوال ہے۔ میں تمھارے سامنے زندہ سلامت موجود ہُوں۔ گھر کے معاملات پُرسکون ہیں۔ میں جو کچھ پُوچھ رہا ہُوں۔ اُس کا جواب پُوری سمجھداری سے دینا۔"

"ہاں ہاں پُوچھیئے۔"

"زمان کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے ذرائع آمدنی کچھ اچھے نہیں تھے۔ ظاہر ہے اُن کے انتقال کے بعد رشید کی پرورش بھی بہتر طور پر نہیں ہُوئی ہوگی۔ فیصل آباد میں اِن لوگوں کے مالی وسائل کیا تھے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ پریشان ہو کر ہی طفیلی بیگم نے مجھے خط لکھا تھا۔ مگر کیا اُن کی کوئی بات ہے؟"

"ہاں اُن کی ہی ہے۔ رشید ہے کہاں آج کل؟ کیا کوٹھی میں نہیں ہے؟"

"نہیں، کئی دِن سے نہیں ہے۔ طفیلی بیگم بتا رہی تھیں کہ کسی کام سے مُلک سے باہر گیا ہُوا ہے۔"

"وہ کام کیا تھا؟ کیا طفیلی بیگم نے اِس کا تذکرہ بھی کیا؟"

"نہیں۔ کہہ رہی تھیں شہاب میاں کے کاروبار میں شریک ہو گیا ہے۔ اور اُن ہی کے حکم سے باہر گیا ہے۔"

"تم نے یہ نہیں پُوچھا ذکیہ بیگم، کہ شہاب کا کیا کاروبار ہے...؟ شہاب تو کچھ بھی نہیں کرتے۔"

"نہیں میں اِتنی گہرائی میں نہیں گئی۔ اور پھر میں نے کبھی کبھی یہ بھی سُنا ہے کہ شہاب تھوڑا بہت کچھ کر لیا کرتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ اِس کے پُوچھنے کی کبھی ضرورت نہیں پیش آئی۔"

"ذکیہ! معاملہ بہت اُلجھا ہُوا ہے۔ اور اِس میں خُدانخواستہ ہم سب بھی ملوّث ہو سکتے ہیں۔ ذرا ایک کام کرو۔ تم خود طفیلی بیگم کے پاس چلی جاؤ۔ اُن سے پُوچھو کہ رشید نے اُن سے جاتے ہُوئے کیا کہا ہے کیا اُنھیں یہ بات معلوم ہے کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اور کیوں گیا ہے؟"

"میں مزید پُوچھے لیتی ہُوں۔ لیکن طفیلی نے یہ ہی بتایا ہے کہ وہ شہاب میاں کے کہنے پر ہی کہیں گیا ہے۔ اور اللہ رکھے اب اچھا خاصا کما رہا ہے۔"

"ہُوں۔ گویا جو کچھ سُنا ہے میں نے وہ سب سچ ہے۔ ذرا طفیلی بیگم کو بُلوا لو۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی بُلواتی ہُوں۔"

"تم نہیں جاؤ بھئی کسی ملازم سے بُلوا لو۔" احسان صاحب نے کہا اور ذکیہ نے فوراً ہی باہر نِکل کر ایک ملازم سے طفیلی بیگم کو بُلانے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد طفیلی بیگم ہانپتی کانپتی اندر آگئیں۔ اِس سے پہلے کبھی ایسا موقعہ نہیں ہُوا تھا کہ احسان صاحب کے کمرے میں اُن کی طلبی ہُوئی ہو۔ احسان صاحب نے خود ہی اُنھیں سلام کیا تھا۔

"بیٹھیئے طفیلی بہن! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"ٹھیک ہُوں بھائی صاحب مجھے بُلایا تھا آپ نے؟"

"ہاں طفیلی بیگم، کچھ ایسی ہی ضرورت پیش آگئی کہ مجھے آپ کو تکلیف دینا پڑی۔ رشید کے بارے میں آپ کو کچھ علم ہے کہ کہاں گیا ہے؟"

"اللہ رکھے مُلک سے باہر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ امّاں بس اب پرواہ مت کر۔ دولت کے انبار لگا دُوں گا۔ خود کو اپنے خاندان کے برابر ثابت کر کے دِکھا دُوں گا۔ ویسے بڑا محنتی بچّہ ہے احسان بھائی! باپ کی موت کے بعد اُسی نے جو کچھ تھا سنبھالا ہُوا تھا۔"

"اُس کی صحبتیں کیسی رہیں طفیلی بیگم؟"

"کبھی کوئی شکایت سُننے کو نہیں ملی بھائی صاحب، ویسے بھی بڑی محبت کرتا ہے آپ سب لوگوں سے۔"

"میں یہ تمام باتیں نہیں پُوچھ رہا۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہُوں کہ اُس کا کردار کیسا رہا ہے۔ غلط صحبتوں میں تو نہیں رہا؟"

"نہیں بھائی صاحب، زمان کی اولاد کبھی خراب نہیں ہو سکتی۔" طفیلی بیگم نے کہا۔ اور پھر چونک کر بولیں "مگر یہ باتیں کیوں پُوچھ رہے ہو بھیّا! خیریت تو ہے نا۔ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں؟"

"کیا وہ آپ کو یہ بتا کر نہیں گیا طفیلی بیگم، کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اور کِس مقصد کے لئے جا رہا ہے؟"

"شہاب میاں نے بھیجا ہے کہیں۔ یہ ہی کہہ رہا تھا کہ کوئی کاروباری سِلسلہ ہے۔ شہاب صاحب نے اُس کے سَر پر ہاتھ رکھ

دیا ہے۔ اور کیوں نہ رکھیں اپنا بچّہ ہے۔ اپنا خُون ہے۔ آپ ہی لوگ اُسے نہ سنبھالیں گے تو اور کون سنبھالے گا۔ زمان زندہ ہے تو اُن کے دِل میں کدُورت رہی۔ لیکن بھیّا! میرا اِس کدُورت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں نے تو گھرانے کی ایک اچھی عورت کی طرح زمان کا ساتھ نبھا دیا۔ جب وہ اِس دُنیا سے رُخصت ہو گئے تو میرے دِل میں بہن کی محبت جاگی۔ اور میں اپنے بچّے کو لے کر یہاں چلی آئی۔ احسان بھائی! بڑے احسانات ہیں آپ کے ہم لوگوں پر اور بڑی فراخدلی ہے آپ کی کہ زمان سے اختلاف کے باوجود رشید کو اپنے گلے لگایا۔ میں اُسے ہمیشہ کے لئے آپ کی غلامی ہی میں دینا چاہتی تھی۔ اور یہ بات بہت دِن سے میرے دِل میں مچل رہی تھی۔ پر کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ رشید کچھ بن جائے گا۔ تو آپ سے تذکرہ کروں گی۔"

"کیسا تذکرہ؟" احسان صاحب کی آواز میں غرّاہٹ پیدا ہو گئی۔

"ابھی کچھ نہیں کہوں گی احسان بھائی! وقت آنے پر سب کچھ کہوں گی۔"

"جائیے آپ اپنے کمرے میں جائیے۔" احسان صاحب نے کہا۔ اور طفیلی بیگم چونک کر اُنھیں دیکھنے لگیں۔ احسان صاحب طفیلی بیگم کی باتوں کا مقصد کچھ کچھ سمجھ گئے تھے۔ ذکیہ بیگم بھی حیران تھیں۔ طفیلی بیگم نے باری باری دونوں کی صُورت دیکھی اور بولیں۔

"کوئی غلط بات نِکل گئی میرے مُنہ سے بھیّا؟"

"طفیلی بیگم! آپ اپنے کمرے میں واپس جائیے۔" احسان صاحب پھر بولے۔

"جا رہی ہُوں بھائی، آپ ہی نے بُلایا تھا۔ لیکن آپ کا لہجہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ ذکیہ بہن! کچھ بتا تو دو مجھے کہ میری یہ غلطی کہاں ہُوئی تھی؟"

"آپ جائیے طفیلی بیگم، آپ جائیے۔"

"کمال کی بات ہے۔ بُلایا۔ اور اب پھر اِس طرح بھگا رہے ہو۔ اَرے بھیّا! اگر کوئی بات بُری لگ گئی ہو۔ تو معافی چاہتی ہُوں میں ٹکڑوں پر پڑی ہُوئی ہُوں۔ لیکن رشتہ بھی ہے میرا۔ کم از کم یہ لہجہ تو اختیار نہ کرو۔"

"نہیں طفیلی بیگم! آپ اِس لہجے کا بُرا نہ مانیں۔ لیکن آپ نے جو باتیں شروع کر دیں وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ کیا کچھ اور وضاحت کریں گی اِس کی؟" احسان صاحب بولے۔

"بھیّا! ہمت تو توڑ دی تم نے اب کیا وضاحت کروں اب تو جب ہی زبان کھولوں گی۔ جب میرا رشید کچھ بن کر دکھا دے گا۔ کیا مجھے" طفیلی بیگم نے کہا۔ اور دروازے سے باہر نِکل گئیں۔ احسان صاحب غُصیلی نِگاہوں سے دروازے کو دیکھتے رہے پھر ذکیہ بیگم کو گھُورتے ہُوئے بولے۔

"یہ کیا بکواس کر رہی تھیں؟"

"خدا جانے میری سمجھ میں تو خود کچھ نہیں آ رہا۔ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھیں۔"

"آپ کو اِن کے الفاظ کا مفہُوم سمجھ لینا چاہیئے ذکیہ بیگم!"

"کچھ کچھ سمجھ تو رہی ہُوں۔ لیکن طفیلی بیگم کی یہ جرأت کس طرح ہُوئی یہ میں نہیں جانتی۔"

"آپ کو جاننا چاہیئے ذکیہ بیگم! یہ گھر ہے چڑیا گھر نہیں۔ میں نے یہاں اپنے رشتے داروں کے لئے دروازے کھول دیئے ہیں۔ لیکن کوئی سَر پر سواری کرنے لگے تو میں اُسے کسی قیمت پر برداشت نہیں کروں گا۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جس شخص سے آپ کو اختلاف ہو بھلا مجھے اُس سے کیا دِلچسپی ہو سکتی ہے۔ آپ ہی کی ہدایت تھی کہ کسی غریب رشتے دار کو ٹھکرایا نہ جائے۔ کیونکہ یہ سب کچھ خُدا کی دین ہے۔ اور اِس دین کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچنا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے لیکن حد سے آگے بڑھنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔" احسان صاحب نرم ہوتے ہُوئے بولے۔

"مگر معاملہ کیا ہے کچھ تو بتایئے مجھے۔"

"قبل از وقت ہو گا۔" احسان صاحب نے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ میں نے کبھی آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف مجبُور نہیں کیا۔ لیکن بہر طور شرعی طور پر بھی حق رکھتی ہُوں۔ اور آج تک جس طرح اپنا کردار نبھاتی رہی ہُوں۔ اُس کے تحت بھی میرا خیال ہے آپ مجھ سے بدظن نہیں ہوں گے۔"

"اَرے نہیں نہیں ذکیہ، کیسی باتیں کرنے لگیں۔ دراصل اِتنا پریشان ہُوں کہ بتا نہیں سکتا۔ رشید گرفتار ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ کہاں، کیسے؟"

"سنگاپور میں۔ ایک بہت بڑے جُرم میں ملوّث پایا گیا ہے وہ ہیروئن کا بہت بڑا ذخیرہ لے کر سنگاپور گیا تھا۔ اور اِس ذخیرے کا تعلق۔ اِس کا تعلق . . ."

"ہاں ہاں اِس کا تعلق؟"

"میرا خیال ہے بس اِتنا رہنے دو۔ اور سُنو! رشید کی گرفتاری کی خبر ابھی عام مت کرنا۔ طفیلی بیگم آسمان سَر پر اُٹھا لیں گی۔ پُوری کوٹھی میں ہنگامہ کر دیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ ابھی یہ بات

منظرِ عام پر آئے۔"

"کوئی خطرہ ہمارے لئے بھی ہے؟"

"سب کے لئے ہے۔ کیا سمجھتی ہیں آپ۔ کیا ہم اِس سے محفوظ رہیں گے؟"

ذکیہ بیگم کا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ بمشکل تمام اُنھوں نے پھُولے ہُوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"تو کیا ہم بھی ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوّث ہو جائیں گے؟"

"جی ہاں براہِ راست کیا سمجھیں آپ۔" ذکیہ بیگم نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"سُنیئے ذکیہ بیگم! میں نے غلطی کی کہ اپنے دِل کی بات آپ کو بتا دی۔ براہِ کرم عورت پن کا ثبوت مت دیجئے۔ آپ کو پُوری ہمت کے ساتھ اِس بات کو ابھی راز میں رکھنا ہے۔ اگر یہ سب کچھ حقیقتیں ثابت ہُوئیں۔ تو . . . تو . . ."

"مگر میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی اگر ایسا ہو گیا۔ طفیلی بیگم سے میرا رشتہ ہے آپ کا نہیں۔"

"حماقتوں کی باتیں نہ کیجئے گا۔ بات آپ کے رشتے داروں ہی کی نہیں۔ میرے رشتے داروں کی بھی ہے۔ جائیے ذکیہ بیگم، اپنے کمرے میں جائیے۔ براہِ کرم مجھے سوچنے دیجئے۔ اور ہاں شہاب جس وقت بھی آئے مجھے فوراً ہی اُس کے بارے میں اطلاع دیجئے۔" ذکیہ بیگم لرزتے قدموں سے باہر نِکل گئی تھیں۔ احسان صاحب گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار بکھرے ہُوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک ملازم نے اطلاع دی۔

"صاحب! مجھے بیگم صاحبہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ شہاب صاحب واپس آ گئے ہیں۔"

"اوہ کہاں ہے وہ۔ اُسے میرے کمرے میں بھیج دو۔" احسان صاحب نے سنبھل کر کہا۔ اور ملازم باہر نِکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شہاب صاحب ایک خوبصُورت سُوٹ میں ملبُوس مُسکراتے ہُوئے بھائی کے سامنے پہنچے تھے۔ ادب سے سلام کیا۔ لیکن احسان صاحب کے چہرے کو دیکھ چونک پڑے۔

"خیریت بھائی صاحب! آپ نے مجھے طلب کیا تھا . . .؟"

احسان صاحب گہری نِگاہوں سے شہاب کا جائزہ لیتے رہے۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"بھائی صاحب! بتلایئے پلیز خیریت تو ہے۔ میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہُوں۔"

"شہاب بیٹھ جاؤ۔ بلکہ رُکو پہلے دروازہ بند کر دو۔" احسان صاحب نے سَرد لہجے میں کہا اور شہاب صاحب اُلٹے قدموں واپس پلٹے۔ اُنھوں نے دروازہ بند کر دیا۔ لیکن اب اُن کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ بھائی کے اشارے پر اُن کے سامنے پڑی ہُوئی کُرسی پر بیٹھ گئے۔

"جی بھائی صاحب۔"

"فرینڈس آرگنائزیشن کیا ہے؟" احسان صاحب نے پُوچھا۔ اور شہاب صاحب کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے احسان صاحب کو دیکھنے لگے۔ پھر اُنھوں نے کہا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"شہاب! رشید گرفتار ہو گیا ہے سنگاپور میں اُسے ہیروئن کے ایک بڑے ذخیرے کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے۔ اور اُس کی گرفتاری انٹرپول کے تحت عمل میں آئی ہے۔" احسان صاحب نے سَرد لہجے میں کہا۔ اور شہاب صاحب کی مُٹھیاں بھینچ گئیں۔ اُن کے بدن کا سارا خُون ایک لمحے کے لئے اُن کے چہرے پر جم گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُنھوں نے خود کو نارمل کر لیا۔ احسان صاحب گہری نِگاہوں سے اُن کا جائزہ لے رہے تھے پھر شہاب صاحب بولے۔

"لیکن اِس معاملے کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟"

"رشید فرینڈس آرگنائزیشن کے بارے میں بیان دے چکا ہے۔ اُس نے تمہارا اور تغیر کا نام دے دیا ہے۔ شاید ایک آدھ دِن میں توقیر صاحب کی فرم بھی سیل ہو جائے تغیر کی گرفتاری کے لئے انٹرپول نے اُس ملک کو ہدایات جاری کر دی ہیں۔ جہاں تغیر ہے۔" احسان صاحب رُک رُک کر یہ الفاظ کہہ رہے تھے۔ اور ہر جملے کا ردِّ عمل شہاب صاحب کے چہرے پر نوٹ کرتے جا رہے تھے شہاب صاحب کے وجُود میں زلزلہ آیا ہُوا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے۔ پھر اُنھوں نے کہا۔

"ممکن ہے رشید نے ایسا کیا ہو۔ لیکن یہ اُس کا کام ہے۔ ظاہر ہے وہ یہ بات کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ کسی فرینڈس آرگنائزیشن سے میرا کوئی تعلق ہے۔"

"سُنو شہاب! مجھے انتہائی خُفیہ بلکہ یُوں سمجھو کارِ دیاری ذرائع سے یہ بات معلوم ہُوئی ہے۔ میرے کچھ کرم فرماؤں نے جو مجھ سے ہمدردی اور محبت رکھتے ہیں۔ وقت سے پہلے مجھے اِس بارے میں اطلاع دے دی ہے۔ چنانچہ میں تم سے ایک بھائی کی حیثیت سے یہ سوال کر رہا ہُوں کہ مجھے اِس سارے کاروبار کی تفصیلات بتا دو۔ میرے علم میں اور بھی بہت سی باتیں آئی ہیں تم سمجھ لو جو

الفاظ میں نے تم سے کہے ہیں۔ وہ صرف اِسی حد تک محدود نہیں ہیں۔ بہت سے معاملات مجھے بتائے گئے ہیں۔ بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی ہے میری اِس سلسلے میں۔ میری اپنی عزت، میرا کاروبار بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔ کیونکہ معاملات بہت دُور تک چلے گئے ہیں۔ اِس سلسلے میں کئی دِن سے کھچڑی پک رہی تھی۔ انٹرپول ہمارے گرد اپنی گرفت تنگ کر چکی ہے اور اب ہم اتنی آسانی سے اِس شکنجے سے نہیں نکل سکتے۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے تمام تفصیلات بتا دو۔ تاکہ کچھ تو بندوبست کر سکوں بظاہر یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے پاس اب کرنے کے لئے کچھ نہیں رہا ہے۔"

"بھائی صاحب! یہ سب کچھ غلط ثابت ہوگا۔ الزام ثابت ہوگا، بہتان ثابت ہوگا، آپ اطمینان رکھیئے۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ بات چونکہ میری ذات سے ملوّث کر کے سامنے لائی گئی ہے۔ چنانچہ میں خود ہی ہر چیز سے نمٹ لُوں گا اور اگر کوئی ایسی بات آپ مجھے بتا سکتے ہیں جو اِس سلسلے میں میرے حق میں بہتر ثابت ہو تو بتایئے۔"

"افسوس تم اُس زبان میں بات نہیں کر رہے شہاب! جس زبان میں تمھیں مجھ سے بات کرنی چاہیئے۔ میں تم سے ابھی تک اپنے اُس سوال کا جواب نہیں لے سکا۔ کہ فرینڈس آرگنائزیشن سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میں اِس نام کی کسی فرم یا کمپنی کو نہیں جانتا میرا اِس سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ رشید اگر کسی سلسلے میں میرا نام لیتا ہے۔ تو وہ احمق ہے۔ ایک بُرے باپ کا بُرا بیٹا۔ اِس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے کہ جس تھالی میں کھائے اُسی میں سوراخ کرے یہاں قدم جما کر اُس نے اپنے آپ کو ایک با حیثیت انسان بنایا۔ اور ہمارے خاندان سے خود کو متعلق ظاہر کر دیا۔ آپ جانتے ہیں بھائی صاحب کہ گھر کے معاملات میں میں کچھ نہیں بولتا۔ بھابی جان کی عزت اپنی ماں کی طرح کرتا ہُوں۔ بھلا میری کیا مجال تھی کہ طفیل بیگم کو یہاں آنے سے منع کرتا۔ اور نہ اِس کی ضرورت محسوس کی تھی میں نے۔ کیونکہ اِس گھر کو جو مراعات آپ نے دی ہیں۔ جس طرح آپ نے خاندان کو نوازا ہے۔ اُن میں کسی کا کوئی تعین نہیں کیا گیا۔ لیکن زمان کا بیٹا کوئی اچھا انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ بُری صحبتوں کا پروردہ یہ ہی سب کچھ کر سکتا ہے وہ اپنے معاملات کا خود ہی ذمّہ دار ہے۔ میرا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس میں آپ سے اِتنا ہی عرض کرنا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ مجھے اجازت دے دیجئے۔"

"کہاں جانا چاہتے ہو؟" احسان صاحب نے پُوچھا۔

"جو کچھ آپ نے مجھے بتایا ہے۔ اس کے لئے میں اِتنا لاپرواہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر کہیں کسی سلسلے میں مجھے ملوّث کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو پھر میں اپنے بچاؤ کا بندوبست بھی کروں گا۔"

"جب تمھارا اِن معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے تو تم خطرہ کیوں محسوس کر رہے ہو؟"

"بھائی صاحب! تعلق نکال لیا جاتا ہے۔ دشمنی کرنے والے پُوری طرح پلاننگ کر کے ہی دشمنی کرتے ہیں۔ خدا حافظ" شہاب صاحب نے کہا اور احسان صاحب کے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئے۔ احسان صاحب سہمی ہُوئی سی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ذکیہ بیگم کمرے میں داخل ہوگئیں۔ اور احسان صاحب انھیں دیکھ کر چونک پڑے۔

ذکیہ بیگم کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔

"شہاب صاحب سے ملاقات ہوگئی؟"

"ہاں۔"

"خدا کے لئے مجھے کیوں نیم مُردہ کئے دے رہے ہیں بتلایئے تو سہی آخر ہُوا کیا؟"

"ذکیہ بیگم! ابھی حالات خود میرے ذہن میں واضح نہیں ہیں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں جا رہا ہُوں۔ اپنی عزت بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ صُورتِ حال سے آگاہی میرے لئے لازمی حیثیت رکھتی ہے۔ رات کے کھانے پر میرا انتظار نہ کیجئے گا۔"

ذکیہ بیگم خاموشی سے شوہر کی صُورت دیکھتی رہ گئی تھیں۔

احسان صاحب نے کچھ تیاریاں کیں۔ اور اُس کے بعد باہر نکل آئے۔ شہاب صاحب کی گاڑی ابھی پورچ ہی میں کھڑی ہُوئی تھی۔ احسان صاحب نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا۔ اور پھر اپنی کار میں بیٹھ کر غلام احمد کے ساتھ چل پڑے۔

جھیل کی ساکن سطح متلاطم ہوگئی تھی۔ ایک طوفان کی آمد آمد تھی۔ لیکن ابھی صرف تین افراد اِس طوفان سے آشنا تھے۔ ذکیہ بیگم جنھیں کوئی تفصیل معلوم نہیں تھی۔ لیکن شوہر کی پریشانی اور اُن کی بتائی ہُوئی کچھ باتوں نے ذکیہ بیگم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور انھیں صُورتِ حال کا کسی حد تک اندازہ ہو رہا تھا۔ احسان صاحب جو بیچارے ناگہانی کا شکار ہُوئے تھے اور اپنی عزت بچانے کی فکر میں سرگرداں تھے اور تیسری شخصیت خود شہاب صاحب کی تھی جو اِس طوفان کے موجب تھے۔

بھائی نے کبھی انھیں کسی اُلجھن میں نہیں پڑنے دیا تھا۔ اچھی خاصی آمدنی تھی اور پھر بنی بنائی ساکھ اور عزت شہاب صاحب کو تو صرف اِس لئے کاروباری معاملات میں ملوّث نہیں کیا گیا تھا کہ احسان صاحب اپنے بھائی سے محبت کرتے تھے۔ بارہا اُنھوں نے پیش کش کی تھی کہ شہاب اگر چاہیں تو اپنے طور پر کسی کاروبار کا آغاز کر سکتے ہیں۔ لیکن شہاب صاحب نے کہا تھا کہ وہ اِس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہاں بھائی اگر کوئی ذمّہ داری سپُرد کریں تو وہ اِس سے اِنکار بھی نہیں کریں گے۔ لیکن احسان صاحب، شہاب صاحب کی لااُبالی فطرت سے واقف تھے اور پھر ضرورت بھی محسوس نہیں ہُوئی تھی۔ شہاب صاحب نے جن راستوں پر قدم بڑھائے تھے۔ اُن کا تعین حالات نے کیا تھا۔ وہ فطرتاً جُرم کی طرف مائل تھے اور دولت کے انبار لگا کر دُنیا کو چونکانا چاہتے تھے، دولت کے حصُول کی خواہش جب بے پناہ ہو جائے تو جُرم کے راستے ہی نظر آتے ہیں۔ اب اِن راستوں پر قدم بڑھاتے ہُوئے اگر سوچ لیا جائے تو انسان اِن سے بچ سکتا ہے اور اگر خودسَری سے کام لیا جائے تو ایک مُجرم تشکیل پاتا ہے اور شہاب صاحب اب جُرم کی دُنیا میں بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ اُن کے دِل پر جُرم کی سیاہی چھا چکی تھی۔

چُنانچہ وہ بھی اپنے کمرے میں بند بیٹھے ہُوئے تھے، اُن کے سامنے ایک کاغذ رکھا ہُوا تھا۔ ہاتھ میں بال پوائنٹ جس سے وہ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہے تھے، ذہن گہری سوچ میں ڈُوبا ہوا تھا۔ اور حالات کا تجزیہ کر رہے تھے کہ یہ کہانی عام کیسے ہُوئی۔ بہت غور و خوض کرنے کے بعد سُرخ فائل ہی اُن کے ذہن میں آئی۔ سُرخ فائل ایک ایسی چیز تھی۔ جو شہاب صاحب کا کچا چٹھا کھول دیتی تھی ورنہ اُنھوں نے اور کوئی پہلو کمزور نہیں چھوڑا تھا۔ جو کاروباری کاغذات تھے وہ اُس خفیہ جگہ رکھتے تھے جو شہاب صاحب نے اپنے لئے مخصُوص کر لی تھی رشید کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شہاب صاحب تیاریاں کر چکے تھے اور اُنھوں نے رشید کو گردن گردن تک پھانس لیا تھا۔ سنگاپور میں وہ ہیروئن کے ذخیرے کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ لیکن اگر شہاب صاحب پر آنچ آئی تو وہ ایسے کاغذات پیش کر سکتے تھے جن سے یہ ثابت ہو جاتا کہ رشید کے کاروبار سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ اور اِس کے لئے اُنھوں نے رشید سے سادہ کاغذات پر دستخط کرا لئے تھے۔ یہ اُمید نہیں تھی کہ رشید پہلے ہی مرحلے میں ناکام ہو جائے گا۔

اُس وقت انھیں صرف یہ افسوس تھا کہ انھوں نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا۔ لیکن دفعتاً ہی اُن کے ذہن میں دُوسری غلط شخصیت گُھس آئی اور شہاب صاحب کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اُن کی آنکھیں گہری سُرخ ہوگئیں تھیں۔ احسان صاحب جو انکشاف کر کے گئے تھے۔ اُس کے بعد سے اب تک شہاب صاحب نے صرف سوچنے میں وقت گُزارا تھا۔ کوئی ایسا پائیدار لائحۂ عمل ہونا چاہیئے۔ جس سے اُن کی شخصیت مکمل طور پر اِس دلدل سے نکل جائے۔ بات تفسیر تک پہنچے یا رشید تک وہ اپنے آپ کو اِس سے صاف بری کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی ایسا حل ذہن میں نہیں آ رہا تھا سُرخ فائل اب کسی اجنبی کی تحویل میں نہیں تھی لیکن رَدا... رَدا...؟

رات ہوگئی ذکیہ بیگم پریشان ہوگئیں تھیں۔ کھانا بھی نہ کھایا شوہر پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ شہاب صاحب کو کھانے کے کمرے میں طلب کیا گیا تو انھوں نے معذرت کر لی اور وقت کا انتظار کرتے رہے، کوٹھی کے مُعاملات سے اُنھیں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بس رَدا رَدی کی بات تھی۔ یُوں بھی اُس وقت کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جو قابلِ توجہ ہوتی۔

جب رات کافی گُزر گئی تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ اور رَدا کے کمرے کی جانب چل پڑے، راستے کا جائزہ لے لیا تھا۔ اور اِس بات کا یقین تھا اُنھیں کہ اِس وقت کوئی مداخلت ممکن نہیں ہے۔ رَدا کے لئے اُن کے ذہن میں دُھواں ہی دُھواں تھا۔ وہ شدّتِ غضب سے مغلوب ہو رہے تھے، دروازے پر دستک دی تو رَدا نے دروازہ کھول دیا۔ تیمور معمُول کے مطابق ثناء کے پاس تھا۔ شہاب صاحب کو دیکھ کر رَدا کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمُودار ہُوئے۔ اندر آنے کے لئے بھی نہ کہہ سکی۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ مِلنے سے اِنکار کر دیتی، شہاب صاحب سَرد لہجے میں بولے۔

"تم سے کچھ گفتگو کرنی ہے رَدا، اندر آنا چاہتا ہُوں۔"

رَدا دروازے کے پاس سے ہٹ گئی۔ شہاب صاحب کے انداز میں جارحیت نظر آ رہی تھی اُنھوں نے پلٹ کر دروازہ بند کیا تو رَدا متوحش ہوگئی۔

"جو گفتگو مجھے تم سے کرنی ہے۔ اُسے محفوظ رکھنا چاہتا ہُوں اِس لئے دروازہ بند کیا ہے۔"

رُدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شہاب صاحب کمرے کے وسط میں آکھڑے ہُوئے تھے۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر چند لمحات کھڑے رَدا کو گھورتے رہے۔ اور اس کے بعد غرّاتے ہُوئے لہجے میں بولے۔

"تم کون ہو رَدا۔ تم کون ہو۔ جواب دو؟ آج تک اِس عمارت کے رہنے والے تمھاری حقیقت سے رُوشناس نہیں ہو سکے۔ لیکن میں مختلف انسان ہُوں۔ اگر تم نے خواب میں بھی یہ سوچا ہو کہ میں یہاں کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اِس کوٹھی کے مُعاملات میرے مُعاملات نہیں ہیں تو یہ تمھاری بھُول ہے۔ کسی بھی لمحہ کسی بھی وقت یا اب سے بہت پہلے اگر میں حتمی لہجے میں یہ الفاظ کہہ دیتا کہ تمھیں یہاں نہیں رکھا جا سکتا۔ تو تمھیں اُسی لمحہ یہ عمارت خالی کر دینا پڑتی لیکن میں کوٹھی کے مُعاملات میں دخل نہیں دیتا۔ میری اپنی مصرُوفیات مختلف ہیں تاہم اتنے عرصے سے تم یہاں مقیم ہو دوسرے لوگوں کو تم جن الفاظ میں مطمئن کر سکی ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہُوں کہ تم کون ہو؟"

"شہاب صاحب" رَدا کی مدھم آواز اُبھری۔

"میں جواب چاہتا ہُوں رَدا"

"میں جواب نہیں دینا چاہتی" رَدا نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"اِس کے نتائج سے آگاہ ہو رَدا؟"

"ہاں! بقول آپ کے اِس عمارت سے آپ مجھے نکال دیں گے یا کوئی اور بھی سزا ہے میرے لئے؟"

"نہیں رَدا۔ بات اب تمھیں صرف اِس عمارت سے نکال دینے کی نہیں رہی ہے بلکہ تمھاری حقیقت جاننا میرے لئے انتہائی ضروری ہو گیا ہے"

"اور آپ میری حقیقت کبھی نہیں جان سکیں گے، شہاب صاحب۔ غلط فہمیوں کا شکار نہ ہوں۔ میں جو کچھ بھی ہُوں۔ جن لوگوں کو بتانا چاہتی تھی۔ جن لوگوں کو بتا سکتی تھی انھیں بھی نہیں بتایا میں نے۔ جب انھوں نے مجھے مجبور نہیں کیا تو آپ کون ہوتے ہیں۔ جہاں تک کوٹھی میں رہنے اور نہ رہنے کا معاملہ ہے تو براہِ کرم آپ اِس سلسلے میں شناء سے بات کر لیجئے۔ شناء واحد ہستی ہے جو مجھے یہاں روکے ہُوئے ہے۔ باقی لوگ بھی ہیں چاہیں گے لیکن میرا صرف شناء سے تعلق ہے"

"نہ میں جذباتی گفتگو کا قائل ہُوں اور نہ ہی اِس کے لئے میرے پاس وقت ہے۔ تم نے میری پُشت میں یہ خنجر کیوں بھونکا رَدا۔ مجھے اِس کا جواب درکار ہے۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اپنے آپ کو اِسی طرح معصُوم ظاہر کر کے کوٹھی کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرتی رہو گی تو یہ ممکن نہیں ہو گا۔ تمھارے کردار کو اُن کے سامنے پیش بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیا ثاقب تمھارا شوہر نہیں ہے۔ یا شوہر نہیں تو کم از کم اِس بچے کا باپ تو وہ ہے۔ کِس طرح، کِن حالات میں؟ یہ سوال اگر تم سے کر لیا گیا تو کیا تم کوٹھی کے لوگوں کو مطمئن کر دو گی۔ میں خود تمھیں یہاں سے نہیں نکالوں گا رَدا۔ بلکہ شناء خود تمھیں دھکے مار کر باہر نکالے گی۔ اِن لمحات سے بچنے کے لئے مجھ سے تعاوُن کرو جو کچھ میں کہہ رہا ہُوں سے غور سے سُنو۔ تم اُن بدترین لمحات سے دوچار ہو سکتی ہو۔ جن کا تمھارے ذہن میں تصوّر بھی نہیں ہو گا۔ جب مجھ پر بن آئے گی رَدا، تو میں بھی کسی کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کروں گا۔ ہو سکتا ہے۔ تمھیں تیمور سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں"

رَدا کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

"کیا؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ شہاب صاحب؟"

"سُرخ فائل تم نے اپنی تحویل میں رکھی رَدا۔ تم نے اُس کی ریڈنگ کی۔ جِس کے بارے میں تم مجھے خود بتا چکی ہو اور تم نے اُس کی ڈُپلیکیٹ تیار کر کے ڈرامہ کرتے ہُوئے اصل فائل میرے حوالے کر دیا اور ڈپلیکیٹ۔۔۔ ڈپلیکیٹ کہاں ہے رَدا جواب دو۔ اِسی پر تمھارے مُستقبل کا دارومدار ہے ورنہ ایسا نہ ہو کہ تمھیں بعد میں پچھتانا پڑے"

"شہاب صاحب! آپ نے اپنی تمام زندگی کمزور لوگوں کو دھمکیاں دیتے ہی گزاری ہے۔ شاید آپ ہمیشہ مجھے دھمکیاں دیتے رہے ہیں کیا یہ مُناسب ہے؟ سُرخ فائل کا مسئلہ بہت پہلے ختم ہو چکا ہے۔ اُس کے بعد سے آپ کو میری ذات سے کوئی شکایت ہُوئی ہو تو بتائیے۔ گھر کے کسی فرد کی زبانی آپ نے کسی ایسی فائل کا تذکرہ سُنا ہو تو مجھے بتا دیجئے۔ سُرخ فائل اتفاقیہ طور پر میری تحویل میں آ گیا تھا۔ میں نے اُسے پڑھ لیا تھا۔

فرینڈز آرگنائزیشن کے کاروبار میں آپ کے ملوث ہونے کی تفصیلات پڑھ کر میں صرف اِس خوف کا شکار ہو گئی تھی۔ کہ کہیں آپ کی وجہ سے یہ خاندان مُصیبت کا شکار نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے شہاب صاحب کہ اِس حسین جنّت میں آگ لگ جائے۔ میں صرف آپ کو اِس کاروبار سے بچانا چاہتی تھی۔ جس کا نتیجہ بالآخر تباہی ہوتا ہے اور آپ نے جب مجھ سے اقرار کر لیا تو میں نے سُرخ فائل آپ کے

حوالے کر دیا بھلا مجھے اِس کی ڈپلیکیٹ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا فائدہ اُٹھا سکتی تھی میں اِس ڈپلیکیٹ سے؟"

"لیکن یہ انکشافات۔۔۔ یہ جو کچھ ہُوا ہے رَدا۔ سمجھ لو اچھی طرح سمجھ لو اگر سُرخ فائل کی تفصیلات منظرِ عام پر آئیں۔ تو اُس کی ذمّہ داری صرف تم پر ہو گی۔ کوئی دوسری ہستی اِس رُوئے زمین پر ایسی نہیں ہے جس پر شبہ کیا جا سکے"

"جُرم آپ نے کیا ہے شہاب صاحب۔ مُجرم آپ ہیں۔ اور دھمکیاں مجھے دے رہے ہیں۔ آپ۔۔۔ آپ مجھے مجبُور کر رہے ہیں کہ میں سارے مُعاملات دوسروں کے سامنے لے آؤں۔ میں کسی بھی دھمکی کو تسلیم نہیں کرتی میری زندگی، میرا شوہر تیمور جو کچھ بھی ہیں اُن کا تعلق میری ذات سے ہے آپ اِس سلسلے میں براہِ کرم فضُول باتوں سے گریز کیجئے"

"لڑکی! بہت بڑی بات کر رہی ہے تُو۔ بھُول گئی ہے کہ میں کون ہُوں؟"

"آپ بھی ایک بات ذہن نشین کر لیجئے شہاب صاحب اگر شناء سے میرے جذباتی رشتے نہ ہوتے تو آپ کی اِس طرزِ گفتگو کی آپ کو سزا دی جاتی۔ جو کچھ آپ نے مجھے کہا ہے اُسے بھی آپ اپنے ذہن سے نکال دیجئے گا۔ جائیے اِس کے بعد میں آپ کو ایک لمحے کے لئے . . . . اپنے کمرے میں برداشت نہیں کر سکتی۔ گیٹ آؤٹ۔ گیٹ آؤٹ۔"

رَدا زور سے چیخی، شہاب صاحب جلتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے پھر انھوں نے ایک گہری سانس لی اور دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ دروازے پر رُک کر انھوں نے کہا۔

"اپنی زندگی کے اُن لمحات کو سکُون سے گزار لو جو بہت مُختصر ہیں۔ فیصلہ کچھ وقت کے بعد ہی ہو گا" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ رَدا غضیلی نِگاہوں سے دروازے کو گھُورتی رہی تھی۔

باہر نکل کر شہاب صاحب کہاں گئے اِس کا رَدا کو علم نہیں تھا۔ وہ تو بس ساری جان سے کانپ رہی تھی۔ آرام کی نیند سو رہی تھی کہ شہاب صاحب نے دستک دے کر اُس کی نیند میں خلل اندازی کی تھی اور اُس کے بعد جو الفاظ وہ کہہ گئے تھے وہ رَدا کے ذہن پر جلتے ہُوئے تیل کا کام کر رہے تھے۔ ایک ایک لفظ اُس کے وجُود میں کھَول رہا تھا۔ پھر جب بے بسی کا احساس ہُوا تو دفعتاً ہی اُس کے حلق سے سسکی سی نکل گئی۔ وہ واپس اپنی مسہری کی جانب پلٹی لیکن دفعتاً ہی اُس کے مُنہ سے ایک تیز آواز نکلی وہ دہشت زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ شہاب صاحب کی آمد اُن کے الفاظ اور اِن الفاظ کے اثرات ایک لمحے کے لئے ذہن سے مفقود ہو گئے۔ وہ مسہری کے نیچے سے جھانکتے ہُوئے دو پیروں کو دیکھ رہی تھی جو بے ترتیبی سے مسہری کی چادر کے نیچے سے باہر نکل آئے تھے، دو سفید سُبک اور خوبصورت مردانہ پاؤں جو پتہ نہیں کسی زندہ انسان کے تھے یا؟ اِس تصوّر کے ساتھ ہی رَدا کے حلق سے ایک دہشت بھری چیخ نکل گئی۔ اور اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن پیروں میں جنبش ہوتے دیکھی، پیر آہستہ آہستہ باہر آئے اور اُس کے بعد اندر کھسک گئے دو ہاتھوں نے مسہری کی پٹّی پکڑی اور اُس کے بعد جو چہرہ برآمد ہُوا وہ خیر دین کا تھا۔ رَدا نے گہری گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں خیر دین کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اُس نے دو تین بار آنکھیں بند کر کے کھولیں اور پھر جیسے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اُس کی بھرّائی ہوئی آواز اُبھری۔

"لو جی۔ یہ تو کمال ہو گئی۔ خیر دین لگتا ہے کسی نے تمھیں نشہ کرانا شروع کر دیا۔۔۔ خیر دین باہر نِکل آیا۔ رَدا اپنی مُصیبت بھُول گئی تھی۔ اور پریشان نِگاہوں سے خیر دین کو دیکھ رہی تھی۔ بمشکل تمام اُس کے مُنہ سے نِکلا۔

"تم۔۔۔ تم یہاں۔۔ تم یہاں کیا کر رہے تھے، کب سے گھُسے ہُوئے ہو یہاں؟"

"لو جی کوئی گھڑی ہے ہمارے پاس۔ پتہ نہیں کیا ٹائم ہُوا تھا۔ رَدا بی بی جی! صفائی کر رہے تھے آپ کی اِس پلنگڑی کے نیچے ایک چُوہا نظر آیا۔ ہم نے سوچا کہ آپ کے کپڑے خراب کرے گا پکڑنے کے لئے نیچے آئے پر نیند آ رہی تھی جی آنکھ لگ گئی۔ میرا مطلب ہے بند ہو گئی۔ اور جی خیر دین سو گئے۔ پتہ نہیں تم نے وہ حلوہ کیسا کھِلایا تھا۔ ہیں؟ بھنگ ہی مِلا دی ہو گی ستم سے نے۔ پر ہم بھی جی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ ہیں۔ دیکھ لیں گے اُس جمن کو۔ ہم نے بھی اُسے چوہے مارنے کی دوا نہ کھلائی تو ہمارا نام خیر دین نہیں۔ ہی۔۔۔ ہی۔۔۔ ہی۔۔" خیر دین نے بھونڈے انداز میں ہنستے ہُوئے کہا۔ رَدا اُسے بُری طرح گھُور رہی تھی۔

"کیوں آئے تھے یہاں؟ بتاؤ گے نہیں!!"

"چُوہا جی چُوہا۔ بالکل چُوہا"

"خیر دین! میں بے حد پریشان ہُوں۔ نہ جانے میری پریشانی کے لمحات میں تم کیوں میرے پاس آ جاتے ہو۔ میں جانتی ہُوں کہ کوئی چُوہا مسہری کے نیچے نہیں ہو گا۔ اور نہ ہی تم

سو رہے ہوگے۔ بتادو خیر دین خُدا کے واسطے مجھے بتادو اتنا تحمل نہیں ہے مجھ میں ۔ خیر دین میں تھکن محسوس کر رہی ہُوں۔ میرا ذہن سوچنے سمجھنے سے قاصر ہے۔ بتاؤ کیوں آئے تھے تم یہاں۔ کیوں آئے تھے؟"

"آؤ جی۔ یہ تو آپ چوہے سے پُوچھو۔ وہی شرارتیں کر رہا تھا بی بی جی۔ خیر دین کیا بتائے۔ وہ تو ہر چوہے کے لئے بلّی بننے کی کوشش کرتا ہے۔ پر کوئی اُسے بلّی بنائے بھی تو۔۔"

"بیٹھ جاؤ۔ دروازہ بند کردو۔ خُدا کے واسطے بیٹھ جاؤ۔۔" رَدا نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

"دروازہ کھُلا ہی رہنے دو رَدا بی بی جی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ خیر دین کے کان بھی بلّی کے کانوں کی طرح ہیں۔ دُور کی آواز سُن لیتے ہیں"

"میں۔۔۔ میں بہت پریشان ہُوں خیر دین۔ تم نے سُنا ہوگا۔ شہاب صاحب مجھ سے کیا کہہ کر گئے ہیں؟"

"او جی۔ ہاں۔ نیند کے عالم میں کچھ آوازیں کان میں پڑ تو رہی تھیں۔ پر۔ بہت دِنوں سے کان کا مَیل نہیں نکلا اور پھر نیند میں بھی تھے اِس لئے ساری باتیں صاف نہیں سُنیں"

"خیر دین مذاق سے باز نہیں آؤ گے۔ میری جان پر بنی ہُوئی ہے اور تمھیں مذاق سُوجھ رہا ہے"

"دیکھو بی بی جی، گاڑھی اُردو کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم تو اِس کے قائل ہیں کہ جو بولو صاف صاف بولو"

"وہ مجھے دھمکیاں دے رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے بدنام کرکے اِس کوٹھی سے نکال دیں گے اور۔ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے وہ۔۔۔ خیر دین میں بہت پریشان ہُوں۔ شہاب صاحب کا خیال ہے کہ میں نے اِس فف۔۔۔ فا۔۔۔ فا" رَدا کہتے کہتے رُک گئی ۔ خیر دین انتظار کرتا رہا اور پھر دفعتاً اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور اِس طرح لہرانے لگا۔ جیسے کھڑے کھڑے سو گیا ہو۔ دفعتاً وہ گرنے کے سے انداز میں لڑکھڑایا اور رَدا کے حلق سے بے اختیار آواز نکلی۔ اُس آواز کو سُن کر اُس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور ڈھیلے ڈھیلے انداز میں ہنستا ہُوا بولا۔

"لو جی کمال ہوگیا۔ نیند تو ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ اب کیا کریں کوئی نیند بھگانے والی بات کرو بی بی جی، آپ تو لوریاں دے رہی ہو جیسے ہم بچے ہوں۔ اجازت دو تو ہم جائیں بی بی جی؟"

"جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں کسی کو اپنا مذاق اُڑانے کا حق نہیں دے سکتی" رَدا روہانسے لہجے میں بولی۔

"او نیئں جی، خیر دین دو پیسے کا آدمی کسی کا کیا مذاق اُڑائے گا۔ یہ حق تو بس آپ کا ہے"

"میرا؟ میں نے مذاق اُڑایا ہے تمھارا؟ کیوں۔ بتاؤ میں اُڑا رہی ہُوں تمھارا مذاق؟" رَدا نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"پتہ نہیں جی۔ اللہ جانے۔ ابھی آپ نا۔۔۔ ناکر رہی تھیں ہم سمجھے ہم سے کہہ رہی ہیں"

"میں بہت پریشان ہُوں خیر دین۔ خُدا کی قسم بہت پریشان ہُوں میری مدد کرو خیر دین"

"ابھی لو جی۔ آپ شاید چُوہوں سے ڈر رہی ہو۔ اب تو مارنا ہی پڑے گا اُس چُوہے کی اولاد کو۔ خیر دین پھر بیٹھ کر مسہری کے نیچے گھُس گیا" رَدا بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

"سنجیدہ نہیں ہوگے تم۔ نکلو مسہری کے نیچے سے نکلو، نکلتے ہو یا نہیں؟"

"او کمال ہے بھئی ہم سے زیادہ آپ کو چُوہوں کا خیال ہے"

"اُٹھو اُس کُرسی پر بیٹھ جاؤ" رَدا نے کہا اور خیر دین فوجیوں کے سے انداز میں چلتا ہُوا جھٹکے سے اُس کُرسی پر بیٹھ گیا اُس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر گردن اکڑا لی تھی۔

"پتہ نہیں کیوں تم پر اِس قدر مذاق سوار ہے جبکہ میں تم سے مسلسل کہے جارہی ہُوں کہ میں اِس وقت پریشان ہُوں"

"اب کیا کہیں بی بی جی۔ موٹی عقل کے آدمی ہیں۔ آپ سمجھائیں گی تبھی سمجھیں گے نا"

"میں اب تمھیں اچھی طرح جان گئی ہُوں۔ سمجھے"

"تو اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہمیں جان کر آپ کیوں پریشان ہوگئی ہیں؟"

رَدا زِچ ہوگئی تھی۔ چند لمحات وہ خیر دین کو گھُورتی رہی پھر بولی "تمھیں معلوم ہے کہ میں نوکری کرتی ہُوں"

"ہاں آپ دفتر جاتی ہیں اور ہم آپ کا انتظار کرتے رہتے ہیں" خیر دین نے کہا۔

اِن الفاظ پر رَدا نے چونک کر خیر دین کو دیکھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر سادگی اور معصُومیت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا تب رَدا نے کہا۔

"جس جگہ میں نوکری کرنے جاتی ہُوں۔ خیر دین، وہاں مجھے شہاب صاحب ہی نے ملازم کرایا تھا وہ فرم توقیر صاحب کی ہے۔ توقیر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ لیکن اِن کا بیٹا تنویر بہتر آدمی نہیں ہے۔ کچھ غلط کاموں میں ملوّث ہیں یہ لوگ۔

اسمگلنگ وغیرہ کا چکر ہے۔ بلیک میلنگ بھی کرتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا کاروبار ہیں اُن کے۔ میں نے شہاب صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ اِس وقت میں اپنا عہد توڑ رہی ہُوں تو اِس کی وجہ صرف شہاب صاحب ہیں۔ میرا قصور نہیں ہے۔ کیا کچھ نہیں کہا اُنھوں نے مجھے۔ ثناء کی محبت میں یہاں مری ہُوئی ہُوں۔ ورنہ یہ گھر میرے باپ کا نہیں ہے۔ وہاں مجھے کچھ ایسے کاغذات ملے جن میں اُن لوگوں کا کچا چٹھا تھا شہاب صاحب بھی اُن کاغذات کی وجہ سے اِس کاروبار میں ملوّث ہوتے تھے بس یہ تفصیل مجھ سے مت پُوچھنا خیر دین کہ میں نے وہ فائل وہاں سے کیوں غائب کیا۔ اِس بارے میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ میری رُسوائی کم نہیں ہُوئی ہے کہ میں خود کو اور رُسوا کروں ۔ فائل میں نے غائب کردیا اور وہی سُرخ فائل تھا شہاب صاحب کو اِس بات کا علم ہوگیا کہ فائل میرے قبضے میں ہے اور اُنھوں نے مجھے دھمکیاں دینا شروع کردیں۔۔۔ خیر دین! میں بہت پریشان کن حالات کا شکار ہوکر یہاں آئی تھی۔ حالانکہ اپنے طور پر میں نے فیصلے کرلئے تھے کہ مجھے کس طرح مستقبل تعمیر کرنا ہے۔ لیکن ریلوے اسٹیشن پر ہی ثناء مجھے مل گئی اور زبردستی مجھے یہاں لے آئی۔ کچھ ایسی عجیب سی لڑکی ہے وہ کہ میں اُس کی وجہ سے اپنے سارے منصُوبے میں ناکام ہوگئی۔ یہاں کے لوگ اِتنے اچھے ہیں کہ میرے دِل میں اُن کے لئے ایک مقام پیدا ہوگیا میں نہیں چاہتی تھی کہ شہاب صاحب اِن غلط کاموں کا شکار ہوکر اِس پُورے گھر کے لئے بربادی کا باعث بنیں۔ اِس لئے میں نے شہاب صاحب پر یہ شرط عائد کردی کہ اگر وہ اپنے آپ کو اِن بُرائیوں سے دُور کرلیں۔ تو میں یہ فائل اُن کے حوالے کرسکتی ہُوں اُنھوں نے وعدہ کیا۔۔۔ اور میں نے فائل اُنھیں دے دیا۔ بات تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ لیکن اب نہ جانے کیا ہُوا ہے کہ شہاب صاحب پھر یہاں آگئے۔ اُن کا خیال ہے کہ میں نے اُس فائل کی ڈپلیکیٹ تیار کرلی۔ میری جُوتی کو کیا غرض پڑی تھی کہ میں ایسا کرتی۔ وہ مجھے دھمکیاں دے کر گئے ہیں کہ اگر میں نے فائل کی ڈپلیکیٹ اُن کے حوالے نہیں کی تو مجھے رُسوا کرکے یہاں سے نکالا جاسکتا ہے۔ تمھی کو غائب کیا جاسکتا ہے۔ اِس گھر میں شہاب صاحب جو کچھ کررہے ہیں۔ وہ بے حد خطرناک ہے خیر دین۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں اِس گھر کی عزّت شہاب صاحب کے ہاتھوں ملیامیٹ نہ ہو جائے۔ بس میں۔۔" رَدا نے خیر دین کی طرف دیکھا اور اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ خیر دین کی گردن سینے سے لگی ہُوئی تھی اور وہ نیند سے اُونگھ رہا تھا۔ رَدا دانت پیستی ہُوئی اُسے گھُورتی رہی اور اُس کے بعد شدید غصّے کے عالم میں اُس نے خیر دین کے قریب پہنچ کر اُس کے بال مُٹھی میں جکڑ لئے اور زوردار جھٹکے دیئے۔ خیر دین نے چونک کر گردن اُٹھا دی تھی۔

"سس۔۔۔ سلا۔۔۔ سلام علیکم جی۔۔۔ سلام وعلیکم، خیر دین ولد بشیر الدین۔۔"

"کھڑے ہو جاؤ۔ کھڑے ہو جاؤ" رَدا غرائی۔ اور خیر دین کرسی سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"میں کہہ رہی ہُوں کھڑے ہو جاؤ"

"او جی۔۔۔ ہم شاید۔۔۔ او نیئں جی کھڑے کہاں ہیں۔ ہم تو بیٹھے ہیں۔ خیر دین آج تیرے ساتھ چوٹ ہوگئی۔ کیا کھلا دیا ہے کمبخت جمن نے ۔ لو جی کھڑے ہوگئے بی بی جی" خیر دین نے جلدی سے کھڑے ہوکر کہا۔ رَدا اُسے دیکھتی رہی اور پھر دفعتاً اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"اُڑا لو۔۔۔ اُڑا لو میرا مذاق۔ میں ہُوں ہی مذاق کے قابل، اُڑا لو تم بھی میرا مذاق" وہ سسکنے لگی۔ تب خیر دین کے ہاتھ آگے بڑھے اور اُس نے بڑی بے باکی سے رَدا کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اُن ہاتھوں کی مضبُوطی اور قوّت کا احساس رَدا کو ہُوا۔ خیر دین نے جس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ رَدا کے لئے اجنبی تھی۔ اُس نے خیر دین کے ہاتھوں کی گرفت سے نکلنا چاہا لیکن یُوں محسوس ہُوا تھا جیسے اُس کے شانے دو آہنی شکنجوں میں پھنس کر رہ گئے ہوں۔ پیچھے ہٹنے کی کوشش ناکام ہُوئی تو اُس نے غضبناک نگاہوں سے خیر دین کو دیکھا۔ خیر دین کی مُسکراتی آنکھیں اُس پر جمی ہُوئی تھیں۔ اور پھر اُس کی آواز اُبھری

"[illegible] نے منع کیا ہے آپ کو مس رَدا کہ آپ یُوں دیوانہ کریں۔ [illegible] کوئی [illegible] مسئلہ ہو آپ کا۔ خیر دین آپ کے لئے چراغ کا جن ہے۔ مجال ہے شہاب صاحب کی کہ وہ آپ کا بال بھی بیکا کرسکیں۔

خیر دین پر اعتماد کیجئے رَدا صاحبہ۔ بس ذرا اُسے اپنی کوئی بھی تکلیف بتا دیا کیجئے۔ مجال ہے کہ کوئی شخص آپ کی طرف غلط نِگاہ سے دیکھ جائے۔ وہ مسہری ہے جایئے آرام سے لیٹ جایئے، دروازہ بند کرلیجئے۔ خُدا حافظ" خیر دین کے لہجے کا اعتماد، اُس کا انداز نہ جانے کیسا تھا۔ نہ جانے کیسا؟ رَدا کو یُوں محسوس ہُوا جیسے اُس کا کوئی بہت ہی اپنا، بہت ہی اپنا اُس کی پُشت پر آ کھڑا ہُوا ہو۔ خیر دین نے مُسکراتے ہُوئے آنکھیں بند کرکے گردن ہلائی۔ اور۔

اُس کے شانے چھوڑ کر دروازے کی جانب مُڑ گیا۔ ندا کے ہونٹ ہلے، وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اُس کے مُنہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اور پھر جب خیر دین نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ چونک کر سنبھل گئی۔ بازوؤں پر اب بھی اُسے خیر دین کے ہاتھوں کی گرفت محسوس ہو رہی تھی اور یہ لمس، یہ لمس انوکھا تھا۔ اُس نے زور سے گردن جھٹکی اور پھر اُس کے مُنہ سے سِسکاری سی نکلی۔

" خیر دین " پھر نہ جانے کیوں وہ ہنس پڑی۔ پاگل ہوں میں بھی... واقعی پاگل ہوں۔ لیکن یہ شخص... یہ شخص.. " ندا نے دروازہ بند کیا اور مسہری پر جا بیٹھی۔

شہاب صاحب کے الفاظ، خیر دین کے پُراعتماد لفظوں میں مُدغم ہو رہے تھے اور نہ جانے کیوں اُسے یُوں لگ رہا تھا کہ جس طرح ثاقب کا نفرت انگیز وجُود گُم ہو گیا ہے اسی طرح شہاب صاحب کی دھمکیاں بھی خیر دین کے الفاظ میں معدُوم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ شخص ہر جگہ ہی تو میرا مُعاون بنا ہے۔ رشید کے سلسلے میں اُس نے جس طرح میری مدد کی، سمندر کے کنارے اور اب.. ! پتہ نہیں خیر دین تم کیا ہو؟ میں اُن لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک ہُوں۔ یہ سب عجیب سے انداز میں میرے بارے میں سوچتے ہیں۔ لیکن تم... تم تو ایک ایسے رازِ سربستہ ہو کہ میں بھی تمھیں حل نہیں کر سکتی۔ خیر دین مجھ سے میری کہانی مت پُوچھو، مجھے اپنی کہانی سُنا دو۔ میری کہانی تو عجیب ترین ہے۔ لیکن تم... تم...!

نہ جانے کب تک وہ خیالات کے سمندر میں غوطہ زن رہی۔ اور اُس کے بعد آنکھیں بند کر کے مسہری پر لیٹ گئی۔ خیر دین کے الفاظ اُس کے گرد بکھر گئے تھے اور اُسے اطمینان سے نیند آ گئی تھی۔

طفیلی بیگم کوٹھی کے صدر دروازے سے نکلیں۔ سامنے ہی ندرت نظر آئی تھی۔ انھیں... لپکی لپکی اُس کے قریب پہنچ گئیں۔ ندرت کسی کام سے جا رہی تھی۔ طفیلی بیگم کو دیکھ کر اُس نے بڑے ادب سے سلام کیا۔

" ندرت بیٹی! دِل بڑا گھبرا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں رات کو روزانہ خواب میں زمان کو دیکھتی ہُوں۔ کچھ بے چین سے نظر آ رہے ہیں۔ رشید کو گئے ہُوئے بھی کافی دِن ہو گئے۔ نہ جانے کیا قصّہ ہے۔ پتہ نہیں رشید کب واپس آئے گا۔ بیٹی! بڑا دِل گھبرا رہا تھا تیرے ہی پاس جانے کے لئے باہر آئی تھی "

" طفیلی خالہ! رشید آپ کو بتا کر تو گئے ہوں گے کہ کہاں جا رہے ہیں "

" اے بیٹی! بھلا کاروباری مُعاملات میں مجھے کوئی کیا بتائے۔ میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا۔ پر رشید شہاب میاں کے کہنے پر کہیں گیا ہے۔ پتہ نہیں کب واپس آئے گا۔ شہاب میاں تو خود کو بہت ہی لئے دیئے رہتے ہیں۔ کئی بار جی چاہا کہ اُن سے معلوم کروں کہ آخر وہ واپس کب آئے گا۔ مگر ہمّت نہیں پڑی۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ کیا کروں؟ "

" اِس میں ہمّت نہ پڑنے کی تو کوئی بات نہیں طفیلی خالہ، شہاب صاحب کی گاڑی تو کھڑی ہُوئی ہے۔ آپ اُن کے پاس چلی جائیے اور اُن سے پُوچھ لیجئے " ندرت نے سادگی سے کہا، اُسی وقت عارفہ بیگم جنھوں نے شاید کہیں دُور سے اُن دونوں کو دیکھ لیا تھا تیزی سے قریب آ گئیں۔

" کیا سِکوٹ ہو رہی ہے؟ بیگم تو اب سازشوں کا اڈّہ بن کر رہ گیا ہے۔ اَرے تھوڑے ہی دِن پہلے کی بات تو تھی کہ یہاں سکون ہی سکون تھا۔ کوئی کسی کے خلاف کچھ نہیں کرتا تھا۔ مگر اب مُنہ اُٹھا کر اندر آ جانے والے کیسی کیسی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ میں سب جانتی ہُوں۔ زیادہ وقت نہیں گزرے گا بی بی، جب تم لوگ دیکھو گی کہ بُرائیاں کس طرح سامنے آتی ہیں "

طفیلی بیگم نے عجیب سی نگاہوں سے عارفہ بیگم کو دیکھا اور بولیں۔

" عارفہ! تمھیں تو اللہ نے صاحبِ اولاد ہی نہیں کیا۔ کیا جانو تم دُکھ درد، جاؤ اِس وقت تم سے لڑنے کو جی بھی نہیں چاہ رہا، میرے مُنہ مت لگو۔ ندرت بیٹی! بھلا میں نے عارفہ کے خلاف کوئی بات کہی تھی؟ "

" بالکل نہیں، طفیلی خالہ " ندرت نے کہا۔

" تو اُنھیں منع کرو کہ میرے مُنہ نہ لگیں میرا دل دُکھ رہا ہے اِس وقت میں کسی سے کچھ نہیں کہنا چاہتی "

عارفہ بیگم نے دُشمن کو مغلوب دیکھا تو کچھ اور کہنا چاہا۔ ایسے موقعے بار بار کہاں ملتے ہیں۔ لیکن ابھی کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ شہاب صاحب کوٹھی سے برآمد ہُوئے۔ راستہ کیونکہ یہی تھا اِس لئے فوراً ہی خاموش ہو گئیں۔

طفیلی بیگم کا مُنہ ایک لمحہ کے لئے کُھلا تھا اور پھر اُنھوں نے بے بسی کی نگاہوں سے ندرت کو دیکھا تھا۔ ندرت اُن کا مطلب سمجھ گئی اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر شہاب صاحب کو آواز دی اور شہاب صاحب رُک گئے۔ اُن کی آنکھیں خمار آلُود تھیں چہرے پر بے پناہ سنجیدگی چھائی ہُوئی تھی۔ ندرت کے سلام کے جواب میں

اُنھوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اور خاموشی سے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے رہے۔

" یہ طفیلی خالہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہیں شہاب صاحب براہِ کرم صرف دو منٹ " ندرت نے بے باکی سے کہا۔ اور نہ جانے کیوں شہاب صاحب گہری نگاہوں سے ندرت کو دیکھنے لگے پھر بولے۔

" کیا بات ہے؟ " اُن کا لہجہ بھاری اور آواز کسی قدر جھنجھلائی ہُوئی تھی۔ طفیلی بیگم کی ہمّت پڑ گئی، آگے بڑھیں اور کہنے لگیں۔

" اَے شہاب میاں! زمان کی بیوی ہُوں میں۔ مرحوم زمان سے ملاقات تو نہیں ہُوئی ہو گی تمھاری مگر نام ضرور سُنا ہو گا۔ رشید میرا ہی بیٹا ہے "

" میں جانتا ہُوں۔ آپ فرمائیے مجھ سے کیا کام ہے؟ "

" اَے بیٹے! رشید کو گئے ہُوئے کافی دِن ہو گئے۔ کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ دِل گھبرا رہا ہے ان دِنوں رہ رہ کر اُس کا خیال آتا ہے۔ کچھ بتاؤ گے مجھے کہ کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آ جائے گا؟ "

" میں... میں کیا بتاؤں آپ کو۔ آپ کا بیٹا ہے آپ کو اُس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟ "

" ہے بیٹا۔ کیا وہ تمھارے کام سے نہیں گیا ہے؟ "

" کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ میرا بھلا اُس سے کیا کام.. ہو سکتا تھا اپنی رشتے داری جتاتا رہتا تھا مجھ سے۔ اور کئی بار پیسے اینٹھ چُکا ہے۔ کہہ رہا تھا اپنی زندگی بنانا چاہتا ہے کچھ رقم درکار ہے۔ میں لوگوں کے ساتھ ایسے سلوک کرتا رہتا ہُوں دس ہزار روپے لئے تھے اُس نے مجھ سے اور یہ کہا تھا کہ کاروبار شروع کرنے کے بعد واپس کر دے گا۔ میں دس بیس ہزار روپے کی پروا نہیں کرتا چنانچہ میں نے اُسے دے دیئے۔ اِس کے علاوہ مجھے اُس کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم "

" مگر بیٹا! وہ تو کہہ رہا تھا کہ شہاب بھائی اُسے باہر بھیج رہے ہیں "

" اگر آپ کا بیٹا جھُوٹا ہے تو میں بھلا اِس سلسلے میں کیا کر سکتا ہُوں " شہاب صاحب نے خُشک لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئے۔ ندرت خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، طفیلی بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔ اور پھر اُن کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

" میرا دِل گواہی دے رہا ہے کہ کچھ ہو گیا ہے۔ ضرور کچھ ہو گیا ہے۔ اندر سے آوازیں اُبھر رہی ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہُوا ہے۔ اے اللہ جو کر ملوا اچھا کر یو۔ یہ شہاب میاں تو بالکل ہی مُکر گئے "

" طفیلی خالہ! ہو سکتا ہے کہ شہاب صاحب دُرست کہہ رہے ہوں۔ رشید نے آپ سے جھُوٹ بولا ہو لیکن اِتنے پریشان ہونے کی بات بھی نہیں۔ رشید آ جائیں گے۔ ابھی دو چار مہینے تو نہیں گزرے "

" بیٹا! دِل کے اِن گوشوں سے واقف نہیں ہو تم، جن میں اولاد کی محبت پوشیدہ ہوتی ہے۔ بس اندر سے آوازیں آتی ہیں۔ اور اِنسان پریشان ہو جاتا ہے۔ کس سے بات کروں اب اپنے بچے کے بارے میں کس سے بات کروں؟ " طفیلی بیگم روہانسی ہو گئیں۔ عارفہ خالہ نے فوراً ہی کہا۔

" پروا اتنی رکھنی چاہیئے طفیلی بیگم کہ اپنے بازو ساتھ دیں۔ اپنے پروں سے اُڑنا اچھا ہوتا ہے۔ جس نے پروازِ بلند کی اُس کا نتیجہ خراب نکلا۔ تم نے اور تمھارے بیٹے نے بہت زیادہ اُونچی پرواز کرنے کی کوشش کی نتیجہ تو خراب نکلنا ہی تھا "

" خُدا تمھیں غارت کرے عارفہ۔ اچھی طرح نمٹ لُوں گی تم سے ذرا میرے رشید کو تو آ جانے دو۔ اب تمھارا ہی جھگڑا پہلے نمٹانا ہے مجھے اِس کے بعد ہی کوئی دوسرا کام کروں گی " طفیلی بیگم نے روتے ہُوئے کہا۔ اور تیزی سے واپسی کے لئے چل پڑیں عارفہ بیگم اُن کی تکلیف سے خوش ہو رہی تھیں۔

•••

ندا حسبِ معمول تیار ہو کر دفتر چل پڑی۔ رات کے واقعات کا اثر ذہن پر تھا۔ لیکن اُس نے خود کو سنبھالے رکھا تھا۔ معمول کے مطابق دفتر کی عمارت میں داخل ہُوئی اور اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ کام شروع کر دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں ذہن مضطرب تھا۔ شہاب صاحب کی دھمکیوں کا خیال آتا تو دِل لرز جاتا اور خیر دین کے الفاظ یاد آتے تو طبیعت میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ بہت کچھ سوچتی رہی تھی وہ۔

دِن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے جب توقیر صاحب نے انٹرکام پر اُسے طلب کیا۔ کچھ ضروری مُعاملات تھے جن کے بارے میں اُنھیں گفتگو کرنی تھی۔ کئی فائل اُن کے سامنے رکھے ہُوئے تھے۔

معمول کے مطابق پُرمحبت انداز میں ندا سے پیش آئے اور اُس سے فائلوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے لیکن ابھی یہ کارروائیاں جاری تھیں کہ دفعتاً باہر سے کچھ آوازیں سُنائی دیں اور پھر چپراسی اندر داخل ہو گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے پولیس کے چند افراد اور سادہ لباس میں ملبُوس کچھ غیر ملکی اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ کھلنے پر باہر سے لوگوں کی آوازیں سُنائی دیں لیکن پھر ایئرکنڈیشنڈ دروازہ بند ہو گیا اور آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ توقیر صاحب پریشانی سے

آنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ وردی میں ملبوس ایک پولیس آفیسر نے اپنا کارڈ توقیر صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا جناب، ایک اہم سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"فرمائیے، تشریف رکھیئے۔" توقیر صاحب نے بھاری لہجے میں کہا۔ چپراسی نے باہر جانے کی کوشش کی تو پیچھے کھڑے ہوئے پولیس آفیسر نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اندر ہی روک دیا۔ اُس کے انداز میں جارحیت تھی۔ رِدا اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور ایک کونے میں سمٹ گئی۔ پولیس آفیسر نے اُس سے بھی کہا۔

"میڈم! آپ براہِ کرم اپنی جگہ رکیں۔ ابھی آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ رِدا ششدر کھڑی رہ گئی تھی۔ توقیر صاحب عجیب سے انداز میں اُن افسران کو دیکھ رہے تھے پھر اُنھوں نے بھرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"پولیس آفیسر! میں آپ سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن ایک معزز شہری کے ساتھ کیا یہ جارحانہ انداز مناسب ہے؟"

"توقیر اے بیگ صاحب آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں!"

"توقیر صاحب! معزز شہری کا تعین بڑا مشکل کام ہے اگر یہ تعین ہو جائے تو آپ سے معذرت کر لی جائے گی۔ لیکن معاف کیجئے گا اِس وقت یہ تمام کارروائی بے حد ضروری ہے انٹرپول کے اِن اعلیٰ افسران سے ملیئے۔ یہ تفسیر کو گرفتار کرنے کے بعد یہاں آئے ہیں۔ آپ کا بیٹا تفسیر اے بیگ سوئیڈن میں گرفتار ہُوا ہے۔ بیس کروڑ روپے کی مالیت کے مختلف فراڈ ثابت ہو چکے ہیں اور وہ اِس وقت سوئیڈن کی جیل میں موجود ہیں۔ ہم فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں جس کا صدر دفتر یہی جگہ ہے۔ پوری عمارت میں پولیس اور انٹرپول کے ایجنٹ قبضہ کر چکے ہیں اور آپ کے ریکارڈ کی چھان بین ہو رہی ہے۔ اب براہِ کرم ایک معزز شہری ہونے کی حیثیت سے آپ فرینڈز آرگنائزیشن سے متعلق تمام ریکارڈ ہمارے حوالے کر دیجئے۔"

"تفسیر گرفتار ہو چکا ہے؟ کیا ایک غیر ملکی پر آپ اِس طرح ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ وہ باقاعدہ چیمبر آف کامرس کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ باہر گیا ہے اور کاروباری اُمور پر کام کر رہا ہے۔"

"اُس کے چیمبر آف کامرس کا یہ اجازت نامہ برائے تحقیق موجود ہے۔ پولیس آفیسر نے ایک فائل کھول کر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اور توقیر صاحب اُس فائل کو دیکھنے لگے۔ پولیس آفیسر نے کہا۔

"بیس کروڑ روپے کا یہ فراڈ، ابتدائی مرحلے میں سامنے آیا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے دعوے دار ہیں جن کے ساتھ فرینڈز آرگنائزیشن کے ذریعے کروڑوں روپے کے فراڈ کئے گئے ہیں۔ اور اُن میں آپ کا بیٹا تفسیر براہِ راست ملوث ہے۔ تمام کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔ انٹرپول کے مقامی دفتر میں اُن کی نقول موجود ہیں۔ ... فرینڈز آرگنائزیشن سے متعلق ریکارڈ ابھی اِس عمارت سے برآمد کر لیا جائے گا۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ہی اگر آپ ہم سے تعاون کریں گے تو آپ کی شخصیت کو اِس کاروبار سے بریٔ الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے حالانکہ اِس فرم کے مالک آپ ہی ہیں اور آپ کا بیٹا تفسیر صرف مینجنگ پارٹنر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا اِس سلسلے میں آپ ہماری کوئی مدد کریں گے؟"

"آفیسر! تمھیں بُرا بھلا کہنے کو تو بہت دِل چاہ رہا ہے لیکن اپنے لئے کوئی مُصیبت مول لینا نہیں چاہتا۔ میں کسی فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں نہیں جانتا۔ یہ فرم کامیابی سے اور دیانتداری سے اپنا کاروبار کر رہی ہے۔ اگر اُس کے کاروبار میں تمھیں کوئی فراڈ نظر آئے تو براہِ کرم مجھے اُس سے آگاہ ضرور کر دینا میں اپنے آپ کو ایک مُجرم کی حیثیت سے پیش کر دُوں گا اور اگر ممکن نہ ہو تو پھر تمھیں بلکہ حکومت کو میری اِس ہتک کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔"

توقیر صاحب اپنی کُرسی سے کھڑے ہوگئے اور اُنھوں نے دونوں ہاتھ بُلند کرتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے۔ پہلے میری تلاشی لے لی جائے۔"

"نہیں جناب ہم اِس حد تک جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر واقعی آپ فرینڈز آرگنائزیشن سے اِس حد تک لاتعلق ہیں تو اطمینان رکھیئے آپ کا مکمل احترام کیا جائے گا۔ لیکن ہماری اطلاعات اور معلومات ناقص نہیں ہیں لیکن آپ کو کم از کم اِس اُلجھن سے ضرور گزرنا ہوگا کہ آپ کی اِس نیک نام فرم کو ایک بڑے ادارے کے تحت بھی استعمال کیا جا رہا ہے اور جو شخص اِس بُرے ادارے کا بانی تصور کیا گیا ہے وہ آپ کا بیٹا ہے۔"

"غلط ہے یہ سب کچھ غلط ہے تاہم میں تمھاری تفتیش میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا آفیسر۔" توقیر صاحب نے کہا اور اُس کے بعد اِس دفتر کی تلاشی بھی ہونے لگی۔ رِدا توقیر صاحب کے ساتھ کھڑی ہُوئی تھی۔ اُس کا چہرہ دُھلے ہُوئے لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ جِس کا اندیشہ تھا وہی ہُوا تھا تفسیر گرفتار ہوگیا تھا۔

اور فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں انٹرپول کو معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ تو پھر بھلا شہاب صاحب کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

رِدا کو احساس ہُوا کہ رات کو شہاب صاحب کی سرگرمی بلاوجہ نہیں تھی۔ پولیس افسران پورے آفس کی تلاشی لے چکے تھے اور یہاں سے کوئی چیز برآمد نہیں ہُوئی تھی۔ اُن میں سے چند باہر نکل گئے اور کچھ موجود رہے۔ توقیر صاحب پھر اپنی کُرسی پر آ بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے فون کرنے کی اجازت مانگی تو اُنھیں فون کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ غالباً اُنھوں نے اپنے ایڈووکیٹ کو فون کیا تھا۔

ایک پولیس آفیسر رِدا کی طرف رُخ کر کے بولا۔

"میڈم! آپ کا عہدہ کیا ہے؟"

"میں سیکریٹری ہُوں۔" رِدا نے جواب دیا۔

"اوہ تب تو آپ خاص حیثیت کی حامل ہیں ہم آپ سے سرکاری نہیں بلکہ غیر سرکاری طور پر یہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں آپ کی اطلاعات کیا ہیں؟"

"میں اِس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"کیا دورانِ ملازمت آپ کو فرینڈز آرگنائزیشن کے بارے میں کوئی خبر نہیں لگ سکی؟"

"جی نہیں۔" رِدا نے جواب دیا۔

"آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"اپنے کچھ محسنوں کے ساتھ رہتی ہُوں۔"

"ہم آپ کے بارے میں بھی تفصیلات جاننا چاہتے ہیں۔ براہِ کرم یہ تفصیلات لکھوا دیجئے گا۔" پولیس افسر نے کہا اور رِدا نے گردن ہلا دی۔

"آپ کا نام؟"

"رِدا۔"

"میرا مطلب ہے کہ اِس کے ساتھ کچھ اور...؟"

"جی نہیں۔"

"شادی شُدہ ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کے شوہر کا نام؟"

"بتانا پسند نہیں کرتی۔"

"مطلب؟"

"میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا مطلب صرف وہی ہے۔" رِدا سرد لہجے میں بولی۔

"کیا آپ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہتیں؟"

"جی نہیں۔"

"آپ کے شوہر کہاں ہیں؟"

"آپ کو بتانا پسند نہیں کرتی۔"

"کمال کی بات ہے۔ یہ ضروری ہے محترمہ؟"

"جی نہیں، قطعی ضروری نہیں ہے۔" رِدا نے غرّائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کا قیام کہاں ہے؟" پولیس آفیسر نے سوال کیا اور رِدا نے اپنا پتہ دوہرا دیا۔ پولیس آفیسر نے یہ پتہ نوٹ کر لیا تھا۔ اور اِس کے بعد اُس نے رِدا سے فرینڈز آرگنائزیشن، یہاں کی مدتِ ملازمت اور اُس کی کارکردگی وغیرہ کی تفصیلات معلوم کیں۔ اور اُس بیان کے نیچے اُس سے دستخط کرائے پھر اُس نے کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو واپس جا سکتی ہیں فی الحال یہ دفتر بند کیا جا رہا ہے۔ اور انتظامیہ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد اسے دوبارہ کام کی اجازت دے گی۔"

رِدا نے توقیر صاحب کی طرف دیکھا تو توقیر صاحب گردن ہلاتے ہُوئے بولے۔

"ہاں بیٹی! تم جا سکتی ہو۔ جو کچھ ہوگا اُس کی اطلاع تمھیں پہنچا دی جائے گی۔"

رِدا خاموشی سے دفتر سے باہر نکل آئی۔ بدن میں لرزشیں تھیں پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ بمشکل تمام اُس نے باہر آکر ایک آٹو رکشہ روکا اور اُس میں بیٹھ کر چل پڑی۔

● ●

شہاب صاحب سخت ذہنی بُحران کا شکار تھے۔ اپنے طور پر تمام کارروائیاں کر رہے تھے بہت سے ممالک کو ٹیلیگرام دیئے تھے، بہت سے نئے سلسلے سمیٹے تھے اور حالات کا انتظار کر رہے تھے۔ تفسیر اُن کا پارٹنر ہی نہیں اُستاد بھی تھا اُسی کی اسکیمیں ہوتی تھیں جن میں شہاب صاحب نے سرمایہ کاری کی تھی۔ نہ صرف سرمایہ کاری بلکہ بہت سے معاملات میں وہ حصّہ دار بھی تھے اور وہاں لوگ تفسیر کا نام نہیں جانتے تھے۔ لیکن کیفیت یہ تھی کہ ہر پروگرام تفسیر سے منسلک تھا اور دونوں مل کر یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ شہاب صاحب کو کروڑوں کا منافع ہو چکا تھا لیکن اُن کروڑوں کو اربوں بنانے کے لئے صرف کر دیا گیا تھا اور اِس کے لئے شہاب صاحب نے جو سب سے زیادہ خوفناک قدم اُٹھایا تھا وہ یہ تھا کہ اُنھوں نے احسان

صاحب کے اثاثے، اُن کا... کو استعمال کی تھی احسان صاحب، بھائی سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتے تھے تمام کاروبار کے انھوں نے دو حصے رکھے تھے اور شہاب صاحب کچھ نہ کرتے ہُوئے بھی احسان صاحب کے کاروبار کے نصف مالک تھے کاغذات اور دوسری چیزیں بھی شہاب صاحب کی پہنچ سے دُور نہیں تھیں چنانچہ انہی کاغذات اور دستاویزات کی ضمانت پر شہاب صاحب کا خُفیہ کاروبار بھی چل رہا تھا جس کا بے چارے احسان صاحب کو پتہ نہیں تھا۔ نیّت شہاب صاحب کی بھی خراب نہیں تھی۔ بھائی کی دولت کو برباد نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ صرف اُس کے ذریعہ اپنا کاروبار جمانے کے خواہش مند تھے اور اُن کا خیال تھا کہ کام ہو جانے کے بعد دستاویزات آزاد ہو جائیں گی اور اُنھیں ہی خاموشی سے اُن کی جگہ پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اچانک سارا کھیل بگڑ گیا تھا اور یہ سب کچھ رشید کی وجہ سے ہُوا تھا رشید نے گرفتار ہونے کے بعد جو بیانات دیئے تھے اُن سے فرینڈس آرگنائزیشن کا سُراغ ملا تھا اور فرینڈس آرگنائزیشن کے سلسلے میں تفتیش سے تفسیر کی خبر ملی تھی۔ یہ مسئلہ اِس لئے اور بھی اُلجھ گیا تھا کہ رشید کا انتخاب خود شہاب صاحب نے کیا تھا اور یہ بات تفسیر سے بھی پوشیدہ تھی اب جو کچھ ہو رہا تھا اُس میں صرف وہ ملوّث تھے تفسیر اگر نکل بھی آیا تو وہ نقصان کا ذمّہ دار صرف شہاب صاحب کو قرار دے گا کیونکہ کھیل اُن کی وجہ سے بگڑا تھا اور یہ بات اُن کے درمیان معاہدے میں درج تھی۔ ہیروئن کا جو ذخیرہ پکڑا گیا تھا اُس میں رشید اگر شہاب صاحب کا نام لے بھی دیتا تو اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اِس ہیروئن کی خریداری کا ذمّہ دار آسانی سے رشید کو قرار دیا جا سکتا تھا اور سادہ کاغذ پر یہ سب کچھ کیا جا سکتا تھا لیکن فرینڈس آرگنائزیشن کے انکشاف کے بعد خود شہاب صاحب کا بچنا مشکل تھا۔ نہ جانے کیوں اُنھیں بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ رَدا کا اِس سلسلے میں ضرور ہے سُرخ فائل جس وقت سے اُس کی تحویل میں پہنچا تھا۔

اِس کے بعد سے ہی گڑبڑ شروع ہو گئی تھی۔

احسان صاحب اُن سے گفتگو کرنے کے بعد نہ جانے کہاں مصروف ہو گئے تھے رات کو بھی اُن سے ملاقات نہیں ہُوئی تھی صبح کو حالانکہ شہاب صاحب جلدی اُٹھ گئے تھے لیکن احسان صاحب کے پاس پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ جا چکے ہیں۔ ذکیہ بیگم سہمی ہُوئی تھیں۔ اُن کے علاوہ ابھی کسی اور کو احسان صاحب کی پریشانی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ ذکیہ بیگم سے شہاب صاحب سے کچھ پُوچھنے کی کوشش کی تو شہاب صاحب نے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہُوئے کہا۔

"افسوس بھائی صاحب نے مجھے بھی اِس سلسلے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی بھابی۔ میں تو خود پریشان ہُوں۔"

"خُدا جانے یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔" ذکیہ بیگم نے سہمے ہُوئے لہجے میں بتایا۔

"میں جا رہا ہُوں شاید کچھ معلوم ہو جائے۔" شہاب صاحب نے کہا اور باہر نکل آئے۔ اِس کے بعد وہ کوٹھی میں نہیں رُکے تھے۔ یہاں سے وہ شہر کی ایک معروف عمارت میں گئے... جہاں اکرم بھائی، مکرم بھائی انٹرپرائز کا بورڈ لگا ہُوا تھا۔ اندر ایک درمیانی جسامت کے شخص سے ملاقات ہُوئی جو شہاب صاحب کو دیکھ کر چونک پڑا تھا۔

"اِرے شہاب بھائی۔ کیا گھپلا ہے بھائی میرے کو کچھ تو بولو یار۔ اپن بھی تمہارا یار ہے۔"

"کہاں ہیں وہ دونوں؟" شہاب صاحب نے پُوچھا۔

"اِرے اکرم بھائی تو پرسوں ہی جاپان چلا گیا تھا مکرم بھائی رات کو کوریا چلا گیا میرے کو سارے کھاتے نئے بنانے کو بول گیا ہے ابی اِتنا آرام سے تو نہیں ہو ٹینگا کیا۔ اُبی تم ہی اَپن کو بولو یار۔"

"وہ دونوں چلے گئے؟"

"اِرے اَپن کو بھی لے جاتے یار۔ اَپن کیا کرے گا اِدھر؟"

"تم نئے کھاتے بناؤ۔ جتنی جلدی کرو گے اُتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔" شہاب صاحب نے کہا اور وہاں سے باہر نکل آئے۔ لیکن ابھی مرسڈیز اسٹارٹ ہو کر آگے بھی نہیں بڑھی تھی، کہ شہاب صاحب نے ایک پولیس کار عمارت کے دروازے پر رُکتے دیکھی چند پولیس افسران اندر داخل ہو گئے تھے۔

شہاب صاحب کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی تھی۔ انھوں نے مرسڈیز اسٹارٹ کی اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گئے اِس بار وہ ایک خوشنما عمارت کے فلیٹ میں داخل ہُوئے تھے جس کا نمبروں والا تالا اُنھوں نے خود کھولا تھا۔ فلیٹ خوبصورتی سے آراستہ تھا شہاب صاحب اُس کے ڈرائنگ رُوم میں جا بیٹھے۔ فُون اُٹھا کر سامنے رکھ لیا پھر اُنھوں نے تین ٹرنک کال بُک کرائیں اور انتظار کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے بعد فُون کی گھنٹی بجی۔ اور آپریٹر نے ایک کال مل جانے کی اطلاع دی شہاب صاحب نے ریسیور کان سے لگا لیا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ تو اُنھوں نے کہا۔

"کیا، وکٹر بول رہا ہے؟"

"یس سَر! آپ کون ہیں؟"

"شہاب۔" شہاب صاحب نے جواب دیا۔

"اوہ! شہاب صاحب فرمایئے کیسے مزاج ہیں؟"

"مزاج کے بچّے۔ کیا رپورٹ ہے کام کی بات کرو۔"

"سوری سَر! میری مصروفیات کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کونسی رپورٹ کی بات کر رہے تھے آپ؟"

"تفسیر کے بارے میں معلوم ہو سکا؟"

"وہ گرفتار ہو چکا ہے اور اُس کے ساتھ ہی وکٹر بھی۔ آپ کون ہیں براہِ کرم اپنے بارے میں تفصیل بتائیں۔"

"تم کون ہو؟"

"اِنٹرپول۔ دیکھئے شہاب صاحب آپ کو اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لئے..." دوسری طرف سے کہا گیا لیکن شہاب صاحب نے بے اختیارانہ انداز میں فون بند کر دیا تھا۔ وہ کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں بیٹھے رہے اور پھر پریشانی سے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ اُن کی حرکات سے سخت بے چینی عیاں تھی دیر تک وہ ٹہلتے رہے۔ پھر دوبارہ فُون کے قریب پہنچے اور ایک نمبر ڈائل کر کے ریسیور کان سے لگا لیا۔

"ہاں کون اعظم، اکرم بھائی مکرم بھائی جاؤ وہاں کیا ہو رہا ہے مجھے رپورٹ دو۔"

"بہتر جناب!" دوسری طرف سے آواز آئی اور شہاب صاحب نے فُون بند کر دیا۔ اِس کے بعد وہ بے چینی سے ٹہلتے رہے اچانک فُون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

فُون پر اعظم تھا۔

"ہاں اعظم۔"

"اکرم بھائی مکرم بھائی سیل کر دی گئی ہے۔ منیجر گرفتار ہو گیا ہے۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

"اعظم، اب تم تفسیر کی فرم پر چلے جاؤ اور وہیں رُکو۔ کوئی خاص بات ہو تو مجھے ہیڈ کوارٹر پر اطلاع دینا۔"

"اوکے سر!"

"احتیاط سے دُور دُور رہنا ہے۔"

"جی بہتر۔" جواب ملا اور شہاب صاحب فُون بند کر کے پھر باہر نکل آئے۔ اُن کی مرسڈیز کی رفتار بہت تیز تھی۔ لیکن کافی دُور جانے کے بعد اُنھیں کچھ خیال آیا۔ دوسرے چوراہے سے اُنھوں نے مرسڈیز واپس موڑی اور پھر کئی سڑکیں عبور کر کے اُس سڑک پر آگئے جہاں تفسیر کی فرم تھی لیکن تفسیر کے در بند ہوتے جا رہے تھے، وقت اعلان کر رہا تھا کہ مصیبت آگئی ہے۔ فرم کے دروازے پر دو پولیس کی جیپیں اور ایک کار کھڑی ہُوئی تھی۔

شہاب صاحب رُکے بغیر آگے بڑھ گئے۔ اب اُن کے چہرے پر سراسیمگی نظر آ رہی تھی۔ غالباً اُن کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ چنانچہ اب اُن کا رُخ اُس عمارت کی طرف تھا... جسے ہیڈ کوارٹر کہتے تھے جہاں اُن کا پُورا ریکارڈ موجود تھا۔ شہاب صاحب عمارت میں داخل ہُوئے اور دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئے۔ اُنھوں نے ایسا تمام ریکارڈ ضائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو اُن کی نشاندہی کر سکتا تھا۔ لیکن ریکارڈ رُوم میں قدم رکھتے ہی اُن کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ الماریاں کُھلی پڑی تھیں۔ کیبنٹ خالی تھے ایسے کاغذات جو کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ بکھرے ہُوئے تھے انتہائی خُفیہ کاغذات ایسی جگہوں پر رکھے ہُوئے تھے جہاں کسی کی توجّہ نہیں جا سکتی تھی لیکن تلاشی لینے والوں کی نگاہ سے وہ جگہ بھی نہیں بچ سکی تھی۔

"نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا... کون ہے، وہ کون ہے؟" وہ پوری عمارت میں دوڑتے پھرے لیکن یہاں کوئی انسانی وجُود نہیں تھا۔ شہاب صاحب کے بدن کی جان نکل گئی تھی۔ وہ ایک کمرے کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ہَوا کے جھونکے کاغذات اُڑا رہے تھے اُن کی سرسراہٹیں سُنائی دے رہی تھیں۔ شہاب صاحب سے بیٹھا نہ گیا تو لیٹ گئے۔ اُن کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ کان آگ اُگل رہے تھے۔ زبان خشک ہو کر تالوے چپک گئی تھی۔ پھر ٹیلی فُون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ جانتے تھے کہ اعظم ہو گا۔ لیکن اُٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ گھنٹی دیر تک بجتی رہی۔ پھر بند ہو گئی۔ شہاب صاحب اِسی طرح فرش پر لیٹے رہے تھے، اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے جو اُن پر اِتنی گہری نگاہ رکھتا ہے۔ کون ہے وہ جسے...؟ اور ایک شکل اُن کی آنکھوں میں اُبھر آئی۔ رَدا... کیا وہ معمولی سی لڑکی اِتنی تیز ہو سکتی ہے، مگر وہ معمولی کہاں ہے، کچھ معلوم ہے اُس کے بارے میں۔ جانتا ہے کوئی اُس کی شخصیت کو؟ اُس نے کس خوبصورتی سے خود کو چھپا رکھا ہے۔ ضرور وہ جانے بُوجھے منصوبے کے تحت اِس کوٹھی میں گھُسی تھی۔ ضرور... مگر... وہ خود اُسے لائے تھے اور، اور... سُرخ فائل اُن کی تفصیل... رَدا... رَدا۔ اُن کا ذہن سوچنے کی قوتیں کھو بیٹھا۔ بس ایک ہی دھواں سا اِس ذہن میں بھر گیا تھا۔ رَدا نے اُن کے خلاف یہ عمل کیا ہے۔

صرف رُدا نے۔

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی آنکھیں خوفناک انداز میں چمک رہی تھیں۔ فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تھی۔ اُنھوں نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے آنے والی آواز اعظم کے سوا کسی کی نہیں تھی۔

"ہاں! میں ہوں۔"

"پولیس جناب۔ پولیس۔"

"مجھے معلوم ہے اور کوئی خاص بات؟"

"نہیں جناب۔" دوسری طرف سے جواب ملا اور شہاب صاحب فون بند کر کے باہر نکل آئے۔ مرسڈیز اب کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔ لیکن کوٹھی پہنچ کر شہاب صاحب نے مرسڈیز کا رُخ صدر دروازے کی طرف کرنے کے بجائے کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف کر دیا تھا۔ پھر ایک جگہ گاڑی روک کر وہ نیچے اُترے اور کوٹھی کی عقبی دیوار کود کر اندر داخل ہو گئے۔ کی باڑھ کا سہارا لیتے ہوئے وہ پچھلے دروازے سے کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ سب لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ شہاب صاحب چوروں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ رُدا کے کمرے کے پاس پہنچ کر وہ رُکے اور پھر اُنھوں نے اندر جھانکا لیکن کمرہ خالی تھا۔ ایک لمحے رُک کر اُنھوں نے کچھ سوچا اور پھر ثناء کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ثناء بھی کمرے میں موجود نہیں تھی۔ تیمور مسہری پر سو رہا تھا۔ شہاب صاحب کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اُنھوں نے دروازے کو دھکیل کر دیکھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

شہاب صاحب بے آواز اندر داخل ہو گئے۔ غسل خانے میں پانی گرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ثناء غسل خانے میں تھی۔ اُنھوں نے برق رفتاری سے آگے بڑھ کر تیمور کو اُٹھایا۔ اور دوسرے لمحے اُس کے منہ پر اپنا ہاتھ پھیلا دیا تیمور کسمسایا تھا۔ لیکن شہاب صاحب جھپک سے باہر نکل گئے اور پھر وہ اُسی احتیاط اور ہوشیاری سے اُسے لئے باہر نکل آئے اور کراٹی کی باڑھ کے سہارے سہارے دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ اِس کے بعد باہر نکلنے میں اُنھیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ تیمور جاگ گیا تھا۔ اور سہمی نگاہوں سے شہاب صاحب کو دیکھ رہا تھا۔

شہاب صاحب مسکرا دیئے۔ اُنھوں نے منہ سے سیٹی بجائی اور تیمور بھی مسکرانے لگا۔ شہاب صاحب نے مرسڈیز اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔ مختلف سڑکوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے وہ ایک گندے سے علاقے میں داخل ہو گئے اور پھر ایک جگہ اُنھوں نے گاڑی روک دی اور تیمور کو گود میں لئے نیچے اُتر آئے ایک بدنما مکان کے دروازے پر پہنچ کر اُنھوں نے پاؤں کی ٹھوکر دروازے پر ماری۔

"کون ہے بے؟" اندر سے ایک آواز سنائی دی اور شہاب صاحب نے دوسری ٹھوکر ماری۔ چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک شخص نے باہر جھانکا۔ اُس کے چہرے پر خشونت تھی لیکن شہاب صاحب کو دیکھ کر اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"ارے میاں جی آپ۔۔ آپ اندر آیئے۔ آج یہاں کیسے؟" وہ جلدی سے دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا تھا شہاب صاحب اندر داخل ہو گئے۔

"کون ہے جلیل خاں؟" کمرے سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

"رحمت جہاں باہر آؤ۔" شہاب صاحب نے آواز دی اور ایک عورت کمرے سے باہر آ گئی۔

"ارے میاں جی ہیں۔ جبھی تو میں کہوں۔ ائے یہ کون ہے۔ ائے اللہ جی۔ کتنا پیارا بچہ ہے۔ آپ کا ہے میاں جی؟" رحمت نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"فضول باتوں سے گریز کرو رحمت۔ اِسے سنبھالو۔" شہاب صاحب نے تیمور کو رحمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور رحمت نے جلدی سے تیمور کو گود میں لے لیا۔

"اللہ جی شہزادہ لگ رہا ہے۔"

"یہ رکھو رحمت۔" شہاب صاحب نے جیب سے ایک ہزار روپے کے نوٹ نکال کر رحمت کی طرف بڑھا دیئے۔

"اللہ جی جبھی تو میں کہوں۔" رحمت نے نوٹ جھپٹتے ہوئے کہا۔

"یہ بچہ ایک مختصر وقت تک تمھارے پاس رہے گا اگر میں نہ آسکوں تب بھی تم اُسے بہت احتیاط سے رکھو گے۔ ذرہ برابر تکلیف نہ ہونے پائے اُسے ورنہ جانتے ہو کیا ہو گا؟"

"جبھی تو میں کہوں۔ مگر میاں جی۔۔"

"اوّل تو بچہ بہت جلد واپس لے لیا جائے گا لیکن اگر ایک آدھ مہینہ لگ جائے تو بھی تم فکر مت کرنا اور گفٹ اسٹور پر جا کر ہر ماہ ایک ہزار روپے لے لیا کرنا۔"

"جبھی تو میں کہوں۔" رحمت خوشی سے بولی۔

"یاد رکھو۔ جلیل خاں اِس کے لئے کپڑے وغیرہ خرید لینا۔ اور اگر پڑوس کا کوئی شخص اِس کے بارے میں پوچھے تو کوئی بھی بات بنا دینا بہت احتیاط رکھنی ہے۔" شہاب صاحب نے کچھ اور

نوٹ نکال کر جلیل خاں کو دیئے۔

"ہم تو اِس کام میں ایکسپرٹ ہیں میاں جی فکر مت کرو۔" جلیل خاں نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"چلتا ہوں۔" شہاب صاحب بولے۔

"وہ کچھ چائے ٹھنڈا میاں جی۔"

"بچے کا خیال رکھنا۔ بس۔"

"جبھی تو میں کہوں۔" رحمت کی آواز اُبھری لیکن شہاب صاحب دروازے سے باہر نکل آئے تھے۔ چند لمحات کے بعد مرسڈیز واپس کوٹھی جا رہی تھی۔

ثناء باتھ روم سے باہر آ گئی۔ آئینے کے سامنے جا کر اُس نے بال وغیرہ سنوارے اور پھر آئینے ہی میں مسہری کی طرف دیکھا۔ تیمور اُسے نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اُچھل پڑی۔

"ارے تیمور!" اُس نے مسہری کے دوسری طرف جا کر دیکھا۔ اُس کا خیال تھا کہ تیمور کروٹ لیتے ہوئے نیچے گر پڑا لیکن تیمور مسہری کے دوسری طرف بھی موجود نہیں تھا۔ "کون لے گیا اُسے؟" ثناء نے سوچا۔ اور باہر نکل آئی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ملازمہ نظر آئی تھی۔

"گل۔" اُس نے آواز دی۔

"آئی بی بی۔"

"تیمور کہاں ہے؟"

"نہیں نہیں معلوم بی بی۔"

"جا دیکھ۔ کون لے گیا اُسے یہ اُس کے سونے کا وقت ہے۔ رو بھی نہیں رہا تھا کون لے گیا؟"

"جی بی بی۔" ملازمہ نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

"کون لے جا سکتا ہے اُسے۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں کرتا اور تیمور خود کہیں جا نہیں سکتا۔" اُس نے سوچا اور کمرے سے نکل کر دادی اماں کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

"دادی اماں! کوئی تیمور کو تو نہیں لایا؟"

"تیمور کو؟"

"ہاں سو رہا تھا اچھا خاصا نہ جانے کون اُٹھا لایا۔" وہ باہر نکل گئی۔ پھر وہ ایک ایک کمرے میں جھانکتی پھری ایک ایک سے پوچھتی پھری لیکن کسی نے نہ بتایا کہ تیمور کہاں ہے۔ اب ثناء حواس باختہ ہونے لگی تھی۔

"تیمور نہ ہوا کوئی تماشہ ہو گیا۔ کس نے یہ بدتمیزی کی ہے۔ میں مذاق میں بھی یہ پسند نہیں کرتی۔ امّی! تیمور کہاں ہے؟" ثناء گرجی۔

"اری لڑکی مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے۔ مجھے کیا معلوم کہاں گیا بچہ آخر۔"

"تلاش کرو۔ اُسے چپے چپے میں تلاش کرو اگر وہ نہ ملا تو، تو۔" ثناء لرزتی آواز میں چیخی اور پھر کسی خیال کے تحت وہ پاگلوں کی طرح دوڑتی کوارٹرز کی طرف بھاگی۔

"ندرت۔۔ ندرت!" اُس نے زور زور سے تین نمبر کا دروازہ پیٹا۔ ندرت ثناء کی آواز پہچان کر باہر نکل آئی۔ لیکن ثناء کی حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔

"تیمور کو لائی ہو تم۔ تیمور ہے تمھارے پاس۔"

"نہیں تو۔" ندرت نے کہا۔

"ندرت! تیمور کہیں نہیں ہے۔ سب جگہ دیکھ لیا۔ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا؟"

"اُسے وہیں ہو گا۔ جا کہاں سکتا ہے؟" ندرت نے کہا۔ اماں بی اور شوکت جہاں بھی نکل آئی تھیں۔ ثناء رونے لگی۔

"نہ جانے کہاں گیا وہ۔"

"کہاں جا سکتا ہے۔ تھا کہاں؟"

"میرے کمرے میں۔" ثناء نے کہا اور دوڑتی ہوئی پھر واپس پلٹ گئی ندرت بھی اُس کے پیچھے دوڑی تھی۔

ایک ایک ملازم، ایک ایک شخص پاگلوں کی طرح کوٹھی کے کونے کھدرے چھانتا پھر رہا تھا۔ گٹروں کے ڈھکن اُٹھا کر دیکھا گیا چوکیدار سے پوچھا گیا لیکن کہیں سے کوئی پتہ نہیں مل سکا۔ ثناء احسان صاحب کے کمرے سے پستول نکال لائی تھی۔

"سب کو گولی مار دوں گی، پوری کوٹھی میں آگ لگا دوں گی۔ بتاؤ تیمور کہاں ہے؟" اُس کے جارحانہ تیور دیکھ کر ملازموں میں بھگدڑ مچ گئی

"ثناء کیوں پاگل ہو رہی ہے۔ یہ پستول کیوں نکال لائی۔ کیا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے؟" ذکیہ بیگم نے کہا اور ثناء خونخوار نگاہوں سے اُنھیں دیکھنے لگی۔

"جو کچھ یہاں ہو جائے گا آپ سوچ بھی نہیں سکتیں امّی۔ بات معمولی نہیں ہے دو چار کو ماروں گی پھر خودکشی کر لوں گی۔ اگر رُدا اور تیمور کے خلاف کسی نے سازش کر کے یہ سمجھا ہے کہ۔۔ رُدا کو یہاں سے نکال دے گا تو۔۔۔ تو اُسے کامیابی نہیں ہو گی۔ سمجھے آپ لوگ۔"

"اری ہوید ہی۔ کہیں رُدا ہی تو اُسے کہیں نہیں لے گئی۔" امّی نے کہا اور ثناء چونک پڑی۔

"رُدا!" اُس نے تحیرانہ انداز میں کہا۔

"خواہ مخواہ طوفان اُٹھا رکھا ہے۔ اُس کی اولاد ہے کیا تو اُسے کہیں لے جانے سے روک سکتی ہے؟" امّی نے کہا اور اُسی وقت کسی نے کہا۔

"رِدا بی بی آرہی ہیں۔" رِدا آٹو رکشہ کا کرایہ ادا کر کے اندر آرہی تھی۔ ثناء رِدا کی طرف دوڑی۔

"رِدا۔۔۔ رِدا۔ تیمور کہاں ہے؟"

"تیمور؟" رِدا کا رنگ زرد ہو گیا۔

"کیا تم اُسے لے گئی تھیں؟ بتاؤ رِدا؟ وہ غائب ہے کہاں ہے وہ؟" ثناء نے پوچھا۔ رِدا کچھ نہ بولی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ثناء کو دیکھ رہی تھی۔

اور عین اُسی وقت شہاب صاحب کی مرسڈیز بھی اندر داخل ہوتی نظر آئی تھی۔

"تم بولتی کیوں نہیں رِدا۔ بتاؤ تیمور کہاں ہے، جواب دو رِدا پلیز کیا تم اُسے کہیں چھوڑ آئی ہو؟"

"کیا ہنگامہ ہے یہ۔ کیا ہو رہا ہے؟" شہاب صاحب مرسڈیز سے اُتر کر اُسی طرف آگئے تھے۔

"انکل تیمور غائب ہے؟"

"کون تیمور؟" شہاب صاحب نے کرخت لہجے میں کہا۔

"اپنا تیمور انکل، اپنا ہیرو۔"

"کیا بکواس ہے ثناء۔ یہ پستول کیوں دبا رکھا ہے ہاتھ میں؟"

"پستول۔ ایں ہاں پستول۔ ایک ایک کو ہلاک کر دوں گی۔ ایک ایک کو جان سے مار دوں گی اگر تیمور نہ ملا تو۔۔"

"کافی ترقی پا چکی ہو۔ اِس کوٹھی میں ایک پھولن دیوی کا ہونا ضروری تھا بس ایک کمی رہ گئی تھی یہاں۔" شہاب صاحب نے طنزیہ کہا۔

"آپ اِس وقت بھی مذاق کر سکتے ہیں انکل۔ یہ وقت مذاق کا ہے؟" ثناء غرائی۔

"مذاق تو اِس عمارت کے ساتھ کیا جا رہا ہے بھتیجی، مذاق تو تمہارے مستقبل کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ لاڈ پیار میں جو چھوٹ تمہیں دی گئی ہے اُس کے نتائج سے لاپرواہ ہو گئے ہیں اِس کوٹھی کے لوگ۔ کاش یہاں میری بھی کوئی آواز ہوتی کوئی حیثیت ہوتی۔"

"کیا کہہ رہے ہو شہاب میاں؟" ذکیہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

"کب تک زبان بند رکھوں۔ بھابی کب تک خاموش رہوں۔ آپ سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ کون ہے تیمور، کون ہے رِدا۔ یہ طفیلی بیگم کون ہیں۔ رشید کون تھا۔ یہ سب کون لوگ ہیں یہاں کیوں ہیں۔ آپ لوگ۔ بھائی صاحب جو کچھ کر رہے ہیں اُس کے اثرات آپ نے مستقبل پر محسوس کئے ہیں۔ کیا ہر ایرے غیرے کو گھر بُلا کر ماحول کو زہر آلود نہیں کیا جا رہا۔ آپ رِدا کو جانتی ہیں کون ہے یہ؟ کہاں سے آئی ہے؟ اِس کا ماضی کیا ہے؟ کسی کو علم ہے اِس بارے میں کوئی جانتا ہے آپ کے ٹکڑوں پر پلنے والی آپ سے سب کچھ چھپائے ہوئے ہے اور بڑے اطمینان سے آپ کے سینوں پر مونگ دَل رہی ہے۔ جواب دے سکتا ہے۔ آپ میں سے کوئی کہ رِدا کون ہے؟"

"تیمور غائب ہے شہاب صاحب یہ وقت اِن باتوں کا نہیں ہے۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"وہ کہاں گیا۔ یہ بات رِدا جانتی ہو گی۔ اِس کا کوئی دوست یا اِس بچّے کا باپ اُسے لے گیا ہو گا۔ وہ بچّہ جس کے باپ کا کوئی نشان نہیں ہے آپ لوگوں کے پاس کس لئے باعثِ دلچسپی ہو سکتا ہے۔ رِدا جانتی ہو گی اُس سے کیوں نہیں پوچھا آپ نے؟"

"اَرے اَرے۔ کیا واہی تواہی بکے جا رہا ہے تو۔ پاگل ہو گیا ہے کیا؟" دادی امّاں نے کہا۔

"کیسے ہوشمند رہ سکتا ہوں۔ آپ نے زبان بندی کر رکھی ہے میری پوچھئے نہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ اِس سے پوچھئے ثاقب کون ہے اِسے کیوں بلیک میل کرتا ہے وہ؟" شہاب صاحب نے کہا۔

"میں کہتی ہوں زبان سنبھال اپنی۔" دادی امّاں بولیں۔

"نہیں امّی جان، یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں اِسے گھر چھوڑنا ہو گا۔ ابھی اِسی وقت۔"

دفعتاً ہی ثناء نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی اور سب دہشت سے کانپ گئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا تھا پستول خالی ہو گیا تو ثناء نے اُس کی نال کنپٹی پر رکھ لی اور سب چیخ پڑے۔

"رِدا نے یہ گھر چھوڑا تو۔۔۔ تو میں یہ دُنیا چھوڑ دوں گی۔ سمجھ لیا آپ لوگوں نے۔ آپ میں سے ایک ایک شخص سُن لے۔ یہ کوٹھی میری ہے، میرے نام ہے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُسے اپنی ملکیت قرار دے کسی کو بھی نہیں۔ یہاں وہ رہے گا۔ جسے میں چاہوں گی سمجھے آپ لوگ۔ یہاں رِدا کی توہین کی گئی ہے۔ میری رِدا کی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ثناء۔ ثناء بیٹی! سُنو تو ایسا نہ کرو۔"

"ثناء!"

"ثناء!" سب منتیں کر رہے تھے۔

"رِدا سے جو کچھ کہا گیا ہے اِس کے بعد میں جینا نہیں چاہتی۔ ڈیڈی کو میرا اسلام کہہ دینا۔" ثناء نے ٹریگر دبا دیا اور سب چیخ پڑے، رِدا چکرا کر گر پڑی۔ لیکن ریوالور سے ٹرچ کی آواز نکل کر رہ گئی تھی۔ ثناء نے بار بار ٹریگر دبایا لیکن گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ شہاب صاحب نے آگے بڑھ کر اُس سے پستول چھین لیا۔

"ہاں یہ کوٹھی واقعی تمہارے نام ہے ثناء یہ میں بھول گیا تھا کوئی بات نہیں میں اُسے چھوڑے دیتا ہوں۔ اچھا ہے میری ذمّہ داریاں کچھ کم ہو جائیں گی۔" شہاب صاحب آگے بڑھ گئے۔

ثناء، رِدا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُسے اُٹھا کر اندر لایا گیا دوسرا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ رِدا کو ہوش میں لانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ثناء بے حد پریشان نظر آرہی تھی۔

پانی کے چھینٹے دیئے گئے۔ ڈاکٹر کی تجویز پیش کی گئی لیکن رِدا ہوش میں آگئی تھی۔

"رِدا۔۔۔ رِدا خود کو سنبھالو۔"

"ٹھیک ہوں میں۔ تیمور۔۔۔ تیمور۔"

"وہ ضرور مل جائے گا رِدا۔ ہم ابھی پولیس میں رپورٹ درج کراتے ہیں۔ وہ ضرور مل جائے گا۔"

دفعتاً ہی ایک ملازمہ چیختی ہوئی اندر آئی۔ "بی بی جی تیمور۔" سب اُچھل پڑے تیمور اُس کی گود میں موجود تھا۔

"اَرے میرا ہیرو۔ میرا تیمور۔ کہاں سے ملا یہ۔ کہاں چلا گیا تھا۔ اَرے بدمعاش کہاں چھُپ گیا تھا تو۔" ثناء اُسے بے تحاشہ چومنے لگی۔ رِدا تعجب سے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی گمشدگی کے بارے میں اُسے یقین تھا کہ شہاب صاحب نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اُس کے لئے یہ ثابت کرنا ناممکن تھا کہ تیمور کو شہاب صاحب لے گئے ہیں۔ کہتی تو وہ ذلیل ہوتی شہاب صاحب نے ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا تھا لیکن تیمور کی موجودگی۔

"کہاں ملا؟" ثناء نے پوچھا۔

"آپ کی مسہری پر بی بی۔"

"کیا؟"

"وہیں لیٹے ہوئے تھے۔" ملازمہ نے بتایا۔

"کیا بکواس ہے؟"

"میں اُدھر سے ہی گزر رہی تھی۔ اندر سے اِن کی آواز سُنی تو جھانک کر دیکھا یہ مسہری پر ہی لیٹے ہوئے تھے۔"

"جھوٹ بول رہی ہے تو؟"

"اللہ کی قسم بی بی۔ میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔"

"ثناء!" ذکیہ بیگم نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اَرے میں کوئی پاگل ہوں۔ دیوانی ہوں میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اندھی تو نہیں ہوں میں واہ۔ یہ وہاں تھا ہی نہیں۔ اِسے تیمور کہاں چلے گئے تھے تم؟" ثناء نے کہا اور تیمور نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں گردن ہلا دی۔

"تم نے جو ہنگامہ کیا ہے۔ ثناء اُسے معاف نہیں کیا جائے گا۔" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"اب جس کا جو دل چاہے کرے۔ مجھے میرا ہیرو مل گیا اے رِدا اُٹھو باہر چلیں گے۔ آؤ بھئی یہاں گھٹن ہو رہی ہے۔ معزز حاضرین کھیل ختم ہو گیا آپ بھی آرام کریں۔"

"مجھے۔۔۔ مجھے کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو ثناء۔" رِدا نے کہا۔

"جی نہیں۔ آپ میرے ساتھ کھلی فضا میں چلیں گی۔ آیئے اُٹھیئے اُٹھو رِدا پلیز۔" ثناء نے کہا اور رِدا اُٹھ گئی۔ اُس کی حالت ابتر تھی ذہن میں پن چکیاں چل رہی تھیں۔ جو کچھ ہوا تھا جو ہونے والا تھا وہ اُس سے واقف ہو گئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی تھی یہ تیمور کے لئے خطرہ اب بھی موجود تھا شہاب صاحب نے کھُل کر جو زبان بولی تھی اُس سے اُن کے عزائم کا اندازہ ہوتا تھا۔

ثناء کے مجبور کرنے پر وہ باہر نکل آئی۔ ندرت باہر ہی مل گئی تھی۔ کوٹھی والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ تیمور مل گیا ہے چنانچہ ماحول پُرسکون ہونے لگا۔ تینوں لڑکیاں لان پر آکر بیٹھ گئیں ثناء سنجیدہ تھی۔ وہ شہاب صاحب کے الفاظ بھول نہیں سکی تھی۔ چند لمحات خاموشی سے گزر گئے پھر ثناء نے کہا۔

"یہ بات میں قیامت تک نہیں مان سکتی کہ تیمور میرے کمرے میں تھا۔ اُسے ضرور کہیں چھپایا گیا تھا اور بعد میں میرے کمرے میں واپس پہنچا دیا گیا۔"

"ہاں میں بھی متفق ہوں۔" ندرت بولی۔

"نوکر کوٹھی کا ایک ایک گوشہ چھان چکے تھے۔"

"پھر یہ کیا ہوا؟"

"خدا جانے، ضرور کسی کی سازش ہے۔"

"مگر کس کی؟"

"معلوم کیا جائے گا۔ یہ مذاق نہیں ہو سکتا۔" ثناء نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"مذاق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"اگر کسی نے سنجیدگی سے یہ سب کچھ کیا ہے تو پھر تیمور کی واپسی کیا معنی رکھتی ہے؟"

"ممکن ہے یہ حرکت کرنے والا خود ہی گھبرا گیا ہو"
"ہاں ہو سکتا ہے" ثناء نے کہا اور پھر رِدا سے بولی "تم خاموش ہی رہو گی رِدا؟"
"کیا بولوں میں؟" رِدا نے روہانسی آواز میں کہا۔
"انکل نے جو کچھ کہا ہے رِدا۔ میں تو اُن کے الفاظ پر تم سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ رِدا، اچھا بھی کیا ہے کبھی۔ غلطیاں بھی ہوئی ہیں لیکن خُدا کی قسم مُعافی نہیں مانگی میں نے کسی سے، آج پہلی بار میں تم سے مُعافی مانگتی ہوں۔ رِدا انکل کے الفاظ اِس کوٹھی میں کہے گئے ہیں تم سے۔ اِن کے لئے مجھے مُعاف کر دو"
"ثناء میری اچھی ثناء تیرے لئے میں ساری دُنیا کو مُعاف کر سکتی ہوں۔ خُدا کی قسم کوئی بات نہیں ہے۔ تُو نے ثناء... تُو نے میرے لئے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو..."
رِدا سسکتی ہُوئی بولی۔
"یار ایک بات کہوں۔ ویسے تو یہ الفاظ میرے حق میں جاتے ہیں اور میرے جذبۂ دوستی کو دوام بخشتے ہیں لیکن یاروں سے جھُوٹ بولنے کو جی نہیں چاہتا" ثناء مُوڈ بدل کر بولی۔
"کیا مطلب؟"
"اَبّو اِس کے قائل ہیں کہ کوئی صُورتِ حال ناگزیر ہو جائے تو اُس کے پیدا کُنندہ کو مار دو۔ خود مرنا کیا معنی رکھتا ہے، اور پھر خودکشی توبہ توبہ۔ کوئی تُک ہے"
"اب اُلٹا ہی ہے" نُدرت بولی۔
"چھوڑو یار اللّٰہ رکھی کھوپڑی استعمال میں رکھو۔ ساری مُشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ ڈرامہ ہٹ ہو گیا۔ لوگوں کے ہوش درست ہو گئے۔ ایک ریوالور میں کتنی گولیاں ہوتی ہیں؟" ثناء نے کہا۔
"چھ!"
"ماہدولت حساب کتاب کے سچے ہیں۔ دو فائر پہلے کر چکے تھے۔ چار بعد میں کئے۔ ہو گئے چھ۔ اُس کے بعد ہی پستول کنپٹی پر رکھا تھا۔ ورنہ کوئی پاگل تھے ہم"
"مالک کی بیٹی۔ خواہ مخواہ سب کو ہولا دیا تھا"
"اب لوگوں کا حساب کتاب ہی کچا ہو تو اپن کیا کریں بھائی" ثناء نے ہنستے ہُوئے کہا۔ پھر رِدا کو گھُورتی ہُوئی بولی...
"یار اب مُسکرا دو۔ ایسا بھی کیا بخل" رِدا رو پڑی تھی۔

☆ ☆

احسان صاحب تھکے تھکے اندر داخل ہُوئے تھے۔ اُن کا چہرہ تاریک نظر آ رہا تھا ہونٹ خُشک ہو رہے تھے۔ ذکیہ بیگم اُنھیں دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔
"خیریت؟ کچھ طبیعت خراب ہے؟"
"وہ... وہ مَردُود کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ ذلیل انسان؟"
احسان صاحب نے کہا۔
"کون؟"
"شہاب! اُسی سانپ کی بات کر رہا ہوں میں، کہاں ہے وہ اُسے بُلاؤ تو سہی"
"کیا ہُوا؟ کیا ہو گیا؟ یہ کیا حالت ہو رہی ہے آپ کی خُدا کے لئے مجھے کچھ تو بتایئے کیا مُصیبت جھیل رہے ہیں آپ تنہا اپنی جان پر۔ مجھے اِس میں شریک کر لیں کیا بات ہے احسان صاحب، خُدا کے لئے"
"مُصیبت... اب یہ مُصیبت تجھے تنہا نہیں گھسیٹنا ہو گی ذکیہ۔ اب تم سب اِس کا شکار ہو گے آہ میں ہار گیا۔ بس میں شاید"
احسان صاحب کے حلق سے سسکی سی نِکل گئی۔ اور ذکیہ بیگم بیقرار ہو گئیں۔
"خُدا کے لئے احسان خُدا کے لئے۔ کچھ تو بتاؤ"
"جاؤ ذکیہ اُسے بُلا کر لاؤ۔ باہر اُس کی گاڑی موجود ہے کہیں وہ نِکل نہ جائے" احسان صاحب نے کہا۔ اور ذکیہ بیگم ہانپتی کانپتی باہر نِکل گئیں۔ شہاب صاحب کے کمرے میں پہنچیں۔ لیکن وہ موجود نہیں تھے۔
"شہاب!" ذکیہ بیگم نے آواز دی اور غُسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن غُسل خانہ خالی پڑا تھا "شہاب کہاں گئے تم؟" اُنھوں نے پھر پُکارا اور پھر اُن کی نگاہ شہاب صاحب کی مسہری پر پڑی۔ تکیے پر ایک لفافہ رکھا تھا: وہ سُن رہ گئیں۔ بمشکل تمام لفافہ اُٹھایا اُس میں رکھا پرچہ نکالا اور پڑھنے لگیں۔ لکھا تھا۔
"بھائی صاحب۔ بھابی جان!
آج مجھے احساس ہو گیا کہ اِس کوٹھی میں میری کیا حیثیت ہے۔ ثناء نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ اُس کی ملکیت ہے یہاں وہ ہو سکتا ہے جو آپ لوگ چاہتے ہیں۔ اِس کے بعد میرے یہاں رہنے کی کیا گنجائش ہے۔ میں اپنے اِس بے حقیقت وجُود کو لے کر کائنات کی وُسعتوں میں گُم ہو جاؤں گا کوئی ایسی جگہ تلاش کروں گا جہاں میرا بھی کچھ ہو۔
جا رہا ہُوں خُدا حافظ!
شہاب"
ذکیہ بیگم پرچے کو دیکھتی رہ گئیں۔ پھر مَرے مَرے قدموں سے باہر نِکل آئیں۔ اِس جنّت کو نظر لگ گئی تھی ————

ذکیہ بیگم کو صُورتِ حال کا تو کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن شہاب صاحب کے سلسلے میں اُن کے وہم و گمان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ شہاب صاحب کسی طور اپنے بڑے بھائی احسان کے لئے نُقصان دہ ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ احسان صاحب نے کچھ ایسے الفاظ ادا کئے تھے جو مشکوک حیثیت رکھتے تھے لیکن ذکیہ بیگم اُن کی گہرائی تک نہ پہنچ سکی تھیں۔ اُس پرچے کو پڑھنے کے بعد اُن کے ذہن میں یہی تصور اُبھرا تھا کہ چونکہ تیمور کے مسئلے میں ثناء نے شہاب صاحب سے بدتمیزی کی تھی۔ یا رِدا کے سلسلے میں شہاب صاحب نے جو الفاظ ادا کئے تھے۔ اور ثناء نے اُن کا جواب تلخ لہجے میں دیا تھا اُس نے شہاب صاحب کو اِس گھر سے بددل کر دیا تھا اور وہ گھر چھوڑ کر ہی چلے گئے تھے۔
شوہر کے کمرے تک واپس جاتے ہُوئے اُن کا دل لرزتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو اور ثناء کو مُجرم سمجھ رہی تھیں۔ دادی امّاں اور احسان صاحب کیا سوچیں گے اپنے دل میں؟
وہ احسان صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ احسان صاحب دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔ قدموں کی چاپ سُن کر اُنھوں نے گردن اُٹھائی۔ ذکیہ بیگم کو دیکھا اور پھر اُن کی متلاشی نگاہیں ذکیہ بیگم کے پیچھے شہاب صاحب کو تلاش کرنے لگیں لیکن شہاب صاحب ظاہر ہے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ ذکیہ بیگم نے لرزتے ہاتھوں سے پرچہ احسان صاحب کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے تعجب سے پُوچھا۔
"دیکھ لیجئے" ذکیہ بیگم کی آواز بڑی مشکل سے نِکلی تھی۔
احسان صاحب نے پرچہ اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور اُسے کھول کر پڑھنے لگے۔ ذکیہ بیگم کی نگاہیں شرم سے زمین میں گڑی تھیں۔ اُن کے کان اب احسان صاحب کے مُنہ سے کچھ الفاظ سُننے کے مُنتظر تھے لیکن جو الفاظ احسان صاحب نے ادا کئے وہ ذکیہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آ سکے تھے احسان صاحب کہنے لگے۔
"ہاں مَردُود۔ احسان فراموش گندے خُون یہی سب کچھ کرنا چاہیئے تھا تجھے۔ اِس کے بعد اِس کھوکھلی دُنیا میں کیا رہ گیا تھا۔ جو تیرے لئے باعثِ کشش ہوتا۔ ذکیہ بیگم! ایک سانپ ہمارے سینے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم سب کو ڈسنے کے بعد وہ بھاگ گیا۔ جو کچھ اُس نے اِس پرچے پر لکھا ہے اُس کی ضرورت ہی کیا تھی کیا جو

کچھ وہ کر چکا ہے اُس کے بعد ان مروّت بھرے الفاظ کی ضرورت باقی رہ ہی گئی تھی۔ ذکیہ! میں تمھیں کبھی پریشان نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو تمھیں کبھی کسی تکلیف کا مُنہ نہیں دیکھنا پڑا۔ کاروباری مسائل اُلجھے ہُوئے ہیں اور بعض اوقات اُن میں ایسی اُلجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کا حل ڈھونڈے نہیں ملتا۔ لیکن ذکیہ! میں نے کبھی تم لوگوں پر ذہنی دباؤ نہیں ڈالا۔ آج صورتِ حال ایسی ہی ہے کہ تمھیں بتانا ضروری ہے تم مجھے مشورہ دو ذکیہ کہ اب میں کیا کروں میرے ہاتھ کٹ گئے ہیں کچھ بھی نہیں رہا اب ہمارے پاس۔"

"خُدا کے لئے بتایئے تو سہی۔ میں تو خود آپ کی صورت دیکھ دیکھ کر اِن دِنوں وحشت کا شکار ہُوں کس پریشانی میں گھرے ہُوئے ہیں آپ۔ کیا ہو گیا ہے آخر! اِس سے پہلے تو کبھی آپ نے ایسی پریشانی کی باتیں نہیں کیں۔ ہمت سے کام لیجئے چہرہ کیسا دُھواں دُھواں ہو رہا ہے۔ شہاب نے کیا کام تھا۔ یہ پرچہ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ہُوا کیا ہے کچھ تو بتائیں آپ۔"

"ذکیہ! شہاب پر مجھے کتنا بھروسہ تھا وہ اگر چاہتا تو میں بڑی خوشی سے سارا کاروبار اُسے سونپ دیتا آخر میرا بھائی تھا۔ جو چاہتا سو کرتا۔ اگر وہ اِس کاروبار میں تبدیلیوں کا خواہشمند تھا اگر اپنے حصّے کا آدھا کاروبار لے کر وہ اپنی صلاحیتیں دِکھانے کی فرمائش کرتا تو خُدا کی قسم میں اُسے کبھی منع نہ کرتا۔ وہ جس طرح چاہتا زندگی گزارتا۔ میں نے تو اُس مردُود پر پُورا پُورا بھروسہ کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ جب تک اُس کا جی چاہے آزادی کی زندگی گزارے، پیشکش بھی کی تھی میں نے اُسے کہ کاروبار دیکھنا چاہے تو جہاں سے دِل چاہے کام شروع کر دے لیکن نہ جانے کب، نہ جانے کیسے ذکیہ وہ بُری عادتوں کا شکار ہو گیا۔ نہ جانے کس سے دوستی رہی اُس کی، نہ جانے کب وہ لوگ نزدیک آ پہنچے اُس کے۔ جو سانپ سے زیادہ زہریلے اور بچھو سے زیادہ کینہ پرور ہوتے ہیں اُنھوں نے شہاب کو اپنی گرفت میں لے کر ہماری گردنوں پر چھُری پھیر دی۔ ہمارے سارے کاروبار ساری دولت شہاب کے ذریعے برباد ہو گئی اُس نے دھوکہ دہی اور فریب کا کاروبار کیا۔ ہماری دولت استعمال کی کہاں کہاں تک بتاؤں تمھیں غلطی میری بھی ہے اندھا پن میں نے بھی اختیار کیا ہے۔ ورنہ اگر نگاہ رکھتا اور تمام چیزوں پر غور کرتا رہتا تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ جائیداد، فیکٹریاں زمینیں تمام کی تمام شہاب کے ذریعے اب دوسروں کی ملکیت بن گئیں۔ شہاب نے اُن پر بڑی بڑی رقمیں وصُول کیں۔ اور نہ جانے کہاں ضائع کر دیں اتنی بڑی بڑی رقمیں کہ آج یہ کہتے ہُوئے شرم آتی ہے کہ میں نے جس کاروبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا اب اُس میں سے کچھ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کروڑوں روپیہ میری کمپنیوں کے نام پر وصُول کیا گیا ہے۔ اور غائب کر دیا گیا ہے اس دولت کا شہاب نے کیا کیا کچھ علم نہیں۔ میرے وکیل سَر مار رہے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ چونکہ جائیداد اگر تقسیم تھی۔ تو دو حصّوں میں اور ایک شخص اُن پر رقومات لینے کا مجاز نہیں ہے۔ لیکن کوئی جان نہیں ہے ہمارے مقدمے میں اور پھر میں کس طرح کہہ سکتا ہُوں کہ شہاب نے فریب کیا ہے میرے ساتھ میرے بھائی نے۔ کیا میں عدالتوں میں کھڑے ہو کر یہ کہوں گا کہ شہاب احمد ولد مقصُود احمد فریب دہی کا مجرم ہے۔ اور اُس نے یہ فریب دہی اپنے بھائی کے ساتھ کی ہے۔ کہہ سکوں گا میں یہ عدالتوں میں؟ سُن سکو گے تم لوگ اور مان سکے گی دُنیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ خود احسان احمد صاحب نے اتنی بڑی بڑی رقومات خورد بُرد کرائیں اور اُس کے بعد بھائی پر الزام لگا کر اُسے فرار کرا دیا یا گرفتار کرا دیا۔ بتاؤ ذکیہ بیگم کر سکتا ہُوں میں یہ سب کچھ اگر کوئی قانونی ذریعہ نِکل آیا۔ اگر تقدیر ہمارا ساتھ دے گئی تو شاید کچھ بچ جائے۔ لیکن اگر یہ نہ ہو سکا تو یہ سمجھ لو کہ یہ عیش و عشرت ختم ہو گئے۔ اور اب ایک تلخ زندگی ہماری مُنتظر ہے۔ میں اپنے خُدا کو یہ امتحان بھی دے سکتا ہُوں ذکیہ۔ یہ اُس کا کرم تھا کہ اُس نے مجھے زندگی کے ایک طویل عرصے تک عیش و عشرت میں بسر کرائی۔ آج وقت بدلا ہے تو میں اپنے خُدا سے شکایت نہیں کروں گا خوف صرف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اُن کے گھروں سے نکال کر میں نے اپنا یہ آشیانہ آباد کیا تھا اب اُن سے کیسے کہوں گا کہ وہ دربدر ہو جائیں بتاؤ۔ ذکیہ بتاؤ کیا کروں میں ایک ہی بیٹی ہے میری اُس کے مستقبل کے لئے جو کچھ کیا تھا میں نے اُس کے چچا نے چھین لیا کیا ہم ثناء کو اب اُس کی آرزوؤں کے مُطابق رُخصت کر سکیں گے؟ ذکیہ میرا دل بند ہُوا جا رہا ہے میرا دِل ڈوبا جا رہا ہے ذکیہ، شاید... شاید میں اِس صدمے کو برداشت بھی نہ کر سکوں"۔ احسان صاحب کی آواز ایک بار پھر سسکیوں میں ڈوب گئی اور ذکیہ بیگم پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑیں۔ پھر احسان صاحب کی خراب حالت دیکھ کر وہ جلدی سے باہر نکلیں

اور دادی امّاں کو بُلا لائیں۔ دادی امّاں بھی احسان صاحب کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں تھیں۔

"ارے کیا ہُوا بیٹے؟ احسان، احسان کیا ہُوا؟ اللہ کے واسطے بتا تو سہی مجھے۔ احسان میرے بچّے دیکھ بتا دے مجھے کیا ہُوا تجھے، دیکھ میں یہ تیری کیفیت برداشت نہیں کر سکوں گی۔ بہو تم ہی بتاؤ خُدا کے لئے۔ کیا ہو گیا ہے احسان کو؟ کیا حالت بنائی ہے تم دونوں نے اپنی۔" دادی امّاں ہراساں ہو گئی تھیں۔ ذکیہ بیگم تو کچھ نہ بول سکیں۔ لیکن احسان صاحب نے دادی امّاں کو تمام تفصیلات بتا دیں۔ دادی امّاں بیچاری پتھر کی بُت کی مانند ساکت رہ گئی تھیں۔ ایک لفظ بھی نہ نکلا اُن کے مُنہ سے وہ بس خاموش بیٹھی بیٹے اور بہو کو دیکھتی رہی تھیں رفتہ رفتہ احسان صاحب نے خود کو سنبھالا اور دادی امّاں کو دیکھتے ہُوئے پھر بولے۔

"امّاں آپ براہِ کرم پریشان نہ ہوں۔ اگر بہتری کی صورت ہوتی تو میں آپ لوگوں کو کچھ نہ بتاتا۔ لیکن میرا تجربہ کہتا ہے بلکہ حالات کہتے ہیں کہ ہم برباد ہو چکے ہیں اور اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شہاب گھر چھوڑ کر چلے گئے اُنھیں جانا ہی چاہئیے تھا۔ کمبخت یہ تو بتا دیتا مجھے کہ یہ دُشمنی اُس نے مجھ سے کیوں کی اگر یہ کروڑوں روپے کی دولت اُس کے پاس محفوظ ہے تو کم از کم بھائی کو جینے کا تھوڑا سا حق ہی دے دیتا۔ اتنا ہی دے دیتا ہمیں کہ ہم در در کے بھکاری نہ ہوتے۔ خاندان کی عزت جائے گی تو کیا لوگ اُسے اچھے نام سے پُکاریں گے اور اگر یہ دولت برباد کر دی ہے تو مجھے بتا تو دیتا کہ اِس بربادی کا ذمّہ دار کون ہے شاید ہم دونوں اُن سے لڑ سکتے لیکن اس موقع پر اُس نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا اور خود فرار ہو گیا۔ امّاں جی مجھے یقین ہے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا اور اُسے آنا بھی نہیں چاہئیے۔ میں آپ لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہُوں کہ جن لوگوں سے میرا لین دین ہے۔ اُن میں سے کسی ایک سے بھی میں رعایت نہیں مانگوں گا۔ سب کی ادائیگیاں کرنی ہیں جو کچھ باقی بچا ہے اُن کے حوالے کرنا ضروری ہے ہو سکتا ہے نوبت اِس عمارت تک پہنچ جائے۔ چنانچہ آپ لوگوں کو بھی ذہنی طور پر اِس کے لئے بھی تیار رہنا چاہئیے۔

"احساں، احسان یہ سب کچھ ہو سکتا ہے یہاں تک بات پہنچ سکتی ہے؟" دادی امّاں نے کہا۔

"ہاں امّاں جی یہاں تک بات پہنچ سکتی ہے..." احسان صاحب نے کہا اور دادی امّاں کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی تھیں۔

●●

"ثناء تین نمبر میں داخل ہو گئی عصمت باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ نُدرت حسبِ معمُول امّاں بی سے لگی ہُوئی تھی۔ اور امّاں بی اُسے غالباً اپنی جوانی کے کچھ قصّے سُنا رہی تھیں۔ دروازے پر آہٹ ہُوئی تو نُدرت نے دروازے کی جانب دیکھا اور ثناء کو پہچان لیا۔ ثناء نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور جھپاک سے باہر نکل آئی۔ چند ہی لمحات کے بعد نُدرت امّاں بی کو چکّر دے کر خود بھی باہر نکل آئی تھی۔

"مالک کی بیٹی خیریت؟ یہ جِن کی طرح اشارے بازی تُو نے کب سے سیکھی؟"

"اے جِن کی سگی کچھ بھی ہو جائے تجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چہرہ ویسے ہی پھُول کی طرح کھلا ہُوا ہے مجھے دیکھ کتنی پریشان ہُوں میں۔"

"تجھے دیکھوں زمانے بھر کی مکّار اتنے بڑے باپ کی بیٹی، لیکن توبہ توبہ شیطان بھی تجھ سے پناہ مانگتا ہو گا۔ چھ گولیاں اور تُو نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں تو تیری دیدہ دلیری پر حیران ہُوں گنتی میں غلطی ہو جاتی تو۔"

"اے چھوڑ یار اِن فضول باتوں کو۔ اصل بات پر تو ہم نے گفتگو ہی نہیں کی۔"

"وہ تیرا ٹریڈ مارک کہاں ہے۔"

"ہیرو؟" ثناء نے پُوچھا۔

"ہاں ہاں اُسی کی بات کر رہی ہُوں۔"

"بھئی اِس وقت ہمیں محترمہ ردا پر رحم آ گیا ہے۔ ماں بیٹے کو بحالت مجبُوری ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ردا بیگم ممتا کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور ہمارے تیمُور کو سینے سے لگائے اپنے کمرے میں چھُپی ہُوئی ہیں یار یہ ساسیں آخری وقت تک بیٹے کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ لیکن نُدرت برائے کرم سنجیدہ ہو جاؤ اور یہ بتاؤ کہ تیمُور کو غائب کس نے کیا؟"

"اللہ کی قسم میں نے نہیں"۔ نُدرت نے دونوں ہاتھ ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر شرارتاً تیمُور کو غائب کیا گیا ہے تو اِس گھر میں شرارت کرنے والا اب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے صرف اللہ رکھی۔ جسے اللہ نے نہ جانے کیوں رکھا ہُوا ہے۔ زمین کا بوجھ بیکار بے مقصد۔"

"آگے بول آگے بول مالک کی بیٹی۔ اللہ رکھی کو غصہ بھی آسکتا ہے شرارت اور مذاق اپنی جگہ لیکن مونا لیزا کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جا سکتے۔ اُس کے ہونٹوں پر تو مسکراہٹ ہی بھلی لگتی ہے۔ یہ کام میں نے نہیں کیا۔"

"یار ندرت پھر ایک ہی شخصیت ہو سکتی ہے اور وہ ہے انکل شہاب کی۔"

"ارے ارے کیا واہی تباہی بکے جا رہی ہے بھلا شہاب صاحب ایسا کیوں کرنے لگے۔" ندرت نے کہا۔

"ایک طرف تو تیمور غائب تھا اور دوسری طرف انکل ردا کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے انھیں تیمور کی گمشدگی کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ جاننا چاہتے تھے کہ ردا گھر تک کیوں آئی ہے کون ہے۔ کیا ہے اُف ندرت کیسی کیسی غلیظ باتیں کی ہیں انھوں نے تم یقین کرو بہت محبت کرتی تھی میں اُن سے۔ ایک ہی چچا ہیں میرے نہ جانے کیا کیا سوچا تھا اُن کے بارے میں میں نے لیکن یار دل کی طرح میری زبان بھی صاف ہے جو کہتی ہوں وہی سوچتی ہوں۔ آج سے مجھے اُن سے نفرت ہو گئی ہے اور اب میں اُن کی صورت دیکھنے کی روادار بھی نہیں ہوں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں ندرت کہ تیمور کی گمشدگی میں انکل کا ہاتھ تھا۔ اور بھی بہت سی باتیں سوچی ہیں میں نے اس درمیان۔ تم سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد اب دادی اماں اور ابو کی ایک میٹنگ بلانا چاہتی ہوں۔ اس میٹنگ میں میں یہ بات منظرِ عام پر رکھوں گی کہ انکل نے ردا کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے اُس کی باز پرس کی جائے اور انکل سے جواب طلبی کی جائے کہ وہ ردا دشمنی پر کیوں آمادہ ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ ردا کے تحفظ کا بندوبست بھی کیا جائے۔ ہمیں اپنے طور پر یہ اندازہ لگانا ہے کہ آخر انکل ردا کے پیچھے کیوں لگ گئے۔ میں بہت غور کرتی رہی ہوں اور اس کے بعد میں نے جو کچھ سوچا ہے تو یقین کر ندرت دُنیا کے بارے میں کبھی اِس انداز سے نہیں سوچا۔ میں نے تو دِلوں میں محبت ہی کے پھول تلاش کیے ہیں۔ کبھی کسی کی ذات سے نفرت میرے سینے میں نہیں اُبھری۔ شرارتوں کی بات دوسری ہے۔ انکل بُرے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ میں اُس وقت سے بات کو یاد کرتی ہوں جب ریلوے اسٹیشن پر انکل کی ملاقات ردا سے ہوئی تھی اور ردا تیمور کو کاندھے سے لگائے کہیں سے آئی تھی۔ شاید تجھے یہ بات معلوم نہ ہو ندرت کہ انکل بے حد مغرور انسان ہیں اپنی سطح سے کم لوگوں کو وہ انسانوں کی صف میں شمار ہی نہیں کرتے۔ وہ انھیں دیکھ کر نفرت کا اظہار کرتے ہیں کوئی ملازم اُن کے لباس کو چھو لے تو وہ اُسے ڈرائی کلین کرائے بغیر نہیں پہنتے۔ اُن کے خیال میں جو مالی طور پر کمزور ہے۔ وہ جسمانی طور پر غلیظ بھی ہے۔ اور غربت کے جراثیم اُس کے ہاتھوں میں چھپے ہوتے ہیں وہ کسی ایسے انسان سے ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتے جس کا لباس بیش قیمت نہ ہو اور جس کی کار معمولی ہو۔ ایسا شخص ردا جیسی بے سہارا لڑکی کو سہارا دے کر کہاں لے جا رہا تھا میں نے بروقت مداخلت کی تو انکل میرے حق میں دستبردار ہو گئے۔ یعنی میں ردا کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اُس وقت انکل کے ذہن میں یقیناً کوئی بُری بات تھی اور اگر میرے پہنچنے سے پہلے ردا اُن کے ساتھ کہیں چلی جاتی تو میں نہیں جانتی کہ وہ کون سی جگہ ہوتی اور اُس کے بعد ردا کا کیا حشر ہوتا۔ ردا بہت گہری لڑکی ہے اُس نے یقیناً اپنے نیک جذبوں کے تحت انکل کی برائیوں کو چھپایا ہوگا۔ ہمارے گھر والوں نے بھی ردا کے ساتھ کوئی کمی نہیں چھوڑی اور یہ الزام بھی لگایا کہ ہو سکتا ہے۔ ردا کے انکل سے خفیہ تعلقات ہوں کتنے مظالم ہوئے ہیں اُس لڑکی پر لیکن یقیناً ایسا نہیں تھا۔ انکل کسی طرح ردا پہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں اور جب ردا نے انھیں تسلیم نہیں کیا تو انکل ردا کے دشمن بن گئے۔ میں نے دُنیا کو دیکھا نہیں ہے ندرت، سُنا ضرور ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بھیڑیئے صرف وہی نہیں ہوتے جو جنگلوں میں مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اور جن کی وحشی زبانیں خون کی تلاش میں باہر نکلی رہتی ہیں۔ بھیڑیئے وہ بھی ہوتے ہیں جنھیں بھیڑ کی کھال میں کہا جاتا ہے۔ اور وہ چہروں پر نقاب سجائے شکار کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انکل جتنے رکیک الزامات ردا پر لگا چکے ہیں۔ اُن کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اُن کی شخصیت بھی سامنے آجاتی ہے۔ خدا کی قسم ندرت میں اپنی ذاتی نفرت کا اظہار نہیں کر رہی۔ بلکہ یہ تمام الفاظ میں نے بہت سوچ سمجھ کر ادا کیے ہیں۔ تو بس مجھے اس سلسلے میں یہ مشورہ دے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ ردا خطرے میں ہے۔ اُس کا تحفظ ضروری ہے۔ ردا اور تیمور کو مصیبتوں سے بچانا میری زندگی کا مشن ہے ندرت۔ اگر انھیں کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو فنا کر لوں گی۔ یہ بات آج میں اُن لوگوں سے بھی کہہ دینا چاہتی ہوں جو صرف دوسروں کے ساتھ رعایت کرنا پسند

کرتے ہیں۔ ارے کسی کو اپنے گھر میں پناہ دے دینا اور روٹی کھلا دینا ہی تو نیکی نہیں ہے۔ عزتِ نفس کا تحفظ بھی تو ہم پر عائد ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو پھر کیا کیا ہم نے؟"

"تو بہت پُرجوش ہے ثنا۔ شہاب صاحب کی مخالفت کر سکتی ہے۔ اُس طوفان سے نمٹ سکتی ہے جو اُس مخالفت کے بعد سر اُٹھائے گا؟"

"ثناء کو جانا نہیں تو نے ابھی ندرت، صرف میری ہنسی اور میری شرارتوں کو ثناء سمجھ لینا نادانی ہے تم لوگوں کی، میں کیا کروں؟ بول تو مجھے کوئی ڈھنگ کی بات بتا سکتی ہے؟"

"بھئی مالک کی بیٹی۔ تم ایک غریب ڈرائیور کی اولاد سے مالکوں کے بارے میں مشورہ لے رہی ہو۔ معاف کرنا میں بھی یہ الفاظ سنجیدگی ہی سے کہہ رہی ہوں۔ یار تیری شرارتوں کے معاملے میں تو میں نے دِل کھول کر تجھ سے سب کچھ کہہ دیا ہے لیکن یہ گھریلو معاملہ ہے جہاں تک ردا کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے وہ چھوڑنے کی چیز نہیں اور نہ ہی اُسے کسی دکھ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میں اپنی ہر خدمت ردا کے مسئلے پر تجھے پیش کر سکتی ہوں ثناء لیکن خدا کے لئے اِس معاملے میں مجھ سے کچھ مشورہ نہ لے شہاب صاحب تیرے چچا ہیں۔ آج اگر میں کوئی غلط بات کہہ بیٹھی تو کل کہیں تیرے دِل میں کوئی برائی نہ پیدا ہو جائے۔"

"میں چلتی ہوں ندرت وقت ضائع کیا ہے۔ تیرے پاس بڑا وقت لگے گا تجھے ثناء کو سمجھنے کے لئے۔ اچھا ٹھیک ہے۔" ثناء نے کہا اور اچانک ہی اُٹھ گئی۔ ندرت اُسے دیکھتی رہ گئی تھی ویسے اُس نے ثناء کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ واقعی معاملہ ایسا ہی تھا کہ اِس سلسلے میں بولتے ہوئے ندرت کو جھجک ہو رہی تھی۔ ثناء ذہنی طور پر اُلجھی ہوئی تھی جو واقعہ پیش آچکا تھا اُس نے نہ جانے کیوں اُسے ذہنی کرب کا شکار کر دیا تھا۔ تاہم کم از کم ردا کے مسئلے میں وہ کسی تساہلی سے کام نہیں لے سکتی تھی۔ ندرت سے واقعی اِس سلسلے میں اُسے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ وہ غلام احمد کی بیٹی تھی اور غلام احمد احسان صاحب کے ڈرائیور تھے۔ دوستی اپنی جگہ۔ اگر کوئی بات سامنے آگئی۔ تو بیچاری ندرت کے لئے تو کوئی پناہ گاہ بھی نہ ہوگی۔ چند لمحات تک وہ کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں چہل قدمی کرتی رہی اور پھر یہ آخری فیصلہ کرنے کے بعد کہ ماں باپ کو اِس مسئلے کو تفصیل سے بتا دے۔ اندر چل پڑی۔ احسان صاحب کی کار کھڑی ہوئی تھی اور شہاب صاحب کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ اچھا ہے بات کچھ صاف ہو جائے۔ جب وہ اندرونی حصے میں پہنچی تو اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ذکیہ بیگم دادی اماں کو سنبھالے ہوئے احسان صاحب کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ دونوں کا انداز ایسا تھا جس سے ثناء کو کچھ شبہ ہوا اور وہ چھپ گئی کیا معاملہ ہے یہ جاننے کا تجسس اُس کے ذہن میں اُبھر آیا تھا۔ ذکیہ بیگم دادی اماں کو لے کر اندر داخل ہو گئیں۔ اور دروازہ بند ہو گیا لیکن ثناء جانتی تھی کہ اندر کی باتیں کس جگہ سے سُنی جا سکتی ہیں چنانچہ وہ تیزی سے ایک راہداری عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گئی اور پھر احسان صاحب کے کمرے کی اُس عقبی کھڑکی تک پہنچنا اُس کے لئے مشکل کام نہ تھا۔ جو عموماً کھلی رہتی تھی اور جس سے اندر کی باتیں سُنی جا سکتی تھیں۔ اُس نے اندر کے ماحول پر نگاہ ڈالی اور ایک لمحے کے لئے اُس کا دِل دھک سے رہ گیا۔ اندر تاریکی نہیں تھی روشنی میں احسان صاحب کا اُترا اُترا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اپنے ابو کو اِس سے پہلے اُس نے کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اُن کے چہرے پر تو ہمیشہ ایک پُراعتماد مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی اور یہ مسکراہٹ اُس کوٹھی میں رہنے والے ہر فرد کو یہ یقین دِلاتی تھی کہ اُسے مکمل تحفظ حاصل ہے۔ لیکن آج احسان صاحب کا چہرہ اک ایسے خوف کا شکار نظر آ رہا تھا کہ یقین نہ آئے۔ ثناء کے کان کھڑکی سے جا لگے اور وہ اندر ہونے والی گفتگو سننے لگی جو اُس کیلئے ناقابلِ فہم تھی لیکن جو الفاظ وہ سُن رہی تھی۔ وہ اُسے بھی کسی حد تک حالات کا احساس دِلاتے تھے۔ ثناء دنگ رہ گئی۔ اپنے گھر اپنی جنت کے بارے میں اُس نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اِس جنت پہ کوئی زوال آسکتا ہے لیکن آج احسان صاحب کے الفاظ بتا رہے تھے کہ یہاں بھی کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی ایسا حادثہ کوئی ایسا واقعہ جو اِس جنت کو تہہ و بالا کر دے۔ ثناء نہ جانے کب تک کھڑکی سے لگی رہی تھی۔ آج اُس کے اندر نئی کیفیت بیدار ہوئی تھی۔ اُسے اپنا وجود بہت ہلکا ہلکا سا لگ رہا تھا اور دِل میں خوف کا ایک احساس اُبھر رہا تھا۔ پھر وہ نہ جانے کب اور کس طرح وہاں سے ہٹی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل پڑی۔ کمرے میں پہنچ کر وہ مسہری پر گر پڑی تھی۔ بات اب بھی اُس کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس کا جی بھر آ رہا تھا اور آنکھیں آنسو برسانے کے لئے بے تاب تھیں۔ اُس نے تکیہ اپنے چہرے پر رکھ لیا۔

" شہاب صاحب کو اندازہ ہوگیا تھا کہ تمام مُہرے پٹ گئے ہیں جن جن لوگوں کی معرفت کام کر رہے تھے اور جو اُن کے کاروبار کے اہم ستُون تھے وہ سب کے سب پولیس کی تحویل میں جاچکے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ اُن کی وہ خُفیہ پناہ گاہ، جہاں خود اُن کے اپنے کاغذات محفُوظ تھے اور جس کے بارے میں صرف چند ہی گنے چُنے لوگوں کو علم تھا، نگاہوں میں آچکی تھی۔ اور وہاں تلاشی لے کر وہ تمام کاغذات حاصل کر لئے گئے تھے جو شہاب صاحب کی گردن میں پھندا بن سکتے تھے۔ اُنھیں اِس بات پر شدید حیرت تھی کہ اگر یہ پولیس کی کارروائی ہے تو پولیس اُس عمارت میں اُن کے استقبال کے لئے موجود کیوں نہ تھی اِس سے صاف ظاہر تھا کہ اُن کے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے اور یہ تمام چیزیں خُفیہ طور پر تحویل میں لے لی گئیں ہیں۔ ذہن مختلف لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور بالآخر اُنھوں نے یہی سمجھا تھا ... ردا کسی کی آلۂ کار ہے۔ اور تیمُور کو غائب کروانے کے بعد ردا کی زبان کھُلوائی جاسکتی ہے کہ بھلا شہاب صاحب کا دُشمن کون ہے۔ کوٹھی میں آکر اُنھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ اِس سوچ کا ردِعمل تھا، لیکن اِس کے بعد کوٹھی میں رُکنا مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب زیادہ وقت نہیں جارہا کہ پولیس اُن کی بھی گردن ناپ لے گی اور اُس کے بعد اُن کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں رہے گا۔ کوٹھی سے کچھ نہیں لینا تھا۔ اب تو یہ دوسروں کی ہی ملکیت تھی۔ اپنی گاڑی بھی اُنھوں نے اِس لئے ساتھ نہیں لی، کہ وہ اِس گاڑی کے ساتھ پہچانے جاتے تھے یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ کسی چیز کا لالچ کیا جائے۔ اپنا تحفظ مشکل ہو رہا تھا لیکن اپنے اُس دُشمن کے لئے اُن کے دِل میں شدید نفرتیں سَر اُبھار رہی تھیں۔ جس نے یہ سب کچھ کیا اور کوٹھی سے خفیہ طور پر نکلتے ہُوئے اُن کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ تیمُور کے ذریعے ردا کے حواس درُست کئے جاسکتے ہیں چار دِن تیمُور گھر سے غائب رہے گا تو ردا کو اپنی حقیقت معلوم ہو جائے گی اور اُس کے بعد اُسے زبان کھولتے ہی بن پڑے گی۔ اپنے دُشمن کے بارے میں جاننے سے پہلے وہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے کم از کم اِس طرح یہ اندازہ تو لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کون ہے جو اُنھیں برباد کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ وہ ڈُوبنے سے بچ جائیں۔ پناہ گاہیں اُن کے لئے اور بھی بہت سی تھیں۔ لیکن اب یہ خوف تھا کہ اُن کے دُشمن ایک ایک جگہ کی نشاندہی کرتے پھر رہے ہوں گے اور اگر وہ اپنی کسی جانی بُوجھی پناہ گاہ میں جائیں تو ممکن ہے پولیس اُن کی وہاں مُنتظر ہو۔ شدید بے بسی کا احساس ہو رہا تھا ایسے حالات میں شہر سے باہر بھی جا سکتے تھے اور ملک سے باہر بھی۔ لیکن یُوں میدان چھوڑ کر بھاگنا اُنھیں پسند نہیں تھا۔ کہاں جانا چاہیئے کون سی جگہ ایسی ہو سکتی ہے جو اِس وقت اُن کے لئے بہتر ثابت ہو سکے۔ کوٹھی سے باہر نکل کر دیر تک سوچتے رہے اور دفعتاً ہی اُن کے ذہن میں رحمت اور جلیل خاں آئے۔ دونوں افراد اُن کے شناسا تھے۔ جلیل خاں ایک جرائم پیشہ آدمی تھا اور مختلف قسم کی بُرائیوں میں ملوّث رہ چُکا تھا۔ ایک دفعہ شہاب صاحب سے ٹکراؤ ہوگیا تھا اور شہاب صاحب نے کسی وجہ سے اُس پر کچھ احسانات کر دیئے تھے اُس کے بعد جلیل خاں اُن کا ممنون ہو گیا تھا۔ کام کا آدمی تھا اور شہاب صاحب کو ایسے لوگوں کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے مستقل جلیل خاں کی کفالت شروع کر دی تھی اور اِس وقت تیمور کو چھپانے کے لئے اُنھیں جلیل خاں کے گھر سے زیادہ بہتر کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔ اور اب جب کہ اُنھیں اپنی پناہ گاہیں مخدوش نظر آئیں تھیں۔ اُنھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اِن حالات میں جلیل خاں کے گھر پناہ لی جائے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جلیل خاں جیسے لوگوں کے گھر میں قدم رکھنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے لیکن مُصیبت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنایا جا سکتا ہے۔ اِس قول کے مصداق اُنھوں نے بالآخر یہی فیصلہ کیا تھا کہ جلیل خاں کا گھر سب سے بہتر ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹیکسی نے اُنھیں اُس علاقے میں چھوڑ دیا۔ یہاں سے پیدل تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جلیل خاں کے گھر میں داخل ہو سکتے تھے اُن کی نِگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ اور وہ محتاط انداز میں راستہ طے کر رہے تھے کہ کسی کی نِگاہ اُن پر تو نہیں ہے۔ لیکن ابھی نوبت یہاں تک نہیں پہنچی تھی کہ اُن کا تعاقب کیا جاتا۔ جلیل خاں کے دروازے کی زنجیر بجائی تو دروازہ رحمت نے کھولا اور شہاب صاحب کو دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

" اللہ جی آجایئے اندر آجایئے" اُس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

" جلیل خاں کہاں ہے؟"

" بازار گیا ہے ذرا ابھی آجائے گا"۔

" بچّہ کیا کر رہا ہے؟" شہاب صاحب نے پُوچھا۔ اور رحمت جو واپس دالان کی طرف مُڑ گئی تھی چونک کر پلٹی اور شہاب صاحب کی صُورت دیکھنے لگی۔

" میاں وہ آپ ہی کے پاس، آپ کے پاس ہوگا ...؟"

شہاب صاحب پر جیسے بجلی گری تھی۔ اُن کا پُورا وجُود لرز کر رہ گیا۔ اور وہ رحمت کی آواز کی بازگشت کانوں میں محسوس کرنے لگے۔ کیا جو کچھ اُنھوں نے سُنا ہے رحمت نے وہی کہا ہے۔ رحمت کے چہرے پر خود بھی حیرت کے نقوش تھے۔ وہ جلدی سے بولی۔

" میاں جی کیا؟"

" کیا بکواس کر رہی ہو رحمت۔ بچّہ کہاں ہے؟"

" میاں جی آپ ہی نے تو گاڑی میں منگوا لیا تھا اللہ قسم اُسی وقت اُسی لمحے آپ کا ڈرائیور لے گیا تھا"۔

" رحمت مجھے جانتی ہو اِتنے ٹکڑے کروں گا کہ گِن بھی نہ سکو گی۔ بچّہ کہاں ہے؟" شہاب صاحب غرّائے۔ اور رحمت چیخ مار کر دیوار سے ٹک گئی۔

" اللہ جی یہ کیا ہوگیا۔ ہائے میں مر جاؤں ارے جلیلو تیرا ستیاناس تو بھی دھوکا کھا گیا۔ ساری چالاکی دھری رہ گئی۔ میاں جی آپ نے بچّہ نہیں منگوایا تھا؟" رحمت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ اور شہاب صاحب پتھرائی ہُوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً عقب سے دروازے پر آہٹ ہُوئی اور جلیل خاں اندر آگیا۔ شہاب صاحب کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

" ارے میاں جی آپ۔ ہم تو ویسے بھی آپ کا انتظار کر رہے تھے پیسے تو دے دیئے آپ نے مگر کام کچھ نہ لیا۔ میاں جی بچّہ واپس کیوں نہیں آیا؟"

" جلیل خاں مجھے جانتے ہو؟ جانتے ہو مجھے؟ چھ گولیاں اُتار دُوں گا تمھارے بدن میں۔ بتاؤ بچّہ کہاں ہے؟ کس کی سازش میں شریک ہو تم؟ اگر پندرہ منٹ کے اندر اندر بچّہ میرے حوالے نہ کیا جلیل خاں تو اپنی اور رحمت کی موت کے ذمّہ دار تم خود ہوگے"۔ شہاب صاحب کے لہجے میں ایک خونخوار کیفیت تھی جلیل خاں ڈر گیا اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں تھیں۔ رحمت بھی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

" اللہ جی! اللہ جی، جبھی تو میں کہوں"۔ رحمت کے مُنہ سے خوف زدہ سی آواز نکلی۔ شہاب صاحب کڑی نگاہوں سے دونوں کو گھُور رہے تھے۔ جلیل خاں نے ہاتھ جوڑتے ہُوئے کہا۔

" مجال ہے ہماری میاں جی کہ آپ کے خلاف کسی سازش میں شریک ہوں۔ میاں جی کوتاہی ضرور ہُوئی ہم سے فوراً ہی ہم نے یہ سوچا تھا مگر دھوکا کھا گئے۔ جیسے ہی آپ بچّے کو دے کر یہاں سے باہر نکلے ویسے ہی وہ آدمی اندر آگیا تھا۔ اُس نے کہا کہ بچّے کو ذرا تھوڑی دیر کے لئے دیں ابھی واپس آجائے گا میاں جی ڈرائیور کی وردی پہنے ہُوئے تھا وہ۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگا کہ آپ کا ڈرائیور ہے۔ آپ جو بچّہ ابھی دے گئے ہیں اُسے آپ نے تھوڑی دیر کے لئے بُلایا ہے۔ غلطی یہ ہوگئی میاں جی کہ مجھے خود بھی اُس کے ساتھ باہر آنا چاہیئے تھا۔ میاں جی آپ نے جو کچھ سُنایا ہے۔ وہ... وہ"

" میاں جی کے بچّے۔ میں کبھی ڈرائیور نہیں رکھتا۔ خود ہی گاڑی چلاتا ہُوں اور پھر جب میں نے بچّے کو اِتنی رازداری سے تیرے پاس چھوڑا تھا تو کسی اور کے ذریعے اُسے باہر بُلانے کا کیا سوال تھا۔ جلیل خان یہ صرف تیری ذِمّہ داری ہے تُو نے اِس وقت مجھے جس ذہنی صدمے سے دوچار کیا ہے میں اُسے معاف نہیں کروں گا"۔

" میاں جی، میاں جی بڑی بدقسمتی ہے ہماری میاں جی ... معاف کر دیں میاں جی"۔

" جبھی تو میں کہوں"۔ رحمت کی کپکپاتی آواز اُبھری شہاب صاحب کے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ یہ انوکھا واقعہ اُن کے لئے انتہائی حیران کُن تھا۔ وہ کون ہے جو اُن کے پیچھے لگا ہُوا ہے۔ اُن کی اپنی خصُوصی رہائش گاہ میں ریکارڈ کی چوری! اِس کے بارے میں اُنھیں اندازہ تھا کہ یہ پولیس کا کام نہیں ہے اور پھر تیمُور کے مسئلے میں اِتنا فوری قدم۔ تیمُور چند لمحات کے لئے بھی پوشیدہ نہ رہا تھا۔ یہ کام کسی ایسے شخص کا ہے جو ہر لمحہ اُن پر نِگاہ رکھ سکتا ہے۔ یہ شخص کم از کم ردا نہیں ہو سکتی۔ دوسری بات ہے کہ ردا کا کوئی متعیّن کردہ کوئی شخص دوسرا ہو سکتا ہے۔ تیمُور ہاتھ آکر نکل گیا تھا۔ لیکن اب شہاب صاحب کو حالات سے کوئی اُمید نہیں رہی تھی۔ تیمور اگر اُن کے قبضے میں ہوتا بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ گھر سے بھی نکل چکے تھے یہ معلوم ہونا بھی مشکل تھا کہ تیمور گھر پہنچا یا کہیں اور؟ اِس وقت تو سر چھُپانے کا مسئلہ سب سے ٹیڑھا تھا۔ جلیل خاں کے گھر اِس لئے آئے تھے کہ کوئی

سوچ بھی نہیں سکتا کہ شہاب جیسی شخصیت ایسی گھٹیا حرکت کر سکتی ہے۔ لیکن یہ حرکت بھی کسی کی نگاہ میں آگئی تھی۔ نہ صرف نگاہ میں آئی تھی بلکہ وہ نامعلوم شخصیت تیمور کے سلسلے میں شہاب صاحب کو چوٹ بھی دے گئی تھی۔ کون ہو سکتا ہے آخر وہ کون ہو سکتا ہے؟ شہاب صاحب کو جلیل خاں اور رحمت پر سخت غصّہ آرہا تھا۔ لیکن اِن دونوں کو کچھ کہنا بھی بیکار ہی تھا۔ اِس سے نتیجہ بھی کیا حاصل ہوتا۔ دونوں ہی شرمندہ نظر آرہے تھے۔ یہاں رُکنا شہاب صاحب کے لئے خطرناک تھا۔ چنانچہ وہ دروازے کی جانب واپس مُڑ گئے عقب سے رحمت کی آواز آئی تھی۔

"اللہ جی!"

اِس سے زیادہ شہاب صاحب نے کچھ نہ سُنا۔ اب اُن کے اندر ایک خوف سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نامعلوم شخصیت کون ہے؟

✤

توقیر صاحب کی فرم تو بند ہی ہو گئی تھی۔ اِس کے بعد ملازمت وغیرہ کا کیا سوال تھا۔ اور پھر جو حادثہ پیش آیا تھا۔ اُس نے رِدا کے اعصاب بیکار کر کے رکھ دیئے تھے وہ جانتی تھی کہ تیمور کو کون لے گیا تھا۔ شہاب صاحب نے جو دھمکی دی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے اِس میں صرف وارننگ کی حد تک ہی عمل کیا تھا۔ اور تیمور کو واپس اُس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ لیکن رِدا جانتی تھی کہ اب اِس عمارت میں رہنا کسی طور ممکن نہیں ہے۔ ثناء کی محبت اُس کا سب کچھ قابلِ قدر تھا۔ لیکن بات اگر تیمور کی ذات تک پہنچ جائے تو رِدا کے لئے اُسے نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ یہ رات اُس کے لئے شدید بے چینی کی رات تھی۔ گزارے گزر نہ رہی تھی۔ ثناء نے تیمور کو پھر اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور رِدا اُسے منع نہیں کر سکی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس کا دِل بار بار دھڑک اُٹھتا تھا اُسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی ایسی مجبوری نے شہاب صاحب کو تیمور کو کوٹھی سے باہر لے جانے سے روک دیا ہے۔ جو اِس وقت اُن کے لئے ناگزیر تھی۔ ورنہ دوبارہ جب بھی اُنھیں موقعہ ملے گا وہ ضرور تیمور کو غائب کر دیں گے اور تیمور؟ رِدا کا دِل اُچھل کر اُس کے حلق میں آجاتا تھا۔ جب وہ یہ سوچتی کہ تیمور اُس سے جُدا ہو جائے گا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہُوئے اُس نے کئی بار یہ سوچا کہ تیمور کو ثناء کے پاس سے لے آئے لیکن اُس نے اگر ایسا کیا تو ثناء اپنے دِل میں کیا سوچے گی نہی کہ رِدا ثناء کی طرف سے بھی بددِل ہو گئی ہے۔ آہ میں کیا کروں؟ وہ اپنے

بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر جب دِل کی حالت سنبھالے نہ سنبھل سکی تو اُٹھی اور کمرے کے دروازے سے باہر نکل آئی۔ راہداری میں چلتی ہُوئی نیچے پہنچی اور پھر ثناء کے کمرے میں جھانکنے لگی۔ مدّھم روشنی ہو رہی تھی اور تیمور ثناء سے لپٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس نے دروازے کو تھوڑا سا اندر دبایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کسی قدر اطمینان ہُوا۔ اور وہاں سے واپس پلٹ پڑی۔ لیکن اُس سے چند قدم کے فاصلے پر خیر دین کو کھڑے دیکھ کر اُس کے بدن میں سرد لہریں دوڑ پڑی تھیں۔ اِتنی رات گئے خیر دین یہاں کیا کر رہا ہے۔ خیر دین اگر رِدا کی نگاہ سے چُھپنا چاہتا تو اُسے کوئی دِقت نہ ہوتی۔ لیکن اُس نے جان بُوجھ کر رِدا کے سامنے سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پھر اُس نے اُنگلی سے رِدا کو اشارہ کیا اور رِدا کسی سحرزدہ شخصیت کے مانند اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ خیر دین رِدا کے کمرے تک آگیا تھا۔ اور پھر اُس نے اپنے مخصوص انداز میں رِدا سے کہا۔

"وہ جی کہتے ہیں نہ کہ خلاق بھی کوئی چیز ہوتے ہیں نا اب آپ یہاں تک آگئی ہو تو مجھے اپنے کمرے میں بھی آنے کے لئے بھی کہو گی"۔ رِدا کا پُورا بدن پسینے میں نہایا ہُوا تھا سانس تیز چل رہا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر پہنچی اور پھر اُس نے خیر دین کو بھی اندر بُلا لیا۔

"او جی سلام علیکم"۔ خیر دین نے کہا۔

"بیٹھو بیٹھو"۔ رِدا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہُوئے بولی۔ اور خیر دین دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔ رِدا اُسے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ اُس نے کہا۔

"خیر دین اللہ کے واسطے میری کچھ پریشانی کا خیال کرو۔ اِس وقت میں بہت پریشان ہُوں۔ دیکھو نیند تک نہیں آئی مجھے۔ کیا تم اِن حالات میں بھی مذاق کر سکتے ہو؟"

"لو جی کمال ہے بھئی۔ ہم نے کون سا مذاق کیا ہے؟ رِدا بی بی جی"۔ خیر دین نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا۔

"اُوپر کیوں نہیں بیٹھتے؟" رِدا جھنجھلا کر بولی۔

"او ہو جی بس کیا کریں۔ ذرا اچھا خون ہے بدن میں اور ہم ذرا اپنی اوقات کا خیال رکھتے ہیں۔ اب دیکھو نہ رِدا بی بی جی ہم سے تو یہ بھی نہ پوچھا گیا کہ ہم کیوں جاگ رہے تھے...؟ وہ جی غریب آدمی کا تو کوئی مقام ہی نہیں ہوتا۔ چلو جی ٹھیک ہے۔ ہم اُوپر بیٹھے جاتے ہیں۔ مالکوں کو ناراض کرنا اچھا بھی تو نہیں لگتا"۔ خیر دین کرسی پر بیٹھ گیا۔ رِدا واقعی چونک پڑی تھی اُس

نے پریشانی کے عالم میں یہ بات نہیں سوچی تھی کہ خیر دین اِس وقت کیوں جاگ رہا ہے؟ وہ خود تو اِن حالات سے پریشان تھی۔ لیکن خیر دین۔ رِدا نے تعجب سے اُسے دیکھا اور بولی۔

"ارے ہاں واقعی تم کیا کر رہے تھے وہاں گیلری میں"۔

"وہ جی بس مچھر پکڑنے نکلے تھے۔ تیس مار خاں بننا چاہتے تھے"۔ خیر دین نے کہا۔

"وہ مکھیاں مار بنتے ہیں کمبے"۔ رِدا نہ جانے کیوں بے اختیار مُسکرا دی۔

"بس جی یہ ہی تو چھوٹے اور بڑے کا فرق ہے۔ مکھیاں اپنی کون سی دوست ہیں یا مچھر ہی بیچارے کون سے دشمن ہیں؟ اتنی اتنی سی باتیں نہ پکڑا کریں رِدا بی بی جی"۔

"تم باز نہیں آؤ گے نا؟ میری پریشانی کا تمھیں کوئی خیال نہیں ہے؟"

"خیال تھا جی۔ ورنہ ہم کیوں جاگ رہے ہوتے؟"

"اب تم نے میرے ذہن کو ایک چکر میں پھنسا دیا۔ بتاؤ تم کیوں جاگ رہے تھے اور وہاں کیا کر رہے تھے"۔

"آپ وہاں کیا کرنے پہنچی تھیں؟ رِدا بی بی جی؟"

"مَیں... مَیں... کیا تمھیں آج دن کا واقعہ معلوم نہیں ہے؟ کیا یہ بات تمھیں معلوم نہیں ہے کہ تیمور کو؟"

"وہ جی ہاں سُنا ہے کہ تیمور بابا غائب ہو گئے تھے اور پھر سُنا ہے کہ دوبارہ اپنے کمرے میں پائے گئے"۔

"ہاں ہاں اگر تمھیں ہم سے دلچسپی ہو تو ایسی باتوں پر توجہ دو۔ ظاہر ہے یہ باتیں تم صرف سُن ہی سکتے تھے"۔ خیر دین کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"چلئے جی آئندہ ہم سُنا بھی نہیں کریں گے"۔

"تم پھر بات گول کر گئے۔ تم وہاں گیلری میں کیا کر رہے تھے؟"

"کہہ دیا نا جی پہرہ دے رہے تھے۔ اب دیکھئے نا جو آدمی تیمور کو ایک بار اُٹھا کر لے گیا وہ اپنی ناکامی کے بعد دوبارہ بھی کوشش کر سکتا ہے"۔

"کیا؟" رِدا تعجب سے بولی۔

"ہاں جی اُس کے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہیں ہو گا کہ اُس کی چال اِس طرح ناکام ہو گئی۔ پر کبھی کبھی ہی تو خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر ۱۸ ضلع گوجرانوالہ کو موقعہ ملتا ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو فلمی ہیرو بنا سکے۔ ارے رِدا بی بی جی آپ ہم پر کتنے ہی الزامات لگا لو۔ جو آپ کی مرضی آئے کہہ لو پر خیر دین کبھی اِس

بات سے بددِل نہیں ہو گا اور جو کچھ اُس کا فرض ہے۔ وہ پُورا کرتے رہیں گے"۔

"تم... تم کہنا کیا چاہتے ہو خیر دین؟"

"لو جی اب ہمارا احسان اپنے کندھوں پر رکھ لو۔ پر کندھوں میں درد ہونے لگے تو بتا دینا تو ہم تھوڑا سا احسان کم کر دیں گے۔ ہم اپنا یہ احسان آپ کو بتاتے بھی نہیں بی بی جی۔ پر آپ کو ہوشیار کر دیں آپ کا کیا خیال ہے جی۔ تیمور بابا کو کون لے گیا تھا"۔

"مَیں... مَیں اُس کا نام لیتے ہُوئے ڈرتی ہُوں"۔

"ہاں جی ہاں۔ خیر دین کے سامنے تو آپ کو اُس کا نام بھی نہیں لینا چاہیئے۔ خیر دین پیٹ کا ہلکا آدمی ہے۔ ساری باتیں بتا دے گا کسی نہ کسی کو"۔

"تم جانتے تو ہو۔ بتا تو چکی ہُوں میں تمھیں مَیں دعوے سے کہتی ہُوں کہ تیمور کو شہاب صاحب ہی اُٹھا کر لے گئے تھے مجھے دھمکی دینے کے لئے"۔

"اور پھر واپس بھی لے آئے۔ کیوں جی یہ ہی بات ہے نا؟"

"ہاں شاید وہ مجھے وارننگ بھی دینا چاہتے تھے"۔

"دیکھو بی بی جی قسم لے لو تم سے کہ اگر ہم کسی بُری نیت سے یہ بات آپ کو بتا رہے ہُوں۔ ہم اِس لئے آپ کو غلط فہمی سے نکالنا چاہتے ہیں کہ آپ دھوکہ نہ کھا جائیں۔ آپ کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے ہم سے جب تیمور بابا کے سلسلے میں خدشے کا اظہار کیا تھا تو ہم نے ڈیوٹی بنا لی کہ تیمور بابا پر نظر رکھیں۔ جب شہاب صاحب تیمور بابا کو اُٹھا کر تیزی سے باہر نکلے تو ہم اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ اور ہم نے اُنھیں نظروں سے اوجھل نہیں کیا۔ شہاب صاحب ایک بہت خراب سے محلّے میں ایک گھر میں داخل ہُوئے اور وہاں تیمور کو چھوڑ کر باہر نکل آئے جب اُن کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ہم جلدی سے اُس گھر میں پہنچے۔ ہم نے ڈرائیور کی ٹوپی پہن رکھی تھی جی۔ ہم نے اُس گھر میں دستک دی اور کہا وہ بچّہ جو شہاب صاحب دے گئے ہیں تھوڑی دیر کے لئے ہمیں دے دیا جائے صاحب نے اُسے اپنی گاڑی میں منگوایا ہے۔ ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ لوگ کچھ سوچ نہیں سکے اور اُنھوں نے بچّہ ہماری گود میں دے دیا۔ تو ہم خاموشی سے اُسے وہاں سے لے کر چل پڑے۔ کوٹھی کے حالات ہمیں معلوم نہیں تھے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ خطرہ بھی تھا کہ بچّہ فوراً ہی اُن لوگوں کے پاس نہ پہنچا تو وہ لوگ شہاب صاحب کو بتا نہ دیں۔ چنانچہ ہم کافی

دیر تک تیمور بابا کو لے کر اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور اُس کے بعد ہمیں جونہی موقعہ ملا ہم نے انھیں ثناء بی بی کے کمرے میں پہنچا دیا۔ لیکن اُس وقت بھی ہماری نگاہیں اُسی پر تھیں۔ اب جی آپ ہمیں کچھ بھی کہہ لو ردا بی بی۔ اِس وقت بھی ہم اِس لئے جاگ رہے ہیں۔ کہ کہیں شہاب صاحب اپنی ناکامی سے بددل ہو کر دوبارہ بابا کو اغواء کرنے کی کوشش نہ کریں۔" ردا کا سانس اُوپر کا اُوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ وہ اپنے چکراتے ہوئے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ احسان خیر دین نے کیا ہے اُس پر کسی نے سوچا بھی نہ تھا خیر دین، خیر دین، ہاں اُس کا سب سے بڑا محسن اُس کا سب سے بڑا محسن، وہ بے اختیاری کے انداز میں اُٹھی آگے بڑھی اور کپکپاتی ہوئی خیر دین کے پاس جا کر اُس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اُس کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو چھلک رہے تھے اور خیر دین کے چہرے سے حماقت کی وہ نقاب سرک گئی تھی جس کو وہ ہمیشہ اپنے چہرے کو چھپانے کی غرض سے ڈالے رہتا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ایسے جذبے کا اظہار ہو رہا تھا جس کو اگر ردا پڑھ لیتی تو پتہ نہیں اُس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی۔ تاہم وہ اِس وقت بڑی محبت اور بڑے جذبات کے ساتھ خیر دین کے ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اُس کے ہاتھوں کا لمس اُس کی گرفت الفاظ بن گئے تھے وہ ممنونیت کے الفاظ اپنے منہ سے نکالنے کے قابل نہیں تھی۔ لیکن اُس کی گرفت سب کچھ کہہ رہی تھی۔ خیر دین نے اُس کے ہاتھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ردا بی بی۔ جب خیر دین نے آپ کی حفاظت اپنے شانوں پر سنبھالی ہے تو آپ کو اُس پر بھروسہ کرنا ہی چاہیئے۔ بار بار بھروسے کا نہ اظہار کر کے آپ خیر دین کا دل توڑ دیتی ہیں۔" ردا نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور نہ جانے کیوں اُس کے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اُس نے آہستہ سے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹا لئے تھے تب خیر دین نے کہا۔

"جائیں جی سلام علیکم" اُس نے ہلکا سا رُخ بدلا ہی تھا کہ ردا نے لپکے سے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں خیر دین ابھی نہیں جاؤ۔ بیٹھو!"

"وہ جی جوان لڑکی ہیں آپ اور رات بہت ہو چکی ہے۔ خیر دین اِس کمرے میں ہوا اور کسی نے دیکھ لیا تو آپ کی کیا عزت رہ جائے گی۔"

"لعنت بھیجو عزت پر۔ بیٹھو۔ اب میں کوئی بات نہیں سنوں گی" خیر دین ایک بار پھر بیٹھ گیا تھا۔ ردا خود بھی اُس کے سامنے بیٹھ گئی اور پھر اُس نے کہا۔

"میں تمہارا کوئی شکریہ بھی نہیں ادا کروں گی بس نہیں ادا کروں گی۔ سوچنا بھی مت کہ میں کسی احسان کے بدلے میں تمہارا شکریہ ادا کروں گی۔ یہ الفاظ تمہاری محبت کا بدل نہیں ہو سکتے۔"

"او جی وعدہ کرتی ہو ردا بی بی" خیر دین نے کہا۔

"مت ایسے لہجے میں بات کرو۔ مجھ سے اپنی اصل زبان میں گفتگو کرو۔"

"نہیں جی نہیں۔ خیر دین نے کبھی گھاٹے کا سودا کرنا نہیں سیکھا۔ ردا بی بی جی۔ اِس ہاتھ دو تو اُس ہاتھ لو۔ جب تک خیر دین کو یہ نہیں پتہ چل جائے گا کہ ردا بی بی ہیں کون۔۔۔؟ خیر دین خود بھی خیر دین ہی رہیں گے۔ پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔"

"بتا دوں گی خیر دین بتا دوں گی۔ کیوں پریشان کر رہے ہو مجھے۔ تم نے کتنے احسانات کئے ہیں مجھ پر اور میں کیسی۔۔۔ میں کیسی ہوں میں کہ تم پر اتنا سا بھی اعتبار نہیں کرتی۔"

"ہاں بی بی جی۔ آپ بہت بُری ہو۔ بہت ہی بُری۔" خیر دین نے کہا۔

"خدا کی قسم خیر دین میں بہت ہی بُری ہوں۔ بہت ہی بُری۔" ردا نے کہا اور خیر دین مسکرانے لگا۔

"چلو جی چھوڑو۔ کبھی کبھی بُرے آدمیوں کے ساتھ بھی گزارا کرنا ہی پڑ جاتا ہے۔ اب یہ بتاؤ اِن حالات میں آپ نے کیا فیصلہ کیا۔ ردا بی بی؟"

"میں سخت پریشان ہوں خیر دین اتنی پریشان ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی۔"

"او جی اچھی بات ہے پریشانی انسان کی مدد کرتی ہے۔ دورانِ خون درست رہتا ہے اور انسان ذرا چُست و چالاک رہتا ہے۔ آپ پریشان اچھی لگتی ہو ردا بی بی، بڑی اچھی بات ہے پریشان رہا کرو۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کروں کیا؟"

"اجی خیر دین کیا اور اُن کی اوقات کیا۔ کون مانے گا اُن کی بات۔ بلاوجہ یہ ہی سمجھا جائے گا کہ نہ جانے اپنے کس مطلب سے بات کر رہا ہے۔"

"نہیں خیر دین تمہارے بارے میں میں یہ بات کبھی نہیں

سوچوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔"

"چلو جی بات نہ سوچو پر مانو بھی تو۔"

"مان لوں گی اب مان لوں گی تم بتاؤ اب میں کیا کروں!"

"ردا بی بی جی آپ کو سب سے پہلے یہ کوٹھی چھوڑ دینی چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی نوکری بھی چھوٹ گئی ہے۔ جب وہ فرم ہی سیل ہو گئی۔ جس میں آپ نوکری کرتی تھیں تو نوکری آپ کس کی کریں گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں ردا بی بی جی کہ آپ کے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ضرور موجود ہیں کہ آپ کرائے پر کوئی جگہ بھی لے سکتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے سر چھپانے کا کوئی الگ ٹھکانہ کریں۔ خیر دین کی بات مان ہی لیں بی بی۔ آپ کو آج نہیں تو کل یہ کرنا ہوگا۔ ورنہ ممکن ہے آج سے زیادہ پریشانی اُٹھانی پڑے۔ جب آپ نئی جگہ چلی جائیں تو پھر نوکری کا بھی اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ دو چار مہینے بیٹھ کر نہیں کھا سکتیں آپ۔ رہی بات آپ کی اِس اولاد کی تو آیا رکھی جا سکتی ہے۔ یہ اتنا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور پھر ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو آپ کی غیر موجودگی میں کچھ تھوڑا سا معاوضہ لے کر تیمور کو سنبھال سکتے ہیں۔ آپ کسی ملازمہ کو رکھ سکتی ہیں جی۔ بس سوچنے کا فرق ہے یہ سارے کام مشکل نہیں ہوں گے۔ لیکن اِن حالات میں آپ گزارا نہیں کر سکیں گی۔ ہمت پیدا کریں ردا بی بی۔ وہی ہمت جسے لے کر آپ یہاں تک آئی تھیں" ردا پھٹی پھٹی آنکھوں سے خیر دین کو دیکھ رہی تھی۔ خیر دین کو یہ بات بھی معلوم ہے، کہ توقیر صاحب کی فرم سیل ہو گئی۔ اور یہ بھی جانتا ہے وہ کہ میں کوئی جذبہ لے کر یہاں تک آئی تھی۔ خیر دین تو ہے کیا بلا۔ ردا نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ لیکن یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ جب تک وہ خیر دین کو اپنے بارے میں نہیں بتائے گی۔ خیر دین کسی قیمت پر اپنا راز بھی نہیں کھولے گا۔ اور ردا اپنے بارے میں ابھی زبان کھولنا نہیں چاہتی تھی۔

"تو جی ہم چلیں؟ اور کیا حکم ہے؟ تیمور بابا کے لئے پہرہ دیتے رہیں یا جا کر آرام سے سو جائیں۔"

"کچھ دیر اور بیٹھو خیر دین۔ چند منٹ صرف چند منٹ" ردا نڈھال لہجے میں بولی۔

"تو بیٹھے تو ہیں جناب۔ آپ کی وجہ سے اُٹھ رہے ہیں۔ ورنہ آپ کے پاس سے جانے کو کس کمبخت کا دل چاہتا ہے۔" خیر دین نے کہا اور ردا کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں تھیں وہ خیر دین کی چمکدار اور خوبصورت آنکھوں کی تاب نہ لا سکی تھی۔ یہ آنکھیں کسی گھریلو ملازم کی آنکھیں نہیں تھیں اُن آنکھوں کو کہنا آتا تھا۔ یہ آنکھیں اپنا مفہوم ادا کر سکتی تھیں اور آنکھوں سے باتیں کرنے والے جاہل نہیں ہوتے۔ چند لمحات وہ کچھ نہ بولی۔ پھر جب خاموشی طویل ہونے لگی تو اُس نے کہا۔

"خیر دین اِس بار میں تمہاری بات مان لوں گی واقعی اِس کے علاوہ اب کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ کہ میں یہ گھر چھوڑ دوں۔ ایک لمحہ بھی نہ رہتی یہاں اگر ثناء اِس حد تک مجبور نہ کر دیتی۔ حقیقت یہ ہے خیر دین کہ میں صرف ثناء کی وجہ سے مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن میں اب تمہاری بات سے متفق ہوں۔۔۔ کوشش کروں گی کہ ثناء سے اپنی بات منوا لوں جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے۔ مجھے خدا پر پورا بھروسہ ہے میں اپنی کفالت کر سکتی ہوں۔ خیر دین میں یہ کام ضرور کر لوں گی۔"

"ہاں جی آپ کو کر لینا چاہیئے ردا بی بی جی۔ اب ہم جائیں؟" خیر دین نے پوچھا۔

ردا نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ خیر دین اپنی جگہ سے اُٹھ گیا تھا۔ پھر وہ ردا کو سلام کر کے باہر نکل گیا۔ اور ردا دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ تیمور کی واپسی میں خیر دین کا ہاتھ تھا۔ یہ احسان اُس نے کیا تھا کیا صلہ دے سکتی ہے وہ خیر دین کو اُس کے احسان کا۔ کہاں کہاں خیر دین نے اُس کی مدد نہیں کی۔ رشید سے جان چھڑائی۔ ثاقب کو راستے سے ہٹایا۔ ہر اُس موقع پر وہ ردا کی ڈھال بنا۔ جب ردا کسی مصیبت کا شکار ہوئی۔ اور اب تیمور کے سلسلے میں اُس نے یہ احسان کر کے تو ردا کو خرید ہی لیا تھا۔ خیر دین کی صورت اُس کی نگاہوں میں پھرتی رہی۔ اور پھر اُس کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

"خیر دین تم بہت دور کا سفر کر چکے ہو۔ واقعی تم بہت دور جا چکے ہو۔ مجھے اِس کا اندازہ ہی نہیں تھا" رات کا بقیہ حصہ بھی بس وسوسوں میں گزرا۔ پلاننگ کرتی رہی کہ ثناء کو کس طرح منائے گی اور اُس کے بعد تیمور کی زندگی کس انداز میں گزارے گی۔ صبح کو غسل کر کے رات کی تھکن دور کی۔ ثناء تیمور کو گود میں لئے باغ میں ٹہل رہی تھی یہ اُس کا روزانہ کا معمول تھا۔ ردا نے موقع غنیمت جانا اور اپنے کمرے سے نکل آئی۔ جمن نے چائے تیار کر لی تھی اور ثناء کے لئے لے کر جا رہا تھا۔ ردا نے اپنے لئے بھی چائے منگوا لی اور پھر ثناء کے پاس پہنچ گئی ثناء کو دیکھ کر ردا کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ اُس وقت ثناء کے چہرے پر وہ شوخی وہ کھلنڈراپن نہیں تھا۔ جو ہمیشہ طاری رہتا تھا۔ یہ

خُوبی تھی ثناء میں کہ اُس کے چہرے پہ سکون اور اعتماد طاری رہتا تھا۔ جیسے وہ اپنے ماحول سے اپنے اطراف سے پُوری طرح مطمئن ہو۔ اور اُسے دُنیا کی کسی شئے کا خطرہ نہ ہو۔ اُس وقت اُس کا چہرہ کچھ مضطرب سا تھا۔ رَدا کے قدموں کی آہٹ پر اُس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر پھیکے سے انداز میں مُسکرا دی۔ یہ کیفیت بھی بالکل اجنبی اجنبی سی تھی۔ رَدا اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"تیمور آج اُن لوگوں کو بھی صبح کے حُسن کا احساس ہو گیا ہے جو سُورج کی صرف بلندیوں پر دیکھتے ہیں۔ چلو خُوش آمدید کہو۔ نئے آنے والوں کو!"

"بہت شکریہ۔ تیمور تمھارا بھی اور تمھاری ثناء کا بھی۔" رَدا گھاس پر بیٹھ گئی۔

"ارے ارے یہ شبنم سے بھیگی سرسبز گھاس اِس لئے نہیں ہے کہ اِس پر صرف بیٹھا ہی جائے۔ ذرا چپلیں اُتار کر تھوڑی سی چہل قدمی کر کے دیکھو۔ آنکھوں میں نُور دِل میں سُرور اُتر آئے گا۔ مگر بد ذوق لوگ ایسی باتیں کیا جانیں تیمور ذرا سمجھاؤ نا اِن رَدا صاحبہ کو!"

"خاتون چائے آرہی ہے وہ دیکھیں دروازے سے باہر نِکل آئی۔ کم از کم اُس کے سامنے تو بیٹھنا ہی پڑے گا" رَدا نے کہا۔

"ہاں یہ دوسری بات ہے۔" ثناء تیمور کو گھاس پہ بٹھا کر خود بھی رَدا کے سامنے بیٹھ گئی۔

"ثناء کچھ پریشان ہو؟"

"بے حد" ثناء نے جواب دیا۔

"وجہ نہیں بتاؤ گی؟"

"تیمور کی پُراسرار گمشدگی۔ میں پریشان ہُوں رَدا۔ وہ کون تھا جس نے یہ مذاق کیا۔ کیا اب بھی حالات ایسے ہیں کہ کوئی ہمارے ساتھ اِتنا سنگین مذاق کر سکے کیا یہ واقعی مذاق تھا یا کسی کی مجرمانہ کوشش؟" ثناء نے کہا۔

"خُدا جانے ثناء یہ کیا تھا؛ لیکن تمھاری پریشانی کی وجہ صرف یہ ہی ہے؟"

"ارے کسی کا شوہر گم ہو جائے اور تم اُسے صرف کہو میرا مستقبل غائب ہو گیا تھا۔ اِس کے بعد مجھے اِس کے علاوہ اور کیا کرنے کو رہ جاتا۔ پھر وہ واپس آگیا یہ خُوشی کی بات ہے" لیکن جمن نے چائے بنا کر لا کر رکھ دی تھی۔ رَدا چائے بنانے لگی۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہُوئی تھیں۔ چائے کی پیالی ثناء کی طرف بڑھا کر اُس نے اپنی چائے کے دو تین گھونٹ لئے اور پھر آہستہ سے بولی۔

"ثناء کچھ کہنا چاہتی ہُوں تم سے۔"

"کہو" ثناء نے کہا۔

"ثناء میں اب یہاں سے جانا چاہتی ہُوں۔"

"کہاں؟" ثناء نے پُوچھا۔

"کِسی بھی جگہ، کوئی فلیٹ وغیرہ کرائے پر لے لُوں گی۔ میں پہلے بھی تم سے کئی بار یہ سب کچھ کہہ چکی ہُوں ثناء لیکن تم نے مجھے اجازت نہیں دی۔ دیکھو ثناء شہاب صاحب نے مجھ سے جو کچھ کیا یا میرے بارے میں جو کچھ کہا وہ بہت بُرا تھا۔ تمھارے لئے میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہُوں لیکن تم پسند کرو گی ثناء کہ کسی صبح میری لاش میرے کمرے سے دستیاب ہو۔ میں مر جاؤں گی ثناء۔ میں گھُٹ کر مر جاؤں گی۔ اِتنا بڑا امتحان لیا میں نے تجھ سے اپنی محبّت کا۔ ثناء میں تجھ سے پیار کرتی ہُوں۔ کوئی احسان نہیں مانتی میں تمھارا کیونکہ دِلوں کے سَودے احسان جیسے سچّے الفاظ کی قیمت کے نہیں ہوتے تم نے میرے ساتھ دوستی کا نہیں بلکہ محبت کا بھی سودا کیا ہے۔ جس کی قیمت دُنیا کی کسی بھی چیز کی صُورت میں نہیں دی جا سکتی۔ ثناء اللہ کے واسطے میرے مسئلے پر غور کرو۔ میں اب یہاں نہیں رُکوں گی۔ دیکھو تیمور تمھارا ہے۔ میں اب اُسے تم سے لینے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔ تم اُسے جہاں چاہو رکھو اپنے پاس رکھو یا میرے پاس چھوڑ دو۔ تم اُس کی پوری پوری حقدار ہو۔ میری ذات کا ذرہ ذرہ تمھارے لئے ہے ثناء لیکن ہمیں اب حقیقتوں کو پہچان لینا چاہیئے۔ کسی بھی چیز کی ایک حد ہوتی ہے میں اب اِن حدوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہُوں۔ ثناء میری بہن میری بات مان لو۔ میرے لئے زندہ رہنے کا بس اب یہ ہی راستہ ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں" ثناء سنجیدہ نِگاہوں سے رَدا کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بولی۔

"کچھ دِن مجھے سوچنے کے لئے وقت دے دو رَدا؛ جہاں اِتنا وقت گزار سکی ہو تم تھوڑے دِن اور گزار لو ایک ہفتہ۔ دس دِن یا آخری پندرہ دِن، اِس کے بعد میں تمھیں اپنے صحیح فیصلے سے آگاہ کر دُوں گی۔ رَدا ثناء کے لئے میں نے کبھی اِتنی سنجیدگی کے ساتھ تم سے کچھ نہیں مانگا یہ پندرہ دِن تو دے سکتی ہو نا؟"

رَدا نے ثناء کا چہرہ دیکھا۔ یہ چہرہ ہمیشہ کی طرح نظر آنے والی ثناء سے بہت مختلف تھا۔ ثناء کو کبھی اِس رنگ میں نہیں دیکھا گیا۔ رَدا کا دل بھر آیا۔

"میں جانتی ہُوں تجھ پر کیا بیت رہی ہو گی ثناء۔ لیکن تُو بھی جان کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔"

"یار فیصلہ کُن بات کر دو نا۔ دے سکتی ہے پندرہ دِن مجھے؟"

"ٹھیک ہے۔ جیسا تُو پسند کرے" رَدا کے پاس اب اِن الفاظوں کے علاوہ اور کوئی جواب بھی نہ تھا۔ بہت دُور سے نُدرت کی صُورت نظر آئی۔ رَدا اور ثناء نے بیک وقت اُسے دیکھا تھا۔ ثناء کہنے لگی۔

"کمبخت کو چائے کی خوشبُو فضاؤں میں محسوس ہو جاتی ہے۔ اب یہ اِدھر ہی آئے گی۔ دیکھو ایک کپ چائے اور ہے کہ نہیں۔" رَدا نے کیتلی میں چائے دیکھی۔ ابھی کئی کپ چائے باقی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں نُدرت کی آمد کا انتظار کرنے لگیں۔

"غلام احمد صاحب احسان صاحب کے ڈرائیور کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ اور اپنے طور پر اُنھوں نے خُدا کی رضا میں خود کو راضی کر لیا تھا۔ سابق مشرقی پاکستان میں جس انداز میں زندگی گزارتے تھے وہ اب خوابوں کی کہانی بن کر رہ گیا تھا۔ پہلے محلے میں جس خوف و ہراس کے عالم میں ایک طویل عرصہ بسر کیا۔ احسان صاحب کی نوازش سے وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ اور احسان صاحب کی اِس کوٹھی میں آنے کے بعد انھیں احساس ہُوا تھا کہ وہ زمین پر آباد فرشتے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کوٹھی تو گہوارۂ محبت تھی۔ آہستہ آہستہ یہاں کے مُعاملات غلام احمد صاحب کو معلوم ہو گئے تھے۔ احسان صاحب کے تمام ہی غریب رشتہ دار یہاں آباد تھے۔ اور جو کچھ بھی احسان صاحب سے اُن کے لئے بن پڑتا تھا کرتے تھے۔ غلام احمد صاحب اپنی دونوں بیٹیوں اور بیوی کے ساتھ جب سے یہاں پہنچے تھے۔ اُنھیں کبھی احساس ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کسی غیر جگہ آباد ہیں۔ یا اُن کی حیثیت ایک ڈرائیور کی سی ہے۔ بھلا احسان صاحب کی بیٹی اور اُن کی اپنی بیٹی کس طرح یکجا ہو سکتی تھیں۔ لیکن وہ نُدرت اور ثناء کی دوستی دیکھ چُکے تھے۔ اور اِس بات پر اُن کے دِل میں احسان صاحب اور اُن کے خاندان کے لئے جو احترام پیدا ہو گیا تھا وہ کبھی مِٹ نہیں سکتا تھا۔ اُن کی بچّیوں کو احساسِ کمتری کا شِکار ہونے کے بجائے برابری کی حیثیت دی گئی تھی۔ جس سے اُن کی شخصیت اُبھرتی جا رہی تھی۔ عصمت یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی عزت و وقار کے ساتھ جاتی اور واپس آجاتی۔ نُدرت بھی گھر کے کام کاج کرتی اور پھر وہ ہوتی اور ثناء۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خود احسان صاحب نے غلام احمد صاحب کو خاص طور سے یہاں آنے کے بعد یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کسی ملازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر اہم مُعاملے میں مشورہ ہر دُکھ میں ساتھ اور انداز بھی دوستوں جیسا۔ جب سے اپنی دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔ محبّت کے دو الفاظ کو ترس گئے تھے غلام احمد صاحب۔ لیکن یہاں مالک تھا کہ اُس نے اپنی دوستی دے دی تھی۔ اور اکثر غلام احمد صاحب سوچتے تھے کہ اِن فرشتوں کی محبّت کا جواب کِس طرح دیا جا سکتا ہے۔ بہر طور زندگی بہت بہتر گزر رہی تھی۔ امّاں بی بھی خوش تھیں اور شوکت جہاں بھی۔ بچّیاں بھی مطمئن تھیں اور غلام احمد صاحب کو یہ زندگی اچھی طرح راس آگئی تھی۔ ایسے ہی وقت گزر رہا تھا کہ ایک دِن اُنھیں ایک بڑا سا لفافہ موصُول ہُوا۔ لفافے پر ریڈ کراس کا نشان دیکھ کر غلام احمد صاحب کا دِل دھڑکنے لگا تھا۔ یہ لفافہ چوکیدار نے لا کر دیا تھا پوسٹ مین نے خاص طور سے غلام احمد صاحب کے بارے میں پُوچھا تو چوکیدار لفافہ لے کر اندر آگیا تھا اور اتفاق سے اِس وقت غلام احمد صاحب موجود تھے۔ ریڈ کراس کا لفافہ اور اُن کے نام۔ ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ دُھندلائی ہُوئی آنکھوں سے اُنھوں نے لفافے کے اندر رکھے ہُوئے پرچے کو نکالا اور تحریر پڑھنے لگے۔ بے صبری اور بے چینی کی انتہا تھی۔ خوبصُورت کاغذ کے آخری حصّے پر جہاں بھیجنے والے کا نام ہوتا ہے۔ پال نائیڈو کا نام پڑھ کر غلام احمد صاحب کو چکر سا آگیا تھا۔ یہ نام اُن کی زندگی میں بہت بڑی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس نام کے ساتھ اُن کی شخصیت گُم ہو گئی تھی اور اب یہ نام اُبھرا تھا تو کیا غلام احمد زندہ ہو رہے ہیں۔ دُھندلائی ہُوئی آنکھوں کو صاف کر کے اُنھوں نے پرچے کی تحریر پڑھنا شروع کی۔ لِکھا تھا۔

"مسٹر غلام احمد ولد فرزند احمد اگر آپ کا تعلق مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش سے ہے اور اگر آپ وہاں مندرجہ ذیل پتے پر رہتے تھے تو برائے کرم اپنے موجُودہ کوائف اپنے نئے پتے کے ساتھ ہمیں لکھ کر بھیجئے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ بنگلہ دیش سے روانگی سے پہلے اُس وقت جب آپ پاکستان آرہے تھے تو آپ نے ایلس براؤنسن اور مسٹر پال نائیڈو کے حوالے کچھ کاغذات کئے تھے اُن کاغذات کی مکمل تفصیل آپ سے برائے راست ملاقات کر کے

حاصل کی جائے گی۔ آپ صرف اتنا لکھ دیجئے ہیں کہ آپ وہی غلام احمد ہیں۔ ہمارا آپ کا جو رابطہ رہ چکا ہے اُس کی تفصیل بھی درج ہونی چاہیئے۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

"پال نائیٹڈو"

غلام احمد صاحب کے بدن پر رعشہ طاری ہوگیا تھا۔ اُنھیں سخت سردی لگنے لگی تھی۔ اُن کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"میرے معبُود، میرے معبُود، میرے معبُود" اور پھر وہ زمین پر ہی سجدہ ریز ہوگئے۔ گھر کے لوگوں کو اُن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن غلام احمد صاحب پر جو کچھ بیت رہی تھی وہی جانتے تھے۔ دیر تک اُن کی آنکھیں آنسُو برساتی رہیں۔ پھر وہ زمین سے اُٹھے۔ وہ ریڈ کراس کا کاغذ اُٹھا کر اندرُونی لباس میں رکھ لیا۔ گھر کے دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتانا چاہتے تھے۔ خُدا جانے حالات کیا ہُوں...؟ خُدا جانے وہ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ ممکن بھی ہو یا نہیں۔ بڑی مشکل سے شوکت جہاں اور اماں بی موجودہ حالات میں گزارا کرنے کے قابل ہوئی تھیں۔ ماضی کی وہ کہانیاں بُھلا دی تھیں اُنھوں نے۔ جن میں وہ بھی انسانوں کی طرح بسر کرتی تھیں وہ تمام کہانیاں قصۂ پارینہ بن چکی تھیں اور اب صرف ایک ڈرائیور کا گھر تھا یہ۔

خُدا کے فضل سے اب تو حالات بھی کچھ بہتر ہوگئے تھے لیکن تھوڑے عرصے پہلے تو انسانوں جیسی زندگی ہی بھُول گئے تھے یہ سب۔ بہرحال اگر تقدیر پھر کوئی موقعہ دے رہی ہے تو اُس وقت گھر والوں کو اس کے بارے میں بتانا بہتر تھا جب کچھ ہو جائے۔ پہلے سے کوئی بات بتا کر وہ کھیل خراب نہیں کرنا چاہتے تھے چنانچہ اُنھوں نے خود کو سنبھال لیا۔ پال نائیٹڈو اور... ایلیس براؤنسن کے پاس اُن کا سرمائۂ حیات تھا اگر وہ واپس مل جائے تو دونوں بچیوں کی زندگی سنور جائے گی اِن بچیوں کے علاوہ غلام احمد صاحب کی دُنیا میں اور تھا ہی کون؟ اگر قدرت اِن بچیوں کو وہ مقام دینے پر آمادہ ہے جو کبھی تھا تو خُدا کے اِس احسان کو غلام احمد صاحب موت کے بعد بھی نہیں بھُول سکتے تھے وہ رات اُن پر بہت بھاری گزری۔ رات کے آخری حصّے میں سردی لگ کر بخار بھی آگیا وہ اِس خوشی کو برداشت نہیں کر پائے تھے لیکن اِس کے باوجود اُنھوں نے کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا اور معمُول کے مطابق ہی رہے۔

احسان احمد صاحب اِن دنوں شدید پریشان نظر آرہے تھے لیکن بھلا غلام احمد صاحب اُن سے اُن کی پریشانی کے بارے میں کیا پُوچھ سکتے تھے؟ حسبِ معمُول وہ تیار ہو کر چل پڑے احسان احمد صاحب آج کل اپنے بڑے دفتر میں بیٹھے سارا دِن حساب کتاب میں مصرُوف رہتے تھے۔ اُنھیں دفتر چھوڑنے کے بعد غلام احمد صاحب نے اُن سے دو گھنٹے کی رُخصت مانگی تو احسان احمد صاحب نے کہا کہ وہ اب شام ہی کو دفتر سے اُٹھیں گے اِس لئے غلام احمد صاحب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو آرام سے کرلیں۔ غلام احمد صاحب کسی کو اپنا راز نہیں دینا چاہتے تھے چنانچہ اُنھوں نے ایک بالکل ہی کاروباری جگہ سے ایک خط ٹائپ کرایا۔ اِس کا مضمون اُنھوں نے خود ہی بنایا تھا... جس میں اُنھوں نے پال نائیٹڈو اور ایلیس براؤنسن کو زوال مشرقی پاکستان کے واقعات کا حوالہ دے کر... اپنے بارے میں مکمل تفصیل لکھی تھی اور کہا تھا کہ اب جب کہ وہ اِن دونوں سے مایُوس ہو چکے تھے اُن کی یہ یاد دہانی غلام احمد صاحب کے لئے بڑی اُمید افزا ہے اور وہ جن حالات میں بسر کر رہے ہیں اِس کے تحت اُن پر پُوری توجہ دی جائے اُنھوں نے اپنا پتہ لکھ دیا تھا لفافے کو رجسٹرڈ پوسٹ کرانے کے بعد وہ خوابوں کی دُنیا میں کھو گئے۔ دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ کیا ہوتا ہے؟ پھر وہ احسان صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ احسان صاحب حسبِ معمُول اپنی جگہ سے اُٹھے تھے اور گھر آگئے تھے یہ اُن دنوں کی بات ہے جب احسان صاحب کو اِن واقعات کی بھنک ہی لگی تھی اور اُنھیں صحیح تفصیل معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ بس ایسے شواہد اُنھیں مل رہے تھے جن سے یہ اندازہ ہو کہ شہاب لحد کے ذریعے کاروباری معاملات میں کچھ گڑبڑ ہُوئی ہے غلام احمد صاحب کو تو اِس سلسلے میں بھی کچھ پتہ نہیں تھا اب تو اُن کی آنکھیں دِن رات پال نائیٹڈو اور ایلیس براؤنسن کے جواب پر لگی رہتی تھیں اور چند ہی روز کے بعد اُنھیں ایک تار موصُول ہُوا۔ جو پال نائیٹڈو کی طرف سے تھا اُس میں لکھا تھا کہ وہ فلاں تاریخ اور فلاں دِن ریڈ کراس کے مقامی دفتر میں مسز پال نائیٹڈو سے ملاقات کریں اُس دِن اور اُس تاریخ کا انتظار غلام احمد صاحب کے لئے نہ جانے کیا بن گیا تھا پھٹتے ہُوئے سینے کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہُوئے وہ وقتِ مقررہ پر ریڈ کراس کی مرکزی شاخ کے دفتر میں پہنچے اُس دِن اُنھوں نے احسان صاحب سے چھُٹی طلب کر لی تھی مرکزی شاخ کے دفتر میں مسز پال نائیٹڈو نے اُن کا استقبال کیا اور ایک لمحے میں غلام احمد صاحب کو پہچان لیا۔

ایک پُرجوش مصافحہ کرنے کے بعد اُنھوں نے غلام احمد صاحب کو احترام سے کرسی پر بیٹھنے کی پیش کش کرتے ہُوئے کہا۔

"میں آپ سے معذرت نہیں کروں گی مسٹر غلام احمد، آپ نے مشرقی پاکستان سے روانہ ہونے کے بعد ہم سے بالکل ہی کنارہ کشی کرلی اور ہم غلط فہمی کا شکار ہوگئے کہ آپ کو کوئی حادثہ پیش آچکا ہے آپ نے روانہ ہونے سے پہلے ہمیں اطلاع دی تھی کہ آپ شاید ہندوستان چلے جائیں چنانچہ ہم نے ریڈ کراس کی ہندوستانی شاخ سے آپ کے بارے میں رابطہ قائم کیا اور اُس کے ذریعے آپ کو تلاش کیا گیا مجھے یقین ہے غلام احمد صاحب کہ آپ ہمیں اپنی اِس پریشانی پر معاف کردیں گے۔ آپ کی امانت ریڈ کراس کے منصُوبوں کے مطابق محفوظ کر دی گئی تھی۔ اور اب اُس کی مالیت موجودہ حیثیت میں آپ کو پیش کر دی جائے گی۔ غلام احمد صاحب کا سانس پھُول رہا تھا اُنھوں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔

"جو واقعات اور حادثات گزرے میں اُنھیں تقدیر کا کھیل قرار دیتا ہُوں یہی ہونا تھا لیکن میں آپ کا شکر گزار ہُوں کہ آپ نے اپنی دیانت دارانہ کوششوں سے مجھے اور میرے اہلِ خاندان کو نئی زندگی دی ہے مجھے اِس بات پر تعجب ہے کہ آپ کو میرے پتے کا علم کیسے ہُوا جب کہ میں تو انتہائی گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا"

"اِس سلسلے میں ہم آپ کے اِن عزیز اختر عادل صاحب کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمیں آپ کے بارے میں تفصیلی اطلاعات دیں بلکہ بیچارے اختر عادل نے ایک طویل سفر کرکے لندن کی مرکزی شاخ سے رُجُوع کیا۔ کیونکہ میں اِن دِنوں لندن میں ہی مقیم ہُوں اختر عادل نے تمام تفصیلات آپ کے بارے میں بتائیں اور اِس طرح ہم آپ کو پانے میں کامیاب ہُوئے"

"اختر عادل" غلام احمد صاحب نے داہنا کان کھُجاتے ہُوئے کہا اور مسز پال نائیٹڈو نے اختر عادل کے بارے میں تفصیلات بتائیں تو غلام احمد صاحب حیران رہ گئے۔ اختر تو وہی بچہ تھا۔ احسان احمد صاحب کے دوست کا بچہ۔ جس نے غلام احمد صاحب سے تفصیلات معلوم کی تھیں بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا وہ بھی۔ لیکن اُس کی یہ توجہ، یہ احسان، غلام احمد صاحب کے دِل میں گھر کر گیا اُنھوں نے یہی سوچا تھا کہ تقدیر جب راستے کھولتی ہے تو خود بخود ہی ذرائع بھی متعین کر لیتی ہے۔ مسز پال نائیٹڈو سے کافی دیر تک ملاقات رہی تھی اور اِس کے بعد مسز پال نائیٹڈو نے دفتر ہی میں تمام کاغذات تیار کئے تھے کچھ تصدیقات بھی کرائی گئی تھیں۔ اور پھر اُنھوں نے غلام احمد صاحب کو مُبارک باد دیتے ہُوئے کہا تھا کہ صرف چند روز انتظار کرنا پڑے گا اُنھیں اِس کے بعد اُن کی جمع شُدہ رقم مِل جائے گی غلام احمد صاحب جب ریڈ کراس کے دفتر سے نکلے تو اُن کے قدم لڑکھڑا رہے تھے یہ دُنیا ایک بار پھر اُن کی آنکھوں میں روشن ہوگئی تھی۔ چاروں طرف پھُول ہی پھُول کھِلے نظر آرہے تھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کریں؟ گھر والوں کو اِس بارے میں بتائیں یا اُس وقت کا انتظار کریں جب رقم اُن کے ہاتھ میں آجائے دُنیا پر اِس قدر بے اعتباری قائم ہوگئی تھی اُن کی کہ اب وہ ہر شخص سے مشکوک رہتے تھے خاص طور سے رقم کے مُعاملات میں۔ جو ہاتھ آجائے سو اپنا ہے اور جو اپنی مٹھی سے دُور ہو اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہاتھ آبھی سکے گا یا نہیں۔ عقل کا تقاضا تھا کہ خاموشی اختیار کی جائے اپنے گھر والوں کو یہ خوشی وہ اچانک ہی دینا چاہتے تھے چنانچہ برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن خوشگوار اثرات چھُپائے نہیں چھُپ رہے تھے۔ پہلے بیوی نے پھر بیٹیوں نے اُن کی بدلی ہُوئی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ باپ کو ہمیشہ متفکر اور اُلجھا ہُوا ہی پایا تھا۔ بدلا ہُوا مزاج دیکھ کر سب ہی کو خوشی ہُوئی تھی۔

"کیا بات ہے ابُّو، یُوں لگتا ہے جیسے اچانک ہی موسمِ بہار آگیا ہو۔ آج کل آپ مُسکرانے لگے ہیں" یہ الفاظ ندرت کے علاوہ اور کوئی نہیں ادا کر سکتا تھا غلام احمد صاحب نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"بھئی ہماری بیٹی کیا چاہتی ہے کیا ہم ہمیشہ گردن لٹکائے ہی گھر میں بیٹھے رہا کریں۔ تمہارے لئے ہنسنا بھی ہوگا ہمیں"

"اچانک ہی آپ کو خیال کیسے آیا ابُّو۔ ہم تو یہ سوچتے تھے کہ آپ ہنسنا بھُول گئے ہیں"

"بھُول گیا تھا بھئی معاف کردو۔ میرا خیال ہے کہ اب تم مجھے ہنستا ہُوا ہی پاؤ گی"

"اور اِس کی وجہ بھی آپ کو بتانا ہوگی"

"بس بھئی ہنسی یاد آگئی ہے وجہ کیا ہو سکتی ہے"

"کمال ہے عصمت باجی آج کل کے ابُّو یہ نہیں سوچتے کہ نئی نسل ذہنی قوتوں میں بہت آگے بڑھ گئی ہے اور ذرا منطقی بھی ہوگئی ہے بھلا کیسے مانا جا سکتا ہے کہ سنجیدہ چہرے مُسکرا اُٹھیں اور اُن کا کوئی مقصد نہ ہو تاہم ابُّو کو کسی سلسلے میں مجبُور کرنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔ غلام احمد صاحب ہنس کر خاموش ہوگئے تھے۔

●●

احسان احمد صاحب اب کسی حد تک مطمئن نظر آنے لگے تھے چہرے پر مسلسل پیلاہٹ طاری رہتی تھی لیکن اب اُن کی آنکھیں پُرسکون ہو گئی تھیں۔ ہاں ذکیہ بیگم نے رات کے کسی حصے میں جب بھی جاگ کر دیکھا۔ احسان صاحب کو جاگتے پایا۔ اُن کا دل خون کے آنسو روتا رہتا تھا۔ بار ہا شوہر سے اِس بارے میں سوالات کئے۔ تو انھوں نے نہایت حلیمی سے جواب دیا کہ حالات بگڑ چکے ہیں۔ بس عزت بچانے کی فکر میں سرگرداں ہوں۔ اِس سے زیادہ اُنھوں نے ذکیہ بیگم کو اور کچھ نہیں بتایا تھا۔ پھر ایک رات وہ بہت خوش نظر آرہے تھے کہنے لگے۔

"بھئی ذکیہ بہت دن سوگوار گزر گئے کوٹھی کی رونق جیسے ختم ہی ہو گئی ہے۔ کل کوئی چھوٹی موٹی تقریب کر ڈالو۔ ہماری شادی کی سالگرہ کبھی نہیں ہوئی۔ کیا خیال ہے کل کا دن مقرر کر لیا جائے؟"

"بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں آپ، اپنے آپ کو بھی اور مجھے بھی آخر کچھ تو بتا دیجئے اب کیا ہو رہا ہے؟"

"بھئی اگر ہماری بیگم ہمیں اجازت دیں تو جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ آج نہیں کل بتا دیں گے تو کیا خیال ہے ہو جائے کل رات کا کھانا، تمام لوگوں کے ساتھ۔"

"کون تمام لوگ؟" ذکیہ بیگم نے پوچھا۔

"وہ جو اِس کوٹھی میں رہتے ہیں۔"

"آپ کی خواہش ہے تو بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن خدا کے لئے شادی کی سالگرہ وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہ کیجئے۔ ہم لوگوں نے کبھی ایسا کوئی چھچھورا پن نہیں کیا۔"

"چلئے پھر ایک کھانا ایسے ہی ہو جائے سب لوگوں کو کل شام کی دعوت دے دیجئے گا لیکن کوٹھی کے تمام افراد ہونے چاہئیں کل مالک اور نوکر کا کوئی فرق نہیں رہے گا بلکہ ہم اِس سلسلے میں آپ کے بجائے اپنی ثناء بیٹی سے رجوع کریں گے اُس میں بہترین انتظامی صلاحیتیں موجود ہیں۔" ذکیہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا دوسرا دِن گو چھٹی کا نہیں تھا لیکن آج یوں محسوس ہوتا جیسے احسان صاحب گھر سے کہیں باہر جانے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں ثناء کو انھوں نے صبح کے ناشتے پر ہی پکڑ لیا تھا۔

"بھئی ثناء آج کل بڑی خاموشی سے وقت گزر رہا ہے۔ نہ کوئی ہنگامہ، نہ کھانا پینا، کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا یہاں تمام رہنے والوں کو؟"

"کچھ نہیں ابّو، ہوتا کیا؟ سب ٹھیک ہے" ثناء نے جواب دیا۔

"بھئی کبھی کبھی ہماری خوشی کے لئے بھی کچھ ہو جانا چاہیئے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج تمھارے زیرِ نگرانی ایک شاندار پارٹی ہو جائے۔ باہر کے کسی فرد کو نہیں بلایا جائے گا اور گھر کے کسی فرد کو نہیں چھوڑا جائے گا۔ سب لوگوں کو ہونا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے ابّو کیا انتظامات کئے جائیں؟"

"باورچی خانے میں جو کچھ بھی ہو سکتا ہے کر لیا جائے باہر کا ساز و سامان باہر سے منگوا لیا جائے گا یہ سب کچھ تم پر منحصر ہے جو اخراجات ہوں وہ ہم سے لے لئے جائیں۔"

"نہیں ابّو اخراجات کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کی خواہش کے مطابق سب کچھ ہو جائے گا۔"

"بس تو پھر یہ سمجھ لو کہ انتظامات لان پر ہوں گے اور آج کا دِن ایسا خوشیوں کا دِن ہونا چاہیئے کہ اُسے مدتوں یاد رکھا جا سکے۔"

"کوئی خاص بات ہے ابّو؟"

"ہاں بیٹے خاص بات بس یہ ہے کہ ہم نے آپ سے فرمائش کی ہے۔"

"ہاں ابّو یقیناً یہ خاص بات ہے آپ اطمینان رکھئے سب کچھ آپ کی خواہش ہی کے مطابق ہو گا" ثناء نے جواب دیا۔

احسان صاحب خود بھی دِن بھر کے پروگرام میں دلچسپی لیتے رہے تھے اُن کی طبیعت میں آج ایک انوکھی بات پائی جاتی تھی۔ کئی بار باورچی خانے کے چکر لگائے۔ لان کے انتظامات دیکھے رِدا اور نُدرت بھی ثناء کے ساتھ آج کے انتظامات میں مصروف تھیں۔ چوتھی بار سب کو رات کے کھانے کی دعوت دے دی گئی تھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کی معذرت قبول کی گئی ہو۔ اور اِس کارروائی کے نتیجے میں رات کو لان میں جو دستر خوان لگا وہ قابلِ دید تھا۔ چار قسم کے مرغ مسلّم تھے تو چھ قسم کا میٹھا بریانی الگ تھی پلاؤ الگ۔ مختلف قسم کے سالن تھے۔ جو میز پر انبار کر دیئے گئے تھے۔ مہمان لان پر پہنچ چکے تھے گھر کے ملازموں نے الگ ٹھکانہ بنانے کی کوشش کی تو احسان صاحب فضل خان چوکیدار سے بولے۔

"خان، کچھ آدابِ میزبانی ہوتے ہیں تو کچھ آدابِ مہمانی بھی ہوتے ہیں کیا سمجھے؟"

"مہمان خان آدابی صاحب" فضل خان نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور لوگوں کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

"نہیں بھائی ہر چیز خان نہیں ہوتی ہمارے کہنے کا مطلب تو یہ تھا کہ ہم نے جب آپ کو دعوت دی ہے تو آپ کو کھانے میں

ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہیئے یہ ایک کونے میں گھسنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں آپ؟"

"ٹھیک صاحب جو حکم" فضل خان نے فوجی انداز میں سلوٹ مارا کیونکہ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا احسان صاحب ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے کچھ عجیب سی بہار آگئی تھی تمام اہلِ خاندان جو اِس کوٹھی میں رہتے تھے خوش نظر آرہے تھے احسان صاحب جو صرف انھیں یہاں بُلا کر مطمئن ہو گئے تھے کہ سب خوش رہ رہے ہیں۔ ایک ایک سے ملتے پھر رہے تھے کھانا شروع ہو گیا اور لوگوں نے نہ جانے کب کب کی کسر پوری کر لی آج سبھی کو کھلی اجازت تھی بلکہ شاید زیادہ کھانے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ہر شخص داؤ پیچ دکھا رہا تھا۔ سبھی مسرور تھے کافی دیر تک یہ مشغلہ جاری رہا اور اِس کے بعد ختم ہو گیا احسان صاحب نے جمن سے کہا۔

"بھئی جمن بھائی! سبز چائے کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جو حکم صاحب!"

"تو پھر اپنے ساتھ مددگار لے جاؤ اور بھر لاؤ دیگچے چائے بغیر مزا نہیں آئے گا۔"

"ابھی جاتا ہوں صاحب۔"

"تنہا نہیں بھئی خیر دین آج تم بھی خیر سے باورچی خانہ دیکھو جاؤ جلدی کرو بھئی سبز چائے کی طلب شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ جمن کے ساتھ خیر دین اور تین ملازمین اور بھی اندر چلے گئے۔ احسان صاحب چہل قدمی کرنے لگے تھے اُن کی شخصیت میں اُس وقت نہ جانے کیا بات تھی خاص طور پر ثناء کو اُن کا بدلا بدلا انداز بہت عجیب لگ رہا تھا اور اُس کا دِل بیٹھا جا رہا تھا تھوڑی دیر کے بعد سبز چائے آگئی اور اُس کا دور شروع ہو گیا جمن اور دوسرے ملازمین نے یہ چائے تمام لوگوں میں تقسیم کر دی آج کا ماحول اُس کوٹھی میں بالکل ہی مختلف تھا چائے کا شغل ختم ہوا تو اُس کے بعد لوگ منتشر ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن احسان صاحب کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

"نہیں بھئی تم میں سے کسی نے یہ تو نہیں پوچھا کہ آخر اِس دلچسپ تقریب کا مقصد کیا تھا اِس دُنیا میں کوئی بھی کام بے مقصد نہیں ہوتا اب ہم آپ لوگوں کو ایک ایسی غمناک داستان سُنانے جا رہے ہیں جسے سُن کر آپ کی یہ تمام خوشیاں ملیامیٹ ہو جائیں گی ہمیں احساس ہے کہ آپ لوگوں سے خوشی کے یہ چند لمحے چھیننا اچھی بات نہیں ہے لیکن آج کی اِس تقریب میں سب ہمارے

اپنے ساتھی، اپنے دوست، اپنے عزیز ہیں دُکھ کی داستان آپ ہی سے نہیں کہیں گے تو پھر کس سے کہنے جائیں گے آپ ہی تو ہمارے غمگسار، ہمدرد اور دوست ہیں آپ ہی لوگوں کے ساتھ تو ہم نے زندگی کا ایک طویل خوشگوار سفر طے کیا ہے۔" احسان صاحب کی آواز میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔

سب لوگ ساکت ہو گئے تھے کسی نے احسان صاحب کو اِس رنگ میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ بدلا ہوا رنگ انوکھا تھا ذکیہ بیگم نے سینے پر ہاتھ رکھ لئے تھے اماں بی کی آنکھوں میں پریشانی اُبھر آئی تھی ثناء پر سکتہ طاری ہو گیا تھا نُدرت اور رِدا اُس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ نُدرت کو خیر اِن حالات کا کوئی پتہ نہیں تھا لیکن رِدا کے دِل کی دھڑکنیں کچھ بڑھ گئیں اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ احسان صاحب کیا انکشاف کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے یہ شہاب صاحب ہی سے متعلق ہو۔ ماحول جو کچھ دیر قبل زعفران زار بنا ہوا تھا اب شدید گھٹن کا شکار ہو گیا تھا - اور تمام نگاہیں احسان صاحب پر جمی ہوئی تھیں۔

ندرت نے رِدا کی طرف جُھک کر کہا ”مونالیزا تم کوئی انوکھی بات محسوس کر رہی ہو؟“

رِدا چونک کر ندرت کو دیکھنے لگی۔ پھر بمشکل تمام بولی ”کیا؟“

”احسان صاحب کے الفاظ میں یاسیت ہے اچانک ہی اُن کی گفتگو نے یہ رنگ اختیار کیا ہے اور یُوں لگتا ہے، جیسے ثناء بھی اِن الفاظ کے مفہوم سے واقف ہے۔ اُس کی حالت بھی مجھے بہتر نہیں معلوم ہوتی۔“

”شاید!“ رِدا نے بمشکل کہا۔

احسان صاحب نے توقف کے بعد کہا ”بچپن سے ایک خواہش دل میں اُبھرتی تھی وہ یہ کہ میرا گھر بھرا پُرا ہو۔ ایک بہت بڑی جگہ بناؤں اور وہاں اُن تمام اپنوں کو جمع کر لوں، جن کے دلوں میں میرے لئے محبت ہو۔ پھر جب شام ہو تو اُن سب کے درمیان کچھ وقت گزاروں اور ہنستے بولتے رات گزارنے کے لئے چلا جاؤں اِسی جذبے کے تحت میں نے آپ لوگوں کو یہ زحمت دی تھی کہ آپ سے اپنے ٹھکانے چھین کر میں آپ کو یہاں لے آیا خدا کے فضل و کرم سے اِس آرزو کی تکمیل ایسے ہُوئی کہ مجھے خود ہی اُس کا اِس حد تک یقین نہیں تھا سبھی نے میرے ساتھ تعاون کیا اور ایک طویل عرصہ اِس طرح گزر گیا کہ جیسے کل ہی کی بات ہو۔ آپ سب نے جس طرح اِس کوٹھی میں رہ کر اپنی محبتیں ہمارے لئے وقف کر دیں کاش میں اِس سلسلے میں اپنے دلی جذبات کا صحیح طور سے اظہار کر سکتا میری اِس جنت میں شاید میری زندگی کی آخری سانس تک کوئی تبدیلی نہ ہوتی لیکن ہم تقدیر کے تابع ہیں اور آسمانوں پر جو فیصلے ہوتے ہیں اُنہی کے مطابق ہمیں زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ یہ جنت زوال پذیر ہو گئی ہے۔ آج آپ تمام لوگوں کو میں نے آخری بار جمع کیا ہے۔ آپ سب جو میری خوشیوں میں ہمیشہ شریک رہے ہیں آج میرے غم میں بھی حصّہ بٹائیں۔ ہاں میں غم زدہ ہُوں میں آپ میں سے کسی کو حقیقتِ حال سے بے خبر رکھنا پسند نہیں کرتا۔ ممکن ہے یہاں کچھ لوگوں کی دل شکنی ہُوئی ہو لیکن یُوں سمجھ لیں کہ کسی بھی جگہ کسی بھی شخص میں کوئی کمزوری آ ہی جاتی ہے یہ باتیں معاف کرنے کے قابل ہوتی ہیں میں آپ سب سے اِن کوتاہیوں کے لئے مُعافی چاہتا ہُوں جو مجھ سے ہُوئی ہیں اب آپ وہ تفصیل سُن لیجئے جو شاید میں آپ کو اُس وقت تک نہ بتاتا جب تک مجھے بہتری کی ایک فیصد بھی اُمید ہوتی۔ اُمید کے تمام دھاگے ٹُوٹ چکے ہیں اور میں آپ سب کے سامنے خالی ہاتھ کھڑا ہُوں۔“ وہ سانس لینے کو ایک لمحے کے لئے رُکے اور پھر بولے۔

”شہاب میاں کو خدا خوش رکھے کہ میرے بھائی ہیں۔ اور کبھی شاید آپ لوگوں نے اپنے ذہنوں میں ہم دونوں کے بارے میں تصور کیا ہو تو یہی اندازہ لگایا ہو گا کہ میں نے بیٹے کی کمی ہمیشہ شہاب سے پُوری کی۔ میں نے اُسے کبھی کسی ذہنی بُحران کا شکار نہیں ہونے دیا۔ میں نے اُس کے شانوں پر کبھی ایسی ذِمہ داری بھی نہیں ڈالی جس سے اُس کے چہرے کی شگفتگی میں کوئی کمی واقع ہو جائے لیکن شہاب نے ایک بُرے انسان کا کردار ادا کیا۔ میری دولت، جائیداد، فیکٹریاں اور جتنے کاروبار بھی تھے میں نے اُن کے کاغذات میں ہمیشہ شہاب کو اپنے ساتھ شامل رکھا اور شہاب نہ جانے کیا دکھانے کے چکر میں کوئی ایسا کھیل کھیلنے لگے جو مُجرمانہ حیثیت کا حامل تھا۔ ہمارے پاس اِتنا کچھ تھا کہ ہم دونوں بھائی شاید اپنی اولادوں کو نہایت سکون سے زندگی گزارنے کا موقعہ دیتے۔ پتہ نہیں کن لوگوں کے زیرِ اثر یا کون سے عوامل کے تحت شہاب میاں نے ایک ایسے ادارے میں شمولیت اختیار کر لی جو مُجرمانہ نوعیت کے کام کرتا تھا۔ میری جائیداد اور دولت کی ایک ایک پائی اُنھوں نے نہایت بے دردی سے اِس کاروبار میں صرف کر دی۔ اُنھیں کیا اُمیدیں تھیں۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے اُنھوں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ خود بہتر جانتے ہیں۔ وہ یہاں سے غائب ہو گئے ہیں اور شاید اب کبھی واپس نہ آئیں۔ لیکن مجھے قلاش کر گئے ہیں میرے وُکلاء اِس کوشش میں مصرُوف تھے کہ اگر ممکن ہو سکے تو میرے لئے اِتنا بچا لیں کہ میرا مستقبل داؤ پر نہ لگے اور میں اپنی وہ چند خواہشیں پوری کر سکوں جن کے سلسلے میں مَیں نے ابھی تک کچھ نہیں۔ لیکن جو بھاری رُقومات شہاب کے ذریعے ضائع ہُوئی ہیں وہ اِتنی ہیں کہ میرا کاروبار اِس کمی کو پُورا نہیں کر سکتا۔ شہاب بے شک ابھی تک پولیس کے ہاتھوں نہیں آئے لیکن بہرطور اگر وہ گرفتار بھی ہو گئے تو کیا میں حکومت سے یہ مطالبہ کر سکتا ہُوں کہ میرے بھائی کو سزا دی جائے۔ اور مجھے میری دولت واپس دلائی جائے؟

آپ لوگوں کے سامنے میں اِس حقیقت کا اظہار کر کے ہرگز شرمندہ نہیں ہُوں کیونکہ آپ سب میرے اپنے ہیں لیکن دُنیا کے سامنے میں کبھی اپنے بھائی کو بُرا نہیں کہوں گا۔ اُس نے جو کچھ کیا۔ نادانی تھی۔ ہمارے بارے میں اُس نے کچھ نہ سوچا، یہ اُس کی اپنی فطرت تھی۔ میں اب بالکل قلاش ہو چکا ہُوں یُوں سمجھ لیجئے دولت، جائیداد کے نام کی کوئی چیز اب میرے پاس نہیں رہی۔

میرا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ تمام اثاثے اور جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ سرکاری تحویل میں جا چکا ہے اور اِس کے ذریعے نہ جانے کہاں کہاں ادائیگیاں کی جا رہی ہیں۔ یہ کوٹھی جس میں مَیں اِس وقت موجود ہُوں شاید چند دِن کے لئے میرے پاس ہے۔ وہ دفتر جسے میں استعمال کر رہا ہُوں۔ اِس کوٹھی کے ساتھ ہی چلا جائے گا اِس کے بعد ثناء ہے۔ اماں بی ہیں ذکیہ ہیں اور میں ہُوں۔ ہم چاروں اپنے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کریں گے۔ یُوں ہماری زندگی میں کچھ تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں۔ یہ الفاظ آپ لوگوں سے کہتے ہُوئے جو کچھ میرے دِل پر بیت رہی ہے میں ہی جانتا ہُوں۔ لیکن اب اِن چند دِنوں کے اندر اندر آپ کو اپنے لئے ٹھکانے تلاش کرنا ہوں گے۔ میں غم زدہ ہُوں کہ میرے ساتھ ساتھ آپ لوگ بھی پریشانیوں سے دوچار ہُوئے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اب ہو چکا ہے۔ آج کی یہ نشست اور وہ وقت جو ہم نے ساتھ گزارا شاید ہماری زندگی کی آخری دولت ہے میں اپنی بیوی، اپنی بیٹی اور اپنی ماں کے لئے زندہ رہُوں گا آپ لوگ اطمینان رکھئے اِتنا کم انسان نہیں ہُوں کہ تھوڑے سے بُرے وقت کو برداشت نہ کر سکوں جدوجہد کروں گا اور اپنا ایک نیا مقام بنانے کی کوشش بھی کروں گا۔ آپ لوگ جہاں کہیں بھی ہوں گے آپ سے مُلاقاتیں بھی رہیں گی۔ لیکن جو کچھ تھا میں نے صدقِ دِل سے آپ کے سامنے رکھ دیا۔ بس یہی کہنے کے لئے میں نے آپ سب کو زحمت دی تھی۔ وہ لوگ جو میرے ساتھ انتظامی اُمور میں تعاون کرتے رہے ہیں۔ اور جنھیں میں نے کبھی اپنا ملازم نہیں کہا اپنے واجبات مجھ سے وصُول کر لیں۔ کل کا دِن میں اِسی کام میں صرف کروں گا اور اِس کے بعد وہ اپنے لئے نئے ٹھکانے تلاش کر لیں۔ یہ دُنیا ہے اور یہی تبدیلیاں داستانِ زندگی کہلاتی ہیں۔ اِس لئے بہت زیادہ افسُردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ لوگوں کے دِل میں میرے لئے محبت ہے اور میری ذات سے آپ کو زیادہ تکلیف نہیں پہنچی تو میرے لئے اِتنی دُعا ضرور کریں کہ میں اپنی ثناء کو اپنی خواہش کے مطابق مستقبل کے سفر پر روانہ کر سکوں۔“

احسان صاحب کی آواز آنسوؤں میں ڈُوب گئی تھی۔ چاروں طرف سے سسکیاں سی اُبھرنے لگیں تھیں۔

ناصر صاحب نے کہا ”احسان بھائی جو کچھ ہُوا ہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم نے آپ کی عنایتوں کے سہارے عیش کے دِن گزارے ہیں تو اب بھی ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے یہ کیا بات کہی آپ نے؟ کہ آپ کو سَر چھپانے کا ٹھکانہ تلاش کرنا پڑے گا ایک چھوٹا سا گھر ہم مشترکہ طور پر لیں گے۔ چاہے ایک ایک کمرہ ایک ایک شخص کے حصّے میں آئے ہم میں سے جو بھی ساتھ رہنا چاہے گا ساتھ رہے گا آج تک ہم آپ کے ساتھ جیتے آئے ہیں اب تنہا نہیں جیئیں گے ہم سب ساتھ ہی جیئیں گے احسان بھائی۔“

دوسرے لوگوں نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ ثناء پتھر کے بُت کی مانند کھڑی تھی۔ رِدا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کی صُورت دیکھ رہی تھی۔ ندرت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ایک گوشے میں غلام احمد صاحب کھڑے بُجھی بُجھی سی نگاہوں سے احسان صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر پہلے کوٹھی کے اِس لان میں مسرّت آمیز قہقہے گونج رہے تھے لیکن اب چاروں طرف سوگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ ثناء بالکل خاموش تھی اُس کے چہرے سے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا احسان صاحب یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد واپسی کے لئے مُڑ گئے۔ سب کی حالت بہت عجیب ہو گئی تھی اماں بی کو غش آ گیا اور ملازموں نے اُنھیں سنبھال کر اندر پہنچایا۔ ذرا سی دیر میں سب کچھ اُجڑنے کا منظر اُس گھر کی آنکھوں نے شاید پہلی بار دیکھا تھا۔ ذکیہ بیگم بھی اندر چلی گئی تھیں۔ ثناء بدستور خاموش کھڑی تھی۔ تیمور اُس کی گود میں تھا۔ اور رِدا پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی لوگ جوش و خروش کا اظہار کرنے لگے یہ طے کیا جا رہا تھا کہ احسان صاحب کو وہ تنہا نہیں چھوڑیں گے مشترکہ طور پر کرائے کا کوئی بڑا سا مکان لے لیں گے اور احسان صاحب کو اُس میں رکھیں گے۔ یہ جذبے قابلِ قدر تھے لیکن کوئی بھی دعوے سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ خود احسان صاحب اُن کے اِن جذبوں کو قبُول کر لیں گے یا نہیں؟

بالآخر لوگ منتشر ہونا شروع ہو گئے، ملازمین اپنی اپنی چیزیں اُٹھانے لگے۔ اُن بے چاروں کو انگ پریشانی لاحق ہو گئی تھی اچانک ہی روزگار چھُوٹا تھا اور وہ بھی ایک ایسی جگہ سے جسے وہ اپنا ہی گھر سمجھنے لگے تھے۔ لیکن پیٹ بُری بلا ہوتی ہے جذبے سینے میں ضرور موجزن ہوتے ہیں۔ لیکن حالات کے ہاتھوں انسان بالکل ہی مجبُور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اُن میں سے بہت سوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُنھیں یہاں سے کہاں کہاں جانا ہے؟

اور اُس رات شاید کوٹھی میں کوئی بھی نہیں سو سکا تھا۔ سب کے ذہن عجیب عجیب انداز سے سوچ رہے تھے۔ سب کی سوچیں مختلف تھیں ہر شخص احسان صاحب سے ہمدردی رکھتا

تھا اور شہاب صاحب کے لئے دِل میں کینہ، دبی زبان سے شہاب کو بُرا بھلا بھی کہا جارہا تھا کیونکہ احسان صاحب نے خود اپنی زبان سے بھائی کو بُرا نہیں کہا تھا اِس لئے دوسرے بھی کھُل کر کچھ کہنے کی جُرأت نہیں کرسکتے تھے لیکن ہر دِل میں شہاب صاحب کے لئے نفرت بیدار ہوگئی تھی۔ ویسے بھی وہ کوٹھی کے پسندیدہ انسان نہیں تھے کسی کی اگر توہین ہُوئی تو وہ اُن کے ہاتھوں کسی کو نقصان پہنچا تو اُنہی کے ذریعے کوٹھی میں یہ رات قیامت کی رات تھی۔

اور اِس قیامت کی رات کی صبح ہوگئی۔ غلام احمد صاحب صبح ہی صبح گھر سے نکل گئے تھے۔ احسان صاحب ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد باہر آبیٹھے اور اُنھوں نے ملازمین کو طلب کر لیا۔ نوٹوں کی گڈیاں اُن کے سامنے رکھی ہُوئی تھیں اِن حالات کے باوجود اُنھوں نے ملازمین کو اُن کی تنخواہوں کے ساتھ تین تین ماہ کی تنخواہ زیادہ دی۔ تاکہ اِس دوران میں اُنھیں پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تقریباً تمام ہی لوگوں نے یہ پیسے لینے سے اِنکار کیا تھا لیکن احسان صاحب عاجزی سے بولے کہ وہ قلاش ضرور ہوگئے ہیں لیکن اِتنے بھی نہیں کہ اپنے ساتھیوں کی خدمت نہ کرسکیں۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر اُن کی یہ حقیر سی پیش کش قبول نہ کی گئی تو اُنھیں افسوس ہوگا۔ خیردین نے رقم لیتے ہُوئے کہا۔

" او جی، خیردین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ تو ایک پیسہ بھی نہیں لینا چاہتے مگر کیا کریں پاپی پیٹ کا سوال ہے۔"

رِدا بھی اُس وقت وہاں موجود تھی اُس نے چونک کر خیردین کو دیکھا لیکن خیردین نے رِدا کی طرف نظر بھی نہیں اُٹھائی تھی۔ دوسرے ملازمین بھی رقومات لینے کے بعد سلام کرکے باہر نکل گئے۔ سامان باندھ کر آج شام تک اُنھیں یہاں سے روانہ ہونا تھا۔

سچائیوں کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ظاہر ہے اُنھیں اپنے ٹھکانے بھی تلاش کرنے تھے۔ زبردستی تو کسی کے سر پر مسلط نہیں رہا جاسکتا تھا، لیکن سبھی افسُردہ تھے، احسان صاحب اپنا کام ختم کرکے اندر واپس چلے گئے۔ امّاں بی سب سے زیادہ غم زدہ تھیں۔ ذکیہ بیگم پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہاں ہونے والی تمام کارروائی دیکھ رہی تھیں کہ طفیلی بیگم اُن کے سامنے پہنچ گئیں اُنھوں نے سلام کیا اور احسان صاحب اُنھیں دیکھنے لگے۔

" احسان بھائی! سب کے ٹھکانے ہیں بھیّا، میرے بارے میں بھی کچھ سوچا۔ میرا تو ایک ہی سہارا تھا رشید گم ہوگیا۔ میری دُنیا سے چلا گیا احسان بھیّا مجھے بھی کچھ بتاؤ گے میں کیا کروں۔ رستہ بتاؤ مجھے۔ سہارا نہیں مانگ رہی راہبری چاہتی ہُوں۔"

طفیلی بیگم کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہُوئی تھی۔ احسان صاحب جلدی سے کھڑے ہوگئے، اُنھوں نے طفیلی بیگم کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔

" نہیں طفیلی بیگم، یہ کیسے سوچ لیا آپ نے کہ آپ تنہا رہ گئی ہیں اور آپ کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ہیں غلطی شاید مجھ سے ہُوئی کہ میں نے امّاں بی، ذکیہ اور ثناء کا نام لیا۔ آپ بھی تو ہیں طفیلی بیگم، آپ کہاں جائیں گی ...؛ جہاں ہم ہوں گے وہاں آپ ہوں گی۔ کم از کم اُس وقت تک جب تک کہ رشید واپس نہیں آجاتا۔ یہ خیال آپ دِل سے نکال دیں کہ آپ کو تنہا چھوڑ دیا جائے گا بالکل نہیں۔"

طفیلی بیگم سِسک کر رونے لگی تھیں۔ ذکیہ بیگم نے اُنھیں سہارا دیا اور اُن کا سر سینے سے لگا لیا۔ درحقیقت طفیلی بیگم جو کچھ بھی رہی ہوں اب قابلِ رحم تھیں۔

ساری کوٹھی میں طرح طرح کے واقعات ہو رہے تھے ملازمین سامان باندھتے ہُوئے رو رہے تھے اور گھر کے افراد کوٹھی کے ایک ایک گوشے کو دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے۔

سوگوار مناظر چاروں طرف بکھرے ہُوئے تھے، رِدا اپنے کمرے میں موجود کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہُوئی تھی شہاب صاحب کو اِسی وقت سے تو روکتی تھی وہ۔ اِسی وقت کے لئے تو اُس نے شہاب صاحب کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی لے ڈوبے سب کچھ، برباد ہوگیا یہ آشیانہ ختم کردیا اُنھوں نے سب کچھ اور خود جہنم رسید ہوگئے، آہ! اگر خیردین مدد نہ کرتا تو تیمور بھی ہاتھوں سے نکل گیا تھا لیکن خیردین نے کس بے مروّتی کا ثبوت دیا۔ کتنی خاموشی اور آسانی سے اُس نے احسان صاحب کی دی ہُوئی رقم قبول کرلی۔ حالانکہ عام لوگوں سے مختلف تھا اگر یہ تھوڑی سی رقم قبول نہ کرتا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی اِس پر وہ کم بخت نہ جانے کیا چیز تھا۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اُس کی شخصیت معمّہ ہی بن رہی تھی۔ رِدا قیامت تک یہ بات نہیں مان سکتی تھی کہ خیردین صرف ایک ملازم تھا۔ وہ یقیناً ایک تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ اور نہ جانے کیوں یہاں اِس کوٹھی میں ملازمت کررہا تھا کہیں اِن واقعات سے خیردین کا تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن کسی بھی مشکل میں رِدا ایسی کوئی کڑی تلاش نہیں کرسکی تھی۔ خیردین کا انوکھا کردار اُس کے دِل کے نہ جانے کون سے گوشوں میں جا بیٹھا تھا یہ سوچ کر اُسے رونا آرہا تھا کہ وہ اب تک جس طرح رِدا کی پُشت پناہی کرتا رہا اُسے اُس نے یکسر فراموش کردیا۔ یہ بھی نہیں پُوچھا کمبخت نے کہ

اب اِن حالات میں وہ کہاں جائے گی؟ یہ سب کچھ اِتنا عارضی تھا اُس کے بارے میں رِدا نے اِتنا غلط انداز میں سوچا تھا یقین نہیں آتا تھا لیکن آنکھیں بدلنے والے یُوں بھی ہوتے ہیں حقیقت کی نگاہ سے جائزہ لیتی تو سب ہی اُسے اپنی جگہ دُرست نظر آتے۔ اب وہ یہاں کس بُنیاد پر رہ سکتے تھے۔ احسان صاحب نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ کوٹھی اب اُن کی ملکیت نہیں رہی ہے اور وہ خود بھی اُسے چھوڑ دیں گے۔

اِس سے قبل رِدا درجنوں بار یہاں سے جانے کے بارے میں سوچ چکی تھی لیکن اب اُس کا اندازِ فکر مختلف تھا اِن حالات میں دوسروں کی مانند اُن سب کو چھوڑ کر چلے جانا خیردین کے اقدام سے مختلف تو نہ ہوتا۔

کوٹھی کی فضا پر عجیب سی ویرانی چھائی ہُوئی تھی۔ جو ملازمین باقی بچ رہے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ گردنیں لٹکائے روانہ ہو رہے تھے، جمن اپنی ماں کے ساتھ چلا گیا تھا اور باورچی خانہ سُنسان پڑا ہُوا تھا۔ رِدا کو خیال آیا اور وہ چونک پڑی دوسرے لمحے وہ تیزی سے اُٹھی اور باورچی خانہ کی جانب چل پڑی۔ باورچی خانے میں جاکر دیکھا تو نُدرت تنہا کھانا پکانے میں مصرُوف تھی۔ رِدا کو شرمندگی ہُوئی کہ جو کام اُسے پہلے کرنا چاہئیے تھا نُدرت اُس پر سبقت لے گئی۔ نُدرت نے سُوجی ہُوئی آنکھوں کے ساتھ رِدا کو دیکھا اور پھیکے سے انداز میں مُسکرادی۔

" ڈمونالیزا، میں جانتی ہُوں تم آج مُسکرا نہیں سکوگی۔"

رِدا خاموشی سے نُدرت کے پاس پہنچ گئی "کیا کررہی ہو نُدرت؟"

" کھانا پکارہی ہُوں گھر والوں کے لئے، کھانا کون پکائے گا؟"

" میں تمھارا ہاتھ بٹانا چاہتی ہُوں۔"

" وہ پیاز نکال لاؤ۔ وہ نفاست سے باریک باریک تراشو۔"

نُدرت نے اپنائیت سے کہا اور رِدا نے گردن ہلادی۔ کافی دیر وہ دونوں کام کرتی رہیں۔ پھر امّاں بی ہانپتی کانپتی اِس طرف آئیں اور اُن دونوں کو دیکھ کر دروازے میں ٹھٹک گئیں۔

" امّاں بی! آپ؟"

" سر درد سے پھٹا جارہا ہے ایک پیالی چائے بنانے آئی تھی بیٹی، تم لوگ یہاں کیا کررہی ہو؟"

" کھانا تیار کررہے ہیں امّاں بی، آپ کہلوا دیتیں کسی سے چائے پہنچ جاتی۔ ابھی میں سب کے لئے چائے لے کر آتی ہُوں۔ آپ اپنے کمرے میں جائیے۔" نُدرت نے کہا امّاں بی چند لمحے اُنھیں دیکھتی رہیں اور پھر خاموشی سے واپس چلی گئیں۔ نُدرت نے چائے بنائی اور رِدا سے بولی۔

" جاؤ رِدا چائے لے جاؤ۔"

" مَیں؟" رِدا نے سہمے ہُوئے سے انداز میں کہا۔

" ہاں، ہانڈی جل جائے گی یا پھر تم دیکھو میں جاتی ہُوں۔"

" نہیں نہیں میں چلی جاتی ہُوں۔" رِدا نے کہا اور چائے کی ٹرالی ڈھکیلتی ہُوئی بڑے کمرے کی جانب چل پڑی۔ بڑے کمرے میں ذکیہ بیگم، امّاں بی، طفیلی بیگم، احسان صاحب اور ثناء موجود تھے تیمور مُسلسل ثناء کی گود میں تھا۔ وہ لوگ بیٹھے ہُوئے باتیں کررہے تھے۔ رِدا چائے کی ٹرالی ڈھکیلتی ہُوئی اندر داخل ہُوئی تو احسان صاحب جلدی سے کھڑے ہوگئے۔

" اوہ! رِدا بیٹی تم نے تکلیف کی۔" رِدا نے شکایتی نگاہوں سے احسان صاحب کو دیکھا تھا۔ ثناء خاموشی سے تیمور کو کلیجے سے لگائے بیٹھی ہُوئی تھی اُس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

" سُنا ہے تم دونوں باورچی خانے میں کھانا پکا رہی ہو...!"

احسان صاحب مُسکرا کر بولے۔

" تو اِس کا تذکرہ ضروری ہے انکل؟" رِدا نے سنجیدگی سے کہا۔

" نہیں بھئی نہ جانے کیوں سب کچھ نیا نیا لگ رہا ہے۔ یہ سب کچھ تقدیر کے کھیل ہیں بیٹے کسی بھی بات کو محسوس مت کرنا۔"

رِدا نے خاموشی سے چائے کی پہلی پیالی امّاں بی کو پیش کی اِس کے بعد ذکیہ بیگم، احسان صاحب اور طفیلی بیگم کو اور پھر ایک پیالی بناکر ثناء کے سامنے لے گئی اور ثناء سِسک پڑی۔

" ثناء نہیں بھئی تم جیسی لڑکی اور یہ آنسو۔ میں نہیں مانتی۔ تبدیلیاں تو زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہیں ثناء۔ ہمیں ہر حالت میں گزر کرنا ہوتی ہے۔ لمحات ہی تو کہانیاں جنم دیتے ہیں اور کہانیوں کے بغیر انسانی زندگی بے مزہ ہوتی ہے میں تمھیں ایک مضبُوط اور پُروقار دوست ہی دیکھنا چاہتی ہُوں ثناء، اگر تمھاری شخصیت میں ذرا بھی لچک پیدا ہُوئی تو یقین کرو تم میرے اُس تاج محل کو توڑ دوگی جو میں نے تمھاری شخصیت کا بنایا ہے۔" ثناء اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اُس نے شیشے جیسی چمکتی آنکھوں سے رِدا کو گھُورتے ہُوئے کہا۔

" رِدا لو تیمور کو سنبھالو۔ اِسے کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے پائے ورنہ سوچ لینا اپنی اور تمھاری زندگی ختم کردُوں گی کتنی ہی دُور رہو۔ اِس شہر کو چھوڑ نہیں جاؤ گی نا۔ یہیں رہو گی تم کہتی تھیں یہیں رہُوں گی ملتی رہو گی نا مجھ سے؟" ثناء کی آواز میں ایک عجیب سی بے بسی تھی اُس نے تیمور کو رِدا کی طرف بڑھا دیا تھا اور چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے پھر وہ غرّائی ہُوئی آواز میں بولی۔

"کیا کروں تیمور کا؟"

"اِسے لے لو اور مجھے بتاؤ تم کہاں جاؤ گی ہم نے ہارتی رہی۔ لیکن اب بھی سوال کھڑے ہیں تم اگر وقتی طور پر چاہو تو ہمارے ساتھ رہ جاؤ لیکن رِدا تمہیں جانا تو پڑے گا۔"

"تم بتاتی ہو نا ثناء مجھے کیا کہنا چاہتی ہو، ناسپاس، بے مروت، بیج خاندان، ذلیل کمینی فطرت یہ تمام گالیاں جو تمہارے اُن چند الفاظ ہی میں پوشیدہ ہیں اس کے علاوہ بھی جو کچھ کہنا ہے کہو مجھے، میں اُس کی حقدار ہوں۔"

"نہیں رِدا جذباتی ہونے سے کام نہیں چلے گا اب وہ وقت نہیں ہے کہ میں تم سے کچھ کہہ سکوں۔"

"تیمور کو قتل کرانا چاہتی ہو میرے ہاتھوں، مار دوں گی خدا کی قسم اسے جان سے مار دوں گی تم نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ جو کچھ میں اپنے حالات سے نظر آتی ہوں کیا تم نے اُسے ہی میری شخصیت سمجھ لیا ہے۔ اتنا ہی گھٹیا، اتنا ہی تنگ سمجھا ہے تم نے مجھے۔ اُن لازموں میں جگہ دی ہے جو گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ تم بڑے آدمی کی بیٹی ہو اور میں ایک لاوارث ہستی جو اِس بچے کو سینے سے لگائے ریلوے اسٹیشن پر بے آسرا پھر رہی تھی اور تم نے ازراہِ کرم سہارا دے کر اپنی اِس جنت میں پناہ دی۔ یہی سب کچھ کہنا چاہتی ہو نا تم، کہہ لو میں تختۂ مشق بننے کے لئے تیار ہوں کیونکہ اِس وقت تم جذبات سے عاری ہو چکی ہو۔ تم اِس انداز میں سوچ رہی ہو جس طرح بڑے لوگ سوچتے ہیں، جس طرح دولت مند لوگ ہر شخص پر احسان کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اِس طرح تم بھی مجھ پر احسانات کو اِن الفاظ کے ساتھ مجھے واپس لوٹا دینا چاہتی ہو۔ یہی جذبے ہیں تمہارے سینے میں۔ ٹھیک ہے ثناء ٹھیک ہے۔ میں ہیچ ہوں۔ وہی ہوں جو تم مجھے کہنا چاہتی ہو لیکن اگر میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھو تو درحقیقت میں وہ نہیں ہوں ثناء جو تم نے مجھے سمجھا ہوا ہے" رِدا کی آواز جوشِ غضب سے لرز رہی تھی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اُس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا عجیب سے احساسات کا شکار ہو گئی۔ اُس نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی ابو کیا میں نے ایسی کوئی بات کہی ہے طفیل خالہ آپ بتائیے کچھ کہا ہے میں نے رِدا سے؟"

"نہیں ثناء ثناء، لاؤ تیمور مجھے دینا چاہتی ہو نا یا یہ الفاظ ادا کر رہی ہو نا کہ میں فوراً یہاں سے چلی جاؤں۔ جا رہی ہوں۔ لے جاتی ہوں اِسے بھی۔ لیکن اب اِس شہر میں نہیں رہوں گی۔ آج اور ابھی یہاں سے ریلوے اسٹیشن جاؤں گی اور اپنی تقدیر کے نئے ٹھکانے تلاش کروں گی کسی تم جیسی بڑی ہستی کو تلاش کروں گی جو اتنے عرصے مجھے اپنوں کی طرح پناہ دے سکے اور بعد میں آسانی سے اِس بات کا اظہار کرے کہ میں اپنی نہیں تھی۔ یہ تو میرا پیشہ ہے ثناء۔ یہی میرا ذریعہ معاش ہے ایسے ہی گھروں کو تلاش کرتی ہوں اور وہاں باعزت بن کر رہتی ہوں اُس وقت تک جب تک وہ صاحبِ حیثیت رہتے ہیں اور جب اُن پر کوئی بُرا وقت آتا ہے تو وہ جگہ چھوڑ دیتی ہوں۔ آؤ تیمور چلیں" رِدا نے ایک جھٹکے سے تیمور کو ثناء کی گود سے لے لیا اور واپسی کے لئے مُڑی لیکن عقب میں احسان صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کے ہونٹوں پر ایک محبت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"رِدا بیٹے! ہم سے پوچھ لیا تم نے، ہم سے اجازت لینا بھی پسند نہیں کرو گی یہاں سے جانے کے لئے؟" رِدا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور اُس نے اپنا سر احسان صاحب کے سینے سے لگا دیا تھا۔

"آپ دیکھ لیجئے انکل آپ خود ہی دیکھ لیجئے میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ثناء مجھے یہاں سے نکال رہی ہے۔"

"میں کب نکال رہی تھی خود ہی تو جانے کے لئے کہتی تھیں۔ ہمیشہ اِس بات کا اظہار کرتی تھیں کہ تم یہ کوٹھی چھوڑ کر چلی جانا چاہتی ہو۔ ہمارا احسان لینا نہیں چاہتیں اب ہم احسان کرنے کے قابل رہے ہی کہاں۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں گے تمہارا" ثناء نے کہا۔

"انکل اِسے روک لیجئے میں خودکشی کر لوں گی۔ خدا کی قسم انکل میں خودکشی کر لوں گی۔ میرا خون اِس کی گردن پر ہوگا۔ اِس سے کہہ دیجئے انکل کہ یہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرے۔"

"نہیں بھئی ثناء کے دل میں وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ وہ خود بھی اِس وقت کتنی جذباتی ہو رہی ہے مگر رِدا بیٹی! بچوں کے مسائل بڑے حل کرتے ہیں اور بچوں کا بھی فرض ہے کہ وہ کم از کم کوئی قدم اُٹھاتے ہوئے بڑوں سے مشورہ کر لیا کریں۔ تم کہاں واپس جا رہی ہو؟ کہاں جاؤ گی تم؟ ثناء نے کہی ہے نا یہ بات بھئی وہ بھی بچی ہے بچوں کے سے انداز میں سوچتی ہے اب ہم نے ثناء سے تو نہیں کہا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلی جائے جب ہم نے ثناء سے یہ الفاظ نہیں کہے تو رِدا سے کیسے کہہ سکتے ہیں کیا اِس بات کو رِدا تسلیم نہیں کرتی کہ وہ بھی ہماری بیٹی ہے" رِدا احسان صاحب کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ ثناء پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی دفعتاً ہی اُس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر

ٹھہر گئی وہ آگے بڑھی اور تیمور کو گود سے چھین لیا۔

"ہیرو! ابھی ہم دولت مند ہیں، مالدار ہیں یار، اِس کا مقصد ہے کہ ابھی ہمارے اندر وہ چیز موجود ہے کہ لوگ اِس طرح ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں چھوڑ یار ہیرو تو کہاں جائے گا، آجا میری جان آجا میری گود میں" وہ تیمور کو سینے سے لپٹائے پیچھے ہٹ گئی اور پھر احسان صاحب رِدا کو لئے ہوئے صوفے پر آ بیٹھے۔

"چلو ثناء! رِدا کو چائے دو۔"

"ابھی ابّو ابھی" ثناء جلدی سے اُٹھی اور اُس نے محبت سے چائے کی ایک پیالی بنا کر رِدا کے سامنے رکھ دی اور بولی۔

"اے مونالیزا تیری ناک بہہ رہی ہے کیوں مجھے بدنام کرنے پر تُلی ہوئی ہے، چل ناک صاف کر کے چائے پی" رِدا خاموشی سے چائے کی پیالی اُٹھا کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی تھی۔

پھر تھوڑی دیر تک وہ لوگ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے اُس کے بعد رِدا اُٹھ گئی۔

"ندرت باورچی خانے میں اکیلی ہے میں جا رہی ہوں۔"

"کیا... یہ اللہ رکھی! باورچی خانے میں گھسی کیا کر رہی ہے؟" ثناء نے تعجب سے کہا۔

"کھانا پکا رہی ہے، کیا کھانا نہیں کھانا دوپہر کو؟" رِدا بولی۔

"گڈ، ویری گڈ، چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ آؤ ہیرو" ثناء نے کہا اور دونوں کمرے سے باہر نکل آئیں۔

❖❖

شہاب صاحب کا کہیں پتہ نہیں تھا ویسے پولیس نے ایک بار بھی اُن کی تلاش میں کوٹھی کا رُخ نہیں کیا تھا۔ اِس بات پر احسان صاحب کو حیرت تھی اور وہ محکمۂ پولیس کے ممنون تھے۔ شہاب صاحب کی تلاش بہرطور جاری تھی لیکن دوسری طرف احسان صاحب اپنی ذمہ داریوں سے نمٹ رہے تھے، سارے کام تقریباً مکمل ہو چکے تھے۔ جن لوگوں کا جو بھی قرض تھا۔ وہ مختلف صورتوں میں ادا کر دیا گیا تھا اب صرف محمود علی آفندی رہ گئے تھے جو معاہدے کے مطابق احسان صاحب کی اِس کوٹھی اور اُس مرکزی فرم کے حقدار تھے جو ابھی تک احسان صاحب کی تحویل میں تھی۔ اِس سلسلے میں کاغذات تیار کئے جا رہے تھے محمود علی آفندی اِس شہر کے بہت بڑے دولت مندوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ عظیم الشان کاروبار پھیلا ہوا تھا اُن کا۔ احسان صاحب سے کاروباری رقابت رکھتے تھے اور بہت سے مرحلوں پر احسان صاحب کی دیانتداری سے شکست کھا چکے تھے یہ شکست اُن کے ذہن میں زندہ تھی اور اِس وقت جب احسان صاحب زوال پذیر ہوئے تھے انھوں نے اپنی مہم تیز کر دی تھی مختلف حلقوں میں احسان صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اُن کے لہجے میں حقارت پیدا ہو جاتی تھی یہ سب پچھلی شکستوں کا بُخار تھا ویسے بھی عمر رسیدہ انسان تھے اور عادتاً بہت غصّہ ور تصوّر کئے جاتے تھے۔ پہلے تو کبھی انھوں نے احسان صاحب کے بارے میں بولتے ہوئے کوئی ایسی بات کہنے کی جُرأت نہیں کی تھی لیکن اب اُن کی زبان کھل گئی تھی اور انھوں نے صنعت کاروں کے کلب میں بیٹھ کر بڑے غرور سے یہ بات کہی تھی کہ اب احسان کا سورج ڈوب چکا ہے۔ اُن کی کوٹھی تک محمود علی آفندی کے قبضے میں آ جائے گی۔ کیونکہ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے واجب الادا ہیں۔ احسان صاحب نے خود ہی یہ پیشکش محمود علی آفندی کو کی تھی۔ محمود علی آفندی نے جان بوجھ کر یہ شرط رکھی تھی کہ کوٹھی اور بڑا کاروبار (یعنی احسان لمیٹڈ) اُن کے سپرد کیا جائے جس کی مالیت تقریباً اِتنی ہی بنتی تھی احسان صاحب نہ مختلف طبیعت کے آدمی تھے جب سب کچھ ہی لُٹ گیا تھا تو پھر اقتدار کو لپٹے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ اِسی کلب میں بیٹھ کر انھوں نے نہایت خوشدلی سے کہا تھا کہ یہ دونوں چیزیں اب محمود علی آفندی کی ملکیت ہیں اور کسی وقت بھی وہ انھیں لے سکتے ہیں کیونکہ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی رقم فراہم کرنا احسان صاحب کے بس کی بات نہیں ہے اب تو اپنا ایک ایک پیسہ لُٹا چکے ہیں وہ۔

تخمینے لگائے جا رہے تھے اور یہ کام کئی وکیل مل کر کر رہے تھے جن کی نگرانی محمود علی آفندی خود کیا کرتے تھے۔ قانوناً احسان صاحب اِس بات کے مجاز تھے کہ اگر ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی رقم ادا کر دی جائے تو پھر اُن دونوں چیزوں پر کسی کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا۔ ملکی اور غیر ملکی تمام قرضے ادا کر دیئے گئے تھے اور اُن کی رسیدیں فائل کر لی گئی تھیں۔

آج کل احسان صاحب کو یہی کام رہتا تھا کوٹھی کی ایک ایک چیز اب محمود علی آفندی کی ملکیت تھی۔ اور اُس شام انھوں نے کلب میں اِس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر احسان صاحب اجازت دیں تو وہ کوٹھی کا جائزہ لے لیں۔ فرم کے کاغذات وہ اچھی طرح چیک کر چکے تھے اِس بات پر احسان صاحب نے کہا کہ اصولاً اُن کے پاس ابھی بائیس دن باقی ہیں جن میں یہ قانونی ادائیگی کرنی ہے۔ چنانچہ اِس دوران آفندی صاحب کو اُس کوٹھی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جس دن وہ

کوٹھی چھوڑ دی جائے گی اُس دن آفندی صاحب وہاں جا سکتے ہیں۔

"بھئی یہ بات تو میں اِس لئے کہہ رہا تھا کہ ذرا اُس کی اندرونی حالت کا جائزہ لے لوں۔ تمھاری گاڑیاں وغیرہ ہیں اُن کے کاغذات بھی چیک کرنے ہیں یہ تمام چیزیں دِقت طلب ہوتی ہیں۔ میں صرف اِس لئے یہ کارروائی کرنا چاہتا تھا۔"

"نہیں، میں یہ شہر چھوڑ نہیں رہا اگر اِس کے باوجود آپ کا مجھ پر کچھ واجب الادا ہوگا تو میں اِس کی ادائیگی کا ذمّہ دار ہوں گا۔ آپ کو اِتنا زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئیے۔" لوگوں نے احسان صاحب کی تائید کی تھی جو کچھ احسان صاحب کے دِل پر بیت رہی تھی وہی جانتے تھے کچھ اُن کے ہمدرد بھی تھے جو انھیں ہر طرح کی پیش کش کر چکے تھے لیکن احسان صاحب نے کہا تھا کہ اپنے اچھے وقت میں جب اُنھوں نے کسی کی مدد قبول نہیں کی تو یہ لمحے تو اُن کے لئے مزید پریشان کُن ہیں۔ اور کسی بھی احسان کے صِلے میں وہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتے چنانچہ احسان ہی کیوں لیا جائے۔ بہت سے ایسے دوست بھی تھے جنھیں احسان صاحب کے اِس طرح لُٹ جانے کا دُکھ تھا۔ لیکن سبھی جانتے تھے کہ احسان صاحب اپنے بھائی کی بُرائیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ بذاتِ خود اُن کا اِن معاملات میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

✤✤

یہ ساری کارروائیاں اِسی طرح جاری تھیں، غلام احمد صاحب نے بھی ابھی گھر نہیں چھوڑا تھا اور تین نمبر آباد تھا جب کہ باقی کوارٹر ویران ہو چکے تھے۔ چوکیدار فضل خان بھی جا چکا تھا۔ اور اِس سلسلے میں احسان صاحب نے ہنس کر کہا تھا کہ اب اُن کا اِس کوٹھی میں ہے ہی کیا جس کے لئے چوکیدار کی ضرورت پیش آئے۔

اُس شام احسان صاحب کوٹھی کے لان پر بیٹھے ہوئے کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے کہ کوٹھی کے بیرونی دروازے سے اُنھیں غلام احمد صاحب اندر داخل ہوتے نظر آئے، احسان صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اُنھیں اپنی طرف بُلا لیا تھا۔ لیکن خود غلام احمد کا رُخ بھی اُسی جانب تھا غلام احمد صاحب قریب پہنچے تو احسان احمد صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی غلام احمد! تم نے بہت دیر لگا دی یہ کوارٹر خالی کرنے میں۔ ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو یا کوئی اور مصروفیت ہے آج کل؟ کہو تو تمھاری نوکری کے لئے کہیں بات کروں۔"

"نوکری تو مجھے آپ کے ہی پاس کرنی ہے احسان صاحب، بھلا اب میں کسی اور کی ڈرائیوری کے قابل کب ہوں۔"

"بھئی مذاق اُڑانے کی نہیں ہو رہی کیا چیز چلائیں گے آپ۔ یہ ساری گاڑیاں تو اب محمود علی آفندی کی ملکیت ہیں۔ وہ کوٹھی کا قبضہ لینے کے ساتھ ساتھ اِنھیں بھی اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ غلام احمد یار! سنجیدگی سے سوچو تمھارے ساتھ بچیاں بھی ہیں اور دو اور خواتین بھی، کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ سب لوگ جا چکے ہیں مجھے یہ سوچ کر اُلجھن ہو رہی ہے کہ اب میں تمھارے لئے کیا کروں گا۔"

"کچھ گفتگو کرنے حاضر ہُوا ہُوں احسان صاحب! موقعہ دیں گے اِس کا؟"

"بیٹھو بھئی بیٹھو۔ کیا تکلیف ہے؟" احسان صاحب نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا اور غلام احمد بیٹھ گئے۔

"ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بہت وسیع کاروبار تھا آپ کا احسان صاحب، کیا کچھ تھا اِس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات تو مجھے بھی حاصل ہیں اور کیا کچھ چلا گیا اِس کا بھی مجھے اندازہ ہے۔ لیکن اگر ہماری بڑی فرم احسان لمیٹڈ اپنا کام کرتی رہے تو کیا یہ مناسب نہیں ہوگا؟ کیا آپ اپنے اندر وہ قوت نہیں پاتے احسان صاحب کہ آپ اِس فرم کو اُسی انداز میں چلا سکیں اگر یہ فرم اُسی انداز میں چلتی رہے تو ہم اپنے حالات بہتر نہیں بنا سکتے۔"

"بھائی! کچھ میں نہیں آیا کچھ۔" احسان صاحب غلام احمد صاحب کو دیکھتے ہُوئے بولے۔

"جو عرض کرنا چاہتا ہُوں اُسے غور سے سُنیئے گا اور ٹھنڈے دِل سے اُس پر سوچیئے گا۔ ہم اُس عُمر میں نہیں ہیں کہ جذباتی انداز میں سوچیں۔ آج میرے الفاظ کچھ تبدیل ہُوئے ہیں احسان صاحب، لیکن آپ اِس تبدیلی کو وقتی تصوّر کریں۔ دراصل میں جو کچھ کہہ رہا ہُوں اُس میں وزن پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے مان لیا ہم نے تمھاری وزنی باتوں کو ویسے واقعی آج تم کافی بدلے بدلے سے ہو۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

"تھوڑی سی تمہید کی اجازت دیں شاید میں نے کبھی اِس بات کا تذکرہ آپ سے کیا ہو کہ سابق مشرقی پاکستان میں میرا ایک چھوٹا سا کاروبار تھا اور خُدا کے فضل سے میں اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ بڑی اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ تبدیلیاں تقدیر کا کھیل ہوتی ہیں احسان صاحب، میری تقدیر نے بھی یہ کھیل کھیلا۔ اور میری زندگی میں بھی کچھ تبدیلی آئی۔ وہاں سے ہجرت کر کے یہاں پہنچ گیا اور ایک ایسے علاقے میں زندگی گزارنے

پر مجبور ہو گیا جہاں میری عزّت داؤ پر لگ گئی تھی ہر لمحہ خوف وہراس کا لمحہ تھا۔ ڈرتے ڈرتے آپ سے تذکرہ کیا اور آپ نے اپنی فراخدلی سے کام لے کر مجھے اِس جنت میں جگہ دے دی جہاں آ کر مجھے جو سکون مِلا وہ بیان سے باہر ہے۔ احسان صاحب لفظوں کے جال میں پھنس کر آپ کو اپنی چرب زبانی سے متاثر نہیں کرنا چاہتا جو کچھ کہہ رہا ہُوں دِلی جذبات ہیں اور شاید اِس سے پہلے میں نے کبھی آپ کے سامنے اِس حد تک بولنے کی جُرأت نہیں کی ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے یہ بہت بڑا خاندان میرا اپنا ہے۔ یہ جُرأت کرنے دیجیئے مجھے کہنے دیجئے کہ میں نے اپنے آپ کو آپ کے خاندان ہی میں تصوّر کیا اور اُس کی بُنیادی وجہ یہ تھی کہ مجھے کبھی خود کو ملازم سمجھنے کا موقعہ ہی نہ دیا گیا۔ ثنا بیٹی میرے کوارٹر میں آتی جاتی رہیں ندرت اور عصمت کو اُنھوں نے اپنی بہنوں کی مانند سمجھا۔ آپ نے مجھے کبھی ڈرائیور نہیں کہا اور اب وہ حیثیت دی جو کم از کم مجھ جیسے لوگوں کو نہیں دی جاتی۔ یُوں سمجھئے کہ میری زندگی کو ایک ایسا ٹھکانہ مِل گیا تھا جہاں رہ کر مجھے عزّت بھی مِلی اور اپنی عزّت محفوظ کرنے کا ذریعہ بھی مشرقی پاکستان سے آنے کے بعد وہ سب کچھ مجھ سے چھن گیا تھا۔ جو کبھی میرا تھا اور جو کچھ چھننے جا رہا تھا اُسے آپ نے بچا لیا احسان صاحب اور انسان کی زندگی میں صرف ایک ہی لمحہ ایسا ہوتا ہے جب وہ کسی کی عنایت سے جینے لگتا ہے۔ میرے خوف وہراس میں ڈوبے ہُوئے دِل کو جو سہارا یہاں مِلا اُس کا کوئی صِلہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں تو میں مشرقی پاکستان کی بات کر رہا تھا کہ وہاں میرے پاس جو رقم تھی یا جو کاروبار تھا میں نے اُسے ایک جگہ جمع کیا اور ریڈ کراس کے دو نمائندوں کے حوالے کر دیا جن میں سے ایک کا نام ایلس براؤنسن اور دوسری مسز پال نائیڈو تھیں۔ ریڈ کراس کے دونوں نمائندے بے پناہ مصروفیات میں مجھے بھول گئے اور اُس کے بعد میرے پاس ایسے بڑے وسائل نہ رہے جن کی بناء پر میں اُنھیں تلاش کر سکتا۔ میں نے کوششیں کیں اور اُس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ میری نِگاہوں کے سامنے ایسے لُٹے ہُوئے کئی خاندان موجود تھے جن کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی۔ میں تو صرف خُدا کا اِس بات پر احسان مند تھا کہ اُس نے مجھ بیٹیوں والے کو عزّت سے رکھا۔ احسان صاحب! ابھی چند روز قبل آپ ہی کے دوست کے ایک بیٹے کے ذریعے مسز پال نائیڈو کو میرا پتہ معلوم ہُوا میں اختر میاں کی بات کر رہا ہُوں جو عادل صاحب کے بیٹے تھے اور یہاں آئے ہُوئے تھے۔ اتفاق سے ایک دِن مجھ سے ملاقات ہُوئی تو میں نے اپنے بارے میں تھوڑی بہت تفصیلات بتا دیں۔ اُس خُدا کے بندے نے انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہُوئے مسز پال نائیڈو کو تلاش کیا اور اُنھیں میرے بارے میں تفصیلات بتا دیں چنانچہ مسز پال نائیڈو نے یہاں تک کا سفر کیا اور اُس کے بعد مشرقی پاکستان میں دی گئی وہ رقم میرے حوالے کر دی جو اُن کے پاس محفوظ تھی۔ یہ رقم اضافے کے ساتھ مجھے دی گئی ہے اور اپنی اصل سے کہیں زیادہ ہے احسان صاحب! جس وقت مجھے پال نائیڈو کا خط مِلا اور اُس کے بعد میری اُن سے ملاقات ہُوئی تو میں نے اپنے اہلِ خاندان کو اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا میں اُن احساسات کا شکار تھا کہ کہیں درمیان میں پھر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے میں اُن لوگوں کو حقیقت بتا دُوں اور پھر وہ سب کچھ نہ ہو سکے جو میں نے سوچا تھا چنانچہ میں انتظار کر رہا تھا کہ جب رقم میرے ہاتھ آ جائے تو میں اپنے خاندان کو یہ خوش خبری سُناؤں۔ خُدا کے فضل سے میں نے اُنھیں اِس بارے میں کچھ نہیں بتایا اور اب مجھے چند چیک مِلے ہیں جو میری رقم کے ہیں۔ میں چاہتا ہُوں کہ اِس رقم سے آپ احسان لمیٹڈ کو بچا لیں اور یہ کوٹھی کسی کے حوالے نہ کریں میں جاننا چاہتا ہُوں کہ جن صاحب کا آپ نے نام لیا ہے یعنی آفندی صاحب اُن کا کتنا سرمایہ آپ پر قرض ہے جس کے عوض وہ یہ کاروبار اور کوٹھی لے رہے ہیں۔"

احسان صاحب ہنس پڑے تھے "بھئی سب سے پہلے تو میری طرف سے اِس بات کی دِلی مُبارک باد قبول کرو کہ تمھیں تمھاری رقم مِل گئی۔ اور اُس کے بعد میری طرف سے ایک دوستانہ مشورہ قبول کرو۔ جذبات ہماری جیسی عمر کے لوگوں کو زیب نہیں دیتے تمھارے سامنے بھی دو بیٹیاں ہیں۔ والدہ اور بیوی ہیں جو ایک اچھا مستقبل کھو کر بیٹھی ہُوئی ہیں جو کچھ بھی تمھیں مِلا ہے۔ سنبھال کر رکھو، بینک میں ڈپازٹ کرا دو اور اُس کے ذریعے اپنی بیٹیوں کا مستقبل سنوارو۔ جہاں تک میرا مسئلہ ہے غلام احمد مجھے خود ہی اُس سے نمٹنے دو مجھے خوشی ہوگی اور یقین کرو یہ جو کچھ ہُوا ہے بہت بُرا ہُوا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ میں اِس سے خوش ہُوں لیکن اِتنا ناخوش بھی نہیں ہُوں جتنا کہ تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ میں زندگی کو حقیقی رنگوں میں دیکھنے کا عادی ہُوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے اِرد گرد بہت سے لوگوں کو جمع کر رکھا تھا میں اُن سب کے درمیان ہی جینا چاہتا تھا۔ لیکن اب زندگی کا یہ رُخ بھی اِتنا بُرا نہیں ہوگا میرے لئے مجھے جدوجہد

کرنے دو، لکن ہے جونی کے کچھ سال واپس لوٹ آئیں۔"

"میں جانتا تھا کہ آپ میری بات کو کبھی سنجیدگی سے نہیں سنیں گے لیکن میں آج اس بات کا تہیہ کرکے آیا ہوں کہ زندگی میں پہلی بار گستاخیاں کرکے رہوں گا۔ مجھے یہ گستاخیاں کرنے دیں احسان صاحب وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد کبھی کوئی گستاخی نہیں کروں گا۔"

"ارے نہیں بھئی، پُرتکلف الفاظ ادا نہ کرو۔ تم نے یہ پیشکش کرکے میرا دل جتنا بڑھا دیا ہے میں اس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں اب بھی دوستوں سے محروم نہیں ہوں۔ میں نے اپنے کسی بھی دوست کا کوئی احسان نہیں لیا۔"

"اپنے محبت کرنے والوں کا تو احسان لے سکتے ہیں آپ، احسان صاحب میرا احسان تو لے سکتے ہیں۔ میں تو آپ کا دوست نہیں ہوں۔ آپ کا خادم آپ کا غلام ہوں۔"

"بھئی اب تو تم غلام نہیں غلام احمد ہو۔ ویسے بڑی معصومانہ خواہش ہے تمھاری۔ کتنی رقم ملی ہے تمھیں ریس کورس سے۔"

"ساڑھے دس کروڑ۔" غلام احمد نے جواب دیا اور احسان احمد صاحب کے ہاتھ سے دبا ہوا پائپ چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

"کتنی؟"

"ساڑھے دس کروڑ۔" غلام احمد صاحب نے جیب سے ایک بڑا لفافہ نکال کر احسان صاحب کے سامنے رکھ دیا اس میں ساڑھے دس کروڑ کی رقم کے چیک موجود تھے۔ احسان صاحب کی آواز بند ہوگئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان چیکوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی پھر انھوں نے نگاہیں اٹھا کر غلام احمد کو دیکھا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ کوئی بات نہیں بن پڑ رہی تھی ان سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی منہ سے... غلام احمد نیازمندی سے خاموش بیٹھے تھے کچھ دیر یہ خاموشی طاری رہی پھر احسان صاحب نے کہا۔

"غلام احمد! کچھ کہنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں میرے پاس، سمجھ سکتے ہو تو میرے جذبات خود ہی سمجھ لو۔ میں تمھیں، میں تمھیں اتنا بڑا انسان نہیں سمجھتا تھا اسے میری کوتاہی کہہ لو یا جو کچھ تم چاہو غلام احمد کیا اب بھی، کیا واقعی اب بھی اس دنیا میں یہ سب کچھ موجود ہے... اب بھی یہاں، یہ تم ہی ہو غلام احمد میرے ڈرائیور، میرے ایک معمولی سے ڈرائیور، جو میرے ملازموں کے کوارٹرز میں زندگی گزارتا رہا ہے غلام احمد، یہ رقم تم مجھے دینے آئے ہو۔ میرا مستقبل بچانے آئے ہو غلام احمد کن الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کروں، خدا کی قسم یہ سب کچھ نہیں چاہیئے مجھے' یہ سب کچھ تمھارا ہے صرف تمھارا۔ لیکن... لیکن تم نے جس جذبے کا اظہار کیا ہے اور جو کچھ تم ہو میں نے کبھی تمھیں اتنا بڑا نہیں سمجھا تھا مجھے ماتم کرنے دو اپنی عقل کا غلام احمد۔ ویری سوری میرے عزیز، میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

"صرف یہ جان کر کہ میں ساڑھے دس کروڑ کی حیثیت کا آدمی ہوں۔" غلام احمد صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں بھئی صرف اس بات پر، میں تمھیں کچھ نہیں سکا۔"

"اور یہ کہ کبھی آپ نے میرے ساتھ جو کیا وہ اس رقم سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔"

"نہیں بھئی، اب مجھے کچھ مت کہو۔ بس اب مجھے کچھ مت کہو۔ میں برداشت نہیں کرپاؤں گا۔ خدا کے لئے یہ لفافہ اپنی جیب میں رکھ لو۔ میں پاگل نہ ہوجاؤں۔"

"یہ لفافہ میں واپس جیب میں رکھنے کے لئے نہیں لایا، احسان صاحب، اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی مجھے عزت یا کوئی مقام دینا چاہتے ہیں تو خاموشی سے یہ چیک قبول کرلیں انھیں جمع کرادیں اور وہ رقم جو ان دونوں چیزوں پر آپ کو ادا کرنی ہے آفندی صاحب کے منہ پر مار کر اس کوٹھی کو اسی طرح قائم رہنے دیں۔ غلام احمد کا کوارٹر اسی طرح سلامت رہنے دیں۔ کاروبار اسی طرح جاری رہنے دیں۔ اور اگر آپ نے یہ سب کچھ نہ کیا تو میں صرف یہی سمجھوں گا کہ ایک ڈرائیور کا احسان لینا پسند نہیں کیا آپ نے"

"میرے بھائی! میرے دوست، نہ کہو یہ سب کچھ یہ کیسے لے سکوں گا میں، میں مجبور ہوں غلام احمد میں مجبور ہوں۔"

"تب پھر مجھے یہ کہنے دیجئے احسان صاحب کہ آپ نہ صرف اپنے اطراف پھیلے ہوئے لوگوں کو بلکہ دنیا کو بھی دھوکہ دیتے رہے ہیں آپ اتنے بڑے انسان نہیں، جتنا بڑا ہونے کا اظہار کرتے ہیں بڑائی تو یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو بھی کسی قابل سمجھے دوسروں کو بھی اپنی ذات میں شامل ہونے دے، کیا آپ مجھے یہ مقام دینا پسند نہیں کرتے، جس کے حصول کا میں خواہش مند ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو غلام احمد کیا کہہ رہے ہو، کچھ سمجھاؤ تو سہی مجھے۔"

"میں صاف الفاظ میں عرض کر رہا ہوں احسان صاحب کہ یہ رقم میں آپ کو دے دینا چاہتا ہوں۔ طویل عرصہ گزر گیا ہے اس حیثیت سے زندگی گزارتے ہوئے میرے اہل خاندان اس کے عادی ہیں اور میں نے ابھی تک انھیں یہ بات نہیں بتائی کہ ریس کورس سے میری رقم واپس مل گئی ہے۔ کوئی نہیں جانتا اس بارے میں۔ وہ لوگ اپنے آپ کو ان حالات میں ایڈجسٹ

کرچکے ہیں میں چاہتا ہوں کہ وہ انہی حالات میں زندگی گزارتے رہیں۔ جہاں تک میری بیٹیوں کا تعلق ہے تو اگر اس سلسلے میں میرے پاس کچھ نہ ہوتا احسان صاحب آپ ہی سے عرض کرتا کہ میری مدد کیجئے۔ اور اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ جب میں ان کی شادیاں کروں گا تو آپ کو مجھے سہارا دینا ہوگا لیکن یہ رقم۔ جو غیر متوقع طور پر مجھے حاصل ہوئی ہے میں آپ کی عزت برقرار رکھنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں مجھے خود بھی اپنی ذات پر فخر محسوس کرنے کا موقعہ دیجئے، بڑائی کا سارا حق آپ ہی کو نہیں پہنچتا ہے احسان صاحب، آپ نے اپنے اہل خاندان کو اپنی کوٹھی میں جمع کرلیا تھا۔ آپ نے ایک غریب ڈرائیور کو ایک کوارٹر دے کر اس کی عزت کو محفوظ کردیا تھا۔ اور یقیناً آپ کے دل میں اس کا احساس ہوگا کہ آپ بہت اچھی فطرت کے مالک ہیں۔ لوگوں نے بھی آپ کے بارے میں یہی سوچا اور کہا ہوگا تو کیا مجھے اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ... میں بھی اپنی ذات کو کچھ سمجھوں۔ اپنے ضمیر کو وہ فرحت دوں جس کا میں بھی خواہش مند ہوں۔ آپ مجھے صرف ایک حقیر ڈرائیور کی حیثیت سے کیوں دیکھتے ہیں۔ مجھے موقعہ دیجئے خدا نے مجھے اس وقت ایک ایسا موقعہ دیا ہے تو آپ اسے کیوں چھین رہے ہیں۔ کیا اس کی جواب دہی آپ کو خدا کے حضور نہ کرنا ہوگی احسان صاحب، آپ نے اگر یہ پیشکش قبول نہیں کی تو روزِ حشر آپ کا دامن پکڑوں گا۔ اور خدا سے فریاد کروں گا کہ اس شخص نے نیکیوں کے تمام حقوق اپنے نام لکھ رکھے تھے اور مجھے ایک بار زندگی میں کچھ کرنے کا موقع ملا تو اس شخص نے میرے یہ حقوق چھین لئے مجھ سے۔ احسان صاحب آپ کو یہ کرنا پڑے گا میں اس کوٹھی کی عزت داغ دار نہیں ہونے دینا چاہتا۔ میں آنے والے کسی کل میں آپ کو کسی چھوٹے سے مکان میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہ میری آرزو ہے یہ میری خواہش ہے آپ اسے پورا کردیجئے، خدا کے لئے آپ اسے پورا کردیجئے۔"

احسان صاحب کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے وہ بمشکل تمام اپنی سسکیاں روکنے میں کامیاب ہوسکے تھے انھوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"غلام احمد! کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو میں ضرور مان لیتا مگر تم سوچو تو سہی تم نے یقیناً جن حالات میں وقت گزارا ہوگا۔ وہ بہت کٹھن ہوں گے اب یہ رقم دیکھنے کے بعد مجھے اس کا اندازہ ہوا ہے۔ میں انسان ہی ہوں فرشتہ نہیں اور نہ ہی علم الغیب رکھتا ہوں۔ مجھے اس چیز کا اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے دولت مند بھی رہے ہوگے... بہرطور اس کے بعد تم نے جو وقت گزارا، اس میں میرا کوئی بھی تو حصہ نہیں ہے کاش میں تمھیں سمجھتا اور اچھے وقت میں اس کا موقعہ دیتا کہ کسی برے وقت میں تمھارا سہارا لے سکوں لیکن اب یہ... یہ سب کچھ جو تمھارا ہے۔ تمھارے خاندان والوں کا ہے میں اسے کیسے لے لوں۔ تم خود ہی بتاؤ یہ سب کس حساب میں درج ہوگا میں اس کی واپسی تمھیں کیسے کرسکوں گا کوئی بھی تو ذریعہ نہیں ہے میرے پاس دور دور تک کوئی ذریعہ نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ نئے سرے سے زندگی گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ روٹی کپڑا اور زیادہ سے زیادہ مکان باقی خدا کے فضل سے میرے اوپر ان ساڑھے آٹھ کروڑ کے علاوہ اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے لیکن اب تم یہ سوچو کہ اگر میں یہ سب کچھ تم سے لے لوں تو پھر... تو پھر..."

"یہ سب کچھ آپ کو لینا ہوگا احسان صاحب میری زندگی کا دارومدار اسی پر ہے ارے ایک جذبہ ابھرا ہے سینے میں کیوں قتل کر رہے ہیں اسے، مجھے زندہ رہنے میں مدد دیں۔ میں ہر قیمت پر یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہوں ہر قیمت پر۔"

"کمال کے انسان ہو بھئی، کمال کے انسان ہو۔ میں یہ سوچ رہا ہوں اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو کیا اتنا بڑا آدمی بن سکتا تھا کیا اس ناقابل یقین فراخ دلی کا مظاہرہ کرسکتا تھا میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں۔ میں ایسا نہ کرپاتا یقیناً غلام احمد تم سبقت لے گئے مجھ پر، یہ پیشکش ہی بہت ہے میرے بھائی ذرا سا انسان بن کر سوچو۔ تھوڑا سا ٹھنڈے دل سے غور کرو مجھے بھی تو یہ سب عجیب لگے گا۔ معمولی رقم نہیں ہے۔ اُفوہ آنکھوں پر کیسے پردے پڑے ہوئے تھے۔ میرے بھائی نہیں نہیں خدا کے لئے نہیں، مجھے اس حد تک مت لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں مگر بڑا مایوس ہوا ہوں میں آپ کی ذات سے احسان صاحب آپ بہت اچھے انسان تھے، کم از کم میرے ذہن میں تھے لیکن آپ نے میری یہ محبت ٹھکرا کر بہت برے انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے میں جا رہا ہوں بڑی مایوسیاں لے کر جا رہا ہوں۔"

"سنو غلام احمد! سنو تو سہی، میری بات تو سنو میرے بھائی۔ بیٹھو بیٹھو، یار کیا کردیا تم نے میرے ذہن کو، خدا کی قسم ابھی تک میں اتنا پریشان نہیں ہوا تھا جتنا اب ہوگیا ہوں کیا کرنا چاہیئے مجھے۔"

"ایک دوست کی دوستی۔ ایک بھائی کی محبت قبول کرلیتی

چاہیئے یہ اِتنا مشکل مسئلہ نہیں ہے"۔

"سوچنے دو مجھے کم از کم ایک رات تو سوچنے دو، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کل صبح مجھ سے اِس کا جواب لے لو؟"

"ہاں اِس میں کوئی ہرج نہیں ہے لیکن سوچنے کا مسئلہ ہی کیا ہے؟ میں اب یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا از سرِ نو نئے نئے کام کرنا ہوں گے اِس کے بجائے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ مجھے اِس میں کوئی دِقت پیش نہیں آ رہی۔ میری زندگی میں ہے ہی کیا؟ دو بیٹیاں اُن کی ذِمّہ داری میں آپ کو سونپ رہا ہُوں زندہ رہُوں گا تو میرے ساتھ مل کر میری مدد کیجئے گا۔ اور مر جاؤں تو میرے بعد یہ بوجھ آپ کے شانوں پر ہوگا مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے"۔

"نہیں غلام احمد، بیٹھو۔ ایک تجویز میری سمجھ میں آئی ہے اگر پسند کرو تو اُس پر عمل کر ڈالتے ہیں"۔

"کیا؟"

"بھئی کاروبار تم اپنے نام منتقل کر لو۔ میرا مطلب ہے اُحسان لمیٹڈ' یہ کوٹھی تم اپنے نام کر لو۔ ہم سب ساتھ ہی رہیں گے کاروبار کے سِلسلے میں تمھاری ہر طرح سے مدد کروں گا، جیسے بھی تم چاہو گے یہ لے لو، اور اِس کے ساڑھے آٹھ کروڑ روپے اُس آفندی کو ادا کر دو، اِس میں تو کوئی حرج نہیں ہے مِل جُل کر رہیں گے کوئی نہیں کہے گا کہ یہ کاروبار میرا ہے یا تمھارا؟ لیکن کم از کم اِتنا تو کر لو، موت زندگی کا تعلق خُدا کی ذات سے ہے اگر یہ سب کچھ تم نے میرے ہی نام رہنے دیا تو آنے والی کل تمھیں پریشانی نہ اُٹھانی پڑے، ظاہر ہے ہم اِس کا تذکرہ تو کسی سے نہیں کرتے پھر رہے ہیں"۔

"مجھے یہ بات بالکل منظور نہیں ہے یہ سب کچھ اِتنی ہی خاموشی سے ہونا چاہیئے جتنی خاموشی سے آپ نے دوسرے لوگوں کی ادائیگی کر دی ہے کسی کو کان و کان بھی خبر نہیں ملنی چاہیئے۔ کہ میں نے اِس رقم کی ادائیگی میں آپ کی مدد کی ہے یہ ساڑھے دس کروڑ روپے ہیں میں تو اِس میں سے وہ دو کروڑ بھی لینے کا روادار نہیں ہُوں۔ جو اِس میں سے باقی بچیں گے انھیں آگے کے کاروبار کے لئے ریزرو رکھنا ہے یہ سب کچھ اِسی طرح چلتا رہے گا میں تین نمبر میں رہُوں گا اور آپ کی ڈرائیوری کروں گا"۔

"گویا زندگی بھر کے لئے مجھے ذلیل کر دو گے"۔

"نہیں احسان صاحب آپ میری ذات میں کبھی کوئی کمی پائیں تو جو چاہیں کرنے کے حقدار ہوں گے"۔

احسان صاحب گہری گہری سانسیں لینے لگے آنکھوں میں اُمید کی قندیلیں بھی جل اُٹھی تھیں لیکن پھر شرمندگی کے احساس سے یہ قندیلیں بُجھ جاتی تھیں کافی دیر اُنھوں نے غور و خوض کرنے کے بعد کہا۔

"اچھی بات ہے میں تمھاری یہ تجویز مان لیتا ہُوں خاموشی سے رقم کی ادائیگی کر دی جائے گی لیکن اِس کے بعد اگر میں کچھ کرنا چاہُوں تو تم میرے راستے کی رُکاوٹ نہیں بنو گے"۔

"صرف ایک معاہدہ کرنا ہوگا آپ کو کہ تذکرہ کبھی کسی زبان پر نہیں آئے گا"۔

"چلو ٹھیک ہے جیسا تم پسند کرو"، احسان صاحب شکست خوردگی سے بولے اور غلام احمد صاحب خُوشی سے کِھل اُٹھے اُنھوں نے وہ لفافہ اُٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر اُسے احسان صاحب کے سامنے پیش کر دیا لیکن احسان صاحب نے غلام احمد صاحب کے دونوں ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگا لیا تھا اُن کی ہچکیاں بُلند ہونے لگی تھیں اُنھوں نے روتے ہُوئے کہا۔

"غلام احمد! یہ کوٹھی چھوڑنے کو میرا بھی جی نہیں چاہتا تھا یہ کاروبار جو احسان لمیٹڈ کے نام سے ہے میری ابتداء تھی۔ میں اِس ابتداء سے ایک نئی ابتداء کر سکتا ہُوں لیکن اگر یہ بھی ہاتھ سے چلا جاتا تو مجھے بہت دُکھ ہوتا تم نے جو کچھ مجھے دیا ہے۔ میرے دوست خُدا تمھیں اِس کا اَجر دے، خُدا تمھیں میری عزت رکھنے کا پُورا پُورا صِلہ دے"۔ غلام احمد صاحب نے دونوں ہاتھوں سے احسان صاحب کو اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔

"اور آپ نے جو مرتبہ مجھے دیا ہے احسان صاحب اُس کا بھی صِلہ آپ کو خدا دے"۔ اُنھوں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا اور پھر اِس لئے جلدی سے علیحدہ ہو گئے کہ کہیں دوسرے لوگ اِس بے تکلفی کو نہ دیکھ لیں اور کچھ سمجھ نہ لیں۔

❖ ❖

ماحول کے اثرات سبھی پر قائم تھے۔ کون تھا جو اِن حالات سے متاثر نہیں تھا۔ ہونٹوں کی مُسکراہٹیں چھن گئی تھیں، کوٹھی کی ویرانی ناقابلِ دید تھی۔ جہاں ہر وقت قہقہوں کا راج تھا وہاں اب سرد آہیں رہ گئیں تھیں۔ خاص طور سے یہ تصوّر کہ کچھ عرصے کے بعد اِس کوٹھی کی حسین فضائیں اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ ندرت پر بھی وہی احساسات طاری تھے عصمت کو بھی صُورتِ حال مکمل طور پر معلوم ہو چکی تھی۔ لوگ چلے گئے تھے، یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت سے مہمان یکجا ہُوئے ہوں شادیا-

نے ہوں اور اِس کے بعد بارات رُخصت ہو گئی ہو گھر کی ویرانی سب کے دِلوں پر طاری ہو گئی تھی۔

رات کو ندرت بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ عصمت بھی کروٹ لئے لیٹی تھی۔ ندرت کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات تھے۔ نہ جانے کون کون اُسے یاد آ رہا تھا اِن یادوں میں بہت سے ایسے تصوّرات تھے جنھیں سوچ کر بھی ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ غالباً ندرت کے ذہن میں اختر کا مُسکراتا ہُوا چہرہ بھی تھا۔ اب تو کوئی آسرا ہی نہیں رہا تھا ظاہر ہے اختر سے اگر کوئی رابطہ قائم ہوتا تو اِسی کوٹھی کے ذریعے ہوتا۔ لیکن اب نہ جانے کہاں ٹھکانہ ہوگا عصمت نے ندرت کی یہ بے چینی محسوس کی تو پلٹ کر اُسے دیکھنے لگی۔ ندرت نے جلدی سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"نہیں ندرت، اِس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خود دیکھ رہی ہو کہ میں جاگ رہی ہُوں"، عصمت نے کہا۔

"باجی! کیا ہو گیا یہ سب کچھ؟ خُدا شہاب صاحب کو غارت کرے، اسے صُورت ہی سے منحوس نظر آتے تھے۔ گھر میں اِس طرح چلتے تھے جیسے فرعون دوبارہ زندہ ہو گیا ہو۔ نہ کسی کو دیکھ کر ہونٹوں پر مُسکراہٹ آتی تھی نہ کسی کے لئے آنکھوں میں گرمجوشی یا تپاک کے آثار اُبھرتے تھے۔ پورے گھر میں وہی ایک شیطان تھے اور بالآخر اِس شیطان نے یہ جنت لُوٹ لی"۔

"میں نے تو اُن پر کبھی غور نہیں کیا لیکن واقعی بڑا بدنصیب انسان تھا خود تو عیش کر رہا ہوگا اور یہاں سب کو برباد کر گیا۔ ہائے کیسا اچھا ماحول تھا ہر وقت ہنسی خُوشی قہقہے، ہنگامہ خیزیاں، نہ جانے کس کی نظر کھا گئی اِس ماحول کو"۔

"باجی اب کیا ہوگا؟"

"خُدا جانے کیا ہوگا، میں کیا جانوں؟"

"میرا تو دِل اُلٹ رہا ہے باجی، کہیں ہمیں پھر پہلے جیسے محلے میں جا کر نہ رہنا پڑے۔ احسان صاحب کی بات اور تھی۔ وہ تو احسان کرنے میں حاتم ہیں، ہر شخص سے محبت ہر شخص سے پیار، باجی کتنا تضاد ہے دونوں بھائیوں میں۔ ایک خلوص و محبت کا پیکر اور دوسرا شیطان صفت"۔

"ہاں! یہ ساری باتیں تو اپنی جگہ ہیں لیکن ذرا سوچو تو سہی ثناء کس طرح نازوں میں پلی ہے اور سب سے عجیب بات یہ کہ اِتنے بڑے آدمی کی بیٹی، اِتنی دولت مند اور مغرور نام کو بھی نہیں۔ سب سے ہنسنا، بولنا، گھلنا، ملنا اِس کوٹھی میں تو ہر شخص ہی مجسّم اخلاص تھا"۔

"باجی! تمھیں ماضی یاد ہے کس طرح ہم لوگ گھر میں گھُس کر رہتے تھے اب اِس جیسی کوٹھی کہاں ملے گی۔ ابھی تو ابّو کو ملازمت تلاش کرنا پڑے گی۔ احسان صاحب نے گاڑیوں کا استعمال بھی چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ گھر ہی میں رہتے ہیں"۔

"کہاں گھر میں رہتے ہیں۔ صبح سے تو گئے ہُوئے تھے"۔

"یقیناً نوکری کی تلاش میں گئے ہوں گے، پتہ نہیں بیچارے کو کس طرح کی نوکری ملے۔ باجی یہ ابّو کب تک ہمارے لئے مارے مارے پھرتے رہیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیئے"۔

"میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی ندرت۔ میرا خیال ہے مجھے اب یونیورسٹی چھوڑ کر ملازمت کے لئے کوشش کرنی چاہیئے"۔

"باجی! ملازمت تو میں بھی کرنا چاہتی ہُوں جہاں کہیں بھی رہیں گے ہم لوگ۔ پتہ نہیں کیسا ماحول ہوگا۔ وہی گھر کی گھٹن۔ میں اب اُس گھٹن میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں بھی نوکری کروں گی ایسا نہ کریں باجی کہ ہم نِدا سے بات کریں وہ کافی عرصے سے ملازمت کر رہی ہے، پوچھیں گے اُس سے کہ ملازمت کیسے کی جاتی ہے۔ کوئی دِقت تو نہیں ہوتی اِس میں"۔

"تو تو پاگل ہے بس۔ بے کار باتیں کرتی رہتی ہے نِدا ملازمت کی ماہر کہاں سے ہو گئی اُس نے بھی پہلی بار ملازمت کی ہے"۔

"کی تو ہے باجی۔ کم از کم ہم سے تو زیادہ تجربہ ہے اُس کا"۔

"پہلے مجھے ملازمت مل جانے۔ اگر کوئی اچھی فرم ہاتھ آ گئی۔ تو پھر میں تیرے لئے بھی کوشش کروں گی"۔

"ارے چھوڑو، چھوڑو تم جیسی لڑکیاں اپنی ہی ملازمت برقرار رکھ لیں تو بڑی بات ہے۔ تم کسی دوسرے کے لئے کیا کوشش کرو گی"، ندرت نے مُنہ بنا کر کہا اور عصمت ہنسنے لگی۔

"تجھے تو بس لڑنے کا کوئی بہانہ چاہیئے"۔

"سچ باجی پتہ نہیں کیسی کیفیت ہو رہی ہے ان دنوں، دِل چاہ رہا ہے ہر ایک سے لڑ پڑوں۔ میرا عجیب حال ہے۔ حالانکہ اگر سچ پوچھو تو ہمارا اِن واقعات سے کیا تعلق ہے۔ مالکان کی بات ہے لیکن یہ لوگ کبھی مالکان محسوس ہُوئے؟ جس دِن سے اِس کوٹھی میں آئے یُوں لگا جیسے اپنے ہی گھر میں آ گئے ہوں"۔

"سو جاؤ ندرت ذہن کو خراب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، بھلا ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ ہم اِن بیچاروں کے لئے کیا کر سکتے ہیں!"

"باجی! صبح مجھے جلدی اُٹھا دینا۔ میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہُوں۔ اگر جاگنے میں جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کروں

تو بس یہ یاد دلا دینا کہ مجھے باورچی خانے جانا ہے۔"

"باورچی خانے؟"

"ہاں باجی۔ سارے ملازم چلے گئے ہیں۔ خدا غارت کرے اس جمن کو چار دن بھی نہ گزار سکا۔ بغیر تنخواہ ہی کے کام کرلیتا کیا کچھ نہیں چرایا اس نے اس کوٹھی کے باورچی خانے سے، باجی یہ ملازم قسم کے لوگ بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کسی کی آنکھ میں بھی مروت نہیں تھی۔ ارے ایک، ایک دو، دو مہینے اگر گزار دیتے یا کم از کم اس وقت تک ہی یہاں رہتے جب تک یہ بیچارے لوگ کوٹھی خالی نہیں کرتے تو کیا بگڑ جاتا ان کا، میں ناشتہ تیار کروں گی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک یہاں ہیں ہم لوگ کھانا وغیرہ ہم خود ہی پکائیں گے۔"

"اوہ ندرت، بڑا اچھا فیصلہ ہے تیرا۔ تو کہے تو میں بھی کچھ دن کے لئے یونیورسٹی چھوڑ دوں۔"

"اگر ایسا کرلو باجی تو بڑی اچھی بات ہے کوئی ایسی خاص مصروفیت تو نہیں ہے تمھیں آج کل؟"

"نہیں بھئی کوئی خاص نہیں۔"

"باجی زندہ باد، میرا خیال ہے اس سلسلے میں امی ابو بھی کچھ نہیں کہیں گے۔ امی سے بات بھی کرلیں گے ہم لوگ۔"

"نہیں نہیں گھر کے ناشتے کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے میں تو ویسے بھی صبح کو نماز پڑھنے کی عادی ہوں اور سب لوگ جاگتے ہیں تو ناشتہ تیار ہو چکا ہوتا ہے۔ بس یہاں سے فوراً وہاں چلیں گے۔ وہاں تو دیر میں ناشتہ کیا جاتا ہے نا۔"

"ہاں باجی، میرا خیال ہے پندرہ بیس دن کی چھٹی کرلو تم اس کے بعد جو بھی صورتِ حال ہوگی۔ دیکھ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے تو اطمینان رکھ۔ مگر اب سو جا۔" عصمت نے کہا۔ اور ندرت آنکھیں بند کرکے دماغ کو خالی کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ خیالات آرہے تھے لیکن وہ تھوڑی دیر کے بعد سونے میں کامیاب ہوگئی۔

پھر صبح عصمت ہی نے جگایا تھا عصمت نے آوازیں دیں تو وہ بالکل بپھر گئی۔

"کیا مصیبت ہے تم کو نیند نہیں آتی اور مجھے پریشان مت کرو باجی۔"

"تجھے باورچی خانے جانا ہے کیا بھیں۔"

"لعنت ہے باورچی خانے پر اور لعنت ہے تم پر۔" ندرت نے کہا اور نیل کر لیٹ گئی۔

"ارے ارے تمھیں کوٹھی کے باورچی خانے جانا ہے۔"

"جہنم میں گئی کو... کو... کو۔" دفعتاً ندرت کو سب کچھ یاد آگیا اور وہ کوٹھی کہتے کہتے رک گئی اس نے آنکھیں کھول کر عصمت کو دیکھا اور ایک دم ہی چارپائی سے چھلانگ لگادی عصمت ہنسنے لگی تھی۔ چند ہی منٹوں میں ندرت تیار ہوگئی تھی اور اس کے بعد دوڑتی ہوئی کوٹھی کے گیٹ کی جانب بڑھ گئی عصمت اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ شوکت جہاں کو اس نے ساری بات سمجھادی تھی اور شوکت جہاں نے بھی بیٹیوں کے جذبے کو سراہا تھا۔ باورچی خانے میں داخل ہونے کے بعد ندرت نے فوراً ہی ناشتے کے انتظامات سنبھال لئے جو چیزیں موجود تھیں انھیں نہایت نفاست سے ترتیب دینے لگی اور ناشتے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

تقریباً پونے آٹھ بجے ذکیہ بیگم باورچی خانے کی طرف بڑھتی نظر آئیں اور چند لمحوں کے بعد اندر داخل ہوگئیں۔ یہاں ان دونوں کو مصروف دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں تھیں۔

"ارے تم لوگ۔" دونوں نے ذکیہ بیگم کو سلام کیا تھا ذکیہ بیگم اندر آگئیں۔

"کیا کر رہی ہو تم دونوں؟"

"ناشتہ تیار کر رہے ہیں بیگم صاحبہ۔"

"کیا، بیگم صاحبہ؟ بھئی اب تو کم از کم مجھے یہ گالی مت دو۔" ذکیہ بیگم نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"سوری خالہ جان، دراصل ہمت نہیں پڑتی آپ کو خالہ جان کہنے کی۔"

"ٹھیک ہے مگر تم کر کیا رہی ہو۔" ذکیہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

"آپ کیسے یہاں آئیں؟"

"ناشتہ تیار کرنے۔"

"جی نہیں یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ جائیے پلیز آپ جائیے ناشتہ کس وقت پہنچنا ہے۔" ندرت نے پوچھا۔ ذکیہ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں تھیں انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"نو بجے۔"

"ٹھیک نو بجے ناشتہ لگ جائے گا۔ آپ ناشتے کے کمرے میں پہنچ جائیے۔"

"مگر بیٹی تم نے یہ تکلیف..."

"جی ہاں ہمیں بھی یہیں سے کھانا اور ناشتہ ملتا ہے چنانچہ تکلیف کا ذکر نہ کیجئے گا۔" ندرت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ذکیہ بیگم دیر تک ایک دیوار سے ٹکی انھیں دیکھتی رہیں پھر ٹھنڈی سانس لے کر

واپس پلٹ گئیں۔

ٹھیک نو بجے سب ناشتے کے کمرے میں داخل ہوگئے ذکیہ بیگم نے شاید تمام صورتِ حال احسان صاحب کو سمجھادی تھی احسان صاحب اندر داخل ہوکر دونوں لڑکیوں کو دیکھنے لگے ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے ناشتہ شروع ہوا تنا بھی پہنچ گئی تھی۔ ندا بھی تھی عصمت اور ندرت ناشتہ سرو کرنے لگیں۔ احسان صاحب بولے۔

"بیٹے، تم لوگ بھی بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں انکل ہم چائے پی چکے ہیں اور... اور..."

"بیٹھ جاؤ۔" احسان صاحب نے ایسے لہجے میں کہا کہ دونوں چونک کر انھیں دیکھنے لگیں۔ اور دونوں ہی بیٹھ گئیں۔

"ناشتہ کرو۔" احسان صاحب سنجیدگی سے بولے عصمت اور ندرت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ثنا ندرت کو آنکھ مار کر بولی۔

"اللہ کھتی، ڈرنے کی ضرورت نہیں اب محمود و ایاز یکجا ہوگئے ہیں۔ کھاؤ آرام سے کھاؤ۔ تمھاری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔"

ندرت نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ناشتہ خاموشی سے کیا گیا۔ اور اس کے بعد احسان صاحب بولے۔

"بھئی آج کل اس کوٹھی کی فضا بڑی ڈرامائی ہوگئی ہے یوں لگتا ہے جیسے ہم سب ایک اسٹیج پر کوئی پلے کر رہے ہیں اور میں اس کے اناؤنسر کی حیثیت رکھتا ہوں میں نے پہلے بھی کچھ پروگرام اناؤنسمنٹ کئے تھے اور اس وقت بھی کافی غور و خوض کے بعد میرا دل چاہ رہا ہے کہ کچھ نئی باتیں آپ حضرات کو بتادوں یہ بھی معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی لیکن بھائی یہ دور ایسا نہیں ہے کہ دل کی بات دل میں رکھ کر خاموش بیٹھ جایا جائے۔ ہر شخص کو کچھ حقیقتِ حال سے واقف ہونا چاہیئے کچھ نئے انکشافات ہیں۔ جو آپ لوگوں کے سامنے کرنا ضروری ہیں۔" ایک بار پھر سب پر ہول سوار ہوگیا ایک انکشاف نے تو انھیں آسمان پر سے زمین پر لا پھینکا تھا اور کون سی نئی بات رہ گئی ہے سب سراسیمہ نگاہوں سے احسان صاحب کو دیکھنے لگے، ندرت اور عصمت بھی اسی طرح حیران تھیں اور ان کی دلچسپی بھی ان الفاظ سے قائم ہوگئی تھی۔

"میں نے کہا تھا آپ لوگوں سے کہ میں نے خدا کے فضل و کرم سے وہ تمام ادائیگیاں کردی ہیں جن کی اشد ضرورت تھی۔ ان ادائیگیوں کے سلسلے میں ہمارے کاروبار اور جائیداد کا ایک ایک ذرہ ذرہ ختم ہوچکا ہے اور اب ہم ایک بے در و بے گھر انسان ہیں ایک آخری پارٹی اور رہ گئی تھی جس کے تقریباً ساڑھے آٹھ کروڑ روپے واجب الادا تھے میں نے اس پارٹی سے وعدہ کیا تھا کہ یہ کوٹھی اور "احسان لمیٹڈ" نامی فرم جو میری سب سے پہلی فرم تھی اور جس کے بعد بھی خدا نے ہمیں بہت سی نوازشات سے نوازا اس پارٹی کے حوالے کردی جائے گی اپنے لئے میں نے صرف ایک چھوٹا سا فلیٹ باقی رکھا تھا جس میں منتقل ہونے کا ارادہ تھا پارٹی کے ساڑھے آٹھ کروڑ روپے مجھ پر باقی تھے ظاہر ہے اب اس رقم کو کیش واپس کرنے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ لیکن موجودہ صورتِ حال کچھ مختلف ہوگئی ہے۔ غلام احمد ہمارے ڈرائیور کی حیثیت سے کافی عرصے سے ہمارے ہاں ملازمت کر رہے ہیں ان کے بارے میں مجھے مختصراً معلوم ہوا تھا کہ سابقہ مشرقی پاکستان میں تھے اور وہاں اچھا خاصا کاروبار کرتے تھے لیکن یہ تمام باتیں بہت ہی مختصر طریقے سے مجھے معلوم تھیں اور میں نے سچی بات ہے۔ ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی بننے اور بگڑنے کا یہ کھیل تو روزِ اوّل سے جاری ہے کون کیا تھا؟ کیا ہوگیا؟ اور کون کیا تھا؟ اور کیا بن گیا؟ ایسی داستانیں سننے میں آتی ہی رہتی ہیں بہرحال غلام احمد بے پناہ شریف آدمی تھے اور میں نے انھیں اپنی قوت کے مطابق اس کوٹھی میں جگہ دے دی تھی غلام احمد کا جو کاروبار مشرقی پاکستان میں تھا۔ اُسے انھوں نے فروخت کردیا تھا اور جو رقم اس سے حاصل ہوئی تھی ریڈ کراس کے حوالے کردی تھی تاکہ انھیں یہاں واپس مل جائے لیکن پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ ان لوگوں کو کھو بیٹھے۔ جنھیں انھوں نے وہ رقم دی تھی۔ غلام احمد اس رقم کے حصول کے لئے مسلسل کوشاں تھے۔ دو بیٹیوں کے باپ ہیں اور ایک چھوٹے سے خاندان کی مکمل کفالت کرتے ہیں بہر اچھا وقت دیکھنے کے بعد اگر انسان پر برا وقت پڑے تو زیادہ کٹھن محسوس ہوتا ہے لیکن اس شخص میں ایک ایسا انسان پوشیدہ ہے جسے اگر ہمیں اجازت ہوتی تو انسانوں کی صف سے آگے کی کوئی چیز کہا جاتا غلام احمد کو اچانک ہی ریڈ کراس کی طرف سے اُن کی رقم واپس مل گئی اور یہ رقم تقریباً ساڑھے دس کروڑ روپے ہے غلام احمد نے سوچا تھا کہ جب یہ رقم اُن کے ہاتھوں میں آجائے گی تب وہ اپنے اہلِ خانہ سے اس کا تذکرہ کریں گے اور اس کے بعد ظاہر ہے ایک کروڑ پتی شخص جس طرح زندگی کا آغاز کرسکتا ہے اسی طرح وہ بھی اپنی زندگی کا آغاز کریں گے یہ ساری آرزوئیں، امیدیں اور اس رقم کا راز وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھے، اور انھوں نے اپنی والدہ، بیوی اور بیٹیوں تک کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ جب رقم مل گئی اور اچانک ہی ہم ان حالات کا شکار ہوگئے تو غلام احمد میرے پاس پہنچے اور انھوں نے

یہ پیش کش کی کہ میں ساڑھے آٹھ کروڑ روپے ادا کرکے یہ کوٹھی اور اپنی فرم بچا لوں میں بہت دولت دیکھ چکا ہُوں حقیقت یہ ہے کہ اب سے تھوڑے ہی عرصے قبل آٹھ دس کروڑ کی میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں تھی. لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب میرے پاس بہت کچھ تھا۔ میں جانتا ہُوں اِس رقم سے غلام احمد میری جگہ لے سکتے ہیں اور مجھے شاید اُن کی ڈرائیوری بھی کرنا پڑے۔ میں نے جس حد تک انسانی ذرائع سے ممکن ہو سکتا تھا۔ اُن سے اِنکار کیا ہر شخص کو خود ہی اپنے مسائل سے نمٹنا ہوتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن آپ لوگ یہ سمجھ لیں کہ غلام احمد نے مجھے انتہائی حد تک مجبور کر دیا کہ جس کے بعد کہنے کے لئے انسان کے پاس کچھ نہیں رہتا اور میں نے اُن کی یہ پیش کش قبول کر لی ہے۔ وہ اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ میری گاڑی چلاتے رہیں اور میں اُن کی دولت پر عیش کرتا رہُوں۔ یہ فرم چلاؤں اِس کوٹھی کو قائم رکھوں اور وہ اِس بات پر مُصر ہیں۔ اماں بی اور ذکیہ میں خاص طور پر تم دونوں سے یہ کہہ رہا ہُوں کہ ایسی ترکیب بتاؤ مجھے کہ میں غلام احمد کو اُن کے اِس اقدام سے باز رکھ سکوں۔ میں اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہو چکا ہُوں، بیٹیو! میں نے خاص طور پر تم لوگوں کے سامنے یہ تذکرہ اِس لئے کیا ہے کہ تم بھی سچائیوں سے واقف ہو جاؤ جذبات انسانی شخصیت میں بے شک سب سے بڑی حیثیت رکھتے ہیں لیکن موجودہ حالات کو دیکھ کر تو یہ سب قِصے کہانیاں محسوس ہوتی ہیں کہ کوئی کسی کے لئے ایثار کرے، ہم کہانیوں کی حد تک تو اِن باتوں کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں صُورتِ حال مختلف ہے۔ تمھارے ابو کہانیوں کے انسان ہیں۔ کوشش کر سکتی ہو تو کر لو، باز رکھو اُنھیں اِس سے۔ کیونکہ تمھارا مستقبل بھی تمھارے سامنے ہے ہر شخص کو اپنی بساط کے مطابق گزارنی چاہیئے۔ ہم بے شک اِن حالات میں آ گئے ہیں۔ لیکن بہت دن نہیں جائیں گے کہ میں دوبارہ کسی حد تک اپنا کھویا ہُوا مقام حاصل کر لُوں گا تمھیں اگر ایک مقام مِل رہا ہے تو خُدا کی قسم میں نہیں چاہتا کہ اُسے چھینُوں۔ آپ لوگوں میں سے جو کوئی میری مدد کر سکتا ہے اِس سلسلے میں وہ کرے۔ مَیں خوش دِلی سے اِس بات پر آمادہ نہیں ہُوں کہ غلام احمد کی یہ پیش کش قبول کروں۔ اگر خُدا اُنھیں ایک طویل محرُومی کے بعد کچھ عطا کر رہا ہے تو وہ اِس طرح ضائع نہیں ہونا چاہیئے یا پھر اگر غلام احمد اِس بات پر تُلے ہُوئے ہیں کہ مجھ پر احسان کریں۔ تو اُن سے کہو کہ صرف فرم خرید لیں یہ کوٹھی خرید لیں میری پارٹی کو رقم ادا کر دیں اور اُس کے بعد ہمیں اِسی کوٹھی میں جگہ دے دیں۔ یہ فرم جو "احسان لمیٹڈ" کے نام سے ہے "غلام احمد لمیٹڈ" ہو جائے اور میں اُس کی ترقی کے لئے کام کرتا رہُوں زیادہ سے زیادہ مجھے ایک مینیجر کی حیثیت دے دی جائے۔ اماں بی! بڑا پریشان ہُوا ہُوں رات بھر۔ میں نے غلام احمد سے وعدہ بھی کر لیا ہے لیکن میرا ضمیر یہ سب کچھ قبول نہیں کرتا۔ آپ لوگ برائے کرم مجھے اِس اُلجھن سے نکال لیجئے۔ میں نہیں چاہتا کہ غلام احمد کی برسوں کی کمائی اِس طرح کھا جاؤں؟"

نُدرت اور عصمت پھٹی پھٹی آنکھوں سے احسان صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے سینے میں طوفان اُبھر رہے تھے ثناء اور رِدا بھی حیران تھیں۔ کافی دیر سکوت چھایا رہا۔ پھر احسان صاحب بولے۔

"اور اگر کچھ نہ ہو سکے تو میں نے یہ بات بڑی دیانت داری کے ساتھ اِن بچیوں کے کان میں ڈال دی ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچیں گی کہ میں نے اُن کا حق مار لیا ہے۔ میں اُس کے لئے قطعی تیار نہیں ہُوں اگر یہ سمجھا سکتیں ہیں تو اپنے باپ کو سمجھائیں۔۔"

نُدرت نے آہستہ سے کہا۔

"اَنکل، اگر ہمارے ذریعے یہ لُٹی ہُوئی جنت آباد ہو رہی ہے تو ہم دونوں بہنیں صرف اِتنا کہیں گی کہ اگر اِس کی دیواروں میں ہمارا خُون جذب ہو جائے اور یہ دیواریں مضبُوط ہو جائیں۔ تو ہم خُوشی سے اپنے بدن کے خُون کا ایک ایک قطرہ نچوڑنے کے لئے تیار ہیں۔" نُدرت کے یہ الفاظ ایسے تھے کہ سب ہی رو پڑے یہاں تک کہ ثناء کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں اُس نے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لئے تھے۔ رِدا بھی خاموش رو رہی تھی۔ احسان صاحب گردن جھٹک کر کہنے لگے۔

"ایک پاگل باپ کی بیٹیاں بھی پاگل نہ ہوں گی تو پھر کیا ہوگا! بہر طور، جو کچھ تم کر سکتی ہو کر لو۔ وقت میرے ہاتھ سے نکل گیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ اب مجھ میں اِتنی ہمت نہیں ہے کہ غلام احمد سے نئے سِرے سے بات کروں۔"

"اِس کی ضرورت بھی نہیں ہے اَنکل۔ ابو نے جو بھی فیصلہ کیا ہے اُنھیں وہی کرنا چاہیئے تھا۔ رہے ہم لوگ تو یقین کریں کہ یہاں سے ہٹ کر جو زندگی ہمیں ملے گی وہ عذابِ جان ہوگی ہم دِن رات اِسی فِکر میں ڈُوبے رہتے ہیں آپ قسم لے کر پُوچھ لیجئے عصمت باجی سے کہ میں راتوں کو سو بھی نہیں پاتی اِس تصوّر سے کہ اب ہم سے ہمارا یہ ٹھکانہ بھی چھن جائے گا۔ ہمیں آپ سے محبت ہے اَنکل۔ ہم ایک خاندان کی طرح یہاں رہے ہیں اور یہ خاندان اِسی انداز میں آباد رہنا چاہیئے۔ اگر ابو کو خُدا نے اِس عزت سے نوازا ہے تو بس ہمیں یہ عزت ہی درکار ہے اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

"کہہ چکا ہُوں۔۔۔ کہہ چکا ہُوں کہ پاگل کی اولاد بھی پاگل ہوتی

ہے۔" احسان صاحب فیصلے لہجے میں بولے اور پاؤں پٹختے ہُوئے باہر نکل گئے۔

اماں بی، ذکیہ بیگم، رِدا اور ثناء خاموش بیٹھی نُدرت اور عصمت کو گھور رہی تھیں، اور نُدرت اور عصمت کے چہرے فخر سے سُرخ ہو رہے تھے نُدرت نے ثناء کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھاتے ہُوئے کہا۔

"مالِک کی بچی! آؤ باہر آؤ تمھاری یہ اداکاری بھونڈی ہوتی ہے اِس قسم کے رول تم پر سُوٹ نہیں کرتے۔ آؤ مونا لیزا تم بھی آؤ باہر بیٹھیں گے لان پر" نُدرت نے دونوں کا ہاتھ پکڑا اور عصمت کو ساتھ لئے ہُوئے لان پر آ گئی۔ ثناء کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ تیمو مُسلسل اُس کی گود میں دَبا ہُوا تھا لان کے ایک مخصُوص گوشے میں بیٹھ کر نُدرت نے ثناء اور رِدا کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"تم دونوں جل گئیں ناں، ہماری دولت سے جل گئیں تم لوگ، کیوں یہی بات ہے ناں؟"

"نہیں بھئی، میری بات کیوں کرتی ہو۔ میں بھلا کیوں جل جاتی۔" رِدا بولی۔

"تمھاری بات نہیں کر رہی ہُوں میں رِدا۔ لیکن اِس ثناء کو دیکھو۔ اَرے جب یہ امیر تھی تو اِس نے کبھی ہمارے چہرے پر کوئی لکیر دیکھی۔ ہم نے کبھی اِسے تسلیم کیا کہ یہ ایک دولت مند باپ کی بیٹی ہے اور آج اِس نے ہمارے بارے میں سُن لیا تو کیسا مُنہ پُھلائے بیٹھی ہے۔ مُبارک باد دینے کی بجائے آنسو بہا رہی ہے۔ یہی دوستی ہوتی ہے ناں۔" نُدرت نے دانت پیس کر کہا۔ اور ثناء کی ڈبڈبائی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں پھر وہ بے اختیارانہ انداز میں اُٹھی اور نُدرت سے لپٹ گئی وہ پُھوٹ پُھوٹ کر رو دی تھی۔

"اَرے اَرے خُدا کی قسم پہاڑ گِر گیا۔ آسمان ٹُوٹ پڑا۔ دریا اُلٹے ہو گئے۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔ یہ آتش فشاں کہاں چُھپا ہُوا تھا۔ اب بھلا بتاؤ اِس لاوے کو کیسے روکا جائے۔ اے ثناء، اے ثناء کی بچی۔ دیکھ باز آ جا ورنہ اُٹھا کر پٹخوں گی کہ کمر ٹُوٹ جائے گی۔ اَرے تو رو کیوں رہی ہے۔۔۔ تُو رو رہی ہے تو میں بھی رو پڑوں گی۔ باز آ جا یار، باز آ جا کیوں ذلیل کر رہی ہے؟"

"نُدرت۔۔۔ نُدرت" ثناء کی روتی ہُوئی آواز اُبھری۔

"یار، یاری کی ہے تو یاروں کی سی بات کر۔ یہ کیا چھچھورا پن کر رہی ہے۔ یاری میں تو یہ جانیں نچھاور کی جاتی ہیں۔ یہ معمُولی سی رقم، ہُنہ! ہمیں تو اِس سے ذرا سی بھی دِلچسپی نہیں ہے۔ ہم تو بھائی یہیں خوش ہیں۔ اِن ہی ہنگاموں میں۔ آئے ہوں گے غلام احمد کے پاس پیسے ہمارا تو جو دَور تھا جھونپڑی ہی میں گزر گیا اور اب جب ہم کسی کے محل میں آ گئے ہیں تو ہمیں یہ بات قطعاً پسند نہیں کہ اُس پر قبضہ کر لیا جائے یہ محل ہماری ثناء کا ہے، ثناء کا سمجھا اور ہم لوگ بھی اُس کے مصاحب۔ میڈم ثناء اللہ رکھی کو اِسی طرح ہم کمانڈ جاری کرتی رہیئے۔ ہمیں اِسی میں مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ مونا لیزا اِس سِلسلے میں تمھارا کردار بڑا مشکوک رہا ہے۔ ارے بھئی کبھی تو کسی کی مدد کر دیا کرو سمجھاؤ نا اِسے آخر یہ رو کیوں رہی ہے، ہم نے کیا کیا ہے؟ دولتیں تو ہاتھ کی میل ہیں وہ جانیں اُن کا کام۔ نہ کسی کا احسان ہم پر، نہ ہمارا کسی پر۔ ہم تو ثناء کے دوست ہیں۔ شروع ہی سے، کب ہم نے انھیں اپنا مالک سمجھا تھا۔ اور جب دوستی ہے تو پھر تمام باتیں فضول ہیں۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ ہمارا گھٹیا سا ڈیڈی خُود بھی اِس کوٹھی کے کسی کام آ گیا اِس کی رونقیں بحال ہو جائیں تو اِس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیئے۔" عصمت بھی ثناء کو سمجھانے لگی۔

اُس نے کہا کہ اِس سلسلے میں کوئی گہری بات سوچنی ہی نہیں چاہیئے ہمارا اِن معاملات سے آخر کیا تعلق۔ ثناء کے آنسو آہستہ آہستہ تھمتے جا رہے تھے۔

رِدا اپنے طور پر پریشان تھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بلاشبہ ثناء کو اِن حالات میں وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے خود بھی ثناء سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ اور پھر اِس گھر کے فرشتہ صفت لوگ اِس قابل نہیں تھے کہ کسی بُرے وقت میں اُنھیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنے آپ پر جبر کرکے ہنس رہے تھے مسکرا رہے تھے لیکن یہ اندازہ تو کسی کو بھی ہو سکتا ہے کہ کسی سے اُس کا سب کچھ چھن جائے تو اُس کے دِل پر کیا بیتتی ہے ثناء نے تیمور کو جب بڑے دُکھ کے ساتھ رِدا کے حوالے کرنا چاہا تھا تو رِدا کا کلیجہ پھٹنے لگا تھا۔ بھلا، اِن حالات میں ثناء ایسا کر سکتی تھی لیکن اُس نے اپنی مجبُوریوں کو محسوس کیا تھا۔ اور رِدا اُس کی اِس مجبُوری کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی لیکن اب کیا کرنا چاہیئے، ذہنی طور پر وہ بھی بہت خُوش تھی کہ اُن ڈوبتے ہُوئے لوگوں کو سہارا مِل گیا۔ غلام احمد کی عظمت کے بارے میں جس قدر سوچتی حیرت میں ڈوبتی جاتی۔ اِس دَور میں تو واقعی یہ ایثار ناقابلِ یقین تھا لیکن وہ بھی بات سچ تھی کہ فرشتوں کو فرشتے ہی مِل جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی تو بے لوث ہمیشہ ہر شخص کے کام آتے رہے تھے۔ خُدا کی طرف سے اگر اُنھیں سہارا نہ ملتا تو بڑی عجیب بات ہوتی۔ لیکن اب اُس کا کردار کیا ہونا چاہیئے ظاہر ہے اب یہ تو مشکل ہو گیا تھا کہ ثناء کو چھوڑ دیا جائے اِس کوٹھی ہی میں طویل وقت گزارنا پڑے گا اُس وقت تک جب تک کہ تیمور بڑا نہ ہو جائے۔ زندگی کا کوئی مقصد حاصل نہ ہو

جائے ابھی تو رِدا کے سامنے ایک پہاڑ سی زندگی پڑی ہوئی تھی اِس زندگی میں دیکھنا یہ تھا کہ کیسے کیسے مرحلے آتے ہیں ظاہر ہے ایک نہ ایک دِن ثناء کی شادی ہوگی۔ اور وہ یہاں سے رُخصت ہوجائیگی۔ اُس کے بعد رِدا کے لئے اِس کوٹھی میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بہر حال گزارہ کیا جاسکتا ہے۔ اِن لوگوں کے درمیان دِل بھی لگ گیا ہے بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا ملازمت ضروری ہے۔ کم از کم اِتنی رقم جمع کرلی جائے کہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ خرید لیا جاسکے۔ رِدا اِسی منصوبے پر کام کر رہی تھی، تیمور کا مستقبل سامنے تھا۔ ابھی کچھ عرصے کے بعد تعلیم کا آغاز ہوگا اور پھر اُس کے لئے وہ سب کچھ کرنا پڑے گا جو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کوئی ٹھوس اور مضبوط ملازمت لازمی چیز تھی۔

وہ اِس وقت بھی اپنے کمرے میں گھسی ہوئی اِسی بارے میں سوچ رہی تھی اپنے مستقبل کا کوئی منصوبہ اُس کے ذہن میں نہیں تھا اُس نے اپنے آپ کو تو انسانوں کی صف میں شمار کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو صرف ایک مقصد ہے ایک مشن ہے تیمور کے لئے صرف تیمور کے لئے۔ بہر حال ملازمت کے بارے میں ممکن ہے احسان صاحب کچھ مدد کرسکیں۔ ابھی ذہنی طور پر اُلجھے ہوئے ہیں ذرا آسانیاں فراہم ہوجائیں اُنھیں، مَیں اُنہی سے ملازمت کے بارے میں بات کروں گی۔ دِل کے کسی نہ کسی گوشے میں بھی ایک تصور جاگ اُٹھتا تھا لیکن رِدا اُسے سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتی تھی۔

یہ خیر دین تھا۔ گھر کا ایک معمولی سا ملازم، جھاڑ پونچھ کا کام کرنے والا۔ پاؤں دبانے والا لیکن اُس کی شخصیت کے جو پہلو سامنے آئے تھے اُنھوں نے بارہا ثابت کر دیا تھا کہ خیر دین کچھ بھی ہے۔ کم از کم وہ نہیں ہے جو خود کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر ایسا کیوں تھا؟ اِس سوال کا کوئی جواب رِدا کے پاس نہیں تھا خیر دین کئی بار اُس کے سامنے نمایاں ہوا تھا لیکن کمبخت ضدی تھا، اپنے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں بتایا: تاہم رِدا کا محسن بھی تھا یہ بات تو رِدا بارہا سوچ چکی تھی کہ خیر دین کے ذریعے اُسے اِتنی آسانیاں فراہم ہوئی ہیں کہ ناقابلِ بیان ہیں۔ اِس مرحلے پر اُس نے رِدا کی مدد نہیں کی اور پھر اُس کے الفاظ اُس کی آنکھیں۔ اُس کے دیکھنے کا انداز کیا تھا وہ سب کچھ اور کیوں؟ بھلا اُسے اِس کی جُرأت کیسے ہوئی مگر وہ، وہ تو ہے ہی نہیں جو نظر آتا ہے۔ کمبخت کہاں مر گیا؟ پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ یہ عجیب و غریب کردار تھا اگر اُسے واقعی رِدا سے کوئی دلچسپی تھی تو اُس نے اِس طرح جانا کیوں پسند کیا؟ وہ جتنا خیر دین کے بارے میں سوچتی اُلجھتی ہی چلی جاتی۔

ایک دو بار دل میں اختر اور خالد کا خیال بھی آیا۔ جی چاہا کہ اُنھیں اِن حالات سے باخبر کر دے لیکن یہ غلط بات ہوجاتی۔ اُسے یہ حق حاصل نہیں تھا کہ احسان صاحب کے معاملات اِس کوٹھی سے کہیں باہر پہنچاتی۔

نہ جانے کتنی دیر وہ اِن سوچوں میں اُلجھی رہی اور اُس کے بعد جب کمرے میں لیٹے لیٹے بور ہوگئی تو اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں گہری سوچ کا شکار تھیں۔ لباس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ باہر نکلنے کا بھی کوئی مقصد نہیں تھا نہ جانے کیوں اُس کے قدم دادی امّاں کے کمرے کی جانب اُٹھ گئے۔ اور اُن کے کمرے میں قدم رکھا تو اندر سے خیر دین کی آواز آرہی تھی۔

"او جی بس بادشاہ سلامت تو بس بادشاہ سلامت ہی ہوتے ہیں مگر دادی امّاں اُنھیں سلامت کیوں کہتے ہیں؟ ہر بادشاہ کو سلامت، ہر بادشاہ کو سلامت۔"

"بیٹے! بادشاہ کے نام کے ساتھ اُس کی سلامتی کی دُعائیں بھی تو مانگی جاتی ہیں اور ہر انسان اُس کے لئے مجبور ہوتا ہے۔"

"لو جی کمال ہے جب یہ بادشاہ تھے ناں دادی امّاں تو سب اِتنا ہی مجبور ہوا کرتے تھے۔ یہ بادشاہ میں کہتا ہوں آخر ہوتے ہی کیوں تھے؟"

"تھے ناں اگر اچھے ہوتے تو قائم رہتے۔"

"لو جی لاکھ روپے کی بات کہہ دی آپ نے۔" خیر دین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور رِدا کمرے میں داخل ہوگئی۔ خیر دین دادی امّاں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ رِدا کو دیکھتے ہی بولا۔

"رِدا بی بی جی سلام!" رِدا کڑی نگاہوں سے اُسے گھور رہی تھی پھر اُس نے سخت لہجے میں کہا۔

"شاید تمہیں معلوم ہوگیا کہ اِس کوٹھی کے حالات پھر سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔"

"لو جی، ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، ذرا سمجھا دو بی بی جی، کیا بات ہے؟ کیا ہوگیا؟" خیر دین نے کہا۔

"کچھ نہیں دادی امّاں ثناء تو اِس طرف نہیں آئی۔"

"نہیں بیٹے وہ شاید باہر لان پر ہے۔" دادی امّاں نے جواب دیا اور رِدا پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل آئی۔ خیر دین کو دیکھ کر اُسے نہ جانے کیوں غصہ آگیا تھا، پھر وہ کہیں اِدھر اُدھر جانے کی بجائے واپس اپنے کمرے ہی میں آگئی تھی۔ کمرے میں آنے کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا بس ذہن پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا پھر... کیا پھر؟ زیادہ نہیں سوچنے پائی تھی کہ دروازے سے خیر دین کی آواز سُنائی دی۔

"اندر آنے کی اجازت مانگتے ہیں جی۔" رِدا نے کوئی جواب نہیں دیا خیر دین نے دروازہ کھول کر تھوڑا سا اندر جھانکا اُس کی آنکھیں اُلوؤں کی طرح گردش کر رہی تھیں۔

"کمال ہوگئی جی اندر آنے کی اجازت مانگی تھی ہم نے آپ سے۔"

"آؤ۔" رِدا سرد لہجے میں بولی۔

"سلام تو ہم پہلے ہی کرچکے ہیں۔ رِدا بی بی جی۔"

"میرا خیال ہے تمہیں یقیناً کسی تھیٹر میں ملازمت مل گئی ہوگی۔"

"لو جی کمال ہوگئی آپ نے ہمارے دِل کی بات کیسے جان لی۔" خیر دین متحیرانہ انداز میں ہنستا ہوا بولا۔

"اِس لئے کہ تم تھیٹر کے کسی مسخرے ہی کی حیثیت رکھتے ہو اور اِسی کے لئے مناسب ہو۔"

"نہیں جی کومیڈی تو کرنا نہیں آتی اپنے کو جناب بی بی جی، ہاں ہیرو بننے کا خیال دِل میں بار بار آیا پر لوگ کہتے ہیں کہ خیر دین ولد بشیر دین تم ہیرو کبھی نہیں بن سکتے کیونکہ تمہارا تلفظ... کیا کہتے ہیں جی اُس کو تلفظ ہی کہتے ہیں ناں اُس کو، تلفظ ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہاں کس لئے آئے ہو؟" رِدا نے بدستور سرد لہجے میں پوچھا۔

"او جی کچھ نہیں، بس میں بیٹھ کر کوٹھی میں آئے، کوٹھی میں آکر دادی امّاں کے پاس پہنچے، دادی امّاں کے پاس سے آپ کے پاس آگئے۔ دراصل رِدا بی بی دادی امّاں کے پاؤں دبانے کی عادت ہوگئی ہے ہمیں۔ ہم نے سوچا کہ پیروں میں درد ہو رہا ہوگا اُن کے تو دبانے چلے آئے، اب آپ کو سلام کرنے آگئے ہیں۔"

"وعلیکم السلام اور کیا خدمت کرسکتی ہوں تمہاری؟" رِدا نے پوچھا۔

"بس جی بیٹھنے کے لئے کہہ دو۔ سو ہم بیٹھ جائیں گے۔" خیر دین نے جواب دیا تھا اور رِدا غصے سے اُسے گھورنے لگی۔

"میرے پیروں میں درد نہیں ہو رہا۔ یہاں کیوں بیٹھنا چاہتے ہو؟"

"لو جی کبھی ہم نے آپ کے پاؤں دبائے رِدا بی بی۔ توبہ توبہ ایسی باتیں نہ کریں ہمیں شرم آتی ہے پر بیٹھنے کو تو کہہ دیں جی۔ اتنی بداخلاق تو آپ پہلے کبھی نہیں تھیں۔"

"اُس وقت میں انسان کی حقیقت سے واقف نہیں تھی۔"

"کومال (کمال)، ہوگئی جی۔ یہ انسان کی حقیقت کیا ہوتی ہے رِدا بی بی؟"

"مختلف شکلوں میں سامنے آتی رہتی ہے۔ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں خیر دین۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی، کسی کی ناک چپٹی ہوتی ہے، کسی کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں کسی کے ہونٹ یُوں ہوتے ہیں اور کسی کے یُوں۔" خیر دین نے پہلے ہونٹ سکوڑے پھر اُنھیں کھینچ کر کانوں تک پھیلا لیا لیکن رِدا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔

"اب کوئی بیٹھنے کو نہ کہے جی تو پھر انسان اِس کے علاوہ اور کیا کرے کہ خود ہی بیٹھ جائے۔" وہ ایک کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا اور بیٹھ گیا، اُس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ اور رِدا کو غصہ آتے جا رہا تھا۔

"پر یہ تو بتا دیجئے رِدا بی بی جی کہ آپ ہم سے ناراض کیوں ہیں؟ دیکھو ناجی عدالتوں میں بھی مجرم کو پہلے فردِ جرم پڑھ کر سُنائی جاتی ہے۔"

"اوہ۔ فردِ جرم کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو تم۔" رِدا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں جی پڑھا تھا ایک کتاب میں وہ ایک فرد ہوتی ہے۔ یعنی افراد کی اکلوتی اور پھر ایک جرم ہوتا ہے۔ وہ جی کسی کی گردن دبا دو۔ کسی کی جیب کاٹ لو کسی کے... کسی کے...۔"

"خیر دین ہنسانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو تم۔ مجھے ہنسی نہیں آئے گی۔"

"یہ تو ہم بھی محسوس کر رہے ہیں بی بی جی، اب تو اپنے پاس کوئی اور بھی تو ذریعہ نہیں رہا ہے آپ کو ہنسانے کا بتایئے کیسے ہنسائیں؟"

"میں ہنسنا نہیں چاہتی۔"

"لو بھئی کومال (کمال) ہوگئی۔ خیر دین ولد بشیر دین چلنا بہتر ہے۔ اب کوئی اِتنی بے عزتی کردے تو اُس کے بعد بھی تم بیٹھے رہو گے۔ اچھا رِدا بی بی سلام۔" وہ کرسی سے اُٹھا تو نہ جانے کیوں رِدا کو ایک عجیب سا احساس ہوا اُس نے فوراً ہی خیر دین کو آواز دی۔

"بیٹھو، اگر یہاں سے گئے تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"ہیں جی؟" خیر دین مُنہ پھاڑ کر بولا۔

"بیٹھ جاؤ شرافت سے۔"

"اچھا جی، اچھا تو آپ اِس لئے ناراض تھیں کہ ہم شرافت سے نہیں بیٹھے تھے لو جی اب بیٹھ جاتے ہیں۔" خیر دین کرسی پر پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اِس بار رِدا کو ہنسی آ ہی گئی تھی۔

"نہیں خیر دین، نہیں یہ تمام کوششیں مت کرو میں تمہارے بارے میں عجیب سے احساسات کا شکار ہوگئی ہوں۔"

"لو جی مجرم کو بھی پھانسی دینے سے پہلے اُس کا قصور بتا دیا جاتا ہے آخر آپ ہمیں ہمارا قصور کیوں نہیں بتاتیں؟"

"خیر دین! کیا اِس دُنیا میں ہر انسان صرف پیٹ کے لئے جیتا ہے جواب دو اِس بات کا۔"

"اللہ جانے جی پیٹ بھی ہوتا ہے، تن بھی ہوتا ہے۔ اور شاید من بھی۔ کیا ہم نے غلط کہا۔ تن، من، پیٹ، نہیں جی اس کے ساتھ تن، من، دھن کہا جاتا ہے شاید، بہرحال رُدابی بی جی پیٹ بھی ایک حیثیت تو رکھتا ہی ہے۔"

"ہاں بے شک رکھتا ہے لیکن زندگی میں کچھ اور بھی اقدار ہوتی ہیں۔"

"کیا ہوتے ہیں جی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"مت بکواس کرو مجھ سے خیر دین، تم جس طرح یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے مجھے پسند نہیں آیا۔"

"نہ جی نہ، ہمارا کیا قصور تھا بی بی جی، بڑے صاحب نے کہا کہ سب لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ ہم بھی چلے گئے۔"

"اور تم نے بڑے صاحب کے دیئے پیسے بھی قبول کر لئے۔"

"لو جی سمندر کے پانی میں سے ایک لوٹا نکال لیا جائے تو کون سی کمی ہو جاتی ہے اُس میں، بڑے صاحب نے پیسے دیئے۔ اور ہم نے لے لئے۔"

"خیر دین میں تم سے ذرا مختلف توقع رکھتی تھی۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی رُدابی بی، توقع بھی رکھی تھیں۔ اور بتایا بھی نہیں۔ اگر خیر دین کو دوسروں سے مختلف سمجھتی تھیں۔ تو کم از کم اُسے مشورہ تو دینا چاہیئے تھا کہ وہ کیا کرے۔"

"تم خود نہیں سوچ سکتے تھے؟"

"چلو مان لیا بی بی جی۔ ہم یہاں سے نہ جاتے پر ہوتا کیا؟ یہ بتاؤ جی۔"

"کیا ہوتا جب سب لوگ یہاں سے جاتے، تب ہی تمہیں بھی جانا چاہیئے تھا۔ میں گئی یہاں سے؟"

"ہم آپ سے یہ پوچھنے آئے تھے کہ آپ کب جا رہی ہیں جی۔"

"میں نہیں جا رہی۔ میں اِسی عمارت میں رہوں گی۔"

"او ہو جی، یہ عمارت تو، یہ عمارت تو۔۔"

"ہاں اب یہ عمارت احسان صاحب کے پاس ہی رہے گی۔"

"لو جی کومال (کمال) ہو گئی جی! یہ تو بڑا گھپلا ہو گیا یہ عمارت احسان صاحب کے پاس رہے گی آپ بھی رہیں گی مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے بی بی جی؟"

"ایسا ہو چکا ہے خیر دین مجھے ایسا ہو چکا ہے میں تمہیں جس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی وہ مقام دوسروں نے حاصل کر لیا۔"

"کس نے جی، آپ اُس کا نام بتائیں۔ ہم اُس کی ہڈی پسلی توڑ دیں گے۔"

"بے کار باتیں کرنے میں تم سے بڑا ماہر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ہڈی پسلی کیوں توڑ دو گے، یہ تو صاحبِ دل لوگوں کا کام ہے۔ جانتے ہو غلام احمد صاحب نے کیا کیا ہے؟"

"کن صاحب نے؟"

"غلام احمد ڈرائیور غلام احمد۔"

"کیا کیا ہے، ہمیں کیا معلوم؟"

"اُنھوں نے یہ کوٹھی اور احسان صاحب کی وہ فرم جو احسان لمیٹڈ کے نام سے ہے واپس حاصل کر لی ہے۔ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے ادا کر کے۔"

"اوہ جی کمال ہو گئی، یہ ڈرائیوری تو بڑے منافع کی چیز ہے۔ جی ہم بھی گاڑی چلانا سیکھ لیں گے ساڑھے آٹھ کروڑ روپے تو آئیں گے۔۔"

"نہیں یہ ڈرائیوری سے نہیں حاصل کئے گئے بلکہ غلام احمد صاحب کا آبائی کاروبار تھا اور اُن کی بہت بڑی رقم ریڈ کراس کے پاس جمع تھی وہ اُنھیں ملی تو اُنھوں نے یہ دولت احسان صاحب کو پیش کر دی۔"

"گویا کوٹھی اور کاروبار اب غلام احمد صاحب نے خرید لیا۔"

"خریدا نہیں بلکہ اُسے برقرار رکھا۔ احسان احمد صاحب کے لئے۔ یہ اُن کی وفاداری اور محبت کا ثبوت تھا۔"

"بڑی بات ہے بی بی جی، بڑی بات ہے، واقعی بڑی بات ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ احسان صاحب کو اس کوٹھی سے نہیں نکلنا پڑے گا۔ ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن یہ ٹھکانہ اگر اُن سے چھن جاتا تو واقعی دُکھ کی بات تھی بہرطور غلام احمد صاحب نے بہت بڑا کام کیا ہے۔"

"اور تم نے؟"

"خیر کام تو ہم نے بھی چھوٹا موٹا نہیں کیا ہے مگر بس۔ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے نہیں تھے ہمارے پاس۔" خیر دین نے جواب دیا۔

"بات ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی نہیں ہے خیر دین۔ بات صرف اُن کے جذبوں کی ہے۔ تمہیں کم از کم اُس وقت تک نہیں جانا چاہیئے تھا جب تک یہ لوگ یہ عمارت نہ چھوڑ دیتے۔"

"چلو بی بی جی غلطی ہو گئی۔ اب معافی مانگ لیتے ہیں مگر اب یہاں سے چلے گئے سو چلے گئے۔"

"نوکری کر لی ہے تم نے کہیں؟"

"ابھی نہیں کی جی مگر کر لیں گے۔ واپس تو اب یہاں آنے سے رہے ہم۔"

"یہ اور بھی بُری بات ہو گی تمہیں اب واپس آنا بھی نہیں چاہیئے۔"

"ہاں جی نہیں آئیں گے۔ نوکری کا کیا ہے کہیں نہ کہیں مل جائے گی اور پھر ہم جیسے لوگوں کے لئے نوکری کی کیا کمی جھاڑو برتن، صفائی اور اگر ضرورت پڑے تو کھانا بھی پکا لیتے ہیں۔"

"اُڑتے رہو، اُڑتے رہو۔ تمھارا کیا خیال ہے میں تمھاری بات تسلیم کر لوں گی؟"

"مجھے نہیں جی رُدابی بی۔" خیر دین نے کہا۔

"میں سمجھانا بھی نہیں چاہتی۔ میں تم سے یہ بھی نہیں پوچھنا چاہتی کہ تم کون ہو؟ اب تو میں نے یہ تصور ہی ذہن سے نکال پھینکا ہے۔"

"تو پھر ناراض کیوں تھیں؟"

"ناراض... ناراض نہیں تھی، بس دُکھ تھا تمھارے اِس کردار پر۔ میں تمھیں دوسروں سے مختلف سمجھنے لگی تھی اور حق بات یہ ہے خیر دین کہ میں تمھیں اپنا محافظ بھی سمجھنے لگی تھی۔ تم نے واقعی مجھ پر جو احسانات کئے ہیں۔ اُن کی جگہ میرے دِل میں ہے۔ اور شاید یہی بات ہے کہ میں تمھاری اِس حرکت سے خوش نہیں ہوئی۔ ورنہ اور بھی بہت سے لوگ چلے گئے مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر تم... تم مختلف ہو۔ تم مختلف تھے۔ تم نے سب کو ایک لمحے میں چھوڑ دیا۔"

"رُدابی بی جی! یہ ضروری تھا۔" خیر دین نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں ضروری تھا مجھے بتاؤ تو سہی کم از کم۔"

"کہیں نہ کہیں نوکری تو کرنی ہے ناں جی، زبردستی کسی کے سر پر سوار رہنا تو اچھی بات نہیں ہوتی۔"

"خیر چھوڑو اِن باتوں کو تمھاری مرضی ہے۔ اب کیا ارادہ ہے تمھارا؟"

"کچھ نہیں جی، یہ تو اچھی بات ہے جی کہ ہمیں اِسی کوٹھی میں آنا پڑے گا۔ یادیں تازہ ہوتی رہیں گی اور جہاں تک رہی آپ کی حفاظت کی بات رُدابی بی، تو ایک بات کا بالکل اطمینان رکھیں۔ جیسے ہی آپ کسی تکلیف کا شکار ہوئیں، خیر دین آپ سے دُور نہیں ہو گا۔"

"نہیں چاہیئے مجھے تمھاری یہ ہمدردی قطعی نہیں اِس کے بعد جو ہو گا خیر دین میں خود ہی کروں گی سمجھے تم۔"

"وہ آپ کی مرضی ہے رُدابی بی جی۔ ہم نے آپ سے کبھی یہ تو نہیں کہا کہ آپ ہمارے کسی کئے کا صلہ دیں۔"

"صلہ! اچھی بات کر رہے ہو۔ باتیں ایسی کرتے ہو جیسے بہت زیادہ اپنائیت رکھتے ہو مجھ سے اور۔۔ اور اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاتے۔ یہ اچھی بات ہے۔"

"اچھا جی سلام علیکم چلتا ہوں پھر آئیں گے آپ سے ملاقات کرتے رہیں گے۔" خیر دین کُرسی سے نیچے اُتر کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ رُدا عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی، دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رُکا اور پھر مُسکراتا ہوا بولا۔

"رُدابی بی! ضد اچھی چیز نہیں ہوتی لیکن کیا کریں ہم دونوں کے درمیان اِسی کا رشتہ قائم ہوا ہے، ایک بار میں پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں۔ دوسری بار بھی اور شاید تیسری بار بھی یہی کہوں گا کہ جب تک رُدا کی کتاب نہیں کھُلے گی خیر دین تو خود بھی بند رہے گا آپ کو خیر دین کی آنکھوں کی بینائی درکار ہوئی تو خیر دین اپنی دونوں آنکھیں آپ کو دے دے گا لیکن اصُول اصُول ہیں۔ اعتماد کے سودے اعتماد کی قیمت پر ہوتے ہیں۔ خُدا حافظ۔۔" وہ دروازے سے باہر نکل گیا اور رُدا دروازے کو گھورتی رہ گئی خیر دین کے الفاظ اُس کے کانوں میں گُونج رہے تھے۔

احسان صاحب بستر پر مسلسل کروٹیں بدل رہے تھے۔ اور ذکیہ بیگم اُن کی بے چینی محسوس کر رہی تھیں۔ احسان صاحب کی یہ کیفیت تو پچھلے کافی دِنوں سے تھی اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہو گئی تھی لیکن اُس رات وہ کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔ ذکیہ بیگم اُن کی پریشانی سے بہت غم زدہ تھیں۔ ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔ کہ وہ بھی جاگ رہی ہیں کہتیں تو کیا کہتیں آخر؟ تمام حالات اُن کی نگاہوں کے سامنے تھے، بہرطور وہ خاموش رہیں۔ احسان صاحب کو شاید کمرے میں کچھ گھٹن محسوس ہو رہی تھی چنانچہ وہ انتہائی خاموشی سے اپنی جگہ سے اُٹھے اسٹینڈ پر ٹنگا ہُوا گون شانوں پر ڈالا اور انتہائی احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ ذکیہ بیگم اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ احسان صاحب کی بے چینی دُور کرنا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ خود بھی بے قرار ہو کر باہر نکل آئیں۔ احسان صاحب راہداری عبُور کر کے پائیں باغ میں جا رہے تھے۔ وہ خود بھی پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ پائیں باغ میں احسان صاحب کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ٹہل رہے تھے کہ اُن کی نگاہ ذکیہ بیگم پر پڑی اور وہ چونک پڑے۔ ذکیہ بیگم آہستہ آہستہ اُن کے قریب پہنچ گئی تھیں، اُنھیں احساس ہو گیا کہ احسان صاحب نے اُنھیں دیکھ لیا ہے، احسان صاحب ذکیہ بیگم کے قریب پہنچ کر ہنس پڑے۔

"بھئی نصف بہتر ہو تم جیسی بلکہ تم تو کچھ زیادہ ہی بہتر ہو۔ کیسے پتہ چل گیا کہ ہم یہاں موجود ہیں؟" ذکیہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ گردن خم کر کے کھڑی ہو گئیں، احسان صاحب جلدی سے اُن کے قریب آ گئے تھے۔

"ارے بھئی واہ! یہ کیا بات، ہم تو سمجھے تھے کہ آپ ہمارا دِل بہلانے آئی ہیں مگر یُوں لگتا ہے جیسے ہمیں خود ہی آپ کا دِل بہلانا پڑے گا۔"

"آپ بہت پریشان ہیں ناں؟"

"لفظ پریشانی کچھ سُوٹ نہیں کرتا اِس وقت کے احسانات سے میرا خیال ہے غلام احمد نے ہمیں اُس پریشانی سے تو نکال دیا. جو چند روز پہلے تھی بھئی دولت چلی گئی کوئی بات نہیں کاروبار چلا جائے تب بھی کوئی بات نہیں دراصل ہم بہت سی دوسری باتیں سوچ رہے تھے ذکیہ مثلاً یہ کہ ابھی ہم نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بھی نہیں کی۔ دِل میں تو بہت کچھ تھا اُس کے لئے لیکن انسان ہمیشہ سے حالات کا غلام ہوتا ہے۔ اور وہ لاکھ چاہے وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہو۔ ہمارے اور تمہارے لئے تو خُدا کے فضل سے کوئی کمی نہیں ہے کہیں بھی گزار لیتے، مار تی ہے تو بس ایک بات وہ یہ کہ اپنی بیٹی کی شادی اُس کے شایانِ شان نہیں کر سکیں گے، اب تم دیکھو نا ہماری ساکھ تو کچھ اور ہی ہے، اور پھر اِن واقعات کی اطلاع عادل حسین کو بھی نہیں دی، لاکھ بچپن کے دوست ہیں. لیکن اِس وقت دُنیا کا رنگ ذرا مختلف ہے. میں عادل حسین کو کوئی الزام نہیں دے رہا لیکن اگر میرے حالات آج جیسے ہوتے تو شاید عادل حسین کو بچپن کی وہ نسبت یاد نہ آتی جو اَب اُنھیں زبانی یاد ہے بس ذکیہ دُنیا نے یہی سب کچھ بتایا ہے میں نہیں جانتا کہ اِن حالات سے واقفیت کے بعد عادل حسین کا رویّہ کیا رہے گا لیکن تشویش ضرور ہے۔"

"دیکھئے اب جو کچھ ہو گیا ہے اُس کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا. ایک بات میں اچھی طرح جانتی ہُوں کہ آپ نے آج تک کاروباری غم خود ہی پالے ہیں کبھی ہم لوگوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ کاروبار کیا شئے ہے؟ یقیناً آپ جو کچھ کرتے رہے ہیں۔ اُس میں دِقتیں بھی پیش آئی ہوں گی آپ کو. حالات واقعی ایسے ہو گئے کہ یہ سب کچھ سوچنا پڑا لیکن میں سمجھتی ہُوں کہ پریشان ہونا کوئی حل نہیں ہے۔"

"ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے کب اِس سے انکار کیا دراصل اِس وقت سب سے زیادہ پریشانی اِس بات کی ہے کہ اِس سر پھرے خاندان کا کیا کیا جائے ذرا غور تو کرو غلام احمد چند ولیں کے عوض ہمارے ڈرائیور رہے ہیں، ایک بہت ہی معمُولی بستی میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی پریشانی بتائی تو میں نے دوسرے ملازموں کی طرح اُنھیں بھی کوارٹر میں جگہ دے دی۔ یقین کرو دِل میں ایثار کا کوئی جذبہ نہیں تھا بس سوچا ڈرائیور ہیں قریب آجائیں گے تو وقت بے وقت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اُس شخص کے ساتھ ہم نے کچھ بھی تو ایسا سلوک نہیں کیا جس کے نتیجے میں وہ اپنی ساری زندگی کی کمائی ہمیں دے دے، میرے تو ایک ہی بیٹی ہے اُس کی دو دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کو انتہائی بہتر طریقے سے بیاہ سکتا ہے وہ۔ بڑے اعلیٰ درجے کے رشتے مل جائیں گے۔ بھائی، ساڑھے دس کروڑ روپے معمولی بات نہیں ہوتی۔ یُوں سمجھ لو خوابوں کی جنّت ہے وہ۔ اور ایک شخص اپنے اِن خوابوں کی جنّت کو ٹھکرانا چاہتا ہے۔ اُس نے تمام جمع پُونجی ہمارے حوالے کر دی۔ فرشتوں جیسی بات ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہُوں ذکیہ بیگم اگر کسی کے ساتھ کوئی ایثار کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو بس اِتنا ہی کیا جا سکتا تھا کہ دس، بیس، پچاس ہزار روپے یا ایک لاکھ روپے یا کوئی اگر ایسا ہی مسئلہ آجاتا تو دو چار لاکھ روپے کسی کو پیش کر دیئے جاتے اپنی زندگی تو کسی کے حوالے نہیں کی جا سکتی تھی اپنا مُستقبل تو کسی پر نہیں لُٹایا جا سکتا یہ کیسا انسان ہے؟ یہ کیسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی نہ صرف اپنی بلکہ سارے خاندان کی زندگی ہمارے سپُرد کر دی؟ ذکیہ بیگم پریشان ہوں خُدا کی قسم بڑا پریشان ہُوں۔ دِل نہیں چاہتا کہ غلام احمد کی اِس حسین جنّت کو اپنے لئے پامال کردوں اِس جیسی چار کوٹھیاں خرید سکتا ہے وہ۔ اپنا کاروبار بھی کر سکتا ہے کچھ بھی کر سکتا ہے آخر کرتا ہی رہا ہے۔ ساڑھے دس کروڑ روپے کما لینا معمُولی بات نہیں اور پھر کتنے ظرف کا انسان ہے کہ اِس حیثیت کا مالک اور ضرورت پڑنے پر ایک جھونپڑی میں جا بسا اور اُس کے بعد سے آج تک ہمیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ کبھی وہ اِتنی بڑی حیثیت کا مالک رہ چُکا ہے نہ صرف وہ بلکہ اُس کے اہلِ خاندان اُس کی بیٹیاں۔ ذکیہ بیگم کچھ سمجھ میں آئے تو کچھ کہوں۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو سوچتا ہُوں کہ یہ کیسا مذاق ہے۔ جو اُس نے میرے ساتھ کیا؟ کیسے اِس مذاق کو برداشت کر لُوں؟ یُوں لگتا ہے جیسے صبح کو جب آنکھ کُھلے گی تو غلام احمد ہنستا ہُوا نظر آئے گا کہ میاں پاگل ہو گئے ہو بھلا اِس انداز میں بھی ایثار کیا جا سکتا ہے. بس یہی پریشانی سونے نہیں دے رہی۔ بخدا میں سب کچھ اپنے اُوپر جھیل لُوں گا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غلام احمد کو کیسے روکوں؟ اُن لڑکیوں سے کچھ اُمید تھی مگر خُون کی بات ہے ذرا بھی تو شکن نہیں آئی اُن کی پیشانی پر ساڑھے دس کروڑ روپے اِس طرح ٹھکرا دیئے جیسے کوئی حقیر سی رقم ہو اُنھوں نے کسی بھی تو ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا نوجوان لڑکیاں ہیں باپ سے کہتیں جا کر کہ بڑے میاں

خود تو زندگی گزار لی ہمارے لئے بھی تو کچھ سوچو ہمارا ابھی تو مستقبل ہے۔"

"اچھا خون اچھی باتیں. قُدرت تو ہمیشہ ہی شناء کے ساتھ رہی ہے بڑی بے تکلفی ہے دونوں میں. مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ عظمت کے ایسے پہاڑ ہمارے گھر کے معمُولی سے کوارٹر میں رہ رہے ہیں۔"

"اب جب یہاں آ ہی گئی ہو ذکیہ بیگم تو مجھے خُدا کے لئے مشورہ دو میں کیا کروں؟ غلام احمد اِس بات پر مطمئن ہو گئے ہیں کہ میں نے اُن کی پیش کش قبول کر لی میں نے سچی بات یہ ہے کہ ابھی گنجائش رکھی تھی یہ سوچ کر کہ دوسرے لوگ اُسے سمجھائیں گے مگر یہ سمجھانے والے کون ہو سکتے ہیں۔ اب تو کوئی مجھے نظر بھی نہیں آتا۔"

"تو پھر مان لیجئے غلام احمد کی بات۔ یہ رقم ہم پر قرض رہے گی۔ آپ ازسرِ نو کوشش کیجئے گا جس طرح بھی بن پڑے. ظاہر ہے۔ اب ہم غلام احمد کو ڈرائیور کی حیثیت تو کبھی نہیں دے سکتے کس مُنہ سے دیں کیا اپنا کلیجہ نہیں کٹ جائے گا؟"

"ہاں بھئی بالکل مگر سمجھ میں نہیں آتا کچھ سمجھ میں نہیں آتا اپنے خُدا سے مدد مانگ رہا ہُوں کہ مجھے صحیح راستہ دِکھا۔ ویسے ذکیہ حقیقت یہی ہے کہ خُدا نے مجھے فرشتوں کے درمیان رکھا ہے یہ ساری باتیں انسانوں کی باتیں نہیں ہیں کس کس کو فرشتہ گردانوں مجھے بتاؤ ذکیہ بیگم کیا تمھارے دِل میں یہ خیال نہیں اُبھرا کہ میرے بھائی نے تمھیں برباد کر دیا؟"

"مجھے صرف مجھے؟" ذکیہ بیگم نے شکایتی نگاہوں سے احسان صاحب کو دیکھا.

"ہاں ذکیہ بیگم میرا تو وہ بھائی ہے میں تو دوسرے انداز میں بھی سوچ سکتا ہُوں لیکن تم۔۔"

"یہاں آپ غلطی کر رہے ہیں غیریت کا احساس دِلا رہے ہیں مجھے۔ میں نے کب شہاب کو اپنوں سے الگ سمجھا؟"

"ہاں... ہاں۔ یہی تو میں کہنا چاہ رہا تھا کہ فرشتوں کے درمیان زندگی بسر کر. باہُوں تم نے ایک لفظ بھی تو نہ کہا۔ کچھ بھی تو نہ کہا تم نے۔ کہہ لیتیں تو کم از کم تھوڑی سی تسلّی ضرور ہو جاتی۔"

"اِن باتوں کو جانے دیجئے. مجھے ذرّہ برابر کسی سے شکایت نہیں ہے شہاب کے بارے میں جو رویّہ آپ کا ہو گا سو میرا. ساری زندگی تو گزار چُکی ہُوں آپ کے ساتھ اور اب بھی "میں" اور "تو" کا فرق درمیان میں رکھوں. اِس ذکر کو جانے دیجئے آپ نے اپنے دِل میں شہاب کے بارے میں جو کچھ بھی سوچا ہو وہی میرے اپنے ذہن میں بھی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے مگر غلام احمد۔ بیگم کم از کم یہ بتا دو کہ غلام احمد کو کیسے سمجھاؤں؟"

"میرا خیال ہے وہ سمجھنے والا انسان نہیں ہے جو کچھ کہہ رہا ہے کریں بعد میں سوچیں گے کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟"

"اچھا ایک بات بتاؤ کیا اب بھی وہ تین نمبر ہی میں پڑا رہے گا؟"

"نہیں۔ میں اِس سلسلے میں بات کر لُوں گی۔ جو کچھ میں کروں گی وہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہم اُنھیں کوٹھی میں لے آئیں گے۔"

"ہاں بھئی کم از کم اپنے آپ اِس قدر برہنہ نہ ہو جائیں ہم لوگ۔ بے غیرتی تو کسی طرح اچھی نہیں لگتی مالکان تو کوارٹر میں پڑے رہیں اور طفیلئے کوٹھی میں راج کریں ذکیہ بیگم آپ کو میری مدد کرنا ہوگی اِس سلسلے میں اپنے طور پر تو میں ہار چُکا ہُوں. وہ اِتنا سخت انسان ہے کہ میں بتا نہیں سکتا. کیا کیا گُر نہیں آزما لئے میں نے اُس پر، مگر ٹس سے مَس نہ ہُوا خُدا کی قسم ایسا عجیب و غریب کِردار اِس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔"

"تو اب یہ پریشانی تو چھوڑ دیجئے میں آپ کو مُسلسل دیکھ رہی تھی۔ آپ بے چین تھے؟"

"اب یہ بے چینی اِس بات کی نہیں ہے کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا؟ بے شک شناء کا خیال میرے دِل میں موجود ہے، پریشان تو صرف میں غلام احمد کے رویّے سے ہُوں۔ اُسے اگر ہوش آ گیا تو کیا ہو گا؟"

"ہم تو نہیں مانگنے گئے تھے اُس کے پاس. اب وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہا ہے تو ٹھیک ہے کوشش کریں گے کہ اُسے اُس کے احسانات کا صِلہ دے سکیں جو کہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے لیکن جس طرح بھی ممکن ہو میری رائے تو یہی ہے آپ خاموش ہو جائیے. اور جو کچھ غلام احمد کہہ رہے ہیں اُس پر عمل کیجئے۔"

"تمھاری یہی رائے ہے؟"

"ہاں! میرا خیال ہے اب اِس میں کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

"اچھا پھر ٹھیک ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی۔ میں تو خُدا کی رضا میں خُوش ہُوں۔" احسان صاحب نے کہا اور ذکیہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر واپس چل پڑے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہُوئے یُونہی نگاہ ایک جانب اُٹھ گئی تھی دیکھا تو اماں بیگم مصلّے بچھائے بیٹھی نماز پڑھ رہی ہیں احسان صاحب پر عجیب سا اثر ہُوا تھا۔ ذکیہ بیگم کا ہاتھ پکڑا! ماں کے پیچھے جا کھڑے ہُوئے اُنھوں نے قدموں کی آہٹ سُن لی تھی. سلام پھیر کر پلٹ کر دیکھا اور پھر مصلّے کا کونہ موڑ کر کھڑی ہو گئیں.

"آرام نہیں کر رہے ہو تم لوگ؟ کہاں گھومتے پھر رہے ہو؟"

"کہیں نہیں امی۔ وہ دراصل نیند نہیں آ رہی تھی سو پائیں باغ میں نکل آئے۔"

"کیا کروں احسان۔ کیا نماز پڑھ کر شہاب کو کوسوں اُس کے لئے بددعائیں کروں۔ اپنے خدا سے مدد مانگ رہی تھی کہ میں کیا کروں؟"

"خدا نہ کرے امی جان قطعی نہیں۔ خدا کی قسم بالکل نہیں آپ شہاب کو کوئی بددعا نہ دیں۔ اُسے دعائیں دیں۔ کہ خدا اُسے محفوظ رکھے اور راہِ راست پر لے آئے جو کچھ اُس نے کیا ہے امی جان بس یہ ہماری تقدیر کا معاملہ ہے میرا ایک ہی بھائی تو ہے کیسے بددعائیں دوں؟ کس دل سے بددعائیں دوں؟ بہرحال بُری صحبتوں کا شکار رہا قصور میرا بھی تو ہے مجھے اُس پر نگاہ رکھنی چاہیئے تھی۔ میں نے ہمیشہ اُس کی دلجوئی پر ہی قناعت کی۔ دیکھئے میں نے اُسے کوئی کام بھی تو نہیں کرنے دیا۔ آزاد چھوڑ دیا تھا میں نے اپنے بھائی کو مگر اس میں غلطی تھی میری مجھے اُس کی ہر چیز کا خیال رکھنا چاہیئے تھا اُس کی صحبت کا بھی، بہرطور میری آپ سے استدعا ہے کہ آپ اُسے بددعا نہ دیں خدا کے لئے" دادی اماں رونے لگی تھیں ذکیہ بیگم اور احسان صاحب اپنی پریشانیاں بھول کر انھیں تسلیاں دینے میں مصروف ہوگئے۔ بمشکل تمام وہ انھیں کمرے تک لائے تھے کافی دیر تک اُن کے پاس بیٹھے شہاب کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، یہ بتلاتے رہے کہ شہاب کی تلاش جاری ہے کسی بھی ممکن طریقے سے انھیں بالآخر تلاش کر لیا جائے گا اور اُن کے خلاف کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جائے گی جو اُن کے لئے پریشانی کا باعث ہو، راہِ راست پر آ ہی جائیں گے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ وہ فکر نہ کریں کافی بہلانے پھسلانے کے بعد دونوں میاں بیوی اپنے کمرے میں آئے تھے۔

"خدا کے لئے سو جائیے اب پریشانیاں ذہن سے جھٹک دیجئے، ثناء پر اُس کا بُرا اثر پڑے گا" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"ہاں بھئی بس فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے اب تم نے بھی اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ تو پھر ہم کیا کریں۔ ٹھیک ہے بھائی غلام احمد ہم تمھاری بڑائی کو ختم نہیں کر سکے تو اپنی بڑائی ختم کئے لیتے ہیں۔" احسان صاحب نے کہا اور بستر پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سچ مچ سو گئے تھے۔ دوسری صبح جاگے غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک دم حالات اتنے تبدیل ہو گئے ہیں۔ ناشتے کے کمرے میں پہنچے تو رِدا، ثناء اور ندرت مصروف تھیں۔ کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی اُنھوں نے۔ ناشتہ لگا دیا گیا تو احسان صاحب نے ندرت سے کہا۔

"بیٹے غلام احمد کہاں ہیں؟"

"گھر میں ہیں۔ بلا کر لاؤں؟"

"نہیں وہ... میرا مطلب ہے۔ ناشتہ.." احسان صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ابّو نے تو ناشتہ کر بھی لیا۔ میں انھیں ناشتہ دے کر آئی تھی۔" ندرت نے سادگی سے جواب دیا۔

"ہم.." احسان صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر بولے۔

"اور تم نے؟"

"نہیں میں نے تو ابھی نہیں کیا۔"

"تو پھر بیٹھ جاؤ ناشتہ کر لو۔"

"آپ کر لیجئے۔ ہم لوگ میرا مطلب ہے میں.." ندرت کے اندر ایک دم جھجک پیدا ہوگئی۔

"ندرت بیٹے بیٹھ جاؤ ناشتہ کر لو۔ رِدا تم بھی۔ ثناء تم انھیں بیٹھنے کے لئے کہو نا۔"

"چلو اے اللہ رکھی بیٹھ جاؤ۔ تم بھی بیٹھ جاؤ رِدا ناشتہ کرو.."

ندرت اور رِدا خاموشی سے کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھیں، ندرت نے ناشتہ کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔ احسان صاحب گہری نگاہوں سے اُس کا جائزہ لے رہے تھے پھر اُنھوں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتے سے فراغت ہوگئی۔ احسان صاحب لباس تبدیل کرنے چل پڑے تھے آج جو فیصلے کئے تھے اُن پر عمل کرنے کا دن تھا جو کچھ کرنا ہے کر ڈالا جائے تاکہ اس اُلجھن سے نجات ملے، لباس وغیرہ پہن کر وہ باہر نکلے تو ایکبار پھر ٹھٹک گئے غلام احمد اپنے مخصوص انداز میں ڈرائیور کی وردی میں ملبوس کار کا دروازہ کھولے ہوئے کھڑے ہوئے تھے، احسان صاحب کے قدم مَن مَن بھر کے ہو گئے۔ نہ جانے کس طرح کار تک پہنچے تھے پھر اُنھوں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ غلام احمد کو دیکھا اور بولے۔

"غلام احمد اب یہ سب کچھ بھی کرو گے؟"

"میں سمجھا نہیں صاحب" غلام احمد صاحب نے کہا۔

"مجھے انسان ماننے سے انکار کرتے ہو کس دل سے یہ سب کچھ جاری رکھوں تم خود ہی مجھے بتا دو؟"

"صاحب جو بولنے والی باتیں تھیں وہ بولی جا چکی ہیں۔ اور ہمارے اور آپ کے درمیان ہونے والے معاہدے نے اب ان میں سے کسی چیز کی گنجائش نہیں چھوڑی آپ تو اس سلسلے میں پریشان ہیں کہ آپ کے ساتھ یہ سب کچھ بنتی۔ میں اس سلسلے میں پریشان

ہو جاؤں گا کہ اب کیا کروں؟ آپ طرح طرح سے میرے ساتھ یہی سب کچھ کرتے رہیں گے۔"

"غلام احمد میرے بھائی اِس زمین پر کیسے آگیا تو، تجھے تو آسمان کا باسی ہونا چاہیئے تھا۔ میرے بھائی کم از کم اتنا تو مجھے بھی جینے کا حق دے دے کہ میں اپنے دل میں نہ کٹتا رہوں۔"

"دیکھئے احسان صاحب فی الحال اُس وقت تک جب تک حالات نارمل نہیں ہو جاتے ہمارے معمولات اسی طرح چلتے رہیں گے، بعد میں اگر آپ نے اس سلسلے میں کوئی سودے بازی کی تو میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا مگر خدا کے لئے اس وقت کوئی ایسی بڑی تبدیلی عمل میں نہ لائیے جو دوسروں کی انگشت نمائی کا باعث بنے۔" احسان صاحب اندر بیٹھ گئے، غلام احمد نے اُسی ادب سے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ رُخ احسان لمیٹڈ کی جانب تھا خوبصورت عمارت کے احاطے میں جہاں پیتل کے بڑے بڑے الفاظ میں "احسان لمیٹڈ" کا بہت بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ غلام احمد نے اُسی جگہ کار روکی جہاں ہمیشہ روکی جاتی تھی اور اُس کے بعد نیچے اُتر کر ادب سے دروازہ کھول دیا احسان صاحب خاموشی سے اندر چلے گئے تھے۔ غلام احمد وہیں کار میں جس طرح بیٹھے رہا کرتے تھے بیٹھ گئے۔ احسان صاحب اپنے کمرے میں پہنچے دفتر کا کام بدستور جاری تھا۔ دفتر والوں کو صورتِ حال کے بارے میں علم تو ہو چکا تھا۔ سبھی اِس سلسلے میں چہ مگوئیاں کر چکے تھے لیکن ابھی چونکہ کوئی بڑی تبدیلی عمل میں نہیں آئی تھی اِس لئے احسان صاحب کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں تھی۔ ویسے یہ بات دفتر کے لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی تھی کہ اب احسان لمیٹڈ۔ احسان لمیٹڈ" نہیں رہے گی بلکہ اس پر محمود آفندی کا قبضہ ہو جائے گا احسان صاحب... کے دشمنوں نے اور اُن لوگوں نے جو اُن سے حسد رکھتے تھے یہ بات جگہ جگہ پھیلا دی تھی اور پھر سبھی جانتے تھے کہ احسان صاحب کی بیشتر فیکٹریاں دوسروں کے قبضوں میں جا چکی ہیں۔ بیچارے دفتر کے لوگ اپنی اپنی تقدیروں کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ احسان لمیٹڈ کی ملکیت تبدیل ہونے کے بعد یہاں کیا ردّ و بدل ہوگی۔ اُن کی ملازمتیں برقرار رہیں گی یا دوسرا اِسٹاف رکھا جائے گا۔ ملازمین اِس سلسلے میں پریشان تھے۔ اور اپنے بارے میں احسان صاحب کی طرف سے کچھ سننے کے متمنی تھے۔ اِس سلسلے میں چند افراد نے آپس میں میٹنگ بھی کی تھی اور اُس میں یہ سوچا تھا کہ کیوں نہ احسان صاحب سے براہِ راست اِس سلسلے میں بات کر لی جائے چنانچہ اِس وقت احسان صاحب کی آمد کے بعد وہ تمام لوگ ایک بار پھر یکجا ہو گئے اور اِس سلسلے میں تعین کیا جانے لگا کہ کون احسان صاحب سے یہ بات کہے، پھر شاید کوئی فیصلہ کر لیا گیا احسان صاحب اپنی میز پر کاموں میں مصروف ہو گئے تھے کہ اُن کے چپراسی نے دفتر کے چند افراد کے بارے میں بتایا جو اُن سے ملنا چاہتے تھے، احسان صاحب نے اُنھیں آنے کی اجازت دے دی تھی۔

آنے والے تین افراد تھے جو مؤدبانہ انداز میں احسان صاحب کے سامنے پہنچ گئے۔

"بیٹھے بھئی خیریت۔ کوئی جھگڑا ہے آپس میں؟ یا میرے لئے کوئی خدمت ہے؟"

"بڑے صاحب! ہم آپ سے بات کرنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے لیکن حالات کی مجبوری ہمیں آپ تک لے آئی۔ ہم سب ہی بال بچوں والے ہیں اور ہمیں دوسرے تمام غریب لوگوں کی مانند اپنی نوکری عزیز ہے۔ یہاں اِس فرم میں کام کرتے ہوئے ہمیں سال ہا سال گزر گئے اور ہم نے آپ کی عنایتوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے ہم کھل کر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ شاید ہمیں زندگی میں کوئی دوسری ایسی ملازمت نہ مل سکے اور دوسرا کوئی ایسا مالک نہ مل سکے جس نے ہمیشہ ہمارا خیال رکھا ہو اور ہمیں ہماری کسی بھی ضرورت میں تنہا نہ چھوڑا ہو حالات ہمارے علم میں بھی آئے ہیں بڑے صاحب! اور ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ پریشان ہیں اور یہ فرم کسی اور کی تحویل میں جانے والی ہے۔ ہماری یہ تشویش لازمی تھی۔ بجائے اِس کے کہ ہم کسی اور سے پوچھ گچھ کرتے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ براہِ راست آپ ہی تک پہنچ جائیں تاکہ اِس سلسلے میں بالکل صحیح معلومات حاصل ہو جائیں۔"

"ہم! بھئی اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں نے ہمیشہ آپ لوگوں کو اپنا دست و بازو سمجھا کوئی بھی شخص کوئی کام تنہا نہیں کر سکتا اگر میں نے کبھی آپ کے ساتھ کچھ کیا تو اُس کا صلہ آپ نے مجھے اپنی بہتر کارکردگی سے دیا اِس لئے نہ میرا احسان آپ پر نہ آپ کا احسان مجھ پر۔ جہاں تک بات اِس فرم کی کسی اور کی تحویل میں جانے کی ہے تو اِس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ آپ کے کانوں تک پہنچا ہے وہ صحیح ہے حالات ایسے ہی پیدا ہو گئے تھے کہ یہ فرم کسی اور کی تحویل میں چلی جاتی لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں اِس ابتدائی مشکل سے نکل آیا ہوں جس کی وجہ سے اِس فرم کے میرے ہاتھ سے نکل جانے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ آپ لوگوں کی دعائیں ہیں اور اللہ کا فضل ہے کہ اب اِس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ ہاں اب جب آپ آ ہی گئے

میں تو میری ایک درخواست میرے ایک ایک ساتھی تک پہنچا دیجئے وہ یہ کہ اب میں اِس فرم کی آمدنی کے لئے مجبور ہوگیا ہُوں کیوں کہ اب میرے دوسرے تمام ذرائع ختم ہوگئے ہیں اور اب ہم سب کا ذریعۂ معاش یہی ایک فرم ہے چنانچہ آپ لوگوں کو پہلے سے زیادہ مُستعدی اور محنت سے کام کرنا ہوگا تاکہ میں اپنی اُلجھنوں سے نکل آؤں۔ اِس کے بعد یار زندہ صُحبت باقی،" تینوں افراد مسرّت سے کھڑے ہوگئے تھے اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر احسان صاحب کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

"ہم اپنے خُوشی کے جذبات کا اظہار نہیں کرسکتے جناب! خُدا آپ کو اِس بُرے وقت سے نکالے"

"ہاں! میرے دوستو! مجھے تمھاری محنت اور دُعاؤں ہی کی ضرورت ہے، اطمینان سے اپنا کام جاری رکھو جو کچھ تم نے سُنا تھا وہ اب نہیں ہے" کارکُن باہر نکل گئے اور انھوں نے ایک دوسرے کو یہ خوشخبری سُنانا شروع کردی۔ تمام ہی لوگ مسرّت سے پھُولے نہیں سما رہے تھے سوائے ایک شخص کے اور یہ اُس فرم کا مینجر تھا۔

مینجر کے خصُوصی تعلقات محمُود آفندی سے تھے۔ ہر چند کہ اِس سے پہلے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا اُس نے تمام معاملات میں جواب پیش آگئے تھے وہ محمُود آفندی کا جاسُوس بنا رہا تھا اُس وقت بھی کارکنوں کی زبانی یہ سب پڑھ سُن کر اُس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہوگئی۔ اُس نے فوراً ہی اپنے کمرے میں جاکر محمُود آفندی سے رابطہ قائم کیا اور دوسری طرف محمُود آفندی نے اُس کا فون ریسیو کیا۔

"ہیلو محترم بول رہا ہے احسان لمیٹڈ سے"

"ہاں محترم کہو کیا بات ہے خیریت؟"

"جنابِ عالی کیا آپ کا احسان احمد صاحب سے کوئی معاہدہ ہوگیا ہے میرا مطلب ہے کیا اب احسان لمیٹڈ آپ کی تحویل میں نہیں آرہی؟ پچھلی رات تک تو آپ نے اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتلایا تھا"

"تو اِس وقت تمھیں کس نے یہ بات بتائی محترم؟" محمُود آفندی صاحب کی آواز ٹیلیفون میں اُبھری۔

"ابھی تھوڑی دیر قبل احسان صاحب دفتر آئے ہیں کارکنوں کے درمیان کھچڑی پک رہی تھی وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ کہ فرم احسان صاحب کی تحویل سے نکل جانے کے بعد اُن کی ملازمتوں کا کیا ہوگا؟ تین افراد اِس سلسلے میں احسان صاحب کے پاس گئے تھے۔ اور واپس آکر انھوں نے ہر شخص کو یہ خوشخبری سُنائی ہے کہ اب یہ فرم کسی کی تحویل میں نہیں جا رہی اور خود احسان صاحب کے ہاتھوں میں رہے گی۔ میرے لئے یہ بات باعثِ حیرت ہے کیونکہ میں یہاں اپنی پوزیشن خراب کر بیٹھا ہُوں۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا محمُود صاحب کہ یہ فرم آپ کی تحویل میں آجائے گی تو مجھے مکمل اختیارات دے دیئے جائیں گے اور میرے سلسلے میں بھی کچھ ہوگا۔ لیکن یہ خبر کیا حیثیت رکھتی ہے؟"

"اِس کے سوا کچھ نہیں کہ شاید احسان احمد اپنا ذہنی توازُن کھوتے جا رہے ہیں۔ بائیس دن کا وقت لیا تھا اُنھوں نے مجھ سے سات دن گزُر چکے ہیں اور اب صرف پندرہ دِن باقی ہیں آج سے سولہویں دِن فرم اور احسان احمد کی کوٹھی ہماری تحویل میں ہوگی جس نے یہ ہوائی اُڑائی ہے تم اُس پر توجہ مت دو"

"خُدا کا شُکر ہے جناب۔ میرا تو اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا" مینجر نے کہا اور اُس کے بعد ٹیلیفون بند کردیا لیکن دروازے پر کھڑے ہُوئے چپراسی کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہُوئی تھیں، وہ تو خود بھی اِس خوشی میں شریک تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اِن تینوں کارکنوں نے اُنھیں دی تھی لیکن مینجر کے یہ الفاظ، محمُود آفندی سے رابطہ، وفاداری کا تقاضہ یہی تھا کہ مینجر کے بارے میں احسان صاحب کو اطلاع دے دے لیکن براہِ راست احسان صاحب کے پاس جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اُس نے اکاؤنٹنٹ کو ہی تفصیل بتائی۔ اکاؤنٹنٹ نے دوسرے لوگوں کو اور اُس کے بعد بات احسان صاحب تک پہنچائی گئی، یہ دو افراد تھے جنھوں نے احسان صاحب کو اِس حقیقت سے آگاہ کیا کہ مینجر صاحب فرم کو محمُود آفندی کی تحویل میں جانے کا انتظار کررہے ہیں تاکہ اُن کی ترقی ہوجائے۔ احسان صاحب کو تو پہلے بھی محترم سے کافی شکایات تھیں۔ لیکن اب تو اُس نے کمال ہی کردیا تھا۔ احسان صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ یہ مینجر محمُود آفندی سے ملتا رہتا ہے۔ اُنھوں نے اُن لوگوں کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"مینجر کے بارے میں فیصلہ کرلیں گے ہم لوگ، جلدی مت کرو لیکن اُس پر نگاہ ضرور رکھو" احسان صاحب کو اپنے اچھے رویّے کی بناء پر احسان لمیٹڈ کے تمام کارکنوں کی ہمدردیاں اور دوستیاں حاصل تھیں چنانچہ وہ سب مستعد رہنے کا وعدہ کرکے وہاں سے چلے گئے۔ اور احسان احمد نے کرسی کی پُشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ نہ جانے اُن کے ذہن میں کیا کیا احساسات تھے۔

*

دو تین دن گزُر گئے تھے کوٹھی کے ماحول میں جو تبدیلی پیدا ہُوئی تھی وہ ابھی تک برقرار تھی ظاہر ہے اب سب کچھ اِس انداز میں رسمی

طور نہیں ہوسکتا تھا جس انداز میں تھا۔ جن لوگوں سے معذرت کی گئی تھی وہ چلے گئے تھے اور اُس کے بعد سے اب تک اُنھوں نے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی اِس کی وجہ شاید یہ نہ ہو کہ اب اُنھوں نے اِن تِلوں میں تیل نہیں محسُوس کیا تھا یہ بھی ہوسکتی تھی کہ برسوں سے یہاں آباد ہونے کی وجہ سے اُن کے پاس چونکہ دوسرے ٹھکانے نہیں تھے اِس لئے سب کے سب اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کی فِکر میں سرگرداں ہوں خیر دین کے علاوہ ابھی کوئی نہیں پلٹا تھا جبکہ جمن کی ضرورت بڑی شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی خود احسان صاحب نے بھی کہا تھا کہ کم از کم جمن کو تلاش کرلیا جائے تاکہ اِن بچیوں پر سے باورچی خانے کا بوجھ ہٹ جائے لیکن فی الحال کوئی ایسا نہیں تھا۔ جو جمن کی تلاش میں نکلتا۔ اِس لئے بات ابھی یُونہی رہ گئی تھی خیر دین بھی اُس دِن کے بعد سے واپس نہیں آیا تھا اور رِدا اکثر اُس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ اُسے یہ احساس نہیں تھا کہ خیر دین اُس کے ذہن کی پھانس کیوں بن گیا ہے، کبھی غور بھی کیا اِس سلسلے میں تو زیادہ سے زیادہ اِتنا سمجھ پائی کہ چونکہ وہ ایک دوہری شخصیت کا مالک تھا۔ اِس لئے ذہن سے الگ نہیں ہو پاتا۔ بہر طور خیر دین کی شخصیت کا تھوڑا بہت اثر رِدا پر ضرور تھا اور جب بھی تنہائی میں وہ اُس کے بارے میں سوچتی اُسے عجیب سا احساس ہونے لگتا تھا آخر یہ خیر دین کیا بلا ہے؟ اُس نے اگر کوئی چولا بدلا ہے تو اِس کا مقصد؟ جب تک یہاں تھا۔ ملازموں کی طرح خدمت انجام دیتا رہتا تھا اور جب اُسے یہاں سے ہٹایا گیا تو اطمینان سے پیسے لے کر چلا گیا مگر اُس کے الفاظ اُس کا انداز۔ وہ لمحات تو بھُلائے جانے والے نہیں تھے جب خیر دین نے جگہ جگہ رِدا کی مدد کی تھی۔ اُس کے سامنے ذہانت کے مظاہرے کئے تھے۔ اور پھر اُس کے آخری الفاظ۔ اُس نے کہا تھا کہ "اگر آپ کو خیر دین کی آنکھوں کی بینائی درکار ہُوئی تو خیر دین اپنی آنکھیں آپ کو دے دے گا۔ لیکن اُصول اُصول ہوتے ہیں جب تک رِدا کی کتاب نہیں کھُلے گی۔ خیر دین بھی اپنے خول میں بند رہے گا" یہ الفاظ ظاہر کرتے تھے۔ کہ خیر دین کی ذات پر بھی کوئی خول ہے اُس نے کھُلی زبان سے اعتراف تو کرلیا تھا لیکن اِس خول کو کیسے توڑا جائے؟ بعض اوقات رِدا کا دِل شدّت سے چاہتا کہ خیر دین کو اُس کی زبان کھولنے پر مجبُور کردے۔ لیکن کم بخت کسی چٹان کی طرح سخت تھا ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار لیکن وہ نہیں بتاتا جو اُسے بتا دینا چاہیئے رِدا کو بعض اوقات اُس پر شدّت سے غصّہ آنے لگتا تھا آخر وہ کیوں اپنے بارے میں سب کچھ نہیں بتا دیتا تھا لیکن پھر اُسے یہ احساس بھی ہوتا کہ یہ حق صرف اُسی کا تو نہیں ہے خیر دین خود بھی تو اُس سے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات رِدا نے دوسرے انداز میں بھی سوچا کم از کم یہ شخص اُس کے لئے ضرر رساں نہیں ہوسکتا اگر میں اُسے اُس کی ضد پوری کرنے کے لئے اپنی کہانی سُنادوں تو اِس سے فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے نقصان نہیں۔ تیمور کو کس طرح اُس نے بچا لیا تھا ہائے اگر وہ نہ ہوتا تو میرا تیمور نہ جانے کہاں کہاں سرگرداں رہتا۔ خیر دین تیرا ستیاناس کیوں مجھے پریشان کر رکھا ہے کچھ تو بتادے مجھے اپنے بارے میں کیوں مجھے پاگل کئے ہوئے ہے میں نے جو کچھ بھی تجھ سے کہا تُو نے کر دکھایا اپنی ذات میں حکمراں ہے تُو مگر مجھے اپنی ذات کا حصہ کیوں نہیں بنا لیتا کیسے تجھے اِس بات کے لئے مجبُور کروں کہ تو اپنی حقیقت مجھے بتادے نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھی وہ اُس کے بارے میں۔ اُس وقت وہ دادی اماں کے کمرے کے سامنے سے گزُر رہی تھی اور کچن میں جا رہی تھی کہ اندر سے خیر دین کی آواز سُن کر اُچھل پڑی وہ کہہ رہا تھا۔

"او جی دادی اماں خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کو۔ بھلا نوکریوں کی کیا کمی ہے ابھی جی نہیں کرتا جی۔ جس دِن بھی جی کرے گا کہیں جاکر کھڑے ہو جائیں گے کہ بھائی نوکری چاہیئے۔ اب دیکھوناں دادی اماں ہر آدمی کی تو نوکری نہیں کی جا سکتی پہلے مالکوں کا ظرف دیکھنا پڑتا ہے۔ آخر ہم ملازم بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں اب کوئی احسان میاں جیسا مالک مِل جائے تو پھر کچھ سوچا جائے" دادی اماں نے کہا۔

"خیر دین تجھے کھانا پکانا تو آتا ہے ناں؟"

"ہاں جی بڑے انگریزی، فرنچ، جاپانی، چائینز اور نہ جانے کہاں کہاں کے کھانے پکانے آتے ہیں ہمیں پر بس ذرا گڑبڑ ہو جاتی ہے جاپانی پکاتے ہیں تو چائینز بن جاتے ہیں اور چائینز پکاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں فرانسیسی کھانا ہے بس جی دادی اماں یہ ذرا سی گڑبڑ ٹھیک ہوگئی تو یُوں سمجھو خیر دین کے عیش ہی عیش ہیں۔۔" دادی اماں بے اختیار ہنسنے لگی تھیں

"تیری جُدائی مجھ سے تو برداشت نہیں ہوتی خیر دین۔ تو آجا واپس یہاں کچھ نہ کچھ کرلیجیو جمن کی تلاش ۔۔ احسان میاں کو باورچی کا معاملہ بہت ضروری ہے"

"او جی کیا حالات کچھ بہتر ہوگئے ہیں؟ ہمارا مطلب ہے۔ کہ کیا احسان میاں اب یہ کوٹھی نہیں چھوڑ رہے"

"ہاں خیر دین اللہ نے کچھ خیر کردی ہے"

"بڑی خُوشی کی بات ہے دادی اماں جی آپ کہیں تو ہم جمن کو تلاش کرکے یہاں پہنچا دیں"

"اے بیٹا یہ کام ضرور کر دینا۔ جمن اگر مل جائے تو اُس کمبخت سے کہنا کہ برسوں ہماری روٹیاں توڑی ہیں کم از کم سلام کرنے تو آ ہی جاتا۔"

"کہہ دیں گے جی کہہ دیں گے بلکہ اُسے پکڑ کر یہاں لے آئیں گے۔"

"تجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے؟"

"نہیں جی، خیر دین ولد بشیر دین کے لئے یہ پتہ چلا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میں تجھ سے کہہ رہی ہُوں کہ جمن کو جتنی جلد ممکن ہو سکے پکڑ کر لے آ۔"

"لو جی یہ گئے اور وہ آئے کل تک آ جائے گا وہ آپ کے پاس۔"

"لے یہ گیا اور وہ آیا جمن کل تک آ جائے گا۔"

"او جی وہ تو محاورے کی بات تھی ہمارا مطلب ہے تلاش تو کرنا پڑے گا اُسے۔"

"ٹھیک ہے تیری بھی بات کروں احسان میاں سے۔" دادی امّاں نے کہا۔

"نہیں جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم آج کل ذرا آرام کرنا چاہتے ہیں بڑے دن سے محنت کر رہے تھے اب ذرا آرام کی روٹی توڑیں گے اور پھر دادی امّاں آپ کے بغیر تو ہمیں بھی چین نہیں پڑتا۔ دو دن تک نہیں آئے تو یُوں لگا کہ برسوں ہو گئے ہوں ویسے سب کچھ تو ٹھیک ہے ناں یہاں؟"

"ہاں بیٹا اللہ نے ایک بار پھر ہم پر کچھ کرم کر دیا ہے اب کیا بتاؤں تجھے اس بارے میں زبان بند ہی رہنے دے یُوں سمجھ لے کچھ فرشتے ہمارے درمیان آ گئے تھے اور اُنھوں نے ہماری عزّت رکھ لی۔"

"او جی عزت رکھنے والا اللہ ہے اچھا دادی امّاں دوسرے لوگوں سے مل لیں۔" خیر دین نے کہا اور رُدا برق رفتاری سے وہاں سے ہٹ گئی۔ یہ دوسرے لوگ کون ہو سکتے تھے وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کچن میں نُدرت اور ثناء دونوں ہی موجود تھیں اور نہ جانے کیا گڑبڑ کر رہی تھیں۔ ثناء کو تو خیر کھانا پکانا بالکل ہی نہیں آتا تھا۔ نُدرت البتہ اِس سلسلے میں کافی معلومات رکھتی تھی چنانچہ اِس وقت صُورت حال یہ تھی کہ ثناء کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور تیمور کا چہرہ لال ہو رہا تھا وجہ یہ تھی کہ ثناء پیاز کاٹ رہی تھی اور پیاز کی دریافت پر تبصرے کرتی جا رہی تھی۔

"یہ حضرت انسان بھی بس عجیب و غریب چیز ہیں کچھ بھی کہیں سے بھی مل گیا، لیا اور حلق میں ٹھونس لیا۔ میں کہتی ہُوں یہ پیاز آخر دُنیا میں اِس کی تخلیق ہی کیوں کی گئی تھی۔ غور تو کریں۔ آنکھوں کا ستیاناس کر دیتی ہیں۔ اور لوگ اِس کے بغیر کھانا ہی نہیں پکاتے، اے اللہ رکھی تجھ پر خُدا کی مار پیاز کے بغیر بھی کچھ کام کر لیا کر لے مجھ سے نہیں کٹتی۔ ہائے میرا تیمور ذرا دیکھو تو سہی چہرہ کیسا لال بھبھوکا ہو رہا ہے اور آنکھیں... اُٹھا لے نُدرت اِس پیاز کو یہاں سے ورنہ خُدا کی قسم میں اِسے کھڑکی سے باہر پھینک دُوں گی۔"

"اے منحوس لڑکی کوئی کام ہوتا ہے تجھ سے۔ دیگچی میں کفگیر چلائے تو چھینٹیں اُڑتی ہیں اور کلائی کے خراب ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آٹا گوندھو تو فرماتی ہیں کہ یہ عجیب و غریب کام دُنیا کا سب سے مضحکہ خیز کام ہے پھر کچن میں آ کیوں مرتی ہو؟ دوسروں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میرا ہاتھ بٹا رہی ہو۔"

"یا اللہ رکھی تیرے ہمارے اِتنے اچھے تعلقات اور تُو ذرا سی دیر میں سب کچھ اُٹھا کر طاق میں رکھ دیتی ہے۔ ارے بھائی تُو کھانا پکاتی آئی ہے کھانا پکا۔ ہم بڑے لوگوں کے مُنہ کیوں لگ رہی ہے؟"

"پیاز کاٹ دے سیدھی طرح ورنہ یہ چُھری تیرے پیٹ میں اُتار دُوں گی۔ لو غضب خُدا کا بتو ذرا سا کام نہیں کریں گی۔ بس گدکڑے مارتی پھریں گی چلو شروع ہو جاؤ۔" یہ اُسی وقت رُدا نے کچن میں جھانکا تھا اور ثناء اُسے دیکھ کر پُوری قوت سے چیخی۔

"آ گئی... آ گئی لو کام بن گیا تمھارا۔ یار تیمور اب لوگ ہماری خُوش قسمتی سے جلیں تو جلتے رہیں لیکن دیکھو خُدا کس طرح ہماری مدد کرتا ہے۔ رُدا میری جان، میری زندگی کہاں تھیں تم۔ آہ کتنا انتظار کرایا تم نے۔ آؤ اندر آؤ۔ اندر آؤ۔" ثناء بڑے محبت بھرے انداز میں بولی اور رُدا کا قہقہہ چُھوٹ گیا۔ نُدرت اور ثناء کی گفتگو وہ سُن چکی تھی اور اِس وقت یہ بیزاری صرف اِس لئے ہو رہی تھی کہ رُدا پیاز کاٹ دے۔ وہ اندر داخل ہُوئی اور اُس نے چُھری ثناء کے ہاتھ سے لیتے ہُوئے کہا۔

"بھئی مسئلۂ پیاز تو مسئلۂ فلسطین بن چکا ہے۔ پتہ نہیں اِس کام کو اِتنا مشکل کیوں سمجھا جا رہا ہے لاؤ مجھے دو۔" ابھی رُدا نے اِتنے الفاظ کہے ہی تھے کہ خیر دین بھی اُس کے پیچھے ہی پیچھے کچن میں داخل ہو گیا اور بولا۔

"سلام علیکم جی، وہ جو کہتے ہیں ناں کہ ہر مرض کی دوا ہیں لُقمان میاں... ہمارا مطلب ہے حکیم لُقمان جی۔ وہ بھی چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ ہی کے رہنے والے تھے اور خیر دین بھی وہیں کے ہیں۔ تو جب لُقمان جی نہیں رہے تو خیر دین سے کام چل سکتا ہے، لاؤ جی پیاز کترنے میں تو ہمارا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔ لڑکیوں کے بس کی بات نہیں ہے یہ۔ لاؤ جی رُدا جی ہم کاٹیں پیاز۔"

"ارے... ارے تم کہاں بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو

گئے۔ واقعی مسئلۂ پیاز تو مسئلۂ فلسطین بن گیا۔" ثناء نے آنکھیں نکالتے ہُوئے کہا۔

"وہ جی بس کہتے ہیں ناں الہ دین کے جن کا چراغ کیا سمجھیں آپ، تو خیر دین بھی کم نہیں ہے اِن سے۔" خیر دین نے چُھری رُدا کے ہاتھ سے لے لی اور پیاز کاٹنے میں مصرُوف ہو گیا۔

"لگتا ہے یہ خیر دین اپنے نمبر بنا رہا ہے مگر دوبارہ تمھیں نہیں رکھا جائے گا خیر دین۔"

"لو جی کومال (کمال) ہو گئی ہم... ہم کوئی رکھنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ ہم تو نمک خوار ہیں بس معاملہ نمک کا ہے تو جی نُدرت بی بی چائے نام کی ایک چیز ہوتی ہے اور جب چار سہیلیاں باورچی خانے میں ہوں تو چائے کے بغیر..."

"ہم! تو تم سہیلی ہو ہماری؟"

"میں اپنی بات تھوڑی کر رہا تھا جی۔ معاف کیجئے گا ایک بڑھ گئی۔ بڑھ گیا۔ تین سہیلیاں اور ایک خیر دین ولد بشیر دین۔"

"ولد نکال دو تو چل سکتے ہو۔" نُدرت نے سنجیدگی سے کہا۔

"لو جی کومال (کمال) ہو گئی انسان کی زندگی میں ولدیت کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے؟ کیوں رُدا جی آپ کا کیا خیال ہے؟" رُدا خاموشی سے مُنہ بنا کر رہ گئی تھی۔ ثناء نے کہا۔

"خیر دین تمھیں کیا کیا پکانا آتا ہے؟"

"ویسے تو سب کچھ پکا لیتے ہیں جی مگر دماغ پکانے میں ہمیں خود بھی بڑا مزا آتا ہے، بھیجہ بڑا بڑھیا پکاتے ہیں۔"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ تم صرف بھیجہ کھاتے ہو۔" ثناء بولی۔

"ہاں جی کھاتے بھی بڑے شوق سے ہیں۔ دراصل بات وہ ہے ناں جی کہ انسان کو جس چیز کا شوق ہوتا ہے وہی اچھی پکاتا بھی ہے وہ۔ کیوں رُدا جی آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتی۔" رُدا نے بگڑے ہُوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تم بلا وجہ رُدا سے بے تکلّف ہونے کی کوشش کر رہے ہو خیر دین۔ یہ بتاؤ آنا کیسے ہُوا؟"

"وہ جی پیاز کاٹنے آئے تھے۔"

"ہم! چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ دادی امّاں کو بیوقُوف بنا رہے ہو گے۔"

"نہیں جی آج تو وہ بھی بے وقُوف نہیں بنیں۔"

"نوکری کر لی کہیں۔" ثناء نے پُوچھا۔

"ناجی نا۔ وہ بات دراصل یہ ہے کہ خیر دین تو ایک مشن پر نکلے تھے ورنہ وہ خود زمیندار ہیں۔ بشیر دین بہت کچھ چھوڑ گئے تھے ہمارے لئے۔ ہمیں نوکری کی ضرورت تھوڑی ہے۔ وہ تو ہم بس تماشۂ اہلِ کرم دیکھنے نکلے تھے۔"

"ہائیں ہائیں یہ کہاں سُن لیا تُو نے خیر دین؟"

"کیا جی اہلِ کرم؟" خیر دین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"پُورے مصرعے کی بات کر رہی ہُوں۔"

"مگر ہم تو مصری کی بات نہیں کر رہے تھے جی۔"

"مصری نہیں مصرعہ۔"

"اوہو ہو اب مصری کا نرخ بھی پیدا ہو گیا۔ نہیں ثناء بی بی جی آپ مذاق کر رہی ہیں۔" خیر دین نے مُنہ پھاڑ کر ہنستے ہُوئے کہا اور نُدرت اور رُدا اپنی ہنسی نہ روک سکیں۔ رُدا نے کہا۔

"یہ اپنے خیر دین جی جو ہیں ناں چک نمبر اٹھارہ بڑے پہنچے ہُوئے بزرگ ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں بس اِس دُنیا کو تماشۂ اہلِ کرم دِکھا رہے ہیں ورنہ میں جانتی ہُوں یہ کیا چیز ہیں؟"

"فی الحال جو کچھ بھی ہیں بڑی اچھی چیز ہیں۔ کم از کم پیاز تو کاٹ رہے ہیں۔" نُدرت نے کہا خیر دین کے ہاتھ برق رفتاری سے پیاز پر چل رہے تھے ذرا سی دیر میں اُس نے ساری پیاز کاٹ کر رکھ دی۔

"اور کوئی خدمت گاری جی ہمارے لئے؟"

"ہاں ہاں ہے۔"

"تو پھر کہو جی۔"

"سُنا ہے چائے تم سے اچھی کوئی نہیں بناتا۔" نُدرت نے کہا۔

"ہاں جی یہ تو سچ ہے آپ ہٹ جاؤ پھر ہم چائے بناتے ہیں۔"

"جیتے رہو۔ پھلو پھُولو، دودھو نہاؤ خُوشیاں مناؤ۔"

"او جی کومال ہو گئی دُودھ پینے کو ملتا نہیں نہانے کو کہاں سے ملے گا بی بی جی۔ آپ بڑے لوگ ہو آرام سے یہ بات کہہ سکتے ہو خیر دین سے پُوچھو دُودھ تو دُودھ پانی تک نہانے کو نہیں ملتا۔"

"اب تُو فلاسفر بننے کی کوشش مت کر ایک مصرعہ کہیں سے کیا یاد کر کے سُنا دیا کہ مُسلسل فلسفہ بگھارے جا رہا ہے، چائے بنا چائے۔"

"او جی ٹھیک ہے فلسفہ بگھر والو، دال بگھر والو، کچھ بھی بگھر والو۔ پر ذرا زبان میٹھی رکھو۔ خیر دین عزت دار آدمی ہے۔"

"تُو تو کہہ رہا تھا کہ صرف زمیندار ہے؟"

"تو کیا ہے جی زمیندار عزت دار نہیں ہو سکتے؟"

"پتہ نہیں کیا کیا ہوتے ہیں لوگ تو۔" نُدرت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ رُدا خاموش ہی رہی تھی خیر دین نے چائے بنائی تینوں کو پیش

کی اور ایک پیالی خود بھی لے کر کھڑا ہو گیا۔

"اللہ اللہ یہ سب کل تک نوکری چاکری کرتے تھے اور آج اُن کی دیدہ دلیری دیکھو مالکوں کے سامنے خود بھی چائے کی پیالی لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔"

"وہ جی بات کل کی غلط تھی آج کی نہیں۔ مالک تو اُونچی ذات والا آسمان والا ہی ہے، نوکری چھوڑ دی دوستوں کی طرح آئے ہیں۔ ایک پیالی چائے بھی نہ پئیں۔"

"چلو ٹھیک ہے چائے پیو اور پھوٹو یہاں سے" ثناء نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہُوئے کہا اور پھر چونک کر بولی۔

"ارے واقعی چائے تو اِس نے کمال کی بنائی ہے، یارو ایک بات بتاؤ جب سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں کسی کی نظرِ کرم سے تو پھر خیر دین کو یہاں جمن کی جگہ کیوں نہ رکھ لیا جائے؟"

"نہ جی نہ اب کوئی ہمیں رکھے گا تو ہم رہیں گے نہیں۔ بھاگ جائیں گے۔"

"کیوں بھئی؟"

"بس جی سوچ لیا ہے کہ اب نوکری نہیں کرنی،" رَدا نے اپنی چائے ختم کر کے رکھتے ہُوئے کہا۔

"ثناء میں چلتی ہُوں ذرا کچھ کام ہے مجھے۔"

"کہاں جا رہی ہو رَدا؟ بیٹھو لُطف آ رہا ہے۔"

"نہیں پلیز تھوڑا سا کام ہے بعد میں آؤں گی۔" رَدا نے کہا۔ اور کچن سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد خیر دین نے بھی اُن سے اجازت مانگ لی اور اُس کے بعد کہیں اور جانے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا وہ سیدھا رَدا کے کمرے ہی میں گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہُوا تھا اُس نے دستک دی اور رَدا نے جان بُوجھ کر اجنبی بنتے ہُوئے کہا۔

"کون ہے؟"

"کمال ہو گئی جی ہم تو سوچ رہے تھے آپ ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی،" خیر دین نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"خیر دین میں نے تمھیں اندر آنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔"

"تو واپس چلے جاتے ہیں جی آپ اجازت دے دوگی تو اندر آ جائیں گے،" خیر دین دروازے کی طرف مُڑا۔

"میرے ساتھ یہ فضول باتیں مت کیا کرو، مجھے تم پر شدید غصہ آتا ہے خیر دین کبھی کبھی تو..."

"ہم جانتے ہیں جی غُصہ اُنہی پر آتا ہے جو اپنے ہوتے ہیں،" اور پھر بی بی خیر دین تو آپ کے اپنے ہی ہیں۔ آپ کے خادم آپ کے غلام۔ خیر دین نے باقی الفاظ بعد میں ادا کئے تھے۔ رَدا ہنس پڑی۔

"واہ! یہ اچھی زبردستی ہے بِلا وجہ کے اپنے ہیں یہ الفاظ کہتے ہُوئے خیر دین کم از کم اپنے دِل میں تو جھانک لیا کرو، اپنے وہی ہوتے ہیں جو اپنوں کو بے وقُوف بنائیں۔"

"لو جی قسم کھوا لو خیر دین ولد بشیر دین سے خیر دین نے تو بے وقُوف بنانا سیکھا ہی نہیں ہے وہ تو خود ہی آج تک بے وقُوف بنتے چلے آئے ہیں۔"

"پتہ نہیں کِس کے ہاتھوں بے وقُوف بنے ہو گے میں تو محسوس کرتی ہُوں کہ تم جیسا چالاک آدمی شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ تمھاری چالاکیاں مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں خیر دین۔ لیکن دیکھ لو کتنے ظرف کی مالک ہُوں کسی کو آج تک نہیں بتایا خیر میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ سب کچھ تم نے میرے لئے نہیں کیا تھا۔ مگر میں تمھاری باتوں کے جواب میں کہہ رہی ہُوں کہ تم بے وقُوف بن کر دوسروں کو بے وقُوف بناتے ہو ورنہ تمھارا بے وقُوفی سے کیا تعلق؟"

"یہ تو ہماری تعریف ہُوئی جی۔ بہت بہت شکریہ کہ آپ ہمیں بے وقُوف نہیں سمجھتیں۔"

"اب بات اُڑا رہے ہو بیچ سے۔ سُنو خیر دین میں فیصلہ کر چکی ہُوں کہ اب تم سے کبھی بات نہیں کروں گی تم کوئی بھی ہو کچھ بھی ہو کتنی ہی تعلیم حاصل کی ہو تم نے جب اپنائیت کا اظہار کرتے ہو تو اپنائیت کا رویّہ بھی اختیار کرو، ورنہ بس میرے اور تمھارے درمیان تعلقات ختم۔"

"نہیں رَدا بی بی جی ایسا نہ کریں آپ۔ خیر دین کی ابھی عُمر ہی کیا ہے۔ اِس عُمر میں اِس کا جنازہ اُٹھتے دیکھ کر آپ کو دُکھ نہیں ہوگا۔"

"فضول باتیں میں بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ جنازے وناز ے کی کیا بات ہو رہی ہے بھلا اِس وقت؟"

"آپ بات نہیں کریں گی بی بی جی ہم سے تو کیا ہم زندہ رہیں گے۔"

"مت کرو ایسی باتیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاتے کیوں نہیں؟ بولو تم کون ہو؟ کیا ہو؟ کیوں اِس کوٹھی میں آئے تھے؟ کیا کرنا چاہتے تھے اور کیوں چلے گئے؟ آخر تمھاری شخصیت کیا ہے؟"

"رَدا بی بی جی ایک بار ذرا آپ بھی اپنے دِل میں جھانک کر سوچیں کیا یہ حق صِرف آپ ہی کو پہنچتا ہے۔ خیر دین کے دِل میں یہ خواہش نہیں پیدا ہوتی ہوگی کہ رَدا بی بی اُسے دوسروں سے الگ سمجھیں۔ اپنا ہمدرد، اپنا ساتھی، اپنا دوست تصوّر کریں کم از کم خیر دین کو تو یہ حق دیں اُسے یہ اہمیت تو دیں کہ وہ اپنے آپ کو خیر دین سے ہٹ کر کچھ سمجھے۔ رَدا بی بی یہ بات صرف اصُول کی ہے آپ خیر دین کے سامنے اپنی زبان کھول دیں، خیر دین آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ دیکھئے رَدا بی بی خیر دین کی اچھائیوں سے آپ انکار نہیں کر سکتیں بھلا خیر دین ولد بشیر دین کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ رَدا بی بی کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لے لیکن اُس نے آج تک یہ کوشش کِس لئے نہیں کی جانتی ہیں آپ؟"

"کیا مطلب تھارا؟" رَدا نے بھوئیں سکوڑ کر پُوچھا۔

"یہی بی بی جی کہ ہم نے خود یہ کوشش نہیں کی پھر مزا ہی کیا جب کوئی اپنا سمجھ کر اپنے بارے میں سب کچھ نہ بتا دے اور اپنوں کو دوسروں سے ممتاز نہ کر دے تو پھر اُس کی اپنی کوششیں کیا معنی رکھتی ہیں چلو جی فرض کرو ہم نے آپ کے بارے میں خود ہی سب کچھ معلوم کر لیا تو کیا پھر وہ بات رہے گی جو آپ کی اپنی زبان سے بتانے پر ہوگی۔"

"ہم! تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اگر چاہو تو تم میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر سکتے ہو لیکن تم اِس لئے یہ معلوم نہیں کر رہے کہ پھر میرے اور تمھارے درمیان وہ اپنائیت نہیں رہے گی؟"

"ہاں بی بی جی یہی کہنا چاہتے ہیں ہم۔"

"تمھیں خود پر بہت بھروسہ ہے خیر دین۔"

"بھروسے کے علاوہ اپنے پاس ہے ہی کیا بی بی جی۔"

"تو پھر ایک کام کرو کہ تم میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر لو۔ اگر تم میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر لو گے ناں خیر دین تو پھر میں تمھارے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔ کیا سمجھے۔"

"سوچ لیں بی بی جی خیر دین سے یہ کہنا آپ کو مہنگا پڑ جائے گا۔"

"نہیں خیر دین اگر تم نے یہ سب کر لیا تو میرے اور تمھارے درمیان لڑائی نہیں ہوگی بلکہ میں تمھاری قائل ہو جاؤں گی۔"

"اور اِس کے بعد بی بی جی آپ ہمیں دوسروں سے الگ سمجھیں گی؟"

"ہاں وعدہ کرتی ہُوں۔"

"اور آپ بی بی جی آپ..." خیر دین نے کہا لیکن اُس کے بعد اُس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے اِس سے آگے وہ کچھ نہیں بول سکا تھا۔

"ہاں... ہاں کہو۔ کہو" رَدا اُس کا چہرہ دیکھتے ہُوئے بولی۔

"نہیں بی بی جی۔ ابھی نہیں کہیں گے پہلے آپ کے حُکم کی تعمیل کر دیں۔ ٹھیک ہے بی بی جی۔ اگر ہم کچھ روز نہ آئیں ناں تو آپ ہمیں یاد نہ کریں۔ یُوں سمجھ لیں ہم اپنے کام میں لگے ہُوئے ہیں۔" رَدا ہنس پڑی تھی پھر اُس نے کہا۔

"وعدہ! تمھیں یاد نہیں کروں گی یُوں سمجھوں گی کہ تم کسی کام میں لگے ہُوئے ہو" اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور خیر دین عجیب سی نگاہوں سے اُسے ہنستے ہُوئے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"بی بی جی اگر خیر دین کو یہ پتہ چل جائے کہ کون سی بات آپ کو قہقہے لگانے پر مجبُور کر دے گی تو خُدا کی قسم ساری زندگی وہ وہی الفاظ دُہراتا رہے۔"

"اچھا... اچھا بس اب چرب زبانی سے کام مت لو چیلنج کیا ہے تم نے مجھے میں نے قبُول کر لیا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے جی۔ یہ بھی اپنی زندگی کا سب سے اہم مرحلہ ہے اور اب بھلا خیر دین یہاں کیوں رُکیں گے چنانچہ سلام علیکم۔" خیر دین نے سَر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور فوراً ہی باہر نکل گیا۔ رَدا مُسکرانے لگی تھی۔

احسان لمیٹڈ کے مینیجر خُرّم بیگ نے محمُود علی آفندی صاحب کے دفتر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ محمود صاحب نے گردن خم کر کے اُس کا استقبال کیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے خُرم بیگ نے اُس کے پاس آنے کی اجازت طلب کی تھی ٹیلیفون پر چنانچہ وہ اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ اُنھوں نے خُرم بیگ کو بیٹھنے کی پیش کش کی اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی کیا تفصیلات بتانے والے تھے تم مجھے ٹیلیفون پر جو کچھ تم نے کہا میری سمجھ میں تو آ گیا لیکن اب ذرا مکمل تفصیل بتا دو۔"

"جو کچھ میں نے ٹیلیفون پر بتایا تھا جناب وہ سچ تھا ممکن ہے آپ کے ذہن میں کچھ اور ہو لیکن مجھے تو یُوں لگ رہا ہے جیسے کوئی بات بنالی گئی ہے کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ احسان صاحب جتنے مطمئن انداز میں یہ باتیں کر رہے ہیں وہ باعثِ تعجب ہے اور میں آپ سے عرض کروں کہ آج دِن بھر تنی فائلوں کی ورق گردانی کی گئی ہے اور اُن تمام پارٹیوں کے نام خطوط ڈیکٹیٹ کرائے گئے ہیں۔ جن سے احسان لمیٹڈ کے معاملات چل رہے ہیں گویا از سرِ نو احسان لمیٹڈ کے کاروبار کو چلا بخشی جا رہی ہے جبکہ پچھلے دِنوں سے تمام کام پینڈنگ میں ڈال دیئے گئے تھے۔ براہِ کرم آپ اِس پر توجہ دیں۔ آفندی صاحب کہیں یہ سب کچھ حقیقت نہ ہو۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اگر ایسا ہے تو آخر کس بنیاد پر۔ اچانک ہی احسان صاحب کے پاس ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی رقم کہاں سے آ گئی کوئی قرض لیا ہے اُنھوں نے یا کچھ اور ہوا ہے۔ سمجھ میں تو آئے۔"

"ظاہر ہے جناب یہ سب کچھ سمجھنے کی بات نہیں ہے کیا آپ اِس سلسلے میں کوئی قانونی حق رکھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر احسان صاحب آپ کو فرم اور کوٹھی کے بجائے نقد رقم ادا کرنا

چاہیں تو قانونی طور پر آپ اِسے قبول کرنے کے لئے مجبُور ہوں گے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میرے اور احسان صاحب کے درمیان کوئی ایسا تحریری معاہدہ تو ہُوا نہیں ہے بس فرم اور کوٹھی کی مالیت کا تخمینہ لگایا گیا ہے اور اِسی کے تحت میں نے احسان صاحب کو بائیس دِن کی مہلت دی تھی۔ حالانکہ اصُولاً مجھے پہلے ہی یہ سب کچھ کر لینا چاہیئے تھا میرے اور اُن کے درمیان صرف زبانی بات چیت ہُوئی ہے وہ بھی چند معتبر لوگوں کے درمیان کلب میں بیٹھ کر...."

"بڑے لوگوں کے بڑے معاملات ہوتے ہیں جناب میں بھلا کیا عرض کر سکتا ہُوں لیکن اگر آپ احسان لمیٹڈ میں دِلچسپی رکھتے ہیں تو میرے خیال میں اِس سلسلے میں کچھ اور کارروائی کیجئے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ احسان صاحب واقعی اپنے خیال کو عملی شکل دے دیں۔"

"ہم! ویسے احسان لمیٹڈ کے سلسلے میں جتنے دعوے کر چکا ہُوں اگر خُدانخواستہ وہ مجھے نہ مل سکی تب پھر میری ساکھ خراب ہو جائے گی۔

نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دُوں گا خرم بیگ تم اطمینان رکھو۔"

"سُولی پر لٹکا ہُوا ہُوں جناب جس وقت سے یہ گفتگو سُنی ہے۔ باقاعدہ مُبارک بادیں دی گئیں ہیں ایک دوسرے کو میرا خیال ہے کل اِس خوشی میں مٹھائی بھی تقسیم کی جائے گی کیونکہ اسٹاف کے لوگ احسان صاحب کے وفادار ہیں۔"

"ایک ایک کو نکال دُوں گا کھڑے کھڑے بالکل نیا اسٹاف رکھا جائے گا احسان لمیٹڈ میں تمہارے علاوہ سمجھے خرم بیگ۔ میرا خیال ہے تمھیں میرے پاس نہیں دیکھا جانا چاہیئے۔ جاؤ تم جاؤ۔ اِس اطلاع کا شکریہ باقی معاملات میں خود دیکھوں گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہُوں جناب۔ کھُل کر اِس سلسلے میں کوئی کارروائی کر نہیں سکتا کیونکہ بہرطور ابھی اُنہی کے ساتھ کام کر رہا ہُوں۔"

"بس تم نے جتنا کر دیا کافی ہے باقی کام میں کروں گا...."

خرم بیگ کے جانے کے بعد محمود علی آفندی خود بھی کسی قدر پریشان ہو گئے تھے۔ احسان لمیٹڈ کی اُنھیں ذرا بھی ضرورت نہیں تھی لیکن کاروباری آدمی تھے۔ اور احسان احمد سے ذہنی مخاصمت کی بناء پر اُنھوں نے احسان لمیٹڈ قبول کر لی تھی ورنہ اُن کا اپنا کاروبار بھی کم نہیں تھا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ احسان لمیٹڈ قبول کرتے ہُوئے اُنھوں نے بڑے بڑے دعوے کئے تھے۔ اور لوگوں سے کہا تھا کہ وہ احسان لمیٹڈ کو ایک نیا رنگ دے کر پیش کریں گے اور دُنیا کو دکھائیں گے کہ کاروبار کیا چیز ہوتی ہے یہ سب احسان احمد پر طنز تھا لیکن آفندی صاحب درحقیقت اِس سلسلے میں اپنا وقار داؤ پر لگا چکے تھے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اُنھوں نے ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھایا اور اپنے وکیل کا نمبر ملانے لگے تھوڑی دیر کے بعد دوسری طرف سے فون ریسیو کر لیا گیا۔

"فارُوقی صاحب میں آپ کا انتظار کر رہا ہُوں۔ بڑا اہم مسئلہ ہے یہیں فرم میں آجائیے۔"

"ٹھیک ہے جناب میں آدھے گھنٹے میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

دوسری طرف سے فارُوقی صاحب کی آواز سُنائی دی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد فارُوقی صاحب پہنچ گئے۔

"جی آفندی صاحب معلوم ہوتا ہے کوئی اہم مسئلہ ہے؟"

"ہاں! قانونی طور پر اہم نہیں لیکن میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔"

"حکم فرمائیے۔"

"بھئی شاید میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا کہ احسان احمد کے دیوالیہ ہونے کے بعد جو رقومات اُن پر نکلتی تھیں اُن کی مالیت ساڑھے آٹھ کروڑ روپے بنتی ہے اور شاید تمھاری موجودگی ہی میں یہ بات طے ہُوئی تھی کہ احسان احمد بائیس دِن کے اندر اندر احسان لمیٹڈ اور اپنی کوٹھی میرے حوالے کر دیں گے۔ اِن ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کے عوض۔"

"جی ہاں! میں نے اُن کے کاغذات بھی تیار کر لئے ہیں مالیت وغیرہ کا اندازہ بھی لگا لیا گیا ہے۔ بات برابر میں چھُوٹ رہی ہے۔"

"ایک بات بتاؤ اگر احسان احمد اب اپنی بات سے ہٹ جائیں تو کیا ہم اُنھیں قانونی طور پر مجبُور کر سکتے ہیں؟"

"بات سے ہٹ جانا کیا معنی رکھتا ہے اگر وہ احسان لمیٹڈ اور کوٹھی نہ دینا چاہیں تو ساڑھے آٹھ کروڑ روپے ادا کر دیں۔ اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار۔ میں ساڑھے آٹھ کروڑ روپے نہیں لینا چاہتا۔ احسان لمیٹڈ چاہتا ہُوں جس کے سلسلے میں اپنے دوستوں کے سامنے بڑے بڑے دعوے کر چکا ہُوں کیا کوئی قانونی نکتہ ایسا نہیں ہے کہ احسان احمد کو یہ دونوں چیزیں میرے حوالے کرنی پڑیں؟" وکیل صاحب سوچ میں پڑ گئے، تھوڑی دیر کے بعد اُنھوں نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"بائیس دِن کا وقفہ صرف اِسی لئے لیا گیا تھا کہ اگر الفاظ میں یہ سب کچھ نہیں کہا گیا تب بھی اِس کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے اِس دوران میں رقم ادا کر دی جائے اگر رقم آپ کی تحویل میں پہنچ جاتی ہے تو کسی بھی قانون کے تحت آپ احسان لمیٹڈ یا کوٹھی پر دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کوئی آپ کو تحریری طور پر تو یہ نہیں لکھ کر دیا گیا کہ یہ دونوں چیزیں اب آپ کی ملکیت ہو گئی ہیں اور احسان احمد صاحب بائیس دِن تک اُن کے عارضی مالک ہیں

بائیس دِن کا مطلب تو یہی ہے جناب کہ بائیس دِن کے اندر اندر یا تو رقومات کی ادائیگی ہو جائے ورنہ تیئسویں دِن احسان لمیٹڈ اور احسان احمد صاحب کی کوٹھی آپ کی ملکیت میں آجائے گی یہ صرف زبانی معاملہ ہے قانونی طور پر ابھی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"مگر وکیل صاحب میں ہر قیمت پر احسان لمیٹڈ کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہُوں کوٹھی چھوڑی جا سکتی ہے احسان لمیٹڈ نہیں۔"

"اِس کے لئے معاف کیجئے گا کوئی قانونی کارروائی ممکن نہیں ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ اِس سلسلے میں احسان احمد سے کوئی تحریر لے لیں البتہ آپ کو اِس کا حق پہنچتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو بائیس دِن کی یہ رعایت ختم کر دیں اور فوری طور پر احسان احمد صاحب سے رقم کی ادائیگی کا تقاضہ کر لیں۔ اگر احسان احمد صاحب آپ کے متعین کردہ وقت میں رقم ادا نہ کر سکیں تو آپ اُن سے یہ تحریر لکھوا لیں کہ یہ دونوں چیزیں آپ کی ملکیت ہو چکی ہیں۔"

"ہم! ٹھیک ہے وکیل صاحب آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ میں احسان احمد کو کلب میں پکڑوں گا۔" کلب کی نشست تمام سرمایہ داروں کی نشست ہوتی تھی اور احسان احمد صاحب بھی بڑی باقاعدگی سے یہاں ایک دو گھنٹے صرف کیا کرتے تھے۔ دفتر سے اُٹھنے کے بعد عموماً کلب ہی کا رُخ کیا جاتا تھا یہ بھی ہے کہ پچھلے کچھ دِنوں سے وہ کلب نہیں آ رہے تھے لیکن آج اتفاق سے دفتر سے اُٹھنے کے بعد اُنھوں نے کلب ہی کا رُخ کیا تھا اور یہ شاید اُن کے ذہنی اطمینان کا اظہار تھا یا پھر وہ خود بھی دوستوں کے درمیان یہ بتانا چاہتے تھے کہ احسان لمیٹڈ اب اُن ہی کی تحویل میں رہے گی۔ آفندی صاحب بے چینی سے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ اِس دوران وہ چند لوگوں سے اِس بارے گفتگو بھی کر چکے تھے لیکن نہایت محتاط انداز میں اُنھوں نے اپنی پریشانیوں کا اظہار کرتے ہُوئے کہا تھا کہ احسان لمیٹڈ کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے بقیہ منصُوبے پینڈنگ میں ڈال دیئے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ احسان صاحب کو مجبُور کیا جائے کہ جو کچھ وہ چند روز کے بعد دینا چاہتے ہیں وہ آج اُن کے ہینڈ اوور کر دیں جو کل کرنا ہے وہ آج کیا جا سکتا ہے کیونکہ اِس سے زیادہ مہلت نہیں دی جا سکتی۔ چند لوگوں نے اِس جلد بازی کی مخالفت کی تھی، اور احسان صاحب کی ساکھ کا حوالہ دیا تھا۔ دوستی کا حوالہ دیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کا سرمایہ دس دِن کے اندر اندر بہت بڑھ بھی سکتا تھا۔ کوئی بھی اِتنا توقف برداشت نہیں کر سکتا بشرطیکہ نئے تھی لوگوں کی۔ احسان احمد اُن کے درمیان پہنچے تو سبھی نے اُن کا خیر مقدم کیا تھا احسان احمد صاحب کے چہرے پر وہی مُسکراہٹ تھی جو اُن کی شخصیت کا ایک حصّہ تھا۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں بھی اُنھوں نے کسی پر یہ اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ پریشان ہیں۔ اِسی طرح اُنھوں نے جس انداز میں لوگوں کی ادائیگیاں کی تھیں اِس پر بھی لوگ اُن پر آفرین کہتے تھے، کسی سے بھی اُنھوں نے کوئی رعایت نہیں مانگی تھی اور آج بھی اُن کی حیثیت مستحکم تھی محمود علی آفندی نے بھی اُن سے بڑے پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملایا تھا اور اِس کے بعد چار پانچ افراد کو ساتھ لے کر ایک الگ گوشے میں جا بیٹھے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آفندی صاحب کے ہمنوا تھے لیکن دِلچسپی لینے والے دوسرے افراد کو بھی اِس میز کے گرد آنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ احسان احمد صاحب نے مُسکراتی نگاہوں سے اُن سب کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"کیوں بھئی آج کچھ خصُوصی عنایات ہیں ہم پر، وجہ دریافت کی جا سکتی ہے؟" خود احسان صاحب کو صُورتِ حال کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ اُن کے اسٹاف نے خرم بیگ کی حرکت سے اُنھیں باخبر کر دیا تھا۔ محمود علی آفندی کہنے لگے۔

"ہاں احسان احمد کچھ ایسا ہی معاملہ ہے جس کے لئے میں تم سے شرمندہ بھی ہُوں اور شرمسار بھی لیکن میں کیا کروں میری اپنی مصرُوفیات میرے اپنے حالات مجھے اِس کی اجازت نہیں دیتے کہ تم سے کیا ہُوا وعدہ پورا کر سکوں۔"

"کون سا وعدہ آفندی صاحب؟"

"بھئی وہ مہلت جو میں نے تمہیں دی تھی اور جس کے سات آٹھ دِن گزر چکے ہیں۔ آج کے دِن سے زیادہ آگے نہیں بڑھائی جا سکتی۔ ... میں کوٹھی کی بات نہیں کر رہا کوٹھی تم بائیس دِن کے بعد کیا ایک مہینہ یا دو مہینے کے بعد خالی کر دو مجھے اعتراض نہیں ہوگا لیکن احسان لمیٹڈ کے سلسلے میں میں نے جن کارروائیوں کا آغاز کیا ہے۔ اُن کی تکمیل کرنا چاہتا ہُوں تاکہ میں اپنے سودے شروع کر سکوں۔ بہت سے کام رُل رہے ہیں مجھے میں چاہتا ہُوں کہ یہ منافع ہاتھ سے کیوں جانے دیا جائے چنانچہ احسان احمد انتہائی معذرت کے ساتھ مجھے تم سے عرض کرنا ہے کہ کل احسان لمیٹڈ کی منتقلی کے کاغذات پر دستخط کر دو اور زیادہ سے زیادہ پرسوں تک مجھے اِس کا چارج دے دو میرے کاروباری معاملات کے لئے بہت ضروری ہے۔"

"آفندی صاحب میں نے احسان لمیٹڈ آپ کے حوالے کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔" احسان احمد کے الفاظ کسی دھماکے کی مانند تھے جنھوں نے محمود علی آفندی کو سُن کر دیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اُن

کا چہرہ سُرخ ہونے لگا اور آنکھوں میں غُصّے کی کیفیت اُمڈ آئی۔

"مطلب نہیں سمجھا میں آپ کا احسان احمد؟"

"آفندی صاحب آپ کی محبت، آپ کی کرم فرمائی نے مجھے اِس قابل کر دیا ہے کہ میں آپ کی رقم آپ کو ادا کر دوں ظاہر ہے بحالتِ مجبوری ہی یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ آپ کی رقم کے عوض احسان لمیٹڈ آپ کے حوالے کر دیا جائے بلکہ اِس پر آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ لنگڑی لولی احسان لمیٹڈ کا آپ کیا کریں گے، از سرِ نو آپ کو اِس کی ترتیب کرنی پڑے گی۔ آپ نے کافی ردّ و قدح کی تھی اُسے قبول کرنے میں۔ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ میں ایک ایسی چیز آپ کے حوالے کر دوں جس میں آپ کو صرف مشکلات کا سامنا کرنا پڑے چنانچہ میں تگ و دو میں لگا ہُوا تھا اور بالآخر خُدا نے مجھے اِس قابل کر دیا کہ میں آپ کی رقم آپ کو واپس کر سکوں چنانچہ اب میں بائیس دن کی مہلت بھی نہیں چاہتا میں انتہائی کم وقت میں ساڑھے آٹھ کروڑ روپے آپ کے حوالے کر دُوں گا۔"

"کیا باتیں کر رہے ہو احسان کیا کاروبار اِس طرح ہوتے ہیں، کیا سودے اِس طرح تکمیل پاتے ہیں؟ احسان لمیٹڈ کے تحت میں نے بہت سے لوگوں سے سودے کئے ہیں اور اب اُن کی تکمیل مجھ پر فرض ہوگئی ہے اب یہ ممکن نہیں ہے احسان احمد کہ میں اِس فرم کو چھوڑ دُوں جو بات ہوگئی سو ہوگئی اگر تم ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی رقم ادا کر سکتے ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ تم اِس سے ایک نئی فرم کی بنیاد ڈالو اور اپنا کام کرو۔"

"نہیں آفندی صاحب آپ ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ جس کا کاروباری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے احسان لمیٹڈ آپ کے حوالے کرنے کا وعدہ میں نے صرف اِس بنیاد پر کیا تھا کہ بائیس دن کے اندر اندر اگر میں آپ کی رقم ادا نہ کر سکا تو بحالتِ مجبوری یہ دونوں چیزیں میں آپ کے سپُرد کر دُوں گا ... اِس سلسلے میں آپ اُس وقت تک کسی کارروائی کے مجاز نہیں تھے جب تک کہ یہ وقت پُورا نہ ہو جاتا۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ معاف کیجئے گا آپ کی کاروباری بھُول ہے اور ظاہر ہے اِس کا خمیازہ میں نہیں بھگتوں گا۔"

"میاں کیسے نہیں بھگتو گے فرم تو تمھیں میرے حوالے کرنا ہی ہوگی۔"

"محمود علی آفندی صاحب یہ الفاظ میرا خیال ہے تمام لوگوں کے لئے باعثِ مُسکراہٹ ہیں اِس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے فرم مجھے آپ کے حوالے کرنا ہوگی، کیوں؟ وجہ بتا سکتے ہیں آپ؟"

"دیکھو احسان احمد میں ... میں ..."

"کچھ نہیں آپ جب حکم دیں گے رقم آپ کے حوالے کر دی جائیگی اِس سے زیادہ میں کچھ کہنا آپ کی اور اپنی دونوں کی توہین تصوّر کرتا ہُوں۔" احسان احمد صاحب نے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔

"سوچ لیں احسان احمد بات آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔"

"میرے خیال میں مجھے تلخ الفاظ کہنے پر مجبُور نہ کریں کاروبار کی دُنیا میں آپ ایسی انوکھی باتیں کر رہے ہیں جو صرف آپ کی ساکھ خراب کرنے کا باعث بنیں گی میں آپ کو رقم کی ادائیگی آپ کے حکم کے مطابق کرنے کے لئے تیار ہُوں اور اگر آپ اِس سلسلے میں کوئی اور کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو میری طرف سے اِس کی اجازت ہے آپ کو میرا خیال ہے گفتگو کے اِس انداز کے بعد میں آپ کے پاس بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"احسان احمد اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کو اِس رقم کی ادائیگی کا اختیار ہے لیکن یہ اختیار تو محمود علی آفندی کو بھی ہے کہ وہ کل آپ سے اِس رقم کا مطالبہ کر دیں۔"

"میں انتہائی شرمسار ہُوں کہ اِتنے دِن اِس میں لگے۔ میں آج ہی اِس رقم کی ادائیگی کرنے کے لئے حاضر ہُوں آپ لوگ اگر پسند کریں تو میرے اور میرے بزرگ محترم محمود علی آفندی کے درمیان اچھے تعلّقات قائم کرنے کے لئے میرا ساتھ دیں میری کوٹھی پر میرے ساتھ رات کا کھانا تناول فرمائیں اور آپ کی موجودگی میں یہ رقم محمود علی آفندی کو ادا کر دی جائے گی۔" آفندی صاحب نے کرسی کی پُشت سے گردن ٹکا لی تھی۔ اِس کے بعد بھلا کیا گنجائش تھی کہ وہ کچھ کہہ سکتے سبھی لوگ اُنھیں قائل کرنے لگے تھے اور اُن کے پاس کوئی چارہ جوئی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ یہ طے پا گیا کہ دوسرے دِن عدالت کے ذریعے یہ رقم محمود علی آفندی کو ادا کر دی جائے گی۔ یہ رات محمود علی آفندی نے جاگتے ہُوئے گزار دی تھی۔ سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ رقم کی وصُولیابی مسئلہ نہیں تھی اصل مسئلہ یہ تھا کہ احسان احمد اپنے پیروں پر کیسے کھڑے ہوگئے، محمود علی آفندی کو تو یہ پتہ چلا تھا کہ اب احسان احمد کے پاس پھُوٹی کوڑی بھی نہیں ہے اور وہ شاید اپنے اہلِ خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے بھی کوئی ملازمت ہی کریں۔ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی یہ رقم ... نہ جانے کب تک وہ پریشان رہے تھے اور پھر دفعتاً اُن کے ذہن میں منوّر علی بیگ کا خیال آیا۔ ریٹائرڈ آئی۔ جی تھے۔ اُن کے پُرانے شناسا پُرانے دوست محمود علی آفندی یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر یہ رقم کہاں سے آئی چنانچہ دوسری صبح سات بجے اُنھوں

نے منوّر علی بیگ صاحب کو ٹیلیفون کیا اور فون منوّر علی بیگ نے ہی ریسیو کیا۔

"محمود علی آفندی بول رہا ہُوں۔"

"او ہو۔ محمود میاں خیریت بھئی اِتنی جلدی جاگ جاتے ہو۔ مجھے تو آج ہی معلوم ہُوا۔"

"تم سے کچھ کام ہے منوّر۔ میں آؤں یا تم آجاؤ گے؟"

"بھئی جیسا تم چاہو۔"

"میں ہی آرہا ہُوں۔ ناشتہ تیار کرا لو۔"

"ناشتہ تیار ہے سرکار آپ تشریف تو لائیے۔" منوّر علی بیگ نے کہا اور محمود علی آفندی نے ریسیور رکھ دیا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے جلدی جلدی تیاریاں کی تھیں۔ رات بھر کی تھکان چہرے سے ٹپک رہی تھی لیکن وہ تنہا ڈرائیونگ کرتے ہُوئے منوّر علی بیگ کی خوبصُورت کوٹھی پر پہنچ گئے۔ منوّر علی بیگ خود بھی صبح خیزی کے عادی تھے۔ ایک خوبصُورت گون میں ملبُوس کوٹھی کے برآمدے میں وہ محمود علی آفندی کا انتظار کر رہے تھے، دونوں گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملے اور منوّر علی اُنھیں اندر لے گئے۔

"ہاں بھئی صبح صبح آمد یقیناً کسی خاص وجہ سے ہوگی چنانچہ میں سب سے پہلے وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہُوں اور اِس کے بعد باقی باتیں ہوں گی۔" محمود علی آفندی ایک صوفے پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگے اور پھر بولے۔

"ساری رات نہیں سو سکا ہُوں۔"

"خیریت کیا عشق ہو گیا ہے کسی سے؟" منوّر علی بیگ نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"نہیں منوّر بڑی سنجیدہ بات ہے معاملہ سو فیصدی کاروباری لیکن ایک دوست کی حیثیت سے مجھے تم سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں ملا یہ بتاؤ تصوّر کیا کر رہا ہے آج کل۔"

"حسبِ معمُول اسپیشل ڈپارٹمنٹ کا چیف ہے عُہدہ ایس پی کا ہے لیکن مراعات ڈی۔ آئی۔ جی تک کی ہیں۔ بڑے اختیارات حاصل ہیں خُدا کے فضل سے اُسے۔ مختلف کاموں میں مصرُوف ہے۔ کیوں خیریت کوئی جرم کا معاملہ ہے؟"

"جُرم تو کہہ نہیں سکتے اُسے۔ دراصل میں اُس کے ذرائع سے ایک شخص کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہُوں۔"

"بھئی تمھارا بیٹا ہے وہ۔ جو چاہتے ہو اُسے حکم دے دو، بھلا درمیان میں میرا ذریعہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔"

"ہاں ہاں یقیناً ... یقیناً۔ کہاں ہے اِس وقت، میرا خیال ہے صاحبزادے تو ابھی سو کر بھی نہیں اُٹھے ہوں گے۔"

"نہیں بھئی وہ ایک مستعد پولیس والا ہے، میرا خیال ہے ورزش کر رہا ہوگا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد ناشتے کے کمرے میں تمھاری مُلاقات ہو جائے گی۔ اُس وقت تک اگر مناسب سمجھو تو مجھے کچھ تفصیلات بتا دو۔"

"میں دراصل کسی سے کوئی رقابت نہیں رکھتا احسان احمد کو جانتے ہو؟ احسان لمیٹڈ والے؟"

"ہاں۔ وہ جو دیوالیہ ہوگئے ہیں؟"

"جی ہاں اُنہی کی بات کر رہا ہُوں۔" محمود آفندی کسی قدر طنزیہ لہجے میں بولے۔

"خیریت بھئی وہ آدمی تو قابلِ رحم ہے کیونکہ میں نے سُنا ہے کہ بذاتِ خود اُس کا کوئی معاملہ نہیں تھا بلکہ اُس کا بھائی شہاب احمد اُس کا بیڑا غرق کرنے کا باعث بنا ہے۔ اُس شخص نے تو سُنا ہے کہ شہاب احمد کے کرتوتوں کو اپنے شانوں پر لے لیا ہے اور بیچارے نے تمام ادائیگیاں کر ڈالی ہیں اِس کا کیس تصوّر ہی کے پاس ہے۔"

"یہ تو بہت بہتر ہُوا۔ میرا خیال ہے تصوّر اب اِس سلسلے میں خصُوصی دِلچسپی لے گا۔ ذرا اُسے بُلا دو اُس سے ہی بات کریں گے۔"

"میاں چھُری تلے دم لو۔ ٹھیک ہے ساری باتیں اُس کے سامنے ہی کی جائیں گی۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو آخر کوئی خطرناک بات ہے؟"

"نہیں۔ میں تصوّر کے سامنے ہی تمام حقیقت تمھیں بتا دُوں گا تم سُناؤ بالکل ٹھیک ہو نا؟"

"بھئی ایک ریٹائرڈ آدمی کی زندگی بس ٹھیک ہی ہوتی ہے۔ دِل تو چاہتا ہے کہ ایک بار پھر کمر کس کر میدان میں آجاؤں۔ کوئی جُرم ہو میری رگ پھڑکنے لگتی ہے مگر کیا کروں بھائی۔ بوڑھا بھی ہو گیا ہُوں۔ ویسے تصوّر خُدا کے فضل سے بہتر طریقے سے کام کر رہا ہے۔"

"کیوں نہیں ... کیوں نہیں۔ آخر تمھارا بیٹا ہے۔ تم نے بھی تو بڑا نام کمایا۔"

"شکریہ دوست۔ دوستوں کی محبتوں اور دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔" کافی دیر اِسی طرح کی رسمی گفتگو ہوتی رہی اِس کے بعد ایک ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ ناشتہ لگ گیا ہے اور سب لوگ ناشتے کے کمرے میں پہنچ گئے ہیں۔ منوّر علی بیگ نے محمود علی آفندی کو بڑے احترام سے اُٹھایا اور ساتھ لئے ہُوئے ناشتے کے کمرے کی جانب چل پڑے۔

ناشتے کے کمرے میں منور علی بیگ کے اہل خاندان موجود تھے، انہی میں تصور علی بیگ موجود تھا۔ خوبصورت تن و توش اور دلکش چہرے کا مالک۔

سب نے کھڑے ہو کر محمود آفندی کا استقبال کیا تھا اور محمود صاحب نے سب سے سلام دعا کی۔ اور پھر اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ایسے مہمان کم ہی ہوتے ہوں گے۔ جو صبح ہی صبح ناشتے کی میز پر پہنچ جائیں۔"

"بھئی مہمانوں کو تو گھر کی برکت کہا جاتا ہے اور یہ برکت صبح ہی صبح گھر میں آ جائے تو سب کی خوش قسمتی کا باعث ہے چلیں ناشتہ شروع کریں۔" محمود علی آفندی اطمینان سے ناشتے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ذہنی کیفیت بہتر نہیں تھی۔ بار بار نگاہیں تصور کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ وہ صورت حال سے بے خبر ناشتے میں مصروف تھا۔ جب ناشتہ ختم ہو گیا تو آئی جی صاحب نے تصور سے کہا۔

"تصور بیٹے! آفندی صاحب خاص طور سے تمہارے پاس آئے ہیں۔ کام ہے انھیں تم سے۔ بہت بے چین تھے۔ میں نے کہا ناشتے کے بعد تصور سے تنہائی میں گفتگو کر لیجئے۔ آؤ ذرا ہمارے ساتھ آؤ۔ آفندی صاحب کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔"

تصور سعادت مندی سے گردن ہلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر وہ تینوں اسی کمرے میں آ گئے جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے آفندی صاحب منور علی صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ منور صاحب بولے۔

"بھئی اگر تم لوگ چاہو تو میں اس کمرے میں بھی نہ رکوں۔ ویسے میرے مشورے بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔ ایک مشیر کی حیثیت سے میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔"

"نہیں منور بیٹھو۔ تمہاری موجودگی کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟"

"شکریہ شکریہ،" منور علی صاحب مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے تصور سوالیہ نگاہوں سے محمود علی آفندی کو دیکھ رہا تھا۔

"تصور بیٹے! کاروباری دنیا بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ بعض اوقات میں خود بھی سوچتا ہوں کہ آخر یہ کون سا نشہ ہے جو انسان کو آخری دم تک متحرک رکھتا ہے۔ مجھے دیکھو آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ بے پناہ دولت ہے۔ بہت کچھ کمایا ہے خدا کے فضل سے اور اس کمائے ہوئے کو استعمال کرنے والا کوئی بھی نہیں ہے میری زندگی میں۔ ایسے حالات میں اگر میں مزید دولت کی خواہش کروں تو اسے قارون جیسی دیوانگی کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میاں انداز فکر یہ نہیں ہوتا کہ موت کے بعد اس دولت کا کیا ہو گا یا یہ ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ یہاں تو سوچ صرف اتنی ہوتی ہے کہ اپنی ساکھ برقرار رکھی جائے۔ اپنی حیثیت بڑھائی جائے۔ اور اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ بعد کی باتیں تو بعد ہی میں ہوتی ہیں۔ انسان زندگی ہی میں موت کو کیوں اپنا لے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے میں کم از کم آپ کے آخری الفاظ سے متفق ہوں آفندی صاحب۔ موت سے پہلے موت کو کیوں اپنا لیا جائے۔"

"بالکل بیٹے بالکل۔ اور پھر اگر کاروبار میں سیاسی چالیں چلی جاتی رہیں تو پھر کاروباری حیثیت متاثر ہو جاتی ہے اس تمہید کے بعد میں اصل موضوع پر آئے جاتا ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ بھائی پولیس آفیسر ہو اور معروف آدمی ہو گئے۔ میرا ایک مسئلہ ہے جس کے لئے مجھے تم سے ذاتی طور پر مدد درکار ہے۔"

"جی... جی فرمائیے۔" تصور نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

"ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے شہر کے بڑے لوگوں کے بارے میں تمہارے پاس تمام معلومات ہوں گی۔ میں تمہاری توجہ احسان احمد صاحب کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ صاحب بہت پرانے کاروباری ہیں۔ احسان لمیٹڈ کے نام سے ایک فرم بھی رکھتے ہیں اور اب سے چند ہفتے قبل ہی بڑے دولتمندوں میں شمار ہوتے تھے لیکن پچھلے دنوں کچھ حادثات کا شکار ہو گئے کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"ہاں۔ غالباً ان کے بھائی شہاب احمد صاحب کروڑوں روپوں کا فراڈ کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے فرینڈز آرگنائزیشن کے نام سے ایک جعلی فرم بنائی اور اس فرم کے تحت کروڑوں روپے کا کاروبار کیا کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ جن میں غالباً توقیر صاحب اور ان کا بیٹا تفسیر اور بھی چند افراد شامل تھے۔ یہی بات ہے ناں؟"

"بالکل... بالکل۔ تو بھائی یہ شہاب احمد صاحب کروڑوں روپے کا فراڈ کر کے کہیں غائب ہو گئے۔ کہاں؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے ویسے سنا ہے پولیس ان کی تلاش میں سرگرداں ہے اور انٹرپول بھی مصروف عمل ہے۔ یہ باتیں تو مجھ سے تعلق نہیں رکھتیں شہاب احمد اگر گرفتار ہو گئے تو ان سے کیا وصول کیا جا سکتا ہے؟ یہ پولیس جانے اور حکومت، میرے اور احسان کے درمیان بھی کچھ اور کاروباری مسئلے تھے جو احسان احمد کے دیوالیہ ہو جانے کے بعد کھٹائی میں پڑ گئے ہیں۔ تقریباً ساڑھے آٹھ کروڑ روپے احسان احمد پر واجب الادا تھے۔ احسان احمد نے بظاہر بڑی دیانت داری کا ثبوت دیا اور بے شمار افراد کو ان کی رقومات واپس کر دیں۔

کسی نہ کسی شکل میں۔ ان کی بہت سی فیکٹریاں اور ادارے اب دوسروں کی تحویل میں جا چکے ہیں انھوں نے فراخدلی سے اپنے بھائی کی حرکتوں کا خمیازہ بھگت لیا ہے۔ آخری رقم میری رہ گئی تھی۔ اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اب احسان احمد کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی کہ وہ کسی کو کچھ ادا کر سکتے۔ مجھ سے انھوں نے زبانی طور پر وعدہ کیا کہ اگر بائیس دن کے اندر اندر میری ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی رقم نہ ادا کر سکے تو اپنی کوٹھی اور احسان لمیٹڈ نامی آخری فرم میرے حوالے کر دیں گے۔ میں نے اس فرم کی ذمہ داری پر سوداکاری شروع کر دی کیونکہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ اب احسان احمد اس رقم کا کہیں سے انتظام نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح میری اپنی پوزیشن بھی متاثر ہو گئی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ بائیس دن کے بعد فرم اور کوٹھی میرے حوالے کر دی جائے گی۔ لیکن اچانک ہی مجھے پتہ چلا ہے کہ احسان احمد نے ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کا انتظام کر لیا ہے اور وہ یہ رقم میرے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں۔"

"اوہ، میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے جناب آفندی صاحب ڈوبی ہوئی رقم کا مل جانا بڑی حیثیت رکھتا ہے۔"

"ارے نہیں میاں۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں احسان لمیٹڈ کے نام پر سودے کاری شروع کر چکا ہوں اور پھر یہ بھی نہ سہی تب بھی میں احسان لمیٹڈ کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے آفندی صاحب؟ اگر ایک شخص نے آپ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ بائیس دن کے اندر اندر وہ آپ کی رقم نہ ادا کر سکا تو یہ دونوں چیزیں آپ کے حوالے کر دی جائیں گی، بائیس دن کے اندر اندر اگر وہ آپ کی رقم دے دیتا ہے تو پھر تو وہ یہ دونوں چیزیں آپ کے حوالے کرنے پر مجبور نہیں ہے۔"

"قانونی طور، اخلاقی طور پر تو یہی ہے لیکن تم اس بات کو کیا کہو گے کہ میں ہر قیمت پر احسان لمیٹڈ ہی اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہوں۔"

"میں اس بات کو جو کچھ کہوں گا وہ آپ کے سامنے عرض نہیں کر سکتا آفندی صاحب، لیکن آپ کون سے قانون کے تحت زبردستی اس فرم پر قبضہ کر سکتے ہیں؟" تصور بیگ نے کہا اور آفندی صاحب آئی جی صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔

"میاں! یہ کیسی بات کر رہا ہے؟ یہ مجھے قانون پڑھا رہا ہے۔ میں اس کے پاس قانون پڑھنے تو نہیں آیا۔ اس سے کہو نا کہ میری مدد کرے اس سلسلے میں۔" آئی جی صاحب بے اختیار مسکرا پڑے۔ پھر بولے۔

"ہاں ہاں بھئی تمہیں آفندی صاحب کی مدد کرنی ہے تصور۔"

"جی۔ جی میں حاضر ہوں۔" تصور نے گردن ہلا کر کہا۔

"میں یہ نہیں جانتا کہ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی یہ رقم احسان احمد کے پاس اچانک کہاں سے آ گئی۔ آج وہ کمبخت یہ رقم عدالت میں میرے حوالے کر دے گا اور اس طرح بات ختم ہو جائے گی میں احسان لمیٹڈ کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیا کوئی ایسا نکتہ ہے کہ تم آج رقم کی یہ ادائیگی ملتوی کرا دو؟"

"ہاں یہ آپ عدالت میں یہ رقم لینے سے انکار کر دیں؟"

"وجہ۔ وجہ کیا بتاؤں گا؟"

"ہاں۔ وجہ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ بہرطور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر آپ عدالت میں یہ رقم وصول نہ کریں تو احسان احمد صاحب سرکاری تحویل میں دے دیں۔ احسان لمیٹڈ تو پھر بھی ان کی ملکیت رہ جاتی ہے۔ لیکن آفندی صاحب آپ احسان لمیٹڈ کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئے ہیں؟ اگر آپ اس فرم کو اتنی مالیت کی سمجھتے ہیں تو اس رقم سے آپ دوسری فرم بھی بنا سکتے ہیں، چھوڑیئے احسان لمیٹڈ کو۔"

"یہی تو نہیں کرنا چاہتا بیٹے۔ یہی تو نہیں کرنا چاہتا بعض معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تمہیں بس یہ کام کرنا ہے کہ کسی بھی طرح رقم کی یہ ادائیگی رکوا دو اور قانونی طور پر احسان احمد کو اس کے لئے مجبور کرو کہ وہ اس رقم کے حصول کا ذریعہ بتائے۔"

"معاف کیجئے گا آفندی صاحب، قانون کی تشکیل میں نہیں کرتا۔ قانون پہلے سے تشکیل شدہ ہے۔ آپ کی رقم اگر کوئی شخص ادا کرنا چاہتا ہے تو اسے اس ادائیگی سے روکا نہیں جا سکتا جہاں تک احسان احمد کا تعلق ہے تو انھوں نے دوسروں کی رقومات بھی تو ادا کی ہیں ان کی اپنی حیثیت ہے۔ ساکھ ہے۔ کوئی بھی یہ سوال نہیں کر سکتا کہ یہ رقم وہ کہاں سے لائے۔ کیا وہ اتنے بے حیثیت آدمی تھے کہ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے مہیا نہ کر سکیں، میں معافی چاہتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ احسان احمد صاحب کے بارے میں چھان بین کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے اثاثے کتنے تھے اور ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی رقم ان اثاثوں میں کہاں سے نکلتی ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل بالکل۔ یہی تو کہہ رہا ہوں میں تم سے اتنی دیر سے، جانتے ہو میرے ذہن میں کیا ہے؟"

"نہیں۔" تصور نے معصومیت سے گردن ہلا دی۔

"میں تو اِس شُبہے کا شکار ہُوں کہ یہ کوئی بہت گہری سازش ہے. احسان احمد نے اپنے بھائی کو منظرِ عام پر لاکر یہ کارروائی خود کرائی ہے اور اُسے رُوپوش کر دیا ہے شاید وہ اپنے کاروبار کو محدود کرنا چاہتا تھا اور اُس نے اِس کاروبار کو اونے پونے فروخت کرنے کے بجائے بھرپور طریقے سے کارروائی کی اور اپنے آپ کو دیوالیہ ظاہر کر دیا پھر بڑی بڑی رقومات کے عوض وہ کاروبار دوسروں کے سر منڈھ دیئے اور اب وہ صرف احسان لمیٹڈ کو چلانا چاہتا ہے. یقیناً وہ اپنے بھائی کی سازشوں میں برابر کا شریک ہے اور دیکھ لینا تم بالآخر یہ بات منظرِ عام پر آجائے گی."

"مشکل ہے آفندی صاحب کیونکہ شہاب احمد رُوپوش ہے اور کوئی بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ اِس فراڈ میں احسان احمد بھی شریک تھے اور پھر آپ تو دہی اپنے الفاظ کی نفی کر رہے ہیں. اگر وہ اپنی قیمتی فیکٹریاں اور ادارے دوسروں کے سپرد کر سکتا ہے، میری مُراد احسان احمد سے ہے تو پھر احسان لمیٹڈ آپ کے حوالے کیوں نہیں کر رہا؟ نہیں آفندی صاحب میں صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ یہ تفتیش کرکے آپ کو رپورٹ دُوں کہ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے احسان احمد نے کہاں سے حاصل کئے. فرم کی منتقلی کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا."

"ہم." آفندی صاحب گردن جُھکا کر کچھ سوچنے لگے پھر بولے. "اِس طرح تو تمہارے پاس آنا بے کار ہی رہا منور بیگ."

"نہیں نہیں اچھا ہُوا ملاقات ہوگئی. ہم لوگوں کو ساتھ ناشتہ کئے بڑے دن ہوگئے تھے."

"یُوں لگتا ہے جیسے تم دونوں باپ بیٹے میرا مذاق اُڑا رہے ہو." آفندی صاحب چڑ کر بولے.

"نہیں چچا، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اِس گستاخی کا مرتکب ہُوں. آپ اطمینان رکھیئے، آپ رقم وصُول کریں اور قانونی طور پر تمام کارروائی قبول کریں اِس کے علاوہ چارۂ کار بھی نہیں ہے لیکن اِس بات کا اطمینان رکھیں کہ میں بہت جلد یہ حقیقت آپ کے سامنے لے آؤں گا کہ دیوالیہ ہونے کے باوجود اتنی بڑی رقم احسان احمد کے ہاتھ کہاں سے لگی."

"گڈ. ویری گڈ. اگر یہ بات بھی منظرِ عام پر آجاتی ہے تو کم از کم میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا. مجھے احسان احمد سے کوئی بیر نہیں تھا. لیکن جو کچھ میری تحویل میں آرہا تھا میں اُسے کھونا نہیں چاہتا تھا. ٹھیک ہے تم اتنا کام ضرور کرو تصور بیٹے اور مُجھ سے ملاقات کرتے رہنا."

"جی بہت بہتر." تصور نے کہا اور آفندی صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ گئے. منور علی بیگ صاحب اُنھیں باہر اُن کی کار تک چھوڑنے آئے تھے.

ꝏ

کوٹھی کے حالات معمُول پر آتے جا رہے تھے. غالباً تین یا چار دن کے بعد کی بات ہے کہ جمن اپنی ماں کے ساتھ کوٹھی پہنچ گیا. جھینپا جھینپا سا تھا. ذکیہ بیگم سے مِلا اور کہنے لگا.

"ہمارا تو قصُور نہیں تھا جی ہم سے تو کہا گیا تھا کہ نوکری چھوڑ دیں تو چھوڑ دی ہم نے اور بیگم صاحبہ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا. ابھی خیر دین جی ملے تھے کہنے لگے بیگم صاحبہ کو تمہاری ضرورت ہے تو ہم آگئے جی."

"ہاں جمن تم اپنا کام سنبھال لو تمہارا کوارٹر خالی پڑا ہُوا ہے."

"بس جی ہم آگئے آج ہی سے کام سنبھال لیتے ہیں."

درحقیقت جمن کا کوئی قصُور نہیں تھا لیکن حالات ایسے ہو گئے تھے کہ باورچی وغیرہ کی عیاشی برداشت نہیں کی جا سکتی تھی. اِس لئے مجبُوراً اُسے بھی سب لوگوں کے ساتھ رُخصت کرنا پڑا تھا. ویسے اب بھی احسان احمد صاحب کفایت شعاری سے کام لے رہے تھے اور کوئی ایسا نیا کام نہیں کیا جا رہا تھا جو بار بن جائے. اُن کے ذہن میں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ اب یہ سب کچھ اُن کا اپنا نہیں ہے بلکہ غلام احمد کا ہے اور غلام احمد کی دولت کو وہ بے دریغ نہیں بہا سکتے تھے یہ دوسری بات ہے کہ غلام احمد صاحب نے انھیں زِچ کرکے رکھ دیا تھا. وہ بدستور ڈرائیور بنے ہُوئے تھے اُسی انداز میں صبح کو گاڑی نکالتے اُسی انداز میں اہتمام سے اُنھیں لے کر دفتر جاتے اور پھر واپسی کے لئے انتظار کرتے رہتے اُنھوں نے احسان احمد کی ایک بات بھی نہیں سُنی تھی. احسان احمد صاحب نے اِس سلسلے میں ذکیہ بیگم سے بھی مشورہ کیا تھا. اور ذکیہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں.

"بھئی میں کیا کروں اماں بی تو دہی غلام احمد صاحب کے کوارٹر میں گئی تھیں. اُنھوں نے شوکت جہاں بیگم اور غلام احمد صاحب کی والدہ سے بڑی شدت سے یہ کہا کہ وہ لوگ کوٹھی میں منتقل ہو جائیں لیکن عجب سر پھرے لوگ ہیں مانتے ہی نہیں. کہتے ہیں اُن کے لئے یہی جگہ مناسب ہے."

"خیر اس مسئلے سے تو میں خود ہی نمٹوں گا. مگر مجھے بڑا عجیب لگتا ہے ذکیہ کسی انسان کی انسانیت فرشتوں کی حد میں داخل ہو جائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کے لئے کیا کیا جائے."

"ٹھیک ہے اب میں کیا بتاؤں اِس سلسلے میں؟ جیسے تم مناسب سمجھو."

احسان احمد صاحب اب حالات نکل آئے تھے عدالت میں ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کی رقم بہت سے لوگوں کے درمیان آفندی صاحب کے حوالے کر دی گئی تھی اور اِس طرح سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا. آفندی صاحب کے پاس اِس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ یہ رقم قبول کرلیں. اِس کے بعد احسان احمد صاحب کے ذریعے اُنھیں یہ عزت یہ وقار حاصل ہو گیا تھا لیکن اُن کے ذہن میں اپنے بھی منصُوبے تھے. اور وہ بہت جلد اپنی کھوئی ہُوئی حیثیت واپس حاصل کر لینا چاہتے تھے. کوٹھی کا معاملہ حسبِ معمُول کوٹھی والوں نے سنبھال لیا تھا. گو شرارتیں کم ہوگئی تھیں. شرارت کرنے کے لئے کوئی رہا ہی نہیں تھا. بے چاری طفیلی بیگم تھیں تو وہ اب یکسر بدل گئی تھیں پانچوں وقت کی نماز پڑھتیں اور گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھی وظیفے کرتی رہتی تھیں. جمن کی ماں بھی معمُول پر تھی کوئی ایسی بات نہیں ہُوئی تھی جو قابلِ ذکر ہوتی البتہ اب اِس سلسلے میں میٹنگیں ہونے لگی تھیں. یہاں سے سکُون ہوگیا تھا تو کوٹھی کی رونقوں کو واپس لانا ضروری تھا. احسان احمد صاحب دبے دبے رہتے تھے اب وہ کُھل کر یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے کہ تمام لوگوں کو واپس لے آیا جائے. کیونکہ دل کی گہرائیوں میں یہ بات جاگزیں تھی کہ اب یہ سب کچھ غلام احمد کا ہے لیکن پھر ایک دِن عارفہ بیگم اپنے شوہر ناصر علی کے ساتھ ملاقات کرنے آئیں اور احسان احمد صاحب بھی اُس وقت وہیں موجود تھے. سلام دُعا ہُوئی. ناصر علی صاحب کہنے لگے.

"ہم لوگ فی الحال ایک شناسا کے ہاں مقیم ہیں. اِس دور میں کوئی جگہ حاصل کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے. دیکھیں کوشش کر رہا ہُوں کہ کسی چھوٹی موٹی آبادی میں کرائے کا کوئی مکان مل جائے جو عیش ہم لوگ یہاں کر چکے ہیں اِس کے بعد کوئی چھوٹی موٹی جگہ نِگاہوں ہی میں نہیں جچتی لیکن اچھا ہے عارفہ بیگم نے یہاں رہ کر کون سی وفاداریوں کا ثبُوت دیا ہے سوائے پریشانیاں کھڑی کرنے کے اب اُنھیں کچھ سبق ملنا ہی چاہیئے." عارفہ بیگم پھس پھس کرکے رونے لگی تھیں. اُنھوں نے دوپٹہ مُنہ پر ڈھک لیا تھا. اور احسان احمد صاحب ہچکچائے ہُوئے انداز میں ذکیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگے اور ذکیہ بیگم جھٹ سے بول پڑیں.

"تو یہیں آجائیے ناں عارفہ بیگم. شاید آپ کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہے ناصر علی بھائی کہ ہم اب یہ کوٹھی خالی نہیں کر رہے خُدا کے فضل و کرم سے کچھ انتظامات ہوگئے ہیں آپ تمام لوگوں کو جس وقت یہ بات کہی گئی تھی اُس وقت اِس کا یقین تھا کہ چند روز کے بعد یہ کوٹھی خالی کرنا پڑے گی لیکن اب ایسا نہیں ہے میرا خیال ہے آپ فوراً یہیں واپس آجائیے اور اپنی جگہ سنبھال لیجئے." عارفہ بیگم کا چہرہ خوشی سے کِھل اُٹھا تھا. اُنھوں نے وہیں گھٹنے موڑے اور سجدۂ شکر میں چلی گئیں. اُن کے مُنہ سے بڑبڑاہٹیں نکل رہی تھیں.

"الٰہی! تُو نے میرے دِل کی سُن لی. تیرا بڑا احسان ہے تو نے میری دُعائیں قبول کرلیں." پھر بولیں "اے احسان بھائی! آپ یقین کریں. نہ جانے کیا کیا دُعائیں مانگی ہیں آپ کے لئے. رو رو کر راتیں گزار دی ہیں کیسا بھرا پُرا گھر. کیسے اچھے لوگ کِس امتحان میں پڑ گئے. اپنے اللہ سے یہی پوچھتی تھی. مجھ سے زیادہ خوش اور کون ہوگا اِس وقت. اے ناصر صاحب! مٹھائی کا ڈبہ لے کر آؤ جلدی سے اِس خوشی کو برداشت نہیں کر پا رہی."

"آجائے گی. آجائے گی مٹھائی بھی. بلاوجہ ڈرامہ مت کرو سیدھی بات کہو کہ واپس آرہی ہو." ناصر علی کھرے آدمی تھے چنانچہ برداشت نہ کر سکے احسان احمد ہنس پڑے.

عارفہ بیگم کی واپسی ضروری تھی کیونکہ لڑکیوں کے لئے خاص طور سے وہ باعثِ تفریح تھیں. چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا. یہ بات سب لوگ اچھی طرح سے جانتے تھے. عارفہ بیگم واپس آجائیں گی. ہو سکتا ہے اُنھوں نے سچ مچ دُعائیں مانگی ہوں لیکن یہ کھوج کئے بغیر نہیں رہ سکیں گی کہ آخر احسان احمد کو دولت کہاں سے ملی؟ اُن کی واپسی سے سبھی لوگوں کو خوشی ہُوئی تھی اِس طرح کوٹھی میں پھر سے رونقیں واپس آنے لگیں. جمن بھی آگیا تھا. عارفہ بیگم آگئی تھیں لیکن اب طفیلی بیگم کا مسئلہ ذرا تبدیل ہوگیا تھا. رشید کے سلسلے میں وہ دوبارہ احسان احمد سے کچھ نہیں کہہ پائی تھیں. کِس مُنہ سے کہتیں. بیٹا دولت مند بننے چلا تھا اور اُس کے ساتھ شامل ہوگیا تھا جس نے اِس گھر کو برباد کرکے رکھ دیا تھا. احسان احمد صاحب کی یہی کیا شرافت کم تھی کہ اِس کے باوجُود اُنھوں نے طفیلی بیگم کو بے سہارا نہیں چھوڑا تھا سب نے اپنے اپنے سہارے تلاش کر لئے تھے لیکن درحقیقت فیصل آباد سے آنے کے بعد طفیلی بیگم کے پاس رشید کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا تھا اگر ایسے موقع پر احسان احمد صاحب اُنھیں یہ سوچ کر وہاں سے نکال دیتے کہ رشید بھی شہاب احمد کا ساتھی تھا تو طفیلی بیگم کو سڑکوں پر ہی گزارا کرنا پڑتا، اُنھوں نے اپنے آپ کو بالکل تبدیل کر لیا تھا. اِس کے علاوہ بیٹے کا غم بھی تھا. جانتی تھیں قید کی صعُوبتیں بُھگت رہا ہے. نہ جانے کیا سلُوک ہو رہا ہوگا اُس کے ساتھ چنانچہ راتوں کو رو رو کر دُعائیں مانگتی رہتی تھیں.

ایسے حالات میں اُن کی بھلا عارفہ بیگم سے کیا چلتی۔
چنانچہ دو دن گزرنے کے بعد جو میدانِ کارزار گرم نہیں ہوا تھا۔ اکثر رِدا، ثناء اور ندرت اکٹھی ہوتیں تو اس سلسلے میں بڑی بے چینی کا اظہار کیا جاتا کہ کوٹھی میں کوئی ہنگامہ نہیں ہے ابھی کچھ اور لوگوں کی ضرورت ہے تاکہ یہاں کی رونقیں بحال ہوں۔ ثناء نے ندرت کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اے اللہ رکھی! تیری صلاحیتیں کہاں گم ہو گئیں؟ تیرا جمن واپس آ گیا ہے۔ کیا تجدید محبت نہیں کرے گی؟"
"نہیں بھئی، جمن پرانا ہو گیا ہے۔ اب یہ گھسا پٹا مُہرہ ہماری بساط پر دوبارہ نہیں آ سکتا۔"
اُس دن چھٹی تھی۔ احسان احمد صاحب گھر پر ہی موجود تھے۔ مزاج میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ پہلے کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن اب نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ فرمائشیں کی جاتی رہتی تھیں۔
موسم ابر آلود تھا چنانچہ جمن کو ہدایت دے دی گئی کہ پکوان پکائے جائیں۔ شاید وہ آج کچھ اور بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ بادلوں کی چھاؤں میں لان پر ڈیرے لگا دیئے گئے احسان احمد صاحب بہت خوش نظر آ رہے تھے تمام لوگوں کو لان پر آنے کی ہدایت کر دی گئی۔ اور خاص طور سے غلام احمد کے کوارٹر سے ایک ایک فرد کو نکال باہر لایا گیا تھا۔ اماں بی بے چاری ضعیف خاتون تھیں۔ چنانچہ وہ شاذ و نادر ہی کوارٹر سے باہر نکلتی تھیں لیکن آج انھیں بھی پکڑ کر لایا گیا تھا اور وہ لجائی شرمائی سی ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دادی اماں بھی اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔
"بھئی معاف کرنا انسان بڑی غلیظ چیز ہے جب تک سر پر نہیں پڑتی انسان نہیں بنتا۔ بھلا آپ سے سرسری تعارف تو رہا مگر کبھی بیٹھک نہیں ہو سکی۔ آج جب ہم آپ کے احسانات تلے دبے ہوئے ہیں تو شرمندگی کا احساس ہو رہا ہے کیا کہیں آپ سے؟ اور کیا نہ کہیں؟"
"کچھ نہ کہئے بیگم صاحبہ، کہہ کر آپ ہمیں شرمندہ کرتی ہیں۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں اور اللہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہاں میری عمر کی کوئی نہیں تھی اگر آپ کے قدموں تک حاضری کی اجازت مل جائے تو وقت ذرا اچھا کٹ جائے گا۔ ہم لوگ تو زندگی کے آخری دور سے گزر رہے ہیں۔"
"اتنے بڑے ہیں آپ لوگ کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"
"بڑی ذات اللہ کی ہے بہن۔ بس یہ سارے مسئلے اللہ پر چھوڑ دو۔ ہم انسانوں کو انسانوں جیسی باتیں کرنی چاہئیں۔" غلام احمد کی والدہ بھی اِس ظرف کی خاتون تھیں۔ بُرے وقت نے صورتیں مسخ کر دی تھیں لیکن بُرا وقت بھی انسان سے انسان کی اچھائیاں نہیں چھین سکتا۔ یہی کیفیت اُن تمام لوگوں کی تھی ذکیہ بیگم شوکت جہاں کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ندرت، رِدا، عصمت اور ثناء ایک ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔
"دیکھو کیا وقت آ گیا آگ اور پانی یکجا ہو گئے ہیں۔ مگر یار اللہ رکھی۔ تجھے اعتراف کرنا ہو گا جب ہم بڑے تھے تب بھی ہم بڑے نہیں بنے۔ آج اِن لوگوں کو شرمندگی ہو رہی ہے لیکن کیا تو میرے چہرے پر شرمندگی کی کوئی لکیر دیکھ رہی ہے؟"
"پتہ نہیں تم لوگوں کو بڑے چھوٹے کا یہ کیا مرض ہو گیا ہے۔ مالک کی بیٹی! اِن باتوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ ارے بھائی اِس میں میرا کیا قصور ہے میرے سامنے فضول باتوں سے گریز کیا کرو۔ سب سے زیادہ حیرت تو اِن طفیلی بیگم اور عارفہ بیگم پر ہو رہی ہے۔ دونوں کیسی ایک دوسرے کی غمگسار بنی ہوئی ہیں۔ یار اِن کے درمیان چلنی چاہیئے ورنہ سارا مزا کِرکرا ہو جائے گا۔"
"نہیں نہیں، طفیلی بیگم کو معاف کر دو بے چاری غم زدہ ہیں۔ تم لوگوں کو کسی غم زدہ انسان پر بھی رحم نہیں آتا۔"
"ہاں بس دو ہی غم زدہ ہیں اِس گھر میں ایک تم اور ایک طفیلی بیگم باقی سب عیش کی گزار رہے ہیں۔" ثناء نے رِدا کو گھورتے ہوئے کہا اور رِدا مسکرا دی۔
احسان صاحب، غلام احمد سے باتیں کر رہے تھے غلام احمد، احسان احمد صاحب کے سامنے بدستور مؤدب تھے پھر احسان صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور دادی اماں کے پاس پہنچ گئے۔
"اماں! آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ذرا تنہائی میں۔۔۔"
دادی اماں اُٹھ کر احسان صاحب کے ساتھ ایک طرف چل پڑی تھیں۔ احسان صاحب اُن سے دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اور دادی اماں گردن ہلاتی رہیں پھر وہ واپس آ گئیں اور غلام احمد کے پاس پہنچ گئیں۔
"غلام احمد بیٹے! مجھے کیا سمجھتے ہو تم؟"
"جی بیگم صاحبہ جی۔" غلام احمد کھڑے ہو گئے۔
"بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے یہ پوچھ رہی ہوں کہ عمر میں، میں تمہاری ماں سے کم ہوں؟"
"نہیں، رتبے میں بھی میرے لئے اُن سے کم نہیں ہیں۔۔۔"
غلام احمد صاحب آہستہ سے بولے۔

"بیٹے! انسانیت بہت بڑی چیز ہے اِس دُنیا میں انسان کو انسان کے کام آنا ہی چاہیئے جس حد تک بھی ہو سکے۔ لیکن بزرگوں کا احترام بھی فرض ہوتا ہے کیا یہ احترام انسانیت کے زُمرے میں نہیں آتا۔"
"کیوں نہیں بیگم صاحبہ۔"
"اگر میں تم سے کہوں کہ تم ایک ماں ہی کی طرح میرا احترام کرو تو کیا تم گنجائش نکال سکتے ہو؟"
"بیگم صاحبہ میں ہر طرح سے آپ کا احترام کرتا ہوں۔"
"اگر تم سے کسی خواہش کا اظہار کروں تو ٹھکرا دو گے؟"
"جی نہیں، کبھی نہیں۔" غلام احمد صاحب بڑے اعتماد سے بولے۔
"تو پھر بیٹے آج کے مُبارک دِن میری ایک بات پر فوری عمل کرو۔ وہ یہ ہے کہ اپنے بال بچّوں سمیت کوٹھی کے بغلی حصّے میں منتقل ہو جاؤ۔ اندر چل کر جائزہ لے لو۔ جو کمرے ہم نے تمہارے لئے مخصوص کئے ہیں وہ تمہاری ضرورت کے مطابق ہیں بس اِسے ایک ماں کا حکم سمجھو بعد میں اِس کی تعمیل یا اِس سے انحراف تمہاری اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔"
غلام احمد صاحب نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایک لمحے کچھ سوچتے رہے پھر بولے "بہتر ہے، کتنی مُہلت دیں گی مجھے آپ اِس کے لئے؟"
"بہتر تو یہی ہو گا کہ ہم دوپہر کے کھانے سے پہلے یہ کام کر لیں۔"
"ٹھیک ہے۔" غلام احمد صاحب نے جواب دیا احسان صاحب نے اُنھیں کھینچ کر سینے سے لگا لیا تھا۔
"یار غلام احمد! معاف کرنا میں تمہاری ضدی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اِس کے لئے مجھے اپنی اماں کا سہارا لینا پڑا۔ تمہارے اِس فیصلے سے مجھے جس قدر خوشی ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا۔ یار کچھ عجیب سا لگتا تھا بس۔ یوں سمجھ لو ایک بے کلی سی تھی ذہن میں۔"
"اب دُور ہو جائے گی احسان صاحب۔" غلام احمد نے پوچھا۔
"بالکل، بالکل۔ میرا خیال ہے یہ میری تم سے آخری درخواست ہو گی اِس کے بعد کچھ نہیں کہوں گا۔" غلام احمد مسکرا دیئے تھے۔
"تو پھر دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ میں یہ کام کر لیتا ہوں۔ آپ مصروف رہیں۔"
"میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا یار۔ کچھ ہدایت ہی دے دُوں گا۔" دوسرے لوگوں کو اِس گفتگو کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ جمن اور جو بھی ہاتھ لگا اُسے ساتھ لے کر غلام احمد صاحب کے گھر کا وہ مختصر سا سامان جو نہایت ضروری تھا کوٹھی میں منتقل کر دیا گیا۔ جب ٹین ڈبّے خالی بوتلیں اُس طرف جانے لگیں تو سب حیرت سے کھڑے ہو گئے۔
"ارے۔ ارے۔ یہ کارواں کدھر جا رہا ہے؟" ندرت نے تعجب سے کہا۔ ثناء، رِدا اور عصمت بھی حیرت سے اُن لوگوں کو یہ کام کرتے دیکھ رہی تھیں۔ دادی اماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی شوکت جہاں کہنے لگیں۔
"اے ندرت یہ کیا ہو رہا ہے؟"
"میرا خیال ہے اماں ہمارا عُہدہ بڑھ رہا ہے۔" ندرت نے جواب دیا۔
"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔"
"جو لوگ یہ کام کر رہے وہ صاحبِ اختیار ہیں تمہارا سمجھنا ضروری تو نہیں ہے اماں۔" ندرت نے کہا اور شوکت جہاں خاموش ہو گئیں۔ دادی اماں مُسکرا رہی تھیں۔ شوکت جہاں نے اُن کی طرف دیکھا اور بولیں۔
"بیگم صاحبہ! آپ کو معلوم ہے یہ کیا ہو رہا ہے؟"
"ہاں معلوم ہے تم لوگ آج سے کوٹھی ہی میں رہو گے۔ بس یہ ہو رہا ہے۔"
"ارے مگر سامان۔۔۔ سامان تو۔۔۔"
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ لڑکیاں تمہارا سارا سامان سمیٹ دیں گی۔" دادی اماں نے جواب دیا۔ ثناء نے رِدا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"دیکھا۔ رِدا دیکھا اب آہستہ آہستہ یہ محترمہ ہم پر احکامات بھی نازل کیا کریں گی۔ ارے ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ آگے آگے کیا ہوتا ہے؟"
"میرے سامنے یہ اُلٹی سیدھی باتیں مت کیا کرو مالک کی بیٹی۔"
"ٹھیک ہے اللہ رکھی۔ ٹھیک ہے نہ جانے کیا کیا دیکھنا تقدیر میں لکھا ہے۔" ثناء نے تیکھے انداز میں کہا اور رِدا ہنسنے لگی پھر بولی۔
"نہیں بھئی میرا خیال تو ہے یہ بہت اچھا ہوا ہم سب لوگ یکجا ہو جائیں گے پھر لُطف آئے گا۔"
"اچھا جی آپ کو بھی لُطف آتا ہے کسی بات پر کمال ہے۔" ثناء نے رِدا کو گھورتے ہوئے کہا۔ سب لوگ ہنستے رہے تھے بہر طور یہ منتقلی مکمل ہو گئی اور آج کا دن کافی خوشگوار گزرا۔

●

ہر کردار کی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے بعض شخصیتیں اِس طرح منظرِ عام سے ہٹ جاتی ہیں کہ دوسرے اُن کی زندگی کے

بارے میں سوچنا چھوڑ دیتے ہیں. حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی کچھ اپنے آپ کو گہرائیوں میں رکھتے ہیں اور یہ گہرائیاں بعض اوقات ساری زندگی کسی کے سامنے آنے نہیں پاتیں. احسان احمد صاحب کی اِس جنت میں بھی بے شمار کردار تھے۔ کچھ کم ہوگئے تھے کچھ باقی تھے۔ اُنہی میں عِصمت بھی تھی۔ غلام احمد کی ایک سنجیدہ سی بیٹی جس نے انتہائی پریشان کُن حالات میں بھی بڑے سکون اور شرافت سے وقت گزارا تھا. بہت سے حادثات سے بچتے ہُوئے وہ اِس پناہ گاہ میں آگئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد غلام احمد صاحب کو کسی قدر ذہنی سکون نصیب ہُوا تو اُنھوں نے بھی بیٹیوں کو تھوڑی سی آزادی دی۔ نُدرت کو تو تعلیم سے کوئی خاص دِلچسپی نہیں تھی عِصمت شروع سے پڑھنے کی شوقین تھی چنانچہ اُس کی خواہش کے مطابق اُسے یونیورسٹی میں داخلہ دِلا دیا گیا تھا۔ کوٹھی میں عِصمت کا کردار ثانوی سی حیثیت رکھتا تھا. گھر کے کام کاج، یونیورسٹی اور کبھی کبھی موقعہ ملتا تو اُن لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی اپنے آپ کو لڑکی سمجھ لیا کرتی تھی. ورنہ زیادہ تر الگ تھلگ ہی اُس کا وقت گزرتا تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی زندگی الگ تھی تعلیم حاصل کرتے ہُوئے اُس کی شناسائی بہت سی لڑکیوں سے ہوگئی تھی. وہ پسندیدہ شخصیت تھی اُن لڑکیوں کی کیونکہ سنجیدگی اُس کی فطرت میں ایک حُسن نُمایاں کئے ہُوئے تھی. لڑکیوں کی حد تک تو خیر عِصمت کو کوئی اعتراض نہیں تھا. لیکن یونیورسٹی کی تعلیم میں لڑکوں سے دُور رہنا بھی مشکل ہی کام ہوتا ہے. بہت سے لڑکوں نے اپنی عادت کے مطابق عِصمت سے بھی پینگیں بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن عِصمت کی شخصیت ہی ذرا مختلف تھی۔ وہ نہایت حلیمی سے اُن سب کے درمیان سے صاف نِکل گئی تھی لیکن کمبخت اقبال جان ہی کو اٹک گیا تھا بہت ہی ڈھیٹ قسم کا لڑکا تھا شکل وصُورت کا کافی حسین، تعلیم میں بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ بس نہ جانے کیوں اُس کی نگاہِ انتخاب عِصمت کی جانب اُٹھ گئی تھیں. ابتداء میں اُس کا طریقہ کار یہی رہا تھا کہ پوائنٹ کی اُس بس کا انتظار کرتا جس میں عِصمت سفر کرتی تھی اور پھر اُسی جگہ اُترتا جہاں عِصمت بس سے اُترتی تھی۔ عِصمت کوٹھی کی جانب چل پڑتی اور وہ کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سے گزرتا ہُوا آگے بڑھ جاتا.

غالباً یہ سلسلہ ڈیڑھ یا دو ماہ تک رہا تھا. بھلا عِصمت کو اِس کا احساس کیوں نہ ہوتا البتہ اقبال نے یونیورسٹی میں کوئی چھچھورا پن نہیں کیا تھا اور کسی اور پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ عِصمت میں دِلچسپی لے رہا ہے جبکہ کھلنڈرے قسم کے لڑکے کسی سے ذرا سی شناسائی ہوجاتی تو نہ جانے کیا کیا کہانیاں گھڑ لیتے تھے عِصمت کو پہلے تو یہ خوف رہا کہ اب یونیورسٹی میں وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح شرارت بھری نگاہوں کا نشانہ بن جائے گی. لڑکی تھی ہزاروں احساسات رکھتی تھی اور یہ بات بھی اُس کے ذہن میں تھی کہ اقبال خصُوصی طور پر اُس کی جانب متوجہ. فطرت میں شرارت تھی مگر اُس نے کبھی عِصمت سے کوئی شرارت نہیں کی تھی صرف سنجیدگی سے اُس کے آگے پیچھے لگا رہتا تھا اور اُس نے ابھی تک عِصمت کو اُنگلیوں کا نشانہ بننے کا موقعہ نہیں دیا تھا لیکن عِصمت کو خوف تھا کہ بالآخر اقبال کی یہ حرکتیں نوٹ کرلی جائیں گی اور اُس کی مُصیبت آجائے گی وہ جس طرح کی زندگی گزار رہی تھی اُس کے تحت رومانس کی گنجائش بھلا کہاں نکل سکتی تھی. باپ کی عزت کو سنبھالے رکھنا ہی سب سے بڑا فرض تھا۔

کئی بار اُس نے سوچا کہ یونیورسٹی چھوڑ دے لیکن اِس کیلئے بھی دِل نہیں چاہتا تھا عجیب مخمصے کا شکار تھی وہ۔ پھر اُسے احساس ہونے لگا کہ اب وہ اقبال کی عادی ہوگئی ہے. ایک بار اقبال تین دِن تک نہیں آیا تو عِصمت انتہائی پریشان رہی. دِل کو لاکھ سمجھایا لیکن بس نہ جانے کیوں یہ احساس بار بار ذہن میں اُبھرتا رہا کہ کہیں وہ بیمار نہ ہوگیا ہو. چوتھے دِن اقبال واپس آگیا تھا لیکن بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ عِصمت اُس کی مزاج پُرسی کرلیتی. سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اِس کے بعد سے یہ معمولات جاری رہے. اور وہ ذہنی طور پر اقبال کے قریب ہوتی چلی گئی لیکن آج تک کبھی اقبال سے اُس کی کوئی گفتگو نہیں ہُوئی تھی. بس حرکات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دوسروں کی نسبت عِصمت میں اپنائیت محسوس کرتا ہے کبھی کبھی عِصمت مختلف انداز میں بھی سوچنے لگتی تھی جس طرح وہ پوائنٹ کی بس سے اُترتی ہے اور اِس اعلیٰ شان کوٹھی میں جاتی ہے ممکن ہے اقبال اُسے کسی بڑے آدمی کی بیٹی سمجھتا ہو. حضرت کو جب یہ عِلم ہوگا کہ میری اوقات کیا ہے تو تمام دِلچسپیاں خود رُخصت ہوجائیں گی. بالکل فلمی کہانیوں جیسی بات بن جائے گی. کیا یہ بہتر ہوگا۔ یہ بھی تو بہتر نہیں ہے کہ وہ میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہے. سوچتے سوچتے وہ چونک پڑتی تھی اور پھر خود کو نفرین کرنے لگتی تھی کہ لعنت ہے مجھے کیا پڑی ہے کہ احمقوں کے سے انداز میں سوچوں. کبھی کبھی خوف ہوتا کہ کہیں کوئی کوٹھی کے آس پاس اقبال کو دیکھ نہ لے کیا بات بنے گی؟ کیا ہوگا؟ لیکن ابھی تک اُس نے اپنی کیفیتوں کا احساس کسی کو نہیں ہونے دیا تھا۔

یونیورسٹی میں الیکشن کی مہم چل رہی تھی. خُوب ہنگامے ہورہے تھے. کیا لڑکے کیا لڑکیاں سبھی الیکشن کے ہنگاموں میں مصرُوف تھے. عِصمت نے ایسی سنجیدہ لڑکیوں کو بھی الیکشن میں دِلچسپی لیتے ہُوئے دیکھا جو صِرف تعلیم سے غرض رکھتی تھیں اور اُن کے ساتھ کوئی اسکینڈل وابستہ نہیں تھا لیکن الیکشن کے سلسلے میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب نے اِس مہم کو اپنا فرض سمجھ لیا ہو.

عِصمت سے بھی اِس سلسلے میں کچھ کہا گیا تھا لیکن اُس نے معذرت کرلی تھی اور کہا تھا کہ اُس کے پاس اِن ہنگاموں کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اقبال بھی اپنے کسی ساتھی کے لئے کام کر رہا تھا اور خُوب سرگرم نظر آرہا تھا. مخالف گروہوں میں کبھی کبھی جھڑپیں بھی ہوجاتی تھیں اور بعض اوقات ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی تھی.

سرگرمیاں شدت اختیار کرچکی تھیں اور آج الیکشن کا دن تھا. جانا ضروری تھا کیونکہ خاص طور سے اِس سلسلے میں ہدایت کی گئی تھی کہ آج غیر حاضری مناسب نہیں ہوگی اُنہی ساتھیوں کے درمیان ابھی وقت گزارنا تھا. اِس لئے عِصمت یونیورسٹی تو پہنچ گئی لیکن وہاں کی فضا دیکھ کر اُسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی. خاصی کشیدگی پائی جاتی تھی. جگہ جگہ نعرے بازیاں ہورہی تھیں. اور ہُلڑ بازی ہوجاتی تھی. یہ ہُلڑ بازی ایک وقت میں آکر سنگین نوعیت اختیار کرگئی اور خاصا زبردست ہنگامہ ہوگیا. توڑ پھوڑ اور مار پیٹ ہونے لگی اور پھر کہیں سے فائرنگ بھی شروع کردی گئی. لوگ بُری طرح دوڑتے پھر رہے تھے، حالانکہ پولیس کا انتظام تھا لیکن عارضی طور پر پولیس بھی اِس ہنگامے پر قابُو پانے میں ناکام ہوگئی تھی.

ہنگامہ شدید نوعیت اختیار کرگیا تھا اور عِصمت خوف زدہ انداز میں باہر نکل کر ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی تھی اُس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا کئی لڑکوں کو اُس نے زخمی حالت میں دیکھا تھا. پولیس اُنھیں اُٹھا اُٹھا کر ایمبولینسوں میں پہنچا رہی تھی لیکن ہنگامے کی شدت پر قابُو پانا مشکل ہوتا جارہا تھا پولیس نے آنسو گیس پھینکنا شروع کردی اور یونیورسٹی کی فضا دُھواں دھار ہوگئی.

آنسو گیس کے دُھوئیں کی جلن نے عصمت کی آنکھوں کو بھی متاثر کیا تھا. اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے. اور وہ بےبسی سے یونیورسٹی کے بیرُونی گیٹ کی جانب چل پڑی. گیٹ کے قریب ہنگامہ زیادہ تھا لیکن نِکلنے کے راستے وہی تھے اور کس طرف جاتی. اُس نے آج تک یونیورسٹی کے دوسرے حِصّوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کہاں بچاتی اپنے آپ کو؟ ہنگامہ شدید تر نوعیت کا تھا۔ اور پولیس کی کچھ تعداد بڑھ گئی تھی اعلیٰ افسران بھی اپنے اپنے طور پر اِس ہنگامے پر قابُو پانے میں کوشاں نظر آرہے تھے۔

عِصمت کو ٹھوکر لگی. کوئی شخص اُس کے قریب ہی آکر گرا تھا وہ خود بھی اُس کے اُوپر ڈھیر ہوگئی۔ بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا تو اقبال تھا. سر پر شدید ضرب آئی تھی اور پُورا چہرہ خون سے تر بتر ہو رہا تھا. عِصمت کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی. بے اختیار اُس نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے اقبال کے سر کے خُون کو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی. اُس نے دوپٹہ ہی اُتار کر اُس کے زخم پر کس دیا. فوراً ہی ایک پولیس آفیسر جیپ سے اُتر کر اُس کے قریب پہنچ گیا. اور اُس نے عصمت کے شانے پر تھپکی دیتے ہُوئے کہا.

"براہِ کرم آپ ہٹ جائیے. زخمی کو ایمبولینس تک پہنچانا ضروری ہے" عِصمت نے خوف زدہ سی نگاہوں سے پولیس آفیسر کو دیکھا اور پھر نہ جانے کیوں اُس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا. پولیس آفیسر کا چہرہ' یہ چہرہ... یہ چہرہ اُس کا شناسا تھا بہت ہی شناسا. لیکن اُس وقت اُس کی حالت میں جبکہ نہ آنکھیں صحیح طور سے کام کر رہی تھیں نہ ذہن۔ وہ آفیسر کو پہچاننے کی کوشش میں مصرُوف نہ ہُوئی آفیسر نے دو آدمیوں کو قریب بُلایا اور اقبال کو اُٹھوا کر ایمبولینس میں پہنچا دیا وہ خود عِصمت کے قریب ہی کھڑا رہا تھا پھر اُس نے کہا.

"یہ شخص آپ کا ساتھی ہے؟"

"ہاں... نہیں... ہاں..."

"خیر کوئی بات نہیں۔ کیا آپ اُس کے ساتھ ایمبولینس میں اسپتال جانا پسند کریں گی؟"

"ہاں" نہ جانے کیوں عِصمت کے مُنہ سے نکل گیا.

"تو پھر آئیے میں آپ کو بھی پہنچائے دیتا ہُوں یہاں سے چلی ہی جائیں تو بہتر ہے"

"جی... جی. بے حد شکریہ" عِصمت کو یہ بات بہت بہتر محسوس ہُوئی تھی. آفیسر اُس کے ساتھ آگے بڑھ گیا عِصمت نے اب بھی دو تین بار چونک کر اُسے دیکھا تھا پھر وہ کہنے لگی.

"معاف کیجئے گا آپ. آپ کا نام؟ نہ جانے کیوں مجھے آپ شناسا سے لگ رہے ہیں"

"آیئے، ایمبولینس قریب ہی ہے" آفیسر نے کہا اور اِس ایمبولینس میں عِصمت کو بھی بٹھا دیا گیا جس میں اقبال کو بھی رکھا گیا تھا۔ عِصمت کی ذہنی کیفیت خراب ہو رہی تھی پولیس آفیسر کے نقوش بھی اُس کے ذہن میں کُلبلا رہے تھے اور اقبال کا زخمی چہرہ اُسے مضطرب کر رہے تھے۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایمبولینس سائرن بجاتی ہُوئی یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکل آئی اور اب عِصمت کو اُس حادثے کی سنگین نوعیت کا احساس ہُوا تھا۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ اقبال کے ساتھ کیوں جا رہی ہے؟ شناسائی سے زیادہ کوئی بات نہیں تھی۔ اُسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اقبال کہاں رہتا ہے؟ کون سے گھرانے سے اُس کا تعلق ہے؟ اور پھر اور اُس کا دوپٹہ... وہ اقبال کی پیشانی سے بندھا ہُوا تھا... اور خون سے تر بتر تھا۔ عارضی طور پر اُسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ وہ دوپٹے کے بغیر ہے۔ جب کہ اِس سے قبل شاید ساری زندگی میں کبھی وہ اِس قدر بے اختیار نہیں ہُوئی تھی وہ ساری جان سے لرزنے لگی۔ اب کیا ہو گا؟ اسپتال جا کر کیا کہوں گی؟ اور دوپٹہ... بغیر دوپٹے کے گھر کیسے پہنچوں گی؟ بڑی کش مکش میں تھی۔

ایمبولینس ہسپتال کی عمارت میں داخل ہو کر رُک گئی اور جب دروازہ کُھلا تو وہ تیزی سے نیچے اُتر آئی۔ دو وارڈ بوائے اقبال کو نیچے اُتارنے لگے تھے وہ ایک قدم آگے نہ جاتی لیکن دوپٹے کے لئے اُسے آگے بڑھنا پڑا تھا۔ دوپٹہ اِس قدر ناکارہ ہو گیا تھا کہ اب اُسے بقیہ لباس پہ اوڑھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ورنہ باقی لباس بھی خراب ہو جاتا۔ اقبال کو فوری طور پر طبّی امداد دی گئی۔ دوپٹہ کھول دیا گیا اور اُس کے سر پر بینڈیج کی جانے لگی۔ جو ڈاکٹر اُس کی دیکھ بھال کر رہے تھے اُنھوں نے خاص طور سے عِصمت سے پُوچھا۔

"بی بی، یہ آپ کے ساتھ ہیں؟"

"جی ہاں، یونیورسٹی میں میرے ساتھ ہی پڑھتے ہیں۔"

"براہِ کرم آپ اِن کے گھر والوں کو اطلاع دے دیجئے۔ یہ دوپٹہ غالباً آپ ہی کا ہے اِسے رکھ لیجئے۔" عِصمت نے دوپٹہ اُٹھایا۔ اقبال کا سُرخ سُرخ لہُو اُس پہ گلکاریاں کر چکا تھا اُس نے دوپٹے کو ایک کاغذ میں لپیٹا۔ اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ آئی۔ ڈاکٹر یہی سمجھے تھے کہ وہ اقبال کے اہلِ خاندان کو اطلاع دینے کے لئے گئی ہے لیکن عِصمت اب ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں نہیں رُکی تھی۔ بھلا اُسے کیا معلوم کہ اقبال کے اہلِ خاندان کہاں رہتے ہیں؟ کسے اطلاع دیتی؟ خود ہی تلاش کر لیں گے اور پہنچ جائیں گے۔ یونیورسٹی کے ہنگامے کی اطلاع تو بالآخر مل ہی جائے گی اُنھیں۔ دوپٹے کو احتیاط سے سنبھالے ہُوئے وہ ہسپتال کے باہر آ گئی۔ یہاں سے یہ بھی علم نہیں تھا کہ کون سی بس اُس طرف جاتی ہے۔ جہاں احسان احمد کی کوٹھی ہے۔ چنانچہ آٹو رکشہ لیا اور اِس میں بیٹھ کر کوٹھی کا پتہ بتا دیا۔ دِل بُری طرح لرز رہا تھا۔ بمشکل تمام کوٹھی پہنچی۔ رکشہ والے کو پیسے دیئے اور لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالتی ہُوئی اندر داخل ہو گئی۔

کوٹھی میں وہی دھماچوکڑی مچی ہُوئی تھی۔ نُدرت، رِدا، اور ثناء تیمور کے ساتھ باہر لان پر بیٹھی ہُوئی تھیں۔ کلائی پہ بندھی ہُوئی گھڑی میں وقت دیکھا تو ابھی بہت وقت تھا۔ تینوں نے بیک وقت آوازیں لگائیں اور عِصمت اپنے آپ کو سنبھالتی ہُوئی اُن کے پاس پہنچ گئی۔ سب سے پہلے رِدا نے اُس کے لباس پر خُون کے دھبّے دیکھے تھے جن کا پتہ خود عِصمت کو بھی نہیں تھا۔ رِدا بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے عِصمت باجی! آپ کے لباس پر خُون... خُون..."

"خُون..." یہ نُدرت بھی چونک پڑی۔ ثناء بھی کھڑی ہو گئی۔

"اُفوہ! آپ کی تو آستین بھی خُون سے تر بتر ہو رہی ہے۔ کیا ہُوا عِصمت باجی... خیریت... خیریت..." رِدا سمجھی کہ شاید عِصمت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کے عِصمت کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

"نہیں میں ٹھیک ہُوں۔ یہ خُون میرا نہیں ہے۔"

"کک... کیا مطلب؟" رِدا چونک کر بولی۔

"یونیورسٹی میں ہنگامہ ہو گیا تھا۔ گولیاں چل گئی تھیں۔ پولیس نے آنسو گیس کے شیلز پھینکے تھے۔ سب کی بُری حالت ہو گئی۔ ایک طالب علم زخمی ہو کر میرے قریب گرا۔ اُس کے سر سے خُون بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا دوپٹہ اُس کی پیشانی پر کس دیا۔ دیکھو دوپٹے پر کتنا خُون ہے۔ پولیس بے چارے کو ہسپتال لے گئی ہے۔ میں بال بال بچ گئی ورنہ... ورنہ..."

"اوہ! میرے خُدا۔ آپ کے تو کہیں چوٹ نہیں آئی عِصمت باجی؟" رِدا نے پُوچھا۔

"اے میڈم! اے میڈم ذرا پیچھے ہٹیئے میں تلاش کرتی ہُوں عِصمت باجی کی چوٹوں کو۔" ثناء تو تھی ہی شرارت کی پتلی بس یہ الفاظ کافی تھے اُس کے لئے کہ عِصمت نے اپنا دوپٹہ کسی زخمی طالب علم کی پیشانی پر باندھا تھا وہ عِصمت کے سامنے پہنچی ٹھوڑی اُٹھا کر

اُس کا چہرہ دیکھا اور پھر معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر بولی۔

"یہ تو بُری طرح زخمی ہو گئی ہیں۔ چہرے سے پتہ نہیں چل رہا تم لوگوں کو؟"

"ثناء! کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو بے چاری عِصمت باجی اِن حادثات کی عادی کہاں، مجھے تو یہی تعجب ہے کہ یہ خیریت سے گھر کیسے پہنچ گئیں بیٹھئے عِصمت باجی۔ آپ کو واقعی کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں رِدا، شکریہ۔ میں بالکل ٹھیک ہُوں۔ بس یہ دوپٹہ اِتنا گندہ ہو گیا تھا کہ اُسے اوڑھ نہیں سکتی تھی۔ اِس کی وجہ سے بہت پریشانی رہی۔"

"آہ! یہ تو پرچم ہے۔ کسی کے لہُو کی نشانیاں سمیٹے ہُوئے اِس پرچم کو تو محفوظ رکھنا چاہیئے باجی، دیکھئے ناں کسی حریت پسند کا خُون اِس میں ہے۔ اِس سے قیمتی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیوں نُدرت تمھارا کیا خیال ہے؟"

"نہیں ثناء، عِصمت باجی اِس وقت واقعی پریشان نظر آ رہی ہیں ہم اِنھیں چھیڑیں گے نہیں۔"

"دیکھ رہے ہو تم لوگ، ذرا سی دیر میں لوگ کتنے بدل جاتے ہیں یُوں اپنے اور تیرے کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔"

"تو تمھارا کیا خیال ہے نُدرت بھی عِصمت باجی کا مذاق اُڑانا شروع کر دے؟"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ہم ہی غلط ہیں تو محترمہ عِصمت باجی آپ کی کیا خدمت کی جائے اِس وقت۔ کوئی ہلدی چُونا وغیرہ۔ میرا مطلب ہے کیا ہوتا ہے۔ وہ جو دادی امّاں کرتی ہیں جب کوئی چھت سے گر پڑتا ہے؟"

"اب تم فضول باتیں بند کرو گی یا نہیں مالک کی بیٹی... عِصمت باجی آپ کا دوپٹہ دھو دُوں گی۔ آپ جائیے کپڑے تبدیل کیجئے" نُدرت نے کہا اور عِصمت گردن اُٹھا کر اُٹھ گئی۔ رِدا نے اپنا دوپٹہ اُسے دے دیا تھا۔ کافی دیر تک وہ گفتگو کرتی رہیں۔ ثناء نے نُدرت کے ہاتھ سے دوپٹہ لے کر اُسے سُونگھا اور دیر تک سونگھتی رہی۔

"کیسی گندی لڑکی ہے یہ ناک سے لگا لیا خُون بھرے دوپٹے کو،" رِدا کہنے لگی۔

"نہیں مس رِدا میں خُون، اِس خُون کو سُونگھ کر اِس میں رچے ہُوئے جذبات کے بارے میں اندازہ لگا رہی ہُوں۔"

"عِصمت باجی ایسی نہیں ہیں کہ کسی جذباتی چکر میں پھنسیں۔"

"ہاں! اِس کی تائید میں بھی کرتی ہُوں بڑی خشک کی خاتون ہیں وہ،" نُدرت نے کہا۔ ثناء کہنے لگی۔

"نا سمجھ بچیو! جو جتنا سنجیدہ ہوتا ہے اُتنی ہی سنجیدگی سے ایسے جھگڑوں میں پڑتا ہے ذرا تفتیش کرنا پڑے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد عِصمت باجی فارغ ہو جائیں تو ذرا اُنھیں ہمارے حضور پیش کرو۔ ہم اُن کی نبض دیکھیں گے۔ دِل کی دھڑکنیں سُنیں گے زبان اور آنکھیں دیکھیں گے اور پھر تمھیں حقیقتِ حال سے واقف کر دیں گے،" ثناء نے کہا۔ رِدا ہنسنے لگی تھی۔

اُس وقت فرصت ہی فرصت تھی عِصمت کو بُلانے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی ٹہلتی ہُوئی وہاں آ گئی تھی۔

"آیئے عِصمت باجی آیئے۔ بخُدا آپ کے چہرے پر تو پھُول ہی پھُول کھلے ہُوئے ہیں سُرخ رنگ کے پھُول۔"

"کیا مطلب؟" عِصمت نے ثناء کی بات نہیں سمجھی تھی۔

"کسی کے خُون کی لالی ہے یا کیا ہے بھئی؟" ثناء نے نُدرت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمھارا پھرا ہُوا دماغ۔"

"ہاں کسی کے خُون کی لالی ہے یا میرا پھرا ہُوا دماغ... ایں مگر مصرعہ بنا نہیں۔" ثناء بولی اور عِصمت ہنستی ہُوئی بیٹھ گئی۔

"شرارتیں عروج پر ہیں نظر نہ لگ جائے۔"

"ابھی نہیں نظر لگے یا نہیں لگے لیکن لگتا ہے آپ کو لگ گئی ہے عِصمت باجی۔ چھپائیں خُوب چھپائیں خُدا نے چاہا تو ایک دن وہ آئے گا جب خود ہی چیخ چیخ کر ہمیں سارے راز بتا دیں گی۔"

"پاگل ثناء! میرا کوئی راز نہیں جو تمھیں بتاؤں۔ میں تو کبھی تم سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔"

"اللہ۔ اللہ یُوں کہیئے کہ میں تو تمھیں کبھی کوئی بات نہیں بتاتی۔ ذرا ایک بات ایسی بتا دیجئے جو آپ نے مجھے بتائی ہو۔"

"کچھ ہو تو بتاؤں۔"

"اچھا تو یُوں سمجھ لیجئے کہ ہم وکیل ہیں اور آپ ملزم۔ جو سوال کیا جائے اُس کا جواب دیجئے محترمہ عِصمت صاحبہ۔"

"بھئی اِس لڑکی کے سر سے ابھی تک بھُوت نہیں اُترا میں تو یونیورسٹی کے بارے میں سوچ رہی ہُوں لگتا ہے اب کئی دن کے لئے بند ہو جائے گی۔"

"اوہو ہو ہو۔ واقعی بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ اچھا ایک بات بتائیے محترمہ عِصمت صاحبہ۔ جس نوجوان کے سر پر آپ نے اپنا یہ دوپٹہ باندھا تھا اُس کی کیا کیفیت ہے؟"

ہسپتال میں ہے بے چارہ۔ ارے ہاں ایک بہت ہی اہم بات تو میں تم لوگوں کو بتانا بھول گئی۔"

"بطخ کے بچوں کو جھیل میں غوطہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے حضرات۔ دیکھئے عصمت باجی کس خوبصورتی سے ٹریک بدل رہی ہیں۔ ہوشیار ہوشیار۔ انھیں واپس اُسی راستے پر لائیے۔ بات ہو رہی تھی اُس بے چارے کی جو ہسپتال میں پہنچ گیا ہے کون سے ہسپتال میں ہے؟" ثناء نے سوال کیا اور عصمت ہنس پڑی۔

"وکیل صاحبہ۔ ابھی آپ کی پریکٹس ذرا کمزور ہے محنت کیجئے ہو سکتا ہے آئندہ چل کر کامیابی نصیب ہو جائے۔ میں تمھیں ایک بات بتا رہی تھی۔ جس وقت یونیورسٹی میں ہنگامہ ہُوا تو پولیس آگئی... پولیس نے ہنگامے پر قابو پانے کے لئے تمام کوششیں کیں آنسو گیس کے شیلز مارے لاٹھی چارج کی۔ دوسری طرف سے فائرنگ بھی کی گئی۔ اور بہت سے لوگ زخمی بھی ہوئے اُسی وقت جب کہ وہ لڑکا زخمی ہُوا اور اتفاق سے میرے قریب ہی گرا میں نے انسانی ہمدردی کی بناء پر اُس کے زخم کو صاف کیا اور سر پر دوپٹہ باندھ دیا تو ایک پولیس آفیسر میرے قریب پہنچ گیا اُس نے مجھ سے پُوچھا کہ کیا یہ لڑکا میرا ساتھی ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ اُسے ایمبولینس میں ڈال کر ہسپتال پہنچا دیا جائے۔ میں نے کہا جیسی تمھاری مرضی لیکن جانتی ہو اِس پولیس آفیسر کو دیکھ کر میرے ذہن میں کیا خیال آیا؟"

"ایک منٹ۔ ایک منٹ" ثناء نے پھر درمیان میں دخل دیا۔ "حضرات کچھ غلطی ہوگئی۔ معاملہ اِس لڑکے کا نہیں بلکہ کسی پولیس آفیسر کا ہے جسے دیکھ کر اِن محترمہ کے ذہن میں کچھ خیال آیا۔ کیا خیال آیا، بیان کیا جائے۔"

"سُنوگی تو حیران رہ جاؤگی۔ وہ اپنا خیر دین ہے ناں؟"

"آپ کا خیر دین؟" ثناء نے تعجب سے پُوچھا۔

"ثناء پلیز ساری بات سُنو۔ تم یقین کرو یا نہ کرو پولیس آفیسر کی صُورت اِس قدر خیر دین سے ملتی جُلتی تھی کہ میں ایک لمحے کے لئے بھونچکی رہ گئی۔ بڑا پولیس آفیسر تھا بہت شاندار لگ رہا تھا لیکن صُورت شکل خیر دین کی تھی۔

"آئے ہائے خیر دین خیر دین۔ ارے خیر دین، اے نُدرت! یار ذرا غور کرو، کرو! ذرا غور تو کرو خیر دین کی صُورت پر اگر اُسے ایک پولیس آفیسر کی وردی پہنا دی جائے تو کیسا لگے گا بھئی بخدا اِس سلسلے میں مذاق نہیں کر رہی ہے تو وہ ہو نگا مگر شکل وصُورت بڑی اچھی پائی ہے۔ گر آنکھوں میں گالوں تک کاجل نہ لگائے رہے۔ اور بالوں کو ذرا سلیقے سے بنا لیا کرے تو میرا خیال ہے شہزادہ لگے گا شہزادہ۔

تو پھر عصمت باجی وہ پولیس آفیسر آپ سے کیا بولا؟"

"تمھارا سَر" عصمت نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"بھئی مُعاملہ کچھ اور رنگ گیا۔ نُدرت دراصل تُو میرا ساتھ نہیں دے رہی اِس تفتیش میں ورنہ دُودھ کا دُودھ، پانی کا پانی کر دیتی" ثناء نے مُنہ بنا کر کہا۔

"ظاہر ہے تمھاری حماقتوں میں تمھارا کیا ساتھ دے سکتی ہُوں بلاوجہ عصمت باجی کو نشانہ بنا رکھا ہے تم نے" نُدرت نے کہا۔

"خیر... خیر ہم اکیلے ہی کافی ہیں۔ ہاں تو محترمہ عصمت بیگم بیان جاری رہے"

"بس بیان ویان کچھ نہیں۔ چائے پلوانی ہو تو پلواؤ ورنہ میں چلتی ہُوں۔ میں تو اِس لئے آگئی تھی کہ تم لوگ بغیر چائے کے نہ بیٹھی ہوگی اور اِس وقت میرا چائے پینے کا سخت مُوڈ ہو رہا ہے۔"

نُدرت اپنی جگہ سے اُٹھ گئی تھی۔ اُس نے کہا۔

"میں ابھی باورچی خانے میں جا کر جمن کو ہدایت دیتی ہُوں"

"اُسے اب ہدایات کی ضرورت نہیں رہی" ثناء بڑبڑانے سے باز نہیں رہ سکی تھی۔ نُدرت ہنستی ہُوئی چلی گئی۔ ثناء کہنے لگی۔

"چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ جمن بے چارے پر اب بھی نگاہ کرم ہے حالانکہ وہ تو تائب ہو چکا ہے"

"ثناء! آج تم پر کچھ زیادہ ہی بھوت سوار ہے" نُدرت نے کہا۔

"ہم پر تو صرف تیمور سوار ہے۔ آؤ یار اِس ساری دُنیا میں صرف تم ایک سچے ہو باقی سب جھُوٹ، فریب" ثناء نے تیمور کو گود میں اُٹھا کر چُومتے ہُوئے کہا۔

چائے آگئی پی گئی اور اِس کے بعد یہ محفل برخاست ہوگئی۔

اُن لوگوں کو کوٹھی کے اُس حصّے میں منتقل ہو جانا پڑا تھا جو احسان احمد صاحب نے اُن کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہاں اُنھیں بہت عجیب لگتا تھا۔ ہر چیز امارت کی مظہر تھی بیش قیمت قالین بیش قیمت مسہریاں۔ ایک سے ایک شاندار ڈیکوریشن پیس جس کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ عصمت نے تو خیر کچھ ایسا وقت دیکھا بھی تھا جب یہ تمام چیزیں اُن کے ہاں بھی تھیں اتنی نہیں تو اُن سے کچھ کم لیکن نُدرت کے لئے یہ سب اجنبی اجنبی سا تھا وہ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی اور دونوں ہی نے باپ کی تربیت کا پُورا پُورا مظاہرہ کیا تھا۔ یعنی اُن کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ سب اُن کا ہے یا اگر وہ چاہیں تو ہو سکتا ہے بلکہ وہ اِس بات پر خوش تھیں کہ غلام احمد صاحب نے بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اور اُن لوگوں کو مُصیبت سے بچا لیا تھا۔ عصمت اور نُدرت اب بھی صفائی کرتی تھیں بلکہ اُنھوں نے کوٹھی کی صفائی کی ذمّہ داری اپنے شانوں پر لے لی تھی۔

معمُولات سے فارغ ہونے کے بعد عصمت جھاڑن لے کر کمروں میں گھُس گئی اور ایک ایک چیز کو صاف کرنے لگی۔ یہ تمام ذمّہ داریاں اُس نے اپنے سَر لے لی تھیں۔ نُدرت بھی اُس کا ہاتھ بٹاتی تھی لیکن ذرا کم ہی کم۔ وہ فطرتاً کاہل تھی۔ شوکت جہاں بھی کام کرتی تھیں۔ اور اُن لوگوں کے رویے سے ذرا بھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اُنھیں اپنی موجودہ حیثیت کا کوئی خیال ہے۔

عصمت رات کو جب بستر پر لیٹی تو نہ جانے کیوں اُس کے ذہن کے پردوں پر دِن کے واقعات اُبھر آئے۔ اقبال زخمی ہے۔ ہسپتال میں ہے۔ پتہ نہیں اُس کے گھر والوں کو اُس کے بارے میں علم ہُوا یا ابھی تک نہیں۔ نہ جانے اُس کے پاس کوئی ایسی شناخت کی چیز موجود تھی یا نہیں۔ جس سے اُس کے اہلِ خاندان اُس تک پہنچے ہُوں۔ کہیں سَر کا زخم شدید نہ ہو۔ آخر انسان ہے۔ اُس کا یونیورسٹی کا ساتھی ہے انسانی ہمدردی کی بناء پر اتنا تو ہونا ہی چاہیئے۔ غلطی ہوگئی جس طرح بھی ممکن ہو سکتا اُس کے گھر والوں کو اُس کے زخمی ہونے کی اطلاع دینی چاہیئے تھی لیکن میں کیا کرتی، کس طرح جاتی، یہ ہو سکتا تھا کہ گھر آ کر اِس سلسلے میں کوشش کرتی۔ کمبخت ثناء نے مذاق اُڑا اُڑا کر دماغ سے ساری باتیں نکال دیں۔ اگر ذرا بھی ہمدردی کا اظہار کرتی تو وہ نہ جانے کیا بات کا بتنگڑ بنا دیتی ورنہ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میں سب سے کہتی کہ ذرا چل کر اِس بے چارے کے گھر والوں کو اِس بارے میں اطلاع دے دی جائے۔

وہ نہ جانے کب تک اقبال کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ دل میں بار بار دُکھ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ ایک دو بار اِس احساس سے چونکی بھی تھی۔ اور اپنے بارے میں غور کیا تھا لیکن ذہن کے کسی گوشے میں کوئی ایسا تصور نہیں تھا جو اُس کے چہرے کی سُرخی بن جائے۔

نہ جانے کب اُسے نیند آئی تھی۔

● احسان احمد صاحب نے پُوری طرح حالات پر قابو پا لیا تھا۔ کارکردگی تیز کر دی گئی تھی لیکن خُرم کے بارے میں وہ گہری سوچوں میں ڈُوبے ہُوئے تھے۔ اِس سلسلے میں کوئی مناسب قدم اُٹھا لینا ازحد ضروری تھا کیونکہ خُرم کے سپرد جو ذمّہ داریاں تھیں۔ وہ کافی اہمیت کی حامل تھیں۔ جس قسم کے خیالات کا مظاہرہ آفندی کر چکا تھا وہ بے حد تشویشناک تھے۔ اُس کے مفادات کو ضرب پہنچی تھی۔ چنانچہ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اور پھر احسان احمد جانتے تھے کہ... محمُود علی آفندی کو جو ضرب اُٹھانی پڑی ہے وہ اُنھیں چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ پھر وہ اُن کا ایک چہرہ کیوں اپنے ساتھ لگائے پھرتے چنانچہ خاموشی سے اُنھوں نے اکاؤنٹنٹ کو ہدایات دے دی تھیں۔ اور خُرم کے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی جا رہی تھی۔

ایک دوپہر کو لنچ کے وقت اچانک احسان احمد صاحب نے منیجر کو طلب کر لیا۔ منیجر لنچ کے لئے فرم سے باہر نہیں جاتا تھا۔ احسان احمد کے اردلی نے اُسے احسان احمد کا پیغام دیا تو وہ اُن کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ احسان احمد نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خُرم بیٹھ گیا تھا۔

"آپ سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں منیجر صاحب!"

"جی میں حاضر ہُوں فرمائیے!"

"جو معاملات آج کل چل رہے ہیں کیا آپ اُنھیں پوری ذمّہ داری سے انجام دے رہے ہیں؟"

"میں سمجھا نہیں صاحب آج تک میں نے جو کچھ کیا ہے اِس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"آج تک تم جو کرتے رہے خُرم میں نے کبھی اِس پر غور بھی نہیں کیا۔ نہ میں اِس قسم کا آدمی ہُوں کہ کسی کی ذمّہ داریوں میں دخل اندازی کروں لیکن جب یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی شخص مجھ سے یا میرے معاملات سے مخلص نہیں ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ میں اُس کی جانچ پڑتال کروں۔ تمھارے بارے میں یہ اطلاع مجھے کافی دِن پہلے مل گئی تھی، چونکنے کی ضرورت نہیں، میں تمھیں تفصیل بتا دُوں۔ تمھیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے صرف کسی کے کہنے پر عمل نہیں کیا بلکہ اپنے طور پر بھی کچھ چھان بین کی ہے۔ پچھلے دنوں جو معاملات چل رہے تھے اُن سے تم بھی میری فرم کے تمام لوگ ہی واقف تھے لیکن کسی نے میرے خلاف سازشوں کا آغاز نہیں کیا وہ سب تقدیر پر شاکر رہے۔ خُدا کا شُکر ہے کہ احسان لمیٹڈ اسی انداز میں بلکہ میرا خیال ہے پہلے سے بہتر انداز میں دوبارہ اپنا کام شروع کر چکی ہے لیکن کیا میں ایک ایسے شخص کو اتنے اہم عہدے پر رہنے دے سکتا ہُوں جس نے میرے حالات خراب ہوتے ہی اُن لوگوں سے ساز باز شروع کر دی جو اپنی دانست میں اپنے آپ کو اِس فرم کا مالک سمجھ بیٹھے تھے؟"

فرم کا منیجر بُری طرح چونکا تھا۔ لیکن پھر اُس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں جناب!"

"تمھاری یہ بات کر رہا ہوں مسٹر خرم، تم محمود علی آفندی کے دستِ راست بن گئے۔ تم نے پہلے ہی تمام حسابات کی جانچ پڑتال شروع کر دی تاکہ اگر تمھارا نیا باس تم سے یہ پوچھے کہ فرم کے معاملات کس نوعیت کے تھے اور وہ کہاں کہاں کیا کیا کر رہی تھی تو تم اُسے تمام حسابات پیش کر سکو بلکہ میری خامیاں بھی اُس کے سامنے لاؤ جس کی وجہ سے مجھے دقتیں پیش آئیں۔"

"جناب یہ غلط فہمی ہے آپ کی۔"

"خیر اسے چھوڑو۔ بہرطور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس دوران میں تم محمود علی آفندی کو میرے بارے میں تمام تفصیلات بتاتے رہے ہو اور یہ بھی بتا دیا تھا تم نے کہ میں فرم محمود علی آفندی کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوں۔"

"جناب یہ بات تو آپ نے سب کو بتائی تھی۔"

"لیکن اِن میں سے کوئی محمود علی آفندی کے گھر نہیں پہنچا۔"

"م م... میں... میں..." خرم بوکھلا گیا تھا۔

"خیر ہر شخص اپنا بہتر مفاد سوچتا ہے تم نے اگر یہ سوچا کہ محمود علی آفندی سے مراسم بڑھاؤ تو میرے خیال میں یہ بُرا نہیں تھا لیکن اُس وقت تک جب تک میں نے فرم کے معاملات... محمود علی آفندی کو منتقل نہیں کئے تھے تمھاری یہ بھاگ دوڑ میرے لئے پسندیدہ نہیں تھی اور میں زیادہ گفتگو کرنے کا عادی نہیں ہوں تمھیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اِن سرگرمیوں کے سلسلے میں میرا ذہن تمھاری طرف سے خراب ہو گیا ہے اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تمھیں تمھاری ذمّہ داریوں سے سُبکدوش کر دیا جائے۔ چنانچہ مسٹر خرم! تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ آج سے ہمارے اور تمھارے درمیان اِس قسم کے تمام معاملات ختم ہو گئے۔ یہ تمھارا فائل موجود ہے۔ تمھارے واجبات کے چیک بنا دیئے گئے ہیں۔ براہِ کرم انھیں وصول کر لو اور اگر ہم پر کچھ باقی رہ گیا ہو تو ہمیں اِس کی تفصیلات مُہیا کر دو۔"

مینجر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ کئی منٹ تک اُس کے مُنہ سے آواز بھی نہیں نکل سکی تھی بمشکل تمام اُس نے اپنے حواس مجتمع کر کے کہا۔

"آپ کو... آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہُوئی ہے۔ احسان صاحب کسی دُشمن نے آپ کو بھڑکا دیا ہے براہِ کرم تحقیقات کیجئے، غور کیجئے۔ اور اُس کے بعد فیصلہ کیجئے میں تو... میں تو بے موت مر جاؤں گا۔"

"مسٹر خرم! بدقسمتی ہے میری کہ زندگی میں پہلی بار مجھے کسی کے ساتھ یہ کارروائی کرنی پڑی ہے ورنہ بھائی میں اِس کا عادی نہیں ہوں۔ زندگی بھر ساتھ نبھانا جانتا ہوں لیکن غدّاری کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے میرے بُرے لمحات دیکھ کر فوراً اپنے بارے میں سوچا اور فائدہ اُٹھانے کے لئے ناجائز طریقے اختیار کئے۔ میرے ایک ایسے مخالف کو آپ نے مدد دی جو اِس وقت میرے لئے سب سے بڑا دُشمن ثابت ہو سکتا ہے۔ اُسے نظر انداز نہیں کر سکا بھائی مجھے معاف کر دینا جو فیصلہ میں نے کیا ہے وہ آخری ہے اور میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے فیصلے کئے ہیں۔"

"آپ تھوڑی سی مُہلت دیجئے مجھے سوچ لیجئے احسان صاحب!"

"نہیں میرا خیال ہے اب مزید وقت ضائع کرنا نہ تمھارے لئے بہتر ہوگا نہ میرے لئے۔ تم جا سکتے ہو۔" احسان صاحب نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ خرم کی حالت بُری ہو گئی تھی جو کچھ کیا تھا اُس پر پچھتا رہا تھا یہ حقیقت تھی کہ بے گُناہ نہیں تھا۔ چنانچہ اب کیا کہتا، خاموشی سے فائل بغل میں دبا کر نکل گیا تھا۔ احسان صاحب کو واقعی تھوڑا سا افسوس ضرور ہُوا تھا کیونکہ وہ اِن تمام چیزوں کے عادی نہیں تھے۔ لیکن خرم کے ساتھ یہ سُلوک لازمی تھا اِس لئے وہ مجبُور تھے۔

کافی دِنوں تک وہ خود بھی اِس بارے میں سوچتے رہے تھے۔ مینجر کی ضرورت کو ذہن سے نہیں نکال سکتے تھے کیونکہ کاروبار کو بڑھانے کے لئے وہ تمام تر ذمّہ داریاں اپنے شانوں پر قبُول نہیں کر سکتے تھے۔ خیر۔ مینجر کا انتظام ہو ہی جائے گا انھوں نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا اور کام میں مصرُوف ہو گئے۔

شام کو گھر واپس لوٹے کوٹھی کی فضا میں وہی رونق وہی قہقہے چل رہے تھے۔ عارفہ بیگم کے واپس آ جانے سے تقریباً فضا میں پہلے جیسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ باقی لوگ تو اپنے طور پر زندگی گزارنے کے عادی تھے لیکن عارفہ بیگم، طفیلی بیگم اور یہ چند لوگ ذرا زندگی سے بھرپُور تھے اور کچھ نہ کچھ حرکتیں کرتے رہتے تھے۔

جمن کے باورچی خانے میں واپس آنے کے بعد لڑکیوں کو بھی فراغت ہو گئی تھی اور اُس وقت بھی وہ لان پر بیٹھی ہُوئی خوش گپیوں میں مصرُوف تھیں۔ احسان صاحب کے دِل میں نجانے کیا سمائی کہ وہ اُنہی کی جانب چل پڑے بس طبیعت پر ذرا اضمحلال طاری ہو گیا تھا۔ دُنیا پر نہ ظاہر کرتے تو دوسری بات تھی اور ظاہر کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ساری ذمّہ داریاں اُنہی کے شانوں پر تھیں۔ شہاب کے بارے میں کبھی سوچتے تو دِل میں دُکھن ہونے لگتی۔ بُرا کیا اُس نے میں نے تو اُسے اپنے بیٹے کی جگہ سمجھا تھا اور دُنیا بھر کی ذمّہ داریوں سے پاک رکھا تھا

اِن تمام باتوں کو سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ خوش رہنا چاہتے تھے اِس لئے اِس وقت لڑکیوں کے پاس آ کر بیٹھ گئے ثناء بہت خوش ہو گئی تھی۔ اُس نے بڑے پیار سے باپ کو دیکھا اور بولی۔

"ابّو۔ آپ اب شام کی چائے ہمارے ساتھ لان پر ہی پیا کریں۔ کیا آپ کو خوشی نہیں ہوتی ابّو کہ اِن تمام جھگڑوں سے بچنے کے بعد آپ کو کچھ وقت مِل جاتا ہے۔ دیکھئے ناں کاروبار تو تمام زندگی کے ہوتے ہیں۔ اِن میں پھنس کر انسان اپنے آپ کو بھی بھُول جائے تو کہاں کی دانشمندی ہے۔ کب سے ہم سوچ رہے تھے کہ آپ کو فرصت مِلے تو آپ کے ساتھ بیٹھیں گپ شپ کریں۔ میں اِن سب کو بتا چکی ہوں کہ میرے ابّو کس قسم کے آدمی ہیں۔ کاروبار میں مصرُوف نہ ہوں تو بہت خوش مزاج اور بڑے اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں۔"

"ہاں بھئی غلطی ہو گئی دراصل ہمیں بہت پہلے ہی یہ سارے کاروبار بند کر دینے چاہئیے تھے تاکہ تمھارے ساتھ بیٹھنے کا وقت ملتا۔" احسان احمد صاحب ہنستے ہُوئے بولے۔

"نہیں ابّو! میں یہ نہیں کہہ رہی۔ میرا مطلب ہے۔ اب جو آپ کو تھوڑی بہت فرصت ہے کتنا اچھا لگ رہا ہے اِس وقت آپ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ رِدا، ثناء، ندرت تم ابّو سے بات کرو گی تو بہت خوش ہو گی۔ میرے ابّو بڑے اچھے لطیفہ گو ہیں پہلے تو یہ ہمیں بہت سے لطیفے سُنایا کرتے تھے لیکن اب کچھ دِنوں سے اِنھوں نے لطافت چھوڑ دی تھی۔"

"واہ۔ واہ بڑی بلیغ زبان بولنے لگی ہو ثناء آج کل تمھاری شرارتیں کچھ کم ہو گئی ہیں۔ کیوں بھئی تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ یہ تمھاری تربیت کا اثر ہے یا پھر یہ لڑکی بڑی ہو گئی ہے؟"

"نہیں انکل، اب یہ سیانی ہو گئی ہے میں خود بھی آپ سے اِس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی تھی۔" ندرت نے کہا۔

"ہاں بھئی ضرور، کیسی گفتگو؟" احسان احمد صاحب بھی ندرت کو دیکھتے ہُوئے بولے۔

"انکل! بچیاں جب سیانی ہو جائیں تو پھر اُن کے ہاتھ پیلے کر دینا مناسب ہوتا ہے۔ آپ اِس کے ہاتھ پیلے کر دیجئے۔ پیلا رنگ لے کر آؤں میں؟" ندرت نے کہا اور احسان احمد صاحب ہنسنے لگے۔

"ہاں۔ ہاں تم نے بالکل صحیح یاد دلایا، پیلے رنگ کا بندوبست اب تو خود ہی کروں گا..." احسان احمد صاحب بولے۔

"اے اللہ رکھی۔ نمبر بنا رہی ہے اپنے۔ ابّو! یہ اپنے آپ کو بہت زیادہ ذہین اور چالاک سمجھتی ہے۔ اِس کی تمام حرکتیں آپ کے سامنے رکھ دُوں تو آپ بھی حیران رہ جائیں ندرت! چلو جمن سے کہو کہ ابّو کے لئے چائے لے آئے۔ جاؤ جمن تمھارا انتظار کر رہا ہوگا۔" ثناء نے کہا اور ندرت بھیگی بِلّی سی رہ گئی۔ ثناء نے در پردہ اُسے جمن کے نام کی دھمکی دی تھی اور ثناء کی زبان کے آگے لگام بھی نہیں تھی۔ نہ جانے کیا کہہ بیٹھتی چنانچہ وہ با دلِ ناخواستہ اُٹھی اور اندرُونی حصّے کی جانب چل پڑی۔ احسان احمد صاحب اطمینان سے بیٹھ گئے تھے پھر وہ بولے۔

"بھئی اگر چائے پلوا رہی ہو تو دوسرے لوگوں کو بھی بُلا لو۔ ندرت سے کہہ دیتیں باقی سب لوگوں کو بھی بُلاتی لائے۔"

"آ جائیں گے ابّو۔ ہم سے تو کچھ دیر باتیں کریں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ کیا گفتگو ہو رہی تھی تم لوگوں کے درمیان؟" احسان صاحب بولے۔

"ابّو! میں سوچ رہی ہُوں کہ کوٹھی کی فضا میں ویسے ہی کچھ اُلجھنیں پیدا ہو گئی ہیں دوسرے لوگوں کو ہم یہاں کیوں جگہ دیں بلاوجہ ذمّہ داریاں ہی بڑھتی ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔" احسان صاحب حیرت سے ثناء کو دیکھتے ہُوئے بولے۔

"رِدا آپ سے درخواست کرنا چاہتی ہیں ابّو کہ اب یہ ہمارا گھر چھوڑنا چاہتی ہیں۔ ٹھیک تو ہے۔ اِنھیں یہاں رہتے ہُوئے کافی دِن ہو چکے ہیں۔"

"بھئی اگر یہ مذاق بھی ہے تو بہت بیہودہ مذاق ہے۔" احسان احمد رِدا کو دیکھتے ہُوئے بولے۔ رِدا مُسکرا رہی تھی۔

"نہیں نہیں ابّو انسان کے اپنے حالات ہوتے ہیں... محترمہ رِدا! آپ نے کہا تھا کہ میں ابّو کے سامنے یہ بات کہہ دوں۔ میں نے آپ کی موجودگی میں آپ کی خواہش ابّو تک پہنچا دی۔" ثناء نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"وہ انکل آپ میری مدد کیجئے یہ ثناء تو پاگل ہے پاگل۔ دیکھئے انکل میرے سامنے میرا پُورا مستقبل پڑا ہُوا ہے تیمور کے لئے بہت کچھ کیا جا رہا ہے یہاں لیکن آپ بتلائیے کچھ عرصے کے بعد یہ بڑا ہو جائے گا اِس کی ذمّہ داریاں بھی مجھ پر آئیں گی۔ یہ محترمہ تو کبھی نہ کبھی اپنے گھر چلی جائیں گی اُس کے بعد کیا ہوگا؟ میں یہ نہیں کہہ رہی انکل کہ آپ لوگ مجھے نکال باہر کریں گے لیکن انسان اپنے آپ سے جو کچھ کر لیتا ہے کیا اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی؟"

"بالکل ہوتی ہے بیٹے۔ میں نے کب منع کیا۔"

"انکل میں تو قیصر صاحب کی فرم میں کام کرتی تھی وہ فرم بند ہوگئی اب میں چاہ رہی ہوں کہ کوئی ملازمت تلاش کروں۔ بہت عرصہ ہوگیا بیکار رہتے ہوئے مجھے تو عادت سی پڑگئی ہے۔ بس اتنا تذکرہ کیا تھا کہ یہ ثناء بی بی بگڑ گئیں شروع ہی سے بگڑتی چلی آئی ہیں میری ملازمت کے سلسلے میں لیکن آپ انہیں سمجھائیے کہ میرے اور اُن کے حالات میں بہت فرق ہے۔"

"ہاں ہاں۔ بالکل بالکل ہے۔ تم کہیں جھاڑو برتن کا کام کرو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے ظاہر ہے لوگ یہ تو نہیں کہیں گے کہ میری کوئی رشتے دار ہے۔ بس لوگ جانتے ہیں کہ کہیں اور سے آئی تھیں اور یہاں آکر آباد ہوگئیں۔"

"جھاڑو برتن کیوں کروں پڑھی لکھی ہوں ملازمت کرونگی۔ کیا کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں ملے گی مجھے؟"

"تو پھر کرو ناں۔ کون منع کر رہا ہے۔" ثناء چڑ کر بولی۔

"بھئی اس سلسلے میں تو میں رِدا سے متفق ہوں معاف کرنا بُرا مت ماننا اگر رِدا کچھ کرنا چاہتی ہے بیٹے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"سوچ لیں ابو آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ثناء نے کہا۔

"سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہا ہوں ثناء رِدا اگر کچھ کرنا چاہتی ہے تو میرے خیال میں اُسے اُس کی پوری پوری اجازت ہونی چاہیئے۔"

"تو پھر میں بھی ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔" ثناء نے کہا۔

"آپ... آپ کس کا سر پھوڑیں گی؟"

"کیوں کیا میں جاہل ہوں؟"

"نہیں بھئی جاہل تو نہیں ہیں آپ مگر آپ کے لئے ملازمت میرا خیال ہے دنیا کا سب سے مشکل کام ہوگی۔"

"آخر کیوں؟ جواب دیجئے ابو۔"

"بھئی میں کسی پرائے کی نوکری تمہیں کہاں سے دلاؤں گا اور ظاہر ہے ماتحتی میں تم کسی کے کام کر نہیں سکتیں اگر تمہیں کسی فرم وغیرہ میں ملازمت دلا دی گئی تو ظاہر ہے فرم کا بیڑا غرق ہوجائے گا۔ دس دس مارے جائیں گے اور... کیوں بھئی رِدا میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"بالکل ٹھیک انکل بالکل ٹھیک۔ یہ تو خیر ضد کی بات ہے لیکن اب جب انکل آپ کے سامنے تذکرہ نکل ہی آیا ہے۔ تو میں آپ سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ براہ کرم اپنے تعلقات سے کام لے کر مجھے کسی جگہ ملازمت دلا دیجئے۔" دفعتاً ہی احسان احمد چونک کر رِدا کو دیکھنے لگے تھے۔ چند لمحات غور کرتے رہے پھر بولے۔

"رِدا بیٹے توقیر کی فرم میں تم کس حیثیت سے ملازم تھیں؟"

رِدا اس ملازمت کی تفصیلات بتانے لگی۔ احسان صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا۔

"بھئی اگر آزمائشی وقفے کے لئے تم چاہو تو احسان لمیٹڈ میں ملازمت کرسکتی ہو۔"

"ابو کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ثناء جھلا کر بولی۔

"بھئی کام کی بات کرنے دو۔ تم چُپ ہوجاؤ۔" احسان احمد صاحب بولے اور پھر کہنے لگے۔

"میری فرم میں منیجر کی ضرورت ہے اور پرانے منیجر کو میں نے نکال دیا ہے۔ رِدا واقعی اگر تم اس سیٹ کو سنبھالو اور اس پر کنٹرول کرلو تو میرے خیال میں یہ بہترین ہوگا۔"

"میں تیار ہوں انکل آپ اس سلسلے میں مجھے پندرہ یا بیس دن کا آزمائشی موقعہ دیں اگر میں اس معیار پر پوری اتروں تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی حرج بھی نہیں ہے ظاہر ہے ہمیں وہی کام کرنا چاہیئے جو ہم کرسکتے ہوں میرا خیال ہے مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میں اب تھوڑا سا تجربہ بھی حاصل کرچکی ہوں۔ آپ دیکھ لیجئے مجھے کوئی حرج نہیں ہے۔"

"تو بس یوں سمجھ لو کہ تمہارا عارضی اپائنٹمنٹ ہوگیا لیکن بھئی اگر تم اپنی پوزیشن نہیں سنبھال سکیں تو ہم تم سے معذرت نہیں کریں گے تمہیں اصولی طور پر اپنی سیٹ چھوڑنا ہوگی۔"

"میں تیار ہوں انکل خدا کی قسم میں تیار ہوں۔" ثناء نے پُرجوش لہجے میں کہا ثناء منہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔

"تیمور دیکھ رہے ہو اس دُنیا کے رنگ کوئی بھی کسی کو مفت میں کھلانے کے لئے تیار نہیں ہے اور پھر ہمارے ابو جان تو سو فیصد کاروباری آدمی ہیں سوچتے ہوں گے کہ اسی طرح کم پیسوں کا منیجر مل جائے گا چلو یار چھوڑو۔ دنیا جہاں جانا چاہتی ہے جائے ہمیں کیا ہماری تمہاری محبت سچی ہے بس اتنا ہی کافی ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد ندرت واپس آگئی اور اُن لوگوں کی گفتگو میں شامل ہوگئی۔ چائے پینے کے بعد احسان صاحب نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"رِدا کل صبح تیار رہنا میرے ساتھ ہی تمہیں آفس چلنا ہوگا۔"

"میں تیار رہوں گی انکل۔" رِدا نے خوش ہوکر جواب دیا۔

● بیانہ ڈی آئی جی منور علی بیگ اپنے اہل خاندان کے ساتھ ڈائننگ روم میں صبح کا ناشتہ کر رہے تھے کہ باہر سے کچھ آوازیں اُبھریں اور پھر محمود علی آفندی صاحب نے ڈائننگ روم میں جھانکا

"بھئی بے شک میں مانتا ہوں کہ اس طرح جنگلی بلوں کی مانند کسی کے گھر میں گھس آنا بدتہذیبی اور بداخلاقی ہے۔ لیکن مجبوری کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ کیا میں اندر آجاؤں؟"

"آجائیے۔ آئیے آفندی صاحب آئیے۔ بھلا آپ کے لئے بھی یہ گھر غیر ہوسکتا ہے۔" منور صاحب نے پُراخلاق انداز میں کہا۔ جب کہ تصور کا منہ بن گیا تھا۔ سب نے محمود علی آفندی کو ناشتے پر خوش آمدید کہا۔

"میں صرف چائے پیوں گا۔ ذہنی طور پر اتنا ہی اُلجھا ہوا ہوں کہ بیان نہیں کرسکتا۔"

"ناشتہ کریں محمود علی ناشتہ کریں، بہت زیادہ اُلجھنیں پالنا بھی صحت کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔ اطمینان سے ناشتہ کریں۔ اس کے بعد آپ کی پریشانیوں کا حل بھی تلاش کرلیا جائے گا۔"

"خاک دریافت کرلیا جائے گا۔ یہ تمہارے صاحبزادے بس کیا کہوں انہیں میاں ایک زمانے میں پولیس زمین کی گہرائیوں سے مجرموں کو تلاش کر لیتی تھی۔ آسمان کی بلندیوں سے اُسے پکڑ لاتی تھیں لیکن آج رنگ ہی بدل گیا ہے کوئی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ کمال ہے۔" آفندی صاحب بگڑے ہوئے لہجے میں بولے۔

"میرا خیال ہے انسان کو خالی پیٹ ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہیئے مضر اثرات ہوتے ہیں ناشتہ کرو اُس کے بعد باتیں کریں گے۔" آفندی صاحب گردن ٹیڑھی کرکے ناشتے میں مصروف ہوگئے۔ تصور سنجیدہ صورت بنائے بیٹھا ہوا تھا ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے کہا۔

"تو پھر مجھے اجازت۔ آج ذرا..."

"دیکھو میاں تمہارے باپ سے میرے جیسے تعلقات ہیں نا' اُن کے تحت میں بالکل لحاظ نہیں کروں گا کہ تم کوئی پولیس آفیسر ہو۔ کان پکڑوں گا تمہارا اور مرغا بنادوں گا۔"

"جی۔" تصور نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تصور سُن لو محمود کیا کہہ رہے ہیں۔ چلو دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔" آئی۔ جی صاحب خود بھی اُٹھ گئے۔ تصور بھی خاموشی سے اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ آفندی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو تصور کہنے لگا۔

"آپ یقین کیجئے آفندی صاحب میں نے احسان احمد صاحب کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرلی ہیں دولت انہیں اپنے ذرائع سے حاصل ہوئی ہے اور انہوں نے اسی سے آپ کے واجبات ادا کردیئے ہیں۔ کہیں کسی بھی جگہ کوئی ایسا لنک نہیں مل سکا۔ جس سے یہ اندازہ ہو کہ شہاب صاحب سے اُن کا کوئی رابطہ ہے یا شہاب کے کئے ہوئے فراڈ میں وہ بھی ملوث ہیں۔ اگر ایسا ہی کوئی معاملہ ہوتا تو جو رقومات انہوں نے ادا کی ہیں اُن کی مالیت کوئی اٹھتر کروڑ روپے بنتی ہے یہ اٹھتر کروڑ روپے بھی انہوں نے بالآخر کہیں نہ کہیں سے ادا کئے ہی ہیں۔ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے آپ کے ادا کردیئے تو یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا اُن کے لئے۔ اُن کی ساکھ اب بھی کافی بڑی ہے اور میرا خیال ہے وہ ابھی کوششیں کریں تو کروڑوں روپے کی رقم اب بھی اپنی ساکھ پر کہیں نہ کہیں سے حاصل کرسکتے ہیں۔"

"لعنت بھیجو میاں جو غرق ہوا اُسے جہنم میں ڈالو۔ اب مجھے احسان لمیٹڈ کے سلسلے میں کوئی تشویش نہیں ہے میری رقم مجھے مل گئی میں نے تمام چیزوں پر لعنت بھیج دی۔"

"سُبحان اللہ۔ لعنت بھیج ہی دینا چاہیئے اُن چیزوں پر جن سے ہمارا کوئی تعلق نہ ہو۔ آپ نے یہ خوشخبری سُنائی ہے مجھے آفندی صاحب۔"

"میں اس وقت ایک اور سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں تصور۔ دیکھو بیٹے کچھ تو کرو میرے لئے میں اتنا پریشان ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

"خیریت خیریت' وہ کیا سلسلہ ہے؟"

"کل کا اخبار۔ کل کا اخبار دیکھا تم نے؟"

"تقریباً تمام۔ ویسے آپ کون سے اخبار کی بات کر رہے ہیں؟"

"یہ دیکھو۔" آفندی صاحب نے جیب سے پچھلے دن کا مُڑا تُڑا اخبار نکال کر سامنے رکھ دیا۔ ایک اشتہار پر انہوں نے سُرخ پنسل سے حاشیہ بنایا ہوا تھا۔ تصور کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اُس نے جھک کر اشتہار پڑھا۔

"رِدا میں بیمار ہوں پرانی رنجشیں بھلا دو مجھ سے ملو رِدا۔ میں نیشنل اسپتال میں اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہا ہوں۔ اُمید ہے کسی مرتے ہوئے آدمی سے ملنے میں تم اپنی شان میں کوئی کمی محسوس نہیں کروگی۔" ثاقب۔

"اس اشتہار کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"ہاں۔" محمود علی آفندی نے کسی مضمحل لہجے میں کہا۔

"اس اشتہار سے آپ کو کیا تکلیف پہنچی ہے آفندی صاحب؟"

"آہ! یہ تفصیل ابھی مت پوچھو میں تمہیں مختصراً کچھ اور بتاؤں۔ کل میں نیشنل اسپتال کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ ثاقب نامی کوئی شخص بھی وہاں داخل نہیں ہے۔"

وہ مجھے نیشنل اسپتال میں نہیں ملا تو میں نے دوسرے اسپتالوں میں اس کی تلاش شروع کردی لیکن حیرت کی بات ہے کسی بھی بڑے اسپتال میں وہ موجود نہیں ہے۔ میں نے ذاتی تعلقات کی بناء پر پوری طرح معلومات حاصل کرلی ہیں۔"

"شاقب زردا... پہلے یہ بتایئے آفندی صاحب پہلے یہ بتایئے کہ ان دونوں ناموں سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" تصور نے گہری نگاہوں سے محمود علی آفندی کو دیکھتے ہوئے کہا اور آفندی صاحب کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آرہے تھے۔ تصور علی بیگ متجسس نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ غالباً محمود علی آفندی اِس تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کررہے تھے۔

الیکشن کے ہنگامے عارضی نوعیت کے تھے۔ چند روز ہنگامے رہے یونیورسٹی بند رہی پھر حالات معمول پر آگئے۔

یونیورسٹی کھل گئی اور عصمت بھی کئی دن کے بعد یونیورسٹی چل پڑی۔ تعلیمی دوست زیادہ نہیں تھے۔ لیکن بہت سے لوگوں سے شناسائی ہوگئی تھی۔ یونیورسٹی کے معاملات معمول کے مطابق تھے۔ ہنگاموں کی یہ بستی جوان زندگی سے بھرپور تھی۔ خوش گپیاں، مذاق، قہقہے زندگی کے مظہر تھے۔

یونیورسٹی میں معمولات جاری ہوچکے تھے تعلیمی سرگرمیاں بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور سیاسی بھی عصمت اپنی ساتھیوں میں گھل مل گئی۔ وہی شوخیاں، وہی شرارتیں ایک دوسرے پر طنز۔ غرض زندگی جوں کی توں تھی۔ چند روز پہلے جو زلزلہ آیا تھا۔ اب اُس کے نشانات بھی باقی نہ رہے تھے اُس دن کے ہنگامے زیرِ بحث آئے اور مختلف لوگوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ عصمت محتاط لڑکی تھی فوراً ہی اُس نے اقبال کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں پُوچھا۔ لڑکیاں تو قیامت ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں اُس دن کسی نے عصمت کی یہ حرکت دیکھی تھی یا نہیں، دیکھ لی جاتی تو اتنی خاموشی نہ رہتی۔

بہ طور یُونیورسٹی کا وقت ختم ہُوا، واپس پلٹی، اقبال نظر نہیں آیا تھا۔ اُس کی چوٹ کا بھی اُسے احساس تھا وہ ان دنوں بہت کچھ سوچتی رہی تھی۔ اُس کے بارے میں آج بھی ایک بے کلی سی ذہن پر طاری تھی وہ کیوں نہیں آیا، خیریت سے تو ہے اِس بے کلی کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ انسانی ہمدردی تھی ظاہر ہے اقبال یونیورسٹی کا ساتھی تھا اگر اُس کے بارے میں سوچ لیا جاتا تو کوئی حرج بھی نہیں تھا لیکن اس کا اظہار خطرناک ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن بھی اقبال نظر نہیں آیا اور پھر جب تیسرے دن بھی عصمت نے اُسے نہ دیکھا تو اُسے اپنا یہ اجتناب بُرا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے سرسری انداز میں ثمینہ سے پُوچھ لیا۔

"اقبال کا پتہ نہیں ہے۔ اُس دن الیکشن کے ہنگاموں میں زخمی ہُوا تھا۔ کیا حال رہے اُس کے؟"

"وہ اقبال صمدانی؟" ثمینہ نے پُوچھا۔

"ہاں! اُسی کی بات کررہی ہُوں۔"

"وہ تو شدید زخمی ہوگیا تھا۔ میرا خیال ہے ابھی اسپتال میں ہی ہے۔ پتہ چلا تھا اُس کے بارے میں کہ اُس کی حالت کافی خراب ہے۔"

عصمت کے ذہن میں ایک گرج سی ہُوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے ایک جُرم کا سا احساس ہونے لگا۔ ایسی بھی احتیاط کیا۔ انسان ہے، انسانی رشتوں کی بنیاد پر ہی سہی۔ ایک آدھ بار اُس کی خبر لینی تو چاہیئے تھی۔

ثمینہ اِس گفتگو کے بعد خاموش ہوگئی۔ لیکن عصمت دیر تک اِس بارے میں سوچتی رہی تھی۔ بڑی عجیب صُورتِ حال تھی۔ اقبال کی خیریت لینا چاہتی تھی لیکن اور بہت سے احساسات دامن گیر تھے۔ اُس کی اپنی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ بے تکلفی سے اقبال کی مزاج پُرسی کے لئے چلی جاتی اِسی لئے اُلجھ گئی تھی اور یہ خوش بختی ہی تھی کہ دوپہر کو کنٹین میں فاروق نے اقبال کا تذکرہ کردیا۔ کوئی گہرائی نہیں تھی اِس تذکرے میں نہ ہی عصمت کو سُنانے کے لئے یہ بات کہی گئی تھی۔ لیکن شاہدہ سنجیدہ ہوگئی۔

"کمال ہے بھئی کتنے بے حس ہو تم لوگ۔ اُس بے چارے کی یہ حالت ہے اور ہم لوگ آج تک اُسے دیکھنے بھی نہ گئے۔"

"تو پھر اِس میں دِقّت کیا ہے، نکل چلتے ہیں یہاں سے اُسے دیکھتے ہُوئے گھر چلے جائیں گے۔"

"ہمیں ضرور جانا چاہیئے۔ یہ ہمارا فرض ہے" فاروق کہنے لگا۔

"کون کون جائے گا بھئی، اقبال کو دیکھنے کے لئے جانے"

ثمینہ بھی تیار ہوگئی تھی۔ شاہدہ، فاروق، ناصر اشند و۔

چند مزید افراد اِس بات کے لئے تیار ہوگئے کہ وہ اسپتال چلیں گے لیکن عصمت کی زبان نہ کھل سکی۔ وہ تو بھلا ہو ثمینہ کا اُس نے خود ہی کہہ دیا۔

"تم بھی چلو ناں عصمت۔ تم بھی دیکھ لینا بے چارے کو۔"

"ٹھیک ہے میں ضرور چلوں گی" عصمت نے سادگی سے کہا۔

طے شدہ وقت کے مطابق یہ گروپ باہر نکل آیا اور اُس کے بعد اسپتال پہنچ گیا۔ اقبال کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں تو پتہ چلا کہ اب سے صرف ایک گھنٹے پہلے اُس کے والدین اُسے اسپتال سے رُخصت دِلا کر لے گئے ہیں۔ گو اُس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے سر کی چوٹ نے اُس کے اعصاب پر بہت اثر ڈالا ہے اور وہ شدید بخار کا شکار بھی ہے لیکن والدین کی ضد تھی کہ وہ اُسے گھر لے جائیں گے چنانچہ وہ لے گئے۔

"اوہ۔ اب یہ تو مشکل ہے کہ اُس کے گھر جایا جائے۔ تم میں سے کسی کو اُس کے گھر کے بارے میں معلومات حاصل ہیں؟"

"میں جانتا ہُوں" ناصر بولا۔

"کہاں رہتا ہے وہ؟"

"ملیر کالونی میں" ناصر نے جواب دیا اور سب ایک دوسرے کی صُورت دیکھنے لگے، پھر ارشد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"وہاں تک جانا تو خیر اِس وقت ممکن نہیں ہے ہو سکتا ہے ایک دو دن میں اُس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے۔ مجبُوری ہے کیا کیا جائے" چنانچہ وہاں سے سب منتشر ہوگئے۔

عِصمت کے ذہن میں ایک کُریدی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ گھر واپس آگئی لیکن یہ شام کچھ بے کل سی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اِس سلسلے میں کیا کیا جائے۔ اپنا جائزہ لیتی تو ایک عجیب سا احساس ذہن کے گوشوں میں پیدا ہو جاتا تھا۔ مجھے اُس میں اتنی دلچسپی نہیں لینی چاہیئے، یہ کیا حماقت ہے؟ یہ لڑکیاں زندہ نہیں چھوڑیں گی مجھے۔ اگر انہیں ذرا بھی شُبہ ہو جائے۔ اُس دن بھی خُون آلُود دوپٹہ دیکھ کر کیسا میرا رنگ اُڑ گیا تھا اُن لوگوں نے نہیں بابا نہیں۔ خُدا اُسے صحت دے، بس اِس سے زیادہ آگے بڑھنا کسی بھی طور دُرست نہیں ہوگا۔ رات کو بے چین سی بستر پر لیٹ کر سو گئی لیکن خوابوں نے پریشان کرکے رکھ دیا۔ آج نجانے کیوں اقبال ذہن پر سوار تھا۔ اُس کی شکایت بھری نگاہیں دُور سے عِصمت کو تک رہی تھیں مُسکراتے ہونٹ سنجیدہ تھے۔ وہ ناراض ہوگیا تھا اُس سے۔ یقیناً وہ ناراض ہوگیا ہوگا۔

رات کو کئی بار اُس کی آنکھ کُھلی۔ اُس نے درود شریف پڑھا۔ خود پر دم کیا۔ اپنے آپ کو بہلانے کی انتہائی کوششیں کیں لیکن جونہی آنکھ بند ہوتی اُس کی تصویر عصمت کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان ہوگئی۔ وضو وغیرہ کرکے اُس نے نماز پڑھی اور پھر انتہائی خلوصِ دل سے اقبال کی صحت یابی کے لئے دُعائیں مانگیں۔ یہ اُس کا اخلاقی فرض تھا لیکن اِن دُعاؤں میں اُس کے لہجے میں رقّت پیدا ہوگئی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی تو اُس نے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جما کر اپنی اِس کیفیت کے بارے میں سوچا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑائی "یہ ہونا نہیں چاہیئے جو ہو رہا ہے کیا کروں میں؟ کیا حماقت ہے؟ کس اُلجھن کا شکار ہوگئی ہُوں؟ خُدا میری مدد کرے۔"

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ معمُول کے مُطابق یونیورسٹی چلی گئی اور وہاں کی مصروفیتوں میں گُم ہوگئی لیکن دوپہر کو پھر اقبال زیرِ بحث آگیا۔ ناصر نے کہا۔

"میں آج اُس کے گھر جانے کا ارادہ رکھتا ہُوں ہمیں اپنے ایک ساتھی کو اِس طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، کون کون میرے ساتھ جانا پسند کرے گا؟"

"بھئی بات ملیر کالونی کی ہے، معمُول سفر نہیں ہوگا، خاصی دِقّت اُٹھانی پڑے گی۔ میرا خیال ہے ہم یہیں اُس کی صحتیابی کی دُعا کرلیں" شاہدہ نے کہا۔

"اصُولاً ہمیں وہاں جانا چاہیئے" فاروق بولا۔

"تو تم چلے جاؤ بھائی۔ تمہیں کسی نے منع کیا ہے" شاہدہ کہنے لگی۔

"ناصر! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اور کوئی ہے ایسا جو میرے ساتھ چلنا پسند کرے؟"

"میں جاؤں گی" ثمینہ نے کہا۔

"زندہ باد۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی صاحبِ دل ضرور ایسا ہوگا جو انسانی فرض پُورا کرے۔ ثمینہ تمہاری گاڑی تو ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟"

"کیوں۔ میری گاڑی کو کیا ہُوا؟"

"نہیں... نہیں ہم یہ سوچ رہے تھے کہ... کہ تمہاری گاڑی ہی سے چلے چلیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کیوں عصمت تم چلو گی؟" ثمینہ نے عِصمت سے سوال کیا اور بادلِ ناخواستہ گردن ہلا دی۔

"چنانچہ ہم چار افراد ہوگئے۔ بس ٹھیک ہے ہمیں کسی اور کی ضرورت بھی نہیں ہے" فاروق بولا۔

"تو پھر میرا خیال ہے ہمیں نکل جانا چاہئیے۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔ کیوں ثمینہ چلیں؟"

"چلو" ثمینہ نے آمادگی کا اظہار کر دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ سب ثمینہ کی کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔

"تھرنے رستے میں کہا" میں بس ایک بار اقبال کے ساتھ اُس کے گھر گیا تھا۔ صحیح جگہ کا اندازہ تو ہے مجھے۔ لیکن ہوسکتا ہے، گھر تلاش کرنے تک کچھ وقت پیش آئے"۔

"اقبال کا جغرافیہ کیا ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"تفصیل تو نہیں معلوم لیکن اُس کی والدہ نابینا ہیں، والد بے چارے کہیں ملازمت کرتے ہیں۔ ایک بہن اور ایک بھائی ہے بس۔ چار افراد پر مشتمل یہ کنبہ ملیر کالونی کے ایک کوارٹر میں کرائے پر رہتا ہے۔ درحقیقت اقبال کی زندگی بڑی کسمپرسی کا شکار ہے لیکن بڑا ہی زندہ دل نوجوان ہے اور اپنے آپ کو کسی سے کمتر نہیں سمجھتا"۔

"خیر کمتری کا کیا سوال ہے؟ ہمارا دوست اور ہمارا ساتھی ہے" فاروق نے کہا۔

عصمت نے اِس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

بالآخر وہ ملیر کالونی میں داخل ہوگئے۔ اور اتفاق سے ناصر نے انہیں صحیح جگہ لے جا کر کھڑا کر دیا۔ عسرت زدہ مکان کے دروازے پر دستک دی گئی تو ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چہرہ پُرکشش تھا۔ یہ اقبال کی بہن ہی ہوسکتی تھی۔ اُن لوگوں کو دیکھ کر اُس نے اُن کے بارے میں پوچھا تو ثمینہ نے آگے بڑھ کر بتایا کہ وہ یونیورسٹی سے آئے ہیں۔ اور اقبال کے دوست ہیں"۔

"آپ براہِ کرم اندر تشریف لے آیئے۔ میں ذرا اطلاع دے دوں" لڑکی عجیب سے انداز میں بولی اور یہ چاروں اُس کے پیچھے ہی پیچھے اندر گھس آئے۔

اُس نے غالباً اقبال کے کمرے میں جا کر اُن لوگوں کے بارے میں اطلاع دی تھی لیکن بھلا وہ اجازت کا انتظار کہاں سے کرسکتے تھے چنانچہ وہ کمرے میں گھس گئے۔ ایک مسہری پر اقبال لیٹا ہوا تھا بائیں جانب ایک چوکی بچھی تھی۔ جس پر ایک خاتون ہاتھ میں تسبیح لئے بیٹھی ہوئی تھیں، پُرنور شکل کی مالک تھیں۔ لڑکی اُن لوگوں کو دیکھ کر ایک بار پھر خجل سی ہوگئی تھی اقبال نے مسکراتی نگاہوں سے اُن لوگوں کو دیکھا اور یہ سب اُس مسہری کے اِردگرد جا کھڑے ہوئے جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ دُھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے بس پڑی پڑی سی ہوئی تھی۔

"یہ اقبال! کمال ہے تم تو کچھ زیادہ ہی لمبے ہوگئے" فاروق بولا۔

"ہاں بھئی ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔ اِسی وجہ سے ملیریا نے بھی حملہ کر دیا اور پھر کچھ نمونیے کے اثرات بھی ظاہر ہوگئے۔ یوں ہمارا کیس ذرا لمبا ہوگیا۔ معاف کرنا یارو، میرے گھر زیادہ کرسیاں نہیں ہیں۔ ارے بھئی تنویر کم از کم باہر سے ایک چارپائی ہی اُٹھا لاؤ"۔

"میں لاتا ہوں"، فاروق بولا۔

"نہیں پلیز میں لے آتی ہوں" اقبال کی بہن تنویر نے لجاجت سے کہا۔

"کس تکلیف میں پڑی ہوئی ہو مس تنویر، بتاؤ چارپائی کہاں ہے؟ اب ہم جیسے قوی ہیکل مردوں کے سامنے تم جیسی نازک سی لڑکیاں چارپائی کیا اُٹھا کر لائیں گی" فاروق بے تکلفی سے باہر نکل آیا اور پھر خود ہی بانوں سے بُنی ہوئی چارپائی لے کر اندر پہنچ گیا۔ یہ چارپائی اُس نے مسہری کے قریب بچھائی اور پھر تنویر کی طرف رُخ کر کے بولا:

"ہاں تم ذرا چائے وغیرہ کا بندوبست کرلو"

"بکواس مت کرو، وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔۔" اقبال نے کہا۔

"چائے کی گنجائش ہے؟ بھئی تنویر صاحبہ ہماری پیالی میں ذرا شکر ہی زیادہ ڈال دیجئے گا" فاروق بولا اور تنویر مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

معمر خاتون عجیب سے انداز میں اُن کی جانب نگراں تھیں۔ سب ہی کو ایک دم اُن کا احساس ہوا، اور پھر سلاموں کی بھرمار ہوگئی۔ ہر شخص انہیں سلام کر رہا تھا۔ معمر خاتون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جیتے رہو بچو، خدا تمہیں اپنی زندگی میں کامیاب کرے"۔

"آمین" یہ ناصر کی آواز اُبھری۔

"میری امی جان ہیں۔ میرے لئے بے حد پریشان۔ بس ہر وقت یہاں بیٹھی پڑھتی رہتی ہیں"۔

"اِسی لئے تو زندہ ہو ورنہ کب کے مر چکے ہوتے" فاروق بے ساختہ بولا۔

"تم انتہائی بدتمیز آدمی ہو فاروق، ایسی باتیں کہتے ہیں یہ عیادت کا طریقہ ہے"۔

"کمال ہے۔ میں تو امی جان کی طاقت کا اظہار کر رہا تھا"۔

"اُن کے سامنے یہ جملے کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیئے۔۔" ثمینہ بولی۔

"چلو آگئی ٹھیک ہے۔ امی میں بہت شرمندہ ہوں"۔

"نہیں بیٹے۔ میں پھر یہی کہوں گی کہ خدا تمہیں ہر آفت سے دُور رکھے"۔

"ہاں تو بھئی اقبال صاحب علاج کیا کیا ہو رہا ہے؟ ذرا آپ اپنا فائل دکھایئے" فاروق نے کہا۔

"افسوس فائل تو نہیں ہے۔ یہ کچھ دوائیں ہیں جو سامنے رکھی ہیں یہی استعمال کر رہا ہوں"۔

"تو پھر کب تک ٹھیک ہونے کا ارادہ ہے؟"

"یار کمزوری کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے، جی تو چاہتا ہے جلدی ٹھیک ہو جاؤں لیکن لگتا ہے کچھ وقت لگ جائے گا۔۔" اقبال نے پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو خیر کوئی بات نہیں ہے۔ دیر آید درست آید۔ مگر ذرا درست ہو کر ہی آنا یونیورسٹی"۔

"کیوں بیٹے کیا ابھی وہاں ہنگامے چل رہے ہیں؟" اقبال کی والدہ نے مضطربانہ انداز میں سوال کیا۔

"نہیں امی ہنگامے تو اُسی دن ختم ہوگئے تھے بس الیکشن میں ذرا کچھ گرما گرمی ہوگئی تھی۔ یہ بے چارے اقبال زد میں آگئے۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں؟"

"نہیں بیٹے شکریہ، سب ٹھیک ٹھاک ہے"۔

تنویر نے تھوڑی ہی دیر بعد چائے بڑے اہتمام سے سجا کر اُن کے سامنے پیش کی تھی۔ بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی پلیٹ میں کھلا ہوا رکھا تھا چنانچہ وہ سب جھپٹا مار کر چائے اور بسکٹوں پر ٹوٹ پڑے عصمت البتہ ذرا دبی دبی سی تھی۔ ثمینہ نے کہا۔

"عصمت: تم بڑی شرمائی شرمائی سی بیٹھی ہو، لو حملہ کرو"

"نہیں میں صرف چائے لوں گی" عصمت نے کہا اور چائے کی پیالی لے کر چوکی پر معمر خاتون کے پاس جا بیٹھی۔

"آپ کو اِن سب کی باتیں بُری لگ رہی ہوں گی امی، مگر یہ بے چارے مجبور ہیں۔ یونیورسٹی کے نام کے ساتھ اُن کے ذہن میں یہ تصور ہے کہ انہیں اتنا ہی شوخ ہونا چاہیئے آپ اُن کی فضول باتوں کو ذرا بھی محسوس نہ کریں"۔

"نہیں بیٹی: میں خود بھی یہی زندگی گزار چکی ہوں اور اِس عمر کی شوخیوں سے ناواقف نہیں ہوں"۔

"اچھا تمہارے، آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے۔ امی۔ معاف کیجئے گا؟" عصمت نے سوال کیا۔

"بس بیٹی پُرانی بات ہے۔ رات گئی بات گئی، جانے دو چھوڑو" معمر خاتون نے عجیب سے انداز میں کہا۔ کسی بات پر سب نے قہقہہ لگایا تھا۔ اقبال بھی ہنسنے لگا ہنستے ہنستے اُسے کھانسی آگئی۔ ثمینہ نے آگے بڑھ کر اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تنویر جلدی سے گلاس میں پانی لے آئی۔

"اب تم لوگ یہ مت سمجھ لینا کہ مجھے ٹی۔ بی ہوگئی ہے، بس نمونیے کی وجہ سے ذرا کھانسی بھی آجاتی ہے" اقبال نے پانی کا گھونٹ لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی۔ ٹھیک ہے۔ مگر تمہارا مکمل چیک اپ کرانا پڑے گا۔ اِس کے بعد ہی اب تمہیں یونیورسٹی میں جگہ دی جاسکتی ہے" فاروق بہت زیادہ بکواس کرنے والوں میں سے تھا۔ اُس کی زبان بند ہی نہیں ہوتی تھی۔

تقریباً پون گھنٹہ یہاں صرف ہوگیا اور اِس کے بعد

اُن لوگوں نے واپسی کی اجازت طلب کی۔

"تمہارے آنے سے بڑی فرحت ہوگئی تھی طبیعت میں۔ یار ناصر کم از کم دوسرے لوگوں کو بھی شرمندہ کرو کہ وہ میری عیادت کے لئے آتے جاتے رہیں۔ میں تو بڑا بور ہو رہا ہوں۔"

"تم فکر مت کرو۔ کل شرمندگان کی ایک پوری ٹیم تمہارے پاس پہنچ رہی ہے۔"

"میں اُسے ویلکم کہوں گا۔" اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اس کے بعد یہ سب وہاں سے رخصت ہوگئے۔

عصمت نے اقبال سے کوئی بات نہیں کی تھی، نہ جانے کیوں اُسے ایک عجیب سا احساس ہی ہوا تھا۔ اقبال نے اُسے دیکھ کر کسی خاص کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا جب کہ اس سے پہلے وہ... اس احساس سے عصمت خود ہی شرمندہ سی ہوگئی۔ ثمینہ نے اُسے اُس کے گھر پر چھوڑ دیا اور باقی لوگوں کے ساتھ چلی گئی۔ لیکن یہ رات بھی عصمت کے لئے اُلجھنوں کی رات تھی۔ اقبال نے ایسا کیوں کہا؟ کیا اُسے دوبارہ اُس کے گھر جانا چاہئے؟ دل کچھ تقاضے کر رہا تھا لیکن احتیاط دامنگیر تھی چنانچہ دوسرے دن وہ یونیورسٹی سے اقبال کے گھر جانے والوں کی ٹیم میں شامل نہیں تھی۔

*

آفندی صاحب خاموش ہوگئے۔ تصور بیگ اور منور بیگ خاموش بیٹھے اُن کی صورت دیکھ رہے تھے۔ آفندی صاحب کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور انھیں شاید اُس کا احساس بھی نہیں تھا۔ تصور بیگ بھی چونکا۔ اُس نے آفندی صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"نہیں انکل، رونا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ ہمت سے کام لیجئے۔ یہ کیا آپ بچوں کی طرح رونے لگے۔" آفندی صاحب نے تصور کو دیکھا اور جیب سے رومال نکال کر آنسو خشک کرنے لگے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"سوری تصور! اپنی زندگی کے اس عجیب المیے کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ یوں سمجھ لو کہ جو زندگی میں گزار رہا ہوں لوگ اس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچتے ہوں گے لیکن میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح یہ وقت گزار رہا ہوں۔ میرے شانے دکھ گئے ہیں تصور، میں اپنی ذات کے خلا کو کبھی پر نہیں کر سکا۔ میں نے اپنے آپ کو اُن ڈرامائی کہانیوں کا ایک کردار تصور کیا ہے جو بظاہر مصنوعی حیثیت رکھتی ہیں لیکن درحقیقت اُن میں سچائیاں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی بچی کے لئے میں ساری زندگی جھلستا رہا ہوں اور اب مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو پاتا۔ میں تھک چکا ہوں۔ بس... میں..." آفندی صاحب کی آواز رندھ گئی۔

تصور خاموشی سے اُن کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"تو انکل میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"اب بھی اس سوال کی گنجائش ہے بیٹے؟ میں اپنی دلی کیفیت تمہیں بتا چکا ہوں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ خالی ہاتھ ہوں میں۔ تصور تم اس بچی کو تلاش کر دو۔ ثاقب کا پتہ لگاؤ۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھے بتاؤ۔ میں... میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ہر قیمت پر... ہر قیمت پر۔ سنو میں تمہیں ہر وہ چیز دینے کو تیار ہوں جو تم مجھ سے طلب کرو۔ مجھے ردا چاہیئے۔ سمجھے تصور مجھے ردا چاہیئے۔"

"عجیب بات ہے آپ کہتے ہیں کہ نیشنل اسپتال میں ثاقب نامی کوئی شخص نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ کیا وہ لڑکی ثاقب کو تلاش کرتی ہوئی وہاں نہیں پہنچی؟"

"نہیں وہ بھی نظر نہیں آئی۔ میں نے بہت وقت ضائع کیا ہے وہاں پر۔ ڈاکٹر وغیرہ سے معلومات حاصل کی ہیں۔ یہاں تک کہ میں اخبار کے دفتر بھی گیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ اشتہار کس نے دیا ہے۔ لیکن وہاں سے بھی پتہ نہیں چل سکا۔ اُن لوگوں نے یہی بتایا ہے کہ ثاقب نامی ایک شخص وہاں پہنچا اور اُس نے یہ اشتہار دیا ہے اور ساتھ ہی رقم کی ادائیگی بھی کردی تھی، بس۔"

"ہوں! ٹھیک ہے آفندی صاحب، لیکن اس سلسلے میں میری ایک گزارش ہے آپ سے، اگر آپ قبول کر لیں۔"

"ہاں، کہو... کہو۔"

"اگر آپ نے یہ ذمہ داری میرے سپرد کر دی تو آپ کو انتہائی خاموشی سے کام لینا ہوگا۔ جلد بازی یا کوئی ایسی کوشش میرے خیال میں آپ کے لئے مناسب نہیں ہوگی جس سے وہ لڑکی آپ سے پھر برگشتہ ہو جائے۔ آفندی صاحب میں دعوے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ آپ کو مل بھی جائے گی تو آپ کو پہچاننے سے انکار کر دے گی۔ اور کوئی بھی ایسی لڑکی جو بالغ ہو اگر یہ بات کہہ دے کہ اُس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے تو آپ اُسے کوئی ایسا کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے جو اُس کی مرضی کے خلاف ہو۔ اگر وہ لڑکی آپ کو پہچاننے ہی سے انکار کر دے تو رونے پیٹنے کے سوا آپ کیا کر سکتے ہیں؟"

"میں جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں مگر دل کی بے چینیوں کا کیا کروں؟"

"معاف کیجئے گا آفندی صاحب! سخت گیری بعض اوقات ایسے کھیل بگاڑتی ہے کہ بنائے نہیں بنتے۔ آپ اب صبر سے کام لیں اور یہ ساری ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں نہ صرف ان دونوں کرداروں کو تلاش کر لوں گا بلکہ تلاش کرنے کے بعد کسی ایسے مناسب طریقے سے انھیں آپ کے سلسلے میں ہموار کرنے کی کوشش کروں گا کہ بات بن جائے۔ دوسری صورت میں اگر آپ نے جلد بازی سے کام لیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ پھر آپ مجھ سے کچھ کہنے کے حقدار نہیں ہوں گے۔ ڈیڈی آپ بھی دلچسپی رکھتے ہیں تو انکل کو صرف یہ سمجھائیے کہ وہ مکمل خاموشی اختیار کریں۔"

"نہیں تصور، مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجھے نظر آ بھی جائے اور میرے ساتھ اجنبیت کا سلوک کرے تو میں اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر تم یہ ذمہ داری قبول کرتے ہو تو میں تمہارے اشاروں پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔"

"نہایت مناسب، بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے یہ پوری پوری ذمہ داری قبول کر لی ہے اور میں آپ کو یہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں وقت ضرور لگ جائے گا لیکن یہ مسئلہ میں لازمی طور پر حل کر دوں گا۔"

"تم نے میرے دل کو بڑی ڈھارس دی ہے تصور۔ خدا تمہیں اس کا صلہ دے گا۔ میں نہیں دے سکتا۔"

"میرے لائق اور کوئی خدمت انکل؟"

"نہیں۔"

"تو آپ نے احسان لمیٹڈ کا تصور بھی چھوڑ دیا ہے؟"

"ہاں! اچانک ہی دل ٹوٹ گیا ہے۔ دنیا سے لڑنے کی کوئی وجہ بھی ہونی چاہیئے۔ صرف اپنی ذات کے لئے تو میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتا۔ بس ٹھیک ہے احسان خوش رہے۔ بلاوجہ میں نے اُس کی دل شکنی کی مگر کیا کروں یہ دیوانگی میری فطرت میں ہے اور میرے لئے نقصان ہی کا باعث بنتی رہتی ہے۔"

"چلئے کوئی بات نہیں۔ بہتر ہے کہ احسان صاحب سے بھی کوئی رابطہ قائم نہ کریں۔ اس سلسلے میں آپ... آپ کی دل شکنی ہوگی اور وہ آپ کو ابھی اپنے ہمدردوں میں شمار نہیں کر سکتے۔"

"نہیں، میں کچھ بھی نہیں کروں گا۔ مجھے اب صرف ردا چاہیئے صرف ردا۔"

"اچھا ڈیڈی مجھے اجازت! بہت وقت ہو چکا ہے۔ خدا حافظ انکل۔" تصور بیگ نے کہا اور پھر وہ ان دونوں سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔ محمود علی آفندی گردن جھکائے بیٹھے رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے بھی اجازت طلب کر لی۔

❖

ردا نے احسان لمیٹڈ میں منیجر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ احسان صاحب کو اُس کی انتظامی صلاحیتوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ردا کافی عرصے توقیر صاحب کی فرم میں کام کرتی رہی تھی لیکن احسان صاحب اس بات سے ناواقف تھے کہ اُس کی کارکردگی کا انداز کیا ہے۔ ردا نے احسان لمیٹڈ میں آنے کے بعد اپنی سیٹ سنبھالی۔ اس نے بہت بڑا چیلنج قبول کیا تھا۔ احسان لمیٹڈ پچھلے دنوں کے شدید بحران کے بعد از سر نو منظم ہوئی تھی۔ خرم نے اپنی غلط فطرت کی وجہ سے بہت سے ایسے معاملات اُلجھا رکھے تھے جن سے احسان لمیٹڈ کی ساکھ متاثر ہو رہی تھی۔ ردا اُن پر مصروف ہوگئی۔ اُس نے پورے عملے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر فرد کو فرداً فرداً اپنے سامنے طلب کر کے اُس سے اُس کی ذمہ داریاں پوچھیں اور پھر تمام کاغذات طلب کر لئے۔ وہ ایک ایک شخص پر کام کر رہی تھی۔ اور اس طریقے نے تمام ڈھکے چھپے امور اُس کے سامنے نمایاں کر دیئے چنانچہ اُس نے اُلجھے ہوئے معاملات کو ایک ایک کر کے سلجھانا شروع کر دیا۔ اس کام میں اُس نے اپنے دن و رات ایک کر دیئے۔ ڈھیروں فائلیں وہ اپنے ساتھ لے آتی تھی۔ اور رات میں دو دو تین تین بجے تک اُن میں مصروف رہتی تھی۔ البتہ ایک منیجر کی حیثیت سے اُسے کار کی آسانی فراہم کر دی گئی تھی اور اب اُسے جانے آنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ نہ صرف اندرونی طور پر بلکہ بیرونی طور پر بھی اُس نے گھوم پھر کر خود ایسے لوگوں سے ملاقات کی تھی جو احسان لمیٹڈ کے لئے کارآمد حیثیت رکھتے تھے۔ اُس کی اس کارکردگی کا نمایاں نتیجہ چند ہی روز میں ظاہر ہونے لگا۔ اُن لوگوں نے احسان صاحب سے رابطے قائم کئے جو فرم سے برگشتہ ہوگئے تھے اور احسان صاحب کے کانوں میں ردا کا نام گونجنے لگا لیکن انھوں نے ابھی کسی جلدبازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ہر چیز سے وہ لاتعلق ہوگئے تھے۔ لیکن،

دل ہی دل میں ردا کی کارکردگی کا پورا پورا تخمینہ لگا رہے تھے۔ ردا اپنے اس ذمے دارانہ کام میں پوری طرح مصروف تھی کہ ایک دن اُس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ صبح کے اخبار میں اُس نے وہی اشتہار دیکھا تھا جس نے آفندی صاحب کو پریشان کر دیا تھا۔

اشتہار اُسی کے لئے تھا اور ثاقب کی طرف سے تھا۔ ردا کے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ اپنے اس نئے کام کو سنبھالنے کے بعد اُس کا رُواں رُواں خوشی سے ناچتا رہتا تھا، احسان لمیٹڈ کے لئے کام کرتے ہوئے وہ یہ سوچ رہی تھی کہ یہاں اپنی اعلیٰ کارکردگی کے ایسے جھنڈے گاڑے گی کہ لوگ اُسے فراموش نہ کر سکیں گے۔ اس طرح وہ کم از کم اس سلسلے میں اپنا تھوڑا بہت فرض پورا کرے گی۔ اس کے لئے اُسے پورے طور پر اعتماد کے ساتھ کام کرنا تھا اور وہ کسی بھی الجھن کو درمیان میں نہیں لانا چاہتی تھی، لیکن یہ اشتہار۔۔۔؟

اُس کی دھندلائی ہوئی نگاہیں بار بار اشتہار کا جائزہ لے رہی تھیں اور اُس کے دل میں نفرتوں کے طوفان اُمنڈ رہے تھے۔ ثاقب اگر مر رہا ہے تو مر جائے مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں۔۔۔ میں اس مکار شخص کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ کچھ بھی نہیں، دیر تک وہ اس بارے میں غور کرتی رہی۔ لیکن اس کا ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہا۔ یہاں تک کہ دفتر جانے کا وقت ہو گیا۔

آج وہ دفتر میں بھی اُلجھی اُلجھی رہی تھی، اشتہار کا مضمون بار بار نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ خدشہ صرف یہ تھا کہ دوسرے لوگ بھی اس اشتہار کو دیکھیں گے اور ہو سکتا ہے انھیں بھی تجسس ہو کہ یہ ردا کہیں یہی تو نہیں ہے۔ پھر وہ ثاقب کے بارے میں باز پُرس کریں گے کیا جواب دے گی انھیں: نیشنل اسپتال جانے کا تصور بھی نہیں کیا تھا اُس نے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ وہاں کے چکر لگاؤں۔ وہ اگر مر رہا ہے تو مر جائے، میرے لئے وہ ایک بے مصرف چیز ہے۔ بلکہ میری ذات پر ایک گہرے دھبے کا باعث!

شام ہو گئی۔ آج وہ زیادہ کام نہیں کر سکی تھی۔ دفتر سے کچھ فائل اُٹھا کر وہ کوٹھی واپس پہنچ گئی۔

کوٹھی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن خود وہ اُلجھی ہوئی تھی۔ ثناء اور ندرت اپنی عادت کے مطابق خوش گپیوں میں مصروف تھیں لیکن اُس نے اُن کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزارا، اور کام کرنے کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ شکر ہے کہ یہ لوگ اخبار چاٹنے کی عادی نہیں تھیں ورنہ اُس سے اس اشتہار کے بارے میں ضرور پوچھا جاتا۔

بہر حال یہ خود اُس کی اپنی سوچ کا معاملہ تھا ورنہ ردا نام کی کوئی اور لڑکی بھی تو ہو سکتی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور اس تصور سے خود کو بہلا لیا تبھی اُس کی نگاہ ایک لفافے پر پڑی۔ جو اُس کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ لفافہ بذریعہ ڈاک آیا تھا۔ اور کسی ملازم نے اُسے اُس کی میز پر لا کر رکھ دیا تھا۔ ردا نے چونک کر لفافہ اُٹھا لیا۔ اور دفعتاً ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لفافہ کینیڈا سے آیا تھا اور پُشت پر اختر کا نام لکھا ہوا تھا۔ اختر کا خط تھا ردا کے نام۔ ردا نے بغور لفافے کو چیک کیا کہ کہیں کسی نے اُسے کھولا تو نہیں لیکن ایسے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

اختر کی طرف سے موصول ہونے والے اُس لفافے کو دیکھ کر ردا کی ذہنی حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ اُس نے لفافہ کھول لیا۔ خوشبو میں بسا ہوا ایک پرچہ باہر نکل آیا۔ اور ردا اُسے کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

ردا بہن!

خوشیوں کی دُعائیں بھائی کی طرف سے،

قصّے کہانیوں اور خواتین کے لکھے ہوئے افسانوں میں پڑھا ہے کہ بھائی کا لفظ بہنوں کے لئے بڑے تقدس کا حامل ہوتا ہے اور بہنیں اس تقدس کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ لیکن میرے اور آپ کے درمیان قائم اس رشتے میں بڑا ہلکا پن ہے۔ سُنا ہے کہ خون بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور زبانی رشتے زیادہ کارآمد نہیں ہوتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اختر اگر ردا کے لئے اپنے دل میں بہن کا سا جذبہ رکھتا ہے تو ردا اس جذبے سے اتنی متاثر نہیں ہے یعنی وہی خون کا رشتہ، بھئی کیا کیا جائے ہمارا تو قصور نہیں ہے اب آپ کسی اور گھر میں پیدا ہو گئیں اور ہم کہیں اور، خون کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا مجبوری ہے میرا اور آپ کا صرف زبانی رشتہ ہے ناں اور زبانی رشتے صرف اُس وقت تک نبھائے جا سکتے ہیں جب زیادہ سے زیادہ انسان ایک دوسرے

کے سامنے ہو، اب دیکھیئے ناں اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو بہن کہا، آپ نے جواب میں مجھے بھائی کہہ دیا۔ کہنے سُننے میں کیا ہوتا ہے؟ بعد میں کون اِن باتوں کو نبھا سکتا ہے۔ ہاں اگر اختر کی بات ہوتی تو اختر ذرا دوسرے قسم کا آدمی ہے، یقین کریں ردا بہن نبھا دیتا۔ بلکہ نبھا دے گا۔ کوئی مسئلہ ہو اور اختر کے قابل ہو تو تفریحاً امتحان لے لیں۔ رہی آپ کی بات تو اب تو کچھ کہنا سُننا ہی بیکار ہے ایک چھوٹا سا کام آپ کے سپرد کر کے آئے تھے بہن کے رشتے سے نہ سہی انسانی رشتے سے اس سلسلے میں کچھ کر دیا ہوتا۔ لوگ تو نہ جانے ایک دوسرے کے لئے کیا کیا کرتے ہیں۔ سمجھ رہی ہوں گی، نہ خط، نہ تار، نہ کوئی ایسا اظہار جس سے پتہ چلے کہ جو الفاظ ہم نے ایک دوسرے پر ظاہر کئے تھے اُن کی کوئی اہمیت ہے۔ بس اتنا ہی لکھنا تھا۔ اور کیا لکھیں۔ سمجھنے کو جی چاہے تو سمجھ لیجئے ورنہ آپ کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(اختر)

ردا نے کئی بار یہ خط پڑھا۔ عجیب سے احساسات دل میں پیدا ہو گئے تھے پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔

کافی دیر تک وہ بیٹھی سوچتی رہی تھی۔ اشتہار سے جو تکدر پیدا ہو گیا تھا اِس خط نے اُسے تھوڑی دیر کے لئے زائل کر دیا۔ اور وہ اسی سلسلے میں سوچتی رہی۔ پھر ذہن کو پُرسکون کرنے کے لئے اُس نے ندرت کو تلاش کیا۔ خوش قسمتی سے ندرت تنہا ہی مل گئی۔ اب اُس کی تلاش کے لئے ملازموں کے کوارٹر کی جانب نہیں جانا پڑتا تھا۔ بلکہ یہ لوگ کوٹھی کے اندرونی حصے ہی میں منتقل ہو گئے تھے۔

ندرت نے ردا کو دیکھا تو چونک کر کھڑی ہو گئی۔

"تم سے کچھ کام ہے!"

"اِس وقت؟ مجھے تو علم ہوا تھا کہ تم اپنے بیڈ روم میں جا چکی ہو مونا لیزا!"

"آؤ، میرے کمرے ہی میں آ جاؤ" ندرت خاموشی سے ردا کے ساتھ اُس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

"ثناء کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں۔ بُلا کر لاؤں اُسے؟ ویسے تم کچھ سنجیدہ نظر آ رہی ہو مونا لیزا۔ خیریت تو ہے؟"

"بہت سنجیدہ بات ہے اور تمھیں اِس سلسلے میں میری مدد کرنی ہے۔"

"سُبحان اللہ! مونا لیزا مسکرا کر کچھ کہہ دے پھر کیا مجال کہ ہم اِس سے انحراف کر سکیں۔"

ردا چند لمحات کچھ سوچتی رہی پھر اُس نے اختر کا خط نکال کر ندرت کی طرف بڑھا دیا۔ ندرت نے تعجب سے خط سنبھالا۔ اختر کا نام دیکھ کر ایک لمحے کے لئے دل زور سے دھڑکا لیکن اپنی دلی کیفیت کا اظہار کسی پر نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ لاپروائی سے خط نکالا اور اُس پر نگاہیں دوڑانے لگی۔ خط کا مضمون سمجھ میں بھی آ رہا تھا لیکن اُس میں کوئی وضاحت بھی نہیں تھی۔ بڑی ذہانت سے خط تحریر کیا گیا تھا۔ ندرت نے پورا خط پڑھنے کے بعد ردا کی جانب بڑھا دیا۔ ردا گہری نگاہوں سے اُس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"اختر کا خط ہے۔ خیریت تو ہے کون سی چیز کا تقاضہ کیا ہے اُن حضرت نے؟ بڑی اپنائیت کی بات ہے ہمیں تو اِس رشتے کا علم ہی نہیں ہو سکا تھا" ندرت نے اپنی دلی حالت کو چھپاتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"بننے کی کوشش مت کرو ندرت! میں تم سے پہلے بھی اِس کا تذکرہ کر چکی ہوں"

"اختر کا؟" ندرت نے حیرانی سے کہا۔

"نہیں، اُس کی دلی کیفیت کا!"

"اچھا۔۔۔ اچھا کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے کیا۔۔۔؟" ندرت نے کہا۔

"دیکھو ندرت! میں نے کبھی چالاک بننے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی میں شرارتوں میں تمھارا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ لیکن اِس سلسلے میں میں تم سے سنجیدگی کی خواہش مند ہوں۔ تم نے دیکھ لیا کہ اُس نے کِس طرح مجھ پر طنز کیا ہے، اُس نے مجھے بہن کہا تھا اور بھائی بن کر مجھ سے کچھ جذبوں کا تذکرہ کر دیا تھا۔ تمھیں علم ہے کہ میں نے کس طرح اُس کے اِس راز کو سینے میں محفوظ رکھا ہے۔ لیکن اب جو کچھ وہ چاہتا ہے اُس کیلئے جواب دینا ضروری ہو جائے گا۔ میری مدد کرو ندرت۔ یہ مسئلہ واقعی سنجیدہ ہے۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا۔ کہ اختر

غیر سنجیدہ سا لڑکا ہے اور اِس مسئلے میں اُس کے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں ہوگی لیکن یہ بات بھی میں دعوے سے کہہ سکتی ہُوں کہ جو غیر سنجیدہ ہوتے ہیں جب وہ سنجیدگی سے کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر انھیں اُن کے فیصلے سے ہٹانے والا اِس رُوئے زمین پر کوئی نہیں ہوتا۔ اختر تمھارے مسئلے میں سنجیدہ ہے نُدرت، ظاہر ہے میں دعوے سے تو کوئی بات نہیں کہہ سکتی لیکن تمھارا اپنا مسئلہ ذرا سوچنے والا ہے، کیا تمھارے دِل میں اُس کے لئے کوئی گنجائش نِکل سکتی ہے یا اُسے اِس سِلسلے میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا؟“

”مُونالیزا! فضاؤں میں پرواز کرنے کی کوشش مت کرو، مُجھ سے کیا کہلوانا چاہتی ہو تم؟“ نُدرت سنجیدگی سے بولی۔

”اگر اِس بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہو تو تمھاری مرضی، مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمھیں کسی مسئلے میں مجبُور کروں لیکن اگر مجھے سُرخرو کرنا چاہتی ہو تو تمھاری عنایت ہوگی مجھے کم از کم اپنی دِلی کیفیت سے تو آگاہ کر دو۔“

”کیا اِس دوران میں مَیں پاگلوں کی طرح سر دھنتی نظر آئی ہُوں؟ کیا کبھی تم نے مجھے تارے گنتے ہُوئے دیکھا ہے؟ یا کھانے کی میز پر یا دسترخوان پر کم کھاتے ہُوئے دیکھا ہے؟“

”میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔“ رَدا بولی۔

”تو پھر سمجھ لو کہ میں اللہ کے فضل سے بالکل خیریت سے ہُوں اور تمھاری خیریت خُداوند کریم سے نیک چاہتی ہُوں۔“

”غیر سنجیدگی نہیں چھوڑو گی؟“ رَدا نے اُسے گھُورتے ہُوئے کہا۔

”ارے واہ... یہ کوئی اچھی بات ہے کہ تم زبردستی کسی کو کسی کی طرف مائل کر رہی ہو۔“

”نہیں، اختر کو جواب دینا ضروری ہے اور میرا خیال ہے یہ جواب سنجیدہ ہی ہونا چاہیئے۔ اِس میں مذاق کی گنجائش نہیں ہے۔“

”تو جواب دے دو۔ مجھے کیا دِلچسپی ہو سکتی ہے اِن سوال و جواب سے؟“

”گویا میں اپنے خط میں اِس بات کا اظہار کر دُوں کہ اِن تِلوں میں تیل نہیں ہے؟“

”تِل کہاں ہیں؟“ نُدرت نے سوال کیا۔

”نہیں نُدرت۔ مجھے چرب زبانی نہیں آتی اور نہ ہی میں تمھاری اِن باتوں کے جواب میں کوئی ایسی بات کہہ سکتی ہُوں جو موزُوں اور موثر ہو۔ میں اختر سے یہی کہہ دُوں گی کہ میں نے نُدرت کو ٹٹولنے کی کوشش کی وہ کھلنے پر آمادہ نہیں ہے۔“

”مُونالیزا! تم آخر چاہتی کیا ہو؟“

”اعتراف... ایک سنجیدہ اعتراف۔ ہاں یا نہیں میں۔“

”کِس بات کا؟“

”یہی کہ تم اختر کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتی ہو یا نہیں۔“

”ارے باپ رے۔ مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ مونالیزا! اگر میں یہ بات کہہ بھی دُوں کہ چلو ہاں میں یہ چاہتی ہُوں۔ تو پھر آگے کیا ہوگا؟ کیا میرے چاہنے سے سب کچھ ہو جائے گا؟“

”تم کہہ تو دو، بعد میں جو کچھ ہوگا اُسے بھی دیکھ لیا جائے گا۔“

”کہی بات پرائی ہوتی ہے۔“

”پرائی نہیں رَدا کی ہوتی ہے۔ اب بولو؟“

”ہُوں! سوچنے کی بات ہے اگر بات صرف رَدا کی ہے تو رَدا پر تو مجھے مکمل اعتماد ہے۔“

”سچ کہہ رہی ہو نُدرت؟“

”ہاں رَدا، اِس میں جھُوٹ کی کیا بات ہے؟ کیا تمھیں یہ احساس نہیں کہ میں تم پر مکمل اعتماد کرتی ہُوں؟“

”نہیں، تم نے کبھی اِس کا ثبوت نہیں دیا۔“

”تو اب دیئے دیتی ہُوں۔ تمھاری یہ شکایت بھی دُور ہو جائے گی۔“

”تو بولو اختر کو کیا جواب دُوں؟“

”بس لکھ دو کہ میں اُس کی یاد میں دِن بھر سُورج کو تکتی رہتی ہُوں اور پھر رات کو آرام سے سو جاتی ہُوں بھُوک بالکل ختم ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چِنگاریاں اُڑتی رہتی ہیں۔ پہلے چار روٹی کھاتی تھی اب آٹھ کھا رہی ہُوں۔ اُس سے کہو کہ جلد ہی کچھ کرے ورنہ میں جس وزن کے ساتھ اُس کے سامنے آؤں گی اُس کی ذِمّہ داری اُس پر ہی ہوگی۔“ نُدرت اپنے مخصوص انداز میں بولی اور رَدا ہنس پڑی۔

”اِس میں مذاق تو نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں، بالکل نہیں، دسترخوان پر تم روٹیوں کا حساب کر لینا۔“ نُدرت نے کہا۔

”تو پھر ایک کام کرو نُدرت۔“ رَدا بولی۔

”کیا؟“

”تم خود ہی اختر کو ایک خط لکھ دو۔“

”ارے واہ! بالکل ہی مرواؤ گی مونالیزا۔ اگر یہ خط کسی اور کے ہاتھ میں پہنچ گیا تو؟“

”تو اُس کی تحریر کچھ ایسی ویسی تھوڑی ہونی چاہیئے ہمیں اپنا وقار مدِنظر رکھنا ہوگا۔“

”تو پھر یُوں کرو کہ اِس قسم کی تحریروں کا مجھے تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی کے ساتھ کوئی حرکت کرانی ہے تو اُس کی ذِمّہ داری ہمارے شانوں پر ڈال دو لیکن یہ تحریری مسئلہ۔ اور پھر تم تو آج کل احسان لمیٹڈ کی مینجر لگی ہُوئی ہو اپنے سیکریٹریوں کو ڈکٹیشن دیتی ہوگی اگر اِس سلسلے میں بھی تم میری مدد کر دو تو مزا آجائے گا۔“

”ہُوں! ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”تو پھر بسم اللہ۔“ نُدرت نے کہا اور بڑی سنجیدگی سے کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گئی۔ رَدا کچھ سوچتی رہی تھی پھر اُس نے کہا۔

”لِکھو۔“

”تیار ہُوں۔“ نُدرت نے جواب دیا۔

”اختر صاحب! السلام علیکم۔“

نُدرت نے رَدا کو گھُورا۔ اور پھر آہستہ سے بولی۔ ”اور اُس کے بعد جانماز بچھا کر سجدے میں چلی جاؤں۔“

”بکواس مت کرو جو کچھ میں کہہ رہی ہُوں وہ لِکھو۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ سلام علیکم۔“ نُدرت نے کہا۔

”رَدا کے ذریعے آپ کی خیریت معلوم ہُوئی۔ ہمیں تو شاید اِس قابل نہیں سمجھا گیا تھا کہ براہِ راست خط لکھ دیا جاتا۔ بہرطور رَدا کے ذریعے یاد آوری کا شکریہ۔ کہیئے کب آرہے ہیں؟ آپ لوگوں کے جانے کے بعد بڑی اُداسی طاری ہو گئی تھی۔ آجایئے۔ کوئی بہانہ کر کے آجایئے ہم سب آپ کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہیں۔“

نُدرت پوری سنجیدگی سے رَدا کے الفاظ کاغذ پر تحریر کرتی رہی اور رَدا نے کاغذ اُس کے ہاتھ سے لے کر دیکھا۔

”بس اب اپنے دستخط کر دو۔“

”بس اِتنا ہی؟“ نُدرت نے حیرت سے پُوچھا۔

”ہاں! بس اِتنا ہی کافی ہے۔ میرا خیال ہے جتنا خُشک خط وہاں سے آیا ہے اُتنا ہی خُشک جواب یہاں سے جا رہا ہے۔“ رَدا نے کہا اور خط تہہ کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔

”تو اِس لئے طلبی ہُوئی تھی۔ ویسے یار مُونالیزا آج کل دِن بڑے بور گزر رہے ہیں۔ نہ طفیلی بیگم میں کوئی زندگی پائی جاتی ہے نہ عارفہ خالہ میں۔ محسن بڑی سنجیدگی سے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوششوں میں مصرُوف ہے اور اُس کی ماں از سرِنو اُس کی تربیت کر رہی ہے۔ غرض کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے دِل بہلایا جائے۔ کچھ سوچو، کچھ کرو۔“

”میں کیا سوچوں بھئی یہ حرکتیں تو تم ہی لوگ کرتے رہتے ہو۔ میرا نہ پہلے اُن سے کوئی تعلق رہا اور نہ اب رہ سکتا ہے۔“

”میں تو واقعی بڑی بور ہو رہی ہُوں۔ تم لوگ میرے لئے کوئی پروگرام بنا لو ورنہ کس وقت کیا ہو جائے، میں اِس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ نُدرت نے کہا۔

”تم خود پروگرام بناؤ، ثناء ہی اِس سلسلے میں تمھاری مدد کر سکتی ہے۔“

”خط کا تذکرہ ثناء سے کیا جائے گا؟“ نُدرت نے پُوچھا۔

”نہیں بھئی! میرے بھائی کا معاملہ ہے میں ایرے غیروں کو اِس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔“ رَدا نے شوخی سے کہا۔

”کہہ دُوں ثناء سے یہ بات کہ تم اُسے ایرا غیرا کہہ رہی تھیں؟“ نُدرت نے آنکھیں نکالیں۔

”کہہ دو پھر میں یہ بھی بتاؤں گی کہ میں کس لئے یہ بات کہہ رہی تھی اور تم جانتی ہو کہ ثناء کیا حشر کرے گی۔“

”نہیں بھئی۔ میں ہتھیار ڈالتی ہُوں کم از کم اِس مسئلے میں کوئی مذاق برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ خُدا کا شکر ہے کہ اختر نے اپنی حماقتوں کے اظہار کے لئے تمھارا انتخاب کیا ہے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو میری خیریت خطرے میں پڑ جاتی میلون۔“

”تمھاری مرضی ہے، بس میں نے تمھیں اِسی لئے بُلایا تھا۔“ رَدا نے کہا اور نُدرت رَدا کے کمرے سے نِکل گئی۔ رَدا کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ نُدرت سے ہونے والی گفتگو اور اُس کے لکھے ہُوئے خط نے اُس کے ذہن کو واقعی تھوڑی دیر کے لئے تر و تازہ کر دیا تھا۔

❀

یونیورسٹی کے معاملات معمُول کے مطابق ہو گئے تھے الیکشن کے زمانے میں جو تھوڑی سی فضا خراب ہُوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اب ٹھیک ہو گئی تھی۔ اقبال کافی دِن تک یونیورسٹی نہیں آیا۔ لیکن اُس ایک دفعہ کے بعد عصمت کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ اقبال سے ملاقات کے لئے اُس کے گھر جاتی۔ باقی لوگ بھی اب اِس سلسلے میں کوئی دِلچسپی نہیں لے رہے تھے لیکن عصمت کے ذہن میں ایک خلش سی مسلسل رہتی تھی، پھر ایک دِن اقبال یونیورسٹی آگیا۔ دوستوں نے اُس کا استقبال کیا تھا۔

اور اُس سے اُس کی خیریت معلوم کرتے رہے تھے۔ عصمت نے بھی دُور سے اُسے دیکھا لیکن اُس کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ البتہ وہ اُس کی واپسی سے کافی خوش ہوئی تھی۔ اقبال اب بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ گویا وہ تندرست ہو گیا تھا۔

دوسرے دن بھی وہ یونیورسٹی میں نظر آیا اور اُس کے بعد سے معمول کے مطابق آنے لگا۔ ابھی تک عصمت آگے بڑھ کر اُس سے نہیں ملی تھی حالانکہ دل کے گوشوں میں اقبال کے لئے ایک باقاعدہ جگہ بن گئی تھی۔ بھلا اُس میں کہاں ہمت تھی کہ خود آگے بڑھ کر اس سلسلے میں کوئی اظہار کر سکے۔

اُس دن یونیورسٹی کے ایک گوشے میں یُونہی ٹہلتی ہُوئی آ نکلی تھی کہ اُسے تھوڑے فاصلے پر اقبال نظر آگیا۔ عصمت کا دل دھڑک اُٹھا۔ یہ صرف اتفاق تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ چوری بن گئی۔ اقبال کی نگاہ بھی اُس پر پڑی اور اُس نے ایک لمحے تک عصمت کو دیکھنے کے بعد رُخ تبدیل کر لیا۔ عصمت کو ایک عجیب سا احساس ہُوا تھا اُسے یوں لگا جیسے اقبال اُس سے ناراض ہے۔ حالانکہ اِس سے قبل کی کیفیت بالکل مختلف تھی چند لمحات وہ سوچتی رہی پھر آہستہ آہستہ بڑھ کر اُس کے نزدیک پہنچ گئی۔

"ہیلو!" اُس نے اقبال کو مخاطب کیا اور اقبال اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیسی ہیں آپ؟" اُس نے پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

"میں تو ٹھیک ہُوں، لیکن آپ...؟"

"کیوں میں آپ کو ٹھیک نہیں لگ رہا؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے" عصمت نے خفیف سی مُسکراہٹ سے کہا۔

"ہو سکتا ہے" اقبال آہستہ سے بولا۔

"کچھ تبدیلی آگئی ہے آپ کے مزاج میں"

"ہاں! وقت انسان میں خود بخود تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے عصمت صاحبہ"

"خیریت؟ کوئی خاص بات ہُوئی ہے؟" عصمت نے کہا۔

"نہیں بس تجربات کی بات کر رہا ہُوں"

"کوئی ناخوشگوار تجربہ؟"

"ہاں! انسان اپنے آپ کو زیادہ عرصے تک نہیں چُھپا سکتا میرے خیال میں اُسے ابتداء حقیقتوں سے کرنی چاہیئے" اقبال نے کہا اور عصمت تعجب سے اُسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"میں سمجھی نہیں؟"

"دراصل عُمر کا تقاضہ کہہ لیجئے یا احساسِ کمتری کہ میں نے یونیورسٹی میں اپنے آپ کو وہ ظاہر نہیں کیا جو میں تھا دوستوں کو غالباً یہ احساس ہوگا کہ میں بھی کوئی قابلِ توجہ چیز ہُوں۔ اچھی طرح مِلتے تھے لیکن اُس دن ساری حقیقت واضح ہوگئی جب اُنھوں نے پہلی بار میرا گھر دیکھا۔ ملیر کالونی کا ایک کوارٹر بھلا اِس قابل کہاں ہو سکتا ہے عصمت صاحبہ کہ انسان دوبارہ اس طرف کا رُخ کرے"

عِصمت چونک پڑی۔ اقبال کا اندازِ فکر ذرا مختلف تھا وہ چند لمحات خاموشی سے اقبال کو دیکھتی رہی پھر بولی۔

"اقبال صاحب! آپ نے عجیب سی بات کہی ہے۔ بھلا دوستی اور ملیر کالونی کے کوارٹر کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

"ہے عصمت صاحبہ! معاف کیجئے گا میرا لہجہ شاید شکایتی ہو جائے آپ اِس پر توجہ مت دیجئے گا بعض معاملات میں انتہائی احمق واقع ہُوا ہُوں۔ براہِ کرم آپ خیال نہ کیجئے گا بس کچھ ایسی ہی کیفیت ہوگئی ہے آج کل کہ پُرانی زندگی پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا ہُوں۔ وہ نہیں سوچنا چاہیئے جو سوچتا رہا ہوں"

"لگتا ہے آپ کچھ ناراض ہیں مجھ سے"

"نہیں پلیز ایسا کوئی حق نہیں ہے مجھے" اقبال نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور نہ جانے کیوں عصمت مُسکرا پڑی۔

"چلیئے آپ کو چائے پلا دُوں" اُس نے کہا اور اقبال گردن ہلا کر اُس کے ساتھ آگے چل پڑا۔

کینٹین کی ایک میز پر بیٹھ کر عصمت نے چائے کے لئے کہا اور پھر اقبال کی صورت دیکھنے لگی۔ نہ جانے اُس کے اندر یہ جُرأت کہاں سے پیدا ہوگئی تھی۔ یہ اُس کی زندگی کا سب سے پہلا واقعہ تھا کہ وہ کسی نوجوان لڑکے کے ساتھ تنہا ایک میز پر بیٹھی تھی اور خاص بات یہ کہ اُس نے خود ہی اُسے اپنے ساتھ چائے کی پیش کش کی تھی۔

"ہاں! اب آپ بتیئے کیا کہہ رہے تھے؟ دراصل بڑی بے ربط گفتگو تھی ہماری اِسی لئے میں نے سوچا کہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کی جائے"

"عصمت صاحبہ! آپ ایک بات بتائیے۔ آپ میرے گھر کیوں آئی تھیں؟" اقبال نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"آپ کو دیکھنے"

"آخر کیوں؟ میرا کیا واسطہ تھا آپ سے؟"

"آپ میرے یونیورسٹی کے ساتھی ہیں"

"تو اِس کے بعد آپ دوبارہ کیوں نہیں آئیں؟"

"دراصل میرے اُوپر کچھ ذمہ داریاں ہیں اور پھر گھر سے اتنی آزادی بھی نہیں کہ بہت دیر کے لئے کہیں جا سکوں..." عصمت نے جواب دیا۔

"نہیں یہ بات میں نہیں مانتا میرے خیال میں آپ نے دوبارہ اُس گھر میں قدم رکھنا پسند نہیں کیا"

"نہیں اقبال صاحب! براہِ کرم ایسی باتیں نہ کریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور پھر آپ کے گھر سے مجھے..." عصمت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"معاف کیجئے گا میں نے یہی سوچا تھا۔ ویسے بھی آپ نے مجھے چند لمحات کے لئے بہت بڑی حیثیت دے دی تھی لیکن اِس کے بعد آپ نے مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا جو آپ نے مجھے دیا تھا۔ آپ مجھے اسپتال لے گئیں۔ آپ نے مجھے وہاں داخل کرایا۔ لیکن اُس کے بعد سے لے کر اُس وقت تک جب تک میں اسپتال میں رہا میں نے ہر لمحہ آپ کا انتظار کیا آپ نہیں آئیں مجھے بہت دُکھ ہُوا۔ نہ جانے کیوں میں یہ توقع رکھتا تھا کہ آپ ضرور آئیں گی۔ ایک بار مجھے دیکھنے ضرور آئیں گی۔ لیکن اُس وقت تک آپ نہیں آئیں جب تک کہ میں اسپتال میں رہا پھر میں نے یہ خیال ہی چھوڑ دیا لیکن اِس کے بعد آپ دوبارہ میرے کوارٹر میں آئیں۔ میں آپ سے ناراض تھا۔ اسپتال نہ آنے پر ناراض تھا۔ میں نے آپ سے صحیح طور پر گفتگو بھی نہیں کی جب کہ میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ آپ سے اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ آپ نے مجھ سے یہ بھی نہ پُوچھا کہ میں آپ سے کیوں ناراض ہُوں۔ میں نے سوچا کہ اِس کے بعد آپ دوبارہ میرے پاس ضرور آئیں گی لیکن میری یہ خوش فہمی بھی ختم ہوگئی عصمت صاحبہ! اُس کے بعد سے میں نے بہت کچھ سوچا ہے اِس دُنیا کے بارے میں اور حقیقت انسان کو اپنی پہنچ سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے"

بیرے نے چائے لاکر رکھ دی اور عصمت چائے بنانے لگی پھر اُس نے بڑے خلوص سے ایک پیالی اقبال کے سامنے رکھ دی۔

"سُنیئے اقبال صاحب! آپ کا اب تک کا تمام خیال غلط ہے۔ میں آپ سے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ یہ بات کہہ رہی ہُوں کہ میں ضرور آپ کے پاس پہنچتی لیکن آپ خود سوچئے پہلی بات تو یہ کہ اگر میں اسپتال آتی تو لوگوں کو اِس کا علم ہو ہی جاتا اور وہ میرے نام کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ منسوب کر دیتے، آپ کے گھر آنے کا جہاں تک تعلق ہے تو آپ یقین کیجئے کہ مجھے گھر سے اتنی آزادی اور فرصت نہیں ہے کہ میں آسانی سے کہیں آ جا سکوں۔ بس یہ دو باتیں تھیں جن کی وجہ سے میں دوبارہ آپ تک نہیں پہنچ سکی۔ آپ کو اگر اِس کی شکایت ہے تو چلیئے معاف کر دیجئے"

"ارے نہیں... نہیں عصمت صاحبہ! آپ پھر مجھے بھٹکا رہی ہیں۔ خُدا کی قسم آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں میں بھٹک گیا تو صرف میں ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ بے موت مارے جائیں گے"

"آپ نہ جانے کیسی گفتگو کر رہے ہیں۔ کیوں بھٹک جائیں گے آپ؟ میں آپ کو کیوں بھٹکاؤں گی؟ کیوں مر جائیں گے لوگ؟ زندہ رہیں اقبال صاحب زندگی بڑی قیمتی چیز ہے"

"ہاں۔ بشرطیکہ اِس کا کوئی مصرف ہو"

"خیر چائے پیئیں۔ ہم اِس موضوع پر کبھی دوبارہ باتیں کریں گے"

"کیا مجھے یہ سعادت حاصل ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی دوبارہ بھی مجھ پر اتنی توجہ دیں؟"

"بھئی طنز آپ کے مُنہ سے اچھا نہیں لگتا پلیز" عصمت نے اپنی پیالی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہُوئے کہا اور اقبال خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ چائے ختم ہوگئی تو عصمت نے کہا۔

"اُٹھیں یہاں سے"

"ضرور" اقبال کھڑا ہو گیا۔ عصمت نے بل کی رقم نکال کر میز پر ڈالی۔ اور پھر دونوں باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر اُس نے کہا۔

"میں اب چلتی ہُوں۔ براہِ کرم آپ اپنے ذہن سے وہ تمام منفی باتیں نکال دیں جو اب تک آپ کے دل میں تھیں"

"آپ کے حکم کی تعمیل میرا فرض ہے کیونکہ آپ میری محسنہ ہیں" اقبال نے جواب دیا۔

"نہیں اقبال! براہِ کرم اتنی سنجیدہ گفتگو نہ کریں مجھے دُکھ ہوگا" عصمت نے کہا اور اقبال اُسے عجیب سی نِگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"بہت بہتر لیکن ایک شرط ہے کل اِسی وقت آپ میرے ساتھ کینٹین میں چائے پئیں گی"

"ضرور پیئوں گی کیوں نہیں" عصمت نے جواب دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

شکر تھا کہ کسی نے اِن دونوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اور یونیورسٹی میں یہ سب کچھ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں بہت سے ایسے دوست بھی تھے جن میں صنف کا کوئی تعین نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں عصمت دِل ہی دِل میں گھبرا رہی تھی۔ خوفزدہ تھی۔ اور وہ رات اُس کے لئے کافی مشکل رہی بستر پر لیٹنے کے بعد جب تنہائی نصیب ہوئی تو اُسے اپنی جُرأت پہ خود حیرت ہونے لگی۔ اقبال اُس کے ذہن کے گوشوں میں جاں گزیں ہو گیا تھا لیکن وہ خود آگے بڑھ کر کبھی اُس سے کوئی بات کر سکے گی۔ اُس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اُس دِن اقبال کے گھر جانے کا فیصلہ بھی بادِل نخواستہ ہی ہُوا تھا اور وہاں سے واپسی کے بعد وہ یہ سوچتی رہی تھی کہ اگر گھر میں کسی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ کیا سوچے گا؟ اور آج ... آج جو کچھ ہُوا وہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اُسے واقعی اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی۔

لیکن یہ اچھا ہی ہُوا تھا کہ اقبال کی خاموشی، اُس کے شکایتی انداز کی وضاحت ہو گئی تھی۔ اُس کی ناراضگی دُور ہو جانے سے اُسے تسکین حاصل ہُوئی تھی اُس نے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیا وہ اقبال کو چاہنے لگی ہے؟ اور دِل نے ہاں کر دی تھی۔ یعنی وہ اقبال کو چاہنے لگی ہے۔ دِل کے اِس انکشاف پر وہ لرز کر رہ گئی۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اگر کسی کو علم ہو گیا تو اُس کے کردار کے بارے میں کیا کیا رائے قائم کی جائے گی۔ یہ مناسب نہیں ہے۔

رات کے نہ جانے کون سے پہر اُس کو نیند آئی لیکن صبح نماز کے وقت اُٹھ گئی۔ مصلّے بچھایا اور نماز پڑھنے بیٹھ گئی۔ نماز کے بعد اُس نے خلوصِ دِل سے دُعا مانگی کہ خُدا اُس کی راہ نمائی کرے اور اُنہی راستوں پر چلائے جو اُس کے ماں باپ کے لئے بدنامی کا باعث نہ ہوں۔

بعد کے معمولات جُوں کے تُوں تھے، یونیورسٹی جانا تھا تیار ہُوئی اور چل پڑی لیکن یونیورسٹی میں پہلا قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اقبال نظر آیا تھا مسکراتا ہُوا اُس کی جانب بڑھ آیا۔

"ہیلو!"

"ہیلو اقبال! خیریت؟"

"ہاں اب تو بالکل خیریت ہے۔ بس کل سے طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی"

"اچھی بات ہے، خوشی ہُوئی" اُس نے سادگی سے جواب دیا۔

"کینٹین میں وقت مقررہ پہ انتظار کروں گا" وقت مقررہ پر وہ کینٹین پہنچ گئی۔ اقبال اُسی میز پر بیٹھا ہُوا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گئی۔

"کتنی دیر پہلے پہنچے یہاں؟"

"بس یوں سمجھ لیجئے نہ جانے کب سے بیٹھا ہُوا ہوں"

"وجہ؟"

"آپ کا انتظار"

"مناسب نہیں ہے اقبال۔ یہ یونیورسٹی ہے یہاں معمولی سی بات کو تفریح کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ لوگ ہمارا نام لے کر ہنسیں، آوازیں کسیں؟"

"قطعی نہیں پسند کروں گا۔ آپ کی حُرمت اب میری زندگی کا سرمایہ ہے"

"اِتنا آگے نہ بڑھیں اقبال۔ کسی سے دوستی یا اُنسیت رکھی جاتی ہے تو اُس کی کوئی حد مقرر کر لی جاتی ہے"

"ٹھیک ہے۔ میں نے یہ حدیں وقت کے لئے چھوڑ دی ہیں۔ آپ میرے راستے مت روکیں۔ آپ کا احسان مند ہوں گا"

عصمت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چائے آ گئی اور اقبال نے ٹرے اپنی جانب سرکانا چاہی تو عصمت نے ٹرے اُس کے سامنے سے اپنی طرف گھسیٹ لی۔ اقبال مُسکرا کر خاموش ہو گیا تھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے اقبال کہ میں کہاں رہتی ہوں؟ میرا گھر بار کہاں ہے، کون ہوں میں؟"

"یقین کریں مجھے کچھ نہیں معلوم، لیکن دِل چاہتا ہے کہ معلوم کروں"

"اِتنی جلدی مناسب نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا"

"اِس رفتہ رفتہ کے لئے میں شکر گزار ہوں"

"شرارت نہیں پلیز" عصمت نے چائے کی پیالی اُس کے سامنے سرکاتے ہُوئے کہا اور اقبال چائے کے گھونٹ لینے لگا۔ پھر بولا۔

"عصمت صاحبہ! کبھی دوبارہ بھی ہمارے غریب خانے پر آیئے۔ امّی سے ملواؤں گا آپ کو۔ میری بہن ہے تنویر اُس سے میں کئی بار آپ کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ یقین کریں اُس وقت سے بہت پہلے جب آپ ہمارے گھر آئی تھیں"

"اچھا! تنویر پڑھتی ہے؟"

"نہیں میٹرک کے بعد اُس نے تعلیم ختم کر دی ہے۔ بس ماں باپ کی نگاہوں کا مرکز میں ہی ہوں۔ والدہ نابینا ہیں۔ والد صاحب اسٹیل مِل میں ملازمت کرتے ہیں۔ معمولی سی زندگی ہے ہماری۔ اور حقیقت یہی ہے عصمت صاحبہ کہ اب مجھے اِس گھر کا بوجھ سنبھال لینا چاہیئے لیکن گھر والے اِس بات پر بضد ہیں کہ میں تعلیم مکمل کر لوں تاکہ اُن کی محنتوں کا پھل ذرا اچھے انداز میں اُن کے سامنے آئے"

"بہت اچھی بات ہے۔ میرا خیال ہے۔ یہ آپ کا آخری سال ہے؟"

"ہاں"

"اِس کے بعد؟"

"یقین کیجئے عصمت! میں نے کبھی اپنی زندگی میں تاج محل نہیں بنائے۔ میں حقیقتوں کی دُنیا میں رہنے کا قائل ہوں۔ ظاہر ہے تعلیم ختم کرنے کے بعد نوکری کروں گا۔ ذرا بہتر نوکری مل جائے تو اچھا ہے والدین کی خواہشات بھی پوری ہو جائیں۔ بہن کی ذِمّہ داری پوری کروں گا اور اِس کے بعد اپنا گھر بساؤں گا۔ میری زندگی میں کوئی ایسا تصور نہیں ہے جو آفاقی ہو۔ بس عام سی زندگی گزارنے کا خواہشمند ہوں"

"اچھی بات ہے یہ تو۔ مجھے پسند آئی" عصمت نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ ہمارے گھر آئیں گی؟"

"دیکھو اقبال وعدہ نہیں کرتی لیکن موقع ضرور نکالوں گی۔ میں تمہیں بتاؤں میرے گھر میں بھی میرے والدین ہیں معمولی سی حیثیت کے مالک ہیں ہم لوگ بھی۔ میری بہن ہے دلوی ہیں اور بس ہماری کچھ ذِمّہ داریاں ہیں جنہیں ہم پورا کرتے ہیں۔ اور اِس کی قطعی گنجائش نہیں ہے کہ ہم اپنی مرضی سے کہیں آ جا سکیں"

"اِس کے باوجود آپ وقت نکالنے کا وعدہ کر چکی ہیں"

"ہاں لیکن براہِ کرم جلد بازی مت کرنا۔ ویسے ایک درخواست ہے تم سے۔ ملاقاتیں جس قدر کم ہوں بہتر ہے۔ میں لوگوں کی گفتگو کا موضوع نہیں بننا چاہتی"

"اِس سلسلے میں آپ جس طرح کہیں گی میں آپ سے تعاون کروں گا" اقبال نے سچائی سے کہا۔

"بے حد شکریہ! مجھے یقین ہے کہ تم میری عزت کا پاس کرو گے اور دوستوں کو یہ سب کچھ کرنا بھی چاہیئے"

"آپ نے کہہ دیا میرے لئے کافی ہے" اقبال نے جواب دیا اِس کے بعد وہ تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے پھر اُٹھ گئے۔

☆

رُدا نے وہ اشتہار نظر انداز کر دیا تھا ثاقب سے دوبارہ ملاقات کر کے وہ اپنی زندگی کو زہر آلود نہیں بنا سکتی تھی لیکن بہت سے خیالات اُس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے خیر دین نے کیا اُس سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا جو آخری گفتگو اُس کے اور خیر دین کے درمیان ہُوئی تھی وہ کچھ تلخ سی ہو گئی تھی ممکن ہے خیر دین نے اُس کا بہت بُرا مانا ہو۔ اُس دِن کے بعد سے وہ آج تک آیا بھی نہیں تھا۔ رُدا کئی بار اُسے یاد کر چکی تھی خیر دین کے بارے میں جب بھی وہ سوچتی اُس کا ذہن عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتا۔ جس طرح وہ خود احسان صاحب کے گھر والوں کے لئے ایک معمّہ بنی ہُوئی تھی اِسی طرح خیر دین اُس کے لئے معمّہ بن گیا تھا۔ نہ جانے کیوں اُس کے دِل میں بارہا یہ خواہش پیدا ہُوئی تھی کہ وہ خیر دین کے بارے میں سب کچھ جان لے گھر کے دوسرے لوگوں کو تو خیر دین کی دوسری حیثیت کا گمان بھی نہیں تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ خیر دین کے پسِ پردہ کچھ اور ہے۔

اِس کم بخت کے بارے میں اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اب کہاں رہتا ہے کیا کر رہا ہے؟ ویسے یہ اندازہ اُسے ہو چکا تھا کہ وہ گھریلو قسم کا نوکر نہیں ہے پھر آخر وہ اُس کوٹھی میں کیوں آیا تھا اور کیوں یہاں سے چلا گیا؟

کہا جاتا ہے کہ اگر دِل کی گہرائیوں سے کسی کو یاد کیا جائے تو وہ ضرور مِل جاتا ہے اُس وقت وہ خیر دین کے بارے میں سوچ رہی تھی تیمور اُس کے پاس تھا کیونکہ ثنا کسی کام سے کہیں گئی ہُوئی تھی اور وہ تیمور کے ساتھ باہر بیٹھی ہُوئی تھی کہ دروازے سے خیر دین داخل ہوتا نظر آیا اور رُدا چونک کر کھڑی ہو گئی۔ خیر دین سے کچھ ایسی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی کہ اب وہ اُسے مخاطب کرنے میں کوئی اُلجھن نہیں محسوس کرتی تھی خیر دین نے شاید اُسے نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ سیدھا ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا کہ رُدا نے اُسے آواز دے لی۔

"خیر دین... خیر دین!" اور خیر دین چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر وہ آہستہ سے مسکرا کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"کہیئے رُدا بی بی خیریت سے ہیں آپ؟"

"منہ اُٹھائے چلے جا رہے تھے جیسے مجھے دیکھا نہ ہو لیکن میں

سب جانتی ہُوں"

"خیر اپنے دل سے یہ احساس آپ نکال دیجئے کہ میں آپ کو دیکھ کر نظرانداز کر سکتا ہُوں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"

"آؤ، اِدھر آجاؤ۔ بعد میں مِل لینا دوسرے لوگوں سے۔ میں جانتی ہوں کہ میں تمھارے لئے اِس کوٹھی میں سب سے غیر اہم شخصیت ہُوں"

"غیر کا لفظ آپ ہمیشہ کے لئے درمیان سے نکال دیجئے" خیر دین نے کہا۔

"آج پھر تم مجھے بھٹکنے پر مجبُور کر رہے ہو۔۔" رُدا نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"کاش میرے پاس ایسا کوئی نُسخہ ہوتا کہ آپ بھٹک جائیں"

"اچھا۔۔۔ اچھا! بُقراط بننے کی کوشش مت کرو۔ تمھیں پتہ نہیں میں کِس طرح تمھیں یاد کر رہی تھی"

"تو بتا دیجئے" خیر دین نے کہا۔

"کمال ہے آج تو تم گفتگو میں مصنُوعی پن بھی نہیں پیدا کر رہے"

"تصنع کی اِس زندگی سے اُکتا گیا ہُوں رُدا" خیر دین نے جواب دیا اور رُدا چونک کر اُسے دیکھنے لگی ایک عجیب سا احساس اُس کے دِل کے پردوں کو چھُوتا ہُوا گزر گیا تھا کتنی بے تکلفی سے خیر دین نے اُسے مخاطب کیا ہے۔ بہر طور اِس بات کے جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔ خیر دین تیمور کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

"تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم سے ملاقات کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے"؟

"بتایا تھا آپ کو یاد نہیں ہوگا"

"کب" رُدا نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"میں نے کہا تھا جب بھی میری ضرورت ہو مجھے دِل سے یاد کر لیں" رُدا ہنسنے لگی۔

"بہت چالاک ہو تم۔ واقعی مجھے تمھاری ضرورت تھی"

"اور آپ نے مجھے دِل سے یاد کیا"؟

"شاید جبھی تو تم آگئے"

"حکم کیجئے۔ کیا خدمت ہے میرے لائق"؟

"خیر دین، پلیز دیکھو اِس وقت غیر سنجیدگی سے کام مت لینا۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہُوں"

"بسم اللہ کیجئے" خیر دین نے کہا۔

"ثاقب کو تم نے کہاں چھوڑ دیا تھا"؟

"یہ سوال جواب کے قابل نہیں ہے"!

"سمجھنے کی کوشش کرو کیا وہ تمھارے چنگل سے نکل گئے ہیں"؟ رُدا نے سوال کیا۔

"ہو سکتا ہے مگر آپ کو یہ خیال کیوں پیدا ہُوا"؟

"ایک اشتہار چھپا تھا اخبار میں جس میں ثاقب نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا کہ میں اُن سے نیشنل اسپتال میں مِل لُوں۔ وہ سخت بیمار ہیں"

"اوہ! پھر آپ ملیں اُن سے"؟

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک مُصیبت سے پیچھا چھُڑانے کے بعد میں دوبارہ اُس سے کیسے مِل سکتی ہُوں خیر دین میری مدد کرو خُدا کے لئے۔ میں کئی دِن سے سخت اُلجھن میں ہُوں اُس دِن سے جب سے وہ اشتہار میری نگاہوں کے سامنے سے گزرا تھا"

"خیر آپ کی اُلجھنوں کا حل میرے پاس کہاں سے ہو سکتا ہے رُدا صاحبہ! آپ خود اپنی اُلجھنوں کا حل تلاش نہیں کر سکتیں"

"مجھ پر طنز کر رہے ہو۔ کرتے رہو۔ میں جانتی ہُوں کہ اِس دُنیا میں کوئی بھی بے لوث ہو کر کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا"

"جب یہ بات جانتی ہیں تو پھر خواہ مخواہ کسی کو مجبُور کیوں کرتی ہیں" خیر دین نے تلخ سے لہجے میں کہا۔ اور رُدا چونک کر اُسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"کیا مطلب ہے اِس بات سے تمھارا"؟

"جب آپ یہ جانتی ہیں کہ اِس دُنیا میں کوئی کسی سے بے لوث ہو کر نہیں مِلتا اور اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تو پھر آپ کسی سے اِس بات کی خواہش مند کیوں رہتی ہیں"؟

"خُدا کے لئے اِس وقت منطق مت بگھارو میں اُلجھن میں ہُوں"

"جی رُدا بی بی فرمائیے! خیر دین ولد بشیر دین آپ کے لئے کیا کر سکتا ہے"؟ خیر دین کا لہجہ ایک دم بدل گیا، اور رُدا پریشان نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"گویا تم میری مدد نہیں کرنا چاہتے"؟

"لو جی ہم تو غلام ہیں آپ کے رُدا بی بی جی بس حکم دے دیا کریں مُنّی خیر دین کو۔ اِس بار کیا کرنا ہے ہمیں"؟

"فضول بکواس مت کرو"

"بہت اچھا جی وعدہ کرتے ہیں آئندہ نہیں کریں گے"

"ثاقب کو تم نے کہاں چھوڑا تھا"؟ رُدا نے جھلائے ہُوئے لہجے میں پُوچھا۔

"نیشنل اسپتال میں جی" خیر دین نے جواب دیا۔

"کیا وہ واقعی بہت بیمار ہے"؟

"پتہ نہیں جی اب تو شاید مر بھی چُکا ہو" خیر دین نے جواب دیا۔

"اوہ! تم نے اُسے نیشنل اسپتال میں داخل کرانے کے بعد اُس کی خبرگیری نہیں کی"؟

"کِس کِس کی خبرگیری کریں جی، اپنے ہی بہت سے مسائل ہیں آپ خود سوچیں رُدا بی بی۔ اِس دُنیا میں جینا کتنا مشکل ہے اور پھر ہم جیسے لوگ جن کا کوئی بھی نہیں ہوتا، چنانچہ اپنی زندگی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے"

"میں تمھارے لہجے کی تلخی کو اچھی طرح محسوس کر رہی ہُوں۔ تم کہاں بھٹک رہے ہو مجھے کچھ نہیں معلوم؛ واپس کیوں نہیں آجاتے"؟

"نہیں رُدا بی بی! افسوس ہے آپ نے آج تک خیر دین کو سمجھا ہی نہیں۔ ہم جہاں سے چلے جاتے ہیں وہاں کبھی واپس نہیں آتے" خیر دین نے آہستہ سے کہا اور رُدا عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"میں جانتی ہُوں تم مجھ سے ناراض ہو"

"لو جی کمال ہوگئی رُدا بی بی! کیسی ہوگئی ہے یہ دُنیا۔ لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ کسی پر ظلم کر رہے ہیں اور پھر کئے جاتے ہیں۔ چلو جی کوئی بات نہیں خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اب جو کچھ کریں گے۔ اپنے بل بوتے پر کریں گے۔ سو رُدا بی بی ہم آپ سے ناراض نہیں ہیں بلکہ اپنے آپ کو آزما رہے ہیں۔ لو جی بڑے سیانے بنتے تھے ہم اب دیکھیں گے کہ کتنے سیانے ہیں اور پھر رُدا بی بی ہماری محنت کا پھل بھی تو ملے گا ہمیں"

"مت کیا کرو اِس لہجے میں مجھ سے گفتگو خیر دین، مت کیا کرو۔ اگر میں تم پر ظلم کر رہی ہُوں تو تم بھی تو کچھ کم نہیں کر رہے۔ سب کو اُنہی میں بیوقوف بناتے ہوئے مجھے بھی شمار کر لیا ہے"! رُدا نے شکایتی لہجے میں کہا اور خیر دین عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"تو رُدا بی بی کیا کرنا چاہیئے۔ آپ کو اِن لوگوں سے الگ کر کے دیکھیں"؟ اُس نے سوال کیا اور رُدا چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُسے اپنے الفاظ کا خیال آیا اُسی نے تو یہ سب کچھ کہا تھا۔ خیر دین کا کیا قصُور؟ اُس نے خیر دین سے کچھ نہ کہا تب خیر دین بولا۔

"بس جی اب تو ایک ہی دُھن سوار ہے ذہن پر اور اُسی کے لئے اپنا وطن چھوڑ رہے ہیں"

"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔" رُدا چونک کر بولی۔

"ہاں جی اپنی بھی ہنجیری تیار ہے چلے دوبئی رُدا بی بی! گھروں میں نوکریاں ہی کرنی ہیں تو کسی شیخ کے گھر کیوں نہ کی جائے تاکہ مال بھی اچھا ملے۔ چلو جی چار پیسے کما لئے تو اپنی زندگی بھی بن جائے گی کیا فائدہ ایسے گھروں میں کام کرنے سے جہاں روٹی کپڑے کے علاوہ اور کچھ نہ مِل سکے اب تو ہم نتھو، بدھو، خیرو دوبئی چلا جاتا ہے واپس آتا ہے تو بریف کیس میں نوٹ بھرے ہوتے ہیں اور ساتھ میں الیکٹرونک سامان، تو خیر دین نے بھی یہی سوچا ہے کہ اب اِس نگری میں زندگی گزارنے سے کیا فائدہ؛ اپنا کوئی ہے ہی نہیں! نہ یہاں ہے نہ وہاں ہوگا"!

"تم۔۔۔ تم دوبئی جا رہے ہو"؟

"ہاں جی، تیاریاں مکمل ہوگئی ہیں بس یُوں سمجھ لیں آپ سے ملنے آئے ہیں" خیر دین نے کہا اور نہ جانے کیوں رُدا کو اپنا دِل خالی خالی محسوس ہُوا۔ اُسے ایک دم سے ایک عجیب سا احساس ہُوا تھا اور اُس احساس نے اُس کے بدن پر ہلکی ہلکی کپکپی طاری کر دی۔ وہ گردن جھکائے بیٹھی رہی اور نہ جانے کب اور کِس طرح اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطرے رینگ آئے جب یہ قطرے آنکھوں سے نکل کر رُخساروں تک پہنچے تو خیر دین چونک پڑا۔

"ارے، ارے رُدا بی بی رُدا۔۔۔ سُنیئے رُدا پلیز" اُس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہوگیا۔

"مت بات کرو مجھ سے خیر دین، مت بات کرو"! رُدا کا لہجہ رُندھ گیا۔

"کوئی غلط بات کہہ دی ہم نے رُدا۔ پلیز رُدا یہ کیا ہو رہا ہے پلیز رُخسار خشک کر لو میں یہ جُرأت نہیں کر سکتا۔ میرے صبر کو نہ آزماؤ رُدا"! خیر دین نے دونوں ہاتھ مسلتے ہُوئے کہا اور رُدا ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی

"تو تم دوبئی جا رہے ہو۔ جاؤ ٹھیک ہے۔ دُنیا خالی ہی تو ہے۔ کون کِس پر اعتبار کر سکتا ہے۔ کون کِس پر بھروسہ کر سکتا ہے اور پھر خیر دین میرا تمھارا واسطہ بھی کیا ہے، بس ذرا یُوں

قربت ہوگئی تھی کہ تم بھی اِس کوٹھی میں اجنبی تھے اور میں بھی۔ اور پھر تم نے عجیب و غریب انداز میں ہمیشہ میری نگہداشت کی اور مجھے بہت سی اُلجھنوں سے بچایا۔ کیا اِتنی سی بات کسی پر حق قائم کر دیتی ہے؟ میرا کیا حق ہے تم پر؟ ٹھیک ہے جاؤ تم بھی جاؤ اور کون رہا ہے میرا جو میں تم پر بھروسہ کروں۔"

رُدا آنسو بھری آواز میں کہہ رہی تھی اور خیر دین عجیب سے انداز میں اُس کی صورت دیکھ رہا تھا پھر بولا۔

"ایک بار کہہ کر دیکھو تو رُدا بی بی کہ ہم تمہارے ہیں۔ پھر دیکھو خیر دین اِس دُنیا کو کیا بنا دیتا ہے۔"

رُدا ایک بار پھر خیر دین کو دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ خیر دین کے چہرے پر اُس وقت اُسے وہی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی جو اُس کی شخصیت کو بدل دیتی تھی چند لمحات دونوں خاموش رہے پھر رُدا نے کہا۔

"دوبئی جا کر کمانا بہت ضروری ہے کیا؟ میں... میں نہیں مانتی جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ حقیقت تو نہیں ہے خیر دین کیوں پریشان کرتے ہو مجھے، تم بھلا دوبئی جاؤ گے تم۔ جو نہ جانے کیا ہو؟"

"ارے۔ ارے۔ ارے پھر وہی گڑبڑ چلیں بھئی ٹھیک ہے نہیں جانے دوبئی دوبئی ہمارا مستقبل تو آپ کی اِن چند باتوں ہی نے تباہ کر دیا۔"

رُدا کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اِس وقت کہ دیکھنے والے کو اپنے دل پر اختیار نہ رہے۔ خیر دین نے آنکھیں بند کر لیں اُس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے۔ اور عجیب سی شکل بنا کر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں رُدا بی بی۔ خیر دین برباد ہو گئے اللہ کے فضل سے۔" اُس نے کہا اور رُدا ہنس پڑی۔

"بہت مسخرے ہو تم۔ پتہ نہیں کیا چیز ہو بہرطور اب ایک بات سنجیدگی سے بتاؤ۔ کیا واقعی باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"رکھتے ہیں نہیں جی، رکھتے تھے۔ اب کیا جائیں گے۔ یہ آنسو بھری مسکراہٹ ہمارے پیروں کے لئے فالج بن گئی ہے اب یہ فالج زدہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے بھلا یہاں سے کہیں جائیں گے۔"

"فضول باتیں مت کرو خیر دین تم... تم اچھا یہ بتاؤ کہاں رہتے ہو؟ اگر تم سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئے تو کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

"کچھ دن اور انتظار کر لیجئے رُدا بی بی، اِس کے بعد ہم آپ کو اپنے گھر کا پتہ بھی بتا دیں گے۔ میرا مطلب ہے ذرا گھر کا بندوبست تو کر لیں ابھی تو کوئی نئی نوکری شروع نہیں کی بس تلاش میں ہیں۔"

"جیسے میں تمہاری باتوں پر یقین کر رہی ہوں نا۔"

"کر تو لینا چاہیئے آپ کو جی۔ ہم نے بھلا کبھی آپ سے کوئی بات چھپائی ہے؟"

"ہوں، ساری باتیں بتا دیتے ہو ناں مجھے۔" رُدا نے کہا۔

"اچھا جی اب اجازت دیں ذرا دادی امّاں سے مل لیں۔ ایک نئی کہانی یاد کی ہے اُن کے لئے اُنھیں سنا دیں۔"

"نہیں بیٹھو! تم نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے خیر دین۔"

"رُدا بی بی! ایک امانت رکھوانا چاہتے ہیں آپ کے پاس رکھ لیں گی؟"

"کیسی امانت؟" رُدا نے کہا اور خیر دین نے اپنے لباس سے ایک سیل بند پیکٹ نکالا چمڑے کے لفافے میں کوئی چیز پیک کی ہوئی تھی لیکن اُس کا منہ مضبوطی سے بند کر کے اُسے سیل کر دیا گیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ایک امانت ہے ہماری جسے آپ اگر وعدہ کریں کہ پوری طرح محفوظ رکھیں گی تو ہم آپ کے پاس رکھوانا چاہتے ہیں۔"

"ہے کیا اِس میں؟"

"امانتوں کے بارے میں بتایا نہیں جاتا جی جو کچھ بھی ہے۔"

"اگر تم اِسے میرے پاس محفوظ کرنا چاہتے ہو تو کر دو۔ ویسے تمہیں یہ اندازہ ہے کہ میں خود بھی غریب الوطن ہوں۔ میرا اپنا گھر تو نہیں ہے یہ۔"

"نہیں... نہیں جی اِس گھر کے لوگ آپ کو غیر نہیں سمجھتے آپ اگر اِسے محفوظ رکھ لیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے تم یہ دے دو مجھے لیکن اب ایک بات بتاؤ۔ کیا واقعی دوبئی جانے کا فیصلہ سنجیدگی سے کیا تھا؟"

"ہاں بی بی! سوچ رہے تھے کہ یہ شہر چھوڑ دیں، سچی بات یہ ہے کہ جنھیں دِل اپنا سمجھتا ہے اگر وہ بھی عام ہی لوگ بن جائیں تو پھر طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے اِسی سوچ کے تحت یہاں سے بھاگ رہے تھے کہ کم از کم اپنی اِس کیفیت

سے تو چھٹکارا پا لیں گے۔"

"خیر دین! میں تمہیں غیر نہیں سمجھتی۔ تم یقین کرو۔ میں تمہیں غیر نہیں سمجھتی بلکہ بعض اوقات تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے۔ میں تمہارے بارے میں بہت سوچتی ہوں خیر دین، تم اکثر میرے ذہن میں آتے رہتے ہو۔ تمہیں خیر دین کہتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے مگر میں کیا کروں تم نے مجھے ایسے چکر میں ڈالا ہے کہ میں کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پاتی تم خیر دین تو خیر نہیں ہو لیکن کیا ہو یہ جانے بغیر میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔"

"خدا کرے آپ زندگی بھر یہ نہ جان سکیں۔" خیر دین نے کہا۔

"کیا بک بک کر رہے ہو؟"

"ہاں رُدا! آپ ہی نے تو کہا ہے کہ اگر آپ میرے بارے میں جان لیں گی تو میرا پیچھا چھوڑ دیں گی اور نہیں جانیں گی تو پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ آپ سے اپنا پیچھا چھڑانا کون چاہتا ہے؟"

"اچھا اب بہت باتیں ہو گئیں مجھے یہ تمام باتیں نہیں آتیں۔"

"تو پھر رُدا بی بی وہ باتیں کر لیجئے جو ہمارے درمیان سے اجنبیت کے تمام پردے ہٹا دیں۔"

"ابھی نہیں خیر دین۔ کچھ دن کی مہلت اور دے دو پلیز! اگر احسان کر سکتے ہو تو ایک احسان کر دو اپنے بارے میں مجھے بتا دو"

"رُدا بی بی۔ ابھی ہمیں بھی مہلت چاہیئے سمجھیں آپ۔"

"اِس کا مطلب ہے کہ تم اعتراف کر رہے ہو؟"

"کیسا اعتراف جی؟" خیر دین نے کہا۔

"یہی کہ تم نے اپنی شخصیت کو ڈبل تسلیم کر لیا ہے۔"

"او نہیں جی ہم کیا اور ہماری شخصیت کیا۔ سنگل پسلی کے آدمی ڈبل کہاں سے ہو گئے۔ لو جی کمال ہو گئی۔" خیر دین ـ اور اُسی وقت ثناء کی آواز سُنائی دی۔

"ارے خیر دین تم آئے ہوئے ہو۔ او تیمور کہاں جا رہا ہے؟ رُدا دیکھو نہیں رہیں تیمور کس طرف جا رہا ہے۔"

"ارے ہاں! خیر دین سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔"

"یہ خیر دین... یہ خیر دین تم یہاں واپس کیوں نہیں آجاتے بھئی۔ جمن آگیا ہے، عارفہ خالہ آگئی ہیں تم بھی یہاں آجاؤ۔"

"آتے تو ہیں ثناء بی بی جی۔ ہم کہیں بھی رہیں آپ لوگوں سے دُور تو نہیں رہ سکتے۔"

"اچھا... اچھا... رُدا ذرا اُٹھو یار کچھ کام ہے تم سے۔" ثناء نے کہا اور رُدا اُٹھ گئی۔ خیر دین نے دونوں کو سلام کیا اور کوٹھی کے اندرونی حصے میں دادی امّاں کی جانب چل پڑا جہاں اُسے اُنھیں ایک نئی کہانی سنانی تھی۔

کافی دیر تک وہ ثناء کے ساتھ مصروف رہی لیکن اُس نے ثناء پر اپنی کسی اُلجھن کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ پتہ نہیں خیر دین کس وقت واپس چلا گیا۔ رُدا کو اِس بارے میں نہیں معلوم ہو سکا۔ نہ ہی وہ دوبارہ رُدا کے پاس آیا تھا۔

لیکن اُس رات جب رُدا اپنے بستر پر لیٹی تو اُس کا ذہن ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ خیر دین کی گفتگو ابھی تک اُس کے ذہن سے نہیں نکل سکی تھی۔ آج تو وہ بہت زیادہ کھل کر بولا تھا لیکن یہ خیر دین... خیر دین وہ نہیں ہے جو ظاہر کرتا ہے پھر اُس نے یہاں ملازمت کیوں کی تھی؟ نوکروں کے سے انداز میں اِس گھر میں کیوں پہنچا تھا؟ سوچنے کے لئے تو نہ جانے کیا کیا تھا رُدا کے پاس، لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ جب خیر دین نے اُس سے ملک چھوڑ کر چلے جانے کا تذکرہ کیا تھا تو اُس کا دِل کیوں بھر آیا تھا؟ اِس بات پر ذرا سنجیدگی سے سوچنا تھا۔ رُدا اپنا تجزیہ کرنے لگی۔ بہت غور کیا اُس نے خود پر اور خیر دین پر۔ بڑی مضحکہ خیز بات تھی۔ وہ کسی اور انداز میں خیر دین کے بارے میں کیسے سوچ سکتی تھی لیکن خیر دین۔ خیر دین بھی تو ایک معمہ تھا۔ اور اگر وہ... وہ کوئی ایسی شخصیت نکلی تو... تو کیا... کیا... رُدا کا وجود پسینہ پسینہ ہو گیا یہ نئی سوچ کچھ نئی اُلجھنوں کی حامل تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اُسے محسوس ہوا کہ وہ بے وقوف سا آدمی بُری طرح اُس کے حواس پر مسلط ہو گیا ہے۔ آہ کیا سوچتا ہو گا میرے بارے میں۔ میں رو پڑی تھی اُس کے جانے کا سُن کر کیوں آخر کیوں، چلا جاتا تو کیا فرق پڑتا لیکن... لیکن وہ ہے بھی تو عجیب کتنی احتیاط سے وہ میری نگرانی کرتا تھا اور اُس نے کیسے کیسے نازک موقعوں پر میری مدد کی ہے گو اپنے مخصوص انداز میں تمام کوششیں کی تھیں۔ یعنی بے وقوف بن کر لیکن یہ بھی سچائی تھی کہ وہ بے وقوف نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے آپ کو مکمل طور پر مجھ سے چھپا سکتا تھا لیکن اُس نے بھی اپنے چہرے پر سے کبھی کبھی نقاب ہٹائی تھی اور آج بھی تو۔ آج بھی تو۔

دفعتاً اُسے اُس پیکٹ کا خیال آیا جو خیر دین نے اُس کے پاس محفوظ کر دیا تھا کیا ہے اِس پیکٹ میں؟ کیا چیز ہے؟

خیر کچھ بھی ہو لیکن کسی قیمت پر وہ اُسے کھول کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ امانت کا مسئلہ تھا اور امانتیں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ انہی پر تو انسان کی شخصیتوں کا دار و مدار ہوتا ہے تجسّس کتنا بھی ہو لیکن اگر خیر دین نے اُسے پیکٹ کھولنے کی اجازت نہیں دی تو پھر وہ اُسے نہیں کھول سکتی لیکن اِس میں کیا ہو سکتا ہے۔

نہ جانے کب تک زدا خیر دین کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اُسے کوئی فیصلہ کرنا تھا اپنی اِس کیفیت کے بارے میں۔ دو ہی صورتیں تھیں یا تو کھل کر کم از کم اپنے دل میں اعتراف کرے کہ خیر دین ایک بدھو ملازم کی حیثیت سے اُس کے لئے باعثِ دلچسپی نہیں یا پھر وہ صرف اِس لئے اُس کی احسان مند نہیں ہے کہ اُس نے دو تین بار بے لوث اُس کی مدد کی ہے۔ بلکہ شہاب صاحب سے، رشید سے اور نہ جانے کس کس سے اُس نے اسے بچایا ہے۔ ثاقب کے مسئلے کو اُس نے اِس طرح حل کیا کہ ثاقب کا ہمیشہ کے لئے نشان ہی مٹ گیا اگر یہ اشتہار نہ آتا تو زدا شاید کبھی ثاقب کے بارے میں نہیں سوچتی لیکن یہ اشتہار...؟

ذہن پھر بھٹک گیا۔ یہ اشتہار کیسے آیا؟ ثاقب کے بارے میں خیر دین نے کچھ بھی تو نہیں بتایا جب کہ اُس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ اب ثاقب اُس کی زندگی میں نہیں آئے گا پھر دفعتاً زدا کے ذہن میں ایک چھناکا سا ہُوا۔ کیا ثاقب واقعی خیر دین کے چنگل سے نکل آیا ہے؟ یا پھر یہ اشتہار خیر دین کی کوئی کوشش ہے۔ اوہ... اوہ... خیر دین نے اُسے چیلنج کیا تھا کہ اب وہ اپنے بل پر زدا کی کتاب کھولے گا۔ یہ کوشش کہیں... یہ کوشش کہیں اسی سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں ہے؟ زدا بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی وہ اور نہ جانے کیوں اُس کے دل میں یہ بات بیٹھتی جا رہی تھی کہ اشتہار کا خیر دین سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ آدمی بہت تیز ہے، بہت ہی شاطر لیکن اُس نے... اُس نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے؟ کیا وہ؟ زدا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور جب ذہن تھک کر چٹخنے لگا تو اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب اُس میں کچھ سوچنے سمجھنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔

غلام احمد صاحب کو کبھی خوشی حاصل ہوئی تھی، بہت بڑا ایثار کیا

تھا اُنھوں نے۔ اِس دور میں ایک ناقابلِ یقین سی بات تھی... ابتداء میں وہ خوف زدہ رہے۔ انھیں احساس تھا کہ انھوں نے صرف اپنی ذات کی تسکین کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے ہو سکتا ہے شوکت جہاں، امّاں بی اور دونوں بچیاں اِس بات کو ذہنی طور پر قبول نہ کریں یہ بھی کوئی بات ہُوئی کہ اپنی روٹی اُٹھا کر دوسرے کے سامنے رکھ دی جائے کتنی بے بسی کی زندگی گزاری تھی اُن لوگوں نے ایک معمولی سی جھونپڑی میں طویل وقت گزار دیا تھا اور اُس کے بعد اِس کوٹھی کے کوارٹر میں کوئی مُستقبل نہیں تھا کوئی ایسی صُورتِ حال نہیں تھی جو مُستقبل کا نشان دے سکے اور جب اُنھیں زندگی کا سب سے بڑا سہارا حاصل ہُوا تھا تو اُنھوں نے وہ سب کچھ احسان صاحب کی نذر کر دیا تھا اِس میں کوئی شک نہیں تھا کہ احسان صاحب ایک بہت اچھے انسان تھے بے لوث، بے غرض ہر ایک کی مدد کرتے تھے ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک ہوتے تھے لیکن اِس کے بدلے میں اتنا بڑا کام شاید کسی کے لئے ممکن نہ ہو، غلام احمد نے اسی ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا اور پھر اُس وقت اُن کی مسرّتوں کی انتہا نہ رہی تھی جب اُن کے اہلِ خاندان نے بھی اُن کی اِس کارروائی کو خلوصِ دل سے تسلیم کر لیا یہاں تک کہ امّاں بی نے بھی اِس مسئلے میں کوئی ٹانگ نہیں اڑائی تھی جب کہ انہی کی طرف سے سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ بیٹیاں تو فراخ دل تھیں لیکن والدہ کے بارے میں وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ غلام احمد صاحب کی اِس کارروائی کو برداشت کر سکیں گی۔ چند ہی روز میں انھیں علم ہو گیا کہ سب نے اُن کے اِس اقدام کو سراہا ہے تو اُن کی مسرّتوں کی انتہا نہ رہی۔ احسان احمد صاحب بے حس نہیں تھے غلام احمد کے مسائل کو جانتے تھے۔ غلام احمد کا سب سے بڑا مسئلہ اُن کی یہ دونوں بیٹیاں تھیں، بس انہی کے لئے ذرا اُلجھن تھی۔ اچھے رشتے ملیں اچھے گھروں میں چلی جائیں تو غلام احمد صاحب کی تمام ذمہ داریاں ختم ہو جاتی تھیں۔ انہی کے لئے تو وہ ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے۔ اور احسان احمد نے اُن کا یہ خوف ختم کر کے اُن کی عزّت بچا لی تھی۔ اُن کی زندگی پر سب سے بڑا احسان کیا تھا۔ اِس احسان کے سلسلے میں یہ صلہ غلام احمد کو زیادہ نہیں محسوس ہوتا تھا... بہرطور انھیں یقین تھا

کہ احسان صاحب اُن کی بیٹیوں کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ بس اُس کے بعد اگر ساتھ ساتھ زندگی گزر جائے تو کیا حرج ہے۔ احسان صاحب بے چارے غلام احمد کے سامنے شرمندہ شرمندہ سے رہتے تھے اور جب غلام احمد ڈرائیور کی حیثیت سے اُن کے لئے کار کا دروازہ کھولتے تھے تو احسان صاحب ایسی نگاہوں سے اُنھیں دیکھتے کہ خود غلام احمد کو شرم آنے لگتی۔

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر کار میں بیٹھ جاتے تھے۔ کیوں کہ اِس کے لئے بھی غلام احمد صاحب نے ضد کی تھی باقی اور کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جو اُن کے اور احسان صاحب کے سامنے ہو، احسان لمیٹڈ کے سلسلے میں اب احسان صاحب خود ہی پوری لگن سے کام کر رہے تھے اور اپنی کھوئی ہُوئی ساکھ بحال کرنے میں کوشاں تھے اکثر غلام احمد کسی کام سے گاڑی لے کر نکل جاتے تھے لیکن ایسے اوقات وہ احسان صاحب کو اطلاع دینا نہیں بھولتے تھے اِس وقت بھی وہ ایک کام ہی سے نکلے تھے۔ شہر کے ایک بھرے پُرے بازار میں آنا تھا۔ پارکنگ تلاش کرنے میں کافی دقت ہُوئی۔ بہرطور ایک جگہ گاڑی پارک کر کے وہ وہاں سے چل پڑے۔ پیدل جا رہے تھے کہ فٹ پاتھ پر اُنھیں ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔ اور غلام احمد صاحب ٹھٹھک کر رہ گئے۔ یہ شناسا چہرہ اگر اُن کی آنکھیں دھوکہ نہیں دے رہی تھیں تو اُن کے جگری دوست ابراہیم صمدانی کا تھا۔ پٹواٹولی میں ابراہیم صمدانی اُن کے سب سے گہرے دوست تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے پھر جب حالات خراب ہُوئے اور یہ لوگ سابقہ مشرقی پاکستان سے جان بچا کر بھاگے تو ابراہیم صمدانی اُن سے بچھڑ گئے۔ اور اِس کے بعد اپنی ہی زندگی مشکل ہو گئی تو پھر دوستیاں کہاں سے نبھائی جائیں۔ کیسے پتا چلایا جاتا کہ ابراہیم کہاں ہیں لیکن آج فٹ پاتھ پر یہ چہرہ دیکھ کر غلام احمد بے اختیار ہو گئے۔ ٹریفک کی پرواہ کئے بغیر دوڑے اور جا کر ابراہیم صمدانی سے بُری طرح لپٹ گئے۔ بیچارے ابراہیم صمدانی نے غلام احمد کی صُورت نہیں دیکھی تھی وہ اِس اُفتادِ ناگہانی سے حواس باختہ ہو گئے لیکن غلام احمد صاحب نے اُن کے گرد اپنی گرفت کم نہیں کی تھی ابراہیم صمدانی کو کم از کم یہ اندازہ تو ہو گیا کہ اُن سے لپٹنے والا کسی بُرے ارادے سے نہیں بلکہ محبت بھرے انداز میں اُن سے لپٹا ہے لیکن وہ کون ہے؟ چہرہ دیکھیں تو پتہ چلے پھر جب غلام احمد صاحب کی آنسو برساتی ہُوئی آنکھیں اُن کے سامنے آئیں تو ابراہیم صاحب بھی بے اختیار ہو گئے۔ آس پاس سے گزرتے لوگ اُنھیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"غلام احمد تم؟"

"ہاں ابراہیم میں غلام احمد ہی ہُوں خُدا کی قسم اب تم سے ملنے کی کوئی آس نہیں رہی تھی جب بھی تم یاد آتے ایک ٹھنڈی سانس کے علاوہ اور کچھ اپنا نہ ہوتا۔ تم... تم ابراہیم تم یہاں کب پہنچے؟"

"بھئی آؤ فٹ پاتھ سے ہٹیں لوگ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔"

"مسکراتے رہیں۔ میرا یار مجھے مِل گیا اِس کے بعد مجھے اور کیا چاہیئے؟"

"آؤ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں؟"

"آجاؤ" غلام احمد نے کہا اور کسی ریستوران کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں لیکن آس پاس بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی تو غلام احمد، ابراہیم صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اُس طرف چل پڑے جہاں اُنھوں نے کار پارک کی تھی کار کے قریب پہنچ کر اُنھوں نے دروازہ کھولا اور ابراہیم سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ ابراہیم نے اپنے لباس کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے کار میں بیٹھ گئے۔ کار یہاں سے چل پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد غلام احمد نے ایک پُرسکون ریستوران کے سامنے کار روکی اور اُس کے بعد ابراہیم صاحب کا ہاتھ پکڑے ہُوئے ریستوران میں آ بیٹھے۔

"ابراہیم کراچی آنے کے بعد یوں سمجھو کہ زندگی بالکل اجنبی اجنبی ہو گئی تھی۔ بہت سے کرم فرما، بہت سے محبت کرنے والے ملے۔ بہت سوں سے ہلکے پھلکے تعلقات بھی رہے لیکن تیرے یار میں نے دوست نہیں بنایا کسی کو۔ آج یوں لگتا ہے جیسے کراچی میرے لئے اجنبی نہیں رہا۔ یہاں میرا دوست موجود ہے۔ یہاں میرا ابراہیم موجود ہے۔ کتنی خوشی ہُوئی ہے تمھیں دیکھ کر بیان نہیں کر سکتا" ابراہیم صاحب خوش بیٹھے رہے تھے۔

"سناؤ کچھ تو بولو یار۔ اتنے چُپ چُپ کیوں ہو؟ بھابی! بچے وغیرہ...؟"

"سوچ رہا ہُوں کہاں سے گفتگو کا آغاز کروں؟ داستان تو بہت لمبی ہے لیکن ماضی کو دُہرانے سے کیا فائدہ تمھاری بھابی ٹھیک ہیں۔ دونوں بچے ہیں اور... اور" ابراہیم صاحب

کی آواز رُندھ گئی۔

"کک... کیا مطلب؟"

"ہاں؛ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھیڑیوں کی نذر ہو گئے۔ اب وہ اِس دُنیا میں نہیں ہیں" غلام احمد صاحب کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ سکتے کے سے عالم میں دیر تک خاموش بیٹھے رہے، پھر اُن کی بھرائی ہُوئی آواز اُبھری۔

"کون سی بیٹیاں؛ کون سا بیٹا؟"

"مقبول اپنی دونوں بہنوں کی عزت بچاتے ہُوئے شہید ہوگیا۔ صائمہ اور نوشابہ نے اپنے آپ کو بھیڑیوں کے چُنگل میں دیکھ کر خودکشی کرلی۔ ایک بیٹی، ایک بیٹا اور ایک بیوی بچ گئے جنھیں لئے ہُوئے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ بالآخر پاکستان آگیا اور اب یہاں اسٹیل مل میں ملازمت کرتا ہُوں ملیر کالونی میں ایک کوارٹر میں رہتا ہُوں" ابراہیم صاحب نے بتایا اور غلام احمد دونوں ہاتھوں سے سَر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

ابراہیم صمدانی کا کاروبار بھی کم نہیں تھا۔ بہت اچھی زندگی گزارتے تھے وہ مشرقی پاکستان میں۔ گو اُن کی دوستی کا آغاز کاروباری انداز ہی میں ہُوا تھا۔ لیکن اُس کے بعد تعلقات اِس قدر بڑھ گئے کہ دونوں ایک جان دو قالب ہوگئے اور اتنے گہرے دوستوں میں شمار ہُوئے کہ لوگ اُن کے تعلقات پر رشک کرتے تھے لیکن کیا تھا کیا ہوگیا۔ غلام احمد صاحب کا دِل غم میں ڈُوب گیا تھا۔ وہ تو زندگی کی خوشیاں پا چکے تھے لیکن اُن کا جگری یار اُن کا دوست کِس قدر غم زدہ تھا کافی دیر تک وہ اِسی طرح سَر پکڑے بیٹھے رہے پھر اُنھوں نے ابراہیم کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔

"ابراہیم تمھارا غم بانٹا نہیں جاسکتا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم صبر کرو صبر صِرف مجبُوری کا نام ہے۔ اور یہ مجبُوری ہم سب کو اپنی گرفت میں جکڑے ہُوئے ہے۔ میرے دوست خود کو سنبھالو۔ اب تو بہت وقت گزر چُکا ہے۔ مَیں تمھارے ساتھ گھر چلنا چاہتا ہُوں۔ یہاں کِسی کام سے آئے تھے؟"

"ہاں کچھ تھوڑی سی خریداری کرنی تھی۔ کچھ چیزیں منگوائی گئی تھیں جنھیں لینے کے لئے یہاں آگیا تھا" ابراہیم صاحب نے بتایا۔

"بہر طور مجھے گھر لے چلو۔ بھابی سے مِلنا چاہتا ہُوں بچّوں سے مِلنا چاہتا ہُوں"

"جیسا پسند کرو" ابراہیم صاحب نے جواب دیا اور یہ لوگ ریستوران سے کچھ کھائے پیئے بغیر اُٹھ گئے۔

غلام احمد صاحب نے کاؤنٹر پر جاکر ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی اور پھر دفتر میں احسان صاحب کو فون کیا۔

"احسان صاحب مشرقی پاکستان کے ایک دوست مِل گئے ہیں اُن کے ساتھ ذرا ملیر جا رہا ہُوں۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر لگ جائے۔ آپ کی اجازت چاہتا ہُوں"

"ٹھیک ہے غلام احمد بھائی۔ آپ اطمینان سے جائیں اور باقی کوئی فکر نہ کریں میں وقت پر گھر چلا جاؤں گا۔ کوئی پیغام تو نہیں دینا گھر میں؟"

"نہیں شکریہ" غلام احمد نے جواب دیا اور ابراہیم کے ساتھ باہر نکل آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد اُن کی کار ملیر کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"کون ہیں یہ احسان؟"

"اِنہی کے پاس ملازمت کرتا ہُوں" غلام احمد صاحب نے جواب دیا۔

"وہ۔ اچھا کیا کرتے ہو؟"

"ڈرائیور ہُوں اُن کا" غلام احمد بولے اور ابراہیم پھیکی سی ہنسی کے ساتھ خاموش ہوگئے۔

غلام احمد اچھی طرح جانتے تھے کہ ابراہیم کی کیا کیفیت ہے۔ اِس وقت کسی طرح کا اظہار ابراہیم کے لئے تازیانہ ثابت ہو سکتا تھا اُن کی خاموشی اور چُپ رہنے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اپنی حیثیت سے بھی شرمندہ ہیں۔ اِسی لئے غلام احمد صاحب نے اپنے بارے میں فوراً ہی اُنھیں بتا دیا تھا تاکہ اِس طرح کم از کم اُن کے دوست کو تسلی تو مِلے۔ راستہ طویل تھا مزید کچھ باتیں ہُوئیں تو غلام احمد صاحب نے ابراہیم صاحب کو بتایا کہ وہ ایک بہت ہی نیک انسان کے ملازم ہیں اور اُنہی کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔

"گویا تم بھی لُٹ گئے دوست۔ کیا تھا کیا ہوگیا" ابراہیم صاحب نے کہا۔

"ابراہیم دولت تو آنی جانی چیز ہے اِس کا کیا غم کیا جائے۔ اصل مسئلہ ان اپنوں کا ہے جو ہم سے بچھڑ جاتے ہیں یقین کرو میرا دِل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ بہت وقت گزر چُکا ہے اب لیکن میں جانتا ہُوں کہ تمھارے دِل کا زخم آج بھی ہرا ہوگا کاش میں تمھارا غم بانٹ سکتا" ابراہیم صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اِس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی یہاں تک کہ کار ملیر کالونی میں داخل ہوگئی اور ابراہیم صاحب کے بتائے ہُوئے پتے کے مطابق اُن کے کوارٹر کے سامنے رُک گئی۔ بھلا غلام احمد کو کیا تکلف ہو سکتا تھا۔

ابراہیم صاحب دروازہ کھول کر غلام احمد کو ساتھ لئے ہُوئے اندر داخل ہوگئے اور اُنھیں سیدھا لے جاکر اپنی بیوی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جو ایک چوکی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہُوئی تھیں غلام احمد صاحب سکتے میں رہ گئے تھے۔ بھابی صاحبہ کی وہ بہت عزت کرتے تھے۔ نہایت نیک اور محبت کرنے والی خاتون تھیں لیکن اِس وقت وہ خاموش بیٹھی خلاء میں گھور رہی تھیں۔ غلام احمد صاحب اُن کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں بھابی صاحبہ، میں غلام احمد ہُوں آپ کا بھیا جسے آپ بھیا کہہ کر پکارتی تھیں" غلام احمد نے کہا اور دفعتاً ہی ابراہیم صاحب کی بیگم کو ایک زوردار جھٹکا لگا تسبیح اُن کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھ خلاء میں نچائے اور اُٹھنے کی کوشش کرنے لگیں غلام احمد صاحب ایک بار پھر شدتِ غم سے گُم ہو کر رہ گئے تھے۔ اُنھوں نے سوالیہ نگاہوں سے ابراہیم کی طرف دیکھا اور ابراہیم نے غمناک انداز میں گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ہاں اِن کی بینائی چلی گئی ہے۔ اُسی وقت سے جب ہمارے تینوں بچے ہم سے بچھڑے تھے" ابراہیم صاحب کی آواز آنسوؤں میں ڈُوب گئی۔ بیگم ابراہیم چند قدم آگے بڑھیں اور غلام احمد صاحب نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر اُن کا سَر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"بھابی صاحبہ... بھابی صاحبہ میں آپ کا غم نہیں بانٹ سکتا۔ مَیں... مَیں آپ کو تسلی بھی نہیں دے سکتا" غلام احمد صاحب رو پڑے تھے۔ بہت دیر تک یہ غمناک فضا طاری رہی۔ پھر بیگم ابراہیم نے لرزتی آواز میں پُوچھا۔

"بھیا شوکت جہاں، بچے، امّاں بی...؟"

"سب ٹھیک ہیں بھابی صاحبہ۔ سب زندہ سلامت ہیں آپ... آپ جو کچھ کھو چکی ہیں بھابی صاحبہ وہ آپ کو واپس نہیں مِل سکتا لیکن... لیکن..." غلام احمد صاحب کی آنکھیں پھر آنسو برسانے لگی تھیں۔ ماضی کی بہت سی باتیں اُنھیں یاد آگئی تھیں۔ اُسی وقت ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوگئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان بھی تھا۔ دونوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا اور ابراہیم صاحب نے اُن دونوں کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"غلام احمد بھائی اِنھیں پہچانو۔ دیکھو کتنے بڑے ہوگئے ہیں یہ دونوں۔ یہ اقبال ہے اور یہ تنویر تمھیں یقیناً یہ دونوں یاد ہوں گے۔ تنویر تو اُس وقت صِرف ایک سال کی تھی جب ہم تم بچھڑے تھے لیکن اقبال..."

"ہاں مجھے یاد ہیں۔ مجھے یاد ہیں یہ دونوں" غلام احمد نے دونوں بازو پھیلا دیئے اور بچے اُن کے قریب پہنچ گئے۔

غلام احمد صاحب نے دونوں کو سینے سے لگا لیا تھا۔ ابراہیم صاحب بولے۔

"اقبال یہ تمھارے چچا غلام احمد ہیں۔ ایسٹ پاکستان میں ہم سب ساتھ ہی رہتے تھے۔ تم لوگوں کو شاید یاد نہ ہو لیکن ہماری دوستی مثالی حیثیت رکھتی تھی آج اچانک ہی ملاقات ہوگئی ہے۔ تم نہیں جانتے بچّو کہ میرا دِل کتنا بڑھ گیا ہے حالات کچھ بھی ہیں ہمارے لیکن ہماری محبتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ مجھے نئی زندگی مِل گئی ہے تنویر" باپ کی یہ محبت دیکھ کر اقبال اور تنویر بھی متاثر ہُوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے غلام احمد صاحب کی خاطر مدارت کا انتظام ہونے لگا۔ غلام احمد صاحب نے اِس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بیگم ابراہیم جن کا نام فیروزہ سُلطانہ تھا اور ابراہیم صاحب اُنھیں صِرف سُلطانہ کہتے تھے۔ بہت خوش ہُوئی تھیں۔ شوکت جہاں کے بارے میں اُنھوں نے بے شمار سوالات کر ڈالے تھے بچّیوں کے بارے میں بھی پُوچھا۔ خاص طور سے عصمت کے بارے میں۔ کیوں کہ اُس وقت جب یہ سانحہ گزرا تھا۔ ندرت تو بہت ہی چھوٹی تھی۔ عصمت کو وہ اچھی طرح یاد رکھے ہُوئے تھیں غلام احمد صاحب نے بتایا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہیں اور بہت جلد وہ کسی بھی دِن سب کو لے کر اُن کے پاس آئیں گے احسان احمد صاحب اور غلام احمد صاحب چھُٹی لے ہی چکے تھے چنانچہ اُنھیں دیر ہوجانے کی فکر نہیں تھی۔ کافی دیر تک وہ اُن لوگوں کے ساتھ رہے۔ کھایا پیا اور پھر ابراہیم صاحب کہنے لگے۔

"غلام احمد تم کہو تو میں تمھارے ساتھ ہی چلوں۔ گھر دیکھ آؤں گا تمھارا تاکہ اگر تمھیں آنے میں دِقت ہو تو مَیں خود سُلطانہ کو لے کر تمھارے پاس پہنچ جاؤں"

"ضرور چلو لیکن میں احسان صاحب کے پاس جاؤں گا ممکن ہے وہ کوئی ایسی ذِمّہ داری میرے سپُرد کر دیں جس کی وجہ سے ابھی گھر نہ جاسکوں۔ بہتر یہ ہوگا ابراہیم کہ تم انتظار کرلو میں کل ہی تمھارے پاس آرہا ہُوں شوکت جہاں، امّاں بی اور بچّوں کو لے کر"

"ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے بھائی نوکری تو نوکری ہی ہوتی ہے"

ابراہیم صاحب نے کہا اور اس کے بعد تمام اہلِ خانہ غلام احمد کو کار تک چھوڑنے آئے تھے۔

ابراہیم صاحب نے انھیں سینے سے لپٹا کر بہت مسرت کا اظہار کیا اور غلام احمد خوش خوش گھر کی جانب روانہ ہوگئے ابراہیم کو اس وقت صرف اس لئے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے کہ اب وہ کوٹھی میں منتقل ہو چکے تھے اگر احسان احمد صاحب کے کوارٹر ہی میں ہوتے تو شاید اسی وقت سب کو گاڑی میں بھر کر اپنے گھر لے آتے۔ خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ جانتے تھے کہ شوکت جہاں بھی اُن لوگوں کے بارے میں سنیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچے احسان احمد صاحب کوٹھی واپس آچکے تھے۔ لان پر محفل جمی ہوئی تھی۔ غلام احمد صاحب کو بھی وہیں بلا لیا گیا۔ اور احسان احمد صاحب اُن سے باتیں کرنے لگے۔ غلام احمد نے مختصر الفاظ میں ابراہیم صاحب کے بارے میں تفصیلات بتادی تھیں۔ اور احسان احمد صاحب نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی ہمیں بھی ابراہیم سے ملاؤ۔ غلام احمد یقیناً تمہارے دوست تم سے مختلف نہیں ہوں گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے احسان صاحب لیکن کچھ اور درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"اِس لہجے میں بات کر کے تم ہمیشہ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہو غلام احمد، بھائی حقیقتوں کو حقیقت ہی کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے تمہیں اب مجھ سے یہ الفاظ نہیں کہنے چاہئیں یقین کرو بڑا دُکھ ہوتا ہے۔"

"آپ خود ہی جذباتی ہو جاتے ہیں ورنہ میں تو بہت خوش ہوں۔ ایک چھوٹی سی خدمت کیا کر دی آپ نے مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔"

"کیا کہہ رہے تھے یہ کہو؟ تم نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے انسان ہو۔" احسان صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"ابراہیم صمدانی کو یہ معلوم ہے کہ میں بھی وہاں سے لٹا پٹا آیا ہوں۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ میں آپ کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے احسان صاحب اگر کوئی اور بات ابراہیم کو معلوم ہوئی تو شاید وہ کسی غلط احساس کا شکار ہو جائے میری درخواست ہے کہ آپ مجھے میری اوقات ہی میں رہنے دیں تاکہ میرا دوست بددل نہ ہو جائے۔"

"غلط بات تم نے کی ہے خمیازہ بھی تم ہی بھگتو۔ میں اب یہ ڈھنڈورا نہیں پیٹ سکتا کہ تم میرے ڈرائیور ہو۔ خواہ مخواہ مجھے ہر شخص کے سامنے شرمندہ کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں غلام احمد تم نے یہ کیا کیا ہے؟"

"یہ درخواست ہے احسان صاحب مؤدبانہ دست بستہ، میرا دوست مجھ سے چھن جائے گا۔"

"تو میاں چاہتے کیا ہو؟"

"جس دن ابراہیم کو یہاں لاؤں مجھے اُسی کوارٹر میں پہنچا دیا جائے بلکہ دو چار دن کے لئے رہنے کی اجازت دے دی جائے جس میں مَیں رہتا تھا۔"

"گویا میرے ڈرائیور کی حیثیت سے انھیں اِس کوٹھی میں خوش آمدید کہنا چاہتے ہو جو اَب تمہاری ملکیت ہے۔"

"یہی سمجھ لیجئے۔"

"مالک ہو بھائی جس طرح حکم دو گے کریں گے ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم انھیں کوٹھی ہی میں بلاؤ۔ یہاں سب کو ہدایت کر دی جائے کہ کسی کو حقیقت نہ بتائی جائے بھئی اچھے لوگ بھی تو اِس دُنیا میں ہوتے ہیں جیسے ہم۔ ابراہیم یہی سمجھ لے گا کہ ہم تمہارے ایک اچھے مالک ہیں۔" احسان صاحب پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولے۔

"نہیں میں اپنے کوارٹر ہی میں اُسے خوش آمدید کہوں گا۔"

"تمہاری مرضی بے تکلفی نہیں ہو سکے گی ابراہیم سے۔"

"آہستہ آہستہ ہم کچھ کر لیں گے احسان صاحب، آپ کسی بھی مسئلے میں اِتنے زیادہ جذباتی ہو کر نہ سوچا کریں۔"

"جو حکم جناب غلام احمد صاحب۔" احسان صاحب نے کہا اور پھر بولے۔ "تو کب لا رہے ہو انھیں؟"

"ابھی نہیں پہلے تو میں خود اُس کے گھر جاؤں گا۔"

احسان صاحب نے گردن ہلا دی تھی۔ یہاں سے اُٹھنے کے بعد غلام احمد صاحب سیدھے اماں بی کے کمرے میں پہنچ گئے انھوں نے شوکت جہاں کو بھی بلا لیا تھا اور دونوں بیٹیوں کو بھی۔ وہ کہنے لگے۔

"اماں بی ابراہیم صمدانی یاد ہیں آپ کو؟"

"وہ پٹوانولی والے"، اماں بی نے کہا۔

"ہاں وہی۔"

"لو یاد کیوں نہ ہوگا اولاد ہی کی طرح چاہتی تھی اُسے بھی۔ وہ بھی مجھے اماں بی۔ اماں بی کہتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔ کیا یاد دلا دیا تم نے غلام احمد کیا دن تھے وہ بھی زندگی ہی کچھ اور تھی۔ پتہ نہیں خدا کو کیا منظور تھا؟ مگر تم نے اُس کا نام آج کیسے لیا؟

کیسے یاد آگیا وہ؟"

"اماں بی ابراہیم صمدانی مجھے ملا تھا آج۔"

"ایں؟" اماں بی اچھل پڑیں۔

"ہاں وہ یہیں آچکا ہے۔ اُس کی بیوی سلطانہ اور بچے بھی یہیں موجود ہیں لیکن بے چارے بڑے بڑے حادثوں سے دوچار ہو چکے ہیں۔" غلام احمد صاحب ابراہیم صمدانی سے ملاقات کی تفصیل... اُس کے گھر جانا... اُس کی دو بیٹیوں اور بیٹے کا سانحہ... سلطانہ کی بینائی کی تفصیل... تمام کہانی اماں بی کو سنا رہے تھے اماں بی اور شوکت جہاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے عصمت کے ذہن میں مٹے مٹے نقوش موجود تھے۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ابو وہ جن کے گھر میں تالاب بنا ہوا تھا اور اُن کے تالاب میں بہت سی مچھلیاں پلی ہوئی تھیں؟"

"یاد ہے تجھے؟"

"وہ گھر یاد ہے لیکن اُن لوگوں کی صورتیں یاد نہیں آتیں ایک دفعہ میں وہاں گئی تھی۔ بارش ہو رہی تھی اور تالاب کے کنارے سُرخ سُرخ بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں میں نے بہت سی بیر بہوٹیاں پکڑ کر شیشی میں بند کی تھیں اور اُس میں چاول ڈال دیئے تھے پھر وہ بیر بہوٹیاں کئی دن تک زندہ رہی تھیں اور اُس کے بعد ایک ایک کر کے مر گئی تھیں وہ مجھے یاد ہے۔"

"ہاں بیٹی اُنہی لوگوں کی بات کر رہا ہوں کل تم یونیورسٹی مت جانا میں دوپہر کو کچھ ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد تم سب کو وہاں لے چلوں گا۔"

"میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ ابھی وہاں چلوں۔"

"مناسب نہیں ہے اماں بی۔ کل کے لئے کہہ کر آیا ہوں اُن سے۔" غلام احمد صاحب نے جواب دیا۔

"خدا اُن لوگوں کو صبر دے۔ سلطانہ کی آنکھوں کا علاج نہیں ہو سکتا غلام احمد؟"

"یقیناً اماں بی، ہم اُن کا علاج کرائیں گے ویسے بیچارے ابراہیم کی کیفیت بے حد خراب ہے۔ اسٹیل مل میں ملازمت کرتا ہے۔ ملیر کالونی کے ایک کوارٹر میں رہتا ہے۔ پتہ نہیں اپنا ہے یا کرائے کا۔ اندر کے حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مالی حالت بہت خراب ہے۔ ایک بیٹا پڑھ رہا ہے بیٹی بھی ماشاءاللہ سیانی ہو گئی ہے۔ اماں بی وہ میرا ایسا دوست تھا کہ میں زندگی کے کسی بھی لمحے اُسے فراموش نہیں کر سکتا ہم احسان صاحب

سے کہ کر اُن کی بھرپور مدد کریں گے لیکن ابھی مَیں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ میں اِس وقت کس حیثیت میں ہُوں، دراصل اماں بی اگر میں اُسے یہ بتا دیتا کہ ہمارا پیسہ ہمیں واپس مِل چُکا ہے اور اِس وقت ہم اچھی خاصی حیثیت میں ہیں تو شاید وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا۔ انسانی فطرت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ میں اپنے دوست کے دِل پر کوئی مَیل نہیں لانا چاہتا۔ شوکت جہاں، عِصمت اور نُدرت بیٹے اِتنا گہرا دوست ہے وہ میرا کہ سمجھو کہ بھائی بھی میرے لئے اِتنی حیثیت نہ رکھتا۔ تم لوگوں کو میری بات نبھانی پڑے گی۔"

"آپ نے حکم دے دیا ابو کافی ہے۔" عِصمت نے جواب دیا۔

"اور بیٹے اِن باتوں کا تذکرہ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے کہ ہمیں کیا مِل گیا ہے، خُدا نے ہمارے ذریعے احسان میاں کا گھر دوبارہ بنا دیا ہے تو یہ خُدا کا احسان ہے جو کچھ چلا گیا تھا. وہ تو چلا ہی گیا تھا۔ ہمارا اب اُس پر کیا حق رہ گیا تھا۔ میں تو سمجھتی ہُوں کہ خُدا نے وہ دولت ہمیں اِسی لئے واپس کی تھی. کہ ہم اُس کے ذریعے کسی اور لُٹے ہُوئے گھر کو بسا دیں ہم تو اِس زندگی کے عادی ہو گئے ہیں اگر یہ تمام لوگ اور احسان احمد کی والدہ مجبور نہ کرتیں تو، ہم تو سچی اُس کوارٹر میں بھی خوش تھے وہاں ایک اپنائیت سی محسوس ہوتی تھی جب کہ یہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنی شرافت کا اظہار کر کے اُن لوگوں کو شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہر شخص دَبا دَبا سا رہتا ہے۔ یقین کرو مجھے تو اُن لوگوں کا یہ دَبا دَبا انداز ذرا بھی پسند نہیں آتا۔ بھرے پُرے لوگ تھے خُدا نے اِس وقت بُرا وقت ڈال دیا ہے تو ہم انھیں شرمندہ کرتے ہُوئے اچھے نہیں لگتے۔"

"کیا کروں امّاں بی، احسان احمد صاحب یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بہرطور میں نے بمشکل تمام اُنھیں تیار کیا ہے کہ اُس دِن کے لئے ہمیں اُس کوارٹر میں واپس جانے کی اجازت دے دیں تاکہ اگر براہیم صمدانی ہمارے گھر آئے تو میرے جھوٹ کا احساس نہ ہو۔"

"کیا کہا احسان احمد نے؟"

"تیار ہو گئے ہیں مگر بڑی بد دِلی سے۔ میرا خیال ہے اب دوسروں کو بھی بتائیں گے اور اِس کے بعد ہمیں کوارٹر واپس مِل جائے گا۔"

"تم کہو تو میں بات کروں احسان احمد سے، میں سچ کہہ رہی ہُوں اِس کوارٹر میں ہمیں کوئی بھی تو تکلیف نہیں تھی. ہم وہیں پر خوش تھے۔"

"خیر امّاں بی فی الحال جانے دیں۔ میرا خیال ہے ایک بار ہم کوارٹر میں منتقل ہو جائیں گے تو اُس کے بعد وہاں سے نکلیں گے ہی نہیں۔ احسان صاحب سے میں بات کر لُوں گا۔"

"تو پھر کب چل رہے ہو کوارٹر میں؟"

"فی الحال تو ہم ابراہیم صمدانی کے گھر جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے رات کو میں احسان صاحب سے مزید بات کرتا ہُوں۔"

رات کے کھانے میں سبھی لوگ شریک تھے۔ رِدا بھی تھی. اور بقیہ افراد بھی۔ غلام احمد صاحب نے سب کے سامنے ہی دادی امّاں سے کہا.

"امّاں جان ایک درخواست کرنا چاہتا ہُوں آپ سب سے ممکن ہے احسان احمد صاحب نے میرے دوست ابراہیم صمدانی کے بارے میں آپ لوگوں کو بتایا ہو۔"

"ہاں بیٹے بتا دیا ہے ہمیں اور تمھاری اِس عجیب خواہش کے بارے میں بھی بتایا ہے میں نے اِس بات سے اختلاف کیا ہے. تمھارا خیال ہے بیٹے کہ تمھارا دوست تمھاری حیثیت کے بارے میں جان کر بَددِل ہو جائے گا۔ میں نہیں مانتی اِس بات کو جب اتنا اچھا دوست ہے تو اُسے تو خوشی ہو گی کہ تمھاری حالت سنبھل گئی۔ کیا فائدہ اِس جھوٹی بات سے؟"

"نہیں امّاں جان میں جانتا ہُوں کہ وہ کس قِسم کا ہے زبان سے کچھ نہیں کہے گا لیکن اُس کے انداز میں جھجھک پیدا ہو جائے گی۔ امّاں جان میری یہ درخواست مان لیجئے۔ خُدا کی قسم اُس کوارٹر میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آپ ہمیں وہاں جانے کی اجازت دے دیں ہم بڑے خوش ہوں گے۔ یہاں آکر ہم اپنے آپ کو اجنبی اجنبی سا محسوس کرتے ہیں۔"

"ارے میاں غلام احمد تم نے مجھ سے صِرف اِتنا کہا تھا. کہ ابراہیم صمدانی کے آنے پر تم اُس کوارٹر میں منتقل ہو جاؤ گے اور میں نے اِسی کی حامی بھری تھی۔ اب یہ امّاں جان سے تم غلط سلط باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"احسان صاحب میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان مانوں گا. آپ نے جہاں بہت سے احسانات کئے ہیں مجھ پر وہیں ایک احسان یہ کر دیجئے کہ مجھے میرا کوارٹر واپس دے دیجئے مجھے وہاں بڑا سکون تھا۔"

احسان احمد صاحب، غلام احمد کو دیکھنے لگے پھر اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی اور وہ آہستہ سے بولے.

"بھئی جیسا تم پسند کرو اب میں کیا کہہ سکتا ہُوں، اِس سلسلے میں۔"

"بے حد شکریہ۔ میں نے امّاں بی سے بات کی تھی امّاں بی بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ کوارٹر میں ہم زیادہ آسانی اور آزادی سے رہتے تھے۔"

"ٹھیک ہے بھلا امّاں بی کی بات سے میں کیسے انکار کر سکتا ہُوں۔ جیسا تم مناسب سمجھو۔"

"تو پھر اپنا کوارٹر ہم آج ہی آباد کر لیں گے۔ آپ نے ہم سے ہمارا گھر چھین لیا تھا احسان بھائی۔" غلام احمد صاحب نے احسان احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے کہا.

رِدا اور ثناء حیران رہ گئی تھیں۔ نُدرت نے آہستہ سے کہا.

"اے ثناء تیرا مُنہ کیوں پھُول رہا ہے؟ ابو کا مسئلہ ہے جانے دے یار۔ میں پہلے ہی کون سا اپنے کوارٹر میں رہتی تھی ہر وقت تو تیرے اُوپر مسلط رہتی تھی اور پھر اِس کوارٹر سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ اپنا جمّن بے چارہ وہاں اکیلا رہ گیا ہے. ہائے اُس کے چہرے کی اُداسی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔"

"بکواس مت کرو تم سب لوگ۔ تم نے ہمیں نہ جانے کیا سے کیا بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیا فائدہ اِن تمام باتوں سے۔"

"ثناء کوئی بات نہیں ہے تم خواہ مخواہ اِتنا محسوس کر رہی ہو. بھئی ایک ہی تو کوٹھی ہے اِن باتوں میں کیا رکھا ہے ہم یہاں رہیں یا وہاں ساتھ ہی تو رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جب بڑوں نے اعتراض نہیں کیا تو میں کیا اعتراض کر سکتی ہُوں اور پھر یہ اللہ رکھی اپنے نام کے ساتھ اُس کوارٹر ہی میں جچتی ہے۔ یہاں آکر بِلاوجہ ہم لوگوں پر مُسلط ہو گئی ہے۔ ارے کہیں تم لوگ کوٹھی کی صفائی وغیرہ سے تو نہیں گھبرا گئے؟"

"جی نہیں آپ کی طرح حرام خور نہیں ہیں ہم لوگ۔" نُدرت نے ناک چڑھاتے ہُوئے کہا۔ بہرطور غلام احمد صاحب کو اجازت مِل گئی تھی۔ اِس بات کے امکانات تھے کہ اگر کل وہ اُن کے ہاں جائیں تو ابراہیم صاحب دوبارہ یہاں آنے کا اظہار نہ کر دیں. بار بار منع کرتے ہُوئے بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اِس لئے راتوں رات کوارٹر آباد کر لیا گیا۔ تمام سامان جو ضروری تھا کوارٹر میں پہنچا دیا گیا اور رات کو بارہ ساڑھے بارہ بجے تک یہ لوگ اِس عجیب و غریب منتقلی میں مصروف رہے۔ رِدا اور ثناء بھی ساتھ تھیں اور ایک انوکھی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو ملازمین موجود تھے اُنھیں بھی ساتھ لے لیا گیا تھا جمّن کی ماں نے حیرت سے یہ تمام منظر دیکھا تھا.

لیکن دوسری صبح سب کو اِس سلسلے میں ہدایت کر دی گئی خاص طور سے طفیلی بیگم اور عارفہ خالہ کو یہ بتایا گیا کہ آنے والے مہمانوں سے یہ ذکر نہ کیا جائے جو کوٹھی میں ہو چُکا ہے یہاں موجود لوگوں کو گزرے واقعات بھُول جانے چاہئیں سختی سے ہدایت دے دی گئی تھی اِس لئے سب ہی نے بات گرہ میں باندھ لی تھی. غلام احمد صاحب کو خصوصی طور پر آج چھٹی دے دی گئی تھی اور اُس کے ساتھ ہی وہ کار بھی جسے وہ چلاتے تھے، احسان احمد صاحب اپنی مصروفیات میں مشغول ہو گئے اور غلام احمد کے اہلِ خاندان ملیر کالونی جانے کے لئے تیاریاں کرنے لگے تھوڑی دیر کے بعد سب کار میں بھر کر چل پڑے۔ غلام احمد صاحب کا چہرہ خوشی سے کھِلا ہُوا تھا اور عِصمت اور نُدرت سوچ رہی تھیں کہ یہ دوستی واقعی بڑی پائیدار معلوم ہوتی ہے.

کار بالآخر ملیر کالونی میں داخل ہو گئی اور اندرونی راستے طے کرتی ہُوئی ایک کوارٹر کے سامنے جا رُکی۔ لیکن یہاں گاڑی رُکتے دیکھ کر عِصمت کا چہرہ ایک دم سے کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ سامنے ہی اقبال کا مکان تھا۔ وہی مکان جس میں ایک بار وہ اقبال کی عیادت کے لئے یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ آ چکی تھی۔ غلام احمد صاحب نے کار کا دروازہ کھولا اور نیچے اُتر گئے۔ عِصمت نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا.

"ابو اُن کا... اُن کا کون سا کوارٹر ہے؟"

اور پھر جس کوارٹر کی طرف غلام احمد صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ اُدھر دیکھ کر عِصمت کو چکّر آ گیا۔ یہ تو اقبال ہی کا مکان تھا۔ سو فیصد۔ سو فیصدی اور اُس کے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ تو کیا اقبال ابراہیم صاحب کا بیٹا ہے؟ اقبال... اقبال ابو کے دوست کا بیٹا ہے؟ بڑی خوفناک صُورتِ حال ہو جائیگی۔ وہ لوگ تو اُسے فوراً پہچان جائیں گے اور پھر یہ بات صیغۂ راز میں نہ رہے گی کہ عِصمت والدین کے علم میں آئے بغیر یہاں تک کا سفر کر چُکی ہے۔ اقبال کے گھر آ چُکی ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا، کوئی ترکیب بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی غلام احمد صاحب دروازے پر پہنچے۔ دستک دی تو فوراً ہی دروازہ کھُل گیا۔ دروازہ کھولنے والے ابراہیم صاحب ہی تھے۔ وہ دوڑ کر غلام احمد سے لپٹ گئے اور اُس کے بعد اُن سب کو اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ امّاں بی اندر پہنچیں تو ابراہیم صاحب امّاں بی کے سینے سے چمٹ گئے تھے۔ وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے.

اماں بی بھی رو پڑی تھیں۔ شوکت جہاں بھی رو رہی تھیں۔ ایک عجیب منظر پیدا ہو گیا تھا۔ بچے پیچھے ہی تھے اِس لئے انھوں نے ابھی عصمت کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی تھی۔ تنویر نے عصمت کو دیکھا اور اُس کا مُنہ حیرت سے کھل گیا۔ اقبال کی نگاہ عصمت پر پڑی اور وہ پتھر کے بُت کی مانند ساکت رہ گیا۔ تنویر تیزی سے آگے بڑھی اور عصمت کے قریب پہنچ کر بولی۔

"باجی... باجی آپ... آپ تو...؟"

"چُپ۔ ہو تنویر خُدا کے لئے چند لمحات کے لئے چُپ ہو" عصمت نے لجاجت سے کہا۔ کوئی اور یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ تنویر حیرت سے عصمت کی صُورت دیکھتی رہ گئی اقبال اب بھی کچھ نہیں بول سکا تھا۔ بے چاری سُلطانہ بیگم ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ شوکت جہاں نے آگے بڑھ کر سُلطانہ بیگم کو سہارا دیا اور سُلطانہ بیگم چیخ مار کر شوکت جہاں سے لپٹ گئیں۔ ایک عجیب رقت انگیز منظر سامنے آ گیا تھا۔ سب لوگ رو پیٹ رہے تھے۔ تنویر حیرت سے عصمت کو دیکھ رہی تھی۔ اور نُدرت اُن دونوں کی حیرت کا تماشا۔ نہ جانے کیوں اُس کے ذہن میں ایک عجیب سا احساس کلبلا رہا تھا۔ تنویر شاید عصمت کو جانتی ہے۔ کم از کم نُدرت جیسی چالاک لڑکی کی نظروں سے یہ بات چھُپی نہیں رہ سکتی تھی لیکن بہرطور یہ بات چھُپائی جا رہی تھی اِس لئے اُس نے بھی آگے بڑھ کر کوئی ایسا سوال نہیں کیا جو دوسروں کے علم میں آ جائے۔ یہ سب بڑے احترام سے آنے والوں کو اندر لے گئے۔ بیٹھنے کا انتظام پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ ہر چیز سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ اقبال بھی اب متحرک ہو گیا تھا۔ لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہیں تھی۔ اُس نے یہ بات تو اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ عصمت غلام احمد کی ہی بیٹی ہے لیکن اِس حیرت انگیز اتفاق کو اُس کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا نہ جانے کیا کیا تاثرات اُس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ بہرطور اُس نے بھی کسی خاص کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا بے چاری سُلطانہ بیگم تو آنکھوں سے معذور ہی تھیں اور ابراہیم صاحب نے عصمت کو نہیں دیکھا تھا۔ لے دے کر تنویر رہ گئی تھی جسے اشارے سے اقبال نے اپنے پاس بُلا کر کہا۔

"تنویر اِس لڑکی کا نام عصمت ہے۔ میرا خیال ہے وہ اِس بات کو چھُپانا چاہتی ہے کہ وہ پہلے بھی یہاں آ چکی ہے۔ تم ذرا احتیاط رکھنا"

"مگر چھُپانے کی ضرورت کیا ہے اقبال بھائی" تنویر نے کہا۔

"تنویر اِس وقت یہ تمام سوال نہ کرو۔ ہم عصمت سے خود ہی معلوم کر لیں گے"

تنویر نے گردن ہلا دی۔ بھائی بہنوں میں بڑی یگانگت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے۔ ویسے بھی پھُوٹی آنکھ کی دو پُتلیاں رہ گئی تھیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی محبتیں ایک دوسرے کے دِلوں میں گھر کئے ہُوئے تھیں۔ اور گزُرے ہُوئے لمحات نے انھیں اور بھی قریب کر دیا تھا ماضی کی باتیں دہرائی جانے لگیں۔ تعزیت کی گئی ظاہر ہے جو زخم ابراہیم صاحب اور سُلطانہ بیگم کے سینے پر لگے تھے وہ کبھی بھرنے والے نہیں تھے۔ اماں بی تو اِس طرح روئیں کہ اُن کی طبیعت خراب ہو گئی انھیں گلوکوز پلایا گیا اور بستر پر تکیئے کے سہارے لِٹا دیا گیا۔ انھیں یہ غم برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ کیسی اچھی زندگی تھی اُن لوگوں کی۔ ابراہیم صاحب کا گھرانا خوشیوں میں کھیلتا تھا بھرا پُرا گھر تھا۔ سارے بچے اماں بی اور شوکت جہاں کو یاد تھے اور وہ اُن کے لئے آنسو بہا رہی تھیں۔ کافی دیر تک یہی ماحول رہا پھر ابراہیم صاحب نے کہا۔

"سُلطانہ یہ زمانہ ہے غم اور خوشیاں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کچھ چلا جاتا ہے تو آنسو بہالئے جاتے ہیں اور کچھ مل جاتا ہے تو مسکراہٹیں بکھر جاتی ہیں۔ مجھے میرا دوست غلام احمد مِلا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ دُکھوں کے اِس وقت کو ٹال دیا جائے ہمیں اِن لوگوں کی آمد پر خوشی کا اظہار بھی تو کرنا ہے۔ یہی سب کچھ جاری رہا تو میرے دوست کو یہاں سے دُکھ کے علاوہ اور کچھ نہیں مِلے گا۔ میں چاہتا ہُوں کہ سب لوگ خود کو سنبھالیں"

"ہاں ابراہیم بھائی اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور سُلطانہ بہن کو بھی۔ جو کچھ چلا گیا وہ خُدا کی مرضی تھی جو کچھ ہے ہمیں اِس پر شکر ادا کرنا چاہیئے" رفتہ رفتہ ماحول اعتدال پر آنے لگا تھا۔ آپس میں نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں ہو رہی تھیں اماں بی کی کیفیت بھی سنبھل گئی تھی۔ تنویر باورچی خانے میں چائے بنانے چلی گئی تو عصمت بھی اُس کے ساتھ ساتھ چل پڑی دِل میں چور تھا۔ تنویر نے بڑے ظرف کا ثبوت دیا تھا کہ ایک اِتنی سی بات پر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ اقبال نے بھی خود پر قابُو رکھا تھا اور کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ اُس کی عصمت سے شناسائی ہے۔ تنویر نے مُسکرا کر عصمت کو دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے بولی۔

"عصمت باجی یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ... آپ اقبال بھائی کی کلاس فیلو ہیں اور اُن کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ اِس بات کو چھُپانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تنویر میری بہن میری جان بس میں اُس دِن گھر والوں سے پوچھے بغیر یہاں آ گئی تھی اور کوئی خاص بات نہیں ہے اِس میں۔ میں نے گھر جا کر بتایا بھی نہیں تھا ساری باتیں تجھے بعد میں بتا دُوں گی۔ دراصل جہاں ہم رہتے ہیں وہاں کچھ ایسی شریر لڑکیاں موجود ہیں کہ اگر انھیں یہ بات بتا دی جاتی تو نہ جانے کیا کیا بکواس کر ڈالتیں۔ میں نے اُن ہی سے بچنے کے لئے یہ سب کچھ چھُپایا تھا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ... کہ..."

"چلئے کوئی حرج نہیں ہے اقبال بھائی بھی تو چُپ ہو گئے ہیں اور میں کبھی زبان نہیں کھولوں گی۔ ابّو نے آپ کو دیکھا نہیں تھا اور امّی بے چاری دیکھ ہی نہیں سکتیں آپ بالکل فکر نہ کریں عصمت باجی آپ کی یہ بات ہمیشہ میرے دِل میں رہے گی"

"لیکن ہمارے دِل میں بلکہ ہمارے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی۔ اِس کے لئے کیا کیا جائے۔ اور کیا خیال ہے آپ دونوں خواتین کا؟" باورچی خانے کے قریبی حصّے سے آواز آئی اور عصمت کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ یہ نُدرت کی آواز تھی وہ تھوڑا سا کھسک کر سامنے آ گئی۔ تنویر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"نُدرت باجی آپ... آپ نے ہماری باتیں سُن لیں؟"

"بھئی اب اِسے اتفاق ہی سمجھو تنویر صاحبہ کہ خفیہ باتیں خواہ مخواہ میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ ہُوں! تو یہ گُل کھلائے جا رہے تھے۔ ابّو سے پہلے ابّو کے دوستوں تک پہنچ جایا جا چکا تھا بہت سنگین بات ہے۔ بہت ہی سنگین اور اِس راز کو راز رکھنے کے لئے بھاری جُرمانے کی ادائیگی ضروری ہے"

"نُدرت پلیز... پلیز نُدرت میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے"

"میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ نکالو کیا ہے جیب میں؟ ہاتھ بھر جائیں گے تو ممکن ہے زبان بند ہو جائے۔ ورنہ ابھی جا کر پول کھولتی ہُوں کہ یہاں پہلے ہی بہت سے مُعاملات طے ہو چکے ہیں" نُدرت نے کہا۔

"نُدرت تجھے خُدا کی قسم جو مانگے گی دے دُوں گی۔ میری عزت رکھ لے۔ کم بخت کہاں سے آ مری۔ باتیں کر رہے تھے ہم دونوں"

"ہوتا ہے۔ ہوتا ہے بعض اوقات تقدیر ایسے ہی دھکا دے دیتی ہے اب کیا کیا جائے اِس بات کو" نُدرت نے کہا۔

"میں تجھ سے کہہ چکی ہُوں کم بخت کہ جو رشوت مانگے گی دے دُوں گی اِس وقت تو زبان بند کر لے۔ کوئی سُن لے گا کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہو رہی ہیں"

"چلو ٹھیک ہے رشوت مِل جانی چاہیئے، بھئی تنویر تم فِکر مت کرو تمہارا حصّہ تمھیں پہنچ جائے گا"

"آپ بہت دلچسپ ہیں نُدرت باجی"

"ہاں... ہاں بہت دِلچسپ ہے یہ، بچ کر رہنا اِس سے تنویر۔ کم بخت آفت کی پرکالہ ہے اور خاص طور سے ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی ہے کیا مُصیبت پڑی تھی مُجھ پر ایک بار نہ آتی تو کیا ہو جاتا؟"

"چلو۔ چلو اب شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مابدولت نے تمہارا یہ راز ہضم کر لیا ہے لیکن طے یہ ہُوا ہے کہ جو مانگیں سو پائیں" نُدرت نے کہا اور خود بھی تنویر کا ہاتھ بٹانے لگی۔

چائے لگائی گئی۔ ابراہیم صاحب نے کافی انتظامات کئے تھے۔ چائے کے ساتھ بہت سے لوازمات تھے جو لا لا کر میز پر سجا دیئے گئے۔ شوکت جہاں کہنے لگیں۔

"ابراہیم بھائی یہ سب کچھ اپنوں کے لئے ضروری نہیں ہوتا"

"جو کچھ ہوتا ہے وہ میں نے کیا ہے۔ اب اِتنا بھی بے حیثیت نہیں ہو گیا ہُوں شوکت بہن اطمینان سے بیٹھو۔ چائے پیئو۔ میں ہُوں ہی کس قابل" ابراہیم صاحب کی آواز لرز سی گئی۔

اِس کے بعد کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ نُدرت آگے بڑھ بڑھ کر سب کو تمام چیزیں پیش کر رہی تھی اور اقبال مُسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ عصمت کی چھوٹی بہن تھی۔ اقبال کو اُس سے ایک لگاؤ سا محسوس ہو رہا تھا اور عصمت کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے بعد کہ وہ ابّو کے دوست کی بیٹی ہے تو اقبال کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا یہ خوشی اُس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ ایک دو بار اُس نے شرارت آمیز نگاہوں سے عصمت کی طرف دیکھا لیکن عصمت نے اُس سے ایک بار بھی نگاہیں نہیں مِلائی تھیں۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ تفریحات شروع ہو گئیں۔ بزرگ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ عصمت، اقبال، نُدرت اور تنویر باہر صحن میں نکل آئے۔ ایک طرف ٹین کی شیٹس ڈال کر جگہ بنالی گئی تھی۔ یہ اِضافی

جگہ تھی جو اِس وقت بیٹھنے کے لئے نہایت موزوں ثابت ہُوئی۔ چار پائیاں بچھا دی گئی تھیں اور اِن پر دریاں اور چاندنیں بچھی ہُوئی تھیں۔ وہ سب اُن پر بیٹھ گئے۔

"ہُوں، تو اقبال آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں؟" نُدرت نے اقبال کی طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں نُدرت ابھی پڑھ رہا ہُوں"۔

"اچھا... اچھا کون سی کلاس میں ہیں آپ، میرا خیال ہے میٹرک تو کرلیا ہوگا آپ نے؟"

"ہاں میٹرک کرلیا ہے"۔

"اچھے بچّوں کی طرح تعلیم پر توجہ دیں۔ اِدھر اُدھر ذہن نہ بھٹکایا کریں"، نُدرت آہستہ سے بولی۔

"خیال رکھوں گا آپ کی اِن نصیحتوں کا" اقبال نے شرارت سے کہا۔ تنویر مسکرا رہی تھی۔

"ارے آپ اِن سے نہیں ملے یہ میری باجی عِصمت ہیں۔ بہت ہی شرمیلی، بڑی نیک فطرت، بس یوں سمجھیں کہ گھر کی بُو بُو ہیں ویسے پڑھتی یونیورسٹی ہی میں ہیں لیکن یونیورسٹی والیوں جیسی کوئی بات نہیں ہے اِن میں"۔

"ہاں" اقبال گڑبڑا کر بولا۔

"کیا ہاں، آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے اِن کے بارے میں یہ بات آپ پہلے سے جانتے ہیں"۔

"ن... نہیں... نہیں" اقبال گھبرا کر بولا۔

"خیر... خیر کوئی بات نہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کو ایک دوسرے کو پہچاننا چاہیئے۔ کیوں عِصمت باجی کیا خیال ہے آپ کا؟" عِصمت بالکل خاموش رہی تھی۔ تنویر سے ہنسی روکنا مشکل ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک یہ تفریحات جاری رہیں۔ نُدرت چھینٹے مارتی رہی اور عِصمت شرم سے پانی پانی ہوتی رہی اُس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اقبال پر بھی ایک مسرت کا عالم تھا۔ تنویر بھی خوش تھی۔ تنویر نے کہا۔

"ہائے نُدرت باجی آپ اور عِصمت باجی آج رات یہاں رُک کیوں نہیں جاتیں، میں اگر آپ کہیں تو چچا جان سے بات کروں"۔

"نہیں تنویر آج نہیں۔ اب تو ہمارے تمہارے درمیان ملاقاتیں رہیں گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تُو، چچا جان سے دُور کیسے رہ سکیں گے۔ رات بھر اتنی خوشیاں مناتے رہے ہیں وہ کہ بیان سے باہر ہیں۔ کل مجھے یونیورسٹی جانا ہے یہ اجازت بہے آج رہنے دو۔ آج کے بعد یہ پروگرام بنائیں گے اور یقیناً تمہارے ساتھ رہیں گے"۔

"ہاں... ہاں تنویر کل عِصمت باجی کا یونیورسٹی جانا بے حد ضروری ہے۔ تم نہیں سمجھتیں کہ صُورتِ حال کیا ہے" نُدرت بولی اور تنویر ہنس کر خاموش ہوگئی۔

عِصمت پر جیسے گھڑوں پانی پڑ رہا تھا۔ خواہ مخواہ ہی چور بنی ہُوئی تھی۔ وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتا بھی نہیں چل سکا۔ دوپہر کے کھانے کا زبردست اہتمام کیا گیا تھا اور لڑکیاں کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی تھیں۔ دسترخوان بچھا دیا گیا، کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد پھر وہی تفریحات جاری ہوگئیں یہاں تک کہ شام ہُوئی۔ شام کی چائے کے بعد غلام احمد صاحب نے اجازت مانگی تو ابراہیم کہنے لگے۔

"غلام احمد کیا یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ آج رُک جاؤ دِل نہیں چاہ رہا دوست کہ تمھیں ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑا جائے۔ کم از کم ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ تو ساتھ رہیں۔ تمھیں چھٹی تو مِل ہی سکتی ہوگی؟"

"مِل تو سکتی ہے لیکن آج کل ذِمّہ داریاں کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہیں۔ ویسے ابراہیم بہت جلد ہم لوگ کچھ عرصہ ساتھ گزارنے کا پروگرام بنائیں گے۔ میں بھی چھٹیاں لے لُوں گا تم بھی چھٹیاں لے لینا۔ میرا خیال ہے ایک دو دِن میں میں احسان صاحب سے یہ بات کرلُوں گا۔ تم بھی اگر چاہو تو درخواست دے دو، اور میں تم لوگوں کو اپنے ساتھ احسان صاحب کی کوٹھی پر ہی لے جاؤں گا"۔

"بھئی مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم کہو تو ابھی تیاریاں کرکے چلتا ہُوں۔ کس بدبخت کا دِل چاہ رہا ہے کہ اب تمھیں ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑے" ابراہیم صاحب نے کہا۔

"تو پھر چلو اِس میں اُلجھن کی کیا بات ہے؟"

"قسم خُدا کی میں تیار ہوجاؤں گا۔ مجھ سے یہ الفاظ نہ کہو"۔

"تو پھر بھائی منع کس گدھے نے کیا ہے چلو ضروری کپڑے لے لو، میں تو کہتا ہُوں کہ کافی عرصے تک میرے ساتھ گزارو۔ اور اُس کے بعد کوئی مشترکہ پروگرام بنالیں گے"۔

"اچھا چلو آج رہنے دیتے ہیں لیکن دو تین دن کے اندر اندر کوئی فیصلہ کُن بات ہوجائے گی اِس سلسلے میں۔ میرا دِل نہیں بھرا، کیوں سُلطانہ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"میں کیا کہوں، خدا جانتا ہے میرے دِل کی بات اور میں جانتی ہُوں" سُلطانہ بیگم نے کہا۔

درحقیقت وہ اِن لوگوں کے مِل جانے سے بہت خوش تھیں اور انتہائی غم انگیز لہجے میں اُنھوں نے اِس بات کا اظہار کیا تھا کہ کاش وہ اپنی آنکھوں سے اِن بچھڑے ہوؤں کو دیکھ سکتیں۔

ماحول کی عجیب سی کیفیت تھی۔ ایک طرف بے پناہ خوشیاں تھیں تو دوسری طرف کھو جانے والوں کا غم، بہرطور اِس کے بعد غلام احمد نے ابراہیم صاحب سے اجازت لے لی۔ اور یہ سب وہاں سے واپس چل پڑے۔ راستے بھر اُن لوگوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اماں بی نے خاص طور سے غلام احمد سے کہا کہ اور کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کا علاج بے حد ضروری ہے۔

"آپ کے کہنے سے پہلے ہی اماں بی میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا۔ میں اپنے دوست کو ایسے نہیں چھوڑوں گا بہت کچھ کروں گا اُس کے لئے مگر پہلے سے کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ بڑی مشکل پیش آئے گی اُسے ذہنی طور پر اِن تمام چیزوں کے لئے تیار کرنے میں۔ میں اُس کی فطرت سے بخُوبی واقف ہُوں ابھی تو کچھ عرصہ ہمیں ایسے ہی گزارنا پڑے گا۔ اِس کے بعد آہستہ آہستہ میں کوشش کروں گا کہ اُسے ذہنی طور پر اُن تمام چیزوں کے لئے تیار کرسکوں"۔

گھر واپس آئے تو ثناء کا مُنہ پھُولا ہُوا تھا۔ ندا تو اپنے کمرے میں تھی لیکن ثناء تیمور کو گود میں لئے باہر ٹہل رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اُن کے قریب پہنچ گئی اور پھر غصیلے لہجے میں بولی۔

"تو اب یہ ہوگا اِس گھر میں"۔

"کیا ہُوا ثناء، کیا بات ہے بیٹی؟" شوکت جہاں نے بیٹی کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہتی خالہ جان۔ کچھ بھی نہیں کہتی ہماری تقدیر ہی خراب ہے"۔

"ارے... ارے نہیں بھئی میری بیٹی کی تقدیر تو اتنی اچھی ہے کہ خُدا سب کی تقدیر میری بیٹی جیسی بنائے"۔

"بس... بس رہنے دیں میں کہتی ہُوں کہ اب میں وہاں اکیلی کیسے رہُوں گی۔ میں بھی کوارٹر ہی میں آجاتی ہُوں"۔

"تو آجاؤ بیٹی تمھیں منع کس نے کیا ہے اور پھر کوارٹر بھی تو اللہ کی زمین پر ہی ہے۔ بیٹی اِن تمام چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے اپنے دل کے بہلانے کی باتیں ہیں۔ کوٹھیاں ہوں یا کوارٹر، انسان اُن میں بسیرا کرتا ہے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرتا ہے اور بس۔ خواہ اُن کا رنگ کیسا ہی ہو، ڈیرا اُن کیسا ہی ہو"۔

"بس۔ بس خالہ جان آپ تو اچھی خاصی فلاسفر ہیں۔ اے نُدرت چلو اندر آؤ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں" ثناء نے نُدرت کو حکم دیا اور نُدرت نے گردن ہلا دی پھر وہ ثناء کے ساتھ چل پڑی۔

عِصمت نے ملتجی نگاہوں سے نُدرت کو دیکھا تھا۔ اور نُدرت سینہ تانے آگے بڑھ گئی تھی۔

ثناء نُدرت کو لئے ہُوئے باغ کے ایک گوشے میں پہنچ گئی۔

"اب سُناؤ اپنے اُن رشتہ داروں کا حال"۔

"ثناء بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بہت ہی اچھے۔ دراصل میں تو اُس وقت بہت ہی چھوٹی تھی جب وہ لوگ مشرقی پاکستان میں تھے مجھے تو کچھ یاد نہیں لیکن آج سب کا مِلنا دیکھ کر مجھے یہ احساس ہُوا ہے کہ ابّو اور ابراہیم صاحب کی دوستی بہت گہری تھی۔ بھائیوں سے بھی زیادہ"۔

"کون کون ہے وہاں؟"

"عجیب کہانی ہے مشرقی پاکستان میں جو کچھ گزرا اُس نے اُن بے چاروں کو انتہائی غم زدہ کردیا ہے۔ تین بچّے وہاں مارے گئے جس کی وجہ سے چچی جان اپنی آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھیں۔ اب یہاں ملیر کے ایک کوارٹر میں رہتے ہیں اور زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹا پڑھتا ہے بیٹی میٹرک کرنے کے بعد غالباً حالات کی وجہ سے تعلیم ختم کرچکی ہے"۔

"کیا نام ہے لڑکی کا؟"

"تنویر"۔

"اور لڑکا...؟"

"وہ اقبال ہے"۔

"تو اُن لوگوں کو یہاں کب بلا رہی ہو؟ ہم سے بھی مِلاؤ"۔

"ہاں... ہاں سب مِلیں گے۔ ابّو نے جو یہ چکر چلایا وہ بالکل عارضی ہے۔ تم اطمینان رکھو ہم سب ٹھیک کرلیں گے۔ میں اور تم مِل کر کیا نہیں کرسکتے"۔

"یہ بات ہُوئی ناں اللہ رکھی۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ نئے دوستوں کی ہمیں سخت ضرورت تھی" ثناء نے کہا۔

تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد ثناء نے نُدرت کو واپسی کی اجازت دے دی اور نُدرت مُسکراتی ہُوئی کوارٹر میں پہنچ گئی۔

"ہائے باجی یہاں آکر ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے لوٹ کر بُدھو گھر کو آگئے ہیں" نُدرت نے عِصمت سے کہا۔

اُس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا شوکت جہاں

اور امّاں بی اندر کمروں میں مصروف تھیں۔ کوارٹر میں واپس آنے کے بعد واقعی انھیں بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا عصمت ندرت سے کہنے لگی۔

"ندرت تجھے خدا کی قسم سچ بتا تنا، کو تو کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں... نہیں بات اصل میں پہلے طے ہو گئی تھی ناں اس لئے ہم بھی ذرا زبان کے پکے ہی ہیں" ندرت نے مسکراتے ہوئے کہا اور عصمت گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

بات عارضی طور پر ہی ٹلی تھی عصمت جانتی تھی کہ ندرت کے پیٹ میں کھولن ہو رہی ہوگی۔ وہ صرف مصلحتاً خاموش ہو گئی تھی اور اُس کا یہ اندازہ درست ہی نکلا رات کو ندرت اُس کی چارپائی پر آگھسی تھی۔

"ہاں عصمت باجی بسم اللہ کیجئے"۔

"کیا ہوا؟ کیا ہو گیا تجھے؟"

"محترمہ اس حقیر و فقیر کا نام ندرت ہے۔ ہر چیز میں ندرت کی قائل۔ اب آپ شرافت کی زبان استعمال کیجئے اور فوراً بتا ڈالیئے کہ سارا چکر کیا ہے؟"

"ندرت بس ذرا سی غلطی ہو گئی تھی مجھ سے جس کا یہ خمیازہ بھگت رہی ہوں"۔

"سچ ہے باجی انسان ذرا سی غلطی کر کے ہمیشہ کے لئے مارا جاتا ہے لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنے دوستوں سے مشورہ کر لیا جائے پھر آپ جانتی ہیں کہ میں بچپن سے آپ کی دوست ہوں۔ ہاں تو دوست وہ غلطی کیا ہوئی تھی؟"

"کمینی ہے تو کسی بات کے پیچھے پڑ جائے تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتی"۔

"خیر ایسے انسان کو کمینہ نہیں کہتے بلکہ مستقل مزاج کہتے ہیں مگر تم بات ٹالنے کی کوشش مت کرو"۔

"بھلا میں بات ٹالنے کی کوشش کیوں کروں گی میرے دل میں کوئی چور تھوڑی ہے۔ میں نے کہا ناں بس ذرا سی غلطی ہو گئی"۔

"خیر جو غلطی ہو گئی ہے وہ معاف کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اُس کی مکمل تفصیل بتا دی جائے"۔

"بھئی اقبال یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اور اکثر اُن سے میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ یونیورسٹی کے الیکشن ہوئے اور اُن میں ہنگامے ہو گئے۔ اُن ہنگاموں میں اقبال زخمی ہوئے تو صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر میں نے اُن کی تھوڑی سی مزاج پرسی کر دی۔ یعنی جب وہ زخمی ہوئے تو میں نے اپنا دوپٹہ اُن کے زخم پر کس دیا۔ تمھیں یاد ہے اُس دن جب میں یونیورسٹی سے گھر واپس آئی تھی تو میرا دوپٹہ خون آلود ہو گیا تھا۔ خیر اقبال کو یونیورسٹی سے ہاسپٹل پہنچا دیا گیا اور اس کے بعد کئی دن یونیورسٹی بند رہی۔ اب ظاہر ہے یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اسپتال میں اُن کی تیمارداری کرنے کے لئے چلی جاتی اور پھر میرے اُن سے کوئی خاص گہرے تعلقات نہیں تھے۔ میں نہیں جا سکی۔ کافی عرصے کے بعد جب یونیورسٹی کھلی تو مجھے معلوم ہوا کہ اقبال کافی زخمی ہوئے ہیں۔ اور اسپتال ہی میں ہیں پھر بعد میں پتہ چلا کہ وہ اسپتال سے گھر منتقل ہو گئے ہیں ایک ساتھی کی حیثیت سے مختلف لوگوں نے مل کر یہ پروگرام بنایا کہ اقبال کو اُن کے گھر دیکھنے جایا جائے۔ بس میں بھی اُن کے ساتھ ہی چلی گئی"۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر گویا آپ ملیر کالونی کے اُس کوارٹر میں پہلے بھی جا چکی ہیں۔ کراچی یونیورسٹی سے ملیر کالونی خدا کی پناہ اتنا لمبا فاصلہ۔ ارے باجی تمھارے دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے بھلا ماں باپ کو بتائے بغیر..."

"یار ندرت بس یہی تو غلطی تھی۔ لوگوں نے مجبور کیا اور میں چلی گئی۔ بس ایک بار گئی تھی۔ دوبارہ کبھی نہیں گئی"۔

"دوبارہ جانے کا دل چاہتا تھا باجی؟"

"ہاں بھئی! میں نے کہا ناں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر"۔

"ہوں! تو آپ دوبارہ نہیں گیئں۔ جب پہلے گئی تھیں۔ تو آپ کی ملاقات..."

"ہاں اُس وقت گھر میں صرف تنویر تھیں، چچی جان تھیں اور اقبال... اقبال تو زخمی ہی تھے، چچی جان بے چاری اپنے نابینا ہونے کی وجہ سے میری صورت نہیں دیکھ سکی تھیں۔ تنویر نے البتہ دیکھا تھا تبھی تو وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ لیکن بہت اچھی بچی ہے فوراً ہی اُس نے بات کو سنبھال لیا۔ دراصل ندرت مجھے صرف اِس بات کا خوف تھا کہ اگر یہ بات منظرِ عام پر آئی تو امی جان اور امّاں بی یہ پوچھ سکتی تھیں کہ میں اُن کی اجازت کے بغیر ملیر کالونی کیوں گئی"۔

ندرت گہری نگاہوں سے عصمت کو دیکھ رہی تھی پھر اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"افسوس ہم تو کبھی یونیورسٹی گئے ہی نہیں لیکن قصّے کہانیوں میں ایسی داستانیں بہت سی پڑھی ہیں۔ بی عصمت، سچی سچی

بتا دیجئے اب دیکھئے آپ کو اپنی ندرت کی قسم کیا... کیا کوئی گڑبڑ ہے؟"

"ندرت بدتمیزی کی حد میں داخل ہو رہی ہو"۔

"دو قدم پیچھے ہٹ آتی ہوں مگر حقیقت تو آپ کو بتانی ہی پڑے گی اور پھر اگر ندرت کی قسم کا کوئی پاس ہے تو مجھے یقین ہے کہ عصمت صاحبہ اعتراض نہیں کریں گی"۔

"کیا پوچھنا چاہتی ہے تو؟"

"صرف اتنا حضورِ والا کہ کیا کوئی گڑبڑ ہے؟" ندرت نے شرافت آمیز انداز میں کہا۔

"نہیں" عصمت سنجیدگی سے بولی۔

"قسم کے ساتھ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں بالکل گڑبڑ کا مطلب ہے کوئی غلط کام ہو جانا۔ کوئی غلط کام نہیں ہوا ہے ندرت۔ اقبال شاید مجھ سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اکثر اپنی باتوں سے اِس کا اظہار کیا ہے۔ لیکن میں نے کبھی اُن کے الفاظ کی پذیرائی نہیں کی ہمارے درمیان پہلے کوئی باقاعدہ ملاقات نہیں تھی۔ اب جب وہ صحت یاب ہو کر یونیورسٹی واپس آئے تو ہماری ایک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ندرت میں بھی اپنے دل میں اقبال کے لئے جگہ پاتی ہوں۔ اکثر مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میرا ذہن اقبال کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ اگر تو اِسے گڑبڑ سمجھتی ہے تو تیری مرضی ہے"۔

"ہائے اللہ باجی قسم کھا رہی ہو جو کچھ کہہ رہی ہو سچ کہہ رہی ہو؟"

"میں نے کہا ناں مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی عار نہیں محسوس ہوتا کہ شاید میرے ذہن میں بھی اقبال کے لئے کوئی جگہ ہے"۔

"اللہ... اللہ ہم تو کبھی اِتنے مُنہ پھاڑ کر یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے"۔

"فرق ہے ناں مجھ میں اور تجھ میں۔ اور میں محسوس کرتی ہوں کہ میں نے کوئی بہت بڑا اقدام نہیں کیا اب تو اور آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں"۔

"باجی... باجی بڑی اونچی پرواز کر رہی ہو"۔

"نہیں ڈارلنگ میری پرواز بالکل زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ ہے۔ تو جو چاہے سمجھ سکتی ہے"۔

"خیر باجی مجھے خوشی ہوئی۔ خدا کی قسم اقبال بھائی مجھے بھی پسند آئے حالانکہ ایک بار دیکھا ہے اور پھر باجی، ابو، اور ابراہیم چچا کے درمیان کتنی دوستی ہے۔ ویسے باجی ایک بات بتاؤ، بچپن میں تو تم نے اقبال کو دیکھا ہوگا کیا اِس دوران کبھی اُس کی صورت تمھاری نگاہوں میں نہیں آئی؟"

"نہیں بھئی کوئی احمقانہ قسم کی سوچ کبھی بھی میرے ذہن میں نہیں پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے اُس وقت وہ بھی بہت چھوٹے تھے اور میں بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی صورت بھول گئے تھے۔ نہ ہمارے درمیان کبھی کوئی ایسی گفتگو ہوئی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ قصّے کہانیوں کی مانند ہمارا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی تعلق نکل آئے گا"۔

"باجی خدا کی قسم مجھے بہت خوشی ہوئی ہے"۔

"شکریہ اور کچھ؟" عصمت نے خشک لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی میں تو تمھاری زبانی یہ سب کچھ سن کر ہی دہشت زدہ رہ گئی ہوں۔ کیا زمانہ آ گیا ہے لڑکیاں کس اطمینان سے اپنی محبتوں کا اعتراف کر لیتی ہیں توبہ۔ توبہ..." ندرت نے کہا۔

درحقیقت عصمت نے اُس وقت اُسے شکست دے دی تھی وہ تو سوچ رہی تھی کہ عصمت کو کافی پریشان کرے گی اندازہ تو اُسے ہو ہی گیا تھا کہ پُراسرار بات ضرور ہے لیکن عصمت اِس طرح کھلے دل سے اِس کا اعتراف کر لے گی۔ اِس کا اُسے یقین نہیں تھا۔ عصمت کہنے لگی۔

"بات دراصل یہ ہے ندرت کہ میں نے کوئی حماقت نہیں کی ہے۔ کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالی ہے جو کسی بھی طرح ہم لوگوں کیلئے باعثِ بدنامی بن جاتی۔ بس ایک سادہ سا اندازہ ہے ہم دونوں کا اور اُس کی کوئی بڑی اہمیت نہیں ہے"۔

"ہائے... ہائے ہم دونوں۔ ارے کل ہی کی بات ہے۔ میں ذرا جمن سے آنکھ لڑا لیا کرتی تھی تو کیسی نصیحتیں کی جا رہی تھیں مجھے۔ ہائے میرا جمن چھنوا دیا تم نے عصمت باجی اور خود بڑے اطمینان سے اعتراف کر رہی ہو۔ کاش تم مجھے بھی اِس کا موقعہ دیتیں کہ میں کھلے دل سے جمن کی محبت کا اعتراف کر لیتی"۔

"ندرت شرارت نہیں۔ آؤ سنجیدگی سے بات کریں۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ابو کو اُن کا ایک ایسا جگری دوست مل گیا۔ ابو بے چارے جس طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا اِس پر تمھیں رحم نہیں آتا؟"

"بس... بس بڑی چالاک ہیں آپ عصمت باجی بات کا رُخ جذباتی گفتگو کی طرف موڑ رہی ہیں مگر.. مگر یہ سب کچھ... یہ سب کچھ... اُفوہ کیسی دیدہ دلیری ہے"

"اب تو خاموش ہو کر سو جاؤ ورنہ تھپّڑ رسید کر دوں گی..." عصمت نے کہا اور ندرت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

❖

اتفاق ہی تھا کہ احسان صاحب کو آج دفتر جانے میں دیر ہو گئی تھی. تیاریاں کر رہے تھے کہ ملازم نے ایک ٹیلیگرام لا کر اُن کے سامنے رکھ دیا اور احسان احمد صاحب چونک پڑے. اُنھوں نے ٹیلیگرام کا لفافہ کھول کر دیکھا اور پھر ٹیلیگرام پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ کر بوکھلا گئے.

"ارے... ارے ذکیہ بیگم.. ذکیہ بیگم کہاں ہو بھئی، کہاں ہو تم، امّاں جان آپ... کہاں ہیں آپ سب لوگ بھئی" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں چیختے ہوئے باہر نکل آئے، ثناء امّاں جان، ذکیہ بیگم وغیرہ باہر نکل آئے تھے. احسان احمد کی بوکھلاہٹ پر وہ سب بھی پریشان ہو گئے تھے.

"خیر تو ہے... یا اللہ خیر تو ہے، کیا بات ہے، کیوں آوازیں دے رہے ہیں آپ گھبرائے ہوئے انداز میں ہم سب کو؟"

"کون گھبرایا ہوا ہے خواہ مخواہ نامعقولیت کی بات ارے عادل حسین آ رہے ہیں آج ہی ساڑھے بارہ بجے کی فلائٹ سے. عادل حسین اپنے بچّوں کے ساتھ آ رہے ہیں. یہ. یہ ٹیلیگرام..."

"عادل بھائی آ رہے ہیں" ذکیہ بیگم خوشی سے اچھل پڑیں.

"عادل آ رہا ہے" دادی امّاں نے بھی پُرمسرت لہجے میں کہا.

"ہاں دیکھیے کمینہ آدمی ہے پہلے سے کوئی اطلاع دیتا حالانکہ کچھ دن پہلے مجھے اُس کا ایک خط ملا تھا لیکن اُس میں اُس نے تذکرہ بھی نہیں کیا تھا. لیکن آج اچانک. ارے ساڑھے بارہ بجے پہنچ رہا ہے وہ. اب بتلائیے کیا کیا جائے؟"

"ارے تو اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے. عادل بھائی آ رہے ہیں. سائیکلون تو نہیں آ رہا اتنے زیادہ پریشان کیوں ہیں؟"

"اوہو! بہت سے مسائل سامنے آ جائیں گے بھئی میں نے... میں نے... آؤ اندر آؤ تم لوگ اندر آؤ امّاں جان آپ اندر آئیے. ثناء تم جاؤ تم جاؤ"

"جی نہیں میں بھی آؤں گی" ثناء نے کہا.

"آ جاؤ بھئی آ جاؤ میں کوئی سازش نہیں کر رہا کسی کے خلاف. آؤ اندر آؤ امّاں جان آپ بھی بیٹھ جائیے. ذکیہ بیٹھو بھئی یہ تو بڑی اُلجھن کی بات ہے"

"آخر کیا اُلجھن ہے اس میں؟ کچھ بتا تو دیں آپ ہمیں"

"بھئی میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ عادل اچانک اِس طرح ٹپک پڑیں گے. میں تو اِس سلسلے میں کافی پریشان تھا کہ عادل کو اپنے بارے میں کیسے تفصیلات بتاؤں، اُنھیں تو کچھ بھی نہیں معلوم. میں نے آج تک اُنھیں خط میں یہ سب کچھ نہیں لکھا کہ میری کیا کیفیت ہو گئی اب اچانک وہ آئیں گے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اُن سے کیا کہیں"

"کیا وہ آتے ہی آپ سے یہ پوچھیں گے کہ آپ کا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ کیا ہوا اور کن پریشانیوں میں گرفتار ہیں آپ" ذکیہ بیگم نے پوچھا.

"نہیں پوچھیں گے مگر... مگر مجھے تو یہ بتانا پڑے گا"

"تو پھر اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے جو ہوا ہے دُنیا جانتی ہے ایک عادل بھائی نہیں جانتے تو کیا ہوا اُنھیں بھی بتا دیا جائے گا"

"اُفوہ! ذکیہ... ذکیہ اے ثناء اِسی لئے تو تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تو دفع ہو جا یہاں سے"

"جی نہیں ہرگز نہیں. جو کچھ ہو گا میرے سامنے ہی ہو گا" ثناء جم کر بیٹھ گئی.

"عجیب احمق لڑکی ہے بھئی ذکیہ تم جانتی ہو کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ ساری دُنیا کو پتہ ہے مگر میری ہمت آج تک نہیں پڑ سکی کہ عادل حسین کو اپنے بارے میں بتاؤں"

"کیوں آخر کیوں؟"

"امّاں بی آپ دیکھ رہی ہیں اِن ذکیہ بیگم کو اِن کے دماغ میں تو جیسے بھوسہ ہی بھر گیا ہے بھئی بیٹی کی سسرال کا معاملہ ہے کیا... کیا ہم اُن لوگوں سے یہ کہہ دیں کھل کر کہہ دیں کہ ہم دیوالیہ ہو گئے ہیں دوسروں کے رحم و کرم پر پڑے ہوئے ہیں اور اگر چھپائیں تو یہ بات کب تک چھپ سکے گی میں نے تو آج تک یہ سوچا ہی نہیں تھا بس یہی دل میں تھا کہ دو چار سال گزر جائیں. عادل بھائی کو بتلانے کی ضرورت ہی نہیں. ہم انشاء اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو سنبھال لیں گے اور اُس کے بعد اِن ساری چیزوں کے تذکرے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی. تم لوگ کیا سمجھتی ہو کیا میرے دل میں یہ بات جم گئی ہے کہ میں بے چارے غلام احمد کا یہ روپیہ

ہضم کر جاؤں. ایک ایک پائی ادا کر دوں گا خدا کی قسم ایک ایک پائی اور مع منافع کے اور اُس کے بعد اِس احسان کا صلہ دوں گا غلام احمد کو. میں اِتنا ناسپاس نہیں ہوں کہ اِس معصوم شخص کے اِس احسان کو فراموش کر دوں"

"ساری باتیں ٹھیک ہیں مگر ایک بات میں آپ سے عرض کر دوں ہم عادل بھائی سے کچھ نہیں چھپائیں گے. ہمیں ہماری اصل حیثیت سے قبول کیا گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کسی کے آگے سر نہیں جھکائیں گے"

"امّی جان زندہ باد. یوں سمجھ لیجئے کہ آج تک آپ سے جتنی شکایتیں تھیں دُور ہو گئیں. انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیئے" ثناء نے سیدھا ہاتھ بلند کر کے پُرجوش انداز میں کہا.

"اب تو باہر نکلتی ہے یا اُٹھاؤں میں جوتی" دادی امّاں نے کہا.

"چلی جاتی ہوں. چلی جاتی ہوں. اصل مسئلہ معلوم کرنا تھا تو معلوم ہو گیا. کوئی بات نہیں بالکل فکر نہیں ہے مجھے" ثناء نے کہا اور باہر نکل گئی.

"بالکل ہی عجیب ہے یہ لڑکی. بہرطور ذکیہ بیگم میرے تو واقعی ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں"

"اپنے آپ کو پُرسکون رکھیں ہمیں دُنیا کا پامردی سے مقابلہ کرنا ہے اور پھر خدا کا احسان ہے کہ اُس نے ہماری عزت تو بچا لی. کسی کے آگے ہاتھ تو نہیں پھیلانے پڑے ہیں. بہت بُری کیفیت تو نہیں ہوئی. باقی رہا غلام احمد بھائی کا مسئلہ تو اُن کے لئے جو کچھ آپ کے دل میں ہے خدا اِس کا موقعہ دے تو ضرور کریں"

"اچھا ٹھیک ہے ارے، یہ رِدا کو آواز دو ذرا رِدا ہے یا چلی گئی، رِدا... رِدا!.."

"خدا کی پناہ بلوائے لیتی ہوں ابھی آپ تو واقعی بدحواس ہو رہے ہیں. ویسے میرا خیال ہے وہ چلی گئی ہو گی وہ تو وقتِ مقررہ پر چلی جاتی ہے"

"عجیب لڑکی ہے یہ بھی. اِتنی ذمّہ دار لڑکیاں مجھے ناپسند ہیں بچپن سے ہی نہیں. کبھی چھٹی ہی نہیں کرتی. مگر.. مگر بہرطور اِس وقت اُس کا تذکرہ نہیں. اگر رِدا چلی گئی ہے تو اُسے ذرا ٹیلیفون کرا دو. ٹھہرو میں خود ہی کئے لیتا ہوں. مگر سنو ذرا اجمن کو ہدایات دے دو اور غلام احمد کہاں ہیں بھئی ایئرپورٹ جانا ہو گا مگر کیا غلام احمد کو؟ ڈرائیور کی حیثیت سے لے جانا مناسب رہے گا؟"

"ایک منٹ، ایک منٹ" ذکیہ بیگم اپنی جگہ سے اُٹھیں اور باہر نکل گئیں.

احسان احمد صاحب اچانک اُن کے اِس طرح اُٹھ جانے پر اُنھیں حیرت سے دیکھتے رہے تھے لیکن چند لمحات کے بعد ذکیہ بیگم آئیں تو اُن کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کا گلاس تھا.

"ذرا یہ پی لیجئے"

"اُڑا لو... اُڑا لو میرا مذاق اُڑا لو. جو کچھ مجھ پر بیت رہی ہے میں ہی جانتا ہوں."

"نہیں احسان بیٹے آخر اِتنا زیادہ اُلجھے ہوئے کیوں ہو؟"

"بھئی انتظامات بھی تو کرنے ہیں. آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ عادل کتنے عرصے کے بعد یہاں آ رہا ہے؟"

"تم اطمینان رکھو سارے انتظامات ہو جائیں گے. لینے کون جائے گا اُسے؟" دادی امّاں نے پوچھا.

"میں خود ہی جاؤں گا غلام احمد کے ساتھ جاؤں گا. ارے ذرا رِدا کو ٹیلیفون کر دوں. کچھ ضروری کام تھے سنبھال لے گی. اور غلام احمد سے بھی مل لوں وہ اپنے کوارٹر میں منتقل ہو گئے ہیں عجیب آدمی ہیں. عجیب آدمی ہیں" احسان احمد صاحب بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے. ویسے اُنھوں نے ذکیہ کا لایا ہوا پانی پی لیا تھا.

رِدا واقعی آفس جا چکی تھی. احسان صاحب نے ٹیلیفون پر اُس سے کہا.

"رِدا بیٹے آج میں دفتر نہیں آؤں گا جانتی ہو کیوں؟"

"نہیں انکل کیا بات ہے؟"

"بھئی وہ عادل حسین آ رہے ہیں کینیڈا سے، اختر اور خالد بھی آ رہے ہیں اچانک ہی مجھے اُن کا ٹیلیگرام ملا ہے. آج ساڑھے بارہ بجے کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں"

"یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے انکل"

"ہاں لیکن میرے لئے پریشان کن ہے.. بہرطور تم وہاں کے معاملات سنبھالے رکھنا. میں آج دفتر نہیں آسکوں گا. عادل حسین... اچھا خدا حافظ" احسان احمد صاحب نے ٹیلیفون بند کر دیا پھر وہاں سے دوڑے دوڑے وہ غلام احمد کی طرف چل پڑے لیکن باہر نکلے ہی تھے کہ غلام احمد کو کار کے قریب کھڑے ہوئے پایا.

"ہوں! ڈرائیور صاحب انتظار کر رہے ہیں" احسان احمد

نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"جنابِ عالی" غلام احمد صاحب بولے۔

"یار تم نے میرا دماغ اور خراب کر رکھا ہے ارے بھائی اتنی کنجوسی بھی مت کرو ایک ڈرائیور رکھ لو اور تم... تم..."

"احسان احمد صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیوں بار بار اس احساس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں جس حیثیت میں ہوں بے حد خوش ہوں۔ آپ میری خوشی کا تصور بھی نہیں کر سکتے"

"اچھا... اچھا بھائی تمھاری خوشیاں تمھیں مبارک۔ جانتے ہو آج کون آ رہا ہے؟"

"جی؟"

"تمھارا دوست ملا تھا ناں تمھیں۔ ارے واہ یہ بات تو میں بھول ہی گیا۔ لو بھئی کمال ہو گیا۔ یعنی تمھیں ابراہیم صمدانی ملے اور مجھے عادل حسین"

"جی میں سمجھا نہیں"

"تمھارے جس طرح جگری دوست ابراہیم صمدانی ہیں۔ اسی طرح میرا جگری دوست عادل حسین ہے۔ کینیڈا میں رہتا ہے۔ ابھی تھوڑے دِنوں پہلے اس کے دونوں بچے آئے تھے ناں، دراصل یار غلام احمد میں شاید تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ثناء کا رشتہ میں نے خالد سے طے کر دیا ہے بہت عرصہ پہلے کی بات ہے ہمارے درمیان یہ معاہدہ ہو گیا تھا۔ غلام احمد عادل حسین میرے بچپن کا دوست ہے۔ لنگوٹیا سمجھ لو لنگوٹیا۔ بہت عرصے کے بعد یہاں واپس آ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اچانک اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ بہرحال میں بھی اتنا ہی خوش ہوں جتنا تم ابراہیم صمدانی کے مل جانے سے خوش تھے"

"میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں احسان احمد صاحب"

"شکریہ۔ شکریہ وہ ساڑھے بارہ بجے اسے لینے کے لئے ایئرپورٹ جانا ہے بلکہ ہم لوگ بارہ بجے ایئرپورٹ پہنچ جائیں۔ فلائٹ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے پہنچے گی"

"بہتر ہے دفتر ہی سے ایئرپورٹ جائیں؟"

"میاں دفتر کون جا رہا ہے ابھی تو اس کیلئے انتظامات کرتے ہیں۔ یہاں قیام کا بندوبست اور... اور" اچانک ہی احسان احمد صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ عجیب سے انداز میں غلام احمد کو گھورنے لگے تھے۔

"جی ہاں... جی ہاں اور... اور فرمائیے اور کیا... میرے لائق جو ذمہ داریاں ہوں مجھے بتا دیں" لیکن احسان احمد صاحب کچھ نہ بولے وہ خاموشی سے کھڑے غلام احمد صاحب کو گھور رہے تھے۔

"کیا ہوا احسان صاحب؟ کون سی ایسی بات یاد آ گئی؟"

"میرے دوست میرے بھائی غلام احمد اس وقت میری کیا کیفیت ہوتی اگر میں یہ کوٹھی چھوڑ چکا ہوتا تو؟"

"خدا کے واسطے احسان احمد صاحب خدا کے واسطے ہم خدا کا شکر کیوں نہیں ادا کرتے کہ اس نے بروقت ہمیں سہارا دے کر ہمارا ہاتھ پکڑ لیا۔ جو نہیں ہو سکا۔ اس کے لئے ہم اتنے دکھ کا شکار کیوں ہیں؟"

"ہاں میاں ٹھیک کہتے ہو بہرطور ہم لوگ یہاں سے پونے بارہ بجے نکل چلیں گے بلکہ ساڑھے گیارہ بجے کیا خیال ہے؟"

"جو حکم"

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ ابراہیم صمدانی یہاں کب آ رہے ہیں؟"

"آج یا کل، میرا خیال ہے آج رہنے دیتے ہیں کل ان لوگوں کو یہاں بلا لیں گے"

"ہاں ٹھیک ہے آج رہنے دو" احسان احمد صاحب نے کہا اور اس کے بعد بغیر کچھ کہے سنے اندر واپس چلے گئے۔

غلام احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ احسان احمد کی بوکھلاہٹ کا انھوں نے بھی اندازہ لگا لیا تھا۔ یہ سوچتے تو دل باغ باغ ہو جاتا کہ ان کا بے کار وجود کسی کے اس طرح کام آیا ہے کہ اس کی اپنی زندگی بن گئی ہے بہرطور انھیں کسی بات کی کوئی فکر نہیں تھی اور وہ اپنے طور پر پوری طرح مطمئن اور خوش تھے۔ احسان احمد صاحب بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ کمروں کی صفائی وغیرہ کے سلسلے میں سبھی کو مصروف کر دیا گیا تھا۔ ندرت پکڑی گئی تھی۔ شوکت جہاں بیگم بھی ذکیہ بیگم کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ اوپر کی منزل میں تینوں... باپ بیٹوں کے رہنے کے لئے الگ الگ کمروں کا بندوبست کیا گیا تھا اور وہاں جن جن چیزوں کی کمی تھی پوری کر دی گئی تھی۔

کھانے کے سلسلے میں جمن کو خاص طور سے ہدایت دے دی گئی تھی۔ احسان احمد جانتے تھے کہ عادل حسین کیا کیا چیزیں پسند کرتے ہیں۔ سبھی کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور ذکیہ بیگم کا ایک پاؤں باورچی خانے میں تو ایک باہر تھا بہرطور گھر میں کافی دن کے بعد ایک انوکھی ہنگامہ خیزی نظر آ رہی تھی ثناء اور ندرت بھی اس سارے سلسلوں میں مصروف تھیں۔ ثناء کی کیفیت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں تھی۔ وہ اس قسم کی لڑکی ہی نہیں تھی۔ ندرت نے بھی کمال صبر سے کام لیا تھا کہ عصمت کا معاملہ ابھی تک ثناء کے علم میں نہیں آیا تھا نہ جانے کیوں ندرت اس سلسلے میں خاموشی برت رہی تھی اور بہرطور یہ خاموشی فی الحال بہتر ہی تھی۔ تفریح کے دوسرے ذرائع ہاتھ آ رہے تھے تو ابھی اس ذریعے کو محفوظ رہنا چاہیئے، ویسے تنویر اور اقبال کا تصور ندرت کو بھی آیا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اسے بھی مسرت ہوئی تھی اور اس نے بھی سوچا تھا کہ انھیں بھی اپنے خاص دوستوں میں شامل کیا جائے گا، ابھی ذرا سی جھجک اور تکلف تھا لیکن یہ سب بھی دور ہو جائے گا، بھلا یہ کام ندرت نہ کر سکی تو پھر اس کا نام ندرت ہی کیا۔

خدا خدا کر کے ساڑھے گیارہ بجے اور احسان احمد صاحب تیار ہو گئے۔ غلام احمد صاحب کار تیار کئے موجود تھے احسان احمد صاحب غلام احمد صاحب کی برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئے اور غلام احمد صاحب نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ راستہ طے ہوا اور یہ لوگ ایئرپورٹ پہنچ گئے احسان احمد صاحب بے چینی سے لاؤنج میں ٹہل رہے تھے غلام احمد صاحب کار کے پاس موجود تھے۔ بالآخر فلائٹ آ گئی اور احسان احمد صاحب مسافروں کے کسٹم ہاؤس سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے، پھر دفعتاً ہی احسان احمد صاحب نے زور زور سے ہاتھ ہلانے شروع کر دیئے۔ انھوں نے عادل حسین کو دیکھ لیا تھا۔ جواب میں اس طرف سے کیا ہوا غلام احمد صاحب کو معلوم نہیں ہو سکا لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک قد آور شخص جو اچھا خاصا عمر رسیدہ ہونے کے باوجود انتہائی شاندار صحت کا مالک اور اسمارٹ آدمی تھا باہر آیا اور پاگلوں کی طرح احسان احمد صاحب سے لپٹ گیا۔ کافی دیر تک دونوں لپٹے رہے غلام احمد صاحب بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ اختر اور خالد غلام احمد سے واقف تھے انھوں نے بڑی محبت سے غلام احمد سے مصافحہ کیا اور غلام احمد صاحب کے ساتھ سامان باہر لے جانے لگے۔

عادل حسین کافی دیر تک احسان احمد صاحب سے لپٹے کھڑے رہے تھے پھر انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"یار رونے کو دل چاہ رہا ہے مگر ایئرپورٹ پر رونا کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ کیا خیال ہے؟"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں۔ آؤ"

"مگر کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے اور کوئی نہیں آیا ہمارے استقبال کے لئے"

"نہیں! میں اس وقت تم میں کسی کا حصہ نہیں لگانا چاہتا تھا" احسان احمد صاحب بولے اور عادل حسین نے ایک گھن گرج قہقہہ لگایا قریب کھڑا ایک انگریز جوڑا چونک پڑا تھا اور اس نے خوفزدہ نگاہوں سے عادل حسین کو دیکھا تو عادل حسین نے انگریزی میں ان سے کہا۔

"معاف کیجئے گا حضرات، ہم بچپن کے دوست ہیں۔ اور بہت دن کے بعد ملے ہیں" اس کے بعد وہ احسان احمد کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

غلام احمد کار کے دروازے کھولے کھڑے تھے عادل حسین، احسان احمد اور خالد کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھ گئے اور اختر، غلام احمد کے برابر آ بیٹھا۔

"سنائیے چچا غلام احمد آپ کے کیا حال ہیں؟" اختر نے پوچھا۔

"آپ کو میرا نام یاد ہے بیٹے؟"

"کیوں آپ کا کیا خیال ہے کیا آپ ایسی ہی کوئی معمولی شئے ہیں جسے میں بھول جاتا" اختر کہنے لگا۔

"نہیں... نہیں بھئی بس مہربانی ہے تمھاری اختر بیٹے سب ٹھیک ہے"

"چچی جان اور عصمت باجی وغیرہ...؟"

"ہاں وہ بھی ٹھیک ہیں۔ کمال ہے بھئی تم نے تو سبھی کو یاد رکھا" غلام احمد صاحب کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولے۔

"ہاں" اختر نے ایک گہری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

اس کی نگاہوں میں ندرت کا چہرہ آ گیا تھا، ندرت کے رشتے سے غلام احمد صاحب اس کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتے تھے۔ کار کوٹھی میں داخل ہوئی تو استقبالیہ کمیٹی استقبال کیلئے تیار تھی۔

اس میں دادی اماں، ذکیہ بیگم، ندرت اور ثناء تھیں۔ شوکت جہاں یا اماں بی جان بوجھ کر نہیں آئی تھیں۔ ابھی راز کو راز ہی رکھنا مناسب تھا۔ لیکن ندرت کی بات دوسری تھی۔ ویسے ندرت نہ جانے کیوں اپنی شخصیت میں کچھ ہلکا ہلکا پن محسوس کر رہی تھی۔ اختر کا سامنا کرنے کے تصور سے عجیب سے احساسات پیدا ہو رہے تھے۔ ابھی چند ہی روز پہلے کی

بات تو یہ ہے کہ نُدرت نے اُس کے کہنے پر اختر کو خط لکھوایا تھا یقیناً وہ خط اختر کو مل چکا ہوگا۔ بہر طور عادل حسین صاحب، اختر، خالد اور احسان احمد کے ساتھ نیچے اُترے اور مُسکراتے ہُوئے پہلے دادی اماں کے سامنے جُھکے۔ دادی اماں نے اُن کا سَر اپنے سینے سے لگا لیا تھا پھر اُنھوں نے ذکیہ بیگم کو سلام کیا اور آخر میں ثناء کو دیکھنے لگے۔

" ہُوں! تمہارا خیال ہوگا ہم یہ پُوچھیں گے کہ ہماری ثناء بیٹی کہاں ہے لیکن جو تصویریں دل میں بسی ہوتی ہیں وہ کبھی بھُولی نہیں جا سکتیں۔ آؤ ہمارے سینے سے لگ جاؤ"
ثناء ادب سے سَر جُھکا کر عادل حسین صاحب کے سینے سے جا لگی تھی۔ عادل حسین صاحب اُس کے سَر کو سینے سے لگا کر سَر پر ہاتھ پھیرتے رہے پھر اُنھوں نے نُدرت کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہی اُن کا ہاتھ نُدرت کی جانب بڑھ گیا اُنھوں نے نُدرت کا سَر بھی سینے سے لگا لیا تھا۔ یہ ایک بُزرگانہ شفقت تھی جب کہ اُن کے ذہن کے کسی بھی گوشے میں نُدرت سے واقفیت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ نُدرت کو بڑے پیار سے اُنھوں نے سینے سے لگا لیا اور اس کے بعد اُس کے بارے میں سوال کرنے لگے۔

" یہ بھی میری ہی بچّی ہے۔ بعد میں تفصیلی تعارف کرا دیا جائے گا" احسان احمد نے کہا۔

" آؤ بھئی بڑی مسرت محسوس کر رہا ہُوں میں ایسا لگ رہا ہے جیسے عُمر کے بیس سال پیچھے واپس آ گیا ہُوں" عادل حسین صاحب کو اندر لایا گیا۔ اور اُس کے بعد ڈرائنگ رُوم میں نشست جم گئی۔

سب لوگ بیٹھ گئے تھے نُدرت نے البتہ بہت زیادہ اُن کے درمیان گھُسنا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ عادل حسین نے جیسے ہی کہا۔

" بھئی ذکیہ بھابی چائے" نُدرت فوراً اُٹھ گئی۔

" میں لاتی ہُوں" کسی نے اُسے نہیں روکا تھا۔ وہ باہر نکل گئی اور احسان احمد صاحب، عادل حسین، ذکیہ بیگم اور دادی اماں نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتے رہے خالد اُن کے ساتھ ہی بیٹھا رہا تھا لیکن اختر موقعہ پاتے ہی باہر نکل آیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے کی راہداری سُنسان پڑی تھی۔ وہ تیزی سے کچن کی جانب چل پڑا۔ نُدرت کچن میں جمن کے ساتھ خود ہی چائے تیار کرا رہی تھی اختر دروازے پر جا کھڑا ہُوا اور اندر کی باتیں سُننے لگا۔ جمن خاموش کھڑا تھا نُدرت نے چائے کے برتن ٹرالی پر سجائے اور پھر جمن کی طرف رُخ کر کے بولی۔

" چلو چائے لے چلو"

" اچھا جی" جمن جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

نُدرت کے ساتھ اب اُس کا یہی رویّہ رہتا تھا پھر وہ چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہُوا باہر نکل آیا۔ اختر ایک سمت ہوگیا اور جمن آگے بڑھ گیا۔ نُدرت پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اختر نے ایک دم سے آگے نکل کر اُس کا راستہ روک لیا۔

" آپ کو خصُوصی آداب کرنا تھا" وہ آہستہ سے بولا اور نُدرت چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی پھر اُس کے چہرے پر خود بخود ہی حیا کے آثار پھیل گئے۔ نہ جانے کیوں اِس وقت اختر سے نگاہ مِلانے میں دِقّت ہو رہی تھی اِس سے قبل کبھی اُس کی یہ کیفیت نہ ہُوئی تھی۔

اختر کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک لہرا رہی تھی ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی نُدرت نے خود کو سنبھالا اور بولی" چلئے جمن چائے لے گیا ہے"

" خصُوصی آداب کے ساتھ چائے بھی خاص ہونی چاہیئے ہم باورچی خانے میں ہی چائے پئیں گے آپ کے ساتھ"

" جی نہیں، باورچی خانے میں کسی کو چائے نہیں دی جاتی" نُدرت نے کہا۔

" محترمہ! ذکر 'کسی' کا نہیں جناب اختر عادل صاحب کا ہے وہ اِن دنوں آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہے ہیں"

" واقعی اختر صاحب، چائے نہیں ہے"

" تو بنائی جائے گی۔ آپ کیسی ہوگئی ہیں نُدرت ایک کپ چائے نہیں بنا سکتیں میرے لیے؟ چلیئے باورچی خانے میں چلیئے" اختر نے کہا اور نُدرت اُسے دیکھنے لگی پھر خاموشی سے باورچی خانے کی طرف مُڑ گئی

" بے حد شکریہ اس فرمانبرداری کا، حالانکہ اِس کی توقع نہیں تھی آپ سے" اختر نے کہا۔

نُدرت نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ باورچی خانے میں پہنچ کر پھر اُس نے چائے کے لیے پانی چڑھا دیا۔

" اور سُنائیے کیسی گزر رہی ہے؟"

" بالکل ٹھیک، ہمیشہ، ہمیشہ کے مُطابق"

" نہیں، ہمیشہ کے مُطابق تو نہیں آپ میں ایک بہت

بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہُوں میں" اختر نے کہا۔

" جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے ظاہر ہے آپ ابھی آئے ہیں۔ میں اخلاقاً آپ کی باتیں مان رہی ہُوں ورنہ"

" ارے۔ ارے واقعی۔ واقعی غلط فہمی ہوگئی تھی سوری" اختر نے مُسکراتے ہُوئے کہا" ثناء حسبِ معمول ہے؟" اختر نے موضوع بدل دیا۔

" بالکل"

" زرّا"

" وہ بھی"

" ڈیوٹی پر گئی ہوں گی محترمہ؟" اختر نے کہا۔

" ہاں ظاہر ہے" نُدرت نے جواب دیا۔

" عصمت باجی یونیورسٹی۔۔۔؟"

" جی ہاں"

" گویا معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ ویسے آپ کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟ آج کل تختۂ مشق کون ہے؟"

" پرائیوٹ باتیں کسی کو بتائی نہیں جاتیں"

" کسی کو؟ غور فرما لیجئے میں نے کچھ چیزیں فریم کرالی ہیں اور میرے پاس اب باقاعدہ سند ہے"

" بلیک میل کر رہے ہیں؟" نُدرت نے مُسکراتے ہُوئے اختر کو دیکھا۔

" نہیں۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن آپ جب بھی مجھ سے اِنحراف کریں گی کم از کم وہ فریم آپ کو ضرور دکھا دیا جائے گا"

" اس فریم کی کہانی بھی آپ کو خود بخود ہی معلوم ہو جائے گی"

" کوئی بہانہ تراشیں گی آپ لڑکیوں میں یہ خاص عادت ہوتی ہے مگر جناب ہم اختر حسین ولدِ عادل حسین کسی کے جھانسے میں آنے والے نہیں۔ ارے ہاں وہ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ۔۔۔"

" وہ اب یہاں نہیں ہے" نُدرت نے جواب دیا۔

" ایں! کہاں گیا؟"

" نوکری چھوڑ گیا ہے وہ"

" بھئی افسوس ہُوا۔ عمدہ چیز تھی ہمیشہ یاد رہنے والی۔ کہاں ملازمت کر رہا ہے وہ؟"

" یہ تو نہیں معلوم کبھی کبھی آتا جاتا رہتا ہے"

" اچھا اور وہ رشید بھائی"

" وہ بھی آج کل باہر ہیں" نُدرت نے کسی قدر ہچکچاتے ہُوئے کہا لیکن اختر نے غالباً اِس ہچکچاہٹ پر غور نہیں کیا تھا۔

" خیر، مِل لیں گے سب سے۔ طفیل بیگم اور عارفہ خالہ وغیرہ؟"

" وہ سب یہیں موجود ہیں"

" استقبال نہیں کیا اُنھوں نے ہمارا؟"

" پتہ نہیں کیوں" نُدرت نے جواب دیا۔

اور پھر چائے پیالی میں نکالنے تک اتنی دیر میں جمن واپس آ گیا تھا۔ اُس نے اندر اُن دونوں کو دیکھا اور بُرا سا مُنہ بنا کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

" ہاں بھئی جمن، آپ سُنائیے آج کل عشق وغیرہ کیسا چل رہا ہے آپ کا؟"

" صاحب جی! ہم نوکر لوگ ہیں ہمیں نوکر ہی رہنے دیں ہم سے مذاق نہ کیا کریں"

" رُوٹھ گئے یار، میں نے تو کام کی بات پُوچھی تھی"

" نہیں جی، مالکوں کی باتیں ہمیشہ نوکروں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں"

" بھلا اچھا، میرا خیال ہے تم نے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی ہے"

" تن۔۔۔ نہیں جی، وہ جو کسی فلم کا گانا ہے کہ۔۔۔ کہ۔۔۔" جمن نے کہا اور پھر خاموش ہوگیا۔

اختر چائے کے گھونٹ لے رہا تھا پھر اُس نے کہا۔

" تم گانا نہیں سُنا رہے ہو؟"

" نہیں سُنائیں گے جی۔ گانا بھی نہیں سُنائیں گے آپ کو کیوں سُنائیں"

" بھئی کمال ہے، یہاں تو سب رُوٹھے رُوٹھے لگتے ہیں۔ خیر اب ہم آ گئے ہیں منا لیں گے ایک ایک کو"

" میں چلتی ہُوں اختر صاحب، براہِ کرم آپ چائے پی کر ڈرائنگ رُوم میں آ جائیے گا" نُدرت نے کہا اور اِس کے بعد وہ اختر کے جواب کا اِنتظار کیے بغیر وہاں سے باہر نکل آئی۔

اُس نے اب ڈرائنگ رُوم کا بھی رُخ نہیں کیا تھا بلکہ سیدھی اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑی تھی۔ یہ بھی اچھا تھا کہ اتفاقیہ طور پر غلام احمد صاحب اِس دَوران میں ہی کوارٹر میں منتقل ہوگئے تھے۔

اختر چائے پی کر باہر نکل آیا اور اُس کے بعد وہ خود بھی۔۔۔

ڈرائینگ روم میں پہنچ گیا ڈرائینگ روم میں زور و شور سے گفتگو جاری تھی۔ عادل حسین کہہ رہے تھے۔

"یار! بتا کر آنے میں وہ مزا نہیں تھا جو اچانک آ جانے میں ہوا۔ مجبوری تھی ورنہ میں تو تمہیں ٹیلی گرام بھی نہ دیتا اور خاموشی سے تمہارے گھر پہنچ جاتا لیکن ذرا سامان وغیرہ کا معاملہ تھا اسی لیے میں نے سوچا کہ کم از کم عین وقت پر تو اطلاع دے ہی دی جائے۔ ویسے تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی یا پتہ نہیں، افسوس کہ فدوی اب ہمیشہ کے لیے یہاں واپس آ گیا ہے۔"

"کیا؟" احسان احمد صاحب خوشی سے اچھل پڑے۔

"ہاں یار بوڑھا ہو گیا ہوں اب دیارِ غیر سے دل اکتا گیا اور اپنے وطن کی مٹھاتی۔ بچوں کا بھی یہی خیال تھا بلکہ یہ تو جب سے یہاں سے گئے تھے مجھ پر زور دے رہے تھے کہ اب باہر رہنا مناسب نہیں لیکن اتنی جلدی تو ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ کاروبار سمیٹے تمام تیاریاں کی اور اس کے بعد بالآخر ہم چل پڑے، آ گئے اپنے وطن میں۔"

"خدا کی قسم عادل حسین جی خوش کر دیا تم نے خدا خوش رکھے تمہیں میری تو دیرینہ آرزو تھی کہ تم یہاں واپس آ جاؤ۔"

"ہر آرزو کی تکمیل کا ایک وقت ہوتا ہے احسان احمد، بہر طور میں یہاں واپس آ گیا ہوں۔"

"خدا کی قسم اس بات پر تو دل چاہتا ہے کہ مٹھائی کے ٹوکرے بانٹے جائیں۔"

"بانٹ دینا، بانٹ دینا، بہت سی ذمہ داریاں بھی اٹھانی پڑیں گی تمہیں میرے سلسلے میں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار، تمہارے سلسلے میں ہر ذمہ داری اٹھانا تو میری دلی خواہش ہے مجھے انتہائی مسرت ہوئی یہ خبر سن کر۔ حقیقتاً تم نے بہت اچھا کیا عادل حسین دور دور رہنے میں مزا نہیں آتا تھا۔ بس ایک تشنگی سی لاحق تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میری تمام تشنگیاں مٹتی جا رہی ہیں۔"

"رات کو اس سلسلے میں تفصیلی بات چیت ہوگی اور ذکیہ بھابی! آپ سنائیے کیسی گزر رہی ہے؟"

"بھائی صاحب، میں تو بالکل ٹھیک ہوں آپ لوگ بہت یاد آتے تھے۔"

"اور اماں بی آپ؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں، بیٹے تمہاری اس بات سے مجھے بھی دلی خوشی ہوئی ہے۔ میں اب اتنی بوڑھی ہو گئی ہوں کہ اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم دونوں یکجا ہو گئے مجھے سکون ہو گیا۔"

رسمی گفتگو بہت دیر تک جاری رہی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ اختر کو چائے پیش کی گئی تو اس نے بھی خاموشی سے اپنی پیالی قبول کر لی۔ خالد سنجیدہ بیٹھا ہوا تھا اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ثنا بھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر نے ہی اس سلسلے میں پہل کی۔

"ثنا صاحبہ، آئیے باہر چلیں۔ خالد بھائی آپ بھی چلیں ہم یہاں کہاں بزرگوں کی باتوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہم جائیں چچا جان؟" اس نے احسان احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرور بیٹے، ضرور جاؤ۔ ہم لوگ تو اب ہفتوں اسی طرح باتیں کرتے رہیں گے۔" احسان احمد صاحب نے کہا اور اختر کے ساتھ ثنا اور خالد بھی اٹھ گئے۔

وہ تینوں باہر نکل آئے۔ باہر نکلنے کے بعد اختر نے کہا۔

"سنائیے ثنا صاحبہ آپ کے اس چڑیا گھر کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟ ردا صاحبہ کا کیا حال ہے؟ کب تک واپس آ جائیں گی وہ؟"

"پانچ بجے تک۔"

"کچھ تبدیلیاں سی محسوس ہو رہی ہیں، لوگ کچھ کم نظر آ رہے ہیں..."

"ہر کام میں جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ ان تبدیلیوں کی تفصیل بھی آپ کو جلد معلوم ہو جائے گی۔" ثناء نے کہا۔

"یہ آپ کی اللہ رکھی کہاں گئی؟ نظر نہیں آ رہی۔"

"ایں! ہاں شاید اپنے کوارٹر میں چلی گئی ہوگی۔"

"تو پھر آئیے اس طرف کیوں نہ چلا جائے؟" اختر نے کہا اور ثناء نے گردن ہلا دی۔

خالد بھی ساتھ ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا لیکن ابھی وہ برآمدے سے نیچے بھی نہیں اترے تھے کہ سامنے سے ردا آتی ہوئی نظر آئی اس سے صبر نہیں ہو سکا تھا۔ احسان احمد صاحب نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ لوگ آ رہے ہیں چنانچہ وہ بھی اپنا کام جلدی جلدی نمٹا کر گھر واپس چل پڑی تھی۔ اختر ردا کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ خالد بھی تیزی سے اس کی جانب بڑھا تھا۔

"ارے ردا صاحبہ آپ آ گئیں ہمیں تو اطلاع ملی تھی کہ آپ پانچ بجے تک پہنچیں گی۔"

"آپ لوگوں کے آنے کی خبر سن کر بھلا میں خود پر کیسے قابو

پا سکتی تھی؟" ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اختر اور خالد کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی مسرت نظر آ رہی تھی! اختر نے کہا۔ "اللہ رکھی کی طرف چل رہے تھے آپ تو غالباً ابھی آئی ہیں جائیں گی نہیں۔"

"تم مجبور کرو تو ایسے بھی چل سکتی ہوں۔"

"آئیے" اختر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "اللہ رکھی کہاں ملتی ہے۔"

"نہیں نہیں اطمینان رکھو مل جائے گی۔" ردا نے معنی خیز لہجے میں کہا اور اختر چونک کر اسے دیکھنے لگا سب لوگ چونکہ آگے بڑھ گئے تھے اس لیے کسی نے ردا کی مسکراہٹ اور اختر کے چونکنے پر غور نہیں کیا۔ اختر نے البتہ دو قدم پیچھے ہٹ کر ردا سے کہا تھا

"بے زبانوں کو زبان مل جائے تو اس کا اتنا فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔"

"تو میں نے کیا کہا ہے؟" ردا ہنس کر بولی۔

"کاش ہمیں بھی کچھ کہنے کو مل جائے۔" اختر آہستہ سے بولا اور ردا مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

سب غلام احمد صاحب کے کوارٹر میں داخل ہو گئے غلام احمد ان کے سامنے بچھ گئے تھے۔ اماں بی اور شوکت جہاں بھی بہت خوش ہوئی تھیں۔

"اللہ نے رونقیں پھر لوٹا دیں۔ خدا ان بچوں کو خوش رکھے کتنی اپنائیت ہے ان میں، اچھا خون ایسا ہی ہوتا ہے۔" اماں بی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بات صرف اچھے خون کی نہیں ہے اماں بی۔" ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں اچھی تربیت بھی ضروری ہوتی ہے۔" اماں بی بولیں اختر اور ندرت ردا کے الفاظ پر جز بز ہو گئے تھے۔ ثناء نے چونکہ اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اس لیے بات آگے نہ بڑھی۔ سب لوگ باتیں کرنے لگے عصمت چائے بنانے چلی گئی تھی۔

"اب تو خوب رونق ہو جائے گی۔ خالد میاں آپ کا یہاں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" غلام احمد صاحب نے پوچھا۔

"بس کاروبار ہی کروں گا چچا میاں، ڈیڈی مجھے کچھ اور کہاں کرنے دیں گے۔"

"کاروبار میں بڑی برکت ہے۔"

"آپ سب لوگوں کو ہماری مدد کرنی پڑے گی۔"

"ضرور بیٹے ضرور، ہم جس قابل ہیں حاضر ہیں۔" غلام احمد صاحب خلوص سے بولے۔ عصمت چائے لے آئی تھی۔ اختر جلدی سے بولا۔

"ارے عصمت باجی آپ نے بلاوجہ تکلیف کی ابھی سب لوگ چائے پی چکے ہیں اور ہم نے تو چائے خصوصی پیا ہے ویسے ویسے یہ کتنی بری بات ہے۔ ندرت صاحبہ! عصمت باجی آپ سے بڑی ہیں اور چائے انہیں بنانی پڑی۔"

"مردوں کو عورتوں کے درمیان زیادہ نہیں بیٹھنا چاہیئے ورنہ عورتوں جیسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ آپ کو ان باتوں پر غور نہیں کرنا چاہیئے اختر صاحب۔" ندرت اب اتنی گم دم بھی نہیں تھی کہ بول ہی نہ پائی البتہ اماں بی کو یہ بات بری لگی۔

"ارے ارے جو منہ میں آتا ہے بکتی رہتی ہے۔ لگام ہی نہیں زبان کے سامنے۔"

"یہ تو مجھے اس سے زیادہ نہ جانے کیا کیا کہہ چکی ہیں اماں بی! اخلاقاً زبان نہیں کھولتا کسی وقت تفصیل سے آپ سے شکایت کروں گا۔" اختر نے کہا۔

"ندرت! خود کو قابو میں رکھا کرو۔" اماں بی نے کہا۔ اختر نے چائے دکھائی تو ندرت بول اٹھی۔

"آپ تو چائے پی چکے ہیں۔"

"آپ پچھتانا چاہتی ہیں تو دوبارہ پیئے لیتے ہیں۔" اختر نے پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی تھوڑی دیر کے بعد سب وہاں سے اٹھ گئے۔ ثناء نے کہا۔

"چلو ندرت، اور آپ بھی عصمت باجی۔ یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟"

"تم لوگ چلو میں ابھی آتی ہوں۔" عصمت نے کہا اور سب باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر ندرت نے گھور کر اختر کو دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ باغ کے مغربی گوشے سے کسی گیدڑ کی آواز ابھری اور سب چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔

"یہ کیسی آواز ہے۔" ثناء نے کہا۔

"او کچھ نہیں۔ ہم کینڈا سے ایک گیدڑ لائے ہیں اور اسے آپ کے باغ میں چھوڑ دیا ہے۔" خالد نے اختر کو گھورتے ہوئے کہا اختر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

❖

رات کا کھانا کھایا گیا۔ ندرت اور عصمت اس میں شریک نہیں تھیں۔ بڑی کمی محسوس کی گئی ان سب لوگوں کی لیکن کوئی کچھ بولا نہیں تھا کھانے کے بعد کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر سب سونے کے لیے اٹھ گئے ردا بھی اپنے کمرے میں آ گئی

بھی۔ ماحول کے اس طرح اچانک بدل جانے سے ردا بھی خوش تھی لیکن تنہائیاں اُس کے لیے زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی تھیں بہت سے خیالات بہت سے وسوسے اُس کے دل میں سر اُبھارنے لگتے تھے۔

ثاقب کے دیئے ہوئے اُس اشتہار کا معاملہ ابھی تک اُس کے ذہن میں اُلجھا ہوا تھا۔ اور جب بھی کبھی وہ اِس کے بارے میں غور کرتی اُس کا ذہن پریشان ہو جاتا تھا اس کے علاوہ خیر دین کا خیال! نہ جانے کیوں اب خیر دین اُسے بہت یاد آنے لگا تھا۔ گو اُن یادوں میں غصّہ ہوتا تھا لیکن پھر نہ جانے دل کے کون سے نرم گوشوں میں ایک کسک سی ہونے لگتی تھی۔

اس وقت بھی بہت سے خیالات دل میں آ رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دل اُچھل پڑا لیکن پھر اختر کی آواز سُنائی دی تھی۔

"حاضر ہو سکتا ہوں؟"

"اوہ۔ آؤ اختر" ردا نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"معاف کیجئے رشتے بعض اوقات انسانوں کو اُلجھن میں ڈال دیتے ہیں مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے اُن کے بغیر انسان جی بھی تو نہیں سکتا۔"

"کون سے رشتوں کی بات کر رہے ہو؟"

"اس وقت تو صرف اپنے اور آپ کے رشتے کے بارے میں کہہ رہا ہوں آپ آرام کر رہی تھیں لیکن بس بھائی کہہ کر پھنس گئیں۔ اور اب وقت ناوقت مجھے برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"مجھے بُرا تو نہیں لگتا اختر" ردا نے کہا۔

"اوہ تب تو میں دیر تک بیٹھوں گا۔"

"ضرور بیٹھو۔"

"ویسے آپ کافی خوش مزاج ہو گئی ہیں اور خوب چوٹیں کرنے لگی ہیں۔"

"بُرا تو نہیں مانتے تم" ردا نے محبت سے کہا۔

"لو جی کمال ہو گئی بھلا اس میں بھی بُرا ماننے کی کوئی بات ہے جی" اختر نے خیر دین کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "وہ آپ نے ایک قصّہ نہیں سُنا ردا بی بی جی۔ لڑکا جوان ہو گیا تھا، ماں باپ کو اُس کی شادی کی فکر تھی، ایک رات کمرے میں سو رہا تھا کہ ماں باپ کی آواز کانوں میں پڑی۔ ماں کہہ رہی تھی "سُنتے ہو جی بیٹا بڑا ہو گیا ہے اب اس کی شادی کر دینی چاہیئے" باپ نے کہا کہ شادی کرنے کے لیے انتظامات بھی کرنے پڑیں گے۔ زیور، کپڑے، کم از کم ایک نیکلس خاص طور سے بننا چاہیئے۔ ماں کہنے لگی "اچھا خاموش ہو جاؤ اکیلے میں باتیں کریں گے کہیں جاگ نہ رہا ہو" باپ خاموش ہو گیا تو بیٹا جلدی سے بولا۔

"اماں، اماں میں سو رہا ہوں، تم اطمینان سے نیکلس والی باتیں کرو" تو ردا بی بی جی! یہ تو واقعی کمال ہو گئی یعنی اپنی اللہ رکھی کا ذکر ہو اور ہم بُرا مانیں۔ ویسے یوں لگتا ہے جیسے اُس آتش بازی کو ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم ہوا۔"

"مشتاق کی بات کر رہے ہو" ردا مُسکرا کر بولی۔

"پوچھنے کی بات ہے، آتش بازی بھی مجھے کچھ بُجھی بُجھی سی لگتی ہے۔ ردا! گھر میں کچھ تبدیلی سی پیدا ہوئی ہے کیا بات ہے..... کافی لوگ کم ہو گئے ہیں، اپنے رشید بھائی بھی نظر نہیں آ رہے۔ کہاں گئے ہوئے ہیں؟ کیا مُلک سے باہر چلے گئے اور شہاب انکل کا بھی پتہ نہیں لگ رہا۔ مجھے سب سے زیادہ خیر دین یاد آ رہا ہے بڑا بے مروّت آدمی نکلا احسان احمد جیسے آدمی کے ہاں سے نوکری چھوڑ کر جانا بڑے دل گُردے کا کام ہے اُسے اب دیکھئے نا روزی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔"

"ہاں بس بندا ز ہے لوگوں کا کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"ویسے ایک بات کہوں ردا بہن، یہ اللہ رکھی تو بالکل نہیں پگھلی خدا اُسی کے ہاتھ کا تھا، میں نے اچھی طرح پہچان لیا تھا، اور آپ یقین کریں کہ دو دن تک حیرت سے کھانا نہیں کھا پایا تھا آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اتنے اطمینان سے کُھل کر مجھے خط لکھ سکتی ہے۔"

"حیرت سے کھانا نہیں کھا پایا تھا" ردا ہنس پڑی۔

"ہاں بس سینڈوچز وغیرہ سے کام چلا لیتا تھا۔ سُوپ پی لیتا تھا، حیرت، حیرت ہی ہوتی ہے" اختر نے کہا اور ردا ہنسنے لگی پھر بولی۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟ وہ پگھلی نہیں۔"

"ہاں انداز میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی، وہی تیکھا پن، وہی لہجہ، کم از کم انسان کسی سے محبت کرے تو اس کے اندر گداز پیدا ہو جانا چاہیئے۔"

"نہیں اب ایسی بات بھی نہیں بس وہ فطرتاً ایسی ہے کوئی بات گہری سنجیدگی سے نہیں لیتی، ویسے میرا خیال ہے اس کے ذہن میں تمہارے لیے جگہ ضرور ہے۔"

"صرف خیال کی باتیں کر رہی ہیں۔ ارے محترمہ گڑھا کر دیجئے اس کے ذہن میں گڑھا... اور اس گڑھے میں صرف ... صاحب ہی پڑے ہوں، کسی اور کا اُدھر سے گذر بھی نہیں ہونا چاہیئے۔"

"اب یہ سارے کام تو میرے لیے مشکل ہیں" ردا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"ہائے ردا بہن، اِس بُرے وقت میں تو ہاتھ نہ چھوڑیں، بڑی ضرورت ہے آپ کی۔"

"تو اتنی پریشانی کی کیا ضرورت ہے، آئے ہو، رہو گے، صورتِ حال بھی واضح ہو جائے گی۔"

"ہاں بس نجانے کیوں بے چینی انسان کی فطرت میں لکھی ہوئی ہے... خیر اللہ مالک ہے، کچھ گفتگو کر کے تو دیکھیں ویسے ردا بہن سوچیں گی آپ ضرور کہ کیسا بے شرم بھائی ہے، اللہ رکھی کے بارے میں اب دل یہی چاہتا ہے کہ وہ دُور نہ رہے۔ آپ نے بلاوجہ اتنی بڑی شخصیت کو اس کوارٹر میں ڈال رکھا ہے آنے والے وقت میں کیا مُنہ دکھائیں گی آپ اُسے جب وہ ایک عالی شان کوٹھی میں مالکہ کی حیثیت سے رہے گی۔"

"بھئی اِس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ بات تو تم دوسروں سے کرو۔"

"اللہ مالک ہے، دوسروں سے بات کرنے کا وقت بھی آ ہی جائے گا... لیکن بہن کی موجودگی میں بھائی کو دوسروں کے سامنے زبان کھولنی پڑے ایک بہن کے لیے معاف کیجئے گا بڑے شرم کی بات ہے۔"

"خُدا کے بندے! تمہیں آئے ہوئے ابھی چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں گزرے اور بہن کے اُوپر اتنی ذمہ داریاں لاد دیں، کچھ وقت تو گزرنے دو۔"

"بس اتنا وقت گزار دیجئے کہ ہم نہ گزر جائیں" اختر نے کہا اور ردا ہنستی رہی اختر کے آنے سے ذہنی پریشانی کچھ کم ہو گئی تھی، ردا خود کو خوش محسوس کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب چلے جانا بہتر ہے، کوئی اخلاق بھی برتے گا تو کہاں تک یہاں تو راتوں کی نیند اور دن کا چین برباد ہو ہی گیا ہے دوسروں کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خُدا ہی حافظ" ردا نے مسکراتے ہوئے کہا اور اختر باہر نکل گیا۔

ردا دیر تک اُس کی باتوں پر مُسکراتی رہی تھی۔

آفندی صاحب اب اکثر تصور بیگ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے اور تصور بیگ اُن سے چُھپنے کی کوششوں میں مصروف رہتا تھا، آفندی صاحب کا ایک ہی تقاضا ہوتا اور اس سلسلے میں وہ تصور بیگ کو کافی لعن طعن کرتے تھے۔

"یہاں ایک زمانے میں پولیس آفیسر ہوا کرتے تھے، بڑے سے بڑے مجرم کا پتہ لگانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ خاندان سمیت گھسیٹ کر لے آیا کرتے تھے، ایک آپ ہیں کہ ابھی تک ایک معمولی سی لڑکی کا پتہ نہیں لگا سکے۔"

"آپ اُسے معمولی لڑکی کہہ رہے ہیں آفندی صاحب" تصور بیگ نے کہا۔

"بھئی وہ ایک سیدھی سادی سی لڑکی ہے اور اس کا اتنے دن تمہاری نگاہوں سے چُھپے رہنا مناسب نہیں ہے۔ اُس کم بخت ثاقب کا بھی پتہ نہیں چل سکا، میں کہتا ہوں تم کر کیا رہے ہو؟" آفندی صاحب غصّے سے بولے۔

"چچا جان! آپ اطمینان رکھیے اور وہ دن دُور نہیں جب زردا آپ کے سامنے ہو گی۔"

"مجھے تو وہ دن بہت دور نظر آ رہا ہے کچھ کرو، خدا کے لیے کچھ کرو۔"

"دیکھیے میں مضبوط بنیاد دوں جو کام کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے زردا آپ کے سامنے آئے اور آپ کو پہچاننے سے صاف انکار کر دے تو ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے؟"

"خیر انکار تو وہ نہیں کر سکتی جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے وہ اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، لیکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دے۔ میں بھی آخر کوئی نہ کوئی حیثیت رکھتا ہوں۔ ایک بار میرے سامنے آ جائے اس کے بعد دیکھنا تماشہ۔" آفندی صاحب بولے۔

"یہی تو میں بھی سوچتا ہوں کہ ایک بار وہ آپ کے سامنے آ گئی تو پھر تماشہ کیا ہو گا؟ بڑی تبدیلیاں ہو جائیں گی آفندی صاحب۔"

"کیا مطلب...؟"

"میرا مطلب ہے کہ وہ... وہ... یعنی بس یوں سمجھ لیں، نجانے کیوں مجھے اس تصور سے ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ زردا آپ کے سامنے آئی تو شاید وہ اپنی شخصیت کو تبدیل کر دے گی۔"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایک بار میرے سامنے آ جائے، میں اُسے سمجھا لوں گا، کیسے نہیں مانے گی۔ پاگل لڑکی ہے بالکل ہی پاگل، احمق ہے خود غرض بھی تو... میں بھی تو اس کا کوئی ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔" تصور بیگ خاموش ہو گیا تھا۔

اُسی وقت کسی ملازم نے باہر سے آ کر اطلاع دی کہ ایک پولیس آفیسر تصور بیگ سے ملنا چاہتا ہے تو تصور بیگ فوراً ہی اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

باہر ایک جیپ میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ایک آفیسر بیٹھا ہوا تھا، تصور بیگ نے اُس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بھائی میرے گھر آئے ہو تو چلئے وہیں سے چائے پلوا دوں گا، اس وقت تمہارا آنا میرے لیے تو بڑی مبارک فال ثابت ہوا ہے۔ نکل چلو یار یہاں سے۔" پولیس آفیسر نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ کافی دُور نکلنے کے بعد تصور بیگ نے کہا۔

"یار یہ بزرگ بوڑھے ہونے کے بعد نجانے کیا بن جاتے ہیں... ایک بزرگ اندر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ایسے مسئلے میں میری جان کھا رہے تھے جسے میں ابھی نظرانداز کرنا چاہتا ہوں۔"

پولیس آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہنسنے لگا تھا تب تصور بیگ نے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ کیسے آنا ہوا تھا...؟"

"وہ سر آج یونیورسٹی چلنا تھا، وائس چانسلر سے میٹنگ تھی نا اس دن کے ہنگامے کے سلسلے میں جو چند لوگ۔"

"اوہ کمال ہے، میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔" تصور بیگ نے کہا۔

"میں نے سوچا آپ کو یاد دلا دوں، وقت بھی ہو چکا ہے۔"

"چلو، پھر نکل چلتے ہیں، ایک آدھ گھنٹے کا کام ہو گا اس کے بعد میری کچھ اور مصروفیات ہیں آج کل ایک اہم مسئلے پر کام کر رہا ہوں، جو بہت زیادہ اہم ہے۔"

پولیس آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے جیپ کا رُخ یونیورسٹی کی جانب موڑ دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیپ یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔

وائس چانسلر طے شدہ وقت کے مطابق اُن دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ میٹنگ میں کچھ اور افراد بھی شریک تھے اور اُن کا انتظار کیا جا رہا تھا... ان کے بیٹھنے کے بعد وائس چانسلر نے اس سلسلے میں گفتگو کا آغاز کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ جن لڑکوں کو اُن ہنگاموں کے دوران میں گرفتار کیا گیا تھا اُنھیں رہا کر دیا جائے اور اس سلسلے میں کوئی ایسا طریقۂ کار اختیار کیا جائے، جو اُن کے لئے توہین آمیز نہ ہو کیونکہ اس میں یونیورسٹی کے وقار کا بھی مسئلہ ہے۔ تصور بیگ اس سلسلے میں اُن سے گفتگو کرتا رہا اُنھیں مشورے دیتا رہا اور تقریباً چالیس منٹ کی نشست کے بعد یہ میٹنگ برخاست ہو گئی۔ وائس چانسلر نے اُن دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے بعد وہ وہاں سے واپس چل پڑے۔

جیپ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ عقب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"مسٹر ڈی سوزا، مسٹر ڈی سوزا۔" تصور بیگ نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اُس کا چہرہ فق ہو گیا اُس کے مُنہ سے نکلا۔

"ارے باپ رے۔ یہ کیا ہو گیا..." انسپکٹر بھی پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔ دُور سے عصمت اُسے آوازیں دیتی ہوئی آ رہی تھی... انسپکٹر نے حیرت سے تصور بیگ کی طرف دیکھا

اور تصور بیگ جلدی سے بولا۔

"یار شاہد! ایک چکر ہے، تفصیلات بعد میں بتا دوں گا، وہ مجھے مائیکل ڈی سوزا کے نام سے جانتی ہے۔ تم مجھے مائیکل ڈی سوزا ہی رہنے دینا۔"

"مائیکل ڈی سوزا۔" انسپکٹر حیرت سے بولا۔

"اوہ میرے بھائی، اس وقت حیرت کا اظہار مت کرو جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر کان دھرو۔"

"ٹھیک ہے سر لیکن..."

"کچھ نہیں، بس تفصیلات بعد میں۔" تصور بیگ نے دانت پیستے ہوئے کہا اور انسپکٹر شاہد مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔

"میرا خیال ہے بات کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔" ابھی تصور بیگ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ عصمت اُس کے قریب پہنچ گئی۔

"ایکسکیوزمی مسٹر ڈیسوزا۔ یقیناً آپ مصروف ہوں گے لیکن میں آپ کا کچھ وقت ضرور لوں گی۔"

"یس سسٹر کیا اُوں نا ہیں۔ کیا اُوں نا ہیں۔ ما ئیں حاضر ہائے۔" تصور بیگ زبان ٹیڑھی کر کے بولا اور عصمت چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ مائیکل ڈی سوزا کا یہ لہجہ تو نہیں تھا اس دن تو وہ بالکل صاف اُردو بول رہا تھا۔ بہرحال اُس نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھا لیا لیکن ہے اُس دن غور نہ کر پائی ہو ہنگامہ ہی ایسا تھا۔

"آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا پسند کریں گے؟"

"ابھی چائے پیا اس کا جارورت نائیں ہائے۔ پلیز آپ مجھے کام بولو"

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"سوری نائیں۔"

"اوہ اُس دن جب یونیورسٹی میں ہنگامے ہوئے تھے۔ آپ نے میرے ایک زخمی ساتھی کی مدد کی تھی اور اُسے اسپتال پہنچایا تھا۔"

"یہ تو ہم سب کا فرض ہائے۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی ایک بار آپ کو شہر میں بھی دیکھا تھا لیکن!"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ اور کوئی کام ہے مجھ سے؟"

"ہاں ایک بہت ضروری کام..."

"آپ بولو... پولیس آپ کا خادم ہائے۔"

"آپ کو کسی شام میرے گھر پر چائے پینی پڑے گی۔"

"جارور پیئیں گا۔ مگر آج کل بہت مصروف ہائے۔ آپ کا فون نمبر مل جائے تو کسی دن آپ کو رِنگ کرے گا۔ سسٹر پھر چائے پیئے گا۔"

"میرا فون نمبر نوٹ کریں۔"

"نوٹ کرو۔" ڈی سوزا نے ساتھی انسپکٹر سے کہا اور انسپکٹر نے فون نمبر نوٹ کر لیا۔ عصمت پھر بولی۔

"اور مجھے بھی اپنا نمبر دے دیں۔"

"نمبر نین کپلیٹ نمبر نین۔" تصور بیگ بولا۔

"کیا نمبر نین، میں فون نمبر کی بات کر رہی ہوں۔"

"اوہ فون نمبر۔ ہاں پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر تو آپ کو اس سے مل جائیں گا اُدھر مائیکل ڈیسوزا کا پوچھ لیں۔"

"کوئی گھر بھی تو ہو گا۔ وہاں فون نہیں ہے۔"

"گھر ہائے۔ فون بھی ہائے۔ بٹ اُدھر ڈینجر لوگ رہتا ہائے آپ فون کریں گا وہ گالی بکیں گا آئی ایم سوری آپ ہیڈ کوارٹر رِنگ کرو ہم اُدھر مِل جائیں گا۔"

"اوکے۔ میں آپ کو رِنگ کروں گی آپ میرے گھر ضرور آئیں۔"

"جارور جارور۔ تھینکیو۔" مائیکل ڈیسوزا نے کہا اور پھر گردن خم کر کے جیپ کی طرف بڑھ گیا اس کی چال میں بھی لنگڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ جیپ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تصور بیگ نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا کافی دُور نکل آنے کے بعد انسپکٹر نے پوچھا۔

"کیا قصہ تھا سر؟"

"تیز چلو یار کہیں وہ محترمہ تعاقب ہی نہ شروع کر دیں۔"

"ہیں کون؟"

"بلائے جان، بھول ہی گیا تھا اُنھیں۔" تصور بیگ نے کہا۔

"مگر سر آپ اُنھیں سسٹر کہہ رہے تھے۔"

"ٹھیک کہہ رہا تھا، یونیورسٹی میں ہنگامے کے دوران ملی تھیں مگر میں اُن سے دوبارہ نہیں ملنا چاہتا تھا۔"

"آپ نے اُنھیں اپنا نام مائیکل ڈیسوزا بتایا تھا؟"

"ہاں جلدی میں یہی نام ذہن میں آ گیا تھا۔"

"اور اگر اُنھوں نے ہیڈ کوارٹر فون کر دیا تو؟"

"تو کیا ہو گا؟"

"اوہ کیا آپ کو مسٹر مائیکل ڈیسوزا یاد ہیں؟"

"ایں۔" تصور بیگ چونک پڑا پھر پیشانی مسلتا ہوا بولا "واقعی مجھے ڈیسوزا یاد نہیں رہے تھے۔ خیر اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"اس کی گہرائی میں ضرور کچھ پوشیدہ ہے۔"

"اوہ یار تو گاڑی چلا جیپ کسی گہرائی میں نہ ڈال دینا" مقصود بیگ نے کہا۔ اور انسپکٹر ہنسنے لگا۔

▼

احسان احمد نے فیصلہ کر لیا۔ ذکیہ اور اماں بی سے اِس سلسلے میں مشورہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ عادل صاحب اُن کے ایسے دوست تھے کہ وہ اُن سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے تھے جتنی دیر ہو گی عادل صاحب اتنا ہی بُرا مانیں گے چنانچہ دفتر جانے سے پہلے اُنھوں نے عادل صاحب سے کہا۔

"کیا پروگرام ہے عادل کوئی خاص مصروفیت تو نہیں"؟

"نہیں کیوں؟"

"میرا مطلب ہے کسی سے ملنے کا پروگرام تو نہیں؟"

"بالکل نہیں تمہیں اگر کوئی مصروفیت ہے تو اسے تمنا دو میں آرام کروں گا۔"

"نہیں میرے ساتھ چلو"

"کہاں"؟

"دفتر کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"بڑی خوشی سے۔ تو اور اچھا ہے۔ بس ابھی تیار ہو جاتا ہوں" عادل بیگ نے کہا۔

"بچے کہاں ہیں؟"

"اختر اور خالد۔" عادل بیگ نے پوچھا۔

"ہاں"

"باہر ہی گئے ہیں؟"

"اُنھیں بھی ساتھ لے لو اُن کی موجودگی بھی ضروری ہے۔"

"کوئی ایسی ہی بات ہے؟" عادل حسین نے کسی قدر جھجک سے پوچھا۔

"ہاں ایسی ہی بات ہے ہمیں یہ کام اپنے بچوں کو اعتماد میں لے کر کرنا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے اُنھیں بھی بلائے لیتا ہوں" عادل حسین نے کہا تھوڑی دیر بعد وہ سب تیار ہو کر باہر نکل آئے اختر اور خالد سخت پریشان تھے۔ انھیں یہ سب کچھ بہت پُراَسرار معلوم ہو رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ غلام احمد نے ہی سنبھالی ہوئی تھی اور ایک مؤدب ڈرائیور کی حیثیت سے گاڑی چلا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دفتر پہنچ گئے سب لوگ دفتر میں داخل ہو گئے تھے۔ احسان صاحب نے چپراسی سے کہا کہ وہ اِس وقت اور کسی سے ملاقات نہیں کریں گے۔ اور اُنھوں نے انٹرکام پر نزدا کو مخاطب کیا اور بولے۔

"نزدا بیٹے، میں ذرا مصروف ہوں کوئی مسئلہ ہو تو تم خود دیکھ لینا۔"

اختر نزدا کے نام پر چونک پڑا تھا۔ اور پھر وسوسے کو دبا گیا۔

"انکل ! نزدا... اپنی نزدا یہاں...؟"

"ہاں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم؟"

"وہ تو کہیں اور ملازمت کرتی تھی۔"

"اب وہ احسان لمیٹڈ کی مینجر ہے اور کسی سفارش یا احسان کے تحت نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کے تحت ہے۔ کمال کی بچی ہے یہ عادل! اتنی ذہین کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔"

"خوب" عادل حسین نے مسکراتے ہوئے کہا "اب وہ اصل بات جلدی سے بتا دو جس کے لیے تم نے میری کنپٹیاں چٹخا دی ہیں اور مسلسل سسپنس پیدا کیے جا رہے ہو۔"

"کچھ حالات بتانا چاہتا تھا ایک عجیب سی مجرمانہ کیفیت محسوس کر رہا ہوں کچھ شرمندگی بھی ہے اور کچھ تشویش بھی۔ دیکھو یار جو کچھ کہوں بُرا نہ محسوس کرنا۔"

"بھلے آدمی پھوٹ بھی پڑو، میرا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔ میری بدقسمتی کی کہانی ہے تم شہاب احمد اور اُس کے رویئے کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ میں نے ہمیشہ اُسے بھائی کے بجائے بیٹے کی حیثیت دی اور کبھی اُسے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ میرا بیٹا نہیں ہے۔"

"مجھ سے زیادہ یہ بات اور کون جانتا ہے احسان کیا اُس نے کوئی گستاخی کی ہے۔ میں نے اس دوران ایک بار بھی اُسے نہیں دیکھا کیا اب وہ تمہارے ساتھ نہیں رہتا؟"

"نہیں" احسان احمد کرب سے بولے۔

"کہاں رہتا ہے گستاخ مجھے بتاؤ۔ کان کھینچ کر سیدھا کر دوں گا آخر اُس نے یہ بدتمیزی کیوں کی؟"

"اُس نے وہ کچھ کیا ہے تم تصور بھی نہیں کر سکتے، وہ بُری طرح بدل گیا تھا اور اُس نے..." احسان احمد نے اُنھیں فرینڈز آرگنائزیشن... ! اور تفسیر کی پوری کہانی سُنا دی۔ پھر بتایا کہ کس طرح اُنھوں نے وہ نقصانات پورے کیے اور اپنی پائی پائی گنوا بیٹھے شہاب صاحب کے ! لے کر احسان لمیٹڈ اور کوٹھی کے ہاتھ سے جانے کے واقعے تک پہنچ کر وہ رُک گئے۔ عادل صاحب بے چینی سے بولے۔

"پھر کیا ہوا جلدی بتاؤ"

"کیا بتاؤں عادل کیا ہوا۔ غلام احمد کو جانتے ہو تم؟"

"کون غلام احمد؟"

"یہ جو ہماری گاڑی ڈرائیو کر کے یہاں تک لائے ہیں"

"ہاں ظاہر ہے ڈرائیور ہے"

"نہیں عادل، وہ احسان لمیٹڈ کا مالک ہے۔ وہ میرا ایسا محسن ہے جس نے اِس زمین پر فرشتہ کی مثال پیش کی ہے اِس نے میری عزت بلکہ میری زندگی بچا لی ہے"

"کیسے" عادل صاحب کا مُنہ حیرت سے کھلا ہُوا تھا۔ خالد اور اختر بھی ششدر رہ گئے۔ تب احسان احمد نے غلام احمد کی کہانی اس وقت سے آخر تک سُنا دی جب اُنھوں نے ڈرائیور کی نوکری کی تھی پھر احسان احمد کی کوٹھی میں منتقل ہُوئے تھے اور آخر میں اپنی ساری پونجی اُن کے حوالے کر دی تھی اور خود ضد کر کے اُن کے ڈرائیور بنے ہُوئے تھے تاکہ کسی کو کوئی احساس نہ ہو سکے۔

سب کی آنکھیں شدّتِ حیرت سے پھٹی ہُوئی تھیں اختر کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے تصوّرات جاگ رہے تھے۔

احسان صاحب کے خاموش ہونے کے بعد بھی دیر تک کسی نے کچھ نہ کہا وہ اِس تمام تفصیلات پر غور کر رہے تھے۔ پھر کافی دیر کے بعد عادل حسین نے کہا۔

"اور وہ آج بھی ڈرائیور ہیں؟"

"کیا بتاؤں عادل۔ میں سب کچھ کہہ چکا ہوں لیکن وہ بضد ہیں کہ اپنی یہی حیثیت قائم رکھیں۔"

"کوارٹر میں ہی رہتے ہیں؟"

"میں نے مِنّت سماجت کر کے کوٹھی میں بُلا لیا تھا لیکن اُن کو ایک ایسا دوست مل گیا جو خود بھی سانحہِ مشرقی پاکستان میں قلّاش ہو گیا صرف اِس لئے کہ اُن کا دوست احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو جائے وہ مِنّت سماجت کر کے واپس کوارٹر میں چلے گئے ہیں۔"

"بھئی کمال کا انسان ہے، واقعی بڑا آدمی ہے،" عادل صاحب نے مُتاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"بہت بڑا عادل، بہت بڑا" احسان صاحب بولے۔

"اُن کے اہلِ خاندان کو یہ بات معلوم ہے" دفعتاً اختر نے پوچھا۔

"ایک ایک فرد کو۔ لیکن اعلیٰ خون اعلیٰ ہی ہوتا ہے کسی کی پیشانی شکن آلود نہیں ہُوئی۔ سب ہم آواز ہیں۔ حالانکہ بچیاں ایک معمولی سی جھونپڑی میں زندگی گزار چکی ہیں مگر وہ سب یکساں ہیں۔ ایک دوسرے کی تصویر ہیں اُنھیں اِس بات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔"

"واقعی بڑے ظرف کی بات ہے۔ اب میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" عادل صاحب نے کہا۔

"ہاں ضرور۔"

"مجھے کینیڈا میں اِن واقعات سے لاعلم کیوں رکھا گیا؟"

"بس یہ سوال مت کرو عادل... میں ہمت نہیں کر سکتا تھا۔"

"کوٹھی اور اِس فرم کے سلسلے میں تو تم مجھ سے رابطہ کر سکتے تھے؟"

"اسے میری کمزوری سمجھ لو۔ اور اب مجھے یہ مشورہ دو کہ میں غلام احمد کے سلسلے میں کیا کروں۔"

"تمہارا معاملہ ہے تم جانو" عادل صاحب خشک لہجے میں بولے اور احسان صاحب خاموش ہو گئے۔

"چچا جان! باقی سب لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہو گی۔"

اِس بار خالد نے پوچھا تھا۔

"ہاں بیٹے کسی سے چھپانا میرے بس کی بات نہیں تھی سب کو معلوم ہے میں نے تم لوگوں کو بھی اِس سے لاعلم رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور اِس لیے تمہیں زحمت دی تھی جو کچھ ہو چکا ہے اُسے واپس نہیں کیا جا سکتا، میری زندگی کا رُخ بدل گیا ہے۔ اور میں ہر حالت میں اپنی اصل شکل میں دنیا کے سامنے رہنا چاہتا ہوں۔"

"ایک سوال کروں تم سے...؟" عادل صاحب نے کہا۔

"ضرور۔"

"غلام احمد کی رقم مجھ سے لے کر واپس کرنا پسند کرو گے۔"

"نہیں...!" احسان احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں...؟"

"اِس لیے عادل حسین کہ میرے اور تمہارے درمیان ایک اور رشتے کے امکانات ہیں اور اِس رشتے میں یہ سب کچھ جائز نہیں ہو گا،" احسان احمد سخت لہجے میں بولے۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے تمہارا معاملہ ہے تم جانو میرا کچھ کہنا مداخلت بے جا ہے۔ ویسے مجھے افسوس ہُوا اُصولاً مجھے اِس رشتے کے تحت کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہیئے لیکن کیا کروں بات صرف تمہاری نہیں ہے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوں گے اور تمہارے کئے کی سزائیں دوسروں کو نہیں دینا چاہتا۔"

"عادل حسین تمہاری یہ باتیں میرا دل دُکھا رہی ہیں۔ اُمید ہے کہ میرے جذبات کا خیال رکھو گے۔"

"ہُوں۔ ٹھیک ہے اب کوئی شکایت نہیں کروں گا لیکن

یہ بات نہیں بھول سکوں گا احسان احمد کہ تم نے میری دوستی پر اعتبار نہیں کیا۔"

"میں اُسے ایک جُرم تسلیم کئے لیتا ہوں۔"

"انکل! کیا میں آپ کی مینجر سے مِل سکتا ہوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"میں بھی چلوں۔" خالد نے پوچھا۔

"آیئے۔۔!" اختر نے کہا اور دونوں باہر نکل آئے۔ اختر نے چپراسی سے مینجر کا کمرہ پوچھا اور وہ دونوں کو لے کر چل پڑا۔ پھر اُس نے اُنھیں رُدا کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ دیا تھا۔

رُدا کام میں اِس قدر منہمک تھی کہ دروازہ کھلنے کا احساس بھی نہ ہُوا۔ وہ تو اُس وقت چونکی جب اچانک اس کے پیروں کے قریب کُتے کے پِلّے کے چیخنے کی آواز ابھری اُس نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ دونوں پیر اُوپر اُٹھائے۔ تب اس کی نگاہ اختر اور خالد پر پڑی۔

"تمہیں خدا سمجھے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اور تمہیں کوئی نہ سمجھے سسٹر کیوں؟" اختر نے آگے بڑھ کر کُرسی گھسیٹتے ہُوئے کہا پھر دھم سے بیٹھ گیا۔

"اَرے تم نارمل کہاں سے ہوگئے؟"

"کیا کریں سسٹر، دیارِ غیر کو اپنا سمجھ کر آ پھنسے ہیں۔ اب خود ہی مجنوں کے دھاگے پکڑتے پھر رہے ہیں مجبوری ہے تنہا جی بھی تو نہیں سکتے۔" اختر نے کہا۔

"کوئی نئی جذبی ناول پڑھ کر آئے ہو؟"

"نہیں، خود کو میڈیرن گئے ہیں۔"

"کیا ہوا! انھیں خالد۔۔؟"

"شکایت تو مجھے بھی ہے آپ سے رُدا بہن۔"

"کیوں میرے پیارے بھائیو؟" رُدا نے سامنے رکھے فائل بند کرتے ہُوئے ہنس کر کہا۔

"ہم خود کو آپ لوگوں کی نگاہوں میں خاص سمجھتے تھے مگر آپ نے ثابت کر دیا کہ ہم بس عام سے ہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے ہم میں کہ دوسرے ہمیں اہمیت دیں۔"

"مجھے میرا جرم تو بتایا جائے۔ ہُوا کیا ہے، آپ لوگ کیوں میری گرفت کر رہے ہیں۔۔۔؟"

"ہم اِس وقت بالکل سنجیدہ ہیں محترمہ رُدا! آپ خود دنیا کی نگاہوں میں معمہ بنی ہُوئی ہیں اور دوسروں کو بھی معمہ بنانا پسند کرتی ہیں۔ دراصل چچا جان نے ابھی ابھی ہمیں وہ سارے حالات بتائے ہیں، جن سے وہ گزرے ہیں آپ یہ بتایئے مِس رُدا کہ آپ نے اپنے خط میں اُن واقعات کے بارے میں ہمیں کیوں نہیں لکھا جبکہ میں یہاں آپ کو اپنی نمائندہ بنا کر چھوڑ گیا تھا۔" اختر نے کہا اور رُدا ایک دم مُسکراتے مُسکراتے سنجیدہ ہوگئی، وہ عجیب سی نگاہوں سے اختر کو دیکھنے لگی تھی۔ پھر اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

"سمجھ سکتے ہو اختر تو اس کیفیت کو خود ہی سمجھ لو! احسان صاحب نے تمہیں سب کچھ خود بتا دیا یہ اُن کا مسئلہ ہے اور یقیناً یہ اُنھیں ہی زیب دیتا تھا، میں کس حیثیت سے اُن کا ذاتی راز منکشف کرتی۔ کیا میرے لیے جائز تھا کہ احسان صاحب جو بات کسی سے چھپانا چاہیں میں اُسے افشاء کر دوں۔۔۔"

"اگر غلام احمد چچا صورتِ حال نہ سنبھالتے تو یہ بتایئے رُدا کیا ہوتا۔۔۔؟" اختر نے کہا۔۔۔

"جو کچھ بھی ہوتا ظاہر ہے اُس ہونے سے میں خوش نہ ہوتی، لیکن میرے لیے یہ انتہائی ناجائز بات تھی کہ میں فوراً ہی اِس گھر کے حالات تم لوگوں کو لکھ دیتی، میں اس سلسلے میں اپنے آپ کو قصوروار نہیں سمجھتی اختر، چاہے تم کچھ بھی محسوس کرو۔" رُدا کا لہجہ بے حد ٹھوس تھا۔ اختر نے مایوسی سے ہونٹ سکوڑے اور خالد کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میں پہلے ہی کہتا تھا یہ رُعب میں نہیں آئیں گی۔۔۔!"

خالد ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "نہیں رُعب میں آنے کی بات نہیں ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب ایک عجیب سا احساس ہو رہا ہے، پہلے جب ہم لوگ یہاں آئے تھے نا تو دل میں ایک تاثر لے کر گئے تھے کہ ہمیں یہاں اپنوں کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن اب یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اپنائیت پیدا کرنے کے لیے نئے سِرے سے کام کرنا پڑے گا۔ بڑا عجیب لگ رہا ہے یہ سب کچھ۔۔۔"

"خالد اختر تو غیر سنجیدہ انسان ہیں، بات پر غور ہی نہیں کرتے۔ آپ مجھے بتایئے کیا یہ وفاداری کے زُمرے میں آتا تھا کہ میں فوراً ہی آپ کو اُن حالات سے آگاہ کر دیتی؟"

"نہیں رُدا بہن، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اب ایک بہت بڑا مسئلہ آ پڑا ہے۔" خالد بولا۔

"کیا۔۔؟"

"ڈیڈی بھی اِس بات پر ناراض ہوگئے ہیں کہ انکل نے اُنھیں اِس صورتِ حال میں شریک کیوں نہیں کیا اور انکل اپنی

بات پر بضد ہیں کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا، کہیں کوئی تلخی نہ پیدا ہو جائے۔"

"اوہ، یہ صورتِ حال واقعی تشویشناک ہے اور اِس سلسلے میں بندی کی خدمات حاضر ہیں۔" رُدا نے کہا۔

"رُدا بہن! بہت سنجیدگی سے اِس مُعاملے کو ڈیل کیجئے، ہم لوگوں کی پوزیشن اِس قابل نہیں ہے کہ ہم آگے بڑھ کر کچھ کہیں۔ ڈیڈی کے ذہن سے یہ خیال دُور ہونا چاہیئے کہ حالات جیسے بھی ہوں کسی قسم کی کوئی بندش صُورتِ حال کو بہت بگاڑ سکتی ہے۔"

رُدا کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے تھے۔ اُس نے کہا۔

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا اور اگر بات کچھ اس طرح بڑھی تو تم لوگ اطمینان رکھو کہ میں تمہارے ساتھ ہُوں اور شاید زندگی میں پہلی بار دعویٰ کر رہی ہُوں۔۔۔ کہ اس مسئلے کو سنبھالوں گی۔"

"دیکھا، دیکھا، یہ اعتماد ہے اپنے آپ پر لیکن اپنے اِس اعتماد میں اپنے اِس چہیتے بھائی کو شریک نہیں کیا جس کی محبت کے نجانے کتنے دعوے کئے گئے تھے۔" اختر نے کہا۔

"اچھا بس اب بے کار باتیں بند، یہ بتاؤ کیا منگاؤں، کیا انکل خود تمہیں یہاں لے کر آئے تھے۔؟"

"جی ہاں، سب آپ ہی کی طرح تھوڑی ہوتے ہیں کوئی ٹھنڈا مشروب پلایئے، جی جل رہا ہے۔" اختر نے ناک چڑھا کر کہا اور رُدا ہنسنے لگی۔ اُس نے ہنستے ہُوئے گھنٹی کا بٹن دبا دیا تھا، چپڑاسی کے آنے پر اُس نے کولڈ ڈرنکس منگوائے اور پھر تینوں کولڈ ڈرنکس کی چسکیاں لینے لگے۔ اختر چند لمحات کے بعد بولا۔

"میرا خیال ہے بھائی صاحب کو خدشہ ہے کہ اُن دونوں بزرگوں کی یہ چپقلش کہیں اُن کے مسئلے میں آڑے نہ آ جائے اِس مسئلے کو سنجیدگی سے ڈیل کرنا ہے رُدا بہن۔"

رُدا نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا، "میں سمجھ رہی ہُوں لیکن میرا خیال ہے جو محبت میں نے اِن لوگوں میں پائی ہے وہ اِس حد تک مجروح نہیں ہو سکے گی۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔۔؟"

"تم لوگوں کو ابھی پریشان نہیں ہونا چاہیئے میں خاص طور سے اِن حالات کا جائزہ لوں گی۔"

مشروب پینے کے بعد وہ وہاں سے اُٹھ گئے۔ دوسری طرف کا بھی خیال ذہن میں تھا۔ رُدا سے اِس بارے میں اور کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا، اختر نے تو کچھ کہنا بھی چاہا، لیکن خالد نے اُسے روک دیا وہ رُدا کی پوزیشن سمجھ رہا تھا اور اُس نے اِس بات کو دل سے تسلیم کیا تھا کہ رُدا کو درحقیقت اِن مُعاملات میں بڑھ چڑھ کر نہیں بولنا چاہیئے تھا۔

دونوں دل میں طرح طرح کے خدشات لیے ہُوئے جب دوبارہ آفس میں داخل ہُوئے تو اُن کے چہروں پر حیرت پھیل گئی، احسان احمد اور عادل حسین صاحب کِس بات پر بے اختیار ہنس رہے تھے، اُنھوں نے سکون کے گہرے سانس لیے۔ گویا بات سنجیدہ نہیں ہو سکی تھی۔

عادل حسین بولے۔۔

"تم لوگ یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہارے اِن چچا جان کو مُعاف کر دیا ہے۔ معاہدہ ہوا ہے ہم دونوں کے درمیان یہ احسان احمد صاحب فرماتے ہیں کہ دو سال کے اندر اندر یہ غلام احمد صاحب کا پورا پورا قرض ادا کر دیں گے اور اپنی ساکھ بحال کر لیں گے۔ اگر یہ ایسا نہ کر سکے تو پھر اِنھیں احسان لمیٹڈ کو میری فرم میں ضم کرنا پڑے گا اور ہماری فرم غلام احمد کا قرض ادا کرے گی۔ میں نے اس صُورت میں اِس شخص کو معاف کیا ہے۔"

"گڈ، ویری گڈ۔" اختر نے بھی مسکراتے ہُوئے کہا۔۔

عادل حسین بولے۔۔

"بھئی اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو چلو واپس چلتے ہیں طبیعت کچھ تکدر کا شکار ہوگئی ہے۔ آج آرام کریں گے احسان کل سے تم چاہو تو باقاعدہ اپنی ذمّہ داریاں سنبھال لینا۔ میں بھی کام شروع کر دوں گا، میرے کچھ لوگوں سے تعلقات ہیں یہاں پر۔ اُن سے ملاقات کروں گا جو کچھ کر کے آیا ہُوں اُس کی تفصیلات بھی معلوم کرنی ہیں، تمہاری ایک گاڑی مجھے درکار ہوگی اور بس۔"

"چلئے، چلتے ہیں۔" احسان احمد نے کہا اور چاروں دفتر سے باہر نکل آئے۔ احسان احمد صاحب نے رُدا کے کمرے میں پہنچ کر اُسے کچھ ہدایات دیں اور پھر باہر آ گئے کار کے پاس غلام احمد صاحب پیلے رنگ کا [illegible] لیے ہُوئے کار کا

شیشہ صاف کر رہے تھے، عادل حسین انہیں دیکھ کر ٹھٹھک گئے، پھر گردن جھٹک کر آگے بڑھے، غلام احمد صاحب نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے فوراً کار کے عقبی دروازے کھول دیئے اور ایک سمت کھڑے ہو گئے۔

عادل حسین اُن کے پاس پہنچے اور پھر دفعتاً انھوں نے غلام احمد کو گھسیٹ کر سینے سے لگا لیا اور کسی قدر بھرائے ہُوئے لہجے میں بولے۔

"سُنا ہے بڑائیاں منتقل بھی ہو جاتی ہیں، میں بھی تمہیں سینے سے لپٹا کر تمہارے ظرف کا کچھ حصّہ حاصل کرنا چاہتا ہُوں غلام احمد۔ خدا تمہیں اِس سے بلند مرتبہ دے۔"

غلام احمد صاحب بھونچکے رہ گئے تھے۔ پھر اُنہوں نے شکایتی نگاہوں سے احسان احمد کی طرف دیکھا تو احسان احمد جلدی سے بول پڑے۔

"غلام احمد یہ شخص میرا دوست ہی نہیں میرا ہونے والا سمدھی بھی ہے، یہ ضروری تھا بھائی کہ میں اِسے تمام تر حقیقت بتا دیتا اور اِسے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی کہ ایک غریب دوست کی بیٹی قبول کرنا اس کے لیے مشکل تو نہیں ہو گا" احسان احمد نے کہا اور عادل حسین گھونسا تان کر اُن کی جانب لپکے۔ پھر اُنہیں کار کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا اور خود بھی اُن کے برابر جا بیٹھے۔ غلام احمد صاحب نے مسکراتے ہُوئے دروازہ کھولا اور اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

❁

لان پر محفل جمی ہُوئی تھی آسمان پر چودھویں کا چاند نکلا ہُوا تھا اور چاروں طرف ٹھنڈی روشنی پھیلی ہُوئی تھی ثناء نے ٹیپ ریکارڈر منگوا کر پاس رکھ لیا تھا اور موسیقی کا کیسٹ چل رہا تھا، موسیقی کی مدہم مدہم لہروں نے ماحول کو اور خوشگوار بنا رکھا تھا۔ اِس وقت عصمت اُس پولیس آفیسر کے دوبارہ مِل جانے کا قِصّہ سُنا رہی تھی جس کا نام مائیکل ڈیسوزا تھا۔ اُس نے کہا

"خُدا کی قسم آج مَیں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں اُس پولیس افسر سے گفتگو کی۔ اُس کا لہجہ بدلا ہُوا تھا۔ اُردو وہ صحیح طور سے نہیں بول پاتا، لیکن چہرہ آج میں نے بہت اچھی طرح سے اُس کا چہرہ دیکھا اور بھائی میں تم لوگوں کو بھی اِس امتحان میں شریک کرنا چاہتی ہُوں، میں دعوے سے کہتی ہُوں کہ ہم نے جُڑواں بہن بھائیوں کو بھی دیکھا ہے لیکن اُن میں بھی کوئی نہ کوئی فرق کہیں نہ کہیں مِل جاتا ہے۔ لیکن مائیکل ڈیسوزا اور اپنے چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کا چہرہ آپس میں اتنا مِلتا ہے کہ اُس میں سرِمو فرق نہیں۔"

"تم اُسے اپنے ساتھ کیوں نہ پکڑ لائیں۔ ذرا دیکھتے تو سہی۔" ثناء نے کہا۔

"بہت اعلیٰ پولیس افسر تھا جناب وہ۔ اب اتنی... آسانی سے بھی اُسے گرفتار کر کے نہیں لایا جا سکتا تھا تاہم میں اُسے یہاں چائے کی دعوت دے آئی ہُوں اور اُس نے مجھے اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیا ہے۔ ظاہر ہے بڑا پولیس افسر ہے مصروف ہو گا، لیکن ہم اُسے بُلائیں گے ضرور، تم لوگ بھی تو ذرا دیکھو قدرت کے اس عجوبے کو۔"

"واقعی تعجب کی بات ہے اور دلچسپ بھی ہے" ثناء نے کہا۔

رِدا تو خیر دین کے نام پر ہی کچھ افسردہ سی ہو گئی تھی، خیر دین کو آئے ہُوئے کئی دن گُذر چکے تھے اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دوبارہ وہ کب آئے۔ رِدا اُس کے سلسلے میں درحقیقت عجیب سی کیفیات کا شکار ہو گئی تھی اُس کی حیثیت اور اُس کا انداز دُنیا کی نگاہوں میں کچھ بھی ہو۔ رِدا اِس حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اور اب جب عصمت نے یہ انوکھی کہانی سُنائی تھی تو کئی بار رِدا کے دل میں یہ خیال آ چکا تھا کہ کہیں خیر دین پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی سے تو تعلق نہیں رکھتا، لیکن اِس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کافی وقت درکار تھا اور رِدا بہت مصروف تھی اور پھر یہ بات بھی اُس کے ذہن میں تھی کہ خیر دین کو اگر اپنے بارے میں کچھ بتانا ہے تو اُس کی تفتیش کیوں کی جائے۔ کیا وہ خود اُسے اِس قابل نہیں سمجھ سکتا کہ اپنے آپ سے رُوشناس کرا دے وہ خاموشی سے اُن لوگوں کی گفتگو سُنتی رہی تھی۔

لیکن اُس کا ذہن خیر دین میں کھویا رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں کِس نے اقبال کا تذکرہ کر دیا اور ثناء بگڑے ہُوئے لہجے میں ندرت سے کہنے لگی۔

"آپ لوگوں کو بھی بس فرشتہ بننے کا خبط ہے، میں کہتی ہُوں اُنہیں یہاں کیوں نہیں لایا گیا، کیا ہمیں اِس

قابل نہیں سمجھا جا رہا، آپ مجھے اُن کے کوارٹر کا پتہ بتائیے میں خود اُنہیں یہاں لے کر آؤں گی۔

"ارے نہیں بھائی، اتنی جلدی مناسب نہیں ہے ابو کا سارا منصوبہ خاک میں مِل جائے گا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ابراہیم چچا کسی احساس کا شکار ہوں۔

"ٹھیک ہے ہم اُنہیں اپنے نوکر کے دوستوں کی حیثیت سے لے آئیں گے۔ تمہیں یہی سب کچھ اچھا لگتا ہے تو یہی سہی؟"

"ابو سے بات کروں گی مَیں۔ واقعی اب کل اُن لوگوں کو یہاں بُلا لینا چاہیئے، ورنہ سوچیں گے کہ زبانی محبت جتا کر رُوپوش ہو گئے، میں کل صبح ہی ابو سے اِس بارے میں بات کروں گی کہ وہ اُنہیں لے کر آئیں۔" ندرت نے کہا۔

لیکن دوسری صبح غلام احمد صاحب نے خود ہی اماں جی سے کہا، آج میں ابراہیم اور اُس کے اہلِ خاندان کو لاؤں گا۔

"میں خود کہنے والی تھی۔ آج ضرور اُنہیں لے آئیے"

"ذرا احسان صاحب سے بات کر لوں۔ صبح ہی صبح نکل جاتا ہُوں کیونکہ ابراہیم کو پہلے سے اطلاع نہیں دی ہے۔" غلام احمد نے کہا اور پھر احسان صاحب کے پاس اندر چلے گئے۔ احسان صاحب نے نہایت خوش دلی سے اجازت دے دی تھی، غلام احمد نے عصمت کو ہدایت کی کہ یونیورسٹی سے واپسی پر وہ اقبال کو ساتھ لے آئے کیونکہ وہ نکل چکا ہو گا، اُس کے بعد وہ تیاریاں کر کے چلے گئے۔

گھر میں انتظامات شروع ہو گئے۔ ندرت کے ساتھ ثناء بیگم بھی آج باورچی خانے میں آ گھسی تھیں اور باندی چولہے سے مذاق کر رہی تھیں لیکن سب خوش تھے۔ پورے کوارٹر کی صفائی کی گئی تھی اور تو اور اختر صاحب بھی موجود تھے اور یورپ کے باورچی خانوں کے بارے میں انکشافات کر رہے تھے۔ خالد عادل صاحب کے ساتھ چلا گیا تھا احسان صاحب بھی ساتھ ہی نکل گئے تھے۔

غلام احمد دن کو گیارہ بجے واپس آئے سب لوگ ساتھ تھے سوائے اقبال کے لیکن اُس کا کوئی مسئلہ نہیں تھا غلام احمد اُن کا مختصر سامان بھی لے آئے تھے اور اب اُنہیں اپنی مرضی سے واپسی کی اجازت مِل سکتی تھی مہمانوں کا استقبال بڑے اہتمام سے کیا گیا تھا۔ جب ایک دوسرے سے گلے مِلے تھے۔ ثناء خاص طور سے تنویر اور سلطانہ بیگم سے متاثر ہُوئی تھی۔ اختر بھی ابراہیم صاحب سے بڑی گرم جوشی سے مِلا تھا۔

"یہ بچی کون ہے۔؟" ابراہیم صاحب نے ثناء کے بارے میں پُوچھا۔

"احسان صاحب کی بیٹی ہے۔"

"خوب۔ اور وہ شاید بیٹا"

"تقریباً۔ وہ اُن کے دوست کا بیٹا ہے۔"

"اچھے لوگ ہیں۔ لڑکی تو کام بھی کر رہی ہے شادی شدہ ہے؟" ابراہیم صاحب نے پُوچھا۔"

"نہیں تم اُس بچّے کو دیکھ کر کہہ رہے ہو گے۔"

"ہاں بڑی ملتا سے سینے سے لگائے ہُوئے ہے"

"رشتوں کا ڈھیر ہے یہ۔ سب کچھ آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا" غلام احمد نے ہنستے ہُوئے کہا۔

سُلطانہ بیگم کہہ رہی تھیں "شوکت جہاں ساری پُرانی یادیں تازہ ہو گئیں کیا یوں نہیں لگ رہا جیسے ہم... مشرقی پاکستان میں ہوں۔"

"ہاں خدا کرے تمہاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں سُلطانہ مجھے تو اُس وقت خوشی ہو گی۔" شوکت جہاں نے کہا اور سُلطانہ بیگم خاموش ہو گئیں۔

تنویر نے ندرت سے کہا "ندرت باجی یہ ثنا بی بی تو بہت اچھی ہیں اور اُن کا بچّہ بھی۔"

"ہاں۔ اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"اِن کے شوہر کہاں ہیں؟"

"ویت نام کی جنگ میں مارے گئے یہ بیوہ ہیں۔" ندرت نے جواب دیا۔

"ہائے اللہ اتنی سی عمر میں۔؟"

"بیوہ ہونے کے لیے عمر کی قید ضروری نہیں ہے۔ انسان جس عمر میں چاہے بیوہ ہو سکتا ہے۔"

"شوہر ہو سکتا ہے۔"

"دو منٹ میں، اِس میں کیا مشکل ہے۔" ندرت جھنجھلا کر بولی۔

"بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اُس سے پُوچھ لینا۔" ندرت نے کہا۔ ثناء سامنے

آئی تنویر پوچھ بیٹھی۔

"ثنا باجی! مجھے آپ کے شوہر کے بارے میں سُن کر بہت افسوس ہوا۔" ثنا چونک کر تنویر کو دیکھنے لگی۔

"کیا سُنا تم نے میرے شوہر کے بارے میں؟"

"یہی کہ وہ ویت نام کی جنگ میں مارے گئے۔"

"اوہ ہاں حالانکہ میں نے اُن سے کہا تھا کہ عرب اسرائیل جنگ میں مارے جائیں مگر وہ میری سنتے ہی کب تھے۔" ثنا نے افسردگی سے کہا اور تنویر حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ پھر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

دوپہر ہوتی جارہی تھی۔ ساڑھے بارہ بجے ایک قافلہ اندر داخل ہوگیا۔ آگے آگے دادی امّاں تھیں، ساتھ میں ذکیہ بیگم اُن کے پیچھے اختر اور پھر طفیلی خالہ اور عارفہ خالہ سب آنے والے مہمانوں سے ملے اور بہت محبت سے ملے غلام احمد ایک ایک کا تعارف کرا رہے تھے۔ ذکیہ بیگم، سلطانہ بیگم سے بہت محبت سے باتیں کرنے لگیں۔ دادی امّاں نے امّاں جی سے کہا۔

"اِس تکلف کی کیا ضرورت تھی ہم کوئی غیر ہیں؟"

"کون سے تکلف کی؟" امّاں جی نے پوچھا۔

"ہماری دعوت کے تکلف کی۔" بے چاری امّاں جی کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا تاہم انہوں نے بات بناتے ہُوئے کہا۔

"ارے اس میں تکلف کی کیا بات ہے، جو دال دلیہ پکا ہے مِل جُل کر کھایا جائے گا۔" لیکن اُن کے دل کو پنکھے لگ گئے تھے۔ کیا سب لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے کچھ صُورتِ حال کا تو انہیں بھی اندازہ تھا چنانچہ موقع پاتے ہی شوکت جہاں سے کہا۔

"اے شوکت جہاں تم نے دعوت کی ہے سب لوگوں کی۔؟"

"میں نے تو نہیں کی امّاں۔ مگر کھانے کا وقت ہو رہا ہے میں خود پریشان ہُوں یہ لوگ موجود ہیں تو کھانے پر پوچھنا ہی پڑے گا۔"

"وہ کہہ رہی تھیں تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ اب کیا ہوگا غلام احمد سے بات کرو بازار سے کھانا لائیں۔" امّاں جی نے کہا۔

"میں ابھی بات کرتی ہُوں۔" شوکت جہاں نے ہراساں لہجے میں کہا زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ اقبال اور عصمت بھی آگئے لیکن وہ احسان صاحب کے ساتھ تھے۔

احسان صاحب بڑی گرمجوشی سے ابراہیم صاحب سے مِلے۔

"بھئی ابراہیم صاحب! آپ کے دوست بہت بخیل ہیں، آپ کو ایسے چھپا رکھا تھا انہوں نے۔ جیسے کوئی نایاب جوہر چھپائے چھپائے پھرتا ہے۔ ہم کہہ رہے تھے کہ ہمیں بھی ابراہیم صاحب کے نیاز حاصل کرائیے مگر صاحب ایسے دوست بھی کم ہی دیکھنے کو مِلتے ہیں۔ بڑی خوشی ہُوئی آپ سے مل کر ابراہیم صاحب! جب آپ کی غلام احمد سے ملاقات ہُوئی تو یوں لگتا تھا جیسے انہیں کوئی خزانہ مِل گیا ہو۔ بدحواس ہی ہو گئے تھے؟"

"ہماری دوستی اتنی ہی گہری ہے جنابِ عالی۔"

"ایں۔ گویا ہمارا تعارف بھی نہیں کرایا گیا۔ بھائی ہم جنابِ عالی نہیں احسان احمد ہیں۔"

"جی ہاں میں جانتا ہُوں۔"

"تو پھر ہمارے نام کی مٹّی کیوں پلید کی جارہی ہے۔ سیدھے سیدھے ہمیں احسان بھائی کہا جائے۔"

"ہمت نہیں پڑ رہی مگر کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا آپ لوگ فرشتہ صفت ہیں ورنہ اِس دور میں۔" ابراہیم صاحب گلوگیر لہجے میں بولے۔

"کون جانے ابراہیم میاں۔ کون جانے کون فرشتہ ہے فرشتے تو انسانی آنکھ کو نظر نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ خود کو چھپائے رکھتے ہیں۔" احسان احمد بولے اور غلام احمد کی گردن جھک گئی۔

"یہ بچّے آپ کو کہاں سے مِل گئے؟" غلام احمد نے بات بدل کر پوچھا۔

"یونیورسٹی سے آرہے تھے دونوں بس اسٹاپ سے آتے ہُوئے مل گئے۔ ہمیں تو فون کیا گیا تھا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے جلدی کھانا لگواؤ کھانے کے بعد باتیں ہوں گی۔" احسان صاحب نے کہا۔

"بس ابھی۔" غلام احمد بولے اور اندر چلے گئے انہیں خود بھی اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ انتظامات اِس پیمانے پر نہیں کیے گئے ہیں۔ انہوں نے شوکت جہاں کو ایک طرف بُلا کر کہا "کیا ان لوگوں کو بھی دعوت دے دی تھی؟"

"میں نے تو نہیں کہا۔ نہ جانے۔"

"اب کیا ہوگا، کھانا تو شاید۔"

"میں خود پریشان ہُوں۔ کچھ کریں وقت ہوگیا اب سب موجود ہیں۔"

"اِس وقت کیا کروں؟ بازار جانے اور واپس آنے میں بھی وقت لگ جائے گا۔ احسان صاحب کہہ رہے تھے کہ انہیں فون کیا گیا ہے کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے" غلام احمد پریشانی سے بولے۔

"پھپی جان! دسترخوان لگ گیا ہے آجائیے۔" باہر سے ثناء کی آواز سُنائی دی اور شوکت جہاں کا رنگ زرد ہوگیا

"لو دسترخوان بھی لگ گیا۔" وہ باورچی خانے کی طرف بھاگیں۔ لیکن باورچی خانے میں آکر دنگ رہ گئیں۔ کھانا اُن کی نگرانی میں پکا تھا انہوں نے تو چند چیزیں پکائی تھیں مگر باورچی خانے میں دیگچوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ گھر کے کھانے تو تین چار تھے دوسروں کی تعداد بارہ تھی کھانا اتنی تعداد میں تھا کہ دس مہمان اور بھی آتے تو کھا سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر شوکت جہاں کا سانس اُترا۔ مگر عقل چکرائی ہوئی تھی یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ اُسی وقت باورچی خانے کی عقبی کھڑکی سے جمّن کی آواز سُنائی دی۔

"ثناء بی بی یہ شیرمال اور لے لیجیے۔ سب کچھ آگیا نا۔؟" شوکت جہاں چونک پڑیں۔ کھڑکی کے دوسری طرف جمّن کھڑا ہُوا تھا۔ شوکت جہاں نے ہاتھ بڑھا کر شیرمال لئے تو اُس نے انھیں دیکھ لیا۔ جمّن زبان دانتوں میں دبا کر رہ گیا تھا۔

"جمّن یہ۔؟"

"اللہ کے واسطے خالہ جی، ثنا بی بی کو مت بتانا۔ مار مار کر بھُرتہ بنا دیں گی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کھڑی ہیں۔"

"یہ سب تم نے پکایا ہے؟"

"مارے جائیں گے جی۔ اللہ کیا کریں انہوں نے کہا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔" اُس وقت باہر سے ثناء اور ندرت کی آوازیں سُنائی دیں اور جمّن غائب ہوگیا دونوں اندر آگئی تھیں۔ ثناء شوکت جہاں کو دیکھ کر چونک پڑی تھی۔

"تو یہ تمہاری شرارت تھی۔؟" شوکت جہاں نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"تو اور کیا ہمیں کبھی نہیں پوچھا گیا؟" ثناء نے مُنہ پھلاتے ہُوئے کہا۔

"ثناء کی بچّی تو نے ہم سب کو پریشان کر دیا۔ میں خود حیران ہوگئی تھی امّاں۔" ندرت نے کہا۔

"چلو اب کھانا نکلواؤ۔"

ابراہیم صاحب شدّتِ حیرت سے گنگ تھے۔ ایسے بڑے لوگ انہوں نے پوری زندگی میں نہیں دیکھے تھے وہ بے حد متاثر ہُو رہے تھے اور غلام احمد کی تقدیر پر رشک کر رہے تھے حالانکہ جگہ بہت تنگ تھی لیکن سب ایک دوسرے میں گھُسے ہُوئے زمین پر بچھے ہُوئے دسترخوان پر کھانا کھا رہے تھے اور خوش تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد احسان صاحب نے کہا "بھئی اب ہم لوگ ذرا چلیں یہاں ویسے بھی جگہ تنگ ہے۔ آئیے ابراہیم صاحب ہم بھی دوست ہیں دشمن نہیں"

"جی ضرور۔" ابراہیم صاحب بولے۔

"چلو غلام احمد؟" احسان صاحب نے کہا اور غلام احمد بھی ساتھ چل پڑے۔ ابراہیم صاحب کوٹھی کی شان دیکھ کر دنگ تھے یہ عالیشان کوٹھی اور اُس کے مکین ایسے اللہ والے۔

"دوسری طرف ثناء نے سب لوگوں کو درختوں کی چھاؤں میں چائے کی پیشکش کر دی تھی چنانچہ غول بیابانی باغ کی طرف چل پڑا۔ ثناء، ندرت، تنویر، اختر سب باغ میں داخل ہو گئے اقبال اور عصمت ذرا پیچھے رہ گئے تھے۔ دفعتاً ثناء نے انہیں دیکھا اور ٹھٹھک گئی۔

"اللہ رکھی۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"مالک کی بیٹی۔"

"یہ جوڑی دیکھ رہی ہو۔؟"

"کیوں کیا ہُوا؟"

"اچھی لگ رہی ہے نا۔" ثناء بولی۔

"کیا بکواس ہے۔؟"

"دونوں یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں نا۔؟"

"تو پھر۔!" ندرت نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"اچھا کرتے ہیں۔" ثناء نے کہا۔ تنویر بھی پاس ہی کھڑی تھی اور مُسکرا رہی تھی۔ ندرت نے کہا۔

"او پاگل ثناء۔ تنویر کا خیال بھی نہیں تمہیں؛

"تنویر کو ہم نے پسند کر لیا ہے اور اب یہ اپنوں میں سے ہے۔ کیوں تنویر" ثناء نے کہا۔

"آپ اتنی اچھی ہیں ثناء باجی کہ بس کیا کہوں"۔

"دوستوں کے انداز سے اُنہیں چاہیں۔ ہاں تو یہ جوڑی کیسی لگ رہی ہے۔؟"

"بہت اچھی"! تنویر نے ہنستے ہُوئے کہا۔ عصمت اور اقبال نزدیک ہو گئے تھے اس لیے موضوع ختم ہو گیا۔ پھر اختر، اقبال کے ساتھ ایک الگ درخت کے نیچے جا بیٹھا اور لڑکیاں کچھ فاصلے پر۔ اور کوارٹر میں دادی اماں ذکیہ بیگم اور دوسری خواتین بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ذکیہ بیگم نے کہا۔

"سلطانہ بہن اور شوکت جہاں۔ اب رات کا کھانا آپ لوگ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ ہمیں اجازت دیں"۔

"تکلف کی کیا ضرورت ہے ذکیہ بہن"۔ شوکت جہاں بولیں۔

"آپ کو بھی نہیں ہے۔ کیا سمجھیں"۔ ذکیہ بیگم نے ہنستے ہُوئے کہا اور جانے کے لیے اُٹھ گئیں۔ طفیلی بیگم اور عارفہ خالہ بھی باہر نکل آئی تھیں۔ عارفہ خالہ نے کہا۔

"دیکھ رہی ہو طفیلی یہ ہے دُنیا۔ دوست کو دوست کی طرح پہچانتی ہے؟"

"یہی دُنیا ہے عارفہ اب تک ہم دُنیا سے دُور رہے ہیں۔ یہاں دولت نہیں خلوص ہے"۔ طفیلی بیگم بولیں۔

"آئے یہ خلوص سب کے لیے تو نہیں ہوتا"۔

"سب کے لیے ہے عارفہ۔ اِس دل سے سوچو اِس آنکھ سے دیکھو تب یہ نظر آتا ہے"۔

"کیا بات ہے بہت متاثر ہو رہی ہو طفیلی بیگم؟"

"اندھی تھی اب تک اب آنکھ کھلی ہے۔ عارفہ خود کو بدلو خلوص کو پہچانو محبتیں جبھی نہیں جاتیں ان کے لیے ایثار کرنے پڑتے ہیں تب ان کی تخلیق ہوتی ہے میں اب کسی کی بُرائی میں نہیں شامل ہو سکتی۔ خُدا کسی نیکی کے طفیل میرا بچّہ مجھے دیدے میں اب اپنی بُرائیوں سے ہار چکی ہُوں" طفیلی بیگم آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

زدا آگئی اور اُن میں گھل مل گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد عادل حسین اور راشد بھی آ گئے اور لان پر شام کی چائے کا اہتمام ہونے لگا۔

ابراہیم صاحب کو ایک ذرا موقع ملا تو اُنہوں نے رشک بھرے لہجے میں کہا۔ "غلام احمد تم تو واقعی جنت میں زندگی گذار رہے ہو۔ میں تو پاگل ہوا جا رہا ہُوں۔ کوئی تو بُرا نظر آئے یہاں کوئی تو بد اخلاق ہو کسی کے رویے سے تو اظہار ہو کہ یہ بڑے لوگ ہیں اور تم اُن کے ڈرائیور۔ کیسے مل گئے یہ لوگ تمہیں کہاں سے مل گئے؟ ناقابلِ یقین ہیں اس ماحول کے لیے۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ مالک اور نوکر کا رشتہ ہے بھائی ابھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا"۔

"بس ابراہیم خُدا کی دین ہے"۔ غلام احمد بولے اور پھر کہنے لگے۔ "اب تو تم بھی ان کے ساتھی بن گئے ہو اپنے آپ کو الگ کر کے کیوں سوچتے ہو"۔

"یقین کرنے میں دیر لگے گی جو کچھ اس دُنیا میں دیکھا ہے اُسے دیکھتے ہُوئے یہ سب خواب لگتا ہے"۔

رات کے کھانے کا انتظام لان پر ہو رہا تھا۔ کُھلی ہُوا میں ڈنر کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یہ سب ابراہیم صاحب کے اعزاز میں تھا۔ اقبال بھی اِس ماحول سے بہت متاثر تھا اُس نے عصمت سے کہا۔

"تمہارا ماحول بہت خوبصُورت ہے عصمت۔ کیسے نفیس لوگ ہیں یہ"!

"اور میں"۔ عصمت نے مُسکرا کر پوچھا۔

"تم"۔ اقبال گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

شام کی کجلاہٹیں رات کی تاریکی کا رُوپ اختیار کرتی جا رہی تھیں لان پر تیز روشنیاں جل اُٹھی تھیں پھولوں کی مہک ہواؤں کے ساتھ تیر رہی تھی۔ نقرئی قہقہے اُبھر رہے تھے کہ کوٹھی کے گیٹ پر ایک ٹیکسی آ کر رُکی اور اس سے ایک شخص نیچے اُتر آیا اُس کے ہاتھ میں سُوٹ کیس تھا ٹیکسی کا بل ادا کر کے وہ جھجھکتا ہُوا اندر داخل ہو گیا اور دروازے پر کھڑے چوکیدار کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ارے رشید میاں آپ۔ آ گئے آپ"!

رشید نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر چوکیدار کو خاموش کر دیا اور چوکیدار تعجب سے اُسے دیکھنے لگا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے رشید صاحب؟"

"کام سے گیا تھا بابا۔ کیا کوئی تقریب ہو رہی ہے یہاں"

"نہیں رشید میاں۔ سب گھر کے لوگ ہیں۔ کچھ مہمان غلام احمد کے گھر آئے ہیں"۔

"اچھا اچھا، بابا ابھی میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا تمہاری مہربانی ہو گی"۔

"کوئی خاص بات ہے رشید میاں؟"

"ہاں بابا۔ میں چھُپ کر اندر جاؤں گا"۔ رشید نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور چوکیدار بھی کچھ نہ سمجھ کر مُسکرانے لگا۔ رشید مہندی کی باڑھ کی آڑ لے کر اندر کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر وہ اُس جگہ پہنچ گیا جہاں طُفیلی بیگم رہتی تھیں لیکن طُفیلی بیگم بھی اُس وقت لان پر تھیں۔

رشید نے سُوٹ کیس ایک طرف رکھا اور تھکے تھکے سے انداز میں ایک پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا داڑھی بڑھی ہُوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک ایک چیز کو بغور دیکھ رہا تھا دیر تک وہ اِسی طرح بیٹھا رہا پھر باہر نکل آیا اور ایک جگہ چھُپ کر لان کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے جمن اندر کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ اور اُس نے گردن ہلائی۔ اُسے سخت بھُوک لگ رہی تھی۔ جمن اندر داخل ہو گیا تو وہ بھی اندر کی طرف چل پڑا۔ جمن کا رُخ باورچی خانے کی طرف ہی تھا رشید خود بھی باورچی خانے میں داخل ہُوا۔ جمن نے کسی کو محسوس کر کے پلٹ کر دیکھا۔ چند لمحات وہ رشید کو پہچان نہیں سکا تھا پھر اُس نے چونک کر کہا۔

"اوہ رشید بھائی"۔

"سُناؤ جمن کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہُوں رشید بھائی، کہاں چلے گئے تھے؟"

"دَورے پر گیا تھا جمن میاں، کچھ کھلاؤ گے؟"

"بہت کچھ ہے رشید بھائی، نکالوں کھانا"۔

"مہربانی ہو گی۔ کیا باہر لوگ کھا چکے؟"

"ہاں سب فارغ ہو گئے۔ میں کھانے کے لئے آیا تھا"۔

"تب آؤ ساتھ ہی کھانے لیتے ہیں"۔

"ارے نہیں رشید بھائی۔ آپ کھا لیں پھر میں کھاؤں گا۔ میری ماں بھی میرے ساتھ ہی کھاتی ہے"۔

"اوہ اچھا تب مجھے تھوڑا سا کھانا دے دو اور پھر تم چلے جاؤ"۔

"ٹھیک ہے صاحب"۔ جمن نے کہا اور ٹرے میں کھانا سجانے لگا۔

"اور سُناؤ جمن تمہاری ماں ٹھیک ہے؟"

"جی صاحب"۔

"کوٹھی کے کیا حال ہیں؟"

"ٹھیک ہے صاحب"۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے؟" رشید نے غور سے جمن کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ہو گی تو ہمیں کیا معلوم، یہ کھانا"۔ جمن نے کہا اور رشید نے ٹرے اُس کے ہاتھ سے لے لی۔

"جمن میاں! میرے بارے میں ابھی کسی کو مت بتانا۔ میں اچانک سب کے سامنے آؤں گا"۔

"ٹھیک ہے صاحب"۔ جمن نے گردن ہلا دی۔ رشید اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو کر کھانے بیٹھ گیا۔ طفیلی بیگم ابھی تک نہیں آئی تھیں کھانے سے فارغ ہو کر وہ اُن کا انتظار کرنے لگا۔ پھر دروازے پر آہٹ ہُوئی اور وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اندر جو کوئی داخل ہُوا اُسے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ آنے والا ایک چُست لباس میں ملبُوس تھا اور اُس کے چہرے پر نقاب چڑھا ہُوا تھا۔

"کون ہو تم"؟ رشید نے کسی قدر گھبرائے ہوئے انداز میں پُوچھا۔ لیکن جواب میں آنے والے نے ایک ڈبہ سامنے کر کے اُس کی اُوپری ناب دبا دی۔ سبز رنگ کا غبار خارج ہُوا اور رشید کے چہرے سے ٹکرایا اور ایک لمحے میں اُس کے اثرات ظاہر ہو گئے، رشید نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن اُس کے مُنہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اُسے بُری طرح چکر آ گیا تھا۔ پھر اُس نقاب پوش نے ہی آگے بڑھ کر رشید کو گرنے سے بچایا تھا۔ رشید بے ہوش ہو گیا۔ نقاب پوش نے پھرتی سے اُسے اُٹھا کر کندھے پر ڈالا اور کوٹھی کے عقبی حصّے کی طرف چل پڑا۔

تمام لوگ باہر خوش گپیوں میں مصروف تھے نقاب پوش احاطے کی دوسری طرف کُود گیا ایک جگہ ایک جیپ کھڑی ہُوئی تھی۔ اُس نے رشید کو جیپ میں ڈالا اور پھر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ چند لمحات کے بعد اُس نے اپنے چہرے سے نقاب اُتار دی تھی۔

رات گئے تک ہنگامے رہے تھے اور سب ہی لوگ اُن میں شریک رہے تھے یہاں تک کہ طفیلی بیگم اور عارفہ خالہ بھی لان پر ہی رہی تھیں۔ پھر ابراہیم صاحب اور غلام احمد کے اہلِ خاندان کوارٹر کی طرف چل پڑے اور باقی لوگ اندرونی حصّے کی جانب۔ عادل صاحب اُن لوگوں کی اعلیٰ ظرفی پر عش عش کر رہے تھے اُن کے لئے یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا اندر واپس آنے کے بعد بھی اُنھوں نے یہی موضوع نکال لیا۔

"بھئی یہ لوگ مُسلسل مجھے پریشان کر رہے ہیں"۔

"کون لوگ؟" احسان احمد تعجب سے بولے۔

"یہی غلام احمد اور اُن کے اہلِ خاندان"۔

"اوہ، اچھا۔ ہاں وہ واقعی اِس دُنیا کی مخلوق نہیں ہیں"۔

احسان احمد بولے۔

"میں خاص طور سے خواتین پر حیران ہُوں مرد تو خیر بہت کچھ کرلیتے ہیں لیکن خواتین تو کچھ نہ ہوتے ہُوئے بھی خودنمائی کی عادت کا شکار ہوتی ہیں اُن لوگوں کے چہرے پر میں نے ایک شکن بھی نہیں دیکھی۔"

نہ جانے کب تک وہ اِس موضوع پر بات کرتے رہے تھے۔

طفیلی بیگم بھی اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔ اُن میں اب نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اُنھوں نے دُنیا سے جنگ چھوڑ دی تھی۔ صُورتِ حال کو پہچاننے لگی تھیں نمازی ہوگئی تھیں۔ اور ہر نماز کے بعد رشید کے لئے دُعا کرتی تھیں۔ اُس وقت بھی وہ سب کے ساتھ شریک رہی تھیں دل بہل گیا تھا لیکن بستر پر لیٹیں تو رشید پھر یاد آگیا "الٰہی نہ جانے کس حال میں ہوگا؟"

مدہم روشنی میں اُن کی نظر اُس طرف اُٹھ گئی جہاں رشید ہوتا تھا۔ دفعتاً اُنھیں کوئی اجنبی چیز نظر آئی۔ "یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے تعجب سے سوچا۔ پہلے تو یہاں کچھ نہیں تھا۔ اُٹھیں تیز روشنی جلائی تو ایک طرف رکھا سُوٹ کیس صاف نظر آنے لگا ... یہ سُوٹ کیس اُن کا نہیں تھا، بہت عُمدہ اور خوبصُورت سُوٹ کیس تھا کس کا ہے یہاں کہاں سے آیا، قریب سے دیکھا کھولنے کی کوشش کی لیکن کھولنے کا طریقہ ہی سمجھ میں نہیں آیا۔ دِل میں طرح طرح کے وسوسے اُبھرنے لگے۔ آخر یہ یہاں کہاں سے آیا کون رکھ گیا کسی چور کا کام نہ ہو۔ نہ جانے اِس میں ہے کیا؛ ذہن میں عارفہ خالہ آئیں۔ کہیں اُنھوں نے کوئی کام نہ دِکھایا ہو۔ جہاں کا الزام لگا کر کچھ کرانا نہ چاہتی ہوں اُن سے کچھ بعید نہیں تھا سخت پریشانی کا شکار ہوگئیں۔ تھوڑی دیر تک سوچ میں گُم رہیں پھر باہر نکل آئیں۔ کس کو اطلاع دیں اِس کے بارے میں۔ لیکن چاروں طرف بتیاں گُل ہوگئی تھیں سب لوگ سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ اب کیا کروں ...؟ ہو نہ ہو عارفہ خالہ کا کام ہے۔ اے عارفہ! تو آج بھی میرے پیچھے لگی ہُوئی ہے اب رہ کیا گیا ہے لُٹ تو گئی برباد تو ہوگئی میں۔ اب کیا کرے گی میرے ساتھ!

صبر نہ ہوسکا عارفہ خالہ کے دروازے پر پہنچ کر دروازہ بجایا اور اندر سے آواز اُبھری۔

"کون ہے؟"

"میں ہُوں۔ عارفہ دروازہ کھولو۔"

"کون طفیلی آپا؟"

"ہاں۔ میں ہی ہُوں بہن، دروازہ کھولو" طفیلی بیگم نے کہا اور چند لمحات کے بعد عارفہ بیگم نے دروازہ کھول دیا۔ اندر ناصر علی بھی موجود تھے۔ عارفہ بیگم نے حیرت زدہ نگاہوں سے طفیلی بیگم کا چہرہ دیکھتے ہُوئے کہا۔

"کیا بات ہے طفیلی، خیر تو ہے؟ کیا ہوگیا؟"

"عارفہ! ذرا دو منٹ کے لئے میرے ساتھ آؤ گی۔ بس دو منٹ کے لئے میری بہن" طفیلی بیگم نے لجاجت سے کہا۔

"کہاں چلنا ہے؟"

"بس ذرا میرے کمرے تک۔ آؤ تمھیں میری قسم" طفیلی بیگم بولیں اور عارفہ بیگم نے اندر ناصر علی کی طرف رُخ کرکے کچھ کہا۔ اُس کے بعد طفیلی بیگم کے ساتھ باہر آگئیں۔

"ہُوا کیا طفیلی؟ کچھ بتاؤ تو، تمھارا انداز ایسا ہے کہ میرا دِل ہول رہا ہے۔ کیا بات ہوگئی آخر؟"

"آؤ عارفہ آؤ۔ میں ایک چیز دکھانا چاہتی ہُوں تمھیں" طفیلی بیگم بولیں اور عارفہ بیگم اُن کے ساتھ اندر داخل ہوگئیں۔ اُن کا چہرہ بھی ہونق ہورہا تھا۔ طفیلی بیگم نے سُوٹ کیس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"یہ کیا ہے عارفہ مجھے بتاؤ یہ کیا ہے؟"

"یہ؟" عارفہ بیگم سُوٹ کیس کے قریب پہنچ کر بولیں۔

"سُوٹ کیس ہے۔ نیا ہے خوبصُورت ہے۔"

"یہاں کیسے آیا؟" طفیلی بیگم نے پُچھتے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا طفیلی بیگم؟"

"یہ میرا سُوٹ کیس نہیں ہے جب میں یہاں سے گئی تھی۔ تب بھی میرے کمرے میں نہیں تھا۔ اب یہ یہاں کہاں سے آگیا؟"

"تو مجھ سے کیوں پُوچھ رہی ہو بُوا؟ میں کیا جانوں ...؟" عارفہ بیگم کو اب طفیلی بیگم کے انداز سے کچھ کچھ احساس ہورہا تھا۔

"میرا مطلب ہے عارفہ یہ تمھارا تو نہیں ہے؟"

"لو میرا کہاں سے آگیا۔ میرے پاس ایسے سُوٹ کیس کہاں ہیں بھلا۔"

"پتہ نہیں کون رکھ گیا ہے اِسے؟ کیا ہے اِس میں؟"

"مگر بُوا کوئی رکھ گیا ہو تمھارے کمرے میں تو مجھے کیا معلوم؟ یہ تو تمھیں خود اندازہ ہونا چاہئے۔ مجھے سوتے سے کیوں جگایا؟" عارفہ بیگم نے کہا اور طفیلی بیگم بے بسی کی نگاہوں سے اُنھیں دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

"نہیں عارفہ، میرا مطلب تو یہ تھا کہ تم سے ذرا مشورہ

لے لُوں۔ پتہ نہیں کیا چیز ہو اِس میں؛ ہوسکتا ہے مال و اسباب ہو دولت ہو اور کوئی اُسے یہاں چھوڑ گیا ہو مجھے بتاؤ۔ میں اِس دولت کا کیا کروں گی؟"

"دولت؟" عارفہ بیگم کی آنکھیں عجیب سے انداز میں سکڑ گئیں پھر اُنھوں نے کہا "ہوسکتا ہے۔ ہو بھی سکتا ہے۔ مم۔ مگر آخر یہ سُوٹ کیس یہاں لایا کون؟ دیکھو تو سہی کتنا خوبصورت ہے کہیں باہر کا معلوم ہوتا ہے۔"

"عارفہ! کیا میں اِسے تمھارے کمرے میں پہنچا دُوں؟"

"مم ... میرے کمرے میں، مم ... مگر کیوں؟"

"اگر تم چاہو تو ایسا کرلو۔ تم رکھ لو اِسے۔ صبح کو دیکھیں گے کہ کیا ہے اِس میں؟"

عارفہ بیگم کسی سوچ میں ڈُوب گئیں پھر آہستہ سے بولیں۔ "تمھاری مرضی ہے اگر تم چاہتی ہو تو میرے پاس پہنچا دو۔ میں احتیاط سے رکھ لُوں گی تمھاری امانت سمجھ کر۔"

"میں یہی چاہتی ہُوں عارفہ" طفیلی بیگم نے کہا۔ اور عارفہ بیگم خوشی سے تیار ہوگئیں۔ بس یہ خیال اُن کے ذہن میں گھر کر گیا تھا کہ اِس سُوٹ کیس میں کوئی بڑی دولت پوشیدہ نہ ہو۔

طفیلی بیگم یہ اندازہ لگانا چاہتی تھیں کہ کہیں عارفہ بیگم اِس سُوٹ کیس کے ذریعے پھر اُنھیں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کررہیں۔ اگر وہ اِسے اپنے کمرے میں رکھنے پر تیار ہوجاتی ہیں تو اِس کا مطلب ہے یہ کام عارفہ بیگم نے نہیں کیا۔ بس اِسی آزمائش کے لئے اُنھوں نے یہ سُوٹ کیس عارفہ بیگم کے کمرے میں پہنچانے کی پیش کش کردی تھی۔ عارفہ خوشی سے تیار ہوگئی تھیں۔ سُوٹ کیس دونوں خواتین گھسیٹتی ہُوئی لائیں۔ اور اُسے عارفہ بیگم کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ناصر علی حیران بیٹھے ہُوئے تھے۔ سُوٹ کیس دیکھ کر وہ تعجب سے بولے۔

"کیا ہے اِس میں؟ کس کا سُوٹ کیس ہے یہ؟ کیا ہوگیا طفیلی آپا؟"

"کچھ نہیں ناصر علی بھیا، بس ذرا یہ تھوڑا سا سامان عارفہ کے پاس رکھوانا ہے۔"

"اوہ! اِس وقت، چلئے ٹھیک ہے۔ اور کوئی خدمت؟" ناصر علی نے پُوچھا اور طفیلی بیگم نے شکریہ کے انداز میں گردن ہلائی پھر وہ وہاں سے واپس پلٹ پڑیں۔ سوچ رہی تھیں عارفہ نے آسانی سے اِس سُوٹ کیس کو قبول کرلیا ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ اِس میں عارفہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ لیکن بات پھر بھی انتہائی حیرت کی تھی۔ آخر سُوٹ کیس یہاں کیسے آیا؟

دوسری طرف عارفہ خالہ نے جلدی سے دروازہ بند کردیا تھا۔ ناصر علی سخت نگاہوں سے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ عارفہ خالہ کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کسی معاملے میں عقل سے کام لینا نہیں جانتی۔ بس زبان ہی زبان ہے۔ طفیلی بیگم کے جانے کے بعد جب عارفہ خالہ نے دروازہ بند کیا اور ناصر علی کی طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ تو ناصر علی نے غرّاتے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"آخر ہے کیا اِس سُوٹ کیس میں؟"

"ناصر علی! دولت ہے دولت۔ جلدی کرو کھول کر دیکھو اِس میں ہے کیا؟"

"مجھے تمھارے پاگل پن پر پہلے بھی کوئی شک نہیں تھا۔ عارفہ لیکن اب یُوں لگ رہا ہے جیسے تم دیوانگی کے آخری اسٹیج میں داخل ہورہی ہو۔"

"اُو نہہ! ہمیشہ مجھے کچھ نہ کچھ کہنے ہی میں تمھیں سکون ملتا ہے۔ میں کہتی ہُوں ذرا کھولو تو اِس سُوٹ کیس کو، پتہ تو چلے کہ اِس میں ہے کیا؟"

ناصر علی سُوٹ کیس کے قریب پہنچ گئے۔ اُنھوں نے اُس کے لاک کو دیکھا۔ نمبروں سے کُھلنے والا تالا تھا۔ کافی دیر تک وہ اِس میں کوشش کرتے رہے لیکن نمبر نہیں معلوم تھے اِس لئے تالا کُھلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا تب اُنھوں نے عارفہ خالہ سے کہا۔

"اِسے کھولنے کا نمبر کیا ہے؟"

"کیسا نمبر؟"

"یہ نمبروں والا تالا ہے۔"

"تو پھر توڑ دو اِسے۔"

"دماغ خراب ہے تمھارا اِتنا اعلیٰ قسم کا سُوٹ کیس ضائع کردیا جائے۔ میں کہتا ہُوں طفیلی بیگم نے اِسے ہمارے ہاں رکھوایا کیوں ہے؟ کس کا ہے اور کیا ہے اِس میں؟"

"یہ طفیلی بیگم کو اچانک ہی اپنے کمرے میں نظر آیا تھا۔ وہ گھبرا گئیں اور مجھ سے مشورہ لینے چلی آئیں۔ کہنے لگیں سُوٹ کیس اُن کا نہیں ہے بلکہ اُن کے کمرے میں پایا گیا ہے۔ چنانچہ میں اِسے اپنے کمرے میں رکھ لوں۔"

"ہم کیوں رکھ لیں ؟" ناصر علی بُری طرح اُچھل پڑے۔

"کیوں کیا اگر اس میں کچھ ہے تو بھلا طفیلی بیگم کیسے کہہ سکیں گی کہ اُنھوں نے کوئی سُوٹ کیس ہمارے حوالے کیا تھا زبان بند نہ کر دیں گے اُن کی۔"

"عارفہ... عارفہ پاگل ہو گئی ہو تم۔ بالکل ہی تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آج کل کے حالات کا اندازہ ہے تمھیں کچھ ؟"

"کیسے حالات ؟"

"ایسے سُوٹ کیسوں میں ٹائم بم بھی رکھے ہوتے ہیں..." ناصر علی نے کہا اور عارفہ خالہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیا ؟"

"ہاں سُنا نہیں تم نے آج کل بموں کے جو دھماکے ہو رہے ہیں وہ کس انداز میں کئے جا رہے ہیں ؟" ناصر علی نے کہا۔ اور عارفہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئیں۔

"اے میرے مولا! اب کیا ہوگا ؟ ناصر علی پھینک دو اسے باہر... بچاؤ اسے کہیں پھٹ ہی نہ جائے" عارفہ خالہ کا دم نکل گیا تھا۔ ناصر علی غصیلی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے پھر بولے۔

"لیکن تم نے اِسے یہاں لانا قبول ہی کیوں کیا تھا ؟"

"اے ناصر علی! پہلے اِس سے پیچھا تو چھڑاؤ۔ اُس کے بعد سوچنا کہ کیا ہُوا ؟ کیا نہ ہُوا ؟"

"بکواس مت کرو۔ رکھا رہنے دو اِسے یہیں پر۔ اگر اِس میں بم وغیرہ بھی ہے تو اچھا ہے پھٹ جائے، تم اپنے لالچ سمیت فنا ہو جاؤ گی۔"

"تمھیں خُدا کا واسطہ، کیوں میرا دل بند کئے دے رہے ہو اے۔ گر بم پھٹے گا تو کیا چیتھڑے نہ اُڑ جائیں گے ہمارے ؟"

"تم اِسی قابل ہو عارفہ! لالچی انسان کے لئے یہی سزا ہونی چاہیئے جاؤ اِسے خود ہی لے کر جاؤ اور طفیلی کو واپس کر کے آؤ۔"

"اور اگر راستے میں پھٹ گیا تو ؟"

"اور اچھی بات ہوگی۔ کم از کم میری جان تو بچ جائے گی۔"

"اے ناصر علی تمھیں خُدا کا واسطہ اِس بار میری مدد کر دو، تمھیں... کوئی ایسا کام نہیں کروں گی۔"

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں اسے یہیں رکھے رہنا چاہیئے۔ صبح ہی کو اس کے بارے میں فیصلہ ہوگا۔"

"اور اگر صبح تک ہمارا فیصلہ ہو گیا تو...؟"

"اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بم کوٹھی کے کسی بھی حصے میں رکھا جائے ظاہر ہے اِتنے بڑے سُوٹ کیس میں کوئی معمولی بم تو ہوگا نہیں پوری کوٹھی ہی تباہ ہو جائے گی۔ کیا ہم گھر سے نکل کر بھاگ سکتے ہیں رات کے اِس وقت ؟"

عارفہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ دہشت زدہ آنکھیں سُوٹ کیس پر لگی رہیں۔ ناصر علی مسہری پر لیٹ گئے تھے اُلجھے ہُوئے وہ بھی تھے کہ آخر یہ سُوٹ کیس اچانک طفیلی بیگم کے کمرے میں کہاں سے آ گیا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بہر طور طے یہی کیا تھا اُنھوں نے کہ صبح کو اِس سلسلے میں احسان صاحب کو تفصیلات بتائیں گے اور دوسرے لوگوں سے پُوچھیں گے کہ یہ سُوٹ کیس کس کا ہے ؟ کہاں سے آیا ؟

وہ خود تو گہری نیند سو گئے لیکن عارفہ خالہ ساری رات پلنگ پر بیٹھی دہشت زدہ نگاہوں سے سُوٹ کیس کو دیکھتی رہی تھیں کبھی جھونک آتی تو آنکھیں بند ہو جاتیں اور اِس کے بعد اچانک کانوں میں دھماکوں کی آواز سُنائی دیتی اور وہ دہشت سے آنکھیں کھول دیتیں۔ اِسی طرح صبح ہو گئی۔ ناصر علی جاگے تو اُنھوں نے عارفہ بیگم کا چہرہ دیکھا اور بے اختیار مُسکرا پڑے۔

"واقعی تمھیں اِس سے اچھی سزا اور کوئی نہیں مِل سکتی ہے۔ میرا خیال ہے آئندہ احتیاط کرو گی۔ اب اُٹھو منہ ہاتھ وغیرہ دھو۔ میں احسان صاحب کے پاس جاتا ہُوں۔" ناصر علی پُوری سنجیدگی سے احسان صاحب کے پاس پہنچے اور اُنھوں نے اُس سُوٹ کیس کا واقعہ اُنھیں سُنا دیا۔

"طفیلی بیگم کے کمرے میں ؟ کھول کر نہیں دیکھا کہ اِس میں کیا ہے ؟" احسان احمد نے پُوچھا۔

"نہیں، بس طفیلی بیگم اُسے ہمارے کمرے میں پہنچا گئیں۔ آپ جانتے ہیں کہ عارفہ کتنی احمق ہیں۔ رات کا وقت تھا اِس لئے میں نے آپ کو اطلاع نہیں دی۔ میرا خیال ہے اِس کا جائزہ لے لیا جائے کہ اِس میں ہے کیا ؟"

"چلو، چلو بھئی واقعی کوئی خطرناک چیز بھی ہو سکتی ہے۔"

"نمبروں والا تالا ہے۔ ورنہ میں اُسے کھول کر دیکھ لیتا۔"

احسان احمد باہر نِکلے تو اختر نظر آ گیا۔ چنانچہ اُنھوں نے اُسے بھی ساتھ لیا۔ ساری صورتِ حال اُنھوں نے راستے میں اختر کو بتا دی تھی اور اختر بھی حیرانی سے اُس سُوٹ کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

سُوٹ کیس دیکھا گیا نمبروں سے کُھلنے والے تالے کو آسانی سے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ اِس لئے چوکیدار کو طلب کیا گیا تاکہ اوزار لے کر تالا توڑ دے۔ سُوٹ کیس کا واقعہ کافی مشہور ہو گیا تھا چنانچہ سبھی اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ ثناء تیمور کو گود میں لئے ہُوئے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی

چوکیدار اوزار لے کر آ گیا۔ لیکن سُوٹ کیس دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"صاحب سُوٹ کیس تو رشید بھائی کا ہے۔ رشید بھائی کے ہاتھ میں تھا۔"

"کیا ؟" احسان احمد نے چونک کر چوکیدار کو دیکھا۔

"میں پہچانتا ہُوں صاحب رشید بھائی ہی یہ سُوٹ کیس لے کر رات کو آئے تھے۔"

"رشید آیا تھا ؟" احسان صاحب نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"جی صاحب اُس وقت جب سب لوگ لان پر موجود تھے۔ رشید بھائی ٹیکسی سے اُترے تھے اور ٹیکسی کا بِل دے کر اندر داخل ہُوئے تھے پھر اُنھوں نے مجھے منع کیا کہ کسی کو اُن کی آمد کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ اور اِس کے بعد اندر چلے گئے تھے۔"

احسان احمد نے طفیلی بیگم کا چہرہ دیکھا۔ طفیلی بیگم کے پورے بدن کا خُون چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ وہ کپکپاتے ہونٹوں سے آہستہ سے بولیں۔

"رشید آیا تھا ؟ مگر... کہاں گیا وہ ؟ کہاں ہے میرا رشید ؟ کہاں ہے رشید، بتاؤ تو سہی کہاں چلا گیا وہ ؟ اے رشید... او رشید کہاں چھُپا ہُوا ہے تو ؟ پگلے کہیں کے باہر نِکل آ۔ کوئی خطرہ نہیں ہے تجھے۔" طفیلی بیگم رشید کو آوازیں دیتی پھریں۔

احسان احمد صاحب عجیب سے انداز میں اُنھیں دیکھ رہے تھے باقی لوگوں کو چونکہ صورتِ حال کا صحیح طرح اندازہ نہیں تھا اِس لئے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ویسے سبھی جمع ہو گئے تھے اِن میں ابراہیم صاحب بھی تھے۔ غلام احمد بھی، غلام احمد البتہ رشید کے بارے میں تفصیل جانتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے کسی قدر ہٹ کر احسان صاحب سے کہا۔

"اِس بات کے امکانات ہو سکتے ہیں احسان صاحب کہ رشید واپس آ گیا ہو۔"

"مگر وہ کہاں چلا گیا ؟"

"ہو سکتا ہے آپ کے سامنے نہ آنا چاہتا ہو۔ کوٹھی ہی میں موجود ہو۔"

"اُسے میرے سامنے آنا چاہیئے۔ کیا پاگل پن ہے۔ یہ میری کوٹھی ہے یا چڑیا گھر۔ لوگوں نے نہ جانے کیا کیا تماشہ بنا رکھا ہے یہاں۔" احسان صاحب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو گئے تھے۔

طفیلی بیگم کوٹھی کے ایک ایک گوشے میں رشید کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔ پھر جمن بھی اُن کے پاس پہنچ گیا جمن نے آہستہ سے کہا۔

"رشید بھائی مجھے بھی تو ملے تھے کھانا کھایا تھا اُنھوں نے مجھ سے لے کر۔"

"ایں! اِدھر آؤ اِدھر آؤ۔" احسان صاحب نے جمن کو اپنے قریب بُلایا اور جمن اُن کے سامنے پہنچ گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو ؟"

"جی صاحب سب لوگوں کو کھانا کھلانے کے بعد میں باورچی خانے میں واپس آیا تھا اور میں خود کھانا کھانے لگا تھا کہ... رشید بھائی اندر پہنچ گئے اور اُنھوں نے مجھ سے کھانا مانگا کہنے لگے بھُوک لگ رہی ہے پھر اُنھوں نے مجھ سے کھانا لے کر کھایا تھا۔"

"مگر اُس کے بعد کہاں گیا ؟"

"اللہ ہی جانے، خُدا ہی جانے۔" نُدرت نے آہستہ سے نِدا کے کان میں کہا۔

"میں سمجھ گئی۔"

"کیا ؟"

"وہ رشید نہیں، رشید کی رُوح تھی یقیناً وہ بے چارہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔ تمھیں معلوم ہے کہ رُوحیں اپنے گھروں میں واپس آتی ہیں۔"

"اور ساتھ میں سُوٹ کیس بھی لاتی ہیں ؟" نِدا نے ہونٹ بھینچتے ہُوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اِس سُوٹ کیس کو ہی کھول کر دیکھ لیا جائے ہو سکتا ہے اِس میں رُوح کا کوئی پیغام ہو۔" نُدرت نے کہا۔

"نُدرت خُدا تمھیں سمجھے، طفیلی بیگم رشید کی ماں ہیں ایسی بات اُن کے سامنے کہی تو اُن کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ خبردار تُو نے بدتمیزی کی کوئی بات اُن کے سامنے نکالی۔"

رشید کا مسئلہ پُوری طرح ایک مسئلہ بن گیا تھا احسان صاحب نے سُوٹ کیس اپنے کمرے میں منگوا لیا۔ عادل صاحب بھی تھے۔ احسان صاحب کہنے لگے۔

"رشید کا اِس طرح پُراسرار طریقے سے آنا اور اِس کے بعد گُم ہو جانا سنسنی خیز ہے۔ فوری طور پر اِس سُوٹ کیس کو توڑ کر

دیکھا جائے کہ اس میں ہے کیا؟

چنانچہ اوزاروں کی مدد سے سوٹ کیس کو توڑا گیا اور اُسے کھول کر دیکھا گیا۔ اُس میں چند جوڑے کپڑے، شیو بنانے کا سامان اور ایسی ہی دوسری چیزیں تھیں۔ اِن کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس کی تمام جیبیں وغیرہ ٹٹول لی گئیں۔ لیکن سوٹ کیس میں اور کچھ نہیں ملا۔ اِس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ سوٹ کیس رشید ہی کا ہے، اور وہ واپس آ گیا ہے۔ لیکن واپس آنے کے بعد وہ کہاں گم ہو گیا یہ بات معمہ بنی ہوئی تھی۔ دو پہر تک اِس سلسلے میں ہنگامہ آرائی رہی اور اِس کے بعد مجبوری ہو گئی۔ کوئی اِس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا البتہ طفیلی بیگم کے آنسو روکے نہیں رک رہے تھے وہ ایک ایک گوشے میں پکارتی پھر رہی تھیں۔

"ارے میرے بیٹے میرے سامنے تو آجا۔ مجھ سے کیا خطرہ ہے تجھے؟ آ تو سہی دیکھتی ہوں کون تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ آجا میرے بچے۔ رشید میرے لال!"

❦

بہت سے واقعات ہوئے تھے۔ بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات معمول پر آتے گئے اور اب پھر کوٹھی میں خوشگوار قہقہے گونجنے لگے تھے۔ البتہ وہ پہلے جیسی رونق نہیں تھی۔ پہلے کی رونق میں ایک اعتماد تھا ایک نُدرت تھی۔ ایک وقار تھا لیکن اب احسان احمد صاحب ہی ذہنی طور پر آزردہ تھے اور اِس احساس کو کسی طرح ذہن سے نہیں نکال سکتے تھے کہ اُس وقت وہ غلام احمد صاحب کے مہمان کی حیثیت سے رہ رہے ہیں یا اگر مہمان نہ سہی تو کم از کم اُن کے احسان مند ہیں۔ اُن میں وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی تاہم عادل حسین کے آجانے سے اختر اور خالد کے آجانے کی وجہ سے وہ کافی حد تک مطمئن ہو گئے تھے اور پھر چونکہ حالات کاروباری طور پر بھی بہتر ہوتے جا رہے تھے اِس لئے احسان احمد صاحب نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

البتہ رشید کی آمد نے ایک بار پھر کوٹھی کی فضا کو مکدر کر دیا تھا۔ اپنے طور پر سبھی اِس بارے میں سوچ رہے تھے اور احسان احمد صاحب بھی چند جگہوں پر ٹیلیفون کر کے رشید ہی کے سلسلے میں کوئی کارروائی کر رہے تھے۔ حیرت کی بات صرف یہ تھی کہ اگر رشید کوٹھی میں آیا تھا تو یہ سوٹ کیس یہاں چھوڑ کر پُر اسرار طریقے سے غائب کیوں ہو گیا؟ اِس کا مقصد کیا تھا۔

ابراہیم صاحب بے چارے کیونکہ حالات سے ناواقف تھے اِس لئے اُنھوں نے بذاتِ خود اِس گھریلو معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی البتہ غلام احمد صاحب سے اُنھوں نے یہ بات پوچھی ضرور تھی کہ رشید کون ہے؟ اور مختصراً غلام احمد نے اُنھیں رشید کے بارے میں بتا دیا تھا۔ شام کو ابراہیم صاحب نے غلام احمد سے گھر جانے کی اجازت مانگی تو غلام احمد کہنے لگے۔

"جلدی کیا ہے ابراہیم، چلے جانا۔ ویسے بھی میرا خیال ہے احسان احمد سے بات کئے بغیر تمہیں نہیں جانا چاہیئے۔"

"یار دل کس کمبخت کا چاہ رہا ہے جانے کے لئے۔ اِس جنت کو چھوڑ کر۔ لیکن جانا تو پڑے گا ہی میرے بھائی، آج نہ سہی کل۔ واقعی یار کمال ہے تمہاری قسمت بہت اچھی ہے۔ غلام احمد کہ اِتنے اچھے لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑ گیا۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا خیال ہے چلیں۔ ویسے بھی سارے معاملات ذرا اُلجھ جائیں گے۔ بچوں کے معمولات میں بھی فرق آئے گا۔ آتے جاتے تو رہیں گے ہی۔"

"پھر احسان صاحب سے بات کر لو اگر وہ اجازت دے دیتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔"

ابراہیم صاحب نے گردن ہلا دی۔ غلام احمد صاحب خود ہی ابراہیم صاحب کو ساتھ لے کر احسان احمد کے پاس پہنچے تھے۔

احسان احمد اُس وقت بھی اپنے کمرے میں غور و خوض میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ عادل حسین شاید اپنی خواب گاہ میں تھے۔ اِن دونوں کو دیکھ کر پُرتپاک انداز میں کھڑے ہو گئے۔

"آیئے... آیئے، ابراہیم صاحب دراصل ایک بالکل ہی ذاتی سا مسئلہ اُلجھ گیا ہے جس کی وجہ سے تھوڑی سی مصروفیت ہو گئی ورنہ آج کا دن تو آپ کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔"

"ابراہیم واپس جانا چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" احسان احمد صاحب چونک کر بولے۔

"جی واپسی تو ہونی ہی ہے میں غلام احمد بھائی سے یہی کہہ رہا تھا کہ کیوں نہ اب چلوں۔"

"بھئی کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہو تو ہمیں بتا دیں آپ، ورنہ اِس طرح گھر چھوڑ کر بھاگنا کیا معنی رکھتا ہے۔"

"کیسی بات احسان احمد صاحب؟" ابراہیم صاحب چونک کر بولے۔

"میرا مطلب ہے کوئی تکلیف ہو رہی ہو آپ کو، آئے ہیں۔ رہیں یہاں دس بارہ پندرہ دن۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں آپ سے۔ ابھی تو ہماری آپ کی کوئی پرائیویٹ ملاقات ہوئی بھی نہیں۔ غلام احمد ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چھوڑ رہے حالانکہ ہم تنہائی میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں جب آپ حکم دیں گے حاضر ہو جاؤں گا احسان صاحب بھلا اب تکلف کی کیا گنجائش ہے؟"

"تو حاضر ہی رہیئے غائب ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ بچوں کے معمولات یہاں سے بھی جاری رہ سکتے ہیں۔ بیٹی ہے آپ کی وہ تو ہے ہی گھر میں۔ اقبال میاں کا یونیورسٹی جانے کا مسئلہ ہے تو عصمت بیٹی یہاں سے جاتی ہی ہے۔ ساتھ نکل جایا کریں گے دونوں۔ نہیں بھئی میری طرف سے قطعی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو اگر غلام احمد کے کوارٹر میں کوئی تکلیف ہو رہی ہے تو اندر تشریف لے آیئے۔ بلا وجہ کا تکلف لاد رکھا ہے آپ لوگوں نے اپنی ذات پر۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"دیکھو میاں کچھ ٹھیک نہیں ہے بس ابھی جانے کا نام نہیں لیا جائے۔ یہی ہمارا حکم ہے۔" احسان احمد نے اِس طرح کہا کہ اِس کے بعد ابراہیم صاحب کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔ ویسے بھی تیاریاں کر کے آئے تھے۔ لیکن اخلاقاً جانے کا اظہار کرنا تو ضروری تھا۔ اب یہ تو کوئی مناسب بات نہیں کہ اچھی جگہ دیکھی تو پڑ گئے۔ بہر طور احسان احمد صاحب نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ ویسے تنویر، نُدرت اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ابراہیم صاحب نے جانے کی اجازت طلب کی ہے۔ اور وہ اِس وقت فیصلے کی منتظر تھیں۔ فیصلہ اُن کے کانوں تک پہنچ گیا اور سبھی خوش ہو گئے۔ تنویر تو یہاں آ کر بہت زیادہ مسرور ہو گئی تھی وہ بے چاری حالات کے تحت دبی دبی تھی لیکن بہر طور کسی نے اُسے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ نُدرت، عصمت، ثناء اور رُدا سبھی اُسے اپنے ساتھ لگائے رہی تھیں اور تنویر کو یہ محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ اُن لوگوں سے ابھی ابھی شناسائی ہوئی ہے۔ اختر اور خالد کو اب چونکہ سارے معاملات معلوم ہو چکے تھے۔ یہ پتہ بھی چل چکا تھا کہ رشید شہاب صاحب کا آلۂ کار بن گیا تھا اور ہانگ کانگ میں گرفتار ہو گیا تھا اور وہیں قید تھا۔ اِس کا اِس طرح اچانک آجانا سبھی کے لئے تعجب خیز تھا بزرگ تو خیر اِس مسئلے میں جو کچھ کر ہی رہے تھے لیکن رشید اُن لوگوں کا بھی موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔ خالد کہنے لگا۔

"رشید کا اِس طرح یہاں آنا واقعی پُر اسرار ہے۔ وہ اب کہیں کسی اور چکر میں نہ آیا ہو۔ ویسے کوٹھی کا چپہ چپہ چھان مارا گیا ہے اگر کہیں پوشیدہ ہوتا تو برآمد ہو جاتا۔"

"رشید نہ ہوا کوئی سوئی ہو گئی۔ اچھا خاصا لمبا چوڑا آدمی تھا۔" ثناء نے کہا۔

"اے ثناء کیسے اُس کے بارے میں بات کر رہی ہو تمہارا تو اُس سے دُوہرا دُوہرا رشتہ ہے۔"

"کون سا دُوہرا رشتہ ہے؟" ثناء نے نُدرت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"شروع ہو گئی اِن دونوں میں۔ میں کہتی ہوں تم دونوں کبھی سکون سے بھی بیٹھی رہا کرو۔" عصمت بولی۔

"کیوں رُدا میں نے غلط کہا؟ کیا یہ بات تمہارے علم میں نہیں ہے؟" نُدرت نے رُدا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری کسی بدتمیزی میں شریک نہیں ہو سکتی۔ بھلا کاہے کا دُوہرا رشتہ؟ فضول کی بات ہے۔" رُدا نے کہا۔

"دیکھو کیسی دُنیا ہو گئی ہے یہ، ذرا سی دیر میں لوگوں کے دیدوں کا پانی ڈھل جاتا ہے اور آنکھیں پھیر لیتے ہیں کل کی ہی تو بات ہے کہ بے چارے رشید بھائی کو سب لوگ رشید بھائی رشید بھائی کہہ کر مخاطب کر رہے تھے، ویسے رُدا صاحبہ کا معاملہ ذرا مختلف تھا کیونکہ سُنا ہے... سُنا ہے۔"

"بکواس کرنے کی عادت ختم کر دو نُدرت ورنہ میں بھی تمہارے اُس افسانے کا تذکرہ کر دوں گی جو تم نے کسی رسالے میں چھپنے کے لئے بھیجا تھا۔" رُدا نے کہا اور نُدرت بُری طرح گڑبڑا گئی۔

"کک... کون سا افسانہ؟ خواہ مخواہ من گھڑت گھڑ رہی ہو۔"

"تو پھر خاموش کیوں نہیں رہتیں۔ تم پر بھی تو الزامات لگائے جا سکتے ہیں۔" رُدا مسکرا کر بولی۔ لیکن ثناء کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے کبھی رُدا اور کبھی نُدرت کو دیکھ رہی تھی لیکن اُس نے اِس سلسلے میں کچھ کہا نہیں کسی سے۔

یہ خوش گپیاں بہت دیر تک جاری رہیں اور اِس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔ کسی کام سے لڑکیوں کو آواز دے لی گئی تھی لیکن ثناء نے رُدا کے الفاظ کو نظر انداز نہیں کر

سکتی تھی۔ وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی اور پھر جب سب لوگ اپنے اپنے راستے پر چلے گئے تو ثناء نے اختر کو جالیا۔

"اختر صاحب" اُس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ اور اختر بُری طرح خوفزدہ ہوکر ثناء کو دیکھنے لگا۔

"آپ نے۔۔۔آپ نے مجھ ناچیز کو یاد کیا؟"

"تم ناچیز تو نہیں ہو، بہت بڑی چیز ہو۔ آؤ ذرا میرے ساتھ" ثناء نے کہا۔

"جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو"

"اتنی آسانی سے بلائیں نہیں ٹلتیں اختر میاں ذرا اِدھر تشریف لے آیئے اِس گوشے میں"

"گ گ۔۔۔گوشے میں، ایک منٹ۔ ایک منٹ ذرا خالد بھائی کو بُلالوں"

"آجاؤ شرافت سے ورنہ سمجھ لو"

"کمال ہے آپ تو ذہنی طور پر بالکل پولیس افسر ہیں۔ اِس طرح سے احکامات دیتی ہیں کہ آدمی کا دِل لرز جائے"

"آجاؤ بھئی بور مت کرو۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں" ثناء نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ لہجہ قابلِ برداشت ہے" اختر ثناء کے ساتھ اُس گوشے میں چلا گیا۔

"بیٹھو پلیز۔۔۔بیٹھ جاؤ" ثناء بولی اور اختر اٹین شن ہوکر بیٹھ گیا۔

"کیوں نہ ہم لوگ آپس میں دوستی کرلیں اختر" ثناء بولی اور اختر بنچ سے گرتے گرتے بچا۔

"اداکاری مت کرو، میں تمھیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں"

"دوستی تو ہماری ہے۔ اب آپ کون سی دوستی کا تذکرہ کررہی ہیں محترمہ"

"اُس دوستی کا جو عام دوستیوں سے ہٹ کر کی جاتی ہے"

"میرا خیال ہے کہ اِس سلسلے میں جملہ حقوق محفوظ ہیں" اختر نے کہا۔

"عشق کی بات نہیں کررہی بے وقوف آدمی میں عشق وِشق نہیں کرتی کسی سے بھی مجھے اِس چکر میں کبھی نہیں پڑنا"

"اوہ، خدا آپ کو خوش رکھے، جی خوش کردیا، عشق کے علاوہ سب کچھ چلے گا" اختر نے کہا اور ثناء مسکرانے لگی پھر بولی۔

"اختر، پچھلی بار تم آئے تھے تو تم نے کوٹھی کی فضا پر غور کیا ہوگا۔ ہنگامے، قہقہے، تفریحات، دلچسپیاں کیا کچھ نہیں تھا یہاں، نہ جانے کس بدبخت کی نظر لگ گئی ہمارے اِس ماحول کو۔ اب تم سے کیا چھپانا۔ یہ بات تمھیں پتہ چل ہی گئی ہوگی کہ شہاب انکل نے ڈیڈی کو برباد کردیا۔ سارا روپیہ خُرد بُرد کرکے پتہ نہیں کیا چکر چلایا کہ ڈیڈی پریشان ہوگئے، یہ بات تمھیں معلوم ہوگئی ہوگی کہ غلام احمد چچا نے اپنی دولت سے ہم لوگوں کی عزت بچائی ہے۔ اُن کے پاس ساڑھے آٹھ کروڑ روپے موجود تھے۔ جو انھیں غالباً بعد میں ملے تھے۔ اُنھوں نے سارے کے سارے پیسے ڈیڈی کو دے دیئے اور ڈیڈی کی کھوئی ہوئی ساکھ بحال ہوگئی میں دل سے اُن لوگوں کی قدر کرتی ہوں لیکن قدر کرنا الگ چیز ہے، اور تفریحات دوسری چیز، کیوں نہ نئے سرے سے کوئی ایسا پروگرام ترتیب دیں جس سے اِس کوٹھی میں زندگی کی لہر دوڑ جائے، ہنگامے ہوں، تفریحات ہوں اور قبرستان کا سا یہ ماحول ختم ہوجائے، اِس سلسلے میں اِس وقت مجھے تم سے بہتر کوئی اور آدمی نظر نہیں آتا"

"اِس سلسلے میں اختر ہر وقت حاضر ہے۔ درحقیقت زندگی تو اِسی کا نام ہے۔ واقعی آپ کا کہنا درست ہے، کہ کوٹھی کے ماحول میں اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی"

"فطری چیز ہے۔ بہرطور سب کے ذہنوں پر ایک بوجھ تو ہے جو کچھ ختم ہوگیا ہے واپس آنا ممکن نہیں ہے اور پھر بہت سے لوگ چلے گئے ہیں۔ طفیلی بیگم نے عارفہ خالہ سے لڑنا چھوڑ دیا ہے۔ ویسے یہ اچھا ہی ہوا دوست اور دشمن پہچان لئے گئے، کچھ تو ایسے تھے جو اپنی خوشی سے یہاں سے بھاگ گئے۔ کچھ بلاشبہ مجبور ہوگئے تھے لیکن میرا خیال ہے جتنا کچھ ہے، اتنا ہی ٹھیک ہے البتہ اِس میں کوئی ایسی بات پیدا کی جائے جس سے کچھ لطف آئے"

"پروگرام ترتیب دے لیا جائے اختر آپ کو اسسٹ کرے گا"

"جی نہیں آپ بہت اونچی چیز ہیں مجھے پتہ ہے۔ اسسٹ وسسٹ نہیں کرنا۔ بس پروگرام بناؤ اور کچھ کرو۔ ویسے آج ایک خاص بات میرے ذہن میں آئی ہے اور اِس پر ذرا غور کرنا ہے"

"کیا" اختر نے دلچسپ نگاہوں سے ثناء کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ثناء اُسے بہت پسند تھی۔ مزاجاً ایسی لڑکیاں شاذونادر ہی ہوتی ہیں۔ لاابالی، بے پرواہ اور کسی بڑے سے بڑے حادثے سے متاثر نہ ہونے والی اپنے بارے میں کسی طرح سے

شک وشُبے کا شکار نہیں تھی۔ تیمور کو جس طرح وہ اپنی اولاد کہہ کر دُنیا سے رُوشناس کراتی تھی اور ذرا بھی نہیں جھجکتی تھی یہ بھی بہت بڑی بات تھی اور اختر کو ثناء کی تمام صفات پسند تھیں۔ خالد کی ہونے والی بیوی کی حیثیت سے بھی وہ ثناء کو بہت زیادہ چاہنے لگا تھا۔ ایسی بھابی مِل جائے تو لُطف آجائے گا۔ بہ طور ثناء کی اِس خواہش پر اُس نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور بولا۔

"تو پھر ثناء کوئی پروگرام ترتیب دینا پڑے گا۔ ہاں آپ کسی خاص بات کی نشاندہی کررہی تھیں"

"یُوں تو بہت سی خاص باتیں ہیں۔ میں سوچ رہی ہُوں کہ یہاں اِس کوٹھی میں ایک محکمۂ جاسُوسی ترتیب دینا چاہیئے اور یہاں جو کردار اپنے آپ میں اُلجھے ہُوئے ہیں اِن کے بارے میں معلومات حاصل کرکے رپورٹ جمع کرنی چاہیئے"

"ونڈرفل آئیڈیا اب اِن کرداروں کا تعین کرلیا جائے"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے رِدا کی زبانی ایک جُملہ سُنا تھا"

"کیا؟"

"یہ کہ اُس نے نُدرت کو خاموش کرنے کے لئے کہا تھا۔ کہ فضُول باتیں نہ کرے ورنہ وہ اُس افسانے کو کسی رسالے میں چھپنے کے لئے بھجوادے گی جو نُدرت نے لکھا تھا۔ اور اِس کے بعد شاید تم نے محسوس کیا ہو کہ نُدرت کی بولتی بند ہوگئی تھی۔ نُدرت جیسی لڑکی معمُولی بات سے بلیک میل نہیں ہوسکتی، اِس کے پسِ پردہ کچھ ہے ہمیں اِس کا پتہ لگانا ہے"

اختر کے دیوتا کُوچ کرگئے۔ یہ معاملہ تو اُس کی ذات سے تعلق رکھتا تھا، رِدا نے جس افسانے کا تذکرہ کیا تھا یہ وہ خط تھا جو نُدرت نے اختر کو لکھا تھا اور اختر کو اِس کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوگئی تھیں چنانچہ وہ نہایت صفائی سے اِس معاملے کو ہضم کرگیا اور بولا۔

"بالکل معلوم ہوجائے گا یہ بھلا کون سا مشکل کام ہے اِس کے لئے ذرا نُدرت کے پیچھے لگنا پڑے گا"

"لگ جاؤ، لگ جاؤ، پہلا کام یہ ہُوا۔ ہم ایک فہرست بنالیتے ہیں۔ اِس فہرست میں مس رِدا بھی سرِفہرست ہیں"

"خُوب! خُوب تو کیا مس رِدا کا معاملہ بھی۔۔۔"

"وہ معاملہ نہیں، رِدا کی شخصیت کے بارے میں تمھیں کم از کم اتنا تو علم ہوگا کہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟ یہاں تک کہ مَیں بھی نہیں جانتی حالانکہ وہ میری کتنی گہری دوست ہے لیکن مجھے اُس سے شکایت ہے۔ نہ جانے کیوں اپنے آپ کو اِتنا چھپائے ہُوئے ہے۔ ہم لوگ اُس کے دُشمن تو نہیں ہیں۔ بتادے تو اُس کی مدد ہی کریں گے۔ لیکن وہ کچی نہیں ہے۔ آج تک اُس نے کبھی کسی کو اپنے اندر نہیں جھانکنے دیا۔ اختر! یہ تمھارے لئے چیلنج ہے اگر رِدا کو نہ جان سکے تو یُوں سمجھ لو تم نے دُنیا میں کچھ نہ کیا"

"جائیں گے بالکل جانیں گے نمبر تین؟"

"نمبر تین عصمت اور اقبال صاحب کا معاملہ ہے۔ میری نظریں کچی نہیں ہیں جب وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ہوتی ہے، دونوں یونیورسٹی میں ساتھ ہی پڑھتے ہیں چنانچہ اِس مسئلے کو نمبر تین پر رکھا جائے۔ ہمیں حقیقتِ حال معلوم کرنی ہے باقی رہا رشید کا معاملہ کہ وہ کیسے آیا؟ کہاں غائب ہُوا تو یہ ہماری تفریحات میں نہیں آتا۔ فی الحال یہ تین کیس ہمارے سامنے ہیں اور تم اِن تینوں کیسوں پر ترتیب وار کام شروع کردو"

اختر نے کھڑے ہوکر ثناء کو سیلوٹ مارا، اور سینے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"چیف! کام کا آغاز ہوجائے گا آپ بالکل مطمئن رہیں"

"گڈ، ویری گڈ۔ ہم تمھاری پہلی رپورٹ کا انتظار کریں گے" ثناء نے کہا اور اِس کے بعد تیمور کو گود میں لئے ہُوئے وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ اختر بھی اُس کے ساتھ ساتھ ہی تھا باہر آکر دونوں جُدا ہوگئے اختر بُری طرح سر کھُجا رہا تھا رِدا نے بڑی احتیاط سے نُدرت کا اور اُس کا مسئلہ چھُپایا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی اگر وہ کہیں بھی چوکتی تو ثناء جیسی شاطر لڑکی فوراً ہی صُورتحال بھانپ لیتی۔

کیسی دلچسپ بات تھی کہ اُس کا کیس اُسی کے سپُرد کیا گیا تھا۔ ثناء کے ذہن کو اُس طرف سے ہٹانے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ ترتیب بدل دی جائے اور دوسرے دو کیسوں میں اُسے اُلجھا دیا جائے۔ بس یہی ایک عُمدہ ترکیب تھی۔

اختر جب پہلی بار یہاں آیا تھا تو رِدا کا معمہ اُس کے علم میں بھی آیا تھا۔ رِدا ایک بند کتاب کی مانند تھی جسے کوئی بھی نہیں کھول سکا تھا۔ اختر نے اُس وقت اِس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ویسے بھی رِدا سے بے تکلفی اُن لمحات میں ہوئی تھی۔ جب وہ واپسی کی تیاریاں کررہا تھا اور اُس کے بعد رِدا کا رویہ

کے ساتھ اتنا بہتر رہا کہ اختر اُس کے ساتھ کوئی شرارت بھی نہ کر سکا اُس کے علاوہ ردا تھی بھی کچھ ایسی پُروقار شخصیت کی مالک کہ اُس کے خلاف کچھ کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بقول اختر کے بھابی بیگم نے اب جو اُس سے گٹھ جوڑ کیا تھا وہ ذرا مختلف قسم کی چیز تھی اور بات صرف شرارت کی حد تک تھی... ردا کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اُسے کسی طرح کا نقصان پہنچانا تو مقصود نہیں تھا چنانچہ اختر نے اِس سلسلے میں ثنا سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ خفیہ طور پر کوئی کاروائی کرنے کے بجائے اُس نے پہلے ردا ہی سے اِس موضوع پر گفتگو کرنا مناسب سمجھا اور ایک شام ردا کو اُس کے کمرے ہی میں پکڑ لیا۔

ردا اپنے لباس کی ترتیب میں مصروف تھی کپڑوں پر استری کر کے رکھی جا رہی تھی اور دوسری تمام تیاریاں بھی ہو رہی تھیں اختر کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"آؤ اختر، بیٹھو۔ کیا ہو رہا ہے باہر؟"

"وہی سب کچھ جو ہوتا رہتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے اب ہم یہاں چند روز کے مہمان ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ردا نے چونک کر پُوچھا۔

"مطلب یہ کہ یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"کہاں؟ مجھے تو علم ہُوا ہے کہ اب تم لوگ مستقل یہاں آ گئے۔"

"آ ضرور گئے ہیں۔ لیکن یہاں رہیں گے تو نہیں۔"

"اِس شہر میں تو رہو گے۔"

"ہاں وہ بھی اگر آپ لوگوں کی اجازت ہُوئی۔"

"ارے واہ، یہ کیا بات ہُوئی۔ میرا بس چلے تو میں تمھیں اِس گھر سے ہی نہ جانے دُوں۔ تم جیسے پیارے بھائیوں سے دُور رہ کر زندگی اُدھوری محسوس ہوتی ہے۔"

"مجھے ایک بات کا تعجب ہے سسٹر۔" اختر نے کہا۔

"کیا...؟"

"بہت اچھے، اچھے لوگ بھی بعض اوقات ایسی باتیں کرتے ہیں جو جھُوٹ پر مبنی ہوتی ہیں۔"

"کرتے ہوں گے۔ ضرور کرتے ہوں گے۔ بعض اوقات انسان غیر اختیاری طور پر بھی جھُوٹ بول جاتا ہے۔" ردا نے کہا۔

"اوہ... اچھا یہ بات ہے۔" اختر نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"مطلب یہ کہ یہ الفاظ آپ نے کچھ غیر اختیاری طور پر ادا کر دیئے ہیں۔"

"کیا بات ہے، شرارت کرنے کے لئے کوئی اور نہیں ملا اِس وقت۔" ردا نے مُسکراتے ہُوئے پُوچھا۔

"نہیں... شرارت کے لئے تو ہر شخص مل جاتا ہے لیکن کبھی کبھی جب سنجیدگی کا موڈ طاری ہوتا ہے تو پھر ایسے لوگوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو خود بھی سنجیدہ ہوں۔"

"تو گویا اِس وقت آپ پر سنجیدگی کا موڈ طاری ہے۔"

"بہت زیادہ۔"

"اِس کی وجہ؟"

"بہت سے خیالات تھے، یہاں سے جانے کا تصور بھی ذہن میں ہے، ویسے بھی اب اِس کوٹھی میں وہ سب کچھ نہیں رہا ہے جو پہلے کبھی تھا۔"

"نُدرت تو ہے۔" ردا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"ایک نُدرت سے کیا کام چلتا ہے؟ ابھی آپ نے ایک بات کہی تھی مجھ سے۔"

"بہت سی باتیں کہی تھیں۔ کون سی بات کی نشاندہی کر رہے ہو؟"

"آپ نے کہا تھا کہ اگر آپ کا بس چلے تو آپ ہم لوگوں کو یہیں رکھ لیں۔"

"خُدا کی قسم۔ یہ جھُوٹ نہیں ہے۔"

"تو اِس کا ایک اور حل بھی تو ہو سکتا ہے سسٹر۔" اختر نے کہا۔

"کیا...؟"

"آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر منتقل ہو جائیں۔" اختر نے سادگی سے کہا اور ردا کے ہاتھ کام کرتے کرتے رُک گئے۔

وہ عجیب سی نگاہوں سے اختر کو دیکھتی رہی اور پھر اُس کے چہرے پر ایک سنجیدگی سی طاری ہو گئی۔ اب اختر کے چونکنے کی باری تھی۔ ردا کے لہجے میں جو اُداسی تھی۔ اُس نے اختر کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا وہ چند لمحات ردا کی صُورت دیکھتا رہا۔ ردا پھیکے سے انداز میں ہنسی اور پھر آہستہ سے بولی۔

"یہ گھر بھی تو میرا اپنا نہیں ہے اختر۔ آج ثنا نے رکھا ہُوا ہے کل تم کہو گے تو تمھارے پاس آ جاؤں گی، کوئی خاص فرق تو نہیں پڑتا اور پھر ثنا کے یہاں سے رُخصت ہونے کے بعد تو میرا بھی شاید ہی یہاں دل لگے۔ میں کس کے سہارے رہوں گی؟"

"خُدا کی قسم سسٹر مزا آ جائے گا۔ ثنا، خالد بھائی کے لئے وہاں پہنچ جائے گی اور ہماری اللہ رکھی، اللہ رکھے ہمارے لئے تو پھر آپ کے لئے یہاں کیا رہ جائے گا؟ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیں گی۔"

"سچ وعدہ کرتی ہُوں اگر حالات سازگار ہُوئے تو میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔" ردا نے کہا۔

"بہت چالاک ہیں آپ سسٹر ایسی باتیں شروع کر دیں کہ جو موڈ بنا کر آیا تھا وہ ایک دم ختم ہو گیا۔ اب بتائیے کیا کہوں آپ سے؟"

"کوئی خاص موڈ بنا کر آئے تھے؟"

"ہاں سسٹر! آج یہ تجزیہ کرنے آیا تھا کہ زبان سے کچھ کہہ دینے سے بات حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے یا نہیں؟"

"کوئی منطق؟"

"منطق کی رُو سے ہی بات کر رہا ہُوں"۔ اختر نے کہا اور ردا ہنس پڑی۔

"بہت دن سے تم نے منطق کی رُو سے کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"آج کرنے آیا ہُوں۔"

"تو پھر کرو۔"

"مسئلہ یہ ہے سسٹر کہ آپ نے مجھے بھائی کہہ دیا اور میں نے آپ کو بہن۔ بظاہر تو یہ بہت بڑی بات ہے لیکن بعض اوقات لوگ چلتے پھرتے لوگوں کو بھی بھائی یا بہن کہہ دیا کرتے ہیں صرف اخلاقاً معلوم یہ کرنا ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو بھائی بہن کا رشتہ قائم ہُوا ہے وہ صرف اخلاقاً ہے یا اِس میں کچھ گہرائی بھی ہے۔"

"یہ سوال تو تم اپنے آپ سے بھی کر سکتے ہو۔"

"وہ ذرا ڈرامائی اور جذباتی بات ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے اپنے آپ سے جو سوال کیا جائے گا۔ اُس کا جواب بھی اپنی مرضی کے مُطابق ہی ملے گا۔ تبدیل شدہ جواب بھلا ذہن کیسے قبول کر سکتا ہے؟"

"مقصد کیا ہے حضرت؟ یہ بتائیے اور بیٹھئے تو سہی کھڑے کیوں ہیں آپ؟"

"دراصل کچھ لوگوں نے چیلنج کر دیا ہے مجھے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"آپ کے سلسلے میں۔"

"اوہ ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ کیا چیلنج ہے۔"

"یہی کہ آپ نے آج تک اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا ہر شخص آپ سے یہ کھیل کھیل کر آؤٹ ہو چکا ہے۔ اختر صاحب سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ یہ کام کر لیں تو اُنھیں تسلیم کر لیا جائے گا

سسٹر بہت سی چالیں ہو سکتی ہیں۔ ہمت سے منصوبے بنائے جا سکتے ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ سسٹر سے ہمارا کیا رشتہ چل رہا ہے؟ بات اگر کہی جا سکتی ہے تو اِس رشتے کی بنیاد پر کہی جا سکتی ہے، کیا خیال ہے؟ کامیابی کی کوئی اُمید ہے؟" اختر نے ردا کو دیکھتے ہُوئے کہا۔ اور ردا اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"اختر! یہ مسئلہ میرے لئے دُکھ کا باعث ہے۔ دیکھو میں، میں اتنے عرصے سے یہاں رہ رہی ہُوں کسی کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ میرے کردار میں بھی کوئی ایسی خامی تلاش نہیں کی جا سکی جس سے اِن لوگوں کو یہ احساس ہو کہ اِن لوگوں کی کوٹھی میں کوئی غلط شخص رہ رہا ہے۔ حالانکہ اِس سلسلے میں چند افراد نے کوششیں بھی کی ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ میری کہانی [illegible] رُسوائیاں چھُپی ہُوئی ہیں ورنہ شاید میں اِن محبت کرنے والے لوگوں سے اتنا انحراف نہ کرتی، کوئی اپنی رُسوائیوں کو اپنے سینے میں دبائے بیٹھا ہے تو اچھے لوگوں کو یہی چاہیئے کہ وہ اُسے بند رہنے دیں۔ یہ ممکن نہیں ہے اختر کہ میں اپنی کہانی کسی کو سُنا دُوں۔ اگر ممکن ہوتا تو میں سب سے پہلے ثنا کو اپنے بارے میں بتاتی کیونکہ اُس نے مجھ سے جس بے لوث محبت کا اظہار کیا ہے وہ ناقابلِ تصوّر ہے۔ بہت احسان مند ہُوں اُس کی اور مزید احسان مند اُس وقت ہُوں گی جب وہ مجھے خاموشی سے میری عمر کا سفر طے کرنے دے۔ کیا فائدہ میرے زخموں کو ہرا کرنے سے۔ اختر جو کوئی بھی تم سے اِس بارے میں کچھ کہتا ہے تم اُس سے صرف اتنا کہہ دو کہ ردا اپنے آپ کو رُسوا نہیں کرنا چاہتی۔ اِس سے زیادہ اُس کا کوئی اور مقصد نہیں ہے، عنایت ہو گی یہاں لوگوں کی نوازش ہو گی کہ مجھے اپنے درمیان سُرخرو رہنے دیں۔ بتا دیا اپنے بارے میں تو پھر یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ کس مُنہ سے رہوں گی؟"

"ارے ارے سسٹر! آپ تو سنجیدہ ہو گئیں۔ بات دراصل یہ نہیں تھی، بات صرف اتنی سی تھی کہ میں اُن لوگوں سے دعویٰ کر بیٹھا تھا۔"

"نہیں اختر کبھی نہیں۔ نہیں بتاؤں گی کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ بس چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" ردا کی آواز رُندھ گئی اور اختر عجیب سے انداز میں اُسے دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔

"ٹھیک ہے سسٹر! میں اب آپ کو اِس سلسلے

میں مجبور نہیں کروں گا۔"

"تم... تم محسوس نہ کرنا اختر۔ اگر تم بھی مجھ سے برگشتہ ہو گئے تو پھر نہ جانے میری ذہنی کیفیت میں کیا تبدیلی رُونما ہو جائے۔"

اختر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ردا تھوڑی دیر کے بعد اپنے کام سے فارغ ہو گئی۔ اختر اُس سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ موضوع تبدیل کر دیا تھا اُس نے، پھر وہ ردا کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔

دُور سے ثناء نے اُسے ردا کے ساتھ دیکھا اور دل ہی دل میں مُسکرا دی۔ اختر کی چالاکی سے وہ اچھی طرح واقف تھی اور یہ جانتی تھی کہ اختر کچھ نہ کچھ کر کے ہی دم لے گا۔ اختر نے اُس دن تو یہ تمام صُورتِ حال ٹال دی۔ لیکن اُس کے دل میں کُرید لگ گئی تھی۔ آخر یہ ردا اپنے آپ کو اتنا چُھپائے ہُوئے کیوں ہے؟ کہیں نہ کہیں تو اُس کے چہرے سے نقاب اُٹھنا چاہیئے۔ کوئی تو ایسی چیز ہو گی جو اُس کی شخصیت کو سامنے لا سکے۔ وہ سوچتا رہا، ردا سے جذباتی گفتگو ضرور ہُوئی تھی لیکن اختر بذاتِ خود اُس گفتگو سے متفق نہیں تھا۔ ردا کی ذات سے اگر کوئی ایسی ویسی بات پوشیدہ بھی ہے تو اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انسان کی زندگی میں نہ جانے کتنے اُلٹ پھیر آتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ نکل بھی آیا تب بھی ردا کم از کم اختر کے لئے قابلِ احترام ہو گی اور پھر بھلا اگر اُس کے بارے میں کچھ معلوم ہو بھی جائے تو کسی سے اُس کا تذکرہ کیوں کیا جائے۔ ردا بذاتِ خود جو کچھ بھی ہے اتنا ہی کافی ہے اور اُس کی ذات پر کسی قسم کا شک زیادتی کے مترادف ہے۔

اُس نے فیصلہ کر لیا کہ ردا کے کمرے کی تلاشی لے گا۔ ممکن ہے اِس تلاش سے ردا کی شخصیت پر سے پردہ اُٹھ جائے، یہ کام اُس نے دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا تھا لیکن دوسرے دن صبح ساڑھے دس بجے عادل صاحب نے سرکاری دفاتر کی کچھ ذمّے داریاں اُس کے سُپرد کر دیں۔ خالہ کو بھی ساتھ لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا چنانچہ وہ چلا گیا۔ دن کے ڈھائی بجے فرصت ہُوئی اور واپس آنے کے بعد اختر اپنے کام کے لئے تیاریاں کرنے لگا۔ خالہ تو تھک گئی تھیں چنانچہ وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئیں۔ اختر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دوپہر کا وقت زیادہ تر لوگوں کے لئے آرام کا وقت ہوتا تھا۔ چنانچہ سب ہی اپنے اپنے کمروں میں گھُسے ہُوئے تھے۔ ردا بے چاری معمول کے مطابق دفتر میں سر کھپا رہی تھی چنانچہ وہ چوروں کی طرح ردا کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ کمرے کا دروازہ کبھی لاک نہیں ہوتا تھا۔ اِس کی ضرورت ہی اِس کوٹھی میں نہیں پیش آتی تھی۔ چنانچہ اُس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ردا کا کمرہ اُس کی نفیس طبیعت کا آئینہ دار تھا۔ سادہ سی ہلکی پھلکی آرائش کی گئی تھی لیکن جس قدر بھی تھی قابلِ داد تھی۔ اختر پہلے بھی اِس کمرے کا جائزہ لے چکا تھا لیکن از سرِ نو گہری نگاہوں سے اُسے ٹٹولا۔ رائٹنگ ٹیبل تھی، ایک الماری تھی... ایک چھوٹا سا بُک شیلف تھا، مسہری اور بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی کُرسیاں وغیرہ بس یہ اِس کمرہ کی کُل کائنات تھی۔ تیمور کے لباس وغیرہ تو ثناء کے پاس ہی رہا کرتے تھے، تیمور کا واسطہ اِس کمرے سے اب بہت ہی کم رہ گیا تھا۔

اختر کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر اُس نے بڑبڑاتے ہُوئے کہا۔

"ردا صاحبہ! آپ کی سادہ طبیعت کسی بہت ہی گہرائی کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن بہرطور یہی کافی ہے کہ آپ نے ابھی تک اپنی شخصیت پردۂ راز میں رکھی ہے۔ اگر آپ اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں تو کس سے کہہ سکتی ہیں۔ ظاہر ہے آپ جیسے لوگ ڈائریاں وغیرہ ہی لکھا کرتے ہیں تاکہ دل کی بھڑاس کاغذ پر اُتر جائے اور آپ مطمئن ہو جائیں۔ مگر ایسی کوئی خفیہ ڈائری آپ کے پاس موجود ہے تو آپ اُسے کہاں چُھپا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے آپ کا واسطہ ثناء اور نُدرت جیسی چڑیلوں سے ہے یقیناً آپ اُن چڑیلوں سے خوفزدہ رہتی ہوں گی، اور آپ نے اِس بات کو مدِنظر رکھا ہو گا کہ اگر کبھی یہ دونوں آپ کے کمرے میں بسیرا کر لیں تو آپ کی اشیاء کو کہاں کہاں تلاش کر سکتی ہیں: بستر، گدّے کے نیچے بلاشبہ گدّا بہت وزنی ہوتا ہے اور اُس کے نیچے اگر کوئی چیز چُھپا دی جائے تو اُٹھانے والے کو خاصی دِقّت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ویسے ڈائریوں وغیرہ کے لئے یہ جگہ عمدہ ہوتی ہے چنانچہ بسم اللہ!"

اختر نے ردا کی مسہری کے وزنی گدّے کو اُوپر تک اُٹھا دیا لیکن گدّے کے نیچے کوئی چیز نہیں تھی۔ اُس نے ایک گہری سانس لے کر گدّے کا نچلا حِصّہ ٹٹولا اور اُس کے بعد اُسے واپس مسہری پر رکھ کر چادر برابر کر دی۔ تکیے وغیرہ کے نیچے وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ مسہری میں کوئی ایسی سائیڈ ٹیبل نہیں تھی جس میں کسی چیز کے موجود ہونے کا امکان ہو چنانچہ پہلی کوشش ناکام ہو گئی۔ اُس کے بعد رائٹنگ ٹیبل۔ ظاہر ہے رائٹنگ ٹیبل کی درازوں میں ایسی کوئی چیز نہیں رکھی جاتی البتہ کوئی خفیہ دراز

سطح کے نیچے ہو سکتی ہے چنانچہ رائٹنگ ٹیبل کے نیچے گھُس کر اُس نے ماہرانہ نگاہوں سے ٹیبل کے نچلے حصّے کا جائزہ لیا۔ تمام رخنے ٹھوک بجا کر دیکھے۔ خفیہ خانے کہاں کہاں ہو سکتے ہیں اِس پر نگاہ دوڑائی۔ لکڑی کے جہاں بھی موٹے تختے تھے وہاں اُنھیں ٹٹول کر دیکھا اور یہاں بھی اُسے مایوسی ہُوئی۔ پھر اُس نے احتیاطاً درازیں بھی دیکھ لیں لیکن اُن درازوں میں بھی کوئی ڈائری وغیرہ نہیں تھی البتہ درازوں میں جو کاغذات موجود تھے اُنھیں اُس نے بغور دیکھا لیکن عموماً کاغذات سادہ تھے اور اگر کسی کاغذ پر کچھ لکھا بھی ہُوا تھا تو وہ دفتری اُمور کے بارے میں تھا۔ یہاں بھی ناکام ہونے کے بعد الماری کا رُخ کرنا تھا چنانچہ اُس نے بڑی احتیاط سے الماری کے تالے پر طبع آزمائی کی لیکن تالا بند ہی کہاں تھا وہ ایک بار پھر آہستہ سے بڑبڑایا۔

"اعتماد کی بھی ایک حد ہوتی ہے بلاشبہ اِس کوٹھی میں چور نہیں ہیں لیکن ملازم وغیرہ اور پھر اپنے راز نہیں صاحب عجیب و غریب ہیں یہ خاتون خیر دیکھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اُس نے الماری کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ تھوڑی دیکھی نہ دیکھی کپڑوں کی تہہ کے نیچے اُسے ایک پیکٹ سا رکھا ہُوا نظر آیا، جو سیل بند تھا یہ سیل بند پیکٹ اختر کے لئے باعثِ دلچسپی ہُوا۔ اُس نے اُسے نکال کر ایک طرف رکھ دیا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ الماری میں اُس سیل بند پیکٹ کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو قابلِ توجہ ہوتی۔ الماری کے پچھلے حصّے کو بھی ٹٹولا گیا اور پھر اختر نے ایک گہری سانس لے کر سوچا کہ اِس کے بعد اب تلاشی لینے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے مگر یہ پیکٹ، یہ سیل بند پیکٹ اِس میں کیا ہے۔ ڈائری وغیرہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ڈائری لکھی جاتی ہے تو پھر پیکٹ کو سیل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کرنا چاہیئے کھول کر دیکھا جائے اُسے یا نہیں؟ وہ دیر تک پیکٹ کو ہاتھ میں لئے اِس بارے میں فیصلہ کرتا رہا اور پھر شانے ہلا کر بولا۔

"ہو سکتا ہے یہ گستاخی ہو لیکن بہرطور ردا صاحبہ مجبوری ہے میرے سپرد یہ ذمّے داری کر دی گئی ہے تو کوشش تو کروں گا اِس سلسلے میں نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔" اُس نے پیکٹ کی سیل اتنی احتیاط سے کھولی کہ اگر چاہتا تو دوبارہ اُسے جوڑ سکتا تھا اور کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا۔ یہ اندازہ البتہ اُسے ہو گیا تھا کہ پیکٹ میں ڈائری ٹائپ کی کوئی چیز موجود ہے۔ سیل کھولنے کے بعد اُس نے ایک خوبصورت نوٹ بُک نکال لی۔ بہت ہی قیمتی نوٹ بُک تھی۔ بڑے حسین کور میں بند ہُوئی۔ اختر کے چہرے پر تجسس کے آثار گہرے ہو گئے۔ اُس نے نوٹ بُک کا پہلا صفحہ کھولا اور اُس پر ایک چھوٹا سا جُملہ لکھا دیکھ کر بُری طرح اُچھل پڑا۔ لکھا تھا "ردا کی کہانی"۔ اختر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ جو کچھ چاہتا تھا اتنی آسانی سے اُسے دستیاب ہو جائے گا اِس کا تصوّر بھی نہیں کیا تھا اُس نے ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا پھر گھڑی میں وقت دیکھا ردا کے آنے میں تو بہت دیر تھی اُس کے بعد وہ ایک کُرسی پر جا بیٹھا۔ اُس نے نوٹ بُک کا دوسرا ورق کھولا، اُس پر لکھا ہُوا تھا۔

تو آ، کہ رازِ نہانی افشا، عقیدت کرتا ہُوں
دامانِ زبانِ خاموشی لبریزِ شکایت کرتا ہُوں
گھبرا کے ہجومِ بے کلی سے، اظہار کی جرأت کرتا ہُوں
میں تم سے...

شعر جرأت کے باوجود پُورا نہیں کیا گیا تھا لیکن اُسے سمجھا جا سکتا تھا پتہ نہیں یہ صرف ایک شعر تھا یا اُس کا کوئی مفہوم بھی تھا۔ اُس نے تیسرا ورق اُلٹ لیا بہت ہی خوبصورت تحریر تھی اور اُسے افسانوی رنگ دیا گیا تھا لیکن اِس افسانے میں ایک حقیقت پنہا تھی۔ ایک ایسی کہانی جو اختر کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی یہ کہانی یا افسانہ خُدا ہی بہتر جانے لیکن اُس کی دلچسپیوں نے اختر کو اپنے آپ میں گم کر دیا۔ ایک ایک سطر ایک ایک لفظ، ایک ایک صفحہ انکشافات کا حامل تھا اور اتنے دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا تھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ردا کی تحریر ہے۔ اختر کچھ اِس طرح گم ہُوا اِس کہانی میں کہ گرد و پیش کے ماحول کو بُھول گیا وہ ایک ایک صفحے کو بغور پڑھ رہا تھا اور پھر چند صفحات سے گزرنے کے بعد دفعتاً ہی اُس کے چہرے پر حیرت کے نقوش پھیل گئے۔ اُس نے مزید دلچسپی سے اُسے پڑھنا شروع کر دیا اور اُس کا خیال غلط نہیں تھا تو اب ردا اِس کہانی میں شامل ہو گئی تھی۔ ردا... ردا... ردا پڑھتا رہا اور اپنے آپ کا بُھول گیا۔ دُنیا کو بُھول گیا۔ کہانی کی دلچسپی نے اُسے خود میں ڈبو دیا تھا اور اختر بڑی دلچسپی سے اُسے پڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ کسی کمرے میں لگی ہُوئی گھڑی نے شام کے چار بجائے اور اختر چونک پڑا۔ چند صفحات باقی تھے کہانی ختم ہونے کے قریب تھی لیکن وہ یہ خطرہ بھی مول لینے کے لئے تیار تھا۔ اب اُس نے ذرا تیزی سے بقیہ صفحات پڑھے یہاں تک کہ آخری صفحے

پر پہنچ گیا۔ کہانی کا اختتام نہیں ہُوا تھا وہ ایک مخصوص جگہ لاکر چھوڑ دی گئی تھی لیکن اختر کے ذہن و دل میں ہیجان برپا تھا۔ یقیناً سو فیصدی یہ ردا کی کہانی ہے۔ ردا کیسی عجیب و غریب بات تھی کیسا طلسم خانہ تھا۔ یہ اِس کوٹھی میں جو بھی تھا اپنی ذات میں منفرد تھا۔ یہ ردا صاحبہ اتنی زبردست چیز نکلیں گی۔ اختر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا لیکن پھر وہ چونک پڑا۔ ردا کے آنے کا وقت ہوگیا تھا اِس نوٹ بک کو اُسی طرح محفوظ کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ردا کو شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

چنانچہ اُس نے انتہائی احتیاط سے نوٹ بک کو پیکٹ میں واپس رکھا سِیں کو جوڑنے کی کوشش کی اور اُس میں کافی حد تک کامیاب ہوگیا اور اُس کے بعد اُسے ردا کی الماری میں رکھ کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ دروازہ اُس نے اُسی طرح بند کر دیا تھا کوئی بھی ایسا نشان نہیں چھوڑا تھا۔ اُس نے جو کسی طور اُس کی موجودگی کی وہاں نشاندہی کر سکے لیکن ذہن و دل کی حالت عجیب تھی۔ اپنے کمرے میں آگیا۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گیا وہ کہانی اُس کے ہوش و حواس پر طاری ہوگئی تھی۔ نہ جانے کب تک وہ اِسی طرح لیٹا رہا پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو چونک کر اُٹھا، ملازم تھا۔ اُس نے کہا۔

"صاحب چائے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ سب لوگ لان پر پہنچ گئے ہیں۔"

"اوہ... ہاں آتا ہُوں، ابھی آیا۔" اختر نے کہا اپنے آپ کو سنبھالنا ضروری تھا یہ انکشاف بلاشبہ حیرت زدہ کر دینے والا تھا لیکن بہرطور اب یہ ایک امانت تھی اُس کے سینے میں ردا کی۔ اُس نے مجرمانہ طور پر ردا کی یہ کہانی پڑھ تو لی تھی لیکن اُس کا انکشاف کسی کے سامنے نہیں کر سکتا تھا چاہے وہ ثناء ہو چاہے نُدرت یا چاہے کوئی بھی ہو ردا کو ابھی راز رکھنا ہوگا۔ یقیناً راز رکھنا ہوگا اُس نے انتہائی پھرتی سے مُنہ ہاتھ دھویا لباس تبدیل کیا اور پھر اپنے آپ کو سنبھال کر باہر نکل آیا۔

لان پر تقریباً تمام ہی لوگ موجود تھے۔ ابراہیم صاحب، تنویر، اقبال، عصمت اور باقی تمام لوگ بھی کم از کم یہ تکلف اب درمیان سے ختم کر دیا گیا تھا کہ لوگ اپنے کوارٹروں ہی میں گھُسے رہیں۔ ثناء بدستور تیمور کو شانے سے لگائے ہُوئے تھی۔ اُس نے دو تین بار احمقانہ انداز میں اختر کو اشارے بازی بھی کی وہ غالباً عصمت اور اقبال کی طرف توجہ مبذول کرا رہی تھی لیکن اختر نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ ردا کی کہانی ہی نے اُس کا سر گھما دیا تھا اور فی الوقت کچھ اور سوچنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ چائے میں شریک ہوگیا لیکن اُس کی ذہنی و شرارت تھوڑی دیر کے لئے اُس سے بالکل ہی رخصت ہوگئی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ کہانی اُس کے ذہن سے محو نہیں ہو پا رہی تھی۔ چائے کا اختتام ہوگیا، کوئی خاص بات نہیں ہُوئی تھی لیکن ثناء کو لگ گئی تھی۔ اُس نے اختر کو آواز دی اور اختر اُس کے پاس پہنچ گیا ثناء مسکراتے ہُوئے بولی۔

"ہاں پارٹنر کب سے کام شروع ہو رہا ہے ابھی کچھ کرو، وقت ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔"

"پروگرام ترتیب دے رہا ہُوں اور یہ سوچ رہا ہُوں کہ کام کہاں سے شروع کیا جائے۔ نُدرت صاحبہ کے سلسلے میں کام کا آغاز کرتا ہُوں تو اُس میں کچھ قباحتیں ہیں مثلاً یہ کہ ابھی وہ اپنے مہمانوں میں مصروف ہیں اور اگر ردا کی طرف توجہ دیتا ہُوں تو بھی ذرا مشکل مسئلہ ہے۔ میرا خیال ہے پہلا کام اِن لوگوں کے سلسلے میں کر لیا جائے۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہوں گی آپ؟"

"عِصمت اور اقبال نا؟"

"ہاں۔"

"گڈ۔ ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہارا امتحان بھی ہو جائے گا۔" ثناء مُسکراتے ہُوئے بولی۔

"جنابہ کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے گا۔" اختر نے مؤدب ہو کر کہا اور ثناء ہنسنے لگی پھر بولی۔

"یقین کرو اختر میں چاہتی ہُوں کہ اب ماحول میں کچھ تبدیلیاں آئیں۔ ہمارے گھر میں بھی شادیانے بجیں۔ شادی کی دُھوم دھام ہو۔ یہاں ہمارے گھر میں تو اب ویرانی چھا گئی ہے۔ خواتین نے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا ہے اور سب کے سب بالکل ہی تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ رشید کا معاملہ بھی حل نہیں ہُوا وہ سُوٹ کیس چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور طفیلی خالہ بے چاری بالکل ہی نیم پاگل ہو گئی ہیں۔ اِس وقت بھی اپنے کمرے میں پڑی ہُوئی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب تو مجھے بھی اُن پر ترس آنے لگا ہے۔ رشید اگر یہاں آیا تھا تو یہ سُوٹ کیس چھوڑ کر پتہ نہیں چلا کیوں گیا۔ کم از کم اپنی ماں سے تو مل لیتا۔ ویسے اختر، رشید کے بارے میں بھی پتہ لگائیں گے۔ تم نے محسوس کیا ہوگا کہ خود ڈیڈی بھی اپنی جگہ پریشان ہیں۔ طفیلی خالہ کا دُکھ ہم لوگوں سے بھی نہیں دیکھا جا رہا۔"

"ہاں واقعی یہ تعجب کی بات ہے۔ ظاہر ہے ہم اپنی بساط کے مطابق ہی کام کر سکتے ہیں۔ پہلے کام کا آغاز یہاں سے

کر دیا جائے۔ کل میں اِس سلسلے میں پہلا قدم اُٹھا رہا ہُوں۔"

"احتیاط سے، ہوشیاری سے۔ ہم تمہاری رپورٹ کے منتظر رہیں گے۔"

"او کے چیف۔" اختر نے کہا اور ثناء ہنسنے لگی۔

☆

ابراہیم صاحب درحقیقت حیران تھے کم از کم اِس دور میں وہ ایسے فرشتہ صفت لوگوں کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ جن کے درمیان اِس وقت گزار رہے تھے۔ وہ تو بہت ہی معمولی حیثیت کے مالک تھے۔ اگر غلام احمد خود ہی کوئی بڑی حیثیت رکھتے ہوتے تو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ معاملہ برابر کا ہے لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ غلام احمد صاحب کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتے تھے جو یہ محسوس ہوتا کہ دوسرے بڑے لوگ بھی اُن سے تعاون کرتے ہیں لیکن یہاں معاملہ ہی عجیب تھا۔ ایک ذرا تیور کو اتنا بڑا رتبہ دیا گیا تھا کہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ غلام احمد صاحب صرف ذرا تیور ہیں۔ احسان احمد غلام احمد سے اِس طرح بات کرتے تھے جیسے کسی برابر کے شخص سے۔ خواتین کی بھی یہی کیفیت تھی۔ بہرحال یہ سب کچھ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تنویر اور اقبال بھی اِس موضوع پر بات کر چکے تھے۔ ابراہیم صاحب، غلام احمد کے اتنے قریبی دوست تھے کہ دونوں سگے بھائیوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ ابراہیم صاحب نے جانا چاہا تو غلام احمد کے بجائے احسان صاحب نے ضد کر کے اُنہیں روک لیا۔

اقبال اور عِصمت ایک دن کی غیر حاضری کر چکے تھے لیکن اب یونیورسٹی جانا ضروری تھا چنانچہ صبح کو دونوں تیار ہو کر نکل گئے۔ سب سے زیادہ خوشی اُن دونوں کو ہی تھی۔ یونیورسٹی پہنچ کر وہ مصروف ہو گئے لیکن گیارہ بجے اقبال نے عصمت کو جا لیا اور دونوں کینٹین چل پڑے۔

کرسی پر بیٹھ کر اقبال نے مُسکراتے ہُوئے کہا "عصمت مجھے اُن تمام باتوں کے حقیقت ہونے کا یقین دلا دو..."

"جذباتی ہو رہے ہیں اقبال صاحب۔"

"عِصمت! کیا جذبات انسانی زندگی کا جزو نہیں ہیں۔ اُن سے دُور رہا جا سکتا ہے؟"

"رہنا چاہیئے!"

"نصیحتیں کر دیں؟"

"نہیں، ہوشیار کر رہی ہُوں۔ یہ یونیورسٹی ہے۔"

"ایک بات کہوں بُرا تو نہیں مانو گی؟"

"کہو...؟"

"میں چاہتا ہُوں عِصمت کہ سب کو ہمارے بارے میں معلوم ہو جائے۔ ہم جدھر بھی جائیں لوگ ہمارے بارے میں باتیں کریں، خوب باتیں کریں۔ ہمیں ایک دوسرے کا نام لے کر چھیڑیں اور ہم اُن سب کا مذاق اُڑائیں۔ اسی طرح ساتھ رہیں، ساتھ آئیں، ساتھ جائیں حیران کر دیں سب کو۔"

"خُدا کی پناہ۔ اِس کے بعد کیا ہوگا؟" عِصمت نے کہا۔

"اُس کے بعد عِصمت، اس کے بعد۔" اقبال کوشش کے باوجود جملہ پورا نہ کر پایا۔

"اِسی لئے کہتے ہیں کہ جذبات مُنہ زور گھوڑے کی مانند ہوتے ہیں۔ لگام ضروری ہے۔"

"تم خوش ہو عِصمت؟"

"کس بات پر؟"

"ہمارے راستے کی مشکلات کس طرح دُور ہُوئی ہیں۔ کیا قدرت نے کسی اور کو اِس طرح نوازا ہوگا؟"

"نہ جانے کن مشکلات کی بات کر رہے ہیں آپ مسٹر اقبال؟" عِصمت مُسکرا کر بولی۔

"مذاق اُڑائے جا رہی ہو کم از کم اتنا اجتناب تو نہ کرو۔ اپنی نہ سہی میری خوشی میں تو شریک ہو جاؤ۔ ویسے عِصمت تم جس جگہ رہ رہی ہو وہ انسانوں کی بستی نہیں ہے۔"

"جانور آباد ہیں وہاں؟"

"نہیں فرشتے۔ ایسے لوگ میں نے پہلے تو نہیں دیکھے۔"

"ایک اطلاع دے دُوں جناب کو۔ یونیورسٹی ہمارے لئے اتنی خطرناک نہیں جتنی وہ کوٹھی ہے۔"

"کیوں...؟"

"وہاں جو فرشتے رہتے ہیں نا اُن میں ایسے ایسے شیطان بھی پوشیدہ ہیں جن سے اصل شیطان بھی پناہ مانگتا ہے، خاص طور سے ثناء اور نُدرت سے ہوشیار رہنا۔ اگر وہاں کہیں کوئی بھی ظاہر ہو گئی تو جینا حرام ہو جائے گا۔"

"اوہ... ہاں نُدرت سے وہ شریر ہے۔ مگر کیا کروں عصمت میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ایک شخص کو سامنے بٹھا کر اپنی کہانی سُناؤں۔ اُسے بتاؤں کہ کس طرح سچے دل سے مانگی دُعائیں پُوری ہو جاتی ہیں۔ ایک خاتون پر نگاہ پڑی، دل کو بھا گئیں۔ بے بسی سے سوچا، پھر بے غیرتی اختیار کر لی۔ بے بسی سے

یوں سوچا کہ ہر چیز قابلِ حصُول تو نہیں ہوتی۔ بے غیرتی اِسی شکل میں اختیار کی کہ خواہ مخواہ تعاقب شروع کر دیا اور توجہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ یہ سوچ کر کہ کم از کم دل کی لگی کو اِس طرح مٹا لیا جائے۔ ڈانٹ پڑ جائے یا بے عزّتی کر دی جائے تو شاید دل کی طلب اپنی جگہ رُک جائے۔ وہ بھی نہ ہُوا اور کچھ کہا بھی نہ گیا تو آتشِ شوق کو ہَوا مِلی اور پھر قُدرت کا کرنا یوں ہُوا کہ خون کا نذرانہ طلب کر لیا گیا اور شاید یہی حصُولِ محبُوب کا راستہ تھا۔ زخمی ہُوا اور وہ زخم محبُوب کے دل میں جگہ بنا گئے۔ نہ صرف جگہ بنائی بلکہ وہ راستے بھی پیدا کر دیئے جو سیدھے درِ محبُوب تک جاتے تھے اور پھر وہ سب کچھ ہُوا جس کا تصوّر اہلِ دل خواب میں تو کر سکتے ہیں، حقیقت کی دُ : میں یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

"ارے، ارے آپ تو مثنوی زہرِ عشق پڑھنے لگے۔ اقبال صاحب حقیقتوں کی دُنیا میں آئیے۔"

"میں حقیقت ہی کی دُنیا میں ہُوں جو کچھ مجھے مِل گیا ہے اُس کے مِل جانے پر اتنا نازاں ہُوں کہ بس میری قوتِ برداشت جواب دے گئی ہے۔"

"مجھے شبہ ہے کہ کہیں آپ اِس میز پر کھڑے ہو کر اُچھلنا نہ شروع کر دیں۔"

"یقین کرو کہ اگر یہ سب کچھ بُرا نہ ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا۔"

"اچھا، اچھا۔ اب بے کار باتوں سے بالکل گریز کیجئے ویسے آپ کی طبیعت تو اب بالکل ٹھیک ہے نا۔ میرا تو خیال ہے سر پر لگے ہُوئے زخموں نے کچھ اثرات ضرور چھوڑے ہیں۔"

"دل کے زخموں کی بات نہیں کریں گی۔ آپ محترمہ عصمت صاحبہ۔"

"ہُونہہ.... سب فرسُودہ باتیں ہیں۔ نہ دل میں کوئی زخم ہوتا ہے نہ اور کچھ۔ بس ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ہاں اقبال ایک بات بار بار میرے ذہن میں آتی ہے۔"

"کیا...؟"

"اُس دن کا واقعہ میں سُناؤں تمھیں۔ جب تم زخمی ہُوئے تھے۔ اس دن جب تم زخمی ہو کر گر پڑے تو میں تمھارے قریب ہی تھی۔ اب ظاہر ہے انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے میں چاہتی تھی تمھیں فوراً طبّی امداد ملے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ میری نگاہ ایک آفیسر پر پڑی جو انتظامی اُمور میں شامل تھا۔ میں نے اُس سے مدد مانگی اور آفیسر نے بھرپُور طریقے سے ہماری مدد کی اور تمھیں ہسپتال پہنچوا دیا۔ لیکن آفیسر کے سلسلے میں ہم سب کے ذہنوں میں ایک کھچڑی پک رہی ہے۔"

"وہ کیا...؟" اقبال نے تعجب سے پُوچھا۔

"ہمارے ہاں ایک ملازم تھا خیر دین۔ بظاہر وہ شخص باہر سے آیا ہُوا تھا اور سیدھا سادہ دیہاتی تھا لیکن وہ انسپکٹر اُس کا اتنا ہمشکل تھا کہ تصوّر سے باہر ہے۔ میں نے دوسرے لوگوں سے بھی اِس کا تذکرہ کیا اور سب ہی اِس بات میں دلچسپی لینے لگے کہ پتہ لگایا جائے کہ خیر دین کی اور اُس کی شکل آپس میں اتنی کیوں مِلتی جلتی ہے۔ خیر دین بڑی دلچسپ شخصیت تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے وہ ہمارے ہاں سے ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ عجیب و غریب ہونے کے باوجود اُسے دیہاتی سمجھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اِس پولیس آفیسر کو دیکھ کر بار بار دل میں یہ خیال اُبھرتا ہے کہ وہ خیر دین سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتا ہے۔ اُس وقت تو خیر میں بھی پریشان تھی جب تم زخمی ہُوئے تھے لیکن بعد میں بھی اُس سے ملاقات ہُوئی اور میں نے اُسے خوب غور سے دیکھا۔ یقین کرو چہروں میں مماثلت ضرور ہوتی ہے لیکن ایسی بے پناہ مماثلت میں نے پہلے نہیں دیکھی۔ میں نے اُسے چائے پر مدعو کیا ہے اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئے گا۔"

"ارے بات اِس حد تک ہے؟" اقبال نے کہا۔

"اُس کوٹھی کی دلچسپیوں سے تم واقف نہیں ہو اقبال۔ یہ میری ڈیوٹی ہے کہ اُسے کوٹھی میں پیش کروں۔"

"ویری گڈ۔ جب تم نے اُسے چائے کی دعوت تک دے دی تو اُس سے اُس کے بارے میں پُوچھا بھی نہیں۔"

"پُوچھا ہے۔ وہ اپنا نام مائیکل ڈیسوزا بتاتا ہے اُردو ٹھیک سے نہیں بول پاتا۔"

"تب خیر دین سے اُس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے خیر دین کچھ پڑھا لکھا ہے۔"

"خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ بس یہی تعلیم ہے اُس کی۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے اقبال کیوں نہ آج مائیکل ڈیسوزا سے ملاقات کریں اور اُسے مجبور کر کے گھر لے چلیں، لُطف رہے گا" عصمت نے کہا۔

"کِسی پولیس والے کو کوئی مجبور کر سکتا ہے۔"

"بھئی کوشش کریں گے، سچ بہت لُطف آئے گا۔"

"عجیب بات ہے مگر اُسے تلاش کہاں کروں؟"

"ہیڈ کوارٹر سے معلوم ہو جائے گا۔"

"دلچسپ بات ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ عصمت صاحبہ بس اللہ والی خاتون ہیں لیکن اب بہت سے راز منکشف ہو رہے ہیں؟" اقبال نے کہا۔

"یقین کرو اقبال میں کبھی ایسے چکّر میں نہیں پڑی۔ بس اب طبیعت میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔"

"اوہ.... تب تو ٹھیک ہے۔ اِن تبدیلیوں میں اضافہ ہوتا رہنا چاہیے میرا خیال ہے ہم ایک بجے نکل چلیں۔"

"او ... " عصمت نے کہا۔ ٹھیک ایک بجے وہ دونوں پولیس ہیڈ کوارٹر چل پڑے۔ مائیکل ڈیسوزا کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو ایک کانسٹیبل نے اُس کے دفتر کا پتہ بتا دیا۔ مائیکل ڈیسوزا کے اردلی نے اُنھیں بتایا کہ وہ بڑے صاحب کے پاس گئے ہیں ابھی آتے ہوں گے انتظار کر لیں اور وہ دونوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک جسیم پولیس افسر اندر داخل ہو گیا۔ سیاہ رنگ، بڑی بڑی مونچھیں، خوفناک چہرہ۔ اُس نے کُرسی پر بیٹھتے ہُوئے کہا۔

"جی فرمائیے؟"

"وہ سر! ہمیں مسٹر مائیکل ڈیسوزا سے ملنا ہے۔"

"تو آئیے جی! میں ہی مائیکل ڈیسوزا ہُوں۔" افسر نے کہا اور عصمت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"آ... آپ...؟" اُس نے گھُٹے گھُٹے لہجے میں کہا۔

مائیکل ڈیسوزا نے باری باری دونوں کو دیکھا اور پھر بولا "جی فرمائیے کیا خدمت کرنی ہے مجھے آپ کی؟"

"آپ مائیکل ڈیسوزا ہیں؟" عصمت نے گھبرائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"تو اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے بی بی؟"

"میرا مطلب ہے آپ؟"

"ہاں جی میرا مطلب بھی میں ہی ہُوں۔"

"پھر وہ کون تھے؟"

"بات کیا ہے بی بی پریشان نہ ہوں آپ سلاٹر ہاؤس میں نہیں بیٹھیں ہیں۔ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتائیں۔"

"معاف کیجئے گا میں نے آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا دراصل وہ ایک صاحب...."

"سوری آفیسر آپ کے ہاں مائیکل ڈیسوزا نامی کوئی اور پولیس افسر بھی ہیں؟" اس بار اقبال نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اور کوئی نہیں ہے مگر آپ بات تو بتائیں کوئی چیٹنگ ہُوئی ہے آپ کے ساتھ؟ کسی نے فرضی افسر بن کر کوئی دھوکہ تو نہیں دیا آپ کو؟"

"نہیں، ابھی کوئی بات نہیں ہے ہماری ملاقات ایک افسر سے ہُوئی تھی بہت اچھے آدمی تھے مگر انھوں نے اپنا تعارف مائیکل ڈیسوزا کہہ کر کرایا تھا اور ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ کبھی اُن سے ملنا چاہیں تو ہیڈ کوارٹر آ جائیں۔"

"کہاں کا افسر تھا وہ؟"

"پولیس افسر؟"

"نہیں بی بی۔ کے ایم سی میں ایک مائیکل ڈیسوزا ضرور افسر ہے اُس سے مل لیں۔"

"آپ کو تکلیف دی اِس کے لئے معذرت چاہتے ہیں۔" اقبال نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"نہیں جی معذرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ پر یہ حیرت کی بات ہے کہ کوئی میرے نام سے آپ سے ملا۔ مجھے بھی سوچنا پڑے گا وہ کون ہو سکتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور کو میرے نام سے فریب دینے کی کوشش کرے۔"

"جی انھوں نے ہمیں کوئی فریب نہیں دیا۔"

"مجھے تو دیا کہ میرا نام استعمال کیا۔ آپ بیٹھیں ابھی اِس سلسلے میں تحقیقات کرتا ہُوں۔"

"جی وہ۔ بس ہمیں اجازت دیں۔ ہم لوگ یونیورسٹی سے آئے

تھے" عصمت نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کہاں سے آئے تھے؟"

"یونیورسٹی سے"

"ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں آپ لوگ؟"

"جی ہاں"

"کیا رشتہ ہے آپ میں؟"

"بس یونیورسٹی کے ساتھی ہیں"

"اور یونیورسٹی سے اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے ہیں" افسر نے گھنٹی بجائی اور ایک آدمی اندر داخل ہوگیا "حکیم صاحب کو بلاؤ" مائیکل ڈیسوزا نے حکم دیا اور عصمت کی روح فنا ہوگئی۔

وہ خوف زدہ نگاہوں سے اقبال کو دیکھنے لگی لیکن اقبال ... حکیم صاحب انسپکٹر تھے اندر آکر اُنھوں نے سلوٹ مارا اور مائیکل ڈیسوزا نے کہا۔

"حکیم صاحب! محکمہ پولیس میں مائیکل ڈیسوزا نامی کوئی اور افسر ہے؟"

"نہیں سر، اِس نام کا کوئی دوسرا نہیں ہے"

"کسی نے اِن بچوں کو میرے نام سے بہکایا ہے"

"اوہ کیا قصہ تھا؟"

"کچھ نہیں سر، یونیورسٹی میں کچھ عرصہ قبل ہنگامے ہوئے تھے اور یہ افسر وہاں انتظامات کر رہے تھے اُنھوں نے ہماری بہت مدد کی اور کہا کہ اگر ہمیں کوئی پریشانی ہو تو ہیڈ کوارٹر آجائیں اور مائیکل ڈیسوزا سے مل لیں۔ ہم نے یہی سوچا تھا کہ مائیکل ڈیسوزا اُن کا اپنا نام ہے۔ ہو سکتا ہے اُنھوں نے اِن مسٹر ڈیسوزا کے بارے میں کہا ہو" اِس بار پھر اقبال نے کہا، اور مائیکل ڈیسوزا چونک کر اقبال کو دیکھنے لگا پھر اُس نے کہا۔

"تم اپنا بیان بدل رہے ہو"

"نہیں جناب! اِس میں بیان بدلنے کی کیا بات ہے؟ ہم یہاں مسٹر مائیکل ڈیسوزا سے ملنے آئے تھے اُن افسر صاحب کی ہدایت کے مطابق یہ سوچ کر کہ وہ خود ہی مائیکل ڈیسوزا تھے ہو سکتا ہے اُنھوں نے ہمیں کسی پریشانی پر آپ سے ملنے کے لئے کہا ہو"

"ہُوں! تو کوئی پریشانی ہے تمھیں؟"

"جی نہیں، اِس وقت صرف اُن کا شکریہ ادا کرتے آئے تھے ہم لوگ" اقبال بولا۔

"یہ ہنگامے کتنے عرصے پہلے ہوئے تھے؟"

"کافی دن ہوگئے"

"آج آپ لوگوں کو شکریہ کا خیال کیسے آگیا؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"بس آج ہمیں فرصت تھی ہم نے سوچا کہ اُن افسر صاحب کا شکریہ ادا کر دیا جائے اور اُنھیں اپنے ہاں چائے پر دعوت دے دی جائے"

"کیا مدد کی تھی اُنھوں نے آپ کی جس کے بدلے آپ اُنھیں اپنے گھر پر چائے پلانا چاہتے تھے؟" مائیکل ڈیسوزا نے پوچھا۔ عصمت کی روح فنا ہوئی جارہی تھی لیکن اقبال مطمئن تھا۔ ظاہر ہے کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی چنانچہ اُس نے کہا۔

"یونیورسٹی کے ہنگاموں میں مَیں زخمی ہوگیا تھا یہ دیکھئے میری پیشانی پر زخم کا نشان بھی ہے۔ اُنھوں نے مجھے ہسپتال پہنچایا تھا اور کافی ذمہ داری اور ہمدردی کا ثبوت دیا تھا"

"واہ بھئی واہ، یعنی زخم ٹھیک ہوگیا اور سارے معاملات رفع دفع ہوگئے اس کے بعد آپ کو اُن کے احسان کا خیال آیا"

"جی ہاں! زخمی حالت میں مَیں یہاں نہیں آسکتا تھا"

"کہاں رہتے ہو؟" مائیکل ڈیسوزا نے سوال کیا۔ اور جواب میں اقبال نے احسان صاحب کی کوٹھی کا پتہ بتا دیا۔ مائیکل ڈیسوزا کسی قدر سنبھل گیا تھا۔

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے بھئی لیکن خیال رکھنا اگر کبھی وہ افسر دوبارہ نظر آئے تو اطلاع ضرور دینا یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ اُس نے اپنا نام مائیکل ڈیسوزا کیوں بتایا"

"بہت بہتر" اقبال نے کہا اور بولا "اب ہم جا سکتے ہیں"

"ہاں، خدا حافظ" مائیکل ڈیسوزا نے کہا اور وہ دونوں باہر نکل آئے عصمت کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوچکے تھے اور اقبال مسکرا رہا تھا باہر نکل کر اُس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"خدا ہی سمجھے اِن پولیس والوں سے بس جان نکال دیتے ہیں"

"جان بچی تو لاکھوں پائے، جلدی سے ہیڈ کوارٹر کے لان سے نکل چلو ورنہ کہیں کوئی مصیبت ہی گلے نہ پڑ جائے"

"تو ڈر کیوں رہے ہو۔ ہم یونیورسٹی سے بھاگے تو نہیں نہ ہی ہمارا کسی غیر ملک جانے کا ارادہ ہے مگر تعجب ہے اُس شخص نے ہمیں اپنا نام مائیکل ڈیسوزا بتایا تھا جب کہ پورے

محکمہ پولیس میں بقول اُن صاحب کے مائیکل ڈیسوزا نامی اور کوئی دوسرا افسر نہیں ہے"

"سوچنا پڑے گا" اقبال سوچنا پڑے گا مگر اِس وقت تو سوچنے کی صلاحیتیں ہی گم ہوگئی ہیں مجھے تو یُوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی الزام میں دھر لئے جائیں گے"

"اِس میں کوئی شک نہیں۔ پولیس کی قربت بڑی خوفناک چیز ہوتی ہے" اقبال نے گہری گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کہیں بیٹھو چائے پلاؤ مجھے میرا تو حال خراب ہو رہا ہے" عصمت نے کہا۔

"بسر و چشم، ابھی وقت ہے ہمارے پاس آؤ"

"کہیں پولیس ہمارا تعاقب ہی نہ کر رہی ہو"

"اُن لوگوں سے کچھ بعید بھی نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں آخر ڈرنے کی کیا بات ہے؟ آؤ وہ سامنے ریسٹوران ہے اُس میں چائے پیتے ہیں" دونوں ریسٹوران میں جا بیٹھے اور اقبال نے چائے منگوالی، چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ اِس واقعے پر غور کرتے رہے اقبال کہنے لگا۔

"آخر اُس نے اپنا نام غلط کیوں بتایا تھا؟"

"اقبال! مجھے کچھ شبہ ہو رہا ہے ہو سکتا ہے اِس شبے میں کوئی حقیقت ہی ہو"

"ذرا تفصیل بتاؤ تو کچھ پتہ بھی چلے"

"خیر دین نامی ایک شخص کافی عرصے سے احسان صاحب کی کوٹھی میں ملازمت کرتا ہے، بلکہ کرتا تھا گھریلو کام کاج پر مامور تھا۔ بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اُس کی شخصیت اُس کی حیثیت سے ہم آہنگ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ باتیں تو وہ ملازموں ہی کی سی کرتا تھا معلوم ہے اپنا نام کیا بتاتا تھا؟"

"مجھے کیا پتہ بھئی"

"خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ۔ یہ اُس کا نام تھا"

"سبحان اللہ، اچھا نام تھا تو پھر ہوا کیا؟"

"بس تھوڑے دن پہلے وہ ہمارے ہاں سے نوکری چھوڑ گیا۔ اور پھر اُس دن جب یونیورسٹی میں ہنگامے ہوئے تو جس افسر نے ہماری مدد کی وہ بالکل خیر دین کا ہمشکل تھا، مَیں اُس وقت ڈری تھی لیکن مسئلہ ذرا سنجیدہ تھا اِس لئے توجہ نہ دے سکی اتفاق سے مجھے وہ دوبارہ بھی نظر آگیا۔ گھر میں تذکرہ ہُوا تو خیر دین کے بارے میں شبہات کا اظہار کیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ میں کسی وقت اُس شخص کو گھر پر مدعو کروں تاکہ دوسرے لوگ دیکھیں تو سہی کہ آخر وہ خیر دین سے اِتنا ملتا جلتا کیوں ہے؟ دوسری بار البتہ جب وہ مجھے ملا تو میں حیران رہ گئی اُس کا لہجہ ٹیڑھا تھا جب کہ پہلی بار جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ صاف اُردو میں بولا تھا۔ میں نے اُس سے ساری باتیں کیں اور اُس نے گھر آنے کا وعدہ کرلیا لیکن اب تم نے دیکھ لیا کہ اُس کا اصل نام ہی مائیکل ڈیسوزا نہیں ہے کیا یہ بات قابل غور نہیں ہے اقبال کہ اُس شخص نے اپنا نام غلط بتایا۔ زبان ٹیڑھی کرکے بولا گویا وہ خود کو چھپانا چاہتا تھا"

"ہو سکتا ہے" اقبال نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"اِس کی وجہ پر غور کرو۔ کیا وہ خیر دین ہو سکتا ہے؟"

"اگر وہ کوئی پولیس آفیسر ہے تو اُس نے تمھارے گھر ملازمت کیوں کی؟"

"اب یہ ساری باتیں مَیں کیا جانوں؟"

"ضرورت ہی کیا ہے جاننے کی۔ تم بس میرے بارے میں سوچو کیا مَیں کوئی مشتبہ شخصیت ہوں؟"

"تم ...؟" عصمت نے کہا اور ہنس پڑی۔

"کیوں میری شکل پر حماقت برستی ہے؟"

"عام حالات میں تو نہیں" عصمت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور خاص حالات میں؟"

"خاص حالات میں کبھی دیکھا نہیں"

"اوہ گویا یہ دعوت ہے" اقبال نے خوش ہوکر کہا۔

"کیسی دعوت؟"

"خاص حالات کی۔ بہرحال شکریہ۔ کم ازکم دعوت تو ملی۔ بے حد شکریہ محترمہ عصمت"

"چائے کچھ زیادہ گرم تھی۔ اُٹھو بھئی [illegible] رہی ہے۔ ویسے ایک بات بتادوں ہم سخت خطرات میں گھرے ہوئے ہیں"

"خطرات؟" اقبال نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں بھئی گھر میں بڑے بڑے شیطان موجود ہیں بال کی کھال نکال لیتے ہیں۔ بے شک ہم لوگ ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ لیکن ہمارا ساتھ آنا جانا اُن کی نگاہوں میں مشکوک ہو سکتا ہے اور اِس کے بعد یُوں سمجھ لو کہ چٹکیوں میں اُڑا کر رکھ دیں گے وہ سب شیطان ہیں"

"تعجب ہے بھئی تم اِس بات سے خوفزدہ ہو رہی ہو۔ جیسے

منظرِ عام پر لانے کے لئے نہ جانے کتنی کتنی اُلجھنوں سے گزرنا پڑتا۔ حقیقت تو یہ ہے عِصمت صاحبہ کہ میری دِلی خواہش ہے کہ سب لوگ ہمارے بارے میں جان جائیں اور یہ بات ہمارے والدین بھی سوچ لیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں اقبال۔ بے کار باتیں ہیں یہ سب۔"

"یعنی آپ کے خیال میں ہماری زندگی کا مسئلہ ہے اور آپ ان باتوں کو بے کار قرار دے رہی ہیں۔"

"زندگی کے مسئلے ایسے حل نہیں ہوتے، سڑکوں پر اور ریستورانوں میں۔"

"دعوت ایک اور دعوت۔" اقبال مُسکرا کر بولا۔

"کیا؟" عِصمت نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"یعنی... یعنی یہ دعوت بھی دی جا رہی ہے کہ یہ مسئلے سڑکوں کے بجائے گھروں میں طے کئے جائیں۔ بہت بہتر عِصمت صاحبہ آپ اطمینان رکھیئے یہ ذمّہ داری میری ہے۔"

عِصمت ہنس پڑی تھی پھر اُس نے کہا۔

"اب اُٹھ جاؤ ورنہ نہ جانے کتنی دعوتیں تمہارے ذہن میں گھُس جائیں گی۔ چلو جلدی اُٹھو۔"

اقبال نے بل کی رقم نکال کر پلیٹ میں رکھی اور عِصمت کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر جا رہے تھے۔

☆

اختر یونیورسٹی سے عِصمت اور اقبال کے پیچھے لگا ہُوا تھا۔ ویسے بھی فراغت تھی اور ابھی کوئی خاص مصرُوفیت نہیں پیدا ہُوئی تھی۔ گو عادل صاحب کاروباری معاملات میں کافی دِلچسپی لے رہے تھے۔ اور اختر اور خالد کے سپُرد بھی بہت سی ذمّہ داریاں کر دی گئی تھیں لیکن ابھی یہ ذمّہ داریاں کوئی باقاعدہ صُورت نہیں اختیار کر سکی تھیں۔ عادل حسین صاحب اپنے طور پر بہت سے معاملات حل کر رہے تھے۔ ہاں کبھی اِن دونوں کی ضرورت پیش آجاتی تو وہ اُن سے مدد لے لیا کرتے تھے۔ ویسے بھی خالد ذرا سنجیدہ تھا اور اُس نے کبھی بھی اختر کو کسی بڑی اُلجھن میں نہیں پڑنے دیا تھا بلکہ وہ اُسے زیادہ تر آزاد ہی رہنے دیتا تھا اور وہ کام جو اختر کے سپُرد کئے جاتے تھے خود ہی کر ڈالتا تھا چنانچہ اختر کے لئے عیش ہی عیش تھے۔

اختر اُس وقت کافی سمجھداری سے کام لے رہا تھا۔ ثناء وغیرہ کے بارے میں اُس کی معلومات محدُود نہیں تھیں خاص طور سے یہ ثناء بیگم جس چیز کے پیچھے پڑ جائیں اور اُن کے دماغ میں جو کچھ بیٹھ جائے اُسے نکالنا دُنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا تھا۔ اس وقت اُنھوں نے تین کیس اختر کے سپُرد کئے تھے۔ یہی شکر تھا کہ خود اختر کا کیس بھی اُس کے سپُرد کر دیا گیا تھا ورنہ اگر ثناء اپنے طور پر اختر اور نُدرت کی کھوج نکالنے بیٹھ جاتی تو اُس کے لئے یہ مشکل نہ ہوتا کہ اصل صُورتِ حال معلوم کر لیتی۔ بہرطور ابھی کسی بھی طرح نُدرت کا معاملہ باقاعدہ منظرِ عام پر نہیں آنا چاہیئے تھا۔ پہلے خالد کا کیس طے ہو جائے۔ اُس کے بعد اختر کسی نہ کسی ذریعے سے اپنا مُعاملہ عادل حسین صاحب کے کانوں تک پہنچا سکتا تھا۔ جو اُلجھن در پیش تھی اُس کا حل خود بخود نکل آیا تھا۔ بارہا اختر نے کینیڈا میں رہ کر سوچا کہ نُدرت سے دل تو لگا بیٹھا ہے لیکن کیا عادل حسین صاحب روایتی باپوں کی مانند ایک ڈرائیور کی بیٹی کو بہُو کی حیثیت سے قبُول کر لیں گے۔ ہر چند کہ اُسے اپنے باپ پر اعتماد تھا بہت ہی سنجیدہ اور نیک فِطرت کے مالک تھے عادل حسین صاحب لیکن بہر طور خاندانی معاملات اور اپنی حیثیت ہر شخص مدِ نگاہ رکھتا ہے۔ اِس سِلسلے میں اختر کو ذرا مشکلات پیش آسکتی تھیں۔ لیکن اِس کے لئے بھی وہ بَد دِل نہیں تھا اُسے یقین تھا کہ اُس کے مددگار کافی طاقتور ہیں اور وہ اُس کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی بس ذہن میں ایک اُلجھن سی تھی اور یہاں آنے کے بعد جب تمام صُورتِ حال واضح ہُوئی تو یہ اُلجھن خود بخود اُس کے ذہن سے نکل گئی۔ اب تو غلام احمد صاحب فرشتوں کی مانند اُن سب کی نگاہوں میں تھے۔ اختر خود بھی اِس بات سے بہت متاثر ہُوا تھا اور اُسے خوشی تھی کہ اُس نے کم از کم ریڈ کراس کے سِلسلے میں غلام احمد صاحب کی مدد کر کے بہت ہی اچھا کام کیا تھا۔ آج تک اُس نے اِس بات کا اظہار غلام احمد صاحب پر نہیں کیا تھا کہ ریڈ کراس کے اُن متعلقہ افراد کو تلاش کرنے کے سِلسلے میں اُسے کتنی دِقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ سب کچھ نُدرت کے لئے تھا اور اب جب کہ غلام احمد کی پوزیشن انتہائی محفُوظ ہو گئی تھی۔ اختر کو اِس بات کا یقین تھا کہ اگر نُدرت کا مسئلہ کبھی عادل حسین صاحب کی عدالت میں پیش ہُوا تو فیصلہ اُس کے خلاف نہیں دیا جائے گا۔ بات ثناء کی تھی۔ ثناء کو اگر یہ تمام صورتِ حال معلوم ہو گئی تو پھر خواہ مخواہ نُدرت کی کھینچائی بھی ہو گی۔ اور ہو سکتا ہے یہ بات جب پھیلے تو وقت سے پہلے عادل حسین اور غلام احمد کے علم میں آجائے چنانچہ اُس نے فوراً ہی ثناء کی اطاعت قبُول کر لی تھی ثناء کو ہینڈل

کرنے کا طریقہ بھی اُس کے ذہن میں آگیا تھا۔ یہی سب سے بہتر صُورت تھی کہ ثناء کو دوسرے چکّروں میں اُلجھائے رکھا جائے اور اُسے باقاعدہ رپورٹیں پیش کی جاتی رہیں۔

چنانچہ اِسی خیال کے تحت آج اُس نے عِصمت اور اقبال پر کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا جُونہی یہ دونوں یونیورسٹی کے لئے نکلے اختر بھی اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اور اُس کے بعد اُس نے بقیہ وقت یونیورسٹی میں ہی گزارا۔ یہاں تک کہ اُس نے ان لوگوں کو کینٹین میں جاتے ہُوئے دیکھا۔ اِس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ عِصمت اور اقبال کے والدین آپس میں بے پناہ اُنسیت رکھتے تھے اور اِس کے مظاہرے وہ دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ اِس طرح عِصمت کا اقبال سے بے تکلّف ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ لیکن کینٹین اور اُن دونوں کی یگانگت اِس محبت اور دوستی سے ذرا الگ ہٹ محسوس ہو رہی تھی چنانچہ اختر کی تیز نگاہیں اُن کا جائزہ لیتی رہیں پھر اُس وقت بھی وہ اُن کے پیچھے تھا جب وہ دونوں یونیورسٹی سے نِکل کر چل پڑے تھے لیکن اختر کے وہم و گُمان میں بھی نہیں تھا کہ اُن کا رُخ پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف ہو گا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں پہنچ کر اختر چکرا کر رہ گیا تھا۔ یہاں آنے کا مقصد قطعی سمجھ میں نہیں آسکا تھا عجیب اُلجھن میں تھا۔ اُس نے اُنھیں ایک پولیس آفیسر کے کمرے میں جاتے ہُوئے دیکھا پھر پولیس آفیسر کو بھی دیکھا۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ صُورتِ حال تو کافی تشویشناک تھی۔ اختر اُن کا جائزہ لیتا رہا۔ کافی دیر تک وہ پولیس آفس میں رُکے اور اُس کے بعد وہاں سے بھی نِکل آئے۔ اختر بڑا حیران تھا۔ وہ دونوں پولیس ہیڈ کوارٹر سے نِکلے ہی تھے کہ ایک جیپ تھوڑے فاصلے پر آکر رُکی اور اُس سے ایک پولیس آفیسر نیچے اُتر آیا۔ کوئی بڑا پولیس آفیسر تھا۔ اختر نے یُونہی سرسری سی نگاہوں سے اُسے دیکھا لیکن دفعتاً ہی اُس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ چہرہ... یہ چہرہ تو شناسا ہے کس کا چہرہ ہے یہ؟ اُس نے اپنی یادداشت پر زور دیا اور اُس کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سُکڑ گئے یہ چہرہ بالکل پروین کا سا تھا۔ بالکل خیر دین کا سا چہرہ۔ یہ کیا قِصّہ ہے؟ کچھ ایسی باتیں ہو تو رہی تھیں جن پر اختر نے غور نہیں کیا تھا لیکن آفیسر؟

اختر کا ذہن برق رفتاری سے کام کرنے لگا وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ پولیس آفیسر کے بارے میں چھان بین کرے یا عِصمت اور اقبال کو دیکھے۔ نہ جانے کیوں اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ ذرا اِس پولیس آفیسر کو قریب سے دیکھ لیا جائے پتہ نہیں کیا چکّر ہے؟ خیر دین نوکری چھوڑ کر جا چُکا تھا اور پروین نے بھی اُس کے بارے میں کچھ الفاظ ادا کئے تھے۔ چنانچہ اختر نے اُن دونوں کو نظر انداز کر دیا اور اب وہ پولیس آفیسر کی کھوج میں لگ گیا۔ اُس نے کافی فاصلے سے پولیس آفیسر کا تعاقب کیا۔ اور اُسے ایک کمرے میں جاتے ہُوئے دیکھا۔ اُس کے دروازے پر جو تختی لگی ہُوئی تھی اُس پر ایس۔ ایس۔ پی تصور بیگ لکھا ہُوا تھا۔ اختر نے زیرِ لب یہ الفاظ دوہرائے اور اِس کے بعد پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ "یہ ایس۔ ایس۔ پی تصور بیگ صاحب خیر دین کے ہمشکل کیوں ہیں؟" اُس نے سوچا اور پھر کافی دیر تک وہ اِس کمرے کے سامنے یونہی بے خیالی کے سے انداز میں کھڑا رہا۔ دو تین لوگوں نے اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھا تھا پھر ایک صاحب نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا۔

"جی فرمایئے آپ کو کسی سے مِلنا ہے؟"

"جی... جی ہاں میرا ایک ساتھی ذرا کام میں مصرُوف ہے۔ میں اُس کا انتظار کر رہا ہُوں۔" اختر نے جواب دیا۔

"اوہ! اچھا اچھا۔" وہ صاحب چلے گئے۔

لیکن اختر کو یہ احساس ہُوا کہ اُس کا اِس طرح یہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے۔ وہ پلٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایس۔ ایس۔ پی تصور بیگ اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اور سیدھا ایک سمت چل پڑا۔ اختر نے خود کو اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا تھا۔ وہ تھوڑا سا فاصلہ دے کر پھر اُس کا تعاقب کرنے لگا۔

آفیسر اُسی جیپ میں بیٹھ کر واپس چل پڑا تھا۔ اور اُس کے بعد اختر کو اُس کا تعاقب کرنے سے کون باز رکھ سکتا تھا؟ چنانچہ اختر اُس کے پیچھے چل پڑا۔ جیپ برق رفتاری سے سفر کرتی رہی اور اُس کے بعد وہ ایک خوبصورت عمارت میں داخل ہو گئی۔ عمارت کے سامنے منوّر علی بیگ کی تختی لگی ہُوئی تھی۔ تصور بیگ۔ منوّر علی بیگ گویا ایس۔ ایس۔ پی صاحب کا یہی مکان ہے۔ اور یہ منوّر علی بیگ یقیناً یا تو اُن کے والد ہو سکتے ہیں یا بھائی؟

بہرطور یہ مسئلہ کافی سنجیدہ تھا۔ چنانچہ اختر نے وہاں سے واپس پلٹتے ہُوئے اِس پر بہت غور کیا۔ فوراً ہی کوئی کارروائی مناسب نہیں تھی۔ پہلے ذرا اِس سِلسلے میں صُورتِ حال کا جائزہ

لے لیا جائے اور جب اطمینان ہو جائے کہ کیا جانا ہے تو کام کی بات ہی معلوم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اس مسئلے کو سب سے پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے خیر دین کا اس طرح اس پولیس آفیسر سے ہمشکل ہونا بڑی تعجب خیز بات تھی۔ اختر عصمت اور اقبال کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ پولیس ہیڈکوارٹر کیوں آئے تھے؟

تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھی میں داخل ہو گیا اس نے دُور ہی سے عصمت کو دیکھ لیا تھا جو ثناء کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی ایک سمت جا رہی تھی۔ اِس کا مطلب ہے کہ عصمت اور اقبال گھر واپس آگئے ہیں۔

اس کے بعد اختر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ثناء کو ابھی رپورٹ دینا مناسب نہیں تھا۔ ذرا حالات پر تفصیلی روشنی پڑ جائے۔ اور شام کی چائے پر یہ روشنی پڑ گئی۔

چائے کے بعد نوجوانوں کی ٹولی گھاس پر جا بیٹھی تھی۔ اختر وغیرہ بھی اس میں شریک تھے۔ عصمت نے خود ہی خیر دین کا تذکرہ نکال لیا اور کہنے لگی۔

"ثناء! آج میں اور اقبال پولیس ہیڈکوارٹر گئے تھے۔"

"تم لوگوں کے لچھن یہی بتاتے ہیں کہ تھوڑے دن کے بعد تم لوگ جیل جاؤ گے" ثناء نے برجستہ کہا۔ اور اقبال اور عصمت جھینپ گئے۔

"اے ثناء! مجھ سے بھی بدتمیزی شروع ہو گئی۔"

"ارے نہیں! نہیں عصمت باجی مذاق کی تو اجازت ہونی چاہیئے" ثناء نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔ عصمت کا وہ احترام بھی کرتی تھی۔

"جاؤ بس اب اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں ہو گی۔" عصمت رُوٹھے ہوئے انداز میں بولی۔

"نہیں عصمت باجی، پلیز دیکھیئے ناں میری عادت تو کچھ نہ کچھ بک دینے کی ہے۔ بک گئی۔ چلیں معاف کر دیں اب ایسا نہیں کیا" ثناء نے خوشامد کرتے ہوئے کہا اور عصمت ہنسنے لگی۔

"میں تو تم لوگوں کی خواہش پر ہی کام کر رہی تھی یہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح خیر دین کے مسئلے کو حل ہونا چاہیئے۔ میں نے اقبال سے بھی اس سلسلے میں گفتگو کی تو اقبال نے کہا کہ ایک بار ان پولیس آفیسر صاحب کو گھر میں سب کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ ان لوگوں کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ پولیس آفیسر صاحب اور خیر دین میں کون سی ایسی چیز ہے، جو

انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے تاکہ سب کا ذہن صاف ہو جائے۔ میں تم لوگوں کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں نے دوبارہ ملاقات پر مسٹر مائیکل ڈیسوزا کو اپنے گھر پر چائے کی دعوت دے دی تھی اور وہ اپنی شستہ اور بہترین اُردو میں میرا شکریہ ادا کر کے اس بات پر تیار ہو گئے کہ کسی بھی فرصت کے وقت وہ ہماری یہ دعوت قبول کر لیں گے۔ میں یہی سوچ کر آج پولیس ہیڈکوارٹر گئی تھی کہ اگر وہ ہاتھ لگ گئے تو ذرا انہیں ساتھ لے آیا جائے لیکن جانتی ہو وہاں جا کر کیا ہُوا؟"

"کیا ہُوا؟" ثناء نے دلچسپی سے پوچھا۔

نُدرت، ندا وغیرہ بھی پوری توجہ سے عصمت کی باتیں سُن رہے تھے عصمت نے کہا۔

"میں وہاں مائیکل ڈیسوزا کو تلاش کرتی ہُوئی اُن کے کمرے تک پہنچ گئی۔ کمرے پر اُن کے نام کی تختی لگی ہُوئی تھی، لیکن وہ موجود نہیں تھے۔ تب میں اُن کے کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی اور تھوڑی دیر بعد مسٹر مائیکل ڈیسوزا اندر داخل ہو گئے۔"

"وہی پولیس آفیسر تھا؟" ثناء نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں، ہرگز نہیں۔ مسٹر مائیکل ڈیسوزا ایک بالکل ہی الگ شخصیت کا نام تھا اور توبہ بھائی یہ پولیس والے بڑی خوفناک چیز ہوتے ہیں۔ میں تو اس نئی شکل کو دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ آنے والے پولیس آفیسر نے اپنا تعارف مائیکل ڈیسوزا کی حیثیت سے کرایا اور ہم سے ہمارے آنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے یہ بات بتا دی کہ ہم ایک اور پولیس آفیسر کی تلاش میں آئے تھے۔ لیکن وہ تو جان ہی کو آگیا کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ بمشکل تمام وہاں سے نکل پائے۔"

"تو کیا اس پولیس آفیسر نے اپنا نام غلط بتایا تھا؟"

"سو فیصدی غلط، بالکل غلط۔ بلکہ اب وہ مجھے دوبارہ نظر آجائے تو میں اُسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ لاؤں۔ خواہ مخواہ مجھے پولیس ہیڈکوارٹر میں پھنسا دیا تھا غلط نام بتا کر اور پتہ ہے وہاں سے کیا معلوم ہُوا؟"

"کیا؟" ثناء نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ کہ پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں مائیکل ڈیسوزا نام کا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔"

"کمال ہے، یہ آخر قصّہ کیا ہے؟ یہ اپنے خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کہیں چکر باز تو نہیں ہیں؟ آخر اس

کا ہمشکل ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟" اور پھر اپنے آپ کو چھپا نہ سکی "ایک بات اور بھی تو کہہ رہی تھیں عصمت۔"

"کیا؟"

"یہ کہ پہلی بار جب وہ تمہیں ملے تھے تو اُن کی زبان بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ دوبارہ ملے تو توڑ مروڑ کر اُردو بول رہے تھے۔"

"ہاں یہ خیال ہے میرے ذہن میں۔ مگر اب یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ دوسری بار یقیناً جان بُوجھ کر زبان بگاڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔"

"تعجب ہے... بے حد تعجب ہے۔ خیر دین بھی کافی دن سے غائب ہے۔ نظر ہی نہیں آیا۔ کبھی کبھی دادی امّاں سے ملنے آجایا کرتا تھا۔ اب تو بہت دن سے غائب ہے۔"

"ہاں بات ذرا قابلِ غور ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ پولیس آفیسر ہمارا خیر دین ہو؟"

"اللہ اُس کی اِس سے بھی زیادہ ترقی کرے، آخر ہمارا نمک کھایا ہے اُس نے اور یہ نمک معمُولی نہیں ہے جناب۔ تھوڑے دن کے بعد ممکن آپ کو شہر کا کمشنر نظر آئے گا" ثناء نے کہا اور سب ہنس پڑے عصمت سنجیدہ ہو کر بولی۔

"نہیں ثناء، تم یقین کرو۔ ایک بار اُس کی صُورت دیکھ لو تو تم بھی حیران رہ جاؤ گی۔"

"تو اب یہ صُورت دیکھنے کا ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"تلاش میں لگی رہُوں گی میں بھی۔ چھوڑوں گی نہیں۔ اِس بار بس وہ مجھے نظر آجائے" عصمت نے کہا اور ثناء گہری نگاہوں سے عصمت کو دیکھنے لگی۔

"یقیناً... یقیناً اب تو آپ کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں عصمت باجی" یہ چوٹ بھی براہِ راست عصمت اور اقبال پر تھی۔ لیکن دونوں انجان بنے رہے۔

اختر اس دوران بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ اب اُس کا ذہن بالکل ہی مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ اِس کا مطلب ہے کہ کوئی لمبا چکر ہے ضرور۔ خیر دین... خیر دین... اختر کے ذہن میں خیر دین... خیر دین گُونجتا رہا۔ اُسے اب اِس مسئلے سے براہِ راست دلچسپی ہو چکی تھی۔ اُن میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اختر نے کیا تیر مارا ہے لیکن ابھی وہ اُن کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ مسئلہ سنجیدہ نوعیت کا بھی ہو سکتا تھا اگر واقعی اُس پولیس آفیسر اور خیر دین میں رابطہ ہے تو آخر وہ پولیس افسر، خیر دین بن کر اِس کوٹھی میں ملازمت کیوں کرتا رہا؟ یا اگر کوئی واسطہ نہیں ہے تو دونوں اِس قدر ہمشکل کیوں ہیں۔ بہت سی کہانیاں اختر کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ ہو سکتا ہے خیر دین کی ذات سے کوئی ایسی پوشیدہ داستان وابستہ ہو جس کا خود خیر دین کو پتہ نہ ہو۔ اختر نے اِس سلسلے میں صبر کرنا ہی مناسب سمجھا تھا! البتہ رات کے کھانے کے بعد اُسے ثناء نے بُلایا تو وہ مُستعد ہو کر پہنچ گیا۔

"یس باس!"

"رپورٹ نہیں پیش کی تم نے؟" ثناء بولی۔

"میں نے تو اِس کام کو کچھ اور آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے مسئلہ یہ ہے کہ اگر پُوری کوٹھی کی رپورٹ آپ کو پیش کی جاتی رہے تو کیا حرج ہے آپ بھی حالات سے واقف رہیں گی۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ انتہائی نفیس، بے حد عُمدہ۔"

"فی الحال عصمت اور اقبال کے بارے میں تفصیلات نوٹ کر لی جائیں۔ میں نے آج اِن پر ہ... رکھی ہے اور اگر یونیورسٹی سے لے کر پولیس ہیڈکوارٹر تک کی بات آپ کو نہ بتائی جاتی تو یہ یقیناً میری زبانی آپ کے علم میں آتی۔ دونوں حضرات ساتھ ساتھ یونیورسٹی گئے۔ کوٹھی سے باہر نکلنے کے بعد بے تکلفی کا انداز پیدا ہو گیا۔ ہنس ہنس کر باتیں کی جاتی رہیں یونیورسٹی کی کلاسز کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ٹھیک گیارہ بجے دونوں کینٹین میں پہنچ گئے۔ آمنے سامنے بیٹھ گئے اور عجیب عجیب سی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ یُوں... یُوں..." اختر نے آنکھیں ٹیڑھی کر کے ثناء کو بتایا اور ثناء قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اختر بدستُور سنجیدہ رہا تھا۔

"اِس کے بعد دونوں افراد کو پولیس ہیڈکوارٹر میں دیکھا گیا۔ اور پھر پولیس ہیڈکوارٹر سے واپس آگئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی اندرُونی چکر ضرور ہے۔ ویسے بھی آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ غلام احمد صاحب اپنے دوست ابراہیم صمدانی سے بہت بعد میں ملے جب کہ یہ دونوں معصُوم بچّے پہلے سے یونیورسٹی میں پڑھتے تھے کیا سمجھیں؟ یونیورسٹی کا ساتھ بعد میں ایک عجیب و غریب رشتے کی شکل میں تبدیل ہو جائے تو ذہنی کیفیت کیا ہو سکتی ہے، اِس کا اندازہ آپ لگا سکتی ہیں۔"

"گُڈ، ویری گُڈ۔ بہت عُمدہ جا رہے ہو اَسسٹنٹ کام جاری رکھو۔ رپورٹیں مکمل طور پر ملنی چاہیئں۔ ویسے اگر یہ تمام حالات بالکل صحیح ہیں تو ہم اپنا کام شروع کریں گے۔"

"اپنا کام؟" اختر نے سوال کیا۔

"بلیک میلنگ، سو فیصدی بلیک میلنگ۔"

"اوہ۔ نہیں باس، غریب لوگ ہیں مارے جائیں گے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو اسسٹنٹ، یہ غریب لوگ ہیں بھئی عصمت کی حالت تو تمھیں معلوم ہے ایک شاندار قسم کی پکنک معہ عمدہ قسم کے کھانے کے عصمت صاحبہ کو ترتیب دینا ہوگی۔ ورنہ اِن کا راز منظرِ عام پر آجائے گا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ کم از کم اِس قدر سزا مناسب ہے۔" اختر نے کہا۔

"کام جاری رکھو اسسٹنٹ مجھے تم سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔"

"مم... مجھ سے۔" اختر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔ عہدوں کا خیال رکھا جائے۔" شناء نے کہا اور اختر نے سیلوٹ مار کر سنجیدہ چہرہ بنالیا۔

"اب اجازت۔"

"ہاں، کام مستعدی سے جاری رکھو۔" شناء نے کہا اور اختر مُسکراتا ہُوا اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

ابراہیم صمدانی نے ہر چند کہ چھٹی لے رکھی تھی لیکن اِس کے باوجود بس ذہن میں کچھ اُلجھا اُلجھا سا پَن تھا۔ بے شک یہاں کا ماحول اور یہ لوگ اتنے نفیس تھے کہ اِن کے درمیان سے جانے والا کفرانِ نعمت ہی کا مرتکب ہو سکتا تھا لیکن انسانی اُصول بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ کئی دِن ہو گئے تھے اُن کو اور اُن کے خاندان کو غلام احمد صاحب کے کوارٹر میں رہتے ہُوئے، کیا خاطر مدارات ہوتی تھی۔ کوئی فرق ہی نہیں تھا۔ کھانا دوپہر کا بیشک بھی کھایا جائے لیکن شام کا کھانا سب کے ساتھ ہی کھانا ہوتا تھا۔ احسان احمد صاحب جیسے پائے کے دولتمند عادل حسین جیسے آدمی اور پھر اُن کے اہل خاندان۔ اِن سب کے تو سامنے بیٹھتے ہُوئے بھی شرم آتی تھی۔ کہاں اسٹیل مل کا ایک معمولی سا ملازم اور کہاں یہ لوگ۔ لیکن اِن لوگوں کی محبتیں لازوال تھیں اور ان کا انداز سمجھ میں نہ آنے والا۔ سب اِس طرح ایک دوسرے سے گھُلے ملے ہُوئے تھے۔ جیسے مالک اور ملازم میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ نہ جانے یہ دُنیا کا کون سا حصہ تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ انسانوں کی اِن آبادیوں میں ایسے گھرانے موجود ہیں جہاں یہ فرق مٹا ہُوا ہے۔ حرفِ غلط کی مانند کوئی تکلف ہی نہیں ہے کسی کے درمیان۔

غلام احمد کتنا خوش نصیب ہے کہ اُسے اِن لوگوں کے درمیان رہنے کا موقعہ مِل گیا۔ ابراہیم اکثر تنہائیوں میں یہ بات سوچتے تھے۔ غلام احمد نے خود بھی ابراہیم صاحب کو جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن جب اُنھوں نے ضد کی تو غلام احمد کہنے لگے۔

"بھائی! تم نے محسوس کرلیا کہ ابتداء میں تو تم میرے پاس آئے تھے ہو سکتا ہے ایک دو دِن سے زیادہ تم یہاں نہ رہتے۔ لیکن اب تم احسان احمد کے مہمان ہو۔ مَیں بھلا اُن کے کسی مہمان کو جانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہُوں؟ یقین کرو یہ مذاق نہیں ہے اگر تم اُن سے مِلے بغیر یہاں سے چلے گئے۔ تو اوّل تو یہ شرافت کے اصُولوں کے خلاف ہے کیونکہ جس طرح وہ لوگ ہم سے پیش آرہے ہیں اُس کے تحت یہ حرکت نامناسب ہوگی۔ دوسرے میری نوکری بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مالک لوگ ہیں ناراض ہو گئے اور یہ کہہ دیا کہ میاں غلام احمد کیسے لوگ ہو تم اور کیسے ہیں تمھارے شناسا کہ ذرا بھی مروت نہیں کی اور مِلے بغیر چلے گئے تو اب تم ہی بتاؤ کہ کیا اِس انداز میں جانا مناسب ہوگا؟"

"مگر یار! تم یہ تو سوچو کتنی شرمندگی کی بات ہے بھئی مہمان ایک دِن رہا جا سکتا ہے۔ دو دِن رہا جا سکتا ہے۔ اب تو بہت دِن ہو گئے اور پھر کوارٹر بھی خالی پڑا ہُوا ہے۔ آج کل کے حالات سے تو تم واقف ہو۔ غلام احمد براہِ کرم اِس سِلسلے میں تم میری مدد کرو۔ بے شک ایسے لوگ دوبارہ دُنیا میں نہیں مِلیں گے۔ لیکن پھر بھی اخلاقی قدریں بھی کوئی چیز ہوتی ہیں۔"

"ہوتی ہیں ناں تو پھر تم یُوں کرو کہ اِس عاجزی سے آج احسان احمد صاحب سے اجازت لے لو۔ بھائی میری نوکری کا خیال کرو، ورنہ کوئی بات نہیں ہے۔"

"اچھی طرح جانتا ہُوں۔ اِس میں تمھارا ہاتھ بھی ہے۔ خُدا کی قسم غلام احمد کون تم سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے، بس یہ احساس ہوتا ہے کہ اب عرصہ زیادہ ہو گیا ہے۔"

"تو اب تم یُوں کرو کہ احسان احمد کی میزبانی نہ قبول کرو اب میرے مہمان رہو۔ میرے پاس تو تم ایک آدھ دِن سے زیادہ نہیں رہے۔"

"مذاق چھوڑو یار آخر چند روز کے بعد جانا ہی ہوگا۔ ملازمت کیسے چھوڑی جا سکتی ہے۔"

"جہاں تک جانے کا مسئلہ ہے تو میرے بھائی یہ بھی وہی

شہر ہے۔ وہاں سے جانے کے بجائے یہاں سے جا سکتے ہو۔"

"مگر کب تک، آخر کب تک؟"

"زندگی بھر، میرا تو خیال یہ ہے کہ تم یہ برابر والا کوارٹر لے لو۔ اور اِس میں آجاؤ۔ ملیر کا وہ کوارٹر بھی کرائے پر ہی ہے ناں؟ آخر اُس میں کیا خُوبی ہے؟ بھائی اسٹیل مل سے تھوڑا سا فاصلہ بڑھ جائے گا۔ آخر اُس کی بسیں یہاں سے بھی تو جاتی ہیں۔"

"کمال کرتے ہو یار... یہ کوارٹر میں کس بُنیاد پر لے لُوں، یہ کوارٹر تو یہاں والوں کے لئے ہے۔"

"میرا خیال ہے کئی کوارٹر خالی پڑے ہُوئے ہیں احسان احمد صاحب سے جھُوٹے مُنہ کہو گے تو سچ مچ مان جائیں گے۔ بلکہ خود ہی پیش کش کر دیں گے۔"

"نہیں غلام احمد تم تو سمجھدار آدمی ہو۔ اب ہم بچے تو نہیں کہ ذرا ذرا سی چیز دیکھ کر خوش ہو جائیں آنے والا وقت ہماری قدر و منزلت کھو دے گا۔ اپنی جگہ ہی ٹھیک ہے یار اور پھر اب آنے جانے سے ہمیں کون روک سکتا ہے۔ اِتنے اچھے لوگوں کے درمیان۔ خُدا کی قسم مجھے تو یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے اِس دُنیا ہی میں نہ ہُوں۔"

"خیر خُدا نہ کرے۔ اللہ ابھی تمھیں اِس دُنیا میں طویل عرصہ رکھے۔"

"بڑے پُر مذاق ہو گئے ہو۔ اچھے حالات مِل گئے ہیں ناں۔ یہاں تو کَس بَل ہی نِکل گئے۔ تم نہ مِل جاتے تو شاید دس بارہ سال کی زندگی نہ بڑھتی جو اب بڑھ گئی ہے۔"

"بس... بس جذباتی باتیں نہ کرو احسان احمد صاحب سے واقعی بات کر لو اِس سِلسلے میں۔ اگر وہ اجازت دے دیتے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تمھیں یہاں لانا یا میرا وہاں پہنچنا کون سا مشکل کام ہے۔"

"ٹھیک ہے شام کی چائے پر میرا خیال ہے میں اُن سے بات کر لُوں گا۔ تم ذرا میری مدد کر دینا۔" ابراہیم صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کہہ دُوں گا کہ ابراہیم صمدانی یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔" غلام احمد صاحب مُسکراتے ہُوئے بولے۔

شام کی چائے پر کچھ مہمان آگئے تھے۔ چائے لگ ہی رہی تھی کہ ایک کار آکر رُکی اور اِس سے ایک معمر لیکن اسمارٹ آدمی برآمد ہُوا۔ جس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں وہ لوگ لان ہی کی طرف آگئے تھے۔ احسان احمد نے سب لوگوں سے اِن کا تعارف کرایا۔

"بھئی یہ ڈاکٹر اکرام احمد ہیں اور یہ مسز اکرام، دونوں مِل کر دونوں ہاتھوں سے اِس دُنیا کو لُوٹ رہے ہیں۔ پہلے ناقص غذاؤں کا انتظام کر کے بینائی کو متاثر کرتے ہیں اور اِس کے بعد علاج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کا کلینک تھوڑے ہی دِنوں میں کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہے۔"

"کمال ہے احسان اِس طرح تعارف کراتے ہیں مہمانوں سے۔" اکرام احمد صاحب نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"اور اکرام یہ عادل حسین ہیں۔ یہ غلام احمد ہیں۔ یہ ابراہیم صمدانی ہیں اور اِسی طرح سے تم بیگمات کی ترتیب کر لو۔ بھئی اکرام میرا بڑا بے تکلف دوست ہے۔ خُدا کے فضل و کرم سے دُنیا کے کئی مُلکوں میں اپنا لوہا منوا چکا ہے یہاں آئی (Eye) کلینک کھولا ہے اُس نے۔ جسے تقریباً تین سال ہو گئے اور اِس تین سال کے عرصے میں اِس "آئی" کلینک نے بڑا شہرہ حاصل کر لیا ہے۔ اکرام پچھلے دِنوں مغربی جرمنی گیا ہُوا تھا مجھے بے چینی سے اُن کی واپسی کا انتظار تھا۔ میرا بڑا بے تکلف دوست ہے۔ ہماری دوستی یُوں سمجھ لیجئے پندرہ سال پُرانی ہے۔" احسان احمد نے سب لوگوں سے اکرام صاحب کا تعارف کرایا اور پھر بولے۔

"اور بھابی بیگم آپ تو صِرف ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر پیسے بنانے کی مشین ہوتا ہے آج کل۔ چنانچہ آپ کو تو کبھی ہماری کسی محفل میں شرکت کی توفیق ہی نہیں ہُوئی۔"

"میرا قصُور نہیں ہے احسان بھیا، بس اکرام سے بات کریں دراصل اُنھوں نے ایک "آئی" اسپیشلسٹ سے شادی ہی اِس لئے کی تھی کہ اُسے کام میں مصرُوف کر دیں۔ اور خود عیش کریں۔"

"اے، اے محترمہ یہ باتیں گھر میں کرنے کی ہیں آپ نے یہاں سب کے سامنے میری پول کھولنا شروع کر دی ہے۔" اکرام احمد نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"حقیقت کہہ رہی ہُوں اِن لوگوں کی شکایت بھی تو بجا ہے۔ پندرہ سال پُرانے دوست ہیں آپ، احسان بھیا سے تو چلو ملاقات ہو ہی جاتی تھی کبھی کبھی لیکن اِس گھر میں آج پہلی دفعہ آنا نصیب ہُوا ہے۔"

"اور وہ بھی میری پُر زور دعوت پر۔" احسان احمد نے کہا۔

"بس یہ ایسے ہی ہیں آپ کے اکرام۔" مسز اکرام نے کہا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ لوگ سب سے گھُل مِل گئے۔

ابراہیم صمدانی اُس وقت اپنے دِل کی بات نہیں کہہ سکے

تھے، چنانچہ خاموشی سے چائے میں شریک ہو گئے اور کافی دیر تک یہ دلچسپیاں جاری رہیں ابراہیم صمدانی کی بیگم سُلطانہ بھی اِس چائے میں شریک تھیں۔ تنویر اُنھیں ہاتھ پکڑ کر لائی تھی۔ اور روزانہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ اکرام صاحب کافی دیر تک بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے اور جب باتوں کا یہ دور ختم ہُوا تو اُنھوں نے کہا۔

"ہاں بھئی یہ انداز، تو ہم لگا چکے ہیں کہ یہاں ہماری مریضہ کون خاتون ہیں لیکن اب ہمیں ذرا اُن کے ساتھ اجازت دی جائے"

"اندر چلیں؟" احسان احمد نے پُوچھا۔

"بہتر ہے کہ اندر ہی چلو۔ یہاں کی روشنی ذرا غیر مناسب ہے"

"آیئے سُلطانہ بہن ڈاکٹر اکرام ذرا آپ کی آنکھوں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں" احسان احمد نے کہا اور ابراہیم صمدانی کے ساتھ غلام احمد بھی چونک پڑے۔

وہ ایک لمحے کے لئے سناٹے میں رہ گئے تھے احسان احمد واقعی عجیب انسان تھے۔ تذکرہ بھی نہیں کیا تھا اُنھوں نے اکرام کا لیکن سُلطانہ بیگم کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اُنھیں فوراً ہی ڈاکٹر اکرام احمد کا خیال آیا تھا۔ معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ دونوں میاں بیوی مغربی جرمنی گئے ہُوئے ہیں۔ چنانچہ انتظار کرتے رہے اور جُونہی پتہ چلا کہ وہ واپس آگئے ہیں اُنھوں نے اُنھیں فوراً ہی شام کی چائے پر بُلالیا تاکہ سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کا معائنہ کرا سکیں۔

"بھئی آیئے ناں آپ لوگ۔ تکلّف کیا ہو رہا ہے" احسان احمد صاحب نے کہا اور پھر ذکیہ بیگم کی طرف رُخ کر کے بولے۔

"ذکیہ! ذرا سُلطانہ بہن کو اندر لے آؤ"

ذکیہ بیگم نے سُلطانہ کا بازو پکڑا اور اُنھیں اندر کی جانب لے گئیں۔ ابراہیم صمدانی کے پاؤں جمے ہُوئے تھے۔ اُن کے بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اُن کے پاس لیکن احسان احمد صاحب نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ غلام احمد نے آہستہ سے کہا۔

"مجبوری ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ کرنے دو"

احسان احمد، ذکیہ بیگم، ڈاکٹر اکرام اور اُن کی بیگم اندر داخل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر اکرام نے اپنی کار سے اپنا بریف کیس اُتار لیا تھا اور اِس کے بعد وہ سب اندر پہنچ گئے۔ سُلطانہ بیگم کے پورے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ تنویر البتہ دوڑتی ہُوئی آگے آگئی تھی۔

اور پھر اِس کے ساتھ ہی رِدا، نُدرت اور شناء بھی جھت کسی کام سے کوارٹر میں چلی گئی تھی۔ سب خاموش کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر اکرام نے سُلطانہ بیگم کو ایک کُرسی پر بٹھایا اور پھر آہستہ سے بولے۔

"آپ گھبرا کیوں رہی ہیں بہن؟ سبھی اپنے ہیں غیر کون ہے یہاں اور پھر یہ دیکھئے یہ میری بیگم ہیں۔ یہی آپ کی مُعالج ہوں گی۔ اِن کا دعویٰ ہے کہ یہ آنکھوں کی مُجھ سے اچھی ڈاکٹر ہیں اور میں چاہتا ہُوں کہ آپ کی آنکھیں کسی اچھی ڈاکٹر ہی کے ذریعے صحیح ہوں۔ حالانکہ میں نے احسان احمد سے کہا تھا کہ اگر آپ کو کلینک لے آئیں تو زیادہ اچھا ہے لیکن یہ افلاطون ایسے ہی احکامات صادر کرتے ہیں۔ حُکم مِلا کہ مریض کوئی معمُولی نہیں ہے بلکہ وہ احسان احمد صاحب کی بہن ہیں اِس لئے معمُولی مریضوں کی طرح کلینک میں معائنہ نہیں کیا جا سکتا۔ چلیئے صاحب ہم نے بھی تسلیم کر لیا۔ اب ذرا آپ پُرسکون ہو جائیں۔ اور اپنا سر ذرا اونچے کر لیں" ڈاکٹر اکرام تیز ٹارچ کی روشنی میں کافی دیر تک سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کا مُعائنہ کرتے رہے۔ پھر اُنھوں نے اپنی بیگم کو اشارہ کیا اور وہ اپنے کام میں مصرُوف ہو گئیں۔ تقریباً دس یا بارہ منٹ تک یہ مُعائنہ جاری رہا۔ اور پھر ڈاکٹر اکرام نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور اپنی بیگم کی طرف دیکھ کر بولے۔

"جی ڈاکٹر صاحب فرمایئے"

"آپ فرمایئے" اکرام احمد کی بیگم نے کہا۔

"نہیں بھئی بڑی ڈاکٹر آپ ہیں"

"چھوٹے ڈاکٹر اپنی رائے ظاہر کریں اِس کے بعد بڑا ڈاکٹر اپنی بات کا اظہار کرے گا"

"تو پھر یُوں سمجھ لیجئے کہ یہ آپریشن ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ اور ڈاکٹر اکرام احمد پُورے دعوے سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ایک کامیاب آپریشن کے بعد سُلطانہ بہن کی آنکھوں کی روشنی واپس آجائے گی"

"بے شک آپریشن پیچیدہ ہے لیکن ڈاکٹری پڑھی کس لئے گئی ہے۔ میں تم سے متفق ہُوں مسٹر اکرام۔ آپریشن مَیں کرونگی"

"مرضی ہے آپ کی میں نے تو پہلے ہی سُلطانہ بہن سے کہہ دیا تھا کہ آپ کی مُعالج میری بیگم ہوں گی"

"سُلطانہ بیگم آپ کو مُبارک۔ مَیں اِنشاءاللہ آپ کا آپریشن کروں گی آپ کی روشنی واپس آجائے گی"

تنویر نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ اُس کا بدن آہستہ آہستہ [illegible]رزنے لگا تھا۔ رِدا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تنویر! خوشی کی بات ہے۔ سنبھالو خود کو"

"باجی۔۔۔ باجی! میری امّی ٹھیک ہو جائیں گی میری امّی [آ]نکھوں کی روشنی واپس آجائے گی" تنویر نے لرزتی آواز پُوچھا۔

"ہمارے ساتھ رہو گی تو عیش کرو گی۔ دیکھتی جاؤ ابھی [ک]یا ہوتا ہے" شناء نے تنویر کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

نُدرت بھی تنویر کو سمجھا رہی تھی۔

"خود کو سنبھالو تنویر یہ کیا ہو رہا ہے بھئی"

"باجی! میں اپنی خوشی پر قابو نہیں پا سکتی"

"بہتر یہ ہے کہ خاموش رہو۔ سب لوگ ہماری طرف متوجّہ [ہو گئے] ہیں" نُدرت نے کہا اور تنویر خود کو سنبھالنے لگی۔

سُلطانہ بیگم سے کُرسی سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ ذکیہ بیگم [اور م]سز اکرام نے سہارا دے کر اُنھیں اُٹھایا اور پھر بولیں۔

"ہم لوگ وقت کا تعین کر لیں گے سُلطانہ بیگم بس آپ [یہ سمج]ھ لیجئے کہ یہ بہترین موقعہ ہے۔ موسم بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ [آپ]ریشن کے لئے یہ دِن انتہائی مناسب ہیں۔ ابھی ہم لوگ آپس [میں] مشورہ کئے لیتے ہیں۔ آپ اپنی تمام مصرُوفیات ترک کر دیجئے۔ [او]ر کلینک میں داخل ہو جایئے۔ زیادہ دِن بھی نہیں لگیں گے۔ [آ]پ اطمینان رکھیں بہت ہی احتیاط سے آپ کا آپریشن کیا [جا]ئے گا۔ کوئی دِقّت نہیں ہوگی آپ کو"

سُلطانہ بیگم کے مُنہ سے آواز نہیں نِکل سکی تھی تھوڑی دیر [کے] بعد سب پھر باہر آگئے۔ باہر تمام لوگ اندر کی طرف نِگاہیں [لگا]ئے بیٹھے تھے۔ اکرام احمد نے جو کچھ کہا تھا وہ ابراہیم صاحب [کو ب]تا دیا گیا۔ ابراہیم صاحب بے چارے گنگ تھے بات کرنا [چا]ہتے تھے لیکن مُنہ سے الفاظ ہی نہیں نِکل رہے تھے احسان احمد [ا]ن کی یہ کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ اُس وقت اُنھوں نے کچھ نہ کہا۔ ڈاکٹر اکرام نے گھڑی دیکھتے ہُوئے کہا۔

"جی جناب نواب ہم لوگوں کو کاروبار کی اجازت دی [جا] سکتی ہے؟ سات بجے کلینک پہنچنا ہوتا ہے اور صرف بیس [م]نٹ باقی رہ گئے ہیں"

"بہت بہت شُکریہ ڈاکٹر۔ ہم لوگ مشورہ کر کے تمھیں [ف]ون پر اطلاع دے دیں گے"

"بہتر" ڈاکٹر اکرام نے کہا اور پھر وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔

احسان احمد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تو اب یہ بہتر ہوگا کہ صبح سُلطانہ بہن کو کلینک پہنچا دیا جائے۔ بیس اِکیس روز لگیں گے اِس آپریشن کے بعد اِن کے ٹھیک ہونے میں میرا خیال ہے آپریشن ایک دو دِن ہی میں ہو جائے گا۔ بھئی ابراہیم تمھیں ذرا سی پریشانی ہوگی لیکن سُلطانہ بہن کی آنکھوں کی روشنی واپس آگئی تو سوچو کتنا اچھا ہوگا"

ابراہیم صاحب نے لاکھ ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ کہنے کی کوشش میں اُن کے مُنہ سے صرف سسکیاں نِکل کر رہ گئیں۔ اور احسان احمد نے آگے بڑھ کر اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ارے بھئی یہ کیا حماقت ہے، غیر سمجھ رہے ہو مجھے خیریت کا ثبوت دینا چاہتے ہو۔ شُکریہ یا نیازمندی کے الفاظ کہہ کر۔ میاں تم کیا جانو یہ دُنیا کیا چیز ہے؟ محبّتیں اور دوستیاں کیا چیز ہیں؟ ایثار اور جذبے کیا ہوتے ہیں؟ کیا ہو تم لوگ میرے لئے تصوّر بھی نہیں کر سکتے تمھیں خُدا کی قسم اگر کسی قسم کا کوئی لفظ مُنہ سے نِکالا۔ نہ کوئی احسان ہے میرا۔۔۔ مَیں تو خود احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہُوا ہُوں۔ کیا کہوں تم سے دِل تو چاہتا ہے کہ اِس احسان کے عوض اپنا کلیجہ نِکال کر تمھارے سامنے رکھ دُوں۔ مگر زبان بندی ہے"

بات ابراہیم صاحب کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ لیکن باقی لوگ سمجھ رہے تھے۔ غلام احمد صاحب دوسری طرف دیکھنے لگے تھے۔ خود اُن کے جذبات بھی بھر آئے تھے۔ سُلطانہ بیگم کے لئے خاموشی سے یہ سب کچھ کرنا احسان جیسے آدمی ہی کا کام تھا۔ بہرطور غلام احمد صاحب کو اِس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کا آپریشن ہو جائے۔ وہ تو خود یہی چاہتے تھے۔ تمام لوگوں کو خبر ہو گئی۔ اقبال اور تنویر کی گردنیں جُھکی ہُوئی تھیں ابراہیم صاحب بھی خاموش تھے۔ غلام احمد صاحب بھی خاموش تھے، بھلا اُس وقت کیا موقعہ تھا کہ ابراہیم صاحب واپسی کے سِلسلے میں بات کر سکیں۔

پھر یہ محفل برخاست ہو گئی۔ رات کے کھانے پر اُسے دوبارہ جمنا تھا۔ کوارٹر میں واپس آنے کے بعد ابراہیم احمد کہنے لگے۔

"غلام احمد! اِن ساری باتوں کا میں کیا جواب دُوں گا؟ کیا کوئی ایسی ترکیب ہو سکتی ہے کہ مَیں بھی اِن کے لئے کچھ کر سکوں؟"

"بالکل ہو سکتی ہے۔ بھلا اتنی سی ترکیب کے لئے مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا فضول باتیں کر رہے ہو یار میری کیا اوقات پتہ نہیں احسان احمد کس احسان کا تذکرہ کر رہے تھے؟"

"میرا خیال ہے وہ تمہیں یہاں ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ ابراہیم اور ایک بات کان کھول کر سُن لو کہ اب تمہاری واپسی دوست ممکن نہیں ہے۔ اب تم کو یہیں کہیں رہنا پڑے گا۔ تیار ہو جاؤ بھائی اب اکیس بائیس دن کے لئے تو گئے ظاہر ہے کوارٹر میں جا کر اکیلے تو پڑو گے نہیں اپنی ملازمت پر جاؤ گے تنویر کہاں رہے گی۔ رگاؤ میاں اس ملیر کے کوارٹر کو تالا۔ اور اطمینان سے پڑے رہو یہیں۔ بیوی کی آنکھوں میں روشنی واپس آجائے گی تو تمہاری دُنیا بھی روشن ہو جائے گی۔ چلے تھے احسان احمد صاحب سے واپسی کی بات کرنے اب نام مت لینا واپسی کا یہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں ورنہ ناراض ہو جائیں گے وہ۔"

ابراہیم صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے۔ اور غلام احمد اِن آنسوؤں سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے رہے تھے کچھ دیر بعد ابراہیم صاحب بولے۔

"مَیں اُن کا یہ احسان کیسے اُتاروں گا آخر؟"

"ایک بات میری بھی سُن لو ابراہیم، انسانوں کی تفریق صِرف اِس زمین پر ہے خُدا نے انسانوں کو تقسیم نہیں کیا ہے۔ دو ہاتھ دو پاؤں اور مکمل اعضاء اِس بات کا سادہ سا ثبوت ہیں۔ تفریق کرنا ہوتی تو اُوپر سے اِس کا انتظام ہوتا اِس کے ساتھ ہی یہ بھی سُن لو کہ وہ اپنے بندوں پر صرف اپنا احسان رکھتا ہے۔ اُس نے مخلوق کو مخلوق کے زیرِ اثر نہیں رکھا ہے وہی کوئی ایسی سبیل پیدا کرے گا کہ تم احسان احمد کو اُن کے کسی احسان کا صِلہ دے سکو۔ اِس کی ذات سے مایوس ہو؟"

"نہیں!"

"تو پھر کیوں پریشان ہو؟"

"بس یُونہی احساس ہو رہا تھا" ابراہیم صاحب نے آنسو خشک کر کے کہا۔

"چھوڑو یار، بھابی کی آنکھوں کی روشنی واپس آجائے یہ کیسی خوشی کی بات ہے۔"

دوسرے دِن باجماعت سُلطانہ بیگم کو ڈاکٹر اکرام احمد کے کلینک تک لے جایا گیا تھا۔ عجیب تماشہ تھا کئی گاڑیاں گئی تھیں اور تقریباً تمام ہی لوگ اُن کے ہمراہ تھے، ثناء، تنویر، نُدرت، عِصمت، اقبال، خالد، اختر خود احسان احمد، عادل حسین، بس یُوں لگتا تھا جیسے ایک قافلہ کلینک کی جانب رواں دواں ہے ابراہیم صاحب تو اب بولنے کی قوت ہی کھو بیٹھے تھے کچھ کہنا اب بے مقصد ہو گیا تھا اُن کے لئے ڈاکٹر اکرام نے اُن سب لوگوں کا استقبال کیا ایک بڑے سے ہال میں اُنھیں لے جا کر بٹھایا گیا اور ڈاکٹر اکرام احمد کہنے لگے۔

"آپ تمام لوگوں کو دیکھ کر بڑا خوف محسوس کر رہا ہُوں۔ اور ذِمّہ داریوں کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا ہے اگر کہیں خُدانخواستہ سُلطانہ بیگم کو میرے ہاں کوئی تکلیف ہو گئی تو پھر میری زندگی ممکن نہیں ہو گی بڑی زبردست جماعت کے ساتھ اُنھیں یہاں لایا گیا ہے۔"

"ہم سب لوگ اُس وقت تک یہیں رہیں گے ڈاکٹر اکرام جب تک سُلطانہ بہن کی آنکھیں دُرست نہیں ہو جائیں گی۔"

"ارے آپ کو خُدا کا واسطہ اِتنی خوفناک دھمکی نہ دیں کہ میرا ہارٹ فیل ہی ہو جائے کلینک میں اِتنے تو مریض بھی نہیں ہیں جتنے آپ تمام افراد ہیں" ڈاکٹر اکرام احمد نے ہنستے ہُوئے احسان احمد سے کہا۔

"تب پھر کچھ رعایت ہو سکتی ہے وہ یہ کہ کم از کم دو افراد کو سُلطانہ بہن کی تیمار داری کے لئے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے۔"

"منظور ہے۔ اِن دو افراد کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی حالانکہ جو کوئی بھی یہاں رہے گا اُسے قطعیً یہ اجازت نہیں ہو گی کہ سُلطانہ بہن پر مُسلط رہے لیکن جُرمانے کے طور پر مَیں یہ ساری چیزیں قبول کئے لیتا ہُوں۔ ٹھیک ہے بھائی دو آدمیوں پر گُزارہ ہو جائے تو اچھا ہے لیکن آپ تمام افراد کی کیا خدمت کی جائے، میرا خیال ہے آپ لوگ چائے پیئیں اور یہاں سے روانگی کی تیاریاں کریں بڑی نوازش ہو گی۔ کیونکہ میں آپ لوگوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

"خالی چائے نہیں۔ چائے کے ساتھ بھی کچھ ہونا چاہیئے۔"

"اب میں اِتنا بد اخلاق بھی نہیں ہُوں ویسے یہ کچھ زیادہ بہتر طریقے سے میری کوٹھی پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ حضرات کبھی وہاں بھی تشریف لائیے۔"

"پارٹی تو تم سے لی جائے گی" احسان احمد نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کس سلسلے میں؟"

"سُلطانہ بہن کے کامیاب آپریشن کی خوشی میں۔"

"ہاں ہاں بھئی خلوصِ دِل سے، سُلطانہ بہن کے آپریشن کے بعد تو مجھے بھی خوشی ہو گی اور اِس خوشی کا اظہار میں اِس طرح کروں گا کہ سُلطانہ بہن کو آپ لوگوں کے حوالے کرنے سے پہلے آپ سب کو اپنی کوٹھی پر دعوت دُوں۔ کیوں سُلطانہ بہن بھائی کے گھر میں آپ اُن لوگوں کو خوش آمدید کہیں گی" ڈاکٹر اکرام احمد نے کہا سُلطانہ بیگم کچھ نہیں بول سکیں تھیں۔

چائے پی لی گئی تھی اِس کے بعد سب لوگوں نے اجازت طلب کر لی تنویر اور نُدرت کلینک ہی میں رہ گئیں تھیں باقی لوگوں کے لئے ڈیوٹیوں کا تعین بعد میں ہونے والا تھا۔ باہر نِکلنے کے بعد احسان احمد، غلام احمد کے ساتھ دفتر چلے گئے، رُدابھی اُن کے ساتھ ہی گئی تھی عادل حسین کو کوئی کام تھا چنانچہ اُنھوں نے بھی غلام احمد سے کہا تھا کہ اُنھیں ڈراپ کر دیا جائے ابراہیم صاحب، اقبال، خالد، اختر، ثناء وغیرہ کوٹھی واپس آگئے تھے اور معمولات جاری ہو گئے تھے۔

ابراہیم صاحب گُم صُم تھے، اقبال اُن کے ساتھ تھا۔ اُنھوں نے آہستہ سے اقبال سے کہا۔

"اقبال بیٹے! ہم اُن لوگوں کی اِن محبتوں کا کیا صِلہ دے سکیں گے؟"

"کچھ نہیں ابو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا" اقبال نے جواب دیا۔ شوکت جہاں اور اماں بی ابراہیم کو بتانے لگیں کہ یہ لوگ بالکل ہی مختلف ہیں اور اِن کے ہاں احسان و حسان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی سب ایک دوسرے کو بے لوث چاہتے ہیں۔

عِصمت بھی اِس گفتگو میں شریک ہو گئی تھی ثناء معمُول کے مطابق تیمور کو لے کر پہلے اپنے کمرے میں چلی گئی پھر کمرے میں بور ہو کر باہر آگئی سُورج بادلوں کی اوٹ میں چھُپ گیا تھا اور گہرے بادل چھائے ہُوئے تھے۔ بُوندا باندی کا امکان بھی تھا چنانچہ وہ تیمور کے ساتھ گھاس پر جا بیٹھی جو بادلوں کی چھاؤں میں بہت خوش نُما ہو گئی تھی۔ خالد جان بُوجھ کر اِس طرف نہیں آیا تھا بلکہ اتفاقیہ طور پر ہی اُدھر سے گُزر رہا تھا کہ اُس کی نِگاہ ثناء پر پڑ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خالد آہستہ خرامی سے ثناء کے نزدیک پہنچ گیا۔

"سُوری ثناء ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے تمھیں!"

"نہیں۔ آؤ بیٹھو" ثناء نے عادت کے مُطابق بے تکلفی سے کہا اور خالد اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

"کیا کر رہے ہیں یہ آپ کے تیمور صاحب؟"

"بس ذرا شرارتی ہو گئے ہیں کہہ رہی ہُوں اِن سے کہ شرارتیں کچھ کم کر دی جائیں۔ نیا نیا چلنا سیکھا ہے چنانچہ اب دوڑ لگاتے ہیں لمبی، اِس کے علاوہ کچھ بول چال کی کوشِش بھی فرما رہے ہیں حالانکہ اِن کی زبان ابھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی" ثناء نے پوری پوری دِلچسپی سے کہا تیمور کو درحقیقت وہ بہت زیادہ چاہتی تھی خالد خاموشی سے اُس کی صُورت دیکھتا رہا پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ثناء! ہمارے یہاں آجانے سے آپ کو تو کوئی دِقت نہیں ہو گی؟"

"کیا مطلب؟" ثناء نے تیمور کے رُخسار نوچتے ہُوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے ہم مستقل کینیڈا سے یہاں آگئے ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے ذرا رونق بڑھ گئی ہے ویسے بھی آپ نے محسُوس کیا ہو گا کہ ہماری کوٹھی میں کچھ ویرانیاں سی پھیل گئی ہیں بس حالات کا تقاضہ ہے ذہنی طور پر تو سب ہی متاثر ہیں۔ گو غلام احمد چچا نے بڑے موقع پہ ہماری عزّت بچائی ہے لیکن اِس کے باوجود سب کے دِلوں میں ایک دُکھ سا تو ہے۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ بہرطور ثناء حالات تو ایسے اَپ ڈاؤن ہوتے ہی رہتے ہیں مجھے ایک بات کی خوشی ہے کہ کوٹھی کے لوگوں نے کوئی بہت گہرا تاثر نہیں لیا اِس کا۔"

"ہاں تاثر لینے سے فائدہ بھی کیا ہوتا" ثناء نے کہا۔

"بات ہو رہی تھی ہمارے یہاں آجانے کی۔"

"کہا ناں کہ آپ کا یہاں آجانا تو اچھا ہُوا۔"

"ڈیڈی کا خیال ہے کہ یہاں کسی علاقے میں ایک خوبصُورت سی کوٹھی خرید لی جائے میں اپنے طور پر آپ سے پُوچھنا چاہتا ہُوں آپ کی اِس سِلسلے میں کیا رائے ہے۔"

"کیوں، کیا یہ کوٹھی چھوٹی پڑ رہی ہے؟"

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جانا تو ہمیں ہو گا ہی یہاں سے کوٹھی کون سے علاقے میں لی جائے۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہُوں اگر جانا ضروری ہے یہاں سے تو پھر کہیں بھی چلے جائیے کیا فرق پڑتا ہے اور اگر ضروری نہ ہو تو اِسی کوٹھی میں رہیں۔"

"نہیں ثناء آپ سمجھ نہیں رہیں یہ کسی طور پر مناسب نہیں ہوگا۔"

"کیوں کیا خرابی ہے اِس میں اچھی نہیں ہے کوٹھی چھوٹی ہے آپ کو سو پچاس کمرے اور چاہئیں۔"

"نہیں بھئی آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں ہماری شادی ہوگی اور اُس کے بعد آپ یہاں سے رُخصت ہوکر جائیں گی آپ کو اُس نئی کوٹھی میں منتقل ہونا ہوگا اِس لئے میں چاہتا ہُوں کہ آپ کی پسند کی جگہ کوٹھی خرید لی جائے۔" خالد نے کسی قدر جھلّائے ہُوئے لہجے میں کہا اور ثناء چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"اَرے... اَرے کیا ہوگیا آپ کو ابھی تو ٹھیک ٹھاک تھے موسم بھی بہت اچھا ہے۔"

"ثناء، مَیں ذرا مختلف قسم کا آدمی ہُوں۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ کچھ سُنے کچھ کہے آپ اِسی طرح میرا مذاق اُڑاتی رہیں ٹالتی رہیں تو مَیں کیا سوچوں گا آپ کے بارے میں۔"

"دیکھئے جناب! نہ میں مذاق اُڑا رہی ہُوں نہ ٹال رہی ہُوں اب دیکھئے ناں یہ سارے کام تو مردوں کے ہیں صحیح فیصلہ وہی کرتے ہیں ہم نے اگر کوئی فیصلہ کرلیا تو بعد میں آپ کہیں گے یہ سب تمھاری غلطی ہے بہتر ہے سوچ سمجھ کر آپ خود ہی اقدامات کیجئے۔" ثناء نے جواب دیا اور خالد کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نِگاہوں سے ثناء کو دیکھ رہا تھا ثناء سے اُسے اِس قدر سنجیدہ جواب کی اُمید نہیں تھی وہ تو ثناء کی باتوں پر جھلّا گیا تھا اور اِس جھلاّہٹ میں اُس کی زبان ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کُھل گئی تھی۔ ورنہ شاید وہ ثناء سے اتنی بے تکلّفی سے یہ الفاظ نہ کہہ سکتا لیکن جواب میں ثناء نے اُس سے جو الفاظ کہے تھے اُس کی سماعت اِس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ثناء خاموشی سے تیمور کے ساتھ کھیل رہی تھی اُس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہیں تھا نہ شرم نہ جھنجلاہٹ نہ شرارت، بس ایک ہلکی سی مُسکراہٹ تھی اُس کے ہونٹوں پر، اُس نے خالد کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"ارے کیا ہوگیا آپ کو، یہ مُنہ کُھلا ہُوا ہے آپ کا، براہِ کرم بند کرلیجئے جراثیم اندر جاتے ہیں۔" خالد نے جلدی سے مُنہ بند کرلیا تھا ثناء ہنس پڑی۔

"ویسے آپ اچھے آدمی ہیں۔ بات بڑی آسانی سے مان لیتے ہیں۔"

"ثناء! جو کچھ تم نے کہا ہے اُس کی قیمت کا اندازہ تمھیں نہیں ہے۔ کتنے اعتماد کا اظہار کیا ہے تم نے مُجھ پر، مُجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی ثناء یقین کرو تم نے مجھے ضرورت سے زیادہ نواز دیا ہے۔"

"اب پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں ایک سنجیدہ بات آپ نے سنجیدگی سے پُوچھی، میں نے سنجیدگی سے جواب دیا، میں نے کیا نوازا ہے آپ کو اور آپ نے کیا کچھ کیا ہے یہ اللہ جانے اور آپ جانیں۔"

"ثناء تم نے... تم نے میرے اُوپر اعتماد کا اظہار کر کے اپنی... اپنی..."

"جی ہاں... جی ہاں بولئے آگے۔"

"کیا کہوں الفاظ ہی ساتھ نہیں دے رہے۔"

"تو پھر پہلے الفاظ سے دوستی کیجئے اور جب وہ آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوجائیں تو مجھے بتا دیجئے گا۔"

"ثناء! گویا... گویا تم نے فیصلہ کرلیا کہ مُجھ سے شادی کر لو گی۔"

"یہ فیصلہ تو بہت پہلے کیا گیا تھا جب آپ نے یہ ذمہ داری میرے اُوپر ڈال دی تو مَیں نے کئی بار اِس کے بارے میں سوچا مَیں نے آپ سے وعدہ کیا تھا ناں کہ شادی کرنا اگر ضروری ہی ہُوا تو آپ سے شادی کرُوں گی اب یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ڈیڈی اور ممّی میری شادی کئے بغیر نہیں مانیں گے تو وعدہ بھی پُورا کرنا ہوگا اور پھر آپ یہاں آگئے یہ بڑا اچھا ہُوا کم از کم ڈیڈی ممّی سے الگ بھی نہیں رہنا پڑے گا۔ ایک بات سُن لیجئے رِدا کو ہم اپنے ساتھ ضرور لے جائیں گے میں تیمور کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ثناء! صِرف وہ ہوگا جو آپ چاہیں گی۔ آپ نے مجھے اعتماد کی جس دولت سے نوازا ہے میں اُس کا شکریہ تو نہیں ادا کر سکتا۔"

"اگر ادا نہیں کرسکتے تو نہ کریں، ضروری تو نہیں ہے۔"

"بہت بہت شُکریہ ثناء، بے حد شُکریہ میں جا رہا ہوں کیونکہ اب آپ کی اِس گفتگو کو تنہائی میں اپنے دِل کے گوشے میں اُتاروں گا نہ جانے کیا لُطف دے گی یہ مجھے۔"

"کمال کے آدمی ہیں آپ بھی، یہ کام اِتنا مشکل تو نہیں ہے۔ ٹھیک ہے جائیے کر لیجئے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" ثناء نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور خالد اپنی جگہ سے اُٹھ گیا ثناء مُسکراتی نِگاہوں سے اُسے دُور تک دیکھتی رہی تھی پھر اُس نے تیمور کو گود میں اُٹھایا اور غلام احمد صاحب کے کوارٹر کی جانب چل پڑی۔

غلام احمد صاحب خود تو موجود نہیں تھے شوکت جہاں امّاں بی وغیرہ نے اُسے خوش آمدید کہا۔ عِصمت اُس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

"رات کا کیا پروگرام ہے عِصمت باجی! رات کو بھی تنویر اور نُدرت وہاں رہیں گے یا ڈیوٹی تبدیل ہوگی۔"

"مجھے نہیں معلوم، پتہ نہیں اکرام انکل آپریشن کب کریں گے۔"

"اِس کے بارے میں تو ٹیلی فون کرکے معلوم ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے آج نہیں کریں گے۔ ابھی تو ٹیسٹ وغیرہ ہوں گے سُلطانہ آنٹی کی آنکھوں اور اُس کے بعد پھر فیصلہ کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے آج کسی کی ضرورت نہیں ہوگی ویسے کیا ارادے ہیں شام کو چلیں گی کلینک۔"

"بھئی میں کیا کہہ سکتی ہُوں۔ پتہ نہیں وہاں جانا مناسب ہوگا یا نہیں بعد میں دیکھ لیں گے۔" عِصمت نے جواب دیا۔

"اقبال صاحب آپ تو کچھ بولتے ہی نہیں ہیں کبھی بات چیت بھی کیا کریں ویسے آپ کا خُوب مشغلہ کیا ہے۔"

"بس پڑھائی۔" اقبال نے جواب دیا۔

"کمال ہے یہ لڑکے کتنا جھُوٹ بولتے ہیں عِصمت باجی! آپ کا کیا خیال ہے کیا اقبال صاحب صرف پڑھائی کرتے ہوں گے۔"

"مجھے کیا معلوم۔"

"اقبال صاحب! یہ لڑکیاں بھی کتنا جھُوٹ بولتی ہیں۔ کیا اُنھیں لڑکوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا۔"

"شرارت کا مُوڈ ہے محترمہ ثناء کا سنبھل کر رہئے اقبال صاحب۔" عِصمت نے اقبال کو ہوشیار کرتے ہُوئے کہا۔

"ہاں سنبھل کر رہئے اقبال صاحب، محترمہ بہت سنبھالنے والوں میں سے ہیں اچھے اچھوں کو سنبھال کر رکھ دیا ہے انھوں نے۔"

"بھئی آج تمھیں نُدرت نہیں ملی ہے تو مُجھ پر حملہ ہوگیا ہے۔ بتاؤ کیا کھلاؤں پلاؤں تاکہ اِس زبان کی تیر اندازی رُک سکے۔"

"کھانے پینے کا بالکل مُوڈ نہیں ہے بس بوریت ہو رہی ہے۔"

"تو خاتون بوریت دُور کرنے کے لئے تختۂ مشق بیچاری عِصمت ہی رہ گئی ہے۔"

"چلیں فی الحال معاف کئے دیتے ہیں آپ لوگ بھی ذرا سنجیدہ ہیں دوپہر کو کھانے میں کیا پک رہا ہے۔"

"ہاں یہ ہُوئی بات جو چاہو۔" عِصمت نے کہا۔

دوپہر کا کھانا ثناء نے یہیں بیٹھ کر کھایا تھا۔ اندر بھی کوئی خاص اہتمام نہیں تھا ابراہیم صاحب بیچارے خاموشی سے ایک کمرے میں تھے۔

شام ہوگئی کلینک سے ٹیلیفون آگیا تھا کہ آپریشن کل دِن میں کسی وقت کر دیا جائے گا کسی کو آنے کی ضرورت نہیں ہے، تنویر اور نُدرت کو بھی واپس بھیج دیا جائے گا، آپریشن کے تین دن کے بعد وہاں کسی کو رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے اکرام صاحب نے صاف گوئی سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کی مہمان نوازی نہیں کر سکیں گے کیونکہ اُن کی مصرُوفیات میں مداخلت ہوتی ہے اور احسان صاحب نے ٹیلیفون پر اُن سے کہہ دیا تھا کہ اِس چالاکی کا بدلہ لیا جائے گا اُن سے۔

رات کو اختر ثناء کے پاس پہنچ گیا اور ثناء نے معمُول کے مُطابق اُس سے بھاری لہجے میں سوال کیا۔

"اسسٹنٹ! رپورٹ پیش کرنے کا ایک وقت متعین کرلیا جائے۔"

"حُکم دیں۔"

"یہ کل دِن میں طے کرلیا جائے گا آج کی کیا رپورٹ ہے۔"

"پورے گھر کی یا خاص رپورٹوں کی بات کر رہی ہیں۔"

"تفصیلی رپورٹ پیش کی جائے۔"

"عارفہ خالہ اور ناصِر صاحب میں جھڑپ ہُوئی ہے۔ غالباً عارفہ خالہ نے ناصِر صاحب کی شیروانی کی جیب سے ایک سو بیس روپے نِکال لئے تھے اِس سلسلے میں ناصِر صاحب نے عارفہ خالہ کو ڈانٹ ڈپٹ کی ہے اور عارفہ خالہ نے اُن سے بولنا چالنا چھوڑ دیا ہے۔ طفیلی بیگم چِلّا کشی کر رہی ہیں تہجّد گزار بھی ہوگئی ہیں غالباً یہ چِلّا کشی رشید کے لئے کی جا رہی ہے جو آنے کے بعد اچانک غائب ہوگیا ہے۔ ثناء اور خالد کی ملاقات پارک میں ہُوئی تھی جِس میں محترمہ ثناء نے اعتراف کرلیا ہے کہ وہ خالد سے شادی کرنے پر رضامند ہوگئی ہیں اور خالد جہاں چاہیں اپنی پسند کی کوٹھی بنا سکتے ہیں۔" اختر نے ہیڈلائن پڑھنے والے انداز میں کہا لیکن ثناء اُچھل پڑی تھی اختر اُس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہا تھا۔

"رِدا صاحبہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی ہیں۔ کلینک جانا چاہتی تھیں لیکن اُنھیں اکرام احمد صاحب کے فُون کے بارے میں بتا دیا گیا اُن کے سلسلے میں کوئی خاص بات نہیں ہے نُدرت! ابھی ابھی کلینک سے واپس آئی ہیں۔ اور تنویر کے ساتھ محوِ گفتگو ہیں۔

آج کی رپورٹ یہی تھی "

" اختر! "شناء کی غزاہٹ اُبھری۔

" یس باس "

" اُونچے اُڑ رہے ہو پرواز نیچی کرو "

" اتنی باس " اختر نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

" اس سے بھی نیچی۔ خاص طور سے شناء کے سامنے سے گزرتے ہُوئے ذرا خیال رکھا کرو "

" ایک بات سمجھ لیجئے اگر رعب ڈالنے کی کوشش کی گئی تو فوراً استعفیٰ دے دیا جائے گا۔ بات کسی حد تک برابری کی بنیاد پر ضرور ہونی چاہئیے "

" فضول آدمی ہو تم ہماری ٹوہ میں رہنے کی کیا ضرورت تھی "

" مطلب کیا ہے آپ کا، آپ ہی نے تو ہدایت کی تھی کہ پوری کوٹھی کی رپورٹیں درکار ہیں ہمیں "

" آدمی بہت چالاک ہو لیکن نمٹ لیا جائے گا تم سے ..
ویسے آج تم نے ہماری حجامت بنا دی ہے "

" رپورٹیں مکمل ہی ہوں گی آپ اطمینان رکھیں "

" عصمت اور اقبال کے بارے میں کوئی خاص بات ؟ "

" ابھی تک نہیں جب سے پولیس ہیڈ کوارٹر سے واپس آئے ہیں ایک دوسرے سے صحیح طور سے بات بھی نہیں کر رہے "

" اچھا اب شرافت سے چلے جائیے آپ۔ آج آپ نے ضرورت سے زیادہ بکواس کر لی ہے۔ کل سے آپ کو نئے احکامات جاری کئے جائیں گے "

" او۔ کے باس " اختر نے سیلوٹ کیا اور مسکراتا ہُوا باہر نکل آیا۔ شناء چند لمحات کچھ سوچتی رہی اور پھر اُس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ " بڑا تیز ہے " اختر، شریر کہیں کا " اُس نے مسکراتے ہُوئے کہا اور تیمور کی جانب دیکھنے لگی۔

✥

سُلطانہ بیگم کا آپریشن ہو گیا۔ ابراہیم صاحب اور غلام احمد اسپتال میں مصروف رہے تھے، حالانکہ اکرام احمد صاحب نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ اِن میں سے کسی کی موجودگی ضروری نہیں ہے۔ اُن کا اپنا کیس ہے وہ سنبھال لیں گے۔ لیکن ابراہیم صاحب کافی بے چین تھے اور غلام احمد صاحب اُنھیں چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ دوستی کا تقاضا یہی تھا۔

پھر جب آپریشن کی کامیابی کی اطلاع اُن لوگوں کو مل گئی تو وہ خوشی خوشی گھر آ گئے۔ اکرام صاحب نے اب تجزیہ کیا تھا کہ سُلطانہ بیگم کی نگہداشت کے لئے کسی کی باقاعدہ کلینک میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے اُن کی دیکھ بھال نہایت مناسب انداز میں ہو گی۔ لیکن لڑکیوں کو یہ دُھن سوار تھی کہ وہ اسپتال میں رہیں اور اِس سلسلے میں باقاعدہ ٹیمیں بن گئی تھیں۔ لیکن اکرام صاحب نے کہہ دیا تھا کہ کم از کم تین دِن کے بعد وہ اِس کی اجازت دے سکتے ہیں۔ البتہ ملاقات کے لئے کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کوئی بھی کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔

سُلطانہ بیگم ہی آج کل موضوع بنی ہُوئی تھیں۔ اِس وقت بھی ساری چوکڑی لان پر موجود تھی۔ عصمت، اقبال، شناء، تنویر، نُدرت وغیرہ۔

دادا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئی تھی۔ لیکن آنے ہی والی تھی۔ ایسے موقع پر خیر دین کا کوٹھی میں داخل ہونا سب کے لئے دھماکے کا باعث بن گیا کیونکہ اِن دِنوں خیر دین بھی ایک پُراسرار شخصیت اختیار کر چکا تھا۔ اختر اور خالد کے آنے کے بعد وہ پہلی بار کوٹھی میں آیا تھا۔ سب لوگ ہی متوجہ ہو گئے۔ اور خیر دین کو دیکھنے لگے۔

خیر دین معمول کے مطابق نظر آ رہا تھا، وہ کوٹھی کی طرف بڑھا، ٹھٹھکا اور پھر اِن لوگوں کو نظر انداز کر کے اندر کی طرف چل پڑا۔ شناء نے زور سے آواز لگائی۔

" اے خیر دین! اِدھر آؤ "

" آتے ہیں بی بی جی، ذرا دادی اماں کی زیارت کر آئیں، اِس کے بعد آئیں گے "

" اِدھر آؤ مَیں کہہ رہی ہُوں " شناء غرا کر بولی اور خیر دین سر کھجاتا ہُوا اُن کے قریب پہنچ گیا۔

" میں نے تم سے کہا تھا کہ اِدھر آؤ اور تم فضول باتیں کر کے اندر جا رہے تھے "

" لو جی کمال ہو گئی۔ اب ہم آپ کی بات کیوں مانیں گے شناء بی بی۔ نوکری تو چھوڑ چکے ہیں ہم "

" نوکری چھوڑ چکے ہو اِس لئے میری بات نہیں مانو گے "

" ہاں جی، اِس کوٹھی میں تو بس دادی اماں ہیں جنھیں ہم ہمیشہ یاد کرتے رہتے ہیں اور کون ہے جی اِدھر، آپ سب لوگ تو ہمیں صرف نوکر سمجھتے ہو، بس دادی اماں ہیں جنھوں نے ہمیں اپنا بیٹا بنایا ہُوا ہے "

" اور اگر میں بھی تمھیں اپنا بیٹا بناؤں تو .. " شناء نے اُسے گھورتے ہوئے کہا اور خیر دین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا پھر وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

" دیکھو جی شناء بی بی جی! بات صرف مذاق کی حد تک رہنی چاہئیے۔ آپ ہمیں گالی دے رہی ہو "

" کیوں... کیوں؟ کیا میں ماں کی حیثیت سے تمھارے لئے گالی ہُوں "

" تو اور کیا جی۔ آپ ہماری ماں کیسے ہو سکتی ہیں۔ آپ کی تو شادی بھی نہیں ہُوئی " خیر دین نے کہا۔ اور اِس کے بعد لوگوں کے لئے قہقہے روکنا مشکل ہو گیا۔ لیکن عصمت اور اقبال اِن قہقہوں میں شریک نہیں ہُوئے تھے وہ بُری طرح خیر دین کو گھور رہے تھے۔ نُدرت نے چٹکی بجاتے ہُوئے کہا۔

" یہ ہُوئی ناں بات جواب دیجئے محترمہ شناء صاحبہ "

" خیر میں تو اِس کی عادی ہُوں اب دیکھو ناں تیمور بھی تو میری ہی اولاد ہے، بہر حال میں خیر دین جیسے لنگور کو خود بھی اپنی اولاد بنانا پسند نہیں کرتی

" حد ہو گئی جی، اب تو ہم آپ کی نوکری بھی نہیں کرتے۔ اور آپ کا جو دِل چاہے کہے جا رہی ہیں ہم سے کوئی کام ہے، تو بتائیں ورنہ ہم جا رہے ہیں دادی اماں کے پاس "

" اِدھر آ جاؤ شرافت سے اِدھر آ جاؤ۔ ورنہ سب تمھیں پکڑ کر اِدھر لے آئیں گے " شناء نے کہا۔

" لو جی آ تو گئے۔ کہو کیا بات ہے ؟ "

" بیٹھ جاؤ .. "

" نہیں، بیٹھیں گے نہیں " خیر دین نے کہا۔

" خیر دین تم نے ہمیں دیکھا نہیں " اختر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

" لو جی کیا ہماری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں دیکھا کیوں نہیں "

" تمھیں حیرت نہیں ہوئی ہمیں دیکھ کر ؟ "

" نہیں جی، آپ کی شکل تو ویسی کی ویسی ہے۔ اِس میں حیرت کی کیا بات ہے، لو جی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کو آپ کیا بے وقوف سمجھتے ہو، آپ لوگ کب آئے جی ؟ "

" اچھا تو تمھیں خیال آ گیا "

" آ رہا تھا آہستہ آہستہ، سب سے زیادہ خیال تو ہمیں دادی اماں کا رہتا ہے کہانیاں یاد کرتے رہتے ہیں ان کے لئے اور کوئی سُنانے کو ملتا جو نہیں۔ دادی اماں ہی ہماری کہانیاں سُن لیتی ہیں "

" تمھاری کہانیاں سُننے والے تو یہاں بہت ہیں بشرطیکہ سُناؤ " اِس بار عصمت بولی اور خیر دین چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

" لو جی کمال ہو گئی بی بی جی، آپ تو پہلی بار ہم سے بولی ہیں نا "

" نہیں خیر پہلی بار تو نہیں بولی۔ اِس کا اندازہ تمھیں اچھی طرح ہے "

" نہیں جی دیکھو ایک بات آپ کو بتا دیں ہم۔ ہم کوئی بات کبھی بھولتے نہیں ہیں اگر آپ نے پہلے کبھی ہم سے بات کی ہوتی تو ہمیں ضرور یاد ہوتی۔ آپ کیسی ہو بی بی ؟ " خیر دین نے کہا۔

" بالکل ٹھیک ہُوں۔ اقبال بھی ٹھیک ہیں اور تمھارے احسان مند ہیں "

" ہم بھی احسان مند ہیں بی بی جی، شکریہ "

" کیوں؟ تم پر ہم نے کون سا احسان کیا ہے ؟ "

" احسان " خیر دین منہ پھاڑ کر بولا " وہ تو کوئی نہیں کیا جی "

" پھر تم کیوں احسان مند ہو ؟ "

" او جی پتہ نہیں ہم احسان کا مطلب نہیں سمجھے تھے۔ اب جائیں جی دادی اماں کے پاس ؟ "

" یہاں کیا تمھیں کھٹمل کاٹ رہے ہیں بیٹھو " شعلہ نے کہا۔

" او نہیں جی ہم گنوار بندے ہیں آپ لوگ ہمارا مذاق اُڑاتے رہو گے ہم اُلٹی سیدھی باتیں جو کرتے ہیں بس دادی اماں ہماری کسی بات کا مذاق نہیں اُڑاتیں "

" سُناؤ تمھاری افسری کیسی چل رہی ہے ؟ " شناء نے کہا۔ اور خیر دین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں پھر اُس کے چہرے پر شرم کے آثار نظر آئے پھر وہ چاروں طرف دیکھنے لگا، پھر آہستہ سے بولا۔

" آپ کو قسم ہے بی بی جی ہمیں بتا دو کوئی آیا ہے کیا چک نمبر اٹھارہ سے ؟ "

" کیا مطلب ؟ "

" ہمارے پنڈ سے کوئی آیا ہے کیا ؟ "

" تمھارے پنڈ سے ؟ "

" پھر آپ کو افسری کے بارے میں کیسے معلوم ہُوا؟ ہم نے تو یہاں کسی کو نہیں بتایا ؟ "

" آج بتا دو، بہت دِن سے ہم لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہو " شناء نے اُسے گھورتے ہُوئے کہا۔

" او نئیں جی، اِس میں بے وقوف بنانے کی کیا بات ہے، آپ چاچا بندے علی کو تو جانتی ہی ہوں گی۔ بیماری تھی جی اُنھیں لوگوں کو پھنسانے کی، جہاں کوئی جوان لونڈا نظر آیا اُس کی گردن

بھنسانے کی فکر میں لگ گئے۔ ہماری منگنی اُس سے زبردستی کرائی گئی تھی ہمیں تو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اُس کے چال چلن بھی ٹھیک نہیں تھے۔"

"کس کے؟" ثناء حیرت سے بولی۔

"او جی اُسی افسری کے" خیر دین معصومیت سے پلکیں جھپکاتا ہُوا بولا۔

"ہم نے اُسے طلاق دے دی جی" ایک بار پھر قہقہے اُبل پڑے تھے۔ ثناء دانت پیستی اُسے دیکھ رہی تھی۔

"معمولی آدمی نہیں ہو تم خیر دین۔ معمولی آدمی نہیں ہو۔ تمہارے جوہر کھل رہے ہیں" اس نے آہستہ سے کہا۔

"او جی بس مہربانی ہے آپ کی، جائیں دادی امّاں کے پاس" خیر دین فخریہ انداز میں مسکراتے ہُوئے بولا۔

"کیا کہتے ہیں خواتین و حضرات" ثناء نے پُوچھا۔

"جانے دو ثناء، خیر دین کے پیٹ میں کوئی کہانی مچل رہی ہوگی" ندرت نے کہا اور خیر دین سلام کرکے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ سب اُسے جاتے ہُوئے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو ثناء نے عصمت سے کہا۔

"اب بتایئے عصمت باجی"

"اقبال آپ بتایئے" عصمت نے کہا۔

"اللہ، بڑی ذمّہ داریاں ڈالتی جارہی ہیں آپ اقبال بھائی پر اب آپ کے جواب اقبال بھائی دیا کریں گے" ثناء نے کہا۔ اور عصمت بوکھلا گئی لیکن فوراً سنبھل کر بولی۔

"میں یقین نہیں کرسکتی، خُدا کی قسم میں یقین نہیں کرسکتی۔ آج میں نے غور سے اُس کے خدوخال دیکھے ہیں کوئی فرق نہیں ہے اگر کوئی فرق نکال دے تو غلام ہوجاؤں گی اُس کی" عصمت نے کہا۔

"اللہ اقبال بھائی کوئی فرق نکال دیں ناں" ندرت نے ٹھنکتے ہُوئے کہا اور اِس بار پھر سب حلق پھاڑ پھاڑ کر ہنسنے لگے، عصمت کی حالت خراب ہُوئی جارہی تھی لیکن اقبال اعتماد سے مُسکرا دیا تھا اُس نے کہا۔

"آپ لوگوں کا مذاق اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس پولیس افسر اور خیر دین میں سرِمو کوئی فرق نہیں ہے، اِس کے علاوہ میں نے اور بھی بہت سی باتوں پر غور کیا ہے اِس کے اندر چُھپی ہُوئی بے پناہ صلاحیتوں پر آپ نے غور نہیں کیا اُس نے لفظ افسری کو کس خوبصورتی سے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایک کہانی میں ڈھال دیا کسی لفظ کو دوسرے معنی دے کر استعمال کرلینا معمولی بات نہیں ہے۔"

"اِس میں کوئی شک نہیں ہے"

"بھئی مجھے اِس بارے میں کچھ نہیں بتایا جارہا کیا مجھ سے چُھپانے کی کوئی بات ہے" خالد نے کہا۔

"کمال ہے مستقبل کے سربراہ کو اِس بات سے آگاہ نہیں کیا جارہا۔ بات یہ ہے خالد بھائی کہ" ندرت نے ایک چُبھتا ہُوا جُملہ کہہ کر فوراً ہی بات کا رُخ بدل دیا اور خالد کو خیر دین کے بارے میں بتانے لگی۔ اور خالد بھی حیران رہ گیا۔ اختر اِس دوران بالکل خاموش رہا تھا اور اُس کی یہ خاموشی بے معنی نہیں تھی۔

خیر دین دادی امّاں کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اُس نے سلام کیا اور دادی امّاں اُٹھ کر بیٹھ گئیں، ذکیہ بیگم اور طفیلی خالہ پاس ہی موجود تھیں۔

"سب کو سلامالیکم جی اور آپ کو کئی بار سلامالیکم" خیر دین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"آؤ خیر دین! اب تو تم مہینوں کے بعد صُورت دکھاتے ہو"

"کیا کریں جی نوکری، نوکری ہوتی ہے اور دادی امّاں کا پیار ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہاتھوں میں کُھجلی ہوتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر دادی امّاں کے پیر نہ دبالیں تو"

"خُدا خوش رکھے تجھے خیر دین۔ اے ذکیہ! خیر دین کو یہیں کیوں نہیں بُلالیتیں؟"

"تو منع کس نے کیا ہے مگر یہ آتا کب ہے؟" ذکیہ بیگم بولیں۔

"لو جی آپ ہی لوگوں نے تو کہہ دیا تھا کہ یہاں سے چلے جاؤ، سو چلے گئے خیر دین ولد بشیر دین۔ پر دادی امّاں جہاں اب ہم نوکری کررہے ہیں وہ بھی بُری جگہ نہیں ہے۔ آپ کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری تو ہو ہی جاتی ہے"

"سب سے زیادہ مجھے تیری کمی محسوس ہوتی ہے۔ خیر دین جو خدمت تُونے میری کی ہے اِس کا صلہ تجھے دُعاؤں کی شکل ہی میں دے سکتی ہُوں"

"لو جی تو پھر کوئی لمبی سی دُعا دے ڈالو دادی امّاں، تاکہ خیر دین کے دن بھی گھوم جائیں" خیر دین نے کہا۔

"گھوم جائیں" ذکیہ بیگم ہنس پڑیں۔

"ہاں جی گھومے بغیر تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ وہ دادی امّاں جی آپ کے لئے ایک کہانی یاد کرکے آئے ہیں آج"

"میں جانتی ہُوں تو کہانیاں سُنائے بغیر باز کہاں آئے گا۔

کیا کہانی گھڑ کر لایا ہے؟"

"وہ جی داستانِ غالب ہے"

"داستانِ غالب؟" دادی امّاں نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"داستان امیر حمزہ کی تو سُنی تھی مگر داستان غالب کی آج پہلی بار سُن رہے ہیں"

"نہیں جی امیر حمزہ امیروں کی داستان تھی اور داستانِ غالب غریبوں کی داستان ہے۔ آپ کو تو جی پتہ ہے ناں کہ غالب جی بڑے غریب تھے۔ بس کام دام نہیں کرتے تھے غزلیں بناتے تھے جی اور سب کو سُنا دیتے تھے۔ پر دادی امّاں ایک بات بتاؤ غزلیں بنا کر روٹی کمائی جاسکتی ہے کہیں؟"

"ارے... ارے تو تو فلاسفروں کی سی باتیں کررہا ہے"

"نہیں جی اپنی سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ وہ قرض لے کر زندگی گزارتے تھے۔ قرض کی شراب پیتے تھے۔ پر کیوں پیتے تھے جی جب جیب میں پیسہ نہیں تو شراب کیوں پی جائے؟ یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی دادی امّاں"

"خیر دین غالب کے شعر کی مٹی پلید کررہا ہے۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن"

ذکیہ بیگم نے کہا۔

"ہاں جی ریڈیو پر سُن لی تھی۔ بس یہ غزل اُسی دن سے اپنی کھوپڑی گھوم گئی۔ بھائی میاں کیوں قرض کی مے پیتے تھے۔ مے پینا بہت ضروری تھا کیا؟ میاں کوئی کام دھندہ کرتے پیسے ہوتے تو جو مرضی آتی کرتے۔ نہ جی دادی امّاں اپنی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی"

"تو تو داستانِ غالب سُنا رہا تھا"

"بس جی سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ سے پُوچھنا چاہتے تھے، چھوڑیئے اب تو ہم ساری داستان ہی بھول گئے" خیر دین حسبِ معمول دادی امّاں کے پاؤں دبانے لگا تھا۔

"بعض اوقات تو تیری باتیں پریشان کردیتی ہیں خیر دین۔ یُوں لگتا ہے جیسے تُو وہ نہ ہو۔ جو خود کو ظاہر کرتا ہے" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"لو جی اب ہم اپنے چک سے یہاں آنے کے بعد بہت ہوشیار ہوگئے ہیں۔ آخر زمانہ دیکھ رہے ہیں۔ لوگوں کو دیکھ رہے ہیں چالاک تو ہونا ہی چاہئے ہیں، بس یہ سمجھ لو بیگم صاحب جی کہ تھوڑے بہت پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ ویسے ہم آج کل ایک اور کام بھی کررہے ہیں"

"کیا؟"

"بس جی کچھ پڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ دُعا کرو دادی امّاں اِس میں کامیاب ہوجائیں"

"خیر دین تیرے لئے تو دل سے دُعائیں ہی دُعائیں نکلتی ہیں"

"اور سُنایئے طفیلی خالہ جی آپ کا کیا حال ہے، کچھ دُبلی ہوگئی ہیں؟"

"خیر دین، طفیلی بیچاری پر بُری گھڑی آپڑی ہے، پتہ نہیں کیا ہُوا ہے، رشید اگر آیا تھا تو کہاں چلا گیا، طفیلی پر بھی اللہ رحم ہی کرے"

"رشید آیا تھا جی اور چلا گیا۔ ہمیں تو پتہ ہی نہیں"

"ہاں خیر دین" دادی امّاں بولیں "رشید ایک رات اچانک یہاں آیا اپنا سامان رکھا اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ طفیلی بیگم اُس کے غم میں بہت پریشان ہیں بیچاری۔ ایک ہی بیٹا ہے اُن کا"

"لو جی یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ آپ ہم سے کہو ناں طفیلی خالہ جی"

"کیا کہوں بیٹا، کس سے کہوں، کیا کہوں کیا نہ کہوں" طفیلی خالہ حسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

"لو کمال ہوگئی جی، اپنے بابا چلمن شاہ کس دن کام آئیں گے"

"یہ بابا چلمن شاہ کون ہیں؟"

"بس جی دادی امّاں پُوچھو مت۔ آسمان سے اُترے ہُوئے بزرگ ہیں۔ سیدھے چلے آرہے ہیں۔ ایک تعویذ دے دیں کسی کو تو یُوں سمجھو کہ بیڑا ہی پار۔ رشید بھائی کے لئے بھی ایک تعویذ لے لو طفیلی خالہ، جہاں کہیں بھی ہوں گے واپس آجائیں گے۔ کوئی پریشانی کی بات بھی نہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے پیر چلمن شاہ کسی سے لیتے دیتے بھی نہیں ہیں۔ ایک پیسہ کا خرچ نہیں ہے۔ کہو تو لادیں تعویذ آپ کے لئے؟"

"اے خیر دین! نیک کام میں دیر کیسی اگر ایسی کوئی بات ہے تو بیٹا ایک تعویذ لادے طفیلی خالہ کو"

"لو جی اب آئیں گے تو لیتے ہُوئے ہی آئیں گے"

"تم مجھے لے چلو اُن کے پاس خیر دین"

"نہ جی نہ، عورتوں سے بڑا جلتے ہیں وہ، کسی عورت کو پاس نہیں آنے دیتے۔ آپ کا جانا تو بالکل ہی بیکار ہوگا طفیلی خالہ۔ بس جی ہم تعویذ لاکر دیں گے آپ کو اور جو کچھ وہ بتائیں گے وہ

آپ کو کرنا پڑے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ رشید بھائی یہ آئے اور وہ آئے۔"

"بہت بڑا احسان ہوگا مجھ پر خیر دین۔ خدا کے لئے مجھے وہ تعویذ لا دے۔" طفیلی خالہ نے روتے ہوئے کہا۔

"نہ جی نہ رونے کی کیا ضرورت ہے بس ہمارا کام یہی ہوگا کہ جائیں چلمن شاہ کے پاس اور تعویذ لے آئیں۔ آپ بالکل فکر مت کرو۔" خیر دین نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح کی دلچسپ باتیں کرتا رہا پھر دادی اماں کی دعائیں لیتا ہوا اٹھ گیا۔

"اب ذرا رُدابی بی جی کے پاس جائیں گے۔ اُن سے بھی سلام دعا کر لیں باقی لوگوں کو تو سلام ہو چکا۔"

رُدا اس دوران میں دفتر سے آ چکی تھی۔ لان پر جو چنڈال چوکڑی جمی ہوئی تھی اُس نے بتا دیا تھا کہ خیر دین آیا ہوا ہے اور اندر موجود ہے۔ اُن لوگوں نے رُدا کو بھی اپنی گفتگو میں شریک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دفتر سے آنے کے بعد رُدا تھوڑی دیر اپنے کمرے میں گزارتی تھی اور اُس کے بعد باہر آتی تھی۔ چنانچہ اُس وقت وہ اپنے کمرے ہی میں موجود تھی کہ خیر دین اُس کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ رُدا کو خیر دین کی آمد کی اطلاع تو مل ہی چکی تھی وہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ آج نہ جانے کیوں اُس کی طبیعت میں کچھ بوجھل پن تھا۔ باہر سے خیر دین نے پکارا۔

"رُدابی بی جی! خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اجازت ہو تو اندر آجائیں۔"

رُدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خیر دین نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور بولا۔

"اجازت مانگ رہے ہیں جی۔"

"آؤ خیر دین۔" رُدا نے کہا اور خیر دین اندر داخل ہوگیا۔

"سلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام، کہو کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہیں رُدابی بی جی آپ کی جاگیر میں جی رہے ہیں۔"

"ہونہہ میری جاگیر۔" رُدا طنزیہ انداز میں ہنس کر بولی۔

"لو جی انسان جہاں رہتا ہے وہی اُس کی جاگیر ہوتی ہے۔ اب جو ہم اس کرسی پر بیٹھیں گے تو یہ ہماری جاگیر ہی ہوئی ناں؟" خیر دین ایک کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"تم بھی مذاق اڑا لو خیر دین۔ میں ہوں ہی مذاق کے قابل۔"

"ارے، ارے بی بی جی یہ کیسی اُداسی کی باتیں کر رہی ہیں"

"کچھ نہیں خیر دین آج میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی، کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ کیا فائدہ دُنیا سے کچھ کہنے کا۔ ہر شخص اپنے اندر ایک اَنا رکھتا ہے۔ کسی کو حق نہیں ہے کہ دوسرے کی اَنا کو توڑ سکے۔"

"بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں جی۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کی اَنا کو توڑ سکے۔ ہاں تعاون ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ، کچھ دینے اور کچھ لینے ہی سے زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ اب یہ کیا بات ہوئی کہ ہم کسی سے کچھ لینے پر ہی تل جائیں۔ دینا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ واقعی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مجبوریاں بعض اوقات زبان پہ تالے لگا دیتی ہیں۔ کم از کم انہیں تو بخل سے کام نہیں لینا چاہئیے جو آزاد ہوتے ہیں۔"

"اور اگر کسی کو اس کے لئے مجبور کر دیا جائے تو؟"

"نہیں خیر دین تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ بہر طور دوسروں کے راز کھولنا اچھی بات نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں۔ ہاں بعض اوقات کچھ لوگ ذہن و دل سے اس قدر قریب آجاتے ہیں کہ اُن کے بارے میں جاننے کا تجسس دل میں پیدا ہو ہی جاتا ہے۔"

"آپ صرف اپنے ذہن و دل کی طرف کیوں دیکھتی ہیں رُدابی بی، دوسرے بھی تو یہ دونوں چیزیں رکھتے ہیں۔"

"خیر دین! تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہے، واقعی غلطی میری ہے مگر میں تم سے کچھ تو نہیں کہہ رہی۔"

"تو خیر دین بھی آپ سے کہاں کچھ کہہ رہے ہیں بی بی جی۔ اور سنائیے آپ کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہوں میں۔ بالکل ٹھیک۔ تم یہاں کوٹھی واپس نہیں آ گئے؟"

"لو جی آپ کی خدمت میں حاضری تو دیتے رہتے ہیں۔"

"یہ عرصہ کتنا طویل ہوگا خیر دین؟"

"جتنا آپ کریں گی بی بی جی۔" خیر دین معنی خیز جملے کہہ رہا تھا۔ رُدا خاموش ہو کر اُسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"ہو سکتا ہے خیر دین میں زیادہ عرصہ خاموش نہ رہ سکوں۔"

"جس دن آپ کی زبان کا تالا ٹوٹے گا بی بی جی اسی دن خیر دین بھی آپ کے قدموں میں آ پڑیں گے۔ مم، میرا مطلب ہے مم... معافی چاہتا ہوں۔ دراصل جاہل آدمی ہوں۔ اُلٹی سیدھی باتیں کر بیٹھتا ہوں۔ آپ محسوس نہ کریں بی بی جی۔"

"ہاں ٹھیک ہے جو کچھ بھی کہہ لو خیر دین۔"

"ہمارے لائق کوئی خدمت ہو بی بی جی تو بتائیے آپ آرام سے رہ رہی ہیں ناں؟"

"ہاں بہت آرام سے ہوں۔ خدا اِن لوگوں کو خوش رکھے۔"

"بس آپ کی صورت دیکھ لیتے ہیں اور جب تک دوبارہ آپ کو نہیں دیکھتے اِس سے کام چلاتے ہیں چنانچہ اجازت دے دیجئے۔" خیر دین نے کہا اور رُدا نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔

وہ کچھ افسردہ سی لگ رہی تھی۔ خیر دین نے ایک نگاہ اُسے دیکھا، آہستہ سے مسکرایا اور باہر نکل آیا۔ اِس کے بعد وہ لان کی طرف بڑھ گیا تھا۔ لان پر اب بھی تمام لوگ موجود تھے، خیر دین کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

"آؤ خیر دین بیٹھو گے نہیں ہمارے پاس۔"

"نہیں بی بی جی بس جانے کا وقت ہو گیا ہے، آپ کو پتہ ہے صاحب لوگ کی نوکری ہے، نوکروں کو زیادہ دیر کی چھٹی نہیں ملتی۔ اب جا کر گھر کا کام کاج کریں گے۔"

ثناء، ندرت، عصمت وغیرہ نے اُسے خدا حافظ کہا۔ اور خیر دین کوٹھی کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ عصمت اور اقبال اب بھی متعجبانہ نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے پھر اقبال نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"خدا ہی جانے یہ کیا اسرار ہے اس شخص کو دیکھ کر یقین نہیں آتا۔"

اختر اُسی وقت اُن لوگوں کے درمیان سے بہانہ کر کے کھسک گیا تھا۔ جب خیر دین کوٹھی میں داخل ہوا تھا صورتحال کافی حد تک اختر کے علم میں آ چکی تھی۔ اور یہ بات بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی شخص اُسے بھی دھوکہ دے جائے۔ عصمت اور اقبال کا تعاقب کرتے ہوئے اُس نے اُس پولیس آفیسر کو دیکھا تھا جو خیر دین کا ہمشکل تھا اور اِس کے بعد اُس نے اُس پولیس آفیسر کا تعاقب گھر تک کیا تھا۔ آئی۔ جی منور علی بیگ کے بارے میں ابھی وہ کچھ معلومات حاصل نہیں کر سکا تھا۔ لیکن یہ بات اُس نے اپنے پروگرام میں شامل کر لی تھی کہ اِس راز کو بھی کھول کر رہے گا اب اُس نے خیر دین کو قریب سے دیکھا تو اِس بات سے پوری طرح متفق ہو گیا کہ خیر دین کے خدوخال اور اُس کا انداز بالکل اُس پولیس آفیسر جیسا ہے اگر خیر دین اِن لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے تو اِس میں کم از کم اختر کو شامل نہیں ہونا چاہئیے، خیر دین کو اپنا راز اختر پر ضرور کھولنا پڑے گا۔ چنانچہ اِس وقت وہ ایک خاص پروگرام کے تحت بائیں سمت کی دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا تھا اور اُس نے ایک ٹیکسی کا انتظام بھی کر لیا تھا ٹیکسی ڈرائیور کو اُس نے اچھی خاصی رقم دے کر اِس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ خاموشی سے انتظار کرتا رہے پھر کافی دیر کے بعد خیر دین باہر نکلا تھا۔

وہ مناسب رفتار سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ رُخ بس اسٹاپ ہی کی طرف تھا جو یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ خیر دین نے بس اسٹاپ پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ اختر نے ٹیکسی ڈرائیور کو تھوڑا سا آگے بڑھنے کے لئے کہا اور پھر وہ بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

"دوست یہ آدمی جس سواری میں بھی سوار ہوگا ہمیں اِس کا پیچھا کرنا ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟ کوئی دُشمنی وغیرہ چل رہی ہے اُس سے؟"

"نہیں یار میں تمہیں صورت سے گڑبڑ نظر آتا ہوں؟"

"نہیں صاحب یہ بات تو نہیں۔ ہم لوگ بھی اپنی روزی کو صاف ستھرا رکھنا چاہتے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو۔ تمہاری روزی صاف ستھری ہی رہے گی۔" اختر نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بس آئی اور خیر دین اُس بس میں سوار ہو گیا۔ اختر نے ٹیکسی ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ٹیکسی بس کا پیچھا کرتی رہی۔ کافی مشکل کام تھا۔ چونکہ بس بار بار اسٹاپوں پر رُک رہی تھی۔ اور فاصلے سے ٹیکسی کو بھی روکنا پڑتا تھا۔ یہ نگاہ بھی رکھنی پڑتی تھی کہ خیر دین اِس اسٹاپ پر تو نہیں اُترا۔ کافی آگے جانے کے بعد بالآخر خیر دین ایک اسٹاپ پر اُتر گیا۔ اختر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ وہی علاقہ تھا جس میں منور علی بیگ صاحب کی کوٹھی تھی۔ اختر نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ خیر دین بس سے اُتر کر پیدل سفر کر رہا تھا اور ٹیکسی سست رفتاری سے اُس کے پیچھے آ رہی تھی ایک دو بار اُس نے پلٹ کر ٹیکسی کی طرف دیکھا بھی لیکن ایسے موقعوں پر اختر سیٹوں کے نیچے ہو جاتا تھا تاکہ خیر دین کی نگاہ اُس پر نہ پڑنے پائے۔ ویسے خیر دین نے اتفاقیہ طور پر ہی اُس طرف دیکھا تھا۔ باقی اور کوئی بات نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر

نے ٹیکسی ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے خیر دین کو منوّر علی بیگ کی کوٹھی میں داخل ہوتے ہُوئے دیکھا تھا۔ پھر وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔

"جناب خیر دین صاحب' واسطہ اختر سے پڑ گیا آپ کا، پتہ نہیں یہ آپ کی خوش قسمتی ہے یا بد قسمتی۔ چلیئے آپ بھی کیا یاد رکھیں گے کہ کوئی کنیڈین آپ تک پہنچا تھا۔"

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد اختر ٹیکسی سے اُتر آیا اور ڈرائیور سے بولا۔

"دوست تمہارا شکریہ! تم نے ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا میرا، لو یہ انعام بھی رکھو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے انعام کی رقم لی۔ اور اُس کے بعد ہوا ہو گیا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب جو کچھ بھی ہو اُس میں اُسے شرکت کرنی پڑے۔ اِس قسم کے واقعات اُس کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔

اختر کافی دیر تک خیر دین کی اِس کوٹھی کے آس پاس چکراتا رہا۔ وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا ہے؟ یا تو خاموشی سے یہاں سے چلا جائے یا پھر منوّر علی بیگ صاحب کی کوٹھی میں خیر دین سے ملاقات کرے لیکن وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ خیر دین کو کم از کم یہ احساس ضرور دلا دینا چاہیئے کہ احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں ایک ایسا فرد ضرور ہے۔ جو اُس کی اصلیت سے واقف ہے چنانچہ آخری فیصلہ کرنے کے بعد وہ گیٹ پر پہنچا اور اُس نے گھنٹی بجادی۔ چند لمحات کے بعد ایک ملازم باہر آیا۔

"میں منوّر علی بیگ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"صاحب تو موجود نہیں ہیں۔ کہیں گئے ہُوئے ہیں۔"

"اور کوئی صاحب ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ صاحب جو محکمہ پولیس میں کام کرتے ہیں؟"

"چھوٹے صاحب ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اُن سے مل لیں۔"

"بالکل، بالکل میری ملاقات چھوٹے صاحب سے کرادو۔"

"نام کیا بتاؤں صاحب آپ کا؟"

"بس یہ کہہ دینا کچھ مہمان آئے ہُوئے ہیں کنیڈا سے اور آپ کے لئے ایک پیغام لے کر آئے ہیں۔"

"آیئے صاحب ڈرائنگ رُوم میں آجائیے۔" ملازم نے شاید کنیڈا کے نام سے متاثر ہو کر کہا۔

ڈرائنگ [illegible] ستانی نفاست سے آراستہ تھا۔ اختر بیٹھا مسکراتا رہا۔ چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا اور خیر دین ایک صاف ستھرے لباس میں ملبوس اندر داخل ہو گیا کوئی بھی اُسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ چند لمحات قبل کا خیر دین ہے۔ وہ ایک شاندار سُوٹ پہنے ہُوئے تھا بالوں کا اسٹائل بھی تبدیل ہو گیا تھا اور چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آتے تھے۔ اندر آنے کے بعد اُس نے گردن خم کی اور ہیلو کہہ کر اختر کی طرف مُصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہیلو" اختر نے گہری نگاہوں سے اُس کا جائزہ لیتے ہُوئے کہا۔

"فرمایئے کیسے آنا ہُوا؟" خیر دین آہستہ سے بولا۔ اور پھر اختر کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بھئی بس سُنا تھا کہ یہاں بہت ہی نامی گرامی پولیس آفیسر رہتا ہے، ہم غیر مُلکی ذرا تجسّس پسند ہوتے ہیں، میں نے سوچا کہ آپ سے ملاقات ہی کر لی جائے۔"

"صرف ایک نامی گرامی پولیس آفیسر سے؟" آنے والے نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"نہیں نہ جانے کون کون سے رشتے نکل آئے ہیں آپ سے ویسے کیا ہم آپ کا نام پُوچھ سکتے ہیں؟"

"تصوّر! میرا نام تصوّر علی بیگ ہے۔ آئی، جی منوّر علی بیگ کا بیٹا ہُوں۔"

"شاید آپ پولیس کی نوکری میں کچھ جدّتوں کے قائل ہیں؟"

"پولیس کی نوکری ہمیشہ جدّت پسندی کا سبق دیتی ہے۔ ظاہر ہے ہماری ذمّہ داریاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ لیکن آپ کسی خاص جدّت کا تذکرہ کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں ایک صاحب ہیں یہاں احسان احمد میں اُنہی کا مہمان ہوں اور اتفاق کی بات ہے کہ اُنہی کی کوٹھی میں پہلی بار آپ سے میری ملاقات ہُوئی تھی۔"

"احسان احمد صاحب، احسان لمیٹڈ کے مالک تو نہیں؟"

"جی ہاں وہی تو وہی۔"

"سوری آپ کو کچھ غلط فہمی ہُوئی۔ میری آپ سے وہاں کبھی ملاقات نہیں ہُوئی۔ اِس لئے اتفاقیہ طور پر بھی میں کبھی اِس کوٹھی میں گیا ہی نہیں۔"

"اوہ! یعنی آپ اپنی وہ شخصیت قائم رکھنا چاہتے ہیں؟"

"کون سی شخصیت؟ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"اختر عادل کہتے ہیں مجھے۔"

"اپنا تعارف تو میں کرا ہی چُکا ہُوں اختر عادل صاحب

لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ آپ کی آمد کی وجہ اور دوسری کوئی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر چھوڑیئے کیا پیئیں گے آپ؟"

"آپ کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہُوں۔ جو دِل چاہے پلا دیں۔" اختر نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور تصوّر علی بیگ نے گھنٹی بجادی۔

ملازم اندر داخل ہُوا اور اختر اُسے دیکھ کر بُری طرح اُچھل پڑا۔

"چائے لے آؤ ہمارے مہمان کے لئے۔" تصوّر علی بیگ نے کہا۔ لیکن اختر کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہُوئی تھیں۔ اندر داخل ہونے والا ملازم خیر دین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اختر کبھی متحیّرانہ انداز میں خیر دین کو دیکھتا اور کبھی تصوّر علی بیگ کو۔ دونوں کی صُورتیں بالکل یکساں تھیں۔ سِوائے اِس کے کہ تصوّر علی کے چہرے پر تعلیم کی روشنی اور تہذیب کی نفاست پھیلی ہُوئی تھی۔ جب کہ خیر دین بے چارہ اُسی شکل میں تھا جس شکل میں وہ ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ خیر دین نے بھی اختر کو حیرت سے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"لو جی کمال ہو گئی آپ ہمارے صاحب کے جاننے والے ہو جی۔"

"خیر دین تم؟"

"ہاں جی آپ اِدھر کیسے آ گئے صاحب؟"

"وہ... وہ خیر دین بس یونہی اِس طرف آ نکلا تصوّر علی بیگ۔ تصوّر علی بیگ صاحب۔"

"خیر دین کیا تم ہمارے معزز مہمان کو جانتے ہو؟" تصوّر علی بیگ نے پُوچھا۔

"جی صاحب' احسان صاحب کی کوٹھی میں مہمان کے طور پر آئے ہُوئے ہیں۔ بھائی اختر صاحب پہلے بھی آئے تھے جی۔ بڑے اچھے آدمی ہیں جی۔ ہمارا ن بھی یاد اللہ ہے۔"

"خیر دین تم یہاں کام کرتے ہو؟"

"ہاں جی! بس یوں سمجھ لیجئے کہ احسان احمد صاحب کی کوٹھی سے نکلنے کے بعد تصوّر بھائی کے پاس ہی آ گئے' بڑے اچھے آدمی ہیں جی۔ اللہ اِن کا بھلا کرے۔ ہمیں اپنے گھر والوں کی طرح رکھا ہُوا ہے اِنھوں نے۔ نام کو تو ہم ملازم ہیں' پر ہمارے تصوّر بھائی ہمارے ساتھ کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ اللہ اِنھیں خوش رکھے۔"

"اچھا۔ اچھا۔" اختر نے سنبھل کر کہا۔

اُس کے دماغ میں لاتعداد دھماکے ہُونے لگے گویا یہ اتفاق ہے صرف اتفاق۔ تصوّر بیگ الگ ہے اور خیر دین الگ۔ اِس اتفاق کو کیا کہا جائے کہ خیر دین تصوّر بیگ کا ہمشکل ہے تصوّر بیگ نے اختر کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ہاں اختر صاحب دلچسپ بات ہے کہ آپ خیر دین کو پہچانتے ہیں، بہر طور فرمایئے کیسے آنا ہُوا یہاں؟"

"تصوّر صاحب ایک دِلچسپ اتفاق مجھے یہاں لے آیا ہے، کیا فائدہ ایک کے بعد دوسرا جھُوٹ بولنے سے، آپ کو اِس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ خیر دین کی صُورت آپ سے ملتی جُلتی ہے؟"

"سُنا ہے خداوندِ عالم نے زمین پر بہت سے ہمشکل پیدا کئے ہیں اور ہر شخص کی شبیہہ کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہے اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ البتہ یہ بات دلچسپ ہے کہ خیر دین میرا ہمشکل ہے۔ ہم اِسی رشتے سے اِسے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ پورے گھر میں خیر دین کو گھر کے ایک فرد ہی کی حیثیت دی جاتی ہے۔" تصوّر علی بیگ نے کہا۔

"تو میں عرض کر رہا تھا کہ خیر دین ہمارے ہاں مشکوک ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہے اور پتہ نہیں کس غرض سے اُس نے احسان احمد صاحب کے ہاں ملازمت کی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ ہمارے گھر گیا تھا اور وہیں سے میں اِس کا تعاقب کرتا ہُوا یہاں تک آیا ہُوں۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بہت بڑا معمّہ حل کر لُوں گا۔ معمّہ تو حل ہو گیا اِس میں تو کوئی شک نہیں لیکن بات واقعی دِلچسپ اور قابلِ حیرت ہے۔"

"اوہ اِس کا مطلب ہے کہ آپ خیر دین کے لئے یہاں آئے تھے؟"

"اگر آپ چاہیں تو معافی بھی مانگ سکتا ہُوں اِس بات کی۔"

"نہیں... نہیں بھئی ایسی بھی کیا بات ہے؟ چلیئے دوستی ہی سہی۔ کچھ اور بھی معلوم ہو جائے گا آپ کے بارے میں۔" تصوّر علی بیگ نے کہا۔

"آپ سے ملاقات کر کے واقعی خوشی ہُوئی تصوّر صاحب' ایک دِن میرے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی حیران کر دیجئے گا۔"

"کون دوسرے لوگ؟"

"احسان احمد کی کوٹھی میں رہنے والے' یقیناً وہ سب آپ سے مِل کر بہت خوش ہوں گے اور ویسے بھی حلقۂ احباب بڑھنا چاہیئے۔ کیا خیال ہے؟"

"ضرور حاضری دُوں گا کبھی، اتفاق کی بات ہے کہ اِن دِنوں مصرُوفیت کچھ زیادہ ہے، بہر طور آپ مجھے اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیجئے۔ میں آپ کے اہلِ خاندان کی غلط فہمی ضرور دُور کر دُوں گا۔" تصوّر علی بیگ نے کہا۔

"ہاں یقیناً... یقیناً۔" اختر نے احسان احمد کی کوٹھی کا فُون نمبر تصوّر علی بیگ کو دے دیا اور اِس کے بعد خیر دین چائے لے آیا۔

"ہاں خیر دین تو تم یہاں کام کرتے ہو لیکن اب تو میں تم سے

یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کوٹھی واپس آجاؤ کیونکہ تصور علی سے بھی میری دوستی ہو چکی ہے۔"

"خیر دین جیسے آدمی کو ہمارے پاس سے لیجا کر آپ ہم پر ظلم ہی کریں گے اختر صاحب۔ یہ بہت نفیس انسان ہے۔ اور میرا ہمشکل ہونے کی وجہ سے ہم میں سے کوئی اُسے چھوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ آپ جب چاہیں اسے اُدھار لے سکتے ہیں ہم سے۔ لیکن رہنے یہیں دیں اِسے آپ۔"

اختر دیر تک تصور علی بیگ سے گفتگو کرتا رہا اور اُس کے بعد اُس نے اجازت مانگ لی۔ تصور علی بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اختر جب چاہے یہاں آسکتا ہے، ویسے اُس نے وعدہ کیا کہ وہ خود بھی کبھی نہ کبھی اُن کے گھر پر حاضری دے گا۔ واپسی پر اختر اپنی کھوپڑی پر چپتیں مار رہا تھا اور پھر اُس نے دل ہی دل میں کہا۔

"چپتیں تو مجھے بہت سے لوگوں کی کھوپڑیوں پر لگانی چاہئیں کیونکہ اُنھوں نے ہی مجھے بھٹکایا تھا لیکن یہ حیرت انگیز مشابہت واقعی بہت تعجب خیز ہے۔ تصور علی بیگ کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی اور اگر کوئی اِس آواز کو غور سے سُن لیتا تو پھر یہ فیصلہ کرنے میں دُشواری نہ ہوتی کہ دونوں الگ الگ ہیں لیکن اختر اِس حد تک تصور علی بیگ سے واقف نہیں تھا وہ صرف عصمت اور اقبال کا معاملہ تھا جو اِس بات پر مُصِر تھا کہ خیر دین اور پولیس آفیسر ایک ہی ہیں۔ کافی دیر کے بعد وہ کوٹھی میں داخل ہوا۔ لان پر اب بھی وہی دھماچوکڑی مچی ہوئی تھی۔ نُدرت وغیرہ کسی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ رَدا خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اختر کو ٹیکسی سے اُترتے دیکھ کر اُن سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ نُدرت نے کہا۔

"ارے، ارے یہ اختر صاحب کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اُٹھ کر گئے تھے۔"

"اور ٹیکسی میں۔" رَدا بولی۔

اختر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا۔ ثناء نے کہا۔

"کہاں گئے تھے اختر؟"

"بس سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کا سر پیٹوں؟ کچھ لوگ قابلِ احترام ہیں جو درحقیقت میری پریشانی کے مُوجب بنے ہیں چنانچہ مجبوراً اپنی ہی کھوپڑی پیٹتا ہوا آ رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے انسان کو دوسرے کے بجائے اپنی ہی کھوپڑی کو پیٹنا چاہیئے۔ لیکن یہ سر کس سلسلے میں پیٹا جا رہا ہے؟ ذرا ارشاد ہو جائے۔" ثناء نے کہا۔

"آپ سب لوگوں کی حماقتوں پر۔ معاف کیجئے گا عصمت صاحبہ! آپ نے ہم سب کو گھن چکر بنا دیا۔"

"ارے۔ ارے میں نے کیا کیا بھئی؟ کیا غلطی ہو گئی مجھ سے؟" عصمت نے تعجب سے پُوچھا۔

"کہانی آپ ہی نے شروع کی تھی خاتون۔ اُس وقت جب آپ یونیورسٹی کے کسی ہنگامے میں حصہ لے رہی تھیں اور اقبال اِس ہنگامے میں زخمی ہو گئے تو ایک پولیس آفیسر نے آپ دونوں کی مدد کی اور یہ پولیس آفیسر خیر دین سے مشابہت رکھتا تھا۔ اِس کہانی کے چرچے عام ہونے اور اُس کے بعد خیر دین کے بارے میں ہر طرح کی تحقیقات کی گئیں اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ خیر دین ہی پولیس آفیسر کا دوسرا رُوپ ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ کبھی کبھی سمجھدار آدمی بھی معصوم لوگوں کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں میں اِس سلسلے میں دلچسپی لے بیٹھا۔"

"ارے تو آخر ہوا کیا؟ خواہ مخواہ سسپنس پیدا کر رہے ہو۔" ثناء نے جھلّاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"سسپنس؟ پتہ نہیں میں کیا کیا کرنے والا ہوں اتنا ہی بے وقوف بنا ہوں اِس وقت، بہرطور میں اِس لئے یہاں سے اُٹھ گیا تھا کہ خیر دین جب یہاں سے واپس جائے تو اُس کا تعاقب کروں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ یہ پولیس آفیسر صاحب آخر کیوں بھیس بدل کر یہاں آتے رہتے ہیں میں نے خیر دین کا تعاقب کیا اور بالآخر اُس جگہ تک پہنچ گیا جہاں خیر دین رہتا ہے۔ وہاں میری ملاقات ایک بہت ہی نفیس طبیعت کے انسان سے ہوئی اور یہ وہی پولیس آفیسر یعنی آپ کے خیر دین صاحب تھے لیکن سلک کے لباس میں ملبوس عُمدگی سے بنائے ہوئے چہرے پر انتہائی نفاست۔ البتہ خدوخال وہی تھے۔ میں نے گویا چور پکڑ لیا تھا اور اب اُس سے چوہے اور بلی کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا کہ چور صاحب نے میرے لئے چائے منگوائی اور چائے لانے والے آپ جانتی ہیں کون صاحب تھے؟"

"نہیں۔" بہت سی آوازیں بے اختیار نکل گئیں۔

"آپ کے خیر دین صاحب۔"

"کیا؟" تمام آوازوں نے بیک وقت پُوچھا۔

"جی ہاں خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے اور پھر مُجھ سے میری خیر خیریت پوچھنے لگے خیریت جو کچھ بھی تھی آپ خود بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کیسے بتائی ہوگی؟ تصور بیگ صاحب کے سامنے کُھلنا پڑا اور یہ بتانا پڑا کہ درحقیقت میں خیر دین کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ تصور بیگ صاحب خود بھی مسکراتے ہوئے اعتراف کر رہے تھے کہ اِن دونوں کی ہمشکلی اُن سب کے لئے باعث دلچسپی ہے۔ بہرطور یہ ہے آپ کے تجسس کی کہانی جس میں بغیر تحقیق کے نازل ہو کر میں نے بھی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔"

"تو کیا درحقیقت خیر دین صرف خیر دین ہے؟" نُدرت نے پُوچھا۔

"نہیں آپ چاہیں تو اُسے لادین یا علاؤالدین بھی بنا سکتی ہیں۔" اختر نے کہا۔

رَدا خاموش بیٹھی یہ ساری باتیں سُن رہی تھی۔ کوئی خیر دین کے بارے میں کچھ ایسی کہانیاں جو لمحات خیر دین نے اُس کے ساتھ بتائے تھے اُنھیں ذہن میں رکھا جاتا تو کم از کم رَدا یہ بات ہوتے کہہ سکتی تھی کہ خیر دین اگر پولیس آفیسر نہیں ہے تب بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ وہ اتنی گہری تھی کہ اپنا راز کسی کو نہیں دے سکتی تھی، بہت دیر تک اِس سلسلے میں تبصرہ ہوتا رہا پھر دفعتاً عصمت نے چونک کر کہا۔

"اختر بھائی آپ نے کیا نام لیا اُس پولیس آفیسر کا؟"

"تصور علی بیگ اور وہ سابق انسپکٹر جنرل تنویر علی بیگ کے صاحبزادے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے اُنھوں نے مجھے اپنا نام مائیکل ڈیسوزا بتایا تھا۔" عصمت نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر چونک کر بولی۔ "ایک بات اور۔۔۔ ایک بات اور کیا وہ اُردو صحیح طور پر نہیں بول پاتے؟"

"بڑی شستہ تعلیق اُردو بول رہے تھے وہ تو بالکل لکھنوی انداز تھا۔ البتہ میں یہ محسوس کر رہا تھا اب یہ معلوم نہیں کہ لکھنؤ رہنے والے کہاں کے تھے۔"

"تب ایک بات آپ کان کھول کر سُن لیجئے اختر صاحب یہیں کہیں کوئی نہ کوئی فریب ضرور پوشیدہ ہے کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ مسٹر مائیکل ڈیسوزا جب مجھے ملے اِن ہنگاموں میں تو اُن کی زبان فصیح نہیں تھی۔ بعد میں ملے تو اُردو ٹیڑھی میڑھی بول رہے تھے اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ اُن کا نام مائیکل ڈیسوزا نہیں بلکہ تصور بیگ ہے تو آپ بتائیے اختر صاحب اِن تمام باتوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟"

اختر پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ یہ بات واقعی اُس نے اِس طور پر نہیں سوچی تھی۔ چند ساعت خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر وہ دُور دُور تک اختر کو دیکھیں گے۔ کہاں تک چالیں چلتا ہے۔ مگر تعجب ہے واقعی تعجب ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ خیر دین کو پکڑا جائے یا تصور علی بیگ کو۔ بہرطور اِس سلسلے میں کارروائی ہوگی اور ضرور ہوگی۔" باقی کسی کو تو شاید معلوم تھا یا نہیں تھا لیکن اختر ایک اور راز سے بھی آشنا ہو چکا تھا اور اِس راز کا تعلق بھی کچھ حد تک خیر دین سے نظر آتا تھا۔ یہ راز وہ پیکٹ تھا جو رَدا کے کمرے میں رکھا ہوا اُسے ملا تھا اور اُس نے اُسے کھول کر پڑھ لیا تھا۔ کافی دیر تک اِس موضوع پر تبصرہ ہوتا رہا۔ اختر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا اور پھر اُس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"تصور علی بیگ صاحب یا خیر دین صاحب یا کوئی دین صاحب! اختر کو چھیڑ دیا ہے آپ نے۔ غور کر لیجئے میں وہ بلا ہوں کہ جس کے پیچھے پڑ جاؤں اُسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرطور دیکھیں گے آپ کو بھی۔ کر لیں گے آپ سے بھی حساب کتاب۔"

وہ پُرخیال انداز میں خاموشی سے سوچتا رہا۔ باقی لوگ مُسلسل خیر دین کے بارے میں تبصرہ کر رہے تھے۔

*

ڈاکٹر اکرام اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہے تھے وہ بڑی مُستعدی سے سُلطانہ بیگم کا معائنہ کرتے رہتے تھے سُلطانہ بیگم تیزی سے صحت پا رہی تھیں بالآخر وہ دن آ گیا جب سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کی پٹی کُھلنے والی تھی۔ یہ دن اور کسی کے لئے کسی بھی حیثیت کا حامل ہو لیکن ابراہیم صاحب، تنویر اور اقبال کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ماں کی آنکھوں کی روشنی اُن کی دِلی آرزو تھی۔ ابراہیم صاحب بھی بیگم کو نئی زندگی سے رُوشناس دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی اپنی استطاعت تو اتنی نہیں تھی کہ وہ سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کا علاج کرا سکتے لیکن خُدا کی ذات سے وہ کبھی نااُمید نہیں ہوئے تھے ایک تصور تھا ذہن میں وہ یہ کہ اقبال کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ اور وہ کسی قابل ہو جائے تو ایک بار سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کا علاج ضرور کرا دے۔ وہ جانتے تھے کہ خُدا خود ہی اسباب پیدا کرتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے جو انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اِس وقت بھی ایسا ہی ہُوا تھا کچھ فرشتہ صفت اُن کی مدد پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ابراہیم صاحب اِس قدر ممنون تھے احسان احمد صاحب کے کہ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنی کھال کے جوتے بنا کر اُن کے پیروں میں پہنا دیں۔ بس اُن کی آنکھوں سے تشکر جھلکتا تھا۔

سب ہی اُس دن ہسپتال میں جمع تھے ۔ ڈاکٹر اکرام احمد اپنے نفیس انداز میں گفتگو کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ اس سے پہلے اتنا بڑا مجمع انھوں نے کبھی نہیں دیکھا جو ہسپتال میں جمع ہوا ہے کہ وہ یہاں بیداری شروع کر دیں۔ وقت آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کی ایک ترتیب کی اور اس کے بعد اُن کی بیگم نے سلطانہ بیگم کی آنکھوں کی پٹی کھولنا شروع کر دی۔ نرسیں تمام ضروریات کا سامان لئے موجود تھیں۔ سُلطانہ بیگم نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ پہلے نگاہوں میں دُھندلاہٹیں اُبھر رہی تھیں پھر سب سے پہلے انھیں تنویر کی صُورت نظر آئی، جس کے ساتھ ہی اقبال کھڑا ہوا تھا آنکھیں نہیں تھیں لیکن دل کی آنکھیں کھلی ہُوئی تھیں۔ اپنے بچّوں کو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھیں۔ برابر ہی ابراہیم صاحب کھڑے ہُوئے تھے اور اس کے بعد وہ سارے محسن جنھوں نے اُن کی دُنیا روشن کر دی تھی۔ ڈاکٹر اکرام پُر تجسُس نگاہوں سے انھیں دیکھ رہے تھے اور پھر انھوں نے سُلطانہ بیگم کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگالیا کہ اُن کا یہ آپریشن مکمل طور پر کامیاب رہا ہے۔ سُلطانہ بیگم نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور آہستہ سے بولیں۔

"مَیں... مَیں دیکھ سکتی ہُوں۔ خُدا کا احسان ہے کہ میری آنکھیں واپس آگئیں۔"

"خُدا کے لئے رونے کی کوشش نہ کریں۔ خوشی کے آنسو بھی نہ بہائیں یہ آپ کی بینائی کے لئے ضروری ہے۔" مسز اکرام نے کہا۔

"نہیں میں روؤنگی نہیں۔ میں تو اپنے معبُود کی شکر گزار ہُوں کہ اُس نے ایک بار پھر مجھے یہ دُنیا دکھادی۔ براہِ کرم اِن سب سے میرا تعارف کرائیں۔ ابراہیم آپ یہ کام کریں۔"

ابراہیم صاحب آگے بڑھے اور انھوں نے احسان احمد کے ہاتھ تھامتے ہُوئے کہا۔

"یہ احسان احمد ہیں اور یہ ہماری بیگم صاحبہ ہیں۔ یہ دادی اماں ہیں۔ یہ عادل بھائی ہیں اور انھیں تو تم پہچانتی ہو سُلطانہ یہ صُورت کیا کبھی تمھاری اندھی آنکھوں سے بھی محو ہُوئی۔" انھوں نے غلام احمد کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"نہیں یہ غلام بھائی ہیں اور یہ شوکت جہاں بیگم اور یہ اماں بی اور یہ عصمت، یہ نُدرت، یہ... یہ" سُلطانہ بیگم نے ثناء کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ تیمور ہیں" ثناء تیمور کو سامنے کرتے ہُوئے بولی۔ اور سب لوگ بے اختیار مُسکرا پڑے۔

"میں ثناء ہُوں۔ یہ نادیہ ہیں۔ یہ اختر ہیں۔ یہ خالد ہیں۔ اور جناب اِن سے ملیئے یہ طفیلی خالہ ہیں۔ یہ عارفہ پھوپھی ہیں وغیرہ وغیرہ" ثناء خود ہی سب کا تعارف کرانے لگی۔

سُلطانہ بیگم سب کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر اکرام احمد نے کہا۔

"یُوں تو تعارف کے لئے ابھی سارا شہر پڑا ہے۔ ثناء کو موقعہ مل جائے تو یہ باہر کے لوگوں کو بھی پکڑ لائے لیکن میں اس سے زیادہ آپ لوگوں کو اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ اپنے مریض کو کل گھر لے جاسکتی ہیں۔ کل تک کے لئے اجازت دیجئے گا خُدا حافظ۔ پاکستان پائندہ باد۔"

"اوہ! انکل آپ نے تو بہت جلد قومی ترانہ سُنا دیا۔"

"براہِ کرم آپ اِس کے احترام میں کھڑی ہوجائیے۔ بلکہ مارچ کرتی ہُوئی باہر نکل جائیے" ڈاکٹر اکرام ہنستے ہُوئے بولے۔

"چلیئے حضرات انکل تو اِس خوشی میں مٹھائی وغیرہ بھی نہیں کھلائیں گے۔ ویسے ہم نے اِتنے کنجوس انکل اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔"

"کمال کی ہیں بھئی آپ محترمہ ثناء مٹھائیوں کے دس بیس ٹوکرے آپ کو لے کر آنے چاہیئے تھے لیکن اچھا ہی ہُوا کلینک میں مکھیاں ہوجاتیں۔ میں رات کو آرہا ہُوں آپ کے ہاں مٹھائی کھانے کے لئے۔"

"ضرور ضرور آپ تشریف لائیے ڈاکٹر ہم آپ کا استقبال کریں گے۔" احسان احمد نے کہا اور پھر وہ ابراہیم صاحب کی طرف دیکھ کر بولے۔ "نہیں جناب ہرگز نہیں آپ جذباتی ہونے کی کوشش نہیں کریں گے، چلئے تشریف لائیے ورنہ آپ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ مِل کر ماضی کی داستانیں دُہرائیں گے اور اُن کی آنکھوں سے کہیں نہ کہیں آنسو نِکل ہی جائیں گے ڈاکٹر اکرام بھئی ذرا اِن سب کو باہر نکالو۔ ورنہ تمھارے احکامات کی تکمیل نہیں ہوگی۔"

"براہِ کرم آپ سب باہر تشریف لے چلیئے" ڈاکٹر اکرام نے خشک لہجے میں کہا۔ اور سب سے پہلے احسان احمد ہی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

سب لوگ گھر واپس آگئے۔ تنویر، اقبال، عصمت اور نُدرت کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ابراہیم کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑتی تھیں۔ آج کا موضوع سُلطانہ بیگم ہی رہیں جنھیں چھوڑ کر کوئی نہیں جارہا تھا لیکن ڈاکٹر اکرام احمد کی ہدایت پر بھی توجہ دینا تھی۔ یہی خوشی کی بات تھی کہ کل کا دن سُلطانہ بیگم کی واپسی

کا دن تھا چنانچہ رات کے اجلاس میں ثناء اور نُدرت سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ وہ یہ فیصلہ کر رہی تھیں کہ کل سُلطانہ بیگم کا استقبال کس طرح کیا جائے گا، اس سلسلے میں مختلف پروگرام ترتیب دئیے گئے سُلطانہ بیگم کی آنکھوں کی واپسی کی خوشی میں شام کو ایک تقریب رکھی گئی تھی جس میں ہنگامی طور پر چند لوگوں کو مدعو کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا باقی تمام افراد کا تعلق گھر ہی سے تھا احسان احمد نے تجویز پیش کی کہ سب لوگ باقاعدہ اکرام احمد کے ہسپتال جائیں اور سُلطانہ بیگم کو بڑے اعزاز کے ساتھ لایا جائے۔ خود اپنے بارے میں انھوں نے معذرت کرتے ہُوئے کہا تھا کہ انھیں ایک بے حد ضروری کام ہے چنانچہ انھیں معاف کر دیا جائے۔ صبح کا انتظار بڑی شدت سے کیا جانے لگا۔ خاص طور پر تنویر اور اقبال کا تو بُرا حال تھا۔ نُدرت اور عصمت انھیں سنبھالے ہُوئے تھیں۔ عصمت اب کافی کھُل گئی تھی۔ اقبال سے اب نُدرت بے تکلفی سے ہر طرح کی گفتگو کر لیتی تھی۔ اِس سلسلے میں اُس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق ڈال دی تھیں اور نُدرت کے ہونٹوں پر کئی بار معنی خیز مُسکراہٹ آگئی تھی، بہرطور صبح ہُوئی تیاریاں ہونے لگیں اور پھر گویا قافلہ اکرام احمد کے ہسپتال کی جانب چل پڑا۔ سُلطانہ بیگم کی خوشیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں تھا طویل عرصے کے بعد یہ دُنیا دیکھ رہی تھیں ایک ایک شخص کو دیکھ رہی تھیں اور نہ جانے کب تک سجدۂ شکر میں پڑی رہی تھیں۔ اپنے بچّوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا کیسی عجیب سی بات لگ رہی تھی انھیں۔ بہت عرصہ پہلے وہ اپنی دُنیا تاریک کر بیٹھی تھیں۔ لیکن ایک بار پھر یہ دُنیا روشن ہوگئی تھی۔ پھر جب تمام کے تمام لوگ انھیں لینے پہنچ گئے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ذکیہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

"نہیں سُلطانہ بہن رونے کے لئے منع کر دیا گیا ہے تمھیں آنسو نہیں آنے چاہئیں۔ دِل ہی دِل میں اُس معبُود کا شُکریہ ادا کرو جو دینے اور لینے والا ہے۔"

"خُداوندِ عالم بے شک ہر انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے لیکن اس کے لئے جو ذرائع اُس نے اِس دُنیا میں پیدا کئے ہیں۔ اُن سے رُوگردانی کفر ہوتی ہے نہیں۔ خُداوندِ عالم تم لوگوں کو وہ سب کچھ دے جو تمھارے دِلوں میں موجود ہے۔"

"آمین" دادی اماں نے محبت بھرے انداز میں کہا... اور سُلطانہ بیگم سوچنے لگیں کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ دُنیا میں اتنے اچھے انسانوں کا تو تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ قصّے کہانیوں کی باتیں اپنی جگہ ورنہ اِس دَور میں کون اپنے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ لیکن زمین کے یہ رہنے والے فرشتہ صفت تھے اور انھوں نے جس طرح اِن معمُولی سے لوگوں کو اہمیت دی تھی وہ بے مثال تھا۔ ڈاکٹر اکرام احمد نے سُلطانہ بیگم کو رُخصت کی اجازت دے دی۔ اور بہت سی دُعاؤں کے ساتھ اور احتیاطی ہدایات کے ساتھ انھیں رُخصت کیا۔ کافی خوش تھے تمام کے تمام لوگ۔ سُلطانہ بیگم خود بھی مسرُور تھیں۔ تنویر اور اقبال بھی حیرت سے اُن سب کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی طرح غیر لوگ ہیں۔ اِتنی اپنائیت کا اظہار کیا جارہا تھا بالآخر یہ جلوس کوٹھی میں داخل ہوگیا۔ کوٹھی میں احسان احمد موجود تھے انھوں نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"بھئی کسی نہ کسی کو تو گھر میں بھی رہنا ہی چاہیئے تھا آئیے سُلطانہ بہن میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہُوں۔"

سُلطانہ بیگم نے گردن جھکالی۔ ابراہیم صاحب احسان صاحب کے پاس پہنچ گئے اور انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"احسان بھائی آپ نے لفظ بھائی کہنے کی جُرأت دِلادی ہے تو جی چاہتا ہے کہ آپ کے گلے سے لپٹ جاؤں۔"

"دیکھو میاں ایسی باتوں کے لئے تمھیں پہلے بھی منع کر دیا گیا ہے۔ جب کسی چیز کے لئے جی چاہے تو انسان کو فوراً کر لینی چاہیئے۔" انھوں نے کھینچ کر ابراہیم کو گلے لگالیا اور بولے۔ "بہت بہت مُبارک ہو۔ بہت بہت مُبارک تمھیں۔"

ابراہیم صاحب سِسک سِسک کر رو پڑے تھے۔ تمام لوگ انھیں تسلّیاں دینے لگے۔ سُلطانہ بیگم کی کیفیت بھی خراب ہو رہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر کی سختی سے ہدایت تھی کہ رونے پیٹنے کا کام نہ کیا جائے۔ بہرطور سب لوگ سُلطانہ بیگم کے گرد جمع ہوگئے۔ اور کافی خوشی اور مسرّت کا اظہار کیا جانے لگا۔ اِس کے بعد احسان صاحب نے ایک اور کارنامہ سرانجام دیا۔ کہنے لگے۔

"بھئی اب یہ محفل باہر لان پر ہونی چاہیئے موسم بھی خوشگوار ہے بلکہ میرا خیال ہے ایک اور کام کیا جائے۔ آئیے آپ حضرات، سُلطانہ بہن آپ بھی آئیے۔ آؤ بھئی غلام احمد یہ سب باغ تمھارا ہی لگایا ہُوا ہے۔ اب ذرا اِن پھُولوں کی خوشبُو بھی محسوس کر لی جائے آئیے تمام لوگ میں آپ کو اپنی کارروائی سے آگاہ کرنا چاہتا ہُوں۔"

کوئی کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔ بہرطور احسان احمد صاحب بھی اِس وقت اپنی شخصیت کے خلاف کھلنڈرے مُوڈ میں نظر آرہے تھے چنانچہ انھوں نے کوارٹروں کی سمت رُخ کیا اور پھر چار

نمبر کوارٹر کے سامنے وہ رُک گئے۔ چار نمبر کے کوارٹر میں تالا پڑا ہُوا تھا۔ احسان احمد صاحب نے تالا کھولا اور پھر تمام لوگوں کو اندر آنے کی دعوت دی۔ لیکن اندر داخل ہو کر اُن سب کا مُنہ حیرت سے کُھلا رہ گیا تھا۔ پورے کوارٹر میں سامان بکھرا پڑا تھا اور ابراہیم صاحب اِس سامان کو اچھی طرح پہچان گئے یہ اُن کا اپنا سامان تھا جو افراتفری میں ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ اُن کا مُنہ حیرت سے کُھلا اور وہ احسان احمد کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

احسان احمد بولے۔

"بدقسمتی سے میرے پاس الہ دین کا چراغ نہیں تھا۔ ورنہ آپ لوگوں کو یہ کوارٹر بالکل ترتیب سے ملتا۔ اب یہ ذمّہ داری اِن لڑکیوں کی ہے کہ ملازموں کو ساتھ لے کر تمام سامان کی ترتیب کرا دیں ویسے ابراہیم میاں آپ کو ذرا میری گلو خلاصی کرانا ہوگی۔"

"یہ... یہ احسان بھائی یہ...؟"

"ہاں میاں ملیر کے کوارٹر پہ ڈاکہ ڈالا ہے اور سارا سامان ٹرک میں بھروا کر لے آیا ہوں۔ تمھارے محلّے والے جمع ہو گئے تھے، سارا نام پتہ لکھ لیا میرا اس کے باوجود کوارٹر خالی کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ بڑی منت سماجت کی اور کہا کہ جس طرح کی ضمانت چاہو دِلوا دی جائے تب کہیں اِس کوشش میں کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مقامی پولیس اسٹیشن میں اِس ڈکے کی رپورٹ درج کرا دی گئی ہوگی۔"

"یہ کام آپ نے کب کیا؟" غلام احمد صاحب حیرت سے بولے۔

"میاں صبح کو میں اِسی لئے رُک گیا تھا۔ دن خُدا سے دُعائیں مانگتا رہا تھا کہ تم لوگوں کی واپسی سے پہلے کوارٹر خالی کر کے لے آؤں ورنہ سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں ابراہیم صاحب کو ساتھ لے کر وہاں جاتا اور یہ کوارٹر خالی کر دیتے۔"

"مگر احسان بھائی آپ نے... آپ نے۔"

"دیکھو میاں، یہیں رہو گے اب تم لوگ جو کچھ بھی کرنا ہے کرتے رہو۔ کوئی تکلیف ہوتی ہے وہ بھی اُٹھا لو۔ اسٹیل مِل ہی جانا ہے تو یہاں بھی پوائنٹ کی بس ملتی ہے کوئی دِقّت نہیں ہوگی لیکن رہنا تمھیں اب یہیں ہے۔ اور ایک بات اور ذہن نشین کر لینا اِن کوارٹروں سے اندر تک کی عمارت کا فاصلہ زیادہ دُور نہیں ہے یُوں سمجھ لو کہ یہاں سے وہاں تک براہِ راست راستہ ہے، کچھ مجبوریاں مُسلّط کر دی گئی ہیں مجھ پر جن کی وجہ سے تمھارا سامان اِس کوارٹر میں لانا پڑا، کیا سمجھے۔"

ابراہیم صمدانی صاحب کی گردن پھر جُھک گئی تھی۔ اور غلام احمد صاحب نے آگے بڑھ کر احسان احمد سے کہا۔

"کتنے احسانات کریں گے آپ ہم لوگوں پر؟ آپ یقین کیجئے آپ کا یہ احسان کہ آپ نے میرے دوست کو میرے قریب کر دیا۔ بھُولنے کے قابل نہیں ہے۔"

"غلام احمد انسان کے صبر کا امتحان نہ لیا کرو، انسان بہت کم قوت رکھتا ہے۔ میں کس حد تک برداشت کروں؟"

غلام احمد صاحب خاموش ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ احسان احمد کس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بہرطور احسان احمد کے اِس قدم سے بڑی سنسنی پھیل گئی تھی اور اِس سنسنی میں مسرت بھی تھی۔ تنویر اور اقبال کی تو باچھیں کِھلی پڑ رہی تھیں یہ سوچ کر کہ وہ اب یہیں رہیں گے اور ان تمام لوگوں کے ساتھ زندگی بسر ہوگی۔ عصمت بھی بے حد خوش تھی اور خوش کون نہیں تھا؛ ابراہیم صمدانی آنسو بھری آواز میں غلام احمد سے بولے۔

"غلام احمد تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم قسمت کے اتنے دھنی ہو اور اِن فرشتوں کے درمیان جی رہے ہو۔"

"خُدا انھیں خوش رکھے جنھوں نے میرے دوست کو میرے بالکل قریب کر دیا، بس اب خوش ہو جاؤ اور ذہن سے ہر تردّد نکال دو۔ احسان احمد ایسے ہی آدمی ہیں۔"

آج کا پورا دن ہی مسرّتوں کا دن رہا تھا۔ شام کی تقریب میں بہت سے افراد شریک ہُوئے تھے۔ جمّن کے ساتھ نُدرت اور عصمت وغیرہ بھی شامل تھیں۔ ردا صاحبہ بھی کام کر رہی تھیں۔ اور پھر دلچسپ بات یہ ہُوئی کہ اتفاقیہ طور پر شام کو خیر دین صاحب بھی نظر آ گئے چنانچہ احسان احمد نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔

"میاں خیر دین، نوکری ضرور چھوڑ چکے لیکن تم نے ہمیں نہیں چھوڑا ہے۔ جاؤ باورچی خانے میں جاؤ۔ آج کی تقریب کے انتظامات میں حصّہ لو۔"

خیر دین باورچی خانے میں داخل ہُوا تو سب حیرت سے اُچھل پڑے۔

"تم یہاں کیسے خیر دین؟"

"بس بی بی جی نمک کی ادائیگی کرنی ہے۔ آیا تھا طُفیلی خالہ کے پاس۔ احسان صاحب نے یہاں بھیج دیا بتائیے کیا کروں؟"

"تمھیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ردا نے مُنہ بنا کر کہا۔

"تو احسان صاحب سے جا کر کہہ دیجئے ردا بی بی۔ میں کون سی خوشی سے باورچی بننے کی۔ لو جی کمال ہو گئی۔" خیر دین اپنے

منحوس انداز میں بولا۔

نُدرت ہنسنے لگی تھی پھر خیر دین بھی کام میں مصروف ہو گیا۔ اُسے برتن صاف کرنے کی ذمّہ داری سونپی گئی اور وہ اسی لئے سیدھے انداز میں برتن صاف کر رہا تھا۔ ردا اُس کے قریب سے گزری تو اُس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں ہاتھوں کی مٹّی پلید کر رہے ہو۔ میں پہلے ہی تمھارے ہاتھوں کے بارے میں پیش گوئی کر چکی ہُوں کہ یہ کسی نوکر کے ہاتھ نہیں ہو سکتے۔"

"لو جی ردا بی بی دُعا کرو ہمارے لئے کہ ہم بھی کسی کے مالک ہو جائیں۔ آپ کی دُعائیں ہی ہمارے کام آ سکتی ہیں۔"

"جی تو چاہتا ہے خیر دین کہ تمھیں ایک کمرے میں بند کر دُوں اور اُس وقت تک بھوکا پیاسا رکھوں جب تک کہ تم آدمی نہ بن جاؤ۔"

"نہ جی نہ بی بی جی، بھوکا پیاسا رہنے سے کوئی آدمی، آدمی بنتا ہے؟ آدمی کو آدمی تو پیار ہی سے بنایا جا سکتا ہے جب تک اُسے اپنا پیار نہ دیا جائے بھلا وہ آدمی کیسے بن سکتا ہے؟"

"کر لو... کر لو جو بکواس دل چاہے کر لو لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب تمھیں کم از کم میرے سامنے اپنی زبان کھولنی ہی پڑے گی۔"

"نہ ردا بی بی جی نہ، وہ وقت اُس وقت سے پہلے کبھی نہیں آئے گا جب آپ خیر دین کو بُلا کر یہ کہیں گی کہ خیر دین میں کیا کروں۔" اُسی وقت جمّن خیر دین کے پاس آ گیا۔

"میاں تم یہاں کھڑے ہُوئے ہو اور وہاں میزیں لگانے کے لئے کوئی نہیں ہے۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ جو کسی فلم کا گانا ہے کہ... کہ۔"

"چُپ رہ بھائی، چُپ رہ تیری فلم ہر وقت چالو رہتی ہے چل میزیں لگائیں۔" خیر دین نے جمّن کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گیا۔

کچھ مہمانوں کو ٹیلیفون پر دعوت دی گئی تھی۔ وہ اِس خوشی میں شریک ہونے کے لئے آ گئے تھے اور پھر وہ سب مہمانوں میں گھُل مل گئے۔ خیر دین اور جمّن بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے اور ایک گوشے میں ردا کھڑی ہُوئی خیر دین کو دیکھ رہی تھی۔ تبھی نُدرت اُس کے پاس پہنچ گئی۔

"کیا خیال ہے مونالیزا یہ خیر دین... خیر دین۔"

"ہاں یہی دیکھ رہی ہُوں نُدرت دیکھو ناں یہ آدمی کس ٹائپ کا ہے۔"

"اللہ ہی جانے اس نے تو واقعی سب کو گھن چکر بنا کر رکھ دیا ہے۔"

باہر کے کاموں سے فراغت ہو گئی۔ خیر دین ایک گوشے میں طُفیلی خالہ کے پاس جا بیٹھا اور اُس نے جیب سے ایک تعویذ نکال کر انھیں دیتے ہُوئے کہا۔

"لو جی طُفیلی خالہ آپ کے پاس آئے تھے یہاں تعویذ دینے۔ پیر صاحب کی بڑی خوشامد کی تب تعویذ ملا ہے، یہاں آ کر پھنس گئے کام دھندوں میں۔"

"اے بیٹا کسی کے کام آ جانا بھی تو ثواب ہے۔ تعویذ کا کیا کرنا ہے مجھے؟"

"بس جی اپنے پاس احتیاط سے رکھو اللہ نے چاہا تو رشید کی خبر مِل ہی جائے گی تمھیں۔"

"اللہ تیری زبان مُبارک کرے۔" طُفیلی خالہ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔ اُسی وقت خیر دین کو غلام احمد نے آواز دے لی۔ اور وہ اُن کے پاس پہنچ گیا۔ غلام احمد صاحب نے اُسے کچھ کام بتایا تھا۔ رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ سُلطانہ بیگم کو اِس طرح مُبارک بادیں اور تحائف دیئے گئے تھے جیسے وہ اِسی کوٹھی کی ایک فرد ہوں۔ اور اِن تمام چیزوں پر اُن لوگوں کو یقین

نہیں آرہا تھا۔ سب کے سب سحر زدہ سے تھے بہرطور محفل ختم ہوئی اور احسان احمد صاحب اپنے کمرے کی جانب چل پڑے۔ اُن کے جانے کے بعد بقیہ لوگوں نے بھی آہستہ آہستہ اپنی آرام گاہوں کا رُخ کیا تھا۔ غلام احمد صاحب، ابراہیم کے ساتھ ساتھ اپنے کوارٹر میں آگئے۔ سلطانہ بیگم خوشی سے پھولی نہیں سمارہی تھیں۔ سونے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اُن کا۔ سب کو ساتھ لے کر صحن میں بیٹھ گئیں اور پھر شوکت جہاں سے بولیں۔

"شوکت جہاں بہن اِن لوگوں کے بارے میں کچھ تو بتاؤ مجھے۔ آخر یہ ہیں کس طرح کے لوگ؟ اب بتاؤ ہمیں طیرہ ہی سے لے آئے۔ کیا کیا کریں گے یہ ہمارے ساتھ؟"

"بھئی دیکھئے شوکت جہاں بھابی اب یہ لوگ کچھ بھی کر رہے ہیں اس سلسلے میں کوئی مداخلت اِن کے ساتھ ناسپاسی ہوگی۔ آپ لوگ رہیں آرام سے یہاں۔ ابراہیم جہاں کام کر رہے ہیں کرتے رہیں۔ اپنا کھائیں گے، اپنا پہنیں گے بس ساتھ ہی رہنا تو ہے۔"

"آپ لوگ یقین کریں کہ اِس سے زیادہ خوشی مجھے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی" سلطانہ بیگم نے کہا۔

"یہ تصور ہی حسین ہے کہ اب کم از کم صبح و شام غلام احمد کے ساتھ گزریں گے۔ ماضی یاد آگیا ہے کیا وقت تھا وہ بھی غلام احمد؟"

"ہاں بھئی اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ زندگی دے تو کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ ویسے ہماری اِس ملاقات میں مستقبل کی بہت سی کہانیاں بھی پوشیدہ ہیں۔"

"غالباً تم ماضی کہنا چاہتے ہو" ابراہیم صاحب نے کہا۔

"نہیں میاں میں ماضی اور مستقبل کا فرق اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اب ذرا تھیوری کر رہا ہوں تو تمہارا کیا خیال ہے کیا ہماری تعلیمی حیثیت بھی ختم ہوگئی ہے؟"

"اوہ نہیں بھئی میرا یہ مطلب نہیں تھا مگر مستقبل کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میاں اب ہمارا مستقبل ہمارے بچے ہیں۔ اور ہم جس مستقبل کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اُن میں بچوں ہی کا تصور ہوتا ہے" غلام احمد صاحب نے کہا اور ندرت چونک کر غلام احمد کو دیکھنے لگی۔

پھر اُس نے معنی خیز نگاہوں سے عصمت اور اقبال کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں وہ دونوں بھی چور سی بن گئے تھے۔ اِس سے زیادہ غلام احمد نے بچوں کے سامنے کوئی اور بات کہنا پسند نہ کی۔ لیکن رات کو چارپائی پر غلام احمد اور ابراہیم صاحب ساتھ ہی تھے۔ ابراہیم صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"غلام احمد تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔"

"یار عجب گاؤدی ہو اُصولاً تمہیں مجھ سے یہ تذکرہ کرنا چاہیئے تھا لیکن مجھے کرنا پڑا۔ دوستی کے سامنے آدمی کو بے حیا بھی بننا پڑتا ہے۔"

"تمہیں خدا کا واسطہ کون سے تذکرے کی بات کر رہے ہو؟"

"بھئی یہی بچوں کے مستقبل والا۔ کیا عصمت کی شادی اقبال سے نہیں کی جائے گی؟"

ابراہیم صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے وہ عجیب سی نگاہوں سے غلام احمد کو دیکھ رہے تھے پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"غلام احمد اتنا بڑا اعزاز دوگے مجھے؟ اِس قابل ہوں میں؟"

"میاں میں تمہاری شادی کی بات نہیں اقبال کی شادی کی بات کر رہا ہوں کیا سمجھے؟"

"غلام احمد خدا کی قسم تمہاری دوستی پر فخر کرتا ہوں میں۔ کاش میں تمہارے قابل ثابت ہوسکوں۔"

"فضول باتوں سے گریز کرو۔ یہ بات ذہن میں رکھنا میں نے اِس لئے کانوں میں ڈال دی ہے کہ کہیں تکلف میں پڑ کر یہ سلسلہ ہی نہ بھول جاؤ۔"

"سلطانہ کو سناؤں گا تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی کیا کیا دے گا میرا رب مجھے، کیا کیا دے گا" ابراہیم صاحب لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔ اور ایک بار پھر گردن جھکا کر بیٹھ گئے، غلام احمد نے انھیں اُن کی چارپائی پر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"بس اب سو جاؤ زیادہ دیر تک جاگنا صحت کے لئے مضر بھی ہو سکتا ہے۔" چنانچہ ابراہیم صاحب لیٹ گئے لیکن اُن کی آنکھیں آسمان پر ٹکی ہوئی تھیں اور وہ نہ جانے کن کن سوچوں میں گم تھے، بہت سے لوگ جاگ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔ احسان صاحب ذکیہ بیگم سے باتیں کر رہے تھے موضوع سلطانہ بیگم ہی تھیں۔ دادی اماں سو چکی تھیں بینا گہری نیند میں تھی۔ باقی لوگ نہ جانے کس کس رنگ میں تھے۔ ایک کمرے میں ندرت اپنی مسہری پر لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات آ رہے تھے ویسے تصور کا مرکز خیر دین ہی تھا۔ کبھی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ اور کبھی وہ آنکھیں سکوڑ لیتی۔ خیر دین تھڑ کا انسان ہے، کتنی پامردی سے اپنے مطالبے پر جما ہوا ہے لیکن یہ مائیکل ڈیسوزا کا کیا چکر ہے؟ اب مائیکل ڈیسوزا تصور علی بیگ بن گیا ہے اور یہ لوگ نئی ہی کہانیاں سُنا رہے ہیں۔ کیا خیر دین واقعی کوئی ایسی ہی شخصیت ہے، نہ جانے

کہاں کہاں کی کڑیاں اِس کے ذہن میں آ کر ملتی رہیں۔ خیر دین کا ایک ایک قدم یاد آ رہا تھا اور اُس کا ذہن شک و شبہے کا شکار ہوتا جا رہا تھا پھر اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"خیر دین تم جو کچھ بھی ہو بہر طور اچھے انسان ہو اور اگر تمہاری ذات میں واقعی کوئی ایسی کہانی پوشیدہ ہے تو پھر... تو پھر" ندرت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پلکیں جڑ گئیں اور خواب کے عالم میں خیر دین کی آواز سُنائی دینے لگی۔

"وہ جی کمال ہوگئی۔ ندا بی بی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ" اور اس کے بعد یہ خواب بھی آہستہ آہستہ خوابوں میں جا سویا۔

* * *

عادل حسین نے خالد اور اختر کو بُلایا اور دونوں ہی اُن کے نزدیک پہنچ گئے، عادل حسین صاحب اُس وقت اپنے کمرے میں تنہا ہی تھے۔ دونوں نے انھیں سلام کیا تو عادل حسین مسکرا کر کہنے لگے۔

"بھئی اختر میاں، بڑی سیر و سیاحت ہو رہی ہے، بڑی تفریحات کی جا رہی ہیں۔ ہمارے کام میں بھی کچھ ہاتھ بٹا لیا کرو بیٹے۔"

"ڈیڈی! یہ کہنے کی بات تو نہیں ہے آپ حکم دیجئے آپ تو خود ہی مصروف رہتے ہیں۔ میں تو کل خالد بھائی سے کہہ رہا تھا کہ خالد بھائی اب ہمارا آئندہ کا پروگرام طے ہونا چاہیئے آخر کب تک اس طرح وقت ضائع کرتے رہیں گے" اختر نے جلدی سے کہا اور عادل حسین ہنسنے لگے، پھر بولے۔

"میں جانتا ہوں تم نے یہ بات خالد سے کبھی نہ کہی ہوگی۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ خالد کبھی تمہارے اِن الفاظ کی تردید نہیں کریں گے، بہ طور خدا تمہیں ہر طرح سے خوش رکھے بیٹے، میں اب مستقل طور پر یہیں زندگی گزار دینا چاہتا ہوں۔ دیکھو کتنا حسین ماحول ہے اس گھر کا، کتنے اچھے لوگ ہیں یہاں، اور کس طرح رہ رہے ہیں۔ یہ ایثار، یہ محبت غیر قوموں میں کہاں مل سکتا ہے۔ میں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہماری نئی زندگی کی گاڑی بھی آہستہ آہستہ ہی سہی آگے بڑھتے رہنی چاہیئے۔ میں محمود آفندی صاحب سے ملا تھا اور اس سلسلے میں جو کارروائیاں اُن کے ساتھ ہو رہی ہیں وہ نہایت تسلی بخش ہیں۔ بہت بڑے کاروباری ہیں آفندی صاحب اور ہمارے ساتھ زبردست تعاون کر رہے ہیں۔ کاروباری معاملات میں تو میں اُن کے ساتھ شامل ہو ہی گیا ہوں اور اُن سے بہت سے مفید کام نکال رہا ہوں لیکن ایک کام جو میں نے کیا ہے اس میں اب تم لوگوں کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلے کو میں نہایت رازداری سے کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے ڈیڈی کیا کرنا ہے ہمیں؟" خالد نے پوچھا۔

"بھئی کوٹھی کا سودا ہو چکا ہے۔ میں تم لوگوں کو وہ کوٹھی دکھا چکا ہوں اور تم نے اسے پسند بھی کر لیا ہے۔ محمود علی صاحب ہی نے اس سلسلے میں بھی میری مشکل حل کر دی۔ اور کل اس کی تمام کارروائی مکمل ہوگئی۔ ہمیں کوٹھی کی چابی مل چکی ہے دراصل میں نے یہ کام اس لئے زیادہ خفیہ رکھا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ فوری طور پر احسان احمد کو اس بارے میں معلومات ہوں مت بُرا مانے گا وہ۔ لیکن بیٹے وہ تو پگلا ہے۔ بچپن ہی سے مجھے تنہا چاہتا ہے کہ تم لوگوں کو بتا نہیں سکتا۔ ظاہر ہے وہ اس بات سے خوش نہیں ہوگا اور اس تصور سے اداس ہو جائے گا کہ میں کہیں اور جا کر رہوں گا لیکن بہرطور ہمیں جانا تو ہے ہی تاکہ آگے کے معاملات آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تم لوگوں کو بھی میں نے اسی لئے منع کیا تھا کہ اس کوٹھی کا تذکرہ کسی سے نہ کیا جائے۔"

"ٹھیک ہے ڈیڈی، آپ نے اُس کا قبضہ لے لیا ہے؟"

"ہاں کل میں اسی کام میں مصروف تھا" عادل حسین نے بتایا۔

"تو پھر اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

"چلنا ہے تمہیں میرے ساتھ اُس کا جائزہ لینے۔ اور یہ طے کریں گے کہ اب اس سلسلے میں ہمیں کیا کیا کارروائی کرنی ہے۔ میرا خیال ہے کوٹھی ویسے تو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ کسی کمپنی کو اس کی ڈیکوریشن کا ٹھیکہ دے دیا جائے مگر اس کام کے لئے نگرانی بے حد ضروری ہے اور اختر! اس کی ذمہ داری میں تمہیں سونپتا ہوں۔"

"او کے ڈیڈی آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ آپ کی پسند ہی کے مطابق کام ہوگا۔"

"یہاں کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر تم تیار ہو کر آجاؤ میرے ساتھ چلنا ہے تمہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اختر اور خالد نے بیک وقت کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد عادل حسین اپنے دونوں بچوں کے ساتھ باہر نکل آئے۔ جس کوٹھی کا سودا عادل حسین نے کیا تھا وہ احسان احمد صاحب کی کوٹھی سے کافی فاصلے پر تھی لیکن بے نظیر آپ تھی۔ بہت وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی اس کے چاروں طرف عظیم الشان احاطہ تھا جس میں درخت جھول رہے تھے۔

بڑے سے صدر گیٹ سے سامنے کی سمت ایک روش دور تک تک چلی گئی تھی جس پر سرخ بجری بچھائی گئی تھی۔ دونوں سمت انتہائی اعلیٰ درجے کے لان لگے ہوئے تھے۔ عقبی لان میں بہت بڑا سوئمنگ پول تھا اور اصل کوٹھی کی نفاست قابلِ دید تھی اختر اور خالد پہلے بھی اس کوٹھی کو دیکھ چکے تھے اور انھوں نے اسے بے حد پسند کیا تھا لیکن اب وہ اسے اپنی ملکیت سمجھ کر دیکھ رہے تھے۔ اختر خالد کو طرح طرح کے اشارے کرتا جا رہا تھا اور خالد کسی قدر جُز بُز ہو رہا تھا۔ وہ ان اشاروں کا مطلب سمجھتا تھا۔ لیکن اسے خدشہ تھا کہ کہیں عادل حسین صاحب ان اشاروں کی طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔ بہر طور پوری کوٹھی کا جائزہ لیا گیا اور اس کے بعد عادل حسین صاحب اختر سے اس کی ڈیکوریشن کے سلسلے میں بات کرنے لگے، دونوں بیٹے باپ کو ڈیکوریشن کا مشورہ دے رہے تھے۔ اور عادل حسین صاحب ان کی فراست سے مطمئن تھے۔

"تو اختر اب یہ تمہارا کام ہے کہ کسی اعلیٰ پائے کی ڈیکوریشن کمپنی کو بکڑو اور یہاں کام شروع کرا دو۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد یہ کام ہو جائے اچھا ہے۔"

"او۔کے ڈیڈی آپ بالکل اطمینان رکھیے۔"

"میری مدد کی ضرورت تو نہیں پیش آئے گی؟" خالد نے پوچھا۔

"ابھی نہیں بھائی جان۔ البتہ ہو سکتا ہے کچھ عرصے کے بعد صرف آپ ہی کی مدد کی ضرورت باقی رہ جائے۔" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی سمجھ میں نہیں آیا اس بات کا مطلب؟" عادل حسین بولے۔

"میرا مطلب ہے ڈیڈی خالد بھائی کو اپنے پورشن کے بارے میں تو مشورے دینا ہی ہیں۔ اس کی بات کر رہا تھا۔"

"ہاں... ہاں بیٹے اپنی پسند سے سارے کام کراؤ۔ بھئی اب ہماری مداخلت صرف اس حد تک ٹھیک ہے کہ یہاں آ کر۔ جو گوشہ ہمیں بتا دیا جائے گا اسی میں پڑے رہیں گے۔"

"نہیں ڈیڈی۔ خدا آپ کو ہم پر سلامت رکھے آپ کے لئے لائبریری کا انتظام بھی کرنا ہے۔ کتابیں بھی اکٹھی کرنی ہیں ابھی تو ہماری کتابیں وہاں سے شفٹ ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے پہنچ گئی ہوں گی۔ آپ اپنی پسند کی کوئی بھی جگہ منتخب کر سکتے ہیں ہماری پسند اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔" خالد نے محبت سے کہا اور عادل صاحب بھی مسکرانے لگے۔

☆

عادل حسین صاحب اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ کام سے چلے گئے تھے۔ احسان احمد اور زدا غلام احمد کے ساتھ دفتر چلے گئے۔ باقی تمام افراد کوارٹر نمبر چار کی سیٹنگ میں مصروف ہو گئے تھے۔ اقبال اور عصمت بھی آج یونیورسٹی نہیں گئے تھے۔ سب لوگ بڑی خوشی خوشی کوارٹر میں کام کر رہے تھے۔ جمن کی ماں بھی ساتھ موجود تھیں۔ ایک بار جمن کی ماں نے رازداری سے عصمت سے پوچھا۔

"اے بیٹا کوئی نئے نوکر رکھے ہیں کیا؟ یہ لوگ تو نوکر لگتے ہی نہیں ہیں، پھر کوارٹر نمبر چار میں کیوں آ رہے ہیں؟"

"ہاں خالہ جان بس یہ سب نوکر تو نہیں ہیں لیکن ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔"

"اے اللہ! میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ میرے گھر میں بھی آبادی بڑھ جائے۔ بیٹا تم دونوں نے مجھ بڑھیا کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ میری ہو جاتیں۔ پر اب ایک کام تو کر سکتی ہو تم؟"

"جی خالہ جان بتائیے؟" عصمت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے جمن کے لئے کوئی لڑکی تلاش کر دو بیٹا خدا خدا کر کے اس کا دماغ ٹھیک ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اللہ میرا گھر بھی بھر دے۔"

"ضرور خالہ جان یہ تو ہماری ڈیوٹی ہے آپ پہلے کہتیں تو ہم کام شروع کر دیتے۔"

"بیٹی دل میں تو کچھ اور ہی تھا۔ اے حُور پریوں کو چھوڑنا پڑا ہے۔ کوئی میرے دل سے تو پوچھے۔" جمن کی ماں نے کہا۔

"چپ ہو جائیے خالہ جان حُور پری نہیں جو چڑیل آپ کی طرف آ رہی ہے ناں وہ۔ بہت خطرناک ہے۔" عصمت نے ندرت کو دیکھتے ہوئے کہا جو اسی سمت آ رہی تھی۔

"اے ہاں بُوا تمھاری بہن ہے تو کیا زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں۔ تم فرشتوں جیسی اور وہ آفت کی پرکالہ۔" شکر ہے ندرت نے یہ الفاظ نہیں سُنے تھے ورنہ پتہ نہیں جمن کی ماں پر کیا آفت نازل ہو جاتی۔

معمولات یونہی جاری رہے۔ کوارٹر میں تمام سامان سیٹ کر دیا گیا تھا۔ غلام احمد صاحب احسان احمد کی ذہنی حالت سمجھتے تھے لیکن بہر طور اس سلسلے میں انھوں نے احسان احمد سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ دفعتاً ثناء پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی کوارٹر میں پہنچی اور طفیلی خالہ... طفیلی خالہ چلانے لگی۔ طفیلی خالہ بھونچکی ہو کر ثناء کو دیکھنے لگی تھیں۔

"اے بیٹا کیا ہوا خیر تو ہے؟ الٰہی خیر کیا ہو گیا میری بچی کو؟"

"جلدی چلئے طفیلی خالہ جلدی چلئے۔ رشید کا فون آیا ہے۔"

"ایں۔" طفیلی خالہ گرتے گرتے بچیں۔

"ہاں وہ فون پر موجود ہے۔ آپ کو بلا رہا ہے۔"

"ثناء کس انداز میں تذکرہ کر رہی ہو رشید کا؟ تم سے بڑا ہے۔ جائیے طفیلی خالہ جلدی سے جائیے فون سنیئے۔"

"اے میرے مولا میری بچی نے مجھ سے مذاق نہ کیا ہو۔ اے میرے مالک میرے بیٹے ہی کا فون ہو۔ ثناء میری بچی تجھے اللہ کا واسطہ، رسولؐ کے صدقے سچ سچ بتا دے، فون آیا ہے میرے رشید کا یا ہنسی کر رہی ہے مجھ سے؟"

"نہیں خالہ ایسی بات میں میں آپ سے ہنسی نہیں کر سکتی۔ جلدی چلئے۔" ثناء نے کہا اور طفیلی خالہ کو لے کر اندر آ گئی۔ اور طفیلی خالہ نے لرزتے ہاتھوں سے فون کا ریسیور اٹھایا اور اس میں ہالو، ہالو چیخنے لگیں۔ دوسری طرف رشید نے کہا۔

"اماں میں ہی بول رہا ہوں۔" طفیلی خالہ کی ہچکیاں بندھ گئیں بمشکل تمام ان کے منہ سے آواز نکلی۔

"اے رشید میرے بیٹے تو ہی ہے؟"

"اماں میں ہی بول رہا ہوں۔ رشید ہوں میں تمھارا۔"

"میری آنکھوں کے نور میرے کلیجے کی ٹھنڈک کہاں ہے تو رشید کہاں سے بول رہا ہے بیٹے؟"

"اماں۔ میں شہر میں ہوں مگر ابھی تمھارے پاس نہیں آ سکتا۔ بہت ضروری کام ہے مجھے کسی قیمت پر چھٹی نہیں مل رہی ہے۔ تم فکر مت کرنا اماں۔ بہت جلد میں اپنے کاموں سے فارغ ہو کر تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"اے بیٹا صورت تو دکھا جا ایک منٹ کے لئے ایک منٹ کے لئے تو آ جا میرے لعل۔ میری آنکھوں میں روشنی واپس آ جائے اندھی ہوئی جا رہی ہوں میں تیرے لئے۔"

"صبر کرو اماں۔ صبر کرو۔ انسان کو اس کے گناہوں کا پھل ملتا ہی ہے۔ ساری باتیں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال اپنے دل کو تسلی رکھو میں خیریت سے ہوں اور مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"مگر تو ہے کہاں بیٹا؟ کیا تو کوٹھی میں آیا تھا؟"

"ہاں اماں! سامان رکھنے آیا تھا۔ میرا سوٹ کیس مل گیا ہو گا تمھیں۔ احتیاط سے رکھنا اسے۔ اس میں میرے کپڑے وغیرہ ہیں کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ میں نے اس لئے تمھیں فون کر دیا کہ کہیں تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں بہت جلد ہی تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں میں اور کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

"اے میرے بیٹا کتنا عرصہ لگے گا؟"

"بس اماں جتنا بھی وقت لگ جائے تم فکر مت کرنا۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اچھا خدا حافظ۔" رشید نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ طفیلی خالہ دیر تک ریسیور میں ہالو، ہالو کرتی رہی تھیں لیکن دوسری طرف لائن بے جان ہو گئی تھی۔ ثناء نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگایا اور پھر اسے کریڈل پر رکھ دیا۔

"مبارک ہو خالہ جان آپ کو آپ کے رشید کا پتہ چل گیا۔" طفیلی خالہ وہیں سجدے میں گر گئی تھیں۔ ذکیہ بیگم، دادی اماں اور عارفہ پھوپھی بھی اندر آ گئی تھیں۔ ذکیہ بیگم نے آتے ہی پوچھا۔

"طفیلی آپا کیا سچ مچ رشید کا فون تھا؟"

"ہاں میرے رشید کا فون تھا۔ اس لئے وہ خیریت سے ہے۔ کہہ رہا تھا کہ جلدی آ جاؤں گا، چھٹی نہیں مل رہی ہے اسے۔ اے اللہ تیرا ہزار ہزار شکر ہے۔ اے خیر دین خدا تجھ پر ہمیشہ اپنی برکتیں نازل کرے۔ یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے اے بیٹی اللہ تمھیں خوش رکھے، تمھارا مرتبہ بلند کرے، ایک ہی تعویذ نے میرے رشید کی آواز مجھے سنوا دی۔ اے بیٹا ثناء یہ خیر دین مجھے کہاں ملے گا ذرا اسے بلوا دے میری بچی ایک تعویذ اور مل جائے خیر دین صاحب سے تو سمجھ لے کہ رشید آ گیا۔ اے اللہ کس منہ سے تیرا شکر ادا کروں۔" طفیلی خالہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں اور ثناء کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

خیر دین کے تعویذ نے یہ کرشمہ دکھایا تھا۔ تعویذ کے بارے میں اسے تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں لیکن رشید کو تو آنا ہی تھا۔ اب خیر دین کو اس کا کریڈٹ مل گیا تھا تو یہ اس کی خوش بختی تھی۔ اس نے ساری کہانی ندرت وغیرہ کو سنائی عصمت ایک دم ساکت رہ گئی تھی تب اس نے آہستہ سے کہا۔

"ثناء ایک بات بتاؤ کیا یہ رشید صاحب کسی جرم میں پکڑے گئے تھے؟"

"بھئی تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں سنا یہی تھا کہ شہاب انکل کے ساتھ ملوث ہو گئے تھے۔"

"ہوں!" عصمت نے پُرخیال انداز میں آنکھیں نچائیں۔ پھر بولی "تو اور خیر دین کے ایک تعویذ نے طفیلی خالہ کو رشید کی آواز سنوا دی، بھئی تم لوگ مجھے جو کچھ بھی کہو خیر دین پر اب میں

بھروسہ نہیں کر سکتی۔ خدا کی قسم وہ کوئی اُونچی ہی چیز ہے۔ اور دیکھ لینا تم لوگ میری پیشین گوئی ہے کہ ایک دن اُس کے نام کا بم پھٹے گا اور وہ نہ جانے کیا سے کیا نکلے گا؟
کسی نے عصمت کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

*

شب و روز معمول کے مطابق گزرتے رہے۔ عصمت نے دوبارہ یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔ اختر اور خالد اب زیادہ تر اپنا وقت کوٹھی میں صرف کرتے تھے۔ عادل حسین صاحب اپنے کاروبار کے معاملات میں مصروف رہتے تھے، احسان احمد اور زدا احسان لمیٹڈ کے معاملات سنبھالے ہوئے تھے ابراہیم صمدانی صاحب کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ غرض زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ بدر سلطانہ بیگم نے ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا تھا اور اس نئی زندگی میں ان کے لئے خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ اپنے مل گئے تھے اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہو گی؟ ندرت اُس وقت کسی کام سے کوٹھی گئی تھی کہ جمن نے باہر نکل کر کہا۔
"آپ کا فون ہے۔ آپ کی بڑی بہن نے کیا ہے گھنٹی بجی تھی تو میں نے اُٹھا لیا۔ ریسیور نیچے رکھ آیا ہوں۔"
"میرا فون؟ عصمت باجی نے کیا ہے؟" ندرت حیرت سے بولی اور پھر تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئی ریسیور اُٹھا کر اُس نے کہا۔
"ہیلو عصمت باجی!"
"ہاں ندرت میں ہی بول رہی ہوں۔ ایک مسئلہ آ پڑا ہے ذرا تم سے، چُپ چاپ چلی آؤ۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔"
"خیریت کہاں سے بول رہی ہیں آپ؟ کیا یونیورسٹی سے؟"
"نہیں بھئی یونیورسٹی سے آ گئی ہوں اور اس وقت حسن اسکوائر پر ہوں۔ تم حسن اسکوائر کے بس اسٹاپ پر آ جاؤ۔"
"کیا اقبال بھائی ساتھ نہیں ہیں؟"
"نہیں تنہا ہی آئی ہوں۔"
"باجی کیا کوئی ایسی ویسی بات ہے؟ کیا ہوا؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟" ندرت نے پریشان لہجے میں کہا۔
"بے وقوف لڑکی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بس ایک کام ہے جلدی آ جا۔ کوئی ٹیکسی وغیرہ کر لینا اور کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں کوئی بہانہ کر کے چلی آ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔" عصمت نے کہا۔
"خیریت تو ہے باجی ہو نا؟"
"ہاں ... کر رہی ہوں بس ..." عصمت غصیلے لہجے میں بولی

"اچھا میں آ رہی ہوں۔" ندرت نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ لیکن پریشانی برحق تھی، پتہ نہیں عصمت یونیورسٹی سے کیوں چلی آئی؟ حسن اسکوائر پر کیوں رُکی؟ اور اُسے اس طرح کیوں بلایا ہے؟ ویسے وہ بہت کم باہر نکلنے کی عادی تھی، لیکن اب عصمت نے اس انداز میں بلایا ہے تو جانا ہی پڑے گا۔ اُس نے کوارٹر میں جا کر جلدی جلدی تیاریاں کیں، پرس لیا اور شوکت جہاں سے بولی۔
"امی میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ رہی ہوں، ذرا ایک تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے۔"
"اکیلی جا رہی ہو؟"
"ہاں امی زیادہ دُور تھوڑی جا رہی ہوں، بس ابھی واپس آئی۔ کچھ ایسی ہی ضروری چیزیں ہیں۔ کوئی زیادہ فاصلہ تھوڑی طے کرنا ہے مجھے، پلیز ابھی آئی بس۔"
شوکت جہاں نے کچھ نہ کہا اور ندرت باہر نکل آئی لیکن اُس کے دل میں تشویش مسلسل تھی۔ آٹو رکشہ لے کر وہ چل پڑی۔ نہ جانے عصمت باجی کو ایسا کیا معاملہ درپیش ہے؟
تھوڑی دیر کے بعد وہ حسن اسکوائر کے بس اسٹاپ پر اُتر گئی۔ آٹو رکشہ کو پیسے دے کر اُس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں لیکن عصمت کہیں نظر نہیں آئی تھی البتہ ایک خوبصورت مرسڈیز بس اسٹاپ سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے یونہی سرسری سی نگاہوں سے مرسڈیز کی طرف دیکھا اور اُسی وقت اختر مرسڈیز کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔ وہ مسکراتا ہوا ندرت کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"اوہ! اختر آپ؟ کیا عصمت باجی؟"
"سوری میڈم معافی چاہتا ہوں مگر کیا کیا جائے انسان پر بُرا وقت آ پڑتا ہے تو وہ ایسی ہی گھٹیا حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عصمت باجی بے چاری یونیورسٹی میں ہوں گی، خادم نے آپ کو عصمت باجی کی آواز میں فون کیا تھا۔"
ندرت حیرت سے اُچھل پڑی۔
"تم نے؟" وہ چیختے ہوئے لہجے میں بولی اور اختر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن خم کر دی۔

ندرت کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اختر کی یہ حرکت اُسے بہت بُری محسوس ہوئی۔ اُس نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
"کیا قیامت ٹوٹی تھی آپ پر؟"
"آہ! اُس وقت کا ذکر کیا کیا جائے جب ہم پر قیامت ٹوٹی تھی۔ بس قیامت، قیامت ہوتی ہے۔ ٹوٹ ہی جاتی ہے کبھی کبھی۔" اختر نے شاعرانہ انداز میں کہا۔
"مگر اس طرح فون کرنا بدتہذیبی ہے۔" ندرت نے کہا۔
"ارے کیا واقعی؟ معاف کیجئے گا ندرت صاحبہ دراصل عمر کا زیادہ حصہ کینیڈا میں گزرا ہے اور یہ مغربی ممالک انسان کو اپنے وطن کی تہذیب سے اتنا دور کر دیتے ہیں کہ آدمی ملغوبہ بن کر رہ جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اِس طرح فون کرنے کا بُرا نہیں مانیں گی۔"
"اختر صاحب! آپ نے واقعی زیادتی کی ہے۔ بدتہذیبی کی ہے۔" ندرت نے سرد لہجے میں کہا۔
"ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو لیکن جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہو ہی چکا۔"
"آپ کو عصمت باجی کی آواز میں فون نہیں کرنا چاہئے تھا۔"
"کسی اور کی آواز میں کرتا تو آپ اُس بات کو زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ اگر میں خود اپنا نام آپ کو بتا دیتا تو اِس وقت احمقوں کی طرح یہاں کھڑا ہوتا۔ اب دیکھئے نا آدمی جو کچھ چاہتا ہے اُس کی تکمیل کے لئے اپنے تمام حربے استعمال تو کرتا ہی ہے۔"
"مجھے سخت نفرت ہے آپ کی اِس بات سے۔"
"خیر اب جو کچھ بھی ہے۔ آیئے تشریف رکھئے۔"
"دماغ خراب ہوا ہے آپ کا؟"
"ہوا تو نہیں ہے ہو جانے کے امکانات ہیں؟" اختر نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ ابھی میں آپ کو بازو سے پکڑ کر گاڑی میں دھکیل کر دو چار بُری بھلی باتیں کہوں تو لوگ جمع ہو جائیں گے اور اس کے بعد میں اُن سے کہوں کہ یہ ہمارا آپس کا جھگڑا ہے تو پھر بھلا کون ہمارے معاملات میں مداخلت کرے گا؟"
"معاف کیجئے گا یہ کمینہ پن نہیں ہے۔ لوگ ... کریں گے آپ کی کہ آپ کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ یہاں صرف میری ... مانی جائے گی۔ آپس کا جھگڑا سب کا جھگڑا بن جائے گا۔"

"وہ تو ہم بھی ملنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم نے کب منع کیا ہے لیکن آپ شاید ہماری یہ گاڑی دیکھ کر جل گئیں۔ اِس میں بیٹھنا نہیں چاہتیں آپ۔"
"بھئی کیا لغویت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس قسم کے انسان ہیں؟"
"آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔ اب دیکھئے نا، ہر بات سمجھنے میں کچھ نہ کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ ویسے آپ بلاوجہ یہ وقت ضائع کر رہی ہیں۔ آیئے براہِ کرم تشریف رکھئے۔"
"میں نہیں بیٹھوں گی اِس گاڑی میں۔"
"تو دوسری خرید لیں گے فی الحال اِسی سے کام چلا لیں۔ ہمیں تو آپ کی پسند کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔" اختر نے کہا۔
کچھ لوگ اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو پر توجہ دے رہے تھے۔ ندرت بوکھلا کر مرسڈیز میں جا بیٹھی اور اختر نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھ دیا۔ مرسڈیز اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔
"مجھے آپ سے اِس چھچھوری حرکت کی توقع نہیں تھی۔" ندرت نے منہ بنا کر کہا۔
"بہت سی باتیں انسان کی توقع کے خلاف ہوتی ہیں۔ اب ہر شخص میں ساری خوبیاں ہی تو نہیں ہوتیں۔"
"آپ مجھے لئے کہاں جا رہے ہیں؟" ندرت نے سوال کیا اور اختر چونک کر اُسے دیکھنے لگا پھر اُس نے عجیب سے انداز میں کہا۔
"کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟" اُس کے لہجے کو ندرت نے خاص طور سے محسوس کیا تھا۔
وہ اختر کی صورت دیکھنے لگی۔ اختر کے چہرے پر ایک ہلکی سی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ تب اُس نے آہستہ سے کہا۔
"یہ بات نہیں ہے لیکن آپ کو میری سمجھ میں نہیں آتا آخر آپ کا پروگرام کیا ہے؟"
"یہ ہوئی نا بات۔ آپ کے لہجے کی تبدیلی بتاتی ہے کہ آپ کو اپنے سوال کی بے تکی کا احساس ہو گیا ہے میں آپ کو جہاں بھی لے جاؤں گا عزت و احترام کے ساتھ لے جاؤں گا اور اُس کے بعد اُسی عزت و احترام کے ساتھ آپ واپس کوٹھی پہنچ جائیں گی پھر بھلا یہ سوال کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

ندرت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اختر کو ڈرائیونگ کرتے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے چونک کر کہا۔

"یہ مرسیڈیز آپ کی کب سے ہو گئی؟"

"صرف دس دن پہلے یہ ہماری زوجیت میں آئی ہے۔" اختر نے جواب دیا اور ندرت مُسکرا دی۔

آہستہ آہستہ اُس کے ذہن سے ناگوار تاثر ختم ہوتا جا رہا تھا۔

"مگر کوٹھی میں تو میں نے اِسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"ابھی اِس نے کوٹھی نہیں دیکھی ہے آپ کی۔" اختر نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

"ہو ہو، یہ کدھر موڑ رہے ہیں آپ؟ یہ تو، یہ تو..."

"بس اب یہاں تک آ گئے ہیں تو تھوڑا سا صبر اور کر لیجئے۔" اختر بولا اور پھر اُس نے ایک خوبصورت اور عالیشان کوٹھی کے صدر گیٹ کے سامنے مرسیڈیز روک دی۔

صدر گیٹ پر تالا پڑا ہُوا تھا۔ اختر نے نیچے اُتر کر چابی سے تالا کھولا اور مرسیڈیز کو اندر لے گیا۔ گیٹ کھُلا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ندرت چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کیا حسین کوٹھی تھی۔ خوابوں کی جنت کے مانند، کسی بھی طرح احسان احمد کی کوٹھی سے کم نہیں تھی بلکہ اُس سے کچھ حسین ہی تھی۔ اختر صدر دروازے پر اُتر گیا اور ایک بار پھر اُس نے مین گیٹ کا تالا کھولا تھا۔

"کیا اِس کی ساری چابیاں آپ کے پاس ہیں؟" ندرت نے سوال کیا۔

"فی الحال مستقبل ... آپ کے پاس ہوں گی۔" اختر نے جواب دیا۔ اور ندرت کے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

اختر نے دروازہ کھولا اور دو قدم پیچھے ہٹتا ہُوا بولا۔

"میری آرزوؤں کی ... کیجئے گا۔"

"کیوں بور کر رہے ہیں اختر صاحب۔" ندرت نے کسی قدر شرمائے ہُوئے سے انداز میں کہا۔

"بعض لوگ ہوتے ہی بد قسمت ہیں۔ اُن کی آرزوؤں سے دوسروں کو بوریت ہوتی ہے۔ آپ اندر چل رہی ہیں یا دھکا دُوں آپ کو؟" اختر نے کہا اور ندرت ایک قدم آگے بڑھ گئی۔

وہ اندر داخل ہو گئی تھی۔ کوٹھی کی ایک ایک چیز سے نفاست ٹپک رہی تھی۔ قدیم طرز کا فرنیچر ایک بہت بڑے ہال میں سجا ہُوا تھا۔ اُس سے آگے راہداریاں اور کمرے تھے۔ کوٹھی تھی کہ قلعہ! اتنی وسیع و عریض، اتنی نفیس کہ بس دیکھتے رہنے کو جی چاہے۔ نہایت اعلیٰ قسم کے قالین بچھائے گئے تھے۔ بہترین ڈیکوریشن کی گئی تھی۔ ہر شے اپنی جگہ نفیس تھی۔ اختر اُسے ایک ایک کمرہ دکھاتا پھرا۔ پھر وہ کوٹھی کی اُوپری منزل پر پہنچ گیا اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ہم نے اپنے لئے یہ منزل منتخب کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کک... کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے آپ اِس اُوپری منزل پر رہنا پسند کریں گی یا نیچے؟"

"اختر صاحب پلیز۔" ندرت نے فہمائشی انداز میں کہا۔

"ارے، ارے پھر کوئی غلطی ہو گئی کیا؟" اختر دانتوں تلے زبان دبا کر بولا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

"حقیقی باتیں، جن میں کُوٹ کُوٹ کر سچائی بھری ہُوئی ہے۔"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"جو بھی کہنا نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ کوٹھی کی مالکہ کو کوٹھی دکھانے لایا ہوں۔"

"کیا آپ یہ نہیں محسوس کر رہے ہیں کہ یہاں میں اور آپ تنہا ہیں اور کیا اِسی احساس کے تحت آپ اتنی بے تکی سے باتیں نہیں کر رہے؟" ندرت نے کہا اور اختر پھر چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"زیادتی پر زیادتی کئے جا رہی ہیں آپ۔ خیر کوئی بات نہیں، ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن محترمہ ذرا اُوپری منزل کی ڈیکوریشن کے بارے میں فرما دیجئے گا۔ ہم آپ کی خواہش کے مُطابق کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں نہیں اختر صاحب نہیں۔"

"ایک درخواست اور ہے۔ اگر قبول کر لیں تو یقین کیجئے کہ اختر کو نہ جانے کیا کچھ مِل جائے گا۔"

ندرت سوالیہ نِگاہوں سے اختر کو دیکھنے لگی۔

"اُوپری منزل میں کچن بھی ہے اور اُس کچن میں ہم نے خفیہ طور پر کچھ چیزوں کا بندوبست کر دیا ہے حالانکہ ابھی اُن کی ضرورت نہیں تھی لیکن انسان بعض اوقات اپنی خواہشوں

کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ جانے کیا کیا کر ڈالتا ہے۔"

"کک... کیا مطلب؟"

"کافی کا پُورا سامان موجود ہے اور آپ کو ہمارے لئے کافی بنانا پڑے گی۔"

"میں گھر جانا چاہتی ہُوں۔" ندرت نے کہا۔

"چلئے۔" اختر سنجیدگی سے بولا اور ندرت پھر اُسے دیکھنے لگی۔ اختر واپسی کے لئے زینے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ ندرت نے اُسے دیکھا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آگے نہیں بڑھی تھی۔ اختر نے سیڑھیوں کے پاس پلٹ کر اُسے دیکھا اور چونک کر رُک گیا۔

"آئیے نا۔"

"اُوپر آ جائیے آپ۔" ندرت بولی اور اختر واپس پلٹ پڑا۔

"جی فرمائیے۔"

"کچن کس طرف ہے؟"

"اوہو... آئیے، آئیے اب دیکھئے نا یہ ساری باتیں ابھی اپنے تجربے سے باہر ہیں۔ ہم نے سُنا تو ہے کہ خواتین کا انکار اقرار کی حیثیت رکھتا ہے لیکن بات ذرا کچھ عجیب سی ہے۔ بھئی بعض اوقات کچھ ایسے کام بھی بتانے پڑتے ہیں، جنھیں واقعی کرنا ہو تو پھر کیا اُن کا اُلٹ کہا جائے۔"

"فضول باتوں میں کوئی آپ سے جیت سکتا ہے، چلئے کچن کی طرف چلئے۔" ندرت نے کہا اور اختر اُسے ساتھ لئے ہُوئے کچن کے قریب پہنچ گیا۔

نہایت عالیشان کچن تھا۔ ایک بہت بڑے ہال کی مانند۔ اِس میں جدید ترین طرز کے چولہے لگے ہُوئے تھے اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ ندرت اُسے دیکھتی رہی۔ وہ اختر سے تمام چیزوں کے بارے میں پُوچھتی رہی اور اختر اُس کی مدد کرتا رہا۔ کافی تیار ہو گئی تو اختر نے کافی کی ٹرے اُٹھائی اور آگے بڑھ گیا۔

"یہ اُنگلی کٹا کر آپ شہیدوں میں کیوں شامل ہو رہے ہیں؟"

"شہادت تو ہمیں بہت پہلے مِل چکی ہے۔ اُنگلی کہاں کٹی ہے؟ آئیے اب دیکھئے نا۔ نصف بہتر کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوتا ہے۔"

"بکواس کئے جائیے آپ۔ میں اب آپ سے بات ہی نہیں کر رہی۔" ندرت نے کہا اور اختر اُسے لئے ہُوئے ایک کمرے میں آ بیٹھا۔ پھر اُس نے اپنے ہاتھوں سے کافی بنائی اور ایک پیالی ندرت کو پیش کر دی۔

"قبول فرمائیے۔ ویسے آپ نے یہ کمرہ دیکھا؟"

"ہاں، کیوں؟"

"ہمیں یہ بہت پسند ہے۔ ہم... میرا مطلب ہے مجھے۔" اختر نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ کو پسند ہو گا لیکن آپ نے یہ کوٹھی کب خریدلی؟"

"میں نے نہیں خریدی بلکہ ہمارے ڈیڈی نے ہمارے لئے خریدی ہے۔"

"تو کیا عادل صاحب یہاں فوراً شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ہاں ظاہر ہے، بچوں کے مستقبل بھی تو بنانا ہیں اُنھیں۔ چاند سی بہوئیں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اکثر کہتے رہتے ہیں کہ یہ دونوں چاند کب اُن کے گھر میں اُتریں گے۔" اختر نے کہا اور ندرت نے کافی کی پیالی رکھ دی۔

"عورتوں کی سی باتیں کر رہے ہیں آپ۔"

"عورتوں کے سامنے عورتوں کی سی ہی باتیں کرنا چاہئیں۔ سُنا ہے وہ اِس سے خوش ہوتی ہیں۔"

"جی نہیں، عورتوں کے سامنے مردوں کی سی باتیں کرنی چاہئیں۔"

"کافی پیجئے۔" اختر نے کرخت لہجے میں کہا اور ندرت نے ہنس کر کافی کی پیالی اُٹھالی۔

اختر چند لمحے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس نے اپنی کافی اُٹھا کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینا شروع کر دیئے۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"خدا کی قسم ندرت! اِس سے زیادہ بے وقوف ہستی اور کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"بس بعض اوقات اُسے ایسی باتوں سے خوشی محسوس ہوتی ہے جو انتہائی جذباتی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں اور اُن کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ کافی میری زندگی کے لئے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ نے یہ مٹھاس میرے پُورے وجود میں گھول دی ہے۔ میں اِس وقت آپ سے بالکل مذاق نہیں کر رہا ندرت، درحقیقت یہ خواب نہ جانے کتنے عرصے سے دیکھ رہا ہُوں میں اور اب اِس کی تعبیر کا وقت آیا ہے۔ آپ اِس تعبیر میں میرا ساتھ دیں گی نا ندرت۔"

"اختر صاحب! وہ باتیں انسان کو نہیں کرنی چاہئیں جو دوسروں کے کرنے کی ہوتی ہیں۔" ندرت نے جواب دیا۔

"بہتر، اب نہیں کی جائیں گی۔ ویسے پلیز ایک بات تو بتا دیجئے یہ کوٹھی آپ کو کیسی لگی؟"

"بہت خوبصورت ہے۔ آپ یقین کیجئے خدا آپ کو مُبارک کرے۔"

"صِرف مجھے؟" اختر نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا اور ندرت مُسکرا دی پھر اُس نے کہا۔

"دیکھئے گھر سے اتنی دور میں کبھی نہیں رہتی عصمت باجی کے حوالے سے باہر نکلی ہُوں، اگر دیر سے گھر پہنچی تو مجھ سے بازپُرس ہو جائے گی۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے؟"

"ہرگز نہیں، چلئے اُٹھئے۔"

"چائے کی پیالیاں تو دھو کر رکھ دُوں۔"

"ارے نہیں یہ کام بندہ خود کرے گا۔"

"نہیں، اتنی دیر تو ہے میرے پاس۔" ندرت نے کہا۔ پھر اُس نے کافی کے کپ اُٹھائے اور کچن میں چلی گئی۔ کپ دھونے کے بعد اُس نے قرینے سے رکھ دیئے اور اُس کے بعد اختر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"چلئے، اب جلدی سے چلئے اور مجھے کسی ایسی مناسب جگہ چھوڑ دیجئے۔ جہاں سے میں آٹو رکشے کر واپس گھر چلی جاؤں۔"

"ایسا ہی ہوگا جنابِ والا۔" اختر نے مُسکرا کر کہا۔ اور اُس کے بعد وہ نیچے اُتر آیا۔ تمام دروازوں کو تالے لگائے اور مرسیڈیز میں بیٹھ کر واپس چل پڑا۔ ندرت مُسکرا رہی تھی پھر اُس نے کہا۔

"آپ نے واقعی بڑی زیادتی کی ہے۔ اِس وقت میرے ساتھ۔"

"اب چھوڑیئے بھی اِن تکلفات کو، کیا فائدہ خوشی تو آپ کے چہرے سے بھی چھلک رہی ہے۔"

"ہُش۔" ندرت نے شرماتے ہُوئے کہا۔

اُس کے بعد اُس کی زبان نہیں کھل سکی تھی۔ ساری کی ساری تیزی طراری رُخصت ہو گئی تھی۔ بالآخر اختر نے اُسے ایک ایسی جگہ اُتار دیا۔ جہاں بہت سے آٹو رکشہ کھڑے ہُوئے تھے۔ ندرت نے آٹو رکشہ میں بیٹھنے کے بعد اُسے پتہ بتا دیا اور آٹو رکشہ چل پڑا لیکن ندرت کا ذہن ہواؤں میں اُڑ رہا تھا جو کچھ اختر نے کیا تھا وہ اُس کی فطرت کے عین مُطابق تھا یعنی شرارت۔ لیکن جو جذباتیت اُس کے انداز میں پائی جاتی تھی اُس نے ندرت کو کھو جانے پر مجبُور کر دیا تھا۔ کیا واقعی؟ کیا واقعی زندگی اتنی ہی سُنہری ہو جائے گی۔ جس کے خواب اُسے دکھائے جا رہے ہیں؟ بالآخر انہی خوابوں میں ڈوبی ہُوئی وہ کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ شکر تھا کہ کسی کو اُس کے بارے میں تشویش نہیں ہُوئی تھی اور عِصمت ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

❊

کوٹھی کی فضا میں جو سوگواریت پیدا ہو گئی تھی وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ گو بہت سے دل زخمی تھے۔ بہت سے ذہن عجیب عجیب سے احساسات کا شکار تھے۔ لیکن نئی تبدیلیوں نے سب پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ ابراہیم صاحب کی آمد بھی کافی دلچسپی کا باعث ہُوئی تھی۔ شامیں آتنی ہی خوشگوار ہو گئی تھیں غلام احمد صاحب ہر چند احسان احمد صاحب سے دُور رہنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے اور اُن کے درمیان اُس فرق کو برقرار رکھنے کے خواہشمند تھے جو احسان احمد صاحب کی شخصیت کو کبھی داغدار نہ ہونے دے لیکن احسان احمد مختلف قسم کے آدمی تھے چنانچہ اپنی شاموں میں وہ خاص طور سے ابراہیم ہمدانی اور غلام احمد کو شریک کیا کرتے تھے۔ عادل صاحب نے ابھی تک اپنی کوٹھی کے بارے میں احسان احمد کو تفصیلات نہیں بتائی تھیں اور ندرت بھی خاموش ہی رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ کسی کو کیسے بتا سکتی تھی کہ اُس نے اختر کے ساتھ جا کر عادل صاحب کی کوٹھی دیکھی ہے۔

کوٹھی کے معاملات تفریحی نوعیت کے چل رہے تھے۔ ویسے اِس وقت کوئی کِسی کا نشانہ نہیں تھا۔ لے دے کر اگر کوئی گفتگو رہ جاتی تھی تو صِرف خیردین کے بارے میں رہ جاتی تھی۔ جو سب کے لئے ایک معمہ بنا ہُوا تھا۔ جمن اور باقی لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصرُوف تھے۔ طفیلی خالہ رشید کی آواز سُننے کے بعد کافی حد تک مطمئن ہو گئی تھیں۔ عارفہ پھپھو اپنے معمول کے مطابق زندگی گزار رہی تھیں۔ غرض تمام مُعاملات معمول کے مطابق ہی تھے۔ جمن کی ماں اب تین نمبر والوں سے اپنے اختلافات ختم کر چکی تھیں اور کبھی کبھی آنے جانے بھی لگی تھیں۔ اکثر اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جمن کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اور ایک ایک سے کہا تھا کہ کوئی جمن کے سر پر بھی سہرا باندھ دے۔ ندرت کے مسئلے میں جمن کو جس تلخ تجربے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اُس نے اُسے بہت محتاط کر دیا تھا۔ اور اُس کے بعد کافی عرصے سے اُسے کسی طرف آنکھ

اُٹھانے کی جُرأت نہیں ہُوئی تھی لیکن کوٹھی میں نئے لوگوں کی آمد ذرا توجہ کا باعث بن گئی تھی اور جمن کی ماں نے ایک رات جمن سے کہا۔

"اے کلموہے تو بھی اِس دُنیا میں کچھ کرے گا یا نہیں؟"

"اماں اور کیا کروں؟ کھانے پکانے کے اتنے طریقے سیکھ لئے ہیں کہ بس اب یوں سمجھ لے کہ تیرا جمن جہاں بھی کھڑا ہو جائے گا اُسے فٹافٹ نوکری مِل جائے گی۔ ارے آج اگر میں چاہُوں تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نوکری کر سکتا ہُوں۔"

"بس بس نوکری ہی کرتا رہے گا۔ زندگی بھر دُنیا اپنی تقدیر بنائے لے رہی ہے اور تو باورچی کا باورچی ہی بنا ہُوا ہے۔"

"اے تو کیا مُلک کا وزیرِاعظم بن جاؤں؟" جمن نے کہا۔

"وزیر تو خیر تیرے پُرکھوں میں کوئی نہ بنا ہوگا مگر کچھ شادی بیاہ کے بارے میں بھی سوچا تُو نے؟"

"اے اماں میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ تُو کچھ نہ سوچ سکی تو میں کیا سوچوں گا۔"

"زبان تو چلانی خوب آ گئی ہے اور کچھ نہ کیا جا سکا۔ ارے میں کہتی ہُوں اگر تین نمبر والیوں میں سے کسی پر داؤ چلا لیتا تو آج تقدیر ہی بدل جاتی۔"

"لے اُن کی تقدیر کون سی بدل گئی؟ کچھ دن کے لئے کوٹھی میں گئے تھے پھر باہر واپس آ گئے۔ اگر وہاں کچھ ہو جاتا تو میری تقدیر میں کیا چار چاند لگ جاتے؟"

"خیر چھوڑ اِن باتوں کو۔ تو کچھ نہ کچھ تو کر کسی سے بات کر۔ میں تو کرتی ہی ہُوں خود بھی تو کسی سے کچھ بات کر۔"

"ایک بات کہوں اماں تو بُرا تو نہیں مانے گی؟"

"ہاں ہاں بول، کہہ۔"

"یہ چار نمبر بھی تو آباد ہو گیا ہے۔"

"ہاں ہو گیا ہے پھر؟"

"وہاں بھی تو ایک ہے۔" جمن نے شرماتے ہُوئے کہا۔

"کون؟"

"اب تُو خود بھی تو کچھ معلومات حاصل کر۔ تنویر ہے اُس کا نام۔" جمن نے کہا اور جمن کی اماں چونک پڑیں۔ کافی دیر تک سوچتی رہیں پھر بولیں۔

"ہاں ہے تو، لڑکی بھی اچھی ہے۔ سیدھی سادی معصوم سی۔ اُن دونوں شیطان کی خالاؤں سے بالکل مختلف مگر اگر یہ بیل منڈھے کیسے چڑھے گی؟"

"یہ سب مجھ سے ہی پُوچھا کر۔ بیٹھی بیٹھی اپنا پیٹ ہی بھرتی رہا کر۔ میرے لئے کچھ بھی نہ کریو اِس دُنیا میں۔"

"کروں گی بابا کروں گی مگر ڈر لگتا ہے جیسی تین نمبر والوں نے دُرگت بنائی، ایسی ہی کہیں چار نمبر والے بھی تیری دُرگت نہ بنا دیں تو خود بھی تو کچھ کر۔"

"ہُوں۔" جمن پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے تو ابھی اپنی زبان بند رکھ۔ پہلے میں کوشش کرتا ہُوں اگر کامیاب ہو گیا تو تجھے بتا دُوں گا اور ناکامی ہو گئی تو بھی تجھے بتا دُوں گا تاکہ تیری زبان خراب نہ ہو۔"

"ہاں بیٹا میں بھی اب تیرا گھر آباد کرنا چاہتی ہُوں۔"

"جیتی رہے اماں، جیتی رہے۔ تو خود بھی آباد رہے۔" جمن نے خلوصِ دل سے کہا اور اُس کے بعد اُسی دن سے جمن تنویر کی تاک میں لگ گیا۔

خود بھی تیز آدمی تھا۔ وہ تو بس ندرت جیسی شیطان کے ہتھوں میں جا پڑا تھا اور اُس کی وجہ سے کافی دُرگت بنی تھی لیکن اپنے فن میں یکتا تھا۔ کوٹھی کے کچن کا آدھا سامان اُس کے اپنے گھر میں آ جاتا تھا اور اُس سے زیادہ خوشحال آدمی اِس کوٹھی میں شاید ہی اور کوئی تھا۔

تنویر بالکل سیدھی سادی بیل کی مانند تھی۔ گھر کے کام کاج اور زندگی کے دوسرے معمولات میں دلچسپی لینے کے علاوہ ابھی کوئی اور تصور اُس کے ذہن میں کبھی نہیں جاگا تھا۔ یہاں کے لوگوں کی ممنون بھی تھی جنھوں نے اُسے اتنی عزت و احترام کے ساتھ اس گھر میں جگہ دی تھی۔ ندرت، عصمت، شنو اور دوسرے سب ہی اُسے ہر معاملے میں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور کبھی نہ اِس کا احساس ہونے دیا تھا کہ وہ کسی طور اُن سے کمتر ہے یہاں آنے کے بعد درحقیقت اُسے زندگی کا صحیح لُطف آ رہا تھا اور جو آزادی اُسے حاصل تھی کہ بے دھڑک کوٹھی میں آ جاتی تھی۔ یہ کوارٹر کوٹھی سے الگ ضرور بنے ہُوئے تھے۔ لیکن اُن کے مکین کوٹھی والوں سے الگ نہیں تھے چنانچہ اب تنویر ذکیہ بیگم، اماں بی اور دوسرے تمام لوگوں کے کام بھی کر دیا کرتی تھی۔ کوئی بھی اُسے اپنے پاس طلب کر لیا کرتا تھا اور تنویر اُن کے کام بخوشی کر دیا کرتی تھی۔ اِس وقت بھی دادی اماں نے اُسے کسی کام سے بلایا ہوا پھر کچن سے تھوڑی سی اجوائن لانے کے لئے کہا جسے وہ پان میں ڈال کر کھانا چاہتی تھیں۔ تنویر کچن کی جانب بڑھ گئی، درحقیقت

لمحات کے بعد کچن کے اندر داخل ہوگئی۔ جمّن ہانڈی میں کفگیر چلاتے ہوئے کوئی فلمی گیت گنگنا رہا تھا۔ جونہی دروازہ کھلا اور وہ چونک کر اُدھر دیکھنے لگا۔ کفگیر پر اُس کا ہاتھ جما ہوا تھا۔ تنویر کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نمودار ہوگئے۔ تنویر ایک قدم آگے بڑھی اور آہستہ سے بولی۔

"اجوائن چاہیئے تھوڑی سی، دادی اماں منگا رہی ہیں۔"

"یں... آپ نک... کیا کہا آپ نے؟"

"اجوائن۔"

"اجوائن۔ جوائن؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"تم اجوائن نہیں سمجھتے؟" تنویر سنجیدگی سے بولی۔

"سس... سمجھتا تو ہوں مم... مگر اس وقت بھول گیا ہوں۔ معاف کرنا آپ کا نام تنویر ہے نا؟"

"جی کیوں؟" تنویر نے سادگی سے پوچھا۔

"وہ فلم بیتاب دیکھی ہے آپ نے؟"

"کون سی؟"

"بیتاب۔"

"کیوں؟"

"اُس میں ایک گانا ہے۔ وہ میرا مطلب ہے جب پہاڑیوں میں گایا جاتا ہے تو محبوب مل جاتا ہے؟"

"اجوائن نہیں ہے؟" تنویر نے سوال کیا۔

"ہے، ہے کیوں نہیں۔ یہ لیجئے پورا ڈبہ ہی لے جائیے۔"

جمّن نے اجوائن کا ڈبہ اُتار کر تنویر کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ڈبہ نہیں منگوایا ہے دادی اماں نے۔ تھوڑی سی منگوائی ہے۔ پان میں ڈال کر کھائیں گی۔"

"وہ، وہ تو ٹھیک۔ مگر میں میرا مطلب ہے آپ کو کھانے میں کیا چیز پسند ہے؟"

تنویر نے تھوڑی سی اجوائن ایک کاغذ میں رکھی اور وہاں سے واپس پلٹ پڑی۔ چند لمحات کے بعد وہ باہر نکل آئی اور جمّن ایک درد بھرا گانا گانے لگا۔ لیکن تنویر کو اُس کی یہ کیفیت بہت عجیب معلوم ہوئی تھی۔ دادی اماں کو اجوائن دینے کے بعد وہ باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جمّن کے اِس رویّے کو بھول گئی تھی لیکن جمّن بھلا کہاں باز آنے والوں میں سے تھا۔ نُدرت کے پیچھے پڑا تھا تو حد کر دی تھی اور اب تنویر اُس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔

جاری ہے

اِس دلچسپ کہانی کے بقیہ واقعات تیسرے حصّہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ایم اے راحت
۳

چنانچہ شام کو جب تمام لوگ لان پر موجود تھے اور تنویر کسی کام سے اندر گئی تو جمن اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ تنویر نے چونک کر اُسے دیکھا۔ جمن آہستہ سے بولا۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کو کھانوں میں کون کون سی چیزیں پسند ہیں؟"

"کھانے کی ساری چیزیں۔"

"مطلب یہ کہ کھانے کی کوئی ایسی خاص ڈش۔"

"کیوں، کیا کروگے تم؟"

"کل سے وہ ہر وقت پکا کرے گی۔ ہر روز پکا کرے گی۔ بس آپ ایک مرتبہ کہہ کر تو دیکھئے۔"

"مگر اِس کی وجہ؟"

"بس میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہ میں آپ کے لئے آسمان کے ستارے اور زمین کے بادل۔ ہم... میرا مطلب ہے کہ وہ کون سی فلم کا گانا ہے۔ وہ آپ نے سُنا تو ہوگا تیری مانگ ستاروں سے بھر دوں۔ مگر... مگر۔"

"پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" تنویر نے آہستہ سے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لیکن جمن کی اُس وقت کی باتیں بھی اُسے بہت عجیب لگی تھیں۔ وہ کافی دیر تک اُس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد جب سب لوگ فارغ ہوگئے تو تنویر، نُدرت کے پاس جا بیٹھی۔

"نُدرت باجی! ایک بات کہوں آپ سے؟"

"ہاں ہاں کہو۔"

"یہ جو ہمارا باورچی ہے نا، مم میرا مطلب ہے ثنا بی بی کا باورچی۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"یہ کچھ عجیب سا ہے۔"

"ارے ارے کیوں کیا ہوا؟ خیریت؟" نُدرت چونک کر تنویر کو دیکھنے لگی اور تنویر نے اُسے اجوائن سے لے کر کھانے کی ڈش تک کا واقعہ بتا دیا۔ نُدرت پھٹی پھٹی آنکھوں سے تنویر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر تنویر کو گلے لگا لیا۔

"جیتی رہئے جیتی رہے تُو، تنویر ہمیشہ جیتی رہے۔ بڑی کوفت ہو رہی تھی اِن دِنوں گھر میں کوئی ایسا ذریعۂ تفریح ہاتھ نہیں آیا تھا جس سے زندگی میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی مگر تُو نے، زندہ باد تنویر زندہ باد۔"

"کک... کیا مطلب ہُوا باجی اِس کا؟ میری تو کچھ سمجھ میں

نہیں آرہا"۔

"تنویر! دیکھو بُرا نہیں ماننا جو کچھ ہم کہیں"۔

"آپ کی بات کا اور بُرا مانوں گی"۔

"نہیں مانو گی نا"؟

"ہرگز نہیں"۔

"تو پھر زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے جسے کہا جاتا ہے تفریح"۔

"ہاں ہوتی ہے"۔

"بھلا کیا ہوتی ہے وہ"؟

"تفریح"۔

"دھت تیرے کی۔ میرا مطلب ہے تفریح کیا چیز ہوتی ہے"؟

"گھومنا پھرنا، کھیلنا کودنا، لطیفے بازی اور ایسی ہی چیزیں"۔

"ایک چیز اور ہوتی ہے"۔ ندرت نے کہا۔

"وہ کیا"؟

"عشق"۔ ندرت نے جواب دیا اور تنویر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"ہاں ہوتی ہے"۔

"کیا ہے کبھی"؟

"نن... نہیں باجی! کک... کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ"؟

"اُوہ! شرمانے کے لئے تم سے کس نے کہا ہے؟ کیا ہے تو بتا دے اور نہیں کیا ہے تو بتا دے"۔

"خدا کی قسم کبھی نہیں۔ مم... میں اتنی بُری لڑکی نہیں ہوں"۔

"جی نہیں، بُری لڑکیاں عشق نہیں کرتیں"۔

"تو... تو کیا مطلب ہے آپ کا اچھی لڑکیاں"۔

"ہاں بالکل بالکل ہر شریف آدمی کو عشق کرنا چاہیئے مگر ذرا دیکھ بھال کے۔ سوچ سمجھ کر۔ تو میں تجھ سے کہہ رہی تھی۔ عشق نامی ایک چیز ہوتی ہے اور غالباً یہی چیز چمن کو تجھ سے ہو گئی ہے"۔

"چ چمن کو"۔ تنویر نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں، کیا ایک باورچی کو عشق کرنے کا حق حاصل نہیں ہے"۔

"باجی! یہ تو بڑی بدتمیزی کی بات ہے اُسے اِس کا خیال رکھنا چاہیئے تھا کہ ہم لوگ... ہم لوگ"۔

"ہاں ہاں خیال نہیں رکھا۔ اِسی کی تو اُسے سزا ملنی چاہیئے"۔

"سزا! بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ باجی اُسے کوئی بڑی سزا دینی چاہیئے"۔

"بالکل میں تجھ سے متفق ہوں۔ لیکن اِس سزا کے لئے ایک پلاننگ کرنا ہوگی"۔

"کیا"؟

"جو کچھ میں تمہیں بتاؤں تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا بولو وعدہ کرو۔ کرتی ہو"؟

"آپ کہیں گی تو سب کچھ کروں گی مجھے آپ پر پُورا پُورا اعتماد ہے"۔

"تو پھر تفریح ہوگی۔ اب اِس میں شک و شبہے کی کیا بات ہے"؟

"اوہ! تو آپ اِس تفریح کی بات کر رہی تھیں"۔

"ہاں بالکل، اب ہمیں ذرا یہ پتہ لگانا پڑے گا کہ کل گھر میں کیا کیا چیزیں پک رہی ہیں اور پھر تم چمن سے اُس کے علاوہ چیزوں کی فرمائش کرو گی۔ میرا مطلب ہے دوسری دو چار ڈشوں کی۔ دیکھیں گے یہ چمن صاحب کیا کرتے ہیں؟ یا تو اپنے پاس سے اخراجات کریں گے اور اگر کوٹھی کے خرچے سے کچھ کرنے کی کوشش کی تو میں اِس سلسلے میں اُن کو ڈانٹ کروں گی"۔

"مم... مگر باجی کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو"۔

"بالکل ایسی ویسی بات نہ ہوگی۔ چمن کی ایسی کی تیسی"۔ ندرت نے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تفریح کے لئے آپ کہہ رہی ہیں تو جیسا آپ کہہ رہی ہیں ایسا ہی کروں گی"۔

"زندہ باد تنویر، زندہ باد۔ تم نے اِس مُردہ کوٹھی میں نئی زندگی دوڑا دی ہے۔ اب دیکھنا ذرا تماشہ، لُطف آ جائے گا"۔ ندرت نے ہنستے ہوئے کہا اور تنویر بھی مُسکرانے لگی۔

چمن خود ہی اپنی شامت کو آواز دے رہا تھا تو کوئی کیا کرتا، لیکن بے چارے کی دُنیا بھی تو محدود تھی۔ کوٹھی ہی میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتا پھرتا تھا اور اب تنویر آ گئی تھی تو اُس کے ذہن میں نئی کونپلیں پھُوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اِن کونپلوں میں ننھے ننھے کانٹے چھپے ہوئے تھے۔

٭

کوٹھی کے سلسلے میں ابھی بہت سے کام باقی تھے۔ اور چونکہ اُس کی ذمہ داری مکمل طور پر اختر کو سونپ دی گئی تھی اِس لئے اختر ہی کو مصروف رہنا پڑتا تھا۔ وہ کوٹھی کی ڈیکوریشن کے لئے خود بھی کافی سامان کی خریداری کرتا رہتا تھا اور ایسے

اوقات میں وہ اکثر مرسیڈیز نکال لیتا تھا جو عادل حسین صاحب نے خریدی تھی۔ اختر نے ابھی تک اِس گاڑی کو چند ہی مواقع پر استعمال کیا تھا۔

اِس وقت بھی چونکہ وہ کوٹھی نہیں گیا تھا اور یونہی ٹیکسی میں بیٹھ کر خریداری کے لئے نکل آیا تھا۔ اِس لئے مرسیڈیز اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ طارق روڈ پر چند چیزیں خرید رہا تھا کہ دفعتاً اُس کی نگاہ ایک سمت اُٹھ گئی اور طارق روڈ کی ایک دُکان میں اُس نے تصور بیگ کو دیکھا تھا جو خود بھی خریداری کر رہا تھا۔ تصور بیگ سے اُس دن کے بعد سے آج تک اختر کی کوئی ملاقات نہیں ہُوئی تھی اور اُس کا مسئلہ کچھ لمحات کے لئے کھٹائی میں پڑ گیا تھا چونکہ اِن دنوں مختلف قسم کی مصروفیات تھیں اِس لئے اختر بھی اُس پر کوئی توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اِس وقت تصور بیگ کو دیکھ کر اُس کی رگ شرارت پھڑک اُٹھی۔ وہ دُور سے اِس بات کا جائزہ لیتا رہا کہ تصور بیگ تنہا ہے یا کوئی اور بھی اُس کے ساتھ ہے لیکن اِس وقت تصور بیگ تنہا ہی تھا چنانچہ اختر پھُرتی سے اپنی جگہ سے نکلا اور تصور بیگ کے پاس پہنچ گیا۔

تصور بیگ ایک سادہ سے شلوار سُوٹ میں ملبوس بہت خوبصورت اور نفیس نظر آ رہا تھا۔ یہ شلوار سُوٹ بھی انتہائی قیمتی کپڑے کا تھا۔ اور اُس میں تصور بیگ کی شخصیت میں چار چاند لگ گئے تھے۔ ویسے بھی خوبصورت آدمی تھا لیکن اِس لباس نے اُسے اور بھی وجیہہ بنا دیا تھا۔ اختر کی آواز سُن کر تصور بیگ چونک پڑا۔ اُس نے اختر کو دیکھا اور پھر ایک دم شناسائی کے انداز میں مُسکراتے ہُوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"ہیلو، آپ کا نام بھُول گیا میں"۔

"اختر، اختر حسین"۔ اختر نے جواب دیا۔

"فرمایئے اختر صاحب، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ کیا ہو رہا ہے؟ تنہا ہیں یا کوئی ساتھ بھی ہے"؟

"کیوں یہ سوال آپ نے کیوں کیا"؟ اختر نے چونک کر پُوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اگر آپ تنہا ہیں تو آیئے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کی جائیں۔ اِس وقت میں فرصت میں ہوں"۔ تصور بیگ نے عجیب سے انداز میں کہا اور اختر نے صاف محسوس کیا کہ وہ بات بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"آپ بھی تنہا ہی معلوم ہوتے ہیں"؟ اختر نے پُوچھا۔

"ہاں بالکل۔ بس ایسے ہی کچھ چھوٹی موٹی خریداری کے لئے اِس طرف آ نکلا تھا"۔

"گویا فرصت کے لمحات گزار رہے ہیں۔ حالانکہ تعجب کی بات ہے، پولیس کی ملازمت میں فرصت کہاں ملتی ہے"؟

"جی ہاں، اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن اِس وقت ذرا اطمینان سے بیٹھا تھا کچھ چیزوں کی ضرورت تھی چنانچہ اِس طرف آ نکلا۔

"میں اِسے اپنی خوش قسمتی ہی قرار دُوں گا"۔

"ہاں واقعی آپ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ میری بھی خوش قسمتی ہے"۔ تصور بیگ نے کہا۔

"جی نہیں میری خوش قسمتی ذرا مختلف قسم کی ہے"۔

"کیا مطلب"؟

"مطلب یہ کہ آپ اعتراف کر چکے ہیں کہ اِس وقت آپ فرصت میں ہیں اور میں وعدہ کر چکا ہُوں مختلف لوگوں سے کہ اُن سے آپ کی ملاقات ضرور کرائی جائے گی چنانچہ اِس اتفاق کو ہم یادگار کیوں نہ بنا لیں"؟

"اوہ آپ کا مطلب ہے کہ... کہ"۔

"بالکل میرا یہی مطلب ہے جو آپ سمجھے ہیں"۔

"اِس وقت تو معذرت چاہُوں گا اختر صاحب کیونکہ مجھے آٹھ بجے تک واپسی ضروری ہے"۔

"بھئی ابھی ٹائم ہی کیا ہُوا ہے۔ ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ آٹھ بجنے میں تو ابھی بہت وقت باقی ہے"۔

"لیکن وہ..."۔

"نہیں تصور بیگ صاحب! یہ عذر لنگ ہے۔ آپ کو بھلا آئندہ فرصت کہاں نصیب ہوگی اور پھر اختر حسین ولد عادل حسین جو ہیں نا کچھ عجیب و غریب طبیعت کے مالک ہیں اگر آپ نے میری یہ دعوت قبول نہ کی تو مجھے رنج ہوگا"۔

"دیکھئے وہ..."۔

"کچھ نہیں تصور بیگ صاحب! کچھ نہیں، تشریف لایئے۔ آپ کے پاس یقیناً گاڑی تو ہوگی"۔

"جی ہاں گاڑی ہے"۔

"تو آپ کی گاڑی میں ہی چلیں گے۔ میں تو ٹیکسی سے یہاں آیا تھا"۔ تصور بیگ چند لمحات کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو چلئے چلتے ہیں"۔

"تشریف لائیے۔ کہاں ہے گاڑی آپ کی؟"

"وہ اُس طرف کھڑی ہُوئی ہے۔" تصوّر بیگ نے کہا اور اختر کے ساتھ چلتا ہُوا گاڑی تک پہنچ گیا۔

اختر نے کئی بار کن انکھیوں سے تصوّر بیگ کا چہرہ دیکھا لیکن وہ اُس کے چہرے پر کوئی خاص بات تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"آپ براہِ کرم مجھے اپنے گھر کا پتہ بتاتے چلئے۔"

"چلتے رہیئے، چلتے رہیئے۔ آپ کو خود بخود سب کچھ یاد آجائے گا۔" اختر نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"میرا مطلب ہے یہ سڑکیں تو آپ کی جانی پہچانی ہوں گی۔ پولیس سے بھلا کون سی جگہ محفوظ رہتی ہے۔" اختر نے جلدی سے کہا اور تصوّر بیگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی کوٹھی کے صدر گیٹ پر پہنچی۔ گیٹ کھُلا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ سب لوگ معمول کے مطابق اور اختر کی توقع کے عین مطابق لان پر موجود تھے۔ پُوری دھما چوکڑی مچی ہُوئی تھی۔ رِدا، ثناء، نُدرت، عِصمت، تنویر، اقبال اور باقی تمام اہلِ خانہ بھی وہیں موجود تھے۔ وہ سب اِس نئی کار کی جانب متوجہ ہوگئے جو بڑی بے باکی سے اندر آگئی تھی۔ لیکن اُس سے اختر کو اور اُس کے پیچھے تصوّر بیگ کو اُترتے دیکھ کر سب کے مُنہ حیرت سے کھُل گئے۔ وہ جنھیں تصوّر بیگ کے بارے میں کوئی حقیقت معلوم نہیں تھی... پھٹی پھٹی آنکھوں سے تصوّر بیگ کو دیکھنے لگے۔ خاص طور سے دادی اماّں اور ذکیہ بیگم بہت حیران تھیں۔

تصوّر بیگ آہستہ آہستہ اختر کے ساتھ چلتا ہُوا لان پر پہنچ گیا۔ اُس کے انداز میں ایک عجیب سی جھجک تھی۔ دادی اماّں ایک دم آگے بڑھ آئیں اور مُسکراتی ہُوئی بولیں۔

"اے بیٹا خیردین! تُو تو اِس وقت بہت پیارا لگ رہا ہے۔ میں پہلے ہی کہتی تھی ذکیہ سے۔ ذکیہ ذرا دیکھو اپنے خیردین کو۔ بھئی پہننا اوڑھنا چیز ہی دوسری ہوتی ہے۔ آج ذرا آدمی کے جامے میں نظر آرہا ہے۔ بڑی خوشی ہُوئی تجھے دیکھ کر بیٹا، ایسا ہی رہا کر ہمیشہ۔"

تصوّر بیگ نے متعجب نِگاہوں سے اختر کو دیکھا تو اختر نے جلدی سے کہا۔

"نہیں دادی اماّں! یہ اپنا خیردین نہیں ہے بلکہ یہ تو تصوّر بیگ صاحب ہیں۔"

"ایں! مجھ سے بھی مذاق کر رہا ہے شریر کہیں کا۔" دادی اماّں نے پوپلے مُنہ سے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ ذکیہ بیگم بولیں۔

"خیردین! واقعی بڑے پیارے لگ رہے ہو تم۔ پتہ نہیں تمہیں کیا سُوجھی کہ اِس طرح چلے گئے۔ بھئی اُس وقت کی بات ذرا مختلف تھی اب تم واپس کیوں نہیں آجاتے؟"

تصوّر بیگ خاموشی سے اُن لوگوں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیوں میں بھی سنسنی پھیل گئی تھی۔ وہ سب گہری نِگاہوں سے تصوّر بیگ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور بالکل خاموش تھیں۔ تصوّر بیگ چند لمحات اُن لوگوں کو دیکھتا رہا پھر مُسکرا کر بولا۔

"اتفاق کی بات ہے محترمہ کہ خیردین میرے ہی گھر پر ملازم ہے اور میرے پاس کام کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے آپ کے الفاظ پر شدید حیرت ہوتی۔" اُس کا لہجہ بالکل بدلا ہُوا تھا۔ حالانکہ آواز میں خیردین کی جھلکیاں صاف ملتی تھیں لیکن لہجے کی نفاست اُسے خیردین سے جُدا ثابت کرتی تھی۔ ذکیہ بیگم نے متحیّرانہ نِگاہوں سے اختر کی طرف دیکھا تو اختر جلدی سے بولا۔

"ہاں چچی جان، یہ حقیقت ہے۔ یہ خیردین نہیں ہیں بلکہ تصوّر بیگ صاحب ہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کے پولیس آفیسر ہیں۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے بلکہ کہتے ہُوئے شرمندگی ہوتی ہے کہ اِن کی صُورت ہُوبہُو خیردین سے ملتی جلتی ہے۔ ہم لوگ بھی ایسے بہت سے دلچسپ واقعات کا شکار ہوئے ہیں جب تصوّر بیگ صاحب کو دیکھ کر خیردین کا تصوّر ذہن میں آیا۔ میں نے سوچا اِنھیں آج یہاں گھسیٹ ہی لایا جائے۔"

"تت تو... یہ یہ۔"

"جی ہاں یہ خیردین نہیں ہیں۔" اختر نے کہا۔ اور پھر آہستہ سے بولا۔

"مجھے اُمید ہے تصوّر بیگ صاحب کہ آپ بُرا نہیں مانے ہوں گے۔"

"ہرگز نہیں بھئی بُرا ماننے کا کیا سوال ہے؟ آپ مجھے اِن سب سے مِلائیے۔ میرا تعارف کرائیے اِن سے۔"

"یہ میری چچی جان ہیں ذکیہ بیگم۔ احسان احمد کی بیگم صاحبہ اور یہ ہماری دادی اماّں ہیں یعنی احسان احمد صاحب کی والدہ۔ باقی لوگوں سے آپ کو مِلاؤں۔ آئیے آگے تشریف لائیے۔" اختر نے کہا اور تصوّر بیگ پُرتکلف انداز میں اُس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

لڑکیاں سنبھل گئی تھیں۔ رِدا سب سے پیچھے تھی۔ ثناء سب سے آگے۔ عِصمت، نُدرت وغیرہ بھی حیرت خیز نگاہوں سے تصوّر بیگ کو دیکھ رہی تھیں۔ جب وہ اُن کے قریب پہنچا تو ثناء نے آگے بڑھ کر کہا۔

"اوئے خیردین! کدھر فرار ہوگیا تھا تُو؟"

"ثناء، ثناء پلیز۔" اختر نے بوکھلائے ہُوئے انداز میں کہا۔

"نہیں بھئی مجھے تو پُوچھنے دو اِس سے۔ آج بن ٹھن کر آیا ہے ہمارے سامنے۔ ارے تُو ہماری نِگاہوں سے کیا چُھپ سکتا ہے اور چُھپ کر دیکھ مُرغا نہ بنا دیا تو ثناء نام نہیں۔"

"ثناء پلیز! کیا کر رہی ہیں آپ۔ یہ تصوّر بیگ ہیں۔"

"ارے ایسے بہت سے تصوّرات ہمارے ذہن میں آکر چلے جاتے ہیں۔ خیردین چلو اِدھر آجاؤ۔"

"جی بہت بہتر۔" تصوّر بیگ نے گردن خم کر کے کہا۔ اور جدھر ثناء نے اشارہ کیا تھا اُس طرف بڑھ گیا۔

"ہاں دیکھا یہ ہے ہمارا رُعب۔ ارے ہمارے سامنے نہ جانے کتنے تصوّر بیگ اور سکندر بخت آتے ہیں اور اپنی اوقات میں واپس آجاتے ہیں۔ اب اِس شخص کی سزا یہی ہے کہ اِسے ایک ہفتے تک یہاں بند رکھا جائے اور یہاں سے نکلنے نہ دیا جائے۔" ثناء نے کہا۔

اختر بوکھلائی ہُوئی نِگاہوں سے ثناء کو دیکھ رہا تھا۔ ہرچند کہ اختر کو بھی ابھی بہت سے شبہات باقی تھے لیکن ثناء کے اِس طرح پیش آنے کی اُسے توقع نہیں تھی جبکہ ثناء تھوڑی بہت حقیقت حال جانتی تھی لیکن ثناء، ثناء تھی۔ کس وقت کیا کر بیٹھے گی، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ ثناء آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی اُس کے قریب پہنچ گئی اور اُس نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہُوئے کہا۔

"تو تم نے چولا بدل ہی لیا؟"

"نہیں محترمہ! میں جیسا تھا ویسا ہی ہُوں۔" تصوّر بیگ نے کہا اور پھر اختر کی طرف رُخ کر کے بولا۔

"اختر صاحب! کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے واقعی سزا سُنا دی جائے۔ اِس لئے بہتر ہے کہ آپ اِن لوگوں کو تمام صُورتِ حال بتا دیجئے۔ ہوسکتا ہے میری جاں بخشی ہوجائے۔"

"ہاں بھئی، آپ لوگ تصوّر بیگ کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میری پُوری داستان تو سُن لیں۔ عِصمت صاحبہ آپ براہِ کرم ذرا آگے تشریف لائیے اور اقبال بھائی آپ بھی۔" اختر نے عِصمت اور اقبال کو مخاطب کر کے کہا اور عِصمت سامنے آگئی۔

وہ گہری نِگاہوں سے تصوّر بیگ کا جائزہ لے رہی تھی۔

"آپ یہ فرمائیے آپ نے اِنھیں پہچانا؟"

"ہاں یہ پولیس آفیسر ہیں۔"

"تو پھر اِن لوگوں کو بتا دیجئے گا بلاوجہ ایک معزز آدمی کی شان میں گستاخیاں کئے جا رہی ہیں۔ ذرا چھُری تلے دم تو لیں۔ تصوّر بیگ صاحب کا باقاعدہ انٹرویو ہوگا اور آپ کی اِس دلچسپی کی پُوری پُوری تکمیل ہوجائے گی جو آپ کو تصوّر بیگ صاحب سے پیدا ہوگئی ہے۔"

"مگر یہ خیردین، تصوّر بیگ کیوں بنا ہم سے پُوچھے بغیر؟" ثناء نے کہا۔

"آپ تو بس خاموش ہی رہیں۔ ارے بھئی کوئی اِنھیں خاموش کرے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اگر زیادہ گڑبڑ ہُوئی تو میں اپنے معزز مہمان کو لے کر واپس چلا جاؤں گا۔" اختر نے کہا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ یہ آپ کے معزز مہمان نہیں ہمارے بھی ہمارے بھی۔" ثناء نے جُملہ اَدھورا چھوڑ دیا۔

"خادم ہُوں آپ کا اور ہمیشہ آپ کی خدمت میں زندگی بسر کرنے کا خواہش مند ہُوں لیکن خادم کا کچھ بیان تو سُن لیا جائے اُس کے بعد جو حکم آپ فرمائیں گی اُس کی تکمیل کردی جائے گی۔" تصوّر بیگ نے آہستہ سے کہا۔

عِصمت آگے بڑھ کر بولی۔

"مائیکل ڈیسوزا صاحب! آپ کی زبان بڑی صاف ہوگئی۔"

"ابھی تو میری طبیعت ہی صاف ہوگئی ہے۔ آپ تمام لوگوں کے درمیان آکر، کچھ ذرا پانی وانی پلائیے تو حواس بحال ہوں۔ اختر صاحب مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔" تصوّر بیگ نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"اور مجھے بھی اِن تمام لوگوں سے یہ اُمید نہیں تھی تصوّر صاحب کہ یہ اِس طرح آپ پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"یار! اگر ذرا کوئی پوزیشن کا آدمی ہوتا تو دوسری بات تھی لیکن مجھے جو عہدہ دیا جا رہا ہے وہ ذرا میرے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ آپ کو کم از کم یہ وضاحت تو کر دینی چاہیئے تھی کہ آپ خود بھی میرے بارے میں چھان بین کر چکے ہیں۔" تصوّر بیگ

نے کہا۔

"ثنا! یہ لوگ موقع ہی نہیں دے رہے اب صرف دو منٹ دیتا ہوں اِن لوگوں کو۔ اپنے آپ کو سنبھالیں، صحیح طریقہ گفتگو اختیار کریں ورنہ پھر یہاں سے چلتے ہیں۔" اختر نے کہا۔

"ارے واہ، ذرا جا کر تو دیکھو کیا دُرگت بنتی ہے تم دونوں کی۔" ثنا بولی اور تصور بیگ ہنسنے لگا پھر اُس نے کہا۔

"خواتین و حضرات! میں آپ کو اپنا حلفیہ بیان دینے پر تیار ہوں۔ پتہ نہیں کیوں آپ ناراضگی کا اظہار کر رہی ہیں۔ براہِ کرم ایک ایک کر کے سوالات کیجئے۔ اِس دلچسپ صورتِ حال سے میں بھی پریشان ہو گیا ہوں۔ چنانچہ بدحواسی میں بالکل ٹھیک باتیں کروں گا۔ آپ مجھے اُس کا موقع تو دیجئے۔"

"ٹھیک ہے ملزم کو کٹہرۂ عدالت میں کھڑا کر دیا جائے۔" ثنا نے کہا۔

"بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے؟" تصور بیگ بولا۔

"چلئے بیٹھئے، آپ بھی کیا یاد رکھیں گے۔" ثنا بولی۔ پھر چند لمحات کے لئے خاموشی چھا گئی۔ ویسے سب کے چہرے نقشِ حیرت بنے ہوئے تھے۔ تصور بیگ اور خیر دین میں بلاشبہ کوئی فرق نہیں تھا۔ لوگ بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ اب تک صرف ردا تھی جو خاموش بیٹھی رہی تھی یہاں تک کہ دادی اماں، ذکیہ بیگم اور دوسرے لوگوں کی توجہ بھی اُسی جانب تھی۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اختر نے کہا۔

"جی اب آپ شریفانہ انداز میں سوالات کر سکتی ہیں۔"

"اِس سلسلے میں سب سے پہلے عصمت باجی کو موقع دیا جاتا ہے کیونکہ یہ شوشہ اِنہی کا چھوڑا ہوا ہے۔"

"جی میں سوالات کے لئے تیار ہوں۔" عصمت بھی اب اُن لوگوں میں رنگ گئی تھی۔ اور خاص طور سے تصور بیگ کے مسئلے میں وہ کچھ زیادہ ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ اُس نے کہا۔

"پہلے آپ یہ فرمائیے جنابِ عالی کہ آپ تصور بیگ ہیں یا مائیکل ڈیسوزا؟"

"فدوی تصور بیگ ولد منور بیگ سابق انسپکٹر جنرل ہے۔ اور فدوی کی مدتِ ملازمت پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تقریباً ساڑھے چھ سال ہے۔ اِس کی تصدیق متعلقہ محکمے سے کی جا سکتی ہے۔ فدوی اپنے فرائض کی بجا آوری میں دیانتدار شخص تصور کیا جاتا ہے۔ اور مخصوصاً محکمۂ پولیس سے اِسے بے شمار مراعات حاصل ہیں۔" تصور بیگ نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ اُس دن یونیورسٹی میں ہونے والے ہنگاموں میں انتظامی اُمور کی دیکھ بھال کے لئے آپ ہی تشریف لائے تھے؟"

"جی ہاں، یہ غلطی مجھ سے ہی سرزد ہوئی تھی۔"

"اور اقبال صاحب کو زخمی حالت میں آپ نے ہی ایمبولینس میں پہنچایا تھا؟"

"جی ہاں! آپ کی درخواست پر۔"

"شکریہ، اُس وقت آپ نے اپنا نام مائیکل ڈیسوزا بتایا تھا۔"

"چلئے مان لیا۔ دوسری ملاقات میں آپ نے مجھے اپنا نام مائیکل ڈیسوزا بتایا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"اور آپ اپنی زبان ٹیڑھی کر کے بھی بولے تھے۔"

"جی نہیں، وہ صرف آپ کا احساس تھا۔ اُس وقت میری دو داڑھوں میں سخت درد تھا اور مجھ سے صحیح طور پر بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔"

"غلط... غلط اگر داڑھ میں درد ہوتا ہے تو لہجے کی ساخت نہیں بدل جاتی۔"

"اِس سلسلے میں کوئی ماہر ڈینٹل سرجن ہی صحیح بیان دے سکتا ہے۔ میں کیا عرض کروں؟" تصور بیگ نے پوری سنجیدگی سے کہا اور بہت سے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"چلئے ٹھیک ہے داڑھ میں درد کی وجہ سے آپ کی زبان ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ لیکن نام کیسے تبدیل ہو گیا تھا آپ کا؟"

"دانت کے درد کے بارے میں جو حضرات جانتے ہیں وہ اِس کا صحیح تجزیہ کر سکیں گے۔ اُس وقت انسان کی ذہنی کیفیت بہت خراب ہوتی ہے اور اُس کے اندر جھلاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی بے جا مداخلت نے میرا پارہ چڑھا دیا اور ذہن میں مائیکل ڈیسوزا کا نام ہی آ گیا جو ہمارے ہی محکمے کا ایک افسرِ اعلیٰ ہے بس وہ نام لے دیا گیا۔"

"کیا یہ تاویل قبول کی جا سکتی ہے؟" عصمت نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوال و جواب جاری رہیں۔ اِس کا فیصلہ بعد میں کیا

جائے گا۔" ثنا نے کہا۔

"اِس کے بعد مزید کوئی سوال میرے پاس نہیں ہے۔" عصمت پیچھے ہٹ گئی۔ ثنا نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا اور سب ہی ہنستے مُسکراتے رہے پھر نُدرت نے کہا۔

"جو سوالات عصمت باجی نے کر لئے ہیں اب اُن کے بعد کس بات کی گنجائش رہ جاتی ہے؟ ویسے تصور بیگ صاحب یہ اپنا خیر دین بہت چالاک ہے اور ایک پولیس افسر ہونے کی وجہ سے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کسی کی نہیں چلنے دے گا۔"

"اِس بے تکلفی میں اپنائیت جھلکتی ہے چنانچہ میں بُرا نہیں مان رہا۔ ویسے آپ لوگ یقین کیجئے گا کہ اپنی مُدتِ ملازمت میں مَیں نے کبھی اتنی گہری تفتیش کسی مجرم کے بارے میں بھی نہیں کی۔ جتنی میرے بارے میں کی جا رہی ہے۔"

"ایک سوال کا جواب آپ اور دیجئے تصور بیگ صاحب۔" ثنا بولی۔

"حاضر۔ حکم فرمائیے۔"

"یہ خیر دین آپ کا ہم شکل کیوں ہے؟"

"کمبخت کی پلاسٹک سرجری نہ کرا دی تو میرا نام بھی تصور نہیں ہے۔" تصور بیگ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اختر صاحب کا کہنا ہے کہ خیر دین آج کل آپ کے ہاں ملازمت کر رہا ہے؟"

"وہ بھی اُس کی کمینگی ہے۔ تاک کر میرے پاس پہنچا۔ ارے آپ لوگ یقین کیجئے میں اپنے دوستوں کے مذاق کا نشانہ بن گیا ہوں۔ دوست مجھ سے یہی کہتے ہیں کہ دیکھ لو انسان یہ چیز ہوتی ہے۔ شکل و صُورت پر کبھی ناز نہیں کرنا چاہیئے۔" تصور بیگ نے جواب دیا۔

"ویسے اگر واقعی آپ خیر دین نہیں ہیں تو پھر اِس حیرت انگیز مشابہت کو ہم دُنیا کا آٹھواں عجوبہ کہہ سکتے ہیں۔"

"آپ کہیں یا نہ کہیں میں اپنے آپ کو دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہی سمجھتا ہوں۔" تصور بیگ نے جواب دیا۔

"ملزم کو کھلایا پلایا جائے۔" ثنا نے مُسکراتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر قہقہے گونج اُٹھے ——————

ویسے حیرت سب ہی کو تھی۔ اتنی دیر میں طفیلی خالہ بھی کہیں سے نکل آئیں۔ اِن لوگوں کے درمیان تصور بیگ کو دیکھا تو ہانپتی کانپتی اُس کے پاس پہنچیں اور اُس کا بازو پکڑ کر بولیں۔

"اے بیٹا! خُدا تیرا بھلا کرے۔ اللہ تجھے اِس دنیا میں ساری خوشیاں نصیب کرے۔ خُدا تجھے ہر خوشی سے نوازے تو نے میرے دل کو جو ٹھنڈک پہنچائی ہے میں تیرا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ اَے بیٹا! چلمن شاہ سے ایک اور تعویذ لادے۔ میرا رشید جہاں بھی ہے میرے پاس آ جائے۔ یہ تو پتہ چل جائے مجھے کہ وہ میرے پاس آ کیوں نہیں رہا؟"

تصور بیگ گھبرائی ہوئی نگاہوں سے طفیلی بیگم کو دیکھنے لگا اور پھر اُس نے بے بسی کے انداز میں باقی سب کی طرف دیکھا۔ قہقہوں کا طُوفان برپا ہو گیا اور طفیلی بیگم متحیرانہ انداز میں ایک ایک کی صُورت دیکھنے لگیں۔

"اَے بیٹا! اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ کیا تم لوگ کو علم نہیں ہے کہ خیر دین نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے؟"

"اماں جی! خیر دین کو میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ اللہ کے واسطے مجھے خیر دین کہہ کر میری پوزیشن کا بالکل ہی بیڑا غرق نہ کریں۔" تصور بیگ نے کہا اور طفیلی بیگم نے جلدی سے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اے بھیا! تو کیا تم خیر دین نہیں ہو؟"

"اگر ہوں تو آپ لوگ مجھے گولی مار دیجئے۔ اِس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔" تصور بیگ نے کہا۔

"اَے خدا کی پناہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" طفیلی بیگم مزید دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

بہر حال یہ تفریحات جاری رہیں۔ تصور بیگ بے چارے کا پیچھا نہیں چھوڑا جا رہا تھا۔ اُس کے بعد چائے وغیرہ کا بندوبست کیا گیا۔ ثنا نے کہا۔

"واقعی تصور بیگ صاحب اگر آپ خیر دین نہیں ہیں تو ہمیں افسوس ہے۔"

"گویا اگر میں خیر دین ہوتا تو آپ کو کوئی افسوس نہیں ہوتا؟ آخر آپ کو مجھ سے کیا دُشمنی ہے ثنا صاحبہ! اگر ملازم کی ضرورت ہے تو میں آپ کے لئے دس ملازم فراہم کر دوں گا اور اُن سب کے نام خیر دین رکھ دُوں گا۔ یا اگر آپ چاہیں تو میں خیر دین کو بھی واپس آپ کی کوٹھی میں بھیج سکتا ہوں۔"

"اچھا ایک کام کیجئے آپ، یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔"

"جی جی فرمائیے؟"

"ایک دن آپ خیر دین کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آ جائیے۔ بلکہ کل ہی کا پروگرام کیوں نہ رکھا جائے؟"

"ضرور آؤں گا لیکن کل کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ کل مجھے کچھ ضروری کام انجام دینے ہیں۔"

"پھر بھی آپ یہاں تشریف تو لاتے رہیں گے؟"

"حاضری دیتا رہوں گا۔ ظاہر ہے اتنے دلچسپ ماحول کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں جس میں مجھے میری اوقات کا احساس دلایا جاتا رہے۔"

"رُدا بہن! آپ نے اِس سلسلے میں اپنے خیر دین سے کوئی سوال نہیں کیا؟" دفعتاً ہی اختر نے رُدا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رُدا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش رہی تھی۔ اِس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ کافی دیر تک تصور بیگ کے ساتھ یہ نشست رہی تھی اور اُس کے بعد اُسے اجازت دے دی گئی۔ تصور بیگ سب کو سلام کرنے کے بعد وہاں سے چل پڑا۔ چند لمحے بعد اُس کی کار باہر نکل گئی تھی۔

"کیا خیال ہے کیا یہ شخص ہم سب کو بے وقوف بنا کر نہیں نکل گیا؟" ثنا نے نُدرت سے کہا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے لیکن اگر خیر دین اُس کے ساتھ آجائے تو پھر ذرا صورتِ حال کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے گا۔"

"اختر جیسا گھاگ شخص اِن دونوں کو یکجا دیکھ چکا ہے تو پھر کسی دوسرے کی کیا گنجائش رہتی ہے؟" خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

***

تصور بیگ اپنے پیچھے بہت سے قصے چھوڑ گیا تھا۔ وہ اتفاقیہ طور پر ہی اختر کے ہاتھ لگا تھا اور اُس کے بعد دو تین دن تک اُس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ البتہ چوتھی شام خیر دین کوٹھی آیا تھا۔ وہی ہونق انداز، وہی تمام کیفیات۔ گھر کے لوگ اُس وقت اندر ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ خیر دین سیدھا دادی اماں کے کمرے میں پہنچ گیا تھا اور دادی اماں چونک کر اُسے دیکھنے لگی تھیں۔ ذکیہ بیگم بھی اُس وقت دادی اماں کے پاس ہی تھیں۔ خیر دین نے سلام کیا اور دادی اماں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ خیر دین نے دادی اماں کا پاؤں اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

"لو جی بس ہڑک اُٹھتی ہے یہیں تو چلے آتے ہیں۔ آپ کے پاؤں دبا کر بس یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جنت میں گھوم رہے ہیں۔" خیر دین نے کہا۔

"خُدا تجھے خوش رکھے خیر دین۔ ارے ذکیہ بیٹی! ذرا دیکھو تو سہی کیا تماشہ ہے قدرت کا۔ ایک کو کیا بنا دیا اور دوسرے کو کیا۔ خیرو! تُو نے زندگی میں لکھنے پڑھنے کی کوشش نہیں کی؟"

"بہت سی کوششیں کی تھیں دادی اماں جی، پر وہ اپنے مولوی صاحب جو تھے بڑی مار لگاتے تھے۔ اِس لئے نہیں پڑھ سکے۔ دادی اماں جی یہ پڑھانے والے مار کیوں لگاتے ہیں؟ اگر یہ مار نہ لگائیں تو بہت سے لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں۔"

"بیٹا! طریقہ کار بدل گیا ہے اب اُستادوں کو مار پیٹ کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"لو جی اب بدلا تو کیا ہوا خیر دین تو بے چارے جاہل ہی رہ گئے۔"

"اچھا تو یہ بتا کہ تُو آج کل نوکری کہاں کر رہا ہے؟"

"دادی اماں جی! یہ نوکری بھی چھوڑ دیں گے ہم۔ ہمیں راس نہیں آرہی۔"

"کیوں؟"

"لو جی بس عجیب سی بات ہو گئی ہے۔ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ ایک سیدھے سادے شریف آدمی ہیں۔ یہاں سے نوکری چھوٹی تو دوسری نوکری کی تلاش میں نکلے۔ ایک بھائی نے پہنچا دیا۔ اُس گھر میں جو پولیس والوں کا گھر ہے اور دادی اماں جی ایک بات بتائیں آپ کو وہاں جو پولیس والے ہیں نا وہ نام پتہ نہیں کیا ہے بیگ جی، بیگ جی تو ہماری صورت کے ہیں اور اکثر وہاں تماشے ہوتے رہتے ہیں جی۔ لوگ وہاں ہمیں بُلا کر ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں۔"

"ہاں ہم بھی دیکھ چکے ہیں تصور بیگ کو۔ واقعی خیر دین، حیرت انگیز بات ہے تمہاری صورت بالکل اُس سے ملتی جلتی ہے۔"

"تو جی ہمارا کیا قصور ہے۔ اللہ نے ایک ہی صورت کے دو بنا دیئے۔ ایک کو خیر دین بنا دیا اور دوسرے کو پولیس والا۔"

"تو پولیس والا تو تجھے تنگ نہیں کرتا۔"

"نہیں جی، تنگ تو کوئی نہیں کرتا۔ بس جی ایسے ہی ہر وقت بُلایا جاتا ہے۔ ہماری صورت ایسے دیکھی جاتی ہے جیسے عجائب گھر میں کسی مجسمے کو دیکھ رہے ہوں۔ دادی اماں جی! بس عجیب سا لگتا ہے۔" خیر دین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ پھر بولا۔

"وہ جی ایک کہانی کھوپڑی میں اٹک گئی تھی آپ کو سُنانے چلے آئے۔"

"اچھا، اچھا اِس وقت تو کہانیاں نہ سُنا۔ میں تو چل رہی ہوں۔" ذکیہ بیگم نے کہا اور پھر اُٹھتی ہوئی بولیں۔ "ویسے خیر دین اگر تجھے واقعی وہ نوکری پسند نہ آرہی ہو تو یہیں واپس آجا، تجھے منع کس نے کیا ہے؟"

"بس جی آ ہی جائیں گے۔ کسی نہ کسی دن، ہم خود وہاں سے تنگ آچکے ہیں۔" خیر دین نے جواب دیا اور ذکیہ بیگم باہر نکل گئیں۔

اُس کے بعد خیر دین تھا اور دادی اماں اُلٹی سیدھی کہانیاں، دادی اماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرتی رہی۔ اور اِن کہانیوں میں خیر دین کا منطقی انداز، وہ ہر کہانی میں تاریک پہلو پر خاص طور سے غور کرتا تھا۔ بادشاہ سلامت کی کہانی تھی اور کسی شہزادی کا قصہ تھا، کہنے لگا یہ بادشاہ سلامت اتنے بے غیرت کیوں ہوا کرتے تھے کہ اپنی بیٹی کے لئے نیلام گھر لگا لیا کرتے تھے۔

"تیری باتوں کا جواب تو ارسطو بھی نہیں دے سکے گا خیر دین۔"

"افسوس وہ ہمارے دور میں نہیں ہے ورنہ ہم اُس سے پوچھتے بھائی کہ تیری فلاسفی اِس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟"

دادی اماں چونک کر اُسے دیکھنے لگی تھیں۔ اُسی وقت ثناء اندر گھس آئی۔

"ملاحظہ کیا آپ نے دادی اماں؟"

"کیا؟"

"یہ ارسطو کے بارے میں یہ بات جانتے ہیں کہ وہ فلاسفر تھا۔"

"لو جی کمال ہو گئی ارسطو، افلاطون اور وہ جو کیا کہتے ہیں اپنے بھائی بُقراط یہ سارے کے سارے تو بڑے مشہور آدمی ہیں۔ اُن کے بارے میں کون نہیں جانتا؟"

"بہرطور اُنھیں کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو لیکن تمہیں واقعی کوئی نہیں جانتا خیر دین۔"

"ٹھیک ہے جی آپ جو کہیں بی بی، مالک ہیں۔ نمک کھا چکے ہیں آپ کا۔" خیر دین نے کہا۔ ثناء تھوڑی دیر یہاں رہی پھر وہاں سے باہر نکل آئی۔ خیر دین، دادی اماں سے باتیں کرتا رہا تھا پھر اُس نے کہا۔

"لو جی اب اجازت دو۔ دادی اماں ذرا دوسرے لوگوں سے مِل لیں۔" دادی اماں نے اُسے دُعائیں دیں اور خیر دین وہاں سے نکل آیا۔ اب اُس کا رُخ رُدا کے کمرے کی طرف تھا۔ رُدا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو رُدا کی آواز سُنائی دی۔

"کون ہے، اندر آؤ۔" اور خیر دین اندر داخل ہو گیا۔

"تم...؟" رُدا کے چہرے پر سُرخی سی پھیل گئی۔ اُس کی آنکھیں تمتما اُٹھی تھیں۔

"لو جی، جب بھی اِدھر آتے ہیں کبھی بھی آپ کو سلام کئے بغیر جاتے ہیں رُدا بی بی؟"

"وعلیکم السلام۔ میرے لائق کوئی خدمت؟" رُدا نے پُوچھا۔

"نہیں جی خدمت گار تو ہم ہیں۔ آپ ہمیں کوئی خدمت بتاؤ بی بی جی۔"

"میں تم سے گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔"

"کوئی بات نہیں جی، ہم خاموش رہیں گے۔ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جائیں؟"

"کیوں مجھے پریشان کر رہے ہو خیر دین؟"

"نہیں جی، اگر ہمارے بیٹھنے سے آپ کو پریشانی ہوتی ہے تو پھر مجبوری ہے چلے جاتے ہیں۔"

"اِدھر آؤ۔" رُدا نے اُس سے کہا اور خیر دین پیچھے دیکھنے لگا۔

"میں نے تمہیں ہی مخاطب کیا ہے۔"

"کمال ہو گئی جی۔ آپ بھی عجیب چیز ہیں رُدا بی بی جی! کبھی تو بھگاتی ہیں اور کبھی بُلاتی ہیں۔"

"اِدھر آؤ شرافت سے۔" رُدا نے کہا اور خیر دین بڑے شریفانہ انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اُس نے اپنے چہرے کو شریفوں کا سا چہرہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ رُدا ہنس پڑی۔

"بے وقوف بنانے میں بڑی مہارت ہے تمہیں۔ آخر ہو نا پولیس والے۔"

"جی آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں رُدا بی بی جی؟ آپ بھی بے چارے خیر دین کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ ویسے بڑی آرزو ہے پولیس میں ملازمت کرنے کی۔ صاحب کی خوشامد تو کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی بھرتی کرا دیں۔"

"خیر دین! تم اُس دن تصور بیگ کی حیثیت سے یہاں آئے تھے۔ دُنیا کو تم نے اپنی چرب زبانی سے بے وقوف بنا دیا لیکن تمہارا کیا خیال ہے کیا میں بھی بے وقوف بن گئی؟"

"لو جی کمال ہو گئی، آپ کو کوئی بے وقوف بنا کر دیکھے۔

نکھیں نہیں نکال دیں گے اُس کی"۔ خیر دین نے غصیلے انداز میں کہا۔

"اپنا ہاتھ آگے لاؤ"۔ رُدا بولی اور خیر دین نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ رُدا نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"اِسے دیکھ رہے ہو کیا ہے؟ وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"ہاتھ ہے جی"۔

"کیا ہے یہ"؟ رُدا نے اُس کی اُنگلیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"خُدا کی قسم اُنگلیاں ہیں ردا بی بی جی اور کچھ نہیں ہے"۔

"اپنی اِس درمیانی اُنگلی کے آدھے تِل کو دیکھ رہے ہو خیر دین۔ کیا اِسے تم اُس دن بھی چھُپا سکے تھے۔ کیا تمھارے خیال میں رُدا بھی دوسروں کی طرح بے وقوف ہے"؟

خیر دین نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ کر پیچھے کر لیا تھا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ نے صرف یہ آدھا تِل دیکھا ہے رُدا صاحبہ میں تو اپنی پُوری زندگی آپ کے سامنے نمایاں کرنے پر تیار ہُوں۔ لیکن، لیکن خُدا حافظ"۔ خیر دین تیزی سے مُڑا اور واپس چل پڑا۔ رُدا کا چہرہ شدّتِ حیرت سے سُرخ ہو گیا تھا۔ گویا خیر دین یہ اعتراف کر گیا تھا وہ خیر دین نہیں تصوّر بیگ ہے۔ وہ چشمِ تصوّر سے دروازے سے باہر جاتے ہُوئے خیر دین کو دیکھتی رہی اور پھر اُس کا ذہن چند روز پہلے پلٹ گیا۔ نفیس شلوار سُوٹ میں ملبوس کتنا اسمارٹ نظر آ رہا تھا وہ۔ کتنی نفاست تھی اُس کے چہرے پر اور اُس کے انداز میں وہ ایک پولیس آفیسر ہے۔ پولیس آفیسر خیر دین اُس کے سامنے نمایاں ہو گیا تھا لیکن، لیکن نہ جانے کیوں رُدا کو اپنے دل میں ایک میٹھی میٹھی سی کسک محسوس ہُوئی اور اُس کے ہونٹوں پر خود بخود ایک مُسکراہٹ پھیل گئی لیکن دوسرے لمحے اُس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"ایسا کیوں ہے خیر دین۔ آخر ایسا کیوں ہے"؟ اُس نے سوال کیا اور پھر اپنی ہی آواز کی بازگشت پر چونک پڑی۔ نہ جانے کیوں اُس کے دل میں مسرتیں سر اُبھار رہی تھیں۔ خیر دین نمایاں ہو گیا تھا۔ لیکن ایک پولیس آفیسر اور اُس گھر میں مُلازم کی حیثیت آخر کیوں؟ اِس کی وجہ کیا تھی۔ رُدا اِس گُتھی کو سُلجھانے میں ناکام تھی لیکن نہ جانے کیوں اُس کے دِل میں یہ تصوّر بار بار اُبھر رہا تھا کہ خیر دین نے خود کو سب سے چھُپایا تھا اُس سے نہیں۔ اُس نے غور کیا تو اُسے احساس ہُوا کہ خیر دین نے تو اپنے آپ کو اُس سے کبھی نہیں چھُپایا۔ وہ ہمیشہ اُس کے سامنے نمایاں رہا لیکن بس اپنے بارے میں بتانے کی ضد اُس پر سوار رہی اور اِس ضد کے جواب میں اُس نے رُدا کے بارے میں بھی اُس کی زبان کھُلوانے کا عزم کیا لیکن، لیکن ..."؟ وہ آہستہ سے بولی۔

"خیر دین تم بہت خطرناک ہو میرے لئے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم میرے لئے ضرورت سے زیادہ خطرناک ہوتے جا رہے ہو"۔

❖

عِصمت اور اقبال کے بارے میں گھر میں کئی بار گفتگو ہو چکی تھی۔ گو یہ گفتگو بچّوں تک نہیں پہنچی تھی لیکن بزرگوں میں کھچڑی پک رہی تھی۔ غلام احمد صاحب کا خیال تھا کہ یہ بات احسان احمد صاحب کے کانوں میں ڈال دی جائے۔ سُلطانہ بیگم شوکت جہاں اور اماں بی وغیرہ بھی دونوں مردوں کے اِس خیال سے واقف ہو چکی تھیں اور بے پناہ خوش تھیں۔ سُلطانہ بیگم نے تو غلام احمد کا اتنا شکریہ ادا کیا تھا کہ غلام احمد شرمندہ ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ غلام احمد اُنھیں کیا کیا دیں گے؟ اُن کی وجہ سے اُن کی آنکھوں کی بینائی واپس مِلی۔ یہ جگر پھٹنے کے لئے مِلی۔ اتنے اچھے لوگ ملے اور اُس کے بعد وہ اُنھیں وہ دولت دے دینا چاہتے ہیں جو صرف اُن کے تصوّر میں تھی۔ اور شاید وہ کبھی اپنی زبان سے اُس کی طلب کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ بُزرگ اپنے خیالوں میں تھے اور اُن کا اندازہ تھا کہ یہ بات بچّوں تک نہیں پہنچ سکی ہے لیکن نہ صرف عِصمت بلکہ اقبال بھی اِس سِلسلے میں سب کچھ سُن چکے تھے اور نُدرت تو تھی ہی آفت کی پرکالہ، تاہم وہ اجنبیت کا اظہار کرتے رہے تھے جیسے اُنھیں اِس سِلسلے میں کچھ نہ معلوم ہو۔

لیکن اِس وقت صُورتِ حال ذرا مختلف ہو گئی۔ عِصمت یونہی ٹہلتی ہُوئی پائیں باغ میں آنکلی تھی۔ دُور دُور تک کوئی نہیں تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا نہ جانے اہلِ خانہ اندر کیوں گھُسے ہُوئے تھے۔ عِصمت دل میں سوچ رہی تھی کہ اُن لوگوں کو باہر کے موسم کے بارے میں متوجّہ کرے۔ اب اُس میں بھی کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ یہاں کے ماحول کو اُس نے پُوری طرح اپنے اندر سمو لیا تھا اور دوسروں کے ساتھ خوش رہنا سیکھ گئی تھی۔ ورنہ پہلے اُس پر عموماً سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ ابھی وہ کوئی

فیصلہ بھی نہیں کر پائی تھی کہ دفعتاً اُسے اقبال نظر آیا جو اُسی سمت آ رہا تھا۔ اقبال کو دیکھ کر عِصمت کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ نہ جانے کیا خیال آ گیا تھا اُس کے ذہن میں۔ اقبالؔ عِصمت کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو عصمت، کیا ہو رہا ہے؟

"محترم! یہ یونیورسٹی نہیں ہے۔ آپ اِسے بھی یونیورسٹی سمجھ کر مُنہ اُٹھائے یہاں تک چلے آئے"۔

"ارے کیوں؟ یہ تو ہمارا گھر ہے۔ یونیورسٹی تو پھر بھی اجنبی جگہ ہوتی ہے"۔

"جی ہاں گھر تو ہے لیکن آپ کو اندازہ نہیں کہ اِس گھر میں کتنے شیطان پرورش پا رہے ہیں"۔

"کمال ہے ہمیں تو ایک بھی نظر نہیں آیا"۔ اقبال نے کہا۔

"نظر آ گیا تو لُطف آ جائے گا آپ کو۔ جینا مشکل ہو جائے گا۔ کیا سمجھتے ہیں آپ اِس گھر کے لوگوں کو"؟

"اِس گھر کے لوگوں کو تو ہم نہ جانے کیا سمجھتے ہیں کیا بتائیں"؟

"رُومانویّت طاری ہو رہی ہے دل و دماغ پر۔ شاعری کی کوئی کتاب پڑھ کر آئے ہیں کیا"؟

"جی تو یہی چاہتا ہے عِصمت کہ شاعری کی کوئی کتاب واقعی پڑھی جائے۔ تمھاری شان میں کبھی کچھ کہنے کو جی چاہے تو کوئی عُمدہ سا شعر یاد ہی نہیں آتا"۔

"بس بس میں کہہ رہی ہُوں، کیوں اپنی شامت بُلوانے پر تُلے ہُوئے ہو"۔ عِصمت نے چاروں طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ وہ اِس وقت پھُولوں کے ایک کنج کے پاس کھڑے ہُوئے تھے۔ جن کی بھینی بھینی خوشبُو فضاؤں میں مہک رہی تھی۔ اقبال مُسکراتا ہُوا بولا۔

"شامت تو اب ہماری تقدیر میں لکھ گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے عِصمت صاحبہ اِس وقت اہلِ خانہ کی گفتگو کا موضوع کیا ہے"؟

"کیا مطلب"؟ عِصمت نے تیکھی نِگاہوں سے اُسے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"لوگ بے چارے اقبال کے سر پر سہرا باندھ دینا چاہتے ہیں"۔

"شرم نہ آئے گی سہرا باندھتے ہُوئے"۔

"سر جھُکا لیں گے اور پھر یہ سر تو جھُکتا ہی ہے آپ کے سامنے"۔ اقبال نے کہا۔

"بھئی کیا فضول باتیں کر رہے ہو تیسرے درجے کے لوگوں کی سی"؟

"کیا کیا جائے شادی کے معاملے میں ہر انسان تیسرے درجے کا ہوتا ہے"۔

"ابھی کوئی شادی وادی نہیں ہو رہی ہے۔ مَیں اپنی تعلیم مکمّل کئے بغیر اِس قِسم کی کوئی بات سُننا بھی پسند نہیں کروں گی"۔

"تو خادم آپ کو تعلیم مکمّل کرنے سے کب روک رہا ہے۔ بد قِسمتی تو یہ ہے کہ ہماری تعلیم آپ سے پہلے مکمّل ہو رہی ہے۔ یونیورسٹی سے نِکل گئے تو پھر کیا ہو گا"۔ اقبال نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"کیوں۔ کیا ہو گا؟

"بھئی ظاہر ہے یونیورسٹی کی دُنیا صِرف ہم سے آباد ہے۔ دو ہنسوں کے جوڑے میں سے ایک وہاں رہ جائے گا۔ ہائے آپ کا دِل لگے گا وہاں ہمارے بغیر"؟

"میں وہاں تعلیم حاصِل کرنے جاتی ہُوں آپ کے لئے نہیں"۔

"ہم کیا کریں۔ ہم تو صِرف آپ کے لئے وہاں جاتے ہیں"۔

"امتحان میں فیل ہو جائیے"۔

"یہ بھی تو ممکن نہیں۔ ناک آپ کی ہی کٹے گی"۔

"جی نہیں، ابھی میری ناک آپ کی ناک سے منسلک نہیں ہے"۔

"ہو جائے گی۔ اِس میں دیر کتنی ہے خُدا سے دُعا کریں کہ وہ ہماری ناکیں یکجا کر دے"۔ اقبال نے کہا اور عِصمت بُری طرح جھینپ گئی اور اُسی وقت پھُولوں کے کنج کے دوسری طرف سے ایک آواز سُنائی دی۔ دونوں بُری طرح اُچھل پڑے تھے۔ عِصمت کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ اقبال بھی ششدر رہ گیا تھا۔

دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پھُولوں کے کنج کے پیچھے دیکھنے لگے اُنھیں ثناء اور تیمور نظر آئے تھے۔ ثناء اُن لوگوں پر توجّہ دیئے بغیر تیمور سے کہہ رہی تھی۔

"تم نہایت نالائق ہو تیمور، اخلاق و آداب بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ یہ رونے کا وقت تھا۔ بلا وجہ دو شریف لوگوں کا سلسلۂ گفتگو منقطع کر لو یا تم نے"؟

عِصمت کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا۔ اُس کے فرشتوں

کو بھی گمان نہیں تھا کہ شناء اور تیمور پھولوں کے کنج کے پیچھے موجود ہیں وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

شناء نے نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا وہ مسلسل تیمور کو خاموش کرانے کی کوشش کر رہی تھی جو اُس کی آغوش میں سو رہا تھا۔ اور سوتے سوتے اچانک رو پڑا تھا۔

عِصمت نے خوفزدہ نگاہوں سے اقبال کی طرف دیکھا اور اقبال شانے اُچکا کر رہ گیا۔ شناء تیمور سے کہہ رہی تھی۔

"تم مستقبل کے ایک شریف نوجوان ہو تیمور تمہیں احساس کرنا چاہیئے تھا کہ عِصمت آنٹی اور اقبال انکل اِس وقت کیسی اہم گفتگو میں مصروف تھے۔ اگر تم کچھ دیر کی خاموشی اختیار کر لیتے تو کیا حرج تھا؟ ایسے اہم معاملات میں ٹانگ اڑانا غیر شریفانہ حرکت ہے۔ تم نہیں جانتے یہ معاملات کیسے نازک ہوتے ہیں" شناء اُن لوگوں کی طرف دیکھے بغیر تیمور سے باتیں کئے جا رہی تھی، تیمور نے کِلکلا کر پھر ایک آواز نکالی تو شناء نے کہا۔

"تمہاری مرضی، سوچ لو، جوان ہو کر یہ وقت تم پر بھی آ سکتا ہے جب تم کونوں کھدروں میں چھپ کر دل کی بات کہنے کے لئے مجبور ہو گے اُس وقت کوئی مداخلت کرے گا تو تمہیں کتنا ناگوار گزرے گا آخر یونیورسٹیاں روز تو نہیں کھلی رہتیں انسان کو بغیر یونیورسٹی کے بھی کبھی کبھی گزارا کرنا پڑتا ہے۔"

عِصمت نے گہری سانس لی اور پھر اُسے آواز دی "شناء!" اور شناء چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"ارے عصمت باجی آپ! اوہو اقبال بھائی آپ بھی ہیں" اُس نے تعجب سے کہا۔ اقبال کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی اُس نے آہستہ سے کہا۔

"جی ہیں تو سہی"

"سوری حضرات! میرا کوئی قصور نہیں ہے، یہ تیمور شاید مستقبل کا ظالم سماج ہے لیکن آپ فکر نہ کریں میں اِسے سمجھا بجھا دوں گی آپ لوگ سلسلہ جاری رکھیں۔ میں خود کچھ نہیں سُن رہی" شناء نے کہا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟" عِصمت نے کہا۔

"ایں؟" شناء چونک کر عِصمت کو دیکھنے لگی۔

"اِتنی خاموش کیوں تھیں؟"

"تو پھر کیا کرتی؟ یہاں بیٹھ کر شور مچاتی؟ تیمور میری گود میں سو رہا تھا۔ اِسے دراصل ٹھنڈی اور تازہ ہوا میں سونے کی عادت ہے۔ میں اِسے اکثر لے کر نکل آتی ہوں اور پھر دیکھئے نا عصمت باجی موسم کتنا خوشگوار ہے۔ میں تو خود سوچ رہی تھی کہ یہ ذرا جاگ جائے تو اِس سے اِسی قسم کی باتیں کروں"

"شناء! میری بہن۔ میری بٹیا"

"ارے... ارے کیا ہو گیا آپ کو؟ یہ آپ کی آواز بھیک کیوں مانگ رہی ہے؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم میری عزت رکھو گی شناء؟"

"کیا ہوا آپ کی عزت کو؟ کہیں سے اُدھڑ ودھڑ گئی ہے؟" شناء نے متحیرانہ انداز میں کہا۔ اور عِصمت اُس کے پاس جا بیٹھی۔

"دیکھو شناء! بعض اوقات انسان کسی کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے"

"ہاں... ہاں عام طور سے دِل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے مجھے پتہ ہے۔ میں نے بہت سے ایسے واقعات سُنے ہیں" شناء نے کہا۔

"شناء مذاق اُڑا رہی ہو میرا؟"

"ہرگز نہیں"

"اچھا تو پھر بتاؤ تم نے کیا سُنا ہے؟"

"قسم لے لیجئے جو میں نے اِس سے زیادہ کچھ سُنا ہو جتنا آپ نے کہا ہے"

"اور اب تم... اب تم میرا مذاق اُڑاؤ گی؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مذاق کیوں اُڑاؤں گی؟ مہندی لگاؤں گی۔ سہرا باندھوں گی آپ کے سر پر باجی۔ ویسے یہ زیادتی ہے آپ لوگوں کی کہ آپ نے ہمیں اِس حادثے سے لاعلم رکھا۔ ویسے آپ یقین کیجئے کہ آپ لوگوں کے درمیان ہمیشہ دال میں کچھ کالا نظر آتا تھا۔ ارے تیمور کیا میں کچھ غلط بول گئی ہوں؟"

"شناء شرارت مت کرو"

"نہیں کرتی، بتلائیے کیا کروں؟"

"کچھ نہیں بس وعدہ کرو خاموش رہو گی"

"کمال ہے ایسا وعدہ میں کیسے کر سکتی ہوں، بھئی مجھے بولنے کی عادت ہے اور پھر بہت سے لوگوں کا معاملہ ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اُس کی کسی نہ کسی بات کا جواب ضرور دینا ہوتا ہے۔ اُس سے خود بات کرنی ہوتی ہے۔ یہ وعدہ کیسے کر سکتی ہوں کہ نہیں بولوں گی"

"جو کچھ تم نے سُنا ہے بھول جاؤ گی"

"آہ کاش میں اُسے بھول سکتی۔ بڑی دلکش اور رومانی قسم کی گفتگو تھی۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت ہی

رومینٹک قسم کی فلم میرے سامنے چل رہی ہو" شناء نے جواب دیا۔ عِصمت اور اقبال بُری طرح جھینپ گئے تھے۔

"شناء صاحبہ! کچھ رشوت وغیرہ سے کام چل سکتا ہے؟" اقبال نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آج کل عِشق کرنے والے اِتنے بزدل کیوں ہوتے ہیں؟ بھئی داستانِ عشق تو لیلیٰ مجنوں کی تھی۔ شیریں فرہاد کی تھی۔ دُنیا کو معلوم ہو گئی۔ نہ صرف معلوم ہو گئی بلکہ دُنیا اِن داستانوں کو نہ جانے کس کس شکل میں دُہرانے لگی۔ بڑے گھٹیا قسم کے اداکار لیلیٰ مجنوں بننے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ آپ لوگ پتہ نہیں کس قِسم کے محبت کرنے والے ہیں۔ میں کہتی ہوں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ میں زیادہ سے زیادہ کہوں گی تو نِدا سے کہوں گی۔ نُدرت سے کہوں گی، اور بہت زیادہ ہُوا تو چلو تنویر بیچاری سے بھی کہہ دوں گی بھلا بزرگوں کے درمیان اِس قسم کی گفتگو کون کرتا ہے؟"

"شناء! تمہیں خُدا کا واسطہ، اللہ کے واسطے ایسا نہ کرنا۔ دیکھو اگر تم نے ایسا کیا تو میں... میں"

"ہاں آپ کیا کریں گی؟"

"میں..."

"میں جانتی ہُوں آپ شادی کر لیں گی" شناء نے جواب دیا۔

"وہ تو ہم کریں گے شناء صاحبہ! لیکن آپ وقت سے پہلے اِس کا ڈھنڈورا نہ پیٹیں تو بہتر ہے" اقبال نے کہا۔

"ابھی آپ کچھ رشوت وغیرہ کی بات کر رہے تھے" شناء نے داہنا رخسار کھُجاتے ہُوئے کہا۔

"رشوت میں آپ کو دینے کے لئے تیار ہُوں شناء"

"تو پھر ٹھیک ہے اِس کا تعین کر لیا جائے گا اگر رشوت شایانِ شان مل گئی تو پھر سوچیں گے کہ اپنی زبان بند رکھیں"

"شناء! میری لاج تمہارے ہاتھ ہے"

"ہائے اللہ کیسی نرم نرم گفتگو کر رہی ہیں آپ، میرے ہاتھ میں تو اِس وقت صرف تیمور ہے" شناء نے شرارت سے کہا۔ اور عِصمت زِچ ہو کر اُسے دیکھنے لگی تب شناء نے کہا۔

"اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ دونوں کی محبتوں کو قائم و دائم رکھے۔ ہم کوئی جلنے والوں میں سے تھوڑی ہیں"

"میں جانتی ہُوں لیکن تم کسی سے کہنا نہیں"

"اچھا بابا ٹھیک ہے۔ خوشامد پہ خوشامد کئے جا رہی ہو۔ جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔ یہاں بیٹھ کر چائے پی جائے گی اِس وقت یہی ہو سکتا ہے" شناء نے کہا۔

"ابھی لائی تم بس ایک منٹ انتظار کرو"

"اقبال صاحب کو میرے پاس ہی چھوڑ جائیے گا۔ کہیں انہیں ساتھ لے کر نہ چلی جائیں آپ اور میں خاموشی سے بیٹھی چائے کا انتظار کرتی رہُوں"

"نہیں... نہیں اقبال تم یہاں بیٹھو میں چائے لے کر آتی ہُوں" عِصمت نے کہا اور شناء کا قہقہہ فضا میں بلند ہو گیا۔ عِصمت چائے بنانے کے لئے دوڑی چلی گئی تھی۔

دِن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ تمام لوگ معمُول کے مُطابق اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے چلے گئے تھے۔ جمن نے نُدرت سے آ کر کہا کہ نِدا کا فون ہے۔

"میرے لئے؟" نُدرت چونک کر بولی۔

"جی ہاں! نِدا بی بی ایک منٹ کے لئے آپ کو بُلا رہی ہیں" نُدرت دوڑی چلی گئی۔ فون کا ریسیور نیچے رکھا ہُوا تھا۔ اُس نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔

"ہیلو نِدا"

"اب اگر نِدا کی آواز میں بولوں گا تو آپ کو اعتراض ہو جائے گا۔ خادم اختر ہے" دوسری طرف سے اختر کی آواز سُنائی دی۔ اور نُدرت ایک لمحے کے لئے مُنہ کھول کر رہ گئی۔

"خُدا تمہیں سمجھے اختر یہ تمہارے گلے میں شیطان کہاں سے آ چھُپا ہے؟ ہر آواز میں بول لیتے ہو"

"شیطان میرے گلے میں نہیں دِل میں آ بیٹھا ہے اب کیا کیا جائے مجبُوری ہے" اختر کی آواز سُنائی دی۔

"کہو کیا بات ہے؟ میں کچھ کام کر رہی تھی۔ نِدا کی طلبی سُن کر دوڑی چلی آئی"

"دیکھو نُدرت! اب تم مجھے غُصّہ دلا رہی ہو"

"کیا مطلب؟ ارے یہ آپ اِتنی بے تکلفی سے گفتگو کیوں فرما رہے ہیں؟" "نُدرت تم مجھے غُصّہ دلا رہی ہو، یہ مخاطب کرنے کا انداز ہے"

"آپ شاید بھُول گئیں محترمہ کہ چند لمحات قبل آپ مجھے کس انداز میں مخاطب کر رہی تھیں؟" اختر نے یاد دلایا اور نُدرت واقعی چونک پڑی۔ اُس نے بلاشُبہ اپنی فطرت کے خلاف اختر سے بڑی بے تکلفی سے بات کی تھی۔

"بھئی کہو نا کیا بات ہے؟" نُدرت نے کہا۔

"حسن اسکوائر میں اُسی جگہ پہنچ جائیے جہاں آپ کو

اُس دن طلب کیا گیا تھا:

"کیا؟ کیا دماغ خراب ہے؟"

"جی ہاں اِس وقت خراب ہوگیا ہے۔ آپ اگر نہ آئیں تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"ارے واہ کیا مجھے گھر سے اِتنی آزادی ہے کہ میں اِس طرح پہنچ جاؤں۔"

"ہر خطرہ مول لے لیجئے۔ سوہنی کچے گھڑے پر سوار ہو کر دریا پار کرتی تھی۔ لیلیٰ اور... اور..."

"بس... بس... بس فضول باتوں سے گریز کیجئے۔ میں نہیں آسکتی۔"

"کیا میں فون بند کردوں؟" اختر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تو اِس میں دھمکی کی کیا بات ہے؟ فون تو بند کرنا ہی ہے آپ کو۔" نُدرت بولی۔

"نُدرت صاحبہ! میں حسن اسکوائر پر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ سوچ لیجئے۔ سمجھ لیجئے یہ مستقبل کا معاملہ ہے۔"

"میں نہیں آرہی۔ نہیں آرہی۔ نہیں آرہی۔" نُدرت نے جواب دیا۔

"میں ایک گھنٹے وہاں آپ کا انتظار کروں گا۔ اور آپ کو آنا ہے۔" اختر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

نُدرت ہیلو۔ ہیلو کرتی رہ گئی تھی۔ ایک لمحے تک وہ پریشانی سے ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی اور پھر اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ کیا کرنا چاہئے۔ کوئی بات۔ جو سمجھ میں آرہی ہو۔ وہ وہاں سے باہر نکل آئی۔ اختر کا اور اُس کا معاملہ ابھی تک بالکل ہی بے سہارا تھا۔ کوئی تصور کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ بس اختر نے اُس سے اُنسیت کا اظہار کیا تھا اور نُدرت کے ذہن میں بھی اُس کے لئے جگہ پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن نُدرت محتاط تھی۔ جمن کے ساتھ کیا جانے والا مذاق دوسری حیثیت کا حامل تھا۔

لیکن اختر کا معاملہ بالکل ہی مختلف تھا۔ وہ پُوری طرح سنجیدہ تھا۔ غیر سنجیدہ نُدرت بھی نہیں تھی اُس کے سلسلے میں، لیکن خوف بہرطور دامن گیر تھا۔ بھلا اُن دونوں کے ذہنوں کی باتیں بڑوں تک کیسے پہنچ سکتی ہیں۔ اور اگر پہنچ بھی جائیں تو کیا صرف رُسوائی کا سبب نہ بنیں گی؟ کیا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ اُسی انداز میں ہو جائے جس انداز میں اُن دونوں کے ذہنوں میں موجود ہے؟ کیا کرنا چاہئے؟ اختر ضدی ہے اور... اور نُدرت کو اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس ہُوئی۔ کتنے اعتماد سے اُس نے اُسے بُلایا ہے۔ اگر یہ اعتماد میرے خوف کا شکار ہو جائے تو کیا اختر اُس سے مطمئن ہوگا؟ کیا کہہ کر اُسے سمجھاؤں گی؟ ضدی آدمی ہے۔ اگر کچھ غلط فہمی کا شکار ہوگیا تو بُرا ہی ہوگا۔ اُس کی شرارتیں اپنی جگہ اور حیثیت اپنی جگہ۔ نہیں اگر اِس طرح میں اُس کے بُلاوے پر چلی جاؤں تو آئندہ بھی اِس قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں۔

اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ دِل اندر سے کہہ رہا تھا۔ کہ اختر نے بُلایا ہے چلی جائے۔ لیکن مصلحتیں راستہ روک رہی تھیں۔ اگر اِس مسئلے کو سنجیدگی سے نہ روکا گیا تو مناسب نہیں ہوگا۔ جمن کا معاملہ مختلف تھا ظاہر ہے اُسے مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن اختر کا سلسلہ بالکل ہی الگ تھا لوگ نہ جانے کیا کیا کہانیاں گھڑ سکتے تھے۔

بہت دیر تک وہ کشمکش کا شکار رہی۔ اختر نے کہا تھا کہ ایک گھنٹہ انتظار کرے گا۔ اگر میں نہ پہنچی اور وہ اِس مسئلے میں سنجیدہ ہی ہوگیا تو اچھا تو نہیں ہوگا۔ ہنستا مسکراتا آدمی ہے اور... اور... دِل نے اندر سے دھڑک کر کچھ کہا اور نُدرت زِچ ہوگئی۔ آج تک شرارتوں میں زندگی بسر کرتی رہی تھی۔ بہت بُرے حالات میں گزارا کیا تھا۔ کبھی شئے کو خاطر میں نہیں لاتی تھی لیکن اِس وقت آٹے دال کا بھاؤ یاد آگیا تھا دِل کے ہاتھوں کچھ مجبُور سی ہُوئی جارہی تھی اپنے آپ کو سنبھالنے کیلئے بہت سی دلیلیں دیں۔ لیکن دِل اندر سے پھڑپھڑا رہا تھا انسان کی زندگی میں چند سہارے ہی تو ہوتے ہیں اور یہی سہارے زندگی بن جاتے ہیں۔ زمانے کے خوف سے اگر اِن سہاروں کو توڑ دیا جائے تو جینا بے مقصد ہو جاتا ہے، پھر اُس نے ایک فیصلہ کیا۔ اختر کی اِس طلبی پر چلی تو جائے گی لیکن آج اُس سے ذرا مختلف طریقے سے گفتگو کرلی جائے۔ یہ پُوچھا جائے اُس سے کہ اِس کھیل کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا ایک غریب گھرانے کی رُسوائی؟

یا اِس سے بھی آگے کچھ ہے؟

وہ کوارٹر میں آئی، تیار ہُوئی اور چل پڑی شوکت جہاں سے کہہ دیا تھا کہ ایک ضروری کام سے جارہی ہے اب اِتنی بھی پابندیاں نہیں تھیں کہ اُسے کہیں جانے ہی نہ دیا جاتا۔ آٹو رکشہ مل گیا اور وہ حسن اسکوائر چل پڑی۔ پھر دُور ہی سے اُس نے وہ مرسڈیز دیکھ لی تھی جو عین اُس جگہ کھڑی ہُوئی تھی جہاں پہلی بار اختر نے اُسے بُلایا تھا۔ آٹو رکشہ کچھ فاصلے پر رُکوا کر وہ اُس سے اُتر گئی۔ یہ تمام تر طریقۂ کار انتہائی قابلِ اعتراض تھا۔

دُنیا سے اِس قدر ناواقف بھی نہیں تھی۔ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی آٹو رکشہ سے اُترے، تھوڑے سے فاصلے پر ایک نوجوان اُس کا انتظار کر رہا ہو اور وہ مرسڈیز میں اُس کے ساتھ بیٹھ کر چلی جائے۔ تو اطراف میں دیکھنے والے کیا فیصلہ کریں گے؟ نُدرت کو معلوم تھا۔ اختر نے دُور ہی سے اُسے دیکھ لیا تھا اُس نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کا دروازہ کھول دیا اور نُدرت پُراعتماد قدموں سے چلتی ہُوئی اُس کے نزدیک پہنچ گئی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر عقبی دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی اختر نے دونوں شانے اُچکائے اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر مرسڈیز اسٹارٹ کردی۔ نُدرت کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہُوئی تھی۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اختر نے کہا۔

"آپ کا انداز تو ایسا ہے خاتون جیسے پولیس والے کسی تفتیش کے لئے نکلے ہوں اور سنجیدگی سے اُس پر غور کر رہے ہوں۔"

"بہتر یہ ہے کہ جہاں چل رہے ہیں وہیں چل کر گفتگو کی جائے۔"

"آپ کی آمد کے لئے انتہائی شکر گزار ہے، اختر بذاتِ خود۔"

نُدرت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اختر نے کئی بار عقب نُما آئینے میں اُس کا جائزہ لیا اور ہر بار اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

کار کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی اور پورچ میں جارُکی۔ اختر نے ڈرائیور ہی کی مانند نیچے اُتر کر عقبی دروازہ کھولا اور نُدرت باہر نکل آئی۔

"تشریف لائیے محترمہ ویسے مستقبل میں بھی کیا مجھے اِسی طرح کار کا عقبی دروازہ کھولنا پڑے گا؟"

"اختر صاحب! میں آج آپ سے کچھ سنجیدہ گفتگو کرنا چاہتی ہُوں۔"

"ہم تو کب سے اِس سنجیدہ گفتگو کے انتظار میں ہیں۔ ویسے اِس وقت آپ کی آمد پر دِل باغ باغ ہوگیا ہے۔ ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں کسی کی نگاہ میں۔ اور کوئی ہماری ناراضگی کا بھی خیال کرسکتا ہے۔" نُدرت نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ڈرائنگ رُوم میں جا بیٹھی۔ اُس کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی کہاں تو اِتنی پذیرائی کہ ہمارے فون پر برداشت نہیں ہو سکا اور چلی آئیں۔ دراصل ہم بھی اپنے اُس اعتماد کو آزمانا چاہتے تھے۔ جو ہمیں آپ پر ہے دوسروں کے حوالے سے بُلانا اپنی ذات کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ ہم نے سوچا کہ آج آپ کو اپنے حوالے سے طلب کریں دیکھیں کیا فیصلہ ہوتا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے اختر صاحب کہ ایک نوجوان لڑکی موٹر رکشہ سے اُتر کر سڑک پر کھڑی ہُوئی ایک کار میں آبیٹھے۔ تو کم از کم دیکھنے والے اُس کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کریں گے، آپ خود ذرا ٹھنڈے دِل سے غور کریں۔ کیا یہ طریقۂ کار مناسب تھا؟"

"آپ نے احساس دلایا ہمیں احساس ہوگیا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا اور پھر اب تو وقت بھی زیادہ نہیں رہا ہے۔ دراصل ہم حضُور کو اِس کوٹھی کی آخری جھلکیاں دِکھانا چاہتے تھے جو کمی رہ گئی تھی وہ پوری کر لی گئی ہے، بس ذرا آخری ہدایت عنایت فرما دیں تاکہ ہمیں فرحت ہو جائے۔"

"اختر صاحب پلیز میں آتو گئی ہُوں۔ اِس لئے کہ آپ سے بے رُخی کا اظہار نہیں کرنا چاہتی۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ بہت ہنس مکھ اور دِلکش۔ آپ جانتے ہیں کہ میں خود بھی ہنسنے ہنسانے کی قائل ہُوں۔ زندگی میں کسی کو دُکھ دینا اچھی بات نہیں ہے اور میں اپنی طرف سے یہ کوشش کرتی ہُوں کہ ہنستی تو رہوں لیکن کوئی مجھے رُلا دے یہ بھی مجھے پسند نہیں۔"

"خُدا کی پناہ عجیب سی گفتگو فرما رہی ہیں آپ، محترمہ وہ کون بدنصیب ہے جو آپ کو رُلانا چاہتا ہے، بس نام پتہ بتا دیجئے ساری زندگی خود ہی روتا رہے گا۔"

"براہِ کرم اختر صاحب اِس وقت تھوڑی دیر کے لئے سنجیدگی اختیار کرلیجئے۔ میں نے اپنے دِل کی بات آپ کو بتا دی ہے۔ میرے والد مشرقی پاکستان سے لُٹ پُٹ کر آئے تھے یہاں ہم نے انتہائی نامُساعد حالات میں زندگی گزاری اور اُس کے بعد واقعات میں تبدیلیاں رُونما ہُوئیں۔ میں اپنے آپ کو ایک غریب باپ کی بیٹی ہی تصور کرتی ہُوں اور بیٹیوں پر باپ کی عزت کی ذمّہ داری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ساری زندگی کا ملن ٹوٹ جاتا ہے اگر بیٹی کی کوئی غلط حرکت باپ کے علم میں آجائے۔ اور اختر صاحب میرے اور آپ کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے جسے کسی ٹھوس شکل میں بیان کیا جا سکے۔"

اختر نے نُدرت کا چہرہ دیکھا اور مُسکراتا ہُوا بولا۔

"میرا خیال ہے یہاں آپ غلط ہیں نُدرت! میرے اور آپ کے درمیان ایک ٹھوس رشتہ تو موجود ہے یُوں کہئے کہ ابھی

اس کے اعلان کا وقت نہیں آیا۔ اگر آپ اتنی ہی سنجیدہ ہیں تو چلیئے ہم بھی سنجیدہ ہوئے جاتے ہیں۔ کیا یاد کریں گی آپ بھی سنیئے ندرت صاحبہ! یہ ہمارا پہلا اور آخری فیصلہ ہے کہ اگر زندگی میں کسی کو شریکِ سفر بنایا تو وہ آپ ہی ہوں گی۔ آپ نے انکار کر دیا تو ساری زندگی اسی طرح بیٹھے رہیں گے۔ نہ خودکشی کریں گے، نہ دیوداس بنیں گے لیکن زندگی میں کسی اور کو شریک نہیں کریں گے۔ آپ نے ہماری شرارتیں دیکھی ہیں۔ ہمارے اندر چھپی ہوئی گہرائیاں نہیں دیکھیں۔ یہ گہرائیاں بہت مستحکم ہیں مُحترمہ۔ ہاں اور جب انسان کسی کو اپنی ذات میں سمو لیتا ہے۔ اُن گہرائیوں میں اُتار لیتا ہے تو پھر وہ ذات اُس کی ذات پر مُحیط ہو جاتی ہے۔ آپ کے ہر طرح کے تحفظ کی ذمّہ داری ہم پر ہے۔ ہاں اگر آپ کے دل میں ہمارے لئے وہ جگہ نہ پیدا ہو سکے جس کے ہم طالب ہیں تو بخُدا نہ تو افسوس کا اظہار کریں گے اور نہ اُس کے بعد یہ بات کبھی زبان پر لائیں گے۔ کیونکہ ہم دل کی آزادی کے قائل ہیں۔ فیصلہ کرنے ہی پر تُل گئی ہیں تو آج کا مُبارک دِن اِس فیصلے کے لئے مخصوص ہو جائے"

ندرت نے چونک کر اختر کی صُورت دیکھی، اختر کا لہجہ بدل گیا تھا۔ چہرہ بدل گیا تھا اور اِس وقت اُس کی شخصیت میں ایک انوکھی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں ندرت خود کو اُس کے سامنے ہلکا ہلکا محسوس کرنے لگی۔ اختر پر الزام لگا دیئے تھے اُس نے لیکن اب جب وہ دفاع پر آیا تو اُسے خود ہی شرمندگی ہونے لگی تاہم اُس نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے کہا۔

"اختر صاحب کیا آپ یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ آپ چاہتے ہیں اُس کے راستے میں کوئی رُکاوٹ نہ ہوگی؟"

"رُکاوٹ صرف آپ ہو سکتی ہیں" اختر نے جواب دیا۔

"اور اگر میرے والدین اِس پر تیار نہ ہُوئے تو؟"

"اِس سلسلے میں بھی آپ ہی میری مدد کریں گی۔ اُن کے تیار نہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"یہ اُن کی اپنی سوچ ہوگی۔ میں اِس سلسلے میں کیا کہوں؟"

"تو پھر اس کے لئے میرے پاس جو لوگ موجود ہیں اور جو اِس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں، اُن میں سے چند نام نوٹ فرمایئے۔ احسان احمد چچا، ذکیہ چچی، دلدی امّاں، ثناء، خالد بھائی، ابراہیم صمدانی اور ایسے ہی چند دوسرے نام جو اِس سلسلے میں اپنی آخری کوشش کر ڈالیں گے، اُس کے بعد بھی اگر ہمیں ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا تو پھر ہم اِس ناکامی کو اپنی تقدیر سمجھ کر قبُول کر لیں گے اور اِتنی خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کر لیں گے کہ لوگوں کو یہ احساس بھی نہ ہو سکے"

"آپ مجھ سے شادی کریں گے اختر صاحب؟"

"ہاں!"

"تو ٹھیک ہے آپ اُس کے لئے تیاریاں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اِسی شرط پر کہ اگر تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کسی قسم کے دُکھ درد کا احساس نہیں کریں گے"

"مجھے منظور ہے" اختر نے جواب دیا۔

"اور ایک بات اور سُن لیجئے۔ اِس طرح ایک تنہا کوٹھی میں آنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے چنانچہ آئندہ اِس سے بھی پرہیز کیا جائے گا"

اختر نے آہستہ سے گردن ہلائی اور کہا۔

"لیکن بھری پُری کوٹھی میں آنا تو آپ کو ناگوار نہیں ہوگا۔ ہم بہت جلد آپ کی نظروں سے دفعان ہونے والے ہیں"

"کیا مطلب؟"

"بھئی یہاں آجائیں گے اور اُس کے بعد آپ کو یہاں آنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوگی"

ندرت کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اگر میرا لہجہ، میرا انداز آپ کو تلخ محسوس ہُوا ہو اختر تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔ لیکن جو ٹھوس سچّائیاں تھیں میں نے اُن کے زیرِ اثر گفتگو کی ہے"

"اتنی سنجیدہ گفتگو کرنی تھی تو وہاں پر بھی کی جا سکتی تھی اب کس مُنہ سے کہیں آپ سے کہ آیئے کوٹھی دیکھ لیجئے تاکہ ہمیں اطمینان ہو جائے"

"نہیں... نہیں جو تبدیلیاں آپ نے کی ہیں مجھے ضرور دِکھایئے اور آپ یقین کیجئے کہ اگر مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کہاں گئی تھی تو میں کُھل کر کہہ دُوں گی کہ اختر صاحب نے مجھے اپنی نئی کوٹھی دِکھانے کے لئے بُلایا تھا" ندرت نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"اور ہم بھی اِس کا اعتراف کریں گے کہ ہم نے ہی آپ کو زحمت دی تھی آیئے" اختر نے کہا اور اُٹھ کر ڈرائنگ رُوم سے باہر نکل آیا۔

خالد نے ثناء سے کہا۔

"یہ تیمور صاحب تو اب واقعی ہمارے لئے کچھ پریشان کُن ہوتے جا رہے ہیں"

"مطلب...؟" ثناء نے تیکھی نگاہوں سے خالد کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"نہیں جی، مطلب کچھ نہیں ہے، کبھی آپ سے اگر کوئی کام ہوتا ہے تو کہتے ہُوئے جھجکتے ہیں کہ تیمور صاحب ڈِسٹرب ہوں گے"

"کوئی کام ہو تو بتایئے"

"جی ہاں ایک کام تھا"

"کیا؟"

"ذرا آپ کی گاڑی میں بازار تک چلنا تھا"

"تو اِس میں تیمور کی مداخلت کا کیا سوال ہے؟"

"گاڑی کون ڈرائیو کرے گا" خالد نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"تیمور کو آپ گود میں بٹھا لیجئے۔ میں گاڑی چلاؤں گی" ثناء خوش ہو کر بولی۔

"ہُوں، ٹھیک ہے بھئی اِن کی ذمّہ داری سنبھالنی ہی پڑے گی"

"مگر چل کہاں رہے ہیں؟"

"یہ وہاں تک پہنچنے سے پہلے نہیں بتایا جا سکتا جہاں ہم جا رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلنا پسند کریں گی یا نہیں؟"

"لیجئے اِس میں ناپسندیگی کی کیا بات ہے، چلیئے چلتے ہیں" ثناء نے کہا اور خالد نے شانے ہلا دیئے۔

ثناء اندر کمرے میں کار کی چابی لینے گئی اور تھوڑی دیر کے بعد کار اسٹارٹ کر کے باہر نکل آئی۔ تیمور کو پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ خالد ثناء کے پاس ہی موجود تھا اور ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ ثناء اُس پر اتنا اعتماد کرتی ہے۔ اور اُس کے ساتھ تنہا آنے جانے کو کسی طور پر بُرا نہیں سمجھتی۔ یہ بات خالد کے لئے بڑے اطمینان کی حامل تھی۔ دھڑکتے دِل سے اُس نے ثناء سے یہ بات کہی تھی، بس نہ جانے کب تک اِس سلسلے میں سوچتا رہا تھا اور کچھ مجبُور ہی سا ہو گیا تھا۔

لیکن ثناء نے جس طرح اُس کی پذیرائی کی، اُس نے خالد کو بہت اعتماد بخشا تھا۔ ثناء ڈرائیو کرتی رہی۔ تیمور نے ایک بار مچل کر کچھ آواز بھی نکالنے کی کوشش کی۔ تو خالد نے اُسے اُٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ ثناء نے مُسکرا کر اُسے دیکھا اور بولی۔

"سچ بتایئے خالد یہ پیارا لگتا ہے نا آپ کو؟"

"اب کیا کہیں اِس کے جواب میں۔ کوئی فرسُودہ جُملہ کہہ دیا تو آپ کے شایانِ شان نہیں ہوگا"

"کہہ دیجئے... کہہ دیجئے"

"مورخین لیلیٰ کے کُتّے کی بات کرتے ہیں تو پھر یہ تو انسان ہے" خالد نے کہا اور ثناء کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"خیر وہ تو بڑی بیہُودہ بات تھی، لیکن یہ ہم لیلیٰ کب سے ہو گئے؟"

"لیلیٰ ایک تصوّراتی جُملہ ہے، میرا مطلب ہے محبّتوں کے اظہار کے لئے یہ جُملہ کہہ دیا جاتا ہے"

"سُبحان اللہ! آج آپ آسمان کی بلندیاں چُھو رہے ہیں"

"اِس میں کوئی شک بھی نہیں ہے بِلاشُبہ آپ جس اعتماد سے ہمارے ساتھ باہر آگئی ہیں۔ اُس نے ہمیں آسمان کی بلندیوں پر ہی پہنچا دیا ہے"

"بے اعتمادی کی اِس میں بھلا کیا بات تھی؟ آپ کوئی مگرمچھ ہیں کہ مجھے کھا جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ میں آپ کو بہت اچھا انسان سمجھتی ہُوں اور جانتی ہُوں کہ آپ کبھی کسی کو کوئی ذہنی تکلیف نہیں دے سکتے"

"آپ بہت فراخدِل ہیں۔ آج تو آپ ہمیں خُوشیوں سے بھرے دے رہی ہیں"

"خُدا کرے آپ خوش رہیں مگر یہ تو بتایئے چل کہاں رہے ہیں؟"

"ہاں اب پہلے سے بتا دینا مناسب ہے۔ کہیں بعد میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ شاید آپ کو علم ہو ثناء کہ ڈیڈی نے کوٹھی خرید لی ہے اور اختر پچھلے کافی دِنوں سے اُس کی ڈیکوریشن میں مصرُوف ہے۔ ہم نے سوچا کہ کوٹھی میں شفٹ ہونے سے پہلے ہم آپ کو کوٹھی دِکھا دیں اور آپ کی پسندیدگی کا اندازہ لگا لیں۔ آپ اُس کے سلسلے میں ہمیں کوئی ہدایت دیں گی تو اُن پر بھی ذرا توجہ دے لی جائے"

"مجھے تو صرف اِس بات کا افسوس ہے کہ آپ لوگ اپنی کوٹھی میں شفٹ ہو جائیں گے۔ آپ کے آجانے سے کوٹھی کی بے رونقی کچھ کم ہو گئی ہے"

"ہم اِن رونقوں کو منتقل کرنا چاہتے ہیں نا اور اب اِس سلسلے میں زیادہ وقت صرف کرنے کے قائل نہیں ہیں"

"کچھ عجیب سا لگ رہا ہے مجھے۔ بہرطور آپ کو مُبارک باد

دیتی ہوں" ثناء نے کہا اور خالد نے سیٹ کی پُشت سے گردن ٹِکالی۔

وہ بہت مسرور ہوگیا تھا۔ اُسے خدشہ تھا کہیں یہ سب کچھ ثناء کے مزاج کے خلاف نہ ہو لیکن ثناء واقعی اُس کے سلسلے میں بہت نرم ہوگئی تھی، بہت ہی ٹھوس اور بولڈ لڑکی تھی۔ جب تک انحراف کیا... کیا۔ لیکن اُس کے بعد جب اس کا انحراف ختم ہوگیا تو اُس نے اپنا انداز بالکل تبدیل کرلیا تھا۔ نہ عشق و محبت کا اظہار۔ نہ بے زاری اور بے رُخی۔ نارمل تھی وہ!

اور اِس وقت بھی اُسی انداز میں اُس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر خالد نے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا اور پھر ثناء کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کار مرسڈیز کے پاس جاکر رُک گئی تھی لیکن کوٹھی کا صدر گیٹ دیکھ کر خالد نے ایک لمحے کے لئے پریشانی سے ثناء کو دیکھا۔ ثناء نے اُس کی یہ پریشانی بھانپ لی اور بولی۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"گڑ بڑ ہوگئی مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ بدمعاش اِس وقت یہاں ہوگا۔"

"کون؟"

"اختر بھئی! یہ اِس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟ آج تو اُس کے آنے کے امکانات بھی نہیں تھے۔"

"تو کیا فرق پڑتا ہے؟ ہوسکتا ہے کوٹھی دیکھنے آیا ہو۔"

"فرق تو پڑتا ہے بھئی، بہت ہی لفنگا آدمی ہے۔ اب دیکھیں نہ جانے کیا کیا تُومار باندھتا ہے۔"

"نہیں بھئی! وہ اِتنا بُرا نہیں ہے۔ اگر آپ نہیں چاہتے کہ میری آمد کے بارے میں کِسی اور کو معلوم ہو تو ہم اختر کو سمجھا دیں گے۔ اُس سے کہہ دیا تو وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔"

"اِتنا اعتماد ہے اُس پر؟"

"ہاں! مجھے آپ دونوں پر بے حد اعتماد ہے" ثناء نے کہا اور خالد نے صدر دروازہ کھول دیا۔

"تشریف لے چلیئے۔"

ثناء تیمور کو کندھے سے لگائے اندر داخل ہوگئی۔ اور اُس کے بعد خالد اُسے کوٹھی دِکھانے لگا۔ اُس نے زور زور سے اختر کو آوازیں دیں۔ لیکن اختر کا جواب نہیں سُنائی دیا تھا۔

پھر ثناء ہی نے اختر کو تلاش کرلیا۔ اُوپری منزل کے ایک کمرے میں اختر موجود تھا اور اُس کے ساتھ نُدرت بھی تھی۔ دونوں سر پکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔

خالد اور ثناء بُری طرح اُچھل پڑے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُن دونوں کو دیکھ رہے تھے، پھر دفعتاً ہی ثناء کا قہقہہ بلند ہوا اور وہ تیمور کو زور زور سے اُچھالنے لگی۔

"یار تیمور! تمہیں کیا کہا جائے۔ بڑے بڑے سُراغ لگا رہے ہو آج کل، اللہ رکھی... اے اللہ رکھی۔ کھڑی ہو جا اب۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔ لیکن تو اِتنی تیز نکلے گی۔ میرے فرشتوں کو بھی گُمان نہیں تھا۔"

نُدرت خاموشی سے ثناء کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ثناء آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے شرارت بھری نگاہوں سے نُدرت کو دیکھا اور پھر اختر کو دیکھنے لگی۔

"اب نکالو مُنہ سے طرح طرح کی آوازیں دوست آج ایسا لگتا ہے جیسے خُوشیاں ہی خُوشیاں بکھر گئی ہیں۔ کیا پکڑا ہے خالد صاحب اِن دونوں کو۔ ہُوں! تو یہ معاملہ تھا۔ اللہ رکھی اپنی عادت کے خلاف بہت آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے تم نے، سوچ لو، اچھی طرح سوچ لو۔"

نُدرت عجیب سی مُسکراہٹ کے ساتھ ثناء کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ بات تم نے بالکل ٹھیک کہی ثناء! میں واقعی اپنی عادت کے خلاف بہت آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہُوں، مجھے شاید یہ کوشش نہیں کرنی چاہیئے تھی۔"

"ارے... ارے اِتنے گھُونسے لگاؤں گی بیٹھ پر کہ ریڑھ کی ہڈی ٹُوٹ جائے گی۔ بھلا اِس میں سنجیدہ ہونے والی کوئی بات ہے؟ اے اختر اِسے سمجھاؤ۔ یُوں لگتا ہے کہ تمھارے کافی اثرات ہیں اِس پر۔ ورنہ یہ اِس طرح یہاں نہ آجاتی۔ اب دیکھو نا ویسے تو یہ کبھی مذاق کا بُرا نہیں مانتی لیکن اِس وقت محترمہ کے چہرے کی سنجیدگی قابلِ دید ہے۔ جان بچانا چاہتے ہو اِس کی تو اِسے ٹھیک کرلو ورنہ آج اِس کی لاش ہی جائے گی یہاں سے میرے ہاتھوں۔ خالد ذرا پکڑنا تیمور کو" ثناء نے تیمور کو خالد کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔

خالد بھی اب حیرت سے نکل آیا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"نہیں بھئی ذرا صورتِ حال کا جائزہ تو لے لینا دیا جائے۔ کیس کی تفتیش تو ہو جائے۔ آپ نہیں جانتیں ثناء آج کتنا بڑا مُوذی مارا ہے ہم نے۔ ناک میں دم کر رکھا تھا اِس اختر نے میرا۔ کیا موقعے سے ہاتھ لگا ہے خُدا کی قسم۔ لُطف ہی آگیا اور محترمہ آپ، آج آپ کو ذرا غور سے دیکھنا ہی پڑے گا۔ ہم نے تو کبھی نگاہ بھر کر آپ کو دیکھا بھی نہیں" خالد اپنی فِطرت کے خلاف اِس وقت شوخی پر اُتر آیا تھا۔

اُس نے گہری نگاہوں سے نُدرت کا جائزہ لیا اور نُدرت نے آنکھیں بھینگی کرکے زبان باہر نکال دی۔

"سُبحان اللہ... سُبحان اللہ ہمیں لڑکی پسند ہے" خالد نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا اور ثناء بے اختیار ہنس پڑی۔

تب اختر نے کہا۔

"آپ لوگوں کا پروگرام ختم ہوگیا ہو تو مجھے بتا دیجئے گا تاکہ میں اپنا پروگرام بھی شروع کرسکوں۔"

"جانے دو... جانے دو آج بہت بڑے بڑے انکشافات ہُوئے ہیں۔ تم ہمارا کیا بگاڑ سکو گے اے نوجوان" ثناء نے گردن ٹیڑھی کرکے کہا۔

"جی نہیں اِس غلط فہمی میں بھی نہ رہیں۔ خالد صاحب کی نکیل میرے ہاتھ میں ہے۔ بھلا دیکھو تو سہی نُدرت، کِس بے حجابی سے دونوں ڈگر ڈگر پھرتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہُوں آپ کی یہاں آمد کِس سِلسلے میں ہُوئی ہے؟"

"اِس سوال کا حق کسی کو نہیں پہنچتا" ثناء بولی۔

"مجھے پہنچتا ہے محترمہ! اِس سے پہلے کبھی اشاروں میں بھی کچھ کہا تو ڈنڈا لے کر کھڑی ہوگئیں اور آج کیسی ٹہلتی ہُوئی چلی آئیں۔"

"بہتر یہ نہیں ہوگا کہ یہ گفتگو چائے کے دوران ہو" نُدرت نے کہا اور ثناء اُچھل پڑی۔

"چائے تت... تو یہاں باقاعدہ رہائش اختیار کرلی گئی ہے؟ چائے وغیرہ کا انتظام بھی ہے۔ دیکھا خالد صاحب یہ ہوتے ہیں دُنیا کے تیز رفتار لوگ، اور ہمیں کانوں کان خبر بھی نہ ہُوئی۔ چلو ٹھیک ہے چائے بھی پی لی جائے گی۔ ہو سکتا ہے دِل کی تپش کچھ کم ہو جائے۔ جاؤ اللہ رکھی چائے بنا کر لاؤ۔ آیئے خالد صاحب نیچے ڈرائینگ رُوم ہی میں بیٹھیں گے" ثناء نے کہا اور نُدرت دانت کٹکٹا کر بولی۔

"بنا کر لاؤں ابھی تمھارے لئے چائے۔ پلاؤں تمہیں اپنے ہاتھ کی چائے۔ چلو باورچی خانے میں چلو۔ یہ تمھاری کوٹھی ہے۔ میرا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہے" نُدرت نے کہا اور ثناء اُسے گھُورنے لگی۔

"دیکھا اِس سے پہلے کبھی آپ لوگوں نے اِس کے لہجے میں یہ بات محسوس کی۔ آج... آج اِس کی ٹیون ہی بدلی ہُوئی ہے۔ خیر چلو باورچی خانے میں تم سے بات کرلی جائے گی" ثناء بھی نُدرت کے ساتھ چل پڑی۔

نُدرت مُسکرا رہی تھی۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ثناء تیمور سے بولی۔

"تیمور! دیدوں کا پانی کِس طرح ڈھل جاتا ہے۔ کوئی نُدرت کو دیکھے۔"

"ویسے محترمہ چلیئے ٹھیک ہے۔ میں تو اچانک ہی یہاں پہنچ گئی ہُوں لیکن آپ کی آمد کِس سِلسلے میں ہُوئی ہے...؟ کیا چچا جان نے آپ کو یہاں بھیجا یا عادل حسین صاحب نے کِسی خاص قِسم کے مقصد کے تحت بھیجا ہے؟"

"نہیں، مجھے تو خالد لائے تھے، کہنے لگے کہ ذرا چل کر کوٹھی دیکھ لو، تم جانتی ہی ہو کہ مستقبل میں میری خالد سے شادی ہونے والی ہے۔ میں نے سوچا کیا حرج ہے دیکھ لی جائے کوٹھی" ثناء نے جواب دیا اور نُدرت رُک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"مالک کی بیٹی بڑی بڑی دیکھی ہیں۔ تم جیسی نہیں دیکھی۔ نِکاح ہوگیا ہے تمھارا... منگنی ہوگئی ہے؟ کیا ہوگیا ہے آخر؟ ابھی تو گفتگو بزرگوں ہی کے درمیان ہے اور تم ہَوائیں اُڑنے لگیں۔"

ثناء نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں ساتھ کچن میں آگئیں۔ اور ثناء چاروں طرف سے کچن کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی

"سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ میرا خیال ہے کوئی کمی نہیں ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"کوئی خیال نہیں ہے میرا" وہ کیتلی رکھی ہُوئی ہے، چلو پانی بھر کر لاؤ اِس میں۔"

"یار تیمور ہے میری گود میں۔ تُو ہی کرلے نا یہ سب کچھ" ثناء نے کہا اور نُدرت مُسکراتی ہُوئی کیتلی کی جانب بڑھ گئی۔

"اِس لہجے میں کہا ہے تو مان لیتی ہُوں تمھاری بات۔"

"اچھا چھوڑو، تھوڑی دیر کے لئے لڑائی ترک کردیتے ہیں۔ سچ سچ نُدرت کیا... کیا ایسی کوئی بات ہے؟"

"ہاں ہے" ندرت نے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ، تمام پرندے اپنے گھونسلوں کی جانب محوِ پرواز ہیں۔ ہر چڑیا اپنے لئے ٹھکانہ تلاش کر رہی ہے۔ کیا ہوگا اِس دُنیا کا؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل اختر نے مجھ سے اِس بات کا اظہار کیا کہ وہ میری جانب متوجہ ہیں اور مستقبل میں میرا ساتھ چاہتے ہیں۔ میں نے اُنھیں سمجھایا کہ یہ مناسب نہیں ہے اور میرے اور اُن کے درمیان یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ضد کر رہے ہیں اختر۔ میں سوچ رہی تھی کہ اِس سلسلے میں تمھاری مدد لُوں۔ تاکہ تم ہی یہ بات اختر کو بتادو کہ یہ ہونا ناممکن ہے۔"

"دماغ خراب ہُوا ہے کیا؟ اتنی اچھی خوشخبری ملنے کے بعد ایسی فضول باتیں کر رہی ہے" ثناء آنکھیں نکال کر بولی۔

"نہیں ثناء، تم خود سوچو، کوئی تُک کی بات ہے۔ اختر بہت اچھے انسان ہیں۔ خوش شکل اور دیدہ زیب، لیکن میرے اور اُن کے درمیان جو فرق ہے، یہ فرق میں نے اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہ بات اختر کے ذہن سے نکال دو۔ میں اُن کی فرمائش پر یہاں آتو گئی ہوں لیکن میں نے اُن سے دو ٹوک لہجے میں کہہ دیا ہے کہ جو کچھ وہ سوچ رہے ہیں۔ وہ خواب میں بھی ممکن نہیں ہے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہہ دیا ہے ثناء کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں اور اگر کبھی مجھے کسی کی پسندیدگی کا حق دیا جاتا تو میں یقینی طور پر اُن کے لئے پسندیدگی کا اظہار کر دیتی۔ لیکن جو کچھ وہ سوچ رہے ہیں وہ کسی طور پر ممکن نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی ثناء کہ ایک اتنا اچھا انسان کسی المیے کا شکار ہو اور اِس سلسلے میں تمھیں میری مدد کرنی پڑے گی۔"

"ندرت! یہ چائے کی کیتلی اُٹھاؤں گی اور تمھارے سر پر اُنڈیل دُوں گی۔ کیا بکواس کر رہی ہو؟ کیا خرابی ہے اختر میں؟ اور کیا رُکاوٹ ہے تم دونوں کے درمیان؟ مجھے بتاؤ، جواب دو! میں تو خدا کی قسم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہائے ندرت تُو تو جانتی ہے کہ مجھے خالد سے شادی کرنا ہی پڑے گی۔ اور میں نے خود بھی سوچ لیا ہے کہ خالد ہی سے شادی کروں گی۔ اچھے ہیں یہ لوگ، لیکن یہ سوچ کر تو میرے دل میں مسرت کی اتنی لہریں جاگ اُٹھی ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"کیا سوچ کر...؟"

"یہی کہ تُو بھی... تُو بھی زندگی کے اِس نئے سفر میں میرے ساتھ ساتھ ہی ہوگی۔ خُدا کی قسم ہم دونوں اِس کوٹھی میں آگئے تو یُوں سمجھ لو کہ ساری رونقیں یہیں سِمٹ آئیں گی۔ مزا آجائے گا۔ اور تُو کیا بے وقُوفی کی باتیں کر رہی ہے ندرت اب مجھ سے بار بار وہ سب کچھ نہ کہلوایا کر۔ جس کے لئے تم ہی لوگوں نے مجھے منع کر دیا ہے۔ کیا میں اندھی ہُوں۔ یہ بات جانتی نہیں۔ دیکھی نہیں ہے میں نے کہ غلام احمد چچا نے ہماری عزت کس طرح سمیٹ لی ہے! اور کس طرح اپنے آپ کو آج تک غلام بنائے ہُوئے ہیں ہمارا۔ یہ انسانی کام نہیں ہے۔ ندرت دیکھ اِس بات پہ خُدا کا شکر ادا کر کہ تم دونوں میرے علم میں آگئے اور اِس بات پر بھی یقین رکھ کہ دُنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے اب تم لوگوں کو مِلانا میری ذِمّہ داری ہے۔ جو کچھ بھی میں چاہُوں گی۔ کروں گی اور اِس سلسلے میں مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ ندرت میں اِس انکشاف سے بہت خوش ہُوں۔"

"مگر ثناء تم خود سوچو، دُنیا کیا سوچے گی؟ کیا کہے گی؟ میں تو اختر صاحب کو یہی سمجھانے آئی تھی۔"

"اگر تم نے یہ بات اُس کے ذہن میں بٹھا دی ہے۔ تو اب تمھیں ہی یہ بات اپنی زبان سے اُس کے ذہن سے نکالنا ہوگی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"ارے کیا تمھارا دماغ خراب ہے؟ کیا فضول باتیں کر رہی ہو؟"

"ندرت، تیری جان کی قسم میں بہت ضدی ہُوں اور اِتنا جانتی ہُوں کہ تیرے دِل میں اور کوئی نہیں ہے، ندرت! اختر کو مایُوس نہیں کرنا، بہت اچھا انسان ہے وہ، ہماری زندگی جنت بن جائے گی۔ میں خود تمھارے سامنے پُوری سنجیدگی سے یہ اعتراف کر رہی ہُوں کہ میں نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد خالد سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بہت اچھے انسان ہیں وہ اور اختر وہ تو میرا ہے بہت ہی پیارا۔ مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز ہے۔ اب تُو یہ سوچ لے کہ اگر میرے بھائی کا دِل توڑنا چاہتی ہے تو میرا ابھی دل ٹوٹ جائے گا۔"

ندرت دِل ہی دِل میں قہقہے ضبط کر رہی تھی۔ ثناء بیگم بہت تیز بنتی تھیں، پھنس گئی اُس کے جال میں، یہ ساری باتیں اُس نے سوچ سمجھ کر ہی کہی تھیں تاکہ ثناء کی زبان بند رہے۔ وہ اپنی اِسی اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہی اور ثناء اُس کے پیچھے پڑتی رہی۔ تب ندرت نے آہستہ سے کہا۔

"ثناء! مجھے کچھ وقت سوچنے کے لئے دو۔ بڑا اُلجھا ہُوا مسئلہ ہے۔ پلیز مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دو اور میں اُمید رکھتی ہُوں کہ تم میری بہت اچھی دوست ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ موقع ضرور دو گی۔"

"لیکن فیصلہ اختر کے حق میں ہی ہونا چاہیئے ندرت، ورنہ میں ہمیشہ کے لئے تجھ سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

اِدھر ندرت ثناء کو اپنے جال میں پھانس چکی تھی۔ اور اِس وقت یقیناً اُس پر سبقت حاصل کر چکی تھی اور اُدھر خالد اختر کی صُورت دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے بھوئیں اُٹھا کر گردن ہلائی۔ اختر بھی اُسی انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ خالد نے کہا۔

"برخوردار ذرا تفصیل تو بتا دو۔"

"کوئی تفصیل نہیں ہے بھائی جان۔ بس ندرت مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"ابے یار، ہم تو لاکھ کوشش کے باوجُود کبھی اِس بے باکی سے یہ الفاظ نہ کہہ سکے۔"

"میں چھوٹا ہُوں نا آپ کا لاڈلا" اختر نے جواب دیا۔

"خیر وہ تو ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کیا یہ معاملات آسانی سے طے ہو جائیں گے؟"

"آپ کی موجودگی میں بھی نہیں ہوں گے؟" اختر نے خالد کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہا ہے میری جان۔ بس سمجھ لے کہ تیرا کام بھی ہو ہی گیا۔ ویسے یار واقعی یہ لڑکی مجھے بھی بہت پسند تھی حالانکہ میں فطرتاً ذرا مختلف ہُوں لیکن اِس کی شرارتیں۔ سوچ لے گھر میں دو طوفان آجائیں گے اور ہمیں چٹکیوں میں اُڑا لیا جائے گا۔"

"تو اچھا ہے نا بھائی جان، یہ ہمیں چٹکیوں میں اُڑائیں گی۔ اور ہم فضاؤں میں پرواز کرتے رہیں گے" اختر نے جواب دیا۔ اور خالد نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

اُسی وقت ندرت اور ثناء کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ ندرت اپنے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اُٹھائے ہُوئے تھی۔ چائے پی گئی۔ اِس موضوع پر اب کوئی بات نہیں ہُوئی تھی۔ نہ ندرت نے یہ سوال کیا تھا کہ خالد اور ثناء یہاں کیا کرنے آئے تھے؟ پھر خالد نے کہا۔

"بھئی اب واپسی کا پروگرام کیسے بنے گا؟ میرا خیال ہے کہ ندرت کو اب ہم اپنے ساتھ ہی لئے چلے جاتے ہیں بلکہ یُوں کریں ثناء کہ آپ ندرت کو لے کر چلی جائیں اور کہہ دیں کہ آپ دونوں کسی کام سے گئی تھیں، ہم دونوں بعد میں واپس آجائیں گے۔"

"اِس طرح چھپنے کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے تاہم ندرت کے معاملے کو اگر آپ لوگ راز میں رکھنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے، میں اور ندرت چائے پینے کے بعد چلے جائیں گے، آپ لوگ جب دِل چاہے آجائیے" ثناء نے کہا۔

پھر بڑی سنجیدگی سے چائے پی گئی اور اُس کے بعد ثناء اُٹھتی ہُوئی بولی۔

"چلو ندرت چلتے ہیں۔"

"کیا مفاہمت ہے دونوں میں" خالد نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور ثناء بھی مُسکرانے لگی۔

اُس نے اِس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ دونوں کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑیں۔ ندرت نے کہا۔

"مجھے کافی دیر ہو گئی ہے اگر تم سے پُوچھا جائے تو تم یہی کہہ دینا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔"

"ہائے اللہ اتنی فکرمند کیوں ہے؟ دیکھ لیں گے۔ اب تو مِل جُل کر ہی کام کرنا ہوگا" ثناء نے مسخرے پن سے کہا۔ اور ندرت ہنسنے لگی۔

❁

تنویر فطرتاً بہت معصُوم تھی۔ ندرت نے اُسے جشن کے سِلسلے میں تیار تو کر لیا تھا۔ لیکن خود تنویر کے اندر یہ جرأت نہیں تھی کہ ندرت کی تفریحات میں کوئی حصہ لے سکے اور شاید اُس کے اندر یہ صلاحیت بھی نہیں تھی۔ ندرت چونکہ اپنے معاملے میں اُلجھ گئی تھی۔ اِس لئے تنویر کے کیس پر کوئی توجہ نہیں دے سکی تھی۔ دلچسپ اور عجیب و غریب واقعہ ہُوا تھا۔ ندرت ابتداء میں تو بے حد خوف زدہ رہی۔ ثناء کی بات اور تھی۔ سبھی لوگ جانتے تھے کہ ثناء خالد سے منسُوب ہے اور آج نہیں کل... کل نہ سہی پرسوں اِن دونوں کو یکجا ہونا ہی ہے۔ لیکن ندرت کا معاملہ بالکل مختلف تھا اور وہ اِس بات پر ثناء سے خوف زدہ رہی تھی۔ ثناء کی زبان کے آگے بند ھ باندھنا بھلا کِس کے لئے ممکن تھا؟ نہ جانے کب اور کہاں بھانڈا پھوڑ دے۔

عِصمت کا معاملہ بالکل اتفاقیہ طور پر ثناء کے علم میں آگیا تھا اور پھر ندرت... ثناء بھی اِس پر خوب ہنسی تھی جہاں تک اُس کا اپنا مسئلہ تھا تو ندرت کا یہ خیال غلط نہیں تھا۔ کہ وہ بالکل ہی مُنہ پھٹ اور جنگلی بَیل کی مانند ہے پتہ نہیں

کس وقت اور کہاں کس کے سینگ مار دے۔ اگر خالد کے سلسلے میں اُس سے کوئی سوال کیا جاتا تو شاید وہ مجمعِ عام میں یہ بتانے سے نہ چوکتی کہ خالد اُسے اپنی کوٹھی لے گیا تھا اور مستقبل کے بارے میں اُس کی رائے جاننا چاہتا تھا لیکن ثناء نے بھی حیرت انگیز طور پر زبان بند کرلی تھی، نہ جانے کیا سمائی تھی دِل میں۔ نُدرت سے اُس کے بعد اِس موضوع پر گفتگو بھی نہیں ہُوئی تھی۔

بات تنویر کی ہو رہی تھی۔ تنویر نُدرت سے وعدہ کرنے کے بعد یہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ لیکن جمن کی آنکھوں میں اب چار کا ہندسہ چکرا تا رہتا تھا۔ باورچی خانے میں وہ عموماً تنویر کی تصویر اپنے سامنے رکھتا تھا اور پچھلے کچھ دِنوں سے سانس میں کچھ جلی جلی سی بُو آنے لگی تھی۔

اِس وقت بھی اتفاقیہ طور پر تنویر کچن کے سامنے سے گزری تھی کچن دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکی لیکن شاید جمن کی چھٹی حس نے اُسے بتا دیا کہ تنویر آس پاس موجود ہے۔ دروازے سے باہر جھانکا اور تنویر پر نِگاہ پڑ گئی۔ جمن کی باچھیں خوشی سے کھِل گئی تھیں۔

"اندر آجاؤ" اُس نے بڑے دِل آویزانہ انداز میں مُسکرانے کی کوشش کی۔

تنویر کا دِل دھک سے رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ کشمکش کا شکار رہی۔ نُدرت کی بات اُسے یاد آگئی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے؟

"اندر تو آؤ۔ گاجر کا حلوہ بنا رہا ہُوں" جمن نے کہا۔

"میں... میں گاجر کا حلوہ نہیں کھاتی"

"تو میں لوکی کا بنا دُوں گا قسم اللہ کی۔ اِس میں کیا مشکل ہوتی ہے۔ تم اندر تو آؤ۔ چائے پلاؤں گا تمھیں"

تنویر بادلِ نخواستہ اندر داخل ہوگئی۔ جمن بدستور اُسے والہانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

"چار نمبر کوارٹر والی یقین کرو جب سے تمھیں دیکھا ہے سالی ایک بھی ہنڈیا ڈھنگ کی نہیں پکی۔ وہ جو کسی فلم کا گانا ہے کہ تیرے بنا یُوں گھڑیاں بیتیں۔ آگے تمھیں یاد ہے"

"نہیں" تنویر نے بے بسی سے گردن ہلا دی۔

"قسم اللہ کی تم مجھے اتنی پیاری لگتی ہو کہ دِل چاہتا ہے تمھیں شوکیس میں رکھ دُوں"

"شوکیس" تنویر نے گھبرائے ہُوئے انداز میں چاروں طرف دیکھا۔

"ارے یہاں تھوڑی۔ اُس شوکیس میں جو میرے کلیجے کے پاس ہے"

"میں جاؤں"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کسی کام سے آئی تھیں اِدھر...؟ چائے بناتا ہُوں تمھارے لئے۔ ذرا چکھ کر تو دیکھو گاجر کا یہ حلوہ، صاحب نے فرمائش کرکے بنوایا ہے"

"نہیں سچ چائے بھی نہیں پیوں گی میں"

"آہ! تم میرے دِل کا حال کب جانو گی؟ میں تو بالکل بس ایسا ہی ہو رہا ہُوں۔ میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا، نہ جی کو جلانا۔ ارے باپ رے شاید ہنڈیا جل رہی ہے" بدبُو جمن کی ناک سے ٹکرائی اور وہ جلدی سے ہانڈی میں پانی ڈالنے لگا۔

تنویر اپنی جگہ سے اُٹھی تو وہ پھر ایک دم اُس کے سامنے آگیا۔

"کچھ دیر تو بیٹھو، ایک بار چلے آؤ۔ دوسری بار چلے جانا" جمن نے پھر شاید کوئی گانا گانے کی کوشش کی تھی۔

تنویر پریشان نِگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ اُس کا دِل ہَول رہا تھا۔ کسی نے اگر اُس سے باتیں کرتے ہُوئے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا اُس کے بارے میں؟ نُدرت کی بات اپنی جگہ صحیح، لیکن یہ سب کچھ اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ جمن نے کہا۔

"تمھیں دیکھنے سے جی نہیں بھرتا۔ اماں سے بات کی ہے میں نے تمھارے بارے میں۔ میرا پیغام بھجوائیں گی تمھارے ہاں اور پھر تم ڈولی بن کے سنوریا... سجنیا... کہار... مم... میرا مطلب ہے کچھ غلط ہوگیا"

"بس چلتی ہُوں" تنویر نے کہا۔

"اچھا زیادہ دیر تمھیں نہیں روکوں گا۔ مگر ایک بات سُن لو بلکہ لکھ لو۔ آج رات کو گیارہ بجے کوارٹروں کے پیچھے جو پیلا درخت ہے، جس پر پیلے پھول کھِلے ہُوئے ہیں۔ وہاں آجانا۔ انتظار کروں گا تمھارا"

"مم... میں"

"تمھیں میری قسم! زندہ دفن ہو جاؤں گا اگر تم نہ آئیں تو"

تنویر بُری طرح باہر نکل آئی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ سے پاؤں اُلجھا تو گرتے گرتے بچی، جمن نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا تنویر نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا دیا تھا، پھر بے تحاشہ دوڑتی چلی گئی۔ اُس کا دِل اُچھل کر حلق میں آرہا تھا۔

بُری حالت ہوگئی تھی اُس کی۔ شکر تھا کہ اِس وقت کوئی نہ مِلا جس کام سے آئی تھی وہ بھی بھول گئی اور باہر ہی نکل آئی۔ اُس کا پُورا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ جو کچھ نُدرت نے کہا ہے وہ نہیں کرسکتی۔ بدنام ہو جائے گی اور لوگ اُس کے بارے میں نہ جانے کِس انداز میں سوچیں گے۔ اِس کوٹھی سے بھی نِکال دی جائے گی اور... اور بنی بنائی عزت خاک میں مِل جائے گی۔ یہاں آکر وہ بے حد خوش تھی۔ اِتنے اچھے لوگ تھے اتنے سارے اور پھر اُسے اُنھوں نے دوستوں ہی کی حیثیت دے دی تھی۔ تنویر اِس حیثیت کو کھونا نہیں چاہتی تھی ایسے فضول معاملے بالآخر دُنیا کی نِگاہوں میں آ ہی جاتے ہیں جبکہ اِس میں اُس کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رُخسار بھیگے تو اُسے اِن آنسوؤں کا احساس ہُوا۔ اِس حالت میں اگر کوارٹر میں واپس آجائے گی تو دوسرے لوگوں کی نِگاہوں میں آجائے گی۔ چنانچہ اُس نے سوچا کہ فرصت سے کسی جگہ بیٹھ کر رو لیا جائے۔ اور باغ کے ایک گوشے کی جانب چل پڑی۔ ایک بنچ پر بیٹھ کر اُس کی سِسکیاں جاری ہوگئیں۔ جمن کا رویّہ اُسے بے حد بُرا لگا تھا۔ لیکن ابھی اُس کی چند ہی سِسکیاں بلند ہُوئی تھیں کہ دفعتاً نُدرت اور ثناء کی حیرت بھری آوازیں سُنائی دیں۔

"ارے تنویر... تنویر کیا ہُوا بھئی؟ ارے... ارے ذرا دیکھو تو نُدرت یہ تو رو رہی ہے"

"تنویر کیا ہوگیا؟" نُدرت نے قریب آکر کہا۔

دونوں غالباً درخت کی دوسری جانب بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ اُنھیں تنویر کی سِسکیاں سُنائی دیں تنویر باقاعدہ رونے لگی تھی۔ نُدرت اور ثناء پریشانی سے اُسے دیکھنے لگیں۔

"خُدا کی بندی کچھ بتاؤ تو سہی۔ کیا ہوگیا؟ کیا کہہ دیا ہے کسی نے؟ ڈانٹ دیا کسی نے؟ ارے بتاؤ کسی نے آنکھ اُٹھائی ہو تو اُس کی آنکھ نکلوا دی جائے۔ میرا مطلب ہے کچھ بتاؤ تو سہی"

تنویر کافی دیر تک روتی رہی اور ثناء اور نُدرت اُسے چُپ کرانے کی کوشش کرتی رہیں۔ نُدرت نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"بالکل ہی بچی ہے ابھی۔ پاگل کہیں کی۔ ارے ہُوا کیا؟ کچھ تو بتا خُدا کی بندی"

"باجی وہ... وہ جمن... وہ جمن"

"ہائے اللہ کیسے بیدردی سے نام لے رہی ہے۔ ہُوا کیا بھائی جمن کو؟ کیا چُولھے میں جل کر ہلاک ہوگئے؟ بات کیا ہُوئی؟"

"باجی وہ... وہ بہت بدتمیز ہے۔ وہ بہت ہی بدتمیز ہے۔ میں... میں وہ سب کچھ نہیں کرسکتی جو آپ نے کہا تھا"

"کیا قصّہ ہے اللہ رکھی؟" ثناء نے کہا اور نُدرت ہنسنے لگی۔

"ارے ثناء! بتانا ہی بھول گئی تمھیں یاد دِلا دیا ہماری تنویر نے۔ مگر یہ تو بتا ہُوا کیا؟ کچھ بول تو سہی" نُدرت بولی۔

"اُس نے مجھے کچن میں بُلایا تھا"

"اچھا... اچھا سُبحان اللہ۔ ماشاءاللہ۔ پھر کیا ہُوا؟"

"کہہ رہا تھا چائے پی لوں"

"اوہو... ہو۔ چائے بھی پلا رہا تھا کمبخت"

"ہاں جی گاجر کا حلوہ بھی کھلا رہا تھا"

"ہائے گاجر کا حلوہ! ثناء کیا کچن میں گاجر کا حلوہ بن رہا ہے؟"

"ارے تُو فضول باتیں مت کر۔ پوری بات سُننے دے۔ ہاں تو پھر کیا ہُوا تنویر ذرا تم مجھے بتاؤ" ثناء تھنے پُھلا کر بولی۔

"پہلے میری بات سُن لو میں یہ واقعہ بتانا ہی بھول گئی۔ ہمارے جمن میاں اب میری طرف سے تو مایُوس ہوگئے ہیں۔ کچھ دِن تو یہ احساس رہا ہوگا کہ نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اب دِل نے پھر جوش مارا ہے اور بے چاری تنویر اِس بار اِس دِل کا شکار بنی ہے"

"کُتّا... کمینہ" ثناء دانت پیس کر بولی۔

"ارے نہیں... نہیں۔ دُنیا کے کسی بھی عاشق کو اِن الفاظ میں نہ پُکارو ثناء، بڑے قابلِ احترام ہوتے ہیں یہ لوگ"

"بکواس مت کرو اُسے یہ جُرأت کیسے ہُوئی میری تنویر کو پریشان کرنے کی"

"اور باجی اُس نے... اُس نے رات کو گیارہ بجے مجھے پیلے درخت کے نیچے بھی بُلایا ہے"

"ہائے" نُدرت سینے پر ہاتھ مار کر بولی "کبھی یہی درخت ہمارے لئے تھا۔ اِس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں ہمارا جمن اور ہم"

"نُدرت بدتمیزی کئے جا رہی ہو اُس کی پوری بات تو سُن لو"

"اُس نے کہا کہ اگر میں وہاں نہ پہنچی تو وہ خودکشی کرلے گا"

"سُبحانَ اللہ... سُبحانَ اللہ اِس کا مطلب ہے کہ اب اُس کا عشق مزید نِکھر گیا ہے۔ مگر اِس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے تنویر؟"

"نہیں باجی! میرا کیا بنے گا... کسی کو پتہ چل گیا تو

"مَیں... مَیں... مَیں" تنویر نے پھر رونے کی کوشش کی، لیکن نُدرت نے آگے بڑھ کر اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اب بھوں بھوں مت کر۔ دماغ درُست کردیں گے اُس کا۔ وہ ہے کیا چیز؟"

"دماغ اُس کا درُست کرنا ہی پڑے گا" ثناء نے غراتے ہُوئے انداز میں کہا۔

"ثناء! بات سُنو! دیکھو بھئی تنویر کو ہم جانتے ہیں۔ دُنیا جانتی ہے، بھلا تنویر کا اِس سلسلے میں کیا قصُور ہے۔ میں نے ہی تنویر سے کہا تھا کہ وہ ذرا جمّن کی طرف توجہ دے مگر یہ بچّی اپنے کام کی ہے نہیں۔ یہ اِس کے بس کی بات نہیں ہے خیر چلو اب اِس بچّی کو کیا پریشان کیا جائے؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بھائی جمّن کو آخری سبق تو پڑھا دیا جائے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ثناء نے کہا۔

"کچھ سوچو یار! بالکل ہی ڈل ہوکر رہ گئی ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ تنویر کچھ کام دِکھا جائے گی۔ مگر نہیں... ہم ابھی اِس معصُوم سی بچّی سے اِتنی مشقت نہیں لے سکتے۔ ٹھیک ہے تنویر تم جاؤ آرام کرو۔ عیش کرو اور ذرا مُنہ دھولینا ورنہ دوسرے لوگوں کو بھی تفصیل بتانا پڑے گی۔"

"مم... مگر باجی گیارہ بجے..."

"گیارہ بجے اُس کا ایک خاص شو ہوگا۔ تم اگر چاہو تو وہ شو دیکھنے آجانا ورنہ دوسروں کی زبانی تمھیں پتہ چل جائے گا..." ثناء نے کہا۔

"ٹھیک ہے باجی مم... میَں... میَں"

"ہاں... ہاں جاؤ۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے" نُدرت نے چمکارتے ہُوئے کہا اور پھر اپنے دوپٹے کے پلّو سے تنویر کے آنسُو خشک کردیئے۔

"ہنستی ہُوئی جانا خُدا کے لئے۔ کہیں بات چاروں طرف نہ پھیلا دینا۔ ہمارا سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

تنویر آگے بڑھ گئی تھی۔ نُدرت اور ثناء ایک دوسرے کی صُورت دیکھنے لگیں۔ پھر ثناء نے کہا۔

"ویسے اِس بچّی کے ساتھ جمّن کی یہ بدتمیزی مناسب نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اُسے نوکری سے نِکلواؤں مگر!"

"کیسی باتیں کررہی ہو بھلا، ایک عاشق کو نوکری سے نِکلوادوگی تو اُس کا دِل تو نہیں چھین لوگی۔ تنویر سے نہ سہی کِسی اور سے عشق کرے گا۔ کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟" ثناء نے کہا۔

"ثناء! ابھی سے تم اپنی ساری شرارتیں بھُول گیئں۔ کِس سوچ میں ڈوبی رہتی ہو آج کل۔ میں تو کہتی ہُوں ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ نہ جانے کب یہ بیل منڈھے چڑھے ابھی سے اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہی ہو؟"

"زیادہ بکواس مت کرو محترمہ اللہ رکھی۔ میں نے زبان بند رکھی ہے تو اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میری زبان ہی نہیں ہے۔"

"ارے... ارے موضوع بدلنے سے کیا فائدہ، میرا مطلب ہے آج رات جمّن کے ساتھ کچھ ہوجائے۔"

"کیا؟" ثناء نے پُوچھا۔

"یار کچھ بھی سوچو نا" نُدرت نے ثناء کو دعوت دی اور دونوں گہری سوچ میں ڈُوب گیئں۔

"تنویر کے ذریعے تو کوئی مسئلہ حل ہونے سے رہا۔ گیارہ بجے جمّن صاحب پیلے درخت کے نیچے آئیں گے اور ساڑھے گیارہ بجے خودکشی کرلیں گے۔ میرا خیال ہے اُن کے خودکشی کے طریقے کو آسان بنا دیا جائے۔"

"کیسے؟"

"یہی تو سوچنا ہے۔ ارے واہ آگئی..." نُدرت ایک دم اچھل پڑی۔

"ضرور آگئی ہوگی۔ آج کل تمہارا دماغ خُوب چلنے لگا ہے۔" ثناء نے اُسے گھُورتے ہُوئے کہا۔

"عارفہ پھُوپھی کے ذریعے کیوں نہ یہ کھیل کھیلا جائے۔"

"کیا؟"

"ہاں عارفہ پھُوپھی" نُدرت نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ ثناء کو کچھ بتانے لگی۔ ثناء کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"درمیان کہیں تنویر کا نام نہ آجائے۔"

"نام آیا تو ہمارے جُوتے بھی جمّن کی کھوپڑی پر برسیں گے، کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تو پھر میں ابتداء کرتی ہُوں۔"

"گڈ ویری گڈ یہ ہوتا ہے صحیح ورکروں کا کام۔ کل کا کام آج اور آج کا کام اب۔ تو پھر میں چلتی ہُوں" نُدرت اپنے کوارٹر کی جانب چل پڑی۔ اور ثناء تمور کو کلیجے سے لگائے آگے بڑھ گئی۔

ثناء ٹہلتی ہُوئی عارفہ پھُوپھی کی جانب چل پڑی۔ عارفہ پھُوپھی نے اُسے دیکھا تو مُسکراتی ہُوئی بولیں۔

"آؤ بیٹا آؤ۔ آج کل تو تم ہماری طرف توجہ کم ہی دیتی ہو۔"

"نہیں عارفہ پھُوپھی ایسی کیا بات ہے، آپ نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں۔ خیریت سے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اِس لئے کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ویسے بھی جب آپ پر کوئی ضرب آتی ہے تو میرا دِل کانپ جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ جو شخص آپ کے خلاف کچھ کہے اُس کا مُنہ نوچ لُوں۔"

عارفہ بیگم کی آنکھوں میں آنسُو ڈبڈبا آئے تھے۔

"اِنہی محبّتوں کے سہارے تو پڑی ہُوئی ہُوں بیٹا ورنہ اور کیا رکھا ہے اب اِس دُنیا میں۔ تمہی لوگوں کے لئے جی رہی ہُوں۔"

"نہیں عارفہ پھُوپھی، ابھی تو آپ کی عمر ہی کیا ہے، ایک بھی جھُرّی تو نہیں ہے چہرے پر۔ آج ذرا یہی دیکھنے آئی تھی کہ اِس کمبخت جمّن کو سُوجھی کیا ہے؟" ثناء نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"غور کررہی ہُوں آپ پر عارفہ پھُوپھی بِلا شُبہ جوانی میں تو بے حد حسین ہوں گی۔ ویسے ابھی آپ کی عمر کتنی ہوگی؟"

"اے کیسی باتیں کررہی ہے بیٹا۔ عمر وُمر کا کیا ہے تم لوگ جوان ہوگیئں اور ہم بُوڑھے ہوگئے۔"

"نہیں عارفہ پھُوپھی میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اچھا ایک بات بتائیے بالکل ایمانداری سے۔"

"ہاں کہو" عارفہ پھُوپھی نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"یہ جمّن کا کیا قصّہ ہے؟"

"کون جمّن بیٹا ابھی تم نے پہلے بھی اُس کا نام لیا تھا۔"

"یہی اپنا باورچی۔"

"کیوں اُس کا کیا قِصّہ ہے؟"

"بس کچھ عجیب سی باتیں کررہا تھا۔ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آئیں۔ لیکن تجسّس ضرور پیدا ہوگیا۔"

"کِس کے بارے میں کررہا تھا؟" عارفہ پھُوپھی نے سوال کیا۔

"آپ کے بارے میں۔ آپ ہی کا نام بار بار لے رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ کون کہتا ہے کہ عارفہ بیگم جوان نہیں ہیں۔ کوئی میرے دِل سے پُوچھے۔"

"جمّن کہہ رہا تھا؟" عارفہ بیگم نے حیرت سے مُنہ پھاڑ کر کہا۔

"ہاں عارفہ پھُوپھی میں نے اچھی طرح اُس کی باتیں سُنی ہیں۔"

"لے اِس موئے کو کیا ہوگیا؛ میری تو اُس سے یاد اللہ بھی نہیں ہے، کبھی ایک آدھ بار ہی بات ہُوئی ہو تو ہُوئی ہو۔"

"مگر وہ سینہ ٹھونک کر کہہ رہا تھا کہ وہ... وہ عارفہ پھُوپھی آپ سے... آپ سے عارفہ پھُوپھی۔"

"لے اُس کا ستیاناس ابھی جاتی ہُوں جُوتی لے کر اور دماغ ٹھیک کردیتی ہُوں اُس موئے کا۔ لے مجھے سمجھا کیا ہے؟ اِس عمر میں یہ ساری حرکتیں کروں گی۔ کمینہ کہیں کا وہی تو کہتی ہُوں بیٹا کہ کم نسل، کم نسل ہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں تو یہ باتیں ہی کرنے لگا۔"

"مگر عارفہ پھُوپھی تعجب ہے مجھے۔ وہ تو ایک اور بات بھی کہہ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ آپ رات کو روزانہ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے پیلے درخت کے نیچے اُس سے ملنے جاتی ہیں۔"

عارفہ بیگم کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ثناء! خُدا کے واسطے بیٹا کہیں اِس بڑھاپے میں چونڈا نہ کٹوا دینا۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"آپ جانتی ہیں عارفہ پھُوپھی میں نے ہمیشہ آپ کی طرف داری کی ہے۔ کِسی کے لئے کوئی کچھ بھی کہتا رہے میں نے کبھی اُس پر غور بھی نہیں کیا۔ طفیلی بیگم نے کیا نہیں کیا آپ کے لئے۔ صرف میں تھی جو آپ کے سامنے سینہ تانے کھڑی رہی اور میں آپ کے پیچھے یا آپ کے سامنے آپ کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں سُن سکتی۔"

"بیٹی معلوم ہے مجھے۔ یہ بات تو مجھے معلوم ہے کہیں تیرے کانوں کو دھوکہ نہ ہُوا ہو۔ کِسی اور کے بارے میں نہ کہہ رہا ہو وہ۔"

"مجھے تو ایک اور شُبہ بھی ہے عارفہ پھُوپھی۔"

"کیا؟"

"کہیں یہ طفیلی بیگم پھر سے سرگرم عمل تو نہیں ہوگیئں۔"

"اے بُوا سانپ کا کام کاٹنا ہے، بچھو کا کام ڈنک مارنا ہے۔ کچھ بھی بیت جائے اپنی عادت کون چھوڑتا ہے ہوسکتا ہے یہ سب طفیلی بیگم کا کیا دھرا ہو۔ ایک بار پھر مجھے ذلیل و خوار کرنا چاہتی ہوں۔"

"تب تو آپ کو اُن کی سازش ناکام بنانی چاہیئے پھُوپھی جان۔"

ثناء نے غصّے سے نتھنے پھُلاتے ہُوئے کہا۔

"لے توکہہ کر تو دیکھ میں تو صرف اِس لئے خاموش رہتی ہُوں کہ لوگ کہیں گے بے چاری طفیلی پر بپتا پڑی ہے اور میں اُس کی جان کے پیچھے پڑی ہُوں۔ میں تو ہمیشہ اُسے نظرانداز کرتی رہتی ہُوں بس یہ سوچ کر کہ دُکھی ہے بے چاری، دُکھوں کی ماری مگر ہُوا نہیں دُنیا کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔"

"یہ بات بھی نہیں کہی جا سکتی عارفہ پھُوپھی کہ یہ کام طفیلی بیگم نے ہی کیا ہو۔ میں ایک اور مشورہ دینا چاہتی ہُوں آپ کو۔"

"کیا ؟"

"آپ یُوں کریں آج رات گیارہ بجے اُس درخت کے نیچے پہنچ جائیں۔ خاموشی سے بیٹھی انتظار کریں۔ دیکھیں جمّن آتا ہے کہ نہیں ؟"

"لے بی بی وہ کیوں آئے گا، بھلا میں اُس سے ملنے جاؤں گی ؟"

"عارفہ پھُوپھی ! جو کچھ میں کر رہی ہُوں وہ کرنے دیں۔ میں جمّن کو منظرِ عام پر لانا چاہتی ہُوں۔ ذرا دس بیس جُوتیاں تو لگا دیں اُس کے سر پر تاکہ ہمیشہ کے لئے بھُوت بھاگ جائے۔" عارفہ بیگم کچھ سوچنے لگی تھیں پھر اُنھوں نے کہا۔

"لے مُوذی کی باتیں اِس عُمر میں مجھے بدنام کرنے چلا ہے، ارے ہو نہ ہو معاملہ طفیلی بیگم ہی کا ہے۔ اُنھوں نے ہی یہ گُل کھلایا ہوگا۔"

"اگر ایسا بھی ہے عارفہ پھُوپھی تو کم از کم جمّن زبان تو کھولے گا۔ پتہ تو چلے گا کہ یہ سازش کس نے کی ہے۔"

عارفہ پھُوپھی گہری سوچ میں ڈُوب گئی تھیں۔ ایک طرف ثناء کی بات پر تن بدن میں آگ لگ گئی تھی تو دوسری طرف ناصر علی کا خطرہ بھی تھا جو اُن کے شوہر تھے اور ہمیشہ اُن کی باتوں پر ناراض رہتے تھے اگر ثناء کی بات مان لی جائے۔ تو ناصر علی کیا سوچیں گے ؟ لیکن یہ خوف بھی تھا کہ اگر بعد میں ناصر علی کے کانوں میں ایسی کوئی بات پہنچی تو بُرا ہوگا۔ بہت دیر تک سوچ بچار میں ڈُوبی رہیں پھر اُنھوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا، رات کو اُس کمبخت کے دس بیس جُوتے تو لگا ہی دُوں گی۔ اگر وہ وہاں پہنچ گیا تو۔"

"ہاں بالکل... بالکل، آپ اِس میں ذرا بھی اعتراض نہ کریں۔ باقی جو کچھ ہوگا میں دیکھ لُوں گی۔ ارے دُنیا آپ کو کچھ بھی کہے ہم تو آپ کو جانتے ہیں عارفہ پھُوپھی۔"

"ٹھیک ہے بیٹا" عارفہ پھُوپھی تیار ہوگئیں اور اُنھیں خُوب پکّا کرنے کے بعد ثناء وہاں سے نکل آئی لیکن عارفہ بیگم کے لئے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ آئی تھی۔

عارفہ بیگم کا شُبہ رہ رہ کر طفیلی بیگم کی طرف جا رہا تھا۔ طفیلی بیگم کیا کچھ نہیں کر چکی تھیں اُن کے لئے پچھلے دِنوں سے اُنھوں نے بلاشبہ چولا بدل لیا تھا اور عارفہ بیگم بھی یہ سوچ کر خاموش ہوگئیں کہ بے چاری اب زمانے سے ہار چکی ہے لیکن اگر طفیلی بیگم دوبارہ شرارت پر اُتر آئی ہیں تو پھر وہ بھی کسی سے کم کہاں تھیں۔ ہاں بات کچھ ایسی تھی کہ رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ کہیں ناصر علی اِس سلسلے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ اوّل تو یہ کہ اگر جمّن نے جھُوٹ بولا ہے۔ تو وہ کمبخت مارا وہاں پیلے درخت کے نیچے آئے گا ہی کیوں، کیونکہ ظاہر ہے بات میں تو اصلیت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ ثناء کی ہدایت پر وہاں جانے کا فیصلہ کر چکی تھیں، بس خیال تھا تو ناصر علی اور اِس سلسلے میں اُنھوں نے ناصر علی سے بھی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ تمام معمُولات سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ آرام کرنے لیٹے تو عارفہ پھُوپھی کہنے لگیں۔

"اے سُنتے ہو۔"

"سُنائیے !" ناصر علی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ایک بات ہے۔ بڑی عجیب سی ہے بس کیا کہوں کہتے ہُوئے دِل ڈر رہا ہے۔"

"خُدا انھیں خوش رکھے، پھر کوئی گُل کھلا ڈالا کیا ؟" ناصر علی بیوی کی عادت کو اچھی طرح جانتے تھے۔

"اے میں نے کیا کھلا ڈالا ؟ گُل تو گُل کھلانے والے کھلا رہے ہیں۔ میں تو بس اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتی ہُوں۔"

"سُبحانَ اللہ ! پوزیشن کا مطلب سمجھتی ہیں آپ ؟"

"کیوں جاہل ہُوں کیا بالکل۔ ارے تم نے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتی ؟"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں۔ ویسے میں نے بالکل صحیح کیا۔ آپ دو کوڑی سے زیادہ کی ہیں بھی نہیں۔"

"ہمیشہ ہی جلی کٹی سُناتے رہتے ہو۔ کبھی دِل کی بات جو سُنتے ہو۔"

"سُنائیے... سُنائیے کچھ کہہ رہا ہے آپ کا دِل ؟"

"اے ایک افواہ سُنی ہے مَیں نے۔ کیا بتاؤں بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی مگر دُشمن تو وار کرتے ہی رہتے ہیں ناصر علی

اور اگر ان واروں سے بے خبر رہا جائے تو پھر یُوں سمجھ لو کہ گھر بگڑ جاتے ہیں۔"

"اللہ اللہ مجھے آپ کے دُشمنوں پر حیرت ہوتی ہے آخر وہ آپ سے دُشمنی کِس بنیاد پر کرتے ہیں ؟"

"وہ دراصل جمّن کو جانتے ہو۔"

"کون جمّن ؟"

"اے وہی مُوا باورچی۔"

"جی ہاں بڑے کام کی چیز ہے۔ اکثر عُمدہ قسم کی چیزیں کھلاتا رہتا ہے۔"

"میرے بارے میں ایسی ویسی باتیں کر رہا ہے کہتا ہے کہ عارفہ بیگم اب بھی لاکھوں میں ایک ہیں۔"

ناصر صاحب نے بے اختیار قہقہہ روکا تھا اور پھر ہنس کر بولے۔

"تھوڑی دیکھی ہے کبھی ؟"

"ہاں... ہاں دیکھی ہے اور جیسی ہے ویسی ہی رکھنا چاہتی ہُوں۔ سُنو وہ جمّن جو ہے میرے بارے میں اِدھر اُدھر کی اُڑا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ میں اُس میں دِلچسپی لے رہی ہُوں۔"

"ایں !" ناصر علی اُچھل پڑے۔ اُٹھ کر مسہری پر بیٹھ گئے۔ اور عارفہ بیگم کو بغور دیکھتے ہُوئے بولے۔ "اماں واللہ کیا واقعی ؟ ایسا بے وقوف اِس رُوئے زمین پر موجود ہے جو یہ تصوّر رکھتا ہے۔"

"ہاں بات آگے بڑھ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں درخت کے نیچے اُس سے ملاقات کیا کرتی ہُوں۔"

"سُبحانَ اللہ سُبحانَ اللہ، ویسے میری طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ آپ درخت کے اُوپر بھی اُس سے ملاقات کر سکتی ہیں۔ کیا اب میں سو جاؤں ؟"

"سنیئے تو سہی۔ میں چاہتی ہُوں ذرا اُسے مزا چکھا دُوں..." عارفہ بیگم نے کہا۔

"عارفہ بیگم ایک بار کوٹھی سے بھگائی جا چکی ہیں۔ اِس بار بھگائی گئیں تو دوبارہ نہیں بُلائی جائیں گی۔" ناصر علی نے طنزیہ کہا۔

"میں تو بس تمھارے کانوں میں بات ڈالنا چاہتی تھی۔ جو کچھ کر رہی ہُوں اپنی عزت کے لئے کر رہی ہُوں۔ ساتھ نہیں دے سکتے میرا تو نہ دو۔ میں اِس مسئلے میں خاموش نہیں بیٹھوں گی۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا محترمہ کہ آپ باہر جا کر جو کچھ چاہیں کریں، کہیں اور سُنیں۔ مجھے اِس وقت آرام کرنے دیں۔" ناصر علی نے اِس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

عارفہ بیگم خاموش ہوگئیں۔ ناصر علی ہمیشہ ہی کے ایسے تھے۔ کبھی جو کسی مسئلے میں ساتھ دیا ہو۔ اپنے طور پر وہ تیار تھیں۔ دوسری طرف ثناء، نُدرت وغیرہ بھی اپنی طرف سے تیار تھیں۔ تنویر کو اِس سلسلے میں زحمت نہیں دی گئی تھی۔ وہ بے چاری ایسے معاملات میں آگے بڑھنے والی نہیں تھی اِس کا اندازہ دوپہر ہی کو ہوگیا تھا۔

رات کے گیارہ بج گئے۔ عارفہ بیگم آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی پیلے درخت کے نیچے جا بیٹھیں۔ اُنھوں نے درخت کے تنے کی جانب رُخ کر لیا تھا، یہاں ویسے ہی اندھیرا تھا۔ لیکن انھیں یقین نہیں تھا کہ جمّن یہاں آئے گا۔ منہ زبانی بات کہہ دینا دوسری بات ہے، عملی طور پر اِس کا بھلا کیا سوال تھا کہ جمّن وہاں آئے، پتہ نہیں نُدرت اور ثناء وغیرہ کہاں چھُپی ہُوئی تھیں۔ عارفہ بیگم کو اِس کا اندازہ نہ ہو سکا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُنھوں نے قدموں کی چاپ سُنی اور اُن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اگر اُن کا اندازہ غلط نہیں تھا تو یہ جمّن ہی تھا اور بلاشبہ اُن کا اندازہ غلط نہیں تھا کیونکہ چند ہی لمحات کے بعد جمّن کی آواز سُنائی دی تھی۔

"جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا۔ روکے زمانہ... آگئیں تم۔ مجھے یقین تھا میرے دِل میں گھُٹن گھُٹ ہو رہی تھی۔ اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ تم آؤ گی... تم آؤ گی۔ تم آؤ گی۔" اُس نے پیچھے سے دونوں ہاتھ بڑھا کر عارفہ پھُوپھی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور عارفہ پھُوپھی نے تڑپ کر زوردار کہنی اُس کے پیٹ میں ماری۔ پھر غُرّاتے ہُوئے لہجے میں بولیں۔

"تیرا ستیاناس مٹی مارے۔ ایسی ہی جوانی پھٹی پڑ رہی ہے تو کسی گٹر میں کُود کر خودکشی کر لے۔ دوسروں کو کیوں بدنام کرتا ہے۔"

"ارے... رے عارفہ پھُوپھی... عارفہ پھُوپھی آپ ؟" جمّن کے مُنہ سے سخت حیرت کے عالم میں نکلا۔

"پھُوپھی ہوگئی اب میں تیری۔ ارے کمبخت مارے دوسروں سے تُو نہ جانے کیا کیا کہتا پھر رہا ہے۔ اب یہاں ایک ہاتھ پڑا تو پھُوپھی ہوگئی میں تیری۔" عارفہ بیگم نے پاؤں سے جُوتی اُتار لی۔ جمّن کے حواس گُم ہو گئے تھے یہ کیا مصیبت آگئی۔

عارفہ بیگم نے جمّن کا گریبان مضبُوطی سے اپنی مُٹھی کی گرفت میں لے لیا تھا۔

"ارے... رے سُنیئے تو... سُنیئے تو م... میں قسم خ... خُدا قسم... خُدا قسم عارفہ پھُوپھی۔"

"عارفہ پھوپھی!" عارفہ پھوپھی کی جوتی جمن کے سر پر پڑی، اور جمن بُری طرح گڑگڑانے لگا۔

"مم... معاف کر دیئے عارفہ پھوپھی آپ تو... آپ تو میری اماں کے برابر ہیں۔ معاف کر دیجئے مم... میں خدا کی قسم مم... میں"

"کس نے بھیجا تھا تجھے بول... بول کس نے بھیجا تھا؟"

عارفہ پھوپھی نے تڑاتڑ جوتیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔

جمن بے چارہ ڈر کے مارے چیخ بھی نہیں رہا تھا کہ کہیں دوسرے لوگ بھی نہ جمع ہو جائیں۔ خوش بختی تھی کہ گھر کے تمام لوگ سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ اور چاروں طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ عارفہ پھوپھی تڑاتڑ جمن پر جوتیاں برسا رہی تھیں۔ جمن بندر کی طرح ناچ ناچ کر اپنے آپ کو بچانے کے لئے اچھل رہا تھا۔ لیکن عارفہ پھوپھی نے اُس کا گریبان مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ پھر جمن نے ایک بار بچنے کی کوشش کی تو جوتی اُس کی ناک پر پڑی اور جمن بلبلا اُٹھا۔

"ارے نکسیر پھوٹ گئی۔ ارے تمہیں خدا کا واسطہ عارفہ پھوپھی نکسیر پھوٹ گئی میری۔ ہائے دیکھو کتنا خون نکل رہا ہے۔"

"ابھی تو میں تیری تقدیر پھوڑوں گی۔ موئے مُردار کہیں کے۔ بول کس نے بھیجا تھا تجھے یہاں؟"

"خدا قسم پھو... پھو کسی نے نہیں بھیجا تھا۔ ہائے کیا کروں نکسیر... نکسیر پھوٹ گئی۔ ہائے میں مر رہا ہوں۔" جمن ایک دم سے زمین پر گر پڑا اور اِس طرح اُس کا گریبان عارفہ پھوپھی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اُسی وقت ندرت اور ثناء ایک درخت کی آڑ سے نکل آئی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"لو دیکھ لو بیٹیا۔ پوچھ لو اپنے اِس لے پالک سے، کیا کرنے آیا تھا یہاں؟ کون موں میں اِس کی؟ بول تیری کون ہوں میں؟"

"پھوپھی ہو۔ اماں ہو میری اماں ہو۔ ارے خدا کے لئے جانے دو۔ کسی کو پتہ چل گیا تو میری شامت آ جائے گی۔ ہائے دیکھئے ثناء بی بی خون نکال دیا اِنھوں نے میری نکسیر پھوٹ گئی۔"

"کھڑے ہو جاؤ۔" ثناء نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا اور جمن کھڑا ہو گیا۔

"کیوں آئے تھے یہاں؟"

"خدا قسم... خدا قسم ہاضمہ خراب ہو گیا تھا۔ پیٹ میں مروڑ ہو رہی تھی۔ ٹہلنے آیا تھا۔ یہ نظر آ گئیں۔"

"اور گردن میں باہیں اپنی اماں کے ڈالی تھیں؟

"اماں سمجھ کر ہی ڈالی ہوں گی۔ ہائے دیکھو خون مسلسل بہہ رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔" جمن نے کہا اور پھر دوڑتا ہوا اپنے کوارٹر کی طرف بھاگ گیا۔

ندرت اور ثناء بمشکل تمام اپنی ہنسی روکے ہوئے تھیں۔ عارفہ بیگم نے ثناء سے کہا۔

"دیکھ لیا بیٹا تم نے دیکھ لیا۔ اب فیصلہ تم ہی کر لینا کیا کچھ"

"عارفہ پھوپھی! آپ بالکل مطمئن رہیں۔ فیصلہ میں ہی کروں گی لیکن ایک بات سُن لیں۔ کسی کو اس سارے معاملے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے جو کچھ کر دیا وہ کافی ہے۔ اِس سے آگے بس جو کچھ میں کروں اُس کا انتظار کیجئے گا۔ کسی کو اِس بارے میں کچھ نہ بتایئے۔"

"ٹھیک ہے بیٹی۔ مگر اِس موذی کو سزا پوری پوری ملنی چاہئے میری آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے اِس نے۔ ارے جوانی عزت سے گزار دی۔ اب یہ مُردود میرے بڑھاپے پر کالک لگانے چلا ہے۔"

"آپ دیکھتی رہیں پھوپھی کیا حالت بناتی ہوں اُس کی آپ جائیں آرام کریں اور سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔" ثناء نے کہا اور عارفہ بیگم بکتی جھکتی چلی گئیں۔

ثناء اور ندرت پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہی تھیں۔ "مزا آ گیا تھا جمن جی کو عشق کا۔" ثناء نے کہا۔

"اب تنویر کو عارفہ پھوپھی کے تحفظ میں دے دیں گے پھر دیکھتے ہیں اِن جمن جی کا عشق۔"

"کیا مطلب؟" ندرت نے پوچھا۔

"عارفہ پھوپھی کو سمجھانا میرا کام ہے۔ وہ تنویر کی نگہداشت کریں گی تمہارا کیا خیال ہے کیا پھر جمن جُرأت کر سکے گا؟"

"ویری گڈ، اِس کا مطلب ہے کہ ابھی کس آگے چلنے کے اِمکانات ہیں؟"

"کیا کیا جائے بھئی کوٹھی سے نحوست تو دُور کرنی ہی ہے۔" ثناء نے جواب دیا اور ندرت سر ہلانے لگی۔

موسم خشک اور ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کوٹھی کے مکین زندہ دل تھے۔ اور ہر طرح کے موسموں سے لُطف اندوز ہونا جانتے تھے۔ لان پر ڈنر کی تجویز احسان احمد صاحب ہی نے پیش کی تھی اور سب نے اِس پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا چنانچہ روشنیوں کے درمیان میزیں لگائی گئیں۔ اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ رات کا کھانا کھایا گیا۔ اِس دوران خوش گپیاں بھی جاری رہی تھیں۔ کھانے سے

فراغت حاصل کر لی گئی۔ اب یہاں سے اُٹھنے کا ارادہ کون کر سکتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سبھی کو بدمست کر دیا اور اِسی بدمستی کے عالم میں عادل حسین نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا۔

"خواتین و حضرات اور محترمہ اماں بی! مجھے علم نہیں تھا کہ آج جب میں اپنے ذہن میں چھپی ہوئی ایک اہم بات کا انکشاف کرنا چاہتا تھا۔ موسم اِتنا خوشگوار ہو جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ موسم میرے ذہن میں چھپے ہوئے خوشگوار انکشاف کا مظہر ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ سب سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"تقریر کا شوق ابھی تک ختم نہیں ہوا تمہارا۔" احسان احمد نے عادل حسین سے کہا۔

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے جب بھی کبھی موقعہ مل جاتا ہے یہ موقعہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔" عادل حسین ہنستے ہوئے بولے۔

"کیا کہنا چاہتے ہو بیٹے؟" دادی اماں نے سوال کیا۔

"اماں بی آپ لوگوں کو یہ علم ہے کہ اب میں ہمیشہ کیلئے یہاں آ گیا ہوں۔ یہاں میرا دوست، میرا بھائی، میرا سب کچھ احسان احمد موجود ہے اور اب ہم زندگی کے اُن راستوں پر سفر طے کر رہے ہیں۔ جو ڈھلان کہلاتے ہیں۔ میں یہاں آنے کے بعد یہاں قدم جمانے کے لئے بہت سی کارروائیاں کرتا رہا ہوں۔ کاروبار کی داغ بیل بھی ڈال دی ہے میں نے اور خدا کے فضل سے مجھے اِس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ اور یہ یقین ہے کہ میں یہاں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اِس کے ساتھ ہی اماں بی! میں نے ایک مکان کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ ایک کوٹھی خریدی تھی میں نے اور اُس کے انتظامات میں مصروف تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے اب وہاں کی تمام ترتیب مکمل ہو گئی ہے چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اب اپنی اُس کوٹھی میں شفٹ ہو جاؤں اور اِس کے لئے میں نے تمام انتظامات کر لئے ہیں۔ کوٹھی مکمل طور سے تیار ہے، میری خواہش ہے کہ جمعہ کے دن آپ تمام لوگ مجھے اور میرے بیٹوں کو میری کوٹھی میں پہنچا دیں اور رات کا کھانا وہیں کوٹھی میں کھایا جائے۔ اِس سِلسلے میں مَیں آپ سب کو یہاں موجود ایک ایک فرد کو دعوت دیتا ہوں۔ تالیاں۔" عادل حسین نے کہا۔

چند تالیاں اُبھریں لیکن احسان احمد کے چہرے پر غصّے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اُنھوں نے غراتے ہوئے لہجے

میں کہا۔

"کیا موت پڑ رہی تھی تم پر، یہاں سے بھاگنے کی، اور پھر بالا ہی بالا یہ سارا کام کر لیا۔ اماں بی کیا یہ کمینگی نہیں ہے؟ اِس کمینگی پر کوئی تالیاں نہیں بجائے گا۔"

"میں آپ سب لوگوں کو سَرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

"مجھے یہ سَرپرائز منظور نہیں ہے۔" احسان احمد اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔

"ہمیشہ ہی جلتا رہا ہے مجھ سے یہ شخص، دیکھیں اماں بی یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔" عادل حسین نے شکایتی انداز میں کہا۔

"میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔ نہ مجھے تمہاری کوٹھی دیکھنی ہے اور نہ ڈنر پر آنا ہے۔" احسان احمد نے کہا اور اُٹھ کر تیز تیز قدموں سے اندر چلے گئے۔

عادل حسین پریشان نگاہوں سے اُنھیں دیکھتے رہے تھے، پھر وہ بدستور اماں بی سے شکوہ کرتے ہوئے بولے۔

"اماں بی یہ شخص کبھی بالغ ہو گا یا نہیں؟ اب ذرا دیکھئے کیا مجھے یہاں سے جانا نہیں تھا؟"

"نہیں... نہیں بیٹے تمہارا فیصلہ بالکل دُرست ہے۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ سمجھاتی ہوں اُس بیوقوف کو۔" دادی اماں نے کہا اور اُس کے بعد ذکیہ بیگم، دادی اماں اور عادل صاحب تینوں اُٹھ کر اندر چلے گئے۔

احسان احمد اپنے کمرے میں موجود تھے۔

"میں تم سے کہے دے رہا ہوں۔ نکل جاؤ یہاں سے ابھی اور اِسی وقت اپنی کوٹھی میں چلے جاؤ۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" احسان احمد نے کہا۔

"کیا بک بک کئے جا رہا ہے۔ دماغ خراب ہی ہے تیرا تو، کچھ سُنے گا بھی یا اپنی ہی بکے جائے گا۔" دادی اماں نے احسان احمد کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اماں بی آخر یہاں رہ رہے تھے یہ لوگ تو کیا مصیبت آ رہی تھی ان پر جتنا میں لوگوں کو اپنے قریب گھسیٹنے کی کوشش

کرتا ہوں۔ اُتنا ہی لوگ مجھ سے دُور بھاگتے ہیں، نہ جانے کیوں؟" احسان احمد نے کہا۔

"ارے باؤلے ذرا یہ تو سوچ کہ عادل حسین یہاں کیسے رہ سکتے ہیں؛ کیا تیرے ذہن میں بیٹی کا خیال نہیں ہے؟"

"کیا مطلب ہے اِس بات کا؟"

"کیا بیٹی کو زندگی بھر گھر میں بٹھائے رکھے گا۔ اب کچھ کرنا ہے اُس کے لئے یا نہیں کرنا؟"

"اِس معاملے کا بیٹی سے کیا تعلق ہے؟"

"کیوں، کیا خالد سے ثناء کی شادی کرنے کا ارادہ ترک کردیا ہے؟"

"تو پھر کیا لڑکے کو گھر میں بیاہ کر لاؤ گے؛ یہیں کے یہیں شادی کرکے بیٹی کو گھر میں رکھ لوگے؟"

"ایں؟" احسان احمد کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔

"جی ہاں؛ ہم تو اِس کے لئے بھی تیار ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ داماد کو تو آپ گھر میں رکھ لیں گے۔ سمدھی اور داماد کے بھائی کا کیا ہوگا؛ وہ کس حساب میں ہوں گے یہاں؟"

"ہم... مگر اس کی اِتنی جلدی کیا تھی؟" احسان احمد کسی قدر نرم پڑگئے۔

"میرے بھائی تُو تو شادی شُدہ ہے۔ مجھے دیکھ میں کب سے تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں اب چاہتا ہوں کہ بیٹوں کی بہوؤں سے گھر آباد کرلوں تو تُو میرے راستے میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ اماں بی سمجھائیے اِسے۔ اب میرا پارہ بھی چڑھنے والا ہے۔"

"نہیں عادل میاں؛ یہ تو بیوقوف ہے۔ سوچ سمجھ کر بات ہی نہیں کرتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی ہی میں ثناء کا معاملہ بھی طے ہوجائے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ جاؤں۔ احسان احمد دعوت قبول کرو۔"

احسان احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی، پھر اُنھوں نے کہا "یار کاروباری آدمی ہوں۔ گھریلو باریکیوں کا کوئی خیال نہیں رہتا میرے ذہن میں۔ چلو خدا تمھیں مبارک کرے۔ مگر شامیں یہیں گزرا کریں گی تمھاری، مجھ سے یہ تنہائی برداشت نہیں ہوگی۔ کچھ دنوں سے بڑی طبیعت لگنے لگی ہے اور جو واقعات میرے ساتھ پیش آچکے ہیں خدا تمھیں بھی تو ذہن میں رکھو پھر میری ذہنی کیفیت کا تمھیں اندازہ ہوجائے گا۔"

"پگلے ہو تم۔ تمھیں چھوڑے گا کون یار؛ تمھاری وجہ سے تو اِتنی دُور کا سفر طے کرکے یہاں آیا ہوں ورنہ کہیں بھی جاکر آباد ہوجاتا۔ کاروبار کی کسی جگہ کیا کمی تھی؟"

"سوری!" احسان احمد نے کہا اور عادل حسین مسکرانے لگے۔

پھر اُس کے بعد دیر تک کوٹھی کے سلسلے میں صلاح مشورے ہوتے رہے۔ عادل حسین نے احسان احمد سے کہا کہ وہ جمعہ کے دن ہی اُنھیں کوٹھی دِکھائیں گے۔ ہاں سارے لڑکے اُدھار چاہئیں اور ملازمین بھی۔ چنانچہ تیاریاں شروع ہوگئیں، عادل حسین اختر، خالد، اقبال، جمن، غلام احمد اور ابراہیم صمدانی کو لے کر دوسرے ہی دِن چلے گئے تھے، تیسرے دِن جمعہ تھا۔ دوسرے دِن یہ تمام لوگ کوٹھی میں تیاریاں کرتے رہے اور اُس کے بعد چند افراد کوٹھی واپس آگئے۔ عادل حسین اُس رات کوٹھی ہی میں رُک گئے تھے تاکہ دوسرے دِن کے انتظامات کرسکیں۔ دوسرے دِن وقت مقررہ پر بہت سی گاڑیاں اِس کوٹھی کی جانب چل دیں۔ جو عادل حسین کی تھی۔ عادل حسین، اختر اور خالد بھی اُن لوگوں کے ساتھ ہی تھے۔ اور اُس کے بعد یہ سب کوٹھی پہنچ گئے۔ احسان احمد نے کوٹھی کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"یہ کہو نا بیٹا اِس خوف کا شکار تھے کہ کہیں میں کوئی گڑبڑ نہ کردوں۔ شاندار کوئی جھولی ہے۔ دِلی مبارکباد۔"

"بھائی تمھارے دوست کی کوٹھی نہیں ہے یہ بلکہ تمھاری بیٹی کی ہے یُوں سمجھ لو۔"

"نہیں عادل حسین ثناء تمھاری بیٹی ہے۔ میری کہاں سے ہُوئی۔" احسان احمد نے کسی قدر افسُردہ لہجے میں کہا۔

"اب فضُول باتوں سے گریز کرو۔ چلو ذرا ایک جائزہ لے لیا جائے کوٹھی کا۔" اور اُس کے بعد تمام کے تمام لوگ کوٹھی میں کُلیلیں کرتے پھر رہے تھے۔ ثناء، رُدا، نُدرت تمام ہی لوگ پُوری طرح تیار ہوکر آئے تھے، کوٹھی بِلاشبہ بہت خوبصورت تھی اور سبھی کو پسند آئی تھی۔ دو تین بار ثناء نے نُدرت اور نُدرت نے ثناء کو آنکھ ماری۔ مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ اِس کوٹھی سے اجنبی نہیں ہیں لیکن دونوں ہی محتاط رہی تھیں۔ رُدا بھی مسکراتی نگاہوں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی اور اُس کی تعریف کررہی تھی۔ ثناء کو ایک دو بار خالد کے حوالے سے چھیڑنے کی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن ثناء بھلا ایسی کہاں تھی۔ کہ کسی چھیڑ سے شرمسار ہوجاتی۔ شام ہوگئی۔ وسیع وعریض لان مہمانوں کی نشستوں کیلئے مخصوص کردیا گیا تھا۔ عادل حسین صاحب نے شہر کے بہت سے معززین کو مدعو کیا تھا۔ کوٹھی بُقعۂ نُور بنی ہُوئی تھی اور چاروں

طرف جھلملاہٹیں نظر آرہی تھیں۔ مہمانوں کی کاریں آنا شروع ہوگئیں۔ شہر کے تقریباً تمام ہی معززین مدعو تھے۔ اور اُن کی بیگمات اور دوسرے اہلِ خانہ بھی اُن کے ساتھ تھے زبردست تقریب ہوگئی تھی۔ کوٹھی زرق برق لباسوں اور حسین قہقہوں سے جگمگا رہی تھی۔ ثناء، رُدا، نُدرت، عصمت، تنویر، اور دوسری تمام لڑکیوں نے اپنے بہترین لباس پہنے تھے ثناء نے رُدا کا میک اَپ خود کیا تھا اور رُدا درحقیقت اِس وقت بھی ہمیشہ کی مانند آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ اِتنی حسین، اِتنی دِلکش کہ جس کی نِگاہ اُٹھ رہی تھی اُسی کی جانب اُٹھ رہی تھی اور بہت سی بیگمات اُس کے بارے میں کانا پھوسیاں کررہی تھیں غرض چاروں طرف خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ دفعتاً ہی رُدا کی نِگاہ ایک سمت اُٹھ گئی۔ دوسرے لمحے اُس کے ذہن میں دھماکہ سا ہُوا۔ اُس نے ایک سفید رنگ کی خوبصورت کار سے تصوّر بیگ کو اُترتے دیکھا تھا۔ نیلے رنگ کے حسین تراش کے سُوٹ میں وہ بِلاشُبہ قیامت نظر آرہا تھا۔ اِتنا دِلکش، اِتنا اسمارٹ کہ ایک دفعہ نِگاہ پڑجائے تو ہٹائے نہ ہٹائی جاسکے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک جاہل دیہاتی تیر دین ہے۔ رُدا کھو سی گئی۔ وہ ماحول کو بھول کر تصوّر بیگ کو دیکھتی رہی تھی۔ خوش بختی تھی کہ ثناء اور نُدرت وغیرہ اِس وقت قریب موجود نہ تھیں ورنہ رُدا کی اِس محویت پر ضرور چونک پڑتیں، اختر نے آگے بڑھ کر تصوّر بیگ کا استقبال کیا تھا اور دونوں کسی بات پر ہنستے ہُوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ رُدا کا دِل بُری طرح دھڑکا اور اپنے دِل کی اِس دھڑکن پر وہ ایک دم چونک پڑی۔ اُس نے سنبھل کر رُخ تبدیل کرلیا تھا۔ تصوّر بھی دوسرے مہمانوں میں گُم ہوگیا۔ تقریباً تمام ہی مہمان آچکے تھے اور ٹولیاں بنائے ایک دوسرے سے خوش گپیاں کررہے تھے۔ ایک گوشے میں محمود علی آفندی عادل حسین، احسان احمد اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہُوئے تھے۔ اُنھوں نے بھی اِس کوٹھی کی بڑی تعریف کی تھی۔ کاروباری آدمی تھے۔ حالانکہ احسان احمد سے اُن کی کچھ عرصے چل چکی تھی لیکن کاروبار اور سیاست ایک جیسی چیز ہوتی ہے۔ جو کیا کیا۔ بعد میں بھول گئے۔ اُن کی نگاہیں دوسرے مہمانوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لیکن دفعتاً ہی محمود علی آفندی صاحب بُری طرح اپنی کرسی سے اُٹھنے کی کوشش میں لڑکھڑا گئے تھے۔ عادل حسین اور احسان احمد نے اُنھیں سہارا دیا تھا اچانک ہی آفندی صاحب کی اِس کیفیت پر وہ حیران رہ گئے تھے۔ آفندی صاحب کے مُنہ سے نکل رہا تھا۔

"ارے... ارے... ارے"

"کیا بات ہے آفندی صاحب؛ خیریت؟" احسان احمد صاحب نے گھبرائے ہُوئے انداز میں پُوچھا۔

"وہ... وہ کون ہے... وہ لڑکی... وہ؟" آفندی صاحب ایک طرف اُنگلی اُٹھائے کہہ رہے تھے۔

سب کی نِگاہیں اُس طرف گھوم گئیں آفندی صاحب کا اشارہ رُدا کی جانب تھا۔

"کیا وہ... کیا وہ رُدا ہے؟" آفندی صاحب کے مُنہ سے رُندھی ہُوئی آواز نِکلی۔

"ہاں وہ رُدا ہی ہے۔ کیا آپ اُسے جانتے ہیں؟"

"وہ۔ وہ رُدا ہی ہے نا؟" آفندی صاحب کا گلوگیر لہجہ اُبھرا اور وہ بے جان سے قدموں سے بیٹھ گئے۔ اُن کی اِس کیفیت پر سبھی ششدر رہ گئے تھے۔ احسان احمد اور عادل حسین پریشان تھے۔

"وہ رُدا ہی ہے آفندی صاحب؛ آپ اُسے کیسے جانتے ہیں اور اُسے دیکھ کر آپ کی حالت کیوں بگڑ گئی؟"

"میں اُس سے مِلنا چاہتا ہُوں۔ کیا مجھے اُس سے مِلنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟"

"ہاں... ہاں کیوں نہیں۔ ابھی بلاتا ہُوں میں اُسے مگر براہِ کرم آپ اپنی حالت سنبھالیں چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ اور بدن کانپ رہا ہے۔ کہیں طبیعت زیادہ خراب نہ ہوجائے؟" عادل حسین نے اُن کا شانہ تھپتھپاتے ہُوئے کہا۔

آفندی صاحب آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کسی شناسا کو دیکھ کر حیرت تو بے شک ہوتی ہے۔ کسی ایسی شخصیت کو جسے بہت عرصے کے بعد دیکھا ہو لیکن اُسے دیکھنے کے بعد یہ کیفیت ہوجانا سب کے لئے باعثِ تعجب تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عادل حسین اور احسان احمد کسی قدر گھبرا گئے تھے۔ آفندی صاحب خاصے معمر آدمی تھے اور جو کیفیت اُن کی ہوگئی تھی اُسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کہیں حالت اور نہ بگڑ جائے چنانچہ اُنھوں نے اُنھیں بازوؤں سے سہارا دیا اور اندر لے چلے۔

"کہاں... کہاں لے جارہے ہو مجھے؛ کیا اُس کے پاس؟"

"اندر چلئے آفندی صاحب، [illegible] کہ وہیں

آپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا" احسان احمد نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

آفندی صاحب لرزتے قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ عادل حسین اُنھیں اپنے ڈرائینگ رُوم میں لے گئے ایئرکنڈیشنر کھول دیا گیا اور آفندی صاحب کو پانی وغیرہ پلایا گیا۔

"کہیں وہ... کہیں وہ چلی نہ جائے۔ اُسے بُلاؤ۔ خُدا کے لئے اُسے بُلاؤ"

"وہ کہیں نہیں جائے گی آفندی صاحب! میرے پاس رہتی ہے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اُسے آپ کے پاس پیش کئے دیتا ہُوں"

"تت... تمہارے پاس رہتی ہے؟" آفندی صاحب نے حیرت سے احسان احمد کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ہاں وہ بہت عرصے سے میرے پاس ہے، مجھے تعجب ہے آخر آپ اُسے کیسے جانتے ہیں؟ چلئے جانتے بھی تو آپ کی یہ کیفیت...؟"

"آہ! مجھے اُس سے مِلا دو۔ مَیں... مَیں اُس سے ملنے کے لئے نہ جانے کب سے تڑپ رہا ہُوں۔ جانے کب سے وہ میرے سینے میں ایک گہرا زخم بنی ہُوئی ہے۔ آہ! پلیز دیکھو اگر اُس نے مجھے دیکھ لیا تو کہیں وہ چلی نہ جائے"

"آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ میں ابھی اُسے بُلاتا ہُوں۔ بس ذرا آپ اپنی حالت سنبھال لیں"

"وہ میرے پاس آجائے گی تو میری حالت خود بخود بہتر ہو جائے گی" آفندی صاحب نے جواب دیا۔

"اچھا میں جاتا ہُوں" احسان احمد بولے۔

عادل صاحب نے اُن سے کہا کہ وہ آفندی صاحب کا خیال رکھیں گے۔ جاتے ہُوئے آفندی صاحب نے احسان احمد سے کہا۔

"براہِ کرم... براہِ کرم اُسے کچھ مت بتانا اُسے کچھ مت بتانا ورنہ وہ نہیں آئے گی"

احسان احمد نے شانے ہلائے اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ عادل حسین بدستور آفندی صاحب کو تسلّیاں دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری جانب رُدا کی نگاہ شاید آفندی صاحب پر نہیں پڑی تھی۔ کیونکہ آفندی صاحب نے جِس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ اگر اُس نے اُنھیں دیکھ لیا ہے تو کہیں وہ یہاں سے چلی نہ جائے۔ رُدا نے شاید آفندی صاحب کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ تو تصوّر بیگ میں گُم تھی۔ اُسی وقت ثناء نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور رُدا چونک پڑی۔

"یہ تمہاری تنہائی پسندی بس کیا بتاؤں، دِل چاہتا ہے کہ... کہ..."

"ہاں... ہاں بولو کیا دِل چاہتا ہے؟"

"فی الحال جو دِل چاہ رہا ہے وہ کر نہیں سکتی۔ بِلاوجہ دوسروں کی محفل خراب ہو گی۔ آؤ میرے ساتھ آؤ"

"دوسروں کی محفل...؟" رُدا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"مطلب کیا ہے؟ آج آپ بھی بول رہی ہیں"

"ہاں بھئی کیوں نہ بولوں گی؟ یہ محفل تمہاری ہے۔ دوسروں کی کہاں سے آئی؟"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ نمٹ لیں گے آپ سے بھی مِس رُدا" ثناء نے کہا اور رُدا کو گھسیٹتی ہُوئی دوسروں کے درمیان لے گئی۔

کبھی کبھی مِلنے والی کئی شناسا وہاں موجود تھیں۔ نُدرت، عِصمت اور دوسرے لوگ بھی اُن کے ساتھ شامِل تھے۔ دفعتاً ہی نُدرت نے ثناء کا شانہ تھپتھپایا اور اُسے ایک دم پیچھے ہٹاتے ہُوئے بولی۔

"ذرا اِدھر آؤ"

"ہُوں! کہو سُوجھی کچھ؟" ثناء نے شرارت آمیز نگاہوں سے نُدرت کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"وہ دیکھو... وہ تصوّر بیگ صاحب ہی ہیں نا؟"

"کہاں؟" ثناء نے شاید ابھی تک تصوّر بیگ کو نہیں دیکھا تھا۔

"وہ... وہ... وہ دیکھو کیا قیامت ڈھائی جا رہی ہے"

"اوہ! واقعی... واقعی یقیناً وہی ہے۔ اِس کا مطلب ہے ظاہر ہے اختر نے اُسے بھی مدعو کیا ہو گا"

"بغیر مدعو کئے ہُوئے وہ یہاں کسی تفتیش کے سلسلے میں تو نہیں پہنچا ہو گا" نُدرت نے کہا۔

"ارے کمال ہے ہم سے کتنا دُور دُور پھر رہا ہے یہ شخص۔ بُلاؤ بھئی اُسے بُلاؤ"

"میں بُلاؤں...؟"

"میں بُلائے لیتی ہُوں" ثناء نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ کر تصوّر بیگ کے پاس پہنچ گئی۔

"آداب عرض کرتی ہُوں جناب" اُس نے کہا۔

"عرض کیجئے... عرض کیجئے" تصوّر بیگ نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"دیکھیئے جناب یہ چرب زبانی اور چالاکی ہم لوگوں کو ذرا پسند نہیں آتی اور اِس وقت آپ وردی میں نہیں ہیں۔ اِس لئے ہمیں اپنے احترام پر مجبور بھی نہیں کر سکتے"

"ہرگز نہیں، کون بدبخت چاہتا ہے۔ کہ آپ اُس کا احترام کریں؟"

"اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ سے دوستانہ انداز میں پیش آئیں تو دوستوں کی طرح ہمارے درمیاں آکر شریک ہوں"

"حاضر ہُوں۔ میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے کچھ توجہ ملے تو آپ لوگوں کے پاس پہنچوں"

"جی ہاں آپ کو توجہ مِل رہی ہے، آئیے" ثناء نے ہاتھ آگے کرتے ہُوئے کہا اور تصوّر بیگ اُس کے ہاتھ کے سہارے اُن لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔

"یہ لیجئے آپ کا مُجرم حاضر ہے"

"ارے ارے کیا کہہ رہی ہیں ثناء؟ کیا کہہ رہی ہیں؟" اختر نے جلدی سے کہا۔

"کہنے دو بھائی... کہنے دو۔ کبھی کبھی ہماری بھی بے عزّتی ہونی چاہئیے۔ آخر ہم دوسروں کی بے عزّتی کرتے ہی رہتے ہیں..." تصوّر بیگ نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"یعنی آپ اِسے بے عزّتی سمجھتے ہیں؟ بھئی میں نے تو آپ ہی کی زبان میں گفتگو کی تھی"

"جی ہاں... جی ہاں بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ہم آپ کے مُجرم ہیں۔ حاضر ہیں۔ فرمائیے اِس جرم کی کیا سزا دی جائے گی ہمیں؟"

"اِس کا فیصلہ عدالت کرے گی" ثناء نے جواب دیا۔

"خُدا کی پناہ کیا یہاں بھی ہمارے لئے عدالت لگ چکی ہے؟ ایک دِن تو اِس عدالت میں ایسے جا پھنسے تھے کہ بس چھٹی کا دُودھ ہی یاد آگیا۔ جو بھی آ رہا تھا ہمارے سر پر ایک دھول جمانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ وہ خاتون جنھوں نے ہمیں خیر دین بنا دیا تھا۔ اور ہم سے تعویز مانگ رہی تھیں"

"آپ ہیں ہی اِس قابل" ثناء نے تصوّر بیگ کو گھونسہ دکھاتے ہُوئے کہا۔

"ثناء بھئی..." اختر نے پھر ثناء کو ٹوکا۔

"بھئی آپ کہنے دیجئے اِنھیں، بے تکلفی کے اِس ماحول میں آپ ہماری شرکت پسند نہیں کرتے شاید" تصوّر بیگ نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور پھر رُدا کی طرف دیکھنے لگا۔ رُدا خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"خاتون آپ کا تعارف تو شاید مُجھ سے کرایا گیا تھا لیکن۔ لیکن" تصوّر بیگ نے براہِ راست رُدا کو مخاطب کر کے کہا اور رُدا گھبرا سی گئی۔

اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، دفعتاً انھیں احسان احمد اپنی طرف بڑھتے ہُوئے نظر آئے اور وہ سب سنبھل گئے۔

"ہیلو!" احسان احمد نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ اور پھر آہستہ سے رُدا سے بولے: "رُدا بیٹے آپ سے ایک کام ہے ذرا آئیے"

رُدا کی جان بخشی ہو گئی تھی۔ وہ بڑی خوشی سے احسان احمد کے ساتھ بڑھ گئی۔

"جی انکل فرمائیے"

"آؤ ذرا اندر آؤ" احسان احمد بولے۔

آفندی صاحب نے اُنھیں منع کر دیا تھا کہ رُدا کو اِس سلسلے میں کچھ نہ بتایا جائے چنانچہ انھوں نے رُدا سے آفندی صاحب کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ رُدا خاموشی سے اُن کے ساتھ ڈرائینگ رُوم میں داخل ہو گئی تھی عادل حسین اُن کے پاس بیٹھے ہُوئے تھے۔ رُدا نے کمرے میں قدم رکھا ایک لمحے کے لئے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ پھر اُس کی نگاہ عادل حسین کے ساتھ بیٹھے ہُوئے شخص پر پڑی اور دفعتاً ہی اُس کا چہرہ پتھرا گیا۔ اُس کے قدم رُک گئے۔ ایک لمحے میں اُس پر نہ جانے کیا کیا کیفیتیں بیت گئی تھیں عادل حسین صاحب بھی چالاک تھے اور احسان احمد بھی آفندی صاحب کی کیفیت تو یہ دونوں دیکھ ہی چکے تھے۔ لیکن اب اُن کی تیز نگاہیں رُدا کے چہرے پر جمی ہُوئی تھیں اور اُنھوں نے رُدا کی بدلتی ہُوئی کیفیت اور اُس کا سارا انداز بخوبی نوٹ کیا تھا تاہم یہ فیصلہ کرنا اُن کے لئے مشکل تھا کہ یہ چکر کیا ہے؟ رُدا چند لمحات کے لئے تو بالکل معطّل سی ہو گئی تھی لیکن پھر اُس نے اپنی زبردست اعصابی قوتوں کے ذریعے خود کو سنبھالا اور احسان احمد کی طرف دیکھ کر بولی۔

"جی انکل!"

احسان احمد نے اُس کا لہجہ بھی پتھرایا سا محسوس کیا تھا۔

اُس لہجے میں چٹانوں جیسی سختی بھی تھی اور ناخوشگوار کیفیت بھی۔

"آگے آؤ رُدا" احسان احمد کسی قدر پُر رُعب لہجے میں بولے اور رُدا چند قدم آگے بڑھ آئی۔ لیکن یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے قدم مَن مَن بھر کے ہو رہے ہوں۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوششوں میں مصرُوف تھی اور چند ہی لمحات کے بعد وہ اُس میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

"جی انکل؟" اُس نے اُسی سرد لہجے میں کہا۔

آفندی صاحب خاموشی سے رُدا کی صُورت دیکھ رہے تھے، اُن کے چہرے پر کرب کے آثار اُبھر آئے تھے اُنھوں نے سہارا لے کر اُٹھنے کی کوشش کی اور پھر آہستہ سے بولے۔

"رُدا... رُدا بیٹی"

"کون ہیں آپ؟" رُدا کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔

"رُدا میں آفندی ہُوں۔ محمود آفندی ہُوں میں۔"

"جی میرے لائق کیا خدمت ہے؟" رُدا نے بھاری لہجے میں کہا۔

"مجھے معاف نہیں کرو گی بیٹی... مجھے معاف نہیں کرو گی؟"

"میں سمجھی نہیں۔ کیا مجھے سمجھایا جائے گا؟" رُدا نے اِس بار احسان احمد کو گھورتے ہُوئے کہا اور احسان احمد نے اُس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندتی محسوس کیں۔ وہ اِس سوال پر چکرا سے گئے اُنھوں نے آفندی صاحب کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"آفندی صاحب آپ جانتے ہیں کہ مجھے آپ دونوں کے درمیان شناسائی نہیں معلوم۔ میں اِس سلسلے میں.."

لیکن آفندی صاحب نے احسان احمد کی طرف رُخ نہیں کیا تھا۔ وہ سہارا لے کر اُٹھ کھڑے ہُوئے اور دو قدم آگے بڑھ کر بولے۔

"مجھے معاف نہیں کرو گی رُدا؟"

"میں نہیں جانتی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"مجھے پہچانو گی بھی نہیں؟"

"میں آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہُوں۔ کون ہیں آپ؟" رُدا نے بدستور غرّاتے ہُوئے انداز میں کہا۔

"مجھے معاف نہیں کرو گی رُدا، مجھے معاف نہیں کرو گی؟"

"میں پُوچھتی ہُوں آپ کون ہیں، میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"رُدا بیٹی ایک بار صرف ایک بار۔ صرف ایک بار اِس زخم کو بھر جانے دو۔ رُدا میں... میں بُوڑھا ہو کر تم سے معافی مانگ رہا ہُوں۔"

"میں اِس ڈرامے کا مقصد نہیں سمجھی احسان احمد صاحب اور نہ ہی میں اِس ڈرامے میں کوئی کردار ادا کرنا چاہتی ہُوں مجھے آپ" رُدا نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہُوئی باہر نکل گئی۔

احسان احمد اور عادل حسین ساکت رہ گئے تھے، آفندی صاحب چند قدم آگے بڑھے اور پھر رُک گئے۔ ایک بار پھر وہ گرنے لگے تھے۔ لیکن اُنھیں جلدی سے سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ آفندی صاحب پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے تھے اُن کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور عادل حسین اور احسان احمد ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں کی ذہنی حالت بھی خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی ایک بات جو سمجھ میں آ رہی ہو۔ آفندی صاحب کو وہ دونوں سنبھالنے کی کوشش بھی کر رہے تھے اور خود پریشان بھی تھے۔ لیکن آفندی صاحب کی ہچکیاں روکے نہ رُک رہی تھیں۔ وہ بچّوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہے تھے۔ ایک بار پھر اُنھیں پانی پلایا گیا اور وہ بھرّائے ہُوئے لہجے میں بولے۔

"تم... میں آپ لوگوں سے معافی چاہتا ہُوں۔ اِس خوشی کے موقع پر میں نے آپ کی محفل خراب کی۔ براہِ کرم... براہِ کرم، اگر آپ کی اجازت ہو تو میں یہاں تھوڑی دیر تک رُکنا چاہتا ہُوں۔ آپ لوگ باہر چلے جائیے۔ اپنے پروگرام میں شرکت کیجئے۔ میں آپ سے شرمسار ہُوں بے حد شرمسار..." وہ آنسوؤں کو خشک کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن اُن کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں آفندی صاحب ہم آپ کے دوست ہیں۔ آپ کے ساتھی ہیں۔ اور جہاں تک رُدا کا معاملہ ہے آپ اُس کے لئے بھی بالکل مطمئن رہیں۔"

آفندی صاحب نے نگاہیں اُٹھا کر احسان احمد کو دیکھا پھر آہستہ سے بولے۔

"وہ... وہ کب سے تمھارے پاس ہے؟"

"کافی عرصہ ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ہی رہتی ہے مگر وہ کون ہے؟ آخر وہ کون ہے؟"

"کیا بتاؤں... کیا بتاؤں؟" آفندی صاحب کی سسکیاں نکل گئیں، پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ میرا مطلب ہے... وہ..."

"ہاں آفندی صاحب میں آپ کو بتا چکا ہُوں وہ کافی

عرصے میرے ساتھ رہتی ہے۔ میری فرم کی جنرل مینیجر ہے۔ میرے ساتھ میری بیٹیوں کی مانند رہتی ہے۔ میری بچی سے بہت مانوس ہے۔ گھر کے تمام لوگ اُس سے محبت کرتے ہیں۔"

"اور... اور اُس کے ساتھ.. اُس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ہاں ایک بچہ تیمور جسے وہ اپنا بچہ بتاتی ہے۔ لیکن اِس سے زیادہ اُس سے اُس کے بارے میں کچھ نہیں پُوچھا گیا۔"

"وہ آپ تک کیسے پہنچی احسان احمد؟" آفندی صاحب نے رُندھے ہُوئے لہجے میں پُوچھا۔

"میں تو تفصیل نہیں جانتا۔ شناء اِس بارے میں آپ کو بتا سکتی ہے۔ ویسے جہاں تک میں نے سُنا ہے وہ یہی ہے کہ شناء کو ریلوے اسٹیشن پر ملی تھی بچّے کو لے کر ٹرین سے اُتری تھی غالباً لاہور سے آئی تھی۔ اور شناء اُسے اپنی دوست بنا کر گھر لے آئی۔ بہت ہی غیور اور نفیس طبیعت کی بچّی ہے۔ ہمارا احسان لینا پسند نہیں کرتی۔ بمشکل تمام میری فرم میں جنرل مینیجر کی پوسٹ پر کام کرنے کے لئے تیار ہُوئی ہے۔ اِس سے پہلے ایک اور فرم میں کام کرتی رہی ہے۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں۔ آفندی صاحب جو آپ کو بتائی جا سکتی ہیں لیکن ہم آپ کی کیفیت پر حیران ہیں۔ آخر اُس کے اور آپ کے درمیان کیا ربط ہے اور ایسی کون سی بات ہے جس کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہو گئی؟"

"آہ! میں... میں شاید میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں اُس وقت تک کچھ نہیں بتا سکتا جب تک وہ خود اِس بارے میں نہ بتائے۔ آپ... آپ احسان احمد میرے بھائی عادل حسین خُدا کے لئے میری مدد کرو۔ اُس سے پُوچھو۔ میرے بارے میں پُوچھو۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک بار پھر اُسے میری جارحیت کا احساس ہو اور وہ یہ سوچے کہ میں نے اُس کی بسی بسائی دنیا پھر سے برباد کر دی۔ اُس سے پُوچھو میرے دوست اُس سے پُوچھو میری حالت بگڑ رہی ہے۔ میں تمھارا بے حد احسان مند ہُوں گا۔ اگر تم مجھے میرے گھر بھجوانے کا بندوبست کر دو۔"

"ہم تو چاہتے تھے کہ آپ آرام کریں اور یہیں رہیں۔ بہرطور اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو میں اُس کے لئے بندوبست کئے دیتا ہُوں۔" احسان احمد نے کہا اور باہر نکل آئے اُنھوں نے فوری طور پر آفندی صاحب کی گاڑی کے ڈرائیور کو طلب کیا۔ اور اُس کو آفندی صاحب کے حکم کے بارے میں بتایا تھوڑی دیر کے بعد آفندی صاحب کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اِس دوران احسان احمد اور عادل حسین نے رُدا کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ بیچارے حیران تھے ویسے دوسرے لوگوں کو اِس بارے میں کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ محفل کا رنگ جُوں کا تُوں تھا۔ چاروں طرف حسین قہقہے کھنک رہے تھے اور لوگ اپنی اپنی تفریحات میں مشغول تھے۔ رُدا پتہ نہیں کیا سوچ رہی تھی، کیا کر رہی تھی؟ آفندی صاحب چلے گئے تو وہ دونوں بھی آ کر دوسرے لوگوں میں شامل ہو گئے دونوں ہی کی نگاہیں رُدا کو تلاش کر رہی تھیں اور رُدا آ گئیں لڑکیوں کے درمیان نظر آ گئی۔ سب لوگوں سے گفتگو بھی ہو رہی تھی، بہت ساری باتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اُن کی نظریں رُدا پر ہی لگی ہُوئی تھیں۔ آخر رُدا کا آفندی صاحب سے کیا رشتہ ہے، اور آفندی صاحب کی یہ کیفیت کیوں ہو رہی تھی؟ رُدا کا انداز اِس قدر جارحانہ کیوں تھا، موقعہ ملتے ہی احسان احمد نے عادل حسین سے کہا۔

"یہ تو بہت ہی نفیس اور نرم مزاج بچّی ہے، اُس کے اندر ذرا برابر رعونت نہیں ہے لیکن اِس وقت... اِس وقت اُس کا رویّہ، یا تم نے محسوس کیا تھا کہ وہ انتہائی سخت لہجے میں گفتگو کر رہی ہے؟"

"ہاں اُس کے اندر بھی ہیجانی سی کیفیت تھی۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا بھائی۔ ویسے آفندی صاحب مجموعی طور پر بُرے آدمی نہیں ہیں لیکن رُدا... یہ لڑکی اب تو ذرا اِس کا جغرافیہ مجھے بھی معلوم کرنا پڑے گا۔" عادل حسین بولے۔

"میں سوچ رہا ہُوں کہ رُدا کے اور آفندی صاحب کے درمیان کے رشتے کو کیسے معلوم کروں؟"

"رُدا سے گفتگو کریں۔"

"بھئی اُس کا جو انداز ہے اُس سے مجھے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا ہے۔ میرے ادارے کی ایک سرگرم رُکن ہے۔ اور اُس کی وجہ سے مجھے جتنی آسانیاں حاصل ہُوئی ہیں عادل حسین! میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"یقیناً ذہین اور سمجھدار بچّی ہے حالانکہ میں نے خصُوصی طور پر اُس کی جانب کبھی توجہ نہیں دی لیکن سرسری نگاہ سے جتنا بھی اُسے دیکھا ہے اُس میں مجھے یہ احساس ہُوا ہے کہ بہت ہی نفاست پسند اور نفیس طبیعت کی مالک ہے۔"

"ہاں میرا خیال ہے ثناء اِس سلسلے میں کچھ کر سکے گی۔"

"ثناء...؟"

"ہاں، ...ہے وہ اُس کی گہری دوست ہے۔ حالانکہ جہاں تک میرے علم میں ہے کسی کو بھی اُس کی اصل شخصیت کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ لیکن آفندی صاحب... دیکھو بھئی کیا ہوتا ہے، اوہو! وہ طارق صاحب اشارہ کر رہے ہیں، آیئے ذرا دیکھتے ہیں۔" احسان احمد نے اپنے ایک دوست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دونوں اُن کی جانب چل پڑے۔

*

بیرونی مہمان تو بارہ ساڑھے بارہ بجے تک واپس چلے گئے تھے لیکن باقی لوگوں کو رُکنا پڑا۔ عادل حسین صاحب نے تو پیش کش کی تھی کہ رات کو یہیں رُک جایا جائے، لیکن کچھ اُصولوں کی بنیاد پر یہ مناسب نہیں تھا چنانچہ تقریباً ڈھائی بجے اِس قافلے کی کوٹھی واپسی ہُوئی احسان احمد کا ذہن اب بھی رُدا میں اُلجھا ہُوا تھا حالانکہ اِس سے پہلے اُنھوں نے اُسے صرف ایک بچّی کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ جنرل مینجر کی پوزیشن میں جب سے اُس نے احسان احمد کے دفتر کا کاروبار سنبھالا تھا احسان احمد اُس کی انتظامی صلاحیتوں کے بھی قائل ہوگئے تھے۔ اور کاروباری صلاحیتوں کو بھی سراہتے تھے لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ہی اُن کے ذہن میں یہ جذبہ بھی موجود تھا یعنی یہ کہ رُدا ثناء کی دوست ہے اور اُن کی بچیوں کی مانند ہے، کبھی کسی مسئلے میں احسان احمد صاحب نے رُدا سے تیز لہجے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور رُدا بھی اُن کے ساتھ نہایت مؤدبانہ انداز میں پیش آتی تھی، رات کو نہ جانے کب تک وہ رُدا کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ بہرطور دوسری صبح وہ اپنے معمولات میں مصروف ہوگئے۔ آفندی صاحب کا مسئلہ ذہن سے نکلا نہیں تھا۔ لیکن وہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ اِس سلسلے میں رُدا سے کس طرح بات کریں۔ بہرطور سارے معاملات اُنھوں نے بعد کے لئے چھوڑ دیئے تھے۔ وقت مقررہ پر وہ آفس چل پڑے۔ رُدا شاید اُن سے پہلے دفتر چلی گئی تھی۔ ثناء اور نُدرت بھی اپنے اپنے طور پر کوٹھی میں مصروف تھیں۔ دن کو دس بجے دونوں کی فرصت سے ملاقات ہُوئی تو ثناء نُدرت کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

"کیوں دانت کیوں نکل رہے ہیں؟ میں محسوس کر رہی ہُوں کہ جب سے تم وہاں سے واپس آئی ہو مسلسل خوش ہو۔"

"اور تو...؟" ثناء نے نُدرت کو گھورتے ہُوئے کہا۔

"بھلا میرا اِن باتوں سے کیا تعلق؟"

"ہُوں! یہ تمھاری عورتوں والی فطرت یعنی یہ کہ اب میں تعلق کا تذکرہ کروں اور تیرے سامنے وہ خوبصورت گفتگو شروع ہوجائے جس کی تو متمنی ہے۔"

"تو حرج بھی کیا ہے اِس میں؟ تیرا بھی تو فائدہ ہے مالک کی بیٹی۔"

"ارے چھوڑ یار نفع نُقصان کو۔ یار ویسے کچھ بوریت کا احساس نہیں ہو رہا؟"

"یقیناً ہو رہا ہوگا... یقیناً ہو رہا ہوگا، بھئی ہم میں اور ثناء میں بس یہی فرق ہے۔"

"کیا فرق ہے؟"

"یہ کہ ہم ہر طرح کے جذبات کا اظہار صاف انداز میں کر دیا کرتے ہیں اور محترمہ اپنی مزاحیہ فطرت کا مظاہرہ کرکے ہر بات کو اُس میں گھول لیتی ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"یہ سو فیصد سچ ہے، جب خالد صاحب یہاں تھے تو محترمہ ثناء اُن سے مسلسل بیزاری کا مظاہرہ کرتی رہتی تھیں، کبھی خالد صاحب کو کوئی فوقیت نہیں دی جاتی تھی۔ عام انداز میں اُن سے پیش آیا جاتا تھا اور کبھی یہ نہیں ہُوا کہ اُن کی پذیرائی کی گئی ہو۔"

"میں چھچھورپن پسند نہیں کرتی۔"

"جی ہاں... خیال اور اِس وقت کیا ہو رہا ہے؟"

"نُدرت زبان سنبھال کر بات کر، جو کچھ ہو رہا ہے تیرے سامنے ہی تو ہو رہا ہے۔ کسی اور سے تو نہیں کہا میں نے کہ کوٹھی میں میرا دل نہیں لگ رہا۔"

"ہائے... ہائے... ہائے یہ تو مجھ سے بھی نہیں کہا تم نے کہ کوٹھی میں تمھارا دل نہیں لگ رہا۔ دل نہ لگنے کی وجہ کیا ہے؟"

"خالد کا نام لُوں یا اختر کا؟" ثناء نے کہا۔

"اختر کا نام لے کر دیکھ زبان باہر نکال کر رکھ دُوں گی تیری۔" نُدرت نے کہا اور ثناء ہنسنے لگی پھر بولی۔

"یار واقعی بوریت ہو رہی ہے اُن دونوں کے چلے جانے سے، ممتن اور تنویر کا سلسلہ بھی زیادہ نہیں چل سکا، طفیلی خالہ اور عارفہ پھوپھی آج کل دوست بن گئی ہیں۔ کوئی بھی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کے تحت کام کیا جا سکے۔ میں کہتی ہُوں ہوگا کیا؟"

"شادی ہوگی رُخصتی ہو جائے گی اور اُس کے بعد میری شامت آجائے گی۔"

"ایک بات سُن لے اگر یہ وعدہ لینا چاہتی ہے کہ اپنی شادی کے بعد میں جلد ہی تمھیں بلا لُوں گی تو چل وعدہ کر لیتے ہیں۔ یار اکیلے تو کسی سے رہا بھی نہیں جائے گا، پتہ نہیں یہ سارے جھنجھٹ کیا ہوتے ہیں شادی... اپنا گھر چھوڑ دینا دوسروں کا محکوم ہوجانا۔ مجھے تو بعض اوقات اِن تمام چیزوں سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ انسان کس خوشی سے اپنے آپ کو دوسروں کی غلامی میں دے دیتا ہے اور بلاوجہ نہ کوئی فائدہ، نہ حاصل۔"

"خیر حاصل تو بہت کچھ ہے۔" نُدرت نے کہا۔

"بکواس سو فیصدی بکواس۔ کاش یہ سب کچھ اِس انداز میں نہ ہوتا۔ ذرا تبدیلی ہوتی اِس میں تو کیا حرج تھا اپنی مرضی سے جایا جاتا۔ کوئی یہ نہ کہتا کہ میں تمھارا شوہر ہُوں یا تم میری بیوی ہو۔"

"کیسی جاہلانہ گفتگو کر رہی ہو۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ انتہائی ضروری تھا۔"

"چلو خیر چھوڑو اِن فضول باتوں کو۔"

اُسی وقت ایک ملازم ثناء کے پاس پہنچ گیا۔ "بی بی جی صاحب کا فون ہے۔"

"کن صاحب کا؟"

"احسان صاحب کا۔" ملازم نے جواب دیا اور ثناء اندر چلی گئی۔ ریسیور میز پر رکھا ہُوا تھا۔ احسان صاحب نے ثناء کی آواز پہچان کر کہا۔

"ثناء! رُدا کہاں ہے؟"

"رُدا؟"

"ہاں؟" احسان صاحب کی آواز کسی قدر گھبرائی ہُوئی تھی۔

"کیوں ڈیڈی کیا ہُوا؟ خیریت؟"

"رُدا کہاں ہے؟ گھر میں موجود ہے وہ؟"

"نہیں ہرگز نہیں، ہوتی تو سامنے آتی۔ ویسے میں نے اُسے اُس کے کمرے میں دیکھا بھی نہیں۔"

"تیمور کہاں ہے؟" احسان صاحب نے پھر سوال کیا۔

"تت... تیمور صبح کو تو میرے پاس تھا۔"

"اِس وقت کہاں ہے؟"

"کہیں نہیں۔ سوگیا تھا۔ میں نے اُسے اُس کے کمرے میں سُلا دیا۔"

"کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"بہت دیر ہوگئی ڈیڈی! میرا خیال ہے دو ڈھائی گھنٹے ہوگئے۔"

"کیا اُس وقت رُدا موجود تھی؟"

"ہاں تیاریاں کر رہی تھی آفس جانے کی۔" ثناء نے جواب دیا اور پھر چونک کر بولی۔

"لیکن ڈیڈی آپ اِس انداز میں سوالات کیوں کر رہے ہیں؟"

"فوراً رُدا کے کمرے میں جاؤ۔ اُسے دیکھو اور یہ بھی دیکھو کہ تیمور کہاں ہے؟ اگر تیمور موجود ہے اور رُدا نہیں ہے تو بھی مجھے اطلاع دو، اور... اور..."

"اور کیا ڈیڈی؟" ثناء نے چیخ کر کہا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم تھوڑی دیر بعد مجھے رِنگ کرو۔ رُدا دفتر نہیں پہنچی ہے۔"

"اوہ اچھا... اچھا۔ میں دیکھتی ہُوں۔" ثناء نے کہا اور ٹیلیفون رکھ کر اندر بھاگی۔

رُدا کے کمرے میں پہنچی۔ کمرہ جُوں کا تُوں تھا۔ تیمور موجود نہیں تھا۔ حالانکہ ثناء اُسے کمرے میں سُلا کر گئی تھی۔ غالباً صبح جلدی جاگ گیا تھا۔ اِس لئے دوبارہ سو گیا تھا۔ اور ثناء نے یہ مناسب نہیں سمجھا تھا کہ اُسے کچی نیند سے جگا دے، اُس وقت جب صبح وہ تیمور کے پاس تھی تو رُدا معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف تھی اور اُس کے انداز سے کسی خاص بات کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ دفتر کیوں نہیں پہنچی؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ تیمور کہاں تھا؟ ثناء تیمور کو تلاش کرنے کے بعد تیزی سے باہر نکل آئی۔ اور پھر وہ ایک ایک ملازم سے تیمور کے بارے میں پُوچھتی رہی۔ ملازموں نے اِس سلسلے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا ثناء کافی پریشان ہوگئی۔ ذکیہ بیگم کے کمرے میں، دادی اماں کے کمرے میں، تمام کوارٹروں میں۔ ہر جگہ تیمور کو تلاش کیا لیکن تیمور کا کوئی پتہ نہیں تھا پھر وہ چوکیدار کے پاس پہنچی۔

"چوکیدار بابا تیمور کو تو نہیں دیکھا آپ نے؟"

"تیمور! اُس بچّے کی بات کر رہی ہیں آپ بی بی جی؟"

"ہاں؟"

"وہ تو رُدا بی بی کے ساتھ تھا۔"

"کک... کیا مطلب؟"

"رُدا بی بی اُسے اپنے ساتھ لے کر باہر نکلی تھیں۔"

"رُدا کے ساتھ تیمور باہر گیا۔ کیوں... آخر کیوں؟"

"ہم کو نہیں معلوم بی بی جی"

"اوہ ہاں اچھا ٹھیک ہے۔ مم... مگر رِدا...؟"

بی بی جی رِدا بی بی اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا بیگ پکڑے ہوئے تھیں جو میں نے پہلے کبھی اُن کے پاس نہیں دیکھا تیمور اُن کی گود میں تھا۔"

"بیگ...؟" ثناء نے پریشان نگاہوں سے چوکیدار کی طرف دیکھا پھر مزید کچھ کہے سُنے بغیر وہ اندر بھاگی اور ایک بار پھر وہ رِدا کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اُس نے وحشت زدہ انداز میں رِدا کی الماری کھولی اور اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ الماری خالی پڑی ہوئی تھی۔ الماری ہی میں ایک سفید رنگ کا کاغذ بھی تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ نہ جانے کیوں ثناء کا دل بند بند سا ہونے لگا۔ اُس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اُس کاغذ کو اُٹھا کر دیکھے۔ نہ جانے کیوں اُس کے دل میں بے شمار بُرے بُرے خیالات آ رہے تھے۔ لرزتے ہاتھوں سے اُس نے کاغذ تھاما۔ کھولا اور اُس کی تحریر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

پیاری ثناء! میں جانتی ہوں کہ صرف تم ہو جس پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے میرے یہاں سے چلے جانے سے لیکن ثناء صورتحال کچھ ایسی ہی درپیش ہے کہ اب ایک لمحے بھی تمہارے پاس رُکنا ممکن نہیں ہے۔ ثناء کچھ لوگ اتنے بُرے نہیں ہوتے جتنا حالات انہیں ظاہر کر دیتے ہیں۔ میں بھی ناسپاس نہیں ہوں۔ تمہاری محبت، تمہاری یگانگت اور تمہارے احسانات کو ٹھکرا کر یہاں سے جا رہی ہوں۔ لیکن میرا جانا بے حد ضروری ہے۔ میری اَنا کا سوال ہے۔ میری زندگی کا سوال ہے۔ میرے اُن لمحات کا سوال ہے جو میں نے نہایت کرب کے عالم میں گزارے ہیں۔ میں اپنے اِن جذبوں کو توڑ نہیں سکتی، جنھوں نے مجھے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ثناء مجھے مُعاف کر دینا۔ تیمور کو تم نے جس انداز میں پالا پوسا اور پرورش کی اُس کے تحت میں اُس پر سے اپنے حقوق سمیٹ چکی تھی اور یقین کرو ثناء اُسے اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے مجھے ایک مُجرم کا سا احساس ہو رہا ہے۔ بالکل اِس طرح جیسے میں اُسے اغوا کر کے لے جا رہی ہوں۔ جیسے میں تمہیں چوٹ دے کر جا رہی ہوں۔ رِدا جھوٹ نہیں بولتی ثناء اگر کسی طور ممکن ہوتا تو میں تیمور کو تمہارے پاس ہی چھوڑ دیتی لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے جانے کے بعد وہ خود تمہارے ذہن پر ایک بوجھ بن جائے گا۔ حالانکہ مُجھ سے زیادہ وہ تم سے مانوس ہے۔ لیکن تم جب اپنے مستقبل کا آغاز کرو گی تو تیمور تمہاری راہ کی رُکاوٹ ہوگا، صرف اِس لئے میری پیاری بہن ثناء صرف اِس لئے تیمور کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں کہ تمہارے مستقبل میں کوئی داغ نہ لگا رہ جائے اور آنے والے وقت میں تمہارے اور خالد کے درمیان تیمور ایک تنازعہ نہ بن جائے، بہرطور یہ ساری باتیں میں نے تم سے کر لیں اور آج بھی میں تم سے شرمندہ ہوں کہ وہ سب کچھ تمہیں نہیں بتا سکی جو بتا دینا چاہیئے تھا۔ ثناء میری کہانی اب شاید تمہارے کانوں تک پہنچ جائے۔ لیکن اِس کہانی کے ساتھ میں تمہارے سامنے نہیں رہ سکتی ثناء یہ میرے لئے ناممکن ہے، مجھے مجبور سمجھ کر مُعاف کرنے کی کوشش کرنا۔ نہ کر سکو تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اپنے دل میں اِس تصور سے افسردہ رہوں گی۔

تمہاری رِدا"

ثناء پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس خط کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے بعد دفعتاً اُس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ باہر بھاگی، جس جس نے اُس کی چیخ سُنی وہ بدحواس ہوگیا اور اُس کے بعد کوٹھی میں ایک عجیب سی افراتفری پھیل گئی۔ ذکیہ بیگم ہائیں۔ ہائیں کرتی ہوئی ثناء کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ ثناء رو، رو کر چیختی چلاتی باہر کی جانب دوڑ رہی تھی۔ اُس کا رُخ کوارٹروں کی جانب تھا۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر نُدرت کو پکار رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں سب اُس کے نزدیک جمع ہوگئے۔ ثناء انتہائی اندوہناک لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"نُدرت... نُدرت رِدا چلی گئی... رِدا چلی گئی، تیمور کو بھی لے گئی۔ نُدرت، رِدا نے یہ گھر چھوڑ دیا"

نُدرت بھی ششدر رہ گئی تھی۔ یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔

تمام لوگ دوڑتے ہوئے ثناء کے گِرد آ جمع ہوئے تھے اور اُس سے صورتحال معلوم کر رہے تھے۔ ثناء نے اپنے بال نوچ لئے تھے اور رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"تم یقین کرو نُدرت... تم یقین کرو اس بار رِدا چلی گئی۔ میں... میں... میں دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ چلی گئی۔ وہ کیوں چلی گئی، نُدرت ہماری رِدا کیوں چلی گئی۔ تیمور... میں تیمور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی نُدرت... نُدرت، رِدا چلی گئی"

"کہاں چلی گئی آخر یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں، دِکھاؤ تو سہی"

نُدرت نے پرچہ ثناء کے ہاتھ سے چھین لیا۔

ثناء زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ عجیب سا انداز تھا اُس کا۔ نُدرت پرچہ پڑھنے لگی۔ ذکیہ بیگم، عصمت اور دوسرے لوگ بھی اِس پرچے کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ نُدرت نے بلند آواز میں یہ پرچہ پڑھا اور سب ساکت رہ گئے۔ دفعتاً ثناء اپنی جگہ سے اُٹھی اور ایک بار پھر اُس نے کوٹھی کی جانب دوڑ لگا دی۔ اِس بار پھر سب اُس کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔ ثناء ٹیلیفون کے نزدیک پہنچی۔ اُس نے بمشکل تمام ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ اور ریسیور کان سے لگا کر کہنے لگی۔

"ہیلو ڈیڈی ہیلو... ہیلو ڈیڈی ہیلو" دوسری طرف سے جب احسان صاحب کی آواز اُبھری تو ثناء نے کہا۔

"وہ چلی گئی ڈیڈی ایک پرچہ لکھ کر رکھ گئی ہے۔ وہ تیمور کو بھی لے گئی۔ ڈیڈی آپ اُسے تلاش کرائیے ڈیڈی اُسے ملنا چاہیئے، ورنہ آپ دو دو انسانوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے مرداسے بھی ثناء سے بھی، ڈیڈی میں مر جاؤں گی اُسے تلاش کیجئے"

"سُنو تو سہی... سُنو تو سہی ثناء کیا... صورتحال کیا ہے؟"

"وہ پرچہ لکھ کر چلی گئی ہے ڈیڈی، وہ کسی وجہ سے یہاں سے چلی گئی ہے۔ اُس نے یہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ ڈیڈی وہ چلی گئی ہے۔ آپ فوراً یہاں آ جائیے۔ مم... میں مر جاؤں گی اُس کے بغیر۔ ڈیڈی مجھے رِدا چاہیئے"

"میں آ رہا ہوں ثناء۔ تم براہِ کرم... تم... تم سُنو تو سہی اپنے آپ پر قابو رکھو۔ یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے، میں آ رہا ہوں" احسان صاحب کی آواز اُبھری اور ثناء نے ریسیور رکھ دیا۔

لیکن وہ مُسلسل بَین کئے جا رہی تھی، سبھی اُسے سمجھا رہے تھے لیکن ثناء کہہ رہی تھی۔

"میرا دل کہتا ہے... میرا دِل کہتا ہے اب وہ نکل گئی۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گی"

سب لوگ پریشانی کے عالم میں اُسے دیکھ رہے تھے۔ پرچے کا مضمون سب نے پڑھ لیا تھا لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ آخر رِدا چلی کیوں گئی؟ کہاں چلی گئی؟ اچانک اُس نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ رات کو تو بہت اچھی تھی۔ ہر طرح کی تفریحات میں دلچسپی لیتی رہی تھی۔ صبح کو وہ گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد احسان احمد بھی پہنچ گئے۔ غالباً عادل حسین کو بھی اُنھوں نے ٹیلیفون کر دیا تھا کیونکہ دونوں کی گاڑیاں ساتھ ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تھیں۔ اختر اور خالد بھی عادل حسین کے ساتھ موجود تھے۔ اندر کی فضاء دیکھ کر وہ سب دنگ رہ گئے تھے۔ ثناء کا رو، رو کر بُرا حال ہوگیا تھا۔ وہ دوڑ کر احسان احمد سے چمٹ گئی۔

"ڈیڈی ہماری رِدا چلی گئی۔ آخر رِدا یہاں سے چلی گئی اُسے یہاں سے نہیں جانا چاہیئے تھا۔ اُس نے... اُس نے ہماری محبت کا خون کیا ہے ڈیڈی۔ رِدا کو یہاں سے نہیں جانا چاہیئے تھا"

"وہ زیادہ دُور نہیں جا سکتی۔ آخر جائے گی بھی تو کہاں جائے گی؟ بالآخر مل جائے گی اور تم نے یہ کیا چکر چلا رکھا ہے؟ سنبھالو خود کو ثناء۔ خود کو سنبھالو"

"ڈیڈی وہ کیوں چلی گئی؟ آخر کیوں چلی گئی؟"

"میں بتاتا ہوں وہ کیوں چلی گئی؟ لیکن تم اپنے حواس تو قائم کرو"

"مم... میں... میں... آپ مجھے رِدا کے بارے میں بتائیے۔ میرے حواس ٹھیک ہیں۔ خُدا کے لئے مجھے جلدی اُس کے بارے میں بتائیے۔ یہ بتائیے کہ وہ کہاں ملے گی؟ کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے اس کو؟"

"خود کو سنبھالو ثناء، کیا تماشہ لگا رکھا ہے تم نے" احسان صاحب ڈپٹ کر بولے۔

"ڈیڈی رِدا... رِدا" ثناء نے کچھ اس انداز میں کہا کہ بہت سی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ احسان صاحب بولے۔

"آؤ میرے ساتھ۔ ہوش و حواس قائم کرو۔ تو تم سے کچھ گفتگو کروں"

"چلئے ڈیڈی چلئے" اور اُس کے بعد وہ سب ڈرائینگ رُوم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ثناء کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"رات کو ایک واقعہ پیش آیا تھا جس سے صرف میں اور عادل حسین واقف ہیں"

"کیا واقعہ ڈیڈی؟ کیا ہُوا؟" شناء نے پُوچھا۔ اختر اور خالد بھی حیرانی سے احسان احمد کی صُورت دیکھنے لگے تھے۔ احسان احمد نے رات کے واقعے کی مکمل تفصیلات شناء کو اور دوسرے لوگوں کو بتادیں۔ شناء متعجبانہ انداز میں احسان احمد کو دیکھ رہی تھی۔

"مگر آفندی صاحب، وہ رَدا کو کیسے جانتے ہیں اور رَدا۔ ڈیڈی آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا رَدا آفندی صاحب کے گھر گئی ہوگی؟ ہم فوراً ٹیلیفون کرکے اُن سے معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔"

"کیسی بچّوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم نے صُورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آفندی صاحب کی وجہ سے تو اُس نے یہ گھر چھوڑا ہے۔"

"تو ہمارا اُن سے کیا رشتہ ہے؟ ہمارے کون لگتے ہیں وہ؟"

"تمہارے کوئی نہیں لگتے بیٹے لیکن رَدا سے اُن کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔"

"تو پھر اُس تعلق کی وجہ سے رَدا نے ہمارا گھر کیوں چھوڑ دیا؟"

"صرف اِس لئے کہ آفندی صاحب نے یہ بات معلوم کرلی تھی کہ رَدا ہمارے ساتھ رہتی ہے۔"

"اوہ! اوہ... یہ آفندی صاحب۔ میں اُنہیں گولی مار دُوں گی۔ مم... میں... میں..."

"بچّوں کی سی باتیں نہ کرو۔ کیا خیال ہے عادل اِس مسئلے نے تو واقعی پریشان کرکے رکھ دیا۔ وہ بچّی مجھے بھی اِسی طرح عزیز ہے۔ مجھے اِس کی اُمید نہیں تھی ورنہ شاید رات ہی کو میں کچھ..."

"میرے ذہن میں یہ بات تھی۔" احسان احمد میں سوچ رہا تھا کہ رات کو اُس کا جو انداز نظر آیا تھا اُس کی بناء پر کہیں وہ آفندی کی وجہ سے ہمارا گھر ہی نہ چھوڑ دے۔"

"آہ! کاش تم مجھے ایک بار اِس کی نشاندہی کرادیتے تم۔ مگر کیا کیا جائے؟ اب بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"میرا ایک ہی مشورہ ہے کہ آفندی صاحب کے پاس چلتے ہیں اُن سے پُوچھتے ہیں۔ اُس بیچارے کی کیفیت کا بھی کوئی اندازہ نہیں ہوسکا۔ میں نے یہی سوچا تھا احسان احمد کہ شام کو دفتر سے فُرصت پانے کے بعد تمہیں ٹیلیفون کروں گا اور تمہارے ساتھ آفندی کے گھر جاؤں گا۔ میرا خیال ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیئے چلو شناء تم بھی چلو۔ تمام لوگ چلتے ہیں۔ آفندی سے یہ معلوم کریں کہ آخر اُس کے اور رَدا کے درمیان کیا مُعاملہ تھا؟ ویسے ہوسکتا ہے یہ خبر اُس کے لئے بھی بہت تکلیف دہ ثابت ہو کہ رَدا ایک بار پھر ہمارے درمیان سے چلی گئی۔"

"نہیں ڈیڈی نہیں، ہمیں رَدا کو تلاش کرنا چاہیئے۔ سب نہیں جاتے۔ اختر تم تو بہت ذہین ہو خُدا کے لئے اپنی ذہانت استعمال کرو۔ رَدا کو تلاش کرو۔" اختر نے آہستہ سے گردن ہلائی اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ خالد بھی اُس کے ساتھ ساتھ ہی تو اقبال نے بھی اپنا فرض پُورا کرنا مناسب سمجھا۔ باقی لوگ عادل کے ساتھ آفندی صاحب کے گھر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

✤

بھُورے چٹیل میدان تاحدِ نگاہ بکھرے ہُوئے تھے اُن کا اختتام بھُورے اور دُور سے سُرمئی سے نظر آنے والے ٹیلوں پر ہوتا تھا۔ جھاڑیاں گڑھے کہیں کہیں چھوٹے پُل جن پر سے ٹرین گزرتی تو فضا میں ایک عجیب سی آواز بلند ہوتی یہ سارے مناظر دوڑ رہے تھے۔ اور رَدا کی آنکھیں اُن میں ڈُوبی ہُوئی تھیں۔ کمپارٹمنٹ میں دوسرے لوگ بھی تھے لیکن رَدا نے ابھی تک اُن میں سے کسی کی صُورت نہیں دیکھی تھی اُس کا مُختصر سا سامان اُس کے پیروں کے نزدیک رکھا ہُوا تھا اور وہ آرام دہ سیٹ سے ٹکی ہُوئی باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ تیمور اُس کی گود میں سو گیا تھا۔ رَدا کے چہرے پر ایک پتھرایا سکون پھیلا ہُوا تھا۔ اِس پتھرائے ہُوئے چہرے کے پیچھے نہ جانے کون کون سے خیالات موجزن تھے۔ اُس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکا تھا۔ سامنے بیٹھی ہُوئی شوخ و شنگ لڑکی کئی بار للچائی ہُوئی نگاہوں سے تیمور کو دیکھ چکی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک معمر خاتون ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی اور ایک بزرگ صُورت شخص بیٹھے ہُوئے تھے۔ لڑکی دو تین بار تیمور کو دیکھ کر اپنی چھوٹی بہن کے کان میں کچھ کہہ چکی تھی اور دونوں کی میٹھی نگاہیں مُسلسل تیمور کا طواف کر رہی تھیں۔ رَدا اُن کی تمام کیفیات سے بے نیاز آہستہ ہلتے ہُوئے باہر کے مناظر میں گم تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُس کے دِل میں کیا کیا خیالات موجزن ہیں۔ اُس کے ہمیشہ مُسکرانے والے ہونٹ اِس وقت بھی مُسکراہٹ کے انداز میں کھنچے ہُوئے تھے پھر وہ اُس وقت چونکی جب تیمور نے ہلکی سی آواز نکال کر انگڑائی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ رَدا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ تیمور اُس کی گود میں اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ اُس کے انداز میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی تھی۔ چند ہی لمحات کے بعد اُس لڑکی سے صبر نہ ہوسکا اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر رَدا کے پاس پہنچ گئی۔ اُس نے بڑی نرم آواز میں کہا۔

"باجی یہاں بیٹھ جاؤں؟"

"اوہ! بیٹھو، ضرور بیٹھ جاؤ۔" رَدا مُسکرا کر بولی۔

"باجی یہ آپ کا بیٹا ہے؟"

"ہاں۔ کیوں؟"

"باجی میں تھوڑی دیر کے لئے اسے اپنی گود میں لے لُوں؟"

"ضرور لے لو۔" رَدا نے تیمور کو لڑکی کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔

"یہ مجھے بہت پیارا لگ رہا ہے۔ سو رہا تھا تو بالکل یُوں لگ رہا تھا جیسے کوئی جاپانی گُڈا ہو۔"

"اوہو! اچھا... اچھا تم بھی تو جاپانی گُڑیا ہو۔"

"باجی آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام فرخ ہے۔" رَدا نے فوراً جواب دیا۔

"اور اس کا...؟" لڑکی نے پُوچھا۔

"اِس کا... اِس کا... اِس کا نام گُل ہے۔"

"اوہ! کتنا خوبصورت سا چھوٹا سا نام ہے۔ سچ مچ باجی مجھے تو یہ پھُول ہی لگتا ہے۔"

"اچھا! بڑی باتیں بنانا آتی ہیں تمہیں۔ کیا نام ہے تمہارا؟" رَدا نے پُوچھا۔

"رُشنا! میرا نام رُشنا ہے، باجی اور یہ میری چھوٹی بہن غزال ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"بہت اچھے چلو بھئی رُشنا تم گُل کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ گُل آپ جائیں گے اِن کے ساتھ؟" رُشنا نے ہاتھ پھیلائے تو تیمور اُس کی گود میں چلا گیا۔ اور رُشنا کھلکھلاتی ہُوئی واپس پلٹ گئی پھر وہ سب تیمور میں گُم ہوگئے۔ رَدا چند لمحات مُسکراتی نگاہوں سے اُنہیں دیکھتی رہی اور پھر اُس نے باہر کھڑکی سے دوسری جانب نگاہیں جمادیں۔ زندگی کا سفر ایک بار پھر جاری ہوگیا تھا اور وہ پھر بہت پیچھے لَوٹ گئی تھی۔ اِتنے پیچھے کہ اُسے وہ مناظر یاد آنے لگے جن سے گزر کر وہ کراچی تک پہنچی تھی۔ نہ جانے کیا کیا خیالات تھے اُس کے ذہن میں؟ نہ جانے وہ کیا کیا سوچ رہی تھی؟ بہت دیر اِسی طرح خاموشی سے گزر گئی۔ تیمور اُن لوگوں کے درمیان گھُل مِل گیا تھا اور اب معمر شخص کی گود میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ رَدا نے ایک بار اُس کی طرف نگاہیں دوڑائیں اُسی وقت رُشنا کی چھوٹی بہن غزال کافی کا ایک کپ لئے ہُوئے اُس کے قریب پہنچ گئی۔

"باجی کافی پی لیجئے۔"

"اوہ! نہیں شکریہ۔"

"نہیں باجی پی لیجئے بہت اچھی بنی ہے۔"

"رہنے دو بھئی تم لوگ کچھ زیادہ ہی تکلّف کر رہی ہو۔"

"لیجئے باجی ابھی ہم نے تکلّف کہاں کیا ہے؟ ابھی تو ہم آپ کو اپنے ساتھ کھانا بھی کھلائیں گے۔"

"نہیں پلیز میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی۔"

"اچھا تو پھر کافی تو پی لیجئے۔"

"تمہاری مرضی! میری طرف سے سب کا شکریہ ادا کردینا۔"

"اچھا باجی!" غزال نے کہا اور واپس اپنی سیٹ پر پہنچ گئی۔ رَدا نے کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لئے اور احسان مند نگاہوں سے اُن سب کی طرف دیکھا۔ تیمور بڑے آرام سے اُن بزرگ کی گود میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اور اُس کے انداز میں کوئی پریشانی نہیں پائی جاتی تھی۔ رَدا کافی کے گھونٹ لیتی رہی۔ اور پھر اُس نے اُٹھ کر کافی کا کپ بڑے ادب سے اُن سب کے سامنے پیش کر دیا۔

"میں آپ سب کی شکرگزار ہُوں۔"

"نہیں بیٹی کوئی بات نہیں ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو مانگ لینا۔ تم شاید اکیلی ہو۔"

"بہت بہت شکریہ۔" رَدا فوراً ہی واپس پلٹ پڑی۔

وہ اُن لوگوں سے بہت سے زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی۔ اُس نے اُلجھے ہُوئے انداز میں سوچا کہ کہیں یہ شناسائی آگے ہی نہ بڑھ جائے اور وہ لوگ اُس سے باتیں نہ کرنے لگیں۔ وہ کسی کو اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اِس لئے اُس نے اپنا نام بھی غلط ہی بتایا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو مصرُوف رکھنے کے لئے کچھ کرنا ضروری تھا وہ اپنے بیگ میں بلاوجہ سامان اُلٹنے پلٹنے لگی اور اُسی وقت اُسے وہ پیکٹ نظر آیا جس میں خیر دین نے کوئی چیز اُس کے حوالے کی تھی۔ بس اپنے آپ کو مصرُوف رکھنے کے لئے اور اُن لوگوں کی گفتگو سے بچنے کے لئے اُس نے وہ پیکٹ نکال لیا اور اُسے کھول کر اُس میں سے وہ خوبصورت ڈائری اپنے ہاتھوں میں لے لی جسے اُس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے اُسے خیر دین کی امانت سمجھا تھا لیکن اب اُس نے یہ نفیس نوٹ بُک کھول لی۔ انتہائی خوبصورت رائٹنگ میں چند جُملے لکھے ہُوئے تھے لیکن

اُنھیں دیکھ کر رُدا چونک پڑی۔

رُدا کی کہانی :

میری کہانی : اُس نے متحیرانہ انداز میں سوچا... اِس نوٹ بک میں : ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو گئی، اُس نے دُوسرا صفحہ اُلٹا۔

تو آؤ کہ رازِ پنہانی افشا نے عقیدت کرتا ہُوں
داماں زبانِ خاموشی لبریز شکایت کرتا ہُوں
گھبرا کے ہجوم پیکاں سے اظہارِ جُرأت کرتا ہُوں
میں تم سے...

میں تم سے... میں تم سے... میں تم سے... سے آگے کیا ہو سکتا ہے اور شعر خود بخود پُورا ہو گیا "میں تم سے محبت کرتا ہُوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہُوں" مگر رُدا کی کہانی۔ رُدا کی کہانی۔

یہ پیکٹ اُسے خیر دین نے دیا تھا یہ کہہ کر کہ یہ اُس کی امانت ہے اور یہ شعر؟

خیالات کی ریل چل پڑی۔ نہ جانے کیوں یہ صفحہ اُلٹنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ نگاہیں اِس شعر پر جمی ہُوئی تھیں۔

دامانِ زبانِ خاموشی
اظہارِ جُرأت
میں تم سے محبت کرتا ہُوں

رُدا کہانی۔ میری کہانی۔ اور کس اور کسی کی زبانی، کیا یہ واقعی میری کہانی ہے۔ مگر خیر دین۔ ہمت کر کے اُس نے تیسرا صفحہ پلٹ دیا۔

زندگی کی کہانیاں یکساں ہیں معمُولی سی ردّ و بدل ہر کہانی کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیتی ہے اور ہم اُسے نئی کہانی سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی کہانی نئی نہیں ہوتی انسانی وجُود ایک جیسے ہیں۔ انسانی سوچ ایک جیسی ہے، انسانی مسائل ایک جیسے ہیں پھر یہ کہانیاں مختلف کیسے ہو سکتی ہیں۔ ہاں واقعات کے پیراہن بدلے ہُوئے ہوتے ہیں۔ اور بس یہی نیا پن ہوتا ہے اِن کہانیوں میں۔ ایسی ہی ایک کہانی کے کردار حِنا اور ثاقب ہیں۔ ہونے کو تو اس کہانی کا آغاز حضرت آدمؑ سے بھی ہو سکتا ہے جن کی اولادوں میں سے یہ دونوں تھے لیکن کہانی طویل ہو جائے گی۔ اِس لئے مُختصراً اِس کہانی کا آغاز اِن ہی دونوں سے کیا جاتا ہے۔

وہ شاعر تھا۔ اپنے اشعار کی طرح خوبصورت تھا۔ اپنی غزل 'تاریکیاں' کی طرح غزیب تھا۔ اپنی نظم 'احساس' کی طرح لاأبالی اور سر پھرا تھا۔ اپنے گیت 'بھادوں' کی طرح غمزدہ تھا۔ اور اس رات بیگم فردوس کے ایک ہزار گز کے لان پر پڑی ہُوئی کُرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہُوا تھا۔

بیگم فردوس ایک دولت مند بیوہ تھیں۔ عظیم الشان کاروبار تھا۔ اور عظیم الشان مشاغل، سوشل ورکر تھیں سماجی کارکن تھیں اِس کے علاوہ صاحبِ ذوق تھیں شعر و شاعری کی رسیا اور اِسی ذوق کے تحت یہ مشاعرہ منعقد ہُوا تھا جس میں ملک کے تمام بڑے بڑے شعراء موجود تھے، بڑے سے اسٹیج پر شعرائے کرام قرینے سے سجے ہُوئے تھے اور دورِ غزل تھا۔ حاضرین کی آہ اور واہ اُبھر رہی تھی۔ اُس سے پہلے لان کے دوسرے پورشن میں کھانے کا دور چل چُکا تھا۔ جس کی خوشبوئیں ابھی تک فضاؤں میں رچی ہُوئی تھیں۔ بیگم صاحبہ کھانوں کے سِلسلے میں بھی بے حد خوش ذوق تھیں اور ان کا باورچی مخصُوص تھا جو اِن محفلوں کے لئے بہت دُور سے بُلوایا جاتا تھا۔

چوتھے شاعر نے اپنا کلام سُنایا اور پھر پانچویں شاعر کے اعلان کے لئے وقفہ ہُوا کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسٹیج پر پہنچ گیا۔ اُس نے مائیک اعلان کرنے والے کے ہاتھ سے لے لیا۔ معمُولی سا لباس، بے ترتیب سا انداز اور پھر یہ مداخلتِ بے جا۔ لوگوں نے حیرت اور ناگواری سے اُسے دیکھا تھا۔ تبھی اُس کی آواز اُبھری۔

"حضرات! میں بھی شاعر ہُوں، نظمیں، غزلیں، گیت کہتا ہُوں۔ یقین نہ آئے تو میری رہائش گاہ کے اکلوتے کمرے میں پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھ لیجئے سگریٹوں کے خالی پیکٹوں پر، ردّی اور استعمال شُدہ لفافوں پر، کاغذ کے ہر اُس ٹکڑے پر جس کا کوئی گوشہ خالی ہو میری غزلیں نظمیں اور گیت انبار ہیں۔ اِس زبانی سند کے ساتھ عملی ثبوت پیش کرنا چاہتا ہُوں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ مداخلتِ بے جا ہے۔ لیکن آپ اِسے ادائیگی قرض سمجھ لیجئے۔ کیونکہ محفلِ سخن کے آداب سے واقف ہُوں۔ اِس لئے اِس وقت اُٹھ آیا ہُوں۔ جب اُصول کے مطابق مجھے پڑھنا چاہیئے تھا۔ شعرائے کرام کی جو محفل سجی ہے اور اس میں جو حضرات مجھے نظر آئے ہیں وہ مجھ سے کہیں برتر و اعلیٰ ہیں۔ اور اگر اُن کے پڑھنے کے بعد میں اپنا کلام سُنانے آتا تو یہ اُن شعراء کی شان میں گستاخی ہوتی۔ جو شعرائے کرام پڑھ چکے ہیں۔ میں اُن سے معذرت خواہ ہُوں۔ خواتین و حضرات! میری اِس

محفلِ مشاعرہ میں شرکت مداخلتِ بے جا ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ادائیگی قرض بھی ضروری ہے البتہ اس قرض کی تفصیل مختصراً عرض کرنا چاہتا ہُوں۔ ہُوا یُوں تھا کہ اِس کوٹھی کے عقبی حصّے میں جو خالی پلاٹ پڑا ہُوا ہے میں اُس طرف سے گُزر رہا تھا کہ میں نے یہاں دیگوں کے انبار دیکھے۔ اُن سے اُٹھنے والی خوشبوؤں نے مجھے اِس طرف متوجہ کر دیا قریب جا کر باورچی سے پُوچھا کہ یہ کھانے کس تقریب کے لئے پک رہے ہیں تو تفصیل معلوم ہُوئی اور پتہ چلا کہ محفلِ مشاعرہ منعقد ہونے والی ہے۔ چپڑی اور دو دو کی کیفیت تھی۔ میں نے کوٹھی کا جائزہ لیا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اِس کے دربانوں کی جسمانی حقیقت کیا ہے۔ وہ سب مجھے مہذب نظر آئے اِن تہذیب یافتہ دربانوں کی وجہ سے میری ہمت افزائی ہُوئی۔ صاحبِ خانہ دریا دل تھا اور یہ خانہ بے تکلف میری ضیافت کے لئے کُشادہ۔ کھانے کی میز تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہُوئی۔ گویا ایک برخود غلط کو قبُول کر لیا گیا تھا۔ پھر یہ پُر لُطف کھانے کھانے کے بعد دِل میں جذباتِ احسان مندی اُبھرے۔ ہمت بڑھی۔ اور یہی ہمت افزائی آپ کے سامنے لانے کا باعث بنی۔ سپاس گزاری کے طور پر ایک غزل پیشِ خدمت ہے برداشت کر لیجئے عنایت ہوگی۔"

اُس کا لہجہ اور اندازِ بیان بے حد دلچسپ تھا۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے شعرائے کرام پر ایک نِگاہ ڈالی۔ اجازت طلب کی لیکن اجازت ملنے کا انتظار بھی نہ کیا اور شروع ہو گیا۔ اس نے کہا۔

یہ فلک بوس نشیمن جو کھڑے ہیں بابا
اِن پہ احسان غریبوں کے بڑے ہیں بابا
فیضِ ساقی نہ رہے قید لبوں تک محدُود
ہم اِسی بات پہ مُدّت سے اڑے ہیں بابا
اپنے دامن کو ذرا دُور ہٹائے رکھیئے
یہ تو چھلکیں گے کہ یہ خالی گھڑے ہیں بابا
لوگ دو گام سلیقے سے نہیں چل پاتے
راستے کتنے صداقت کے کڑے ہیں بابا
عہدِ نو اُن کے تقدس کی قسم کھائے گا
آج جو بستۂ زنجیر کھڑے ہیں بابا
لوگ مہتاب کی تابندہ جبیں روند آئے
ہم ابھی وہم کی پستی میں پڑے ہیں بابا
سادہ سادہ سا ہے ملبُوسِ تمنا لیکن
ہم نے اشکوں کے گہر اِس میں جڑے ہیں بابا
زندگی پھُولوں کے بِستر پہ نہیں گُزری ہے
عُمر بھر گردشِ دوراں سے لڑے ہیں بابا

یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ رُکا پھر مُسکرا کر بولا "اِس کے بعد مقطع ہونا چاہیئے تھا لیکن ہم وہ شاعر ہیں جس نے مقطع ذہن میں ہونے کے باوجود کبھی نہیں لِکھا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ مقطع لِکھیں یا نہ لکھیں ہمیں کوئی نہیں جانے گا اپنے طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ اِس غزل کی شکل میں ہم نے اُن عُمدہ کھانوں کا بِل ادا کر دیا ہے جو ہم نے صاحبِ خانہ کی میز پر کھائے ہیں۔ سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ خدا حافظ۔"

وہ بغیر کسی اجازت کے اسٹیج سے اُتر آیا۔ چاروں طرف سے آوازیں اُبھرنے لگیں لوگ اُس سے کچھ اور پڑھنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ کچھ اور عطا کرنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ لیکن وہ چوروں کے سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوٹھی سے نکل بھاگنا چاہتا ہو، تبھی ایک مضبُوط ہاتھ نے اُس کی کلائی مضبُوطی سے پکڑ لی۔

"جا کہاں رہے ہیں حضرت! ابھی بِل کی ادائیگی مکمل نہیں ہُوئی ہے۔ ایسے نہیں جا سکتے آپ۔"

"بھائی یہ کلائی میں آپ سے نہیں چھڑا سکتا مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ لیکن کرم کریں ایک غریب کا پیٹ بھر گیا آپ کو دُعائیں دے گا بے عزتی کرا دیں گے آپ کو کیا ملے گا۔"

"اِس کی ذِمّہ داری لی جاتی ہے کہ صاحبِ خانہ آپ کو کچھ نہ کہیں گے براہِ کرم تشریف رکھیئے۔" ہاتھ پکڑنے والے ضعیف نوجوان نے کہا اور اُسے ایک خالی کرسی پیش کر دی گئی۔ لوگ مُسلسل اُس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ شعرائے کرام کے ہونٹوں پر بھی مُسکراہٹ تھی۔ اُسی وقت بیگم فردوس اسٹیج پر آئیں اور اُنھوں نے مائیک پر کہا تھا۔

"معزز شاعر نے اپنا کلام سُنا کر ہمارے دِل موہ لئے اُنھوں نے جس طرح یہاں اپنی آمد کا تذکرہ کیا اُس نے مجھے از حد شرمندہ کیا ہے۔ اور میں انتہائی شرمندہ ہُوں کہ میں اِس نوجوان شاعر سے رُوشناس کیوں نہ تھی، جہاں تک اِس محفل کو رونق بخشنے کا سوال ہے میں تہہ دِل سے اِس شاعر کی ممنُون ہُوں کہ اُس نے کسی طرح بھی شرکت کی لیکن مجھ پر احسان کیا، نوجوان شاعر سے میری درخواست ہے کہ وہ ہماری اِس محفل میں آخر تک

شریک رہ کر ہم پر ایک اور احسان کرے۔ میں اُس کی شکر گزار ہُوں گی۔"

شاعر نے قریب بیٹھے ہُوئے نوجوان سے کہا "یہ لگتا ہے، غلطی سے فرشتوں کے درمیان آگیا ہُوں۔"

"جی ہاں آپ جنّت الفردوس میں ہیں یہ خانۂ فردوس ہی ہے۔" نوجوان نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

بریکوں کی تیز چڑچڑاہٹوں نے رُدا کو چونکا دیا اُس نے ناگواری سے گردن اُٹھا کر باہر دیکھا کوئی اسٹیشن آگیا تھا۔ اور ٹرین کی رفتار سُست ہوتی جارہی تھی۔ وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ تیمور اطمینان سے رُخشنا کی گود میں کھیل رہا تھا۔ چند لمحات کے ہنگامے اور اُس کے بعد ٹرین پھر رفتار پکڑنے لگی۔

رُدا نے خُشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ڈائری کا ورق اُلٹ دیا۔

رُدا کا بدن آہستہ آہستہ لرز رہا تھا لیکن یہ لرزشیں ٹرین کے ہچکولوں میں چُھپ گئی تھیں اُس نے آنکھیں بھینچ کر زور سے سر جھٹکا اور پھر ڈائری پر نگاہ دوڑانے لگی۔

بیگم فردوس نے اُسے بیٹھے ہُوئے دیکھ لیا تھا۔ کمپیئر کی آواز اُبھری "معزز سامعین گمنام شاعر نے قطع نہ پڑھ کر ہم پر ظلم کیا ہے لیکن وہ ہمارے درمیان موجود ہیں اُنھیں دوبارہ دعوت دی جائے گی۔ اِس خوبصورت تبدیلی کے بعد اب جناب؟"

اُس نے شاعر کا نام اَناؤنس کر دیا۔

بیگم فردوس مُسکراتی ہُوئی اُس کے پاس آگئی تھیں۔ اُنھوں نے اُس کے قریب ہی جگہ حاصل کی۔ اور بیٹھ گئیں وہ گھبرائی ہُوئی نگاہوں سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔

"آپ فرار کیوں ہو رہے تھے۔ اور آپ نے یہ کیوں محسوس کیا کہ آپ کی اِس عنایت کو ہم ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے؟"

"اب تو کچھ غلطی کا سا احساس ہو رہا ہے۔ مگر کیا معلوم تھا کہ اپنے شہر میں بھی آپ جیسی موجود ہیں، بہرحال ایک بار پھر گستاخی کے لئے معذرت۔"

"ہرگز نہیں جناب، صرف معذرت سے کام نہیں چلے گا آپ کو محفلِ مشاعرہ کے اختتام تک بیٹھنا ہوگا اور اُس کے بعد آپ مجھ سے ملاقات کئے بغیر نہیں جائیں گے۔ ویسے آپ نے قطع تو نہ کہا لیکن کم از کم خفیہ طور پر سہی اپنا نام بتا دیجئے۔"

"ثاقب کہتے ہیں احقر کو، یہی نام ہے اور یہی تخلص۔"

"بہت مسرت ہُوئی ثاقب صاحب آپ سے مل کر، براہِ کرم مجھ سے تعاون کیجئے۔ اِس وقت دوسروں کی پذیرائی بھی ضروری ہے، ورنہ آپ کے ساتھ ہی بیٹھتی۔"

"بس یُوں لگ رہا ہے جیسے کوئی نئی دُنیا ہے جو آپ نے آباد کی ہے۔ تعمیلِ حکم کے لئے بیٹھا رہُوں گا!"

آگے والی رو میں حِنا موجود تھی۔ اُس نے بھی اُسے دیکھا تھا۔ سُنا تھا محظوظ ہُوئی تھی اور اب گردن گھما کر اُس کی اور بیگم فردوس کی گفتگو سُن رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اُس کے دِل میں ایک میٹھا میٹھا احساس جاگا تھا، کِتنا عجیب ہے، اور... اور نہ جانے کیسا ہے، بس یہ ایک احساس تھا جو اُس وقت تک اُس کے ذہن پر طاری رہا جب تک محفلِ مشاعرہ ختم نہ ہوگئی۔

بیگم فردوس سے خاندانی تعلقات تھے اور اُن کی محفلوں میں حِنا کو شرکت کا حکم دیا جاتا تھا شعر و شاعری کی دِلدادہ تھی اور اُس میں ندرت کی قائل تھی جو کچھ اُس نے کہا تھا اُس سے متفق بھی تھی۔ وہ تو بیگم فردوس کے پاس رہ گیا اور حِنا اپنی خوبصورت کار میں گھر چلی آئی۔

لیکن رات کے بقیہ حصّے میں بھی وہ اُس کے ذہن پر چھایا رہا تھا اور وہی میٹھا میٹھا سا احساس اُس کے رگ و پے میں سرایت کرتا رہا تھا۔ وہ تو اُس کا صُورت آشنا بھی نہیں ہُوا تھا کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ سگرٹوں کے وہ پیکٹ، ردّی کاغذوں کے لفافے اور وہ ٹکڑے جن پر اُس کی غزلیں رقم ہیں نہ جانے کس جگہ ہیں، کیسے معلوم ہو؟

اُس کے دل میں یہ خواہش بیدار ہُوئی تھی کہ وہ دوبارہ بھی مِلے اُس سے شناسائی حاصل کی جائے، اور یہ پُوچھا جائے اُس سے کہ اُس کے سارے وجُود کی یہ تلخیاں کون سی کہانی رکھتی ہیں۔ اُن کی بنیاد کیا ہے؟

بیگم فردوس کے ہاں ہر تقریب میں حِنا کی شرکت ضروری ہوتی تھی لیکن اِس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا وہ خود بیگم فردوس سے اچھی طرح واقفیت رکھتی تھی۔ اور اُسے عِلم تھا کہ بیگم فردوس نے خصُوصی طور پر اُسے روک لیا ہے یقیناً اُنھوں نے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کی ہوں گی۔ چنانچہ اِس وقت اُس کی بازیابی کا ذریعہ بیگم فردوس ہی ہوسکتی ہیں۔

لیکن فوری طور پر بیگم فردوس سے مِل کر اُس کے بارے

میں معلومات کچھ مناسب نہیں لگتی تھیں۔ اِس لئے کچھ توقت ضروری تھا۔

حِنا ایک امیر زادی تھی قِصّہ کہانیوں کی وہ امیر زادی جس کے لئے ستارے کوئی وقعت نہیں رکھتے، جو زندگی میں کبھی لفظِ ناکامی سے رُوشناس نہیں ہوتیں اور یہ کامیابیاں اُنھیں ہر شئے سے بے نیاز کر دیتی ہیں جو کہتی ہیں کہ بھوکوں کو روٹی نہیں مِلتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھا لیتے، یہی اُس کا مزاج تھا۔ اور اِس مزاج کے رکھوالے اُس کے دولتمند ڈیڈی تھے۔ ہر شئے کے آسان حصُول نے اُسے دُنیا کی قیمتی سے قیمتی شئے سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن یہ شخص... وہ اُس سے بے نیاز نہ رہ سکی تھی۔

بیگم فردوس سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ اُس نے محفلِ مشاعرہ کی تعریف کی۔

"ہاں! اُس دِن کا پروگرام تو حیرت انگیز طور سے کامیاب رہا۔" بیگم صاحبہ نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"وہ شاعر بے مقطع مقطع کے بغیر بھاگ گیا یا آپ نے اُس سے مقطع وصُول کر لیا؟"

"جان ڈال دی تھی اُس نے مشاعرے میں بہت ہی انوکھا نوجوان تھا۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"کیا نام تھا؟"

"ثاقب۔"

"صِرف ثاقب؟"

"اِتنا ہی بتایا تھا اُس نے۔"

"کہاں رہتا ہے؟"

"کچھ نہیں بتایا اپنے بارے میں عجیب مستانہ تھا ہر شئے سے بے نیاز۔ دوبارہ آنے کا وعدہ تو کیا تھا اُس نے لیکن شاید کبھی نہ آئے۔"

"کیوں؟"

"بس یہ میرا اندازہ ہے اُس کے بارے میں۔ ایسا ہی لگتا تھا مجھے۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ ایک بے نام سا احساس اُس کے دِل کو چُھوا تھا تاہم اُس نے اِتنا ضرور کہا "وہ دوبارہ آپ سے مِلے تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔"

"ٹھیک ہے میں تمھیں فون کر دُوں گی۔" بیگم فردوس نے کہا۔

اور وہ انتظار کرتی رہی۔ ایک ہفتہ، پندرہ دن اور پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ بہت سی چیزیں بھُول جانے کے لئے

ہوتی ہیں لیکن وہ اُسے نہ بھُول سکی۔ اُس نے گھنٹوں اُس کے لئے آوارہ گردی کی۔ ہر جگہ اُسے تلاش کیا۔

یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لڑکے لڑکیاں لان پر مشاعرہ جما لیتے تھے اور اپنی اپنی تیاریوں کے مظاہرے کرتے رہتے تھے۔ ایک دِن وہ بھی اُن کے درمیان پہنچ گئی۔ باقر باقری کہہ رہا تھا۔

"خواتین و حضرات! بہترین اشعار برائے فروخت ہیں جس دام خریدے ہیں اُسی دام فروخت کر دُوں گا۔ ایک پیسہ بھی منافع نہیں لُوں گا حلفیہ کہہ رہا ہُوں۔ ابھی مہینے کے بارہ دن باقی ہیں اور فدوی کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔"

"کوئی لمبی غزل خرید لی کیا؟" نور نے پُوچھا۔

"ہاں یار اِس بار وہ کم بخت چُوتا لگا گیا، مجبوری سے فائدہ اُٹھا گیا۔"

"کون؟"

"ہمارا فیلمی شاعر ہے۔" باقر نے کہا۔

"فیلمی شاعر" سب لوگ ہنس پڑے۔

"ہاں دادا میاں کو نعت گوئی کا شوق ہے اسی سے نعتیں لکھواتے ہیں، چچا صاحب قبلہ بھی شاعر ہیں اُس کے مستقل گاہک، مہینے میں ایک دو غزلیں خرید لیتے ہیں اور اب اپنے دیوان کی تیاریاں کر رہے ہیں اپنا کام بھی اسی سے چلتا ہے۔ غلطی یہ ہو گئی کہ اِس بار اُس پر اشعار کی تعداد کی پابندی نہیں لگائی تھی۔"

"پھر؟"

"پینتیس اشعار کی غزل کہہ لایا۔ کہنے لگا کچھ زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا بھائی میں صرف پندرہ شعر خرید سکتا ہوں۔ اتنا ہی بجٹ ہے مگر اڑ گیا کہنے لگا پوری غزل بیچوں گا۔ خریدنی ہے تو خرید لو ورنہ کہیں اور قسمت آزماؤں گا، بڑی مشکل پیش آ گئی تھی۔ بالآخر اِس بات پر جھگڑا ختم ہو گیا کہ کتنے شعر اصل قیمت پر خریدنے ہیں اتنے اصل قیمت پر خرید لوں۔ باقی کے آدھے پیسے لگاؤں اور مجبوراً پوری غزل خریدنی پڑی، تو بھائیو بیس اشعار برائے فروخت ہیں چار روپے فی شعر کے حساب سے قبول فرمائیے اور اسی روپے اِس خادم کی نذر کر دیجئے گا۔"

حِنا دلچسپی سے باقر باقری کی یہ بکواس سُن رہی تھی لوگ اُس کا مذاق اُڑاتے رہے تب حِنا نے کہا۔

"ذرا غزل تو دِکھاؤ، ہے کیا اِس میں؟"

اور باقر باقری نے اُسے گاہک سمجھ کر جلدی سے وہ غزل اُس کے سامنے پیش کر دی۔ حِنا اُس پر نگاہیں دوڑانے لگی۔

وہ اکیلا، برف سی ٹھنڈک، گلابی سردیاں
آزمائیں گی اُسے کب تک گلابی سردیاں
اوڑھ کر سوتا رہا ہے خود وہ ریشم کا لحاف
دیتے دیتے تھک گئیں دستک گلابی سردیاں
سرد لمحوں سرد راتوں کے ہم عادی ہو گئے
دے نہیں سکتیں ذرا بھی ذک گلابی سردیاں
پھر وہی ٹوٹا دریچہ پھر وہی اُجڑا گواڑ
آ گئیں پھر میری کٹیا تک گلابی سردیاں
گرمیوں نے تاک بن کر تن بدن جل جل ڈسا
چاٹتی ہیں بن کے اب دیمک گلابی سردیاں

وہ غزل کے اشعار پڑھتی رہی۔ ایک ندرت تھی۔ ایک نیا انداز تھا۔ دِل زور سے دھڑکا۔ آنکھیں باقر باقری کی جانب اُٹھ گئیں۔ زبان وہی تھی، لہجہ وہی تھا، انداز وہی تھا، غزل اچانک ہی اُس کی نگاہوں میں اہمیت اختیار کر گئی۔ لیکن اُس نے باقری پر اِس کا اظہار نہیں کیا اور غزل اُس کی طرف بڑھاتی ہُوئی بولی۔

"بہت عُمدہ ہے مگر اِس کے بقیہ اشعار کہاں ہیں؟"

"وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔ دیکھیں ناں صُورتحال آپ سمجھ رہی ہیں۔ بل... لیکن آپ یہ کاغذ مجھے واپس کیوں دے رہی ہیں، میرا خیال تھا کہ آپ کو یہ غزل پسند آ گئی ہے۔"

"ہاں بے شک بہت عُمدہ ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد تمہیں اِس کی ادائیگی کر دوں گی۔"

"تو رکھ لیجئے۔ رکھ لیجئے پیسوں کی کوئی بات نہیں ہے ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی ایسا ویسا مسئلہ تو نہیں ہے۔" باقری نے خوشامدانہ انداز میں کہا اور اُس نے کاغذ لپیٹ کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔

"تھوڑی دیر بعد آپ مجھ سے اِس کی رقم لے لیجئے۔"

"میں نے عرض کیا ناں کہ کوئی بات نہیں ہے۔" باقر باقری مسکین انداز میں بولا۔

حالانکہ یہ بات ابھی ثابت نہیں ہُوئی تھی کہ یہ غزل ثاقب ہی کی ہے۔ لیکن اُس کے الفاظ اور اُس کا اسلوب بتا رہا تھا کہ وہی بول رہا ہے اور پھر باقر باقری کے الفاظ ایک ایسے ہی پھکڑ قسم کے شخص کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔ جو ثاقب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ حِنا کے ذہن پر ثاقب سوار ہو گیا تھا۔ بہت دِن گُزر چکے تھے، لیکن یہ امیرزادی اُسے نہیں بھول سکی تھی اُس نے باقر باقری کو کینٹین میں طلب کر لیا اور پھر سو روپے کا ایک نوٹ اُس کے حوالے کرتی ہُوئی بولی۔

"تمہاری غزل کے بقیہ اشعار بھی میں نے خرید لیئے۔"

"بب... بیس روپے کھلے نہیں ہیں میرے پاس۔" باقری نے کہا۔

"اوہ نہیں ڈیئر، ایسی بھی کیا بات ہے، بیس روپے میری طرف سے رکھ لو۔ ویسے بھی تم نے کہا کہ ابھی مہینے کے بارہ دِن باقی ہیں اور تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"خُدا سلامت رکھے۔ ہر طرح کی خوشیاں نصیب ہوں۔" باقر باقری گڑگڑاتے ہُوئے بولا۔ بہت دلچسپ شخصیت کا مالک تھا وہ۔ چند لمحات کے بعد حِنا مطلب پر آ گئی۔

"باقری! ایک بات بتاؤ مجھے۔"

"ضرور... ضرور، فرمائیے۔" باقری نے دست بستہ کہا۔

"شاعر کا نام کیا ہے؟"

"وہ... وہ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں بھئی کیسی باتیں کرتے ہو، کیا میں اِس قسم کی ہوں؟"

"بالکل نہیں... بالکل نہیں۔ ثاقب کہلاتا ہے یہ۔" باقری نے جواب دیا۔

"بہت اچھا شاعر ہے۔ میں اِس سے مِلنا چاہتی ہُوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ آپ بھی اُس کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں؟"

"ہاں بھئی، لیکن مشاعروں میں غزلیں پڑھنے کے لئے نہیں بس ایسے ہی اِس قسم کے لوگوں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو میں مِلا دُوں گا۔ آج تو ذرا مصروفیت ہے کل اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ وہاں چلئے گا۔ ویسے شام کا وقت موزوں رہے گا۔ پانچ یا چھ بجے۔"

"اُس وقت تم مجھے کہاں مِلو گے؟"

"جہاں آپ حکم دیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" حِنا نے اُسے وقت اور جگہ بتا دی اور باقری نیازمندی سے گردن خم کر کے وہاں سے باہر نکل گیا۔

حِنا ثاقب کے خیال میں کھو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اِس شاعر نے اُس کے ذہن پر قبضہ جما لیا تھا اور وہ اُس کے سِلسلے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی تھی یا پھر یہ شوق بھی ہمیشہ کی مانند تھا۔ بڑی متلوّن مزاج تھی وہ، اپنے آپ میں مست، اپنی دُھن میں کھوئی ہُوئی۔ جو شئے پسند آئی اُس پر قبضہ جمانے کی فکر شروع کر دی، جو ناپسند آئی خواہ وہ کسی بھی حیثیت کی حامل ہو اُس کی نگاہ میں جگہ نہیں پا سکتی تھی۔ یا تو اِس شاعر کا اندازِ بیان یا اُس کا پھکڑپن یا اُس کا خوبصورت چہرہ کوئی چیز ایسی ضرور تھی جو اُس کے دِل کو بھا گئی تھی اور اب وہ شاعر کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

باقر باقری سے اُس کا پتہ مِلا تو خُوشی سے پھولی نہ سمائی اور پھر انتظار کے لمحات بڑے کٹھن گزرے۔ وقتِ مقررہ پر اُس جگہ پہنچ گئی، جہاں باقر کو آنے کی ہدایت کی تھی۔ باقر اُس کا ممنون کرم تھا اور پھر یوں بھی بڑے لوگوں سے شناسائی اور دوستی کار آمد رہتی ہے۔ چنانچہ باقر وہاں موجود تھا۔ اُس نے اپنی کار کا دروازہ کھول دیا اور باقر اُس کے ساتھ آ بیٹھا۔ راستے میں وہ کہنے لگا۔

"جس جگہ ہم چل رہے ہیں وہ اِس کار کے شایانِ شان نہیں تھوڑا سا فاصلہ پیدل بھی طے کرنا پڑے گا۔"

"اوہو، کیا وہ بہت گندی جگہ رہتا ہے؟"

"شاعر اور کہاں رہ سکتا ہے محترمہ؟" باقر نے جواب دیا۔ اور اُس نے ہونٹ سکوڑ کر گردن ہلائی۔

تعجب کی بات ہے، یہ شاعر ایسے کیوں ہوتے ہیں؟ یا ایسے لوگ شاعر کیوں ہوتے ہیں؟ تمام ہی شاعروں کا ایسا ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہوتا ہے، بہت کم ایسے ہوں گے جنھیں خوشحال دیکھا ہو گا۔

بہرطور باقر باقری کا کہنا بالکل دُرست تھا۔ جگہ واقعی بہت گندی تھی۔ ایک عجیب سی جگہ باقر نے گاڑی رُکوا دی۔ سامنے ہی موٹر گیراج تھے ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام ہو رہا تھا دھڑ دھڑ کی آوازیں اُبھر رہی تھیں، بوسیدہ اور نیچے نیچے مکانوں کے درمیان ایک پتلی سی گلی نکالی گئی تھی اور اُس کے بیچوں بیچ گندہ پانی بہہ رہا تھا۔ وہ اِس گندے پانی سے گُزر کر آگے بڑھتے رہے اور حِنا نے ناک پر رُومال رکھ لیا۔ نہ جانے کیوں اُسے شاعر کی شخصیت کچھ ہلکی لگنے لگی تھی۔ بالآخر ایک گھر کے دروازے کے سامنے وہ رُک گئے۔ دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔ باقر نے دستک دی۔ اندر سے کچھ آوازیں بلند ہو رہی تھیں، پھر ایک آواز سُنائی دی۔

"ارے کیا مذاق ہے بھائی اِس گھر کے دروازے دستک کے لئے نہیں ہیں، جس کا دِل چاہے آ جائے۔ ہم نے جہانگیر کو شکست دی ہے۔"

باقری نے حِنا کی طرف دیکھا اور دونوں اندر داخل ہو گئے، چھوٹا سا صحن، جسے صحن نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ جسے برآمدہ نہیں کہا جا سکتا تھا اور پھر ایک کمرہ جسے اگر دِل چاہے تو کمرہ کہہ لیا جائے ورنہ وہ کمرہ بھی نہیں تھا برآمدے کے تخت پر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہُوا تھا اور سامنے ہی وہ کھڑا تھا۔ وہ بے نیازانہ انداز، بکھرے ہُوئے بال۔ بڑھی ہُوئی داڑھی، چمکتی ہُوئی آنکھیں مُسکراتے ہُوئے ہونٹ، البتہ تخت پر بیٹھا ہُوا شخص برہم نظر آ رہا تھا۔

"اے بابا تمہارا مہمان آ گیا اب اپن چلتا پڑا۔ پن ایک بات سُن لو ثاقب بھائی۔ اپن کو پیسہ چاہیئے، پیسہ ضرور مِلنا چاہیئے۔ ورنہ اپن قانون کا سہارا لے گا۔"

"سہاروں کے بغیر اِس دُنیا کا کاروبار نہیں چلتا ہے فضل بھائی۔ ویسے آپ کو اِس گندے سے محلّے میں یہ عالی شان عمارت تعمیر نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ اِس محلّے میں تو وہی لوگ رہ سکتے ہیں جن کا کوئی سہارا نہ ہو۔ بہرحال آپ قانون کا

سہارا نہ لیں۔ میں کچھ نہ کچھ بندوبست کروں گا۔ ارے باقری ایک بات تو سنو بھئی" اُس نے جنا کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔ جیسے کوئی بے حد حسین، بے حد نفیس لڑکی اُس کے گھر نہ آئی ہو۔ ایک معمولی سی شخصیت باقری کے ساتھ چلی آئی ہو۔ بڑا لاپرواہ تھا وہ۔ بڑا لاابالی تھا۔

"کہو ثاقب بھائی کیا بات ہے" باقری نے کہا۔

"یار یہ اپنے فضل بھائی ہیں۔ اپنے لینڈلارڈ اور یہ لینڈ انہی کا ہے جس پر میں قیام پذیر ہوں۔ فضل بھائی باقری میری غزلوں کا تھوک خریدار ہے۔ اگر نہیں بھی ہوتا تو کہیں نہ کہیں سے یہ خریدار مہیا کر دیتا ہے ابھی آپ کے سامنے بات ہوئی جاتی ہے، ہو سکتا ہے آپ کا کام بن جائے۔ ہاں تو بھئی باقری - یار فضل بھائی کا ایک سال کا کرایہ چڑھ گیا ہے اور بلا شبہ اب تو مجھے بھی تھوڑی تھوڑی سی شرمندگی ہونے لگی ہے۔ سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں اور بارہ مہینے میں تین سو پینسٹھ دن اور ان تین سو پینسٹھ دن میں تقریباً ایک سو پینسٹھ دن ہمارے فضل بھائی میرے پاس ضرور آتے ہیں۔ ویسے تو مجھے ان سے بہت محبت ہے۔ لیکن یکطرفہ محبت - یہ محبت کا جواب محبت سے نہیں پیسے سے چاہتے ہیں اور پیسہ میرے پاس نہیں ہے۔ یار تم یوں کرو کچھ گاہک پیدا کرو۔ تھوڑی سی غزلیں، نظمیں اور گیت اگر سیل ہو جائیں تو بڑا کام بن جائے گا ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں فضل بھائی بیچارے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے"

باقری نے مسکراتی نگاہوں سے جنا کو دیکھا۔ اور جنا نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کرایہ ہے اس گھر کا؟"

"جج... جی" باقری بولا۔

"میرا مطلب ہے فضل بھائی کا کتنا کرایہ ہے ثاقب صاحب پر؟"

"اسّی روپے ماہوار کے حساب سے نو سو ساٹھ روپے"

ثاقب نے جلدی سے جواب دیا اور جنا نے پرس کھول کر ایک ہزار کا نوٹ نکال کر فضل بھائی کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ بارہ مہینے کا کرایہ آپ رکھ لیجئے"

"ارے... ارے محترمہ آپ کیوں یہ تکلیف کر رہی ہیں؟" وجیہ ثاقب نے چونک کر کہا۔

"میں بھی غزلوں، نظموں اور گیتوں کی تھوک خریدار ہوں۔ مگر مال تو آپ نے پسند کیا ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے مطلب کا مال اس وقت نہ نکل پائے"

"اگر اس وقت کچھ کمی ہوئی تو بعد میں پوری کر لی جائے گی" جنا نے کہا اور ہنس پڑی۔

"یار فضل بھائی آدمی آپ بہت کمینے ہیں۔ ایسا کریں چھ مہینے کا کرایہ رکھ لیں۔ باقی پیسے مجھے واپس کر دیں۔ اب دیکھیں ناں مجھے بھی تو زندہ رہنا ہے"

"ارے بابا بس ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ پن ایک بات سنو۔ کرائے کا بندوبست کر لیا کرو۔ ورنہ مکان خالی کرنا پڑے گا"

"بہتر ہے کہ اب آپ تشریف لے جائیے اور ہاں وہ چالیس روپے آئندہ کے حساب میں لگا لیجئے۔ آپ کے پاس یقیناً کھلے نہ ہوں گے"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ابھی اگلے مہینے چالیس روپے خود دے دینا" فضل بھائی نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

اُنہیں خطرہ تھا کہ کہیں آنے والے چلے نہ جائیں۔ اور ثاقب اُن سے ہزار روپے کا نوٹ چھین نہ لے۔ ثاقب نے تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خاتون! تخت پسند کریں گی یا اندر چلیں گی۔ ویسے میرا خیال ہے جہانگیر کے دربار میں تخت مل جائے تو بڑی بات ہے، بیٹھو یار باقری اندر سے کرسی نکال لاؤ"

"میں آپ کے کمرے کا جائزہ لینا چاہتی ہوں"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے اب تو آپ کو میرے لباس کی تلاشی لینے کا حق بھی ہے۔ کیونکہ آپ نے بہت بڑی خریداری کی ہے۔ ویسے باقری کچھ تعارف ہو جاتا تو بہتر تھا"

"یہ جنا ہیں۔ جنا آفندی۔ اور یہ ثاقب ہیں"

"ثاقب صاحب! آپ کا تخلص ثاقب ہے یا نام؟"

"محترمہ میں شاعر نہیں ہوں۔ شاعری کا دکاندار ہوں۔ اور کسی دکاندار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا تخلص بھی اختیار کرے چنانچہ خادم صرف ثاقب ہے"

"خوب" جنا تخت پر بیٹھ گئی۔

"باقری کچھ چائے کا بندوبست کر دو یار" ثاقب نے جھینپے ہوئے سے انداز میں کہا اور باقری اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر بولا۔

"کیا چائے بنانی پڑے گی؟"

"نہیں، وہ جو ڈیفنڈر بیٹھا ہے ناں اُس کے برابر میں... چھوٹا سا چائے کا ایک کیبن ہے۔ بس وہاں بول آؤ... میرا نام لے دینا"

باقری خاموشی سے باہر نکل گیا۔ جنا مسکراتی نگاہوں سے

اُسے دیکھنے لگی تھی۔

"ثاقب صاحب! دل تو چاہتا ہے کہ ہزاروں باتیں کر لی جائیں آپ سے، لیکن اس وقت یہ ہزاروں باتیں کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں آپ کو جاننا چاہتی ہوں"

"ایک شعر بطور نمونہ مفت قبول فرمائیے۔

ہوتے ہوں گے اس دنیا میں عرش کے دعویدار بلند
پستی کے ہم رہنے والے نکلے آخر کار بلند
کب کی ہے ہم نے ضد تم سے اپنی اونچی ہستی کی
کیسی بحث تقاضا کیا، تم ہو ہم سے یار بلند

ویسے معاف کیجئے بس شعر سنانے کو جی چاہا تھا۔ اسے کسی سمت منسوب نہ کیجئے گا"

جنا مسکراتی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔

"آپ کی بلندیوں کی تو میں دل سے قائل ہوں ثاقب صاحب لیکن جو ہزاروں باتیں میرے سینے میں ہیں اُن کا کیا کروں؟"

"محترمہ! آپ نے فضل بھائی سے ہماری جان مزید ایک سال کے لئے بچا دی۔ اس کے نتیجے میں آپ جتنی چاہیں باتیں کریں۔ جتنے چاہیں اشعار کہلوائیں۔ دراصل آج کل تھوک خریدار ملتے کہاں ہیں؟"

"میں آپ سے بہت متاثر ہوں ثاقب صاحب - میں چاہتی ہوں کہ آپ سے ملاقاتیں کرتی رہا کروں"

"دیکھیے اب ہم اُن خودداروں میں سے نہیں ہیں جو کسی کا احسان لینا قبول نہیں کرتے۔ وقت نے ہمیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی زندگی میں خوددار رہے ہوں، یاد نہیں۔ چنانچہ آپ نے اگر ہمیں اس قابل سمجھا ہے تو ضرور ملتی رہیے گا۔ ہمارا بھی بھلا ہو جایا کرے گا"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ فن کی جن بلندیوں پر ہیں غالباً اپنی لاابالی فطرت کی وجہ سے اُن سے بھی واقف نہیں"

ثاقب ہنسنے لگا تھا پھر بولا۔

"ہمارے واقف ہونے یا نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا خاتون، باقری نے آپ کا نام شاید..." وہ رکا۔

"جنا" جنا نے جواب دیا۔

"جی ہاں۔ جی ہاں! معافی چاہتا ہوں۔ تو جنا صاحبہ، عرض یہ کر رہا تھا کہ ہم اگر اپنے آپ سے واقف ہو جائیں تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے، زندگی دوسروں کے لئے گزرتی رہے یہی کافی ہے"

"بڑی عجیب بات ہے" جنا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو ہم آپ کی کیا خدمت کریں اس سلسلے میں۔ آپ اگر چاہیں تو اندر تشریف لے آئیں مگر پہلے چائے پی لی جائے یہ باقری ابھی تک نہیں آیا۔ پتہ نہیں کیوں اور کہاں اٹک گیا؟"

چند ہی لمحات کے بعد دروازے کے دوسری طرف سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ لیکن اُن کا مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ثاقب نگاہیں اُٹھا کر اُدھر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد باقری بھنّایا ہوا سا اندر آ گیا۔

"عجیب جاہل آدمی ہے۔ بدتمیز، بیہودہ، لغو"

"خوب... خوب کس کی شان میں قصیدہ خوانی ہو رہی ہے؟"

"یار یہ چائے والا۔ میں نے اُس سے کہا کہ چائے لے کر میرے ساتھ چلو، مجھے روک لیا۔ چائے تیار کی اور جب یہ کیبن کے دروازے پر پہنچا تو عجیب نامعقول باتیں کرنے لگا۔ یہاں چائے منگوائی گئی ہے۔ میں نے کہا ہاں تو بولا پیسے تم دو گے یا وہ شاعر صاحب دیں گے؟ میں نے کہا وہی دیں گے۔ تو بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا کمبخت کہہ رہا تھا کہ کبھی ہمارے باپ نے بھی چائے پی ہے"

"اوہو ذرا غیر شاعرانہ قسم کا آدمی ہے۔ خیر تو محترمہ جنا بات کچھ عجیب سی ہو گئی۔ لیکن اس کم بخت کی چائے اچھی بھی نہیں ہوتی۔ استعمال شدہ پتی شامل کرتا ہے چائے میں۔ میں خود آپ کو یہاں چائے پلانا نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن میں نے سوچا جب آپ آئی ہیں تو کچھ تو خاطر ہونی ہی چاہیئے"

"اور میری درخواست اگر آپ قبول کر لیں تو میں آپ کی شکرگزار ہوں گی"

"کون سی درخواست؟"

"آئیے چلتے ہیں۔ باہر چل کر چائے پیئیں گے"

"میرے دل کی بات چھین لی آپ نے جنا صاحبہ" باقری بولا۔ ثاقب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے جیسا آپ پسند کریں۔ چلیئے" اُس نے سامنے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا اور جنا دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

باقری نے اپنے حلیئے اور لباس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ دروازے سے باہر نکلا تو جنا نے پوچھا۔

"تالا نہیں لگائیں گے آپ دروازے کو؟"

اِس سوال پر وہ بہت زور سے ہنسا تھا۔

"اچھا مذاق ہے پسند آیا۔ محترمہ آپ نے اس گھر کا سرمایہ دیکھ

لیا۔ کوئی چور اگر اندر داخل ہو بھی جائے تو جس کا منہ دیکھ کر گھر سے چلا ہو گا اُس کی واپس جا کر پٹائی ضرور کرے گا، ایسی بے تکی جگہ تو اُسے دھات کا لوٹا بھی نہیں مل سکتا۔ پلاسٹک کے لوٹے کی ٹونٹی غائب ہے، باقی جو کچھ ہے آپ نے دیکھ ہی لیا۔ ہاں کچھ غزلیں، نظمیں، گیت، اشعار وغیرہ ضرور پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اِن کے لئے چور کا شاعر ہونا ضروری ہے ورنہ وہ چیزیں ہاں تو ردی کے بھاؤ بھی نہیں بکیں گی۔"

حِنا ہنستی رہی۔ وہ اُن دونوں کے ساتھ اپنی کار تک آگئی۔ عقبی دروازہ کھولا تو باقری اندر بیٹھ گیا ثاقب اپنی فطری لاپرواہی سے حِنا کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ حِنا نے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ حِنا کی قیمتی کار سے ذرّہ برابر مرعوب نہیں ہوا تھا اور نہ ہی یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی کار میں پہلی بار بیٹھا ہے۔ شخصیت کی یہی خوبی تو حِنا کو بھائی تھی فردوسی بیگم کے مشاعرے میں اُس نے جس لاأبالی پن کا مظاہرہ کیا تھا وہی اُس کی فطرت میں اِس وقت بھی موجود تھا۔ پھر اُس عمدہ سے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے بھی اُس نے کسی قسم کے تکلف کا اظہار نہیں کیا تھا اور اندر پہنچ کر اِس طرح کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا جیسے یہ جگہ بھی اُس کے لئے اجنبی نہ ہو۔ باقری کی موجودگی حِنا کو کھل رہی تھی۔ لیکن یہ باقری کا احسان تھا کہ اُس نے اُسے ثاقب تک پہنچا دیا تھا ثاقب سے مل کر حِنا کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی تھی جدید دور کی جدید لڑکی نفاستوں میں زندگی تو گزارتی ہی رہی تھی۔ اُسے یہ تبدیلی ہی شاید بھائی تھی۔

چائے کے ساتھ دیگر لوازمات بھی آئے اور حِنا اُس کی تواضع کرنے لگی۔ باقری سب کچھ بھول کر کھانے پینے میں مصروف ہو گیا تھا۔ حِنا چاہتی تھی کہ وہ اُٹھ کر چلا جائے لیکن یہ جرأت شاید اُس میں بھی نہیں تھی کافی دیر تک اُن لوگوں کی نشست رہی۔ اور اِس دوران میں ثاقب سے گفتگو جاری رہی جب وہ وہاں سے اُٹھے تو حِنا نے کہا۔

"باقری! تم چاہو تو جا سکتے ہو۔ اگر کوئی کام ہو تمہیں۔ میں ذرا ثاقب صاحب کو اُن کے گھر تک چھوڑ دوں؟"

"ارے نہیں... نہیں اِس کی زحمت نہ کیجئے گا، چلے جائیں گے" ثاقب جلدی سے بولا۔

"نہیں! ابھی آپ سے کچھ وصول بھی تو کرنا ہے"

"معاف کیجئے گا واقعی غلطی ہو گئی" ثاقب نے کہا۔

"تو پھر حِنا صاحبہ، مجھے اجازت دیجئے، میرے لائق کوئی خدمت؟" باقری بولا۔

"نہیں! تمہارا بے حد شکریہ باقری" حِنا نے کہا۔

"ویسے حِنا صاحبہ! ذرا ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ ہمارے گھر کا سارا شعری ڈیپارٹمنٹ اِنہی کے دم سے چلتا ہے، خاندانی راز بہت کم باہر پہنچائے جاتے ہیں۔ وہ تو یوں سمجھئے کہ ہم نے آپ کے احسان کا بدلہ اُتارا ہے۔ ذرا باہر کے لوگوں سے یہ جگہ محفوظ رکھئے گا ورنہ ثاقب کا سارا سرمایہ لُٹ جائے گا"

حِنا نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُس کے بعد وہ ثاقب کے ساتھ اُس کے گھر آ گئی۔ کمرے میں مدھم سی روشنی کر دی گئی۔ ویسے بھی اب تاریکی پھیل گئی تھی حِنا نے اُس ٹوٹی پھوٹی چارپائی کو دیکھا۔ اُس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے کاغذات دیکھے اور پھر ثاقب کی طرف دیکھنے لگی۔ ثاقب ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دیوار سے ٹکا کھڑا تھا۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے اپنے کمرے کی!"

"حِنا صاحبہ! یہ کمرہ میری اندرونی کیفیات کا غماز ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے میں بھی اپنے اندر سے اِتنا ہی منتشر ہوں"

"وجہ؟" حِنا نے پوچھا۔

"طویل داستان ہے، بے مقصد اور بے معنی اگر اُس میں کوئی دِلکشی ہوتی تو آپ کو بتانے سے اعتراض نہ کرتا"

"ثاقب صاحب! میں تو آپ کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی متمنی تھی۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے آپ سرسری انداز میں مجھے ٹالنا چاہتے ہیں"

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے، میرے بارے میں جاننے سے آپ کو کچھ نہ ملے گا حِنا صاحبہ، شاید میں خود بھی اپنے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ چھوڑیئے اِن باتوں کو۔ آپ سنائیے آپ کے کیا مشاغل ہیں؟"

"پڑھتی ہوں"

"پڑھتی رہیں، اچھی بات ہے، شعر و شاعری سے دلچسپی لگتی ہے آپ کو"

"ہاں اور آپ میرے پسندیدہ شاعر ہیں"

"ارے واہ کیا مذاق کی بات ہے، ویسے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے آپ نے۔ میں شاعر ہوں ہی کب، پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ شعروں کا دُکاندار ہوں"

"میں آپ کو شاعر کی حیثیت سے منظرِ عام پر دیکھنا چاہتی ہوں"

"کاش آپ کا یہ خواب پورا ہو سکتا۔ لیکن اِس کے امکانات نظر نہیں آتے"

"میں اپنے خوابوں کی تعبیر ہمیشہ حاصل کر لیتی ہوں" حِنا نے مغرور لہجے میں کہا۔

"آپ کی قیمتی گاڑی یہی بتاتی ہے"

"طنز نہ کریں۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا"

"بخدا طنز نہیں کر رہا۔ حقیقتوں کو ذرا صاف زبان میں کہہ دینے کا عادی ہوں اور آپ نے جس مہربانی کا ثبوت دیا ہے اُس کے تحت آپ کا شکرگزار بھی ہوں۔ چنانچہ اگر میری کسی بات میں آپ کو تلخی نظر آجائے تو براہِ کرم اُسے طنز نہ سمجھیں"

"توجہ دلانے کا شکریہ" حِنا نے کہا اور پھر ایک کاغذ کا ٹکڑا اُٹھا کر دیکھنے لگی۔

یہاں تو جو کچھ تھا یہی سب کچھ تھا۔ اُس نے کاغذ کے اِس ٹکڑے کو پڑھ کر دیکھا لکھا تھا۔

یہ میعوب سا ہے کہ تم مڑ کے دیکھو
غ۔ کہاں تک غبارِ پسِ کارواں ہے
بظاہر یہ آئندہ ساعت کا پیکر
گذشتہ دِنوں کا دُھواں ہے

اُس نے ایک دوسرا ٹکڑا اُٹھایا لکھا تھا۔

یاد ہیں ابھی تک مجھے وہ گذشتہ ایام
جب میری پہلے پہل تم سے ملاقات ہوئی
کیسے مستی میں فضاء ڈوب گئی تھی جیسے

نِچلا شعر پھٹا ہوا تھا وہ مختلف ٹکڑوں کو یکجا کرتی رہی۔ اور ثاقب مسکراتا رہا، پھر اُس نے کہا۔

"یہاں تو یہی سب کچھ بکھرا ہوا ہے حِنا صاحبہ، کیا کیا سمیٹیں گی؟"

"میں اِن بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کروں گی ثاقب، آپ کی اجازت درکار ہے"

"کیا ملے گا آپ کو؟"

"ذہنی سکون، کیا آپ مجھے اُس سے محروم رکھیں گے؟"

"نہیں۔ میں یہ گناہ نہیں کر سکتا"

"تو پھر کل میں یونیورسٹی سے چھٹی کر رہی ہوں۔ آپ کے گھر کے دروازے تو کھلے ہی ہوتے ہیں"

"ہاں دِل چاہے تو آجائیے گا۔ یہاں آپ کو کوئی دِقت نہیں ہو گی"

بہت دیر تک وہ ثاقب سے باتیں کرتی رہی، اپنے گھر، اپنے ڈیڈی، اپنے مشاغل کے بارے میں بتاتی رہی ثاقب بھی سکون سے اُس کی باتیں سُنتا رہا، پھر حِنا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"اوہ بہت دیر ہو گئی۔ باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ ثاقب صاحب ایک اور جرأت کرنا چاہتی ہوں بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

"نہیں حِنا صاحبہ۔ میں بہت دِن پہلے بُرا مانا کرتا تھا اب نہیں مانتا"

"تو یہ چھوٹی سی پیش کش قبول کر لیجئے" حِنا نے اپنے پرس سے کچھ نوٹ نکال کر ثاقب کی چارپائی پر رکھ دیئے۔ اور تیزی سے واپسی کے لئے مُڑ گئی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں ثاقب یہ نوٹ اُٹھا کر اُس کے مُنہ پر نہ مار دے۔ اُس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ ثاقب پر کیا گزری۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس کی کار اپنے گھر کی جانب جا رہی تھی اور اُس کے ذہن میں ثاقب ہی ثاقب تھا۔ زندگی کی بہت سی بے قاعدگیاں دیکھیں اُس نے ثاقب کی ذات میں۔ ثاقب کے گھر میں۔ لیکن یہ بے قاعدگیاں اُسے بہت دِلکش لگی تھیں۔ ایک شاعر اگر عام لوگوں سے مختلف نہ ہو تو پھر اُس میں حسن ہی کیا، وہ اپنی دُنیا میں کھویا ہوا انسان ہے۔ اُسے دُنیا کی اقدار سے کوئی دِلچسپی نہیں ہے۔ ایسا شخص۔ ایسا شخص زندگی کے لئے کتنا حسین، کتنا دِلکش ثابت ہو سکتا ہے راستے بھر وہ یہی سوچتی ہوئی گھر واپس آئی تھی، اپنی دُنیا کی شہنشاہ تھی۔ کوئی اُس سے بازپُرس کرنے والا نہیں تھا۔

دوسرے دِن یونیورسٹی نہیں گئی۔ تیار ہوئی اور ثاقب کے گھر کی جانب چل پڑی۔ کار پارک کر کے وہ نیچے اُتری۔ اور ثاقب کے اُس ٹوٹے پھوٹے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازے کے کواڑ بھڑے ہوئے تھے۔ اُس نے اُنہیں دھکیلا اور اندر داخل ہو گئی۔ ثاقب موجود نہیں تھا چند لمحات کیلئے تو اُسے یہ سب کچھ بے حد معیوب محسوس ہوا۔ کیسی عجیب بات ہے، کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ ایک اجنبی نوجوان کے گھر میں ایک تنہا اجنبی لڑکی۔ اور وہ بھی اُس کے بغیر، کیا مجھے اِس حد تک جرأت کرنی چاہیئے؟ لیکن پھر اپنے اندر کی خودی اُبھر آئی۔ اور پھر ثاقب کے کمرے سے ایک ایک کاغذ چننے لگی۔ اِن کاغذات کو اُس نے بڑی احتیاط سے محفوظ کیا۔ ہر کاغذ پر

لفظوں کی دولت بکھری ہوئی تھی۔ وہ یہ اشعار پڑھ پڑھ کر جھومتی رہی۔ بڑے عجیب سے احساسات اُس کے دِل میں تھے کیسا عظیم شاعر، کتنا اچھا انسان کس طرح زندگی گزار رہا ہے، بار بار یہ سوال اُس کے ذہن میں پیدا ہوا کہ ثاقب کی یہ حالت کیوں ہے؟

وہ کمرے کی صفائی کرتی رہی۔ ہر سائز کے کاغذ سگریٹوں کے ٹکڑے اور نہ جانے کیا کیا؟ اُس نے الگ الگ جمع کر دیئے تھے، سوچ رہی تھی اِن سب کو دوسرے کاغذات پر منتقل کرائے گی اور اُس کے بعد اِن کے مجموعے ترتیب دیئے جائیں گے، ثاقب کو اب وہ بکنے نہیں دے گی۔

اِنہی خیالات میں ڈُوبی نہ جانے کتنا وقت گزار گئی وہ۔ پھر اُسے باہر قدموں کی چاپ سُنائی دی اور اُس کے بعد ثاقب نظر آیا۔ وہ حیرانی سے مُنہ پھاڑے اُسے دیکھ رہا تھا پھر اُس نے اپنے کمرے پر ایک نگاہ ڈالی اور مُسکرا دیا۔

"اگر میں اچانک ہی گھر میں گھُستا اور آپ موجود نہ ہوتیں تو سوچتا کہیں اور آ گیا ہُوں۔ آپ نے تو میرے کمرے کا حُلیہ ہی بدل دیا۔"

"میں آپ کو بالکل تبدیل کر دُوں گی ثاقب صاحب" اُس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"کیسی ہیں آپ؟ کِس بستی سے آئی ہیں؟ وہ بستی آسمانوں میں ہے یا اِسی زمین پر، سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کیوں؟"

"کِسی کی ذات سے دِلچسپی رکھنے والے اِس دُنیا میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ اچھا شعر، اچھی غزل سُن کر داد دے دینا بہت بڑی عنایت ہوتی ہے، لیکن شاعر کی ذات کو سمیٹنا تعجب کی بات ہے، مجھے تو آپ پر واقعی حیرت ہونے لگی ہے۔"

"اِن حیرتوں کو آپ ذہن سے نکال دیجئے، اور یہ بتایئے کہ اگر میں آپ کی جانب کچھ اور قدم بڑھاؤں تو کیا آپ اِن بڑھتے ہُوئے قدموں کو برداشت کر لیں گے؟"

ثاقب کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ اُس نے مدّہم لہجے میں کہا۔

"حِنا صاحبہ! اب آپ مجھے خوابوں کی وادی میں لے جا رہی ہیں۔ ممکن ہے آپ اپنے کِسی خواب سے چونک کر اپنے آپ پر ہنس لیتی ہُوں۔ لیکن میں نے اگر کوئی خواب دیکھا اور اُس کی تعبیر مجھے نہ مِل پائی تو شاعر مَر جائے گا۔"

"میں آپ کو آپ کے ہر خواب کی تعبیر دے دُوں گی ثاقب، مجھے اپنی ذات پر حق دے دو۔" اُس نے بے اختیار کہا اور پھر خود ہی چونک پڑی۔

یہ الفاظ تو بہت گہرائیوں کے حامل تھے، کیا اِن گہرائیوں کا تعلق میرے دِل سے ہے؟ اُس نے سوچا اور دِل نے کہا کہ ہاں، ثاقب کی شخصیت اُس کے پورے دِل پر تسلط جما چکی ہے۔ اور جب دِل اِس بات کا اعلان کر دے تو بہتر ہوتا ہے کہ فضُول تکلف سے اجتناب کیا جائے۔ وہ ثاقب کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ثاقب غم زدہ ہوگیا تھا۔ تب اُس نے کہا۔

"میں بہت جلدی... بہت تیزی سے دوڑ رہی ہُوں ثاقب۔ لیکن تیز دوڑنا میری عادت ہے۔ اِس عادت کو برداشت کر لیں۔"

"حِنا صاحبہ! آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے مجھے میرا احساس دِلا دیا۔ اِس سے پہلے مجھے اور کوئی نہ مِلا تھا۔" بس یہ الفاظ جیسے اپنے آپ کو سپُرد کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔

✥

حِنا نے ثاقب کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ یونیورسٹی کی دِلچسپیاں کم ہوگئی تھیں۔ زیادہ تر وقت ثاقب کے ساتھ گزر رہا تھا۔ ثاقب میں یہ خُوبی تھی کہ وہ جاہلانہ قسم کے تکلفات کا عادی نہیں تھا۔ جو کچھ اُس کے پاس نہیں تھا وہ اگر اُسے کوئی دے تو وہ اُس سے اجتناب نہیں کرتا تھا۔ خود مانگنے کا عادی نہیں تھا۔ چنانچہ اُس کے لئے نئے تنے، بہت سے تحائف خریدے البتہ جو چیزیں قیمتی تھیں اُن کے لئے ثاقب نے کہا۔

"حِنا صاحبہ! میں آپ کو اِتنا زیرِ بار نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے میری حیثیت ہی میں رکھیں تو آپ کا شکر گزار ہُوں گا۔ میں اِن قیمتی چیزوں کا متحمل نہیں ہو سکتا، صرف ضرورت پُوری ہو جائے کافی ہے۔"

"آپ وعدہ کر چکے ہیں کہ مجھے کسی مسئلے میں نہیں ٹوکیں گے۔" حِنا نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے، لیکن..."

"بس... بس جو کچھ میں کر رہی ہُوں، وہ مجھے کرنے دیا جائے۔" حِنا نے اِس سلسلے میں اور بھی بہت سے اقدامات کئے تھے۔

ثاقب کا سرمایۂ حیات اُس نے جمع کیا اور اپنے ایک خاص آدمی کے سپُرد کر دیا تاکہ وہ اُسے ایک جگہ نقل کر لے۔ اور اِس کام پر بھی اُس نے اچھے خاصے پیسے خرچ کر دیئے تھے۔

یہ تمام کارروائیاں ہوتی رہیں۔ ثاقب اور حِنا مِلتے رہے اور اُن کے درمیان سے تکلفات کے پردے ہٹتے رہے، پھر حِنا نے ثاقب کو اُس کی غزلوں کا پہلا مجموعہ پیش کیا تو ثاقب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُس نے ڈبڈبائی ہُوئی آنکھوں سے حِنا کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"آپ نے میری ذات کے ٹکڑوں کو جمع کر دیا ہے حِنا صاحبہ۔ پتہ نہیں زندگی اب مجھ سے کون سا کھیل کھیلنا چاہتی ہے؟"

"مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے ثاقب؟"

"کیا بتاؤں؟ بس یُوں سمجھ لیجئے کہ بدقِسمتی نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ والدین ختم ہو گئے۔ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن سہارے چھن گئے تو بددِلی اُبھر آئی۔ شعر و شاعری میرا بچپن کا جنون تھا جب اپنوں کو کہیں بھی نہ پایا تو غیروں کی اِس دُنیا میں زندگی گزارنے لگا اور طبیعت میں لاُابالی پن پیدا ہو گیا اور اُس کے بعد انسانیت کی وہ اقدار بھی کھو بیٹھا جن کے ساتھ زندگی گزاری جاتی ہے۔ دُنیا کے بہت سے رنگ دیکھے میں نے حِنا صاحبہ، لوگ اپنے آپ کو صاحبِ اقدار کہتے ہیں لیکن اِس حد تک کہ اُن کی ذات کہیں مجرُوح نہ ہو۔ جہاں اُن کی ضرورتیں، اُن کی اقدار سے اُونچی ہو جاتی ہیں تو وہ اقدار کو مزید نیچا کر لیتے ہیں۔ اور اپنی مطلب براری کر لیتے ہیں۔ دُنیا کے یہ رنگ دیکھنے کے بعد میں نے بھی اپنی اَنا، اپنی خودی اور وہ ساری چیزیں اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دیں۔ جو اِس دور کے لئے بے مقصد سمجھی جاتی ہیں اور جنھیں خود پر مسلط کر کے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ چنانچہ میری یہ حالت ہو گئی حِنا صاحبہ، آپ یقین کیجئے کہ اُس کے بعد سے میں نے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ اپنی ذات کچھ نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص مجھے اپنے آپ سے مُنسلک کر سکتا ہے۔ اُس وقت تک کے لئے جب تک اُسے میری ضرورت ہو اور اُس کی ضرورت پوری ہو جائے تو میں کچھ بھی نہیں ہُوں۔ یہی فیصلہ کیا کہ میں کچھ بھی نہیں اور اِسی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔"

"میرے بارے میں بھی یہی سوچا ہے آپ نے؟"

"نہیں حِنا صاحبہ، وہ جو مجھ سے مُنسلک تھے مختلف تھے۔ آپ نے تو مجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ صرف میرے لئے جیتی رہی ہیں۔ آپ کے بارے میں مَیں بھلا کِس طرح سوچ سکتا ہُوں۔"

"آپ کا بے حد شکریہ ثاقب، حقیقت یہی ہے کہ میرا راستہ بھی صرف آپ کی طرف آتا ہے۔" لاتعداد مواقع ایسے آئے تھے۔

جب حِنا نے نہایت بے تکلفی سے ثاقب سے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو کہا جا سکتا ہے اور اُس کے بعد بھی اگر ثاقب اُس کے دِل کی کیفیتوں کو نہ سمجھ پائے تو اُسے ناسمجھی نہیں بلکہ اجتناب کہا جا سکتا تھا اور ثاقب اُس سے اجتناب نہیں برتنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک دِن پست لہجے میں کہا۔

"حِنا! میں آپ کے وجُود میں مُدغم ہو چکا ہُوں اب ثاقب اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یکجا رکھیں گی تو یکجا رہُوں گا۔ پھینک دیں گی تو منتشر ہو جاؤں گا۔ میں ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونا چاہتا۔"

"مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو ثاقب؟"

"میں نے کہا ناں حِنا، ثاقب کو اب ثاقب کہنا بیکار ہے۔ وہ حِنا کے وجُود میں مُدغم ہو چکا ہے اور اپنے آپ میں کچھ نہیں ہے۔ سوچتا ہُوں کہ میرا کیا ہوگا؟"

"میں تمہیں زندگی کی تمام اُلجھنوں سے نکال لُوں گی۔ ثاقب مجھ پر بھروسہ کرو۔"

"حِنا! یُوں لگتا ہے جیسے تقدیر نے جتنے مظالم کئے تھے۔ اب اُن کا مداوا کرنے پر تُلی ہُوئی ہے۔" ثاقب نے حِنا کا ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہُوئے کہا۔

زندگی کی ساری دِلچسپیاں ثاقب کی ذات میں شامل ہو گئی تھیں۔ اب نہ یونیورسٹی یاد رہی تھی، نہ دوسری محفلیں، صبح کو معمُول کے مطابق نِکلتی، ثاقب کے پاس پہنچ جاتی۔ اُسے ساتھ لے کر کہیں نِکل جاتی یا اُس کے گھر میں بیٹھی اُس سے باتیں کرتی رہتی۔ دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھایا جاتا۔ شام کو اپنے گھر واپسی مجبوری ہوتی تھی چنانچہ وہ واپس چلی آتی تھی۔

آفندی صاحب نے حِنا کو بہت آزادیاں دے رکھی تھیں۔ وہ خود کاروباری آدمی تھے۔ لیکن کاروباری مصرُوفیتوں کے باوجُود کبھی کبھی بیٹی پر توجہ دینا بھی ضروری ہوتی تھی۔ چنانچہ اُنھیں احساس ہونے لگا کہ حِنا کے معمُولات کچھ تبدیل ہُوئے ہیں لیکن اُنھوں نے اِس تبدیلی پر کسی قسم کی تشویش نہیں محسوس کی تھی۔ ذہن زیادہ تر کاروباری اُلجھنوں ہی میں گرفتار رہتا تھا۔ اور اُن کی اپنی مصرُوفیات بھی حد سے زیادہ ہی بڑھی ہُوئی تھیں۔ ایک پاؤں لاہور میں تو دوسرا کراچی میں، دونوں ہی جگہ سے اُن کا رابطہ تھا اور کاروبار عظیم الشان پیمانے پر پھیلا ہُوا تھا۔ تاہم اُنھوں نے ڈِنر پر حِنا سے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

"بھئی حِنا بیٹی۔ ہم تو خیر ہمیشہ سے اِس بات کے معترف ہیں

کہ ہم ضرورت سے زیادہ مصروف رہتے ہیں اور تمہارے ساتھ بہت کم وقت گزرتا ہے ہمارا۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے محسوس کر رہے ہیں کہ تم نے ہم پر بھی توجہ دینا کم کر دی ہے۔ کیا یہ اظہارِ ناراضگی ہے یا تمہاری مصروفیات کچھ بڑھ گئی ہیں؟"

"نہیں ڈیڈی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ یہ اظہارِ ناراضگی ہے اور نہ میری مصروفیات کچھ بڑھ گئی ہیں۔ بس میں آپ کے معمولات میں دخل نہیں دیتی۔"

"نہیں بھئی، کم از کم جب ہمیں فرصت ہوا کرے اُس وقت تو ہم پر توجہ ہونی چاہیئے، آخر ہمارا بھی تو اور کوئی نہیں ہے۔ تمہارے سوا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈیڈی۔ میں آپ کی سب کچھ ہوں۔" حنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکریہ، شکریہ۔ تو اِن معمولات میں تبدیلی کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے؟"

"نہیں ڈیڈی، کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔" حنا نے جواب دیا۔

آفندی صاحب مطمئن ہوگئے تھے اِن دنوں واقعی کچھ فرصت ہی تھی کوئی ایسا اُلجھا ہوا مسئلہ نہیں تھا، جس پر توجہ دینا ہوتی۔ اور یوں بھی کچھ تھکن تھکن سی محسوس کر رہے تھے، اِس لئے بہت سے پروگرام کینسل کر دیئے تھے، حنا معمول کے مطابق یونیورسٹی چلی گئی اور آفندی صاحب کچھ مقامی دوستوں سے ملنے میں مصروف ہوگئے، بہت سے ٹیلیفون کئے۔ بہت سے ٹیلیفون ریسیو کئے اور پھر اُس وقت دوپہر کے تقریباً دو بجے تھے، جب پانچ لڑکیاں کوٹھی میں داخل ہوئیں اور اتفاق سے آفندی صاحب ہی سے اُن کا واسطہ پڑ گیا۔ آفندی صاحب کوٹھی کے برآمدے میں تھے، بچیوں کو دیکھ کر اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہیلو انکل،" لڑکیوں نے انھیں سلام کیا اور پھر اُن میں سے ایک نے کہا۔

"انکل! حنا کہاں ہے؟"

"حنا تو یونیورسٹی گئی ہے بھئی۔"

"جی... ؟" وہ لڑکی حیرت سے بولی۔

"ہاں یونیورسٹی گئی ہے میرا خیال ہے آتی ہی ہوگی، یا پھر ممکن ہے وہاں سے کہیں اور چلی جائے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں انکل، وہ تو دو مہینے سے یونیورسٹی نہیں آئی۔ شکل دیکھنے کو ترس گئے ہم اُس کی۔"

آفندی صاحب کا مُنہ ایک لمحے کے لئے حیرت سے کھلا پھر بند ہوگیا۔ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ وہ خبر واقعی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"بھئی دراصل ہم بے حد مصروف رہتے ہیں، کبھی لاہور کبھی کراچی، حنا پچھلے کچھ دنوں سے تھکن محسوس کر رہی تھی اور اُس نے ہم سے اجازت لی تھی کہ وہ آرام کرنا چاہتی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس نے یہ آرام شروع کر دیا ہے۔ آؤ تم لوگ بیٹھو۔ ہو سکتا ہے آتی ہی ہو۔"

"نہیں انکل ہم لوگ بھی یونیورسٹی ہی سے آ رہے ہیں۔ آپ اُسے ہمارا پیغام دے دیجئے، اُس سے کہئے کہ کم از کم چکر تو لگا لے یونیورسٹی کا سب لوگ پریشان ہیں اور ویسے بھی آج کل کچھ پڑھائی ہو رہی ہے اگر توجہ نہیں دے گی تو نقصان ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے... میں آتے ہی اُس سے یہ بات کہہ دوں گا۔" آفندی صاحب نے کہا۔

لڑکیوں کو اُنھوں نے چائے کی پیش کش کی تھی، لیکن اُنھوں نے قبول نہ کی اور چلی گئیں۔ لیکن آفندی صاحب ساکت ہوگئے تھے۔ گویا اُنھوں نے حنا کے معمولات میں جو تبدیلی محسوس کی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ وہ دو مہینے سے یونیورسٹی نہیں جا رہی تو پھر کہاں جا رہی ہے؟ صبح نکلتی ہے۔ تو کہاں چلی جاتی ہے؟ آفندی صاحب کے ذہن میں اُلجھنیں پیدا ہوگئیں۔ وہ پریشانی سے ٹہلنے لگے۔ حنا کن راستوں پر سفر کر رہی ہے؟ کہیں کوئی غلط بات تو نہیں ہے؟ آفندی صاحب نے ہمیشہ ایک پُر اعتماد باپ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اپنی بیٹی کی بات پر ہمیشہ یقین کیا تھا اور کبھی ایسی فضا پیدا نہ ہونے دی تھی کہ حنا کو اُن سے جھوٹ بولنا پڑے، لیکن یہ سب... یہ سب کیا ہے؟ ابھی فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک کار کوٹھی کے دروازے پر نظر آئی اور پھر اندر داخل ہوگئی۔ آفندی صاحب اُسے دیکھنے لگے تھے۔ کار سے ایک شخص نیچے اُترا۔ اُس کی بغل میں ایک بڑا سا لفافہ دبا ہوا تھا۔ وہ سلام کر کے آفندی صاحب کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر ادب سے بولا۔

"بی بی صاحبہ سے ملنا ہے۔"

"حنا سے؟"

"جی ہاں۔"

"وہ تو گھر پر موجود نہیں ہے، آپ کون صاحب ہیں؟"

"جی میں پبلیشر ہوں۔ رحیم اینڈ سنز کا نمائندہ، یہ کتابت لایا ہوں حنا بی بی کے لئے پروف ریڈنگ کر لیں تو فلمیں بنانے

کے لئے بھیج دوں۔ کیا میں یہ آپ کو دے جاؤں؟"

"دکھاؤ۔ دکھاؤ کیا ہے؟" آفندی صاحب نے کہا اور وہیں اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

اُنھیں اِس سے دلچسپی نہیں تھی کہ کتابت کیسی ہے؟ یا کیا چکر ہے؟ بس وہ یہ جائزہ لینا چاہتے تھے کہ ہو سکتا ہے، اِس سے حنا کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں ایک شعری مجموعہ تھا جو انتہائی نفاست سے آرٹ پیپر پر کتابت کرایا گیا تھا۔ انتساب حنا کے نام تھا اور شاعر تھا ثاقب کوئی تخلص وغیرہ نہیں تھا۔ آفندی صاحب اِن اشعار اور غزلوں کو دیکھنے لگے اِس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ غزلوں سے متاثر ہوگئے تھے اور اُنھیں یہ اشعار بڑے جاندار محسوس ہوئے تھے لیکن ثاقب کون ہے اور حنا سے اُس کا کیا تعلق ہے؟ یہ بات اُن کے ذہن میں اُلجھن بن گئی تھی، تاہم اُنھوں نے یہاں بھی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"آپ جیسا پسند کریں لیکن بہتر یہ ہوتا کہ آپ دوبارہ زحمت کر لیتے اور یہ کتابت شدہ مسودہ حنا ہی کو دکھا دیتے، ویسے اور کیا کچھ چھاپتے ہیں آپ؟"

"بس جناب ہر قسم کی کتب چھپتی ہیں۔ حنا صاحبہ نے خصوصی طور پر ہم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ اُن کا پہلا مجموعہ بہت خوبصورت چھپا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ بھی ہم نے ہی چھاپا ہے۔"

"کہاں بھئی؟ ہم تو کاروباری آدمی ہیں شعر و شاعری کی دُنیا ذرا مختلف ہے۔ ہم جیسے دو اور دو چار، والوں کو اِن چیزوں سے کہاں لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ کیا پہلا مجموعہ بھی ثاقب ہی کا تھا؟"

"جی ہاں بہت اچھے شاعر ہیں۔ کمال کے شعر کہتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ گمنام تھے لیکن اب حنا صاحبہ انھیں منظرِ عام پر لائی ہیں۔"

"واقعی... واقعی اُن کے چند اشعار پڑھنے سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بہت اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں یہ ثاقب صاحب، رہتے کہاں ہیں؟"

"سر مجھے تو یہ بات نہیں معلوم۔ حنا بی بی ہی بتا سکیں گی۔"

"اچھا۔ اچھا، لیجئے یہ کاغذات رکھ لیجئے۔" اُنھوں نے احتیاط سے کتابت شدہ کاغذات پبلیشر کے حوالے کر دیئے اور وہ سلام کر کے گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

آفندی صاحب کرسی کی پُشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ اُن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آ رہے تھے، ثاقب، شاعر، حنا دو مہینوں سے یونیورسٹی سے غائب ہے، بہت سے جملے اُن کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور وہ پریشانی سے بار بار گردن جھٹکنے لگتے تھے۔ یہ ثاقب کون ہے؟ زمانۂ حال میں اور زمانۂ قدیم میں خاص طور سے شاعروں کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ خوبصورت الفاظ، خوبصورت نظمیں، خوبصورت غزلیں کہہ دینا اُن کا مشغلہ ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ اندر سے بھی وہ اتنے ہی خوبصورت ہوں حنا کسی جنجال میں نہ پھنس جائے۔ اِس قسم کے لوگ بہت تیز و طرار ہوتے ہیں اور اُن کے طریقۂ کار مختلف۔ آفندی صاحب کوئی بُری بات نہیں کہنا چاہتے تھے، لیکن انتہائی بے بسی محسوس کر رہے تھے وہ۔ پے در پے کئی واقعات ہوئے تھے جنھوں نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ حنا اگر یہ بتا دیتی کہ وہ یونیورسٹی نہیں جاتی بلکہ اِن دنوں کچھ اور مشاغل ہیں اُس کے تو شاید آفندی صاحب کو کوئی تشویش نہ ہوتی لیکن اُس نے اُن سے یہ بات چھپائی اور ثاقب کے دیوان چھپوائے، مسئلہ کیا ہے؟ کچھ بتانا تو چاہیئے اُسے۔ لیکن اگر وہ نہیں بتانا چاہتی تو اِس کا مقصد ہے کہ اُس کے دل میں کچھ اور پوشیدہ ہے اور آفندی صاحب اُسے کسی غلط چکر میں پھنسنے سے بچانا چاہتے تھے۔ کیا کریں کیا نہ کریں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر دور سے منشی مظفر آتے نظر آئے۔

منشی مظفر ایک ایسی شخصیت تھے جن کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ آفندی صاحب کے ملازم ہیں، دوست ہیں یا بھائی ہیں، بچپن سے آفندی صاحب نے انھیں اپنے ساتھ دیکھا تھا۔ آفندی صاحب کے والد کے زمانے سے منشی مظفر صاحب کے والد بھی اُن کے ساتھ تھے اور اُس کے بعد جب بزرگ ختم ہوگئے تو نوجوانی کا دور دونوں نے ساتھ ساتھ گزارا، اور آج تک وہ ساتھ تھے، منشی مظفر بھی صاحبِ اولاد تھے آفندی صاحب کے ساتھ بھی رہ سکتے تھے، لیکن منشی مظفر کے کچھ مسائل تھے جن کی وجہ سے وہ آفندی صاحب کے ساتھ قیام نہیں کر سکتے تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے علاقے میں رہتے تھے۔ منشی مظفر پر ہر طرح سے اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ کھرے آدمی تھے، کھری بات کرتے تھے اور کسی سلسلے میں لاگ لپیٹ نہیں رکھتے تھے، کبھی اُنھوں نے تکلفات کی حدود عبور نہیں کی تھیں حالانکہ آفندی صاحب نے اُنھیں ہمیشہ اپنا سمجھا تھا۔

منشی مظفر کو دیکھ کر اُنھیں بڑی ڈھارس ہُوئی سول کی کوئی بات منشی مظفر کے علاوہ کسی اور سے کہی بھی تو نہیں جا سکتی تھی چنانچہ اُن کے اشارے پر منشی مظفر اُن کے سامنے بیٹھ گئے اور بولے۔

"کیا بات ہے آفندی صاحب؟ چہرے پر کچھ پریشانی کی جھلکیاں دیکھ رہا ہُوں"

"ہاں مظفر کچھ اُلجھنیں پیش آگئی ہیں"

"کاروباری؟"

"تم جانتے ہو کاروباری اُلجھنوں کو میں کبھی اہمیت نہیں دیتا"

"تو پھر اور کیا اُلجھن ہے تمھیں؟" منشی مظفر نے پُوچھا۔

"بھئی حنا میری اُلجھن بن گئی ہے"

"حنا؟" منشی مظفر تعجب سے بولے۔

"ہاں، مظفر تم سے میری کون سی بات چھپی ہُوئی ہے زندگی جس طرح گزاری ہے حنا کی والدہ کی موت کے بعد اگر میں چاہتا تو جو دل چاہے کر سکتا تھا لیکن میری نیک نیّتی کی تم بھی تصدیق کروگے کہ میں نے کبھی اُن راستوں کا راہی بن کر نہیں سوچا۔ اور حنا کی پرورش میں زندگی صرف کردی۔ میں اُس پر کوئی احسان نہیں ڈالنا چاہتا۔ بلاشُبہ کاروبار میری ضرورت ہی نہیں میرا شوق بھی ہے اور میں اپنے اِس شوق میں زندگی بھر اُلجھا رہا ہُوں چنانچہ حنا کو ہر طرح سے چاہنے کے باوجود بہت سے معاملات میں اُس سے دُور رہا ہُوں اور ممکن ہے میری یہ کوتاہی حنا کی بُراعتمادی کا باعث بن گئی ہو"

منشی مظفر کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا وہ خاموشی سے آفندی صاحب کی صُورت دیکھ رہے تھے تب آفندی صاحب نے کہا۔

"حنا پچھلے دو مہینوں سے یونیورسٹی نہیں جا رہی جب کہ گھر سے وہ باقاعدگی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اُس نے ثاقب نامی کسی شاعر کے دو مجموعے بڑے اہتمام سے شائع کرائے ہیں خیر ادب دوست ہونا بُری بات نہیں۔ لیکن یونیورسٹی سے گُمشدگی اور دوسروں کی اُس سے لاعلمی باعثِ تشویش ہے۔ منشی مظفر! کیا تم یہ ذمّہ داری قبُول کر سکتے ہو کہ حنا کی اِن مصرُوفیات کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ جو یونیورسٹی سے ہٹ کر ہیں"

"یقیناً یہ کام میرے لئے مشکل نہیں ہوگا لیکن بس یہ سوچ لینا کہ میں جو کچھ کہوں گا سچ ہی کہوں گا"

"ظاہر ہے میں سچ ہی سُننا چاہتا ہُوں کیونکہ حقیقت معلوم ہونا بے حد ضروری ہے"

"کتنے دِن تک فرصت ہے؟" منشی مظفر نے پُوچھا۔

"بھئی اِس مسئلے نے ذہنی طور پر اِتنا اُلجھا دیا ہے کہ کوئی اور کام شاید شروع نہ کر سکوں"

"تو ٹھیک ہے مجھے کم از کم ایک ہفتے کی مُہلت درکار ہے" منشی مظفر نے کہا اور آفندی صاحب نے گردن ہلا دی۔

منشی مظفر، حنا کی کھوج میں لگ گئے، اُنھوں نے اپنے جتنے بھی وسائل ہو سکتے تھے استعمال کئے، اِس بات کو اُنھوں نے مدِ نظر رکھا تھا کہ آفندی کی عزّت پر حرف نہ آئے، نہایت ہوشیاری سے اُنھوں نے ثاقب کا گھر دریافت کیا جہاں حنا جاتی تھی، بہت ہی احتیاط کے ساتھ اُنھوں نے قُرب و جوار کے لوگوں سے حنا اور ثاقب کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اور اُن کی زیرک نگاہ سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی کہ حنا ثاقب پر فدا ہوگئی ہے اور مفلوک الحال شاعر کے دِن پھر گئے ہیں۔ وہ بہترین لباس میں نظر آنے لگا ہے، عُمدہ ہوٹلوں میں پایا جاتا ہے۔ اور عیش کی زندگی گزار رہا ہے بلکہ بعض پڑوسی تو اِس سلسلے میں چھان بین پر بھی آمادہ تھے کہ یہ نواب زادی کون ہے۔ جس نے تباہ حال شاعر کے دِن بدل دیئے ہیں یہ تمام معلومات ہی کافی نہ تھیں منشی مظفر نے، اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے ثاقب اور حنا کو دیکھا تھا۔ اور حنا کے والہانہ پن کا اندازہ بھی اُنھیں بخُوبی ہوگیا تھا۔ یہ معلومات اُن کے لئے بھی کافی افسوسناک تھیں۔ ظاہر ہے آفندی صاحب یہ سب کچھ سُن کر خوش نہیں ہوں گے۔ تاہم اُنھیں حقیقتوں سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا چنانچہ منشی مظفر آفندی صاحب کے سامنے پہنچ گئے۔

پانچواں ہی دِن تھا آفندی صاحب سے یُوں تو روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی لیکن اِس سلسلے میں آج پہلی بار آفندی صاحب کے پاس وہ پہنچے تھے، آفندی صاحب نے گہری نگاہوں سے منشی مظفر کا جائزہ لیا اور بولے۔

"یقیناً تم کوئی اہم اطلاع دینے آئے ہو"

"ہاں، حنا کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئی ہیں"

"خُوب، تو کیا اطلاع ہے؟"

"ثاقب ایک نوجوان شاعر ہے، ایک گندی سی بستی کے گندے سے مکان میں کرائے پر رہتا ہے۔ کچھ روز پہلے اُس کے پاس کرایہ تک دینے کے لئے پیسے نہیں ہُوا کرتے تھے شاعروں ہی کی طرح لااُبالی اور بے روزگار ہے۔ کچھ نہیں کرتا لیکن جب سے حنا اُس پر مہربان ہُوئی ہے اِس شاعر کی زندگی بدل گئی ہے۔ پڑوسی تک حیران ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ رئیس زادی کون ہے جس نے شاعر کی تقدیر بدل دی۔ حنا نے ثاقب کے دیوان شائع کرائے ہیں اور یہ دیوان اب شہر کے بُک اسٹالوں پر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تمام تفصیلات ہیں۔ وہ یونیورسٹی کے بجائے اُس کے گھر جاتی ہے اور بعض اوقات پُورا دِن وہیں گزار دیتی ہے"

آفندی صاحب کے بدن میں لرزشیں پیدا ہوگئی تھیں۔ وہ بہت ہی پریشان نظر آنے لگے تھے۔ منشی مظفر نے جو کچھ بتایا تھا اُس پر ذرّہ برابر شک نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا۔ کہ اِس تشویشناک صُورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے؟ بہت ہی پریشان نظر آرہے تھے وہ منشی مظفر نے کہا۔

"آفندی صاحب! یہ مسئلہ اِس طرح حل نہیں ہو سکتا۔ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ اِس کے لئے کچھ سوچنا پڑے گا"

"منشی! یار میری زندگی میں یہ سب سے کٹھن مرحلہ آگیا ہے، مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"یہ بتائیے آفندی صاحب کہ کیا حنا پر کوئی دباؤ ڈال سکتے ہیں؟"

"یہی بات تو سب سے زیادہ باعثِ تکلیف ہے۔ اِس سے پہلے تو میں نے کبھی اُس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا عموماً اُس کی خواہشات کی تکمیل کرتا رہا ہُوں۔ کبھی او کسی بھی وقت میں نے اُسے کسی اُلجھن کا شکار نہیں ہونے دیا لیکن اُس نے میرے لئے یہ اُلجھن پیدا کردی۔ ہوش سے کام لینا چاہئیے تھا اگر ذہن کے نرم گوشے کسی سے متاثر بھی ہُوئے تو وہ ایک ایسا ناکارہ آدمی جس کے مستقبل پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ نئی نسل کا یہ رُجحان بے حد خطرناک ہے اور میں اِسے ایک طویل ترین پس منظر کا حامل سمجھتا ہُوں"

"میں سمجھا نہیں"

"نوجوان اپنے مستقبل سے مایُوس ہیں۔ وہ جان چکے ہیں کہ اب اُن کے لئے نہ بہتر روزگار ہیں۔ نہ بہتر زندگی اگر کہیں چھوٹی موٹی ملازمت مل بھی گئی تو بس اِتنا ہی ممکن ہے کہ لباس پہن لیا جائے، کھانا کھا لیا جائے جب کہ ہر نگاہ میں مستقبل ایک تابناک اور چمکتی دمکتی چیز ہوتی ہے چنانچہ عام طور سے نوجوانوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ مالدار لڑکیوں یا خواتین سے شادی کریں اور اِس طرح مالی آسُودگی حاصل کرلیں، خیر یہ قصّہ تو بہت طویل ہے اور کافی عرصہ سے یہ سوچ ذہنوں میں بیدار ہو چکی ہے لیکن پہلے اِس سوچ کے حامل چند لوگ ہُوا کرتے تھے، اور اب معاشرے کا ایک بڑا حصّہ اِس میں شامل ہو چُکا ہے۔ چنانچہ اگر لااُبالی شاعر نے حنا جیسی لڑکی کو متاثر کرکے یہ قدم اُٹھایا ہے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حنا پر آپ کے کس قدر اثرات ہو سکتے ہیں اور اگر آپ اُسے باز رکھنے کی کوشش کریں تو آپ کو کس حد تک کامیابی حاصل ہو سکتی ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں نے کبھی حنا سے اِس موضوع پر دوٹوک گفتگو نہیں کی ہے۔ بے شک میں اپنی بیٹی سے بہت زیادہ بے تکلف ہُوں لیکن۔ لیکن اِس حد تک کبھی نہیں ہو سکا"

"اِس سلسلے میں آفندی کم از کم تمھیں بڑے اعتماد کے ساتھ قدم اُٹھانا پڑے گا"

"میں کیا کروں؟"

"ایک ہی حل ہے حنا کی شادی کر دو۔ کہیں مناسب جگہ دیکھ کر"

"اوہ! یہ اِتنا آسان نہیں ہے جتنا تم نے کہہ دیا منشی مظفر"

"میں جانتا ہُوں لیکن اِسی مشکل سے گزرنا ہماری کامیابی کی دلیل ہے" منشی مظفر نے کہا اور آفندی صاحب کسی گہری سوچ میں ڈُوب گئے۔

اُن کی زندگی میں سب سے کٹھن مرحلہ آگیا تھا۔

باب

حنا ثاقب کی زندگی میں بہت گہرائیوں تک اُتر گئی تھی اور خود ثاقب حنا کے لئے نہ جانے کیا بن گیا تھا اب وہ اُس سے ہٹ کر سوچنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ زندگی کے مسائل اُس کی نگاہوں میں تھے اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ثاقب کو زندگی بھر کے لئے اپنانے میں بڑی مشکلات سے گزرنا ہوگا۔ لیکن جس کام کا آغاز ہو چُکا تھا۔ اُسے انجام تک پہنچانا بھی ایک ضروری مسئلہ تھا اور اِن دِنوں وہ بڑی سنجیدگی سے اِس مسئلے پر غور کر رہی تھی۔ ثاقب کی فِطرت کا تجزیہ بھی کیا تھا اُس نے اور ثاقب کی فِطرت کا یہ لااُبالی پن ہی اُسے بھا گیا تھا۔ صُورت شکل کا بھی بہت اچھا تھا لیکن اُس کی فِطرت میں جو نُدرت تھی وہی حنا کے لئے باعثِ کشش بنی تھی، البتہ زندگی کے عملی میدان میں آنے کے لئے یہ لااُبالی پن کارآمد نہیں ہو سکتا

تھا اُس نے ثاقب کی فطرت کے چند پہلو تبدیل کر دیئے تھے۔ وہ تنہا زندگی کا عادی تھا۔ چھوٹا سا گھٹن سے بھرا ہوا یہ گھر اُس کی کائنات تھا جس کا کرایہ بھی مہینوں نہ جاتا۔ غزلیں بک جاتیں تو کھانے پینے کا بندوبست ہو جاتا، ورنہ فاقہ کشی بھی کرنا پڑتی تھی۔ لباس کے معاملے میں بالکل لاپرواہ تھا، کبھی غور نہیں کرتا تھا۔ غرض زندگی کا کوئی اصول اُس نے نہیں اپنایا تھا۔
لیکن جب سے حِنا اُس کی زندگی میں شامل ہُوئی تھی اُس نے اپنی باگ ڈور حِنا کے ہاتھ میں دے دی تھی اُس کے احکامات پر عمل بھی کرتا تھا۔ گھر صاف ستھرا کیا گیا، چھوٹے چھوٹے ردی کاغذوں کے ٹکڑے جن پر اشعار لکھے ہُوئے تھے چُن لئے گئے تھے اور نئی غزلوں کے لئے حِنا نے اُسے انتہائی نفیس رائٹنگ پیڈ لا کر دیئے تھے، کچھ ہدائتیں بھی تھیں اُس کے لئے، مثلاً یہ کہ سگریٹوں کے ٹکڑے بھی زمین پر نہ پھینکے جائیں۔ کوئی کاغذ زمین پر پڑا ہُوا نہ ملے، لباس تبدیل کئے جائیں تو سلیقے سے ہینگر پر ٹانگے جائیں جو ضرورتیں تھیں وہ حِنا نے خود پوری کر دی تھیں، ابتداء میں تو چند روز ثاقب کے لئے مشکل گزرے۔ برسوں کی عادت دِنوں میں نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔ لیکن جب کوئی ایسا کام کرتا جس کے سلسلے میں حِنا کی ہدایت مختلف ہوتی اُسے حِنا یاد آ جاتی اور پھر اُس کام میں سلیقہ پیدا ہو جاتا۔ چنانچہ اب اُس کی فطرت بہت حد تک تبدیل ہو گئی تھی۔ مستقبل کے بارے میں اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا جب کہ حِنا اِس سلسلے میں اُلجھنوں کا شکار تھی۔ حِنا نے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ ثاقب کے اندر تبدیل ہونے کی صلاحیت موجود ہے، کسی ایسے آدمی سے اُس کی توقع کی جا سکتی ہے جو تعاون پہ آمادہ ہو، آنے والے وقت میں ثاقب یقینی طور پر ایک نفیس انسان بن سکتا ہے اور یہی بات باعثِ اطمینان تھی، حِنا اِس بات کی توقع کرتی تھی کہ ثاقب اُس سے کبھی مستقبل کی بات کرے۔ لیکن لاابالی شاعر شعروں کی دُنیا میں مست تھا۔ حِنا کی شان میں قصیدہ خوانی اُس کے ایک ایک عضو پر اشعار اور غزلیں ثاقب کے لئے مشکل نہ تھیں۔ اِتنا کچھ کہا تھا اُس نے کہ حِنا مست ہو گئی تھی۔ لیکن زندگی اِن مستیوں میں تو نہیں گزر سکتی، مستقبل کے لئے اور بھی بہت سے مرحلے درپیش ہوتے ہیں۔
جب اُس نے دیکھا کہ یہ شاعر زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہے تو وہ خود ہی چند قدم آگے بڑھ گئی اور اُس دِن جب وہ ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد خاموش بیٹھے لوگوں کے مشاغل دیکھ رہے تھے تو حِنا نے سِلسلۂ گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اُس نے کہا۔
"ثاقب! ہوٹلوں میں، سڑکوں پر، پارکوں میں، تفریح گاہوں میں جو لوگ تمہیں نظر آتے ہیں تم نے کبھی اُن کے بارے میں سوچا؟"
"میں نے ہمیشہ اِن پر سوچا ہے حِنا اور میری یہی سوچ اشعار کا رُوپ دھارتی ہے۔ میں زندگی کو ہمیشہ دوسرے رُخ سے دیکھتا ہُوں اور میری غزلوں اور نظموں کا محور یہی دوسرا رُوپ ہوتا ہے۔ سامنے کے رُخ سے دیکھنے والے سطحی باتیں کرتے ہیں۔ میں سطح کے پیچھے دیکھنے کا خواہشمند ہُوں۔"
"بہت عمدہ بات ہے، اور یہی تمہارے اشعار کی نُدرت ہے۔"
"شکریہ حِنا۔"
"تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا ثاقب کہ زندگی کا ایک ہی رُوپ ہے اور وہ ہے محبت، مختلف شکلوں میں، مختلف انداز میں۔"
"بلاشُبہ محبت زندگی میں شاید سب سے گہرا دخل رکھتی ہے اور کوئی جذبہ اُس سے آگے نہیں ہے۔"
"زندگی جو کچھ چاہتی ہے ثاقب اُس کا تجزیہ بھی تم نے ضرور کیا ہوگا۔ اُن لوگوں کو دیکھو۔ جو ایک دوسرے سے کتنے مطمئن نظر آتے ہیں۔ محبتوں کے ساتھ اپنے اپنے شریکِ زندگی منتخب کر کے اپنی منزل کی جانب گامزن یہ لوگ میں سمجھتی ہُوں کہ اِس دُنیا کے کامیاب ترین لوگ ہیں۔"
"ہاں چھوٹے چھوٹے مسائل تو ہر زندگی میں ہوتے ہیں۔ لیکن محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو اِن مسائل کو عبور کرنے کے لئے پُل کا کام دیتا ہے۔"
"واہ کیا اچھی بات کہی تم نے، لیکن زندگی کا یہ منصب حاصل کرنے کے لئے ہمیں جدوجہد تو کرنا ہی ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"
"بلاشُبہ جدوجہد کے بھی مختلف رُوپ ہیں۔" ثاقب نے جواب دیا۔ حِنا آہستہ آہستہ اُسے مطلب کی جانب لا رہی تھی۔ غالباً لاابالی شاعر نے اُس کے ذہن کی گہرائیوں میں نہیں جھانکا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے، چند لمحات خاموش رہنے کے بعد حِنا نے کہا۔
"میرے اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے ثاقب؟"
"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں۔"
"ہم ایک منزل کی جانب چل پڑے ہیں لیکن کیا اِسی

جگہ رُک کر ہم منزل کے قریب آنے کا انتظار کریں گے؟"
ثاقب عجیب سی نگاہوں سے حِنا کو دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔
"نہیں، قدم اُٹھائے بغیر منزل کی جانب سفر کیسے کیا جا سکتا ہے۔"
"ثاقب! کیا ہم بہت عرصے سے ساکت نہیں ہیں؟ میں نے تمہارے فن کے راستے تمہیں پایا اور اُس کے بعد تمہارے فن کی منزل آگے بڑھائی اور تمہاری ذات تک پہنچی، ثاقب۔ میں ذرا بے حجابی سے کام لے رہی ہُوں ظاہر ہے ہم دونوں کی یہ یگانگت، ایک دوسرے کا ساتھ، ایک دوسرے کا انتظار۔ ایک دوسرے کے قرب کی خواہش کیا اِس بات کا اظہار نہیں ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے سے ویسی ہی محبت کرنے لگے ہیں جیسی دُنیا میں روزِ اوّل سے کی جاتی رہی ہے۔ کیا ہم ایک دوسرے کو پانے کے خواہشمند نہیں ہیں؟"
ثاقب کے چہرے پر ایک تبدیلی سی رُونما ہُوئی اُس نے آہستہ سے کہا۔
"یہ جملے میں بہت عرصے سے کہنا چاہتا تھا حِنا لیکن اپنی اور تمہاری حیثیت کا فرق محسوس کر کے یہ الفاظ میرے سینے میں دم توڑ دیتے تھے، ہاں کہیں کہیں یاسیت کی کچھ جھلکیاں میرے اشعار میں تمہیں مل جائیں گی۔"
"کیا مطلب ثاقب؟ کیا تم اپنے اور میرے ملاپ کو یاس کے ہاتھوں سونپ چکے ہو؟"
"نہیں، لیکن زمانہ ہمیں یہ احساس دِلاتا ہے کہ ہمارے یکجا ہونے میں مشکلات حائل ہیں۔"
"کیا اِن مشکلات کو عبُور کرنے کی ہمت نہیں کی جا سکتی؟"
"کی جا سکتی ہے لیکن بہت کچھ سوچنے کے بعد۔"
"اور اگر یہ مشکلات ہمارے قد سے اُونچی ہو گئیں تو کیا تم اپنا رُخ تبدیل کر لو گے ثاقب؟" حِنا نے پُوچھا۔
"رُخ تو شاید تبدیل نہ کر سکوں لیکن خود کو موت کی آغوش میں دے دُوں گا۔"
"کیا یہ بُزدلی نہیں ہے؟"
"نہیں، حقائق ہیں جو میری نگاہوں کے سامنے بار بار آتے رہتے ہیں۔"
"تم نے کبھی حقائق کا رُخ موڑنے کی کوشش نہیں کی؟"
"اِس کا کوئی ذریعہ میرے سامنے نہیں آتا۔"
"میرے سامنے ہے ثاقب۔ میں نے اِس کا حل سوچا ہے۔ سُنو تم میرے اور اپنے درمیان جن دیواروں کو حائل سمجھتے ہو وہ اخلاق، والدین، دولت یہی دیواریں ہیں ناں؟"
"ہاں میں اخلاق کی دیواروں کے اُس طرف ہُوں۔ والدین کا جہاں تک مسئلہ ہے تو تم جانتی ہو حِنا کہ میرا اپنا راستہ روکنے والا کوئی اِس دُنیا میں نہیں ہے۔ میں تمہاری بات کرتا ہُوں۔ کیا مجھ جیسے بے مایا شخص کو تمہاری زندگی میں شامل کرنے کے بارے میں سوچا بھی جا سکتا ہے؟"
"ہاں کیوں نہیں، یہ سوچ میں بیدار کروں گی ثاقب، لیکن تمہارے شانے کا سہارا لے کر۔"
"میرا تو تمام وجُود تمہارا ہے حِنا، بشرطیکہ یہ بے معنی وجُود سہارا بن سکے۔"
"میں اِس وجُود کو بہت مضبُوط سہارا تصوّر کرتی ہُوں ثاقب، جو کچھ میں کہہ رہی ہُوں اُسے ذرا غور سے سُنو اور وہی کرو جو میں چاہتی ہُوں۔"
"ضرور، مجھے بتاؤ کہ اِس منزل کو پانے کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"
"شعر و شاعری کی دُنیا بلاشُبہ حسن و جمال کی دُنیا ہے۔ اِس میں زبان کے، الفاظ کے پھُول کھِلتے ہیں، اِس میں حسین تخیّلات کے محل بنتے ہیں۔ اِس میں گنگناتے آبشار، بہتی ندیاں، ہرے بھرے درخت، رنگ برنگے پھُول نہ جانے کیا کچھ ہے۔ کائنات کا تمام حُسن اِن اشعار میں سمٹ آتا ہے لیکن اشعار کی دُنیا سے الگ بھی ایک دُنیا ہے جسے عمل کی دُنیا کہا جاتا ہے، سوچ عمل کے بغیر بے مقصد ہوتی ہے ثاقب تم عمل کی دُنیا میں قدم رکھو اور آہستہ آہستہ میری جانب بڑھتے چلے آؤ۔"
"بہت خوبصورت الفاظ میں تم نے اپنا مقصد ظاہر کیا ہے، لیکن حِنا میرے سامنے زندگی کے راستے بند ہیں۔"
"تم اِن راستوں کو ٹھوکر مار کر کھولنے کی کوشش کرو ثاقب، عملی زندگی میں آؤ۔ میں یہ نہیں کہتی کہ شعر نہ کہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ مجھ سے نہ ملو لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ہی تم عملی زندگی میں بھی قدم رکھو، کوئی نوکری تلاش کرو۔ ملازمت کر لو چاہے وہ کیسی ہی ہو۔ بس ایک باعزت اور باوقار ملازمت ہو چاہے وہ کلرک ہی کی کیوں نہ ہو۔ میں تمہیں ایک باعمل آدمی دیکھنا چاہتی ہُوں تاکہ اپنے ڈیڈی سے کہہ سکوں کہ ثاقب بے شک ایک غریب نوجوان ہے لیکن اگر ڈیڈی ہم پر سے ہاتھ اُٹھا

لیں تو میں اُس کے ساتھ محبت کے سہارے زندگی گزار لوں گی۔ یہ میرا عمل ہوگا لیکن اگر تم ایک ناکارہ اور نکمے شاعر کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے رہو گے تو کوئی بھی یہ بات تسلیم نہیں کرے گا کہ تم مستقبل میں کچھ کر سکتے ہو۔"

"بس" ثاقب سنجیدہ نگاہوں سے حِنا کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا: "حِنا! تم ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارے ڈیڈی خود ایک بڑے کاروباری ہیں، کیا تم اِس سلسلے میں میری مدد نہیں کر سکتیں؟"

"ضرور مدد کر سکتی ہوں میں تمہاری۔ لیکن تمہارے لئے میں اپنے ڈیڈی کا سہارا نہیں چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ کل ڈیڈی یہ کہیں کہ وہ شخص جسے انہوں نے ملازمت دی ہے، جسے انہوں نے روٹیاں دی ہیں وہ اُن کی بیٹی کا حقدار کیسے بن سکتا ہے؟ تم خود اِس سلسلے میں کوشش کرو عمل کی دُنیا میں آؤ۔ دیکھو ثاقب، اب میں یہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں کہ تمہارا باعمل ہونا بے حد ضروری ہے۔ تم کل سے اپنے لئے ایک نیا راستہ تلاش کرنے نکلو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ میری محبت تمہارے ساتھ ہے۔"

"اوہ لیکن حِنا اِس دوران میں تم سے ملاقات؟"

"کیوں، مجھ سے ملاقات شام میں بھی ہو سکتی ہے ہم لوگ چاہے دن میں ساتھ نہیں رہیں گے تو کیا ہوگا۔ یہ تو ایک عارضی بات ہے تم اپنی منزل کی جانب آؤ۔ میں اُس کے بعد مستقل تمہاری زندگی سے منسلک ہو جاؤں گی۔ میں اُن تمام آرزو بھری لڑکیوں کی طرح ایک چھوٹا سا گھر بنانا چاہتی ہوں چاہے وہ یہی گھر کیوں نہ ہو۔ اِسی گندے سے محلّے میں کیوں نہ ہو۔ جس میں مجھے گندی گلیوں سے گزر کر، گندی نگاہوں کو سہہ کر تم تک آنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ تمہارا گھر ہوگا ثاقب اور میں فخر سے کہہ سکوں گی کہ میں اپنے گھر جا رہی ہوں یا اپنے گھر میں رہ رہی ہوں۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں حِنا، ٹھیک ہے میں اِس سلسلے میں اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔"

"شکریہ! میں آج تم سے بس یہی کہنا چاہتی تھی۔ تم اپنی منزل کی جانب قدم بڑھاؤ۔ میں تمہارے تعاقب میں آ رہی ہوں۔"

حِنا چلی گئی۔ لیکن ثاقب کے لئے بے شمار پریشانیاں چھوڑ گئی تھی۔ وہ حِنا کا عادی ہو گیا تھا۔ حِنا نے اُس کی زندگی میں دِل کی گہرائیوں تک دخل حاصل کر لیا تھا لیکن باہر کی دُنیا سے وہ ناواقف تھا اور شاید باہر کی دُنیا کے لئے ناموزوں بھی۔ اگر اُس کے سوچنے کا انداز یہ ہوتا کہ شعروشاعری تو رُوح کی لطافت ہوتی ہے ماحول کی کثافت سے بھی کچھ نہ کچھ واسطہ تو رکھنا پڑتا ہے۔ جو ثاقب آج تک نہیں رکھ پایا تھا۔ ورنہ فردوس بیگم کے مشاعرے میں کھانا کھا کر وہ اُن جذبات کا اظہار نہ کرتا۔ یہ غالباً اُس کی فِطرت کا ایک پہلو تھا جو نمایاں تھا۔ اب اِس پر غور نہ کیا جاتا تو یہ دوسری بات ہے۔

اُس نے اپنے طور پر کوششیں شروع کر دیں۔ دُنیا سے کنارہ کش تھا۔ صِرف اُن لوگوں سے اُس کی واقفیت تھی جو اُس کے اشعار کی داد دے دیا کرتے تھے۔ جو اُس کے اشعار خرید لیا کرتے تھے، لیکن وہ لوگ خود بے عمل لوگ تھے دوسروں کی غزلیں خرید کر اپنے نام سے منسوب کر کے سُنانا بے عملی کا انتہائی واضح ثبوت تھا۔ ایسے لوگ بھلا ثاقب کی کیا مدد کر سکتے تھے؟

وہ کسی حد تک پریشان ہو گیا تھا۔ اب وہ دِن بھر نوکری کی تلاش میں جُوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نوکری کے حصُول کے ذرائع کیا ہیں؟ رفتہ رفتہ اُس کی مایُوسیاں بیدار ہوتی جا رہی تھیں۔ اِس سے پہلے اُس کی زندگی میں صرف اشعار سجے ہُوئے تھے، لاأبالی پن، بے فکری، مِل گیا تو کھا لیا۔ نہ مِلا تو نہ سہی۔ زندگی کو اُس نے اِس رنگ میں کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اب حِنا بھی اُس کی زندگی کا ایک جُزو بن چکی تھی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ شاعرِ بے چارہ محبت کے پھیر میں پڑ کر پریشان ہو گیا تھا

رُدا نے اجنبی نگاہوں سے ماحول کو دیکھا۔

کمپارٹمنٹ میں ہلکی روشنی پھیلی ہُوئی تھی،

زیادہ تر لوگ نیم غنُودہ نظر آ رہے تھے۔ ٹرین کے سفر میں سونے کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی رات ہو گئی تھی۔ راستے میں کیا ہُوا تھا رُدا کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ تیمور کو بھی بھُول گئی تھی، خود کو بھُول گئی تھی۔ عجیب کہانی تھی جس نے اُس پر سحر طاری کر دیا تھا اُسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ اِس دُنیا سے واپس نہیں آنا چاہتی تھی۔ وہ دُنیا اُس کی جانی پہچانی تھی۔ اور یہ... یہ سب اجنبی تھے۔ اُس نے اُلجھی نگاہوں سے اُن سب کو دیکھا یہ کون ہیں؟ اور اُس کے اِرد گِرد کیوں بیٹھے ہیں؟

پھر کچھ آوازیں آنے لگیں "چائے گرم، گرم کلیجے، کھانا کڑاکڑ بول رہی ہیں۔ گرم انڈے، دیسی مُرغی کے انڈے گرم"

یہ آوازیں اُسے اُس سحر زدہ ماحول سے واپس لے آئیں۔ اور وہ کپکپا کر رہ گئی۔ اُسے تیمور یاد آیا۔ اُس نے گھبرائی ہُوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔

"کچھ چاہیئے باجی؟" رُشنا کی آواز سُنائی دی۔

"تیمور... تیمور" اُس نے رُندھی ہُوئی آواز میں کہا۔

"کیا باجی؟"

"تیمور کہاں ہے؟" اُس نے پریشانی سے کہا۔

"کون تیمور؟"

"ابھی تھا۔ میرے ساتھ تھا" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

"آپ گُل کے لئے کہہ رہی ہیں؟"

"گُل؟" اُس نے چکراتے ذہن سے سوچا۔ اور پھر جلدی سے سنبھل گئی۔ اُسے یاد آگیا کہ اُس نے تیمور کا نام گُل بتایا ہے۔ وہ جلدی سے گردن ہلاتی ہُوئی بولی "ہاں گُل۔ گُل"

"سو رہا ہے، دودھ پی کر سو گیا ہے"

"اوہ" اُس نے گہری سانس لی اور ڈائری بند کر کے رکھ دی۔ اِس کتاب نے اُس کے حواس چھین لئے تھے۔ لیکن باحواس رہنا ضروری ہے۔ ورنہ کھیل بگڑ جائے گا، یہ لوگ کیا سوچیں گے اُس کے بارے میں، کہیں وہ اُن کی نگاہوں میں مشکوک نہ ہو جائے۔ وہ جھینپے ہُوئے انداز میں مُسکراتی ہُوئی بولی۔

"میں تو جیسے سو ہی گئی تھی"

"کیا پڑھ رہی تھیں آپ؟" رُشنا نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں، میری ڈائری تھی۔ سوری رُشنا گُل کی وجہ سے تمیں بہت تکلیف ہو رہی ہے، لا دو اب اُسے مجھے دے دو"

"رہنے دیں آرام سے سو رہا ہے۔ ویسے آپ اُسے تیمور کہتی ہیں؟" رُشنا نے کہا۔

"ہاں، اُس کا پُورا نام تیمور گُل ہے"

"اوہ، اچھا" رُشنا نے کہا۔ اُسی وقت کسی نے رُشنا کو آواز دی اور وہ اُدھر چلی گئی۔ رُدا گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اُسے یہ سب کچھ بہت بُرا لگ رہا تھا۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اِس ڈائری کو پڑھنا چاہتی تھی۔

اُسی وقت غزال آ گئی "چلیئے باجی کھانا کھا لیں"

"ایں" وہ چونک پڑی۔

"کھانا لگ گیا ہے"

"غزال میں۔ میں.."

"امی بُلا رہی ہیں"

"میرا شکریہ ادا کر دو۔ میں ڈائننگ کار سے کھانا منگوا لوں گی"

"باجی پلیز" غزال نے کہا اور وہ جھلّائے ہُوئے انداز میں اُٹھ گئی۔ یہ لوگ حد درجہ احسانات کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ، بِلاوجہ کے فرشتے، عجیب لوگ ہیں۔ لیکن اُن سے پیچھا چھُڑانے کے لئے یہی بہتر ہے کہ اُن کی بات مان لی جائے، ورنہ جان کو روگ لگا رہے گا" وہ اُٹھ کر اُن کے پاس پہنچ گئی۔

"آپ لوگ بِلاوجہ میرے لئے زحمت کر رہے ہیں دراصل میری کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں اگر بھُوک لگی تو کھانا منگوا لوں گی، برائے کرم آپ کھانا کھا لیجئے"

"تھوڑا بہت بیٹی، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تم بہت زیادہ تکلف کرو، پلیز بیٹھ جاؤ" معمّر خاتون نے کہا اور وہ جھلّائے ہُوئے سے انداز میں بیٹھ گئی، بہرطور اُس نے تھوڑا بہت کھانا کھایا وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آ رہی تھیں۔ اور اُسے خود اپنے جھلّائے جھلّائے سے انداز پر شرمندگی ہو رہی تھی، لیکن بس عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی اُس کی۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر اُس نے کہا "رُشنا! اگر تم چاہو تو میں تیمور کو اپنے نزدیک سُلا لوں۔ جگہ بھی ہے۔ میرا مطلب ہے گُل کو اور اب ویسے بھی رات ہو گئی ہے۔ تمیں بھی نیند آئے گی"

"باجی! آپ اُسے کم از کم اُس وقت تک تو ہمارے پاس رہنے دیں، جب تک ہم یہ سفر کر رہے ہیں اُس کے بعد تو مجبوری ہوگی، اُسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ اور پھر آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ آرام کریں اُس کی بالکل فکر نہ کریں" رُشنا نے کہا اور وہ شکریہ ادا کر کے اپنی جگہ آ بیٹھی۔

باہر گہری تاریکی پھیلی ہُوئی تھی۔ ٹرین نے اِس دوران میں اسٹیشن چھوڑ دیا تھا اور اُس کے بعد وہی لامتناہی سناٹے، وہی تاریکی میں ڈُوبے ہُوئے میدان اور اُن کے آخری سِروں پر نظر آتے ہُوئے دھُندلکے۔

باہر کی فضا سُنسان تھی۔ اسٹیشن اب پیچھے رہ گیا تھا اور اُس کی آخری روشنی بھی نِکل چکی تھی کمپارٹمنٹ میں زیادہ تر لوگ سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اُس خاندان کے افراد بھی بستر وغیرہ دُرست کر چکے تھے۔

اُس نے مگی روشنی میں ڈائری ایک بار پھر کھول لی۔ واپس اُس ماحول میں جاتے ہُوئے تھوڑی سی دِقت ضرور ہُوئی۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد ماحول اُس پر مُسلط ہوگیا۔ الفاظ کرداروں کی شکل اختیار کرگئے اور وہ سب رفتہ رفتہ اُس کے سامنے آگئے۔ اُس نے آفندی صاحب کو دیکھا۔ آفندی صاحب پریشانی سے گردن جُھکائے بیٹھے کِسی سوچ میں گُم تھے، مُنشی مظفر بھی اُن کے سامنے موجود تھے، چند ساعت کے بعد مُنشی مظفر نے کہا۔

"اِس کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے آفندی صاحب! آپ کو ہمّت کرنا ہوگی۔"

"ہاں بھئی میں بے ہمّت آدمی نہیں ہُوں - لیکن بس نہ جانے کیوں عجیب سے احساسات ہو رہے ہیں۔ یہ سوچ رہا ہُوں کہ کہیں میری ذات بھی تو کوئی کہانی بننے نہیں جا رہی۔ تم خود سوچو مُنشی مظفر کیا زندگی گُزاری ہے میں نے اور کِن اُلجھنوں سے واسطہ پڑا ہے میرا۔ خود مَیں نے تو یہ اُلجھنیں کبھی نہیں دیکھیں، زیادہ سے زیادہ قِصّے کہانیوں کی حد تک اِن باتوں سے واقف ہُوں اور اب یہ سوچ رہا ہُوں کہ قِصّے کہانیوں کے کردار میری ہی طرح اُلجھ جاتے ہوں گے، کیسے مظلوم کردار ہوتے ہیں یہ۔" آفندی صاحب کی آواز بھرّا گئی تھی۔ اُن کی آنکھوں کی کوریں بھیگ گئی تھیں۔ اُنھوں نے زندگی میں کاروبار کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر محبّتوں کا تصوّر کیا جاتا تو بیوی کی موت کے بعد ایک ہی ہستی سے محبت رہ گئی تھی اور وہ حِنا تھی۔ لیکن حِنا کی ذات سے کوئی اُلجھن وابستہ ہو جائے یہ اُن کے لئے بڑی تکلیف دِہ بات تھی - مُنشی مظفر گہری گہری سانسیں لینے لگے، پھر اُنھوں نے کہا۔

"آفندی صاحب آپ کو جس طرح بھی بَن پڑے ہمّت کرنی ہوگی۔ کم از کم ایک بار اُس سے بات تو کیجئے اُس سے معلوم کیجئے کہ وہ کیا چاہتی ہے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ آپ خود اُس کی زبان سے اُس کی منشاء سُنیں۔ اپنے طور پر آپ یہ ظاہر کریں کہ آپ اُس کے مُستقبل کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"بس ایک بات سے ڈرتا ہُوں مُنشی۔ اگر اُس نے میری شخصیت کو ٹھکرا دیا تو پھر کیا کروں گا۔"

"یہ تو آپ کو کرنا ہی ہوگا آفندی صاحب اور کوئی صُورتِ حال ایسی نظر نہیں آتی جسے ہم اپنا سکیں۔" مُنشی مظفر حسین نے کہا۔

آفندی صاحب ہمت کرتے رہے اور بالآخر اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ حِنا سے بات کریں گے اور اِس سِلسلے میں اُنھوں نے بالکل صاف سُتھرا طریقۂ کار اختیار کیا۔

اُس صبح ناشتے کی میز پر اُنھوں نے مُسکراتے ہُوئے حِنا سے کہا۔

"بھئی آج تم یونیورسٹی وغیرہ نہیں جاؤ گی - ہماری بہت دِن سے تمھارے ساتھ نشست نہیں ہُوئی - ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہماری آج کی مصروفیات صرف تمھارے ساتھ رہیں گی۔"

"ڈیڈی! کوئی خاص وجہ ہے اِس کی؟" حِنا نے سوال کیا۔

"یُوں سمجھ لو۔ خاص وجہ بھی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ ہُوں لیکن ایک خرابی ہے مُجھ میں ڈیڈی اور وہ یہ کہ اُلجھنوں میں بسر نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی خاص وجہ ہے تو پھر فوراً ہی اُس کا اظہار ہو جانا چاہیئے۔"

"ہاں بیٹے، یقیناً۔ دراصل ایک باپ کی زندگی بڑی عجیب ہوتی ہے اور وہ بھی ایک بیٹی کے باپ کی اور بدقسمتی سے اگر صرف ایک ہی بیٹی ہو، تو پھر باپ کے لئے مستقبل کے مسائل بڑے تشویشناک ہوتے ہیں۔ اب دیکھو ناں زندگی ہم نے کِس طرح گُزار دی۔ بہت سے ایسے مسئلے آتے ہیں جن میں کِسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم نے سوچا چھوڑو ہماری حِنا ہی ہماری ساتھی ہے۔ ہر مسئلے میں ہمارا ساتھ دینے والی۔ سو ہم نے تم پر قناعت کر لی بیٹے، تاہم ہر باپ کی طرح ہمارے دِل میں بھی یہی خواہش ہے کہ ہم تمھیں ایک بہتر مستقبل دے کر اپنے فرائض سے سُبکدوش ہو جائیں۔"

"میرے مستقبل کو کوئی خطرہ ہے ڈیڈی؟" حِنا نے پُوچھا۔

"نہیں بیٹے، بہتر مستقبل سے مُراد وہ زندگی ہے۔ جو ہر شخص کی آرزو ہوتی ہے اور ہر دَور میں اُس کے لئے ایک ہی انداز اختیار کیا جاتا ہے یعنی تمھاری شادی۔"

"اوہ" حِنا کا دِل آہستہ سے دھڑک اُٹھا اور وہ ایک لمحے کے لئے خاموش سی ہوگئی۔ تب آفندی صاحب نے کہا۔

"اور ہم نے اِس سِلسلے میں اپنی پسند کا انتخاب بھی کر لیا ہے۔ ہمارے ایک شناسا ہیں، بہت اچھے آدمی ہیں اُن کا بیٹا بہت اچھی ملازمت پر ہے یُوں سمجھ لو زندگی کے

تمام تعیشات اُنھیں حاصِل ہیں اور یقین کر لو تم اُس گھر میں بے حد خُوش رہو گی۔ ہم نے تو بڑے اعتماد سے یہ بات کہہ دی ہے اُن سے کہ ہم نے زندگی میں جِتنی بھی دولت کمائی ہو۔ لیکن ہماری سب سے بڑی دولت ہماری بیٹی ہے اور ہمیں اُس پر ناز ہے کہ وہ ہمارے کسی مقصد کے آڑے نہیں آتی۔"

حِنا کا مُنہ ایک لمحے کے لئے کُھلا، پھر بند ہوگیا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ فوری طور پر کوئی سِلسلہ کر لیا جائے اور اُس کے بعد ایک وقت کا تعیّن کر لیا جائے جب ہم اِس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔"

"ڈیڈی! یہ مناسب نہیں ہوگا۔" حِنا نے سرد لہجے میں کہا اور آفندی صاحب سہمی ہُوئی نِگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ لیکن دوسرے لمحے اُنھوں نے خود کو سنبھال لیا۔

"کیا مطلب بیٹے، مَیں سمجھا نہیں؟"

"اِس سِلسلے میں کوئی جلدی نہیں ہے ڈیڈی" حِنا بولی۔

"بیٹے! اِس فیصلے کا حق تو ہمارے پاس ہی رہنے دو۔ والدین صدیوں سے اِس حق کے سہارے جیتے رہے ہیں۔"

"نہیں ڈیڈی! صدیوں سے جو حماقتیں ہُوئی ہیں۔ ضروری تو نہیں ہے کہ اُنھیں جاری رکھا جائے، اور پھر یہ رسمیں اصولی طور پر غلط ہیں۔ زمانۂ جہالت میں یہ ہوتا تھا کہ والدین اپنی بھیڑوں کو جس کے حوالے چاہیں کر دیں - لیکن زمانۂ جدید میں یہ تصوّر مِٹ چُکا ہے کہ بیٹیاں، بہنیں اور بیویاں بھیڑیں ہیں۔ اور اُنھیں لکڑی مار کر ایک سمت ہنکایا نہیں جا سکتا، آج کے دَور نے ہر انسان کو اُس کا ایک جائز مقام دیا ہے۔ اور پھر ڈیڈی یہ زندگی بھر کے فیصلے ہوتے ہیں، یہ فیصلے اب والدین کو نہیں کرنے چاہئیں۔ آپ ذرا غور کریں آپ کا کوئی فیصلہ اگر آپ کی اولاد کے لئے غلط ہو جاتا ہے تو یہ قسمت کا فیصلہ تو نہیں ہوتا ڈیڈی، یہ تو آپ کا فیصلہ ہوتا ہے آپ اپنے بچّوں کو یہ حق کیوں نہیں دیتے کہ وہ اپنے مستقبل کے لئے خود ہی جدوجہد کریں۔ بہرطور میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر اِس سِلسلے میں آپ نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو اُسے ملتوی کر دیں۔ میں یہ فیصلہ خود کروں گی ڈیڈی۔"

آفندی صاحب کا خوف ختم ہوگیا اور اب اُس کی جگہ اُن کے مزاج میں کسی قدر جھنجلاہٹ آگئی۔ اور وہ تُرش رُوئی سے بولے۔

"تو پھر اُن رشتوں کو کیا نام دیا جائے گا جو باپ اور بیٹی کے درمیان ہوتے ہیں؟"

"رشتے بدستور قائم رہیں گے ڈیڈی۔ آپ مجھے میری پسند کا لباس پہننے سے نہیں روکتے۔ میرے دوسرے مسائل میں میرے آڑے نہیں آتے تو پھر اِتنے بڑے مسئلے میں آپ اپنی ضِد کو قائم کیوں رکھنا چاہتے ہیں، یہ تو بہت بڑا مسئلہ ہے ڈیڈی۔ اور اگر یہ مرضی کے خلاف ہُوا تو آپ کا کیا خیال ہے کیا میں زندگی بھر خُوش رہُوں گی؟"

"دیکھو بھئی اِس سِلسلے میں ہمیں تھوڑا سا اپنا حق استعمال کرنے کا موقع بھی دو۔ ہم تمھارے لئے جو کچھ فیصلہ کریں گے وہ غلط نہیں ہوگا۔"

"نہیں ڈیڈی۔ میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی ہُوں کہ کسی دوست کے بیٹے سے میری زندگی منسُوب نہ کریں اور اگر آپ اِس سے زیادہ بھی کچھ سُننا پسند کریں تو میں آپ کو یہ بتا دُوں کہ میں اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کر چکی ہُوں۔ اِسے میری بے حیائی نہ سمجھیں ڈیڈی بلکہ میں پورے اعتماد سے یہ بات کہتی ہُوں کہ میں نے اگر کسی شخص کا انتخاب کیا ہے تو میرے اور اُس کے درمیان پاکیزگی کے تمام رشتے برقرار ہیں اور ہم نہایت وقار سے ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔" حِنا نے سنجیدگی سے کہا۔

آفندی صاحب سرد نگاہوں سے حِنا کو دیکھتے رہے، پھر اُنھوں نے اپنے غُصّے کو ضبط کرتے ہُوئے پُوچھا۔

"کون ہے وہ؟"

"ثاقب نام ہے شاعر ہے۔"

"خاندان کیا ہے اُس کا؟"

"انسانوں کے ریوڑ میں سے ایک ہے۔ اور اگر خاندان رشتوں کے حوالے سے بنتا ہے تو اُس کا کوئی خاندان نہیں ہے، وہ اپنے رشتوں میں تنہا ہے۔ اُس کا رشتہ شعر و شاعری سے ہے اور بس۔"

"کیا کرتا ہے؟ کاروبار کیا ہے اُس کا؟ ملازمت پیشہ ہے، مالی حیثیت کیا ہے اُس کی؟" آفندی صاحب نے غُرّاتے ہُوئے لہجے میں پُوچھا۔

"بے روزگار ہے، ملازمت کے لئے کوشش کر رہا ہے۔" حِنا نے جواب دیا۔

"اور تم ... تم اُس بے روزگار سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"
"جی ... جی ڈیڈی۔"
"یقیناً وہ بھی تم سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوگا؟"
"کیوں نہیں۔"
"کیا وہ تمھاری حیثیت سے واقف ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ جانتا ہے کہ تم کس کی بیٹی ہو؟"
"جی ڈیڈی اچھی طرح جانتا ہے۔"
"اور اُس کے باوجود وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ دیکھو حِنا، مَیں کسی بھی مسئلے میں تمھارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تجربے کے لحاظ سے تم نے اِس دُنیا میں چند ہی قدم ابھی طے کئے ہیں۔ ہمیں ہر جگہ طرح طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ کم از کم تم اِس بات سے تو واقف ہوگی کہ وہ لوگ جو اپنی منزل نہیں پاتے، منزل تک پہنچنے کے لئے چور راستے تلاش کرتے ہیں اور خاص طور سے آج کل کے نکمّے اور ناکارہ نوجوان دولتمند لڑکیوں کے خواب صرف اِس لئے دیکھتے ہیں کہ اُن کا مستقبل سنور جائے۔ اُن کی نِگاہوں میں اُس لڑکی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ اُس کی دولت کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور اُس کے بعد جب اُنھیں وہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کے وہ خواہش مند ہوتے ہیں تو پھر بدل جاتے ہیں مَیں نے ایسی شادیاں کبھی کامیاب ہوتے نہیں دیکھیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈیڈی ایسا ہوتا ہے۔ مَیں جانتی ہُوں اچھی طرح جانتی ہُوں۔ لیکن کیا آپ کے خیال میں دُنیا کا ہر آدمی یکساں ہوتا ہے؟"

"نہیں میں یہ بات نہیں کہتا۔"

"تو پھر میں ثاقب کے بارے میں یہ بات کہہ سکتی ہُوں کہ وہ اِس تصوّر سے ناآشنا ہے آپ اُسے نہیں جانتے ڈیڈی۔ ملیں گے آپ اُس سے تو یہ اعتراف کریں گے کہ وہ اِس دور کے نوجوانوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے شریف ہے، اگر اُس کے پاس دولت نہیں ہے تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے پاس دولت ہے ڈیڈی۔ ہم اُسے اپنے آپ میں شامل کرکے ایک بہتر مستقبل کی جانب گامزن کر سکیں گے۔ ہم اُسے ایک مکمل انسان بنا سکتے ہیں۔ کسی کو سہارا دینا بُری بات نہیں ہے ڈیڈی۔ اور کسی کی غربت سے نفرت کرنا میرے نزدیک جُرم ہے۔" حِنا بڑے ٹھوس لہجے میں یہ گفتگو کر رہی تھی اور آفندی صاحب کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے کہا۔

"گویا تم مجھے یہ احساس دِلانا چاہتی ہو کہ باپ ہونا جُرم ہے۔ اولاد کو پیدا کرنے اور اُس سے محبت کرنے کی سزا مار باپ کو ضرور ملنی چاہیئے۔ یہ دولت جو میں نے بڑی عرق ریزی سے حاصل کی ہے اور جسے میں نے بڑے اہتمام سے فروغ دیا ہے صرف اپنی محبت کی خاطر میں اُسے ایک اجنبی کے حوالے کر دُوں۔ میں اپنی شخصیت کو قتل کر کے دُنیا کو یہ کہنے کا موقع دے دُوں کہ حِنا میری بیٹی نہیں بلکہ باپ ہے اور اِس گھر میں وہ ہوتا ہے جو حِنا چاہتی ہے آفندی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی مقصد ہے ناں تمھارا؟" آفندی صاحب غصّے سے بولے۔

"نہیں ڈیڈی، قطعی نہیں۔ اگر پُوری زندگی کا سوال نہ ہوتا تو میں آپ سے کبھی اختلاف نہ کرتی۔ لیکن اِس سلسلے میں... مَیں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ اِس کے علاوہ آپ مجھے جو بھی حکم دیں گے اُسے میں دِل و جان سے تسلیم کر لُوں گی۔"

حِنا کے لہجے میں آفندی صاحب نے گستاخی پائی تھی وہ بمشکل تمام یہ گستاخی برداشت کر رہے تھے، اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا چاہتے تھے ورنہ دِل تو چاہ رہا تھا کہ حِنا کا دماغ درُست کر کے رکھ دیں۔ چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُنھوں نے کہا

"اُس کا اپنا کوئی مکان ہے؟"

"نہیں، ایک گندے سے محلّے میں ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔"

"اور اُس سے شادی کر کے تم اُس گندے سے علاقے میں رہنا پسند کرو گی؟"

حِنا نے عجیب سی نگاہوں سے آفندی صاحب کو دیکھا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ کے اِن الفاظ میں دھمکی چھپی ہُوئی ہے ڈیڈی۔ آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر میں نے اِس سلسلے میں اپنی ضد برقرار رکھی تو آپ مجھے خود سے دُور کر دیں گے اور اُس کے بعد مجھے اُس شاعر کے ساتھ اُسی گندے سے محلّے میں رہنا ہوگا۔"

"اِس کے امکانات بھی تو ہو سکتے ہیں حِنا۔" آفندی

صاحب سرد لہجے میں بولے۔

"تو ٹھیک ہے ڈیڈی میں زندگی کا تجربہ بھی کر لُوں گی۔"

"نوجوانی کے فیصلے جذباتی ہوتے ہیں حِنا۔ تم اپنے الفاظ سے مجھے بالکل بے حیثیت ثابت کرنا چاہتی ہو۔ بے شک میں ایک محبت کرنے والا باپ ہُوں۔ اور اِس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ میں نے زندگی میں تمھارے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔ لیکن تمھارے اِن الفاظ کے بعد میرے ذہن میں ایک تصوّر پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ میری اپنی شخصیت کیا ہے؟ میں نے یہ جو کچھ حاصل کیا ہے اُس میں کسی کی امداد قبول نہیں کی۔ تمھاری بھی نہیں۔ تم نے خود میری محبتوں کے سائے میں پرورش پائی ہے لیکن آج تم نے مجھے یہ احساس دِلایا ہے کہ صرف محبت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اپنی ذات بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور آج جو میری ذات پر ضرب پڑی ہے حِنا اُس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے۔ میں غور کروں گا۔ میں یہ سوچوں گا کہ میں نے جس طرح تمھیں پرورش کیا ہے۔ اُس کا یہ صلہ تمھاری طرف سے دُرست ہے یا نہیں۔ اگر دِل نے تسلیم کر لیا تو ٹھیک ہے ورنہ تمھیں اپنے فیصلے میں ترمیم کرنا پڑیگی۔"

"یہ ممکن نہیں ہے ڈیڈی۔ آپ نے اپنی زندگی گُزار لی ہے۔ دُنیا کے سرد و گرم دیکھے آپ نے، اِس زندگی میں لاکھوں افراد کے لئے ہزاروں فیصلے کئے ہوں گے آپ نے، دُرست بھی، غلط بھی۔ میں نے اپنی زندگی میں یہ پہلا فیصلہ کیا ہے اور میں خود کو آزمانا چاہتی ہُوں۔ مجھے بھی اِس دُنیا کا تجربہ کرنے دیں تاکہ میں آنے والے وقت کے لئے خود کو تیار کر سکوں۔"

"بعض غلط فیصلے ساری زندگی کے لئے عذاب بن جاتے ہیں حِنا۔"

"میں جانتی ہُوں ڈیڈی لیکن انسان کو زندگی میں تجربات ضرور کرنے چاہئیں اور مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے اِس کا موقعہ دیں گے، مجھے اجازت دیجیئے۔" حِنا کھڑی ہوگئی۔ اور اُس کے بعد وہ پُراعتماد قدموں سے چلتی ہُوئی باہر نِکل گئی۔

آفندی صاحب کے پورے وجُود میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ثاقب کی گرفت حِنا پر بہت مضبُوط ہے۔ لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہُوئی۔ ایک باپ جس نے زندگی بھر اپنی اولاد کو پیار بھری نِگاہ سے دیکھا۔ وہ اُس باپ کی اُن تمام محبتوں اور کاوِشوں کو ٹھکرا دے اور ایک ایسے شخص کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ جو اُس کی زندگی میں صرف چند روز پہلے داخل ہُوا، حِنا کی ضد نے آفندی صاحب کو شدّت پسند بنا دیا اور اُس میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ایک رقیبانہ جذبہ اُبھر آیا گو اِس کی نوعیت مختلف تھی لیکن حقیقت وہی تھی کہ اُن کی بیٹی ایک بے نام سے فقیر کے چُنگل میں پھنس گئی ہے اور یہیں سے اُن کے ذہن میں بھی ضد کا جذبہ شروع ہوگیا۔

اب تکلّفات ٹُوٹ چکے تھے اور آفندی صاحب ایک کاروباری آدمی تھے۔ لاتعداد کاروباری حریفوں سے اُنھوں نے میدانِ جنگ میں مقابلہ کیا تھا کبھی ہارے تھے، کبھی جیتے تھے، اِس بار ایک انوکھا مدِمقابل سامنے آیا تھا۔ اُنھوں نے اُسے دیکھ لینا مناسب سمجھا اب تک بیٹی کی محبت نے خوف زدہ کر رکھا تھا لیکن حِنا کی گفتگو نے ضد کا جو جذبہ سینے میں اُبھلا تھا اُس نے محبت کا جذبہ معدُوم کر دیا تھا اور اب وہ ایک مدِمقابل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے چنانچہ اُن کا ذہن مختلف انداز میں سوچنے لگا اور پھر اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ثاقب سے ملاقات کریں گے، چنانچہ اِس سلسلے میں منشی مظفر کو استعمال کیا۔

منشی مظفر ثاقب کے گھر کے بارے میں معلومات حاصل کر چکے تھے، آفندی صاحب نے مختصراً منشی مظفر کو صُورتحال بتا دی اور پھر اُن کی راہنمائی میں ثاقب کے گھر کی جانب چل پڑے، جب اُس جگہ پہنچے جہاں ثاقب رہتا تھا تو اُن کا دِل خُون خُون ہوگیا۔ بیٹی کی ذہنیت کا اندازہ لگانے لگے، اُنھوں نے تو اُسے پھُولوں کے بستر پر پروان چڑھایا تھا۔ اُس کا ذہن اِن غلاظتوں کی طرف مائل کیسے ہوگیا؟ بھلا یہ جگہ؟ منشی مظفر نے اُن کی راہنمائی ثاقب کے گھر تک کر دی۔ اور اُس کے بعد وہاں سے واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے آفندی صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی۔

"ارے کون ہے بھائی؟ کوئی اجنبی لگتے ہو۔ یہ دروازہ بجائے جانے کے لئے نہیں ہے، اندر آجاؤ کون ہے؟"

اور آفندی صاحب اندر داخل ہوگئے تب اُنھوں نے ثاقب کو دیکھا۔ لااُبالی سا یہ شخص اُنھیں پہلی نِگاہ ہی میں پسند نہیں آیا تھا۔ نہ کوئی احترام، نہ انسانیت، نہ کسی کی پذیرائی کا انداز۔ وہ ثاقب کو دیکھنے لگے اور وہ مُسکرا کر بولا۔

"آیئے... آیئے تشریف لایئے شاعری کا شوق چرّایا ہوگا۔ کسی مشاعرے میں مدعو کرلیا گیا ہے کیا؟ فکر نہ کریں۔ جس نے بھی آپ کو یہ جگہ بتائی صحیح بتائی۔ تشریف رکھیئے۔" اُس نے کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ اور آفندی صاحب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

"جی فرمایئے! کیا خدمت کروں میں آپ کی؟ کوئی مصرعِ طرح ہے یا سادہ سی غزل کی ضرورت ہے اگر مصرعِ طرح ہے تو ارشاد فرمایئے۔ غزل آپ کو کل تک مل جائیگی۔ اور اگر ایک سے زیادہ کی بات ہے تو بے شمار غزلیں موجود ہیں۔ جی حکم دیں!"

"تو ثاقب صاحب آپ غزل فروش ہیں؟" آفندی صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"واہ! اچھی اصطلاح ہے۔ پسند آئی۔ جی دُرست فرمایا، مَیں غزل فروش ہی ہُوں۔"

"اور یہی آپ کا کاروبار ہے؟" آفندی صاحب بولے۔

"جی ہاں، خیال تو یہ تھا کہ کوئی غزل فیکٹری لگاؤں۔ لیکن صاحب یہ کام بھی بڑی راز داری کا ہے۔ لوگ فیکٹری میں نہیں آئیں گے۔ کیونکہ وہ خفیہ طور پر آتے ہیں۔ غزلیں خریدتے ہیں اور اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے ہیں جبکہ بخدا لاتعداد کا تلفظ بھی دُرست نہیں ہوتا۔"

"آپ تھوڑے سے پیسوں کے لئے اپنی کاوشیں فروخت کردیتے ہیں ثاقب صاحب؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں بالکل۔ یہ تھوڑے سے پیسے بدقسمتی سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اُن کے لئے نہ جانے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے آپ کے سوالات کچھ عجیب سے ہیں۔ پتہ کس نے بتایا آپ کو میرا؟"

"زندگی میں اور کچھ کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے...؟" آفندی صاحب نے پُوچھا۔

"ارے صاحب ارادوں سے کیا ہوتا ہے۔ ارادے تو توڑ ہی دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ اِتنی عمر ہوگئی اور آپ اِس دُنیا کو نہیں سمجھے؟"

"بدقسمتی یہی ہے ثاقب صاحب کہ میں نے اِس دُنیا کو سمجھا ہے۔ دیکھا ہے۔ پرکھا ہے اور بڑا خوف زدہ ہُوں اِس دُنیا سے۔ لوگوں کے سوچنے کے انداز نے مجھے دہشت کا شکار کر رکھا ہے۔ بہرطور آپ سے اپنا تعارف کرادوں۔ حِنا کا باپ ہُوں مَیں۔ آفندی کے نام سے پُکارا جاتا ہُوں۔"

ثاقب کے انداز میں ایک تبدیلی رُونما ہُوئی۔ اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

"مُعافی چاہتا ہُوں، سمجھ نہیں سکا تھا۔"

"اب تو سمجھ گئے ہو؟"

"جج... جی... جی" ثاقب نے بوکھلائے ہُوئے سے انداز میں کہا۔

"سُنا ہے تم حِنا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ جی... جی" ثاقب بدستور ہکلا رہا تھا۔

"اُس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہوگے تم...؟ ظاہر ہے اِس کے بغیر تم نے یہ چکر نہیں چلایا ہوگا۔ یہ بتاؤ کیا حِنا سے شادی کرکے تم اُسے خوش رکھ سکوگے؟"

"جی میں کیا عرض کرسکتا ہُوں" ثاقب نے لرزتی ہُوئی آواز میں کہا۔

"اور تم نے اُس سے تارے توڑ لانے کی بات کی ہوگی، اور وہ تارے تم اِسی گندے سے غلیظ مکان میں سجاؤگے! کیوں یہی دوگے نا تم حِنا کو؟ وہ ہر چھ مہینے کے بعد نئی کار خریدتی ہے۔ کیا تم اُسے ایک پُرانی گاڑی ہی خرید کر دے سکتے ہو۔ اُس کا بیڈ رُوم تقریباً دس لاکھ روپے کے نوادرات سے آراستہ ہے اور تم اُسے اِس گھر میں رکھنا چاہو گے۔ صاحبزادے ایک بات کان کھول کر سُن لو۔ اگر تم نے اُس کی ذات سے کچھ غلط اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں تو میں اُن کمزور افراد میں سے نہیں ہُوں جو ہار مان لیتے ہیں۔ میں تمھیں آگاہ کرنا چاہتا ہُوں کہ جن راستوں پر تم چل رہے ہو وہ تمھارے لئے موت کے راستے بھی بن سکتے ہیں اور میرے اِن الفاظ کو تم صرف دھمکی تصوّر نہیں کرو۔ چاہو تو آزما کر دیکھو۔ مجھے کم از کم یہ تو بتاؤ کہ حِنا اگر کسی جذباتی واقعے سے متاثر ہوکر تم تک آپہنچی ہے تو کیا مستقبل میں بھی تم سے اِسی طرح متاثر رہے گی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاحبزادے عمل کی دُنیا بالکل مختلف چیز ہے۔ تم مجھے بتاؤ تم زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتے ہو؟ یہ شادی اگر فرض کرو ہو بھی جائے تو میری مرضی کے خلاف ہوگی اور اپنی مرضی کے خلاف شادی کرنے والی حِنا کو میں اپنی دولت میں سے کچھ نہیں دے سکتا۔ اِن حالات میں اگر تم نے حِنا کو قبول کرلیا اور اُس

نے تمھیں تو تمھاری اور اُس کی زندگی کیا ہوگی؟ کیا تم اِس بات کی توقع رکھتے ہو کہ مُستقبل میں اُس جیسی لڑکی کو تم اپنے ساتھ رکھ سکوگے۔ میں مانتا ہُوں کہ نوجوانی کا بھوت سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ عارضی لمحات بے شک تم جذباتی کیفیت سے گزاروگے لیکن اُس کے بعد؟ کچھ مُنہ سے تو بولو بیوقوف آدمی تم نے جو جال پھیلایا ہے اُس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

لیکن ثاقب کی زبان گنگ تھی۔ وہ سہما ہُوا سا نظر آرہا تھا۔ آفندی صاحب اُسے دیکھتے رہے پھر اُنھوں نے آخری لہجے میں کہا۔

"سُنو! اگر میں چاہُوں تو تمھارا سارا مُستقبل تباہ ہو سکتا ہے۔ تمھاری پوری زندگی جیل میں گزر سکتی ہے۔ لیکن فی الحال میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تم پر ایک ذمّہ داری عائد کرتا ہُوں۔ حِنا کو اِس حماقت سے باز رکھنے کی کوشش کرو۔ ورنہ اُس کے بعد میں تمھارا مدِمقابل ہوں گا اور ہمارے درمیان جنگ ہوگی۔ اِس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے سمجھے۔"

ثاقب نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا آفندی صاحب کو وہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ چند لمحات وہ اُسے گھورتے رہے، اور پھر غصّے سے پاؤں پٹختے ہُوئے باہر آگئے۔

منشی مظفر گاڑی میں بیٹھے اُن کا انتظار کررہے تھے۔ آفندی صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کی اور برق رفتاری سے آگے بڑھادی۔ وہ جو کچھ کہہ کر آئے تھے اُس پر قائم ہو گئے تھے۔ ثاقب جیسے آدمی اِس قابل نہیں ہوتے کہ اُن کے ساتھ کچھ کیا جائے۔ یہ شخص اُنھیں اپنے تجربے کی کسوٹی پر ایک نکمّا اور ناکارہ نوجوان نظر آیا تھا اور وہ اپنے اِس فیصلے پر پوری طرح مطمئن تھے۔ حِنا کو سنبھلنا ہی پڑے گا ہر قیمت پر۔ اُنھوں نے فیصلہ کرلیا تھا۔

منشی مظفر اُن سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے لیکن اب آفندی صاحب بھی مشورے کی حد سے نکل گئے تھے اگر وہ ثاقب کے اندر کوئی ایسی خوبی پاتے جس سے اُنھیں یہ توقع ہوتی کہ اِس نوجوان کو سہارا دے کر ایک خوبصُورت مستقبل دیا جاسکتا ہے تو شاید اُن کے انداز میں کچھ لچک پیدا ہو جاتی۔ لیکن اُن کا تجربہ کہتا تھا کہ وہ ایک مکمل طور پر ناکارہ نوجوان ہے اور زندگی کے کسی بھی مرحلے پر وہ ترقی نہیں کرسکتا۔ اُسے اُٹھانے کے لئے دولت چاہیئے۔ ہو سکتا ہے حِنا کے مسئلے میں وہ سنجیدہ ہو لیکن اِس سنیدگی سے زندگی نہیں گزر سکتی۔

آفندی صاحب خود بھی ضدّی فطرت کے مالک تھے اور اِس مرحلے پر اُنھوں نے دِل پر پتھر رکھ کر یہ سوچا تھا کہ اگر حِنا حد سے آگے بڑھی تو وہ اُس کی بات تسلیم نہیں کریں گے اور چونکہ خود بھی ذرا تیز مزاج کے آدمی تھے۔ اِس لئے انتظار نہ کرسکے اور اُنھوں نے حِنا کو اپنے کمرے میں بُلالیا۔

حِنا خاموشی سے اُن کے سامنے پہنچ گئی تھی اُس کے چہرے پر کبیدگی کے آثار تھے۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"جی ڈیڈی!"

"بیٹھ جاؤ حِنا! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہُوں۔"

حِنا بیٹھ گئی۔

"تھوڑی دیر پہلے میں ثاقب کے گھر گیا تھا۔"

"جی" حِنا بُری طرح چونک پڑی۔

"ہاں، تم نے جو اُلجھن میرے ذہن میں پیدا کردی ہے۔ حِنا اُس نے مجھے بُری طرح بے سکون کردیا ہے، ظاہر ہے تمھارے مستقبل کی تعمیر میری ذمّہ داری ہے، تمھارے کسی احمقانہ فیصلے کو سنبھالنا بھی میرے ہی شانوں پر ہے۔ تم نے ابھی اِس دُنیا میں کچھ نہیں دیکھا حِنا۔ میں اُس شاعر کی کون سی بات پسند آگئی۔ لیکن مجھے اُس میں ایک بھی ایسی خُوبی نظر نہیں آئی جس کی بناء پر میں یہ سوچ سکوں کہ وہ مستقبل میں کوئی اچھا انسان ثابت ہوگا۔ تمھیں ایک بار پھر دُنیا کی اُونچ نیچ سے آگاہ کرنا چاہتا ہُوں۔ ثاقب شاعر ہے اور شاعر کی تاریخ بڑی عجیب ہے! بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے شاعر کو لے لو۔ شعر کی دُنیا میں گُم ہوکر وہ زندگی کے دوسرے قوائد بُھول جاتا ہے۔ بہت کم تمھیں ایسے ملیں گے۔ جو شعر و شاعری کو صرف ایک مشغلہ سمجھتے ہیں۔ میں یہ بھی مانتا ہُوں کہ شاعر کی نِگاہ گہری ہوتی ہے اور وہ دُنیا کو زیادہ قریب سے دیکھ لیتا ہے اور یہ چیز اُسے دُنیا سے اُکتا دیتی ہے پھر وہ دوسرے مسئلوں کے قابل نہیں رہتا لیکن زندگی ایک الگ چیز ہے بیٹے زندگی گزارنے کے لئے بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ میرا سب کچھ تمھارا ہے اور یقیناً اُس شخص کا بھی ہوگا جو تمھاری زندگی میں تمھارے شوہر کی حیثیت سے آئے گا۔ لیکن یہ سب کچھ میں نے بڑی محنت سے حاصل کیا ہے، کسی دوسرے کے ہاتھوں ضائع ہونے کے لئے نہیں ہے۔ ثاقب ساری زندگی ایک

نا کارہ آدمی ثابت ہوگا۔ یہ میرا تجربہ کہتا ہے۔"

"ڈیڈی! آپ تقدیر کے قائل نہیں ہیں۔"

"وہ کیسی تقدیر ہے۔ حنا جو بنی ہوئی ہے، لیکن اُسے بگاڑ کر بنانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ تمہیں اپنے شایانِ شان کسی شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے اور میں تمہیں اِس کی اجازت دے سکتا ہوں لیکن ثاقب کے علاوہ۔"

"آپ اُس سے مِلے تھے ڈیڈی؟" حنا نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کوئی بات کی تھی آپ نے اُس سے؟"

"ہاں! میں نے اُس سے معلوم کیا کہ اُس کے مستقبل کا پروگرام کیا ہے، جانتی ہو اُس کے مستقبل کا پروگرام کیا ہے؟"

"نہیں ڈیڈی۔"

"تمہاری دولت پر عیش کرنا۔"

"کیا اُس نے یہ الفاظ کہے؟"

"اُس کا عضو عضو چیخ کر یہی کہہ رہا تھا کہ وہ اِس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔"

"میں آپ کے اِس تجربے کو تسلیم نہیں کرتی ڈیڈی۔"

"حنا! میں نے کبھی تم پر کوئی سختی نہیں کی۔ تمہاری ہر خواہش کو پُورا کیا ہے، دیکھو بیٹے تمہارے بغیر میری زندگی بھی ایک زخم کی مانند ہوگی۔ لیکن میں اُصولوں کا انسان ہوں۔ اگر میرے اصُول قتل کئے جائیں گے تو شاید میں برداشت نہ کر سکوں۔"

"میں سمجھنا چاہتی ہوں ڈیڈی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"صرف اِتنا کہ ثاقب تمہارے قابل نہیں ہے۔ میں نے اُسے سخت سُست کہا برا بھلا کہا مگر ایک جواب بھی نہیں دیا اُس نے مجھے۔ کم از کم اُسے جوش آنا چاہیئے تھا۔ مجھے وہ کم از کم یہ اطمینان دِلاتا کہ اگر مستقبل میں اُسے تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ حنا کے لئے بہت کچھ کر سکے گا۔ میں نے اُسے اُس کی غربت کے طعنے دیئے مگر اُسے طیش نہیں آیا۔ وہ بے حسی اور بزدلی سے سب کچھ سُنتا رہا۔ اگر ذرا بھی پُرجوش ہوتا وہ، اگر اُس کے دِل میں تمہاری تڑپ ہوتی حنا تو اُسے ضرور غصّہ آتا — وہ پُرعزم ہی نہیں ہے۔ تصوّرات کی دُنیا میں وہ بہت دُور [illegible] سکتا ہے۔ لیکن عمل کی دُنیا میں اُس کے اندر ایک قدم [illegible] کی ہمت نہیں ہے۔ یہ میری پیش گوئی ہے حنا کہ تم اُس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکو گی چنانچہ اُس کا خیال ترک کر دو۔"

"بس ڈیڈی یا اور کچھ بھی ہے؟"

"کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

"نہیں، مجھے تعجب ہے بڑی انوکھی کسوٹی رکھی ہے آپ نے ڈیڈی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ آپ میرے ڈیڈی ہیں اگر اُس نے آپ کا احترام کیا تو آپ نے اُسے بزدل قرار دے دیا۔ کیا وہ میرے حصُول کے لئے احمقانہ اور بلند و بانگ وعدے کرنے لگتا؟ وہ شاعر ہے زمانے پر اُس کی گہری نگاہ ہے لیکن اِس کا یہ مطلب تو نہیں۔"

"حنا! تم اُن راستوں پر جا رہی ہو۔ جہاں ضد پیدا ہوتی ہے۔ تم ضدی ہو۔ میں نے اپنی شخصیت تمہارے لئے قتل کر کے رکھ دی ہے لیکن اِس سے شاید تم نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ میں بالکل ہی بے وقعت آدمی ہوں۔ میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تم مجھے مجبُور کر رہی ہو کہ میں تم پر سختی کروں۔"

"نہیں ڈیڈی! مجھ پر سختی کرنے سے آپ کو کچھ نہیں مِلے گا، کیا کر سکیں گے زیادہ سے زیادہ آپ میرے ساتھ؟"

"میں ایک ماہ کے اندر تمہاری شادی کر دُوں گا۔"

"ضرور کر دیں ڈیڈی، لیکن صرف اور صرف ثاقب سے۔ اِس کے علاوہ اور کسی کے بارے میں نہ سوچیں ورنہ حالات خراب ہو جائیں گے۔ میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔ اور شاید ضد مجھے آپ سے ورثے میں مِلی ہے سمجھے ڈیڈی۔ آپ وہی کریں جو میں کہہ رہی ہوں۔ میں آپ کو یہ ثابت کر کے دِکھا دُوں گی کہ یہاں آپ کے تجربے نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔"

"لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو حنا۔ میں اُس شخص کو اپنے دروازے پر کھڑے بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"لیکن ڈیڈی میں اُس کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہوں۔"

"خواہ اُس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہ رہے؟"

"ڈیڈی! یہ الفاظ میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔"

"سوچ لو حنا۔ اُس کے بعد ساری زندگی کے لئے تم پر اِس گھر کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اور جب تم زندگی کے مسائل سے آشنا ہو گی اور جذبات کا بھوت سر سے اُترے گا تو پھر پچھتاوے کے علاوہ تمہارے پاس اور کچھ نہیں ہو گا لیکن اُس وقت اِس گھر میں یا میرے دِل میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔"

"اگر آپ اِس حد تک چلے جانا چاہتے ہیں ڈیڈی تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ زندگی بھر اِس کوٹھی میں کبھی واپس نہیں آؤں گی۔" حنا نے جواب دیا اور آفندی صاحب خونخوار نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟ ایک بار پھر تم سے کہتا ہوں حنا کہ زندگی کو جذباتی تجربوں کی نذر نہ کرو۔"

"آخری فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے ڈیڈی۔ مجھے آپ اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیجئے۔" حنا کے لہجے میں بے حد سختی تھی۔

"تو اِس کے لئے میں تم سے کوئی وقت طلب نہیں کروں گا حنا۔ اگر تم ثاقب ہی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو تو خدا حافظ۔ اِن حالات میں تمہارے لئے اِس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہارے جانے کے بعد کس طرح گزاروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں لیکن اُس کے بعد میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا پسند کروں گا۔ تم جانا چاہو تو ابھی اور اِسی وقت جا سکتی ہو۔"

حنا خاموشی سے اُٹھی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ آفندی صاحب نے اُسے نِگاہ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔

❖

کوٹھی سے باہر نکل آئی تھی۔ بڑے جوش سے باہر قدم رکھا تو دِل آہستہ سے دھڑکا۔ آفندی صاحب نے یہ سب کچھ کہہ تو دیا ہے لیکن کیا اُس میں کوئی لچک تھی؟ اگر لچک تھی تو مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا؟ کیا اُن کی خوشامد کرتی گِڑگِڑاتی اُن کے سامنے۔ اُنھیں خود بھی تو سوچنا چاہیئے تھا یہ سب کچھ جائز تو نہیں ہے۔ کِسی ایسے شخص کو ناکارہ قرار دے کر ٹھکرا دیا گیا تھا جو بے مایا تھا۔ دولت مند باپ کا بیٹا ہوتا تو آفندی صاحب اُس کے بارے میں سب کچھ نظر انداز کر دیتے۔ نہیں یہ مُناسب نہیں تھا۔ دو ہی صُورتیں تھیں۔ اگر ڈیڈی کی بات مان لیتی تو ایک بہت اچھا انسان ختم ہو جاتا۔ کتنا خوش ہو گیا ہے وہ میرے اِس پیار سے، میری اِس محبت سے اُس کے اشعار میں کیسا نکھار آ گیا ہے۔ میں اُسے موت کے حوالے نہیں کر سکتی۔ ڈیڈی اپنی ضد پر اَڑے ہوئے ہیں۔ تو اِس میں میرا کیا قصُور؟

اُس نے خود کو سمجھایا اور اُس کے بعد ثاقب کے گھر کی جانب چل پڑی۔ گھر کا دروازہ تو بقول ثاقب کے کبھی بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ اِس وقت بھی کُھلا ہُوا تھا اور ثاقب افسُردہ سا ایک کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس کے چہرے پر رنج و غم کی پرچھائیاں تھیں۔ آہٹ پر اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا اور حنا کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"حنا!" اُس کی ٹوٹی ہُوئی آواز اُبھری۔

"کیوں ثاقب کیا بات ہے، اُداس بیٹھے ہُوئے ہو؟"

"حنا وہ کچھ ہو گیا ہے جس کی توقع کی جا سکتی تھی جو ہونا تھا حنا وہ ہو گیا ہے۔"

حنا نے اُس کے لہجے کے دُکھ کو محسوس کیا اور اُس کے سامنے مُسکراتی ہُوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے ثاقب؟"

"حنا! تمہارے ڈیڈی آئے تھے۔ بدقسمتی سے پہلے اُن سے کبھی نہیں مِل سکا۔ پہلی بار دیکھا تھا میں نے اُنھیں۔"

"اچھا پھر کیا ہُوا؟"

"بس حنا وہی ہُوا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم لوگ آپس میں مِلیں۔ حنا اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔ تم میرے اشعار کی رُوح ہو اور شاید تم میری رُوح ہو۔ ہاں حنا دِل کی گہرائیوں میں جھانکتا ہُوں تو یہی جواب مِلتا ہے۔ لیکن اِسی کم بخت دِل نے بارہا یہ احساس بھی دِلایا کہ میں تمہاری دُنیا کا انسان نہیں ہُوں، حنا! میں نے زندگی میں صرف دُکھ دیکھے ہیں۔ اور شاید یہ دُکھ میری ذات سے چمٹ گئے ہیں میں کبھی اِن دُکھوں سے نجات حاصِل نہیں کر سکتا۔

حنا! میں نے زندگی میں جس چیز کو بھی پانے کی آرزو کی ہے۔ وہ مجھ سے دُور ہٹتی چلی گئی ہے اور یہی وجہ تھی کہ میری زندگی میں لااُبالی پن پیدا ہو گیا۔ میں اِتنے دُکھوں سے گزرا ہُوں حنا کہ اُس کے بعد میں نے اِن دُکھوں ہی کو اپنی منزل سمجھ لیا اور رفتہ رفتہ ہَوا کے دباؤ سے میں اُسی منزل کی جانب کھسک رہا تھا کہ دفعتاً تم ایک نسیمِ صبا کے جھونکے کی مانند میری زندگی میں آ گئیں اور میں اپنا ماضی بھُول گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا حنا کہ میری تقدیر میں کیا ہے؟ آج تقدیر نے مجھے پھر ایک ٹھوکر لگا کر جگا دیا ہے۔

حنا! آفندی صاحب آئے تھے اور اُنھوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم سے کوئی رابطہ نہ رکھوں ورنہ میری زندگی

بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے، حنا! تم پر ایسی لاکھوں زندگیاں قربان۔ لاکھوں بار مر سکتا ہُوں تمھارے لئے لیکن تمھاری ذات کو کوئی دُکھ پہنچے یہ مجھے منظور نہیں۔ حنا میں۔ مَیں تمھیں خُوش دیکھنا چاہتا ہُوں۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں تم ہر چھ مہینے کے بعد گاڑی بدل لیتی ہو اور میری اِس جھونپڑی میں صحیح طور سے روشنی بھی نہیں۔ واقعی حنا۔ میں تمھارے لئے کیا کر سکوں گا؟ میں نے اگر اپنی ذات کو تم پر مُسلط کر بھی دیا تو بہت جلد تمھیں یہ احساس ہو جائے گا کہ تم نے غلطی کی ہے"

حنا خاموشی سے اُس کی صُورت دیکھتی رہی پھر بولی۔

"محبت کے لئے تو تاج محل بنائے گئے ہیں ثاقب...! محبت کے لئے تو پہاڑ تراش دیئے گئے ہیں۔ کیا محبت کے وہ جذبے صرف روایت تھے؟"

"نہیں حنا! محبت بہت بڑی شئے ہے۔ ساری کائنات پر مُسلّط۔ ہم اِس سے اِنکار نہیں کر سکتے"

"تو پھر ہم اپنی محبت کو تقدیر کے حوالے کیسے کر دیں ثاقب، کیا تقدیر محبت سے اُونچی چیز ہے؟"

"یہ الفاظ جذباتی تو ہو سکتے ہیں حنا لیکن آفندی صاحب کو یہ منظور نہیں ہے اور تم اُن کی بیٹی ہو"

"اور کیا کہا اُنھوں نے تم سے؟"

"بس یہی باتیں... وہ مجھے بہت نفرت کی نِگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اُنھوں نے بہت سی ایسی باتیں کیں۔ جو مجھے بُری تو لگیں لیکن اُن کی حقیقتوں سے میں اِنکار نہیں کر سکتا"

"اور تم نے اُنھیں کسی بھی بُری بات کا جواب نہیں دیا ثاقب؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو حنا! وہ تمھارے ڈیڈی تھے، اس دُنیا میں میرے لئے بے حد قابلِ احترام۔ میں بھلا اُن کے سامنے گردن کیا اُٹھا سکتا ہوں۔ اور پھر اُنھیں میری ذات سے دُکھ پہنچا ہے۔ ظاہر ہے اُنھیں یہی سب کچھ کہنا چاہئے تھا۔ نہیں حنا اُنھیں کوئی جواب دینے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟"

"ڈیڈی نے تمھارے ساتھ زیادتی کی ہے ثاقب۔ اُنھیں یہ نہیں کرنا چاہئے تھا"

"وہ بھی تو مجبُور ہیں۔ ایک باپ ہیں۔ تمھارے لئے اُنھوں نے ساری دُنیا کی آسائشیں اکٹھی کر دی ہیں۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے ایک لحاظ سے سچ ہی تھا"

"تم اُن سے یہ بھی تو کہہ سکتے تھے ثاقب کہ تم میرے لئے سب کچھ کرنے کی کوشش کرو گے، کوشش تو انسان کرتا ہی ہے"

"حنا! میں اُن کے سامنے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ میں نے اپنی مجبُوریوں کو بارہا آزمایا ہے۔ میں ہی مجبُور رہا ہُوں دُنیا میرے سامنے فاتح ہو جاتی ہے"

"لیکن آج فتح تمھاری ہُوئی ہے ثاقب اور میں تمھیں اِسی فتح کی مُبارکباد دینے آئی ہُوں"

"کیا مطلب؟" ثاقب نے چونک کر پُوچھا۔

"ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمھارے پاس آئے اور تم سے سخت سُست باتیں کیں"

"تو پھر...؟"

"میں نے اُن سے یہی کہا کہ ڈیڈی ثاقب ہی میری منزل ہے اور میں اُس کے بغیر اِس دُنیا میں نہیں رہنا چاہتی۔ تم جانتے ہو اُنھوں نے کیا جواب دیا؟"

"کیا حنا... کیا؟"

"اُنھوں نے کہا کہ مجھے دونوں گھروں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ ثاقب کے گھر کا یا اِس کوٹھی کا؟ اور ثاقب میں نے تمھارے اِس گھر کا انتخاب کر لیا اور تمھارے پاس چلی آئی"

"کک... کیا... کیا کہہ رہی ہو تم حنا؟"

"وہی جو تم نے سُنا ہے۔ میں اپنی اُس کوٹھی کو چھوڑ کر تمھارے پاس آگئی ہُوں"

ثاقب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئی تھیں۔ اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"کیا واقعی حنا... کیا واقعی؟"

"ہاں ثاقب! زندگی بھر کے فیصلے دوسروں کے ہاتھ میں نہیں سونپے جا سکتے۔ بلاشبہ ڈیڈی نے پوری زندگی میرے لئے قُربانیاں دی ہیں۔ لیکن اِن قُربانیوں کے بدلے میں مَیں اُنھیں اپنی ذات کی قُربانی دے سکتی تھی۔ تمھارے نہیں، جب مجھ سے فیصلہ کرنے کے لئے کہا گیا تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے"

"مگر حنا مَیں... مَیں... مَیں تمھیں کیا دے سکوں گا؟"

"سُنو ثاقب! یہ بات نہ تو جذباتی ہے نہ لمحاتی اور نہ ہی اِس میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے۔ کبھی اور کسی قیمت پر نہیں۔ اِسے ذہن نشین کر لینا۔ مجھے اِس وقت تمھارے اُن ہمدردوں کی ضرورت ہے جو تمھارے کام آسکیں"

"میں سمجھا نہیں حنا؟"

"تمھیں مجھ سے آج... ابھی شادی کرنا ہوگی ثاقب"

"حنا"

"ہاں ثاقب! اگر تم اِس کے لئے تیار نہیں ہو اور کوئی اُلجھن پالتے ہو اپنے ذہن میں تو مجھ سے اِنکار کر سکتے ہو لیکن جو فیصلہ میں نے کیا وہ آخری فیصلہ ہے"

"نہیں حنا مَیں... مَیں تمھیں زندگی سے زیادہ چاہتا ہُوں۔ تمھارے لئے میں ایسی ہزار زندگیاں قربان کر سکتا ہُوں۔ تم میری منزل ہو حنا۔ تم میری ذات کی پہلی خُوشی ہو۔ تم میرے وجُود میں پہلا پھُول ہو حنا۔ میں تمھیں کیسے چھوڑ سکتا ہُوں"

"تو پھر الفاظ اور وقت نہ ضائع کرو۔ بندوبست کرو۔ ہمیں شادی کرنی ہے"

ثاقب اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر میرا انتظار کرو" وہ باہر نِکل گیا اور حنا اِس گھر کو محبت بھری نِگاہ سے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی اور پھر اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ڈیڈی! آپ سلامت رہیں۔ خُدا کرے آپ سالہا سال جئیں۔ اِتنے جئیں کہ جیتے... جیتے تھک جائیں۔ لیکن میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے یہ مجبُوری تھی ڈیڈی۔ میں ثاقب کو بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایک ایسی ضد کی ہے جس سے دوسروں کو بھی نقصان پہنچا ہے، لیکن میں یہی کرنا چاہتی تھی ڈیڈی، اور یہ نہ کر کے زندہ نہیں رہ سکتی تھی"

ثاقب نے سچ مچ ہی انتظامات کر ڈالے تھے نجانے کہاں سے اُس نے چار آدمی پکڑ لئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ قاضی کو بھی لے کر آیا تھا۔ ایک سُرخ دوپٹہ بھی لایا تھا۔ سُرخ دوپٹہ حنا کے سر پر ڈال دیا گیا۔ قاضی صاحب نے سہمے ہُوئے سے انداز میں پُوچھا۔

"بیٹی تمھیں تمھاری مرضی کے خلاف تو اِس شادی کے لئے مجبُور نہیں کیا جا رہا؟"

"نہیں قاضی صاحب! میں بالغ ہُوں اور خُدا کے فضل و کرم سے اپنا اچھا بُرا سوچ سکتی ہُوں۔ میں خلوصِ دل سے اِس شادی پر آمادہ ہُوئی ہُوں۔ براہِ کرم آپ اپنے ذہن سے خدشات نکال دیجئے"

"الحمدُللہ" قاضی صاحب نے کہا اور پھر اُن چار گواہوں کی موجودگی میں نکاح نامے کی خانہ پُری کی جانے لگی اور اُس کے بعد حنا کے سر پر سُرخ دوپٹہ ڈال کر اُسے ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ قاضی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ تھوڑی سی شیرینی تقسیم کی گئی۔ ثاقب نے اپنے اُن شناساؤں کا شکریہ ادا کیا جو اُس کے لئے اِس کام پر تیار ہو گئے تھے اور اُس کے بعد تمام لوگ چلے گئے۔

ثاقب بھونچکا سا کبھی حنا کو دیکھتا کبھی اپنے گھر کو۔ اِس سے پہلے واقعی یہ گھر کباڑ خانہ بنا ہُوا تھا۔ لیکن جب سے حنا نے یہاں قدم رکھے تھے۔ بے شمار چیزیں یہاں آگئی تھیں۔ جو کچھ یہاں سما سکتا تھا وہ آچُکا تھا یہاں تک کہ ایک خوبصُورت مسہری بھی۔ یہ مسہری خریدتے ہُوئے حنا نے یہ نہیں سوچا تھا کہ یہی ایک دِن اُس کے ارمانوں کی سیج بن جائے گی۔

مگر آج یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ ثاقب کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج صبح جب وہ سو کر اُٹھے تھے تو اُن دونوں کے ذہنوں میں سے کسی میں یہ خیال نہیں تھا کہ آج کا دِن اُن کے لئے کیا ثابت ہوگا؟ لیکن اب اِس وقت جب شام کے دُھندلکے فضاؤں میں اُتر رہے تھے۔ حنا ثاقب کی شریکِ حیات بن چُکی تھی۔ اُس کی تمام تر زندگی کی ساتھی۔

ثاقب نے اُس کے سامنے مسہری کے پاس بیٹھتے ہُوئے کہا۔

"حنا کیا خواب ایسے بھی ہوتے ہیں؟"

"خواب ایسے نہیں ہوتے ثاقب" حنا نے جواب دیا۔

"تو پھر... پھر یہ سب کیا ہے حنا؟ میں اِسے سچ کیسے سمجھ لُوں؟"

"جناب ثاقب صاحب! آپ اب بھی سوال کر رہے ہیں؟ اب بھی سوچ رہے ہیں کہ اِسے سچ سمجھ لیں۔ میں آپ کی بیوی ہُوں سمجھے آپ اور اِس کے بعد جو کچھ ہوگا وہ میری مرضی سے ہوگا"

"حنا! کیا میں اِس بات پر یقین کر لُوں؟"

"اے ثاقب! تم مجھے تسلیم نہیں کر رہے؟"

"نہیں حنا اپنی خوش بختی کو سمجھ نہیں پا رہا۔ کیسے ہو

سکتا ہے یہ سب کچھ... کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اپنا ہاتھ اِدھر لاؤ" حنا نے کہا اور ثاقب نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔

حنا نے اُسے اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے کہا۔

"اب محسوس کرو اور یقین کر لو"

ثاقب کے بدن میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور حنا کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

"اے خوبصورت نظم، اے خوبصورت شعر تو میری ملکیت ہے۔ تجھے میں نے کہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

اور حنا نے اس سچ کی تصدیق کر دی۔

یہ رات اُمنگوں آرزوؤں کی رات تھی اِس رات میں مستقبل کے خواب سجے ہوئے تھے، اِن خوابوں میں ناعاقبت اندیشی تھی اِس رات کی صبح بے حد خوشگوار تھی۔

حنا نے گھر کا نظام سنبھال لیا "جناب ثاقب صاحب اِس گھر میں مجھے بہت سی تبدیلیاں کرنی ہیں"

"اور مجھ میں؟" ثاقب نے پوچھا۔

"ہوں۔ تم بھی..." حنا نے شرارت بھری نظروں سے ثاقب کو دیکھا، پھر مسکرا پڑی۔

"نہیں۔ تم مجھ نہیں"

"کیوں؟"

"جو کچھ ہو وہی تو اچھا لگا تھا۔ تبدیلیاں ہو گئیں تو پھر کیا رہ جائے گا"

"ایک انوکھا تجربہ ہوا ہے" ثاقب نے کہا۔

"کیا؟"

"یہ لڑکیاں سچ مچ پاگل ہوتی ہیں"

"کیوں؟"

"زندگی میں خوشیوں کی متلاشی، رنگوں میں ڈوب جانے والی، ہر چیز کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھنے والی اور آرزوؤں اور اُمنگوں میں ڈوبی ہوئیں لیکن بعض اوقات ایسے فیصلے کر لیتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے"

"مثلاً؟" حنا نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا رکھا تھا اِس شاعر آوارہ میں۔ نہ زندگی کی کوئی رمق، نہ اُمیدوں کا کوئی چراغ... اور تم اِس گھر میں چلی آئیں؟"

"کیا میری آمد سے یہ گھر روشن نہیں ہو گیا؟"

"میں یہ سوچ سکتا ہوں۔ بلاشبہ مجھے وہ ملا ہے جس کی آرزو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ آرزو مجھے خود اپنا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی لیکن تمہیں کیا ملا؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو ثاقب، میں نے بچپن سے اب تک کی زندگی جن تعیشات میں گزاری ہے۔ اُن سے میرا دل بھر گیا ہے اور پھر زندگی تو ہے ہی تبدیلیوں کا نام... یکسانیت تو موت کو کہتے ہیں"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے حنا۔ لیکن خدا کرے تمہارا یہ اعتبار برقرار رہے"

"ہم مستقبل کے اندیشوں سے حال کو تباہ نہیں کر سکتے، کیا سمجھے، اور پھر ضروری تو نہیں ہے کہ ہماری زندگی یونہی گزرے، دُنیا کے کامیاب لوگوں کا تصور کرو۔ اُن میں سے سب ایسے نہیں تھے۔ جنہیں غیب سے امداد ملی ہو، اُنھوں نے خود بھی اپنے آپ کو تعمیر کیا ہے۔ اور ثاقب محبتیں تو تاج محل تعمیر کر دیتی ہیں۔ ایک چھوٹا سا پُرسکون خوبصورت سا گھر تعمیر کر لینا کون سا مشکل کام ہے۔ ہم زندگی کے اِن حسین لمحات کو مستقبل کے اندیشوں سے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہنسو، خوش رہو، شعر کہو اور اُس کے بعد جب زندگی کا آغاز کریں گے تو وہ یقیناً خوشگوار ہو گا"

ثاقب خاموش ہو گیا اور پھر ہنسنے لگا۔ حنا بھی بہت خوش تھی۔

نئے دن کا آغاز باورچی خانے سے ہوا۔ حنا نے چائے بنائی۔ ثاقب ناشتے کا سامان لے آیا۔ اور چھوٹے سے باورچی خانے میں دونوں نے مل کر ناشتہ تیار کیا۔ ثاقب کی چور نگاہیں بار بار حنا کا جائزہ لے رہی تھیں وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کہیں حنا کو کسی کام میں دقت تو نہیں ہو رہی کہیں اُس کے چہرے پر ماضی کے سائے تو نہیں لرز رہے، ایک ایسا گھر چھوڑ کر آئی تھی جس میں وہ سب کچھ تھا جو کسی انسان کی آرزو ہو سکتی ہے، خود ثاقب کے ذہن میں بھی کوئی ایسا تاثر نہیں اُبھرا تھا جس میں محرومی کا احساس ہوتا۔ حنا کی آمد واقعی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔ اور اِس خوشگوار تبدیلی میں ایک ہفتہ گزر گیا۔

ایک ہفتے کے بعد ثاقب کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور حنا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دیکھا تو باہر باقر باقری کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے حنا کو دیکھا۔ اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا، پھر بے وقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حنا مسکرا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ باقر باقری آہستہ سے بولا۔

"یہ وہی کھلا دروازہ ہے جس سے اندر داخل ہونے میں کسی کو کوئی دقت نہیں ہوتی تھی؟"

"ہاں اب یہ صرف شناساؤں کے لئے کھلتا ہے"

"تم حنا... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" باقر باقری نے پوچھا۔

"اندر آؤ تو شریفوں کی طرح بات چیت ہو..." حنا مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ واقعی... واقعی" باقر باقری بوکھلایا ہوا سا اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے گھر کی حالت دیکھی۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر تخت پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہو گیا تمہیں؟ سر میں درد ہو رہا ہے کیا؟" حنا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"چکر آ رہے ہیں" باقری بھرّائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں؟"

"کیا الٰہ دین کا چراغ اِس دَور میں بھی دستیاب ہے؟"

"تمہیں چاہیئے؟"

"نہیں، بس یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اُجڑا دیار کیسے بس گیا؟"

"میں نے بسایا ہے"

"کیوں، آخر کیوں؟" باقری نے پوچھا۔

"اِس لئے کہ میں ثاقب سے محبت کرنے لگی تھی"

"ہائے تمہیں کوئی اور نہیں ملا تھا" باقری نے رونے والے انداز میں کہا۔

"ہاں، اُس جیسا کوئی اور نہیں ملا تھا"

"غلط۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں مگر خیر کیا تم لوگ شادی کرنے والے ہو؟"

"ہم شادی کر چکے ہیں" حنا نے جواب دیا۔

"اگر میں یہاں گر کر بے ہوش ہو جاؤں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہو گا حنا؟" باقری بھرّائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نہیں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں تمہیں ہوش میں لانے کے لئے وہ پانی بھری بالٹی تمہارے اُوپر اوندھا دوں گی"

"اوہ نہیں! میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں"

"یہی تمہارے حق میں بہتر رہے گا" حنا نے کہا اور باقری دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔

"تو تم نے شادی کر لی ہے؟"

"ہاں"

"اور کسی کو اطلاع بھی نہیں دی"

"نہیں"

"اپنے والد صاحب کو بھی نہیں؟"

"وہ جانتے ہیں"

"اُنھوں نے اجازت دے دی تھی؟"

"مسٹر باقر باقری آپ میرے یونیورسٹی کے ساتھی ہیں۔ ماموں یا چچا نہیں ہیں سوالات میں احتیاط"

"لاحول ولا قوت۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ یاد نہیں آیا تمہیں" باقری نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ اور پھر جلدی سے بولا "مذاق برطرف حنا، خُدا کی قسم بڑا سنسنی خیز انکشاف ہے۔ ہمت و عظمت کی بہت سی کہانیوں میں ایک گرانقدر اضافہ۔ سوری میں نے واقعی ایک ذاتی سوال پوچھ لیا تھا۔ خدا کرے تمہاری زندگی خوشگوار گزرے"

"شکریہ باقری"

"وہ شاعر کہاں ہے؟"

"وہ بازار گئے ہیں"

"پھنس گئے بیٹا آٹے دال کے چکر میں" باقری ہنس پڑا، پھر بولا "میرا آرڈر نوٹ کر لو"

"کیسا آرڈر؟"

"ایک نعت بیس اشعار کی، دادا جان ایک نعتیہ مشاعرے میں شرکت کر رہے ہیں۔ دو غزلیں پندرہ اشعار سے زیادہ کی نہ ہوں۔ ذرا چھوٹی بحریں ہوں۔ یہ ایڈوانس سو روپے، باقی مال وصول کرتے ہوئے"

"سوری باقری" حنا نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اب یہاں شاعر کرائے پر دستیاب نہیں"

"ارے نہیں خدا قسم یہ غضب مت کرو۔ ہمارا بہت پرانا کاروبار ہے"

"یہ کاروبار اب ختم"

"پھر ہمارا کیا ہو گا؟"

"کوئی اور کھلا دروازہ دیکھو" یہ دروازہ اب بند ہو

چکا ہے"

"تم نے شاعر بد شب خون مارا ہے جِنا، بہر حال بیچارے کی قسمت۔ اب یہ بتاؤ یہاں چائے وغیرہ بھی مل جاتی ہے، یا نہیں؟" باقر باقری بولا۔

"ہاں ہاں بیٹھو، شریف آدمیوں کی طرح بیٹھو تو شرافت سے تمھارے بارے میں سوچا بھی جائے، چائے پلائی جاتی ہے تمھیں۔ اور سناؤ یونیورسٹی کے کیا حال ہیں؟"

"یونیورسٹی تو خیریت سے ہے، لیکن ایک بات چائے پینے سے پہلے کہہ دینا چاہتا ہوں مسز ثاقب!"

"جی جی کہیئے کہیئے"

"خادم کو باقر باقری کہتے ہیں اور بچپن سے ایک بیماری خادم کو لاحق ہے وہ یہ کہ معدہ خراب ہے، بہت سے ڈاکٹروں سے علاج کرایا لیکن علاج نہیں ہو سکا اب اِس معدے میں کوئی چیز رُکتی نہیں۔ چاہے وہ بات ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ کل صبح یونیورسٹی میں ایک تعزیتی میٹنگ ہوگی۔ باقر باقری کی صدارت میں۔۔ اور تمام اہلیان کو آگاہ کیا جائے گا کہ مسز ثاقب یعنی محترمہ جِنا آفندی نے ثاقب سے شادی کر لی ہے۔ اور اس طرح اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی۔ چنانچہ اُن سب کو حق حاصل ہے کہ احتجاج کریں اور اس ننھے سے مکان پر حملہ کر دیں"

"باقر! جب میں نے تم سے یہ سب کچھ نہیں چھپایا تو کسی دوسرے سے چھپانے کی مجھے کیا ضرورت لاحق ہو سکتی ہے۔ تم جو کچھ بھی حرکتیں کرنا چاہو کرتے رہو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اجازت کا شکریہ اب میں چائے حلال کہلایا جا سکوں گا" باقر باقری بکواس کرتا رہا، جِنا ہنستی رہی، پھر باقر باقری نے چائے پی اور آہستہ سے بولا۔

"جِنا! اگر ثاقب کا کاروبار جاری رہے تو کیا حرج ہے؟ بہتوں کا بھلا ہو جاتا ہے اِس میں"

"اِس کے بارے میں ہم دونوں مل کر سوچیں گے اور کوئی خدمت ہمارے لائق؟"

"نہیں، آج کا دن نہ جانے کیسا تھا، خوشی کی خبر تو یہ ہے کہ تم دونوں نے شادی کر لی اور چند لوگوں کے لئے بُری خبریں بھی ہیں یعنی یہ کہ نہ دادا جان کو اب نہ نعت ملے گی اور نہ دو ضرورت مندوں کو غزلیں جن سے میں نے وعدہ کر لیا تھا۔ دراصل جِنا اپنا بھی کچھ کمیشن بن جاتا ہے بیچ میں، یہ دھندا بہت دِنوں سے چالو ہے، مگر خیر اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ فدوی کو اجازت دو"

باقر باقری چلا گیا اور جِنا مُسکراتی رہی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ اب یونیورسٹی میں اُس کی شادی کے چرچے پھیل جائیں گے، بس ایک ہلکا سا خیال دِل میں ضرور تھا کہ آفندی صاحب کو شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔ لوگ بہر حال اُن سے باز پُرس تو کریں گے ہی۔ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ اُنھوں نے اپنی بیٹی کو شادی کی اجازت کیسے دے دی؟

لیکن اِس میں قصور میرا بھی نہیں ہے۔ ڈیڈی نے روایتی باپ بننے کی کوشش کی تھی اور میں نے روایتی بیٹی بننے سے اِنکار کر دیا۔ سینکڑوں قِصّے کہانیوں کو دوبارہ جنم دینے کی کوشش کی تھی، ڈیڈی مان جاتے تو کیا ہوتا ہماری خواہشیں بھی پوری ہو جاتیں۔ کیا ضروری تھا کہ ڈیڈی۔ برسوں پُرانی روایتیں دوہراتے۔ اگر ثاقب کو تسلیم کر لیتے تو کیا حرج تھا ہم لوگ بھی ذرا بہتر زندگی گزار لیتے۔ لیکن یہی زندگی سہی یہ زندگی کیا بُری ہے؛

ثاقب واپس آگیا۔ وہ بہت سی چیزیں ساتھ لایا تھا۔ اُس نے یہ سامان جِنا کے سامنے رکھا اور جیب سے سو سو کے تین نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"کہاں سے آئے یہ پیسے؟"

"کچھ غزلیں فروخت ہُوئی ہیں"

"کیا مطلب؟"

"پُرانا حساب بھی تھا چند لوگوں پر، کبھی مانگا ہی نہیں تھا آج نِکل گیا تو پیسے وصول ہو گئے"

"کہاں چھپی تھیں یہ غزلیں؟"

"رسالوں میں"

"تمھارے نام سے؟"

"او ہ نہیں ڈارلنگ۔ نام سے چھپنے کے پیسے نہیں ملتے"

"اب یہ سب کچھ نہیں ہوگا"

"نہیں ہوگا" ثاقب نے گردن خم کرتے ہُوئے کہا۔

"وہ باقری آیا تھا"

"باقر باقری؟"

"ہاں"

"کہاں گیا؟"

"چائے پی کر چلا گیا کچھ غزلیں درکار تھیں آسے"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"یہی کہ یہ دوکان بند ہوگئی ہے۔ اب یہاں شعر کی حُرمت بھی جائے گی۔ اُس کا کاروبار نہیں ہوگا"

"اوہ" ثاقب نے عجیب سے انداز میں ہنستے ہُوئے کہا۔ اس کے بعد یہ موضوع ختم ہوگیا۔

دوسرے دِن دوپہر کو زور زور سے دروازہ پیٹا جانے لگا۔ لڑکیوں کا ایک جُلوس آیا تھا باقر باقری کی قیادت میں چند لڑکے بھی تھے، ثاقب نے دروازہ کھولا اور وہ سب دھکا مار کر اندر گھس آئے۔ سب کے سب جِنا کے بے تکلف دوست تھے، اُنھوں نے جِنا اور ثاقب کو گھیر لیا اور شور غپاڑہ کرنے لگے۔

"جِنا کی بچّی تجھے سزا دی جائے گی" ایک لڑکی نے کہا۔

"کیوں بھئی؟"

"ہمیں بتایا بھی نہیں"

"حالات ایسے نہیں تھے"

"یہ تیرا گھر ہے؟"

"تمھیں کیا نظر آ رہا ہے؟"

"تو یہاں جی سکے گی؟"

"جن رستوں سے تم گزر کر یہاں تک آئی ہو وہاں کیا لاشیں پڑی ہُوئی ہیں"

"کیا مطلب؟"

"چاروں طرف گھر ہیں اور لوگ اُن میں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ وہ سب زندہ ہیں تو مجھے کیا ہو جائے گا؟"

"ہائے ذرا پوری کہانی تو سُنا"

"کہانی صرف یہ ہے کہ میں نے ثاقب کو پسند کیا اور اُس سے شادی کر لی"

"بس اِتنی سی بات؟"

"ہاں صرف اِتنی سی"

"ارے ذرا دوسروں کی رہنمائی کر، کیا کیا کرنا پڑتا ہے اِس سلسلے میں؟"

"ہمّت و پامردی، یقینِ کامل" جِنا نے جواب دیا۔

"اور والد صاحب؟"

"اِس سلسلے میں تبصرہ محفوظ ہے" جِنا نے کہا۔

"یعنی ظالم سماج، یقیناً آفندی صاحب راضی نہ ہُوئے ہوں گے"

"میں نے کہا ناں اِس بارے میں تبصرہ محفوظ ہے"

"جِنا تو خوش ہے؟"

"کیسی نظر آتی ہُوں" جِنا نے کہا۔

"ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دِن گزرے ہیں۔ کیا تو مستقبل کی صعوبتیں برداشت کرے گی؟"

"نہیں۔ میں مستقبل کو تابناک بناؤں گی" جِنا نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"خُدا تجھے کامیاب کرے"

"شکریہ"

نوجوان لڑکے ثاقب سے پُوچھ رہے تھے "پیر و مُرشد ہمارے لئے بھی تعویذ کر دیں"

"کیسے تعویذ؟"

"یہ جل پری شیشے میں کیسے اُتری؟ اِس کا طریقِ کار کیا ہوتا ہے؟"

"سچائی، جذبِ صادق خود اعتمادی" ثاقب نے جواب دیا۔

"صرف تین چیزیں؟"

"ہاں یہی تفسیرِ کائنات ہیں"

"ہائے اِس کائنات میں ہماری "وہ" کہاں ہیں؟" پھر سب نے مطالبہ کیا۔

"خواتین و حضرات! جذبۂ رحم سے کام لیتے ہُوئے اِس غلطی کو معاف کیا جاتا ہے کہ جِنا نے ہمیں اپنی شادی میں شریک نہیں کیا۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی جِنا کو اِس غلطی کا اعتراف کرتے ہُوئے ایک دِن مقرر کرنا ہوگا جب وہ یونیورسٹی کے تمام ساتھیوں کو ایک عُمدہ سا ڈِنر کسی عُمدہ سے ہوٹل میں دیں گی"

"خواتین و حضرات آپ کا یہ مطالبہ مجھ پر قرض۔ میرے شوہر ابھی بے روزگار ہیں اور ہم یہ ڈِنر نہیں دے سکتے۔ ہمارے حالات اِس کی اجازت نہیں دیتے اس لئے میں معذرت خواہ ہُوں"

"بڑی ڈھیٹ ہے یہ لڑکی، اب کیا کریں" سب ایک دوسرے سے پُوچھنے لگے۔

"ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا"

"مگر کیا؟"

"ہم اپنی نیک کمائی سے چندہ کریں گے، اور یہ تقریب منعقد کریں گے"

"ہمیں منظور ہے" چند لڑکے لڑکیوں نے کہا۔

"غلط غلط غلط۔ یہ بھی نہیں ہوگا" جِنا نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"دیکھو دوستو! تم مجھے جانتے ہو ایسی پارٹیاں ایسے فنکشن میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں اب بھی یہ سب کچھ کرسکتی ہوں لیکن میں نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے، اس زندگی میں غربت ہے اور یہی اِس نئی زندگی کی تبدیلی ہے۔ میں اِس زندگی کے مزے لینا چاہتی ہوں۔ ہم نے وہ دُنیا چھوڑ دی ہے اور اپنی اِس دُنیا سے رُوشناس ہونا چاہتے ہیں۔ ہماری اِس نئی زندگی میں دخل نہ دو یہی تمہاری دوستی ہے، مُخلص ہو تو اُٹھو چائے بنانے میں مدد کرو، جس برتن میں بھی چائے ملے پیئو۔ ہمیں دُعائیں دو اور رفو چکر ہو جاؤ، یہ پسند نہ ہو تو دروازہ کھلا ہے۔"

"صرف چائے؟" لڑکے واویلا کرنے لگے۔

"ہاں صرف چائے۔"

"ہائے، چلو دوستو، بسم اللہ۔"

چائے بنائی گئی پیالیوں، گلاسوں اور دوسرے برتنوں میں پی گئی۔ اور اُس کے بعد سب رُخصت ہو گئے۔ حِنا مُسکرا رہی تھی اور ثاقب کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مُسکراہٹ تھی۔

"مجھے اِس کا خطرہ تھا۔" حِنا نے کہا۔

"کچھ انتظام کیا تو جا سکتا تھا۔"

"نہیں بھئی ہم اپنا بجٹ خراب نہیں کر سکتے۔"

"تمہیں دُکھ نہیں ہوا حِنا؟"

"کیسی بچّوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ اِس میں دُکھ کی کیا بات ہے میں نے پہلے ہی مرحلے پر سب کو ٹھیک کر دیا ہے۔ اور اُس میں ہمیں آسانی بھی ہو گئی ثاقب۔ کوئی ہمارے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہ رہے گا اور ہمیں آئندہ کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ ہم جو نہیں ہیں وہ خود کو ظاہر کیوں کریں جو ہیں اگر کسی کے لئے قابلِ قبول ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ وہ اپنی دُنیا میں خوش ہم اپنی دُنیا میں خوش۔"

"ایک بات کہوں حِنا؟"

"اجازت کیوں لے رہے ہو؟" حِنا نے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید اتنی پامردی سے یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے میں خود کو بہت دُنیادار سمجھتا تھا بہت بولڈ محسوس کرتا تھا۔ بڑا اعتماد کرتا تھا خود پر، لیکن حِنا تم مجھ سے برتر ہو، تم مجھ سے زیادہ مضبوط اور باہمت ہو۔"

"چلو کچھ تو ہے ہمارے پاس جو باعثِ اعتراف ہو، لیکن ثاقب، میرے ساتھی میں جو کچھ بھی ہوں تمہاری ملکیت ہوں اور مجھے اِس پر فخر ہے۔" حِنا نے کہا اور ثاقب نے اُس کا ہاتھ چُوم لیا۔

"مجھے اپنی اِس ملکیت پر فخر ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا

حِنا بڑی ہمت بڑی پامردی سے کام لے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مسائل اُبھر رہے تھے۔ ابھی تک جو کچھ گُزر رہی تھی اُس میں تشویش نہیں شامل ہوئی تھی۔ اقدار کے ڈھول پیٹے جا رہے تھے، باقر باقری کو غزلوں کے کاروبار سے منع کر دیا گیا تھا اور حِنا نے ثاقب کے اشعار کی فروخت پر پابندی لگا دی تھی، پتہ نہیں ثاقب نے اُس کے بعد اِس قسم کا کوئی سودا کیا یا نہیں۔ امکان یہی تھا کہ اُس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیونکہ حِنا سے اُس کی محبت پہلے سے بھی کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ اب وہ کوئی خوبصورت غزل کوئی حسین شعر کہتا تو وہ حِنا کی تفسیر ہوتی۔ اُس نے حِنا پر ایک پُوری غزل لکھی تھی اور حِنا اِس غزل کو سُن کر اپنے آپ کو نہ جانے کیا تصور کرنے لگی تھی۔ لیکن اِس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ زندگی صرف محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ نہیں گُزر سکتی۔ لوازماتِ زندگی کچھ اور بھی ہیں۔ البتہ وہ ثاقب سے یہ ضرور کہتی تھی کہ زندگی کے اِس نئے رُخ کو قبول کرنے کے ساتھ اُس میں تھوڑی سی تبدیلی ضرور ہونی چاہیئے یعنی یہ کہ اب وہ لااُبالی شاعر ایک اور وجُود سے وابستہ ہو کر زندگی کی حقیقتوں میں قدم رکھ چُکا ہے۔ چنانچہ شعر کی دُنیا ایک حصّہ اختیار کر لے اور دوسرا عمل کی زندگی کے لئے وقف کر دیا جائے چنانچہ ثاقب نوکری کی تلاش میں تھا۔ اُس نے اپنے شناساؤں سے تذکرے کئے تو لوگ مُسکرا دیئے۔

"میاں شعر و شاعری کرنے والے دفتری فائلوں پر قلم نہیں چلا سکتے اور ایک شاعر کی ملازمت ذرا مشکل کام ہے۔ تم کروگے کیا؟ کس دفتر کی کلرکی؟ صاحب کی فائل میں اندراجات کے بجائے اشعار ہوں گے اور صاحب بازو سے پکڑ کر دروازے سے باہر چھوڑ جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے، کم از کم مجھے میرے شایانِ شان ملازمت ملنی چاہیئے۔"

"تو یُوں کرو اپنی شان میں کچھ قصیدے لکھ ڈالو اور درخواست کی جگہ یہ قصیدے پیش کر دیا کرو۔" دوستوں نے

مشورہ دیا۔ حِنا کو معلوم ہوا تو وہ بولی۔

"نہیں ثاقب، زندگی کی حقیقتوں سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اپنے اِس چھوٹے سے گھر کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی شخصیت کو تبدیل کر دیں گے۔ تم یُوں سمجھو کہ تم شاعر صرف میرے لئے ہو اور دُنیا کے لئے ایک عام انسان۔ کیا تم مجھے مشاعرہ گاہ نہیں سمجھتے؟ اپنی ہر غزل، ہر شعر مجھے سُنایا کرو اور یقین کرو داد سے جی نہ بھر جائے اور دل سیراب نہ ہو جائے تو حِنا نہ کہنا۔"

"میں اپنے تصوّر کا ہر لمحہ تمہیں دے چُکا ہوں حِنا۔ بے شک میرے اشعار کا ماحصل تم ہی ہو۔ لیکن ایک کلرک کی زندگی؟"

"کلرک نہیں، حِنا کا شوہر۔ جسے اپنے گھر کی ترتیب کرنی ہے جسے محبت کی اِس نئی کہانی کی لاج رکھنی ہے۔ یہ ضروری ہے ثاقب۔ ہم اِس کرائے کے گھر کو چھوڑ کر اپنا چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔ اور اُسے بربط کا نام دیں گے، بربط میں ہماری آوازیں نغمہ سرا ہوں گی۔ چھوٹی سی زندگی مسرتوں سے گنگناتی ہُوئی۔ میں نے ایک اور فیصلہ بھی کیا ہے ثاقب۔"

"وہ کیا جانِ من؟"

"تعلیم حاصل کی ہے میں نے اور اپنے گھر کو اپنی جنّت بنانا چاہتی ہُوں۔ جنّت کی تعمیر کے لئے جدّوجہد تو کرنا ہی ہوگی۔ ایک طرف تم ملازمت کے لئے نِکلو۔ دوسری طرف میں یہی کارروائی کرتی ہُوں۔ دیکھتے ہیں وقت کیسے نہیں بدلتا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو حِنا۔ تم ملازمت کروگی؟"

"ہاں، یہ ضروری ہے۔"

"نہیں رُوپ یہ ممکن نہیں ہے۔ بھلا میرے خواب دوسروں کی نِگاہوں کا مرکز بن جائیں۔ یہ مجھے کیسے اچھا لگے گا۔"

"اے شاعرِ فرسُودہ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ زندگی کی تعمیر میں ہم دونوں کو نہ تھکنے والے مزدوروں کی طرح عمل کرنا ہوگا۔ اِس میں کسی کی نِگاہوں کا خوف بے معنی ہے۔ ہم مِل جُل کر جدّوجہد کے راستے اختیار کریں گے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ہمیں کتنے لوگوں کا چیلنج قبول کرنا پڑا ہے۔ اگر ہم اپنی جدّوجہد میں پامال ہو گئے تو یُوں سمجھو کہ سب کو ہنسنے کا موقعہ مِل جائے گا۔ اِس کی تم بالکل فکر مت کرو۔ میں جانتی ہُوں کہ تم حسّاس ہو اور میں تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی۔ میں تمہارے شعروں کی محافظ ہُوں۔ مجھے اجازت دو ثاقب ہم دونوں ہی تقدیر آزماتے ہیں۔"

ثاقب نے گردن خم کر دی تھی اور پھر دوسری صبح دونوں گھر سے ساتھ ساتھ نِکلے۔ ثاقب نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ اور حِنا ایک مختلف راستے پر چل پڑی۔ بلاشبہ یہ زندگی اُس کے لئے بالکل نئی تھی۔ اُس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ جو وقت اُس نے گُزارا تھا وہ اِس زندگی سے کتنا مختلف تھا۔ یہ بات سبھی جانتے تھے اور آج وہ کسی ملازمت کی تلاش کے لئے نِکلی تھی اور اُسے یہ دُنیا بڑی عجیب عجیب لگ رہی تھی۔ وہ اُن بے شمار افراد کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اُسی کی طرح روزی کی تلاش میں نِکلے ہیں ننھی ننھی چڑیاں دوسرے پرندے۔ سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ کتّے، سب کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ زندگی کی گُزرگاہ سے زندگی کے لوازمات کے ساتھ گُزرنا۔ کل تک وہ لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے دیتی تھی۔ آج خود مانگنے نِکلی تھی۔ باہر نِکل کر اُس نے سوچا کہ اِس مانگ کی ابتداء کہاں سے کرے؟ کیا کسی شناسا سے مدد لے؟ لیکن یہ تو اچھا نہ ہوگا۔ بات آفندی صاحب تک پہنچے گی اور آفندی صاحب کہیں گے کہ ہاں اُس نے اپنی تقدیر کو ٹھوکر ماری ہے اور اب میرے ہی شناساؤں سے کام لے رہی ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ آفندی صاحب کے کسی شناسا سے مدد مانگنے کا مطلب ہے کہ اُس نے کسی واسطے کے ساتھ آفندی صاحب کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ اپنے آپ ہی کو آزمانا بہتر ہوگا۔ چنانچہ وہ قدم آگے بڑھاتی رہی۔ اُن جگہوں کو اُس نے نظر انداز کر دیا تھا جہاں آفندی صاحب کے شناساؤں کی موجودگی کا امکان تھا۔ ویسے اُسے اِس کا بھی خطرہ تھا کہ آفندی صاحب کا کوئی شناسا اُسے راستے میں نہ مِل جائے۔ اُسے اِس حال میں دیکھ کر کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔ اُس نے اپنے آپ کو مضبُوط کیا اگر ہو بھی جائے تو یہ کوئی جُرم نہیں ہے۔ وہ اپنے مقدر کو آزمانے نِکلی ہے، بہرطور اِس سلسلے میں کوششیں کرتی رہی۔ اِتنی خوش نصیب تو نہیں تھی کہ پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو جاتی۔ لیکن مایُوس بھی نہیں ہُوئی تھی۔ وہ ایک بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔ اور بس کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گُزری تھی کہ اُس کی ایک دوست افشاں اُس کے قریب آ گئی۔ افشاں اُسے بس اسٹاپ پر کھڑے دیکھ کر متحیّر رہ گئی تھی۔

یونیورسٹی سے بہت پہلے نکل چکی تھی وہ اور طویل عرصے سے اُس سے ملاقات بھی نہیں ہُوئی تھی، حنا کو پہچان کر اُس کے نزدیک آگئی۔

"ہیلو حنا یہاں کیا کر رہی ہو؟" اُس نے تعجب سے کہا اور حنا مُسکرا دی۔

"ہیلو افشاں کہاں بھئی؟ کیسے آگئیں یہاں؟"

"میں تو جیسے بھی آگئی ہُوں لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"بس کا انتظار۔"

"کیوں؟" افشاں کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔

"بس کا انتظار کیوں کیا جاتا ہے؟" حنا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"حنا کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے؟ آؤ یار سامنے ریستوران ہے۔ میرے ساتھ ایک پیالی چائے نہیں پیئوگی؟"

حنا نے نگاہیں اُٹھا کر تھوڑے فاصلے پر بنے ہُوئے ریستوران کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"نہیں افشاں! پلیز میں ریستوران میں نہیں جا سکتی۔"

"لیکن کیوں آخر؟"

"بھئی ہو سکتا ہے کہ میرے شوہر کو یہ بات پسند نہ آئے۔"

"شوہر؟" افشاں چیخ پڑی۔ "تو تم نے شادی کر لی۔ کس سے؟"

"ثاقب سے، جانتی ہو اُسے؟"

"ثاقب! نہیں بھئی میں کہاں جانتی ہُوں۔ لیکن یہ تو غلط ہے۔ کم از کم ہمارے درمیان اِتنا ربط تو ضرور تھا کہ تم مجھے اپنی شادی میں مدعو کر لیتیں۔ بُری بات۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔"

"ہاں افشاں بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جس میں انسان نہ چاہتے ہُوئے بھی مجبُور ہو جاتا ہے۔ بہرحال اِس کے لئے میں معذرت کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہُوں۔"

"ارے تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ نا میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"میرا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے ہوٹل میں چائے نہیں پی سکتیں۔ میرے گھر میں تو چائے پینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا تمھیں؟"

"اوہ! اچھا! کہاں ہے تمھارا گھر؟"

"بس یہ سامنے سے آگے بڑھیں گے۔ ایک سڑک آئے گی، سڑک کے دوسری جانب تھوڑا سا میدانی فاصلہ طے کرنا ہے اور اِس میدان کے اختتام پر جو بلڈنگ ہے اُس میں ہمارا فلیٹ ہے۔"

حنا کچھ دیر تک سوچتی رہی اور اُس کے بعد شانے ہلا کر افشاں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ افشاں کی حیرتیں انتہا کو پہنچی ہُوئی تھیں۔ حنا یونیورسٹی کی ایک مغرور ترین لڑکی تھی۔ اعلیٰ درجے کی گاڑیاں اُس سے زیادہ کسی کے پاس نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ نہ جانے کیسی پُر سحر شخصیت کی مالک تھی وہ، اور اب اُس کی یہ کیفیت۔ بہرطور تھوڑی دیر بعد وہ ایک خوبصورت فلیٹ میں داخل ہوگئیں اور افشاں نے حنا کا تعارف اپنے والدین سے کرایا۔

"یہ میری یونیورسٹی کی ساتھی حنا ہیں۔"

"خُوب!" افشاں کی والدہ نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور افشاں حنا کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

"جی تو اب ذرا اِن ثاقب صاحب کا تعارف ہو جائے، آخر کون صاحب ہیں یہ؟ جنھوں نے ہماری حنا پر یہ شب خُون مار دیا اور اِتنی خاموشی سے یہ شادی کر لی گئی۔ ویسے حنا یقین کرو مجھے سخت حیرت ہے، مجھے کچھ تفصیل تو بتاؤ!"

"کیا تفصیل بتاؤں افشاں، بس یُوں سمجھ لو شادی کر لی میں نے۔"

"تم نے یا تمھارے ڈیڈی نے؟"

"نہیں ڈیڈی نے تو شادی نہیں کی۔" حنا ہنس پڑی۔

"بھئی میرا مطلب یہ نہیں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہُوں کہ ثاقب صاحب سے شادی تمھاری پسند سے ہُوئی ہے یا تمھارے ڈیڈی کی پسند سے؟"

"میری پسند سے، میرے ڈیڈی نے ثاقب کو پسند نہیں کیا لیکن شاید تمھیں میری فطرت کا اندازہ ہو افشاں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا اور وہ فیصلہ آخری تھا۔"

"اِس کا مطلب ہے کہ تم... تم گھر سے علیٰحدہ ہوگئیں۔"

"ہاں شادی کے بعد گھر سے علیٰحدہ تو ہو ہی جاتے ہیں۔ لیکن ڈیڈی نے مجھے خُوشی سے اپنے آپ سے علیٰحدہ نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ میری زندگی میں ثاقب کے علاوہ

کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ ڈیڈی کا خیال تھا افشاں کہ ثاقب کے ساتھ مجھے زندگی کے بہت سے مشکل مرحلے طے کرنے ہوں گے۔ اور میں اُن مرحلوں پر پامرد نہیں رہوں گی۔ میں نے ڈیڈی کی بات منظور نہیں کی اور بالآخر ثاقب سے شادی کر لی اور اب میں ثاقب کے ساتھ ایک گندے سے علاقے کے چھوٹے سے گھر میں رہتی ہُوں۔ ہم دونوں ملازمت کی تلاش میں ہیں اور اِس بات کے خواہاں ہیں کہ زندگی میں کوئی بہتر مقام حاصل کر لیں۔"

افشاں کے چہرے پر افسوس کے آثار نظر آئے تھے۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تو تم نے اپنے ڈیڈی سے بغاوت کر کے اپنی پسند کی شادی کر لی؟"

"ہاں افشاں اور میں اِس پر شرمسار نہیں ہُوں۔ ثاقب جتنا اچھا ہے، جتنا عظیم ہے۔ میرے علاوہ بھلا کون جان سکتا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ میں اپنے سینے میں کسی اور کو یہ مقام نہیں دے سکتی۔ اور جب کسی شئے کو اطمینان کی نگاہ سے نہ دیکھا جا سکے تو پھر اُس سے منسُوبیت کیا معنی رکھتی ہے۔"

"افسوس... واقعی افسوس ہُوا!"

"کمال کی لڑکی ہو تم۔ میری خُوشی پر افسوس کر رہی ہو۔"

"خُوشی پر نہیں بلکہ تمھاری اِس کیفیت پر جیسا کہ تم نے بتایا کہ تم بے روزگار ہو۔ میرا مطلب ہے ثاقب۔ تو کیا تم مشکلات میں زندگی نہیں گزار رہیں؟"

"اگر اِسے جذباتی تصوّر نہ سمجھو افشاں تو یقین کرو کہ اگر زندگی کا کوئی من پسند ساتھی مِل جائے تو بہت سی دوسری چیزیں بے وقعت ہو جاتی ہیں۔ بے شک ہم شدید ترین معاشی مسائل کے شکار ہیں۔ لیکن یہ عارضی چیز ہے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش مِل ہی جائے گا۔ اِس دنیا میں بہت سے لوگ جیتے ہیں اور مختلف طریقوں سے جیتے ہیں۔ ہمیں بھی جینے کا کوئی نہ کوئی سہارا ضرور مِلے گا۔ میں خود بھی کوئی ملازمت کرنا چاہتی ہُوں۔ لیکن اُن لوگوں کے سہارے سے نہیں، جو میرے ڈیڈی کے دوست یا شناسا ہیں۔ بس مجھے کوئی ایسی ملازمت چاہیئے کہ ہم زندگی کو ہلکے پھلکے انداز میں آگے بڑھا سکیں اور بالآخر ہمیں بھی زندگی کے وہ راستے مِل جائیں گے۔ جو بڑھاپے کی منزل تک لیجاتے ہیں۔"

"کاش میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں حنا۔" افشاں نے خلُوص سے کہا۔

"اگر کر سکتی ہو تو ضرور کرو۔ اِس وقت مجھے تم جیسے ہی ساتھیوں کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"ایک بات کا میں تم سے وعدہ کرتی ہُوں حنا کہ میں آج ہی ڈیڈی سے بات کروں گی۔ شاید وہ کچھ کر سکیں۔"

"میں تمھارا بے حد شکریہ ادا کروں گی افشاں خاص طور سے اِس لئے کہ تم نے اِن حالات میں بھی بڑی جُرأت اور ہمت سے اپنے گھر میں خُوش آمدید کہا ہے۔ ورنہ لوگ ایسے نہیں ہوتے۔"

افشاں نے آگے بڑھ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔

ایسی باتیں نہ کرو حنا میں یونیورسٹی کی اُس حنا کو جانتی ہُوں جس کے دونوں ہاتھ کسی کو کچھ دینے کے لئے بے چین رہا کرتے تھے اور اب اگر یہ ہاتھ کسی کی سمت اُٹھتے ہیں تو اُن ہاتھوں کو چُوم لینا ضروری ہوگا۔"

"یہ تمھارا ظرف ہے افشاں، بلاشبہ تم بہت اچھی ہو۔ کاش میں اپنے اچھے وقت میں تم سے اِتنی ہی بے تکلف ہو سکتی۔"

"چھوڑو اچھے وقت کے ساتھی تو بے شمار ہوتے ہیں۔ میں اگر تمھارے لئے کچھ کر سکی تو مجھے زندگی کا سب سے زیادہ لُطف حاصل ہوگا۔"

چائے کے دوران مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر حنا نے کہا۔

"اب مجھے اجازت دو افشاں، یُوں سمجھ لو کہ آج کی یہ ملاقات نظر انداز کرنے کے لئے نہیں ہے۔ میں تم سے رابطہ قائم کروں گی۔"

"بالکل بے فکر رہو حنا۔ اب یہ تمھارا ہی نہیں میرا بھی مسئلہ ہے۔ میں دِل سے یہ بات کہہ رہی ہُوں۔"

حنا نے اظہارِ تشکر کے طور پر افشاں کے ہاتھ دبائے اور پھر اُس کے پاس سے چلی آئی۔ اب گھر واپس جانا ضروری تھا۔ گھر کا دروازہ کُھلا تھا۔ اِس کا مقصد ہے کہ ثاقب اندر موجود ہے۔ وہ مُسکراتی ہُوئی اندر پہنچی تو ثاقب بستر پر لیٹا کسی سوچ میں گُم تھا۔ حنا کو دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھا۔

"ہیلو ثاقب تھک گئے؟" حنا نے مُسکرا کر کہا۔

"نہیں۔ کیسی تھکن؟ البتہ اگر تمھیں میرا انداز تھکا تھکا محسُوس ہو رہا ہے تو یہ اُس وقت تک کے لئے سمجھو جب تک ہماری زندگی کے لئے کوئی راستہ نہیں مِل جاتا۔"

حِنا نے ثاقب سے کچھ نہیں پُوچھا۔ اُس نے بھی کچھ نہیں بتایا البتہ اُس نے سو سو کے چند نوٹ نکال کر حِنا کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"یہ... یہ کیا ہے؟"

"یقین کرو حِنا میں نے اپنی کوئی غزل نہیں بیچی ہے۔ بہت پہلے ایک پبلشر پر کچھ رقم نکلتی تھی۔ آج اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُس سے یہ رقم وصول کرلی۔"

"ہُوں! چلو ٹھیک ہے۔ اس حد تک بُرا نہیں ہے۔ لیکن میرا کہنا ہمیشہ ماننا۔ مجھے زندگی میں کچھ نہ ملے، تمھارے اشعار میرے لئے ہونے چاہئیں۔ میں اپنے اِس حق کو کھونا پسند نہیں کروں گی۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو حِنا، مُجھ سے اِس کی توقع رکھتی ہو کہ جس چیز کے لئے تم نے منع کردیا میں اُس پر عمل کروں گا۔"

حِنا نے مسرت سے ثاقب کا راز پکڑلیا تھا۔ زندگی کا یہ سفر چھوٹے چھوٹے واقعات کے ساتھ جاری رہا اور پھر ایک دن افشاں نے حِنا کو خوشخبری سُنائی۔ وہ اِس دوران دو بار حِنا سے مِل کر اِس بات کا وعدہ کرچکی تھی کہ وہ اُسے ملازمت دلا کر رہے گی۔ اُس نے حِنا کے ساتھ اُس کا گھر بھی دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اُس صبح افشاں بہت مسرور وہاں پہنچی تھی۔

"جناب، ہم نے اپنا وعدہ پُورا کردیا۔ آیئے ہمارے ساتھ۔"

حِنا کو افشاں اپنے ساتھ جس جگہ لے گئی۔ وہاں حِنا کو کافی اچھے حالات نظر آئے تھے۔ ایک پرائیویٹ فرم تھی جس کے مالک تنویر صاحب تھے اور تنویر صاحب افشاں کے والد کے دوست تھے۔ انھوں نے حِنا کو اپنی سیکریٹری کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ پندرہ سو روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ حِنا نے بڑی خوشی سے یہ نوکری قبول کرلی اور اُس کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ تنویر صاحب کو اپنی کارکردگی سے متاثر کرکے دم لے گی پھر اُس نے اپنی اِس ملازمت کی خوشخبری ثاقب کو سُنائی اور ثاقب نے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ لئے۔ چند لمحات خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"میری طرف سے مُبارک باد قبول کرو حِنا۔"

"شکریہ جناب! نہ صرف مُبارک باد بلکہ آپ تشریف لایئے میرے ساتھ کچن میں۔ کچھ عُمدہ عُمدہ چیزیں مل کر پکائیں گے۔ آخر خوشیاں منانا تو سب کا حق ہے۔"

ثاقب نے اُس کی خواہش پر اُس کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اُس کے ہونٹوں پر جاندار مُسکراہٹ نہیں پیدا ہو سکی تھی۔ ایک مہینہ بڑے سکُون سے گزر گیا۔ ثاقب کے معمُولات جُوں کے تُوں تھے۔ حِنا اپنی فرم میں اپنی زندگی بنانے میں لگی ہُوئی تھی اور تنویر صاحب اُس کے معترف ہوگئے تھے، ڈیڑھ ہزار روپے کے نوٹ حِنا کو تنخواہ کی شکل میں ملے تو اُسے یُوں محسوس ہُوا کہ اُس کے سر سے مصائب کے تمام بوجھ اُتر گئے ہوں، گھر پہنچی تو ثاقب معمُول کے مُطابق پلنگ پر دراز گہری سوچوں میں گم تھا۔ حِنا کو دیکھ کر چونکا اور حِنا نے ڈیڑھ ہزار کے نوٹ اُس کے سامنے رکھ دیئے۔

"آج پہلی تاریخ ہے ثاقب۔"

ثاقب نے عجیب سی نگاہوں سے اُن نوٹوں کو دیکھا اور دُکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"کاش میں تمھاری تنخواہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا۔ بلکہ اپنی کمائی تمھارے سامنے رکھتا حِنا!"

"کیا یار فرسُودہ باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو تم۔ اب کوئی درد بھرا گیت گنگنانا شروع کردینا۔ ثاقب مَیں تم سے بار بار یہ بات کہہ چکی ہُوں کہ زندگی کی گاڑی دونوں پہیوں سے چلتی ہے۔ جو کچھ میں نے کیا وہ تم نے ہی تو کیا ہے۔ بس بے کار باتیں نہ کرو۔ چلو کہیں باہر چل کر کھانا کھائیں گے۔"

ثاقب نے کوئی جواب نہیں دیا اور حِنا کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ حِنا نئی زندگی میں اِس طرح گم ہو گئی کہ آہستہ آہستہ اُس کے ذہن سے ماضی بالکل ہی گم ہوگیا۔ وہ بھُول گئی تھی کہ وہ کیا ہے، بس اُسے یہ یاد تھا کہ وہ حِنا ثاقب ہے۔ اور اُن کا ایک چھوٹا سا گھر ہے جس میں اُن کی زندگی سکُون سے گزر رہی تھی۔ البتہ ایک ہلکا سا احساس اُس کے ذہن میں ضرور اُبھرتا تھا وہ یہ کہ ثاقب اپنی ملازمت کے لئے اِتنی کوشش نہیں کررہا جتنی اُسے کرنی چاہئے تھی۔ اِس سلسلے میں اُس کی کاوشیں بہت کم تھیں۔ حِنا نے ایک دِن تنویر صاحب سے کہا۔

"سر، میرے شوہر بھی ملازمت کے متلاشی ہیں اور بہت عرصے سے اِس سلسلے میں کوششیں کررہے ہیں مَیں نے آپ سے یہ عرض کردینا ضروری سمجھا۔ ہوسکتا ہے آپ اِس سلسلے میں میری کچھ مدد کرسکیں۔"

تنویر صاحب نے مُسکراتے ہُوئے حِنا کو دیکھا اور پھر بولے۔

"کیا تمھارے شوہر بھی تمھاری طرح محنتی اور نفیس

انسان ہیں؟"

"سر یہ اندازہ تو آپ اُنھیں دیکھ کر ہی لگا سکیں گے۔"

"تو پھر ایک خوشخبری سُن لو اتفاق سے میرے پاس ایک سیٹ خالی ہُوئی ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کے لئے اخبار میں اشتہار دُوں لیکن اگر ثاقب یہ جگہ سنبھال سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ تم اُنھیں کل مجھ سے ملا دو۔"

حِنا کی خوشیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ اُس شام وہ بڑی تیز رفتاری سے گھر پہنچی تھی اور ثاقب کا انتظار کررہی تھی۔ تقریباً ساڑھے سات بجے ثاقب واپس آیا چہرے پر وہی افسُردگی، وہی تھکن طاری تھی۔ حِنا کو مُسکراتے دیکھ کر خود بھی اُس کی مُسکراہٹوں میں شریک ہوگیا اور ایک شعر سُنا ڈالا۔

"اے شاعرِ آوارہ کچھ زندگی کی بھی فکر، نصف بہتر تیرے لئے ایک بہترین پروگرام لائی ہے۔"

"کیا حِنا؟"

"نوکری... ایک نوکری۔ وہ بھی میرے ہی دفتر میں۔ دونوں ساتھ ساتھ جایا کریں گے۔ ساتھ ساتھ واپس آئیں گے۔ زندگی کو ایک حسین رُخ مل جائے گا۔ یہ سُن لو ثاقب کہ ہماری مشکلات نے بالآخر ہمارے عزم کے سامنے دم توڑ دیا۔ اب تم بھی اِس فرم میں ملازمت حاصل کرلوگے، اور کفایت شعاری سے کام لے کر اپنے اِس چھوٹے سے گھر کو ایک چھوٹے سے خوبصُورت مکان میں تبدیل کرلیں گے۔ بہت سی آسانیاں حاصل ہوجائیں گی ثاقب۔ بہت کم لوگ اِتنے خوش نصیب ہوتے ہوں گے جنھیں اِس طرح زندگی کی خُوشیاں اور اِتنی جلد مِل جائیں۔"

ثاقب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک تازہ غزل موزوں کررہا تھا اور گہری سوچ میں کھویا ہُوا تھا پھر اُس نے آہستہ سے گردن جھٹکتے ہُوئے کہا۔

"تمھارے خیال میں کیا یہ میرا مقام ہوگا حِنا؟"

"میں سمجھی نہیں ثاقب!" حِنا نے کہا۔

"ایک دفتر کی میز پر بیٹھ کر کلرکی کرنا میرے اُن بلند و بالا خوابوں کا حاصِل تو نہیں ہے جو میں نے اپنی زندگی کے لئے دیکھے تھے۔ تمھارے لئے دیکھے تھے۔ حِنا میں ذہنی طور پر مرجاؤں گا۔ میرا وجُود پارہ پارہ ہوجائے گا میں ایک کلرک بن کر نہیں جی سکتا۔ یُوں سمجھو کہ اگر میں خود کلرک بن گیا تو میرے تمام تعمیر کئے ہُوئے محل دھڑام سے زمین پر آگریں گے۔ کلرک دُنیا کا سب سے مظلُوم انسان... میں نے اُس کے موضوع پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ میں خود پر مظلُومیّت کیسے طاری کرسکتا ہُوں۔ کیا تم یہ پسند کروگی حِنا کہ میری زندگی اُن احساسات کا شکار ہوجائے جن پر میں نے بہت کچھ کہا ہے حِنا۔"

حِنا سکتے کے سے عالم میں ثاقب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پریشان بھی ہوگئی تھی۔ کیا ثاقب یہ ملازمت قبُول نہیں کرے گا! کیا وہ اپنے لئے بہت بڑی جگہ چاہتا ہے۔ اور کیا اِس بڑی جگہ کا حصُول آسان ہوگا؟ ثاقب تو شاعر ہے۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے والا... وہ زندگی کی اِن حقیقتوں سے مُنہ کیسے موڑ رہا ہے وہ کیوں نہیں سوچتا کہ منزل ایک بے معنی سا لفظ ہے۔ اِس کا تصوّر تو کرلیا جاتا ہے۔ اِس کی صُورت دیکھنے والے شاذ و نادر ہی ہوں گے۔ ہاں چلتے رہنے کا نام سفر ہے اور منزل ایک تصوّر ہوتی ہے۔ بعض لوگ اپنے اِس تصوّر کی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں اور بعض راستے میں کھو جاتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ ثاقب ایک لااُبالی قسم کا شاعر ہے۔ اُسے وہ دِن یاد تھا جب بیگم فردوس کے ہاں تھوڑے سے کھانے کے عوض ایک غزل سُنائی تھی اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ سپاس گزاری ہے یا مُعاوضہ... لیکن اُس وقت کا لااُبالی پن ایک الگ حیثیت رکھتا تھا۔ ثاقب کو کم از کم یہ سوچنا چاہئے کہ اب زندگی دوسرا رُخ اختیار کرچکی ہے۔ اُس کا ماضی بھی ایسا نہیں تھا کہ حال کی تلخیوں میں وہ خود کو بھُول نہ سکتا۔ آخر حِنا بھی تو ملازمت کررہی تھی۔ ایسی ملازمت جسے وہ سینکڑوں لوگوں میں تقسیم کرسکتی تھی۔ مگر اُس نے محبت کی خاطر سب کچھ اپنا لیا تھا اور اپنی محبت کا تاوان ادا کررہی تھی۔ ثاقب کو بھی یہی چاہئے کہ اپنا مستقبل بنانے میں حِنا کے ساتھ مکمل تعاوُن کرے اُسی جیسا اندازِ فکر اختیار کرے۔ لیکن اُسے ثاقب سے محبت تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ثاقب ذہنی طور پر مُردہ ہوجائے۔ چنانچہ وہ خاموش ہوگئی۔

تنویر صاحب کے سامنے اُسے جھُوٹ بولنا پڑا تھا۔ اُس نے تنویر صاحب سے کہا تھا کہ ثاقب نے ایک دوسری ملازمت کے لئے کوشش کی تھی اور اُس کے مِل جانے کے امکانات ہوگئے ہیں چنانچہ اِس ملازمت کو کسی اور کے حوالے کردیا جائے۔ لیکن یہ کہتے ہُوئے اُسے ایک دُکھ سا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ سوچ رہی تھی کہ ثاقب نے اِس ملازمت کو ٹھکرا کر

اچھا نہیں کیا۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ اپنے آپ کو حِنا سے بہتر کیوں سمجھتا ہے؟ جب حِنا نے یہ زندگی اپنالی ہے۔ تو ثاقب کو چاہیئے تھا کہ اُس کی محبت کی تکمیل کے لئے اور اُس کی خوشیاں رکھنے کے لئے خود بھی یہ ملازمت قبول کرلے، لیکن بہرطور وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسی تلخی نہیں چاہتی تھی، چنانچہ اپنے طور پر اُس کی جدوجہد جاری رہی اور تنویر صاحب کے ذہن میں اُس کے لئے جگہ بڑھتی رہی۔ چنانچہ چوتھے ہی مہینے اُس کی تنخواہ دو ہزار ہوگئی۔ البتہ ثاقب کچھ اور سُست پڑ گیا تھا۔ اب اُس کا زیادہ تر وقت ہوٹلوں اور پارکوں میں گزرتا تھا۔ اور وہ شام کو اس وقت گھر آجاتا تھا جب حِنا کے آنے کا وقت ہوتا تھا اور پھر اُس کی تازہ نظم، نئی غزل حِنا کے لئے تیار ہوتی۔ اب اِن نظموں اور غزلوں کا مرکز حِنا ہی رہ گئی تھی بلکہ اُس میں دُنیا کا رونا بھی تھا اور حالات کی بے بسی کا اظہار بھی۔ حِنا صبر و سکون کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ پھر اُس نے کوشش کرکے پارٹ ٹائم میں اپنے لئے ایک کام اور تلاش کرلیا۔ کسی کمپنی کے حسابات لکھنے کا معاوضہ اُسے آٹھ سو روپے ماہانہ کی شکل میں مل گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ کام گھر پر شروع کردیا۔ اٹھائیس سو روپے ماہوار کی آمدنی ہوگئی تھی۔ چنانچہ حِنا نے اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے کا آغاز کیا۔ وہ یہ گھر چھوڑنا چاہتی تھی چنانچہ وہ اِس سلسلے میں کوشش کرنے لگی اور تنویر صاحب نے یہاں بھی اُس کا ہاتھ تھاما۔ اُنھوں نے ایک فلیٹ حِنا کو دے دیا جو اُن کی اپنی ملکیت تھی۔ اُنھوں نے اِس فلیٹ کا ایڈوانس وغیرہ بھی نہیں لیا تھا اور کرایہ بھی نہیں لینا چاہتے تھے لیکن حِنا نے اُنھیں مجبور کیا کہ احسانات اِس حد تک رہیں جو قابلِ برداشت ہوں۔ چنانچہ تنویر صاحب نے اُس سے پانچ سو روپے ماہوار وصول کرنا شروع کردیئے۔ وہ حِنا کی کارکردگی سے بہت متاثر تھے۔ ثاقب نے نئے فلیٹ میں منتقل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا البتہ پُرانے گھر کو چھوڑتے ہُوئے اُس نے ایک نظم ضرور کہی تھی جس میں بچھڑے ساتھی کو تسلّیاں دی گئی تھیں۔ حِنا کو یہ نظم پسند نہیں آئی تھی وہ اُسے ایک بدنُما جگہ سے لئے جارہی تھی، بہرطور دونوں اِس فلیٹ میں منتقل ہوگئے اور یہاں کی فضا میں ثاقب اُسی طرح گھُل مِل گیا جیسے اپنے پُرانے گھر میں تھا نئے فلیٹ میں آنے کے بعد بھی اُس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہُوئی تھی لیکن حِنا کو اپنی زندگی میں ایک تبدیلی محسوس ہُوئی۔ یہاں آئے ہُوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اُسے کچھ انوکھے احساسات ہُوئے وہ احساسات جو شادی شُدہ زندگی کا انعام ہوتے ہیں۔ اور اُس نے شرماتے ہُوئے انداز میں ثاقب کو ایک نئے مہمان کی آمد سے آگاہ کیا تو ثاقب نے فوراً ہی ایک نظم آنے والے مہمان پر کہہ ڈالی جس کی داد حِنا نے اُسے شرماتے ہُوئے دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کانٹا سا اُس کے دِل میں چُبھ گیا ثاقب نے حِنا سے یہ نہیں پُوچھا تھا کہ اِس نئے مہمان کے لئے اُس کے اپنے فرائض کیا ہوں گے؟ کوئی عملی قدم اُٹھانے کے بجائے اِس نئے مہمان کی شان میں ایک غزل کہہ ڈالی تھی اور اپنے فرض کی تکمیل کردی تھی۔ لیکن حِنا ثاقب سے کچھ نہ کہہ سکی اور خاموشی اختیار کرلی اُس کے معمولات یونہی چلتے رہے۔ حِنا کو البتہ مزید کچھ پریشانیاں لاحق ہوگئی تھیں پھر ایک شام ثاقب اُس وقت گھر میں داخل ہُوا جب حِنا آچکی تھی۔ ثاقب کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔ حِنا اُسے مُسکراتے دیکھ کر خوش ہوگئی۔

"خیریت جناب کیا ہُوا؟"

"حِنا یُوں سمجھ لو کہ زندگی بہت عرصہ کے بعد مجھے میری حیثیت دینا چاہتی ہے تم اگر اجازت دو اور کچھ مدد کرو۔ تو یُوں سمجھ لو کہ بات بن جائے گی۔"

"ذرا تفصیل بھی ہوجائے جناب؟" حِنا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"میرا ایک دوست تھا بہت پُرانا۔ بہت عرصہ پہلے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ میرا اِتنا ہی مداح۔ اِتنا ہی شیدائی تھا۔ جانتی ہو آج کل وہ کیا کر رہا ہے؟"

"نہیں۔"

"دوبئی میں اُس نے اپنی ایک فرم کھولی ہُوئی ہے۔ ساری دُنیا سے اخبارات و رسائل منگاتا ہے۔ اور دوبئی میں فروخت کرتا ہے۔ بھئی اُس کی تو حیثیت ہی بدلی ہُوئی ہے۔ پہلے ایک پسماندہ سا لڑکا تھا۔ میری طرح ہی لااُبالی اور بے فکرا۔ مارے باندھے اُس کے ماں باپ نے اُسے دُوبئی بھیج دیا۔ وہاں نہ جانے اُس نے کیسے ترقی کرلی اور کسی مقامی شخص سے مِل کر اِس کاروبار کا آغاز کردیا اور اب جو آیا ہے وہ تو اُس کی آن بان دیکھنے کے قابل ہے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر میں اُس کا ساتھ دُوں تو بہت کچھ ہوسکتا ہے

اور حِنا میں چاہتا ہُوں کہ میں اُس کے ساتھ دُوبئی چلا جاؤں تم یقین کرو ہماری تمام مشکلات کا حل نکل آئے گا۔"

حِنا کا دِل دھک سے ہوکر رہ گیا تھا۔ اُسے ثاقب سے یہ توقع نہیں تھی۔ ثاقب جانتا تھا کہ حِنا نے اُس کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے اور تنہا اُس کی ذات پر بھروسہ کیا ہے، اُس نے اپنا سب کچھ صرف ثاقب کو سمجھ لیا تھا۔ اور سب کچھ چھوڑ کر ثاقب کے پاس آگئی تھی اُس کے گندے سے گھر میں۔ اِس معمولی سے مکان میں جہاں کوئی شریف آدمی رہنا پسند نہ کرے اور اُس کے بعد زندگی کی جدوجہد کرتی ہُوئی وہ اِس فلیٹ تک آپہنچی تھی۔ اُسے دولت تو نہیں چاہیئے تھی۔ ثاقب کی قربت درکار تھی اُسے۔ اور اِس قربت کے لئے اُس نے دولت کے انبار ٹھکرادیئے تھے۔ اور اب اگر ثاقب اُسے تنہا چھوڑ جانے کے بارے میں سوچ رہا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کا اندازِ فکر مختلف ہے۔ دولت تو بہت تھی اُس کے پاس۔ اگر وہ آفندی صاحب سے تعاون کرلیتی تو نہ جانے کیا کچھ تھا اُس کے پاس۔ دولت کے لئے تو اُس نے زندگی کا کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھایا تھا۔ پھر دولت کے لئے کیا وہ ثاقب کو چھوڑ دے؟ اور تنہا رہ جائے۔ یہ تنہائی تو اُس صُورت میں بھی ممکن ہوسکتی تھی کہ وہ ثاقب کے ساتھ زندگی گزارنے کا ارادہ ترک کردیتی۔ ثاقب نے بے حسی کا ثبوت دیا ہے اور آج پہلی بار اُسے اپنے والد کے الفاظ یاد آنے تھے۔

"وہ ایک ناکارہ آدمی ہے۔ اگر وہ صرف غریب ہوتا تو شاید میں اُسے قبول کرلیتا۔ لیکن میں نے اُس سے جو گفتگو کی اُس کی روشنی میں میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ ثاقب ذہنی طور پر معطّل ہے۔ وہ صرف خیال کی دُنیا کا انسان ہے۔ عملی زندگی میں وہ کچھ نہیں ہے۔" اُس وقت حِنا نے سوچا تھا کہ یہ آفندی صاحب کے اندر کا بڑا آدمی بول رہا ہے۔ لیکن آج ثاقب کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر اُسے آہستہ آہستہ اُن الفاظ کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ اِس احساس کو پرورش کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے تو دِل و جان سے ثاقب کو چاہا تھا۔ یقیناً اُس وقت وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ چاہت سے آگے بھی کچھ اور دُنیا ہوتی ہے ثاقب کو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن ساری رات وہ سو نہ سکی۔ اگر ثاقب کے ذہن میں بھی اُس کے لئے یہی سب احساسات ہوتے تو وہ کلرکی کرکے حِنا کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کرتا۔ یہیں رہ کر کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتا۔ اُسے یُوں چھوڑ کر دوبئی جانے کا تصوّر بھی نہ کرتا۔ لیکن شاید تقدیر مجھے سزا دینا چاہتی ہے۔ شاید اِس بات کی سزا کہ میں نے اپنے باپ کو دُکھ پہنچایا ہے۔ شاید اِس بات کی سزا کہ میں نے ایک جہاندیدہ شخص کے تجربے کو ٹھکرایا ہے۔ شاید آفندی صاحب کا کہنا ہی درست تھا۔ رات بھر وہ یہی سوچتی رہی اور رات کے آخری حصّے میں اُس کے وجُود میں پہلے والی حِنا زندہ ہوگئی۔ اُس نے سوچا کہ جو کچھ میں نے ثاقب کے بارے میں سوچا ثاقب نے میرے بارے میں کیوں نہ سوچا؟ کیا میں اُس کے لئے اِتنی گر جاؤں کہ اُس سے اپنی محبت کی بھیک مانگوں۔ اُسے یہ بتاؤں کہ اُسے دوبئی کی دولت کی ضرورت ہوگی مجھے نہیں۔ میں تو دولت کے انبار پر چلتی ہُوئی یہاں تک آئی ہُوں، بہرطور آخری فیصلہ اُس نے یہ کیا کہ اگر ثاقب اِس طرح جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں اُس کی راہ کی رُکاوٹ نہیں بنوں گی۔ میں اُسے یہ کہنے کا موقعہ نہیں دُوں گی کہ میں نے اُس کی زندگی کی جدوجہد میں راستے کاٹے ہیں۔ اپنے اِس فیصلے سے وہ مطمئن ہوگئی۔

"حِنا شاید تم مجھ سے متفق نہیں ہو۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"میں نے جو کچھ تم سے کہا تھا تم نے اُس کا جواب نہیں دیا۔"

"نہیں ثاقب سوچ رہی تھی میں... سوچ رہی تھی کہ کیا ہونا چاہیئے؟ میرا خیال ہے تمھارا فیصلہ درُست ہے۔"

"کیا واقعی؟" ثاقب خُوشی سے اُچھل پڑا۔

"ہاں ظاہر ہے اب ہم جذبات کی زندگی کا طویل عرصہ گزار چکے ہیں۔ تم شاید حقیقت کی زندگی اپنانا چاہتے ہو۔ میں تمھارا راستہ نہیں روکوں گی۔"

"تو پھر میں اپنے دوست سے مِل لُوں؟" ثاقب نے سوال کیا۔

"ہاں مِل لو۔ ضرور مِل لو۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"لیکن حِنا اِس کے لئے مجھے بھی کچھ انتظامات کرنے ہوں گے۔"

"کیسے انتظامات؟" حِنا نے پُوچھا۔

"وہ... کچھ تھوڑی سی رقم چاہیئے ہوگی ناں۔ حالانکہ وہ مجھے اپنے اخراجات پر اپنے ساتھ لے جارہا ہے لیکن دیارِ غیر۔ غیر ہی ہوتا ہے۔ کم ازکم میری اپنی بھی تو کچھ حیثیت ہونی چاہیئے۔"

"ہاں... ہاں کیوں نہیں، میں کوشش کروں گی۔" حِنا نے جواب دیا۔

اُس کے ذہن میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہوگیا تھا ثاقب کے اِن الفاظ نے اُسے نہ جانے کتنی بلندیوں سے نیچے لا پھینکا تھا۔ اب تک وہ کسی اور پہ ہی بھروسہ کرتی رہی تھی۔ اس نے ایک بے نام سا سہارا اپنا لیا تھا۔ لیکن اب محسوس کرتی تو اس کے عقب میں کچھ نہ تھا۔ تنہا تھی۔ ہاں تنہا تھی وہ۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنا کیا وہ خود ہی بھگتے گی۔ ثاقب کو سمجھنے میں واقعی غلطی ہوگئی تھی۔ اُسے حِنا سے اِتنی رغبت نہیں تھی کہ حِنا کے وجُود میں مکمل طور سے گُم ہو جاتا اور نہ ہی . . . نہ ہی اُسے آنے والے مہمان کی کوئی خوشی ہُوئی تھی۔ جو اُن دونوں کی اُمنگوں کا ثمر تھا۔ وہ یہ باتیں سوچتی رہی اور اُس نے اپنے دِل میں نئے حوصلے پیدا کئے۔ اُس دن اُس نے تنویر صاحب سے عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ اُسے کچھ رقم ایڈوانس کے طور پر دے دی جائے۔

"ضرور بیٹی! ایسی کیا ضرورت آپڑی ہے؟" تنویر صاحب نے محبت سے پُوچھا۔

"وہ دراصل ثاقب دُوبئی جا رہے ہیں۔ اُس کے لئے رقم کی ضرورت پڑگئی ہے"

"جتنی تم چاہو لے لو۔ بعد میں ہم حساب کتاب کرلیں گے" تنویر صاحب نے کہا اور بالآخر اُس کی ضرورت کے مطابق رقم مِل گئی۔

اُس نے یہ رقم ثاقب کو دی تو ثاقب خُوشی سے اُچھل پڑا۔ اُس نے حِنا کا ہاتھ پکڑتے ہُوئے کہا۔

"حِنا تم نے میرے لئے جو قربانیاں دی ہیں میں اُنھیں تاحیات نہیں بھُولوں گا۔ حِنا میں نے اپنے خیالوں میں جو تاج محل بنائے اُن کی شکل مختلف تھی۔ مَیں نے اپنے خوابوں کے حسین محل میں تمھیں ایک اور رُوپ میں دیکھنا چاہا تھا۔ حِنا میں وہی رُوپ تمھیں دینا چاہتا ہُوں ایک چھوٹا سا گھر۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ۔ معمُولی سی زندگی میرے خوابوں کی تکمیل تو نہیں ہے۔ میں اُنہی خوابوں کی تکمیل کے لئے سرگرداں تھا اور میں سمجھتا ہُوں کہ اب اِس کا آغاز ہوگیا ہے۔ میں ایک سُنہرے مستقبل کے لئے جا رہا ہُوں۔ بہت جلد ہم اپنا کھویا ہُوا مقام حاصل کرلیں گے اور میں تمھیں وہی سب کچھ دے سکوں گا جو میرے دِل میں ہے۔ حِنا میں تمھارا شکر گزار ہُوں"

"نہیں ثاقب میں اپنا فرض پُورا کر رہی ہُوں" حِنا نے پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر دوسرے دِن خریداری کی گئی۔ کئی نئے سُوٹ اور بہت سی دوسری چیزیں، بالآخر اُس نے ثاقب کو اُس کے دوست کے ساتھ ایئر پورٹ پر الوداع کیا۔ ثاقب کے چہرے پر وہ اپنی جُدائی کا غم تلاش کرنے لگی لیکن یہ غم ثاقب کے چہرے پر نہیں تھا جب کہ اُس کا دِل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ اُسے الوداع کہہ کر واپس آئی تو تنہائی کا احساس بے پناہ ہوگیا۔ گھر آئی اور بستر پر گر پڑی آنکھوں سے آنسُوؤں کی دھارا بہہ نکلی تھی۔ ثاقب دُوبئی چلا گیا لیکن اپنے پیچھے بے شمار تصورات چھوڑ گیا تھا۔ ایسے تصورات جنھیں وہ اپنے خود سے بھی چھُپانا چاہتی تھی۔ وہ ساری دُنیا میں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اِس وقت کوئی ایسا نہیں تھا۔ جو اُسے سہارا دے سکتا۔ بلاشُبہ ثاقب کے انتخاب میں اُس نے غلطی کی تھی۔ ایک لمحہ ہی تو ہوتا ہے۔ جو صحیح صُورتحال واضح کر دیتا ہے، بس ثاقب نے یہ نہ سوچا کہ اُسے اِس دولت کی ضرورت نہیں جو ثاقب سے دُور رہ کر حاصل ہو سکے اُسے . . . اُسے تو ثاقب کی قربت میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے سہارے درکار تھے اور اب جب کہ وہ زندگی کے اتنے نازک . . . اتنے اہم موڑ پر ہے کہ اُن کی زندگی میں ایک اور نئی زندگی شامل ہونے والی ہے تو ثاقب کو اُس کی قربت کی زیادہ ضرورت تھی لیکن . . . لیکن اُس نے نہ سوچا قصُور شاید میرا ہے یا پھر ڈیڈی کا؟ ڈیڈی اگر اتنی سختی نہ کرتے تو شاید مجھے ثاقب کو قریب سے دیکھنے کا کچھ اور وقت مِل جاتا اور اُس وقت مَیں کوئی اور فیصلہ کرلیتی۔ کوئی صحیح فیصلہ۔ لیکن ڈیڈی نے بھی فوری طور پر اپنا فیصلہ سُنا دیا تھا ثاقب اگر میری زندگی میں داخل نہ ہوتا تو کیا میں کسی اور کو اِس حیثیت سے قبُول کر سکتی تھی؟ اِس خیال سے اُس کا دِل لرز گیا اور اُس کے مُنہ سے نِکلا۔

"نہیں خُدا نہ کرے ایسا ہوتا۔ خُدا نہ کرے ایسا ہو جاتا"

نہ جانے دروازہ کیسے کھُلا رہ گیا تھا نہ جانے وہ دروازے کو بند کرنا کیوں بھُول گئی تھی۔ اُس نے افشاں کے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سُنی تھی۔ نہ ہی اُسے دیکھا تھا جبکہ افشاں کئی منٹ سے اُسے دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اُس کی نظر افشاں پر پڑی اور وہ کسی کو محسوس کرکے اُچھل پڑی۔ لیکن پھر اُس نے افشاں کو پہچان لیا۔

"خیریت حِنا! بڑی خاموش خاموش سی بڑی عجیب سی کیفیت میں ہو۔ کیا بات ہے؟"

"اوہ! وہ . . . افشاں تمھارا بہت بہت شُکریہ۔ افشاں میری زندگی . . . میری رُوح تیرا بہت شُکریہ! اِس وقت تیرے آنے کا بے حد شُکریہ"

"ارے کیا ہُوا؟ خیریت تو ہے؟ تم کچھ پریشان سی ہو"

"تم کب آئیں . . . کب آئیں؟"

"دروازہ اِس طرح کھُلا چھوڑ دیتی ہو" افشاں نے آگے بڑھ کر اُس کی ٹھوڑی کو اُونچا اُٹھایا اور پھر نہ جانے کس خیال کے تحت اپنے دوپٹے سے اُس کے آنسُو خشک کرنے لگی، حِنا چور سی بن گئی تھی۔ افشاں نے اُس کی آنکھوں میں آنسُو دیکھ لئے تھے۔ کیا سوچتی ہوگی وہ اُس کے بارے میں؟ کیا سوچا ہوگا اُس نے آنسُوؤں کے بارے میں؟ اُس نے لرز کر افشاں کو دیکھا تو افشاں آہستہ سے بولی۔

"جی ہاں ہم جانتے ہیں کہ آپ کے محبُوب یعنی ثاقب صاحب دُوبئی چلے گئے ہیں"

"افشاں مَیں تنہا رہ گئی ہُوں۔ میں تنہا رہ گئی ہُوں افشاں" وہ بِلک بِلک کر رو پڑی اور افشاں نے اُسے سینے سے لگالیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو حِنا؟ ایسا کیوں سوچتی ہو؟ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ لوگ نوکری کرنے پردیس جاتے ہیں۔ ثاقب پر ایک بہتر مستقبل کی ذمہ داری بھی آپڑی ہے۔ تمھیں آنے والے کا استقبال ہنسی خوشی کرنا چاہیئے حِنا۔ تم خود سوچو ثاقب تمھیں بے حد چاہتے تھے۔ وہ تم سے کبھی جُدا نہ ہوتے اگر نئے مہمان کی آمد متوقع نہ ہوتی اور اب محبتوں کے زاوئیے بدل جائیں گے۔ تم بھی کسی اور کے لئے جیو گی اور ثاقب بھی تمھاری مشترکہ محبت ایک نئی صُورت اختیار کرنے جا رہی ہے حِنا۔ بھئی کیا حماقت ہے۔ اُٹھو پلیز چلو کہیں گھُوم کر آئیں کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے"

"نہیں، یہیں بیٹھتے ہیں۔ باتیں کریں گے"

"ہرگز نہیں۔ آپ نے اپنا جو یہ حُلیہ بنا رکھا ہے ناں۔ ایک بات بتا دُوں آپ کو کہ اگر آپ اپنے آپ کو انہی پریشانیوں کا شکار رکھیں گی تو جو نئے حضرت تشریف لائیں گے ناں۔ یہ پریشانیاں اُن کی صُورت پر بھی چسپاں ہوں گی۔ بھئی کیوں کسی ننھے سے مہمان کو بدصُورت بنانا چاہتی ہو، اُٹھو پلیز اُٹھو" افشاں نے کچھ اِس طرح کہا کہ حِنا کو اُٹھتے ہی بن پڑی۔

رات کا کھانا افشاں نے اُسے ایک عُمدہ سے ہوٹل میں کھِلایا تھا۔ کافی رات تک اُس سے باتیں کرتی رہی تھی اور پھر اُسے اُس کے گھر چھوڑ گئی تھی۔

"حِنا تم اطمینان رکھنا۔ عموماً شامیں مَیں تمھارے ساتھ ہی گُزاروں گی اور پھر زیادہ وقت تو نہیں لگے گا کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ ثاقب بھائی جب واپس آئیں گے تو تمھاری زندگی کا ایک نیا آغاز ہوگا اور یہ بات مَیں اچھی طرح جانتی ہُوں کہ وہ حضرت بھی دُوبئی میں تمھارے بغیر خوش تو نہیں رہ سکیں گے"

حِنا اُس کی باتوں سے عارضی طور پر بہل سی گئی تھی۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد جب رات کی کالی تنہائیاں فضاؤں پر مُسلّط ہُوئیں تو اُس نے ثاقب کے بارے میں سوچا اور اُس کے دِل نے ایک ہی بات کہی۔ کچھ بھی ہوتا، کچھ بھی ہوتا ثاقب کو یہیں رہنا چاہیئے تھا۔ لوگ چاہے کچھ بھی کہیں میں اِس بات کو تسلیم نہیں کروں گی۔ آخر اُس نے جانے کا فیصلہ کیا ہی کیسے؟ یہ کیوں نہ سوچا اُس نے کہ حِنا اگر چاہتی تو دولت کی اُس کے لئے کمی نہ تھی ثاقب سے اُسے اِتنی دولت نہیں چاہیئے تھی کہ اُن کے درمیان جُدائی پیدا ہو جائے۔

افشاں بہترین دوست ثابت ہُوئی تھی وہ جو بُرے وقت کا ساتھی ہو وہی دوست کہلایا جاسکتا ہے اچھے وقت کی یادگاریں بہت سی تھیں جن کا اب حِنا کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ دفتر جاتی گھر واپس آجاتی۔ افشاں جانتی تھی کہ اُس کی ملازمت کے اوقات کیا ہیں بعض اوقات تو یُوں بھی ہوتا کہ افشاں اُس سے پہلے اُس کے فلیٹ پر پہنچ جاتی اور اُس کے بعد شام کے معمُولات اُس کے ساتھ گزرتے۔ رات کو جب وہ واپس چلی جاتی تب یہ احساس ہوتا کہ زندگی میں تنہائی پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن یہ احساس تو ہر لمحہ رہتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مصرُوفیتیں اُسے بھلائے رکھیں پھر اُسے ثاقب کا پہلا خط دُوبئی سے موصُول ہُوا لکھا تھا۔

"میرے ریزہ ریزہ خواب حِنا!

آ تو گیا ہُوں لیکن آکر سوچ رہا ہُوں کہ کیا اچھا کیا۔ تمھارے مستقبل کا تصوّر دِل کو کسی قدر سکُون دیتا ہے۔ لیکن تمھاری جُدائی بے سکُون کر دیتی ہے۔ دُوبئی بہت خوبصُورت جگہ ہے۔ صحراؤں کی تقدیر پر رشک کرتا ہُوں

کہ قدرت نے انھیں کیا سے کیا بنا دیا لیکن اپنی ذات کے صحرا کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس میں کبھی بہار نہ آئے گی۔ یہاں کی زندگی بہت حسین ہے۔ خاص طور سے ہم بے وفاؤں کے لئے کہ اپنی لگن میں لگے رہتے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ خود کو یہاں کے ماحول میں ضم کر سکوں۔ جو تصور تم نے مجھے دیا تھا۔ وہ میرے دل و جان میں محفوظ ہے۔ نہیں جانتا کہ واپس آؤں گا تو کیا تبدیلیاں پاؤں گا۔ نہیں جانتا کہ واپس آؤں گا بھی یا نہیں؟ دوبئی کی زندگی بہت اچھی ہے۔ نیا ماحول، نئے لوگ اور پھر جگہ جگہ سے اپنے دُکھوں کی کہانی لانے والے یہاں یکجا ہوگئے ہیں۔ میرے بھی دُکھ کی ایک کہانی ہے۔ لیکن یہ کہانی تمھاری امانت ہے اور میں یہ امانت کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ اپنے سینے میں نہ جانے کیسے احساسات کے انبار دبائے ایک عملی انسان بننے کی کوششوں میں مصروف ہوں۔ ہاں تمھاری یاد کے چراغ روشن ہیں اور احساسات الفاظ کی شکل لے کر یوں گویا ہوتے ہیں۔

اِک سُندر سا سپنا بن کر دن بھر لوٹے دل کا چین
اور آنکھوں سے نیند چُرائے بھیگی بھیگی راتوں میں
بیتی باتیں بچھڑی یادیں تنہائی کا دھاریں روپ
یاد کسی کی جب تڑپائے بھیگی بھیگی راتوں میں
گھیریں دُکھ کے کالے سائے بھیگی بھیگی راتوں میں
سناٹے کا سینہ چیرے جب کوئل کی بیکل کوک
ٹیس سی دل میں اُٹھ اُٹھ جائے بھیگی بھیگی راتوں میں
تکتا رہوں میں تانے بانے کب تک اندھے سپنوں کے
آجا سچ مچ نین جھکائے بھیگی بھیگی راتوں میں
تن من سُلگے جی گھبرائے بھیگی بھیگی راتوں میں
تجھ بن ساجن جیا نہ جائے بھیگی بھیگی راتوں میں

بس یہ احساسات ہیں جو اپنے وجود میں سمو کر تمھاری یاد میں بسر کر رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم بھی مجھے یاد کرتی ہوگی، لیکن مجبوریاں ظالم سماج بن گئی ہیں اور دیکھوں اِس ظالم سماج سے کب تک چھٹکارا ملتا ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا۔

تمھارا ثاقب!

اُس نے خط پڑھا اور دل میں نہ جانے کیسی کیسی ہُوکیں اُٹھ کر ٹوٹ گئیں۔ دل میں ہلکے سے درد کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اِس درد کو دبا کر ثاقب کی یادوں میں کھوگئی، البیلا سا، مستانہ سا، لیکن وہ نہیں جو اُس نے سمجھا تھا کب مانگے تھے اُس نے محبتوں کے تاج محل۔ وہ تو اِس چھوٹی سی کُٹیا میں جینے آگئی تھی۔ کسی کی محبت کی عظیم عمارت سمجھ کر لیکن ثاقب نے دُنیا کو دُنیا کے ڈھنگ سے دیکھا۔ جو اُس نے نہ چاہا وہ تو دینے کا آرزومند رہا، جو چاہا اُسے نظر انداز کیا۔ ایک غزل موزوں کر لینا اپنے جذبات کو الفاظ میں سمو کر بیان کر دینا ایک شاعر کے لئے مشکل نہیں لیکن جذبات کی صحیح تفسیر کم از کم دوسرے سے تو پُوچھے۔ ثاقب نے وہ نہیں کیا اور یہ بات اِس دُنیا کی ریت کے مطابق ہے۔

یہ خط بہر طور اُس کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اور اُس نے اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ ثاقب کی محبت کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ کچھ نئے نئے مسائل آکھڑے ہوئے تھے اور در حقیقت وہ قدرت کے اِس رحم کی قائل تھی کہ اگر وہ انسان کے لئے جینے کا ایک بھی سہارا نہ پیدا کرے تو پھر جینا تو ممکن ہی نہ رہے۔ دردِ تنہائی، ہر درد میں شامل ہوگیا تھا۔ بدن میں موجود اجنبی وجُود اپنا احساس دلا رہا تھا۔ وہ بھی درد دینے والوں میں شامل تھا۔ درد سمیٹنے والوں میں نہیں۔

افشاں ایک ناقابلِ فراموش ساتھی تھی۔ غالباً قُدرت کی طرف سے اُس کی نگرانی کے لئے متعین کردہ جہاں تک اُس کی ذات کا تعلق تھا۔ وہ ہر طرح سے حِنا کی مدد کر رہی تھی۔ ہسپتال سے تعلق قائم کر لیا گیا تھا ایک بہت اچھی لیڈی ڈاکٹر سے دوستی ہوگئی تھی۔ اُس نے دوائیں لکھ کر ہدایات دیں۔ زیادہ محنت نہ کرنا۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھنا، بہت زیادہ محنت نقصان دِہ بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوائیں استعمال کرنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن اُس کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرنا بھلا کیسے ممکن

تھا۔ افشاں کے علاوہ کسی سے دوستی بھی نہیں تھی یہ خوف بھی رہتا تھا کہ لوگ اُسے پہچان نہ لیں۔ کوئی یہ نہ جان لے کہ وہ کون ہے۔ مذاق اُڑائیں گے۔ بات آفندی صاحب تک جا پہنچے گی کہیں وہ آکر اُسے اُس کی غلطی کا احساس نہ دلائیں، لیکن میں نے غلطی تو نہیں کی بس ثاقب ذرا مختلف قسم کا انسان نکلا۔ میں کیا کرتی؟ مجھے زیادہ تجربہ بھی تو نہیں تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتی تھی کہ انسانوں کی کتنی اقسام ہوتی ہیں؟

غمگسار افشاں ہر دوسرے دن آتی تھی ایک آدھ بار اُس کی والدہ بھی ساتھ آئیں۔ اور اُن کے الفاظ نے حِنا کو کافی تسلیاں بخشیں۔ انھوں نے کہا تھا۔

"دیکھو بیٹی، کسی قسم کی فکر مت کرنا۔ خود کو تنہا نہ سمجھو، اوّل تو افشاں آتی رہتی ہے لیکن اگر فوری ضرورت پیش آجائے تو کہیں سے فون کرا دینا۔" انھوں نے اُسے فون نمبر دے دیا۔

دوسرے محبّ اُس کے باس تھے جو انتہائی شریف انسان تھے اور یہ بات جانتے تھے کہ حِنا کا شوہر مُلک سے باہر ہے اور وہ گھر میں تنہا ہے۔ اُن کی شرافت بے مثال تھی۔ انھوں نے اُسے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی تھیں وہ حِنا کے بزرگ کی حیثیت سے لیڈی ڈاکٹر سے ملے اُس سے معلومات حاصل کر کے انھوں نے حِنا کو تین ماہ کی رخصت دلوادی۔ اگر یہ ہمدرد لوگ نہ ملتے تو نہ جانے کتنی مشکلات سے گزرنا پڑتا۔ ثاقب کا دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا خط آیا اور وہ ہر خط کی تحریر کی تبدیلی کو بخوبی محسوس کرتی رہی۔ دوبئی اب ثاقب کو اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ شارجہ، عمان، مسقط اور کویت کی باتیں کرتا تھا جہاں اُسے جانا ہوتا تھا کاروباری سلسلے میں۔ وہاں کے حُسن کے بارے میں اکثر لکھتا رہتا تھا۔ سمندر کے نیچے بنی ہوئی سُرنگ میں سفر کرتے ہوئے اُسے بے حد لطف آتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ اگر اِس سُرنگ میں ایک باریک سا سُوراخ ہو جائے تو اُس سے گزرنے والوں کا کیا حال ہوگا؟ کئی بار اُس نے ثاقب کے خطوط کا جواب بھی دیا تھا لیکن کوئی شکایت یا تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ ثاقب کو بے حد چاہتی تھی اور اُسے ذہنی اذیت نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ پردیس میں تھا اور پردیس میں انسان کے احساسات بہت نازک ہو جاتے ہیں۔ لیکن خطوں کی تحریر اُسے آگاہ کرتی رہتی تھی کہ یہ سب دِل کے بہلاوے ہیں۔ اگر غلط فہمیوں کا شکار رہ کر زندگی گزار دی جائے تو گزاری جا سکتی ہے۔ لیکن اگر گردن اُٹھا کر دیکھو تو تاریک خلاء کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ وہ اِس تاریک خلاء میں جھانکنے سے خوفزدہ رہتی تھی اور پھر زندگی میں ایک انوکھی تبدیلی رُونما ہُوئی اور اِس تبدیلی کا نام اُس نے رِدا رکھا۔

❋

بریکوں کی چنگھاڑ نے ایک دھماکہ سا پیدا کیا اور رِدا اُچھل پڑی۔ یہاں سے وہ براہِ راست اِس کہانی میں شامل ہوگئی تھی۔ رِدا... رِدا... رِدا... اُس کا ذہن چیخ رہا تھا تا حدِ نگاہ گہری تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔

ٹرین کی رفتار سُست ہوگئی تھی اور کمپارٹمنٹ کے مُسافر گہری نیند سوگئے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں وہ منظر، وہ ماحول نہیں تھا۔ ٹرین یہاں صرف ایک منٹ رُکی، اُس کے بعد عقب سے کہیں سیٹی کی آواز سُنائی دی اور خیالات کا سفر جاری ہوگیا۔ خوبصورت نیچی ماں اور باپ کے حُسن کا مجمُوعہ احسان کرنے والے جنھوں نے بے لوث حِنا کو ہر طرح کی سہُولتیں فراہم کی تھیں انسان دوستی کا بہترین ثبوت دیا تھا اور وہ دِل کی گہرائیوں سے اُس کی ممنون تھی۔

زندگی آہستہ آہستہ معمُول پر آگئی۔ اُس کے باس نے فرشتوں کا رُوپ دھار لیا تھا اور وہ ہر طرح کی سہُولتیں فراہم کر رہے تھے، چنانچہ اُس نے رِدا کی پرورش کے لئے ایک آیا کا بندوبست کیا۔ اُس کی آمدنی اور عہدہ بڑھ گیا تھا۔ کبھی کبھی ثاقب کے خط آجاتے تھے۔ اُس نے رِدا کو صرف پیار ہی بھیجا تھا اور اُس کی شان میں کچھ اشعار اور بس... باپ کی طرف سے بیٹی کو اور کوئی تحفہ نہیں ملا تھا۔ لیکن حِنا اِن چیزوں سے بے نیاز تھی۔ ضروریاتِ زندگی تو پوری ہو ہی رہی تھیں۔ اور اُن میں کوئی دِقت نہیں ہوتی تھی لیکن اب اُس نے رِدا کی موجودگی محسوس کی تھی۔ اور ثاقب کے سحر سے آزاد ہوتی جا رہی تھی۔ ثاقب اُس کے سینے میں ایک دُکھن، ایک کسک بن کر رہ گیا تھا اُسے آہستہ آہستہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ ثاقب اُس کی دُنیا سے نکلتا جا رہا ہے۔ لیکن رِدا نے بہت سی کمی پوری کر دی تھی۔ وہ اُس کے لئے تحفظ فراہم کرنا چاہتی تھی۔ اپنے اخراجات پورے کر کے خاصی رقم بچا لیتی تھی۔ جسے اب وہ رِدا کے لئے محفوظ

کر رہی تھی۔ ابھی تک تو زندگی جیسے بھی گزر رہی تھی۔ گزر رہی
رہی تھی لیکن ردا کے بعد اس نے سوچنے کے انداز میں کافی
تبدیلیاں پائی تھیں۔ بیٹی کو اس سے زیادہ باپ کی ضرورت
ہے۔ لیکن اسے بھی ضرورت تھی وقت ہی کتنا گزرا تھا ثاقب
کے ساتھ... اور اب تو ثاقب کے خط بھی آنا بند ہو گئے تھے۔
آخری خط آئے ہوئے کافی دن گزر گئے تھے اور اس آخری
خط میں اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی نوکری چھوڑ دی
ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

"ڈیئر جنا!
شاعر آوارہ کا نام دیا تھا تم نے مجھے۔ میں
نے اپنی زندگی جس انداز میں گزاری وہ تم
سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کائنات میں
بے شمار لوگ ذہن اور عمل میں بالکل مختلف
ہوتے ہیں۔ میں ذہن کی دنیا میں کچھ اور تھا۔
لیکن عمل نے مجھے میرے راستوں پر چلنے سے
روکا۔ جگہ جگہ روکا۔ اور میں ان رکاوٹوں
کو دور کرنے ہی کو زندگی تصور کرتا ہوں۔
مجھے شاعری سے ہٹا کر دکاندار بنانے کی کوشش
کی گئی تو میں نے یہ کوشش تسلیم نہیں کی۔
اور بالآخر سب کچھ چھوڑ دیا۔ میری غزلیں ہی
تو تمہاری زندگی کا سرمایہ تھیں ناں، تم جس چیز
کو محفوظ رکھنا چاہتی تھیں اس کی حفاظت کی
ذمہ داری مجھ پر بھی تو ہے۔ آئندہ کیا کروں گا؟
کیسے گزاروں گا؟ اس بارے میں ابھی تفصیل
نہیں لکھ سکتا۔ بہرطور جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔"

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا تھا اس خط میں یہاں
تک کہ ردا کا ذکر بھی نہیں تھا۔ اس دوران میں جنا معمول
کے مطابق خط لکھتی رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد ثاقب کی
طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ تب اس نے سوچا
کہ ممکن ہے ثاقب پریشان ہو۔ وطن سے دور زندگی گزارنا بھی
ایک مسئلہ ہے۔ بے شمار اخراجات ہوتے ہیں۔
آخری خط میں جنا نے اسے یہ بھی لکھا کہ اگر وہ مالی پریشانی
کا شکار ہو تو کچھ رقم روانہ کر دی جائے۔ لیکن ثاقب کی طرف
سے مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی کو کوئی ماہ کا عرصہ گزر گیا۔
جنا اس کے بارے میں سوچتی تھی کہ اگر وہ پریشانی کا شکار ہے،
تب بھی اسے خط تو لکھنے چاہیئے تھے۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں؟
طرح طرح کے خیالات جنا کو پریشان کر رہے تھے۔ ثاقب
کی شخصیت کا ایک ایک پہلو اب مزید نمایاں ہو کر اس
کے سامنے آتا تھا۔ اگر ابتداء ہی میں غور کر لیتی تو اس کی
حقیقت آشکارا ہو جاتی۔

وہ نکما انسان صرف شاعر تھا۔ نہ محبوب تھا وہ۔ اور
نہ شوہر اور نہ ہی باپ۔ کیسا انوکھا تھا وہ۔ اپنی ذات میں
لاپرواہ، بعض خوبصورت چیزیں یقیناً نوادرات میں شمار
ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے اثرات بہتر نہیں ہوتے۔ ثاقب
بھی انہی میں سے ایک تھا منفرد نظر آنے والا۔ زندگی گزارنے
میں بھی منفرد تھا۔ اس نے اپنے شانوں پر کوئی بوجھ قبول نہیں
کیا تھا۔ یہاں تک کہ محبت کا بوجھ بھی نہیں۔ کبھی ایک
پیسہ بھی تو نہیں بھیجا تھا اس نے دوبئی جا کر، جبکہ وہ اس
کے لئے محل تعمیر کرنے گیا تھا۔ اپنی بیٹی سے بھی اس نے کسی
رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں جب
وہ ثاقب کو تلاش کرتی تو اس کی ہستی اسے محبوب ہوتی۔
پہلے وہ صرف اس کی ندرت کا شکار ہوئی تھی لیکن اب وہ
اس کا شوہر تھا۔ اس کی بچی کا باپ تھا اگر وہ بیمار ہے تو اس
کے لئے کچھ کرنا ہی چاہیئے۔

اس نے بے چین ہو کر ایک روز اپنے باس سے کہا۔
"سر! میں دوبئی جانا چاہتی ہوں۔"
"کیوں، خیریت؟"
"کئی مہینے سے ثاقب کی خیریت نہیں ملی ہے۔"
"اوہ! لیکن تمہیں کافی مشکلات پیش آئیں گی۔"
"میں جانتی ہوں جناب لیکن یہ ضروری ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ مجھے بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
"کچھ عرصے کی چھٹی درکار ہوگی مجھے تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ"
"ہوں، اور دیگر مشکلات کا کیا ہوگا، پاسپورٹ وغیرہ
اور پھر وہاں جانے کی وجوہات؟ پھر اخراجات جو
ہوں گے۔"
"نہیں... نہیں میں یہ سب بندوبست کر لوں گی"
"ہوں، ٹھیک ہے پریشان نہ ہو۔ میں یہ سارے
انتظامات کر دوں گا۔"
"سر! میں بہت جلد جانا چاہتی ہوں۔"
"میں کوشش کرتا ہوں کہ تمہارے سارے کام

ہو جائیں۔"
جنا خاموش ہو گئی۔ توازن برابر تھا۔ جہاں اسے ثاقب
جیسے شوہر سے واسطہ پڑا تھا۔ وہیں اس کے ہمدرد اور محبت
کرنے والے بہت سے تھے۔ جنھوں نے ہر مشکل وقت میں
اس کا ساتھ دیا تھا اور ہوا بھی یہی اس کے باس نے تمام
انتظامات مکمل کر دیئے۔ ضمنی کارروائیوں کے سلسلے میں صرف
جنا کو تھوڑا بہت مصروف ہونا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ
اس کو ٹکٹ بھی آ گیا۔ چھٹی منظور ہو گئی اور وہ دوبئی جانے
کی تیاری کرنے لگی لیکن جس دن اسے دوبئی کے لئے فلائی
کرنا تھا اس سے ایک دن قبل ثاقب کا ایک اور خط بہت
دن کے بعد ملا اور اس خط نے جنا کا دل چھلنی کر دیا۔
لکھا تھا۔

"ڈیئر جنا!
امید ہے خیریت سے ہو گی۔ تمہارے
سلسلے میں اس لئے مطمئن ہوں کہ تم نے
اس دنیا میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے اور
ثاقب کی طرح خود کو ایک برگ آوارہ نہیں
بنایا۔ میں نے بہت کوشش کی جنا کہ اپنی
فطرت میں کچھ تبدیلیاں پیدا کروں۔ لیکن
شاید مجھ میں پیدائشی ہی خامیاں ہیں نہ جانے
کیوں اس دنیا سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔
اور یہ لڑائی مجھے پے در پے نقصانات پہنچا
رہی ہے۔ مگر کیا کروں دنیا مجھے جس رنگ میں
نظر آتی ہے میں اس رنگ کو تبدیل کرنے
میں ہمیشہ ناکام رہ جاتا ہوں۔
جنا! میں یہاں دوبئی میں ... بڑی
بے کسی کے دن گزار رہا تھا اور یہ احساس
ہونے لگا تھا کہ انسان کبھی انسان کا سہارا
نہیں بنتا۔ لیکن میرے ایک دوست نے
یہ احساس غلط ثابت کر دکھایا۔ میں نے
اسے اپنی کہانی سنائی تو وہ بہت متاثر ہوا
اور اس نے کہا کہ وہ میرے مستقبل کے لئے
کچھ کرے گا۔ بے کسی کے ان لمحات میں تمہارے
پاس واپس آنے کی جرأت نہیں کر سکا۔
بڑے دعوے کر کے چلا تھا وہاں سے کہ ایک
دنیا خریدوں گا تمہارے لئے لیکن لوگوں
نے مجھے بہت سستے داموں خرید لینا چاہا۔
میں دنیا تو نہ خرید سکا لیکن خود بازار میں آ گیا۔
اور بازار کا یہ رنگ مجھے پسند نہیں آیا چنانچہ
وہی لڑائی۔
ایک گوشے میں چھپ کر یہ سوچتا رہا
کہ کیا کروں؟ اسی دوران تم سے رابطہ بھی نہ
قائم کر سکا۔ کن الفاظ میں تمہیں تسلیاں دیتا؟
میرے پاس وہ لفظ نہیں تھے۔ ہاں ایک
شاعر نے جو زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتا
ہے۔ خط لکھتے ہوئے خود کو بے بس پایا۔ میں
آس کیسے دلا سکتا ہوں تمہیں، جس کا وعدہ
کر کے یہاں تک آیا تھا۔ بہرطور میرا یہ نیا
دوست بہت مخلص ہے۔ اور شاید میرے
مسائل اب زوال سے نکلتے آ رہے ہیں۔
جنا! میں کینیڈا جا رہا ہوں۔ کینیڈا پہنچنے
کے بعد صورتِ حال کے مطابق تمہیں خط
لکھوں گا اور تمہیں بتاؤں گا کہ میں روشنی
کے ساتھ کب واپس آ رہا ہوں۔ ہاں جنا میں
فیصلہ کیا ہے کہ واپس لوٹوں گا تو تمہارے
سارے تصورات جگمگا دوں گا اور امید
رکھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس وقت تک
کے لئے خود کو سنبھالے رکھنا۔ بس کیا کہوں؟
تمہارا ثاقب!

جنا کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا تھا ثاقب دوبئی
میں نہیں ہے۔ وہ بیمار بھی نہیں ہے بلکہ اپنی ناکارگی
اور نکمے پن کو چھپائے ایک گوشے میں بیٹھا ہے۔ وہ کبھی
کچھ نہ کر پائے گا۔ خواہ وہ کینیڈا چلا جائے یا کہیں اور۔ کچھ
نہیں بن سکے گا وہ۔ کیسے اس احساس کو پروان چڑھاؤں
کہ جو غلطی ہو گئی تھی اس کا تعلق ساری عمر سے ہے یہ غلطی
لمحاتی نہیں بلکہ... بلکہ اب یہ زندگی بھر رلانے کے لئے
ہے۔ آہ! کیا کیا چھن گیا مجھ سے۔ پپا۔ جنھوں نے ہمیشہ میرے
قدموں تلے چراغ جلائے تھے، جنھوں نے میری کوئی آرزو
کبھی پامال نہیں کی تھی اور میں... میں نے انھیں کیا
دیا؟ سوائے ایک درد مسلسل کے۔ میں اس قابل نہیں

ہوں کہ اب کبھی پپا کو اپنا منہ دِکھاؤں۔ یہ خدوخال لے کر زندگی میں کبھی پپا کے پاس نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ جو غلطی میں نے کی ہے اُس کا خمیازہ مجھے ہی بھگتنا ہوگا۔ ہر قیمت پر۔ ہر حال میں۔ خودکشی کی جا سکتی تھی لیکن رِدا کا کیا قصور تھا۔ میری غلطی کی سزا مجھے مِلی میرے پپا کو مِلی اور اب کسی اور کو نہیں مِلنی چاہیئے۔

'حِنا! پامردی سے کام لو۔ قدموں کو مضبوطی سے جمائے رکھو یہ مناسب نہیں ہوگا۔ یہ ممکن نہیں ہوگا تمہیں لڑنا ہے رِدا کے لئے۔۔۔ رِدا کے لئے'۔ دِل کے گوشے میں ثاقب کی یاد تڑپی۔ پانی کے دھارے آنکھوں کی جانب بڑھے۔ اور نہ جانے کب کے بند سوتے کھُل گئے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات سی ہوگئی۔ اِتنا روئی کہ قمیص کا دامن تر ہوگیا۔ ننھی رِدا معصوم نِگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے سوال تھے یا پھر یہ صرف حِنا کا احساس۔ اُس نے رِدا کو اُٹھا کر چوم لیا۔ اور جذباتی لہجے میں بولی۔

"رِدا! یہ آنسو آخری بار بہا رہی ہوں اور سب بہا دینا چاہتی ہوں تاکہ بار بار نہ بہیں۔ غلطی میں نے کی ہے میری بچی۔ میں اُس کی سزا تجھے ہرگز نہ دوں گی۔"

تمام کام بے کار ہوگئے تھے۔ وہ دوسرے ہی دِن صبح کو اپنے دفتر پہنچ گئی۔ اپنے کاغذات اور ٹکٹ وغیرہ اُس نے اپنے باس کے سامنے رکھ دیئے۔ اور وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

"کیوں بھئی خیریت؟ آج تو تمھیں جانا ہے۔"

"سر اب میں نہیں جا سکتی۔"

"ارے بھئی کیوں؟ اب کیا کمی رہ گئی؟ تقریباً تمام انتظامات مکمل ہوگئے۔"

جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ اُس نے ثاقب کا خط نکال کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ باس نے خط پڑھا۔ اور پھر آہستہ سے بولے۔

"ہوں! جاؤ اپنی سیٹ پر جاؤ۔" اُن کے اِن الفاظ میں ساری کہانی لکھی ہوئی تھی۔

حِنا اپنی سیٹ پر آگئی اور اُس کے بعد زندگی کے وہی معمولات ہوگئے۔ اُسے متضاد کیفیات سے گزرنا پڑ رہا تھا کہ کم از کم ثاقب خیریت سے تو ہے۔ باقی وہ زندگی میں کچھ نہ کر سکا یہ دوسری بات ہے۔ ثاقب کی واپسی سے بھی وہ مایوس ہوگئی تھی۔

پھر کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ افشاں کی شادی ہو رہی تھی، بچپن ہی سے وہ اپنے خالہ زاد بھائی آفتاب سے منسوب تھی اور اب اُس کے والدین یہ فریضہ ادا کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُسے ایک مصروفیت حاصل ہوگئی تھی دفتری اوقات سے فراغت ہوتی تو وہ سیدھی افشاں کے گھر پہنچ جاتی۔ آیا پہلے ہی سے رِدا کو ساتھ لئے وہاں موجود ہوتی تھی۔ آیا کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ گھر کا چھوٹا موٹا کام کر کے افشاں کے گھر پہنچ جایا کرے چنانچہ اب یہی معمول مستقل ہوگیا۔

شادی میں ابھی بیس پچیس دِن باقی تھے حِنا نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ ہر چیز کی دیکھ بھال اُس کے سپرد کر دی گئی اور اُداس زندگی میں خوشی کی کچھ گھڑیاں حاصل ہوگئیں۔

پھر افشاں کی شادی ہوئی اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ دو دن تک حِنا افشاں کے والدین کے پاس رہی۔ اور اُس کے بعد جب سب ہنگامے ختم ہوگئے تو بہت سی دُعاؤں کے ساتھ اپنے گھر واپس آگئی۔ لیکن ایک اور احساس سینے میں سمایا ہوا تھا۔ افشاں درحقیقت اُس کی زندگی کا جزوِ لازم بن گئی تھی اور یہ افشاں ہی کا سہارا تھا کہ وہ اِتنے ستم سہہ گئی تھی لیکن اب؟

اب افشاں پرائی ہوگئی۔ اور اُس کے لئے لاتعداد اُداسیاں چھوڑ گئی لیکن تقدیر نے اُس کا ساتھ دیا۔ یہ تیسرا ہی دِن تھا۔ شام کا وقت تھا وہ دفتر سے واپس آئی تھی اور اپنے معمولات میں مصروف ہوگئی تھی کہ دروازے کی بیل بجی۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا تو افشاں اور آفتاب اندر آگئے۔

"ہیلو حِنا!"

"ہیلو حِنا باجی!" آفتاب نے خوش مزاجی سے کہا۔ وہ اُن دونوں کو دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

"ارے بھئی تم لوگ اِس طرح اچانک، زیادتی کی ہے تم لوگوں نے۔ میں تو تمہاری دعوت کے منصوبے بنا رہی تھی۔ اور تمھیں باقاعدہ اپنے ہاں مدعو کرنا چاہتی تھی۔"

آفتاب نے شرارت بھری نِگاہوں سے افشاں کو دیکھا اور بولا۔

"یہی ہیں؟"

"ہیں تو یہی۔ اِس وقت کچھ بہکی ہوئی لگ رہی ہیں۔" افشاں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ خوش دِلی سے مسکرا کر بولی۔

"سو فیصد وہی ہیں آفتاب۔ میں قسم کھا سکتی ہوں۔" افشاں نے کہا۔

"اے افشاں! شوہر کے ساتھ مِل کر مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ کیا کہہ رہے ہو تم دونوں؟"

"کیا بتائیں حِنا باجی، یہ افشاں نے آپ کی اِتنی تعریفیں کر دی تھیں کہ یہ دو دِن بڑی مشکل سے گزرے، ورنہ پہلے ہی آپ کے پاس آجاتے، کہہ رہی تھیں کہ حِنا اِن کی زندگی کا ایک حِصہ ہے۔"

ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں شاید میں اِس کی زندگی کا ہی ایک حصہ ہوں۔ یہ میرے دُکھ اور خوشی میں اِتنی ہی شریک رہی ہے کہ اب مجھے اِس کے الگ ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن آفتاب تم بھی۔۔۔ کیا تم بھی اِسی کی طرح معصوم ہو؟"

"لیجئے اب اِس سوال کا کیا جواب دیا جائے افشاں صاحبہ؟"

"بھئی آپ لوگوں کی گفتگو میں میں دخل نہیں دے رہی۔ اپنی باتیں آپ خود کریں۔"

حِنا آفتاب سے بولی "کیا کہنا چاہتے ہو آفتاب؟"

"مطلب یہ ہے باجی کہ آپ اِتنی قربت کے باوجود غیریت کی باتیں کر رہی ہیں۔ میں تو قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اگر پہلی بار افشاں کے منہ سے آپ کے بارے میں سُن کر مجھے موقعہ مِلتا تو میں فوراً ہی آپ سے ملاقات کے لئے آجاتا۔ یہ دو دِن تو بس اخلاقاً ہی گزار لئے ہیں۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"خُدا تم دونوں کو خوش رکھے اور کبھی کسی ایسے عذاب میں گرفتار نہ کرے جو تمہارے دِلوں کو مجروح کر دے۔"

آفتاب بہت اچھا انسان تھا۔ افشاں بھی بہت اچھی تھی اور بہت اچھے انسان کو بعض اوقات بہت اچھے ساتھی مِل جاتے ہیں۔ حِنا نے اُنھیں لاکھوں دُعائیں دیں اور اُس کے بعد آفتاب نے اُس کمی کو ختم کر دیا، جِس کا احساس حِنا کو تھا۔ شام ہوتی تو وہ دونوں آجاتے، حِنا کے ساتھ کھانا کھاتے، کبھی زبردستی اُسے اور رِدا کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

یوں افشاں نے شادی کے بعد بھی حِنا کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور اُس جیسی دوست مِل جانے پر حِنا نے خُدا کا بے حد شکر ادا کیا تھا۔

دوسری شخصیت اُس کے باس کی تھی۔ جو اُس پر عنایتوں کی بارش کر رہے تھے۔ خُدا نے اُن دونوں کو اُس کی بہتری کے لئے پیدا کیا تھا اور وہ اُس کے لئے سب کچھ کرتے جا رہے تھے۔

فرم میں اُس کی حیثیت سینئر کی تھی۔ لیکن بالآخر پھر کچھ تبدیلیاں کر دی گئیں اور اُسے فرم کا منیجر بنا دیا گیا تنخواہ بھی کافی بڑھ گئی۔ حالانکہ پہلی تنخواہ ہی تینوں کے لئے کافی تھی۔ تیسری شخصیت اُس آیا کی تھی جو خود بھی بے سہارا تھی۔ اور اب اِن لوگوں کے ساتھ اِس طرح شامل ہوگئی تھی کہ زندگی میں کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن تنخواہ بڑھ جانے کے بعد زندگی میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں کمپنی کی طرف سے ہی اُسے ایک بنگلہ اور ایک کار دی گئی آخر منیجر کا عہدہ تھا اور اب تک حِنا نے جس طرح اپنے فرائض نبھائے تھے اُن کا اعتراف بھی کیا جا رہا تھا۔

چنانچہ کمپنی کی طرف سے مِلنے والے بنگلے میں اُسے شفٹ ہونا پڑا۔ کچھ اور مراعات بھی دی گئی تھیں۔ کار کے ساتھ ڈرائیور بھی دیا گیا اور اب حِنا کی زندگی میں کسی حد تک وہ سب کچھ آگیا تھا جو کبھی اُسے میسر تھا۔

آیا بدستور اُس کے ساتھ تھی۔ ایک اور ملازم کھانا پکانے اور دیگر کاموں کے لئے رکھ لیا گیا تھا۔ اِس کے علاوہ آیا بھی پوری طرح رِدا کی دیکھ بھال کرتی تھی چنانچہ حِنا کو اِس کا موقعہ مِل گیا کہ جو فرائض اُسے سونپے گئے ہیں اُنھیں خوش اسلوبی سے انجام دے۔

افشاں اور آفتاب بھی ہمیشہ کی مانند تھے اُن کے لئے بڑی دُعائیں نکلتی تھیں جو قول دیا تھا افشاں نے وہ نبھا کر دِکھا دیا تھا۔ آفتاب بھی بے حد اچھا انسان تھا۔ اُس سے زیادہ ہمدرد، اُس سے زیادہ اچھا انسان شاید ہی حِنا کو اپنی زندگی میں کوئی اور مِلا ہو۔ اکثر دونوں میاں بیوی اُس کے لئے افسردہ ہو جاتے تھے۔ آفتاب ذرا صاف گو انسان تھا اور جو کچھ اُس کے دل میں ہوتا تھا صاف صاف کہہ جاتا تھا۔ ایک دِن اُس نے بڑی بے ساختگی سے کہا۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں حِنا باجی۔ میں یہ بات کہے بغیر نہ رہ سکوں گا ثاقب صاحب کے دل کی گہرائیوں میں کچھ اور تھا۔"

"کیا؟" حِنا کی بجائے افشاں نے سوال کیا۔

"کاش میں ایک بار اُن سے مِلا ہوتا تو اُن کی پوری اندرُونی کیفیت آپ لوگوں کے سامنے رکھ دیتا۔ لیکن میں سمجھتا ہُوں کہ ثاقب صاحب نے ضرور یہ سوچا ہوگا کہ حِنا ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے اور اُن کا سارا مستقبل سنور جائے گا۔ وہ عیش کریں گے، شعر کہیں گے اور زندہ رہیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حِنا باجی وہ آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بعد کسی دفتر میں کلرکی کر لیتے، بھلا جب اپنی ذات محبُوب کو سَونپ دی تو پھر اَنا کہاں سے باقی رہ گئی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں دعوے سے کہتا ہُوں کہ ثاقب صاحب کے ذہن میں اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اور شادی کے بعد جب اُنھوں نے دیکھا کہ بات دوسری شکل اختیار کر گئی ہے تو وہ حِنا باجی کو چھوڑ بھاگے اور یہ بھی کہہ سکتا ہُوں مَیں کہ وہ ذرا مشکل ہی سے واپس آئیں گے۔ بات بہت تلخ ہے، لیکن حقیقت سے قریب تر۔"

افشاں نے پریشان نِگاہوں سے حِنا کو دیکھا۔ سوچ رہی تھی کہ شاید حِنا بُرا نہ مان جائے۔ لیکن حِنا کا چہرہ سپاٹ تھا اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ابّو نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ نکمے اور ناکارہ لوگ کسی دولت مند لڑکی کے خواب اِس لئے دیکھتے ہیں کہ اُن کا مستقبل بن جائے۔ بعض غلط فیصلے زندگی کا عذاب بن جاتے ہیں افشاں، واقعی وہ ایک بزدِل اور ناکارہ شخص ہے، پپّا نے بالکل سچ کہا تھا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ میں جانتا ہُوں جب تم زندگی کے مسائل سے آشنا ہو جاؤ گی اور جذبات کا بھوت اُتر جائے گا تو اُس وقت تمھیں اِس بات کا احساس ہوگا کہ میرا تجربہ تم سے کہیں زیادہ تھا۔ ہاں افشاں، پپّا نے بالکل سچ کہا تھا۔ بے شک اُن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ اور یقین کرو افشاں۔ میں نے شکست مان لی ہے۔ میں اُنھیں خود سے زیادہ زیرک اور سمجھدار تسلیم کرتی ہُوں۔"

اُس کے اِن الفاظ پر افشاں نے عجیب سے انداز سے آفتاب کو دیکھا اور آفتاب نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ نہ جانے اُن کے ذہن میں کیا خیال تھا۔ اُن کی جُرأت نہیں ہو رہی تھی کہ جو کچھ اُن کے دِل میں ہے کہہ ڈالیں۔

حِنا نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ماضی کی کتاب اُن کے سامنے کھُل گئی اور اُس کے ہر ورق پر ایک تحریر تھی گزرے ہُوئے لمحات کی تحریر۔ ثاقب کے ساتھ گزرنے والا ایک ایک لمحہ اُسے یاد تھا۔ آہ، کیوں نہ سوچا میں نے کہ پپّا میرے لئے غلط نہیں سوچ سکتے۔ کیوں نہ اُن کی بات مان لی۔ ہُوبہُو وہی سب کچھ نکلا جس کی اُنھوں نے پیش گوئی کی تھی۔

حِنا اُن کی اِس اشارے بازی سے بے نیاز کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ تب آفتاب کی آواز اُبھری۔

"حِنا بہن!"

"اوہ!" وہ چونک پڑی۔

"ایک بات کہوں۔ بُرا تو نہیں مانیں گی؟"

"نہیں، کہو!"

"آپ... آپ اپنے ڈیڈی کے پاس چلی جائیے!" آفتاب نے بمشکل تمام کہا۔ حِنا اُچھل پڑی۔ چند لمحات وہ عجیب سی نظروں سے آفتاب کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔

"نہیں آفتاب، نہیں پیارے بھائی، یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں حِنا بہن آخر کیوں؟"

"کچھ نہیں بھیّا، بس یُونہی زندگی گزاریں گے اپنی رِدا، تم لوگ ہو۔ بس کافی ہے وقت گزر جائے گا۔ سب کو سب کچھ تو نہیں مِل جاتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن حِنا۔ یہ بہتر ہو گا بے شک تمھاری زندگی پُرسکون ہے، تم رِدا کی بہترین پرورش کر سکتی ہو۔ لیکن اگر رِدا کو نانا کا سہارا مِل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔"

"نانا جیسے اِس بات کے منتظر ہوں گے کہ اپنی حماقت کی سَوغات لے کر اُن کے پاس جاؤں اور وہ ہم دونوں کو سینے سے لگا لیں۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کسی قیمت پر یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے پپّا سے کہا تھا کہ اگر میرا تجربہ ناکام رہا۔ تب بھی میں اُنھیں تکلیف نہیں دُوں گی۔ افشاں، ڈیڈی نے میرے چلے آنے کو آسانی سے برداشت نہ کر لیا ہوگا۔ میں جانتی ہُوں میرے اِس اقدام کے بعد اُنھیں کیسے کیسے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا اپنے ہم عصروں اور دوستوں کے سامنے اُنھیں کیا کیا جھُوٹ بولنے پڑے ہونگے نہ جانے کس طرح اُنھوں نے اپنی عزّت بچائی ہوگی، نہ جانے کتنی تکلیف پہنچی ہوگی اُنھیں اور اب جب وہ اپنے اِس دُکھ کو، اِس درد کو بھُلانے میں کسی حد تک کامیاب ہُوئے

ہوں گے تو میں ایک نیا درد لے کر اُن کے پاس پہنچ جاؤں۔ کیا یہ انصاف ہے؟ اُنھوں نے تو اُس کے بعد مجھ سے کسی مسئلے میں مداخلت نہیں کی میں کیوں اُنھیں پریشان کروں؟"

"یہ اچھا نہیں ہے حِنا۔"

"وہ بھی اچھا نہیں ہے۔" حِنا نے سخت لہجے میں کہا۔ اُس کے بعد افشاں اور آفتاب کچھ نہ بول سکے۔

*

وقت کے دھارے بہتے رہے۔ حِنا نے اپنی سخت محنت سے کمپنی کو چار چاند لگا دیئے تھے اور اِس کا اعتراف مختلف اشکال میں کیا جاتا تھا۔ اُس کی زندگی کے دو مرکز تھے۔ رِدا اور ملازمت۔ اُس نے اُن دونوں کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔

رِدا کی پرورش نہایت سخت اُصُولوں کے تحت ہو رہی تھی اُس نے اپنے تجربات کو مدِّ نگاہ رکھا تھا۔ اگر ناز و نعم میں پرورش پا کر وہ خود سر نہ ہو گئی ہوتی تو زندگی کے اِتنے بڑے المیّے سے دوچار نہ ہوتی۔ رِدا کے لئے چند اُصُول بنائے گئے تھے اور وہ سختی سے اُن پر عمل پیرا تھی۔

وقت گزرتے بھلا کیا دیر لگتی ہے۔ تقریباً چار سال گزر گئے، رِدا اسکول میں داخل ہو چکی تھی اور زندگی کے شب و روز بالکل سپاٹ گزر رہے تھے کہ ایک شام جب اُس کی کار بنگلے میں داخل ہُوئی تو اُس نے ایک اور شاندار کار دیکھی۔ یہ کار اُس کے لئے اجنبی تھی۔

اُس نے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور ملازم اُس کے قریب آ گیا تھا۔

"کون آیا ہے؟"

"میں نہیں جانتا بی بی صاحبہ، بس کچھ ضِدی سے آدمی ہیں کہتے ہیں مِل کر ہی جاؤں گا۔"

"نام بتایا؟"

"نہیں۔" بے اختیار حِنا کا دِل دھڑکا۔ 'ثاقب' اُس نے سوچا۔ پھر اُس کی نظر قیمتی کار پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے چہرے پر مایوسی طاری ہُوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی اُس کی آنکھوں میں روشنی آ گئی اور وہ دیوانوں کی طرح ڈرائینگ رُوم کی طرف دوڑ پڑی۔

دیوانے دل نے اس مختصر لمحے میں نہ جانے کتنا طویل سفر طے کر لیا تھا۔ ثاقب۔ اس کا محبُوب کینیڈا اور... اور... کیا اس نے اپنی منزل پالی۔ کیا وہ جیت کر بھی ہار گیا ہے۔ کیا اُس کے بارے میں ساری سوچیں غلط تھیں؟

ڈرائینگ رُوم تک جاتے ہُوئے اُس نے نہ جانے کیا کیا سوچ ڈالا تھا۔ پھر اُس نے لرزتے ہاتھوں سے ڈرائینگ رُوم کا دروازہ کھولا اور اُس کا دل دھڑکنا بھُول گیا۔ اُس کے پاؤں جم گئے۔ ایک صوفے پر آفندی صاحب بیٹھے ہُوئے تھے، وہ اپنی جگہ کھڑی ڈولتی رہی۔ دِل کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔

"کیا تم میری اِس جسارت کو معاف کر دو گی؟" آفندی صاحب کی بھرّائی ہُوئی آواز اُبھری۔ اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے آفندی صاحب کو دیکھا۔ آنسوؤں کی دُھند میں اُن کا چہرہ صاف نہیں نظر آ رہا تھا۔ "شاید تم سے اجازت لئے بغیر مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھی اور اُن کے قریب پہنچ گئی۔ آفندی صاحب کھڑے ہو گئے اُن کے ہاتھوں میں تشنج سا ہو رہا تھا پھر اُنھوں نے خود ہی بے اختیار ہو کر حِنا کو بھینچ لیا اُن کے آنسو اُبل پڑے تھے۔ اُنھوں نے روتے ہُوئے کہا۔ "کیا یہ سینہ اب اِس قابل بھی نہیں ہے؟"

"نہیں ڈیڈی۔ میں خود اِس سینے کے قابل نہیں ہُوں۔ میں نے آپ کو بہت دُکھ دیا ہے۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہُوں ڈیڈی۔" وہ بلک پڑی۔ دیر تک دونوں باپ بیٹی روتے رہے تھے۔ آفندی صاحب نے حِنا کو قریب بٹھا لیا۔

"آپ کیسے ہیں ڈیڈی؟"

"تم سے دُور ہو کر جیسا ہو سکتا ہُوں۔ ویسا ہُوں۔ خُدا کا شکر ہے کہ اب تم میری کیفیت بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو۔"

"میں سمجھی نہیں ڈیڈی؟"

"صاحبِ اولاد ہو کر ہی ماں یا باپ بن کر سوچا جا سکتا ہے۔" آفندی صاحب نے کہا۔

حِنا خاموش ہو گئی، چند لمحات یہ خاموشی قائم رہی۔ پھر حِنا نے کہا۔

"آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے؟"

"اب بھی یہ سوال کر رہی ہو؟"

"جی۔"

"غافل رہ سکتا تھا تم سے؟" آفندی صاحب نے سِسک کر کہا پھر بولے "ثاقب تمھیں چھوڑ کر چلا گیا ہے؟"

"ہاں!" وہ آہستہ سے بولی۔

"کوئی جھگڑا ہُوا تھا؟"

"نہیں"

"پھر؟"

"وہ بہتر مستقبل کی تلاش میں گیا تھا"

"کہاں؟"

"پہلے دوبئی، پھر وہاں سے کنیڈا چلا گیا مجھے بتائے بغیر"

"اس سے رابطہ ہے؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"وہ شاید ہمیں بھول چکا ہے یا پھر اُسے اُس کی منزل نہیں مل سکی" حِنا نے سرد لہجے میں کہا۔

"تمہارا دوسرا خیال دُرست ہے حِنا، واقعی اُسے اُس کی منزل نہیں ملی، کیونکہ اُس کے خوابوں کی تعبیر تم نہیں حِنا تمہاری دولت تھی وہی اُس کی منزل تھی اُس نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ یہ سب کچھ اُس کی توقع کے خلاف تھا اُس نے تو تمہاری صورت میں خوشحالی، سُنہرا مستقبل دیکھا تھا کچھ نہ ملا اُسے۔ میں آج بھی وہی موقف رکھتا ہوں۔ میرا تجربہ لفظوں میں بولتا ہے اِس دور کا نوجوان سہل پسندی کا شکار ہے۔ اُس کے وجود میں خودداری سو چکی ہے، وہ دولت کے خواب دیکھتا ہے لیکن اُس کے حصول کے لئے محنت اور جدوجہد کا قائل نہیں ہے۔ دولت کے حصول کے لئے وہ چور دروازے تلاش کرتا ہے۔ اور ثاقب بھی اِسی دور کا نوجوان نظر آیا تھا مجھے، وہ ایک اچھا شاعر تھا لیکن اُس نے خود کو تخیلات میں آباد کر لیا تھا۔ وہ عملی انسان نہیں تھا اور یہی میں نے تم سے کہا تھا۔ میرا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا جس کا تم بُرا مان گئیں حِنا اور تم نے اِتنا بڑا فیصلہ کر لیا"

"ہاں ڈیڈی، میری ناتجربے کاری مجھے لے ڈوبی۔ میں اِس کا اعتراف کرتی ہوں۔ بلاشبہ میں نے آپ کی بات نہ مان کر غلطی کی تھی"

آفندی صاحب کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے، چند لمحات وہ حِنا کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے، یہ ایک پُرانا مقولہ ہے لیکن ایک ٹھوس اور سچی حقیقت، بہرحال میں خوش ہوں کہ تم نے اپنی اِس غلطی کا اعتراف کر لیا۔ میں تمہارا باپ ہوں اور والدین بچوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ ثاقب سے میری جو بات چیت ہوئی تھی اُس نے مجھے احساس دِلا دیا تھا کہ وہ ایک خوددار شخص نہیں ہے، لیکن اب ہم اُس کا تذکرہ بار بار نہیں کریں گے، کیونکہ وہ اب ہمارے راستے سے ہٹ گیا ہے، چلو حِنا تیاریاں کرو اپنے گھر واپس چلو تمہیں تمہاری غلطی کا احساس ہو گیا۔ میرا دل صاف ہو گیا۔ تمہارے لئے سب کچھ موجود ہے۔ تمہیں اُلجھنوں پر نہیں رہنے دے سکتا میں۔ تمہارے علاوہ اِس دُنیا میں ہے بھی کون؟"

حِنا نے چونک کر آفندی صاحب کو دیکھا چند لمحات دیکھتی رہی۔ اور پھر مدھم سی مُسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"آپ کی محبت اور آپ کی اِس فراخدلی کا شکریہ ڈیڈی بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ لیکن ڈیڈی میں نے اپنے آپ کو معاف نہیں کیا۔ مجھے میری حماقت کی سزا ملنا ضروری ہے اور یہ سزا میں ہر قیمت پر پوری کروں گی۔ میں نے یہ فیصلہ بہت پہلے کر لیا تھا"

"کیا مطلب ہے؟" آفندی صاحب چونک کر بولے۔

"میں اب کہاں جاؤں گی ڈیڈی؟ مجھے بس آپ یہیں رہنے دیں۔ میرے دِل میں جو سب سے بڑی خلش تھی وہ آج آپ نے دُور کر دی۔ میں آپ کے اِس احسان کی بے حد شُکر گزار ہوں۔ آپ کے معاف کر دینے سے مجھے جو دِلی سکون مِلا ہے ڈیڈی، اُسے میں بیان نہیں کر سکتی"

"مگر میں تمہاری بات نہیں سمجھا حِنا۔ کیا تم میرے ساتھ گھر واپس نہیں چلو گی۔ بولو حِنا" آفندی صاحب بے چینی سے بولے۔

"نہیں ڈیڈی! میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے بس آپ یہیں رہنے دیں۔ یہ میرا گھر ہے۔ میری اپنی محنت سے حاصل کیا ہُوا۔ میری زندگی میں رِدا ہے اور میں رِدا کی بہتر زندگی کے لئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ڈیڈی کہ میں شدید محنت کروں اور رِدا کو اپنی اُن حماقتوں کا احساس دِلاؤں جو میں نے کی ہیں۔ میں اُسے اس عمر میں ہی وہ تجربہ فراہم کر دوں جو میرے پاس نہیں تھا۔ میں اُسے نازونعم میں پرورش کر کے دُنیا سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتی تاکہ وہ کسی بھول کا شکار نہ ہو۔ ڈیڈی! میں اُسے زندگی کے سارے تجربے فراہم کروں گی جن سے میں ناآشنا تھی۔ اور ناآشنائی ہی میری بربادی کا باعث بنی۔ میں اُس کی

زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دینا چاہتی ہوں"

آفندی صاحب مُنہ کھولے حِنا کی باتیں سُنتے رہے۔ پھر بوکھلا کر بولے۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹا۔ کروڑوں روپے کی یہ دولت یہ جائیداد کس کی ہے؟ میرے بعد کون اِس کا وارث ہو گا؟ میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے بیٹا۔ میرے بعد تم ہی اِس کی مالک ہو گی۔ تم اور صرف تم۔ رِدا اور تمہارے علاوہ میرا اِس دُنیا میں کون ہے؟"

حِنا کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ بدستور مُسکرا رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔

"ذرا سی تبدیلی پیدا کر لیں اپنی سوچ میں ڈیڈی آپ! لاکھوں ضرورت مند اِس کائنات کے چپے چپے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ آپ کی اولاد نے آپ کو بے سکون کیا ڈیڈی۔ آپ اُن ضرورت مندوں کی مدد کر کے دِلی سکون حاصل کریں"

"گویا... گویا تمہارا مطلب ہے کہ میں یہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت غریبوں میں تقسیم کر دوں۔ اور... اور... کیا کہہ رہی ہو حِنا؟ کیسی عجیب بات ہے؟ یہ سب کچھ... یہ سب کچھ بیٹی میں نے تمہارے لئے کیا ہے صرف تمہارے لئے۔ میں تمہاری یہ احمقانہ منطق قبول نہیں کر سکتا" آفندی صاحب بے حد پریشان نظر آنے لگے تھے۔ حِنا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"نہیں ڈیڈی۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہُوں کہ مجھے اِس سلسلے میں مجبور نہ کریں۔ ڈیڈی میں نے بڑے عزم سے آپ سے کہا تھا کہ میں زندگی میں کبھی اِس کوٹھی میں واپس نہیں آؤں گی۔ اور ڈیڈی میرا عزم میری ساری زندگی پر محیط ہے۔ میں اُس پر قائم رہتے ہُوئے مرنا چاہتی ہوں۔ آپ اِس بات پر یقین کر لیں کہ میں کبھی وہاں واپس نہیں جاؤں گی۔ اور پھر یہاں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میرے دِل میں ایک چُبھن تھی وہ یہ ڈیڈی کہ میں نے آپ کی بات نہ مان کر اور ثاقب کے سِلسلے میں آپ کو غلط سمجھ کر آپ کو دُکھ دیا۔ بعد میں جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ آپ کا کہنا ہی سچ تھا۔ تو مجھے بے حد شرمندگی رہی۔ میں نے بارہا سوچا کہ میری وجہ سے آپ کو ذہنی اور قلبی تکلیف ہُوئی۔ لیکن ڈیڈی میں آپ سے معافی مانگنے کے لئے آپ کے پاس نہ آسکی اور آج آپ نے اپنی محبت اور شفقت کا ثبوت دیتے ہُوئے مجھے معاف کر دیا۔ میں اِسے اپنی خوش بختی کی انتہا کہتی ہوں جہاں تک رہا میری ذات کا مسئلہ تو اُسے میری تقدیر کے ساتھ سفر کرنے دیں ڈیڈی۔ میری تقدیر نے میرے لئے جو راستے منتخب کئے ہیں۔ میں اُنھیں عبور کر چکی ہوں اور بس اب اُن میں کوئی تبدیلی قطعی ناممکن ہے" حِنا سپاٹ لہجے میں بولی۔

"ایک بار پھر تم اپنا غلط فیصلہ مجھ پر مُسلّط کر رہی ہو ایک بار پھر تم اُس جنونی جذبے سے کام لے رہی ہو حِنا جس جنونی جذبے کے تحت تم نے ایک غلطی کی تھی۔ حِنا میں تم سے ناراض ضرور تھا۔ لیکن بیٹے والدین ناراض ہوتے ہیں لیکن نفرت نہیں کرتے۔ حِنا میں تمہارے اِس غلط قدم کا شاکی رہا۔ لیکن تمہاری ذات ہمیشہ میرے سینے میں کسکتی رہی۔ اور آج جب میں اپنی اَنا کو توڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں تو تم مجھے ایک بار پھر مایوس کر دینا چاہتی ہو۔ مجھے اُن تنہائیوں میں دھکیل دینا چاہتی ہو حِنا۔ جس میں میں نے ایک اذیتناک عرصہ گزارا ہے، مجھے یہ احساس دِلانا چاہتی ہو کہ تم نے میری محبت کو قابل اعتبار نہ سمجھا۔

حِنا تمہارے نزدیک باپ اور باپ سے محبت کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیسی بیٹی ہو تم؟ کیا بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں حِنا؟ کیا یہ زیادتی نہیں ہے میرے ساتھ؟ ٹھیک ہے میری ذات پر لعنت بھیجو۔ لیکن اب تمہاری اپنی ذات سے ایک اور شخصیت مُنسلک ہے اور یہ تمہاری بیٹی رِدا ہے۔ اپنے لئے تو تم نے جو فیصلے کئے بقول تمہارے تم اُنھیں قبول کر چکی ہو، لیکن کیا رِدا کو تم ایک بہتر مستقبل نہیں دینا چاہتیں، کیا تم یہ پسند نہیں کرو گی کہ رِدا کا ایک شاندار مستقبل ہو، وہ کوئی معمولی لڑکی نہ سمجھی جائے اور معمولی ہے بھی نہیں وہ... وہ ایک کروڑپتی نانا کی نواسی ہے۔ نہیں حِنا تم ایک بار پھر غلطی کر رہی ہو۔ تم رِدا کو اپنی ضد کا شکار بنا رہی ہو"

حِنا خاموشی سے آفندی صاحب کی صورت دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ڈیڈی! مجھے اپنے پہلے غلط فیصلے کا اعتراف ہے، لیکن آپ یقین کیجئے کہ یہ دوسرا فیصلہ میں نے غلط نہیں کیا ہے۔ میں آپ کی توہین نہیں کرنا چاہتی ڈیڈی اور میں آپ کو تنہا چھوڑنے کی خواہشمند نہیں ہوں۔ نہ ہی مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے۔ لیکن اب جو یہ فیصلہ میں نے کیا ہے وہ عمر کی اُس منزل

میں آکر کیا ہے جہاں میں ناتجربے کار نہیں ہُوں بلکہ آپ جیسا تجربہ بھی حاصِل ہو چُکا ہے مجھے، ڈیڈی اِرَدا کی پرورِش ٹھیک ہو رہی ہے۔ آپ اِس سِلسلے میں کوئی فکر نہ کریں۔ آپ یقین کیجئے کہ میں اُس کی تربیت اِس انداز میں کروں گی کہ آپ کو اُس کی ذات سے کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ اب تو مجھے اپنے آپ کو آزما لینے دیں ڈیڈی۔ مجھے اُن تصوّرات میں نہ دھکیلیں، جن میں میرے لئے اذیت ہو۔ میں بہت مُطمئن ہُوں ڈیڈی۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے مطمئن رہنے دیں گے۔"

"تم حِنا... تم... تم آج بھی ضِد کر رہی ہو لیکن ٹھیک ہے، مجھے تم سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اب میں اپنے اِس حق کو استعمال کر سکتا ہُوں۔ جو ایک باپ کی حیثیت سے مجھے تم پر حاصِل ہے۔ حِنا میری بچّی۔ میری بیٹی ضِد مت کرو، ضِد بالکل مت کرو۔"

"نہیں ڈیڈی! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتی۔" حِنا نے مُتاسفانہ لہجے میں انکار کیا۔

"تمہارے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہُوئی حِنا۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ شاید... شاید تمہارے دِل میں ابھی باپ زندہ ہو۔ لیکن یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم نے باپ کی شفقت ہمیشہ کے لئے دِل سے کھُرچ پھینکی ہے۔ یُوں لگتا ہے مجھے تو کہ... جیسے باپ کی محبّت کا تم سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ بس میں تو یہ محسوس کر رہا ہُوں جیسے تم نے اپنے آپ کو اِس سِلسلے میں آخری حقدار قرار دے دیا۔ حِنا! میں تمہاری یہ ضِد نہیں مان سکتا۔"

"نہیں ڈیڈی میری ضِد آپ نے کبھی نہیں مانی۔ کاش آپ زندگی میں ایک بار میری ضِد بھی مان لیتے۔ اگر آپ میری ضِد مان لیتے ڈیڈی تو ثاقب کو یہاں سے دوبئی اور پھر وہاں سے کینیڈا جانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ہاں ڈیڈی وہ ناکارہ تھا۔ ناکارہ رہتا۔ ہمیشہ ہمیشہ ناکارہ رہتا۔ لیکن وہ دولت جو آج آپ میرے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ اگر ضِد سے کام نہ لے کر اُس وقت ہمیں اُس میں شریک کر لیتے تو ہم دونوں مِل کر ثاقب کو بھی سنبھال لیتے ڈیڈی۔ اور اُسے کہیں جانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ کوئی جواز ہی نہ رہتا اُس کے لئے۔ لیکن ڈیڈی وہاں آپ نے ضِد کی۔ آپ نے یہ سوچ کر مجھے اِس دُنیا میں تنہا چھوڑ دیا کہ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر بالآخر ایک دِن میں آپ کی کوٹھی پر پہنچوں گی۔ آپ کے قدموں میں گِر کر گڑگڑاؤں گی۔ اور آپ سے اپنے گُناہوں کی مُعافی مانگوں گی۔ ڈیڈی! آپ یہ چاہتے تھے کہ مجھے زمانے کی ٹھوکریں لگیں۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہُوا مجھے زمانے کی ٹھوکریں بے شک لگیں۔ لیکن میں نے اپنی اُس ضِد، اُس اَنا کو برقرار رکھا، جو شاید آپ کے خُون سے میرے خُون میں منتقل ہُوئی ہے آج آپ کو فتح ہُوئی ڈیڈی۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے جیسا کہ آپ نے ابھی فرمایا کہ آپ کا تجربہ اِس بات کا یقین رکھتا تھا کہ ثاقب آوارہ ہے اور زندگی میں کبھی کچھ کرنے کے قابل نہ ہوگا۔ اگر آپ کا تجربہ یہ آپ سے کہتا تھا تو پھر آپ یُوں کرتے کہ اپنی بیٹی کی یہ ایک آخری ضِد بھی پوری کر دیتے ناکارہ ثاقب کو اپنا لیتے اور اُسے زندگی کے اُن بہتر راستوں پر لگانے کی کوشش کرتے، جہاں اچھا مستقبل انتظار کرتا ہے، ڈیڈی کچھ بھی نہ ہوتا۔ ثاقب کچھ بھی نہ کرتا۔

لیکن آج آپ جس دولت کی بات کر رہے ہیں بقول آپ کے یہ دولت میرے لئے ہی تھی اگر میری ذات سے تعلق رکھنے والے کسی شخص پر اِس دولت کا معمُولی سا حصّہ خرچ ہو جاتا۔ صرف اِتنا کہ ثاقب بھی ہمارے ساتھ رہ کر اچھا کھا لیتا اچھا پہن لیتا تو کیا بگڑ جاتا آپ کا۔ آپ نے یہ سب کچھ قبول نہیں کیا۔ اور بالآخر ثاقب مُجھ سے جُدا ہو گیا۔ رِدا کے سر سے زندگی میں ہی اُس کے باپ کا سایہ چِھن گیا۔ تو ڈیڈی اب اِن تمام باتوں کی کیا گنجائش ہے۔ میں پھر آپ سے یہ بات کہتی ہُوں کہ آپ کی محبّت اور آپ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس ہمیشہ میرے سینے میں موجود رہا اور میرے دِل میں ایک ہی خواہش ہمیشہ اُبھرتی رہی کہ کاش کبھی مجھے آپ معاف کر دیں۔ لیکن آپ نے کہا تھا کہ جب تم زندگی کے مسائل سے آشنا ہو گی اور جذبات کا بھُوت تمہارے سر سے اُتر جائے گا تو تمہیں یہاں آنا پڑے گا۔ آپ نے کہا تھا ناں ڈیڈی کہ اُس کے بعد اُس کوٹھی میں اور آپ کے دِل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ اور اُس وقت میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں زندگی میں کبھی دوبارہ اِس کوٹھی میں واپس نہیں آؤں گی ڈیڈی! وہ باب ختم ہو گیا ہے۔ اور اب اُس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔"

آفندی صاحب پھٹی پھٹی نگاہوں سے حِنا کو دیکھتے رہے، جب حِنا نے اُن کے سامنے یہ اعتراف کیا تھا کہ اُس سے غلطی ہو گئی تھی جس کا اُسے احساس ہے کہ وہ اپنی ناتجربے کاری کا شکار ہو گئی تو آفندی صاحب نے سوچا تھا کہ حِنا راہِ راست

پر آگئی ہے اور اب اُس کے بعد بھلا اِس بات کی کہاں گنجائش تھی کہ وہ حِنا کو خود سے دُور رہنے دیتے۔ لیکن یہ اَنا کا پتھر، آج بھی اپنی جگہ ایک ٹھوس چٹان کی مانند اُن دونوں کے درمیان موجود تھا۔ اور جو الفاظ اُس کی زبان سے ادا ہُوئے تھے وہ اِتنی سختی رکھتے تھے کہ آفندی صاحب اُن کے سامنے خود کو بالکل بے بس پا رہے تھے۔

اُن کی آنکھوں سے آنسُو بہہ نِکلے۔ کافی دیر تک وہ خاموشی سے آنسُو بہاتے رہے اور پھر اُنھوں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں میرے وہ الفاظ یاد رہ گئے حِنا۔ میرے کرب کا تمہیں کوئی احساس نہیں ہُوا۔ تم نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تمہارے گھر سے چلے آنے کے بعد مُجھ پر کیا بیتی؟ میں نے کِس طرح لوگوں کی باتیں برداشت کیں۔ جوان بیٹیاں سماجی قانون کے خلاف باپ کے گھر سے نِکل جائیں تو باپ معاشرے کا مُجرم بن جاتا ہے۔ تم نے یہ کبھی نہیں سوچا حِنا کہ میں نے اب تک ایک مُجرم کی سی زندگی بسر کی ہے۔ اور اب اِن حالات میں بھی تم مجھے سہارا نہیں دینا چاہتیں۔ حِنا مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کرنے آیا ہُوں۔ میں تم سے اپنی محبّت کا حق مانگنے آیا ہُوں حِنا۔ اب جب کہ ثاقب تمہارے ساتھ نہیں رہا تو مجھے تمہارا سہارا چاہیئے۔"

"اب جب کہ ثاقب ہمارے ساتھ نہیں رہا ڈیڈی۔ تو مجھے آپ کا سہارا نہیں چاہیئے۔ مجھے وہی تنہائیاں چاہئیں جن تنہائیوں کا شکار آپ رہ چکے ہیں۔ مجھے بھی اپنے گُناہ کی اذیت بھگتنے دیں ڈیڈی۔ میں مجبُور ہُوں خُدا کی قسم میں دوبارہ اُس کوٹھی میں کبھی نہیں جاؤں گی۔ اگر مر جاؤں اور آپ کو اُس کے بارے میں اطلاع مِل جائے تو یہ میری وصیّت ہے کہ میری لاش بھی وہاں نہ لے جائی جائے۔ میں جو فیصلہ کر کے وہاں سے نِکلی تھی۔ اُس فیصلے پر موت کے آخری لمحے تک قائم رہنا چاہتی ہُوں۔ آپ اِس بات کو ذہن نشین کر لیجئے ڈیڈی، کہ میں زندگی میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔ اور مرنے کے بعد اگر آپ کو میری وصیّت یاد رہے اور آپ اپنی اَنا کی تسکین نہ چاہیں تو مجھے وہاں نہ لے جائیں۔"

آفندی صاحب ششدر رہ گئے تھے، بیٹی اِس قدر کمزور نہیں تھی جتنا اُنھوں نے سمجھا تھا۔ اُنھیں احساس ہُوا کہ واقعی وہ لمحات اُن کی زندگی میں حماقت کے سب سے بڑے لمحات تھے جب اُنھوں نے یہ سوچا تھا کہ حِنا بالآخر زمانے کی ٹھوکریں کھا کر اُن کے پاس پہنچ جائے گی۔ اُنھیں اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ اُنھوں نے بیٹی کی شخصیت کا کوئی تجزیہ نہیں کیا تھا۔ اُنھیں یہ تجزیہ کر لینا چاہیئے تھا۔ ہاں یہ سختی اُنھیں حِنا جیسی شخصیت کے ساتھ نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ مگر بیٹی کے بارے میں شاید اِتنا نہیں جانتے تھے اِس لئے غلطی کر بیٹھے تھے وہ ماں نہیں تھے، باپ تھے، اور شاید باپ بیٹیوں سے اِتنی زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ مگر اب حِنا کے لہجے کی سختی اور اُس کے الفاظ یہ احساس دِلا رہے تھے کہ گیا وقت واقعی ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔

چنانچہ وہ دیر تک آنسُو بہاتے رہے حِنا گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ ملازم نے چائے وغیرہ لا کر رکھ دی۔ دِل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن حِنا کے خوف سے چائے قبُول کر لی اور پھر اُس کے بے جان سے گھُونٹ لیتے ہُوئے بولے۔

"رِدا کو میں کبھی کبھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہُوں حِنا؟"

"نہیں ڈیڈی! ہرگز نہیں" حِنا نے جواب دیا۔ اور آفندی صاحب نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی۔

"کیوں اِس میں کیا قباحت ہے؟"

"ڈیڈی! میں حِنا کو اُس کوٹھی کے بارے میں کیا بتاؤں گی۔ میں اُس کا اُس دولت سے رشتہ نہیں جوڑ سکتی جس کو میں چھوڑ چکی ہُوں۔ میں اُس کے معصُوم ذہن میں سوالات نہیں پیدا کرنا چاہتی"

"یہ صرف تمہاری ضد ہے حِنا۔ میں تمہاری اِن باتوں کو اب دوسری صُورت میں دیکھ رہا ہُوں۔ مجھے کم از کم اِس کا اِتنا تو حق دو کہ میں تمہاری بیٹی کو اپنی نواسی کہہ سکوں۔ میں اُس کے لئے ایک الگ کوٹھی خریدوں گا میں اُس کے لئے اپنی پسند کا مستقبل تلاش کروں گا۔ کیا مجھے اِس کی اجازت بھی نہیں ہے؟" آفندی صاحب بولے۔

"ڈیڈی! میں رِدا کو صرف اپنے بل پر زندہ رکھنا چاہتی ہُوں۔ میں اُسے خود یہ سب کچھ دینے کی کوشش کروں گی۔ اور اِس سلسلے میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ براہِ کرم آپ اِس سلسلے میں ایسی کوئی کوشش نہ کریں۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہُوں" حِنا نے جواب دیا اور آفندی صاحب نے رُومال سے اپنے آنسو خشک کر لئے۔ پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

"زندہ رہو حِنا۔ خُدا کرے تمہیں زندگی کی ساری خُوشیاں مل جائیں۔ دراصل کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی بیٹی۔ تمہاری باتوں سے میں نے یہ سمجھا تھا کہ شاید میں آج بھی تمہارا باپ ہی ہُوں لیکن غلط فہمی تھی میری۔ تم ایک اچھی اور خوش اخلاق لڑکی ہو۔ جس نے کم از کم مجھے اپنے ڈرائینگ رُوم میں بٹھا کر ایک پیالی چائے پلانا پسند کیا۔ اور اِس کے ساتھ ہی میری وہ ساری باتیں بھی برداشت کیں جنھیں میں کسی اور ہی رنگ میں کہہ رہا تھا۔ لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اُس دِن کوٹھی سے نِکلتے ہُوئے شاید تم نے سارے رشتے توڑ دیئے تھے۔ اور اب اُن رشتوں کا کوئی وجُود باقی نہیں رہا۔ میں تمہارا شکر گزار ہُوں حِنا کہ اتنی دیر ہی تم نے برداشت کر لیا۔ مَیں۔۔۔ مَیں تمہارا شکر گزار ہُوں۔ مَیں۔۔" آفندی صاحب کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ آہستہ سے اُٹھے اور ڈرائینگ رُوم سے باہر نِکل گئے۔

حِنا تیزی سے دروازے تک آئی تھی پھر صدر دروازے تک پہنچی تھی اور اُس کے بعد اُس نے آفندی صاحب کی کار باہر نکلتے ہُوئے دیکھی تھی۔ جُونہی اُن کی کار نگاہوں سے اوجھل ہُوئی حِنا بلک بلک کر رو پڑی۔

"آپ نے خود ہی تو حِنا کو دفن کر دیا تھا ڈیڈی۔ آج آپ نے سارا قصُور میرا قرار دے دیا۔ لیکن آپ نے اپنی اَنا کے لئے اپنی حِنا کو مار ڈالا تھا اور آج آپ اپنی حِنا کی لاش کو لینے کے لئے آئے تھے اِس لاش کو اپنی عظیم الشان کوٹھی میں لے جا کر آپ کیا کریں گے؟ موت کے بعد تو انسان کو خود پر اختیار مل جانا چاہیئے ڈیڈی۔ مُردہ حِنا کو اپنی اُس عظیم الشان کوٹھی میں لے جا کر کیا کریں گے؟ نہیں، ڈیڈی! انسان کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ وہ دوسرے کو قصُور وار قرار دے دے۔ قصُور تھا میرا، میری ناتجربے کاری نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ لیکن آپ کا تجربہ میری پسند کو سہارا تو دے سکتا تھا۔ آپ نے میرا اثاثہ مجھ سے چھین لیا۔ آپ نے میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری نہ کی۔ آپ نے۔۔۔ آپ نے۔۔۔ ڈیڈی آپ نے۔۔"

حِنا دیر تک روتی رہی۔ اُس کے وجُود میں طوفانوں کا بسیرا تھا۔ اُس کے دِل میں مختلف سوالات کا سیل رواں تھا جس کے سامنے بند باندھنا ممکن نہیں تھا۔ اُس نے اپنے ڈیڈی کو ٹھکرا دیا تھا! وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ اچھا ہوا یا بُرا ہُوا۔ لیکن جو کچھ بھی تھا ہو چکا تھا۔

وہ کئی دِن تک اذیت کا شکار رہی تھی۔ لیکن رِدا پر وہ اپنی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دینا چاہتی تھی معصُوم بچی کو وہ ہر ذہنی بوجھ سے آزاد رکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی چنانچہ رِدا کے لئے اُس نے خود کو سنبھالا۔ باپ کو طویل عرصے کے بعد دیکھا تھا اور اُس کے بعد اُن حالات میں اُن سے جُدا ہُوئی تھی کہ دوبارہ مِلنے کے امکانات نہیں رہے تھے۔

نہ جانے کتنی بار اُس نے حسرت سے سوچا تھا کہ کاش آفندی صاحب اِس کے علاوہ اور کوئی فیصلہ کر لیں کاش وہ اُسے اُس کے موقف پر قائم رہنے دیں اور خود اپنے اندر لچک پیدا کر کے اُس سے مِلنا شروع کر دیں۔ یہ حسرت تھی۔ اُس کے دِل میں۔ وہ آفندی صاحب سے مِلنا چاہتی تھی۔ بالآخر وہ اُس کے باپ تھے اور شاید اُس کی یہ دُعا قبول ہوگئی

کافی دِن گزر گئے تھے۔ ایک شام وہ دفتر سے واپس آئی ہی تھی کہ آفندی صاحب کی کار بنگلے کے احاطے سے

اندر داخل ہُوئی اور اُس کا دِل خوشی سے اُچھل پڑا وہ آفندی صاحب کا استقبال کرنے کے لئے بچوں کی طرح دوڑتی ہُوئی اُن کے پاس پہنچ گئی تھی۔ آفندی صاحب کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔ آنکھوں کے گِرد سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے، شیو بڑھا ہُوا تھا لباس بھی ملگجا تھا۔ اُنھوں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دوبارہ آنے کی مُعافی چاہتا ہُوں۔ لیکن آ گیا، کیا کروں؟" اُن کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہُوا تھا۔ وہ دوڑ کر آفندی صاحب سے لپٹ گئی۔

"ایسی باتیں نہ کریں ڈیڈی۔ خُدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔ اور یہ آپ نے اپنا حُلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ آئیے اندر آئیے" وہ بڑے پیار سے اپنے باپ کو لئے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

آفندی صاحب کہنے لگے "بس تمہارے پاس سے جانے کے بعد سکون کا ایک لمحہ میسر نہ ہو سکا۔ بہت کوشش کی کہ تمہاری اِس پُرسکون زندگی میں مداخلت کر کے تمہیں پریشان نہ کروں۔ پر دِل نہیں مانا بیٹی اور یہ دِل کمبخت بڑی منحوس چیز ہے۔ انسان کو خود پر اختیار پانے ہی نہیں دیتا"

"ڈیڈی! ایسی باتیں نہ کیجئے۔ آئیے اندر آئیے"

"میں اندر چل تو رہا ہُوں حِنا۔ پر بیٹی ایک اجازت مانگنے آیا ہُوں تم سے۔ کیا میری ایک خواہش پوری کر دو گی؟"

"حکم دیں ڈیڈی"

"کیا میں کبھی کبھی تم سے مِلنے آ سکتا ہُوں؟" آفندی صاحب نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"ڈیڈی! یہ تو میری خواہش ہے۔ آپ یہاں روز آیا کریں اور رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا کریں۔ ڈیڈی مجھے اِس سے زیادہ خوشی کسی بات کی نہیں ہوگی۔ یہ میری درخواست بھی ہے آپ سے"

"خُدا کا شُکر ہے۔ احسان ہے اُس معبُود کا کہ یہاں تم نے میرے راستے میں کوئی رُکاوٹ پیدا نہیں کی۔ شاید میں بہت کمزور ہو گیا ہُوں حِنا۔ اندر سے عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے میری۔ رِدا میری پیاری سی نواسی۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ مَیں حِنا میں" آفندی صاحب کی آواز بھرّا گئی۔

"وہ آپ کی جو کچھ ہے وہی رہے گی ڈیڈی۔ بس چند باتوں کا خیال رکھنا ہوگا"

"تم مجھے وہ ساری باتیں سمجھا دینا حِنا، جو مجھے نہیں کرنی چاہیئں۔ مگر میرے لئے اپنے گھر آنے کی اجازت برقرار رکھنا۔ ورنہ شاید میری زندگی کچھ اور کم ہو جائے۔ وہ بہت پیاری ہے بہت ہی پیاری۔ میں۔ میں اُس سے مِلتے رہنا چاہتا ہُوں"

حِنا آفندی صاحب کو اندر لے جانے کے بعد فوراً ہی کام میں مصرُوف ہو گئی۔ ملازم کو بھیج کر اُس نے اُن کے لئے شیونگ باکس منگوایا اُن کے کپڑوں کو اُتروا کر استری کی اور اُس کے بعد اُن کی خدمت کرنے لگی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے آفندی صاحب کے لئے چائے بنائی تھی۔ اور پھر اُس رات آفندی صاحب نے رات کا کھانا رِدا اور حِنا کے ساتھ کھایا۔

رِدا آفندی صاحب سے مِل کر بہت خوش ہُوئی تھی۔ خُون نے خُون کو پُکارا تھا اور رِدا اُن سے کچھ اِس طرح گھُل مِل گئی تھی کہ آفندی صاحب کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہُوا تھا۔ وہ حِنا کے شُکر گزار تھے کہ حِنا نے کم از کم اُن سے رِدا کو نہیں چھینا تھا اور رِدا کے اور اُن کے درمیان کسی قسم کی رُکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اپنے اُصُولوں پر چٹانوں کی طرح سخت تھی اور اُس نے آفندی صاحب کو کبھی اِس کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ رِدا کے لئے کچھ کریں۔ اُس نے نہایت لجاجت سے کہا تھا کہ ڈیڈی آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر لیکن مجھے اپنے آپ کو آزما لینے دیجئے اگر میں رِدا کے لئے وہ سب کچھ نہ کر سکی جو میں کرنا چاہتی ہُوں تو اُس کے بعد رِدا کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں دے دُوں گی۔ حِنا نے کہا اور آفندی صاحب نے اُس سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

✤

وقت کے بہت سے ورق اُلٹ گئے تھے رِدا امتحانات پاس کرتی چلی جا رہی تھی۔ پرائمری سے سیکنڈری اور پھر کالج۔ وہ بے پناہ حُسن کی مالک تھی۔ صاف و شفاف بے داغ چہرہ، بے داغ زندگی، جوانی آ چکی تھی۔ وہ حِنا کی نسبت زیادہ تندرست اور توانا تھی اور اپنی عُمر سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی شکل و صُورت میں بھی حِنا سے کچھ زیادہ ہی خُوب صُورت تھی۔

بہرطور اب اُس کے اندر سنجیدگی اور سوچ پیدا ہو گئی تھی۔ آفندی صاحب کو وہ نانا جان کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی لیکن آفندی صاحب کو دیکھ کر اُس کی نگاہوں میں ایک سوال پیدا ہو جاتا تھا اور جب حِنا نے پہلی بار یہ سوال اُس کی نگاہوں میں محسوس کیا تو اُس نے رِدا کو اپنے ماضی سے لاعلم رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اُس سوال کا انتظار کر رہی تھی۔

رِداکے کچھ پُوچھنے سے پہلے وہ اپنا ماضی اُسے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اور اب جب رِدا کی آنکھوں میں یہ سوال اُبھر آیا تھا تو اُس نے خود ہی اُسے ایک شام اپنے قریب بُلاکر کہا۔

"رِدا! آفندی صاحب کے بارے میں تم شاید مجھ سے کچھ پُوچھنا چاہتی ہو؟"

رِدا خاموش رہی تو حِنا نے خود ہی کہا۔

"ہاں رِدا میں نے تمھاری آنکھوں میں وہ سوال پڑھ لئے ہیں جو تمھارے ذہن کو داغدار کرتے ہیں۔ اور میں سمجھتی ہُوں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں تمھیں سب کچھ سچ سچ بتا دُوں... یہ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہُوں کہ.... آفندی صاحب میرے والد ہیں بہت ناز و نعم سے پرورش کیا تھا اُنھوں نے مجھے۔ زندگی کی ساری خوشیاں میرے سامنے ڈھیر کر دیں تھیں۔ اور میں نے یہ جانا رِدا کہ زندگی میں طلب نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہر شئے پا لینے کے لئے ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو۔ اِن سوچوں میں پروان چڑھی تھی میں اور انہی سوچوں نے مجھے ایک غلط فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ فیصلہ ایک شاعر کے بارے میں تھا جس کی بے باک فِطرت اور جس کی انوکھی شخصیت نے مجھے متاثر کیا۔ حالانکہ وہ میری سطح کا انسان نہیں تھا وہ... وہ ایک... بس میں اُس کے بارے میں اس لئے کوئی غلط لفظ نہیں استعمال کرنا چاہتی کہ وہ تمھارا باپ ہے۔"

رِدا کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔ لیکن حِنا نے اُس کے اِن جذبات کو محسوس کرنے کے باوجود کہا۔

"ہاں رِدا! میں نے اپنے ڈیڈی سے بغاوت کی۔ اور ثاقب سے شادی کر لی۔ میرے ذہن میں ایک تصوّر تھا۔ دِل میں ایک جذبہ تھا۔ جسے تم ناتجربے کاری کہہ سکتی ہو۔ میں اپنی ناتجربے کاری کا شکار ہوگئی رِدا۔ ثاقب وہ نہیں تھا، جو میں نے سوچا تھا بلکہ وہ تھا جو میرے ڈیڈی نے سوچا تھا۔ وہ دولت کے لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میں نے ڈیڈی سے اختلاف کر کے یہ سوچا تھا کہ زندگی چاہے جیسی بھی گزرے ایک محبت کرنے والا تو ساتھ ہوگا۔

لیکن رِدا۔ ثاقب ہمارے ساتھ نہ رہا۔ وہ مجھے دھوکا دے کر یہاں سے نکل گیا۔ اور اس کے بعد... اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کو ٹھوس حقیقتوں پر استوار کیا۔ اور اب پسند کرنے والے آفندی صاحب مجھے بہت سی پیش کشیں کر چکے ہیں۔ لیکن میں... میں اُن کی یہ باتیں نہیں مان سکی۔ جس چیز کو میں نے ایک دعوے کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا رِدا اُسے قبول کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ یہ ذرا مشکل ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے اِس بارے میں؟"

رِدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ سُن کر وہ عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہوگئی تھی کہ اُس کا باپ زندہ ہے اور اس نے آج تک اپنی بیٹی کی صُورت بھی نہیں دیکھی۔

بہرطور بات آئی گئی ہوگئی۔ رِدا اب اپنے آپ سے واقف ہوچکی تھی۔ بظاہر اس پر اِس کا کوئی اثر نظر نہیں آیا تھا لیکن اُس کی محبتیں آفندی صاحب کے ساتھ بڑھ گئی تھیں اور وہ آفندی صاحب سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی تھی اُن کے لئے ہر طرح سے تیار رہتی تھی۔ وہ آتے تو رِدا اُن کے سامنے بچھ بچھ جاتی۔ آفندی صاحب نے رِدا کی اِس کیفیت کو نوٹ کر ہی لیا۔ چنانچہ ایک دِن وہ پُوچھ بیٹھے۔

"رِدا! ہم نے تمھارے اندر ایک خاص تبدیلی نوٹ کی ہے۔ اِس کی وجہ بتاؤگی؟"

"کیا تبدیلی نوٹ کی ہے آپ نے نانا جان؟"

"بھئی تبدیلی... مُعاف کرنا۔ ہم اُسے الفاظ میں نہیں بیان کر سکتے۔ کچھ... کچھ ایسا لگتا ہے رِدا۔ جیسے اچانک تمھاری نگاہوں میں ہماری وقعت بڑھ گئی ہو۔ بس ہم کہہ نہیں سکتے کہ ہم کیا محسوس کر رہے ہیں۔"

رِدا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے گردن جُھکالی۔ حِنا اس وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ شاید وہ دفتر ہی میں تھی۔ آفندی صاحب رِدا کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُس کے رُخساروں پر جب اُنھوں نے آنسو بہتے ہُوئے دیکھے تو بے چین ہوگئے اور بہت ہی پریشان ہوکر بولے۔

"رِدا بیٹے! ایسی کون سی بات کہی ہم نے، رونے کی کیا بات ہے بھئی۔ ہمیں بتاؤ تو سہی کوئی غلطی ہوگئی، کیا ہوگیا؟ رِدا پلیز بیٹے۔ دیکھو اب ہم کسی کے آنسو نہیں برداشت کر سکتے اور یہ تمھی رو رہی ہو کے..."

"نانا جان آپ امّی کے ابّو ہیں ناں؟"

"ہاں بیٹی۔ کیوں؟"

"میرے ابّو کہاں ہیں نانا جان۔ کیا آپ مجھے میرے ابّو کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟" رِدا نے سِسکتے ہُوئے کہا۔ اور آفندی صاحب کا سانس جیسے بند ہوگیا۔ اُن کے حلق میں ایک گولا سا آپھنسا تھا۔ وہ پریشان نِگاہوں سے رِدا کو دیکھنے لگے اور رِدا نے آہستہ سے کہا۔

"میں اب بچی نہیں ہُوں نانا جان۔ باپ کی محبت سے واقف ہُوں میں۔ میں نے دوسری لڑکیوں کے باپ کا پیار دیکھا ہے۔ میرے ابّو اگر مجھے دیکھتے تو شاید وہ بھی مجھے اِتنا ہی پیار کرتے۔ آپ سب نے مِل کر مجھے میرے ابّو کے پیار سے محروم کر دیا۔ نانا جان ساری باتیں مجھے معلوم ہوگئی ہیں۔ میں مانتی ہُوں ابّو اچھے انسان نہیں تھے لیکن اگر اُن کے لئے دِل میں لچک پیدا کر لی جاتی اور اگر ابتداء آپ ہی کر دیتے تو میں... میں شاید باپ کے پیار سے محروم نہ رہتی۔ نانا جان پہلے آپ نے اور آپ کے بعد امّی نے مجھے میرے ابّو سے محرُوم کیا۔ نانا جان میں آپ کو بچپن سے چاہتی ہُوں لیکن یقین کیجئے مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کہ آپ امّی کے سگے باپ ہیں اِس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مجھے آپ دونوں کے درمیان وہ رشتہ کبھی نظر نہیں آیا جو باپ بیٹی کے درمیان ہوتا ہے۔ بس ایک کھچاوٹ سی محسوس کرتی تھی آپ دونوں میں۔ یا پھر آپ لوگوں میں رشتوں کا وہ جذبہ نہیں پاتی تھی میں، جو باپ اور بیٹی کے درمیان ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امّی نے مجھے ساری کہانی سُنا دی مجھے علم ہوگیا کہ آپ امّی کے سگے۔ تو میں مجھے آپ پر بے حد پیار آیا۔ میرے ابّو گُم ہوگئے۔ مگر میری امّی کے ابّو تو ہیں۔ بس مجھ میں اگر کوئی تبدیلی ہے تو صرف اِس تصّور کے ساتھ کہ آپ میری امّی کے ابّو ہیں اور دُکھ ہے تو اس کا کہ آپ نے میرے ابّو کو میرے پاس نہ رہنے دیا۔"

آفندی صاحب کوشش کے باوجود اپنے آنسو نہ روک سکے۔ وہ رِدا سے کچھ بھی کہہ نہ سکے۔ لیکن اُن کے دِل پر ایک شدید بوجھ آپڑا تھا۔ یہ احساس تو انھیں بہت پہلے ہو چُکا تھا کہ حِنا کے معاملے میں ضِد کر کے اُنھوں نے اچھا نہیں کیا تھا۔ دراصل بیٹی کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے تھے۔ اور اب... اب وہ وقت گُزر چُکا تھا جب حالات ہموار ہوتے، اُنھوں نے اپنے طور پر ثاقب کے بارے میں معلومات کرائی تھیں۔ لیکن کینیڈا سے یا کہیں اور سے یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ ثاقب کہاں ہے؟ اِس کی اطلاع اُنھوں نے حِنا کو بھی نہیں دی تھی۔ رِدا کی آج کی گفتگو نے اُنھیں بہت زیادہ افسُردہ کر دیا تھا۔ لیکن اب اِس کا کوئی حل نہیں تھا اُن کے پاس۔ حِنا اپنی جگہ سخت تھی اور اب آفندی صاحب اُس کی زندگی کے معمُول میں کوئی تبدیلی لانا نہیں چاہتے تھے جب تک کہ وقت خود ہی کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے۔

❁

پھر وقت نے کروٹ بدلی اور ایک نیا موڑ آگیا حِنا بدستُور اپنی زندگی کے مشاغِل میں مصرُوف تھی۔ دفتر، گھر، رِدا۔ جس میں آفندی صاحب بھی شریک ہوتے آفندی صاحب حِنا کو تو اُس کوٹھی تک نہیں لے جا سکے تھے جس میں حِنا بچپن سے جوان ہُوئی تھی۔ لیکن اب نہ وہ رِدا کو چھوڑ سکتے تھے نہ حِنا کو۔ چُنانچہ اب اُن کا زیادہ تر وقت یہیں گُزرتا تھا، بیٹی کے گھر زیادہ وقت گزارتے ہُوئے وہ اُلجھتے بھی تھے اور بعض اوقات دِل پر جبر کر کے کافی وقت باہر گُزارلیا کرتے تھے۔

ایک دِن حِنا اپنے دفتر میں بیٹھی کام کر رہی تھی کہ چپڑاسی اندر آگیا۔

"وہ صاحب پھر آئے ہیں میڈم۔" اُس نے کہا۔

"کون؟" حِنا چونک کر بولی۔

"وہی جو کل بھی آئے تھے اور پرسوں بھی۔"

"کون ہیں وہ؟ کیا مجھے اُن کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"اور شاید آپ کو علم نہیں ہو سکا میڈم! پرسوں بھی وہ شام ہی کو آئے تھے آپ اُن کے آنے سے دس منٹ پہلے جا چُکی تھیں اور کل بھی وہ آپ کے جانے کے بعد ہی آئے تھے، آج اِس وقت آئے ہیں۔ دراصل کل میں نے اُنھیں بتا دیا تھا کہ آپ اِس وقت یہاں سے اُٹھ جاتی ہیں چنانچہ آج وہ جلدی آگئے ہیں۔"

"کوئی نام تو ہوگا اُن کا۔ کون ہیں اور کیا کام ہے مجھ سے؟" حِنا نے پُوچھا۔

"عجیب آدمی ہیں میڈم۔ اِس لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہُوں نہ اُن کا کوئی کارڈ ہے نہ اپنا نام وغیرہ بتاتے ہیں۔ بس مجھ سے کہا کہ وہ میڈم حِنا سے مِلنا چاہتے ہیں اُنھیں اطلاع کر دی جائے اور صرف دو منٹ دِلوا دیئے جائیں۔ اگر میڈم ناپسند کریں گی تو وہ واپس چلے جائیں گے۔"

"کون ہیں آخر، بُلاؤ دیکھوں کون ہے" حِنا نے کہا۔ تجسّس تو انسانی فِطرت کا خاصہ ہوتا ہے۔ اور وہ اِس

عجیب وغریب شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جو اُس سے ملنے کے لئے تین دن سے برابر آرہا تھا۔

چپڑاسی باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ حِنا نے آنے والے کو دیکھا تھا۔ خوبصورت لباس میں ملبوس، ایک قدآور شخصیت!

لیکن دفعتاً ہی اُس کے زخمی وجود میں کانچ کے ہزاروں ٹکڑے چُبھ گئے۔ وہ اپنی جگہ ساکت وجامد رہ گئی۔ آنے والا بہت خوش پوش تھا اُس کی آنکھوں پر انتہائی قیمتی کمانی کی عینک لگی ہوئی تھی۔ اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

یہ شخص ثاقب کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور اُس کی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو اُسے تبدیل کردیتی۔ بس کنپٹیوں کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی آگئی تھی۔ بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی تروتازہ ہوگیا تھا چہرے پر زندگی کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ وہ سنجیدہ سا دروازے کے قریب کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

نہ جانے کتنا وقت اِسی طرح گزر گیا؛

حِنا کے وجود کی گڑگڑاہٹ آہستہ آہستہ تھم گئی۔ اور پھر اُس کے اندر جوالا مُکھی کھول اُٹھا۔ اُس کے وجود میں لاوا اُبل رہا تھا لیکن اِس لاوے کو اُس نے ذہن میں روک لیا۔ اور انتہائی سرد لہجے میں بولی۔

"تشریف لائیے۔"

ثاقب آگے بڑھ آیا۔ حِنا نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گیا۔ تب حِنا کی سرد آواز اُبھری۔

"جی میں کیا خدمت کرسکتی ہوں؟"

"کیا تم مجھے پہچان نہیں سکیں حِنا؟" ثاقب کی آواز اُبھری۔

"میرے لائق کوئی خدمت؟" حِنا کا لہجہ انتہائی کرخت تھا۔ ثاقب کے انداز میں کچھ تبدیلی رُونما ہوگئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔

"حِنا! میں... میں ثاقب ہوں۔ بہت عرصے کے بعد تم تک پہنچ سکا۔ دراصل کچھ غلطیاں ہوگئی تھیں حِنا، اور میں کچھ ایسی اُلجھنوں کا شکار ہوگیا تھا کہ میں... کہ میں۔ لیکن حِنا! میں تم سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنا چاہتا ہوں گو کہ تم سے میری یہ لاپرواہی قابلِ مُعافی تو نہیں۔ لیکن حِنا! میری زندگی میں تمہارا ایک مقام ہے۔ میں... میں تم سے مُعافی مانگنے آیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں مَیں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں کہ میں..."

"ثاقب صاحب! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ دفتر ہے۔ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ دفتروں میں کام کیا جاتا ہے اور شاید یہ بھی جانتے ہیں آپ کہ اِس دفتر میں میری کیا حیثیت ہے؟"

"میں... میں دو دن سے مُسلسل آرہا ہوں۔ یہ لوگ... یہ لوگ مجھے تمہارے گھر کا پتہ نہیں بتلاتے۔ میرا خیال ہے۔ میں آج تمہارے گھر پر آجاؤں۔ براہِ کرم مجھے اپنے گھر کا پتہ دے دو حِنا۔ تم جس انداز سے مجھ سے پیش آئی ہو، اُس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ... کہ..." ثاقب جُملہ پُورا نہ کرسکا تھا۔

حِنا کے تن بدن میں گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اُس کے وجود کا لاوا کھول کر باہر آجانے کے لئے بے چین تھا۔ اُس نے انتہائی نفرت بھری نگاہوں سے ثاقب کو دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے بولی۔

"عجب مضحکہ خیز شخصیت ہے تمہاری ثاقب، تمہاری غیرت نے یہ بات کس طرح گوارہ کرلی کہ اِتنے عرصے بعد تم میرے سامنے آؤ۔ تعجب ہے، شدید حیرت ہے مجھے۔ انسانوں کی کون سی قسم سے تمہارا تعلق ہے۔ تم... تم ثاقب... تم عجیب انسان ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں انسان کہوں بھی یا نہ کہوں۔ تم غالباً کوئی حق اپنے ذہن میں تصوّر کرکے مجھ تک آئے ہو۔ سُنو ثاقب! میں انسانوں کے ساتھ بُرا سلوک کرنے کی عادی نہیں ہوں، بہتر ہے فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ اِس دفتر سے ایک سیکنڈ کے اندر اندر نکل جاؤ ورنہ میں اپنی زندگی میں وہ کر بیٹھوں گی جو میں نے کبھی نہیں کیا۔ میں تمہارے ساتھ وہ کچھ کر بیٹھوں گی ثاقب، جِس کا تم تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔"

ثاقب خاموشی سے حِنا کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے آہستہ لہجے میں کہا۔

"میں تم سے گھر پر ملنا چاہتا ہوں حِنا، بہت تھوڑا وقت لوں گا میں تمہارا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں سُننا بے حد ضروری ہیں حِنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑا بہت وقت تمہیں مجھے دینا چاہیئے، یہ ضروری ہے حِنا۔ بہت ضروری ہے حِنا! میری بھی ایک حیثیت ہے اور وہ حیثیت

ختم نہیں ہوئی۔ ہاں اگر تم نے کوئی اور ذریعہ دریافت کیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ کم از کم مجھے کچھ وقت تو دو۔"

"ورنہ دوسری صورت میں آپ میرے دفتر میں موجود ہر شخص سے کہیں گے کہ آپ میرے شوہر ہیں۔ اور میں آپ کی بیوی۔ بلیک میل کریں گے آپ مجھے۔ ٹھیک ہے۔ ہم عزت دار لوگ ہیں ثاقب، اور اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ میرا کارڈ ہے شام کو چھ بجے آپ یہاں تشریف لے آیئے میں اپنی آبرو بچانے کے لئے آپ کا انتظار کروں گی۔"

حِنا نے ایک سفید کارڈ اُس کے حوالے کردیا اور پھر اپنے سامنے رکھا ہوا ایک فائل کھول کر اُس پر جُھک گئی۔ ثاقب چند لمحات اُسے دیکھتا رہا۔ کارڈ اُس نے جیب میں رکھا اور کُرسی سے اُٹھ گیا۔ اُس کے بعد وہ حِنا کے دفتر میں نہیں رُکا تھا۔

باہر کھڑے ہوئے چپڑاسی نے اُس کے لئے دروازہ کھول دیا اور جب وہ باہر نکل گیا تو اُس نے دروازہ بند کردیا۔

حِنا کی آنکھیں دُھندلا گئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے تھے۔ اُسے چکر آرہے تھے۔ دِل چاہ رہا تھا لیٹ جائے، سو جائے، گہری نیند... گہری نیند۔ اُس کا وجود تپ رہا تھا۔ دماغ کی شریانیں پھٹی جارہی تھیں۔ ثاقب... یہ ثاقب کہاں سے آگیا؟ کیوں آگیا؟ اب کیا ہوگا؟

اس کا پورا بدن لرز رہا تھا دِل بیٹھا جارہا تھا کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھی وہ یہاں سے گھر واپس چلی جانا چاہتی تھی۔ لیکن... لیکن... کیسے جائے گی۔ کیا... کیا وہ اِس قابل ہے کہ یہاں سے اُٹھ کر اپنی کار تک جاسکے اور گھر واپس پہنچ سکے۔ حلق خشک ہورہا تھا۔ شدید پیاس لگ رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلائے اُس سے پانی طلب کرے۔ مگر جب چپڑاسی اُسے دیکھے گا تو محسوس کرے گا کہ اُس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اور اُس کے بعد کیا سوچے گا وہ، کیا سوچے گا، کیا کرنا چاہیئے مجھے کیا کرنا چاہیئے؛

وہ کُرسی کی پُشت سے ٹیک کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ثاقب آخر اِتنے عرصے کے بعد واپس کیوں آیا ہے؛ گویا وہ ذہنی طور پر آسودہ ہے اور اُسے حِنا سے جُدائی کا کوئی احساس نہیں رہا ہے۔ سچ تو ہے یہ تصوّر کیوں کیا جائے کہ اُس کے ذہن میں حِنا سے جُدائی کا کوئی خیال ہوگا۔ لیکن ...لیکن اب وہ یہاں کیوں رُکا ہے؛ وہ یہاں کیوں آیا ہے؛ رِدا کی تو اُس نے صورت بھی نہیں دیکھی۔ رِدا بھی ہوسکتا ہے اُس کے ذہن میں ہو۔ مگر... مگر اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ آہ۔ میں کیا کروں؛ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف رہی۔ زندگی میں پھر ایک طوفان اُٹھا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اُسے اِس طوفان کے خلاف جنگ کرنا ہے اُس کے لئے خود کو تیار کرنا ہے۔ بات اب صرف اُس کی ذات تک محدود نہیں ہے رِدا بھی اِس سلسلے میں ملوّث ہوجائے گی۔ آہ کیا کروں... کیا کروں؛ میں نے تو اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کرلیا تھا اپنی زندگی کے وہ سُنہرے دِن اور سُنہری راتیں کھونے کا ملال بھی ختم کردیا تھا جو انسان کی زندگی کے لئے بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ اور میں نے اپنی ذات رِدا کے لئے وقف کردی تھی۔ میں نے آفندی صاحب کو بھی وہ درجہ نہیں دیا۔ جس کے وہ مستحق تھے اُس نے شدید مزاحمت کی اُن کے ساتھ اور جب وہ ٹوٹ پھوٹ گئے اُن کی ساری شخصیت ریزہ ریزہ ہوگئی، وہ کیا سے کیا بن گئے؛ کتنے مغرور تھے وہ خود پر۔ کتنے لئے دیئے رہتے تھے خود کو۔ لیکن اُنھوں نے جیسے اپنی شخصیت کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا وہ اُن دونوں ماں بیٹیوں کے لئے، خود برباد ہوکر رہ گئے تھے۔

اور حِنا نے اپنے باپ کی اِس ٹوٹی پھوٹی شخصیت کو قبول کرلیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے سامنے جُھکی نہیں تھی بلکہ اُس نے اپنے باپ کو جُھکا لیا تھا ایک بیٹی ہونے کے باوجود اُس نے اپنی ضد، اپنی اَنا برقرار رکھی تھی۔

لیکن اب یہ ثاقب... یہ ثاقب، یہ خودغرض اور لاپرواہ شخص، یہ نکمّا اور ناکارہ انسان دوبارہ اُس کی پُرسکون زندگی میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے آگیا ہے۔ کیا کرے گا یہ زیادہ سے زیادہ؛ کیا کرسکتا ہے یہ؛ کون سے حقوق ہیں اُس کے مجھ پر؛

حِنا نہ جانے کِس کِس انداز میں سوچتی رہی۔ پھر اُس نے دِل میں سوچا کہ فوراً ہی آفندی صاحب کو ثاقب کی آمد سے مطلع کردیا جائے۔ اور اُن سے کہا جائے کہ وہ ثاقب کے خلاف اُس کی مدد کریں۔ لیکن کیا کریں گے آفندی صاحب؛ کہیں کوئی اور ہی حادثہ نہ ہوجائے۔ کہیں غُصّے میں آکر وہ ثاقب کو قتل ہی نہ کردیں، چشمِ تصوّر میں اُس

نے نہ جانے کیا کیا دیکھا۔ وہ جانکنی کے عالم میں تھا، وہ دم توڑ رہا تھا۔ اور آفندی صاحب پستول ہاتھ میں لئے اُسے خُونی نِگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

نہ جانے کیوں اُس کے دِل کو دھکّا سا لگا۔ ثاقب کو اِس طرح خُون میں ڈُوبے دیکھ کر اُس سے برداشت نہیں ہو سکا تھا۔ اُس کے دِل میں ایک عجیب سی دُکھ کی سی لہر بیدار ہوگئی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ، کیا ہو رہا ہے؟

وہ نہ جانے کب تک اِسی طرح بے حِس و حرکت بیٹھی رہی، پھر چپڑاسی نے ہی کِسی کام سے دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہوگیا تھا۔ اُس نے ایک کارڈ حِنا کے سامنے رکھا اور بولا۔

"میڈم! یہ صاحب آپ سے مِلنا چاہتے ہیں۔" اُس نے چپڑاسی کو دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

"نہیں اُن سے معذرت کر لو، جو کوئی بھی ہیں اُن سے معذرت کر لو۔ کہہ دو میں اِس وقت کِسی سے نہیں مِل سکتی اور ایک گلاس پانی لے آؤ میرے لئے۔" نہ جانے کِس طرح اُس نے یہ الفاظ ادا کئے تھے۔ چپڑاسی اُس پر توجہ دیئے بغیر گردن خم کرکے باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ گلاس میں پانی لے آیا تھا۔

حِنا نے اُسے دیکھا اور گلاس اُس کے ہاتھ سے لیتے ہُوئے بولی "وہ صاحب چلے گئے؟"

"جی میڈم! وہ جا چکے ہیں۔" چپڑاسی نے جواب دیا۔ اور حِنا پانی پینے لگی۔ پانی پینے کے بعد اُسے کافی سکُون محسوس ہُوا تھا۔ ویسے بھی خود کو سنبھالنا بے حد ضروری تھا۔ بات معمُولی نہیں تھی۔ ثاقب اُس کی زندگی میں پھر سے داخل ہوگیا تھا۔ اِتنے عرصے کے بعد، ایک طویل وقت گزارنے کے بعد جب انسانوں کی صُورتیں ذہن سے بالکل محو ہوجاتی ہیں۔ ثاقب دوبارہ آگیا تھا۔

اب کیا کروں؟ اب کیا کرنا چاہیئے؟ وہ مجھ پر اپنا حق جتائے گا۔ لیکن کیا میرے اُوپر اُس کا کوئی حق ہے؟ ڈیڈی کو جب یہ بات معلوم ہوگی تو اُن پر کیا بیتے گی؟

کوئی فیصلہ کرنا تو ضروری ہے۔ ثاقب کو اِس سے پہلے اُس کے گھر کا پتہ معلوم نہیں تھا، لیکن جو کارڈ اُس نے ثاقب کو دیا ہے اُس پر اُس کے گھر کا پتہ درج ہے، کہیں وہ مجھ سے پہلے میرے گھر نہ پہنچ جائے۔ کہیں وہ رَدا سے مِل کر کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ کرے۔

دفعتاً ہی اُس کے بدن میں بجلیاں سی بھر گئیں، وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اور اُس کے بعد اُس سے وہاں رُکا گیا، اِس خیال نے اُس کے بے جان بدن کو آتشیں قوت بخش دی تھی وہ دیوانہ وار باہر نِکل آئی۔ چپڑاسی اُسے اِس انداز میں باہر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ تاہم اُس نے اُس سے زم لہجے میں کہا۔

"سُنو! میں باہر جا رہی ہُوں۔ اگر کوئی میرے بارے میں پُوچھے تو کہہ دینا کہ مصرُوف ہُوں۔"

چپڑاسی نے احمقانہ انداز میں گردن ہِلا دی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے باہر نِکل آئی۔ اپنی کار وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی چُنانچہ باہر نِکل کر اُس نے کار کا دروازہ کھولا، اور پھر اُسے اسٹارٹ کرکے برق رفتاری سے آگے بڑھا دیا۔ اب اُس کی ذہنی قوتیں بحال ہوگئی تھیں۔ اِس احساس نے اُس کے وجُود میں چنگاریاں بھر دیں تھیں کہ کہیں اُس سے پہلے ثاقب رَدا کے پاس نہ پہنچ جائے۔ وہ رَدا کو بہکانے کی کوشش نہ کرے۔ نہ جانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کی دُنیا میں کوئی شدید طوفان آگیا ہے۔ ڈیڈی اب اُس کے پاس آکر بہت خوش ہوتے۔ رَدا اور اُس کے ساتھ بہت وقت گزارتے تھے وہ۔ ثاقب کی آمد کو وہ کِس انداز میں محسوس کریں گے۔ ہُونہہ ثاقب ہے کیا چیز؟ وہ سب کی نِگاہوں میں ظاہر ہو چُکا ہے اور اب اُس کے بارے میں ایسی کوئی بات سوچنا حماقت ہے۔ ہمارا کوئی نہیں ہے اب وہ۔ کیا کریں گے ہم اُس بے غیرت شخصیت کا جس نے ایک طویل عرصے تک پلٹ کر نہ پُوچھا وہ... وہ ایک انتہائی لالچی اور خود غرض انسان ہے۔ ایسے خود غرض انسان کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیئے؟

پریشان حال سی وہ گھر پہنچی۔ رَدا گھر پر ہی موجود تھی۔ اُس نے وحشت ناک لہجے میں پُوچھا۔

"کوئی آیا تو نہیں رَدا؟"

"نہیں امّی، کیا کِسی کو آنا تھا؟ آپ اِس وقت کیسے واپس آگئیں؟ آپ کے چہرے کو کیا ہو رہا ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" رَدا نے پریشانی سے پُوچھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہُوں رَدا۔ کوئی بھی نہیں آیا ناں؟"

"نہیں امّی، کِسے آنا تھا؟ آپ تو اندر آیئے۔" رَدا ماں کی یہ کیفیت دیکھ کر پریشان سی ہوگئی تھی۔ وہ حِنا کو لئے ہُوئے اندر داخل ہوگئی۔ پھر اُس نے حِنا کو صوفے پر بٹھایا فین کھولا اور خود باہر نِکل گئی۔ چند لمحے بعد وہ پانی میں گلوکوز مِلا کر لے آئی تھی۔

"یہ پی لیں امّی! شاید آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے، بات کیا ہے؟" رَدا نے پُوچھا۔ حِنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گلوکوز مِلا ہُوا پانی پی گئی۔ اُس کے بعد وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ رَدا بغور اُس کا جائزہ لے رہی تھی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"امّی! کوئی بات ضرور ہے، کیا مجھے بتانے کی نہیں ہے؟" اُس نے عجیب سی نِگاہوں سے رَدا کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"نہیں رَدا! مَیں... بس اچانک ہی بہت پریشان ہوگئی ہُوں۔"

"میں نے آپ سے یہ پُوچھا تھا کہ کیا مجھے بتانے کی بات نہیں ہے؟"

"نہیں! وہ... وہ ثاقب آگیا ہے۔" حِنا نے بمشکل تمام کہا۔

"کون ثاقب؟"

"ثاقب... میرا شوہر۔ تمہارا باپ۔ وہی ثاقب رَدا وہی ثاقب۔" حِنا نے نہ جانے کِس انداز میں یہ الفاظ ادا کئے۔ اُس کے لہجے سے نفرت و حقارت ٹپک رہی تھی۔ لیکن رَدا کا چہرہ ایک دم سُرخ ہوگیا۔

"ابّو... امّی ابّو... امّی جی ابّو... آپ... آپ ابّو کی بات کر رہی ہیں؟" اُس نے ہیجانی انداز میں پُوچھا اور حِنا چونک کر رَدا کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رَدا کے چہرے پر نہ جانے کیا کیا تاثرات بکھرے ہُوئے تھے۔ حیرت، مسرّت، حسرت، شوق اور نہ جانے کیا کیا... ایک ہی نِگاہ میں اُس نے رَدا کے چہرے کی تحریر پڑھ لی اور دفعتاً اُس کی آنکھیں خُون کی طرح سُرخ ہوگئیں۔

"کیا تم اُس کی آمد سے خوش ہو رَدا؟"

"نن... نہیں، میرا مطلب ہے امّی ابّو... ابّو..."

"کیا تم اِس نام سے واقف ہو۔ کیا تم نے کِسی کو اِس نام سے پکارا ہے رَدا؟" حِنا نے غرّاتی آواز میں سوال کیا اور رَدا تعجب سے حِنا کی صُورت دیکھنے لگی۔ وہ حِنا کے تاثرات جاننے کی کوشش کر رہی تھی پھر دفعتاً ہی اُس کے چہرے پر تاریکی چھاگئی۔

"امّی مَیں... مَیں... امّی میرا مطلب ہے کہ آپ کے لئے کچھ اور لاؤں؟"

"نہیں، بیٹھو میرے سامنے بیٹھو، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اب تم اِتنی چھوٹی نہیں ہو رَدا کہ حالات اور واقعات کو نہ سمجھ سکو یا میری بدقسمتی کو نہ جان سکو۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے اپنی زندگی کے ایک ایک راز سے واقف کر دیا ہے تمہیں۔ اِس وقت تمہیں میری مدد کرنی ہوگی رَدا، مجھے اِس وقت تمہاری مدد درکار ہے۔" حِنا کا لہجہ بہت ٹوٹا ہُوا تھا۔ شکست خوردہ سی لگ رہی تھی۔

رَدا پتھرائی نِگاہوں سے ماں کو دیکھتی رہی، اُس کا وجُود جیسے پتھرا گیا تھا۔ نہ جانے باپ کی آمد کے تصوّر کے ساتھ ساتھ اُس کے دِل میں کیا کیا احساسات بھڑک اُٹھے تھے۔ وہ عجیب سی نِگاہوں سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ تب حِنا نے کہا۔

"رَدا! وہ میرے دفتر آیا تھا۔ اُسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خُون اُتر آیا تھا۔ یہ وہ شخص ہے رَدا، جس نے مجھ سے میرا ماضی چھین لیا۔ میری جوانی کے وہ لمحات چھین لئے جن لمحات میں انسان نہ جانے کیا کیا آرزوئیں کرتا ہے، ہاں رَدا یہ وہ شخص ہے جس نے مجھ سے میرا باپ چھین لیا میرے باپ کی شفقت چھین لی۔ سب کچھ چھین لیا۔ اور یہ چھیننے والا پھر میری زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ رَدا! میں سخت پریشان ہُوں۔ میں تمہاری مدد چاہتی ہُوں۔ میں تمہارا مشورہ چاہتی ہُوں رَدا، مجھے بتاؤ میں اِس شخص کا کیا کروں؟ میرا جی چاہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے..." حِنا خاموش ہوگئی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ اور رَدا اب بھی اُسی طرح پتھرائی ہُوئی نِگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

حِنا چند لمحات خاموش رہی، جذبات کا طوفان بُری طرح اُبل رہا تھا۔ اُس کا سینہ دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ اُس کی آواز پھر اُبھری۔

"ہاں رَدا وہی ہے یہ۔ وہی ہے یہ۔ میں نے جس پر اپنی زندگی نثار کر دی تھی۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ میں اُس کے ٹُوٹے پھُوٹے مکان میں آخری سانس تک بسر کرلوں گی۔ میں نے اُس کے لئے اپنا شاندار گھر چھوڑ دیا تھا۔ پیار کرنے والا باپ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اُس

کے لئے، اور اُس کے جھونپڑے میں چلی آئی تھی۔ اُس ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں جہاں کاغذوں پر لکھے ہُوئے اشعار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے اُسے چاہا تھا رُدا۔ اُسے چاہا تھا میں نے۔ اور پھر میں نے اُسے زندگی کے اُن سُلجھے ہُوئے راستوں پر چلانا چاہا۔ اُن راستوں پر جو زندگی تعمیر کرتے ہیں۔ انسانی مستقبل کو خوش آئند نوید دیتے ہیں۔

لیکن وہ... وہ ناکارہ شخص ڈیڈی کے کہنے کے مطابق اُس کی نگاہیں دُور تک دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں اِتنے بڑے آدمی کی اکلوتی بیٹی ہُوں اور ایک دِن اُن کی اتنی بڑی دولت اور جائیداد مجھے مِل جائے گی۔ رُدا، یہ دولت نہ مِلی تو اُس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اُس نے مُنہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن کچھ کر کے بھی نہ دِکھایا، پھر اُس کے بعد وہ بہانہ کر کے ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے دوبئی اور پھر کینیڈا۔ میں نے جب اُسے تمہاری آمد کی اطلاع دی تو رُدا اُس نے مجھے مُبارک باد کا ایک پیام تک نہ بھیجا ایک بھی ایسا تحفہ نہ بھیجا تمہارے لئے جس سے یہ اظہار ہوتا کہ ایک باپ کے دِل میں اپنی بیٹی کے لئے کچھ ہے۔

رُدا! بہت خود غرض انسان ہے وہ، بہت خود غرض۔ میں اُسے ایک لمحہ برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ شاید یہاں آئے گا، سمجھیں رُدا!"

"کب؟" رُدا کے مُنہ سے بے اختیار نِکل گیا۔

"نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے آج شام۔ ہو سکتا ہے کل... اور رُدا تم... تم اُس کے سامنے نہیں آؤ گی، سمجھیں وہ اِس قابل نہیں ہے کہ اپنی بیٹی کی صُورت دیکھے۔"

رُدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گردن جُھکائے بیٹھی رہی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے اور جب حِنا کی نظر اُس کے آنسوؤں پر پڑی تو وہ جھنجھلا اُٹھی۔

"کیوں رو رہی ہو؟" اُس کی لرزتی ہُوئی آواز اُبھری۔ اور رُدا چونک پڑی۔

"کک... کچھ نہیں امّی، کچھ بھی تو نہیں۔ میں جاؤں؟"

رُدا ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی اور حِنا کوئی جواب نہ دے سکی۔ رُدا جلدی سے کمرے سے باہر نِکل گئی تھی اور حِنا جلتی ہُوئی آنکھوں سے اُسے جاتے دیکھتی رہی تھی۔

"آہ رُدا کا یہ انداز، نہیں ہرگز نہیں، اُسے باپ کے نام سے دِلچسپی ہے، لیکن باپ، کیا ثاقب کو باپ کہا جا سکتا ہے؟ کیا اُس کے دِل میں باپ کا کوئی تصوّر موجود ہے؟ نہیں رُدا یہ تیری غلط فہمی ہے میں جس آگ پر جلتی رہی ہُوں اُس آگ پر چلنے کے بعد اب میرے اندر اِتنی سکت نہیں رہی ہے کہ مَیں... مَیں... ہاں رُدا تو نہیں جانتی پگلی، تو نہیں جانتی۔ وہ یہ دیکھنے آیا ہے کہ میرے اور میرے ڈیڈی کے درمیان سمجھوتہ ہُوا ہے یا نہیں؟ وہ بہت چالاک انسان ہے، وہ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ وہ ایک آس لگا کر آیا ہے۔ لیکن میں اُس کی یہ آس پوری نہ ہونے دُوں گی۔ رُدا تو بے وقوف ہے۔ میں تجھے تیرا باپ کبھی نہیں دے سکوں گی۔ کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔"

رُدا کے جانے کے بعد وہ نہ جانے کب تک ایسے ہی بیٹھی رہی تھی اور اُس کا خیال غلط نہیں نِکلا، ثاقب اُس کا پتہ معلوم کر گیا اور حِنا نے دفتر میں زیادہ گفتگو نہ کرنے کے لئے یہ غلطی کر ڈالی تھی۔ لیکن اِس سے کیا ہوتا ہے۔ ثاقب یہاں موجود تھا تو کہیں نہ کہیں سے اُس کا پتہ حاصِل کر کے اُس تک آ سکتا تھا۔

ملازموں نے ثاقب کے آنے کی اطلاع دی۔ اور حِنا کے وجُود میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتی رہی، پھر اُس نے ملازم سے پُوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"ڈرائینگ رُوم میں ہیں آپ سے مِلنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

حِنا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ باتھ رُوم میں جا کر چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ بال دُرست کئے اور پھر چہرے پر ایک سنگینی لئے ہُوئے وہ ڈرائینگ رُوم میں داخِل ہو گئی۔

ثاقب اُسی لباس میں تھا جس میں وہ دِن میں نظر آیا تھا۔ اُس کے بال اُلجھے ہُوئے تھے۔ ہر چند کہ اُس نے اپنا چہرہ مغموم بنانے کی کوشش کی تھی لیکن حِنا اُس کے دِل کی گہرائیوں میں جھانک رہی تھی۔ اُن گہرائیوں میں جہاں فریب اور مکّاری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ثاقب کا یہ چہرہ بھی مصنُوعی تھا، سو فیصد مصنُوعی!

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی سامنے کے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور پھر اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

"جی ثاقب صاحب! فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت

کر سکتی ہُوں؟"

"حِنا! میں تمہاری اِس بے رُخی کی وجہ محسوس کر رہا ہُوں، سمجھ رہا ہُوں اچھی طرح، درحقیقت تمہیں میرے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ میں اِسی قابل ہُوں حِنا، کچھ لوگ زندگی میں پیدا ہونے کے بعد سے مرنے کے وقت تک صرف ٹھکرائے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ اُن کی اپنی فطرت ہوتی ہے یا تقدیر؛ لیکن سوچتا ہُوں کہ بچپن تو معصُومیت میں بسر ہوتا ہے، پھر بچپن اِن تکلیفوں کا شکار کیوں ہو جاتا ہے۔ تم تو میری داستانِ حیات سے واقف ہو حِنا کیا زندگی گُزاری ہے میں نے۔ کِس طرح میں نے اپنے آپ کو زندگی کی لطافتوں سے دُور کر لیا تھا۔ اور یہ سوچ کر اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ تقدیر میں ہی سب کچھ لِکھا ہے۔

حِنا تم خود میری زندگی میں داخل ہُوئی تھیں میں نے تمہیں آواز نہیں دی تھی۔ اِس لئے کہ میں اپنی تقدیر سے شاکی تھا۔ میں کسی کو آواز دینے کے قابل نہیں تھا حِنا۔ بے شک تم نے مُجھ پر بے حد احسانات کئے، بہت کچھ چھوڑ دیا میرے لئے، لیکن میں اُس کا صِلہ تمہیں کیسے دیتا حِنا، میری تقدیر کی سیاہی نے تو میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں اس احساس کا کیا کرتا حِنا۔ جو میرے دِل پر کچوکے لگاتا رہتا تھا جو اِس بات کا آرزُومند تھا کہ حِنا کو دوبارہ وہی زندگی دی جائے، جس زندگی کو اُس نے میرے لئے چھوڑا ہے، تم مُجھ سے کہتی تھیں کہ میں نوکری کر لُوں۔ ہم ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے، ہم اس گھر میں رہیں گے۔ لیکن میری بدنصیبی نے یہاں مجھے ایک اور ٹھوکر لگائی تھی میں یہ سوچنے لگا تھا، کہ میں حِنا کے لئے ایک چھوٹا سا گھر نہیں اُس کے شایانِ شان ایک گھر تعمیر کروں گا۔ اور حِنا یہی آرزُوئیں میرے دِل میں تھیں جو مجھے تم سے دُور لے گئیں تھیں۔ میں تمہارے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا حِنا۔ بہت کچھ۔ میں نے تمہاری جُدائی صرف اِس لئے برداشت کی تھی کہ تمہارے لئے وہ سب کچھ کر سکوں جو میرے دِل میں ہے۔" ثاقب کی آواز رُندھ گئی، حِنا تمسخرانہ نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی اُس کے چہرے پر بے پناہ طنز بکھرا ہُوا تھا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اب تم صرف آزاد نظم کہتے ہو ثاقب، بہرحال بہت اچھی کہنے لگے ہو۔"

ثاقب اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر وہ پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہاں حِنا! نظمیں، غزلیں اور شعر کہنے کے علاوہ مَیں نے اِس زندگی میں کیا ہی کیا ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ میری زبان سے نکلی ہُوئی ہر بات بس ایک شعر ہی تو ہے جس میں میرے دِل کی کرچیاں شامل ہوتی ہیں۔ تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو حِنا۔ تمہارے الفاظ بھی غلط نہیں ہیں۔ لیکن مجھے صرف ایک بات بتا دو حِنا کہ جس انسان نے زندگی میں کبھی کوئی اپنا نہ دیکھا ہو، وہ اگر کسی کو اپنا محسوس کرے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے؟"

"اُسے اپنے کو زندگی کی تمام خُوشیوں سے محرُوم کر کے ٹھکرا دینا چاہیئے۔ اُسے ایک جھُوٹا دِلاسہ دے کر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اُس کے بعد جب کبھی دِل بہلانے کو جی چاہے تو اُس کی طرف رُخ کر لینا چاہیئے۔ بے شک واقعی آپ نے زندگی میں کوئی اپنا نہیں دیکھا۔ لیکن اگر کوئی بدنصیب زندگی میں آپ کا اپنا بن کر آپ تک پہنچ گیا تو وہ آپ کی اُس فطرت کو تو تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ جو اپنوں کی قائل ہی نہیں ہوتی۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ثاقب صاحب! آپ کسی کی اپنائیت کو کیسے قبول کر سکتے ہیں جب کہ آپ نے کوئی اپنا دیکھا ہی نہیں۔ اور جب کسی کی اپنائیت سے دِل بھر گیا تو آپ نے ایک کہانی تراشی، ایک شعر کہی اور اُس کے بعد اُس کی اپنائیت کو ٹھکرا کر نِکل گئے ایک نئی منزل کی سمت، ثاقب آپ کو یاد نہیں میرے پاس سب کچھ تھا جو میں نے آپ کے لئے چھوڑا صرف آپ کے لئے۔ اگر میں آپ کی شخصیت کو سب کچھ نہ سمجھ لیتی تو اپنا گھر کیوں چھوڑ دیتی۔ اُس کے بعد مجھے اُس دولت کی طلب تو باقی نہیں رہی تھی جسے میں خود آپ کے لئے ٹھکرا چکی تھی مجھے تو صرف اور صرف آپ درکار تھے لیکن آپ... آپ، ہم سے دُور ہو گئے ثاقب، اگر اِس شہر میں رہ کر، اِس ملک میں رہ کر آپ ایک معمُولی کلرک کی حیثیت سے کچھ کر لیتے تو میرے لئے وہی بہت کچھ ہوتا کیونکہ اپنی زندگی میں، میں وہ سب کچھ دیکھ چکی ہُوں جو آپ مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ مَیں تو وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد آپ تک آئی تھی، پھر بھلا مجھے اُن چیزوں کی تمنا کیسے ہوتی؟"

"ایسے نہ کہو حِنا، ایسے نہ کہو۔ محبتوں کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ چاہتوں کا اپنا اپنا سفر ہوتا ہے۔ کوئی اِس سفر کو کچھ چھوڑ کر طے کرتا ہے اور کوئی یہ سفر کچھ دینے کے لئے اپنے آپ کو فنا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ میں اسی فیصلے کے تحت ملک سے باہر گیا تھا لیکن میری کالی تقدیر نے میرا ساتھ نہ دیا۔ کاش! میں اپنی کسی نظم کے ذریعے اپنی تقدیر کو بھی بدل سکتا لیکن تقدیریں بدلنا! بہرحال تقدیر سے اِتنے شکوے کرتا رہا ہُوں کہ اب تو الفاظ بھی باقی نہیں رہے اب اگر اس سے شکوہ کروں بھی تو کن الفاظ میں؟ یہ ذلتیں میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ ہاں اِتنا سا دُکھ ضرور ہُوا ہے کہ میری یہ تذلیل اُن کے ہاتھوں ہُوئی جس سے اِس کی اُمید کبھی نہیں کی تھی۔ بس یہی ذرا اجنبی پن ہے اِس میں جو ذرا سی تکلیف دے رہا ہے۔ ناکامیوں کی ہواؤں کے دوش پر اُڑتا ہُوا ایک برگِ آوارہ کی مانند یہاں آ پہنچا تو تم یاد آئیں اور تمھیں تلاش کرتا ہُوا تم تک آ گیا۔

لیکن وقت نے تمھیں بھی مجھ سے چھین لیا۔ وقت کی یہ عادت ہے کوئی خاص بات نہیں ہے حِنا چلتا ہُوں ایک آرزو تھی دِل میں سُن لو۔ پوری کرنا یا نہ کرنا تمھارا حق ہے۔"

"کیا؟" حِنا نے سرد نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ یہ الفاظ اُسے متاثر نہیں کر سکے تھے۔ خوبصُورت الفاظ میں نظمیں کہہ کر ہی تو ثاقب نے اُسے روک لیا تھا۔ اب وہ ان الفاظوں کے سحر میں گرفتار ہونا نہیں چاہتی تھی۔

"وہ... وہ ایک بچّی تھی میری۔ تمھارے پاس شاید میری امانت۔"

"اوہ تمھیں یاد ہے۔" حِنا نے طنز کے ساتھ کہا۔

"ہاں ہمیشہ ہی یاد رہی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو کیا فائدہ اپنے احساسات کا تذکرہ کرنے سے۔ تم انھیں ایک خوبصُورت نظم کا نام دے دو۔"

"نام کیا ہے تمھاری بچّی کا؟" حِنا نے طنزیہ لہجے میں پُوچھا۔

"نام... "

"عُمر کیا ہے اُس کی؟" حِنا پھر بولی۔ اور وہ سنجیدہ نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر گردن ہلا کر بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں اُس کا نام نہیں جانتا۔ میں اس کی صحیح عُمر بھی نہیں جانتا۔ ہاں حِنا! میں اپنی بچّی کی نہیں تمھاری بچّی کی بات کر رہا تھا۔ کیا ایک بار تم مجھے اپنی بچّی کی صورت دِکھا سکتی ہو؟" ثاقب کا لہجہ اِتنا دردناک تھا کہ حِنا کے اندر ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ لیکن یہی کپکپی تو اُس کی موت کا باعث بنی تھی۔ وہ اب اُس سے متاثر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ثاقب! وہ نادانی کی اُس عُمر میں ہے جس میں انسان بہت سے لوگوں سے متاثر ہو جاتا ہے لیکن یہ تاثر اس کی زندگی کے لئے روگ بن جاتا ہے۔ باپ کا نام لاکھوں بار اُس کے دِل میں بھی اُبھرا ہوگا لیکن وہ اُس کے سامنے نہیں تھا اِس لئے وہ اُسے نہیں پہچانتی۔ آج اگر تم سے مل کر اُس نے یہ سوال کر لیا کہ تم کون ہو اور اُس کے اِس سوال کا اُسے جواب مِل گیا تو وہ بھی ایک درد کا شکار ہو جائے گی، اور میں نہیں چاہتی کہ میری بچّی جسے میں نے نہ جانے کس کس طرح پرورش کیا ہے کسی اجنبی کے ہاتھوں دُکھ کا شکار ہو۔ ایک ایسے اجنبی کے ہاتھوں جو اُس کا نام اور اس کی عُمر تک نہیں جانتا۔ میں ایک ایسے شخص کو اُس کا باپ بنا کر اُسے اذیتوں میں گرفتار نہیں کرنا چاہتی۔ نہیں ثاقب مجھے دُکھ ہے کہ میں تمھاری یہ خواہش بھی پوری نہیں کر سکتی۔"

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ملازم نے کسی مہمان کو محسوس کر کے چائے بنا دی تھی۔ اور اُسے ایک ٹرالی میں رکھ کر لے آیا تھا۔ وہ ادب سے گردن جھکائے واپس چلا گیا اور حِنا اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ اُس نے چائے بنائی اور ثاقب کے سامنے رکھ دی۔ ثاقب اُسے پھیکی پھیکی نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اُس نے دفعتاً ہی ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور آہستہ سے بولا

"حِنا! تمھیں مُجھ سے پہلی ملاقات یاد ہے، بھُوکا تھا، ایسی جگہ سے گزر رہا تھا جہاں کھانا پک رہا تھا، کھانوں کی خوشبو سُونگھتا گھُس آیا اور پھر کھانا کھا لیا۔ پتہ چلا کہ مشاعرہ ہو رہا ہے۔ سوچا کہ نمک کھایا ہے تو حقِ نمک ادا کر دُوں اور میں نے ایک غزل سُنا دی۔ اس وقت تم نے مجھے چائے پلائی تھی۔ آج نثر میں کچھ سُنا دُوں اگر اعتراض نہ ہو تو سُن لو۔ بات بھی ہو گی اور میرے خیال میں چائے کی قیمت ادا ہو جائے گی۔"

حِنا سُلگتی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی ثاقب چائے کے گھونٹ لیتے ہُوئے شاید اپنی اِس نثری نظم کو موزوں کر رہا تھا۔

حِنا اپنی زندگی کے سب سے کٹھن لمحات سے گزر رہی تھی اُس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ بدن میں لرزشیں ہو رہی تھیں سامنے ایک ایسا وجُود بیٹھا تھا جسے اُس نے دِل کی گہرائیوں سے چاہا تھا جس کی ہر جنبش اُسے ایک ایسی ادا لگتی تھی جس پر لاکھوں بار نثار ہُوا جائے۔ لیکن جب اُس نے زندگی بھر کے لئے اُسے اپنا لیا اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر اُس کی ہو گئی تو اُس نے حِنا کی بے قدری کی۔ اُس کی نسوانیت کے غرور کو پاش پاش کر دیا۔ دولت کی طلب کبھی تھی اُسے؟ وہ تو صرف اپنی پسندیدہ ہستی کے ساتھ جینا چاہتی تھی اور ثاقب نے اُس کا یہ مان توڑ دیا تھا۔ ٹوٹے ہُوئے شیشے کبھی بے داغ نہیں رہ سکتے۔ اپنے دل کے داغ کو وہ ثاقب کے لئے کیسے بھُلا سکتی تھی؟ اُس کا وجود تو کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اور جب آفندی صاحب نے طویل عرصے کے بعد پھر سے بیٹی کو سمجھنا چاہا تھا تو اُس نے آفندی صاحب سے باپ کی شفقت اور اُن کے سینے میں پلنے والی محبت تو نہ چھینی لیکن اپنے آپ کو اِس قابل نہ پایا کہ دوبارہ اُن کے قدموں میں جا پڑے۔ اِس طرح تو اُسے اپنی شخصیت کا ایک حصہ بھی نصیب نہ ہوتا۔ یہی کوئی زندگی تھی کیا اپنے دل میں اپنے آپ سے مطمئن ہو سکتی تھی۔

آفندی صاحب نے اُس کی ضد سے سمجھوتہ کر لیا اور اپنے آپ کو سمجھا لیا وہ جانتی تھی کہ آفندی صاحب خوش نہیں ہیں۔ وہ لمحہ لمحہ اُس کے پاس آ کر مرتے ہیں۔ چند کہ وہ ایک بہتر زندگی گزار رہی تھی لیکن کہاں آفندی صاحب کا عظیم الشان کاروبار جو دُنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلا ہُوا تھا اُن کی عالی شان کوٹھی اور کہاں یہ عمارت، جو بہ طور رہنے کے قابل تو تھی۔ لیکن آفندی صاحب کے شایانِ شان نہیں تھی یہاں آ کر وہ گھٹتے تھے۔ بے بسی کا شکار ہوتے تھے اور بے بسی ہی سے واپس چلے جاتے تھے

حِنا کو اپنے باپ کے کرب کا احساس تھا لیکن وہ کچھ ایسی ہی شدت پسند تھی کہ اِس کرب کو محسوس کرتے ہُوئے بھی اپنے آپ کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ اُس کی شخصیت کی ایک خامی ہو لیکن انسان خامیوں اور خوبیوں ہی سے بنتا ہے۔ حِنا اپنی یہ خامی دُور نہیں کر پائی چنانچہ وہ اب یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ ثاقب کے سلسلے میں اپنی اِس انا کو کس حد تک زندہ رکھ سکتی ہے؟

ثاقب کی خاموشی ٹوٹ گئی۔

"میری نثری نظم کا عنوان حِنا ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا: حِنا! جسے میں نے زندگی کے اُس دور میں پایا جب زمانے بھر کی مایوسیاں مجھ پر مسلط ہو چکی تھیں اور میں اِس لئے جی رہا تھا کہ سانس آتے جاتے تھے۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو زندوں میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا اِس دُنیا نے زندگی کا سارا وقار مُجھ سے چھین لیا تھا اور میں ایک بے مقصد انسان بن کر رہ گیا تھا اور پھر اِس انسان کو بامقصد بنانے کے لئے حِنا میری زندگی میں شامل ہُوئی۔ میں نے کبھی یہ نہ چاہا تھا کہ اپنی ناکارہ ذات سے کسی کو منسلک کر لُوں لیکن حِنا نے مجھے بتایا کہ میں بھی اُنہی انسانوں میں سے ایک ہُوں جو صدیوں سے یہاں زندگی گزارتے آئے ہیں مجھے بھی جینے کا اِتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے لوگوں کو۔

اِس حق کو تو میں نے فراموش کر دیا تھا لیکن حِنا نے دوبارہ مجھے زندگی کی جانب راغب کیا اور جب وہ میرے وجُود میں شامل ہُوئی تو میں نے سوچا کہ میں نے زندگی پا لی۔ حِنا بہت کچھ چھوڑ کر آئی تھی میرے لئے اور میرے سینے میں اُسے وہ بہت کچھ دینے کے جذبے تڑپ رہے تھے جذبوں کی یہ تڑپ مجھے مجبُور کرتی تھی کہ میں کوئی ایسا آفاقی کام کروں جس سے حِنا کو وہ سب حاصِل ہو جائے جو اُس نے میرے لئے چھوڑا ہے۔

مانتا ہُوں ایک شاعر کی حیثیت سے کہ میری اِس سوچ میں ایک کچا پن تھا زمانہ اپنے آپ کو یُوں ہی تو نہیں بنا لیتا۔ نہ جانے کیا کیا دینا پڑتا ہے اُسے اور جب میں نے اپنا تجزیہ کیا تو میں نے یہ سوچا کہ میں نے زمانے کو کچھ نہیں دیا بلکہ اُس سے کچھ لے ہی لیا ہے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شئے حِنا۔ سو پھر یہ خیال میرے ذہن میں جاگا کہ زمانہ اِس سے زیادہ کچھ دے بھی کہاں سکتا ہے اور اگر مجھے حِنا کے لئے وہ زندگی حاصل کرنی ہے جس کے خواب میں دیکھ رہا تھا تو مجھے زمانے کو بھی کچھ دینا چاہیئے اور میں نے اُس کے لئے اپنی محبت کے وہ جذبے فروخت کئے جو حِنا سے ایک لمحہ دُور رہنے نہ دیتے۔ میں جانتا تھا کہ صرف جذبوں کے سہارے زندگی نہیں گزرتی۔ زمانے کو اپنا لہُو دینا ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر کچھ حاصِل کیا جا سکتا ہے۔

میں دفتر کا کلرک نہیں بننا چاہتا تھا کیونکہ اُس کے بعد حِنا کی زندگی میں کبھی کوئی پھُول نہیں کھِلتا چنانچہ میں نے دِل پر جبر کر کے وہاں سے دوبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ اور اُس کے لئے ایک دوست نما دُشمن کا سہارا بھی حاصل ہو گیا تھا۔ یہ

فیصلہ میں نے جس کرب کے عالم میں کیا میرا دل جانتا ہے، لیکن یہ فیصلہ مجھے حنا کے لئے کرنا پڑا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ حنا اِس فیصلے سے خوش نہیں ہے۔ لیکن انسان کے دِل میں اُمیدوں کے چراغ جلتے ہیں تو وہ اُن کی روشنی کی حد ہی میں دیکھتا ہے اُس کے بعد پھیلے ہُوئے اندھیروں سے اُسے دستور ناواقفیت حاصل رہتی ہے۔ میں اِس محدُود روشنی میں حنا کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اور دوبئی پہنچ گیا میرا دوست جس نے مجھ سے بہت سے وعدے کئے تھے۔ اُن وعدوں کا پابند نہ رہا۔ دوبئی میں اُس نے ایک چھوٹی موٹی نوکری مجھے دے دی جو اُس کی ذاتی نوکری تھی۔ اُسے ایک ایسے پُراعتماد آدمی کی ضرورت تھی جس پر وہ پوری بھروسہ کر سکے۔ وہاں اُس نے مجھے کھانے پینے کے اور رہنے کے مواقع تو ضرور فراہم کئے لیکن اُس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہ تھا۔ میں تو کچھ اور ہی تلاش کرنے یہاں آیا تھا۔ میں نے کافی عرصے تک یہ انتظار کیا کہ یہاں رہ کر میں اپنے لئے، حنا کے لئے اور اُس ننھے سے وجُود کے لئے جس کی اطلاع میری زندگی میں شامل ہُوئی تھی، کچھ کروں اور اِس کچھ کرنے کے تصوّر نے مجھے ذہنی طور پر باغی کر دیا میں اپنے دوست سے چھٹکارا حاصِل کرنے کی تدبیریں کرنے لگا لیکن اُس وقت مجھے معلوم ہُوا کہ میرے دوست نے کوئی پہلو کمزور نہیں چھوڑا ہے۔ یہاں میری حیثیت ایک پوشیدہ انسان کی سی تھی۔ اور میں وہ مقام حاصِل نہیں کر سکا تھا جو یہاں دوسروں کو حاصل تھا یعنی جس ویزے پر مجھے لایا گیا تھا وہ ختم ہوگیا تھا اور اُس کے بعد میری کوئی تجدید نہیں کرائی گئی تھی اگر وہ پولیس کو میرے بارے میں اطلاع دے دیتا تو میں شاید وہاں قید و بند کی صعُوبتوں میں زندگی گزار دیتا۔ یہ کیفیت میرے لئے رُوح کا درد تھی اور چونکہ طویل عرصے تک یہاں رہنے کے باوجُود میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا اِس لئے میں بددِل ہوگیا اور اب مجھے حنا کو کھونے کا احساس ہُوا۔ لیکن ایک ناکام اور بے غیرت انسان کی مانند میں نے حنا کے پاس واپس لوٹ جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اپنے لئے ایسے پوشیدہ راستے تلاش کرنے لگا جہاں سے میں کچھ کر سکوں۔ تبھی میری ملاقات ایک غیر ملکی شخص سے ہوگئی جس نے مجھے پیش کش کی کہ اگر میں چاہُوں تو اُس کے ساتھ چل سکتا ہُوں۔ وہ مجھے ہالینڈ لے جائے گا اور وہاں میری زندگی کے لئے بہترین بندوبست کرے گا۔

مجھے یہاں سے نِکلنے کا راستہ درکار تھا اِس موقعے کو میں نے غنیمت جانا اور خاموشی سے اُس شخص کے ساتھ چل پڑا۔ ہم نے جہاز کا سفر طے کیا اور جب ہم ہالینڈ پہنچے تو وہ شخص بہانہ کرکے مُجھ سے علیحدہ ہوگیا۔ اُس نے کہا تھا کہ جو سامان میرے پاس ہے وہ اُس کا ہے اور میں اُسے اپنا سامان کرکے باہر لے آؤں لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اُس سامان میں منشیات پوشیدہ ہیں۔ اِن کا سُراغ لگا لیا گیا اور اُس کے بعد منشیات کے اسمگلر کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے لاکھ کہا کہ میں ایک بے گناہ انسان ہُوں لیکن ماضی کو جہاں چھوڑ آیا تھا وہاں گُناہ ہی گُناہ تھے۔ میں کسی کو بھی اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکا اور ہالینڈ کی مقامی عدالت نے مجھے تین سال قید بامشقت سُنائی۔

یہ تھا میری اُن کاوِشوں کا پھل جو میں اپنی محبت کے لئے کر رہا تھا جیل کی زندگی میں مُجھ پر نہ جانے کیسے کیسے الم کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ حنا سے کیا کہہ کر آیا تھا اور کیا ہوگیا تھا۔ کیا میں واقعی اِس دُنیا کا ایک ناکارہ انسان ہُوں؟ کیا ثاقب کبھی اُن لوگوں میں شامل نہیں ہو سکتا جو زندگی میں کامرانیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ کیا کامیابی کا کوئی دَور میری زندگی میں ممکن نہیں ہے؟ سوچنے کے لئے یہی سب کچھ تھا حنا۔ اِس کے علاوہ اور کیا سوچتا؛ بس اپنے غم کو اپنے سینے میں دبانے زندگی گزارتا رہا اور وقت رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا تین سال۔

حنا میری زندگی کے وہ تین سال مُجھ پر تین صدیاں بن کر گزرے۔ میں بہت کچھ سوچتا رہا تھا اِس دوران میں یہ بھی سوچا میں نے کہ حنا مُجھ سے کیا چاہتی تھی؛ بلاشبہ حنا کی طلب میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ لیکن میں کیا کرتا جذبے میرے بھی کھوٹے نہیں تھے ہاں تقدیر ہم دونوں کے درمیان مسلسل دیوار حائل کرتی رہی تھی۔

تین سال کے بعد جیل سے باہر نِکلا تو یہ دُنیا کتنی اجنبی اجنبی لگی۔ نہ جانے کتنے غم، نہ جانے کتنے حادثات اپنے سینے میں چُھپائے میں اِس دُنیا کے بارے میں سوچتا رہا اور باہر کی دُنیا میں میری زندگی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ میں غم و اندوہ میں ڈوبا سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ سوچتا تھا کہ کیا کروں؟ کس طرح حنا تک پہنچوں؟ کوئی ذریعہ، کوئی سہارا نہیں تھا اور اِن حالات نے حنا۔ اِس کالی تقدیر نے پھر ایک دھکا دیا۔ اِنہی سوچوں کے درمیان نیم دیوانگی کے عالم میں دیوانہ وار سڑکوں پر پھر رہا تھا کہ نہ جانے کون کرم فرما، نہ جانے کون محبت کرنے والا مجھ پر

بے کم مار کر چلا گیا۔ میں گر پڑا اور اُس کے بعد؛

اُس کے بعد میری زندگی سے سب کچھ گُم ہوگیا۔ ہاں حنا میں تم سب کو بھُول گیا۔ میں نے اپنی دُنیا بالکل فراموش کر دی۔ اور یہ دُنیا نہ جانے کتنے عرصے کے لئے میری نِگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ آہ! کاش موت کا گزر اُدھر سے ہو جاتا اور میری زندگی کی یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ حنا میں نے خودکشی کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ میں خودکشی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا بس جی رہا تھا... نہ جانے کیوں؛ میری یادداشت گُم ہوگئی تھی۔ کس ہسپتال میں داخل ہوگیا ہُوں گا؟ میں ظاہر ہے مجھے اُس کے بارے میں نہیں معلوم اور پھر میرے زخم ٹھیک ہوگئے ہوں گے، لیکن وہ لوگ میرے بارے میں کچھ نہ معلوم کر سکے۔ میں نہ جانے کہاں رہا؟ کہاں وقت گزرا؛ بہت عرصہ گزر گیا اِس طرح۔ میں اُس عرصے کا تعین بھی تو نہیں کر سکتا۔ میری زندگی کے جو ماہ و سال گزر گئے مجھے تو اُن کی تعداد بھی یاد نہیں۔ اِس طرح میں بھٹکتا رہا اور اپنے اِس بھٹکتے رہنے کا احساس مجھے بہت عرصے کے بعد اُس وقت ہُوا جب ایک دن اچانک مُجھ میں ماہ و سال کو جاننے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ کتنی افسوسناک زندگی تھی میری۔ کتنا دردناک پہلو تھا یہ میری زندگی کا۔ کاش یہ آگہی مجھے دوبارہ نہ ملی ہوتی۔ اِس دنیا سے ناواقف رہتا تو میرے حق میں کتنا بہتر ہوتا۔ لیکن تقدیر مجھے پُرسکون نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔ دُنیا ایک بار پھر یاد آگئی تھی مجھے، نہ جانے کیسے؛

اور جب یہ دُنیا یاد آئی تو اِس دُنیا میں سب سے پہلی یاد حنا اور اپنی بیٹی کی تھی۔ ماہ و سال کا تعین کرنے کے بعد میں نے دل ہی دِل میں سوچا کہ یقیناً حنا کو میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوگا۔ وہ نہیں جانتی ہوگی کہ ثاقب پر کیا بیتی ہے؛ اُس کے دِل میں بدگمانیوں کے انبار ہوں گے اور کیا اِن انباروں میں میں اپنے لئے جگہ بنا سکتا ہُوں، نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا میں؛ بہت کوئی بار گلے لگانے کی کوشش کی۔ لیکن حنا میں مرنا بھی نہیں چاہتا تھا تمہیں دیکھے بغیر اور اُس کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جدوجہد تو میری زندگی کا جُزو ہے۔ کم از کم اتنی کوشش کر لُوں کہ تم تک پہنچ جاؤں اور اِن کوششوں کے لئے میں نے ثاقب کو بار بار بیچا۔ اِتنا کُچلا ثاقب کو کہ اُس کی کوئی شخصیت ہی نہ رہی۔ ہاں وہ اِس قابل تھا کہ شدت سے کُچلا جائے۔ اور میں ثاقب کو کُچلتا رہا۔ میں اِس کُچلے ہُوئے ثاقب کی قیمت بھی وصُول کرتا رہا اور بالآخر میرے پاس اِتنے پیسے جمع ہوگئے کہ میں اپنے وطن تک کا سفر کروں۔

یہاں اپنے وطن کی سرزمین پر اُترتے ہُوئے میرے دِل میں نہ جانے کیا کیا وسوسے تھے میں یہ سوچ رہا تھا کہ حنا زندہ ہے یا نہیں؛ اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر وہ زندہ ہُوئی تو کیا اُس کے دِل میں میرے لئے کوئی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے؛ بہرحال اِنہی تمام تصورات کو لئے ہُوئے حنا تمہیں تلاش کرتا رہا اور نہ جانے کہاں کہاں تلاش کیا تمہیں؛ میں نے اپنی زندگی میں بہت جدوجہد کی ہے۔ تم تک پہنچنے کے لئے شاید تمہیں اِس بات کا یقین نہ ہو اور جب مجھے یہ علم ہُوا کہ تم زندگی کو کتنے کٹھن انداز میں گزار رہی ہو تو میں دُکھ سے کٹ کٹ گیا۔ میں تمہارے سامنے پہنچا ایک مُجرم کی حیثیت سے اور بلاشبہ تم نے میرے ساتھ ایک مُجرم ہی کا سلوک کیا۔ میں اُس سے منحرف نہیں ہُوں۔ بے شک میں اِسی سلوک کا مستحق ہُوں۔ لیکن حنا! میں تمہیں اپنے گزرے ہُوئے لمحات کی کہانی تو سُنانا چاہتا تھا۔ یہ تو حق ہے میرا۔ میں نے اپنی نثری نظم تمہارے سامنے پیش کر دی اور یقینی طور پر تم مجھے اِس نظم کی داد دوگی۔ باقی رہا میرے اور تمہارے درمیان کا مسئلہ تو حنا میری زندگی میں کامیابی کا کوئی گزر نہیں ہے۔ میں اب کامیابی کے لفظ سے نامانوس ہوگیا ہُوں۔ میں جانتا ہُوں زندگی جس رنگ میں گزرنے کے لئے وجُود میں آئی تھی وہ اِسی رنگ میں گزرتے گزرتے ختم ہو جائے گی۔ میں السر کا مریض ہُوں اور بعض اوقات میری کیفیت بہت خراب ہو جاتی ہے اور اِس خراب کیفیت میں مجھے سب سے زیادہ انتظار جس کا رہتا ہے۔ جانتی ہو موت کا صرف موت کا۔ ہاں اگر اِس انتظار میں کوئی روشنی کی چمک نظر آ جاتی تھی تو وہ تمہارے مل جانے کا ایک تصور تھا اور اگر تم مجھے معاف کر دیتیں تو شاید میں زندگی کے بارے میں سوچتا۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے سامنے اِس لئے نہیں کہا کہ تم مُجھ پر رحم کھاؤ۔ بس تمہاری غلط فہمیوں کو دُور کرنے کے لئے ایک کہانی گھڑ دی ہے جس پر یقین کرنا نہ کرنا تمہارا اپنا کام ہے میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے"

حنا سکتے کے سے عالم میں اُس کی یہ کہانی سُن رہی تھی۔ ثاقب اُس کے سامنے تھا ناقابلِ یقین۔ یہ شخص... یہ شخص واقعی تصورات کا بادشاہ ہے۔ اِس کا کہنا بالکل درست ہے۔ یہ کہانی اِس نے بڑی خوبصُورتی سے گھڑ کر سُنا دی ہے اِس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔ ثاقب وہی تو ہے جو اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا حنا نے اُس سے کب کچھ مانگا تھا وہ جانتی

تھی لیکن ثاقب... ثاقب!

بہت کچھ سوچتی رہی وہ۔ اُس نے اپنے آپ کو بھٹکنے سے بچایا۔ ثاقب عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا پھر اُس نے مُسکرا کر کہا۔

"تو کیا یہ آخری محرومی بھی میری تقدیر میں لکھی ہُوئی ہے حِنا کہ میں اپنی بچّی کی صُورت بھی نہیں دیکھ سکتا؟"

"تم بہت ذہین انسان ہو ثاقب! تمھاری ذہانت کو میں نے بہت پہلے تسلیم کیا تھا۔ بہت ہی پہلے! لیکن افسوس اُس ذہانت سے مجھے تکلیفوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا میں اس بات پر پُورا پُورا یقین رکھتی ہُوں کہ یہ کہانی بھی تمھاری تخیلات کی تخلیق ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہے مجھے افسوس ہے کہ میں اب اِس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنی دُنیا بسالی ہے۔ اور اُس میں تمھارے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ بات ختم ہوگئی ثاقب، وہ کہانی ختم ہوگئی اور اِتنا عرصہ تم مُجھ سے دُور رہے کہ اب تمھارا مُجھ پر کوئی حق نہیں ہے، چنانچہ میں نہیں چاہتی کہ میری پُرسکون دُنیا کو جو نہ جانے کتنے کتنے غم اُٹھانے کے بعد بسائی ہے کوئی رخنہ اندازی ہو نہیں ثاقب معافی چاہتی ہُوں میں تمھارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گی۔"

ثاقب گردن ہلاتا رہا تھا پھر اُس نے کہا۔

"لیکن حِنا! میں ابھی مایُوس نہیں ہُوا۔ تم مُجھ پر غور کر لینا اگر کہیں سے میری بے گُناہی کا کوئی نِشان مِل جائے تمھیں تو مجھے معاف کر دینا حِنا! میں ابھی یہ شہر نہیں چھوڑوں گا۔ بڑی آس، بڑی اُمیدیں لے کر یہاں آیا ہُوں میں یہ شہر نہیں چھوڑوں گا حِنا! میں ایک ہوٹل میں مقیم ہُوں۔ تم اس ہوٹل کا نام اور اُس کا فون نمبر لکھ لو۔ میں بتائے دیتا ہُوں۔" ثاقب نے کہا اور اپنا فون نمبر اور ہوٹل کا نام حِنا کے سامنے دُہرا دیا پھر بولا۔

"میں جا رہا ہُوں حِنا۔ دوبارہ تمھیں تنگ نہیں کروں گا بلکہ انتظار کروں گا صرف انتظار۔ یہ وعدہ کرتا ہُوں کہ خود تم تک پہنچنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن اگر میری بے بسی پر تمھیں ترس آجائے تو مجھے اپنے پاس بُلا لینا۔ میرا بھی اِس دُنیا میں کوئی نہیں ہے حِنا! کوئی بھی نہیں۔" ثاقب اُٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہُوا باہر نکل گیا۔

حِنا پتھرائی ہُوئی نِگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی تھی اُس کے کانوں میں جیسے کسی نے گرم گرم لاوا ڈال دیا تھا ایک شدید جلن ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں۔ یہ جلن تو اُس کے سارے وجُود میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ پھنکتے ہُوئے وجُود کے ساتھ وہیں بیٹھی رہ گئی۔ اِس وقت اُس کی حالت بہت خراب تھی۔

نہ جانے خاموشی اور تنہائی کے یہ لمحات کتنے طویل ہوگئے وقت گزرتا چلا گیا۔ نہ جانے کیوں رُدا بھی اُس کے پاس نہیں آئی تھی اور۔ پھر جب اندھیرا پھیل گیا تو ملازمہ نے اندر داخل ہو کر روشنیاں جلائیں۔ وہ روشنی دیکھ کر چونک پڑی۔ ملازمہ خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ خود بھی باہر نکل آئی اور اِدھر اُدھر رُدا کو تلاش کرنے لگی۔ رُدا کے کمرے میں بھی روشنی جل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی وہ رُدا کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ رُدا رائیٹنگ ٹیبل کے پیچھے کُرسی پر بیٹھی ہُوئی ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ رُدا کو اِس حالت میں دیکھ کر اُسے اطمینان ہُوا۔

"تم ابھی تک پڑھ رہی ہو؟"

جواب میں رُدا نے آنکھیں اُٹھائیں تو حِنا کو اُس کی آنکھیں سُرخ اور سُوجی ہُوئی محسوس ہُوئیں۔ وہ آہستہ آہستہ رُدا کے قریب پہنچ گئی۔

"تم رو رہی تھیں؟" اُس نے رُدا سے سوال کیا اور رُدا کی

سِسکیاں بُلند ہوگئیں۔

"کیا بات ہے رُدا؟ کیوں رو رہی ہو تم؟" اُس نے پُوچھا

حِنا کو کچھ کچھ شبہ ہو رہا تھا کہ رُدا ثاقب کے بارے میں جان چکی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اُس کا باپ یہاں آیا تھا لیکن۔ لیکن رُدا کو نہیں رونا چاہیئے۔ اُس نے باپ کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ صرف ایک جھلک! جب کہ ماں کی آغوش میں اُس نے آنکھ کھولی ہے اور ماں ہی کی آغوش میں اب تک کی زندگی گزاری ہے۔ ایک اجنبی شخص خواہ وہ کسی نام سے اُس کی زندگی میں داخل ہُوا اُس کے لئے باعثِ دلچسپی کیوں ہے؟ تب اُس کے لہجے میں سختی آگئی۔

"رُدا! میں تم سے پُوچھ رہی ہُوں۔ تم کیوں رو رہی ہو؟"

"کچھ نہیں امّی! کچھ بھی نہیں۔"

"میں جواب چاہتی ہُوں رُدا! جھُوٹ نہیں۔"

"کچھ نہیں امّی! کوئی بات نہیں۔"

"یہ جواب ہے؟"

"جی ہاں!"

"ہُوں! ٹھیک ہے۔ میں جانتی ہُوں کوئی بے وجہ نہیں۔

لیکن آج تم نے انحراف کیا ہے رُدا، ٹھیک ہے جیسا تم پسند کرو۔" وہ خاموشی سے رُدا کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

رُدا نے اُسے نہیں روکا تھا۔ یہ اُس کی سرکشی کا ایک انداز تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ ملازمہ کو بُلایا اور کہا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ رُدا اگر کھانا کھائے تو اُسے کھلا دیا جائے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔

یہ رات اُس کے لئے قیامت کی رات تھی اُس پر قیامتیں ٹوٹ پڑی تھیں۔ کیا کرنا چاہیئے؟ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ اِس سوچ کے علاوہ اُس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ رُدا سے بھی ناراض ہوگئی تھی وہ۔ رُدا کو اِس ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس نے اپنی پوری زندگی رُدا کے سامنے رکھ دی تھی رُدا صرف ایک نام کی کشش میں اِتنی دیوانی ہوگئی کہ ماں کی قدر و قیمت۔ اُس کے مصائب بھول گئی۔ رُدا کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے نہیں رُدا کچھ بھی کرے میں اُس سے تعاون نہیں کروں گی۔ یہ ناممکن ہے، یہ بالکل ناممکن ہے۔

رات کے دوسرے پہر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ باہر نکلی۔ پُوری کوٹھی پر مکمل سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی وہ رُدا کے کمرے تک پہنچی۔ مدھم روشنی میں رُدا گہری نیند سو رہی تھی۔ اُسے رُدا کو سوتے دیکھ کر ایک اطمینان سا ہُوا پھر اُس نے ایک جگ میں پانی بھرا گلاس لیا اور کئی گلاس پانی پی گئی۔ جگ کو دوبارہ بھر کر وہ اپنے کمرے میں لے آئی۔ ایک ٹیبل پر جگ رکھنے کے بعد وہ ایک کُرسی پر جا بیٹھی۔ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ پانی پیتی جا رہی تھی۔ اُس کے وجُود کی آگ مدھم نہیں پڑ رہی تھی شعلے اُٹھ رہے تھے اُس کے سارے ذہن میں وہ فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی لیکن فیصلہ کرتے ہُوئے بہت سے حالات اُس کے سامنے تھے۔ آفندی صاحب نے یہی تو کیا تھا کہ حِنا کو ثاقب کے ساتھ شادی کرنے سے منع کیا تھا۔ اور حِنا نے ضِد کر کے ثاقب سے شادی کر لی تھی جس کی سزا اُس نے آفندی صاحب کو یہ دی کہ اُنھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ سے محرُوم کر دیا اور آفندی صاحب نے اپنی شکست قبُول کرنے کے بعد دوبارہ اُس سے رابطہ قائم کیا اور اب جب بھی وہ آتے ہیں اُن کے چہرے پر یہ احساس چسپاں ہوتا ہے کہ وہ ہار مان کر یہاں تک آتے ہیں کیوں؟ اپنی محبتوں کے ہاتھوں مجبُور ہو کر، جب حِنا نے اُنھیں معاف نہیں کیا تو ثاقب کو کیسے معاف کر سکتی ہے۔ دوبارہ آفندی صاحب پر ظلم کرنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ثاقب سے تو اُس نے ہر زبان میں کہہ دیا تھا کہ وہ صرف ثاقب کے قُرب کی طالب ہے۔ وہ ثاقب کی معمُولی سی کمائی سے زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اُس نے اپنی پیش کش بھی تو کر دی تھی ثاقب کو اور ثاقب کی یہاں موجودگی ہی میں وہ ملازمت کرنے لگی تھی۔ ثاقب کے دِل میں کبھی کوئی جذبہ نہیں اُبھرا۔ کبھی وہ اِس بات پر نہیں تڑپا کہ حِنا اُس کے لئے، صرف اُس کے لئے مصیبت اُٹھا رہی ہے۔ وہ نوکری کرتی ہے۔ اُسے کھلاتی ہے۔ ثاقب کو چاہیئے تھا کہ وہ بھی اُسی کی طرح کوئی چھوٹی موٹی نوکری قبُول کر کے اپنی زندگی کا آغاز کر دیتا حِنا کو اُس کی قربت درکار تھی اُس کی دولت نہیں۔ ثاقب نے یہ بات کیوں نہیں سوچی۔ وہ اُسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا،

اور اُس کے بعد اُس نے جو کہانی سُنائی تھی وہ اُس پر یقین نہیں رکھتی تھی ثاقب جیسے آدمی پر اب یقین نہیں کیا جا سکتا تھا اور پھر کسی بھی طرح آفندی صاحب کو ثاقب پر قُربان نہیں کیا جا سکتا تھا قُربانی بس ایک بار ہی دی جا سکتی ہے، بار بار کسی کو اپنے جذبات کے لئے ذبح نہیں کیا جا سکتا نہیں ثاقب، ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں جس طرح میں نے ڈیڈی سے ایک بار یہ کہہ کر کہ میں دوبارہ اِس کوٹھی میں نہیں آؤں گی۔ کبھی وہاں قدم نہیں رکھا۔ اِسی طرح اب تم میری زندگی میں کوئی قدم نہیں رکھو گے ثاقب۔ یہ میرا فیصلہ ہے، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

دُور کہیں سے مُرغ کے بانگ دینے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ گویا اُسے سوچتے سوچتے صبح ہوگئی تھی لیکن اپنے اِس فیصلے کے بعد اُسے واقعی سکُون محسوس ہُوا تھا۔

غُسل خانے میں جا کر اُس نے غُسل کیا اور اُس کے بعد سکُون سے بستر پر آلیٹی۔ اب سونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا رُدا کے بارے میں بھی بار بار خیالات ذہن میں آجاتے تھے۔ رُدا ابھی ناسمجھ ہے۔ اُس کے اندر جذباتی کیفیات ہیں لیکن وہ رُدا کے لئے بھی کم از کم یہ قُربانی نہیں دے سکتی تھی چاہے رُدا پر کچھ بھی بیتے۔ رُدا نے اُس کی حالت کو سنجیدگی سے محسوس نہیں کیا۔ اور ایک طرح سے اُس نے اپنی ماں سے انحراف کیا۔ حِنا کو اِس کی اُمید نہیں تھی لیکن بہرحال یہ بھی ایک فطری تقاضا تھا۔ کوئی کسی کی فِطرت نہیں بدل سکتا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو تبدیل کرنے کے لئے مجبُور نہیں ہُوں۔

صبح کے ناشتے پر اُس نے رِدا کو طلب کیا تھا رِدا آہستہ آہستہ اُس کے پاس پہنچ گئی۔ حِنا نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا اُس کا چہرہ بھی غور سے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے یہ چہرہ اُس کے عزم کو متزلزل کر دے چنانچہ وہ اِس چہرے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی حِنا نے بہت مختصر سا ناشتہ کیا اور رِدا بھی اُس کا ساتھ دیتی رہی پھر حِنا اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔

"تم کالج جاؤ گی؟" اُس نے سوال کیا۔

"جی امّی!" رِدا آہستہ سے بولی اور حِنا کھانے کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔

ایک انگریزی رسالہ پڑا ہُوا تھا تھوڑی دیر تک وہ اُسے دیکھتی رہی اور پھر آفس جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آفس کے لئے چل پڑی۔ رِدا اُس کے سامنے ہی کالج جانے کی تیاریاں کر رہی تھی البتہ آج ایک معمولی سی تبدیلی ہُوئی تھی وہ یہ کہ آج رِدا نے اِس انداز میں لپک کر اُسے خدا حافظ نہیں کہا تھا لیکن حِنا اب اپنے اردگرد پھیلے ہُوئے ہر مسئلے سے نپٹنے کا عزم کر چکی تھی کچھ بھی ہو جائے۔ کچھ بھی ہو جائے وہ جُھکے گی نہیں ثاقب کے سامنے کسی قیمت پر نہیں۔

دفتر پہنچنے کے بعد اُس نے پورے طور پر اپنے آپ کو دفتری معاملات میں اُلجھا لیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے ذہنی خلفشار کو بُھول گئی۔ لنچ کے وقت یکایک اُسے کچھ خیال آیا۔ اور اُس نے اپنے اردلی کو بُلا کر کہا۔

"دیکھو! ثاقب نامی کوئی شخص اگر مجھ سے ملنے کے لئے آئے تو اُسے صاف منع کر دیا جائے۔ ریسپشنسٹ کو بھی یہ بات بتا دو!"

"جی میڈم!" اردلی نے گردن خم کر کے کہا اور باہر نکل گیا۔

لنچ کے بعد وہ پھر اپنے معمولات میں گم ہو گئی اور پھر شام تک اُسے ثاقب یاد نہ آیا۔ شام کو وہ دفتر سے گھر کے لئے چل پڑی۔ ایک بار پھر رِدا کا خیال اُس کے ذہن میں آیا تھا لیکن اُس نے سوچا تھا کہ اگر رِدا نے اپنے رویّے میں سرد مہری رکھی تو وہ بھی اُس کا جواب سرد مہری سے دے گی۔ آخر رِدا کیا حیثیت رکھتی ہے اِس سلسلے میں کہ وہ اُسے کسی ایسی بات کے لئے مجبور کر سکے جو اُس کی زندگی میں بہت بڑی حیثیت رکھتی ہے۔

رِدا کالج سے واپس آ گئی تھی۔ گھر ہر رہی تھی اور اب اُس کے چہرے پر زیادہ تردّد نہیں نظر آ رہا تھا البتہ وہ خاموش، خاموش سی تھی۔ شام کی چائے بھی اُن دونوں نے ساتھ ہی پی۔ لیکن چائے کے دوران رِدا سے کوئی گفتگو نہیں ہُوئی تھی۔

چائے کے بعد وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ حِنا خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آفندی صاحب اندر داخل ہو گئے، باپ کو دیکھ کر وہ استقبال کے لئے اُٹھ کھڑی ہُوئی ایک لمحے کے لئے اُس کے وجُود کو جھٹکا سا لگا تھا آفندی صاحب نے اپنا سارا غرُور ترک کر کے محبت کے ہاتھوں مجبُور ہو کر اُس کے پاس باقاعدہ آنا جانا شروع کر دیا تھا لیکن دونوں کے درمیان ایک جِھجک آج تک قائم تھی حِنا اپنے مقدور بھر آفندی صاحب کی خدمت کرتی تھی اُن سے محبت اور پیار کے ساتھ پیش آتی تھی لیکن آفندی صاحب کی پیش کش ٹھکرا کر اُس نے آفندی صاحب کو ناراض کر دیا تھا وہ آتے تھے، بیٹھتے تھے لیکن اُن کے رویّے میں تبدیلی صاف طور پر محسوس کی جاتی تھی۔

آج اُن کا چہرہ کچھ زیادہ ہی سُتا ہُوا تھا، اور وہ بہت خاموش نظر آ رہے تھے، آہستہ آہستہ چلتے ہُوئے وہ حِنا کے سامنے آ بیٹھے اور حِنا کے دل میں وسوسے گھر کرنے لگے کہیں آفندی صاحب کو ثاقب کی آمد کے بارے میں معلومات تو نہیں حاصل ہو گئیں؟ کہیں... کہیں اُنھوں نے ثاقب کو دیکھ تو نہیں لیا؟ وہ پریشان نگاہ سے اُنھیں دیکھنے لگی پھر آہستہ سے بولی۔

"خیریت ڈیڈی! آپ کچھ مضمحل سے نظر آ رہے ہیں؟"

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے، بس کچھ بدنصیب سا انسان ہُوں۔ بعض اوقات اپنا بہت کچھ کھونے کا احساس ہوتا ہے یہ سب کچھ میں نے اپنے ہاتھ سے نہیں کھویا حِنا بلکہ زمانے نے مُجھ سے چھین لیا ہے۔"

"کیا بات ہے ڈیڈی! خیریت تو ہے؟" اُس نے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

"حِنا میں کچھ عرصے کے لئے باہر جا رہا ہُوں۔"

"کہاں؟"

"امریکہ" آفندی صاحب نے جواب دیا۔

"کیوں ڈیڈی خیریت؟"

"تم جانتی ہو کئی ملکوں میں میرا کاروبار پھیلا ہُوا ہے بہت عرصے سے اُسے سمیٹنے کی کوششوں میں مصرُوف ہُوں۔ یہ کام کافی حد تک ہو چُکا ہے۔ لیکن باقی کام میرے وہاں جائے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔"

"اوہ! کتنے عرصے کا قیام ہے؟"

"نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کافی وقت لگ جائے۔"

"تو پھر آپ وہاں سے کام سمیٹ لیں گے؟"

"ہاں حِنا! ظاہر ہے ہر انسان کی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور وہ مقصد ہی کے لئے جیتا ہے۔ میں وہ انسان ہُوں جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ کوئی اور اولاد نہیں ہے تمہارے سوا تم ہو، رِدا ہے اور بس! اِتنا کچھ ہے میرے پاس یہ تم لوگوں کے لئے کافی ہو سکتا ہے، لیکن تم... تم مجھے اپنا باپ ہونے سے خارج کر چکی ہو۔ اب مجھے کیا ضرورت ہے اِن تمام جھمیلوں میں پھنسے رہنے کی۔ بس کراچی میں کچھ کاروبار بڑھا دیا ہے باہر کے ممالک سے اُسے سمیٹ کر کراچی منتقل کر دُوں گا۔ ایک آس لے کر آیا تھا تمہارے پاس اور سوچا تھا کہ چونکہ یہ تمہاری ذات سے تعلق نہیں رکھتی اِس لئے شاید تم اِسے نہ توڑو۔"

"جی ڈیڈی! فرمائیے کیا بات ہے؟" حِنا نے پُوچھا۔

"حِنا میں رِدا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔"

"کہاں؟"

"امریکہ!" آفندی صاحب نے کہا اور حِنا سکتے کے عالم میں رہ گئی۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اِس بات کا کیا جواب دے،

"بس دِل میں ایک خواہش اُبھری تھی کہ تمہارے ساتھ جو وہ آرزوئیں، وہ حسرتیں پوری نہ کر سکا لیکن رِدا تقریباً شریک ہے میرے اور تمہارے لئے اور میرے بدنصیب دِل میں اُس کے لئے بھی محبت پیدا ہو چکی ہے۔ نانا ہُوں آخر اُس کا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اُسے باہر کی دُنیا دِکھا دُوں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں تم اجازت دو نہ دو۔ فیصلہ سُنا سکتی ہو۔"

حِنا بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ رِدا کو اپنے آپ سے کیسے الگ کر دے، اور وہ بھی ایک طویل عرصے کے لئے جس کا کوئی تعیّن نہیں ہے۔ کیا کہے آفندی صاحب سے؟ کیا اُن کی یہ آرزو بھی ٹھکرا دے؛ بڑا عجیب معاملہ آ پڑا تھا۔ ابھی تو ثاقب ہی کا عذاب سر پر سوار تھا کہ یہ نئی پریشانی، نئی فکر اُسے لاحق ہو گئی۔

آفندی صاحب اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے، پھر اُن کے ہونٹوں پر ایک تلخ مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"یقین کرو کہ رِدا کے سلسلے میں مجھے خود بھی یقین نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم صاف اِنکار کر دو گی۔ اِتنے تذبذب کی کیا ضرورت ہے، دو جملوں میں بات ختم کر سکتی ہو۔"

"ڈیڈی! آپ جانتے ہیں کہ رِدا کے علاوہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں آپ کے حق کو چیلنج نہیں کر رہی۔ ڈیڈی لیکن... لیکن میں... میں شاید اُس کے بغیر جی نہ سکوں۔ میں... میں بہت پریشان ہُوں ڈیڈی۔ میں بہت اُلجھی ہُوئی ہُوں آپ خدا کے لئے اِس سلسلے کو جذباتی انداز میں نہ سوچئے رِدا کا جانا ممکن نہیں ہو گا پلیز ڈیڈی میری اُلجھنوں کو سمجھئے۔"

"ہاں... ہاں واقعی حِنا تمہاری اُلجھنیں بے پناہ ہیں۔ خیر چھوڑو، چائے نہیں پلواؤ گی؟" آفندی صاحب نے کہا۔

"ابھی منگواتی ہُوں ڈیڈی!" وہ جلدی سے اُٹھی اور پھر خود ہی اندر دوڑ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ چائے لئے ہُوئے آ گئی تھی۔ آفندی صاحب گہری سوچ میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ چائے پیتے ہُوئے بھی وہ خاموش رہے۔ حِنا پریشان نگاہوں سے اُنھیں دیکھ رہی تھی پھر اُنھوں نے کہا۔

"حِنا! بیٹیاں والدین کو بہت کچھ دیتی ہیں۔ تم نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا ہے اور میں تنہائیوں میں اِس بات کا حساب لگاتا ہُوں کہ میں نے تم سے کیا چھینا اور تم نے مجھ سے کیا چھین لیا۔ حِنا تم مجھ سے بہت آگے نظر آتی ہو واقعی میں ایک بدنصیب انسان ہُوں۔ اِس لئے کہ کاش تمہارے علاوہ بھی میرا کوئی اور ہوتا اِس دُنیا میں۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ اِس درد کو بھُولنے کی کوششوں میں مصرُوف رہتا ہُوں۔ ہو سکتا ہے اِس میں کامیاب ہو ہی جاؤں۔ اچھا خدا حافظ۔ زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا اب شاید جاتے ہُوئے بھی تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ کہہ نہیں سکتا کس وقت چلا جاؤں۔" آفندی صاحب نے مزید کوئی گفتگو نہیں کی۔ رِدا کو بھی نہیں پُوچھا۔ بس اُٹھے اور چلے گئے، تھوڑی دیر بعد اُن کی کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔

حِنا کا سر چکرا رہا تھا، بہت دُکھوں کی ماری تھی وہ۔ بہت سے غموں میں ڈوب گئی تھی۔ کیا رِدا کو آفندی صاحب کے ساتھ بھیج دینا ممکن ہوتا؛ اوّل تو رِدا کے کالج کا معاملہ تھا۔ اُس کی تعلیم تھی۔ آفندی صاحب کی پیش کش قبُول کرنے کا مطلب تھا کہ رِدا کو تعلیم سے دُور کر دیا جائے اور... اور اِس بات پر تکیہ کر لیا جائے کہ بالآخر اُس کا مستقبل آفندی صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اُسے ہر طرح کا سہارا دیں گے۔ نہیں... یہ ممکن نہیں ہے۔ جب میں نے ڈیڈی کا سہارا قبُول کرنے کی کوشش کی تھی تو اُنھوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا تھا مجھے اپنی کوٹھی سے نکال دیا تھا اگر وہ میری بات مان لیتے تو شاید... شاید حالات یہ

نہ ہوتے۔

یہ خیال آج بھی حِنا کے سینے میں پتھر کی سِل کی مانند موجود تھا بے شک آفندی صاحب کے آنے پر وہ بے حد خوش ہُوئی تھی لیکن اُن لمحات کو نہیں بُھول سکی تھی۔ جب اُسے بے سرو سامانی کے عالم میں اُس کوٹھی سے باہر نکلنا پڑا تھا۔ سب ایک جیسے ہیں۔ سب ایک جیسے ہیں۔ محبتیں بے شک ایک مُسلّم حیثیت رکھتی ہیں لیکن اُن کی بھی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ جذبات کے ہاتھوں بہہ جانے والے ہمیشہ نُقصان اُٹھاتے ہیں اور میں ایک بار نقصان سے دوچار ہو چُکی ہُوں بار بار یہ نقصان نہیں اُٹھا سکتی۔ خواہ اُس کے لئے مجھے کچھ بھی کھونا پڑے۔

اُس نے دِل میں سوچا اور اپنے ارادوں کو مضبُوط کرنے لگی۔ کیسے کیسے کچوکے لگ رہے تھے اُس کے وجُود میں۔ لیکن وہ سنے جان تھی کہ اِن سارے کچوکوں کو برداشت کر رہی تھی۔

پتہ نہیں کب آفندی صاحب چلے گئے وہ دوسرے ہی دِن اُن کی کوٹھی پہنچی لیکن اُن کے بارے میں معلوم ہُوا کہ وہ کراچی جا چکے ہیں۔ اور وہیں سے وہ امریکہ کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ گویا اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ کر دِکھایا تھا۔

بہرطور اُس نے دِل ہی دِل میں اُنھیں خُدا حافظ کہا۔ اور واپس اپنے گھر آ گئی۔

رُدا کے معمُولات میں کوئی فرق نہیں تھا اور اب وہ کسی حد تک مطمئن نظر آتی تھی البتہ اُس نے حِنا سے باتیں کرنا بہت کم کر دیا تھا صرف ضرورتاً گفتگو کر لیا کرتی تھی یہ گویا اظہارِ ناراضگی تھا اور اِس بات کو چھ سات بلکہ آٹھ دِن گُزر گئے، حِنا نے بھی اِس سِلسلے میں اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی وہ خود رُدا کی اِس حرکت سے ناراض تھی۔ رُدا نے اُس انداز میں نہیں سوچا تھا جس انداز میں اُسے سوچنا چاہیئے تھا۔

آٹھویں دِن وہ اپنے دفتر میں بیٹھی ہُوئی تھی کہ اُسے ایک ٹیلیفون موصُول ہُوا۔ اُس نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔

"ہیلو!"

"ہیلو آنٹی! میں تسنیم بول رہی ہُوں"

"ہیلو تسنیم! میں پہچانی نہیں"

"تسنیم جواد ڈاکٹر جواد کی بیٹی"

"اوہو تسنیم تم! بخیریت..." حِنا نے کہا۔ وہ رُدا کی دوست تسنیم کو جانتی تھی۔

"آنٹی! رُدا کہاں ہے آخر؟ کیا ہو گیا ہے اُسے؟ خیریت تو ہے نہ گھر پر مِلتی ہے۔ نہ کالج آتی ہے۔ آج چھ سات دِن ہو گئے کہ وہ بیمار تو نہیں ہے؟ میں دو بار گھر جا چکی ہُوں وہاں بھی نہیں آئی۔ آج بھی اُس کی وجہ سے کالج سے جلد ہی نِکل آئی گھر پہنچی لیکن پتہ چلا کہ گھر پر نہیں ہے۔ میں اُس کے لئے پریشان ہُوں آنٹی! آخر وہ کالج کیوں نہیں آ رہی؟"

حِنا پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ چند لمحات خاموش رہی، دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔

"ہیلو؟"

"ہیلو! ہاں سُوری تسنیم ذرا ایک صاحب سے باتیں کرنے میں مصرُوف ہو گئی تھی، بھئی دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے کچھ عزیز باہر سے آئے ہُوئے ہیں اور بہت عرصے کے بعد آئے ہیں۔ رُدا اُن کے پاس چلی جاتی ہے۔ ایک دو دِن میں چلے جائیں گے وہ۔ اُس کے بعد وہ باقاعدہ کالج آنا شروع کر دے گی۔"

"اوہ! اُسے بتا دیجئے کہ میں تین بار اُس کے لئے اُس کے پاس جا چکی ہُوں"

"سُوری تسنیم!"

"نہیں آنٹی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے ایک دو دِن کے بعد تو وہ کالج آنا شروع کر دے گی ناں؟"

"ہاں کیوں نہیں"

"او کے آنٹی" دوسری طرف سے ٹیلیفون بند کر دیا گیا۔ لیکن حِنا ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی تھی اُسے ایک بار پھر صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ رُدا... رُدا... رُدا۔ اِس سے زیادہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھی اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ رُدا کا کردار اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا حِنا نے اُسے جو کچھ بنانے کی کوشش کی تھی اُس میں اپنے آپ کو ناکام نہیں سمجھتی تھی لیکن... لیکن اُس کی یہ گمشدگی ظاہر ہے تسنیم نے غلط نہیں کہا ہو گا۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہو سکتا۔

اُس کا دِل اُلٹنے لگا اور تھوڑی دیر بعد وہ دفتر سے اُٹھ گئی اور گھر آ گئی۔ وقت سے پہلے آ گئی تھی۔ رُدا موجود نہیں تھی صبح وہ معمُول کے مطابق کالج جانے کے لئے نِکلی تھی اور حِنا نے اِس پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ چھ سات دِن سے کالج نہیں جا رہی تھی کیوں؟ آخر کیوں؟ کہاں جاتی ہے وہ؟ کوئی بات حِنا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

زیادہ دیر نہیں گُزری تھی کہ اُسے رُدا نظر آ گئی۔ اُس کے کمرے کے سامنے سے گُزر کر اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھی حِنا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ... یہ انتہا ہے۔ یہ لڑکی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ غُصّے میں ڈُوبی ہُوئی باہر نِکل آئی۔ رُدا اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ چُکی تھی۔

"رُدا! اِدھر آؤ" اُس نے گرجدار آواز میں کہا۔ اور رُدا کسی قدر بوکھلا گئی۔

اُس نے سہمی ہُوئی نِگاہوں سے حِنا کو دیکھا اور حِنا اُسے قہر آلُود نگاہوں سے گھُورنے لگی۔

"آؤ، اندر آؤ" اُس نے کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

رُدا سہمی ہُوئی سی کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ حِنا کی شُعلہ بار نِگاہیں اُسے گھُور رہی تھیں۔ رُدا چوروں کی مانند کھڑی رہی۔ اُس کے بدن میں ہلکی ہلکی لرزشیں بتا رہی تھیں۔ کہ وہ خوف زدہ ہے اور اِس خوف سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اُس کے اندر کوئی مجرمانہ جذبہ چھُپا ہُوا ہے۔ حِنا کی آنکھوں سے شُعلے برستے رہے۔ رُدا کے پاؤں کانپ رہے تھے حِنا نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ" اور رُدا دھم سے بیٹھ گئی۔

"تسنیم کا فون آیا تھا میرے دفتر۔ تسنیم جواد جانتی ہو ناں؟"

"جی" رُدا نے آہستہ سے کہا۔

"پُوچھ رہی تھی مُجھ سے کہ رُدا کہاں ہے؟ تین بار تمھارے پاس یہاں آ چکی ہے۔ کالج میں بھی تم نہیں جاتیں یہ اطلاع دی ہے اُس نے مجھے۔ میں نے اُس سے یہ کہہ دیا ہے کہ آجکل کچھ عزیز آئے ہُوئے ہیں وہ اُن میں مصرُوف ہے۔ ایک دو دِن کے بعد کالج آئے گی"

رُدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حِنا اُس کے چہرے پر اُس کا جُرم تلاش کرنے لگی۔ پاکیزہ اور معصُوم سا چہرہ۔ جس پر کوئی داغ نہیں تھا ہر داغ سے بے نیاز۔ آخر رُدا کون سا ایسا جُرم کر رہی ہے؟ کیا کیا ہے اُس نے؟ یہ دِن اُس نے کہاں گُزارے اور وہ بھی اِتنے پوشیدہ انداز میں کہ نہ حِنا کو بتایا اور نہ کسی اور کو۔ وہ خاموشی سے رُدا کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"رُدا! کیا تم میرے سوال کا جواب دینا پسند کرو گی کہاں جاتی ہو تم؟"

"ابّو... ابّو کے پاس" رُدا نے سِسکتے ہُوئے کہا اور حِنا کے بدن میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔

اُس کے ذہن میں لاکھوں شیشے ٹوٹ گئے تھے ایک عجیب سی ہولناک گرج اُس کے دماغ میں ہوتی رہی اور وہ اپنے آپ کو اِس خوفناک طُوفان سے بچانے کی کوشش کرتی رہی تھوڑی دیر کے بعد طُوفان تھما تو اُس نے رُدا کو گھُورتے ہُوئے کہا

"کہاں؟"

"اُن کے ہوٹل کمرہ نمبر دو سَو سات میں" رُدا نے جواب دیا۔

"تمھیں اُس کے بارے میں کیسے معلوم ہُوا؟ کیا میری غیر موجودگی میں ثاقب یہاں آئے تھے؟"

"نہیں امّی! اُس دِن جب وہ پہلی بار یہاں آئے تھے تو میں نے ڈرائینگ رُوم میں جھانک کر دیکھا تھا وہ آپ کو اپنا پتہ بتا رہے تھے۔ میں نے اُن کی زبانی اُن کی پُوری کہانی سُنی تھی امّی اور اُس کے بعد... اُس کے بعد میں دوسرے ہی دِن گھر سے نِکلی اور اُن کے پاس پہنچ گئی۔ میں ابّو سے مِلنا چاہتی تھی امّی... میں ابّو سے مِلنا چاہتی تھی" رُدا نے سِسکیاں بھرتے ہُوئے کہا۔

"اِس کے باوجود کہ میں ثاقب سے قطع تعلق کر چُکی ہُوں۔ اِس کے باوجود رُدا کہ تم کو میں اپنی پُوری کہانی سُنا چکی ہُوں۔ اِس کے باوجود رُدا کہ اُس شخص نے تمھیں زندگی کے اُن کٹھن سالوں میں تنہا چھوڑ دیا تھا جب تمھیں اُس کی ضرورت تھی۔ اِس کے باوجود رُدا کہ تمھیں میں نے کبھی اُس کی کمی محسوس نہ ہونے دی تم ثاقب کے پاس گئی تھیں میری مرضی کے بغیر، میری اجازت کے بغیر"

"ہاں امّی! مجھ سے یہ جُرم ہُوا ہے۔ باپ کا نام میرے لئے اِتنا پُرکشش تھا امّی کہ میں... میں اُسے نظرانداز نہیں کر سکی۔ میرے اعصاب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میرے دماغ نے فیصلہ کرنا چھوڑ دیا۔ میں صرف ابّو کے پاس جانا چاہتی تھی اُن کے قریب۔ بہت قریب! اُن کے دستِ شفقت سے میں اپنے وجُود کو سرشار کرنا چاہتی تھی میں... میں اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکی۔ بہت سوچا تھا میں نے۔ بہت کچھ سوچا تھا اور امّی میں بس پہنچ گئی اُن کے پاس۔ امّی مجھے معاف کر دیجئے امّی! ابّو کو معاف کر دیجئے" رُدا نے کہا اور حِنا بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

"رُدا! اِس کا مطلب ہے کہ تمھارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ بالکل تسلیم کرتی ہُوں اِس بات کو۔ تمھاری رگوں میں دوڑنے والا خُون ثاقب کا ہے۔ اِس بات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ اولاد کی رگوں میں دوڑنے والا خُون باپ کا ہوتا ہے۔ ماں سے اُسے منسلک کر دیا جائے تو یہ ایک احمقانہ سوچ ہے۔ کیوں رُدا تم نے

اِس کی تصدیق کی ہے نا۔"

رُدا کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اور آگے بڑھ کر حِنا کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"مُعاف کر دیجئے امّی! ابّو کو معاف کر دیجئے وہ بے گُناہ ہیں۔ اُنھوں نے قصُور نہیں کیا۔ امّی اُنھوں نے صرف آپ کے بارے میں سوچا۔ صرف آپ کے بارے میں سوچا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی سوچ کا انداز غلط تھا وہ بہت اچھے شاعر ہیں لیکن آپ کے دِل کی گہرائیوں کو نہ دیکھ پائے اور اپنی دُھن میں آپ کے پاس سے چلے گئے۔ پھر مصائب نے اُن کا ساتھ نہ چھوڑا امّی وہ... وہ اِتنے بُرے نہیں ہیں۔ وہ... وہ بے گُناہ ہیں۔ خُدا کے لئے اُنھیں معاف کر دیجئے۔ آپ تو باپ کی تڑپ جانتی ہوں گی۔ کیوں کہ آپ اپنے باپ سے کافی عرصہ دور رہ چکی ہیں۔ لیکن امّی آپ کے باپ تھے آپ کے قدم اُن تک جا سکتے تھے۔ امّی میں تو مجبُور تھی اور جب میرے ابّو میرے سامنے آئے تو امّی میری مجبُوریوں نے ساری زنجیریں توڑ دیں۔ میں اُن کے پاس پہنچ گئی۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ بہت محبّت کرتے ہیں مُجھ سے۔ بہت چاہتے ہیں مجھے امّی۔ خُدا کے لئے میرے لئے آپ اُنھیں معاف کر دیجئے۔ امّی آپ اُنھیں معاف کر دیجئے۔" وہ حِنا کے قدموں سے لپٹی آنسو بہاتی رہی۔

اُس کے آنسو حِنا کے پیروں کو بھگو رہے تھے اور حِنا کے پُورے وجُود میں گڑگڑاہٹیں اُبھر رہی تھیں پھر اُس کی سرد آواز اُبھری۔

"رُدا! اُٹھ جاؤ۔ اُٹھ جاؤ رُدا۔"

"آپ ابّو کو معاف کر دیجئے امّی! آپ ابّو کو معاف کر دیجئے۔"

رُدا مسلسل اُس کے پیروں سے لپٹی کہہ رہی تھی۔ بالآخر حِنا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔ اُسے اپنے سامنے کیا اور اُس کے آنسو بھرے چہرے کو دیکھنے لگی۔ دفعتاً ہی اُس کے سینے میں ایک ٹیس سی اُٹھی تھی۔ رُدا رو رہی ہے۔ رُدا رو رہی ہے، حِنا نے رُدا کو کبھی روتے نہیں دیا تھا۔ اُس نے رُدا کا بسُورتا ہُوا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا آج یہ چہرہ... ایک معصُوم سا چہرہ عجیب انداز میں بسُور رہا تھا حِنا کے سینے کی ٹیسیں بڑھتی گیئں۔ اُس نے آگے بڑھ کر بے اختیار رُدا کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

"نہیں رُدا! مُجھ سے وہ نہ مانگ میری بچّی۔ مُجھ سے وہ نہ مانگ جو میں دے نہیں سکتی۔ نہیں رُدا تو نہیں سمجھتی۔ رُدا تُو نہیں سمجھتی کہ میں اِس زندگی میں کتنی بار مری ہُوں۔ رُدا میرا وجُود ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے۔ اِس وجُود کو اور ریزہ ریزہ نہ کر میری بچّی، مُجھ سے وہ نہ مانگ جو میں دے نہیں سکتی۔" حِنا کی آواز بھرّا گئی اور پھر وہ رُدا سے زیادہ بے اختیار ہوکر رونے لگی۔

رُدا اب سسک رہی تھی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"امّی! آپ نے اپنی ایک پسند کے لئے نانا جان کو چھوڑ دیا تھا کیا آپ مجھے یہ بتا سکتی ہیں کہ نانا جان کو چھوڑنے کے بعد کتنی خوش رہی ہیں، بتا سکتی ہیں امّی مجھے؟" رُدا نے سوال کیا۔

حِنا روتی رہی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تب رُدا خود ہی بولی۔

"میں جانتی ہُوں امّی! میں اچھی طرح جانتی ہُوں کہ نانا جان سے الگ ہوکر آپ خوش نہ رہی ہوں گی۔ بے شک آپ کو زندگی کا وہ سکون عارضی طور پر مل گیا ہوگا جس کے لئے آپ نے نانا جان کو چھوڑا ہوگا۔ لیکن باپ آپ کے ذہن میں زندہ رہا ہوگا۔ آپ نے نانا جان کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزاری ہوگی میں جانتی ہُوں امّی: لیکن میں وہ ہُوں جس نے صرف باپ کا نام سُنا تھا۔ جو ہزاروں بار اِس نام کے لئے تڑپی تھی۔ میری زندگی میں کوئی ثاقب نہیں ہے جس کے لئے میں اپنے باپ کا تصوّر ترک کر دُوں۔ میں جس چیز کو اپنی حسرت سمجھ بیٹھی تھی وہ مجھے مِل جائے تو آپ مجھے بتائیے کہ کیا میں اُسے آسانی سے چھوڑ سکتی ہُوں! ذرا ٹھنڈے دِل سے غور کیجئے امّی میں... میں اُن خوش قسمت لڑکیوں کی طرح باپ کا سایہ چاہتی ہُوں جو۔ جو اپنی تقدیر پر پھُولے نہیں سماتیں۔ جو کسی کو پیار سے ابّو، پاپا یا ڈیڈی کہتی ہیں۔ امّی یہ لفظ میرے ہونٹوں سے چھین لیا گیا تھا حالانکہ میں بھی اِس سے واقف تھی اور اب جب کہ یہ لفظ میرے ہونٹوں تک پہنچا ہے تو کیا... کیا آسانی سے میں اُسے نظر انداز کر سکتی ہُوں؟ آپ مُجھ پر بھی تو غور کیجئے۔ بے شک ابّو نے آپ کے لئے جو کچھ کیا ہے آپ اُسے معاف نہیں کر سکتیں۔ لیکن امّی! میرے دِل کی گہرائیوں میں بھی تو جھانکیئے، مجھے بتائیے کہ میں کِس انداز میں صبر کروں؟ میرا باپ میرے سامنے ہے میرے قریب ہے۔ مجھے وہ مِلا ہے جو میرے پاس نہیں تھا۔ میں... میں کیسے اُسے بھُول جاؤں امّی۔ مجھے بتائیے میں کیسے اُسے بھُول جاؤں؟"

"رُدا... رُدا تو نہیں جانتی تیرا باپ اُن باپوں میں سے نہیں ہے جو بیٹیوں کے سروں پر چھاؤں ہوتے ہیں رُدا اُسے تیرے بارے میں علم ہوگیا تھا آج تک کچھ نہیں کیا اُس نے تیرے لئے۔ کچھ نہیں کیا، پُوچھا بھی نہیں۔ تیرے نام سے بھی ناواقف

ہوگا وہ۔ تو اُس سے ملی ہوگی تو تجھے اِس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ وہ تجھے نہیں جانتا تھا۔ رُدا وہ اچھا انسان نہیں وہ بہت بُرا انسان ہے۔ میں جانتی ہُوں۔ میں جانتی ہُوں وہ یہاں کِس لئے آیا ہے، رُدا میں جانتی ہُوں مجھے بربادی کے گڑھوں میں نہ دھکیل میری بچّی! میں نے تیرے ساتھ کچھ بُرا نہیں کیا۔ تُو میری زندگی کو کیوں روگ لگانا چاہتی ہے؟"

"ابّو آپ کے لئے روگ نہیں بنیں گے امّی میں وعدہ کرتی ہُوں۔ وہ آپ کے لئے روگ کبھی نہیں بنیں گے۔"

"رُدا! وہ ایک ناکارہ انسان ہے۔ اُس نے زندگی میں کبھی کچھ نہیں کیا۔ شعر کہنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکتا اور اب بھی... اب بھی وہ تیرے لئے سایہ نہیں۔ بس ایک ہیولا ہے جس کا سہارا اگر تُو نے کبھی پکڑا تو بے موت ماری جائے گی رُدا۔ سُن، وہ یہاں صرف اِس لئے آیا ہے کہ ہو سکتا ہے میرے تعلّقات میرے باپ سے بحال ہوگئے ہوں۔ تُو جانتی ہے کہ آفندی صاحب کِس قدر دولت مند انسان ہیں یہ دولت ہمیشہ ثاقب کی نِگاہوں میں رہی۔ رُدا! میں نے اپنے باپ کو کوئی تکلیف نہیں دی لیکن اگر... اگر ثاقب میری زندگی میں دوبارہ شامل ہو جائے تو میں جانتی ہُوں اُس کے بعد ڈیڈی زندہ نہ رہ سکیں گے۔"

"نہیں امّی! اگر ایسی بات ہے تو ہم کبھی نانا جان کو ابّو کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔ سُنا امّی! ہم اُنھیں کبھی نہیں بتائیں گے۔ ہم اُنھیں بھی زندہ رکھیں گے۔ امّی آپ میرے باپ کو بھی زندہ رہنے دیجئے اور اپنے باپ کو بھی زندہ رکھئے۔ میں ابّو کے بارے میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتی ہُوں کہ وہ کسی چیز کے خواہشمند نہیں ہیں۔ اگر وہ آپ سے کچھ مانگیں تو اُنھیں صاف اِنکار کر دینا میں آپ کے راستے میں کبھی نہیں آؤں گی۔ اُنھیں صرف میرے باپ کی حیثیت سے اپنے اِس گھر میں جگہ دے دیجئے۔"

حِنا نے روتی ہُوئی آنکھوں سے رُدا کو دیکھا اور بولی۔ "تُو معصُوم ہے رُدا۔ تو نہیں جانتی۔ تو کہتی ہے وہ ہم سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ رُدا۔ رُدا وہ بہت لالچی انسان ہے۔ میں اُس کی رگ رگ سے واقف ہو چکی ہُوں تو... تو اگر مجھے ڈبونا ہی چاہے تو دوسری بات ہے رُدا۔ میں نے تجھے ڈبونے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ لیکن تُو... تُو میری موت کا سامان کر رہی ہے۔"

"امّی خُدا کے لئے... خُدا کے لئے۔" رُدا کہتی رہی۔ حِنا نے اپنے آنسو خشک کئے پھر آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے رُدا۔ ٹھیک ہے۔"

"امّی!" رُدا کی آواز خوشیوں میں ڈوب گئی۔

"ہاں! آؤ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہُوں۔" حِنا سنجیدگی سے بولی اور رُدا اُس کے پیچھے پیچھے اندر پہنچ گئی۔

حِنا نے اُسے سامنے بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر رُدا سے بولی۔

"تُو... تُو اپنا باپ چاہتی ہے ناں رُدا، اور اگر باپ مِلنے کے بعد ماں تجھ سے کھو جائے تو...؟"

"نہیں امّی... نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"تو... کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں اپنے آپ کو بالکل ختم کر لُوں؟"

"نہیں امّی! میں یہ نہیں چاہتی۔"

"تو پھر کیا چاہتی ہے تو...؟"

"اُنھیں... اُنھیں قبُول کر لیا جائے۔ اُن کا گُناہ معاف کر دیا جائے۔"

"اور اِس کی صُورت کیا ہوگی؟"

"امّی میں... میں کیا بتاؤں آپ، میں کیا بتاؤں؟"

"سُنو رُدا! اگر تم یہی چاہتی ہو کہ میں تمیں اُن کے پاس رہنے دُوں تو ٹھیک ہے میں اِس کے لئے تیار ہُوئی جاتی ہُوں۔ لیکن جہاں تک میرا اپنا مسئلہ ہے، مُجھ سے یہ بات کبھی مت کہنا کہ میں اُسے شوہر کی حیثیت سے تسلیم کر لُوں۔ رُدا تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ جو دروازے میں نے بند کئے کبھی پلٹ کر اُن کی جانب نہیں دیکھا۔ ڈیڈی خود میرے پاس آئے تھے۔ اور اُنھوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی پیش کش کی تھی ثاقب نے جب مجھے چھوڑ دیا اور میں اِس دُنیا میں بے سہارا رہ گئی تو میں اگر چاہتی تو ڈیڈی سے رُجوع کر سکتی تھی۔ وہ مجھے اُس وقت بھی اپنے سینے سے لگا لیتے۔ مُجھ پر تمہاری ذمّہ داری تھی رُدا اور میں تمیں نہیں بتا سکتی کہ یہ ذمّہ داریاں پوری کرنے کے لئے مجھے کیسے کیسے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا۔ میں نے سب کچھ برداشت کر لیا لیکن ڈیڈی کی جانب نہ گئی اور جب ڈیڈی نے مجھے یہ پیش کش کی تو میں نے اُنھیں منع کر دیا۔ ثاقب تمہارا باپ ہے میں اِس سے اِنکار نہیں کرتی لیکن اُسے صرف اپنا باپ رہنے دینا۔ مجھے کبھی اُس کے لئے مجبُور نہ کرنا۔"

"امّی! آپ نے مُجھ پر یہ احسان کیا ہے تو کچھ احسانات اور کر دیجئے۔ کیا میں ابّو سے یہ کہہ دُوں کہ وہ یہاں آکر رہ سکتے ہیں؟"

"اگر ثاقب اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے تو اُس سے

کہوکہ وہ یہیں اِسی شہر میں کہیں ایک گھر لے لیں اُس میں رہے تم جب چاہو اُس سے مِل سکتی ہو۔ لیکن اُس کا یہاں آکر رہنا مناسب نہیں ہے یہ... یہ جگہ اُس کی نہیں ہے اُس کی بنائی ہُوئی نہیں ہے۔ رِدا تم یہ بھی جانتی ہو کہ ڈیڈی نے بمشکل تمام اپنے آپ پر جبر کرکے ساری باتیں منظور کرلی ہیں۔ وہ اپنی محبت کے ہاتھوں شکار ہوکر یہاں آجاتے ہیں لیکن اگر وہ یہاں ثاقب کو دیکھیں گے تو اُن کے دِل پر کیا بیتے گی ؟ رِدا وہ تمھیں اپنے ساتھ امریکہ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے منع کردیا۔ ایک بات بھی تو نہیں مانی میں نے اُن کی اور اب... اب جب کہ اُن کی اَنا کو یہ آخری ضرب پہنچے گی تو اُن کے دِل پر کیا بیتے گی ؟ رِدا میں ثاقب کو یہاں رکھ کر اپنے باپ کو ہمیشہ کے لئے نہیں کھونا چاہتی۔ باپ کی تڑپ تمھارے دِل میں موجود ہے۔ مجھے بھی اُسی میزان پر پرکھو تمھیں اندازہ ہوجائے گا۔"

"امّی! ہم ابّو کو یہاں لے آتے ہیں۔ لیکن ایک شرط رکھ دیں گے۔ ابّو یہ بات کبھی ظاہر نہیں کریں گے کہ وہ یہاں آگئے ہیں جب کبھی نانا جان یہاں آئیں گے تو ابّو کو چھُپنا ہوگا اُن سے۔"

حِنا نے گہری نِگاہوں سے رِدا کو دیکھا اور دِل ہی دِل میں مُسکرا پڑی۔

"ہاں اگر ثاقب یہ منظور کرلے تو ٹھیک ہے اُسے چوروں ہی کی طرح یہاں رہنا ہوگا۔"

"امّی! ابّو میرے لئے سب کچھ منظور کرلیں گے۔ میں... میں وہ... وہ مجھے بہت چاہتے ہیں امّی اُنھوں نے رو رو کر مجھے اپنی کہانی سُنائی ہے۔ وہ ہمارے لئے بہت تڑپتے رہے ہیں۔ امّی میں آپ سے اُن کی سفارش نہیں کررہی لیکن حقیقت یہی ہے کہ تقدیر نے اُن کے ساتھ بہت بھیانک مذاق کیا ہے، وہ... وہ اپنی مرضی سے گُم نہیں ہُوئے تھے۔ دماغی اسپتال میں وہ نہ جانے کتنے عرصے رہے ؛ ایک طویل عرصہ وہ اپنے آپ کو بھُولے رہے۔ اور اُس سے پہلے کا وقت اُنھوں نے اپنی تعمیر کے لئے کوششیں کرتے ہُوئے گزارا۔"

"ہُوں!" حِنا ہنس پڑی "ٹھیک ہے بیٹی زمانے کا تجربہ ابھی تمھیں نہیں ہے۔ لیکن اِس بات کو ذہن میں رکھنا کہ اِس دُنیا میں لوگ رشتوں کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ ہر شخص اپنے مطلب کے لئے جیتا ہے اور دوسروں کو اپنے مطلب کے لئے ماردیتا ہے۔ بہر طور میری دُعا ہے کہ خُدا تمھیں زندگی دے۔ تم کبھی موت کا مزہ نہ چکھو۔ اُس موت کا جو زندہ رہ کر آجاتی ہے۔" حِنا نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ رِدا اُسی وقت بولی۔

"امّی! تو کیا میں ابّو کو بُلا لاؤں ؟"

"ہاں! اُن سے کہنا کہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"

حِنا نے کہا اور رِدا مسرت سے دیوانی ہوگئی اُس نے حِنا کو بُری طرح بھینچ لیا۔ اُسے بُری طرح چُوما، بہت خوش تھی وہ اپنے باپ کو یہاں آنے کی اجازت حاصِل کرکے۔

اور پھر اُسی وقت وہ حِنا کی اجازت کے بعد وہاں سے چلی گئی۔ حِنا نے یہ سب کچھ منظور کرلیا تھا۔ بلاشُبہ تنہا جی کر اُسے کیا مِلتا، اور اب تو تنہا جی بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس کی زندگی تو رِدا کے لئے وقف تھی۔ وہ رِدا کی آنکھوں میں اِس طرح آنسو اُبلتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور رِدا کی سِسکیاں اور ہچکیاں نہیں سُن سکتی تھی ماں تھی آخر۔ دِل سے مجبور ہوگئی تھی۔

لیکن ثاقب... ثاقب کے لئے یہ سزا مناسب ہے اگر وہ چوروں کی طرح یہاں رہے گا تو اُسے اپنی حیثیت کا احساس ہوتا رہے گا۔ حِنا نے بہت سے فیصلے کئے تھے۔ اِس بات کا امکان بھی تھا کہ ثاقب اِس انداز میں یہاں آنے سے اِنکار کردے۔ وہ لمحات یاد آگئے۔ آفندی صاحب ثاقب کی کوٹھری میں جاکر اُس سے مِلے تھے۔ اُنھوں نے ثاقب کو بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ اور اور اُس کے بعد واپس آئے تھے تو اُنھوں نے حِنا سے کہا تھا کہ جو شخص غیرت مند نہ ہو جس کی غیرت یہ الفاظ سُن کر نہ جاگے وہ اچھا انسان نہیں ہوسکتا۔ ثاقب ایک بے غیرت انسان ہے چنانچہ ایسے بے غیرت انسان سے زندگی نہیں نبھائی جاسکتی۔ حِنا کو وہ الفاظ آج تک یاد تھے۔ اُس کے جواب میں اُس نے کہا تھا کہ ثاقب نے صرف اُن کا احترام کیا ہوگا۔ اور جب اُس نے ثاقب سے اِس بارے میں بات کی تو اُس نے بھی یہی الفاظ کہے تھے۔ اُس نے کہا تھا کہ حِنا میں تمھارے ڈیڈی کے سامنے بدزبانی کیسے کرسکتا تھا ؟ اُس وقت حِنا نے ثاقب کی بات مان لی تھی لیکن بعد میں آفندی صاحب کے الفاظ زیادہ سچ ثابت ہُوئے تھے۔ بلاشُبہ یہ ثاقب کی بے غیرتی تھی اُسے یہ خیال بھی تھا کہ ثاقب اِس وقت بھی اپنی اَنا کو زندہ نہ رکھ پائے گا۔ وہ بے غیرت انسان ہے۔ ہوسکتا ہے۔ وہ اِس شرط پر بھی رِدا کے ساتھ یہاں آہی جائے۔

اور حِنا کا خیال غلط نہیں نِکلا۔ رِدا واپس آئی تو ثاقب اُس کے ساتھ تھا۔ حِنا کو سب سے زیادہ حیرت اُس کا چہرہ دیکھ کر ہوتی تھی۔ ثاقب اگر واقعی اِن مصائب کا شکار رہا ہے جن کا تذکرہ اُس نے کیا ہے تو اُس کے چہرے میں بھی کوئی تبدیلی ہونی چاہیئے تھی لیکن وہ پہلے سے زیادہ چاق وچوبند اور دِلکش ہوگیا تھا۔ وہ آیا تو اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی حِنا نے اُس کا کوئی استقبال نہیں کیا تھا البتہ رِدا مسرت سے پاگل ہورہی تھی اندر آکر اُس نے کہا۔

"ابّو! یہ ہماری امّی ہیں حِنا ہے اِن کا نام۔"

"ہاں میں اِنھیں جانتا ہُوں۔ اچھی طرح جانتا ہُوں رِدا۔ ہم لوگ شعر کے رشتے سے ایک دوسرے سے شناسا ہُوئے تھے، لیکن اُس کے بعد... اُس کے بعد بہت کچھ ہُوا۔ چند اشعار میں حِنا سُن لو۔ بہت دِن کے بعد سُنا رہا ہُوں تمھیں۔

چاہت کے پھُول لے کر پُوجا کی تھالیوں میں
ہم بھی کھڑے ہُوئے تھے تیرے سوالیوں میں
پرتوَ ہے تیرے رُخ کی رنگینیوں کا ورنہ
اتنی چمک کہاں تھی سونے کی بالیوں میں
احساسِ کرب بن کر رگ رگ میں دوڑتا ہے
جو زہر ساعتوں نے گھولا تھا پالیوں میں
نفرت کی گرم لُو سے جھُلسے ہیں بیشتر سارے
پھل، پھُول چاہتوں کے تھے جن کی ڈالیوں میں
شاداب رکھ سکیں جو احساس کے چمن کو
اِتنا لہو کہاں ہے اِن خشک نالیوں میں

بہرحال رِدا تمھاری اِمّی بڑی اچھی سخن فہم تھیں۔ لیکن وقت نے ہم سے، اِن سے مجھ سے۔ نہ جانے کیا کیا چھین لیا۔ پتہ نہیں اب شعر کی آواز اِن کے کانوں تک پہنچتی ہے یا نہیں ؟"

حِنا کے ہونٹوں پر طنزیہ مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے رِدا سے کہا۔

"ہاں رِدا تمھارے ابّو ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ ہیں۔ ورشاید رہیں گے۔ لیکن اُنھیں شعر کی دُنیا سے باہر لانے کی کوشش نہ کرنا یہ زندگی اُن کے بس کی نہیں ہے۔"

"اب آپ لوگ ایسی ہی باتیں کئے جائیں گے یا اِس موضوع کو تبدیل بھی کیا جائے گا۔" رِدا نے کہا۔

"ہاں... ہاں موضوع تبدیل کیا جائے گا۔ تم نے اپنے ابّو کو بتا دیا ہے ناں رِدا کہ یہاں کیا صورتِ حال ہے ؟ ثاقب صاحب اگر آپ کو رِدا نے نہیں بتایا ہے تو میں آپ سے عرض کردوں کہ رِدا کی ضد نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں آپ کو یہاں بُلا لوں۔ آپ رِدا کے لئے آئے ہیں میرے لئے نہیں۔ آپ کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو پہلے تھی اور میں اِس بات پر یقین رکھتی ہُوں اور رِدا کی یہ ذمّہ داری ہے کہ آپ اِن حدُود سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کریں گے ثاقب صاحب۔ میں نے محنت مزدوری کرکے نوکری کرکے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ آپ کے بارے میں میں نہیں جانتی کہ آپ کی مالی حیثیت کیا ہے ؛ لیکن کچھ وقت میں آپ کو یہ رعایت دے سکتی ہُوں کہ آپ یہاں رہیں کھائیں پیئیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنے لئے کوئی وسیلۂ آمدنی تلاش کریں۔ اور آس پاس ہی کوئی ایسا مکان لے لیں خواہ کرائے پر ہی کیوں نہ ہو جہاں آپ رہ سکیں۔ میں رِدا کی اور آپ کی ملاقات پر کوئی پابندی نہیں لگاؤں گی۔ لیکن میری خواہش ہے کہ آپ جس قدر جلد ممکن ہوسکے ایسا کرلیں۔ اُس وقت تک کے لئے میں آپ کو اپنی بیٹی کے باپ کی حیثیت سے اِس گھر میں جگہ دے سکتی ہُوں۔"

"ہمیں تو بس ایک سہارا چاہیئے۔ باقی اور کس شئے کے طلب گار ہیں ہم ؟ آپ اطمینان رکھیئے حِنا صاحبہ کہ آپ کی اِس دولت میں سے ہم آپ سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ وعدہ۔"

"رِدا تمھاری خواہش پُوری ہوگئی ہے اب میرے لئے کوئی اور ذمّہ داری تو نہیں ہے ؟"

"امّی!"

"ہاں رِدا اب باقی معاملات تم خود سنبھالو۔ رات کا کھانا میں تمھارے ساتھ نہیں کھاسکوں گی۔"

رِدا نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے تو ثاقب نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں بیٹے! ابھی زیادہ ضِد نہ کرو۔ وقت کا انتظار کئے لیتے ہیں ہم۔ شاید اِن کا غصّہ ختم ہوجائے تو یہ انسانوں کی طرح سوچیں۔"

حِنا بھاری قدموں سے باہر نِکل گئی تھی اور اُس کے بعد اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ دِل و دماغ جل رہے تھے۔ رِدا کی ضِد کے آگے بے بس ہوگئی تھی لیکن ثاقب کو اُس کا دل قبُول نہیں کررہا تھا بہرطور اب رِدا سے یہ سب کچھ کہہ دیا تھا تو اِس میں گنجائش نہیں تھی۔

دِن گزرنے لگے۔ حِنا اِن تمام معاملات سے دُور ہوگئی تھی۔ دفتر وقت پر جاتی۔ دفتر سے واپس گھر آجاتی۔ باپ بیٹی اِس دوران کیا کرتے رہے ہیں ؟ کیا کررہے ہیں۔ اُسے اِس سے غرض نہیں ہوتی تھی رِدا نے کئی بار یہ چاہا کہ حِنا اور ثاقب کو یک جا

کردے لیکن یہ اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ حِنا نے اُسے پُوری آزادی دے رکھی تھی اور ایک بار جب رِدا نے اُس سے اِس موضوع پر بات کی تو حِنا آگ بگولہ ہوگئی۔

"رِدا! تمہارے آنسو ایک حد تک مجھے پگھلا سکتے ہیں لیکن اگر میری ذات ہی کوئلہ بن گئی تو پھر میں تمہارے لئے کیا کرسکوں گی؟ جو کچھ ہو رہا ہے اُسے جاری رکھو اور جاری رہنے دو۔ مجھے میرے معاملات میں تنہا چھوڑ دو۔"

رِدا اُس کے لہجے کے پتھریلے پن سے خاموش ہوگئی اِس دوران آفندی صاحب نے اُن سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ بار ہا حِنا کو اُن کا خیال آیا اور اُس نے اپنے طور پر آفندی صاحب کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہ امریکہ میں بھی نہیں ہیں بلکہ وہاں سے کسی اور ملک چلے گئے ہیں۔ اور اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔

حِنا خاموشی سے وقت گزارتی رہی۔ ثاقب کا اچھی طرح تجزیہ بھی کر رہی تھی وہ اُس کی کیفیت پہلے سے مختلف نہیں پاتی تھی مالی حالت بھی جُوں کی تُوں تھی۔ صرف چند جوڑے کپڑے تھے اُس کے پاس اور بس وہی شعروشاعری۔ البتہ جب کبھی وہ رِدا کو اپنی غزلیں سُناتا تو حِنا جُھوم جُھوم اُٹھتی۔ بلاشبہ اُس کی شاعری میں پہلے سے بھی زیادہ نکھار آگیا تھا اُس نے کئی غزلیں کہی تھیں اور حِنا کو منانے کے لئے رِدا کو سُنائی تھیں۔

رِدا اُن سے بہت متاثر ہُوئی تھی۔ وہ اُس پر جان نچھاور کرتی تھی، ابو... ابو کہتے کہتے اُس کا مُنہ سُوکھا جاتا تھا۔ لیکن حِنا میں وہ پُرانی جیسی بات پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ دوسرے تمام معاملات میں اُس نے رِدا کو سمجھا دیا تھا چنانچہ رِدا اُس کے احکامات کی پابندی کر رہی تھی۔ ابھی تو آفندی صاحب یہاں موجود نہیں تھے۔ لیکن یہ بات پوری طرح ثاقب کو بتا دی گئی تھی کہ جب وہ آجائیں گے تو ثاقب اِس انداز میں یہاں نہیں رہ سکے گا۔ اُسے یا تو دوسرا مکان لینا ہوگا یا پھر وہ اُس وقت یہاں نہیں آئے گا جب آفندی صاحب موجود ہوں گے۔

پھر ایک اور تبدیلی ہُوئی۔ ثاقب نے کہیں نوکری کرلی تھی۔ یہ اطلاع بھی رِدا ہی نے اُسے دی تھی۔

"خُوب! ویسے بہت اچھا ہُوا کیونکہ میں محسوس کر رہی تھی کہ ثاقب کو پھر ایک آرام گاہ مِل گئی ہے۔"

"نہیں امی! ابو تو کافی دِن سے کوششوں میں مصروف تھے، اب اُنہیں ایک اچھی ملازمت مِل گئی ہے اور اب وہ باقاعدہ ملازمت پر جائیں گے۔"

ثاقب نے واقعی نوکری پر جانا شروع کردیا اور پھر مہینے کی پہلی تنخواہ اُسے مِلی تو وہ حِنا اور رِدا کے لئے بہت سے تحائف خرید کر لایا تھا رِدا اُس وقت حِنا کے پاس ہی بیٹھی ہُوئی تھی۔ ثاقب کو دونوں نے آتے ہُوئے دیکھا اور ثاقب نے اپنی لائی ہُوئی چیزیں اُن کے سامنے رکھ دیں۔ رِدا نے تو خوش ہو کر باپ کی لائی ہُوئی چیزوں کو قبول کرلیا تھا البتہ حِنا نے آہستہ سے کہا۔

"ثاقب! میں اِن کی متحمل نہیں ہوسکتی یا تو انہیں واپس کر آؤ ورنہ اپنی تحویل میں لے لو۔ میں تو کبھی اِن چیزوں سے آشنا ہی نہیں ہُوئی۔ یہ نئی بات میرے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگی۔"

"حِنا میں... میں"

"نہیں ثاقب پلیز! میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہر معاملے میں ایک حد ضروری ہے اور میں اِن حدوں کو توڑنا نہیں چاہتی۔"

ثاقب نے بھرّائے ہُوئے لہجے میں کہا "ٹھیک ہے حِنا جیسی تمہاری مرضی" اور اُس کے بعد وہ افسُردہ سا یہ چیزیں اُٹھا کر اندر چلا گیا تھا۔

رِدا! حِنا کو دیکھتی رہی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"میں نے باپ اور بیٹی کے درمیان آنا چھوڑ دیا رِدا۔ اپنے فیصلے تمہیں خود ہی کرنا ہوں گے۔"

رِدا نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُس کے بعد پھر وہی معمُولات چلنے لگے۔ رِدا کالج جاتی۔ دو بجے واپس آجاتی۔ ثاقب دفتر جاتا۔ پانچ بجے آجاتا۔ کبھی کبھی حِنا اُن کے ساتھ چائے میں شرکت کرلیا کرتی تھی۔ لیکن خاموش... عموماً اُس نے رات کا کھانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ رات کا کھانا رِدا ثاقب کے ساتھ کھاتی تھی۔ رِدا نے بہت کوششیں کی تھیں لیکن وہ حِنا کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرپائی تھی۔ اکثر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حِنا کسی وجہ سے گھر واپس آجاتی۔ رِدا غیر موجود ہوتی۔ ثاقب بھی گھر پہنچ جاتا۔ ایسے لمحات میں شام کی چائے ثاقب کو تنہا ہی پینی پڑتی تھی۔ حِنا اُس کے قریب نہیں جاتی تھی اور ثاقب کی بھی اب جُرأت نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہ دور سے عجیب سی نِگاہوں سے حِنا کو دیکھتا رہتا۔

پھر ایک دِن رِدا کالج کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لئے گئی ہُوئی تھی۔ شام کے چار بجنے والے تھے حِنا آج وقت سے کافی پہلے دفتر سے اُٹھ گئی تھی۔ مقصد کچھ بھی نہیں تھا بس کچھ تھکن سی محسوس کر رہی تھی۔ آسمان پہ بادلوں کی کجلاہٹیں رقصاں تھیں۔ موسم کئی دِنوں سے ابر آلُود ہو رہا تھا اور اُس میں ایک خُوشگوار سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ باہر ابھی لان پر بیٹھنے کا وقت تو نہیں آیا تھا لیکن حِنا ایسے ہی چہل قدمی کے لئے نکل آئی تھی۔ کہ عمارت کے دروازے پر ایک ٹیکسی آکر رُکی اور ثاقب اُس سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بھی وقت سے کچھ پہلے آگیا تھا حِنا نے دُور سے اُسے دیکھا۔ ثاقب ٹیکسی ڈرائیور کو پیسے ادا کرنے کے بعد لڑکھڑاتے قدموں سے اندر کی جانب چل پڑا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور قدم ڈول رہے تھے حِنا نے دُور ہی سے اُس کی کیفیت کا جائزہ لیا۔ ثاقب کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا اور اُس پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ وہ سینہ پکڑے پکڑے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا رہا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔ حِنا ایک عجیب سی اُلجھن کا شکار ہوگئی تھی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ثاقب کو کوئی تکلیف ہے۔ وہ اپنی جگہ پتھرائی ہُوئی سی کھڑی رہی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے؟ ثاقب اِس عمارت میں ضرور رہتا تھا لیکن ایک اجنبی کی مانند۔ رِدا ہی اُس کا خیال رکھتی تھی۔ اُس سے محبت کرتی تھی۔ اُسے پیار کرتی تھی۔ اُسے ابو کہتی تھی لیکن حِنا نے اِس دوران میں ثاقب سے اپنے طور پر ایک بار بھی گفتگو نہیں کی تھی۔ کبھی وہ تنہائی میں قریب آجاتا تو حِنا خاموشی سے آگے بڑھ جاتی۔ نہ جانے اُس وقت دِل میں کیا کیا ہوتا تھا، لیکن وہ اپنے عزم میں پکّی تھی کچھ اِسی قسم کی عورت تھی وہ۔ جُھکنا جانتی ہی نہ تھی لیکن اِس وقت ثاقب کی یہ کیفیت اُسے اندر سے بے چین کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

'اگر ثاقب کو کوئی تکلیف ہے تو اِن حالات میں میرے فرائض کیا ہیں؟' کوئی جواب حاصل نہیں کرسکی تھی وہ اِس بات کا، اندر مکمل خاموشی تھی۔ پھر بے خیالی کے انداز ہی میں اُس کے قدم آگے بڑھ گئے اور وہ اُس وقت چونکی جب وہ ثاقب کے کمرے کے سامنے تھی۔ اندر سے ثاقب کے کراہنے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ اُس نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور اندر داخل ہوگئی۔ یہ سب غیر اِختیاری طور پر ہو رہا تھا ثاقب اپنے بستر پر اوندھا لیٹا ہُوا تھا۔ اُس نے پاؤں کے جُوتے بھی نہیں اُتارے تھے۔ حِنا آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اُس کے قریب پہنچ گئی۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے بھاری اور سَرد لہجے میں پُوچھا۔ لیکن ثاقب نے رُخ تبدیل نہ کیا۔ حِنا اُسے تڑپتے ہُوئے دیکھتی رہی شاید اُسے بہت زیادہ تکلیف تھی۔

"کیا میں ڈاکٹر کو بُلاؤں؟" اُس نے پھر سوال کیا اور ثاقب نے بمشکل تمام گردن ٹیڑھی کرکے اُسے دیکھا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں کرب کی کیفیت منجمد تھی۔

"نہیں پلیز نہیں! ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے بھینچے ہُوئے ہونٹوں سے بمشکل تمام کہا۔

"کیا تکلیف ہے؟" حِنا نے سوال کیا۔

"میرے... میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔ اکثر ہوتا ہے بس ٹھیک ہو جائے گا تھوڑی دیر کے بعد، رِدا... رِدا نہیں ہے؟"

"نہیں، وہ کالج کے سالانہ فنکشن میں گئی ہے۔"

"اوہ! ہاں یاد ہے مجھے۔ پلیز کوئی بات نہیں ہے تم آرام کرو۔"

"یہ درد کیسے ہوگیا؟" حِنا نے پھر کسی اندرُونی جذبے سے مجبُور ہو کر پُوچھا۔

"وہ... وہ اُف! وہ حادثہ ہُوا تھا میرے ساتھ۔ سینے میں بھی چوٹ لگی تھی، کبھی کبھی سال دو سال میں ایک آدھ بار یہ درد اُبھر آتا ہے۔ سُنو حِنا! سُنو تمہیں تکلیف تو ہوگی۔ ایک تھوڑا سا پانی گرم کرکے ربر کی بوتل میں۔ کیا بوتل موجود ہے؟"

"اوہ! ہاں کیا سِنکائی کرنی ہے؟"

"ہاں بس اُسی سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔" ثاقب نے درد بھرے لہجے میں کہا اور حِنا برق رفتاری سے باہر نکل آئی۔

ساری باتیں اپنی جگہ۔ یہ تو انسانی ہمدردی کے طور پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جس جذبے کے تحت وہ کام کر رہی تھی اُس میں صرف انسانی ہمدردی ہی شامل نہیں تھی۔ پانی گرم کرنے کے بعد وہ برق رفتاری سے بوتل میں بھر کر لے آئی اور اُس کے بعد اُس نے ثاقب سے کہا۔

"سیدھے ہو جاؤ۔"

ثاقب نے کروٹ بدل لی تھی حِنا نے اُس کے سینے پر پانی کی بوتل رکھ دی اور اُسے اپنے ہاتھوں سے دبانے لگی۔ تب اُس نے ثاقب کی آنکھوں میں دیکھا۔ آنکھوں کے دونوں سمت آنسو بہہ رہے تھے، حِنا نے ایک لمحے کے لئے اِن آنسوؤں کو دیکھا۔ اور نہ جانے کیوں اُس کے حلق میں ایک گولا سا آپھنسا، دِل کے اندر ایک دم سے کچھ ہُوا تھا۔ ثاقب کی آنکھوں سے آنسو اُبلتے رہے اور حِنا اُنہیں دیکھتی رہی ثاقب نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ لیکن بند آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی روانی نہیں رُک رہی تھی۔ اُس نے آہستہ سے پُوچھا۔

"تکلیف کم نہیں ہو رہی۔ میرا خیال ہے میں ڈاکٹر کو بُلا لیتی ہُوں۔"

"نہیں حِنا! پلیز نہیں... پلیز نہیں" ثاقب نے ہونٹ بھینچتے ہُوئے کہا، پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ربر کی بوتل پر رکھ لئے۔

حِنا کے ہاتھ خود بخود ہٹ گئے تھے۔ ثاقب نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ لیکن بند آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی ہوئی تھی جو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی۔

حِنا اُسے دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی اور پھر اُس کے وجُود میں ایک بھونچال سا پیدا ہوگیا۔ وہ یکبارگی ماضی میں لَوٹ گئی۔ مُسکراتا ہُوا شوخ ثاقب... دلنشیں آواز میں اپنی تازہ غزل پڑھتا ہُوا اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے کچھ بھی نہ ہُوا ہو۔ ابھی ابھی وہ ثاقب کے گھر آئی ہو۔ زندگی کے چند ہی ایام تو گزارے تھے اُنھوں نے شوہر اور بیوی کی حیثیت سے اور پھر حالات نے اچانک ہی اُن کی گردن دبالی جو کچھ ثاقب نے کہا تھا ممکن ہے سچ ہی ہو۔ شاعر ہے۔ حسّاس ہے۔ زندگی کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا اور اُس کی بھُول بھُلیوں میں پھنس کر خود کو کھو بیٹھا۔ کیا واقعی وہ اسی سُلوک کا مستحق ہے؟ کیا جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہے؟

وہ ثاقب کی آنکھوں سے بہتے ہُوئے آنسو دیکھتی رہی اور اُس کے ذہن میں گڑگڑاہٹ ہوتی رہی ثاقب... ثاقب اُس کا محبوب... اُس کا شوہر... اُس کی زندگی، کچھ بھی کیا ہے اُس نے، کیا وہ قابلِ معافی نہیں ہے؟ چند لمحات اسی طرح گزر گئے۔ اُس کے بعد آہستہ سے اُٹھی اور اُس نے بڑی محبت سے ثاقب کے جُوتے کے بند کھولے اور اُنھیں اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ ثاقب کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے کُھلیں۔ وہ حِنا کو دیکھتی رہیں اور پھر اُس کے مُنہ سے رُندھی ہُوئی آواز نکلی۔

"معاف کر دو یار۔ ایک بار معاف کر دو حِنا۔ سچ جانو جان بُوجھ کر یہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ سچ مان لو حِنا۔ میں جھُوٹ نہیں بول رہا۔ جھُوٹ نہیں بول رہا۔ جھُوٹ نہیں بول رہا"

وہ بے اختیار ہوگئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے ثاقب کا سر پکڑ کر اُٹھایا اور اُسے پوری قوت سے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ ثاقب کا درد جیسے ایک دم سے ختم ہوگیا ہو۔ وہ حِنا کے بازوؤں میں سکون کی سانسیں لیتا رہا۔ گہری گہری سانسیں۔

اور حِنا... حِنا کا دِل دُھل گیا۔ آئینے کی طرح شفّاف ہوگیا۔ ہاں بالآخر وہ اُس کی بیوی ہے۔ اور وہ... وہ اُس کا شوہر ہی نہیں محبوب بھی ہے۔ نہ جانے کب سے یہ جذبات یہ میں مُردہ ہوگئے تھے لیکن آج جاگے تو ایسے جاگے کہ ایک لمحے کے لئے اُس کا سر اپنے آپ سے جُدا کرنے کو جی نہ چاہا، بہت دیر اسی طرح گزر گئی پھر حِنا نے پُوچھا۔

"درد رُک گیا؟"

"ختم ہوگیا" ثاقب نے جواب دیا اور حِنا نے اُس کا سر ہٹا کر سامنے کر لیا۔

دیر تک وہ اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔

"مجھے یقین تھا حِنا۔ مجھے یقین تھا۔ سزا پوری ہو جائے گی۔ کیا سزا پوری ہوگئی حِنا؟"

"سزا پوری ہوگئی" حِنا نے آہستہ سے کہا۔

"اب کچھ نہ کہو حِنا۔ کچھ بھی مت کہو۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کے ازالے کا موقعہ دو۔ میں... میں بے قصُور ہوتے ہُوئے بھی شرمندہ ہُوں حِنا۔ یقین کرو... یقین کرو جو میں نے تم سے کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ میں بے قصُور ہوتے ہُوئے بھی شرمندہ ہُوں۔ معاف کر دیا ہے تم نے تو اور کچھ مت کہو پلیز کچھ اور نہ کہو"

"ہُوں! ٹھیک ہے ثاقب جانے دو، سب ٹھیک ہے۔ اُٹھو آؤ باہر چلتے ہیں۔ درد واقعی ختم ہوگیا ہے یا ہے؟ ڈاکٹر کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کرتے؟"

"کبھی کبھی یہ درد اُٹھ آتا ہے۔ میں نے ایک دو بار ڈاکٹر کو دِکھایا۔ اُس نے کہا اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، کبھی کبھی مَسلز اکڑ جاتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد خود ہی اعتدال پر آجاتے ہیں۔ کسی دوا کے لئے منع کر دیا تھا ڈاکٹر نے"

"چلو، پھر اُٹھو لباس تبدیل کر لو" حِنا نے کہا، پھر حِنا نے اُسے لباس دے دیا۔ ثاقب کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لان پر نکل آئے۔ لان پر پڑی ہُوئی کرسیوں میں سے ایک پر ثاقب بیٹھ گیا اور حِنا آسمان کی جانب دیکھنے لگی، پھر بولی۔

"رِدا نہیں آئی ابھی۔ بادل گہرے ہوتے جا رہے ہیں"

ثاقب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ عجیب سی نِگاہوں سے حِنا کو دیکھتا رہا تھا۔

"کافی کے لئے کہہ کر آتی ہُوں۔ بادلوں کی چھاؤں میں کافی بہت عُمدہ لگے گی" وہ ثاقب کے جواب کا انتظار کئے بغیر اندر چلی گئی۔ ثاقب اُسے دیکھتا رہا تھا خود حِنا کی کیفیت بھی بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں پھُول رہے تھے۔ دِل میں خُوشیوں کے طوفان اُمڈ رہے تھے ثاقب... ثاقب واپس آگیا تھا ثاقب واپس آگیا تھا۔ اُس کا محبوب... اُس کا شوہر ثاقب تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آئی۔ ساتھ میں کافی کی ٹرالی تھی اور اُس پر خشک میوے رکھے ہُوئے تھے۔ اُس نے ٹرالی ثاقب کے سامنے رکھ دی اور خود اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے اندر کتنا ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے حِنا"

"نہیں ہونا چاہئیے تھا؟" حِنا نے سوال کیا۔

"نہیں"

"تم... تم سدا کے لاأبالی انسان ہو۔ بس منع کر چکے ہو چنانچہ کوئی ایسی بات مت کرو جس کا جواب دینے کے لئے مجبُور ہو جاؤں"

"تم نے خلُوصِ دِل سے معاف کر دیا ہے مجھے حِنا؟"

"ہاں! میں فیصلے کرنے کی عادی ہوں۔ فیصلہ کر لیا تو... تو اُس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئیے تمھیں"

"بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے حِنا لیکن خوف بھی محسُوس ہوتا ہے کہ کہیں رُخ ماضی کی جانب نہ پلٹ جائے"

"رِدا کے بارے میں گفتگو کرو۔ کیسی لگی رِدا تمھیں؟"

"بدنصیب ہُوں میں کہ اِتنے عرصہ اُس سے دُور رہا" ثاقب نے جواب دیا۔

"بہت پیاری ہے وہ۔ بہت ہی پیاری ہے مجھے"

"ہاں اُس کا احسان ہے مجھ پر کہ اُس نے میری حِنا مجھے واپس دے دی۔ حِنا اب میں غزل نہیں کہوں گا میں شاعری ترک کر رہا ہُوں"

"ہاں ثاقب تخیل کی دُنیا حقیقت کی دُنیا سے بہت مختلف ہے۔ اِس دُنیا میں تخیل کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ تم حقیقت کی دُنیا میں آؤ۔ اپنی ذِمّہ داریاں سنبھالو"

"شاید اب تمھیں مجھ سے شکایت نہ ہو حِنا" ثاقب نے جواب دیا اور اُسی وقت دونوں کی نِگاہیں سامنے کی جانب اُٹھ گئیں۔

رِدا کی کار اندر داخل ہو رہی تھی۔ لیکن وہ پورچ میں جانے کے بجائے گیٹ کے پاس ہی رُک گئی۔ رِدا اسٹیرنگ پر بیٹھی حیرت زدہ نِگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ ایک تبدیلی کا احساس فوراً ہی ہوگیا تھا ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا کہ اُس کی غیر موجودگی میں یہ دونوں اِتنی یگانگت سے آمنے سامنے بیٹھے ہُوں۔ یقیناً کچھ ہوگیا تھا۔ اور اگر وہ کچھ ہوگیا تھا جو اُس نے سوچا ہے تو... تو اُس کی زندگی میں مسرتیں ہی مسرتیں بھر جائیں گی۔ وہ وہیں گاڑی کھڑی کر کے نیچے اُتر آئی اور حیران سی نِگاہوں سے ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگی۔ دونوں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ رِدا آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی اُن کے قریب پہنچ گئی۔

"میں کسی غلط گھر میں تو نہیں گھُس آئی ہُوں؟ ماں اور باپ تو وہی لگتے ہیں مگر... مگر یہ سب کچھ..."

"آؤ تمہارا پروگرام ختم ہوگیا؟"

"گولی ماریں پروگرام کو... یہ بتائیے یہ سب کچھ کیا ہے؟"

"کہاں بھئی... کہاں کی بات کر رہی ہو رِدا؟"

"آپ ابّو آپ... امّی آپ..."

"ہاں رِدا میرے اور ثاقب کے درمیان صُلح ہوگئی ہے"

رِدا نے ایک زور دار نعرہ لگایا اور ایک ہی جست میں اُن دونوں کے قریب پہنچ گئی۔ مسرّت سے دیوانی ہو رہی تھی وہ۔ عام طور سے غیر سنجیدہ نہیں تھی۔ لیکن اِس وقت اُس میں بچّوں کی سی شوخی آگئی تھی۔ اُس نے چٹاخ پٹاخ کئی پیار ماں کو کئے باپ کو کئے اور پھر مسرّت سے پاگل ہوتی ہُوئی بولی۔

"اوہ میرے خُدا... اوہ میرے خُدا مجھے وہ مِل گیا، جس کی میں نہ جانے کب سے طالب تھی، امّی... امّی آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ابّو کو معاف کر کے مجھ پر بھی احسان کیا ہے اور خواتین وحضرات یعنی خاتون اور حضرت، رِدا اِس خوشی میں اپنی طرف سے اعلان کرتی ہے کہ آج کا کھانا گھر سے باہر کھایا جائے گا۔ ابھی... ابھی تھوڑی دیر کے بعد دیکھئے بادل کتنے خوبصُورت لگ رہے ہیں۔ ہم بادلوں کی چھاؤں میں سیر کریں گے۔ سڑکوں پر گھُومتے پھریں گے رات ہونے تک! خُدا کرے بارش ہو جائے اور یہ بھی سُن لیجئے کہ آپ دونوں حضرات پچھلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور مس رِدا ثاقب ڈرائیو کریں گی۔ جی ہاں آج کے دِن مس رِدا ثاقب نے اپنے آپ کو آپ کے سامنے ڈرائیور کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔ جلدی تیار ہو جائیے۔ یہ موقعہ بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔ بھئی آئیے آپ لوگ اندر کیوں نہیں آ رہے ہیں؟" رِدا اُن دونوں کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اندر گھسیٹنے لگی۔ حِنا کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

رِدا کی خُوشیاں اُسے دِل وجان سے عزیز تھیں اور آج... آج اُسے دُو اپنے نظر آ رہے تھے۔ رِدا اور ثاقب۔ ثاقب اور رِدا۔

گہری تاریک رات کا بیکراں سناٹا چاروں طرف ایک جامد خاموشی۔ کھڑکی سے باہر دُنیا کی ہر شئے معدوم جیسے اِس کائنات میں زندگی باقی نہ رہی ہو۔ جیسے اِس جامد تاریکی کے سواد دُنیا میں کچھ بھی نہ رہا ہو۔ ہاں ٹرین کی مخصوص آواز عجیب کہانیاں سُناتی ہُوئی ایک انوکھا ردھم اور کمپارٹمنٹ میں سوتے ہُوئے لوگ۔ مختلف انداز میں کہیں کہیں کھانسی کی ہلکی سی آواز اور بس !

تیمور سو رہا تھا صرف رُدا تھی جو چھت میں لگے ہُوئے مدھم سے بلب کی روشنی میں اِس ڈائری کے سحر میں گرفتار تھی۔ یہ تحریر نہیں تھی بلکہ کسی ہپناٹسٹ کی آنکھ تھی جس نے اُسے مسحور کر دیا تھا اور وہ اِس کے طلسم سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ حالانکہ آنکھیں دُکھ گئی تھیں۔ حلقوں میں ہلکا سا درد شروع ہوگیا تھا لیکن اِس تحریر نے اُسے خود میں جکڑ لیا تھا۔ انوکھی تحریر تھی یہ۔ دُکھی ہُوئی آنکھوں کے باوجود۔ ماحول کا جائزہ لینے کے باوجود وہ اِس کے صفحات سے نہیں ہٹنا چاہتی تھی جو کچھ اِس میں تھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ جو کہانی سینوں میں دفن ہوگئی ہو وہ الفاظ کی صورت میں کیسے اُبھر آئی ؟ یہ طلسم اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ہر صفحے کو ختم کرنے کے بعد وہ یہ سوچتی کہ ڈائری اپنے ہاتھ سے رکھ دے لیکن یہ اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ تحریر اُسے آواز دے رہی تھی اور وہ اُس میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے ہوش و حواس اُس کے اپنے نہ تھے بلکہ سب کچھ ... سب کچھ اِس کتاب میں مُدغم ہوگیا تھا یہاں تک کہ اُس کا اپنا وجود بھی۔ اُس کی نِگاہیں پھر آگے کی تحریر پر دوڑنے لگیں۔

ثاقب ... رُدا ... حِنا ! یہ کردار پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے۔ بولتے مسکراتے آگئے۔

حِنا نے ثاقب کو اپنا لیا تھا۔ رُدا کو جیسے جنّت مِل گئی تھی۔ سکون کی لامتناہی وادیاں جس میں ماں اور باپ دونوں تھے اور دونوں کی یگانگت لمحہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ رُدا بے چاری کیا جانتی کہ حِنا نے کِس طرح ٹُوٹ کر ثاقب کو چاہا ہے اِتنی قُربانیاں دی ہیں اُس کے لئے کہ اُس کا اپنا وجود ریزہ ریزہ ہوگیا نہ جانے کیا کیا چھوڑنا پڑا تھا اُسے ثاقب کے لئے ... اور ایک قُربانی تو سب قُربانیوں پر بھاری تھی۔ آفندی صاحب جیسا باپ، جس نے ماں کی کمی بھی ہمیشہ پُوری کی تھی، حِنا نے چھوڑ دیا تھا ثاقب کے لئے۔ دِل کے ہاتھوں وہ اِتنی ہی مجبور ہوگئی تھی کہ ثاقب کے علاوہ کائنات خالی کر دی تھی۔ اور پھر وہ ثاقب اُس کی کائنات خالی چھوڑ کر چلا گیا۔

حِنا پر جو کچھ نہ بیتی وہ کم تھی لیکن اب ثاقب واپس آگیا تھا اور حِنا نے شاید پہلی بار اپنی پوری عُمر میں خود کو توڑ دیا تھا۔ ہاں پہلی بار اُس سے پہلے جب اُس نے ثاقب کے لئے اپنی کائنات چھوڑی تھی تو وہ ٹُوٹی نہ تھی اور ثاقب کے چلے جانے کے بعد بھی اُس نے اپنے آپ کو برقرار رکھا تھا گو اُس کی شخصیت میں بہت سے بال پڑ گئے تھے لیکن اُس کے باوجود رُدا اُس کی زندگی میں تھی۔ اور اُس نے رُدا کے لئے خود کو جوڑ لیا تھا اور اب پہلی بار ثاقب کی محبت نے اُسے توڑا تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح محسوس کرتی تھی۔

ثاقب ایک بار پھر اُس کی زندگی پر چھا گیا تھا اور حِنا کی فرمائش پر اُس نے اپنی شاعری کا سِلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ رُدا تو تھی ہی اپنے باپ کی دیوانی۔ باپ کی ایک ایک ادا سے اُسے پیار تھا۔ زندگی کچھ یُوں مسرور ہوگئی تھی جیسے اب اُس میں خزاں کے لئے کوئی رخنہ باقی نہ رہ گیا ہو۔ رُدا بھی خوش تھی۔ حِنا بھی خوش تھی اور ثاقب اِن دونوں کا ممنونِ کرم تھا۔ اُس نے کبھی اپنی برتری کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ وہ ماں اور بیٹیوں کا تابع تھا۔ اُس نے کئی بار حِنا سے اِس سِلسلے میں مشورہ کیا تھا۔

" حِنا ! یہ ملازمت ایک عارضی حیثیت رکھتی ہے۔ تم یہ نہ سوچنا کہ میں نے اِس پر قناعت کر لی ہے۔ میرے شب و روز یہ سوچتے گُزر رہے ہیں کہ میں کوئی اور بہتر مقام حاصل کروں۔ تھوڑی سی جدوجہد تو کرنی ہی پڑے گی۔ لیکن حِنا میں اپنا وعدہ ضرور پُورا کروں گا۔"

حِنا مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ اب دِل شکنی کا کوئی لفظ ثاقب سے نہیں کہتی تھی۔ اپنا کام بدستور جاری تھا اور دفتری اوقات میں سب اپنے اپنے معمولات میں مصروف ہوجاتے۔ حِنا اپنے دفتر میں۔ ثاقب اپنے دفتر میں۔ رُدا کالج میں۔ اور اُس کے بعد سب سے پہلے رُدا ہی واپس آتی تھی۔

شام کو سب یکجا ہوجاتے تھے۔ شام کی چائے حِنا کے خُوب صورت لان پر پی جاتی تھی اور اُس کے بعد رات تک کے پروگرام ترتیب پا جاتے تھے، چھٹی کا دِن زیادہ تر سیر و سیاحت میں گُزرتا۔ رُدا کو اِس کے علاوہ اور کیا چاہیئے تھا ؛ اُسے یُوں لگتا تھا جیسے خوشیوں کے خزانے اُس پر کُھل گئے ہوں اور اب اِس دُنیا میں اُسے اور کسی شئے کی حاجت باقی نہ رہی ہو۔ ہاں حِنا کے دِل پر کبھی کبھی کچھ بوجھ آ پڑتا تھا اور وہ تھا آفندی صاحب کا خیال۔

بہرحال آفندی صاحب واپس آجائیں گے، اُنھیں اِس

مُعاملے میں کیسے شریک کیا جا سکتا ہے ؟ اِس خیال سے حِنا کبھی کبھی خوفزدہ ہو جایا کرتی تھی اور یہ ایک ایسا خیال تھا جسے وہ دوسروں پر ظاہر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ثاقب کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اُس نے واقعی اپنے آپ کو بالکل تبدیل کر دیا ہے، مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ اپنی تمام تنخواہ لا کر حِنا کے قدموں میں رکھ دیا کرتا تھا جب پہلی بار اُس نے ایسا کیا تو حِنا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

" نہیں ثاقب ! یہ تو میرا فرض ہے مجھے پُورا کرنے دو۔"

" کیا مطلب ؟"

" بھئی میں اپنی تنخواہ تمہیں دُوں گی۔ گھر کے مالک اب تم ہو۔ تم اپنے طور پر اِس گھر کے بارے میں فیصلے کرو گے۔"

ثاقب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے کسی قدر افسُردگی سے کہا۔

" نہیں حِنا ! یہ میری خوشی ہے۔ میں بدنصیب تمہیں اِس دُنیا میں وہ سب کچھ نہ دے سکا جس کا خواہش مند تھا تو میں اپنے حقُوق بھی برقرار رکھنے کا اہل نہیں ہُوں۔ یہ ذمّہ داریاں تم نے جس انداز میں سنبھالی ہیں۔ اُس میں تمہاری برتری کا اعتراف کرتا ہُوں اور اپنے آپ کو بھی تمہاری ہی تحویل میں دینا چاہتا ہُوں۔ جو کچھ کرو گی حِنا تم خود کرو گی۔ مجھے صرف ہدایات دیتی رہو اِسی میں مَیں خوش رہُوں گا۔"

" مگر ثاقب۔"

" نہیں حِنا ! یہ میری آرزُو ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم میری اِس آرزُو کو پامال نہیں کرو گی۔"

" تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تو تمہیں تمہارا مقام دے ہی چکی ہُوں۔" حِنا نے کہا اور وہ درحقیقت ثاقب کو اُس کا مقام دے چکی تھی۔ اب وہ دونوں ایک بیڈ رُوم میں ہوتے تھے اور رُدا کا بیڈ رُوم الگ تھا۔ اِس بیڈ رُوم میں حِنا نے ثاقب کو اپنی اُن طویل، تاریک، تنہا راتوں کی کہانی سُنائی تھی جو ثاقب کے بغیر اُس نے گُزاری تھیں اور ثاقب نے اپنا سینہ اُس کے لئے کُشادہ کر دیا تھا۔ وہ اُن تمام تنہائیوں کا حساب دے رہا تھا۔

وقت کے دھارے بڑے پُرسکون انداز میں بہہ رہے تھے۔ لیکن گردشِ چرخ تبدیلیوں کی خواہش مند ہوتی ہے اور یہ تبدیلیاں فطری حیثیت رکھتی ہیں۔ رُدا معمُول کے مطابق دوپہر کو آگئی تھی۔ حِنا بھی تھوڑی دیر پہلے پہنچی تھی ثاقب آنے والا تھا۔ باہر بادلوں بھرے آسمان کے نیچے رُدا کُرسیاں لگوا رہی تھی تاکہ شام کی چائے کا بندوبست کیا جا سکے، یہ معمُول سے مختلف نہیں تھا۔ کُرسیاں لگ گئیں۔ حِنا بھی تیار ہوکر آگئی تھی۔ اور اب وہ دونوں بیٹھی ثاقب کا انتظار کر رہی تھیں جو آج کچھ لیٹ ہوگیا تھا۔ دفعتاً ہی بنگلے کے دروازے پر کچھ آواز پیدا ہُوئی اور پھر دروازہ کُھل گیا جو کار اندر داخل ہُوئی تھی اُسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے حِنا کا دِل بند سا ہوگیا۔ رُدا اُچھل کر کھڑی ہوگئی تھی۔

" امّی ! نانا ابّو۔" اُس نے پُرمسرت لہجے میں کہا اور پھر کار کی جانب دوڑ پڑی۔

آفندی صاحب مُسکراتے ہُوئے کار سے نیچے اُتر رہے تھے۔ اور حِنا کا سر چکرایا جا رہا تھا۔ آفندی صاحب نے رُدا کی پیشانی چُومی۔ اُن کی کار بھری ہُوئی تھی نہ جانے کیا کیا الّم غلّم بھر لائے تھے وہ اِس کار میں۔ اُنھوں نے کار بھی پورچ میں نہیں کھڑی کی۔ بلکہ لان کے نزدیک ہی رُکوا دی تھی اور پھر اُنھوں نے حِنا کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ پھیلا دیئے حِنا اُن کی جانب بڑھی تو اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ آفندی صاحب نے اُسے سینے سے بھینچ لیا۔ ایک سمت رُدا تھی تو دوسری سمت حِنا۔ آفندی صاحب کی صحت پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی۔ اُن کا چہرہ سُرخ و سفید ہو رہا تھا اور وہ بڑے مسرور انداز میں مُسکرا رہے تھے۔

" نانا ابّو آپ اچانک آگئے۔ ہمیں اطلاع بھی نہ دی۔"

" اِس اچانک ملنے سے جو خوشی تمہیں ہُوئی ہوگی وہی میں تمہیں دینا چاہتا تھا۔"

" آپ کب آئے نانا ابّو ؟"

" آج ہی دوپہر کو دو بجے۔" آفندی صاحب نے جواب دیا۔

" بہت دِن لگائے آپ نے ممالکِ غیر میں۔"

" ہاں بھئی اِس بار ذرا لمبا ہی پروگرام بنا کر گئے تھے۔ صرف امریکہ ہی نہیں ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک، سویڈن، ناروے اور نہ جانے کہاں کہاں ؟ بڑی لمبی چوڑی سیر کی ہے ہم نے۔ اے تم اِدھر آؤ۔" اُنھوں نے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور ملازم قریب پہنچ گیا۔

" ذرا یہ سارا سامان نکال کر یہاں کُرسیوں کے پاس رکھ دو۔" آفندی صاحب بولے۔

" کیا ہے یہ نانا ابّو ؟"

" تمہارے لئے ہر مُلک کے تحفے خریدے ہیں ہم نے بھئی، بس ذرا دیکھو اور ہمیں بتاؤ کہ ہماری محنت بار آور ہُوئی یا نہیں ؟"

آفندی صاحب بھی بے حد مسرُور تھے۔

بظاہر حِنا بھی مُسکرا رہی تھی لیکن اُس کی مُسکراہٹ میں جو خوف چُھپا ہُوا تھا اُس کی کوئی مثال نہیں تھی معصوم رُدا نے ابھی

تک اس موضوع پر غور نہیں کیا تھا وہ تو بس اپنے نانا ابّو کے آجانے سے بہت خوش تھی اور پھر بچّوں ہی کی طرح وہ تحائف کے اس انبار کو دیکھتی رہی جو پہلے کار کے اندرونی حصّے میں بھرا ہُوا تھا اور اُس کے بعد اُس کی چوڑی ڈِکی سے نکالا گیا تھا۔

"ہائے نانا ابّو آپ تو یُوں لگتا ہے جیسے سارا یُورپ ہی خرید لائے۔"

"ارے بیٹے! بس کیا کیا کہیں تم سے۔ کیا کیا جی چاہتا تھا یُوں سوچتے تھے ہم کہ اپنی رِدا کے لئے واقعی یُورپ خرید لے جائیں لیکن بس ذرا اُس کا لانا مشکل تھا اب تم یہ بتاؤ کہ چائے کتنی دیر میں پلوا رہی ہو؟"

"بس نانا ابّو ابھی تھوڑی دیر میں۔" رِدا نے کہا اور پھر ایک دم اُس کا دِل دھک سے ہوگیا۔

وہ یہ کہنے جا رہی تھی کہ ابّو آجائیں۔ اُس نے سہمی ہُوئی نگاہوں سے حِنا کو دیکھا اور ایک لمحے میں اُسے صُورتِ حال کا اندازہ ہو گیا۔ واقعی خوشی کے عالم میں ابھی اُس نے ثاقب کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ خود بھی کش مکش کا شکار ہوگئی۔ ثاقب بس آنے ہی والا تھا اور اِس دوران۔

اِس دوران میں وہ کِن الفاظ میں اپنے نانا ابّو کو اِس بارے میں بتائے اُدھر آفندی صاحب بچّے بنے ہُوئے تھے۔ وہ تحفوں کے پیکٹ کھول رہے تھے۔ اعلیٰ درجے کے لباس ... طرح طرح کے ڈیکوریشن پیس اور اُس کے بعد کھلونے۔ ہنستے بولتے، مُسکراتے۔ شرارتیں کرتے کھلونے۔

رِدا کے ہونٹوں پر ایک لمحے کے لئے مُسکراہٹ آئی لیکن دوسرے لمحے یہ مُسکراہٹ سُکڑ گئی۔ اُس نے مدّھم سے لہجے میں کہا۔

"نانا ابّو! آپ میرے لئے کھلونے بھی لائے ہیں؟"

"تو اور کیا بھئی۔ کھلونوں کا دَور تمھاری امّی نے گزار دیا۔ ہم کیا کریں! لیکن اپنے جذبات سے مجبُور ہوگئے اور اب تم اِن کھلونوں سے کھیلو گی۔" آفندی صاحب نے کہا۔ لیکن رِدا کا بدن بھی ہَولے ہَولے کانپ رہا تھا۔

ایک لمحہ مِل جائے تو ماں سے اِس سلسلے میں سوال کرے کہ ثاقب کا تعارف نانا ابّو سے کیسے کرایا جائے؟ لیکن بھلا اِس کا موقعہ کہاں تھا، آفندی صاحب نے پھر فرمائش کی۔

"بھئی چائے میں دیر ہو رہی ہے۔ ہم تو یہ فیصلہ کرکے گھر سے نکلے تھے کہ چائے فوراً ہی جا کر پیئں گے۔ رِدا بیٹے چائے کیوں نہیں منگوا رہیں؟"

"بس ابھی... بس ابھی نانا ابّو۔" رِدا نے مدّھم سی آواز میں کہا اور پھر دھڑکنیں بند ہوگئیں۔ ثاقب آ رہا تھا۔

ثاقب گیٹ سے اندر داخل ہوگیا۔ آفندی صاحب کا رُخ ابھی اُس جانب نہیں ہُوا تھا۔ وہ ملازم سے اپنی نگرانی میں کھلونے واپس پیک کروا رہے تھے ثاقب چند قدم آگے بڑھا اور پھر ٹھٹھک گیا۔ آفندی صاحب نے نہ جانے کیوں رِدا اور حِنا کی صُورت دیکھی۔ اُن دونوں کی نِگاہیں ثاقب کی جانب مرکوز تھیں۔ ثاقب خود بھی کچھ چور سا ہوگیا تھا۔ تب آفندی صاحب نے پلٹ کر دیکھا اور پھر پلکیں جھپکا جھپکا کر ثاقب کو دیکھنے لگے غالباً وہ اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں اِس وقت ایک کھلونا تھا جو اُن کے ہاتھ سے گرا تو رِدا اور حِنا جان لیا کہ اُنھوں نے ثاقب کو پہچان لیا ہے۔ اُنھوں نے پریشان نِگاہوں سے حِنا کی طرف دیکھا اور حِنا کی گردن جُھک گئی۔ پھر اُن کی نِگاہیں رِدا کی جانب اُٹھیں تو رِدا نے ہمّت کرکے کہا۔

"نانا ابّو یہ... یہ میرے ابّو ہیں۔ آپ تو اِنھیں جانتے ہیں نا! یہ میرے ابّو ہیں۔"

آفندی صاحب نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ اُن کے مُنہ سے آواز نہیں نِکل سکی تھی۔ ثاقب نے چند قدم آگے بڑھائے اور اُس کے بعد آفندی صاحب کے سامنے پہنچ گیا۔ اُس نے نہایت ادب سے اُنھیں سلام کیا تھا۔ آفندی صاحب جواب بھی نہ دے سکے، اُن کی نِگاہیں بار بار رِدا اور حِنا کی جانب اُٹھ رہی تھیں رِدا نے ہی خود کو سنبھالا۔ حِنا کا تو جیسے پورے بدن کا خُون خُشک ہو گیا تھا۔ رِدا کہنے لگی۔

"نانا ابّو... ابّو غیر ممالک گئے تھے، وہاں اُن کے ساتھ بہت سے حادثات پیش آگئے اور طویل عرصے تک وہ یہاں نہ آسکے۔ پھر وہ یہاں آئے تو امّی اُن سے ناراض رہیں۔ مگر میں نے... میں نے نانا ابّو اِن دونوں کے درمیان صُلح کرادی۔ نانا ابّو اب آپ بھی میرے ابّو کو گلے لگا لیجئے۔ وہ میرے ابّو ہیں اور میں آپ کی بیٹی، نانا ابّو۔ آپ میرے ابّو کو بھی گلے لگا لیجئے۔"

"آپ کے مزاج کیسے ہیں آفندی صاحب؟" ثاقب نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

لیکن آفندی صاحب ساکت و جامد کھڑے رہے تھے۔ اُنھوں نے چند لمحات کے بعد گردن ہلائی اور پھیکے سے لہجے میں کہا۔

"تمھیں یہ تحائف پسند آئے رِدا؟"

"بہت پیارے ہیں نانا ابّو۔ آیئے بیٹھئے ناں آپ۔"

"نہیں رِدا بیٹے! میں کچھ مصرُوف ہُوں۔ جانا چاہتا ہُوں۔"

"نانا ابّو۔"

"خُدا حافظ۔" آفندی صاحب نے کہا اور تیز تیز قدموں سے اپنی کار کی جانب بڑھ گئے۔

"نانا ابّو... نانا ابّو۔" رِدا اُنھیں پکارتی رہ گئی لیکن آفندی صاحب کار ریورس کرکے گیٹ تک لے گئے اور پھر کُھلے ہُوئے گیٹ سے اُن کی کار باہر نکل گئی۔

ثاقب، رِدا، اور حِنا سکتے کے عالم میں کھڑے جاتی ہُوئی کار کو دیکھ رہے تھے۔ بہت دیر تک کِسی کے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ تب ثاقب ایک گہری سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حِنا ابھی تک اپنی جگہ کھڑی تھی رِدا نے کہا۔

"بیٹھ جایئے امّی۔"

"اوں۔" حِنا چونک پڑی اور پھر وہ کرسی پر آ بیٹھی۔

ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہُوا لے آیا اور اُس نے سب کے سامنے چائے سرو کردی۔ رِدا بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی اُس کے چہرے پر گہری فِکرمندی کے آثار تھے۔ ثاقب نے رِدا سے کہا۔

"یہ... یہ اچھا نہ ہُوا رِدا۔ یہ تو اچھا نہ ہُوا۔"

رِدا نے چونک کر ثاقب کو دیکھا۔ پھر حِنا کو دیکھنے لگی۔

"امّی! آپ اِتنی فِکرمند نہ ہُوں۔ میں اِس ذِمّہ داری کو قبُول کرتی ہُوں۔ میں نانا ابّو کو مناؤں گی۔ یہ کام بھی میں آپ کو کرکے دِکھادُوں گی امّی۔ آپ لوگ اطمینان رکھیئے۔"

حِنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ثاقب آہستہ سے بولا۔

"میری بدنصیبی حِنا کو کبھی سکُون سے نہ رہنے دے گی۔"

"نہیں ابّو! اِنسان عجیب و غریب شے ہے۔ اپنے جذبوں کو وہ اِس قدر شدید کرلیتا ہے کہ بعض اوقات اُسے اپنے نفع نقصان کا احساس بھی نہیں رہتا۔ نانا ابّو بہت سمجھدار ہیں۔ بے شک وہ شِدّت میں۔ اور پھر چونکہ وہ اچانک آگئے اگر پہلے سے ہمیں ان کی آمد کا علم ہو جاتا تو ہم گراؤنڈ تیار کرلیتے۔ اچانک ہی یہ سب کچھ دیکھ کر شاید وہ برداشت نہیں کرسکے۔ بہرحال ہم سے ایک کہانی وابستہ ہے اور ہم اِس کہانی کو جھٹلا نہیں سکتے۔ لیکن ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے اگر حل نہ ہو تو مسئلہ ہی نہ ہو۔ آپ لوگ مطمئن ہو جائیں یہ ذِمّہ داری میں قبُول کرتی ہوں نانا جان کو میں سمجھا بُجھا لُوں گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ابّو آپ بھی بالکل آزردہ نہ ہوں اور امّی آپ اپنے چہرے سے یہ رنج دور کرلیں آپ لوگوں کو مجھ پر اعتماد رکھنا چاہیئے۔ میں... میں سب ٹھیک کرلُوں گی۔ آپ سے وعدہ کرتی ہُوں کہ اِس مسئلے کو میں بالکل آرام سے حل کرلُوں گی۔"

"نہیں رِدا، ممکن نہیں ہے۔" حِنا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میں اِس ناممکن کو ممکن بنادُوں گی امّی مجھے خود پر بہت اعتماد ہے۔ آپ دیکھئے جو کچھ میں کہہ رہی ہُوں وہ کرکے نہ دکھادُوں تو رِدا نام نہیں۔ آپ لوگ چائے پیجئے مجھے خود دُکھ ہے۔ کہ نانا ابّو ہمارے ساتھ چائے نہ پی سکے جب کہ وہ چائے کا تقاضہ کرتے ہوئے آئے تھے۔"

اُس کے بعد تو چائے صرف زہر مار کی گئی تھی۔ کِس کا جی چاہ رہا تھا کہ بولے۔ رِدا خود ہی اُن دونوں کو باتیں کرنے پر اُکسا رہی تھی اور پھر اُس نے کہا۔

"میرا خیال ہے امّی میں وقت نہ ضائع کروں۔ میں ابھی نانا ابّو کے پاس جاؤں گی۔"

حِنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ثاقب بھی خاموش تھا۔

تھوڑی دیر بعد رِدا اندر چلی گئی۔ وہ غالباً لباس تبدیل کرنے گئی تھی حِنا نے ملازموں سے کہا کہ یہ تمام پیکٹ اندر رکھ دیئے جائیں اور اُس کے بعد ثاقب کے ساتھ کمرے کی جانب چل پڑی۔ ثاقب خود پژمُردہ نظر آ رہا تھا۔ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اِس سلسلے میں حِنا... اِس سلسلے میں تم مجھے جو حکم دو گی. میں اُسے پُورا کرنا اپنا فرض سمجھوں گا جس طرح چاہو مجھے آفندی صاحب کے سامنے پیش کرو۔ میں اُن سے ہر طرح کی معافی مانگنے کے لئے تیار ہُوں جو کچھ تم کہو گی حِنا مجھے اُس سے اِنکار نہیں ہوگا۔ میں تمھاری خوشی کے لئے آفندی صاحب کے قدموں تک میں گِرنے کے لئے تیار ہُوں۔"

حِنا نے ایک نِگاہ ثاقب کو دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

"ابّو... ابّو بہت سخت گیر ہیں ثاقب۔"

"حِنا! اِس کے لئے تم یُوں سمجھ لو کہ میں تمھارا محتاج ہُوں جو کچھ تم کہو گی اُس کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔ یہاں میں یہ نہیں سوچُوں گا کہ میری اپنی کوئی شخصیت ہے یا نہیں۔"

حِنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اندر آگئی۔ رِدا تیار ہو کر باہر نِکل رہی تھی۔ حِنا نے اُسے روکتے ہُوئے کہا۔

"تم جا رہی ہو رِدا؟"

"ہاں امّی! کیا نہ جاؤں؟"

"نہیں... نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہیں تمھیں ناکامی نہ ہو۔"

"رُدا ہے میرا نام سمجھیں آپ۔ ناکامی میرے قریب سے نہیں گزری۔ نانا ابّو کو رات ہی کو نہ لے آؤں تو آپ دیکھ لیجئے گا۔ رات کے کھانے پر آپ لوگ نانا ابّو کے ساتھ ہی ہوں گے۔" رُدا نے کہا اور مسکراتی ہُوئی باہر نکل گئی۔

بے شک نانا ابّو بے حد شفیق تھے بہت محبت کرتے تھے لیکن ماں اور نانا کے درمیان جو مسئلہ چل چکا تھا اُس سے بھی رُدا واقف تھی ماں تو خیر انتہا پسند تھی ہی لیکن کم نانا ابّو بھی نہ ہوں گے۔

وہ ایک اُمید لئے آفندی صاحب کی کوٹھی کی جانب چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی کار آفندی صاحب کی عظیم الشان کوٹھی میں داخل ہو رہی تھی۔ معمولات جُوں کے تُوں تھے کوئی ایسی خاص بات محسوس نہ ہوتی تھی۔ وہ اندر اُتری اور تھوڑی دیر کے بعد آفندی صاحب کے بیڈ رُوم تک پہنچ گئی۔ ملازم اُسے اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ کوئی دِقت نہ ہُوئی اُسے۔ اُس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ آفندی صاحب ایک گاؤن میں لپٹے ہُوئے مسہری پر نیم دراز تھے اُن کا سر تکیے سے لگا ہُوا تھا اور اُن کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ رُدا کو دیکھ کر وہ چونکے، سنبھلے اور اُس کے بعد نارمل ہو گئے۔

"آؤ رُدا۔" انھوں نے بھاری لہجے میں کہا۔ اور رُدا اُن کے سامنے پہنچ گئی پھر وہ اُن کی مسہری پر پائنتی بیٹھ گئی تھی۔

"نانا ابّو۔" اُس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں بیٹے کیا بات ہے؟"

"نانا ابّو! آپ اِس طرح کیوں چلے آئے؟"

"رُدا! وہ جگہ جہاں ثاقب موجود ہو میرے لئے ناموزوں ہے۔"

"نانا ابّو! آپ کو اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی ناں؟"

"حنا سے...؟" آفندی صاحب نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

"جی نانا ابّو، ایک ہی تو بیٹی ہے آپ کی۔"

"ہاں ہے۔ تھی نہیں ہے۔" آفندی صاحب پُختہ لہجے میں بولے۔

"اور آپ کی بیٹی بھی آپ کو بہت چاہتی تھی نانا ابّو؟"

"ہاں میں اِس سے انکار نہیں کروں گا۔ حنا بھی کسی زمانے میں مجھے بہت چاہتی تھی۔"

"خیر کسی زمانے کی بات چھوڑیئے نانا ابّو۔ میں اِس زمانے کی بات کر رہی ہُوں۔ نانا ابّو میرے دِل میں بھی اپنے ابّو کی بہت چاہت ہے۔ بیٹیوں کے لئے باپ کا تصوّر بہت عجیب ہوتا ہے۔

بس یُوں سمجھ لیجئے نانا ابّو وہ ایک بند کوٹھری میں بیٹھی ہوں لیکن سر پر باپ کا سایہ نہ ہو تو وہ کوٹھری اُنھیں کھلا آسمان محسوس ہوتی ہے۔

نانا ابّو جب تک ابّو کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا آپ یقین کیجئے میں ایک عجیب حسرت کا شکار رہتی تھی لیکن محسوس ہوتا تھا جیسے میرے سر پر کھلا آسمان ہے۔ مجھے اپنے ابّو کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا لیکن پھر ایک دِن ابّو اچانک آگئے، امّی نے اُنھیں نہایت سختی سے مُسترد کر دیا اور اُن کا رویّہ دُرشت رہا ابّو کے ساتھ۔ لیکن نانا ابّو! میں نے اپنے ابّو کو دیکھا تو میرے دل میں جیسے ہزاروں کنول کھِل گئے۔ میں مرمٹی اپنے ابّو پر۔ میں چُھپ چُھپ کر اُن سے ملنے لگی۔ وہ ایک ہوٹل میں مقیم تھے، امّی کو مجھ پر شک ہُوا اُنھوں نے مجھ سے پُوچھا تو میں اُن کے قدموں میں گر پڑی۔ اور میں نے اُن سے کہا کہ وہ ابّو کو معاف کر دیں۔ ابّو بہت دِل گرفتہ تھے۔ اُنھوں نے ہمیں اپنی داستان سُنائی۔ وہ امّی کے لئے وہ سب کچھ حاصل کرنے گئے تھے جو امّی کو خوشیاں دے سکے۔ لیکن تقدیر نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ ایک حادثے کا شکار ہو کر وہ دماغی توازن کھو بیٹھے اور اُس کے بعد ایک ہسپتال میں اُنھوں نے نہ جانے کتنا وقت گزار دیا وہ زمانے بھر میں بھٹکتے رہے اور بالآخر جب اُن کے ہوش و حواس واپس آئے تو وہ ہماری تلاش میں چلتے ہُوئے یہاں تک آگئے۔

امّی کا غُصّہ اُن کی شِدّت اپنی جگہ درست تھی لیکن قصُور ابّو کا بھی نہیں تھا۔ اور میں نے بہت جدوجہد کی اِس سلسلے میں۔ اور ابّو کو امّی سے معافی دِلوا دی۔ امّی آپ کے لئے سخت پریشان تھیں اور وہ یہ بات جانتی تھیں کہ آپ اِس بات کو پسند نہیں کریں گے لیکن میں نے اُنھیں مجبُور کر دیا نانا ابّو۔ میں آپ سب کے درمیان ایک ایسی شخصیت ہُوں جو اپنے آپ منوا کر رہتی ہے۔ نانا ابّو آپ کے اِس وقت آجانے کے بعد گھر کی جو کیفیت ہو گئی آپ اُس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ میں... میں اِس دعوے کے ساتھ آپ کے پاس آئی ہُوں کہ میں آپ کو لے کر جاؤں گی۔ رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے نانا ابّو اور آپ... آپ میرے ابّو کو معاف کر دیں گے، جو کچھ بھی آپ کو شکایت ہے اُن سے آپ سب کچھ معاف کر دیں گے۔"

آفندی صاحب کے چہرے پر نرمی کے آثار پیدا ہوئے وہ ایک تلخ سی مُسکراہٹ کے ساتھ رُدا کو دیکھتے رہے رُدا خاموش ہُوئی تو اُنھوں نے کہا۔

"رُدا! میری بچّی، یہ سچ ہے کہ اِس کائنات میں حنا کے بعد میں نے تجھے سب سے زیادہ چاہا ہے۔ کاش میں تجھے یہ تیری خوشیاں واپس کر سکتا۔ کاش میں حنا کو اُس کے ارادے سے باز رکھ سکتا۔ اگر رُدا تم مجھے اِس دُنیا میں کوئی حیثیت دیتی ہو۔ اور ایک انسان سمجھتی ہو تو جو کچھ میں کہہ رہا ہُوں اُسے غور سے سُن لو۔ ثاقب کے بارے میں میرا نظریہ روزِ اوّل سے یہی تھا کہ وہ ایک نکما، ناکارہ، اور اوباش آدمی ہے۔ وہ ایک اچھا انسان ہو ہی نہیں سکتا۔ چاہے عُمر کی آخری سانس آجائے۔ وہ آج بھی وہی ہے۔ اپنے آپ پر لبادے ڈال لینے میں وہ ماہر ہے، شعر و شاعری سے الگ اُس کی کوئی دُنیا نہیں ہے اور وہ ہر چیز کو اُسی نِگاہ سے دیکھتا ہے۔ تمھاری ماں کو اُس نے صرف اِس لئے اپنایا تھا رُدا کہ اُس کے ذریعے وہ ایک پُرسکون زندگی حاصل کرے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر یہ پُرسکون زندگی اُسے حاصل ہو جاتی تو وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اُس نے تمھاری ماں کو محبت کا فریب دیا۔ ہو سکتا ہے اُس کے دل میں تمھاری ماں کے لئے گنجائش ہو لیکن رُدا! وہ ایک اچھا انسان کبھی نہیں بن سکتا کبھی نہیں۔

اور اِس کے بعد کسی بھی وقت یہ بات تم پر واضح ہو جائے گی کہ جس شخص کا نام ثاقب ہے وہ اندر سے کیا ہے رُدا! میں تمھارے لئے یہ کائنات چھوڑ سکتا ہُوں۔ تمھیں اپنا سب کچھ دے سکتا ہُوں۔ لیکن یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا کہ ثاقب کوئی قابلِ اعتماد شخصیت ہے۔ وہ ایک غلیظ انسان ہے اور ہمیشہ غلیظ رہے گا۔ چنانچہ میرے اپنے بھی کچھ اصُول ہیں رُدا۔ میں نے اُسے روزِ اوّل مُسترد کر دیا تھا اور شاید آخری سانس تک میں اُسے قبُول نہ کر سکوں۔ یہ میری مجبُوری ہے یُوں سمجھ لو یہ میری بیماری ہے رُدا۔ اور بیماری کو جب تک شفا نہ مِل جائے وہ بیماری رہتی ہے۔ جہاں تک رہا حنا کا سوال تو مجھے اُس سے شکایت ہے۔ مجھے اُس کے رویّے سے دُکھ ہے رُدا۔ تم خود سوچو۔ تم نے خود دیکھا ثاقب اُسے مجھ سے چھین کر ایک جھونپڑے میں لے گیا۔ اور حنا نے یہ سمجھا کہ وہ اِس جھونپڑے کو محل بنا دے گی۔ ثاقب کے ذریعے۔ وہ جھونپڑا... جھونپڑا ہی رہا اور جب ثاقب کو اُس کے مذموم مقاصد میں کامیابی نہ حاصل ہُوئی تو اُس نے حنا کو چھوڑ دیا۔ بہانہ کر کے یہاں سے فرار ہو گیا اُس نے جو کہانی تمھیں سُنائی ہے اگر تم اُس کا تجزیہ کرو گی تو ایک بات آفندی کا تجربہ سمجھ لو کہ وہ ساری کہانی جھوٹی نکلے گی۔ میں دُنیا کو تم سے بہت اچھی طرح جانتا ہُوں رُدا۔ ثاقب جیسے لوگ صرف نکمے اور ناکارہ ہو سکتے ہیں وہ کبھی کارآمد نہیں ہوتے اِن وقتی طور پر وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے کوئی بھی خول پہن لیں۔ لیکن جب وہ خول سے باہر آئیں گے تو وہی ہوں گے اُن میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔ بے شک تمھارے جذبات میرے اِن الفاظ سے مجروح ہو رہے ہوں گے لیکن میں اپنے تجربے کی نفی تو نہیں کر سکتا۔

میں حنا کی بات کر رہا تھا۔ ایک خوبصورت گھر کی تلاش میں اپنے باپ کی محبت کو چھوڑ کر چلی گئی اور اُس کے بعد وہ مایُوسیاں اُس کے سامنے آگئیں جن کی پیش گوئی میں نے کر دی تھی ثاقب اپنی جو کہانی لے کر آیا ہے حنا اُس سے متاثر ہو سکتی ہے میں نہیں ہُوا رُدا۔ اور نہ میں کبھی ہو سکتا ہُوں۔ ایک دِن ثاقب پھر واپس چلا جائے گا۔ جہاں تک حِنا کا تعلق ہے تو مجھے ایک بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ جب ثاقب چلا گیا اور حنا نے اپنے لئے ایک زندگی کا انتخاب کر لیا اور مجھے میری محبت اِس بات کے لئے مجبُور کرنے لگی کہ میں اب حنا کو سہارا دُوں تو میں خود ہی اپنی اَنا توڑ کر حنا کے پاس پہنچ گیا۔ خُدا کے فضل سے وہ اچھی زندگی گزار رہی تھی۔ اگر وہ انتہائی بے کسی کی زندگی گزار رہی ہوتی تو میرے یہ زخم اور زیادہ گہرے ہو جاتے۔ میں نے حنا سے کہا کہ اب سب کچھ چھوڑ کر میرے ساتھ واپس چلے اور رُدا اُس نے یہ تسلیم کیا کہ میرا تجربہ دُرست تھا ثاقب ایک غلط انسان تھا لیکن یہ سب کچھ تسلیم کرنے کے باوجود اُس نے اپنے اِس وقار کو برقرار رکھا کہ جس گھر کو وہ ایک بار ٹھکرا کر آچکی ہے اُس میں میری تمام تر محبتوں کے باوجود واپس جانا پسند نہیں کرے گی۔ مجھے بہت بُرا لگا تھا رُدا۔ اُس نے مجھے ایک باپ کی حیثیت نہیں دی۔ اُس نے ایک باپ کی محبت کو پامال کر دیا۔ ایک بار غلط فیصلہ کیا تھا اُس نے اور میں نے اُس کے اِس فیصلے کو باوجود اِس کے کہ اُس کے جانے کے بعد مجھے شدید پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، لوگوں میں مُنہ چُھپانا پڑا تھا مجھے نہ جانے کیا کیا بہانے تراشنے پڑے تھے لیکن میں نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ میں اُس کے لئے سب کچھ قربان کر چکا تھا۔ اپنی اَنا۔ اپنا وقار سب کچھ... لیکن اُس نے مجھے تسلیم نہ کیا۔ وہ اُن لمحات کو بھول گئی جب وہ ایک معصُوم سی بچّی تھی۔ مُنہ بسورتی ہُوئی اپنے آپ سے بے نیاز محبتوں کے اُن لمحات کو بھول کر اُس نے اپنی اَنا اپنے وقار کو برقرار رکھا اور مجھ بدنصیب نے اپنی محبت کے ہاتھوں شکست کھا کر بالآخر اُس کی یہ بات بھی تسلیم کر لی۔ وہ میرے ساتھ نہ گئی لیکن میں آتا رہا اِس لئے کہ اِس دُنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو اس کا عادی بھی بنالیا خود کو دھوکہ دینے کے لئے میں نے یہ احساس تراشا کہ بہر طور میری بیٹی پُر وقار ہے۔ اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اپنے ایک غلط فیصلے کو زندگی کی آخری سانس تک نبھا دینا چاہتی ہے۔ یہ بھی ایک باپ کی محبت تھی کہ اُس نے بیٹی کی اِس بے اعتنائی کو ایک دوسرا رُوپ دے دیا۔ میں نے اِس ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیا۔ اور بالآخر سب کچھ بھول گیا۔

لیکن لمحہ لمحہ یہ مجھ کو بتاتا تھا کہ حِنا مجھے اپنا باپ تو تسلیم کرتی ہے لیکن کوئی حق مجھے دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور اُس وقت جب میں امریکہ جا رہا تھا تو میرے دِل میں یہ شدید آرزو تھی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں مجھے اِس کا حق پہنچتا تھا رُدا، لیکن تمھاری ماں نے مجھ سے یہ حق بھی چھین لیا اور مجھے وہ حیثیت نہ دی جو مجھے ملنی چاہیئے تھی۔ میں نے اس پر بھی صبر کرلیا۔ لیکن اب جب کہ میں نے ثاقب کو اپنی آنکھوں سے اُس کے پاس دیکھا ہے اور اُسی حیثیت سے دیکھا ہے جو ثاقب کی اپنی حیثیت تھی تو پھر میں اپنے آپ کو کس خانے میں فِٹ کروں؟ رُدا! اِس سے زیادہ میں اپنی شخصیت کو نہیں کچل سکتا۔ میں آج اِس احساس کا شکار ہُوں کہ مجھے بہت پہلے اپنی جگہ دیکھ لینی چاہیئے تھی۔ اُس وقت جب حِنا نے میرے ساتھ گھر آنے سے اِنکار کر دیا تھا۔ وہ اُس کی اَنا تھی جس نے اُسے قائم رکھا تھا۔ لیکن اب ثاقب کیا چیز ہے؟ کیا اُس کے سامنے اُس کی اَنا اِتنی آسانی سے ٹُوٹ سکتی ہے تو اِس کا ایک ہی مطلب ہُوا رُدا۔ وہ یہ کہ میرا اور ثاقب کا فرق نمایاں ہے اور اِس کے بعد مجھے اپنے آپ کو اِس کے لئے تیار کرنا پڑے گا کہ اگر میری محبت، میری تڑپ سکون نہیں پاتی تو میں خود کو ثاقب کے سامنے حقیر کر دُوں۔ ہاں رُدا مجھے کم از کم اِس کے لئے کچھ وقت تو دو۔ انسان اپنے آپ کو قتل کرنے میں کچھ وقت تو لیتا ہے۔ مجھے وہ لمحات دو رُدا کہ میں اپنے آپ کو مار دُوں۔ میں تم سے اُس وقت کا طالب ہُوں میری بچّی، ہو سکتا ہے میری محبّتیں میرے وقار کے بُت کو پاش پاش کر دیں۔ ویسے بھی اب اِس بُت میں رہ کیا گیا ہے؛ کھوکھلا بے جان "! آفندی صاحب کی آواز لرز گئی۔

رُدا خاموشی سے اُنھیں دیکھ رہی تھی۔ آفندی صاحب کچھ دیر اِسی طرح بیٹھے رہے پھر اُنھوں نے کہا۔

" رُدا میری بچّی! جس شخص کا نام ثاقب ہے ناں' وہ تیرا باپ ہے۔ میں تیرے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہُوں اور خاص طور سے اِس لئے کہ تو بیٹی ہے۔ بیٹیاں نرم طبع ہوتی ہیں۔ اور باپ کے نام پر وہ کسی جلاّد کو بھی قبول کر سکتی ہیں کیونکہ اُن کے دِلوں میں باپ کے لئے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ ہر چند کہ تجربہ میرا نہیں ہے۔ لیکن میں دُنیا سے یہی سُن چکا ہُوں۔ ایک بات تو اپنے ذہن میں رکھ لے رُدا کہ جو شخص تجھے باپ کی حیثیت سے مِلا ہے وہ درحقیقت باپ نہیں ہے۔ وہ ایک دغاباز فریبی اور مکار شخص ہے اور اگر تُو نے اُس سے جذبات کے رشتے اُستوار کر لئے تو ایک دِن تجھے بھی اُسی غم سے دوچار ہونا پڑے گا جس غم سے حِنا ہُوئی تھی آج اگر وہ اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگ کر تم لوگوں سے آ مِلا ہے۔ تو میرا تجربہ کہتا ہے کہ اُس کے ذہن کی گہرائیوں میں کچھ اور ہے۔ وہ صاف دِل اور صاف طبیعت کا مالک کبھی نہیں ہو سکتا انسان سب کچھ بدل دیتا ہے لیکن اپنی فِطرت تبدیل نہیں کر سکتا۔ میرا مشورہ ہے رُدا کہ اُسے باپ کی حیثیت سے قبول کرکے جذبات کی اندھیری کھائی میں مت گرِنا۔ ایک فاصلہ رکھنا۔ ایک اِتنا فاصلہ جو تجھے موت کی طرف نہ لے جائے۔ اُس کا کام دھوکہ دینا ہے۔ وہ دھوکہ دے گا۔ یہ باتیں تجھے بے شک بُری لگ رہی ہوں گی۔ لیکن ایک بُوڑھے کی نصیحت سمجھ کر ذہن میں رکھ لینا، دِل چاہے تو اِس سے فائدہ بھی اُٹھا لینا "

" نہیں نانا ابو۔ ابّو ایسے نہیں ہیں۔ نانا ابو آپ مان لیں ابّو ایسے نہیں ہیں "رُدا نے روتے ہُوئے کہا۔

" میری بچّی! تیرے آنسُو میرے لئے بہت قیمتی ہیں۔ لیکن میں بدنصیب تو وہ ہُوں جو اَب آنسُو بھی نہیں بہا سکتا اِس لئے کہ بہت آنسُو بہا لئے ہیں میں نے اور اب میری آنکھیں خُشک ہوگئی ہیں "

" نانا ابو! تو آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گے؟"

" کہاں رُدا؟"

" ہمارے گھر "

" نہیں بیٹے! میں اِس کے لئے تجھ سے معافی چاہتا ہُوں اِس پاگل بُوڑھے کو معاف کر دینا یہ ممکن نہیں ہے " آفندی صاحب نے آخری لہجے میں کہا اور رُدا کو یہ احساس ہوگیا کہ اِس لہجے کے بعد سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

وہ تھوڑی دیر تک آفندی صاحب کے ساتھ بیٹھی رہی پھر بولی۔

" اچھا نانا ابو میں چلتی ہُوں "

. خُدا حافظ۔ میں بہت دُکھی ہُوں تمہارے لئے "

رُدا وہاں سے واپس پلٹ پڑی۔ لیکن اُس کے ذہن میں جوار بھاٹے اُٹھ رہے تھے۔ کیا کروں؟ بڑے اعتماد سے یہاں آئی تھی، بہت کچھ کہہ کر آئی تھی۔ میری ہی وجہ سے تو امّی نے ابّو کو تسلیم کیا۔ میری وجہ سے اُن کے ابّو پھر اُن سے چُھوٹ گئے۔ آفندی صاحب حِنا کے بارے میں مختلف انداز سے سوچ رہے تھے۔ لیکن اصلیت یہ نہیں تھی حِنا نے تو ہر طرح سے مداخلت کی تھی۔ کہ ثاقب اُس کے قریب نہ آنے پائے۔ یہ تو صرف میں ہی تھی۔ جس نے اُنھیں اِس حد تک مجبُور کر دیا تھا اور بالآخر وہ انسان تھیں ابّو کو اُنھوں نے مجبُوراً وہ حیثیت دے دی جو ابّو کی اصل حیثیت تھی۔ سب کچھ بھول کر۔ ہاں ابّو سے کوتاہیاں ضرور ہُوئی ہیں لیکن۔۔ لیکن وہ میرے باپ تو ہیں۔

رُدا راستے بھر سوچتی آئی اور جب وہ اپنے گھر میں داخل ہُوئی تو اُس کے ذہن میں ایک منصُوبہ آگیا تھا۔ حِنا اور ثاقب اُس کا اِنتظار کر رہے تھے۔ رُدا کو تنہا دیکھ کر اُنھیں صُورتِ حال کا اندازہ ہوگیا۔ حِنا نے خاموشی سے رُدا کی صُورت دیکھی اور رُدا اُن کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی۔

" تو وہ تیار نہیں ہُوئے؟"

" نہیں امّی! " رُدا نے جواب دیا اور حِنا خاموش ہوگئی۔ ثاقب بھی چور سا بنا بیٹھا تھا۔

دوسری صبح رُدا نے ناشتے کی میز پر کہا " امّی میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں جانتی ہُوں کہ میرا وجُود ہمیشہ آپ کے لئے تکلیف دِہ رہا ہے۔ لیکن اپنے اِس حق کو میں نہیں بھُول سکتی۔ اِس وقت میں اپنی ماں اور اپنے باپ کے سامنے ہُوں بچّے ماں باپ سے فرمائشیں کرتے ہیں۔ بے شک بعض فرمائشوں کو ٹال بھی دیا جاتا ہے لیکن اچھے ماں باپ کم از کم جائز فرمائشوں کو ٹالنا پسند نہیں کرتے "

" کیا بات ہے رُدا؟ کُھل کر کہو "

" امّی ہمیں یہ گھر چھوڑنا ہوگا "

" کیا "! حِنا کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔

" ہاں امّی اب ہم نانا ابو کے ساتھ رہیں گے "

" کیا "! حِنا نے پھر اُسی انداز میں کہا۔

" ہاں امّی۔ نانا ابو نے آپ سے کہا تھا ناں کہ آپ اُن کے گھر واپس چلی جائیں۔ آپ نے اِنکار کر دیا آپ نے کہا کہ جس جگہ کو آپ چھوڑ آئیں اُس جگہ دوبارہ جانا پسند نہیں کرتیں لیکن امّی اب آپ کو اپنا یہ فیصلہ بھی بدلنا پڑے گا "

حِنا سکتے کے سے عالم میں رُدا کو دیکھتی رہی۔ رُدا کی اِس بات سے اُس نے تمام مفہوم سمجھ لیا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھی سوچتی رہی اور پھر دیوانہ وار کھڑی ہوگئی۔

" ہاں رُدا میں تیار ہُوں۔ میں خلوصِ دل سے تیار ہُوں۔ ٹھیک ہے اب میں اپنے ڈیڈی کے گھر میں رہُوں گی۔ میں اُنھیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ چلو ثاقب تیار ہو جاؤ۔ ڈیڈی ہمارے ساتھ جو دِل چاہے سُلوک کریں۔ وہ ہمیں ٹھوکریں بھی لگائیں تو ہم اُس گھر کو نہیں چھوڑیں گے۔ میں۔۔۔ میں ڈیڈی سے کہوں گی میری اَنا ٹُوٹ گئی ہے۔ میں۔۔۔ میں اُن کے پاس رہنا چاہتی ہُوں۔ میں اُن کی خدمت گُزار رہ کر جینا چاہتی ہُوں۔ چلو رُدا دیر نہ کرو۔ جلدی کرو "

رُدا کے مایُوس دِل میں ایک بار پھر اُمیدوں کے کنول کِھل گئے تھے۔ مسرّت کے عالم میں وہ اِس طرح اُٹھی کہ گِرتے گِرتے بچی۔

" چلیئے امّی جلدی چلیئے۔ سامان کا کیا لینا؛ بعد میں بھی لے لیں گے۔ چلیئے جلدی چلیں۔ ہم۔۔ ہم بالآخر نانا ابو کو اِس کے لئے تیار کر ہی لیں گے کہ وہ ہمیں اپنی کوٹھی میں جگہ دے دیں۔ ہاں امّی! میں اُنھیں تیار کر لُوں گی۔ وہ بہت اچھے ہیں وہ بُرے انسان نہیں ہیں امّی۔ چلیئے۔۔ جلدی چلیئے "

اور تھوڑی دیر کے بعد رُدا اپنی کار ڈرائیو کر رہی تھی ثاقب اور حِنا پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہُوئے تھے۔

راستہ بڑی برق رفتاری سے طے ہُوا اور تھوڑی دیر بعد رُدا کی کار آفندی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوگئی دو تین ملازم کھڑے ہُوئے اُسے دیکھ رہے تھے۔ رُدا دیوانہ وار نیچے اُتری اور اُس نے ایک ملازم سے پُوچھا۔

" نانا ابو۔۔۔ نانا ابو کہاں ہیں؟ اندر ہیں ناں وہ؟"

" نہیں بی بی وہ کہیں گئے ہُوئے ہیں "

" کہاں؟" رُدا نے کہا۔

" پتہ نہیں بی بی! رات ہی کو اُنھوں نے اپنا سامان لیا۔ ہم لوگوں کو احتیاط سے رہنے کی ہدایت کرکے چلے گئے "

" سس۔۔ سامان؟" رُدا نے متحیّرانہ انداز میں سوال کیا۔

" ہاں! چند جوڑے کپڑے ایک سُوٹ کیس میں لے گئے ہیں وہ، شاید کسی لمبے پروگرام سے گئے ہیں " ملازم نے جواب دیا اور رُدا کے بدن میں لہُو جیسے خُشک ہوگیا۔

❖

چار دِن، چھ دِن۔ ایک ہفتہ، پندرہ دِن پھر ایک ماہ گزر گیا۔ رِدا بِلا ناغہ آفندی صاحب کی کوٹھی پر جاتی رہی لیکن آفندی صاحب واپس نہیں آئے تھے۔ کئی بار وہ ملازموں سے لڑ پڑی تھی۔

"تم جھوٹ بولتے ہو تمھیں نانا ابّو کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں؟"

"یقین کریں چھوٹی بی بی۔ وہ ہمیں کچھ بتا کر نہیں گئے۔ ہم کیوں جھوٹ بولیں گے۔"

"آخر میں کس سے اُن کے بارے میں معلوم کروں؟"

"ہم یہ بھی نہیں جانتے۔"

آفندی صاحب نے اپنا مقامی دفتر بھی بند کر دیا تھا اُسی وقت بند کر دیا تھا جب وہ امریکہ جا رہے تھے رِدا کی ہر کوشش ناکام ہوگئی وہ آفندی صاحب کو تلاش نہیں کر سکی تھی اُسے ایک عجیب جُرم کا احساس ہوتا تھا یُوں لگتا تھا اُسے جیسے اُس نے اپنے باپ کے حصُول کے لئے امّی سے اُن کا باپ چھین لیا ہو۔

حِنا نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا تھا وہ بس پہلے کی نسبت خاموش ہوگئی تھی۔ ثاقب سے سمجھوتے کے بعد جو بشاشت اُس کے اندر پیدا ہوئی تھی وہ معدُوم ہوگئی اُس نے آفندی صاحب کی گمشدگی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ پھر یُوں لگا جیسے سب اُنھیں بھول گئے ہوں۔ ثاقب کو تو خیر اُس کی فکر ہی کیا ہو سکتی تھی اُس نے تو اپنا ایک مور بنا لیا تھا۔ البتہ اُس نے ایک دِن کچھ عجیب سی باتیں کیں۔

شام کی چائے پی جا رہی تھی۔ موسم بھیگا بھیگا تھا۔ اور بارش کے آثار تھے۔ چائے پیتے پیتے وہ اچانک بولا "آفندی صاحب کی کوئی خبر نہیں ملی۔"

کِسی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ثاقب پھر بولا۔

"آخر وہ گئے کہاں؟"

"خُدا جانے۔" حِنا نے کہا۔

"واپس یورپ تو نہیں چلے گئے؟"

"ہو سکتا ہے۔"

"کچھ معلوم تو کرنا چاہیئے۔ ضعیف انسان ہیں کوئی ہمدرد بھی ساتھ نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے ابّو۔ نانا ابّو کو اِس عُمر میں ہماری ضرورت تھی لیکن وہ۔۔" رِدا نے کہا۔

"زندگی موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا خُدانخواستہ اُنھیں کچھ ہوگیا تو۔۔۔ کروڑوں رُوپے کی جائیداد اور کاروبار پر اُن کا لوگ قبضہ کر لیں گے۔ ہمیں تو اُس کی تفصیل بھی نہیں معلوم کچھ پتہ بھی نہیں چل سکے گا۔"

"ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" حِنا نے کہا۔

"دیوانی ہُوئی ہو حِنا۔ وہ سب کچھ ہمارے علاوہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ آفندی صاحب انتہا پسند ہیں اپنی ضد میں سب برباد کریں گے۔ میں تو کچھ اور سوچ رہا ہُوں حِنا!"

"کیا؟" حِنا نے بھنویں اُٹھا کر پُوچھا۔

"دفتر سے دو ماہ کی چُھٹی لے کر اِس بارے میں پوری چھان بین کروں آفندی صاحب کا پتہ چلاؤں اُن کے کاروبار اور دولت کے بارے میں معلوم کروں کہیں یُوں نہ ہو کہ بعد میں ہمیں ہاتھ مَل کر رہ جانا پڑے۔"

"ڈیڈی کا سب کچھ اُنھیں مُبارک ہمیں کیا کرنا ہے اُس سے تو بہت پہلے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی ہم نے اپنی دولت کا وہ جو دِل چاہیں کریں ہمیں صرف اُن کی زندگی سے دلچسپی ہے۔"

"تمھاری امّی دیوانگی کی حد تک انتہا پسند ہیں رِدا۔ اِتنی سیر چشمی بھی اچھی نہیں ہوتی اِس دور میں۔ دولت ہے تو زندگی ہے۔ ورنہ بے بسی کی موت کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"وہ دولت ہماری تو نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے۔ قانونی طور پر وہ ہماری ہے اگر تم آفندی صاحب کی بیٹی ہو۔"

"تھی کبھی، اب نہیں ہُوں۔ اُنھیں کیا دیا ہے میں نے سوائے دُکھ اور تکلیفوں کے۔"

"یہ تمھارا احساس ہے حِنا اور کچھ بھی نہیں ہے، اُصُولی طور پر میں آفندی صاحب کے رویے سے کبھی متفق نہیں رہا۔"

"مطلب؟" حِنا نے پُوچھا۔

"یہ صرف اَنا پرستی تھی آفندی صاحب نے تمھاری پسند پر غور نہ کیا صرف اِس لئے کہ میں ایک دولت مند باپ کا بیٹا نہ تھا۔ اُن کی دولت کے معیار پر پُورا نہ اُترتا تھا اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو اُنھیں مُجھ میں کوئی خامی نظر نہ آتی اور وہ خاموشی سے تمھیں میرے حوالے کر دیتے۔ خواہ بعد میں ایک اوباش شرابی اور آوارہ انسان نکلتا اور وہ سب کچھ تباہ کر دیتا جو میرے پاس ہوتا اور عموماً ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اُس وقت آفندی صاحب کیا کرتے کچھ نہیں کیونکہ یہ شادی اُنھوں نے اپنی پسند سے کی ہوتی۔ پہلی بات صرف اپنی اَنا کی تھی جِس نے اُنھیں مُجھ سے متنفر کر دیا

اور اُسی اَنا پرست باپ کی اَنا پرست بیٹی تم ہو حِنا۔ صرف اپنے بارے میں سوچتی ہو۔ رِدا تمھارے خاندان میں اَنا پرستی کا جنُون ہے۔ تمھارے نانا بھی جنُونی ہیں اور تمھاری ماں بھی۔ اِس نے صِرف اپنی اَنا کے لئے آفندی صاحب کی اعانت قبول نہیں کی۔ حالانکہ زندگی اِس طرح نہیں گزرتی آفندی صاحب نے اپنی اَنا پر حِنا قُربان کر دی اور حِنا اپنی اَنا پر رِدا کو قُربان کرنا چاہتی ہے۔"

"ثاقب! تم غلط بات کہہ رہے ہو۔"

"ہاں اب مُجھ سے لڑنا شروع کر دو۔ سچّائی تم لوگوں کو ہضم نہیں ہوتی۔"

"اوہ ابّو! یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟" رِدا نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بیٹے! میں لڑ نہیں رہا۔ نہ لڑوں گا۔ حِنا اور رِدا مجھے ساری دُنیا سے زیادہ عزیز ہیں بس یُوں سمجھ لو تمھارے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہُوں۔" ثاقب نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"رِدا کا مستقبل تو تمھاری ذمّہ داری ہے ثاقب۔"

"دیکھا طعنے دینا شروع کر دیئے۔ یہ پسند ہوگا تمھیں کہ آفندی صاحب کی دولت دوسرے کھا جائیں۔"

"خُدا اُنھیں سلامت رکھے۔" حِنا سسک پڑی۔

"خُدا ہمیں بھی تو سلامت رکھے۔" ثاقب نے کہا اور بُرا سا مُنہ بنا کر اُٹھ گیا۔ حِنا سسکتی رہی پھر بولی۔

"دیکھا رِدا تم نے ثاقب کو؟"

"اوہ امّی آپ جذباتی کیوں ہوگئیں ہم سب کو نانا ابّو کی زندگی عزیز ہے۔ اور ابّو بھی شاید اِس نظریئے سے یہ سب کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔"

"ثاقب عجیب ہے رِدا۔ وہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔" حِنا نے کہا۔

"نہیں امّی! انسان بعض اوقات خود بھی اپنے جذبات کی ترجمانی نہیں کر پاتا۔ ویسے میں ابّو کی اِس بات سے متفق ہُوں کہ وہ نانا ابّو کے بارے میں معلومات حاصِل کریں۔ نانا ابّو کی خیریت معلوم ہونا ضروری ہے۔"

حِنا نے کوئی جواب نہیں دیا ــــ باپ کو یاد کر کے وہ دیر تک روتی رہی تھی۔

"ابّو! آپ امّی سے معافی مانگیئے۔" رات کو رِدا نے کہا۔

"کس بات کی بھئی۔"

"آپ نے اُنھیں رُلا دیا تھا۔"

"اوہ! اچھا بھئی مُعافی مانگ لیتے ہیں وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہیں اور انسان اپنی اولاد کے مستقبل کے لئے سب کچھ کرتا ہے۔" ثاقب نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"ڈیڈی نے اگر اپنی دولت ہمیں دینے کی کوشش بھی کی تو ہم اُسے قبُول نہیں کریں گے۔" حِنا بولی۔

"کیا واقعی؟" ثاقب نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں بالکل۔" حِنا تیزی سے بولی۔ اور ثاقب رِدا کو دیکھ کر مُسکرانے لگا۔

رات کو رِدا دیر تک اپنے نانا ابّو کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اُسے اُن کے اِس طرح چلے جانے کا بہت دُکھ تھا ماں کی کہانی اُس کے علم میں تھی اور وہ فیصلہ کر رہی تھی کہ یہ سب کچھ اِس انداز میں کیوں ہوگیا۔

دوسری صبح اُس نے ثاقب سے کہا "ابّو آپ نانا ابّو کے بارے میں معلومات حاصِل کریں اور پتہ لگائیں کہ وہ کہاں گئے آپ یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"رِدا بیٹی کہے گی تو ضرور کریں گے۔"

"کب سے شروع کریں گے؟"

"بھئی آج سے، دفتر سے چھٹی لینی پڑے گی۔"

"اوکے بیٹے، اوکے۔" حِنا نے اِس گفتگو میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔ ثاقب دفتر جانے کے لئے تیار ہونے لگا تو رِدا نے حِنا کو دیکھ کر کہا۔

"امّی! آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"

"میں آج نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو میں بھی نہیں جاؤں گی آج۔ خُوب باتیں کریں گے۔" رِدا نے کہا۔ ثاقب چلا گیا۔ رِدا ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ حِنا خاموش تھی۔

"آپ ابّو سے ناراض ہیں امّی؟"

"رِدا! اِس موضوع پر بات مت کرو۔"

"کیوں امّی؟"

"میں پریشان ہوگئی ہُوں۔"

"آخر کیوں؟"

"بعض اوقات رِدا۔۔۔ بعض اوقات مجھے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔"

"کس بات سے؟"

"ثاقب سے۔ وہ بڑی عجیب باتیں کرتا ہے۔ وہ رُدا...
وہ مجھے کبھی کبھی عجیب نظر آتا ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہُوئی اُس میں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا اُس کا" رُدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کچھ سوچتی رہی تھی۔

گھر کی فضا میں کچھ تکدّر پیدا ہو گیا تھا۔ شام تک ماحول بوجھل رہا۔ ثاقب واپس آ گیا۔ معمول کے مطابق تھا۔ جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔

"ہیلو رُدا"

"ہیلو ابّو"

"کیا بات ہے آج کچھ بادل چھائے ہُوئے ہیں"

"کہاں ابّو، آسمان تو صاف ہے"

"ہم اپنی محبت کے آسمان کی بات کر رہے ہیں جہاں کچھ سیاہیاں چمک رہی ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے رُدا... محبتوں کے راستوں میں کتنی رُکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں۔ دِل کی بات کوئی نہ جانے کچھ سُنانے کو جی چاہ رہا ہے آج۔ سُنائیں"

"سُنائیں ابّو" رُدا نے کہا۔

"یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم مل کا سفر کر رہے تھے، دِل گھر سے دُور رہ کر تڑپتا تھا اس وقت یہ چند اشعار کہے تھے۔"

"جی ابّو!"

"سُنو"

کون سُنے گا رام کہانی
پیار کی باتیں اب ہیں پُرانی
خُون بنا ہے سب کا پانی
سب ہیں یہاں پر غم کے باقی
ڈالر سب کے من کو بھائے
اِس پردیس میں سب ہیں پرائے
کس کی خاطر دیس کو چھوڑا
کیوں پردیس سے ناطہ جوڑا
اپنوں سے بھی رشتہ توڑا
سارے سُکھوں سے مُنہ کو موڑا
قدم قدم پر دھوکے کھائے
اِس پردیس میں سب ہیں پرائے
پریت یہاں کی ریت نہیں ہے
کوئی کسی کا میت نہیں ہے
مَن والوں کی جیت نہیں ہے
کوئی خوشی کا گیت نہیں ہے
یہاں ہیں دُکھ کے ہر سُو سائے
پردیسی کے.........

حِنا اپنی جگہ سے اُٹھ گئی رُدا نے چونک کر دیکھا اور بول

"کیا بات ہے امّی کہاں؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" حِنا تیز تیز قدموں سے
چلی گئی ثاقب خاموش ہو گیا تھا، پھر اس نے کہا۔

"تمہاری امّی کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے"

"وہ نانا ابّو کے لئے پریشان ہیں ابّو۔ آپ نے چھٹی لے لی"
رُدا نے پُوچھا۔

"ہاں درخواست دے دی ہے" ثاقب نے آہستہ سے کہا
اور اُس کے بعد اُس نے آرام کرسی پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں

حِنا کی طبیعت واقعی خراب ہو گئی تھی رات کو اُسے تپ
ہُوئی تھی اور بہت دیر تک سر چکراتا رہا تھا۔

رُدا پریشان ہو گئی ماں کی وجہ سے وہ دوسرے دن
بھی کالج نہیں گئی تھی۔ دِن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے
ایک ملازم نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ رُدا اُس وقت حِنا
کے ساتھ تھی۔

"کون ہے؟"

"کوئی گوری میم ہیں بی بی۔ ایک بچّہ بھی حِنا کے ساتھ ہے"
نوکر نے بتایا۔

"گوری میم؟" رُدا حیرت سے بولی "ڈرائینگ رُوم میں بٹھا

"نہیں جی۔ ڈرائینگ رُوم کھول دُوں؟"

"ہاں کھولو" رُدا نے کہا پھر حِنا سے بولی "امّی آپ آرام
کریں میں دیکھتی ہُوں"

"نہیں میں بھی چلتی ہُوں۔ ممکن ہے کمپنی کے سلسلے میں کوئی
ملنے آیا ہو۔ کل بھی نہیں گئی تھی" حِنا نے کہا۔

دونوں ماں بیٹیاں تیار ہو کر ڈرائینگ رُوم کی طرف چل
پڑیں۔ ڈرائینگ رُوم میں ایک خوبصورت عورت ایک تقریباً
گیارہ سالہ بچّے کے ساتھ موجود تھی۔ اُنھیں دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی
اُس کی آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ اُنھیں دیکھتے ہی
اُس نے انگریزی میں کہا۔

"کیا آپ مسز ثاقب ہیں؟"

"جی۔ تشریف رکھئے پلیز"

"او مائی گاڈ۔ مِسز ثاقب، مسٹر ثاقب یہیں ہیں ناں؟" اُس نے اپنے لباس سے ایک تصویر نکال کر حِنا کے سامنے کر دی ثاقب کی ایک بہت خوبصورت تصویر تھی۔

"ہاں یہیں ہیں آپ پریشان کیوں ہیں؟"

"آپ کی شادی کب ہُوئی؟"

"بہت پُرانی بات ہے۔ مگر آپ کچھ بتائیں تو سہی" حِنا کا کلیجہ نِکلا پڑ رہا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" اِس بار عورت نے رُدا کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"یہ مسٹر ثاقب کی بیٹی ہے رُدا" حِنا نے کہا اور عورت بیٹھ گئی اُس کے چہرے پر غم کے سائے لہرا رہے تھے۔ پھر اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"آخر بات کیا ہے آپ بتاتی کیوں نہیں؟"

"یہ... یہ ثاقب کا بیٹا ہے یُوسف۔ اور میں۔ میں میرنا گراہم ہُوں ثاقب کی بیوی" اُس نے غم آلُود لہجے میں کہا اور رُدا کے دماغ میں دھماکہ ہُوا۔ حِنا ساکت رہ گئی۔ رُدا کی نظریں بچّے کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہُو بہُو ثاقب تھا۔ ہُو بہُو وہی نقوش وہی سب کچھ!

دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرنا کو دیکھتی رہیں۔ یوسف خاموش بیٹھا ہُوا تھا۔ میرنا ہی نے اِس خاموشی کو توڑا۔

گیارہ سال سے زیادہ گزر گئے شاید بارہ یا شاید تیرہ سال وہ مجھے بون میں مِلا تھا وہ پوئٹ تھا اور مجھے شاعری بہت پسند تھی۔ میں نے اُس کی نظموں کے ترجمے سُنے اور مجھے اُس سے ہمدردی ہو گئی۔ اُس نے بتایا کہ وہ اِس دُنیا میں تنہا ہے اُس کا کوئی نہیں ہے اور یہ ہمدردی رفتہ رفتہ محبت کا رُوپ اختیار کر گئی اُس نے مجھے اپنے حالات سُنائے، کہنے لگا وہ زمانے میں بھٹکتا پھر رہا ہے اور اس کائنات میں اپنے لئے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہے، بڑا اُلجھا اُلجھا سا تھا وہ، بہت ہی رُومینٹک اور میں اُس کے لئے دیوانی ہو گئی۔ میں نے بہت سی مخالفتیں مول لے کر بالآخر اُس سے شادی کر لی۔

میں اُس کی نظموں کو زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ وہ بہت ہی خُوبصورت شاعری کرتا تھا۔ میں نے اُسے مقامی نیشنلٹی دلانے کے لئے سخت محنت کی اور اُس کے ساتھ ساتھ ہی اپنا ایک اسٹور بھی کھول لیا تاکہ ہماری آمدنی کے وسائل جاری رہیں۔ لیکن وہ شاعر تھا اُسے دُنیا کی کسی اور شئے سے دلچسپی نہیں تھی وہ میرے حُسن پر اشعار کہتا تھا اور میں عملی زندگی میں آنا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے اسٹور کے معاملات کی جانب راغب کرنا چاہا میں نے اُسے اپنا دستِ راست بنا کر سوچا کہ زندگی گزارنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو ہونا ضروری ہے، لیکن اُس نے کبھی دِلچسپی نہ لی، پھر بھی میں اُسے زندہ رکھنا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی زندگی سے میری محبت قائم تھی۔ اور اُس کے بعد ایک ننّھے سے وجُود نے ہماری مسرتوں میں اضافہ کر دیا۔

یوسف کو وہ دِل و جان سے چاہتا تھا اور اُس کے لئے نہ جانے اُس نے کیا کیا کچھ شاعری کی تھی لیکن اُس کی محبت صرف شاعری تک محدُود تھی، عمل کی دُنیا میں وہ کوئی دِلچسپی نہیں لیتا تھا اور اُس کے بعد میرے اور اُس کے درمیان رفتہ رفتہ تلخیاں ہونے لگیں۔ حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ میں اُس سے امن کی زندگی چاہتی تھی اور وہ کہتا تھا کہ اُسے اِن ساری باتوں سے کوئی دِلچسپی نہیں ہے۔ میں اکیلی اسٹور کو چلا رہی تھی اور میرے معمولات میں بہت مصرُوفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ عموماً شراب کے نشے میں غرق رہتا اور اُسے باقی دُنیا سے کوئی دِلچسپی نہ ہوتی۔

یہ تلخیاں رفتہ رفتہ شدّت اختیار کر گئیں اور ایک دِن میری اُس سے جھڑپ بھی ہو گئی۔ اُس نے مجھے عجیب سی نِگاہوں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔ عورت کی نِگاہوں میں محبت کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ محبت سے ابتداء کرتی ہے۔ اور بالآخر دولت پہ جا کر اُس کی محبت ختم ہو جاتی ہے ایک شاعر کو زندہ رکھنے کا ذریعہ یہی ہے کہ اُسے فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا جائے" میں نے اُس سے کہا کہ اب وہ ایک شاعر ہی نہیں ایک باپ بھی ہے اور اُس کے سامنے اُس کے بیٹے کا مستقبل بھی ہے۔ لیکن اُسے کسی چیز سے کوئی دِلچسپی نہیں تھی۔

یُوں طویل عرصہ گزر گیا اور پھر تقریباً ڈیڑھ سال پہلے۔

ڈیڑھ سال پہلے ایک دِن اچانک وہ غائب ہو گیا۔ اُس کے بعد میں نے اُسے جرمنی میں ہر جگہ تلاش کیا۔ اُس کا ایک دوست بھی تھا جس کا نام فرید تھا۔ فرید جرمنی کی ایک فرم میں کچھ عرصے پہلے ملازمت کرتا تھا۔ اور اُس کے ذریعے میں فرید سے متعارف ہُوئی تھی۔ میں نے فرید کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ کئی سال قبل جرمنی سے واپس اپنے وطن چلا گیا۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ میں اُس کی تلاش میں دیوانی ہو گئی۔ اور پھر رفتہ رفتہ میری حالت تباہ ہونے لگی۔ مجھے جب یہ علم ہُوا تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ وہ میرے اکاؤنٹ سے اٹھارہ ہزار پاؤنڈ نکال کر لے گیا ہے یہ ایک الگ سلسلہ تھا۔ میں نے اُس

پر ہمیشہ بھروسہ کیا تھا اور اپنا اکاؤنٹ اُسی کے نام سے کھولا تھا اسٹور کے معاملات ایک دم ٹھپ پڑ گئے اور میرے پاس اِس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ اُس کے وطن آکر اُسے تلاش کروں۔

مجھے یہاں اِس شہر میں آئے ہُوئے دُوسرا مہینہ ہے، ایک ہوٹل میں قیام ہے میرے اخراجات بے پناہ ہیں۔ اور شاید میں زیادہ عرصے یہاں نہ رہ سکوں میں اُسے نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی پھری ہُوں پھر اتفاق سے مجھے اُس کا ایک دوست نظر آگیا۔ وہی دوست جس کا نام فرید تھا۔ فرید اب یہاں سٹیل ہو چکا ہے اور شادی کر چکا ہے۔ میں نے اُس سے ثاقب کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے مسکراتے ہُوئے بتایا کہ ثاقب اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہے۔ میں ششدر رہ گئی میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ثاقب دوسری شادی کرے گا۔ میں نے فرید سے ثاقب کا پتہ پُوچھا تو اُس نے مجھے یہ پتہ بتا دیا۔ مجھے یہاں آکر ہی یہ بات معلوم ہُوئی کہ اُس نے دوسری شادی نہیں کی بلکہ میں ہی اُس کی دوسری بیوی ہُوں"۔

میرنا گراہم زار زار روتے ہُوئے اپنی کہانی سُنا رہی تھی اور حنا کا دِل بیٹھا جا رہا تھا۔ رِدا کی پھٹی پھٹی آنکھیں بھی میرنا کا چہرہ تک رہی تھیں اور اُس کے دِل میں نہ جانے کتنے تاج محل ٹوٹ چکے تھے۔ ابّو کیا واقعی ابّو ایسے ہیں۔ کیا ابّو اِتنے بدکردار ہیں۔ ابّو اِتنے فریبی ہیں۔ اُنھوں نے مجھے بھی فریب دیا۔ یہ معصوم سا بچّہ میرا بھائی ہے۔ ایک اور عورت کے بطن سے پیدا شدہ ہاں اِس کے خد و خال سے ابّو صاف نُمایاں ہیں اور اِس سے بڑا ثبوت اِس رُوئے زمین پر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

دونوں ماں بیٹیاں خاموشی سے اُس کی باتیں سُن رہی تھیں۔ تب میرنا نے کہا۔

"مجھے بتاؤ اب میں کیا کروں مجھے بتاؤ" میرنا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا "کیا آپ لوگ مجھے اُس سے مِلنے دیں گی؟"

رِدا چونک پڑی۔ اُس نے ماں کی طرف دیکھا حنا کے چہرے پر سنگینی اُبھر رہی تھی، چند لمحوں کے بعد وہ بولی تو بالکل پُرسکون تھی۔

"آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"ہوٹل سلازار۔ رُوم نمبر ایک سو آٹھ میں"

"آپ یہاں آرام کریں۔ اُس سے مل کر جائیں"

"مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے، لیکن وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ... وہ بہت خود غرض ہے۔ بہت.."

"اِس کے علاوہ آپ کو جس قدر رقم کی ضرورت ہو میں آپ کو دے سکتی ہُوں آپ پلیز تکلف نہ کریں"

"مگر اُس نے مجھے سہارا نہ دیا تو مجھے یہاں سے واپس جانے کے لئے کچھ رقم درکار ہوگی میں جرمنی جا کر یہ رقم آپ کو واپس بھجوا دُوں گی" میرنا نے سسکتے ہُوئے کہا۔

حنا کی کیفیت عجیب ہوگئی تھی۔ اُس نے رِدا سے ایک بات بھی نہیں کی تھی لیکن میرنا سے وہ بہت اخلاق سے پیش آرہی تھی۔ اُس نے یوسف کو بہت پیار کیا تھا۔

شام ہوگئی۔ وہ لان پر نہیں آئے تھے۔ اور ثاقب کا انتظار کر رہے تھے پھر جھٹپٹا پھیل گیا۔ لیکن ثاقب نہ آیا۔ اور حنا بے چین ہونے لگی تبھی ایک ملازم نے بتایا۔

"صاحب تین بجے آئے تھے"

"کیا؟" رِدا اور حنا اُچھل پڑیں۔

"جی وہ اندر آئے تھے ڈرائینگ رُوم تک گئے تھے پھر وہاں سے فوراً پلٹ کر واپس نکل گئے تھے"

"میرنا ثاقب بھاگ گیا" حنا نے کہا۔

"کیا؟" میرنا چونک پڑی ملازم کی بات وہ نہیں سمجھی تھی۔

"ہاں: وہ چور بھاگ گیا"

"آہ اب کیا ہوگا: اب کیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے اُس نے تمھیں یہاں دیکھ لیا ہے اور وہ یہاں بھی نہیں آئے گا"

میرنا بلک پڑی تھی۔ دیر تک وہ روتی رہی۔

رِدا کے بدن کا خُون خُشک ہوگیا تھا وہ براہِ راست مجرم تھی۔ ثاقب سامنے آیا تھا اور وہ صرف باپ کے نام سے محروم ہوگئی تھی۔ اُسے ثاقب سارے جہان سے اچھا نظر آیا تھا۔ مار کی نفرت اُسے انتہا پسندی محسوس ہُوئی تھی۔ اُسے ثاقب کی بات پر یقین آگیا تھا۔ ابّو تے اِتنے اچھے ابّو نے اُس سے جھوٹ تو نہ بولا ہوگا۔ وہ حادثے کا شکار ہوگئے تھے۔ لیکن حادثہ.. حادثہ کیا تھا اب اُسے معلوم ہوگیا تھا۔ بارہ تیرہ سال اُس نے میرنا کو بے وقوف بنا کر جرمنی میں گزارے تھے اور وہاں سے میرنا کو لُوٹ کر بھاگ آیا تھا۔ ثاقب۔ ابّو... اُس کے ابّو۔ مگر ثاقب... اُسے نانا ابّو کے الفاظ یاد آئے۔ اور اُس کا دِل رونے لگا۔ نانا ابّو نے ہی ٹھیک کہا تھا وہ اُس سے زیادہ تجربے کار تھے۔

ایک عجیب سی کیفیت ہوگئی اس کی۔ اِس ڈر خوف سے دُنیا ایسی ہوگئی ہے۔ ایسی ہے یہ دُنیا تو اِس میں کیسے جیا جا سکتا

میرنا نے یہ رات یہیں گزاری۔ دوسری صبح اُس نے کہا "اب میں چلتی ہُوں"

"کہاں جاؤ گی؟"

"ہوٹل!"

"ٹھیک ہے، ویسے اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ لیکن تمھارے لئے میری پیش کش برقرار ہے"

"بے حد شکریہ" میرنا نے کہا۔ اور پھر وہ وہاں سے چلی گئی۔ حنا خاموش تھی اس لئے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا۔

دِن کو دس بجے اُس نے کہا۔

"تمھیں معلوم ہے ثاقب کہاں کام کرتا تھا؟"

"اوہ۔ ہاں امّی ایک بار ابّو نے بتایا تھا"

"کہاں؟"

"آرگن اوورسیز!"

"آؤ چلتے ہیں۔ تیار ہو جاؤ" رِدا بادلِ ناخواستہ تیار ہوگئی تھی۔ ڈرائیونگ حنا ہی کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آرگن اوورسیز کی عمارت کے سامنے پہنچ گئیں۔ اُنھوں نے براہِ راست منیجر سے رابطہ قائم کیا تھا۔ منیجر فارُوقی صاحب حنا سے واقف تھے۔

"او ہو حنا صاحبہ! خیریت آپ نے کیسے تکلیف کر لی"

"سوری فارُوقی صاحب! مجھے یاد ہی نہ رہا تھا کہ آپ یہاں ہیں کچھ معلوم کرنا تھا۔

"جی فرمائیے"

"ثاقب نامی ایک صاحب آپ کے یہاں ملازم ہیں"

"ثاقب! پُورا نام کیا ہے؟"

"صِرف ثاقب"

"نہیں۔ اِس نام کے کوئی صاحب کم از کم آرگن اوورسیز میں نہیں ہیں ہاں آگے پیچھے اور کوئی نام لگا ہو تو..."

"آپ براہِ کرم کچھ تکلیف کیجئے"

"پورے عملے کو ہی بُلائے لیتا ہُوں آپ فکر کیوں کرتی ہیں؟" فارُوقی صاحب نے کہا۔

"صرف کیشیئر کو بُلا دیجئے سب پتہ چل جائے گا"

"یہ بھی ٹھیک ہے اور تجربے کی بات ہے" فارُوقی صاحب نے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد علم ہوگیا کہ اِس نام کے کوئی صاحب یہاں نہیں ہیں"

"شکریہ فارُوقی صاحب! اجازت"

"کوئی خاص بات ہے"

"ہاں بس تلاش تھی۔ بہت بہت شکریہ" حنا اُٹھ گئی۔ وہاں سے وہ سیدھی گھر آگئی تھیں۔ رِدا کے دِل میں گولے پھٹ رہے تھے وہ رونا چاہتی تھی لیکن رو بھی نہیں پا رہی تھی۔

حنا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور رِدا اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی تھی اُسے یُوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی کوئی بہت عزیز چیز چھن گئی ہو کسی نے اُس سے اُس کا سب کچھ چھین کر اُسے قلاش کر دیا ہو۔

حنا نے دفتر فون کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ بیمار ہے اس لئے کئی روز تک نہ آسکے گی اُس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ نہ صبح کے ناشتے پر وہ آتی تھی نہ دوپہر کے کھانے اور نہ شام کی چائے پر۔ رِدا لاکھ کوشش کے باوجود اُس کے پاس نہ جا سکی تھی۔ ماں بیٹیوں کے درمیان ایک انوکھی کھچاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ رِدا پر جو بیت رہی تھی اُس کا دِل ہی جانتا تھا اُس کا چہرہ حسرت و یاس کی تصویر بن گیا تھا۔ پھر ایک شام حنا تیار ہو کر کمرے سے نکلی

اور رِدا کے کمرے میں پہنچ گئی۔
"آؤ!" اُس نے سرد لہجے میں کہا۔
"کہاں امّی؟"
"بابا چل رہے ہیں؟"
"میں لباس تبدیل کر لوں؟" رِدا نے پُوچھا۔
"ہاں؟" حِنا کُرسی پر بیٹھ گئی۔ رِدا نے جلدی جلدی غُسل خانے جا کر خود کو درُست کیا اور پھر دونوں باہر نکل آئیں۔ حِنا نے کار اسٹارٹ کی اور چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد کار ایک ہوٹل کے سامنے رُک گئی جس پر سلازار کے سائن نظر آ رہے تھے۔ رِدا کو اِس ہوٹل کا نام یاد تھا۔ حِنا نے کمرہ نمبر ایک سو آٹھ کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا خوبصورت یُوسف تھا۔
"ہیلو!" اُس نے گردن خم کر کے اُنھیں اندر آنے کی دعوت دی۔ اور دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ اندر میرنا موجود تھی۔
"ہیلو میرنا!"
"ہیلو!"
"خیریت تم نے مجھے کیوں فون کیا تھا؟" حِنا نے پُوچھا۔
میرنا کی آنکھیں سُرخ اور متورم تھیں۔
"اِس لئے کہ یہ میرا وطن نہیں ہے یہاں میرا کوئی نہیں ہے اور اب... اب مجھے اُس سے خوف آنے لگا ہے۔"
"کِس سے؟"
"ثاقب سے۔"
"کیا اُس کا پتہ چل گیا؟"
"ہاں فرید سے اُس کا پتہ معلوم ہُوا ہے۔ اور مَیں تمھارے ساتھ اُس سے مِلنا چاہتی ہُوں۔"
"کہاں ہے وہ؟" حِنا کے لہجے میں نفرت کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں جواب میں میرنا نے جس ہوٹل کا نام لیا اُسے سُن کر رِدا چونک پڑی۔ یہ وہی ہوٹل تھا جس میں وہ ثاقب سے پہلی بار مِلی تھی تو کیا ہوٹل کا وہ کمرہ اُس کے پاس اب بھی تھا؟
"چلنا پسند کرو گی؟"
"ہاں" حِنا نے جواب دیا۔
"تمھارے پاس گاڑی ہے؟"
"ہاں آؤ" حِنا نے پھر کہا اور اُس کے بعد وہ سب نیچے اُتر آئیں۔ حِنا نے بدستور اسٹیرنگ سنبھال لیا تھا۔ کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔
رِدا کا دِل لرز رہا تھا۔ راستے کے مناظر اُس کی آنکھوں میں دُھندلائے جا رہے تھے۔ کار رُکی تو وہ چونکی تھی اُس کے بعد کا راستہ کِس طرح طے ہُوا اِس کا اندازہ رِدا کو نہ تھا پھر اُس کمرے کے دروازے پر دستک دی گئی اور اندر سے ثاقب کی آواز اُبھری۔
"کون ہے اندر آ جاؤ۔" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے تھے۔ ثاقب ایک آرام کُرسی پر بیٹھا ہُوا تھا اُس کے سامنے رکھی سینٹر ٹیبل پر شراب کی بوتل رکھی ہُوئی تھی۔ شیو بُری طرح بڑھا ہُوا تھا اُن دونوں کو دیکھ کر وہ بُری طرح چونک پڑا پھر بدحواس ہو گیا اپنی جگہ سے اُٹھا پھر بیٹھ گیا پھر اُس کے چہرے پر بے نیازی پھیل گئی۔
"ہیلو میرنا کیسی ہو؟ ہیلو یوسف!"
"ہیلو پپا!" یوسف نے لپک کر آگے بڑھنا چاہا لیکن میرنا نے اُس کے شانے کو دبوچ کر اُسے روک لیا۔
"یُوسف! وہ اُس کا بھی پپا ہے۔" اُس کا اشارہ رِدا کی طرف تھا۔
"ہاں یُوسف میں اُس کا بھی ابو ہُوں۔ ویسے تم لوگوں نے یہاں پہنچ کر بڑی دلچسپ سچویشن پیدا کر دی ہے۔ کاش اِس موقع کے لئے بھی میں نے کوئی شعر کہا ہوتا۔" ثاقب مُسکرا کر بولا۔
"مرد کے اِس گھناؤنے رُوپ کے بارے میں بھی تم نے کہا ثاقب؟" میرنا نے کہا۔
"ابھی تک نہیں۔ کہوں گا جلدی کیا ہے تم لوگ مجھے قتل کرنے کا ارادہ کر کے تو نہیں آئیں ناں؟" ثاقب بدستور مُسکرا رہا تھا۔
"یہ تمھاری بیوی ہے ثاقب؟" میرنا نے کہا۔
"ایں۔ ہاں حِنا! اِس نے تم سے پہلے میری غزلوں سے پیار کیا تھا۔ بعد میں تم نے۔۔"
"تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم دُنیا میں بے سہارا ہو۔ اِس کائنات میں تمھارا کوئی نہیں ہے۔"
"سچ کہا تھا جھُوٹ تو نہیں بولا تھا میں نے۔ حِنا سے ایک جذباتی حماقت ہو گئی تھی وہ مجھ سے شادی کر بیٹھی تھی کچھ دن کے بعد اُسے اِس حماقت کا احساس ہو گیا اور شاید مجھے بھی۔ اُسے کم مجھے زیادہ کیونکہ میں نے کوئی جذباتی حماقت نہیں کی تھی البتہ مجھے وہ کچھ نہ مِلا جس کے لئے میں نے درجنوں غزلیں کہیں گیت لکھے۔ میرے گیت بے اثر رہے میرنا۔ میں نے کِسی سے جھُوٹ نہیں بولا۔ میں اِس کائنات کا بہت بڑا سچ ہُوں۔"
حِنا نے زہر بھری مُسکراہٹ سے رِدا کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔
"رِدا! تمھارے ابو۔ میں چلتی ہُوں۔" حِنا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تو رِدا اُس کے پیچھے لپکی۔
"میں بھی... میں بھی امّی... میں بھی تو چلوں گی۔" دونوں دروازے سے باہر نکل آئیں۔

حِنا گھر واپس آ گئی۔ اُس کے چہرے پر ایک سنگین خاموشی طاری تھی۔ رِدا بھی اُس کے ساتھ تھی گھر آنے کے بعد حِنا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے رِدا سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ رِدا بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ پھر ایک کُرسی پر بیٹھ کر وہ اِس دُنیا کے بارے میں سوچنے لگی۔ انسانوں کے چہروں پر کتنے مکروہ خول ہوتے ہیں۔ کل تک ثاقب ایک محبت کرنے والا باپ تھا جو اپنی کوتاہیوں پر شرمندہ تھا۔ لیکن آج وہ ایک بھیانک رُوپ میں آ گیا تھا جسے دیکھ کر آنکھوں کو یقین نہ آئے۔ اُس کے سامنے شراب کے برتن تھے وہ ایک اوباش طبع آدمی تھا اور اُس نے اب تک جو ڈرامہ کیا تھا وہ اِس لئے تھا کہ آفندی صاحب کی دولت اُس کے تصرّف میں آ جائے۔ کِتنا طویل دھوکہ دیا تھا اُس نے حِنا کو۔ اُس کا نظریہ روزِ اوّل سے یہی تھا کہ حِنا جیسی دولت مند لڑکی اُس کے قابو میں آ جائے تو وہ اُس کی دولت پر عیش کر سکے۔ اب تو کوئی شُبہ باقی نہیں رہا تھا۔ ایک بے چاری میرنا تھی جو ثاقب کے ہاتھوں اُسی طرح برباد ہُوئی تھی جس طرح حِنا!
"غلطی میری تھی کہ میں جذباتی ہو گئی تھی اور میں نے امّی کو ثاقب سے سمجھوتے کے لئے مجبُور کر دیا تھا۔ آہ! مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ باپ کی صُورت اِتنی گھناؤنی ہے۔"
رِدا نے سوچا اور پھر وہ بڑی گہرائی سے دُنیا کا تجزیہ کرنے لگی۔ اگر سب مرد ثاقب ہوتے تو کہانیاں بدلی ہُوئی ہوتیں۔ خود اُس کی اپنی نگاہوں کے سامنے بہت سے ایسے چہرے تھے جو مطمئن اور مسرُور تھے۔ اُن کی زندگی میں ماں اور باپ تھے بھائی اور بیٹا تھے۔ نہیں ثاقب جیسے لوگ کچھ خاص ہی ہوتے ہیں۔ بات ناتجربہ کاری کی تھی۔ رِدا کے احساسات بہت شدّت اختیار کر گئے۔ ثاقب ہی نہیں۔ نانا ابّو نے بھی تو وہی مردوں والا کردار ادا کیا تھا۔ آخر امّی اولاد تھیں اُن کی۔ ایک ذرا سی ضد کی تھی اُنھوں نے کہ پوری زندگی تباہ کر دی نانا ابّو نے اُن کی۔ مان لیتے، اگر اُن کی دولت کی خواہش پوری ہو جاتی تو شاید وہ امّی سے بے وفائی نہ کرتے۔ وہ اِس دُنیا میں ایک ناکارہ انسان رہ کر زندگی گزار سکتے تھے۔ نانا ابّو کی دولت تو اِتنی تھی کہ اُس پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ کِتنا حاصل کر لیتا میرا باپ اُس سے۔ نہیں یہ سب اپنی ضد کا شکار ہوتے ہیں۔ نانا ابّو بھی کوئی اچھے انسان نہیں، مان لیتے امّی کی بات تو کیا ہو جاتا؟ آخر وہ اولاد تھیں اُن کی۔ ثاقب بھی ایسا ہی ہے اُس نے رِدا کو محبت کا وہ لمحہ دیا جو دِلوں میں روشنی پیدا کر دیتا ہے لیکن اُس کی ذات میں اپنی ذات کی خُوشی چھُپی ہُوئی تھی۔ سب ناقابلِ یقین ہیں۔ سب اپنے مقصد کے لئے جی رہے ہیں۔
"رِدا! قصوروار تو تم بھی نہیں ہو۔ یہ دُنیا تو ہے ہی دھوکہ کھانے کے لئے۔ بے شک میں اِس دُنیا سے دھوکہ کھا گئی، لیکن یہ صرف ایک دھوکہ ہے۔ زندگی تو بہت طویل ہے نہ جانے کِتنے انسانوں سے واسطہ پڑے۔ مجھے ہوشیار رہنا ہو گا۔ ہوشیار رہنا ہو گا۔ مگر اب امّی کو کیسے سنبھالا جائے۔ وہ تو مجھے ہی اِس کا قصوروار سمجھ رہی ہیں۔ بات کروں گی میں اُن سے۔ بات کروں گی۔" رِدا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُس کے اندر ایک ٹھوس قِسم کی سوچ بیدار ہو گئی تھی۔
رات کے کھانے پر اُس نے جب امّی کو نہ پایا تو اُن کے کمرے کی جانب چل پڑی۔ حِنا اپنے کمرے میں خاموش لیٹی ہُوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں چھت کی جانب تک رہی تھیں۔ رِدا اندر داخل ہُوئی تو اُس نے نِگاہیں گھُما کر رِدا کو دیکھا۔ رِدا آہستہ آہستہ اُس کے پاس پہنچ گئی۔
"امّی آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"
حِنا نے کوئی جواب نہیں دیا تو رِدا پھر بولی۔
"دیکھئے امّی! آپ کو میری عُمر کا اندازہ ہے۔ آپ کو یہ بھی اندازہ ہے کہ میں نے آج تک کالج، اسکول اور یونیورسٹی کی فضا میں اپنے آپ کو صرف تعلیمی سرگرمیوں میں مصرُوف رکھا ہے، آپ کو یہ بھی اندازہ ہے کہ آپ کے گھر میں میری سہیلیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں آیا۔ آپ کو یقیناً میرے بارے میں یہ بھی اندازہ ہو گا کہ مردوں سے میرا واسطہ بس اِسی حد تک رہا ہے کہ چند لڑکوں سے سلام دُعا ہُوئی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مجھے کیا تجربہ ہو سکتا ہے اِس دُنیا کا؟ میرے تجربے کی عُمر ہی کیا ہے؟ میں آپ کے نام میں دِلکشی محسوس کرتی تھی اور ایک حسرت کا شکار تھی۔ بے شک آپ نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرا باپ ایک اچھا انسان نہیں ہے لیکن اِس لفظ کی دِلکشی میں گُم ہو گئی تھی۔ میں نے آپ سے کبھی خُوب صُورت کھلونوں کی فرمائش نہیں کی۔ میں نے کبھی آپ سے پسندیدہ جوڑے کے لئے ضد نہیں کی۔ کوئی زیور نہیں مانگا آپ سے۔ یہ ایک جذباتی طلب تھی جس کے لئے میں شرمندہ بھی ہُوں اور اپنی ناتجربہ کاری کا اظہار بھی کرتی ہُوں۔ اِس کے باوجود اگر آپ مجھے قصوروار سمجھتی ہیں تو پھر امّی میں یہ کہنے پر مجبُور ہُوں گی کہ اِس دُنیا میں جس کو جس پر حق حاصل ہے وہ اپنا حق استعمال کرتا ہے، اور جس کے پاس کوئی حق نہیں ہوتا وہ خاموش ہونے کے

علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے حق سے کام لے کر مجھے اِس سلسلے میں جتنا چاہیں قصوروار ٹھہرا لیں۔ میں دِل سے اپنے قصور کو تسلیم نہیں کروں گی۔ اِس لئے کہ میں ناتجربہ کار تھی، میں نہیں جانتی تھی کہ ایک مرد دولت کے لئے ایک عورت کو دھوکہ دے سکتا ہے تو کیا ایک باپ بھی دولت کے لئے اپنی بیٹی کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ میرے تجربے کی عمر بہت کم ہے امّی اور اگر آپ مجھے اِس ناتجربہ کاری کی سزا دینا چاہتی ہیں تو میں اِسے زیادتی سمجھ کر قبول کر لوں گی۔ لوگ دُنیا میں ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہی ہیں دوسروں کی زیادتی کا بدلہ اپنے سے کمزور سے لیا ہی جاتا ہے سمجھیں امّی! کھانا نہیں کھائیں گی؟" رِدا نے آخری سوال کیا۔

حِنا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے اب وہ رِدا کو دیکھ رہی تھی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"رِدا! مجھے بُخار ہو گیا ہے۔"

"اوہ!" رِدا بے اختیار آگے بڑھی اور اُس نے ماں کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"امّی! مجھے بُلایا کیوں نہیں آپ نے؟ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں"

"بیکار ہے رِدا۔ بس اِس ذہنی صدمے کا اثر ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔"

"آپ کے لئے چائے بنا لاؤں؟"

"کسی سے کہہ دو۔ کیا کھانا لگ گیا ہے؟"

"نہیں امّی!"

"تو پھر تم کھا لو اور سُنو میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔" حِنا نے کہا اور دھیرے سے مُسکرا دی۔

"شکریہ امّی! میں آپ کے ساتھ چائے پیوں گی کھانا کھانے کو دِل نہیں چاہ رہا میرا۔"

"تھوڑا سا کھا لو بیٹے۔ میں تو طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے نہیں کھا رہی، صبح کو تمہارے ساتھ ناشتہ ضرور کروں گی۔"

"ٹھیک ہے امّی! ہلکی پھلکی کوئی چیز لے لوں گی۔ چائے کے لئے کہہ آؤں۔" رِدا کی ہمت بڑھی تھی۔

ماں نے اُس کے بعد اُسے قصوروار نہیں ٹھہرایا تھا بلکہ ... اُس کی تاویل قبول کر لی تھی۔ حِنا نے تسلیم کر لیا تھا کہ رِدا اِس سلسلے میں جذباتی ضرور ہو گئی تھی لیکن اُس بے چاری کو تجربہ نہیں تھا۔

رِدا نے بڑے پیار سے چائے کی پیالی حِنا کے ہاتھ میں تھما دی اور پھر اپنی پیالی لے کر اُس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

"اب ہم کیا کریں گے امّی؟"

"کیا کیا جا سکتا ہے رِدا! تم بتاؤ کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں امّی؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"دیکھو رِدا! ہم خاموشی سے زندگی گُزار رہے تھے زخم میرے دِل پر تھے اور میں نے اِن زخموں کی آنچ تم تک نہیں پہنچنے دی تھی۔ وقت نے یہ زنجیر توڑ دی اور تم بھی زخموں کا شکار ہو گئیں لیکن رِدا انسانی زندگی خُدا کا عطیہ ہوتی ہے۔ جیسے بھی گُزرے ہمیں حکم ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ گُزاریں۔ اپنی مصلحتیں خُداوند عالم خود ہی جانتا ہے۔ حادثے دِلوں پر زخم بن جاتے ہیں لیکن یہ لفظی کیفیات ہیں۔ کِس نے کِس کے زخم دیکھے ہیں؟ ہم اُنھیں صرف ایک نام دے سکتے ہیں۔ باقی باتیں بیکار ہیں بہتر ہے کہ زندگی میں اِس بھول کو بھول جاؤ۔ جو ہُوا ہے اُسے نظرانداز کرنا مناسب ہو گا ورنہ ہم دونوں زندگی کی چکی میں پس جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے امّی! آپ اطمینان رکھیں۔ میں اِس بوجھ کو سر سے اُتار دوں گی۔"

دوسری صبح حِنا کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ اُس نے رِدا کے ساتھ ناشتہ کیا تھا پھر بولی۔

"آفس نہیں جا سکی ہُوں کئی دِنوں سے۔ زندگی کے معمولات کو جاری رکھنا چاہیئے۔ تم بھی کالج چلی جاؤ۔"

"جی امّی!" رِدا نے جواب دیا اور اُس کے بعد معمولاتِ زندگی ایک بار پھر سے جاری ہو گئے۔

رِدا نے باقاعدہ کالج جانا شروع کر دیا۔ حِنا دفتر جانے لگی۔ پانچ چھ دِن اِسی طرح گُزر گئے۔ حِنا کے رویّے سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اُس نے رِدا کو معاف کر دیا ہے اور اب کم از کم اُس کے دِل میں رِدا سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔

چھ سات دِن کے بعد ایک دِن رِدا سے حِنا نے کہا۔

"رِدا! کل تم یونیورسٹی مت جانا۔ ذرا اُس بدنصیب کی خبر بھی لے لو جس کا نام میرینا ہے۔"

"ٹھیک ہے امّی! کیوں نہ ابھی چلی جاؤں؟" رِدا نے کہا۔ اور حِنا کچھ سوچنے لگی پھر اُس نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم تیار ہو کر ذرا میرینا کو دیکھو۔ وہ بدنصیب کِس عذاب کا شکار ہے۔ پتہ نہیں اُس کے پاس پیسے وغیرہ بھی ہیں یا نہیں؟ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہمیں تھوڑی بہت توجہ اُس کو دینا ہو گی۔"

"جی امّی!" رِدا نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ تیار ہو کر باہر

نِکل آئی۔

ہوٹل سلازار پہنچ کر اُس نے میرینا کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہ چار دِن قبل ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر جا چکی ہے اِس سے زیادہ تفصیلات ہوٹل سے معلوم کرنے کی کوشش کرنا حماقت کی بات تھی رِدا ٹھنڈی سانس لے کر باہر نِکل آئی اور پھر نہ جانے کِس خیال کے تحت اُس نے ہوٹل کا رُخ کیا۔ جہاں ثاقب رہتا تھا۔ حالانکہ ثاقب سے اب اُس کا کوئی ذہنی رشتہ نہیں رہ گیا تھا۔ اِس کے بعد کوئی ذہنی رشتہ رکھا بھی نہیں جا سکتا تھا بلکہ اُس کے دِل میں ثاقب سے ذاتی نفرت کی بنیاد بھی پڑ گئی تھی۔ حِنا اُس کی طلب تھی دولت کے لئے، لیکن اولاد تو اُس دولت کے حصُول کا ذریعہ نہیں تھے۔ اُنو نے مجھے کیوں نظرانداز کر دیا؟ میں تو اُن سے ایک مقدس رشتہ رکھتی تھی لیکن وہ شخص۔ جو ساری زندگی ایک عورت کو دھوکہ دے سکتا ہے دوسری کو دے سکتا ہے۔ تو پھر تیسری کو کیوں نہیں دے سکتا۔ رشتوں کا تقدس اُس کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کتنا خوبصورت تھا اُس کا بیٹا یُوسف! اُس نے اُس کی بھی پرواہ نہیں کی۔

رِدا ساری صورتِ حال معلوم کر کے گھر واپس جانا چاہتی تھی۔ وہ اُس ہوٹل پہنچ گئی اور وہاں بھی اُس کی توقع کے مطابق ہی جواب ملا۔ ثاقب بھی وہ ہوٹل کا کمرہ چھوڑ چکا تھا البتہ اِتنا معلوم ہُوا کہ ثاقب نے وہ کمرہ اُس ملاقات کے دوسرے دن ہی چھوڑ دیا تھا۔ رِدا ایک گہری سانس لے کر واپس آئی۔ حِنا اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ رِدا کے چہرے کو دیکھ کر حِنا کے چہرے پر ہلکی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"کہو، کیا معلوم کر آئیں؟"

"امّی! وہ دونوں جا چکے ہیں۔"

"دونوں؟"

"جی ہاں! میرا مطلب ہے میرینا۔ اُس کا بیٹا اور ثاقب ..." رِدا نے آج ثاقب کو ابو نہیں کہا تھا۔

"دونوں جا چکے ہیں۔" حِنا کسی قدر اُلجھے ہُوئے انداز میں بولی۔ پھر اُس نے نفی میں گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"نہیں رِدا ایک ساتھ دونوں نہیں جا سکتے۔ میرینا جو کچھ بھی تھی وہ بطور مجھے عورت لگی تھی اور ثاقب اُسے دھوکہ دے کر آ چکا تھا وہ جانتا ہے کہ میرینا کے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔ اُس کا اسٹور ثاقب ٹھکانے لگا چکا تھا۔ اب کیا کرے گا وہ میرینا کے ساتھ جا کر، میرا خیال ہے بدبخت نہیں اور زندگی کے راستے تلاش کر رہا ہو گا۔ چھوڑو! ... میرینا کے بارے میں معلوم کرنے کی خواہش مند تھی۔ اُسے کم از کم جرمنی بھیجنے میں اُس کی مدد کی جا سکتی تھی۔"

رِدا بھی خاموش ہو گئی۔ دونوں نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

پھر وقت مزید کچھ آگے بڑھ گیا معمولات میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہُوئی۔ البتہ رِدا یہ بات اچھی طرح محسوس کر رہی تھی کہ اُس کی ماں کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ حِنا کے خوبصورت چہرے پر پیلاہٹ چھاتی جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑنے لگے تھے۔ اور وہ اکثر بیمار رہتی تھی۔ ایک دن رِدا نے اُس سے سختی سے کہا۔

"امّی! آپ کو ڈاکٹر کے پاس چلنا ہو گا۔ یہ کیا حُلیہ بنا رکھا ہے آپ نے اپنا۔ مجھے تو آپ جینے کی تلقین کرتی ہیں اور آپ خود کیا کر رہی ہیں؟"

"چھوڑو رِدا! کِس چکّر میں پڑ گئیں۔ زندگی ایسے حادثوں سے دوچار ہوتی ہے۔ وقت بالآخر صبر دے دیتا ہے، جو صبر میں کر چکی تھی۔ وہ صبر عارضی طور پر مجھ سے چھن گیا اب رفتہ رفتہ میری کیفیت بحال ہو گی لیکن فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔"

"وہ تو صحیح ہے امّی! لیکن یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھاؤں۔"

"بھئی ضد نہ کرو نا۔"

"امّی! یہ ضد ایسی نہیں ہے جس پر مجھے آپ سے شرمندہ ہونا پڑے۔" رِدا نے اِس طرح حِنا کو مجبور کیا کہ حِنا ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

ایک اچھے ڈاکٹر کو اُس نے حِنا کو دِکھایا۔ ڈاکٹر نے حِنا کی نبض دیکھی۔ اُس کا جائزہ لیا پھر مُسکرا کر بولا۔

"نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ دراصل بیٹے تم ذرا باہر چلی جاؤ۔" اُس نے رِدا سے کہا اور رِدا تعجب سے ڈاکٹر کی صُورت دیکھتی ہُوئی باہر نِکل گئی۔

ڈاکٹر نے حِنا کو ایک پرچہ لکھ کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور حِنا چبھتی نظروں سے اُس پرچے کو دیکھنے لگی۔ اُس کے چہرے پر شُبہے کے آثار تو پہلے ہی اُبھر آئے تھے لیکن ڈاکٹر نے جو بات اُسے بتائی اُسے دیکھ کر حِنا کا سر جھک گیا۔ وہ خاموشی سے پرچہ لے کر اُٹھی۔ ڈاکٹر نے اُسے کچھ ہدایات دی تھیں اور پھر وہ باہر نِکل آئی۔ رِدا اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے امّی؟ کیا بتایا ڈاکٹر نے؟"

حِنا خاموشی سے رِدا کو دیکھتی رہی اور پھر اُس نے وہ پرچہ رِدا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رِدا نے پرچہ پڑھا اور اُس کا چہرہ ہونق بنیا

ہوگیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے حِنا کو دیکھتی رہی تھی پھر واپسی میں حِنا بہت دِل برداشتہ تھی۔

"یہ بہت بُرا ہُوا رِدا۔ ثاقب کے ذریعے جو یہ نیا گھاؤ مجھ پر لگا ہے۔ میں اِس سے جانبر نہیں ہو سکوں گی۔ رِدا یہ بہت بُرا ہُوا ہے۔ غلطی میری بھی ہے مگر خیر اب جو کچھ ہُوا ہو چُکا ہے۔ میں تمہیں قصُور وار ٹھہرانے جا رہی تھی لیکن رِدا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہاں... ہاں میں برباد ہوگئی۔ میں اپنی زندگی میں دوسرا دھوکہ کھانے کے بعد رِدا اب تیسرا دھوکہ کھانے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔ مجھے اِس بات کی اُمید نہیں تھی رِدا۔ مجھے اِس کی اُمید نہیں تھی۔"

حِنا گھر واپس آگئی۔ لیکن کچھ ایسا صدمہ بیٹھا تھا اُس کے دِل پر کہ اُس کے بعد وہ بستر سے نہ اُٹھ سکی۔ وہ مُسلسل بیمار رہنے لگی تھی اور رِدا بہت سخت پریشان ہوگئی تھی۔ علاج جاری تھا۔ بیماری کوئی خاص نہیں تھی بس ڈاکٹر نے اِتنا ہی بتایا تھا کہ حِنا ماں بننے والی ہے۔ لیکن یہ الفاظ حِنا کے لئے کِس قدر رُوح فرسا تھے رِدا اِن سے کِن کیفیات کا شکار ہوگئی تھی۔ دونوں ماں بیٹیاں ہی جانتی تھیں۔ حِنا کے اندر تبدیلیاں رُونما ہونے لگیں اور پھر اُس نے ایک دن رِدا سے کہا۔

"رِدا! اب میں دفتر نہیں جانا چاہتی۔ میں یہ ملازمت چھوڑنا چاہتی ہُوں۔ تم میرا استعفےٰ ٹائپ کرا کے دفتر بھجوا دو۔ ہاں رِدا۔ یہ مجبُوری ہے جسے میں ٹال نہیں سکتی تم جانتی ہو۔"

نہ جانے کیوں رِدا کو ایک عجیب سا احساس ہُوا۔ حِنا کا لہجہ اِس قدر ٹوٹا ہُوا تھا کہ رِدا کی آنکھوں میں آنسُو آ گئے۔ حِنا کے سامنے تو اُس نے کچھ نہ کہا لیکن اپنے کمرے میں جا کر وہ بہت روئی تھی اُسے احساس ہو رہا تھا کہ بے بسی کا آغاز تو اب ہُوا ہے اور نہ جانے کیوں آج وہ اپنے آپ کو مُجرم سمجھ رہی تھی اگر ثاقب کے مسئلے میں وہ حِنا کو اِس طرح مجبُور نہ کرتی تو شاید یہ وقت کبھی نہ آتا لیکن اُس نے جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر حِنا کو مجبُور کر دیا تھا۔

حِنا نے دوسرے دِن اُس سے پھر استعفےٰ کی فرمائش کی اور کہا کہ وہ یہ سب کچھ بے حد ضروری سمجھتی ہے۔ رِدا اِس کو نظرانداز نہ کرے۔ رِدا نے اُس کے اِس حُکم کی تعمیل کر دی۔ استعفےٰ ٹائپ کیا گیا۔ حِنا نے اُس پر دستخط کر دیئے، دفتر سے اِس سلسلے میں کافی چھان بین کی گئی تھی۔ حِنا کو پیش کش کی گئی تھی کہ وہ جتنے دِن کی چاہے چھٹیاں کر سکتی ہے لیکن استعفےٰ نہ دے، حِنا نے اِس سلسلے میں معذرت کرتے ہُوئے کہا تھا کہ اب وہ اپنے معمُولات جاری نہیں رکھ سکتی۔ اُس کی یہ درخواست قبُول کر لی، چنانچہ بحالتِ مجبُوری اُس کا استعفےٰ منظُور کر لیا گیا۔

ولادت کا وقت قریب آ گیا اور حِنا ہسپتال روانہ ہو... ہسپتال میں داخل ہوتے ہُوئے اُس نے شرمندگی کے لہجے میں...

"وہ ہو رہا ہے رِدا جو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن میری... کبھی قصُوروار نہ قرار دینا۔ کم از کم میں تمہارے سامنے پورے... سے کہہ سکتی ہُوں کہ میں قصُوروار نہیں ہُوں۔ رِدا وقت نے... ایسے چرکے لگائے جو مجھے نہیں لگنے چاہیئے تھے۔ میں اِتنی... اِتنی... بھی نہیں تھی۔" حِنا کا لہجہ دِل گداز تھا۔ رِدا رونے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔

بہر طور ہسپتال میں گزرے ہُوئے وہ لمحات بھی رِدا کی... میں انوکھے اور عجیب تھے۔ وہ تھی اور حِنا تھی اور کوئی نہیں تھا اِس دُنیا میں اُن کا پُرسانِ حال۔

اور پھر رِدا کی زندگی میں ایک بھیانک تبدیلی رُونما ہُوئی۔ حِنا نے ایک بچّے کو جنم دیا تھا لیکن خود وہ اُس کے بعد زندہ نہ رہ... تھی۔ ڈاکٹروں نے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ خبر رِدا کو سنائی اور رِدا کی قوتِ سوچ جواب دے گئی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح ہسپتال کی بینچ پر بارہ گھنٹے بیٹھی رہی تھی اور بہت سے لوگ اُس سے ہمدردی کا اظہار کرتے رہے تھے۔

رِدا کو نہیں معلوم تھا کہ حِنا کی تدفین کس... وقت کا تھا ہی کون اِس دُنیا میں جو اُن کے سِلسلے میں جدوجہد کرتا۔ ہاں، شاید حِنا کے دفتر کے لوگوں نے اُس کی اِس سلسلے میں مدد کی تھی۔ رِدا تو ایک دم سرد سی ہوگئی تھی۔ کوئی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جو کچھ ہو رہا تھا بس اُسے دیکھتی رہ گئی تھی سارے معاملات طے ہو گئے تھے۔ رِدا کی کچھ کالج کی سہیلیاں اُس کے پاس آ گئیں۔ ایک بُزرگ خاتون بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ یہ سب کیا کرنا چاہتی ہیں، کیوں ایسا ہو رہا ہے؟ ماں کی موت کا اُسے علم ہو چُکا تھا لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ موت کا ماتم کیسے کیا جاتا ہے؟ رو تو اُس کا دِل رہا تھا آنکھیں نہ جانے کیوں خُشک ہوگئی تھیں۔ اِس کیفیت میں کئی دن گُزر گئے۔ اور پھر جب ننھا سا گول مٹول بچّہ اُس کی گود میں دیا گیا تو وہ حیرت سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ کیا کرے وہ اِس بچّے کا؟

"... یہ..." تب اُس کی ایک دوست نے کہا۔

"رِدا! کیسی عجیب بات ہے تمہارے اُوپر اِس وقت

ذِمّہ داری آ پڑی ہے جب تم اِس سے بالکل بھی واقف نہیں ہو۔ لیکن رِدا ہمت سے کام لینا پڑے گا تمہیں۔ اب اِس کی پرورش تمہیں ہی کرنا پڑے گی۔"

"مجھے...؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تو اور کیا رِدا! کیا اِسے یتیم خانے میں داخل کرا دوگی؟"

"مگر مجھے کیوں...؟"

"اِس لئے کہ تمہارے علاوہ اِس کا اِس دُنیا میں کون ہے؟ یہ تمہارا بھائی ہے رِدا! تمہاری ماں کی اولاد۔"

"بھائی؟" رِدا نے یہ لفظ اپنی زبان سے ادا کیا اور نہ جانے کِس طرح اُس کے دِل میں بے شمار سوتے کُھل گئے۔

اِن سوتوں سے محبت اُبل رہی تھی بھائی... بھائی۔ بھائی۔ باپ کو تو دیکھا تھا اور اب... اب بھائی بھی سامنے آ گیا تھا۔ گول مٹول سا خوبصورت بھائی اور رِدا ماں کے اِس انوکھے تحفے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اُسے ایک دم احساس ہُوا تھا کہ اب یہ بچّہ اُس سے متعلق ہے۔ بھائی ہے یہ میرا اور... اور میرے علاوہ اِس کا دُنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ امّی بھی اِسے میرے ہاتھوں میں سونپ کر چلی گئی ہیں۔

رِدا کا دِل ایک بار پھر رو پڑا۔ میری امّی حادثے کا شکار ہُوئی ہیں۔ وہ حادثہ ہی تو تھا۔ ثاقب بخت آ گیا تھا۔ اور اُس نے رِدا کے سہارے حِنا پر حملہ کیا تھا اور حِنا ہلاک ہوگئی تھی۔ بیشک، بیشک۔ سب کچھ میری وجہ سے ہُوا ورنہ امّی نے تو اُسے دھتکار دیا تھا۔ وہ اُسے اپنا سایہ دینا تک پسند نہیں کرتی تھیں لیکن رِدا کے ہاتھوں مجبُور ہوگئی تھیں۔ اور امّی جو اُس کی وجہ سے موت کی آغوش تک جا پہنچیں، یقینی طور پر مظلوم تھیں اور یہ... یہ ہاں یہ میرا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اِسے مُجھ سے چھین سکے، ٹھیک تو ہے یہ ثاقب کی طرح بُرا نہیں ہوگا کیونکہ یہ میری آغوش میں پرورش پائے گا۔

اُس نے پہلی بار بڑی چاہت سے اِس گول مٹول سے بچّے کو اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا اور عورت کے سینے میں تو ممتا قُدرتی طور پر ہوتی ہے۔ یہ تو اُس کا خُون ہے۔ رِدا کو اُس سے کہیں زیادہ سکون محسُوس ہُوا تھا۔ اِس تصوّر کے ساتھ کہ اِس دُنیا میں کوئی ایسا نہیں جو اُس کے بھائی کو اُس سے چھین سکے اور اِس تصوّر سے کہ یہ ننھا سا معصُوم سا وجُود اُس کی اپنی ملکیت ہے۔ رِدا کو ایک خُوشی سی ہُوئی تھی۔ ایک عجیب کیفیت کا شکار ہوگئی تھی وہ۔

ایک طرف تنہائی، ماں کی غیر موجودگی اور دوسری طرف بچّے کا مِل جانا۔ اُس نے بڑی چاہت سے بچّے کا نام تیمور رکھا تھا اُس کے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ وہ اِس کی ماں نہیں ہے بلکہ بہن ہے۔ اُس نے دِن رات تیمور پر قُربان کر دیئے اور نہ جانے کہاں سے اُس کے دِل میں بے پناہ ہمت کُود پڑی۔ ہم اِسے خُدا کی دین ہی تصوّر کر سکتے ہیں۔ معصُوم سی کمزور سی عورت ایک انسان کی پرورش کی ذِمّہ داری سنبھالتی ہے اور اپنے کمزور وجُود کے ساتھ اُسے انتہا تک پہنچا دیتی ہے کہ یہی مقصدِ کائنات ہے اور اِس میں اُسے لازمی طور پر تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے۔

وہ تن تنہا تیمور کی پرورش میں مصرُوف تھی مالی وسائل ابھی بہت عرصے تک ساتھ دے سکتے تھے، عُمدہ گھر تھا۔ دُنیا کی ہر شے موجود تھی اور پھر حِنا کے دفتر سے اچھی خاصی رقم حاصل ہوگئی تھی چنانچہ تیمور کی پرورش میں کوئی دِقت نہیں پیش آ رہی تھی۔ ہاں لوگ کچھ عجیب سی گفتگو کرنے لگے تھے۔ حِنا کے بارے میں بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ ثاقب بہت عرصے کے بعد واپس آیا ہے، جوان بیٹی کو چھوڑ کر حِنا چلی گئی تھی لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ایک معصُوم سا وجُود اُسے تحفے کے طور پر دے گئی تھی، بعض اوقات لوگوں کی نکتہ چینیاں رِدا کو پریشان کر دیتی تھیں۔ وہ لڑنے جھگڑنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اُس کی طبیعت میں تو انتہائی سادگی اور معصُومیت تھی۔ لوگوں کے اُلٹے سیدھے سوالوں کے جواب میں اُس کی آنکھیں ساون بھادوں برسا دیتی تھیں اور بس!

اُسے رفتہ رفتہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہاں اُس کی زندگی مشکل ہو جائے گی اور بہت گہرائی میں جا کر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ تیمور کے بہتر مستقبل کے لئے اُسے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ تیمور کی ذرا سی طبیعت خراب ہو جاتی تو وہ اُسے لئے ہُوئے ڈاکٹر کے پاس دوڑتی۔ اُس کے لئے نیا لباس، نئے سامان ہر چیز رِدا مہیا کر رہی تھی اور اِس مصرُوفیت میں وہ ہر غم کو بھُول گئی تھی۔ اُسے یہ احساس تھا کہ اگر زندگی میں اِس کی ذِمّہ داری کسی کو سنبھالنی ہے تو وہ خود ہی ہے۔ اور اُس نے اپنی تمام تر قوتوں کو آواز دے لی تھی فیصلے خود ہی کرنے تھے۔ کون ایسا تھا جو مستقبل کے لئے اُسے مشورہ دیتا۔ اور اب تو عموماً وہ گھر میں تنہا ہی رہتی تھی۔ ملازموں وغیرہ کو مجبُوراً چُھٹی دینا پڑی تھی۔ کیونکہ اُن کی تنخواہ اب باقاعدگی سے ادا نہیں کی جا سکتی تھی رِدا جانتی تھی کہ اُسے پیسے کی ضرورت ہے تیمور کے لئے، گھر کے چھوٹے موٹے کام وہ خود سنبھال لیتی تھی۔

قِصّہ مُختصر رِدا اپنے اِس احساس کا شکار ہوتی چلی گئی تھی۔

اُس نے ایک دِن سوچا کہ اِس کربناک ماضی کے ہر نشان

کو مٹانے کے لئے بہتر ہے کہ نقلِ مکانی کرلی جائے اور یہ فیصلہ اُس کے ذہن میں پختہ ہوتا چلا گیا۔ تیمور خوش و خرم تھا اُس کی صحت قابلِ دید تھی۔ رِدا کی شب و روز کی محنت نے تیمور کو بہت کچھ بنا دیا تھا، پھر رِدا نے اپنے اِس فیصلے کو عملی صُورت دے ڈالی اور ایک دِن اُس نے اپنے تمام سامان کو منتقل کر کے گھر پر تالا لگا دیا جو کچھ نقد شکل میں موجود تھا اُسے محفوظ کیا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔

پھر وہ ایک ٹرین میں بیٹھ کر کراچی چل پڑی دِل میں لاکھوں خیالات لئے لاکھوں احساسات لئے۔

کراچی پہنچنے کے بعد اُسے زندگی کا ایک ایسا سہارا حاصل ہو گیا جو بِلاشبہ قابلِ قدر تھا۔ یہ اُس کی دوست... بلکہ اچانک بن جانے والی دوست ثناء تھی۔

ثناء رِدا کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی اور وہاں اُس نے رِدا کے لئے وہ سب کچھ مہیا کر دیا جو ایک انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ثناء کی صُورت میں رِدا کو ایک فرشتہ مِلا تھا اور رِدا وہاں بے حد خوش تھی۔ تیمور کو اُس نے اپنا بچّہ بتایا تھا اور لوگوں کے دِلوں میں نہ جانے کیا کیا خیالات چھوڑ دیئے تھے لیکن رِدا نہیں جانتی تھی کہ وقت اپنے راستے خود منتخب کرتا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو تیمور کے مستقبل کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ اُس کے نیک جذبوں کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ لیکن وقت کی کہانیاں تبدیل کرنا اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔

رِدا بیشک تم نیک جذبوں سے مالا مال ہو لیکن زندگی کے بہت سے ایسے راستے اپنی خوشی کے خلاف اپنی مرضی کے خلاف اپنانے پڑتے ہیں جو بالآخر انسان کو انتہا تک لے جاتے ہیں انتظار کرو اُن لمحات کا جب تمہیں اپنے ذہن و دِل میں کچھ اور تبدیلیاں محسوس ہوں۔ ہاں اپنے خیالات کو آخری حد تک نہ لے جانا اور اپنے سامنے کوئی دیوار نہ بنا لینا کہ دیواریں گر جاتی ہیں رِدا انسان کی زندگی کی ہر دیوار ناپائیدار ہوتی ہے۔ اِن ناپائیدار دیواروں پر اپنے مضبوط قوتِ ارادی کے نقوش کندہ کرنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ بالآخر یہ گِر جائیں گی۔

یہاں یہ تحریر اچانک ختم ہو گئی تھی۔

رِدا کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ لرز کر رہ گئی۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے سفر کرنے والی ٹرین کسی خوفناک حادثے کا شکار ہو گئی ہو۔ اُس نے وحشت زدہ انداز میں اِس نوٹ بک کے دوسرے اوراق اُلٹے لیکن آخری صفحہ تک سادہ پڑا ہُوا گویا یہ کہانی جاری تھی اور یہ سادہ صفحات بقیہ کہانی کے لئے پڑے ہُوئے تھے۔ وہ بے چینی سے اپنے کرب زدہ دِل کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں اُس کا دِل چاہ رہا تھا نوٹ بک کے یہ اوراق بھی سادہ نہ ہوتے۔ اِن اوراق میں اِس سے آگے کی کہانی ہوتی۔

اُس نے دکھے دِل کے ساتھ سوچا اور اُس کی نگاہیں ریل کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں بہت دُور اُفق کے آخری سرے پر صبح کی سفیدی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔

رِدا کو یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ماضی ایک بار پھر اُس پر سے گزر گیا ہو۔ اور اُس کے بعد وہ اِس نوٹ بک کی تحریر میں کھو گئی۔ یہ... یہ تحریر کس کی ہے؟ کِس نے لکھا اسے؟ کون ہے ایسا جو مُجھ سے اِس حد تک واقف ہے۔ نہ صرف مجھ سے بلکہ میری ماں سے بھی۔ اُس نے جِنا کے احساسات کی ترجمانی کی تھی، اُس نے میرے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ لمحات بیان کئے ہیں جو میرے علم میں بھی نہیں تھے۔ آہ! کون ہے وہ جو ہم سے اِس قدر واقف ہے۔ میری زندگی میں تو کوئی ایسا راز دار بھی نہیں تھا جسے میں نے اپنے درد کی کہانی سُنائی ہو۔ یہ کہانی جاننے والا کون ہو سکتا ہے؟

تب اُسے خیر دین یاد آیا۔ وہ بے وقوف سا احمق سا نوجوان جو ایک عجیب سے انداز میں اُس کے سامنے آیا تھا اور ہر لمحہ اپنے بارے میں ایک نیا نقش چھوڑ جاتا تھا۔ یہ بات تو رِدا اچھی طرح جانتی تھی کہ خیر دین وہ نہیں ہے۔ جو اُس نے اپنے آپ کو بنا کر پیش کیا تھا لیکن وہ کیا ہے؟ اُس کے بارے میں مٹے مٹے نقوش اُجاگر ہُوئے تھے لیکن یہ کوئی بھی ثابت نہیں کر سکا کہ خیر دین درحقیقت کون ہے؟ وہ جو کوئی بھی تھا رِدا کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

سوال صرف یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ اُس کے واقعات سے اِس قدر واقف کیسے ہو گیا؟ اُس نے رِدا کو یہ دونوں ڈائریاں اُس وقت دی تھیں جب رِدا مطمئن اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ گزرے ہُوئے لمحات رِدا کی نگاہوں میں اُبھرنے لگے اُس نے خیر دین سے کہا تھا کہ اگر وہ اُس کی کتاب خود کھولے تو رِدا اپنے آپ کو اُس کے سامنے گردن خم کر کے پیش کر دے گی۔ خیر دین نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا اور اُس کے بعد!

اُس کے بعد خیر دین نے درحقیقت اُس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا یہ جادوگری تھی۔ ایک ناقابلِ یقین سی بات کہ خیر دین اُس کے بارے میں اِس حد تک جان گیا۔ کیسے؟ آخر کیسے؟

ماضی کے دُہرانے سے جو ذہنی دباؤ اُس کے اُوپر طاری ہو گیا تھا اِس سوچ نے اُسے آہستہ آہستہ زائل کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ خیر دین کے پُراسرار کردار میں کھو گئی۔ آخر خیر دین نے یہ سب کچھ کیسے معلوم کر لیا؟ وہ کون سا ذریعہ تھا کہ اُس نے میری زندگی کے وہ تمام ماہ و سال کھنگال ڈالے جن سے صرف میں واقف تھی۔ نہ صرف وہ ماہ و سال بلکہ اُس نے جِنا کی زندگی کے بارے میں بھی اِتنا کچھ معلوم کر لیا کہ جتنا مجھے بھی معلوم نہیں ہے، مجھے تو وہ لمحات بالکل علم میں نہیں تھے جب میری ماں نے ثاقب کو دیکھا تھا۔ لیکن اُس کے ہاتھوں جو نقصان مجھے اور میری ماں کو اُٹھانا پڑا اُس کے بعد اُسے باپ کہتے ہُوئے وحشت ہوتی تھی۔

خیر دین... خیر دین نے ہی تو ثاقب کو بھی۔ او ہو! میں سمجھ گئی۔ خیر دین کا رابطہ کسی نہ کسی طرح ثاقب سے ہو گیا ہو گا۔ اور ثاقب نے اُسے اپنی داستان سُنائی ہو گی۔ لیکن اُس کا رابطہ ثاقب ہی سے تو ہُوا تھا۔ جِنا کے ماہ و سال اُسے کیا معلوم؟ جِنا کی زندگی کے بارے میں کیسے جان گیا؟ اور اُس کے بعد میں میرے احساسات کی جو ترجمانی کی تھی کیا درحقیقت میری کیفیات اُس سے مختلف تھیں۔ نہیں ہرگز نہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہ سب کچھ اُس جادوگر کو کیسے معلوم ہو سکا؟ وہ بُری طرح اُلجھ گئی۔ نہ جانے خیر دین کون ہے اور اُس کے بارے میں اِس قدر کیسے جانتا ہے؟

کمپارٹمنٹ میں زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ لوگ جاگنے لگے تھے۔ تیمور سامنے والی لڑکیوں کی آغوش میں سو رہا تھا۔ اور کچھ اِس طرح لٹکا ہُوا تھا کہ اگر کوئی زور کا جھٹکا لگتا تو شاید گِر بھی پڑتا۔ وہ آہستہ سے اُٹھی اور اُس نے آہستگی سے تیمور کو اپنی گود میں لے لیا اور واپس اپنی جگہ آ گئی۔ سب لوگ آہستہ آہستہ اپنی زندگی کے معمولات میں مصرُوف ہوتے جا رہے تھے۔ وہ لاہور کے قریب پہنچ رہی تھی اور اب فاصلہ بہت زیادہ نہیں رہ گیا تھا پھر کسی خیال کے تحت اُس نے اپنے دُکھتے ہُوئے بدن کو جنبشیں دیں اور تیمور کو گود میں لئے ہُوئے وہاں سے آگے بڑھ گئی، بس یونہی ذرا سی چہل قدمی کرنا چاہتی تھی۔ لمبے کمپارٹمنٹ میں وہ آخری سرے تک چلی گئی اور اُس کے بعد وہاں کھڑی ہو کر باہر کے مناظر دیکھنے لگی۔ ٹرین کو ہچکولے لگ رہے تھے تیمور کو سنبھالے ہُوئے اُس نے ایک سیٹ کا سہارا لیا اور اُسی وقت اُس کی نظر ایک جانب اُٹھ گئی ایک شخص تھا۔ جو ایک گوشے میں بیٹھا اپنے نیند کے مزے لے رہا تھا لیکن رِدا کے ہاتھ سے تیمور چھُوٹتے چھُوٹتے بچا تھا کیونکہ یہ شخص... یہ شخص کوئی اور نہیں تھا... یہ خیر دین تھا۔

خیر دین!

رِدا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے کھڑی دیکھتی رہی۔ خیر دین کا عجیب سا حلیہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اِس حلیئے میں اِس کمپارٹمنٹ میں بچ نہیں رہا تھا معمُولی سا سادہ سا لباس گلے میں تعویذ، قریب میں ٹین کا ایک بکس۔ اُس کے نزدیک ایک لوٹا رکھا ہُوا تھا۔ یہ خیر دین کا سامان تھا۔ جب کہ اِس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والے باقی لوگ نہایت عمدہ سامان سے لیس تھے۔

خیر دین یہاں کہاں سے آیا؟ دفعتاً ہی اُسے احساس ہُوا کہ اِس میں بھی اُس کی کوئی شرارت ہے۔ لیکن وہ کمبخت میرا پیچھا کرتا ہُوا یہاں تک کیسے آ گیا؟ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے؟ خیر دین کو مخاطب کرے یا اُسے نظر انداز کر دے لیکن کیا اِس بات کے امکانات تھے کہ وہ خیر دین کو نظر انداز کر دیتی۔ خیر دین جس نے اُس کی زندگی کی کہانی اس کے سامنے پیش کر دی تھی اور خود ابھی بند کتاب کی مانند تھا دفعتاً ہی اُسے احساس ہُوا کہ خیر دین نے اُسے شکست دے دی ہے۔ ہاں یہ ایک فاتح تھا جو اُس کے سامنے بیٹھا کچھ اِس انداز میں ہچکولے کھا رہا تھا کہ اُس کی کیفیت دیکھ کر ہونٹوں پر خواہ مخواہ ہنسی مچلنے لگی تھی نہ جانے کیوں رِدا کو ایک عجیب سا احساس ہُوا یہ کوئی اجنبی نہیں ہے اور اِسے مخاطب کرنا کوئی ایسی بات نہیں ہو گی جو... جو میری اَنا کو ٹھیس پہنچا سکے۔

چنانچہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور خیر دین کے قریب پہنچ گئی اور پھر اُس نے بڑے زور سے خیر دین کے بازو پر گھونسا مارا۔

”اُٹھو!“ وہ غرائی اور خیر دین بوکھلائے ہُوئے انداز میں اِس طرح اُٹھا کہ رِدا سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور پھر اُس کے حلق سے بھرّائی ہُوئی آواز نکلی۔

”لو کمال ہو گئی۔ کیا لاہور آ گیا؟“

”اُٹھ جاؤ خیر دین ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“ رِدا نے عجیب سے لہجے میں کہا اپنے اِس لہجے کے بارے میں وہ خود بھی کوئی اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی کہ اِس لہجے میں مسرت ہے، غُصّہ ہے، ناراضگی ہے یا اپنائیت ہے۔ لیکن اُس نے کسی کے ساتھ کبھی اِس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ خیر دین اپنا بازو دبا رہا تھا۔

"اوجی رُدابی بی جی آپ بتا سکتی ہو کہ ہمارے بازو میں کیا لگا تھا؟"

"خیر دین! میں اِس کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دوں گی۔ بس اَب تم انسان بنو۔ دیکھو خیر دین میری پریشانیاں آخری حد تک پہنچ چکی ہیں۔ یہ بتاؤ تم یہاں کیسے؟"

"لوجی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آرہی کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے، ارے باپ رے یہ تو ریل لگتی ہے جی، او ہو، ہم تو ریل ہی میں سفر کر رہے تھے۔ لوجی کمال ہوگئی!"

"خیر دین... خیر دین! خُدا..."

"ہاں... ہاں آگے بولو خُدا ہمیں غارت کر دے۔ ہم اِس کھڑکی سے گِر کر مر جائیں۔ یہی کہنا چاہتی ہو ناں رُدا بی بی جی؟"

"تیمور کو سنبھالو پلیز خیر دین۔" رُدا نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے کہا اور تیمور کو خیر دین کی گود میں دے دیا۔ خیر دین نے بڑے پیار سے اُسے اپنی آغوش میں بٹھا لیا تھا اور پھر اُس نے رُدا کی مرضی محسوس کر کے اُس کے لئے بیٹھنے کی جگہ بھی بنا دی۔

رُدا کے بیٹھنے کے انداز میں بڑی اپنائیت تھی، بیٹھنے کے بعد وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اور پھر اُس نے نظریں گھما کر خیر دین کو دیکھا اور خیر دین عجیب بھونڈے انداز میں مسکرانے لگا۔ رُدا دانت پیس کر اُسے گھورنے لگی تھی۔

"وہ رُدابی بی جی کوئی کہانی سُنائیں آپ کو۔ ہا ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خُدا بادشاہ۔"

"ٹھیک ہے میری بے بسی کا مذاق اُڑانے کا حق ہے تمہیں خیر دین جو دِل چاہے سُناؤ۔ میں کسی کو کیسے مجبُور کر سکتی ہُوں۔"

"نہ بی بی جی! خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ تو آپ کو ہنسانا چاہتے ہیں اور آپ یہ سوچ بھی نہیں سکتیں رُدابی بی جی کہ جب آپ ہنستی ہیں تو خیر دین کو یُوں لگتا ہے جیسے اِس کے بعد اِس کائنات میں کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہ رہی ہو۔"

آفندی صاحب خاصے عمر رسیدہ انسان تھے لیکن اِس عمر میں بھی اُن کی صحت بہت عُمدہ تھی۔ حالانکہ آفندی صاحب سے احسان احمد کے معاملات کچھ اِس طرح چل چکے تھے کہ دونوں کے درمیان ہلکی سی رنجش باقی تھی۔ لیکن عادل حسین نے اِس رنجش کو بھی دُور کر دیا تھا اور احسان احمد تو ویسے ہی ایک نرم دِل اور نرم خو انسان تھے۔ بیچارے گزرے ہُوئے واقعات بھول گئے تھے اور رُدا کے معاملے نے تو آفندی صاحب سے بھی ہمدردی پیدا کر دی تھی پھر ثناء نے جو شور مچایا ہُوا تھا نے بھی سب کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ ابتداء میں رُدا کے سِلسلے میں بڑی بڑی باتیں ہُوئی تھیں۔ بہت سے لوگوں خاص طور سے خواتین نے اُس پر ہمیشہ ناک بھوں چڑھائی اور تیمور کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا تھا لیکن رفتہ رفتہ رُدا کی نرم طبیعت اور اُس کے محبت بھرے انداز نے سب ہی کو نرم کر دیئے تھے اور اب تو ذکیہ بیگم یہاں تک کہ دادی اماں بھی رُدا کے لئے سخت پریشان تھیں۔

بہر حال قافلے کا قافلہ آفندی صاحب کی کوٹھی کی جانب روانہ ہُوا تھا اور سب وہاں پہنچ گئے تھے۔ آفندی صاحب کی صُورت دیکھ کر احسان احمد کو بہت دُکھ ہُوا۔ ذرا سی دیر میں اُن کا چہرہ ڈھلے ہُوئے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا اور وہ بستر پر دراز تھے۔ اِن لوگوں کی اطلاع پاکر بمشکل تمام خود کو سنبھال پائے اور ایک ملازم کے سہارے ڈرائینگ رُوم میں آئے ہُوئے۔ اُن کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر بنا ہُوا تھا۔ اِن سب کو دیکھ کر وہ کافی حیران ہُوئے۔ احسان احمد صاحب اور عادل حسین نے اُن سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا عادل حسین کہنے لگے۔

"آخر ہُوا کیا آفندی صاحب؟ یہ سارا ڈرامہ ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔"

"وہ... وہ کہاں ہے؟ تمہارے گھر میں موجود ہے؟" آفندی صاحب نے گلوگیر لہجے میں پُوچھا۔

"نہیں آفندی صاحب وہ صبح... صبح خاموشی سے گھر سے نِکل گئی اور اب اُس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔"

"آہ! مجھے یہی خدشہ تھا۔ یہی خدشہ تھا مجھے۔ میں جانتا ہُوں وہ مُجھ سے سخت ناراض ہے۔ میں جانتا ہُوں اُس کے دِل میں میرے لئے کیا ہوگا لیکن... لیکن" آفندی صاحب کی آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہوگئے۔

اُن کی عمر... صحت اور پھر یہ دُکھ دیکھ کر سبھی دُکھی ہو گئے تھے۔ احسان احمد نے کہا۔

"آفندی صاحب! خُدا جانتا ہے کہ میرے دِل میں آپ کے لئے عزت اور محبت ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی آپ کے ذہن میں یہ بات آئے کہ میرے اور آپ کے درمیان کچھ ایسے معاملات چل چکے ہیں جو ناخوشگوار تھے لیکن آج میرے دِل میں کوئی گرد نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پُوچھنے کی جُرأت کرنا چاہتا ہُوں کہ رُدا کے اور آپ کے درمیان کیا تعلق تھا اور یہ سب کیا ہے؟"

"احسان احمد! میں تو اپنی ہی شرمندگی کا شکار ہُوں میں نے تمہارے ساتھ سختیاں کیں لیکن تم نے میرا خُون اپنے جگر میں پرورش کیا۔ میری رُدا کو تم نے اپنے ساتھ رکھا اور جس انداز میں وہ نظر آئی تھی اُس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ تم نے اُسے بہت محبت سے رکھا ہُوا تھا۔ تمہارا یہ احسان میری گردن پر ہے۔ اب بھلا تم سے کیا چھپاؤں گا، احسان میاں ایک ذرا سی ضد کا شکار ہوگیا میں۔ پتہ نہیں ہم والدین اپنی اولاد کو اِس طرح نظر انداز کیوں کر دیتے ہیں؛ بچوں سے بھی بھلا کہیں ضِد کی جاتی ہے؛ اُن کا تجربہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ اگر ہم اُن کی ناسمجھی کے مقابلے پھر اپنی اَنا لے آئیں تو کیسے کیسے المیئے جنم لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ میری داستان میں پوشیدہ ہے۔

میں تمھیں کہانیاں نہیں سُناؤں گا۔ مُختصر الفاظ میں یہ داستان بتاؤں گا۔ ہُوا یُوں تھا کہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے میری بیٹی حِنا جو ماں کی موت کے بعد بڑے لاڈ سے میری آغوش میں پروان چڑھی تھی۔ ایک ذہنی حادثے کا شکار ہوگئی۔ ایک اَوباش اور آوارہ فطرت شاعر اُس کے دِل کو بھا گیا اور اُس شخص کا نام ثاقب تھا۔ حِنا اِس طرح اُس سے متاثر ہُوئی کہ اُس کے لئے اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھی۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ خُدا گواہ ہے کہ شاعر کی غُربت میرے لئے باعثِ تشویش نہیں تھی۔ میں اُس سے ملا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ بے حس اور نکما قسم کا انسان ہے۔ بہت خوبصُورت اشعار کہتا تھا لیکن اُن اشعار کی رُوح اُس کے وجُود میں نہیں تھی۔ میرے تجربے نے یہی بتایا اور میں نے حِنا کو اِس کی تفصیل بتا دی مگر حِنا نے میرے تجربے کو قبُول نہ کیا اور وہی ہُوا جو ایسے کسی مسئلے میں ہونا چاہیئے تھا۔ حِنا نے اپنی ضِد کو برقرار رکھا اور میں اپنی اَنا کے ہاتھوں مجبُور ہوگیا۔ نتیجے میں حِنا گھر سے چلی گئی۔ اُس نے شاعر سے شادی کر لی اور اُس کی جھونپڑی میں رہنے لگی۔

احسان احمد! میں نے غلطی کی تھی لیکن مجھے یہ احساس بھی تھا کہ حِنا نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میری ساری محبت کو اُس نے ٹھکرا دیا ہے چنانچہ طویل عرصہ تک میں اُس سے دُور رہا۔ میں نے لوگوں سے اُس کے بارے میں معلومات بھی حاصل نہ کیں پھر جب میری محبت ضبط کے آخری بندھنوں... کو توڑ کر سامنے آئی تو میں حِنا کی تلاش میں نِکلا اور مجھے اپنے تجربے کی تصدیق ہوگئی۔ حِنا نے اُس کے لئے دولت چھوڑ دی تھی۔ اُس نے دولت کے لئے حِنا کو چھوڑ دیا۔ وہ روزگار کی تلاش میں ملک سے باہر چلا گیا تھا اور حِنا ایک بچی کی ماں تھی اور اُس بچی کا نام رُدا تھا۔ ماں نے بیٹی کو باپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں اُن دونوں سے مِلا تو میری محبتوں کے سوتے پھُوٹ پڑے لیکن مجھے اِس بات کا علم نہیں تھا کہ میری اولاد اِتنی ضِدی ہے۔ حِنا نے مجھے مکمل اعتماد دیا لیکن اُس نے یہ بات بھی کہہ دی کہ جس گھر سے اُسے نکال دیا گیا تھا وہ اُس گھر میں واپس نہیں جائے گی۔ میں نے لاکھ کوششیں کر لیں۔ رُدا کو بھی اِس سلسلے میں استعمال کر لیا۔ معصُوم بچی ماں کی ضِد کے آگے مجبُور ہوگئی اور میں اُن دونوں کو اپنے ساتھ نہ لا سکا۔ حِنا نے اپنے اور میرے درمیان فاصلے رکھے تھے۔ وہ سروس کرتی تھی۔ اور بہت اچھی حیثیت اختیار کر گئی تھی جب کہ ثاقب کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اُس کا رابطہ حِنا سے مکمل طور پر ٹُوٹ چُکا تھا اور اِس بات کو طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ میں حِنا کی ضِد سے دِل برداشتہ تھا۔ رُدا کے قُرب نے میرے دِل میں کچھ اور جذبے جگا دیئے تھے۔ پھر میں اپنے کاروبار کو سمیٹنے کے لئے بیرُونِ ملک نِکل گیا۔ میں نے رُدا کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن حِنا نے اُسے منظُور نہ کیا اور اِس بات سے مجھے ایک بار پھر غُصّہ آیا۔ طویل عرصے تک میں نے اُن لوگوں سے رابطہ قائم نہیں کیا پھر میں وہاں سے واپس آیا تو مجھے علم ہُوا کہ ثاقب کمبخت پھر واپس آ گیا ہے۔ اور کِسی طرح حِنا سے اُس کے تعلقات استوار ہو گئے ہیں۔ مجھے شدید غُصّہ آیا۔ مجھے یہ شکایت تھی اپنی بیٹی سے کہ اُس نے بُوڑھے باپ کو تو معاف نہ کیا لیکن شوہر کو معاف کر دیا اور اُس کے بعد میں اُن لوگوں سے قطع تعلق کر کے کراچی چلا آیا طویل عرصہ تک میں اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ضم کئے رہا اور ایک بار پھر مجھے یہ احساس ہُوا کہ میری زندگی کے لمحات ہی کتنے ہیں؛ میں ہُوں ہی کتنے دِن کا مہمان؛ واپس لاہور پہنچا تو پتہ چلا کہ میری دُنیا میں ایک بدترین انقلاب آ چکا ہے۔ ایک ایسا انقلاب احسان احمد جس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا کہ میری حِنا اِس دُنیا سے رُخصت ہوگئی اور... اور وہ سانپ... وہ کمبخت سانپ ایک بار پھر اُسے کاٹ کر دُور چلا گیا ہے۔ ثاقب نے حِنا کو رِجھا لیا تھا۔ حِنا پھر ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ اِسی بچے کی پیدائش پر حِنا کا

انتقال ہوگیا۔

میں جانتا تھا کہ رِدا بھی اپنی ماں سے مختلف نہ ہوگی۔ میں نے رِدا کے بارے میں معلومات کیں تو پتہ چلا کہ وہ لاہور چھوڑ چکی ہے۔ کہاں گئی ہے کوئی نہیں جانتا اور اُس کے بعد احسان احمد! میں نے جہاں جہاں ممکن ہو سکتا تھا اُسے تلاش کیا۔ رِدا مجھ سے ناراض تھی۔ میں جانتا ہُوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے۔ اُس نے سوچا کہ میں نے اُس کی ماں کو قتل کر دیا ہے۔ یقینی طور پر میں اِس سِلسلے میں اپنے آپ کو مُجرم سمجھتا ہُوں۔ ہاں میری ذرا سی ضِد نے حالات بگاڑ دیئے۔ میں اگر چاہتا تو اپنی نگرانی میں ثاقب کی تربیت کرتا۔ مگر ایک ضِد، ایک اُلجھن میرے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔ کیا نہیں تھا میرے پاس، میں ... میں اُسے ایک اچھی زندگی دے سکتا تھا لیکن میں اپنی بیٹی سے جُدا ہو گیا۔ آہ حِنا مر گئی۔ وہ اگر میری سرپرستی میں ہوتی تو شاید یہ سب کچھ اُس پر نہ بیتتی اور ... !

اور اب ایک طویل عرصے کے بعد رِدا مجھے نظر آئی ہے تو ... تو میرا دِل بے قابو ہو گیا ہے۔ احسان احمد کِسی طرح ... خُدا کے واسطے کِسی طرح میرے اور اُس کے درمیان تلخیاں ختم کرا دو میں ... میں اُس سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہُوں۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرُوں گا۔ آہ! اِن آنکھوں نے اپنی بچّی کو کھو دیا ہے میں اُس کی صُورت میں اپنی بچّی کی صُورت دیکھ لُوں گا۔ اور پھر وہ بچّہ حِنا کا بیٹا جو رِدا کے پاس ہے۔ احسان احمد مجھ سے زیادہ بدنصیب انسان کوئی ہو سکتا ہے جس نے اپنی ضِد کے لئے اپنی زندگی کے طویل ترین سال برباد کر دیئے۔ کوئی بھی تو نہیں ہے میرا اِس دُنیا میں کیا کروں مجھے بتاؤ ... کیا کروں؟"

یہ کہانی اِتنی دِلدوز تھی کہ ثناء کی آنکھیں بھی آب دیدہ ہو گئی تھیں۔ احسان احمد اور عادل حسین وغیرہ بھی انتہائی متاثر نظر آ رہے تھے، آفندی صاحب نے کہا۔

"ایک بار ... بس ایک بار اُسے میرے پاس پہنچا دو۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ اُسے تلاش کر کے میرے پاس پہنچا دو۔ میں اُس سے معافی مانگ لُوں گا۔ میں اُس کے قدموں میں سر رکھوں گا اور اعتراف کروں گا کہ مجھ سے غلطی ہُوئی تھی اِس غلطی کی سزا اب ختم ہو جانی چاہیئے۔ آہ! احسان احمد وہ جہاں بھی مِل سکے۔ اُسے تلاش کرو۔"

احسان احمد خاموشی سے گردن جُھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔ پھر انھوں نے کہا۔

"آفندی صاحب! میں اِس سِلسلے میں تمام کارروائیاں کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیئے گا۔ اپنے کو حوصلہ دیجئے۔ بہتر یہ نہیں ہوگا کہ آپ ہمارے ساتھ ہی چلیئے۔ پتہ نہیں آپ کی کیا حالت ہو۔"

"نہیں احسان میاں۔ تمہارا بے حد شکریہ مجھے کِس قدر شرمندہ کرو گے۔ میں تو اب شرمندہ ہونے کی سکت بھی نہیں رکھتا۔ بس میں یہاں ٹھیک ہُوں۔ تم براہِ کرم مجھ سے رابطہ رکھو احسان احمد میں تنہا ہُوں۔ اب اِس دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ ایک ایسے لاوارث انسان کو سہارا دو جو اب دوسروں کی جانب بھیک مانگنے والے انداز میں محبت کے لئے ترس رہا ہے۔"

"آپ بالکل فِکر نہ کریں آفندی صاحب! اب یہ معاملہ صرف آپ کا نہیں ہے۔ رِدا نے اِس گھر میں ایک ایسی حیثیت حاصل کر لی ہے کہ شاید آپ اِس بات پر یقین نہ کریں کہ رِدا اور ثناء کے لئے ہمیں کوئی فرق نہیں رہا ہے اور یہ ثناء ... یہ تو پاگل ہے اُس کے لئے۔ آپ دیکھیئے اِس نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے! آپ اطمینان رکھیئے۔ ہم اُسے تلاش کریں گے ضرور تلاش کرینگے، ویسے آپ کا کیا خیال ہے کیا وہ لاہور واپس جا سکتی ہے؟"

"کیا بتاؤں، مَیں تو اُس کے ذہن کے بارے میں زیادہ جانتا بھی نہیں۔ بڑی معصُوم تھی، محبت کرتی تھی مجھ سے مگر ماں کی موت کے بعد شاید اُس نے اپنی محبت کے جذبے سرد کر لئے اور میں تھا بھی اِس قابل۔ کم از کم حِنا سے ناراض تھا میں۔ لیکن وہ تو مجھ سے محبت کا اظہار کرتی تھی۔ میں کچھ ایسا بُزدل ہُوا اُن دونوں سے کہ ... کہ پلٹ کر اُن کی خبر نہ لی۔" آفندی صاحب ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔

یہ کہانی بڑی دردناک تھی اور اب کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رِدا کو کہاں تلاش کریں۔

بہرحال کافی دیر تک وہ آفندی صاحب کے ساتھ رہے اور اُس کے بعد وہاں سے واپس چل پڑے۔ ثناء روتے ہُوئے کہہ رہی تھی۔

"تیمور رِدا کا بھائی تھا۔ وہ اُسے اپنا بچّہ بتاتی تھی ٹھیک ہی تو ہے ماں ہی تو تھی وہ اُس کی۔ ماں سے بھی زیادہ محبت کرتی تھی وہ۔ لیکن رِدا۔ ڈیڈی مجھے رِدا چاہیئے۔"

❋

تیمور خیر دین کی گود میں جاگ گیا تھا۔ اور خیر دین اُس سے باتیں کر رہا تھا۔

"لو جی شہنشاہِ عالم آپ نے تو ہندوستان پر سکہ جما دیا تھا۔

مگر کیا جائے آپ کے ساتھی اُس پر قبضہ برقرار نہیں رکھ سکے۔ پر جی کوئی بات نہیں اپنا پاکستان زندہ باد۔ لو جی کمال ہو گئی رِدا بی بی جی، تیمور میاں ہنس رہے ہیں۔"

رِدا کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ نہ آئی۔ وہ خاموشی سے خیر دین کو دیکھ رہی تھی پھر اُس نے آہستہ سے پُوچھا۔

"خیر دین! تم کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں آپ حُکم دیں گی ردا بی بی جی۔ ہم تو خادم ہیں۔"

"خیر دین! ایک بات کہوں تم سے بُرا تو نہیں مانو گے؟"

"لو جی کمال ہو گئی۔ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضِلع گوجرانوالہ اور رِدا بی بی کی باتوں کا بُرا مانیں گے! ہم تو خادم ہیں جی۔ خادم کبھی بُرا مانتے ہیں؟"

"تو سُنو خیر دین، میں جس قدر ٹوٹی ہُوئی ہُوں اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اِس کے باوجود میرے اندر حِسِ ظرافت باقی رہے گی تو میرے خیال میں۔ میں اِسے ظُلم تصوّر کروں گی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم میری مظلومیت پر ترس کھاتے ہُوئے میرے ساتھ منصفانہ سُلوک کرو۔ میں اِس وقت کسی ذہنی بوجھ کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہُوں۔"

"لو جی کمال ہو گئی رِدا بی بی جی ہم نے کون سا بوجھ ڈالا آپ پر جی؟"

"یہ ڈائریاں تم نے مجھے دی تھیں ناں؟"

"ڈائریاں؟ کون سی ڈائریاں جی؟"

"وہ جنھیں میں پڑھ رہی تھی۔"

"لو جی ہمیں کیا معلوم کہ آپ ڈائریاں پڑھ رہی تھیں۔"

"تم اِسی کمپارٹمنٹ میں موجود تھے خیر دین۔"

"ہاں جی تھے تو اِسی کمپارٹمنٹ میں۔"

"اور یقیناً مجھ سے غافل نہیں ہو گے۔"

"چلو جی مان لیتے ہیں غافل نہیں تھے۔"

"تو تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ میں رات بھر جاگتی رہی ہُوں؟"

"دیکھا تھا رِدا بی بی جی۔"

"یہ بھی دیکھا ہوگا تم نے کہ میں ڈائریاں پڑھ رہی تھی؟"

"ہاں جی دیکھا تھا۔"

"اور یہ وہی ڈائریاں تھیں جو تم نے مجھے دی تھیں۔"

"بڑی خوشی ہُوئی جی کہ آپ نے ہماری ڈائریاں پڑھ لیں۔"

"اِس کا مطلب ہے خیر دین کہ تم میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکے تھے۔" رِدا نے خیر دین کو دیکھتے ہُوئے کہا۔ اور خیر دین نے نظریں جُھکا لیں۔

"ہاں جی کر چکے تھے۔"

"یہ بتاؤ یہاں تم کیسے پہنچ گئے؟"

"آپ کا پیچھا کرتے ہُوئے رِدا بی بی جی۔" خیر دین نے جواب دیا۔

"گویا تمھیں معلوم تھا کہ میں وہاں سے نکل آؤں گی؟"

"ہاں جی معلوم تھا۔"

"کیسے؟"

"آپ کو نظر میں رکھتے تھے رِدا بی بی جی اُسی دِن سے نظر میں رکھ لیا تھا، جس دِن سے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا ہمارا مطلب ہے ہم جاہل سے آدمی ہیں آپ ہماری کسی بات کا بُرا نہ مانیں ہم نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا رِدا۔ بی بی جی۔"

"تم جا کہاں رہے ہو؟"

"کہا نا جی آپ کے پیچھے پیچھے یہاں آئے ہیں اور جہاں آپ، آپ جائیں گی وہاں آپ کے پیچھے پیچھے جائیں گے۔"

"لاہور کتنی دُور رہ گیا ہے؟"

"لو جی تھوڑی دیر کا سفر اور باقی رہ گیا ہے۔"

"ہُوں، ٹھیک ہے وہیں چل کر تم سے باتیں ہوں گی۔ بہت دِن کے بعد وہاں واپس جا رہی ہوں خیر دین۔ پتہ نہیں میرا گھر کیسا ہوگا؟"

"لو جی جیسا بھی ہوگا آپ کا گھر ہے اور آپ کا یہ خادم جو آپ کے ساتھ ہے۔"

"تم ... تم خیر دین! خیر ابھی میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی یہاں میں خواہ مخواہ تماشہ بننے کے لئے تیار نہیں۔"

"خُدا نہ کرے آپ کہیں تماشہ بنیں رِدا بی بی جی۔ ہم آپ کے لئے جان دے دیں گے، کیا سمجھیں آپ؟"

رِدا نے گہری نگاہوں سے خیر دین کو دیکھا اور اُسے ڈائری کے پہلے صفحات پر لکھے ہُوئے اشعار یاد آ گئے۔ وہ اشعار خیر دین ہی نے لکھے تھے اور اُن اشعار میں ... اُن اشعار میں ... نہ جانے کیوں رِدا کے چہرے پر تمام تر افسُردگی کے باوجود ایک ہلکی سی شگفتگی بھی پیدا ہو گئی۔ اُس نے کہا۔

"تیمور کو ساری رات تو وہ سامنے والی لڑکیاں سنبھالے رہی ہیں۔ اب تم اِسے سنبھالو۔ میرے بس کا نہیں ہے۔"

"آپ حُکم دو جی۔ ساری عمر سنبھالیں گے۔ ہم کبھی گردن اُٹھا جائیں تو گردن کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دینا۔ کیوں بھئی تیمور میاں۔ ہماری بات پر تمھیں یقین ہے؟"

تیمور کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"او جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ یاروں کی بات یار ہی سمجھتے ہیں۔ آپ اُدھر کہاں بیٹھیں گی رُدابی بی جی بلاوجہ پریشان ہوں گی یہیں بیٹھیے۔"

"نہیں میں جا رہی ہُوں۔" رُدا نے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنی جگہ آ بیٹھی۔

ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا اُسے۔ عجیب سا احساس۔ اور وہ دل ہی دِل میں غور کر رہی تھی کہ یہ خیر دین یا یہ جو کوئی بھی ہے۔ اُس کا تعاقب کرتا رہا ہے۔ وہ نہ جانے کس طرح اِس کپارٹمنٹ میں پہنچا اور... اور... ویسے... ویسے۔ اور اُس کے بعد رُدا سے کچھ نہ سوچا گیا۔

روشنی پوری طرح پھیل چُکی تھی۔ اور مُسافر اپنا اپنا سامان تیار کر رہے تھے۔ لاہور کا اسٹیشن بس آنے ہی والا تھا۔

پھر وہ اُس وقت تک خیر دین کے پاس نہیں گئی جب تک لاہور کا اسٹیشن نہیں آ گیا اور اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد جب ٹرین رُکی تو خیر دین اُس کے پاس پہنچ گیا۔

"آیئے رُدابی بی جی۔"

رُدا نے اپنے اُن ہمسفروں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے رات کو اُس سے اپنائیت کا مظاہرہ کیا تھا اور اُس کے بعد خیر دین کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر اُتر گئی۔ یہ شہر اُس کے بچپن کا امین تھا۔ اِس شہر کا ایک ایک گلی کوچہ اُس کے لئے نہ جانے کیا کیا حیثیت رکھتا تھا؟ کافی عرصے کے بعد زندگی کا عجیب وغریب وقت گزارنے کے بعد وہ ایک بار پھر اِس شہر میں آئی تھی اور اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہ گلیاں اور یہ سڑکیں اُسے شکایت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں۔ کچھ کہہ رہی ہُوں اُس سے۔

رُدا کے ذہن میں طوفان مچا ہُوا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد اُنھوں نے ٹیکسی کرنے کے بجائے ایک تانگہ کیا اور تانگے میں بیٹھ کر رُدا اپنے گھر کی جانب چل پڑی۔ اُس کے دل میں بہت سے دُکھ اُبل رہے تھے۔ جنا یاد آ رہی تھی اُسے۔ اپنا کالج یاد آ رہا تھا۔ نہ جانے کون کون یاد آ رہا تھا اور تانگہ جانی پہچانی سڑکوں سے گزر کر بالآخر اُس جگہ پہنچ گیا جہاں اُس کی رہائش گاہ تھی۔

مکان کے دروازے پر تالا یُونہی پڑا ہُوا تھا اور اِس بات کا منتظر تھا کہ کوئی اُسے کھولے گا اور اُس کے بعد اُس مکان کی حیثیت پھر سے لوٹ آئے گی۔ لیکن رُدا کے دِل میں اندھیرے اور مایُوسیاں در آئے تھے۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ رہی تھی۔

خیر دین نے تیمور کو لئے لئے مکان کا دروازہ کھولا اور اُس کے بعد اندر داخل ہو گیا۔ سارا مکان گندگی سے پٹا پڑا تھا۔ درختوں کے پتے بھڑ جھڑ کر صحن میں جمع ہو گئے تھے۔ ہر چیز پر ایک حسرت برس رہی تھی۔

رُدا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ خیر دین خاموشی سے اُس کے ساتھ آگے بڑھا اور پھر رُدا نے اندر کا دروازہ کھولا اور اُس کے بعد اندر پہنچ گئی۔ چونکہ مکان چاروں طرف سے بند کر دیا گیا تھا اِس لئے اندر کی حالت بالکل صاف سُتھری تھی۔ صحن البتہ گندگی کا مظہر تھا اور ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ مکان طویل عرصے سے بند پڑا ہُوا ہے۔ خیر دین نے تیمور کو ایک جگہ اُتارا اور پھر باہر نکل آیا۔ رُدا اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی تھی اور تیمور پورے گھر میں ٹہلتا پھر رہا تھا۔ رُدا کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ اِس گھر میں آنے کے بعد اُسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ خیر دین کو جب کافی دیر ہو گئی اور وہ واپس نہ پلٹا تو رُدا نے خود ہی خود کو سنبھالا اور باہر نکل آئی لیکن باہر دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ خیر دین نے تمام کوڑا کرکٹ صاف کر کے ایک کونے میں جمع کر دیا تھا۔

"خیر دین! کیا کر رہے ہو تم؟"

"کچھ نہیں رُدابی بی! آپ کا گھر صاف کر رہا ہُوں۔"

"خیر دین! یہ سب کچھ بھی کرو گے تم؟"

"ہاں رُدا کیوں نہیں۔" خیر دین نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ رُدا چونک پڑی اور اُسے دیکھنے لگی۔

اِس وقت اُس نے رُدابی بی نہیں کہا تھا۔ لہجہ بھی بدلا ہُوا تھا پھر اُس نے آہستہ سے پُوچھا۔

"رُدابی بی جی! کھانے پینے کو کچھ ہے؟ ہمیں ناشتہ کرنا ہوگا۔"

"ہُوں! یہاں تو کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو خراب ہو چکا ہوگا۔"

"تو پھر تھوڑی دیر کے لئے میں آپ سے جُدا ہو رہا ہُوں۔" خیر دین نے کہا۔

"سُنو تو سہی۔ کہاں جا رہے ہو؟"

"ناشتے کا انتظام تو کرنا ہی ہے۔" خیر دین نے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

رُدا کھڑی اُسے دیکھتی رہی تھی پھر وہ ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹی اور اُس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ نکلی۔ "نہ جانے کون ہو تم خیر دین۔ لیکن کچھ بھی ہو کمال کی شخصیت ہو۔"

وہ واپس اپنی جگہ آ گئی اور بیٹھ کر پھر سوچوں میں ڈُوب گئی۔

بدن رات بھر کے سفر کی وجہ سے اکڑ گیا تھا، پھر چونکہ سوئی بھی نہیں تھی اِس لئے دماغ میں سناٹے سے اُترتے ہُوئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ لیکن گھر کی صفائی سُتھرائی ضروری تھی۔ ابھی تک اُس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ یہ بھی نہیں سوچ پائی تھی کہ خیر دین اُس کے ساتھ ساتھ لگا یہاں تک آ گیا ہے۔ اب ہوگا کیا؟ اِنہی تمام سوچوں میں گُم تھی کہ خیر دین واپس آ گیا۔ اور اُس نے رُدا کے سامنے ناشتے کا پُورا پُورا سامان رکھ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چائے کی پتی اور دودھ شکر وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہم چائے بنا کر لاتے ہیں آپ اِنھیں پلیٹوں میں سجائیے۔"

"ٹھہرو، بھئی ٹھہرو۔ میں جا رہی ہُوں کچن میں۔" رُدا نے کہا۔

"تو پھر چلیئے جی ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔"

"تم مجھے بے وقوف بنانے سے باز نہیں آؤ گے ناں۔"

"آ جائیں گے جی۔ اِتنی جلدی کیا ہے؟" خیر دین نے کہا اور رُدا ایک گہری سانس لے کر کچن میں داخل ہو گئی۔ خیر دین، تیمور کو اپنی پُشت پر لادے اُس کے دونوں ہاتھ گردن میں ڈالے رُدا کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ پھر اُس نے تیمور سے کہا۔

"اور اب جی تیمور خان صاحب ہم لوگ ناشتہ کریں گے۔ یہ رُدابی بی چائے بنا رہی ہیں۔ آپ چائے پئیں گے؟" اُس نے تیمور سے پُوچھا اور تیمور نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

رُدا کو نہ جانے کیوں ایک ڈھارس سی بندھ گئی تھی۔ وہ جس طرح یہاں آئی تھی۔ اُس کا دِل بہت زیادہ ٹُوٹا ہُوا تھا لیکن خیر دین کی یہاں موجودگی اُس کے لئے ایک بہت تقویت کا باعث بن گئی تھی۔ خیر دین تو وہاں بھی اُس کا رکھوالا بن گیا تھا۔ رُدا کو اُس نے نہ جانے کیسی کیسی مُصیبتوں سے بچایا تھا۔ رُدا اُن میں سے ایک بات کو بھی نہ بھُول سکی تھی۔ بس غُصّہ تھا تو اُسے اِس بات پر کہ خیر دین جیت گیا تھا۔ اُس نے رُدا کے بارے میں تفصیلات معلوم کر لی تھیں اور اُسے ابھی تک خیر دین کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

بہرحال ہلکا پھُلکا ناشتہ تیار ہو گیا۔ خیر دین جو کچھ بازار سے لایا تھا۔ رُدا نے اُسے سلیقے سے برتنوں میں سجایا اور پھر ٹرے اُٹھائے ہُوئے باہر نکل آئی۔ ڈائننگ رُوم میں پہنچ کر اُس نے ناشتہ میز پر لگا دیا اور تیمور کو ایک کُرسی پر بٹھا دیا پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ خیر دین ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ رُدا نے گھُور کر اُسے دیکھا۔

"آ جاؤ۔"

"وہ رُدابی بی جی ہم... ہم۔"

"خیر دین! خُدا کی قسم تمام ناشتہ اُٹھا کر پھینک دُوں گی اور پھر آج دن بھر کچھ نہیں کھاؤں گی۔ رات بھر بھی کچھ نہیں کھاؤں گی۔"

"ارے بب... باپ رے۔ آپ نہیں کھائیں گی تو ہم بھی کیسے کھائیں گے۔ مر جاؤ گے بیٹا خیر دین، بہتر ہے کہ شرافت سے باز آ جاؤ۔" خیر دین جلدی سے کُرسی پر بیٹھ گیا اور پھر اُس نے بھی اپنے سامنے پلیٹیں کھسکا لیں۔

رُدا نے اُس کے برتنوں میں ناشتہ دیا اور اُس کے بعد خود بھی تیمور کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی۔ اُس کا ذہن بُری طرح چکرا رہا تھا تب ناشتے کے بعد خیر دین نے کہا۔

"اب ہم آپ سے ایک درخواست کریں۔ ردابی بی جی؟"

"کیجئے۔"

"آپ آرام سے اپنے بیڈ رُوم میں جا کر سو جائیے، تیمور خان اگر آپ کے ساتھ سوتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اُنھیں سنبھالنے کی ذمّہ داری ہماری..."

"اور تم تو رات بھر جیسے کپارٹمنٹ میں سوتے ہی رہے ہو۔"

"ہاں جی ہم تو مزے سے سوئے تھے۔"

"تو پھر مجھے ڈائری پڑھتے ہُوئے کون دیکھ رہا تھا؟"

"ہم جی..."

"کیسے؟"

"بس جی ہماری کچھ خُوبیاں ہیں۔ ہم سوتے میں بھی دیکھ لیتے ہیں مگر صرف مطلب کی چیزیں۔"

"جاؤ۔ تم سو جاؤ اور سُنو یہاں بہت سے کمرے ہیں جو کمرہ اپنے لئے پسند کرو اُس میں چلے جاؤ۔"

"بہت شُکریہ ردابی بی جی۔"

"مگر اِس سے پہلے باہر کا دروازہ بند کرنا مت بھُولنا۔" رُدا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

خیر دین نے بس ایک نِگاہ اُسے دیکھا تھا اور اُس کے بعد وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔

رُدا کو خود بھی اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی۔ اُس نے خیر دین سے کہا تھا کہ وہ یہاں آرام سے سو جائے۔ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ گھر میں خیر دین کے اور اُس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ تیمور ننھا سا معصُوم سا بچّہ تھا۔ لیکن خیر دین... خیر دین اُسے ذرّہ برابر اجنبی نہیں لگتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ خیر دین کیا ہے اور اِس کے بعد

وہ بستر پر لیٹ گئی۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ تیمور بھی غالباً بے سکون رہا تھا اِس لئے وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد سو گیا اور اُس کے بعد جب رُدا جاگی تو تقریباً ساڑھے تین بجے تھے۔ خُوب ہی سوئی تھی۔ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ کلائی پر بندھی ہُوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور حیران رہ گئی۔ تیمور ابھی تک سو رہا تھا۔ اُس نے تیمور کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اچھا ہے نیند بھر جائے۔ پھر اُسے خیر دین کا خیال آیا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی سو رہا ہو۔ بھلا ٹرین کے سفر میں بھی کہیں نیند آتی ہے۔ پھر وہ باتھ رُوم کی جانب بڑھ گئی۔ سب کچھ اُس کا جانا پہچانا تھا۔ باتھ رُوم میں اُس نے غسل کیا۔ اپنے بہت سے لباس وہ یہیں چھوڑ گئی تھی۔ چنانچہ لباسوں کے مسئلے میں کوئی دِقت نہیں ہُوئی۔ ویسے کراچی سے بھی وہ اپنے چند لباس لے آئی تھی۔ لباس وغیرہ تبدیل کر کے وہ باہر نکلی تو ایک دم چونک پڑی۔ خیر دین دروازے اور کھڑکیوں کی صفائی کر رہا تھا۔ اور اُس نے پُورا گھر ہی چمکا کر رکھ دیا تھا۔ جن چیزوں کا سوچ رہی تھی کہ وہ خود کرے گی وہ سب کی سب خیر دین نے کر ڈالی تھیں۔ اُس نے خیر دین کو دیکھا تو وہ رُک گیا۔

"ہم نے کچن بھی صاف کر دیا ہے رُدا بی بی جی! سارے کمرے صاف کر دیئے ہیں۔ آپ دیکھ لو جی آپ کو ذرہ برابر یہ محسوس ہو کہ یہ گھر کافی عرصے تک بند رہا ہے تو جو چور کی سزا وہ خیر دین کی... اور رُدا بی بی جی شام کے کھانے کا بندوبست بھی کر دیا ہے ہم نے۔ مگر آپ کو مچھلی پکانی پڑے گی۔ رُدا بی بی جی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کو مچھلی بڑی پسند ہے بشرطیکہ کوئی پکانا جانتا ہو۔ آپ کو مچھلی پکانا آتی ہے"

"یہ تم مچھلی کہاں سے لے آئے؟"

"بازار سے جی"

"تو تم سوئے نہیں؟"

"نہیں بی بی جی ایک ڈیڑھ گھنٹہ سوئے تھے اُس کے بعد آنکھ کھل گئی"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے جو تمہارا دِل چاہے کرو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گی"

"بہت... بہت شکریہ جی! اگر آپ ہمیں نہیں روکیں گی تو ہم اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے خُوش قسمت انسان تصوّر کریں گے" خیر دین نے کہا اور رُدا گہری نگاہوں سے اُسے دیکھتی ہُوئی کچن کی جانب چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد خیر دین بھی اُس کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گیا۔

"ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ جی"

"جاؤ۔ باہر جاؤ، تیمور ابھی سو رہا ہے"

"او جی پرواہ مت کرو۔ ہمارے کان اُس کی آواز فوراً سُن لیں گے۔ ویسے رُدا بی بی جی اگر چائے مل جاتی تو بڑا احسان ہوتا"

"ابھی بنا رہی ہُوں۔ باہر بیٹھ کر پیئیں گے"

"بہت بہت شکریہ"

رُدا جب چائے وغیرہ بنا کر باہر آئی تو تیمور خیر دین کی گود میں کھیل رہا تھا اور خُوش نظر آ رہا تھا۔ خیر دین نے تیمور کا چہرہ بھی دُھلا دیا تھا اور اُسے دوسرا لباس پہنا دیا تھا۔ رُدا واقعی شرمندہ سی ہو گئی۔ یہ... یہ شخص اُس کے لئے کیا کیا کچھ کر رہا ہے کتنی اپنائیت ہے اُس کے انداز میں۔ اور رُدا کے دِل میں ایک ہُوک سی اُٹھی اور وہ ایک لمحے کے لئے کھو سی گئی تھی پھر وہ چائے لئے ہُوئے خیر دین کے پاس پہنچ گئی۔

"لو خیر دین چائے پیئو"

"بہت بہت شکریہ" خیر دین نے کہا اور پھر تیمور سے بولا "آیئے مسٹر تیمور، چائے پی لیں"

رُدا نے پھر اُس کا لہجہ بدلا ہُوا محسوس کیا۔ لیکن یہ خیر دین تو اُسے پاگل کر دینے پر تُل گیا تھا چنانچہ وہ خاموشی سے خیر دین کے سامنے بیٹھ گئی۔

"مچھلی کا کیا ہُوا رُدا بی بی؟"

"جہنّم میں گئی"

"پانی میں گئی ہو گی، بھلا وہ جہنّم میں کیسے زندہ رہ سکتی ہے" خیر دین نے کہا اور رُدا بے اختیار ہنس پڑی۔

"اب بھی مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے خیر دین؟" اُس نے چند لمحات کے بعد کہا۔

"کیوں نہیں بتائیں گے رُدا بی بی، لو جی کمال ہو گئی۔ ہم تو آپ کو سب کچھ بتائیں گے۔ ہمیں اب بتانے میں عار کیا رہ گئی ہے" خیر دین کے اِن الفاظ پر رُدا چونک پڑی تھی۔

خیر دین خاموشی سے چائے کے گھونٹ لیتا رہا پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"معاف کیجئے مس رُدا آپ کو میری وجہ سے بہت سی ذہنی اُلجھنوں سے گزرنا پڑا ہے"

رُدا حیرت انگیز نگاہوں سے خیر دین کو دیکھ رہی تھی۔ خیر دین نے اپنی چائے کی پیالی خالی کی اور پھر اپنے ہونٹ خشک کرتا ہُوا بولا

"میرا نام تصوّر بیگ ہے"

رُدا نے جلدی سے اپنی پیالی نیچے رکھ دی اور اُس کی

نگاہیں خیر دین پر جم گئیں۔

"تصوّر بیگ، پولیس ڈیپارٹمنٹ..." رُدا کے مُنہ سے اچانک نکلا۔

"جی رُدا صاحبہ! میں اسپیشل برانچ کا چیف آفیسر ہُوں۔ اور میرے والد ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل ہیں"

رُدا کے مُنہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے خیر دین کو دیکھ رہی تھی۔ اب اُس کا انداز بالکل ہی تبدیل ہو گیا تھا، بمشکل تمام رُدا کے مُنہ سے نکل سکا۔

"لیکن خیر دین تم... میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے کہ۔ کہ"

"ہاں رُدا صاحبہ ایک بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ آپ میرے بارے میں سوالات کریں اور میں آپ کو اُن کے جواب دُوں"

"تم خود ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ تم۔ میرا مطلب ہے تصوّر صاحب"

"رُدا صاحبہ! میں آپ کی اُس کوٹھی میں بے مقصد نہیں آیا تھا یُوں سمجھ لیجئے ایک ذِمّہ داری میرے سپُرد کی گئی تھی اور اِس کی تفصیل بھی میں آپ کو بتائے دیتا ہُوں۔ شہاب صاحب کو آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ شہاب صاحب کے بارے میں ہمارے محکمے کو چند اطلاعات ملی تھیں اور اُن کے سِلسلے میں تفتیش کی جا رہی تھی۔ میری ذِمّہ داری یہ لگائی گئی کہ میں جس طرح بھی بن پڑے اُس کوٹھی تک رسائی حاصل کروں اور اُس ناجائز کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل کروں جو شہاب صاحب کے ذریعے ہو رہا تھا۔ اُس وقت بہت خراب صورتِ حال تھی اور احسان احمد صاحب کو بھی اِس سِلسلے میں ملوّث سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد مجھے آہستہ آہستہ تمام صُورتحال معلوم ہوتی چلی گئی۔ لیکن شہاب صاحب اِس قدر زیرک انسان تھے کہ اُنھوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی تھی جو میرے کام آ سکتی۔ اِس سِلسلے میں ایک فائل خاص طور سے قابلِ ذِکر تھا جو اُس وقت تک میرے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا"

"سُرخ فائل؟"

"ہاں رُدا صاحبہ سُرخ فائل! آپ کو اُس کے بارے میں کیسے معلوم؟" تصوّر بیگ نے پُوچھا۔

"وہ... وہ بس عجیب کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گی۔ اوہ! تصوّر صاحب... تصوّر صاحب تت... تو آپ نے کیا کیا؟"

"رُدا صاحبہ! وہ کام ابھی تک ختم نہیں ہُوا۔ بلاشبہ اُس میں طویل عرصہ لگ گیا ہے۔ لیکن معاملہ بھی اِتنا ہی طویل ہے اور پھر باقی سب کچھ جو ہُوا میرے سامنے ہی ہُوا۔ کاش میں اُس وقت شہاب صاحب پر ہاتھ ڈال سکتا"

"لیکن... لیکن۔ اُف میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کہاں سے سوالات کروں! تم... تم خود ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو"

"میں اپنے بارے میں جو بتانا چاہتا تھا وہ تو آپ کو بتا ہی چُکا۔ یعنی میں تصوّر بیگ ہُوں اور اُس وقت صرف شہاب صاحب کے سِلسلے میں آپ کی کوٹھی میں داخل ہُوا تھا"

"اُس کے بعد کی باتیں بعد میں" تصوّر بیگ نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"لیکن تصوّر بیگ صاحب، اختر... اختر یاد ہے ناں آپ کو؟"

"ہاں کیوں نہیں"

"اختر تو آپ کے گھر گئے تھے اور وہاں اُنھوں نے اصل خیر دین کو دیکھا تھا"

"اُنھوں نے اصل خیر دین کو نہیں دیکھا تھا بلکہ میرے کزن کو دیکھا تھا جو اتفاق سے میرا تھوڑا بہت ہم شکل بھی ہے اور بے حد شریر نوجوان ہے۔ باقی میں نے میک اَپ کر کے کسر پوری کر دی تھی۔ ورنہ اختر صاحب جیسے آدمی کو بے وقوف بنانا آسان کام نہیں تھا۔ دراصل مجھے علم ہو گیا تھا کہ وہ میرا تعاقب کر رہے ہیں" تصوّر بیگ نے جواب دیا اور رُدا نے آنکھیں بند کر لیں۔

"میرے خُدا... میرے خُدا آپ نے اختر جیسے شاطر کو بیوقُوف بنا دیا۔ اختر جو خود کو دُنیا کا سب سے چالاک آدمی سمجھتا ہے" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"چھوڑیئے رُدا صاحبہ! کیا رکھا ہے اِن باتوں میں ساری زندگی نہ جانے کیا کیا کرتا رہا ہُوں لیکن آج تک اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ کیا فائدہ اُس ذہانت سے جو اپنے کام نہ آئے" تصوّر بیگ نے کہا۔ لیکن رُدا نے اُس کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ حیرتوں کے سمندر میں غرق تھی۔

اُس کی آنکھیں تصوّر بیگ پر تھیں اور ذہن نہ جانے کہاں کہاں پرواز کر رہا تھا۔ گُزرا ہُوا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ خیر دین کی باتیں، اُس کی اپنائیت کا انداز، کوٹھی میں بہت سے لوگ تھے لیکن وہ خاص طور سے رُدا سے مانوس تھا اور ہر نازک لمحے میں اُس نے رُدا کی مدد کی تھی۔ اور اب وہ اُس کے پاس موجود تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا اِس بات کو سوچنے کا تو موقعہ ہی نہیں مِل سکا تھا۔ ابھی تو وہ حیرتوں کی منزل میں تھی اور بُنیادی باتیں نظر انداز کر بیٹھی تھی۔ چند لمحات کے بعد اُس نے کہا۔

"عِصمت باجی کو یونیورسٹی میں آپ ہی ہی ملے تھے؟"

"بھانڈا تو انھوں نے ہی پھوڑا تھا"
"میرے خدا خیر دین بن کر تم نے کس طرح ہم سب کو بے وقوف بنایا۔ معاف کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا احترام کروں یا۔۔۔ یا"
"کمال ہوگئی جی ردا بی بی جی۔ آپ بھی تکلف کریں گی"
"میرے خدا تم تو باقاعدہ قسم کے جاسوس ہو اور اتنے بڑے پولیس افسر ہونے کے باوجود تمھیں یہ ساری باتیں کیسے آگئیں۔ تم نے کسی کو اپنی شخصیت کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ اچھا یہ بتاؤ شہاب صاحب کے سلسلے میں کیا ہوا"
"شہاب صاحب بہت جلد ہماری گرفت میں آنے والے ہیں۔ میں نے بہت لمبا جال پھیلایا ہے اور اس سلسلے میں ہمارے لئے سب سے زیادہ کارآمد شخصیت اپنے رشید بھائی کی رہی ہے"
"رشید؟ کیا مطلب"
"وہی کوؤں والے رشید بھائی ردا بی بی جی، جنھیں کوؤں نے گنجا کر دیا تھا"
ردا کھلکھلا کر ہنس پڑی "میرے خدا تمہاری کون کون سی بات یاد کروں۔ کمال کے آدمی ہو اس دن تم نے رشید کو کوؤں سے جو مار کھلائی تھی وہ کبھی بھولی جا سکتی ہے؟"
"وہ تو ہمارا فرض تھا ردا بی بی جی"
"کیوں فرض تھا"
"مجال ہے کسی کی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی ردا سے بدتمیزی کرے اور تصور خاموش رہ جائے" تصور نے کہا۔
"اتنے سوالات ہیں میرے ذہن میں کہ میں ان کی ترتیب نہیں کر پا رہی۔ تم نے۔۔ تم نے تو ہم سب کو گھن چکر بنا کر رکھ دیا۔ رشید کی بات کر رہے تھے تم"
"ہاں ردا، رشید بہر طور ایک بری فطرت کا نوجوان ہے۔ لیکن یہ بری فطرت اسے برے ماحول کی وجہ سے ملی، مجموعی طور پر وہ برا نہیں ہے"
"کیا تمھیں یہ بات معلوم ہے کہ رشید کا فون بھی آیا تھا"
"رشید میرے قبضے میں ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ میرا قیدی ہے اور وہی شہاب کے سلسلے میں بہترین معلومات کا ذریعہ بنا۔ شہاب صاحب اس وقت کینیڈا میں ہیں اور انٹرپول ان کے گرد گرفت مضبوط کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد ہماری گرفت میں آجائیں گے۔ اس کے بعد اس بات کے مکمل امکانات ہیں کہ احسان احمد صاحب کا وقت پھر سے لوٹ آئے"
"اوہ، میرے خدا۔۔۔ میرے خدا کتنی خوشخبریاں سنائی ہیں

تم نے، بتاؤ۔ میں تمھیں خیر دین کہوں یا تصور بیگ کہوں
"اب جب آپ کو یہ علم ہوگیا ہے کہ میں تصور ہوں تو آپ تو خیر دین نہ کہیں۔ دراصل خیر دین کہنے سے میری پوزیشن ایک د ڈاؤن ہو جاتی ہے۔ جب کہ اب میں آپ کی نگاہوں میں کوئی او پوزیشن چاہتا ہوں" تصور بیگ نے کہا۔
"خیر۔۔۔ خیر تم سے تو اچھی طرح نمٹوں گی۔ میں اپنی اس بے تکل سے باز نہیں آسکتی۔ تم نے مجھے اس حد تک پہنچا دیا ہے"
"تو کون کہتا ہے باز آنے کو۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اس کچھ اور اضافہ ہو"
"خدا کی قسم بڑے ٹوٹے دل کے ساتھ یہاں آئی تھی لیکن تم کیفیت ہی بدل ڈالی تصور بیگ"
"ہاں ردا۔ میں چاہتا ہوں تمہاری پوری زندگی بدل جائے"
"اچھا یہ بتاؤ۔۔۔ مگر کہاں سے سوال کروں، چلو ٹھیک ہے تم اتنی محنت سے ان لوگوں کی خدمت کرتے رہے۔ دادی امان کو الٹی سیدھی کہانیاں سناتے رہے۔ ہم سب کے لئے سارے کام کرتے رہے۔ گھر کی جھاڑ پونچھ اور دوسرے تمام کام کیا محکمہ پولیس میں یہ سب بھی سکھایا جاتا ہے؟"
"دراصل ردا صاحبہ! بہت سے معاملات ایسے ہیں کے لئے ہمیں اپنے آپ کو تیار رکھنا پڑتا ہے"
"ونڈرفل۔۔۔ ونڈرفل۔ چلو اچھا رشید کا مسئلہ تو یہاں حل ہوا۔ یہ بتاؤ ثاقب صاحب۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ میرا مطلب"
"جی۔۔۔ جی"
"وہ کہاں ہیں؟ تم نے اس دن سے انھیں ایسا غائب کہ مجھے دوبارہ نظر نہیں آئے"
"وہ بے چارے السر کے مریض ہیں۔ ایک ہسپتال میں داخل ہیں"
"ہوں" ردا نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔
اسے اپنی بدلی ہوئی کیفیت کا خود بھی اندازہ ہو رہا تھا۔ نے اس طرح اس کے ذہن کو جھٹکا پہنچایا تھا کہ گزرے ہوئے کا بوجھ اس کے دماغ سے تقریباً اتر ہی گیا تھا اور اب وہ خرم نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کس تصور کے ساتھ، پھر اس نے کو دیکھا اور دفعتاً ہی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔
"تم مجھے کس قدر بے وقوف بناتے رہے ہو۔ تم نے اپنا کر لیا، یعنی میرے بارے میں معلومات حاصل کر لیں اور

اپنے بارے میں بتا رہے ہو"
"دیکھئے ناں ردا انسان کو بعض معاملات میں اپنے آپ کو برتر رکھنا ہی پڑتا ہے ورنہ سارا مستقبل تباہ ہو جاتا ہے"
"کیا مطلب"
"مستقبل کا مطلب تو مستقبل ہی ہوتا ہے" تصور بیگ نے کچھ اس انداز میں کہا کہ ردا کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔
اس کی آنکھوں میں ایک شرگیں کیفیت ابھر آئی تھی۔ تصور بیگ پھر سے سنبھل گیا اور اس نے تیمور کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"لو جی تیمور خان کمال ہوگئی۔ یار تم بچے ہو کر بڑوں کی باتیں سن رہے ہو۔ بھائی کھیلو، بہت بڑا گھر ہے، بہت بڑی کوٹھی ہے۔ تھوڑی دیر ہمیں بھی دے دو"
تیمور نہ جانے کیا سمجھا کہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ ردا مسکراتی نگاہوں سے تصور کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔
"اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں تمھیں یہ تمام تفصیلات کیسے معلوم ہوئیں۔ دیکھو کسی قسم کی ترکت برداشت نہیں کروں گی۔ ناراض ہو جاؤں گی" ردا کے انداز میں کچھ ایسی اپنائیت محسوس ہو رہی تھی کہ تصور بیگ کا چہرہ بھی خوشی کا آئینہ بنتا جا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
"مس ردا! آپ کا چیلنج قبول کرنے کے بعد میں نے آپ کے بارے میں چھان بین شروع کر دی۔ اس سلسلے میں ثاقب سب سے پہلے ذریعہ بنے اور مجھے ان سے کافی تفصیلات معلوم ہوگئیں۔ دوسرا ذریعہ آفندی۔ میرا مطلب محمود آفندی صاحب سے تھا انھوں نے مجھے باقی تمام داستان سنائی۔ جو ثاقب کی زندگی سے پہلے کی داستان تھی اور اس کے علاوہ مجھے آفندی صاحب ہی کے ذریعے ایک ڈائری بھی مل گئی جو آپ کی والدہ کی ڈائری تھی، یعنی حنا صاحبہ کی ان تینوں ذریعوں نے مل کر مجھے وہ تمام مواد فراہم کر دیا جو مجھے آپ کے بارے میں چاہیئے تھا۔ حنا صاحبہ کی ڈائری میں ان کے احساسات اور جذبات درج تھے اور شاعر سے ملاقات کا تذکرہ تھا۔ ثاقب نے بعد کی زندگی کے بارے میں تفصیلات بتائیں اور آفندی صاحب نے باپ بیٹی کے معاملات تفصیل سے بتا دیئے۔ بس یہ تینوں چیزیں مل کر میری راہبر بنیں اور میں نے اپنی ایک اختراع کر ڈالی"
"لیکن ان تمام احساسات اور جذبات کی ترجمانی تم نے کیسے کی جو میرے اپنے تھے اور حقیقی تھے"
"بس اس کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ ہم نے کسی کو گہرائیوں سے پڑھا اور آپ اس سلسلے میں چاہیں تو ہمیں داد دے سکتی ہیں"
"خدا کی قسم تم نے مجھے حیران کر دیا ہے، لیکن اب مجھے حیران

نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ جان کر کہ معاملہ ایک پولیس آفیسر کا ہے جس نے بہت سے افراد کو ایک طویل عرصے تک بے وقوف بنائے رکھا تھا۔ ارے میں کون کون سی بات کا تذکرہ کروں۔ ایک ایک بات یاد آتی ہے تو دماغ چکر کھانے لگتا ہے۔ تصور بیگ۔۔۔ تصور بیگ۔ کیسے تمھیں تصور بیگ کہوں؟"
"آپ چاہیں تو خیر دین کہہ سکتی ہیں ردا بی بی جی" تصور بیگ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور ردا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
تصور بیگ نے شاید اب تک کی زندگی میں ردا کو کبھی اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ردا ہنستی رہی اور پھر جب اس نے تصور بیگ کی طرف دیکھا تو دفعتاً ہی اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ تصور بیگ کی آنکھوں میں جو کچھ نظر آیا تھا۔ وہ ردا کے لئے شرم کا باعث بن گیا تھا پھر نہ جانے کیوں وہ ان آنکھوں کے سامنے ٹک نہ سکی۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"مچھلیاں جہنم میں جل رہی ہوں گی۔ ذرا انھیں دیکھ آؤں" اور وہ اٹھ کر باورچی خانے کی جانب چل پڑی۔
چند ہی قدم آگے بڑھی تو عجیب سے احساسات نے اس کا پیچھا گھیر لیا۔ عقب سے اسے تصور بیگ کی آنکھیں اپنے بدن میں گڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔
باورچی خانے میں پہنچ کر اس نے عجیب و غریب انداز میں سوچا یہ مجھے کیا ہوگیا؟ غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی یہاں آئی تھی۔ لیکن یہ۔۔۔ یہ سب کچھ ذہن سے کیسے نکل گیا۔ میں تو نہ جانے کیا کیا احساسات لئے یہ سفر کر رہی تھی گزرے ہوئے ماضی نے ایک بار پھر میرے دل کو زخمی کر دیا تھا لیکن یہ سب کچھ کیسے ایک دم ختم ہوگیا۔ مجھے۔۔۔ مجھے تو ایک خوشی کا سا احساس ہو رہا ہے۔ کیوں۔۔۔ آخر کیوں؟
وہ اپنا ذہن ٹٹولنے لگی اور پھر ایک ہی تصور اس کے ذہن میں ابھرا جو تصور کا تصور تھا۔ اور اس کا دل دھک سے ہوگیا وہ گم صم سی کھڑی رہ گئی۔
یہ سب کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تصور سے میرا کیا واسطہ ہے، میں اس کے اس انداز سے کیوں خوش ہو رہی ہوں۔ اور۔۔۔ اور اسے میں اپنے ساتھ یہاں کیوں لے آئی ہوں؟ کیا یہ معیوب بات نہیں ہے۔ کیا مجھے اس سے اتنا بے تکلف ہونا چاہیئے وہ آخر میرا ہے کون؟ شاید غلطی ہوگئی۔ شاید۔
ردا کا دماغ چکرانے لگا۔ کیا یہ سب کچھ ہونا چاہیئے تھا۔ کیا یہ مناسب ہے؟ دل و دماغ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ انداز تو کچھ عجیب ہے ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے اگر

وہ شاہ کی کوٹھی کا ملازم ہوتا تو دوسری بات ہوتی۔ ملازموں کا ایک مقام ہوتا ہے لیکن وہ ایک پولیس آفیسر ہے۔ ایک عُمدہ شخصیت کا مالک ہے۔ چنانچہ اُسے اپنا تو نہیں سمجھا جاتا۔ بہرحال وہ میرے لئے غیر ہے۔ کوئی دیکھے گا، کوئی سُنے گا تو کیا سوچے گا، کیا کہے گا؟

ایک دم ہی اُسے اپنی خراب پوزیشن کا احساس ہُوا۔ وہ وہاں سے چلی آئی تھی کسی سے کچھ کہے بغیر۔ سب کی محبتوں کو ٹھکرا کر۔ اور اب اگر کسی کو پتہ چلے کہ... کہ یہاں وہ تصوّر بیگ کے ساتھ ہے۔ تو لوگ کیا سوچیں گے؟

اُس کے بدن میں لرزش سی پیدا ہوگئی، اور یہ تصوّر بیگ، آخر وہ ٹرین تک پہنچا کیسے۔ ارے، یہ تو پُوچھا ہی نہ تھا۔ ہاں اُس وقت وہ بھی تو موجود تھا۔ اختر وغیرہ کی کوٹھی میں باقاعدہ مدعو کیا گیا تھا۔ اب پتہ چلے گا کہ رُدا کے ساتھ تصوّر بیگ یا خیر دین بھی غائب ہے تو... تو... اُف یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اب کیا کہوں اُس سے... کیسے کہوں، مگر کمال کا انسان ہے۔ کس طرح سب کو گھن چکر بنا کر رکھ دیا لیکن وہ آخر یہاں آیا کیسے ہے؟

پھر اُسے اور کہانی یاد آئی۔ اُس نے کتنی محنت سے وہ ڈائری یا کتاب لکھی ہے۔ کیا خوبصورت تحریر ہے۔ صرف اپنے ذہن سے سوچ کر یا صرف واقعات کے سہارے اُس نے میرے جذبات کی ترجمانی بھی کر ڈالی اِس طرح جس طرح میں نے سوچا تھا۔ سب کچھ لفظ بہ لفظ درُست تھا۔ کیسے آخر کیسے۔ وہ میرے دِل کی گہرائیوں میں کیسے اُتر گیا۔ وہ... وہ۔ تبھی اُسے نوٹ بُک کے ابتدائی صفحات یاد آئے، جن پر کچھ اشعار لکھے ہُوئے تھے۔

لو آؤ کر رازِ پنہانی ۔ افشائے عقیدت کرتا ہُوں
دامانِ زبانِ خاموشی لبریزِ شکایت کرتا ہُوں
گھبرا کے ہجومِ پیکاں سے اظہارِ جُرأت کرتا ہُوں
میں تم سے . . . .

شعر کی تکمیل سمجھی جا سکتی تھی۔ بہ آسانی اُسے مکمل کیا جا سکتا تھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہُوں۔ رُدا پریشان ہوگئی۔

اُس کی زندگی میں اِن تمام باتوں کی گنجائش نہیں تھی۔ تصوّر بیگ نے حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اُسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ رُدا کو اپنی ملکیت سمجھ لے۔ وہ پولیس آفیسر ہو یا کوئی اور۔ میں نے کوئی جُرم تو نہیں کیا ہے، پھر میں اُس کا تسلّط کیوں برداشت کروں؟

رُدا کو غصّہ آگیا اور وہ منفی انداز میں سوچنے لگی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اِس موضوع پر تصوّر بیگ سے گفتگو کرے گی۔ اُس کے اپنے ذہن میں نہ جانے کیا تھا۔ اِس کا تجزیہ وہ کبھی نہیں کر پائی تھی۔ لیکن آخر تصوّر بیگ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اُس کی نجی زندگی میں مداخلت کرے؟

باورچی خانے میں کام کرتے ہُوئے اُس نے بہت سی باتیں سوچی تھیں۔

تیمور تصوّر بیگ کے پاس تھا اور خُوش تھا۔ ویسے نہ جانے کیوں رُدا کو اب بہت سی باتیں یاد آرہی تھیں۔ یہ رات اُس نے یُونہی گزاری۔ تصوّر بیگ سے کوئی خاص گفتگو نہیں ہُوئی تھی رات کے کھانے کے بعد وہ تیمور کو ساتھ لئے ہُوئے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اُس نے تصوّر بیگ سے یہ بھی نہیں پُوچھا تھا کہ وہ کہاں آرام کرے گا۔ دوسری صبح جب وہ جاگی تو تصوّر بیگ چائے لئے کھڑا ہُوا تھا۔ رُدا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"یہ... یہ کیا؟"

"وہ رُدا بی بی جی بیڈ ٹی ہے" تصوّر بیگ نے کہا اور رُدا آہستہ سے بولی۔

"تصوّر صاحب میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہُوں"

"لو جی کمال ہوگئی رُدا بی بی جی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آپ جب ہمیں خیر دین کہتی ہیں تو یُوں لگتا ہے جیسے آپ ہم پر مہربان ہیں اور جب بھی آپ تصوّر بیگ صاحب کہہ کر بات کرتی ہیں ہمارا دِل ڈرنے لگتا ہے کہ کہیں کوئی سخت بات نہ ہو جائے"

"دیکھو تصوّر بیگ! میں واقعی تم سے سنجیدگی سے بات کرنا چاہتی ہُوں"

"اللہ کا شکر ہے بھائی۔ آپ سے تم پر تو آئیں آپ"

"تم یہ چائے بنانے کے لئے باورچی خانے کیوں گئے تھے"

"وہ آپ سے اجازت تو نہیں لی تھی، ہم نے مگر ہمیں چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ آپ کے لئے بھی بنا..."

"مجھے جگا کر مجھ سے کہہ دیتے"

"لو جی کمال ہوگئی۔ مالک کہیں چائے بناتے ہیں؟"

"ہُوں" رُدا نے ایک نگاہ تیمور کی طرف دیکھا جو مزے سے سو رہا تھا پھر وہ کہنے لگی "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہُوں"

"چائے پی کر کریں جی۔ ہم نے اس میں دو چمچ شکر زیادہ دی ہے۔ ذرا باتیں میٹھی ہو جائیں گی"

رُدا نے چائے کی پیالی کے اُوپر پلیٹ ڈھکی اور باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔ تصوّر بیگ خاموشی سے ایک سمت کھڑا تھا اُس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مُسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی۔

رُدا چہرہ وغیرہ دھونے کے بعد بال سنوارتی ہُوئی باہر نکلی۔ وہ اپنی جگہ کھڑا تھا۔ رُدا کو کچھ جھنجھلاہٹ سی ہوگئی۔

"کب تک مجھے بے وقوف بناتے رہو گے تم؟"

"لو جی اللہ نے جب تک موقعہ دیا اِس میں حرج ہی کیا ہے"

"نہیں، پلیز نہیں۔ میں تمہاری کوئی توہین نہیں کرنا چاہتی۔ تم بہت مُخلص انسان ہو۔ تم چاہے کتنے ہی بڑے عُہدے دار ہو۔ میں تکلّف سے تم سے گفتگو کر ہی نہیں سکتی۔ میری اِس بے تکلّفی کو معاف کر دینا تصوّر بیگ! بیٹھو پلیز! بیٹھ جاؤ"

"چائے گرم کر لائیں جی؟"

"پلیز بیٹھ جاؤ۔ ایسی باتیں مت کرو" رُدا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اور تصوّر بیگ شانے اُچکا کر بیٹھ گیا۔

"بات یہ ہے تصوّر بیگ کہ میرے دل میں تمہارے سلسلے میں بہت سی باتیں ہیں۔ بھُول بھی جاتی ہُوں اور یاد کرتی ہُوں تو یاد آ جاتی ہیں۔ دیکھو میں جو کچھ تم سے کہہ رہی ہُوں اِس میں خُدانخواستہ تمہاری توہین کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اب جب کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے، اور خود تمہاری زبانی کہ تم ایک اچھے خاصے اعلیٰ عُہدے دار ہو، ایک اچھے خاندان کے فرد ہو تو میں تم سے کوئی ایسی بات تو کہہ نہیں سکتی۔ جو تمہاری شان کے خلاف ہو لیکن جو کچھ میں کہوں اُس میں اِتنے تلخ حقائق پوشیدہ ہیں کہ میری بات خود بخود تمہیں بُری معلوم ہوگی"

"آپ نے چائے کا گھونٹ نہیں لیا مس رُدا! میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ جو بھی گفتگو کریں چائے پینے کے بعد کریں"

"اور تم اپنی گفتگو میں برابر مزاح کا عنصر شامل کئے جا رہے ہو" رُدا نے چائے کی پیالی اُٹھائی اور اُسے ہونٹوں سے لگا لیا، پھر وہ چائے کے گھونٹ لیتی رہی۔ تصوّر بیگ کُرسی پر بیٹھا مُسکراتا رہا۔

"بلاشبہ تصوّر بیگ تم نے خیر دین کی حیثیت سے بہت سی مُشکلوں سے نجات دِلائی۔ انسان کی زندگی میں ایسے بہت سے بُرے وقت آتے ہیں جب وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے رشید کے ہاتھوں میری اَنا کو جو ٹھیس پہنچ رہی تھی اُس میں تم نے میرے مددگار کی حیثیت سے میرا ساتھ دے کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اور میں اِس احسان کے لئے تمہاری بے حد شُکر گزار ہُوں۔ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں ہمیشہ تمہیں خُوش آمدید کہوں گی"

"بہت بہت شکریہ مس رُدا! اب آگے کہیئے" تصوّر بیگ نے اب اپنا لہجہ بدل لیا تھا۔

"پہلی بات یہ تصوّر بیگ صاحب کہ تمہیں میرے بارے میں یہ معلومات کب حاصل ہُوئی تھیں؟"

"غالباً یہ اُس وقت کی بات ہے مس رُدا جب آپ نے مجھے اپنے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا چیلنج دیا تھا اور بات میری اپنی شخصیت پر آگئی تھی۔ میں نے آپ کے بارے میں تمام معلومات مہیا کیں اور اُس کے بعد یہ ڈائری ترتیب دی۔ اور پھر میں نے اِسے آپ کے پاس محفوظ کر دیا تاکہ سند رہے۔ اور بوقتِ ضرورت کام آئے"

"تم نے مجھے یہ پڑھنے سے منع کیوں کر دیا تھا"

"میں یہ چاہتا تھا کہ آپ مناسب وقت پر میری کاوشوں سے آگاہ ہُوں"

"اِس مناسب وقت کا تعین کیا کیا تھا تم نے" رُدا نے پُوچھا۔

"اِسے رہنے دیجئے ابھی۔ یہ سوال آپ کا مجھ پر قرض رہا"

"ہُوں! اچھا یہ بتائیے تصوّر بیگ صاحب کہ آپ یہاں کیسے آئے؟"

"یہ آپ پھر ہوگیا" تصوّر بیگ نے کہا۔

"پلیز میرے جُملوں پر غور نہ کرو"

"کیسے آنے سے کیا مُراد ہے آپ کی؟ ظاہر ہے ٹرین میں آیا تھا۔ آپ کو ٹرین ہی میں ملا تھا"

"میرا مطلب ہے آخر تم یہاں کیوں آئے؟"

"بس جی آگئے۔ آخر خیر دین ٹھہرے"

"تم اِس پروگرام میں شریک تھے جس میں میرا سامنا آفندی صاحب سے ہُوا تھا؟"

"جی"

"اور تم نے شاید یہ محسوس کیا کہ میں کچھ دل برداشتہ ہوگئی ہُوں"

"جی ہاں، بات دراصل اِس وقت سچ بولنے کی ہو رہی ہے تو سچ سُننے کی ہمت بھی پیدا کیجئے آپ اپنے اندر"

"میرے اندر بہت ہمت ہے۔ کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟" رُدا نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

"وہ جی رُدا بی بی جی ڈانٹنے کی نہیں ہو رہی ہے، خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ بہت کمزور دل کے مالک ہیں، یہ ڈانٹ ڈپٹ برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"تو ہم کون سے غیر سنجیدہ ہیں؟ آپ کو چہرے سے غیر سنجیدہ نظر آ رہے ہیں؟"

"میں پوچھتی ہوں تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس کے بعد حالات یہ رُخ اختیار کر جائیں گے؟"

"وہ جی بس گڑبڑ یہ ہو گئی کہ آئی جی صاحب کے بیٹے ہیں بچپن ہی سے یہ تمام چیزیں دیکھی ہیں۔ لوگوں کے چہروں کے تاثرات سے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اب وہ کیا کرنے والے ہیں؟"

"ہوں! تو تمہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آفندی صاحب کو دیکھنے کے بعد میرے اوپر کچھ ایسا ہی ردِعمل ہو گا؟"

"ہاں بی بی جی! بس اندازہ ہو گیا تھا ہمیں۔"

"اور اس کے بعد سے تم میری تاک میں لگ گئے۔"

"جی ہاں جی۔"

"اور جب میں وہاں سے چلی تو تم نے میرا تعاقب کیا؟"

"ہاں جی قصور ہو گیا معاف کر دیجئے۔"

"نہیں تصور بیگ! میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم میرے تعاقب میں کیوں آئے؟"

"وہ جی تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے آپ کو۔"

"تم کون ہوتے ہو میری تنہائی کا خیال کرنے والے؟"

"خیر دین ولد بشیر دین۔"

"ہرگز نہیں۔ تم نے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے سچ بولو گے۔"

"تو جی منع کب کر رہے ہیں سچ بولنے سے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ انسان اپنی متاعِ حیات کو ایسے تو نہیں چھوڑتا۔" تصور بیگ نے کہا اور رُدا کے حلق میں جیسے پھندا سا لگ گیا۔ تصور بیگ بدستور احمقانہ سی صورت بنائے ہوئے کھڑا تھا۔

"تصور بیگ! کیا تم مجھے تنہا سمجھ کر مجھ سے فضول گوئی کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں رُدا، تنہا تو آپ مجھے کئی بار ملی تھیں۔ میں نے کبھی آپ کی تنہائی سے فائدہ اُٹھانے کی کوئی کوشش کی؟"

"لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری اِس حرکت کو پسند کروں گی؟"

"ناپسند کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا محترمہ۔" تصور بیگ عجیب دو رُخی کھیل رہا تھا۔ کبھی تو وہ خیر دین بن جاتا اور کبھی تصور بیگ کے انداز میں گفتگو کرنے لگتا۔

"اگر میری کہانی تم پہلے جان گئے تھے تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"آپ پھر اُسی پُرانے سوال پر آ گئیں، ہم کہہ چکے تھے ہم اِس کے لئے مناسب وقت نہیں سمجھا تھا۔ لیکن آپ کی کہانی آپ ہی کے ساتھ محفوظ تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو میں نے یہ بات مان لی۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے میرا تعاقب کیوں کیا؟"

"آپ گھوم پھر کر وہی سوالات کئے جا رہی ہیں۔ ہم نے کہا نا ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔"

"لیکن تصور بیگ اس بات کو نظر انداز کرنا میں سمجھتی ہوں میرے ساتھ زیادتی ہے کہ تم میرے کوئی نہیں ہو۔ اور تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ذرا غور کرو میں کراچی چھوڑ کر یہاں آ گئی، تم بھی غائب پائے جاؤ گے اور اگر بعد میں کسی کو یہ علم ہو جائے کہ میرے یہاں آتے ہوئے تم میرے ساتھ تھے تو میری اپنی کیا پوزیشن رہ جائے گی؟"

"رُدا بی بی! یہ خطرہ ہم نے مول لیا ہے اور آپ کو بھی مول لینا پڑے گا۔"

"کیوں، آخر کیوں، میں نے تو تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ آؤ۔"

"مگر میں نے کہا ناں آپ سے۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔"

"کیا یہ ایک غلط ضد نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"لیکن میں انتہائی افسوس کے ساتھ کہتی ہوں کہ میں یہاں پر تمہاری موجودگی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"تو نہ کریں جی! دروازے کے باہر بیٹھ جائیں گے۔ آخر ملازم آدمی ہیں۔ مالک جو بھی جگہ دے دے۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں، تصور بیگ یہ ممکن نہیں ہو گا۔ میں کسی قیمت پر یہ پسند نہیں کروں گی کہ تم یہاں میرے ساتھ رہو۔ دیکھو! میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی پھر تم میری عزت کے گاہک کیوں بن رہے ہو؟"

"وہ جی! بڑی بڑی باتیں ہماری سمجھ میں آتی نہیں ہیں بی

تصور بیگ نے پھر لہجہ بدل لیا اور رُدا کے چہرے پر ایک تنفّر آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کافی دیر تک خاموش رہی پھر اُس نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ کوئی سخت کلامی نہیں کرنا چاہتی۔ تصور بیگ، تم میرے محسن بھی ہو اور ایک ایسے گھرانے سے ہمارا اور تمہارا تعلق رہا ہے جہاں بہت اچھے لوگ رہتے تھے، لیکن تصور بیگ ایک انسان کی حیثیت سے سوچو۔ ایک لڑکی کی عزت کتنی نازک ہوتی ہے، تم اگر یہاں رہو گے۔ تو میرے بارے میں طرح طرح کی افواہیں بھی پھیل سکتی ہیں۔ کیا تمہیں یہ بات پسند آئے گی؟"

"ہرگز نہیں جی۔"

"تو پھر بہتر یہی ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تمہارا احسان ہو گا تصور بیگ ویسے میں اِس بات کے لئے بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے میری وجہ سے یہاں تک آنے کا پروگرام بنایا، مجھ سے اتنی اپنائیت کا اظہار کیا کہ میں... میں..." رُدا خاموش ہو گئی۔ وہ جملہ پورا نہ کر پائی تھی، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"اور تم نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا، یہ مجھ پر اعتماد کا اظہار ہے۔ میں تمہارے ان جذبوں کو ہمیشہ دل میں رکھوں گی اور تمہارا احترام کرتی رہوں گی۔ لیکن باقی میری زندگی ذرا مشکل ہو گئی ہے۔ تمہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ میں ایک ضدی ماں کی ضدی بیٹی ہوں اور اپنی ضد پر قائم رہنا چاہتی ہوں۔"

"بہت سی باتیں آپ سے کرنی ہیں مس رُدا! آپ ذرا اپنے سوچنے کے انداز کو تبدیل کریں تو یہ باتیں ہوں اور یہ تبدیلی اِسی صورت میں ممکن ہے جب آپ کچن میں جا کر ناشتہ بنائیں، اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ آج کا دن ہم گفتگو کر کے گزاریں تو میں سمجھتا ہوں نہایت بہتر رہے گا۔ ناشتے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ بلکہ بہتر تو یہ ہو گا کہ دوپہر کے کھانے کا بندوبست بھی کر لیا جائے تاکہ باتوں میں رخنہ اندازی نہ ہو۔"

"ہاں ہاں مجھے اِس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ایک وعدہ کرنا ہو گا تصور بیگ۔"

"جی فرمایئے۔"

"اگر میں تمہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو کوئی ضد مت کرنا میرے حالات کو سمجھو۔ بات اور کچھ نہیں ہے، لیکن بس ہمیں معاشرے کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔"

"ہاں جی بالکل خیال رکھیں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں چلیئے۔ اب بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتہ آپ ہی کے ہاتھ کا کھایا جائے گا۔"

"میں جا رہی ہوں۔ لیکن میرے اور تمہارے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہو گیا ہے۔"

"بالکل ہو گیا ہے۔" تصور بیگ نے کہا۔

"ذرا تیمور کا خیال رکھنا تنہا کہیں ڈر نہ جائے۔"

"آپ اطمینان رکھیں میں بچے کو کھلا رہا ہوں آپ ناشتہ بنایئے۔" تصور بیگ نے ایسے انداز میں کہا کہ رُدا اُٹھتے اُٹھتے رُک گئی اُس نے گھور کر تصور بیگ کو دیکھا لیکن نہ جانے کیوں اُس کا چہرہ دیکھ کر اُسے ہنسی آ گئی، پھر وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

تصور بیگ دروازے کو آنکھ مار کر مسکرانے لگا تھا پھر وہ تیمور کی طرف دیکھنے لگا اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

"بڑی ٹیڑھی کھیر ہے تیمور بھائی! یار کچھ مدد کرو اسے ذرا سیدھا کرنا ہے۔" پھر اس وقت تک وہ خاموشی سے بیٹھا رہا جب تک کہ رُدا ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر نہ آ گئی۔

"سوری، کچھ دیر ہو گئی، تیمور جاگا تو نہیں؟"

"نہیں جی وہ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔"

"پلیز! ناشتہ کرو۔"

"شکریہ رُدا صاحبہ۔ آپ کے ہاتھ کے بنے ہوئے ناشتے میں واقعی لطف آ جائے گا۔"

رُدا خود بھی ناشتہ اپنے لئے پلیٹ میں نکالنے لگی تھی۔ دونوں نے نہایت خاموشی سے ناشتہ کیا، رُدا کے چہرے پر اب نرمی کے آثار نظر آ رہے تھے، پھر اُس نے کہا۔

"ہم دونوں بیچ کے درمیان رہ کر گفتگو کریں گے۔"

"یہ وعدہ تو میں آپ سے پہلے بھی کر چکا ہوں۔"

"میرے حالات تم نے مکمل طور پر جان لئے۔ اب مجھے بتاؤ تصور بیگ کہ کیا میں اِن حالات میں آفندی صاحب کے پاس رہ سکتی ہوں؟ آفندی صاحب نے اپنی اَنا پر میری ماں کو قربان کر دیا۔ تمہیں تمام تر حالات معلوم ہو چکے ہیں۔ مجھے جواب دو کیا والدین کو ایسا ہی ہونا چاہیئے؟ کیا آفندی صاحب اپنے رویئے میں تھوڑی سی لچک پیدا کر کے شروع ہی سے میری ماں کو بہتر زندگی نہیں دے سکتے تھے؟ ثاقب کی فطرت دولت پسند تھی اور وہ سب کچھ ہونے کے باوجود ایک اچھا انسان نہیں تھا اگر اُسے اُس کی خواہش کے مطابق وہ دولت دے دی جاتی تو کتنا خرچ کر لیتا۔ اُس میں سے وہ؟ آفندی صاحب کو صرف اِس بات پر ناز تھا۔ کہ دولت اُن کی کمائی ہوئی ہے لیکن کیا زمانہ اِسی انداز میں سوچتا ہے؟ کیا اپنی اولاد کو اِس طرح اپنی اَنا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے اور اب جب آفندی صاحب اپنی زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ کھو

بیٹھے ہیں تو وہ مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہیں میرے بھائی پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں... میرا دل یہ قبول نہیں کرتا تصور بیگ میرا دل یہ قبول نہیں کرتا۔ میں وہاں رہتی تو مجھے طرح طرح سے مجبور کیا جاتا، بزرگ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ کوئی میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر نہیں دیکھتا، بس لوگ آفندی صاحب کی اس لئے حمایت کرتے کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور اُن کی صحت خراب ہے۔ لیکن میرے سینے پر جو زخم موجود ہیں مجھے جس طرح اپنی ماں سے دُور کر دیا گیا ہے اُس کے تحت ثاقب یا آفندی صاحب کے لئے میرے دل میں جگہ پیدا ہو سکتی ہے؟"

"نہیں رُدا... ہرگز نہیں۔"

"تو پھر کیا میرا یہاں آجانا غلط ہوا؟"

"ہاں۔"

تصور کے اِن الفاظ پر رُدا چونک پڑی تھی۔

"مطلب، یعنی اِن تمام باتوں کے باوجود مجھے یہاں نہیں آنا چاہئیے تھا؟"

"نہیں۔"

"کیوں آخر کیوں، میں اُن لوگوں کے ہاتھوں میں کیوں کھیلتی رہتی؟" رُدا نے کہا۔

"کون کہتا ہے رُدا کہ آپ اُن لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتیں۔ آپ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ آپ ملازمت کر رہی تھیں۔ آپ نے اِس سے پہلے بھی ایک ملازمت کی تھی۔ آپ اگر احسان صاحب کی ملازمت میں نہیں رہنا چاہتی تھیں تو کیا آپ کے لئے وہاں دوسرا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا، آپ کو اعتماد کے ساتھ وہیں رہنا چاہئیے تھا آپ نے کراچی چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟"

"بس میں اِن حالات میں اپنی ماں کو بھلا کر نہیں رہ سکتی تھی۔ میں اِس ماحول کو تبدیل کر دینا چاہتی تھی۔"

"تو پھر اِس ماحول میں واپسی کیا معنی رکھتی ہے؟"

"میں نے ابھی اِس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ آفندی صاحب کو دیکھنے کے بعد میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی اور اُس کے فوراً بعد میں نے وہ جگہ چھوڑ دی۔"

"آپ کا رُخ لاہور کی جانب ہی ہوا کیونکہ یہاں آپ کا گھر موجود ہے۔"

"ہاں، ظاہر ہے مجھے کوئی ٹھکانہ تو درکار تھا۔"

"نہیں رُدا یہ کچے ذہن کی سوچ ہے۔"

"بہرطور میں تسلیم کر لیتی ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہاں رہ کر میں اپنے لئے کوئی بہتر راستہ تلاش کر سکوں۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں۔ آپ لاہور نہیں کراچی میں چل کر رہیں۔ اپنی پسند کے مطابق رہیں۔ ظاہر ہے آپ کو قانونی طور پر کوئی اِس کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔"

"اخلاقی طور پر مجھے۔ بہت مجبور کیا جائے گا۔"

"آپ لوگوں کو اپنا مقصد بتا سکتی ہیں۔"

"مگر مجھے اُن سب کا سامنا کیوں کر کروں؟"

"رُدا! آپ یہ بات بھول رہی ہیں کہ اُن لوگوں نے بہت نازک وقت میں آپ کو سہارا دیا تھا۔"

"ہاں، اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔" رُدا نے کہا۔

"اور ثناء آپ کو دیوانوں کی طرح چاہتی ہے۔"

"ہاں بلاشبہ وہ لڑکی میری زندگی میں اِتنی گہرائیوں تک اُتر گئی ہے کہ میں ہمیشہ اُس کے لئے افسردہ رہوں گی۔"

"دوسرے لوگوں نے بھی آپ کو چاہا تھا۔ ہر ایک کا سلوک آپ کے ساتھ بہت اچھا تھا۔"

"اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"تو کیا اپنی اَنا کے لئے آپ اُن کے احسانات کو نظرانداز کر دیں گی، وہ سب آپ کے لئے دُکھی ہو جائیں گے۔ اگر آپ اُنھیں مخلصانہ طور پر یہ سب بتا دیتیں اور کہہ دیتیں کہ آپ کا مطمعِ نگاہ کیا ہے تو آپ کو کون مجبور کر سکتا تھا؟"

رُدا کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ بات واقعی ایک طرح سے درست تھی۔ اُسے اِس طرح نہیں آنا چاہیئے تھا۔ ذرا سی نرم ہوئی تو تصور بیگ نے پھر کہا۔

"ہر انسان کا اپنی زندگی پر اختیار ہوتا ہے۔ آپ کو بھی ہے آپ اُن سے کہہ سکتی تھیں کہ چونکہ حالات یہ تھے اور آپ اپنی اَنا کو نہیں توڑ سکتیں۔ چنانچہ آپ اُن سے علیحدگی اختیار کر رہی ہیں یا پھر آپ یہ کہہ سکتی تھیں کہ وہ آپ کو آفندی صاحب کے سلسلے میں مجبور نہ کریں۔ کون آپ کو مجبور کرتا؟ لیکن اِس طرح اُن سب کو ٹھکرا کر آپ کا چلا آنا مناسب نہیں ہے۔"

"ہاں تھوڑی سی غلطی ہوئی ہے لیکن جذبات ہی میں۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ انسان جذبات ہی میں بہت سی غلطیاں کر جاتا ہے۔ اب یُوں کریں گے کہ ہم یہاں سے واپس چلیں گے، ابھی نہیں کچھ دِن کے بعد۔"

"ہم سے کیا مُراد ہے؟"

"میں اور آپ۔"

"پھر تم نے اپنے آپ کو مجھ سے منسلک کر لیا۔"

"آہ! یہ کام تو بہت پہلے ہو چکا ہے رُدا۔ اِس سے تو کوئی فرار نہیں ہے۔"

"نہیں تصور، بھول کر بھی یہ بات مت سوچنا۔ میں نے اپنی زندگی کے لئے ایک مقصد بنایا ہے، تیمور کی پرورش، اور اُس کی پرورش کرتے ہوئے اپنی زندگی کو اختتام تک پہنچا دینا۔ اِس میں کوئی اور گنجائش نہیں ہے، تمھاری بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے اِس کام سے آپ کو کوئی نہیں روکتا۔ لیکن رُدا میں آپ سے محبت کرتا ہوں، سمجھیں آپ۔ میں اگر صرف خیر دین ہوتا اور آپ سے محبت کرتا تو اپنی اِس محبت کو خاموشی سے اپنے سینے میں دبا کر قبر کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا۔ کیونکہ میرے اور آپ کے درمیان ایک وسیع و عریض خلاء ہوتا۔ اور اب جب کہ یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے کہ میں ایک تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار آدمی ہوں تو میں آپ سے یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ آپ کو میں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

رُدا کے ہونٹوں پر ایک تلخ مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تصور بیگ! بات بہت دُور تک چلی جاتی ہے، جو کچھ میں کہوں گی وہ تم برداشت نہیں کر پاؤ گے۔"

"کرلوں گا رُدا۔ آپ کہیں۔"

"کیا تم بھی ثاقب کی مانند کسی سُنہرے مستقبل کی آس لگائے بیٹھے ہو، کیا تم نے تمام باتیں جاننے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میری جانب قدم بڑھاؤ اور مجھے کسی طرح اپنے جال میں پھانس لو تاکہ آفندی صاحب کی دولت تم تک منتقل ہو جائے۔ کیا میں اِس سوچ کو نظرانداز کر سکتی ہوں تصور بیگ؟" رُدا نے تصور بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور تصور بیگ کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ گہری ہو گئی۔ پھر اُس نے کہا۔

"نہیں رُدا بی بی! آفندی صاحب کا معاملہ بہت بعد میں سامنے آیا تھا۔ ثاقب سے ملاقات بہت بعد میں ہوئی تھی۔ اِس سے پہلے خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ آپ کے لئے اپنے اِن جذبات کا اظہار کر چکے تھے جو اُن کے دِل میں تھے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آفندی صاحب کی دولت سے مجھے کوئی دِلچسپی نہیں ہے۔ میرے والد آئی جی رہ چکے ہیں ہماری کافی جائیدادیں وغیرہ رہ چکی ہیں۔ زمینیں ہیں۔ میں خود بھی بہت اچھی رقم کما لیتا ہوں۔ میرے اپنے اکاؤنٹ میں اِتنا بڑا سرمایہ پڑا ہوا ہے کہ اگر میں کوئی کاروبار شروع کرنا چاہوں تو اِس میں مجھے کوئی دِقت نہیں ہوگی۔ مطلب یہ کہ میں سیر چشم انسان ہوں چنانچہ یہ بات آپ دِل سے نکال دیں کہ میں آفندی صاحب کی دولت سے کوئی دلچسپی رکھتا ہوں، اِس کے علاوہ میں آپ کو اِس بات کے لئے کبھی مجبور نہیں کروں گا کہ آفندی صاحب سے ربط ضبط بڑھائیں یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہوگا بلکہ میں آپ کا سہارا بنوں گا اِس سلسلے میں اور ہر وہ کوشش کروں گا جس سے آپ کی اَنا مجروح نہ ہو۔"

"عجب زبردستی کی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ تصور بیگ صاحب۔ یہ کسی طور ممکن نہیں ہے۔ ہر انسان کی زندگی کا ایک لائحہ عمل ہوتا ہے میں... میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، کیا آپ مجھے اِس کے لئے مجبور کریں گے؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر آپ مجھے پسند نہیں کریں گی تو مجھ سے شادی نہیں کریں گی۔ بس یہی بات مسئلہ ہے نا؟"

"بہت آگے بڑھ رہے ہیں آپ مجھے تنہا پا کر۔" رُدا نے کسی قدر رُندھے ہوئے انداز میں کہا اور تصور بیگ چونک پڑا۔ وہ پُرخیال نگاہوں سے رُدا کو دیکھ رہا تھا، پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"دیکھو رُدا! میں نے تم سے اپنے دِل کی بات کہہ دی نہیں کہنا چاہئیے تھی۔ لیکن میرا اندازِ فکر ذرا مختلف ہے۔ میں سوچتا ہوں جو دِل میں ہے وہ کہہ دینا چاہئیے یہ زیادہ بہتر ہے۔ کہیں دوسرا کسی غلط فہمی میں مُبتلا نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ شاید میں آپ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا، اور آپ کو اپنی زندگی میں شامل کر لوں گا۔ لیکن اگر آپ یہ تمام باتیں محسوس کرتی ہیں تو پھر ٹھیک ہے نہ سہی یہ سب کچھ مس رُدا! اِتنا حق تو مجھے ہے کہ میں آپ کو یہاں سے لے جاؤں اور اِس تنہا زندگی میں نہ بھٹکنے دُوں۔ ہو سکتا ہے کسی وقت آپ کو کوئی مُشکلات پیش آجائیں۔ آپ بالکل تنہا ہیں، تیمور ابھی بہت چھوٹا ہے۔ چنانچہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے اندرُونی جذبوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کو ایسی کسی مُصیبت میں نہ پھنسنے دُوں۔ آپ مجھ سے بیگانگی کا اظہار کرتی ہیں کرتی رہیں۔ جہاں تک پسند یا ناپسند کا مسئلہ ہے تو یہ صُورتحال بالکل مختلف ہے۔ آپ اُس کے لئے یقینی طور پر آزاد ہیں۔ میں نے ایک بات کہی، نامنظور ہو گئی کوئی بات نہیں۔ لیکن بعد کے معاملات میں تو کم از کم مجھے دخل اندازی کرنے دیں۔"

"ہرگز نہیں... ہرگز نہیں۔ اگر تم مجھے اِتنا ہی مجبور کرتے ہو تصور بیگ تو میں تم سے ایک اور بات کہنے پر مجبور ہوں۔" رُدا نے غم و غصّے

کی حالت میں کہا۔

"کیا؟"

"میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ اگر زندگی میں کبھی حالات نے اجازت دی تو میں اُس شخص سے شادی کروں گی، بشرطیکہ وہ بھی اِس کے لئے تیار ہُوا۔"

"اوہ! تو پھر اُس کے لئے آپ کو تصور بیگ سے بہتر آدمی اور کون مِل سکتا ہے؟ رِدا صاحبہ! محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ انسان اپنے اِن جذبوں کی تسکین کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے، اُس شخص کو آپ سے محبت کرنے کے لئے مجبور کرنے کی ذمّہ داری۔ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ کی ہے۔"

"تم اِس طرح باز نہیں آؤ گے!"

"نہیں! پلیز نہیں۔ میں کسی طرح باز نہیں آؤں گا!"

"تو پھر مجبوراً مجھے یہ الفاظ کہنے پڑ رہے ہیں تصور بیگ صاحب کہ براہِ کرم آپ میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔ آپ یہاں سے چلے جایئے!"

"اِس کے سلسلے میں ہم بعد میں فیصلہ کر لیں گے رِدا۔ کیا میں ایک کپ چائے اور لے سکتا ہوں؟" اِس وقت تیمور نے کلبلا کر کروٹ بدلی اور رِدا اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ وہ تیمور کی جانب مُڑ گئی تھی۔ تصور بیگ چند لمحات خاموش کھڑا رہا اور اُس کے بعد اُس کمرے سے باہر نکل آیا۔

رِدا تیمور میں مصروف ہو گئی تھی اُسے باتھ رُوم میں لے جا کر غسل وغیرہ کروایا۔ لباس تبدیل کروایا اور پھر تیمور کو ناشتہ کرانے لگی۔ تصور بیگ اِس دوران بار بار اُس کے ذہن میں آیا تھا اور اُس کے دِل میں یہ تجسّس پیدا ہُوا تھا کہ ذرا باہر جا کر دیکھے کیا صُورتحال ہے لیکن ہمت نہیں کر پائی تھی۔

کافی دیر اِسی طرح گزر گئی۔ تیمور تیار ہو گیا تھا۔ آخر کب تک کمرے میں بیٹھی رہتی؟ تیمور کو ساتھ لے کر باہر نکل آئی اور پھر مکان کے مختلف گوشوں میں چکراتی پھری۔ لیکن خیر دین یا تصور بیگ نظر نہیں آیا تھا۔ رِدا کا دِل ایک لمحے کے لئے بُری طرح دھڑکا۔ ایک عجیب سا احساس اُس کے رگ و پے میں اُترنے لگا اور اُس نے تصور بیگ کی تلاش تیز کر دی۔ لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ یقیناً وہ جا چکا تھا۔ رِدا تیمور کو گود میں لئے پریشان سی کھڑی رہی اِس احساس نے اُسے غم زدہ کر دیا تھا اور پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ تیمور کو کھیلنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود پریشان بیٹھ کر دیوار کو تکتی رہی۔ کیا میں نے اچھا کیا؟ کیا جو الفاظ میں نے اُس سے کہے اِس کے بعد اُس کا یہاں رُکنا مناسب تھا؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے اُسے باقاعدہ اپنے گھر سے نکال دیا۔ واقعی ایک غیرت مند آدمی کو اُس کے بعد یہاں رُکنا زیب نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں کیا کرتی، میں کیا کرتی؟ ظاہر ہے میں کسی قیمت پر اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی تھی۔ میری اپنی بھی ایک شخصیت ہے۔ لوگ اگر میرے بارے میں معلوم کرتے تو کیا سوچتے وہ؟ چاہے تصور بیگ کتنا ہی نفیس انسان کیوں نہ ہو لیکن دُنیا نفیس نہیں ہے۔

پھر اُس کے اندر خود ہی ایک سوال پیدا ہُوا۔ کیا میں اِس دُنیا کی احسان مند ہُوں؟ شکرگزار ہُوں؟ کون میری خبرگیری کرتا ہے؟ کون آ کر اِس گھر میں پُوچھے گا؟ کہ میں کس حال میں بسر کر رہی ہُوں؟ کس نے پُوچھا ہے اِس سے پہلے؟ غیروں کے خوف سے اپنوں کو کھو دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ آخر... آخر وہ بیچارہ میرے لئے ہی تو یہاں آیا تھا۔ ہاں یہ اُس کی سرکاری ڈیوٹی تو نہیں تھی۔ وہ مجھ پر پوری طرح نِگاہ رکھتا تھا اُسے میری داستان معلوم تھی۔ وہ میرے جذبات و احساسات سے پوری طرح واقف تھا اور اُس نے... اُس نے میرا ساتھ دیا۔ میرے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔ کیا کچھ نہیں کہا میں نے اُس کو؟

ایک مرد کی اَنا کو زخمی کرنے کے لئے اِس سے بڑی بڑی باتیں اور کون کون سی ہو سکتی ہیں؟ میں نے تو اُس سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ثاقب کی طرح اِس بات کا خواہش مند ہے کہ آفندی صاحب کی دولت مجھے مِل جائے اور وہ اُس پر عیش کر سکے۔ اِس کے جواب میں اُس نے اپنی حیثیت کے انکشافات کئے تھے۔ یہ الفاظ واقعی بہت سخت تھے۔ کم از کم مجھے جذبات کے عالم میں اِتنا کچھ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ اِس سے زیادہ بُری باتیں اور نہیں کہی جا سکتی تھیں۔ وہ تو میرے لئے یہاں تک آیا تھا اور میں نے اُسے چند لمحات بھی اپنے گھر نہ رہنے دیا۔ یہ باتیں جو اِس انداز میں کہی گئیں ذرا مختلف انداز میں بھی کہی جا سکتی تھیں اُس کی دِل شکنی نہیں کرنی چاہیئے تھی مجھے۔ یہ تو بُرا ہُوا۔ یہ تو واقعی بہت بُرا ہُوا۔

بہت دیر تک وہ اِسی عالم میں گم صُم سوچتی رہی۔ لیکن اب وقت گزر گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ واپس چلا گیا ہو گا۔ اُس نے گردن جھٹکی اور پھر تیمور کو لے کر باہر نکل آئی۔ کہیں بھی جی نہیں لگ رہا تھا، بہت سے وسوسے اور بہت سے احساسات اُسے گھیرے ہُوئے تھے۔ وہ اپنے بینک اکاؤنٹس بھی کلیئر کر کے نہیں آئی تھی۔ پیسے وغیرہ تھے تو اُس کے پاس۔ لیکن بہت ساری رقم کراچی کے بینکوں میں جمع تھی وہ جس افراتفری کے عالم میں وہاں سے بھاگی تھی کہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی اب سوچ رہی تھی کہ میں نے غلط کیا

یا درُست؟ آفندی صاحب مجھے اغواء تو نہیں کر سکتے تھے میں بڑے اطمینان سے یہ کہہ سکتی تھی کہ میں اُنھیں نہیں جانتی اور وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں غلط ہے۔ آخر وہ مجھے مجبُور کیسے کرتے؟ لیکن اِس بات کے اِمکانات بھی تھے کہ دوسرے لوگ مجھے مجبُور کرنے کی کوشش کرتے، پھر میری کہانی عام ہوتی اور مجھے رُسوا ہونا پڑتا۔

لیکن کیا میرے اِس طرح چلے آنے کے بعد میری کہانی عام نہ ہُوئی ہو گی! کیا آفندی صاحب نے سب کو میرے بارے میں نہ بتا دیا ہو گا؟ سب کے سامنے میری رُسوائی ہو گئی ہو گی، بہتر ہی ہُوا وہاں سے چلے آنا۔ اچھا ہی ہُوا۔ لیکن اب کیا ہو گا؟ یہاں میں کیا کروں گی؟ کیا اِس مکان میں رہ سکوں گی؟ یہ تو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑے گا۔ یہاں میں... میں؟ آخر یہاں سے میں گئی ہی کیوں تھی؟ اِنہی حالات کا شکار ہو کر بے بسی اور بے کلی کا شکار ہو کر۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہُوا ہوتا۔ میں جس مقصد کے تحت گئی تھی اُس کی تکمیل کرتی۔ ملازمت تو کہیں نہ کہیں مِل ہی جاتی۔ تنہا زندگی گزار رہی ہوتی۔ کیا میں اِتنی ہی بے بس ہُوں؟ کیا میں نے یہ تعلیم اِسی لئے حاصل کی ہے؟ آخر احسان احمد کی اور اِس سے پہلے توقیر صاحب کی فرم میں کام کرتی ہی رہی ہُوں، تجربہ بھی ہے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب۔ مگر کیا کیا جائے؟ کیا یہاں ملازمت تلاش کرنا آسان ہو گا؟ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی وہ۔ اور جب ذہن کے خانے اِن احساسات سے خالی ہوتے تو پھر اُن میں تصور کا خاکہ اُبھر آتا۔

وہ مختلف انداز میں سوچتی۔ سمندر کنارے کی باتیں اُسے یاد تھیں۔ رشید نے اُس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش جب بھی کی تصور آڑے آیا اور اُس نے کس کس طرح رشید کو بے وقوف بنا کر اُس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اُس نے ہمیشہ ہی اُس کی حفاظت کی تھی۔ لیکن مجھے، مجھے اُس کے جواب میں اُس کے لئے کیا کرنا چاہیئے تھا۔

دفعتاً ہی اُس کے ذہن میں ثاقب اُبھر آیا تھا جب وہ باپ کی حیثیت سے اُسے مِلا تھا تو اُس کے دِل کے تمام گوشے منوّر ہو گئے تھے۔ ماں کو اُس نے کس کس طرح مجبُور کرنے کی کوشش کی تھی۔ جانے کیسے کیسے درد بھرے انداز میں اُسے بتایا تھا کہ ثاقب ایک اچھا انسان نہیں ہے۔ وہ دھوکہ کھا گئی اور اب اُسے دھوکہ نہ کھانے دیا جائے۔ لیکن وہ تو دیوانی ہو رہی تھی ابّو کا نام سُن کر۔ لیکن ابّو کیا نکلے؟ وہ بے چاری غیر ملکی عورت اور اُس کا معصُوم بچہ۔ جو میرا بھائی تھا لیکن اُس سے رشتہ ثاقب ہی کی معرفت تھا اور جب ثاقب قابلِ نفرت ہے تو پھر باقی لوگوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ میرا بھائی تیمور ہے۔ میں اِس کے لئے اپنی زندگی کا آخری سانس تک صرف کر دُوں گی۔ ہاں تصور تم ہو سکتا ہے ثاقب نہ ہو لیکن مجھے کسی بھی مرد پر بھروسہ نہیں ہے اِس دُنیا میں۔ وہ محبُوب بن کر دھوکہ دیتا ہے، شوہر بن کر دھوکہ دیتا ہے، باپ بن کر دھوکہ دیتا ہے تو پھر ایسا کون سا رشتہ رہ جاتا ہے جس کے تحت اُس پر بھروسہ کیا جا سکے؟

میں... میں کیا اپنی ماں کے تجربے سے فائدہ نہ اُٹھاؤں؟ تصور بیگ تمہاری باتوں میں دِلکشی ہے۔ تمہارے انداز میں نُدرت ہے۔ لیکن نُدرت تو اُس شخص کے انداز میں بھی تھی جس نے پہلی بار ایک غزل سُنا کر میری ماں کا دِل لُوٹ لیا تھا۔ ہاں عورت اِتنی ہی جذباتی ہوتی ہے۔ وہ ایک ذرا سی بات پر مر مٹتی ہے اور اُس کے بعد وہ ذرا سی بات اُس کی پوری زندگی پر کالی رات بن کر چھا جاتی ہے، نہیں، پر کچھ بھی بیتے۔ میں اپنی زندگی کو اُن کالی راتوں کے حوالے نہیں کروں گی۔ تم چلے گئے۔ تم نے اچھا کیا تصور، ہو سکتا ہے تم اچھے انسان ہو لیکن مجھے انسانوں کا جو تجربہ ہُوا ہے اُس میں تمہاری کوئی گنجائش میرے دِل میں باقی نہیں رہی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں جلد بازی میں دُکھ پہنچا دیا لیکن تصور یہ اِس لئے اچھا ہُوا کہ آگے کے تمام راستے تم خود بند کر لو گے۔ تم اگر اچھے انسان ہو تو کسی ایسی لڑکی سے رجُوع کر لینا جسے میری طرح حالات کا شکار نہ ہونا پڑا ہو۔ وہ تمہاری بہتر پذیرائی کر سکے گی۔ ہاں تم تو دِلکش بھی ہو۔ ہر لحاظ سے چارمنگ۔ ہر انداز میں پیارے۔ لیکن پیار میرے دِل میں تمہارے لئے نہیں پیدا ہو سکتا۔ معافی چاہتی ہُوں تصور۔

اُس نے ایک مضبُوط قوّتِ ارادی کے تحت ایک آخری فیصلہ کیا کہ اب وہ تصور کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دے گی۔ اور اِس کے بعد اُسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یہاں وہ اپنی زندگی کے کس دور کا آغاز کرے یا پھر یہاں سے کہیں اور چلی جائے۔ یہ بہت بڑا گھر اُس کی ماں کی یادگار تھا۔ لیکن اِس یادگار سے بہت سی دُکھ بھری یادیں بھی وابستہ تھیں۔ میں اگر اِس گھر میں رہُوں گی۔ تو یہ دُکھ بھری یادیں ہمیشہ میرے ذہن پر حاوی رہیں گی۔ کیوں نہ اِسے فروخت کر دُوں؟ اور کوئی چھوٹی سی جگہ کرائے پر حاصل کر لُوں۔ ماحول تبدیل ہو گا تو ذہن میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی۔

لیکن وہاں... وہاں کراچی میں کیا ہو رہا ہو گا؟ ثناء تم نے بھی سوچا ہو گا کہ کس سانپ کو آستین میں پالا تھا، کِسے دُودھ پلایا تھا۔ تمہاری محبتیں ہمیشہ مجھے یاد رہیں گی۔ لیکن ثناء بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں محبتوں کا جواب دینا نہیں آتا۔ مجھے معاف کر دینا میری بہن۔

مجھے معاف کر دینا۔

اُس کے دل میں ایک دم سے خیال پیدا ہُوا کہ ثناء سے کسی طرح رابطہ قائم کیا جائے لیکن پھر فوراً ہی اُس نے دل کو سمجھا لیا۔ یہ دل تو نہ جانے کیا کیا چاہتا ہے۔ لیکن مصلحتیں بھی کچھ ہوتی ہیں۔

رات ہو گئی۔ آج کچھ کھایا پیا بھی نہیں گیا تھا، بس تیمور کی ضرورتیں پوری کرتی رہی تھی۔ دل اُداس اُداس سا تھا شاید کراچی سے آنے کے بعد اُداسیاں اُسے کافی دن تک گھیرے رہتیں، لیکن اگر ان میں تصوّر کا تصوّر شامل نہ ہوتا تو وہ اُنھیں بآسانی برداشت کر لیتی۔

رات کو بستر پر لیٹی وہ تیمور کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی رہی اور بہت سے خیالات آتے رہے۔ کبھی اختر کا تصوّر آتا تو ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل جاتی۔ نُدرت یاد آتی تو نہ جانے کیسے کیسے احساسات دل میں اُبھر آتے۔ آہ کیا ہی اچھا ماحول تھا۔ اُن لوگوں نے مجھے پتہ بھی نہ لگنے دیا کہ میں کسی اجنبی جگہ ہُوں۔ وہ جگہ میرے لئے اجنبی تو نہ رہی تھی۔ ثناء اور نُدرت کیسی کیسی شرارتیں کرتی تھیں۔ اور کیسے کیسے پیارے لوگ تھے وہاں۔

نہ جانے کب تک اُنہی کرداروں میں گم رہی اور اُس کے بعد آنکھوں میں نیند نے بسیرا کر لیا۔ نیند ایک مہربان ماں کی مانند ہے جو ہر قسم کی اُلجھنوں سے نجات دِلا دیتی ہے۔ لیکن صبح کا سُورج بھی نمُودار ہوتا ہے۔ اور اُس وقت ماں کی آغوش چِھن جاتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے حِنا اُس کے پہلو سے اُٹھ کر چلی گئی تھی دل اُداس اُداس سا تھا۔ غسل خانے میں جا کر ٹھنڈا پانی چہرے پر ڈالتی رہی حد تیمور جاگ گیا اور وہ تیمور کو ناشتہ وغیرہ کرانے لگی پھر تیمور کو گود میں لئے وہاں سے باہر نِکل آئی۔

آج کچھ نہ کچھ کرنا تھا کہیں نہ کہیں تو نکلنا ہی تھا یہاں اُس کی بہت سی شناسا لڑکیاں تھیں۔ اُن کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن پھر یہ بھی نامناسب سمجھ کر اُس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ ہو سکتا ہے اُن کے سامنے اپنی تفصیلات بیان کرنی پڑیں۔ پھر اِتنے دِن یہاں سے غائب رہی ہے، کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی ہو گا۔ وہ ٹہلتی رہی اور پھر اُس کی نِگاہ اپنے لان کے ایک چھوٹے سے گوشے کی طرف مبذول ہو گئی اور اُس کا دِل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ جوڑے سے درخت کے تنے کے پیچھے سے اُسے دو پاؤں پھیلے ہُوئے نظر آ رہے تھے، برابر میں چائے کی پیالی رکھی ہُوئی تھی۔ وہ عجیب سے انداز میں اُسے دیکھتی ہُوئی آگے بڑھنے لگی اور بالآخر تنے کے قریب پہنچ گئی۔ وہ تصوّر ہی تھا جو درخت کے تنے سے سر لگائے کسی خیال میں گم تھا۔

احسان احمد صاحب پر جو کچھ گُزری تھی۔ اُس نے اِس خوبصُو کوٹھی کی فضا میں کچھ آلُودگیاں پیدا کر دی تھیں اور اُس کی حسین ایک دم مُرجھا گئی تھی۔ شہاب صاحب نے اپنی دانست میں کوٹھی کو زمیں بوس کر دیا تھا لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا احسان صاحب نے تو ہمیشہ دوسروں کے لئے اپنا دِل کھولے رکھا تھا خُدا اُنھیں نظر انداز کیسے کر دیتا؛ چنانچہ انتہائی مایُوسی کے عالم اچانک روشنیاں کُود پڑی تھیں اور غلام احمد صاحب نے حق اد ادا کر دیا تھا۔ اُنھوں نے بڑی خاموشی سے احسان احمد صاحب ساکھ سنبھال لی اور اپنے طور پر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے د یہ دوسری بات ہے کہ احسان احمد صاحب اُن کے اِس ایثار چُھپا نہ سکے۔ بات یہیں تک محدُود نہ رہی تھی احسان احمد صاحب نے تو بڑے دال والے ہو کر اور بڑی شخصیت والے ہو کر لوگوں احسانات کئے تھے لیکن غلام احمد نے بلاشُبہ اُن سے زیادہ بڑائی ثبُوت دیا تھا اور اپنی تکلیف دِہ زندگی کو کبھی بھی کسی پر ظاہر ہونے دیا تھا اور سارا اثاثہ احسان احمد صاحب کے حوالے کر د

کوٹھی کی فضا میں پھر وہی حُسن قائم ہو گیا اور اُس کے بعد حالات میں تبدیلیاں ہُوئیں۔ اختر اور خالد اور عادل حسین وغیرہ کے آ جانے سے زندگی میں پھر وہی ہماہمی پیدا ہو گئی۔ گو لوگ اِس کوٹھی سے کنارہ کشی کر گئے تھے لیکن اُن کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ وقت کے ساتھی تھے۔ اور بُرے وقت پر چھوڑ گئے تھے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہُوا تھا کم از کم احسان صاحب کو دوست اور دُشمن کی تمیز ہو گئی تھی وہ جو اِبن الوقت تھے کنارہ کشی کر گئے تھے اور وہ جو محبت سے اُن کے ساتھ تھے تک اُن کے ساتھ موجود تھے جب کہ کوٹھی کی فضا میں وہ رونق واپس آ چکی تھیں، پھر اختر حسین، عادل حسین اور خالد نے ٹھکانہ الگ بنا لیا تھا۔ گو احسان احمد صاحب کے لئے یہ بات تکلیف تھی۔ لیکن ایک دوسری صورتِ حال بھی تھی۔ خالد اور ثناء نسبت دونوں بزرگوں کے علم میں تھی، اور ظاہر ہے اِس مسئلے کو بھی بڑھانا تھا چنانچہ سب کچھ اچھے انداز میں ہو رہا تھا لیکن ثناء اچانک چلے جانے سے کوٹھی کی فضائیں پھر سے سوگوار ہو چکی

گو اِس میں کوئی شک نہیں کہ آفندی صاحب نے قرض کی وصُولیابی کے لئے احسان احمد کے ساتھ بہتر سلوک نہ کیا تھا لیکن احسان احمد جیسے لوگ اِس رُوئے زمین پر نیکیوں نِشان ہوتے ہیں۔

آفندی صاحب کے دُکھ میں احسان احمد صاحب اپنی تمام بتیں بھُول گئے تھے اور اب دِل وجان سے اِس بات کے لئے وشاں تھے کہ کسی طرح رُدا کا پتہ چل جائے۔ آفندی صاحب سے ملاقات کر کے آنے کے بعد یہ مسئلہ اور بھی گمبھیر ہو گیا تھا۔ ہر شخص کی زبان پر کچھ نہ کچھ تھا۔ ذکیہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

"میں بھئی کبھی کھُل کر زبان نہیں کھولتی کسی مسئلے میں لیکن بچّی کے پنڈے سے یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ ایک بچّے کی ماں ہے۔ کنوارپن کا ایک الگ انداز ہو سکتا ہے بس وہ اپنے آپ کو اُس بچّے کی ماں کہتی تھی تو میں خاموش ہو جاتی تھی لیکن دِل نہیں مانتا تھا اِس بات کو۔"

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ذکیہ کہ آخر وہ گئی کہاں؟ اَے میں کہتی ہُوں اگر ثناء سے اِتنی ہی رنجش تھی تو ہمیں تو بتا دیتی ہمارے ساتھ سچ مانو اُس نے زیادتی کی ہے۔ اَے میں کہتی ہُوں کیا فرق رہ گیا تھا اُس میں اور ثناء میں؟ ہر لمحے ہم لوگ اُس کے بارے میں سوچتے اور دیکھتے رہتے تھے۔ اب تو کوئی بات بھی نہ تھی۔"

"امّاں بی! وہ بھی بس ایک ضِدی ماں کی ضِدی بیٹی ہے۔ پتہ نہیں کمبخت خود کو کوئی روگ نہ لگا لے۔ آخر ایسی بھی کیا ضِد؟ لڑکیوں کی ایسی ضِدیں مجھے تو اچھی نہیں لگتیں۔"

"بھئی آپ لوگ زنانہ گفتگو کئے جا رہی ہیں۔ کچھ مدد کیجئے آپ ہماری۔ آخر اُسے کہاں تلاش کیا جائے؟"

"لو میں کیا مدد کروں؟" ذکیہ بیگم نے احسان احمد کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اِس سلسلے میں نوجوانوں میں مجلسِ مشاورت ہو رہی ہو گی۔ میں خود بھی جا کر دیکھتا ہُوں۔ کیا عادل حسین چلے گئے؟"

"ہاں! کہہ گئے تھے کہ میں چلتا ہُوں کچھ کام ہے۔ اختر اور خالد شاید یہیں موجود ہیں۔" ذکیہ بیگم نے جواب دیا۔

"ہُوں! ذرا دیکھوں میں اُنھیں کہاں ہیں؟"

احسان احمد صاحب باہر آئے تو اُن کا خیال درُست ہی نکلا۔ لان پر مجلس جمی ہُوئی تھی اور اِس سلسلے میں زور و شور سے گفتگو ہو رہی تھی۔ احسان احمد صاحب خود بھی اُن کے قریب پہنچ گئے، سبھی موجود تھے۔ اقبال، تنویر، نُدرت، عِصمت، خالد، اختر وغیرہ وغیرہ۔ موضوع رُدا ہی تھی۔ احسان احمد صاحب کو دیکھ کر سب مؤدّب ہو گئے۔

"بھئی مُعاف کرنا تم لوگوں میں داخل ہو کر مداخلت کی ہے، لیکن میں جانتا ہُوں کہ موضوع رُدا ہی ہو گی۔"

"ہاں چچا جان۔ ہم لوگ یہی گفتگو کر رہے تھے کہ اب کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے۔"

"دیکھو بھئی ظاہر ہے مجھے بھی اِس سلسلے میں اِتنی ہی تشویش ہے جتنی تم لوگوں کو۔ میں چاہتا ہُوں کہ زیادہ وقت نہ ضائع ہو۔ جس قدر جلد ہو سکے اُسے تلاش کر لیا جائے۔ بس چند منٹ لُوں گا تم سے۔ یہ بتاؤ تمھارے خیال میں وہ کراچی ہی میں ہو سکتی ہے یا کہیں ایسا تو نہیں کہ لاہور واپس چلی گئی ہو؟"

"ہم ہر پہلو کا جائزہ لے رہے ہیں چچا جان۔ ویسے اگر ضرورت پیش آئی تو پھر کچھ افراد لاہور بھی چلے جائیں گے۔"

"ہاں میری خدمت کی ضرورت جہاں بھی ہو میں حاضر ہُوں۔ یُوں سمجھ لینا کہ میں بھی اِس سلسلے میں تمھارے برابر ہی تشویش کا شکار ہُوں۔ لیکن ماشاءاللہ تم لوگ نوجوان ہو۔ زیادہ برق رفتاری سے کام کر سکتے ہو۔ بس اِسی لئے میں یہاں آیا تھا کہ تم لوگوں کو یہ بات بتا دُوں۔"

"آپ مطمئن رہیئے چچا جان۔ ذرا اِس ثناء کو سمجھا دیجئے اِس نے اپنی حالت بُری کر رکھی ہے۔"

"ثناء بیٹے! بس تم سے کچھ کہنا بیکار ہی ہے۔ خود سمجھدار ہو۔ کوشش کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے روتے پیٹنے سے۔" احسان احمد نے ثناء کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

ثناء کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ احسان احمد صاحب کو بہت دُکھ ہُوا۔ پھر وہ اِن لوگوں کے درمیان سے واپس چلے گئے۔ لڑکے اور لڑکیاں خاموشی سے اُنھیں جاتے ہُوئے دیکھتی رہی تھیں تب اختر نے کہا۔

"تو خواتین و حضرات قِصّہ چہار دُرویش یا پھر پنج دُرویش یہ ہے کہ۔۔"

"اختر! اِس وقت غیر سنجیدگی بالکل نہیں برداشت کی جائے گی۔" عِصمت نے کہا۔

"ٹھیک... ٹھیک! آپ ہی اِس وقت ہماری سربراہ ہیں تو پھر فرمایئے، سنجیدگی سے کیا کام کیا جا سکتا ہے؟"

"بھئی تمھاری ذہانت کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ سُنا ہے کہ تم بہت ہی سمجھدار قسم کے نوجوان ہو چنانچہ جو کچھ تم کہو گے وہی زیادہ مؤثر ہو گا۔"

"آداب عرض کرتا ہُوں۔ آداب عرض کرتا ہُوں۔" اختر نے

جھک کر ہاتھ کو پیشانی تک لے جاتے ہوئے کہا، پھر بولا "توقصہ پنج دُرویش یہ تھا کہ ہم لوگ کسی کی کمی محسوس کر رہے ہیں یا نہیں؟"

"مطلب؟"

"کوئی ایسی شخصیت جو اس سلسلے میں ہماری دوست بھی ہو اور ہمارے لئے مؤثر کارروائی کرسکتی ہو۔"

"یہ پہیلیاں بجھوانے کا وقت ہے کیا؟" ثناء نے تیکھے انداز میں کہا۔

"اللہ۔ اللہ۔ آواز ایسی جگہ سے اُبھری ہے کہ پانچوں دُرویش کو اب فرار ہو جانا چاہیئے۔ میں جناب تصور بیگ صاحب کی بات کر رہا تھا۔ آخر اُن کی پولیس افسری کس دن کام آئے گی۔ اور پھر ہمارے ایک ملازم کے ہمشکل ہونے کی وجہ سے اُن پر ہمارے خاصے احسانات بھی ہیں تو کیوں نہ اس سلسلے میں اُن سے مدد لی جائے؟"

"ارے ہاں بات ذرا مسخرے پن سے کی گئی ہے۔ لیکن ہے پائیدار" خالد نے چونک کر کہا۔

"جنابِ عالی، یہ مسخرا پن ذہانت کی علامت ہوتی ہے۔ آپ ایسے معاملات میں اپنی مداخلت نہ کیا کریں۔"

"واقعی بڑے پتے کی بات ہے۔ ذرا نُدرت تم تصور بیگ کو ٹیلیفون تو کردو" خالد نے کہا۔

"ایک منٹ ... ایک منٹ یہ پولیس افسران جس قسم کے لوگ ہوتے ہیں آپ کو خود اندازہ ہے بھائی جان میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کوئی اور ترکیب کی جاسکتی ہے۔"

"کیا؟" خالد نے اختر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ کوئی خاتون چلیں ہم سیدھے تصور بیگ کے گھر جائیں گے۔ خاتون کو اندر بھیج دیا جائے گا تاکہ تصور بیگ اگر چھپنے کی کوشش کریں تو انھیں گرفتار کیا جاسکے۔"

"وہ چھپنے کی کوشش کیوں کریں گے؟" عصمت نے پوچھا۔

"بس عصمت باجی آپ اِن پولیس والوں کو نہیں جانتیں وقت پڑنے پر اِن کی تمام دوستی و دوستی رُخصت ہو جاتی ہے" اختر نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ خالد کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مُسکراہٹ آگئی تھی لیکن اُس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"نُدرت، پلیز تم ذرا اختر کے ساتھ چلی جاؤ۔ واقعی ہمیں اس وقت تصور بیگ کی ضرورت ہے۔ اختر تم اُسے جہاں سے بھی ملے پکڑو اور اپنے ساتھ ہی لے آؤ۔"

"جیسا آپ حکم دیں بھائی جان" اختر نے سعادت مندی سے کہا اور نُدرت بوکھلا سی گئی۔

"مم... میں؟"

"ہاں بھئی چلی جاؤ۔ حرج کیا ہے، میں اُتو سے کہہ دوں ظاہر ہے اِس سلسلے میں ہمیں تکلفات سے کام نہیں لینا چاہ" عصمت نے کہا اور نُدرت گردن ہلا کر خاموش ہو گئی۔

"تو پھر دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ میں گاڑی لئے جا رہا ہوں ہا لے جاؤ" خالد نے کہا اور اختر گاڑی کی جانب بڑھ گیا نُدرت ٹھٹکتے قدموں سے اُس کے ساتھ چل پڑی تم جانتی تھی کہ اختر نے اِس وقت بھی شرارت کی ہے لیکن صُورتِ اتنی سنجیدہ تھی کہ وہ کسی قسم کا اظہار بھی نہیں کرسکتی تھی چنانچہ آہستہ چلتی ہوئی اختر کے قریب پہنچ گئی اور کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اختر نے کچھ کہے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اختر خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ نُدرت نے دو تین بار حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔ اختر اور اتنی خاموشی ایک ناممکن سی بات تھی ہو سکتا ہے کسی سوچ میں ہو۔ لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کار ایک خوبصورت سے ریستوران کی پارکنگ میں داخل ہو گئی۔

"ارے ارے یہاں کہاں؟" نُدرت نے گھبراتے ہوئے لہجے

"خاموشی سے نیچے اُتر آؤ ورنہ گولی مار دوں گا" اختر غرّاکر

"کیا بکواس ہے بھئی"

"نیچے اُترو۔ اختر زور سے چیخا اور نُدرت بوکھلائے ہوئے انداز میں نیچے اُتر آئی۔ کچھ لوگ رُک کر دیکھنے لگے تھے اختر اتنی ہی زور سے چیخا تھا۔ اس کے چہرے پر غُصّے کے تاثرات تھے نُدرت گھبرائے والے انداز میں اُس کے ساتھ چلتی ہوئی ریستوران میں آگئی اختر نے اُس کے لئے کُرسی گھسیٹ دی تھی۔

"تم انسان ہو یا..." نُدرت نے کہا۔

"شوہر" اختر کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"چیخے کیوں تھے؟"

"زمانہ قدیم کے شوہروں کا تصور ذہن میں آگیا تھا۔"

"اور میں زمانہ جدید کی بیوی بن کر دِکھاؤں تو" نُدرت دانت پیس کر بولی۔

"تمھیں اللہ قسم ضرور دِکھاؤ" اختر نے گھگھیائے ہوئے انداز میں کہا اور نُدرت کو احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔

"آخر یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"تمھیں کچھ پلانا چاہتا ہوں نصف بہتر" اختر نے کہا۔

"میں کچھ نہیں پینا چاہتی"

"یہاں جینا تو صُورتِ حال مختلف ہو جائے گی جب تک ہیں گے لوگ ہمیں گھورتے رہیں گے" اختر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی زبردستی ہے" نُدرت بے بسی سے بولی۔

"اچھی ہے ناں تمھیں پسند آئی مجھے یقین تھا۔ ویسے یہاں کولڈ کافی بھی اچھی ہوتی ہے۔ ویٹر" اختر نے ویٹر کو آواز دی اور پھر کولڈ کافی کا آرڈر دے دیا۔

"مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا ہے" نُدرت نے کہا۔

"ہاں، نیا نیا شروع کیا ہے ناں"

"میں نے شروع کیا ہے" نُدرت آنکھیں نکال کر بولی۔

"اُفوہ! عشق کرنا بھی نہیں آتا۔ یہ کام محبوب ہی کرتے ہیں" اختر نے کہا۔

"خُدا کی قسم تم بہت شاطر ہو"

"بے حد شکریہ نصف بہتر!"

"زبردستی نصف بہتر!"

"دور ہی ایسا ہے کیا کیا جائے؟"

"خالد بھائی نے مجھے پھنسایا ہے میں سب سمجھتی ہوں" نُدرت گردن ہلاتی ہوئی بولی۔

"تم انھیں پھنسا دینا، احسان اُتر جائے گا" اختر لاپرواہی سے بولا۔

"مجھ پر کا ہے کا احسان ہے"

"وہی عورتوں والی باتیں۔ دِل میں کچھ زبان پر کچھ، ویسے تعاوُن ہمارے درمیان جاری رہنا چاہیئے۔ اب دیکھو انھوں نے ہمارے لئے کچھ کیا ہم اُن کے لئے کچھ کریں گے"

"اختر، سنجیدہ ہو جاؤ"

"خُدا کی قسم تمھارے معاملے میں مَیں بالکل سنجیدہ ہوں۔ آخر تمھیں یقین کیوں نہیں آتا کچھ دِل وغیرہ چیر کر دِکھاؤں؟"

نُدرت بے بسی سے ہنسنے لگی۔ ویٹر نے کولڈ کافی سرد کر دی تھی دونوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔

"تصور بیگ واقعی اِس سلسلے میں کچھ کریں گے" تھوڑی دیر کے بعد نُدرت نے کہا۔

"یار نصف بہتر، تم سے خصُوصی طور پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسی باتیں جو شاید میں کسی سے نہ کہہ سکتا تھا" اختر پُرخیال انداز میں بولا۔ نُدرت سوالیہ انداز میں اُسے دیکھنے لگی۔ اختر چند لمحات خاموش رہا پھر اُس نے کہا۔

"نُدرت کافی دِن پہلے کی بات ہے ایک دِن بس یوں ہی شرارت میں رُدا کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور اُس کی کھوج میں اُس کے سامان کی تلاشی لے ڈالی تھی اور تو کوئی خاص چیز نہیں ملی لیکن ایک نوٹ بُک ہاتھ لگی تھی بلکہ دو حصّوں میں تھی۔ اور اُس نوٹ بُک میں ایک کہانی لکھی ہوئی تھی ایک ایسی کہانی جسے میں نے بڑی احتیاط سے دِل میں چھُپا کر رکھ لیا تم اِس بات پر یقین کرو گی کہ وہ کہانی رُدا کی کہانی تھی۔"

"کیا مطلب؟" نُدرت نے چونک کر پُوچھا۔

"ہاں، رُدا کی زندگی کی کہانی جو اگر سچ تھی۔ اور صرف ایک افسانوی حیثیت نہیں رکھتی تھی تو یُوں سمجھ لو کہ میں نے رُدا کے ماضی کی ایک ایک بات جان لی تھی۔

"اختر سنجیدہ ہو"

"ہاں" اِس سلسلے میں بالکل سنجیدہ ہُوں۔ پورے اعتماد سے سُنو" اختر نے جواب دیا اور نُدرت عجیب سے انداز میں اُسے دیکھنے لگی۔ اختر پُرخیال انداز میں داہنا گال کھُجاتا ہوا بولا۔

"دراصل تمھارے سلسلے میں رُدا ہی ایک ایسی شخصیت نظر آئی مجھے جس پر میں دل کی کہانی کھول سکتا تھا۔ دراصل نُدرت اب فضُول پردہ پوشیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی میں تمھیں اپنا ہمسفر دیکھا اور تمھاری طرف سے محتاط ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ میں بہت دُور ہُوں کہیں میرے پیچھے گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میں نے دِل میں فیصلہ کیا کہ رُدا کو اپنا رازدار بنالُوں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ویسے رُدا بہت باظرف اور بہت نفیس خاتون ہیں۔ انھوں نے میری اِس شخصیت کو اپنے دِل ہی میں چھُپائے رکھا۔ چنانچہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ رُدا کی کہانی میرے عِلم میں آئے اور میں اُسے عام کر دُوں"

"مگر کہانی کیا تھی؟"

"مختصراً وہی جو آفندی صاحب نے ہم لوگوں کو سُنائی ہے۔ بس اُس میں ذرا رنگ آمیزی تھی۔ ثاقب اور رُدا کی والدہ حِنا کی ابتدائی ملاقات اُن کے عشق کے مراحل، آفندی صاحب کی مرضی کے بغیر اُن کی شادی کا تذکرہ، ثاقب کا دھوکہ دے کر باہر چلے جانا اور پھر اُس کے بعد رُدا کی پیدائش، اُس کی تربیت، بعد میں ثاقب صاحب کی دوبارہ واپسی اور پھر رُدا کی اُس سے اُلفت، مطلب یہ کہ یہ تمام چیزیں اُس نوٹ بُک میں اُس وقت تک کی تفصیل کے ساتھ درج تھیں جب رُدا اِس کوٹھی میں آئی۔ باقی باتیں تو تمھارے عِلم میں ہیں ہی۔ رُدا کا گھر لاہور میں ہے، اور اِس بات کے قوی امکانات ہیں کہ وہاں چلی گئی ہو لیکن

اصل مسئلہ جو ہے وہ کچھ اور ہے اور ہمیں اِس پر ہی توجہ دینی ہے۔"

"کیا؟"

"ڈائری کے شروع کے اوراق میں ایک شعر یا چند اشعار لکھے ہُوئے تھے جو مجھے آج تک یاد ہیں اُن کا معمّہ حل نہیں ہو پا رہا۔"

"کیا اشعار تھے؟"

"لکھا تھا۔"

تو آؤ کہ رازِ پنہانی افشائے عقیدت کرتا ہُوں
داماں زبانِ خاموشی لبریزِ شکایت کرتا ہُوں
گھبرا کے ہجومِ پیکاں سے اظہارِ جُرأت کرتا ہُوں
میں تم سے . . . .

تو یہ اشعار ابتداء میں لکھے ہُوئے تھے اور میں اُس وقت سے آج تک اُلجھن میں ہُوں کہ یہ اظہارِ محبت کس کا تھا؟ پھر نیچے لکھا ہُوا تھا۔ "رِدا کہانی" انداز کچھ ایسا تھا نُدرت جیسے یہ کہانی خود رِدا نے نہ لکھی ہو بلکہ کسی اور نے تحریر کی ہو۔ وہ کوئی اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ بات اگر ذہن میں آجائے تو بہت سے معمّے حل ہو جائیں۔"

نُدرت بھی اب پوری طرح اِس بات میں دلچسپی لینے لگی تھی پھر اُس نے کہا۔

"لیکن اختر! یہ بات تو تمھیں پہلے بتانی چاہئیے تھی کم از کم ہم لوگوں کو تو۔۔"

"یار اِتنا ہی سوچتیں کہ کتنا پائیدار اور ٹھوس قسم کا عاشق مِلا ہے تمھیں، جو غیروں کی بات اِس طرح دِل میں رکھ سکتا ہے وہ اپنوں کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔"

"پھر اپنی بین بجانا شروع کر دی نا۔"

"یہ تو ضروری ہے نصف بہتر۔ مسئلہ بیچارے آفندی صاحب کا ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے ہمارے گھر کا بھی ہے۔ کیوں نہ ایسا کریں کہ ہم دونوں لاہور چلیں۔"

"کیا۔ کیا؟" نُدرت چونک پڑی۔

"ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اِس میں حرج کیا ہے؟"

"جی آپ ایسے میرے وہ لگتے ہیں ناں کہ میں آپ کے ساتھ لاہور چلی جاؤں۔"

"خیر وہ تو لگتا ہُوں اب یہ دوسری بات ہے کہ تم ابھی اِس بات کو تسلیم نہ کرو۔"

"اختر! بھئی سنجیدہ ہو جاؤ۔ سچ مچ اِس مسئلے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے تمھاری ذہانت کہاں گئی؟"

"یہ بات ذہانت کی نہیں ہے۔ رِدا کے بارے میں تو ... ہے کہ اِن حالات سے گھبرا کر ممکن ہے اُس نے کراچی ہی ... دی ہو۔"

"تو تم لاہور چلے جاؤ ناں۔"

"میں ہی رہ گیا ہُوں اکیلا۔ تم لوگوں کی صرف زبان ... ہے اِن معاملات سے۔"

"اچھا تو پھر تصوّر بیگ سے مدد لو ناں۔"

"کافی ختم کرو ذرا سا مُنہ لگایا تو سر پر ہی چڑھ کر بیٹھ گ... چلو جلدی کرو۔" اختر نے ناک ٹیڑھی کر کے کہا اور نُدرت نے ... پھر کافی کا بِل ادا کیا گیا۔

ایک بار پھر نُدرت، اختر کے ساتھ باہر آگئی اُس نے ... دروازہ کھولا تو اختر دانت پیس کر بولا۔

"کار کسی دیوار سے ٹکرا دُوں گا اور خود نیچے کُود جاؤں ... سمجھ گئیں۔ شوہر ہُوں ڈرائیور نہیں۔ چلو آگے آ کر بیٹھ جاؤ۔"

"اچھی زبردستی ہے یہ تو ہر مسئلے میں۔"

"جی ہاں! گھر میں تو آپ نے جو پاکیزگی کا اظہار فرمایا ... اُسے صرف اِس لئے برداشت کر لیا کہ چلو کسی کی عزّت کا معا... لیکن اب بھی آپ مجھے ڈرائیور بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔"

"یہ تم مردوں کا کمپلیکس ہوتا ہے۔"

"بیٹھو، شرافت سے بیٹھ جاؤ۔"

نُدرت ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والے دروازے ... بیٹھ گئی اور اختر نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

"دِل تو چاہ رہا ہے کہ یہاں سے سیدھے ساحلِ سمندر کا ... کریں اور میں کار کو ڈرائیو کرتا ہُوا پانی کی گہرائیوں میں لیتا چلا ..."

"میں زبان بند ہی رکھوں گی۔ تمھاری بکواس کے آگے ... کا کچھ بولنا ممکن نہیں ہے۔"

"یار نصف بہتر ایک بات بتاؤ۔ تم اپنے گھر میں بہت ... سمجھی جاتی تھیں۔ میں نے تمھاری ساری شرارتوں کو اچھی طرح ... کیا تھا وہ دِن بھی یاد ہے مجھے جب تم اُس پانچ نمبر میں جو تو... چکر چلا رہی تھیں اور میں نے تمھاری یہ اسکیم فیل کر دی تھی ... رہی۔ سیر کو سوا سیر مِلا یا نہیں؟"

نُدرت نے کوئی جواب نہیں دیا اور اختر ہونٹوں ... سیٹی بجانے لگا، پھر اُس نے تصوّر بیگ کے گھر کے سامنے کار ... دی اب وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

خوبصورت وسیع و عریض عمارت کے گیٹ کے دوسری

طرف چوکیدار نظر آ رہا تھا جو گاڑی کو دیکھ کر باہر ... آیا تھا۔ اختر اور نُدرت گاڑی بند کر کے نیچے اُتر آئے۔

"تصوّر صاحب موجود ہیں؟" اختر نے پُوچھا۔

"نہیں صاحب وہ تو کہیں گئے ہُوئے ہیں۔"

"ارے باپ رے۔" اختر آہستہ سے بولا۔ پھر چوکیدار کو دیکھ کر ... لگا۔

"کچھ معلوم ہے کتنی دیر میں واپس آئیں گے؟"

"نہیں صاحب وہ اپنی ڈیوٹی پر کہیں دُور گئے ہیں۔" چوکیدار نے ... جواب دیا۔

"کہاں، کراچی سے باہر؟"

"جی صاحب! ہمیں پتہ نہیں، ویسے وہ آئے نہیں ہیں دو دِن سے۔"

"کوئی اور ہے؟"

"ہاں جی! وہ نعمان صاحب ہیں۔"

"ذرا اُن سے ملاقات کرا دو۔"

"آئیے صاحب آپ کو ڈرائنگ رُوم تک پہنچا دُوں۔ ابھی ... صاحب کو اطلاع دیتا ہُوں۔" چوکیدار نے کہا اور احترام کے ... انھیں اندر لے گیا۔ ڈرائنگ رُوم کھول کر بٹھایا اور اختر پُرخیال ... میں بولا۔

"یہ نعمان صاحب کون ہیں اِن کا نام تو پہلی بار سُنا ہے۔" ... وہ یہی گفتگو کر رہے تھے کہ ایک خوبصورت سا نوجوان کمرے ... داخل ہُوا اور انھیں دیکھ کر بُری طرح ٹھٹک گیا۔ اختر اور ... اُچھل پڑے تھے کیونکہ اُس نوجوان کے خدوخال تقریباً نوّے ... تصوّر بیگ سے مِلتے جُلتے تھے۔ اِس سے پہلے تصوّر بیگ کے کسی ... وغیرہ کے بارے میں معلومات نہیں حاصل ہو سکی تھیں لیکن ... ویسے تصوّر بیگ میں اور اُس میں تھوڑا سا فرق ضرور تھا ... وہ شخص آگے بڑھ آیا اور اُس نے گونجدار آواز میں ہیلو کہا۔

"ہیلو نعمان صاحب۔" آپ سے پہلی بار ملاقات ہُوئی ہے۔ ... تصوّر بیگ صاحب میرے بہترین دوست ہیں۔"

"اوہ جی! ہاں میں اُن کا کزن ہُوں۔ عموماً یہاں نہیں رہتا۔ ... مِل کر خُوشی ہُوئی۔ آپ کے نام نہیں جان سکا۔"

"میرا نام اختر ہے اور یہ نُدرت ہیں۔ ویسے حیرت انگیز بات ... آپ دونوں کی صورتیں بہت زیادہ مِلتی جُلتی ہیں۔"

"جی۔۔۔ جی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہم دونوں ضرورت سے ... زیادہ کزن ہیں۔" نعمان نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"تصوّر بیگ صاحب کہاں گئے ہیں کچھ معلوم ہے؟"

"شاید لاہور گئے ہیں۔" نعمان نے جواب دیا اور اختر ایک لمحے کے لئے چکرا سا گیا۔ بہرحال اُس نے خود کو سنبھال لیا پھر بولا۔

"کسی سرکاری کام سے؟"

"یقیناً ایک پولیس آفیسر کسی سرکاری کام سے ہی کہیں جا سکتا ہے۔"

"اچھا ایک زحمت اور کیجئے گا آپ ذرا خیر دین کو بُلا دیجئے۔"

"باورچی کو۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔"

"بہتر ہے میں بھیجتا ہُوں۔ ویسے تصوّر بھائی سے کوئی کام تھا آپ کو؟"

"ہاں! بہت ضروری کام تھا، اور اگر وہ واپس آجائیں تو براہِ کرم آپ اُن سے کہیں کہ ہم سے فوراً رابطہ کریں۔ ویسے وہ کب گئے ہیں؟" اور جواب میں نعمان نے وہی تاریخ بتائی تھی جس تاریخ کو رِدا غائب ہُوئی تھی، پھر وہ خیر دین کو بھیجنے کی کہہ کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد خیر دین اندر داخل ہُوا اور اُس نے اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا۔

"لو جی کمال ہو گئی۔ آپ لوگ اِدھر کیسے آ گئے۔ اختر بھائی جی۔"

"بیٹھو خیر دین، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اختر نے کہا اور خیر دین کاندھے پر سے کپڑا اُتار کر سامنے بیٹھ گیا۔ اختر پُرخیال انداز میں اُسے دیکھ رہا تھا لیکن دفعتاً ہی وہ اُچھل پڑا۔ خیر دین کو شاید اختر کے چونکنے کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ اُس نے چند لمحات کے بعد کہا۔

"اور جی اختر بھائی، کوٹھی میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے ناں۔"

"ہاں خیر دین تم آئے نہیں بہت دِن سے؟" اختر کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی جسے نُدرت نے محسوس کیا۔ خیر دین بولا۔

"بس جی دھندوں سے فرصت ہی نہیں مِلتی اختر بھائی جی مصروف رہتے ہیں۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ رِدا غائب ہو گئی ہے؟"

"کون غائب ہو گئی ہے جی؟"

"رِدا۔" اختر نے کہا۔

"کِس کی جی؟" خیر دین نے پھر سوال کیا اور اختر ہنس پڑا پھر وہ نُدرت سے بولا۔

"دیکھا تم نے نُدرت، یہ اپنا خیر دین کس قدر پُرمزاح ہو گیا ہے رِدا کے معنی بھی سمجھتا ہے یہ پُوچھ رہا ہے کس کی رِدا غائب ہو گئی ہے حالانکہ اسے اِتنا نہیں معلوم کہ اس کی بائیں مُونچھ نیچے لٹکتی جا رہی

ہے اور اپنی جگہ سے اُڑ گئی ہے خیر دین نے گھبرا کر اپنی مونچھ پر ہاتھ مارا۔ تو اختر نے اُس پر چھلانگ لگا دی۔ ندرت بے چاری نہ اختر کے الفاظ پر غور کر پائی تھی نہ خیر دین کی حرکت پر البتہ اختر کے اِس طرح چھلانگ لگانے پر وہ چونک پڑی تھی۔ اختر نے خیر دین کو پیچھے سے پہنچ کر دبوچ لیا اور آن کی آن میں اُس کے بالوں کو مٹھی سے جکڑ کر زور سے اُوپر کھینچ دیا ندرت چکرا کر رہ گئی تھی کیونکہ خیر دین کے سر سے ایک وِگ اُتر گئی تھی جس میں نقلی لٹک رہی تھی اور اس وِگ کے نیچے سے جو چہرہ برآمد ہوا تھا وہ ابھی چند لمحات قبل اُن دونوں کے سامنے تھا یعنی نعمان کا چہرہ خود نعمان بھی اختر کی اِس حرکت پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"یہ ندرت تم ذرا خیر دین کو رکھو۔ میں نعمان صاحب سے گفتگو کروں" اختر نے وِگ ندرت کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا نعمان ایک لمحے کے لئے بدحواس ہو گیا تھا پھر اُس نے ایک گہری سانس لی۔ اور اختر کو دیکھنے لگا۔

"کسی کے گھر میں گھس کر اُس کا حلیہ بگاڑ دینا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے اختر صاحب"

"اور ایک شریف آدمی کو وِگ لگا کر دھوکہ دینا کوئی اچھی بات ہے جناب نعمان صاحب"

"بھائی میں کیا کروں۔ میں کوئی میک اَپ مین ہوں۔ پولیس والا بھی نہیں بلکہ اُس کا بھائی ہوں اب یہ سب کچھ مجھے اِس طرح تو نہیں آتا جس طرح تصور چاہتا ہے"

"ہوں۔ ہوئی ناں بات۔ اب آپ سے ذرا کھل کر بات ہو جائے گی نعمان صاحب" ندرت پاگلوں کی طرح نعمان اور اختر کو دیکھ رہی تھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ چکر کیا ہے۔ اختر نے ندرت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ندرت صاحبہ! بہت بڑا معمہ حل ہو گیا ہے یہ اپنے نعمان صاحب خیر دین نہیں ہیں بلکہ کرائے کے خیر دین ہیں کیوں نعمان صاحب؟"

"ویسے اختر صاحب آپ بہت تیز آدمی ہیں آپ کی اِس حرکت کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے" نعمان نے کہا۔

"میں آپ کو بہترین مشورہ دے سکتا ہوں نعمان صاحب"

"کیا...؟"

"دوستی کر لیں۔ گہری اور پکی دوستی،" اختر نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور نعمان مسکرا دیا پھر وہ بولا۔

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تصور کی غیر موجودگی میں مجھے آپ کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے"

"بہتر طریقہ یہ ہے کہ سچائی کے راستے اختیار کئے جائیں کبھی نقصان نہیں ہوتا"

"اب کیا رہ گیا ہے جو جھوٹ بولا جائے ویسے تصور مروایا اوّل تو بِلا وجہ مجھے باورچی بنا دیا ایک ڈاکٹر کو باور کرنے پر مجبور کر دیا اور پھر یہ بھی نہیں بتایا اگر ایسی کوئی پیش آجائے تو کیا کروں؟"

"کوئی بات نہیں۔ تصور موجود نہیں ہے۔ آپ اِس مجھ سے ہدایات لے سکتے ہیں میرا اور اُس کا بڑا گہرا رابطہ آپ میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہیں؟"

"بھائی! ہاؤس جاب کر رہا ہوں" نعمان نے گردن ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ کو یہ خیر دین بننے کی کیا سوجھی؟"

"وہ پولیس والا مجھے اکثر اپنے بے تکے کاموں میں استع رہتا ہے۔ اُس دن اچانک ہی مجھے خیر دین بنا دیا تھا کوئی صورتحال پیش آگئی تھی۔"

"جب میں آیا تھا"

"ہاں! اُسی دن کی بات ہے بڑی پریشانی کے عالم کہنے لگا ذرا جلدی سے آؤ اور پھر بڑی تیز رفتاری سے چہرے پر میک اَپ کیا یہ وِگ تو بعد میں بنائی گئی ہے تاکہ کے وقت اِسے استعمال کیا جا سکے اُس وقت وہ میک اَپ تھا مجھے بولنے کا انداز بھی ہنگامی طور پر سکھایا گیا تھا"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ واقعی باکمال انسان ہیں زبردست کام کیا تھا اُس دن بھی، مجھ جیسے آدمی کو بھی بے

"شکریہ شکریہ۔ بہر طور چھوڑیئے اِن باتوں کو اب باتیں منظرِ عام پر آچکی ہیں تو پولیس والا جانے اور آپ سلسلے میں اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا"

"ظاہر ہے۔ ظاہر ہے۔ ویسے اِن سے ملیئے یہ ندرت ہیں اور میرا نام تو آپ اچھی طرح جانتے ہی ہیں۔ آپ کا نا چکے ہیں"

"مگر ذرا یہ بتایئے یہ سب چکر کیا ہے؟"

"تصور بیگ کا چلایا ہوا چکر ہے۔ فطرتاً شریر آدمی لوگوں سے اکثر مذاق کرتا رہتا ہے کبھی اینگلو انڈین بن کر کچھ بن کر مگر یہ لاہور کس سلسلے میں گیا ہے" اختر نے بے تکلفی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"آپ یقین کیجئے مجھے نہیں معلوم۔ ابھی آپ کی آمد

بات یاد آگئی تھی کہ مجھے خیر دین کی حیثیت سے آپ کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور پھر آپ نے خیر دین سے ملنے کی فرمائش بھی کی تھی چنانچہ جلدی میں خیر دین بن گیا اب اِس مونچھ کا کیا کروں جس نے گڑبڑ کر ڈالی" اختر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ندرت اب بھی احمقوں کی طرح دونوں کی صورتیں دیکھے جا رہی تھی۔ اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ویسے نعمان صاحب! بلکہ ڈاکٹر نعمان صاحب" آپ سے مل کر واقعی مسرت ہوئی ہے آپ نے اپنا کردار بڑے شاندار طریقے سے انجام دیا۔ اب آپ صرف اِتنی زحمت کر لیں کہ جس وقت بھی وہ پولیس والا واپس آجائے اُس سے کہیں کہ احسان صاحب کی کوٹھی پہنچ جائے اُس سے بہت ضروری کام ہے"

"بس اِتنا بتا دیجئے اِس انکشاف سے کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا تصور بیگ کو؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ اب تو اِس دلچسپی میں آپ برابر کے شریک رہیں گے"

"ویسے میں محسوس کر رہا ہوں کہ برابر کا شریک آپ نے مجھے کیا نہیں بلکہ اپنا مطلب حل کرنے کے بعد رفو چکر ہونے کے چکر میں ہیں آپ"

"ڈاکٹر صاحب! برابر کا شریک آپ کو کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آپ ہمیں اپنے دوستوں میں شامل کریں"

"کیا جا سکتا ہے کوئی ایسی بات تو نہیں میں خود بھی اچھے دوستوں کا قائل ہوں آپ لوگوں کے بارے میں کچھ تفصیلات تو نہیں معلوم ہو سکیں لیکن اگر آپ ہمیں لفٹ دیں تو ہم حاضر ہیں"

"تب پھر میں دوبارہ آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ لیکن ہمیں تفصیلی ملاقات کے لئے کچھ مہلت درکار ہے"

"کوئی بات نہیں آپ سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ لیکن اِتنا تو بتا دیجئے کہ یہ خیر دین کا چکر کیا ہے؟"

"پولیس والے نے آپ کو نہیں بتایا؟" اختر نے پوچھا۔

"بھئی وہ بڑا چکر باز آدمی ہے، کہنے لگا بس چند لوگوں کو خیر دین بن کر بے وقوف بنایا تھا اب صورتحال ایسی ہو گئی ہے کہ زن! کر خیر دین کے کردار کے لئے کسی کی ضرورت ہے۔ میں چونکہ اُس کا بڑا بہت مشکل ہوں یہ اِسی کی سزا ہے کہ مجھے خیر دین بنا دیا۔ مگر اِس کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟"

"اب یہ سب کچھ تصور بیگ کی موجودگی ہی میں بتانا مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب اجازت دیجئے"

"نہیں نہیں کچھ پی کر جایئے"

"آپ نے جو کچھ پلا دیا ہے ڈاکٹر صاحب! اُس سے بھی اِتنا سرور آگیا ہے کہ اب مزید کچھ پینے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ آپ کو دعوت دی جائے گی احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں اور اُس کے بعد ہم سب مل کر کچھ پیئں گے"

"میں اُس وقت تک پریشان رہوں گا جب تک کہ یہ معمہ حل نہ ہو جائے" نعمان نے اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور اختر ندرت کے ساتھ باہر نکل آیا پھر اُس نے بڑی جلد بازی میں کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تھی۔

"اختر! میری تو عقل ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ کیا چکر ہے یہ؟" ندرت نے پریشان لہجے میں کہا۔

"اِتنا بڑا چکر ہے ندرت کہ سنو گی تو یقین نہ کر پاؤ گی اور بہتر ہے کہ ابھی نہ سنو ذرا مجھے اپنی اِس سیکنڈ ہینڈ کھوپڑی کا استعمال کرنے دو میرے خدا یہ بہت لمبا چکر ہے یقیناً بہت لمبا"

ندرت احمقوں کی طرح اختر کی صورت دیکھ رہی تھی اور اختر ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا اُس کا ذہن گاڑی سے زیادہ تیز رفتاری سے چل رہا تھا کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اُس نے کہا۔

"ندرت! کوٹھی میں جا کر بس اِتنا ہی بتانا ہے کہ تصور سے ملاقات نہیں ہوئی اور وہ کسی کیس کے چکر میں اُلجھا ہوا ہے ہم اُس کے لئے پیغام چھوڑ آئے ہیں"

"میں تمہارے احکامات پر عمل کیوں کروں گی؟"

"ارے ارے، یہ ابھی سے انحراف شروع کر دیا تم نے مجازی خدا ہوں تمہارا۔ کوئی معمولی بات نہیں ہے" اختر نے کہا اور ندرت ہنسنے لگی پھر بولی۔

"یہ ڈاکٹر نعمان بھی خوب تھا مگر تصوّر بیگ نے اُسے خیر دین کیوں بنا دیا، یہ سارا چکر واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آیا"

"ذرا تفصیل سے بات کریں گے میں پہلے کچھ فیصلے کرنا چاہتا ہوں" اختر نے کہا اور ندرت نے گردن ہلا دی کار کوٹھی کے قریب پہنچ رہی تھی اختر نے اُسے سائیڈ کر کے روک دیا۔

"کیوں، کیا ہوا؟"

"بہتر ہے اب آپ پیچھے چلی جایئے۔ آپ کی عزت کا معاملہ ہے ورنہ میں تو آپ کو دِل میں بٹھا کر بھی کوٹھی میں لے جا سکتا ہوں" ندرت ہنس پڑی اور پھر وہ اُتر کر گاڑی کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی تھی۔ اختر نے اطمینان سے کار آگے بڑھا دی اور چند لمحات کے بعد کوٹھی میں داخل ہو گیا۔

ندرت کار سے اُتر کر کوارٹر کی طرف چلی گئی اور اختر ٹہلتا ہُوا اندر آ گیا۔ اتفاق سے اُس وقت کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہو کے صوفے پر بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگا خیر دین ولد بشیر دین۔ وہ خیر دین نہیں تصور بیگ تھا۔ ایک اعلیٰ پولیس افسر، لیکن کیوں؟ وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ اختر نے آنکھیں بند کر لیں دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا پھر کسی کے قدموں کی آہٹ سُن کر چونک پڑا۔ ندرت کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ارے اوہ۔ تم... آؤ تم۔۔ میرا مطلب ہے یہ انہونی۔ آخر یہ کیسے ہُوا؟"

"سب مصروف ہیں" ندرت نے کہا۔

"اوہ ڈیئر ندرت! آج تم نے میرا مرتبہ بہت بڑھا دیا کیا سے کیا بنا دیا تم نے مجھے"

"کیا مطلب؟"

"یعنی وہ جو کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بند ھے۔ اور دوسری کلاسیکل داستانیں۔ یعنی سوہنی کچے گھڑے پر دریا پار کر کے مہینوال سے ملنے جاتی تھی۔ اور شیریں نے فرہاد کے لئے دُودھ کا کنواں کھود ڈالا تھا"

"رات کو اُن سب کی رُوحیں تمہاری گردن نہ دبوچ لیں تو میرا نام نہیں" ندرت نے دانت پیستے ہُوئے کہا۔

"چھوڑو۔ ہمیں گزرے ہُوؤں سے کیا لینا میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ حضور والا نے خاکسار کو کس آسانی سے تلاش کر لیا آخر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ خادم یہاں ہے یہ جذبۂ دِل ہی تو ہے جس میں کچے دھاگے استعمال کئے جاتے ہیں"

"پلیز اختر، سنجیدگی اختیار کر لیں عنایت ہوگی میں ذہنی طور پر سخت اُلجھ گئی تھی۔ اِس وقت اتفاق سے سبھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے میں نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے تم سے اِس موضوع پر بات کروں تم میرے سامنے اندر آئے تھے چند کمروں میں جھانکنے سے تم مل گئے"

"خدا کرے ایسے غنیمت مواقع ہمیں ہمیشہ ہی ملتے رہیں آنکھوں کو روشنی اور دِل کو جِلا ملتی ہے واہ سُبحانَ اللہ"

"اِس کا مقصد ہے میں جاؤں"

"کک۔۔ کیا مطلب؟ کک کیوں؟" اختر نے اداکاری کرتے ہُوئے کہا۔

"اِس لئے کہ میں صرف سنجیدہ گفتگو کرنے آئی ہُوں اور آپ ایک دم سے فضاؤں میں پرواز کرنے لگے"

"کیا کہا جائے اس مقامی عورت کے بارے میں جس کے دِل میں کبھی محبت کے جذبات جنم ہی نہیں لیتے۔ خیر آپ تشریف رکھ[ئے] میری اُمیدوں پر سوڈا واٹر پھیرنے میں آپ کو کچھ خصوصی لُطف آتا ہے تشریف رکھئے"

"ایک شرط پر"

"جج... جی ہاں آپ کی تمام شرطیں مجھے منظور ہیں مہر[...] کا مسئلہ بھی طے کر لیجئے میں بھلا آپ سے منحرف ہو سکتا ہُوں[...] نیچ ہو کر بیٹھ گئی تھی پھر اُس نے کہا۔

"اختر پلیز، پہلے میرے ذہن میں یہ تصور بیگ کا مسئلہ [...] کرو یہ سب کیا تھا ہماری تو کوئی گفتگو ہی نہ ہو سکی"

"ہُوں! اِس کا مطلب ہے کہ آپ صرف اِس مسئلے [...] تشریف لائی ہیں"

"تو اور کیا ابھی کافی دیر تک تو ہم لوگ ساتھ رہے ہیں"

"ایسا ساتھ بھی کیا ساتھ جس میں تکلفات اور پابندیا[ں]"

"اللہ کے واسطے سارے رُومانی ڈائیلاگ اِسی وقت نہ کر لیں اور بھی بہت سے مواقع آئیں گے"

"وعدہ" اختر نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"توبہ ہے" ندرت نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی

"چلو ٹھیک ہے۔ اِس وعدے پر میں سنجیدہ ہُوا"

"یہ آخر نعمان صاحب اور خیر دین کا کیا چکر ہے؟"

"کچھ دِن قبل بلکہ کافی دِن قبل ایک بار میں نے [...] بیگ کا تعاقب کیا تھا اور اُن کے پیچھے لگا اُن کے گھر تک گیا تھا۔ صرف اِس بات کی تصدیق کرنے کے لئے کہ تصور بیگ ہیں کیا چیز، حالانکہ مجھے تعجب ہُوا تھا کہ خیر دین اُسی گھر [...] داخل ہُوا جس گھر میں اُس کا ہمشکل ایک پولیس آفیس[ر] تھا۔ لیکن نہایت خوش اسلوبی سے نعمان کو خیر دین بنا کر سامنے پیش کر دیا گیا اور تصور بیگ بھی میرے سامنے [...] ظاہر ہے تم نے خود بھی دیکھ لیا کہ ڈاکٹر نعمان نے اپنے آپ[...] خیر دین کی حیثیت سے کس عمدگی سے پیش کیا تھا وہ تو ہم [...] دھوکہ دے گئے ورنہ ہم اِس وقت بھی بے وقوف بن کر [...] آتے لیکن تم اِس بات پر غور کرو ندرت کہ تصور بیگ [...] نے خیر دین کی حیثیت سے اِس گھر میں ڈیرہ کیوں ڈال [...]"

"اوہ میرے خدا، اِس کا مطلب ہے کہ خیر دین در حقی[قت] تصور بیگ تھے"

"سو فیصدی، اب اِس میں شُبہے کی کیا گنجائش ہے [...]

پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے" اختر نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا اور ندرت تصویرِ حیرت بنی اختر کی صُورت دیکھتی رہی پھر اُس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"خدا کی پناہ خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ، دادی امّاں کو سُنائی جانے والی کہانیاں ہر قسم کے معاملات میں خیر دین کا اپنا کردار، گھر کی صفائی سُتھرائی اور تمام لوگوں سے گفتگو تصور بیگ نے سب کو ہی بے وقوف بنا ڈالا"

"یقیناً ایسا ہُوا ہے لیکن اب اہم مسئلہ یہ ہے کہ آخر اُس نے ایسا کیوں کیا، وہ اِس عمارت میں کیوں آیا تھا؟ ویسے ندرت ایک بات تم سے کہوں۔ یُوں سمجھ لو اپنی زندگی کا آدھا راز تمھیں دے رہا ہُوں سمجھ رہی ہو ناں آدھے راز کا مطلب چنانچہ اس بات کی توقع رکھتا ہُوں کہ یہ بات کسی سے نہ کہنا۔

"ٹھیک ہے فرمائیے" ندرت نے مُنہ بناتے ہُوئے کہا۔

"مجھے تو ایک شُبہ ہے"

"کیا؟"

"یہ تصور بیگ صاحب خیر دین کی حیثیت سے بلاوجہ ہی اِس کوٹھی میں نہیں داخل ہُوئے بلکہ اِس کی وجہ رُدا بھی ہو سکتی ہے"

"کیا مطلب؟"

"یار، اِتنی سی بات تو سمجھ لیا کرو بالغ ہو گئی ہو آخر" اختر نے اِس انداز میں کہا کہ ندرت بے اختیار ہنس پڑی پھر اُس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"نہیں، خدا کی قسم میں نے تو کبھی غور نہیں کیا اِس بات پر۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"بھئی اس کے علاوہ اور کوئی بات تو سمجھ میں آتی نہیں ہے"

"مگر ایسا کیسے ہُوا؟"

"بہت سے ذرائع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تصور بیگ نے رُدا کو دیکھا ہو۔ پولیس والا ہے پیچھا کیا، گھر دیکھ لیا اور اُس کے بعد کسی فلمی کہانی کا آغاز ہو گیا۔ جس میں بہت بڑے گھر کا ہیرو ملازم، باورچی مالی یا ڈرائیور بن کر محبُوبہ کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے اور اُس کے بعد محبُوبہ رام ہو ہی جاتی ہے تو ہو سکتا ہے، یعنی ممکن ہے کہ اپنے تصور بیگ صاحب نے بھی وہی طریقۂ کار اختیار کیا ہو اور محترمہ رُدا صاحبہ پر ڈورے ڈالے ہوں بھئی معاف کرنا میں ذرا غلط الفاظ میں یہ داستان بیان کر رہا ہُوں لیکن کیا تمہارا ذہن کسی اور طرف جاتا ہے"

"میں کیا کہوں۔ میں تو واقعی چکرا کر رہ گئی۔ اِس کا مطلب ہے کہ عصمت باجی نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا۔ یونیورسٹی میں جس شخص نے اپنے آپ کو ڈیسوزا کے نام سے متعارف کرایا تھا وہ تصور بیگ ہی تھے۔ اور اس کے بعد یعنی جو کچھ ہُوا کمال ہے خیر دین بن کر تصور بیگ صاحب نے واقعی بڑا عجیب چکر چلا دیا تھا یہاں اور پھر بات نبھانے کے لئے ویسے اختر ایک بات کہوں تمہیں بھی چکر دے دیا تھا تصور بیگ نے"

"اعتراف کرتا ہُوں اِس بات کا انکار کب کیا" اختر نے جواب دیا پھر بولا "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیوں؟ اچھا ایک بات بتاؤ ندرت، یہ تصور بیگ صاحب کا نزول میرا مطلب ہے کہ خیر دین ولد بشیر دین اِس کوٹھی میں کب داخل ہُوئے تھے؟" ندرت کچھ سوچنے لگی پھر اُس نے اپنی یادداشت کی بناء پر اس وقفے کا اظہار کیا۔

"گویا رُدا یہاں آ چکی تھی"

"ہاں سو فیصد" ندرت نے جواب دیا اور اختر پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر اُس نے کہا۔

"ندرت صاحبہ! لکھ لیجئے اِس بات کو تصور بیگ بھی رُدا کے پیچھے ہی پیچھے لاہور گیا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ باخبر نکلا۔ پارٹی میں اُس وقت وہ خود بھی شریک تھا جب آفندی صاحب نے رُدا کو دیکھا۔۔۔ اور تصور بیگ کو رُدا کی تمام حقیقت بہت پہلے معلوم تھی بلکہ اُس نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ رُدا اب لاہور ہی کا رُخ کرے گی چنانچہ وہ بھی لاہور کے لئے چل پڑا۔ بھئی کمال ہے ہم تو اپنے آپ کو بڑا تیس مار خان سمجھتے تھے عشق و عاشقی میں۔ لیکن یہ حضرت تصور بیگ تو ہم سے کئی جُوتے آگے نکلے اور اُنھوں نے میدانِ عاشقی مار لیا"

"تو اب کیا یہ بات یقینی ہے کہ رُدا لاہور ہی گئی ہے؟"

"تقریباً نوّے فیصد" اختر نے جواب دیا۔

"شناء کی حالت کافی خراب ہے۔ ویسے بھی دیوانی سی لڑکی ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ کہیں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ رُدا نے تھوڑی سی زیادتی ضرور کی ہے اِس انداز میں یہاں سے جا کر"

اختر نے کوئی جواب نہیں دیا تو ندرت کہنے لگی "میرا خیال ہے اگر تم اجازت دو تو میں شناء پر اس خیال کا اظہار کر دُوں"

"ڈیئر نصف بہتر! ایک درخواست کریں گے آپ سے وہ یہ کہ اِس بات کا اظہار ضرور کر دیں لیکن تفصیل میں نہ جائیں یہ آپ کے مجازی خدا کا پہلا حکم ہے آپ کے لئے"

ندرت نے مُسکراتی نگاہوں سے اختر کو دیکھا اور پھر باہر نکل گئی اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ اختر کی باتوں سے کم از کم

یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ خیر دین اور تصور بیگ ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے حالانکہ انتہائی حیرت ناک بات تھی اور ندرت جتنا اس پر سوچتی حیران ہوتی جاتی لیکن اب اس سلسلے میں کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

وہ ثناء کی تلاش میں چل پڑی اور پھر ایک دلچسپ سچویشن اس کے سامنے آگئی۔ خالد اور ثناء باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے ثناء کی گردن جھکی ہوئی تھی اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور خالد اسے سمجھا رہا تھا۔ ندرت چھپ کر ان کی گفتگو سننے لگی۔

"ثناء! دیکھو یہ سب کچھ حماقت میں شمار ہوتا ہے بلاشبہ ردا سے تمہاری نسبت ہم سبھی کے علم میں ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ردا بذاتِ خود بہت معصوم سی شخصیت کی مالک تھی۔ لیکن اب کسی کے لئے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے کئی وقت سے، ثناء یہ سب کچھ مناسب نہیں ہے۔"

"میں خودکشی کر لوں گی آپ سب لوگ کان کھول کر سن لیجئے۔ ردا کو کہیں سے بھی برآمد کرنا پڑے گا۔ ورنہ ثناء بھی زندہ نہیں رہ سکے گی۔"

"اور میرا کیا ہوگا؟" خالد نے سوال کیا۔

"آپ بھی خودکشی کر لیجئے" ثناء نے بڑی نرمی سے کہا اور خالد کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ندرت نے بڑی مشکل سے اپنا قہقہہ ضبط کیا تھا۔ خالد بوکھلائی ہوئی سی نگاہوں سے ثناء کو دیکھتا رہا۔ عجیب مشورہ تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کہے۔ چند لمحات اسی طرح گزر گئے پھر خالد نے کہا۔

"کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں ہی خودکشی نہ کریں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں خالد؟"

"میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں ثناء صاحبہ کہ اپنے آپ کو سنبھالئے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ سب ہی اس سلسلے میں کاوشیں کر رہے ہیں اور یقینی طور پر ردا آسمان میں غائب نہیں ہو جائیں گی۔ ہم کسی نہ کسی شکل میں انہیں تلاش کر ہی لیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ اپنے آپ پر قابو پائیں خود کو سنبھالیں اور اس کے بعد ہم لوگ مل جل کر اس سلسلے میں کام کریں۔"

"تو میں آپ کو کام کرنے سے کب روک رہی ہوں؟" ثناء نے کہا۔

"روک رہی ہیں ایک طرف تو ردا کا معاملہ ہے جو ہمیں نہیں مل رہیں اور دوسری طرف آپ کی یہ پریشانی ہے جس نے ہمیں غم زدہ کر دیا ہے اب اس عالم میں ہم بھلا ردا کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔"

"میں آپ کو کیا پریشان کر رہی ہوں؟" ثناء نے سوال کیا۔

"آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے" خالد کسی قدر جھلائے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں خالد" ثناء بولی۔

"ہاں آپ کو ڈانٹ رہا ہوں لیکن اس ڈانٹ سے کوئی فائدہ بھی تو نہیں حاصل ہوا مجھے۔ سنیئے ثناء آپ نے اگر کھانا نہیں کھایا تو آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ پانی تک نہیں پیئوں گا۔ بھئی آپ، اس کے علاوہ اور کیا کہوں آپ سے۔"

"ارے واہ آپ پانی نہیں پیئیں گے تو میرا کیا بگڑے گا" ثناء بولی۔

"کچھ نہیں بگڑے گا" خالد اسے دیکھتا ہوا بولا اور ثناء آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگی پھر اس نے کہا۔

"خالد مجھے تیمور بہت یاد آرہا ہے۔ ردا نے کیا یہ اچھا کیا خود جانا تھا تو چلی جاتی تیمور کو کیوں لے گئی۔ بڑی بے مروت نکلی سچ میں اب اس سے کبھی نہیں بولوں گی" ثناء نے کہا اور خالد ہنس پڑا پھر کہنے لگا۔

"ردا کو ہم چھوڑیں گے نہیں تلاش کیا جا رہا ہے اور تلاش کر لیا جائے گا اور میرا خیال ہے اس میں زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا بشرطیکہ آپ اس سلسلے میں تعاون کریں۔"

"کھانے ہی کا مسئلہ ہے نا تو چلو کچھ کھائے لیتی ہوں مجھے خود بھی بھوک لگ رہی ہے مگر بس غصہ آرہا ہے ردا پر ایک بار مل جائے تو ایسی حجامت بناؤں گی اس کی کہ وہ بھی کیا یاد کرے گی۔ ارے ہم تو اتنی محبت سے پیش آتے رہے اور انہیں جب ذرا سا غصہ آیا اپنی اولاد کو لے کر چل پڑیں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، اب جو کچھ بھی دیکھا جائے گا" ثناء غصیلے لہجے میں بولی۔

"تو پھر میں آپ کے لئے کھانے کا بندوبست کر دوں؟"

"کر دیجئے" ثناء معصومیت سے بولی اور ندرت جلدی سے سامنے آگئی۔

"یہ انتظام میں کئے دیتی ہوں آپ لوگ گفتگو کیجئے" دونوں ہی اچھل پڑے تھے پھر خالد نے ندرت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہوں تو آپ حسبِ معمول اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔"

"جی نہیں۔ ابھی ابھی آئی تھی۔ ہنسوں کے جوڑے کو موڈ میں دیکھ کر رک گئی۔"

"ندرت" ثناء غرائی۔

"جی فرمایئے" ندرت نے تن کر کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"چھوڑو، چھوڑو، کوئی بکواس نہیں کر رہی چلو کھانا کھاؤ۔ اور آپ جناب خالد صاحب جایئے آرام کیجئے یہ کام ہم لوگ بھی کر سکتے ہیں۔"

"ارے ارے، بلاوجہ بگڑ رہی ہو میں نے کیا کیا ہے؟"

"جایئے جایئے، بلاوجہ ہلکان ہو رہے ہیں یہ کام ہم لوگوں کا ہے" ندرت نے کہا اور ثناء کا ہاتھ پکڑ کر اندرونی حصے کی جانب لے گئی۔ خالد احمقوں کی طرح کھڑا انہیں جاتے دیکھتا رہا تھا، پھر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ گردن جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ اسی وقت کوٹھی کے اندرونی حصے سے اختر باہر نکلتا ہوا نظر آیا اور خالد اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"تم کب واپس آئے؟"

"بہت دیر ہو گئی۔ کیا خیال ہے گھر واپس چلنا ہے یا آپ نے دوبارہ یہیں قیام فرما لیا۔"

"بکواس مت کرو۔ ڈیڈی چلے گئے؟"

"جی۔۔۔ بظاہر تو یہی محسوس ہوتا ہے ویسے صحیح بات آپ بتا سکیں گے۔"

"تم کیا تیر مار کر آئے ہو؟"

"ارے صاحب ہم تیر اندازی کرتے ہی نہیں ہیں۔ یہ تیر اندازی تو آپ پر ہی سجتی ہے۔"

"اختر۔۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں ناراض ہونے کی نہیں ہو رہی۔ کیا خیال ہے واپس چلیں؟"

"آؤ۔ اِدھر آؤ۔ یہ بتاؤ کیا کر کے آئے ہو" خالد نے کہا اور اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسی جانب بڑھ گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ ثناء کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا پھر اس نے اختر کو بٹھا دیا۔

"ہاں تو شروع ہو جاؤ۔"

"جناب قبلہ بھائیجان، حالات بڑی گمبھیرتا اختیار کر چکے ہیں۔ اور فدوی کے پاس بہت سے انکشافات موجود ہیں۔"

"لیکن فدوی کو اب صحیح طور پر زبان کھول دینی چاہیئے۔ ورنہ میں اپنے بڑا ہونے کا حق استعمال کر سکتا ہوں۔"

"سبحان اللہ۔۔ سبحان اللہ، مشق فرما رہے ہیں۔ آئندہ خوشگوار زندگی کے لئے، لہجے میں کافی رعب پیدا ہو چکا ہے۔ بہ حال ہم سنجیدہ ہوئے جاتے ہیں۔ مثلاً آپ کی ہونے والی ان کی سنجیدگی کا خیال بھی ہے اس لئے سنجیدگی ایک مجبوری بن گئی ہے۔"

"اختر پلیز۔"

"بھائی جان! اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ درحقیقت بہت اونچی چیز ہیں، یعنی اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہی پولیس آفیسر تصور بیگ ہیں۔"

"بخدا سچ کہہ رہے ہو؟" خالد نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔

"جی ہزار فیصد سچ" اختر نے جواب دیا۔

"مم۔۔ مگر معلوم کیسے ہوا؟ یہ بتاؤ۔"

"ہم لوگ وہاں پہنچے تھے۔ تصور بیگ صاحب اپنے دولت خانے پر تشریف نہیں رکھتے، لاہور گئے ہوئے ہیں ردا کے پیچھے پیچھے۔"

"اوہ۔ گڈ ویری گڈ۔"

"اور اپنے ایک شریف النفس بھائی کو خیر دین کی حیثیت سے چھوڑ گئے ہیں جسے میک اپ کرنے کا سلیقہ نہیں ہے کیونکہ وہ ڈاکٹر ہے۔"

"یار اختر! اگر اس وقت سنجیدہ ہو جاؤ تو تمہارا احسان مانوں گا۔"

"بہتر ہے آپ پوری تفصیل سن لیجئے گا" اختر نے کہا اور خالد کو اس سلسلے میں مفصل تفصیل بتانے لگا۔

خالد بھی حیران رہ گیا تھا پھر اس نے کہا۔ "اس کا مقصد ہے ہمیں ردا کا سراغ مل رہا ہے۔"

"مل گیا۔ اب کیا ملنا ہے۔ ویسے بھائی جان معاملہ ہے دلچسپ۔ تصور بیگ صاحب فوراً ہی ردا کے پیچھے چل پڑے۔ دراصل پارٹی میں انہوں نے صحیح صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ مگر ان کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ بھائی جان ایک بات کہوں۔"

"ہوں۔"

"میرا خیال ہے آفندی صاحب کے پاس چلتے ہیں کچھ باتیں ان سے پوچھنا باقی رہ گئی ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"جیسا تم مناسب سمجھو۔"

"بھئی ہر وقت یہاں آنا جانا رہتا ہے۔ اب اجازت کی کیا تک ہے؟"

"تو پھر آیئے" اختر نے کہا اور دونوں گاڑی کی جانب چل پڑے۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کی کار سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اور اس کا رخ آفندی صاحب کی کوٹھی کی جانب ہی تھا آفندی صاحب بے چارے بہت مضمحل ہو چکے تھے اور ایک طرح سے بستر سے ہی جا لگے تھے۔ نہ جانے کیا کیا احساس ہوں گے ان کے دل میں، بہرطور ان دونوں کی آمد کی خبر سن کر وہ جلدی سے باہر آگئے غالباً اس تصور کے ساتھ کہ شاید ردا کا کوئی پتہ چل سکا ہے اور انہوں نے سوال بھی یہی کر ڈالا۔

"یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے آفندی صاحب! بہرحال ہمیں

رُداکے بارے میں معلومات حاصل ہو ہی جائیں گی۔ میں جانتا ہُوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ کہاں جاسکتی ہیں۔ آپ کے پاس اِس وقت ایک زحمت دینے حاضر ہُوئے تھے "

" جی بیٹے! کہو کیا بات ہے ؟" آفندی صاحب نے نمناک لہجے میں کہا۔

" اُس دِن کوٹھی میں تصوّر علی بیگ بھی تھے اور تصوّر علی بیگ کو بہرطور آپ بھی کسی حد تک جان گئے ہیں۔ میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہُوں۔ کیا تصوّر علی بیگ صاحب سے آپ پہلے بھی واقف تھے ؟"

" نہ صرف تصوّر بیگ سے بلکہ میری اصل دوستی تو اُس کے والد منوّر علی بیگ سے ہے۔ محکمۂ پولیس میں انسپکٹر جنرل رہ چکے ہیں اور میرے اُن سے انتہائی دیرینہ تعلّقات ہیں تصوّر علی بیگ سے میں نے رُدا کے بارے میں کہا تھا۔ دراصل اخبار میں ایک اشتہار چھپا تھا ثاقب کی طرف سے رُدا کے لئے۔ میں نے اُس اشتہار کو پڑھنے کے بعد رُدا کی تلاش شروع کردی تھی اور اِس سلسلے میں تصوّر سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ رُدا کو تلاش کررہا تھا "

" اوہ میرے خُدا " اختر نے خالد کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

" کیوں، کیا ہُوا ؟" آفندی صاحب گھبرا کر بولے۔

" نن... نہیں ہُوا کچھ نہیں۔ اِس کا مقصد ہے کہ تصوّر علی بیگ۔ اوہ گڈ ویری گڈ۔ صُورتِ حال کھُلتی جارہی ہے۔ اچھا آفندی صاحب ذرا یہ اور فرمائیے کہ کیا آپ نے انفرادی طور پر تصوّر علی کو رُدا کی پوری کہانی سُنائی تھی ؟"

" ہاں الف سے لے کر ے تک "

" خوب، بہت خوب اور تصوّر بیگ صاحب نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ رُدا کو تلاش کرلیں گے ؟"

" یہی کہا تھا اُس نے مگر کیوں ؟"

" نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ اچھا اب آپ بالکل پُراطمینان ہوجائیے اور ہر خدشے کو ذہن سے نکال دیجئے رُدا محفوظ ہے اور کچھ دِن کے بعد سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ہاں ذرا یہ تو فرمائیے کہ لاہور میں اُس کی کوٹھی کا پتہ کیا ہے ؟"

" اوہ، تو کیا تم بھی اِسی انداز میں سوچ رہے ہو، بخُدا میرے دِل میں بھی یہی خیال آیا تھا کہ وہ لاہور چلی گئی ہوگی۔ اور میں وہاں جانے کی تیاریاں کرنا چاہتا تھا "

" نہیں آفندی صاحب! ویسے تو آپ بزرگ ہیں اور ظاہر ہے رُدا کے نانا ہیں۔ آپ جو بہتر سمجھیں گے کریں گے لیکن آپ اِس بات کو بھُول گئے کہ رُدا آپ کو دیکھ کر یہاں سے چلی گئی ہیں وہ کسی بھی قیمت پر آپ کے ساتھ آنا پسند نہیں کریں گی۔ آپ کو اندازہ ہے کہ وہ کس ضدی ماں کی بیٹی ہیں۔ آپ یہ ذمّہ داری ہم پر چھوڑ دیں ہم تمام معاملات ہموار کرلیں گے۔ ذرا رُدا کے گھر کی تفصیل بتا دیجئے " اور آفندی صاحب نے مکمل پتہ اختر کو بتادیا۔

" اب آپ بالکل اطمینان سے اپنے معمُولات جاری رکھیے سوفیصدی وہیں گئی ہُوئی ہیں اور ہم اُنھیں کسی نہ کسی طرح لے آئیں گے "

" بیٹے! زندگی کا چراغ گُل ہونے کو ہے اگر تم اِس بات پر یقین رکھتے ہو کہ انسان کو وقت سے پہلے اپنی موت کا اندازہ ہوجاتا ہے تو میں اِن دِنوں اِنہی مراحل میں ہُوں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اب میں زیادہ عرصہ نہیں جی سکوں گا چنانچہ اِس مسئلے کو اپنی سانسوں کے ساتھ ہی حل کردینا چاہتا ہُوں۔ میری بیٹی مجھ سے رُوٹھ گئی لیکن رُدا... رُدا " آفندی صاحب کی آواز آنسوؤں میں ڈُوب گئی۔

" آپ ابھی بہت دن زندہ رہیں گے آفندی صاحب اِس تصور کو ذہن سے نکال دیجئے۔ بعض اوقات انسان ایسی ہی کیفیات کا شکار ہوجاتا ہے۔ بس آپ کو ایک بار پھر یقین دلاتا ہُوں کہ رُدا بہن کو یہاں لاکر رہُوں گا۔ یہ ایک بھائی کی ذمّہ داری بھی ہے "

آفندی صاحب اِن الفاظ سے کافی مطمئن ہُوئے تھے تھوڑی دیر تک وہ اِن لوگوں کے ساتھ گفتگو کرتے رہے پھر خالد اور اختر نے اجازت مانگ لی۔ باہر نکلنے کے بعد اختر نے کار کا اسٹیرنگ سنبھال لیا اور خالد اُس کے برابر آبیٹھا۔ اِن لوگوں نے اپنی رہائش گاہ کا رُخ کیا تھا خالد بھی خاموش تھا اور اختر بھی کسی سوچ میں گم تھا۔ اِسی طرح وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ گھر پہنچنے کے بعد خالد نے کہا۔

" کیا اِس بارے میں ثناء کو ٹیلیفون کیا جائے ؟"

" جناب بھائی صاحب قبلہ، کرنے کو تو میں مُدرت کو بھی ٹیلیفون کرسکتا ہُوں۔ آپ اپنے نمبر کیوں بنا رہے ہیں ؟"

" فضُول بکواس سے باز نہیں آتے۔ ذرا سا بھی احترام نہیں کرتے میرا "

" نہیں بھائی صاحب! آپ یقین کیجئے آپ کا احترام میرے سر آنکھوں پر۔ کبھی سوچ بھی جاؤں اِس بارے میں کہ آپ کا احترام نہیں کرتا تو گردن کاٹ لُوں گا اپنی، لیکن بھائی صاحب کم از کم اِس معاملے میں آدمی ذرا سا خود غرض ہو جاتا ہے آپ ثناء کے سامنے نمبر بنانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو روکوں گا نہیں

اب اِتنی جلدی بھی نہیں کچھ نہ کچھ تو آپ سمجھتے ہیں " اختر نے شرماتے ہُوئے کہا اور خالد ہنس پڑا۔

" اچھا جاؤ ٹھیک ہے بھائی۔ آرام کرو... اب کل دِن میں دیکھیں گے یہ سارا مسئلہ "

" صرف دیکھیں گے ہی نہیں بلکہ انتظامات بھی کرنے ہوں گے "

" کیسے انتظامات ؟"

" روانہ ہونا پڑے گا لاہور " اختر نے جواب دیا۔

" ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہُوں " خالد اپنے کمرے میں چلا گیا اور اختر اپنے کمرے میں آگیا۔

سلیپنگ سُوٹ پہننے کے بعد وہ بستر پر دراز ہوگیا اور اُس کے ذہن میں خیالات کی چکّی چلنا شروع ہوگئی۔ اب تقریباً سارے معاملات واضح ہوچکے تھے۔ تصوّر کے بارے میں اب کوئی شک و شُبہ نہیں رہا تھا۔ وہ یقینی طور پر رُدا کی محبت میں گرفتار ہوکر احسان احمد کی کوٹھی میں ملازم کی حیثیت سے داخل ہُوا تھا۔ ایک پولیس والا تھا اور زندگی کے تمام رموز سے آشنا۔ اِس لئے کامیابی سے اپنا کردار نبھاتا رہا تھا اور تقریباً سبھی کو بے وقوف بنا ڈالا تھا۔ وہ کہانی جو کہ اختر نے ڈائری میں پڑھی تھی پوری طرح اختر کے سامنے تھی۔ لیکن اِس طرح تو یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ تصوّر علی بیگ ایک اچھا ادیب بھی ہے جو مناظر اُس نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے جن کے بارے میں اُس نے آفندی صاحب سے سُنا ہوگا۔ لیکن اندازِ تحریر یُوں تھا کہ ایک ایک منظر آنکھوں سے گزرا محسوس ہوتا تھا۔ تصوّر کے بارے میں وہ بہت دیر تک سوچتا رہا اور اُس کے بعد گہری نیند سوگیا۔ دوسری صبح تیاریوں کے بعد کوئے جاناں یاد آیا اور اُس نے خالد کو بھی اپنے ساتھ لے لینا مناسب سمجھا حضرتِ خالد بھی اپنی تیاریاں مکمل کرچکے تھے چنانچہ دونوں کار میں بیٹھ کر احسان احمد کی کوٹھی کی جانب چل پڑے۔ کوٹھی کے معمُولات میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ خاص طور سے ثناء نے تو سبھی کو سوگوار بنا ڈالا تھا اور مجال تھی کسی کی کہ کوئی ہنستا ہُوا نظر آجاتا۔ یہاں تک کہ احسان احمد صاحب بھی پریشان تھے غلام احمد بے چارے خود سر پکڑے بیٹھے رہا کرتے تھے کہ اِس سلسلے میں کیا کیا جائے۔ اقبال، عصمت غرض کہ تمام ہی لوگ ثناء کے گرد تعزیت کرنے والوں کی حیثیت سے جمع رہتے تھے اور ثناء درمیان میں ایسی بیٹھی نظر آتی جیسے جو کچھ گزرا ہے اُس کے ساتھ گزرا ہے، اختر اور خالد کو دیکھ کر گردن اُٹھائی۔ اِس وقت بھی وہ بیرُونی حصّے ہی میں موجود تھی اور پھر ہاتھ سے اپنی جانب آنے کا اشارہ کردیا۔

اختر نے مُسکراتے ہُوئے خالد سے کہا۔

" خالد بھیا! ذرا حالات پر اچھی طرح غور کرلینا میرا مطلب ہے بھابی حضُور کی فطرت سے آگہی ضروری ہے۔ ایک ذرا سا مسئلہ ہو جائے گا تو اِس طرح آپ کو اپنے درمیان عیادت گزار جمع کرنا پڑیں گے "

" یہ بات ثناء سے کہہ دُوں ؟"

" ارے باپ رے آپ کے خیال میں کیا تیسرا ایٹم بم مناسب ہوگا ؟"

" تیسرا ایٹم بم ؟"

" ہاں ایک ہیروشیما پر پھٹا تھا۔ دوسرا ناگاساکی پر اور اگر آپ نے یہ بات بھابی حضُور سے کہہ دی تو تیسرا ایٹم بم یہیں اِسی کوٹھی پر پھٹے گا "

خالد ہنسنے لگا تھا۔ پھر وہ دونوں بھی سنجیدگی سے ثناء کے پاس پہنچ گئے۔

" اختر! تم اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتے تھے، کچھ بھی نہیں کرسکے تم لوگوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں کرسکا "

" کک... کیا کرنا ہے ثناء صاحبہ ؟" اختر نے سوال کیا۔

" رُدا کے بارے میں اب کبھی معلومات نہیں حاصل ہو سکیں گی ہمیں۔ آخر یہ تو پتہ چلتا کہ کہیں سے اُس کی لاش دستیاب ہُوئی یا نہیں، تیمور... ہائے تیمور۔ رُدا اگر سمندر میں کُود ی ہوگی تو کیا تیمور کو بھی اُس نے اپنے ساتھ ہی رکھا ہوگا، یہ تو بڑی ناانصافی ہے۔ تیمور کی لاش تو پھُول کر کُپا ہوگئی ہوگی " ثناء نے کہا۔

" اے... اے کیا بکواس کررہی ہو، خواہ مخواہ بے تکی باتیں مُنہ سے نکالتی ہو " ذکیہ بیگم نے غُصیلے انداز میں کہا۔

" ہائے امّی! تو پھر وہ آخر کہاں گئی ؟"

" ارے پتہ چل جائے گا، جہاں بھی گئی ہوگی۔ خواہ مخواہ تم نے گھر سر پر اُٹھا رکھا ہے "

" سب مجھے ہی کہہ رہے ہیں۔ کوئی اُسے نہیں کہتا " ثناء آنسو بہانے لگی اور بہت سے ہونٹوں نے اپنی اپنی مُسکراہٹیں بمشکل تمام روکیں۔ اختر نے ثناء سے کہا۔

" ثناء! ذرا آپ اِدھر آئیے۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں "

" اچھا! اچھا کوئی... کوئی رُدا کے بارے میں بات ہے ؟"

" جی! سوفیصدی " اختر نے کہا اور ثناء جلدی سے اُٹھ کر باہر نکل آئی۔

" ہاں کہئے کیا بات ہے ؟"

" صرف یہ بات کرنی ہے کہ رُدا جہاں بھی ہوں گی خیریت سے

ہوں گی۔ آپ نے بلاوجہ اتنا اودھم مچا رکھا ہے۔"

"اختر..." شناء آنکھیں نکال کر بولی۔ "یہ بات بتانے کے لئے تم نے مجھے اُن لوگوں کے درمیان سے بُلایا تھا۔"

"تو اور کیا کرتا۔ آپ کو اُن لوگوں کے درمیان بیٹھنا اچھا لگتا ہے؟ جب دیکھیں دس پانچ کو گھیرے بیٹھی رہتی ہیں۔ میں کہتا ہوں آخر آپ کو یہ شوق کیوں پیدا ہو گیا ہے؟"

"بکواس مت کرو۔ مجھے کوئی شوق نہیں پیدا ہوا نہ میں کسی سے کہتی ہوں کہ کوئی میرے پاس آکر بیٹھ جائے بس میرا تو دل گھبراتا ہے نہ جانے... نہ جانے کیا حال ہوا ہوگا اُن دونوں کا؟"

"اُنہی کا حال تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔"

"اختر!" شناء چیخ کر بولی۔

"جی... جی فرمایئے" اختر نے جلدی سے کہا۔

"کچھ اور بھی جانتے ہو تم رُدا کے بارے میں؟ مسلسل پریشان کئے جا رہے ہو۔"

"جی جانتا ہوں لیکن یہ کام میرا بھائی کرے گا کیونکہ اُس کے حقوق اُسی کے پاس محفوظ ہیں" اختر نے خالد کی طرف اشارہ کر کے کہا اور خالد بے اختیار ہنس پڑا۔

"تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے اختر۔ شناء سُنیئے رُدا کے بارے میں ہم نے ایک اندازہ قائم کیا ہے اور ہمارا یہ خیال ہے کہ ہمارا اندازہ بالکل درست ہے۔"

"کمال ہے آپ لوگ ابھی تک صرف اندازوں پر گزارا کر رہے ہیں۔ کیسے لوگ ہیں آپ؟ ایک معمولی سی بات کا پتہ نہیں لگا سکتے" شناء نے گردن جھٹک کر کہا۔

"جی پتہ لگا لیا ہے اگر آپ سُننا پسند کریں تو۔"

"رُدا کا پتہ معلوم ہو گیا؟" شناء ایک بار پھر اُچھل پڑی۔

"اُفوہ! اختر بھئی میں اپنے حقوق سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ تمہی اِس صورتِ حال کو سنبھالو۔"

"جی نہیں بھائی جان، اِس کی ایک خاص وجہ ہے۔"

"کیا؟"

"جب اِس سلسلے کے آفٹر افیکٹس ظاہر ہوں گے تو صورتحال ذرا مختلف ہوگی۔ احسان چچا ہو سکتا ہے مجھے گھورنے لگیں" اختر نے کہا اور کئی قدم پیچھے ہٹ کر نُدرت کے پاس پہنچ گیا۔

"نُدرت! ذرا آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

نُدرت اختر کے ساتھ چل پڑی دوسری جانب خالد شناء سے کہہ رہا تھا۔

"ہمارا اندازہ ہے کہ رُدا لاہور چلی گئی ہیں۔"

"لاہور؟" شناء نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"جی اپنے اُس گھر میں جسے چھوڑ کر وہ یہاں آئی تھیں۔"

"ارے... اُفوہ! تو پہلے کیوں نہ کہا۔ ارے چلو جلدی کرو" شناء نے ایک دم اودھم مچا دیا اور تمام لوگ اُچھل اُچھل کر ہو گئے۔

اختر ابھی نُدرت سے کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے شناء اِس شور شرابے سے اِس طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔

"کیا ہوا... کیا ہو گیا؟" ذکیہ بیگم نے پوچھا۔

"لاہور... لاہور ارے جلدی کیجئے۔ لاہور..."

"خُدا کی پناہ شناء تجھے کیا ہو گیا؟ میں کہتی ہوں یہ پاگل پن حد سے بڑھ چکا ہے۔ سنبھال اپنے آپ کو ورنہ کہیں میرا دماغ خراب نہ ہو جائے۔"

"میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے لاہور چلئے۔"

"کیا مطلب ہوا اِس بات کا" ذکیہ بیگم نے خالد کو دیکھتے ہوئے

"پپ... پتہ نہیں۔ اچانک ہی لاہور... لاہور چیخنا شروع کر دیا ہے" اختر نے بوکھلائے انداز میں کہا۔

"اچانک نہیں رُدا لاہور میں ہے امی۔ رُدا لاہور میں ہے جلدی چلئے خُدا کے لئے کہیں وہ وہاں سے بھی نہ چلی جائے۔"

"کیسے پتہ چلا کہ وہ لاہور میں ہے؟"

"جی بس وہ آفندی صاحب سے گفتگو ہوئی تھی۔ اور..." یہی اندازہ قائم کیا جا سکا۔

"دیر لگا رہے ہیں آپ سب لوگ۔ لاہور کیسے جائیں گے بائی ایئر جائیں گے۔ ٹرین میں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ابّو... ابّو جلدی سے لاہور چلئے۔ جلدی سے لاہور چلئے" شناء چیختی ہوئی اندر کی طرف دوڑی۔

احسان احمد بھی اتفاق سے گھر ہی میں تھے اور ابھی کہیں نہیں گئے تھے۔ شناء تو نگاہوں سے غائب ہو گئی اور لوگ خالد سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ اختر اطمینان سے نُدرت کو بتا رہا تھا۔

"سمجھداری کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان اہم معاملات دوسروں کے سپرد کر دے۔ لوگ اپنے نمبر بنانے کے لئے کوششیں کرتے ہیں لیکن ذہانت سے کام نہیں لیتے۔ خالد صاحب کا خیال تھا کہ میں اپنی تحقیق کا انکشاف صرف نُدرت پر نہ کروں۔ وہ بھی شناء سے کچھ کہیں میں نے اُنہیں پورے پورے حقوق دے دیئے اور اب دیکھ لیجئے کس طرح

دوسروں کے ہاتھوں میں تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ نُدرت تھوڑا سا اور پیچھے آ جاؤ۔ کہیں وہ گھبرا کر میرا نام نہ لے دیں۔"

نُدرت بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ اُس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"تو تم لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ رُدا لاہور میں ہے؟"

"ظاہر ہے۔ اِس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں سوچی جا سکتی۔"

"اور تصور بیگ بھی اُسی کے ساتھ ہی ہے۔"

"خُدا کرے کہ ہو۔ ظاہر ہے رُدا کو کسی نگرانی کرنے والے کی ضرورت ہے۔"

"اختر صاحب پھر تو واقعی لاہور جانا ہی پڑے گا۔"

"تو جا رہے ہیں ناں۔ خالد صاحب نے یہ بات شناء کو بتا دی ہے کہ رُدا لاہور میں ہے اور اب شناء اندر آ گئی ہے۔ اب دیکھئے کون کون لاہور جاتا ہے؟"

"اگر جہاز سے گئے تو پورا طیارہ ہی چارٹر کرنا پڑے گا۔"

"ہوں! اِس بات کے امکانات تو ہیں اور شناء، ظاہر ہے ہوائی جہاز سے ہی جائیں گی۔ ٹرین سے سفر کیسے کر سکتی ہیں.. بھلا وہ، اور اچھا ہے نہ کریں ورنہ ٹرین میں جتنے بھی مسافر ہوں گے اُن کی بھی شامت آ جائے گی" اختر نے کہا اور نُدرت ہنسنے لگی۔ پھر اُس نے عجیب سی نگاہوں سے اختر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے چارے خالد بھائی کی مدد کرو۔ دیکھو ناں کس بوکھلاہٹ کا شکار نظر آ رہے ہیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بیویوں کے معاملات میں انسان کو اپنی مدد خود کرنی چاہئے۔ آؤ، ذرا اور پیچھے ہٹ جائیں" اختر نے کہا اور نُدرت کا ہاتھ پکڑ کر اور پیچھے گھسیٹنے لگا۔

"اے۔ اے اختر۔ کیا کر رہے ہو؟ پلیز اِس قدر بے تکلفی مناسب نہیں" نُدرت دانت پیس کر بولی تو اختر نے گھبرا کر نُدرت کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

باب

رُدا نے قریب پہنچ کر دیکھا۔ تصور بیگ اطمینان سے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے لیٹا تھا وہ اُسے گھورتی رہی اور اُس کے تن بدن میں چنگاریاں سی دوڑتی رہیں۔ پھر اُس نے پاؤں پٹخ کر زور سے کہا۔

"تم یہاں کیوں ہو؟" اور تصور بیگ اُچھل پڑا۔ اُس کے مُنہ سے گھبرائے ہوئے انداز میں نکلا۔

"ارے باپ رے۔"

"یہ کیا ہے؟" رُدا نے چائے کی پیالی کی طرف اُنگلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"چچ... چائے۔ بب... بخُدا چچ... چائے۔"

"کہاں سے آئی؟"

"سس... سامنے والے ہوٹل سے مم... میں کچن میں نہیں گھُسا تھا" تصور بیگ نے جواب دیا۔

"کیوں آئی یہاں سامنے والے ہوٹل سے؟"

"پپ... پینے کے لئے" تصور بیگ نے جواب دیا اور رُدا گہری گہری سانسیں لے کر اُسے گھورتی رہی۔

"میں نہیں سمجھتی تصور بیگ صاحب کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ آپ کوٹھی سے نکل گئے تھے، آپ یہاں کے لان پر موجود ہیں۔ اور اِس انداز میں کہ آپ باہر سے چائے لائے ہیں۔ میں کہتی ہوں آخر آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"اوہ۔ ذرا نرم پڑو تو کچھ بات بھی کروں۔ اِس طرح غرّا رہی ہو کہ شیرنی کا گمان ہوتا ہے" تصور بیگ نے کچھ بدلے ہوئے سے انداز میں کہا۔

"بے تکلفی میں بالکل پسند نہیں کرتی۔"

"اب کیا کروں خوف کی وجہ سے الفاظ پر قابو بھی نہیں رہا۔ رُدا صاحبہ معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟"

"آپ کو کیا کرنا ہے آخر؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟ یہی میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

"اگر یہ فیصلہ کر سکتا کہ میں کیا چاہتا ہوں تو آپ کو بتا نہ دیتا؟ ابھی فیصلے کر رہا ہوں۔ فیصلہ کر لوں گا تو بخُدا ضرور بتا دوں گا۔"

"دیکھو تصور بیگ، یہ بہت بُری بات ہے۔ ہم آپس میں ایک دوسرے کے شناسا ہوتے ہیں۔ فیصلے کرتے ہیں لیکن ہماری یہ شناسائی کس حد تک ہونی چاہئے؟ کسی کو اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ آپ یہ سب کر رہے ہیں تصور بیگ صاحب۔"

"مگر میں کیا کروں؟ آپ تنہا ہیں رُدا۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا آپ پریشان ہیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں ہونے دینا چاہتا آپ کو بھی ابھی فیصلے کرنے ہیں۔ اِس گھر میں آپ بالکل تنہا ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو چھوڑ دوں۔"

"میں یہاں پہلے بھی تنہا رہ چکی ہوں کوئی نئی بات نہیں ہے میرے لئے۔"

"اُس وقت صورتِ حال دوسری تھی۔"

"ہاں یہ بات آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں اُس وقت

صورتِ حال دوسری تھی۔ میں دوسروں کے سامنے رسوا نہیں ہوئی تھی میری اپنی ایک عزت تھی۔ اِس گھر میں کوئی دوسرا میرے معاملات کے بارے میں نہیں جانتا تھا اب آپ میرے بارے میں جانتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں بالکل بے سہارا ہوں اور ایک لڑکی کے بے سہارا ہونے سے فائدہ اُٹھانا ہی چاہیئے۔ آپ جانتے ہیں کہ میری مدد کے لئے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ ایک مرد ہیں مجھ سے طاقتور اور مجھ سے ہر وہ سلوک کر سکتے ہیں۔ جو آپ مجھ سے کرنا چاہیں۔ اِسی لئے آپ اِتنی ہٹ دھرمی سے میرے منع کرنے کے باوجود مجھ پر مسلط ہیں" رَدا نے کہا اور تصور بیگ عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"بلاشبہ انتہائی سخت ہیں۔ انتہائی سخت الفاظ ہیں۔ میرا خیال ہے آپ خود بھی اِس سے زیادہ سخت الفاظ کا انتخاب نہیں کر سکتیں۔ لیکن... لیکن مجھے بھی تو کوئی فیصلہ کرنے دیں۔ تھوڑا سا وقت تو اور دے دیں میں کم از کم اپنی غیرت کو آواز تو دے لوں رَدا صاحبہ"

"آپ کچھ بھی کہہ لیں جب ایک کام میں آپ کے ذریعے نہیں کرنا چاہتی تو آپ کیوں مجھ پر مسلط رہ کر مجھے اِس کے لئے مجبور کر رہے ہیں؟"

"بلاشبہ بات قابلِ غور ہے۔ لیکن اچھا ایک بات بتا دیجئے۔ لاہور میں تو رہ سکتا ہوں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میرا مطلب ہے، ہو سکتا ہے آپ کو... آپ کو لاہور میں میری ضرورت پیش آ جائے"

"تصور بیگ صاحب اگر بالکل ہی لاوارث ہو گئی بے سہارا رہ گئی تب بھی آپ سے درخواست نہیں کروں گی کہ آپ میری مدد کریں۔ اللہ کے واسطے اگر میں نے کبھی آپ کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی ہے تو اُسے مدِ نگاہ رکھتے ہوئے مجھ پر سے یہ عذاب ہٹا لیں مجھے اِس کے لئے مجبور نہ کریں کہ..." رَدا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بہت بُری ہیں آپ رَدا۔ بہت ہی بُری۔ کیا کہوں اب آپ سے۔ اب یُوں کریں تھوڑا سا موقعہ دے دیں مجھے سوچنے کے لئے شاید میں کل تک چلا جاؤں یہاں سے"

"آپ کو جانا ہے تصور بیگ صاحب۔ آپ لاہور میں رہیں یا کہیں بھی رہیں لیکن براہِ کرم میرے اِس مکان میں آپ کو نظر نہیں آنا چاہیئے"

"رَدا! میری وہ ڈائری واپس کر دیں گی؟"

"کون سی ڈائری؟"

"وہی جو آپ کے پاس محفوظ ہے"

"اُس ڈائری میں میری کہانی ہے"

"لیکن میں نے لکھی ہے"

"میں... میں آپ کو یہ موقعہ نہیں دے سکتی کہ آپ مجھے بلیک میل کریں"

"آپ بلیک میل نہیں ہو سکتیں رَدا۔ میری تحریر ہے میں تو کبھی سے دعویٰ بھی نہیں کر سکتا اُس کا"

"آپ اُسے میرے پاس کیوں نہیں رہنے دیتے؟"

"کیا کریں گی آپ! اُس میں میں نے غلطی سے چند اشعار لکھ دیئے تھے"

"آپ وہ اشعار والے صفحات پھاڑ لیں۔ وہ آپ کی ملکیت [illegible]"

"ہُوں، وہی دے دیجئے" تصور بیگ نے کہا۔ اور رَدا غصیلے انداز میں غراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

تصور بیگ اُسی جگہ کھڑا رہا تھا لیکن پھر جب رَدا واپس آئی تو تصور بیگ وہاں موجود نہیں تھا۔ رَدا نے ڈائری سے وہ اوراق پھاڑ لئے تھے اور پھر جب تصور بیگ وہاں موجود نہ ملا تو اُس نے اُن اوراق کے پُرزے پُرزے کر کے وہیں پھینک دیئے اور وہاں سے واپس مُڑ گئی۔ چائے کی پیالی بھی اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ ہانپتی کانپتی وہ اندر آ گئی۔ تیمور کمرے میں تنہا کھیل رہا تھا۔ رَدا اُسے دیکھتی رہی پھر دفعتاً ہی اُس کا دِل بھر آیا وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ نہ جانے کب تک وہ اِسی طرح روتی رہی۔ اور اب بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ بس دِل بھر آیا تھا اور آنسو تھے کہ اُمڈے ہی آ رہے تھے پھر جب دِل کا سارا غبار ڈھل گیا تو اُس نے باتھ رُوم میں جا کر چہرہ صاف کیا اور تیمور کے کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔ تیمور کو کھانا کھلانے کے بعد چائے پینے کے لئے اُس کا دِل چاہا تو وہ کچن میں پہنچ گئی۔ چائے بنائی اور ایک پیالی میں اُنڈیل لی۔ پیالی لے کر باہر نکل رہی تھی کہ دفعتاً ایک خیال اُس کے ذہن میں اُبھرا۔ زمین پر چائے کی پیالی رکھی ہُوئی تھی جو سامنے کے گندے سے ہوٹل سے لائی گئی تھی۔ ہاتھوں میں پکڑی ہُوئی چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں لرز گئی۔ چند لمحات تک دُھندلائی ہُوئی نگاہوں سے چائے کی پیالی سامنے رکھ کر اُسے گھورتی رہی، بڑی طلب سے چائے بنائی تھی لیکن اب اُس کا ایک گھونٹ لینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، چائے اُسی طرح رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی اور وہ کافی دیر تک بیٹھی خلاء میں گھورتی رہی۔

پھر تیمور ہی اُٹھ کر اُس کے پاس آ گیا تھا۔ اُس نے رَدا کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ اور رَدا چونک پڑی۔ اُس نے تیمور کو دیکھا اُٹھایا۔ اور سینے میں بھینچ لیا۔

"میری رُوح... میری زندگی بے شک دُنیا عجیب جگہ ہے۔ اور یہاں انسان بعض اوقات اپنی ذات سے نہیں دوسروں سے مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن میں نے تو اپنی زندگی تیرے لئے وقف کر دی ہے۔ میں امی کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں، میں... میں تجھے اپنی زندگی سے زیادہ چاہُوں گی۔ میں تیرے مستقبل پر قربان ہو جاؤں گی"

اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا، تیمور کو ساتھ لئے ہُوئے غسلخانے گئی۔ مُنہ ہاتھ دھویا۔ بال سنوارے اور پھر اُسے لئے ہُوئے ڈرائنگ رُوم میں آ بیٹھی۔ اب اُسے سنجیدگی سے آئندہ کے بارے میں سوچنا تھا۔ کراچی اِس پروگرام کے تحت گئی تھی وہ کہ تیمور کی پرورش کے لئے معقول بندوبست کرے گی۔ کوئی ملازمت کرے گی۔ اور ایک آیا رکھ لے گی۔ یہ ساری چیزیں سوچی تھیں اُس نے لیکن وہاں پہنچ کر کچھ ایسے حالات میں گِھر گئی کہ سب کچھ بھول گئی۔ پیسے اُس کے پاس کافی تھے۔ یہ مسئلہ نہیں تھا کہ اُسے کوئی مالی پریشانی ہوتی لیکن ذہنی پریشانی کافی تھی۔ وہ کسی قیمت پر آفندی صاحب کا احسان قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اِن لوگوں نے اُس کی ماں کے ساتھ شدید مظالم کئے اور بالآخر اُسے موت کی آغوش تک پہنچا دیا امی اِتنی جلدی نہ مرتیں اگر اُنہیں اپنی زندگی کی خوشیاں حاصل ہوتیں۔ اُن سے اُن کی خوشیاں چھین گئیں۔ اور اُنہیں مار دیا گیا۔ جو لوگ میری ماں کے قاتل ہیں اب میں اُن سے کوئی تعاون نہیں کر سکتی۔ خواہ اِس کے لئے مجھے کوئی بھی مجبور کرے۔ اُس نے دِل میں فیصلہ کر لیا کہ اب لاہور ہی میں رہے گی اور یہیں تیمور کے لئے کوئی مناسب بندوبست کرے گی۔ اپنے مشاغل کی اُسے کوئی فکر نہیں تھی ظاہر ہے کھانے پینے کا تو مسئلہ نہیں تھا اُس کا اپنا گھر تھا۔ اُس کے پاس کافی رقم موجود تھی ایک دو ماہ اگر اِس طرح بھی گزر جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھالنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنی چند دوستوں کو ٹٹولا جائے۔ زمانۂ طالب علمی میں بہت سی دوست تھیں اُس کی اور وہ اُن سے ملاقاتیں کرتی رہتی تھی حادثے کے تحت اُس نے اُن سب سے ملنا چھوڑ دیا تھا لیکن اب یہ ضروری تھا کہ اپنے مستقبل کے لئے ماضی کی اچھی ساتھیوں کو تلاش کیا جائے۔ اپنے بہت اچھے دوستوں کی فہرست اُس نے ذہن میں دُہرائی اور اُس کے بعد اُس نے فیصلہ کر لیا کہ آج تو نہیں لیکن کل گھر سے نکلے گی اور اُن سے ملاقات کی کوشش کرے گی اُنہیں بتا دے گی کہ صورتِ حال کیا ہے؟ یہ کوئی جُرم نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کی پرورش کر رہی تھی، بہت سے اِس بات سے واقف تھے۔

وہ نہ جانے کب تک اِنہی سوچوں میں گم رہی اور اُس کے بعد دوپہر ہو گئی۔ خود بھوک نہیں لگ رہی تھی طبیعت کے اندر ایک کڑواہٹ سی مسلسل موجود تھی لیکن تیمور کے لئے سب کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ اِس بار اُس نے کچن کا بغور جائزہ لیا اور ایک بار پھر دُکھوں میں گم ہو گئی۔ خیر دین یا تصور بیگ نے کچن کے لئے کافی سامان لا کر رکھا تھا۔ وہ اُس کے تصور کے ساتھ ہی ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو جاتی۔ بدن میں گرم گرم لہریں دوڑنے لگتیں۔ تصور بیگ نے اُس سے اظہارِ محبت کر دیا تھا لیکن یہ تصور بھی اُس کے لئے رُوح فرسا تھا کہ وہ کسی کو اپنی زندگی میں شامل کر لے کیا حالات نے اِس کی گنجائش چھوڑی ہے؟ کیا اِس دُنیا کے رہنے والے ثاقب نہیں ہوتے وہ سب... وہ سب صرف ثاقب ہوتے ہیں۔ کتنی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔ کتنی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ باپ بن کر بھی دھوکہ دیتے ہیں تو پھر کوئی اور رشتہ کیا معنی رکھتا ہے؟ نہیں، تصور بیگ اگر صرف ایک دوست ہوتا یا وہ سچ مچ خیر دین ہوتا تو وہ اُس کی محبتوں کو اُس کی وفاداریوں کو قبول کر لیتی۔ لیکن تصور نے اپنے دِل میں ایک اور ہی پودا اُگایا تھا۔ وہ اِس پودے کو پروان نہیں چڑھانا چاہتی تھی۔ یہ تو ساری زندگی کا مقصد ختم کر دینے والی بات تھی۔ اپنے آپ کو سمجھانے میں کچھ وقت تو ضرور لگا لیکن بالآخر وہ مطمئن ہو گئی۔ رات گزر گئی۔

دوسرے دِن بس یُونہی ایک تصور کے ساتھ تیمور کو گود میں لئے ہُوئے اُس طرف جا نکلی جہاں پچھلی صبح اچانک ہی تصور بیگ نظر آیا تھا اور عجیب سے شرارت آمیز مُوڈ میں نظر آیا تھا لیکن اِس وقت وہ جگہ خالی تھی۔ وہاں کوئی نشان نہیں مِلتا تھا اُس نے ایک گہری سانس لی اور پھر آہستہ سے بڑبڑائی۔

"اچھا ہُوا تصور بیگ تم نے حقیقتوں کو سمجھ لیا، یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے" دفعتاً ہی اُسے ایک خیال آیا کل اُس نے یہاں ڈائری کے اُن اوراق کے پُرزے پھینکے تھے وہ پُرزے یہیں بکھرے تھے۔ اور اُس کے بعد سے پھر کسی نے اُن کی صفائی نہیں کی تھی لیکن اِس وقت وہاں کاغذ کا کوئی ننھا سا پُرزہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اگر یہ پُرزے ہَوا سے اُڑ گئے ہوتے تو کہیں نہ کہیں اُن کا کوئی ٹکڑا گھاس میں پھنسا ہُوا نظر آ جاتا لیکن وہاں سفیدی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

اِس کا مقصد تھا کہ کسی نے اِن پُرزوں کو چُن لیا ہے اور یہ پُرزے چُننے والا تصوّر بیگ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟ رُدا کھوسی گئی۔ اور اُس کے کانوں میں تصوّر بیگ کی آواز اُبھرنے لگی۔

" تو آؤ کہ رازِ پنہانی، افشائے عقیدت کرتا ہُوں "

" نہیں تصوّر بیگ تم اِس راز کو اپنے سینے ہی میں چُھپا رہنے دو۔ میں دُنیا سے اِتنی بددِل ہوگئی ہُوں کہ اب اِس دُنیا کے رازوں سے مجھے کوئی دِلچسپی نہیں رہی ہے "

اُس نے واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے اور پھر طے کئے ہُوئے پروگرام کے تحت گھر سے نکل گئی۔ لباس وغیرہ تبدیل کر لیا تھا۔

وہ ایک پتے پر پہنچی۔ یہ ایک خوبصورت فلیٹ تھا اُس نے فلیٹ کی کال بیل دبائی اور چند لمحات کے بعد ایک معمّر خاتون نے دروازہ کھول دیا یہ معمّر خاتون رُدا کے لئے اجنبی تھیں۔ رُدا نے کہا۔

" زینت یہاں رہتی تھی کیا وہ یہاں موجود نہیں ہے؟"

" زینت۔ نہیں بیٹی اب وہ یہاں نہیں رہتی۔ وہ لوگ یہاں سے گلبرگ چلے گئے ہیں۔ میرے پاس تو اُن کا پتہ بھی نہیں ہے "

" اوہ۔ معاف کیجئے آپ یہاں رہتی ہیں؟"

" ہاں ہم نے یہ فلیٹ خرید لیا تھا "

" زحمت کے لئے معافی چاہتی ہُوں "

" نہیں کوئی بات نہیں ہے "

رُدا وہاں سے واپس پلٹ آئی تھی، پہلی ناکامی پر ایک لمحے کے لئے اُس کے دل پر ایک بوجھل سی کیفیت طاری ہُوئی تھی لیکن اُس کے بعد ایک اور دوست کی طرف اُس نے قدم بڑھا دیئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں پہنچ گئی۔ یہاں اُسے ناکامی نہیں ہُوئی تھی۔ شہناز اُس کی دوست اُسے مل گئی۔ شہناز نے رُدا کو دیکھا۔ اور ساکت رہ گئی۔

" رُدا تم ... " وہ متحیّرانہ انداز میں بولی۔

" کیوں، کیا تم نے میری موت کی خبر سُن لی تھی جو اِس طرح بھونچکی نظر آ رہی ہو؟"

" او مائی گاڈ۔ نہیں بھئی۔ آؤ اندر آؤ پلیز اِمر رآؤ " اُس نے رُدا کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ تیمور بھی رُدا کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا تھا۔ شہناز اُسے لئے ہُوئے اپنے ڈرائنگ رُوم میں پہنچ گئی۔

" رُدا ... رُدا کتنے عرصے کے بعد ملی ہو۔ ایسی گُم ہوگئی تھیں۔ جیسے کبھی شناسائی ہی نہیں تھی "

" تم سُناؤ کیا حال چال ہیں تمھارے، کیا کر رہی ہو آج کل؟"

" گھر پر ہُوں، کچھ بھی نہیں کر رہی۔ ڈیڈی نے مستقل یورپ میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے۔ ہم اہلِ خاندان یہیں رہتے ہیں "

" شادی ہُوئی تمھاری؟"

" نہیں بھئی کہاں۔ کچھ چکر چل رہے ہیں ویسے یار رُدا یہ چکر بڑا عجیب ہوتا ہے۔ ارے ہاں تمھاری شادی ہوگئی؟ کیا یہ حضرت؟" اُس نے تیمور کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

" کوئی حضرت نہیں ہیں یہ میرا بھائی ہے " رُدا نے جواب دیا۔

" اوہ سُوری رُدا۔ لیکن تمھاری امّی کا تو انتقال ہوگیا تھا۔ کسی نے بتایا تھا "

" ہاں، اِسی بھائی کی ولادت پر امّی کا انتقال ہُوا تھا "

" مُعاف کرنا رُدا کچھ ایسے حالات تھے کہ کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی "

" نہیں بھئی گزری ہُوئی گزر گئی۔ اب اِن باتوں میں کیا رکھا "

" تم لاہور سے کہیں چلی گئی تھیں؟"

" ہاں کچھ عرصے کے لئے کراچی چلی گئی تھی۔ اب لاہور واپس آ گئی ہُوں "

" بڑی خوشی ہُوئی میں دوسری سہیلیوں کو بھی اطلاع دے دُوں گی "

" زینت کہاں ہے اِن دِنوں؟"

" گلبرگ میں رہتی ہے۔ شادی ہوگئی ہے ناں اُس کی "

" اوہو۔ اچھا ... اچھا اور اُس کے والدین؟"

" شوہر صاحب گھر داماد ہیں۔ اُس کے گھر پر ہی رہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے زینت اپنے والدین کے ساتھ ہی رہتی ہے "

" چلو اچھا ہُوا۔ اُس کی خواہش پوری ہوگئی کہتی تھی ناں کہ شادی نہیں کرے گی کہ والدین سے جُدا ہونا پڑے " رُدا کی آواز ایک لمحے کے لئے لرز گئی۔ شہناز نے فوراً ہی اُس کے لئے کافی وغیرہ کا بندوبست کیا تھا۔ شہناز سے کافی دیر تک گفتگو رہی اور رُدا کی طبیعت کچھ بہل سی گئی۔

شہناز نے زبردستی اُسے دوپہر کے کھانے پر بھی روک لیا تھا اور رُدا اُس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ شہناز نے اُس سے پوچھا کہ اب وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟

" بھئی کراچی میں ملازمت کرتی رہی ہُوں اور اچھا خاصا تجربہ ہوگیا ہے مجھے نوکری کا، چنانچہ خیال ہے کہ لاہور میں بھی کسی فرم میں نوکری ہی کی کوشش کروں گی "

" نوکریاں ذرا مشکل ہی سے ملتی ہیں "

" بہرحال اب اتنی پریشانی بھی نہیں ہے کہ فوراً ہی نوکری ضرورت ہو "

" دیکھو۔ میں بھی کوشش کروں گی۔ ویسے رُدا تم اکیلی رہ سکو گی؟ میرا مطلب ہے کہ تمھیں کوئی دِقّت نہیں ہوگی؟"

" دِقّتیں تو ہوتی ہیں لیکن انسان کو اِن دِقّتوں سے نمٹنا ہی پڑتا ہے "

" تم کسی چیز کی فکر نہ کرنا۔ کوئی شئے درکار ہو میرا مطلب ہے کہیں بھی کوئی اُلجھن پیش آئے تو مجھ سے رجُوع کر لینا "

" ٹھیک ہے " رُدا نے جواب دیا۔

تقریباً تین ساڑھے تین بجے وہ واپس گھر آ گئی اور اُس کے بعد گھر کے وہی سنّاٹے۔ وہی ویرانے۔

رُدا نے اِن ویرانوں میں بیٹھ کر سوچا کہ زندگی کا باقاعدگی سے آغاز کرنے کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ اِس سلسلے میں اُس نے شہناز سے کچھ نہیں کہا تھا، بھول گئی تھی اُس وقت۔ لیکن اب اُس نے سوچا کہ فوری طور پر شہناز سے زینت سے اور دوسری دوستوں سے کہہ کر ایک آیا کا بندوبست کرنا چاہیئے جو اُس کے پیچھے گھر کے معاملات سنبھال سکے۔

اُس کے بعد وہ رات کو بیٹھ کر اپنے حسابات کا جائزہ لینے لگی تھی۔ زندگی کے معمُولات جاری رکھنے کے لئے دولت بھی ایک اہم حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ اُس کے پاس کتنی رقم موجود ہے کیونکہ اُسی کے حساب سے آگے بڑھنا تھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ اِس سلسلے میں اُسے کوئی دِقّت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ مطمئن ہوگئی لیکن اِس کے باوجود کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔

رات کو تیمور کو سینے سے لگا کر سو گئی۔ بہت عرصے سے رُدا اِس لمس سے محرُوم تھی۔ ثناء نے تیمور سے اِس محبّت کا آغاز کیا تھا کہ رُدا آہستہ آہستہ تیمور کی قربت بھول گئی تھی اور تیمور بھی ثناء کے ساتھ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مطمئن تھا۔ ویسے اِس بات پر حیرت تھی کہ تیمور نے یہاں آ کر کسی قِسم کی پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہاں وہ ثناء سے بہت مانوس تھا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا۔ ورنہ اُسے دِقّت ہوتی۔

تیسرا دِن بھی گزر گیا چوتھا اور پانچواں دِن بھی، اِس کے بعد تصوّر بیگ کی صُورت کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آئی تھی۔

چھٹا دن بھی بڑی ہنگامہ خیزیوں کا حامِل تھا رُدا نے کچن میں ناشتہ بنایا اور ناشتہ ٹرے میں سجا کر تیمور کے ساتھ آ بیٹھی کہ باہر کچھ آہٹیں سُنائی دیں۔ عجیب سی آہٹیں تھیں بہت سی انسانی آوازیں، رُدا بُری طرح چونک پڑی۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ وہ بے اختیار باہر نکل آئی۔ برآمدے میں پہنچی۔ باہر کا منظر دیکھا۔ اور دوسرے لمحے اُس کا دِل دھک سے رہ گیا۔

ثناء، نُدرت، خالدہ اختر، تنویر اقبال، عِصمت باجی سبھی لوگ موجود تھے، رُدا کو ایک لمحے کے لئے چکّر سا آ گیا تھا وہ ساکت و جامد کھڑی رہ گئی اور پھر جب اُس سے کھڑا نہ رہا جا سکا تو لڑکھڑاتی ہُوئی وہیں برآمدے میں بیٹھ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ گیٹ سے داخل ہونے والوں نے اُس پر چھلانگ لگا دی۔ اور تھوڑی دیر میں وہ سب رُدا کے گرد جمع ہوگئے۔ نُدرت نے رُدا کو بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔ عِصمت باجی اُسے سنبھالنے لگیں اور ثناء رُدا کو گھُورے جا رہی تھی اُس کی آنکھیں گہری سُرخ ہوگئیں پھر اُن سُرخ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عِصمت اور نُدرت نے سنبھال کر رُدا کو اندر لے جانا شرُوع کر دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ سب ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوگئے۔ رُدا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں ثناء کچھ نہ بولی۔ وہ خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ رُدا کو بٹھا دیا گیا اور اختر پانی کی تلاش میں دوڑ گیا۔ چند لمحات کے بعد رُدا کو پانی پلایا گیا۔ رُدا مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اور سب لوگ ساکت تھے۔ نہ جانے کیا کیا منصوبے بنا کر آئے تھے، کہ اُسے بُرا بھلا کہیں گے۔ اُس سے بہت کچھ کہیں گے۔ یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ کہیں کہیں یُوں نہ ہو کہ رُدا اپنے گھر میں موجود نہ ملے لیکن اُن لوگوں کو یہاں آتے ہی اِس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ گھر آباد ہے، اور دروازے کھُلے ہُوئے ہیں۔

رُدا کی حالت نے اُن سب کی زبانیں گنگ کر دی تھیں بمشکل تمام رُدا کو سنبھالا جا سکا۔ رُدا آہستہ آہستہ صوفے کی پُشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، پھر اُس کی نِگاہیں اُٹھیں۔ اُس نے دُھندلائی ہُوئی نِگاہوں سے سب دیکھا اور اُس کی نظریں ثناء کے چہرے کی جانب اُٹھ گئیں جو خاموش بیٹھی ہُوئی تھی سُرخ آنکھوں سے گرنے والے چمکدار آنسو مُسلسل بہہ رہے تھے۔ رُدا کو ایک دم شدید شرمندگی کا احساس ہُوا۔ اِس دوران تیمور ثناء کے پاس جا کھڑا ہُوا تھا۔ لیکن ثناء تیمور کی جانب متوجّہ نہیں ہُوئی تھی۔ وہ بس دونوں ہاتھ گود میں رکھے خاموش بیٹھی ہُوئی تھی۔

رُدا کی نِگاہیں اُس پر جمی رہیں۔ اُسے وہ لمحات یاد آ گئے تھے، جب ایک بار رُدا کو کسی نے کوئی الزام لگایا تھا ثناء نے خودکشی کی کوشش کر ڈالی تھی۔ رُدا کو ایک دم احساس ہُوا کہ واقعی ثناء کے ساتھ زیادتی ہُوئی ہے۔ اُس جیسی محبّت کرنے والی لڑکی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن رُدا نے اپنے جنون میں ثناء کو بھی نظرانداز

کر دیا تھا۔ اب ایک دم اُسے احساس ہُوا کہ شناء نے اُس کے گم ہو جانے پر کیا کیا کچھ نہ کیا ہو گا۔ اِن لوگوں کی باجماعت یہاں آمد اِسی بات کی مظہر تھی کہ شناء نے وہاں کسی کو سکون نہیں لینے دیا۔

رَدا کے ہاتھ بے اختیار مضطربانہ انداز میں اُٹھے اور شناء کی جانب بڑھے لیکن شناء پتھرائی ہُوئی بیٹھی رہی تب رَدا نے خود کو سنبھال کر گردن جھٹکی اور پھر اُٹھ کھڑی ہُوئی پھر وہ آہستہ آہستہ شناء کی جانب بڑھ گئی۔ شناء کے پاس بیٹھی ہُوئی تنویر نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر رَدا کو وہاں بیٹھنے کی جگہ دی اور رَدا نے شناء کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"شناء!" وہ رُندھی ہُوئی آواز میں بولی لیکن شناء نے کچھ نہیں کہا اُس نے اپنے ہاتھ بھی چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی بس وہ خاموش بیٹھی ہُوئی تھی البتہ رَدا نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ بے حد سرد ہو رہے تھے۔

"شناء! بہت ناراض ہو گی مجھ سے۔ مجھے احساس ہے" شناء پھر بھی کچھ نہ بولی بس اُس کی آنکھوں سے خاموشی سے آنسو بہتے رہے۔ اُس نے رَدا کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔

"شناء! میں تم سے بے حد شرمندہ ہُوں معاف کر دو گی مجھے، معاف کر سکتی ہو شناء" وہ پھر بولی لیکن شناء نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ رَدا اُس سے چمٹ گئی۔ لیکن شناء کا بدن اکڑا رہا تھا اُس نے رَدا کی جانب بالکل توجہ نہیں دی۔ رَدا کئی منٹ تک اُس سے لپٹی روتی رہی لیکن شناء نے اپنے رویے میں تبدیلی نہیں کی تھی اس کے بعد نُدرت نے رَدا کو شناء سے علیحدہ کیا اور پھر شناء سے بولی۔

"نہیں شناء! اِتنی سختی اچھی نہیں ہے۔ رَدا مل گئی تمہاری آرزو پوری ہو گئی۔ اب رَدا سے بات کرو۔ پُوچھو اِن سے کہ یہ اِس طرح ہم لوگوں کو غیر سمجھ کر یہاں کیوں آ گئیں؟ اِن سے پُوچھو کہ اِن کی دھیمی دھیمی مُسکراہٹ صرف ایک اخلاقی مُسکراہٹ تھی۔ اُس میں محبت کا کوئی پہلو نہیں تھا؟"

"نہیں نُدرت، خُدا کے لئے ایسا مت کہو" رَدا نے کہا۔

"شناء! تم بات کیوں نہیں کرتیں رَدا سے شناء، پلیز بات کرو" لیکن شناء نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس پر دیوانگی سی طاری تھی اور بس وہ بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ رَدا کی کسی حرکت پر اُس نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ایک بار رَدا نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"میری شناء، سچ بات ہے کہ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ کم از کم مجھے تجھے بتا کر آنا چاہیئے تھا لیکن شناء، شناء میں کیا بتاؤں، کیا بتاؤں تم لوگوں کو جاننا چاہتے ہو تو سُنو میرے بارے میں، جناب آفندی صاحب میرے نانا ہیں۔ میری ماں کے قاتل ہیں۔ ہاں

اُنھوں نے میری ماں کو سِسک سِسک کر مرنے پر مجبُور کر دیا تھا اور باپ ثاقب جس نے میری ماں کو بدترین دھوکہ دے کر زندگی کی تمام مسرتوں سے محرُوم کر دیا۔ میں وہ ہُوں جس نے اپنے باپ کے ہاتھوں دھوکہ کھایا ہے۔ یہ تیمور میرا بیٹا نہیں میرا بھائی ہے۔ میری ماں کے ساتھ ہونے والا ایک دھوکہ ہے۔ میں اِتنی اذیت زدہ ہُوں کہ اگر میری کہانی سُنو گی تو تمہاری آنکھیں آنسوؤں میں ڈُوب جائیں گی اِتنا برباد کیا گیا ہے مجھے کہ اُس کے بعد بربادی کا تصوّر ختم ہو گیا ہے۔ آفندی صاحب کے بارے میں مَیں اچھی طرح جانتی ہُوں کہ وہ اب اپنی بیٹی کی موت کے بعد مُجھ سے غمگساری کرنا چاہتے ہیں میں جانتی تھی کہ وہ آپ لوگوں کو مجبُور کر کے مجھے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ میں کسی قیمت نہیں چاہتی تھی میں بھی انسان ہُوں۔ میرے سینے میں بھی جذبات ہیں میں بھی دُکھوں بھری ہُوں۔ ایک ایک لمحہ میں نے موت کے ساتھ سفر کر کے گزارا ہے آپ لوگوں کو نہیں معلوم مُجھ پر یہ جنُون طاری ہو جانا ایک قُدرتی امر تھا۔ ہاں میں اِس بات کو تسلیم کرتی ہُوں کہ میں نے آپ جیسے محبت کرنے والوں کو اِس طرح چھوڑ کر غلطی کی لیکن میں جانتی تھی کہ اگر میں آپ سے رجُوع کرتی تو آپ مجھے سمجھاتے بلکہ آپ لوگ اِس بات کے لئے مجبُور کرتے مجھے کہ مَیں آفندی صاحب کو معاف کر دُوں اور ایک خوبصُورت زندگی اپناؤں۔ میں صِرف اِس لئے وہاں سے بھاگ آئی کہ میں یہ سب کچھ کسی قیمت پر نہیں کر سکتی تھی۔ میرے پاس، میرے دِل میں۔ میرے سینے میں وہ گنجائش ہی نہیں باقی رہی جس میں آفندی صاحب کے لئے درگُزر کرنے کا جذبہ ہو سمجھے۔ مجھے بھی مجبُور سمجھیں اور اگر اِس کے باوجود آپ لوگ مجھے اِتنا ہی بُرا سمجھتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں کیوں مُجھ سے اِتنی محبتوں کا اظہار کیا ہے آپ نے کہ کراچی سے یہاں تک سفر کیا ہے۔ میں اِس قابل نہیں ہُوں۔ میں جانتی ہُوں کہ میں اِس قابل نہیں ہُوں۔ سمجھے آپ لوگ۔ میں آپ کے معیار کی لڑکی نہیں ہُوں۔ میں ایک غیر معیاری شخصیت ہُوں۔ ایک نچلے درجے کی عورت سے آپ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اخلاقیات کے معیار پر پُوری اُترے گی تو یہ میرا قصور نہیں آپ کا ہے آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں جانتی ہُوں کہ بڑی کاوشیں کی ہوں گی آپ نے میری تلاش میں۔ لیکن یہاں آ کر آپ کو مایُوسی ہی ہو گی کیونکہ۔۔ کیونکہ میں وہ معیار پیش نہ کر سکوں گی جس کا تصوّر آپ نے مُجھ سے قائم کر لیا ہے۔

اور شناء! تم بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو صرف دولت کی

حیثیت سے بڑے باپ کی بیٹی نہیں بلکہ معیار کے لحاظ سے بھی۔ تمہیں مُجھ پر یہ فوقیت حاصِل ہے کہ تمہارا باپ ایک نیک نام شخص ہے۔ ایک ایسا شخص ہے جس نے محبتوں کے در کھول رکھے ہیں اور بہت سوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے اور میں اُس باپ کی بیٹی ہُوں جس نے صرف دھوکوں میں زندگی گزُاری ہے۔ میری ماں کو دھوکہ دیا۔ مجھے دھوکہ دیا اور۔۔ اور نہ جانے کِسے کِسے دھوکہ دیا۔ شناء! کیسے ہو سکتی ہُوں میں تمہاری ہم پلّہ تم خود بتاؤ۔ غلطی میری ہی نہیں تمہاری بھی ہے کہ تم نے ذات کو نہ جانے بُوجھے بغیر مجھے اپنے دِل میں اِس قدر جگہ دی۔ ہاں شناء اپنے سارے دروازے بند کر لو کہ میں اُن دروازوں کے قابل نہیں ہُوں۔ غلطی انسان سے ہی ہو جاتی ہے اور تم سے میرے بارے میں غلطی ہو گئی تھی۔ شناء۔ تیمور ہٹ جاؤ شناء کے پاس سے۔ تم گندی نالی کے کیڑے سے بہت بڑی جگہ جانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہٹ جاؤ تیمور یہاں سے۔ ہٹ جاؤ" رَدا نے تیمور کو پکڑا اور اُسے گھسیٹتی ہُوئی وہاں سے پیچھے لے گئی۔ وہ رونے لگا تھا۔

تمام لوگ سکتے کی سی کیفیت کا شکار ہو کر رَدا کو دیکھ رہے تھے، رَدا تیمور کو گھسیٹتی ہُوئی کمرے کے وسط میں لے گئی تھی۔ اُس پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ دانت ایک دوسرے پر مضبُوطی سے بھنچے ہُوئے تھے۔ بدن کانپ رہا تھا۔ آنکھیں گہری سُرخ ہو گئی تھیں۔ ہاتھوں کی مُٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اُس پر۔ اور تمام لوگ ہکا بکا اُسے دیکھ رہے تھے پھر دفعتاً ہی رَدا کی مٹھیاں کُھلیں اور وہ آنکھیں بند کر کے لہرانے لگی۔ اُس کے بعد فرش پر آ رہی۔ اقبال نے جلدی سے جھپٹا مار کر فرش پر گرنے سے روکا اور اپنے بازُوؤں میں سنبھال لیا۔ تمام ہی لوگ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ رَدا کو بمشکل تمام ایک صوفے پر لٹایا گیا اور سب بھاگ دوڑ کرنے لگے۔

شناء بدستور اپنی جگہ بیٹھی ہُوئی تھی۔ تیمور چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اور دوسرے لوگ رَدا کو ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہے تھے، پانی کے چھینٹے مارے گئے اور ہر وہ کوشش کی جانے لگی جس سے رَدا ہوش میں آ جائے۔ لیکن رَدا اب ساکت و جامد تھی البتہ اُس کا بدن پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

"میرا خیال ہے بستر پر لٹا دیا جائے۔ گہری بے ہوشی طاری ہو گئی ہے" خالد نے کہا اور پھر تمام لوگ رَدا کو سنبھالے ہُوئے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور اُسے ایک بستر پر لٹا کر تیز پنکھا کھول دیا گیا۔ ہر وہ کوشش کی جانے لگی جو ممکن ہو سکتی تھی لیکن رَدا ہوش میں نہ آئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب اُس کا پُورا لباس پسینے میں شرابور ہو گیا تھا اور چہرے پر ایک مُردنی سی طاری ہونے لگی تھی۔ اختر نے اُس کی اِس کیفیت کو دیکھتے ہُوئے خالد سے کہا۔

"میرا خیال ہے بھائی صاحب ڈاکٹر کو بُلانا ضروری ہے"

"ایں۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ لیکن ڈاکٹر۔۔" خالد نے بوکھلائے ہُوئے سے انداز میں کہا۔

"باہر نکل جایئے۔ آپ کو کسی نہ کسی ڈاکٹر سے پتہ مِل ہی جائے گا"

خالد اور اقبال دونوں باہر دوڑ گئے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے ہُوئے آگے بڑھتے رہے اور پھر اُن کی یہ مشکل فوراً ہی حل ہو گئی۔ سامنے ہی ایک اچھا خاصا کلینک نظر آ رہا تھا۔ وہ دوڑتے ہُوئے کلینک میں داخِل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔ اُنھیں صُورتِ حال بتائی گئی تو وہ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ اتفاق ہی تھا کہ کلینک میں زیادہ مریض نہیں تھے۔

وہ لوگ ڈاکٹر کو لئے ہُوئے مکان میں داخل ہو گئے اور پھر اُنھیں رَدا کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے رَدا کو دیکھا۔ اور اُس کا دیر تک معائنہ کرتے رہے پھر اُنھوں نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"کوئی شدید ذہنی شاک ہے۔ لیکن یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے، میری رائے ہے آپ اِنھیں فوراً اسپتال لے جایئے۔ میں اِس سِلسلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہُوں۔ ویسے فوری طور پر اِنھیں ایک انجکشن دے رہا ہُوں لیکن آپ میری بات پر پُورا یقین کیجئے کہ اِن کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ ذہنی شاک برین ہیمرج میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے"

تمام لوگ سناٹے میں رہ گئے تھے۔ شناء بھی وہیں موجود تھی۔ اُس نے وحشت زدہ نگاہوں سے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن رَدا کے لگا دیا تھا۔ اُس کے بعد اُس نے کاغذ پر کچھ لکھ کر اُن کے حوالے کر دیا اور ایک اچھے اسپتال کے لئے اُنھیں ہدایات دے دیں۔

فوری طور پر انتظامات کئے جانے لگے۔ ڈاکٹر تو چلا گیا تھا۔ لیکن تمام لوگ متفکر تھے۔ خالد اور اقبال ہی بھاگ دوڑ کرتے رہے اور تھوڑی دیر بعد رَدا کو اُس اسپتال لے جایا گیا جہاں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا تھا۔

ایمرجنسی کیس تھا۔ فوراً ہی دیکھ بھال کی گئی اور رَدا کو ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اور اُسے وہ امداد دی جانے لگی جو فوری طور پر اُس کے لئے بہتر ثابت ہو سکتی تھی۔ برین ہیمرج کا خطرہ ٹل جانے کا انتظار تھا۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر مریض کی حالت بہتر

ہوسکتی تھی ورنہ حالت بگڑ سکتی تھی۔

شناء بھی بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھی۔ اِس میں کوئی شک نہیں تھا کہ رِدا کو دیکھ کر اُس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اُس کے دِل میں شدید غصّے کا طوفان مچا تھا اور وہ اِس بات پر سخت چراغ پا تھی کہ رِدا نے اُس کا خیال بھی نہ کیا۔ اُس کی محبت کا بھی خیال نہ کیا۔ کم از کم وہاں سے آتے ہُوئے اُسے تو بتا دیتی۔ اُس نے سب کو ایک جیسا ہی سمجھا تھا۔ اِس احساس نے شناء کو مضمحل کر دیا تھا اور وہ اعصابی طور پر بالکل منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن اب رِدا کی اِس حالت نے اُسے بوکھلا دیا تھا۔ اور ڈاکٹر کے انکشاف نے تو درحقیقت اُس پر دیوانگی طاری کر دی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، تیمور کو اُس نے سینے سے لگا کر سنبھال لیا تھا۔ سب کے سب ہی اسپتال میں موجود تھے اور وہ ڈاکٹروں کی جان کھا رکھی تھی۔

تقریباً چھ گھنٹے تک وہ سب وہاں پر موجود رہے ... اور ڈاکٹروں سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے، چھ گھنٹے بعد ایک ڈاکٹر نے اُنھیں تسلّی بخش خبر سُنائی اور اُس نے کہا کہ مریضہ کو ہوش میں لے آیا گیا ہے اور یہی خطرے کے ٹل جانے کی علامت ہے، اُسے دس منٹ تک ہوش میں رکھا گیا ہے اور اُس کے بعد خواب آور انجکشن دے دیا گیا ہے اور اب وہ پُرسکون ہے۔

سب نے اطمینان کی گہری سانسیں لی تھیں۔ ڈاکٹروں نے اُنھیں بتایا تھا کہ ابھی اُس کا ہوش میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ وہی احساس دوبارہ اُس کے ذہن پر مسلط ہُوا تو دوسرا حملہ بھی ہوسکتا ہے۔ اِس لئے اُسے خوابیدہ ہی رکھا جائے گا، البتہ ڈاکٹر نے یہ کہا تھا کہ تیمارداری کے لئے ایک آدھ آدمی اُس کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ شناء نے کہا۔

"میں رہُوں گی اُس کے ساتھ۔"

"شناء تم؟"

"ہاں میں رہُوں گی۔ اور کسی سے کسی قسم کی ہدایات سُننے کی روادار نہیں ہُوں، سمجھے آپ لوگ؟"

"لیکن تیمور؟"

"تیمور کو عصمت باجی سنبھال لیں گی، بس کچھ بھی کہا جائے میں رِدا کے پاس رہُوں گی۔" شناء نے کہا اور سب خاموش ہوگئے، شناء کی ضد کے بارے میں سب ہی جانتے تھے۔ ابھی یہاں سے کسی کے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن گھر تو واپس جانا ہی تھا۔ سارے کے سارے تو اسپتال میں نہیں رہ سکتے تھے۔ آئے تھے یہاں رِدا کی تلاش میں۔ مداخل بھی گئی تھی لیکن اُس کے بعد جو کچھ ہُوا تھا وہ اُن سب کی توقع کے خلاف تھا۔

اُدھر شناء کی کیفیت پر بھی سب کو پریشانی تھی کہیں اُسے کچھ نہ ہوجائے۔ بس جنونی قسم کی لڑکی تھی جو کچھ بھی ذہن میں سما جائے اُسے کر ڈالنے کے چکّر میں رہتی تھی۔ خالد نے پیش کش کی کہ وہ بھی یہاں موجود رہے گا اور اِس سلسلے میں اُس نے ڈاکٹروں سے بات بھی کر لی تھی اُسے ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اُس طرح کمرے میں رہ سکتا ہے۔ خواتین کے ساتھ اُس کا رہنا مناسب نہ ہوگا۔ خالد نے کہا کہ وہ اِسی کمرے میں قیام کرے گا۔ البتہ اُس نے شناء سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں موجود ہے اور کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف یا ضرورت ہو تو اُس کے پاس شناء آ سکتی ہے۔ بالآخر تمام لوگ گھر واپس چلے گئے۔

رات ہوگئی تھی۔ اور چاروں طرف گہری خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ کبھی کبھی کسی طرف سے کوئی ہلکی سی آواز اُبھر آتی، اِس کے علاوہ مکمل طور پر خاموشی تھی۔

خالد اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا کہ دفعتاً اُسے دروازے کے باہر آہٹ سُنائی دی اور پھر شناء دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ خالد استقبالیہ انداز میں اُٹھ گیا تھا۔

"خیریت تو ہے شناء، سب ٹھیک ہے ناں؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" شناء ایک گہری سانس لے کر بولی۔ اور ایک جانب بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہاں آجاؤ۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہُوں!" خالد نے کہا۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہُوں۔" شناء نے مضمحل انداز میں کہا۔ خالد اُس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا چند لمحات خاموشی رہی پھر خالد بولا۔

"شناء! میرے خیال میں تمھیں خوش ہونا چاہیئے کہ رِدا یہاں مِل گئی اگر وہ دیوانگی کے عالم میں کہیں اور نِکل جاتی تو کیا ہوتا؟" شناء نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خالی خالی نِگاہوں سے خالد کو دیکھتی رہی۔ خالد نے پھر کہا۔

"اِس کے ساتھ ساتھ ہی میرے خیال میں رِدا کو اِس وقت ہمدردیوں کی ضرورت ہے۔ کسی بھی قسم کی سختی اُس کے لئے مناسب نہیں ہوگی۔ تم یہ اندازہ لگا سکتی ہو شناء کہ اُس پر کیا بیتی ہے! وہ انتہائی دِل برداشتہ ہو کر اور بدحواسی کے عالم میں کراچی سے یہاں آئی ہے۔ میرے خیال میں اُس کے ساتھ یہ سب کچھ مناسب نہیں تھا۔"

"ہاں... ہاں! قصور وار میں ہی ہُوں ناں! میں ہی قصور وار ہُوں ناں! میں نے... میں نے اُس کے ساتھ اِتنی ہی بُرائیاں کی ہیں کہ اُن کے نتیجے میں مجھے کوئی حیثیت نہیں ملنی چاہیئے تھی..."

شناء نے کہا۔

"نہیں شناء یہ بات نہیں ہے۔ میرے خیال میں رِدا کی یہ کیفیت اِسی بات کی غمّاز ہے کہ وہ تمھیں بہت زیادہ چاہتی ہے۔ شاید تمھیں اِس بات کا اندازہ نہ ہو۔ تم بھی بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھیں اُس وقت جب رِدا تم سے کہہ رہی تھی 'میری شناء مجھے معاف کر دو۔ میری شناء مجھے معاف کر دو۔' اُس وقت اُس کی جو حالت تھی شناء، میرا خیال ہے اگر تم کسی سے بھی پُوچھو گی تو وہ یہی بتائے گا کہ وہ بے حد شرمندہ تھی لیکن اپنے حالات سے مجبُور بھی۔"

"میں نے... میں نے اُسے اپنی زندگی سے زیادہ چاہا۔ میں نے اُسے اور تیمور کو اِتنا چاہا کہ اُس کے بعد چاہتوں کا تصور ہی ختم ہوجائے۔ لیکن اُس کے جواب میں کیا یہ لازم تھا کہ وہ... وہ مجھے بھی کچھ نہ بتاتی اور غیروں کی طرح وہاں سے چلی آتی؟"

"نہیں شناء! ذرا سا غور کرو تو تمھیں صُورتِ حال کا خود ہی اندازہ ہوجائے گا۔ اب تو اُس کی پوری کہانی ہمارے عِلم میں آچکی ہے۔ تم جانتی ہو شناء کہ وہ کرب کی کیسی کیسی منزلوں سے گزری ہے۔ ماں اُس کی ماں بے کسی سے مر گئی۔ ایک ایسی ماں جو بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اور اُس کی موت کا سبب اُس کا اوباش باپ تھا۔ تم اگر ٹھنڈے دِل سے غور کرو گی شناء، تو تمھیں اُس کے جذبات کا اندازہ ہوجائے گا۔ باپ نام کی گالی اُس کے نام سے منسلک ہے اور... اور ماں کی بے کسی کی موت اُس کے لئے باعثِ شرمندگی ہے وہ دونوں سمتوں کو کھوئے ہُوئے ہے اور تنہا اپنی ذات میں جی رہی ہے۔ اور پھر اُس کی ذمّہ داری تیمور، تم ذرا خود غور کرو ایک ایسی لڑکی جو خود بھی دُنیا سے بہت زیادہ واقف نہیں ہے۔ تم خود بتاؤ شناء اُس نے اپنے آپ کو کتنا ذلیل کر لیا تھا کس طرح گرا لیا تھا دُنیا کی نگاہوں میں۔ ایک ایسے بچّے کو وہ گود میں لئے پھر رہی تھی جو اُس کا اپنا نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو اُس کی ماں کہتی تھی۔ لوگوں کی مشتبہ نگاہوں کا کتنا سامنا کرنا پڑا ہوگا اُسے۔ لیکن یہ سب کچھ اُس نے اپنی تنہا ذات پر جھیلا۔ اُس کے سینے میں بہت سے غم ہیں شناء۔ اور ایک ایسی غم زدہ لڑکی جب ایک ایسی شخصیت کو اپنے سامنے پائے جو اُن تمام غموں کا باعث تھی تو اُس کی کیا کیفیت ہو جانی چاہیئے؟ نہیں شناء ایک انسان کی حیثیت سے میں دعوے سے یہ بات کہہ سکتا ہُوں کہ رِدا نے جو کچھ برداشت کیا وہ واقعی انسانی قوتوں سے باہر ہے۔ اور اُس نے جس پامردی سے اپنے آپ کو زندہ رکھا ہے شناء۔ یقین کرو بہت کم لوگ اِس طرح سے اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتے تھے۔ حالات کے ہاتھوں بھٹک کر خودکشی کرنے والوں کی خبریں تم اخبار میں پڑھتی رہی ہوگی۔ میرا خیال ہے اُن کے مسائل رِدا سے زیادہ نہ ہوتے ہوں گے۔ میرے تو ذہن میں یہی بات آتی ہے شناء۔ ویسے اگر تم اِس سے مختلف انداز میں سوچ رہی ہو۔ ظاہر ہے میں تمھاری سوچوں پر پابندی نہیں لگا سکتا۔" شناء خالد کو دیکھتی رہی گھورتی رہی اور پھر دفعتاً اُس کے چہرے میں تبدیلیاں رُونما ہُوئیں۔

"مجھے صرف مجھے بتا دیتی وہ۔" شناء سِسک کر بولی۔

"اپنی رُسوائیوں کی داستان کوئی کسی کو سُنانا بھی چاہے تو زبان لڑکھڑاتی ہے شناء۔"

"ہاں سچ ہے۔ ٹھیک ہے۔ مم... میں نے۔ میں... بس میں بھی تو۔ مجھے بھی تو غصّہ آگیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے اب تم اُسے ٹھیک کر سکتی ہو شناء۔ اور ابھی تو ہمیں بہت سے مشکل مراحل سے گزرنا ہے۔ یہ معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ رِدا ٹھیک ہو جائے لیکن اُس کے باوجود ہم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے احکامات پر عمل کرے گی اُسے یہاں سے لے جانا بہت مشکل کام ہوگا۔ میرے خیال میں اِس سلسلے میں اُسے زیادہ مجبُور مت کرنا۔ یہ کام ابّو اور چچا جان کے لئے چھوڑ دو۔" شناء نے کوئی جواب نہیں دیا پھر دفعتاً چونک کر بولی۔

"میں جاؤں، ہوسکتا ہے وہ جاگ جائے۔"

"کیسی کیفیت ہے؟"

"ہے تو ٹھیک، سو رہی ہے آرام سے کوئی جسمانی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اُسے کہیں بُخار وغیرہ نہ آجائے۔"

"بیٹھو اگر مناسب سمجھو تو؟"

"نہیں خالد پلیز! بس ایسے ہی دِل گھبرا رہا تھا تو اُٹھ کر یہاں نِکل آئی۔ اوکے۔ خُدا حافظ۔" شناء نے کہا اور کمرے سے باہر نِکل گئی۔ خالد مُسکراتی نِگاہوں سے اُسے جاتے دیکھ رہا تھا۔

رِدا کو نہ جانے کِس وقت ہوش آگیا۔ بلکہ وہ جاگ گئی کیونکہ بیہوشی تو ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق پہلے ہی ختم ہوگئی تھی اور وہ خطرے سے نِکل آئی تھی۔ اُس کے بعد ڈاکٹروں نے اُسے خواب آور انجکشن دیا تھا لیکن رات کا آخری پہر تھا جب رِدا جاگ گئی۔ کمرے میں مدّھم روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔ چاروں طرف ہُو کا سناٹا تھا بستر پر رِدا لیٹی چھت کو گھُورتی رہی۔ وہ اپنی یہاں موجودگی کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر رفتہ رفتہ اُسے تمام مناظر یاد آگئے۔ جب اُسے اچانک چکّر سا آگیا تھا۔ اُس نے ایک گہری سانس لی اور پھر حیران نگاہوں سے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگی اور پھر چند ہی لمحات میں اندازہ ہوگیا کہ یہ کسی اسپتال کا کمرہ ہے۔ اُس نے کہنی ٹکا کر کروٹ بدلی۔ اور دوسری سمت دیکھنے لگی تبھی اُس کی نگاہ

ایک سمت پڑ گئی۔ ایک چھوٹا سا دیوان پڑا ہوا تھا۔ جو کسی انسان کے دراز ہونے کے لئے ناکافی تھا اور اُس پر ایک انسانی وجود نظر آرہا تھا۔ آدھا زمین پر اور آدھا دیوان پر۔ لیکن جب اُس کا چہرہ رُدا کی نگاہوں میں واضح ہوا تو وہ تڑپ کر اُٹھ گئی۔ وہ ثناء تھی۔ رُدا نے متحیرانہ نگاہوں سے ثناء کو دیکھا۔ کمرے میں ثناء کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ رُدا بے چین ہو کر اپنے پلنگ سے نیچے اُتر آئی اور تیز رفتاری سے چلتی ہوئی ثناء کے پاس پہنچ گئی۔ اُس کے جسم میں کوئی کمزوری وغیرہ نہیں تھی ظاہر ہے کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ بس ایک ذہنی جھٹکا لگا تھا اُسے اور وہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش و حواس سے عاری ہو گئی تھی۔ ثناء کے قریب پہنچ کر وہ جھکی اور دوسرے لمحے اُس کے ذہن کو ایک دھکا سا لگا۔ ثناء کا چہرہ کتنا اُتر گیا تھا بکھرے ہوئے بال پیشانی پر چپکے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے نظر آرہے تھے اور حسین، معصوم اور پُرکشش چہرے پر ہلکی سی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ لباس بے ترتیب تھا اور انتہائی بے ترتیبی سے وہ آدھی زمین اور آدھی دیوان پر پڑی ہوئی تھی۔ رُدا بے اختیار جھکی۔

اور اُس نے ثناء کی پیشانی سے بال ہٹانے شروع کر دیئے تبھی اُسے اندازہ ہوا کہ ثناء کو اچھا خاصا تیز بخار ہے۔ رُدا بدحواس سی ہو گئی۔ اُس نے ثناء کی گردن کے پیچھے ایک ہاتھ ڈالا اور دوسرا ہاتھ اُس کی کمر کے نیچے اور پھر اُسے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگی چند لمحات کے بعد وہ اِس کوشش میں کامیاب ہو گئی لیکن دیوان پر ثناء کو لٹائے رکھنا مناسب نہیں تھا چنانچہ اُس نے بڑی ہمت کر کے ثناء کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اُسے سنبھالے ہوئے بستر کے قریب پہنچ گئی۔ پتہ نہیں بخار کی وجہ سے ثناء اپنے حواس کھو بیٹھی تھی یا پھر یہ گہری نیند تھی۔ ویسے ثناء تھی تو گہری نیند سونے کی عادی اور اکثر ایسے لمحات پیش آئے تھے جب نیند کے عالم میں اُس سے کوئی کام لینا چاہا گیا اور وہ کسی طور ممکن نہ ہوا۔ بہر طور اُس نے ثناء کو کسی نہ کسی طرح اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور بدحواس نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ پنکھا دیکھا۔ پنکھا خاصا تیز تھا اور ہوا پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے جا کر پنکھا آہستہ کیا کیونکہ ثناء کو تیز بخار تھا اور تیز ہوا ثناء کے لئے نقصان دہ بھی ہو سکتی تھی وہ پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کیا کرنا چاہیئے۔ حالات اُس کے ذہن میں واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اُس کے اچانک بے ہوش ہو جانے سے سب لوگ تشویش کا شکار ہو گئے ہوں گے اور اُسے اسپتال لے آیا گیا اور ثناء اُس کی تیمارداری کے لئے یہاں موجود تھی۔ رُدا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اُس کے مُنہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

"میں تجھے اِس محبت کے جواب میں کیا دے سکوں گی؟ کچھ بھی تو نہ دے سکوں گی میں۔ ہے کیا میرے پاس؟ میں تو ایک لٹی ہوئی شخصیت ہوں۔ تم مجھ سے اِتنی محبت کیوں کرتی ہو پاگل؟ انسانوں کو انسانوں کے لئے اِتنا پریشان نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ... کیونکہ حالات بعض اوقات اِس طرح مجبور کر دیتے ہیں کہ محبتوں کا جواب محبتوں سے دینے کی اجازت ہی نہیں دیتے" رُدا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔ وہ ثناء کے سرہانے بیٹھ کر اُس کے بال سنوارنے لگی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ باہر پھیلے ہوئے سناٹے اور خاموشی سے اُس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ رات کافی گزر چکی ہے۔ اِس وقت کسی سے رابطہ کیا ممکن ہے؟ پھر کافی دیر اسی طرح گزر گئی اور کمرے کی عقبی کھڑکی سے اُجالا جھانکنے لگا۔ غالباً صبح کے ساڑھے چھ یا پونے سات بجے ہوں گے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اور خالد ایک عمر رسیدہ نرس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ خالد صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے آیا اور نرس مریض کا ٹمپریچر وغیرہ لینے کے لئے۔ دونوں اندر داخل ہو کر بیڈ کے قریب پہنچ گئے لیکن خالد نے یہ اُلٹی صورتِ حال دیکھی تو بوکھلا کر رہ گیا۔ ثناء بستر پر تھی اور رُدا اُس کی تیمارداری کر رہی تھی جب کہ معاملہ بالکل ہی اُلٹا تھا۔ وہ کچھ بول بھی نہ پایا تھا کہ نرس نے رُدا سے پوچھا۔

"رات بھر مریض کی کیسی کیفیت رہی؟"

"تیز بخار ہے" رُدا نے جواب دیا اور نرس ثناء کا ٹمپریچر لینے لگی جب اُس نے ثناء کے مُنہ میں تھرمامیٹر رکھا تو ثناء نے آنکھیں کھول دیں۔ نرس نے بڑے اطمینان سے اُس کا ٹمپریچر لیا۔ خالد پریشان نگاہوں سے اِس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مُنہ کھولا تو نرس کہنے لگی۔

"بخار زیادہ نہیں ہے۔ اِس وقت تو صرف ایک سو ایک ہے"

"لیکن نن... نرس کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے" خالد بولا۔

"کیا ہوا جی؟" نرس نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مریض بدل گیا ہے" خالد بولا اور بے اختیار ہنس پڑا۔

"مذاق کر رہے ہو جی، ہم کوئی مذاق کرنے کے قابل ہیں" نرس بُرا مان کر بولی۔

"نہیں نرس پلیز سُنیئے تو سہی۔ مریض دراصل یہ ہیں کچھ گھپلا ہو گیا۔ رُدا کیا ہے بھئی یہ؟" خالد نے رُدا سے کہا۔ نرس غصیلی نگاہوں سے خالد کو دیکھنے لگی تھی۔

"آپ کیا کہہ رہے ہو جی ہماری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا"

"سسٹر اصل مریض یہ ہیں۔ آپ براہ کرم انہیں دیکھئے"

"کیوں جی؟" نرس نے خالد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اوہ... رُدا پلیز براہِ کرم آپ خود ہی بتائیں"

رُدا بھی مُسکرا دی تھی۔ ثناء حیرت سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے ایک دم اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے رُدا تم بیٹھی ہو سسٹر اصل مریض یہ ہیں"

"دیکھو جی بات سُنو۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ ہم یہاں ڈیوٹی دینے آتے ہیں ہنسی مذاق کرنے نہیں" نرس نے کہا۔

"مگر سسٹر آپ یہ بات کیوں نہیں مان رہیں کہ اصل مریض یہ ہیں" خالد نے کہا۔

"لو جی کیسے مان لیں؟ بستر پر وہ لیٹی ہوئی ہیں۔ اور یہ تیمارداری کر رہی ہیں اور آپ کہہ رہے ہو کہ اصل مریض یہ ہیں"

"ہوں! اب آپ کی مرضی ہے جسے اصل مریض سمجھ لیں۔ ویسے یہ گڑبڑ گھٹالا کچھ سمجھ میں نہیں آیا"

"ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں آجائے گا جی۔ ہم چلتے ہیں۔ دوسرے مریضوں کو بھی دیکھنا ہے" نرس غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ خالد حیرانی سے اِن دونوں کو دیکھ رہا تھا تب رُدا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دلچسپ لطیفہ ہوا ہے یہ۔ ثناء وہاں دیوان پر لیٹی تھیں۔ انہیں بخار آگیا ہے۔ میں جاگی۔ اور انہیں دیکھا تو بستر پر لا کر لٹا دیا"

"ہوں! یہاں ایک دوسرے کے لئے آپ ایثار کر رہی ہیں۔ اور وہاں باہر نرس جا کر اچھا خاصا جھگڑا کھڑا کر دے گی"

"تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں لیٹ جاتی ہوں بستر پر لیکن پہلے ثناء کو دوا دلوائیے۔ انہیں بخار آگیا ہے"

"میں لعنت بھیجتی ہوں دوا پر۔ بالکل نہیں لوں گی کوئی دوا۔ خبردار اگر ڈاکٹر سے کسی نے میرے بخار کے بارے میں کچھ کہا" ثناء نے غصیلے لہجے میں کہا اور رُدا ہنس پڑی۔

"کمال ہے بھئی" اُس نے کہا۔

"یہ تم نے مجھے بستر پر کیسے لٹایا؟"

"کیوں؟"

"کیسے لٹایا میں سوال کر رہی ہوں" ثناء غرائی۔

"ہوں! اور اگر تمہیں خود کچھ ہو جاتا تو؟"

"اوہ... نہیں ثناء میں تو ٹھیک ہوں۔ دیکھ لو مجھے کچھ نہیں ہوا"
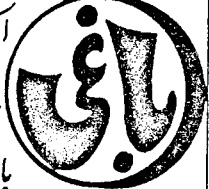
چند ہی لمحات کے بعد ڈاکٹر اُسی نرس کے ساتھ اندر داخل ہُوا۔ نوجوان ڈاکٹر تھا۔ رُدا کو دیکھ کر بولا۔

"بی بی یہ نرس کچھ کہہ رہی ہیں، آپ دونوں میں سے مریض کون ہے؟"

"اِس وقت تو ہم دونوں ہی ہیں ڈاکٹر، میں تو وہ ہُوں جو یہاں علاج کے لئے آئی تھی۔ یہ میری تیمار دار ہیں لیکن انھیں بھی بُخار آگیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ سسٹر نے اِنھیں بستر پر لیٹے ہُوئے دیکھ لیا۔"

ڈاکٹر بھی ہنسنے لگا تھا۔ اُس نے ثناء کو دیکھتے ہُوئے کہا "آپ کا ٹمپریچر لے لُوں کوئی حرج تو نہیں ہے۔"

"میں ٹھیک ہُوں ڈاکٹر کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔"

"پھر بھی پلیز ایک دوا لے لیجئے۔ اور آپ کیسی ہیں" اُس نے رُدا کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ڈاکٹر اب تو بالکل ٹھیک ہُوں۔" ڈاکٹر نے رُدا کا معائنہ کیا۔ اور اُس کے بعد ہنستا ہُوا نرس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ خالد بھی ہنسنے لگا تھا پھر اُس نے ثناء سے کہا۔

"مجھے کیا کرنا چاہیئے اب؟"

"کچھ نہیں بس یہ معلوم کرنا ہے کہ رُدا کو یہاں سے کب چُھٹی مل جائے گی؟"

"بھئی میں ٹھیک ہُوں۔ چُھٹی ملے یا نہ ملے جانا تو ضروری ہے، تیمور کہاں ہے ثناء؟"

"وہاں موجود ہے۔ عصمت باجی اُس کی نگرانی کر رہی ہیں۔" ثناء نے جواب دیا اور رُدا چونک کر ثناء کو دیکھنے لگی۔ ثناء کا لہجہ اس وقت بدلا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ رُدا کی آنکھوں میں مُسکراہٹ آگئی اور اُس نے ثناء کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہُوئے کہا۔

"میرے سینے سے نہیں لگوگی ثناء؟"

"نہیں ہرگز نہیں" ثناء نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"بس میری مرضی" ثناء بولی اور رُدا ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئی۔

"اے۔۔ اے ثناء کیا آپ پھر۔۔۔ آپ پھر۔۔"

"لو بھئی کمال ہے۔ یعنی اگر غُصّے کا اظہار کرو تو محترمہ ناخوش ہو جاتی ہیں۔ چلو ٹھیک ہے ہم بھی مُسلمان ہیں، گلے مل لیتے ہیں۔" ثناء نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ رُدا نے آگے بڑھ کر اُس کو آغوش میں لے لیا تھا۔ ثناء اُس کے سینے سے لگی رہی پھر کہنے لگی۔

"تمھیں اِس طرح نہیں آنا چاہیئے تھا رُدا، میں۔۔۔ میں آ تمھاری اپنی ہُوں ناں۔ کسی کو نہ بتاتیں۔ مجھے بتا دیتیں، بس مجھے بتا دیتیں۔"

رُدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خالد کہنے لگا "اب یہ ڈرامہ ختم کیا جائے تو نوازش ہوگی۔ بور ہو چُکا ہُوں اِس سے۔"

"تو آپ سے کہہ کون رہا ہے کہ آپ اِس ڈرامے میں شریک ہوں" ثناء نے کہا اور خالد ایک گہری سانس لے کر ہنسنے لگا۔

"دیکھا آپ نے رُدا صاحبہ، ویسے محترمہ بس کیا کہوں کچھ کہہ دُوں گا تو ناراض ہو جائیں گی۔ چلتا ہُوں" خالد دروازے کی طرف بڑھا تو رُدا جلدی سے بولی۔

"ارے۔۔۔ ارے خالد بُرا مان گئے، واپس آؤ بھئی۔ کیا تماشہ ہو رہا ہے یہاں اسپتال میں!"

"جی نہیں۔ اب ہم اِتنے گئے گُزرے بھی نہیں ہیں کہ ہمیں دُھتکار دیا جائے اور ہم بیٹھیں رہیں۔"

"میں نے کب دُھتکارا ہے؟" ثناء غصیلے انداز میں بولی۔

"بھائی میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا۔"

"ہاں ابھی سے اِس کی ابتداء نہ کرو خالد" رُدا معنی خیز لہجے میں بولی۔ اُسی وقت باہر شور سُنائی دیا۔ کئی آوازیں تھیں۔ اور آنے والے اُن کے علاوہ اور کوئی نہ تھے۔ سب ہی آگئے تھے۔ تیمور عصمت کی گود میں تھا۔ تنویر اور اقبال ساتھ تھے ندرت اور اختر ساتھ تھے۔ بہرطور یہ سب کے سب بھرّا مار کر اندر داخل ہوگئے اور رُدا کو دیکھ کر سبھی خوش ہوگئے۔ اختر نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ہُوں! تو اصل معاملہ یہ تھا۔ بھائی یہ دُنیا بڑی چالاک ہے۔ لوگ کیسے کیسے بہانے بنا کر اپنا معاملہ سیدھا کرتے ہیں۔ رُدا صاحبہ نے سوچا کہ یہ غولِ بیابانی آگیا ہے تو اِس سے چھٹکارے کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا شاندار چال چلی اُنھوں نے۔ دیکھا آپ حضرات نے" اختر نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو تمھارا کیا خیال تھا۔ وہ بیمار ہی پڑی رہتیں کیا؟" ثناء نے کہا۔

"حیرت۔۔۔ حیرت۔۔۔ حیرت صاحبو! حیرت۔ یعنی ہو۔۔۔ ہو ہو۔ اصل مسئلہ یہ تھا۔ بھئی رُدا صاحبہ مان گئے آپ کو۔ واقعی ثناء صاحبہ آسانی سے ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ آپ نے اِنھیں منانے کا صحیح طریقہ دریافت کرلیا۔ بھئی واہ اُستاد بنانا پڑے گا اب تو آپ کو" خالد نے کہا "حضرات اِس سے زیادہ دلچسپ واقعہ میں آپ

کو سُنا سکتا ہُوں۔ بشرطیکہ آپ مجھے بتائیں کہ صبح کے ناشتے کا کیا بندوبست ہے؟"

"ناشتہ حاضر ہے واقعہ گو۔ بہت عُمدہ بندوبست کیا گیا ہے اور اب لُطف آئے گا پکنک کا سا اسپتال کے اِس کمرے میں۔"

"ڈاکٹر ڈنڈے مار کر سب کو باہر نکال دے گا۔"

"ارے تو کیا کوئی ناشتہ بھی نہ کرے۔ ہم لوگ تو بس مُنہ دھو کر چل پڑے ہیں۔ چائے تک نہیں پی۔ ارے بھئی اقبال جلدی کرو ناشتے کا بندوبست کرو۔"

"یہیں؟" اقبال نے سوال کیا۔

"تو پھر اور کہاں؟" اختر آنکھیں نکال کر بولا اور اقبال مُسکراتا ہُوا باہر نکل گیا۔

"ہاں تو وہ واقعہ کیا تھا؟" اختر نے خالد سے پُوچھا اور خالد اِس دلچسپ واقعے کی تفصیلات بتانے لگا جس میں مریض بدل گیا تھا اور نرس پریشان ہُوئی تھی۔ سب لوگوں کے قہقہے کمرے میں گُونجے تو ایک ڈاکٹر اندر گُھس آیا۔ خوش اخلاق آدمی تھا اور پھر کمرہ بھی وہ تھا جو عام لوگوں کے لئے نہیں ہوتا چنانچہ ڈاکٹر کو اپنا اخلاق قائم رکھنا پڑا۔

"حضرات کیا کیفیت ہے مریض کی؟ اور کون ہے مریض ذرا مجھے معلومات حاصل ہو جائیں تو بہتر ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب ہم لوگ تو یہاں پکنک منانے آئے تھے آپ بھی ہمارے ساتھ پکنک میں شریک ہونا چاہیں تو شریک ہو جائیں ہمیں بے حد خوشی ہوگی۔"

"اچھا اسپاٹ منتخب کیا آپ نے۔ لیکن ایک درخواست مان لیں تو عنایت ہوگی۔"

"ٹھہر جایئے۔ ابھی سے درخواستیں نہ کریں ہو سکتا ہے کہ آپ کی اُس درخواست میں کوئی تلخی چُھپی ہُوئی ہو۔ ابھی یہاں عُمدہ قسم کا ناشتہ آ رہا ہے اور آپ ہمارے ساتھ اِس ناشتے میں شرکت کریں گے۔"

ڈاکٹر ہنسنے لگا پھر آہستہ سے بولا "بہتر ہے آپ ناشتے کی رشوت دے رہے ہیں تو ہم بھی خاموش ہُوئے جاتے ہیں ویسے ہم یہ عرض کرنا چاہتے تھے ذرا یہ قہقہہ بازی کم ہو جائے تو اچھا ہے!"

"نہیں ڈاکٹر ایک شرط مان لیں آپ ہماری واقعہ سُن لیں پُورا اُس کے بعد اگر آپ نہ ہنسے تو ہم بھی خاموش ہو جائیں گے۔"

"کیا واقعہ ہے؟" ڈاکٹر نے پُوچھا اور اختر اُسے تفصیل بتانے لگا۔ ڈاکٹر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اِتنی دیر میں اقبال ناشتے کے بنڈل اُٹھائے ہُوئے اندر داخل ہوگیا اور اُس نے وہ بنڈل زمین پر رکھ دیئے اور کافی کے دو بڑے تھرماس تھے اور کپ بھی تھے۔

"شکریہ اقبال صاحب شکریہ۔ آیئے ڈاکٹر صاحب پلیز ہمارے ساتھ کافی پی لیجئے" ڈاکٹر اُن کے ساتھ کافی میں شریک ہوگیا تھا پھر اُس نے رُدا سے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کا معائنہ کرلُوں؟"

"آپ اپنا فرض ضرور پُورا کرلیجئے ڈاکٹر۔ اب میں بالکل ٹھیک ہُوں اور یہاں سے جانا چاہتی ہُوں۔"

"بہت بہتر تو پھر براہِ کرم" ڈاکٹر نے رُدا کو دیکھا۔ اور پھر مطمئن انداز میں بولا۔

"خُدا کے فضل سے آپ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"اختر تم ضروری کارروائیاں کرکے گھر واپس پہنچو۔ ہم لوگ چلتے ہیں" رُدا نے کہا۔

ناشتہ ختم ہو چُکا تھا۔ بہرطور کوئی خاص دِقت نہ ہُوئی اور اُس کے بعد یہ قافلہ رُدا کے گھر کی جانب واپس چل پڑا۔ بڑی عجیب اور دلچسپ صُورت حال تھی۔ رُدا سخت بیمار ہُوئی تھی۔ اور ایک ہی رات میں صحتیاب ہوکر واپس آگئی تھی۔ ثناء کو ہلکا ہلکا بُخار اب بھی تھا لیکن یہ صرف ذہنی تھکن کی وجہ سے تھا اور اُس کے لئے دوا لے لی گئی تھی۔ تمام لوگ رُدا کے پورے گھر پر قابض ہوگئے تھے۔ کسی نے رُدا سے یہ نہ پُوچھا کہ کونسی چیز کہاں ہے؛ ندرت، عصمت اور تنویر نے کچن سنبھال لیا۔ خالد، اختر اور اقبال بیرُونی کاموں میں مصرُوف ہوگئے۔ رُدا کو اُنھوں نے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا اور رُدا عجیب سی نِگاہوں سے اِن سب کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات آ رہے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھایا گیا اور اُس کے بعد شام کو یہ طے کیا جانے لگا کہ دوسرے دن لاہور کے کون کون سے مقامات کی سیر کی جائے گی۔ کسی نے رُدا سے سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہی نہیں کی تھی اور اِس سلسلے میں اُن سب کے درمیان منصوبہ بندی ہوگئی تھی دوسرے دِن واقعی پکنک کا پروگرام بنا لیا گیا۔ راوی کنارے پہنچ کر کیمپ لگا لیا گیا اور اُس کے بعد راوی میں کشتی رانی کی گئی۔ پُورا دِن اِسی کشتی رانی کی نظر ہوگیا تھا۔ ثناء کا بُخار بھی اُتر گیا تھا۔ اور رُدا بالکل نارمل تھی لیکن اُس کی پیشانی پر درد کی ایک لکیر ضرور دیکھی جا رہی تھی جب کہ باقی لوگوں میں سے کسی نے اِس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ ہاں اِس دوران تصور بیگ کے بارے میں کچھ گفتگو ضرور ہُوئی تھی۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ شاید تصور بیگ رُدا کے ساتھ

ہی آگیا ہے۔ لیکن چونکہ یہاں اُسے نہیں پایا گیا تھا اِس لئے کسی نے اُس کے بارے رُدا سے سوال بھی نہیں کیا کیونکہ یہ صُورتِ حال کچھ معیوب سی محسوس کی گئی تھی، بہرحال یہ تفریحی دِن گزر گیا۔ شام کو رُدا خاصی بہتر حالت میں تھی۔ اِس رات بھی کسی نے اِس موضوع پر گفتگو نہ کی لیکن درپردہ کارروائیاں جاری تھیں اور احسان احمد اور عادل حسین کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ رُدا موجود ہے چنانچہ آج ہی شام چار بجے اُن لوگوں کو یہاں پہنچنا تھا اور اس کام کے لئے اختر ائیرپورٹ چلا گیا۔ وہ اُن لوگوں کو ساتھ لے کر رُدا کے گھر آگیا تھا۔ رُدا کو اِس بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا اِن دونوں کی شکلیں دیکھ کر رُدا ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ عادل حسین اور جناب احسان احمد نے آگے بڑھ کر رُدا کو سینے سے لگالیا۔ انھوں نے اُس سے کوئی شکایت نہیں کی تھی لیکن رُدا خود ہی شرمندہ نظر آرہی تھی۔

"میں نے آپ لوگوں کو کتنا پریشان کیا ہے۔ میں... میں شاید کبھی اِس کا اِزالہ نہ کر سکوں"

"ارے نہیں بیٹی ہوتا ہے بعض اوقات بچے کوئی ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ بزرگوں کو پریشان ہونا ہی پڑتا ہے، بہرطور کوئی بات نہیں۔ اچھا ہے تمھاری وجہ سے لاہور کا ایک چکر لگ گیا ورنہ ہم لوگ تو سوچتے ہی رہ جاتے ہیں" احسان احمد نے کہا اور رُدا سر جھکا کر خاموش ہوگئی۔

رات کے کھانے پر بھی اِس موضوع پر کوئی گفتگو نہ چھیڑی گئی۔ دوسرے دن صبح کا ناشتہ بڑے اہتمام سے کیا گیا۔ کون کیا کر رہا تھا اور یہ سب کہاں سے ہو رہا تھا، رُدا کو کچھ نہیں معلوم تھا لیکن وہ بڑی اُلجھی اُلجھی سی تھی۔ اِس دوران تنہائی میں وہ یہ سوچ چکی تھی کہ اِن سب کی یہ آمد ظاہر ہے کس وجہ سے ہے اور اس سلسلے میں اُسے کیا کرنا چاہئے، اُسی دِن دوپہر کو یہ موضوع چھیڑ دیا گیا اور اِس کی محرک بھی ثناء ہی تھی۔

"ڈیڈی لاہور کا پروگرام کتنے عرصے کا ہے ہمارا" اُس نے احسان احمد سے پُوچھا۔

"بھئی جتنے عرصے رُدا ہمیں روکے گی" احسان احمد نے جواب دیا۔

"کیوں بھئی آپ کتنی دیر میں واپسی کا پروگرام بنا سکتی ہیں؟" رُدا نے سنجیدہ نِگاہوں سے اُن سب کو دیکھا اور پھر خاموش ہوگئی۔

"اگر آپ لوگ اجازت دیں تو اِس موضوع پر میں رُدا سے گفتگو کر لوں؟"

"انکل میں کراچی واپس نہیں جاؤں گی" رُدا نے بمشکل تمام کہا۔

"بھئی ہم جانتا ہم سب لاہور آتے جاتے ہیں۔ اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیوں بھئی ثناء کیا خیال ہے تمھارا؟"

"آہ! لاہور واقعی رہنے کی جگہ ہے ڈیڈی۔ میں تو خوشی سے یہاں منتقل ہونے کے لئے تیار ہُوں بس ہم سب کے لئے رُدا کا مکان چھوٹا پڑ جائے گا۔ طفیلی خالہ اور باقی لوگ کہاں رہیں گے ذرا سی دِقت نہیں ہو جائے گی۔ کیوں رُدا اگر ہم اُوپر کچھ کمرے بنوالیں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" رُدا نے شرمگیں نِگاہوں سے ثناء کو دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"خیر اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ لوگ مجھے اپنا نمائندہ قرار دے کر رُدا سے گفتگو کر لینے کی اجازت دیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا"

"اجازت... اجازت" چاروں طرف سے آوازیں اُبھریں اور اُس کے بعد احسان احمد صاحب نے کہا۔

"تو پھر آج رات ڈنر کے بعد مذاکرے کا یہ دور شروع ہوگا، اور کمرے میں میں اور عادل حسین تنہا ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ صرف رُدا ہمارے ساتھ ہوگی۔ آپ لوگوں میں سے کسی کو داخلے کی اجازت نہیں دی جائے گی"

"ایسا لگتا ہے جیسے مجرم ہم ہی لوگ ہیں" اختر نے ناک سکوڑتے ہُوئے کہا اور کسی نے اِس موضوع پر اور کوئی گفتگو نہ کی البتہ رُدا کو جب موقعہ مِلا تو اُس نے ثناء اور نُدرت کو اپنے پاس بُلا کر بھرّائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"ثناء نُدرت میری بہنو میں تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتی ہُوں خُدا کے لئے میں تم سے عاجزی کرتی ہُوں کہ میری بات سُن لو اُس کے بعد تم میرے لئے فیصلہ کرو"

"ظاہر ہے یہ کوئی بیوقوفی کی بات ہوگی رُدا صاحبہ ہرگز نہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" ثناء نے کہا۔

"مونالیزا تمھاری مُسکراہٹ کتنی حسین ہے۔ تم نے اپنے سارے وجُود سے اُس حُسن کا اظہار نہیں کیا"

"کاش یہ مُسکراہٹ حسین نہ ہوتی۔ کاش میرا وجُود اِتنا مکروہ ہوتا کہ آپ لوگ خود ہی مجھ سے نفرت کرتے"

"جُملہ نوٹ کیا جائے، اچھا ہے کسی کہانی میں کام آئے گا..." ثناء نے کہا۔

"میں سنجیدہ ہُوں"

"سنجیدہ بھی ہُوں اور رنجیدہ بھی۔ خیر... خیر فرمائیے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ" ثناء نے کہا۔

"دیکھو اب تم لوگوں سے میری رُسوائی چھُپی ہُوئی نہیں ہے، خُدا کی قسم بات اگر میری ذات تک ہوتی تو اپنے آپ کو برہنہ کر دیتی تمھارے سامنے۔ کچھ نہ سوچتی اپنے بارے میں، میں یہی سوچتی کہ میں ایک گندہ وجُود ہُوں جس کو کچھ لوگوں نے صاف سُتھرا سمجھ کر سینے سے لگا رکھا ہے تو اِس موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے لیکن نُدرت... ثناء اِس میں میری امّی بھی ملوّث ہوتی ہیں۔ اِس کہانی میں میری امّی بھی شامل ہیں۔ اُنھوں نے مرتے وقت مجھ سے تیمور کے بارے میں کہا تھا کچھ اور میں نے اُن کی اِس یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے میں اپنی ماں کی رُوح سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی ثناء میری بات مان لو۔ وہاں آفندی صاحب ہیں۔ میرے نانا ہیں وہ لیکن میری ماں کے ساتھ اُنھوں نے جو سلوک کیا وہ ایک انسانی سُلوک نہیں تھا دیکھو انسان اپنی ذات کے لئے کتنا سخت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کسی طرح جُھکانا نہیں چاہتا اگر تھوڑا سا ایثار کر دیتے۔ میرے نانا تو یہ کہانی اِس شکل میں ترتیب نہ پاتی۔ تم لوگ خود بتاؤ۔ اور اب جبکہ اُنھیں سب کچھ کھونے کا احساس ہُوا ہے تو وہ مجھے اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ مجھ سے رجوع کرنا چاہتے ہیں۔ تم خود سوچو روزِ قیامت میں اپنی ماں کو کیا جواب دُوں گی، کیا کہوں گی اُن سے کہ جس چیز کو اُنھوں نے تو زندگی بھر ٹھکرایا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگالیا۔ اُن سے بدعہدی کی میں نے"

"رُدا کیا تمھاری امّی نے یہ کہا تھا کہ تم زندگی بھر آفندی صاحب سے مت مِلنا، اُن سے رُجُوع نہ ہونا؟"

"نہیں کہا تھا یہ۔ بالکل نہیں کہا تھا لیکن اُنھوں نے کیا یہی تھا۔ اُنھوں نے اپنے باپ کی کوئی بات نہیں مانی۔ اِس لئے نہیں مانی کہ آفندی صاحب نے اُن کی زندگی تلخ کی تھی ورنہ شاید اُس بدکار شخص کو اُس کی خواہش کے مطابق دولت مِل جاتی تو وہ اِتنا بُرا نہ ہوتا۔ کم از کم وہ میرا باپ ہوتا۔ میری ماں کا شوہر ہوتا جیسے بھی زندگی گزارتا کم از کم ہم دونوں کے نام کے ساتھ وابستہ تو ہوتا لیکن... لیکن نانا جان نے ہم سے ہمارا نام چھین لیا۔ ہماری شناخت چھین لی۔ بُرا کیا اُنھوں نے۔ بہت بُرا کیا او۔ اب اگر وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہیں تو کم از کم میں اِس شرمندگی۔ اِس پچھتاوے میں اُن کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ خُدا کے لئے مجھے مجبُور نہ کرو۔ مجھے مجبُور نہ کرو۔ تمھارا اِتنا احسان مانوں گی کہ تم تصوّر بھی نہیں کر سکتیں"

"لیکن رُدا یہ بات تم سے کسی نے کہی کہ تم آفندی صاحب کے ساتھ رہنے کے لئے مجبُور کر دی جاؤ گی"

"وہ وہاں ہیں اور... اور اپنی تمام کوششیں کریں گے وہ... وہ میرے سامنے آئیں گے بار بار مجھے مجبُور کریں گے۔ اور کہیں تم لوگ بھی اُس میں شامل نہ ہو جاؤ بس اِسی خوف سے میں وہاں سے بھاگی تھی"

"نہیں تمھیں تمھاری مرضی کے خلاف کبھی مجبُور نہیں کیا جائے گا رُدا"

"میں اب یہیں رہنا چاہتی ہُوں۔ میں وہ کرنا چاہتی ہُوں جس کا میں نے عہد کیا تھا۔ یقین کرو میں تیمور کو لے کر کراچی صرف اِس لئے گئی کہ وہاں اپنے لئے مستقبل تلاش کروں گی۔ تیمور کو ایک حسین زندگی دوں گی۔ میرا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں تھا لیکن وہاں تم ملیں پھر باقی لوگ بھی مل گئے اور... اور میں کچھ اِس طرح مجبُور ہوگئی کہ سب کچھ بھُول گئی۔ شاید میں اپنی زندگی کی کہانی اِسی گوشے میں ختم کر لیتی اگر آفندی صاحب راستے میں نہ آتے۔ میں چاہتی ہُوں ثناء کہ... کہ دیکھو میری یہ بات مان لو۔ میں تمھاری ہر خدمت کے لئے حاضر ہُوں جب حُکم دو گی۔ کراچی آجایا کروں گی لیکن وہاں آفندی صاحب ہیں وہ مجھے مجبُور کریں گے۔ میں جانتی ہُوں وہ مجھے مجبُور کریں گے"

"نہیں کریں گے خیر تم ابّو سے گفتگو کر لو اُس کے بعد جو فیصلہ بزرگ کریں گے، ہم بھی اُسے مان لیں گے" ثناء نے کہا۔

"میری اچھی ثناء اِس سِلسلے میں میری مدد کرنا۔ تم سے بڑی توقع ہے مجھے" رُدا نے کہا اور ثناء یا نُدرت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بہرطور رات کو کھانے کے بعد احسان احمد صاحب نے رُدا سے درخواست کی کہ وہ اُنھیں اپنے کمرے میں لے چلے۔ رُدا اُلجھی اُلجھی سی اُن دونوں کے ساتھ چل پڑی تھی۔ باقی لوگ مُسکرا رہے تھے۔ رُدا کے انداز میں بڑی بے بسی سی تھی اپنے کمرے میں چل کر اُس نے اُن دونوں کو بیٹھنے کی پیش کش کی۔ بہت مؤدب تھی وہ اُن کے سامنے۔ احسان احمد صاحب بیٹھ گئے اور پھر اُنھوں نے رُدا کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"رُدا بیٹے پُوچھ سکتا ہُوں کہ تم لاہور کیوں آگئیں؟"

"انکل آفندی صاحب کی وجہ سے میں کسی قیمت پر اُن کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی"

"ہُوں! لیکن بیٹے آفندی صاحب آپ کو اغوا کرنے تو نہیں آئے تھے۔ کیا وہ میری کوٹھی سے آپ کو زبردستی لے جاتے؟" احسان احمد نے پُوچھا۔

"آپ... آپ سب لوگ مجھے مجبُور کرتے اور۔ اور مجھے۔ مجھے"

رُدا نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"کیوں بیٹے کیا اتنے عرصہ ہمارے ساتھ رہ کر آپ نے یہی محسوس کیا کہ ہم آپ سے بد دِل ہیں یا آپ کو گھر سے ہٹانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں انکل ایسا تو نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا کہ ہم آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف آفندی صاحب کے حوالے کر دیں گے۔"

"یہ ہوتا انکل... یہ ضرور ہوتا۔ وہ آپ کے سامنے روتے گڑگڑاتے۔ نہ جانے کیا کیا طریقے اختیار کرتے وہ۔ بس میں نے یہی سوچا کہ بات بِلاوجہ آگے نہ بڑھنے پائے۔" احسان احمد خاموش ہو گئے، چند لمحات کے بعد انھوں نے کہا۔

"تو پھر تم نے ہمیں مُجرم قرار دے دیا۔"

"نہیں انکل خُدا نہ کرے بس میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں کسی قیمت پر آفندی صاحب کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

"اور اگر ہم تم سے یہ کہیں کہ تم آفندی صاحب کے پاس نہ جاؤ اور ہمارے ساتھ ہی رہو۔"

"انکل وہ آپ کو بھی پریشان کریں گے۔"

"کیا آفندی صاحب بہت بُرے انسان ہیں؟"

"بہت بُرے، اُنھوں نے میری ماں کو مار دیا انکل اُنھوں نے میری ماں کو ہلاک کر دیا۔"

"نہیں رُدا ایسا نہ کہو۔ بعض اوقات اَنا نہ جانے کیا کیا کہانیاں سُناتی ہے۔ انسان بعض معاملات میں بڑا مجبور ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی شخص اپنا سب کچھ ہارنے کے بعد اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے کے لئے تُل جائے تو پھر ہم اُسے مُجرم نہیں قرار دے سکتے آفندی صاحب اَنا کا جُرم کرنے کے مرتکب ضرور ہوئے ہیں لیکن اب وہ ایک ٹوٹے ہوئے انسان ہیں۔ تاہم رُدا میں تم سے کبھی یہ بات نہیں کہوں گا کہ تم آفندی صاحب کے گھر چلی جاؤ۔ وہاں میرا گھر بھی تو ہے جہاں میں نے تمھیں ہمیشہ ثناء کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ شاید کہیں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو لیکن رُدا بیٹے میں نے کوشش یہی کی ہے۔" احسان احمد نے کہا۔

"انکل آپ نے مجھے دراصل ایک ایسے سحر میں گرفتار کر دیا تھا۔ کہ... کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے وہاں سب کچھ ملا تھا انکل۔ محبت... پیار... عزت سب کچھ ہی تو ملا تھا لیکن... لیکن انکل میں بدنصیب ہوں۔ میں اِس قابل نہیں ہوں۔ خُدا کے لئے پلیز میں نے وہاں سے آتے ہوئے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اب آپ مجھے وہاں نہ لے جائیں۔ انکل آپ خود ہی بتائیے میں وہاں۔ وہاں میرا مطلب ہے کہ... کہ۔"

"بات دراصل یہ نہیں ہے بیٹے۔ ہم بیشک تمھیں مجبور نہ کرتے لیکن تم ایک بات اور بھی تو سوچو جن لوگوں کے بزرگ ہوں وہ اپنے بچّوں کو تنہا کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ ہم تمھارے بزرگ ہیں بیٹے۔ باقی تم جس طرح بھی مناسب سمجھو۔"

"انکل میں آپ کے حکم پر زہر کھانے کے لئے بھی تیار ہوں لیکن خُدا کے لئے اب آپ مجھے وہاں جانے کے لئے مجبور نہ کریں۔ میں کسی قیمت پر آفندی صاحب کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔" احسان احمد نے سرد نگاہوں سے رُدا کو دیکھا اور پھر عادل حسین سے بولے۔

"کیا خیال ہے عادل حسین، ہم غلطی نہیں کر رہے واقعی رُدا کو مجبور کرنے کا نہ مجھے حق ہے اور نہ تمھیں۔ کاش ہم سچ مچ رُدا کے بزرگ ہوتے۔ بہرطور ٹھیک ہے رُدا بیٹے تمھاری اپنی ایک زندگی ہے اور تم اُسے بہتر طور سے گزارنے کا فیصلہ کر سکتی ہو۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اُس میں یہ تبدیلی کر و لیکن اِس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ میرا تم سے کوئی ذاتی رشتہ نہیں ہے۔ بہرطور میری دُعا ہے کہ تم زندگی کے تمام مراحل بغیر کسی اُلجھن کے طے کر لو۔ آؤ عادل حسین چلیں اُٹھیں۔" احسان احمد نے کہا اور رُدا کو جُھرجُھری سی آگئی۔ احسان احمد کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ بزرگ بچّوں کو تنہا نہیں چھوڑتے۔ کاش... کاش ہم تمھارے سچ مچ بزرگ ہوتے۔ احسان احمد، جن کا دِل اِس کائنات کی طرح وسیع تھا جنھوں نے اپنے گھر کو اپنے عزیزوں سے سجایا ہُوا تھا جو کسی عالم میں کسی کی دِل شکنی نہیں کر سکتے تھے اور آج رُدا کے ہاتھوں اُن کی دِل شکنی ہُوئی تھی۔ اُنھیں... اُنھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نہیں یہ تو مناسب نہیں ہے۔ یہ کسی قیمت پر مناسب نہیں ہے۔ عادل حسین بھی اُٹھ گئے۔ رُدا اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُس نے احسان احمد کے سامنے سرخم کرتے ہُوئے کہا۔

"یہ آپ نے کیسے کہا کہ آپ میرے بزرگ نہیں ہیں۔ آپ نے۔ آپ نے کب مجھے یہ احساس ہونے دیا کہ... کہ میں کسی غیر جگہ ہُوں۔"

"نہیں بیٹے خُدا تمھیں خُوش رکھے بلاشُبہ میں شاید تمھاری وہ خدمت نہیں کر سکا کہ تمھارے دِل کی وُسعتوں تک پہنچ سکوں۔" احسان احمد کسی قدر آزردہ لہجے میں بولے۔

"نہیں انکل میں نہیں جانے دُوں گی آپ کو ایسے۔ آپ... انکل آپ ٹھیک ہے آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں کراچی چل رہی ہوں۔"

"ایں؟" احسان احمد چونک پڑے۔

"ہاں انکل یہ الفاظ سُننے کے بعد میں زندہ نہیں رہنا چاہتی کہ آپ میرے بزرگ نہیں ہیں۔ آپ میرے اپنے ہیں انکل۔ آپ نے ہزاروں اپنوں سے زیادہ اپنائیت دی ہے مجھے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ آپ کا حکم میرے ذریعے تشنۂ تکمیل رہ جائے۔ ٹھیک ہے انکل میں چل رہی ہُوں بغیر شرُوط طور پر چل رہی ہُوں۔ میں کوئی شرط عائد نہیں کروں گی۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں کیونکہ آپ اور عادل حسین صاحب میرے بزرگ ہیں۔ وہ سب میرے اپنے ہیں جو میرے لئے کراچی سے یہاں تک دوڑے چلے آئے۔ اگر اُنھیں بھی اپنا نہ سمجھوں گی تو پھر اپنے کہاں تک تلاش کروں؟ کون ہوتا ہے اپنا؟ نہ ماں نہ باپ، نہ نانا نہ اور کوئی۔" رُدا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی احسان احمد رُدا کو دیکھتے رہے پھر اُنھوں نے آگے بڑھ کر رُدا کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ہاں بیٹے میں تمھارے غرُور کو کبھی نہیں توڑوں گا وعدہ کرتا ہُوں تم سے۔ میں تمھارے غرُور کو کبھی نہیں توڑوں گا۔ میں تمھارے مقاصد میں کبھی اپنا فیصلہ صادر نہیں کروں گا۔ چلو کراچی کے لئے تیاریاں کرو۔ ہم کراچی چلیں گے اور سُنو۔ مجھے اگر تم نے یہ حق دے دیا ہے۔ تو کچھ باتیں تم سے اور کرنا چاہتا ہُوں بیٹھو۔ بیٹھو عادل حسین۔" احسان احمد نے کہا اور عادل حسین مُسکراتے ہُوئے بیٹھ گئے۔ رُدا بھی احسان احمد کے سامنے بیٹھ گئی تھی احسان احمد کہنے لگے۔

"دیکھو رُدا میں نہیں جانتا کہ تمھاری مالی حالت کیسی ہے؟ تم میرے پاس کام کرتی تھیں۔ اُس کا ایک معاوضہ لیتی تھیں۔ نہ میرا تم پر کوئی احسان تھا اور نہ تمھارا مجھ پر۔ گھر میں جب تم ہوتی تھیں۔ تو میرے لئے ثناء کی حیثیت رکھتی تھیں اور ثناء اگر میرے اِس سے کچھ کھاتی پیتی ہے کچھ خرچ کرتی ہے تو نہ ثناء کا مجھ پر احسان ہے اور نہ میرا ثناء پر۔ گھر میں تمھاری حیثیت وہی ہوتی ہے۔ آفس میں تم میری فرم کی جنرل منیجر ہو بلکہ اگر یُوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ کہ غلام احمد کی فرم کی جنرل منیجر ہو۔ تم وہی رہو گی۔ میں تمھاری یہ جائیداد بیچ رہا ہُوں۔ اِس کا تیا پانچہ کر کے ہی جاؤں گا۔ یہ رقم محفوظ کر دی جائے گی۔ تیمور کے سلسلے میں ایک ذمّہ داری عائد کر دُوں گا کہ اُس کی تعلیم و تربیت اور اُس کی بہتر زندگی فرم کے سپُرد ہوگی۔ یہ سمجھ لو آسانی فراہم کر رہا ہُوں میں تمھیں فرم کی طرف سے۔ فرم کو جتنا منافع تمھارے ذریعے حاصِل ہوگا اُس کا کچھ حصّہ تمھارے نام بھی، مخصُوص کیا جائے گا اور یہ بھی تمھاری محنت پر مبنی ہوگا میں تمھاری محنت کے بغیر ایک پیسہ زائد تمھیں نہیں دُوں گا چنانچہ یہ تم پر احسان نہیں ہوگا اور نہ ہی تمھاری محنت مجھ پر احسان ہوگی۔ جہاں تک آفندی صاحب کا تعلّق ہے اُنھیں یہ بتا دیا جائے گا کہ رُدا کسی قیمت پر اُن کی طرف رجُوع ہونے پر تیار نہیں ہے اور براہِ کرم اُسے مجبُور نہ کیا جائے رُدا، یہ تمام کام میں کروں گا جن کا میں تم سے وعدہ کرتا ہُوں اور یہ بھی وعدہ کرتا ہُوں کہ آفندی صاحب تمھیں پریشان کرنے کے لئے تمھارے پاس نہیں پہنچ جائیں گے۔" رُدا گردن اُٹھا کر احسان احمد کو دیکھنے لگی پھر اُس نے کہا۔

"اور آپ کہتے ہیں کہ آپ میرے بزرگ نہیں ہیں؟"

"اب تو ہُوں بھئی۔ تم نہیں مان رہی تھیں تو مجبُور ہو گیا۔" احسان احمد نے کہا اور رُدا نے اپنے ہاتھ اُن کی گردن میں حمائل کر کے اپنا سر اُن کے سینے سے ٹکا دیا اور زور زور سے سِسکیاں لینے لگی۔

احسان احمد نے بڑے غرُور سے اعلان کیا تھا کہ رُدا اُن کے ساتھ واپس کراچی چل رہی ہے۔ اُس کے بعد دوسرے دِن صبح کچھ فیصلے ہُوئے جن کے تحت عادل حسین، خالد، اقبال تین افراد کو واپس کراچی چلے جانا تھا۔ باقی لوگوں کی بھی ذِمّہ داریاں تقسیم کر دی گئی تھیں اور احسان احمد خود رُک گئے تھے۔ اُنھوں نے عادل حسین سے کہا تھا کہ وہ رُدا کو ساتھ لے کر آئیں گے۔ کچھ ضروری کام کرنے کے بعد اور اُس کے بعد احسان احمد نے اِس سلسلے میں کارروائی شروع کر دی۔ رُدا کا مکان بہت اچھی قیمت پر فروخت کر دیا گیا اور اُس کا تمام ضروری سامان جو کراچی لے جایا جا سکتا تھا بُک کرا دیا گیا اور باقی یہیں فروخت کر دیا گیا۔ رُدا نے اب اِس سلسلے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ احسان احمد جیسے انسان کے بعد بھلا اِس بات کی کہاں گنجائش رہ جاتی تھی کہ وہ کسی اور سمت دیکھتی۔ اِن تمام کارروائیوں میں تقریباً بارہ دِن یہاں لگ گئے احسان احمد صاحب اپنا قیمتی وقت یہاں صرف کر رہے تھے۔ یہ اُن کی دلچسپی کا ثبُوت تھا۔ ثناء، نُدرت اور تنویر وغیرہ بہت خُوش تھیں، اختر کی شرارتیں جاری تھیں۔ غرض خُوب تفریحی دِن گزر رہے تھے۔ اور اُنھوں نے نہ صرف لاہور بلکہ اُس کے نواحات کی بھی سیر کی تھی پھر اِن تمام کاموں کی تکمیل کے بعد احسان احمد صاحب اُن لوگوں کو لے کر کراچی چل پڑے۔ رُدا واپس کراچی آگئی اور گھر میں خُوشیوں کی لہر دوڑ گئی ذکیہ بیگم، امّاں بی اور باقی تمام لوگ بھی بے حد خوش تھے۔ رُدا سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا اب تو اُس کی کہانی پُورے طور سے منظرِ عام پر آچکی تھی۔ اور سبھی لوگ جانتے تھے کہ وہ بے حد مظلُوم اور پریشان حال لڑکی ہے چنانچہ صرف اُس سے محبت کا سلُوک کیا جانے لگا احسان احمد صاحب نے خصُوصی منظُوری کے تحت اُسے پندرہ دِن آرام کے لئے دیئے تھے اور کہا تھا کہ آج سے

ٹھیک سولہویں دن وہ اپنی ذمّے داریاں سنبھال لے یہ تمام کام مکمل کرنے کے بعد احسان احمد صاحب اپنے دوسرے فرض کی تکمیل کے لئے آفندی صاحب کے پاس پہنچ گئے محمود علی آفندی بیچارے بدستور صاحبِ فراش تھے احسان احمد کو دیکھ کر انھوں نے غم آلود لہجے میں کہا۔

"کچھ پتہ چل سکا احسان احمد۔"

"نہ صرف پتہ چل سکا بلکہ میں اُسے واپس لے آیا ہُوں۔"

"کیا؟" آفندی صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ہاں وہ لاہور میں اپنے گھر میں تھی۔"

"اوہ مجھے یہی شُبہ تھا۔ وہ یہاں سے چلی کیوں گئی تھی۔"

"آفندی صاحب آپ کو دیکھ کر۔"

"مجھے؟" آفندی صاحب نے ہکلاتے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں! میں چونکہ اب پوری کہانی سُن چکا ہُوں آفندی صاحب اس لئے یہ بات کہنے میں عار نہیں محسوس کرتا کہ وہ اپنی ماں سے بھی زیادہ ضدی ہے وہ یہاں سے صرف اس لئے چلی گئی تھی کہ آپ اُسے اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کریں گے اور اُس کا کہنا ہے کہ آپ کی وجہ سے اُس کی ماں مرگئی۔"

"وہ سچ کہتی ہے بالکل سچ کہتی ہے میں اپنی اَنا کا غلام بن گیا تھا میری وجہ سے میری بیٹی ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر کسمپرسی کی حالت میں مرگئی۔" آفندی صاحب سِسک کر بولے۔

"دیکھئے آفندی صاحب آپ بچّے نہیں ہیں اور ہم لوگ عُمر کے تجربوں سے گزُرنے کے بعد کم از کم اتنا تجربہ ضرور حاصل کر لیتے ہیں کہ بچّوں کو کس طرح ہینڈل کیا جاسکتا ہے تھوڑے سے صبر سے کام لینا پڑے گا میں نے اُس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اُسے آپ کے پاس آنے سے یا آپ کے سامنے آنے سے مجبُور نہیں کروں گا اور کسی قیمت پر یہ نہیں کروں گا کہ وہ آپ کی تحویل میں پہنچ جائے آفندی صاحب یہ وعدہ مجھے فی الحال پُورا کرنا پڑے گا اور آپ کو ضبط و صبر سے کام لینا پڑے گا لیکن ہم ایک تھوڑی سی بے ایمانی کریں گے۔ کاروبارِ محبت اور جنگ میں بے ایمانیاں تو کرنی ہی پڑتی ہیں وہ بے ایمانی یہ ہوگی کہ ہم کوئی ایسا جذباتی لمحہ سامنے لائیں گے جن میں وہ جذباتی طور پر متاثر ہو جائے اور آپ تک پہنچ جائے میں اِس کا وعدہ کرتا ہُوں کہ یہ ماحول میں مہیّا کروں گا۔ لیکن آپ کو بھی یہ وعدہ کرنا پڑے گا آفندی صاحب کہ آپ اِس دوران پورے ضبط سے کام لیں گے اور جلد بازی نہیں کریں گے۔" آفندی صاحب ڈبڈبائی ہُوئی آنکھوں سے احسان احمد کو دیکھتے رہے اور پھر بولے۔

"ہم... مگر کیا کرنا پڑے گا ایسا کیا کرنا پڑے گا تم دیکھو میری عمر کتنی گزرگئی ہے احسان احمد کب تک زندہ رہ سکوں گا۔"

"کم از کم اُس وقت تک ضرور جب تک رُدا آپ کے پاس نہ آجائے۔"

"آہ کیا یہ ممکن ہوگا کیا میں اپنی رُوٹھی ہُوئی زندگی کو پھر سے مَنا سکوں گا۔"

"اِس کا وعدہ میں آپ سے کر چکا ہُوں لیکن اِس کے لئے وقت درکار ہے۔"

"تم میرے دوست ہو احسان احمد مانتا ہُوں کہ میں۔ میں بہت سے معاملات میں بہت غلط انسان رہا ہُوں لیکن اب میں بے بس ہُوں ٹوٹا ہُوا ہُوں تم سے مدد کا طالب ہُوں سب کچھ بھُول جانا احسان احمد میرے دِل میں اب ایک ہی طلب ہے۔ کسی طرح میں اپنی نواسی کو اپنے سینے سے لگا لوں یہ سب کچھ اُس کے حوالے کردُوں اور اُس کے بعد خاموشی سے مرجاؤں۔"

"اِس میں اگر ذرا سی تبدیلی ہو جائے تو کیا حرج ہے جناب آفندی صاحب۔"

"کیسی تبدیلی؟"

"آپ یہ سب کچھ اپنی نواسی کے حوالے کردیں اُسے سینے سے لگالیں اور زندہ رہیں زندہ رہنا بے حد ضروری ہے۔" آفندی صاحب کچھ نہ بولے اور اُن کی آنکھیں ڈبڈبائی رہیں احسان احمد نے کہا۔

"اُس پر بہت بُرا ردِّعمل ہُوا تھا آفندی صاحب آپ کو شاید اس کا احساس بھی نہ ہوگا کہ ہم کن مراحل سے گزُرے ہیں وہ بہت ضدی ہے اور میں سمجھتا ہُوں اِس میں بے شک کچھ وقت لگ جائے گا لیکن یہ وعدہ ہے آپ سے کہ ایک دِن ایسا ضرور ہوگا جب وہ خود آپ کے پاس آجائے گی لیکن اِس سلسلے میں آپ کا تعاوُن بے حد ضروری ہے۔"

"طویل عرصے سے صبر کر رہا ہُوں احسان احمد جتنا عرصہ کہوگے صبر کرلُوں گا تقدیر کے لِکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔"

"بس تو پھر آپ یُوں سمجھئے کہ آپ کا یہ کام میری ذِمّے داری ہے۔"

"کاش میں تمہارا احسان اُتار سکتا۔" آفندی صاحب نے کہا اور احسان احمد مُسکرانے لگے اُنھیں اچھی طرح سمجھانے بُجھانے کے بعد وہ وہاں سے واپس چل پڑے تھے۔ احسان احمد صاحب کو خود بھی یہ احساس تھا کہ رُدا اِس گھر میں ایک ٹھوس حقیقت ہے اور کوئی بھی اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا بلا شُبہ احسان احمد بے غرض انسان تھے اور اپنے جتنے رشتے داروں کو اُنھوں نے اپنے گِرد جمع کر لیا تھا۔ اُن سے بھی اُنھیں کوئی لالچ نہیں تھا وہ اُن سے بے لُوث محبت کرتے تھے اور یہی کیفیت اُن کی رُدا کے ساتھ تھی رُدا بے شک ثناء کی وجہ سے گھر پہنچی تھی لیکن اُس کے بعد احسان احمد صاحب ذاتی طور پر اُس سے متاثر ہوگئے تھے اُنھیں اِس لڑکی کی صلاحیتوں پر رشک آتا تھا جس نے اُن کی فرم میں داخل ہونے کے بعد تمام کاروبار اِس طرح سنبھال لیا تھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کوئی ناتجربہ کار لڑکی ہے اور زندگی میں پہلی بار ملازمت کر رہی ہے رُدا اپنے تمام کاموں میں بے حد حاذق و چوبند تھی اور احسان احمد ذاتی طور پر اُسے بے حد پسند کرنے لگے تھے رُدا کی یہ صلاحیتیں بے مقصد نہیں تھیں بعد میں اُنھیں معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کس پائے کی لڑکی ہے۔ لیکن بہر طور احسان احمد صاحب کو تو پہلے بھی اِس سے غرض نہیں تھی اور اب بھی وہ اِس بات سے غرض نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ رُدا کی یہ ذہنی کیفیت دُرست کرنے کے لئے کوئی ایسا قدم ہونا چاہیئے کہ وہ ذہنی طور پر شگفتہ ہو جائے۔ ویسے یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ رُدا جب اپنی ملازمت پر واپس آجائے گی تو اُس کی حالت کافی بہتر ہو جائے گی البتہ فوراً ہی وہ اُسے ملازمت پر نہیں لانا چاہتے تھے گھر پہنچنے کے بعد اُنھوں نے خاص طور سے ذکیہ بیگم سے کہا۔

"ذکیہ رُدا اور ثناء کے درمیان جو ربط ہے تم اُسے اچھی طرح جانتی ہو اور اب تم سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہی ہے کہ رُدا کون ہے، میں چاہتا ہُوں کہ اِس دوران اُسے ذہنی طور پر مطمئن کردیا جائے تاکہ اس کی حالت بہتر ہو جائے اِس سلسلے میں تم کچھ کر سکتی ہو۔" ذکیہ بیگم نے ہمدردی سے کہا۔

"آپ یقین کریں وہ بچّی تو لگتی ہی نہیں کہ کوئی غیر ہے۔ بالکل اپنی ہی لگتی ہے۔ میں خود بھی چاہتی ہُوں کہ اُس پر جو آفت پڑی ہے اور جس طرح اُس کا دِل مُرجھا گیا ہے وہ بہتر ہو جائے۔"

"بس یُونہی ذرا بچّوں کو ہدایت کر دینا کہ سیر و تفریح کے کچھ پروگرام بنائیں بلکہ میں خود ہی اُن کے سامنے چند تجویزیں پیش کردُوں گا۔ ذرا سا گھُوم پھر لیں گے تو رُدا کی کیفیت نارمل ہو جائے گی اصل میں وہ آفندی صاحب کی وجہ سے پریشان ہے بےچارے آفندی صاحب اب اپنے کئے سے تائب ہو چکے ہیں اور شرمندہ ہیں کہ اُن کا اِس دُنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔" ذکیہ بیگم گردن ہلانے لگی تھیں احسان احمد نے یہ سب کچھ اپنے طور پر سوچا تھا لیکن اُنھیں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی یہ بات سبھی جانتے تھے کہ رُدا کا دل اُداس ہے اور وہ اُلجھی ہُوئی ہے چنانچہ اپنے طور پر سبھی اِس بات کے لئے کوشاں تھے کہ رُدا کے ذہن سے یہ تکدر دُور کردیا جائے اور اِس سلسلے میں پروگرام ترتیب دے لئے گئے تھے جن کا انچارج اختر تھا آج بھی شام کو کچھ لوگوں کو دعوت دی گئی تھی اور رُدا کے اعزاز میں ایک عُمدہ قسم کی چائے پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں کافی رونق ہوگئی تھی ویسے رُدا کے سلسلے میں ہر شخص کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اُس سے کوئی باز پُرس نہ کی جائے۔ اور کوئی اُس سے اِس بارے میں سوال نہ کرے کہ وہ کہاں چلی گئی تھی یہ خطرہ طفیلی بیگم اور عارفہ خالہ ہی سے تھا کہ کہیں وہ باتیں بنانے نہ بیٹھ جائیں لیکن اُن دونوں خواتین نے بھی پورے پورے ظرف کا ثبُوت دیا تھا اور کسی قسم کی کوئی بات نہیں کی گئی تھی بہرطور چائے پارٹی کا یہ اہتمام بڑا دِلچسپ رہا اور اُس میں خُوب قہقہے لگائے گئے رُدا نے بھی اپنے آپ کو نارمل کر لیا تھا اس دوران وہ عجیب احساسات کا شکار رہی تھی اُس نے رات کی تنہائی میں سنجیدگی سے سوچا تھا کہ یہ لوگ کتنے عجیب ہیں نہ کوئی رشتہ نہ کوئی ناتہ نہ کوئی لالچ کچھ بھی تو نہیں تھا اُنھیں رُدا کے ذریعے لیکن سب کے سب اُس پر جان دے رہے تھے اُسے شرمندگی ہونے لگی کہ اُس نے جلد بازی میں لاہور جانے کا فیصلہ کر کے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اُن کی نظروں میں ہلکا کر لیا لیکن کسی نے اِس بات کا اظہار نہیں کیا تھا اُس پر ہاں بس ایک ثناء تھی جس کے اندر رُدا ایک اجنبیّت محسوس کر رہی تھی تیمور بدستور ثناء کے سینے سے لپٹا رہتا تھا لیکن ثناء نے اب اُس پر اپنے حق جتانا چھوڑ دیئے تھے اور رُدا سے گفتگو کرتے ہُوئے بھی وہ کچھ بُجھی بُجھی سی نظر آتی تھی یہ بات کسی اور نے قطعی نہیں محسوس کی تھی لیکن رُدا جانتی تھی کہ ثناء ذہنی طور پر اُس سے مطمئن نہیں ہُوئی ہے۔ ثناء کی جو کیفیات اُس نے دیکھی تھیں اُن کے تحت اُسے ثناء سے بے پناہ اُلفت ہوگئی تھی کتنی بے لُوث اور محبت کرنے والی لڑکی ہے جنون کی حد تک چاہنے والی اُس کی یہ ناراضگی بجا ہے واقعی یہ غلطی ہُوئی تھی مجھ سے اور مجھے اِس کا اعتراف کر لینا چاہیئے اِن حالات کے بعد ثناء نے اُس سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا بس کچھ باتیں ایسی تھیں جن سے رُدا یہ محسوس کرتی تھی کہ ثناء اُس سے ناراض ہے تین چار دِن گزُر چکے تھے اور اِن چار دِنوں ہی دِنوں میں کوئی نہ کوئی تفریحی پروگرام بنتا رہا تھا ایک شام ایک پکنک کے سلسلے میں بھی طے کیا گیا تھا اور اس کے اہتمام کئے جا رہے تھے اس وقت بھی ثناء تیمور کو لئے رُدا کے کمرے میں داخل ہُوئی تیمور

جاگ چکا تھا شناء کے ہاتھ میں ایک لباس تھا اُس نے رُدا کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

”یہ کپڑے پہنا دُوں تیمور کو؟“ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا شناء تیمور پر اِتنا حق جتاتی تھی کہ اُس نے رُدا کے تمام حقوق ختم کر دیئے تھے لیکن یہ سوال اِس بات کا مظہر تھا کہ اب شناء وہ انداز اختیار نہیں کر سکتی تھی رُدا نے اُسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”مجھ سے کیوں پُوچھ رہی ہو؟“

”نہیں بس ایسے ہی“ شناء نے جواب دیا اور تیمور کو اُٹھا کر باہر جانے لگی تو رُدا نے اُسے آواز دی۔

”شناء“ اور شناء رُک گئی۔

”یہاں تو آؤ“

”جی“ شناء آہستہ سے بولی اور رُدا کے سامنے پہنچ گئی رُدا اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر اُس نے آگے بڑھ کر شناء کا بازو پکڑ لیا۔

”ناراض ہو مجھ سے؟“

”نہیں“ شناء آہستہ سے ہنس پڑی۔

”یہ ہنسی ہے تمھاری؟“

”میں سمجھی نہیں“ شناء نے کہا۔

”شناء تمھیں میری قسم جواب دو ناراض ہو مجھ سے؟“ شناء نے اُسے گھُور کر دیکھا لیکن کچھ نہ بولی۔

”ہو ناں ناراض؟“

”کہا ناں“

”کیا کہا جواب دو میری قسم کھا کر جواب دو؟“ رُدا بولی اور شناء خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی لیکن اُس کے اندر ایک پتھریلا پن سا پیدا ہو گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ شناء“ رُدا نے کہا اور شناء بیٹھ گئی۔

”جواب نہیں دو گی مجھے؟“

”بھئی کیا جواب دُوں کہہ تو رہی ہُوں ناراض نہیں ہُوں؟“

”میری قسم کھا کر ایک بار یہ بات کہہ دو میں دوبارہ تم سے یہ سوال نہیں کروں گی۔“

”میں قسم نہیں کھاتی رُدا“

”اِس وقت کھانی پڑے گی تمھیں قسم“

”نہیں کھاؤں گی“ شناء غصیلے لہجے میں بولی۔

”تمھیں میری قسم شناء جواب دو پلیز جواب دو“ شناء نے اُسے دیکھا اور پھر دوسری طرف رُخ کر لیا رُدا کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی تھی آہستہ سے آگے بڑھی اور کہنے لگی۔

”شناء تم نے مجھے مُجرم سمجھا ہے میں نے اِس دُنیا کا بہت زیادہ تجربہ نہیں کیا شناء غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے مجھ سے بھی ہو گئی مجھے اعتراف ہے مجھ سے غلطی ہُوئی مجھے یہاں سے اِس طرح نہیں جانا چاہیئے تھا لیکن شناء تمھاری ناراضگی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے میں... میں تمھاری ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی“

”جھُوٹ بولتی ہو تم“ شناء نے جواب دیا۔

”نہیں جھُوٹ بولتی اور جھُوٹ نہیں بول رہی“

”تم... تمھیں اگر میری ناراضگی کا خیال ہوتا تو تم جاتیں اِس طرح“

”شناء اگر میں جانے کی کوشش کرتی تو تم مجھے روکتیں اور اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آفندی صاحب مجھ پر مُسلط ہو جاتے“

”دیکھو رُدا میں ایک بات کہہ سکتی ہُوں صرف تم سے کہ اِس عمارت میں رہ کر جو کام تم نہیں چاہو گی وہ کبھی نہیں ہو گا اور یہ بات میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی تھی اور تم نے دیکھا بھی تھا کہ میں نے کبھی کسی کو تمھاری آواز سے اُونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں دی مجھے اعتماد میں لے کر تم ہر کام کر سکتی تھیں لیکن تم نے ایسا نہیں کیا اور رُدا اِس طرح تم نے مجھے یہ احساس دِلایا کہ غیر غیر ہوتے ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہوتا کہ اِن غیروں کو اپنا بنایا جا سکے“

”میں غیر ہُوں؟“

”نہیں تھیں لیکن تم غیر بنی ہو رُدا تم اِس بات کا اعتراف کرو“

”معافی نہیں ملے گی مجھے؟“

”جو چاہو گی کہہ دوں گی اپنی زبان سے کیونکہ تمھیں ہر قیمت پر یہاں دیکھنا چاہتی ہُوں لیکن میرے دِل میں جو دُکھ بیٹھ گیا ہے وہ آسانی سے نہیں نکلے گا“

”کوئی ایسی ترکیب ہے جس سے تم مان جاؤ“ رُدا نے شناء سے کہا اور اُس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اُس نے ایسا چہرہ بنا لیا تھا کہ شناء ٹھٹک کر اُسے دیکھنے لگی۔

”مت کرو رُدا ایسی کوئی حرکت مت کرو“ شناء رُخ بدل کر بولی

”خُدا کی قسم شناء! خُدا کے سوا کسی اور کے سامنے اِتنا نہیں گڑگڑائی۔ تم جانتی ہو شناء تم جانتی ہو کہ میں... میں بہت ضدی ہُوں لیکن شناء صُورتِ حال ایسی تھی کہ میں یہ ذہنی جھٹکا برداشت نہ کر سکی تھی۔ شناء میں کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”مجھے چھوڑتے ہُوئے یہ بھی نہیں سوچا تھا تم نے کہ میں... میں مر جاؤں گی“

”میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ ذہن میں صرف دھُواں تھا صرف دھُواں“ رُدا نے کہا۔ اُس کے دونوں ہاتھ اب بھی جُڑے ہُوئے تھے۔

”لوگ میرا مذاق اُڑاتے تھے۔ مجھے پاگل کہتے تھے میں پاگل ہو گئی تھی تمھارے لئے“

”میں جانتی ہُوں شناء۔ میں جانتی ہُوں“ رُدا کی آواز کپکپا گئی۔ اور شناء اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر رو پڑی۔ پھر اُس کے سینے سے لگ کر بولی۔

”جاؤ معاف کر دیا میں نے“

پکنک کی تیاریاں مکمل ہو گئیں اور پھر ایک صبح وہ لوگ چل پڑے، قہقہے لگ رہے تھے سب خوش تھے رُدا بھی مطمئن نظر آ رہی تھی پکنک کے لئے وہی اسپاٹ منتخب کیا گیا تھا جہاں یہ لوگ ایک بار پہلے بھی جا چکے تھے رُدا کو یہ بات معلوم نہیں تھی لیکن جب سب وہاں پہنچ گئے تو رُدا کے دِل کو ایک دھچکا سا لگا اُسے ماضی کی کہانی یاد آ گئی تھی پکنک میں سب لوگ تھے بس خیر دین نہیں تھا۔

اِس دوران تصوّر بیگ رُدا کو بار ہا یاد آیا تھا۔ لیکن وہ اِس قدر پختہ ذہن رکھتی تھی کہ اُس نے کسی کو گمان بھی نہ ہونے دیا تھا کوئی نہیں جان پایا تھا کہ خیر دین یا تصوّر بیگ رُدا کے تعاقب میں لاہور پہنچا تھا اور رُدا نے جنُون کے عالم میں اُس کے ساتھ اِتنا بُرا سلوک کیا تھا کہ اب سوچ کر ہی کانپ جاتی تھی۔ اُسے رہ رہ کر تصوّر بیگ یاد آتا تھا۔ اُس کی باتیں یاد آتی تھیں اور وہ ذہنی طور پر سخت پریشان ہو جاتی تھی، اب جب اُسے معلوم ہو گا کہ وہ کراچی واپس آ گئی ہے اور اُن تمام لوگوں کے ساتھ خوش و خرم ہے تو وہ کیا سوچے گا اپنے دِل میں۔ کیا عزت کرے گا وہ رُدا کی۔ لیکن پھر وہ یہ کہہ کر دِل کو بہلا لیا کرتی تھی کہ تصوّر بیگ نے جو کھیل شروع کیا تھا وہ کسی طور اُس کی متحمل نہیں تھی۔ وہ تصوّر بیگ کی اُس چاہت کا جواب نہیں دے سکتی تھی جو اُس کے دِل میں پیدا ہو گئی تھی ظاہر ہے اُس نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنایا تھا اور اُسی مقصد کے لئے جینا چاہتی تھی۔ پھر ظاہر ہے اِس بات کی کیا گنجائش تھی کہ کوئی اُس کے دِل میں اُتر جاتا یا اُس کے دِل کی گہرائیوں تک جگہ پا لیتا۔ یہ کسی طور ممکن نہیں تھا۔ بہتر ہے کہ تصوّر بیگ اپنی توہین کا احساس کر کے اُس سے دُور رہے لیکن کم بخت دِل کبھی کبھی پھڑپھڑانے لگتا تھا اور وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتی تھی۔ اِس وقت اِس پکنک اسپاٹ پر آنے کے بعد اُسے خیر دین شدّت سے یاد آیا اور وہ اُن تمام مناظر کو یاد کرنے لگی۔ جو یہاں پیش آئے تھے۔ رشید سے پیچھا چھُڑانے کے لئے خیر دین نے کیا ہی دلچسپ چالیں چلی تھیں اور یہ چالیں بظاہر معصُومانہ تھیں۔ لیکن اب وہ یہ بات جانتی تھی کہ خیر دین یا تصوّر بیگ نے جان بُوجھ کر وہ تمام حرکتیں کی تھیں اور رشید سے اُس کی جان بچائی تھی۔ بہرطور اِس وقت بھی اُس نے دِل کو سمجھایا اور اپنے آپ کو تسلیاں دینے لگی کہ اُس نے جو کچھ کیا غلط نہیں کیا۔ وہ کسی بھی طور تصوّر بیگ کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔

پُورا دِن اِسی انداز میں گزر گیا۔ سب لوگوں نے قہقہے لگائے، رنگ رلیاں منائیں۔ رُدا بھی اُن میں پیش پیش رہی تھی اور اُس نے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے سب کچھ ہی کیا تھا۔ لیکن رہ رہ کر تصوّر بیگ کا تصوّر اُس کے اندر زندہ ہو جاتا تھا۔ اُسے تو غالباً احساس بھی نہیں تھا کہ کوئی اور بھی اُس کے دِل کی گہرائیوں تک پہنچا ہے، بس ایک اختر تھا جسے آج اچانک ہی خیر دین یاد آیا تھا۔ اِس دوران کچھ ایسی ہنگامہ خیزیاں رہیں۔ اور کچھ اِس طرح مصرُوف رہا وہ کہ ایک بار بھی تصوّر بیگ کی طرف نہ جا سکا، کسی کو بھی خیر دین کا خیال ہی نہیں آیا تھا سب ہی مصرُوف تھے اور اُنہی لوگوں میں اختر بھی تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد نہ جانے کیوں اُسے خیر دین کا خیال آ گیا۔ اور وہ گہری سوچوں میں گُم ہو گیا۔ اُس نے رُدا کا جائزہ لیا۔ یہ بات لاہور جا کر بھی معلوم نہیں ہو سکی تھی کہ تصوّر بیگ یا خیر دین رُدا کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا، حالانکہ ڈاکٹر نعمان نے اُنھیں بتایا تھا کہ تصوّر بیگ کراچی سے باہر گیا ہُوا ہے۔ وہاں پہنچ کر اختر اور باقی تمام لوگ رُدا میں اِس طرح اُلجھ گئے کہ رُدا سے اِس سلسلے میں کوئی سوال بھی نہیں کیا جا سکا۔ اختر نے موقع غنیمت دیکھ کر نُدرت کو اشارہ کیا اور نُدرت اُس کے پاس پہنچ گئی۔ اختر کے چہرے پر کچھ سوچوں کے سائے نظر آ رہے تھے اُس نے نُدرت کو سمندر کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا جناب اختر صاحب؟“

”بیٹھو یار۔ ہر وقت احتیاط کو گردن میں نہیں لپیٹے رکھنا چاہیئے“

”باقی تمام لوگ ہمیں اِس طرح دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے؟“

"سوچیں گے کہ کسی رُومانی فلم کا منظر چل رہا ہے اور حرج بھی کیا ہے۔ بہ طور ایک دِن دُنیا یہ رُومانی فلم دیکھ ہی ڈالے گی۔"

"وہ دِن کم از کم آج تو نہیں آنا چاہیئے۔"

"اچھا فضُول بکواس مت کرو نصف بہتر خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ کچھ اہم باتیں کرنا ہیں"۔ اختر نے کہا اور نُدرت اُسے دیکھنے لگی۔

اختر چند لمحات خاموش رہا، پھر بولا: "یار نُدرت ایک بات تو بتاؤ؟"

"سُبحان اللہ، کس بے تکلفی سے مخاطب کیا جا رہا ہے۔"

"اللہ کی نیک بندی تھوڑی دیر کے لئے خاموش بھی رہا جاتا ہے کیوں یہ عورتوں والی بک بک لگا رکھی ہے۔"

"جناب اختر صاحب ابھی آپ کو اِس لہجے کا حق نہیں ملا۔"

"لفظ ابھی اِس بات کا اظہار کرتا ہے کہ یہ حق مستقبل میں ملنے والا ہے۔ چنانچہ اُس کا تھوڑا سا استعمال قبل از وقت کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں کہتا ہُوں بھئی سنجیدہ ہو جاؤ۔ مجھے تم سے ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔"

"تو کہیئے ناں"۔ نُدرت نے کہا

"نُدرت، تصور بیگ کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔"

"ایں"۔ نُدرت بھی چونک پڑی۔

"ہاں... ہمیں جو معلومات حاصِل ہُوئی تھیں ناوہ تشنہ ہی رہ گیئں۔ لاہور میں وہ نہیں تھا۔ اِس لئے یہ خیال ذہن سے نِکل گیا کہ وہ لاہور آیا ہوگا۔ چلو ٹھیک ہے وہ کسی اور معاملے میں مصرُوف ہوگا۔ لیکن ہم نے تمھیں جو تھوڑی بہت تفصیلات بتائی ہیں اُن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مثلاً؟"

"اے بے وقُوف خاتون، اِتنی اہم باتیں اگر ذہن سے نکال دی جائیں تو تم یہ بات کیسے یاد رکھو گی کہ ہمارا تمہارا نکاح بھی ہُوا تھا۔"

"نکاح اگر ہوگیا تو یاد بھی رکھا جائے گا"۔ نُدرت نے کہا۔

"اگر... یہ لفظ اگر پر جی چاہتا ہے کہ آپ کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے۔"

"خُدا کے لئے نہیں۔ مجھے پانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"ہُوں ہُوں۔ بات پھر غیر سنجیدہ ہوگئی۔"

"مطلب کیا ہے آپ کا؟"

"بھئی خیر دین بھی اچانک ہی غائب ہوگیا ہے ورنہ کبھی کبھی دادی امّاں کی قدم بوسی کے لئے آ ہی جایا کرتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے تصور بیگ صاحب کہیں باہر چلے گئے ہوں؟"

"ہُوں معلوم کرنا پڑے گا۔ ویسے نُدرت ایک بات بتاؤ؟"

"کیا؟"

"کیا رُدا تصور بیگ سے متاثر ہو سکتی ہے؟"

"کیا پتہ..."۔ نُدرت نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیسے پتہ لگایا جا سکتا ہے۔"

"ممکن نہیں ہے۔ رُدا جتنی گہری لڑکی ہے وہ کبھی اپنے دل کا راز زبان پر نہیں آنے دے گی۔ مگر یہ بات تمھارے دِل میں کیوں آئی؟"

"ہُوں یہ بات ذرا سوچنے کی ہے کہ یہ بات میرے دِل میں کیوں آئی۔ لیکن کیا کیا جائے یار۔ کچھ ایسی ہی اُلجھنیں در پیش ہیں۔"

اچانک ہی خالد اور ثناء اُس طرف آتے نظر آئے اور یہ گفتگو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ دونوں اُن کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"یہ تنہائیاں کیوں تلاش کی جا رہی ہیں اللہ رکھی"۔ ثناء نے نُدرت کو گھورتے ہُوئے کہا۔

"بس... پتہ نہیں، بس اِدھر آ نکلی تھی۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہم لوگ آ گئے جائے"

"بے کار ہے بھائی جان، آئیے واپس چلتے ہیں۔ اِتنا کھلا ہے یہ کہ آپ کا آگے جانا بالکل ہی بے مقصد ثابت ہوگا"۔ ثناء نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔ بہت زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش پر میں تھپّڑ بھی مار دیا کرتا ہُوں"۔ خالد نے کہا۔

"کمال ہے یعنی اِس سے پہلے آپ کبھی تھپّڑ مار چکے ہیں مجھے"

"اب مار دُوں گا، اگر زیادہ بکواس کی تو۔"

"کیا کیا جائے۔ آؤ نُدرت چلتے ہیں بھئی۔ یہ لوگ غالباً ہماری یہاں موجودگی پسند نہیں کرتے"۔ اختر نے نُدرت سے کہا۔ اور دونوں واپس پلٹ پڑے۔

اب یہ بات اُس سے ڈھکی چھُپی نہیں تھی کہ کم از کم رُدا تو تصور بیگ یا خیر دین ضرور رُدا سے محبت کرتا ہے۔ ڈائری کے وہ اشعار اختر کو زبانی یاد ہوگئے تھے جو اُس کی ابتداء میں تھے اور اب یہ بات ڈھکی چھُپی نہ رہ سکی تھی کہ ڈائری کی تحریر خیر دین یا تصور بیگ کے ہاتھوں کی لکھی ہُوئی تھی۔ لیکن اِس وقت یہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اختر نے فیصلہ کیا کہ دوسرے دِن وہ ضرور تصور بیگ سے ملاقات کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ واپس ہو۔ اِس کے علاوہ یہ تجسُس اُس کے ذہن میں تھا کہ جب زدا

گئی تھی تو تصور بیگ کہاں چلا گیا تھا؟ اِس کا فیصلہ تصور بیگ سے مِل کر بھی کیا جا سکتا تھا۔

رات کا کھانا اختر اور خالد نے یہیں کھایا اُس کے بعد اجازت طلب کر لی۔ راستے میں اُس نے خالد سے کہا۔

"کیسی رہی آج کی پکنک خالد بھائی؟"

"حماقت، فضُول!"

"کیا مطلب؟"

"مجھے ان فضُولیات سے کوئی دِلچسپی نہیں ہے"۔ خالد نے جواب دیا۔

"جناب قبلہ بھائی صاحب!" اختر آنکھیں نکال کر بولا۔

"کیوں، اِس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟"

"آپ خود سمجھتے ہیں وہاں بھابی بیگم کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے اور اب ایسی باتیں کر رہے ہیں"۔ اختر نے نتھنے پھُلاتے ہُوئے کہا۔

"اپنی طرح سب کو احمق سمجھتے ہو۔"

"یہ بات ہے، سوچ لیں!" اختر نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ اور پھر بولا۔ "اگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر آپ کی اور بھابی بیگم کی لڑائی نہ کرا دی تو اختر نام نہیں۔"

"ارے اوہ۔ مذاق کا بُرا مان گئے بھائی"۔ خالد گھبرا کر بولا اور

اختر نے صبح ہی صبح تیاریاں کیں اور گھر سے نکل آیا۔ خالد اور عادل حسین کسی کام سے چلے گئے تھے وہ وہاں سے سیدھا منور علی بیگ کی کوٹھی چل پڑا۔ کار روکی تو اتفاق سے ڈاکٹر نعمان نظر آ گیا اُس نے اختر کو پہچان لیا تھا۔

"ہیلو اختر صاحب آئیے آئیے۔"

"آپ کہیں جا رہے تھے ڈاکٹر نعمان؟"

"ہرگز نہیں، بس کہیں جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"تصور صاحب گھر پر ہیں؟"

"بالکل نہیں وہ تو منیلا گئے ہُوئے ہیں انٹر پول کی ایک ٹیم کے ساتھ! آئیے بیٹھیے ناں۔"

"منیلا کیسے جانا ہوگیا؟"

"بھئی اسپیشل ڈیوٹی کا آدمی ہے ہوگا کوئی کام نہ وہ مجھ سے کبھی کچھ پُوچھتا ہے نہ میں اُس سے۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے اِس چھوٹی سی عُمر میں زندگی بڑی محدُود کر لی ہے۔"

"اوہ نہیں یہ اندازہ کیسے لگایا آپ نے؟"

"بس تنہا تنہا سے نظر آتے ہیں"۔ اختر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان مُسکرانے لگا۔

"لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے دوست بنانا نہیں آتا۔ اور شاید یہ حقیقت بھی ہے۔ میری تعلیمی زندگی میں بھی دوستوں کی حیثیت سے زیادہ لوگ نہیں رہے۔ اب بھی یہی کیفیت ہے۔ بدقسمتی سے مجھے آگے بڑھ کر جام اُٹھانے کا سلیقہ نہیں ہے میں دوستیاں کرنا چاہتا ہُوں مگر نہ جانے کیوں لوگ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔"

"میں نہیں مانتا ڈاکٹر صاحب! اور اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ملائیے ہاتھ آپ کے سامنے دوستوں کے انبار نہ لگا دیئے تو اختر حسین نام نہیں!"

"یقین کیجئے میں شکر گزار رہُوں گا"۔ نعمان نے کہا۔

"تو پھر طے ہوگئی بات؟"

"جی!"

"ویری گُڈ، ویسے ڈاکٹر صاحب ایک اہم سوال؟"

"فرمائیے۔"

"عِشق کیا ہے آپ نے کبھی؟"

"جی؟" نعمان کا مُنہ حیرت سے کھل گیا۔

"مُنہ بند کر لیں پتہ چل گیا"۔ اختر نے کہا اور نعمان نے جلدی سے مُنہ بند کر لیا۔ "دوسرا سوال"۔ اختر بولا اور نعمان تعجب سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ "یہ تصور صاحب اپنے تصور میں کسی کو بسائے ہُوئے ہیں کیا۔ کچھ پتہ ہے آپ کو؟"

"وہ پولیس والا ہے۔ اور اُسے صرف مجرموں سے عِشق ہے یعنی اُنھیں گرفتار کرنے سے اور سزا دِلوانے سے۔ وہ کیا عِشق کرے گا"۔ نعمان نے جواب دیا۔

"آپ کو یقین ہے؟"

"ایک بات بتا دُوں آپ کو۔ وہ مجھے صرف احکامات دیتا ہے، اور مجھے اُس کے احکامات ماننے پڑتے ہیں۔ بس میرے اور اُس کے درمیان یہی رشتہ ہے۔"

"کمال ہے یار۔ بہر حال کسی دِن آئیے ہمارے یہاں بلکہ ایک آدھ دِن میں ہی آ جائیے۔ آپ کی بہت سی دوستیاں کرا دی جائیں گی۔"

"ضرور حاضری دُوں گا۔"

"اجازت؟"

"ارے نہیں کچھ چائے وغیرہ"۔ نعمان نے کہا لیکن اختر اُس سے معذرت کر کے وہاں سے نِکل آیا مسئلہ کچھ حل نہیں ہُوا تھا۔

❋

ڈاکٹر نعمان نے اپنی خوبصورت کار پورچ میں روکی اور نیچے اُتر آیا۔ کوٹھی کا بیرونی حصہ سنسان پڑا ہوا تھا۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کار سے نیچے اُتر کر وہ احمقانہ انداز میں سر کھجانے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ دُور گیٹ پر کھڑا ہوا چوکیدار اُسی کی جانب نگراں تھا اُس نے ڈاکٹر نعمان کو اندر آنے کی اجازت تو دے دی تھی۔ لیکن یہ چہرہ اُس کے لئے اجنبی تھا۔ اگر کار میں بیٹھا ہوا شخص ایک شاندار سُوٹ میں ملبُوس نہ ہوتا اور اُس کی کار اِس قدر قیمتی نہ ہوتی تو شاید اِتنی آسانی سے اُسے اندر آنے کا موقع نہ ملتا۔ ڈاکٹر نعمان نے پریشانی کے عالم میں ہونٹ سکوڑے۔ اُسی وقت اُسے ایک لڑکی سامنے کے کوارٹروں کے حصّے سے آتی ہُوئی نظر آئی اور نعمان اُس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لڑکی اپنی دُھن میں مگن گردن جُھکائے چلی آ رہی تھی، پھر ڈاکٹر نعمان کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹھکی اُس نے ڈاکٹر نعمان کو دیکھا اور اُس کے چہرے پر دہشت کے آثار پھیل گئے۔ ڈاکٹر نعمان نے آگے بڑھ کر کہا۔

"معذرت چاہتا ہُوں دراصل"

"جج... جی مگر... کون ہیں آپ؟ کک... کیا بات ہے" لڑکی بوکھلائے ہُوئے انداز میں دُو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میں آپ کو صُورت سے اُچکا نظر آتا ہُوں جو آپ مُجھ سے اِس قدر خوف زدہ ہو رہی ہیں"

"کک... کون ہیں آپ؟ کک... کیا چاہتے ہیں" لڑکی نے عجیب سے انداز میں پُوچھا اور ڈاکٹر نعمان کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"کم از کم آپ کو کوئی نُقصان نہیں پہنچانا چاہتا"

"ارے واہ آپ مجھے کیوں نُقصان پہنچائیں گے۔ مم... میں نے کیا بگاڑا ہے آپ کا" لڑکی روہانسے لہجے میں بولی۔

"کمال کی شخصیت ہیں آپ، میں آپ سے کچھ پُوچھنا چاہتا ہُوں مگر آپ"

"مم... میں کچھ نہیں بب... بتا سکتی بس، کہہ دیا میں نے آپ سے مجھے اندر جانے دیجئے"

"محترمہ میں نے آپ کا راستہ تو نہیں روکا۔ دراصل میں آپ سے کچھ پُوچھنا چاہتا ہُوں"

"کہہ تو دیا کہ میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گی۔ ہٹیئے ناں سامنے سے" لڑکی نے کہا اور ڈاکٹر نعمان ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"عجیب خاتون ہیں آپ! میں تو آپ سے صرف اِتنا پُوچھنا چاہتا تھا کہ اختر صاحب"

"جی" لڑکی رُک گئی۔

"جی ہاں میں اختر صاحب سے ملنا چاہتا ہُوں"

"وہ... وہ تو یہاں نہیں رہتے" لڑکی نے جواب دیا اور ڈاکٹر نعمان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اختر عادل حسین! کیا وہ یہاں نہیں رہتے؟"

"بب... بالکل نہیں آپ... آپ مجھے اندر جانے دیجئے"

"حالانکہ میں نے ایک بار بھی آپ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ آپ کا گھر ہے ناں"

"مم... میں یہیں رہتی ہُوں"

"کیا نام ہے آپ کا" ڈاکٹر نعمان نے مُسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تنویر ہے میرا نام! مگر آپ کیوں پُوچھ رہے ہیں؟ مم... میں آپ سے کوئی تعارف تو نہیں ہے"

"اب ہو گیا ناں! آپ کا نام تنویر ہے اور میرا نام نعمان"

"ہوگا، مجھے کیا؟ آپ مجھے اندر تو جانے دیجئے"

"خُدا کی بندی میں نے آپ کو اندر جانے سے تو نہیں روکا ایک پتہ پُوچھ رہا تھا آپ سے۔ اختر عادل حسین نے یہی جگہ بتائی تھی مجھے اور مجھے بُلایا تھا"

دفعتاً ہی دُور سے ایک آواز اُبھری "تنویر کیا بات ہے؟ کون صاحب ہیں؟"

"مم... مجھے کیا معلوم؟ ہٹیئے راستے سے" تنویر نے کڑک کر کہا اور ڈاکٹر نعمان چند قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ حالانکہ تنویر کے اور اُس کے درمیان پانچ چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور اسی فاصلے سے گفتگو ہو رہی تھی۔ تنویر احمقانہ انداز میں تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اُس سے سوال کرنے والی ثناء تھی جو معمُول کے مطابق تیور کو خود پر مسلط کئے کوٹھی سے برآمد ہُوئی تھی۔ ثناء آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی ڈاکٹر نعمان کے پاس آگئی۔ اُس نے ڈاکٹر نعمان کو دیکھا پھر اُس کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"جناب تصوّر بیگ صاحب" اُس نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا اور نعمان ثناء کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"معاف کیجئے گا میں تصوّر بیگ نہیں ہُوں"

"ہُوں، تو آپ خیر دین ہوں گے۔ مگر اِس لباس میں" ثناء نے تیکھی نگاہوں سے ڈاکٹر نعمان کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"اتفاق سے خیر دین بھی نہیں ہُوں"

"گویا تیسرے بہروپ میں ہیں آپ۔ مقصد کیا ہے اور اب کیا چلانے آئے ہیں یہ بتائیے؟"

"آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہُوں؟"

"ثناء بی بی یہ سب سے اِسی طرح تعارف حاصل کر رہے ہیں" تنویر نے ثناء کا سہارا پاکر اپنے آپ کو سنبھالتے ہُوئے کہا۔

"اور اپنا تعارف کسی سے نہیں کرا رہے میں کہتی ہُوں تصوّر بیگ صاحب۔ آپ آخر ہیں کیا بلا؟ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ اور پھر کس ڈھٹائی سے آپ اپنے کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ ابھی آپ کی زبان سے یہ اُگلواؤں کہ آپ تصوّر بیگ ہیں؟"

"جی مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے یہ بات اُگلوا سکتی ہیں آپ مجھے تصوّر بیگ تو کیا قلندر بیگ، سکندر بیگ اور جو آپ کا دِل چاہے بنا سکتی ہیں لیکن محترمہ ایک مشکل میں ہُوں اگر حل ہو جائے تو بڑا شکر گزار ہُوں گا۔ ویسے آپ یقین کیجئے کہ میرا یہ پہلا تجربہ خاصا مشکل ثابت ہُوا ہے میرے لئے"

"فرمائیے، فرمائیے۔ میں بہت زیادہ چالاک لوگوں کو پسند نہیں کرتی" ثناء نے کہا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ اتفاق سے میں بالکل بے وقُوف آدمی ہُوں" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"کیا آپ صرف یہ گفتگو کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں؟"

"جی نہیں مجھے اختر عادل حسین کا پتہ چاہیئے۔ اختر صاحب نے مجھ سے مُلاقات کی تھی اور مجھے اپنے گھر پر دعوت دی تھی۔ یہ خاتون بتا رہی ہیں کہ اختر یہاں نہیں رہتے۔ کوئی مدد کی جا سکتی ہے اِس سلسلے میں میری؟"

"اوہ! اختر سے ملنا چاہتے ہیں آپ۔ نُدرت! نُدرت! ذرا اِدھر آؤ" ثناء نے نُدرت کو آواز دی اور نُدرت کا نام سُن کر نعمان کے چہرے پر کسی قدر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ ثناء شاید نُدرت سے رُخصت ہو کر ہی یہاں آئی تھی یا نُدرت کہیں آس پاس موجود تھی۔ چند لمحات کے بعد نُدرت بھی وہاں پہنچ گئی۔ اُس نے بغور ڈاکٹر نعمان کو دیکھا اور پھر مُسکراتی ہُوئی آگے بڑھ آئی۔

"ہیلو ڈاکٹر نعمان"

"خُدا کا احسان ہے کہ یہاں اِس کوٹھی میں کوئی تو ایسا شخص موجود ہے جو مجھے ڈاکٹر نعمان کے نام سے پُکار رہا ہے محترمہ! اختر صاحب نے کچھ وعدے کئے تھے اور اُنہی وعدوں کی ڈور میں ہاتھ میں پکڑے پکڑے یہاں تک آگیا ہُوں۔ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ میری بدبختی یہاں تک میرے تعقب میں ہے۔"

"ارے کیا ہو گیا، آپ اندر آئیے ناں۔ آئیے پلیز۔ ثناء یہ ڈاکٹر نعمان ہیں۔ تصوّر بیگ صاحب کے کزن۔ میری اِن سے مُلاقات ہو چکی ہے۔ میں نے اور اختر نے اِنہیں یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ آئیے ڈاکٹر نعمان صاحب"

"بے حد شکریہ لیکن یہ جو مس تنویر نے فرمایا ہے کہ اختر حسین یہاں نہیں رہتے۔ اِس میں کوئی صداقت ہے؟"

"آپ آئیے تو سہی۔ ہم لوگ تو ہیں یہاں"

"جی... جی حاضر" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور نُدرت اُسے ساتھ لئے ہُوئے ڈرائینگ رُوم کی جانب بڑھ گئی۔ تنویر کہیں چلی گئی تھی۔ لیکن ثناء اُن دونوں کے پیچھے پیچھے ہی ڈرائینگ رُوم تک آئی تھی۔ اُسے اب اِس بات پر حیرت ہُوئی تھی کہ یہ ڈاکٹر نعمان ہے اور تصوّر بیگ نہیں ہے لیکن دونوں کے چہرے کتنے ملتے جُلتے ہیں آپس میں۔ اب جو ذرا غور کیا تو یہ اندازہ ہو گیا کہ واقعی ڈاکٹر نعمان اور تصوّر بیگ میں تھوڑا سا فرق ہے۔ گو یہ فرق بہت زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی کافی ہے۔ نُدرت ڈاکٹر نعمان کو لئے ہُوئے ڈرائینگ رُوم میں داخل ہو گئی اور ڈاکٹر نعمان ایک صوفے پر بیٹھ کر اپنی گردن پر پھونکیں مارنے لگا۔

"یہ بتائیں آپ کیا پیش کرے ہم"

"خُدا کی قسم باہر اِتنے ہوٹل ہیں کہ گنے نہیں جا سکتے اور وہاں ہر چیز ملتی ہے۔ یہاں آکر میری جو پذیرائی ہُوئی ہے بس ذرا وضاحت ہو جائے اور اُس کے بعد واپسی کی اجازت مِل جائے" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"کمال ہے بہت بد دِل ہو گئے ہیں آپ۔ بھئی ثناء کسی کو آواز دے کر ڈاکٹر نعمان صاحب کے لئے کچھ منگواؤ" نُدرت نے کہا اور ثناء نے گردن ہلا دی پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی چند ہی لمحات کے بعد واپس آگئی۔ شاید کوئی قریب ہی مِل گیا تھا جس سے کافی کے لئے کہہ دیا گیا تھا۔ نُدرت مُسکراتے ہُوئے ڈاکٹر نعمان سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کے ساتھ عموماً اِس قسم کی ٹریجڈی ہو جایا کرتی ہے"

"رہنے دیجئے محترمہ یہ سارے معاملات تقدیر کے ہیں۔ اور اب تو میں نے تقدیر سے شکوہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ ویسے اختر صاحب کا معاملہ..."

"اختر صاحب چند روز قبل یہیں رہتے تھے۔ اُن کے بھائی خالد اور ڈیڈی عادل حسین صاحب کینیڈا کے باسی تھے لیکن بہرطور وہ وہاں کی رہائش ترک کر کے اپنے وطن میں آگئے ہیں اور کافی دِن یہاں رہے لیکن اب اُنھوں نے اپنی کوٹھی خرید لی ہے اور اُس

میں منتقل ہوگئے ہیں خونی طور پر اختر صاحب یہاں سے اتنے اٹیچ ہیں کہ انھوں نے آپ کو یہیں کا پتہ بتا دیا ویسے شامیں اُن کی یہیں گزرتی ہیں. میرا خیال ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد آنے والے ہوں گے۔"

"جی! خیر اب کیا کہا جا سکتا ہے لیکن تجربہ کچھ بہتر نہیں ہوا۔"

"آپ اطمینان سے تشریف رکھیئے بلکہ ہم آپ کو کمپنی دیں گے. اختر صاحب آجائیں تو اُن سے جو چاہیں شکایت کر لیجئے گا۔"

"نہیں جی شکایت کیسی لیکن وہ محترمہ میرا مطلب ہے تنویر صاحبہ۔"

"جی... جی۔"

"کچھ عجیب سی خاتون تھیں۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور ندرت کے ساتھ ثناء بھی ہنس پڑی پھر ندرت نے چونک کر کہا۔

"ارے اِن سے تو ملئے نعمان صاحب یہ ثناء احسان احمد ہیں۔"

"جی میں اپنا نام تو آپ سے عرض کر ہی چکا ہوں ثناء صاحبہ اور آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ میں تصور بیگ نہیں ہوں۔"

"معافی چاہتی ہوں لیکن آپ تصور بیگ سے بہت ملتے ہیں۔ دو جڑواں بھائی تو ایسے ہو سکتے ہیں لیکن دو کزن اتنی مماثلت رکھتے ہوں یہ پہلی ہی بار دیکھا ہے میں نے۔ تاہم ڈاکٹر نعمان صاحب آپ اتنے بزدل نہ ہوں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔"

"بے حد شکریہ۔ رفتہ رفتہ میری تقدیر کے مسائل حل ہوتے جا رہے ہیں۔"

"کون سے مسائل؟" ندرت نے سوال کیا۔

"اُس دن آپ سے گفتگو ہوئی تھی نا مس میری. مس ندرت تو میں نے عرض کیا تھا کہ میں دوستیوں کے معاملات میں بہت بدنصیب ہوں یا تو مجھے دوست بنانا نہیں آتے یا پھر میری تقدیر میں دوستیاں نہیں ہیں۔ آپ نے ہمیں دعوت دی تھی آج اُس دعوت کے سہارے یہاں چلا آیا تھا۔"

"بس ذرا سی غلطی ہوگئی۔ اختر صاحب نے آپ کو اپنے گھر کا پتہ نہیں بتایا۔" ندرت نے کہا۔ ثناء اِس دوران ندرت کو گھور رہی تھی اور ندرت بھی کسی قدر اُلجھ گئی تھی کیونکہ ثناء سے اِس سے پہلے کبھی تصور بیگ کے ہاں جانے کا تذکرہ نہیں ہوا تھا

✱

اِس دلچسپ کہانی کے بقیہ واقعات چوتھے (آخری) حصّہ میں ملاحظہ فرمائیں

ایم اے راحت
۲

بہرطور نُدرت نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بعد میں ثناء کو بتادے گی کہ اصل مسئلہ کیا تھا اور اِس سلسلے میں رِدا ہی کا حوالہ دے گی ورنہ ثناء کی زبان بند کرنا آسان کام نہیں تھا. اتفاق سے ثناء کا مُوڈ بھی بہتر ہی تھا اور شاید نعمان کی آمد سے وہ ناخوش نہیں تھی. اِس لئے کافی دلچسپی سے گفتگو ہوتی رہی. تھوڑی دیر کے بعد عُمدہ قسم کی کافی اور اس کے ساتھ بہت سی چیزیں ڈاکٹر نُعمان کے سامنے پہنچادی گئیں.

"اِس تکلّف کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ تکلّف تو اب جاری رہے گا بلکہ شام کی چائے پر آپ کی ملاقات تمام لوگوں سے کرائی جائے گی۔"

"نہیں خاتون! شام کی چائے میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوسکوں گا. ہاں اگر اِسی قسم کی کوئی دعوت کسی اور دِن کے لئے مِل جائے تو ضرور حاضری دُوں گا۔"

"کیوں، شام میں کیا مصروفیت ہے؟"

"عرض کیا ناں ہاؤس جاب کر رہا ہُوں. ڈیوٹی ہے میری پانچ بجے سے۔" ڈاکٹر نعمان نے جواب دیا.

"اختر صاحب سے نہیں مِلیں گے؟"

"پھر کسی دِن مِل لُوں گا. آج آپ لوگوں سے ہی ملاقات ہوگئی کافی ہے۔"

"ہُوں! لیجئے اگر یہ بات ہے تو پھر کافی پیجئے۔" نُدرت نے کافی کی پیالی اُس کے سامنے پیش کرتے ہُوئے کہا.

"بے حد شکریہ۔"

"ویسے ڈاکٹر نُعمان صاحب! ہمیں ذرا کچھ تصوّر بیگ صاحب متعلق بتائیے۔" ثناء نے کہا.

"خاتون! کسی پولیس والے کے بارے میں پُوچھ گچھ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"ارے ہاں یہ تو بتائیے کہ کیا وہ منیلا سے واپس آگئے؟"

"جی نہیں! سُنا ہے کہ وہاں سے کہیں اور نِکل گئے ہیں. بس گھر پر اطلاع دی تھی کہ واپسی میں کافی وقت لگ جائے گا۔"

"اوہ! اچھا... اچھا۔"

"نُدرت تمہیں تو لگتا ہے. تصوّر بیگ کے بارے میں ہر بات معلوم ہے۔" ثناء نے اُسے گھُورتے ہُوئے کہا اور نُدرت نے ایک گہری سانس لی. ثناء اپنا تجسُّس چند لمحات کے لئے بھی نہ چُھپا پائی تھی لیکن بہتر موقعہ تھا کہ اِسی وقت صُورتِ حال کی تشریح کردی جائے ورنہ بعد میں نہ جانے ثناء کیا کیا سوچنے لگے. چنانچہ نُدرت نے کہا.

"بھئی تمہارے چکر میں اِن سب سے ملاقات ہُوئی تھی میں اور اختر تصوّر بیگ صاحب کے گھر گئے تھے. یہ معلوم کرنے کے لئے کہ محترمہ رِدا کے بارے میں اُن لوگوں کو تو کوئی بات معلوم نہیں ہے، چنانچہ اُس وقت نعمان صاحب سے ملاقات ہُوئی اور پتہ چلا کہ

تصوّر بیگ صاحب متیلا گئے ہُوئے ہیں۔ اُسی وقت ہمارا اِن سے تعارف ہُوا تھا۔"

"ہُوں، ہُوں، اچھا ٹھیک" ثناء نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔ نعُمان نے اختر کے گھر کا پتہ پُوچھا تو ثناء نے اُسے پتہ نوٹ کرا دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"اب آج تو آپ کو مجبُور نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر کسی دِن ضرور تشریف لائیے۔ آپ سے مل کر خوشی ہُوئی ہے۔"

"بے حد شکریہ، ویسے یہاں آمد کی ابتدا تو بڑی خطرناک ہُوئی تھی لیکن انتہا میرا خیال ہے کافی اطمینان بخش ہے۔"

"تصوّر بیگ کے بارے میں کچھ اور بتائیے اور ہاں ذرا یہ تو بتائیے کہ کیا خیر دین کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں؟" ثناء نے سوال کیا۔

"نہیں ثناء، بے چارے خیر دین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ہم اِن سے پُوچھ چکے ہیں" ندرت نے فوراً ہی بات اُچک لی اور ثناء کو اس کا کوئی شُبہ نہیں ہُوا۔ البتہ ڈاکٹر نعُمان نے ایک لمحے کے لئے ندرت کی صُورت دیکھی اور پھر خود بھی انجان بن گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے اُن لوگوں سے اجازت طلب کر لی اور ندرت اور ثناء اُسے باہر تک چھوڑنے آئیں۔ ڈاکٹر نعمان نے ہاتھ ہلایا اور دوبارہ ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ ویسے اُسے یہ تجربہ خاصا دِلکش محسوس ہُوا تھا۔ اچھے لوگ تھے اور اُن سے ملاقات کی جا سکتی تھی۔ وہ کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل آیا اور سُست روی سے کار ڈرائیو کرتا ہُوا آگے بڑھتا رہا۔ زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اُس نے اُسی لڑکی کو دیکھا جس نے اپنا نام تنویر بتایا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر شاید کسی سواری کی تلاش میں کھڑی ہُوئی تھی۔ ڈاکٹر نعُمان کے ہونٹوں پر گہری مُسکراہٹ پھیل گئی اور تنویر کے سامنے اُس نے کار روک دی۔ تنویر چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"آپ... آپ" اُس نے بوکھلاہٹ کے عالم میں کہا۔

"مِس تنویر! آپ شاید کہیں جا رہی ہیں؟"

"ہاں ذرا بازار جا رہی ہُوں۔ لیکن آپ کو کیا؟" تنویر نے کہا۔

"دیکھئے میں اختر حسین کا دوست ہُوں اور اچھے دوستوں میں شمار ہوتا ہُوں۔ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہُوں۔ ڈاکٹر قسم کے لوگ کسی بھی طور دوسروں کے لئے ضرر رساں نہیں ہوتے۔"

"تو میں کیا کروں؟" تنویر اُسی انداز میں بولی۔

"میں چاہتا ہُوں کہ آپ میری کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں اور جہاں حکم دیں میں آپ کو وہاں پہنچا دُوں۔ اب دیکھئے نا اِتنی شناسائی تو ہے ہم لوگوں کے درمیان۔ میں آپ کی رہائش گاہ میں رہنے والے ایک فرد کا دوست ہُوں چنانچہ آپ کا بھی دوست ہُوا۔"

"ارے واہ زبردستی ہم... میں... میں گاڑی میں نہیں بیٹھ سکتی۔ پلیز آپ جائیے" تنویر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان مُسکراتا رہا پھر بولا۔

"میرا دِل دُکھے گا آپ کو اِس طرح کھڑے دیکھ کر۔"

"کیوں دُکھے گا؟"

"بس دِل کمبخت بتا کر تھوڑی دُکھتا ہے۔ خود بخود دُکھنے لگتا ہے۔"

"اچھا" تنویر حیرت سے آنکھیں نکال کر بولی۔

"جی بالکل اب آپ دیکھئے ناں آس پاس کوئی سواری نہیں ہے اور آپ یہاں سواری کے انتظار میں کھڑی رہیں گی میرے پاس یہ کار ہے اور یہ کافی لمبی چوڑی ہے۔ اگلا حصّہ بھی خالی ہے۔ اور پچھلا حصّہ بھی اب میں یہ سوچوں گا کہ کاش آپ میری یہ دعوت قبول کر لیتیں اور میرے ساتھ کار میں آ بیٹھتیں اور اگر آپ نہیں بیٹھیں گی تو میرا دِل دُکھے گا ناں کہ ایک خاتون نے میری شرافت پر بھروسہ نہیں کیا۔"

"آپ باتیں کیوں بنائے جا رہے ہیں۔ میں نہیں بیٹھوں گی۔ آپ کی کار میں۔"

"اپنی سمجھ کر بیٹھ جائیے۔"

"واہ کیسے سمجھ لُوں اپنی جب یہ میری ہے ہی نہیں۔"

"ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر نعمان نے ہنستے ہُوئے کہا نہ جانے کیوں اُسے یہ بوکھلائی بوکھلائی سی لڑکی بہت پیاری لگی تھی، پہلی ہی نگاہ میں اُس نے اُسے پسند کیا تھا لیکن اُس کا یہ انداز اُسے مزید بھایا تھا۔

"دیکھئے پلیز آپ اپنی کار آگے بڑھا لیجئے۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، میں... میں واپس جا رہی ہُوں پھر کسی دِن بازار چلی جاؤں گی" تنویر تیزی سے واپسی کے لئے مُڑ گئی۔ ڈاکٹر نعُمان کار روکے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس نے کار ریورس کی اور تیزی سے تنویر کے قریب پہنچ گیا۔ تنویر ایک لمبی سی کراہ کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی۔

"سُنیئے خاتون آپ میرے ساتھ نہیں جانا چاہتیں تو نہ جائیے، میں جا رہا ہُوں۔ آپ میری وجہ سے اپنا بازار جانے کا ارادہ کیوں مُلتوی کر رہی ہیں؟" یہ کہہ کر ڈاکٹر نعُمان نے اپنی کار آگے بڑھا دی۔ تنویر اُسے عقب نما آئینے میں حیران کھڑی نظر آ رہی تھی۔

*

رُدا نے کئی بار احسان احمد صاحب سے درخواست کی تھی کہ

اُسے اُس کی نوکری پر جانے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن احسان احمد صاحب نے اُسے دو ٹوک لہجے میں کہہ دیا تھا کہ اُسے پندرہ دِن اِسی طرح گزارنے ہوں گے، بہرطور یہ پندرہ دِن گزر گئے اور رُدا نے سولہویں دِن احسان احمد صاحب سے اجازت بھی نہیں... لی تھی بس خاموشی سے تیار ہُوئی اور آفس پہنچ گئی۔ سب کچھ جُوں کا تُوں تھا۔ کافی عرصے کے بعد اپنے دفتر میں آئی تھی۔ میز پر بیٹھ کر اُس نے اردلی کو بُلایا اور چائے طلب کر لی، چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہُوئے وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی رہی۔

"نہ جانے اِس دوران یہاں کاروباری معاملات میں کیا کیا کچھ ہو چکا ہوگا اب سارا کام اَز سرِ نو دیکھنا ہوگا۔ کیا ہُوا تھا یہ، کیا حماقت ہو گئی تھی اُس سے، بلاوجہ اِس بھرے پڑے گھر پر لات مار کر چلی گئی۔ کم از کم سہارا تو ہے میرا۔ وہاں پہنچ کر میں کِس طرح خود کو بے یار و مددگار سمجھنے لگی تھی۔ بے شک زندگی گزارنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ہاتھ آ ہی جاتا۔ لیکن یہ رونقیں اور دِلچسپیاں کہاں ہوتیں، وہاں میرے دِل کی ویرانیاں ہوتیں. اور میں ہوتی۔ بے چارے تیمور پر بھی یہ کیفیت اثر انداز ہو سکتی تھی۔ واقعی غلطی ہُوئی تھی مُجھ سے!"

ثناء نے رُدا کو بے شک معاف کر دیا تھا لیکن رُدا جب بھی کبھی اُس کے بارے میں سوچتی اُسے ایک جُرم کا سا احساس ہوتا۔ ثناء جیسی بے لوث محبت کرنے والی بھلا اور کون مِل سکتی تھی، بے غرض اُس نے رُدا کا کتنا ساتھ دیا تھا، اِتنا چاہتی تھی وہ اُسے کہ کسی دوست کا کسی دوست کو چاہنا ممکن نہ ہو۔ مجھے واقعی اِس طرح نہیں جانا چاہیئے تھا۔ آفندی صاحب زبردستی تو مجھے نہیں لے جا سکتے تھے بھلا اُنھیں قانونی طور پر کیا حق پہنچتا ہے مجھے اپنی تحویل میں لینے کا، میری مرضی میں اُن کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ پتہ نہیں اُنھیں میری واپسی کا علم ہُوا ہے یا نہیں، ہو بھی گیا تو کیا بگاڑ لیں گے، احسان احمد صاحب نے مُجھ سے وعدہ کیا کہ مجھے میری مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے گی. ہاں نانا جان سے میں کچھ نہیں چاہتی جب میری ماں ہی کو اُن سے کچھ نہ مِلا تو میں اُن کی یہ دولت یہ جائیداد لے کر کیا کروں گی؟ تھوکتی ہُوں میں اِس دولت پر۔ اِس جائیداد پر جس نے مجھ سے میری ماں چھین لی۔ رُدا سوچتی رہی۔ اُس کے دِل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آ رہے تھے اور پھر ایک اور تصوّر اُس کے ذہن میں گھس آیا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا، نہ جانے کیوں اِتنی دیوانی ہو گئی تھی، یہ تصوّر... تصوّر بیگ کا تھا جس نے اُسے یہ سوچنے پر مجبُور کر دیا تھا۔ تصوّر بیگ... خیر دین۔ وہ میرے ساتھ میرے پیچھے پیچھے لاہور پہنچ گیا تھا اپنی تمام تر مصروفیتیں ترک کر کے صرف میرے لئے، صرف میرے لئے کیوں، اور اُس کی نگاہوں میں ڈائری کے وہ صفحات آ گئے۔

"تو آؤ کہ رازِ پنہانی افشائے عقیدت کرتا ہُوں!

تم نے یہ راز افشا کرنے سے پہلے میرے بارے میں کیوں نہ سوچا تصوّر، تم تو ایک اعلیٰ درجے کے پُولیس آفیسر ہو۔ تم... تم عام لوگوں سے زیادہ ذہین ہو۔ تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ میں کِس کشتی کی سوار ہُوں اور اِس کے باوجود کہ تمھیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ پھر تم نے اِس طرح کیوں میری جانب قدم بڑھائے، تم جانتے تھے تصوّر کہ میری ماں کو ایک تمہاری جیسی شکل والے ناگ نے ڈسا تھا۔ میں مردوں کے بارے میں کوئی اچھا خیال نہیں رکھتی تھی۔ یہ بات تم جانتے تھے تصوّر۔ اُس کے بعد بھی تم نے اِس طرف قدم بڑھائے، تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ جس جگہ محبتوں کا بسیرا ہوتا ہے وہاں ایک گلے ہُوئے ٹوٹے ہُوئے دروازے کے سوا کچھ نہیں ہوتا پھر تم نے اِس دروازے کو کھولنے کی کوشش کیوں کی، نہیں تصوّر بیگ قصُور صرف میرا نہیں تمھارا بھی ہے۔ رُدا کے کانوں میں وہ تمام الفاظ گونجنے لگے۔

تصوّر بیگ نے اُسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہاں سب کچھ، وہ رُدا کی کہانی بہت پہلے سے جانتا تھا لیکن اُس نے یہ کہانی کسی کو نہیں سُنائی تھی۔ تاوقتیکہ یہ کہانی خود بخود منظرِ عام پر نہ آئی اور آفندی صاحب نے اُس کے بارے میں دوسرے لوگوں کو کچھ نہ بتایا۔ تصوّر بیگ نے بِلا شُبہ خیر دین بن کر جگہ جگہ میرا تحفُظ کیا۔ مجھے ہر آفت سے بچایا، ہر اُلجھن میں میرا ساتھی رہا اور میں... میں اُسے خیر دین ہی سمجھتی رہی لیکن اُس کے الفاظ مجھے ہمیشہ چونکا دیا کرتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ یہ شخص وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے۔ میں نے ہی تو اُس سے کہا تھا کہ وہ اگر میرا راز کھول سکتا ہے تو کھول دے اور اُس نے میرا یہ چیلنج قبُول کر لیا تھا لیکن کِتنا باظرف تھا وہ کہ اِتنے عرصے پہلے وہ اِس راز کو جاننے کے باوجود اُسے میرے حوالے کرنے کے باوجود اُس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور اُس وقت اِن حقیقتوں کو آشکارا کیا جب میں نے خود چاہا۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین انسان ہے اُس نے صُورتِ حال کا اندازہ لگا اور میرے پیچھے پیچھے لاہور تک آیا۔ آہ! کتنی بُزدِل تھی میں اِس

دُنیا سے۔ اُس نے میرا تحفظ کیا اور میں نے۔۔۔ میں نے لاہور والے گھر میں اُس سے پہلے تو بہت اچھے انداز میں گفتگو کی۔ اُس نے سب کچھ ہی تو بتا دیا۔ یہ تک بتا دیا کہ وہ شہاب صاحب کی وجہ سے خیر دین بن کر وہاں پہنچا تھا اور رشید کا حوالہ بھی دیا تھا اُس نے، یہ ساری باتیں صرف مجھے بتائی ہیں صرف مجھے۔ ابھی تک جو تمام باتیں اہم ترین سرکاری راز ہیں اُس نے اِن رازوں کو میرے سامنے افشا کر دیا۔ تو آؤ کہ رازِ پنہانی افشا نے عقیدت کرتا ہُوں، یہ شعر یا مصرع تو اُس کی تمام حقیقتوں کی تفسیر بن گیا تھا لیکن میں نے اُس کے بعد۔۔۔ میں نے اُس کے بعد وہ سب کچھ کیا آہ! بہت کچھ کہہ دیا تھا میں نے اُسے۔ لیکن غائب کہاں ہے وہ؟ پتہ نہیں اُسے میرے یہاں آنے کی اطلاع مِل گئی یا نہیں؟ لاہور میں بھی تو اُس کے بعد مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ کیسے معلوم ہو کہ وہ یہاں موجود ہے یا نہیں؟ خیر دین بن کر بھی وہ کوٹھی نہیں پہنچا تھا۔ حالانکہ دادی امّاں کی مزاج پرسی کے لئے آتا جاتا رہتا تھا اور کہتا تھا کہ اُن کی قدم بوسی سے اُسے سکون حاصل ہوتا ہے، پھر وہ دادی امّاں کے لئے بھی وہاں نہیں آیا۔ ناراض ہو گیا ہو گا مجھ سے۔ آہ! ناراض ہونا ہی چاہئیے تھا اور اچھا ہے کہ ناراض ہو گیا ہے۔ بلاشبہ احسان احمد صاحب نے احسانات کی انتہا کر دی ہے لیکن میری زندگی میں تاریکیوں اور ویرانیوں کے سوا کیا ہے؟ میرے مستقبل میں کچھ نہیں ہے سوائے اِس کے کہ میں تیمور کی پرورش کروں۔ اپنی ماں کی آرزو پُوری کر دوں میں تو اپنے آپ کو اس کے لئے بہت پہلے وقف کر چکی ہُوں۔ نہیں تصوّر بیگ ہو سکتا ہے میرے دِل میں تمھاری گنجائش ہو اگر نہ ہوتی تو تم مجھے بار بار کیوں یاد آتے؟ ہو سکتا ہے جناب تصوّر بیگ ایک عورت کی حیثیت سے میں تم سے متاثر ہُوئی ہُوں۔ میں نہیں جانتی کہ ایسا ہُوا ہے یا نہیں لیکن ہو بھی گیا ہے تو بے سُود ہے اِس لئے کہ میں نے اپنی زندگی سے اِن لطافتوں کو ہمیشہ کے لئے نکال پھینکا۔ میری آنکھوں میں محبت کے خواب کبھی نہیں جاگ سکتے تھے، مجھے معاف کر دینا تصوّر۔ مجھے معاف کر دینا اگر تمھارا دِل ٹوٹا ہے تو مجھے دُکھ ہے اور اگر تم خود کو سنبھالا دے سکتے ہو تو اِس سے اچھی بات اور کوئی نہیں ہے، کچھ بھی تو نہیں کر سکتی میں تمھارے لئے۔ ہاں تم سے میں نے جو رویّہ اختیار کیا کاش کوئی اُس کا نعم البدل ہوتا۔ کاش کسی اور طرح میں تمھیں اِن تمام باتوں سے باز رکھ سکتی۔ میں نے تم سے تمھاری فطرت کی شوخی چھینی ہے۔ مجھے اِس کے لئے معاف کر دینا تصوّر، مجھے اِس کے لئے معاف کر دینا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہُوئی تو اُس نے خود کو سنبھال لیا۔ آنے والے احسان احمد صاحب تھے۔ وہ انھیں دیکھ کر بدحواسی کے عالم میں کھڑی ہو گئی۔ احسان احمد اندر آ گئے تھے۔

"ارے۔ ارے بھئی یہ احترام ہو رہا ہے ہمارا؟"

"آپ نے مجھے بُلوا لیا ہوتا۔"

"کیوں؟ ہمارا یہاں آنا کچھ غلط ہو گیا۔" احسان احمد نے آگے بڑھتے ہُوئے کہا۔

"نہیں میرا مطلب ہے اگر کوئی کام تھا۔"

"ذاتی کام کے لئے تو ہمیں ہی یہاں آنا پڑا۔" احسان احمد مُسکراتے ہُوئے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے پھر بولے۔

"بیٹھو، بیٹھو۔" رُدا اپنی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"ہاں بھئی تمھارے سر پر تو ایک انبار ہو گا، بہتر یہ ہے کہ ایک ساتھ کام کا بوجھ سر پر مت ڈالنا۔ تم اگر چاہو تو میں تمھارے لئے ایک معاون کا بندوبست کر سکتا ہُوں۔"

"نہیں ضرورت نہیں ہے۔ میں کام بے شک آہستہ آہستہ کروں گی لیکن سب کچھ سنبھال لُوں گی۔"

"بھئی قصور ہمارا نہیں ہے یہ تمھاری ذمّہ داری ہے تم نے بلاوجہ اپنی اِس سیٹ کو محروم کر دیا تھا۔"

"معافی چاہتی ہُوں۔" رُدا نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے۔۔۔ ارے تم تو سنجیدہ ہو گئیں۔ رُدا بہت تکلف کرتی ہو۔ بہت زیادہ تکلف کرتی ہو۔ دراصل آج میں تم سے کچھ ذاتی باتیں کرنا چاہتا ہُوں۔ جی چاہا ہے بس اور اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکا" رُدا تشویش سے احسان احمد صاحب کو دیکھنے لگی۔ احسان احمد بولے۔

"دیکھو رُدا بیٹے اپنی فطرت کے بارے میں چند الفاظ کہہ رہا ہُوں۔ جو شاید مرتے دم تک کسی سے نہ کہتا۔ تم سے کہنے کو جی چاہا ہے، مایوس نہ کرنا مجھے جھوٹ نہ سمجھنا۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں انکل۔" رُدا نے کہا۔

"ہاں بیٹے میں جھوٹ بہت کم بولتا ہُوں۔ انتہائی مشکل حالات میں بولتا ہُوں اور خدا سے ہمیشہ یہی دُعا کرتا ہُوں کہ ایسا کوئی مشکل مرحلہ نہ آئے۔ میں رُدا۔۔۔ میں انسانوں سے محبت کرتا ہُوں۔ میں جانتا ہُوں کہ ہم چند روز کے لئے اِس دُنیا میں آتے ہیں۔ اپنے لئے ایک جگہ بناتے ہیں۔ میں بچپن سے جوانی تک کی بات نہیں کرتا۔ محبتوں سے اِس دُنیا کا وجُود قائم ہے۔ اگر محبتوں کا تصوّر ذہنوں سے ختم ہو جائے تو کوئی ماں اپنی اولاد کو پرورش نہ کرے،

کوئی باپ اپنے بچّوں کے لئے اپنی زندگی قربان نہ کر دے چنانچہ یہ تصوّر کبھی ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ جس طرح خُدا نے ہمیں دو آنکھیں، دو ہاتھ اور دو پاؤں دیئے ہیں اِسی طرح ہمارے دِلوں کو محبت سے منوّر کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی فطری خرابیوں کا سہارا لے کر نفرتوں کی بنیاد بھی ڈال لیتے ہیں۔ لیکن فطرت کبھی نفرت سے پرورش نہیں پاتی۔ فطرت محبت کی پرستار ہے اور اگر موقع مِل سکے تو صرف محبت کرو۔ صرف محبت۔ نفرت کا نام لُغت سے نکال پھینکو یہی نظریہ ہے، بعض لوگوں سے تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں لیکن وہ بھٹکے ہُوئے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بھُول جاتے ہیں کہ دُنیا میں اُن کے لئے صرف چند سانسیں ہیں اپنے آپ کو موت کی آغوش میں جانے سے کبھی نہیں روک سکتے۔ منصوبہ بندیاں کرتے ہیں، کرنی چاہئیں۔ میں اُن سے منکر نہیں ہُوں لیکن اِن منصوبہ بندیوں میں کسی کے لئے تکلیف، کسی کی دِل آزاری نہ ہو۔ کیونکہ کون جانتا ہے کہ کون کتنا دُکھی ہے؟ خیر، کچھ طویل گفتگو ہو گئی میرا مطلب یہ تھا بیٹے کہ تم مجھے ثناء کے ساتھ نظر آئیں۔ ثناء میری اولاد ہے۔ تمھیں اِتنا چاہتی ہے وہ کہ مجھے حیرت ہوتی ہے اور میں سوچنے لگتا ہُوں کہ کیا وہ مجھے بھی اِتنا چاہتی ہے؟ کیا اپنی ماں کو بھی اِتنا ہی چاہتی ہے؟ بہر طور اِس کا تجزیہ تو نہیں کر سکا لیکن تمھارے لئے اُس کے دِل میں جو چاہت ہے اُس کا اندازہ مجھے ہو چکا ہے۔ بیٹے اگر میں تم سے یہ الفاظ کہوں کہ میں بھی تمھیں ثناء ہی کی مانند چاہتا ہُوں تو اِس میں تمھیں کچھ کھوٹ محسوس ہو گی۔ لیکن یقین کرو کہ اگر تم اپنی محبت کو میرے دِل میں تلاش کرو تو شاید ثناء سے تھوڑی ہی کم نکلے۔ بس اِس سے آگے اِس مسئلے میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کوئی تکلف میرے اور اپنے درمیان مت رکھنا جس وقت جو دِل چاہے کہہ دینا۔ ثناء بھی مجھ سے ضد کرتی ہے۔ آج پتہ نہیں کیوں کچھ جذباتی سی کیفیت کا شکار ہُوں۔ دِل پر ایک بوجھ تھا سوچا کہ تمھارے پاس آؤں اور تمھارے سامنے دِل کا یہ بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں کافی اُلجھا ہُوا ہُوں اِن دنوں۔ اُس وقت سے جب سے شہاب نے ہمارے سینے میں خنجر گھونپا ہے۔ بھائی ہے میرا۔ بہت چاہا تھا میں نے اُسے۔ میں تو صرف چاہتوں کے لئے ہی زندہ ہُوں لیکن وہ ہماری چاہتوں کا جواب محبت سے نہ دے سکا۔ خیر خُدا اُسے خوش رکھے، لیکن ایک کام وہ غلط کر گیا۔ مجھے میری زندگی کی تمام خوشیوں سے محرُوم کر گیا۔ آج میرے دِل کے آخری خانے میں ایک چور ہے، ایک ایسا چور جو دُنیا کے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا کروں زبان پر تالے لگا دیئے گئے ہیں۔ غلام احمد کے بارے میں کہنا چاہتا ہُوں۔ کیا کروں اُس شخص کا رُدا، جس نے میری زندگی خرید لی ہے۔ کیسا انسان ہے وہ؟ کیا اس کے بعد کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ محبت ایک لافانی جذبہ نہیں ہے؟ کیا کیا تھا میں نے اُس کے ساتھ؟ کچھ نہیں، یقین کرو صرف ڈرائیور تھا وہ میرا۔ میں اُس سے میٹھے بول بول لیتا تھا۔ محبت سے بات کر لیتا تھا بس اور اُس نے اپنا سنہرا

مستقبل مجھے دے دیا رُدا۔ میں اِس سُنہرے مستقبل کا بار نہیں اُٹھا پا رہا ہُوں۔ میں مشورہ چاہتا ہُوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اور غلام احمد جب میرے لئے میری کار کا دروازہ کھولتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُس سے کہوں سر! میں آپ کے لئے دروازہ کھولتا ہُوں آپ اندر تشریف رکھیے۔ یہ سچائی ہے رُدا۔ یہ ایک ٹھوس سچائی ہے۔ اُس نے مجھے اپنی جگہ دے رکھی ہے اور میں اِس جگہ کو ہمیشہ اپنے اُوپر قرض سمجھتا ہُوں۔ یہ قرض میں کیسے ادا کروں؟ مجھے اِس کا کوئی ذریعہ بتا سکتی ہو؟" رُدا عجیب سی نگاہوں سے احسان احمد کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"انکل میں آپ کی پریشانی سمجھتی ہُوں۔"

"یہ سارا کھیل غلام احمد کا ہے رُدا۔ ایک ایک پائی اُس کی ہے، ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اُس کے بل پہ کر رہے ہیں۔ وہ اِن تمام چیزوں سے اپنا کوئی رابطہ نہیں رکھتا اب مجھے بتاؤ یہ کتنے عرصے ہو سکے گا؟ اب تو جو کچھ میں خرچ کرتا ہُوں مجھے یہ احساس ہوتا ہے جیسے میں ضرورت سے زیادہ کر رہا ہُوں اور مجھے اُس کا حساب دینا چاہیئے۔ رُدا اِتنا تو میں نے کیا ہے کہ اپنے کاغذات تیار کرا لئے ہیں جن میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اِس کاروبار کی ایک ایک پائی غلام احمد کی ہے اور میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن غلام احمد کو کس طرح مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اِس کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے یہاں بیٹھے۔ اور میری کار کی ڈرائیوری چھوڑ دے۔"

رُدا چونک پڑی۔ پھر اُس نے احسان احمد کو دیکھتے ہُوئے کہا: "آپ نے یہ بات اُن سے کی انکل؟"

"کچھ سُننے پر تیار ہوتا ہے وہ؟ عجیب ہے وہ۔ واقعی بہت عجیب انسان ہے۔ پریشان کر دیا ہے اُس نے مجھے۔ میں اُس کے سِلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کوئی ترکیب بتاؤ بھئی۔ بڑا پریشان ہُوں میں۔"

"انکل اس سِلسلے میں پریشان نہ ہوں۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ آنے والا وقت کیسا ہو؟"

"کیا ہو سکتا ہے تم بتاؤ۔ کیا ہو سکتا ہے؟"

رُدا کے ذہن میں پھر ایک دھماکہ ہُوا۔ تصوّر بیگ نے اُس سے کہا تھا کہ شہلب صاحب بہت جلد قابو میں آنے والے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ احسان احمد کا سب کچھ اُنھیں واپس مِل جائے۔ اِس وقت یہ الفاظ دِل سے اُچھل اُچھل کر زبان کی جانب آنے لگے، لیکن یہ تصوّر بیگ کی امانت تھے۔ اُس نے جو امانت رُدا کو سونپی تھی اسے رُسوا کرنا مناسب نہیں تھا۔ نہیں یہ الفاظ میں کسی قیمت پر احسان احمد کو نہیں دے سکتی۔ اُن کے احسانات اپنی جگہ لیکن تصوّر، سب کچھ تو نہ چھینا جائے اُس سے۔ احسان احمد کہنے لگے۔

"بھئی بڑی بداخلاق مینیجر ہیں آپ ہماری فرم میں۔ کچھ چائے وغیرہ کا بندوبست نہیں ہوگا؟"

"انکل ابھی منگواتی ہُوں۔" رُدا نے کہا اور بیل بجا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ احسان احمد کے لئے چائے بنا رہی تھی۔

"یقین کرو رُدا اِس وقت تمہارے پاس آنے کا مقصد صرف اِتنا تھا کہ اپنی یہ بات تمہارے سامنے لے آؤں میرے دِل کا بوجھ جِتنا ہلکا ہُوا ہے، بخُدا تم سے بیان نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ تمھیں بھی دیکھنا تھا۔ دِلجمعی سے بیٹی اپنا کام انجام دو اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ وقت بقول تمہارے صحیح فیصلے کرتا ہے۔ وقت میرے لئے بھی فیصلہ کرے گا اور تمہارے لئے بھی اگر اِس دوران تم نے خود کو اُلجھائے رکھا تو یقین کرو خود سے انصاف نہ کر سکو گی۔"

"میں جانتی ہُوں انکل۔"

"تو کیا پھر میں یہ اُمید رکھوں کہ تم پوری مستعدی سے اپنی فرم کا کام انجام دوگی؟"

"انکل اِس میں آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ میرا مقصد اِس شکایت سے نہیں ہے۔ میں تو تمھیں بھی ذہنی طور پر فریش دیکھنا چاہتا ہُوں۔"

"میں خوش ہُوں۔ ثناء نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ ورنہ وہاں میں تنہا رہ جاتی انکل۔ میں بالکل تنہا رہ جاتی۔"

"خُدا تمھیں تمہاری تمام خوشیاں واپس لوٹائے۔ اچھا بھئی چائے کا بے حد شکریہ اور دِل کا جو تم سے کچھ کہہ دینے کے بعد ہلکا ہو گیا ہے اس کا بھی دِلی شکریہ۔ چلتا ہُوں۔" احسان احمد چلے گئے اور رُدا بہت دیر تک اُن کے بارے میں سوچتی رہی۔ غلام احمد ذہن میں آئے اور اُس نے سوچا کہ اچھے لوگوں کو ہمیشہ اچھے لوگ مِل جاتے ہیں۔ احسان احمد کو غلام احمد شاید اِس لئے مِلے تھے کہ اُن کی گرتی ہُوئی عزت گرتی ہُوئی ساکھ سنبھال سکیں اگر احسان احمد خود اچھے نہ ہوتے۔ تو یقیناً غلام احمد اُن تک کبھی نہ پہنچتے۔ بہت دیر تک یہ خیالات جاری رہے اور پھر اُس کے بعد اُس نے اپنے آپ کو کاموں میں مصروف کر لیا۔ ذِمّہ داریاں بھی تھیں اور پھر ذہن کو بٹانے کے لئے یہی ایک بہتر ذریعہ تھا۔ وہ اِس طرح کاموں میں مصروف ہُوئی کہ اُس کے بعد اُسے کچھ یاد ہی

نہ رہا۔ لنچ کے وقت بھی وہ کام ہی میں مصروف رہی تھی۔ تقریباً چار بجے فارغ ہُوئی اور اُس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بُلا لیا اُس سے چائے منگوائی اور پھر چائے پیتے ہُوئے وہ احسان احمد سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچتی رہی، ہاں میں نے اچھا کیا کہ تصوّر بیگ کی تفصیل احسان احمد کو نہ بتائی۔

پانچ بجے چُھٹی کر کے گھر واپس لوٹی۔ کوٹھی کے معمولات میں اب دوبارہ وہی رونق پیدا ہو گئی تھی اور اب یہاں وہی تفریحات رہتی تھیں۔ شام کو اختر اور خالد ہمیشہ ہی آجایا کرتے تھے۔ عادل حسین بھی ساتھ ہوتے تھے۔ اُنھوں نے الگ جگہ تو لے لی تھی لیکن اُن میں سے کسی کا دِل وہاں نہیں لگتا تھا ہر طور رُدا کو اختر ہمیشہ سے پسند تھا۔ اور وہ اُس کے ساتھ کافی بے تکلّف ہو گئی تھی۔ بہت سے معاملات میں اُس نے اختر کو اپنا رازدار بھی بنا لیا تھا۔ لیکن کم از کم تصوّر بیگ کے سِلسلے میں نہیں۔ وہ اپنے معمولات سے فارغ ہونے کے لئے اندر چلی گئی جانتی تھی کہ اُس کے بعد شام کی چائے پر لان پر پہنچنا پڑے گا۔ کوٹھی کے بغلی حصّے کا منظر اُس کے کمرے سے صاف نظر آتا تھا۔ اِس سمت عارفہ خالہ، طفیلی خالہ اور دوسرے لوگ رہا کرتے تھے اور یہاں سے اُنھیں دیکھا جا سکتا تھا۔ لباس تبدیل کر کے اُس نے اپنے بال سنوارے اور پھر باہر نکلنے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ کھڑکی کی جانب نظر اُٹھ گئی۔ اُس نے طفیلی خالہ کو دیکھا جو چلی آرہی تھیں۔ دفعتاً اُنھوں نے ٹھوکر کھائی اور گھٹنوں کے بل نیچے گر گئیں۔ اُنھوں نے سنبھالا لیا۔ اور اُٹھ کھڑی ہُوئیں۔ نہ جانے کیوں رُدا کو اُن کے اِس طرح گرنے پر دُکھ کا احساس ہُوا تھا۔ اُس نے غور کیا تو طفیلی خالہ اُسے بہت کمزور نظر آئیں۔ وہ ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر باہر نِکل آئی۔ طفیلی خالہ اِس دوران اپنے کوارٹر میں جا چکی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی طفیلی خالہ کے کوارٹر تک پہنچ گئی۔ اور اُس نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے اندر آجاؤ" طفیلی خالہ کی آواز اُبھری لیکن رُدا کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں پھر اُنھوں نے مُسکراتے ہُوئے کہا

"ارے رُدا بیٹا آؤ۔ آؤ خیریت۔ کوئی کام ہے تو مجھے بُلوا لیا ہوتا۔"

"عجیب ہیں آپ لوگ بھی طفیلی خالہ! آپ بڑی ہیں مجھ سے۔ کبھی دِل میں ایسے محبت آئے تو آپ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کو بُلوا لیا ہوتا۔"

"نہیں بیٹی یہ بات نہیں ہے بس ایسے ہی کہہ دیا تھا میں نے۔ تم بیٹھو ناں مگر۔"

"جی... جی فرمائیے مگر کیا؟"

"نہیں۔ میرا کچھ مطلب نہیں ہے بس ذرا حیران ہو رہی ہُوں۔ آؤ کوئی کام ہو تو بتاؤ فوراً مجھے۔"

"ہاں آپ سے بہت ضروری کام ہے طفیلی خالہ۔"

"تو پھر بتاؤ ناں۔"

"ایک بات پُوچھنی ہے آپ سے؟"

"پُوچھو بیٹی۔"

"آپ اِتنی کمزور کیوں ہو گئی ہیں، اِتنی پریشان کیوں رہتی ہیں آپ؟" رُدا نے سوال کیا اور طفیلی خالہ تعجب سے اُسے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

"یہی بات پُوچھنی ہے بیٹی؟"

"ہاں صرف یہی۔" جواب میں طفیلی خالہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

رُدا بیٹی! غم کی ماری ہُوں۔ بہت اکڑتی تھی اِس دُنیا پر۔ سوچتی تھی کہ سب کچھ میرا ہے، جو چاہوں گی کروں گی لیکن انسان بڑا احمق ہے۔ گزرنے والا وقت اُسے بتا دیتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک چوٹ لگتی ہے تقدیر کی اور ایسا مُنہ کے بل گِرتا ہے کہ پھر کھڑا نہیں ہو پاتا۔"

"سمجھاؤ طفیلی خالہ مجھے سمجھاؤ۔" رُدا نے کہا۔

"بیٹی سمجھدار ہو۔ خود سمجھ سکتی ہو۔ مجھ سے میرا کلیجہ چِھن گیا ہے۔ نظر نہیں آیا اِتنے دِن سے، کب سے اُس کی صُورت نہیں دیکھی۔ اُس کی آواز نہیں سُنی۔ ایک ہی تو روشنی ہے میری آنکھوں کی۔ وہ چِھن گئی ہے۔ مجھے میرے کِس گناہ کی سزا مِلی۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے۔ سب کچھ بھول گئی ہُوں۔ گُناہ بھی بہت کئے ہیں میں نے۔ پتہ نہیں کیا کیا۔ آج سوچتی ہُوں تو صرف خُدا کے حضور ہی پلّو پھیلا کر بیٹھ جاتی ہُوں کہ معاف کر دے۔ تو معاف کرنے والا ہے۔ معاف کر دے اگر کِسی کا دِل دُکھا ہے معاف کر دے ہر ایک سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہُوں کہ میرا خُدا مجھے معاف کر دے میرا نورِ نظر مجھے دِکھا دے۔ میری آنکھوں کی روشنی مجھے واپس دے دے۔"

رُدا کا دِل ایک بار پھر سینے میں دھڑکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ رشید کہاں ہے، طفیلی خالہ یہ سب رشید کے بارے ہی میں کہہ رہی تھیں۔ کیا... کیا میں طفیلی خالہ کو یہ بتا دُوں کہ رشید محفُوظ ہے۔ وہ تصوّر بیگ کے قبضے میں ہے۔ لیکن... لیکن نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ احسان احمد کو کچھ نہیں بتایا تو طفیلی خالہ کو کیا بتا سکتی ہُوں، ہاں احسان احمد کی نسبت طفیلی خالہ زیادہ پریشان

اور غمزدہ تھیں۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ ایک بات کیوں نہیں سوچتیں طفیلی خالہ، میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کیا بیٹی؟"

"آپ کو علم ہے کہ رشید ٹھیک ہے۔ وہ جہاں بھی ہے بالکل ٹھیک ہے اور اُسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو رَدا۔ رَدا بیٹی میں تم سے بھی شرمندہ ہُوں۔ میں نے یہ بات تو سوچی بھی نہیں تھی۔ ہاں رشید کے ذریعے تمھارا دِل بھی تو دُکھا ہے۔"

"بچوں کی سی باتیں نہ کریں طفیلی خالہ! رشید سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ مجھے کسی سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ایسی کوئی بات ہے تو میں صدقِ دِل سے آپ کو معاف کرتی ہُوں۔ رشید کو معاف کرتی ہُوں۔ میری دُعا ہے کہ وہ زندہ سلامت تندرست و توانا آپ تک پہنچ جائے، آپ سے مِل جائے۔ اور ایسا ضرور ہوگا طفیلی خالہ! آپ کو ایک بات یاد ہے کہ آپ ایک بار ٹیلیفون پر اُس کی آواز سُن چکی ہیں۔ اُس نے آپ کو دِلاسہ بھی دیا تھا۔"

"ایک بار! صرف ایک بار اُس کے بعد وہ مجھے پھر کبھی نہیں مِلا۔ کبھی اُس کی آواز نہیں سُنائی دی۔ اور وہ خیر دین بھی نہیں ہے آج کل! ایسا تعویذ لاکر دیا تھا بے چارے نے کہ وہ کام ہوگیا تھا۔ جس کے لئے میں نہ جانے کب سے تڑپ رہی تھی۔ اے رَدا بیٹی کہیں سے خیر دین مِل سکتا ہے تمھیں؟" رَدا نے ایک پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مِل گیا تو ضرور لے آؤں گی طفیلی خالہ وعدہ کرتی ہوں لیکن ایک بات آپ سُن لیجئے۔ خیر دین نے آپ کو تعویذ دیا تھا میں آپ سے یہ دعویٰ کرتی ہُوں کہ بہت جلد رشید آپ تک پہنچ جائے گا۔"

"بیٹی خُدا تیری زبان مُبارک کرے رَدا۔ خُدا تجھے دُنیا کی ہر خُوشی نصیب کرے، کبھی تجھے وہ دُکھ نہ دِکھائے جو میں نے دیکھا۔" طفیلی خالہ آبدیدہ ہوگئیں۔ رَدا بہت دیر تک اُنھیں تسلّیاں دیتی رہی پھر بولی۔

"دیکھئے طفیلی خالہ ذرہ برابر پریشان نہ ہوں میری بات پر بھروسہ رکھیں رشید واپس آجائیں گے۔ خوش و خرّم واپس آجائیں گے۔ آپ کو خُدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔"

"خُدا تجھے خوش رکھے۔ کم از کم میرے دِل کو تو سمجھایا تُو نے۔" طفیلی خالہ نے اُسے دُعائیں دیتے ہُوئے کہا۔

رَدا تھوڑی دیر تک اُن کے پاس بیٹھی رہی پھر باہر نکل آئی۔ کافی دیر ہوگئی تھی۔ وقت کا پتہ بھی نہیں چلا تھا۔ شام کی چائے لگ گئی تھی اور اُس کی تلاش ہو رہی تھی، بہر طور اُس نے دِل کیفیت کا اظہار کسی پر نہیں کیا تھا اور اُن لوگوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوگئی۔ کوئی خاص بات نہ ہُوئی رات کو البتہ بستر پر اُس نے لیٹ کر کچھ نئی باتیں سوچیں۔ دِل میں بار بار ایک تصور پیدا ہو رہا تھا وہ یہ تھا کہ کم از کم رشید کے سِلسلے میں تصور بیگ سے مُلاقات ضرور کرے۔ اُس سے بات کرے، لیکن کیا... کیا میں تصور بیگ کے سامنے جا سکوں گی؟ لیکن طفیلی خالہ کی کیفیت کم از کم انسانیت کے نام پر اُس سے ایک بار گفتگو ضرور کی جا سکتی ہے اور کچھ نہ کر سکے تو اِتنا تو ضرور کر دے کہ طفیلی خالہ سے ٹیلیفون پر رشید کی بات کرا دے۔ اُسے خود یہ کرنا چاہیئے تھا۔ میں اُس سے ضرور مِلوں گی۔ ایک بار اُس سے ضرور مِلوں گی۔ اُس کے مزاج کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ ویسے خیر دین کی حیثیت سے تو آ سکتا تھا یہاں۔ کم از کم میرے پاس نہ سہی تو دادی امّاں کے پاس ہی سہی۔ کیا وہ اِتنا ہی ناراض ہوگیا ہے؟ نہ جانے کب تک وہ اِن خیالات میں گُم رہی تھی۔

"اللہ رکھی" ثناء نے رُخسار کھجاتے ہُوئے نُدرت کو پُکارا اور نُدرت چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"فرمائیے" اُس نے کہا۔

"یار بوریت ہو رہی ہے۔"

"شادی کر لیجئے" نُدرت پُرسکون لہجے میں بولی۔

"ہوش خراب ہوگئے ہیں کیا؟"

"کیوں شادی نہیں کرو گی؟"

"میں کہتی ہُوں بکواس بند کرو۔ سنجیدگی سے کچھ سوچو۔ یار واقعی اِن دِنوں تو ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے جیسے کوٹھی قبرستان بن کر رہ گئی ہو۔ نہ کوئی ہنگامہ ہے، نہ دِلچسپیاں تمھارا جمن بھی بوڑھا ہوگیا ہے۔ بس کام کرتا رہتا ہے، بے چاری تنویر کی جان شامت آئی تھی لیکن بجائے اِس کے کہ یہ کھیل چلتا تم نے عارفہ پھوپھو کے ذریعے سارا چکر ہی ختم کر دیا۔"

"بھئی تنویر بہت معصوم لڑکی ہے۔ وہ اِن تفریحات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔"

"چلو ٹھیک ہے، لیکن کچھ تو ہنگامہ ہو۔ جمن کی امّاں بھی پتہ نہیں کیوں سیدھی ہوگئی ہے، عارفہ پھوپھی کو دیکھو تو بالکل اللہ والی ہوگئی ہیں۔ خیر بے چاری طفیلی خالہ کا مسئلہ بالکل مختلف ہے وہ اب واقعی غمزدہ ہیں اور ہر طرح سے ہمدردی کی مستحق۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"تو پھر یار کیا زندگی یُونہی گُزر جائے گی؟ کچھ کرنا تو پڑے گا۔"

"کہہ تو رہی ہُوں شادی کر لو۔"

"نہیں بھئی بے وقُوفی کی باتیں جِتنی دیر تک ٹلتی رہیں اچھا ہے اور پھر اچھا ہے کہ ابھی ہمارے بزرگوں کے دماغ میں نہیں سمایا۔ ویسے میں تیری حرکتیں سمجھ رہی ہُوں اللہ رکھی۔"

"حرکتیں؟"

"میری زبان سے اپنی شادی کی باتیں سُننا چاہتی ہوگی۔ ارے تُو ہے اِتنی تیز کہ بس پتا نہیں سکتی۔ فوراً ہی میری برابری کرنے پر تُل گئی۔"

"یعنی... یعنی؟"

"زبان کھول دُوں گی تو مزہ آجائے گا بچّو۔"

"مطلب کیا ہے تمھارا؟"

"اختر کو بے وقُوف کس نے بنایا" ثناء نے نُدرت کو گھورتے ہُوئے کہا۔

"اللہ نے" نُدرت نے بڑے احترام سے کہا اور ثناء بے اختیار ہنس پڑی۔

"کہہ دُوں یہ بات اختر سے؟"

"تمھارا کیا خیال ہے کیا میں ڈرتی ہُوں؟"

"جی ہاں آپ کیوں ڈریں گی۔ آپ نے تو اپنا پُورا تسلط جما رکھا ہے اُس بے چارے پر۔"

"اور خالد بھائی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"خیر وہ تو بہت پُرانی بات ہے" ثناء نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا پھر بولی "اپنے اپنے چکروں میں اُلجھ گئے ہم لوگ، بھئی میں کہتی ہُوں واقعی کچھ کرو۔ کچھ سوچو نُدرت۔"

"اِن حالات میں کیا سوچا جا سکتا ہے؟ سبھی پر تو کھولٹ طاری ہوگئی ہے خاص طور سے رَدا کے معاملے نے سب کو عجیب و غریب کر دیا ہے۔"

"ہاں رَدا کا مسئلہ بھی بڑا اُلجھا ہُوا ہے۔ آفندی صاحب نے خُدا کا شُکر ہے اُس کے بعد اِدھر کا رُخ نہیں کیا۔ میں نے بھی سب سے کہہ دیا ہے کہ اِدھر آئیں تو دھکّے دے کر باہر نکال دیا جائے۔ بتائیے جب وہ اپنی نواسی کے نہیں ہُوئے تو کسی اور کے کیا ہوں گے۔ اپنی بیٹی کے نہیں ہُوئے وہ تو۔۔۔"

"بھئی یہ باتیں مجھے کم از کم پسند نہیں ہیں۔"

"تو اِسی لئے کہہ رہی ہوں ناں کہ اپنے اِس بھُوسہ بھرے سر کو استعمال کرو۔ کچھ نکالو اِس میں سے۔ کوئی ترکیب" نُدرت پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی، دفعتاً ثناء چونک کر بولی۔

"ارے یار نُدرت ایک آئیڈیا۔"

"آگیا؟"

"یقین کرو بالکل آگیا۔"

"اُگل دو" نُدرت نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا اور ثناء کسی سوچ میں گم ہوگئی پھر اُس نے آہستہ سے کہا "یار یہ اپنی عصمت باجی کیسی ہیں؟"

"بہت اچھی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"میرا مطلب ہے اُن کی شادی وغیرہ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"ایں؟" نُدرت چونک پڑی۔ اُس نے مُشتبہ نگاہوں سے ثناء کو دیکھا تھا! عصمت اور اقبال کا معاملہ نُدرت کے علم میں بخوبی تھا لیکن ثناء کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر وہ چونک پڑی تھی۔ ایک بار عصمت کی زبانی بہت کچھ سُنا تھا لیکن چھوٹی بہن تھی۔ بڑی بہن کی عزت کو زندگی سے زیادہ عزیز تصور کرتی تھی کبھی کِسی کے سامنے اُس نے حوالہ تک نہیں دیا تھا۔ ثناء کہنے لگی۔

"یار تعصب سے کام مت لینا۔ یہ مت سوچنا کہ وہ تمھاری بڑی بہن ہیں۔ میری بھی بہن ہیں وہ لیکن تفریحات اپنی جگہ۔"

"مگر بھائی ارادہ کیا ہے؟"

"عصمت بمقابلہ اقبال۔"

"مطلب؟" نُدرت ایک بار پھر سہم سی گئی۔

"یار نُدرت وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گی۔ آج زبان کھول رہی ہُوں۔"

"کھولو۔ کھولو۔"

"یہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" نُدرت آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"قسم خُدا کی میں نے خود سُنا ہے اپنے کانوں سے۔"

"کیا؟" نُدرت نے چونک کر پُوچھا۔

"بس بھئی وہ جو دِل کی باتیں ہوتی ہیں۔ اب اُن کی تفصیل تو مجھے یاد نہیں لیکن ایک بات میں دعوے سے کہہ سکتی ہُوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

"بچپن میں اِن دونوں کی منگنی بھی ہُوئی تھی یا منگنی نہیں تو کم از کم اِس سِلسلے میں کچھ گفتگو ضرور ہُوئی تھی میں نے سُنا تھا۔"

"تو پھر کیا خیال ہے اِس سلسلے میں؟ کوئی کارروائی کی جائے؟"
"مگر کیسے؟"
"یہی تو سوچنا ہے، بات کچھ آگے بڑھنی چاہیئے۔"
"ہُوں!" ندرت پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔
"مگر اس میں تفریح کا کیا پہلو نکلتا ہے؟"
"کمال کی انسان ہو۔ تفریح کا پہلو کیوں نہیں نکلتا۔ بھئی ظاہر ہے اِس گھر میں شادی ہوگی۔ بینڈ باجے بجیں گے، اور ہم سب شاد ہوجائیں گے۔ بہت سے ہنگامے ہوجائیں گے، واقعی مزہ آجائے گا یار ندرت، اِس سلسلے میں کچھ آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیئے۔"
"بھئی میری پوزیشن تو تم جانتی ہو اچھی طرح۔ میں بھلا کیا کرسکتی ہُوں۔"
"اُفوہ! یہاں سب اپنی اپنی پوزیشن الگ الگ رکھتے ہیں۔ میرا ساتھ تو دے سکو گی ناں؟"
"کیسے؟"
"جیسے میں کہوں۔"
"خیر انکار تو میں نے کبھی نہیں کیا اور پھر یہ ویسے بھی نیک کام ہے۔ دونوں کو آپس میں ملا دینا۔ لیکن انکشاف بڑا عجیب ہے، مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا۔"
"تم اپنے ہی چکر میں پڑی ہُوئی ہو کسی دوسرے کی طرف کیا نظر کروگی؟"
"خیر... خیر اب ایسی بات بھی نہ کرو تمھارے مسئلے میں تو میں دل و جان سے کام کرتی رہی ہُوں۔"
"اچھا... اچھا بے حد شکریہ اب مسئلہ یہ ہے کہ اس کی ابتداء کیسے کی جائے؟ دیکھو، ہوتا یُوں ہے کہ لڑکے والے لڑکی والوں سے بات کرتے ہیں۔ لڑکے والوں سے یہ بات کیسے شروع کی جائے؟ ہم تو لڑکی والے ہیں۔"
"لو کمال ہے ہم لڑکے والے بھی تو ہیں کیا اقبال بھائی ہمارے بھائی نہیں ہیں اور پھر ابراہیم چچا اور سلطانہ چچی اُن لوگوں سے تو ہمارے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔"
"تم ہمت کرسکو گی؟"
"بھئی ذرا دبے انداز میں۔ آگے مت بڑھانا مجھے۔"
"ٹھیک ہے اِس بات کا وعدہ کہ آگے میں رہُوں گی۔"
"مگر کرنا کیا ہے؟"

"آؤ اُٹھو۔ مستقبل کے فیصلے مستقبل میں نہیں حال میں کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"
"کک... کہاں؟"
"سُلطانہ چچی کے پاس۔"
"ارے باپ رے ابھی...؟" ندرت گھبرا کر بولی۔
"ابھی اور اِسی وقت۔ اور اُن سے بات کریں گے۔ اِس وقت نہ ابراہیم چچا ہیں اور نہ غلام احمد صاحب، سُلطانہ آپا اپنے کوارٹر میں تنہا ہوں گی بس ذرا اُن سے گپّیں لڑاتے ہیں اِس موضوع پر۔"
"میں بھی ساتھ رہُوں گی؟"
"ہاں تم اطمینان رکھو۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"
"ٹھیک ہے جیسا تم پسند کرو۔" ندرت نے کہا اور ثناء نے تیمور کی اُنگلی پکڑی اور ندرت کو ساتھ لے کر ابراہیم صاحب کے کوارٹر کی جانب بڑھ گئی کوارٹر کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے سُلطانہ بیگم کی آواز سُنائی دی۔
"آؤ کون ہے؟" دونوں اندر داخل ہوگئیں۔ سُلطانہ بیگم اُنھیں دیکھ کر چونک پڑی تھیں۔ "ارے تم... آؤ۔ آؤ بیٹی آؤ ٹھٹھک کیوں گئیں۔"
"کیا ہورہا ہے چچی جان؟" ثناء نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔
"کچھ نہیں بیٹی، بس وہی زندگی کے معمولات آؤ بیٹھو تمھارے آنے سے مجھے بے حد خوشی ہُوئی ہے۔"
دونوں بیٹھ گئیں۔ ثناء نے کہا۔ "یہ تنویر کہاں ہے؟"
"باورچی خانے میں ہے تمھاری آواز نہیں سُنی ہوگی تنویر اے تنویر دیکھو ذرا کون آیا ہے؟"
تنویر باورچی خانے سے باہر نکل آئی اور اُن دونوں کو دیکھنے لگی جیسے وہ دونوں کہیں باہر سے آئی ہوں۔
"کیا ہُوا بھئی تنویر۔ خیریت؟"
"جی ہاں بالکل خیریت ہے۔ مگر... کیا مطلب ہے؟"
"...کیا مطلب ہے امّی جان؟"
"ارے... ایسے تم بوکھلا کیوں گئیں؟ عجیب باؤلی لڑکی ہے ذراسی بات میں ہونق ہوجاتی ہے۔ میں تو تمھیں بتا رہی تھی کہ ثناء اور ندرت آئی ہیں۔"
"جی... جی چائے بنالاؤں؟" تنویر نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔ اور ثناء ہنس پڑی۔
"ہاں... ہاں جاؤ۔ جاؤ بنالاؤ۔ بنالاؤ۔ اچھی سی بنانا۔"

...نے کہا اور تنویر واپس چلی گئی سُلطانہ بیگم ہنستے ہُوئے کہنے لگیں۔
"بس ایسی ہی ہے ابھی تک اِسے گفتگو کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔"
"آجائے گا چچی جان! آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟" ثناء نے مُسکراتے ہُوئے کہا اور ندرت کو دیکھ کر اشارہ کیا۔ ندرت دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔
"چچی جان کیسی گُزر رہی ہے؟" ثناء نے کہا۔
"ٹھیک ہے بیٹی۔ شکر ہے اُس باری تعالیٰ کا جس نے مجھے فرشتوں کے درمیان بھیج دیا۔ اِس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ میری تاریک دُنیا روشن ہوگئی۔"
"آنکھوں میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے چچی جان؟"
"بالکل نہیں، خُدا کا بڑا احسان ہے، بہت دِن کے بعد یہ دنیا پھر سے دیکھی بیٹی۔" سُلطانہ بیگم نے کہا۔
"آپ یقین کریں چچی جان! اِس بات سے ہم اِتنے خوش ہیں کہ الفاظ میں بیان نہیں کرسکتے۔"
"بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے بیٹی۔ ہر چیز انسان کو نظر آجاتی ہے۔"
"اب چچی جان کچھ تبدیلیاں کیجئے گھر میں۔ دیکھئے ناں کتنے عرصے سے یہ کوٹھی سُنسان پڑی ہُوئی ہے۔ کوئی ایسی بات ہی نہیں ہُوئی یہاں جس میں خوشیاں ہوں ہنگامے ہوں۔ کوئی تو شروع کرے اِن ہنگاموں کو۔"
"بیٹے اِن کی ابتداء تو احسان احمد کو کرنی چاہیئے تم کہو تو میں اُن سے بات کروں؟" سُلطانہ بیگم نے کہا اور ندرت بے اختیار ہنس پڑی۔
"ہاں چچی جان اِسی لئے تو آئے ہیں ہم لوگ۔" ثناء نے گھور کر ندرت کو دیکھا۔ بات کچھ عجیب سا رُخ اختیار کرگئی۔ آئی تھی اقبال اور عصمت باجی کے بارے میں بات کرنے کے لئے لیکن سُلطانہ بیگم نے بازی ہی اُلٹ دی تھی۔
"تو پھر کیا خیال ہے اگر تم لوگ مجھے اجازت دو تو میں سلسلہ جنبانی شروع کروں۔ کیوں ثناء کیا واقعی ایسی بات ہے؟"
"بالکل ایسی بات ہے چچی جان لیکن اگر کچھ کہنے کا موقعہ عنایت کریں تو مہربانی ہوگی۔"
"ہاں... ہاں کہو بیٹے۔ میں نے کب منع کیا ہے؟ جو دِل چاہے کھل کر کہو۔"
"ڈیڈی کو ابھی کسی بارے میں کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے چچی جان اور بھی تو ہیں یہاں بہت سے، بہت سے مسئلے ہیں۔ یہ ندرت ہے یہ عصمت باجی ہیں اور... اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ آپ کے پاس تو میں ایک خاص کام سے آئی تھی۔"
"اوہ! تو کہو کہنے میں ہچکچا کیوں رہی ہو؟ بھئی معاف کرنا مجھے، موٹی عقل کی ہُوں۔ کوئی غلط سلط بات مُنہ سے نکل جائے تو محسوس مت کرنا۔"
"نہیں چچی جان آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ظاہر ہے ہم تو آپ کے بچّے ہیں۔ اب دیکھئے ناں بڑے لوگوں نے تکلّف شروع کردیا ہے کوئی کچھ بولتا ہی نہیں اپنی زبان سے تو کیا ہم بھی نہ بولیں؟"
"ضرور بولو بیٹا۔ ضرور بولو۔" اِتنی دیر میں تنویر چائے بنا کر لے آئی تھی اُس نے بڑی نفاست سے پیالیاں اُن کے سامنے رکھ دیں۔
"تنویر کی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے چچی جان؟" ثناء نے پھٹ سے کہا اور تنویر کا مُنہ حیرت سے کھل گیا۔
"مم... میری شش... شادی؟" اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنھیں دیکھتے ہُوئے کہا۔
"ہاں کیوں؟ کیا تمھاری شادی نہیں ہوگی؟"
"جی ب... بالکل نہیں۔ قطعی نہیں۔ یہ... یہ کیا بات ہُوئی؟ سس... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" تنویر نے رُندھے ہوئے لہجے میں کہا اور سُلطانہ بیگم ہنسنے لگیں۔
"اری باؤلی بیٹھے گی نہیں؟"
"نہیں بیٹھوں گی، بس میری شادی کی بات نہیں ہونی چاہیئے، یہ... یہ کیا بات ہُوئی؟ ابھی تو اقبال بھائی کی شادی ہوتی ہے۔ مم... میں تو ابھی بہت چھوٹی ہُوں۔"
"چھوٹی! جاؤ باورچی خانے میں کام کرو۔ بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔"
"جی نہیں... نہیں جاؤں گی۔ میں چلی جاؤں گی تو آپ لوگ میری شادی کے بارے میں بات کریں گی۔"
"اچھا۔ چلو مت جاؤ۔ بیٹھ تو جاؤ۔"
"بیٹھوں گی بھی نہیں۔" تنویر نے ضدی انداز میں کہا۔
"کیوں بھئی؟"
"اِس لئے کہ آپ لوگ... آپ لوگ..."
"اچھا ابھی تم نے ایک بات کہی تھی اپنے اقبال بھائی کی شادی کے لئے؟"
"اور کیا میں... میں بھلا ابھی اقبال بھائی۔ میرا مطلب ہے۔"

اور تنویر بیچیر بدحواسی کے عالم میں باہر نکل گئی۔ ندرت اور ثناء کے قہقہے گونج اٹھے تھے۔ سلطانہ بیگم بھی اُن کے ساتھ ہنسی میں شریک ہوگئیں تھیں۔

"اِس باؤلی کی شادی کروں گی میں، کوئی باؤلا ہی مِل جائے تو پھر تو یہ ہوسکتا ہے، ورنہ یہ کہاں نبھے گی؟"

"نبھے گی چچی جان بہت اچھی نبھے گی آپ فِکر نہ کریں فی الحال اقبال بھائی کی شادی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہُوں۔"

"اقبال" سلطانہ بیگم کی آنکھوں میں محبّتیں جگمگانے لگیں۔

"ہاں میرا خیال ہے ہم اِس کوٹھی میں شادیوں کی ابتداء اقبال بھائی سے کرتے ہیں۔"

"اور انتہا کہاں ہوگی؟" ندرت نے ثناء کو گھورتے ہُوئے کہا۔

"دیکھو ندرت جب دو بڑے آپس میں باتیں کر رہے ہوتے ہیں تو بچّوں کو خاموش بیٹھنا پڑتا ہے۔ اگر تم خاموش نہیں بیٹھ سکتیں تو باہر نِکل جاؤ۔ میں تمھیں اِس لئے اپنے ساتھ نہیں لائی تھی کہ تم میری گفتگو میں مداخلت کرو۔"

"اوہ معافی چاہتی ہُوں۔" ندرت نے سنجیدہ ہوکر کہا۔ اور ثناء سلطانہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔

"بات صرف میرے ذہن کی ہے چچی جان اور اِس میں کوئی گہرائی نہیں ہے۔ بہت پہلے میں نے ایک بار چند الفاظ سُنے تھے۔ یا پھر ہوسکتا ہے یہ صرف میرا تصوّر ہو جس نے مجھے یہ احساس دِلایا ہو کہ یہ الفاظ میں نے سُنے ہیں۔ اِن احساسات کی روشنی میں مَیں آپ کے پاس آگئی ہُوں۔"

"کیسے الفاظ بیٹی؟" سلطانہ بیگم نے کہا۔ پھر بولیں: "چائے تو پیو ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"پیوں گی، پیوں گی۔ الفاظ یہ تھے کہ کبھی بچپن میں اقبال بھائی اور عصمت باجی کے سِلسلے میں گفتگو ہُوئی تھی؟"

"اوہ ہاں... ہُوئی تھی۔" سلطانہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

"شاید منگنی بھی ہُوئی تھی؟"

"نہیں منگنی ونگنی تو نہیں ہُوئی تھی۔ بس اُس وقت ہم بھی بہت بہتر حالت میں تھے اور غلام احمد بھائی اللہ اُنھیں زندگی دے وہ تو بہت اچھے حال میں تھے۔ دوستی کی بنیاد پر اُنھوں نے یہ بات کہی تھی ایک بار۔ لیکن بعد میں اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہوگیا۔"

"کیا منظور ہوگیا؟ اللہ کو اگر منظور نہ ہوتا چچی جان تو اِتنا طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد آپ یہاں پر دوبارہ پہنچ جاتیں؟"

"ایں! ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" سلطانہ بیگم نے کسی قدر اُلجھے ہُوئے انداز میں کہا۔

"تو پھر جو بات اللہ کو منظور ہے چچی جان اُس میں آپ کیوں رُکاوٹ ڈال رہی ہیں؟"

"کیسی رُکاوٹ بیٹی، میں کچھ نہیں؟"

"میرا مطلب ہے اِس کام کی اِبتداء کیوں نہیں کرتیں؟" ثناء نے کہا اور سلطانہ بیگم کے چہرے پر افسُردگی چھا گئی۔ چند لمحات وہ خاموش رہیں پھر اُنھوں نے ندرت کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ندرت بیٹی خُدا کی قسم بُرا مت ماننا، جو کچھ میں کہوں اُس کا بُرا مت ماننا۔ کسی سے تذکرہ مت کرنا۔ میری اولاد ہی کی مانند ہو تم لیکن دِل کی بات آج زبان پر آگئی ہے، روک نہیں سکتی۔"

"ارے... ارے چچی جان کیا آپ کو مجھ پر اِتنا سا بھی بھروسہ نہیں ہے۔ آپ مجھے حکم دیا کریں کہ یہ کام کرو اور یہ نہ کرو۔ اگر اِس سے انحراف ہو تو پھر میری گردن اور آپ کا ہاتھ۔"

"بیٹی جو کچھ کہہ رہی ہُوں دُکھے دِل سے کہہ رہی ہُوں۔ کیا ہمارے حالات اِس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اب ہم غلام احمد سے اُن کی بیٹی کا رشتہ مانگیں؟"

"حالات؟" ندرت نے چونک کر سلطانہ بیگم کو دیکھا۔

"ہاں تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے چچا کیا کرتے ہیں؟ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اقبال کی تعلیم ابھی بس ختم ہی ہُوئی ہے۔ اب وہ نوکری تلاش کرے گا۔ ایک مستقبل بنائے گا اور اِس کے بعد ہی اُس کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے اور پھر حالات ایسے ہیں کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اقبال کو کتنے عرصے تک ملازمت نہ مِلے یا ہمارے راستے میں کیا کیا مشکلات درپیش ہوں؟"

"یہ تو ٹھیک ہے چچی جان! لیکن بہرطور دوستوں کے سہارے بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ اپنوں کے رشتے بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ اقبال بھائی کو ملازمت مِلتی رہے گی جو سِلسلہ ہم لوگوں کے ذہنوں میں ہے اُس کی اِبتداء کیوں نہ کردی جائے۔"

"بغیر کسی بات کے؟"

"بات کیا ہوتی ہے؟ بچپن کے اِس رشتے کو اُستوار کیا جائے بات چیت آگے بڑھائی جائے۔ آپ لڑکے والی ہیں۔ لڑکی والوں کے گھر جائیے اُن سے بات کیجئے۔ پُوچھئے اُن سے کہ کیا اُنھیں یہ رشتہ منظور ہے؟ اگر وہ اِنکار کردیں تو دوسری بات ہے۔"

"بیٹی سچی بات تو یہ ہے کہ ابراہیم صاحب نے بھی ایک دوبار یہ الفاظ بڑے کہے ہیں لیکن وہ بھی اِسی خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اُن کی حیثیت کیا ہے؟ اگر وہ اِس قسم کی کوئی بات زبان سے نکالیں تو کہیں یُوں نہ ہو کہ دوستی میں فرق پڑ جائے۔"

"ارے چھوڑیئے۔ چھوڑیئے وہ دوستیاں ہی کیا جن میں فرق پڑے۔ میرا خیال ہے آپ بلاوجہ اِس سلسلے میں پریشان ہو رہی ہیں۔ میں غلام احمد چچا کو بھی اچھی طرح جانتی ہُوں وہ کیا ہیں؟ ہمارے دل سے پُوچھئے یہ تو آپ لوگ۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔"

"جب ایک آدمی ایسا ہو تو کیا وہ اپنے ایک ایسے دوست کو فراموش کردے گا جو اُس کا نہ جانے کب کا ساتھی ہے پھر آپ نے یہ بھی دیکھا کہ غلام احمد چچا نے کس طرح سارے مسئلے حل کردیئے اور آپ لوگ یہاں تک آگئے ورنہ آپ آتے یہاں تک؟"

"ہاں میں بھی یہی کہتی ہُوں کہ خُدا غلام احمد کو دُنیا کی ہر خوشی دِکھائے۔ لیکن بیٹی یہ بات تم نے آج سے پھر میرے ذہن میں زندہ کردی ہے۔ ہم لوگ تو نہ جانے کِن کِن باتوں سے متاثر ہوتے تھے اور دِل میں یہی سوچتے تھے کہ خُدا جانے یہ کام ہوگا یا نہیں؟"

"ہوگا... ہوگا ضرور ہوگا۔ بس میں نے کہہ جو دیا ہوگا۔ آپ ایسا کریں ایک پروگرام بنالیں میرے ساتھ چلیئے میں اِس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کرتی ہُوں بشرطیکہ آپ مجھے اِس کا موقعہ دیں اور مجھ پر اعتبار کریں۔" ثناء نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی؟ تم جو کچھ ہو ہمارا دِل ہی جانتا ہے۔"

"تو پھر اِس پروگرام کا انچارج بنایا آپ نے مجھے؟" سلطانہ بیگم مُسکرانے لگیں اور تھوڑی دیر کے بعد بولیں۔

"بنا تو دُوں لیکن تمام اڑی بھڑی تم ہی سنبھالو گی۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو اُس کی ذمّہ داری تمھارے اُوپر ہوگی۔"

"خُدا کی قسم چچی جان منظور۔ لیکن ایک بات اور بھی سُن لیجئے جب میں کسی کام کی ابتداء کرتی ہُوں تو اُسے انتہا تک پہنچا کر ہی دم لیتی ہُوں آپ کو میرے ساتھ مکمل تعاون کرنا ہوگا۔"

"وعدہ! اگر اِس تعاون سے اِنکار کرجاؤں تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

"گویا آپ اِس بات کے لئے خوشی سے تیار ہیں کہ عصمت باجی کی شادی اقبال بھائی سے کردی جائے۔"

"بالکل تیار ہُوں۔ بلکہ یہ تو میری دِلی آرزو ہے۔ عصمت اِتنی پیاری بچّی ہے اور پھر اقبال۔ اقبال بھی بُرا نہیں ہے بس ذرا تقدیر کا بیٹا ہے۔"

"نہیں! آپ یہ بات نہیں کہہ سکتیں۔ اچھا اب اِس سلسلے میں ہمیں بالکل خاموشی اختیار کرنی ہے۔ ابھی اُس وقت تک کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیئے جب تک میں آپ سے دوسری بار ملاقات نہ کروں۔"

"ٹھیک ہے بھئی! اب تو تم اِس پروگرام کی انچارج بن ہی گئی ہو۔" سلطانہ بیگم نے کہا اور دونوں چائے پیتی رہیں۔ اُس کے بعد وہاں سے اُٹھ گئیں۔ ثناء بہت خوش تھی۔ اُس نے باہر نِکل کر ندرت سے کہا۔

"دیکھا ندرت کیا تیر مارا ہے ہم نے؟"

"ہاں۔ ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔ مگر اب ارادہ کیا ہے؟"

"بس تو دیکھتی جا کیا کرتی ہُوں۔" ثناء نے کہا۔

"اے مجھے نہیں بتائے گی؟" ندرت نے ثناء کو گھورتے ہُوئے کہا۔

"یار لڑکے کے مستقبل کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے اقبال بھائی کو کہیں ملازمت دِلاتے ہیں۔ پڑھائی تو پوری ہوچکی ہے اُن کی۔ کہیں نہ کہیں ملازمت کریں گے۔ اور پھر کیا ضروری ہے کہ ملازمت باہر کریں؟ میرا خیال ہے ابھی تک کِسی نے گھر میں تذکرہ نہیں کیا ورنہ ڈیڈی ہی اِس بارے میں سوچتے۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے۔" ندرت نے کہا۔

"تو بس فِکر مت کر میں پہلے اقبال بھائی کو کوئی ملازمت دِلا دُوں۔ اِس کے بعد آگے کے معاملات طے کریں گے۔"

"اور ملازمت تو جیسے تمھاری مُٹھی میں رکھی ہے۔"

"میری مُٹھی میں کیا کیا ہے بی بی، ذرا دیکھنا کیا دِکھاتی ہُوں تمھیں؟" ثناء نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

* *

احسان احمد اپنے کمرۂ خاص میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں گُم تھے، بہت سے تصوّرات بہت سے خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ دِل میں کیا تھا یہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا جن دُکھوں سے گُزر رہے تھے اُن کا دِل ہی جانتا تھا۔ شہاب احمد نے جس طرح زندگی برباد کی تھی اُس کی توقع کبھی خواب میں بھی نہیں کی تھی۔ اپنے طور پر تو انسانوں کے ساتھ محبّت کا سلوک کرتے رہے تھے۔ لیکن اب جب یہ سب کچھ ہوگیا تھا تو دِل میں خُدا سے دُعا کرتے تھے کہ وہ گُناہ معاف ہو جائے جس کی سزا اُنھیں اِس شکل میں مِلی ہے۔ غلام احمد انسان کی صُورت میں فرشتہ تھے اُن کے سامنے۔

اور احسان احمد کو اب یہ احساس ہوتا تھا کہ اُنھوں نے ساری زندگی جھک ماری ہے۔ اپنے طور پر اُنھوں نے سارے خاندان کو اپنی کوٹھی میں جمع کر کے اور اُن کے ساتھ محبتوں کا سلوک کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ وہ اُن سب کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور سوچتے تھے کہ ہر شخص کو یہی کرنا چاہیئے۔ اُنھوں نے کم از کم تھوڑا بہت فرض تو پُورا کیا ہے، لیکن غلام احمد نے اُنھیں ایک ہی وار میں چت کر دیا تھا۔ اُنھیں اپنا سب کچھ سونپ کر اُن کی عزت برقرار رکھ کر غلام احمد بدستور اُن کے ڈرائیور بنے ہوئے تھے۔ اِس سے بڑی بات شاید انسانی تصور سے بھی باہر ہو۔ وہ اکثر تنہائیوں میں بیٹھ کر یہ سوچتے تھے کہ اب اِس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟ اپنے طور پر اُنھوں نے ایک ہی فیصلہ کیا تھا اور اِس فیصلے پر عمل درآمد بھی کر رہے تھے یعنی تمام کاروبار کا حساب کتاب رکھ رہے تھے۔ اپنے لئے بس اِتنا ہی نکالتے تھے جتنا ایک جائز حد تک ممکن ہو سکے وہ بھی منافع کا تیس فیصد۔ ستر فیصد منافع وہ غلام احمد کے اکاؤنٹ میں جمع کرا رہے تھے اور تمام کاغذات غلام احمد کے نام سے ہی جمع کئے گئے تھے۔ جس کے بارے میں غلام احمد کو تفصیل سے نہیں بتایا گیا تھا لیکن بڑے بڑے معاملات میں غلام احمد کا نام ہی سرِفہرست تھا وہ کسی بھی طور یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ غلام احمد کی دولت پر قابض ہو کر بیٹھ جائیں۔ زندگی میں تو اب خیر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ غلام احمد صاحب یہ واپس لیں گے لیکن مستقبل میں جب بچے سمجھ دار ہو جائیں گے اور اپنے اپنے منصب سنبھالیں گے۔ تو احسان احمد کبھی یہ پسند نہ کرتے کہ یہ تمام دولت اُن کے نام سے منسُوب ہو۔ خفیہ طور پر اُنھوں نے کوٹھی بھی غلام احمد کے ہاتھوں ہی فروخت کر دی تھی اور اُس کے تمام کاغذات وکیل کے پاس موجود تھے۔ لیکن یہ تمام باتیں وہ غلام احمد کو بتا کر اُن کا دُکھ مول نہیں لے سکتے تھے چنانچہ خاموشی سے ہی اُنھوں نے اپنے دل کے سکون کے لئے تمام کارروائی کر ڈالی تھی اور اِس پر باقاعدگی سے عمل ہو رہا تھا لیکن کبھی کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے کوئی تاریکی نہیں تھی۔ ایک شناء تھی جسے بہرطور کسی نہ کسی صُورت میں عادل حسین کے بیٹے سے بیاہ دیا جائے گا۔ یہ مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ عادل حسین اُن کے گہرے دوست تھے اور اب عادل حسین سے بھی کوئی بات چھپی ہُوئی نہیں تھی۔ لیکن یُونہی کبھی کبھی دِل میں افسردگی آجاتی تھی۔ اِس وقت بھی اِنہی تصورات میں گھرے ہُوئے تھے کہ شناء دروازہ کھول کر بے تکلفی سے اندر داخل ہوگئی۔

"ہیلو ڈیڈی!"

احسان احمد کی آنکھوں کا چراغ تھی وہ چنانچہ وہ بھی اُسے دیکھ کر خوش ہوگئے تھوڑی دیر کے لئے تمام وسوسے اُن کے ذہن سے نِکل گئے۔

"آیئے۔ آیئے تشریف لایئے جنابِ عالی۔ یقیناً کوئی حکم نامہ لے کر آئی ہوں گی"

"نہیں ڈیڈی آج تو ایک درخواست لائی ہُوں"

"اچھا! کمال ہے بھئی! تم درخواست بھی کر لیتی ہو۔۔۔" احسان احمد نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"دروازہ بند کر دوں ڈیڈی؟"

"اگر ضروری سمجھتی ہو تو بند کر دو" احسان احمد بولے اور شناء نے دروازہ بند کر دیا۔

"دراصل یہاں مداخلت کار بہت زیادہ ہیں۔ ہماری آپ کی پرائیویٹ گفتگو میں بھی کوئی نہ کوئی مداخلت کر ہی ڈالے گا"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے" احسان احمد نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ڈیڈی وہ درخواست۔۔"

"ہاں۔ ہاں بھئی کہو کیا بات ہے؟ بے تکلفی سے کہو"

"ایک آدمی کو ملازمت دِلوانی ہے ڈیڈی"

"اوہو! اچھا۔۔۔ اچھا تو اِس کے لئے اِتنی بہت سی باتوں کی کیا ضرورت تھی؟"

"ڈیڈی کوئی اچھی ملازمت دِلوانی ہے"

"ٹھیک ہے بھئی کوئی بہت اچھی ملازمت مِل جائے گی اُسے۔ تم نے وعدہ کر لیا ہے؟"

"ڈیڈی ابھی تو میری اُس آدمی سے بات بھی نہیں ہُوئی۔ بس میں اپنے طور پر ہی یہ سوچ رہی ہُوں"

"آدمی کون ہے یہ تو بتاؤ؟"

"اقبال بھائی"

"کون اقبال؟" احسان احمد نے چونک کر پُوچھا۔

"وہی اپّو! ابراہیم صاحب کے بیٹے اقبال"

"اچھا۔۔۔ اچھا ہاں بھئی عُمدہ بات ہے اقبال کی ملازمت"

"ڈیڈی وہ آج کل ملازمت تلاش کر رہے ہیں"

"بے وقوفی کر رہا ہے۔ ملازمت گھر میں موجود ہے اور وہ باہر تلاش کر رہا ہے" احسان احمد صاحب مُسکراتے ہُوئے بولے۔

"آپ سنجیدہ ہیں ناں ڈیڈی؟"

"بالکل سنجیدہ ہُوں بھئی۔ ہماری بیٹی ہم سے کوئی بات کہے اور وہ پوری نہ ہو"

"ڈیڈی آپ اُنھیں کہاں ملازمت دلوائیں گے؟"

"لو کہاں ملازمت دلوائیں گے؟ اپنی فرم میں دے دیں گے۔ باہر کی کیا ضرورت ہے؟ بہت سے لوگوں کی جگہ خالی ہے ہمارے پاس"

"لیکن ڈیڈی بہت اچھی ملازمت چاہیئے اُسے"

"کتنی اچھی کم از کم؟"

"کم از کم منیجر کی پوسٹ"

"اوہ! ہماری فرم میں منیجر کی تو کوئی جگہ خالی نہیں ہے" احسان احمد پُرخیال انداز میں بولے۔

"ڈیڈی دراصل پوری بات نہیں سُنی آپ نے۔ میں آپ کو تھوڑی سی تفصیل سُنانا چاہتی ہُوں"

"اچھا۔۔۔ اچھا واقعی غلطی ہوگئی ہم سے، پوری بات سُننی چاہیئے تھی ہمیں" احسان احمد صاحب نے کہا اور شناء مُسکرانے لگی۔ احسان احمد کو شناء کی صُورت دیکھ کر خُوشی ہو رہی تھی اور وہ بھی تمام تفکرات سے آزاد ہو کر کھلنڈرے مُوڈ میں آگئے تھے۔

"جنابِ عالی فرمایئے"

"ڈیڈی دراصل میں اقبال کی شادی عصمت باجی سے کرانا چاہتی ہُوں"

"آپ چاہتی ہیں؟" احسان احمد آنکھیں پھاڑ کر بولے۔

"جی ہاں میں چاہتی ہُوں۔ کیا میری کوئی حیثیت نہیں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں بھئی اِس گھر میں وہی ہوتا ہے۔ جو آپ چاہتی ہیں۔ بہت بڑی حیثیت ہے آپ کی۔ لیکن بی بی اقبال کی شادی کی اجازت آپ کو کِس نے دی؟ میرا مطلب ہے آپ کو یہ اختیارات کیسے مِل گئے؟"

"بس مِل گئے۔ آپ کو اِس سے کیا؟"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی آپ کیجئے ضرور کیجئے۔ آپ اقبال کی شادی عصمت۔۔۔ عصمت۔ کون عصمت؟ غلام احمد کی بیٹی" دفعتاً احسان احمد چونک پڑے

"جی۔۔۔ جی ڈیڈی وہی۔ وہی عصمت باجی اپنی عصمت باجی"

"اوہ! اچھا۔۔۔ اچھا تو آپ اقبال کی شادی عصمت سے کرنا چاہتی ہیں؟"

"جی ڈیڈی! اُن کی بچپن سے منگنی ہے"

"اچھا تو یہ منگنی آپ نے بچپن ہی میں کر دی تھی؟"

"لیجئے میں نے تھوڑی کی تھی۔ اُن لوگوں کے والدین نے کر دی تھی"

"اچھا! اور شادی کی ذِمّہ داریاں آپ کو سونپ دی گئیں"

"جی ہاں۔ جی ہاں مجھے سونپ دی گئی ہیں شادی کی ذِمّہ داریاں"

"کیا تم سنجیدہ ہو شناء؟"

"ڈیڈی بالکل سنجیدہ۔ اِسی لئے تو آپ کے پاس آئی ہُوں"

"ہُوں! بات واقعی سنجیدہ لگتی ہے بھئی۔ تو اقبال کی شادی عصمت سے کی جائے گی"

"جی ہاں، لیکن لڑکے کا برسرِ روزگار ہونا بھی ضروری ہے۔ اقبال بھائی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور ظاہر ہے ملازمت کے بعد اُن کی شادی ہونی ہے تو پھر ہم کیوں نہ اِس مسئلے کو یہاں سے حل کرنا شروع کریں"

"ہُوں! ٹھیک۔ مگر شناء ایک گڑبڑ ہوگئی بھئی"

"کیا ڈیڈی؟"

"کیا اقبال ہمارے ہاں ملازمت کرے گا؟"

"کیوں ڈیڈی کیا آپ کی اِتنی بڑی فرم میں اُس کے لئے کوئی ملازمت نہیں ہے؟"

"ہُوں! ہاں ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے اطمینان رکھو۔ اُسے ملازمت مِل جائے گی"

"گڈ ڈیڈی ویری گڈ۔ تو پھر جس وقت اقبال بھائی کو ملازمت مِل جائے گی ناں تو ہم اِس سلسلے کو آگے بڑھا دیں گے، اور میرا خیال ہے کوئی دِقت نہیں ہوگی۔ ڈیڈی بڑا لُطف آئے گا۔ واقعی ہماری کوٹھی میں ایک بار پھر سے رونقیں ہو جائیں گی۔ ہم لوگ خوب اچھی تیاریاں کریں گے شادی کی اور خُوب دھُوم دھام سے یہ شادی کریں گے"

"ہاں بیٹے یقیناً یقیناً۔ تم یہ بتاؤ کہ تم لڑکے والوں کی طرف سے ہوگی یا لڑکی والوں کی طرف سے؟"

"دونوں کی طرف سے"

"نہیں بھئی یہ غلط ہے۔ ایسا کرو لڑکے والوں کا چارج تم سنبھال لو۔ لڑکی والوں کا چارج ہمیں دے دو"

"ہُوں! ڈیڈی واقعی مزہ آجائے گا۔ چلئے ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ میرا گڈا۔ آپ کی گُڑیا" شناء نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

احسان احمد صاحب بھی اُس کے ساتھ ہنسنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر تک ثناء اُن کے پاس بیٹھی رہی اور اُس کے بعد یہ ہدایت کر کے اُٹھ گئی کہ اقبال کی ملازمت کا فوراً بندوبست کر دیا جائے۔

اُس کے جانے کے بعد احسان احمد صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ جو خیال اُن کے ذہن میں آیا تھا وہ ذرا مختلف تھا لیکن ثناء کو اس بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں تھا۔ ثناء کے کہنے کے مطابق اقبال کی منگنی غلام احمد کی بیٹی عصمت سے بچپن سے تھی اور غلام احمد ابھی تھوڑی دیر پہلے۔۔ تھوڑی دیر پہلے وہ غلام احمد کے بارے ہی میں تو سوچ رہے تھے۔ اگر وہ اقبال کو اپنی فرم میں ملازمت دے دیں تو اس کا مطلب ہے کہ اقبال اپنے سسر کا ملازم ہوگا نا ممکن۔ اُس کے لئے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔ اور پھر وہ ایک دم چونک پڑے۔ اُنھوں نے سامنے رکھے ہوئے ٹیلیفون کو دیکھا اور اُٹھ کر اُس کے قریب پہنچ گئے پھر اُنھوں نے عادل حسین کے نمبر ڈائل کئے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟" دوسری طرف سے عادل حسین کی آواز سُن کر اُنھوں نے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔ بس کام ہو رہا ہے۔ اِن دِنوں بہت مصروف ہوں۔"

"کس وقت آؤ گے یہاں؟"

"کیوں؟"

"ذرا پہلے آجاؤ یار! کچھ باتیں کرنی ہیں۔ شام کی چائے پر تو ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے۔"

"آ رہا ہوں۔" عادل حسین نے کہا۔

"انتظار کروں؟"

"ہاں... ہاں ضرور۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" تب عادل حسین سے جواب ملا اور تھوڑی دیر کے بعد عادل حسین صاحب احسان احمد کے پاس پہنچ گئے۔ وہ سیدھے احسان احمد کے کمرے ہی میں داخل ہو گئے تھے۔ احسان احمد نے اُن کا استقبال کیا اور پھر دونوں دوست ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟"

"تم یہ بتاؤ اپنی فرم کا افتتاح کب کر رہے ہو؟"

"بس میرا خیال ہے ہفتے عشرے میں۔ تم نے دیکھا تھا تمام تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔ اسٹاف وغیرہ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ اور بس میرا خیال ہے کوئی دقت نہیں رہی۔ سارا کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ خالد اور اختر بھی اِس بات پر راضی ہیں کہ بہت جلد اُس کی ابتداء کر دی جائے تاکہ وہ اپنا کام شروع کر سکیں۔"

"یہ بتاؤ کسی کو منیجر کی پوسٹ دی؟"

"نہیں خالد اور اختر ہی سنبھالیں گے۔ منیجر کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہے۔" احسان احمد نے کہا اور عادل حسین گہری نگاہوں سے اُنھیں دیکھنے لگے۔

"اگر ہے تو پھر ہے کوئی ہے تمھاری نگاہ میں؟"

"ہاں۔"

"کون؟"

"ابراہیم صمدانی کا بیٹا اقبال صمدانی۔"

"ابراہیم صاحب! یہ جو اپنے ابراہیم صاحب ہیں۔"

"اور اقبال...؟"

"جی ہاں اُن کا بیٹا اقبال۔"

"اوہ! اچھا۔ ٹھیک ہے اگر تمھاری یہ رائے ہے تو اقبال کو ہم منیجر کی جگہ دے دیتے ہیں۔ ویسے بہت اچھا لڑکا ہے مجھے بھی بہت پسند ہے۔" عادل حسین نے کہا۔

"شکریہ عادل حسین! کچھ ایسا ہی معاملہ تھا جس کی وجہ سے مجھے تمھیں یہ تکلیف دینے کی ضرورت پیش آئی۔"

"احسان احمد..." عادل حسین نے غصیلی نگاہوں سے احسان احمد کو دیکھا۔

"بھئی پوری بات تو سُن لو۔ دراصل غلام احمد صاحب کی بیٹی عصمت سے اُس لڑکے کی بچپن کی منگنی ہے اور ظاہر ہے۔ دونوں دوست جتنے گہرے ہیں تمھیں اُس کا اندازہ ہو چکا ہوگا۔ چنانچہ یہ معاملہ اِس شکل میں طے پائے گا۔ لیکن اِس سے پہلے اقبال کے لئے ملازمت ضروری ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اُسے اپنی فرم میں میرا مطلب ہے غلام احمد کی فرم میں منیجر جنرل بناؤں۔ کیونکہ معاملہ کافی گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"میرے ذہن میں تم ہی آئے اور تمھیں ظاہر ہے ایک منیجر کی ضرورت ضرور ہوگی؟"

"ہاں بالکل ہے۔ یقیناً ہے۔ تو پھر کب مِل رہا ہوں میں اقبال سے؟" عادل حسین نے کہا۔

"بس کل بھیج دوں گا میں اُسے تمھارے پاس۔"

"کہاں؟"

"جہاں تم کہو۔"

"میرا خیال ہے فرم میں بھیج دینا۔ کل ٹھیک گیارہ بجے۔"

"او کے۔۔ او کے۔" احسان احمد نے کہا اور اُس کے بعد یہ گفتگو ختم ہو گئی۔

شام کی چائے کا ہنگامہ ہُوا جو تقریبات مستقل رہتی تھیں۔ وہی رہیں اور کوئی ایسی خاص بات نہ ہُوئی جو قابلِ ذکر ہوتی۔ لڑکے لڑکیاں اور اہلِ خاندان شام کو بس جمع ہو جاتے تھے۔ اور پھر رات گئے تک یہ تفریح کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد احسان احمد نے خاص طور سے اقبال کو اپنے پاس بُلایا اور اقبال حیرت زدہ سا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ بہت کم ایسے مواقع آئے تھے جب احسان احمد نے براہِ راست اُسے مخاطب کیا ہو۔

"آؤ بھئی ذرا تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" احسان احمد بولے، ثناء دُور سے اُن دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُس نے ابھی تک یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی یہاں تک کہ نُدرت کو بھی نہیں۔ احسان احمد اقبال کو لے کر ذرا دُور نکل گئے اور پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"سُنا ہے تم آج کل ملازمت کی تلاش میں ہو؟"

"جی چچا جان! ظاہر ہے اب تعلیم ختم کرنے کے بعد ملازمت کی ضرورت تو ہے مجھے۔"

"کہاں، کہاں درخواستیں دیں؟"

"دو تین جگہ کوشش کر چکا ہوں۔"

"کوئی کامیابی؟"

"ابھی تک تو نہیں۔"

"مجھ سے کیوں نہیں کہا؟" احسان احمد بولے اور اقبال جھینپے جھینپے انداز میں گردن جھکائے اُن کے ساتھ چہل قدمی کرتا رہا۔

"بولو مجھ سے کیوں نہیں کہا؟"

"بس ہمت نہیں پڑی۔" اقبال نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا... اچھا خیر کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تمھارے لئے ایک ملازمت کا بندوبست کر دیا ہے۔ کل ٹھیک گیارہ بجے میرے دیئے ہُوئے پتے پر چلے جانا۔ بات چیت ہو جائے گی۔"

"واقعی تم... میں... میں۔"

"بس... بس... بس اِس حد تک میں نے سُن لیا کہ تمھاری ہمت نہیں پڑی مجھ سے یہ بات کہنے کی لیکن اب اِس کے بعد میں یہ کرنا بالکل پسند نہیں کروں گا کیا سمجھے۔ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرو اور کچھ کر کے دِکھاؤ، کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا چچا جان آپ اطمینان رکھیئے انشاء اللہ تعالیٰ مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی کسی کو۔"

"پتہ نوٹ کر لو۔ کل ٹھیک گیارہ بجے۔" احسان احمد نے کہا۔ اور پھر اُنھوں نے عادل حسین کی فرم کا پتہ اقبال کو بتا دیا۔ اقبال عجیب سی نِگاہوں سے احسان احمد کو دیکھنے لگا تھا۔

بہر طور یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس میں اقبال کو کوئی اعتراض ہوتا۔ ظاہر ہے اُسے ملازمت کی ضرورت تھی اور یہ مسئلہ اِتنی جلد اور اِس طرح حل ہو جائے تو اُس سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہو سکتا تھا۔ اصل صورتِ حال کی اُسے ہَوا بھی نہیں لگی تھی۔ دوسرے دِن احسان احمد کے حکم کے مطابق وہ عادل حسین کی فرم پر پہنچ گیا۔ فرم دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اِتنی شاندار فرم بنائی ہے عادل حسین نے اِس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ابھی تک کوٹھی کے علاوہ اور کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جسے تمام لوگوں نے دیکھا ہو۔ پہلی بار اقبال اِس فرم کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بہت متاثر ہُوا تھا۔ عادل حسین اُسے اپنے دفتر ہی میں بیٹھے ہُوئے مِلے اُنھوں نے مُسکراتی نِگاہوں سے اقبال کا خیر مقدم کیا تھا۔

"ہیلو اقبال! آؤ بھئی بیٹھو بیٹے۔" اقبال سلام کر کے بیٹھ گیا۔ عادل حسین صاحب سے تو اُس کی آج تک براہِ راست کبھی گفتگو تک نہیں ہُوئی تھی۔

"بھئی تعجب ہُوا ہمیں یہ سُن کر کہ ہمارا ہی ایک بچہ ملازمت کی تلاش میں ہے اور ہم بلاوجہ دوسری جانب نِگاہیں دوڑا رہے ہیں۔ اقبال اگر تم ہماری فرم کی منیجری قبول کر لو تو یُوں سمجھو کہ ہماری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا۔"

اقبال کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے اِس پوسٹ کے لئے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ کافی دیر تک اُس کے مُنہ سے کوئی جُملہ ہی نہ نکل سکا۔

"اور اگر تمھیں کوئی مجبوری ہو تو پھر ظاہر ہے کہ ہم تمھیں مجبور نہیں کر سکتے۔ لیکن ہماری دِلی خواہش یہی ہے۔ بات یہ ہے بیٹے کہ لوگ تو بہت سے مِل جاتے ہیں لیکن اپنا کوئی نہیں مِلتا جو پوری ذمہ داری اور محنت کے ساتھ فرم کے معاملات سنبھالے۔"

"لیکن جناب مجھے تو اِس بارے میں کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"تجربہ عُمر دیتی ہے۔ وقت دیتا ہے اور کام دیتا ہے اور پھر ہم تمھارے نگران ہوں گے تمھیں فِکر کس بات کی ہے؟"

"آپ۔۔ آپ اگر مجھ پر یہ احسان کرنا چاہتے ہیں تو میں انکار کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ... آپ نے مجھے میرے خوابوں کی

جنّت دے دی ہے۔ میں۔۔ میں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

"اگر الفاظ نہیں ہیں تو پھر تکلیف کیوں کر رہے ہو؟ چھوڑو ان باتوں کو اقبال۔ اختر اور خالد تمھاری ماتحتی میں کام کریں گے۔ دونوں تمھارے ساتھ مکمل طور سے تعاون کریں گے اور تم اُنھیں ہر طرح سے اپنے لئے استعمال کر سکتے ہو۔ میری طرف سے اِس کی بھرپور اجازت ہے۔ تم مکمل طور سے اِس فرم کے معاملات سنبھالو گے۔ ساری تفصیلات میں تمھیں بتا دُوں گا کہ کس طرح کام کرنا ہے۔ اور جہاں تک تجربے کا معاملہ ہے میں تمھیں ایسے آدمی دُوں گا جو تمھارے ہر طرح سے معاون ہوں گے۔ اِس بارے میں تم بالکل کوئی فِکر مت کرو۔"

"جی بہت بہتر،" اقبال نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر کل ہم تمھارے لئے اپائنٹمنٹ لیٹر جاری کر دیں گے۔ اسٹاف میں جن جن لوگوں کو رکھ لیا گیا ہے۔ اُنھیں بھی اِس مہینے کی گیارہ تاریخ کو بلوا لیا جائے گا اور میرا خیال ہے اُسی دِن ہم اپنی اِس فرم کا افتتاح بھی کئے دیتے ہیں۔"

"جیسا آپ حکم دیں۔ ویسے مجھے اِس سِلسلے میں مزید ذمّہ داریاں بتا دیں۔ اب جب آپ نے مجھے یہ اعزاز بخش ہی دیا ہے تو میں اپنے کام کا آغاز بھی فوراً ہی کر دینا چاہتا ہُوں۔"

"تو کون منع کر رہا ہے بھئی تمھیں۔ بیٹھو آج ذرا تم سے دو دو ہاتھ ہی ہو جائیں۔ میں تمھیں بتاتا ہُوں کہ ہمیں کیا کیا کرنا ہے؟"

عادل حسین دو گھنٹے تک اقبال سے فرم کے معاملات پر گفتگو کرتے رہے تھے اور اُسے تمام تفصیلات سمجھاتے رہے تھے پھر انھوں نے سوال کیا۔

"اِس میں کوئی مشکل ہوگی تمھیں؟"

"قطعی نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"تو بس کل سے تمھاری یہ ذمّہ داری شروع ہو جاتی ہے۔ گیارہ تاریخ کو ہم اِس فرم کا افتتاح کر دیں گے،" عادل حسین نے کہا اور اقبال نیازمندی سے گردن جُھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے بعد عادل حسین نے اُسے مصافحہ کر کے رُخصت کر دیا تھا۔

اقبال واپس کوٹھی پہنچا تو اُس کے پاؤں زمین سے نہ لگ رہے تھے۔ اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے زندگی کی ساری خوشیاں اچانک مِل گئی ہوں۔

کوارٹر کے دروازے سے اندر داخل ہُوا تو تنویر نظر آ گئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر تنویر کو دبوچ لیا اور تنویر اس زور سے چیخی کہ وہ خود گھبرا گیا۔

"ارے کیا ہو گیا تجھے؟"

"آپ کو کیا ہو گیا؟" تنویر سہمے ہُوئے لہجے میں بولی۔

"دماغ خراب ہُوا ہے تیرا؟" اقبال ہنس کر بولا۔

"بالکل نہیں۔ کِس نے کہا آپ سے؟"

"پتہ لگا ہے،" اقبال کو اب لُطف آنے لگا۔

"جھوٹی خبر ہے خُدا کی قسم! میں تو بالکل ٹھیک ہُوں امّی ذرا باہر آئیے،" تنویر نے کہا اور سُلطانہ بیگم باہر نکل آئیں۔

"کیا ہُوا تنویر؟"

"امّی کسی نے بھائی جان کو بہکا دیا ہے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے زور سے پکڑ کر میرا دماغ دیکھ رہے تھے۔"

"آپ خود دیکھ لیجئے امّی! اِس کا دماغ خراب نہیں لگ رہا،" اقبال قہقہے لگاتا ہُوا بولا۔

"دیکھئے امّی پلیز! مجھے تو کچھ نہیں محسوس ہو رہا،" تنویر نے سُلطانہ بیگم کے پاس جا کر سر جُھکاتے ہُوئے کہا۔

"مجھے تو تم دونوں ہی پاگل لگ رہے ہو اِس وقت۔ اقبال کیا بات ہے بھئی،" سُلطانہ بیگم نے کہا۔

"میں نے اِس کے لئے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا ہے امّی ایک ہی علاج بتاتے ہیں سب اِس کا۔"

"کیا علاج؟ انجکشن لگیں گے کیا؟" تنویر نے پُوچھا۔

"جی نہیں آپ کے پیٹ میں چودہ انجکشن لگ جائیں تب بھی آپ پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ آپ کا علاج ہے شادی۔"

"کیسی شادی؟" تنویر نے ہراساں ہو کر پُوچھا۔

"ویسی شادی جس میں ایک دُولھا میاں ہوتے ہیں۔ سر پر سہرا باندھے مذ لیت کی شیروانی پہنے قسمِ اوّل کے گدھے کیا سمجھیں؟"

"میں کوئی علاج وِلاج نہیں کراؤں گی۔ ارے ہاں زبردستی کسی کو بیمار بنا کر اُس کے علاج کے لئے پریشان ہو رہے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہُوں۔ ہاں۔"

"کیا واقعی؟"

"تو اور کیا؟"

"ثبُوت دو۔"

"کیسے ثبُوت دُوں؟"

"بہت عُمدہ سی چائے بنا کر۔ اگر چائے اچھی ہُوئی تو اس کا مطلب ہے کہ تم ٹھیک ہو اور اگر ذرا بھی گڑبڑ ہُوئی تو۔۔۔"

"دیکھ لیجئے! ابھی بنا کر لاتی ہُوں آپ کو پسند نہ آئے تو پھر کہیں۔۔" تنویر نے کہا اور بدحواس سی باورچی خانے کی جانب چلی گئی۔ اقبال بے تحاشہ قہقہے لگا رہا تھا۔

"کیوں تنگ کر رہے تھے اقبال اُسے؟"

"امّی یہ لڑکی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کب بڑی ہو گی۔ آج کل تو بچّے بھی اِتنے معصُوم نہیں ہیں۔ بالکل ہی پگلی ہے یہ تو۔"

"ہاں بیٹے اِس نے دُنیا کو بہت کم دیکھا ہے۔"

"مگر امّی! میں تو سچ مچ اِس کی شادی کرنے کے لئے سوچ رہا ہُوں اور میری نِگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی ہیں کوئی بھی اچھا لڑکا مِلا تو سب سے پہلے میں اِس کی شادی کے بارے میں فیصلہ کروں گا۔" سُلطانہ بیگم کی آنکھوں میں محبت کے آثار اُمڈ آئے۔

اُسی وقت ابراہیم صاحب آ گئے۔ وہ اپنے کام سے واپس لَوٹے تھے۔ سُلطانہ بیگم اور اقبال کو مسرُور دیکھ کر بولے۔

"خیریت بھئی، کیا بات ہے۔ ہمیں بھی بتائی جائے تاکہ ہم آپ کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔"

"ابّو واقعی! بہت بڑی خوشخبری ہے۔ یُوں سمجھئے میں تو خوشی سے پاگل ہو رہا ہُوں۔ ابّو مجھے ملازمت مِل گئی ہے عادل حسین صاحب نے مجھے اپنی فرم میں جنرل منیجر کی پوسٹ آفر کی ہے۔"

"جی! وہ کیسے؟ ذرا ہاتھ مُنہ دھولُوں اُس کے بعد آپ سے تفصیلات معلوم کروں گا،" ابراہیم صاحب مُنہ ہاتھ دھونے چلے گئے، تنویر دونوں کے لئے چائے لے آئی تھی باپ کی آواز بھی سُن لی تھی چنانچہ اُن کے لئے بھی فوراً ہی چائے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اُس نے چائے کی ٹرے لا کر سامنے رکھی اور پھر پریشان سی ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ اقبال نے اُس کی صُورت دیکھی اور ہنس پڑا۔

"ابّو ذرا یہ چائے پی کر دیکھئے کیسی ہے؟" اُس نے ابراہیم صاحب سے کہا اور ابراہیم صاحب نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔

"کمال ہو گیا واقعی لاجواب چائے ہے،" تنویر کا چہرہ خوشی سے کِھل اُٹھا تھا اقبال نے بھی چائے اُٹھائی اور پھر پُرخیال انداز میں گردن ہِلاتا ہُوا بولا۔

"ابّو نے بھی تعریف کر دی ہے اور چائے واقعی اچھی ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ لوگوں کا خیال غلط ہے۔"

"بالکل غلط بھائی جان! خُدا کی قسم بالکل غلط۔ کِسی نے ہَوائی اُڑائی ہے۔ امّی آپ خود بتائیے میں دِن بھر تو آپ کے سامنے رہتی ہُوں۔"

"ارے، ارے یہ کیا چکر شروع ہو گیا؟" ابراہیم صاحب بولے

"تنویر! یہ اقبال تو تجھے چھیڑ رہا تھا مت چکر میں پڑا کر اِس کے۔ اپنے آپ کو سنبھال بیٹے۔ دُنیا کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیسی بچّوں جیسی باتیں کر رہی ہے؟"

"ایں؟" تنویر نے کہا اور پھر گردن کھُجاتی ہُوئی وہاں سے چلی گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر جھینپی جھینپی مُسکراہٹ تھی مُختصر الفاظ میں سُلطانہ بیگم نے ابراہیم صاحب کو اقبال اور تنویر کا کیس بتایا اور ابراہیم صاحب بھی ہنسنے لگے پھر بولے۔

"ویسے اقبال واقعی ٹھیک کہتا ہے۔ اِس لڑکی کے لئے ہمیں خاصی پریشانیاں اُٹھانی پڑیں گی۔ اِتنی معصُوم ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اِتنی بڑی کیسے ہو گئی۔ ہاں بھئی تو اب تم مطلب پر آ جاؤ ذرا مجھے بتاؤ تو سہی یہ واقعہ کیا ہُوا تھا؟" ابراہیم صاحب نے کہا اور اقبال اُنھیں تفصیل بتانے لگا۔ تفصیلات سُننے کے بعد ابراہیم صاحب بولے۔

"واقعی بس اسے خُدا کا احسان کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے ہم سب کو اِتنے سہارے مہیا کر دیئے۔ ویسے میں عادل حسین صاحب کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔"

"ہاں ابّو! یقیناً،" اقبال نے کہا اور اُسی شام جب عادل حسین صاحب کوٹھی آئے تو ابراہیم صاحب اُن کے پاس پہنچ گئے عادل حسین، اختر اور خالد کا یہاں آنا بس اِسی طرح کا تھا جیسے دو گھروں میں سے ایک گھر میں آ گئے ہوں یہ سب کچھ بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ یہی کیفیت اب یہاں کے لوگوں کی تھی کوئی نہ کوئی عادل حسین صاحب کی کوٹھی میں پہنچا ہی رہتا تھا ویسے شام کا اجتماع ابھی یہیں تھا۔ ابراہیم صاحب کو دیکھ کر عادل حسین ٹھٹکے اور پھر خود ہی آگے بڑھ گئے۔

"کہئے ابراہیم صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے، کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا۔"

"ارے ارے اِتنی گاڑھی اُردو کب سے بولنے لگے آپ۔ بھئی سیدھی سیدھی بات کہئے کہ میرے پاس آئے تھے۔ مجھے بُلا لیا ہوتا۔"

"میں کیا عرض کروں؟ عادل حسین صاحب سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ کیا ہیں؟"

"ارے ارے کوئی گڑبڑ ہو گئی بھئی ہم سے،" عادل حسین صاحب ہنستے ہُوئے بولے۔

"نہیں۔ آپ نے اقبال کو ملازمت دے دی ہے۔"

"آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ۔۔۔ کہ۔"

"جی۔۔ جی فرمائیے فرمائیے،" عادل حسین صاحب کسی قدر طنزیہ انداز میں بولے۔

"آپ نے یہ احسان کیا ہے ہم پر"
"نہیں کرنا چاہئے تھا" عادل حسین صاحب بولے۔

"میرا مطلب یہ نہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اتنی بڑی جگہ"

"بھائی عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ۔ ملازمت میں نے اقبال کو دی ہے اور شکریہ ادا کرنے آ گئے ہیں آپ۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ یہ کہ اقبال کے والد ہیں۔ بے شک ہیں۔ مانتے ہیں۔ ہم کبھی اس بات پر اصرار نہیں کریں گے کہ اُس کی ولدیت میں ہمارا نام لکھ دیا جائے۔ اُس کی ولدیت ہمیشہ ہمیشہ ابراہیم صمدانی رہے گی مگر بھائی تھوڑا بہت حق تو ہمیں بھی دے دو۔ ہمارا بچہ ہے، جو کچھ ہم نے کیا اپنے بچے کے ساتھ کیا۔ اِس میں نہ اُس بچے پر احسان ہے نہ آپ پر۔"

"عادل حسین صاحب! میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے۔"

"جب نہیں سمجھتے تو پھر کہنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ سنو ابراہیم! ہونہار بچہ ہے، میری آنکھیں بھی دور تک دیکھتی ہیں۔ کاروباری آدمی ہوں کہ کون میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔ اور سنو کسی پر کوئی احسان نہیں کیا ہے میں بھی اپنی فرم کو چلانا چاہتا ہوں۔ دولت کمانا چاہتا ہوں۔ یہ اندازہ ہے کہ کون میرے لئے کیا کر سکے گا۔ اِس دور میں اپنے ہر طور کافی حد تک کارآمد رہتے ہیں۔ جب کہ غیروں پر بھروسہ کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی نظریہ تھا میرے ذہن میں اور اِس سلسلے میں مَیں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

"شکریہ عادل حسین صاحب"

"پھر وہی شکریہ۔ ارے بھائی کوئی اور بات نہیں ہے تمہارے پاس کرنے کے لئے"

"معافی چاہتا ہوں۔ اب نہیں کروں گا" عادل حسین صاحب بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

"ہاں یہ ہوئی ناں ذرا مزے دار بات۔ آؤ یار ذرا ان جناب احسان احمد صاحب کو دیکھیں" عادل حسین صاحب نے ابراہیم صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور اُن کے پنجے میں انگلیاں پھنسا کر آگے بڑھ گئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر احسان احمد صاحب نظر آ رہے تھے۔ عادل حسین نے اِس سلسلے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا بس وہی شام کی نشست شروع ہو گئی تھی جس میں ہنگامہ خیزیاں ہوتی تھیں۔ ہم عمر کے لوگ یکجا ہو جاتے تھے لان پر پھر وہی دھما چوکڑی شروع ہو گئی تھی۔ اقبال، ندرت اور باقی تمام افراد بھی پہنچ گئے تھے۔ اور احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں رونقیں اُمڈ رہی تھیں۔

اختر اپنی کوٹھی سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ اُسے خوب صورت کار نظر آئی جو کوٹھی کے سامنے آکر رُکی تھی۔ اختر نے کار میں بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا اور دوسرے لمحے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اپنی کار ریورس کی اور واپس اندر لے گیا تب دوسری کار اندر داخل ہو گئی تھی اور پھر اختر کار سے اُتر آیا۔

"ہیلو نعمان صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے"

"بھائی کمال کے انسان ہو۔ واقعی کمال کے انسان ہو" نعمان اپنی کار سے اُترتا ہوا بولا پھر کہنے لگا۔

"دراصل چونکہ میں نے آپ کو بھی بتا دیا تھا جناب اختر صاحب کہ میں نے بہت سی دوستیاں نہیں کی ہیں اور اخلاق اور آداب سے ذرا عاری شخص ہوں۔ اصولاً مجھے یہ پیش کش کرنی چاہیئے تھی کہ آپ جہاں جا رہے ہیں وہاں تشریف لے جائیے لیکن معاف کیجئے گا۔ یہ پیش کش نہ کر سکوں گا اور آپ کے ساتھ چائے پیوں گا"

"تو آپ کو جانے کون دے گا اِس وقت آئیے اندر آئیے" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا اور نعمان سے ہاتھ ملا کر اُسے اندر لے گیا۔

"تو یہ ہے آپ کی اصلی کوٹھی"

"اصلی!" اختر نے کہا۔

"چلئے، چلئے ذرا ڈرائینگ روم میں چلتے مگر ٹھہریئے۔ پہلے ذرا آپ کی اِس کوٹھی کا معائنہ کیا جائے گا"

"کمال کے ڈاکٹر ہیں آپ۔ آیئے" اختر نے کہا اور پھر وہ کوٹھی کا معائنہ کراتا پھرا، اِس وقت نہ خالد تھا نہ عادل حسین صاحب تھے۔ اختر بھی کہیں جا رہا تھا۔ باقی کوٹھی میں ملازم وغیرہ موجود تھے جو یہاں رکھ لئے گئے تھے ڈاکٹر نعمان نے پوری کوٹھی دیکھی اور پھر حیرت کا اظہار کرتا ہوا بولا۔

"اِتنی بڑی کوٹھی میں آپ تنہا رہتے ہیں"

"تنہا ہوں! آپ نے یہ ملازمین وغیرہ نہیں دیکھے"

"میاں ملازمین بھی کوئی قابلِ ذکر چیز ہوتے ہیں میرا مطلب ہے آپ کی زوجۂ محترمہ اور دوسرے افراد"

"واللہ کیا گھونسہ مارا ہے آپ نے نعمان صاحب 'زوجۂ محترمہ' کا تذکرہ کر کے"

"ہیں۔ بخدا کوئی افسوسناک بات ہے کیا؟"

"اِس سے زیادہ افسوسناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ابھی تک زوجۂ محترمہ کا اِس کوٹھی میں کوئی وجود نہیں ہے ویسے میرے بڑے بھائی خالد صاحب ہیں۔ والد صاحب ہیں۔ تاہم فی الحال ذرا مل

گیا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ حقیقتیں ہیں"

"واہ یہ خالد اور والد بھی خوب رہے میرا مطلب ہے کہ خواتین کہاں ہیں؟"

"بس یہی ایک کسر ہے" اختر نے کہا۔

"یعنی آپ کی شادی وغیرہ نہیں ہوئی"

"آپ سے کہا تو تھا پہلے بھی شاید"

"کہاں! اِس حد تک گفتگو ہی کہاں ہوئی بلکہ آپ تو ہمیں صاف چکر دے کر نکل گئے"

"کیسا چکر؟"

"پتہ کون سا بتایا تھا آپ نے ہمیں اپنی کوٹھی کا؟"

"یہی پتہ بتایا تھا"

"جی نہیں! آپ نے ہمیں احسان احمد صاحب کی کوٹھی بھجوا دیا تھا اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ذاکہ زنی تھی ہم پر"

"او ہو! واقعی... واقعی مجھے یاد آیا آپ نے جب مجھ سے پتہ پوچھا تھا تو میں نے وہیں کا پتہ بتایا تھا"

"جی ہاں! اور جس لئے بتایا ہم جانتے ہیں"

"کیا پلوایا جائے آپ کو؟"

"بہتر ہے کہ کوئی غم آلود چیز پلا دیجئے"

"ہوں! ٹھیک ہے ابھی منگواتا ہوں" اختر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان چونک کر اُسے دیکھنے لگا اختر نے ملازم کو بلا کر چائے کے لئے کہا۔ اور ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی۔

"بلاشبہ آپ ذہین آدمی ہیں جب انسان پر غم انگیز کیفیت طاری ہو تو اُسے چائے ہی پینی چاہیئے"

"لیکن برادرِ عزیز! آپ کو کون سا غم کھا رہا ہے؟" اختر نے پوچھا۔

"ذرا بتائیں گے تفصیل سے کہ آپ نے ہمیں وہ پتہ کیوں بتا دیا تھا"

"بھائی ڈاکٹر نعمان! کچھ عرصے پہلے ہم لوگ وہیں تھے۔ یہ کوٹھی حال ہی میں خریدی گئی ہے اور یوں سمجھ لیجئے جس طرح شیطان کو جنت سے نکالا گیا تھا اِسی طرح ہم اُس جنت سے نکل کر یہاں آ گئے ہیں"

"ہوں تو یہ مسئلہ ہے۔ لیکن برادرِ عزیز۔ وہ جنت آپ نے کیوں چھوڑ دی؟"

"یار آپ تو جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسے جا رہے ہیں آپ کو گھریلو حالات کیوں بتائیں؟"

"اِس لئے عزیزم کہ آپ نے ہمارے ذہن میں دوستی کا تصور پیدا کیا ہے اور اب تو مجبوری ہے۔ زبردستی ہی سہی ہم نے آپ لوگوں کو اپنا دوست تصور کر لیا ہے"

"بڑی گڑبڑ ہو گئی یہ تو۔ خیر چلو کوئی بات نہیں ایک دوست کا اضافہ برداشت کیا جا سکتا ہے" اختر نے کہا اور پھر ہنس پڑا۔ ڈاکٹر نعمان بھی اُس کا ساتھ دے رہا تھا، پھر اُس نے کہا۔

"یار اختر! معاف کرنا بڑا بے تکلف آدمی ہوں اور یقینی میری کچھ باتیں تمہیں بری لگ جائیں گی۔ اب دیکھو ناں آپ سے تم پر آ گیا"

"یہی بہتر تھا آپ کہتے ہوئے جناب کے مُنہ سے کچھ جچتا نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی مہذب بننے کی کوشش کر رہا ہو"

"میاں سند یافتہ ڈاکٹر ہوں۔ کوئی بھی لفنگا نہیں کہہ سکتا" نعمان نے کہا۔

"اخلاقاً نہ کہہ سکتا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے"

"گویا صورت سے لفنگا نظر آتا ہوں"

"ارے نہیں نہیں ہرگز نہیں بالکل نہیں۔ کون کہتا ہے" اختر نے کہا۔ ملازم فوراً ہی چائے لے آیا تھا۔

"کوئک سروس ہے" ڈاکٹر نعمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب آپ چائے پیجئے اور حالِ دِل بیان فرما دیجئے"

"ناراض تو نہ ہو جائیں گے"

"نہیں، وعدہ! کوئی مسئلہ ہی ہے جس کے لئے اتنی تمہید باندھی جا رہی ہے" اختر نے مسکراتی نگاہوں سے ڈاکٹر نعمان کو دیکھتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر نعمان چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

"کچھ زیادہ ہی انتظار کرا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب" اختر نے کہا۔

"میاں چھری تلے دم تو لو۔ ذرا دِل کو تقویت بخش رہا ہوں۔ معمولی بات نہیں ہے جو تم سے کہنے جا رہا ہوں"

"یہ تجسس بھڑکا رہے ہو تم میرا"

"نہیں بخدا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سچ بول رہا ہوں کہ ہمت نہیں پڑ رہی کچھ کہنے کی۔ خیر اللہ مالک ہے جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ سو ہوا یوں کہ ہم وہاں گئے تھے، یعنی احسان احمد صاحب کی رہائش گاہ پر، ابتداء ایک خاتون سے ملاقات سے ہوئی۔"

"جی ہاں! تنویر کے نام سے جانا جاتا ہے انھیں۔ ہم نے بھی بڑی چالاکی سے اُن کا نام معلوم کر ہی لیا"

"بخدا ڈاکٹر نعمان سچ کہہ رہے ہو" اختر بُری طرح اُچھل پڑا۔

"خدا کی قسم مر مٹے ہیں اُن محترمہ۔ معاف کرنا اختر نجانے تمہارا اُن سے کیا رشتہ ہو لیکن ایسی معصوم، ایسی سادہ، ایسی تیکھی کہ

معلوم ہوتا تھا بہتر ہے جو جہاں بیٹھے گی کاٹ کھائے گی۔ بس یہی کٹ کھنا پن ہمیں پسند آ گیا۔ احمق سمجھ لو، بے وقوف سمجھ لو، کچھ بھی سمجھ لو وہاں سے واپس پلٹے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے اس دنیا میں کچھ رہا ہی نہیں۔ کسی کو دوا کا ڈوز دینا ہوتا ہے انجکشن لگا دیتے ہیں۔ انجکشن لگانا ہوتا ہے تو ڈرپ چڑھا دیتے ہیں اُس وقت سے یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ بھائی اپنی ڈاکٹری تو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ کچھ کرو۔" اختر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار ڈاکٹر نعمان کچھ اُونچی ہی چیز معلوم ہوتے ہو"

"اماں لعنت بھیجو اُونچی نیچی چیزوں پر۔ ہم تو بڑے ہی گھٹیا ہو گئے ہیں۔ یقین کرنا چاہو تو کرو ورنہ کوئی شریف آدمی کسی شریف آدمی کے گھر پہلی بار جائے وہاں کسی خاتون کو دیکھے اور پھر اُسی شریف آدمی سے اپنے عشق کی داستانیں بیان کرنے لگے۔ توبہ توبہ یہ انسانیت کے بالکل خلاف ہے، بڑا غور کیا، بڑا سوچا لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو جھگڑے سے بچنے کے لئے دل میں سوچا کہ تمہاری کوٹھی تلاش کریں۔ جس کا پتہ ہم نے وہیں سے لے لیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ گھونسے مار کر نکال دو گے، لیکن ہم سر سامنے کر دیں گے تاکہ دماغ سے یہ عشق کے جراثیم ناک کے ذریعے باہر نکل جائیں۔ اگر جوتے نہ لگائے تو اس کا مقصد ہے کچھ اُمیدیں بندھ جاتی ہیں اور ہم نے تمہارے چہرے پر ابھی تک ناخوشگواری کے آثار نہیں دیکھے۔" اختر بے اختیار قہقہے لگاتا رہا تھا پھر اُس نے کہا۔

"میں نے اُونچی چیز بلاوجہ نہیں کہا تھا۔"

"اللہ وجہ بھی بتا دیجئے۔" ڈاکٹر نعمان ناک پر اُنگلی رکھ کر بولا۔

"اُونچی چیز اس معنے ہیں آپ کہ آپ نے بالکل خالی مکان پر چھاپہ مارا ہے۔"

"اماں، تمہیں واللہ۔ یعنی ذرا سی کچھ حقیقت اور میرے بھائی، تمہیں اللہ کا واسطہ۔"

"عزیزم وہ علاقہ بالکل خالی ہے اور وہاں ابھی کوئی بستی آباد نہیں ہوئی ہے۔ مگر یار کمال ہے تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ ایسی کوئی بات ہے۔"

"او ہو۔ اس کا مطلب ہے وہاں پلاٹنگ ہو چکی ہے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے نہیں ہونی چاہئے تھی۔"

"ضرور ہونی چاہئے تھی بھائی مگر ہمیں بھی وہاں کوئی پلاٹ خالی مل جائے گا۔"

"تم تو خود اُس پر چھاپہ مار چکے ہو۔"

"نہیں بھیا! یہ تو بس یوں سمجھ لو کہ دیکھ کر چلے آئے ہیں اور دل میں ہزاروں وسوسے لئے بیٹھے ہیں کہ نہ جانے کیا ہو۔ تم سے کہتے ہوئے بھی بس یہی سوچا تھا کہ یا تو تعلقات ختم اور مار پیٹ شروع یا پھر یہ کہ کچھ کام بن ہی جائے گا اگر صاحب دل ہوئے تو۔"

"اچھا اب سنجیدہ ہو جاؤ ڈاکٹر۔ بات سنو، وہ کوٹھی جو ہے نا، واقعی بہت اچھے انسانوں کی بستی ہے۔ وہاں جو لوگ رہتے ہیں وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ محبت کرنا جانتے ہیں۔ محبتیں نبھانا جانتے ہیں۔ جو خواتین و حضرات وہاں قیام پذیر ہیں اُن میں کچھ آپس کے رشتے قائم ہو چکے ہیں۔ جن محترمہ کا آپ نے تذکرہ کیا اُن کا ابھی تک کسی سے ایسا رشتہ نہیں ہے لیکن یہ بات میں پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اس سلسلے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی دوست بنایا تھا میرے خیال میں تم بالکل صحیح جگہ پہنچے ہو۔"

"خدا تمہیں ہر قسم کی بیماریوں سے بچائے۔ واقعی یہ بات کہہ کر تم نے میرا دل بڑھا دیا ہے اختر! سچ مچ بڑا غور کیا اس بات پر مگر کچھ ایسی کمبخت دل میں چبھ گئی ہے کہ بتا نہیں سکتے۔"

"کسے کمبخت کہہ رہے ہو۔"

"بات کو یار۔ بات کو بھلا تمہارے خیال میں ہم کسے کمبخت کہہ سکتے تھے۔"

"میں سمجھا تو یہ کو۔"

"ہائے۔۔۔ اُن کے سامنے کمبخت تو ہم ہیں۔ وہ تو خوش بخت ہیں کہ اُنھوں نے ایک ہی نگاہ میں ہماری محبت حاصل کر لی۔ کمبخت تو ہم ہیں کہ اُنھوں نے ہمارے ساتھ ہماری گاڑی میں بیٹھنا بھی قبول نہ کیا۔" ڈاکٹر نعمان نے پوری تفصیل اختر کو بتا دی اور اختر ہنستا رہا۔

"مزے کی چیز ہو دوست۔ آہستہ آہستہ کھل رہے ہو۔"

"ارے اب کھلنے کو کچھ نہیں رہ گیا۔ سب کچھ کھل کر تمہارے سامنے ڈھیر ہو گئے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کرنا کیا ہے۔"

"دیکھو بھائی میں اُس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بلاشبہ بہت ہی معصوم، بہت ہی سادہ مزاج ہے۔ ویسے یوں سمجھ لو کہ اگر اُس کے دل میں کوئی اور آباد نہیں ہے تو تمہارے چانسز سو فیصد ہی ہیں۔"

"اللہ، کوئی وظیفہ ہی بتا دو تاکہ اُس آبادی کو خالی کرایا جا سکے۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"خیر وظیفہ وغیرہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن ٹرائی کرتا ہوں اس سلسلے میں میرے کچھ نمائندے وہاں موجود ہیں۔

"کرو ٹ کرو ٹ۔ مم۔۔۔ مگر نہیں۔ شاید کچھ غلط بول رہا ہوں۔ یار سمجھ لو کہ ساری دُعائیں دے ڈالیں تمہیں اور اب میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کوئی دُعا نہیں ہے۔" اختر اور ڈاکٹر نعمان دیر تک ہنستے رہے تھے پھر اختر نے کہا۔

"چلو گے وہاں؟"

"خدا کی قسم دل کی بات کہہ ڈالی ہے۔ اس وقت تو بس ایک ہی آرزو ہے دل میں کہ کوئے جاناں کا طواف کئے جائیں۔ جملہ غلط تو نہیں ہو گیا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں بالکل ٹھیک ہے۔ پرانے پاپی معلوم ہوتے ہو۔ ایکٹنگ کر رہے ہو۔"

"بخدا لعنت بھیجتا ہوں جھوٹ بولنے والے پر۔"

"خیر۔۔۔ مگر شام کو۔"

"ارے۔۔۔ ارے ابھی کیوں نہیں؟"

"اب بے کار باتوں سے گریز کرو۔ میری بھی مٹی پلید کراؤ گے کیا؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں اُستادِ محترم۔ آپ کے لئے تو یہ جانِ عزیز بھی حاضر ہے۔"

"کس کس کے لئے یہ جان حاضر ہے۔"

"صرف دو افراد کے لئے۔ یعنی اُن خاتون کے لئے اور اُس کے بعد آپ کے لئے۔"

"خیر اس سچ پر خوش ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے شام کو ساڑھے چھ بجے وہاں آ جانا اور اپنے ساتھ اُن حضرت کو بھی لے آنا۔"

"کسے؟"

"تصور بیگ صاحب کو، بہت دنوں سے غائب ہیں۔"

"وہ آئے کہاں ہیں؟"

"ابھی تک نہیں آئے۔"

"منیلا سے سویڈن چلے گئے ہیں۔ ٹیلیفون پر اطلاع دی تھی۔"

"او ہو۔ کوئی لمبا ہی چکر ہے۔"

"ہاں یقیناً انٹرپول کے ساتھ کچھ کام کر رہے ہیں۔ ویسے چچا جان بھی اُن کے لئے پریشان ہیں۔"

"چچا جان؟"

"اُن کے والدِ محترم کا تذکرہ کر رہا ہوں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔ آپ شام کو تشریف لے آئیے ہم انتظار کریں گے۔"

"بخدا دل کی ساری دُعائیں تمہارے لئے ہیں اختر حسین سمجھے۔"

"سمجھ گیا۔ اب کیا خیال ہے اُٹھنا پسند کرو گے۔"

"اُٹھ رہے ہیں بھائی! دل تو چاہتا ہے کہ آپ سے اُن کی باتیں کئے جائیں۔"

"آپ کو پتہ ہے۔ میں کہیں جا رہا تھا۔"

"تو چل تو رہے ہیں ناں، آپ خود بھی تو اُٹھیے محترم اختر حسین صاحب۔" اختر اُٹھ گیا تھا اور پھر دونوں باہر نکل آئے ڈاکٹر نعمان نے اپنی کار ریورس کی اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اختر بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"تو پھر ساڑھے چھ بجے۔" نعمان نے ایک بار پھر سر نکال کر کہا۔

"خدا حافظ" اختر نے کہا اور پھر اپنی کار ایک جانب اُڑا لے گیا۔ نعمان دیر تک وہیں کھڑا اُس کی کار کو دیکھتا رہا تھا پھر اُس نے بھی ایک ٹھنڈی سانس لے کر کار آگے بڑھا دی۔ واقعی تنویر اُس کے دل میں اُتر گئی تھی اور وہ بہت کچھ سوچتا رہا تھا اُس کے بارے میں۔ اختر کی شخصیت اُسے پسند آئی تھی۔ دلچسپ آدمی تھا بس خطرہ یہ تھا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے کہ اختر بگڑ جائے۔ پھر سوچا کہ ہمت تو کرنی ہی پڑے گی۔ بات بگڑ گئی تو دیکھا جائے گا۔ اُس کے بعد بس وہ اپنے طور پر اسی سلسلے میں سوچتا رہا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے سے ہی اُس نے جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بہت سے لباس نکالے تھے اور اُنھیں مسترد کر دیا تھا بعض بہت قیمتی اور بھڑکیلے تھے اور بعض بہت زیادہ گھٹیا۔ اختر جیسے چالاک آدمی سے اُسے اندیشہ تھا کہ وہ اُسے چٹکیوں میں اُڑا کر رکھ دے گا چنانچہ نارمل ہی رہنا مناسب تھا تاہم بڑی نفاست سے سوٹ پہنا، ٹائی وغیرہ باندھی۔ ہلکے قسم کا سینٹ لگایا۔ اور بے چینی سے گھڑی میں وقت دیکھتا رہا پھر وقت سے کچھ پہلے ہی باہر نکل آیا کہ کہیں کسی اور طرف سے کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے اور وہ نہ پہنچ پائے۔ کار کو سست رفتاری سے آگے بڑھاتا رہا تاکہ وقت بھی ہو جائے اور پھر ٹھیک ساڑھے چھ بجے وہ احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ لان پر دھماچوکڑی مچی ہوئی تھی یہاں تو روزانہ یہی سب کچھ رہتا تھا اور آج تو خاص طور سے اختر نے اہتمام کیا تھا۔ اُس نے سرسری انداز میں بتا دیا تھا کہ نعمان سے اُس کی دوستی ہوئی ہے اور اُس نے آج شام کو نعمان کو یہاں بلایا ہے۔ سب ہی نعمان کے منتظر تھے۔ ہر طور اُن لوگوں کی اپنی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اختر کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ آج کا مہمان ڈاکٹر نعمان ہے۔ اختر نے خصوصاً اقبال، تنویر اور باقی تمام افراد کو بلا لیا تھا۔ تنویر ایسے ہنگاموں سے بھاگتی تھی لیکن اختر نے ندرت سے کہا تھا کہ تنویر کو ضرور لایا جائے۔ لیکن اُس نے ندرت کو اصل بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی تنویر

بھی آگئی تھی اور حسبِ معمول بونقوں کی طرح ہر معاملے میں مصروف تھی۔ عجیب ہی لڑکی تھی۔ کبھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہوتی اور کبھی اُس پر ایسے بے وقوفی کے دورے پڑتے کہ لوگوں کو حیرت ہونے لگتی تھی۔ اُسے علم نہیں تھا کہ ڈاکٹر نعمان بھی آرہا ہے اُس دن اُس نے ڈاکٹر نعمان کو دیکھا تھا۔ کچھ باتیں ہُوئی تھیں لیکن وہ بعد میں اُن تمام باتوں کو بھول گئی تھی اب اِس وقت جو اُس نے ڈاکٹر نعمان کو اُترتے ہُوئے دیکھا تو اُسے وہ باتیں یاد آگئیں اور انجانی گھبرائی ہُوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اُس کی جانب متوجہ تو نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کیا فرق پڑتا ہے آتا ہے تو آجائے۔ ڈاکٹر نعمان کا استقبال سب ہی نے کیا تھا اور ڈاکٹر نعمان ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ سب نے اُس سے ہاتھ ملائے اور اُس کے بعد احسان احمد صاحب کہنے لگے۔

"آیئے بھئی ڈاکٹر صاحب! ویسے ہم لوگوں کے خاندان میں، میرا مطلب ہے یہاں جو لوگ جمع ہیں اُن میں ایک ڈاکٹر کی کمی واقعی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اب یہ پتہ نہیں کہ آپ ایک تجربہ کار ڈاکٹر ہیں یا ایسے ہی فضول سے۔ خیر اللہ نہ کرے کہ آپ سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئے۔"

"میں کیا عرض کرسکتا ہُوں۔ ویسے لوگوں کا خیال ہے کہ میں خاصہ تجربہ کار ہُوں اور اِتنی سی عمر میں، میں نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ معاف کیجئے گا شاید آپ لوگوں کو اِتنی سی عمر پر اعتراض ہو لیکن میں واقعی ابھی کم عمر ہوں۔"

"ارے۔ ارے۔ تو بیٹا یہ کون کہہ رہا ہے تم سے کہ تم بُوڑھے ڈاکٹر ہو۔"

"جی نہیں تجربہ وغیرہ بُوڑھے لوگوں سے ہی منسلک کر دیا جاتا ہے۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ چھوڑو اِن باتوں کو اِس وقت تم ایک ڈاکٹر نہیں مہمان ہو۔" احسان احمد صاحب نے کہا۔ نعمان کی باتیں اُنھیں پسند آئی تھیں اُس کے بعد قہقہے لگنے لگے۔ خوش گپیاں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر نعمان نے بھی کسی حماقت کا اظہار نہیں کیا تھا اور تنویر کی طرف سے لا پرواہ رہا تھا۔ البتہ اختر کی نگاہیں تنویر کا اور اُس کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ تاہم اُس نے کسی سے اِس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وقت سے پہلے بات کو ظاہر کرنے کا مقصد ہے کہ گڑبڑ ہو جائے۔ یہاں کے لوگ ویسے بھی بہت خوفناک تھے۔ اور کوئی بھی بات کسی بھی شکل میں بگاڑ سکتے تھے۔ اِس لئے اختر نے احتیاط رکھی تھی۔ بہرطور ڈاکٹر نعمان سب سے گفتگو کرتا رہا۔ چائے کا دور چلا۔ خاص طور سے اختر نے بڑی چالاکی سے ڈاکٹر نعمان کے لئے ایک ایسی جگہ منتخب کی جس کے سامنے تنویر بیٹھی ہُوئی تھی اور تنویر سے حماقتیں سرزد ہونے لگیں۔ لیکن اِن حماقتوں کو کسی نے ڈاکٹر نعمان کی آمد کا نتیجہ نہیں سمجھا تھا۔ پھر ایک بار ڈاکٹر نعمان کو موقعہ مِل گیا اور اُس نے تنویر سے کہا۔

"محترمہ تنویر صاحبہ۔"

"جی فرمائیے۔"

"اُس دِن آپ کچھ ناراض ہوگئی تھیں مجھ سے۔"

"میں ... بالکل نہیں غلط ہے۔ قطعی ناراض نہیں ہُوئی تھی۔"

"او ہو تو خوش ہُوئیں تھیں۔"

"جی ..." تنویر نے حیرت سے کہا۔

"بھئی دیکھئے ناں! دو ہی چیزیں ہوتی ہیں انسان یا تو کسی سے ناراض ہوتا ہے یا خوش ہوتا ہے۔ آپ کو دونوں میں سے کیا ہُوا تھا؟"

"مجھے کچھ نہیں ہُوا تھا۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہُوں۔ جیسے پہلے تھی۔ ویسے اب بھی ہُوں۔ کیا سمجھے آپ۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں سمجھ گیا اِس کا مقصد ہے کہ آپ ناراض نہیں ہُوئی تھیں۔"

"ارے واہ، زبردستی ہے اب میں یہ کہوں کہ میں خوش ہُوئی تھی۔"

"کہہ دیجئے کیا حرج ہے۔" ڈاکٹر نعمان نے گڑگڑاتے ہُوئے کہا۔

"نہیں کہوں گی! بالکل نہیں کہوں گی۔ آپ پتہ نہیں کیا سمجھیں گے۔"

"قسم لے لیجئے جو کچھ سمجھوں۔"

"واقعی۔"

"جی بالکل! قسم آدمی بلاوجہ تو نہیں کھاتا۔"

"تو پھر یہ سمجھ لیجئے خوش ہُوئی تھی۔"

"خُدا آپ کا بھلا کرے ویسے میں آپ کو خوش کرنے کے لئے کس وقت آجایا کروں۔"

"اے۔ اے مسٹر آپ بہت زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں بہت زیادہ بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں تھوڑا سا بے تکلف ہُوں گا آپ سے۔"

"جی ہاں۔ ذرا خیال رکھئے گا۔"

"میں نے وقت پُوچھا تھا۔"

"کوئی وقت نہیں میرے پاس۔ میں بہت مصروف ہُوں۔ پتہ ہے گھر کے سارے کام میں خود کرتی ہُوں۔"

"اچھا۔ خیر اللہ مالک ہے۔ پھر شام ہی کو کبھی کبھی ملاقات ہو جایا کرے گی۔"

"ہاں۔ شام کو سب لوگ فارغ ہو جایا کرتے ہیں اور ہم سب لان پر آجاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا نا کتنا اچھا لگتا ہے یہاں۔"

"بہت اچھا، آپ یقین کیجئے تنویر صاحبہ! بہت خوبصورت۔"

"جی ہاں بالکل میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہاں سب لوگ اِتنے اچھے ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔"

"نہیں نہیں۔ بتا سکتی ہیں۔ آپ اگر بتانا چاہیں تو . . ." ڈاکٹر نعمان نے کہا اور پھر خالد کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر سنجیدہ ہوگیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب تصور بیگ کہاں ہیں؟"

"میں نے بتایا تھا اختر صاحب کو وہ منیلا گئے ہُوئے تھے منیلا سے پھر سوئیڈن چلے گئے ہیں۔"

"واپسی کب تک متوقع ہے؟"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا خالد صاحب۔" اُس کے بعد دوسرے لوگوں کے درمیاں گفتگو ہوتی رہی احسان احمد صاحب نے تو ڈاکٹر نعمان کو رات کے کھانے کی بھی پیش کش کر دی تھی لیکن نعمان نے معذرت کرتے ہُوئے کہا کہ اُسے رات کی شفٹ میں جانا ہے۔ اور یہ بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ پونے آٹھ بجے وہ وہاں سے رُخصت ہوگیا جاتے ہُوئے وہ دِل میں بہت سی خوشگوار کیفیات لے کر گیا تھا۔

●

رِدا نے اپنے آپ کو پھر حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا ابتداء میں اُسے بہت سے خدشات لاحق رہے تھے۔ اُسے اِس بات کا خوف تھا کہ آفندی صاحب یہاں آتے جاتے رہیں گے، اور ہو سکتا ہے اُس پر آفندی صاحب سے روابط بڑھانے کے لئے دباؤ بھی ڈالا جائے۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُسے کچھ اعتماد سا ہونے لگا آفندی صاحب اِس دوران ایک بار بھی یہاں نہیں آئے تھے نہ ہی کسی نے اُس سے اُن کے بارے میں کوئی گفتگو کی تب رِدا کسی حد تک بہتر ہوگئی اور اب وہ اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوششوں میں مصرُوف تھی۔ دفتر کے معاملات اُس نے اِس طرح سنبھالے تھے کہ احسان احمد صاحب دانتوں میں اُنگلیاں دبا کر رہ گئے تھے وہ ایک انتہائی تجربے کار منیجر ثابت ہورہی تھی۔ بارہا احسان احمد صاحب کہہ چکے تھے کہ اُس نے یہاں سے اِس طرح جا کر احسان احمد صاحب کو زک پہنچانے کی کوشش کی تھی یقیناً وہ اُس جیسا شاندار منیجر نہیں لاسکتے تھے۔ رِدا ایسے اوقات میں بس نیاز مندی سے گردن جھکا دیتی تھی احسان احمد صاحب اُس کے ہر قدم کو سراہتے تھے اور بلاشبہ رِدا نے کاروباری معاملات میں ایسی زبردست ذہانت کے مظاہرے کئے تھے کہ بعض اوقات تو بڑے بڑے لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اب وہ صرف اِس کوٹھی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ فرم کی طرف سے اُس کے تعلقات دوسرے لوگوں سے بھی بڑھتے جارہے تھے اُن میں بہت سے کاروباری لوگ بھی تھے۔ اور بہت سے ایسے بھی جن کا تعلق دوسرے شعبوں سے تھا اکثر اہم میٹنگوں میں اُسے بھی طلب کیا جاتا تھا اور وہ اپنی فرم کی نمائندگی کرتی تھی اُس کی اچھی خاصی پذیرائی ہونے لگی تھی اور کچھ مصرُوفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ اُس کی شخصیت میں ایک انوکھی تمکنت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ حُسن و جمال میں تو اُس کا کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔ آج بھی احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں جب وہ دوسروں کے درمیان آجاتی تو پھر کوئی چراغ جلتا نہ رہتا تھا سب ہی اُس کے سامنے بُجھے بُجھے سے نظر آتے تھے۔ خاص قسم کی میٹنگوں میں بھی اُسے بڑی اشتیاق آمیز نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا بہت سے سرپھروں نے اُس کی دوستی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن رِدا یہ بات شاید پہلے ہی جانتی تھی اور اُس نے اِس کے لئے ایک طریقۂ کار بھی متعین کر لیا تھا وہ ایسے لوگوں سے انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی اور اُن کو یہ باور کرادیتی تھی کہ وہ کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جس سے وہ دوستی کی پینگیں بڑھا سکیں۔ ہاں کاروباری اُمور میں وہ جس طرح بھی چاہیں اُس سے دِلچسپی لے سکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں وسیم نامی ایک نوجوان خاصا آگے بڑھ آیا تھا۔ ایک دولت مند باپ کا بیٹا تھا اور اُس کے باپ کا انتقال ایک سال قبل ہُوا تھا۔ ایک سال پہلے اُس نے باپ کی موت کے بعد یہ کاروبار سنبھالا تھا اور بہرطور خوش اسلُوبی سے چلا رہا تھا اور اپنی شخصیت کو بھی سنوار رہا تھا۔ رِدا کو اُس کے بارے میں تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ لیکن صرف ایک کاروباری آدمی کی حیثیت سے۔ البتہ میٹنگوں کے دوران وسیم نے رِداء کی قربت حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ ایک میٹنگ کے دوران اُس نے کہا۔

"رِداء صاحبہ میٹنگ کے بعد آپ سے کچھ ضروری اُمور پر گفتگو کرنا چاہتا ہُوں۔"

"معاف کیجئے گا۔ کیا وہ اُمور اِتنے ہی ضروری ہیں کہ آپ آج ہی اِس موضوع پر مجھ سے گفتگو کریں گے مسٹر وسیم!"

"ہیں تو ضروری لیکن اگر آپ کے پاس وقت نہ ہو تو میں مجبور نہیں کروں گا۔"

"جی ہاں! کوئی بہت ہی اہم بات ہو تو آپ مجھے بتا دیجئے۔"

ورنہ ہم پھر کوئی ملاقات طے کر لیتے ہیں"

"بالکل۔ بالکل۔ اتنی بھی ضروری نہیں ہے کہ اِس وقت آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف زحمت دُوں۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود ہی کوئی وقت متعین کر لیں"

"جی ضرور۔ آپ یُوں کیجئے کہ کل دوپہر کو ڈھائی بجے"

"وہ تو خالص کاروباری وقت ہوتا ہے"

"معاف کیجئے گا میرے کچھ اصُول ہیں۔ پانچ بجے کے بعد میں عموماً کسی کاروباری مسئلے میں اُلجھنا نہیں چاہتی"

"اور اگر مسئلہ خالص کاروباری نہ ہو تو..."

"تو پھر مجھے اپنے مشاغل میں سے وقت نکالنا پڑے گا"

"نہیں... نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن کل ڈھائی بجے آپ سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"اگر آپ میرے دفتر تشریف لے آئیں تو لنچ کے بعد مَیں کافی آپ کے ساتھ پیئوں گی"

"آہ! کاش آپ لنچ پر ہی دعوت دے ڈالتیں"

"ہاں... ہاں! کیوں نہیں لنچ میرے ساتھ کر لیجئے۔ لیکن بدقسمتی سے میں لنچ نہیں کرتی دوپہر کو بس کافی پی لیتی ہُوں"

"ارے توبہ توبہ۔ میں تو لنچ ضرور کرتا ہُوں۔ خیر ٹھیک ہے کل ڈھائی بجے آپ کی خدمت میں حاضری دے رہا ہُوں" وسیم نے کہا اور رِداء نے پُراخلاق انداز میں گردن خم کر دی۔ وسیم کی اِس گفتگو کا اُس نے کوئی خاص اثر نہیں لیا تھا اور بعد میں اُسے بھُول ہی گئی تھی۔ لیکن دوسرے دِن جب ٹھیک ڈھائی بجے اُسے وسیم کے بارے میں اطلاع ملی تو وہ چونک پڑی۔ وسیم مُسکراتا ہُوا اندر داخل ہوگیا تھا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہُوئی رِدا صاحبہ" اُس نے کہا اور کرُسی پر بیٹھ گیا۔

"قطعی نہیں"

"آپ نے یقیناً کافی کے لئے کہہ دیا ہوگا"

"نہیں اِتنی مُستعدی نہیں دِکھا سکی" رِدا نے کہا اور مُلازم کو بُلانے کے لئے گھنٹی بجا دی۔ کافی کے لئے کہہ کر اُس نے وسیم کو دیکھا پھر بولی: "جی وہ ضروری امُور کیا تھے؟"

"کوئی خاص نہیں ہیں آپ سے اُس مُختصر ملاقات میں جی نہیں بھرا تھا۔ بائی دی وے آج کل کاروباری حلقوں میں آپ بڑا موضوع بنی ہُوئی ہیں"

"وہ کس طرح؟"

"لوگوں کا خیال ہے کہ حُسن اور ذہانت یکجا نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں یہ خیال غلط ثابت ہُوا ہے۔ آپ نے احسان لمیٹڈ کے لئے جو کچھ کیا وہ بہت اہم ہے"

"میں نمک حلالی کر رہی ہُوں۔ اور میرے خیال میں کرنی چاہیئے۔ باقی فرم کے مالک کی تقدیر ہے"

"ہم لوگ ایک پیش گوئی کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ بہت جلد آپ خود کسی فرم کی مالک ہوں گی"

"اوہ۔ یہ آپ لوگوں کی محبت ہے" رِدا نے کہا وسیم نے کافی پی اور رِدا اُسے کریدتی رہی۔ لیکن وسیم نے کوئی اہم بات نہیں کی تھی پھر اُس نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"سوری رِدا صاحبہ! اچانک میں نے وہ اہم مسئلہ آپ کو بتانے کا فیصلہ بدل لیا ہے۔ میرے خیال میں اُس کے لئے مَیں دوبارہ آپ سے ملاقات کروں گا"

پھر وہ زور سے الوداعی کلمات کہہ کر چلا گیا اور رِدا شانے ہلا کر رہ گئی۔ اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں وسیم کے لئے کوئی تصور نہیں اُبھرا تھا، بس اِتنا ہی احساس ہُوا تھا اُسے کہ وہ کاروباری ہے اور احسان احمد کی فرم کی بہتری کے لئے وہ کسی بھی شخص سے رابطہ کر سکتی تھی۔ وسیم آفس سے جاتے ہی اُس کے ذہن سے نِکل گیا تھا لیکن اُس شام اُسے ایک ہلکا سا ذہنی جھٹکا برداشت کرنا پڑا۔ یہ وہی شام تھی جب ڈاکٹر نعمان یہاں آیا تھا۔ رِدا بھی معمُول کے مطابق موجود تھی اُس نے نعمان کو دیکھا۔ نعمان بالکل تصور بیگ کا ہمشکل تھا اُسے تصور بیگ یاد آگیا۔ اور پھر وہ رات تصور بیگ کے خیال میں گزُری۔ اُسے احساس ہُوا کہ وہ انتہا پسند ہے، بے شک اُس کے حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ دِل کی چالوں میں اُلجھ جائے لیکن تصور تو اُس کے ساتھ مُخلص تھا اُس کی ذات سے تو کوئی ایسا خیال وابستہ نہیں تھا جو باعثِ اذیت ہو۔ سِوائے ایک خیال کے، اور وہ ثاقب کا خیال تھا۔ ثاقب نے بھی حنا کو نہ جانے کون کون سے رُوپ دکھائے ہوں گے۔ نہ جانے کِس کِس طرح اُسے اپنے فریب کے جال میں پھانسا ہوگا سب یہی کرتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہوں گے۔ سب ہی بعد میں دوسری شکلوں میں نمایاں۔ یہاں اُس کی سوچ رُک گئی۔ کیا یہ خیال دُرست ہے۔ دُنیا ایک جیسی تو نہیں ہے بہت سے لوگ نظروں کے سامنے ہیں۔ کامیاب جوڑے جو بُوڑھے ہوگئے۔ اور آج بھی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور... اور مگر اُن کے حالات کافی مختلف ہیں۔ تو کیا تصور بیگ۔ میں نے کچھ زیادہ ہی سختی برت ڈالی۔ وہ

میرے ساتھ صرف میری وجہ سے لاہور گیا تھا۔ کئی دِن گُزارے اُس نے میرے لئے۔ اور میں نے... میں نے اُسے اپنے گھر کی چھت بھی نہ دی۔ زیادتی کی تھی میں نے۔ اور... اور کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔ لیکن وہ کوٹھی بھی تو نہیں آیا۔ دادی امّاں سے مِلنے بھی آجاتا۔ رِدا بہت اُلجھ گئی تھی۔ آخری فیصلہ اُس نے یہ کیا کہ خود کو کسی حد تک بدلا جائے۔ اُس کے مسائل ذاتی ہیں۔ اُس کی اُلجھنوں سے اِس گھر کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اِتنے اچھے لوگ ہیں جو اُسے ہر طرح برداشت کر رہے ہیں ورنہ کون کسی کے لئے کچھ کرتا ہے۔ مجھے اُن میں گھُلنا مِلنا چاہیئے۔ یہ گھٹیا پن ہے کہ میں خود کو لئے دیئے رکھوں۔

اپنے اِس فیصلے پر اُس نے دوسرے دِن سے ہی عمل شروع کر دیا۔ اُس دِن آفس میں بھی اُس نے مِس فراز سے بالکل بدلے ہُوئے انداز میں گفتگو کی۔ مِس فراز اسٹینو گرافر تھی۔ اور شاید آج تک اُس نے رِدا کی مُسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔

"ہیلو مِس فراز" وہ مُسکرائی اور مِس فراز چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔

"ہیلو میڈم!"

"آج آپ کے لباس میں کچھ سادگی ہے"

"جی میڈم؟"

"میں نے آپ کو ہمیشہ بھڑک دار لباس میں دیکھا ہے"

"آپ نے مجھے دیکھا ہے میڈم؟" مِس فراز نے بے ساختہ کہا۔ اور رِدا کو ایک عجیب سا احساس ہُوا۔ دوسرے بے جان تو نہیں ہوتے کہ کچھ محسوس نہ کریں۔ مِس فراز کے الفاظ بھرپُور طنز رکھتے تھے۔

"کیا مطلب؟" رِدا نے کہا۔

"سس... سوری میڈم"

"بیٹھئے بھئی آپ کچھ ناراض معلوم ہوتی ہیں"

"شش... شکریہ"

"ناراض ہیں ناں آپ؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا میڈم! میں یہ جُرأت کر سکتی ہُوں"

"لگتا تو ہے۔ آپ کے الفاظ بتاتے ہیں۔ چلئے ہم آپ کو میٹھی میٹھی شکر والی چائے پلاتے ہیں۔" رِدا نے گھنٹی بجائی اور چپراسی سے چائے کے لئے کہا۔

"میڈم! آج کچھ کام نہیں ہے؟"

"چائے کے بعد"

"جی بہتر"

"ہاں تو کیا کہا تھا آپ نے، میں نے کبھی آپ کو دیکھا ہے"

"جی میرا مطلب تھا کہ آپ نِگاہیں اُٹھاتی ہی کہاں ہیں؟"

"آپ کے خیال میں... میں مغرور ہُوں؟"

"نہیں میڈم! یہ خیال نہیں ہے میرا۔ آپ مغرُور نہیں۔ باس ہیں صرف باس"

"انسان نہیں ہُوں؟"

"ہیں میڈم، لیکن جنرل منیجر بھی ہیں۔ ماتحتوں کے سامنے مُسکرانا پسند نہیں کرتیں آپ کا خیال ہے کہ وہ سر پر چڑھیں گے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہوتی میڈم۔ آپ کا یہ اخلاق، رویّہ ہمارا دِل بڑھاتا ہے۔ ہمیں آپ سے قریب کر دیتا ہے ہم آپ سے محبت کرنے لگتے ہیں چھوٹے لوگ بہت کم لالچی ہوتے ہیں میڈم۔ وہ آپ کی مُسکراہٹ کو اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہیں۔ ہاں آپ کا سرد رویّہ اُنھیں اپنی حیثیت کا احساس ضرور دِلا دیتا ہے۔ اور وہ بُجھ کر کام کرتے ہیں"

"اوہ۔ سوری مِس فراز۔ آپ یقین کریں میرے دِل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے مجھے میری کمزوری کا احساس دِلا دیا۔ میں آپ کی شُکر گزار ہُوں"

"میڈم... میڈم! میں نے گستاخی کی ہے"

"چھوڑو یار! میری ایک کمی تھی جس سے تم غلط فہمی کا شکار ہوگئیں اور کچھ نہیں ہے۔ چلو میں تمہارے لئے چائے بناتی ہُوں"

رِدا نے کہا اور مِس فراز پر حیرتوں کے دورے پڑتے رہے۔ چائے پی گئی پھر کام شروع ہوا۔ مِس فراز واپس گئی تو اُس کا چہرہ ہونق ہو رہا تھا۔ لیکن رِدا خوش تھی: "میں انسانوں کے اِس غول سے الگ تو نہیں ہُوں۔ کیوں سب سے جُدا رہتی ہُوں۔ غلط ہے یہ۔ غیر مناسب رویّہ ہے"

شام کو اُس نے ثناء سے کہا: "اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے ثناء"

"مونالیزا!" ثناء نے حیرت سے کہا۔

"ہاں گھسی پِٹی اشیاء کباڑی کے حوالے کر دینا ہی دُرست ہوتا ہے"

"ارے ارے کیا دوسروں کی بھی یہی کیفیت ہُوئی ہے۔ ضرور چائے کے ساتھ کوئی غلط چیز کھا گئی ہو۔ میں ابھی ساری اشیاء کے نمونے کیمیاوی تجزیئے کے لئے بھجواتی ہُوں"

"میں نے سچ کہا ہے"

"کِس لحاظ سے خاتون؟"

"تمہارے اندر وہ زندگی ہی نہیں رہی۔ کہاں تو ہر لمحہ کسی نئی شرارت میں گزرتا تھا اور کہاں اب یہ ماحول جس میں ہو گویا

سی رہی ہُوئی ہے۔
• کیا واقعی صبح ہوگئی؟
• صبح؟
• ہاں! لگتا ہے آج تمھاری آنکھ کھلی ہے۔ اللہ کس نے جگایا ہے تمھیں مونالیزا؟
• میں نے غلط تو نہیں کہا؟
• تم نے مجھے اِس قابل چھوڑا ہے؟ شناء نے کہا۔
• کیا مطلب؟
• میری شخصیت کرچی کرچی تو کر دی تم نے۔ اِتنا اثر لایا ہے کہ اب ہنستا بھول گئی ہُوں؟
• کیا واقعی شناء؟
• غلط کہہ رہی ہُوں کیا۔ خود سوچ لو؟ شناء نے کہا اور رِدا خجالت سے اُسے دیکھنے لگی، پھر اُس نے کہا۔
• قصور تمھارا ہے شناء؟
• جی ہاں، سارے قصور میرے ہیں؟
• تم نے مجھے اِتنا مُنہ لگایا ہی کیوں پرکھے بغیر۔ ہر شخص معیاری تو نہیں ہوتا بعض اوقات گھٹیا لوگوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ جو کسی کی ذرا سی کمزوری سے اکڑ جاتے ہیں۔ میں اِس قابل نہیں تھی جتنا درجہ تم نے مجھے دے دیا۔"
• لڑنا ہے؟ شناء تنتنے پھُلا کر بولی۔
• ہرگز نہیں؟
• پھر ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟
• مُعافی مانگنا چاہتی ہُوں؟
• کِس سِلسلے میں؟
• اپنے آج تک کے غلط رویّے کی۔ واقعی میں تمھاری محبّت کا جواب اُس انداز میں نہ دے سکی جس طرح دینا چاہیئے تھا۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہم دُور ہوتے جا رہے ہیں؟
• دِل دُکھا ہُوا ہے تم سے میرا؟
• میں شرمندہ ہُوں شناء!
• قسم کھاؤ؟
• تمھاری قسم؟
• پھر وعدے کرو؟
• کہو؟
• آئندہ کوئی ایسی حرکت نہ کروگی جو ہم سے غیریت کا اظہار کرتی ہو؟

• وعدہ کرتی ہُوں؟
• مُعاف کیا۔ ویسے اب اِس کی وجہ بھی بتادو؟
• بڑی تنہائی محسوس کر رہی ہُوں شناء۔ بالکل اکیلی اکیلی سی رہ گئی ہُوں؟
• نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، بس ماحول کچھ خراب ہو ہی گیا ہے، میرے خیال میں انکل شہاب نے اِس کوٹھی کی بہاریں لُوٹ لی ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے رِدا، ڈیڈی مطمئن ہیں۔ میں اندھی نہیں ہُوں ڈیڈی کے وجود میں ایک کرب ہے۔ رِدا جسے میں محسوس کرتی ہُوں۔ انکل غلام محمد کی دولت سے اُن کی ساکھ بحال ہُوئی ہے۔ ورنہ ہم سب دو کوڑی کے ہوگئے ہوتے یہ بات ڈیڈی نے نظر انداز نہیں کی۔ انکل فرشتہ ثابت ہُوئے ہیں ہمارے لئے یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اُنھوں نے جو انداز، جو رویّہ اختیار کیا ہُوا ہے وہ اور جانکاہ ہے۔ ڈیڈی احساسِ شرمندگی سے پس رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوٹھی میں کسی نئے فرد کا اضافہ نہیں ہُوا بلکہ کافی لوگ کم ہوگئے ہیں۔
• ہاں اِس کا مجھے اندازہ ہے۔ لیکن شناء تم یہ سب کچھ سوچتی ہو؟ رِدا حیرت سے بولی۔
• نہ جانے کیوں تم اپنے علاوہ سب کو احمق سمجھتی ہو؟ شناء نے ناک چڑھاتے ہُوئے کہا۔
• نہیں بھئی۔ ایسی بات نہیں ہے" رِدا نے عجیب سے انداز میں کہا۔ اُسے پھر ایک ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ ہر شخص اپنے ذہن کی گہرائیوں میں تصوّرات رکھتا ہے۔ اِس گھر نے اُسے بھرپُور اعتماد دیا تھا۔ ہر طرح کی محبّت اور تحفظ فراہم کیا تھا اور وہ۔ بس ایک کرائے دار کی طرح یہاں رہ رہی تھی۔ نہیں رویّہ تبدیل کرنا ضروری ہے۔ اور اُس نے اِس پر عمل شروع کر دیا۔ رِدا کے مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس سب کو ہوگیا تھا اب اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد وہ باقی دوسرے کاموں میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی اچھے لباس پہننا شروع کر دیئے تھے۔ اُسے احساس ہُوا کہ وہ واقعی کوٹھی کے بہت سے معاملات سے بےتعلق ہوگئی تھی۔
شناء نے کہا؟ ایک بات بتاؤں مونالیزا؟
• بتاؤ؟
• میں اور ڈیڈی گُڈّے گُڑیا کی شادی کر رہے ہیں۔"
• خُوب، کیا واقعی؟
• ہاں گُڈّا میرا، گُڑیا ڈیڈی کی؟
• اِس مذاق کی اہمیت کیا ہے؟

• خُدا کی قسم سچ کہہ رہی ہُوں؟
• ارے واہ، دلچسپ بات ہے؟ مگر احسان احمد صاحب اپنی گُڑیا کی شادی کیوں نہیں کر رہے ہیں؟
• کر تو رہے ہیں۔ یہ پوچھو گُڑیا کون ہے اور گُڈّا کون؟
• اوہو۔ تو اِس میں کوئی رمز ہے؟
• ہاں؟
• چلو بتاؤ کون سے گُڈّے گُڑیا ہیں؟
• عصمت باجی اور اقبال بھائی؟
• کیا؟ رِدا حیران رہ گئی۔
• آنکھیں کھُلی رکھو تو کچھ پتہ بھی چلے۔ تم نے تو اطراف میں دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہے، یہاں لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے مستقبل کے فیصلے کر چکے ہیں ایک تم ہو جو اِس دُنیا سے بےخبر ہو کر چین کی نیند سو رہی ہو۔ یہ دونوں نرناری ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں بچّہ اور اُن کا پریم سچّا ہے چنانچہ بہت جلد ہم اِس پریم کہانی کو اِس کوٹھی کے پردۂ سیمیں پر پیش کر رہے ہیں؟
• کوئی بات ہُوئی ہے اِس سِلسلے میں؟
• یہ تو سُنا ہوگا تم نے کہ جناب بلند اقبال، عادل صاحب کی فرم کے جنرل منیجر ہوگئے ہیں؟
• ہاں معلوم ہے؟
• بس کچھ انتظار کیا جا رہا ہے لڑکا برسرِ روزگار ہُوا ہے۔ اب اُس کا رشتہ غلام احمد صاحب کو دیا جائے گا۔ خاص طور سے کچھ توقف کیا گیا ہے اور ڈیڈی نے ہدایت کی ہے کہ رازداری ضروری ہے۔ ابھی اِس خبر کو عام نہ کیا جائے؟
• عُمدہ بات ہے؟
• اب تمھیں تو شاید یہ بھی نہ معلوم ہو کہ اختر عادل صاحب اللہ رکھی کے متوالے ہوگئے ہیں؟
• بڑے بڑے انکشاف کر رہی ہو آج کل" رِدا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ یہ بات اُس سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔
• ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی عیش ہوں گے دوست، ہاہاہا؟ شناء نے مردانہ انداز میں کہتے ہُوئے قہقہہ لگایا۔
• اور یہ مِس شناء کی مانگ میں سِندُور کب بھر رہا ہے؟
• لاحول ولاقوۃ۔ اچھے خاصے سر کو خراب کرنے سے کیا فائدہ۔ ہم ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے؟
• بکواس کرتی ہو۔ یہ تو تمھیں کرنا ہی پڑے گا؟
• خُدا کی قسم کبھی نہیں کروں گی؟ شناء بولی۔

• ارے۔ ارے پاگل ہوگئی ہے کیا؟
• تو خالد سے شادی نہیں کرے گی؟
• یہ میں نے کب کہا؟
• کیا مطلب؟
• شادی ضرور کروں گی اپنی مانگ میں سِندُور کبھی نہیں لگاؤں گی۔ ویسے بھی میرے بالوں کا اسٹائل مختلف ہے؟
• تجھے خُدا سمجھے شناء!؟ رِدا نے ہنستے ہُوئے کہا۔ بہرحال رِدا کے بدلے ہُوئے انداز سے بڑی خوشگوار تبدیلی پیدا ہوگئی تھی ڈاکٹر نعمان بھی اب اکثر آنے لگے تھے لیکن محتاط تھے اور ابھی تک اختر کے سوا کِسی کو اُن کی، وارداتِ قلب کا پتہ نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ ڈاکٹر نعمان یہاں مقبول ہوتا جا رہا تھا۔ رِدا سے بھی اُس کی کئی بار بات چیت ہو چکی تھی۔ اِس شام بھی وہ آیا تھا۔ اور رِدا کو تنہا مِل گیا تھا۔
• کہیئے نعمان صاحب، کیسی چل رہی ہے آپ کی ڈاکٹری؟
• ٹھیک ہے آپ لوگ بیمار ہی نہیں ہوتے؟
• کیا مطلب؟
• آپ میں سے کوئی بیمار ہو تو ہم اپنے جوہر دکھائیں؟
• خُدا نہ کرے آپ ڈاکٹر تو دُعائیں مانگتے ہوں گے؟
• کون اپنی روزی کے لئے دُعائیں نہیں مانگتا؟ ڈاکٹر نعمان نے کہا۔
• وہ آپ کے تصوّر صاحب کیا مُلک چھوڑ گئے؟ رِدا نے پُوچھا۔
• اتفاق سے رات کو آئے ہیں۔ اور شاید پرسوں پھر کہیں جا رہے ہیں؟
• کہاں؟ رِدا نے پُوچھا۔
• سُوئیڈن؟
• کوئی خاص مُعاملہ ہے؟ پچھلے دِنوں بھی سوئیڈن میں تھے؟
• لگے ہوں گے کسی کی جان کے پیچھے۔ میں کبھی اِس بارے میں کچھ نہیں پُوچھتا؟
• اوہ اچھا! رِدا نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ لیکن آج پھر وہ بےچین ہوگئی تھی۔ اُسے احساس تھا کہ تصوّر ناراض ہے اور اُسے ہونا بھی چاہیئے تھا۔ رِدا شدید کشمکش کا شکار تھی، صبح کو اُس نے ایک فیصلہ کیا اور وقت سے کچھ پہلے کوٹھی سے نکل گئی۔ اُس نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور اب اپنی کار خود ڈرائیو کرتی تھی جو اُسے دفتر کی طرف سے دی گئی تھی۔ دِل و دماغ کی کیفیت عجیب تھی لیکن ہمّت کر ڈالی تھی چنانچہ راستے میں کئی بار خود پر قابو

پایا بالآخر تصوّر بیگ کی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ ملازم سے تصوّر بیگ کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ موجود ہے۔ خدا کا شکر تھا کہ نعمان کی کار نہیں نظر آ رہی تھی۔

"میں اُن سے ملنا چاہتی ہُوں۔"

"آپ کا نام بی بی صاحبہ؟"

"کہہ دو رِدا آئی ہے۔" ملازم نے ڈرائنگ رُوم کھول دیا تھا وہ دھڑکتے دِل کے ساتھ تصوّر بیگ کا انتظار کرتی رہی۔ کئی منٹ کے بعد وہ ڈرائنگ رُوم میں داخل ہُوا تھا۔ خوبصورت گون میں ملبُوس وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔

"ہیلو" اُس نے سادہ سی مُسکراہٹ سے کہا۔

"ہیلو۔ کیسے ہیں آپ تصوّر صاحب؟" رِدا کو اپنی آواز پھنستی ہُوئی محسوس ہُوئی تھی۔

"ٹھیک ہُوں۔"

"بہت دن کے بعد وطن واپسی ہُوئی۔"

"جی ہاں! اسپیشل ڈیوٹی لگی ہُوئی ہے۔"

"آپ نے شہاب صاحب کے کیس کے بارے میں بتایا تھا۔"

"جی! آپ کچھ پیئیں گی مِس رِدا؟"

"چائے پلوا دیجئے۔" رِدا نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور تصوّر نے ملازم کو بُلوا کر چائے کے لئے کہا۔ وہ نرم اور خوش اخلاق لہجے میں گفتگو کر رہا تھا لیکن اُس کے انداز میں ایک پتھریلا پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ایسی کیفیت جو رِدا کو پانی پانی کر رہی تھی۔ اُس نے کچھ نہیں پُوچھا تھا رِدا سے، یہ بھی نہیں کہ وہ لاہور سے کب واپس آئی کیسی ہے اُس نے کچھ نہیں پُوچھا تھا۔

"میں نے شہاب صاحب کے کیس کے بارے میں پُوچھا تھا" رِدا نے پھر کہا۔

"جی؟"

"کیا ہو رہا ہے اِس سلسلے میں؟"

"کوئی خاص بات پُوچھنا چاہتی ہیں آپ؟"

"ہاں میرا مطلب ہے۔"

"انتظامیہ کے مُعاملات کچھ خفیہ ہوتے ہیں اور مُجھ پر کچھ ذِمّہ داریاں ہیں" تصوّر بیگ بولا۔

"نہیں میں بس یُونہی ... وہ بے چاری طفیلی خالہ۔ رشید کی آزادی کے امکانات ہیں؟"

"ہاں وہ آزاد ہو جائے گا۔"

"کب؟"

"اِس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی؟"

"کیسی؟"

"میرا مطلب ہے رشید کی گلُو خلاصی ہو جائے۔"

"میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ انتظامی امُور ہوتے ہیں ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں مِس رِدا!"

"طفیلی خالہ کی حالت بہت خراب ہے۔ بے چاری بالکل بدل گئی ہیں۔ بہت دُکھ ہوتا ہے اُنھیں دیکھ کر۔"

"ہاں بعض اوقات کسی کے گُناہ کی سزا کسی کو بھگتنا پڑتی ہے۔ ویسے میرا خیال ہے رشید بچ جائے گا۔ آپ اگر اپنے طور پر کچھ کرنا چاہیں تو انھیں اطمینان دِلا دیں۔"

"میں نے کسی کو کچھ بتایا تو نہیں۔ ایک بات بھی نہیں بتائی کسی کو" وہ رِدا جلدی سے بولی۔

"شکریہ مِس رِدا۔ مجھے خوف تھا کہ اِس طرح میری پوزیشن خراب نہ ہو جائے۔ آپ نے ایک اچھے شہری کی مانند پولیس سے تعاون کیا اِس کے لئے میں شُکر گزار ہُوں، ورنہ سرکاری راز کے افشا ہو جانے سے مجھے شرمندگی اُٹھانی پڑتی۔"

رِدا کو پسینہ آنے لگا۔ سب کچھ کہہ رہا تھا وہ کچھ نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ رہا تھا اُس کے الفاظ بالکل سادہ تھے لیکن اِس سادگی میں ہی پوری کہانی پوشیدہ تھی۔ رِدا کو حلق سے چائے اُتارنا مشکل ہو گئی۔ چائے پینے کے بعد اُس نے کہا۔

"تو اِس سِلسلے میں طفیلی خالہ کو کوئی اُمید نہ دلائی جائے۔"

"کچھ ممکن ہوتا تو میں ضرور کرتا مِس رِدا، معافی چاہتا ہُوں۔"

"اجازت چاہتی ہُوں" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"فی امان اللہ" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"آپ دادی امّاں سے مِلنے بھی نہیں آئے۔ وہ کئی بار آپ کو یاد کر چُکی ہیں۔"

"اوہ۔ ہاں بس۔ اب تو مشکل ہی ہے مِس رِدا۔ وہ ڈیوٹی تھی۔" تصوّر بیگ نے کہا اور رِدا باہر نکل آئی۔ تصوّر بیگ اُسے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ رسمی الفاظ ادا ہو چُکے تھے وہ اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ کر کے واپس موڑ دی نہ جانے کیوں کار آگے بڑھاتے ہُوئے اُس نے عقب نُما آئنے میں دیکھا لیکن تصوّر بیگ موجود نہ تھا۔ رِدا پہ اُداسی کا حملہ ہُوا۔ دفتر میں بھی وہ بد دِل ہی رہی۔

اُسے تصوّر بیگ سے ہونے والی گفتگو یاد آتی رہی کوئی رعایت نہیں تھی اُس کے انداز میں۔ بس رسمی سا ہی ملا تھا۔

"مجھے وہاں نہیں جانا چاہئے تھا۔ غلطی میری ہی تھی" رِدا خلید پچھتا رہی تھی۔

تمام دِن یُونہی گُزر گیا۔ بہت سی یادیں آتی رہی تھیں کبھی تصوّر بیگ پر غصّہ آنے لگتا کبھی وہ سب کچھ یاد آیا جو لاہور میں ہُوا تھا اُس نے تو تصوّر بیگ کو اپنے گھر سے بھی نکال دیا تھا وہ سامنے کے ہوٹل سے چائے لا کر پیتا رہا تھا اور... اور لان پر سوتا رہا تھا۔

شام کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ معمُولات سے فارغ ہو کر باہر نکلی تھی کہ طفیلی خالہ نظر آئیں۔ اُن کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔

"اے رِدا بیٹی سُنو تو۔"

"خیریت طفیلی خالہ؟"

"رشید کا فُون آیا تھا۔"

"ایں ...؟" وہ چونک پڑی۔ "کب؟"

"کوئی تین بجے ہوں گے۔"

"تین بجے؟" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیا کہہ رہے تھے؟"

"بڑی تسلّیاں دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا امّاں میں بالکل ٹھیک ہُوں خُوب آرام سے ہُوں واپسی میں کچھ وقت لگ جائے گا۔ مگر تو دیکھنا موٹا ہو رہا ہُوں کھا پی کر مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

"اور کیا کہا؟"

"کہہ رہا تھا کہ دس ہزار روپے کا منی آرڈر بھجوا رہا ہُوں کل یا پرسوں میں مِل جائے گا آرام سے خرچ کرنا کسی سے اُدھار قرض نہ لینا۔ مجھے دیر لگ گئی تو اور بھجوا دُوں گا۔"

"مُبارک طفیلی خالہ۔"

"شُکرانے کے نفل پڑھے ہیں میں نے بیٹی۔ اب مجھے فِکر نہیں ہے" طفیلی خالہ نے کہا اور رِدا گہری سوچوں میں ڈُوبی رہی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تمھاری ناراضگی حق بجانب ہے تصوّر۔ شکریہ بے حد شکریہ" لیکن پھر وہ خود اپنے الفاظ پر چونک پڑی۔ اُس نے طفیلی خالہ کی طرف دیکھ کر کہا "آپ نے مٹھائی نہیں کھِلائی خالہ۔"

"ہاں بیٹی ضرور۔ وہ بس ذرا منی آرڈر آ جائے" طفیلی خالہ نے کہا۔

"ارے آپ کے پاس ..." رِدا کہتے کہتے رُک گئی اُسے ندامت ہُوئی تھی۔ پھر اُس نے کہا "مجھے آپ سے شکایت ہے خالہ۔"

"کیوں بیٹی؟"

"بیٹی کہہ رہی ہیں اور پیسوں کے لئے پریشانی اُٹھاتی ہیں۔ ویسے قصُور میرا بھی ہے مجھے خود ہی آپ سے پُوچھنا چاہیئے تھا معاف کر دیجئے خالہ مُجھ سے غلطی ہُوئی ہے" طفیلی خالہ رونے لگی تھیں رِدا کا دِل بھی اُداس ہو گیا تھا۔ اُس رات وہ نہ جانے کب تک تصوّر علی بیگ کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

احسان احمد نے مُسکراتی نظروں سے ثناء کو دیکھا اور پھر کہنے لگے۔

"یُوں تو کم از کم شام کی چائے اور ڈنر پر تم سے مُلاقات ہوتی ہے لیکن جب تم اِس طرح میرے کمرے میں داخل ہوتی ہو تو نہ جانے کیوں مجھے خطرے کی گھنٹی بجتی ہُوئی محسوس ہوتی ہے، اور میں سوچتا ہُوں ضرور کوئی خاص بات ہے۔"

"میں اِتنی خطرناک ہُوں ڈیڈی؟" ثناء نے رُوٹھے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اِس سے بھی زیادہ خطرناک۔ بات یہ ہے بیٹی کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تم پر حکمرانی کرتے ہیں اور حکمرانوں سے تو انسان خوفزدہ رہتا ہی ہے نہ جانے کیا حکم دے ڈالیں۔ تعمیل کرنی پڑتی ہے نا" احسان احمد صاحب بدستور مُسکراتے ہُوئے بولے۔

"بات بدل رہے ہیں اب۔ پہلے تو جو جی چاہا کہہ دیا۔"

"کوئی غلطی ہو گئی ہے تو چلو معافی مانگ لیتے ہیں۔ ویسے گھنٹی مسلسل بج رہی ہے" احسان احمد صاحب نے کہا، پھر محبت سے کہنے لگے۔

"بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔ کیسا ہے تمھارا یہ تیمور؟" احسان احمد صاحب نے تیمور کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"اچھا ہُوں" تیمور آہستہ سے بولا۔

"اوہو، بھئی پہلی بار تمھاری آواز سُنی ہے کیا انعام دیں بھئی تمھارے تیمور کو؟"

"جو جی چاہے ڈیڈی۔ ویسے اب یہ بہت بولنے لگا ہے ایسی مزے مزے کی باتیں کرتا ہے کہ بس بتا نہیں سکتی آپ کو۔"

"تیمور صاحب کافی ذہین معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں بھئی تو آمدم برسرِ مطلب۔"

"اب آپ مجھے مطلب پرست بھی کہہ رہے ہیں ڈیڈی۔"

"اللہ کی پناہ۔ چلئے خاموش ہُوئے جاتے ہیں آپ خود ہی جب لب کُشائی فرمائیں گی تو ہم جواب دے دیں گے۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے ڈیڈی۔ آپ نے جو پہلا قدم اُٹھایا تھا میری تجویز کے سِلسلے میں وہ نہایت کامیاب رہا ہے ڈیڈی۔ میں آپ سے کبھی جذباتی گفتگو نہیں کرتی میں جانتی ہُوں کہ آپ خوش رہنے کے عادی ہیں اور آپ نے اپنے اِردگرد جو ماحول

پھیلانے ہیں وہ آپ کی فطرت کا اظہار کرتے ہیں۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتی جو جذباتی نوعیت کی حامل ہو میں تو خود بھی آپ کی ان مسرتوں میں اضافے کرتی رہنا چاہتی ہوں۔"

"ارے ارے کیا معجون بقراط کھالی ہے تم نے یا ارسطو کی داستان پڑھی ہے۔ ایسی سنجیدہ باتیں کر رہی ہو کہ عقل کھوپڑی سے اُوپر ناچنے لگی ہے۔"

"ڈیڈی میں سنجیدہ ہوں۔"

"بہت بہتر۔ خیر جناب والا اگر جواب دینا ضروری ہے تو عرض ہے کہ میں زندگی کو اس کے اصل رنگ میں دیکھنے کا عادی ہوں بے شک کاروباری مسائل اُلجھائے رکھتے ہیں لیکن بے شمار لوگ بیٹھے اپنے لئے مشغلے دریافت کر لیتے ہیں۔ میں اُن سے متفق نہیں ہوں جو اپنے بھرے پُرے گھر چھوڑ کر باہر کی محفلوں میں پناہ لیتے ہیں۔ میرا گھر میری محفل ہے اور کاروباری اُمور سے نمٹنے کے بعد مجھے اپنے گھر سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔"

"میں جانتی ہوں ڈیڈی۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"خُدا کا شکر ہے کہ تمہاری نگاہ اِن مسائل پر بھی رہتی ہے۔"

"اب آپ لوگوں نے میرا مطلب ہے آپ نے مجھے اِتنی آسانیاں فراہم کر دی ہیں کہ کوئی مشکل مشکل ہی نظر نہیں آتی۔ تو کیا میں اپنے آپ کو بلاوجہ مشکلات میں اُلجھائے رکھوں۔ بات کہیں سے کہیں نکل گئی ہے میں اصل مطلب پہ آنا چاہتی ہوں۔"

"تشریف لائیے تشریف لائیے۔" احسان احمد صاحب بدستور مُسکراتے ہُوئے بولے۔

"بات پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ آپ نے جو کونپل اُگائی تھی۔ وہ سرسبز ہوگئی ہے اب اُسے درخت بنانے میں مدد کیجئے ناں قدم آگے بڑھائیے۔"

"یقیناً اقبال اور عصمت کی بات ہو رہی ہے۔"

"یہ بے نیازی مجھے ناپسند ہے ڈیڈی۔"

"ارے توبہ توبہ۔ کون بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا ہے، ہم تو صِرف اپنا خیال ظاہر کر رہے تھے۔"

"جی اقبال کو عادل حسین صاحب نے بہت اچھی ملازمت دے دی ہے۔ اُن لوگوں کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اِس سِلسلے کو اب آگے بڑھایا جائے۔"

"یقیناً ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"مگر کِس طرح؟ میرا کوئی تجربہ تو نہیں ہے اِس سِلسلے میں ڈیڈی۔"

"بھئی تجربہ تو ہمارا بھی نہیں ہے۔ کِسی سے مشورہ لے لو۔" احسان احمد صاحب بولے۔

"کوئی اتنا اہم معاملہ بھی نہیں ہے جس کے لئے مشورہ لیا جائے۔ عادل حسین چچا سے ایک میٹنگ رکھ لیتے ہیں اور اُس کے بعد اس مسئلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔"

"ہُوں۔" احسان احمد صاحب پُرخیال انداز میں بولے پھر کہنے لگے "کیا ابراہیم صاحب اور غلام احمد صاحب کو بھی اس میٹنگ میں شریک کیا جائے گا؟"

"جی نہیں۔ کیونکہ اتفاق سے یہ دونوں اِس سلسلے کے فریق ہیں یہ میٹنگ ہمارے اور آپ کے درمیان ہوگی۔"

"تو پھر یُوں کرتے ہیں کہ آج تم لنچ کے بعد عادل حسین کی کوٹھی پر پہنچ جاؤ۔ ہم بھی دفتر سے اُٹھ کر وہیں آجائیں گے۔ میں عادل حسین کو ٹیلی فون کر دُوں گا کہ وہ ہمارا انتظار کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گی۔"

"کوئی اور حکم؟"

"نہیں ڈیڈی۔ بس اب اِس کام کی تکمیل کرنی ہے۔ دیر نہیں ہونی چاہیئے۔"

"جو حکم جناب والا۔" احسان احمد صاحب نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"اجازت؟"

"اللہ حافظ۔ مجھے بھی آفس جانے کے لئے تیار ہونا ہے۔" ثناء باہر نکل آئی وہ بہت مسرور تھی اِس مسئلے کو واقعی وہ سنجیدگی سے آگے بڑھانے کی سوچ رہی تھی اور اِس میں بس وقت کا انتظار تھا۔

دوپہر کو وہ تیار ہو کر تنہا ہی چل پڑی معاملہ چونکہ احسان احمد صاحب سے ملاقات کا تھا اِس لئے ڈرائیور کو ساتھ لینا مجبوری تھی کیونکہ اُسے تنہا کار چلانے کی اجازت ذرا کم ہی ملتی تھی لیکن آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اچانک ہی ایک احساس اُس پر مُسلط ہو گیا۔ عادل حسین صاحب کی یہ کوٹھی اُس کے لئے ایک اور حیثیت بھی رکھتی تھی خالد نے اُسے یہ کوٹھی دِکھائی تھی اور جو کچھ کہا تھا وہ ثناء کو ابھی تک یاد تھا یہ ایک ٹھوس سچائی تھی کہ خالد کے سِلسلے میں اُس کے ذہن میں عشق و محبت کے جذبات نہیں پیدا ہُوئے تھے لیکن اِس کے باوجود اگر وہ زندگی کی سچائیوں پر نگاہ ڈالتی تو اُسے اپنا ہم سفر خالد کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا تھا خالد اُس کا سب کچھ تھا۔ ابتداء اور انتہا اگر اُسے محبت یا عشق کا نام دیا جاتا تو ثناء نے خود کبھی ایسا کوئی نام اِن جذبات

کو نہیں دیا تھا خالد نے دھیمے دھیمے انداز میں اُس سے اظہار اُلفت کیا تھا اور ثناء اِن الفاظ کی لطافت کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی تھی لیکن اپنی فطرت کے مطابق اُسے یہ سب کچھ بہت عجیب لگتا تھا اور وہ خود اِن الفاظ کو نہیں اپنا سکتی تھی۔

بہرطور کوٹھی کی جانب سفر جاری رہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھی میں داخل ہو گئی ابھی تک احسان احمد صاحب نہیں پہنچے تھے حالانکہ حسب وعدہ اُنھیں پہنچ جانا چاہیئے تھا اِس کا اندازہ ثناء نے یُوں لگایا کہ پورٹیکو میں احسان احمد صاحب کی کار موجود نہیں تھی۔ البتہ جب وہ اپنی کار سے اُتری تو اُسے سب سے پہلے اختر ہی نظر آیا جو کسی کام سے باہر نِکل رہا تھا ثناء کو دیکھ کر اس نے آنکھیں پھاڑ دیں۔

اور پھر دفعتاً ہی ثناء کو اپنے عقب میں مینڈکوں کی ٹرٹراہٹیں محسوس ہُوئیں وہ چونک کر پلٹی اور اُس کے ہونٹوں سے ہنسی چھوٹ گئی۔

"آج اپنی مادری زبان میں بول رہے ہو۔" اُس نے اختر سے کہا۔

"آیئے مادرِ مہربان۔" اختر گردن خم کر کے بولا۔

"کیا بدتمیزی ہے؟"

"نہیں ثناء بی بی۔ بالکل بدتمیزی نہیں ہے حقائق کی رُو سے بڑی بھابی بڑی بہن کی مانند ہوتی ہے اور بڑی بہن ماں کی طرح۔ چنانچہ اگر آپ نے یہ فرمایا کہ میں اپنی مادری زبان میں بول رہا ہوں تو اِس وقت آپ مجھے اپنی بڑی بہن یا ماں ہی نظر آ رہی ہیں۔"

"خُدا تم سے سمجھے۔" ثناء نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"خالد بھائی اندر ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" ثناء بولی۔

"اللہ رے بے نیازی۔ یعنی آپ کی تشریف آوری کِس سِلسلے میں ہُوئی ہے غالباً آپ کو یہ خیال نہ تھا کہ میں اِس وقت یہاں مِل جاؤں گا لیکن یہ خالد بھائی منصوبوں میں ہمیشہ کمزور رہتے ہیں کبھی کوئی ایسی منصوبہ بندی نہیں کر سکے جو کامیاب ہو۔ اب اُنھوں نے آپ کو طلب فرمایا لیکن مجھے نہ ٹال سکے اور تو اور ڈیڈی بھی اندر ہی موجود ہیں۔ کاش مجھ سے رجوع کر لیا جاتا تو آپ لوگوں کو یہ مشکل نہ ہوتی ڈیڈی کو ساحلِ سمندر پہ لے جاتا اُنھیں پانی کی لہروں میں پاؤں بھگونے کا بڑا شوق ہے۔"

"بکتے رہو۔ تمہاری سُنتا کون ہے۔ میں تو چچا جان کے پاس آئی ہوں۔"

"ہوں۔ ہوں۔ بعد میں یہی سب کچھ کہا جاتا ہے۔ آیئے آپ کو چچا جان کے پاس لے چلوں۔" اور ثناء مُسکراتی ہُوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔ اختر نے اُسے سچ مچ عادل حسین کے کمرے میں پہنچا دیا تھا اپنی دانست میں اس نے ثناء سے مذاق کیا تھا۔ لیکن اِس وقت تو ثناء عادل حسین کے پاس ہی آئی تھی۔

"وہ ڈیڈی... یہ ثناء آپ سے مِلنے آئی ہیں۔" اختر نے خشک سے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ ہاں آؤ ثناء بیٹے۔ میں انتظار کر رہا تھا تمہارا۔ اور احسان احمد ابھی نہیں پہنچے ٹیلی فون دو بار کر چکے ہیں میرا خیال ہے آفس ہی میں کہیں مصروف ہو گئے ہوں گے۔" اختر نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر عادل حسین کی طرف دیکھا اور پھر ثناء کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا بات وہی تھی جو ثناء نے کہی تھی وہ خود بھی صوفے پر بیٹھنے لگا تو ثناء بولی۔

"چچا جان! ہمارے درمیان جو گفتگو ہوگی وہ تنہائی میں ہوگی اِس لئے اس وقت ہر مداخلت سے معذرت کر لیجئے گا۔"

"ہاں اختر کچھ ضروری بات کرنی ہے ہمیں اِس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔" اختر جھلّایا ہُوا سا اُٹھ کر باہر نِکل گیا تھا اور ثناء کی ہنسی چھوٹ گئی۔ عادل حسین صاحب بھی مُسکرانے لگے اُن کی نِگاہوں میں محبت پھوٹ رہی تھی۔

"اور سُنایئے ثناء صاحبہ! کیسی گُزر رہی ہے؟"

"بس چچا جان! ٹھیک ہے سب کچھ ٹھیک ہے۔" ثناء نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا پیو گی؟"

"کوئی ٹھنڈا مشروب۔" اور عادل حسین صاحب نے فوراً ہی ملازم کو طلب کر کے مشروب لانے کو کہا۔ ملازم باہر نِکل گیا پھر تھوڑی ہی دیر گُذری تھی کہ احسان احمد صاحب بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔ عادل حسین نے اُن سے ہاتھ مِلایا اور پھر ثناء کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"چند منٹ لیٹ ہو گیا جس کے لئے معافی درکار ہے۔" پھر وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

"ہاں بھئی عادل حسین! کیا چل رہا ہے تمہارا کاروبار؟"

"فضُول باتیں چھوڑ کر اصل بات کرو۔ ظاہر ہے تم کاروبار کے بارے میں معلوم کرنے نہیں آئے ہو۔ میرا خیال ہے کام کی باتوں پر آجانا چاہیئے۔"

"دیکھا ثناء! یہ عادل حسین بہت ہی خودغرض قِسم کا آدمی ہے۔ گویا یہ چاہتا ہے کہ ہم لوگ جو بات چیت کرنی ہے کریں اور یہاں سے دفعان ہو جائیں۔"

"بخدا کس کافر کے دل میں یہ خیال آیا ہو۔ میں تو بس شناء کی مدد کر رہا ہوں میں جانتا ہوں کہ شناء اپنی بات کرنے کے لئے بے چین ہوگی" عادل حسین نے جواب دیا۔

ملازم نے مشروب لاکر رکھ دیئے اور شناء نے گلاس بناکر اُن دونوں کو پیش کئے اور تیسرا گلاس خود لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تو پھر بسم اللہ" احسان احمد بولے۔

"ہاں شناء بیٹے کہیئے"

"بس چچا جان وہی سلسلہ جو ہمارے ذہن میں تھا۔ میں اُسے آگے بڑھانا چاہتی ہوں"

"میں تیار ہوں اس کے لئے ہم نے کچھ اور باتیں بھی سوچی تھیں مثلاً یہ کہ اقبال اور ابراہیم صاحب کو معہ اُن کے چھوٹے سے خاندان کے ہم اسی کوٹھی میں بلالیں۔ وہاں تو اُن کا رہنا مناسب نہیں ہے۔ اصل مسئلہ انھیں یہاں بلانے کا ہے، اس کے لئے تم ہماری کیا مدد کرسکتی ہو؟"

"آپ اس گفتگو کا آغاز کیجیئے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی بھرپور مدد کروں گی اور ڈیڈی بھی اس سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں گے میرا خیال ہے اُن لوگوں کو یہاں منتقل ہوجانا چاہیئے"

"بھئی سچی بات یہ ہے کہ میری رہائش گاہ میں بہت سے افراد پہلے ہی کم ہوچکے ہیں یہاں مجھے تھوڑا سا اختلاف تھا آخر اُن لوگوں کے وہاں رہنے میں کیا حرج ہے؟"

"کمال کرتے ہو احسان احمد۔ یعنی ایک ہی جگہ لڑکا بھی ہو۔ لڑکی بھی ہو۔ بلکہ چند گز کے فاصلے پر کیا ایسی شادی مناسب رہتی ہے اور پھر ہم ابراہیم صاحب کو وہ مقام دیں گے جو اُن کے لئے ہونا چاہیئے۔ بیٹا ہمارا ہوگا بیٹی آپ کی۔ اس طرح بات ہو تو اچھا ہے اس کوٹھی میں بھی رونقیں اُبھر آئیں گی۔ میں بڑی تنہائی محسوس کرتا ہوں"

"یہ سب کیا دھرا تمہارا ہی ہے مجھ سے مشورہ کیا تھا کوٹھی بنانے کے بارے میں۔ تم تو خود علیٰحدگی پسند ہوگئے تھے"

"بھئی کمال ہے۔ اب میں شناء کے سامنے کچھ کہوں گا تو شناء خواہ مخواہ شرمندہ ہوگی یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمہاری ہی کوٹھی میں رہتا۔ یعنی یعنی ..."

"ہاں۔ ہاں چلو ٹھیک ہے۔ تم نے اچھی ترکیب استعمال کی ہے۔ خیر بھئی ہم تو ویسے بھی اب بہت سے دعووں سے دستبردار ہوگئے ہیں کوٹھی غلام احمد کی ہے۔ کاروبار غلام احمد کا ہے۔ اب ہم اگر وہاں بے شمار افراد کو اکٹھا کرلیں تو یہ کچھ گھٹیا سی حرکت ہو جاتی ہے جو اچھی نہیں لگتی"

"احسان احمد! میرا خیال ہے غلام احمد کے مسئلے کو فی الحال رہنے دو۔ وہ شخص اتنا عجیب و غریب ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا عقل حیران رہ جاتی ہے اُس کے بارے میں سوچ کر ایسے مخلص آدمی کو اگر تم نے بار بار اس موضوع پر قائل کرنا چاہا تو نہ جانے اُس کے جذبات کیا ہوں۔ بہرطور یہ بالکل مختلف معاملہ ہے۔ ابراہیم صاحب کا یہاں آجانا بہت ضروری ہے اور تم لوگ اس سلسلے میں میرا ساتھ دو"

"ٹھیک ہے چچا جان، آپ اطمینان رکھیں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ کیوں نہ آج شام ہی کی چائے پر ہم اس مسئلے کو حل کرلیں۔ ذرا محنت کرنی پڑے گی اس سلسلے میں۔ لیکن بہرطور محنت تو کرنا ہی پڑے گی"

"ویسے احسان احمد ابھی ابراہیم صمدانی سے یہ تذکرہ کرنا مناسب ہوگا یا نہیں"

"معاف کیجئے گا چچا جان۔ میں درمیان میں دخل دے رہی ہوں۔ آپ نے یہ سوال ڈیڈی سے کیا ہے لیکن اس کا جواب میں دے رہی ہوں۔ ابھی اس مسئلے کو بالکل نہ چھیڑا جائے وہ لوگ یہاں منتقل ہوجائیں گے۔ آپ سے اُن کا براہِ راست معاملہ رہے گا۔ چنانچہ اُس وقت یہ سب کچھ بہت مناسب رہے گا"

"میری بھی یہی رائے ہے" احسان احمد نے کہا۔

"تو اس میٹنگ میں یہ طے پایا کہ پہلے یہ کام اس انداز میں کرلیا جائے"

"ہاں۔ بالکل، بالکل" شناء نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے بھئی۔ ہم متفق ہیں" عادل حسین بولے۔

"اور شناء بی بی؟"

"بس اس سلسلے میں پہلا قدم تو یہی ہے دوسرا قدم بھی کچھ عرصے کے بعد ہی اُٹھایا جائے گا اور ہم میرا مطلب ہے آپ لوگ باقاعدہ اس سلسلے میں اصولوں کے مطابق عمل کریں گے۔ اور صمدانی صاحب اپنے بیٹے کا پیغام چچا غلام احمد کو دیں گے۔ میرا مطلب ہے وہی جو سب کچھ ہوتا ہے" شناء نے کہا۔ اور عادل حسین ہنس پڑے۔

"ہاں بھئی بالکل بالکل" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شناء اور احسان احمد صاحب وہاں سے باہر نکل آئے تھے اختر یا خالد کو کوئی لفٹ نہیں دی گئی تھی۔ شناء ڈرائیور کے ساتھ کوٹھی واپس چلی گئی اور احسان احمد واپس

دفتر پہنچ گئے۔

شام کو البتہ اختر شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا۔ خالد تو اپنی مدھم فطرت کی بناء پر نارمل ہی رہتا تھا۔ لیکن اختر نے شناء کے پاس پہنچ کر کہا۔

"بھئی کیا ہیں آپ اپنے کو بھابی بیگم۔ گزارنا تو ہمارے ساتھ ہی ہے جانتی نہیں ہیں بعد میں کیا سلوک کیا جائے گا آپ کے ساتھ"

شناء نے تیکھی نگاہوں سے اختر کو دیکھا اور بولی۔

"کیا سلوک کیا جائے گا؟"

"نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن کم ازکم وہ نہیں جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا"

"جناب اختر صاحب! میرے سامنے ذرا احتیاط رکھا کریں"

"ارے چھوڑیئے بھابی بیگم! نہ ہوئیں آپ ہمارے لئے کوئی اجنبی! بتاتے آپ کو کہ کیا ہوسکتا ہے اب گھر کی عزت کو تو ظاہر ہے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ویسے آپ نے ایک بدترین جرم کیا ہے"

"کون سا جرم؟" شناء نے منہ بناکر پوچھا۔

"آپ اپنے آپ کو بہت مدبّر سمجھتی ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر کچھ کرکے دکھا دیجیئے"

"سوچ لو اختر"

"سوچ لیا ہے اچھی طرح سے"

"تو پھر ٹھیک ہے تمہارا چیلنج مجھے منظور ہے"

"کمال ہے، ابھی سے آپ کا یہ حال ہے تو آگے چل کر ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ ارے ہم دو بھائی بن ماں کے بچے آپ کو تو ہم نے اپنی ماں تصور کیا ہے وہ مینڈکوں والی آواز کا تذکرہ یاد نہیں ہے آپ کو۔ آپ یہ سلوک کریں گی ہمارے ساتھ" شناء بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

"تو پھر مجھ سے اکثر گفتگو نہ کیا کرو"

"ٹھیک ہے۔ مستقبل سامنے آئے گا"

"تم آخر بگڑے کس بات پر ہو؟"

"دوپہر کو آپ گئیں آپ کے والد بزرگوار تشریف لائے۔ تم دونوں تو جیسے انسان ہی نہ تھے۔ آپ تو ڈیڈی کے معیار کی خاتون ہیں ہم سے ملنا بھی پسند نہ کیا"

"ضروری نہ سمجھا" شناء نے جواب دیا۔

"تو پھر یوں کہیئے لڑائی کا آغاز ہوا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں آپ معذرت وغیرہ کرلیں تو دوسری بات ہے"

"کوئی معذرت نہیں ہوگی۔ ایک سنجیدہ مسئلہ تھا جس میں سنجیدہ لوگوں سے گفتگو کرنا تھی"

"حد ہوگئی بے عزتی کی۔ ٹھیک ہے بھابی بیگم نمٹ لیں گے آپ سے اچھی طرح" اختر نے کہا اور منہ پھلائے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شناء اُسے دیکھتی رہی اور پھر ہنس پڑی، بہرطور وہ اپنے آپ کو سنجیدہ رکھنا چاہتی تھی آج ایک اہم مسئلہ درپیش تھا۔ اس لئے کسی فضول گفتگو میں حصہ نہیں لیا جاسکتا تھا۔

عادل حسین اور احسان احمد نے بالآخر ابراہیم صمدانی کو گھیر لیا۔ غلام احمد صاحب بھی پاس تھے اور شناء بھی ٹہلتی ہوئی اُن کے پاس ہی پہنچ گئی تھی باقی لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔

"بھئی آپ لوگوں سے ایک اہم گفتگو کرنی تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں اس کے لئے یہ وقت بہت موزوں ہے"

"ہاں۔ دوسروں کو ذرا دور ہی رہنے دیا جائے" احسان احمد بولے ابراہیم صمدانی نے تعجب سے عادل حسین کو دیکھا۔ پھر نیازمندی سے بولے۔

"جی جی۔ فرمایئے عادل بھائی"

"ہوں! بڑی اپنائیت سے بھائی کہہ دیا ہے یار احسان احمد ایک مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے لوگ خلوص کا اظہار کرتے ہوئے ایسے ایسے الفاظ استعمال کرجاتے ہیں کہ آدمی غلط فہمیوں کا شکار ہوجائے۔ لیکن جب اُن پر کچھ پڑتی ہے تو اپنے آپ کو بالکل الگ کرلیتے ہیں۔ یہ تو منافقت ہوئی ناں"

"بالکل" احسان احمد نے کہا۔

"اب تم دیکھو کس بھرے منہ سے عادل بھائی کہا ہے مجھے اِن صاحب نے، بخدا دل میں کچھ عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ لفظ تو بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بڑی قیمتی شے ہے یہ لفظ"

"یقیناً" احسان احمد صاحب نے لقمہ دیا۔ غلام احمد اور ابراہیم صمدانی مسکراتی نگاہوں سے اُن دونوں کو دیکھ رہے تھے اور عادل حسین بولے۔

"دو معاملے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ جناب اقبال صمدانی صاحب میری فرم کے منیجر ہیں ایسے اہم ذمہ دار جنھیں ہر لمحہ میرے ساتھ ہونا چاہئے۔ نیا نیا کام شروع کیا ہے اور میرا دماغ آخری حیثیت نہیں رکھتا۔ اقبال میاں نے جس طرح صورت حال کو سنبھالا ہے وہ باعثِ حیرت ہے اور باعثِ مسرت بھی، بس یوں کہہ لیں

ابراہیم صاحب! مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے اگر اقبال اِس طرح ہمارے لئے محنت کرتا رہا تو یہ فرم ایک دِن ہمارے لئے بہت شاندار حیثیت اختیار کر جائے گی۔"

"میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں عادل حسین صاحب! آپ نے اقبال کو اپنی سر پرستی میں لے کر ہمارے اِس خاندان پر جو احسان کیا ہے اُس کا کوئی صِلہ نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"نہیں ہے ناں؟" عادل حسین بولے۔

"واقعی نہیں ہے۔"

"اور اگر صِلہ مانگا ہی نہ جائے تو؟"

"میں جانتا ہُوں مجھ سے کچھ مانگا بھی گیا تو کیا دُوں گا۔"

"اچھا چھوڑو بھئی یہ جذباتی باتیں۔ ہم موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔ تو بات یہ ہو رہی تھی کہ میرے منیجر کو میرے اِتنا قریب رہنا چاہیئے کہ وہ کسی بھی وقت مجھے دستیاب ہو سکے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے صمدانی صاحب کہ آپ لوگوں کو یہاں سے اُڑا کر اپنی کوٹھی پر لے جاؤں۔"

"جی؟" ابراہیم صمدانی کے علاوہ غلام احمد بھی چونک پڑے تھے۔

"جی ہاں! آپ محترمہ بھابی صاحبہ، بیٹی تنویر اور اقبال میاں میرے ساتھ میرے کوٹھی میں رہیں گے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اور اس میں کسی ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اِس شکل میں کہ آپ اپنے اِس لفظ کی تائید کریں جو ابھی ابھی آپ نے ادا فرمایا ہے۔" ابراہیم صمدانی نے پریشان نِگاہوں سے غلام احمد کو دیکھا اور پھر بولے۔

"لیکن... لیکن۔"

"ہاں۔ ہاں۔ لیکن کی گنجائش تو ہمیشہ ہی رہتی ہے۔ انسان جب پھنس جاتا ہے تو لیکن کا سہلا لیتا ہے۔ بھئی احسان احمد آپ میری مدد کیجئے۔ دیکھئے یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری خواہش ہے کہ یہ چاروں افراد میرے ساتھ رہیں۔ میں تنہا ہُوں۔ دو بیٹے ہیں میرے۔ عورت کوئی بھی نہیں ہے۔ اِن حالات میں مجھے بھی کِسی کی رفاقت کی ضرورت ہے۔ کل اپنے بیٹوں کی شادی کروں گا تو کیا تنہا کروں گا کوئی تو مددگار ہونا چاہیئے۔ کوئی تو میرا ساتھ دے۔ مجھے بھی مسرت ہوگی کہ میری بھابی، میرا بھائی اور ایک چھوٹا سا خاندان میرے ساتھ ہے۔ یہ درخواست بھی جائے اور اِسے قبُول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ابراہیم صمدانی تمہارے پاس محفوظ ہے۔" ابراہیم صمدانی پریشان کُن نِگاہوں سے مسلسل غلام احمد کو دیکھے جا رہے تھے تب غلام احمد نے کہا۔

"اگر ابراہیم صمدانی تم میری طرف اِس لئے دیکھ رہے ہو کہ مَیں اِس بارے میں اپنا کوئی مشورہ دُوں تو میرا مشورہ عادل حسین کے حق میں ہے۔ غلام احمد صاحب کے اِن الفاظ پر نہ صرف ابراہیم صمدانی بلکہ عادل حسین اور احسان احمد بھی چونک پڑے تھے۔ عادل حسین نے پُرمسرت انداز میں کہا۔

"میاں غلام احمد درحقیقت تمہارے بارے میں تو اب یہ بات پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی ہے کہ اِس دُنیا سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم تو صرف اِس دُنیا میں رہنے والوں پر احسان کرنے کے لئے آسمان سے اُترے ہو۔ کیوں میاں ابراہیم صمدانی اب بھی کوئی اعتراض کرو گے تم؟"

"یہ بات اچانک مجھ سے اِس طرح کہی گئی ہے کہ میری تو عقل حیران ہے کیا فیصلہ کروں اِس بارے میں۔"

"ٹھیک ہے۔ لوگوں سے مشورہ کرو۔ کہو کہ ایک بے وقوف آدمی نے ایک پُرخلوص پیش کش کی ہے [illegible] احمق کے خلوص کو ٹھکرا دیا جائے یا پھر اُس پر کوئی غور کیا جائے۔ ٹھیک ہے بھئی بات ختم کی جاتی ہے۔ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ جو صاحب پُورے خلوص سے عادل بھائی کہہ سکتے ہیں وہ کبھی ہماری پیش کش پر تعرض نہ کریں گے ویسے ہم کچھ اور باتیں بتا دیں۔ آپ کو ہمارے ہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ہمارا ایک مسئلہ اِس شکل میں حل ہو جائے گا۔"

"آپ یقین کیجئے عادل بھائی! مجھے ذرہ برابر بھی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو بس یہ سوچ رہا ہُوں کہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچے گی۔"

"بات جہاں سے جہاں تک بھی پہنچے آپ اِس سلسلے میں غور فرمانا چھوڑ دیجئے جب آپ کو کوئی تکلیف پہنچے تو آپ ہمیں اِس بارے میں مطلع کر دیجئے گا۔ باقی ہمارے خلُوص کا مذاق کیوں اُڑا رہے ہیں آپ!"

"بخدا! میں اِس تصور سے ہی شرمندہ ہُوں کہ آپ میری اِس ہچکچاہٹ کو اپنے خلُوص کا مذاق سمجھتے ہیں، بہرطور میرے تمام آپ ہی لوگ ہیں مجھے بھلا کِس سے مشورہ کرنا ہے، بھائی غلام احمد بھی یہی رائے دے رہے ہیں اور احسان صاحب بھی یہی حکم فرما رہے ہیں تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے جیسا آپ پسند فرمائیں، میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ۔ کہ میری غربت کہیں...."

"کمال کرتے ہو میاں۔ اِتنی عُمدہ تنخواہ دے رہا ہُوں تمہارے بیٹے کو اور اب بھی تم اپنے آپ کو غریب سمجھ رہے ہو۔ بس اب غُصہ نہ دِلاؤ۔ ورنہ میں اپنے حقوق بھی استعمال کر سکتا ہُوں۔"

اِس بار عادل حسین صاحب نے غلام احمد صاحب سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں عادل صاحب، بِلاشُبہ ہم سب کا عضو عضو آپ کی محبتوں کا ممنُون ہے۔" غلام احمد نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے کہا۔

"تو پھر فیصلہ کیوں نہیں کرتے تم۔ آخر ابراہیم صمدانی تمہارے دوست ہیں اور تم اُن پر بڑا فخر کرتے ہو۔"

"ٹھیک ہے ابراہیم نہایت موزوں بات ہے تمہیں عادل حسین صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہیئے۔ یہ بھی تو سوچو کہ عادل صاحب نے کیا کہا ہے۔ اُنھیں اپنے لئے کچھ سہارے درکار ہیں۔ کیا اس کے بعد اِس بات کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تم اُن سے اِنکار کر دو۔"

"کِس بدبخت نے اِنکار کیا ہے، جیسا آپ حکم دیں۔ عادل بھائی! مجھے کب وہاں جانا ہے۔"

"یہ ہُوئی ناں بات، بس کل صبح۔" عادل حسین صاحب پُرمسرت انداز میں بولے۔

"جو حکم۔ اپنا مُختصر سا سامان باندھ لُوں گا۔"

"واللہ جی خوش کر دیا۔ میاں احسان احمد تم کیوں مُنہ لٹکائے بیٹھے ہو؟"

"کچھ سوچ رہا ہُوں۔ آخر آپ اِس گھر سے کیا کیا لے جائیں گے، عادل حسین صاحب؟"

"مطلب؟"

"بھئی میرے گھر میں ویسے ہی مُختصر افراد ہیں۔ کہاں تو یہ گھر گُل و گُلزار بنا ہُوا تھا اور کہاں اب اِتنے سے لوگ رہ گئے ہیں، یہ چار افراد اور کم ہو جائیں گے میرے گھر سے۔"

"نہیں نہیں بھئی۔ کون کم ہوگا؟ دراصل کچھ اور بھی اصُول طے کر لئے جائیں۔ یہ راہنما اصُول ہوں گے اور اُس کے بعد ہمیں کوئی دِقت نہ ہوگی۔"

"کیا؟" احسان احمد نے پُوچھا۔

"باقاعدہ ایک معاہدہ کر لیا جاتا ہے کہ شام کی چائے پر تو تقریباً تمام ہی لوگ جمع ہو جاتے ہیں لیکن تم لوگ چالاکی سے یہ سارا کام اپنی ہی کوٹھی میں کر لیتے ہو اور میرے ہاں انسانوں کی کمی سے فائدہ اُٹھاتے ہو۔ چنانچہ آج سے یہ بات طے کہ ایک دِن شام کا اجتماع یہاں ہوگا اور دوسرے دِن میرے ہاں۔ ایک دِن ہم لوگ یہاں آجایا کریں گے اور دوسرے دِن تمام لوگوں کو وہاں پہنچنا ہوگا۔ یہ سِلسلہ روزانہ جاری رہے گا شام کی چائے کے ساتھ رات کے کھانے میں بھی یہی عمل ہُوا کرے گا۔"

"آنے والوں میں کون کون شامل ہوگا؟"

"ہر شخص۔ ایک ایک فرد۔"

"یہ تو مشکل ہے، جس شخص کو مشکل پیش آئے رہنے دیا جائے۔ لیکن جسے مشکل نہ ہو اُس کے آنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔" احسان احمد نے کہا۔

"بھئی واللہ آج تو یُوں لگتا ہے جیسے خوشبوؤں کے خزانے ہمارے لئے کھول دیئے گئے ہوں۔ تو پھر یہ بات طے۔ اب اِس سلسلے میں اعتراض تو نہیں رہا کسی کو؟"

"نہیں۔" ابراہیم صمدانی نے جواب دیا اور اُس کے بعد یہ موضوع ختم کردیا گیا۔

***

وسیم جمال احسان احمد صاحب کے دفتر میں داخل ہوگیا۔ اور احسان احمد صاحب نے خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کیا۔

"کہیئے۔ وسیم میاں کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"بس احسان احمد صاحب۔ آپ جیسے بزرگوں کے سایہ میں کاروبار کرنا سیکھ رہا ہُوں۔"

"بھئی تمہیں تو کاروباری ذہانت ورثے میں ملی ہے۔ ہم سے کیا سیکھو گے۔ بیٹھو۔" وسیم مُسکراتا ہُوا کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

"بہت سے لوگوں سے میرے کاروباری روابط رہے ہیں۔ لیکن والد صاحب مرحوم کی زندگی میں بھی آپ کے بارے میں گفتگو ہُوا کرتی تھی اور والد صاحب ایک بات کہتے تھے کہ بلاشبہ احسان احمد اُن تاجروں میں سے ہیں جو ایمانداری کو اپنا شعار بناتے ہیں اور اُسی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔"

"بس میاں۔ دولت تو آنی جانی شئے ہے۔ اقدار بھی کوئی چیز ہوتی ہیں۔ کاروبار بے شک کئے جاتے ہیں لیکن میں ہمیشہ اِس بات کے لئے کوشاں رہا کہ کاروبار کو وہ شکل نہ دُوں جس میں دھوکہ کا عیب سمجھا جاتا ہے۔ اب جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔"

"یقیناً کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ چنانچہ میں نے بھی جب اِس سلسلے میں سوچا تو یہی اندازہ ہُوا کہ آپ سے رجوع کرنا ضروری ہے۔"

"کیا مسئلہ ہے؟"

"ایک چھوٹا سا کام ہے جس کی تکمیل میں آپ کے ذریعے کرنا چاہتا ہُوں اور اسی سلسلے میں آپ سے گفتگو کرنے حاضر ہُوا ہُوں۔" وسیم نے ساتھ لایا ہُوا فائل کھول کر احسان احمد کے سامنے رکھ دیا اور احسان احمد صاحب اُس پر جُھک گئے۔

ایک اچھا خاصا بڑا کاروباری مسئلہ تھا جس میں انتہائی اہمیت کی حامل چند چیزیں باہر سے منگوانی تھیں اور احسان احمد صاحب اِس سلسلے میں ڈیل کرتے تھے وہ فائل کو دیکھتے رہے، پھر اُنھوں نے کہا۔

"خُوب بہت خُوب۔"

"یہ سارا مسئلہ میں آپ کے ساتھ شراکت کرکے حل کرنا چاہتا ہُوں۔ تمام کاغذات آپ کے سامنے ہیں غور کرلیجئے۔ اِن میں کہیں بھی کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ بالکل سیدھا سیدھا کام ہے منافع کی شرح بھی درج کرلی گئی ہے اور پُورے خلوص کے ساتھ میں اِس میں سے پچاس فیصد آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہُوں۔ کام میں زیادہ طوالت نہیں ہے میرا خیال ہے زیادہ سے زیادہ بیس دِن کے اندر اندر تمام معاملات مکمل ہوجائیں گے اور ہم لوگ بیس دن میں یہ رقم کمالیں گے۔"

احسان احمد صاحب کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا تقریباً پینتیس لاکھ روپے کا منافع ہونے والا تھا اُنھیں اِس چھوٹے سے کاروبار میں اور معاملہ بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔

"مگر جو کچھ تم منگا رہے ہو اُس کی کھپت کا کوئی بندوبست ہے؟"

"آرڈر ملنے پر ہی کام کر رہا ہُوں اور تمام معاملات طے کرلئے ہیں بلکہ یُوں سمجھ لیں کہ ایڈوانس رقم بھی حاصل کرلی ہے۔ اور یہ کام اب کرنا ہی ہے۔ کیا آپ اِس سلسلے میں میری مدد کرنا پسند کریں گے انکل؟"

"بھئی معاف کرنا مجھے تو یہ خاصا دِلکش مسئلہ لگتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا جو پیش کش تم نے کی ہے اُس پر غور و خوض کرلیا ہے۔ مجھے بھلا کس سے مشورہ کرنا ہے؟"

"احسان احمد صاحب! میں نے جو فیصلہ کیا اُس پر عمل کر ڈالا۔ آپ اگر یہ فیصلہ قبول فرمالیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ میرے شانوں کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا اور میں بڑی خوشی سے یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوجاؤں گا۔"

"تو ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہے؟"

"تو پھر اِس سلسلے میں معاہدہ تیار کرلیا جائے؟"

"فوراً کرلو۔ اور بہتر یہ ہے کہ اِس سلسلے میں رُدا سے بھی ملاقات کرلو۔ میری طرف سے تو کوئی پیچ نہیں ہے لیکن رُدا سے ملنا بہت ضروری ہے چونکہ ہر طرح تمام ذمّہ داریاں اُس کی اپنی ہیں۔"

"بہتر میں مس رُدا سے بات کئے لیتا ہُوں۔ آپ کی طرف سے تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" احسان احمد صاحب نے کہا۔ اور وسیم اُن کے پاس سے اُٹھ گیا۔

"چائے نہیں پیوگے ہمارے ساتھ؟"

"آپ اگر رُدا صاحبہ کو یہ ہدایت کردیں کہ وہ مجھے چائے پلادیں تو بہتر ہوگا۔ کم وقت میں کام مکمل ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے پلیز۔" احسان احمد نے کہا اور وسیم اُٹھ کر رُدا کے آفس کی جانب چل پڑا۔

رُدا نے بھی پُرخلوص انداز میں اُس کا استقبال کیا تھا۔ حالانکہ وسیم کے انداز سے وہ کافی حد تک مشکوک ہوگئی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ کاروباری معمولات تھے اور کاروباری شخص کو وہ کسی طرح بھی اپنے پاس آنے سے نہیں روک سکتی تھی وسیم مُسکراتا ہُوا اُس کے پاس پہنچ گیا اور رُدا کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"دیکھ لیجئے مس رُدا! کیا جذبہ ہے ہمارا۔ کسی نہ کسی طرح آپ سے ملاقات کا بہانہ نِکال ہی لیتے ہیں۔"

"بہانوں کی کیا ضرورت ہے وسیم صاحب! مجھ سے ملنے کے لئے آپ کو کوئی مُشکل تو پیش نہیں آتی۔"

"بیرُونی طور پر تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ لیکن اندرُونی مشکلات کا ذکر کیسے کیا جائے مس رُدا۔"

"اندرُونی مشکلات۔"

"ہاں جو مشکلات دِل کے اندر پروان چڑھتی ہیں۔"

"دِل کے اندر مشکلات تو نہیں پروان چڑھتیں۔"

"جذبے تو پروان چڑھتے ہیں۔ وہی جذبے انسان کو نہ جانے کہاں کہاں خوار کرتے پھرتے ہیں!"

"آپ بہت دلچسپ گفتگو کرلیتے ہیں وسیم صاحب!"

"آہ۔ کاش آپ اِس بات کا یقین دِلادیں کہ میری گفتگو آپ کو دلچسپ محسوس ہوتی ہے۔"

"دیکھئے آپ کا اندازِ گفتگو کسی قدر اُلجھن آمیز ہوتا ہے۔ آپ ایک بہت بڑے کاروباری ہیں اور میں ایک بہت بڑے کاروباری کی جنرل منیجر۔ میں آپ کی پذیرائی وسیم صاحب اِسی حیثیت میں کرتی ہُوں لیکن اگر آپ مجھے عورت سمجھ کر گفتگو کرتے ہیں تو میں آپ سے انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کر دُوں کہ اِس سلسلے میں مجھے قطعی عورت نہ سمجھا جائے۔"

"یعنی کمال ہے جو بات ایک ٹھوس حقیقت ہے میں اُسے نظر انداز کر دُوں؟"

"کرہی دیں تو آپ کے حق میں بہتر ہے۔ میں اِس سلسلے میں پہلے بھی آپ سے عرض کرچکی ہُوں۔"

"نہیں مس رُدا! آپ بھروسہ کیجئے اِس وقت اہم کاروباری مسئلہ لے کر آپ کے پاس پہنچا ہُوں۔ بلکہ آپ سے پہلے احسان احمد صاحب سے مل چُکا ہُوں لیکن اگر آپ بھروسہ کریں تو یہ سب کچھ میں نے آپ ہی کے لئے کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" رُدا نے تیکھی نِگاہوں سے وسیم کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"اب جب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ زبان اِس حد تک کُھل گئی ہے تو میں کوئی پردہ نہیں رکھوں گا۔ دراصل رُدا صاحبہ آپ مجھے پہلی ہی نِگاہ میں اِتنی پسند آئی ہیں کہ میں آپ سے محبت کرنے لگا ہُوں۔ مس رُدا میرا کردار داغدار نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے طور پر اِس کی تصدیق کرسکتی ہیں۔ میں اب تک ایک سادہ کاغذ کی مانند رہا ہُوں، کچھ غلطیاں انسان سے زندگی میں ہو ہی جاتی ہیں۔ اور میں غلطیوں سے مبرا نہیں ہُوں لیکن یہ غلطیاں ایسی نہیں ہیں جو میرا کردار داغدار کردیں میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا خواہش مند ہُوں اور اِس سلسلے میں بہت سے تصورات میرے ذہن میں موجود ہیں۔ میں نے بارہا تنہائیوں میں آپ کے بارے میں سوچا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ میری زندگی کا ایک اہم جُزو ہیں۔ میں اپنے طور پر اِس عمر میں بڑے بڑے کاروبار سنبھالے ہُوئے ہُوں اور مجھے ایک ایسی ساتھی کی بھی ضرورت ہے۔ جو میرے کاروبار میں میری مُعاون ہو۔ اور آپ سے زیادہ اِس سلسلے میں اور کون ہوسکتا ہے مس رُدا۔ معاف کیجئے گا وہ الفاظ کہہ دیئے ہیں جنھیں کہنے میں مہینے لگتے لیکن میں جانتا ہُوں کہ مہینوں آپ مجھے ملاقات کا موقعہ نہ دیتیں اور میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آپ کے پاس آنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ آج میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ آج میں آپ سے تمام باتیں کُھل کر کہہ دُوں گا اور فیصلہ آپ پر چھوڑ دُوں گا۔"

"وسیم صاحب! عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے کیا مجھے بالکل لاوارث سمجھ رکھا ہے؟"

"نہیں مس رُدا! میں تو آپ سے آپ کے وارثوں کا پتہ معلوم کرنا چاہتا ہُوں۔ تاکہ حالِ دِل اُن سے کہوں اپنی خواہشوں کا اظہار اُن سے کروں۔"

"معاف کیجئے گا وسیم صاحب! میرے دل و ذہن میں ابھی ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے جو آپ نے پیش کیا ہے۔ اگر کبھی کوئی ایسا خیال دل میں آیا تو میں آپ سے رجوع کروں گی۔"

"کتنا عرصہ انتظار کرنا ہوگا مس رُدا؟"

"اِس کے لئے میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ فرمائیے کیا کام ہے مجھ سے؟"

"ہوں۔ ہاں کام تو ہے۔ مجھے احسان احمد صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔"

"اور یہ بھی کہا ہے کہ آپ مجھے چائے پلائیں گی۔"

"او ہو اچھا۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ابھی منگواتی ہوں۔"

رُدا نے انٹرکام پر چائے کے لئے کہا اور اُس کے بعد وسیم کی جانب متوجہ ہوگئی۔

وسیم اب سنجیدہ ہوگیا تھا۔ رُدا نے جس سخت لہجے میں اُس سے گفتگو کی تھی وہ اُس کے لئے ذرا سنبھلنے والا لہجہ تھا۔ بہرطور رُدا اتنی قیمتی شئے تھی اُس کی نگاہوں میں کہ وہ اس لہجے کو بھی پی گیا تھا پھر اُس نے خالص کاروباری باتیں شروع کردیں۔ اور فائل نکال کر رُدا کے سامنے رکھ دیا۔

"احسان احمد صاحب اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟" رُدا نے پوری فائل پڑھنے کے بعد سوال کیا۔

"وہ تو بہت خوش ہیں اور اُنھوں نے مجھے آپ کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ باقی باتیں میں آپ سے کرلوں۔"

"ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا وسیم صاحب کہ ہمیں اس سودے کی تکمیل سے کیا منافع ہوگا۔ آپ نے اِس میں ہمیں پچاس فی صد منافع کی پیش کش کی ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ تمام منافع آپ کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے مس رُدا۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ پچاس فی صد اس لئے رکھا ہے کہ احسان احمد صاحب اِنکار نہ کرسکیں۔ اور مس رُدا صرف ایک لفظ اور برداشت کرلیجئے پلیز۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔ وہ یہ کہ یہ سب کچھ میں نے آپ کی قربت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔" رُدا نے سنجیدہ نگاہوں سے وسیم کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"اِس سلسلے میں میرا جواب وہی ہے وسیم صاحب! جو بھی منافع ہوگا احسان احمد صاحب کے پاس جائے گا۔ میں اس میں سے ایک پیسہ لینا بھی حرام سمجھتی ہوں۔ چنانچہ اگر آپ اپنے ذہن میں یہ تصوّر کئے ہوئے ہیں کہ اِس منافع سے مجھے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو براہِ کرم آپ یہ تصوّر ذہن سے نکال دیں اور جہاں تک معاملہ اِس فرم کے مفاد کا ہے تو میں خلوصِ دل سے یہ چاہوں گی کہ اِس فرم کو یہ منافع ہو۔"

"آپ خلوصِ دل سے کچھ چاہیں اور ہم اُس سے منحرف ہوجائیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں یہ فائل اپنے پاس رکھ لوں؟"

"آپ ہی کے لئے ہے۔"

"ہمیں اِس سلسلے میں مُعاہدہ کب تک کرنا ہوگا؟"

"کل پھر آپ سے ملاقات کا موقعہ مِل جائے گا اگر میں معاہدے کے کاغذات دستخط کرالاؤں۔" رُدا نے عجیب سی نِگاہوں سے وسیم کو دیکھا۔ اِتنی دیر میں چائے آگئی۔ اور رُدا نے اُسے چائے پیش کرتے ہُوئے کہا۔

"وسیم صاحب! معاملات دوسرے انداز میں بھی تو طے ہو سکتے ہیں۔ آپ ایک اچھے کاروباری ہیں اور میں ایک فرم کی جنرل منیجر۔ ہم دو اچھے دوست بن سکتے ہیں۔ ہمارے مفادات مشترک ہوجائیں تو کوئی حرج بھی نہیں ہے اگر آپ میرے ذہن پر یہ بوجھ نہ ڈالیں تو میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔"

"مس رُدا میں آپ کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اِس میں بالکل سچائیاں ہیں لیکن جب میں اپنے دل پر بوجھ محسوس کرتا ہُوں تو آپ کے سامنے زبان کھولنے پر مجبور ہوجاتا ہُوں براہ کرم کچھ وقت ضرور لیں لیکن خدارا اِس مسئلے پر غور ضرور کریں۔"

رُدا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وسیم کافی دیر اُس کے ساتھ بیٹھا رہا اُس کے بعد سلام کرکے چلا گیا۔ لیکن رُدا کے لئے وہ اِتنی اُلجھنیں چھوڑ گیا تھا کہ رُدا سخت پریشان ہوگئی ذہن ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وسیم کی بے باکانہ گفتگو اُسے اُلجھن میں مُبتلا کررہی تھی کئی بار اُس نے مختلف انداز میں وسیم کے بارے میں سوچا لیکن ہر بار دِل میں ایک کسک سی بیدار ہوگئی۔ وسیم اُس کی زندگی کا ساتھی نہیں بن سکتا تھا۔ چونکہ... چونکہ... اور اُس کے آگے ایک سیاہ دیوار تھی جس میں ایک چہرہ بار بار چمکنے لگتا تھا لیکن وہ چہرہ۔ وہ چہرہ تو اب ایک حسرت بن گیا تھا۔ اور یہ چہرہ تصوّر بیگ کے علاوہ کسی کا نہ تھا۔ وہ جب اُس کے بارے میں سوچتی تو انتہائی

پیچیدہ احساسات کا شکار ہوجاتی تصوّر کے ساتھ اُس نے جو کچھ کیا تھا اور اُس کے بعد تصوّر پر اُس کا جو ردِّعمل ہُوا تھا وہ سب کچھ رُدا کے سامنے تھا۔ تصوّر کو تو وہ ایک لمحے کو بھی قصوروار نہیں سمجھتی تھی اُس نے تو اپنے خلوص اور محبت کی انتہا کردی تھی۔ لیکن رُدا ہی نے اُس کو اِس طرح ٹھکرایا تھا۔ کہ اُس کے بعد وہ پاش پاش ہوگیا تھا۔ اب بھلا اِس کی کیا گنجائش تھی کہ رُدا اُن کرچیوں کو آسانی سے جوڑ سکے اور پھر اس کی ہمت بھی نہیں تھی اتنی کہ وہ تصوّر سے معافی مانگے، جب اِن ساری باتوں کو سوچ لیتی تو پھر ایک اور احساس اُس کے دِل میں اُبھرتا۔ یہ ثاقب کا احساس تھا ثاقب اُس کا باپ جس نے اُس کی ماں کو اتنی تاریکیوں میں ڈبو دیا تھا کہ اُس کی اولاد تک اُس کا خمیازہ بھگت رہی تھی۔

مرد تصوّر بھی ایک مرد ہے۔ وسیم بھی ایک مرد ہے اور، اور... یہ صنف قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ یہاں آکر اُس کے دِل میں باغیانہ خیالات جنم لینے لگتے تھے۔

بہت دیر تک پریشان انداز میں سوچنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وسیم سے اِس سلسلے میں کل معاہدے کے وقت صاف صاف گفتگو کرلے گی کہ اگر آئندہ اُس نے اُس سے اِس قِسم کی گفتگو کی تو احسان احمد صاحب کو اُس کی اطلاع دے دی جائے گی۔ کاروباری معاملات کے لئے وہ اپنی ذہانتیں تو صرف کرسکتی تھی لیکن اپنے وجود پر کوئی بوجھ نہیں برداشت کرسکتی تھی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی اُسے اِن معاملات میں اُلجھے ہُوئے کہ احسان احمد صاحب دروازے پر نظر آئے اور اُنھوں نے باقاعدہ اندر آنے اجازت طلب کی وہ کرسی سے کھڑی ہوگئی تھی۔

"آئیے انکل۔ آپ اجازت کیوں لیتے ہیں؟"

"معاف کرنا اِس وقت میں انکل نہیں بلکہ احسان احمد ہُوں اور آپ میری فرم کی جنرل منیجر ہیں مس رُدا۔" رُدا آہستہ سے ہنس پڑی اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ احسان احمد صاحب اندر آگئے پھر کرسی پر بیٹھتے ہُوئے بولے۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے وسیم تمھارے پاس آیا تھا؟"

"جی... جی یہ فائل میرے سامنے موجود ہے۔"

"بھئی رُدا ہم تو اِسے امدادِ غیبی سمجھتے ہیں۔ یُوں سمجھ لو غیب سے ہماری مدد ہُوئی ہے۔ حالانکہ وسیم ایک کاروباری باپ کا بیٹا ہے جس نے زندگی میں شاید ہی کبھی مار کھائی ہوگی وہ کاروبار کے گر بھی جانتا ہے اور میں اُس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرچکا ہُوں۔ لیکن یہ پیش کش واقعی بڑی حیرت کی حامل ہے۔ اپنی نوعیت کی واحد پیش کش۔ وسیم اگر چاہے تو اپنے وسائل سے بھی یہ سارے کام کرسکتا ہے اور اِس میں اُسے کوئی دِقت نہ ہوگی۔ اخراجات اِس کے پانچ فیصد بھی نہ آئیں گے لیکن اُس نے ہماری فرم کو یہ پیش کش کی ہے، میں سمجھتا ہُوں کہ یہ صرف خدا کا احسان ہے ہم پر، اچھا خاصا منافع ہوجائے گا جس کا تخمینہ تقریباً پینتالیس لاکھ ہوسکتا ہے۔"

"جی انکل۔" رُدا نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ وہ احسان احمد کا خوشی سے سُرخ چہرہ دیکھ رہی تھی اور اُس کے دِل میں عجیب، عجیب احساسات پیدا ہورہے تھے۔

وسیم اُس کی ذات کو اِن معاملات میں ملوث کررہا تھا لیکن... لیکن اِس فرم کی جو ذمّہ داریاں اُس پر عائد ہوتی تھیں۔ اُن کے تحت اُسے ہر قیمت پر اُس کی تکمیل کرنی تھی ہر قیمت پر۔ خواہ اُس کے لئے اُسے اپنی ذات پر جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ فرم کے مفادات کو نقصان بھی تو نہیں پہنچا سکتی تھی۔

"مجھے یقین ہے رُدا تم بہت خوش اُسلوبی سے تمام معاملات ہینڈل کرلوگی۔" احسان احمد نے کہا اور اُس نے آہستہ سے گردن ہلادی۔

ڈاکٹر نُعمان کئی دِن کے بعد احسان احمد کی کوٹھی میں آیا تھا۔ اُسے کوٹھی خالی خالی محسوس ہُوئی حالانکہ چائے کا وقت تھا چوکیدار نے بتایا کہ سب لوگ عادل حسین کی کوٹھی پر گئے ہُوئے ہیں چنانچہ ڈاکٹر نعمان نے بھی اُدھر ہی کا رُخ کیا۔

عادل حسین کی کوٹھی کا لان اِس وقت وہی منظر پیش کررہا تھا، چہلیں ہورہی تھیں، ٹولیاں بنی ہُوئی تھیں۔ ڈاکٹر نُعمان کا خیر مقدم تالیاں بجا کر کیا گیا تھا۔

"سوچتے تو ہوں گے آپ لوگ کہ کیسا انسان ہے کھانے پینے کی خوشبو سُونگھتا چلا آتا ہے۔ لیکن بعض اوقات مجبوریاں انسان پر ایسا ہی وقت لے آتی ہیں۔"

"یہ گوہر افشانی آپ نے کس سلسلے میں فرمائی ہے عزیزم؟" عادل حسین صاحب نے نُعمان کو گھورتے ہُوئے کہا۔

"جی وہ میں پہلے احسان احمد صاحب کی کوٹھی پر گیا تھا وہاں جا کر معلوم ہُوا کہ تمام لوگ آپ کے ہاں موجود ہیں۔ سو اِدھر چلا آیا۔ راستے میں دل نے کئی بار کہا کہ کسی پر مُسلط ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن میں دِل کی باتیں ذرا کم ہی مانتا ہُوں چنانچہ یہاں چلا آیا۔"

"اور اب شرمندگی کا شکار ہو" عادل حسین صاحب نے سوال کیا۔

"جی ہاں"

"کیوں" عادل حسین صاحب نے پوچھا۔

"جی وہ بس"

"سنو میاں، ذرا غور سے سن لینا اور گرہ میں باندھ لینا یہ خانۂ بے تکلف ہے اپنا عادی بنا دو ہیں۔ اُس وقت تک چائے کا اہتمام نہ ہوگا جب تک تم نہ آجاؤ گے۔ اگر اپنائیت محسوس کرتے ہو تو اپنائیت کا ثبوت دو۔ ورنہ بے کار باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ آج سے تمہیں ہمیشہ کے لئے دعوت دی جاتی ہے کہ روزانہ یا بشرطِ فرصت تم یہاں آتے رہو گے۔ شام کی چائے کا وقت چھ بجے مقرر ہے۔ آج کے دن سے حساب کتاب لگالو ایک دن یہاں تو ایک دن وہاں، کیا سمجھے؟"

"جی، جی" ڈاکٹر نعمان نے سعادت مندی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ تمام لوگ اُسی کی جانب متوجہ تھے۔ وہ سیدھا بزرگوں کے پاس پہنچا تھا۔

"ارے میاں غیریت کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے، جب تک تمہارے دل میں اپنائیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ کوئی تم سے کچھ کہنے والا نہیں تھا۔ لیکن اب یہ سمجھ لو کہ یہ دعوت ہمیشہ کے لئے ہے" ذکیہ بیگم نے کہا۔

"جی چچی جان۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں بھی اِس دُنیا میں تنہا ہی ہوں، چچا جان کے ساتھ رہتا ہوں اور میرے والدین موجود نہیں ہیں۔ کچھ ایسے سلسلے ہیں کہ اِس وقت بیان کرنا بے مقصد ہوگا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اسپتال میں ہوتا ہوں یا پھر تھوڑا بہت وقت گھر پر گزار لیتا ہوں۔ دوستیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور نہ جانے کیوں دوست بنانے میں ہمیشہ ناکام رہا ہوں آپ لوگوں نے ذرا سی توجہ دی تو بس جب بھی دل اُداس ہوتا ہے، تو آپ کی جانب چلا آتا ہوں"

"بات دراصل یہ ہے صاحبزادے کہ ہم لوگ بڑی بے تکلفی سے کسی کو احمق اور بے وقوف کہہ دیا کرتے ہیں اور اِس وقت جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں بھی انہی الفاظ سے نوازا جائے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ انہیں پھر کسی دن کے لئے ملتوی کر دیا جائے اب تو بات سمجھ میں آگئی ناں"

"جی، جی۔۔"

"تو پھر جاؤ ٹوٹ پڑو چائے پر، ورنہ سب لوگ صاف کر دیں گے، کمپلیٹ ہو چکے ہو"

ڈاکٹر نعمان آہستہ آہستہ اُن لوگوں کی جانب بڑھ گیا سنجیدہ چہرہ تھا۔ وہاں نعرے لگا لگا کر اُس استقبال کیا گیا۔ ثناء، ندرت اور دوسرے لوگوں نے اُس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔

"اُس دِن سے آپ ایسے غائب ہوئے ڈاکٹر نعمان صاحب، کہ آج صورت دِکھائی ہے" ثناء بولی۔

"جی۔ وہ۔ بس روز آنے کی ہمت نہیں ہوتی"

"تو طاقت کی کوئی دوائی استعمال کیجئے ہمت پیدا ہو جائے گی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ کیا ایسی کوئی دوا آپ کے عِلم میں نہیں ہے" ثناء نے کہا۔ لیکن ڈاکٹر نعمان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اختر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"جی ڈاکٹر صاحب! فرمائیے کیسے مزاج ہیں"

"چھوڑو یار، تم سے تو مجھے سخت اختلاف ہے"

"جی جی ذرا غور کر لیجئے اپنے الفاظ پر، ایک واحد شخصیت میری ہے جو آپ کے ساتھ ہر بُرا سلوک کر سکتی ہے۔ غور فرمالیا آپ نے؟"

"نہیں بھئی۔ میں واقعی رنجیدہ ہوں"

"او ہو۔ جلدی کرو بھئی۔ کوئی ڈاکٹر صاحب کے لئے چائے لائیے۔ ارے ہاں یہ تم سب لوگ کھانے پینے کی چیزوں پر کیوں حملہ آور ہو، ڈاکٹر صاحب کے لئے بھی کچھ لاؤ۔ بے چارے غم زدہ ہیں اِس وقت۔ مگر برادرِ من، یہ غم زندگی کِس کِس کھاتے میں ہے؟"

"مجھے اطلاع بھی نہیں دی گئی کہ آج کی محفل یہاں ہے۔ ٹیلی فون کر کے بُلایا بھی جا سکتا تھا مجھے"

"ایں، واقعی یار گڑبڑ تو ہو گئی۔ لیکن اب ہمیں کیا پتہ کہ تم کِس وقت اپنے کِس مریض میں اُلجھے ہوئے ہو۔ تاہم اگر اس کی گنجائش ہے تو پھر وعدہ!"

"جی نہیں۔ یہ وعدہ۔۔۔ یہ وعدہ بعد از وقت ہے۔ کیونکہ مجھے روزانہ آنے کی دعوت پہلے ہی مل چکی ہے اور وہ بھی بزرگوں سے، آپ لوگوں کی تو خیر اوقات ہی کیا ہے۔ اِدھر لاؤ یہ پلیٹ" اُس نے اختر کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے ہوئے کہا۔

"لیجئے لیجئے، بچا کھچا ہے۔ آپ ہی کے لئے رکھا گیا تھا۔ بلکہ ہم انتظار کر رہے تھے کہ کوئی آئے تو یہ ساری چیزیں اُسے دے دی جائیں۔ بڑے اچھے وقت پر تشریف لائے آپ" اختر نے کہا اور چاروں طرف سے ہنسی کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ ڈاکٹر نعمان اِن آوازوں سے بے پرواہ ہو کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اور اختر میز سے دوسری چیزیں اُٹھانے لگا۔ اُس نے ایک اور

پلیٹ بنا کر ڈاکٹر نعمان کی پلیٹ میں اُنڈیل دی۔

"ارے ارے کیا کر رہے ہیں آپ اختر صاحب"

"کھاؤ میاں کھاؤ کوئی بات نہیں۔ ارے ہاں چائے کا بندوبست کرو جلدی چائے لاؤ" اختر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان جھینپی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس کی نظر تنویر پر جا ٹکی اور تنویر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ڈاکٹر نعمان جھکا گیا اور اُس نے پلیٹ آگے بڑھ کر میز پر رکھ دی۔ اختر چائے کی پیالی لئے ہوئے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نعمان نے چائے کا گھونٹ لیا تو اُس کے ہونٹ جل گئے۔

"صبر سے میاں صبر سے۔ اور بھی چائے ہے" اختر بولا۔ اور دیر تک ہنسی اُبھرتی رہی۔ ڈاکٹر نعمان نے بھی اب اپنے آپ کو ڈھیٹ بنا لیا تھا۔ ثناء کہنے لگی۔

"مسٹر اختر! آپ کو ذرا بھی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ آپ ڈاکٹر نعمان کا مذاق اُڑائیں"

"اچھا! وہ کِس رشتے سے" اختر نے پوچھا۔

"ڈاکٹر نعمان ہمارے معزز دوست ہیں"

"تو پہلے کیوں نہ فرمایا آپ نے ثناء صاحبہ" اختر نے کہا۔

"نہیں بس اب مذاق بالکل نہیں ہوگا"

"ہونے دیجئے، ہونے دیجئے، کوئی حرج نہیں ہے" ڈاکٹر نعمان بولے۔

"جی ہاں ہونے دیجئے" وہ کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں۔ اختر نے یہ جملے زیرِ لب کہے تھے۔ آواز اتنی تھی کہ صرف ڈاکٹر نعمان سُن سکے۔ اُس نے جلدی سے سنبھل کر چائے کی پیالی میز پر رکھ دی تھی۔ غرض یہ کہ اِسی طرح ہنسی مذاق ہوتا رہا اور اُس کے بعد لوگ پھر اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر نعمان خالد سے اختر کے بارے میں گفتگو کرنے لگا تھا۔

"یہ شروع ہی سے ایسے ہیں یا کسی حادثے نے اِن کی یہ کیفیت کر دی ہے" اُس نے بڑی سنجیدگی سے خالد سے پوچھا۔

"نہیں بھائی ابتداء ہی سے برداشت کر رہا ہوں۔ دیکھ لو۔ بھائی ہو تو مجھ جیسا"

"جی، جی۔ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خالد صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ ابھی تو آپ کو ڈاکٹر صاحب اِن کی بہت سی خوبیاں بتائی جائیں گی" اختر بولا۔

"ذرا سی کوئی بات کہہ دو، بس اِسی طرح جان کو آجاتا ہے۔ اور اُس کے بعد نہ جانے کیا کیا اُلٹی سیدھی بکنے لگتا ہے"

"یار ڈاکٹر نعمان تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تم سے کچھ ضروری گفتگو کرنا چاہتا ہوں" اختر نے دوستانہ انداز میں اختر کا ہاتھ پکڑا۔ اور تھوڑا سا پیچھے ہٹ آیا۔

"تو تمہیں شکایت ہے ہم لوگوں سے"

"واقعی سنجیدگی سے شکایت ہے۔ اِس جنت میں میرا گزر اتنی آسانی سے نہیں ہو پاتا۔ جتنی آسانی سے تم لوگ اِس میں شامل ہو جاتے ہو"

"دراصل ڈاکٹر نعمان! جنت میں ایک ہستی کا گزر ممکن ہی نہیں"

"شیطان کہنا چاہتے ہو ناں!"

"ارے نہیں بھئی توبہ توبہ۔ وہ بھلا کِس قابل ہے" اختر نے کہا اور ہنس پڑا پھر بولا "ویسے ہم اپنی اِس کوتاہی کا ازالہ کرنے کے لئے تیار ہیں"

"مطلب؟"

"ایک ایسی خبر سُنائیں گے آپ کو ڈاکٹر نعمان صاحب کہ اُس کے بعد ہماری خوشامدوں کے علاوہ کچھ نہیں کر پائیں گے آپ"

"تو پھر سُنا دو بھائی، کیا خبر ہے؟"

"دوستی کا حق ہم نے ادا کر دیا ہے ڈاکٹر نعمان صاحب اور وہ بھی صرف آپ کے لئے آپ یوں سمجھ لیں کہ ہم نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ دُنیا کا کوئی شخص دے نہیں سکتا"

"یعنی۔۔۔ یعنی"

"آپ کے لئے تنویر کو ہم اِس گھر میں اُٹھا لائے ہیں"

"وہ کیسے؟"

"بھئی ابراہیم ہمدانی صاحب اب ہمارے ساتھ ہی قیام فرمائیں گے۔ محترمہ تنویر، اُن کے بھائی، اُن کی والدہ اور اُن کے والد، یہ سب لوگ اِسی کوٹھی میں رہا کریں گے، احسان صاحب کی کوٹھی چھوڑ دی ہے اُن لوگوں نے"

"کک۔۔۔ کب سے؟"

"آج تیسرا دِن ہے"

"ہوں، اچھا۔ خوشخبری تو ہے"

"کیسے بھلا بتائیے؟"

"مم۔۔ میرا مطلب ہے اب ہم یہیں آیا کریں گے"

"جی نہیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو دُنیا کی نگاہوں میں مشکوک ہو جائیں گے۔ آپ کو وہاں بھی آنا پڑے گا اور یہاں بھی، جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ اب ایک دِن شام کی نشست

یہاں ہوگی، اور ایک دن وہاں۔ ویسے آپ یہاں اگر زیادہ سکون محسوس کیا کریں گے۔"

"مم... میرا مطلب ہے کہ اب تو یہاں آسانی سے آیا جاسکتا ہے۔ وہاں تو بہت سے لوگ ہوا کرتے تھے لیکن یہاں صرف آپ لوگ۔"

"خیر آپ کا آنا اِتنا آسان بھی نہیں ہوگا۔ ذرا احتیاط رکھئے گا۔ آپ بہت بے باک فطرت کے مالک ہیں۔ کسی اور کو احساس ہو گیا تو جانتے ہیں یہ لوگ آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"نن... نہیں، احساس ہوگا ہی کیوں! بس ذرا اِس سلسلے میں اناڑی ہیں۔ آپ اِسے بے باکی نہ تصور فرمائیے، ویسے آپ کی رہنمائی درکار ہے پیر و مرشد۔"

"فکر مت کر بچّہ، سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اختر نے ایک ہاتھ ڈاکٹر نعمان کے سر پر رکھتے ہوئے کہا، پھر ڈاکٹر نعمان نے تھوڑی دیر کے بعد جانے کی اجازت مانگی تو احسان احمد صاحب کہنے لگے۔

"نہیں میاں یہ اصول کے خلاف ہے۔ طے پایا ہے کہ شام کی چائے میں شریک ہونے والا ڈنر کے بعد ہی واپس جاسکے گا۔ تمھاری ڈیوٹی تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں ڈیوٹی تو نہیں ہے آج۔"

"تو بس ڈنر کے بعد ہم سب یہاں سے رخصت ہوجائیں گے۔"

ڈاکٹر نعمان بھی رک گیا تھا۔ ان کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا اور سب لوگ اپنی ٹولیاں بنائے اندر پہنچ گئے تھے۔ ردا بھی اُن سب لوگوں میں شریک تھی۔ لیکن عام دِنوں کی نسبت آج وہ کچھ سنجیدہ سنجیدہ سی تھی۔ نہ جانے کیوں۔ تاہم وہ اُن لوگوں میں شامل رہی تھی۔ اب اپنے بدلے ہوئے رویّے کے بعد وہ زیادہ تر اُن لوگوں میں گھلی ملی رہتی تھی اور اُس نے تنہائی ختم کردی تھی۔ وہ سب لوگوں کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اور حتی الامکان اُن لوگوں کے ساتھ گھلی ملی رہی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے پر ایک اُلجھن صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ اختر ڈاکٹر نعمان کو اپنا کمرہ دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔ اور وہاں پہنچ کر اُس نے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر نعمان، آپ نے اِتنے دِن کیوں لگائے آنے میں؟"

"یار بس ہمت نہیں پڑی تھی۔ پپ۔ پتہ نہیں کیوں سوچتا ہوں اور رہ جاتا ہوں۔"

"ہمت کیجئے، آنا جانا اچھا ہے۔ ویسے میں آپ کو بتادوں یہ جو لوگ ہیں ناں جن کے درمیاں آپ آئیں گے جائیں گے۔ یہ آنے جانے والوں سے زیادہ خوش ہوتے ہیں آپ کی عزت و توقیر اِس طرح نہیں ہوگی کہ آپ کبھی کبھی آئیں۔ بس اِس طرح زیادہ ہوگی کہ آپ آئیں اور روز آیا کریں۔ اِس طرح ہم آپ کو اپنے خاندان کا ہی فرد سمجھنے لگیں گے۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟"

"نہیں۔ اِس کی ذمّہ داری لی جاسکتی ہے۔ جب بھی کوئی گڑبڑ محسوس کریں آنا جانا ترک کردیں۔"

"یہ ٹھیک ہے تو پھر کل پہنچ رہا ہوں میں۔"

"آج کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ملو گے؟"

"ملاؤ گے؟"

"کیا دو گے؟"

"جو مانگو گے۔"

"وعدہ؟"

"بالکل، ہم زبان کے سچّے ہیں۔"

"ہوں۔ بیٹھو۔ انتظام کرکے آتا ہوں۔" اختر نے کہا اور اُس کے بعد باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر نعمان پُرمسرت انداز میں کسی سوچ میں گم ہوگیا تھا۔ واقعی اِن لوگوں کے ساتھ مل کر زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ اِس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بہت سے دوست تھے اُس کے۔ لیکن ایسی بے تکلفی، ایسا دِلکش ماحول اُس نے اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اختر واپس آیا اور اُس نے کہا۔

"اب سے ٹھیک دس منٹ کے بعد آپ لان کے پچھلے حصّے میں پہنچ جائیے تنویر وہیں آجائے گی۔"

"کک... کیا کہا ہے آپ نے اُن سے؟" ڈاکٹر نعمان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس آپ جائیے۔"

"اختر کوئی شرارت تو نہیں ہوگی یار؟"

"ڈاکٹر۔" اختر نے گھورا۔

"نن... نہیں۔ میں بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ بس ذرا ابھی، ابھی... ڈرتا ہوں۔"

"نہ ڈرو میرے لال نہ ڈرو۔ اختر کی سرپرستی میں ہو۔ کسی بات کی فکر مت کرو۔" اختر خود ڈاکٹر نعمان کو کوٹھی کے عقبی لان میں چھوڑ کر آیا تھا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سامنے کی سمت روشنیاں جل رہی تھیں، اِدھر بھی مدھم مدھم روشنیاں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر

کے بعد تنویر کی آواز سنائی دی۔

"اختر بھائی، اختر بھائی، کیا بات ہے، کیوں بلایا ہے آپ نے مجھے؟" وہ تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی ڈاکٹر نعمان کے قریب پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نعمان پلٹا تو تنویر چونک کر رک گئی۔

"اختر بھائی۔ اختر بھائی یہاں نہیں آئے؟"

"نہیں، مجھے بھیجا ہے انھوں نے۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"آپ کو؟"

"جی۔"

"تو کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟"

"وہ کچھ ضروری اور اہم باتیں کرنی ہیں۔"

"مگر اختر بھائی نے تو یہ نہیں بتلایا تھا۔"

"ظاہر ہے بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ میرے دِل کا حال بھلا وہ کیسے جان سکتے ہیں۔"

"اچھا، کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟"

"وہ تنویر صاحبہ۔ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھئے؟"

"آپ یہاں آکر خوش ہیں؟"

"مطلب؟"

"میرا مطلب ہے آپ یہاں آکر خوش ہیں؟"

"آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں مجھ سے؟"

"اِس لئے کہ میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ارے واہ۔ میں خوش ہوں یا ناخوش، آپ کو کیا؟" تنویر بولی۔

"لڑنے کا دِن ہے آج؟" ڈاکٹر نعمان نے پوچھا۔

"کس سے لڑوں گی؟"

"مجھ سے جو لڑ رہی ہیں آپ۔"

"اِسے لڑائی کہتے ہیں۔ لڑائی دوسری ہوتی ہے۔ جناب آپ سمجھتے کیا ہیں؟"

"اچھا چلیں چھوڑیں۔ یہ بتائیے کیسی ہیں؟"

"جیسی بھی ہوں ٹھیک ہوں۔ آپ کو کیا؟" تنویر بولی۔

"خدا کرے مس تنویر آپ بیمار ہوجائیں۔"

"ارے ارے دماغ صحیح ہے آپ کا؟"

"جی ہاں بالکل صحیح ہے۔ آپ نہیں جانتیں اِس دُعا کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔"

"آپ خود بیمار ہوجائیں۔ میں کیوں ہوں۔ میں بھی آپ کو یہ بددُعا دے سکتی ہوں۔"

"دیجئے، دیجئے کچھ تو دیجئے، بددُعا ہی سہی۔"

"خدا کرے آپ کو ہیضہ ہوجائے۔"

"اُونہوں۔ لاحول ولا قوۃ کس بیہودہ بیماری کا نام لیا ہے۔ کوئی خوبصورت سی بیماری تجویز کریں میرے لئے جیسے عارضۂ دِل عارضۂ قلب وغیرہ۔"

"اور آپ اللہ کو پیارے ہوجائیں۔"

"کاش آپ کی دُعا قبول ہوجائے کسی کا تو پیارا ہوجاؤں ایں۔"

"بے کار باتیں کرنے میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے ڈاکٹر نعمان صاحب۔ آپ یہ بتائیے مجھے آپ نے یہاں کیوں بلایا تھا؟"

"کیا مطلب، ڈاکٹر میں ہوں یا آپ؟"

"آپ کی باتیں مجھے کچھ عجیب سی لگ رہی ہیں۔ لیکن یہ اختر بھائی انھوں نے جان بوجھ کر مجھے یہاں بھیجا تھا۔ میں سمجھ گئی۔"

"ہاں اختر میرے محسن ہیں تنویر صاحبہ۔ وہ میرا حالِ دِل جانتے ہیں۔"

"آپ عجیب سے آدمی ہیں ڈاکٹر نعمان صاحب۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔"

"آپ تنویر غور کیجئے، کچھ رومانی ناول نہیں پڑھے آپ نے؟"

"رومانی ناول۔ نہیں کوئی پڑھنے ہی نہیں دیتا۔"

"میں آپ کو ایسے ناول لاکر دُوں؟"

"جی نہیں، کوئی پوچھے گا کہ کون لایا ہے تو میں کیا جواب دُوں گی؟"

"آپ کہہ دیجئے گا کہ میں نے خریدے ہیں۔"

"نہیں میں جھوٹ نہیں بولتی۔ آپ براہِ کرم ایسی کوئی تکلیف نہ کریں۔ مگر رومانی ناول پڑھنے سے ہوگا کیا؟"

"آپ کو محبت کرنا آجائے گی۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور تنویر اُسے دیکھنے لگی، پھر ایک دم مسکرادی۔

"آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔"

"جی؟" ڈاکٹر نعمان آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"ہاں آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ اچھا اب میں جاؤں؟"

"اچھا، یعنی ایک جملہ آپ نے اِتنی دیر میں میری پسند کا فرمایا اور اُس کے بعد جانا چاہتی ہیں؟"

"تو پھر کیا کروں۔ باقی تمام لوگ وہیں ہیں۔ کھانے پینے کا انتظام ہو رہا ہے۔ میری بھی کچھ ذمّہ داریاں ہیں آپ کو پتہ ہے کہ ہم اِسی گھر میں آگئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں، پتہ ہے۔ اور میں نے ایک فیصلہ بھی کیا ہے۔"

• کیا؟

• آپ سے ملنے کو جی چاہا کرے گا تو یہیں آجایا کروں گا۔ ویسے آپ اسکول اور کالج وغیرہ نہیں جاتیں؟

• نہیں۔ آج کل نہیں جا رہی۔"

• کب سے جانا شروع کریں گی؟

• مجھے کیا معلوم۔ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔"

• پڑھنا لکھنا اچھی بات ہے۔ اِس طرح آپ سے گھر سے باہر بھی ملاقات ہو جایا کرے گی۔"

• نہیں جناب ڈاکٹر نعمان صاحب، گھر سے باہر میں کبھی آپ سے ملاقات نہیں کروں گی۔ اُس دن یاد ہے آپ نے مجھے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی پیش کش کی تھی۔"

• اور آپ نے نہایت بے دردی سے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔"

• تو ظاہر ہے پہلی ہی تو ملاقات تھی ہماری۔"

• اب کوئی ایسا موقعہ مل سکتا ہے؟

• جی نہیں۔ کیا ضروری ہے، ویسے آپ کا جب جی چاہا کرے۔ یہاں آجایا کریں۔ کوئی دِقت بھی نہیں ہوگی آپ کو، اختر بھائی آپ کے دوست ہیں۔ باقی سارے لوگ بھی آپ کے دوست ہیں ویسے آپ کو اچھا تو نہیں لگتا ہوگا جب آپ کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔"

• آپ کو اچھا لگتا ہے؟" ڈاکٹر نعمان نے پُوچھا۔

• نہیں۔ مجھے بھی اچھا نہیں لگا۔"

• آہ یہ محبت کی نشانی ہے۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور تنویر ہنسنے لگی، پھر بولی۔" اچھا اب تو مجھے اجازت دیجئے، بہت دیر ہوگئی۔"

• خُدا آپ کا بھلا کرے۔ ویسے دوبارہ بھی مجھ سے اِسی نرمی سے پیش آیئے گا، کچھ دِن جی لُوں گا آپ کے زیرِ سایہ۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور تنویر ہنستی ہُوئی وہاں سے چلی گئی۔ ڈاکٹر نعمان اُسے مُسکراتی نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔

▽ وسیم جمال کی بے باکی رُدا کو سخت ناپسند تھی لیکن وہ بے بس ہوگئی تھی۔ احسان احمد نے جس طرح اِس منصُوبے سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا اُس نے رُدا کی زبان پر تالے لگا دیئے تھے وہ جانتی تھی کہ احسان احمد صاحب کی کیا پوزیشن ہے۔ بے چارے ازسرِنو نئی تعمیر میں مصرُوف تھے اور سخت محنت کر کے کچھ کما لینا چاہتے تھے۔ بینتالیس لاکھ کا منافع کوئی معمُولی بات نہیں تھی۔ اِس سے احسان احمد کو جتنا سہارا مِلتا، رُدا جانتی تھی۔ وسیم جمال نے دوسرے ہی دِن مُعاہدے کے پیپر سائن کرائے تھے، اور اِس معاہدے کی تکمیل ہوگئی تھی اِس طرح اُس نے احسان احمد صاحب تک رسائی حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ تلاش کر لیا تھا اور اب روزانہ ہی کسی نہ کسی بہانے سے آجایا کرتا تھا۔ اُس نے ایسے اوقات مُنتخب کر لئے تھے جب اُس کی ملاقات براہِ راست احسان احمد صاحب سے نہ ہو اور ظاہر ہے اُن کی جگہ رُدا ہی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ وہ اب اندر آنے کی اجازت بھی طلب نہیں کرتا تھا۔ اور رُدا اُسے صرف احسان احمد صاحب کے لئے برداشت کر رہی تھی۔ وسیم نے اُس دن کے بعد سے ایسی کوئی بات نہ کہی تھی۔ جو رُدا کے لئے باعثِ پریشانی ہوتی۔ لیکن اُس کی تمام تر توجہ رُدا پر ہی رہتی۔ ہاں البتہ اُس دن کی ملاقات میں جب اُس نے رُدا کو ہیروں کے آویزے پیش کئے تو رُدا نے اُسے تعجب سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

• یہ کیا ہے وسیم صاحب؟

• ایک حقیر سا تحفہ ہے آپ کے لئے مِس رُدا۔"

• آپ آدمی بہت دلچسپ ہیں وسیم صاحب۔ میں اس فرم کی جنرل مینجر ہُوں اور آپ ہمارے پارٹنر۔ اب بھلا یہ بتائیے کہ اس میں تحائف کی گنجائش کہاں سے نکل آتی ہے۔"

• دلچسپ بات تو یہی ہے کہ نہ میں آپ کو اس فرم کی جنرل مینجر سمجھتا ہُوں اور نہ اپنے آپ کو اِس فرم کا یا معاہدے کا پارٹنر۔ بلکہ آپ آج تک یقین نہ کر پائیں اور نہ جانے کب تک یقین نہ کر پائیں گی کہ یہ سارے مسئلے آپ کے لئے ہیں مِس رُدا۔ میں ہر قیمت پر آپ کے قریب پہنچنا چاہتا ہُوں۔"

• آپ صرف اِس فرم تک محدُود ہیں وسیم صاحب، اِس سے آگے پہنچنے کی ہر کوشش میں آپ ناکام رہیں گے۔ رُدا ٹھوس لہجے میں بولی اور وسیم اِس بات پر برافروختہ ہونے کی بجائے مُسکرا دیا پھر بولا۔

• تاریخ گواہ ہے مِس رُدا کہ محبت کرنے والوں نے ایسے ہی کڑے مراحل سے گُزر کر محبت کی تکمیل کی ہے۔ میں تو سارے امتحانات کی تیاریاں کر چُکا ہُوں اور ابھی تک میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے کسی امتحان سے نہیں گزرنا پڑا۔ میں آپ تک پہنچوں گا مِس رُدا اور یقیناً پہنچوں گا، مجھے اپنے آپ پر پُورا پُورا بھروسہ ہے، کیونکہ میں نے زندگی میں کبھی ناکامیوں کا مُنہ نہیں دیکھا۔"

• آپ کسی فلمی وِلن کی مانند نظر آرہے ہیں وسیم صاحب۔ جو ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ مجھے ہنسی آتی ہے آپ پر، معاف کیجئے گا۔ میں آپ کا احترام کرتی ہُوں آپ کا مذاق اُڑانا نہیں چاہتی۔ آپ کی دِل شکنی نہیں کرنا چاہتی، کیونکہ آپ سے میری فرم کا مفاد

وابستہ ہے، لیکن جب آپ ذاتی باتیں کرتے ہیں تو میں سوچتی ہُوں کہ ہر مرد کے اندر کچھ حماقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ہر نوجوان کسی بھی لڑکی کو دیکھ کر یہی تصورات قائم کر لیتا ہے۔ وہ کبھی نہیں سوچتا کہ لڑکی خود بھی اُس کی جانب مائل ہے یا نہیں۔ جہاں تک معاملہ فِلمی زندگی کا ہے، تو وسیم صاحب آپ نے اگر اپنے آپ کو واقعی ایک عملی انسان سمجھا ہے تو آپ خود غور فرمائیے کہ فِلمی زندگی میں جو کہانیاں بنائی جاتی ہیں اُن میں کیا حقیقت ہوتی ہے۔ کیا ہم اسی طرح سڑکوں پر ایک دوسرے سے مل کر محبت کرنے لگتے ہیں۔ کیا محبت اِتنی ہی عام اور معمُولی شئے ہے۔ کیا زندگی کے فیصلے اسی طرح گلیوں، سڑکوں اور بازاروں میں ہو جاتے ہیں۔ کیا ہم میں سے کوئی فلمی ہیرو اور ہیروئن کی مانند صحراؤں جنگلوں اور برفانی میدانوں میں حلق پھاڑ پھاڑ کر گانے گاتا پھرتا ہے۔ ہیروئن کو ہر سیچویشن کا گانا یاد ہوتا ہے اور ہیرو اُس کا ساتھ دیتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے وسیم صاحب، عملی زندگی اِس سے کتنی مختلف ہے۔ آپ نہ جانے کیوں اپنے آپ کو اس ماحول میں ضم کرتے ہیں۔ جب کہ آپ ایک بہترین کاروباری ہیں۔ میں اگر آپ سے صاف الفاظ میں یہ کہوں تو یہ آپ کے ساتھ دشمنی نہیں دوستی ہوگی کہ میں ذہنی طور پر آپ کی جانب مائل نہیں ہُوں۔"

• آپ نے فلمی زندگی کی بات کی ہے اور مجھے وِلن کہا ہے۔ تو بس اِتنا سا جواب اور دے دیجئے کہ اگر میں وِلن ہوں تو کیا ہیرو کوئی اور ہے۔"

• میں یہ جواب آپ کو کیوں دُوں وسیم صاحب کس رشتے سے آپ کو یہ جواب دُوں، آپ فرمائیے آپ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے اور آپ کے روابط کیا ہیں؟

• بہت تلخ باتیں کہی ہیں آپ نے رُدا صاحبہ۔ لیکن کیا کروں اِس تلخی میں بھی کچھ مزا ہی آجاتا ہے۔ میں کوشش جاری رکھوں گا۔ دیکھئے یہ تو انسان کا فرض ہے اور یہ ہی سچائی بھی ہے کہ ہر مسئلے میں محنت سے صلہ مِلتا ہے۔ میں محنت کرتا رہُوں گا۔ بردِل نہیں ہُوا ہُوں آپ کی طرف سے، آپ اِتنی اچھی ہیں رُدا کہ میں آپ کو اِتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے دوہرے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ میرے کاروبار کو چار چاند لگا سکتی ہیں۔ دوسری بات یہ رُدا کہ آپ اِس دُنیا میں سب سے زیادہ خوبصوُرت لڑکی ہیں۔ اِتنی حسین، اِتنی دِلکش کہ انسان آپ کے لئے اپنا سب کچھ کھو دے۔"

• آپ بے باکی سے یہ الفاظ صرف اِس لئے کہہ دیتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں کہ میری فرم آپ سے فائدہ حاصل کر رہی ہے۔ اور میں اِس فرم کی جنرل مینجر ہُوں۔ میں صرف یہ سوچتی ہُوں کہ کہیں میری وجہ سے اِس فرم کا کوئی نقصان نہ ہو جائے۔ اِس سے زیادہ میرے ذہن میں اور کوئی تصور نہیں ہے۔ آپ کو اور کون سے الفاظ میں یہ سمجھاؤں وسیم صاحب، آپ اِنہی الفاظ سے سب کچھ سمجھ لیں تو ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔"

وسیم سنجیدہ نِگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا، پھر ہنس پڑا، پھر اُس نے کہا۔

• خیر میں اِتنی آسانی سے شکست ماننے والوں میں سے نہیں ہُوں۔"

• گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں چاہُوں یا نہ چاہُوں آپ مجھ پر تسلّط حاصل کر لیں گے۔"

• نہیں مِس رُدا، ہرگز نہیں آپ پر کسی سختی کا تصور تو کوئی کافر ہی کر سکتا ہے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ وہ جو آپ نے سُنا ہے کہ اگر پتھر پر بھی بُوند پڑتی رہے تو اُس میں ایک گڑھا پڑ جاتا ہے۔ میں اپنی محبتیں آپ کے لئے وقف کر دُوں گا آپ کے دِل میں گداز پیدا کرنے کی کوشش کروں گا اپنے لئے۔"

• آپ کے لئے صرف ایک جواب ہے وسیم صاحب صرف ایک جواب۔ وہ یہ کہ پتھر بہت نرم ہوتا ہے۔ میں رُدا ہُوں۔" رُدا کا لہجہ درحقیقت پتھر سے زیادہ سنگین تھا۔ وہ اپنے باطن کی زبان بول رہی تھی۔ وسیم مُسکراتا ہُوا اُٹھ گیا۔

• یہ بکس۔" رُدا نے حقارت سے آویزوں کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا اور وسیم ڈبہ جیب میں رکھ کر مُسکراتا ہُوا باہر نکل گیا۔

وسیم واقعی بڑا کائیاں تھا، رُدا کی کھری کھری باتوں نے اُس پر جنُون طاری کر دیا تھا۔ رُدا کے سامنے سے تو مُسکراتا ہُوا آگیا تھا لیکن رات کی تنہائی میں اُس نے بہت کچھ سوچا تھا۔ رُدا ایک حسین شہزادی ہے۔ وہ بے حد ذہین ہے اگر وہ زندگی میں شامل ہو جائے تو... تو... اُسے میری زندگی میں شامل ہونا چاہیئے۔ اُس کے بغیر میری زندگی اُدھوری ہے وہ خود کچھ بھی تو نہیں ہے ایک فرم کی منیجر ہی تو ہے۔ آخر وہ میری پیش کش کیوں ٹھکرا رہی ہے۔ اُس کے سامنے کچھ اور ہے کیا۔ اگر کچھ اور ہے تو کیا ہے۔ اِس کا سُراغ لگانا پڑے گا، رُدا کی نجی زندگی کیا ہے؛ وہ کون ہے؛ کہاں رہتی ہے؛ کچھ معلوم تو ہو۔

وسیم نے سوچنے کا انداز تبدیل کر دیا تھا۔ رُدا نے تو صاف صاف لہجے میں اُسے بتا دیا تھا کہ اُس کا وسیم سے صرف کاروباری تعلق ہے اور وہ اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے اُس کی پذیرائی کرتی

ہے۔ وسیم اِن الفاظ سے مایوس نہیں ہوا تھا بلکہ اُس نے اپنی کارکردگی کا انداز بدلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ احسان احمد ایک کاروباری آدمی تھے اور وسیم خود بھی کاروباری ذہن رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رِداء تک پہنچنے کا زینہ احسان احمد صاحب بن سکتے ہیں۔

اب اِس سلسلے میں اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ احسان احمد کو پُوری طرح شیشے میں اُتار لیا جائے۔ وہی رِداء کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرسکتے ہیں لیکن اِس کے لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے کاروباری نقصانات اُٹھانے پڑیں گے۔

وسیم نے آج کا تمام دِن اِنہی اُمور پر صرف کیا تھا رِداء اُس کے ذہن پر بُری طرح سوار تھی اور وہ نقصانات اُٹھانے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ یُوں بھی اِس کے عظیم الشان کاروبار کے سامنے یہ نقصانات اہمیّت نہیں رکھتے تھے لیکن اگر یہ کچھ کام احسان احمد کے سپُرد کردیئے جائیں تو احسان احمد یقینی طور پر اُس کے سامنے گردن جُھکا دیں گے۔

غرضیکہ اُس نے اپنے طور پر منصُوبہ بندی کرلی اور اُس کے بعد ایک مناسب وقت پر وہ احسان احمد سے مِلا۔ اُن دِنوں ویسے بھی احسان احمد کے اور اُس کے درمیان کاروباری معاملات چل رہے تھے اور احسان احمد اس سودے کی تکمیل کے قریب تھے جس کا مُعاہدہ وسیم سے ہُوا تھا۔

احسان احمد صاحب نے بڑے احترام سے خوش آمدید کہا۔ اور وسیم مُسکراتا ہُوا اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔

" کہیئے احسان احمد صاحب کیسا چل رہا ہے آپ کا کاروبار؟"

" بس میاں، خُدا کا فضل ہے کام جاری ہے "

" ہمارا یہ مرحلہ تو تقریباً تکمیل کے قریب ہے "

" ہاں۔ خُدا کے فضل سے خوش اسلُوبی سے کام ہوگیا "

" میں چاہتا ہُوں احسان احمد صاحب کہ ہم مزید چند چھوٹے چھوٹے معاہدے کریں اور اِس سلسلے میں کچھ تفصیلات لے کر حاضر ہُوا ہُوں، بغیر ٹیلی فون کئے آگیا بس یُوں سمجھ لیں یہ سوچا تھا کہ اگر آپ کو فُرصت ہُوئی تو بات چیت ہو جائے گی۔ ناں ہُوئی تو آپ سے وقت لے لُوں گا "

" ہاں۔ ہاں کیوں نہیں مجھے فُرصت ہے کہو کیا مسئلہ ہے "

" ذرا یہ ملاحظہ فرما لیجیئے۔ میں نے یہ تمام چھوٹے چھوٹے نوٹس تیار کئے ہیں۔ یہ چند معاملات ہیں جن میں مَیں آپ کی مدد چاہتا ہُوں اور اُسی انداز میں جس انداز میں ہمارے درمیان یہ کام ہُوا ہے "

احسان احمد صاحب نے پُوری دلچسپی لی تھی اور وسیم کے تیار کئے ہُوئے نوٹس دیکھے تھے وہ دِل ہی دِل میں بہت خوش ہُوئے تھے کہ ایک اچھا بزنس ہاتھ آیا تھا یہ تمام نوٹس بغور پڑھنے کے بعد اُنھوں نے کہا۔

" سارے کام وہ ہیں جو میں اور تم مِل کر باآسانی کرسکتے ہیں وسیم جمال صاحب "

" ہاں کیوں نہیں اِس کے لئے میں نے آپ ہی کا انتخاب کیا ہے میں چاہتا ہُوں کہ اِن تمام مرحلوں کے بارے میں ہماری گفتگو ہو جائے کیا آپ کو حاصل ہو گا اور کیا مجھے، میرا خیال ہے یہ کافی منافع بخش سودے ہیں اور میں سمجھتا ہُوں احسان احمد صاحب کہ ابھی تو یہ ابتداء ہے ہماری۔ اگر ہمارا مکمل کاروباری تعاون ہو گیا تو پھر میں بہت سے ایسے بڑے بڑے معاملات کی جانب قدم بڑھاؤں گا جو میں نے ملتوی کئے ہُوئے ہیں "

" احسان احمد لمیٹڈ تمھارے ساتھ بھر پُور تعاون کرے گا مسٹر وسیم جمال، اطمینان رکھو ہمارے اور تمھارے معاملات بہتر سے بہتر ہوتے جائیں گے جو ذمّہ داریاں تم ہمارے سپُرد کروگے۔ اُن میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی "

" ویسے ایک بات میں آپ سے ضرور عرض کروں گا احسان احمد صاحب۔ آپ کی مینجر کمال کی شخصیت ہے میں نے اِس نوعُمری میں کسی کو کاروباری طور پر اتنا ذہین نہیں دیکھا "

" رِداء "، احسان احمد صاحب مُسکرائے پھر بولے " ہاں! رِداء بلاشُبہ لڑکی ہونے کے باوجود ایک بہترین ذہن کی مالک ہے، بس یُوں سمجھ لو وسیم اُسے یہ ہونا ہی چاہیئے تھا "

" میں سمجھا نہیں " وسیم جمال نے کہا۔

" میں سمجھا بھی نہیں سکتا۔ یُوں سمجھ لو کہ یہ سب کچھ اُس نے اپنی خُداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر حاصل کیا ہے "

" مِس رِداء کا پس منظر کیا ہے اُنھوں نے کہاں سے تعلیم حاصل کی ہے کتنے عرصے سے آپ کے ساتھ ہیں۔ کہاں رہتی ہیں۔ کچھ معلوم نہیں ہوسکا احسان احمد صاحب "

" بس یُوں سمجھ لو میری ہی بچّی ہے۔ میرے ساتھ رہتی ہے۔ اور میں ہی اُسے گھسیٹ کر اِس فرم تک لایا ہُوں "

" اوہو۔ کیا وہ آپ کی بیٹی ہیں؟ "

" بیٹی جیسی سمجھ لو میری بیٹی کی دوست ہے وہ "

" اُن کا خاندان "

" لاہور کی رہنے والی ہے، کافی عرصے سے یہاں ہے، بس خاندان میں ہم ہی لوگ ہیں "

" اوہ " وسیم کے ہونٹ سُکڑ گئے۔ وہ زیادہ کھوج کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ رفتہ رفتہ ہی سارے کام ہونے چاہیئے تھے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ رِداء ایک طرح سے لاوارث ہے اور احسان احمد صاحب ہی اُس کا سہارا ہیں، وسیم کو خوشی ہُوئی تھی۔ عجب احمق لڑکی ہے اُسے تو زندگی میں بہت سے سہاروں کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ پر نہ جانے اِتنی نازاں کیوں ہے اب صرف ایک ہی مسئلہ اور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ ہوسکتا ہے اُس کا ذہنی رُجحان کسی اور طرف ہو کوئی اور اُس کی زندگی میں شامل ہو ورنہ باقی تو اور کچھ نہیں رہ جاتا تھا یہ معلوم کرنا بے حد ضروری ہے اور اُس کے بعد ہی رِداء کے سلسلے میں کوئی مؤثر قدم اُٹھایا جاسکتا ہے۔

چند روز اور گُزر گئے۔ وسیم نے اِس دوران میں رِداء سے جان بُوجھ کر ملاقات نہیں کی تھی البتہ احسان احمد صاحب سے وہ دو بار مِل چُکا تھا اور اُس نے اُنھیں اپنے منصُوبے پیش کردیئے تھے جن پر فوری طور پر کام شروع ہونے والا تھا۔ اِس دوران میں وہ پہلا معاملہ نمٹ چُکا تھا اور منافع کی رقم جناب احسان احمد کے ہاتھ آگئی تھی جس سے وہ بہت خوش تھے بہت بڑی رقم تھی جو اُنھوں نے بہت مُختصر وقت میں کمائی تھی۔

نُقصان وسیم جمال کا بھی نہیں ہُوا تھا۔ ہاں اگر نُقصان تھا تو بس اِتنا کہ اگر وہ یہ کام اپنے طور پر کراتا تو پانچ دس لاکھ روپے میں سَودا بن جاتا لیکن اُس نے جان بُوجھ کر یہ رقم قُربان کی تھی اور اُس سے اُس پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ سوائے اِس کے کہ اُس کے منافع میں تھوڑی سی کمی ہوگئی تھی۔ لیکن اِس طرح اُس نے احسان احمد صاحب کو اپنے جال میں جکڑ لیا تھا اور جو نئے منصُوبے اُنھیں پیش کئے تھے احسان احمد صاحب اُن پر پُوری پُوری توجہ دے رہے تھے۔ رِداء سے بھی اِس مسئلے پر گفتگو ہو چُکی تھی اور رِداء خلُوصِ دِل سے اُن کی جانب متوجہ ہوگئی تھی احسان احمد صاحب نے کہا۔

" میں وسیم جمال کو ناتجربہ کار نہیں کہتا لیکن اُس نے ہم سے تعاون کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ بلاشُبہ قابلِ قدر ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ہم سے گٹھ جوڑ کرکے مزید بڑی کارروائیاں کرنا چاہتا ہو۔ دونوں فرموں کی ساکھ ہے اور اگر وسیم اِسی انداز میں کام کرتا رہا تو میں اُسے احسان احمد لمیٹڈ کے نام پر بھی کام کرنے کی اجازت دے سکتا ہُوں "

" کیوں نہیں انکل۔ ظاہر ہے ہمیں کام چاہیئے۔ اور بہتر منافع بھی "

" تمھاری بے حد تعریف کرتا ہے۔ حیران ہے کہ تم نے اِس نوعُمری میں یہ اہم ترین ذہانت کہاں سے حاصل کرلی " رِداء مُسکرا کر خاموش ہوگئی لیکن اُس کے دِل میں ایک ہلکی سی کسک مسلسل موجود تھی۔ وسیم یقینی طور پر اُس سے دستبردار نہیں ہُوا ہے اُس کی مسلسل دلچسپیاں اِس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ رِداء کی قُربت چاہتا ہے۔ کاروباری معاملات میں رِداء اُس سے ہر تعاون کرنے کو تیار تھی لیکن باقی سب کچھ سوچتے ہُوئے بھی دُکھ ہوتا تھا۔ ذہن میں رہ رہ کر تصوّر اُبھر آتا تھا اور وہ دِل مسوس کر رہ جاتی تھی انا آڑے آتی تھی ورنہ تصوّر سے پھر بھی ملاقات کرتی۔ اب تو پتہ نہیں کہ وہ مُلک میں ہے یا مُلک سے باہر، ویسے سخت آدمی ہے تمام مروّتیں فراموش کردیں اُس نے دادی امّاں۔ ذکیہ بیگم اور دوسرے لوگ اکثر خیردین کو یاد کرتے رہتے تھے۔ لیکن اب اُس نے دادی امّاں کی طرف رُخ بھی نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے اُسے مجبُور کون کرسکتا تھا اُس ملاقات کے بعد رِداء کے حوصلے پست ہوگئے تھے اُس نے اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور رِداء سے بہت پُراخلاق انداز میں گفتگو کی تھی لیکن جو چھچھلاپن اُس کی باتوں میں پایا جاتا تھا اُس کے بعد رِداء کا یہ حوصلہ نا ہُوا کہ وہ اُس سے فوراً ہی دوسری ملاقات کے بارے میں سوچتی۔

پھر یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وہ دوسرے ہی دِن مُلک سے باہر جا رہا ہے، البتہ طفیلی خالہ کو دس ہزار روپے بھی مل گئے تھے۔ اور رشید کا ٹیلی فون بھی موصُول ہُوا تھا گویا اُس نے طفیلی خالہ کے سلسلے میں رِداء کی سفارش قبُول کرلی تھی اور دس ہزار روپے کا نُقصان بھی اُٹھایا تھا۔ ظاہر ہے یہ رقم رشید نے تو نہ بھیجی ہوگی۔ یہ احسان اُس نے کیوں کیا۔ رِداء تصوّرات کا سہارا لینے لگی۔ اور اُس نے خود ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا کیا حماقت ہے یعنی اب بھی اِس بات کی گنجائش ہے کہ میں اُس کے سلسلے میں کوئی ایسی بات سوچ سکوں۔ اپنا ایک ایک لفظ یاد آتا تھا اُسے اُس نے تصوّر کی جو بے عزّتی کی تھی اُس کے بعد واقعی کوئی غیرت مند انسان اُس کی جانب نِگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا یہاں تک کہ اُس نے تصوّر سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کوئی اور اُس کے دِل میں ہے۔ واقعی میں نے جذبات میں آکر بڑے سخت اقدامات کئے

تصنور بھی تو اسی مقصد کے تحت لاہور پہنچا تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر لے آئے۔ یہ کام میں نے تصنور کے کہنے سے نہ کیا اور دوسروں کے کہنے پر یہاں آگئی۔ تصنور جتنا بھی ناراض ہو کم ہے۔ لیکن اب معاملہ صرف ناراضگی کا نہیں، ہو سکتا ہے اُس کے دِل میں میرے لئے نفرت بیدار ہو گئی ہو۔ آہ۔ کاش میں اُس کے دل سے یہ نفرت نکال سکوں۔

اپنے نئے پروگرام کے تحت وہ کوٹھی کے لوگوں سے ملی ہُوئی تھی۔ اور اُن کے معمولات میں پوری طرح دلچسپی لیتی تھی اُن دِنوں معاملہ کچھ اور دلچسپ ہو گیا تھا۔ یعنی ایک شام احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں اجتماع ہوتا تو دوسری شام عادل حسین صاحب کے ہاں گزرتی رِداء باقی معمولات سے بھی بے خبر نہیں تھی لیکن دفتری مُعاملات بالکل ہی الگ نوعیت کے حامل تھے اور اِس سلسلے میں وہ کوٹھی میں کسی کو اپنا شاملِ راز نہیں کر سکتی تھی۔

احسان احمد صاحب نے دفتر میں ایک دعوت نامہ اُس کے حوالے کیا اور مُسکراتے ہُوئے بولے۔

"ذرا اِس لفافے پر درج شُدہ نام دیکھو۔ رِداء کو اس پر اپنا نام لکھا ہُوا نظر آیا تھا۔"

"کیا ہے یہ انکل؟"

"چیمبر آف کامرس کی سالانہ کانفرنس کا دعوت نامہ رِداء! میں تمھیں مُبارک باد پیش کرتا ہُوں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں چیمبر آف کامرس سے براہِ راست دعوت نامہ جاری کیا جائے اور وہ کسی فرم کے مالک نہ ہوں۔ یہ تمھاری ذاتی مقبُولیت ہے کہ تمھیں اِس میٹنگ کے شرکاء میں ساتھ رکھا گیا۔ ویسے بہت سی فرموں کے مینجر وغیرہ شامل ہوتے ہیں لیکن فرموں کے مالکوں کی معرفت، یہ براہِ راست دعوت نامہ پہلی بار کسی فرم کے جنرل مینجر کے لئے اِشو ہُوا ہے۔"

رِداء نے سنگین نِگاہوں سے دعوت نامے کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"انکل! اِس میٹنگ میں مجھے شرکت کرنا پڑے گی؟"

"ضروری ہے۔ انتہائی ضروری۔ تم نہیں سمجھتی ہو کہ اِس سے تمھارے کیریئر میں ایک نیا اضافہ ہو گا۔"

"انکل!" رِداء پتھریلے لہجے میں بولی اور احسان احمد چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

"میں سمجھ رہا ہُوں تمھارے ذہن میں کیا ہے۔ کہو کیا کہہ رہی ہو؟"

"اگر آپ سمجھ رہے ہیں انکل تو پھر مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟" رِداء اُسی انداز میں بولی۔

"اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو تم یقیناً آفندی صاحب کے بارے میں سوچ رہی ہو گی یہ خیال ہو گا تمھارے دِل میں کہ اِس میٹنگ میں آفندی صاحب بھی موجود ہوں گے۔"

"جی! یہ خیال ہے میرے ذہن میں۔"

"آفندی صاحب بے چارے ملک سے باہر گئے ہُوئے ہیں اور اِن دِنوں کچھ زیادہ بیمار ہیں۔ میرے خیال میں یہ اطلاع تمھارے لئے کافی ہے۔ رِداء خاموش رہی۔ اُس کے بعد اِس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہُوئی تھی۔

میٹنگ کا وقت دوسرے دِن گیارہ بجے مقرّر تھا۔ رِداء، احسان احمد کے ساتھ چل پڑی اور احسان احمد صاحب چیمبر آف کامرس کی بلڈنگ میں داخل ہو گئے۔ بلاشُبہ شہر کے تمام بڑے بڑے لوگ یہاں موجود تھے۔ رِداء نے پہلی مرتبہ ایسی کسی میٹنگ میں شرکت کی تھی اور احسان احمد صاحب نے اِس بات کا خیال رکھا تھا کہ اُسے اِس میٹنگ میں کوئی عملی کام نہ کرنا پڑے بس وہ خاموشی سے اِس میٹنگ کی کارروائی دیکھتی رہے تاہم چند شناسا لوگوں نے احسان احمد صاحب کی وساطت سے رِداء سے ملاقات بھی کی تھی اور اُس کے کچھ اقدامات کو کچھ سراہا بھی تھا۔

وسیم جمال بھی موجود تھا اور یہاں بالکل سنجیدہ رہا تھا۔ تمام کارروائی جاری رہی اور تھوڑی دیر کے بعد رِداء بڑے پُرسکون انداز میں اِس کارروائی کا جائزہ لیتی رہی نہ جانے اُس کے دِل میں کیا کیا تصورات اُبھر رہے تھے۔ تیمور بھی ذہن میں تھا اُس کے دِل میں یہ خواہش بھی تھی کہ آنے والے کچھ لمحات شاید ایسے بھی ہوں جب وہ ایسی کسی میٹنگ میں کسی فرم کے جنرل مینجر کی حیثیت سے نہیں بلکہ مالک کی حیثیت سے شرکت کر رہی ہو اور وہ یہ سب کچھ اپنے لئے نہیں تیمور کے لئے سوچتی تھی میٹنگ کی یہ کارروائی ایک بجے ختم ہُوئی اور اُس کے بعد لنچ کا وقفہ ہو گیا۔ احسان احمد صاحب نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"بھئی رِداء اِس کے بعد کے اہم معاملات تم اپنے طور پر نوٹ کر لینا مجھے ڈیڑھ بجے ایک صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔ اور اب میری شرکت کی ضرورت بھی نہیں رہی ہے۔ غالباً یہ کارروائی لنچ کے بعد ایک یا ڈیڑھ گھنٹے تک اور جاری رہے گی گاڑی چھوڑے جا رہا ہُوں تمھارے لئے واپس آ جانا زیادہ وقت لگ جائے تو پھر گھر ہی پہنچ جانا۔"

"جی انکل" رِداء نے پُرسکون انداز میں جواب دیا اور اُس کے بعد وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس حال میں داخل ہو

گئی جہاں لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

وسیم جمال نے اِس دوران ایک بار بھی اُس کے نزدیک آنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ لنچ کے وقت وہ نظر بھی نہیں آیا تھا غالباً کہیں باہر چلا گیا تھا لیکن تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد آکر لنچ میں شریک ہو گیا تھا دو بجے یہ کارروائی دوبارہ شروع ہُوئی اور اُس کے بعد زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی، پونے تین بجے میٹنگ ختم ہو گئی اور رِداء دوسرے تمام ارکان کے ساتھ باہر نکل آئی احسان احمد کار کی چابی اُسے دے گئے تھے اُس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی اور اُس کے بعد کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ خیال تھا کہ ابھی دفتر ہی واپس چلی جائے گی۔ ابھی گھر جانے کا وقت نہیں ہُوا تھا۔

لیکن کئی سیلف مارنے کے باوجود کار اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ تو اُسے کسی قدر اُلجھن ہونے لگی وہ پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی تقریباً تمام ہی کاریں جا چکی تھیں اِکّا دُکّا گاڑیاں رہ گئی تھیں اور اُن میں اُس نے وسیم جمال کی کار بھی دیکھ لی تھی۔ اُسی وقت وسیم جمال باہر آیا اور اپنی کار کی جانب بڑھنے لگا۔ رِداء اسٹیئرنگ پر ہی بیٹھی ہُوئی تھی وسیم اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو رِداء احسان احمد صاحب کا انتظار کر رہی ہو؟"

"او نہیں وسیم صاحب! گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔"

"خیریت۔ ذرا بونٹ کھولئے" وسیم نے کہا اور رِداء نے بونٹ کھول دیا۔ وسیم انجن کے وائر وغیرہ دیکھنے لگا۔ اُس نے ایک دو بار رِداء سے سیلف لگانے کے لئے بھی کہا لیکن کار اسٹارٹ نہ ہُوئی وہ شانے ہلا کر بولا۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ آئیے میں اپنی گاڑی میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ راستے میں کسی میکینک سے کہتے چلے جائیں گے۔ یا دفتر جا کر کسی کو فون کر دیجئے گا۔"

"دفتر جا کر تو میں کسی کو بھی بھیج سکتی ہُوں۔ اتفاق سے میں اور احسان احمد صاحب ساتھ ہی آ گئے تھے۔ ڈرائیور کو لانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ آئیے، پلیز" وسیم نے خوش اخلاقی سے کہا اور رِداء اُس کی کار میں جا بیٹھی۔ وسیم کی ایئر کنڈیشن کار بے آواز آگے بڑھ گئی اُس نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"کیسی چیمبر آف کامرس کی یہ پہلی میٹنگ آپ کو کیسی لگی؟"

"میٹنگ، میٹنگ تھی اچھی یا بُری کا کیا سوال ہے؟" رِداء نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے یہ تجربہ آپ کی زندگی میں یقیناً پہلا ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"بھئی طویل عرصے سے کاروباری دُنیا میں ہُوں اناڑی تو نہیں ہُوں۔ نہ ہی اجنبی ہُوں۔"

"ہاں۔ یہ بات تو سچ ہے۔ تجربے میں کچھ اضافہ ہُوا ہے میرا خیال ہے کہ مجھے اِس میں کوئی اُلجھن نہیں ہُوئی ہے۔" رِداء نے کہا۔

"آپ جیسی ذہین خاتون کو اُلجھن ہونی بھی نہیں چاہیئے تھی۔"

"ارے یہ گاڑی کس طرف موڑ دی آپ نے؟"

"اطمینان رکھیے۔ سند یافتہ شریف آدمی ہُوں۔ کوئی ایسی بات بالکل نہ ہو گی جو آپ کے دِل کو گراں گزرے۔"

"وسیم صاحب! بداخلاقی نہیں ہے یہ۔ آپ میری اجازت کے بغیر کہیں اور جا رہے ہیں؟"

"ہے سو فیصدی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ

لازم ہے دِل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے"

"میں احتجاج کرتی ہُوں آپ کی اِس غیر اخلاقی حرکت پر وسیم صاحب۔"

"اور میں احتجاج کرتا ہُوں انتہائی شریفانہ ڈانٹ پر۔ آپ کو تو اِس سلسلے میں انتہائی سخت الفاظ استعمال کرنا چاہیئے تھے۔ ڈانٹ میں بھی مزا نہ آئے تو وہ کس کام کی" وسیم نے ڈھٹائی سے کہا اور رِداء کافی پریشان ہو گئی۔

"آخر آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"ساحل پر۔ میری پسندیدہ جگہ ساحل ہے۔ رِداء صاحبہ آپ یقین کیجئے سمندر کو دیکھ کر ہر بار ایک نیا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے، آپ سمندر میں کھو جائیے تو۔ میرا خیال ہے ایک عُمر گزر جائے اِس کے بارے میں سوچتے سوچتے۔ یہ کیا ہے۔ کیوں ہے اور اور اور۔"

"میرے خیال میں آپ حماقت کر رہے ہیں وسیم صاحب براہِ کرم مجھے دفتر چھوڑ دیجئے کچھ کام ہے مجھے۔"

"رِدا صاحبہ! جتنی کہیں گی معافیاں مانگ لُوں گا اِس وقت اپنے آپ سے بھی باغی ہو گیا ہُوں۔ کسی اور کو کیا خاطر میں لاؤں گا۔" وسیم نے کہا اور رِداء خاموش ہو گئی۔ اُسے حالات کا احساس ہو رہا تھا لیکن اب پوری ہمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا تھا۔ وسیم ایک مرد تھا اور اِس وقت ایک تیز رفتار کار ساحل کی جانب سفر کر رہی تھی۔ کوئی احمقانہ کوشش کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد کار ساحل سمندر تک جا پہنچی اور وسیم نے اپنی جگہ سے اُتر کر اُس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

" بس اِتنا ہو گا ہم لوگ تھوڑی دیر لہروں کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کریں گے اُس کے بعد میں آپ کو سامنے والے ریستوران میں چائے پلاؤں گا اور پھر آپ جہاں حکم دیں گی میں آپ کو وہاں چھوڑ دُوں گا۔ ایک اِتنی سی آرزو پُوری کرنے کے لئے اگر آپ اپنا دِل فراخ نہ کر سکیں تو مجھے بڑی مایوسی ہو گی۔"

رُداء نے ایک نِگاہ وسیم کو دیکھا اور اُس کے بعد نیچے اُتر آئی وسیم نے شکریہ ادا کیا تھا۔

ساحل پر کافی لوگ نظر آ رہے تھے یہ جگہ ذرا کچھ سُنسان سی تھی وسیم آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا پھر ایک جگہ جہاں ساحل کی خُشک ریت ختم ہوتی تھی اُس نے جُوتے اُتار دیئے۔

" لہروں کی بے حُرمتی مناسب نہیں ہوتی رُدا صاحبہ! جُوتے اُتار دیجئے۔"

" عجیب ہیں آپ۔"

" بخدا اِن الفاظ کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی اِس تعاون کی۔"

" وسیم صاحب! آپ ایک تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ آئیے آپ کی خواہش کے مطابق لہروں کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے ہیں آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ ہو سکتا ہے۔ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے۔"

" ہاں۔ ہاں۔ یقیناً شاید میں سمجھ جاؤں۔" وسیم نے کہا اور رُداء خاموشی سے اُس کے ساتھ ساحل کی جانب بڑھ گئی۔ سمندر پر شور بھا اور بہت دُور لہروں کے سفید سفید جھاگ نظر آ رہے تھے، کناروں پر آنے والی لہریں ہلکی ہو جاتی تھیں اور بات صرف پاؤں بھگونے تک ہی محدود رہی تھی۔ رُداء چہل قدمی کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی چند لمحات کے بعد اُس نے کہا۔

" یہ جو کچھ آپ نے کیا ہے اخلاقی طور پر مناسب نہیں ہے۔ آپ دیکھئے میں اگر کار میں کوئی شدید احتجاج کرتی یا اگر یہاں سے واپسی پر یہ بات احسان احمد صاحب کو بتا دوں تو آپ کی اچھی خاصی بے عزّتی ہو جائے گی۔ اور اُس کے بعد آپ کی پوزیشن بہتر نہ رہے گی۔"

" میں آپ سے التجا کروں گا کہ ایسا نہ کریں ایک چھوٹی سی خواہش تھی آپ کے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کرنے کی، جو میں نے آپ کی اجازت کے بغیر پوری کر لی ہے۔ رُدا! آپ نے ابھی مجھ سے کہا تھا کہ مجھے سمجھائیں گی، مجھے سمجھا دیجئے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ نہ جانے کیوں آپ دل کی گہرائیوں میں اِتنی نیچے تک اُتر گئی ہیں کہ اب آپ کو گھسیٹ کر اُوپر لانے کی تمام کوششیں ناکام ہوتی جا رہی ہیں۔ رُداء! میرے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہے اپنے کاروبار کو اِتنی وُسعت دُوں کہ وہ ساری دُنیا میں پھیل جائے۔ میں اِس کے لئے کام کر رہا ہوں اور آپ یقین کیجئے اِس سے پہلے میں نے اِس بارے میں کبھی نہیں سوچا کہ شادی کر لوں۔ شادی کا تصوّر میرے ذہن میں ضرور تھا انسان ہی ہُوں۔ لیکن اُس کے لئے کوئی نظریہ قائم نہیں کیا تھا میں نے۔ بتا چُکا ہُوں آپ کو کہ ایک طرح سے لاوارث ہُوں جو فیصلے بھی کرنا ہوتے ہیں۔ خود ہی کرتا ہُوں شادی کے بارے میں شاید کبھی موقعہ ملتا تو فیصلہ کر لیتا۔ لیکن آپ سے ملاقات کے بعد یہ تصوّر بہت شدّت سے ذہن کے پردوں پر اُبھر آیا ہے اور اِس کی بنیادی وجہ بھی میں آپ کو بتا دُوں آپ اِتنی اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہیں کہ میں نے آپ کو جب بھی دیکھا اپنی ہی تحویل میں دیکھا معاف کیجئے گا۔ شاید میں نے غلط جُملہ استعمال کیا ہے میرا مطلب ہے کہ میں نے آپ کو اپنے شانہ بشانہ دیکھا آپ ایسی خاتون ہیں جو ایک اچھی بیوی بھی ثابت ہو سکتی ہیں اور ایک انتہائی ذہین کاروباری ساتھی بھی، رُداء! تمہیں محبت کرتا ہُوں آپ سے اِس میں کوئی شک نہیں کہ میں چاہنے لگا ہُوں آپ کو۔ آپ کی اِن اعلیٰ صلاحیتوں کی بناء پر اور یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کروں گا کہ آپ لاکھوں میں ایک ہیں۔ آپ کا حُسن ایک ملکوتی حیثیت رکھتا ہے اور اِس دُنیا میں ایسے چہرے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ اِن کا تعلق اِس زمین سے ہے ایک محبت کرنے والے کی حیثیت سے مجھے آپ کی ذات میں بے پناہ کشش محسوس ہوتی ہے اور آپ کے حُسن میں بے پناہ دِلکشی نظر آتی ہے۔ اور ایک کاروباری ہونے کی حیثیت سے میں آپ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ کر میں اپنے کاروبار کو اُنہیں منزلوں پر دیکھتا ہُوں جہاں میں اُسے پہنچانے کا خواہش مند ہُوں۔ اگر آپ کسی اور کو چاہتی ہیں تو یہ بات بھی مجھے کُھل کر بتا دیں کیونکہ جو پیش کش میں نے آپ کو کی ہے میرے خیال میں کسی بھی ذی ہوش کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ اب اگر اِس پیش کش کو قبول کرنے سے کوئی شے روک سکتی ہے تو وہ کوئی ایسا ہی معصوم جذبہ ہو سکتا ہے جو بچپن میں یا کسی بھی عُمر میں دِل کی گہرائیوں میں پیدا ہو گیا ہو، اگر ایسی کوئی بات ہے تب بھی میں آپ کو یہ پیش کش کروں گا کہ زندگی کے اِن تلخ حقائق کو گہری نِگاہوں سے دیکھیئے جو زندگی کا ایک جُزوِ لازم ہیں۔ اعلیٰ پائے کی زندگی انسان کی سب سے بڑی

خواہش ہوتی ہے ہم لوگ جیتے ہیں مرنے کے لئے اور مرنے سے پہلے ہمارے ذہن میں ایک تصوّر ہوتا ہے یعنی جنّت کا تصوّر۔ اگر یہ زمین بھی ہمارے لئے جنّت نظیر ہو تو اِس میں حرج کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم بُرائیوں کی اُس انتہا تک جا پہنچیں جہاں اپنا ضمیر داغدار ہونے لگے لیکن دو اچھے ساتھیوں کی حیثیت سے۔ میاں بیوی کی حیثیت سے ہم اپنی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں میں اُس سے پہلے آپ کے قدموں کی خاک بھی چُھونے کی کوشش نہیں کروں گا اور نہ ہی آج کے بعد آپ کی مرضی کے خلاف کوئی ایسا قدم اُٹھاؤں گا اِس کا وعدہ کرتا ہُوں ایک مرد کی حیثیت سے۔ لیکن اِس بات کی درخواست بھی کرتا ہُوں کہ آپ مجھے اپنے دل کا وہ بھید ضرور بتا دیں جو آپ کے دل میں ہے اور آپ کو مجھ تک آنے سے روکے ہُوئے ہے۔ رُداء نے ایک اچٹتی سی نِگاہ وسیم پر ڈالی نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لئے ذہن پر ایک دُھند سی چھائی تھی اور اُس کے بعد یہ دُھند صاف ہو گئی تھی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

" آپ کی یہ پیش کش بہت مُخلصانہ ہے اور میں سمجھتی ہُوں شرافت سے بھرپُور ہے وسیم صاحب۔ لیکن یہ سوال کہ کیا میرے دِل کی گہرائیوں میں کوئی اور ہے ذرا غیر مناسب ہے معاف کیجئے گا، پہلے بھی آپ سے عرض کر چکی ہُوں کہ کاروباری مسئلے میں مَیں آپ کے شانہ بشانہ ہُوں لیکن جو معاملات اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہوں اُن میں کسی کو شریک بنانا میرا خیال ہے خود سے بددیانتی ہے اور یہ بددیانتی میں نہیں کر سکتی۔ وسیم صاحب! آپ کا نظریہ بالکل غلط نہیں ہے آپ نے ایک اچھے انسان کی حیثیت سے مجھ سے وہ کہا ہے جو کوئی زیادہ سے زیادہ کسی سے کہہ سکتا ہے۔ میں بھی آپ کو ایک اچھے ساتھی کی حیثیت سے ایک دوست کی حیثیت سے یہ بتا دُوں کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ بلاشُبہ آپ کی زندگی میں جو بھی شامل ہو گا وہ بڑی تقدیر والا ہو گا لیکن بدقسمتی سے میں وہ تقدیر نہیں رکھتی۔"

" وجہ نہیں بتائی آپ نے۔"

" میں وجہ بتانا نہیں چاہتی وسیم صاحب۔"

" رُداء! یہ بات مجھے پسند نہیں آئی۔"

" ہو سکتا ہے ایسا ہو۔"

" ایک بات آپ سُن لیں میں آپ کا پیچھا کروں گا رُداء، میں آپ کو ایک دِن مجبُور کر دُوں گا کہ آپ میری بات مان لیں۔"

" جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے وہ آپ کا ذاتی مسئلہ

ہے۔ میں یہ کیوں کہوں کہ آپ ایسا نہ کریں آپ کیجئے گا۔ ضرور کیجئے گا۔ لیکن اگر اُس میں ناکام رہیں تو پھر اِتنے ہی اچھے انسان کی حیثیت سے آپ پیچھے ہٹ جائیے گا۔"

" یعنی آپ اپنے اندر کوئی لچک نہیں پیدا کریں گی؟"

" ممکن نہیں ہے۔"

" ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہُوں وہ یہ کہ انسان ہُوں۔ انسان میں کمزوریاں بہت ہوتی ہیں۔ ضدی ہو گیا ہُوں آپ کے سِلسلے میں اور یہ ضد مجھے میری منزل سے بھٹکا رہی ہے۔ یہ مجھے اپنی سطح سے نیچے بھی لا سکتی ہے رُداء۔"

" یہ دھمکی ہُوئی ناں۔" رُداء نے رُک کر سوال کیا۔

" نہیں۔ پہلے سے اظہار کر رہا ہُوں اِس کا۔ آپ کو ابھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا جہاں آپ حکم دیں گی وہاں چھوڑ دُوں گا اور اُس کے بعد آپ کی اور میری ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ آپ کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا اور اگر آخری کوشش میں بھی ناکام ہو گیا تو شاید پھر اپنی سطح سے نیچے گر جاؤں۔"

" کاش آپ اپنی سطح سے نیچے نہ گریں کیونکہ گر کر بھی آپ کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

" میں کیا حاصل کر سکتا ہُوں کیا نہیں حاصل کر سکتا اِس کا یقین آپ نہیں کر پائیں گی رُداء۔"

" ٹھیک ہے۔ میں آپ کی تمام دھمکیاں ذہن نشین کر رہی ہُوں۔ میں نے آپ سے انتہائی عاجزی سے یہ الفاظ کہے ہیں کہ جو کچھ آپ نے میرے بارے میں سوچا ہے وہ آپ کے لئے قطعی ممکن نہیں ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ پتھر پر بھی بُوند بُوند ٹپکتی

ہے تو پتھر میں سُوراخ بن ۔۔۔ میں نے آپ سے اُس کے جواب میں عرض کیا تھا کہ ۔۔۔ رِداء ہُوں پتھر میں سُوراخ ہو سکتا ہے لیکن میری ۔۔۔ ۔ آپ بھی آزما کر دیکھ لیجئے کہ میرا کہا درُست ہے یا غلط "

وسیم سرد نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ دفعتاً سمندر میں ایک چھپاکا سا ہُوا غالباً کوئی مچھلی تھی جو لہروں کے ساتھ قریب آ گئی تھی لیکن جب اُس مچھلی نے سر اُبھارا تو اُن دونوں نے ایک انسان کو دیکھا جو غوطہ لگا کر اس جگہ ساحل پر اُبھرا تھا۔ وہ کافی اُونچا اُبھر آیا اور پھر دفعتاً ہی رِداء کے حلق سے ایک آواز سی نِکل گئی۔

"ارے تصور صاحب آپ" دوسرے لمحے اُس شخص نے چونک کر رِدا کو دیکھا اور پھر اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

"آپ یہاں۔ آپ تصور صاحب" رِداء کئی قدم آگے بڑھ گئی لیکن جب پانی نے اس کے ٹخنے کو چھُوا تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

تصور آہستہ آہستہ پانی سے باہر نِکل آیا اُس کا ورزشی کسرتی جسم نُمایاں تھا اور اس وقت اُس نے اپنے بدن کو چُھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی ویسے بہت عمدہ قسم کا سوئمنگ کاسٹیوم پہنے ہُوئے تھا اُس نے ایک نِگاہ رِداء کو اور پھر وسیم کو دیکھا پھر مُسکراتا ہُوا بولا۔

"ہیلو مس رِداء۔ ہیلو سر" اُس نے وسیم کو مخاطب کیا۔

"ہیلو گویا آپ ایک دوسرے کے شناسا ہیں"

"جی" تصور نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے تصور صاحب۔ آپ اِس طرح ساحل پر م۔۔ میرا مطلب ہے آپ تو۔۔۔ آپ تو بے حد مصروف انسان ہیں"

"ہاں۔ مس رِدا آپ کو علم ہے کہ کبھی کبھی میں اپنی مصروفیتوں میں وقت بھی نِکال لیا کرتا ہُوں یہ عادت پُرانی عادت ہے۔ کِسی نے ڈال دی تھی اور اب پڑ ہی گئی ہے۔ سمندر کی لہروں کے نیچے میں اپنا کھویا ہُوا ماضی تلاش کرتا ہُوں" تصور نے جواب دیا۔

"واہ بھئی، بڑی شاعرانہ گفتگو ہو رہی ہے" وسیم مُسکراتا ہُوا بولا۔

"جی سر! مس رِداء کو ایسے ہی ایک سمندری واقعے کی یاد دِلا رہا ہُوں بہت پہلے ہمارے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا"

"آپ تصور صاحب! آپ کا لباس کہاں ہے؟"

"پہلے تو سوچا کہ پانی ہی میں گُم ہو جاؤں لیکن دِل نہ مانا آپ کو دیکھ کر بے حیائی خود پر لا دلی اور اب اِس کے لئے مُعافی مانگنا ہے کا ہے، لباس یہاں سے بہت دُور محفُوظ ہے۔ دراصل سر اِتفاق سے آپ کا نام نہیں معلوم مجھے۔ اِس لئے آپ کو سر کہہ کر مخاطب کرتا رہوں گا، بہت دُور نِکل آیا ہُوں پانی کے نیچے۔ بس نہ جانے کیوں ایک عادت سی پڑ گئی ہے، بعض اوقات کُچھ لوگوں کو میری مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ میری بہت پُرانی عادت ہے کہ اچانک ہی اُس جگہ پانی سے نمُودار ہوتا ہُوں جہاں کوئی مجھے مدد کے لئے پُکارنے والا ہوتا ہے"

"میں ذرا گردن کھُجاتُوں کیونکہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی" وسیم نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور رِداء چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تصور صاحب! یہ وسیم جمال ہیں"

"خُدا سے التجا ہے کہ ان کا حسن و جمال قائم رہے اور یہ ہمیشہ خوش رہیں" تصور نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"بھئی واہ، آدمی اچھے معلوم ہوتے ہو دُعائیں دے رہے ہو میں"

"ہاں وسیم صاحب! آپ کے لئے تو دِل سے نہ جانے کتنی دُعائیں نِکلیں گی ابھی۔ آپ کو دراصل پہلی بار دیکھا ہے فی الحال اِس بے سرو سامانی کے عالم میں آپ کو اور کیا تحفہ پیش کر سکتا ہُوں" تصور نے اپنے بے لباس بدن کی جانب اشارہ کرتے ہُوئے کہا اور وسیم ہنس پڑا۔

"بھئی بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ۔ اب ذرا تیرتے ہُوئے ہمارے ساتھ وہاں تک چلیئے جہاں آپ کا لباس موجود ہو پھر آپ کے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے پی جائے گی"

"نہیں وسیم صاحب! مس رِداء بہت بامرّوت ہیں اور آپ بھی کُچھ اُنہی کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں لیکن میں آپ کی اِس مرّوت سے فائدہ نہیں اُٹھاؤں گا، مجھے اِس جگہ نمُودار ہونا ہی نہیں چاہئیے تھا مگر کیا کروں ہمیشہ غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہُوں۔ براہِ کرم آپ جائیے چیئے" تصور نے کہا اور دوسرے لمحے اُس نے اُلٹی چھلانگ لگا دی اور اُس کے بعد دیر تک پانی سے سر نہ اُبھارا۔ وسیم متحیّرانہ نِگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر اُس نے کہا۔

"کیا یہ ڈُوب گیا؟"

"واپس چلیئے وسیم صاحب پلیز واپس چلیئے"

"ارے ارے۔ وہ واقعی پھر نظر نہیں آیا کیا ایک ڈُوبنے والے کی مدد نہیں کریں گی مس رِداء؟"

"وسیم صاحب واپس چلیئے، بہت ہو گئی" رِدا نے غرّاتے ہُوئے لہجے میں کہا اور وسیم گہری نِگاہوں سے اُسے گھُورنے لگا۔ پھر شانے ہِلا کر بولا۔

"گویا چائے کی حسرت دِل ہی میں رہ گئی"

"اگر آپ فوراً واپس نہیں چلیں گے تو میں۔۔ میں۔۔"

"نہیں نہیں۔ میں فوراً واپس چل رہا ہُوں براہِ کرم کوئی دھمکی نہ دیجئے گا" وسیم نے کہا اور واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ رِداء پلٹ پلٹ کر ساحل کو گھُور رہی تھی پھر ایک جگہ کافی فاصلے پر اُسے تصور کا سر پانی پر اُبھرتا نظر آیا اُس کے قدم ٹھٹکے لیکن دوسرے لمحے تصور پھر پانی میں گُم ہو گیا تھا۔ وسیم کار کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں نے جُوتے پہنے اور اُس کے بعد کار میں آ بیٹھے۔ وسیم نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر اُس نے کہا۔

"مس رِداء! میں اِن تصور صاحب کا مکمل تعارف چاہتا ہُوں"

"آپ بہت سی ایسی فضُول باتیں چاہتے ہیں وسیم صاحب جو میں آپ کو قطعی نہیں بتا سکتی"

"لیکن نہ جانے کیوں میرا دِل چاہتا ہے کہ آپ مجھے اُس شخص کے بارے میں ضرور بتائیں"

"خُدا کے لئے خاموش ہو جائیے آپ نے تو انتہا کر دی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اتنے۔۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ جی کہیئے، کہیئے۔ میں سُننا چاہتا ہُوں کہ آپ میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ کیا کہہ سکتی ہیں"

"کاش۔۔ میں آپ کو وہ سب کُچھ کہہ سکتی جو میرے دِل میں ہے"

"آہ۔ کاش آپ ایسا کر ڈالتیں" وسیم نے کہا اور اُس کے بعد خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُس جگہ آ گیا جہاں رِداء کی کار چھوڑ کر گیا تھا۔

"آپ مجھے یہاں چھوڑ دیں گے؟"

"آپ کی کار درُست ہے مس رِداء۔ بس میں نے کوائل کے تار نِکال دیئے تھے ابھی لگائے دیتا ہُوں، اسٹارٹ ہو جائے گی"

"کیا؟" رِداء نے چونک کر کہا۔

"جی۔ لنچ کے وقت، جب آپ لوگ لنچ کر رہے تھے میں اِس کارروائی میں مصرُوف تھا۔ میں نے بونٹ کھول کر کوائل کے تار نِکال دیئے اور وہ صرف اِس لئے کہ آپ کو ساحل تک لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے میری یہ کوشش انتہائی کارگر رہی ہے۔ آپ کے بارے میں ذرا مختلف انداز میں سوچنا ہو گا مس رِداء، بہت کُچھ اندازہ ہو رہا ہے مجھے"

رِداء نے اُس کی پوری بات نہ سُنی اور کار کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ پر جا بیٹھی۔

"یہ یُوں اسٹارٹ نہیں ہو گی۔ براہِ کرم ذرا بونٹ کھول دیجئے" رِداء نے بونٹ کھول دیا اور وسیم نے کوائل کا تار لگا دیا۔

"اسٹارٹ کیجئے" ایک ہی سیلف میں گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی رِداء کو حیرت تھی کہ وسیم نے بغیر چابی کے کار کا دروازہ کیسے کھولا لیکن اُسے اِس بات کا اندازہ بھی ہو چُکا تھا کہ وسیم چھچھورا آدمی ہے، بظاہر نیک و شریف بننے کی کوشش کر رہا ہے لیکن درپردہ بہت آگے کی چیز معلوم ہوتا ہے اُس نے بڑی تیزی سے کار ریورس کی اور پھر اُسے موڑ کر کوٹھی کی جانب چل پڑی۔ اُس کے دِل میں وسیم کے لئے نفرت ہی نفرت بھری ہوئی تھی۔

کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے مُوڈ درُست کرنا بہت ہی ضروری تھا کیونکہ وہ کِسی پر اپنی اِس کیفیت کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کوٹھی کے معمُولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ آج کا دِن یہیں کے لئے وقف تھا اور سب لان پر تیاریاں کر رہے تھے۔ اختر اور خالد، عادل حسین کے ساتھ آ چکے تھے ڈاکٹر نعمان بھی نظر آ رہے تھے۔ رِداء کو دفعتاً اپنے پیروں کو دیکھ کر احساس ہُوا کہ اُس کے پیروں میں ساحل کی ریت لگی ہُوئی ہے۔ دوسرے لوگ دیکھ لیں گے تو بات کا بتنگڑ بنا دیں گے چنانچہ اُس نے مُسکرا کر گردن خم کی اور تیزی سے چلتی ہُوئی کوٹھی کے اندرُونی حصّے کی جانب چل پڑی تاکہ اُن لوگوں کو شبہے کا موقعہ نہ مِل سکے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ لباس وغیرہ تبدیل کر کے واپس اُن کے درمیان آ گئی اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے اُس نے تمام تر کوششیں صرف کر دی تھیں تاکہ کِسی کو اُس کی ذہنی کیفیت کا عِلم نہ ہو سکے اور اپنی اِس کوشش میں وہ کامیاب تھی۔

ڈاکٹر نعمان کا اضافہ اُن لوگوں کے درمیان اچھی خاصی دلچسپی کا باعث بنا تھا اور عام طور سے اُسے گھیرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

اِس وقت بھی یہی سب کُچھ ہو رہا تھا۔ رِداء اُن سب کے درمیان کھُوکھلی ہنسی ہنستی رہی اُس کے دِل کی کیفیت عجیب سی تھی۔

اور پھر اُس کے بعد تمام ہنگامے جب ختم ہوگئے تو اُس نے اپنے کمرے میں آکر کمرہ بند کرلیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی، کچھ دل ہلکا ہُوا تو اُٹھی چہرہ دھویا اب کسی کے آنے کے امکانات نہیں تھے، لباس تبدیل کیا اور بستر پر آلیٹی۔

آج تابُوت میں آخری کیل بھی ٹھک گئی تھی تصوّر نے اُسے وسیم جمال کے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کرتے ہُوئے دیکھا تھا اور کِس طرح مُسکرا رہا تھا وہ۔ وسیم سے کتنے اخلاق سے پیش آیا تھا اور اُن کی کوئی بات سُنے بغیر پانی میں گُم ہوگیا تھا۔

اُس نے وہ لمحات بھی یاد دِلائے تھے جب وہ خیر دین کی حیثیت سے پکنک پر گیا تھا اور اِسی طرح رشید کے سامنے نمُودار ہوگیا تھا جیسے اُس وقت پانی سے نِکلا تھا۔ نہ جانے کہاں سے وہاں پہنچ گیا پتہ ہی نہ چل سکا کہ کب باہر سے واپس آیا،

اور... اور!

نہ جانے نِداء کیا کیا سوچتی رہی اور اُس کی آنکھوں کی کورین پانی سے بھیگتی رہیں بار بار وہ تکیئے پر گِر جانے والے آنسو خُشک کرنے کی کوشش کرتی تھی آج نہ جانے دِل کیوں زیادہ ہی بھر آیا تھا پھر نہ جانے کب روتے روتے اُسے نیند آگئی۔ اور وہ شاید نیند میں بھی سِسکیاں بھرتی رہی۔ لیکن اُس کو سہارا دینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

عادل حسین کو ایک تار موصول ہُوا تھا اور وہ اُسے پڑھ رہے تھے تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے اختر کو پُکارا۔ اختر تو شاید کِسی کام میں مصرُوف تھا۔ خالد، عادل حسین صاحب کے پاس پہنچ گیا اور اُنھیں سوالیہ نِگاہوں سے گھُورنے لگا عادل حسین نے وہ تار خالد کے حوالے کرتے ہُوئے کہا۔

"پڑھو اِسے" اور خالد تار پڑھنے لگا تھا پھر چونک کر بولا۔

"یہ تجمّل حسین صاحب وہی تو نہیں تھے جنھوں نے افریقہ میں اپنا کاروبار شروع کیا تھا"

"ہاں وہی۔ میں گیا بھی تھا اُس کے انتقال پر" عادل حسین نے کہا۔

"اور اجمل میاں وہی بھوندو سے صاحب زادے تھے جو ضرورت سے زیادہ موٹے ہو رہے تھے ہمارے گھر بھی آئے تھے ایک مرتبہ"

"وہی۔ وہی"

"تو گویا یہ آرہے ہیں"

"ہاں بیٹے بہت اچھا انسان تھا تجمّل حسین، بہت سے معاملات میں میرا ہمدرد و معاون رہا ہے اور پھر انسانوں کا ایک ہی تو مشغلہ ہوتا ہے ایک دوسرے سے شناسائی اور اُس کے بعد یگانگت کا اظہار کرنا۔ دوست کا بیٹا ہے آنا چاہتا ہے آجائے، مجھے تو خوشی ہو رہی ہے"

"کیوں نہیں ڈیڈی۔ مہمان آنے سے کسے خوش نہیں ہوتی۔"

"رات کو ساڑھے آٹھ بجے آرہا ہے"

"ہاں میں یہی کہنے والا تھا کہ اُسے بڑی محبت اور احترام سے خوش آمدید کہا جائے تم دونوں ہی چلے جانا میں جا کر کیا کروں گا"

"ظاہر ہے ڈیڈی آپ اطمینان رکھیئے ہم اُسے لے آئیں گے۔ دیکھیں اب کیا ہوگیا ہے اُس وقت تو بڑی عجیب و غریب چیز تھی"

"اِس بات کا خیال رکھنا کہ وہ میرے دوست کا بیٹا ہے"

خالد نے سعادت مندی سے گردن خم کردی تھی جس قسم کا ماحول اُن لوگوں کو یہاں مِلا تھا وہ اُن لوگوں کے لئے بہت ہی پسندیدہ تھا عادل حسین صاحب اپنے کاروبار میں پورے اعتماد کے ساتھ جم گئے تھے اور اقبال واقعی حیرت انگیز ثابت ہُوا تھا۔

ویسے تو عادل حسین اختر اور خالد سے بھی کام لے رہے تھے اور اقبال کو اُنھوں نے صرف ایک خاص تصوّر کے تحت اپنے ہاں ملازم رکھا تھا لیکن اقبال نے بہت ہی مُختصر دِنوں میں اپنی ذمّہ داریوں کو جِس خوش اسلُوبی سے پُورا کر کے دِکھایا تھا۔ وہ باعثِ حیرت تھی۔ اور اُس نے منوالیا تھا کہ وہ انتہائی باصلاحیت نوجوان ہے۔ اور یہ اتفاق عادل حسین کے لئے بہت کار آمد ثابت ہُوا۔

اُن دِنوں ذرا کچھ زیادہ ہنگامہ خیزیاں چل رہی تھیں ابھی ایک دِن پہلے اِس سِلسلے میں آخری میٹنگ ہُوئی تھی جس میں ثناء بھی شریک تھی احسان احمد صاحب بھی تھے اور خالد اور اختر وغیرہ بھی۔ عادل حسین صاحب کے سپُرد یہ ذِمّہ داری کی گئی تھی کہ ایک آدھ دن کے بعد باقاعدگی سے اقبال اور عصمت کے مسئلے کا آغاز کردیا جائے، یعنی عادل حسین صاحب ابراہیم صمدانی کے ساتھ مِل کر عصمت کا رشتہ لے کر احسان احمد کی کوٹھی جائیں اور اِس سِلسلے میں وہ تمام رُسوم پوری کی جائیں جو ہوتی ہیں اِس کے لئے ایک دِن متعیّن کرلیا گیا تھا اور اُس کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ لیکن بات ابھی خفیہ رکھی گئی تھی۔ یہاں تک کہ ثناء نے نُدرت کو بھی اِس بارے میں نہیں بتایا تھا۔

وقتِ مقرّرہ پر خالد اور اختر ائیرپورٹ چل پڑے، اختر نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"یاد ہے بھائی جان، ایک بار وہ ہمارے ہاں آیا تھا اور ہم اُسے چڑیا گھر میں چھوڑ کر آگئے تھے"

"ہاں، تمھاری حرکتیں ہمیشہ یہی رہی ہیں اِس کے علاوہ بھی کچھ کیا ہے"

"بڑی موٹی چیز تھی وہ۔ خاص طور سے جب پتلون اور چُست جرسی پہنتا تھا تو دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے"

"خیر اُس کا حُلیہ کچھ بھی ہو ڈیڈی کی ہدایت ہے کہ اُسے اُن کے مرحوم دوست کا بیٹا تصوّر کیا جائے چنانچہ تم خاص طور سے احتیاط رکھو گے"

"کمال ہے، لوگوں نے مجھے تو اِس طرح بدنام کر رکھا ہے کہ بس، خیر کوشش کروں گا کہ اپنے آپ کو قابُو میں رکھوں۔ لیکن ایک وعدہ نہیں کرسکتا"

"کیا؟"

"اگر وہ اُتنا ہی موٹا ہُوا تو پھر یہ میری ذِمّہ داری بنتی ہے کہ اُس کی صحت کا خیال کرتے ہوئے اُسے ٹھیک ٹھاک کردُوں۔ بھئی دیکھئے ناں کم از کم ہمیں بھی دوستی کا کچھ فرض تو نبھانا ہوگا"

خالد ہنسنے لگا تھا۔

ائیرپورٹ پر پہنچنے کے بعد اُنھوں نے فلائٹ کا وقت معلوم کیا اور پھر اُس کا انتظار کرنے لگے، اختر نے اِس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ سالہاسال کے بعد وہ نظر آئے گا کیا اُسے پہچان لیا جائے گا۔

"میں نے اِس کا انتظام کرلیا ہے۔ اوّل تو وہ نہ بھُولنے والی چیز ہے لیکن اگر کچھ تبدیلی ہوگئی ہے تو پھر یہ موجود ہے۔ خالد نے ایک بڑا سا کاغذ نِکالا جس پر "اجمل حُسین خوش آمدید" لکھا ہُوا تھا۔ اختر نے پُراطمینان انداز میں گردن ہلا دی۔

وقتِ مقرّرہ پر فلائٹ آگئی اور یہ لوگ انتظار کرتے رہے، اِمیگریشن ڈپارٹمنٹ کے شیشوں سے اندر کا منظر نظر آرہا تھا۔ وہ مُسافروں کو دیکھتے رہے اور پھر خالد نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں بھئی۔ یہ تو مسئلہ گڑبڑ ہی رہا۔ کوئی اندازہ لگا سکتے ہو"

"میں بتاؤں۔ وہ جو شخص نظر آرہا ہے لمبے قد و قامت کا مالک۔ وہ ہوسکتا ہے"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو اچھا خاصا ورزشی جسم کا مالک ہے ویسے مجھے بھی کچھ شُبہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ چہرہ، اوہ۔ کمال ہے، بھئی یہ وہی ہے لیکن اُس نے تو اپنے آپ کو قیامت بنالیا ہے۔ موٹاپے کا تو نام و نشان نہیں رہا، بھاری بدن سے لگتا ہے بڑی محنت کی ہے اپنے آپ پر"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم لوگ غلط فہمی کا شکار ہوں۔ چنانچہ آپ اپنا یہ خوش آمدید کارڈ نکال ہی لیں تو اچھا ہے۔" اختر نے کہا اور خالد نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر وہی ہُوا۔ آنے والا وہی شخص تھا جسے وہ پہچان نہیں پائے تھے، وہ کارڈ دیکھ کر اُن کے پاس پہنچ گیا جسم واقعی بہت عُمدہ تھا۔ رنگ گہرا کالا تو نہیں لیکن افریقہ کی زندگی میں اچھا خاصا سانولا ہوگیا تھا۔ خدوخال میں ایک معصُومیت اور بھولپن پایا جاتا تھا۔ بدن البتہ ورزشی تھا لباس بے حد قیمتی اور شاندار لیکن اُس وقت یہ دونوں حیران رہ گئے۔ جب وہ خالد بھائی کہہ کر خالد سے اور اختر بھائی کہہ کر اختر سے لپٹ گیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں ہوگئے سچی بات تو یہ ہے کہ اختر تو بوکھلایا ہی تھا لیکن ائیرپورٹ پر اُسے روتے دیکھ کر خالد کو بھی عجیب سی خجالت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

وہ اجمل کو لے کر کار میں آبیٹھے کافی سیدھا نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اور اختر خاص طور سے خوش تھا کہ ایک عُمدہ چیز ہاتھ آئی ہے۔ ڈرائیونگ خالد کر رہا تھا اور اختر اجمل کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہُوا تھا۔

"کہو اجمل! افریقہ میں کیسی گزر رہی ہے؟" جواب میں اجمل نے پھر ہونٹ بسُورے تھے اور اختر نے جلدی سے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"نہیں نہیں میرے بھائی۔ پیارے بھائی۔ یہ سڑک ہے لوگ یہ سمجھیں گے کہ ہم تمھیں اغواء کر کے لے جا رہے ہیں۔ براہِ کرم رونے کی کوشش مت کرو" اجمل نے اختر کے ہاتھ کو مُنہ سے ہٹا دیا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"آپ نے سوال ہی ایسا کردیا تھا اختر بھائی"

"ہاں۔ ہاں بس غلطی ہوگئی تھی" اختر نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔ ویسے اُس کے پیٹ میں قہقہے مچل رہے تھے۔ اور خالد دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم اختر کے ہاتھ ایک اور کھلونا آگیا ہے لیکن عادل حسین صاحب کی ہدایت بھی زیرِ نِگاہ تھی اور خالد کو اختر کو باز رکھنے کی ذِمّہ داری بھی قبُول کرنا تھی۔

وہ اجمل کو لے کر گھر پہنچ گئے اِس دوران میں عادل حسین صاحب، ابراہیم صمدانی اور اُن کی بیگم وغیرہ کو بھی اپنے دوست

کے اس بیٹے کے بارے میں بتا چکے تھے چنانچہ اجمل کا استقبال کرنے کے لئے سب ہی موجود تھے۔

کوٹھی کے بیرونی حصے ہی میں اجمل کا استقبال کیا گیا وہ شخص یادداشت کا واقعی تیز تھا ایک لمحے میں اُس نے عادل حسین صاحب کو پہچان لیا گاڑی سے نیچے اُترا دونوں ہاتھ پھیلائے، اور عجیب سے انداز میں بھاگتا ہُوا عادل حسین صاحب کی جانب لپکا اُس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی تھی۔

"انکل جان!" اور اُس کے بعد عادل حسین صاحب سے گُتھ گیا۔ عادل حسین بے چارے اپنا توازن نہیں سنبھال پائے تھے لیکن دیوہیکل اجمل نے سب کچھ سنبھال لیا تھا باقی سارے لوگ بھونچکے ہو کر اُن کی صورت کو دیکھنے لگے کیونکہ اجمل بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا اور اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

عادل حسین اُسے خود سے الگ کرنے کی کوشش میں مسلسل ناکام ہو رہے تھے اور باقی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عادل حسین صاحب کو کیسے بچائیں، پھر شاید اُسے خود ہی اُن کی بوڑھی ہڈیوں پر رحم آ گیا اور وہ آہستہ آہستہ سسکتا ہُوا پیچھے ہٹ گیا عادل حسین بُری طرح ہانپتے ہُوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور اختر بڑی سنجیدہ سی شکل بنائے کھڑا ہُوا تھا اُس نے آہستہ سے اقبال کے کان میں کہا۔

"ڈیڈی کو دُعائیں دو اقبال ڈیئر کہ انھوں نے ہمارے لئے ایک شاندار تفریح امپورٹ کی ہے۔" اقبال بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ عادل حسین صاحب نے پہلے خود کو سنبھالا اور پھر دوسروں کی طرف امداد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگے تاکہ کوئی اِس سانڈ کو سنبھالنے کی کوشش کرے، وہ خود تو اس کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے کیونکہ خطرہ تھا کہ اجمل میاں دوبارہ جذباتی ہو گئے تو شاید عادل حسین کی ہڈیاں ہی توڑ ڈالیں، ابراہیم صمدانی نے اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہُوئے کہا۔

"میاں! ہمت سے کام لو۔ جوان آدمی ہو۔ اِس طرح بے اختیار ہونا اچھا نہیں ہے۔"

"اوہ۔ انکل جان" اجمل نے ابراہیم صمدانی کی جانب بھی رُخ کیا لیکن وہ گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے تھے، اُن کے حلق سے بوکھلائی ہُوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"ہاں۔ ہاں میاں، سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے، چلو۔ چلو اندر چلو۔" اجمل کے حملے سے بچنے کے بعد ابراہیم صمدانی اُس کی پُشت پر آ گئے اور عقب ہی سے آگے دھکیلا جانے لگا بمشکل تمام وہ اجمل کو اندر لے گئے تھے اور پھر اُسے بڑی نشست گاہ میں بٹھایا گیا تھا۔

سامان کے تینوں سُوٹ کیس اندر پہنچا دیئے گئے تھے۔

تمام ہی لوگ اُس کے اِرد گِرد بیٹھ گئے عادل حسین نے کہا۔

"اجمل میاں! اگر نہانا چاہو تو لباس نِکلوا دُوں تمہارا اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے میرا خیال ہے کہ چائے کے بجائے اب ڈِنر ہی مناسب رہے گا۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ تمہارے آنے کے بعد ڈِنر کیا جائے گا۔"

"اوہ۔ نہیں انکل جان۔ میں پچھلے ہفتے ہی نہایا تھا اب سولہ تاریخ کو ساڑھے پانچ بجے نہاؤں گا۔"

"کک۔۔۔ کیا مطلب؟"

"جی ہاں، اِس سے پہلے نہانا میرے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔"

اجمل نے جواب دیا۔

"پچھلے ہفتے نہائے تھے؟" عادل حسین متحیّرانہ انداز میں بولے اور خالد نے مسکراتی نگاہوں سے اختر کو دیکھا لیکن اختر کے چہرے پر اجمل کے لئے بڑی ہمدردی کے آثار نظر آ رہے تھے اور خالد سے زیادہ اختر کے چہرے کے اِن تاثرات کو اور کون سمجھ سکتا تھا اختر کے ہاتھ تو گویا ایک خزانہ لگ گیا تھا ایسی نایاب چیز ذرا مشکل ہی سے ہاتھ آتی ہے اور اختر نے اِس سلسلے میں پہل بھی کر ڈالی۔

"جی ڈیڈی۔ آپ کو شاید یہ یاد نہیں رہا کہ اجمل میاں صحرائے اعظم افریقہ سے آئے ہیں اور اُنھوں نے وہیں پرورش پائی ہے۔ کچھ رسم و رواج تو انسان کے علاقائیت کی بنیاد پر خود بخود ہو جاتے ہیں آپ اُنھیں مجبور نہ کریں۔" عادل حسین صاحب گردن ٹیڑھی کر کے خاموش ہو گئے تھے پھر اُنھوں نے کہا۔

"پھر بھی لباس تو تبدیل کر لو تاکہ ڈِنر کیا جا سکے۔"

"لباس ٹھیک ہے انکل جان، پلیز۔"

"ٹھیک ہے بیٹی۔" عادل حسین صاحب نے کہا اور پھر ایک ملازم سے کہنے لگے کہ وہ کھانا لگوا دے۔

تمام ہی لوگ اجمل کی طرف متوجہ تھے ویسے ابراہیم صمدانی اور اُن کے اہلِ خاندان عادل حسین کی محبت سے اب پوری طرح مطمئن ہو گئے تھے عادل حسین نے اُن سب سے درخواست بھی کی تھی کہ اُن لوگوں کو یہاں لانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں اُن کی اپنی ذات میں جو کمی ہے وہ پوری ہو جائے اور اُنھیں ایک بھرپُور گھریلو ماحول مل جائے اگر اُن لوگوں نے یہ سوچ کر تکلّف کیا کہ وہ یہاں کسی اہمیت کے حامل نہیں ہیں تو عادل حسین صاحب

کو دِلی رنج ہوگا۔

ابراہیم صمدانی تو اِس سلسلے میں پہلے ہی اپنے اہلِ خاندان سے یہ گفتگو کر چکے تھے کہ مشرقی پاکستان کے المیئے کے بعد اُنھوں نے زندگی کو صرف ایک پھانسی گھر سمجھ لیا تھا لیکن قُدرت نے اُنھیں جن لوگوں کے درمیان پہنچا دیا ہے وہ فرشتہ صفت ہیں اور اُن کی محبت کو قبول نہ کرنا ناشُکر گزاری ہوگی۔ چنانچہ جیسا عادل حسین صاحب چاہتے ہیں ویسا ہی کیا جائے اِس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھا جائے۔ کوئی ایسا لمحہ شاید کبھی نہیں آئے گا جب اُنھیں کِسی سلسلے میں شرمندگی اُٹھانی ہوگی چنانچہ جب اِس محبت کا جواب دینا ہی ہے تو پھر تکلّفات حماقت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گے۔ چنانچہ ابراہیم صمدانی کے پورے گھرانے نے اِس گھر کا نظام سنبھال لیا تھا اور عادل حسین صاحب بے حد خوش تھے۔ بیگم صمدانی کو نئی زندگی مِل گئی تھی۔

حالات بدلے تو خُدا نے آنکھوں کی بینائی بھی واپس لوٹا دی اور اُس کے بعد خُوشیاں ہی خُوشیاں زندگی میں شامل ہو گئی تھیں۔

بہرحال اجمل میاں کی آمد اُن سب کے لئے باعثِ خوشی تھی بمشکل تمام اُنھیں کھلا پلا کر سُلا دیا گیا اور اختر اور خالد، اقبال کے ساتھ مِل کر اُن کے موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔

"ابھی بڑے گھر والوں کو اِس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں ملی ہے میرا خیال ہے کل کی شام ہمارے لئے کافی دلچسپ ہوگی۔ ویسے حضرات! اِن اجمل میاں کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"یہ تو میں دعوے سے کہتا ہُوں کہ وہ شخص بناوٹی نہیں ہے کیونکہ ہم اُسے بہت پہلے بھی دیکھ چُکے ہیں اِس سے بھی کچھ زیادہ تھا تھوڑی سی تفریح بھی کی جا چُکی ہے اُس کے ساتھ۔ بدن وغیرہ اب درُست کر لیا ہے اُس نے، لیکن شاید عقل بھی اِس سلسلے میں کام آ گئی ہے۔"

"بظاہر دلچسپ آدمی ہے لیکن اِس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ اُس پر گہری نظر رکھی جائے کہیں احمق بن کر ہم سب ہی کو احمق نہ بنا دے۔"

دیر تک اُس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اُس کی اُردو دانی کو بھی سراہا گیا تھا اچھی خاصی اُردو بول رہا تھا حالانکہ افریقہ میں رہا تھا پتہ نہیں اُس کے اور کیا کیا شاغل ہوں۔

دوسرے دِن صبح ناشتے کی میز پر اجمل میاں بہت ہی مختلف نظر آئے اِس وقت وہ مکمل طور پر سنجیدہ تھے اُنھوں نے خود ہی فرمائش کی کہ سب سے اُن کا تعارف کرا دیا جائے اور یہ کام عادل حسین نے خود سرانجام دیا ابراہیم صمدانی اقبال، بیگم صمدانی وغیرہ کا تعارف کرایا گیا۔ تنویر ناشتے کی تیاریوں میں چونکہ کچن میں تھی اِس لئے اُس سے ملاقات نہیں ہُوئی تھی۔ اُس کے بعد عادل حسین صاحب اُسے اپنے ساتھ لئے ہُوئے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے اور اُنھوں نے اجمل میاں سے اُن کی وہاں کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔

"بس انکل جان! ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا رہ گیا۔ ایک پھوپھی جان تھیں جنھوں نے مجھے پرورش کیا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں اُن کے ساتھ زندگی گُزرتی رہی مگر مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوتا تھا، پھوپھی جان ہمیشہ یہاں کی کہانیاں سُناتی رہتی تھیں وہ خود بھی بیمار رہنے لگی تھیں اور اُنھوں نے اِس بات کا مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ یہاں کا کاروبار میرا مطلب ہے افریقہ سے کاروبار سمیٹ کر اپنے وطن منتقل ہو جایا جائے۔ میں بھی وہاں سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک بار پھوپھی جان نے یہ بھی کہا کہ میں آپ کے پاس چلا جاؤں لیکن اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ یہاں تک کہ پھوپھی جان کا انتقال ہو گیا اور اُس کے بعد وہاں میری زندگی دُوبھر ہو گئی۔ چنانچہ میں نے بھی دونوں کانیں فروخت کر دیں جو ڈیڈی جان نے بڑی مشکل سے حاصل کی تھیں اور اُس کے بعد اپنی دولت یہاں منتقل کرتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے سارے مسئلے سمیٹ لئے میں نے پھر آپ سے رُجُوع کیا تو پتہ چلا کہ آپ بھی یہاں واپس آ گئے ہیں بس یہ بات میرے لئے باعثِ تشفّی تھی۔ میں نے وہیں سے آپ کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم کیں اور آپ کے ایک خاص آدمی ڈیری جان مائیکل نے مجھے آپ کا موجودہ پتہ بھی بتا دیا تھا۔ سو میں نے تار دے دیا یہاں کے علاوہ بھلا اور میں کہاں آ سکتا تھا۔"

"اوہ۔ گویا تم مستقل طور پر یہاں آ گئے ہو۔"

"جی انکل جان، بس اب آپ کے قدموں ہی میں رہوں گا کہیں بھی مجھے مصروف کر دیجئے ڈیڈی کے بعد اور کوئی سہارا تو نہیں ہے میرا۔"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں بیٹے۔ کیوں نہیں آرام سے یہاں رہو تمھیں کوئی دِقّت نہیں ہوگی۔ باقی رہا کاروبار وغیرہ کا مسئلہ تو تمہارے رُجحان کے مطابق وہ سب کچھ بھی درُست کر دیا جائے گا۔"

"انکل جان!" اجمل میاں دوڑ کر عادل حسین سے لپٹ گئے۔

عادل حسین کو بھی اُس سے محبت محسوس ہو رہی تھی ویسے بھی تجمل حسین سے بڑے دیرینہ تعلقات تھے اُن کے غرض یہ کہ اجمل میاں کا انٹرویو مکمل ہو گیا۔

بابر اختر وغیرہ موجود تھے اقبال تو عادل حسین کے ساتھ آفس چلا گیا خالد اور اختر کے سپُرد یہ ذمّہ داری کر دی گئی تھی کہ اجمل میاں کی دلجوئی کریں چنانچہ دونوں اُسے گھیر کر بیٹھ گئے۔

"وہاں افریقہ میں تو آپ نے بڑی سیر و سیاحت کی ہو گی اجمل صاحب" اختر نے پوچھا۔

"ہاں۔ افریقہ کی پسماندگی اب ایک روایتی چیز رہ گئی ہے، وہاں وہ سب کچھ نہیں ہے جس سے افریقہ کو منسوب کیا جاتا ہے اُس کے ساحل جدید ترین ہیں اندرونی زندگی میں بس وہ روایتی کہانیاں باقی رہ گئی ہیں لیکن چھوٹے چھوٹے تمام شہر دُنیا کے جدید شہروں کا مقابلہ کرتے ہیں"

"ایسے سخت ماحول میں رہ کر بھی آپ اِس قدر نرم دِل ہیں مسٹر اجمل" خالد نے کہا۔

"کیا بتاؤں بھائی جان۔ دُنیا سے کٹ کر رہا ہوں میں۔ ہمیشہ محبتوں کی تلاش میں سرگرداں دِل کچھ کمزور ہو گیا ہے"

"وہاں کسی افریقن سے شادی وغیرہ نہیں کر ڈالی تم نے" اختر نے سوال کیا۔ اور اجمل میاں بُری طرح شرما گئے۔

"ششش... شادی خود تو نہیں کی جاتی۔ کوئی کرنے والا ہوتا ہے"

"ارے ہاں۔ یہ تو بالکل درُست ہے ویسے کسی افریقن سے دوستی تو ضرور ہُوئی ہو گی"

"میں شریف آدمی ہُوں وہ اچھی نہیں ہوتیں" اجمل میاں بدستور شرماتے ہُوئے بولے۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے یہاں تمھاری شادی کر دیں گے کسی سے"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ مم... میں... میں" اجمل میاں ادھر اُدھر گردن مٹکنے لگے۔

"واللہ کمال ہے۔ تمھاری آمد ہمارے لئے بہت خُوشی کا باعث ہے ویسے تم اُردو بہت اچھی بول لیتے ہو اجمل میاں یہ کیا بات ہے؟"

"ڈیڈی جان بچپن ہی سے کہا کرتے تھے کہ اپنی زبان کبھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے۔ میں نے اپنے ہاں کا سارا لٹریچر پڑھا ہے اور جہاں بھی مجھے کہیں کوئی اُردو دان مِل جاتا تھا۔ میں اُس سے اُردو ہی میں باتیں کرتا تھا۔ گھر میں بھی پھوپھی جان کے ساتھ اور اُس سے پہلے ڈیڈی جان کے ساتھ اُردو ہی میں بات چیت کی جاتی تھی اِس لئے مجھے اپنے وطن کی زبان خُوب آتی ہے"

"بڑی اچھی بات ہے یہ تو۔ ہونا بھی یہی چاہیئے"

"آپ لوگ بھی تو جرمنی میں رہے ہیں لیکن کتنی اچھی اُردو بولتے ہیں"

"تمھیں یاد ہے تم ہمارے ہاں آئے تھے؟"

"ہاں کیوں نہیں اچھی طرح یاد ہے دوبارہ آنے کے بارے میں سوچتا رہا مگر کبھی موقعہ نہیں مِل سکا"

"سُنو اجمل میاں! یہاں ہمارے بہت سے دوست ہیں۔ ایک اور گھرانا ہے جس سے آج شام کو تمھاری ملاقات ہو گی۔ یہاں خُوب تفریحات رہتی ہیں۔ اپنے آپ کو بالکل اپنوں ہی کے درمیان سمجھو"

"تو اور کیا سمجھتا ہُوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سیدھا یہاں کیوں چلا آتا" اجمل میاں نے جواب دیا۔

"ذرا اپنا لباس وغیرہ دِکھا دو مجھے مقامی طور پر تمھیں کچھ لباسوں کی بھی ضرورت ہو گی"

"اب ایسی جلد بازی کیا ہے اختر۔ یہ سب کچھ تو آہستہ آہستہ ہو ہی جائے گا"

آج شام کا پروگرام احسان احمد کی کوٹھی میں تھا اِس لئے اِس شاہکار کو بنا سجا کر تمام لوگ احسان احمد کی کوٹھی کی جانب چل پڑے اور شاید اُس وقت ہی اجمل میاں نے تنویر کو بھی دیکھا تھا اور دیکھتے ہی رہے تھے لیکن اُس کی اِس بات پر کسی نے کوئی توجّہ نہیں دی تھی۔

احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں داخل ہُوئے سب کے سب موجود تھے اور اُن لوگوں کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا ڈاکٹر نُعمان کی کار بھی نظر آ رہی تھی۔ رِدا بھی سب کے درمیان تھی اور پھر جب گاڑیوں سے باقی لوگوں کے علاوہ ایک اجنبی شخصیت کو اُترتے ہُوئے دیکھا گیا تو سب ہی اُس کی جانب متوجّہ ہو گئے تھے۔

عادل حسین نے سب سے پہلے اجمل میاں کا تعارف احسان احمد ہی سے کرایا تھا اور احسان احمد نے بڑی محبّت سے اجمل میاں کا استقبال کیا تھا جس پر وہ ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئے، اور اُن کے رُخساروں پر آنسُو بہنے لگے۔

"ارے۔ ارے۔ یہ کیا ہو گیا بھئی؟" احسان احمد نے کہا۔

اور عادل حسین نے صُورتِ حال سنبھال لی۔

"اجمل بہت کچّے دِل کا مالک ہے باپ اور پھوپھی کے ساتھ زندگی گُزاری ہے افریقہ کی زندگی میں بھی بہت ہی معصُوم اور سادہ فِطرت رہا ہے محبّتیں جہاں بھی اُسے ملتی ہیں وہ آبدیدہ ہو جاتا ہے"

"نہیں میاں۔ تم یُوں سمجھ لو کہ اپنوں میں آ گئے ہو کوئی اُلجھن کی بات نہیں ہے اب تمھارا ایک گھر وہ ہے ایک گھر یہ ہے"

"جی انکل جان" اجمل میاں نے بھرائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

لڑکے اور لڑکیاں اِس عجُوبے کو اپنے حصّے میں آنے کا انتظار کر رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد اختر صاحب بنفسِ نفیس اجمل میاں کو لے کر اُن کے درمیان پہنچ گئے۔

"خواتین و حضرات! اختر حسین ولد عادل حسین آپ کی خدمت میں ایک نایاب تحفہ پیش کرتا ہے، اجمل حسین۔ تالیاں" لیکن کسی نے تالی نہیں بجائی تھی اور اجمل میاں احمقانہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے رہے تھے اُن کی نگاہیں ایک ایک فرد کا جائزہ لے رہی تھیں اور وہ شرما شرما کر دوہرے ہُوئے جا رہے تھے بڑی پذیرائی کی گئی اُن کی۔ شناء نے نُدرت کے کان میں کہا۔

"اللہ رکھی! یہ اختر کیا چیز لے آیا؟"

"شاید خُدا نے ہماری سُن لی"

"ہاں لگتا تو یہی ہے۔ بہت دِن سے بوریّت کا شکار ہو رہے تھے اب تو سارے ہی کردار فرسُودہ ہو گئے۔ ہر شخص اپنا کھیل تماشہ دِکھا کر پس منظر میں چلا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ اجمل میاں ہمارے کسی کام آ جائیں"

"آدمی تو کچھ شاندار لگتا ہے اگر یہ چہرہ ہٹا کر کوئی قاعدے کا چہرہ اُس کی جگہ لگا دیا جائے تو یقینی طور پر اُسے ایک عُمدہ شخصیت کہا جا سکتا ہے"

"چلو چھوڑو، چہرے مہُرے میں کیا رکھا ہے، بس جو کچھ چہرے پر نظر آ رہا ہے اللہ کرے اندر بھی وہی ہو تب بات بنے گی"

"ذرا احتیاط سے، چچا جان بڑی محبّت سے اِن کا تعارف کرا چکے ہیں اِس کا مطلب ہے کہ ابتداء میں اِس کا خیال کرنا پڑے گا"

"ہاں۔ ہاں وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ٹھنڈا کر کے کھانا بہتر ہے۔ ورنہ مُنہ جل جاتا ہے"

نُدرت اور شناء اُس کے بارے میں باتیں کرتی رہیں اُدھر اختر نے جیسے اجمل میاں کو اپنی ملکیت تصوّر کر لیا تھا کسی کو انھیں ہاتھ نہیں لگانے دے رہا تھا چائے کا دور چلتا رہا۔

ڈاکٹر نُعمان تنویر پر نگاہیں جمائے ہُوئے بیٹھا تھا۔ تنویر البتہ اُسی سادگی کے عالم میں تھی اور اُس نے ایک بار بھی ڈاکٹر نعمان کو نہیں دیکھا تھا اختر ہی نے ڈاکٹر نعمان کو ہوشیار کیا۔

"او بھائی ڈاکٹر، ذرا عقل کو بھی ساتھ رکھا کر مسلسل گھُورے جا رہا ہے جیسے چائے کے ساتھ اُسے ہی کھا جائے گا کسی اور طرف بھی دیکھ میرے بھائی۔ دوسرے لوگ تیری طرف متوجّہ ہوتے ہیں تو کچھ حیران سے ہو جاتے ہیں اور تجھے پتہ ہے کہ اگر وقت سے پہلے صورتِ حال سب کے علم میں آ گئی تو پھر یہ لوگ ایک لمبے بانس پر تجھے ٹانگ کر تجھ پر پتھراؤ شروع کر دیں گے"

"ن... نہیں بسس... سوری یار، بس کیا بتاؤں دِل بے قابُو ہو جاتا ہے اُنھیں دیکھ کر"

"دِل کے لئے کوئی عُمدہ قسم کی دوا تجویز کر لو میرے بھائی، ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے"

"ٹھیک ہے یار۔ ہمیشہ دھمکیاں ہی دیتے رہتے ہو ابھی تک کوئی کام کی بات تو نہیں کر سکے"

"میاں! کچھ دو، کچھ لو۔ اب ایسے ہی سب کچھ تو نہیں ہو جاتا ہے اور پھر ہم کوئی کاروباری آدمی تو ہیں نہیں، منت کرتے رہو انشاء اللہ پھل میٹھا ہو گا۔ فی الحال یہ گِرے فرُوٹ کھاؤ"

"لاحول ولاقوۃ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے"

"ڈاکٹر ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو" اختر نے کہا اُسی وقت اختر کو کسی نے آواز دے لی اور ڈاکٹر نعُمان ایک بار پھر تنویر کی جانب دیکھنے لگا تنویر کی نِگاہ بھی اُس وقت اتفاق سے ڈاکٹر نعمان ہی پر تھی نِگاہیں ٹکرائیں اور وہ ہنس پڑی۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔ لیکن ابھی مُعاملہ ڈِنر تک کے لئے تھا۔

چائے کی نشست برخاست ہو گئی تھی اور ڈِنر تک کا وقفہ طویل تھا سب کے دلوں میں اجمل میاں کے لئے کھلبلی مچی ہُوئی تھی بزرگوں کی موجودگی میں تو کوئی گڑبڑ نہیں کی جا سکتی تھی لیکن جونہی بزرگ اندر داخل ہُوئے سب اختر پر ٹوٹ پڑے اب وہ ذرا کھُل کر باتیں کرنے کے مُوڈ میں تھے۔ اختر نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی تھی۔ شناء نے کہا۔

"ڈیئر اختر! یہ سب کچھ آخر ہُوا کیسے؟"

"مطلب کیا ہے آپ کا شناء صاحبہ؟" اختر نے تیکھے لہجے میں پُوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ پہلے سے ہمیں کیوں نہ معلوم ہُوا؟"

"چھوڑیئے اِن باتوں کو میں ذرا اجمل میاں کو کوٹھی کا اندرونی حصہ دکھانے لے جا رہا ہوں" اختر نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"بہت اکڑ رہے ہو"

"اکڑنے کی کیا بات ہے بھئی۔ میرے معزز مہمان ہیں اجمل میاں ذرا انھیں یہاں سے روشناس کرا دوں" اختر نے کہا۔

"یہاں... یہاں کیا حرج ہے" اجمل بدقت تمام بولے۔ اور اختر چونک کر انھیں دیکھنے لگا۔

"مطلب" اس نے کہا۔

"یہیں ٹھیک ہے کوٹھی کا کیا دیکھنا۔ کوٹھی والوں کو دیکھنا زیادہ اچھا ہوتا ہے" جواب میں چاروں طرف سے واہ واہ کے نعرے بلند ہونے لگے اور اختر نے اجمل میاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ گویا اختر سے بغاوت۔ نتیجہ جانتے ہو"

"میں سمجھا نہیں ڈیئر اختر جان" اجمل میاں نے کہا اور ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"واہ اختر جان۔ اختر... اختر بھائی صحیح معنوں میں اجمل میاں نے آپ کو سمجھا ہے"

"اور آپ لوگ یاد رکھیئے۔ میں آپ سب کو سمجھ لوں گا"

"ارے چھوڑو، چھوڑو۔ ہر وقت تمھاری تڑی نہیں چل سکتی" ثناء نے کہا اور پھر براہ راست اجمل میاں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اجمل صاحب! آپ کسی کے دباؤ میں نہ رہیں آپ صرف اختر ہی کے نہیں، ہم سب کے مہمان ہیں کیا سمجھے"

"جی۔ بے حد... بے حد... بے حد شکریہ۔ مم... مگر ایک شکایت ہے آپ لوگوں سے" اجمل میاں نے کہا اور اختر آنکھیں پھاڑ کر انھیں دیکھنے لگا۔ ثناء نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"کیا شکایت ہے"

"میرا تعارف تو سب سے کرا دیا گیا لیکن آپ لوگوں کا تعارف نہیں ہوا یہ کچھ غیر اخلاقی سی بات ہے۔"

"میں کراتا ہوں" اختر آگے بڑھ کر بولا اور تمام لوگ اُسے دیکھنے لگے۔

"یہ مس ثناء ہیں احسان احمد صاحب کی بیٹی"

"ثناء جان" اجمل میاں بولے۔ اور تھوڑی سی گردن بھی خم کر دی۔ تمام لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے تھے۔

"جی ہاں، جی ہاں، ثناء جان" اختر جلدی سے بولا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" اجمل میاں نے اپنا لمبا چوڑا ہاتھ آگے بڑھایا اور ثناء جلدی سے پیچھے ہٹ کر بولی۔

"معافی چاہتی ہوں میرے ہاتھ میں کچھ تکلیف ہے مڑ گیا تھا"

"اور آپ" اس بار اجمل کا رُخ عصمت کی طرف تھا۔

"عصمت جان" اختر نے جلدی سے کہا۔

"بہت خوب آپ سے مل کر بھی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اور یہ خاتون" اختر ندرت کی طرف متوجہ ہوا تو ندرت جلدی سے ہاتھ آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

"آپا جان" اجمل میاں نے پہلی بار ندرت سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اور اختر ندرت کو گھورنے لگا۔

"آیئے، بقیہ لوگوں کا تعارف میں کرا دوں" ندرت نے جلدی سے اجمل میاں سے کہا تاکہ اختر کچھ اور نہ کہہ سکے۔

"شکریہ آپا جان" اجمل میاں نے نیاز مندی سے کہا۔ ہنسی اور قہقہے اُبھر رہے تھے اور بقیہ کام ندرت نے سنبھال لیا تھا بلاشبہ اُس نے اِس وقت اختر کی سازش ناکام بنا دی تھی غرض یہ کہ اجمل میاں اِس وقت سب ہی لوگوں کے لئے باعثِ تفریح بن گئے تھے خاص طور سے اُن کے جان کہنے کا انداز بہت دلچسپ تھا۔ دو تین ناموں کی تو انھوں نے خصوصاً مٹی پلید کی تھی جیسے خالد جان، اقبال جان وغیرہ وغیرہ۔ تنویر بے چاری فطرتاً بوکھلائی ہوئی تھی چنانچہ جب اجمل میاں نے اُس کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو تنویر نے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"کیا بدتمیزی ہے، میں ہاتھ واتھ نہیں ملاؤں گی۔ واہ۔ یہ کوئی بات ہوئی خواہ مخواہ کی حماقتیں" وہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ اندر بھی کچھ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں" ندرت نے کہا۔

"گویا آپ انھیں اندر لئے جا رہی ہیں"

"کیوں نہیں۔ آپا جان ہوں اِن کی" ندرت نے کہا۔ اور اجمل میاں ریشہ خطمی ہو گئے۔

"میری" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سو فیصدی۔ سو فیصدی" ندرت گردن ہلا کر بولی اور پھر اجمل میاں اُس کے ساتھ آگے بڑھ گئے وہ بڑی نیاز مندی سے ندرت کے ساتھ چل رہے تھے اور عقب میں اختر ندرت کو گھور رہا تھا۔ ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اختر صاحب! اپنے آپ کو سب کچھ سمجھ لینا مناسب نہیں ہوتا ویسے چھوڑیئے خیر اب ذرا بزرگوں سے تعارف ہو گا اجمل میاں کا لیکن یہ تو فرمایئے کہ یہ عجیب و غریب چیز آپ کے ہاتھ کہاں سے

لگ گئی۔"

"براہ راست امپورٹ کی ہے افریقہ سے۔ کیا سمجھیں"

"واقعی آپ کے چڑیا گھر میں ایک افریقی چیز کی کمی تھی" ثناء نے کہا۔

"چڑیا گھر۔ ہاں چڑیا گھر آپ نے بالکل دُرست کہا کچھ چڑیاں ابھی یہاں موجود ہیں اور اُس گھر تک نہیں پہنچیں میں خالد بھائی سے کہتا ہوں کہ جلدی سے چڑیا گھر مکمل کر لیں۔ چڑیوں کو لا کر پنجرے میں بند کر دیں تاکہ اُس کا حُسن نکھر جائے" اختر کی چوٹ پر سب ہنس پڑے اور ثناء بھی کھسیائے ہوئے انداز میں مسکرانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں تنویر پاؤں پٹختی ہوئی باہر آتی نظر آئی۔

"یہ ندرت باجی کو کیا ہو گیا ہے پتہ نہیں اُس بندر کو کہاں کہاں لئے پھر رہی ہیں۔ سب کو جان ہی کہہ کر پکارتا ہے"

"کوئی بات نہیں تنویر جان۔ اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے" اختر نے کہا اور تنویر غصیلی نگاہوں سے اُس کو گھورنے لگی۔

"دیکھیئے اختر بھائی۔ مم... مجھے... مجھے پلیز"

"اچھا، اچھا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ آیئے حضرات اندر ہی چلیں کام کی چیز تو وہ ندرت جان لے اُڑی ہیں خیر انھوں نے اپنے لئے جو حالات پیدا کر لئے ہیں اُن سے خود ہی نمٹیں گی۔ اُس گدھے کو آپا جان کے لغوی معنی نہیں معلوم"

تمام لوگ ہنستے رہے نعمان صاحب بھی اُن کے ساتھ شریک تھے تھوڑی دیر کے بعد نعمان نے اختر کے کان میں کہا۔

"یار اختر! تمھیں ذرا احتیاط کرنی ہے"

"کیا مطلب"

"بھائی، محتاط آدمی ہوں یہ شخص ذرا اُلٹی سیدھی چیز معلوم ہوتا ہے اور تمھیں معلوم ہے کہ میری ایک امانت تمھارے پاس محفوظ ہے"

"جی... جی... میں اُس امانت کا ٹھیکیدار ہوں کیا"

"ارے اختر بھائی۔ میرے تمھارے درمیان تو کوئی جھگڑا وغیرہ نہیں ہے میرا مطلب ہے کہ ہمارے تعلقات تو کافی بہتر ہیں۔ میں اگر اِس سلسلے میں تم سے کوئی مدد کی درخواست کرتا ہوں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے"

"ہاں۔ ہاں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ خیال رکھیں گے" اختر نے کہا۔

"میں تمھارا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ ویسے تنویر اُس شخص کی وجہ سے پریشان نظر آتی ہے"

"اب بہت زیادہ اُلٹی سیدھی باتیں مت کرو۔ کسی کو اندازہ ہو گیا تو شامت آ جائے گی"

"یار اختر جی چاہتا ہے تم سے بہت سی باتیں کی جائیں میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس سلسلے میں معاملات کیسے آگے بڑھائے جاتے ہیں کچھ تو کرو میرے لئے"

"کریں گے، کریں گے، جلدی اچھی نہیں ہوتی ابھی ایک اور معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے اُس سے نمٹ لیں۔ اُس کے بعد تمھارے بارے میں بھی سوچیں گے"

"کون سا کیس" نعمان نے سوال کیا۔

"بھئی شاید تمھیں اِس بارے میں معلوم نہیں کہ بہت جلد ایک کارروائی عمل میں آنے والی ہے"

"کیسے معلوم ہو؟ آپ لوگوں نے مجھے وہ حیثیت کب دی ہے جو آپ کو ایک دوسرے کے درمیان حاصل ہے"

"مطلب" اختر نے چونک کر پوچھا۔

"دیکھیئے ناں جو باتیں آپ لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں وہ مجھے کہاں معلوم ہو سکتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اپنے آپ کو آپ لوگوں میں ضم کر دوں"

"ڈاکٹر نعمان! بہت جلدی نہ کرو۔ ضم ہو جاؤ گے ہمارے درمیان بلکہ ہو چکے ہو۔ معاملہ اقبال اور عصمت کا تھا"

"اقبال اور عصمت، یعنی اقبال صاحب اور عصمت صاحبہ"

"جی ہاں۔ صاحب اور صاحبہ کا اضافہ کر کے جیسے تم نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے"

"میرا مطلب ہے قصہ کیا ہے"

"شادی کا قصہ ہے، بہت جلدی اِن لوگوں کو شادی کے بندھن میں جکڑ دیا جائے گا اور یہ ذمہ داری یہ خادم انجام دے رہا ہے"

"بہت اچھے انسان تک پہنچا ہوں میں۔ خدا تمھیں خوش رکھے ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک کرو..." ڈاکٹر نعمان نے کچھ اِس انداز میں کہا کہ اختر بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

"تمھارے ساتھ جو سلوک کروں گا میں وہ ذرا مختلف ہو گا۔ جلد بازی سے گریز کرو"

"جو حکم پیر و مرشد" ڈاکٹر نعمان نے گردن خم کر کے کہا۔ اور دونوں ہنسنے لگے۔

چند ہی روز میں اجمل میاں سب کی آنکھوں کا تارہ بن گئے تھے۔ اور یہ بات متفقہ طور پر

تسلیم کرلی گئی تھی کہ وہ درحقیقت معصوم ہیں شاید انھیں اِس زمانے کی ہوا ہی نہیں لگی۔ اُن کی فطرت میں کچھ خوبیاں تھیں جنھیں نظر انداز کردیا گیا تھا۔

مجموعی طور پر وہ سب ہی کے لئے پسندیدہ ہوگئے تھے۔ بے چاری دادی اماں جو ذہنی طور پر بس خیر دین سے متاثر تھیں۔ اور اس پر انھیں پیار آتا تھا اب اجمل میاں کی طرف متوجہ ہو گئیں تھیں کیونکہ وہ انھیں بڑے پیار سے دادی جان کہتے تھے، ذکیہ بیگم چچی جان تھیں احسان احمد چچا جان تھے غرض ہر شخص اجمل میاں کی جان تھا اور اجمل میاں کی دلکش شخصیت پر سب ہی جان دینے لگے تھے۔

فی الحال اگر کوئی شخصیت اُن سے فرار ہوتی تھی تو وہ تنویر کی تھی تنویر سے کوئی رشتہ تو قائم نہیں کرسکے تھے لیکن پیچھے اور سامنے وہ تنویر جان ہی تھی اور چونکہ عادل حسین کی کوٹھی میں اجمل میاں کا قیام تھا چنانچہ تنویر کچھ زیادہ ہی اُن کا نشانہ بننے لگی تھی باقی معاملات بھی بڑی دلچسپ حیثیت رکھتے تھے، مثلاً یہ کہ ندرت نے اجمل میاں کو متنبہ کرلیا تھا اور ابھی تک بے چارے اجمل میاں کو کسی نے یہ بتایا نہیں تھا کہ آپا جان کیا چیز ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب بھی اجمل میاں احسان احمد کی کوٹھی میں پہنچتے آپا جان کو تلاش کرلیتے اور خصوصی بات یہ تھی کہ ندرت نے انھیں تمھاری آپا جان کہہ کر رُوشناس کرایا تھا۔ اور اجمل میاں کو یہ مسرت تھی کہ دُنیا میں اور کچھ حاصل ہو نہ ہو ایک شخصیت تو اُن کی اپنی ہے جو کھل کر انھیں تمھاری کہنے کی اجازت دیتی ہے۔

غرض یہ کہ معاملات بڑے دلچسپ چل رہے تھے اختر ابھی کچھ دبا دبا سا تھا کیونکہ عادل حسین اُس کی فطرت سے واقف تھے اور اُسے دوسری بار بھی خصوصی طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ اجمل میاں کی سادگی سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ اِس سلسلے میں اختر کی خالد سے بحث بھی ہوچکی تھی۔

• ڈیڈی نے کہا تھا کہ اُس کی سادگی سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے میں اِس کا وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی فائدہ ناجائز نہ ہوگا لیکن خالد بھائی یہ کیسے ممکن ہے کہ جان سے پیارے اجمل میاں کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔"

• بھئی ڈیڈی کا معاملہ ہے تم سمجھ لو۔ میں اِس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد شاید کبھی نہ کرسکوں۔"

• میں اپنی مدد خود کرنے کا عادی ہوں۔" اُس نے مُنہ ٹیڑھا کرکے جواب دیا۔

فی الحال ابھی تک اجمل میاں کے ساتھ کوئی ایسی بات نہ ہُوئی تھی جو اُن کے لئے باعثِ پریشانی ہو اختر کا خیال تھا کہ ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے۔ جُمعہ جُمعہ آٹھ دِن تو را کھلا پلا لیا جائے صاحبزادے کو پھر اُس کے بعد اُن پر مشق شروع کی جائے گی لیکن اجمل میاں وقت سے پہلے ہی ایک ایسی حرکت کر بیٹھے کہ پھر اختر سے باز نہ رہا گیا۔ فطرتاً حُسن پرست واقع ہُوئے تھے اور اُن دونوں خاندانوں میں جتنی لڑکیاں اُن کے سامنے آئی تھیں وہ یکے بعد دیگرے سب ہی کو اپنے خوابوں میں سجا چکے تھے اور ایک ایک دِن ایک ایک کا خواب دیکھتے تھے ابھی یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون اُن کے خوابوں میں مستقل حیثیت اختیار کرتی ہے اور اِس سلسلے میں اُنھوں نے ایک لائحۂ عمل بھی بنایا تھا جس کے تحت انھیں یکے بعد دیگرے ایک ایک پر ٹرائی کرنا تھی۔

تنویر بے چاری چونکہ اُسی گھر میں رہتی تھی اور اجمل میاں نے سب سے پہلے اپنی قربت میں اُسے ہی پایا تھا چنانچہ اُن کی تمام تر توجہ تنویر کی جانب ہی تھی دولت کے انبار ساتھ لائے تھے۔ اور اِس سلسلے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا عادل حسین نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ ابھی ذرا اجمل میاں کو سکون کی سانس لینی چاہیئے۔ اُس کے بعد سوچا جائے گا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔

خود عادل حسین کے کاروباری معاملات کافی بہتر چل رہے تھے اور اقبال اُن کے لئے واقعی بہترین مُعاون ثابت ہُوا تھا۔ اختر اور خالد کو بھی دفتری اوقات میں آفس میں رہنا پڑتا تھا۔ اور کچھ ذمہ داریاں اُن کے سپرد بھی کردی گئی تھیں عادل حسین چاہتے تھے کہ وہ بھی کاروباری اُمور کو سمجھیں تاکہ مستقبل میں اِس کاروبار کو بہتر طریقے سے چلا سکیں بعض اوقات اجمل حسین صاحب بھی دفتر پہنچ جاتے تھے اور وہاں بھی اُن سے تفریح کا سامان پیدا ہوجاتا تھا لیکن عمومی طور پر وہ گھر پر ہی رہتے تھے اور اِس وقت بھی وہ گھر پر ہی تھے جبکہ تقریباً تمام ہی لوگ گھر سے باہر گئے ہُوئے تھے آج اجمل میاں کے ذہن میں کوئی خاص ہی پروگرام تھا، کیونکہ کمرے میں وہ کافی دیر تک اپنے حُسن و جمال کی تکمیل میں مصروف رہے تھے اور اُس کے بعد مُسکراتے باہر نکل آئے تھے۔ تنویر کو تو تلاش کرنا اُن کے لئے مشکل نہ ہُوا۔ اور تنویر انھیں کچن سے نکلتی ہُوئی مل گئی اجمل میاں اِس طرح کھڑے ہوگئے کہ تنویر کو ٹھٹک کر

رُک جانا پڑا۔

• تنویر جان! کچھ کام ہے آپ سے۔"

• کتنی بار کہا ہے میں نے آپ سے کہ ہر شخص کو جان نہیں کہتے، مجھے آپ کے مُنہ سے اِن الفاظ کو سُن کر سخت چڑ محسوس ہوتی ہے۔"

• لیکن اِس میں حرج ہی کیا ہے تنویر جان۔ مم۔ میرا مطلب ہے۔ وہی... وہی جو آپ چاہتی ہیں۔"

• پتہ نہیں کس احمق نے آپ کو یہ بات بتادی ہے کہ ہر شخص کو جان کہنا چاہیئے۔" تنویر تنک کر بولی۔

• میں تو سب ہی کو یہ کہتا ہوں۔"

• اگر آپ مجھے نہ کہیں تو آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔" تنویر دانت پیستی ہُوئی بولی۔ اور دفعتاً ہی اجمل میاں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

• میں سمجھتا ہوں۔ سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا۔"

• ایں کیا سمجھ گئے آپ؟" تنویر آنکھیں نکال کر بولی۔

• آپ اپنے اور میرے درمیان ایک انفرادیت چاہتی ہیں۔ تو آپ یقین کیجئے تنویر جان۔"

• صرف تنویر۔" تنویر ڈانٹ کر بولی۔

• اچھا اچھا ٹھیک ہے تو آپ یقین کیجئے مس تنویر کہ میرے اور آپ کے درمیان ایک انفرادیت ہے۔"

• خُدا کی پناہ۔ افریقہ سے چھوٹ کر آپ سیدھے اِدھر ہی کیوں آگئے کوئی اور جگہ نظر نہیں آئی تھی آپ کو۔"

• میں یہاں آکر بہت خوش ہوں۔"

• بہت سے لوگ ناخوش ہوگئے ہیں اُن کا کیا کریں گے آپ۔"

• میں انھیں بھی خوش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

• تو پھر سامنے سے ہٹ جایئے اور جلدی سے اِس کام کا آغاز کردیجئے۔"

• وہ میں آپ سے کچھ کہنے کا خواہش مند ہوں۔"

• کہیئے کہیئے۔ کہہ ڈالیئے۔"

• کچھ شرم آتی ہے۔"

• اگر شرم و حیا ہے آپ کو تو بہتر ہے کہ میرے راستے سے تو ہٹ جایئے۔"

• ایں۔" اجمل میاں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن جگہ اب بھی اِتنی نہیں رہی تھی کہ تنویر آگے بڑھ سکتی تھی اجمل میاں نے اپنی جیب سے ایک خوبصورت سا پیکٹ نکالا اور اُسے تنویر کے سامنے کرتے ہُوئے بولے۔

• میں آپ کے لئے ایک تحفہ خرید کر لایا ہوں۔"

• کیا؟"

• جی ہاں! براہِ کرم دیکھ لیجئے آپ کی پسند کے مطابق ہے یا نہیں۔"

اُنھوں نے ڈبّہ کھول دیا اندر بہت ہی حسین جڑاؤ آویزے تھے جن میں ننھے ننھے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ تنویر نے متحیّرانہ نگاہوں سے اُنھیں دیکھا پھر بولی۔

• یہ آپ میرے لئے لائے ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

• جی ہاں! صرف آپ کے لئے میں نے عالمِ خواب میں انھیں آپ کے کانوں میں جگمگاتے دیکھا ہے براہِ کرم قبول کرلیجئے۔"

• آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا۔ میرا آپ سے رشتہ کیا ہے جو میں آپ سے تحفے قبول کروں کیا سمجھتے ہیں آخر آپ مجھے۔"

• تنویر جان۔" اجمل میاں نے جواب دیا اور تنویر نے ڈبّہ اُن کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

• ٹھیک ہے۔ اب آپ نے مجھے آخری حد تک جانے کے لئے مجبور کردیا ہے اجمل صاحب! شام کو جب چچا جان آئیں گے تو میں یہ ڈبّہ اُن کے سامنے رکھ دُوں گی اور اُن سے کہوں گی کہ آپ نے یہ سب کچھ شروع کردیا ہے اِس کا کیا فیصلہ ہونا چاہیئے۔" تنویر پاؤں پٹختی ہُوئی اپنے کمرے کی جانب چل پڑی اور اجمل میاں اُس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اور جب مفہوم سمجھ میں آیا تو اُن کا چہرہ اُتر گیا وہ بوکھلائی ہُوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، پھر اُن کے مُنہ سے آہستہ سے آواز نکلی۔

• ارے باپ رے۔ چچ... چچا جان کے سامنے۔ تت... تو پھر... مم... مگر یہ تو..." وہ بوکھلاہٹ میں تنویر کے کمرے کی جانب بڑھے۔ لیکن پھر آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہُوئی اور ٹھٹک کر اُلٹے قدموں واپس چل پڑے۔

اُدھر تنویر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ غُصّے سے اُس کا بُرا حال تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ڈبّہ ضرور عادل حسین کے سامنے رکھ دے گی لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی اُسے ٹھٹک جانا پڑا سامنے ہی اختر ایک تپائی پر بیٹھا ہُوا تھا اور شرارت آمیز انداز میں داہنا پاؤں ہلا رہا تھا۔

• آپ، اختر بھائی آپ... آپ یہاں کیا کررہے ہیں اور آپ تو باہر گئے تھے؟"

• بھئی وقت سے کچھ پہلے گھر واپس آجانے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے۔"

"مم... مگر... یہ کمرہ میرا ہے"

"ہم نے کب کہا یہ کمرہ آپ کا نہیں ہے. بات سُنیئے آپ کے ہاتھ میں جو کچھ ہے ذرا اِدھر دکھایئے گڑیا جان"

"اختر بھائی! اچھا ہُوا آپ آگئے. آج فیصلہ ہو کر رہے گا مم... میں... میں..."

"اِدھر تو لایئے ذرا اسے میرے سامنے کیجئے" اختر نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہُوئے کہا اور تنویر نے ڈبّہ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"بہت خُوب صُورت ہیں"

"کچل کر پھینک دُوں گی خُدا کی قسم. آخر مجھے اجمل میاں نے سمجھا کیا ہے" تنویر غصیلے لہجے میں بولی اور اختر مسکراتا ہُوا اس ڈبّے میں رکھے آویزوں کو دیکھتا رہا پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ڈیئر تنویر! وہ بے چارہ بڑی محبّت سے یہ تحفہ تمہارے لئے لایا ہے"

"اختر بھائی! خُدا کی قسم اچھا نہیں ہوگا مجھے... مجھے کئی دن سے اُس کی حرکتیں ناگوار گزر رہی ہیں مم... میں..."

"صبر... صبر... عزیزہ ہم جو ہیں ہم کس کام آئیں گے یہ معاملات بڑوں تک پہنچانے کے بجائے اگر ہم تک پہنچا دیا کرو تو تمہارا ہی بھلا ہوگا باقی تمہاری مرضی اب دیکھو ناں بہت سے مسائل ہو سکتے ہیں مثلاً کوئی ڈبّہ تمہارے پاس دیکھے گا تو کیا تم سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ آخر تم نے اِس تحفے کو قبول کیسے کر لیا"

"مم... میں... میں نے قبول کر لیا" تنویر بکھر کر بولی۔

"تو پھر یہ تمہارے پاس کیوں ہے؟ ابھی کوئی بھی شخص اِسے تمہارے پاس دیکھ کر یہی سوچ سکتا ہے کہ تم نے اُس سے یہ تحفہ قبول کیا اب یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں تم نے فیصلہ بدل دیا ہو"

"ایں" یہ تنویر کا مُنہ حیرت سے کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔ اور پھر اُس کے چہرے پر بوکھلاہٹ نظر آنے لگی "یہ تو... یہ تو گڑبڑ ہو گئی. مم... مجھے یہ لینا نہیں چاہیئے تھا بلکہ ویسے ہی کہہ دینا چاہیئے تھا"

"تو پھر تم ثبوت کے طور پر کیا پیش کرتیں"

"کیا مطلب"

"بھئی وہ اِنکار بھی کر سکتا تھا کہ اُس نے ایسے کسی تحفے کی پیشکش تمہیں نہیں کی تھی" تنویر پھر سوچ میں ڈُوب گئی تھی۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑتے ہُوئے کہا۔

"اختر بھائی! میرا تو... میرا تو سر پھٹا جا رہا ہے. نہ جانے آپ نے یہ کیا چکر چلا دیا"

"ہر مرض کی دوا ہیں اختر جان. کیا سمجھیں. ہم سے رجوع کرو. عزیزہ. سب ٹھیک کر دیں گے" اختر نے ہنستے ہُوئے کہا. اور تنویر آہستہ سے بولی.

"تو پھر ٹھیک کر دیجئے نا اختر بھائی"

"ہاں... ہاں یہ ہُوا ناں کسی سے کام لینے کا انداز. اب تم بالکل بے فکر ہو جاؤ اور جو کچھ ہم کہیں اُس پر عمل کرو سب ٹھیک ہو جائیگا. بالکل اطمینان رکھو" اختر نے کہا اور تنویر سمجھنے والے انداز میں گردن ہلانے لگی.

○

رَداء کا وجود پُھنک رہا تھا. کوٹھی کے معاملات میں دلچسپی لینا ایک مجبُوری بھی تھی. اُس نے اپنے معمُولات میں جو تبدیلی کی تھی. اُس کے تحت یہ سب کچھ ضروری تھا اور اِس تبدیلی کے یقینی طور پر بہتر نتائج برآمد ہُوئے تھے.

لیکن وہ اپنی اِس بزدِل فِطرت کو کیا کرتی جو دِل کی بات کسی سے کہنے سے ہمیشہ روک دیتی تھی اور پھر یہاں کوئی اِتنا سنجیدہ تھا بھی تو نہیں تھا جسے اپنے مسئلے میں شریک کر کے اُس سے مشورہ کیا جا سکتا. وسیم جمال نے آج جو حرکت کی تھی وہ رَداء کے لئے ناقابِل برداشت تھی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے بہت سے فیصلے کئے تھے لیکن ہر فیصلے میں خوف کی ایک لہر بھی شامل ہوتی. اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد جب اُسے تنہائی نصیب ہُوئی تو دِل کی جلن حد سے زیادہ بڑھ گئی اور وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی.

"کتنی تنہا ہُوں میں، اِتنے بہت سے محبّت کرنے والوں کی موجودگی میں بھی کتنی تنہا ہُوں میں کیا کروں؟ کیا کرنا چاہیئے؟ کِس طرح اپنی ذات پر چڑھے ہُوئے اِس خول کو توڑ لُوں. کِس طرح انسانوں پر اعتماد کرنا سیکھوں؟ کِس پر اعتماد کروں؟ کون میرے لئے بہتر ثابت ہوگا حالانکہ سب ہی میرے چاہنے والے ہیں لیکن میرے مسائل کچھ اِتنے بڑھ چکے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کِس کِس کو ان مسائل میں مُبتلا کروں. آہ. کیا کرنا چاہیئے مجھے کیا کرنا چاہیئے"

بہت دیر اِسی پریشانی کے عالم میں گزر گئی کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی دفعتاً اُسے اپنے کمرے کے دروازے پر ایک زوردار آواز محسوس ہُوئی اور وہ اُچھل پڑی. ابھی بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا بس کوٹھی کے معمُولات ختم ہُوئے تھے سب لوگ اپنی اپنی آرام گاہوں میں چلے گئے تھے. وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھی اور اُس نے دروازہ کھول دیا پھر سامنے ہی دادی امّاں کو دیکھ کر حیران رہ گئی. دادی امّاں اُسے دیکھ کر مسکرائیں اور کہنے لگیں.

"معاف کرنا بیٹی. اِدھر سے گزر رہی تھی کہ پاؤں ایک دم مُڑ گیا

تمہارے دروازے کا سہارا لینے پر مجبُور ہو گئی تھی. سو تو نہیں گئی تھیں تم؟"

"نہیں دادی امّاں! بالکل نہیں. آیئے ناں اندر آیئے. کہاں نِکل گئی تھیں آپ"

"بس ذرا ایسے ہی کِسی کام سے نِکلی تھی. واپس اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ یہاں کم بخت پاؤں، یہ فرش بھی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چکنے ہو گئے ہیں. لوگ یہ نہیں سوچتے کہ یہ چلنے پھرنے کی زمین پر اِتنی پالش کرائی جاتی ہے میرا مطلب ہے کہ کسی کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے"

رَداء نے محبّت سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا.

"آیئے ناں" اور دادی امّاں مُسکراتی ہُوئی کمرے میں آ گئیں.

"بِلاوجہ تمہاری بھی نیند خراب کی مجھے اِس کا افسوس ہے"

"نہیں دادی امّاں! میں سوئی نہیں تھی"

"اچھا، کیا کر رہی تھیں؟ تم تو بیٹی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مصرُوف ہو گئی ہو. بالکل مَردوں کی سی ذمّہ داریاں سنبھال لی ہیں اچھی بات بھی ہے انسان اگر اپنے آپ کو کچھ بنا لے تو بہت ساری مصیبتوں سے محفُوظ ہو جاتا ہے"

"بس دادی امّاں! میرا دِل لگا رہتا ہے اِن کاموں میں ویسے آپ لوگوں کو میری وجہ سے..."

"چھوڑو بیٹا، چھوڑو. تم نے پہلے ہی ہمیں کافی ذلیل و خوار کیا ہے اپنے بارے میں کچھ نہ بتا کر. بہت بدسلوکیاں بھی ہُوئی ہیں اِس گھر میں. تمہارے لئے لوگوں نے نہ جانے کیا کیا سوچا ہے میں تو بس جب بھی اِس بارے میں سوچتی ہُوں بڑی شرمندگی کا احساس ہوتا ہے مگر بیٹے غلطی تمہاری بھی تھی. ہم تمہارے لئے غیر تو نہیں ہیں قسم لے لو جس کی دِل چاہے کہ اب تو بالکل یہ احساس بھی دِل سے نِکل گیا ہے کہ تم کسی غیر گھر کی بچّی ہو"

"دادی امّاں! مجھے اپنی تقدیر پر فخر ہے کہ میں آپ لوگوں کے درمیان ہُوں"

"کبھی کبھی تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچتی ہُوں رَداء. عمر کا یہ حصّہ اپنے بچّوں کے بارے میں اچھی اچھی باتیں سوچتے اور اُن کے لئے دُعائیں کرتے ہُوئے ہی گزرتا ہے. انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں، بچپن ہوتا ہے جو معصُوم سوچوں کا حامل رہتا ہے، اُس کے بعد جوانی آتی ہے اور کچھ نئی ذمّہ داریاں شانوں پر آ پڑتی ہیں. پھر اگر اللہ اِس کا موقعہ دے تو بچّے اور گھر ہوتے ہیں اور اُس کے بعد بُزرگ اُن کے لئے دُعائیں کرتے کرتے اپنے خاتمے کی دُعائیں مانگتے ہیں. میں اِس تیسرے مرحلے میں ہُوں. جوڑوں میں کچھ درد سا رہنے لگا ہے خُدا خُوش رکھے خیر دین کو، جب تک یہاں تھا کتنے پیار سے میری خدمت کرتا تھا میں تو اُس کی عادی ہو گئی تھی. مگر بڑا بے مروّت نِکلا. ایسی آنکھیں پھیریں طوطے کی طرح، اُمید نہ تھی اُس سے، دِل کا تو بڑا ہی سیدھا سچّا تھا. پتہ نہیں کیوں آنا جانا چھوڑ دیا؟ کسی سے کہوں گی کہ اُسے تلاش کر کے ملنے کے لئے تو لے آئے"

رَداء کے دِل پر ایک گھونسہ سا پڑ گیا تھا. نہ جانے کیوں خیر دین کا خیال اب اُس کے لئے ایک خوف سا بن گیا تھا اور پھر آج ہی تو اُسے دیکھا تھا آج ہی. رَداء سوچوں میں گُم ہو گئی دادی امّاں کہنے لگیں.

"آرام کرو بیٹی. مجھے بھی نیند آ رہی ہے"

"آیئے. میں آپ کو کمرے تک پہنچا دُوں" رَداء نے کہا.

"ارے نہیں بیٹا! خُدا نے ہمّت برقرار رکھی ہے جا رہی ہُوں کوئی بات نہیں ہے"

دادی امّاں چلی گئیں لیکن خیر دین... خیر دین. اُس کا ذہن گردان کرنے لگا پانی سے برآمد ہُوا تھا بالکل اِسی طرح جیسے ایک بار رشید کے سامنے آ کر اُس نے اُس کی مدد کی تھی اور آج بھی کچھ ایسی ہی صُورتِ حال تھی لیکن وسیم جمال...

رَداء کے جبڑے بھنچ گئے، کیا سمجھتا ہے وہ خود کو. بہت بڑا سرمایہ دار ہے بہت بڑا. لیکن تھوکتی بھی نہیں میں اُس کے سرمائے پر. حد سے آگے بڑھ گیا ہے. اُس کی یہ جُرأت، اُسے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے. نقصان ہوتا ہے تو احسان لمیٹڈ کا ہوگا. میری جیب میں تو کچھ نہیں آ رہا. میں وفاداریوں کو اِس حد تک نہیں لے جا سکتی کہ میری اپنی ذات داغ دار ہو جائے ٹھیک ہے وسیم جمال کے بارے میں فیصلہ کر لینا ہے مجھے، وہ سمجھتا کیا ہے خود کو، بہت سے دیکھے ہیں ایسے.

اُس کا تصوّر گھوم کر پھر تصوّر تک پہنچ گیا اور رَداء کے دِل میں ایک اور خیال اچانک پیدا ہُوا. تصوّر نے اُسے وسیم جمال کے ساتھ دیکھا اور کچھ ایسے الفاظ ادا کئے جس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اُس نے کچھ اور ہی سمجھا ہے "نہیں تصوّر ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، غلط فہمیوں کا شکار تو نہ ہو" اُس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ سی نِکلی اور اپنی اِس آواز پر وہ خود ہی چونک پڑی اُس نے سوچا کہ تصوّر آخر اُس کے لئے ایسی کیا اہمیت رکھتا ہے؟ دوسرے بہت سے کرداروں کی طرح وہ بھی اُس کی زندگی میں آیا ہے. اور اِن کرداروں کو بلاشبہ ایک اہمیت دینا پڑی ہے لیکن اِتنی بھی نہیں کہ کسی کے سامنے مجبُور ہو جایا جائے. کیا مجھے تصوّر سے مِلنا چاہیئے؟

میں نے اُس سے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں ذہنی طور پر کسی اور سے وابستہ ہوں کیا آج اُسے اِس بات کا یقین نہ ہو گیا ہو گا کہ میرا کہا درست تھا حالانکہ... حالانکہ۔ اُسے یکایک احساس ہُوا کہ اُس کے رُخسار بھیگ رہے ہیں اور اِن بھیگے ہُوئے رُخساروں کو اُس نے فوراً ہی صاف کر لیا۔

" آخر مجھے رونے کی کیا ضرورت ہے؟ کس کے لئے رو رہی ہُوں میں۔ اپنی تنہائی پر اپنی بے بسی پر؟ وسیم جمال کی اِس حرکت پر یا تصوّر کی غلط فہمی پر، مگر کیوں؟ میں اِن سب کے سامنے اِتنی بے بس کیوں ہو گئی ہُوں؟ مجھے اپنا جائزہ لینا چاہیئے خواہ مخواہ اپنی شخصیت کو مِٹا رہی ہُوں۔

اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ غُسل خانے میں جا کر مُنہ ہاتھ دھویا بالوں میں بے اختیارانہ انداز میں کنگھا کیا حالانکہ اِس وقت اِس کی ضرورت نہ تھی اور پھر اپنی مسہری پر آ کر بیٹھ گئی۔

تیمور گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کی پرورش جس بہتری سے ہُوئی تھی اُس کے لئے رُداء ہمیشہ ثناء کی احسان مند رہتی تھی یہ ثناء ہی تھی جس نے اُسے کراچی آنے کے بعد بھرپور سہارا دیا تھا اور دُنیا بھر کی ٹھوکروں سے بچا لیا تھا۔ ورنہ یہاں آ کر وہ نہ جانے کس طرح اپنی زندگی کا آغاز کرتی۔ نہ جانے اِن کوششوں میں کس طرح کامیاب ہوتی۔ دُنیا تو بُرائیوں سے بھری پڑی ہے۔ کیا یہ بُرائیاں میرا دامن نہ پکڑ لیتیں مگر ثناء... اُس نے اپنا ذہن ثناء سے ہٹایا تو دوسرے معاملات پر آ گیا اور لے دے کر آخری تصوّر... تصوّر ہی کا رہ گیا۔ تب اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

" دیکھو رُداء! دِل کے تقاضے بے شک اہمیت رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ہر شخص ایک سا نہیں ہوتا اب عُمر نے تجھے تجربہ دیا ہے تو کم از کم اِس سوچ کو ذہن سے نِکال کہ دُنیا میں صرف ثاقب بھرے ہُوئے ہیں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں تاں اِس دُنیا میں۔ مرد اور عورتیں۔ تجھے احسان احمد بھی تو مِلے ہیں ثناء بھی تو مِلی ہے۔ اِن میں سے کون کتنا بُرا ہے؟ کِس نے کِس کے ساتھ کتنی بُرائیاں کی ہیں اگر ایک بھی ایسی بُرائی ہوتی تو سامنے آ جاتی کچھ تو بُرائی تیرے سامنے ضرور آتی۔ اِس کا مطلب ہے کہ سب بُرے نہیں ہوتے۔ بہتر ہے کہ ایک بُرے کے سامنے ہر شخص کو بُرا نہ سمجھو، تصوّر سے ملاقات کرو۔ کم از کم اُسے ذہنی طور سے تو مطمئن کر دو۔ مگر کیوں؟ آخر اُس سے مجھے لینا کیا ہے؟ میں نے اپنی زندگی کا ایک راستہ بنایا ہے۔ ملازمت کر رہی ہُوں اور اگر وقت نے ساتھ دیا تو شاید اپنے طور پر بھی اپنے لئے کچھ کر دوں۔ یقیناً اِس میں دیر لگے گی۔

لیکن کوئی بات نہیں ہے۔ احسان احمد صاحب کو وسیم جمال کے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔

ذہن کی اِس بات پر وہ بالکل متفق ہو گئی تصوّر اگر وسیم جمال کے لئے دِل میں کوئی تصوّر رکھتا ہے تو یہ غلط فہمی خود بخود ہی دُور ہو جائے گی میں اپنی ذات کو اِتنا پست نہیں کر سکتی کہ اب اُسے یہ بتانے دوڑی جاؤں کہ وسیم جمال کا معاملہ کیا ہے کیوں بتاؤں میں اُسے!

اور اِس فیصلے کے بعد وہ سونے کی کوشش کرنے لگی اور اُسے اُس میں کامیابی حاصل ہو گئی۔

دوسری صبح کافی سکون تھا۔ تیاریاں کرنے کے بعد وہ آفس چل پڑی اور تھوڑی دیر بعد آفس میں داخل ہو گئی اپنے معمولات کو اُس نے خوش اُسلوبی سے نمٹانا شروع کر دیا۔ دفتر سے متعلق لوگوں سے جو اُس کے پاس پہنچے بڑی نرم خوئی سے گفتگو کی اُس کے انداز کی تبدیلی کو سب ہی نے خوشگوار انداز میں محسوس کیا تھا اور اِس طرح رُداء کو کچھ اور قربتیں حاصل ہو گئی تھیں، پھر دِن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اُس نے احسان احمد کو ٹیلی فون کیا اور احسان احمد کی آواز سنائی دی۔

" ہاں بھئی، کیا بات ہے رُداء بیٹے "

" انکل آپ کے پاس آنا چاہتی ہُوں کوئی مصروفیت؟ "

" کوئی بہت اہم مصروفیت نہیں ہے آ جاؤ " احسان احمد صاحب نے کہا۔ اور رُداء اُن کے آفس کی جانب چل پڑی۔ احسان احمد صاحب نے مُسکراتے ہُوئے اُس کا استقبال کیا تھا پھر اُنھوں نے رُداء کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور رُداء بیٹھ گئی۔

" ہاں بھئی! تمھارے ہاتھ میں کوئی فائل وغیرہ نہیں ہے اِس کا مطلب ہے کہ کوئی اور بات ہے "

" ہاں انکل! آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہُوں "

" تو کہو۔ ہچکچا کیوں رہی ہو؟ " احسان احمد بولے۔

" وسیم جمال کے بارے میں گفتگو کرنا ہے "

" اوہو۔ وسیم جمال بڑے کام کی چیز ہے اور یُوں لگتا ہے جیسے قُدرت نے اُسے ہمارے بارے میں سوچنے کی خاص طور سے ہدایت کی ہے۔ جو نئے پروگرام ہیں اُس کے وہ بہت منافع بخش ہے "

" یقیناً انکل! اور میں دِل و جان سے یہ چاہتی ہُوں کہ احسان لمیٹڈ کے کاروبار میں دِن رات ترقی ہو۔ لیکن انکل وسیم جمال کے بارے میں کچھ کہنا اب میرے لئے ناگزیر ہو گیا ہے " احسان احمد اُس کے لہجے پر کسی قدر چونک پڑے پھر آہستہ سے بولے۔

" کوئی خاص بات ہے؟ "

" ہاں انکل! ابتداء ہی سے وہ مجھ سے کچھ اِس انداز میں گفتگو کرتا رہا ہے جیسے مجھے صرف مینیجر نہ سمجھتا ہو... بلکہ دوستی کے زُمرے میں لانا چاہتا ہو۔ دوستی بُری چیز نہیں ہے انکل، لیکن میں اِن دوستیوں کی قائل نہیں ہُوں جو ہوٹلوں یا نائٹ کلبوں تک لے جائیں "

" کیا مطلب؟ " احسان احمد کا مُنہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔

" میرے الفاظ کا مفہوم وہی ہے انکل جو آپ نے سمجھا وسیم جمال ابتداء ہی سے مجھے یہ تاثر دیتا رہا ہے کہ وہ میرے لئے ناگزیر ہے کیونکہ احسان لمیٹڈ کو وہ بہت بڑا بزنس دے رہا ہے۔ اُس نے مجھے یہ بھی پیش کش کی کہ اگر میں چاہُوں اور محسوس کروں کہ کسی وقت احسان لمیٹڈ کو چھوڑنا پڑے تو یہ فیصلہ وقت سے بہت پہلے کر لُوں آج کر لُوں اور اُس نے مجھ سے اور بھی بہت سی باتیں کہیں انکل، جنھیں میں نظر انداز کرتی رہی، صرف اِس تصوّر کے تحت کہ اُس سے احسان لمیٹڈ کو کچھ فائدے حاصل ہو رہے ہیں۔ لیکن انکل! اُس نے میری ذات کو بالکل ہی کچلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ مجھ سے اب اِس انداز میں گفتگو کرنے لگا ہے کہ وہ گفتگو مجھے ناگوار گزرتی ہے انکل۔ کل وہ میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد دھوکا دے کر مجھے ساحلِ سمندر پر لے گیا اُس نے میری گاڑی کے کوائل کے تار نکال دیئے اور جب مجھے یہ احساس ہُوا کہ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے تو اُس نے خود مجھے چھوڑنے کی پیش کش کی اور اُس کے بعد ساحلِ سمندر پر جا کر بے ہُودہ گفتگو کرنے لگا اُس کا کہنا ہے کہ وہ مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے لیکن انکل یہ کسی طور ممکن نہیں ہے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انکل یہ سب کچھ میرے لئے انتہائی مشکل ہے۔ آپ کو یہ صُورتحال سنبھالنا ہو گی میں اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی " احسان احمد دیر تک سوچ میں ڈُوبے رہے پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

" رُداء بیٹے! میں بہت شرمندہ ہُوں لیکن قصُور میرا بھی نہیں ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے کیا احسان احمد لمیٹڈ کے لئے ایسے لوگوں سے فائدہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ خُدا کے فضل سے ہماری فرم اِتنی کمزور نہیں ہے کہ ہم کسی ایسے ذریعے سے... لاحول ولا قوۃ۔ اُس کمینے انسان سے میں آج ہی بات کرتا ہُوں۔ اُس کی یہ جُرأت کیسے ہُوئی۔ سمجھا کیا ہے اُس نے اپنے آپ کو۔ میری عزّت پر ہاتھ ڈالا ہے اُس نے، برباد کر دُوں گا میں اُسے " احسان احمد بپھرنے لگے تو رُداء نے آہستہ سے کہا۔

" نہیں انکل... میرا خیال ہے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اُس سے بات کریں اُسے سمجھائیں کہ یہ سب کچھ مناسب نہیں ہے۔ انکل میں خود بھی بہت کچھ کر سکتی ہُوں لیکن بس میں نے آپ کو یہ سب کچھ بتا دینا ضروری سمجھا جب میرے بزرگ موجود ہیں تو مجھے بھلا قدم بڑھانے کی کیا ضرورت ہے "

" بالکل ٹھیک کیا بیٹے اور تم بالکل اطمینان رکھو۔ میں سب ٹھیک کر لُوں گا " احسان احمد نے کہا اور اُس کے بعد وہ ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھا کر وسیم جمال کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔

" میں چلتی ہُوں انکل " رُداء نے کہا اور احسان احمد نے گردن ہلا دی۔

رُداء کو اُن کے کمرے سے باہر نِکلنے کے بعد بہت سکون کا احساس ہُوا تھا اور اپنے اِس فیصلے پر وہ خوش تھی۔

*

اِس وقت اختر کے گھر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن عادل حسین صاحب نے اُسے ایک آؤٹ ڈور کام سے بھیجا تھا۔ اور اُس کے بعد اُسے فُرصت تھی چنانچہ اُس کام کی تکمیل کے بعد بس یُونہی گھر چلا آیا تھا۔ سوچا تھا کہ کچھ دیر آرام کرے گا۔ اچانک ہی اُس کی نظر اُن دونوں پر پڑی تھی اور اختر کی رگِ شرارت پھڑک اُٹھی تھی وہ چوروں کی طرح اُن دونوں کے قریب پہنچا تھا۔ لیکن پھر اُن کی گفتگو سُن کر ایک جگہ آڑ میں ہو گیا تھا اُسے اجمل صاحب کے اِس اقدام پر حیرت بھی ہُوئی تھی اور ہنسی بھی آئی تھی گویا اجمل نے کُھلنا شروع کر دیا۔

اِس دوران میں اختر کو کم از کم اِتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ اجمل گہرا آدمی نہیں ہے بلکہ جس قدر سادہ وہ نظر آتا ہے درحقیقت اِتنا ہی سادہ ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ عُمر کا یہ حصّہ ایسی ہی باتوں کے لئے مخصُوص ہوتا ہے اور کوئی بھی اُن سے خالی نہیں ہوتا لیکن نِگاہِ انتخاب تنویر پر پڑے گی اجمل صاحب کی۔ اِس کا اختر کو اندازہ نہیں تھا یا پھر اِس بات کے بھی امکانات تھے کہ چونکہ تنویر اِس گھر میں ہی ہے اِس لئے اجمل صاحب نے سوچا ہو گا کہ چلو کوششیں شروع کر دی جائیں تاہم کم از کم اجمل کی اِس حرکت کو اِس حد تک ناخوش گوار نہیں محسوس کرتا تھا ویسے تفریح کا بہترین موقعہ ہاتھ آیا تھا اجمل صاحب کا یہ رُخ اختر کو بہت بھایا تھا اور اُس نے ایک ہی لمحے میں بہت سے فیصلے کر لئے تھے۔ بات تنویر کی تھی جو بالکل ہی گاؤدی تھی اور اِن معاملات میں قطعی کوری۔

ویسے نُعمان کا مسئلہ بھی کافی دلچسپ ہو گیا تھا کیونکہ وہ بھی تنویر کے مسئلے میں اختر کی ہر وقت خوشامدیں کرتا رہتا تھا اور ابھی تک شاید تنویر نے اُس پر توجہ نہیں دی تھی یا پھر وہ اِس قسم کی لڑکی ہی

نہیں تھی کہ ایسی باتوں پر توجہ دیتی۔ ویسے بھی اختر نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت ہی سادہ فطرت کی مالک ہے۔ اُس کی باتیں بہت ہی سادہ ہوتی ہیں۔

اُس کے بعد اختر اپنی اِسی شرارت کے زیرِ تحت تنویر کے کمرے میں گھسا تھا دروازہ کھلا ہُوا تھا اور اُس میں آسانی بھی تھی اُسے اندازہ تھا کہ تنویر تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنے کمرے میں پہنچ جائے گی۔ اُس کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔

اُس کے بعد تنویر کی اور اختر کی گفتگو ہُوئی اور اختر نے وہ تحفہ اپنے پاس محفوظ کرلیا۔ تنویر کو اُس نے سمجھا دیا تھا کہ ابھی وہ اِس سلسلے میں بات عادل حسین صاحب تک نہ پہنچائے۔ اب اُس کے بعد اجمل صاحب کی خبر لینی تھی چنانچہ وہ اجمل کے کمرے کی جانب چل پڑا۔

اجمل ایک کرسی پر پریشان سا بیٹھا ہُوا تھا اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔ اختر کو دیکھ کر بُری طرح اُچھل پڑا۔ اور پھر اُس کے حلق سے بھرائی ہُوئی آواز نکلی۔

"اختر جان"

"ہیلو جانِ جاناں" اختر نے مسکراتے ہُوئے کہا اور پھر چونک کر بولا "کیوں کیا بدہضمی ہوگئی ہے؟"

"بدہضمی۔ بات ذرا کچھ ثقیل نہیں ہے۔"

"میرا مطلب ہے پیٹ خراب ہوگیا ہے۔" اختر نے کہا اور اجمل چونک کر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا پھر تعجب سے بولا۔

"نہیں تو... کہیں سے بھی خراب نہیں ہُوا"

"بیٹھ جاؤ پیارے بھائی، بیٹھ جاؤ" اختر نے کہا اور اجمل بیٹھ گیا۔

"چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" اجمل کا ہاتھ ایک بار چہرے پر گیا اور پھر بوکھلاتے ہُوئے کہا "تمھارا مطلب ہے اختر جان۔ تمھارا مطلب ہے کہ..."

"اوّل تو یار تُو نے ہم سب کے ناموں کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے"

"سب یہی کہتے ہیں آخر میں نے کیا کیا ہے آپ لوگوں کے ناموں کا"

"یہ جان کے بغیر کام نہیں چلتا؟"

"اِس میں کوئی حرج ہے اختر جان"

"حرج تو نہیں ہے مگر تم نے سب کی پوزیشن خراب کردی ہے۔ چلو چھوڑو اپنی سُناؤ"

"مم... میں ایک بہت بڑی... مم... مصیبت میں پھنس گیا ہُوں"

"اچھا" اختر نے آنکھیں پھاڑدیں۔

"براہ کرم سنجیدگی سے میرے کیس پر غور کرو اختر بھائی جان"

"ویری گڈ۔ دیکھو یہ تبدیلی مجھے پسند آئی یعنی اختر بھائی جان۔ تم آئندہ مجھے یہی کہہ کر مخاطب کیا کرو"

"بھائی کے اضافے سے ساری بات بن جاتی ہے"

"ہاں، بہتر ہے کہ یہ اضافہ تم ہر شخص کے ساتھ کردو"

"یعنی کہ... یعنی کہ خواتین کے ساتھ بھی؟"

"کیا حرج ہے، ذرا ندرت پیدا ہوجائے گی میرا مطلب ہے تبدیلی" اختر نے جلدی سے کہا۔

"ہُوں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر۔ میرا مذاق مت کروانا۔ خواتین کو بھائی جان کہنا کیسا لگے گا"

"لُطف آجائے گا اجمل میاں۔ تم کہہ کر تو دیکھو سب کے تاثرات تبدیل ہوجائیں گے"

"یہ لوگ مجھ پر ہنستے ہیں"

"تم ہنسی کا کیا مطلب سمجھتے ہو میرا مطلب ہے ہنسی کا کیا مطلب ہے؟"

"مذاق اُڑاتے ہیں"

"نہیں۔ یہی تو غلط فہمی ہے تمھاری عزیزِ من۔ ابھی تک افریقہ میں رہتے رہے ہو خالص افریقی ہوگئے ہو"

"وہ کک... کیسے؟" اجمل کا ہاتھ ایک بار پھر اپنے چہرے پر پہنچ گیا۔

"خیر ابھی رنگ اِتنا کالا نہیں ہُوا ہے میرا مطلب ہے کہ تم ہماری باتوں کو نہیں سمجھ پاتے۔ ہنسنے کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ صرف مذاق ہی اُڑایا جائے انسان خوش ہوکر ہنستا ہے تمھاری باتوں پر اِن سب کو مسرت ہوتی ہے"

"اوہ۔ مم... مجھے اِس سے اختلاف ہے"

"کیوں؟"

"ایک خاتون ایسی ہیں جنھیں میری باتوں سے کوئی مسرت نہیں ہوتی"

"نام بتاؤ اُن کا ٹھیک کرکے رکھ دُوں گا"

"نن... نہیں ایسی کوئی بات میں نہیں چاہتا۔ بب... بس میرا مطلب ہے کہ اُنھیں، اُنھیں..."

"تفصیل بتاؤ۔ پیارے ورنہ گڑبڑ ہوجائے گی"

"اختر بھائی جان۔ گڑبڑ تو ہوگئی ہے" اجمل میاں نے کہا۔

"ہُوا کیا؟"

"وہ دراصل میں نے تنویر جان کو... مم... میرا مطلب ہے تنویر بھائی جان کو ایک تحفہ پیش کردیا تھا" اجمل میاں نے کہا اور اختر نے بڑی مشکل سے اپنا قہقہہ ہضم کیا۔

"تحفہ؟"

"ہاں۔ میں نے اُنھیں ایک تحفہ دے دیا تھا اور وہ اُس پر ناراض ہوگئیں اُنھوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ تحفہ چچا جان کو دِکھا دیں گی اور شاید میری شکایت بھی کریں گی۔ پپ۔ پیارے بھائی اب کیا ہوگا اگر اُنھوں نے وہ تحفہ چچا جان کو دِکھا دیا تو؟"

"کان پکڑ کر اِس کوٹھی سے نِکال دیئے جاؤ گے یہاں ایسی باتوں کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے اور اُن کے لئے شدید احتیاط برتنا پڑتی ہے، مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے وہ تحفہ تنویر جان کو بلکہ تنویر بھائی جان کو دیا کیوں تھا؟" اختر نے سوال کیا۔

"بس۔ وہ مجھے اچھی لگتی ہیں"

"کہیں محبت وحبت تو نہیں ہوگئی اُن سے؟" اختر نے سوال کیا اور اجمل میاں گردن کھجانے لگے پھر بولے۔

"نہیں، محبت تو نہیں ہُوئی بس وہ اچھی لگتی ہیں مجھے"

"اِس سے پہلے کہیں کسی کو پسند کیا ہے؟"

"نہیں اختر بھائی جان، وہ دراصل افریقہ میں تو کوئی اِس قابل ہوتا ہی نہیں تھا۔ ایک مس ہیلن آئی تھیں ہمارے علاقے میں اُن سے ذرا دوستی ہوگئی لیکن وہ شادی شدہ تھیں ذرا بعد ہی میں پتہ چلا اور اُس کے علاوہ کبھی کوئی ایسی نوبت ہی نہیں آئی۔ مم۔ مگر اختر بھائی جان۔ معافی چاہتا ہُوں بے تکلفی کی معافی چاہتا ہُوں۔ میرا دِل بہت چاہتا ہے کہ میں کِسی سے محبت کروں"

"ہاں... ہاں ہر شریف انسان کو کسی نہ کسی سے محبت کرنی چاہیئے"

"مگر کیسے، مجھے تو اِس کا صحیح طریقہ ہی نہیں آتا۔ میں نے یہی سوچ کر اُنھیں تحفہ دیا تھا کہ اگر اُنھوں نے بخوشی یہ تحفہ قبول کرلیا تو پھر اُن سے محبت کا آغاز کردُوں گا"

"دھت تیرے کی۔ ابے کِس اُستاد کا شاگرد ہے؟" اختر نے کہا اور اجمل میاں چونک کر اُنھیں دیکھنے لگے پھر بولے۔

"کک... کیا مطلب، میں سمجھا نہیں"

"صاحبزادے! اِس سلسلے میں اُستادی شاگردی ضروری ہوتی ہے تم عشق کرنا چاہتے ہو"

"عشق۔ یعنی وہ صحراؤں والا اور پہاڑوں والا"

"جی نہیں۔ اب نہ آپ کو کوئی صحرا میں جانے دے گا۔ اور نہ پہاڑ کھودنے کی اجازت ایسے مِل سکتی ہے اب تو پہاڑ ڈائنامائیٹ سے اُڑائے جاتے ہیں اور صحراؤں میں ریت اُڑتی ہے کیا سمجھے تم؟"

"ج... جی ہاں۔ جانتا ہُوں"

"چنانچہ یہ علم ہوگیا تمھیں کہ تمھیں کون سا عشق کرنا ہے"

"عشق تو بہت بڑی چیز ہے۔ میرا مطلب ہے عشق کے قصے اور کہانیاں بڑا مشکل کام ہے اختر جان"

"خالی اختر جان نہیں اختر بھائی جان"

"وہی۔ وہی۔ میرا مطلب ہے وہی بالکل وہی"

"تو پھر کیا چاہتے ہو؟"

"صرف محبت کرنا چاہتا ہُوں"

"اُس سے کیا ہوگا؟"

"شش... شادی۔ میرا مطلب ہے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی ہے۔ دراصل اختر بھائی جان۔ میں نے وہاں افریقہ میں رہ کر یہی سوچا کہ یہاں تو یہ کالی کلوٹیاں زندگی حرام کردیں گی اور میں اِن کے جال میں پھنس کر رہ جاؤں گا۔ اپنا وطن اپنا ہی وطن ہوتا ہے یہاں رہ کر میں زندگی کی ساری خوشیاں سمیٹ لینا چاہتا ہُوں۔ یہیں شادی کروں گا اور پھر یہیں رہُوں گا"

"ہُوں۔ تو تم محبت شادی کے لئے کرنا چاہتے ہو"

"بب... بالکل۔ بالکل"

"اور تنویر کو تم نے نشانہ بنایا ہے"

"جی ہاں۔ بب... بُری نہیں ہے وہ"

"اچھا، ایک بات بتاؤ"

"جی" اجمل میاں جلدی سے بولے۔

"اِس کے لئے تنویر ہی بہت ضروری ہے" اختر کے اِس سوال پر اجمل میاں گہری سوچ میں ڈُوب گئے پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"آپا جان بھی بُری نہیں ہیں۔ اُنھوں نے خود مجھ سے تمھاری آپا جان کہا تھا"

"کیا؟" اختر آنکھیں نکال کر بولا۔

"آپ آپا جان کو نہیں جانتے؟"

"تمھاری آپا جان کو؟"

"ہاں وہی وہی"

"جانتا ہُوں" اختر ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"وہ بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ مگر ذرا اُن سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی بہت تیز طبیعت کی مالک ہیں"

"نہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ تو بہت نرم دِل خاتون ہیں، بہت ہی محبت کرنے والی" اختر نے جواب دیا۔ اور اجمل میاں کسی گہری سوچ میں ڈُوب گئے پھر بولے "وہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر اب اُس کا کیا ہوگا وہ جو میں نے تحفہ دیا ہے؟"

"واپس لینا چاہتے ہو وہ تحفہ"

"تحفے کی کوئی بات نہیں ہے اگر اُنھوں نے وہ تحفہ چچا جان

کے سامنے پیش کر دیا تو واقعی گڑ بڑ ہو جائے گی۔ کیا سوچیں گے وہ میرے بارے میں؟"

"یہی سوچیں گے کہ افریقی ہے۔"

"افریقی ہونا تو خیر کوئی بُری بات نہیں ہے مگر انھیں یہ کرنا نہیں چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتیں کہ میرا تحفہ واپس کر دیتیں، نہ لیتیں۔ آپ... آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے اختر بھائی جان؟"

"ہوں، کر سکتا ہوں۔ لیکن ایک شرط پر۔"

"کیا؟"

"آپا جان سے اظہارِ عشق کر دو گے۔"

"ارے بب... باپ رے۔ م... مشکل کام ہے۔ کیا میں انھیں کوئی تحفہ پیش کر دوں؟"

"ابے گھامڑ، تحفے وغیرہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے پہلی بات تم سے یہ کہی ہے کہ شاگردی کر و مجھے اپنا اُستاد بناؤ اس کے بعد میں تمھیں بتانا پسند کروں گا کہ تمھیں کیا کیا کچھ کرنا چاہیئے۔"

"ہوں۔ تو پھر تنویر جان کا مسئلہ کیا رہے گا؟"

"کچھ سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تھوڑی سی رقم خرچ ہو جائے گی۔"

"رقم کی آپ فکر نہ کریں اختر جان۔ میرا مطلب ہے اختر بھائی جان۔ رقم وقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے میرا خیال ہے آپ تنویر جان کو انکل جان کے پاس جانے سے روک دیں۔"

"روکوں گا، روکوں گا۔ مگر تم... تمھارے بارے میں کافی غور کرنا پڑے گا اجمل میاں۔ یہ بات تم نے مجھ سے پہلے نہ کہی ورنہ میں شاید تمھارے لئے کچھ شروع ہی کر دیتا لیکن ابھی اس وقت تک اپنے طور پر کچھ مت کرنا جب تک میں تم کو تفصیلات نہ بتاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔ وعدہ کرتا ہوں۔" اجمل میاں نے کہا مگر پھر بولا "لیکن تنویر بھائی جان کا مسئلہ۔"

"ہوں۔ تنویر جان کے مسئلے کو میں کسی نہ کسی طرح حل کرتا ہوں۔"

"آپ نے رقم کی بات کہی تھی۔ چیک دے دوں؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔ لے لوں گا تم سے۔ ویسے سُنو تم فوراً ہی تنویر کا پیچھا مت چھوڑ دینا خاص طور سے اس وقت جب لوگ جمع ہو جائیں تمھیں تنویر کی جانب متوجہ ہونا ہے، اُس سے ہلکی پھلکی باتیں بھی کر لینا۔"

"اور اگر انھوں نے کوئی سخت قدم اٹھایا تو؟"

"نہیں اٹھائے گی، اُستاد کس کام آئیں گے آخر تمھارے۔"

"اختر بھائی جان۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوؤں گا۔"

"ٹھیک ہے آرام کرو۔" اختر نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ اُس کے ذہن میں ایک شرارت کلبلا رہی تھی۔ آپا جان یعنی نُدرت صاحبہ اور اجمل میاں کا عشق، نُدرت نے بہت بڑا تیر مارا تھا اپنے آپ کو اجمل میاں کی زبانی آپا جان کہلوا کر۔ اگر یہ تیر واپس اُن کی جانب نہ اُلٹ گیا تو پھر اختر نام ہی کیا۔ اختر نے دل ہی دل میں سوچا ایک بار پھر اُس نے تنویر سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ تنویر کا معاملہ کافی دلچسپ تھا اور اِس وقت انتہائی فرصت تھی۔

نُعمان کے مسئلے میں البتہ اختر سنجیدہ تھا ڈاکٹر نُعمان ایک نفیس انسان تھا اور اُس نے کُھل کر اختر سے اپنی پسند کا اظہار کر دیا تھا۔ دل ہی دل میں اختر نے سوچا تھا کہ اگر تنویر کا مسئلہ بھی حل ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ ابراہیم صمدانی صاحب کی ساری اُلجھنیں دُور ہو جائیں گی اور ویسے بھی ڈاکٹر نُعمان بے حد اچھا انسان تھا اور اختر کو بے پناہ پسند بھی۔ اب یہ تنویر کی سادگی تھی کہ وہ ڈاکٹر نُعمان کی احمقانہ کوششوں کے باوجود اُس کی طرف راغب نہ ہُوئی تھی حالانکہ اختر اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوششیں کر چُکا تھا لیکن ابھی تک اُن کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہُوا تھا اور اِس وقت اُس کے ذہن میں جو شرارت کلبلائی تھی۔ اُس کے تحت ہو سکتا ہے تنویر نُعمان کی جانب متوجہ ہو جائے۔

چنانچہ وہ پھر تنویر کے کمرے میں داخل ہو گیا، وہ بدستور خاموش بیٹھی ہُوئی تھی۔

"ارے تم ابھی تک سوچ میں ڈُوبی ہُوئی ہو اور پریشان بیٹھی ہو۔"

"ن... نہیں اختر بھائی۔ اب تو پریشان نہیں ہوں آپ نے جو کچھ کہا ہے وہی کروں گی۔"

"میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے اُس میں تھوڑی سی ترمیم بھی کرنا پڑے گی تمھیں۔ میرا خیال ہے تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو تنویر۔"

"کیوں نہیں اختر بھائی۔ میں تو آپ پر بہت اعتبار کرتی ہوں۔"

"تو ایک ترکیب بتاتا ہوں میں تمھیں، دیکھو دُہرے فائدے والی بات ہے اگر تم نے ڈیڈی کو وہ تحفہ پیش کر دیا اور انھیں یہ ساری تفصیل بتا دی تو پوزیشن اجمل ہی کی نہیں تمھاری بھی خراب ہو جائے گی۔"

"میری کیسے خراب ہو جائے گی؟"

"میں تم سے کہہ تو چُکا ہوں ناں کہ آخر تحفہ تمھارے پاس ہی اور اِس سلسلے میں اجمل اگر چالاکی سے کام لے تو بات تم پر اُلٹ سکتی۔"

"لیکن آپ نے تو کہا ہے کہ آپ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔"

"بالکل نہیں ہونے دُوں گا۔ اِس سلسلے میں ایک تھوڑی سی ترمیم پیش کرنی ہے اپنے پروگرام میں۔"

"جی فرمایئے۔"

"ڈاکٹر نُعمان کو دیکھا ہے تم نے؟"

"ہاں ہاں کئی بار دیکھا ہے۔" تنویر حیرت سے بولی۔

"کیسا آدمی ہے؟"

"بس ٹھیک ہیں۔"

"میرا مطلب ہے تمھیں پسند ہے؟" اختر نے کہا اور تنویر کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا پھر وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"پسند سے آپ کی کیا مُراد ہے؟"

"میرا مطلب ہے تم اُس سے نفرت تو نہیں کرتیں؟"

"میرا بھلا اُنھوں نے کیا بگاڑا ہے جو میں اُن سے نفرت کروں۔"

"جب آدمی کسی سے نفرت نہیں کرتا تو کیا کرتا ہے؟"

"محبت کرتا ہے۔ دو ہی چیزیں تو ہوتی ہیں نفرت یا محبت۔"

"تو ثابت ہُوا تم اس سے نفرت نہیں کرتیں۔"

"بالکل نفرت نہیں کرتی۔"

"اِس کا مطلب ہے محبت کرتی ہو۔" اختر نے کہا اور تنویر کا مُنہ ایک بار پھر بھاڑ سا کُھل گیا۔

"ایں محبت۔ نہیں محبت بھی نہیں کرتی۔ وہ میرے لگتے کون ہیں؟"

"ہوں۔ یہ ہُوئی ناں درمیانی بات۔ لیکن ڈیئر تنویر اب تم اُن سے محبت کرو گی۔"

"کک... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"اُفوہ سمجھا کرو۔ اوّل تو واسطہ ایسے ایسے کوڑھ مغزوں سے پڑا ہے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اختر بھائی۔ کیا سمجھ میں آئے میرے۔" تنویر روہانسے لہجے میں بولی۔

"او بے وقوف لڑکی! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سُنو، تم اپنی آنکھوں میں نشہ پیدا کر سکتی ہو؟"

"کک... کیا مطلب ہے آپ کا؟ کک... کیا میں شراب پیتی ہوں۔"

"اُونہہ۔ وہ شراب کا نشہ نہیں۔ محبت کا نشہ ہے، محبت کا۔"

"جی نہیں۔ میں کوئی نشہ وشہ کرنا نہیں جانتی۔"

"اچھا کسی کو میٹھی نگاہوں سے دیکھا ہے تم نے؟"

"آنکھوں میں شکر ڈال کر۔ مگر شکر ڈالنے سے تو آنکھیں ہی بند ہو جاتی ہیں۔"

"جی۔ جی... جی بالکل دُرست فرمایا آپ نے۔ میں نے اِس نکتے پر سوچا ہی نہیں تھا مطلب یہ کہ تم کسی کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھو کوئی چھوٹا سا ننھا سا بچہ تمھیں پسند آ جائے تو تم اُسے کیسی نگاہوں سے دیکھتی ہو۔ ذرا آنکھیں بنا کر بتاؤ۔" اور تنویر اختر کی ہدایت پر محبت بھری آنکھیں بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے ارے توبہ... توبہ یہ تم کدھر دیکھ رہی ہو۔ کیا بیک وقت تمھیں دو سمتوں میں نظر آ رہا ہے۔"

"ج... جی... نظر آ رہا ہے۔"

"اور یہ آپ کے محبت سے دیکھنے کا انداز ہے۔"

"ن... نہیں۔ یہ تو نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم اِس دُنیا میں کچھ نہیں کر سکو گی میرا مطلب ہے کہ اگر تمھاری کسی سے دوستی ہو جائے اور تم اُسے دیکھو تو تمھاری آنکھیں کیسی ہوں گی۔"

"مجھے کیا معلوم، کوئی آئینہ تھوڑا ہی ہوتا ہے ہر وقت میرے ہاتھوں میں۔"

"اچھا خیر چھوڑو اِن باتوں کو ذرا تم ڈاکٹر نعمان سے مُسکرا کر کچھ باتیں کر لیا کرو۔"

"کیوں؟" تنویر مشتبہ انداز میں بولی۔

"اِس طرح اجمل میاں کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ سوچیں گے کہ تم ڈاکٹر نُعمان سے محبت کرتی ہو اور وہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور تمھاری جان بچ جائے گی۔" تنویر اِس نکتے پر غور کرنے لگی پھر بولی۔

"اچھا۔ تو اِس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی اختر بھائی؟"

"اور کسی ترکیب کو سوچنے کی ضرورت کیا ہے، بس یہ تو ایک کھیل ہو گا۔ ڈاکٹر نُعمان سے تم ذرا محبت سے بات کرو گی اور اجمل میاں کو یقین آ جائے گا کہ یہاں اُن کی دال نہیں گلے گی۔ چنانچہ وہ مایوس ہو جائیں گے اور تمھارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ اِس سے آسان نسخہ میرے علم میں نہیں ہے۔" تنویر نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا کر لُوں گی۔"

"مگر ہوشیاری سے ایسا نہ ہو کہ تم سے یہ کام نہ ہو سکے۔"

"نہیں نہیں اب اتنی بے وقوف بھی نہیں ہُوں۔"

"بالکل بے وقوف نہیں ہو۔ میں اِس بات پر یقین رکھتا ہُوں۔"

"آپ بالکل اطمینان رکھیئے۔ ذرا دیکھیئے تو سہی میں کیا کر کے دکھاتی ہُوں آپ کو۔"

"جیتی رہو، جیتی رہو۔ بس یُوں سمجھ لو کہ کام بن گیا۔"

"بس ٹھیک ہے اختر بھائی، بالکل ٹھیک ہے۔" تنویر نے سر ہلا کر کہا اور وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اختر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہُوا باہر نکل آیا تھا۔

احسان احمد کا رابطہ وسیم جمال سے ہوگیا اور وسیم جمال احسان احمد کی آواز پہچان کر بولا۔

"ہیلو۔ او ہو۔ احسان احمد صاحب۔ فرمائیے کیسے مزاج ہیں؟"

"ٹھیک ہوں۔ کیا تم مجھ سے ملاقات کر سکتے ہو؟"

"جب حکم دیں حاضر ہو جاؤں۔"

"بہتر یہ ہوگا کہ ابھی آجاؤ۔"

"آرہا ہوں۔" وسیم جمال نے جواب دیا اور احسان احمد صاحب نے فون بند کر دیا۔

وہ وسیم کا انتظار کرتے رہے۔ رداء نے جو کچھ کہا تھا وہ اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھا اور وہ اُس سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ رداء کی فطرت کو اچھی طرح جانتے تھے اپنی وفاداریوں کو انتہائی حد تک پہنچا دینے کی عادی، ضدی لڑکی جس نے نہ جانے کیا کچھ ٹھکرا کر یہ زندگی قبول کی تھی۔

وہ دُنیا کی ہر شئے پر لعنت بھیج سکتے تھے رداء کی عزت و آبرو کے لئے۔ کسی بھی طور وہ رداء کو شناء سے کم نہیں سمجھتے تھے اپنی فطرت کی مطابقت سے بھی، اور رداء کی حقیقت جاننے کے بعد شدید تر ہوگئی تھی اُن کا ذہن غصّے سے کھول رہا تھا۔

وہ وسیم جمال کا انتظار کرتے رہے اور تھوڑی دیر بعد وہ اُن کے اردلی کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔

"تم جاؤ اور اندر کسی کو نہ آنے دینا۔" اُنھوں نے اردلی سے کہا اور وسیم مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

"کہیئے احسان احمد صاحب۔ کیسے یاد فرمایا؟ ہمارے معاملات تو بہتر سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔" احسان احمد نے خونی نگاہوں سے وسیم کو دیکھا اور آہستہ سے بولے۔

"چیمبر آف کامرس کی میٹنگ کے بعد تم نے کیا بدتمیزی کی تھی۔" وسیم احمد اُن کے طرزِ تخاطب پر حیران رہ گیا وہ یہ کبھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ احسان احمد اس لہجے میں اُس سے بات کر سکتے ہیں۔ تاہم گھاگ آدمی تھا سنبھل کر بولا۔

"میں سمجھا نہیں احسان احمد صاحب۔"

"تم نے رداء کی گاڑی خراب کی اور اُسے اپنی گاڑی میں چھوڑنے کی پیش کش کی تھی اور اُس کے بعد اُسے ساحلِ سمندر پر لے گئے تھے۔" احسان احمد بدستور سرد لہجے میں بولے۔

"اوہ۔ وہ جی ہاں، بس شرارت کرنے کو جی چاہا تھا تو میں نے مس رداء کے ساتھ یہ شرارت کر ڈالی۔"

"رداء کو جانتے ہو وہ کون ہے؟"

"اپنی مس رداء ناں۔ اُنہی کی بات کر رہے ہیں ناں آپ احسان احمد صاحب۔" وسیم بے باکی سے بولا۔

"ہاں۔ اُسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیا رداء صاحبہ نے آپ سے شکایت کی ہے میری؟"

"تمہارا کیا خیال تھا وہ تم سے مرعوب ہو جائے گی وسیم جمال! تم رداء کو اچھی طرح جانتے نہیں ہو۔"

"جاننا چاہتا ہوں احسان احمد صاحب آپ ہمارا راستہ کیوں روک رہے ہیں؟"

"تم شاید مجھے بھی نہیں جانتے۔"

"احسان احمد صاحب! اب جب کہ یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچ ہی گئی ہے تو میں بھی اپنے الفاظ پر مُلمّع نہیں رکھنا چاہتا۔ آپ کا کیا خیال ہے میں بے وقوف آدمی ہوں جو کام میں نے آپ کے سپُرد کیا تھا اُسے اپنے طور پر نہیں کر سکتا۔ آپ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ میرا اس طرح لاکھوں کا فائدہ ہو سکتا تھا مگر میں نے یہ بزنس آپ کے ذریعے کیوں کیا؟"

"اب تک نہیں سوچا تھا اب جاننا چاہتا ہوں۔" احسان احمد صاحب غرّاتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"اگر دماغ کو تھوڑا سا ٹھنڈا رکھیں اور دوستانہ انداز میں گفتگو کریں تو بہت سے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔ یہ ایک سچائی ہے احسان احمد صاحب کہ میں نے یہ سب کچھ رداء کے لئے کیا تھا۔ اُس سے پہلی ہی نگاہ میں بُری طرح متاثر ہوگیا تھا۔ وہ اتنی ذہین زیرک اور سمجھدار لڑکی ہے اگر مجھ جیسے کسی شخص کی زندگی میں شامل ہو جائے تو ہم کاروبار کی دُنیا میں انقلاب لا سکتے ہیں اور یہ تصور بُرا نہیں ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں صرف اُس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہوں۔ اور کسی قسم کی بدتمیزی کرنا چاہتا ہوں تو خدا کے لئے یہ خیال ذہن سے نکال دیں۔ میرے دل میں رداء کی بڑی عزت ہے۔ میں بڑا احترام کرتا ہوں اُس کا، اور اس احترام کے ساتھ انتہائی احترام کے ساتھ آپ کو اپنی یہ پیش کش دینا چاہتا ہوں احسان احمد صاحب۔ میں رداء سے شادی کا خواہش مند ہوں آپ حکم دیں گے تو میں رداء سے اُس وقت تک نہیں ملوں گا جب تک کہ ہم دونوں کی شادی نہ ہو جائے۔ میں اُس سے کسی قسم کی کوئی بدتمیزی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو ایک انسانی جذبہ ہے جو میرے دل میں اُس کے لئے پیدا ہوگیا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا احسان احمد صاحب کہ میں اُس سے عشق کرنے لگا ہوں لیکن اگر عشق کو فرسودہ روایات سے نکال لیا جائے تو

پھر صرف پسند رہ جاتی ہے اور میں رداء کو حد سے زیادہ پسند کرتا ہوں اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

جہاں تک میرے علم میں آچکا ہے۔ آپ اس کے سرپرست ہیں وہ آپ کے پاس رہتی ہے۔ سُنا ہے بے سہارا ہے اگر آپ اُسے میری زندگی میں شامل کر دیں تو آپ کا اپنا فرض بھی پورا ہو جائے گا کہیں نہ کہیں تو آپ اُس کے بارے میں فیصلہ کریں گے ہی۔ میرے بارے میں معلومات حاصل کر لیجئے اتنا بُرا انسان نہیں ہوں جو کچھ میں نے رداء کے ساتھ کیا اُسے اتنی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ آپ رداء سے بھی پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے صرف اُس کے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کی تھی ایک جُملہ بھی ایسا نہیں کہا جو نازیبا ہو۔ ہاں جو کچھ اور اُس نے کہا وہ ایک سچائی ہے اور اُس کے لئے اگر آپ چاہیں تو میں آپ سے اور اُس سے دونوں سے معذرت کر سکتا ہوں۔" احسان احمد صاحب اُسے گھورتے رہے پھر اُنھوں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"یہ الفاظ تم سے کس نے کہے کہ وہ بے سہارا ہے؟"

"اس سے بھی میرا مطلب آپ غلط نہ لیجئے گا۔ میری بات سے مُراد یہ ہے کہ خود اُس کے اہلِ خاندان میں کوئی نہیں ہے۔ اور وہ آپ ہی کے ساتھ پرورش پا رہی ہے میرا مطلب ہے رہتی ہے۔"

"دیکھو وسیم جمال! کسی کو اپنی زندگی کے لئے منتخب کرنا میرے خیال میں بُری بات نہیں ہے اس کے لئے کچھ طریقۂ کار ہوتے ہیں۔ اُس کے بزرگوں سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے، رشتہ دیا جاتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ تمھارے پاس کوئی بزرگ نہیں ہے۔ لیکن پہلے تو اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دو کہ رداء کے اہلِ خاندان میں کوئی نہیں ہے وہ جو کچھ ہے میں تمھیں اُس کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا لیکن سب سے بڑا سرپرست اُس کا میں ہوں اور میں ہی اُس کی زندگی کے بارے میں فیصلے کر سکتا ہوں۔ لیکن اِس کے لئے جو طریقۂ کار تم نے انتخاب کیا وہ انتہائی غیر شریفانہ ہے یہ سوچ کر تو میں تمھیں معاف کر سکتا ہوں کہ تمھارے بزرگ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی تمھیں یہ سب کچھ نہیں بتا سکا، چونکہ تم نے پہلی بار یہ حرکت کی ہے اس لئے میں تمھاری اس حرکت کو معاف کر سکتا ہوں اوّل تو یہ کہ اس کے بعد تم رداء کے سامنے آنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ دوئم میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں صاحبزادے کہ رداء اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کے لئے آزاد ہے۔ میں صرف اُسے ایک سرپرست کی حیثیت سے مشورے دے سکتا ہوں اور فیصلہ وہی ہوگا جو خود رداء کرے گی۔ کم از کم تمھارے سلسلے میں اُس کے فیصلے کو میں جان چکا ہوں چنانچہ یہ مشورہ تمھیں دیتا ہوں کہ تم یہ خیال اپنے دل سے نکال دو، رداء اگر کسی طرح بھی تمھیں قبول کرتی تو تمھاری شکایت مجھ سے نہ کرتی وہ مجھے بتا چکی ہے کہ تم اُس سے مدعائے دل کہہ چکے ہو۔ اِس جرأت کو بھی تمھاری ناسمجھی سمجھ کر معاف کیا جا چکا ہے۔ لیکن آخری وارننگ میں تمھیں یہی دیتا ہوں کہ اب رداء کی طرف آنکھ اُٹھانے کی جُرأت نہ کرنا۔"

"کمال ہے احسان احمد صاحب! آپ نے تو میری حیثیت ہی دو کوڑی کی کر کے رکھ دی۔ ہمارے آپ کے درمیان روابط ایسے نہیں ہیں کہ ہم اِس طرح قطع تعلق کر لیں اور رداء سے قطع تعلق کرنے کا مطلب یہی ہے کہ ہمارے آپ کے سارے کاروبار منسوخ ہو گئے کیا آپ یہ کرنا پسند کریں گے؟"

"افسوس یہ جُملے میں ترتیب وار تم سے کہنا چاہتا تھا۔ لیکن تم اس میں پہل کر گئے۔ میں اِسے اپنا خسارہ سمجھتا ہوں جناب وسیم جمال صاحب آپ اِس غلط فہمی کو دِل سے نکال دیجئے کہ احسان لمیٹڈ سے اپنے کچھ کاروبار کرا کے آپ نے احسان لمیٹڈ پر کوئی احسان کیا ہے، آپ جیسے بے شمار لوگ احسان لمیٹڈ کے ذریعے کاروبار کرتے ہیں۔ اور اُن کی حیثیت اِس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ وہ صرف ایک کاروباری ہیں۔ میں آپ پر اور آپ کے اِن سودوں پر لعنت بھیجتا ہوں اور آپ سے پہلے اُنھیں منسوخ کرنے کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔ خیر میں اُسے اَنا کا مسئلہ نہیں بناتا آپ نے یہ بات کہہ دی میں نے مان لی۔ اِس کے بعد آپ اِس دفتر کے دروازوں کی جانب بھی رُخ نہ کیجئے گا ورنہ چپراسی اتنے مضبوط ہیں آپ کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر آپ کو یہاں سے روانہ کر دیں گے۔ اپنے تمام کاغذات آپ چاہیں تو اِسی وقت لے جا سکتے ہیں یا بعد میں منگوا لیجئے گا۔ رداء کا جہاں تک مسئلہ ہے تو اُس کے فیصلے سے آپ آگاہ ہو چکے ہیں مزید کوئی کوشش آپ کے لئے جس قدر نقصان دہ ہو سکتی ہے اس کا تجربہ نہ کریں تو بہتر ہے۔" وسیم جمال کا چہرہ اب سنجیدہ ہو گیا تھا اُس نے احسان احمد صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں آپ نے احسان صاحب! میں تو گنجائش چھوڑنا چاہتا تھا۔ رداء کے اور میرے مسئلے کو آپ ہم دونوں تک ہی رہنے دیجئے آپ اُس کے باپ نہیں ہیں اِس لئے میں آپ کو کسی بھی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ سودے منسوخ ہو چکے ہیں۔ کاغذات کی مجھے پرواہ نہیں ہے لیکن جہاں تک رداء کا معاملہ ہے میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اِن ہدایات کے بارے میں سوچوں، دل نہ مانا تو معذرت خواہ ہوں اجازت چاہتا ہوں۔" وسیم جمال اُٹھا اور رُکے بغیر دروازے سے باہر نکل گیا۔

احسان احمد ملتجی نگاہوں سے دروازے کو دیکھتے رہے تھے۔ پھر اُن کے چہرے پر تشویش کی ایک ہلکی سی لہر پیدا ہوئی اور اُس کے بعد اُنھوں نے کرسی کی پشت سے گردن ٹکادی اور آہستہ سے بڑبڑائے۔

"یہ سب کچھ تمھارے لئے اِتنا آسان نہیں ہوگا وسیم جمال میں نے اب تک انسانوں سے صرف بھلائی کے بارے میں سوچا ہے لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ تم جیسے لڑکے مجھے ہراساں کردیں ٹھیک ہے فیصلہ ہوجائے گا۔"

*

آج کی شام احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں تھی اور معمول کے مطابق تمام لوگ کوٹھی پہنچ چکے تھے۔ لان پر رونق جاری تھی۔ ویسے موسم میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہوگئی تھی۔

اِس وقت موسم بے حد خوشگوار تھا۔ اختر حسبِ معمول چہکتا پھر رہا تھا کہ اُسے دُور سے ہی ڈاکٹر نعمان کی کار نظر آگئی اور وہ دوسرے لوگوں کو غچہ دے کر آگے بڑھ گیا۔ گیٹ پر ہی اُس کی کار میں بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نعمان نے کار پارک کی اور اختر کی جانب دیکھتے ہُوئے کہا۔

"کہئیے اختر صاحب! سب خیریت ہے ناں؟"

"ہاں بھئی! ڈاکٹر صاحب خیریت تو ہے لیکن اختر حسین ولد عادل حسین آج کل عجیب سی کیفیات کا شکار ہوگئے ہیں یُوں لگتا ہے جیسے محبتوں کی ٹھیکیداری کر رہے ہوں۔ دوستی میں بعض اوقات آدمی بڑا عجیب ہوجاتا ہے۔"

"سمجھا نہیں، سمجھائیے۔"

"سمجھ لو عزیزم سمجھ لو اور قدر کرنا ہماری اِس محبت کی۔ کیا سمجھے؟"

"آپ کی محبت کی تو میں دِل سے قدر کرتا ہُوں اختر صاحب! یہ آپ ہی ہیں جنھوں نے مجھے زندگی کی اِس دِل کشی سے رُوشناس کرایا ہے، پہلے ہی عرض کرچکا ہُوں کہ بڑی خُشک اور سادہ سی زندگی گزار رہا ہُوں۔ ایک طرح سے لاوارث ہی سمجھ لیجئے ہر چند کہ بہت سے لوگوں کی محبتیں حاصل ہیں مجھے لیکن اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے کبھی کبھی بڑی کمی کا احساس ہوتا ہے مجھے۔"

"پُوری ہوجائے گی۔ فکر کیوں کرتے ہو جانِ من۔ ہم جو ہیں تمھارے لئے لو اِسے سنبھالو" اختر نے ایک تعویذ جیب سے نِکال کر ڈاکٹر نعمان کو دیتے ہُوئے کہا۔

"اِس پُڑیا میں کیا ہے؟"

"اِسے جادُو کی پُڑیا کہتے ہیں ڈاکٹر جان، آپ کی دوا دارو بہت سے امراض میں کام آتی ہے اور آپ بڑے تیر بہ ہدف نُسخے لکھا کرتے ہوں گے لیکن یہ زندگی کا ایک الگ شعبہ ہے۔ آپ اِس جادُو کی پُڑیا کے بھی کمالات دیکھئے اِس کو عُرفِ عام میں تعویذ کہتے ہیں۔"

"تعویذ؟"

"جی ہاں! تعویذِ محبت۔ نقشِ سلیمانی محبوب آپ کے قدموں میں وغیرہ وغیرہ بابا اُطرم شاہ سے خاص طور پر آپ کے لئے حاصل کیا ہے اور اِس پر بڑے بھاری اخراجات ہُوئے ہیں اب دوستی میں آپ سے کیا وصُول کیا جائے رکھ لیجئے اِسے کوٹ کی جیب میں دِل کے آس پاس۔"

"مگر اِس سے کیا ہوگا اختر بھائی؟" نُعمان نے پُوچھا۔

"محبوب آپ کے قدموں میں۔ محبوب کی توجہ حاصل کرنے کا سب سے شاندار نُسخہ بابا اُطرم شاہ زندہ باد۔"

"یار تعویذوں کے بارے میں سُنا تو ہے اور ہمیشہ ہی مُسکرا دیا ہُوں۔ طبّی نُقطۂ نِگاہ سے یہ انسانی فِطرت کی ایک کمزوری ہے البتہ کلامِ الٰہی سے منحرف نہیں ہُوں بڑے بڑے کام بنا دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے میرا کام بھی بن جائے۔"

"اب جاؤ اور اِس تعویذ کے کمالات دیکھو۔"

"آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"ارے میاں چھوڑو۔ جائیں گے کہاں۔ تمھارے ساتھ ہی ہیں۔" اور پھر دونوں ٹہلتے ہُوئے لان کی جانب بڑھ گئے۔

نُعمان کا معمول کے مطابق خیر مقدم کیا گیا اور اُس کے بعد چائے کا دور چلا اختر جان بُوجھ کر نُعمان کے پاس سے ہٹ گیا تھا اور دُور سے تنویر کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحات تو تنویر کو کوئی احساس ہی نہ ہُوا۔ غالباً وہ اختر کی ہدایات کے بارے میں بھُول چکی تھی لیکن پھر اُسے فوراً ہی خیال آگیا اور یہ خیال اجمل میاں کو دیکھ کر آیا تھا۔ جو اُس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اور اُسے دیکھ رہے تھے تنویر کو اجمل میاں کی صُورت دیکھ کر غُصہ آگیا اور پھر فوراً ہی اختر کی ہدایات یاد آئیں اور وہ گردن اُٹھا کر نُعمان کو تلاش کرنے لگی۔ ڈاکٹر نعمان اُس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا تنویر نے مُسکرا کر اُسے دیکھا اور ڈاکٹر نعمان گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تب ہی تنویر نے ایک ڈِش اُس کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا۔

"آپ یہ لیجئے ناں نعمان صاحب" اور نُعمان کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ پھر گھبرائے ہُوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ تنویر نے خود ہی اُس کی پلیٹ میں کھانے کی اشیاء ڈالیں اور ڈش رکھ کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

کچھ فاصلے پر بیٹھی ثناء نے مُنہ پھاڑ کر تنویر کو دیکھا تھا نعمان بوکھلائے ہُوئے انداز میں تنویر کی دی ہُوئی چیز جلدی جلدی ہڑپ

کرنے لگا اور ثناء کی ہنسی چھُوٹ گئی۔ لیکن شکر تھا کہ ڈاکٹر نعمان اِس وقت اُس کی جانب متوجہ نہیں تھا ورنہ نروس ہو جاتا اُس نے جلدی جلدی تمام شئے ہڑپ کی اور اُسی وقت تنویر نے ایک دوسری ڈِش اُٹھالی تھی۔

"اِس میں سے بھی کچھ لیجئے" تھوڑے فاصلے پر بیٹھے اختر نے بھی سر پکڑ لیا تھا۔ اُسے اِس بات کی اُمید نہیں تھی کہ تنویر آج ہی اپنی تمام نوازشات نُعمان پر خرچ کردے گی۔ تنویر ڈاکٹر نعمان کی خاطر کرتی رہی کئی بار اُس نے مُسکرا کر نُعمان کو دیکھا تھا ایک بار اُس کی آنکھیں بھینگی بھی ہوگئی تھیں غالباً اُسے یاد آگیا تھا کہ اُسے محبت بھری نِگاہوں سے ڈاکٹر نعمان کو دیکھنا ہے اور وہ اِس سلسلے میں کوشش کر رہی تھی۔

ثناء ہی نہیں بلکہ اب تو عصمت وغیرہ بھی تنویر کی جانب متوجہ ہوگئے تھے اور مُنہ پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہے تھے۔ البتہ یہ غنیمت تھا کہ بزرگ ذرا فاصلے پر تھے ورنہ شاید تنویر کی دماغی حالت پر شُبہ کیا جانے لگتا۔

ڈاکٹر نعمان پسینہ پسینہ ہو رہا تھا دِل ہی دِل میں عجیب و غریب خیالات آرہے تھے۔

تمام لوگ اپنی اپنی تفریحات میں مشغُول ہوگئے تھے۔ ثناء نے بڑے صبر سے کام لیا اور اِس سلسلے کو پی گئی اور کسی مناسب وقت کے لئے اُٹھا رکھا لیکن تنویر ڈاکٹر نعمان کے سامنے ہی سامنے رہی تھی اور اُس نے ڈاکٹر نعمان سے بہت سے اُلٹے سیدھے سوالات بھی کر ڈالے تھے۔

"آپ ڈاکٹر ہیں؟"

"جج... جی ہاں۔ کک... کوئی غلطی ہوگئی؟" ڈاکٹر نعمان گھبرائے ہُوئے لہجے میں بولا۔

"غلطی! میرے علم میں تو نہیں ہے" تنویر نے چونک کر کہا۔

"مم... میرا مطلب ہے آپ مجھ سے پُوچھ رہی تھیں ناں کہ میں ڈاکٹر ہُوں۔"

"تو اِس میں غلطی کی کیا بات ہے؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر تو بہت اچھے ہوتے ہیں مریضوں کی خدمت کرتے ہیں اور انجکشن وغیرہ لگاتے ہیں۔ ویسے معاف کیجئے گا انجکشن سے میں بہت ڈرتی ہُوں آپ کو شاید حیرت ہو کہ میں نے کبھی زندگی میں انجکشن نہیں لگوایا۔ یہ اِتنی لمبی سُوئی مگر انجکشن لگانے کے لئے سُوئی ہی کیا ضروری ہے۔ کیا انجکشن میں جو دوا ہوتی ہے ہم اُسے پی نہیں سکتے؟"

"پپ... پی سکتے ہیں" ڈاکٹر نعمان نے تھوک نگلتے ہُوئے کہا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ ہاں۔ ساری دوائیں تو پی جاتی ہیں۔ یہ انجکشن میں ایسی کیا خاص دوا ہوتی ہے؟"

"آپ میڈیکل پر بحث نہ فرمائیے گا کچھ اور گفتگو کریں ناں۔"

"کچھ اور، کچھ اور... ہاں ٹھیک تو ہے۔ آپ کی شادی ہوگئی؟"

"جی۔"

"ارے نہیں کچھ غلط بول گئی میں شاید۔ شادی تو نہیں ہُوئی ناں آپ کی؟"

"اللہ نے چاہا تو ہو جائے گی" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"انشاء اللہ، انشاء اللہ" تنویر پورے خلوص کے ساتھ بولی۔ پھر چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"مم... مگر کس سے ہوگی؟"

"جس سے آپ چاہیں گی۔"

"میں؟" تنویر ہونق بن کر بولی۔

"جی ہاں۔ میں نے مسئلہ آپ کے ہاتھ میں دیا۔"

"ارے واہ۔ میں اپنے ہاتھ میں ایسے مسئلے کیوں لُوں کوئی میں بُوڑھی ہُوں۔"

"جج... جی نہیں بالکل نہیں" ڈاکٹر نعمان آہستہ سے بولا۔

"تو پھر آپ مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟"

"پپ... پھر غلطی ہوگئی شاید۔"

"اچھا چھوڑئیے۔ آپ کو میری آنکھیں کیسی لگتی ہیں؟"

"آپ کی آنکھوں میں ستارے جگمگاتے ہیں۔"

"خُدا قسم" تنویر حیرت سے بولی اور اُس کی ایک اُنگلی اپنی آنکھ پر پہنچ گئی پھر اُس نے جھینپ کر اُنگلی پیچھے ہٹالی۔

"آپ میری آنکھوں کی تعریف کر رہے ہیں ناں۔"

"آپ ہیں ہی قابلِ تعریف۔"

"بہت بہت شُکریہ" تنویر نے اٹھلا کر کہا۔ اور اُس وقت اختر ڈاکٹر نعمان کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔

"نُعمان! ذرا ایک کام ہے تم سے۔" اور ڈاکٹر نُعمان بوکھلائے ہُوئے انداز میں اختر کے ساتھ پلٹ گیا۔

"خُدا کے بندے۔ سارے مراحل آج ہی طے کئے لے رہے ہو۔"

"خُدا کی قسم اختر بھائی! دِل چاہ رہا ہے کپڑے پھاڑ لُوں اور چیخیں مارتا ہُوا بھاگ نِکلوں یہاں سے۔"

"کیوں بھئی! یہ دِل کیوں جاہ رہا ہے"

"یہ تعویذ ہے یا معجونِ فلک سیر۔ اس نے تو گولی سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کیا ہے۔ ارے آپ نے دیکھا نہیں وہ کس طرح پٹر پٹر مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ آج پہلی بار اور ناشتے کی میز پر... اختر بھائی میں آپ کو کیا بتاؤں"

"نہ بتاؤ، عزیزی نہ بتاؤ۔ دُنیا نے سب کچھ دیکھ لیا ہے"

"د د... دُنیا نے..."

"جی ہاں۔ آپ کی بسیار خوری اور تنویر کی پیش کش میرا خیال ہے طُرم شاہ صاحب نے کافی تیز تعویذ دے دیا ہے غلطی میری ہی ہے مجھے اُن سے کہنا چاہیئے تھا کہ ذرا ہلکا تعویذ دیں اُس کے بعد تیز اور تیز..."

"ہاں واقعی۔ میں تو آج سے دُعا تعویذ کا دِل سے قائل ہو گیا ہُوں"

"ٹھیک ہے میاں، مگر ذرا احتیاط رکھو ویسے جو کچھ ہو چُکا ہے وہ بھی تمہارے حق میں بہتر نہ ہو گا"

"گک... کیا مطلب؟"

"پیارے بھائی، بات کچھ حد سے آگے بڑھ گئی مجھے شبہ ہے کہ ثناء اور نُدرت نے تنویر کی اِن پیشکشوں اور رعنائیوں کو گہری نِگاہوں سے دیکھا ہے اور اب تمہارے رسّہ باندھ دیا جائے گا"

"یار کیوں ڈرا رہے ہو اختر بھائی۔ دِل ہی دِل میں مَیں خُدا کی قسم اِتنا خوش ہُوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے یہ تعویذ نکال لُوں جیب سے ورنہ تنویر پھر دوڑی چلی آئے گی"

"اب کیا ہو گا۔ اِس کا اثر تو ہو چُکا ہے" اختر نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"تو میں کیا کروں، مجھے بتایئے اختر بھائی"

"بھگتو میاں۔ اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے بُھگتو، بھگتنا تو پڑے گا"

"بُرا تو نہیں ہو رہا مگر سب کے سامنے ہو رہا ہے۔ اِس کے لئے کیا کیا جائے؟"

"ہُوں۔ اِس بات کو ذہن میں رکھنا جو کچھ ہو گا سب کے سامنے ہو گا پیچھے کبھی کچھ نہ ہو گا"

"گک... کیا کوئی پیچھے والا تعویذ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے یہی سب کچھ..."

"سوچیں گے، دیکھیں گے طُرم شاہ صاحب سے بات کرنا ہو گی"

"مجھے اُن کی خدمت میں لے چلیں، پاؤں دھو دھو کر پیوں گا اُن کے" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ کیا گندی گندی باتیں کر رہے ہو۔ پاؤں سے میل اُترتا ہے یہ پتہ نہیں ہے۔ مگر اب دُور دُور رہو بات کچھ آگے بڑھ رہی ہے اِتنی نہیں بڑھنی چاہیئے"

"ہاں۔ میں بھی محسوس کر رہا ہُوں مگر کمال ہو گیا اختر بھائی بخُدا بہت سے تیز ترین انجکشن بھی اِتنی سُرعت سے کام نہیں کرتے جِتنا تیز اِس تعویذ نے کیا ہے"

"ہُوں۔ ہُوں ٹھیک ہے اب ذرا احتیاط کرنا تم خود ہی کترانے کی کوشش کرو"

"مگر پھر وہ کیا سوچیں گی؟"

"ابے وہ تو جو کچھ سوچیں گی، دوسرے جو کچھ سوچیں گے وہ سوچ تم تک پہنچائی بھی جا سکتی ہے کیا سمجھے؟"

"ہاں۔ یہ میں جانتا ہُوں مگر اُن کا دِل کیسے توڑوں" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ اُن کا دِل مت توڑو مگر تمہارے سر ٹوٹنے کے امکانات روشن ہیں، بس ذرا کسی کو محسوس ہو جانے دو سب ٹھیک ہو جائے گا" اختر بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"ارے باپ رے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے؟"

"جی نہیں، بس کسی کے لئے آپ کی نگاہِ التفات کافی ہے۔ آپ کا محبُوب پلیٹ میں رکھ کر آپ کو پیش کر دیا جائے گا" اختر نے دانت پیستے ہُوئے کہا اور ڈاکٹر نعمان گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

اختر کو اِس بات کی توقع نہیں تھی کہ احمق تنویر اِس قِسم کی حرکتیں شروع کرے گی۔ اُس نے اختر کی ہدایت کے مطابق اجمل میاں کو جلانے کے لئے یہ سب شروع کیا تھا لیکن انتہائی حد تک احمق لڑکی تھی اور اُس نے یہ سب کچھ اِس طرح شروع کیا تھا کہ دوسرے لوگ بھی چونک پڑے تھے۔ مگر کیا کیا جاتا وہ اِتنی ہی معصُوم تھی۔

اِس دوران میں اختر اجمل میاں کا چہرہ بھی دیکھتا رہا تھا۔ اجمل میاں عجیب بھونق سے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر نعمان کو سمجھانے بُجھانے کے بعد اختر آہستہ آہستہ تنویر کی جانب بڑھا اور اُس کے قریب سے یہ کہتا ہُوا گُزر گیا۔

"بس تنویر، کافی ہے اب اِس سے آگے کچھ نہ کرنا"

تنویر نے چونک کر اختر کو دیکھا دیکھتی رہی اور پھر مطمئن انداز میں گردن ہلا کر آگے بڑھ گئی گویا اُس کا کام ختم ہو گیا تھا لیکن اختر کا کام ابھی جاری تھا۔ اجمل میاں کے قریب پہنچا تو وہ بھرائے ہُوئے لہجے میں بولے۔

"اختر بھائی! اب کیا کروں؟"

"کیوں، کیا ہو گیا؟"

"وہ تو مجھ سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہو گئیں اور اُن صاحب کو میرا مطلب ہے اُن صاحب کو"

"یار! میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اِدھر تمہاری دال نہیں گلے گی۔ بلاوجہ وقت ضائع کر رہے ہو کچھ اور ٹرائی کرو"

"مگر آپ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ آپ میرے اُستاد ہیں"

"ہُوں... ہُوں۔ یاد ہے تمھیں" اختر نے اجمل میاں کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"بالکل یاد ہے اختر بھائی جان! اب بھلا کیا بھُول سکتا ہُوں۔" اجمل میاں نے 'بھائی' خاص طور سے یاد رکھا تھا۔ اور اختر کو بھی یہ جُملہ یاد آ گیا اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اِن تمام لڑکیوں کو دیکھ رہے ہو"

"جی ہاں۔ جی ہاں"

"اگر تنویر کو نظر انداز کر دو تو اِن میں سے کوئی تمھیں پسند آئے گی"

"ویسے تو سب ہی مجھے اچھی لگتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ہر ایک سے محبت کروں" اجمل میاں نے شرمائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"ابے کھوپڑی قابو میں رکھ افریقی۔ ورنہ تجھے واپس افریقہ پہنچا کر کسی کوئلے کی کان میں ڈال دیا جائے گا اور کان کو بم سے بلاسٹ کر دیا جائے گا۔ سب کو پسند کرنے کی کوشش کی تو سب مِل کر تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گی"

"گک... کیوں۔ پپ... پسند کرنے میں کیا حرج ہے"

"ایک ایک کر کے پیارے بھائی ایک ایک کر کے... ویسے آپا جان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اوہ سُوئیٹ۔ ویری سُوئیٹ"

"ہوش میں۔ ہوش میں۔ دوسرے سے جواب مِلنے سے پہلے تم اِس قِسم کی کوئی بکواس نہیں کر سکتے" اختر دانت پیس کر بولا۔

"میرا مطلب ہے کافی اچھی ہیں وہ"

"اور اب تم انھیں کیا کہو گے؟"

"آپا جان"

"اور وہ بھائی کہاں گیا؟"

"سس... سُوری اختر بھائی جان میرا مطلب ہے آپا بھائی جان"

"گُڈ۔ ویری گُڈ۔ تو پھر آج ہی سے اسٹارٹ لے لو۔ تنویر اگر ڈاکٹر نعمان کی جانب متوجہ ہے تو تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔ اور پھر تمہاری وہ آپا جان تمھیں تمہاری کہہ چکی ہیں اِس لئے تمہارا راستہ صاف ہے"

"بہت بہت شکریہ اختر بھائی۔ میں بھی کسی کی جان کے پیچھے نہیں پڑنا چاہتا اگر یہ تنویر صاحبہ میری جانب متوجہ نہیں ہیں تو نہ سہی آپا بھائی جان۔ آپا بھائی جان۔ گُڈ ویری گُڈ"

"تو پھر بسم اللہ" اختر نے کہا اور وہاں سے ہٹ گیا اب وہ اِس افریقی بندر کا نیا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا ویسے اُس نے یہ پوری کوشش اِس لئے کی تھی کہ ڈاکٹر نعمان اور تنویر کا موضوع زیادہ طوالت نہ اختیار کرنے پائے اور یہ نیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے تاکہ اِن خواتین کی توجہ بٹ جائے ورنہ بے چارے ڈاکٹر نعمان اور تنویر ہی کی فوری شامت آ جانی تھی۔

اِس وقت نُدرت اور ثناء یکجا ہو گئی تھیں اور ثناء نُدرت سے کہہ رہی تھی۔

"اللہ رکھی! قیامت آنے والی ہے قیامت"

"اللہ رکھے! آ جائے کیا حرج ہے" نُدرت نے جواب دیا۔

"اگر تیری آنکھیں اندھی نہیں ہیں تو تُو نے وہ عجیب و غریب منظر دیکھ لیا ہو گا۔ توبہ، توبہ۔ لڑکیوں کی آنکھوں کا پانی تو ڈھل ہی گیا ہے۔ ہمارے تمہارے وقتوں میں ایسا کہاں تھا اللہ رکھی"

"تنویر کی طرف اشارہ ہے"

"ہاں۔ یہ ہو کیا گیا میں تو حیران ہُوں۔ یہ لڑکی تو بڑی باؤلی سی نظر آتی تھی۔ یہ اچانک ہی اُس پر کیا دورہ پڑ گیا ہے۔ اور یہ ڈاکٹر نعمان بے چارہ تو ریوڑ سے بھٹکے ہُوئے بھیڑ کی مانند اُچھلتا پھر رہا تھا۔ ایک ایک کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا مگر اُس سے زیادہ حیرت تنویر پر ہے"

"اللہ کی دین ہے۔ اللہ نے اُسے محبت کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے مالک کی بیٹی، تو پھر اِس میں ہمارا تمہارا کیا نقصان ہے"

"ٹھیک ہے وہ محبت کی دولت سے مالا مال ہو گئی ہے۔ مگر یہ دولت چوراہے پر کھڑے ہو کر کیوں اُچھال رہی ہے"

"تمھیں جلن ہو رہی ہے؟"

"نُدرت سنجیدگی سے سوچو کہ یہ ہو کیا گیا اور کیسے ہو گیا۔ چلو یہ بات تو مان لی جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے تنویر کے دِل میں ڈاکٹر نعمان کا تصوّر پیش ہو گیا ہو لیکن آج جس طرح اُس نے ساری دُنیا کو جُوتے کی نوک پر مار کر ڈاکٹر نعمان سے التفات کا اظہار کیا ہے۔ کیا یہ بات خود اُس کے لئے نقصان دِہ نہیں ہو سکتی"

نُدرت بے اختیار ہنس پڑی پھر کہنے لگی۔

"سچ مانو، تو اِس بات پر مجھے اُس پر پیار آ رہا ہے"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ میں نے سچ مان لیا لیکن دوسروں کو اِس طرح اُس پر پیار نہیں آئے گا۔"

"میرے خیال میں اُس نے کوئی خواب دیکھ لیا ہے اور دن بھر اُس کی تعبیر پوری ہونے کا انتظار کرتی رہی ہے اور اب برداشت نہ کر سکی۔ یہ اُس کا باؤلا پن ہی تو ہے کہ اُس نے اِس طرح سرِعام اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ ویسے یار چیز ابھی تا کی ہے اُس نے۔ ڈاکٹر نعمان بُرا آدمی تو نہیں ہے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ سلسلہ اِس طرح جاری ہو جائے گا۔ ویسے ہمیں تنویر کی مدد کرنی چاہیئے معصوم لڑکی ابھی محبت کے اُلٹ پھیر نہیں جانتی کیوں نہ ہم لوگ اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیں۔"

"میری بات نہ کرو۔ مجھے یہ سب حماقتیں نہیں آتیں۔ ہاں تم اِس سلسلے میں کافی ماہر ہو کسی کو اُڑ کر بھی خبر نہیں لگنے دیتیں تم اگر چاہو تو اُس کی سرپرستی کر سکتی ہو۔"

"کیا بات ہے۔ تم کچھ جلی جلی نظر آ رہی ہو مالک کی بیٹی؟"

"جی ہاں۔ جل رہی ہوں میں۔ دیکھ مجھ سے اُلٹی سیدھی باتیں نہ کیا کر۔ ورنہ جھگڑا ہو جائے گا۔"

"ارے نہیں۔ بھلا میرے تیرے درمیان بھی جھگڑا ہو سکتا ہے ویسے میرا خیال ہے کل دِن میں تنویر سے ملاقات ضرور کر لی جائے اور کچھ معلومات حاصل کی جائیں اللہ خیر یہ اجمل جان اِدھر کیسے تشریف لا رہے ہیں۔" ندرت چونک کر بولی اور دونوں اجمل میاں کی طرف دیکھنے لگیں جو بڑی نیاز مندی سے گردن خم کئے اُنہی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چند لمحات کے بعد وہ اُن کے قریب پہنچ گئے۔ شناء اور ندرت متعجبانہ انداز میں اُن کا چہرہ دیکھنے لگیں جس پر بھکاریوں جیسے تاثرات پھیلے ہوئے تھے پھر اُنھوں نے مدھم لہجے میں کہا۔

"آپا بھائی جان۔" اور دونوں ہی پریشان نگاہوں سے اُنھیں دیکھنے لگیں شناء بے اختیار بول اُٹھی۔

"کیا چاہیئے تمہیں؟"

"جی وہ آپ سے نہیں مم... میں آپا بھائی جان سے بات کر رہا ہُوں۔"

"آپا بھائی جان؟" ندرت متحیرانہ انداز میں آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"جج... جی ہاں۔ مم... میں نے سوچا کہ آپ خالی آپا جان کہنے سے بُرا مان جائیں گی تو اب میں آج سے آپ کو آپا بھائی جان کہا کروں گا۔" اجمل میاں نے جواب دیا اور ندرت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شناء کا چہرہ دیکھنے لگی۔ شناء نے بے اختیار مسکراہٹ دباتے ہُوئے کہا۔

"اور مجھے کیا کہیں گے؟"

"شناء بھائی جان۔"

"سُبحان اللہ۔ سُبحان اللہ۔ اجمل میاں یہ عقل آپ میں کہاں سے آ گئی اور آپ نے اِتنے خوبصورت انداز میں کسی کو مخاطب کرنا کیسے سیکھ لیا؟" شناء کے الفاظ پر اجمل میاں نے چونک کر شناء کو دیکھا پھر شرمائے انداز میں بولے۔

"مجھے بھی۔ مجھے بھی اب یہاں کے آداب آتے جا رہے ہیں۔"

"خوشگوار زندگی گزاریں گے۔ خوشگوار زندگی گزاریں گے آپا بھائی جان، شناء بھائی جان۔ بھئی لُطف آ گیا اِس طرزِ تخاطب میں اور اب یہ بتائیے اجمل میاں کہ آپ کو اِس ذہانت پر کیا انعام دیا جائے۔"

"جج... جی وہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے میرے پاس بس آپا بھائی جان۔"

"جی؟" ندرت آنکھیں نکال کر بولی۔

"جج... جی ہاں... مم... میرا مطلب ہے میں آپ سے تت... تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہُوں۔"

"اللہ آپ پر رحم کرے۔ آئیے۔" ندرت نے کہا اور شناء کو آنکھ ماردی۔ شناء اپنے قہقہے روکے ہُوئے تھی۔ ندرت جیسی آفت کی پرکالہ کے لئے یہ موقعہ بہترین تھا۔ وہ دونوں تو پہلے ہی پروگرام بنا چکی تھیں کہ اجمل میاں کو تختۂ مشق بنائیں گی۔ بھلا ایسی تفریح ہاتھ آئے اور وہ اُس سے چوک جائیں۔ شناء نے ندرت کو پُورا پُورا موقعہ دے دیا تھا دونوں ایک دوسرے کی رازدار تھیں اور شناء کو اِس بات کا اطمینان تھا کہ ندرت جو کچھ کرے گی وہ لاجواب ہوگا۔

ندرت اُسے لئے ہُوئے کافی فاصلے پر آ گئی۔ اجمل میاں کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

"جی فرمایئے میرا خیال ہے اب ہم دونوں تنہا ہیں۔"

"جج... جی ہاں، جی ہاں ہم... ہم دونوں۔ مم... میرا مطلب ہے میں اور آپ... آپ میرا مطلب ہے آپ اور میں۔"

"میں آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی ہُوں آگے بڑھیئے۔" ندرت نے پُرخلوص انداز میں کہا۔

"جج... جی وہ آپا... آپا بھائی جان۔ جج... جب سے آپ کو دیکھا ہے وہ اِس جگہ۔ اِس جگہ۔" اجمل میاں نے سینے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہُوئے کہا۔

"جی ہاں، جی ہاں کہتے رہیئے۔ کہتے رہیئے اِس جگہ کیا ہو گیا؟"

"بس دد... دھڑکنیں کچھ بڑھ گئی ہیں اور... اور وہ جو یعنی میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ اچھا ایک بات بتایئے اگر میں آپ کو کوئی خوبصورت سا تحفہ دُوں تو کیا آپ اُسے قبول کر لیں گی؟"

"اوہ خُدا کی پناہ اجمل میاں، یہ اچانک ہی آپ کو کیا ہو گیا؟"

"جی ہاں وہی ہو گیا ہے جو ہو جاتا ہے۔ میں اِس کا قائل تو نہیں لیکن اب ہو گیا ہُوں۔"

"اچھا اچھا آپ تحفے کی بات کر رہے تھے؟"

"جی ہاں، جی ہاں میں آپ کو ایک تحفہ دینا چاہتا ہُوں۔"

"نکالئے کہاں ہے؟"

"جی وہ اِس وقت... اِس وقت تو نہیں ہے۔ مَیں لے کر آؤں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے جب لے آیئے تب بات کر لیجئے گا۔"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ مجھے میری اِس بات کا جواب دیں گی۔"

"یعنی تحفے کے جواب میں آپ مجھ سے تحفہ لینا چاہتے ہیں؟"

"بب... بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں آپ سے کوئی چیز نہیں لینا چاہتا۔ میں تو... میں تو اُفوہ نہ جانے کیوں اِتنا نروس ہو جاتا ہُوں ایسے موقعوں پر۔"

"حالانکہ ہونا نہیں چاہیئے۔"

"بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ مم... مگر دراصل ڈر لگتا ہے یہاں مجھے کوئی بات کرتے ہُوئے ابھی نیا نیا ہُوں ناں۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بالکل ہی نئے پھنسے ہیں آپ۔ ویسے آپ ایک بات بتائیے آپا جان کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟"

"مطلب... میرا مطلب ہے کک... کہ لُغوی معنی تو نہیں سمجھتا آپ نے اپنا نام یہی بتایا تھا ناں۔ میں نے اُس میں بھائی جان کا اضافہ کر دیا ہے ورنہ آپا جان آپ۔"

"ہُوں... ہُوں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے آپ کے اِس اضافے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپا بھائی جان کہہ لیا کریں۔ ہاں تو آپ اِس لفظ کے معنی نہیں سمجھتے؟"

"نہیں۔ اصل میں اُردو پر مجھے اِتنا عبور نہیں رہا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ با محاورہ اُردو ذرا میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"جی جی۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ جائیں گے، مگر ایک بات بتایئے یہ اچانک ہی آپ کو میں۔"

"جج... جی ہاں۔ میں نے... میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سوچا ہے۔"

"کسی سے مشورہ بھی کیا ہے؟" ندرت نے مشتبہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہُوئے کہا اور اجمل میاں آنکھیں چرانے لگے۔

"نن... نہیں۔ کک... کوئی مشورہ تو نہیں کیا۔"

"ناممکن، ناممکن۔" ندرت نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"کیا ناممکن؟"

"یہی کہ آپ یہ سب کچھ صرف اپنی سمجھ سے کر رہے ہیں۔"

"دیکھنے میں بے وقوف نہیں ہُوں، بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے بالآخر دِل میں یہ فیصلہ کیا کہ آپ سے اظہار کر دینا چاہیئے۔"

"خیر اظہار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے میں بھی سوچوں گی اِس بارے میں مگر آپ مخلص نہیں ہیں مجھ سے۔"

"بخدا دِل کی گہرائیوں میں صرف آپ کی تصویر بسی ہُوئی ہے اور میں آپ سے بالکل مخلص ہُوں۔"

"یہ جملہ آپ کا ذاتی ہے؟" ندرت نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"بب... بالکل قسم لے لیجئے خالص ذاتی ہے۔"

"بہت خُوب ہے میرا خیال ہے کافی اچھے جا رہے ہیں آپ کسی اچھے اُستاد کی ترتیب ملی ہے آپ کو۔" ندرت گردن ہلاتی ہُوئی بولی۔

"جج... جی ہاں، جی ہاں، بے مثال اُستاد ہیں میرے۔" اجمل میاں نے مسکرا کر گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"اور آپ ہم سے چھپا رہے ہیں۔" ندرت اُٹھلا کر بولی۔

"کک... کیا چھپا رہا ہُوں؟" اجمل میاں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"اُستاد کا نام۔" ندرت بدستور دلربایانہ انداز میں کہنے لگی اور اجمل میاں پریشان ہو گئے۔ اب کیا کریں اختر نے منع کیا تھا کہ اُن کا نام کبھی سامنے نہ آئے اور اختر اُن کا ہمدرد تھا اگر ندرت کو یہ نام بتا دے تو کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے اچھی خاصی پریشانی کا شکار ہو گئے تھے وہ۔ ندرت بغور اُن کا جائزہ لے رہی تھی پھر اُس نے مایُوسی سے کہا۔

"کیسے انسان ہیں آپ اجمل صاحب! یعنی مجھ سے آپ اظہارِ عشق بھی کر رہے ہیں اور اُس کے بعد مجھ سے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی چھپا رہے ہیں یا اس کا مطلب ہے کہ آپ کا عشق سچا نہیں ہے۔ آپ کو علم ہے کہ عشق میں راز داری اور سچائی ضروری ہوتی ہے"

"راز داری اور، اور سچائی" اجمل میاں نے یہ جملہ زیرِ لب دہرایا۔

"بالکل... بالکل، آپ یوں کیجئے کہ پہلے عشق کے بارے میں لٹریچر پڑھیئے اُس کے بعد مجھ سے بات کیجئے" ندرت روٹھے ہوئے سے انداز میں بولی اور اجمل میاں جلدی سے کہنے لگے۔

"نن... نہیں نہیں تم... میرا مطلب ہے میں راز داری اور سچائی ہوں پوری طرح راز داری اور سچائی ہوں"

"ہیں؟"

"ہاں ہاں بالکل ہوں" اجمل میاں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اختر کا نام آپ مجھ سے چھپا کیوں رہے ہیں؟" ندرت بغور انھیں دیکھتی ہوئی بولی اور اجمل میاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" انھوں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"اب جب کہ ہمارا دلوں کا رابطہ ہوگیا ہے تو بھلا میں آپ کی بات کیسے نہ جانوں گی جو کچھ آپ کے دل میں ہے وہ میرے ذہن میں"

"دد... دل... دل کا رابطہ ہوگیا؟" اجمل میاں نے بے خودی سے پوچھا۔

"کیوں آپ کا کیا خیال ہے ویسے بھی میں آپ کے بارے میں بہت کچھ سوچتی رہی ہوں اجمل صاحب"

"کیا؟" اجمل میاں نے وفورِ مسرت سے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"بس یہی کہ آپ افریقہ میں کیسے لگتے ہوں گے آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں ہمیشہ افریقہ کے خواب دیکھتی رہی ہوں"

"افریقہ کے خواب؟"

"جی ہاں مجھے وہاں کے رقص بے حد پسند ہیں، آہ کیا زندگی ہوتی ہے ان رقصوں میں کیا حسن ہوتا ہے۔ انسان بالکل سیماب کی مانند رقصاں ہو جاتا ہے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے اجمل صاحب کہ مجھے افریقہ کے ان رقاصوں سے کس قدر دلچسپی ہے۔ آپ تو یقیناً وہاں کے رقص کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے"

"جج... جی ہاں، جی ہاں۔ کک... کیوں نہیں؟"

"وہ آپ نے زولو رقاصوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں"

"جج... جی ہاں، جی ہاں۔ بب... بالکل زولو، زولو"

"اور تناتار رقص اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بہت عمدہ ہوتا ہے، بہت ہی اچھا"

"تو اجمل میاں آپ ہمیں وہ رقص کر کے دکھائیں نا" ندرت نے کہا اور اجمل میاں کا چہرہ ہونق ہوگیا۔

"مم... میں میں"

"کیوں آپ کو رقص نہیں آتے؟" ندرت مایوسی سے بولی۔

"نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ بالکل آتے ہیں بالکل آتے ہیں"

"رقص افریقہ کی روایت میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اور افریقیوں سے صرف اسی لئے محبت کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے دُنیا کو بہت سے رقص دیئے ہیں جتنے رقص ایجاد ہوئے ہیں، اُن میں افریقی رقاصوں کی جھلک شامل ہوتی ہے اور اجمل میاں آپ یقین کریں جب آپ افریقہ سے آئے تھے تو میرا دل چاہا تھا کہ آپ سے بے اختیار کہوں کہ مجھے کوئی افریقی رقص دکھائیے"

"جج... جی جی" اجمل میاں گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ پھر بولے "ضرور دکھاؤں گا۔ لل... لیکن ابھی ابھی نہیں"

"ہاں ہاں ابھی کی میں کب بات کر رہی ہوں اب تو ہمارا رابطہ براہِ راست ہو چکا ہے۔ اور دیکھئے اب کسی راز دار کو ہمارے درمیان نہ رہنے دیجئے وہ جو آپ نے اشعار سُنے ہوں گے کہ دل سے دل کے راستے سیدھے اور سچے ہوتے ہیں۔ ان راستوں پر کوئی پتھر نہیں ہونا چاہیئے"

"پپ... پتھر"

"میرا مطلب ہے اب جو کچھ آپ کا دل چاہے مجھ سے کہیں اور میرا جو کچھ دل چاہے گا آپ سے کہوں گی۔ ویسے افریقی رقص کے لئے آپ تیار رہیں۔ جب بھی میں فرمائش کروں گی آپ کو یہ رقص دکھانا پڑے گا۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ میں نے کتنا سوچا ہے اِس بارے میں"

"جج... جی جی ضرور... ضرور اطمینان رکھیئے"

"اگر آپ کو مشق نہ ہو تو ذرا تنہائی میں مشق کر لیں اچھا اب میں چلوں یا اور کوئی بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے؟"

"نن... نہیں میں تم... مشق کروں گا اور پھر آپ کو افریقی رقص دکھاؤں گا۔ ویسے آپا بھائی جان! آپ میرے بارے میں ذرا سنجیدگی سے سوچئے"

"بالکل اطمینان رکھیں اجمل جان۔ میں آپ کے بارے میں انتہائی سنجیدگی سے سوچوں گی" ندرت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور اجمل میاں کا چہرہ خوشی سے گُلنار بن گیا۔ بہت دُور سے اختر،

ندرت اور اجمل کی جانب نگراں تھا اور اجمل میاں کی کاوشیں دیکھ رہا تھا۔ ندرت نے دِل ہی دِل میں سوچا کہ اختر میاں آپ نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ میں ذرا مختلف قسم کی انسان ہوں۔ یہاں آپ مار کھا جائیں گے مجھ سے"

اُسے سو فیصدی یقین تھا کہ اجمل میاں کو یہ راستہ دکھانے والا اختر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا اور مقصد... مقصد بھلا شرارت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے لیکن اِس شرارت کو ندرت نے بہت ہی خوبصورتی سے اُسی طرف موڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

فاصلے پر کھڑی ہوئی ثناء اُن دونوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ باقی لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ ثناء بے چین تھی کہ ندرت سے معلومات حاصل کرے۔

تھوڑی دیر بعد اجمل میاں مطمئن اور مسرور وہاں سے واپس چلے گئے اور ندرت ٹہلتی ہوئی ثناء کے قریب آگئی۔ ثناء بے چینی سے اُس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی ندرت کے قریب پہنچتے ہی بولی۔

"میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے اللہ کرے جلدی شروع ہو جا۔ کیا ہوگیا ہمارے اِن اجمل میاں کو؟"

"عشق ہوگیا۔ ثناء بے چارے کو عشق ہوگیا" ندرت نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"ہوگیا؟" ثناء متحیرانہ لہجے میں بولی۔

"ہاں لگتا ہے کافی زبردست قسم کا عشق ہوا ہے"

"مم... مگر کس سے؟"

"مجھ سے" ندرت نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

"ارے خُدا کی پناہ کک... کیا اظہارِ عشق کر دیا؟" ثناء نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بالکل کر دیا"

"ہوں، یہ تو کمال ہوگیا۔ بھئی قدرت ہماری اِس کوٹھی کو مالا مال کر رہی ہے۔ پے در پے عشق ہو رہے ہیں۔ کمال ہے۔ کیا اِن سارے عشقوں کو ہم آسانی سے سمیٹ سکیں گے"

"بالکل سمیٹیں گے، بہت دن کی خاموشی کے بعد کچھ زندگی پیدا ہوئی ہے ثناء۔ اِس زندگی سے بھرپور فائدہ اُٹھائیں گے ویسے جانتی ہو کہ اپنے اجمل میاں کے اُستادِ محترم کون ہیں؟"

"اختر کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ چکّر اُسی کے ہاتھ لگا ہے اور اُس نے کارروائی شروع کر دی ہے"

"بالکل بالکل، اختر صاحب نے اپنا شیر میدان میں اُتارا ہے، اب ذرا دو دو ہاتھ ہوں گے دیکھوں گی میں بھی کہ یہ اختر صاحب کتنے شریر ہیں اور کیا کیا شرارتیں کر سکتے ہیں"

"واقعی لطف آ گیا بھئی کمال ہوگیا۔ لیکن اللہ رکھی ذرا سلیقے سے ہینڈل کرنا۔ بڑی بوریت ہو رہی تھی اِن دنوں اب پے در پے دو دلچسپیاں ہاتھ لگی ہیں۔ بڑی احتیاط سے خرچ کرنا ہے اِنھیں"

"اطمینان رکھو ایسا ہی ہوگا" ندرت نے مردانہ وار سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا اور ثناء پُرخیال انداز میں مسکرانے لگی۔

⁂

رِداء کو انٹرکام پر احسان احمد صاحب کی آواز سُنائی دی۔

"ہیلو رِداء کیا کر رہی ہو؟"

"ایک فائل دیکھ رہی تھی۔ ڈاڈا اینڈ سنز لمیٹڈ کا" رِداء نے جواب دیا۔

"ویری گڈ۔ یہ فائل لے کر میرے پاس آ جاؤ" احسان احمد صاحب نے کہا اور رِداء نے جواب دے کر انٹرکام بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فائل لے کر احسان احمد صاحب کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

احسان احمد صاحب کے سامنے کئی فائل رکھے ہوئے تھے۔ اور اُنھیں چیک کر دیا گیا تھا۔ رِداء نے فائل احسان احمد صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ویسے وہ اُن فائلوں کو دیکھ رہی تھی جو احسان احمد کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ اُن سب ہی کا تعلق کسی نہ کسی طرح وسیم جمال سے تھا۔

احسان احمد صاحب نے رِداء کے ہاتھ سے فائل لے کر اُسے کھولا۔ دیکھتے رہے پھر چند کاغذات پر کراس کے نشان بنائے اور فائل اُنہی فائلوں کے ڈھیر پر رکھ دیا۔ رِداء سنجیدگی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ احسان احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

"اِس کے علاوہ تو ہمارے پاس ایسا کوئی اور فائل نہیں ہے جس کا تعلق وسیم جمال سے ہو؟"

"یہ کون کون سے فائل ہیں جناب؟" رِداء نے سوال کیا اور احسان احمد صاحب نے فائلوں کا بنڈل کھول کر رِداء کے سامنے کر دیا۔

"تم خود ان کا جائزہ لے لو" رِداء ایک ایک فائل دیکھتی رہی، اُس نے لگے ہوئے کاغذات پر احسان احمد صاحب کے نوٹ پڑھے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اُس نے فائل ایک جانب کھسکا دیئے۔

"میرے خیال میں وسیم جمال سے متعلق اور کوئی فائل نہیں ہے" اُس نے جواب دیا۔

"کیا تم میری اِس کارروائی سے مطمئن ہو؟"

"آپ نے وسیم جمال سے کئے ہُوئے تمام سودے منسوخ کر دیئے ہیں ناں، جو کام ہم اُن کے لئے کر رہے تھے اب نہیں کریں گے ناں؟"

"ہاں اِس کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟" رِداء نے گردن جُھکالی۔ دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

"فرم کو اِس کارروائی سے لاکھوں روپے کے نقصانات اُٹھانے پڑیں گے۔"

"ہم نے ابھی اُن پر کام شروع ہی کب کیا ہے اور تمھارا کیا خیال ہے اِس کام کو نہ کر کے فرم کسی خسارے سے دوچار ہو جائے گی۔ بھئی رِزق دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ہمارا یہی نظریہ رہا ہے ہمیشہ سے، اِس کارروائی کو مُلتوی کر کے میں بے حد خُوش ہُوں۔ مجھے قطعی کوئی افسوس نہیں ہے۔"

"آپ کی وسیم جمال سے بات ہُوئی تھی؟" رِداء نے پُوچھا۔

"ہاں تمھیں بتانا بھی تھا اِس بارے میں۔" احسان احمد کہنے لگے اور رِداء سوالیہ نِگاہوں سے اُنھیں دیکھنے لگی۔

احسان احمد صاحب نے وسیم جمال سے ہونے والی گفتگو رِداء کو سُنائی اور اُس میں کسی قسم کی کوئی کمی بیشی نہ کی۔ رِداء خاموشی سے یہ سب کچھ سُن رہی تھی۔ چند لمحات کے بعد احسان احمد بولے۔

"اگر اِس میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو تم مجھے بتا دو۔"

"مجھے بس ایک بات کا افسوس ہے جناب کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ ہُوا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔" رِداء مُتاسفانہ لہجے میں بولی۔

"اور مجھے دوسری بات کا افسوس ہے۔ وہ یہ کہ تم مجھے باپ نہیں سمجھتیں بیٹی۔ کیا یہ کارروائی اگر ثناء کے ساتھ ہوتی تو کیا میں خاموشی اختیار کرتا۔ کیا بیٹیوں کی عِزّت داؤ پر لگا کر باپ روزی کماتے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے لئے ایک گالی کے مترادف ہے رِداء، اگر تم اِس بات سے مُنحرف ہو تو مجھے کُھل کر بتا دو۔ ورنہ پھر اِس انداز سے گفتگو نہ کرو۔"

رِداء بُری طرح متاثر ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور پھر یہ آنسو میز پر ٹپک پڑے، احسان احمد صاحب خاموشی اور سنجیدگی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"میں تمھارے جواب کا مُنتظر ہُوں رِداء۔" اُنھوں نے کہا اور رِداء نے تشکرانہ نگاہوں سے احسان احمد کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"مجھے اپنی تقدیر پر ناز ہے کہ مجھے آپ ملے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر یہ الفاظ کیوں دُہراتی ہو؟ وسیم جمال کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میں اُسے قبر کی گہرائیوں میں دفن کر دُوں گا اگر اُس نے کوئی بدتمیزی کی تو... اور میں نے اُسے جو جواب دیا ہے میں اُس سے مطمئن بھی ہُوں۔ کسی بھی صُورت میں وہ شخص ہم میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہے۔ کیا تم میری بات کی تصدیق کرتی ہو؟"

"جی یقیناً۔" رِداء نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"اب میرے ذہن سے سارے تکدر دُور ہو گئے اور جہاں تک اِس سودے کا معاملہ ہے تو مجھے اِتنا حقیر بھی مت جانو۔ بے شک ہاتھی لُٹ چکا ہے لیکن پھر بھی سوا لاکھ نہیں، سوا کروڑ نہیں بلکہ سوا ارب کا ہے۔ لعنت بھیجتا ہُوں ایسے سودوں پر جس میں میری رِداء کا دامن میلا ہو۔ بس بیٹے جاؤ آرام کرو۔ اور اِس تمام اُلجھن کو ذہن سے دُور کر دو۔ اِس قِسم کے لوگ زندگی میں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ مگر تم سمجھتی ہو اُن کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔"

رِداء نے خاموشی سے گردن ہلائی اور اُٹھ کر اپنے آفس میں واپس آ گئی۔ اُس کی کیفیت اندر سے عجیب سی ہو رہی تھی۔ احسان احمد صاحب نے ہمیشہ ہی ایک بہت اچھے انسان ہونے کا ثبوت دیا تھا اور اُن لوگوں نے اُس پر جو احسانات کئے تھے اُن کے بارے میں سوچتی تو یقین نہ آتا کہ اِس دُنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں۔

بہت دیر تک وہ اِسی تاثر میں ڈُوبی بیٹھی رہی تھی۔ وسیم جمال کا خیال دِل میں آیا تو تصوّر بھی ذہن میں جاگ اُٹھا۔ اور تصوّر کا احساس جب بھی اُسے ہوتا تو اُس کے دِل کی کیفیت عجیب ہو جاتی تھی بارہا خود پر جھنجھلائی اور بہت ہی سخت رویّہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اُسے احساس ہوتا تھا کہ بعض چیزوں پر انسان کا قابو نہیں ہوتا۔

اس وقت بھی بس یُونہی تصوّر دِل میں داخل ہو گیا تھا کہ ٹیلی فُون کی گھنٹی بج گئی اور وہ چونک کر سنبھل گئی اُسے احساس ہو گیا کہ وہ یہاں اِس وقت ایک نادان الھڑ دوشیزہ نہیں بلکہ ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کی فرم کی جنرل مینجر ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنا اعتماد بحال کیا اور ٹیلی فُون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا لیکن دوسری طرف سے جو آواز سُنائی دی تھی اُسے سُن کر وہ ایک دم محتاط ہو گئی۔

وہ وسیم جمال تھا۔

"ہیلو۔"

"جی فرمایئے کون صاحب ہیں؟" رِداء نے سرد لہجے میں کہا۔

"بھئی ہمارا خیال یہ تھا کہ آپ ہماری آواز ایک دفعہ سُن

کر پہچان لیتی ہیں؟"

"وسیم جمال صاحب ہیں۔"

"شکریہ آپ نے ہمارا اعتماد بحال کر دیا۔"

"فرمایئے کیسے مزاج ہیں؟" رِداء نے پُوچھا۔

"ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ نے جو طریقہ کار اختیار کیا وہ ہماری توقع سے بہت مختلف ہے۔"

"کس سِلسلے میں وسیم صاحب؟"

"بھئی بچّوں کے معاملات کا بڑوں سے کیا تعلق۔ کم از کم تمھیں احسان احمد صاحب کو یہ ساری باتیں نہیں بتانی چاہیئے تھیں۔ بے چاروں کا کتنا بڑا نقصان کر دیا تم نے۔ حالانکہ احسان لمیٹڈ کو میرے ذریعے بہت بڑا سہارا مِل رہا تھا۔"

"کیا ہُوا وسیم صاحب! ذرا تفصیل سے فرمایئے۔" رِداء نے دفعتاً ہی بدلے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"خیر علم تو ہو ہی گیا ہو گا تمھیں۔ احسان احمد صاحب نے جاتے ہی تمھیں بتایا ہو گا کہ اُنھوں نے کِس طرح مُجھ سے گفتگو کی۔" وسیم جمال بولا۔

"اوہ ہاں مجھے علم ہُوا ہے کہ آپ کے سارے فائل آپ کے مُنہ پر مار دیئے گئے ہیں۔"

"خیر اِس دُنیا میں ابھی ایسا کوئی شخص نہیں پیدا ہُوا رِداء صاحبہ جو میرے مُنہ پر کوئی چیز اُٹھا کر مار دے۔ ایسا شخص پھر اِس دُنیا میں رہتا نہیں ہے۔"

"اِس کا مطلب ہے کہ آپ بہت بڑے غنڈے ہیں؟" رِداء نے کہا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس اپنی اَنا اور اپنے وقار کا تحفظ کرنا جانتا ہُوں۔"

"اچھی بات ہے، اَنا اور وقار کا تحفظ تو کرنا ہی چاہیئے انسان یہ بھی نہ کر سکے تو پھر کسی گندے نالے میں ڈُوب مرے جا کر۔"

"آپ شاید مجھے گالیاں دینے کے مُوڈ میں ہیں؟"

"جی نہیں۔ میرا خیال ہے میں نے آپ کو ابھی تک کوئی گالی نہیں دی۔"

"خیر چھوڑیئے اِن تلخ و تُرش باتوں کو۔ آپ نے احسان صاحب کو یہ سب کچھ کیوں بتا دیا؟"

"تو آپ کا کیا خیال ہے، مجھے کِسے بتانا چاہیئے تھا؟"

"میرا مطلب ہے ہم اپنے ذاتی معاملات خود آپس میں ہی طے کر لیتے۔ احسان صاحب سے آپ کا کوئی رشتہ تو نہیں ہے۔ سُنا ہے آپ کے سرپرست ہیں بلکہ بڑے دعوے کر رہے تھے وہ سرپرستی کیا حیثیت رکھتی ہے رِداء صاحبہ! کوئی شخص کِسی کا سرپرست بن سکتا ہے آپ کے اپنے اہلِ خاندان نہیں ہیں۔ آپ نے بِلاوجہ دوسروں کی سرپرستی کا بوجھ سر پر کیوں لاد لیا ہے؟"

"اِس سِلسلے میں سوال کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں جناب وسیم صاحب؟"

"ہوتا تو نہیں ہُوں۔ لیکن ہو جاؤں گا۔"

"کیا احسان احمد صاحب سے ابھی آپ کو کچھ اور سُننا بھی باقی ہے؟" رِداء نے سوال کیا اور وسیم جمال کی ہنسی سُنائی دی پھر اُس نے کہا۔

"بہت سی فلمیں دیکھی ہیں میں نے۔ اور بہت ہی عجیب و غریب کہانیاں اُن میں ہوتی ہیں۔ بلکہ نظر آتی ہیں لیکن میں اِن کہانیوں سے اختلاف رکھتا ہُوں۔ ایسے کِردار بھی اِن کہانیوں میں ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے احسان احمد لمیٹڈ صاحب ہیں لیکن ان کِرداروں کو صِرف اسکرین کی حد تک رہنا چاہیئے اسکرین سے آگے یہ بالکل بے وقعت ہوتے ہیں۔"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" رِداء نے سوال کیا۔

"دراصل میں نے احسان احمد صاحب سے بھی یہی کہا تھا۔ کہ میں رِداء صاحبہ کا بڑا احترام کرتا ہُوں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں اُنھیں شرارتاً ساحل سمندر پر لے گیا تھا لیکن میں نے رِداء سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو غیر معیاری ہوتی بلکہ میں نے انتہائی شریفانہ انداز میں اُن سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اور رِداء یقینی طور پر احسان احمد نے تمھیں یہ بھی بتایا ہو گا کہ اُن سے بھی میں نے اپنے اِنہی جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ آخر رِداء کو کِسی کا دامن تو تھامنا پڑے گا۔ احسان احمد صاحب اگر رِداء کو احسان احمد لمیٹڈ کے لئے بہت زیادہ ضروری سمجھتے ہیں تو یہ اُن کی غلطی ہے۔ آج نہیں تو کل رِداء اُن سے جُدا ہو جائے گی۔ دراصل رِداء تم نہیں سمجھتیں کہ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ احسان لمیٹڈ بہت پُرانی فرم ہے اور بہت عُمدگی سے کام کرتی رہی ہے۔ لیکن جو طریقۂ کار میں نے تمھارا دیکھا ہے اُسے دیکھ کر میں دعوے سے کہتا ہُوں کہ تم احسان احمد کے لئے انتہائی ضروری ہو اور احسان احمد صاحب اپنی محبت کی آڑ میں تم پر تسلط جمائے رکھیں گے۔ رِداء! اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچو، بہت طویل زندگی پڑی ہے تمھاری۔ اور میرے ساتھ تمھارا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ تم اِس فرم کی جنرل منیجر ہمیشہ رہ سکتی ہو۔ پوری عُمر رہ سکتی ہو لیکن

کیا پوری عمر تمھارا اِسی طرح رہنے کا ارادہ ہے۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچوگی؟"

"بہت طویل مکالمے بولے ہیں آپ نے وسیم جمال صاحب، بڑی مشکل سے یاد کئے ہوں گے۔ لیکن وسیم صاحب آپ میرے لئے اِس قدر فکرمند کیوں ہیں؟"

"بس اِس لئے کہ تم سے محبت کرتا ہُوں۔"

"یکطرفہ محبت کیا کامیاب ہوسکتی ہے؟"

"ابتداء ایک ہی سمت سے ہوتی ہے رِداء۔ اب میں نے تم سے اپنے دِل کا حال کہا۔ کہتا رہُوں گا اور رفتہ رفتہ تمھارے دِل میں جگہ ہوجائے گی۔ بالکل اِسی طرح جیسے کہ پانی کی بوند پتھر میں گڑھا کردیتی ہے۔"

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہُوں کہ نہ تو میں پتھر ہُوں اور نہ ہی آپ پانی۔ اور اِس قِسم کے امکانات یہاں قطعی نہیں ہیں۔"

"نہیں رِداء! میں کِسی بھی طرح مایُوسی کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں ہُوں۔ تمھارے سِلسلے میں مَیں نے جو فیصلہ کیا ہے اُس پر اٹل ہُوں اور اٹل رہُوں گا۔ اور صرف اِتنا کہنا چاہتا ہُوں۔ رِداء کہ شرافت کے سارے راستے اپنا تا رہُوں گا۔ وہ راستے جن سے تم تک پہنچ سکوں اور اگر شرافت کے راستے کسی جگہ جاکر ختم ہوگئے تو پھر اپنے بارے میں صرف اِتنا بتادینا چاہتا ہُوں کہ میں جِس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہُوں کر ہی لیتا ہُوں کِسی نہ کِسی طرح۔"

"واہ! آپ نے ابھی کچھ فِلموں کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے بھی کچھ فِلمیں دیکھی ہیں اور اِن فِلموں میں ایسے کردار نظر آجاتے ہیں جو اِسی قِسم کی گفتگو کرتے ہیں اور اُس کے بعد جب اسکرین پر فلم کی کہانی ختم ہوتی ہے تو وہ کِردار اِس کہانی کے ساتھ ہی سو جاتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں یہ سب کچھ بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔"

تمھیں یہ سُن کر اور یہ دیکھ کر لُطف آئے گا رِداء کہ میں اپنے اِن خوابوں کو حقیقت بنانا چاہتا ہُوں۔"

"بہت چھچھوری گفتگو کررہے ہیں وسیم جمال صاحب لیکن ہوسکتا ہے اِس کا تعلق آپ کے خاندانی پس منظر سے ہو۔ احسان احمد صاحب کے بارے میں آپ اِتنا جان لیجئے کہ اگر وہ آپ کے خلاف کمربستہ ہوگئے تو آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

جواب میں وسیم جمال ہنس پڑا تھا پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"وہ بزرگ ہیں، قابلِ احترام ہیں رِداء اور میں اُن کا احترام کرتا ہُوں۔ مگر تمھیں خود اندازہ ہے کہ وہ بُوڑھے ہوچکے ہیں اور نوجوانوں کے معاملے میں بُوڑھوں کا دخل دینا خود اُن کے لئے ہی خطرناک ہوسکتا ہے۔ اب ہمارے تمھارے درمیان وہ گفتگو ختم ہوگئی جو نرمی اور محبت کی گفتگو ہوتی ہے۔ اِس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا اُس کی ذمّہ داری تم پر ہوگی۔ اچھا خدا حافظ کہتا ہُوں۔"

وسیم جمال نے کہا اور رِداء نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ وہ وسیم جمال کے الفاظ کے بارے میں سوچتی رہی، شدید غصّہ آرہا تھا۔ اُسے اُس شخص پر۔ بھلا اُس کی جُراٗت کیا ہے کہ یہ میرا بال بھی بیکار کرسکے۔ اور کِسی کے پیچھے پڑجانا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ لیکن کمینہ انسان ہے۔ میں اُسے مزہ چکھادُوں گی۔ اُس نے غصیلے انداز میں سوچا۔ اور کُرسی کی پُشت سے ٹک کر بیٹھ گئی۔

بہت دیر تک دِل میں غصّہ رہا اور اُس کے بعد دفعتاً ہی اُسے ایک اور احساس ہُوا۔ اُس نے احسان احمد صاحب کے بارے میں سوچا۔ احسان احمد صاحب۔ احسان احمد صاحب واقعی یہ بات تو وسیم جمال نے بالکل درُست کہی تھی کہ وہ بُوڑھے ہوچکے ہیں۔ کاروباری آدمی ہیں اور ہر ایک کے ساتھ نرمی اور برتاؤ کا سلوک کرنے والے، اُنھوں نے کہاں اپنی زندگی میں کِسی کے ساتھ کوئی سخت سلُوک کیا ہوگا۔ اور وسیم جمال اُس کے بارے میں بہرطور یہ اندازہ تو ہوجاتا تھا کہ غلط آدمی ہے اور اِس غلط آدمی سے اپنا تحفظ کیسے کیا جاسکتا ہے؟

رِداء کے اعصاب آہستہ آہستہ شکستہ ہونے لگے۔ بدن پر ایک ہلکی سی تھرتھری طاری ہوگئی۔ مَیں... مَیں کیا واقعی اُس کے خلاف کچھ کرسکتی ہُوں، میں نے غُصّے میں سب کچھ کہہ تو دیا۔ لیکن اگر وہ کِسی شرارت پر آمادہ ہو ہی گیا تو... تو احسان احمد صاحب۔ بھلا کیا کرسکیں گے۔ کیا کرسکتے ہیں وہ؟

وہ دیر تک یہی باتیں سوچتی رہی۔ اور ایک بار پھر دِل میں کسک سی ہونے لگی۔ ایک شخص تھا۔ ہاں ایک شخص تھا جو اِس بات کے جواب میں اِتنے سخت اقدامات کرسکتا تھا کہ وسیم جمال کو دانتوں پسینہ آجاتا۔ اُسے احساس ہوتا کہ جو الفاظ وہ غلطی سے کہہ گیا ہے، اُس کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے۔ اور وہ تھا تصوّر۔ یعنی خیردین، یعنی وہ جِس نے رشید سے اُس کی جان بچائی تھی۔ خیردین۔ خیردین۔ خیردین۔ تصوّر... وہ اِس وقت ذرا مختلف انداز میں سوچ رہی تھی اُسے نہ جانے کیوں یہ احساس ہورہا تھا۔ کہ تصوّر اُس کے سامنے ایک ایسی چٹان کی مانند تھا جِس سے دُنیا کی ہر بُرائی ٹکراکر ٹوٹ سکتی ہے۔ لیکن تصوّر۔ تصوّر اب اُس

کی دسترس سے بہت دُور تھا۔ اُس کے دِل میں نہ جانے کیا کیا احساسات جنم لے چکے ہیں اور اُس کا رویّہ اب اِس بات کا مظہر ہے کہ وہ اب رِداء کے لئے دِل میں کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔

رِداء کو بے اختیار اپنے اطراف خالی ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اور وہ سسکتے ہُوئے دِل کے ساتھ سوچنے لگی۔ کیا میں نے غلطی کی ہے، اگر واقعی تصوّر میرا ساتھی ہوتا تو وسیم جمال جیسے لوگ کبھی یہ جُراٗت نہ کرپاتے۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اُسی وقت چپڑاسی نے اندر جھانکا اور وہ چونک کر سیدھی ہوگئی۔

"یس میڈم!"

"کیا بات ہے؟"

"آپ نے مجھے بُلایا تھا؟"

"میں نے؟"

"گھنٹی بجی تھی جی۔" چپڑاسی واپسی کے لئے مُڑتا ہُوا بولا۔ تب ہی رِداء کو احساس ہُوا کہ اُس کا پاؤں غلطی سے نیچے گھنٹی پر جا پڑا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"سُنو مجھے ایک گلاس پانی پلادو۔" اور چپڑاسی گردن خم کرکے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی کا گلاس لے آیا اور رِداء نے اُسے واپسی کی اجازت دے دی۔ چپڑاسی کے جاتے ہی اُس نے پانی کا گلاس اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں اُسے خالی کرگئی بڑی تپش، بڑی جلن کا احساس ہورہا تھا۔

⁂

اختر کو صبر کہاں تھا۔ واپس پلٹے اور اُس نے کوٹھی پہنچتے ہی اجمل میاں کو چھاپ لیا۔ پہلے اُس نے اُنھیں پُرجوش مُبارک باد پیش کی اور پھر کہنے لگا۔

"آپ نے تو کمال کردیا اجمل میاں۔ واقعی میں نے اِتنا پھرتیلا آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ لوگ تو حیران رہ گئے ہوں گے۔ دو منٹ میں آپ نے سب کچھ ہی کر ڈالا یعنی فوراً ہی آپا بھائی جان سے مل بیٹھے آپ۔" اجمل میاں کے چہرے پر ایک شرمائی ہُوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"بس اللہ کا کرم ہے اختر بھائی جان، ورنہ میں کِس قابل ہُوں۔"

"ہاں اِس میں کوئی شک نہیں۔ آپ ہیں تو کِسی قابل نہیں۔ مگر اب ذرا جلدی سے یہ اُگل ڈالئے کہ آپا بھائی جان سے آپ کی کیا گفتگو ہُوئی؟"

"وہ بس میں اُنھیں الگ لے گیا۔ تنہائی میں اور وہاں میں نے اُن سے کہا کہ میں اُن سے محبت کرنے لگا ہُوں۔"

"ایسے فوراً ہی کہہ دیا؟" اختر نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے سوچا جب کہنا ہی ہے تو اِس میں تکلّف کیا۔"

"پھر کیا ہُوا؟"

"بس آپا بھائی جان نے میری محبت قبول کرلی۔"

"کرلی؟" اختر گہری سانس لے کر بولا۔

"ہاں اختر بھائی جان۔ اِس سِلسلے میں مَیں بہت خُوش نصیب ہُوں۔ وہ ذرا بھی میری بات کا بُرا نہیں مانیں۔ بلکہ بہت سی باتیں کرتی رہیں مجھ سے، آپ نے دیکھا ہوگا؟"

"ہاں میں نے دُور سے دیکھا تھا اور تمھاری خُوش بختی پر رشک کررہا تھا۔ واقعی اِس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے کمال کر دکھایا۔ اچھا ذرا یہ بتاؤ کہ گفتگو کیا ہُوئی اُن کی اور تمھاری؟"

"وہ اختر بھائی ہم بس یُوں سمجھ لیجئے کہ ہم، ہم براہِ راست ہوگئے۔"

"کیا ہوگئے؟"

"میرا مطلب ہے کہ درمیان کے سارے رابطے ہٹ گئے۔ اور ہم دونوں براہِ راست ہوگئے۔ مطلب یہ کہ ڈائریکٹ... ڈائریکٹ۔"

"ارے اجمل بھائی جان۔ میں ذرا غلط قِسم کا آدمی ہُوں۔ صحیح صحیح گفتگو نہ کرنے والے کو سزا ضرور دیتا ہُوں ذرا ہوش حواس قائم کرکے مجھ سے بات کیا کرو۔"

"کچھ غلطی ہوگئی اختر بھائی جان؟"

"غلطی اور مسلسل غلطی۔ میں پُوچھ رہا ہُوں تفصیلی بات چیت بتلاؤ۔"

"تت... تو تفصیلی تو مجھے یاد نہیں رہی۔" اجمل میاں چالاکی سے کام لینے لگے۔ قُدرت نے اُنھیں منع کردیا تھا کہ اِس سِلسلے میں کِسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔

"اچھا یہ بتاؤ جب تم نے اُن سے کہا کہ تم اُن سے عشق کرنے لگے ہو تو اُنھوں نے کیا جواب دیا؟"

"بس یہ پُوچھنے لگیں کہ تمھارا اُستاد کون ہے؟"

"کیا؟" اختر نے آنکھیں پھاڑ دیں۔

"ہاں اُنھوں نے مجھے بتایا کہ اُستاد کے بغیر عشق نہیں کیا جاسکتا۔"

"ہُوں، ٹھیک۔ تم نے کیا جواب دیا؟"

"پہلے تو کچھ جواب نہیں دیا تھا۔"

"ابے پہلے کی نہیں بعد کی بات پُوچھ رہا ہُوں۔"

"ب... بعد میں بھی کوئی جواب نہیں دیا۔"

"اجمل!" اختر آنکھیں نکال کر بولا۔

"جی۔ ب... بتا تو رہا ہُوں۔ اور وہ ڈائریکٹ۔ میرا مطلب

ہے براہِ راست "

" میں تیرا مطلب سمجھ رہا ہُوں اچھی طرح۔ تمھارے کہنے کا مطلب یہی ہے ناں کہ اب چونکہ اُن کے اور تمھارے درمیان براہِ راست تعلقات ہوگئے ہیں اِس لئے اب تم کسی درمیانی شخص کو پسند نہیں کرتے "

" جی ہاں، جی ہاں۔ بالکل بالکل۔ صحیح تجزیہ فرمایا آپ نے " اجمل نے مسکراتے ہُوئے گردن ہلائی۔

" اور تُو اُستاد کی اُستادی ختم کر رہا ہے "

" ایں۔۔ نہیں تو۔۔۔ ایسا تو کوئی کام نہیں کر رہا "

" تو پھر ان باتوں کو چھپانے کا مقصد کیا ہے ؟"

" چھپا کب رہا ہُوں۔ بتا تو رہا ہُوں۔ انھوں نے کہا کہ اُنھیں افریقہ بہت پسند ہے۔ اور وہ افریقہ کے خواب دیکھا کرتی ہیں "

" اچھا اچھا، خوب " اختر نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔ ندرت کو وہ اچھی طرح جانتا تھا اُس نے شرارتاً ہی یہ سب کچھ کیا تھا لیکن ندرت نے فوراً ہی اِس شرارت کو عملی جامہ پہنا دیا تھا بھلا ندرت جیسی آتش ریز لڑکی اجمل میاں کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ اختر نے اجمل میاں سے بہت سے سوالات کئے اور اجمل میاں راستے میں کنی کتراتے رہے پھر اختر نے اُنھیں آخری دھمکی دی اور کہا۔

" دیکھو اجمل میاں! بات دراصل یہ ہے کہ میں تمھارا بُرا نہیں چاہتا۔ اس کی بجائے کہ میں تمھارا دیا ہُوا تحفہ اور تنویر کا معاملہ عادل حسین صاحب کے سامنے پیش کر دوں۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی سیدھے راستے اختیار کر لو "

" ارے تو اختر بھائی میں کر ہی کیا رہا ہُوں۔ اور آپ۔ آپ براہِ کرم مجھے وہ تحفہ واپس کر دیں۔ اب وہ تحفہ میں آپا بھائی جان کو دُوں گا "

" دینا ضرور دینا۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ اور کیا کیا باتیں کیں اُنھوں نے ؟"

" بس وہ یہی باتیں کرتی رہیں۔ آپ مجھ سے قسم لے لیجئے میں ایک بات آپ کو بتا سکتا ہُوں وہ یہ کہ اُنھوں نے میری محبّت قبول کر لی ہے "

" خیر یہ تو بڑی اچھی بات ہے اور کوئی ایسی بات تو نہیں کہی اُنھوں نے جو تم مجھے نہ بتا رہے ہو ؟"

" لیجئے اختر بھائی جان آپ کو نہیں بتاؤں گا تو پھر کس کو بتاؤں گا " اجمل میاں کو گلو خلاصی ہوتی ہُوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کم از کم افریقی رقص کے بارے میں وہ اختر کو نہیں بتانا چاہتے تھے۔

اور پھر یہ تو خالص ذاتی معاملہ تھا۔ اُن کی محبُوبہ نے اُن سے افریقی رقص کی فرمائش کی تھی اور وہ اُس کے لئے اپنے دل میں بہت سے منصُوبے بنا چکے تھے۔ کئی افریقی رقاصوں کی وڈیو فلمیں مِل سکتی تھیں جنھیں دیکھ کر اُن رقصوں کی نقل کی جا سکتی تھی اور پھر وہ رقص پیش کرنا بھلا کون سا مشکل کام تھا۔ اِس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے ایسے افریقی رقص دیکھے تھے اور بے ہنگم اُچھل کُود اور جسم کے تھرکانے کو رقص کہا جاتا تھا۔ اور یہ بہرطور اجمل میاں کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا کم از کم ایک بات تو راز میں رہنے دی جاتی۔ ورنہ اگر اُس کا چرچا بھی عام ہو جاتا تو پھر آپا بھائی جان دِل میں کیا سوچتیں۔

بہرطور اختر سے پیچھا چھُوٹ گیا تھا اور اختر نے دِل میں یہی سوچا تھا کہ ندرت اِس مسئلے میں کافی دلچسپی لے گی ویسے ندرت کے کردار کو وہ اچھی طرح جانتا تھا اور کوئی ایسی ویسی بات اُس کے ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن تنویر کا پیچھا چھُوٹنا مشکل تھا ثناء اور ندرت کے دِل میں جو کھچڑی پک رہی تھی وہ بہت ہی دلچسپ کیفیات کی حامل تھی۔

دونوں رات کو بھی اِس موضوع پر بات کرتی رہی تھیں۔ اور اجمل میاں، نعمان اور تنویر کا مسئلہ اُن کے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث تھا۔ دونوں اِس بات سے خُوش تھیں کہ کم از کم اُن کے ہاتھ ایک تفریح تو آئی دونوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دوسرے دِن وہ صبح دس، ساڑھے دس بجے نکل جائیں گی اور عادل حسین کی کوٹھی پہنچ جائیں گی اِس دوران میں اختر اور خالد وغیرہ نہیں ہُوا کرتے تھے۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ دفتر جایا کرتے تھے اور دوپہر تک مصرُوف رہا کرتے تھے۔ تنویر سے جو کچھ گفتگو کی جا سکتی ہے، اِسی دوران کی جا سکتی ہے۔ اگر اختر وغیرہ آ گئے تو پھر تنویر سے بات کرنا مشکل ہو جائے گی۔

آخری فیصلہ کرنے کے بعد دونوں اپنے اپنے بستر پر چلی گئیں۔ اور دوسرے دِن صبح ناشتے کے بعد سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ جس کے سلسلے میں ایک دوسرے کو اشارے کئے جانے لگے۔

رِدا دفتر جا چکی تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے معاملات میں مصرُوف ہوگئے تھے۔ ثناء نے گاڑی نکالی، ندرت بھی تیار ہوگئی تھی۔ ثناء نے اُس کے لئے اجازت لے لی تھی اور کہا تھا کہ وہ ایک ضروری کام سے اُسے ساتھ لے جا رہی ہے۔ ایسا اکثر ہو جاتا تھا۔ اِس لئے کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اور پھر اِس گھر کا ماحول اعتراض کرنے کا نہ تھا۔ چنانچہ دونوں روانہ ہوگئیں اور

تھوڑی دیر کے بعد وہ عادل حسین کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئیں۔

کوٹھی کا لان سنسان پڑا تھا۔ عادل حسین صاحب کی کار موجود نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر اُنھیں بے حد اطمینان ہُوا کہ اختر وغیرہ موجود نہیں۔ تنویر گھر پر ہی تھی۔ اقبال جا چکا تھا۔ صمدانی صاحب بھی موجود نہیں تھے۔ چنانچہ اُن دونوں کے کام کے لئے فضا بہت سازگار تھی۔

سُلطانہ بیگم نے دونوں کا پُرجوش استقبال کیا۔ وہ ہمیشہ ہی اُن سے بہت محبّت سے پیش آتی تھیں کہنے لگیں۔

" ارے خیریت ؟ تم دونوں اچانک ہی کیسے آنا ہوگیا کوئی خاص بات تو نہیں ہے ؟"

" نہیں چچی جان! ایک کام سے اِس طرف آئے تھے سوچا آپ کو سلام کرتے چلیں " ثناء نے کہا۔

" بیٹھو بیٹھو۔ کیا پیو گی یہ بتاؤ ؟"

" وہ تنویر کہاں ہے ؟"

" آ رہی ہے ابھی کچن کی طرف گئی ہے " ندرت اور ثناء چند لمحات سُلطانہ بیگم سے بات کرتی رہیں پھر دونوں ہی اُٹھ گئیں۔ سُلطانہ بیگم نے پُوچھا تو ثناء نے کہا۔

" ذرا کچن کی طرف جا رہے ہیں تنویر کے پاس "

" بیٹھو، بُلا لیتی ہُوں اُسے یہیں چائے وغیرہ پی لینا میرے ساتھ "

" پی لیں گے چچی جان! ابھی ہم کوئی جا تھوڑی رہے ہیں آپ کے پاس ہی بیٹھیں گے۔ ذرا تنویر سے تو ملاقات کر لیں " ثناء نے کہا اور سُلطانہ بیگم نے گردن ہلا دی۔ جانتی تھیں کہ لڑکیاں اپنی ہم عمروں میں ہی خوش رہتی ہیں۔ ثناء اور ندرت کچن کی جانب چلی گئیں۔ تنویر باورچی کو ہدایت دے رہی تھی۔ اُن دونوں کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔

" ارے ندرت باجی، ثناء باجی، آپ لوگ کب آئیں ؟"

" کیا کر رہی ہو یہاں ؟"

" کچھ نہیں بس تھوڑا بہت کھانا پکانا سیکھ رہی ہُوں "

" آؤ اپنے کمرے میں چلو " ندرت نے کرخت لہجے میں کہا۔ اور تنویر حیران ہو کر کچن سے نکل آئی۔

" سب خیریت تو ہے ناں ندرت باجی۔ کوئی خاص بات ہے کیا ؟" تنویر نے پُوچھا۔ لیکن دونوں نے کوئی جواب نہ دیا اور تنویر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئیں۔

تنویر اُن کی صُورتیں دیکھ کر گھبرا گئی " کچھ بتائیں گی نہیں۔ کیا ہُوا۔ سب لوگ خیریت سے تو ہیں ؟ آپ اِتنی سنجیدہ کیوں ہیں ؟"

" بیٹھو " ندرت آہنی لہجے میں بولی۔

" نہیں بیٹھوں گی پہلے آپ بتائیے کیا بات ہے، یہ کیسی ہو رہی ہیں آپ دونوں۔ نہ ہنستی ہیں نہ مُسکراتی ہیں کیا ہوگیا آپ دونوں کو ؟" تنویر پریشانی سے بولی۔

" بیٹھ جاؤ " ندرت نے غرّا کر کہا اور تنویر دھم سے بیٹھ گئی۔

" ارے ارے ڈانٹ بھی رہی ہیں۔ کیا کیا ہے میں نے ؟" اُس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ندرت اور ثناء سخت نظروں سے اُسے گھُور رہی تھیں۔

" اِس شہر میں جو بھی ایسی واردات ہوتی ہے ہماری اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی " ندرت نے کہا۔

" یہ آپ کسی اور سے کہہ رہی ہیں یا مجھ سے ؟" تنویر نے پریشانی سے کہا۔

" ہاں تم سے "

" مگر میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا "

" کل صبح ناشتے میں کیا کھایا تھا ؟"

" کل ؟"

" ہاں کل صبح "

" صرف چائے پی تھی "

" دوپہر کو ؟"

" کھانا کھایا تھا۔ مگر "

" اگر مگر کچھ نہ کرو۔ جو سوال کیا جائے اُس کا جواب فوراً دو ورنہ نتائج بہت خطرناک نکلیں گے "

" آپ مذاق کر رہی ہیں ناں ندرت باجی۔ پلیز بتا دیجئے " تنویر نے خوشامد کرتے ہُوئے کہا۔

" ہرگز نہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ حالات کتنا خطرناک رُخ اختیار کر چکے ہیں۔ اِس وقت صرف ہم تمھیں بچا سکتے ہیں تنویر ورنہ تم گئیں کام سے " ثناء بولی اور تنویر کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ وہ بے حد خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ ندرت اور ثناء نے اُسے دیکھا اور پھر مایُوسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ندرت نے ثناء سے کہا۔

" یار ثناء! بات کچھ کھُلنے والی ہے یہ گھُنّی کسی کو سینگ نہیں مار سکتی " ثناء نے بھی تائیدی انداز میں گردن ہلائی تھی اور پھر دونوں نے اپنا رویّہ ذرا نرم کر دیا۔

" دراصل تنویر کل تم سے کچھ ایسی حرکتیں سرزد ہوگئی ہیں۔ جن کی بناء پر سب لوگ تشویش کا شکار ہوگئے ہیں۔ یہ سوچا جا رہا ہے کہ شاید تمھاری دماغی کیفیت کچھ متاثر ہُوئی ہے اور فیصلہ

کیا گیا ہے کہ تمھیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ ہمیں اِس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں تمھیں دماغی اسپتال میں نہ داخل کر دیا جائے اور ہم تمھیں اِسی سے بچانا چاہتے ہیں۔"

"ہائے اللہ۔ میرے دماغ کو کچھ ہو گیا ہے کیا، مجھے تو پتہ ہی نہیں چل سکا۔ قسم لے لیجئے ندرت باجی میرا سر تو بالکل ٹھیک ہے درد بھی نہیں ہوتا" تنویر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اِسی لئے تو تم سے کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم سے پوچھا جائے اُس کے بالکل درست جواب دینا اور کسی قسم کا جھوٹ مت بولنا تاکہ ہم تمھیں دماغی اسپتال میں داخل ہونے سے بچا سکیں۔"

"خدا قسم میں نے تو بالکل جھوٹ نہیں کہا۔ صبح کو میں ناشتہ نہیں کرتی صرف چائے پیتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا بھی بہت ہلکا کھاتی ہوں۔ دراصل زیادہ کھانے سے مجھے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ شام کی چائے میں البتہ کچھ لے لیتی ہوں اور پھر رات کا کھانا بعض اوقات تو گول کر جاتی ہوں اور بعض اوقات تھوڑا بہت کھا لیتی ہوں۔ کیا یہ چیزیں دماغ پر اثرانداز ہو سکتی ہیں؟"

"بالکل نہیں ہو سکتیں۔ اب اگر تم ہمیں ہماری تحقیق میں مدد دو تو ہم صاف الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ تنویر بالکل ٹھیک ہے۔ اور صرف لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے" ندرت نے کہا۔

"تو میں جواب دے تو رہی ہوں۔ کیا میں نے اِن میں سے کوئی جواب غلط دیا ہے، کیا ثناء باجی آپ کو بھی میرا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے؟"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں۔ ہم تو سب سے اِس بات کی پُرزور تردید کر رہے تھے کہ تنویر بالکل ٹھیک ہے، سب لوگ اُس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اچھا خیر چھوڑو اب سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے"

"جی، جی فرمائیے"

"ڈاکٹر نعمان کی خاطر مدارت کل کیوں ہو رہی تھی؟"

"ایں" تنویر چونک پڑی اور اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ دونوں گھاگ لڑکیوں کی نظریں اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ثناء نے ڈپٹ کر کہا۔

"خبردار۔ خبردار۔ دیکھو تم جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہم تو تمھارے ہمدرد ہیں اگر اسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتیں تو ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

"توبہ۔۔۔ توبہ، اسپتال کے تو تصوّر ہی سے میری جان نکلنے لگتی ہے۔ مم۔۔۔ مگر ڈاکٹر نعمان کی خاطر مدارت، وہ۔۔۔ وہ دراصل معاف کیجئے گا۔ ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے سچ بولوں یا۔۔۔ یا۔"

"ندرت! اُٹھو بیکار ہے، اِس کی تقدیر میں اسپتال میں داخل ہونا لکھا ہے۔ ہم چل کر سب سے کہہ دیتے ہیں کہ تنویر کا دماغ مشکوک ہے اور وہ ہمارے ساتھ کوئی تعاون نہیں کرنا چاہتی۔"

"ارے نہیں نہیں خدا کے لئے بیٹھئے تو سہی دیکھئے میری بھی ایک مجبوری تھی۔ یہ جو اجمل بھائی ہیں ناں۔ وہ جو اجمل بھائی جان ہیں اور افریقہ سے دوڑتے ہوئے یہاں چلے آئے ہیں خواہ مخواہ۔ وہ دراصل یہ سب کچھ کیا دھرا اُن کا ہے۔"

"اجمل بھائی جان کا؟" ندرت حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"تو اور کیا وہی تو اِن مصیبتوں کی جڑ ہیں۔"

"ذرا تفصیل جانِ من ذرا تفصیل، اصل واقعہ کیا ہُوا تھا؟"

"اصل واقعہ یہ تھا کہ یہ اجمل بھائی جان جب سے یہاں آئے مجھے تنویر جان۔ تنویر جان کہہ کر پکارتے ہیں اور پتہ نہیں کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے مجھے ایک تحفہ بھی دیا اور کہنے لگے کہ اُنھوں نے خوابوں میں وہ آویزے میرے کانوں میں آویزاں دیکھے ہیں۔"

"اللہ۔ اللہ، پھر کیا ہُوا؟" ندرت اور ثناء آنکھیں پھاڑ کر بولیں۔

"اُنھوں نے ڈبہ مجھے دیا تو میں نے اُنھیں دھمکی دے دی کہ آج شام ہی کو میں یہ ڈبہ چچا جان کے حوالے کر دُوں گی اور بتا دُوں گی کہ کیا صورتِ حال ہے مگر وہ اختر بھائی بیچ میں کُود پڑے۔"

"یقیناً کُود پڑے ہوں گے، جہاں اختر ہو وہاں یہی سب کچھ ہوتا ہے" ندرت نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تو اور کیا میرا تو اِس میں کوئی قصور نہیں ہے اختر بھائی جان نے وہ ڈبہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور کہنے لگے کہ اگر یہ بات چچا جان کے کانوں تک پہنچی تو خود میرا کردار بھی مشکوک ہو جائے گا میں تو بہت ڈرتی ہوں ثناء باجی۔ میرے تو حواس ہی قابو میں نہیں رہے۔ اور اختر بھائی جان نے مجھ سے کہا کہ میں اجمل کو اِس راستے سے ہٹانے کے لئے ایک ہی ترکیب کر سکتی ہوں کہ ڈاکٹر نعمان سے التفات کا اظہار کر دُوں۔ اگر اجمل میاں یہ دیکھیں گے کہ میں ڈاکٹر نعمان کی کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اُن کی خاطر مدارت کر رہی ہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور پھر میرا کام بن جائے گا۔"

"سُبحان اللہ کیا تجویز پیش کی تھی اختر نے" ندرت نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا پھر بولی۔

"لیکن ڈاکٹر نعمان ہی کیوں؟"

"وہ ڈاکٹر نعمان بھی بہت عجیب ہیں۔ جب ہم لوگ وہیں رہتے تھے ناں۔ میرا مطلب ہے ثناء باجی کے ہاں تو ڈاکٹر نعمان وہاں آتے جاتے تھے ایک بار میں باہر نکلی تو اُنھوں نے مجھے اپنی گاڑی میں کہیں چھوڑنے کی پیش کش کی جہاں میں جا رہی تھی اور اُس کے بعد بھی جب وہ آتے ہیں مجھ سے عجیب عجیب سی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ باتیں بھی اختر بھائی کو معلوم تھیں چنانچہ اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ اجمل میاں کو راستے سے ہٹانے کے لئے میں ڈاکٹر نعمان سے التفات کا اظہار کروں اور میں نے اختر بھائی کے کہنے پر ہی یہ سب کچھ کیا ہے۔"

"ڈاکٹر نعمان کیا تم سے اظہارِ عشق بھی کر چکے ہیں؟" ثناء نے سوال کیا اور تنویر کے چہرے پر ایک بار پھر شرمگیں کیفیت پھیل گئی۔

"مم۔۔۔ میں نہیں جانتی۔ بالکل نہیں جانتی۔ آپ قسم لے لیجئے مجھ سے۔ مم۔۔۔ میں نے تو کبھی اظہارِ عشق سنا بھی نہیں ہے کہ وہ ہوتا کیسے ہے؟"

"یقیناً نہیں سنا ہو گا۔ تم ایک شریف بچّی ہو لیکن ایک بات بتاؤ تنویر" ثناء نے اُسے گھورتے ہُوئے کہا۔ "تمھیں ڈاکٹر نعمان اچھے لگتے ہیں کہ اجمل میاں؟"

"ڈاکٹر نعمان، وہ تو بہت اچھے ہیں" تنویر نے اُسے بھولپن اور سادگی سے جواب دیا۔

"تو فیصلہ ہو گیا" ثناء نے ندرت سے ہاتھ ملاتے ہُوئے کہا۔ ندرت کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیلی ہُوئی تھیں اُس نے متحیّرانہ انداز میں کہا۔

"بھئی کمال ہے یعنی یہ سارا کچھ یُوں ہو جاتا ہے ثناء، یُوں!"

"ہاں۔ ہو تو جاتا ہے تم بھی یُوں یُوں کرنے کی ماہر ہو۔"

"اے۔ اے ثناء کیا یہیں آپس میں جھگڑنے کا ارادہ ہے ساری پول کھول دُوں گی تیری۔ فضول باتیں نہ کرو بے چارے خالد بھائی کو کس معصومیت سے بے وقوف بنایا ہے۔ کہنے لگیں"

"بکواس بند۔ بالکل بکواس بند" ثناء نے غرّاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر خود کو بھی قابو میں رکھو ناں"

"یہ آپ لوگوں نے کیا باتیں شروع کر دیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔"

"تمھاری سمجھ میں زندگی بھر کچھ نہیں آئے گا عزیزہ، سُنو سارے معاملات ہم بخیر و خوبی سنبھال لیں گے، تمھارا کہنا ہے کہ ڈاکٹر نعمان تمھیں پسند ہیں"

"میں نے کب کہا یہ کہ وہ مجھے پسند ہیں۔"

"ابھی ابھی تم نے کیا کہا تھا۔"

"وہ تو آپ کی بات کا جواب دیا تھا آپ نے کہا تھا کہ اجمل بھائی اور ڈاکٹر نعمان میں سے کون اچھا ہے تو میں نے کہہ دیا کہ ڈاکٹر نعمان مجھے اچھے لگتے ہیں"

"لگتے ہیں ناں"

"ہاں بالکل، اجمل بھائی سے تو بہت اچھے ہیں۔ اجمل بھائی تو بس عجیب و غریب انسان ہیں اُن کی تو کوئی بات میری سمجھ میں ہی نہیں آتی"

"ہُوں۔ ہُوں۔ ہُوں اچھا تو پھر سُنو ڈاکٹر نعمان سے تم اپنے التفات کا سلسلہ جاری رکھو لیکن چائے کے دوران نہیں بلکہ کبھی کبھی اُن سے باتیں کر لیا کرو اِس طرح لوگ اِس بات کا یقین کر لیں گے کہ تمھاری ذہنی حالت بالکل ٹھیک ہے"

"آپ پورے اعتماد سے کہہ رہی ہیں ناں؟" تنویر نے ہراساں لہجے میں پُوچھا۔

"بالکل اطمینان رکھو، جب ہم کسی کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتے ہیں تو پھر اُس کے عیش ہی عیش ہوتے ہیں۔ ویسے تنویر ایک بات ہے، تم ہو بڑی چکر باز معصوم بن کر دوسروں کو بے وقوف بناتی ہو"

"خدا قسم ثناء باجی میں نے آج تک کسی کو بے وقوف نہیں بنایا"

"جی چاہتا ہے کسی کو بے وقوف بنانے کے لئے"

"ایں نہیں جی نہیں چاہتا کیا فائدہ کسی کے ساتھ ایسا مذاق کرنے سے جس سے اُسے کوئی تکلیف ہو"

"اچھا پھر ڈاکٹر نعمان کا مسئلہ طے رہا"

"لیکن مجھے کرنا کیا چاہیئے؟"

"سب سے پہلا کام تمھیں یہ کرنا چاہیئے کہ اختر صاحب کی تحویل سے نکل آؤ جو کچھ وہ تمھیں بتائیں گے وہ ہمیشہ تمھارے حق میں نقصان دہ ہو گا"

"نہیں۔ اختر بھائی ایسے نہیں ہیں۔ اِس بات پر مجھے اعتماد ہے"

"تو ہم ایسے ویسے ہیں" ندرت آنکھیں نکال کر بولی۔

"نہیں باجی! آپ بھی میری مدد کرتی ہیں"

"ارے ندرت! چھوڑو یار کیسی معصوم بچّی پر ہاتھ ڈال رہی ہو، کوئی مدِمقابل ہو تو ذرا بات بنتی ہے" ثناء نے رحم کھاتے ہُوئے کہا۔

"تو پھر یہ معصوم بچّہ بھی تو انسان بنے، خواہ مخواہ اپنی ذہانت کا مظاہرہ کر کے مجھے غصّہ دِلا رہا ہے"

"چھوڑو۔۔۔ چھوڑو اچھا بھئی تنویر تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اور خبردار اختر سے اِس کا تذکرہ بالکل نہ ہو اُس وقت ہم تمھاری

بالکل مدد نہیں کریں گے اگر تم نے اختر کو یہ باتیں بتا دیں۔ اختر سے انحراف بھی نہ کرو لیکن کل تم نے جو کچھ کیا اُس سے اختر مطمئن تھا۔"

"ہاں۔ بس اُنھوں نے وہیں یہ بات کہی تھی کہ اب میں یہ سلسلہ بند کر دوں۔ اور میں نے بند کر دیا۔"

"ارے ہاں، اجمل کہاں ہے؟" ثناء نے چونک کر پوچھا۔

"وہ اختر بھائی کے ساتھ ہی گئے ہوئے ہیں صبح سے دونوں ہی ساتھ نکلے تھے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ تم ایک پیغام دے دینا اجمل میاں کو ذرا میرا۔" نُدرت نے کہا۔

"جی... جی کہیئے۔"

"اُن سے کہنا کہ آپا بھائی جان آئی تھیں آپ سے ملنے کے لئے۔"

"آپا بھائی جان" تنویر بھی ہنس پڑی۔

"ہاں بھئی۔ وہ مجھے یہی کہتے ہیں۔"

"ارے ہاں تو بہ وہ تو مجھے بھی تنویر بھائی جان کہنے لگے ہیں۔"

"بہت اچھے انسان ہیں بہت ہی اعلیٰ اور نفیس قسم کے کیوں ثناء بھائی جان؟" نُدرت نے ثناء کی طرف دیکھ کر کہا اور ثناء بے اختیار ہنس پڑی۔

تنویر کی طرف سے اُن کا ذہن صاف ہو گیا تھا چکر اختر کا چلایا ہُوا تھا لیکن ڈاکٹر نعمان اور تنویر.. تنویر اور ڈاکٹر نعمان جوڑی یہ بھی اچھی تھی۔ ثناء نے نُدرت سے کہا۔

"چلو اللہ کا شکر ہے اور بے چاری بچّی کی قسمت جاگی۔ میرے خیال میں اب یہ ذِمّہ داری بھی ہمیں ہی قبول کرنا ہوگی۔"

اُسی وقت سُلطانہ بیگم کی آواز سُنائی دی۔

"ارے بھئی کہاں ہو تم لوگ چائے نہیں پیو گی کیا؟" اور اُس کے بعد وہ تینوں وہاں سے اُٹھ گئیں۔ ثناء نے تنویر کے کان میں کہا۔

"خبردار چچی جان کو اِس سلسلے میں ذرہ برابر کوئی معلومات نہیں حاصل ہونی چاہیئے۔ بس یہ کہہ دینا کہ یُوں ہی ملنے آ گئیں تھیں ہم لوگ اور باتیں کر رہے تھے۔" تنویر نے سمجھ جانے والے انداز میں گردن ہلا دی تھی۔

"فیض بابا نے چائے لگا دی ہے بھئی۔ اب تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔ اختر وغیرہ بھی آنے والے ہوں گے۔"

"نہیں چچی جان شام کو تو آنا ہی ہے۔ ہم لوگ اتنی دیر کے لئے کہہ کر نہیں آئے۔" چائے پینے کے بعد ثناء اور نُدرت واپس چل پڑی تھیں آتے ہوئے اُنھوں نے تنویر کو ایک بار پھر تاکید کر دی تھی۔

✦

وسیم جمال نے کار کے بریکوں پر دباؤ ڈالا اور کار کی رفتار سُست ہو گئی وہ بائیں سمت ہاتھ نکال کر کار کو فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑا کرنے لگا اور پھر کار روک کر اُس نے دروازہ کھولا اور نیچے اُتر آیا۔ وہ نوجوان ایک اسٹور سے باہر نکلا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ نظر آ رہا تھا فٹ پاتھ پر وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ وسیم جمال اُس کے قریب پہنچ گیا اُس نے بے تکلّفی سے خوبصورت نوجوان کے شانے پر ہاتھ رکھا اور نوجوان رُک کر اُسے دیکھنے لگا۔ وسیم جمال کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی نوجوان بھی اُسے دیکھ کر مُسکرا دیا۔

"ہیلو۔" وسیم جمال نے کہا

"ہیلو سَر۔" نوجوان بھی پُر تپاک لہجے میں بولا۔

"مجھے اپنی یادداشت پر فخر ہے لیکن میرا خیال ہے تم نے بھی مجھے پہچان لیا۔"

"کیوں نہیں جناب! میں آپ کو پہچان گیا ہُوں لیکن بدقسمتی ہے ہم دونوں کا کوئی تعارف نہیں ہے۔"

"ہاں سو فیصد بدقسمتی ہے یہ، اور تعارف ہو جانا چاہیئے۔ آؤ کہیں ضروری کام سے تو نہیں جا رہے؟"

"جی نہیں، قطعی نہیں، بس کچھ تھوڑا سا سامان خریدنے کے لئے نکلا تھا۔" نوجوان نے جواب دیا اور وسیم جمال اُسے لئے ہُوئے اپنی شاندار و قیمتی کار کے قریب پہنچ گیا۔

"آؤ بیٹھو کہیں مناسب جگہ بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔" نوجوان نے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

وسیم جمال نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کا دروازہ کھول دیا اور نوجوان اندر آ کر بیٹھ گیا وسیم اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ بہت ہی دِلکش اور پُر سحر شخصیت کا مالک تھا یہ شخص اور وسیم نے اُس دِن اُسے ساحِل پر دیکھا تھا جب وہ رَداء کو دھوکا دے کر ساحِلِ سمندر پر لے گیا تھا اور یہ نوجوان پانی سے برآمد ہُوا تھا۔ دونوں کے درمیان کچھ ایسی شناسائی کا اظہار ہُوا تھا کہ وسیم نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے گہرے شناسا ہیں۔ اُس کے بعد نوجوان رُکا نہیں تھا لیکن رَداء سے بھی اُس کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی تھی۔

اِس وقت وسیم کو وہ بازار میں نظر آ گیا تو وسیم نے کار روک کر اُسے اِس طرح مخاطب کر لیا تھا راستے میں وسیم نے کہا۔

"میرا نام وسیم جمال ہے۔"

"اور فدوی کو مرزا تصوّر بیگ کہتے ہیں۔"

"گڈ، بڑی خوشی ہُوئی تم سے مِل کر، گو ہماری اُس دن کی ملاقات بڑی ڈرامائی کیفیت کی حامل تھی لیکن اِتنا اندازہ میں نے لگا لیا تھا کہ تمھارا رَداء سے کوئی گہرا رشتہ ہے۔"

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب آپ کو غلط فہمی ہُوئی ہے۔" تصوّر بیگ نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مس رَداء کے لئے دِل میں کوئی بدگمانی نہ پیدا کریں ہمارے درمیان صرف شناسائی ہی ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"آؤ۔" وسیم نے کار ایک خوبصورت ریستوران کے سامنے روکی اور نیچے اُتر گیا۔

"سامان یہیں چھوڑ دو تھوڑی دیر بیٹھیں گے اُس کے بعد تم جہاں کہو گے میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔"

"جی بہت بہتر۔" تصوّر بیگ نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا۔ اور وسیم کے ساتھ ریستوران میں داخل ہو گیا۔ ریستوران بہت ہی اعلیٰ درجے کا تھا اور تصوّر بیگ اپنے انداز سے جھجک کا اظہار کر رہا تھا جسے وسیم جمال نے خاص طور سے محسوس کیا تھا وہ اِس شخص کی حیثیت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا اور نوجوان کے جھجکنے کے انداز سے اُسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کے ریستورانوں کے قابِل نہیں ہے۔

چند لمحات کے بعد دونوں ایک میز کے گِرد جا بیٹھے اور وسیم نے چائے کے ساتھ کچھ اور لوازمات کا آرڈر دے دیا۔ وہ نوجوان، تصوّر بیگ نہایت نیاز مندانہ انداز میں بیٹھا ہُوا تھا۔

"ہاں تو مائی ڈیئر مسٹر تصوّر بیگ، یہ بات میرے لئے انتہائی باعث دلچسپی ہوگی کہ میں تم سے مکمل تعارف حاصل کروں۔ کیا کرتے ہو؟"

"جی وہ میں ایک فرم میں کلرک ہُوں۔" تصوّر بیگ نے جواب دیا۔

"ہُوں۔ اچھا۔ اچھا۔ ٹھیک۔ یہ رَداء سے اُس دِن تمھاری کیا گفتگو ہو رہی تھی تمھاری شناسائی کہاں سے ہے؟"

"بس جناب عالی، جس فرم میں مَیں ملازمت کرتا تھا۔ مس رَداء بھی پہلے اُسی فرم میں کام کرتی تھیں بہت ہی اعلیٰ قسم کی خاتون ہیں ہر ایک سے محبّت اور نرمی سے پیش آنا اُن کا شعار ہے۔ میں بھی اُن کے نیاز مندوں میں شامِل تھا اور میں نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ بالآخر ایک دِن رَداء صاحبہ بہت بڑی حیثیت اختیار کر جائیں گی۔"

"کون سی فرم میں کام کرتی تھیں مس رَداء؟" وسیم جمال نے پُوچھا اور تصوّر بیگ نے بڑے اطمینان سے تفسیر کی فرم کا نام لے دیا۔ "احسان لمیٹڈ سے پہلے،"

"اوہ، ہاں اچھا اچھا ٹھیک تو تمھارا اور رَداء کا بس یہی رشتہ تھا، یہ رشتہ تو کچھ نہ ہُوا۔"

"نہیں جناب مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ زمین اور آسمان کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا لیکن بہر طور ایک رشتہ ہوتا ہے۔"

"واہ شاعری بھی کر لیتے ہو؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔" تصوّر بیگ نے گردن خم کر کے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ چائے آ گئی تھی وسیم جمال نے اپنے ہاتھ سے چائے کے دو کپ بنائے اور پھر تصوّر بیگ کو کھانے پینے کی طرف متوجہ کیا۔

"شکریہ، بے حد شکریہ لیکن جناب کیا میں بھی آپ سے ایک سوال کر سکتا ہُوں؟"

"ہاں۔ ہاں پُوچھو کیا پُوچھنا چاہتے ہو؟" وسیم جمال کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ تصوّر بیگ بہت زیادہ کام کی چیز نہیں ہے۔ ایک معمولی سا کلرک بھلا اُس کے کیا کام آ سکتا ہے۔

"آپ کا مس رَداء سے کیا رشتہ ہے؟" تصوّر بیگ نے سوال کیا اور وسیم جمال کسی سوچ میں ڈُوب گیا پھر اُس نے اپنے ذہن میں کوئی فیصلہ کرتے ہُوئے آہستہ سے کہا۔

"وہ رشتہ جو ازل سے چلا آیا ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔"

"سُبحان اللہ، آپ کی شاعری بھی بُری نہیں ہے۔" تصوّر بیگ نے کہا اور وسیم جمال سرد نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔

"نہیں یہ شاعری نہیں ایک سچّائی ہے میں رَداء کو چاہتا ہُوں۔"

"معاف کیجئے گا آپ گرامر کی کچھ غلطی کر گئے ہیں آپ نے یہ نہیں کہا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔" تصوّر بیگ نے ایک پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہُوئے کہا اور وسیم جمال کے ہونٹ سُکڑ گئے پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ابھی میں یہ نہیں کہہ سکتا۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔" تصوّر بیگ بولا اور وسیم جمال شاید صحیح الفاظ کا انتخاب کرنے لگا پھر اُس نے کہا۔

"یُوں سمجھو دوست، ابھی وَن وے ٹریفک ہے۔"

"اوہ۔ تعجب ہے یقین نہیں آتا۔ ساحِلِ سمندر پر اِتنی بے تکلفی

سے جہل قدمی کر رہے تھے آپ حضرات کہ کوئی بھی دیکھ کر یہ کہہ سکتا تھا کہ ایک رُومانی جوڑا ہے۔ لیکن آپ کے یہ الفاظ مجھے بہت عجیب لگ رہے ہیں حالانکہ آپ کی عظیم شخصیت، آپ کی شاندار کار اور آپ کا یہ پُروقار انداز تعجب ہے ویسے سَر آپ کا شغلہ کیا ہے؟"

"میں ایک بہت بڑی فرم کا مالک ہوں تنہا اور بلا شرکتِ غیر ہے"

"تب تو میرا خیال ہے رداء صاحبہ انتہائی احمق ہیں معاف کیجئے گا میں بے تکلفی سے یہ جملہ کہہ گیا۔ اگر آپ رداء صاحبہ کو چاہتے ہیں تو پھر وہ آپ کو کیوں نہیں چاہتیں؟"

"چاہیں گی۔ چاہیں گی۔ اور مائی ڈیئر مسٹر تصوّر بیگ تم ذرا تماشہ دیکھنا کہ وہ مجھے کیسے چاہتی ہیں"

"سَر! آپ مجھے اِس تماشے میں شریک کریں گے؟" تصوّر بیگ نے سوال کیا اور وسیم جمال اُسے بغور دیکھنے لگا پھر بولا۔

"ایک بات بتاؤ؟"

"جی جی فرمائیے فرمائیے" تصوّر بیگ نے مستعدی سے کہا۔

"رداء کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟"

"سَر! میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اُن کا قد پانچ فٹ ساڑھے سات انچ ہے اور معاف کیجئے گا اِس سے آگے مَیں کچھ کہنا نہیں چاہتا باقی اُن کی کسی بات کے بارے میں مجھے نہیں معلوم لیکن سَر تعجب ہے اُن کی آپ سے اِس قدر بے تکلفی اور آپ اُن کے بارے میں اِتنا بھی نہیں جانتے"

"اوہ تم اُس دِن کے واقعے کو بے تکلفی نہ سمجھو۔ مَیں اُسے دھوکہ دے کر ساحل پر لے گیا تھا لیکن میری جان تصوّر بیگ! تمھیں ایک بہت اچھا موقعہ مِل سکتا ہے۔ رداء سے تمھاری شناسائی ہے تم میرے کسی کام آ سکتے ہو؟"

"سَر! پیدا کس لئے ہوئے ہیں اور آپ جیسے بڑے لوگوں کے کام نہ آئے تو اِس کا مطلب ہے کہ اِس دُنیا میں کچھ بھی نہ کیا" اور تصوّر بیگ نے پُرخلوص انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا اور وسیم جمال کسی گہری سوچ میں ڈُوب گیا وہ رداء اور تصوّر بیگ کی شناسائی سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا لیکن بدبخت اِس بات سے ناواقف تھا کہ تصوّر بیگ درحقیقت کون ہے؟

ثناء اور نُدرت اپنے مشن کی تکمیل کے بعد گھر واپس آ گئی تھیں راستے بھر دونوں قہقہے لگاتی آئی تھیں تنویر، ڈاکٹر نعمان اور اجمل بھائی جان۔ اِن لوگوں نے احسان احمد کے اِس گلزار میں ایک بار پھر قہقہوں کے پھول کھلا دیئے تھے۔

نُدرت، ثناء کو اجمل بھائی جان کے اُس کی طرف مبذول ہو جانے والے عشق کی تفصیل بھی بتا چکی تھی۔

گھر واپس آ کر بھی اِس سلسلے میں صلاح و مشورے ہونے لگے: "یار اللہ رکھی: خُدا کے فضل و کرم سے ایک بار پھر ہم اِن تفریحات میں خود کفیل ہو چکے ہیں پچھلے کچھ دِن بڑے کٹھن گزرے سب پر اوس پڑ گئی تھی۔ عارفہ خالہ، طفیلی بیگم، جمّن میاں اور دوسرے بہت سے۔ مگر بعد میں اب کچھ صُورتِ حال سنبھلی ہے۔"

"اس وقت ہمیں ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے" نُدرت نے کہا۔

"چیلنج؟"

"تم نے اندازہ نہیں لگایا مالک کی بیٹی"

"کس طرف اشارہ ہے؟"

"میاں اختر" نُدرت نے کہا۔

"اوہ۔ اپنے میاں کی بات کر رہی ہو" ثناء نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"اے۔ اے۔ زبان کو لگام دو۔ ذاتی اختلاف نہ شروع ہو جائے دُشمن فائدہ اُٹھا سکتا ہے" نُدرت آنکھیں نکال کر بولی۔

"میں نے تو تمھیں خوش کرنے کے لئے کہا ہے۔ ظاہر ہے جو ہے وہ تو ہے ہی۔ آج نہیں تو کل، یہ تو ہو گا اور وہ سچ مچ میاں کہلائیں گے"

"میاں جی ہی کہلائیں گے ناں۔ میاؤں تو نہیں ہوں گے"

"میاؤں؟"

"تمھارے میاؤں کی بات کر رہی ہوں۔ سر سے پاؤں تک میاؤں۔ میاؤں" نُدرت نے کہا۔

"خالد کی بات کر رہی ہو" ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ نام سُنے بغیر چین نہیں آیا"

"میرا خیال ہے ہم موضوع سے ہٹ گئے ہیں" ثناء بولی۔

"آپ ہی نے جادو بیانی کا آغاز کیا تھا" نُدرت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تو بات چیلنج کی ہو رہی تھی"

"ہاں۔ اتفاق سے اِس وقت تمام گھوڑوں کی لگامیں اختر صاحب کے ہاتھ میں ہیں اور اُنہی کی ڈائریکشن میں سارا ڈرامہ ہو رہا ہے یعنی ہمارے تین اہم گھوڑے تنویر، اجمل بھائی اور ڈاکٹر نعمان تینوں ہی براہِ راست دُشمن کے قبضے میں ہیں اور دُشمن ہماری برتری کبھی قبول نہیں کرے گا۔ کچھ اِس انداز سے اِن گھوڑوں پر قابو پانا؟

کہ دُشمن دیکھتا رہ جائے۔ اختر صاحب نے اجمل بھائی جان کو میری جانب متوجہ کیا ہے میں نے فوراً ہی گیند کیچ کر لی ہے لیکن یہ گیند اختر کے اشاروں پر نہیں چلنی چاہیئے۔ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ اجمل بھائی جان ہمارے کنٹرول میں آ جائیں باقی رہ گئے تنویر اور ڈاکٹر نعمان تو بہرطور تنویر پر جال توڑ ڈالا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اختر اُس کی کاٹ کس طرح کرتے ہیں دراصل وہ سارا کھیل اپنی ہی ڈائریکشن میں چلانے کے خواہشمند معلوم ہوتے ہیں"

"بات تُو نے بالکل ٹھیک کہی ہے اللہ رکھی یار کچھ ہونا چاہیئے، ویسے سمجھ میں نہیں آتا کہ کس انداز میں آغاز ہو"

"کچھ سے کیا مُراد ہے؟"

"یار نُدرت یہ پہلا قدم تو ہم لوگ اُٹھا چکے ہیں عصمت باجی اور اقبال بھائی کے سلسلے میں پتہ نہیں اب یہ تعطّل کیوں پیدا ہو گیا ہے"

"ہُوں۔ قدم بہ قدم مرحلے تو طے ہو رہے ہیں یعنی ابراہیم صمدانی صاحب عادل انکل کی کوٹھی میں منتقل ہو چکے ہیں۔ لڑکا اپنے گھر بار کا ہو گیا ہے لڑکی کی رُخصتی کے سلسلے میں اب کیا قباحتیں ہیں"

"اِس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرو میرا خیال ہے آغاز ہو جانا چاہیئے ورنہ ہم لوگ بھی بُوڑھے ہو جائیں گے" دونوں کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں پھر ثناء نے کہا۔

"میں آج ہی ڈیڈی سے اِس بارے میں آخری گفتگو کرتی ہوں واقعی اب انتظار کس بات کا؟"

"اُس کے بعد دوسرے کھیل تو ہوتے ہی رہیں گے، بلکہ جاری رہیں گے۔ میرا خیال ہے اِن دونوں کی زندگی آباد کر دی جائے تو پھر تم آج ہی چچا جان سے بات کر لو"

"بالکل کروں گی اطمینان رکھو۔ شام کو تو ذرا وہاں جانا ہے دیکھیں کیا پھول کھلتے ہیں" "دراصل تنویر بھی بالکل بونگی ہے اور ڈاکٹر نعمان اور اجمل بھائی"

"خیر اجمل بھائی کی تو تم پرواہ مت کرو۔ اُن کو تو میں ایسا سنبھالوں گی کہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔ اختر نے جو مذاق میرے ساتھ کیا ہے آئٹ ہِز سَنڈوں اختر پر تو میرا نام نُدرت نہیں ہے"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ وہ کم از کم اِس سلسلے میں مار کھا جائیں گے" ثناء نے کہا اور اُس کے بعد دونوں دیر تک اِس موضوع پر بات کرتی رہیں۔

شام کو عادل حسین کی کوٹھی جانا تھا چنانچہ تیاریاں ہوئیں اور اُس کے بعد بڑی باقاعدگی سے عادل حسین کی کوٹھی کی جانب سفر شروع کر دیا گیا۔

ڈاکٹر نعمان کے بارے میں بھی امکانات تھے کہ شاید آ جائیں عادل حسین کی کوٹھی پُررونق ہو گئی تمام لوگ موجود تھے خود عادل حسین اور احسان احمد صاحب بھی اِتنی باقاعدگی سے اِن پروگراموں میں شرکت کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی حالانکہ کاروباری لوگ تھے۔

بچوں نے مِل کر کچھ ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ بڑے بھی اِس میں رنگ کر رہ گئے تھے اور اپنی عُمروں کو بھول گئے تھے۔ خوش گپیاں، چُہلیں، ہنسی مذاق، لطیفے بازی ایک دوسرے کی مزاج پُرسی اِس کے علاوہ انسان کو زندگی میں اور کیا درکار ہوتا ہے اور پہلے یہ سب کچھ ایک گھر میں محدُود تھا اب دو گھروں میں منتقل ہو گیا تھا اور سب ہی خُوش و خُرم تھے کسی کے دِل میں اگر کوئی دُکھ تھا وہ بہت معمُولی سا اور ایسا نہیں کہ زندگی کا روگ بن جائے ہاں کبھی کبھی رداء کے بارے میں ثناء اور نُدرت گفتگو کرتیں تو اُن کے چہروں پر تاسف اُبھر آتا۔ رداء بے شک اپنے نئے رویّے کے مطابق اب سب لوگوں میں گھُلنے مِلنے لگی تھی لیکن صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ عجیب سے احساس کا شکار ہے اور اپنی ذات پر جبر کر کے یہ سب کچھ کر رہی ہے، بعض اوقات تو ثناء اور نُدرت اِس موضوع پر بڑی دیر تک گفتگو کرتی رہتیں تھیں۔ ایک دِن نُدرت نے کہا تھا۔

"ثناء! یہ مونالیزا ہمیں ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کر سکتی میں تو اب اُس کی طرف سے مایُوس ہو گئی ہوں"۔

"کیا کیا جائے بھئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ رداء کا ٹائپ کیا ہے۔ حسّاس اور جذباتی ہونا اچھی بات ہے ظاہر ہے انسان کی فطرت کے جُزو ہیں یہ۔ لیکن ساری محبتوں کو نظر انداز کر دینا بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے وہ بہت ریزرو رہتی ہے اور میں اپنی تمام تر کوششیں کر کے ہار چکی ہوں بے شک میرے دِل میں اُس کی محبت پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہے لیکن اب میں کیا کروں ہر وقت تو اُس کی دلجوئی میں نہیں لگی رہ سکتی۔

"پتہ نہیں کیسے زندگی گُزارے گی یہ لڑکی بھی۔ برباد کر لیا ہے اپنے آپ کو"۔ بہرطور رداء کو زیادہ تنگ نہیں کیا جاتا تھا وہ جس طرح دوسروں کے ساتھ پیش آتی اُسی طرح اُسے قبول کر لیا جاتا تھا اور کوئی بھی اُس سے تعرض نہیں کرتا تھا آج کی شام اجمل بھائی کے نام تھی کیونکہ ڈاکٹر نعمان نہیں آئے تھے اختر بھی تفریحات میں گُم تھا تنویر ایک جانب خاموش بیٹھی تھی اور اجمل بھائی جان ایک عمدہ لباس میں ملبُوس اِدھر سے اُدھر جھکتے پھر رہے تھے۔

دراصل نُدرت کے ساتھ اُنھیں تنہائی نہیں مل رہی تھی۔ نُدرت نے خود ہی اِس کا موقعہ فراہم کیا اور ٹہلتی ہُوئی ایک جانب نِکل گئی۔

"آپا بھائی جان! آپ سب سے الگ تھلگ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"اوہ، مائی ڈیئر! اجمل بھائی جان! بس یُوں سمجھ لیں آپ کے لئے اِس طرف آ گئی تھی"۔

"ہیں"۔ اجمل میاں کا مُنہ پھاڑ سا کُھل گیا۔

"ہاں۔ دِن میں بھی آپ کی تلاش میں آئی تھی۔ شاید آپ کو علم ہُوا ہوگا"۔

"آہ۔ مجھے پتہ چلا تھا اور میں آپ کو نہیں بتا سکتا آپا بھائی جان کہ کتنی دیر تک افسوس کرتا رہا تھا دراصل اختر بھائی جان بہت ستم ظریف قسم کے آدمی ہیں۔ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اِدھر اُدھر گھماتے رہتے ہیں۔ دفتر میں بٹھا دیتے اب مجھے بتائیے مجھے دفتر سے کیا دِلچسپی ہوسکتی ہے۔ آپ... آپ میرے لئے آئی تھیں"۔

"تو اِس کوٹھی میں آپ کے علاوہ اور ہے کون"۔

"کک... کیا مطلب؟ یہاں تو بہت سے لوگ رہتے ہیں"۔

"رہنے والوں سے مجھے کیا دلچسپی جس سے مجھے دِلچسپی ہے جب وہی مجھے نہ مِلا تو میں کیا کرتی"۔ اجمل میاں سراپا عِشق بن گئے، اُن کی آنکھوں میں محبت کے طوفان اُمنڈنے لگے اور وہ جذباتی لہجے میں بولے۔

"آپا بھائی جان! آپ یُوں سمجھ لیجئے کہ میں... میں آپ کا غلام ہُوں آپ کے لئے جیتا ہُوں اور آپ کے لئے مرجاتا ہُوں۔ مم میرا مطلب ہے مر نہیں جاتا بس آپ کے لئے۔ آپ کے لئے"۔

"سمجھ گئی، سمجھ گئی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں اجمل بھائی جان، بہرطور عِشق پر ذرا قابو رکھنا چاہیئے۔ ہمارا معاشرہ افریقہ سے بے حد مختلف ہے یہاں زیادہ آزادی اور بے باکی کو پسند نہیں کیا جاتا اور پھر عِشق تو اُس گیلی لکڑی کی مانند ہے جو دھیمے دھیمے سُلگتی ہے آنچ دیتی ہے پر شعلہ نہیں دیتی۔ کیا سمجھے آپ؟"

"سج... جی ہاں۔ سمجھ گیا ہُوں بالکل سمجھ گیا ہُوں"۔

"تو پھر اب آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کک... کچھ نہیں۔ شش... شولا... میرا مطلب ہے شعلہ بن کر سُلگوں گا"۔

"سُلگیئے سُلگیئے۔ اللہ آپ کو ساری زندگی سُلگاتا رہے۔" نُدرت نے کہا اور اجمل میاں نے بڑی سعادت مندی سے سر جُھکا لیا پھر بولے۔

"اور کل آپ سے ملاقات ہو رہی ہے؟"

"ظاہر ہے ہوگی۔ کیوں کیا کل آپ وہاں نہیں آئیں گے"۔

"نہیں میرا مطلب ہے کل دِن میں آئیں گی آپ"۔

"بھئی وعدہ نہیں کرتی دراصل گھر سے زیادہ آزادی نہیں ہے ناں آج تو ذرا بہانہ بنا کر نکل آئی تھی لیکن کل مشکل ہوگا شام کو تو آپ آ ہی رہے ہیں"۔

"جی ہاں، جی ہاں۔ اور وہ آپ نے مجھے مائی ڈیئر کہا ہے نا۔ میں اِسے ہمیشہ دِل میں رکھوں گا"۔

"جی۔ جی۔ جی۔ دِل میں رکھنا اچھی بات ہے ویسے ذرا ایک بات تو بتائیے آپ"۔ نُدرت نے کہا۔

"پُوچھیئے"۔

"اختر صاحب نے آپ سے معلوم تو کیا ہوگا میری اور آپ کی گفتگو کے بارے میں"۔ اجمل میاں چند لمحات سوچتے رہے پھر بولے

"اختر بھائی بڑے چالاک ہیں بس یُوں سمجھ لیجئے کہ وہ سب کچھ معلوم کرتے رہے مگر میں نے وہ بات نہیں بتائی"۔

"کون سی بات؟"

"وہی افریقی رقص والی"۔

"ارے ہاں۔ اِس بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"میں... میں بہت جلد آپ کی اِس خواہش کو پُورا کردوں گا"۔

"اچانک... اِس طرح کہ لوگ سمجھنے بھی نہ پائیں کہ ہو کیا گیا"۔

"جج... جی بس مجھے ذرا جھجک محسوس ہوتی ہے"۔

"کمال ہے۔ کیا افریقہ کا طرزِ زندگی ہمارے طرزِ زندگی سے بہت مختلف ہے"۔

"میں سمجھا نہیں"۔

"میرا مطلب ہے کہ وہاں یہ ساری چیزیں اِس انداز میں نہیں ہوتیں جس انداز میں یہاں ہوتی ہیں"۔ نُدرت بولی۔

"اب بھی نہیں سمجھا"۔ اجمل میاں بولے۔

"جھجکنا مردوں کی شان کے خلاف ہے۔ مرد جو فیصلہ کر لیتے ہیں وہ بہت ٹھوس اور مضبُوط ہوتا ہے آپ افریقی رقص پیش کرنا چاہتے ہیں تو خُفیہ طور پر اُس کی تیاریاں کریں اور ایک دِن جب محفل شباب پر ہو لوگ اپنی اپنی تفریحات میں مشغُول ہوں آپ اچانک ہی یہ رقصِ بسمل پیش کر دیجئے گا پھر دیکھیں تماشہ۔ دُنیا آپ کی قدر و منزلت کرے گی لوگوں کی آنکھوں میں آپ کے لئے تحسین کے جذبات پیدا ہو جائیں گے اور وہ حیران ہو کر سوچیں گے کہ یہ کون جیالا ہے

جو میدانِ عمل میں اِس طرح رقصاں ہے"۔ اجمل میاں کے اندر جوش کے آثار پیدا ہوگئے پھر اُنھوں نے کہا۔

"آپ اطمینان رکھیں۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں میں آپ کو وہ کر کے دِکھاؤں گا۔ جو آپ کے دِل میں ہے"۔

"یقیناً یقیناً مجھے آپ سے یہی اُمید ہے۔ اب جایئے۔ وہ دیکھئے وہ اختر صاحب آپ کو کس طرح گھُور رہے ہیں"۔

"کک... کیا مطلب؟"

"بس وہ ذرا مختلف قسم کے آدمی ہیں پچھلے دِنوں مُجھ سے التفات کا اظہار کرتے رہے تھے مگر میرے دِل میں وہ کبھی نہ آ سکے"۔

"التفات۔ کیا ہوتا ہے التفات"۔ اجمل میاں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"محبت۔ محبت۔ وہ میری جانب میٹھی نِگاہوں سے دیکھتے تھے یُوں۔ یُوں"۔ نُدرت نے آنکھیں بھینگی کر کے کہا۔

"اوہو۔ پھر۔ پھر کیا ہُوا؟" اجمل میاں نے پھُولے ہُوئے سانس کے ساتھ پُوچھا۔

"بس میری توجہ اُن کی جانب نہ ہو سکی کچھ دِن تو کوشش کرتے رہے اور اُس کے بعد مایُوس ہو کر پیچھے ہٹ گئے"۔

"پپ... پیچھے ہٹ گئے؟" اجمل میاں نے جلدی سے پُوچھا۔

"ہاں ہٹنا ہی تھا۔ لیکن اب مجھے اِس بات کا خدشہ ہے کہ کہیں وہ میرے خلاف کوئی سازش نہ کریں"۔

"نہیں اختر بھائی ایسے آدمی تو ہیں نہیں۔ مم۔ مُجھ سے تو اُنھوں نے خود ہی کہا تھا کہ کسی اور پر ٹرائی ماروں۔ میرا مطلب ہے آپا بھائی جان کے لئے کوشش کروں"۔

"ہُوں، ہُوں ٹھیک ہے اچھا تو پھر اُنھوں نے تفصیلات تو معلوم کی ہوں گی آپ سے"۔

"میں نے بس تھوڑی بہت باتیں بتا دیں لیکن افریقی رقص کے بارے میں کچھ نہیں بتایا یہ میرا اور آپ کا راز تھا"۔

"بہت اچھا کیا آپ نے۔ ساری کوششیں بھی خُفیہ طور پر ہی کریں بس اختر بھائی جان کو ٹال دیا کریں آپ۔ کہ کوئی خاص گفتگو نہیں ہُوئی"۔

"آپ اطمینان رکھیں آپا بھائی جان ایسا ہی ہوگا"۔

"اب جایئے"۔ نُدرت نے کہا اور اجمل میاں واپس چل پڑے، نُدرت پُرسکُون انداز میں اُنھیں جاتے ہُوئے دیکھتی رہی تھی اور اُس کے بعد وہ بھی واپس اُس جگہ آ گئی۔ مقصد ہی یہ تھا اور پُورا ہو چُکا تھا شناء اُسے دیکھ رہی تھی۔

تنویر بے چاری کسی اُداس اُلّو کی مانند بیٹھی ہُوئی تھی۔ پتہ نہیں اُس کے ذہن میں ڈاکٹر نعمان آیا تھا یا پھر یہ سنجیدگی یُونہی تھی شناء کو البتہ شرارت سُوجھی اور وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی تنویر کے پاس پہنچ گئی۔

"تنویر"۔

"جی شناء باجی"۔

"اُداس کیوں بیٹھی ہو؟"

"اُداس۔ کیا میں اُداس ہُوں شناء باجی"۔

"ہاں۔ بالکل آنکھوں سے غم ٹپک رہا ہے ہونٹوں پہ کپکپاہٹ ہے۔ آخر یہ اُداسی کس لئے ہے۔ کوئی یاد آ رہا ہے؟"

"کوئی یاد تو نہیں آ رہا ہے، بس پپ... پتہ نہیں بس یُونہی ڈاکٹر نُعمان کا خیال آ گیا تھا"۔

"ہاں۔ ہاں مجھے یقین تھا۔ آنا ہی چاہیئے ہر شریف لڑکی کو اپنی پسندیدہ شخصیت کا خیال آنا ہی چاہیئے"۔

"سچ باجی! آپ نے دوپہر سے جب سے مُجھ سے بات کی ہے نا تو میرے ذہن میں مسلسل ڈاکٹر نعمان کا خیال آنے لگا ہے"۔

"اچھا۔ اچھا۔ آج آئے نہیں وہ خیر کوئی بات نہیں آج نہیں تو کل۔ اور پھر اگر ایسا ہُوا تو ہم اُسے بُلا لیں گے تمھارے لئے"۔

"نن... نہیں ابھی بُلائیں تو نہیں۔ مم... میں ذرا سوچ لُوں کہ مجھے اُن کا خیال کیوں آ رہا ہے"۔

"تمھیں اُن سے محبت ہوگئی ہوگی"۔ شناء نے کہا۔

"ارے نہیں باجی! خُدا کے لئے ایسی بات نہ کہیں مجھے کسی سے محبت وحبت نہیں ہُوئی بس ایسے ہی میں سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں آج وہ کیوں نہیں آئے"۔

"تم فِکر مت کرو کل وہ ضرور آئیں گے اور اگر نہیں آئے تو کان سے پکڑ کر بُلا لئے جائیں گے"۔

"ارے نہیں باجی۔ کان نہ پکڑیں اُن کا"۔ تنویر نے کہا۔

"اچھا۔ تمھیں دُکھ ہوتا ہے"۔

"نہیں نہیں۔ وہ سب کے سامنے ذرا بے عزتی ہو جائے گی۔ کان وان نہ پکڑیں بس ایسے ہی بُلا لیں"۔ تنویر نے کہا اور شناء ہنسنے لگی۔

"خُدا تجھے سمجھے تنویر۔ اِتنی بے وقُوف ہونا بھی کوئی اچھی بات تو نہیں ہے"۔

"کک... کیا میں بے وقُوف ہُوں شناء باجی؟"

"نہیں نہیں اچھا خیر ٹھیک ہے۔ چائے وغیرہ پی لی"۔

"ہاں پی پی" تنویر نے جواب دیا۔ ثناء اس بے چاری سے کیا مذاق کرتی بالکل بُدھو تھی۔ بالکل ہی بُدھو۔ بہر طور تقریبات ختم ہوئیں رات کو واپسی ہوئی تو نُدرت نے ثناء سے اپنا مطالبہ دُہرایا۔

"ثناء! کیا خیال ہے آج ہی گفتگو کی جائے گی۔ جناب احسان احمد صاحب سے"

"ہاں بھئی بالکل! میرا خیال ہے بات کر لیتی ہُوں آج ہی۔ رات کو ڈیڈی کے کمرے میں گھُس جاؤں گی۔ اور اُن سے تفصیلی گفتگو کر لُوں گی" ثناء نے کہا اور نُدرت گردن ہلانے لگی۔

✲

احسان احمد صاحب نے مُسکراتی نِگاہوں سے ثناء کو دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گئے ثناء بھی مُسکرا دی تھی۔

"تشریف لائیے۔ تشریف لائیے۔ مس ثناء احسان احمد"

"شُکریہ ڈیڈی"

"آپ کی آمد ذرا بڑی سنسنی خیز ہوتی ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دیکھئے کیا حُکم نازل ہونے والا ہے"

احسان احمد نے کہا اور ثناء ہنس دی۔

"آپ سمجھ گئے ہوں گے ڈیڈی کہ میں کیوں آپ کے پاس آئی ہُوں"

"میرا خیال ہے سمجھ گئے ہیں ہم۔ لیکن پُوچھنا آپ ہی سے چاہیں گے"

"بس ڈیڈی وہی مسئلہ تھا آخر آپ کیوں دیر کر رہے ہیں اب کیا قباحت ہے"

"بھئی آپ کے حُکم کا انتظار تھا پہلے بھی ہمارے درمیان یہ بات ہو چکی تھی کہ اِن مسائل کو آہستہ آہستہ نِمٹاتے ہیں اور اُس کے بعد جب آپ حُکم دیں گی آغاز کر دیا جائے گا"

"تو میرا خیال ہے اب مناسب وقت ہے"

"ہاں بالکل مناسب وقت ہے۔ تو پھر کیا خیال ہے کہ میں کل دِن میں یُوں کرتا ہُوں کہ عادل حسین سے بات کئے لیتا ہُوں اور سارے معاملات طے کر لئے جاتے ہیں۔ تمھیں گھر پر انتظام کرنا ہو گا"

"بالکل ٹھیک ہے ڈیڈی! میں کل سارا انتظام کر لُوں گی۔ مگر آپ یہ بات یقین سے کہتے ہیں کہ چچا عادل کل کے لئے تیار ہو جائیں گے"

"ظاہر ہے بھئی عادل حسین بھی اپنے پروگرام شام کے لئے ملتوی کر دیتے ہیں اور دِن ہی میں اپنے سارے کام نِمٹا دیتے ہیں۔ میں تمھیں ٹیلی فُون پر اطلاع دے دُوں گا سب سے پہلا کام یہی کروں گا کہ عادل حسین سے ٹیلی فُون پر بات کر لُوں گا۔ اور سارے مشورے کر لُوں گا اُس کے بعد چار بجے اُنھیں بُلا لیتے ہیں۔ میں دِن میں گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تمھیں ٹیلی فُون کر دُوں گا"

"او۔ کے۔ تھینک یُو ڈیڈی" ثناء نے کہا۔

"اور سُنائیے۔ کیسے مزاج چل رہے ہیں"

"بس ٹھیک ہُوں" ثناء نے کہا اور احسان احمد صاحب مُسکراتی نِگاہوں سے اپنی لاڈلی کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ثناء وہاں سے چلی آئی۔

دوسرے دِن احسان احمد صاحب نے وعدے کے مُطابق ساڑھے دس بجے عادل حسین کو ٹیلی فُون کیا اور دوسری طرف سے عادل حسین نے فُون ریسیو کر لیا۔

"بھئی عادل! رات کو ثناء صاحبہ تشریف لائی تھیں میرے پاس"

"ثناء" عادل حسین نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"جی۔ جی"

"خیریت"

"بس اب وہ چاہتی ہے کہ آپ اقبال کے سِلسلے میں سِلسلہ جنبانی کریں"

"حاضر ہیں بھئی۔ ہم تو احکامات کے مُنتظر تھے۔ ورنہ ہم تو تیار ہیں"

"ابراہیم صمدانی صاحب کِس طرح ہاتھ لگ سکتے ہیں"

"ہاں۔ یہ ذرا مسئلہ بن جائے گا۔ لیکن۔ لیکن ٹھیک ہے صمدانی کو میں کسی نہ کسی طرح پکڑ لُوں گا۔ اطمینان رکھو"

"تو پھر یُوں کرو کہ چار بجے آپ لوگ تمام حضرات تیار ہو کر غلام احمد کے گھر پہنچ جائیں ہم وہاں آپ کا استقبال کریں گے"

"ٹھیک ہے اچھا ہُوا تم نے بتا دیا۔ وقت بہت کم ہے اگر آج کے بجائے یہ پروگرام کل کا رکھ لیا جائے تو کیسا رہے گا"

"نہیں جناب! میں وعدہ کر چکا ہُوں محترمہ ثناء صاحبہ سے اور آپ جانتے ہیں کہ وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دینا چاہتیں"

"ہاں بھئی ہاں۔ ٹھیک ہے اب تم اطمینان رکھو، بس ابھی سے میں گھوڑے دوڑانا شروع کر دیتا ہُوں۔ عادل حسین نے کہا اور احسان احمد نے شُکریہ ادا کر کے فُون بند کر دیا اِس کے بعد اُنھوں نے ثناء کے نمبر ڈائل کئے اور تھوڑی دیر کے بعد ثناء سے رابطہ قائم ہو گیا۔

"تم تو جیسے فُون پر ہی بیٹھی ہُوئی تھیں"

"جی ڈیڈی! آپ نے وعدہ کیا تھا ناں کہ آپ مجھے اطلاع دیں گے"

"بھئی آپ حکم دیں اور تعمیلِ حُکم نہ ہو۔ چار بجے تمام لوگ غلام احمد کے گھر پہنچ رہے ہیں"

"او۔ کے ڈیڈی! بہت بہت شُکریہ انتہائی شُکریہ" ثناء نے کہا اور خُوشی سے اُچھلتی ہُوئی باہر نِکل آئی۔

نُدرت کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا جو اِس سِلسلے میں پہلا شریک ہوتا اُس نے فوراً ہی نُدرت کو اطلاع دی۔ اور نُدرت کہنے لگی۔

"مالک کی بیٹی اب ذرا تم تھوڑی سی اداکاری کر لو ہمارے گھر آ کر۔ کیونکہ میرا اِس سِلسلے میں آگے بڑھنا ٹھیک نہیں ہے"

"تو... تو چل... گھر میں آئی۔ ثناء گنگنائی اور نُدرت کوارٹر میں واپس پہنچ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ثناء ٹہلتی ہُوئی نُدرت کے پاس پہنچ گئی تھی۔ شوکت جہاں اور امّاں بی نے اُس کا استقبال کیا اور ثناء نے فوراً ہی اپنی آمد کی وجہ بیان کر دی۔

"وہ دراصل چچی جان! کچھ ایسے معاملات ہیں جن کے بارے میں مختصراً تو میں آپ سے گفتگو کر چکی ہُوں یا مجھے یاد نہیں کہ میں نے گفتگو کی تھی یا نہیں، نہیں کی تھی تو اب کئے لیتی ہُوں بعض اوقات بڑے وہ ذمہ داریاں محسوس نہیں کرتے جو بچّوں کے ذہن میں آ جاتی ہیں پتہ نہیں ہم لوگوں نے ابھی تک اِس بارے میں کیوں نہیں سوچا"

"کِس بارے میں بیٹی" امّاں بی نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"امّاں بی گھر میں لڑکیاں ہوں تو ماں باپ کے سینے پر بوجھ بننے لگتی ہیں اب آپ دیکھئے عصمت باجی ہیں نُدرت ہیں آخر آپ نے اِن کے بارے میں کچھ نہیں سوچا لڑکیوں کی عُمریں بڑھنے لگتی ہیں تو ماں باپ کو فکر لاحق ہو جاتی ہے مگر یہاں کوئی ذِکر ہی نہیں ہے" شوکت جہاں اور امّاں بی ایک دوسرے کی صُورت دیکھنے لگیں پھر شوکت جہاں نے کہا۔

"ثناء بیٹی! تمھارا کہنا بالکل دُرست ہے لیکن تم نے یہ کیوں سوچا کہ ہم اِس بارے میں نہیں سوچتے"

"کبھی کوئی تذکرہ ہُوا ہوتا تو میں سوچتی کہ ایسی کوئی بات ہے، آپ اپنی زبان سے کچھ کہتی ہی نہیں میں پچھلے دِنوں سے اِن معاملات پر سوچ رہی ہُوں اور بالآخر میں نے ایک فیصلہ کیا ہے آپ کو میرا یہ فیصلہ ماننا پڑے گا"

"کہو بیٹی۔ بڑی سنجیدہ گفتگو شروع کر دی تم نے آتے ہی۔ فیصلہ کیا کیا ہے؟"

"یہ بتائیے اقبال کیسا لڑکا ہے" ثناء نے کہا اور امّاں بی اور شوکت جہاں بُری طرح چونک پڑیں۔

"اقبال اپنا بچّہ ہے کیا کا کیا سوال ہے؟"

"میں نے سُنا ہے بچپن میں آپ لوگوں نے میرا مطلب ہے ابراہیم صمدانی صاحب نے اور آپ نے اِس بارے میں کوئی بات کی تھی"۔

"ہاں۔ یقیناً یہ بات ہے عصمت کا سِلسلہ اقبال سے کیا گیا تھا مگر یہاں آنے کے بعد حالات کچھ ایسے ہو گئے اور پھر سچی بات ہے کہ وقت نے یہ مُہلت نہ دی کہ ہم اِس سِلسلے کو آگے بڑھا سکتے۔ ابراہیم صمدانی صاحب تو مِلے ہی طویل عرصے کے بعد۔ بہر طور ثناء تمھارے ذہن میں یہ خیال آیا اور اب اتفاق کی بات یہ ہے کہ تم نے خود ہی سِلسلہ چھیڑ دیا ہے تو میں دِل کی بات کہوں کہ میں خود بھی یہی چاہتی ہُوں کہ یہ کام کچھ آگے بڑھے"

"سچ کہہ رہی ہیں آپ چچی جان" ثناء نے مسرّت سے دیوانی ہوتے ہُوئے کہا۔

"ہاں بیٹی! تم سے جھُوٹ بولنے کا کیا تصوّر کر سکتی ہُوں میں۔ یُوں کرو کہ تم اِس سِلسلے میں کوئی بہتر فیصلہ کرو اور ہماری نمائندہ بن جاؤ"

"بن جاؤں کیا چچی جان بن گئی ہُوں۔ میں تو یہ سُن کر خُوشی سے پاگل ہو گئی ورنہ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے کِن کِن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے آپ لوگ تیاریاں کریں"

"کیا مطلب؟"

"تیاریاں کریں۔ آج ہمارے گھر مہمان آ رہے ہیں عصمت باجی کا رشتہ لے کر"

"ہیں۔ امّاں بی اور شوکت جہاں کا مُنہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا"

"ہمارا نام ثناء ہے چچی جان۔ کیا سمجھیں آپ؟ الٰہ دین کا چراغ نہ آپ نے دیکھا ہے نہ میں نے دیکھا ہے۔ لیکن میں نے اپنی جیب میں محسوس کیا ہے یعنی چراغ رگڑو جن آ جائے اور جن سے جو کچھ کہو وہ ہو جائے۔ تیاریاں کیجئے آج شام کو چار بجے ہمارے گھر معزز مہمان آ رہے ہیں عصمت باجی کا رشتہ لے کر"

"میرے خُدا تم نے۔ تم نے یہ سب کچھ کر بھی ڈالا"

"جی چچی جان! اب آپ خواہ مخواہ اپنی تعریفیں کرانے پر تُلی ہُوئی ہیں تو میں کئے دیتی ہُوں کہ دراصل میں آپ لوگوں کو اپنی ذات کا ایک حصّہ سمجھتی ہُوں کسی بھی طرح آپ کو اپنے آپ سے جُدا نہیں سمجھتی میں یہ سمجھتی ہُوں کہ اگر میں کوئی غلط فیصلہ بھی کر لُوں تو اِس گھر کے لوگ میرے اِس غلط فیصلے کو قبول کر لیں گے۔ اور اِس اعتماد کی بنیاد پر میں نے یہ فیصلہ کیا اور اُس پر عمل بھی کر ڈالا"

"خدا کی پناہ... خدا کی پناہ۔ ویسے یہ بات تم نے بالکل درست کہی شناء کہ تمھارے ہر فیصلے کو ہم سر آنکھوں پر قبول کریں گے اور اس کی بھی کچھ وجوہات ہیں۔ تم نے اور تمھارے گھر والوں نے ہماری عزت کو سہارا دیا اور انسان کے لئے عزت سے زیادہ قیمتی شئے اور کوئی نہیں ہوتی اس دُنیا میں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ لوگ اس کا مفہوم ہی گُم کر بیٹھے ہوں وہ سہارا ہم زندگی کا اتنا بڑا سہارا سمجھتے ہیں کہ اُس کے بعد ہمارے لئے کچھ سوچنے سمجھنے کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی خیر یہ جذباتی باتیں ہیں تم ذرا بتاؤ تو سہی قصّہ کیا ہُوا ہے؟"

"بس چچی جان قصّہ کچھ نہیں ہُوا ہے، بس میں نے ڈیڈی سے اس موضوع پر بات کی تھی ڈیڈی بھی مجھ سے متفق ہو گئے ہیں۔ اور ہم دونوں مل کر یہ کھچڑی پکا رہے ہیں کہ عصمت باجی اور اقبال بھائی کی شادی کی جائے۔ اس سلسلے میں ابراہیم صمدانی صاحب سے بھی بات کر لی گئی ہے وہ بے چارے بڑی ہمت کر کے اس بات پر آمادہ ہُوئے کہ آپ کے ہاں رشتہ لے کر آئیں پتہ نہیں کیسے کیسے احساسات کا شکار ہیں وہ۔ بہر طور یہ کام آج ہونے جا رہا ہے۔"

"تو پھر... ہم... مگر غلام احمد صاحب سے۔ اُن سے تو بات بھی نہیں ہُوئی۔"

"آپ لوگ اطمینان رکھیں ڈیڈی انکل سے بات کر لیں گے، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے۔"

"انتظام۔ مہمانوں کے لئے ضیافت کا انتظام۔ چار بجے وہ لوگ آجائیں گے، چار بجے سے پہلے ہمیں تمام تیاریاں کر لینی ہیں۔" شوکت جہاں اور اماں بی کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے تھے ندرت اُس وقت کمرے میں موجود نہیں تھی بہر طور شوکت جہاں نے کہا۔

"بیٹی تم ہی سب کچھ کرو۔ میں کیا کر سکتی ہُوں۔"

"تو پھر آپ سے کرنے کو کہہ کون رہا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں سب کچھ ہو جائے گا۔ انکل میرے الٰہ دین کے چراغ ہیں" شناء نے کہا اور ہنستی ہُوئی باہر نکل آئی۔ ندرت کو تفصیلات بتائیں اور دونوں روانہ ہو گئیں اس کے بعد باقی سارے انتظامات شناء نے سنبھال لئے تھے اِدھر شناء اِن کارروائیوں میں مصرُوف تھی اُدھر احسان احمد صاحب اپنا کام کر رہے تھے غلام احمد تو اُن کے پاس ہمیشہ ہوتے ہی غلام احمد کو اُنھوں نے اپنے کمرے میں طلب کر لیا تھا غلام احمد صاحب احسان احمد کے سامنے پہنچے تو احسان احمد کہنے لگے۔

"ماشاء اللہ تین بیٹیاں ہیں ہماری۔ ویسے تو ہم پر بہت سی ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں لیکن اِن تین بیٹیوں کے سلسلے میں فوراً ہی کارروائی کا آغاز کرنا ہے۔ یعنی شناء، ندرت، عصمت کیا خیال ہے تمھارا؟"

"ج... جی یقیناً۔"

"اور عصمت ماشاء اللہ اُن سب میں بڑی ہے چنانچہ پہلے ہمیں اُس کے بارے میں سوچنا ہے" غلام احمد صاحب کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ احسان احمد کی فطرت سے وہ بخوبی واقف ہو گئے تھے چند لمحات کے بعد وہ آہستہ سے بولے۔

"لیکن جناب آپ کو اِس بات کا خیال کیسے آیا؟"

"کوئی خیال اچانک نہیں آتا۔ آہستہ آہستہ آتا ہے۔ ذہن میں جڑ پکڑتا رہتا ہے بس اُسے کہنے کے لئے کوئی وقت تعیّن کرنا پڑتا ہے چنانچہ میں آج تم سے یہ سب کچھ باتیں کر لینا چاہتا ہُوں۔"

"ضرور فرمائیے۔"

"ہمیں عصمت کی شادی کر دینی چاہیئے۔"

"بہت بہتر کر دیجئے" غلام احمد صاحب خفیف سی مُسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"سوچ لو میاں۔ میں آدمی ذرا ٹیڑھا ہُوں۔"

"آپ کے کسی فیصلے سے کسی حکم سے کوئی انحراف کر سکتا ہُوں میں" غلام احمد نے کہا۔

"مار لو۔ بھگو بھگو کر مار لو۔ خُدا نے تمھیں اِس کا موقعہ دیا ہے، خیر چھوڑو۔ اچھا یہ بتاؤ اقبال کیسا لڑکا ہے" احسان احمد نے کہا اور غلام احمد عجیب سی نگاہوں سے احسان احمد کو دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"وہ میرے دوست کا بیٹا ہے بچپن سے میرا جانا پہچانا ہے میں اُس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہُوں۔"

"بے کار باتوں سے گریز کرو یہ بتاؤ عصمت کے لئے وہ کیسا لڑکا ہے۔"

"نہایت موزوں۔ اور آپ کو شاید یہ سُن کر ہنسی آئے کہ بچپن میں میرے اور ابراہیم صمدانی کے درمیان یہ بات ہو چکی ہے اب میں نے بہت بار یہ بات سوچی لیکن بیٹی کا باپ ہُوں ابراہیم صمدانی کی ہی طرف سے کسی تذکرے کا منتظر تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ آپ نے بھی اسی انداز میں سوچا۔"

"یہ اتفاق کی بات نہیں ہے عزیز بلکہ تم ابراہیم صمدانی کی ذہنی کیفیت کو سمجھو وہ جن حالات کا شکار ہُوا ہے کیا اُس کے بعد وہ اتنی آسانی سے زبان کھول سکتا تھا۔"

"اگر اس نے حالات کو مدّ ِنگاہ رکھتے ہُوئے زبان بند رکھی تو مجھے اس سے شکایت ہو جائے گی۔ احسان صاحب۔ اُس نے میری دوستی پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے حالات پر نگاہ ڈالی۔"

"خیر... خیر جذباتی باتیں مت کرو۔ میں نے اِس موضوع کو آگے بڑھایا ہے اور اگر تمھاری اجازت ہو تو آج میں عادل حسین صاحب، ابراہیم صمدانی وغیرہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دُوں۔"

"جی؟" غلام احمد صاحب چونک پڑے۔

"ہاں" وہ لوگ رشتہ لے کر آنا چاہتے ہیں۔ غلام احمد صاحب عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے چند لمحات وہ سوچتے رہے پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ... آپ کے بارے میں میں اچھی طرح جانتا ہُوں۔ احسان احمد صاحب آپ کے ذہن میں جو کچھ ہے میں سمجھتا ہُوں" نہ جانے کیوں غلام احمد کی آواز رُندھ گئی۔

"یار اُلٹی بات کر رہے ہو۔ میں بھلا تم سے کسی طور انحراف کر سکتا ہُوں۔ تم... تم غلام احمد! کاش تم میری ماں کے پیٹ سے پیدا ہُوئے ہوتے کتنا فخر ہوتا مجھے تم پر۔"

"اور اب نہیں ہے" غلام احمد نے سوال کیا۔

"اب فخر کیا اب عقیدت ہے عقیدت۔ غلام احمد حقیقتوں سے گریز مت کرو میں تم سے عقیدت رکھنے میں حق بجانب ہُوں۔ ہم دونوں ہی جذباتی ہو گئے جذبات بعض اوقات اصل موضوع سے بہت دُور لے جاتے ہیں چھوڑو اِن باتوں کو۔ دیکھو اقبال بہت اچھا لڑکا ہے برسرِ روزگار بھی ہو گیا ہے اور عادل حسین مستقل اُس کے گُن گاتے رہتے ہیں مستقبل میں انشاء اللہ بہت کچھ بن جائے گا میرے خیال میں تو ہر لحاظ سے موزوں ہے۔"

"تو میں نے کب اِس سے اِنکار کیا۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں عادل حسین کو اطلاع دیئے دیتا ہُوں وہ اِس سلسلے میں مجھ سے کافی دِن سے کہہ رہے تھے۔ اور میں ٹال رہا تھا اُن کو۔"

"آپ کو مجھ سے پُوچھے بغیر ہی یہ سارے معاملات طے کر لینے چاہیئے تھے آپ کی بھی بیٹیاں ہیں وہ۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں بالکل ہیں بلاشبہ ہیں۔ بہت بہت شکریہ غلام احمد اب جاؤ بیٹھو آرام کرو۔"

"چنانچہ تمام ہی معاملات طے ہو گئے۔"

اِدھر یہ باپ بیٹی اپنے کاموں میں مصرُوف تھے اور اُدھر اِس طوفانی مہم میں عادل حسین کا کردار بھی زبردست ہو گیا تھا۔ وہ اِس وقت اپنی جگہ سے اُٹھ گئے تھے اُس کے بعد یہ بھی شکر تھا کہ ابراہیم صمدانی صاحب اُنھیں گھر پر ہی مل گئے تھے۔

"یار تمھارے سلسلے میں تو بڑی پلاننگ کر کے آیا تھا میں۔ اور سوچا تھا کہ کچھ بانس وغیرہ خرید کر لے جاؤں تاکہ کنوئیں میں ڈلوانے کا کام مکمل ہو جائے شکر ہے تقدیر یاور رہی اور تم سے ملاقات ہو گئی۔" ابراہیم صمدانی صاحب مُسکرانے لگے تھے پھر بولے۔

"جی ہاں! آج طبیعت کچھ کسلمندی کی طرف مائل تھی چنانچہ گھر پر ہی رُک گیا۔"

"میں سمجھتا ہُوں کہ ہر کام خُدا کی مرضی سے ہوتا ہے ابراہیم تم سے ایک بات کرنی ہے اور انتہائی سنجیدگی سے کرنی ہے پہلے بھی میں تم سے اِس موضوع پر گفتگو کر چکا ہُوں لیکن آج ذرا ٹھوس گفتگو ہو جانی چاہیئے۔"

"جی۔ جی! فرمائیے۔"

"غلام احمد کی بیٹی عصمت کے رشتے کی بات کر رہا ہُوں اقبال کے ساتھ اُس کی شادی کرنا چاہتا ہُوں۔" عادل حسین بھی کھرے اور سچّے آدمی تھے چنانچہ لگی لپٹی کے بغیر اُنھوں نے اپنا مدعا ظاہر کر دیا ابراہیم صمدانی چونک کر اُنھیں دیکھنے لگے پھر اُنھوں نے کہا۔

"ایک بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہُوں عادل حسین صاحب کہ آپ اِس رشتے کو موزوں سمجھتے ہیں؟ غلام احمد کے سلسلے میں جو معلومات حاصل ہُوئی ہیں اُنھیں آپ بھی جانتے ہیں میں بھی جانتا ہُوں اِن حالات میں کیا اُس کی بیٹی..."

"ہاں! بالکل دُرست رہے گا یہ سب کچھ اور اقبال کو اگر تم معمولی انسان سمجھتے ہو تو اِس لئے سمجھ سکتے ہو کہ وہ تمھارا بیٹا ہے اور گھر کی مُرغی دال برابر ہوتی ہے لیکن وہ جو کچھ ہے میں نے اُسے دیکھا ہے، پرکھا ہے اُس کا مستقبل انتہائی تابناک ہے ابراہیم اور میں سمجھتا ہُوں غلام احمد کو اُس جیسے داماد کے مل جانے پر فخر کرنا چاہیئے۔"

"میرے معاملات آپ سنبھال لیجئے مجھے ذرّہ برابر اعتراض نہ ہو گا۔"

"سوچ لو جو کچھ کہہ رہے ہو کر دِکھاؤ گے۔"

"میرا یہ سر آپ کے سامنے خم ہے عادل حسین صاحب آپ لوگوں نے ہمیں کیچڑ سے اُٹھا کر مخمل میں رکھ دیا ہے کیا عرض کر سکتے ہیں آپ سے۔"

"بس بس! ڈرامہ نگاری نہ کرو یار۔ آج شام کو چل رہے ہیں ہم لوگ رشتہ لے کر غلام احمد کے گھر..."

"آج؟" ابراہیم صمدانی چونک پڑے۔

"جی ہاں! غلام احمد کو اِس بارے میں اطلاع ہے۔"

"اوہ۔ اوہ۔ ابراہیم صمدانی کا چہرہ مسرت سے سُرخ ہوگیا وہ پاگلوں کی طرح عادل حسین کا چہرہ دیکھنے لگے پھر اُنھوں نے اُن کے ہاتھ پکڑ کر چومتے ہُوئے کہا۔

عادل حسین صاحب! آپ جو کریں گے میں اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہُوں"۔

"میرا سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے تیاری کرو جاؤ اندر جاؤ۔ اور بھابی صاحبہ کو اِس بارے میں اطلاع دو اور تمام تیاریاں مکمل کرلو میں تمھارے ساتھ ہُوں"۔ ابراہیم صاحب پُر مسرت انداز میں اندر دوڑ گئے تھے۔

❀

سب ہی کو لایا گیا تھا۔ ابراہیم صمدانی، سُلطانہ بیگم، تنویر بس اقبال نہیں آیا تھا اور اجمل بھائی جان۔ عادل حسین، اختر اور خالد بھی شریک تھے۔ غلام احمد اور احسان احمد پہلے ہی گھر آگئے تھے۔ اور ساتھ میں رِداء کو بھی لے آیا گیا تھا۔ رِداء کو احسان احمد صاحب نے ساری تفصیلات بتادی تھیں، اور وہ بہت خُوش ہُوئی تھی بعد میں اُس نے گھر آنے کے بعد ثناء اور نُدرت کو پکڑلیا۔

"اے لڑکیوں آج شام کو میں ذرا تم سے تفصیلی جھگڑا کرنا چاہتی ہُوں"۔

"کچھ کرو تو سہی مونالیزا تم نے تو اب ہم سے جھگڑا کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ سارے معاملات سے الگ تھلگ ہوکر رہ گئی ہو"۔ نُدرت بولی۔

"میں الگ تھلگ ہوکر رہ گئی ہُوں یا تم لوگوں نے مجھے الگ تھلگ کردیا ہے"۔

"بکواس مت کر رِداء، اچھا نہیں ہوگا بس کہے دیتی ہُوں"۔ ثناء نے بھی ٹکڑا لگایا۔

"ہاں بھئی ڈانٹ ڈپٹ کا محکمہ تو تمھارے پاس ہے جب دِل چاہے اپنے اختیارات استعمال کرسکتی ہو"۔

"ہم سب تم سے اجتماعی طور پر ناراض ہوگئے ہیں۔ ہمارے کسی مسئلے میں بھی تم نے دِلچسپی لینا ہی چھوڑ دی ہے"۔

"دیکھو بھئی، ناراض ہو یا کچھ بھی ہو جاؤ مجھے اِس کی پرواہ نہیں ہے۔ میں خود تمھارے سِلسلے میں شکایات رکھتی ہُوں تم لوگوں نے خود مجھے اپنے آپ سے دُور کردیا ہے"۔

"شرکت کروگی ہمارے ساتھ؟"

"کیوں نہیں کب اِنکار کیا ہے"۔

"خیر اب بہی ذرا اِس مسئلے کو حل کرلیں۔ اُس کے بعد تمہی سے نمٹیں گے"۔ ثناء نے کہا اور رِداء مُسکرانے لگی۔ غلام احمد صاحب نے مُسکراتی نِگاہوں سے عادل حسین، ابراہیم صمدانی وغیرہ کا استقبال کیا تھا۔ یہ تقریب خصُوصاً غلام احمد صاحب کے کوارٹر میں رکھی گئی تھی۔ تاکہ اُن کی اپنی شخصیت کو قائم رکھا جائے اور یہاں بھی جناب احسان احمد کا احسان اُن پر نہ رہے۔ بہرطور جذباتی گُفتگو ہُوئی۔ ابراہیم صمدانی نے آنسو بھری آواز میں کہا کہ یہ تو اُن کی ازلی خواہش تھی کہ غلام احمد سے اُس دور کے کٹے ہُوئے اِس رشتے کو استوار کریں جس دور میں وہ بھی اچھی حیثیت کے مالک تھے، لیکن اب اُن کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ غلام احمد صاحب نے شکایت کی کہ اُنھوں نے دولت کو دوستی پر ترجیح دی، بہرطور یہ ساری باتیں کرکے اُن دونوں کو دِل کی بھڑاس نکال لینے دی گئی اور عادل حسین نے سِلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"میاں اب یہ تمھارے شِکوے شکایات تو ہوچکے ذرا ہماری بھی سُن لو۔ بڑی آرزوئیں لے کر آئے ہیں"۔

"جی جی اب آپ فرمائیے"۔ احسان احمد نے غلام احمد کا ساتھ دیتے ہُوئے کہا۔

"ہمارا ایک بیٹا ہے جس کا نام ہے اقبال صمدانی ہم اُس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور نِگاہِ اِنتخاب تمھاری صاحبزادی عصمت غلام احمد پر پڑی ہے چنانچہ دست بستہ گزارش ہے کہ جناب اقبال صمدانی کو اپنی فرزندی میں قبُول کرکے ہمیں عزت بخشو"۔

"لڑکا کیا کرتا ہے؟" احسان احمد صاحب نے مُسکراتے ہُوئے پُوچھا۔

"ایک بہت اعلیٰ پائے کی فرم کا منیجر ہے اور بارہ ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ بہت ہی عُمدہ قسم کے مکان میں رہتا ہے۔ مکان اُس کا ذاتی ہے۔ ایک بہن ہے۔ ماں باپ ہیں اور بس۔ لڑکی راج کرے گی آپ کی"۔ عادل حسین صاحب نے کہا۔

"ہُوں۔ کیوں بھئی غلام احمد صاحب کیا مشورہ ہے؟"

"میں کیا عرض کرسکتا ہُوں۔ بیٹی آپ کی ہے۔ فیصلہ آپ کریں گے"۔

"لڑکا تو بُرا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں یہ رشتہ منظور کرلینا چاہیئے"۔

"تو پھر یہ مٹھائی قبُول فرمائیے"۔ عادل حسین صاحب نے مِٹھائی کا ڈبہ احسان احمد کے سامنے رکھتے ہُوئے کہا اور احسان احمد صاحب نے گردن ہلادی۔

"میاں جو طریقہ ہے اُس طریقے سے مِٹھائی کِھلاؤ"۔ عادل حسین صاحب نے ابراہیم صمدانی کو اشارہ کیا۔ ابراہیم صمدانی نے ایک لڈّو اُٹھا کر تھوڑا سا احسان احمد کے مُنہ میں پھر غلام احمد کے مُنہ میں رکھا

اور اُس کے بعد باقی بچا ہُوا لڈّو عادل حسین کے مُنہ میں ڈال دیا۔ عادل حسین صاحب نے اُن کا مُنہ میٹھا کرایا اور سب ایک دوسرے کو مُبارک بادیں دینے لگے۔ تب عادل حسین بولے۔

"جناب ابراہیم صمدانی صاحب کی طرف سے میری مودبانہ درخواست ہے کہ یہ شادی بہت جلد ہوجانی چاہیئے۔ ہم اِس بات کے مُنتظر ہیں کہ آپ ہمیں کوئی مناسب تاریخ دے دیں تاکہ اِس نیک کام کو جلد از جلد کرلیا جائے"۔

"میاں ابھی تو ذرا جُوتے گھِسنے پڑیں گے آپ کو۔ تاریخ لینے کے لئے آپ دوبارہ تشریف لائیں۔ باقاعدہ اہتمام ہوگا۔ بہرطور آپ کی خواہش کا احترام بھی کیا جائے گا۔ اور یہ تاریخ ہم جلد از جلد آپ کو دے دیں گے"۔

"تو پھر اُس کی حاضری کب ہو جائے؟"

"آج سے ٹھیک دس دِن کے بعد آپ یہاں تشریف لائیے۔ ہم آپس میں طے کرکے تاریخ کا فیصلہ کرلیں گے"۔ احسان احمد صاحب نے کہا۔

"بسر و چشم۔ ہمیں آپ کا یہ حُکم منظُور ہے۔ مُبارک بادوں کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ ابراہیم صمدانی صاحب غلام احمد صاحب کے پاس پہنچے اور بولے۔

"غلام احمد تم نے مجھے جو عِزت بخشی ہے، جو مقام دیا ہے وہ مرتے دم تک نہ بھُول سکوں گا"۔

"کیسی باتیں کرتے ہو ابراہیم! میرے بچپن کے دوست ہو یار۔ کب سے ہمارا ساتھ ہے۔ اگر تم نے اِس دوران تکلف کا کوئی تصور ذہن میں رکھا تو یہ میرے ساتھ زیادتی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ رشتہ تو آسمانوں سے طے ہوگیا تھا۔ خُدا کا شُکر ہے، ہم لوگ اِس فرض سے بہت جلد سبکدوش ہو جائیں گے"۔

"اب جب کہ یہ سب کچھ ہوچُکا ہے تو میری آرزو ہے میاں غلام احمد کہ یہ کام جلد از جلد ہو جائے، نہ جانے کیوں یُوں محسوس ہو رہا ہے جیسے دِن اور رات مشکل ہی سے گزریں گے"۔

"احسان بھائی کا حُکم ہے کہ دس دِن کے بعد یہ تاریخ طے کردی جائے تو اپنی پسند کا دِن مجھے بتا دینا مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے، جو کچھ بھی ہے پیش کردُوں گا۔ مجھے عصمت بیٹی مل جائے اور اُس کے علاوہ کیا درکار ہوگا مجھے"۔ جذباتی گُفتگو میں یہ محفل ختم ہوگئی۔ کھانے پینے کا پروگرام رکھا گیا احسان احمد صاحب نے پیش کش کی تھی کہ شام کی چائے اِس سلسلے میں ذرا بڑا اہتمام ہوگی۔ بہر حال اب یہاں سے واپسی کا کوئی تصور نہیں تھا چنانچہ شام کا بندوبست ہوگیا اور وقتِ مقررہ پر شام کا پروگرام جاری ہوگیا۔

بے چارے ڈاکٹر نعمان کو اِس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ ویسے بھی شاید وہ مصروف تھا کیونکہ اِس شام بھی وہ نہیں آیا تھا اور ثناء اور نُدرت نے تنویر کے چہرے پر آج بھی اُداسی دیکھی تھی۔ حالانکہ بھائی کا رشتہ طے ہوجانے سے وہ بے حد خوش تھی۔ لیکن اُس کی نگاہیں ڈاکٹر نعمان کو تلاش کررہی تھیں۔ نُدرت نے ثناء کو ٹہوکا دیا اور ثناء کہنے لگی۔

"ہاں میں دیکھ رہی ہُوں۔ یہ لڑکی تو باقاعدہ تربیت یافتہ ہوگئی ہے"۔

"یہ اجمل بھائی جان کیا ہونقوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں"۔

"دراصل بے چارے کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ آج ڈبل ڈبل پروگرام کیسے ہوگیا۔ میں ذرا اُنھیں دیکھتی ہُوں"۔ نُدرت نے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اجمل بھائی جان کے قریب پہنچ گئی۔ اجمل بھائی جان واقعی پریشان پریشان سے تھے حالانکہ اُنھیں صُورتِ حال سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن بات اُن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"وہ آپا بھائی جان یہ... یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

"یہ سب وہ ہورہا ہے اجمل بھائی جان جو ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے"۔

"یعنی... یعنی آج ہم لوگ پہلے کیوں آگئے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ لوگ شادی کی تاریخ طے کرنے جارہے ہیں یا پیغام لے کر جارہے ہیں۔ یہ سب کچھ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آرہا"۔

"جب آپ کی شادی کا پیغام لے کر جایا جائے گا تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا"۔

"مم... میری شادی۔ اوہ... اوہ..." اجمل میاں بُری طرح شرما گئے۔ نُدرت اُن کی شرماہٹ پر ہنس پڑی تھی۔ اُس وقت اختر اُنھیں اپنی جانب آتا نظر آیا اور نُدرت نے خطرے کی گھنٹی بجادی"۔

"کھسک لیں اجمل بھائی جان! ڈینجر مین آرہا ہے۔ اور کوئی بھی خطرہ درپیش ہوسکتا ہے"۔ اجمل میاں سچ مچ وہاں سے بھاگ لیے تھے۔ اختر ٹہلنے کے سے انداز میں چلتا ہُوا نُدرت کے پاس پہنچ گیا اور اُس نے نُدرت کو گھُورتے ہُوئے کہا۔

"کیا ہو رہا تھا یہ؟"

"کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں"۔ نُدرت نے دونوں ہاتھ سامنے

کرتے ہوئے کہا۔

"سنو بی بی! دراصل جب ایسا کوئی موقعہ ہوتا ہے تو میں جذباتی ہو جاتا ہوں اور آپ کو میرے جذبات کی پذیرائی کرنا چاہیئے۔ ورنہ صورتِ حال بگڑ بھی سکتی ہے۔"

"ارے کیا ہوا؟ کیسا موقعہ؟ کیسے جذبات؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ اختر عادل حسین صاحب؟"

"آج کا دن کسی تفریح کے لئے "آلاؤ۔ ALLOW" نہیں ہے آپ کو۔ آج آپ صرف میرے ساتھ دیکھی جانی چاہیئں سمجھیں"۔ ندرت ہنس پڑی پھر بولی۔

"جناب نے ہی یہ کوشش فرمائی ہے میں کیا عرض کر سکتی ہوں۔ ویسے اجمل بھائی جان بلاشبہ ایک حسین ترین شخصیت ہیں۔"

"سنو ندرت کل تنہا کہیں ملاقات ہونی چاہیئے۔ میرا خیال ہے ساحلِ سمندر موزوں رہے گا۔ آپ کو کل کسی بھی بہانے سے ساحلِ سمندر پر آنا ہوگا۔"

"ارے باپ رے۔ اتنی بڑی ذمہ داری نہ ڈالیں آپ کا احسان ہوگا۔ دراصل حالات کا ذرا تجزیہ کریں پھر کسی دن ایسا موقعہ نکال لیں گے کہ تھوڑی بہت دیر ساتھ گزاری جائے۔ لیکن کل کا دن معاف کر دیجیئے گا۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، پھر دن منتخب کر کے بتا دو"۔ اختر نے سوال کیا۔

"اس کے بعد آپ کو ہی یہ سچوئیشن پیدا کرنی ہوگی آپ کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کرتا ہے۔ نکال لیجئے گا کوئی موقعہ"۔ ندرت بھی شاید کچھ جذباتی سی ہو رہی تھی اس لئے اس نے اختر کو زیادہ تنگ نہ کیا۔

سب لوگ اپنی اپنی تفریحات میں مشغول ہو گئے تھے شام کو اقبال بھی معمول کے مطابق پہنچ گیا تھا۔ بلکہ اُسے ٹیلی فون کر کے بلا لیا گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو اس طرح لاتعلق ثابت کر رہا تھا جیسے اُسے آج کی اس تقریب کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ یہ بات بھی سب لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا باعث بن رہی تھی اور اقبال ان مسکراہٹوں کو دیکھ دیکھ کر جھینپ رہا تھا۔ عصمت کا چہرہ بھی شرم سے سرخ تھا۔ لیکن ظاہر ہے کسی جہالت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ عصمت تھوڑی دیر کے بعد اُٹھ کر کوارٹر کی جانب چلی گئی تھی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اس لئے کسی نے توجہ نہ دی۔ لیکن جب ثناء نے اقبال کو بھی کھسکتے ہوئے دیکھا تو اُس نے ندرت کو فوراً ہی اشارہ کیا۔

"ندرت... ندرت ذرا دیکھو۔ ذرا دیکھو۔"

"کیا ہو گیا؟ کیا بات ہے؟"

"پہلے عصمت باجی کوارٹر گئی تھیں اور اب اقبال بھائی ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔"

"ارے واقعی یہ لمبا چکر یقینی طور پر بعد میں کوارٹر تک جا کر ختم ہوگا۔"

"یار دیکھنا چاہیئے کیا پروگرام رہتا ہے؟"

"ہوشیاری سے باقی لوگ ہماری کمی کو محسوس نہ کر لیں۔"

"اس کے لئے ہر خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خواتین و حضرات، بلکہ خاتون و حضرت! او ہو ہو ہو، یہ ہیں چکر بازیاں۔ واہ ہمیں چکر دیا جا رہا ہے۔ ہمیں۔ ثناء نے کہا اور ندرت ہونٹ بھینچ کر گردن ہلانے لگی"۔ تھوڑی دیر کے بعد اقبال نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ندرت اور ثناء بھی خاموشی سے ٹہلتی ہوئیں اس انداز میں چل پڑیں جیسے چہل قدمی کر رہی ہوں۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے تھوڑی دیر کے بعد وہ کوارٹر کے نزدیک پہنچ گیئں اور اس کے بعد انتہائی احتیاط کے ساتھ انھوں نے کوارٹر کی دیوار پھلانگ لی، جمن کے گھر سے ہوتی ہوئیں اوپر پہنچیں اور پھر خاموشی سے کوارٹر میں اُتر گیئں۔

اُن کا اندازہ درست تھا۔ اقبال عصمت کے پاس موجود تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ اور ایک دوسرے سے کچھ شرما سے رہے تھے، پھر اقبال نے کہا۔

"جانتی ہو۔ کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے میں نے؟"

"آپ نے بہت گڑبڑ کر ڈالی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ گھر کتنا خطرناک ہے، ثناء ایک بار ہمیں بلیک میل کر چکی ہے۔"

"چھوڑو بھئی اب یہ بلیک میلنگ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ دراصل ایک عرض کرنا تھی اور ضرور کرنا تھی۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت صورتِ حال کس قدر خطرناک ہے لیکن کل آپ کو زحمت کرنا ہوگی۔"

"کہاں؟"

"ہوٹل رینبو میں... رینبو ہوٹل دیکھا ہے ناں جہاں ایک بار۔"

"ہاں دیکھا ہے لیکن... لیکن یہ مناسب نہ ہوگا۔ خواہ مخواہ ذرا سی لغزش بدنامی کا باعث بن سکتی ہے۔"

"چھوڑو ساری باتیں۔ کل بدنامی کا خطرہ مول لینا ہی ہوگا۔ میں رینبو کے کیبن نمبر سات میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اس کیبن کا بندوبست میں دن میں ہی کر لوں گا۔"

"لیکن کیا ضروری ہے اقبال۔ سوچو تو سہی میرا آنا کتنا مشکل ہوگا؟"

"عصمت یہ میری آرزو ہے تم کل آؤ۔ بیٹھ کر بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ اس سے زیادہ وقت یہاں نہیں لگایا جا سکتا۔ کل ہوٹل رینبو کیبن نمبر سات۔"

"بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ساڑھے بارہ بجے تمہارا انتظار کروں گا۔ لنچ تمہیں میرے ساتھ ہی کرنا ہوگا۔"

"اچھا میں کوشش کروں گی۔"

"کوشش نہیں۔ یقیناً۔ میں وہاں تنہا تمہارا انتظار کروں گا۔"

"اب جاؤ تو سہی۔ کوئی متوجہ نہ ہو جائے۔"

"او کے۔ او کے، جا رہا ہوں"۔ اقبال نے کہا اور اس کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ثناء اور ندرت دم سادھے یہ گفتگو سُن رہی تھیں۔ عصمت کوارٹر میں ہی تھی بمشکل تمام وہ پھر جمن کے کوارٹر میں اُتریں اور وہاں سے واپس چل پڑیں۔ اقبال دوسرے لوگوں کے درمیان پہنچ گیا تھا۔

آج کے دن کے لئے احسان احمد صاحب نے خصوصی انتظامات کئے تھے ڈنر کے سلسلے میں بڑی تیاریاں کی جا رہی تھیں دوسرے لوگ گفتگو میں مصروف تھے۔ ندرت نے ثناء سے کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے مالک کی بیٹی؟"

"رینبو۔ کیبن نمبر سات"۔ ثناء نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اگر ہم کل دن میں ہوٹل رینبو میں نہ ہوئے تو لعنت ہے ہم پر۔"

"ہزار بار لعنت"۔ ندرت نے بڑے خلوص سے کہا۔

"مگر اسکیم اللہ رکھی! کل اگر ان دو محبت بھرے دلوں کی دھڑکنیں ہم نے نہ سُنیں تو یوں سمجھو اس دُنیا میں کچھ نہ کیا؟"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"مگر یہ ہوگا کیسے؟"

"ایک بات کہوں ثناء؟"

"کہو بھئی۔"

"شیطانِ عظیم کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔"

"میں شیطان ظاہر کی بات کر رہی ہوں۔"

"یعنی جناب اختر حسین۔"

"سو فیصدی۔ اگر انھیں شامل کر لیں تو کام میں آسانی ہو جائے گی۔ شیطان کا کام ہی یہی ہوتا ہے۔"

"تم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے یہ بات۔ مگر اختر کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے؟"

"اب اتنے بے اثر بھی نہیں ہیں ہم"۔ ندرت نے کہا اور پھر بولی۔ "حضرت میاؤں بھی شریک ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔"

"یعنی خالد۔"

"جی آپ کے میاؤں کی بات کر رہی ہوں۔"

"یار وہ سنجیدہ آدمی ہیں۔ کوئی گھپلا نہ کر دیں"۔ ثناء نے کہا۔

"کر کے دیکھیں زندہ رہنا ہے اُنھیں یا نہیں؟ تو پھر کیا خیال ہے اختر سے بات کروں؟"

"کر لو۔ مگر وہ غدار آدمی ہے۔ کہیں غداری نہ کر جائے۔"

"ہونہہ! چاند پر خاک ڈالنے سے وہ میلا نہیں ہوتا۔ اختر کو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے"۔ ندرت نے کہا اور ثناء ہنس پڑی۔

"اسے کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ تمام انتظامات اختر کے سپرد کر دو لیکن پوری احتیاط سے اور سنو زیادہ رومانی ہونے کی کوشش نہ کرنا۔"

"میاؤں"۔ ندرت نے دانت نکال کر کہا اور پھر اختر کی تلاش میں چل پڑی۔ اختر تنویر کو دلاسے دیتا ہوا مل گیا تھا۔ ندرت نے سرد لہجے میں کہا:

"اختر صاحب! ثناء بلا رہی ہیں۔"

"خالد بھائی کو بلا رہی ہوں گی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"آئیے پلیز"۔ ندرت نے کہا اور اختر تنویر سے معذرت کر کے اُٹھ گیا۔ ندرت اُسے لان کے ایک گوشے میں لے گئی تھی۔

"خدا خیر کرے۔ یہاں... یہاں کیا کریں گی آپ؟" اختر نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک جملہ غیر سنجیدگی کا کہا تو میں چلی جاؤں گی۔ ایک واردات ہو گئی ہے۔ غور سے سُنیئے"۔ ندرت نے کہا اور پھر پوری کہانی اختر کو سنا دی۔

"توبہ۔ توبہ۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ یعنی حد ہو گئی ہے بے شرمی کی۔ مگر اب ہم کیا کریں۔"

"کل ہم لوگ یعنی میں آپ، خالد بھائی اور ثناء بھی ہوٹل رینبو میں لنچ کریں گے۔ اور کیبن ہوگا نمبر آٹھ یا چھ سمجھے آپ۔ اور یہ انتظام آپ کو کرنا ہے۔"

"چراغ کا جن حاضر ہے مستقبل کے آقا۔ انتظام ہو جائے گا"۔ اختر نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں دیر تک دوسرے دن کا پروگرام ترتیب دیتے رہے تھے۔

شیطانی ٹولہ مصروفِ عمل تھا اور پھر ذمہ داری اختر جیسے آدمی کے سپرد کردی جائے تو بھلا کام میں کیا کمی رہ سکتی ہے۔ اختر نے اپنی طرف سے بھی کچھ جدتیں کرڈالی تھیں۔ صبح کو عادل حسین صاحب جب دفتر کی جانب چلے تو اختر اور خالد بھی معمول کے مطابق اُن کے ساتھ ہی تھے لیکن گیارہ بجے اختر کوئی بہانہ کرکے نکل آیا اور اُس کے بعد اپنی کارروائیوں میں مصروف ہوگیا اُس نے اِن کارروائیوں میں جو جدتیں کرڈالی تھیں وہ ندرت اور ثناء کے علم میں نہیں تھیں۔ سارے کام انتہائی برق رفتاری سے کرنے کے بعد وہ بالآخر پونے بارہ بجے آفس واپس پہنچ گیا۔ بارہ بج کر دس منٹ پر اُس نے اقبال کو باہر نکلتے ہُوئے دیکھا۔ دفتر کی جانب سے اقبال کو باقاعدہ کار مہیا کی گئی تھی۔ چنانچہ اقبال صاحب کار میں بیٹھ کر چل پڑے تو اختر دوڑتا ہُوا خالد کے کمرے میں گھس گیا۔

"وہ خالد بھائی کچھ مصروف ہیں آپ"۔ اُس نے کہا اور خالد چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"ہاں! مصروف تو ہُوں کہو کیا بات ہے"۔

"میرا مطلب ہے کوئی اہم مصروفیت تو نہیں ہے"۔

"مصروفیت ہمیشہ اہم ہوتی ہے۔ تم اپنی سناؤ"۔

"منطق نہ جھاڑیں مجھ سے آئیے ذرا چلنا ہے"۔

"کہاں؟"

"کیا آپ کو مجھ پر اِتنا اعتبار نہیں ہے کہ میں آپ کو کسی غلط جگہ نہیں لے جاؤں گا"۔

"خدا کے بندے کچھ بتاؤ تو سہی"۔

"خدا کا بندہ اگر یہاں سے چل کر کچھ بتائے تو آپ کو اعتراض ہوگا"۔

"اُفوہ۔ یہ کام بھی اہم ہے بھئی۔ مسئلہ کیا ہے، پہلے مسئلہ بتاؤ پھر غور کروں گا۔ چل کہاں رہے ہو"۔

"اُٹھ جائیے اب ورنہ معاملہ بگڑ سکتا ہے کہہ رہا ہے میں نے آپ سے"۔ اختر نے جھلائے ہُوئے انداز میں کہا اور خالد اُسے دیکھتا رہا پھر مسکرادیا۔

"میں جانتا ہُوں کوئی غیر سنجیدہ بات ہی ہوگی۔ بہرحال چلو ڈیڈی کو بتادیا جائے"۔

"چاہیں تو بتادیں۔ ٹیلیفون پر بتادیں کہہ دیں ذرا ایک ضروری کام سے آؤٹ ڈور جارہے ہیں"۔ اختر نے کہا اور خالد نے انٹرکام کا بٹن آن کردیا۔ عادل حسین صاحب کی آواز سنائی دی تھی۔

"ہاں۔ کہو"۔

"وہ ڈیڈی ذرا تھوڑی دیر کے لئے جارہا ہُوں۔ ایک ضروری کام ہے"۔

"واپسی"۔

"واپسی تھوڑی دیر میں ہوجائے گی"۔

"جاؤ"۔ عادل حسین صاحب کی آواز اُبھری اور اختر نے خالد کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھالیا۔

"چلئے چلئے جلدی چلئے"۔

"آخر مصیبت کیا نازل ہُوئی ہے"۔

"نخرے کئے جائیں گے۔ مزا نہ آجائے تو دام واپس"۔ اختر نے کہا اور خالد ایک گہری سانس لے کر گردن ہلانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر اپنی کار میں آبیٹھا اور اُس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا وہ اور رفتار کافی تیز تھی۔

"یار بتاؤ گے نہیں تم کہ بات کیا ہے"۔

"آپ کو ایک ہوٹل میں لنچ کرانا ہے"۔ اختر نے جواب دیا۔

"اور اُس کے لئے یُوں محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی طوفان آنے والا ہے"۔

"جی ہاں! یہ لنچ ذرا اِسی قسم کا ہے آپ اِسے طوفانی لنچ کہہ سکتے ہیں"۔

"کون سے ہوٹل میں جارہے ہو"۔

"ہوٹل رینبو"۔ اختر نے جواب دیا۔

"رینبو شاید میں نے دیکھا ہے مگر وہ اِس طرف کہاں ہے، وہ تو۔۔"

"اِس طرف نہیں ہے۔ ذرا ایک ضروری کام ہے۔ احسان لمیٹڈ سے"۔

"ہُوں"! خالد نے نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی اور پھر خاموش ہوگیا کار تھوڑی دیر کے بعد احسان لمیٹڈ کے سامنے پہنچ گئی بارہ بج کر پچیس منٹ ہوچکے تھے احسان لمیٹڈ کے صدر گیٹ سے کچھ فاصلے پر رَداء کھڑی ہُوئی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھ رہی تھی۔ کار اختر نے اُس کے سامنے روک دی اور پچھلا دروازہ کھولتے ہُوئے کہا۔

"آئیے سسٹر"۔ رَداء مسکراتی ہُوئی کار کی جانب بڑھی اور پھر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اختر نے کار آگے بڑھادی تھی۔

"جا کہاں رہے ہو بھئی! تمہارے سارے کام ایسے ہی ہُوا کرتے ہیں کچھ بتا تو دو قصہ کیا ہے"۔ رَداء نے بھی وہی سوال کیا اور پھر خالد کی طرف دیکھ کر بولی۔

"خالد صاحب آپ بتائیے کیا معاملہ ہے یہ اختر تو بس یُوں ہی

اُوٹ پٹانگ ہیں مجھے ٹیلی فون پر حکم دیا کہ ٹھیک سوا بارہ بجے دفتر سے نکل کر نیچے آجاؤں بہت ضروری کام ہے۔ اور اب اِس طرح اغواء کرکے لئے جارہے ہیں"۔

"آپ یقین کیجئے رداء صاحبہ یہی کیفیت میری ہے۔ میں خود بھی نہیں سمجھ پایا کہ قصہ کیا ہے یقیناً اِس کے شیطانی ذہن نے کوئی شیطانی منصوبہ ہی بنایا ہوگا"۔

"اختر بتاؤ گے نہیں کہاں جارہے ہو"۔

"بتا چکا ہُوں سسٹر کہ ہوٹل رینبو جارہے ہیں ہم لوگ اور وہاں لنچ کریں گے"۔

"خدا کی پناہ یہ قیامت کیسے ٹوٹ پڑی ہے"۔

"آپ لوگ اگر مکمل رازداری کا وعدہ کریں تو کچھ اشارے دیئے جاسکتے ہیں"۔

"چلو ٹھیک ہے، ظاہر ہے تم سے انحراف کرکے خطرہ کون مول لے سکتا ہے اب بتادو رازداری کا وعدہ"۔

"دراصل آج ہم لوگوں نے لنچ کا پروگرام بنایا ہے اور ندرت اور ثناء صاحبہ بھی ہوٹل رینبو پر ہمارا انتظار کرتی ہُوئی ملیں گی"۔

"یہ ہوٹل رینبو پر عنایت کیوں ہُوئی ہے؟"

"بس سب کا یہی پروگرام تھا۔ میں نے سوچا کہ اِس میں آپ کو بھی شرکت کرنی چاہیئے۔ حالانکہ آپ کے بارے اُن دونوں کو بھی نہیں معلوم یہ میری اختراع ہے"۔

"مگر یہ سب کچھ آخر ہو کیوں رہا ہے"۔

"کھانا انسان کی ازلی ضرورت ہے اور ہم لوگ مسلسل عجیب و غریب چکروں میں مصروف رہتے ہیں کبھی کبھی کچھ تبدیلی بھی ہونی چاہیئے"۔

"کمال ہے یار خواہ مخواہ وقت ضائع کیا میں ایک ضروری کام کررہا تھا۔ لنچ اِتنا ضروری تو نہیں ہے اور پھر اُس کے لئے ہوٹل رینبو پر قیامت کیوں ٹوٹی آس پاس بھی بہت سے ہوٹل موجود ہیں"۔

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں خالد بھائی کہ وہ انسان کو بتائی نہیں جاتیں بلکہ خود بخود اُسے معلوم ہوجاتی ہیں"۔ اختر نے رفتار سست کردی۔ پندرہ منٹ کا یہ وقت ضروری تھا کیونکہ اِس سے پہلے ہوٹل پہنچنا خطرناک بھی ہوسکتا تھا بہرحال ٹھیک بارہ بج کر چالیس منٹ پر وہ ہوٹل رینبو پہنچا تھا اور دُور ہی سے انہیں ثناء کی کار نظر آگئی تھی۔ دونوں کار کے قریب کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اختر نے اپنی کار ثناء کی کار کے پاس روک دی ہوٹل رینبو کے سامنے کے فٹ پاتھ کے ساتھ اُس نے اقبال کی کار بھی کھڑی دیکھ لی تھی جس پر خالد وغیرہ کی نظر نہیں پڑی تھی۔ کار سے اُتر کر وہ ندرت اور ثناء کے پاس پہنچ گئے۔ ثناء اور ندرت رَداء کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ تھوڑی سی شرمندگی کا بھی احساس ہُوا تھا لیکن اُنھوں نے فوراً ہی صُورت حال کو سنبھال لیا۔

"اختر! تمہارا بے حد شکریہ کہ تم رداء کو اپنے ساتھ لے آئے"۔ ثناء بولی۔

"ہاں بھئی آپ لوگوں نے کہا تھا بھلا میں آپ کے حکم کی تعمیل کیوں نہ کرتا"۔ اختر نے کہا اور پھر پُوچھا۔

"پہنچ گئے"۔

"ہاں"۔

"تو پھر چلیں"۔

"آؤ"۔ ثناء نے کہا اور اُس کے بعد پانچوں ہوٹل رینبو کے صدر گیٹ سے اندر داخل ہوگئے۔ خالد اور رَداء اب بھی حیران تھے۔ ہوٹل رینبو بہت خوبصورت ہوٹلوں میں سے تھا اور اُس نے خصوصی طور پر کیبنوں کی روایت برقرار رکھی تھی جب کہ دوسرے ہوٹلوں میں کیبن سسٹم تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ وہ خاموشی سے بڑے ہال میں داخل ہُوئے ہال میں سناٹا طاری تھا چند ہی میزیں آباد تھیں البتہ کچھ کیبنوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ کیبن بھی نہایت خوبصورتی سے بنائے گئے تھے اور اُن کے درمیان رازداری کا معقول بندوبست رکھا گیا تھا کیبن نمبر چھ اختر نے حاصل کرلیا تھا چنانچہ وہ خاموشی سے کیبن نمبر چھ میں داخل ہو گیا غالباً یہاں آکر وہ پہلے بھی کچھ کارروائی کرچکا تھا۔ وہ لوگ دروازہ بند کرکے بیٹھ گئے اور اختر مسکرائی نِگاہوں سے اِن تمام لوگوں کو دیکھنے لگا پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور جیب سے ایک چھوٹا سا چوکور بکس نکال کر میز پر رکھ دیا۔ سب لوگوں نے متحیرانہ نِگاہوں سے اِس چوکور بکس کو دیکھا تھا جس کے درمیانی حصّے میں ایک۔۔۔ اسپیکر لگا ہُوا تھا اختر نے دو تار اُس میں سے نکالے۔ اور اُس کے بعد کیبن کے ایک گوشے میں جُھک کر دو اور تاروں سے اُن کا کنکشن کرنے لگا۔ دونوں تاروں کا کنکشن ہوگیا اور اختر نے اِس چوکور بکس کا سوئچ آن کردیا۔ سب احمقوں کی طرح اُس کی یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اِس سلسلے میں ثناء اور ندرت کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ خالد وغیرہ بھی اُسے تعجب سے دیکھتے رہے۔ لیکن دوسرے لمحے اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں سوئچ آن کرتے ہی چوکور بکس سے مدھم مدھم آوازیں اُبھرنے لگی تھیں۔

"ہاں عصمت آپ یقین کریں کہ میں نے بشکل تمام یہ ہمت

کی ہے اور آپ کا بھی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ تعاون کیا۔"

"یہ اس قدر تکلف کیوں پیدا ہوگیا ہے آپ کی گفتگو میں؟"

دوسری آواز عصمت کی تھی۔ ندرت اور ثناء حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئیں تھیں۔ ردا بھی اس کی جانب متوجہ ہوگئی تھی۔ اور خالد بھونچکا نظر آرہا تھا اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یہ تو... یہ تو عصمت اور اقبال کی آوازیں ہیں"۔ اختر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا، عصمت کہہ رہی تھی۔

"تو فرمائیے آپ نے یہ زحمت آخر کیوں کی ہے؟"

"بس عصمت کل کی خوشی تنہا برداشت نہ کر پایا۔ میں نے سوچا کہ تمھیں الگ بلا کر مبارکباد دوں۔"

"کمال کے آدمی ہیں آپ، ہم جس طرح بارود کے ڈھیر پر رہتے ہیں اس میں رہ کر آپ کو یہ خطرہ نہیں مول لینا چاہیئے تھا۔"

"بارود کا ڈھیر؟" اقبال نے سوال کیا۔

"ندرت، ثناء، اختر۔ ان تینوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تینوں ہی ٹائم بم ہیں۔" اقبال نے کہا۔

"اور ان ٹائم بموں کی موجودگی میں آپ نے مجھے یہاں بلا لیا۔"

"اب چھوڑو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ویسے ایک بات جانتی ہیں عصمت؟"

"کیا؟"

"یہ سارے کارروائی کس نے کی ہے؟"

"آپ بتائیے۔"

"میرا خیال ہے ثناء اس میں پیش پیش ہیں۔"

"تو کیا برا کیا انھوں نے؟" عصمت نے سوال کیا۔

"نہیں بھئی میں تو بس یہ سوچ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں شکرگزاری کا اظہار کیسے کیا جائے؟"

"کوئی اظہار نہ کریں خواہ مخواہ گلے پڑ جائے گی کچھ نہ کچھ..."

"یار۔ گلے ڈالنا چاہتا ہوں یہ ثناء اتنی پیاری ہے کہ بس اس کے لئے جان دینے کو دل چاہتا ہے۔ کتنے اچھے لوگ ہیں عصمت ذرا غور تو کرو۔ ہم لوگوں کی تقدیر بنانے میں کیا ان لوگوں کا ہاتھ نہیں ہے؟"

"ہاں! ان کے لئے دل سے دعائیں ہی دعائیں نکلتی ہیں۔ زمین کے فرشتے ہیں یہ لوگ اس میں کوئی شک نہیں اقبال کہ شاید ہم زندگی بھر یہ سب کچھ نہ کر پاتے جو ہمارے ذہنوں میں تھا۔ کیا ذریعہ ہوتا۔ ادھر چچا جان اپنی جھجک میں رہتے اور ادھر ابو یہ سوچتے رہتے کہ وہ بیٹی کے باپ ہیں۔ یہ ثناء ہی کا کمال ہے۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں ہے، بہرطور کسی نہ کسی موقع پر ان سے رابطہ قائم کیا جائے گا اور ہم ان کا شکریہ ضرور ادا کریں گے۔"

"ابھی رہنے دو بیکار باتیں ہیں۔ ڈر بھی تو لگتا ہے ناں ان لوگوں سے۔ ذرا سی دیر میں مذاق اڑا کر رکھ دیں گے۔"

"ویسے عصمت یہ مذاق بہت خوبصورت ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کی تکمیل کب ہوتی ہے؟"

"کچھ جلد بازی ہی ہو رہی ہے شاید اس سلسلے میں۔"

"آہ کاش وہ کچھ اور جلد بازی سے کام لیں"۔ اقبال بولا۔

"بیکار باتیں نہ کریں، بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔"

"اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ عادل حسین صاحب نے مجھے بیٹوں کی سی حیثیت دی ہے آپ یقین کریں عصمت کہ وہ مجھے خالد اور اختر ہی کی مانند چاہنے ہیں۔ میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ دل اور جان سے ان کے لئے کام کروں گا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔"

"اچھا اب کھانا شروع کیجئے۔ بہت زیادہ وقت نہیں لگانا چاہیئے ہمیں تھوڑی دیر کے بعد میں چلی جاؤں گی۔"

"تو منع کون کر رہا ہے کھانا آ تو جانے دیجئے۔"

"ہاں... ہاں آ رہا ہے۔ وہ آ گیا" عصمت نے کہا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد برتنوں کے کھنکھنے کی آوازیں۔ سب کے چہرے حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے ندرت نے سرگوشی کے انداز میں اختر سے کہا۔

"کیا ہم بول سکتے ہیں۔ ہماری آواز دوسرے کیبن میں سنی جائے گی؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اختر صاحب سے رجوع کریں گی تو ایسے ہی عیش کرتی رہیں گی یہ صرف ہمارا کارنامہ ہے۔"

"خدا کی قسم اختر تم نے کمال کر دکھایا ہے۔ ورنہ بلاوجہ ہم برابر کے کیبن کے چکر میں پڑے ہوئے تھے یہاں سے تو آوازیں ہی نہیں سنائی دے سکتی تھیں دوسری طرف کی۔"

"میں نے پہلے ہی آکر کیبن ریزرو کرا لیا تھا اور اس کے بعد ان انتظامات میں مصروف ہوگیا تھا۔"

"لیکن یہ چکر کیا ہے بتاؤ گے نہیں تم" خالد نے کہا۔

"اوہو آپ بتائیے انھیں ثناء صاحبہ آپ کی بات ان کی سمجھ میں باآسانی آجائے گی" اختر نے کہا اور ثناء ہنس دی پھر بولی۔

"خالد صاحب دراصل ان شریر لوگوں نے . . . . کسی

طرح عصمت اور اقبال کی باتیں سن لی تھیں وہ دونوں یہاں آنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ کل کی تقریب کے بعد وہ ایک دوسرے سے تنہائی میں ملنا چاہتے تھے اور یہاں آکر لنچ کا فیصلہ کیا گیا تھا چنانچہ ان شریر لوگوں نے یہ طے کیا کہ ہم لوگ بھی یہاں آئیں اور عصمت اور اقبال کو بلیک میل کریں۔"

"اے ثناء صاحبہ ہوش میں رہیں آپ۔ بہت زیادہ رعب ڈالنے کی کوشش نہ کریں اپنی شرافت کا۔ خالد بھائی یہ بھی شریک تھیں میرے ساتھ ساری کارروائیوں میں" ندرت نے خالد کو دیکھتے ہوئے کہا اور ثناء ہنس پڑی۔

"ہاں بس ہم دونوں ہی نے سن لیا تھا اور یہ مونالیزا صاحبہ انھیں دیکھئے جیسے ساری دنیا سے لاتعلق ہوں۔"

"ناراض ہوں میں تم سے مجھے کیوں نہیں اطلاع دی گئی تھی؟" ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ ردا۔ تم تو دفتر میں گھسی رہتی ہو کبھی ہماری معمولات میں دلچسپی لیتی ہو۔ ہم نے سوچا بلاوجہ کیا فائدہ تم سے سر پھوڑنے کا" ثناء نے کہا۔

"لیکن ہم نے درخواست ضرور کی تھی اختر صاحب سے کہ اگر ممکن ہوسکے تو کسی طرح ردا، باجی کو بھی ساتھ لے لیا جائے"۔ ندرت نے بڑے احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور ردا مسکرانے لگی۔ اختر نے ردا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمام لوگوں کا مشترکہ پروگرام تھا۔ لیکن انھیں اغوا کرنا بھی میرا ہی کارنامہ ہے۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں آئی۔ بہرحال بھئی بہت شریر ہو تم لوگ بے چاروں کو یہاں بھی تنہا نہ رہنے دیا کتنی آرزوؤں اور امنگوں سے یہاں آئے ہوں گے اور اب ان کی باتیں بھی سن رہے ہو۔ اے اختر بند کر دو یہ اپنی حرکت۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ردا صاحبہ اس کے لئے مجھے جس قدر رقم خرچ کرنا پڑی ہے اور جتنی محنت کی ہے میں نے۔ ویٹر کو جس طرح اپنے ساتھ ملایا ہے آپ نہیں جانتیں پورے دو سو روپے تو صرف میں نے کیبن نمبر سات کے ویٹر کو دیئے ہیں اور اس نے مجھے اس کیبن میں یہ کارروائی کرنے کا موقعہ دیا ہے۔"

"بڑی مجرمانہ ذہنیت کے مالک ہو اختر! بہت خطرناک۔" ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ردا صاحبہ جس قدر مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہوں میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، بتاؤں گا کسی دن تفصیل سے۔"

اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ خالد نے کہا۔

"اس پر یہاں کی کوئی آواز ادھر نہیں سنائی دے گی۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بس ادھر کی آواز ادھر کرنے کا آلہ ہے یہ"۔ اختر نے کہا۔ کھانے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے کیبن کا ویٹر بھی آگیا اور اسے عمدہ قسم کے کھانے کا آرڈر دے دیا گیا۔

"یہ لنچ کس کی طرف سے ہے؟" ردا نے پوچھا۔

"عصمت باجی اور اقبال بھائی کی طرف سے"۔ ثناء ہنس پڑی۔

"کیا مطلب؟" خالد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہمارے اس بہترین کھانے کا بل وہی دونوں ادا کریں گے۔"

"تو کیا... تو کیا انھیں... انھیں... ارے نہیں یہ ناجائز ہے۔ تم لوگوں نے یہ سب کچھ تو کر ڈالا ہے مگر انھیں اس کا احساس نہ ہونے دو" خالد نے کہا۔

"لیجئے سنبھالئے انھیں بھی آپ بل ادا کریں گے" ندرت نے خالد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ادا کر دیں گے بھئی۔ مگر یہ بری بات ہے دونوں کس قدر شرمندہ ہوں گے۔"

"رہنے دیجئے خالد بھائی رہنے دیجئے۔ میں نے کہا تھا اختر سے کہ خالد بھائی بلاوجہ بور کریں گے انھیں نہ بلایا جائے۔"

"واقعی تم لوگ مجھے نہ بلاتے تو بہتر تھا۔"

"خالد بھائی آپ بالکل خاموش بیٹھے رہیں اس معاملے میں آپ بالکل مداخلت نہیں کریں گے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ سمجھ لیں آپ ارے ہاں۔ خود بڑے پارسا ہیں کوٹھی میں ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ اور اس وقت ان دونوں کی حمایت کر رہے ہیں؟" ندرت نے ناک چڑھا کر کہا۔

"آپ بھی تو تشریف لائیں تھیں وہاں ندرت صاحبہ۔"

"ہاں آئی تھی بس۔ خاموش ہو جائیے آپ بل ہم ان لوگوں سے لیں گے۔"

"مگر پروگرام کیا ہے؟"

"خاموش رہیئے باتیں سننے دیجئے۔ دیکھئے تو سہی ایک رومانی جوڑا کس طرح گفتگو کر رہا ہے بلکہ کھانا کھا رہا ہے"۔ ندرت نے کہا۔ اور خالد کے ساتھ ردا بھی ہنس پڑی۔ دونوں دیر تک ہنستے رہے تھے، تھوڑی دیر کے بعد ویٹر نے ان لوگوں کے سامنے بھی کھانا لگا دیا۔

"پانچ آدمیوں کا بل خدا کی پناہ اچھا خاصہ مہنگا پڑ جائے گا بے چارے اقبال کو یہ سب کچھ اور پھر دونوں بڑے پریشان ہو جائیں گے۔"

"ہونے دیجئے ہونے دیجئے" ندرت نے کہا اور اُس کے بعد کھانے کی قابیں کھلنے لگیں اختر بالکل خاموش تھا سب کچھ اُس کی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا دوسری طرف بے چارے اقبال اور عصمت اِس خیال سے ساری باتیں کئے جا رہے تھے کہ اب انہیں اُس وقت تک تنہائی نہ ملے گی جب تک دونوں قانونی طور پر تنہا نہ ہو جائیں۔ ندرت ایک ایک ڈش سب کی طرف بڑھا کر اصرار کر کر کے کھلا رہی تھی اور اس احساس سے کافی دلچسپ صورتحال پیدا ہو گئی تھی کہ بل اقبال صاحب ادا کریں گے۔

اقبال کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا اور عصمت کی آنکھیں شرمسار تھیں، پھر وہ چونک کر بولی "کافی وقت ہو گیا ہے اب اُٹھ... جانا چاہیئے"

"کیا واقعی؟" اقبال شوخی سے بولا۔

"خیریت... کیا ارادہ ہے؟"

"اوہ، کیا ہم اور کیا ہمارے ارادے؟ کوئی ہمیں آزادی دے دے تو ہم یہاں سے جانے سے انکار کر دیں یا جانا ہی پڑے تو پھر سیدھے حجلۂ عروسی ہی میں جائیں"

"اُٹھ جایئے، بُرا وقت آنے سے پہلے اُٹھ جایئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو پتا چل جائے، جانتے ہیں۔ گھر میں کتنے شیطان پل رہے ہیں۔ ڈانڈا ڈولی کر کے آپ کو حجلۂ عروسی تک نہیں ساحلِ سمندر تک لے جائیں گے اور گہرے پانی میں اس وقت تک غوطے دیں گے، جب تک آپ کے حواس بالکل درست نہیں ہو جاتے"

"لاحول ولاقوۃ! کیا خوفناک باتیں کرتی ہو" اقبال گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا اور پھر اُس نے بل طلب کر لیا۔ واقعی کافی دیر ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ویٹر نے بل لا کر رکھ دیا۔ تیرہ سو اسّی روپے کا بل تھا۔ اقبال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ... یہ بل... ہمارا ہے بھائی؟"

"جی صاحب! برابر کے کیبن والوں نے بھی اپنا بل اسی میں شامل کرا دیا ہے"

"برابر کے کیبن والوں نے؟"

"جی صاحب!"

"کیوں؟"

"وہ لوگ بولتے صاحب کہ آپ لوگوں کے ساتھ ہیں"

"دماغ خراب ہوا ہے تمہارا کون ہیں وہ؟" اقبال جھلا کر بولا اور کرسی سے اُٹھ گیا۔ بیرا اُس کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ پیچھے پیچھے عصمت بھی آ گئی۔

"اس کیبن والوں نے صاحب!" بیرے نے اشارہ کیا اور اقبال نے کیبن میں جھانکا۔ اختر، ندرت، ثناء، خالد وغیرہ اندر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ اقبال ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ حالانکہ اُسے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

اقبال نے پندرہ سو روپے نکال کر ویٹر کی پلیٹ میں رکھ دیے۔ عصمت حیرت سے بولی۔

"کون ہے؟" اقبال سے جواب نہ پا کر اُس نے خود اندر جھانکا اور اُس کی کیفیت بھی اقبال سے مختلف نہ ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے میز پر ایک چوکور بکس رکھا ہوا تھا، جس سے آواز اُبھر رہی تھی۔

"مِس عصمت! آپ یقین کریں مَیں نے بمشکل یہ ہمت پیدا کی ہے" یہ اقبال کی ریکارڈ شدہ آواز تھی۔

"یہ اس قدر تکلّف کیوں پیدا ہو گیا آپ کی گفتگو میں؟" عصمت کو اپنی آواز سُنائی دی۔ اقبال بیوقوفوں کی طرح کھڑا تھا۔ اچانک

ثنا نے عصمت کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہیلو عصمت باجی! اندر آ جایئے"

"ہیلو اقبال بھائی!" اختر نے چہک کر کہا۔ اقبال اُنہیں گھورنے لگا۔

"بل ادا ہو گیا؟" ثنا نے پوچھا۔

"ہاں" اقبال بھاری لہجے میں بولا۔

"اندر آ جایئے آپ لوگ۔ اب ایک آئس کریم ہماری طرف سے ہو جائے۔ بھئی آیئے نا آپ تکلّف کر رہے ہیں" ثنا نے کہا۔ عصمت نے اقبال کو دیکھا اور اقبال نے گردن ہلا دی۔ عصمت اندر داخل ہوئی تو اقبال بھی اندر چلا آیا۔ ثنا خوش ہو کر بولی۔

"اوہ مائی گاڈ... دیکھا ندرت کتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے ایک دوسرے سے، یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے"

"آپ لوگ... آپ لوگ" اقبال دانت پیس کر بولا۔

"مار رہے ہیں" ندرت مُنہ بسور کر بولی اور خالد بے تحاشہ ہنس پڑا۔

"یار اقبال! مجھے ان لوگوں میں شریک نہ سمجھنا، مجھے اور ردا صاحبہ کو دھوکا دے کر لایا گیا ہے" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے واہ! کھانے پینے میں تو آپ سب سے آگے تھے" ندرت نے آنکھیں نکال کر کہا۔ اختر نے پھر ایک بٹن دبا دیا اور چوکور بکس سے واضح آواز اُبھری۔

"تو فرمایئے آپ نے یہ زحمت آخر کیوں کی؟"

"بس عصمت! کل کی خوشی تنہا برداشت نہ کر پایا۔ مَیں نے سوچا کہ تمہیں الگ بُلا کر مبارک باد دُوں"

"کمال کے آدمی ہیں آپ! ہم جس طرح بارُود کے ڈھیر پر رہتے ہیں، اس میں رہ کر آپ کو یہ خطرہ نہیں مول لینا چاہیئے تھا" اختر نے ایک بار پھر چوکور بکس کا سوئچ آف کر دیا اور اقبال چوکور بکس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔

"یہ زیادتی کی انتہا ہے۔ اس حد تک نہیں ہونا چاہیئے تھا"

"یہ کیسٹ ضائع کر دیا جائے گا، آپ اطمینان رکھیں لیکن ہم اس میں حق بجانب تھے، یہ بارُود کا ڈھیر کسے کہا ہے، آپ جانتے ہیں؟" اختر نے کہا اور ایک بار پھر بٹن آن کر دیا۔

"بارُود کا ڈھیر!" اس بار اقبال کی آواز اُبھری۔

"ہاں... ندرت، ثنا، اختر، ان تینوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تینوں ہی ٹائم بم ہیں" اقبال کی آواز اُبھری۔

"اور ان ٹائم بموں کی موجودگی میں آپ نے مجھے یہاں بُلا لیا" عصمت کی آواز اُبھری۔

"اب چھوڑو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ویسے ایک بات جانتی ہیں عصمت!" دفعتاً اقبال دروازے کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔

"آؤ عصمت! مَیں تمہیں واپس چھوڑ دُوں"

"ارے، ارے عصمت کا مسئلہ اب آپ کا نہیں رہا ہے۔ چونکہ بل ادا کر دیا گیا ہے، اس لیے ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہا۔ ویسے کبھی کبھی ہمیں بھی نوازتے رہا کریں، بنا کر رکھنا ہر شخص کے لیے بہتر ہے" اختر نے کہا اور اقبال بے بسی سے اُنہیں دیکھنے لگا۔

"بھئی آخر اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ چند روز ہی کا تو مسئلہ ہے، آپ لوگ ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہو جائیں گے، پھر ہم کیا پِدّی اور کیا پِدّی کا شوربہ! چھوڑیں اقبال بھائی! بیٹھیں آئس کریم کھائیں ہماری طرف سے"

"معافی چاہتا ہُوں اس وقت آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں گا" اقبال جلے کٹے لہجے میں بولا۔

"کوئی حرج نہیں ہے، کوئی حرج نہیں ہے، ویسے... آپ جایئے عصمت باجی ہمارے ساتھ چلی جائیں گی... آپ بالکل اطمینان رکھیں انہیں پورے تحفظ کے ساتھ گھر تک چھوڑ دیا جائے گا اور یہی کہا جائے گا کہ یہ ہمارے ساتھ تھیں" اقبال نے عصمت کی طرف دیکھا اور عصمت نے نظریں جھکا لیں۔

"بتا دیجیے، بتا دیجیے آپ ٹائم بموں کے ساتھ رُکنا پسند کریں گی یا نہیں" عصمت پھیکی سی ہنسی کے ساتھ خاموش ہو گئی تھیں۔ اقبال نے آہستہ سے کہا۔

"اختر بھائی! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا"

"بھائی پیٹ کی خاطر تو انسان کو نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے، یہ تو معمولی سی بات ہے"

"مَیں نے بل ادا کر دیا ہے۔ یہ کیسٹ تو مجھے واپس کر دیجیے گا"

"ہُوں... حضرات کیا خیال ہے آپ لوگوں کا؟" اختر نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا اور خالد نے ہاتھ بڑھا کر چوکور بکس نما ٹیپ ریکارڈر سے کیسٹ نکال لیا۔

"ارے، ارے خالد بھائی!"

"بکواس مت کرو!" خالد نے اختر کو ڈانٹتے ہوئے کہا اور کیسٹ اقبال کے حوالے کر دیا، وہ آہستہ سے بولا۔

"آئی ایم سوری اقبال! مَیں پھر تمہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس معاملے میں شریک مت سمجھنا، نہ مَیں نہ ردا، ان حالات سے واقف تھے، یہ ان تینوں ہی کی شرارت ہے" اقبال پھیکے سے انداز میں مُسکراتا ہُوا واپس مُڑ گیا تھا۔ دروازے پر رُک کر اُس نے کہا۔

"مَیں اجازت چاہتا ہُوں" اور پھر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ ثناء نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ہاں مصروف آدمی ہیں نہ جانے اپنی مصروفیت میں سے کس طرح اتنا وقت نکالا ہے۔ ویسے آئس کریم کے بارے میں کیا خیال ہے آپ لوگوں کا؟"

"میرا خیال ہے چھوڑو چلتے ہیں" ردا نے کہا اور ثناء نے شانے اُچکا دیئے، پھر وہ سب کے سب باہر نکل آئے۔ اقبال کا باہر کوئی پتا نہیں تھا۔ ثناء نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"ردا صاحبہ! آپ بھی اگر چاہیں تو دفتر واپس جا سکتی ہیں اور آپ لوگ تو دفتر جائیں گے۔ ہم خواتین گھر جا رہی ہیں۔ اچھا خُدا حافظ"... اور اس کے بعد وہ سب اپنے اپنے راستوں پر چل پڑے۔

۞

رداء احسان لمیٹڈ کے دفتر میں سر جھکائے کام میں مصروف تھی کہ انٹرکام پر اشارہ موصول ہوا اور اُس نے انٹرکام بٹن آن کر دیا۔ دوسری طرف سے احسان صاحب تھے۔

"ہیلو رداء! کیا ہو رہا ہے بیٹے؟"

"کچھ نہیں انکل! بس کام میں مصروف ہوں۔"

"تھوڑا سا وقت نکال سکتی ہو؟"

"جی ہاں... کیوں نہیں؟"

"تمہیں لیکو لمیٹڈ جانا ہوگا۔ لیکو لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر ظہیر صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں، کچھ ضروری امور پر گفتگو کرنی ہے، لیکو لمیٹڈ سے ہمارے نئے کاروبار کے بارے میں تو تمہیں علم ہوگا ہی۔"

"اتفاق سے انکل اس وقت میں لیکو لمیٹڈ کا فائل ہی دیکھ رہی تھی، میں خود بھی ظہیر احمد صاحب سے اس سلسلے میں ملنا چاہتی ہوں۔"

"پھر اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہے، اس وقت وہ اپنے آفس ہی میں موجود ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ اگر تم تھوڑی دیر کے لیے اُن کے پاس پہنچ جاؤ تو..."

"میں ابھی چلی جاتی ہوں انکل! اسی فائل کو ڈیل کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس سلسلے میں ظہیر احمد صاحب سے ایک ملاقات کر لوں۔"

"ویری گڈ! تو پھر میں نیچے اطلاع بھجوائے دیتا ہوں، تاکہ گاڑی تیار ہو جائے۔"

"میں خود ہی چلی جاتی ہوں انکل! آپ بالکل فکر نہ کریں۔" رداء نے کہا اور اس کے بعد انٹرکام کا سوئچ آف کر کے تیاریاں کرنے لگی۔ اُس نے فائل ہینڈ بیگ میں رکھے اور ہینڈ بیگ اُٹھائے ہوئے باہر نکل آئی۔

احسان لمیٹڈ کے معاملات میں اُس نے جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ ناقابلِ یقین سا تھی۔ وہ ہر مسئلے کو بڑی خوش اسلوبی سے ہینڈل کر لیا کرتی تھی اور احسان صاحب کو اب اس سلسلے میں اُس پر بے حد اعتماد ہو گیا تھا۔ نیچے اُتر کر وہ گاڑی میں آ بیٹھی اور ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ رداء نے فائل کھول لیا اور ضروری پوائنٹس ذہن میں نوٹ کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد کار لیکو لمیٹڈ کی خوبصورت عمارت کے سامنے رُک گئی، تب وہ چونکی اور فائل دوبارہ ہینڈ بیگ میں رکھ کر خاموشی سے نیچے اُتر آئی۔ ایک سادا سے خوبصورت لباس میں ملبوس تھی اور انتہائی پُروقار نظر آ رہی تھی۔ لیکو لمیٹڈ کی عمارت میں داخل ہو کر اُس نے اپنا کارڈ اندر بھجوایا اور چند ہی لمحات کے بعد ایک خوش پوش آدمی اُسے ریسیو کرنے آ گیا۔

"آئیے میڈم! ظہیر احمد صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ظہیر احمد کے خوبصورت آفس میں داخل ہو کر رداء نے تعریفی نگاہوں سے دفتر کو دیکھا۔ ظہیر احمد خود بھی ایک نوجوان آدمی تھا اور اُس کی عمر تیس تینتیس سال سے زیادہ نہیں تھی، چہرے سے البتہ زیادہ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہی خباثت اُس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی جو اس قسم کے لوگوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔ رداء نے ایک لمحے میں اُس کی شخصیت کا اندازہ لگا لیا۔ ظہیر احمد نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر تھوڑا سا خم ہوتے ہوئے کہا۔

"تشریف لائیے مس رداء! آپ نے تو ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔" رداء کرسی گھسیٹ کر پُراعتماد انداز میں بیٹھ گئی اور پھر آہستہ سے بولی۔

"کیسا ہنگامہ ظہیر احمد صاحب؟"

"بھئی بہت سے لوگ آپ کا نام لے لے کر آپ کی تعریفیں کرتے ہیں، خود میرے دل میں بھی آپ کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ معاف کیجیے گا رداء صاحبہ! ذرا بے تکلفی سے گفتگو کرنے کا عادی ہوں۔ ہر شخص کے بارے میں جو دل میں ہوتا ہے کہہ دیتا ہوں، یہ بتائیے آپ کی اس شہرت میں آپ کے حُسن کی پُرکاری شامل ہے یا کارکردگی؟"

"میرا خیال ہے ہمیں غیر متعلق باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔" رداء سرد لہجے میں بولی۔

"جی نہیں، ہماانسانی زندگی سے جو بات بھی متعلق ہو اُسے غیر متعلق تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ میرا آپ سے سوال ہے اور آپ پر لازم ہے کہ آپ اس کا جواب دیں۔"

"کیا میں یہاں اپنے حُسن کی پبلسٹی کروں یا اپنی کارکردگی کا اظہار؟ آپ اپنے طور پر میرے بارے میں جو فیصلہ چاہیں قائم کریں ظہیر صاحب! میں آپ سے پھر بھی عرض کروں گی کہ ذاتی گفتگو کرنے کی بجائے ہمیں کاروباری گفتگو کرنا چاہیے۔"

"ذاتیات کے بعد ہی کاروبار کا آغاز ہوتا ہے مس رداء! بہت سے ایسے معاملات ہیں جو ذاتیات سے حل ہو جاتے ہیں

اور بہت سے ایسے کاروبار ہوتے ہیں جو ذاتی دلچسپی نہ ہونے کی بنا پر ختم بھی ہو جاتے ہیں۔"

"احسان لمیٹڈ کا یہ اصول رہا ہے کہ کاروبار کو صرف کاروبار کی بنیاد پر کیا جائے۔ ہم کبھی بھی ایسے کام پر افسوس نہیں کرتے جو ہماری ذاتی زندگی سے ٹکرا جائے اور ہمیں نہ ملے۔"

"ارے نہیں نہیں... آپ شاید میری باتوں کا کچھ بُرا مان گئیں۔" اُسی وقت ظہیر احمد کو ایک ٹیلی فون موصول ہوا اور اُس نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا پھر آہستہ سے بولا۔

"ہاں... ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔ نہیں، نہیں کوئی بات نہیں، ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ بس ایک منٹ میں جی۔ ہاں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔ ایک مہمان سے باتیں کر رہا ہوں، بہت ضروری اور کاروباری گفتگو ہے۔ جی بہتر... ابھی آیا۔" ظہیر احمد نے ٹیلی فون رکھا اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"صرف دو منٹ کی اجازت چاہتا ہوں مس رداء! ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے، صرف دو منٹ۔ براہ کرم! آپ فائل دیکھیے۔" اُس نے ان معاملات کا فائل رداء کے سامنے کر دیا جو احسان لمیٹڈ اور لیکو لمیٹڈ کے درمیان چل رہے تھے۔ رداء نے فائل لے لیا، لیکن اُس کے چہرے پر تکدّر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ فائل پر نگاہیں دوڑاتی رہی اور ایک ڈیڑھ منٹ گزر گیا پھر عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سُنائی دی۔ غالباً ظہیر احمد واپس آ گیا تھا۔ رداء نے فائل بند کر کے پلٹ کر دیکھا... اور دوسرے لمحے دھک سے رہ گئی۔ وہ ظہیر نہیں، بلکہ وسیم تھا۔ وسیم جمال ایک خوبصورت سوٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور پُراطمینان قدموں سے چلتا ہوا ظہیر احمد کی کرسی پر آ بیٹھا۔

"ہیلو مس رداء کیسی ہیں آپ؟"

"آپ یہاں کیسے نازل ہو گئے وسیم صاحب؟"

"بھئی! آپ یوں سمجھ لیں مس رداء کہ ہم نے آپ کو ذہن سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں نکالا، بلکہ یوں سمجھ لیجیے آج کل... ہماری مصروفیت صرف آپ ہیں اور اس سلسلے میں ہم اپنے دوستوں کو ٹٹول رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے ہماری فرم سے رابطہ ختم کرنے کے بعد کیا ہمارا رابطہ آپ سے ٹوٹ گیا؟ نہیں مس رداء! ہم تو مختلف ذرائع سے آپ تک آنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔"

"کمال کے انسان ہیں آپ بھی وسیم صاحب! میرا خیال ہے میں نے ہر وہ بُرا لفظ استعمال کر لیا آپ کے لیے جو کوئی کسی کے لیے کر سکتا ہے لیکن آپ جیسا ڈھیٹ بھی کبھی... نہیں دیکھا۔"

"نہیں دیکھا نا، اس اعتراف کا بے حد شکریہ اور آپ دیکھ بھی نہیں پائیں گی، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم آپ کو محدود کریں گے تاکہ آپ ہم جیسا دوسرا ڈھیٹ کبھی نہ دیکھ پائیں۔"

"پتا نہیں، آپ کس خوش فہمیوں کا شکار ہیں، آپ مجھے کیسے محدود کریں گے۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتلائے گا رداء! اب دیکھیے نا بے چارے ظہیر سے ہم نے کہا کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کتنا بڑا سودا کیا اُس نے احسان لمیٹڈ سے ہمارے لیے، صرف ہمارے لیے... رداء! ہمارے پاس بے پناہ دولت ہے اور ہم تمہارے حصول کے لیے اس کی ایک ایک پائی خرچ کر سکتے ہیں، اس سے یہ اندازہ لگا لو کہ ہم تمہیں کتنی مہنگی قیمت پر اپنے آپ میں شامل کرنے کے خواہش مند ہیں۔"

"افسوس وسیم! میں آپ کو اب وسیم صاحب نہیں کہوں گی، کیونکہ آپ اس قابل نہیں ہیں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ دولت کے ذریعے دُنیا کی ہر شے نہیں خریدی جا سکتی۔"

"یہ الفاظ ڈراموں اور کتابوں میں تو اچھے لگتے ہیں۔ عملی زندگی میں آ کر دیکھیے مس رداء! ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، دولت سے۔ ہر چیز خریدی جا سکتی ہے اور پھر ہم تو خود بک رہے ہیں آپ کے ہاتھوں ہم کون سا آپ کو خرید رہے ہیں۔ یہ جملہ آپ نے شاید غلط استعمال کیا ہے۔"

"آپ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ظہیر احمد صاحب نے صرف آپ کی وجہ سے مجھے بُلایا ہے۔"

"سو فی صد... سو فی صد..."

"تو پھر میں آپ پر اور ظہیر احمد صاحب پر تھوکتی ہوں۔ لیکو لمیٹڈ سے ہمارا کوئی معاملہ ہو یا نہ ہو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے، میں یہاں نہیں رُکنا چاہتی۔"

"دروازہ باہر سے بند ہے مس رداء! اور آپ اسے اندر سے نہیں کھول پائیں گی۔ بڑے انتظامات کیے ہیں ہم نے۔"

"مطلب؟" رداء تیکھی نگاہوں سے اُسے گھورتی ہوئی بولی۔

"باتیں کریں گے آپ سے، یہ تو دفتر ہے کوئی خلوت گاہ نہیں کہ آپ کو اپنے لیے خطرہ پیدا ہو جائے۔"

"آپ نہایت بدتمیز ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ زبردستی مجھے یہاں روک سکتے ہیں تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔ میں اس دروازے کو توڑ بھی سکتی ہوں۔"

"اوہو... ایسا نہ کیجیے، خواہ مخواہ اخبارات کے لیے کہانیاں مہیا ہو جائیں گی۔ کچھ دیر تو بیٹھیے براہِ کرم کچھ دیر تو باتیں کیجیے، میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں مس ردا کہ آخر آپ کو مجھ سے کیا پرخاش ہے؟ میں اُن تمام روایات پر پورا اُترتا ہوں جو کسی لڑکی کی آنکھوں کا خواب بن جاتی ہیں۔ آپ کو دُنیا کی ہر آسائش فراہم کر دُوں گا۔ دُنیا کا ہر مُلک گھماؤں گا آپ کو مس ردا۔ زندگی کے کسی بھی لمحے آپ کو نظرانداز نہیں کروں گا، میرا وعدہ ہے آپ کیوں مجھے قبول نہیں کر لیتیں؟"

"اس لیے کہ مجھے آپ کے وجود، آپ کی شخصیت سے نفرت ہے۔"

"اس نفرت کو محبت میں تبدیل کرنے کا طریقہ خود بتا دیجیے تو بہتر ہے، ورنہ اگر میں ایک مرد بن گیا مس ردا، تو پھر ساری زندگی پچھتاوے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوگا آپ کو۔"

"مرد بننے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"دیکھیے چوٹ کھایا ہُوا سانپ ہر طرح اپنا کام نکال لیتا ہے مس ردا! احسان احمد صاحب بُوڑھے آدمی ہیں وہ آپ کا کیا تحفظ کر سکیں گے۔ خواہ مخواہ کسی دن ایسا ہوگا کہ میں دیوانگی کی حدود میں داخل ہو جاؤں گا اور پھر میری دیوانگی جو گل کھلائے گی، وہ آپ کے تصوّر سے بھی باہر ہوگی۔ اس قسم کے واقعات اگر آپ کی نظروں سے نہیں گزرے تو آپ نے اُن کا تذکرہ ضرور سُنا ہوگا۔ اپنے آپ کو اس تجربے کا شکار نہ بنایئے۔ میں پاگل ہو چکا ہوں آپ کے لیے اور اس پاگل پن میں ہر قدم اُٹھا سکتا ہوں، ہر قدم جو ہر طور اچھا نہیں ہوگا۔"

"آپ کی یہ دھمکیاں اگر پولیس تک پہنچ جائیں تو..."

"آپ کو کچھ حاصل نہ ہوگا مس ردا! میں آپ سے یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہر چیز خریدے جانے کے قابل ہوتی ہے۔ اگر آپ پولیس تک یہ اطلاع پہنچائیں گی تو میں کچھ رقم خرچ کر دوں گا اور بات ختم ہو جائے گی، لیکن آپ کے ساتھ وہی سب کچھ ہوگا جو میں چاہتا ہوں سمجھیں آپ۔" اسی وقت دروازے پر ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہُوئی اور کسی نے باہر سے دروازہ کھول دیا۔ دو آدمی اندر داخل ہو گئے تھے دونوں ہی اندر ردا، اور وسیم کو دیکھ کر کچھ گڑبڑا گئے تھے، پھر اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ظہیر احمد صاحب کہاں ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟"

"میرا نام عظیم خان ہے اور یہ میرے پارٹنر اظہار احمد ہیں۔ ظہیر احمد صاحب نے ہم دونوں کو بُلایا تھا۔ براہِ کرم آپ انہیں بُلا دیجیے۔"

"باہر گیٹ پر چپراسی نہیں تھا؟" وسیم نے جھلّائے ہُوئے لہجے میں پوچھا۔ ردا اس دوران اپنا فائل اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں تھا جی، ورنہ اُسی سے بات کر لیتے مگر ظہیر احمد صاحب کہاں ہیں؟" اُن میں سے ایک شخص نے کہا۔ اس دوران ردا دروازے کی جانب بڑھ گئی تھی اور پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

پورے بدن پر کپکپی طاری تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے شدّت کی سردی لگ رہی ہو، بخار سا آ رہا تھا، کان گرم ہو رہے تھے، کنپٹیوں سے آگ نکل رہی تھی، اندر کیا ہُوا اُسے اندازہ نہیں تھا لیکن ان دونوں کی آمد اس وقت اُس کے لیے بہت ہی بہتر ثابت ہُوئی تھی اور اُسے نکل آنے کا موقع مل گیا تھا، تیز تیز قدموں سے چلتی ہُوئی باہر تک آئی۔ کار کا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھی اور لرزتے لہجے میں ڈرائیور... سے کہا۔

"چلو۔" ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور بولا۔

"کہاں چلوں میڈم؟"

"آفس۔" ردا نے بہ مشکل تمام کہا اور اُس نے کار کی پُشت سے گردن ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ بڑی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اُس کو وسیم کے الفاظ یاد آ رہے تھے اور بدن پھُنکا جا رہا تھا، بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا لیکن احسان صاحب سے جو کچھ کہہ چکی تھی۔ اب اس کے بعد کچھ کہنا مناسب نہیں تھا خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔

آفس آ گئی اور اپنے آفس میں آ بیٹھی۔ احسان احمد صاحب کو اتنا تو بتانا ہی تھا کہ ظہیر سے کیا سلسلہ رہا، پریشان تھی کہ کیا کرے لیکن خوش بختی یہ ہُوئی کہ احسان احمد صاحب خود بھی کہیں چلے گئے تھے۔ چنانچہ اس وقت اُسے سوچنے کا موقع مل گیا کوئی کام نہیں کر پائی تھی۔ یہاں تک کہ وقت گزرتے، گزرتے شام ہو گئی، دیوارگیر گھڑی نے پانچ بجائے تو اُس نے تمام سامان سمیٹ کر رکھ دیا اور گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ احسان احمد صاحب سے ملاقات نہ ہونا اچھا ہی رہا تھا نہ جانے کیا ہو جاتا۔

کوٹھی چل پڑی۔ راستے کس طرح طے ہُوئے کچھ یاد نہ تھا، بس سوچوں میں گھری ہُوئی تھی۔ وسیم جمال! شیطان صفت انسان۔ کیا کرنا چاہیے، اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ آہ کس سے کہوں کہ ایک لفنگا میرے پیچھے پڑ گیا ہے، وہ بہت خطرناک ہے، مجھے اس سے بچاؤ... کس سے کہوں؟ انہی سوچوں میں کوٹھی پہنچ گئی۔ لان پر شام کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ہنگامے جاری تھے۔

"ردا! جلدی آ جاؤ۔" ثنا نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"جی ایم صاحب پھر نہ فرمایئے یہ زحمت۔" بولی۔ ثنا کے پاس کھیلتے ہُوئے تیمور نے ننھے مُنّے ہاتھ ہلائے اور اُس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ مُسکراہٹ ہونٹوں تک کیسے آتی۔ صرف میں نہیں مُسکرا سکتی تھی، صرف میں... یہ لوگ بھی تو ہیں جو زندگی سے بھرپور ہیں۔ ہنسنے اور مُسکرانے کے سوا ان کی زندگی میں اور کچھ نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے آخر... ایسا کیوں ہے؟ وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ دل پر... بے پناہ بوجھ تھا طبیعت اندر سے متلائی متلائی سی ہو رہی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں، غسل خانے میں جا کر اُس نے خود پر ڈھیروں پانی گرایا اور پُرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس مسئلے کا کوئی حل دریافت تو کرنا ہی ہوگا، زندگی اس طرح گنوانے کی چیز تو نہیں ہے۔ باہر ہنگامہ آرائیاں تھیں اور یقینی طور پر اُس کا انتظار ہو رہا ہوگا، ان لوگوں کو بلاوجہ پریشان کرنا مناسب نہیں ہے خود پر جبر کرنا سیکھ لیا تھا، چنانچہ لباس وغیرہ تبدیل کیا اور جس حد تک ممکن ہو سکا اپنے آپ کو سنبھال کر ان کے بیچ پہنچ گئی۔ زندگی کی وہی ہنگامہ آرائیاں تھیں، نوجوان دلوں کی شوخیاں دبی دبی مُسکراہٹوں، قہقہوں کی شکل میں لان پر بکھری ہُوئی تھیں۔

وہ خود بھی اُن کے درمیان اپنے آپ سے جھُوٹ بولنے لگی اور اُس نے انتہائی جرأت سے کام لے کر کسی کو اپنی ذہنی کیفیت کا احساس نہ ہونے دیا۔ لیکن رات کی تنہائیاں ہر بیماری کو اُبھار دیتی ہیں۔ اُس کے دل میں ہُوک سی اُٹھی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اپنی بے بسی پر رو رہی تھی وہ احسان احمد صاحب کے لیے ویسے ہی کون سی کم مصیبتیں

لا کھڑی کی تھیں اُس نے کہ اب اُنہیں مزید پریشان کیا جائے، بے چارے بوڑھے آدمی ہیں کیا کر سکیں گے؟

آہ... میں کیا کروں رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا اور کوٹھی کے لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کی گہری نیند سو رہے تھے۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور تکیہ آنسوؤں سے تر ہوتا رہا، نہ جانے کتنی دیر تک وہ سسک سسک کر روتی رہی آج دل کی تمام بھڑاس آنسوؤں اور سسکیوں کی شکل میں باہر آ گئی تھی۔ وہ اپنا چہرہ تکیے میں چھپائے اُسی طرح سسکتی رہی۔ تب آہستہ سے اپنے بالوں میں کسی لمس کا احساس ہوا اور وہ بُری طرح اُچھل پڑی۔ اُس نے دہشت بھری نگاہوں سے اپنے سرہانے... کسی وجود کو دیکھا۔ بلب کی مدھم نیلی روشنی میں ایک لمحے کے لیے تو اس وجود کے خد و خال اُس کے ذہن میں نہ آ سکے لیکن وہ اُچھل کر بیٹھ گئی تھی اور پھر اُس نے اختر کو دیکھا جو شب خوابی کے لباس میں ملبوس اُس کے سرہانے کھڑا اُسے سنجیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بپھر گئی۔

"تم... تم یہاں کیوں آ گئے؟ کیسے آ گئے تم میرے کمرے میں بلا اجازت۔ جواب دو اختر! تم نے یہ جرأت کیسے کی اور کیوں آئے ہو تم یہاں جواب دو؟" وہ چیخ پڑی اور اختر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اِدھر سے گزر رہا تھا کہ آپ کی سسکیوں کی آواز سُنی، اس طرح رونے میں محو تھیں آپ کہ دروازہ کھول کر میرے اندر آنے کا پتا بھی نہ چلا آپ کو، بہر طور میں آپ کی کسی تکلیف کو نظر انداز تو نہیں کر سکتا۔"

"بکواس کرتے ہو تم! تمہیں اس طرح میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ یہ کوئی شریفانہ حرکت نہیں ہے، میں رو رہی تھی یا ہنس رہی تھی تمہیں اس سے کیا، بولو کیا سزا دی جائے تمہیں... تمہاری اس بدتمیزی کی؟"

"ردا صاحبہ! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ انتہائی خود پرست ہیں ہم سب آپ سے اتنی محبّت کرتے ہیں کہ شاید آپ کی جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو یقینی طور پر ہمیں بھی جواب میں اتنی ہی محبّت دیتا لیکن آپ کے دل کی ساخت میں کوئی تبدیلی ہے محترمہ ردا! ہم دو بھائی ہیں، کوئی بہن نہیں ہے ہماری۔ چند الفاظ میں آپ کو بہن کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں جس کے لیے جو کچھ دل میں رکھتے ہیں اُسی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں لیکن شاید آپ ایسے کسی احمقانہ اظہار کو قبول نہیں کرتیں کوئی نہیں ہیں ہم آپ کے، بلاشبہ کوئی نہیں ہیں، جب کچھ بہن بھائیوں کو یکجا دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں بھی ایک ہُوک اُٹھتی ہے کہ کاش کوئی بہن ہوتی ہماری، ہم بھی اُسے اتنا ہی چاہتے جتنا بھائی بہنوں کو چاہتے ہیں، ایک آرزو ہے میرے اور خالد کے دل میں جو حسرت کی شکل رکھتی تھی، خالد کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن ردا! جب آپ نے مجھے بہن کہہ لینے کی... اجازت دی تو نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ میں آپ کا بھائی ہوں آپ یقین کریں ردا! کاش ہماری کوئی بہن ہوتی ہو سکتا ہے، وہ آپ جیسی ہوتی یا ہو سکتا ہے وہ آپ جیسی نہ ہوتی لیکن ہم اُسے بہت چاہتے۔ خیر میں آپ کی سسکیاں سُن کر یہ سوچ کر اندر چلا آیا کہ بہن اور بھائیوں کے درمیان پردے ضرور ہوتے ہیں لیکن اتفاقیہ طور پر پردے چاک ہو جائیں تب بھی اس رشتے کے تقدّس میں فرق نہیں آتا۔ شاید آپ مجھے بھائی نہ سمجھ کر یہاں آنے پر سیخ پا ہیں، معافی چاہتا ہوں غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہو گی، مناسب سمجھیں تو معاف کر دیں۔" اختر نے کہا اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی تھی پھر اُسے ایک دم سے احساس ہوا کہ بلاوجہ اختر پر بگڑ گئی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ تو بہت اچھا انسان ہے۔ وہ تو اُس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ ایک محبّت بھرا لمس تھا جسے ٹھکرا کر اُس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ اختر دروازے کے قریب پہنچا تو اُس کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

"اختر سُنو تو سہی۔ اختر!" اختر رُک کر اُسے دیکھنے لگا۔ ردا نے آہستہ سے کہا۔ "آؤ نا، میرے پاس آؤ۔"

اختر آہستہ آہستہ اُس کے قریب پہنچ گیا۔ ردا کے آنسو بھرے رخسار اُس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ ردا اُسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ایم سوری اختر! آئی ایم ویری سوری! میں بہت تلخ ہو گئی، معافی چاہتی ہوں۔"

"کیوں رو رہی تھیں؟" اختر نے سوال کیا۔

"میں تھک گئی ہوں اختر، تھک گئی ہوں میں کہ اب شاید اپنے پیروں پر بھی کھڑی نہ ہو پاؤں، میرا وجود شدید زخمی ہو گیا ہے، میں اختر کھڑی نہیں ہو سکتی... اب میں اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔"

"اگر کوئی بیمار ہو جائے، کمزور ہو جائے تو وہ اپنوں کا

سہارا لیا کرتا ہے ردا! اور اپنے آسمان سے براہِ راست نہیں اُترتے سارے رشتے زمین پر آنے کے بعد ہی بنتے ہیں۔ انسان تنہا ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے بعد بھی رشتے اُس کی پرورش میں پوری عمر گزار دیتے ہیں، اُس کا تحفّظ کرتے ہیں، اُسے سہارا دیتے ہیں۔ ردا! آپ بھی کسی اپنے کا سہارا لیجیے، اپنے بھائی کا سہارا لیجیے کیوں اتنا اپنے آپ کو مار رہی ہیں سینے میں جو کچھ محفوظ کر رکھا ہے اُسے نکال دیجیے، ورنہ سینہ پھٹ جائے گا۔ میں ایک غیر سنجیدہ آدمی ہوں زندگی کو ہنسی کھیل سمجھ کر گزار دینے کا خواہش مند لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جذبات سے عاری ہوں،... جذبات سے عاری ہوتا تو انسان ہی نہ ہوتا ردا! جو کچھ دل میں ہے کہہ دیجیے آج اگر آپ کو اپنے ان الفاظ پر پشیمانی کا احساس ہوا ہے تو اس کا جرمانہ ادا کیجیے، مجھے بتا دیجیے کہ کیا چیز بک رہی ہے آپ کے سینے میں، ردا! آپ کی کہانی ہم سب کو معلوم ہو چکی ہے، آپ کے بارے میں ہم سب کچھ جان چکے ہیں لیکن کچھ ایسا ہی ہے جسے میں نے نہ جانے کب سے اپنے سینے میں محفوظ کر رکھا ہے۔ آج میں اسے بھی آپ کے سامنے کھول دینا چاہتا ہوں سمجھیں ردا! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت محتاط ہیں، میری طرح جذباتی نہیں ہو سکتیں لیکن میں اپنے آپ کو کیا کروں جو اتنا ہی جذباتی ہو جاتا ہے۔

ردا! ایک بار میں آپ کے کمرے میں آیا تھا۔ آپ موجود نہیں تھیں بالکل اتفاقیہ طور پر، سمجھیں یا اسے صرف میری شرارت تصوّر کریں، میں نے آپ کے سامان میں ایک کتاب دریافت کی۔ کتاب نہیں، بلکہ ڈائری تھی، اور اُس پر لکھا تھا 'ردا کہانی' اور وہ کہانی آپ کی تھی ردا! آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ اس کتاب کے ذریعے آپ کی کہانی مجھے اس وقت معلوم ہو چکی تھی جب کسی اور کو یہ کہانی معلوم نہیں تھی۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں رکھا لیکن حیران رہا یہ سوچ کر کہ کوئی اور بھی ہے، جسے مجھ سے پہلے یہ کہانی معلوم تھی اور ردا! میں اُسے جانتا ہوں۔ میں خیر دین کا نام لیے بغیر نہیں رہوں گا۔ خیر دین جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تصوّر بیگ ہے اور ردا! مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ڈائری خیر دین ہی نے لکھی تھی اور اس ڈائری کے... ابتدائی صفحات میں کچھ اشعار بھی تھے جو میں آپ کے سامنے دُہراتا ہوں۔

لو آؤ کہ رازِ نہاں کو افشائے حقیقت کرتا ہوں
دامانِ زبانِ خاموشی کو لبریزِ شکایت کرتا ہوں
اظہارِ جرأت کرتا ہوں میں تم سے...

یہ اشعار تھے جو خیر دین یا تصوّر بیگ کے دل کی ترجمانی کرتے تھے۔ اُس نے ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے آپ کی کہانی بہت پہلے معلوم کر لی تھی اور اُسے قلم بند کر کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتا میں ردا کہ آپ کے اور تصوّر بیگ کے درمیان کیا کچھ ہے لیکن خیر دین یا تصوّر بیگ کے دل کی واردات میری نگاہوں سے دُور نہیں ہے لیکن میں نے ہمیشہ آپ کا احترام ایک بہن کی مانند کیا اور کبھی یہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا کہ خود آپ کے ذہن میں تصوّر بیگ یا خیر دین کا کیا تصوّر ہے؟ ہاں یہ ضرور سوچا تھا میں نے کہ اگر کبھی اس سلسلے میں بھی آپ کو میرے سہارے کی ضرورت ہوئی تو میں خلوص، پوری رازداری اور محبّت کے ساتھ اپنا سہارا آپ کو پیش کر دوں گا۔ دیکھ لیجیے ردا! میں اتنا بدکردار نہیں ہوں کہ کبھی یہ سب کچھ میری زبان پر کسی عزیز ترین شخصیت کے سامنے بھی آ جاتا، میں نے اپنے دل کی کہانی آپ کو سُنا دی تھی۔

ندامت کے لیے میں نے اپنے جذبات کا اظہار صرف آپ سے کیا تھا ردا! بہت اعتماد کیا تھا میں نے آپ پر اور آپ نے بے شک میرے اعتماد کو نہیں توڑا لیکن نہ میں ہی اتنا ناسپاس نہیں ہوں کہ آپ کے اس اعتماد کو زندگی بھر توڑنے کی جرأت کر پاتا اور باقی جو کچھ ہے آپ کی زندگی میں اس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم لیکن آپ کی یہ آہیں اور سسکیاں بتا رہی ہیں کہ آپ اندر سے کچھ اور ہیں۔ مجھے بتا دیجیے ردا! یہ جاننے کے باوجود کہ میں نے آج تک کبھی آپ کا کوئی راز نوکِ زباں پر نہیں آنے دیا۔ میں اتنا ناقابلِ بھروسا نہیں ہوں آپ پر جو گزر رہی ہے مجھے بتا دیجیے خواہ وہ کوئی بھی مسئلہ ہو بھائی ہوں آپ کا، بہن کہا ہے آپ کو، نبھاؤں گا یہ رشتہ عمر کی آخری سانس تک، وعدہ کرتا ہوں۔"

ردا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اختر کو دیکھ رہی تھی اُس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔ ڈائری کا راز اختر کو معلوم ہے، بہت پہلے سے معلوم ہے، اس سے بھی پہلے، جب اُس نے یہ ڈائری پڑھی تھی اور اختر نے زبان بند رکھی۔ بلاشبہ اس جیسے شریر نوجوان کا بہت بڑا کارنامہ ہے یہ، اس وقت عجیب سے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ردا کو ایک سہارے کا سا احساس ہوا اور اُس کے اندر مسرّت کی ایک لہر سی پھوٹ آئی۔ اختر کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا اُس نے۔ وہ تو

بہت اچھا ہے، بے اختیار اُس کے ہونٹوں سے الفاظ... پھسل پڑے۔

"بیٹھو اختر، بیٹھ جاؤ۔" اُس نے اپنی مسہری پر اختر کو بیٹھنے کے لیے جگہ دی اور وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گیا۔

"تو یہ ڈائری تم پڑھ چکے تھے؟"

"ہاں رداء! آپ یقین کیجیے بہت پہلے کی بات ہے۔"

"مجھ سے بھی ذکر نہ کیا۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس! وہ آپ کا راز تھا، آپ ہی تک رہنا چاہیے تھا اس وقت بھی میں اسے نہ کھولتا لیکن جب میں نے چاروں طرف ذہن دوڑایا تو بہت سے وسوسے دل میں آئے اور تصوّر بیگ کا خیال بھی آ گیا، میں نے صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے آپ سے یہ الفاظ ادا کیے کہ آپ ایک راز کو چھپانے کے لیے اپنے دل پر جبر نہ کریں اور یہ جان لیں کہ میں اس راز سے بھی واقف ہوں رداء! آپ یقین کیجیے مجھے تصوّر بیگ کے لاہور جانے کا واقعہ بھی معلوم ہے اور میں سب کچھ جانتا تھا لیکن میں نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا، میں آپ سے بہت محبّت کرتا ہوں رداء! میں آپ کو اپنی سگی بہن کی مانند سمجھتا ہوں کوئی فرق نہیں ہے میرے دل میں اس رشتے کے سلسلے میں رداء! آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کا کھوج لگاتا رہا ہوں۔ اُن دنوں میں یہ معلوم کرنے کے لیے... تصوّر بیگ کے گھر نکل گیا تھا کہ کہیں اُنہیں تو آپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم پتا چلا وہ موجود نہیں ہیں بعد میں یہ بات بھی میرے علم میں آ گئی کہ وہ ان دنوں لاہور گئے ہوئے تھے۔ یہ ساری باتیں کسی خاص مقصد کے تحت نہیں بتا رہا، میں ان... آنسوؤں اور سسکیوں کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔" رداء نے اپنے آنسو خشک کر لیے اور محبّت بھری نگاہوں سے اختر کو دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔

"جو کچھ میں نے تمہیں کہا نا اختر، اس کے لیے مجھے معاف کر دو گے ناں۔"

"ارے چھوڑیے، اختر وہ شے ہی نہیں جو کسی کی بات کا بُرا مان جائے مگر آپ اس کا ازالہ کر دیجیے مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیجیے، دیکھیے رداء! بہت بڑا غرور کر رہا ہوں اپنے آپ پر، بہت بڑے الفاظ کہہ دیے ہیں میں نے آپ سے، اُن کی لاج رکھ لیجیے ورنہ آپ یقین کیجیے کہ اختر اپنی شخصیت کو قتل کر دے گا، اتنا بدل جاؤں گا میں کہ سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گی آپ اور سب لوگ حیران رہ جائیں گے۔"

"نہیں اختر پلیز... میں تم سے معافی مانگ چکی ہوں۔ بتاتی ہوں... میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں... کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی تم سے وعدہ کرتی ہوں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔" رداء نے کہا اور اختر کا ہاتھ ایک بار پھر اُس کے سر پر پہنچ گیا اُس نے رداء کے بکھرے ہوئے بال سُلجھائے... اور آہستہ سے بولا۔

"بتائیے رداء بتائیے؟"

"میری زندگی کا بھیانک المیہ تو تمہیں معلوم ہے اختر! بہت نفرت کرنے لگی تھی میں ان مردوں سے، اُن کا تصوّر میرے لیے انتہائی بھیانک تھا، مجھے ہر مرد میں اپنے باپ کا چہرہ جھلکتا نظر آتا تھا۔ میں نے کبھی کسی ایسے انداز میں سوچا بھی نہیں اختر! تم یقین کرو میں نے کبھی نہیں سوچا، میں ابتداء خیر دین ہی سے کرتی ہوں۔

تصوّر بیگ، خیر دین بن کر یہاں کس لیے آئے تھے یہ اُن کا راز ہے اور میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا افشا کبھی نہیں کروں گی لیکن تم یُوں سمجھ لو اختر، وہ میرے لیے نہیں آئے تھے۔ اُن کا اپنا کچھ اور مسئلہ تھا۔ پلیز... مجھ سے اس بارے میں مت پوچھنا۔ بہرطور بہت دن تک میں بھی اُنہیں خیر دین سمجھتی رہی لیکن اُن کی باتوں میں کبھی کبھی مجھے کچھ اور شخصیت نظر آتی تھی، پھر بے شمار واقعات ہوئے کچھ ایسے واقعات بھی جن میں... خیر دین نے میرا تحفّظ کیا اور مجھے مصیبتوں سے بچایا۔

تم سے اختر اتنا کچھ کہہ رہی ہوں کہ زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔ اپنی ماں سے بھی نہیں، کسی سے بھی نہیں، اختر! خیر دین مجھے بُرے نہیں لگتے تھے، میں نہیں جانتی تھی کہ وہ تصوّر بیگ ہیں لیکن میں جاننا چاہتی تھی اور اس سلسلے میں میری خیر دین سے ایک گفتگو بھی ہوئی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں اُن کی شخصیت کو کچھ اور پاتی ہوں، وہ مجھ پر کیوں نہیں کُھل جاتے تو اُنہوں نے کہا کہ رداء! جب آپ مجھ پر کُھل جائیں گی تو میں بھی آپ پر کُھل جاؤں گا۔

ہم دونوں کے درمیان یہ چکّر چلتا رہا۔ تصوّر بیگ یا خیر دین مجھے جان چکے تھے۔ اُنہوں نے یہ ڈائری میرے پاس امانتاً رکھوائی تھی اور اس ڈائری میں میری اپنی ہی کہانی تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ یہ ڈائری میں اس وقت تک نہ کھولوں، جب تک کہ وہ مجھے اس کی اجازت نہ دیں۔ مذاق کی سی بات تھی، میں نے اسے محفوظ رہنے دیا، پھر جب آفندی صاحب کا معاملہ آیا تو میں یہاں سے بے اختیار چل پڑی... راستے میں ٹرین میں میں نے وہ ڈائری پڑھی اور اُسے پڑھ کر ششدر رہ گئی۔

یہ ڈائری تصوّر بیگ کی لکھی ہوئی تھی، لیکن ٹرین ہی میں مجھے تصوّر بیگ بھی نظر آ گئے۔ کچھ ایسی بددلی ہو رہی تھی اُس وقت میں حالات سے کہ میں نے اُن کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کی۔ وہ میرے ساتھ لاہور تک گئے، میرے گھر گئے، میری ہر طرح سے مدد کی لیکن میں نے اُن کے ساتھ انتہائی نفرت آمیز سلوک کیا، وہ جب تک برداشت کر سکتے تھے برداشت کرتے رہے اور اس کے بعد خاموشی سے وہاں سے چلے گئے، پھر اس دوران میں تم لوگ بھی پہنچ گئے اور مجھے یہاں لے آئے۔

تصوّر بیگ سے یہاں میری ملاقات ہوئی لیکن اُن کا انداز بالکل بدل چکا تھا، میں نے اُن سے بہت سی بُری بُری باتیں کہہ دی تھیں، میں نے اُن سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ایک مرد کی حیثیت سے مجھے متاثر نہیں کر سکتے کیونکہ میرے دل میں کسی اور مرد کا تصوّر ہے، میرا خیال ہے یہ جُملہ اُن کے لیے تابوت کی آخری کیل ثابت ہُوا اور وہ مجھ سے دُور ہٹ گئے۔ اُنہوں نے کئی بار میرا تحفّظ کیا، بعد میں بھی میرا تحفّظ کیا اور میں اُن کے اس احسان کا کبھی کوئی صلہ نہیں دے سکتی جہاں تک اختر، میرے دل میں اُن کی محبّت کا سوال ہے۔ اختر! شاید میں تصوّر سے محبّت کرتی ہوں، شاید میں اُنہیں چاہتی ہوں لیکن میری اپنی آرزو، میری اپنی شخصیت اپنی جگہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ زندگی میں کسی مرد کو وہ مقام کبھی نہیں دُوں گی جو میری ماں نے میرے باپ کو دیا تھا۔ ہاں اختر! تمہارے سامنے یہ اعتراف کرتی ہوں یہ تمہاری تمام محبّتوں کا صلہ ہے کہ میں تصوّر بیگ کو چاہتی ہوں... یقیناً میں اُنہیں چاہتی ہوں لیکن میں اس وقت اُن کے لیے نہیں رو رہی اختر! میرا مسئلہ کچھ اور ہے کچھ اور..." رداء ہیجانی انداز میں کہہ رہی تھی اور اختر محبّت بھرے انداز میں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور چند لمحات کے لیے رُکی، پھر بولی۔

"میرا مسئلہ کچھ اور ہے اختر! میں عورت ہوں اور... اور مرد بھیڑیے مجھے پامال کرنا چاہتے ہیں، وہ عورت کے علاوہ میری کوئی اور حیثیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ... وہ مجھے... وہ مجھے اختر... وہ مجھے پامال کر دینا چاہتے ہیں۔" رداء پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اختر نے اُسے خاموش نہیں کرایا تھا اور وہ روتی رہی، پھر جب آنسوؤں کا طوفان تھما تو اختر نے نرم لہجے میں کہا۔

"کون ہیں وہ؟"

"وسیم... وسیم جمال!"

"ایں۔" اختر چونک پڑا۔

"ہاں، ایک دولت مند شخص... ایک...۔" رداء نے وسیم کی پوری کہانی اختر کو سُنا دی اور اختر ششدر رہ گیا، پھر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور پھر اُس نے نرم لہجے میں کہا۔

"غلطی آپ کی ہے اور سو فی صد تمہاری ہے۔"

"میری؟"

"ہاں، بالکل آپ کی، آپ نے دُنیا پر اعتماد کرنا کیوں چھوڑ دیا۔ لاکھوں نہیں کروڑوں مثالیں ہیں، لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں، اچھے اور بُرے۔ صرف بُرے ہی اس دُنیا میں نہیں ہیں اچھے بھی ہیں، کسی ایک بُرے کو نگاہ میں رکھ کر سب کو ایسا ہی قرار دینا دانش مندی تو نہیں ہے۔ اس گھر کو ہی دیکھ لو... یہاں کس نے آپ کے ساتھ بُرائی کی ہے۔ کیا لالچ ہے اس گھر کے لوگوں کو آپ سے رداء! سب بے لوث آپ کو چاہتے ہیں۔ وسیم کوئی مسئلہ نہیں ہے... بالکل نہیں ہے۔ اطمینان رکھیں اب وہ آپ کے راستے میں نہیں آئے گا۔"

"اختر!"

"ہاں رداء! آپ بہرحال لڑکی ہیں، کمزور ہیں، ہر حال میں کمزور ہیں، وہ آپ کو ڈرا سکتا ہے، سب کو نہیں... مجھے نہیں۔"

"میں کیا کروں اختر؟" رداء درد بھرے لہجے میں بولی۔

"اعتماد... سب پر، ہر اُس پر جس سے آپ کو نقصان نہ پہنچا ہو اس اعتماد کو بحال کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اختر میں بہت پریشان ہوں۔"

"اپنی یہ پریشانی میرے ہاتھ بیچ دیں، بولیں کیا لیں گی؟" اختر مسکرا کر بولا۔ رداء اُسے دیکھتی رہی، پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"تم آج اپنے گھر نہیں گئے، یہاں کیسے رُک گئے؟"

"یار راز کی باتیں ہیں کسی نے کہا رُک گئے۔" اختر مسکرا کر بولا۔

"ندامت ہے؟" ردا بولی اور اختر نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔
ردا بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ اختر خوش ہو کر بولا۔
"اسے عبادت کہتے ہیں کیا سمجھیں آپ۔۔۔"
"مجھے بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے، میں اب کیا کروں؟۔۔۔ سچ جانو میں اس سے بے حد خوف زدہ ہوں، بے چارے احسان احمد صاحب کہیں میری وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔"
"پھر وہی ایک بات۔۔۔ میں نے کہا نا اب ان تمام حالات کو آپ ذہن سے نکال دیجیے گا۔ اختر عادل سے سودا ہو چکا ہے اور اب یہ سارے معاملات آپ کے نہیں میرے ہیں۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں، معمول کے مطابق اپنی۔۔۔ ذمے داریاں پوری کریں ردا، ظہیر احمد کے بارے میں۔۔۔ اگر مناسب سمجھیں تو احسان صاحب کو مختصر الفاظ میں تفصیل بتا دیں کیونکہ یہ سارا چکر وسیم جمال ہی کا چلایا ہوا ہے اور ظاہر ہے نیکو لمیٹڈ سے احسان لمیٹڈ کا کاروبار نہیں ہو سکے گا۔ احسان صاحب کو مطمئن کرنا بھی ضروری ہے لیکن انہیں پریشان نہ کریں آپ۔"
"ٹھیک ہے اب تم جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گی میں۔"
"ارے، ارے اتنا بڑا قول نہ ہاریں، میں ذرا بگڑا ہوا۔۔۔ انسان ہوں، کوئی ایسی ویسی بات کہہ بیٹھا آپ سے جو آپ نہ کر پائیں تو خواہ مخواہ آپ کو شرمندگی ہو گی۔" ردا چونک کر اختر کو دیکھنے لگی، پھر بولی۔
"اختر شرارت مت کرو۔"
"ایک شرط پر، آپ وعدہ کریں کہ کل سے پُر سکون رہیں گی۔" ردا نے آہستہ سے گردن ہلا دی تھی، اختر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میں جاؤں۔"
ردا آہستہ سے بولی "جاؤ۔۔۔ تم نے مجھے بہت بڑا سہارا دیا ہے اختر! بس کیا کہوں میں۔۔۔"
"خاموشی سے آنکھیں بند کیجیے اور بستر پر دراز ہو جائیے۔ خبردار کوئی بات سوچی تو۔" اختر نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے پر رک کر وہ بولا۔ "اور ہاں دروازہ بند کر لیجیے گا اندر سے۔"
ردا خاموشی سے بستر پر بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ اختر وہاں سے باہر نکل آیا۔ [illegible] انداز

میں گفتگو کرتا رہا تھا لیکن اس کے کمرے سے باہر آ کر وہ گہری سوچ کا شکار ہو گیا تھا، بہت دیر تک وہ منصوبہ بندیاں کرتا رہا اور اس کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا۔

تصور بیگ تیار ہو کر اپنے گھر سے باہر نکلا۔ پولیس کی وردی میں وہ بے حد شاندار نظر آ رہا تھا۔ باہر کھڑی جیپ میں بیٹھ کر اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور پولیس ہیڈ کوارٹر کی جانب چل پڑا۔
ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ عقب سے اختر کی کار نکل کر اس کی جیپ کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ پہلے تو تصور بیگ نے کوئی خیال نہ کیا لیکن چند لمحات کے بعد اسے احساس ہو گیا اور اس نے کار پر نظر ڈالی تو اختر نظر آیا جو خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ تصور بیگ ایک لمحے کے لیے چونک پڑا اور پھر اس نے یہ سوچا کہ اختر کو مخاطب کرے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ریستوران نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ تصور بیگ، اختر کو پکارتا، اختر نے اپنی کار دبانی شروع کر دی اور چند لمحات کے بعد وہ جیپ کے بالکل سامنے آ گیا۔
تصور بیگ نے بوکھلا کر بریک لگا دیے تھے۔ ورنہ جیپ آگے والی کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا جاتی۔ اختر نے کار کا انجن بند کیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ جیپ کا راستہ اس نے بالکل ہی روک دیا تھا۔ تصور بیگ حیرانی سے مسکرا رہا تھا۔
"نیچے تشریف لے آئیے جناب پولیس آفیسر صاحب" اختر نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔
"ارے بھائی کیا چالان کرنے کا ارادہ ہے؟" تصور بیگ مسکراتا ہوا بولا۔
"جی ہاں، نیچے تشریف لے آئیے۔"
"اچھی زبردستی ہے، بہتر ہے جناب حاضر ہوں" تصور بیگ جیپ سے نیچے اتر آیا اور اختر اسے گھورنے لگا۔
"ایک سوال کر سکتا ہوں؟"
"میرا خیال ہے میں جیپ غلط نہیں چلا رہا تھا۔ آپ نے اپنی کار سے میری جیپ کو دبایا اور اس کے بعد اپنی کار اس طرح میرے سامنے لے آئے کہ اگر میں ہوشیاری سے کام نہ لیتا تو جیپ کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا جاتی۔"
"مسئلہ جیپ اور کار کا نہیں ہے، میں نے آپ سے

ایک سوال پوچھنے کی اجازت مانگی تھی۔" اختر نے کہا۔
"حکم فرمائیے۔"
"آدمی ہو یا پولیس والے؟" اختر بولا اور تصور بیگ اسے دیکھنے لگا۔
"میرا خیال ہے آدمی ہی ہوں۔"
"تو پھر آؤ آدمیوں کی طرح ذرا اس ریستوران میں بیٹھ کر تھوڑی سی گفتگو کریں گے، میں جانتا ہوں کہ تمہیں نوکری پر جانے کی اتنی جلدی نہیں ہو رہی۔"
"بہت بہتر، اب آپ نے ایک کسوٹی بنائی ہے تو۔۔۔ ہمیں اس کسوٹی پر پورا اترنا ہی پڑے گا۔" تصور بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اختر کے ساتھ ریستوران کی جانب چل پڑا۔ جیپ کو اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ فٹ پاتھ کے ساتھ مناسب جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے اسے کوئی تردد نہیں تھا۔ اختر کے ساتھ وہ ریستوران میں داخل ہوا اور اختر نے خالی ریستوران کے ایک گوشے میں پہنچ کر دو کرسیاں گھسیٹ لیں اور اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"کسی پولیس والے کو اس طرح اغوا کر کے ریستوران میں لانا غالباً اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے۔"
"جی ہاں، بعد میں اگر چاہیں تو آپ اس اغوا کے الزام میں مجھے سزائے موت تک دلوا سکتے ہیں۔"
"خدا نہ کرے۔" تصور بیگ اپنائیت سے بولا اور اختر اسے گھورنے لگا، پھر اس نے کہا۔
"یار بازار میں ایک بہت سستی سی چیز ملتی ہے جسے لوگ نمک کہہ کر پکارتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ نمک کا محاورہ کس نے ایجاد کیا اور کیوں کیا، کوئی بہت ہی قیمتی شے ہوتی تو ہم یہ سوچتے کہ انسان کسی خاص مقصد کے تحت اس کا حوالہ دیتا ہے لیکن لوگ اوّل تو ہر چیز میں نمک استعمال کرتے ہیں۔ آدمی کہاں کہاں بچے، کہیں نہ کہیں کھا ہی لیا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کا اتنا مان کیوں کیا جاتا ہے؟"
"غالباً آپ نمک حرامی کے بارے میں کچھ فرما رہے ہیں۔" تصور بیگ نے چٹکی بجا کر ویٹر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ویٹر قریب آیا تو تصور بیگ نے اسے چائے لانے کا حکم دیا۔
"جی جی، وہی عرض کر رہا تھا۔"
"اور اب آپ یہ فرمائیں گے کہ میں نے احسان احمد

صاحب کی کوٹھی میں نمک کھایا ہے اور اس کے بعد نمک حرامی کر رہا ہوں۔"
"نمک حرامی کی نہیں حلالی کی [illegible] ت کر رہا تھا۔ نمک حلالی میں کچھ اس قسم کے واقعات بھی شا[illegible]مل ہو جاتے ہیں کہ کوئی شخص اگر کسی جگہ کچھ عرصے رہ چکا ہو، و[illegible]اں کے لوگ اس سے محبت کرنے لگے ہوں تو اسے اپنا مطل[illegible]ب پورا ہونے کے بعد بالکل ہی ان تمام لوگوں کو نظر انداز نہیں [illegible] کر دینا چاہیے۔ اب جیسے دادی اماں کی بات کرتا ہوں، با[illegible]ت بات میں خیر دین۔۔۔ خیر دین پکارنے لگتی ہیں، کبھی خیر د[illegible]ین کا جی نہیں چاہا کہ جا کر دادی اماں سے مل لے۔"
"ہاں، کافی عرصہ ہوا کہ دادی ا[illegible]ماں سے ملاقات نہیں ہوئی۔"
"اوہ بھئی بہت سے لوگ ہیں [illegible] جن سے ملاقات ہونی چاہیے تھی۔ خیر، تصور بیگ کی حیثیت [illegible] تو ہمیں یہ اختیار نہیں حاصل ہوتا کہ ہم کوئی سخت یا تلخ با[illegible]ت کہہ دیں لیکن اپنا خیر دین وہ کبھی کبھی بہت یاد آتا ہے مس[illegible]ٹر تصور بیگ!" تصور بیگ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات [illegible]ل گئے، پھر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"آپ بہت دلچسپ انسان [illegible] ر اختر صاحب! انہوں نے ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے۔"
"مہربانی ہے بھائی تمہاری [illegible] میرا مطلب ہے آپ کی جناب تصور بیگ صاحب! ان[illegible] کبھی خیر دین سمجھ کر پھسل جائے تو برا نہ مانیے گا۔"
"آپ چاہیں تو مجھے خیر دین ک[illegible]ہہ کر ہی مخاطب کر سکتے ہیں۔"
"ارے بھائی! ہم کیا اور ہما[illegible]ری اوقات کیا۔ اب بھلا آپ کو کوئی خیر دین کہہ سکتا ہے؟ [illegible] بہت سے سوالات ذہن میں چکراتے ہیں تصور بیگ [illegible]ب اور دل چاہتا ہے کہ آپ سے دوستی کر کے ان کے [illegible] مانگے جائیں۔۔۔ لیکن آپ کی دوستی کا بھی مسئلہ ذرا ٹیڑ[illegible]ھا ہے۔"
"کیوں؟" تصور بیگ نے مسک[illegible]راتے ہوئے کہا۔
"بھائی بہت بڑے پولیس آ[illegible] ہو۔ یہ پھول تیلتے ہیں اور ویسے بھی ظاہر ہے پولیس کا معاملہ [illegible] کیا کہیں اور۔۔۔ کیا نہ کہیں۔۔۔؟"
"آپ مجھے آدمی کہہ کر فٹ پا[illegible] سے یہاں تک لائے ہیں، پولیس کی اس وردی پہ نہ جائ[illegible]یے۔"
"وعدہ؟" اختر نے ہاتھ بڑھا[illegible]یا۔ اور تصور بیگ نے

اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔
"تو جناب محترم تصوّر بیگ صاحب عرف خیر دین! اب کوئی تکلف نہیں ہوگا۔ آپ اس کی اجازت دے چکے ہیں۔"
"ہاں، مَیں اجازت دے چکا ہُوں" تصوّر بیگ نے کہا۔
"بار کو بھی آنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔"
"ہاں، بس کچھ پولیس کی مصروفیات سمجھ لیجیے اور کچھ تھوڑی سی جھجک بھی۔"
"جھجک کیوں؟"
"بتا نہیں سکتا۔"
"گڈ، ویری گڈ! مجھے یہ انداز پسند ہے"۔ اختر نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔ ویٹر نے چائے کا نفیس ترین سامان سامنے لاکر رکھ دیا اور اختر خود ہی چائے بنانے لگا۔
"خیر دین کی حیثیت سے یہ خدمت مجھے انجام... دینے دیجیے۔"
"جی نہیں، آج خیر دین، خیر دین نہیں، تصوّر بیگ ہے اور بہت بڑی چیز ہے، اس لیے چائے ہمیں ہی بنانے دیں"! تصوّر بیگ مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ اختر کہنے لگا۔
"بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ بعض اوقات آدمی اپنی اوقات سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اوقات کا تعیّن ذرا مشکل کام ہے، اب ہمیں دیکھ لیجیے آپ جناب تصوّر بیگ صاحب، اختر حسین نام ہے اپنا، عادل حسین صاحب کے بیٹے ہیں۔ اچھی خاصی مال و دولت کے مالک ہیں اس لیے اپنے آپ کو صاحب حیثیت بھی سمجھتے ہیں لیکن آپ کے سامنے کچھ احساس کمتری کا شکار ہوگئے ہیں۔"
"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں اختر صاحب؟"
"جی جی... جی یہی بات ہے۔" اختر نے کہا۔
"تو کہیے نا... دوستی بھی ہے ہماری، بے تکلفی کا اظہار بھی ہو چکا ہے اور پھر میں آپ سے یہ بھی عرض کر چکا ہُوں کہ مَیں آپ کی بے پناہ عزّت کرتا ہُوں۔"
"عزّت برقرار رکھو گے؟" اختر نے سوال کیا۔
"انشاء اللہ"۔ تصوّر بیگ نے جواب دیا۔
"تو کچھ ایسی باتوں کی طرف آ رہا ہُوں، جو یقیناً تمہارے لیے حیرت انگیز ہوں گی لیکن بتانا ضروری سمجھتا ہُوں، کچھ دن پہلے کی بات ہے بلکہ کافی دن پہلے کی بات ہے کہ یُوں ہی شرارتاً ایک دن رداء کے کمرے میں جا گھسا تھا۔ وہاں اُس کے سامان کی تلاشی لینے پر ایک ڈائری دستیاب ہُوئی جس پر لکھا تھا رداء کی کہانی۔" اختر نے تصوّر بیگ کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا۔

تصوّر بیگ تھوڑا سا چونک پڑا تھا۔ اختر کچھ لمحات خاموش رہا، پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔
"اور مسٹر تصوّر بیگ ایک بات کروں آپ سے؟ مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس وقت میری کسی بات کو جھُوٹ یا فریب پر مبنی نہ سمجھا جائے، مجھے حیرت ہُوئی اور مَیں نے جلدی جلدی وہ ڈائری پڑھ ڈالی۔ اس ڈائری میں رداء کی کہانی تھی اور یہ اس وقت کی بات ہے مسٹر تصوّر بیگ، جب رداء کی کہانی کسی کو معلوم نہیں تھی... مَیں نے اس کہانی کو اپنے سینے میں دفن کر لیا، تجسّس تو جاگا تھا میرے دل میں بہت زیادہ، لیکن جو کچھ مَیں نے پڑھا تھا اُس کے انکشاف سے رداء کی شخصیت مجروح ہونے کا خیال تھا اور رداء کے سلسلے میں، مَیں آپ سے صرف اتنا عرض کر سکتا ہُوں کہ ہم دونوں بھائی ایک بہن کو ترسے ہُوئے تھے اور ہم نے ایک بہن کی شکل میں رداء کو دیکھا تھا، میرا خیال ہے آپ میری تمام باتوں پر یقین کریں گے۔"
"آپ بار بار یہ بات نہ دُہرائیں اختر صاحب! مَیں آپ کی بات پر پورا پورا یقین کر رہا ہُوں۔"
"خیر... مَیں نے اس مسئلے کو کرُیدنا مناسب نہیں سمجھا... لیکن تصوّر بیگ صاحب! میرے ذہن میں کُرید ضرور پیدا ہو گئی تھی، بات آئی گئی ہوگئی۔ رداء کا وہ واقعہ ہُوا، جس میں وہ لاہور چلی گئی تھی، آفندی صاحب سامنے آئے اور وہ کہانی منظرِ عام پر آگئی لیکن اُس کے کچھ پہلو تشنہ تھے اور مَیں بارہا اس بارے میں سوچ چُکا تھا کہ اگر کبھی رداء کے اندر کوئی لچک پاؤں تو ان پہلوؤں کے بارے میں اُس سے معلومات حاصل کروں۔ آپ وہاں سے واپس چلے آئے، حالات میں تبدیلیاں رونما ہُوئیں۔ مَیں نے اس سلسلے میں کوئی غور نہیں کیا تھا... تصوّر صاحب لیکن اب ایک واقعہ ایسا پیدا ہوگیا ہے کہ جس کی وجہ سے مجھے آپ سے رجوع کرنا پڑا ہے۔"
"کیا؟" تصوّر بیگ نے آہستہ سے پوچھا۔
"ایک شخص ہے وسیم جمال... ایک بڑا سرمائے دار ہے اور احسان لمیٹڈ پر احسانات کرتا رہا ہے۔ اُس نے رداء پر یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ احسانات اُس نے رداء کی وجہ سے احسان

لمیٹڈ پر کیے ہیں۔ احسان صاحب کے کانوں تک یہ بات رداء نے پہنچائی تو احسان صاحب نے اُس شخص سے تمام تعلقات... میرا مطلب ہے کاروباری تعلقات منقطع کر لیے اور اُسے بُرا بھلا بھی کہا، اس پر اُس شخص نے نہایت سرد لہجے میں احسان صاحب کو جواب دیا کہ وہ رداء کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں احسان صاحب رکاوٹ نہ بنیں۔ گویا ایک طرح سے یہ اُس کا چیلنج تھا اور تصوّر بیگ صاحب! وہ اس چیلنج کو حقیقی شکل دینے میں مصروف ہے۔ دیکھیے بات اگر بہن تک آجائے تو پھر انسان بہت سے خدشات کو نظر انداز کر دیتا ہے، مَیں بذاتِ خود وسیم جمال سے مل سکتا ہُوں اور اُسے قوّت کے ذریعے اُس کی بدتمیزی کی سزا دے سکتا ہُوں لیکن کچھ واقعات اور ایسے ہُوئے جس سے آپ کا نام میرے ذہن میں آیا اور مَیں نے سوچا کہ جب ہمارے تعلقات ایک ایسے شخص سے ہیں جو قانونی طور پر وسیم جمال کو درست کر سکتا ہے تو مجھے غیر قانونی طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے، مَیں آپ کو بالکل مجبور نہیں کروں گا تصوّر بیگ صاحب لیکن سچائی یہ ہے کہ رداء اُس شخص سے بہت خوفزدہ ہے، اُس نے کل رداء کو ایک غیر متعلق دفتر میں بُلایا! رداء وہاں اپنے ایک دوست کے ذریعے رداء سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی۔ غالباً مَیں غلط الفاظ استعمال کر رہا ہُوں، یُوں سمجھ لیجیے کہ اُس نے ایک سازش کی اور رداء کو ایک ایسے دفتر میں بُلایا جس سے احسان لمیٹڈ کے کچھ کاروباری معاملات چل رہے ہیں، وہاں وہ شخص ظہیر احمد غائب ہوگیا اور وسیم جمال وہاں پہنچ گیا اور اُس نے رداء سے بے پناہ بدتمیزی کی۔ رداء کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آئی لیکن رات کو اُس کی حالت بے حد خراب تھی اور اتفاقیہ طور پر مَیں نے اُس کی سسکیاں سُن لیں اور مَیں اُس کے کمرے میں جا گھسا۔

جذباتی ہو کر رداء نے مجھے تمام کہانیاں سُنا دیں اور مَیں نے اُسے تسلّی دیتے ہُوئے کہا کہ وسیم جمال کا کھیل ختم کرنے میں میری زندگی بھی کام آجائے تو مَیں اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ وہ فکر نہ کرے کیونکہ وہ میری بہن ہے، مَیں نے بہت غور و خوض کیا۔ رداء کی بتائی ہُوئی تفصیلات میں آپ کا نام بھی سامنے آیا جس میں اُس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بیشتر ایسے مراحل پر آپ اُس کی ڈھال بنے ہیں۔
لیکن اب آپ اُس سے برگشتہ ہو چکے ہیں، اس برگشتگی کی وجہ مَیں نے پوچھی تو اُس نے مجھے وہ تمام تفصیلات بھی بتا دیں، جو لاہور میں آپ کے ساتھ پیش آئی تھیں۔ وسیم جمال نے اُس کو اتنا حواس باختہ کر دیا ہے کہ اب وہ ذہنی طور پر کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل بھی نہیں رہی ہے اور اسی ذہنی بحران کے عالم میں اُس نے مجھے یہ بھی بتایا تصوّر بیگ صاحب کہ وہ آپ کو چاہتی ہے، اُس نے مجھے یہ بھی بتایا تصوّر کہ اُس نے آپ کی بہت بے عزّتی کی اور اس کی وجہ اُس کا باپ ثاقب ہے جس نے اُسے اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ ہر مرد سے نفرت کرنے لگی ہے، اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ کو اپنے آپ سے دُور کرنے کے لیے اُس نے یہ بھی کہا ہے، آپ سے کہ اُس کے دل میں کوئی اور ہے۔

تصوّر بیگ صاحب! آپ بھی بالغ نگاہ رکھتے ہیں۔ رداء کے کردار کے ساتھ ایسا کوئی تصوّر بھی محال ہے اور اس کا اُس نے میرے سامنے اعتراف کیا، بہت ہی غلط بات کر رہا ہوں، ایک بھائی کو اپنی بہن کے بارے میں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے لیکن تصوّر بیگ صاحب! یہ خیال مَیں آپ کے دل میں ڈال دینا چاہتا ہُوں کہ رداء آپ کو چاہتی ہے، اسے ذہن میں رکھیں، ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ مَیں آپ سے یہ بھی عرض کروں گا کہ وسیم جمال جیسے شخص کو ایک قانون کے محافظ کی حیثیت سے سزا دینا آپ کا فرض ہے، ممکن ہے آپ کو میری باتیں بے ربط محسوس ہو رہی ہُوں لیکن اس وقت میں ذہنی طور پر بہت جذباتی ہو رہا ہُوں اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہُوں کہ الفاظ کی ترتیب کیا ہونی چاہیے۔" تصوّر بیگ نے اختر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔
"اختر! گفتگو میں تکلف شامل نہ ہو تو وہ سوفی صد... سچائیوں پر مبنی ہوتی ہے، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہتے رہیں۔"
"بس، مَیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا، وسیم جمال جو کچھ کر رہا ہے یا جو کچھ اُس نے کیا ہے وہ انتہائی حد تک گری ہُوئی بات ہے اور اگر کوئی رداء کو اس طرح مجبور کر دے تو کم از کم مَیں تو خودکشی کرنے کے بارے میں ہی سوچوں گا۔"
"نہیں، آپ اس سلسلے میں تنہا نہیں ہیں اختر! بھول جائیے اس مسئلے کو وسیم جمال نے جو کچھ کیا ہے اُس کی سزا اُسے بھگتنی پڑے گی، ایسی سزا کہ وہ تصوّر بھی نہیں کر پائے گا۔" اختر چونک کر تصوّر کو دیکھنے لگا تھا۔ تصوّر نے مسکراتے ہُوئے کہا۔
"ہاں، یہ آپ ہی کی نہیں میری بھی عزّت پر حملہ ہے۔ آپ مطمئن

رہیں اختر اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیں وسیم جمال اب ردا صاحبہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا، باقی رہی دوسری باتیں تو ان پر پھر کبھی گفتگو کریں گے، دراصل آپ سے اب کیا پردہ، ردا نے میرے اُوپر اتنے کاری وار کیے ہیں کہ... کہ میں خود اپنی شخصیت کو ٹوٹا ہُوا محسوس کرتا ہُوں۔"

"یار تصوّر! جب یہ بات سامنے آگئی کہ وہ تمہیں چاہتی ہے اور تمہاری ڈائری مجھے یہ بھی بتاتی ہے کہ تمہارے ذہن میں بھی اُس کے لیے جگہ ہے تو پھر کوئی درمیانی راستہ نہیں تلاش کیا جا سکتا؟"

"تلاش کریں گے اختر! تم نے یہ انکشاف کر کے صحیح معنوں میں میرے دل کا ایک زخم بھر دیا ہے، واقعی بہت بڑی تبدیلی رونما ہُوئی ہے مجھ میں، مگر جلد بازی نہیں کرتے اس سلسلے میں، تم جانتے ہو کہ ردا بے حد جذباتی خاتون ہیں اور ان کے لیے ہر قدم سوچ سمجھ کر اُٹھانا پڑے گا۔"

اختر نے تصوّر بیگ کی آنکھوں میں مسرّت و انبساط دیکھی تھی اور اُسے ایک گونا سکون ہُوا تھا کہ اُس نے جو فیصلہ کیا وہ غلط نہیں ہے، تصوّر بیگ نے ہونٹ بھینچتے ہُوئے کہا۔

"اس وسیم جمال کو تو مَیں آج ہی سنبھال لوں گا، اُس کی تم فکر مت کرو، ردا پر جس طرح چاہو رُعب گانٹھ سکتے ہو۔ پلیز... میرا نام ابھی درمیان میں مت لانا۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر یہ بات ہے تو مَیں مطمئن ہو جاتا ہُوں لیکن صورتِ حال کے بارے میں تم سے معلومات حاصل ضرور کروں گا۔"

"ضرور، ضرور، تم مجھے ٹیلی فون کر لینا شام کو چھ بجے کے قریب، مَیں تمہیں تفصیلات سے آگاہ کر دُوں گا۔ ویسے اختر! اب ہمارے تمہارے درمیان رابطہ رہنا چاہیے، بہت سے مسئلے اُلجھے ہُوئے ہیں، جو تمہاری مدد سے سُلجھ سکتے ہیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں، اب یہ کاروبار بھی کرنا پڑے گا مجھے... کریں گے بھائی کریں گے یہ بھی کر کے دیکھیں گے کیسا لگتا ہے۔" اختر نے مسخرے پن سے کہا اور تصوّر ہنسنے لگا، پھر خوشامدانہ انداز میں بولا۔

"یار اختر! جو خوش خبری تم مجھے سُنا کر جا رہے ہو، اب اُسے آخری حد تک پہنچانا بھی تمہارا ہی کام ہوگا۔ مَیں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھُولوں گا۔"

"کمال ہے صاحب، لوگ ذرا سا مطلب پُورا ہو جانے پر کس قدر موم ہو جاتے ہیں، ورنہ پتھر کی طرح سخت نظر آتے ہیں... اچھا بھئی اب چلا جائے۔"

"ہاں بالکل۔" اختر اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا اور تصوّر بیگ جیپ میں آ بیٹھا، خوشی اُس کے چہرے سے پھُوٹی پڑ رہی تھی۔ عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ جیپ اسٹارٹ کر کے بڑھائی اور تھوڑی دیر کے بعد پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔

اپنے آفس میں داخل ہو کر وہ میز پر بیٹھا اور کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ پانچ چھ منٹ تک وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا، پھر اُس نے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھا کر دو نمبر ڈائل کیے اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے آواز آنے پر اُس نے کہا۔

"مظہر شیخ کو دو۔" چند لمحات کے بعد دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سُنائی دی۔

"سر مظہر شیخ بول رہا ہے۔"

"تصوّر!"

"جی سر!"

"مظہر! غلام عابد کی کیا کیفیت ہے؟"

"ممتاز شاہ کے کیس والے غلام عابد کی سر!"

"ہاں بھئی! اُسی کی بات کر رہا ہُوں۔"

"ٹھیک ہے سر اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس، ہم ابھی اس سلسلے میں شواہد جمع کر رہے ہیں، کچھ اور گرفتاریاں متوقع ہیں، جن کے لیے کارروائی ہو رہی ہے۔"

"ہُوں، غلام عابد کے پاس پہنچو مَیں آ رہا ہُوں۔" تصوّر بیگ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہیڈ کوارٹر کے اندرونی حصّے کی جانب چل پڑا، جہاں پولیس لاک اَپ تھے۔ ایک لاک اَپ کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ مظہر شیخ وہاں آ گیا۔ انسپکٹر تھا، اُس نے آتے ہی سلوٹ مار کر تصوّر بیگ کو سلام کیا تھا۔ غلام عابد سلاخوں کے پیچھے تھا، چوڑے چکلے بدن کا ایک شخص۔ تصوّر بیگ نے اشارے سے اُسے قریب بُلایا اور مسکراتا ہُوا بولا۔

"کہو، تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"نہیں، صاحب! آپ لوگوں کی مہربانیاں ہیں۔"

"کچھ کام ہے تم سے، کرو گے؟"

"صاحب! آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، اُس

کے صلے میں تو گردن کاٹ کر بھی آپ کے قدموں میں ڈال سکتا ہُوں۔" غلام عابد نے جواب دیا۔

"گڈ، ویری گڈ! وسیم جمال کو جانتے ہو؟"

"وسیم جمال، نہیں صاحب! یہ نام تو کبھی نہیں سُنا میں نے۔"

"سُنا ہے، سمجھے، سُنا ہے۔" تصوّر بیگ نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا اور غلام عابد مسکرا دیا۔

"جی صاحب سُنا ہے۔"

"کون ہے یہ آدمی؟"

"جی یہ... یہ..."

"مَیں بتاتا ہُوں۔" تصوّر بیگ نے کہا اور غلام عابد کو وسیم جمال کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا، پھر بولا۔

"اور یہ شخص ممتاز شاہ کے قتل میں برابر کا شریک تھا اُس نے جو جو کارروائیاں کی ہیں اُن کی تفصیلات مَیں تمہیں فراہم کر دُوں گا سمجھے، کیا یہ شخص ممتاز شاہ کے قتل میں شریک تھا؟"

"بالکل شریک تھا صاحب! بلکہ اس سلسلے میں سب سے سرگرم کارکن تھا۔"

"گڈ، ویری گڈ!" تصوّر بیگ نے زیرِ لب مسکراتے ہُوئے کہا اور پھر مظہر شیخ کی طرف رُخ کر کے بولا۔

"مظہر! تمہیں پولیس کی اچھی خاصی نفری کے ساتھ اس پتے پر پہنچنا ہے، ذرا وقت نکال کر جانا، یہاں پہنچنے کے بعد تم وسیم جمال کو گرفتار کر لو گے اور ہتھکڑیاں لگا کر پولیس ہیڈ کوارٹر لے آؤ گے، مَیں یہاں تمہارا انتظار کروں گا۔ خبردار! کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ شخص کتنی ہی دھمکیاں دے، کچھ بھی کہے، اُسے اُس کے دفتر ہی میں ہتھکڑیاں ڈال کر کھینچتے ہُوئے باہر لاؤ گے، ہر طرح کی ذمّے داری مَیں قبول کرتا ہُوں۔"

"یس سر!" مظہر شیخ نے جواب دیا اور تصوّر بیگ اُس کے سامنے پہنچ کر آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے بولا۔

"کسی قسم کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا، میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"آپ مطمئن رہیے جناب! آپ کی ہدایت کے مطابق ہی عمل ہوگا۔"

"گڈ، جاؤ تیاریاں کرو، مَیں ذرا اپنے دوست غلام عابد سے کچھ گفتگو کر لُوں۔" تصوّر بیگ نے کہا اور غلام عابد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ غلام عابد کو تفصیلات سمجھانے لگا تھا... اور انسپکٹر مظہر شیخ اپنے چیف کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے کے لیے تیاریاں کرنے چل پڑا۔

*

دوسری صبح ردا بہت مطمئن تھی۔ رات کو اختر کے جانے کے بعد دیر تک عجیب سے احساسات کا شکار رہی تھی لیکن اس کے بعد اُس نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ اختر قابلِ اعتماد ہے، بہت سے اعترافات کیے تھے اُس نے اختر کے سامنے لیکن نہ جانے کیوں دل بہت ہلکا محسوس ہُوا۔

معمول کے مطابق تیاریاں کیں اور پھر دفتر چل پڑی۔ دفتر کا ڈرائیور وقت پر گاڑی لے کر آ جاتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھی... وہ بہتر الفاظ ترتیب دے رہی تھی، جن سے احسان صاحب کو ظہیر احمد کے بارے میں تفصیلات بتائے کہ اچانک اُس کی نگاہ آگے سڑک پر جاتے ہُوئے ایک لڑکے پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک پڑی۔ جانی پہچانی صورت تھی، سو فی صد جانی پہچانی... لیکن یقین نہیں آ رہا تھا... وہ یوسف تھا... ثاقب کا بیٹا... جرمن نژاد میرنا اُس کی سوتیلی ماں کا بیٹا۔ حالانکہ کئی سال پہلے اُسے دیکھا تھا لیکن اُس کے خدوخال ردا کے ذہن میں محفوظ تھے۔

"ڈرائیور گاڑی روکو!" اُس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اور ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔

"ریورس کرو... اُس لڑکے تک۔" ردا نے دوسرا حکم دیا اور ڈرائیور نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔

گاڑی ریورس ہو کر اُس لڑکے سے بھی پیچھے نکل گئی... لیکن ردا نے اس طرح اُسے اور قریب سے دیکھ لیا تھا، اُس کی یادداشت اُسے دھوکا نہیں دے رہی تھی۔ وہ یوسف ہی تھا۔ چند سال بڑا ضرور ہو گیا تھا، لیکن خدوخال میں نمایاں تبدیلی نہیں ہُوئی۔ وہ ویسے ہی تھے۔

اُس کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور نے گاڑی کچھ آگے بڑھائی اور پھر اُس نے آواز دی "یوسف..."

لڑکا چونک کر رُک گیا۔

"تم... تم یوسف ہو نا؟" ردا نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ لڑکا اُسے دیکھتا رہا اور پھر اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔

"اوہ... سسٹر آپ؟" ردا جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئی۔ یوسف بھی دو قدم آگے آ گیا تھا۔ نہ جانے کون سے اندرونی جذبے اُبھرے کہ ردا نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ یوسف کے انداز میں بھی اپنائیت پائی جاتی تھی۔

"تم نے مجھے پہچان لیا؟"

"کیوں نہیں سسٹر؟" یوسف مسکرا کر بولا، پھر وہ گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

"آؤ... آؤ میرے ساتھ۔" رداء نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اُسے دھکیلنے لگی۔

یوسف گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

"تم یہاں کیسے آ گئے یوسف تم... اور تمہاری ممی تو یہاں سے چلے گئے تھے؟"

"ہم یہاں آ گئے ہیں سسٹر! اب یہیں رہتے ہیں۔ وہ سامنے میرا کالج ہے میں نے یہاں فرسٹ ائر میں ایڈمیشن لیا ہے۔"

"ممی بھی آ گئی ہیں؟"

"ہاں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"کچھ دُور ہمارا فلیٹ ہے۔ آپ ممی سے ملنا پسند کریں گی؟" یوسف نے پوچھا اور رداء کسی سوچ میں ڈوب گئی، پھر اُس نے کہا۔

"ممی مجھ سے ملنا پسند کریں گی؟"

"کیوں نہیں سسٹر! چلو۔" رداء کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ بہ مشکل تمام اُس نے یوسف سے اُس کے فلیٹ کا پتا پوچھا اور پھر ڈرائیور سے اس جگہ چلنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"تمہیں یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ گزرا یوسف؟"

"پانچ ماہ ہو گئے سسٹر! یہ شہر بہت اچھا ہے، مجھے... بے حد پسند ہے اور میں نے یہاں کے لوگوں کی زبان بھی سیکھ لی ہے۔"

"اوہ ہاں... اچھا۔" رداء یوسف سے اُس سے زیادہ نہ پوچھ سکی، اُسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا، بہت کچھ....

کار سفر کرتی رہی اور یوسف کے اشارے پر وہ ایک عمدہ عمارت کے سامنے رُک گئی۔ یوسف نے نیچے اُتر کر رداء کی طرف کا دروازہ کھولا اور وہ نیچے اُتر آئی۔ شدید تجسس اور ذہنی بوجھ کا شکار تھی۔ دوسری منزل کے ایک فلیٹ کے سامنے رُک کر یوسف نے بیل بجائی اور چند لمحات کے بعد میرنا نے دروازہ کھول دیا۔

رداء نے ایک لمحے میں اُسے بھی پہچان لیا تھا میرنا پہلے سے زیادہ شگفتہ نظر آ رہی تھی۔ اُس نے سادہ سا لباس پہنا ہُوا تھا۔ یوسف کے ساتھ رداء کو دیکھ کر وہ بھی بھونچکی رہ گئی اور پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ یوسف نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"پہچانیں ممی کون ہیں یہ؟"

"اوہ، یہ... یہ..." میرنا کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"آنٹی! میرا نام رداء ہے۔"

"ہاں، میں پہچان گئی، میں پہچان گئی۔" میرنا نے کہا اور پھر آگے بڑھ کر رداء کے دونوں رُخسار چُومے اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر گھسیٹ لیا۔

"تم... تم یہاں ہو، یوسف کو کیسے مل گئیں؟" اُس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور رداء چند قدم آگے بڑھ آئی۔

میرنا نے دروازہ بند کیا اور رداء کا ہاتھ پکڑے ہُوئے اندر چل پڑی۔

"یوسف! یہ تمہیں کہاں سے مل گئیں؟"

"سڑک پر ممی یہ اپنی کار میں جا رہی تھیں۔"

"کیا تم یہیں رہتی ہو بیٹی؟" میرنا نے سوال کیا اور اُسے لیے ہُوئے ڈرائنگ رُوم میں داخل ہو گئی۔ نہایت سادگی لیکن مغربی طرز پر آراستہ ڈرائنگ رُوم کے ایک صوفے پر بٹھا کر اس نے رداء کو بغور دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ "تم یہیں رہتی ہو کیا؟"

"ہاں۔" رداء نے جواب دیا۔

"میں تم لوگوں کو کبھی نہیں بھول سکی، کبھی نہیں۔" میرنا بھاری لہجے میں بولی اور رداء کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی۔ خود میرنا کی کیفیت بھی عجیب ہو گئی تھی۔ اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے، پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"ایک بات پوچھوں... بُرا تو نہیں مانو گی؟"

"ہاں، پوچھیے۔"

"تمہاری ممی کہاں ہیں؟"

"ان کا انتقال ہو گیا۔"

"اوہ۔" میرنا نے سسکی سی لی۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔ یوسف باہر نکل گیا۔ میرنا عجیب نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے کہا۔

"ثاقب جانتا ہے کہ تم یہاں رہتی ہو؟" رداء نے چونک کر اُسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"اس سے پہلے بھی کچھ سوال پوچھنا چاہتی ہُوں۔"

"پوچھو۔"

"آپ یہاں کب آئیں؟"

"پانچ ماہ قبل۔"

"کس طرح؟"

"ثاقب نے مجھے بُلایا تھا۔ اُس نے مقامی حکومت کے ایک نمائندے کے ذریعے تمام کارروائیاں خود کی تھیں اور مجھے یہاں بُلایا تھا۔ مجھے ضمانت دی گئی تھی کہ یہاں مجھے تمام حقوق دیے جائیں گے۔ ثاقب نے خط لکھا تھا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے اور مجھے اُس سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔ اُس کا کہنا دُرست تھا، اب وہ ایک اچھا انسان بن گیا ہے، اُس کی السر کی بیماری بھی دُرست ہو گئی ہے اور وہ تندرست ہے۔ ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کرتا ہے، ہم نے یہ فلیٹ خرید لیا ہے اور میں خود بھی نوکری کر رہی ہُوں۔ یوسف کو کالج میں داخلہ دلا دیا گیا ہے، ثاقب نے مجھے بتایا کہ تمہاری ممی مر چُکی ہیں اور تم نے لاہور چھوڑ دیا ہے، میں نے اُس سے بارہا کہا تھا کہ تمہیں تلاش کر کے یہاں لے آئے، میں تمہیں اپنی بیٹی کی مانند رکھوں گی اور اُس نے کہا کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ پانچ ماہ گزر چکے ہیں ثاقب بہت بدل گیا ہے، میں نے اُس کے اندر اب کوئی خرابی نہیں دیکھی مگر... اُس کا ماضی اب بھی مجھے شک میں مبتلا کر دیتا ہے اور میں سوچتی رہ جاتی ہُوں کہ وہ کون سی بات سچ کہہ رہا ہے کون سی جھوٹ۔" میرنا نے کہا۔

رداء خیالات میں کھو گئی۔ اُسے ثاقب یاد آیا، اس کے ساتھ ہی خیر دین یاد آیا، جب سے خیر دین نے اُس سے کہا تھا کہ اب ثاقب اُس کا پیچھا نہیں کرے گا، اس وقت کے بعد سے ثاقب دوبارہ اُسے نظر نہیں آیا تھا اور اب یہ سب کچھ...

میرنا بولی۔ "بعد میں مجھے کچھ اور حقیقت معلوم ہُوئی۔"

"کیا؟" رداء بے اختیار بول پڑی۔

"ثاقب کو اُس کا ایک فرشتہ صفت دوست مل گیا تھا۔ اس دوست کو جب ثاقب کی تمام تفصیلات معلوم ہُوئیں تو پہلے اُس نے ثاقب کا بہترین علاج کرایا، پھر اُس کا برین واش کیا اور اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مجھے یہاں بُلا کر اپنے بیٹے کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرے، اُس نے ثاقب کو نوکری بھی دلائی اور اُس کی ہر طرح نگہداشت کی۔ اُس نے شاید ثاقب کے ساتھ کچھ سختی بھی کی کیونکہ ثاقب اُس سے بہت گھبراتا ہے۔ ویسے اُس نے جو کچھ کیا وہ واقعی فرشتوں کا کام ہے، جب بھی وہ کبھی کبھی میرے پاس آ کر ثاقب کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے اور ثاقب کا چہرہ اُسے دیکھ کر فق ہو جاتا ہے، میں نے اتنا شاندار پولیس آفیسر نہیں دیکھا۔"

رداء خاموشی سے یہ سب کچھ سُن رہی تھی اور اُس کا ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا لیکن پولیس آفیسر کا نام سُن کر وہ بُری طرح چونک پڑی۔ اُس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"پولیس آفیسر؟"

"ہاں، ثاقب کا وہ دوست محکمہ پولیس کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔"

"کیا نام ہے اُس کا؟"

"مرزا تصور بیگ۔" میرنا نے جواب دیا۔

رَدا سکتے کے عالم میں رہ گئی تھی۔ اُس کا ذہن چکرا گیا تھا۔ ماضی کے کچھ واقعات اُس کے ذہن میں تیز رفتار ریل کی طرح چل پڑے تھے۔ ثاقب کے بارے میں اُس نے خیر دین کو بتایا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ اب ثاقب اُسے پریشان نہیں کرے گا۔ اور اُس کے بعد واقعی ثاقب کبھی اُس کے راستے میں نہیں آیا تھا۔ تصور بیگ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے ثاقب کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ اُسے جیل بھیج سکتا تھا لیکن اُس نے انسان ہونے کا ثبوت دیا تھا وہ کام جو ثاقب کے لئے کوئی نہ کر سکا تھا تصور بیگ نے کر دکھایا تھا۔ اُس نے اُسے انسان بنا دیا تھا۔ اِتنا انسان کہ اب میرینا اس کے ساتھ تھی۔ انسانی رشتوں کو مدِ نگاہ رکھتے ہُوئے رَدا کو اس وقت میرینا سے کوئی حسد نہیں ہُوا تھا۔ وہ بھی عورت تھی اور ایک مرد کے ہاتھوں اُس نے دھوکہ کھایا تھا۔ حنا تو اب اِس دُنیا میں ہی نہ تھی۔ لیکن میرینا کو ایک اچھی زندگی مل گئی تھی۔ اور یہ بھی تصور بیگ کا ایک احسان تھا۔ اِس سے زیادہ اچھا کام اور کون سا کیا جا سکتا تھا۔ کِسی کو تباہ کر دینا تو دُنیا کا سب سے آسان کام ہے لیکن کِسی کو بنا دینا ہی انسانیت کا کارنامہ ہے۔

میرینا نے کہا: "ایک بات کہوں رَدا؟"

"جی آنٹی!"

"تمہیں مجھے دیکھ کر دُکھ تو نہیں ہُوا؟"

"دُکھ؟"

"ہاں! تمہیں تمہاری ماں ضرور یاد آئی ہو گی۔"

"ہاں آنٹی! مجھے امی یاد آئی ہیں۔"

"لیکن رَدا! اِس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ میں اُن حالات سے ناواقف تھی۔"

"میں جانتی ہوں آنٹی"
"تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"
"بالکل نہیں آنٹی۔ بلکہ میں خوش ہوں کہ آپ کو ایک پُرسکون زندگی مِل گئی"
"ثاقب اب واقعی ایک اچھا انسان بن گیا ہے۔ مجھے اِس کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھو رِدا یُوسف کو اُس کا باپ چاہئے تھا۔ اُسے وہ مِل گیا۔ میری ایک اور خواہش ہے"
"کیا؟"
"اگر تم بھی ہمارے ساتھ رہو تو کیا حرج ہے؟"
"یہ مناسب نہ ہوگا آنٹی!"
"میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھیں شکایت کا موقعہ نہ دُوں گی تمھیں اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گی۔ اور ہاں۔ تمہارا ایک بھائی بھی تو ہے"
"دو آنٹی" رِدا نے خود کو سنبھال کر کہا۔
"دو؟"
"ہاں یُوسف بھی تو میرا بھائی ہے"
"بالکل ہے۔ دوسرے بھائی کا کیا نام ہے؟"
"تیمور!"
"مجھے اُس سے نہیں ملاؤگی؟"
"ضرور ملاؤں گی"
"تم میری پیش کش سے کیوں اِنکار کر رہی ہو؟"
"سچ بولوں آنٹی!"
"ہاں سچ بولو"
"میں شاید برداشت نہ کرسکوں گی۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو ایڈجسٹ کیا ہے۔ یہاں رہ کر مجھے اپنی ماں یاد آئے گی جس نے ایک غلطی کی تھی۔ زندگی کی صرف ایک غلطی۔ اور اُس غلطی نے بالآخر اُسے موت کے دہانے تک پہنچادیا" رِدا سِسکی لے کر بولی۔
میرینا گردن جُھکا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ پھر اُس نے کہا "تم درست کہتی ہو"
"میں آپ کی خوشی سے خوش ہوں۔ آپ سے ملتی رہوں گی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتادیجئے گا"
"تم کہاں رہتی ہو؟"
"یہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے"
"کیوں؟"
"میں ابھی اِن واقعات کے بارے میں سوچوں گی۔ اِن پر غور کروں گی۔ فیصلہ کروں گی کہ مجھے آئندہ کیا کرنا ہے؟ اور اِس کے بعد تعین کروں گی۔ مجھے اِس صاف گوئی کے لئے معاف کیجئے گا"
"نہیں۔ میں جانتی ہوں تمہاری کیفیت کو۔ چائے پلاؤں"
"تکلف کی ضرورت نہیں"
"میں نے تکلفاً نہیں پُوچھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہُوں کہ تمہارے ذہن پر کیا اثرات مرتب ہُوئے ہیں؟"
"پلا دیجئے" رِدا نے کہا۔
"شکریہ" میرینا نے کہا اور تھوڑی دیر کے لئے اجازت لے کر چلی گئی۔ یوسف رِدا کے پاس تھا۔
"سِسٹر! میں آپ کا بھائی ہُوں نا؟"
"ہاں! کیوں؟"
"بس۔ یہاں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ میرا دِل چاہتا ہے۔ جیسے لوگ اپنے بہن بھائیوں سے مِلتے ہیں۔ میرا بھی کوئی ہو۔ میں بہت اکیلا ہُوں سِسٹر آپ... آپ..." وہ خاموش ہوگیا۔ اور رِدا کے دِل میں فِکر بیدار ہوگئی۔ اُس نے یوسف کو قریب گھسیٹ کر کہا۔
"تم میرے بھائی ہو یوسف۔ میں کِسی سے مِلوں یا نہ مِلوں تم سے ضرور مِلوں گی۔ سمجھے"
"تھینک یو سِسٹر۔ اور وہ ننھا بھائی؟"
"اُس سے بھی تمھیں ملاؤں گی"
"بہت چھوٹا ہے؟"
"ہاں! ابھی بہت چھوٹا ہے"
"مجھے چھوٹے بچّے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ اُسے ضرور مجھ سے ملائیے سِسٹر میں اُس کے لئے ایک گِفٹ دینا چاہتا ہُوں"
"ابھی رہنے دو۔ جب اُس سے مِلو تو دے دینا"
"آپ اُسے میری طرف سے یہ گِفٹ دے دیجئے۔ جب اُس سے مِلوں گا تو دوسرا گِفٹ دُوں گا" اُسی وقت میرینا آگئی یوسف کو رِدا سے لپٹا دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی تھی اور پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ اُس نے رُندھی ہُوئی آواز میں کہا۔
"تھینک یو رِدا۔ تھینک یو۔ ہم ماں بیٹے بے قصُور ہیں، یقین کرو ہم دونوں بے قصُور ہیں"
"آپ مسلسل یہ بات کیوں کہہ رہی ہیں آنٹی؟"
"تمھیں دیکھ کر ایک جُرم کا سا احساس ہوتا ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے میں نے تم سے۔ تمہاری ممی سے کچھ چھین لیا ہے۔ رِدا! یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اگر تمہاری ممی زندہ ہوتیں تو ثاقب میرا نہیں اُن کا ہوتا۔ اور رِدا اگر ایسا ہوتا تو خُدا کی قسم میں اُن کے راستے سے ہٹ

جاتی۔ اُن کا حق پہلا تھا"
"تقدیر کا یہی فیصلہ تھا آنٹی۔ شاید وہ آپ کے لئے ہی اِس دُنیا کو چھوڑ گئیں" رِدا سِسکی بھرے لہجے میں بولی۔
"مجھے اُن کی جگہ دے دو رِدا۔ تمہاری خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی" یوسف اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ میرینا چند لمحات آنسو بہاتی رہی پھر چائے لینے چلی گئی۔
یوسف ٹافیوں کا ایک پیکٹ لے کر آیا تھا جسے اُس نے ریپ کیا تھا اور اُس پر لکھا تھا "میرے چھوٹے بھائی کے لئے" رِدا نے پیکٹ لے کر پرس میں رکھ لیا تھا۔
چائے پینے کے بعد رِدا نے کہا "اب مجھے اجازت دیں آنٹی"
"کہاں جاؤگی؟"
"نوکری کرتی ہُوں" رِدا نے کہا۔ اور میرینا نے ایک ٹھنڈی سانس لی، پھر بولی۔
"بہت عاجزی کے ساتھ ایک بات کہنا چاہتی ہُوں رِدا"
"جی ضرور کہیئے"
"تمھیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو۔ بے دھڑک مجھے بتا دینا میں جس قابل بھی ہُوں لیکن... لیکن..."
"ضرور آنٹی! آپ بس دِل میلا نہ کریں۔ میرے آخری الفاظ یہ ہیں کہ مجھے آپ سے ذرّہ بھر شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ سارے حالات میں جانتی ہُوں۔ آپ کے پاس آتی رہا کروں گی۔ اور یوسف! تم سے بھی بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی"
"میں آپ کا انتظار کروں گا سِسٹر"
"میں ضرور آؤں گی۔ اچھا خُدا حافظ" دونوں اُسے دروازے تک چھوڑنے آئے تھے اور پھر رِدا ہاتھ ہلا کر چل پڑی تھی۔
ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ رِدا کے ذہن پر سنّاٹا چھایا ہُوا تھا، بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی اِس بارے میں مگر دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اُسی کیفیت میں دفتر آگئی۔ یہاں آکر معلوم ہُوا کہ احسان احمد صاحب کسی کام سے چلے گئے ہیں اُس کے لئے کچھ ضروری ہدایات چھوڑ گئے تھے۔ چند فائل اُس کے سپُرد کر دیئے گئے۔ اُس نے خود کو اُن فائلوں میں مصرُوف کرلیا اور ذہن آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن رہ رہ کر وہی خیالات آجاتے تھے۔ میرینا خوش تھی، ثاقب ٹھیک ہوگیا تھا۔ یوسف کو اُس کا باپ مِل گیا تھا اور... اور!
پُورا دن اِسی طرح گزر گیا تھا۔ اور اُس نے بہت سے فیصلے کئے تھے۔

تمہیں ملیں گے
جن کی تحریریں ہمارے معاشرے سے قریب ترین ہوتی ہیں۔ اِس تحریر میں اُنھوں نے ایک انتہائی نازک موضوع پر قلم اُٹھایا ہے جس کا ہماری آج کل کی زندگی کیسا تھ بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک لڑکی لڑکا بن کر بھی نامکمل، اَدھوری۔ آخر کیوں؟

اَدھورا اَدھوری

تبدیلیٔ جنس کی ایک انوکھی کہانی

*

وسیم جمال معمُولی آدمی نہیں تھا۔ بارسُوخ بھی تھا اور دولت مند بھی۔ سب سے بڑا رسُوخ دولت ہی ہوتی ہے۔ لیکن اُس پر جو گزُری تھی ناقابلِ یقین تھی۔ انسپکٹر مظہر شیخ کو جس انداز میں ہدایات مِلی تھیں اُسے اُنھیں پہ عمل کرنا تھا کیونکہ تصور بیگ کے بارے میں بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ تصور بیگ نرم خلیق اور ملنسار آدمی تھا۔ لیکن اپنے معمُولات میں جس قدر سخت تھا اِس کے تجربات بھی بارہا ہوچکے تھے۔ چنانچہ وہ کسی اجازت کے بغیر وسیم جمال کے دفتر پہنچا تھا۔
چپراسی نے جھجکتے ہُوئے کہا "صاحب! کچھ لوگ صاحب کے پاس بیٹھے ہُوئے ہیں"
"ہٹو سامنے سے" مظہر شیخ نے کہا، پورا دفتر پولیس فورس کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ مظہر شیخ اندر داخل ہوگیا۔ اور وسیم جمال چونک کر دیکھنے لگا۔
"کیا بات ہے انسپکٹر؟"
"آپ وسیم جمال ہیں"
"ہاں، مگر تم نے چپراسی سے بات نہیں کی تھی کیا، مجھے تمہارے آنے کی اطلاع نہیں ملی"
"آپ کی گرفتاری کی ہدایت ملی ہے مسٹر وسیم جمال"
"کیا بکواس ہے؟" وسیم جمال جھلّا کر بولا۔ اور انسپکٹر نے ہتھکڑیاں آگے بڑھا دیں۔
"ہاتھ آگے کریں"
"تمہارا دماغ خراب ہُوا ہے کیا؟ جانتے ہو کس سے مخاطب ہو؟"

"آپ وسیم جمال ہو نا؟"

"وارنٹ دکھاؤ۔"

"بغیر وارنٹ گرفتاری ہے۔"

"نوکری سے تنگ آگئے ہو کیا؟ جاؤ وارنٹ لاؤ۔ میرے پاس کچھ معزز لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ورنہ مزا چکھا دیتا۔" وسیم جمال خونخوار لہجے میں بولا۔

"مجھے ہدایت ملی ہے کہ آپ کو ہتھکڑیاں ڈال کر لے آؤں۔ آپ اِس سلسلے میں مجھ سے تعاون کریں گے۔" مظہر شیخ نے کہا۔

"گیٹ آؤٹ۔" وسیم جمال آپے سے باہر ہو گیا اور مظہر شیخ کے ساتھ آئے ہوئے پولیس والوں نے اُس پر رائفلیں تان لیں۔ مظہر شیخ نے آگے بڑھ کر وسیم جمال کا گریبان پکڑا اور اُسے میز کے پیچھے سے کھینچ لیا۔ پھر اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔

"زندہ دفن کرا دوں گا انسپکٹر۔ اِس بدتمیزی کا وہ نتیجہ نکلے گا کہ تم سوچ بھی نہ سکو گے۔"

"میں اپنے وکیل کو فون کرنا چاہتا ہوں۔"

"لاک اپ چل کر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ آگے بڑھیئے۔" مظہر شیخ نے اُسے دوسرا دھکا دیا اور پھر وہ اُسے اُسی طرح دھکے دیتا ہوا اُس کے آفس سے باہر نکال لایا تھا۔ وسیم جمال شدتِ جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا مگر بے بس تھا۔ راستے بھر وہ پولیس انسپکٹر کو دھمکیاں دیتا رہا تھا اور مظہر شیخ ہنستا رہا تھا۔

ہیڈ کوارٹر لا کر اُسے لاک اَپ میں دھکیل دیا گیا لیکن دفتر کے افراد نے شاید اُس کے وکیل قادر خان کو اطلاع دے دی تھی۔ کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد ہی قادر خان پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تھا۔ اور اُنہی سے معلومات حاصل کر کے انسپکٹر مظہر شیخ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اُدھر مظہر شیخ نے ہیڈ کوارٹر میں تصوّر بیگ کو مکمل تفصیل فراہم کر دی تھی اور تصوّر بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"شکریہ مظہر! تمھارے اِس عمل کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔"

"میرے خیال میں اِس کے سلسلے میں فوری کارروائی ہو گی جناب۔ یہ میرا اندازہ ہے۔"

"اِس کے تمام انتظامات مکمل کر لئے ہیں فکر مت کرو۔ جو بھی تم سے ملے اُسے میرے پاس بھیج دینا۔"

"یس سر!" مظہر شیخ نے کہا۔ درحقیقت اِس کارروائی میں تصوّر بیگ کے دِل کی آگ بھی شامل تھی۔ لاہور میں رِدا نے کہا تھا کہ اُس کے دِل میں کسی اور کا بسیرا ہے اور اِن الفاظ پر تصوّر بیگ مُرجھا گیا تھا کیونکہ اِس کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی پھر اُس نے وسیم جمال کو رِدا کے ساتھ ساحل پر دیکھا تھا اور اُس کے دِل میں یہ خیال گزرا تھا کہ شاید یہی وہ شخص ہے۔ اُس کے بعد وسیم جمال نے اُس سے ملاقات کی تھی تو وہ اُس کے الفاظ پر اُلجھ گیا تھا۔ اختر نے جب یہ انکشاف کیا کہ وسیم جمال زبردستی پر اُتر آیا ہے تو تصوّر بیگ کے دِل میں ایک آگ روشن ہو گئی تھی اُس نے تو اُس وقت بھی اپنے مخصوص انداز میں رشید کا دماغ درست کر دیا تھا جب وہ ساحل پر رِدا کو پریشان کرنا چاہتا تھا اور چونکہ اب تو صورتِ حال ہی دوسری تھی چنانچہ اُس نے ایک بہترین منصوبہ تیار کر لیا تھا اور پوری طرح مطمئن تھا۔

وکیل نادر خان مظہر شیخ کے سامنے پہنچ گیا۔ "آپ انسپکٹر مظہر شیخ ہیں؟"

"جی ہاں وکیل صاحب! بڑی جلدی بھول گئے آپ مجھے۔ ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔"

"شاید... شاید... اِس وقت میں وسیم جمال کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔"

"اچھا۔ اچھا ہاں، فرمائیے۔"

"کس جُرم میں گرفتار کیا گیا ہے اُسے؟"

"اِس کی خبر تو اعلیٰ حکام کو ہو گی۔"

"وارنٹ ملے تھے آپ کو؟"

"افسر کے الفاظ ہی وارنٹ ہوتے ہیں نادر صاحب۔"

"قانون کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"قانون قانون ہے۔"

"آپ کو وسیم جمال کی حیثیت کا اندازہ ہے؟"

"ہمیں اِتنی فرصت کہاں وکیل صاحب۔"

"میرا خیال ہے اب مل جائے گی۔ آپ مجھے وہ نام بتائیے جس کے حکم پر آپ نے یہ گرفتاری کی ہے؟"

"مرزا تصوّر بیگ۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"دائیں ہاتھ کے آخری کمرے میں چلے جائیے۔" مظہر شیخ نے کہا اور نادر خان ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ پھر مرزا تصوّر بیگ تک رسائی حاصل کرنا مشکل نہ ہوا تھا۔

"جناب وکیل صاحب؟"

"وسیم جمال کو آپ کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وارنٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔ اچھا۔ ضرور۔" تصوّر بیگ نے کہا اور وارنٹ نکال کر وکیل صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

"جُرم؟"

"قتل۔"

"کس کا؟"

"ممتاز شاہ کا قتل۔ شاید اخبارات نظر سے گزرے ہوں آپ کے۔"

"اِس قتل سے وسیم جمال کا کیا تعلق ہے؟"

"کچھ ہے وکیل صاحب! بلا وجہ تو ہم کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔"

"حکومت مرزا صاحب۔" نادر خان نے کرخت لہجے میں کہا۔

"ارے ارے وکیل صاحب آپ نے تو پولیس ہیڈ کوارٹر ہی میں عدالت لگا ڈالی... بھلا یہاں کیا ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ عدالت میں بات کیجئے گا۔" تصوّر بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور نادر خان تصوّر بیگ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"آپ نے شاید وسیم جمال کی حیثیت کا اندازہ نہیں لگایا ہے مرزا صاحب! آپ کو اِس اقدام پر افسوس کرنا پڑے گا۔"

"تو افسوس کر لیں گے نادر خان صاحب۔" تصوّر نے کہا۔

"آپ شاید اِسے مذاق سمجھ رہے ہیں۔"

"آپ کے الفاظ تو مذاق نہیں ہیں لیکن انداز بڑا مزاحیہ ہے۔ کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"ضمانت۔ فوری ضمانت اور یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ آخر آپ نے وسیم جمال کو ممتاز شاہ کے قتل کے کیس میں کیسے ملوّث کیا ہے؟"

"کیا ضمانت صرف آپ کے تشریف لانے سے ہو سکتی ہے۔ کاغذات تیار کر کے لائے ہیں آپ؟"

"تصوّر بیگ صاحب سب کچھ ہو جائے گا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے کس غلط فہمی کی بنیاد پر یہ قدم اُٹھایا ہے، دعوے سے کہتا ہوں کہ ممتاز شاہ کے کیس میں وسیم جمال کا ذرّہ برابر ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ اِس کے علاوہ اگر ایسی کوئی بات سامنے آ بھی گئی تھی تو گفت و شنید کی جا سکتی تھی۔ وسیم جمال جیسے اعلیٰ پائے کے انسان پر ہاتھ ڈالنا دانش مندی کی نشانی تو نہیں ہے۔ مگر کیا کیا جائے آپ جیسے نوجوانوں کو جو پہلے تو بے تکے قدم اُٹھا بیٹھتے ہیں۔ اور اُس کے بعد قانون کی بے بسی کا رونا رونے لگتے ہیں۔ بات یہ ہے تصوّر بیگ صاحب کہ ہر شخص کا اپنا ایک معیار ہوتا ہے اور اُس معیار کا خیال رکھنا آپ لوگوں کا کام بھی ہے۔ اب اِس کے نتیجے میں آپ کو جن مشکلات سے گزرنا پڑے گا اُن کا آپ واقعی تصوّر نہیں کر سکتے۔"

"بات دراصل یہ ہے نادر خان صاحب کہ ہم ابھی اپنی اِس ملازمت کی ابتدائی منزل میں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں پختگی حاصل ہو اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم تجربات کریں۔ آپ جیسے بزرگ ہی تو ہمارے لئے راستے روشن کرتے ہیں آپ دیکھیں گے یہ کہ وسیم جمال جیسے آدمی پر ہاتھ ڈالنے کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا تجربہ ہو گا اور اُس کے بعد آئندہ احتیاط کر لیں گے۔"

"چرب زبانی کر رہے ہیں آپ۔ میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں کہ اب سے چند گھنٹے کے اندر اندر وسیم جمال کو آپ کو چھوڑنا پڑ جائے گا۔"

"یہ چیلنج کچھ ہضم نہیں ہو رہا وکیل صاحب۔"

"ہو جائے گا۔ ہو جائے گا۔ میں ذرا وہ ثبوت دیکھنا چاہتا ہوں جس کے تحت آپ نے وسیم جمال کو گرفتار کیا ہے، جہاں تک اِن وارنٹس کا تعلق ہے تو یہ ابھی تھوڑی دیر میں منسوخ ہو جائیں گے۔"

"تب تو میرے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ میں وہ ثبوت آپ کو دکھاؤں۔ آپ وارنٹ سے ابتدا کیجئے۔ ثبوت کا معاملہ ابھی چھوڑیئے۔ میں کوشش کروں گا کہ وسیم جمال کی ضمانت نہ ہو سکے۔"

نادر خان غصّے کے عالم میں کھڑا ہو گیا تھا پھر اُس نے ایک نگاہ تصوّر بیگ کو دیکھا اور اُس کے بعد وہاں سے باہر نکل گیا۔

تصوّر بیگ اِن تمام کارروائیوں کے لئے تیار تھا اور اُس نے اپنے طور پر بھی بہت سے مضبوط اقدامات کر لئے تھے۔ اپنے اختیارات سے فائدہ اُٹھانے کا یہ اُس کا پہلا موقعہ تھا لیکن جو اصل مسئلہ تھا اُسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ رِدا کی توہین کی گئی تھی، اور شاید رِدا اُس کی دِل کی گہرائیوں میں اِتنی نیچے اُتری ہوئی تھی کہ وہ رِدا کی توہین کرنے والے کو معاف کرنے کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا چنانچہ وہ تیار ہو گیا۔ مظہر شیخ تھوڑی دیر کے بعد آیا تھا اور اُس نے بتایا تھا کہ نادر خان غصّے کے عالم میں دھمکیاں دیتا ہوا باہر نکل گیا ہے۔ تصوّر بیگ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم فکر مت کرو آج میں رات تک یہیں ہوں اور اُس کی کارروائیوں کا انتظار کر رہا ہوں ویسے تمھاری ڈیوٹی بھی میرے ساتھ رہنی چاہیئے کیونکہ امکانات ہیں اِس بات کے کہ وسیم جمال کو بار بار

گرفتار کرنا پڑسکتا ہے؟" مظہر شیخ نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی تھی اور پھر کہا تھا:

"ایک سوال کر... [illegible] سر؟"

"ہوں؟"

"وسیم جمال نے کیا کوئی بدتمیزی کر ڈالی ہے؟"

"ذاتی سوال ہے یہ مت پوچھو مظہر۔"

"سوری سر۔ اپنا سوال واپس لیتا ہوں۔"

"بے حد شکریہ" تصور بیگ نے جواب دیا اور پھر درحقیقت وہ انتظار کرتا رہا تھا۔ ٹھیک دو گھنٹے کے بعد نادر خاں ایک بار پھر پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا اور تصور بیگ تک پہنچ گیا۔ تصور بیگ نے مسکراتے ہوئے اُس کا استقبال کیا تھا۔

"ہیلو خان صاحب! میں آپ کی دوبارہ واپسی پر حیران ہوں۔"

"یہ کاغذات ملاحظہ فرما لیجئے۔ وارنٹ منسوخ کر دیا گیا ہے، اور فوری طور پر حکم دیا گیا ہے کہ وسیم جمال کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے یہ حکم نامہ موجود ہے۔"

"اوہ۔ خوب۔ خوب" تصور بیگ نے وہ کاغذات دیکھے اور اُس کے بعد مسکراتا ہوا بولا۔

"آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔ قتل کے ایک ملزم کو اِس طرح آزاد کرا لینا آپ ہی کا کام ہے نادر خاں صاحب۔"

"ہاں! یہ کام میرے لئے واقعی مشکل نہیں تھا۔ لیکن میں پھر کہوں گا مسٹر تصور بیگ کہ آپ نے اپنے لئے واقعی بڑی مصیبتیں خرید لیں ہیں۔ براہِ کرم کسی کو میرے ساتھ بھیجئے اور وسیم جمال کو لاک اَپ سے رہا کرا دیجئے۔"

"ضرور" تصور بیگ نے سامنے رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ اور اُس کے بعد انسپکٹر مظہر شیخ کو طلب کر لیا۔ انسپکٹر مظہر شیخ فوراً ہی پہنچ گیا تھا۔

"نادر خاں صاحب اِن کاغذات کی رُو سے اِس بات کے حق دار ہیں کہ وسیم جمال کو رہا کر دیا جائے یہ کام انہوں نے یہیں کرا لیا ہے۔ جاؤ وسیم جمال کو رہا کر دو" مظہر شیخ کا مُنہ ایک لمحے کے لئے کھلا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ متحیر سا نادر صاحب کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ نادر خاں لاک اَپ پر پہنچا وسیم جمال غصّے سے سُرخ چہرہ لئے لاک اَپ میں موجود تھا۔ نادر خاں کو دیکھتے ہی اُس پر برس پڑا۔

"کیا آپ کو اِتنی دیر میں میرے بارے میں اطلاع ملی خاں صاحب۔ یہ آپ کی ذمّہ داری ہے۔"

"نہیں۔ وسیم صاحب مجھے تو فوراً ہی اطلاع مل گئی تھی۔ لیکن یہاں ایک مقامی آفیسر آپ کے سلسلے میں کچھ جذباتی ہو گئے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ آپ کو ضمانت پر رہا کرانا ممکن نہیں ہو گا اور میں اِسی ناممکن کو ممکن بنانے کے لئے نکل گیا تھا اور ممکن بنا کر ہی واپس آیا ہوں۔"

"کون آفیسر ہے وہ؟" وسیم جمال نے سوال کیا۔

"مرزا تصور بیگ۔"

"میں اُس شخص کو نہیں جانتا لیکن اُس نے وارنٹ کے بغیر مجھے گرفتار کیسے کیا اور اِس گرفتاری کا جواز کیا ہے؟"

"معزز آفیسر اعلیٰ نے آپ کو ایک قتل کے کیس میں گرفتار کیا ہے۔ ممتاز شاہ نامی کسی شخص کے قتل کے الزام میں۔"

"میں۔۔۔ میں۔" وسیم جمال غصّے سے جُملہ پُورا نہ کر سکا۔ مظہر شیخ نے آگے بڑھ کر لاک اَپ کا تالا کھول دیا تھا۔ وسیم جمال نے اُسے گھورتے ہُوئے کہا۔

"اور تم سے۔۔۔ تم سے میں نے جو کچھ کہا ہے پولیس انسپکٹر اُسے پُورا کرنا میرا ایمان ہے۔ مجھے جو وقت اِس لاک اَپ میں گزارنا پڑا ہے اُس کے ایک ایک لمحے کا حساب تم سے اور تمہارے اُس تصور بیگ سے لُوں گا۔ نادر خاں صاحب میں اُس شخص سے مِل کر یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ اُسے یہ بتا کر کہ اُس نے اپنی زندگی کا کتنا غلط کارنامہ سرانجام دیا ہے" وسیم جمال نے کہا اُسی وقت سامنے سے تصور بیگ آتا ہُوا نظر آیا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی نادر خاں نے آہستہ سے کہا۔

"یہی ہے مرزا تصور بیگ" وسیم جمال نے اُسے دیکھا پولیس کی وردی میں ایک لمحے میں تو وہ تصور بیگ کو نہیں پہچان سکا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ۔۔۔ یہ" اِتنی دیر میں تصور بیگ، وسیم جمال کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

"تم۔۔۔ تم پہلے مُجھ سے ملاقات کر چکے ہو نا۔ وہی ہو نا تم جس نے، جس نے۔۔۔"

"جی وسیم جمال صاحب خادم وہی ہے۔"

"لل۔۔۔ لیکن تم نے، تم نے اُس دِن مُجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ تم ایک معمولی سی ملازمت کرتے ہو۔"

"اب جو کچھ بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ ملازمت تو کرتا ہوں وسیم جمال صاحب اِس میں جھوٹ کیا تھا۔"

"اوہ تم، تم۔ میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔"

"ابھی نہیں دیکھ رہے آپ مجھے۔ بھئی نادر خاں صاحب غصّے میں آدمی کتنے بے ربط الفاظ بولنے لگتا ہے۔ بہرحال وسیم جمال صاحب آپ کو ممتاز شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا حالانکہ اِس سلسلے میں ابھی تفتیش مکمل نہیں ہُوئی لیکن ہمارے قابل وکیل نادر خاں صاحب نے آپ کی ضمانت کرا لی اور کمال کر دِکھایا۔ اُن کی نوکری آپ کے ہاں کچی۔ لیکن اب اِسے کیا کہا جائے کہ آپ کو ایک اور سلسلے میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں۔"

نادر خاں کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا تھا اُس نے متحیرانہ انداز میں تصور بیگ کو دیکھا اور بولا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مرزا صاحب؟"

"یہ کاغذات موجود ہیں۔ میں آپ کو وارنٹ بھی پیش کئے دیتا ہوں" تصور بیگ نے کہا اور ایک اور وارنٹ نکال کر نادر خاں کے سامنے کر دیا۔ نادر خاں کی پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا۔ اُس نے متوحش نِگاہوں سے تصور بیگ کو دیکھا اور پھر وسیم جمال کو، تصور بیگ نے مظہر شیخ کو اشارہ کیا اور مظہر شیخ نے آگے بڑھ کر وسیم جمال کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں اور وسیم جمال اِس بار بھی پریشان ہو گیا تھا۔ نادر خاں نے آہستہ سے کہا۔

"مرزا صاحب! یہ تو، یہ تو بہت بڑی زیادتی ہے۔"

"اب آپ یُوں کیجئے نادر خاں صاحب! یہ وارنٹ لے کر چلے جائیے۔ میں کیس نمبر بھی دے دیتا ہُوں آپ کو۔ دو گھنٹے کے بعد میں آپ کو اپنے آفس ہی میں ملوں گا ضمانت کرا لیجئے گا۔"

"لل۔۔۔ لیکن، لیکن۔۔" نادر خاں نے بوکھلائے ہُوئے انداز میں کہا۔

"وسیم جمال کو لاک اَپ میں ڈال دو" تصور بیگ نے مظہر شیخ سے کہا اور مظہر شیخ وسیم جمال کو دوبارہ گھسیٹتا ہُوا لاک اَپ میں لے گیا۔ اندر لے جا کر اُس کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ وسیم جمال خاموشی سے ایک کونے میں جا بیٹھا اور نادر خاں پریشان نِگاہوں سے اُن وارنٹس کو دیکھتا رہا جو نئے نئے اُس کے حوالے کئے گئے تھے۔ پھر اُس نے گردن جھٹکتے ہُوئے کہا۔

"تصور بیگ صاحب! آپ کا کچھ وقت لینا چاہتا ہُوں۔"

"تشریف لائیے میرے آفس میں۔ چائے پیجئے گا میرے ساتھ" نادر خاں نے پریشان نِگاہوں سے وسیم جمال کو دیکھا اور پھر تصور بیگ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

"قصّہ کیا ہے تصور بیگ صاحب، کوئی پرخاش ہو گئی ہے آپ کو وسیم جمال سے؟"

"جی نہیں! میں صرف قانون کی ہدایت پر عمل درآمد کر رہا ہوں۔ اور نادر خاں صاحب اِس سلسلے میں آپ کسی بھی طور وسیم جمال کی ضمانت نہیں کرا سکیں گے۔ کیونکہ معاملہ انٹرپول کا ہے۔ انٹرپول اِس سلسلے میں شواہد جمع کر رہا ہے اور جب تک یہ شواہد ہمارے پاس نہیں پہنچتے نہ تو وسیم جمال کی ضمانت ہو سکتی ہے اور نہ ہی اِس سلسلے میں کوئی رعایت کی جا سکتی ہے۔"

"یُوں لگتا ہے جیسے کوئی ذاتی مسئلہ ہی اٹک گیا ہے، خیر آپ نے یہ دوسرا وار بہت کاری کیا ہے۔ ہماری آپ کی کوئی پرخاش نہیں ہے تصور بیگ صاحب! لیکن میری ذمّہ داریوں کو بھی ذہن میں رکھیئے گا آپ اگر مجھ سے تعاون کریں گے تو مجھے خوشی ہو گی اور میں آپ کا احسان مند ہُوں گا۔"

"کیا تعاون چاہتے ہیں آپ؟"

"میرا مطلب ہے کم از کم مجھے یہ بتا دیجئے کہ وسیم جمال صاحب سے پرخاش کی وجہ کیا ہے؟"

"ایک مُجرم سے ایک پولیس آفیسر کو جو پرخاش ہو سکتی ہے وہی پرخاش مجھے وسیم جمال سے ہے اور آپ جو ایک ایسے شخص کی حیثیت کی بناء پر اپنے تعلقات استعمال کر رہے ہیں جو مُجرم ہے کسی رعایت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ جائیے اِس سلسلے میں جو کارروائی آپ کر سکتے ہیں کر لیجئے گا۔ میں رات کو آٹھ بجے تک آپ کو یہاں موجود مِلوں گا" نادر خاں پریشان نِگاہوں سے [illegible] بیگ کو دیکھتا رہا تھا پھر اُس نے گردن جھٹکتے ہُوئے کہا۔

"آپ اگر مجھے اِس ذاتی مسئلے میں شریک کر لیتے تو بڑی آسانیاں ہو جاتیں آپ کے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔ آپ یقین کیجئے گا وہ بہت بڑی حیثیت کا آدمی ہے۔ اور آپ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"اِس کے بعد اگر آپ نے کسی ذاتی مسئلے کا تذکرہ کیا تو ممکن ہے آپ کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے" تصور بیگ اپنے د[illegible] تک پہنچ چکا تھا۔ نادر خاں رُک گیا۔

"ٹھیک ہے مسٹر تصور بیگ! میں دیکھتا ہُوں کہ میں کیا کر سکوں گا۔"

"آٹھ بجے تک میں یہاں ہُوں۔ اُس وقت تک اگر کچھ کر لیں تو مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔ ویسے میں نے آپ کو چائے کی پیش کش بھی کی تھی۔"

"وہ اِس صُورت میں بہتر رہتی جب ہمارے درمیان دوستانہ انداز باقی ہوتا۔"

"خدا حافظ" تصوّر بیگ [illegible] کہا اور اپنے آفس میں داخل ہوگیا۔ نادر خاں باہر کھڑا دانت پیس رہا تھا۔

باب

اقبال اور عصمت کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی تھی۔ دو گھروں کی تیاریاں تھیں اور پھر تاریخ بھی زیادہ دُور نہیں تھی۔ اِس لئے انتظامات جلدی جلدی کرنے تھے۔ صمدانی صاحب کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے تھے۔

"بھئی پریشانی کیا ہے۔ کیوں تمہارا چہرہ اُتر گیا ہے" عادل حسین نے صمدانی صاحب سے پُوچھا۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بس ذرا یہ لوگ گھبرا گئے ہیں" صمدانی صاحب نے کہا۔

"گھریلو انتظامات کے سلسلے میں؟"

"جی ہاں"

"میاں چھُری تلے دم لو۔ ہم بھی بڑے کائیاں ہیں کل تاریخ طے ہُوئی ہے آج دوسرے معاملات طے ہوں گے۔ آنے دو شام کی چائے پر اُن لوگوں کو" عادل حسین بولے۔

"جی وہ بس" صمدانی صاحب ہاتھ ملتے ہُوئے بولے۔

"دیکھو صمدانی! اگر کوئی اور تردّد ذہن میں ہے تو اُسے نکال پھینکو۔ نہ کوئی غیر ہے اور نہ تکلف۔ میرے گھر میں خوشیوں کا آغاز ہو رہا ہے کسی قسم کا اظہار کر کے مجھے غیر نہ بناؤ کل خالد اور پرسوں اختر کے لئے بھی یہی سب کچھ کرنا ہے"

"جی یقیناً" صمدانی صاحب نے کہا۔

"بس تم میرے زیرِ ہدایت عمل کرو اپنے ذہن سے کچھ نہ سوچو"

"بہت بہتر" ابراہیم صمدانی نے گردن جھکا دی۔

ایک دِن پہلے عادل حسین باقاعدہ مٹھائی لے کر غلام احمد کے گھر گئے تھے اور شادی کی تاریخ پکّی کر آئے تھے۔

شام کو معمُول کے مطابق تمام گاڑیاں آگئیں بس آج عصمت نہ آئی تھی۔ شام کی چائے پر خُوب ہلا گُلا کیا گیا تھا۔ پُرلطف بات یہ تھی کہ ڈاکٹر نعمان بھی آگئے تھے، اجمل بھائی جان بھی تھے۔ سب نے قیامت ڈھا رکھی تھی۔ چاروں طرف قہقہے بکھرے ہُوئے تھے، اجمل بھائی جان نے موقع غنیمت دیکھ کر ندرت کو جالیا۔

"وہ آپا بھائی جان!"

"عزیز از جان!" ندرت شوخی سے بولی۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"شادی کا ہنگامہ"

"کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے کیا؟"

"بہت بڑی گڑبڑ"

"اب کیا ہوگا؟"

"شادی ہوگی۔ اور دو مظلوم زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے کے قیدی بن کر رہ جائیں گے"

"مگر شادی تو سب کی ہوتی ہے"

"آپ بھی کریں گے؟"

"میں... ہی ہی ہی" اجمل میاں شرما گئے۔ ندرت نے بمشکل قہقہہ روکا تھا۔

"وہ اجمل صاحب!"

"جی؟"

"آپ نے میری فرمائش پوری کرنے کا انتظام کیا ہے؟"

"ج... جی ہاں! مکمل مشق کرلی ہے۔ آپ جب حکم دیں گی!"

"مناسب وقت آنے والا ہے لیکن آپ مجھے بے عزّت تو نہ کردیں گے؟"

"میں سمجھا نہیں!"

"آپ کو رقص پیش کرنا ہوگا"

"کروں گا دل و جان سے کروں گا آپ کی فرمائش جو ہے"

"تیار رہیئے گا"

"جی۔ بالکل!"

"کیا گفتگو ہو رہی ہے اجمل بھائی جان سے" اختر نے قریب آتے ہُوئے کہا۔

"لیجئے آگئے" ندرت نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یہ آپ ہم دونوں کے درمیان کیوں آجاتے ہیں؟ میں نے خاص طور سے غور کیا ہے جب بھی میں آپا بھائی جان کے ساتھ ہوتا ہُوں آپ دُور سے ہمیں دیکھ کر آجاتے ہیں"

"اِس کا کچھ انتظام کریں اجمل بھائی جان' یہ ٹھیک نہیں ہے" ندرت نے ناک پھُلاتے ہُوئے کہا۔

"انتظام" اجمل بھائی جان پُرخیال انداز میں بولے پھر بُری طرح اُچھل پڑے۔ اُنھیں محسوس ہُوا تھا جیسے کوئی چیز سنسناتی ہُوئی اُن کے کان کے پاس سے نکل گئی ہو۔ وہ کان جھاڑنے لگے تھے۔ لیکن دوبارہ وہی آواز اُن کے دوسرے کان کے پاس اُبھری اور

وہ حواس باختہ ہوگئے۔ ندرت نے بھی یہ آوازیں سُنی تھیں تیسری آواز پر اجمل بھائی جان بھاگ کھڑے ہُوئے تھے۔

"ن... نہ جانے کک... کیا ہو رہا ہے میں ابھی آیا"۔ لیکن ندرت اختر کی شرارت سمجھ چکی تھی۔

"بہت بُرے ہیں آپ۔ اُس نیک انسان کو خوف زدہ کردیا آپ نے؟"

"خبردار اِس وقت میں بہت جذباتی ہو رہا ہُوں۔ اپنی مملکت میں کسی کو نہیں دیکھ سکتا" اختر نے کہا۔

"تب تو مجھے کھسک جانا چاہیئے"

"کھسک کر دیکھو۔ ہاتھ پکڑ کر نہ لے جاؤں تو اختر نام نہیں" اختر نے آنکھیں نکال کر کہا اور ندرت ہنسنے لگی۔

کچھ فاصلے پر ڈاکٹر نعمان تنویر سے کہہ رہے تھے "میری طرف سے آپ کو دِلی مبارک باد مس تنویر"

"کس سلسلے میں؟"

"اقبال صاحب کی شادی ہو رہی ہے"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ بھی تیاریاں کر لیجئے" تنویر نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"جی؟" ڈاکٹر نعمان کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔

"کیا ہُوا؟ کوئی غلط بات کہہ دی میں نے"

"ج... جی نہیں۔ لل... لیکن اِتنی جلدی۔ پہلے اقبال صاحب کی شادی ہو جانے دیجئے"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"وہ... وہ بھی تیاریاں۔ ابھی تو بہت سے مراحل باقی ہیں۔ اور پھر یہ کام تو بزرگ کرتے ہیں۔ میں کیا تیاریاں کروں؟"

"آپ کی شادی کی بات کر رہی ہُوں کیا؟"

"پھ... پھر؟"

"آپ اقبال بھائی کی شادی میں شرکت نہیں کریں گے کیا؟ اُس کی تیاری کی بات کر رہی ہُوں میں"

"اوہ۔ میں کچھ اور سمجھا تھا" ڈاکٹر نعمان ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"کمال ہے۔ آپ بھی بس عجیب انسان ہیں" تنویر نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہُوں آپ کا ہُوں" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور تنویر کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔ وہ چند لمحے مُنہ پھاڑے ڈاکٹر نعمان کو دیکھتی رہی پھر ایک دم مُڑ کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

ڈاکٹر نعمان سر کھُجاتے رہ گئے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی تفریحات میں گم تھا۔ چونکہ ایک دِن پہلے اقبال اور عصمت کی شادی کی تاریخ طے ہُوئی تھی۔ اور اُس کے بعد یہ پہلی نشست تھی۔ بزرگوں نے بھی نوجوانوں کو کھُل کر کھیلنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور تو اور خالد صاحب بھی آج کچھ زیادہ ہی مُوڈ میں تھے۔ اور کئی بار ثناء کو تنہا پانے کی خواہش کر چکے تھے۔ یہ موقعہ اُنھیں بھی نصیب ہوگیا۔

"ثناء صاحبہ" اُنھوں نے ثناء کو آواز دی اور ثناء چونک کر رُک گئی۔

"جی" اُس نے کہا۔

"میں احتجاج کرنا چاہتا ہُوں"

"کس سلسلے میں؟"

"وہ جو کہتے ہیں نا کہ ؏ غیروں پہ کرم، اپنوں پہ ستم اور آگے کسی جانِ جہاں وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے تو یہ سلسلہ میرے اور آپ کے ساتھ بھی ہے"

"اب ترجمہ کر دیجئے گا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہے" ثناء نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"مجھے علم ہے کہ اقبال اور عصمت کی شادی کی رُوحِ رواں آپ ہیں"

"کچھ اعتراض ہے آپ کو؟"

"جی ہرگز نہیں۔ لیکن اِس صف میں ہمارا نمبر تو سرِفہرست تھا"

"پھر ترجمہ فرمایئے" ثناء بولی۔

"میرا مطلب ہے سب سے پہلے ہماری اور آپ کی نسبت طے ہُوئی تھی۔ لیکن یہ فائدہ دوسرے لوگ اُٹھا رہے ہیں"

"تو اِس میں میرا کیا قصُور ہے؟" ثناء نے آہستہ سے کہا۔ اور خالد چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"نہیں سمجھا کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟"

"میں جو کچھ کہتی ہُوں صرف ایک بار کہتی ہُوں۔ بار بار کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا" ثناء نے بدستور مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"یہ زیادتی ہے آپ کی۔ کیونکہ دوسروں کا تو آپ سر سے لے کر پاؤں تک ترجمہ کر ڈالتی ہیں" خالد پُراحتجاج لہجے میں بولا اور ثناء ہنس پڑی پھر وہ وہاں سے آگے بڑھ گئی اور خالد اُسے دیکھتا رہ گیا۔

تمام تفریحی مشغلے جاری تھے اور ہر شخص اپنی اپنی تفریحات میں مگن تھا پھر اِس محفل کو احسان احمد صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے سنجیدگی بخش دی۔ عادل حسین اُن سے گفتگو کر رہے تھے۔ اور غالباً ابراہیم صمدانی کے مرحلے کو طے کر رہے تھے احسان احمد نے کھڑے ہو کر کہا۔

"خواتین وحضرات! یہ تفریحی مشاغل تو جاری رہیں گے، اب تھوڑی دیر کے لئے سنجیدگی اختیار کرلیں۔ ایک اہم مسئلہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے" تمام لوگ احسان احمد کے گرد جمع ہو گئے۔ سب ہی شامل تھے اور کوئی بھی اُن سے دُور نہیں تھا!

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس وقت جس گھر میں آپ رنگ رلیاں منا رہے ہیں اِس کے مسائل پر بھی کسی نے غور کیا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں گڑیا، گڈّے کی شادی کرنی ہے ایک گھر گڑیا والا ہے تو دوسرا گڈّے والا اور اِن تمام کاموں کی تیاریوں کے لئے بہرطور افرادی قوت درکار ہے۔ اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اِس وقت بھائی عادل حسین کے پاس اِفرادی قوت کی کچھ کمی ہے۔ میں چاہتا تو اِس سلسلے میں ووٹنگ کرا لیتا کہ کون اِدھر سے شریک ہونا چاہتا ہے اور کون دوسری طرف سے۔ لیکن یہ بات میں نے مناسب نہیں سمجھی اور میں نے، اور عادل حسین نے کچھ فیصلے کئے ہیں لیکن اِن فیصلوں کا اطلاق اُسی وقت ہوگا جب پہلے آپ لوگوں کی رائے لے لی جائے۔ خواتین وحضرات! دونوں سمت سے تیاریاں کرنی ہیں۔ لڑکے والوں کی طرف سے بھی اور لڑکی والوں کی طرف سے بھی، چنانچہ افراد بانٹ لئے جائیں تو بہتر ہے۔ کون کس طرف سے کام کرے گا یہ اُس کی مرضی پر منحصر ہے۔ فریق اوّل ہیں محترمہ ثناء صاحبہ جو سرسے پاؤں تک لڑکی والی ہیں اور ظاہر ہے اُن سے اِس سلسلے میں کچھ کہنا بالکل بیکار ہے۔ اِس کے علاوہ لڑکی والوں میں نُدرت صاحبہ رہ جاتی ہیں جو بہرطور لڑکی کی بہن ہیں اِس کے ساتھ ساتھ ہی مس رِدا ہیں جو لڑکی سے زیادہ ایک فرم کی جنرل منیجر ہیں۔ گو ثناء صاحبہ کا دعویٰ ہے کہ وہ سارے انتظامات خود کرلیں گی لیکن بہرطور اُن کی مدد کے لئے بھی کوئی نہ کوئی ضروری ہے، چنانچہ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے آپ لوگ اگر اُس سے متفق ہوں تو ہاتھ اُٹھا دیں"

سب لوگ دلچسپی سے احسان احمد کو دیکھتے رہے، احسان احمد صاحب نے کہا۔

"جدید نسل اپنے آپ کو بڑی منتظم اور نمائندہ سمجھتی ہے۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مقابلہ قدیم وجدید میں ہو جائے۔ یعنی غلام محمد صاحب کی طرف سے ساری لڑکیاں بالیاں اور عادل حسین صاحب کی طرف سے میرا مطلب ہے ابراہیم ہمدانی صاحب کی طرف سے تمام بزرگ۔ میں سرِفہرست ذکیہ بیگم کو رکھتا ہوں وہ سلطانہ بہن کی مدد کریں گی۔ اُن کا ساتھ دیں گی۔۔۔ طفیلی بیگم جب کہ اُس سمت عارفہ بیگم لڑکیوں کا ساتھ دیں گی۔ کیونکہ بہرحال کچھ تیاریوں میں بزرگ خواتین کی بھی ضرورت ہوگی۔ مردوں میں میں نے طے کیا ہے کہ اُس طرف خالد صاحب ہوں گے یعنی عصمت کی سمت سے اور اِدھر تو اختر وغیرہ ہیں ہی تو آپ لوگوں کی اِس سلسلے میں کیا رائے ہے؟ حتمی فیصلہ آپ لوگ کر ڈالئے گا ہماری ڈائریکشن دونوں طرف سے رہے گی"

"مجھے منظور ہے" ثناء نے چیلنج قبول کرنے والے انداز میں کہا۔

"ہم جانتے تھے یہ آتش فشاں فوراً ہی چیلنج قبول کرلے گا"

"ٹھیک ہے ثناء صاحبہ آپ کو منظور ہے تو ہمیں بھی منظور ہے" کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور احسان احمد صاحب نے خوش اسلوبی سے تمام معاملات طے کر دیئے تھے۔ ذکیہ بیگم نے سلطانہ بیگم سے کہا۔

"سلطانہ! تم تو فکر ہی مت کرو۔ ایسے انتظامات کروں گی کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے"

"یقیناً ذکیہ بہن مجھے آپ سے یہی اُمید ہے"

"لیکن یہ لوگ مارے گئے۔ دراصل جس طرف اختر حسین ہوں گے اُدھر کی بات ہی کچھ اور ہوگی" اختر نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

"مُنہ دھو رکھیئے اختر صاحب! ایک ہی آئیٹم ایسا پیش کروں گی جو آپ لوگوں کے لئے ایٹم بم ثابت ہوگا" نُدرت نے بے اختیار کہا اور سب لوگ ہنسنے اور مسکرانے لگے اختر نے ایسی نگاہوں سے نُدرت کو دیکھا کہ نُدرت بُری طرح جھینپ گئی نگاہوں ہی نگاہوں میں گویا اختر نے کہہ دیا تھا کہ محترمہ ایٹم بم تو آپ خود ہمارے لئے ثابت ہو چکی ہیں۔ ہم بھلا اِس چیلنج سے انحراف کیسے کریں گے؟ اختر نے یہ الفاظ مُنہ سے نہیں ادا کئے تھے لیکن وہ اپنے لفظوں کی ادائیگی نظروں سے بھی کرسکتا تھا اور اُس نے یہی کیا تھا۔

اِس طرح یہ مرحلہ مکمل ہو گیا اور اِس سلسلے میں ضروری اُمور طے کر لئے گئے۔

*

اختر نے رِدا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اندر سے رِدا کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

"فدوی کو اختر حسین کہا جاتا ہے" باہر سے آواز سنائی دی اور رِدا نے خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اختر مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا، پھر اُس نے کہا۔

"اُس دن سے بڑا خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ ڈانٹ ڈپٹ کا محکمہ گردش میں رہتا ہے اور بغیر اجازت اندر داخل ہونے والا بھی اُسی گردش میں شامل ہو جاتا ہے"

"بس فضول باتوں سے گریز کیا جائے"

"کرلیا گیا۔ کچھ اطلاعات دینی تھیں اِس لئے حاضری دی ہے"

"بیٹھو"

"بے حد شکریہ" اختر نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اطلاعاً عرض ہے کہ وسیم جمال گردن گردن تک دلدل میں غرق کر دیا گیا ہے اور اُسے طویل سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ ایک قتل کے مقدمے میں ملوث ہوا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ ہی اُس پر انٹرپول کی جانب سے ایک مقدمہ قائم کیا گیا ہے جس کی تفتیش جاری ہے۔ اگر اجازت ہو تو اب مکمل بلیٹن پیش کیا جائے" رِدا دلچسپ نگاہوں سے اختر کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے کہا۔

"اب ڈرامہ مت کرو مجھے پوری تفصیل بتاؤ"

"تفصیل کا مطلب ہوتا ہے تفصیل۔ اور اختر حسین صاحب ہیں باقاعدہ انسان چنانچہ اگر تفصیل پوچھی جائے تو پھر تفصیل ہی عرض کی جائے گی"

"اب بکو بھی ناخواہ مخواہ فضول باتیں کئے جا رہے ہو" رِدا نے کہا۔

"فدوی سب سے پہلے جناب مرزا تصوّر بیگ صاحب سے ملا اور اُنھیں بتایا کہ اُن کی رِدا خطرے میں ہے۔ م۔۔۔ معاف کیجئے گا تفصیل بتانے میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو محسوس مت کیجئے گا"

"اختر!" رِدا نے بُرا ماننے والے انداز میں کہا۔

"جی جی۔ جاری ہے، جاری ہے۔ تو تصوّر بیگ صاحب کو جب یہ بتایا گیا کہ وسیم جمال نامی شخص نے رِدا صاحبہ کے ساتھ یہ بدتمیزی کی ہے اور اِس قسم کی دھمکیاں دی ہیں تو اُن کا چہرہ پہلے سفید، پھر زرد اور بعد میں سُرخ ہو گیا۔ اُس کے بعد اُنھوں نے کوئی رنگ نہیں بدلا تھا۔ غرضیکہ تصوّر بیگ صاحب نے پُرجوش لہجے میں کہا کہ وسیم جمال کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں اور میں اطمینان رکھوں اور شام کے چھ بجے اُنھیں فون کرکے تفصیلات معلوم کرلوں جواب میں میں نے چھ بجے ٹیلی فون کیا اور تصوّر بیگ نے مجھے تفصیلات کچھ اِس طرح بتائیں کہ اُن کے ایک انسپکٹر نے وسیم جمال کو اُس کے دفتر سے دھکّے دے کر باہر نکالا اور اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر کھینچتا ہوا اُسے پولیس ہیڈ کوارٹر تک لے گیا۔ وہاں وسیم جمال پر ایک قتل کا مقدمہ قائم کر دیا گیا یہ قتل کسی انسان کا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن ایک محبت کرنے والے کے احساسات کا قتل ضرور تھا پھر یُوں ہوا کہ وسیم جمال کی دولت حرکت میں آ گئی اور اُس کے وکیل صاحب فوراً ہی دو گھنٹے کے اندر اندر اُس کی ضمانت کی کارروائیاں مکمل کرکے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے اور تصوّر بیگ کو اُن کی ضمانت منظور کرنا پڑی وسیم جمال کو لاک اَپ سے نکالا گیا اور لاک اَپ کے دروازے سے چند قدم آگے بڑھ کر دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اِس بار مقدمہ انٹرپول کی طرف سے تھا اور تفصیلات زیرِ تفتیش تھیں۔ اِس لئے اِس مُلک کی کوئی بھی عدالت اِس شخص کی ضمانت نہیں کرسکتی جب تک کہ انٹرپول کی طرف سے تمام تفتیش مکمل نہ ہو جائے یہ دوسری بات ہے کہ اِس تفتیش میں یہ ثابت ہو جائے کہ وسیم جمال بے گناہ ہے اور اُس کے بعد اُسے رہا کر دیا جائے، لیکن اب یہ مرزا تصوّر بیگ کے ہاتھ میں ہے کہ انٹرپول کی یہ تفتیش کب تک ختم ہوتی ہے، اِس میں سال بھر بھی لگ سکتا ہے۔ دو سال بھی لگ سکتے ہیں۔ پانچ سال بھی لگ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف مرزا تصوّر بیگ کا رہینِ منّت ہے، چنانچہ مجھے یہ تفصیل بتائی گئی ہے اور اِس کے بعد جو حکم رِدا" اختر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ رِدا کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ ہو گیا تھا اُس نے پُرمسرت انداز میں کہا۔

"آہ۔ کاش میں اپنی آنکھوں سے اُس شخص کا یہ تماشہ دیکھ سکتی"

"حکم نہ فرمایا گیا تھا ورنہ یہ کام آپ کی موجودگی ہی میں ہوتا"

"بہت اچھا ہوا۔ بہت ہی اچھا ہوا"

"اب کیا حکم ہے، جاؤں؟"

"بیٹھو کیا خدمت کروں تمہاری؟"

"جی نہیں خدمت وغیرہ کا میں قائل نہیں ہوں کچھ اور سوالات ہوں تو کر لیجئے گا"

"فضول باتوں سے گریز کرو"

"یہ جُملہ آپ نے پانچویں مرتبہ فرمایا ہے"

"تو پھر بتاؤ اب کیا کروں؟"

"تصوّر کا تصوّر ذہن میں نہیں ہے، کچھ پُوچھیں گی نہیں اُس کے بارے میں"

"دیکھو اختر! جو کچھ میں نے تمھیں جذباتی ہو کر بتا دیا ہے۔ اُسے مذاق نہ بناؤ میں اِس مذاق کی متحمل نہ ہو سکوں گی"

"میرا مطلب ہے شکریہ وغیرہ کا کوئی پیغام تو نہیں دینا آپ کو"

"ہاں! تصوّر ملیں تو اُن سے میرا شکریہ ضرور ادا کر دینا"

"اور کوئی پیغام نہیں"

"نہیں" رُدا نے سخت لہجے میں کہا۔

"زیادتی ہے" اختر بولا۔

"اتنے بڑے کام کا صلہ یہ معمولی سا شکریہ۔ میرے خیال میں یہ بہت کم ہے"

"اختر پلیز" رُدا نے خشک لہجے میں کہا۔ اور اختر بڑبڑاتا ہُوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ رُدا گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

روز و شب جیسے پَر لگا کر اُڑ گئے۔ شادی کی تاریخ طے کئے ہُوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ شادی کے دِن قریب آ گئے۔ اُن دِنوں ایسی شدید مصروفیت رہی تھی کہ سارے پروگرام ہی درہم برہم ہوگئے تھے۔ اُدھر ذکیہ بیگم نے پُورا نظام سنبھال رکھا تھا اور ایسی شاندار بری تیار کی تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ تو اِدھر ثناء بھی آخر اُنہی کا خون تھی۔ اُس نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے لاکھوں روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ جہیز کے جوڑے اور دیگر سامان ایسا تھا کہ تلاش کرنے کے باوجود کوئی کمی تلاش نہ کی جاسکے۔ سارے پروگرام بڑی خوش اسلوبی سے طے ہوگئے تھے۔ شادی اور مہندی وغیرہ کے کارڈ تقسیم ہوگئے تھے۔ مہمانوں کا مکمل تخمینہ لگا لیا گیا تھا۔ غرض کہ کسی بھی چیز کی کوئی بھی کمی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور بڑی دلچسپی میں وقت گزر رہا تھا یہاں تک کہ مہندی کا وقت آگیا اور آج دُولہا والوں کو مہندی لے کر آنا تھا۔

عادل حسین صاحب نے اپنے نئے حلقہ احباب سے تقریباً تمام ہی افراد کو معہ اُن کی فیملی کے مدعو کیا تھا اور خصوصی تاکید کی تھی کہ کوئی بھی شخص اِس تقریب میں شرکت سے گریز نہ کرے کیونکہ اُنہی پر انحصار کیا گیا ہے۔ چنانچہ بے شمار نوجوان لڑکے، لڑکیاں، معمر خواتین و حضرات مہندی کی رسم میں شرکت کے لئے پہنچے تھے۔ مہندی کیا تھی پوری بارات تھی۔ جس کی ضیافت کا اہتمام ثناء نے کیا تھا۔ احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں بھلا کیا کمی تھی مہمانوں کے لئے؛ دونوں طرف سے انتظامات گھروں پر ہی کئے گئے تھے اور اِس کا جواز یہ پیش کیا گیا تھا کہ گھر کم از کم شادی کے گھر تو معلوم ہوں۔

بہر طور مہندی والے مہندی لے کر پہنچ گئے۔ ستائیس نوجوان لڑکیاں مہندی کے تھال ہاتھوں میں اُٹھائے احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں داخل ہُوئیں اور اُن کے پیچھے بے شمار مہمان بھی اور اُس کے بعد وہ طوفان مچا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ بہت ہی شاندار اہتمام کیا گیا تھا۔ گانے بجانے کے لئے دونوں طرف سے پارٹیاں جم گئی تھیں۔ اِس تقریب کے لئے دو گھنٹے مخصوص کئے گئے تھے۔ اور اِن دو گھنٹوں میں وہ ہنگامہ ہُوا کہ بزرگوں کو تو کان بھی بند کر لینے پڑے۔ لیکن سب ہی دلچسپی لے رہے تھے۔ عادل حسین اور احسان احمد تک اِس محفل میں موجود تھے۔ انتظامات چونکہ بڑے سائنٹیفک انداز میں ہُوئے تھے چنانچہ کوئی بھی بدانتظامی نہیں ہُوئی تھی۔ مہندی کے دوران مشروبات چلتے رہے تھے۔ کھانے کا انتظام سب سے آخر میں تھا۔ اور اس کا وقت ساڑھے دس بجے دیا گیا تھا۔ دس بجے یہ طے کیا گیا تھا کہ اس قسم کے تمام پروگرام ختم ہو جائیں۔ خاص طور سے آرکسٹرا بلوایا گیا تھا، جس میں خاص قسم کے ڈرم بھی شامل کئے گئے تھے اور ابھی تک ان ڈرموں کا استعمال نہیں کیا گیا تھا اور اِس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن ڈرمسٹ ڈرموں پر موجود تھے، پھر اچانک ہی اُن کی موجودگی کا مقصد واضح ہوگیا۔

راگ رنگ کی یہ محفل اپنے ابتدائی مرحلے سے گزری تھی کہ اچانک ہی ڈرموں پر چوٹ پڑی اور اُس کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب شئے مہمانوں کے درمیان آگئی۔ اُس کے جسم پر پتّوں کا لباس تھا، سر پر پتّوں کا تاج، بدن زیبرے کی شکل میں رنگا گیا تھا اور مختلف پٹیاں یہ ثابت کر رہی تھیں کہ درحقیقت کوئی افریقی مخلوق درمیان میں نہیں آگئی ہے۔ بلکہ کسی اچھے خاصے شریف آدمی کو اِس رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ ڈرم ہیجانی انداز میں بجنے لگے۔ اور پتّوں کی مخلوق اُچھل کود مچانے لگی۔ اُس کے حلق سے وحشیانہ آوازیں نِکل رہی تھیں۔

ابتداء میں تو لوگوں نے حیرت و دلچسپی سے زولونس کے اِس باشندے کو دیکھا لیکن دفعتاً ہی عادل حسین کے حلق سے سرسراتی ہُوئی آواز نکلی۔

"ارے ارے... ارے... احسان احمد یہ تو... یہ تو اجمل ہے۔ اجمل ہے یہ تو"

"کیا؟" احسان احمد صاحب نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

"خُدا کی قسم اجمل ہے اِسے کیا ہوگیا؟ او ہو کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ یہ اِس قسم کا بچّہ نہیں ہے"

"کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے؟ وہ افریقی رقص پیش کر رہا ہے۔ جذباتی ہوگیا ہے"

"اماں نہیں۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ یقیناً اِس کے ساتھ کوئی شرارت کی گئی ہے۔ کوئی، کوئی غلط چیز کھلا دی گئی ہے اُسے۔ ورنہ... ورنہ اُس سے ایسی کسی حرکت کا سوال ہی نہیں پیدا

ہوتا۔ ارے دیکھو اُسے۔ غیر بچّہ ہے، میری ذمّہ داری پر یہاں آیا ہے۔ اگر اِسے کچھ ہو گیا تو میں مُنہ دِکھانے کے قابل نہیں رہوں گا"

"مگر وہ تو ناچ رہا ہے"

"ناچ رہا ہے۔ میں کہتا ہُوں جانکنی کے عالم میں گرفتار معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو افریقی رقص بھی نہیں ہے"

اجمل میاں اِن باتوں سے بے خبر اپنی محبت کی تکمیل کرنے میں مصروف تھے، جنگلی رقص تو اُنھیں بھلا کیا آتا۔ بس لمبی لمبی چھلانگیں مار رہے تھے۔ اور بعض اوقات اندازے کی غلطی پر قلابازی بھی کھا جاتے تھے۔

اُدھر ثناء، نُدرت اور رُدا وغیرہ کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ تنویر حیرت سے مُنہ پھاڑے اجمل میاں کو بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اُس نے تو اجمل میاں کو پہچان بھی لیا تھا اور پہچان کر اُس نے قریب بیٹھی ثناء سے کہا۔

"اللہ قسم ثناء باجی! میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ یہ شخص پاگل ہے، خُدا کا شکر ہے کہ میں نے اُس سے زیادہ میل جول نہیں رکھا۔" ثناء کو بھلا ہنسنے سے کہاں فرصت تھی۔ آنکھوں سے پانی نِکل رہا تھا۔ قہقہے تھے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے سب ہی ہنس رہے تھے مگر اجمل میاں فرضِ محبت پُورا کر کے ہی دم لینا چاہتے تھے۔ ثناء نے نُدرت سے کہا۔

"نُدرت! خُدا تجھے غارت کرے، کیا حشر کر دیا بے چارے کا۔ ارے اب اُسے روک تو سہی۔ کہیں ناچتے ناچتے ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے"

دوسری طرف عادل حسین شدید پریشانی کا شکار تھے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اُنھوں نے اختر کو پکڑا اور اُس سے بولے۔

"تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہے اختر! کیا کھلا دیا تھا اُسے؟ دیکھو دیکھو میری ذمّہ داری پر ہے یہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ جلدی سے ڈاکٹر کا انتظام کرو۔ پکڑو اُسے پکڑو۔ ضرور کسی نے شرارت کی ہے۔ اماں تم سُنتے نہیں ہو۔ میٹھے بیٹھے میری شکل دیکھے جا رہے ہو۔ میں کہتا ہُوں اُسے پکڑو"

"ج... جی..." اختر نے گھبرائے ہُوئے انداز میں کہا۔ نُدرت کی حرکت کو وہ بھی سمجھ گیا تھا۔ لیکن یہ کمبخت اجمل اِتنا وفادار نِکلے گا اِس کا اختر کو اندازہ نہیں تھا۔ عادل حسین کے دھکّے دینے پر وہ جلدی سے اُس جگہ پہنچا جہاں اجمل چھلانگیں لگا رہا تھا۔ اختر نے دو تین بار اُسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اجمل کی چھلانگیں بہت لمبی لمبی تھیں۔ لوگوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو چکا تھا لیکن اجمل میاں کسی بھی طور باز آنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اختر نے ایک ایسی جگہ تاکی، جہاں اجمل میاں کو پہنچنا تھا۔ اور اِس بار اُنھوں نے اجمل کی کمر پکڑ ہی لی تھی۔ اجمل ایک لمحے کے لئے رُکا۔ اور اختر کی صُورت دیکھی۔

"او اجمل۔ او اجمل! او بھائی جان خُدا تیرا..."

لیکن دفعتاً ہی اجمل میاں اختر کی گرفت سے نِکل گئے۔ اور اِس بار اُنھوں نے اپنے پورے بدن کو تھرکانا شروع کر دیا اب کیفیت یہ تھی کہ اختر بھاگ بھاگ کر اجمل کو پکڑ رہا تھا اور اجمل بار بار اُس کی گرفت سے نِکل جاتا تھا۔ اِس اُچھل کود نے اور قیامت ڈھا رکھی تھی۔ اور لوگ اب بے بسی سے آنسو پونچھتے ہُوئے اُس رقص کو دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً اختر کو ایک اور سُوجھی اور وہ جلدی سے ڈرم بجانے والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اور اُس نے اُن سے کہا۔

"بند کر دو یہ ڈرم۔ بند کر دو" دوسرے لمحے ڈرم بند ہو گئے، اور فضا میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ اجمل میاں کے انداز سے یُوں محسوس ہُوا جیسے اُن کی ہَوا نِکل گئی ہو۔ اُن کے ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے لٹک گئے اور مُنہ پھاڑ کر ڈرم بجانے والوں کو دیکھنے لگے، تب اختر نے کہا۔

"آؤ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ تمہاری وفاؤں کا پُورا پُورا امتحان ہو چُکا ہے بلکہ تم اپنے امتحان میں پُورے اُترے ہو آؤ شاباش آجاؤ۔" اختر نے اُن کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور دانت پیستے ہُوئے اُنھیں لے کر آگے بڑھنے لگے۔ لیکن اجمل میاں اُونٹ کی طرح گردن اُٹھا اُٹھا کر نُدرت کو تلاش کر رہے تھے، لیکن نُدرت بے وقوف نہیں تھی کہ ایسے موقع پر اُن کی نِگاہوں کے سامنے آجاتی۔ وہ ثناء اور رُدا کے پیچھے چُھپ گئی تھی۔ تب اجمل میاں نڈھال ہو گئے اور اختر اُنھیں سنبھالے ہُوئے اندر داخل ہو گیا۔ ہنسنے والے اب بھی ہنس رہے تھے اور ثناء بار بار کہہ رہی تھی۔

"خُدا تجھے غارت کرے اللہ رکھی۔ خُدا واقعی تجھے غارت کرے۔ بے چارے شریف آدمی کا کیا حشر کر دیا ہے تُونے؟"

نُدرت کوئی جواب نہ دے پا رہی تھی۔ ہنستے ہنستے اُس کا سانس چڑھ گیا تھا۔ غرض مہندی کی اِس محفل میں باقی تو جو کچھ ہُوا سو ہُوا ہی تھا۔ لیکن اجمل میاں نے جو جان ڈالی تھی وہ ناقابلِ فراموش تھی۔ تمام تر ہنگاموں کے ساتھ بالآخر رسم حنا ختم ہو گئی اور عادل حسین صاحب اپنے مہمانوں کے ساتھ بالآخر۔

واپس چل پڑے۔ لیکن رات کو اجمل میاں سے بات ضرور ہُوئی تھی۔ ظاہر ہے اس اہم ترین مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اختر انجان بنا ہُوا تھا۔ عادل حسین نے سب سے پہلے اجمل میاں کی خبر لی تھی جواب بالکل پُرسکون تھے اور اُن کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" عادل حسین نے پُوچھا۔

"ٹھیک ہُوں جی... چچاجان" اجمل میاں نے جواب دیا۔

"یہ وہاں تم نے کیا کیا تھا؟"

"ک... کہاں؟"

"احسان احمد کی کوٹھی پر۔"

"ج... جی وہ زولو۔ زولو رقص تھا۔"

"وہ رقص تھا؟"

"ج۔ جی ہاں سو فیصدی رقص تھا۔" اجمل میاں عادل حسین صاحب کے سامنے بُری طرح ہکلا رہے تھے۔

"مگر تمہیں کیا سُوجھی تھی؟"

"بس میں بھی یہاں کی خوشیوں میں حصّہ لینا چاہتا تھا۔"

"کس نے مجبُور کیا تھا تمہیں اِس کے لئے؟" عادل حسین نے اختر کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"کسی نے نہیں، یقین کیجئے کسی نے نہیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے، تو میں نے یہ کر دیا۔"

"آئندہ نہ کرنا۔"

"ج... جی نہیں۔ نہیں کروں گا۔" اجمل میاں نے جواب دیا اور عادل حسین نے اُس کی جان چھوڑ دی۔ اختر نے اِس سلسلے میں لاتعلقی ہی برقرار رکھی تھی۔ ظاہر ہے نُدرت کا نام تو وہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ بہرحال دوسرے دِن بھی تفریحات رہیں۔ اور اس کے بعد شادی کا دِن آ گیا۔ شادی کے لئے جو اہتمام کیا گیا تھا وہ مکمل طور پر قابلِ اطمینان رہا اور بارات احسان احمد صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ تمام رُسومات ادا ہو گئیں اور عصمت دُلھن بن کر بالآخر عادل حسین کے گھر آ گئیں۔ لیکن بہت سے معاملات ایسے رہے تھے جس میں مختلف لوگوں کے ذہنوں میں مختلف خیالات گردش کرتے رہے تھے۔ اُن میں سرفہرست رِدا تھی جس کی نگاہیں اِس تمام تقریب کے دوران بار بار کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اور اختر نے بھی اُن نگاہوں کو محسوس کیا تھا۔ وہ خود بھی بے چین رہا تھا کیونکہ تصوّر بیگ نے شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ اختر نے ڈاکٹر نعمان سے اِس سلسلے میں باز پُرس کی تو ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"مجھ سے تو کہا تھا کہ آئیں گے لیکن نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ پُولیس کی نوکری ہی ایسی ہے، کوئی جُرم ہو گیا ہو گا جس کی تفتیش کے لئے چل پڑے ہوں گے۔" اختر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن دوسرے دِن وہ تصوّر بیگ کی تلاش میں چل پڑا۔ تصوّر بیگ کو تلاش کرنا اُس کے لئے مشکل نہ ہُوا۔ اختر کو دیکھ کر تصوّر بیگ کے ہونٹوں پر ایک مُسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"آپ نہیں آئے مرزا صاحب؟" اختر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ اور تصوّر بیگ مُسکرانے لگا۔ پھر بولا۔

"ہاں میں نہیں آیا۔"

"حالانکہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔" اختر نے کہا۔

"تم نے ضد ہی اِتنی کی تھی اختر کہ مجھے جھُوٹا وعدہ کرنا پڑا۔"

"گویا آپ جان بُوجھ کر نہیں آئے؟"

"ہاں بھئی۔"

"کیوں آخر؟"

"اب تھوڑا سا تم خود ہی غور کرو تمہیں بھی اندازہ ہو جائے گا۔ آخر ہمارا وقار بھی کوئی چیز ہے۔ ہمیں بہت بُری طرح نکالا گیا تھا۔ کم از کم تھوڑی بہت تو خوشامد وغیرہ ہو جانے دو۔"

"تصوّر بیگ صاحب! جس لڑکی کا نام رِدا ہے نا وہ شاید ہیرے سے بھی زیادہ سخت ہے، پتھر تو معمُولی چیز ہے۔"

تصوّر بیگ کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پھیل گئی، پھر اُس نے کہا۔

"مجھے یقین ہے اختر! تم مجھے میرے ضمیر کے خلاف مجبُور نہیں کرو گے۔ وہ اگر ہیرے سے زیادہ سخت ہے تو میں شاید اُس سے زیادہ سخت ثابت ہُوں، اِس لئے میرے دوست مجھے اپنی ذات میں زندہ رہنے دو۔ براہِ کرم۔ براہِ کرم۔"

"گویا آپ ولیمے میں بھی نہیں آئیں گے؟"

"نہیں۔ تم سے سچ بول رہا ہُوں۔ بِضد نہ کرنا اور ایک درخواست بھی کرتا ہُوں۔"

"کیا؟"

"دوست سمجھ کر۔" تصوّر بیگ نے کہا۔

"کہیئے۔"

"رِدا سے یہ کہنا کہ میں ولیمے میں نہیں آؤں گا۔ اُس سے یہی کہنا کہ میں تمہارے ہاتھ نہیں آ سکا۔ ملاقات نہیں ہُوئی۔ وعدہ کرتے ہو؟"

"جھُوٹا وعدہ کرنا میرے لئے بھی مشکل ہے۔"

"ایک ہی بات کہہ رہا ہُوں تم سے اختر! نہ ماننا چاہو تو میرے پاس منوانے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔" تصوّر بیگ نے عاجزی سے کہا۔

"یار مگر وہ تمہاری خوشامد کرنے نہیں آئے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ وقت کا کوئی نہ کوئی لمحہ اُسے یہ احساس ضرور دِلائے گا کہ اُس نے لاہور میں میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ مناسب نہیں تھا۔ اور اگر کوئی انسان احساس سے اِس قدر عاری ہو۔ اور اپنے آپ کو جھُکانے پر راضی نہ ہو تو پھر وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتا اور اُس سے مراسم استوار کرنا بالکل بیکار ہے۔ کیا سمجھے؟ مجھے یقین ہے کہ تم اِس کے لئے مجھے مجبُور نہیں کرو گے۔"

تصوّر بیگ کا لہجہ اِتنا سخت اِتنا ٹھوس تھا کہ اس کے بعد اختر کے پاس کچھ کہنے کے لئے گنجائش نہیں رہی تھی۔ بہرحال کچھ اِس قِسم کے معاملات ضرور ہُوئے تھے جو تھوڑا سا تکدّر رکھتے تھے۔ مثلاً آفندی صاحب کو بھی نظر انداز کیا گیا تھا اور صرف رِدا کی وجہ سے یہ لوگ ولیمے میں بھی شریک نہیں ہُوئے تھے اور اختر نے رِدا کی آنکھوں میں مایُوسیوں کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔ شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے لیکن اُن لوگوں کے معمُولات میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ وہی ہنگامہ آرائیاں تھیں سب خوش فِکرے تھے کوئی ایسا اہم مسئلہ نہ تھا جو قابلِ توجہ ہوتا۔ رِدا کے معمُولات بھی جاری تھے۔ وسیم جمال کا معاملہ ختم ہو چُکا تھا اور نہ جانے کیوں احسان احمد نے بھی ظہیر والے مسئلے پر رِدا سے گفتگو نہیں کی تھی۔

ایک دِن آسمان ابر آلُود تھا اور فضا پر ایک سکُوت سی چھائی ہُوئی تھی رِدا اپنے دفتر میں بیٹھی ہُوئی تھی کہ انٹرکام پر اشارہ موصُول ہُوا اور رِدا نے بٹن آن کر دیا۔

"ہیلو مینجر!" احسان احمد کی آواز اُبھری۔

"ہیلو سَر!"

"کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"آؤ کچھ باتیں کریں گے۔"

"حاضر ہوتی ہُوں۔" رِدا نے کہا اور پھر وہ اُٹھ کر احسان احمد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ احسان احمد نے مُسکراتے ہُوئے اُس کا استقبال کیا تھا۔

"موسم کافی سرد ہو رہا ہے اِس لئے میں نے اپنے اور تمہارے لئے کافی منگوالی ہے۔" احسان احمد بولے اور وہ مُسکرا دی۔ "اِس شادی نے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔"

"جی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں بھئی اب دل یہی چاہتا ہے کہ مسلسل شادیاں ہوتی رہیں۔ اِس سلسلے میں تم سے مشورہ کرنا ہے۔"

"اوہ۔" رِدا ہنس پڑی۔

"نہیں رِدا مذاق نہیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے اور پھر کوئی کام کرنا ہو تو پھر اُسے لیٹ نہیں کرنا چاہیئے۔ عادل حسین بھی میری طرح جذباتی ہو رہے ہیں۔"

"میں اُن سے متفق ہُوں انکل۔"

"تو بس اب ہر چند ماہ کے بعد ایک شادی ہونی چاہیئے۔ اور اِس وقت میں نے تمہیں اِسی مقصد کے لئے بُلایا ہے۔ رِدا پھر ہنس پڑی تھی۔ "بھئی ظاہر ہے میں اپنے جنرل مینجر ہی سے مشورہ کروں گا۔"

"ضرور انکل!" رِدا نے کہا۔

"پروگرام پیش کرو۔"

"اب ثناء کا نمبر ہے۔"

"بالکل۔ اور اگلی شمشاد ہی؟"

"اِس کے لئے میں کیا کروں؟"

"بھئی دیکھو! اِن دو خاندانوں میں جو بچے بچیاں ہیں اُن سب کو ٹھکانے لگانا ہے۔ جتنا کام آپس میں ہو وہ آپس میں کر دو۔ کچھ باہر سے امپورٹ ہو تو وہ باہر سے کر لیا جائے۔ اب اِن ناموں کی ترتیب کرو۔ لڑکوں میں خالد، اختر اور وہ زولو سردار ہے بہرحال اُسے بھی ٹھکانے لگانا ہے۔"

"اجمل بھائی جان۔" رِدا نے ہنستے ہُوئے کہا اور احسان احمد گردن ہلانے لگے۔ ملازم کافی لا کر رکھ دی تھی۔

"لڑکیوں میں نُدرت ہے، ثناء ہے، تنویر ہے اور رِدا ہے۔ بیچ میں دخل نہ دینا کافی ہیوی۔ اِن کے رشتے تلاش کرنے میں کوئی تجویز پیش کر سکتی ہو؟"

"جی؟" رِدا نے کہا۔

"پیش کرو۔"

"ثناء کا رشتہ خالد سے طے ہے۔"

"الحمدُ لِلّٰہ!"

"نُدرت کو اختر سے منسُوب کر دیا جائے۔"

"کچھ مشکلات تو درپیش نہ ہوں گی؟" احسان احمد نے کہا۔

• جیتی رہو۔ مشورہ بلاوجہ نہیں مانگا تھا۔ میرے ذہن میں خود کئی بار یہ بات آئی تھی تجویز کے لئے کیا کہتے ہو؟
• ڈاکٹر نعمان کو جانتے ہیں؟
• اچھی طرح! احسان احمد حیرت زدہ ہوگئے۔
• کیسا لڑکا ہے!
• کبھی غور بھی نہیں کیا؟
• بہت اچھا ہے۔ بالکل موزوں؟
• پورے اعتماد سے کہہ رہی ہو؟
• جی قطعی؟
• خدا کی قسم کمال کر دیا۔ مگر وہ باہر کا معاملہ ہے اِن اندرونی معاملات کو تو ہم بہ آسانی ہینڈل کر سکتے ہیں لیکن ... ؟
• یہ ذمے داری میں قبول کرتی ہوں؟
• مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ اب رہ گئی میری بیٹی رِدا؟
• اُس کے درمیان دو شناسائیاں باقی ہیں اُن سے نمٹ لیا جائے بعد میں طے کر لیں گے؟
• وعدہ؟
• ہاں کیوں نہیں؟ رِدا نے کہا۔
• تو پھر ایک پیالی کافی اور دو۔ اور اُس زولو سردار کے بارے میں کیا رائے ہے؟
• باہر سے لڑکی منگانی پڑے گی؟ رِدا نے خوشگوار لہجے میں کہا۔
• ہاں یہ ایک مشکل مرحلہ ہے، بہرحال اللہ مالک ہے؟
احسان احمد نے کہا اور پھر دیر تک اِس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ احسان احمد بولے "تم اب اختر کے مسئلے میں بات سامنے لے آؤ اور میرے خیال میں مَیں عادل حسین سے خالد اور شناء کا معاملہ طے کر دوں؟
• ضرور انکل! رِدا نے کہا۔ کافی دیر اِسی طرح باتیں کرتے گزر گئی۔
احسان احمد بولے۔
• آج کا دِن کام کرنے کا نہیں میں تو چلتا ہوں تمہارا جو دِل چاہے کرتی رہو۔ خُدا حافظ؟ احسان احمد اُٹھ گئے اور رِدا مُسکراتی ہُوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ دیر تک وہ احسان احمد کی باتوں پر مُسکراتی رہی تھی۔ اختر کے مسئلے کو اُس نے بڑی خوش اسلوبی سے آگے بڑھا دیا تھا۔ رِدا اِس بات پر مُسکرا رہی تھی کہ اپنے بارے میں بھی اُس نے احسان احمد کو مایوس نہیں کیا تھا۔ بہت دیر تک اِسی طرح خیالات میں ڈوبی بیٹھی رہی، پھر نہ جانے کیوں میرینا ذہن میں آگئی۔ اُس سے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب تک نہ جا سکی تھی۔ میرینا کے ساتھ یوسف بھی یاد آیا تھا دِل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ اُٹھ گئی۔ کیشئر سے ایک بھاری رقم لی اور گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑی ڈرائیور سے اُس نے بازار چلنے کے لئے کہا تھا۔ یوسف کا قد و قامت نگاہ میں تھا۔ اُس نے ایک بہترین اسٹور سے یوسف کے لئے درجنوں سُوٹ، جرسیاں وغیرہ خرید ڈالیں۔ پھر ایک لیڈیز ڈریس ایمپوریم سے میرینا کے لئے بے شمار لباس خریدے۔ اُس کے بعد ایک ٹوائے اسٹور سے اُس نے یوسف کی عمر کے لحاظ سے الیکٹرک گیم خریدے۔ بائیس تئیس ہزار کی یہ خریداری کر کے اُس نے ڈرائیور سے اُس علاقے میں چلنے کے لئے کہا جہاں میرینا رہتی تھی۔
گھر کا دروازہ یوسف نے کھولا تھا اور اُسے دیکھ کر خوشی سے کِھل اُٹھا تھا "ممی... ممی سسٹر آگئیں" وہ چیخا اور میرینا باہر آگئی۔ اُس نے رِدا کے رُخسار کو بوسہ دیا تھا۔
"یقین کرو میں مایوس ہوگئی تھی"
"نہیں آنٹی! بہت مصرُوف ہوگئی تھی۔ میں وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتی۔ میرینا اُسے اندر لے گئی۔ اُس کے انداز میں بڑی اپنائیت تھی۔
• ممی میں جیت گیا نا؟ یوسف نے کہا۔
"ہاں تم جیت گئے" میرینا نے کہا۔
"کِس سلسلے میں آنٹی؟"
• میرا خیال تھا کہ تم اب نہیں آؤ گی۔ جب کہ یوسف کہتا تھا کہ اُس کی بہن نے اُس سے وعدہ کیا ہے وہ ضرور آئے گی؟
"یوسف! میں تمہارے لئے کچھ لائی ہُوں۔ ڈرائیور سے کہو کہ سارا سامان اندر پہنچا دے؟
• اوہ۔ تھینک یو سسٹر! میں تو خود یہ سوچ رہا تھا کہ آپ سے کچھ فرمائش کروں۔ یُوسف باہر دوڑ گیا ڈرائیور نے پیکٹوں کے انبار لگا دیئے اور میرینا مسرور نظروں سے اُنہیں دیکھنے لگی۔
• آپ کا کوئی جنرل اسٹور ہے سسٹر؟ یوسف نے کہا۔
• اب تم یہ سارے پیکٹ میرے سامنے کھولو اور مجھے بتاؤ کہ اِن میں کیا تمہیں پسند آیا کیا نہیں آیا۔ رِدا نے کہا اور یوسف پیکٹ کھولنے لگا۔ اُس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ ہو رہا تھا۔ میرینا کا سامان وہ علیحدہ کرتا رہا اور اپنا الگ، پھر دیوانگی کے عالم میں بولا۔
• سسٹر یُو گریٹ۔
میرینا آہستہ سے بولی "کیا یہ تم نے ... کیا ہے رِدا؟"
"ہاں آنٹی۔ یہ میری خوشی تھی"

• ہم تمہیں اِس کے شایانِ شان جواب نہ دے سکیں گے؟ میرینا اُداسی سے بولی۔
• مجھے آپ سے جو درکار ہوگا مانگ لوں گی؟
• وعدہ کرتی ہو؟
"ہاں؟"
"اور تم وعدہ خلافی نہیں کرتیں؟"
"نہیں" وہ اعتماد سے بولی۔
• کھانا کھاؤ گی؟
• ہاں؟
"میں تیار کرتی ہُوں؟"
• میں بھی چلتی ہُوں؟ رِدا نے کہا۔ کچن میں اُس نے پُوچھا۔
• ابّو کو میرے بارے میں بتایا تھا؟
• ہاں؟
• کیا کہا اُنھوں نے؟
• سِسک سِسک کر رو پڑے تھے اُس دِن کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کئی دِن اُداس رہے تھے، پھر تمہارے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ تم کسی فرم میں جنرل مینجر ہونا؟
• ہاں؟ رِدا نے آہستہ سے کہا۔
• بس بڑی حسرت سے تمہارے بارے میں باتیں کرتے رہے، میں نے کہا کہ وہ تم سے مِلیں تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئے؟ رِدا نے کوئی جواب نہ دیا۔
دوپہر کا کھانا رِدا نے میرینا کے ساتھ کھایا۔ یوسف تو اُن تحائف میں ہی گم رہا تھا۔ اُس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا بہت دیر کے بعد رِدا نے اجازت مانگی تو میرینا نے کہا۔
• رِدا! اپنے ابّو سے مِلنا پسند کرو گی؟
• نہیں آنٹی؟ رِدا نے آہستہ سے کہا اور میرینا خاموش ہوگئی۔ پھر وہ رِدا کو چھوڑنے آئی تھی اور رِدا اُسے خُدا حافظ کہہ کر اپنی کار کی طرف چل پڑی تھی۔ لیکن ابھی وہ کار کے قریب بھی نہ پہنچی تھی کہ ایک اور کار اُس کی کار کے برابر آکر رُکی۔ اتفاقیہ طور پر ہی رِدا کی نظریں اُس کی طرف اُٹھی تھیں لیکن کار میں جو کوئی تھا اُسے دیکھ کر رِدا کا پُورا بدن پسینے میں ڈُوب گیا۔ دِل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں اور وہ ساکت رہ گئی۔ وہ تصور بیگ تھا جو خود بھی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ اُس نے بھی رِدا کو دیکھ لیا تھا اور اس کے بعد صرف ایک لمحے کے لئے وہ بھی ٹھٹکا تھا پھر وہ کار کا انجن بند کر کے دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا رِدا کے قدم جم کر رہ گئے تھے۔ اُس نے سادہ سی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
• ہیلو مِس رِدا! رِدا کے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہ نکل سکی۔ تاہم اُن ہلتے ہُوئے ہونٹوں نے اُسے ہیلو کہا تھا "آپ ٹھیک ہیں مِس رِدا؟" اُس نے دوبارہ کہا۔
• جج... جی ہاں! رِدا بولی اُس نے آہستہ سے گلا صاف کیا تھا۔ وہ اُس کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا اور رِدا کو اپنی شخصیت کے ہلکے پن کا احساس ہو رہا تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ زیادہ نروس ہوگئی ہے۔
• ثاقب صاحب کے گھر سے آ رہی ہیں؟ وہ پھر بولا۔
• جی! رِدا خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔
• موجود ہیں ثاقب؟
• نہیں!
• اوہ۔ میرا خیال تھا کہ آ چکے ہوں گے، پھر تو وہاں جانا بیکار ہے؟ تصور بولا اور پھر گردن خم کر کے واپس اپنی کار کی طرف مُڑ گیا۔ جیسے واپس جا رہا ہو۔
• تصور... تصور صاحب! رِدا کی آواز کمبخت اُس کا ساتھ نہ دے پا رہی تھی۔
• جی! وہ رُک گیا۔
• آپ مصرُوف ہیں؟
• نہیں فرمائیے؟
• مجھے کچھ وقت دے سکتے ہیں؟
• حاضر ہُوں؟
• اگر مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لیں؟
• لائیے؟ اُس کے انداز میں شوخی پیدا ہوگئی۔ اور رِدا کے ہونٹ بھی مُسکراہٹ کے انداز میں کِھنچ گئے۔
• کوئی ریسٹورنٹ؟ آپ کی پسند سے؟ اُس نے کہا۔
• ہُوں۔ لاروا۔ زیادہ دُور بھی نہیں ہے؟ وہ بولا۔
• آپ راہنمائی کیجئے؟
• بہتر ہے؟ اُس نے کہا اور اپنی کار کا لاک دوبارہ کھول لیا۔ پھر اندر بیٹھ کر اُس نے کار اسٹارٹ کر دی اور رِدا کے اپنی کار میں بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ رِدا نے اپنی کار میں بیٹھ کر ڈرائیور سے کہا۔
"اِس کار کے پیچھے چلو؟
لاروا کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ رِدا کے ڈرائیور نے بھی کار تصور بیگ کی کار کے ساتھ پارک کر دی تھی۔ تصور بیگ نے خود رِدا کی سمت کا دروازہ کھولا تھا۔ اور رِدا شکریہ ادا کر کے نیچے اُتر آئی تھی۔ ویسے اِس مختصر سے سفر کے دوران اُس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ لاروا کے ایک حسین

گوشے میں تصور بیگ نے اُس کے لئے کُرسی کھسکائی اور پھر خود بھی ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کی فرم عُمدہ چل رہی ہے؟" اُس نے کہا۔

"ہاں!"

"آپ نے بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"خاک!" وہ بولی۔

"میرا تو یہی اندازہ ہے۔"

"آپ کے پاس اِن دِنوں باتوں کا اندازہ لگانے کے لئے وقت ہے؟" رُدا کا لہجہ خود بخود شکایتی ہوگیا۔

"فضُول باتوں کا اندازہ لگانے کا وقت تو نہیں ہے، بشرطیکہ وہ فضُول ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔ ویٹر آگیا تھا۔

"چائے یا کافی؟"

"چائے!" تصور نے کہا۔ اور ویٹر چائے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔ رُدا خاموشی سے میز کے ٹاپ سے کھیلنے لگی تھی پھر اُس نے کہا۔

"آپ شادی میں نہیں آئے؟"

"جی ہاں!"

"کیوں؟"

"بس تو نہی، جی نہ چاہا۔"

"سب نے انتظار کیا۔"

"سب سے شرمندہ ہُوں!" اُس نے ہنس کر کہا اور رُدا نے نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا پھر بولی۔

"میں جانتی ہُوں آپ بہت عُمدہ باتیں کرسکتے ہیں اور اِس وقت میں اِن باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکوں گی بتائیے شادی میں کیوں نہیں آئے آپ؟"

"سچ عرض کر رہا ہُوں بس جی نہیں چاہا۔"

"آخر کیوں؟ کیا آپ کا خیال تھا کہ آپ کو صرف رسمی طور پر دعوت نامہ بھیجا گیا تھا؟"

"جی نہیں، یہ خیال تو نہیں تھا میرا لیکن تعین نہیں کر پایا کہ کون میرے نہ پہنچنے سے زیادہ ناراض ہُوا ہے۔ کسی نے بعد میں اِس کا اظہار بھی نہیں کیا بہت سے لوگ نہ آئے ہوں گے۔"

"آپ بہت سے لوگوں میں اور خود میں کوئی فرق نہیں سمجھتے؟" رُدا نے پُوچھا اور تصور بیگ ہنس پڑا۔ اُس نے اِس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ رُدا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اُس سے گفتگو کرے ویسے اُس نے اپنے انداز میں ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں پیدا کی تھی جس سے رُدا کو کوفت ہوتی چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"تصور صاحب! میں آپ کی بہت مقرُوض ہُوں، بہت قرض ہے آپ کا مُجھ پر۔"

"تو واپس کر دیجئے گا۔" وہ بولا۔

"واپس کرنا چاہتی ہُوں۔"

"آپ جب بھی میرا قرض واپس کریں گی میں خوشی سے اُسے وصُول کر لُوں گا۔ ویسے انوکھی بات ہے مس رُدا کہ اِس قرض کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ نہ ہی اِتنا مخیر ہُوں مَیں کہ لوگوں کو قرض دے کر بھُول جاؤں۔ آپ کو شاید کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

رُدا ویٹر کی طرف دیکھنے لگی جس نے چائے کے برتن عُمدگی سے اُن کے سامنے سجا دیئے تھے اُس نے یہ برتن اپنے سامنے سرکا لئے اور پھر تصور سے پُوچھے بغیر اُس کے کپ میں شکر ڈالی۔ چائے بنائی اور اُس کے سامنے سرکا دی اُس نے پیالی اپنے بالکل قریب کرلی تھی اور پھر کپ اُٹھا کر اُس نے چائے کا ایک چھوٹا سا سِپ لیا۔ رُدا کہنے لگی۔

"آپ نے کیا کچھ نہیں کیا میرے لئے تصور صاحب! اُس وقت جب آپ خیر دین کی حیثیت سے احسان احمد صاحب کی کوٹھی میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے، آپ نے کئی بار میری مدد کی ایسے حالات میں جب مَیں بے پناہ اُلجھ گئی تھی۔ اور پھر آپ نے مسلسل اپنا یہ عمل جاری رکھا میں نے آپ سے ثاقب کے سِلسلے میں درخواست کی تو آپ نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جس پر غور کرتی ہُوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے سِلسلے میں کیا فیصلہ کروں؟"

"اگر آپ یقین کریں مس رُدا، تو اِس فیصلے کے بارے میں تو میں بھی جاننا چاہتا ہُوں میں نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف انسانی نُقطۂ نِگاہ سے کیا یہ احساس بار ہا دِل میں اُبھرا کہ آپ کو عِلم ہوگا تو پتہ نہیں آپ کا کیا ردِ عمل ہو؟"

"تصور صاحب! میں اب یہ تو نہ کہوں گی کہ آپ بہت ذہین، بہت چالاک ہیں کیونکہ مجھے عِلم ہو چُکا ہے کہ آپ محکمۂ پولیس کے ایک اعلیٰ عہدیدار ہیں لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے ایک عجیب و غریب کارنامہ سرانجام دیا ہے اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں کہ آپ اِس سِلسلے میں مجھے مفصّل تفصیل بتا دیں تو کیا آپ میری یہ درخواست قبُول کرلیں گے، آپ نے تصور صاحب آپ نے وہ ڈائری ترتیب دے کر یہ ثابت کر دیا کہ آپ

مُجھ سے جیت گئے میں تو اُس وقت تک آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم کرسکی تھی بلکہ سچّی بات تو یہ ہے کہ میں آج بھی آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن آپ نے میری کہانی تحریر کردی اور مجھے بتایا بھی نہیں اور پھر کہانی بھی اِتنی سچ کہ شاید اگر میں خود اُسے اپنے ذہن میں تازہ کرتی تو اِن الفاظ میں تازہ نہ کر پاتی۔"

"اگر یہ میری تعریف ہے تو میں بے حد خوش ہُوں اور اگر مُجھ پر طنز ہے تو آپ یقین کیجئے کہ میری ساری ذہانت چائے کی اِس پیالی میں ڈُوب گئی۔"

"نہیں، طنز بالکل نہیں ہے اب میں آپ پر طنز کرنے کا حق نہیں رکھتی کوئی کِسی پر کتنا ناز کرے آپ نے احسانات کے اِتنے بوجھ لاد دیئے ہیں مُجھ پر کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب بوجھ میں کیسے اُتار سکوں گی میں یہ بوجھ اُتارنا چاہتی ہُوں آپ ہی مُجھ پر ایک اور احسان کرتے ہُوئے اُس کا طریقۂ کار بتا دیجیے۔"

"اُٹھا کر دے مارا آپ نے مجھے زمین پر ایک ہی ایسا سوال کر ڈالا ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔" تصور بیگ نے کہا اور رُدا بے اختیار ہنس پڑی۔

"نہیں میں سچ کہہ رہی ہُوں ایک بات آپ یقین کر لیجئے میں جھُوٹ نہیں بولتی۔ میں آپ کی بہت ممنُون ہُوں آپ نے نہ جانے کیا کیا کر دیا ہے میرے لئے کیا بتاؤں، کیا کہوں آپ سے کتنی بار شُکریہ ادا کروں۔"

"اگر آپ کے پاس وقت ہے تو ایک کے بعد ایک شُکریہ ادا کر دیجئے اب اُس کی تعداد اِتنی بھی نہ ہوگی کہ آپ کا بہت زیادہ وقت صرف ہو جائے، جہاں تک ثاقب کا مسئلہ ہے بلکہ ثاقب صاحب کا تو بات دراصل یہ ہے مس رُدا کہ میں پہلے تو نہیں سمجھا تھا بعد میں جب ثاقب صاحب کی حقیقت معلوم ہُوئی تو اُس کے ساتھ ہی یہ انکشاف میرے لئے باعثِ حیرت تھا کہ وہ آپ کے ڈیڈی ہیں۔ آپ اُن کے ساتھ کتنی ہی نفرت کا سُلوک کرتیں لیکن میں یہ احساس دِل سے نہیں ہٹا سکتا تھا کہ ثاقب آپ کے والد ہیں وہ میرے لئے مُحترم تھے، پہلے تو میرا سُلوک اُن کے ساتھ بہتر نہ رہا لیکن جب پوری کہانی منظرِ عام پر آئی تو پھر میرا رویّہ تبدیل ہوگیا ظاہر ہے اُن کا آپ سے رشتہ تھا بھی ایسا جسے کِسی بھی چیز سے توڑا نہیں جاسکتا۔ مس رُدا میں نے ثاقب صاحب ہی سے آپ کے بارے میں تفصیلات معلوم کی تھیں وہ نشے کے عادی تھے اور میں نے اُنھیں لالچ دے کر اُن کی زبان کھلوائی تھی لیکن اُن کی شخصیت جو نکلی اُس نے مجھے مجبُور کردیا کہ میں اُن کے ساتھ وہ سُلوک کروں جو مجھے کرنا چاہیئے چنانچہ میں نے اُنھیں علاج کی غرض سے اسپتال میں داخل کر دیا اور اِن کا بہترین علاج کرایا۔ یہ علاج کرانے کے بعد ثاقب صاحب کی شخصیت بالکل تبدیل ہوگئی۔ اُن کی کہانی میرے عِلم میں آچکی تھی۔ نشے کا عادی شخص اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے ثاقب صاحب کی شخصیت میں لاآبالی پن تھا اور اِس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے زندگی کبھی سنجیدگی سے گزاری نہیں تھی جو کچھ بھی اُن کا ماضی رہا تھا اُن کی فطرت اُسی ماضی کی دین تھی۔ جہاں تک مُجھ سے ممکن ہو سکا اُن کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اِس سِلسلے میں کچھ لوگوں سے تعاون بھی حاصل کیا جس کا نتیجہ یہ نِکلا کہ ثاقب صاحب کی حالت بہتر ہوگئی، اب وہ کِسی بھی نشہ آور چیز پر لعنت بھیجتے ہیں اور اُن چیزوں کے لئے اُن کے دِل میں نفرت کے سِوا کچھ نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ مس رُدا وہ اپنی زندگی کے اِتنے بڑے کرب کا شکار ہیں کہ شاید آپ اُن کی کیفیت کا تجزیہ نہ کرسکیں آپ یقین ہی نہیں کریں گی، ثاقب صاحب کی ذہنی حالت پر وہ آپ کی والدہ کے سِلسلے میں اِس قدر دِل برداشتہ تھے کہ اُنھوں نے خودکشی تک کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے میں نے اُنھیں ایسا نہ کرنے دیا۔ وہ کہتے تھے کہ کِسی انسان نے کسی محبت کرنے والے انسان کے ساتھ یہ سب کچھ نہ کیا ہوگا جو اُنھوں نے حِنا صاحبہ کے ساتھ کیا۔ نِدا کے ساتھ کیا وہ آپ کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ اپنے آپ کو اِس قابل نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں حسرت و یاس جِس انداز میں کروٹیں لیتی رہتی تھی میں اُس کا صحیح اندازہ لگا رہا تھا اور پھر میرے ذہن میں میرینا کا خیال آیا۔ حِنا تو اِس دُنیا میں نہیں تھیں وہ تو اپنی آرزوؤں کو سمیٹ کر قبر میں جا چکی تھیں لیکن ایک اور عورت تھی جس نے اپنے خسارے کو محسوس کیا تھا۔ ایک بچّہ تھا جو ثاقب ہی کی چیرہ دستیوں کا شکار تھا۔ میں نے دِل میں سوچا مس رُدا کہ آپ کو تو ایک ایسی زندگی مِل گئی ہے کہ آپ اُسے با آسانی گزار سکتی ہیں لیکن وہ بچّہ اور وہ عورت ہمیشہ حسرت و یاس کا شکار رہیں گے چنانچہ کیوں نہ ثاقب کا رُخ اِسی طرف موڑ دیا جائے ہوسکتا ہے حالات کبھی کوئی اور موڑ اختیار کریں۔

ثاقب کی تنہا زندگی بے مقصد تو نہ رہے گی۔ خاص طور سے اِس لئے کہ آپ اُسے معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوتیں اور بالآخر وہ زندگی کھو بیٹھتا۔ میں نے میرینا اور یوسف کو یہاں بُلا لیا اور اُسے ثاقب کے حوالے کر دیا۔ میں نے ثاقب سے کہا کہ یہ اُس کے بُرے اعمال کے کفارے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور وہ ثابت کرے کہ اُس نے جو کچھ کیا اُس پر شرمندہ ہے اور مجھے انتہائی خوشی ہے ندا صاحبہ کہ

ثاقب اب ایک عام دُنیا کا انسان ہے۔ وہ ایک ذمّے دار باپ ہے، ذمّے دار شوہر ہے۔ گو اُس کے دل کی گہرائیوں میں حنا صاحبہ کی یاد مچلتی ہے، میں اچھی طرح جانتا ہُوں کہ ثاقب کے دل میں آپ کی بھی بے پناہ محبت ہے۔ میں نے بارہا اُس سے کہا کہ اگر ممکن ہو سکے تو وہ اپنے طور پر رُدا سے ملاقات کر لے۔ اُس وقت وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر رُدا کے علاوہ کوئی اور بھی شخصیت ہوتی تو میں اُس کے لئے قابلِ معافی تھا۔ مس رُدا میں بھی آپ کی

دِلی واردات جانتا تھا آپ پر جو اثرات مرتب ہُوئے تھے وہ میرے علم سے باہر نہیں تھے، چنانچہ میں نے اِس سلسلے میں خود بھی کوئی ایسا قدم نہ اُٹھایا جس سے آپ کو ذہنی کوفت کا شکار ہونا پڑتا البتہ اب جب یہ بات آپ کے سامنے آ ہی گئی ہے تو میں اپنے ذہن سے بھی ایک بوجھ ہٹانا چاہتا ہُوں براہِ کرم مجھے یہ بتایئے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کے لئے قابلِ قبُول ہے یا نہیں ؟

رُدا خاموشی سے تصوّر بیگ کو دیکھتی رہی پھر اُس نے کہا۔

"تصوّر صاحب! انسانی نقطۂ نگاہ سے آپ نے دو بڑے کام کئے ہیں ایک شخص کو اُس نفرت بھری زندگی سے نجات دِلائی آپ نے جس سے کوئی بھی محبت نہیں کر سکتا اور دوسرے شخص کو زندگی کے عذاب سے نجات دِلا دی۔ نہ سہی میری ماں لیکن ایک اور عورت تو زندگی کا وہ سکوُن پا گئی جو حق کسی اور کا تھا۔ لیکن یہ بہت بہتر ہُوا۔ اور مجھے اِس سے کوئی اختلاف نہیں ہے"

"خُدا کا شکر ہے بہت عرصے سے یہ بوجھ میرے ذہن پر تھا۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو حالانکہ میں جانتا ہُوں کہ آپ بہت اعلیٰ ظرف ہیں اور انسانی نقطۂ نگاہ سے آپ کو بے مثال فطرت کا مالک کہا جا سکتا ہے آپ یقینی طور پر اِس سے اختلاف نہیں کریں گی۔ کیونکہ آپ کی سرشت میں انتقام کا وہ جذبہ نہیں ہے جو عموماً لوگوں میں ہوتا ہے بلکہ آپ نیکی اور رحمدلی کی جانب مائل ہیں تاہم ذرا سی اُلجھن ضرور تھی میرے ذہن میں۔ رُدا گھبرائی ہُوئی نگاہوں سے تصوّر بیگ کو دیکھنے لگی۔ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُس کے یہ الفاظ طنز پر مبنی ہیں یا وہ سادگی سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے لیکن تصوّر بیگ کے چہرے پر اُسے طنز کے آثار نظر نہیں آئے پھر بھی وہ آہستہ سے بولی۔

"آپ کے یہ الفاظ مجھے سخت شرمندہ کر رہے ہیں تصوّر صاحب"

تصوّر نے چونک کر اُسے دیکھا پھر بولا۔

"میں سمجھا نہیں رُدا!" رُدا اُن الفاظ کا کوئی جواب نہیں دے سکی تھی، کچھ دیر خاموشی سے گزر گئی پھر اُس نے کہا۔

"آپ نے وسیم جمال کے سلسلے میں بھی جو کچھ کیا ہے وہ میرے لئے احسان کے مترادف ہے درحقیقت اُس شخص نے مجھے شدید ذہنی بُحران کا شکار کر دیا تھا شاید آپ کو اِس سلسلے میں تفصیلات معلوم نا ہوں۔ اُس دِن ساحلِ سمندر پر وہ مجھے دھوکے سے لے گیا تھا دراصل احسان لمیٹڈ سے اُس کے کچھ کاروباری معاملات چل رہے تھے اور احسان لمیٹڈ کے سلسلے میں مجھے مختلف لوگوں سے ڈیل کرنا ہوتا ہے اُس نے، اُس نے...."

"مجھے اِس کا علم ہو چکا ہے مس رُدا! اور اُس نامعقول شخص کو میں نے درحقیقت ایسی سزا دے دی ہے کہ اب شاید وہ زندگی میں آپ کا تصوّر نہ کر سکے اور اُس کے ساتھ ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ اُس کی بہترین اصلاح ہو جائے میں اُسے اُس کے ناکردہ گناہ کی سزا تو نہیں دِلاؤں گا بس اُسے یہ احساس دِلاؤں گا کہ اُس نے اپنے آپ کو جو کچھ سمجھ رکھا تھا درحقیقت وہ.... وہ نہیں تھا اور مس رُدا ایک سوال میں آپ سے ضرور کروں گا۔ آپ کو اِس بات کا علم کیسے ہُوا کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے"

"اختر کی زبانی۔ ہر چند کہ میں نے آپ کو زحمت دینے کے لئے نہیں کہا تھا بلکہ بس اختر سے اپنی اُلجھن بتائی تھی اُس کے ذہن میں آپ آ گئے"

"ہاں میں جانتا تھا کہ آپ اِتنی ہی خود دار ہیں کہ کم از کم مجھ جیسے شخص سے اپنی کوئی اُلجھن بیان نہیں کر سکتیں"۔ تصوّر بیگ نے کہا اور رُدا ایک بار پھر چونک کر اُسے دیکھنے لگی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے"

"نہ ہوگی۔ بہر طور آپ کی خدمت میرا فرض ہے"

"کیوں؟" رُدا نے سوال کیا۔

"جی وہ میرا مطلب ہے بس عادت پڑ گئی تھی خیر دین کی حیثیت سے"

"مگر میں تصوّر بیگ صاحب، میں تو اُس گھر میں خود ایک مہمان بلکہ مہمان کہنا عجیب سا لگتا ہے یُوں سمجھ لیجئے ایک عجیب سی حیثیت رکھتی تھی۔ میرا تو آپ پر کوئی حق نہیں بنتا تھا"

"پھر بھی آپ مالکان کی مہمان تھیں"

"مگر آپ خیر دین تو نہ تھے" رُدا نے مسکرا کے کہا۔

"اُس وقت تو تھا"

"ارے ہاں آپ یہ بتایئے کہ شہاب صاحب کا مسئلہ کیا ہُوا؟ آپ نے مجھے اِس بارے میں بتایا تھا نا۔ دراصل یہ بات مجھے یُوں یاد آ گئی کہ آپ نے خیر دین کا تذکرہ کیا ہے کیا شہاب صاحب آپ کی

پہنچ سے باہر ہو گئے"

"بدقسمتی سے بہت سے حالات نے غلط فہمیوں کا شکار کر دیا تھا مس رُدا! میں یہ سوچتا تھا کہ کوئی بھی میری پہنچ سے باہر نہیں ہے لیکن بات وہی نکلی، وسیم جمال نے بھی اِسی انداز میں سوچا تھا انسان کہیں نہ کہیں یکساں کمزوری کا شکار رہتا ہے، شہاب صاحب میری پہنچ سے دُور نہیں ہیں بس یُوں سمجھئے کہ بہت جلد میں اُن کے سلسلے میں آپ تمام حضرات کو ایک خوشخبری سُنانا چاہتا ہُوں"

"اوہ۔ میں اِس سے زیادہ آپ سے کچھ پُوچھنے کا حق نہیں رکھتی" رُدا نے کہا اور تصوّر عجیب سے انداز میں مسکرانے لگا۔ دفعتاً رُدا چونک کر بولی۔

"کافی دیر ہو گئی اب اُٹھا جائے یہاں سے"

"جو حکم" رُدا نے ویٹر کو اشارہ کیا اور اُس سے بل طلب کر لیا تصوّر بیگ نے بل کی ادائیگی کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اور یہ بھی اُس کا ایک اچھا انداز تھا جو رُدا کو پسند آیا ہوٹل سے باہر نکلتے ہُوئے اُس نے تصوّر بیگ کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"تصوّر بیگ ایک پُروقار شخصیت کے مالک ہیں لیکن خیر دین نے اپنا ایک الگ مقام بنا لیا تھا نہ جانے کون کون آج بھی اُسے یاد کرتا ہے خاص طور سے دادی اماں۔ میں اِسے آپ کی زیادتی قرار دُوں گی کہ آپ نے اُس کوٹھی سے بالکل ہی رابطہ منقطع کر لیا۔ کبھی آ جایئے، تصوّر بیگ بن کر نہ سہی خیر دین بن کر سہی"

"بہتر ہے جب بھی فرصت ملی حاضر ہو جاؤں گا"

"یہ الفاظ ٹالنے والے ہوتے ہیں"۔ رُدا نے کہا اور تصوّر بیگ عجیب سے انداز میں اُسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"اور یہ دعوت بھی مجھے رسمی ہی لگی ہے مس رُدا معاف کیجئے گا۔ بہر طور یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے کبھی نہ کبھی حاضری ضرور دے دُوں گا اچھا خُدا حافظ" تصوّر بیگ نے کہا اور رُدا کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا پھر اُس نے دروازہ کھول کر کار اسٹارٹ کی اور اِس دوران ایک بار بھی رُدا کی جانب نہیں دیکھا۔ جب کہ رُدا اپنی جگہ کھڑی اُسے جاتے ہُوئے دیکھ رہی تھی تصوّر بیگ کے یہ آخری لمحات اُس کی ذہنی کیفیت کا اظہار کرتے تھے رُدا کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیل گئے لیکن رفتہ رفتہ اُس کی یہ کیفیت مُسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی اپنی کار میں آ بیٹھی اور ڈرائیور سے کوٹھی چلنے کے لئے کہا۔

٭٭٭

عادل حسین صاحب غیر متوقع طور پر احسان احمد کے دفتر پہنچ گئے تھے احسان احمد صاحب بس یُوں ہی سرسری سے کاموں میں مصرُوف تھے عادل حسین کی آمد کی اطلاع پا کر حیران رہ گئے۔ اور پھر اُنھوں نے عادل حسین کا بڑا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔

"بھئی کیا کہا جائے وہ شعر بھی سُوٹ نہیں کرتا کہ...."

"وہ آئیں گھر میں ہمارے" اور شعر نہ گڑبڑ کرنا مجھے کبھی پسند نہیں آیا یعنی اگر میں یہ کہنا چاہُوں کہ وہ آئیں دفتر میں ہمارے خُدا

کی قدرت ہے ، تو دفتر اور گھر کا فرق نمایاں ہے۔ خواہ مخواہ شاعر کی رُوح ناراض ہوگی ،،

" بہت خوش نظر آ رہے ہو کیا بات ہے ؟

" بھئی غیر متوقع طور پر کوئی جگری دوست اچانک آ جائے تو کیا خوشی کی بات نہیں ہے۔ آؤ بیٹھو پہلے یہ بتاؤ کوئی کام ہے یا ایسے ہی نکل آئے ہو ؟"

" میاں احسان احمد صاحب بلکہ احسان لمیٹڈ اب ہم بھی اِتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ ہمیں اِن دفتری اوقات میں بھی فرصت ہو کوئی ضرورت ہی ہمیں تمہارے پاس لے آئی ہے ،،

" تو پھر ساری باتوں سے پہلے وہ ضرورت بیان کر دو۔ تاکہ میرے ذہن میں اُلجھن باقی نہ رہے ،،

" کمال کی بات ہے نہ خاطر نہ مدارات یہ دفتر ہے۔ میاں پہلے کچھ منگاؤ پھر پلاؤ ذرا سکون کی سانس لیں تو آمد کی وجہ بھی بیان کریں۔ سانس چڑھا ہُوا ہے اور تھکن بدن پر سوار ہے۔ اور آپ فوراً کام کے چکر میں پڑ گئے ،،

" اِس کا مقصد ہے کہ خیریت تو ہے نا ،، احسان احمد نے کہا۔

" بالکل خیریت ہے اللہ کا احسان ہے تم کیا سمجھتے ہو ہمیں ،،

" کچھ نہیں سمجھتا۔ اب یہ فرمائیے کیا پینا پسند کریں گے ؟"

" میاں جوانی میں کچھ نہیں پیا تو اب کیا پسند اور ناپسند کا مسئلہ ہے بس چائے منگوالو سیدھی سادی ،، عادل حسین نے کہا۔ اور احسان احمد صاحب نے انٹرکام پر چائے کے لئے کہہ دیا۔ وہ کافی مسرور نظر آ رہے تھے پھر اُنھوں نے کہا۔

" اب بتاؤ کیا صورتِ حال ہے ؟"

" چائے کے بعد۔ تم یہ بتاؤ کسی ضروری کام میں مصروف تھے ،،

" کوئی ضروری کام نہیں ہے۔ بالکل آرام سے ہوں چائے جلدی آ جائے تو اچھا ہے ،،

" عجب بے صبرے انسان ہو۔ خیر چلو تم بھی کیا یاد کرو گے ، تمہاری ذہنی اُلجھن دُور کئے دیتے ہیں۔ بھئی بات دراصل یہ ہے کہ اب شیر کے مُنہ خون لگ گیا ہے کیا شادی تھی لُطف آ گیا بس دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ لمحات ختم ہوں میری مُراد اقبال میاں اور عصمت کی شادی سے تھی واقعی احسان انسان عجیب و غریب شئے ہے۔ زندگی کے مدارج کس طرح طے کرتا ہے ، بچپن فکروں سے بے نیاز ، کھیل کود۔ والدین کی جانب سے تعلیم کا بوجھ ، ڈنڈا اور اُس کے بعد تعلیم اور پھر تعلیم کے حصول کے بعد خواہ مخواہ دُنیا ، سماج ، معاشرہ ، ضرورت ذہن پر سوار ، پھر اُن سب کو پسِ پُشت ڈال کر شادی ، شادی کے بعد بیگم کے نخرے اور اُس کے بعد بچّوں کی فکر یہ ساری چیزیں خود بخود انسان کی زندگی میں شامل ہوتی جاتی ہیں اور پُر لطف بات یہ ہے کہ اِن میں سے کوئی بھی چیز بُری نہیں لگتی۔ عمر کا ایک حصہ گزر جاتا ہے ، بچّے بڑے ہو جاتے ہیں تو فکر پیدا ہو جاتی ہے کہ بچّوں کی شادی کی جائے حالانکہ مسئلہ خالص اُن لوگوں کا ہوتا ہے جنھیں شادی کرنی ہے ، گھر بسانا ہے اور معاشرتی اور سماجی مسائل حل کرنے ہیں لیکن وہ ذِمّہ داری جو تقدیر میں لکھی ہُوئی ہے اب فِطرت میں رچی ہُوئی ہے بھلا کہاں ساتھ چھوڑتی ہے اور یہ مرجی بھی یہی چاہتا ہے کہ اپنی ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہو جایا جائے ، شادی کے یہ چند روز یقین کرو اتنے پُرکشش تھے کہ دل ہی نہ چاہتا تھا کہ یہ لمحات ختم ہوں۔ مگر ابھی کافی کارڈ ہیں ہمارے ہاتھ میں کیوں نہ انھیں استعمال کیا جائے اور وہ دِن پھر سے واپس لے آئے جائیں ،، احسان احمد صاحب عادل حسین کی گفتگو کا مطلب سمجھ رہے تھے اِتنی دیر میں چائے آ گئی اور دونوں کے سامنے سرو کر دی گئی۔ عادل حسین نے چائے کے کئی گھونٹ لئے اور پھر مطمئن انداز میں گردن ہلا کر بولے۔

" اِس کی مٹھاس بتاتی ہے کہ بات کرنے کا یہ وقت ناموزوں نہیں ہے ،، احسان احمد صاحب نے اپنی پیالی اُٹھالی اور آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگے تو عادل حسین غرّا کر بولے۔

" تمہاری خاموشی بتاتی ہے کہ اصل صُورتِ حال کو سمجھ گئے ہو۔ اِس لئے شانِ بے اعتنائی سے کام لے رہے ہو۔ مگر ایک بات پر غور کرو میاں احسان احمد سنو یہ دفتر ہے اور یہاں گھریلو تکلّفات نہیں چلتے میں دفتر اِسی لئے آیا ہُوں کہ اپنے دوست احسان احمد سے مشورہ کروں اور اُس کے بعد اپنے ہونے والے سمدھی احسان احمد کے گھر جا کر اُن سے تفصیلی بات کروں ،، احسان احمد ہنسنے لگے پھر بولے۔

" اِتنی لمبی تمہید تو فسانۂ عجائب میں بھی نہ باندھی گئی تھی ،،

" ارے تو یہاں کون اصل بات کہنے سے گھبرا رہا ہے اور تمہید کا سہارا لے رہا ہے بات دراصل یہ ہے کہ اب ثنا بیٹی بہت دِن تمہارے ہاں رہ لی ، ہماری امانت ہمیں دے دو بھائی بس اِس سلسلے میں بات کرنے حاضر ہُوئے تھے ،،

" آج ہی بُلا لیجئے بلکہ یہیں سے ٹیلی فون کر دیجئے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے امانت بہرحال امانت ہوتی ہے ،،

" خُدا تمہیں خوش رکھے کیا دِل لگتی بات کہی ہے ، بہرطور ایک معزز شخص کی معزز بیٹی کو بڑے اعزاز کے ساتھ ہم اپنے گھر لانا چاہتے ہیں اور اِس سلسلے میں اپنے دوست احسان احمد سے مشورہ کرنے آئے ہیں۔ یار احسان احمد واقعی اب میں مکمل طور پر سنجیدہ ہُوں۔

خالد نے ماشاء اللہ فرم کے تمام معاملات سنبھال لئے اور باعمل شخصیت کا مالک بن گیا ہے چنانچہ اِس سلسلے کو اب کر ڈالنا چاہئیے ،،

" عادل حسین بھائی میں نے آپ سے کب انکار کیا ہے۔ مجھے بھی اگر اِس سلسلے میں کوئی مشورہ کرنا ہوتا تو آپ کے علاوہ کس سے کرتا اگر آپ یہ بہتر سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ جو حکم دیں گے اُس کے مطابق عمل کر لیا جائے گا ،،

" جی چاہتا ہے کہ تمہارے گلے سے لپٹ جاؤں ، اِس خوشی میں ، ویسے اُمید یہی تھی کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ بہت بہت شکریہ تو پھر اب ہم باقاعدہ کارروائیوں کا آغاز کئے دیتے ہیں ،، احسان احمد صاحب مُسکراتے رہے تھے پھر دفعتاً اُنھیں کوئی خیال آیا اور وہ چونک کر بولے۔

" یہ مسئلہ تو میرا خیال ہے تمہاری خوشی کے مطابق حل ہُوا۔ اب میں ذرا تم سے کچھ اور گفتگو بھی کرنا چاہتا ہُوں ،،

" ارشاد ، ارشاد ،، عادل حسین نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

" خالد کو تم باعمل کہہ رہے ہو میرا خیال ہے جِتنا کچھ خالد کرتا ہے اِتنا ہی اختر بھی ، اختر کی طرف سے آنکھیں کیوں بند کر لی ہیں ،،

" مُنہ کی بات چھین لی تم نے یقین کرو اِس کے بعد ہی گفتگو شروع کرنا چاہتا تھا ظاہر ہے اختر کا مسئلہ بھی ماشاء اللہ تیار ہی ہے خواہ مخواہ میں نہیں چاہتا کہ ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے شکایت ہو ایک شادی شُدہ ہو جائے اور دوسرا مُنہ دیکھتا رہ جائے مگر یہ بتاؤ اختر کے لئے کرنا کیا ہے کوئی بات ذہن میں ہے ،،

" کیوں نہیں ، احسان احمد نے کہا۔

" اماں تمہیں واللہ۔ اگر ایسی بات ہے تو ذرا جلدی سے اُگل دو تاکہ میرا تجسس شِدّت نہ اختیار کر جائے ،،

" پُورے اعتماد اور پُورے سکون کے ساتھ میں غلام احمد کی دوسری بیٹی نُدرت کا نام لیتا ہُوں۔ اختر کے لئے نہایت موزوں ہے ، اور مجھے پُورا پُورا یقین ہے کہ تمہیں بھی اِس پر اعتراض نہیں ہوگا ،، عادل حسین صاحب کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا تھا وہ متعجبانہ انداز میں احسان احمد کا چہرہ دیکھتے رہے تو احسان احمد نے کہا۔

" دیکھو عادل حسین میرے جذبات سے واقف ہو تم اچھی طرح کوئی ایسی بات نہ کہہ دینا جس سے دِل کو ٹھیس لگے ، غلام احمد کی حیثیت کے بارے میں بارہا تمہیں بتا چکا ہُوں اور پھر صاحبِ حیثیت وہی ہوتا ہے ، جو صاحبِ عزّت ہو۔ غلام احمد جیسا فرشتہ صفت انسان شاید ہی اِس روئے زمین پر دوسرا کوئی ہو۔ ایثار و وفا کی یہ تصویر میرے سارے وجود پر مسلّط ہے اور خُدا کی قسم اُس کی شخصیت کے بارے میں ہلکا تصوّر تک اپنے دِل میں برداشت نہیں کر سکوں گا ،،

" کیا پاگل پن کی باتیں کر رہے ہو۔ کون نالائق کوئی اُلٹی سیدھی بات سوچ رہا ہے۔ میں تو بس اِس بات پر حیران ہُوں کہ خود میری کھوپڑی اِتنی ناکارہ کیوں ہے ، یہ بات خود میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی اور تمہیں کہنا پڑی ،، احسان احمد کا چہرہ خوشی سے کِھل گیا تھا کہنے لگے۔

" اپنے کوڑھ مغز ہونے کا اعتراف کر لو عادل حسین ، بُوڑھے ہو چکے ہو ہم سے ہلو جوان دِلوں کی قربت میں رہتے ہیں اور ہماری جوانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ، کیا سمجھے ،،

" گویا ، گویا کچھ اور بھی انکشاف کرنا چاہتے ہو ،،

" لعنت ہے چھچھوری باتیں کرنے والے پر انکشاف سے تمہاری کیا مُراد ہے کیا عشق و محبت کی کوئی کہانی سُننا چاہتے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن تاڑنے والے قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ ہم پوری پوری بینائی روشن رکھتے ہیں اور یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کہاں ایک دوسرے کے لئے دِل میں عزّت ، محبت اور پسندیدگی پائی جاتی ہے۔ نُدرت بہت پیاری بچّی ہے۔ بس ملکہ شر بیر۔ اور اختر کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اِن دونوں کی یگانگت کا بخوبی جائزہ لیا ہے میں نے اور بہت دِن پہلے دِل ہی دِل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی وقت تم سے اِس کا تذکرہ کروں گا ،،

" اماں احمق صاحب ! مجھ سے تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی خود ہی اِس سلسلے میں آغاز کر دیتے۔ بہرطور اب تذکرہ کر چکے ہو تو میں خلوصِ دِل سے اِس رشتے کے لئے تیار ہُوں بلکہ تمہارا ممنون ہُوں کہ تم نے میری توجہ اِس طرف دِلائی بلاشُبہ غلام احمد کی دونوں بچّیاں قابلِ فخر بہو بننے کے قابل ہیں اور میں اِسے اپنی خوش بختی تصوّر کروں گا لیکن احسان احمد غلام احمد بھی بخوشی تیار ہو جائیں گے اِس کے لئے ،،

" بس اب یہ بات شروع ہو گئی ہے تو آج ہی غلام احمد سے بھی بات کرلوں گا اِس موضوع پر ،،

" کیا خیال ہے شام کو مٹھائی لے کر پہنچ جاؤں ؟"

" نہیں بھائی ابھی نہیں اِتنی جلد بازی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ذرا غلام احمد سے بات تو کر لوں اُس کے بعد ہی تمہیں اِس سلسلے میں کوئی جواب دُوں گا۔ ویسے تمہاری اجازت ہے نا ،،

" اجازت۔ میں کہتا ہُوں میری خواہش ہے یہ ، بہت ہی خوشی ہوگی اگر یہ مسئلہ اِس انداز میں ہو جائے ،،

" ٹھیک ہے اور کچھ ؟"

• نہیں نہیں اب ہم پھر پہلے موضوع پر آجاتے ہیں۔ ذرا یہ بتاؤ کہ خالد اور ثناء کے مسئلے کو کب تک حل کر لیا جائے؟

• چند روز گزار لینے میں اگر کوئی حرج نہ ہو تو گزار لو غلام احمد سے بات کر لیں کیوں نہ پھر ان دونوں سلسلوں میں کام شروع کر دیا جائے۔

• تمہارا مطلب ہے اختر اور خالد کی شادی ایک ساتھ ہو جائے۔

• ہو جائے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے ورنہ کم از کم یہ تو ہو کہ ایک چھوٹی سی تقریب اس سلسلے میں بھی ہو جائے۔ کم از کم منگنی کی صورت میں ہی سہی۔

• ہوں! بھئی میں تو اس سلسلے میں بہت زیادہ تجربہ نہیں رکھتا نہ ہی کوئی واقفیت ہے مجھے اب جیسا تم مناسب سمجھو کرو یوں سمجھ لو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ عادل حسین نے کہا اور احسان احمد گردن ہلانے لگے کافی دیر تک دونوں دوست بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے پھر عادل حسین شام کو ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے اور احسان احمد مسکراتے رہے ردا سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تھی اور احسان احمد کو اچانک ہی عادل حسین کی آمد پر یہ سب کچھ یاد آگیا تھا بہرحال فوراً ہی انھوں نے ردا کو طلب کر لیا اور تھوڑی دیر کے بعد ردا ان کے پاس پہنچ گئی۔

• تشریف رکھیئے منیجر صاحب آپ نے نہ جانے کون کون سے شعبے سنبھال لئے ہیں ہمارے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ہم اس دفتر میں بیٹھ کر کیا کریں"۔ ردا مسکرا دی۔ احسان احمد بولے۔

• ردا بیٹی تمہارے حکم کے مطابق میں نے دوسرے سلسلے میں بھی کام شروع کر دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے عادل حسین صاحب اٹھ کر گئے ہیں خالد اور ثناء کی شادی کا تقاضہ کرنے آئے تھے۔ میں بھی یہ سوچتا ہوں کہ فرائض جس قدر ادا ہو جائیں اچھا ہوتا ہے عمر کا کیا بھروسہ بیٹی والا تھا اس لئے انتظار کرنا بھی ضروری تھا ورنہ بیٹے والا ہوتا تو اب تک کبھی کا عادل حسین سے کہہ چکا ہوتا کہ بھئی اس فرض سے بھی سبکدوش کر دو۔

" عادل حسین صاحب تشریف لائے تھے؟

• ابھی ابھی تو اٹھ کر گئے ہیں مشورہ کرنے آئے تھے خالد اور ثناء سلسلے میں ایک دوست کی حیثیت سے میں نے کہا کہ ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن محترمہ ردا وہ شہنشاہی پروگرام درہم برہم ہو گئے ہو سکتا ہے ہمیں فوراً ہی اس سلسلے میں کام شروع کر دینا پڑے۔

• تو حرج کیا ہے آخر آپ کا کہنا بالکل درست ہے خدا لوند عالم آپ کو زندہ سلامت رکھے لیکن جہاں تک فرائض کی ادائیگی کا معاملہ ہے وہ واقعی جس قدر جلد ادا ہو جائیں کوئی حرج نہیں ہوتا۔

• دوسرا سلسلہ نہیں پوچھا تم نے کہ کیا ہے؟

• جی... جی انتظار کر رہی تھی کہ آپ خود ہی بتا دیں گے۔

• میں نے اختر اور ندرت کا تذکرہ بھی چھیڑ دیا۔ احسان احمد بولے اور ردا چونک پڑی۔

• واقعی؟ اس نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

• ہاں، اور مزید مسرت کی بات یہ ہے کہ عادل حسین خلوصِ دل سے تیار ہو گئے۔

• ویری گڈ۔ ویری گڈ، واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے،

• اب یہ بتاؤ غلام احمد سے کس انداز میں بات کی جائے۔

• کیوں اس میں حرج کیا ہے آپ براہِ راست غلام احمد صاحب سے بات کر لیں۔ میرا تو خیال ہے انھیں اعتراض نہیں ہوگا۔ احسان احمد پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگے تھے پھر وہ ردا سے صلاح و مشورے کرتے رہے اور اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ آج ہی گھر پر غلام احمد صاحب سے اس موضوع پر بات کریں گے اور پھر دفتر سے واپس گھر پہنچے تو سیدھے غلام احمد صاحب کے ساتھ ان کے کوارٹر میں داخل ہو گئے۔ حالانکہ غلام احمد دفتر سے ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔ راستے میں کوئی بات نہیں کی تھی احسان احمد صاحب نے البتہ جب وہ غلام احمد صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہوئے تو غلام احمد حیران رہ گئے۔

• بھئی معاف کرنا غلام احمد آج کل ہم سب لوگ کافی ڈرامائی ہو گئے ہیں زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں کوئی نہ کوئی ڈرامہ کرنا پڑتا ہے اس وقت میں بھی کچھ ایسی ہی حیثیت اختیار کر گیا ہوں، دراصل تم سے کچھ بات کرنی ہے دفتر میں یا راستے میں میں نے یہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا چونکہ آداب کے خلاف ہے اور بے اصولی کی بات ہے"۔ غلام احمد صاحب مسکرانے لگے پھر بولے۔

• آپ نے بلاوجہ تکلف کیا احسان احمد صاحب، تشریف لائیے حکم فرمائیے۔

• اب دیکھو اس وقت نہ تو دفتری اوقات ہیں اور نہ ہی کوئی ہمارے آس پاس موجود ہے جو تم بھی یہ ڈرامہ جاری رکھو، ٹھیک ٹھاک ہو کر بیٹھو بہت ہی اہم موضوع پر بات کرنی ہے۔

• میں حاضر ہوں"۔ غلام احمد صاحب مسکرا کر بولے۔

• بھئی ماشاءاللہ عصمت اقبال میاں کے ساتھ خوش و خرم ہے اس کا اندازہ ہے تمہیں غلام احمد۔

• جی ہاں! خدا نے مجھ پر بہت بڑا کرم کیا ہے، بیٹیاں صحیح جگہ پہنچ جائیں تو ماں باپ کی خوشی سچی عروج پر ہوتی ہے میں اس سلسلے میں بہت مسرور ہوں اور پھر آپ کی محبت اور عادل حسین کا تعاون۔

• بس... بس بس، تم تو مجھ سے بھی بڑے ڈرامہ باز ہو۔ میں ندرت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا تم سے۔

• جی فرمائیے؟ غلام احمد نے کسی قدر تعجب سے کہا۔

• کیوں نہ ہم ندرت کی شادی بھی کر دیں؟ احسان احمد بولے اور غلام احمد بے اختیار مسکرا دیئے۔

• ضرور کر دیجیے میں نے کب انکار کیا ہے،

• میں نے ندرت کے لئے لڑکا تلاش کر لیا ہے۔

• یقیناً وہ بہتر ہوگا"۔ غلام احمد نے جواب دیا۔

• غلام احمد تمہیں خدا کا واسطہ جو کچھ کہنا سچے دل سے اور دل کی گہرائیوں سے کہنا، تکلف، محبت احترام بہت اچھی چیزیں ہیں۔ اور انسانی فطرت کا خاصہ ہیں لیکن بعض اہم معاملات میں دل کی گہرائیوں سے بات کرنی چاہیئے، یہ ضروری ہوتا ہے، دراصل ندرت کے لئے میں نے اختر کا انتخاب کیا ہے عادل حسین کے چھوٹے بیٹے اختر کا، تم جانتے ہو کہ خالد کا مسئلہ ثناء سے طے ہے میں چاہتا ہوں کہ ندرت کو اختر سے منسوب کر دیا جائے"۔ غلام احمد کا منہ ایک لمحے کے لئے حیرت سے کھلا اور پھر بند ہو گیا وہ عجیب سی نگاہوں سے احسان احمد کو دیکھنے لگے تھے پھر انھوں نے آہستہ سے کہا۔

" احسان احمد صاحب کیا یہ مناسب ہوگا؟

" اس کا فیصلہ صرف اور صرف تم کرو گے غلام احمد۔

" اگر مجھے یہ ضمانت دی جائے کہ آپ میرے الفاظ پر ناراض نہیں ہوں گے تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

• ضمانت دی جاتی ہے"۔ احسان احمد بولے۔

• کیا یہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہ ہوگا، احسان احمد صاحب میری اور آپ کی حیثیت میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ میں، میرا مطلب ہے میں... میں... کیا میں یہ گوارہ کر سکتا ہوں کہ جس گھر ثناء بی جائیں وہاں میری بیٹی بھی چلی جائے۔

" خوب حیثیتوں کے فرق کی بات کر رہے ہو غلام احمد کیوں یہی بات ہے نا؟" احسان احمد کے تیکھے انداز پر غلام احمد جلدی سے سنبھل گئے اور پھر بولے۔

• نہیں، نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔

• پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟

• اب کیا عرض کروں؟

• میاں عرض کیا کرو گے، سن لو جو سننا چاہتے ہو اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ عادل حسین کا گھر بہت بڑا ہے اور وہاں ثناء جا رہی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ بڑا گھر ہے اور میں ثناء کو بڑی خوشی کے ساتھ اس گھر میں بھیج رہا ہوں لیکن جہاں تک میری حیثیت کا تعلق ہے وہ تو تمہاری مرہونِ منت ہے میں تو کچھ نہ ہوتا ایسے حالات میں۔ میں یہ کیسے سوچ سکتا ہوں کہ تم میری بیٹی کا مقابلہ نہ کر سکو۔ سنو غلام احمد بات دراصل یہ نہیں ہوتی کہ کون مالی اعتبار سے کتنا مضبوط ہے اگر یہ سوچا جائے تو میں بے حد کمزور انسان ہوں میرے پاس رکھا ہی کیا ہے، اگر خاندانی اصولوں کی بات کی جائے تو غلام احمد تم نے اپنی برتری بھی ثابت کر دی ہے جو شخص اخلاقی طور پر اتنا عظیم ہو اس کے خاندان کا تعین اس کی شخصیت سے کیا جا سکتا ہے۔ عادل حسین سے یہ بات ہوئی تھی اور عادل حسین نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ اگر ندرت ان کے گھر آجائے تو اس سے زیادہ قابلِ فخر بات ان کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی انھوں نے مجھے اختیارات دیئے ہیں کہ میں تم سے بات کروں چنانچہ اگر تم اس کی اجازت دینا چاہو تو میرے لئے باعثِ مسرت ہوگی۔ غلام احمد صاحب کی گردن جھکی ہوئی تھی انھوں نے آہستہ سے کہا۔

" شاید میں نے ہی غلط طریقۂ گفتگو اختیار کیا تھا احسان بھائی آپ نے احسان کرنے میں ابتداء کی تھی اور اس وقت مجھے سہارا دیا تھا جب میں بے بس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا میرے پاس اپنی عزت بچانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا آپ نے میری عزت کا تحفظ کیا احسان احمد صاحب اور عزت کی قیمت لگا دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو تحفظ آپ نے مجھے دیا اس کے سامنے میرا حقیر سا نذرانہ بے وقعت ہے آپ کبھی اس کا مقابلہ اس سے نہ کیجئے گا۔ بہرطور جو کچھ آپ نے سوچا وہ میرے لئے اس لئے باعثِ تردد تھا کہ یہ میرے مقام سے بہت بڑھ کر بات تھی۔ تاہم اگر آپ اسے بہتر سمجھتے ہیں تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے"۔

• گویا تمہاری طرف سے اجازت ہے؟

• جی احسان احمد بھائی، آپ میرے شانوں سے جیتے جی بوجھ ہلکے کر رہے ہیں اس کا احسان میں کبھی نہ اتار سکوں گا۔ غلام احمد

نے کہا اور احسان احمد خوش خوش وہاں سے رُخصت ہو گئے۔

اُس شام عادل حسین کے اہلِ خاندان کو یہاں آنا تھا اِس لئے شام کا اہتمام ہونے لگا احسان احمد نے یہ بات ابھی بالکل صیغۂ راز میں رہنے دی تھی اور اِس سلسلے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ شام کی تفریحات معمول کے مطابق رہیں تمام لوگ اُسی طرح ہنستے بولتے رہے تھے البتہ عادل حسین صاحب نے موقع پاتے ہی احسان احمد کو جالیا۔

• میاں کیا الگ الگ پھر رہے ہو یعنی ہمارے ذہن میں تجسس کا طوفان جگا دیا اور اُس کے بعد یہ شانِ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے کچھ کہو تو سہی غلام احمد سے بات ہُوئی ؟

• جس کام کا آغاز احسان احمد کریں وہ نامکمل رہ جائے کل آپ کے ہاں آنا ہے ہمیں لیکن پروگرام میں تبدیلی کا اعلان کل ہی کیا جائے گا اور آپ ہمارے ہاں آئیں گے مٹھائی وغیرہ لے کر، پیغام لے کر ؟

• اماں واللہ واقعی بات ہو گئی ؟

• مجھے پہلے بھی یقین تھا غلام احمد کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے ویسے بھی وہ جس قسم کے آدمی ہیں آپ جانتے ہیں ؟

• یار اجازت دو تو ذرا غلام احمد سے گلے مِل لُوں دُو دُو سمدھی ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں ؟

• جی نہیں ایسی کوئی اجازت آج نہیں دی جا سکتی یہ کام کل پر ملتوی کر دیجئے گا۔ ویسے یہ بتاؤ اقبال وغیرہ کو اِس سلسلے میں تفصیلات بتائیں ؟

• نہیں بھئی تمہارا خوف تھا کہیں تمھیں اعتراض نہ ہو اِس لئے ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا۔

• آج ہی رات تذکرہ کر دینا اور یہ ہدایت بھی کر دینا کہ کل دِن میں کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سارے کام اچانک ہی کئے جائیں گے ؟

• تعمیلِ حکم ہو گی ؟ عادل حسین نے کہا وہ خود بھی بہت مسرور نظر آ رہے تھے اور جب رات کو وہ واپس اپنے گھر پہنچے تو اُن سے ضبط نہ ہو سکا سُلطانہ بیگم، ابراہیم صمدانی، عصمت اور اقبال وغیرہ کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا صرف خالد کو بُلایا گیا تھا اور اختر کو خصوصی طور پر ایک کام سے روانہ کر دیا گیا تھا اجمل میاں تو خیر تھے ہی گھر کے فرد۔ یہ مجلسِ مشاورت عادل حسین صاحب کے کمرے میں ہُوئی تمام ہی لوگ حیران تھے کہ عادل حسین صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں اُنھوں نے کہا۔

• معزز حاضرین کی آمد پر میں اُن کا دلی شکر گزار ہُوں ایک اہم مسئلہ زیرِ غور تھا جس میں آپ کی رائے لینا انتہائی ضروری تصوّر کیا تھا میں نے اور اِسی لئے میں نے آپ تمام حضرات کو یہاں زحمت دی ہے ؟ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی عادل حسین صاحب نے کہا۔

• دراصل احسان احمد صاحب سے خالد میاں کے سلسلے میں آخری گفتگو کرنا چاہتا تھا میری خواہش ہے کہ اب خالد میاں کے سر پر سہرا باندھ دُوں چنانچہ احسان احمد صاحب نے میری پسند کے مطابق یہ بات منظور کر لی اور مجھے اجازت دی کہ میں جو بھی تاریخ مناسب سمجھوں طے کر لوں اِس سلسلے میں بھی آپ لوگوں سے مشورہ درکار ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ ہی ایک اور اہم مسئلہ زیرِ غور آیا وہ تھا اختر کی شادی کا۔ اختر کے لئے مجھے کسی بہتر رشتے کی تلاش تھی میری نِگاہ بار بار ایک شخصیت پر پڑ رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا اظہار کیسے کروں بہرحال ہمت کر کے احسان احمد ہی سے اِس سلسلے میں اظہار کیا اور اُنھوں نے میری مشکل حل کر دی وہ شخصیت کون ہے اِس کے بارے میں آپ لوگوں کو یقیناً تجسس ہو گا لیکن میں اِس تجسس کو برقرار نہیں رکھوں گا۔ میں نے غلام احمد کی دوسری بیٹی نُدرت کا انتخاب کیا ہے اختر کے لئے ؟

تمام لوگ چونک پڑے تھے عصمت کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا تھا۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا اعزاز تھا اُس کے لئے، اقبال سے تو خیر اُس کی بچپن ہی سے منسُوبیت تھی اور ابراہیم صمدانی بالکل ایک الگ شخصیت کے مالک تھے لیکن نُدرت اختر سے منسُوب ہو جائے اور اِسی گھر میں آ جائے عصمت کے لئے یہ بات سب سے زیادہ باعثِ خوشی تھی، اُس کی زبان بند ہو گئی تھی۔

عادل حسین صاحب ایک ایک سے رائے لے رہے تھے۔ ابراہیم صمدانی، سُلطانہ بیگم یہاں تک کہ خالد صاحب نے بھی اِس سلسلے میں ووٹ دیئے اور اجمل میاں حیرانی سے مُنہ پھاڑے ایک ایک کی صُورت دیکھتے رہے شاید وہ بھی کوئی رائے دینا چاہتے تھے، لیکن اُن کی زبان نہ کُھل سکی۔ تمام لوگوں نے یہ بات خوشی کے ساتھ منظور کر لی کہ نُدرت کے لئے اختر کا رشتہ دے دیا جائے۔ اور پھر عادل حسین نے اُنھیں بتایا کہ کل اصُولی طور پر جانے کی پارٹی اُن کے ہاں ہونی ہے لیکن کل یہ نہیں ہو گا بلکہ سب ہی لوگ وہاں جائیں گے، اور مٹھائی وغیرہ لے کر جائیں گے، سب نے خوشی کا اظہار کیا تھا البتہ جب یہ محفل برخاست ہو گئی تو اجمل میاں نے متحیرانہ انداز میں خالد سے کہا۔

• وہ خالد بھائی جان ایک سوال کرنا چاہتا ہُوں آپ سے ؟

• ارشاد، ارشاد ؟

• نہیں ارشاد صاحب نہیں، میں کرنا چاہتا ہُوں یہ سوال آپ سے ؟

• او ہو آپ، اچھا اچھا فرمایئے ؟

• یہ نُدرت جو ہیں ناں یہ وہی آپا بھائی جان ہیں ناں ؟

• جی ہاں آپ کی آپا بھائی جان ؟

• اور وہ نسبت میرا مطلب ہے جو باتیں چچا میاں فرما رہے تھے وہ کیا تھی ؟

• اختر کی شادی نُدرت کے ساتھ طے کرنے کا پروگرام بنا لیا گیا ہے ؟

• آپا بھائی جان ؟ اجمل میاں نے ایک دِلدوز چیخ ماری. اور خالد کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔

• ارے ارے خیریت، کیا ہُوا آپ کو ؟

• نہیں آپا بھائی جان، آپا بھائی جان میرا مطلب ہے آپا بھائی جان سے تو پُوچھ لیا جائے اِس سلسلے میں ؟

• اجمل بھائی جان! آپ کی آپا بھائی جان خوشی سے اِس بات کے لئے تیار ہیں ؟

• دھوکا، یہاں ہر شخص دھوکے باز ہے ہر شخص مجھے دھوکا دیتا ہے آپا بھائی جان تم... میں نے تو اُن کے لئے زور و رقص بھی کیا تھا پھر اُنھیں کیا ہو گیا ؟

• اجمل میاں قصہ کیا ہے ؟ خالد نے پُوچھا لیکن اجمل میاں اپنے چہرے پر غم کے تاثرات سجائے وہاں سے باہر چلے گئے۔ خالد مسکراتی نِگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا تھا پھر اختر واپس آ گیا۔ اور خالد سے صبر نہ ہو سکا اُس نے اختر کو یہ خوشخبری سُنائی اور اختر اُچھل کر پلنگ کے سرہانے پر چڑھ گیا پھر وہاں سے سامنے والی میز پر اور اُس کے بعد وہ کمرے میں دیر تک ناچتا رہا تھا۔

• او بے وقُوف کیا حماقت کر رہا ہے۔ کوئی آ گیا تو تجھے پاگل ہی کہے گا اور سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا ؟

• آہ خالد بھائی جان! کاش میں اِس وقت آپ کا مُنہ میٹھا کرا سکتا ؟

• اچھا فضُول باتوں سے گریز کرو۔ کل کے لئے تیاریاں کرنی ہیں. ڈیڈی نے کہا ہے کہ کل مٹھائی وغیرہ لے کر جانا ہے ؟ اختر نے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھُپا لیا۔ اور شرمانے کی اداکاری کرنے لگا۔ خالد کا قہقہہ فضا میں بلند ہو گیا تھا اُسی وقت اقبال اور عصمت بھی دروازہ کھول کر بغیر اجازت لئے ہُوئے اندر آ گئے اور دونوں چونک کر اُنھیں دیکھنے لگے۔

• ارے ارے یہ کک... کیا بھئی کم از کم... ؟ خالد نے کہا.

• بے کار باتیں نہ کیجئے جناب خالد صاحب! مٹھائی کہاں ہے ؟ عِصمت نے کہا.

• کیسی مٹھائی بھابی جان! کچھ پتہ تو چلے ؟

• انجان بننے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ اختر اختر صاحب ایک ایک حرکت کا بدلہ نہ لے لیا تو میرا نام بھی عصمت نہیں ہے ؟

• کمال ہے یہ اچانک ہی آپ پر بیگانگی کا دورہ کیسے پڑ گیا محترمہ بھابی جان ؟ اختر نے کہا.

• بس بچّو اب پھنسے ہو میرے شکنجے میں اب صرف بھابی جان ہی نہیں ہُوں تمہاری بڑی باجی بھی ہُوں باجی کہنا پڑے گا مجھے ؟

• ہی ہی ہی ؟ اختر نے پھر اُسی طرح شرمانے کی اداکاری کی اور اقبال ہنس پڑا.

• سچ عصمت اِس اختر کو ایسے نہیں چھوڑیں گے ہم جو کچھ اِس نے ہمارے ساتھ کیا ہے اُس کا پُورا پُورا بدلہ لیا جائے گا کہ کیا سمجھے اختر میاں اب کارڈ ہمارے ہاتھ میں ہے اور تم پھنسو گے ہمارے جال میں اگر ذرا بھی گڑبڑ کرو گے تم یقین کرو کوئی ایسا چکر چلایا جائے گا کہ تم بھی کیا یاد کرو گے ؟

• ارے چھوڑیئے چھوڑیئے اقبال بھائی نہ میں آپ کی طرح نُدرت کو کسی ہوٹل میں دعوت دُوں گا اور نہ اِس طرح مارا مارا پھروں گا. آپ کیا بگاڑ سکتے ہیں میرا ؟

• یہ بات ہے اچھا ٹھیک ہے آؤ عصمت اِس نے ہمیں چیلنج کیا ہے ہم اِس کا یہ چیلنج قبول کرتے ہیں ؟

• ارے ارے سُنئے تو سہی تم... میرا بھی تو معاملہ ہے خواہ مخواہ اُس کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا ؟ خالد نے کہا.

• نہیں آپ کا معاملہ سب ٹھیک ٹھاک ہے اب اِس وقت جنگ ہمارے اور اختر کے درمیان ہے ذرا دیکھیں گے اِن اختر صاحب کو کہ کتنے پانی میں ہیں ؟ عصمت اور اقبال کمرے سے چلے گئے، اور اختر اور خالد اِس موضوع پر گفتگو کرتے ہُوئے قہقہے لگاتے رہے، خالد نے دوسرے دِن کے تمام انتظامات سنبھال لئے تھے اور اہتمام کیا جا رہا تھا اِس گھر سے کوئی خبر باہر نہ نکلنے دی گئی تھی البتہ شام کو ساڑھے چار بجے جب احسان احمد صاحب گھر واپس پہنچے تو اُنھوں نے تمام لوگوں کو تیاریاں کرتے دیکھ کر کہا.

• آج عادل حسین کے گھر نہیں جانا بلکہ عادل حسین خود یہاں

آرہے ہیں۔"

"کیوں؟" ثناء نے چیخ کر پوچھا۔

"بس میں نے اُن سے یہی کہا ہے کہ آج ہم اُن کے ہاں نہیں، وہ خود ہمارے ہاں آئیں گے۔"

"مگر پروگرام میں تبدیلی کیوں کی گئی ڈیڈی کوئی وجہ تو ہوگی اِس کی؟"

"بھئی اُن کی مرضی آرہے ہیں اب کیا کیا جاسکتا ہے۔۔" احسان احمد نے کہا۔ ثناء، ندرت سے کہنے لگی۔

"اللہ رکھی ضرور دال میں کالا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے یہ آج پروگرام تبدیل کیسے ہوگیا پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہُوا۔" ثناء پُرخیال انداز میں بولی۔

"کیا گڑبڑ ہوسکتی ہے؟"

"کوئی اندازہ نہیں۔ مگر ہے کچھ ضرور۔ بہرحال جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"عصمت باجی کو فون کروں؟"

"اُس سے کیا ہوگا؟"

"صحیح صُورتِ حال معلوم ہوجائے گی۔"

"جی! وہ ضرور بتائیں گی صحیح صُورتِ حال۔ اُن کا تعلق اب یہاں سے نہیں رہا ہے۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"ایسی ہی بات ہے مجھے معلوم ہے۔" ثناء نے کہا۔

جانے کے انتظامات بھی ہوگئے تھے۔ پھر عادل حسین کے ہاں کی گاڑیاں پہنچ گئیں تھیں اور سب لوگ نیچے اُتر آئے اجمل بھائی جان اور اقبال مٹھائی کے سجے ٹوکرے اُٹھائے اندر داخل ہُوئے تو ماحول اور گھمبیر ہوگیا ثناء نے ندرت کو دیکھ کر سرسراتے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"اللہ رکھی! معاملہ بہت بڑی حیثیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ یہ مٹھائی کے ٹوکرے کس پر نازل ہورہے ہیں؟"

"بھئی یقین کرو میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آرہا۔" ندرت نے اُلجھتے ہُوئے کہا۔ مٹھائی کے ٹوکرے ایک جگہ رکھ دیئے گئے اور سب لوگ آپس میں خوش گپیاں کرنے لگے ثناء آہستہ آہستہ آگے بڑھی اُس نے عصمت کو سلام کیا اور بڑے پیار سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھادیا۔ عصمت نے ہنستے ہُوئے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ثناء نے اس کی اُنگلیوں میں اپنی اُنگلیاں ڈال کر گرفت تنگ کردی۔

"ارے ارے کیا پہلوانی شروع کردی ہے؟" عصمت نے اُس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔

"شرافت سے اِن لوگوں سے الگ ہوکر آجایئے ورنہ آپ خود ذمّے دار ہوں گی۔" ثناء سرد لہجے میں بولی۔

"ارے ارے اغوا کررہی ہو مجھے سب کے سامنے، چھوڑو میرا ہاتھ۔" عصمت نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی تھی اُسی وقت اقبال عصمت کے قریب پہنچ گیا۔

"خیریت یہ آپ کے رُخِ زیبا پر کرب کے سائے کیوں منڈلا رہے ہیں؟"

"چلے جایئے یہاں سے میں کہتی ہُوں اقبال بھائی چلے جایئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" ثناء نے کہا۔

"کمال ہے بھئی یہ کیا ہورہا ہے آخر؟" اقبال نے کہا اور عصمت ثناء سے ہاتھ چھڑانے میں کامیاب ہوگئی۔

"مجھے یہاں سے لے چلو اقبال یہ لڑکی دہشت گردی پر آمادہ ہے۔" عصمت نے کہا۔

"آؤ، آؤ، میرے ساتھ آؤ۔" اقبال نے عصمت کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اُسے آگے بڑھاتے ہُوئے کہا۔ ثناء کھَول کر رہ گئی تھی۔ دوسرے لوگ چونکہ آس پاس موجود تھے اِس لئے وہ اِس سے زیادہ کوئی حرکت نہیں کرپائی تھی، لیکن اُن کے ذہنوں میں شدید تجسس تھا۔ جس طرح جانے کا اہتمام ہُوا کرتا تھا اُسی طرح جاری رہا۔ عصمت، اقبال اور اختر وغیرہ بزرگوں کے ساتھ ہی تھے۔ یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت ہورہا تھا جانتے تھے کہ اِن لوگوں کے ذہنوں میں تجسس بیدار ہوجائے گا اور وہ اِن ٹوکروں کا راز معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ تنویر کو خاص طور سے کنٹرول میں رکھنے کی ہدایت کی تھی کیونکہ وہ معصُوم صفت تھی۔ اور ساری صُورتِ حال بتاسکتی تھی لیکن بدبخت اجمل بھائی جان کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور اُنھیں فوراً ہی گیند کی طرح کیچ کرلیا گیا اختر وغیرہ کی نِگاہیں اُن کی جانب نہیں پہنچی تھیں لیکن ندرت نے اجمل بھائی جان کو چمکارتے ہُوئے کہا۔

"آج کل آپ بہت کھنچے کھنچے نظر آتے ہیں اجمل بھائی جان!"

"بس یہاں سے واپسی کے بارے میں سوچ رہا ہُوں آپا بھائی جان یہاں میرا گزارہ ممکن نہیں ہے۔"

"ارے ارے اب اتنی جلدی بھی کیا ہے ذرا اِدھر آیئے۔ مٹھئیے تو ہمارے ساتھ آپ مٹھائی کا ٹوکرا ہاتھوں میں اُٹھائے ہُوئے بالکل پرستان کے شہزادے لگ رہے تھے۔"

"کیا لگ رہا تھا؟" اجمل بھائی جان چونک کر بولے۔

"شہزادے، شہزادے کیوں ثناء؟" ندرت نے کہا۔

"چھوڑیئے آپا بھائی جان مجھے آپ کی اِس نگری میں آکر کچھ نہیں مِلا۔"

"بھئی سبحان اللہ کیا خُوبصُورت اُردو سیکھ لی آپ نے نگری، نگری۔" ندرت نے ثناء کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"اجمل بھائی جان بے حد ذہین ہیں تم دیکھ لینا ایک دِن وہ یہاں کی بامحاورہ اُردو اچھی طرح سیکھ جائیں گے۔" ثناء نے تائید کی۔

"ارے ہاں اجمل بھائی جان یہ مٹھائی کے ٹوکرے کس چکر میں لے آئے آپ؟"

"مجھے نہیں معلوم منع کردیا گیا ہے مجھے۔"

"کیا منع کردیا گیا ہے؟" ندرت نے بڑے پیار سے آنکھیں جھکاتے ہُوئے کہا۔

"یہی کہ اِس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔"

"کس نامعقول نے منع کیا ہے؟" ندرت غرّا کر بولی۔

"اختر بھائی جان نے۔"

"ہُونہہ اختر بھائی جان! ایک بات بتایئے اجمل صاحب اختر بھائی جان آپ کی نِگاہوں میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یا میں؟"

"اب تو سب کچھ چوپٹ ہوگیا اب کیا رکھا ہُوا ہے۔" اجمل بھائی جان نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بتاؤں وتاؤں گا کچھ نہیں میں آپ لوگوں کو، آپ لوگ اختر بھائی جان سے میرا تحفظ نہیں کرسکتیں وہ۔۔۔وہ۔۔" اجمل میاں نے جُملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"جان دے دیں گے آپ کے لئے بس ذرا ایک بار بتا کر تو دیکھئے۔" ندرت مردانہ وار بولی اور اُسی وقت اختر نے اجمل بھائی جان کو ندرت کے ساتھ دیکھ لیا تیر کی طرح وہ اُن لوگوں کی طرف آیا تھا۔ اور اُس نے اجمل بھائی جان کی کلائی پکڑلی تھی۔

"ہُوں تو تم یہاں آگھسے۔" اختر نے آنکھیں نکالتے ہُوئے کہا۔

"اختر صاحب آپ براہِ کرم واپس جایئے ہمیں اجمل بھائی جان سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

"کیا معلومات حاصل کرچکی ہیں اب تک آپ؟"

"بہت کچھ حاصل کرچکے ہیں آپ جایئے پلیز۔" ثناء نے کہا۔

"جی نہیں میں آپ کے احکامات ماننے کا پابند نہیں ہُوں۔" اختر نے کہا۔

"اجمل بھائی جان آپ اختر سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکتے۔"

"چھچ۔۔۔ چھڑا تو سکتا ہُوں مم۔۔۔ مگر۔ گگ۔۔۔ کلائی ٹوٹ جائے گی کیا فائدہ ہوگا؟" اجمل میاں نے کہا اور ندرت دانت پیسنے لگی اختر، اجمل بھائی جان کو گھسیٹتا ہُوا لے گیا تھا ندرت نے خونیں نِگاہوں سے اُسے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اِس کا بدلہ نہ لیا تو میرا نام بھی ندرت نہیں ہے۔"

"آخر ایسی کون سی بات ہے۔ جو ہم سے چھپائی جارہی ہے۔ آؤ ذرا اِن لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھیں کچھ تو پتہ چلے گا۔" ثناء، ندرت وغیرہ بزرگوں میں جاکر بیٹھ گئی تھیں کوئی خاص تذکرہ نہیں چھیڑا تھا۔ ابھی تک مٹھائی کا مسئلہ بدستور صیغۂ راز میں تھا اور ہر چہرے پر اِس کے بارے میں تجسس نظر آرہا تھا غرضیکہ کچھ وقت گزر گیا پھر عادل حسین کہنے لگے۔

"میاں اب کتنا وقت لگے گا اِن ساری چکر بازیوں میں مَیں اعلان کرنا چاہتا ہُوں؟"

"کس سِلسلے میں؟" احسان احمد نے عادل حسین کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"تم چُپ رہو بھئی اور ہاں سُنو بھئی بچّے اور بچیو! چالیس سال سے کم عُمر کے تمام بچّے بچیاں یہاں سے کم از کم دو سو گز دُور ہٹ جائیں کیا سمجھے آپ لوگ؟"

"جی گگ۔۔۔ کیا بات ہے انکل؟" ثناء نے پُوچھا۔

"بس بیٹے بزرگ کچھ اہم اُمور پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو بچّوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔"

"ہم اپنے کان بند رکھیں گے آپ اطمینان رکھیئے۔" ثناء نے کہا۔

"ارے نہیں نہیں خواہ مخواہ کان بند کرنے کے سِلسلے میں تمھارے ہاتھ مصرُوف ہوجائیں گے کھا پی بھی نہیں سکو گے بھئی تم لوگوں نے سُنا نہیں میں کہہ رہا ہُوں چالیس سال سے کم عُمر کے بچّے بچیاں یہاں سے ہٹ جائیں۔" ندرت آہستہ سے آگے بڑھی۔ اور عادل حسین سے بولی۔

"انکل میری عُمر اکتالیس سال ہے۔" عادل حسین ہنس پڑے، پھر اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں بیٹے ابھی کہاں، جاؤ جاؤ شاباش ضِد نہیں کرتے۔" ندرت بُرا سامنہ بناکر وہاں سے پلٹ گئی تھی احسان احمد نے مُسکراتے ہُوئے عادل حسین کے کان میں سرگوشی کی۔

"کہیں تم سچ مچ اُس کی عُمر اکتالیس سال مت سمجھ بیٹھنا۔"

عادل حسین ہنس پڑے تھے پھر جب تمام بزرگ یہاں رہ گئے تو عادل حسین نے کہا۔

"بھئی احسان احمد کچھ مدد کرو میری"

"کیا بات ہے کیا آپ کے پاؤں میں موچ آگئی ہے؟" احسان احمد بھی اُس وقت بہت موڈ میں تھے۔ ندا کو بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا اُس کی عمر چالیس سال کے زمرے میں آتی تھی بہرحال عادل حسین نے کہا۔

"محترمہ ذکیہ بھابی جان! قابلِ احترام اماں بی صاحبہ اور معزز خواتین و حضرات! عادل حسین مٹھائی کا ٹوکرا نمبر ون آپ کے سامنے پیش کرتے ہُوئے کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہے"

"رشوت ستانی کی جا رہی ہے کتنی افسوسناک بات ہے۔ کہ ہم گھروں میں بھی رشوت لے آئے ہیں مٹھائی کا یہ ٹوکرا سو فیصدی رشوت معلوم ہوتا ہے اور اِس کی پیش کش پہلے کر دی گئی ہے" احسان احمد نے کہا۔

"جی نہیں یہ رشوت نہیں ہے اظہارِ مسرت ہے تو محترمہ اماں بی دراصل خادم عرض کرنا چاہتا تھا کہ اب ہماری امانت ہمارے حوالے کر دی جائے میرا مطلب ہے تمام حالات بالکل قابو میں آچکے ہیں اور میں نے یہاں اپنے لئے سب کچھ بنا لیا ہے۔ بس ایک بہو کی کمی ہے چنانچہ میری اِس درخواست پر غور کرتے ہُوئے فیصلہ صادر فرمایا جائے اور تاریخ کے لئے تعین کر لیا جائے"

"ہُوں اماں بی کیا فرماتی ہیں اِس سلسلے میں؟"

"بیٹے! ظاہر ہے یہ فرض تو پُورا کرنا ہی ہے اور فرض جس قدر جلد پُورا ہو جائے بہتر ہوتا ہے میں سمجھتی ہُوں اِس سلسلے میں اب کوئی دِقت تو نہیں رہ گئی اگر یہ مرحلہ بھی حل ہو جائے تو مجھے بھی خوشی ہوگی" اماں بی نے یہ فیصلہ دیا تو احسان احمد کہنے لگے۔

"بھئی عادل حسین جب اماں بی نے فیصلہ سُنا دیا تو پھر بھلا ہم لوگوں کی کیا مجال ہے کہ اُس سے انحراف کریں"

"تو پھر میں چاہتا ہُوں کہ کسی مناسب تاریخ کا تعین کر دیا جائے"

"اِس کا فیصلہ تو بعد ہی میں ہو سکتا ہے۔ فوراً ہی سارے کام تو نہیں ہوتے" احسان احمد نے کہا۔

"یار زبردستی پھیل رہے ہو۔ اگر فوراً ہی یہ کام ہو جائے تو کوئی حرج ہے اماں بی؟"

"حرج تو نہیں ہے بیٹے لیکن آج تم نے اِس کا تذکرہ کر دیا ہے تم یہ بتاؤ کون سی تاریخ چاہتے ہو اور کتنے عرصے کے بعد کی؟ ہم لوگ آپس میں مشورہ کر لیں گے اور اُس کے بعد ایک دِن بیٹھ کر یہ تاریخ کا مسئلہ بھی طے ہو جائے گا" اماں بی نے کہا۔

"آپ کا حکم ہے تو بالکل ٹھیک ہے اور اب میں ٹوکرا نمبر دو کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہُوں" عادل حسین بولے۔

"جی جی ارشاد۔ ارشاد فرمائیے یہ ٹوکرا نمبر دو کس سلسلے میں ہے؟"

"یہ سلسلہ براہِ راست بھائی غلام احمد سے ہے"

"یعنی وہ ٹوکرا اُن کا ہے؟"

"سو فیصدی"

"تعجب ہے فرمائیے" احسان احمد نے کہا۔ غلام احمد اور شوکت جہاں بھی موجود تھے۔ دادی اماں بھی تھیں تمام لوگ یہاں نظر آرہے تھے عادل حسین نے غلام احمد سے کہا۔

"بھائی غلام احمد دراصل میں اپنے دوسرے بیٹے اختر حسین کو آپ کی فرزندی میں دینا چاہتا ہُوں" تمام لوگوں کے مُنہ حیرت سے کُھل گئے تھے یہ وہ لوگ تھے جنھیں اِس سلسلے میں کوئی صورتِحال معلوم نہیں تھی احسان احمد جلدی سے بول پڑے۔

"تو اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے اسپیئر ہے تو دے دو"

"یار تم خاموش نہیں رہو گے طوطے کی طرح ساری باتیں رٹ کر آیا ہُوں بُھلائے دے رہے ہو۔ میرا مطلب ہے غلام احمد بھائی میں آپ کی بیٹی نُدرت کو اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہُوں"

"بھئی کیا ادل بدل کر رہے ہو یعنی بیٹا غلام احمد کو دے رہے ہو۔ بیٹی خود لے رہے ہو کچھ وضاحت سے کہو تو ہماری سمجھ میں بھی آئے"

"یار احسان اِس وقت تو تم بالکل بچّے بنے ہُوئے ہو ایک سنجیدہ بات ہو رہی ہے اور بیچ میں ٹانگ اڑائے دے رہے ہو!"

"اچھا اچھا ہم ٹانگیں سمیٹ لیتے ہیں آپ براہِ راست ہو جائیے" احسان احمد نے کہا اور عادل حسین پھر اُسی انداز میں بولے

"بھائی غلام احمد میں اپنے بیٹے اختر حسین کو آپ کی فرزندی میں دینا چاہتا ہُوں میرا مطلب ہے میں آپ کی بیٹی نُدرت کے لئے اختر حسین کا رشتہ دینے کا خواہش مند ہُوں اور بڑی آرزو رکھتا ہُوں کہ آپ میری اِس درخواست کو قبول کریں گے۔

غلام احمد کو احسان احمد پہلے ہی اِس بارے میں بتا چکے تھے گو اِس سلسلے میں اُنھیں عجیب سی کیفیت کا احساس ہوتا تھا لیکن بہرطور احسان احمد نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کی آواز نہ نکل پا رہی تھی بمشکل تمام اُنھوں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔

"عادل حسین بھائی! اگر آپ مجھے اِس قابل سمجھتے ہیں اور یہ اعزاز بخشنا چاہتے ہیں تو اعزاز لینے سے کون اِنکار کر سکتا ہے"

"زندہ باد آؤ گلے مِل جائیں" عادل حسین نے کہا اور اُٹھ کر غلام احمد کو سینے سے لگا لیا غلام احمد صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور باقی تمام لوگوں کے چہروں سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یعنی کمال ہے میاں۔ تم نے تو گھر ہی دیکھ لیا ہے ایک کے بعد ایک حملہ کئے جا رہے ہو" احسان احمد نے کہا۔

"خُدا کا احسان ہے احسان بھائی کہ میرا گھر بھر رہا ہے" عادل حسین بولے۔

"اور یہاں جو گھر خالی ہو رہا ہے اُس کا کیا ہوگا؟"

"فرق کر رہے ہو احسان احمد۔ کیا اِن گھروں میں الگ الگ ہونے کا کوئی تصوّر ہے"

"دیکھا! اب چالاکی سے بات بدل دی"

"خُدا کی قسم میری نظروں میں کوئی فرق نہیں ہے" عادل حسین نے کہا اور احسان احمد گردن ہلانے لگے۔

دوسری طرف نوجوانوں میں کھچڑی پک رہی تھی۔ ثناء کہہ رہی تھی "یہ اقبال بھائی اور عصمت باجی کتنے غدار ہیں یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُنھیں معلوم ہے"

"اختر کو بھی تو معلوم ہے" نُدرت بولی۔

ثناء نے خالد سے کہا "خالد آپ اِدھر آئیے" سب چونک پڑے۔ خالد جلدی سے اُٹھ کھڑا ہُوا تھا۔

"اے خالد بھائی آپ یہاں سے نہیں جائیں گے" اختر آنکھیں نکال کر بولا۔

"مجبُوری ہے عزیزم ساری زندگی کا معاملہ ہے کوئی وقتی بات ہوتی تو تمھاری ہدایت پر عمل کرتے" خالد شرارت سے بولا۔ اور ثناء کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ثناء جُرأت مند تھی ورنہ یہ اقدام کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ بہرحال سب اُنھیں دیکھتے رہ گئے تھے، ثناء ایک جگہ رُک کر بولی۔

"کیا ہے یہ سب کچھ؟ آپ مجھے بھی نہیں بتائیں گے"

"آپ کو... آپ کو تو میں وہ کچھ بھی بتا دُوں گا جو نہیں ہے" خالد نے جواب دیا۔

"تو بتائیے"

"کیا بتاؤں؟ جو ہے وہ یا جو نہیں ہے وہ" خالد نے پُوچھا۔

"آپ مجھے باتوں میں اُڑانے کی کوشش کر رہے ہیں" ثناء غرّائی۔

"توبہ۔ توبہ میں آپ کو ہوائی جہاز میں اُڑانے کی کوشش کر رہا ہُوں محترمہ ثناء میرا مطلب ہے یہاں سے کسی اور ملک یعنی سوئیزرلینڈ، فرانس، امریکہ وغیرہ" خالد نے مسکراتے ہُوئے کہا اور ثناء اُسے گھورنے لگی خالد جلدی سے بولا۔

"میرا مطلب ہے یہ بزرگ... یہ بزرگ اُن کوششوں میں مصرُوف ہیں جن کے لئے، جن کے لئے" خالد نے شرمانے کی اداکاری کی۔

"خالد صاحب؟"

"عرض تو کر رہا ہُوں آپ تو بلاوجہ ڈانٹ رہی ہیں، وہ یعنی ڈیڈی حضُور آپ کے ڈیڈی حضُور سے میری اور آپ کی نسبت کے بارے میں گفتگو کرنے تشریف لائے ہیں۔ یعنی آج یہ مسئلہ حل ہو کر رہے گا جو بہت دِن سے صرف میرے ذہن میں پک رہا تھا"

"یعنی..."

"شادی، شادی۔ ہماری شادی جو اَب جلد ہو جانی چاہیئے" خالد نے کہا اور ثناء کا چہرہ گلابی ہو گیا تاہم اُس نے ہمّت سے کام لے کر کہا۔

"آپ جھُوٹ بول رہے ہیں"

"باخُدا زندگی کے ہر مسئلے میں جھُوٹ بول سکتا ہُوں اِس میں نہیں" خالد نے کہا۔

"توبہ۔ توبہ..."

"جی ہاں آج یہ فیصلہ ہو کر رہے گا کہ آخر آپ کب تک دوسروں کے گھر میں رہیں گی اپنے گھر میں کب تشریف لائیں گی"

"بیکار باتیں کر رہے ہیں آپ"

"جی نہیں۔ کائنات کی سب سے کارآمد باتیں کر رہا ہُوں اِس وقت آپ کا حکم ہے۔ بھلا جھُوٹ بول سکتا ہُوں آپ سے ساری زندگی کا معاملہ ہے، اگر پہلے ہی مرحلے پر آپ نے مجھے جھُوٹا تصوّر کر لیا تو کیا ہوگا؟"

"خالد صاحب!" ثناء کے لہجے میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

"خُدا کی قسم جی چاہتا ہے آپ بار بار اِس لہجے میں مجھ سے خالد صاحب، خالد صاحب کہیں۔ خیر وہ وقت بھی جلد آنے والا ہے تو محترمہ آپ کے حُکم کی تعمیل میں نے کر دی ہے یعنی مٹھائی کا ٹوکرا نمبر ون اِسی سلسلے میں لایا گیا ہے کہ جناب عادل حسین صاحب احسان احمد صاحب سے یہ گفتگو کرنے آئے ہیں کہ ہماری شادی کب ہوگی"

"فضُول ہیں آپ"

"اب جو کچھ بھی ہیں آپ کی قسمت میں لکھے گئے ہیں۔ آپ کی

قسمت ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"ٹوکرہ نمبر ایک آپ نے کہا گویا ٹوکرہ نمبر دو کسی اور سلسلے میں ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وہ کیا؟"

"اختر کی نسبت ندرت سے طے کی جا رہی ہے اور اِس سلسلے میں عادل حسین صاحب پیغام لے کر غلام احمد صاحب کے پاس آئے ہیں۔"

"کیا؟" ثناء خوشی سے اُچھل پڑی۔

"جی ہاں، دیکھیئے دیکھیئے اُدھر دیکھیئے غلام احمد صاحب اور عادل حسین صاحب گلے مل رہے ہیں۔ گویا گویا اختر اور ندرت ایک دوسرے سے گل مل گئے۔"

ثناء کے حلق سے ایک قہقہہ آزاد ہوگیا تھا اور پھر اُس نے اُن لوگوں کی طرف دوڑ لگا دی تھی اُس کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا اور سب اُسے گھور رہے تھے، اقبال نے عصمت سے کہا۔

"توبہ، توبہ کیا زمانہ آگیا خالد بھائی نے یقیناً ثناء کو تفصیل بتا دی ہے، محترمہ ثناء خوشی سے اُچھلتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔"

"قصّہ کیا ہے اب بھی مجھے نہیں بتائیں گے آپ لوگ؟" ندرت بولی

"بھئی قصّہ یہ ہے کہ اختر صاحب اب آپ کی تقدیر کے مالک بن گئے۔ غلام احمد صاحب اور عادل حسین گلے مل گئے مطلب یہ کہ آپ دونوں کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اقبال نے کہا اور ندرت کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا پھر وہ چاروں طرف دیکھنے لگی ثناء نے ندرت کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جی ندرت صاحبہ بہت شور مچاتی تھیں آپ، آج چھری تلے آگئیں۔"

"کیا بکواس ہے؟" ندرت نے کہا۔

"قسم خدا کی تیری تقدیر پھوٹ گئی ندرت، تجھے اختر سے منسوب کر دیا گیا ہائے ندرت کتنی اچھی تھی تو تیری شرارتیں نہ بھولنے کے قابل تھیں اب اختر جیسے آدمی سے تجھے گزارا کرنا پڑے گا ہائے تیرا کیا ہوگا۔ ثناء بین کرنے والے انداز میں بولی اور سب لوگ بُری طرح ہنسنے لگے۔

"ثناء، بدتمیزی بند، یہ کیا فضول بکواس لگا رکھی ہے تو نے، میں، میں...۔"

"تو اختر سے شادی نہیں کرے گی، یہی کہنا چاہتی ہے نا؟" ثناء نے اُسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"فضول لوگ ہو تم سب بالکل بیکار۔" ندرت نے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے اپنے کوارٹر کی جانب چلی گئی۔ ثناء نے حکیمانہ انداز میں کہا۔

"جانا چاہیئے۔ جانا چاہیئے کنواری بچیوں کا شرمانا بے حد ضروری ہوتا ہے۔"

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے محترمہ بھابی جان؟" اختر نے ثناء کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اے خاموش بیٹھو، بچوں کو بڑوں کے منہ نہیں لگنا چاہیئے۔" ثناء نے کہا اور بڑے غصّے سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"کمال ہے آپ لوگ بھی بس یوں ہی فضول سے لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ اُنھیں ناراض کر کے بھگا دیا۔"

"میں بُلا کر لاؤں؟" اجمل بھائی جان نے بھولے پن سے پوچھا۔ اور اختر اُسے گھورتا ہوا بولا۔

"اے اجمل بھائی جان خاموشی سے بیٹھ جائیے ورنہ واپس افریقہ بھجوا دوں گا سمجھے آپ۔"

چاروں طرف سے قہقہے اُبل پڑے اور اجمل بھائی جان جھینپے ہوئے سے انداز میں اپنی جگہ بیٹھ گئے تھوڑی دیر کے بعد اس سلسلے میں باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ ندرت تو پہلے ہی فرار ہوگئی تھی اختر اور خالد کو اُن لوگوں کے درمیان سے گھسیٹ لیا گیا البتہ ثناء ڈھٹائی سے وہیں بیٹھی رہی تھی اور اُس کے بعد بقیہ وقت خوشی اور قہقہوں میں بسر ہوا ندرت واپس نہیں آئی تھی اور اختر بار بار منہ بسور رہا تھا۔

"میاں اختر! اب پھنسے ہو ننیانوے کے پھیر میں۔ اِس وقت صرف دو ہی افراد تمھارے کام آ سکتے ہیں یعنی مسز اقبال اور مسٹر اقبال۔"

"اخاہ۔ اقبال بھائی یہ آپ ہیں۔ ارے کمال ہے کیا عظیم شخصیت پائی ہے آپ نے۔" اختر نے اقبال سے گلے ملتے ہوئے کہا اور چاروں طرف قہقہوں کا طوفان برپا ہوگیا۔

اقبال اُچھل پڑا۔ غسل خانے سے باہر قدم رکھا تھا کہ ایسی ہی آواز سنائی دی جیسے کوئی بلّی پاؤں کے نیچے دب گئی ہو۔ لیکن کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں ایک انوکھا منظر کچھ فاصلے پر ضرور نظر آ رہا تھا۔ یہ اختر تھا جو ایک گوشے میں بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ اختر کا بدن ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ اقبال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کمرہ اُس کا اپنا تھا اور اختر کبھی بغیر اجازت اِس کمرے میں نہیں آتا تھا لیکن اُس وقت، اُس وقت اقبال حیرت زدہ سے انداز میں آگے بڑھ کر اختر کے قریب پہنچ گیا۔ اور پھر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اختر

اقبال کے جوتے کو برش سے چمکا رہا تھا اور اُس کے انداز میں بڑا انہماک تھا ویسے بلّی کی دُم دب جانے کے بعد بلّی جس طرح چیختی ہے اِس آواز کے بارے میں اقبال کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اختر ہی کے منہ سے نکلی ہوگی۔ اقبال کو ہنسی آگئی اور اُس کی ہنسی کی آواز پر اختر نے چونک کر اُس کی صورت دیکھی۔

"اوہو اقبال بھائی جان! صاف ہوگئے دیکھیئے کیسے چمک رہے ہیں؟" اختر نے جوتے اُس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"یار کیا چکر بازی ہے یہ صبح ہی صبح یہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوششیں کیوں شروع ہوگئیں۔ جو اصل قصّہ ہے وہ بتا دو۔ یہ عصمت کہاں چلی گئیں؟"

"عصمت باجی تو شاید دوسرے کمرے میں آپ کا کوٹ استری کر رہی ہیں اقبال بھائی جان، لے کر آتا ہوں ابھی۔" اختر نے اُٹھتے ہوئے کہا اور اقبال نے اُس کی آستین پکڑ لی۔

"دیکھو یلد اختر! میں نے کبھی خود کو تمھارا مقابل نہیں پایا۔ میں ایسے معاملات میں بڑا بے وقوف سا آدمی ہوں یہ چکر کیا ہے بتا دو؟"

"ارے کون سا چکر آخر؟" اختر نے تعجب سے کہا۔

"یہ کرم فرمائی کس سلسلے میں ہو رہی تھی اور مجھے کیوں شرمندہ کیا جا رہا تھا؟"

"تعجب ہے آپ کو اقبال بھائی کہتا ہوں میں۔ بڑے ہیں آپ مجھ سے۔ احترام کرتا ہوں آپ کا خالد بھائی کی طرح۔ چھوٹا بھائی اگر جوتوں پر پالش کر دے تو کوئی بہت ہی انوکھی بات ہو جاتی ہے؟" اختر نے کہا۔

"اختر! میں آفس جانے والا ہوں، یہ سمجھ لو کسی کام کا نہیں رہوں گا۔ اگر تم نے وضاحت نہ کر دی تو...۔" اتنی دیر میں عصمت کوٹ لٹکائے اندر آگئی تھی اختر اور اقبال کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر بولی۔

"خیریت، یہ اختر صاحب کا نزول آپ کے کمرے میں کیسے ہوگیا؟"

"حیران ہوں، عصمت تم ہی میری مدد کرو۔ ذرا دیکھو یہ اختر صاحب میرے جوتوں پر پالش کر رہے تھے بیٹھے ہوئے اور خوب چمکایا ہے اُنھوں نے۔"

"ارے توبہ۔ کیا گڑبڑ ہے۔ بھئی اختر صاحب خیریت یہ آپ نے ہمیں شرمندہ کرنے کا شعبہ کیوں سنبھال لیا ہے؟"

"عصمت بھابی یا عصمت باجی پتہ نہیں آپ لوگ کیسے ہیں۔ کسی کی محبت کو، کسی کے پیار کو یوں نظر انداز کر دینا کوئی اچھی بات ہے کیا، میں نے نیک جذبوں کے تحت پیار بھرے انداز میں اقبال کے جوتوں پر پالش کر دی تو ایسا محاسبہ ہو رہا ہے میرا جیسے نہ جانے کیا کر بیٹھا ہوں میں۔"

"محترم جناب اختر عادل صاحب! آپ اور اقبال کے جوتوں پر پالش۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہ چمک کیا رنگ لائے گی۔" عصمت نے کہا۔

"گویا آپ کو میرے اُوپر بالکل اعتبار نہیں ہے عصمت باجی؟"

"نہیں، نہیں۔ آپ بالکل قابلِ اعتبار آدمی ہیں۔ لیکن اُس وقت جب آپ سچ بول دیں۔"

"ناشتہ وغیرہ کر لیا آپ لوگوں نے؟"

"اقبال صبح کو باقاعدہ ناشتہ نہیں کرتے ایک پیالی چائے پی چکے ہیں۔"

"لعنت ہے مجھ پر، چلتا ہوں۔" اختر نے کہا اور اقبال نے پھر اُس کی آستین پکڑ لی۔

"پیارے بھائی اُس وقت تک نہیں جانے دوں گا جب تک کہ تم میری عقل کی مرمّت نہ کر دو گے۔ سارا دن کھوپڑی گھومتی رہے گی۔ یہ تصوّر کر کر کے کہ اختر صاحب جنھوں نے شاید زندگی میں کبھی اپنے جوتے کی پالش نہیں کی میرا جوتا پالش کر رہے تھے، ویسے میں کافی شرمندہ بھی ہوا ہوں اِس بات سے۔" اقبال نے کہا۔

"اِس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے میرے سر پر کبھی محبت بھرا ہاتھ نہیں رکھا۔ اقبال بھائی کبھی یہ نہ سوچا کہ میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔"

"او اقبال سمجھو، کچھ سمجھو۔" عصمت نے اقبال کو گھورتے ہوئے کہا اور اقبال چونک کر عصمت کو دیکھنے لگا۔

"نہیں سمجھ رہا عصمت بی بی سمجھا دیجئے گا۔"

"اختر کی یہ خوشامد کسی خاص مقصد کے تحت ہے اور آپ کے ذہن میں وہ مقصد نہیں آ رہا۔"

"ارے باپ رے سمجھ گیا... سمجھ گیا۔ اے مسٹر ہم زلف کیا قصّہ ہے؟" اقبال نے اختر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"حضور، سرکار، مائی باپ اب جو کچھ بھی ہے آپ کے سامنے ہے آپ جو چاہیں گے وہ ہو جائے گا یہ ایسا نازک موقع ہوتا ہے کہ انسان نہ جانے کس کس کو مطلب کے لئے وہ بنا لیتا ہے سمجھ گئے ہوں گے ناں آپ۔ دونوں الفاظ ادا کرنے سے گریز کر رہا ہوں کیونکہ نہایت ہی گھٹیا الفاظ ہیں۔ مم... میرا مطلب ہے اقبال بھائی نظرِ کرم ہو جائے زندگی بھر دعائیں دیتا رہوں گا۔"

"چاہتے کیا ہو؟" اقبال نے گردن اکڑا کر پوچھا۔

"بس اقبال بھائی زندگی میں کبھی خالد بھائی سے نیچا نہیں دیکھا لیکن اب گردن جھکی جا رہی ہے یہ سوچ سوچ کر کہ اُن کے سر پر سہرا ہو گا اور اپنی کھوپڑی گنجی ہو گی مم... میرا مطلب ہے بغیر سہرے کے۔ اگر آپ چاہیں تو دونوں سہرے بیک وقت بندھ سکتے ہیں۔"

"سُنا تم نے عصمت؟"

"سُن لیا، سمجھ بھی گئی تھی۔" عصمت نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔ مگر معاملہ بہت ٹیڑھا ہے کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"نہیں، نہیں، حضور اگر آپ کی کوششیں شاملِ حال ہو جائیں گی تو سب کچھ ممکن ہے۔ ایسے موقع پر بڑے ہی کام آتے ہیں میری دست بستہ گزارش ہے کہ اِس سلسلے میں پورا پورا زور لگا دیں اور پھر عصمت باجی، عصمت بھابی، عصمت بھابی عصمت باجی! میرا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے سارے اختیارات تو آپ لوگوں کو حاصل ہیں۔"

"یار، ہم زُلف آدمی، بہت تیز ہو تم۔ لیکن ایک بات سمجھ لو میں وہ چوٹ زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا جو تم نے مجھے دی تھی۔"

"ارے مر جاؤں گا اقبال بھائی بالکل مر جاؤں گا کیا میری اِس جوان لاش کو آپ اپنی نگاہوں سے دیکھ سکیں گے۔"

"خُدا نہ کرے، فضول باتیں مت کرو۔" عصمت نے جلدی سے کہا۔

"تب تو پھر میں ضرور مر جاؤں گا آپ کے دِل میں گداز پیدا ہُوا ہے میرے لئے تو بس سمجھ لیجئے میرا کام نہ ہُوا تو خودکشی کر لُوں گا۔ دس بیس روٹیاں کھا کر۔" اختر نے کہا اور عصمت ہنس پڑی۔

"اب بے کار باتیں نہ کرو مطلب یہ ہے تمھارا کہ ہم اِس سلسلے میں۔"

"جیتی رہیں عصمت باجی خُدا گود ہری کرے مگر یہ ہری۔ یار اقبال بھائی یہ لوگوں نے کیا کیا فضول باتیں کر رکھی ہیں گود ہری ہونے سے کیا مطلب ہے یعنی گرین کلر یہ کس کام آ سکتا ہے؟"

"بس بس آ گئے فضول باتوں پر مگر میں لائن سے نہیں ہٹوں گا۔"

"کون سی لائن سے بڑے بھائی؟"

"تم نے مجھ سے لیچ لیا تھا ناں؟"

"لیا تھا۔" اختر مُردہ سی آواز میں بولا۔

"تو پھر تم ڈِنر دو گے۔"

"خوشی خوشی دُوں گا لیکن وہ بھی آئیں گی ناں؟"

"جی نہیں اُن کے علاوہ سب آئیں گے۔"

"تو پھر یُوں کر لیجئے کہ ڈِنر آپ دے ڈالئے۔ پے منٹ میں کر دُوں گا۔" اختر بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"نہیں بھائی... اِس سلسلے میں تو تمھیں ہم سے تعاون کرنا ہو گا ہم زُلف۔ سمجھ لو اچھی طرح نُدرت کو لانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے عصمت بھی اِس میں ناکام رہیں گی۔"

"ناں بھئی ناں میں اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتی، اوّل تو نُدرت خود نہیں آئے گی۔ دوسری بات یہ کہ سارے لوگ اُنگلیاں اُٹھائیں گے۔ نہیں اختر میاں آپ کو اِس سلسلے میں صبر سے کام لینا ہو گا۔"

"لے لُوں گا مگر شرط یہی ہو گی کہ خالد بھائی اکیلے سر پر سہرا نہیں باندھیں گے۔ ہم بھی ان کے ساتھ سہرا باندھے بیٹھے ہوں گے، واہ کیا لُطف آئے گا؟"

"یار مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی میرا مطلب ہے ساتھ ساتھ۔ بزرگوں نے اِس موضوع پر بات بھی کی تھی مگر اُنھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔"

"اگر یہ بات ہے اقبال بھائی تو آپ یہ سمجھ لیجئے کہ زندگی بھر کے لئے آپ کو ناکارہ قرار دے دیا جائے گا۔ اب کسی اور کو ہی اِس سلسلے میں پکڑنا پڑے گا۔"

"خیر کوشش تو میں ضرور کروں گا مگر وہ ڈِنر والی بات۔"

"جس دن چاہو لے لو یار ہم اتنے کنجوس تھوڑی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر ہم انتہائی کوشش کریں گے۔ وعدہ کیا جاتا ہے اِس بات کا۔"

"جیتے رہیں اقبال بھائی جیتے رہیں۔ ارے یہ کوٹ آپ نے صحیح طور پر استری نہیں کیا عصمت بھابی۔ لائیے میں دوبارہ استری کرا لاؤں۔"

"نہیں نہیں بس کافی ہے۔" اقبال نے ہنستے ہُوئے کوٹ اختر کے ہاتھ سے لے لیا اور اختر سعادت مندی سے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ عصمت ہنسے جا رہی تھی۔

▼ ▼ ▼

اختر نے فون کا ریسیور اُٹھایا اور احسان احمد کی کوٹھی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ چند لمحات کے بعد دوسری طرف سے ایک ملازمہ

کی آواز سُنائی دی۔

"جی: کون بول رہا ہے؟"

"میں رِدا بول رہی ہوں۔ تم کون ہو؟" اختر نے رِدا کی آواز میں کہا۔

"اوہو رِدا بی بی میں فیاضی بول رہی ہوں کیا بات ہے؟"

"اوہ فیاضی آپا! ذرا نُدرت کو بُلا دیجئے۔" اختر نے ہُو بہُو رِدا کی آواز میں کہا اور فیاضی ریسیور نیچے رکھ کر چلی گئی۔ اختر انتظار کرتا رہا اُس کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ جس وقت وہ رِدا کی آواز میں بول رہا تھا عصمت نے اندر جھانکا تھا اور پھر آنکھیں پھاڑے چند لمحات تک اُسے دیکھتی رہی تھی اس کے بعد دوڑ کر دوسرے فون پر پہنچ گئی تھی اور اُس نے فون اُٹھا کر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا تھا اختر کو ذرا انتظار کرنا پڑا پھر نُدرت کی آواز سُنائی دی۔

"ہیلو؟"

"نُدرت تم بول رہی ہو۔" اختر نے رِدا کی آواز میں کہا۔

"جی محترمہ مونا لیزا فرمائیے کیسے یاد آ گئی ہم غریب لوگوں کی؟"

"فضول باتیں مت کرو بھئی تمھاری ضرورت ہے مجھے۔"

"اللہ رے ہماری تقدیر، مونا لیزا کو ایک معمولی سی لڑکی کی ضرورت پیش آ گئی۔"

"تم سیدھی بات تو کر ہی نہیں سکتیں نُدرت ذرا یُوں کرو کہ تھوڑی دیر کے بعد کسی بھی طرح بازار پہنچ جاؤ میں طارق روڈ پر ایل سینٹر کے سامنے تمھارا انتظار کروں گی تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے بھئی آج ذرا دفتر سے جلدی اُٹھ رہی ہوں۔"

"کیسی شاپنگ رِدا باجی؟" نُدرت نے کسی قدر متحیّرانہ انداز میں کہا۔

"تمھیں آنے سے غرض ہے یا ان باتوں سے؟"

"نہیں نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے کتنی دیر میں پہنچ جاؤں؟"

"میرا خیال ہے آدھے گھنٹے کے اندر اندر ٹیکسی سے آ جانا بعد میں ہم دونوں ساتھ گھر واپس آ جائیں گے۔"

"ثنا کو بھی لے آئیں۔" نُدرت نے سوال کیا۔

"اُفوہ بھئی اگر مجھے ثنا کی ضرورت ہوتی تو اُسے بھی ٹیلی فون کر سکتی تھی۔ تم سے ہی کہنا کیا ضروری تھا۔" اختر نے گڑبڑائی ہُوئی آواز میں کہا اور شاید نُدرت کے لئے اِتنا ہی کافی تھا۔ ایک لمحے کے لئے دوسری طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر نُدرت کی آواز اُبھری۔

"ٹھیک ہے میں آ جاتی ہُوں رِدا۔ لیکن یہ تو بتاؤ وہ سُوٹ تم نے جاتے ہُوئے دے دیا تھا کڑھائی کے لئے۔"

"سُوٹ؟" اختر، رِدا کی آواز میں متحیّرانہ انداز میں بولا۔

"ہاں بھئی تمھیں پتہ ہے۔ کتنا وقت لگتا ہے کڑھائی والوں کے ہاں۔ وہ لوگ کبھی وقت کی پابندی نہیں کرتے۔"

"وہ بس ہاں بھول گئی تھی۔"

"ارے ارے، صبح کو تو تم اپنے ساتھ لے گئی تھیں یہ کہہ کر کہ دیتی ہُوئی جاؤں گی اور ضرور وہیں سے گزروں گی۔"

"بھئی دفتری کاموں میں ایسی باتیں یاد کہاں رہتی ہیں بس بھول گئی۔"

"کیا بھول گئیں؟"

"سُوٹ ساتھ لانا۔"

"مگر میں نے تو جاتے ہُوئے تم کو وہ گاڑی میں دیا تھا۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔ گاڑی میں ہی پڑا ہُوا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب تم آ تو رہی ہو۔ یہاں سے چلیں گے ناں تو پھر ساتھ ساتھ ہی دے دیں گے اِس میں کون سی ایسی مصیبت پیش آجائے گی" اختر بولا اور دفعتاً ہی ندرت کا گھن گرج قہقہہ فضا میں اُبھرا۔

"ہُوں تو یہ بات ہے۔ جناب اختر صاحب، کہیئے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"کیا ہُوا؟ کیا کہیں اور سے لائن مِل گئی" اختر لو کھلائے ہُوئے لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ بدقسمتی سے لائن آپ ہی سے ملی ہے۔ اور آپ ٹریس آؤٹ ہو گئے"

"بھئی کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا" اختر کی حالت تو خراب ہو گئی تھی۔ لیکن لہجہ اُس نے رُدا کا ہی رکھا۔

"بڑی مشکلات پیش آئیں گی اختر صاحب آپ کو مستقبل میں، کیونکہ واسطہ ندرت سے پڑا ہے کسی ایسی ویسی شخصیت سے نہیں"

"کیا تمہارا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے۔ میں کچھ کہہ رہی ہُوں اور تم اختر، اختر لگائے ہُوئے ہو" اختر بدستور رُدا کے لہجے میں بولا۔

"اچھا تو آپ رُدا ہیں"

"تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟"

"اچھا تو پھر آپ یُوں کریں کہ فُون بند کر دیں۔ میں خود آپ کو آپ کے دفتر ٹیلی فُون کرتی ہُوں"

"کیوں آخر کیوں؟ مجھ پر تمھیں بھروسہ کیوں نہیں؟"

"اِس لئے کہ آپ کو اطلاع ہونی چاہیئے کہ رُدا صاحبہ کوئی جوڑا لے کر نہیں گئیں۔ نہ ہی کوئی ایسا جوڑا زیرِ تکمیل ہے۔ کیا سمجھیں آپ؟"

"وہ تو میں نے یُونہی کہہ دیا تھا۔ میں خود سمجھ رہی تھی کہ تم مذاق کر رہی ہو" اختر نے کہا اور ندرت ایک بار پھر زور سے ہنس پڑی، پھر اُس نے کہا۔

"مزاج تو بتائیے کیسے ہیں آپ کے؟"

"ٹھیک ہُوں۔ اللہ کا شکر ہے" اِس بار اختر اپنی اصل آواز ہی میں بولا تھا۔

"آپ کی خوشی سے مجھے بھی خوشی ہُوئی۔ کہیئے فُون کیسے کیا؟"

"دیکھو میرے سامنے بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش ہمیشہ نقصان دِہ ہوتی ہے۔ اگر کسی کی جان کو آ جاؤں تو وہ مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے"

"مجھ سے زیادہ اِس کی تصدیق اور کر کون سکتا ہے۔ آپ میری جان کو آئے اور میں مصیبتوں میں گرفتار ہو گئی ورنہ کہاں مَیں اور کہاں آپ!"

"مِس ندرت! بہت اُونچی پرواز کر رہی ہیں آپ اب ذرا نیچے آجایئے"

"ابھی اُونچا ہی اُونچا رہنے دیجئے، جب کبھی آسمان سے اُترنے کی ضرورت پیش آئی تو اُتر آئیں گے"

"فی الحال آسمان سے نہ اُترو بلکہ زمین پر ہی چلتی ہُوئی طارق روڈ آجاؤ۔ مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے" اختر نے کہا۔

"سُوری، معذرت خواہ ہُوں" ندرت نے کہا۔

"اے کیا کھا جاؤں گا تمھیں؟ کمال کرتی ہو ذرا ملنا تھا، کچھ گفتگو کرنی تھی" ندرت کا پھر ایک قہقہہ اُبھرا۔ اور اُس نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"جنابِ عالی نہایت مشکل کام ہے اور میں اُس کی تکمیل کے لئے معذرت خواہ ہُوں"

"دیکھو ندرت اچھا نہیں ہو گا۔ آؤ میں تم سے ملنا چاہتا ہُوں"

"کمال ہے آخر آپ سوچتے کیوں نہیں ہیں اختر۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہم لوگ کتنے خطرناک لوگوں کے درمیان رہتے ہیں۔ کسی کو پتہ چل گیا تو زندہ درگور ہو جائیں گے۔ آج تک دوسروں کا مذاق اُڑاتے آئے ہیں۔ اب اپنا مذاق اُڑنا شروع ہو جائے گا"

"اوہ ندرت صاحبہ بہت بے وقوف ہیں آپ، ارے اِس مذاق اُڑنے میں جو لُطف آتا ہے آپ کو اُس کا اندازہ ہی نہیں" اختر نے کہا۔

"جی مجھے نہیں آتا اِس لئے میں آپ سے معافی چاہتی ہُوں" ندرت نے کہا۔

"اور اگر میں آپ کو حُکم دُوں تو تب بھی نہیں آئیں گی آپ؟"

"جی نہیں۔ میں احکامات ماننے کی عادی نہیں ہُوں"

"ندرت! میں سچ مچ ناراض ہو جاؤں گا"

"اگر آپ سچ مچ ناراض ہونے والے ہیں۔ تو میں آپ سے انتہائی منت و سماجت سے یہ عرض کرتی ہُوں اختر صاحب کہ یہ سب کچھ اچھا نہیں ہے۔ آپ اِس قسم کی کوئی حرکت نہ کیجئے جس سے ہم داغ دار ہو جائیں۔ صاف سُتھرا رہنا زیادہ اچھا ہوتا ہے"

"تب میں پھر تم سے ناراض ہو گیا"

"خیر خُدا نے کبھی اِس کا موقعہ دیا تو منا لیں گے ہم آپ کو۔

فی الحال اِس سلسلے میں ہمیں معذور سمجھئے گا" ندرت نے کہا۔ اور اختر نے زور سے فُون کا رسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اُس کے بعد وہ چند لمحات فُون کو گھُورتا رہا اُس کے بعد کمرے سے باہر نِکل آیا اور پھر پاؤں پٹختا ہُوا ایک طرف چل پڑا۔ سامنے ہی عصمت کا کمرہ نظر آیا تھا جس کا دروازہ کھُلا ہُوا تھا۔ لیکن جو سب سے زیادہ حیرتناک بات تھی وہ یہ تھی کہ اجمل میاں چوروں کی طرح اندر جھانک رہے تھے۔ اختر کو دیکھ کر اُن کا چہرہ ہونق ہو گیا اور اختر اُنھیں گھُورتا ہُوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔

"یہ کیا حرکت ہو رہی ہے؟"

"خاموش اختر بھائی جان خاموش۔ ذرا دیکھئے تو عصمت باجی کو کیا ہو گیا؟"

"کیا ہو گیا!"

"ہنسے جا رہی ہیں پیٹ پکڑ پکڑ کے ہنسے جا رہی ہیں۔ خُدانخواستہ پیٹ میں تو تکلیف نہیں ہو گئی؟"

"اے اگر کسی کے پیٹ میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ پیٹ پکڑ کر ہنستا ہے یا روتا ہے"

"ایں۔ تب پھر... تب پھر کچھ اور ہو گیا ہو گا" اختر نے عصمت کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور پھر کھُلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ عصمت نے اُسے دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا تھا۔

"اوہو! اِس کا مطلب ہے آپ کو واقعی کچھ ہو گیا"

"ہو گیا۔ واقعی مجھے کچھ ہو گیا ہے" عصمت نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"آخر کیا ہو گیا ہے؟" اختر نے کہا اور دوسرے لمحے اُس کی نظر ٹیلی فُون کے رسیور پر پڑی۔ جو نیچے لٹک رہا تھا۔ اختر ایک لمحے میں صُورتِ حال کو سمجھ گیا اور پھر اُس نے عصمت کو گھُورتے ہُوئے کہا۔

"ہُوں تو یہ حرکت ہو رہی تھی"

"کچھ نہیں سُنا۔ میں نے کچھ بھی نہیں سُنا" عصمت نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ایک ایک ایکسٹینشن اُکھاڑ کر پھینک دُوں گا۔ خُدا کی قسم یہ زیادتی ہے، یہ زیادتی ہے" اختر نے جھلّائے ہُوئے لہجے میں کہا اور پھر اجمل میاں کی طرف رُخ کر کے بولا۔

"اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کک... کچھ نہیں بس خیریت معلوم کرنے آ گیا تھا میں بھی"

"نِکل جاؤ فوراً۔ میں کہتا ہُوں یہاں سے نِکل جاؤ" اختر گھونسہ تان کر بولا۔ اور اجمل بھائی جان تیزی سے کمرے کے دروازے سے باہر نِکل گئے، عصمت نے پھر ایک قہقہہ لگایا تھا۔

"اب تم یُوں کرو کہ ٹیلی فون کا رسیور چبا لو"

"میں آج ہی سارے ایکسٹینشن اُکھاڑ کر پھینکے دیتا ہُوں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے کہ کسی کی گفتگو دوسرے فُون پر سُنی جائے"

"اُکھاڑ دو، مجھے کیا؟" عصمت نے کہا۔

"عصمت بھابی!" اختر غصیلے لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں کہو کہو، کیا بات ہے؟" عصمت نے کہا۔

"دیکھئے یہ تو زیادتی ہے عصمت باجی یہ تو سراسر زیادتی ہے"

"بھئی کس کی؟ میری یا کسی اور کی؟"

"آپ کی۔ صرف آپ کی۔ آخر آپ ٹیلی فُون پر میری باتیں کیوں سُن رہی تھیں؟"

"میری مرضی، کوئی مجھے روکنے والا ہے" عصمت نے کہا اور اختر کمرے میں ناچنے لگا۔ عصمت ہنستی ہُوئی بولی "جیسا بویا ہے ویسا ہی کاٹو گے"

"جی ہاں! انتقام لینے کا اِس سے بہتر موقعہ آپ کو اور کون سا ہاتھ آئے گا۔ آخر بھابی ہیں ناں، بہن ہوتیں یا باجی ہوتیں میری تو ایسا نہ کرتیں۔ بلکہ میری مدد کرتیں۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ہم دونوں بھائیوں کی کوئی بہن نہیں ہے، کسی سے ہم یہ مان نہیں کر سکتے کہ... کہ کوئی ہماری مدد کرے گا کسی ذاتی سلسلے میں" اختر کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ عصمت کی ہنسی بھی سکڑتی گئی۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"ارے کیا فضُول باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ کیا کہہ رہے ہو؟" عصمت نے کہا۔

"سچ کہہ رہا ہُوں عصمت بھابی، بعض اوقات کسی بہن کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، بہنیں تو بھائیوں کے لئے کتنا ایثار کرتی ہیں۔ مگر ہماری بدنصیبی کہ ہم کسی بہن کی محبت سے محرُوم ہیں، چھوٹی ہوتی یا بڑی، ایک بہن ہوتی تو شاید زندگی کا رُخ ہی بدلا ہُوا ہوتا" اختر کی آواز میں بھرّاہٹ پیدا ہو گئی۔ اور عصمت ہکا بکا سی اپنی جگہ سے اُٹھی اور پھر بولی۔

"یہ کیا شروع کر دیا تم نے اختر، فضُول باتیں۔ کیا میں تمھاری بہن نہیں ہُوں"

"کہاں ہیں بہن؟ ہنس رہی ہیں ناں مجھ پر میری کسی اُلجھن پر، میری کسی پریشانی پر، بہن ہوتیں تو... تو..." اختر کے حلق سے سسکی

سی نکل گئی اور عصمت کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"میں تو تمہیں بھائی ہی سمجھتی ہوں اختر، یقین کرو یہ تم نے، یہ تم نے کیسی باتیں شروع کر دیں" عصمت کی آواز میں بھرّاہٹ پاکر اختر نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور عصمت ایک بار پھر چونک پڑی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اختر کو دیکھ رہی تھی۔ اختر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"چیلنج کیا ہے آپ کی سسٹر نے، نمونہ دیکھ لیا آپ نے، اگر آٹھ اور آٹھ سولہ آنسو نہ رلادوں اُن خاتون کو تو میرا نام بھی اختر نہیں ہے۔ اسے کہتے ہیں اداکاری۔ دو منٹ میں آواز بھرّا گئی"

"خدا تم سے سمجھے اختر! تم نے واقعی مجھے افسردہ کر دیا"

"ارے چھوڑیئے۔ اختر صاحب کا فن ابھی کس نے دیکھا ہے، آپ نے میری آواز سنی ٹیلی فون پر"

"خدا کی قسم اگر رِدا بھی یہ آواز سُنے تو نہ پہچان سکے۔ یہ ندرت واقعی شیطان صفت ہے"

"ہے ناں، ہے ناں۔ یہ کہی ہے ناں بہنوں والی بات، چلئے آپ ہی کو بہن مان لیا۔ مگر یار عصمت بھابی یا عصمت باجی یہ تو زیادتی ہے ناں اب دیکھئے ناں، نہ جانے کتنا عرصہ لگے گا۔ شادی میں اور اُس وقت تک، اُس وقت تک بوریت کا شکار رہیں گے ہم۔ کیا آپ کے خیال میں یہ مناسب ہے"

"بھئی میں خود ان معاملات سے بہت ڈرتی ہوں اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ معاملہ کتنا آگے نکلتا ہے، بہر طور دیکھو اختر ایک بہن ہی کی حیثیت سے مشورہ دے رہی ہوں۔ شرارتیں اپنی جگہ لیکن اگر ایسی باتیں عام زبانوں تک پہنچ جاتی ہیں تو لوگ خواہ مخواہ کی باتیں کرتے ہیں۔ بگاڑ ہمارا کوئی بھی کچھ نہیں سکتا۔ بس ایک ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے"

"چھوڑیں عصمت باجی آپ اپنا پہلو بچا رہی ہیں! خیر ہم بھی اپنے مسئلے میں کچھ نہ کچھ کر ڈالیں گے"

"بات سنو۔ کوئی مصروفیت تو نہیں ہے اس وقت" عصمت نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ کوئی ارشاد" اختر نے سوال کیا۔

"ہاں۔ مٹھائی وغیرہ تقریباً ہر جگہ تقسیم ہو چکی ہے ایک گھر رہ گیا ہے۔ وہاں تمہیں ہی جانا پڑے گا"

"گویا یہ نائی کے فرائض بھی خادم ہی کو سرانجام دینا پڑیں گے"

"اپنے لئے تو لوگ نہ جانے کیا کیا بن جاتے ہیں تمہیں تو صرف نائی ہی بننا پڑے گا"

"عجیب سا کام ہے ویسے یہ مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنا۔ کہاں بھیجنی ہے اب مٹھائی آپ کو"

"ڈاکٹر نعمان نہ جانے کہاں غائب ہیں، نظر بھی نہیں آئے کئی دن سے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ مٹھائی اُنھیں نہ جائے" عصمت نے کہا۔

"لائیے عنایت فرمائیے ہم یہ ذمّہ داری سرانجام دے دیتے ہیں"

"میرا بھیّا" عصمت نے کہا اور اُس کے بعد مٹھائی کی ایک خوبصورت پیکنگ ڈاکٹر نعمان کے لئے دے دی گئی۔

"اور تصور بیگ کے لئے"

"لے جاؤ ایک پیکٹ اُن کے لئے بھی لے جاؤ" عصمت نے کہا۔

اختر کو تو ویسے بھی فی الوقت کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ دونوں پیکٹ لیکر باہر نکل آیا اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کی گاڑی مرزا تصور بیگ کے بنگلے کی جانب دوڑنے لگی۔ ذہن میں رِدا کا خیال آگیا تھا۔ مرزا تصور بیگ سے بھی ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ رِدا کے مسئلے کو کچھ آگے بڑھانا ضروری تھا۔ ویسے یہ مسئلہ اختر کے خیال کے مطابق خود بخود تھوڑا تھوڑا کر کے آگے بڑھ رہا تھا۔ مرزا تصور بیگ نے کم از کم وسیم جمال کے سلسلے میں جو کچھ کیا تھا۔ وہ بے مثال تھا اور یقینی طور پر رِدا اُس سے متاثر ہوئی ہوگی تھوڑی دیر کے بعد وہ تصور بیگ کے بنگلے کے سامنے پہنچ گیا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر نعمان صاحب بھی تشریف رکھتے ہی تھے۔ باقی شاید بنگلے میں اور کوئی موجود نہیں تھا سوائے ملازموں کے کیونکہ اختر کا استقبال ڈاکٹر نعمان ہی نے کیا تھا۔

"اخاہ، یعنی کہ وہ آئیں گھر میں ہمارے!"

"بس بس۔ فضول قسم کی بکواس میں ناپسند کرتا ہوں۔ شعر کوئی نیا ہو تو سنایا کرو۔ یہ پُرانے شعر سُن سُن کر کانوں میں درد ہو جاتا ہے" اختر نے کہا۔

"جی بہتر۔ ویسے آپ کے ہاتھوں میں جو یہ خوش نما شئے نظر آ رہی ہے یہ کیا ہے"

"اِسے مٹھائی کہتے ہیں"

"طبی نقطۂ نگاہ سے تو یہ غلط چیز ہے، لیکن اِس کی دلکشی سے بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بائی دا وے یہ مٹھائی آپ یہاں چھوڑ جائیں گے"

"جی ہاں! ان میں سے ایک بکس آپ کا ہے۔ اور دوسرا

تصور بیگ کا۔ ویسے یُوں لگتا ہے جیسے اِس وقت اِس کوٹھی پر آپ ہی کی بادشاہت ہے۔ کوئی اور نظر نہیں آ رہا۔ مرزا تصور بیگ بھی نہیں ہیں شاید"

"جی ہاں! فی الحال یہی مسئلہ ہے۔ میری ڈیوٹی آج کل یہیں لگائی گئی ہے"

"کیا مطلب یعنی واقعی ہاؤس جاب کر رہے ہو" اختر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان بے اختیار ہنس پڑا۔

"واہ۔ پسند آئی یہ اصطلاح۔ ہاؤس جاب۔ اصُولی طور پر تو اِس کے یہی معنی ہیں آپ کو چائے بھی پلوائی جائے گی۔ اور کچھ کھلوایا بھی جا سکتا ہے، تشریف لائیے" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور اختر اُس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ ڈاکٹر نعمان نے پُوچھا۔

"ویسے سُنا ہے کہ مٹھائیاں کسی خوشی کے موقع پر ہی تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ خوشی کا موقعہ کب آیا؟ اور کب گزر گیا؟ کچھ ہمیں بھی علم ہو جائے"

"غائب کہاں ہو اتنے دن سے"

"یار اختر بھائی! کیا بتائیں۔ عجیب سی مصیبت کا شکار ہو گئے ہیں ہم اِن دِنوں" نعمان نے اُداس لہجے میں کہا اور اختر نعمان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"خیریت؟ اِتنے اُداس ہو کیا بات ہے"

"ہاں ہے تو سب خیریت، بس آپ کے ہاں آنے جانے کے مسئلے میں کبھی کبھی غیرت آجاتی ہے۔ دراصل یہ مکان تو اِس قابل نہیں ہے کہ یہاں بھی کبھی کبھی شام کی چائے کی نشست جمائی جا سکے۔ ہم مُردوں کے علاوہ کون ہے۔ یہاں اور ظاہر ہے ہمارے لئے انتظامات کرنا بھی مشکل ہیں۔ روز روز آپ کے ہاں چائے کے لئے پہنچ جانا عجیب لگتا ہے"

"رہے ناں ڈاکٹر کے ڈاکٹر۔ کبھی اِس کے آگے پیچھے بھی کچھ سوچ لیا کرو" اختر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان متعجب نِگاہوں سے اختر کو دیکھنے لگا۔ پھر پریشان لہجے میں بولا۔

"کچھ سمجھا نہیں"

"اِتنے سمجھدار ہوتے تو ڈاکٹر ہوتے"

"جملے پر جملہ کئے جا رہے ہیں، سمجھاتے بھی تو جایئے" نعمان نے بسُورتے ہُوئے کہا۔

"یعنی کبھی غیریت کا اظہار نہیں کیا ہم لوگوں نے مگر تم آنے جانے سے بھی گریز کرتے ہو"

"ویسے نہ کرتا لیکن"

"جی... لیکن..."

"اُن کی بدنامی کا خیال رہتا ہے"

"کِس کی" اختر نے لُطف لیتے ہُوئے کہا۔

"یار تو ویر کی بات کر رہا ہُوں" نعمان جھلا کر بولا اور اختر کا قہقہہ گُونج اُٹھا۔

"گھوڑوں گدھوں کے ڈاکٹر بھی ایسے نہ ہوتے ہوں گے" اختر نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"اِس میں ڈاکٹری کہاں سے آگھسی۔ آپ جیسی تقدیر تو ہے نہیں اپنی کہ آنکھیں بند کر کے جو چاہا حاصل کر لیا۔ میں بہرحال وہاں زبردستی گھسا ہُوں۔ اور ذرا سی لغزش پر نکالا جا سکتا ہُوں۔ اُنھیں آپ جانتے ہیں کبھی اجتناب تو اِتنا کہ لگتا ہے شناسائی ہی نہیں اور کبھی التفات ایسا بیباک کہ ابھی کہہ دیں گی کہ قاضی کہاں ہے"

"وہ معصوم لڑکی ہے"

"سو تو ہے۔ مگر وہاں کچھ خطرناک نِگاہیں تعقب کرتی ہیں اور مجھے ڈر لگتا ہے"

"عزیزی! کچے آدمی ہو، کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے" اختر نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"تو میں نے کب اِس بات کا اظہار کیا ہے کہ اِس معاملے میں بھی مشق رکھتا ہُوں" ڈاکٹر نعمان بدستور مُنہ بسُورتے ہُوئے بولا۔

"ہمت کے بغیر دُنیا میں آج تک کوئی کام نہیں کیا جا سکا"

"ہمت تو ہے مگر سب لوگ اِتنے اچھے ہیں کہ اُن کے سامنے ذلیل نہیں ہونا چاہتا۔ خیر چھوڑیئے اِن باتوں کو اختر بھائی آپ اپنی سُنایئے، ارے ہاں پھر مٹھائی کی بات آگئی یہ مٹھائی کس سلسلے میں ہے"

"ہمتِ مرداں مددِ خُدا"

"کیا مطلب"

"میاں ہم نے ہمت کی، پالا مار گئے"

"وہ کیسے" ڈاکٹر نعمان مُنہ کھول کر بولا۔

"میاں، نعمان صاحب قِصّہ یہ ہے کہ ہماری بات محترمہ ندرت غلام احمد کے ساتھ طے ہوگئی ہے، خالد کی شادی بھی بہت جلد طے ہو جائے گی میرا مطلب ہے تاریخ، اور ہمارے بھی سہرے کے پھُول کھِلنے والے ہیں یہ مٹھائی اِس سلسلے میں ہے"

"گویا کوئی تقریب ہو گئی"

"نہیں تقریب نہیں بس بزرگوں کو رحم آگیا اور یہ موضوع

نکال بیٹھے، کام بن گیا اپنا" اختر نے کہا۔

"تب تو واقعی خلوصِ دل سے اِس کی مُبارک باد پیش کرتا ہُوں ایک جرماں نصیب کی حیثیت سے"

"کیا بدشگونی کر رہے ہو یار، یہ کیا بات ہُوئی بھئی ہمت کر کے آگے ہاتھ بڑھاؤ اور جام اُٹھا لو"

"ڈر لگتا ہے جیسے ہی ہاتھ بڑھا اُس پر ڈنڈا پڑے گا"

"تو اُس سے کیا فرق پڑتا ہے دوسرا ہاتھ بڑھا دینا"

"اور دوسرے پر بھی ڈنڈا پڑ گیا تو؟"

"پہلا ہاتھ" اختر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان ڈرے ڈرے انداز میں ہنسنے لگا پھر بولا۔

"اختر جیسی ہمت کہاں سے لاؤں؟ ویسے واقعی خلوصِ دل سے مُبارک باد پیش کرتا ہُوں۔ میری بات چھوڑو۔ میرے خیال میں میرا مسئلہ کافی مشکل ہے"

"نہیں ڈاکٹر نعمان تمھارا مسئلہ بالکل مشکل نہیں ہے لیکن ہمت کئے بغیر چارہ کار نہیں ہوگا"

"اُستاد ہی اگر ساتھ چھوڑ دے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے"

"یہ اچھی بات ہے جس کو دیکھو وہی اُستاد بنا لیتا ہے یہ سب مطلب نکالنے کی باتیں ہیں۔ میں کسی کا اُستاد وُستاد نہیں ہُوں" اختر نے کہا۔

"چلیئے یہی سہی لیکن مطلب نکالنے کے لئے بھی اُس شخص کو منتخب کیا جاتا ہے جو اس حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ ویسے ہم تو ہمت نہیں کر پائیں گے آپ سے مدد کی درخواست کرنے کی۔ بس تقدیر پر چھوڑ دیتے ہیں اپنے آپ کو"

"چھوڑ دو۔ چھوڑ دو اور جہنم میں جاؤ۔ وہ چائے کہاں ہے؟"

"ابھی بس چند منٹ کے اندر اندر" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور پھر وہ خود ہی چائے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بہترین چائے آگئی تھی چائے کی دو چسکیاں لے کر اختر نے کہا۔

"چائے اتنی عمدہ ہے کہ تمھارے لئے کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے"

"میں آپ کو ایسی عمدہ چائے کی ایک ہزار پیالیاں پلا سکتا ہُوں، اختر بھائی واقعی کچھ کر ہی ڈالئے میرے لئے بھی"

"آ جاؤ شام کو۔ ویسے ایک مشورہ دُوں ڈاکٹر نعمان اگر مان لو تو"

"جی... جی ارشاد۔ ارشاد" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"تم یُوں کرو رُدا سے مل لو"

"کس سے؟"

"رُدا کو نہیں جانتے؟"

"کیوں نہیں جانتا"

"تو پھر رُدا سے مل کر اپنے دِل کا حال اُن پر واضح کر دو"

"ارے باپ رے یہ اُس سے بھی زیادہ خطرناک کام ہے" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"نہیں ہے۔ میں کہہ رہا ہُوں اِس لئے"

"اللہ کے لئے ذرا سی وضاحت کر دیں زندگی بھر احسان مانوں گا" ڈاکٹر نعمان نے گڑگڑاتے ہُوئے کہا۔

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میرے سلسلے میں بھی محترمہ رُدا صاحبہ نے ہی امداد فرمائی اور احسان احمد صاحب سے گفتگو کی ہے۔ دراصل رُدا اور احسان احمد صاحب کی بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے اور دونوں ایک دوسرے کی بات مانتے ہیں۔ چنانچہ یہ مسئلہ رُدا ہی کے ذریعے حل ہو گا تم یُوں کرو یار آج ہی رُدا کے پاس اُس کے دفتر پہنچ جاؤ"

"دد... دفتر"

"ہاں دفتر بھی نہیں جانتے کیا؟"

"نہیں نہیں دفتر تو جانتا ہُوں۔ وہ احسان لمیٹڈ ہی میں بیٹھتی ہیں ناں"

"بالکل سو فیصدی"

"تو رُدا کے پاس چلے جاؤ اور نہایت ہی دست بستہ انداز میں اُس سے اظہارِ مدعا کر دو۔ ہو سکے تو آنکھوں میں دو چار آنسو بھی لے آنا بس یُوں سمجھ لو کام بن جائے گا"

"آنسو" ڈاکٹر نعمان تھوک نگل کر بولا۔

"نہیں نکلتے کیا؟"

"میں سنجیدگی کی توقع رکھتا ہُوں آپ سے"

"تو انتہائی سنجیدگی سے آنسو بہا لینا اِس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ طبی نقطۂ نگاہ سے بھی بہتر ہے۔ سُنا ہے آنکھیں صاف ہو جاتی ہیں"

"یہ کام میں نہیں کر سکتا" ڈاکٹر نعمان جھلاتے ہُوئے لہجے میں بولا۔

"چلو ٹھیک ہے کم از کم بھکاریوں جیسی شکل تو بنا سکتے ہو"

"آپ مسلسل مذاق کئے جا رہے ہیں اتنی سنجیدہ گفتگو پر"

"تو پھر جو کہہ رہا ہُوں وہی کرو ناں۔ رُدا کے پاس چلے جاؤ اور اُس سے مدعائے دِل بیان کر دو یہ ہمت تو کرنی پڑے گی دوست ورنہ کام مشکل ہو جائے گا"

"اِس طرح کام بن سکتا ہے؟"

"سو فیصدی، جو کچھ میں کہہ رہا ہُوں کر ڈالو اور آگے اللہ پر بھروسہ رکھو" اختر نے چائے کی پیالی خالی کرتے ہُوئے کہا۔ نعمان پریشان نظروں سے اختر کو دیکھ رہا تھا پھر اُس نے کہا۔

"اِس کے علاوہ کوئی اور ترکیب ہو سکتی ہے اختر بھائی۔"

"ہو سکتی ہے" اختر اطمینان سے کہا۔

"وہ بتائیے!"

"خودکشی کر لو"

"ایں؟"

"اِس کی ترکیب بھی بتا سکتا ہُوں۔ ایک ہزار ایک سو ایک نسخے جانتا ہُوں خودکشی کرانے کے" اختر نے کہا اور ڈاکٹر نعمان نے مغموم سی شکل بنا لی۔

"ٹھیک ہے اختر بھائی! جو منزل پا لیتے ہیں وہ نا آسُودۂ منزل کا اِسی طرح مذاق اُڑاتے ہیں۔ آپ بھی مذاق اُڑا لیں"

"یار عجیب انسان ہو۔ دماغ خالی کر کے رکھ دیا جو کچھ کہہ رہا ہُوں مان نہیں رہے۔ المیہ ڈائیلاگ بولے جا رہے ہو" اختر نے جھلائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

"اور اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو؟"

"خُدا حافظ" اختر نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"خُدا کی قسم میں جا رہا ہُوں رُدا صاحبہ کے پاس لیکن بات بگڑی تو خودکشی کر لُوں گا اور میرا خُون آپ کی گردن پر ہو گا" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور اختر باہر نکل آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رُدا معمُول کے مطابق دفتری کاموں میں مصرُوف تھی۔ لنچ کا وقت گزر چکا تھا۔ احسان احمد چلے گئے تھے اور وہ کچھ اہم فائل دیکھ رہی تھی کہ چپراسی نے ایک کارڈ پیش کیا۔

"یہ صاحب ملنا چاہتے ہیں میڈم" رُدا نے فائلوں سے گردن اُٹھائی۔ کارڈ پر ایک نظر ڈالی اور پھر چونک پڑی کارڈ پر ڈاکٹر نعمان نمایاں نظر آ رہا تھا۔

"بُلاؤ۔ بُلاؤ" رُدا نے فائل سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہُوئے کہا اور چپراسی باہر نکل گیا اُس نے دروازہ کھولا۔ اور ڈاکٹر نعمان عجیب سی شکل بنائے ہُوئے اندر آگیا۔ رُدا نے کُرسی سے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا تھا۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب تعجب ہے آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"بیٹھ سکتا ہُوں" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"ارے ہاں ہاں تشریف رکھئے تشریف رکھئے پلیز" رُدا نے اشارہ کرتے ہُوئے کہا اور ڈاکٹر نعمان کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے جیب سے رُومال نکالا اور پیشانی خُشک کرنے لگا۔ رُدا دلچسپ نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی پھر اُس نے کہا۔

"کیا گرمی زیادہ ہے باہر؟"

"ج... جی نہیں۔ مم۔ مجھے لگ رہی ہے بس"

"آپ کچھ پریشان ہیں"

"جی ہاں سخت پریشان ہُوں"

"خُدانخواستہ خیریت۔ کیا بات ہے؟" رُدا نے سنجیدگی سے کہا۔

"کک... کچھ نہیں آپ... آپ ذرا ایک گلاس پانی منگوا دیجئے"

"ہاں ہاں ضرور" رُدا حیرت زدہ لہجے میں بولی اور اُس نے گھنٹی بجا کر چپراسی سے پانی لانے کے لئے کہا اُس وقت تک خاموش رہی جب تک ڈاکٹر نعمان نے پانی کا گلاس خالی نہ کر لیا پھر وہ جھینپی ہُوئی نگاہوں سے رُدا کو دیکھتے ہُوئے بولا۔

"آپ بھی کیا سوچ رہی ہوں گی میرے بارے میں؟"

"میں صرف یہ سوچ رہی ہُوں کہ آخر آپ کو ایسی کیا پریشانی لاحق ہو گئی؟ سب خیریت تو ہے ناں"

"جی ہاں بالکل خیریت ہے کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے، بس میں ذاتی طور پر کچھ پریشان ہُوں"

"آپ ذاتی طور پر بھی پریشان نہ ہوں، مجھے بتایئے کیا پریشانی ہے۔ اگر کسی پریشانی میں آپ نے میری طرف رُخ کیا ہے تو بس یُوں سمجھ لیجئے کہ وہ پریشانی دُور ہو گئی"

"کیا واقعی؟" ڈاکٹر نعمان نے گہری نگاہوں سے رُدا کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

"کوشش تو یہی کروں گی انشاء اللہ" رُدا نے کہا۔

"تو بس پھر یُوں سمجھ لیجئے کہ آپ میری پریشانی دُور کر سکتی ہیں"

"تو پھر پریشان ہونا چھوڑ دیجئے جب آپ کو یہ یقین ہے کہ پریشانی میرے ذریعے دُور ہو سکتی ہے تو یہ بھی یقین ہونا چاہیئے آپ کو کہ میں آپ کی پریشانیوں میں برابر کی شریک ہُوں"

"خُدا کی قسم رُدا باجی آپ نے دِل بڑھا دیا ہے دراصل زمانہ اِتنا خراب ہو چُکا ہے کہ اب بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کے لئے خود ہی کوششیں کرنی پڑتی ہیں ورنہ عزت واحترام کا جہاں تک معاملہ ہے تو آپ یُوں سمجھ لیجئے کہ میں آپ کی عزت بڑی بہن کی مانند کرتا ہُوں۔ بڑی بہنوں کے سامنے زبان کھولنا اور وہ

بھی ایک ایسے مسئلے میں جو بہتر نہیں ہے، بڑا مشکل کام ہے۔"

"اگر کوئی ایسا مسئلہ ہے جسے آپ بہتر نہیں سمجھتے تو پھر مجھ سے وہ کام کیوں کرانا چاہتے ہیں؟" رِدا نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، ہے تو بہتر لیکن کسی کو اگر بڑا تسلیم کیا جائے تو پھر اُس کے سامنے یہ ساری باتیں کرتے ہُوئے عجیب سا احساس ہوتا ہے۔"

"چلیں بہت سی باتیں ہوگئیں اب آپ ایسا کریں اپنی پریشانی دُور کرنے کے لئے وہ بات جلدی سے مجھ سے کہہ ڈالیں جسے کہتے ہُوئے آپ اِتنی پریشانی کا شکار ہیں۔"

"رِدا باجی!" ڈاکٹر نعمان بھرّائے ہُوئے لہجے میں بولا۔

"بھئی اب باجی کہہ دیا ہے تو بہت سی ذمّے داریاں بھی لاد دی ہیں آپ نے ہمارے کاندھوں پر۔ کہہ ڈالئے، کہہ ڈالئے پریشانی کیا ہے آخر؟"

"دراصل آج اختر صاحب آئے تھے۔"

"کہاں آئے تھے؟"

"میرے پاس مٹھائی کا ڈبّہ لے کر۔"

"اوہو اچھا، اچھا، ہاں یقیناً پہنچے ہوں گے، سُنا ہے آج کل مٹھائی بیچتے پھر رہے ہیں۔"

"جی نہیں بیچنے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ وہ میرے لئے لائے تھے۔"

"کِس سلسلے میں؟" رِدا نے لُطف لیتے ہُوئے کہا۔

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"ایک دو سِلسلے تو معلوم ہیں مجھے جیسے اُن کی نسبت طے ہوگئی۔"

"بس بس وہی سِلسلہ تھا۔"

"تو کیا ہُوا، مٹھائی میں کچھ گڑبڑ نکل آئی؟"

"نہیں، رِدا باجی پلیز آپ میرے نروس ہونے سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ میں واقعی بہت زیادہ نروس ہو رہا ہُوں۔"

"اچھا چلیئے فائدہ نہیں اُٹھاتے اب بتا دیجئے قصّہ کیا ہے؟"

"دراصل میں چاہتا ہُوں کہ میرا، میرا سِلسلہ بھی ہو جائے۔"

"کیا سِلسلہ ہو جائے؟"

"وہ رِدا باجی! میں... میں بھی شادی کرنا چاہتا ہُوں۔ جی میں بھی شادی کرنا چاہتا ہُوں کہہ دیا میں نے ایسا ہو کر رہے گا۔"

"اوہ، کوئی روک رہا ہے آپ کو شادی سے؟" رِدا بمشکل تمام ہنسی روک کر بولی۔

"نہیں رِدا باجی! میں تنویر سے شادی کرنا چاہتا ہُوں سمجھیں آپ، اور آپ کو میری مدد کرنا ہوگی، بس یہ کام کرنا ہوگا آپ کو۔ آپ صرف اختر اور خالدہ کی ہی نہیں میری بھی بہت کچھ ہیں ارے۔ واہ میرا کوئی نہیں ہے تو اِس میں میرا کیا قصور ہے؟" رِدا بدستور مُسکراتی رہی، پھر اُس نے کہا۔

"میں آپ کو چند اصُولی باتیں بتا سکتی ہُوں ڈاکٹر نعمان۔"

"وہی بتا دیں۔"

"بھئی ایسے معاملات بزرگوں کے ذریعے طے کئے جاتے ہیں۔ آپ اپنے بزرگوں کو اِس کے لئے تیار کریں۔ اُنھیں باقاعدہ پیغام لے کر بھیجیں اللہ نے چاہا تو کام بن جائے گا۔"

"بزرگ؟"

"جی ہاں کیوں؟"

"نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ چچا جان یا تصور بھائی... چچا جان کا تو میں خیر تصور بھی نہیں کرسکتا۔ رہے تصور بھائی۔ تو... تو..."

"آپ یُوں کریں، پہلے تصور صاحب سے بات کرلیں وہ آپ کے چچا جان سے بات کرلیں گے۔"

"ہاں یہی ایک طریقہ ہے۔ مگر میں نے تو کبھی تصور بھائی سے بھی ایسی باتیں نہیں کی ہیں۔"

"کمال ہے، اب کیا کروں یہ بتائیے۔"

"نہیں وہ کچھ نہیں۔ آپ کا کہنا دُرست ہے۔ ویسے یہ کام کب تک ہو جانا چاہیئے۔"

"آج کل شادیوں اور نسبتوں کا موسم ہے۔ کرلیں تو اچھا ہے۔"

"بہتر کوشش کرتا ہُوں۔ اجازت دیجئے۔"

"ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا، کچھ آپ کریں کچھ ہم کرتے ہیں۔ اللہ مالک ہے۔"

"جی بہت بہت شُکریہ رِدا باجی۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا اور کُرسی کھِسکا کر کھڑا ہوگیا۔ رِدا مُسکراتی نِگاہوں سے اُسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو رِدا کے ہونٹوں پر خود بخود ہی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ معاملات کافی دِلچسپ تھے، اتفاق کی بات تھی کہ یہ صُورتِ حال کِسی حد تک اُس کے علم میں پہلے ہی آگئی تھی اور اُس نے بالکل ہی غیر یقینی طور پر احسان احمد صاحب کے سامنے اِس جوڑے کا نام بھی لے دیا تھا اور آج یہ مسئلہ کھُل کر سامنے آگیا تھا۔ ویسے اختر بھی بہت ہی دِلچسپ انسان تھا۔

آخر اُس نے میرا انتخاب کیوں کیا اور ڈاکٹر نعمان کو یہاں کیوں بھیج دیا۔ اختر کی ذہنی صلاحیتوں کا رِدا کو پُورا پُورا احساس تھا۔ پھر دِل کے کسی گوشے سے ایک عجیب سی کیفیت کا اظہار ہُوا۔ اِس طرح تصور بیگ... تصور بیگ کچھ اور قریب آجائے گا۔ حالانکہ اُس سے جو ملاقات ہُوئی تھی وہ بہت اطمینان بخش تھی اور رِدا کو یُوں محسوس ہُوا تھا جیسے تصور کے ذہن سے اُس کی بداخلاقی کے اثرات کم ہوتے جا رہے ہوں۔ لیکن پھر بھی اُس دِن کے بعد سے آج تک تصور کا سامنا نہیں ہُوا تھا۔ رِدا نے جب بھی اُس کے بارے میں سوچا تھا۔ اُسے احساس ہُوا تھا کہ واقعی تصور اُس کے ذہن میں کچھ ہلچل مچانے کا باعث بنا ہے۔ لیکن اِس سے آگے اُس کا اپنا تصور تاریکیوں میں گم ہو جاتا تھا۔

اُس شام کی چائے پر ڈاکٹر نعمان صاحب بنفسِ نفیس شریک تھے اور شاید اُن کی خوش بختی تھی کہ تنویر بھی اُن کی جانب مائل تھی رِدا دُور دُور سے اُن دونوں کا جائزہ لیتی رہی۔ تنویر تو خیر تھی ہی بہت سادہ لوح۔ لیکن ڈاکٹر نعمان بھی بہت زیادہ چالاک انسان نہیں تھا۔ اُس کی تصور بیگ سے حیرت انگیز مشابہت پر بھی آج رِدا نے بہت زیادہ غور کیا اور دیر تک نجانے کیا کیا سوچتی رہی۔ چائے کی تفریحات میں اضافہ ہوگیا تھا کیونکہ اختر حسین صاحب پریشان پریشان پھرتے رہے تھے۔ کیونکہ چائے کی اِس محفل میں نُدرت شریک نہیں تھی ہوسکتا ہے اِس سلسلے میں اُنھوں نے کسی سے احتجاج بھی کیا ہو۔ بہرطور یہ سارے معاملات بہت دِلچسپ تھے اور رِدا دُور دُور ہی سے اُن میں لُطف لے رہی تھی حسبِ معمُول چائے کے پروگرام کی تفریحات ختم ہوگئیں۔ کوئی ایسی بات رِدا تک نہیں پہنچی تھی جو قابلِ ذکر ہوتی اور وقت اِسی طرح گزر گیا تھا رات کو دیر تک رِدا کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا تصورات جاگتے رہے اور وہ بہت دیر تک سوچوں میں گم رہی۔ لیکن اُس کے بعد یہ تمام سوچیں نیند میں گم ہوگئی تھیں۔ دوسرا دِن معمُول کے مطابق تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہُوئی تھی جو قابلِ ذِکر ہوتی صبح کو معمُولات سے فارغ ہونے کے بعد وہ تیار ہو کر دفتر پہنچ گئی۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اُسے کسی کام سے احسان صاحب کے آفس میں جانا پڑا۔ اور وہ فائلیں لئے ہُوئے احسان صاحب کے دفتر میں داخل ہوگئی۔

احسان صاحب نے معمُول کے مطابق مُسکراتے ہُوئے اُس کا استقبال کیا تھا لیکن اُن کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی جسے رِدا محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی تب ہی اُسے احساس ہُوا کہ پچھلے کچھ وقت میں بھی احسان احمد صاحب اِسی طرح افسردہ نظر آتے رہے ہیں اِس بات پر اُس نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن آج اُس نے خصُوصی طور پر اِس بات پر غور کیا تھا۔ احسان احمد صاحب نے اُسے کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔

"جی بیٹے، کہیئے۔"

"یہ کچھ فائل تھے آپ نے اِن پر نگاہیں ڈال لی ہوں گی۔ آپ ہی کے پاس سے پہنچے تھے۔"

"جی بالکل مجھے یاد ہے۔"

"چند اُمور پر بات کرنی تھی۔"

"میں فرصت سے ہُوں۔" احسان احمد صاحب نے کہا۔ اور رِدا اُن فائلوں کے بارے میں احسان صاحب سے ڈسکس کرنے لگی تھوڑی دیر کے بعد وہ اِس کام سے فارغ ہوگئی۔ اُس نے دو تین بار احسان احمد کے چہرے پر نگاہیں ڈالی تھیں۔ اور ہر بار اُسے یہ محسوس ہُوا تھا کہ احسان صاحب یقینی طور پر مطمئن نہیں ہیں بلکہ کسی اُلجھن کا شکار ہیں۔ تاہم اُنھوں نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"جی مینیجر صاحب اور کوئی حکم؟"

"جی نہیں، اب ذرا مینیجر کی پوسٹ سے ہٹ کر رِدا کی حیثیت سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہُوں۔"

"کُرسی تو نہیں بدلنا ہوگی؟" احسان احمد صاحب نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"جی نہیں۔ میں ہر جگہ رِدا ہُوں اور ہر جگہ مینیجر۔"

"گڈ۔ ہم آپ کے اِس عہدے کو ہر جگہ سے تسلیم کرتے ہیں۔" احسان احمد صاحب نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"انکل آپ کچھ پریشان ہیں۔" رِدا احسان احمد صاحب کے چہرے پر نگاہیں جما کر بولی۔ اور اُس نے احسان احمد کو چونکتے ہُوئے دیکھا۔

"یعنی، یعنی۔"

"آپ پریشان ہیں انکل غالباً دو یا تین دِن سے۔"

"ہماری پریشانی کا احساس آپ کو کیسے ہُوا رِدا بیٹے؟"

"اِس لئے انکل کہ میں آپ کے چہرے کو بغور دیکھتی ہُوں۔ اور اُسے پڑھتی بھی ہُوں۔"

"یعنی کمال ہے یہ چوری کب سے ہو رہی ہے بھئی۔ ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا۔" احسان احمد صاحب بولے۔

"زیادہ گہرائیوں میں نہیں گئی میں، بس یُونہی کبھی کبھی آپ پر بھی غور کرلیتی ہُوں۔ آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ کیوں پریشان ہیں؟"

"آپ ڈانٹ کر کہیں گی تو ضرور بتادیں گے۔" احسان احمد ہنس کر بولے۔

"آپ نے مجھے جو مقام دیا ہے انکل! اُس کے بارے میں، میں جانتی ہُوں اسی لئے اِس اعتماد سے پُوچھ رہی ہُوں۔"

"ہُوں! رُدا کچھ ایسے حالات ہیں جو میں شاید ذکیہ کو بھی نہ بتاسکوں اُن کا تعلق صرف میرے دِل کی گہرائیوں سے ہے۔"

"اوہ۔" رُدا چونک پڑی۔ بہت بڑی بات کہہ دی تھی احسان احمد نے۔ اب وہ پریشان ہوگئی تھی۔ بمشکل اُس نے کہا "سُوری انکل۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید... شاید کوئی عام بات ہو۔"

"مطلب؟"

"نہیں۔ اِتنا اہم معاملہ ہے تو... تو میں اُسے پُوچھنے کا حق نہیں رکھتی۔"

"گویا ہتھیار ڈال رہی ہو؟"

"یہ بات نہیں انکل! بس یُونہی۔ اجازت چاہتی ہُوں۔"

"بیٹھو بیٹے! تم نے خود اپنا ایک مقام متعین کرلیا ہے اور فاصلے منتخب کرلئے ہیں حالانکہ... حالانکہ... بیٹھ... بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں اپنی پریشانی کی وجہ بتانا چاہتا ہُوں۔" احسان احمد بولے۔ اور رُدا بیٹھ گئی۔ احسان احمد کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

"حالات سے تم ناواقف نہیں ہو رُدا۔ ثناء میری اکلوتی بیٹی ہے، بہت چاہتا ہُوں میں اُسے۔ اُس کی شادی ہو رہی ہے اور... اور..." احسان احمد کی آواز لرز گئی۔

"انکل!" رُدا آہستہ سے بولی۔

"ہاں رُدا! تم خود سوچو۔ اِس وقت میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرا نہیں غلام احمد کا ہے۔ بغیر کسی حیل وحجت کے گزار رہا ہُوں۔ ہر کام ہو رہا ہے مگر کیا دِل سے یہ خیال نکل سکتا ہے کہ یہ سب کچھ میرا نہیں۔ غلام احمد کا ہے۔ اُس کی بیٹی کی شادی ہُوئی نہ جانے کیا کچھ ہوگا اُس کے دِل میں، نہ جانے کیا دینا چاہتا ہوگا وہ اُسے۔ سب کچھ میں نے کیا۔ وہ اِتنا عجیب انسان ہے کہ کسی معاملے میں کچھ نہ بولا نہ جانے کہاں کمی رہ گئی ہوگی۔ نہ جانے کہاں اُسے اپنی زبان روکنا پڑی ہوگی۔ بڑا خوش تھا میں یہ سوچ کر کہ میرا خاندان میرے ساتھ پل رہا ہے۔ میں اپنی دولت سے بہت کچھ کر رہا ہُوں اپنوں کے لئے۔ بڑا خوش تھا میں اپنی اِس سرشت پر۔ لیکن وہ میرے اپنے تھے۔ میرے عزیز میرا خون۔ کوئی احسان نہ تھا کسی پر۔ اُن کا حق دے رہا تھا میں اُنھیں جو مجھ پر فرض تھا۔ مگر غلام احمد میرا کون ہے۔ کوئی بھی تو نہیں۔ اور اُس نے اپنا سب کچھ مجھے دے دیا ہے۔ میں نے نہ جانے خود پر کتنا جبر کر کے اُس کا یہ سب کچھ لے لیا ہے۔ عصمت کی شادی تھی جو دِل میں آیا کرتا رہا۔ ایک اعتماد تھا کہ جو کچھ کر رہا ہُوں غلام احمد کی بیٹی کے لئے کر رہا ہُوں، لیکن اب، اب ثناء کی شادی ہے اُس کے لئے کیا کروں؟ جو کچھ خرچ کروں گا اُس پر دِل روتا رہے گا۔ جُرم کا احساس رہے گا۔ آخر کتنی ڈھٹائی اختیار کروں۔ ڈھٹائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اور اگر احتراز کرتا ہُوں تو... تو ثناء کو کیا دُوں گا؟ کیا دُوں گا اپنی بچّی کو؟"

احسان احمد کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ثناء ششدر رہ گئی تھی۔ بلاشبہ احسان احمد کی سوچ دُرست تھی۔ ایک ایسا احساس تھا یہ جسے کسی طور نظر انداز نہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ گُم صُم بیٹھی رہی۔ اِس مشکل کا کوئی حل نہ تھا۔ کوئی حل نہ تھا۔

"بتاؤ میری پریشانی میری افسردگی دُرست ہے ناں۔ اور یہ بات میں کسی سے کہہ سکتا ہُوں۔ ذکیہ یا اماں بی سے بھی نہیں کیونکہ وہ آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کرسکیں گی۔"

رُدا خاموش بیٹھی رہی۔ چند لمحات کے بعد احسان احمد نے خود کو سنبھال لیا اور بولے "بس بیٹے یہی اُلجھن ہے۔ دیکھو خُدا کو کیا منظور ہے۔ بظاہر کوئی حل نہیں ہے اِس اُلجھن کا۔"

رُدا کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اُٹھی اور باہر نکل آئی۔ لیکن دِل و دماغ تہ و بالا ہوگئے تھے۔ واقعی ایک دردناک مسئلہ تھا اور کسی کے پاس اِس کا کوئی حل نہیں تھا۔ اُس کے بعد دفتر میں اُس سے کوئی کام نہ ہوسکا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی تھی۔

"لنچ ٹائم ہوچکا ہے میڈم۔ کچھ کھائیں گی؟" چپراسی نے اندر آکر کہا۔

"نہیں۔" وہ بھاری لہجے میں بولی اور پھر گردن اُٹھا کر کہا۔ "بڑے صاحب موجود ہیں؟"

"نہیں جی۔ وہ تو بہت دیر پہلے چلے گئے۔" چپراسی نے جواب دیا۔

"ہُوں! میں بھی جارہی ہُوں۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی تیار کرلے۔"

"جی میڈم۔" چپراسی نے کہا اور باہر نکل گیا۔ احسان احمد کی باتوں نے اُسے بہت افسردہ کردیا تھا۔ درحقیقت اُن کی سوچ

بالکل دُرست تھی۔ غلام احمد کے فرشتہ ہونے میں کوئی شک نہیں تھا اُنھوں نے فرشتوں جیسا ہی کام کیا تھا اور خود رُدا بھی کبھی کبھی حیرانی سے اُس شخص کے بارے میں سوچتی تھی جو آج بھی بس ملازموں کی ہی مانند سر جُھکائے احسان احمد کے احکامات مانتا رہتا تھا اور اُس کے انداز میں کبھی ایسی کوئی کیفیت نہیں پیدا ہُوئی تھی جس سے کسی کو احساس ہوتا کہ اُسے اپنی اصلیت کا عِلم ہے نہ صرف وہ بلکہ اُس کے اہلِ خاندان بھی بے مثال لوگ تھے، نُدرت تھی، عصمت تھی اور غلام احمد صاحب کی اہلیہ اور والدہ تھیں۔ عورتیں اِتنی فراخدلی کا ثبوت نہیں دے پاتیں۔ لیکن اُن لوگوں کی فراخدلی بے مثال تھی کسی کے انداز میں بھی جو یہ کیفیت پائی جاتی ہو کہ اُسے اپنی اصل حیثیت کا احساس ہے۔ ایسے دَور میں جب کہ انسان، انسانیت کے معیار سے بہت نیچے آچکا ہے ایسے لوگوں کا تصوّر صرف قصّے کہانیوں والی بات تھی لیکن یہ قصّے کہانیاں جیتی جاگتی رُدا کی آنکھوں کے سامنے موجود تھیں۔ اور اُن سے انحراف ناممکن، احسان احمد صاحب کی سوچ اپنی جگہ بالکل دُرست تھی بلاشبہ نُدرت یا عصمت کے سلسلے میں وہ پُورے اعتماد سے سب کچھ کرسکتے تھے لیکن ثناء کو کچھ دینا اُن کے لئے بے حد شرم کا باعث تھا غلام احمد صاحب کے کانوں تک اگر یہ بات پہنچتی تو شاید وہ سخت ناراض ہوجاتے لیکن احسان احمد کی اپنی سوچ اپنی جگہ تھی اور بدقسمتی یہ تھی کہ خود رُدا بھی اِس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتی تھی بالکل بے بس تھی وہ، کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے احسان احمد صاحب کی مشکل حل ہوسکتی۔ دفتر میں طبیعت اُچاٹ ہوگئی تھی احسان احمد صاحب کے پاس سے واپس آنے کے بعد کسی کام میں جی نہیں لگا تھا چنانچہ وہ دفتر سے نکل بھاگنے کی سوچ چکی تھی باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھی تو پھر وہی مسئلہ درپیش ہوگیا کہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ گھر جائے تو اُس کے لبد بھی سوچیں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گی۔ ایک ہی ایسی جگہ تھی جو اَب اُس کے لئے آنے جانے کا ذریعہ بن گئی تھی اور یہ تھا ثاقب کا گھر حالانکہ ثاقب کے تصوّر کے ساتھ اب اُس کے دِل میں کوئی ایسا احساس نہیں اُبھرتا تھا وہ وقت سے سمجھوتہ کرچکی تھی لیکن براہِ راست ثاقب سے کوئی رابطہ قائم کرنا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا اُس نے جب بھی اِس بارے میں سوچا اپنے آپ کو ثاقب سے تعلقات بڑھانے میں معذور پایا حِنا بار بار اُس کی نِگاہوں کے سامنے آجاتی تھی تاہم میرینا اور یوسف کا رویّہ ایسا تھا کہ اُسے وہاں جاکر خوشی ہی ہوتی تھی چنانچہ

اُس نے ڈرائیور کو پتہ بتادیا ڈرائیور پہلے بھی وہاں جاچکا تھا وہ خاموشی سے چل پڑا اور رُدا باہر کے مناظر دیکھتی رہی دُنیا بھاگ دوڑ میں مصرُوف تھی ہر ایک کے ساتھ نہ جانے کیا کیا مسائل ہوں گے اور ہر شخص اپنی اپنی اُلجھنوں کا شکار ہوگا زمین کے بسنے والے دُو ہاتھ اور دُو پاؤں پر جینے والے نہ جانے اپنے ساتھ کیا کیا مصیبتیں پال لیتے ہیں۔ انوکھی ہے یہ دُنیا واقعی بے حد انوکھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کار کا سفر ختم ہوگیا۔ اور رُدا خیالات کے ہجُوم میں ڈُوبی ہُوئی میرینا کے گھر کے دروازے پر چل پڑی۔ ڈرائیور سے اُس نے کہہ دیا تھا کہ کار کسی مناسب جگہ پارک کرلے۔ چند لمحات کے بعد اُس نے میرینا کے گھر کے دروازے کی بیل بجائی۔ دروازہ کھولنے والا جو کوئی بھی تھا اُسے دیکھ کر کم از کم اُس وقت دھک سے رہ گئی تھی۔ یہ تصوّر بیگ ہی تھا ایک لمحے کے لئے اُس نے سوچا کہ تصوّر کا میرینا کے ہاں بہت زیادہ آنا جانا ہے، لیکن اب سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ تصوّر خود اچنبھے کا شکار تھا پھر اُس نے مُسکرا کر اُسے راستہ دیتے ہُوئے کہا۔

"اندر تشریف لے آیئے، یہ مُبارک جگہ ہے کہ کم از کم یہاں آپ کی زیارت تو ہوجاتی ہے۔" رُدا نے خود کو سنبھالا اور جلدی سے اندر قدم بڑھادیئے، گھبرائے ہُوئے انداز میں اُس نے پُوچھا۔

"آنٹی ہیں؟"

"ہاں ہیں آپ میرے ساتھ آیئے۔" تصوّر بیگ نے کہا اور رُدا کو لئے ہُوئے ڈرائنگ رُوم کی جانب بڑھ گیا یوسف شاید موجود نہیں تھا ورنہ سب سے پہلے وہی آتا تھا میرینا بھی کسی کام ہی میں مصرُوف تھی چنانچہ تصوّر بیگ اُسے لئے ہُوئے ڈرائینگ رُوم میں پہنچ گیا اور اُس نے رُدا کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے ہنستے ہُوئے کہا۔

"آپ بھی کیا سوچتی ہوں گی کسی پر ایک احسان کردیا تو اُس نے گھر میں بسیرا ہی کرڈالا لیکن آپ یقین کیجئے کہ اُس دِن جب آپ سے ملاقات ہُوئی تھی اُس کے بعد سے آج یہاں آیا ہُوں یقین نہ آئے تو میرینا بھابی سے پُوچھ لیجئے گا۔"

"ارے نہیں! آپ کی بات پر یقین نہ آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔" رُدا نے جلدی سے کہا تو تصوّر بیگ بے اختیار مُسکرا اُٹھا۔ رُدا اُس کی معنی خیز مُسکراہٹ دیکھ کر جھینپ گئی تھی پھر اُس نے کہا۔

"ہاں! غلط تھوڑی کہا ہے میں نے۔"

"تعجب ہے غلط نہیں کہا آپ نے لیکن پہلی بار کہا ہے۔"

"چھوڑیئے اِن باتوں کو آپ سُنایئے آپ کیسے ہیں؟"

"جیسا بھی ہُوں آپ کے سامنے ہُوں۔"

"کب آئے تھے؟"

"کافی دیر ہوگئی۔"

"آنٹی کہاں ہیں؟"

"ابھی آ رہی ہیں غالباً کچھ مصروف ہیں۔"

"ہوں! ڈاکٹر نعمان کیسے ہیں؟" رُدا بے اختیار مسکرا پڑی۔

"اوہو ہاں مجھے علم ہے کہ ڈاکٹر نعمان آپ کے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ بہرحال ٹھیک ہیں۔"

"ایک بات بھی کرنی تھی آپ سے ڈاکٹر نعمان کے سلسلے میں۔" رُدا کسی حد تک حواس باختہ ہو رہی تھی اس لئے مسلسل کچھ نہ کچھ کہے جا رہی تھی۔ حالانکہ اُس کی باتوں میں بوکھلاہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"ڈاکٹر نعمان کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔"

"جی ہاں!"

"ضرور کہیئے۔ کیا بات ہے؟"

"وہ آنٹی!"

"آنٹی، ابھی تو آپ نعمان کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔" تصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ براہِ کرم آنٹی کو اطلاع دے دیں۔"

"جو حکم، جاؤں؟"

"نہیں میرا مطلب ہے۔" رُدا گہری گہری سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں وہ اُلجھ گئی تھی۔ حالانکہ تصور کا یہاں موجود ہونا کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی۔ اُس نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے بولی۔

"میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ آپ آنٹی کو میری آمد کی خبر دے دیں اور کچھ بھی نہیں۔ یا۔۔ یا میں خود چلی جاتی ہوں کہاں ہیں وہ؟"

"اوہ۔ آپ میری وجہ سے پریشان ہو رہی ہیں شاید۔ آپ اطمینان سے تشریف رکھیں میں بھابی کو بُلا لاتا ہوں۔"

"آپ رہنے دیں میں خود۔۔"

"جی نہیں۔ آپ تشریف رکھیئے۔ میں اُنہیں بُلا کر لاتا ہوں۔" تصور نے کہا اور پھر وہ ڈرائینگ رُوم سے باہر نکل گیا۔ رُدا دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھی تصور بیگ کے وہاں مل جانے کی توقع نہیں تھی اُسے۔ اور نہ جانے کیوں وہ اُسے دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر آہٹ ہُوئی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ پہلے میرینا اندر آگئی تھی اور اُس کے پیچھے تصور بیگ بھی اندر آگیا تھا رُدا کھڑی ہوگئی۔

"ہیلو رُدا!"

"ہیلو آنٹی!" وہ چند قدم آگے بڑھ کر میرینا کے قریب پہنچ گئی۔ میرینا نے آگے بڑھ کر رُدا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اُسے پیار کیا اور پھر اُسے سینے سے لگا کر بولی۔

"کیسی ہو رُدا؟"

"ٹھیک ہوں آنٹی۔ یوسف کہاں ہے؟"

"ایک دوست کے گھر گیا ہے۔ رات تک آئے گا تمھیں بہت یاد کرتا ہے، کئی بار ضد کر چکا ہے کہ اُسے تمھارا پتہ بتایا جائے تو تمھارے پاس جائے گا۔" میرینا نے کہا۔

"اوہ ہاں میں خود کسی دن اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ آپ اُسے میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں گی ناں آنٹی۔" رُدا نے کہا اور میرینا عجیب سی نگاہوں سے رُدا کو دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"تمھارا بھائی ہے وہ میں تمھارے اور تمھارے بھائی کے درمیان کیسے آسکتی ہوں ویسے مجھے اِس بات کا افسوس ہے رُدا کہ تم نے مجھے ابھی تک تیمور سے نہیں ملایا میرا دل اُسے دیکھنے کے لئے بہت چاہتا ہے۔"

"جی جی آنٹی ضرور اب کے جس دن بھی آؤں گی اُسے ساتھ لے کر آؤں گی آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔" رُدا نے کہا تصور خاموشی سے بیٹھا مسکرا رہا تھا میرینا بولی۔

"دفتر سے آ رہی ہو؟"

"جی آنٹی!"

"اتنی جلدی؟"

"بس آپ سے ملنے کو جی چاہا اُٹھ گئی۔" رُدا نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

"ظاہر ہے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہوگا میں لاتی ہوں۔"

"ارے نہیں نہیں آنٹی کیوں میری عادت خراب کر رہی ہیں۔ میں شاید پہلے بھی آپ کو بتا چکی ہوں کہ دوپہر کا کھانا قطعی نہیں کھاتی اور کھاتی ہوں تو بیمار ہو جاتی ہوں۔"

"اچھا کچھ پھل وغیرہ لے کر آتی ہوں۔" میرینا نے کہا اور تصور بیگ سے بولی۔

"تم ذرا میری رُدا کا خیال رکھو تصور بس ابھی چائے وغیرہ بنا کر لاتی ہوں اُس وقت تک تم اِس سے باتیں کرو۔"

"جی بھابی آپ اطمینان رکھیں میں رُدا سے گفتگو کر رہا ہوں۔" تصور بیگ نے کہا اور پھر مسکراتی نگاہوں سے رُدا کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

"جی رُدا صاحبہ کسی گفتگو کا آغاز آپ خود ہی کریں ڈاکٹر نعمان والی بات تو درمیان ہی میں رہ گئی۔"

"ذرا تفصیل طلب بات ہے اور تفصیل سے ہی ہو سکتی ہے۔ پھر کبھی سہی۔"

"اوہو یہ تو بڑا مسئلہ بن جائے گا کیا کبھی آپ سے کوئی تفصیلی ملاقات ہو سکتی ہے اُس کے امکانات ہیں۔" تصور بیگ نے کہا اور رُدا چونک کر اُسے دیکھنے لگی تصور بیگ کے چہرے سے ایک دم ایسا محسوس ہُوا تھا جیسے وہ شرمندہ ہو گیا ہو رُدا خاموشی سے اُس کا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر اُس نے دوسری طرف نگاہیں گھما دیں۔ بظاہر وہ ایک دیوار کو دیکھ رہی تھی لیکن اُس کے ذہن میں تصور بیگ کے یہ الفاظ گونج رہے تھے اور وہ اُن کا مناسب جواب تلاش کر رہی تھی لیکن اِس سے پہلے ہی کچھ اور ہو گیا۔ دیوار کی جانب نگاہیں اُٹھائیں تو نظر اُس کھڑکی پر جا پڑی جس میں شفاف شیشہ لگا ہُوا تھا گو پردہ پڑا ہُوا تھا لیکن ایک سمت کا پردہ پُورا ہٹا ہُوا تھا اور اُس پردے کے پیچھے اُسے ثاقب کا چہرہ نظر آیا تھا ثاقب اُس شیشے کے پیچھے موجود تھا اور رُدا نے بخوبی اُسے دیکھ لیا تھا ایک دم اُس کا ذہن بھک سے اُڑ گیا اور اُس کے چہرے پر نمایاں تغیرات نمودار ہو گئے تصور جو اُس کی شکل دیکھ رہا تھا چونک پڑا اُس نے رُدا کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور پھر شیشے کے عقب میں اُس نے خود بھی ثاقب کو دیکھ لیا رُدا ایک دم اُٹھ کھڑی ہُوئی تھی۔

"بس۔ میں جا رہی ہوں۔ میں جا رہی ہوں۔"

"ارے ارے رُدا سُنیئے تو سہی۔ سُنیئے تو سہی۔"

"آنٹی سے کہہ دیجئے پھر، پھر کبھی آؤں گی۔" رُدا پھُولے ہُوئے سانس کے ساتھ بولی اور تصور پریشان ہو گیا۔ رُدا ایک لمحے رُکے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ تصور کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا، پھر وہ اندر بھاگا اور اُس نے کچن میں موجود میرینا کو مختصر الفاظ میں صُورتِ حال بتائی پھر باہر نکلتا ہُوا بولا۔

"میں اُسے روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ باہر نکلا تو رُدا اپنی کار کے قریب پہنچ کر دروازہ کھول چکی تھی۔

"رُدا مجھے آپ سے کام ہے رُدا۔ سُنیئے تو سہی مجھے آپ سے کام ہے۔" تصور بیگ نے اُس کے نزدیک آ کر کہا۔

"تصور صاحب پلیز اِس وقت میں۔۔ اِس وقت میں معافی چاہتی ہوں آپ محسوس نہ کریں۔" رُدا نے کہا اور اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ "چلو ڈرائیور۔" اُس نے کہا اور ڈرائیور نے گردن خم کر کے کار اسٹارٹ کر دی۔ رُدا کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی، اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ ثاقب کا چہرہ بار بار اُس کی آنکھوں میں اُبھر رہا تھا۔ وہ ٹھیک ہو گیا تھا ٹھیک ہو کر نکھر گیا تھا لیکن۔۔۔ لیکن یہ مناسب نہ تھا۔ وہ اُسے کیوں دیکھ رہا تھا۔ اُسے اِس طرح رُدا کو نہیں دیکھنا چاہیئے تھا میرا اُس سے واسطہ ہی کیا۔ ہاں میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

"جی بی بی!" ڈرائیور نے کہا۔ شاید رُدا کے مُنہ سے یہ الفاظ زور سے نکل گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟"

"آپ نے کچھ کہا!"

"خاموشی سے گاڑی چلاتے رہو۔" رُدا غرّائی۔

"کہاں چلوں بی بی؟" ڈرائیور نے کہا۔

"ایں۔" وہ چونک پڑی، پھر بولی۔ "ساحلِ سمندر چلو۔" اور ڈرائیور نے گردن جھکا دی اور وہ پھر خیالات میں ڈُوب گئی۔ غلطی میری ہے۔ ثاقب سے واسطہ نہیں تو میرینا سے کیا واسطہ۔ میں جانتی ہوں وہ اِسی گھر میں رہتا ہے۔ میری وجہ سے وہ گھر تو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے خود وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ غلطی سو فیصدی میری ہے۔ سو فیصدی۔ پھر اچانک اُسے تصور یاد آیا۔ کس طرح خاموش کھڑا رہ گیا تھا۔ اوہ۔ یہ غلطی ہوگئی۔ تصور سے مجھے بات کرنی چاہیئے تھی اُس کا کیا قصُور تھا۔ اُسے اِس طرح نظر انداز کر دینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اُس کی پھر توہین کر دی۔ اُس نے تو ایک انسانی فرض پُورا کیا تھا ثاقب کو اُس نے موت کے راستے سے ہٹا کر زندگی کے راستے پر لا ڈالا تھا۔ میرینا اور یوسف کو نئی زندگی دی تھی اُس نے۔ کتنے خوش ہیں وہ۔ مگر میں۔ آہ تصور تقدیر ہمارے راستے جُدا رکھنا چاہتی ہے تو میں کیا کروں!

دفعتاً وہ اُچھل پڑی۔ براؤن رنگ کی ایک شاندار کار اُس کی کار کے برابر سے گزری تھی اور اِس طرح گزری تھی کہ رُدا کی کار کا ڈرائیور اگر ذہانت سے کام نہ لیتا تو وہ کار اُس سے ٹکرا ہی گئی تھی۔ تاہم تھوڑی رگڑ لگی تھی اور ڈرائیور نے پھر اسٹیرنگ کاٹ لیا تھا۔

"نشے میں ہے شاید۔" رُدا کی کار کا ڈرائیور بولا۔ مگر ایک بار پھر اُس نے اپنی کار کو بریک لگائے تھے کیونکہ براؤن کار چند گز آگے جا کر ہی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی تھی۔

آس پاس سے بہت سی آوازیں اُبھریں اور لوگ براؤن کار کی طرف دوڑ پڑے۔ ٹریفک رُک گیا۔ اب رُدا کی کار بھی آگے نہیں جا سکتی تھی۔ رُدا پریشان نظروں سے سامنے دیکھنے لگی۔ لوگ براؤن کار کے ڈرائیور کو دیکھ رہے تھے، پھر دو آدمی اِدھر اُدھر دیکھنے لگے قریب

صرف رُدا کی کار تھی وہ اُس طرف دوڑے۔

"بہن جی۔ اِس بے چارے کو دِل کا دورہ پڑا ہے بُوڑھا آدمی ہے اگر اسپتال نہ لے گئے تو دم توڑ دے گا۔"

"اوہ۔ نہیں۔ براہِ کرم اُسے لے آؤ۔" رُدا نے جلدی سے کہا اور وہ دونوں براؤن کار کی طرف دوڑ گئے۔ رُدا نے دروازہ کھول دیا۔ چند افراد نے براؤن کار کے ڈرائیور کو اسٹیرنگ کے پیچھے سے نکالا۔ اور رُدا کی کار کی طرف لانے لگے۔ رُدا ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے والا کوئی ڈرائیور نہیں بلکہ کار کا مالک معلوم ہوتا تھا اُس نے قیمتی تھری پیس پہنا ہُوا تھا۔ رُدا نے ہمدردی سے اُسے دیکھا۔ لیکن آج کا دن۔۔ آج کا دن نہ جانے کیسا تھا۔ یہ چہرہ بھی رُدا کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ محمود علی آفندی تھے جن کے چہرے پر کرب، بے بسی، تنہائی نہ جانے کیا کیا نظر آرہا تھا وہ بے ہوش تھے۔

رُدا کے دِل میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ اس کی گھُٹی گھُٹی چیخ اُبھری۔

"ڈرائیور، جلدی اسپتال۔ اسپتال۔" پھر وہ بے اختیار ہوکر رو پڑی۔ رُدا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور ڈرائیور نے بادلِ ناخواستہ کار آگے بڑھا دی۔ "جلدی چلو ڈرائیور۔ جلدی چلو۔" وہ بھنچی بھنچی آواز میں روتے ہُوئے کہہ رہی تھی۔ پھر اُس نے بے اختیار ہوکر آفندی صاحب کا سر اُٹھاکر گود میں رکھ لیا اور اُس کے آنسو اُن کا چہرہ تر کرنے لگے۔

کار برق رفتاری سے دوڑتی ہُوئی دِل کے امراض کے اسپتال میں داخل ہوگئی۔ اور مستعد عملہ صورتِ حال معلوم ہوتے ہی دوڑ پڑا۔ آفندی صاحب کو ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ اور ڈاکٹروں نے فوراً ہی کارروائی شروع کردی۔ رُدا پر تشنج سا طاری تھا۔ اُس کے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک ہمدرد آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"بہن، آپ مریض کے ساتھ تنہا ہیں۔ کوئی ضرورت ہو تو بتادیں۔"

"ایں۔" رُدا چونک پڑی۔ اُس نے اُس شخص کا شکریہ ادا کیا۔ اور پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ کار پارکنگ میں کھڑی ہُوئی تھی لیکن ڈرائیور موجود نہ تھا۔

"اوہ۔ یہ کہاں گیا۔۔۔ یہ کہاں گیا؟" رُدا نے ہاتھ ملتے ہُوئے کہا۔ اور پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اُس وقت ڈرائیور اُسے آتا ہُوا نظر آیا۔ "جلدی آؤ۔ کہاں چلے گئے تھے؟"

"فون کرنے گیا تھا بی بی!"

"کسے؟"

"کوٹھی فون کیا تھا۔ صاحب نہیں تھے شناء بی بی کو فون کرکے بتا دیا تھا کہ آپ یہاں ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ وہ آرہی ہیں۔ آپ یہیں رہیں؟"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ میں اِسی لئے تمہیں تلاش کر رہی تھی۔ میں اندر ہُوں۔ شناء کو بتادینا۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔" ڈرائیور نے کہا اور رُدا پھر اندر داخل ہوگئی۔ اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ایک میل نرس نے کہا۔

"یہیں رکیں سسٹر۔ ڈاکٹر مصرُوف ہیں۔"

"مریض۔ مریض کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"ڈاکٹر مصرُوف ہیں آپ دُعا کریں۔" نرس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ رُدا کا چہرہ بُری طرح سُرخ ہو رہا تھا آنکھوں سے آنسو رُوکے نہ رُک رہے تھے اُس کے دِل کی دُنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ "نانا جان۔ میرے نانا جان۔ میری امّی کے ابّو۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے کتنا چاہتے تھے وہ۔" اس سے کھڑا نہ ہُوا جا رہا تھا چنانچہ وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ کلیجہ اُٹھا جا رہا تھا نہ جانے کیا کیا احساسات دِل میں جاگ رہے تھے۔

پھر خُدا خُدا کرکے شناء کا چہرہ نظر آیا۔ نُدرت بھی ساتھ تھی۔ دونوں بُری طرح پریشان نظر آرہی تھیں اور دوڑتی ہُوئی اندر آئی تھیں۔ شناء نے رُدا کو دیکھ لیا اور ہکّا بکّا رہ گئی۔

"رُدا کیا ہُوا! کِسے دِل کا دورہ پڑا ہے، کچھ بولو تو رُدا، کچھ بولو تو۔" رُدا کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ بار بار اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر اندر کی طرف اشارہ کر رہی تھی مگر الفاظ اُس کے مُنہ سے نہ نکل رہے تھے۔

"ہائے رُدا! کہیں ڈیڈی۔۔۔ ڈیڈی۔"۔۔۔ اچانک شناء کے مُنہ سے نکلا اور اُس کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔

"نہیں شناء! وہ۔۔۔ وہ نانا۔۔۔ نانا جان۔" بمشکل تمام رُدا نے کہا۔

"نانا جان؟ کون نانا جان؟" شناء نے خود کو سنبھالا۔

"میرے۔۔۔ میرے نانا جان۔ میرے نانا جان میری امّی کے ابّو۔" رُدا نے روتے ہُوئے کہا۔

"شناء شاید آفندی صاحب۔" نُدرت نے صورتِ حال سمجھ کر کہا پھر بولی۔ "میں اختر کو فون کرتی ہُوں تم رُدا کو سنبھالو۔" اور نُدرت فون کی تلاش میں چل پڑی۔

نُدرت نے اختر کو فون کیا۔ اختر کو تلاش کرنے میں اُس وقت تھوڑی سی دِقت پیش آئی تھی۔ لیکن بہرطور وہ اختر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اُس نے مختصر صورتِ حال اختر کو بتادی۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر بھی پہنچ گیا تھا اور پھر یہاں کی صورتِ حال معلوم کرنے کے بعد وہ مصروفِ عمل ہوگیا۔ چنانچہ ذرا سی دیر میں تمام کے تمام لوگ اسپتال پہنچ چکے تھے۔ اُدھر ڈاکٹر آفندی صاحب کی زندگی بچانے کی کوششوں میں مصرُوف تھے اور اپنی انتہائی کوشش کر رہے

تھے۔ آفندی صاحب کی حالت کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ کافی سیریس ہے اور ڈاکٹر ابھی پُراُمید نہیں ہیں۔ رُدا کو بھی اِس سلسلے میں صورتِ حال معلوم ہوگئی تھی اور اُس کا چہرہ سُت گیا تھا۔ حالانکہ اِس سے پہلے آفندی صاحب کے لئے دِل میں نفرت کے علاوہ کچھ نہیں تھا یا پھر ہو سکتا ہے کہ اُس کے دِل کی گہرائیوں میں نفرت نہ ہو، بس ایک ضد جو اُسے اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ غرض یہ کہ رات ہوگئی اور صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ ڈاکٹر ابھی تک آفندی صاحب پر ہی مصرُوف تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد رُدا نے تصوّر بیگ کو بھی وہاں دیکھا۔ شاید کسی ذریعے سے اُسے اطلاع مل گئی تھی اور تصوّر ڈاکٹر نُعمان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ تقریباً تمام ہی لوگوں کا اجتماع اسپتال میں ہو چکا تھا اور ان سب نے ایک جگہ ڈیرا ڈال دیا تھا۔ کون تھا جو یہاں موجود نہیں تھا، تقریباً اِس کہانی کے سب کردار اُس جگہ جمع ہوگئے تھے۔ بس میرینا اور ثاقب وغیرہ نہیں آئے تھے، غالباً یہ مناسب نہیں سمجھا گیا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں کے لئے اجنبی تھے جو اِس وقت یہاں موجود تھے۔

رُدا پر چُپ سی لگی ہُوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ آفندی صاحب کو آئی سی یُو میں منتقل کردیا گیا ہے، اُن کی حالت بدستور تشویشناک ہے جو کارروائی کی جا سکتی تھی وہ کرلی گئی ہے، آئی سی یُو میں بھی اُن کی بہترین نگہداشت کی جا رہی تھی۔ اور کسی کو بھی اُن کے پاس آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

رات کے تقریباً دو بج گئے، اُس کے بعد رُدا نے شناء سے کہا۔

"شناء ساری رات تمام لوگوں کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے ظاہر ہے ہمیں یہاں رہنا ہوگا۔ جاگنا ہوگا۔ میں کہتی ہُوں ایک دو افراد یہاں رہ جائیں۔ باقی لوگوں کو رُخصت کر دیا جائے۔" شناء نے یہ بات احسان احمد صاحب سے کہی تو احسان احمد صاحب گردن ہلاتے ہُوئے بولے۔

"نہیں بھئی، میرا تو یہاں رہنا بے حد ضروری ہے جو جانا چاہتا ہے چلا جائے، لیکن کوئی بھی جانے کو تیار نہیں تھا۔ تمام لوگ وہاں ہی رُکے رہے، بہرطور رات بھر کا یہ رت جگہ عجیب و غریب رہا تمام لوگوں نے اپنی مصرُوفیات ترک کردی تھیں۔ اب پتہ نہیں یہ آفندی صاحب کی وجہ سے تھا یا رُدا کی وجہ سے۔ یہاں تک کہ تصوّر بیگ بھی ڈاکٹر نعمان کے ساتھ رات بھر رُکا رہا تھا۔ ڈاکٹر نعمان بھی اِس سلسلے میں اِس وقت کافی کارآمد ثابت ہو رہا تھا اور اُس کی بھاگ دوڑ اُن لوگوں کو صحیح رپورٹیں مہیا کر رہی تھی۔

صبح کے تقریباً ساڑھے پانچ بجے ڈاکٹر نعمان نے رپورٹ دی کہ اب صورتِ حال کچھ بہتر نظر آرہی ہے اور اُن لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ صبح چھ بجے کے قریب باقی تمام افراد روانہ ہو گئے۔ اختر، ڈاکٹر نعمان اور تصوّر بیگ البتہ یہاں موجود تھے احسان احمد صاحب کی ہدایت پر باقی تمام لوگ چلے گئے تھے اور اِس سلسلے میں البتہ ایک ٹائم ٹیبل مرتب کرلیا گیا تھا کہ کس کی ڈیوٹی کس وقت ہوگی۔ چنانچہ یہ ڈیوٹی دوسرے دن بھی رہی۔ دوسرے دن دوپہر کو ڈاکٹر نعمان نے احسان احمد سے کہا کہ رُدا پر بہت زیادہ جاگنے کا بُرا اثر بھی ہو سکتا ہے چنانچہ بہتر ہے کہ اُن کو یہاں سے لے جایا جائے۔

رُدا قطعی جانے کے تیار نہیں تھی لیکن احسان احمد صاحب نے اُسے اِس طرح مجبُور کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے جانے پر راضی ہوگئی۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر نعمان ہی کی کوششیں کام آئی تھیں۔ چنانچہ رُدا کو گھر لے جانے کے بعد ایک انجکشن دیا گیا اور اُس انجکشن کے زیرِ اثر وہ گہری نیند سوگئی رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اُسے ہوش آیا تھا اور وہ بے چین ہوگئی تھی۔ لیکن گھر میں اُس کے لئے آفندی صاحب کے لئے رپورٹس موجود تھیں۔ اُسے بتایا گیا کہ آفندی صاحب کی حالت مسلسل بہتر ہو رہی ہے اور ہو سکتا ہے کل اُنھیں انسینٹو کیئر کے کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔

رُدا تیار ہوکر اسپتال پہنچ گئی اور وہاں اُسے بہت سے افراد ملے۔ رُدا کو حیرت ہو رہی تھی۔ یہ سارے کے سارے محمُود علی آفندی سے چند روز قبل تو نہایت فاصلے پر تھے، اور اُن سے کوئی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اِس وقت سب اُن پر اِس طرح مصرُوف تھے جیسے یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ کس لئے ہے، لیکن بعد میں سب سمجھ میں آگیا۔ رُدا کی وجہ سے آفندی صاحب کی بھی ایک حیثیت قائم کرلی گئی تھی۔

رُدا اُن نیک لوگوں کی ممنُونِ کرم تھی جِنھوں نے کسی بھی موقع پر اُسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اُس کے ذہن میں بہت سے خیالات آرہے تھے، اور وہ اُن کی کافی شُکر گزار تھی۔

آفندی صاحب کو ایک نِگاہ دُور سے دیکھنے کی اجازت مِل گئی تھی۔ وہ پُرسکون سے محسوس ہو رہے تھے ویسے اُنھیں کافی ڈرپس وغیرہ لگی ہُوئی تھیں۔ آکسیجن چیمبر میں رکھا گیا تھا اُنھیں۔ اِس کا مطلب تھا کہ صورتِ حال ابھی تشویشناک ہے۔ رُدا کے ذہن پر نہ جانے کیا کیا بیت رہی تھی۔ شناء نے اُس سے کہا۔

"رِدا! تمہارے ذہن میں آفندی صاحب کے لئے یہ تبدیلیاں کیسے پیدا ہوگئیں؟" رِدا نے افسردہ نگاہوں سے ثناء کو دیکھا اور بولی۔

"میں نہیں جانتی ثناء۔ میں نہیں جانتی۔"

"خون کے رشتے ختم نہیں کئے جاسکتے رِدا۔ عارضی ناراضگی ایک الگ چیز ہوتی ہے۔ لیکن کسی بھی شخصیت کا ایک اپنا مقام ہوتا ہے۔" رِدا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ بہت فاصلے پر ایک شخص کو بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

یہ تصوّر بیگ تھا جو اطمینان سے ایک جگہ بیٹھا ہُوا تھا حالانکہ اُس وقت رات کے پونے دو بج رہے تھے، لیکن تصوّر بیگ بھی ابھی یہاں موجود تھا۔ رِدا فاصلے سے اُسے دیکھتی رہی اور اُس کے بعد اُس نے گردن جھٹک دی۔ نہ جانے کیا کیا خیالات اُس کے ذہن میں آرہے تھے، بہرحال یہ رات بھی رِدا نے وہیں گزاری۔ اور دوسرے دن سب سے بڑی خوشخبری اُسے یہ ملی کہ اب محمود علی آفندی صاحب کو آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کیا جارہا ہے اِس سلسلے میں رِدا کو تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی، یہاں اِتنے افراد موجود تھے جو یہاں اِس سلسلے میں سارے انتظامات کر رہے تھے، اِن کاموں میں بھی کافی وقت لگ گیا اور دِن کو دس بجے آفندی صاحب کو بہتر حالت میں ایک شاندار ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ تاہم ڈاکٹروں کی ہدایات موجود تھیں۔ احسان احمد صاحب نے ایک اور کارروائی کی برابر کا ایک اور کمرہ اُنھوں نے حاصل کرلیا۔ تاکہ جو لوگ اسپتال میں آنا چاہیں اُنھیں کوئی دِقت نہ ہو۔ اور اِس سے کافی فائدہ ہُوا تھا۔ کئی لوگوں نے یہاں ڈیرہ جمالیا تھا اور رِدا اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کر رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے تمام لوگوں نے اپنے اپنے کاروبار بند کر دیئے ہوں اور صرف آفندی صاحب کی تیمارداری میں مصروف ہوگئے ہوں۔ رِدا اُن سب کی ممنونِ کرم تھی۔

آفندی صاحب کی حالت اُس رات بہتر ہوگئی اور سب سے پہلے اُنھوں نے رِدا کو دیکھا۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کمرے میں صرف ایک آدمی رہ سکتا تھا۔ دوسرا آدمی اُس کی جگہ لے سکتا تھا، لیکن بہت سے لوگوں کو اِس کمرے میں ایک ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور اِس کے لئے ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ صرف ایک یا دو دِن ایسی کیفیت میں بسر ہوں گے۔ اُس کے بعد مریض کی حالت اِس قابل ہو جائے گی کہ زیادہ لوگ بھی اگر چاہیں تو وہاں رہ سکتے ہیں۔

جس وقت آفندی صاحب کو تھوڑا سا ہوش آیا اور اُن کی ذہنی کیفیت بحال ہُوئی تو رِدا اُن کے سامنے موجود تھی آفندی صاحب نے گردن گھما کر اُسے دیکھا۔ دیکھتے رہے شاید اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے اور جب اُسے پہچانا تو اُن کے بدن میں جنبشیں پیدا ہُوئیں۔ رِدا اُنھیں کسمساتے دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھی اور اُس نے اُن کے ایک بازو پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"نہیں نانا جان آپ ہلنے جُلنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

"تم تم رِدا بیٹی تم۔ تم؟"

"ہاں نانا جان۔ میں۔"

"تمھیں۔۔ تمھیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہوگیا؟"

"بس معلوم ہوگیا نانا جان آپ اپنے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالیئے۔ سب ٹھیک ہے میں آپ کے پاس موجود ہُوں۔"

"تم کب سے یہاں ہو؟"

"جب سے آپ بیمار ہُوئے ہیں۔" آفندی صاحب کی آنکھوں کی کوریں بھیگ گئیں۔ رِدا نے اُن کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔

"دیکھئے نانا جان! آپ روئے تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

آفندی صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر آنکھوں کی کوریں صاف کیں اور پھر آہستہ سے بولے۔ "صرف ایک لفظ کہہ دو مجھ سے رِدا۔ صرف ایک لفظ کہہ دو۔"

"جی نانا جان فرمایئے۔" رِدا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا تم۔۔۔ کیا تم مجھے معاف کرسکتی ہو، کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے رِدا کہ تم مجھے معاف کردو؟"

"میں آپ کو معاف کرچکی ہُوں نانا جان۔ میں آپ کی غلام ہُوں۔ آپ کی بیٹی ہُوں میں۔ میں آپ کی حِنا ہُوں نانا جان۔ میں آپ کی حِنا ہُوں۔" رِدا رو پڑی۔ آفندی صاحب بھی رونے لگے۔ رِدا تھوڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی پھر اُس نے آفندی صاحب کے پیروں کو چھوتے ہُوئے کہا۔

"آپ اپنے دِل سے تمام بوجھ ہٹا دیجئے نانا جان اب میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ آپ کے ساتھ۔"

"میں ٹھیک ہوگیا بیٹے۔ میں ٹھیک ہوگیا۔ کون کہتا ہے مجھے کوئی تکلیف ہے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ سکتا ہُوں۔"

"آپ بیٹھ سکتے ہیں نانا جان، لیکن بیٹھیں گے نہیں آرام کیجئے۔"

"تمہارے اِن الفاظ نے مسیحائی کا کام کیا ہے، میری زندگی میں اور کوئی دُکھ ہی نہیں تھا رِدا، بس تمہارا ہی دُکھ تھا کہ تم ہو، اور مجھ سے اِتنی دُور ہو۔ تمہاری دُوری کے اِس احساس نے مجھے زندہ درگور کر دیا تھا۔"

"اب میں آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑوں گی نانا جان۔" رِدا نے کہا اور آفندی صاحب بے حد مسرور نظر آنے لگے۔ واقعی اُن کے چہرے کی بحالی بحال ہوگئی تھی، پھر وہ رِدا سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ بہت سی باتیں کیں اُنھوں نے، سب لوگوں کے بارے میں پُوچھا اور رِدا نے اُنھیں بتایا کہ کس طرح تمام لوگ اُن کی بیماری کی وجہ سے مصروف ہوگئے ہیں۔ اور رِدا نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح آفندی صاحب کی کار اُس کے سامنے ٹکرا گئی تھی۔ آفندی صاحب خاموش ہوگئے، پھر اُنھوں نے کہا۔

"بعض بیماریاں بھی کتنی مبارک ہوتی ہیں۔ مجھے اِس بیماری کے زیرِ اثر جو کچھ ملا ہے۔ میں۔۔۔ میں اِس بیماری کا شکریہ نہیں ادا کرسکتا۔"

"اب آپ اِس بیماری کو خیرباد کہہ دیجئے اور جلدی سے ٹھیک ہو جایئے۔"

"بیٹے اگر تم چاہو تو ڈاکٹر سے مشورہ کرلو، ای سی جی نکال لیں میرا۔ اگر ذرا بھی خراب ہو تو نام بدل کر رکھ دینا میرا۔" آفندی صاحب مسرور لہجے میں بولے اور رِدا مسکرانے لگی۔

آفندی صاحب کی اِس بہتر حالت کی اطلاع تمام لوگوں کو ہوگئی۔ ایک ایک کرکے تمام ہی افراد آفندی صاحب سے ملنے آئے اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق ایک سے زیادہ آدمی اندر نہیں آیا تھا۔ غرض یہ کہ آفندی صاحب کی حالت بہتر سے بہتر ہوتی چلی جارہی تھی۔

رِدا اب کافی مطمئن نظر آرہی تھی۔ اسپتال میں احسان احمد صاحب نے وہ تمام انتظامات کر دیئے تھے جو کئے جاسکتے تھے اور بالکل گھر کا سا ماحول مہیا ہوگیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت رِدا کو تصوّر بیگ پر تھی۔ وہ جب بھی دیکھتی تصوّر بیگ اُسے آس پاس ہی نظر آتا۔ کئی بار اُس کا تصوّر بیگ سے سامنا بھی ہُوا تھا اور وہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار نظر آیا تھا۔ رِدا اِس تمام کیفیت کو محسوس کر رہی تھی۔ یہ کیفیت محسوس کرنے والی صرف رِدا ہی نہیں تھی۔ گہری نِگاہ رکھنے والے ہر شخص نے تصوّر کی اِس موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ نُدرت نے ثناء سے کہا۔

"ثناء ایک بات کہوں؟"

"کیا؟"

"اِس اپنے خیر دین کو دیکھ رہی ہو؟"

"خیر دین؟"

"تصوّر کی بات کر رہی ہُوں۔"

"ہاں! کیا بات ہے؟"

"کالا ہے کچھ؟"

"کالا؟"

"میرا مطلب ہے دال میں کالا۔ یہ آفیسر صاحب تو بڑے مصروف تھے کبھی نظر ہی نہیں آتے تھے۔"

"ہاں! اِس میں شک نہیں ہے۔"

"اور اب نظر ہی نظر آتے ہیں۔"

"اِس شخص کے بارے میں کچھ عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے ذہن کی، خیر دین کی حیثیت سے یہ ہمارے گھر میں رہا اور اچھا خاصا کام بنالیا پھر دُور ہُوا تو اِتنا کہ غائب ہی ہوگیا۔ بعد میں وہ پولیس افسر نِکلا۔ کیوں آیا تھا یہاں اور کیا کچھ تھا پتہ ہی نہ چل سکا۔"

"اب پتہ چل رہا ہے۔" نُدرت گردن ہلا کر بولی۔

"کیا؟"

"میرا خیال ہے یہ شروع ہی سے رِدا کے بارے میں جانتا تھا اور ضرور اُسی کے چکر میں یہاں ملازم بن کر رہا تھا۔"

"اوہ۔ اِس کا مطلب ہے کہ مونا لیزا بھی۔" ثناء حیرت سے بولی۔

"صرف خیال ہے میرا اب کچھ کچھ اِس کی تصدیق ہو رہی ہے۔"

"کمال ہے۔ اگر ایسا ہے تو واقعی کمال ہے۔ مگر یہ بات ہے تو پتہ لگنا چاہیئے۔" ثناء نے کہا۔

"بالکل لگنا چاہیئے۔ کام شروع کردو۔" نُدرت نے کہا۔

✣

غالباً چھٹا دِن تھا اور آفندی صاحب اب کافی بہتر حالت میں تھے یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے اُنھیں تھوڑا بہت چلنے پھرنے کی اجازت بھی دے دی تھی رِدا نے تو اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا اُن کے لئے وہ اب رات دِن اسپتال ہی میں رہ رہی تھی ویسے احسان احمد صاحب نے بھی اُس سے کہہ دیا تھا کہ دفتری معاملات کی بالکل فکر نہ کرے تمام کام ٹھیک چل رہے ہیں کوئی اُلجھن کی بات نہیں ہے رِدا کے اپنے ذہن میں نہ جانے کیا کیا تصوّرات آتے تھے، اِس سلسلے میں وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ درحقیقت آفندی صاحب کو اب تنہا چھوڑنا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا لیکن دوسرے ایسے بہت سے معاملات سامنے آجاتے تھے جن کا کوئی حل اُس کے

ذہن میں نہیں آتا تھا مثلاً یہ کہ اب اگر وہ آفندی صاحب کے ساتھ رہے گی جیسا کہ اُس نے آفندی صاحب سے وعدہ کیا تھا تو پھر احسان احمد صاحب کی کوٹھی چھوڑنا پڑے گی، ظاہر ہے اُس کے بعد وہاں رہنے کا کیا جواز رہ جاتا۔ لیکن آفندی صاحب کے ساتھ رہ کر کیا وہ اُس ماحول کو بھول سکے گی۔ اُن لوگوں سے رابطہ تو خیر منقطع نہیں ہوگا جس طرح عادل حسین صاحب سے اُن کا رابطہ مسلسل قائم تھا لیکن کچھ ایسی تبدیلیاں ضرور ہو جائیں گی جو عجیب محسوس ہوں گی۔

بہرطور یہ سوچیں اِن دِنوں رِدا کے ذہن پر مُسلط تھیں۔ اُدھر آفندی صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اُسے دیکھ دیکھ کر جی رہے تھے، خود ڈاکٹر اس سلسلے میں حیران تھے کہ اتنی خطرناک کنڈیشن

ہونے کے باوجود کس طرح اُنھوں نے سنبھالا لیا ہے اُس رات بھی آفندی صاحب دیر تک رِدا سے باتیں کرتے رہے تھے پھر ڈاکٹر نے اُن کو جاگتے دیکھ کر کچھ ایسی دوائیں دی تھیں جن سے وہ سو جائیں۔ رِدا البتہ جاگ رہی تھی کوئی ساڑھے بارہ پونے ایک بجے کا وقت تھا تمام لوگ واپس جا چکے تھے اب اُن کی وہاں ضرورت بھی نہیں تھی۔ رِدا نے خصوصی طور پر سب سے کہا تھا کہ جب کسی کی ضرورت ہی نہیں ہے تو اُنھیں پریشان ہونے سے کیا فائدہ، چنانچہ اُس نے زبردستی سب کو واپس بھیج دیا تھا اور خود ہی کمرے میں موجود تھی اُسے نیند نہیں آرہی تھی آفندی صاحب کے سونے کے بعد وہ یونہی ٹہلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ راہداری سے گزرتی ہوئی کھلی ہوا میں آگئی سامنے ہی ایک بنچ پر اُسے تصور بیگ نظر آیا اور رِدا اُسے دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ تصور بیگ کی اِس وقت یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے اُسے گمان بھی نہیں تھا کہ تصور بیگ یہاں موجود ہوگا۔ وہ ٹہلتی ہوئی اُس کے پاس پہنچ گئی اُس کی آنکھوں میں حیرانی کے آثار تھے، تصور نے اُسے دیکھا اور مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے آپ سوئی نہیں۔ آپ کو سو جانا چاہئیے تھا۔"

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں تصور صاحب؟" اس نے سوال کیا اور تصور بیگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بیٹھا ہوا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے کیوں؟"

"کمال ہے یعنی اگر میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں تو اِس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔"

"پلیز اِیسی باتیں نہ کریں۔" رِدا نے کہا۔

"کک... کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟" تصور بیگ نے کہا۔

"آپ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں مجھے یہ بتائیے؟"

"یعنی سب لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ مناسب نہیں تھا۔ اب نظریہ ہے اپنا اپنا آپ نے بے شک سب کو واپس بھیج دیا لیکن ہو سکتا ہے اللہ نہ کرے کوئی ضرورت پیش آجائے آپ کو ایسے لمحات میں آپ اکیلی پریشان بھاگتی پھریں گی۔"

"اور آپ یہاں موجود ہیں مجھے بتایا بھی نہیں آپ نے۔"

"ضروری تو نہ تھا آپ کو بتانا۔" تصور بیگ نے کہا۔

"اب آپ خود بتائیے اگر ضرورت پیش آجاتی تو میں یہ کیسے سوچتی کہ آپ یہاں موجود ہیں؟"

"آپ کو سوچنے کی ضرورت پیش آتی تو پھر میری یہاں موجودگی

کیا معنی رکھتی ہے سب سے رابطہ ہے میرا اور ہر رات رابطہ رہتا ہے۔"

"ہر رات؟" رِدا متحیرانہ انداز میں بولی۔

"اب آپ میری ایثار پسندی کا امتحان لے رہی ہیں۔ بھئی کیوں کہلوانا چاہتی ہیں مجھ سے یہ بات کہ میں ہر رات یہاں موجود ہوتا ہوں بلاناغہ میں نے اپنی ڈیوٹی یہاں لگالی ہے، آپ ذرا سخت قسم کی خاتون ہیں میں جانتا ہوں کہ تمام لوگوں کو آپ واپس بھیج دیتی ہیں لیکن بس میں یہاں موجود رہتا ہوں۔"

"تصور صاحب! زیادتی نہیں کی ہے آپ نے؟"

"اگر یہ بھی زیادتی ہے تو معافی مانگے لیتا ہوں آپ کے سامنے تو بدن کی کوئی بھی جنبش زیادتی بن سکتی ہے۔" تصور بیگ نے کہا اور رِدا خاموشی سے بنچ پر بیٹھ گئی۔ تصور اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا رِدا چند لمحات گردن جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"تصور صاحب! ایک درخواست کروں آپ سے؟"

"درخواست، اگر درخواست کرنا آتی ہے آپ کو تو ضرور کیجئے گا۔"

"ہاں تصور بیگ صاحب، یہ درخواست قبول کر لیجئے آپ۔"

"جی بہتر آپ کے حکم سے یہ درخواست ہم نے قبول کر لی۔" تصور بیگ نے کسی قدر شوخی سے کہا۔

"نہیں پلیز سنجیدہ ہو جائیے۔"

"اچھا اچھا سنجیدہ ہوتا ہے، ہو گئے۔" تصور بیگ نے کہا اور رِدا نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"آپ مجھے معاف کر سکتے ہیں؟"

"کیا؟" تصور بیگ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"میں... میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں اپنی اُن تمام فضول باتوں کی جو میں نے آپ سے کی تھیں یہاں اور لاہور میں جو کچھ بھی مجھ سے ہوا بس آپ یوں سمجھ لیجئے میری دیوانگی تھی۔ اور میں جذبات کے زیرِ اثر تھی۔ اِتنے بوجھ تھے میرے ذہن پر آپ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے تصور صاحب میں ذہنی طور پر معطل تھی اور اس کیفیت میں مَیں نے آپ کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے واقعی وہ اِتنی زیادہ ہے کہ اُس کی معافی مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

"لو جی کمال ہو گئی رِدا بی بی جی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ خادم ہیں جی آپ کے بھلا خادم کسی بات کا بُرا مانتے ہیں؟"

"تصور بیگ صاحب! جب تک آپ اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہیں گے کہ آپ نے میری تمام گستاخیوں کو معاف کر دیا ہے آپ یقین کیجئے میں بے سکون رہوں گی۔"

"او بھائی، رِدا بی بی جی خیر دین ولد بشیر دین چک نمبر اٹھارہ ضلع گوجرانوالہ آپ کو معاف کرتے ہیں چلئے اب تو آپ خوش ہو گئیں۔" رِدا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اس نے تصور بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے واقعی بہت بدتمیزی کی ہے آپ سے آپ ہی جیسا فراخ دِل انسان اِس بدتمیزی کو درگزر کر سکتا ہے تصور بیگ صاحب! آپ بہت عظیم ہیں، بہت اچھے انسان ہیں۔ آپ میری ہر بات کو بھول جائیے میں نے جو الفاظ کہے تھے اُن کا میرے دِل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بس جذبات کی بوجھل کیفیات سے مغلوب ہو کر میں نے یہ سب کچھ بکواس کر دی تھی اِس بکواس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ تصور بیگ صاحب میں آپ کی بے پناہ عزت کرتی ہوں۔"

"رِدا بی بی جی اب ہمیں دِل کا دورہ پڑ جائے گا جی اِتنی خوشی برداشت کرنے کی اہلیت نہیں ہے ہم میں۔"

"اللہ نہ کرے آپ جیئیں ہزاروں برس جیئیں۔" رِدا نے شرمسار لہجے میں کہا اور گردن جھکالی تصور بیگ مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا پھر اُس نے کہا۔

"واقعی رِدا صاحبہ بعض معاملات کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے ذہنوں کی صفائی کے لئے ایک حادثہ درکار ہوتا ہے اور وہ حادثہ پیش آچکا ہے رِدا صاحبہ جب آپ نے اِتنی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے یہ تمام الفاظ کہہ دیئے ہیں مجھ سے معافی مانگ لی ہے تو پھر آپ ایک بات میری بھی سُن لیجئے مجھے یقین ہے کہ یہ وقت بہت

بہتر ہے اور میرے دِل میں جو کچھ ہے وہ میں آپ سے کہہ دینے میں گریز نہیں کروں گا۔" رِدا نے نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا تو تصور آہستہ سے بولا۔

"رِدا! میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں رِدا بہت زیادہ چاہتا ہوں آپ کو، آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا خواہش مند ہوں۔ اگر زندگی کے کسی مرحلے پر اِس طرف توجہ ہو تو میری اِس درخواست کو زیرِ توجہ رکھیئے گا۔" رِدا خاموشی سے گردن جھکائے رہی اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تصور بیگ نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے کوئی جواب نہیں چاہئیے بس اِتنا بتا دیجئے آپ میری اِس بات کا بُرا تو نہیں مانیں؟"

"نہیں۔" رِدا نے پُرمتانت لہجے میں کہا۔

"بے حد شکریہ رِدا صاحبہ، بے حد شکریہ۔"

چودہ دِن کے بعد ڈاکٹروں نے آفندی صاحب کو گھر جانے کی اجازت دے دی اس دوران میں تمام لوگ آفندی صاحب سے غیر متعلق نہیں رہے تھے ہر شخص مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ احسان احمد نے تمام انتظامات کئے تھے گو اِس دوران بے شمار افراد آفندی صاحب سے ملنے اسپتال آئے تھے یہ شہر کے بڑے بڑے کاروباری تھے خود آفندی صاحب کے دفتر کے لوگ بھی آتے جاتے رہتے تھے اور تمام انتظامات بہتر انداز میں ہو رہے تھے۔ لیکن احسان احمد صاحب نے اِس مسئلے کو یونہی نہیں چھوڑا تھا۔ عادل حسین سے گفتگو کرتے ہوئے ایک دِن انھوں نے کہا تھا۔

"بھئی عادل حسین! بڑی تبدیلیاں آجائیں گی اب حالات میں ہمیں ازسرِنو کچھ انتظامات کرنا ہوں گے۔"

"مثلاً؟" عادل حسین صاحب نے پوچھا۔

"بھئی اوّل بات تو یہ کہ احسان لمیٹڈ کی جنرل منیجری ظاہر ہے آفندی صاحب معمولی شخصیت کے مالک نہیں ہیں بہت بڑا کاروبار ہے اُن کا اور اب رِدا اُن کے ساتھ ہی رہے گی یہ بات طے ہے چنانچہ فرم کے لئے مجھے ایک جنرل منیجر بھی درکار ہوگا خیر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے بس اور بھی ایسے بہت سے ضروری اُمور ہیں جن کی انجام دہی ہم پر لازم ہے آفندی صاحب کو ہم اپنے ہاں بھی لا سکتے تھے لیکن سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب وہ تنہا نہیں ہیں ویسے میں نے تم سے کہا تھا ناں عادل حسین کہ یہ معاملہ کسی طور بہرطور ہموار ہو جائے گا مجھے خوشی ہے کہ ایسا ہو گیا آفندی صاحب بہت خوش ہیں بے چارے ظاہر ہے رِدا

کے علاوہ اُن کا اس دُنیا میں اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔

• ہُوں۔ واقعی تبدیلیاں تو آئیں گی اِس دوران میں۔

• تبدیلیاں تو خیر اب ضرورت سے زیادہ ہی ہوتی جا رہی ہیں تھوڑے دِن کے بعد ثناء بھی تمہارے گھر پہنچ جائے گی یار میرا گھر اکیلا ہو جائے گا۔

• کیسی باتیں کرتے ہو احسان احمد میرا گھر اور تمہارا گھر الگ الگ تو نہیں ہے اگر تم چاہو گے تو میں وہ کوٹھی بیچ کر یہیں تمہاری کوٹھی کے برابر کوئی دوسری کوٹھی خرید لوں گا یہ کون سی ایسی مشکل بات ہے۔

• ہاں بھئی یہ کرنا پڑے گا عادل حسین، اِس لئے کہ میں اکیلا رہنے کا عادی نہیں ہُوں تم دیکھو میں نے کس طرح یہ کنبہ سجا رکھا تھا۔ بڑی تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں اس میں۔

• میں جانتا ہُوں مگر یار تم فکر کیوں کرتے ہو۔ عادل حسین نے کہا۔

آفندی صاحب کو بڑے اہتمام کے ساتھ اُن کے گھر لایا گیا رُدا اُن کے ساتھ تھی تیمور ثناء کی گود میں تھا۔ ثناء نے تیمور کو اِس دوران میں اپنے پاس ہی رکھا تھا اور وہ اِس طرح ثناء سے گھُلا مِلا تھا کہ اُسے رُدا کی کمی محسوس نہیں ہُوئی تھی۔ رُدا نے آفندی صاحب کو تیمور سے بھی کئی بار ملایا تھا اور آفندی صاحب اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے وہ مسرور لہجے میں کہتے تھے کہ اب اُن کے گھر میں بھی زندگی پیدا ہو جائے گی، اِس ویرانے میں اُنھوں نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ حِنا کو یاد کر کے کبھی کبھی اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے لیکن اب بھُولی ہُوئی یادوں کو سینے سے لگائے رکھنے سے کیا فائدہ تھا جسے جانا تھا وہ جا چکا تھا۔

آفندی صاحب اپنی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ رُدا اُن کے ساتھ ہی تھی اُن دِنوں اُس کے معمولات میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ نہ صرف اُس کے معمولات میں بلکہ احسان احمد صاحب کے معمولات میں بھی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ کئی دِن تک تو شام کی چائے کا وہ سلسلہ ہی منقطع رہا تھا جو نہ جانے کب سے بلکہ اُس دِن سے جس دِن سے قائم ہُوا تھا مسلسل چلا آ رہا تھا تاہم معمولات ڈسٹرب ہو گئے تھے، اُس کے بعد یہ تقریب ہُوئی بھی تو نہایت ہی پھیکے انداز میں سب کے ذہن رُدا کی جانب منتقل تھے۔ رُدا واقعی اِس خاندان میں ایک انوکھی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور کوئی بھی اُسے فراموش نہیں کر پایا تھا۔

تصور بیگ کے معمولات میں کوئی بھی تبدیلی نہیں پیش آئی تھی وہ اسپتال میں چودہ دِن تک مسلسل رات کی ڈیوٹی سر انجام دیتا رہا اور اس کے بعد جب آفندی صاحب اپنی کوٹھی میں منتقل ہُوئے تب بھی اُس کا دِن میں ایک بار وہاں آنا لازمی حیثیت رکھتا تھا تیمور کی کیفیت یہ تھی کہ وہ دِن کا پُورا حصّہ ثناء کے پاس گزارتا اور رات کو ثناء روزانہ آتی اور تیمور کو رُدا کی تحویل میں دے جاتی غرض معمولات یُونہی چلتے رہے اِس دوران آفندی صاحب کے مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے اور ڈاکٹر اُن کی صحت کی جانب سے نہایت مطمئن تھے بس تھوڑی سی احتیاط بتائی تھی اُنھوں نے۔ تمام معمولات حسبِ معمول تھے، آفندی صاحب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا رُدا سے روزانہ گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ اور بے حد خوش تھے کاروبار کے مسائل بھی جوں کے توں چل رہے تھے کوئی ایسی اُلجھن پیش نہیں آئی تھی جو باعثِ تردد ہوتی۔ رُدا نے ایک دِن اُن سے کہا۔

• نانا جان میں آپ کا جشنِ صحت منانا چاہتی ہُوں۔

• یعنی جو کچھ آپ چاہتی ہیں رُدا اُس کے لئے ہم سے اجازت کیوں لیتی ہیں؟

• نہیں۔ بس مشورہ لے رہی ہُوں آپ سے۔

• تو پھر بتاؤ کیا کرنا ہے؟

• میں تمام لوگوں کو مدعو کروں گی اُنھیں بھی جو آپ کے کاروباری لوگ ہیں اور باقی اُن لوگوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔

• تو پھر یُوں کرتے ہیں کہ شاہد کو میں بُلا لیتا ہُوں دفتر سے اُسے تمام معمولات بتا دو انتظامات کر دے گا۔ شاہد آفندی صاحب کی فرم کا منیجر تھا چنانچہ رُدا کے ایماء پر اُسے طلب کر لیا گیا اور رُدا نے اُس کے ساتھ مل کر مضمون وغیرہ بنایا اور پھر اُسے تمام ذمّے داریاں سونپ دی گئیں۔ رُدا نے تمام تفصیلات بتا دی تھیں۔ آفندی صاحب کی شاندار کوٹھی ہی میں یہ انتظامات کرنے تھے اور رُدا خاموشی سے اِن انتظامات میں مصروف رہی صرف ایک تصور بیگ تھا جسے تمام صورتِ حال معلوم تھی وہ خود بھی اِن تیاریوں میں حصّہ لے رہا تھا، اِدھر احسان احمد، ثناء، مُسرت، اقبال، عصمت، تنویر غرض یہ کہ تمام لوگ رُدا کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ابھی تک رُدا کی احسان احمد صاحب سے ایسی کوئی گفتگو نہیں ہُوئی تھی جس میں، دفتری معاملات آتے لیکن اُس شام جب احسان احمد صاحب تنہا وہاں پہنچے تو رُدا نے اُن سے کہا۔

• آپ بھی سوچتے ہوں گے انکل کہ میں کس قدر خود غرض ہُوں اُس دِن سے دفتر کے بارے میں پُوچھا بھی نہیں جس دِن سے اِس معاملے میں اُلجھی لیکن آپ میری مجبوریوں کو مدِنظر رکھیں۔

• یہ تمام الفاظ کہنے کی ضرورت ہے رُدا بیٹے؟ احسان احمد

صاحب نے کہا۔

• کیا ہو رہا ہے دفتر میں، میں ایک دو دِن میں دفتر آ کر تمام معمولات دیکھوں گی۔

• ضرور دیکھنا بیٹے تمہارا دفتر ہے لیکن میں تم سے خود اِس سلسلے میں مشورہ کرنے والا تھا میرا خیال ہے اب تمہارا دفتر آنا ممکن نہیں ہے حالات کا اندازہ میں خود بھی لگا رہا ہُوں چنانچہ اگر تمہاری اجازت ہو تو ایک اشتہار دے دیا جائے جنرل منیجر کے لئے۔

• انکل! ایک پیش کش میں ضرور کرتی ہُوں آپ کو ہفتے میں ایک دِن اگر میں وہاں پہنچ جایا کروں اور تمام معاملات دیکھ لیا کروں تو؟

• ضرور آؤ بیٹے ضرور آؤ میں منیجر کو تمہارے معاون کی حیثیت دے دُوں گا، بھئی آفندی صاحب آپ کی رُدا کا ایک حصّہ ہمارے لئے مخصُوص ہے اور اِس سلسلے میں آپ ہم سے تعرض نہیں کریں گے۔

• کیسی باتیں کرتے ہیں احسان۔ آپ نے جو احسان مجھ پر کیا ہے اُسے میں مرتے دم تک فراموش نہیں کر سکوں گا جیسا بھی مناسب سمجھیں کریں۔

• تو پھر یُوں ٹھیک ہے رُدا جنرل منیجر آپ ہی رہیں گی ہم ایک اسسٹنٹ منیجر اپائنٹ کئے لیتے ہیں جو باقی چھ دِن احسان احمد لمیٹڈ کے تمام معمولات دیکھے گا ضرورت پڑے گی تو آپ سے رجوع کرے گا اور اُس کے بعد جو معاملات ہوں گے وہ خود ہی سنبھالے گا۔

• جی انکل بالکل ٹھیک ہے میں اِس کے لئے خلوصِ دِل سے تیار ہُوں۔ کیوں نانا جان آپ کو تو اعتراض نہیں ہے؟

• سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بیٹے۔ پھر رُدا نے احسان احمد صاحب کو اِس جشنِ صحت کے بارے میں بتایا اور اُنھوں نے اپنی ذمّے داریاں معلوم کیں غرضیکہ یہ تمام باتیں بھی اُن تمام لوگوں تک پہنچ گئیں۔ اور دوسرے ہی دِن اُن سب نے آفندی صاحب کی کوٹھی پر حملہ کر دیا۔

• یہ جشنِ صحت منایا جا رہا ہے اور اکیلے اکیلے مونا لیزا یہ بات پسند نہیں آئی ہے مجھے تمہاری۔ ثناء نے کہا۔

• یار ثناء! اب یہ فیصلہ کرنے کے بعد تم سے سارے مشورے کرنے تھے ظاہر ہے یہ کام تو کرنا ہی ہے اور پھر اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اِتنا اُلجھا ہُوا ہے کہ میں خود بھی صحیح فیصلے نہیں کر پا رہی۔

• مثلاً؟

• یعنی سارے معمولات ... ہو گئے ہیں نہ اب شامیں وہاں گزرتی ہیں اور نہ کوئی تفریح رہ گئی ہے۔

• خیر مونا لیزا تم تو حصّہ بھی نہیں لیتی تھیں ہماری اُن شاموں میں۔ آ گئیں سو آ گئیں ورنہ اپنے معمولات میں مصروف رہیں اگر اس سلسلے کو جاری رکھنا ہی چاہتی ہو تو پھر اُس میں ایک تبدیلی کر لیتے ہیں۔

• کیا؟

• یعنی ایک دِن ہمارے ہاں تقریب ہوتی ہے میرا مطلب ہے شام کی چائے کی، دوسرے دِن عادل حسین انکل کے ہاں تیسرے دِن تم اپنے ہاں رکھ لو آخر اتنے عرصے کھا پی رہی ہو ہمارا۔

• خُدا کی قسم میں خلوصِ دِل سے اِس کے لئے تیار ہُوں۔ رُدا نے کہا۔

• تو پھر انتظامات کر لو یہ بھی کوئی مشکل مسئلہ ہے۔ ثناء نے کہا اور رُدا نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

• انتظامات کا کیا سوال ہے بس کل کا دِن ہمارے ہاں متعین ہو گیا۔

• میں یہ اعلان کئے دیتی ہُوں۔ ثناء نے کہا۔

• بالکل کر دو تمہیں اِس کا حق حاصل ہے۔ واقعی یہ مسئلہ بہت آسان ثابت ہُوا وہ جو تبدیلی ہو گئی تھی وہ اِس طرح سے پُوری کر لی گئی اور دوسرا ہی دِن آفندی صاحب کی کوٹھی کے لان پر بھرپور دِن تھا رُدا نے بڑے زبردست انتظامات کئے تھے۔ اور تقریباً تمام ہی لوگوں کو طلب کر لیا گیا تھا ڈاکٹر نعمان صاحب بھی شریک تھے اور تنویر کے اِرد گِرد اُسی طرح چکرا رہے تھے جیسے اُن کی عادت تھی کبھی کبھی وہ بھیک مانگنے والی نظروں سے رُدا کو دیکھنے لگتے رُدا کی کیفیت میں اب کچھ شوخی سی پیدا ہو گئی تھی وہ بھاری پن جو اُس کی طبیعت پر طاری رہتا تھا اب الگ ہو گیا تھا۔ اور وہ ہر مسئلے میں دِلچسپی لینے لگی تھی اُس نے نعمان صاحب کو دیکھتے ہُوئے کہا۔

• فکر نہ کریں آپ میرے ذہن میں ہیں۔

• واللہ خُدا کرے آپ ذہنی طور پر ہمیشہ طاقتور رہیں تاکہ ہمارے مسئلے کے حل میں کوئی دقّت پیش نہ آئے۔ ڈاکٹر نعمان نے اُسے دُعائیں دیتے ہُوئے کہا آج کی یہ تقریب آفندی صاحب کے لئے بھی بہت دِلکش تھی اور اُنھوں نے آنسو بھرے لہجے میں احسان احمد صاحب سے کہا۔

"احسان احمد! یہ تمہارا ہی دم ہے کہ تم نے میری اِس کوٹھی کو یہ رونق بخش دی۔"

"آفندی صاحب! خدا کرے آپ کو زندگی کی تمام خوشیاں مل جائیں جو محرومیاں آپ کی ذات سے منسلک ہوگئی تھیں وہ سب ہی کی ساری دُور ہوجائیں۔"

"بہت بہت شکریہ" آفندی صاحب نے کہا اور اب یہ سلسلہ مستقل ہوگیا ایک ایک دن تقسیم ہوگیا تھا اور رِدا اِس سے بہت خوش تھی آفندی صاحب کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے تمام معاملات رِدا کے سامنے رکھ دیئے تھے اور کہا تھا۔

"رِدا بیٹی! یہ سب ہمیشہ سے تمہارا تھا بس یُوں سمجھو تقدیر میں کچھ رُکاوٹیں تھیں جو سامنے آگئی تھیں اب یہ دُور ہوگئی ہیں تو میں سمجھتا ہُوں اِس سلسلے میں تمہیں تمام کچھ اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔"

"آپ ہر قسم کی فکر دل سے نکال دیں نانا جان میری اپنائیت میں کوئی کمی پائی ہے آپ نے؟"

"نہیں قطعی نہیں۔"

"بس تو پھر ان تمام باتوں کے سوچنے سے فائدہ" رِدا نے کہا اور آفندی صاحب خاموش ہوگئے۔ اِس معمول کے مستقل ہوجانے سے زندگی میں جو گڑبڑ پیدا ہوگئی تھی وہ کافی حد تک ہموار ہوگئی اب یہ اجتماع یہیں ہوجاتا تھا تصوّر بیگ بھی برابر ان تمام معمولات میں شریک رہتا تھا اور یُوں ایک تھوڑا تعلق جو پیدا ہوگیا تھا وہ مکمل طور سے دُور ہوگیا تمام کے تمام لوگ اُسی طرح آپس میں ملنے جُلنے لگے پھر وہ دن آگیا جب آفندی صاحب کا جشنِ صحت منایا جانا تھا۔ اِس جشنِ صحت میں جو اہتمام کئے گئے تھے سبھی اُس میں شریک تھے شہر کے بڑے بڑے کاروباری اور تمام لوگ یہاں موجود تھے اور یہ شام ایک بہترین شام قرار دی گئی تھی جب تمام مہمان آہستہ آہستہ کرکے رُخصت ہوگئے تو رِدا نے تصوّر بیگ کی طرف دیکھا وہ حسبِ معمول اب بھی یہاں موجود تھا ڈاکٹر نعمان چلاگیا تھا آفندی صاحب خود بھی تصوّر بیگ سے اِس قدر مانوس ہوگئے تھے کہ اگر وہ کبھی نہ آتا تو وہ جگہ جگہ ٹیلیفون کرکے اُسے تلاش کرلیا کرتے تھے" رِدا نے کہا۔

"تصوّر صاحب! آپ کی اچھی ڈیوٹی لگ گئی ہے، آپ کی افسری کہاں گئی؟ آپ اِتنے مصروف رہا کرتے تھے اور ایک لمحے کی فرصت نہیں ہوتی تھی؟"

"یہ سوال آپ کررہی ہیں رِدا صاحبہ" تصوّر بیگ نے کان کھجاتے ہُوئے کہا۔

"کیوں؟ کوئی غلط سوال ہے؟"

"بات یہ ہے کہ میں نے اب اپنی ذمّے داریاں تقسیم کرلی ہیں پہلے ایک آزاد پنچھی تھا لیکن اب کسی کے زیرِ تحت ہُوں۔"

رِدا مُسکرادی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"آیئے نانا جان کے پاس چلتے ہیں۔"

"بیٹھو بھئی کچھ باتیں کرنی ہیں خاص طور سے" تصوّر بیگ نے کہا اور رِدا چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"کیا باتیں ہیں خیریت؟"

"رِدا! ایک بات بار بار ہونٹوں پہ آکر رہ جاتی ہے سمجھ میں نہیں آتا اُسے کہوں یا نہ کہوں ڈرتا ہُوں کہ کہیں اور کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہوجائے۔"

"نہیں آپ کہیئے" رِدا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"میرا ذہن بار بار ثاقب کی جانب جاتا ہے صرف چند الفاظ کہنا چاہتا ہُوں رِدا! وہ باپ ہے تمہارا! اور اُس کے دل میں تمہارے لئے بہت سی باتیں پیدا ہوچکی ہیں میرا مطلب ہے وہ اِس بات کو نہیں بھول پایا کہ تم اس کی اولاد ہو اپنے کیئے پر شرمندہ بھی ہے۔ رِدا کیا یہ ممکن ہے کہ تم اُسے معاف کردو پھر میرینا ہے اور یُوسف ہے وہ لوگ سب سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر کچھ لوگوں کو تم اپنی خوشیوں میں شامل کرلیں تو کیا حرج ہے؟"

رِدا دیر تک سوچتی رہی پھر اُس نے کہا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں تصوّر صاحب؟"

"تم... میں؟" تصوّر نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"اِں آپ بتایئے مجھے" رِدا بولی۔

"میں اِن الفاظ کا مطلب نہیں سمجھا رِدا۔"

"دیکھیئے تصوّر صاحب! ابو نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا وہ بہت بُرا تھا میں نہیں جانتی کہ نانا جان پر اس نام کا کیا اثر ہوگا لیکن آپ کے بہت سے قرض ہیں مجھ پر میں آپ کے کچھ ایسے احکامات کی تعمیل کرنا چاہتی ہُوں جو مجھے پسند نہ ہوں لیکن آپ مجھے حکم دیں۔"

"اِتنی بُلندی پر نہ لے جایئے رِدا کہ اپنے آپ کو زمین پر لانا مشکل ہوجائے۔"

"آپ خود کو میری ذات سے منسلک رکھتے ہُوئے اِتنی ہی بُلندی پر محسوس کریں تصوّر صاحب۔"

"خدا کی قسم یہ الفاظ زندگی کا سرمایہ بن گئے رِدا میں چاہتا ہُوں کہ تم ثاقب کو معاف کردو میرینا اور یوسف کو بھی اِس بھرے پُرے خاندان میں شامل کرکے زندگی بخش دو۔"

"آیئے نانا جان سے باتیں کریں" رِدا نے کہا اور تصوّر کے ساتھ آفندی صاحب کے پاس پہنچ گئی۔

"نانا جان! تصوّر بیگ صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں ہاں بھئی کہو کیا بات ہے؟" آفندی صاحب نے پُوچھا۔

"آفندی صاحب! ماضی کی تھوڑی سی باتیں دُہرانا چاہُوں گا۔ ایک کردار ہے جس کا نام ثاقب ہے رِدا کا نام بہرطور ثاقب سے منسلک ہے اس لئے کہ اس کی ولدیت میں جب بھی کوئی نام لکھا جائے گا وہ ثاقب ہی کا نام ہوگا اس بات سے ہم کسی بھی طور انحراف نہیں کرسکتے۔" آفندی صاحب نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"بے شک، بے شک، لیکن ثاقب ہے کہاں؟"

"آج میں آپ کو اُسی کے بارے میں بتانا چاہتا ہُوں۔" تصوّر بیگ نے کہا اور پھر اُس نے اُس وقت سے سلسلۂ گفتگو شروع کیا جب ثاقب کو رِدا نے اُس کے حوالے کیا تھا تھوڑی سی تفصیلات بتاکر تصوّر بیگ نے کہا۔

"ثاقب کے بارے میں مجھے نہیں علم تھا کہ وہ کون ہے لیکن جب میں نے اُسے گرفتار کیا اور لاک اَپ میں بند کردیا تو اُس نے مجھے تمام تفصیلات بتائیں یہ معلوم کرکے کہ وہ رِدا کے والد ہیں میری ذمّے داریاں ذرا تبدیل ہوگئیں۔ میں نے اُنھیں اسپتال میں داخل کرکے اُن کا علاج کرایا اور علاج کرنے کے بعد اُنھیں ایک صحت مند زندگی دی ثاقب نے مجھ سے بہت سے وعدے کئے اور بلاشبہ وہ اُن وعدوں کی تکمیل کرتے رہے، آفندی صاحب ہوسکتا ہے آپ کو اُن کی دوسری شادی کے بارے میں معلوم نہ ہو میں آپ کو مختصر الفاظ میں اِس بارے میں بھی بتائے دیتا ہُوں۔" تصوّر بیگ نے میرینا اور یُوسف کے بارے میں تفصیلات بتائیں، پھر کہنے لگا۔

"میرے ایماء پر ثاقب نے میرینا کو یہاں بُلالیا اور اب وہ اپنے بچّے اور بیوی کے ساتھ وہاں رہتا ہے لیکن آفندی صاحب انسان سے زندگی میں بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں اور اِن غلطیوں کی سزا اُسے قدرتی طور پر بھی ملتی ہے۔ انسان کسی بھی انسان کو زیادہ سے زیادہ کتنی سزا دے سکتا ہے اِس کا تصوّر آپ خود کرلیجئے غرضیکہ ثاقب اب ایک ایسے انسان کی زندگی گزار رہا ہے جس کے سینے پر لاتعداد زخم ہیں میری درخواست ہے آفندی صاحب کہ ثاقب کو معاف کردیا جائے اور اگر گنجائش ہو تو اُسے بھی اِس خاندان کی ایک شخصیت کے طور پر تسلیم کرلیا جائے؟" آفندی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر اُنھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"جو کچھ ہوچکا ہے تصوّر بیٹے میں نے اُسے ذہن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا ہے میری اپنی سوچ ہی کون سی بہت زیادہ بہتر تھی کاش میں اپنی سوچ میں کچھ تبدیلیاں کرلیتا جانے والا تو اِس دُنیا سے ضرور چلا جاتا ہے لیکن اپنے ساتھ وہ ایسی دُکھ بھری یادیں بھی چھوڑ جاتا ہے کسی بھی انسان سے اب مجھے نفرت نہیں ہے اور کسی کے ساتھ بھی میں کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا جو کچھ میں کر چکا ہُوں اُس کی سزا مجھے اِس قدر مل چکی ہے کہ اب کچھ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا میں اگر رِدا تیار ہو تو میں اُس شخص کو معاف کرنے کے لئے تیار ہُوں اور خلوصِ دل سے اِس بات کا وعدہ کرتا ہُوں کہ اِس سلسلے میں کوئی رُکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔"

رِدا نے اپنے نانا کو پیار سے چُومتے ہُوئے کہا۔

"نانا جان! ابو کو ہم اپنے پاس بُلائے لیتے ہیں یہیں رکھیں گے اُنھیں، امّی اب اِس دُنیا میں نہیں ہیں لیکن۔ لیکن بہرطور ہم ابو کو معاف کردیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے" تصوّر کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے تھے اُس نے آہستہ سے کہا۔

"شکریہ رِدا، بہت بہت شکریہ" پھر جب وہ باہر آیا تو رِدا اور اُس کے درمیان ثاقب کے سلسلے میں کافی بات چیت ہوتی رہی تھی تصوّر بیگ نے کہا۔

"رِدا! اِس اعزاز کو میں اپنے اُن تمام تمغوں سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہُوں جو اَب تک مجھے میری نوکری کے دوران ملے ہیں۔ آپ نے مجھے یہ اعزاز بخش کے بہت بڑا درجہ دے دیا ہے۔"

رِدا شرمگیں نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے آپ سے بدتمیزی بھی تو بہت کی ہے تصوّر بیگ صاحب بھلا وہ کوئی بھولنے کی بات ہے۔"

"اب بھول جایئے اِن باتوں کو کیا رکھا ہے تو پھر اجازت ہے اِس سلسلے میں میں سرخروئی حاصل کرلوں۔"

"ہاں ابو کو جس طرح بھی آپ مناسب سمجھیں یہاں لے آیئے۔ میری ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجئے گا۔"

"بہت بہتر" تصوّر بیگ نے کہا اور وہاں سے رُخصت ہوگیا۔ رِدا اُسے چھوڑنے آئی تھی واپس پلٹی تو آفندی صاحب اُس کا انتظار کررہے تھے۔

"رِدا!" اُنھوں نے اُسے پُکارا۔

"جی نانا جان؟"

"میرینا کو تم نے دیکھا ہے؟"

"اِس دوران اُن سے ملتی بھی رہی ہُوں نانا جان۔"

"کیسی عورت ہے؟"

"بہت اچھی حیرت انگیز طور پر اچھی۔"

"ثاقب سے ملی ہو اِس دوران؟"

"نہیں۔"

"ایک سوال کروں تم سے؟"

"جی نانا جان!"

"اُن لوگوں کے آجانے سے تمھیں کوئی کوفت تو نہ ہوگی؟"

"نہیں نانا جان، ہم اِن بدلے ہُوئے حالات کو قبول کریں گے، وقت کے فیصلے نظر انداز تو کئے جا سکتے ہیں مُسترد نہیں۔" رُدا نے جواب دیا۔ آفندی صاحب نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا۔

"رُدا بیٹے اِس تھوڑی سی تبدیلی کے سلسلے میں اگر ہم احسان اور عادل حسین کو بھی اپنا شریکِ راز کرلیں تو کوئی حرج ہے؟"

"کون سی تبدیلی نانا جان؟"

"میرا مطلب ہے ثاقب کے سلسلے میں کہیں وہ لوگ یہ تصور نہ کریں کہ اب ہم نے اپنے فیصلے تنہا کرنا شروع کر دیئے ہیں۔" رُدا چند لمحات سوچتی رہی پھر اُس نے کہا۔

"ٹھیک ہے نانا جان آپ کا کہنا درست ہے۔"

"تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے میں چاہتا ہُوں کہ اُس کے آنے سے پہلے ہی احسان احمد اور عادل حسین کو یہ تمام تفصیلات معلوم ہو جانی چاہئیں۔"

"اگر آپ چاہیں تو میں اُن لوگوں کو یہاں بُلا لوں۔"

"نہیں بھئی ہم خود ہی کیوں نا چلیں۔"

"جیسا آپ پسند کریں۔" رُدا نے کہا اور آفندی صاحب تیار ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد اُن کی کار باہر نکل آئی اور وہ سیدھے احسان احمد کی کوٹھی چل پڑے، اُن دونوں کو اچانک دیکھ کر احسان احمد صاحب بھونچکے رہ گئے تھے۔ ثناء اور نُدرت بھی دوڑی چلی آئیں تھیں۔ رُدا نے اُن سے کہا کہ وہ احسان احمد صاحب کے پاس آئے ہیں اور بمشکل تمام وہ اُن سے پیچھا چھڑا کر وہ اندر داخل ہُوئی تھی۔" احسان احمد صاحب نے کہا۔

"خیریت بتائیں آفندی صاحب خیریت بتائیں۔"

"خیریت۔ بالکل خیریت ہے ایک خاص اور اہم مسئلے میں مشورہ کرنا تھا ذرا دیر سے یہ مسئلہ علم میں آیا ورنہ وہیں پر گفتگو ہو جاتی میں چاہتا ہُوں کہ عادل حسین صاحب کو بھی بُلا لیا جائے یا پھر ہم لوگ وہیں چلیں۔"

"جیسا آپ پسند کریں۔"

"نہیں یہ آپ پر منحصر ہے احسان احمد۔"

"عادل بھائی کو ٹیلی فون کئے دیتا ہُوں اگر وہ آسکیں تو آ جائیں۔"

"تو پھر جلدی بُلا لو۔" عادل حسین صاحب ٹیلی فون ملنے کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے تھے اِس دوران بڑا سسپنس رہا تھا۔ احسان احمد صاحب نے عادل حسین صاحب کے آنے کے بعد کہا۔

"بھئی یہ آفندی صاحب کوئی بھان متی کا پٹارہ کھولنے والے ہیں۔ بڑا سسپنس پھیلایا ہے اِنھوں نے اب ذرا پُوچھو اِن سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"بڑی سنجیدہ بات ہے احسان احمد ثاقب کا نام تمھارے ذہن میں ہے۔"

"کیوں نہیں۔" احسان احمد بولے۔

"کچھ تھوڑی سی تفصیلات اُس کے بارے میں معلوم ہُوئی ہیں۔" آفندی صاحب نے کہا اور پھر مختصر الفاظ میں تصور بیگ کی سنائی ہُوئی کہانی دُہرا دی احسان احمد اور عادل حسین حیرت سے یہ کہانی سُن رہے تھے پھر آفندی صاحب بولے۔

"وہ یہیں موجود ہے اور رُدا کے لئے تڑپتا ہے میں نے رُدا سے مشورہ کیا اور دِل میں سوچا کہ اب جب یہ گھر یہ گلشن ایک بار پھر آباد ہو گیا ہے یہاں ہر پُھول کھِل گیا ہے تو اُن لوگوں کو بھی خود سے کیوں دُور رکھا جائے۔ بہرطور رُدا کا باپ ہے اور میری بیٹی سے منسلک رہ چکا ہے جو ہمارے درمیان سے چلا گیا اب اُس کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے لیکن اُس کے ساتھ دو کردار اور منسلک ہیں اگر ہم لوگ انھیں اپنے آپ میں شامل کرلیں تو کوئی حرج ہے؟"

"قطعی نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہُوں کہ یہ ایک بہت اچھا قدم ہوگا تعجب کی بات ہے اب تک ایسا کیوں نہیں ہُوا؟ آہ کاش ایسا ہو جاتا تو آج کی محفل میں وہ سب بھی شریک ہوتے۔"

"تو میں اِس سلسلے میں آپ لوگوں کی رائے لینے آیا ہُوں۔"

"یہ کام آپ کو فوراً کر لینا چاہئے آفندی صاحب۔ ہماری ہر طرح کی خدمات حاضر ہیں اِس سلسلے میں۔"

"بہت بہت شکریہ آپ نے ہمیں اِس قابل سمجھا۔"

"اب اِن باتوں کو اِس انداز میں نہ کیا کریں احسان احمد یہ میرا خاندان ہے آپ سب لوگ میرے اپنے ہیں آپ کے مشورے کے بغیر میں کوئی قدم کیسے اُٹھا سکتا ہُوں۔"

"تو پھر فوراً ہی یہ قدم اُٹھا لینا چاہئے اِس سلسلے میں میرا خیال ہے تصور بیگ کو استعمال کرنا زیادہ مناسب ہے۔"

"بہت بہتر۔ بس اِسی لئے حاضری ہُوئی تھی۔" رُدا باہر نکل آئی اُس نے ثناء اور نُدرت وغیرہ کو بھی یہ تمام تفصیلات بتائیں۔ اور اُن لوگوں نے بھی اِس پروگرام کی تائید کی اُدھر تصور بیگ معروف تھا ثاقب سے اُس نے نہ جانے کیا گفتگو کی بہرطور دوسرے دِن صبح ساڑھے دس بجے ہی وہ اُن لوگوں کے ساتھ آفندی صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا تھا۔ ثاقب اندر داخل ہُوا اور اُس نے آفندی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے آفندی صاحب نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے غلطیاں نہ جانے کس کس سے ہوتی ہیں ہر انسان اپنے آپ کو اپنے اقدامات میں حق بجانب سمجھتا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میری ضد تھی اور اِس ضد نے مُجھ سے میری بیٹی چھین لی لیکن خُدا کا احسان ہے کہ رُدا میری بیٹی کی کسر پوری کرتی ہے تیمور، تیمور۔"

"ثاقب نے... میں نے بہت گُناہ کئے ہیں آفندی صاحب میں نہیں سمجھتا کہ اِن گناہوں کی سزا مجھے دوسری دُنیا میں کیا ملے گی لیکن اِس دُنیا میں جو سزائیں مجھے مل چکی ہیں آپ یقین فرمائیے وہ بہت ہیں، رُدا بیٹے، رُدا بیٹے میں نے تمھیں... میں نے تمھیں سب سے زیادہ دھوکہ دیا ہے تم نے مجھے جتنی چاہت سے ابو کہا تھا میں اُس کا مان نہیں رکھ سکا۔" ثاقب اِتنا رو یا کہ اُس پر غشی سی طاری ہونے لگی بمشکل تمام اُسے سنبھالا گیا تھا میرینا اور یوسف بھی رو رہے تھے، رُدا نے آگے بڑھ کر یوسف کو سینے سے لگاتے ہُوئے کہا۔

"نہیں بیٹے نہیں میرے بھائی روتے نہیں ہیں۔" بہرطور بڑے رقت آمیز مناظر رہے تھے اور اُس کے بعد آفندی صاحب نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

"تو پھر اب یہ بات طے ہوگئی ثاقب کہ تم میرینا اور یُوسف یہیں میرے ساتھ رہو گے، تصور بیٹے ہم تمھیں زحمت دیں گے فوری طور پر جو اِن کا ضروری سامان ہے وہ یہاں منتقل کرا دو۔ اور اب اِن کے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" ثاقب نے گردن خم کر دی تھی میرینا اور یوسف مسلسل روتے رہے تھے میرینا نے روتے ہوئے کہا کہ اُسے یہ نئی زندگی جو ملی ہے وہ اُس کے لئے بہت دِلکش ہوگی اور وہ بھی زندگی کی کچھ بہاریں دیکھ لے گی۔ آفندی صاحب نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔

"تم میری بیٹی کی جگہ لے چکی ہو میرینا، بہت بڑا درجہ حاصل ہُوا ہے تمھیں، آہ کاش... آہ کاش حنا بھی ہمارے درمیان ہوتی اور خُوشیوں کے یہ مناظر دیکھتی۔" بہرطور تمام ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لے کر تصور بیگ وہاں سے چلا گیا تھا اور اُسی شام اُس نے اُن لوگوں کا سامان بھی وہاں منتقل کر دیا آفندی صاحب نے اُس سے کہا۔

"تصور بیٹے جو محنت تم کر رہے ہو ہمارے لئے ہم اُس کا صلہ کیسے دے سکیں گے؟"

"یہاں تو ہر تھوڑی دیر کے بعد ایک نہ ایک آدمی ایک نہ ایک شخص کا احسان مند ہو جاتا ہے جنابِ عالی میں جو کچھ کر رہا ہُوں اُس میں میری اپنی محبت بھی چھُپی ہُوئی ہے چنانچہ آپ اُس کا مضحکہ نہ اُڑائیے۔" رُدا نے مُسکرا کر تصور بیگ کو دیکھا تھا پھر اُس کے ساتھ باتیں کرتی ہُوئی باہر نکل آئی تھی۔ میرینا، یوسف اور ثاقب کا معاملہ آفندی صاحب نے اپنے آپ سنبھال لیا تھا۔ تصور بیگ رُدا کے ساتھ پائیں باغ کے ایک گوشے میں آ بیٹھا اور اُس نے کہا۔

"جی کوئی اور نیا حُکم؟"

"نہیں۔ آپ کو حُکم کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ہاں شکریہ ضرور ادا کیا جا سکتا ہے۔"

"جی نہیں قطعی شکریہ نہیں ادا کیا جا سکتا نہ جانے آپ لوگوں کے پاس شکریہ کا اِتنا اسٹاک کہاں سے جمع ہو گیا ہے بھئی میں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے اپنی محبت کے لئے کیا جا رہا ہے، محبت سمجھتی ہیں نہ آپ۔" رُدا آہستہ سے ہنس پڑی تھی۔

"جی ہاں سمجھتی ہُوں۔" اُس نے شرمگیں لہجے میں کہا تھا۔

زندگی میں جو ہنگامہ خیزیاں پیدا ہو گئیں تھیں وہ اب معمول پر آتی جا رہی تھیں لیکن اِن ہنگامہ خیزیوں کے نتائج بڑے خوبصورت تھے پہلی بات تو یہ کہ ہمارے آفندی صاحب جو اِس پوری کہانی میں ایک اہم کردار کے حامل تھے، سب لوگوں سے دُور تھے اور کسی بھی تفریح یا دِلچسپی میں اُن کی کوئی شمولیت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اب اِس خاندان میں شامل ہو گئے تھے اور اِس طرح شامل ہُوئے تھے کہ اب اُن کی کہی ہُوئی ہر بات آخری حیثیت رکھتی تھی خود احسان احمد اور عادل حسین اپنے کسی بھی ذاتی مسئلے میں مشورہ کرنے اُن کے پاس پہنچتے تھے۔ اُن کے علم میں تمام معاملات لے آئے گئے تھے اور اُن کی رائے ہر سلسلے میں طلب کی گئی تھی اِس کے علاوہ خاندان میں جو لوگ اور شامل ہُوئے

تھے اُن میں میر، نیا، یوسف اور ثاقب تھے اور ہر فرد نے اپنے طور پر فیصلہ کیا تھا کہ اِن تین افراد کو وہ بھرپور اپنائیت دی جائے گی جو خاندانوں میں ہوتی ہے تاکہ اُن کے ذہنوں میں کوئی غیریت باقی نہ رہے۔ ابتداء میں تو یہ لوگ بہت دبے دبے سے رہے تھے۔ لیکن خود آفندی صاحب نے ثاقب کو بُلا کر اُسے جو ہدایات دی تھیں اُن ہدایات نے اُس میں بڑا اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ پہلی ہدایت تو یہ تھی کہ ثاقب جو ملازمت کر رہا ہے اُس سے فوراً استعفیٰ دے دے۔ ثاقب نے تھوڑی سی ردوقدح کی تھی تو رُدا نے اُس سے کہا تھا۔

"نہیں ابو، آپ یہ الفاظ کہہ کر اپنے آپ کو ہم سے دُور کر رہے ہیں اب تو ایسا نہ کریں۔" اور ثاقب شرمندگی سے خاموش ہو گیا تھا۔ آفندی صاحب نے کہا۔

"یہ اِتنا بڑا کاروبار ہے بیٹے خُدا کا شکر ہے کہ تم اِسے سنبھالنے والے موجود ہو چنانچہ اب میری ذمّہ داریاں ختم کر دو اور اِس پر بھرپور نگاہ رکھو۔ میں تمام معاملات سے تمہیں آگاہ کر دُوں گا اور اُس کے بعد ساری چیزوں کی نگرانی تمہیں کرنا ہوگی۔" ثاقب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ بِلک بِلک کر رو پڑا تھا غالباً اِس وقت اُسے جِتنا یاد آئی تھی آفندی صاحب خود بھی رونے لگے تھے اور رُدا بھی اپنے آپ کو اِس دُکھ سے دُور نہ کر سکی تھی۔ غرضیکہ یہ ذمّہ داری ثاقب کو سونپ دی گئی۔ یُوسف تو تیمور کا دیوانہ ہو گیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی چپٹے رہنا چاہتا تھا۔ بہرطور معمولات میں کوئی تبدیلی رُونما نہ ہونے دی گئی تھی۔ شناء کا تیمور پر جو حق تھا وہ قائم ہی رکھا گیا تھا اور اِس سلسلے میں خود رُدا نے بھی کِسی قسم کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا شناء کو۔ یہ تمام سِلسلے جاری تھے اور ہنگامہ خیزیاں رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھیں اِس دوران اختر وغیرہ بڑے اُداس رہنے لگے تھے۔

یہ تمام اُداسی اداکاری ہوتی تھی لیکن اختر اپنی اداکاری کو حقیقت کا رنگ دینا جانتا تھا اُس نے دانت پیستے ہُوئے رُدا سے کہا۔

"سِسٹر! آپ نے یہ ہنگامہ کر کے ہمارے معاملات جِس طرح پسِ پُشت ڈالے ہیں اُس کی پوری پوری جواب دہی کرنا پڑے گی آپ کو ارے ہاں ہماری آنکھیں چھوٹی ہُوئی تو نہیں ہیں دیکھ رہے ہیں اچھی طرح کہ تصوّر بیگ صاحب کیا رنگ دِکھا رہے ہیں اب تو یُوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی ملازمت بھی چھوڑ دیں گے۔"

"اختر! شرارت نہیں۔"

"جی ہاں! جی ہاں اختر کو بس ڈانٹ ڈپٹ کر کے خاموش کر دیا جاتا ہے، ہم نے جِتنی کوششیں کیں وہ تو کِسی قابل نہ رہیں لیکن سارے معاملات خود بخود طے ہو گئے۔"

"بھئی کیا معاملات طے ہو گئے کیسی باتیں کر رہے ہو۔" رُدا نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"بُرا مانیئے یا بھلا۔ دیکھیں گے آگے دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔"

"تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیئے؟"

"ہمارا خیال کیا حیثیت رکھتا ہے جی۔ بس دیکھ لیا آج کل کے ان لڑکے لڑکیوں کو سارے معاملات خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ اور بزرگوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔"

"محترم بزرگ کوئی کام کی بات کرو اب یہ بتاؤ تمہارا سِلسلہ کیا ہو رہا ہے؟"

"جہنم میں ڈالیئے ہمارا سِلسلہ ہم کِس قابل، روتے پیٹتے رہیں گے بس آپ لوگ اپنے اپنے گھر بسا لیجیئے۔"

"نہیں اختر تمہارا گھر بسانے کے بعد ہی ہم اپنے گھر کے بارے میں سوچیں گے۔"

"واللہ پھر سے فرمایئے یہ بات۔ جی خوش کر دیا رُدا باجی آپ نے یہ الفاظ کہہ کر۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے بس حرکتیں کیئے جاؤ کوئی اور کام تو ہے نہیں تمہارے پاس۔"

"جی نہیں کام تو بہت سے ہیں۔ شادی کرنی ہے اور اُس کے بعد اُس کے بعد بچّے پالنے ہیں۔"

"نُدرت سے بات کروں گی۔"

"اللہ رکھی آپ کی اللہ رکھی تو اب مجھ سے مجھ پر اِتنے احکامات جتانے لگی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا شادی کے بعد کیا ہوگا۔" رُدا ہنسنے لگی تھی اُس کے بعد باقاعدہ ایک دن شام کی چائے پر

میٹنگ ہُوئی اور یہ بات طے پائی کہ شادی کے ہنگامے پھر سے جلدی کر دیئے جائیں رُدا نے آفندی صاحب سے تذکرہ کیا اور کہا کہ اختر اور نُدرت کی شادی بھی اگر خالد اور شناء کی شادی کے ساتھ ہو جائے تو کیا حرج ہے آفندی صاحب کا حکم صادر ہو گیا۔ اور بالآخر یہ بات طے ہو گئی کہ دو دُولہا دو باراتیں، دو دُلہنیں، دو شادیاں ہوں گیں اور اختر اُس دِن خوشی سے ناچتا پھر رہا تھا اُس نے رُدا کو لاکھوں دُعائیں دی تھیں پھولوں کا ایک ہار لا کر اُس نے اچانک ہی تصوّر بیگ کے گلے میں ڈال دیا تھا جو اب شام کی نشستوں میں عموماً شریک رہتا تھا۔

"ارے، ارے یہ تم اپنی خوشی میری جانب کیوں منتقل کر رہے ہو؟"

"یہ رمزکی باتیں ہیں جناب جسے خوش کرنا تھا وہ خوش ہو گیا۔ آپ کیا جانیں اِن تمام باتوں کو۔" اختر نے کہا اور تصوّر بیگ مُسکرانے لگا۔ پھر ڈاکٹر نعمان بھی اکثر رُدا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور وہ جب بھی آتا رُدا کے سامنے سر جُھکا کر سہمی سی شکل بنا کر بیٹھ جاتا اور رُدا ہنس پڑتی۔

"میرے بھائی تُو خود بھی تو کوئی کوشش کر میں تیرے لئے آخر کیا کیا کروں۔"

"آپ نے جو وعدہ کیا ہے رُدا باجی وہ پُورا کریں آپ بس ورنہ اچھا نہیں ہوگا، کوئی خودکشی وُدکشی کرنے کے بارے میں سوچوں گا میں۔" ڈاکٹر نعمان نے کہا۔

"ارے نہیں نہیں اب ایسا بھی کیا ذرا اِس مسئلے کو ہو جانے دو تین دُولہا تین باراتیں ویسے بھی اچھی نہیں لگیں گی۔"

"آپ یہ جُملے بھی کہہ دیجئے کافی ہوگا۔"

"تو کہہ دیئے تم اطمینان رکھو یہ کام کرا کر رہوں گی"۔ رُدا نے کہا اور ڈاکٹر نعمان نے آگے بڑھ کر اُس کے پاؤں چُھو لئے۔

"کیا بدتمیزی ہے بھئی کیا فضُول باتیں کر رہے ہو۔"

"آپ نہیں جانتیں اِن فضُول باتوں کا میری زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے۔" اِن سارے معاملات میں اگر کوئی شخصیت حد سے زیادہ پریشان تھی تو وہ تھے، اجمل بھائی جان جو ایک ایک سے پُوچھتے پھرتے تھے کہ اب یہ کیا ہو رہا ہے اب یہ کیا ہو رہا ہے ویسے یہ احساس اُنھیں بخُوبی ہو گیا تھا کہ تمام چڑیاں اپنا الگ الگ گھونسلہ رکھتی ہیں اور کوئی گھونسلہ اُن کے لئے خالی نہیں ہے، بہرطور اُداس پنچھی کی طرح چاروں طرف چکراتے پھرتے تھے اور ایک ایک کو حسرت سے دیکھتے تھے آپا بھائی جان

کا مسئلہ بھی اُن کے علم میں آ چکا تھا اور اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیسے اپنا رقیب بنیں، بہرطور اُن کی بھی گُزر رہی تھی شادی کے ہنگامے تیز سے تیز تر ہوتے چلے جا رہے تھے اِن ہنگاموں میں کھو کر رُدا کچھ عرصے کے لئے احسان احمد صاحب کی وہ بات بھول چکی تھی جو اُنھوں نے اُسے بتائی تھی لیکن بعد میں اُسے یہ احساس پھر ستانے لگا تھا کہ احسان احمد صاحب کی پریشانی کِسی طرح دُور کرے آفندی صاحب سے اب اُس کے دِل کے راستے بالکل صاف ہو گئے تھے اور کوئی بات وہ اُن سے نہیں چُھپاتی تھی چنانچہ ایک رات اُس نے آفندی صاحب سے کہا۔

"احسان احمد صاحب کے بارے میں آپ کو سب کچھ معلوم ہے نانا جان ایک بڑی مشکل درپیش ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"کیا؟" آفندی صاحب نے پُوچھا اور رُدا نے اُنھیں پوری تفصیلات بتا دیں۔ آفندی صاحب بھی گہری سوچ میں ڈُوب گئے تھے پھر اُنھوں نے کہا۔

"رُدا بیٹے ثناء کے سِلسلے میں، جو کچھ بھی تم کرنا چاہو کر سکتی ہو، ظاہر ہے تمہارا ہاتھ کِسی شکل میں نہیں روکا جا سکتا لیکن کیا احسان احمد اِس بات کو قبُول کر لیں گے؟"

"کچھ عجیب سے حالات ہیں نانا جان میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اِس سِلسلے میں کیا کروں۔"

"تم مجھے جس طرح بھی حکم دو۔ میرا مطلب ہے میں خود ہی احسان احمد کو یہ پیش کش کروں۔"

"نہیں نانا جان بالکل نہیں ورنہ وہ یہ سوچیں گے کہ میں نے اُن کا راز آپ کو دے دیا، بہت نازک طبیعت کے مالک ہیں وہ"۔ رُدا نے کہا اور آفندی صاحب گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے پھر اُنھوں نے کہا۔

"تاہم اِس سِلسلے میں تم جو بھی فیصلہ کرو گی میں اُس میں بھرپور طریقے سے تمہارے ساتھ ہُوں، لیکن رُدا کا ذہن خود کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا وہ تمام کاموں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ لیکن اُس کی گہری نظریں احسان احمد کے چہرے کو دیکھتی رہتی تھیں۔ آفندی صاحب نے ایک دن کہا۔

"رُدا بیٹی! تصوّر کو کیا ساری صُورتِ حال معلوم ہے؟"

"کِس سِلسلے میں نانا جان؟"

"احسان احمد کے بارے میں۔"

"ہاں کِسی حد تک معلوم ہے، آپ کیوں پُوچھ رہے ہیں؟"

"تصوّر آیا تھا میرے پاس تمہیں معلوم ہے وہ مجھ پر بھی احسانات کرتا رہا ہے یُوں ہی احسان احمد کا تذکرہ نِکل آیا تھا۔ میرے مُنہ سے بات نِکل گئی۔ وہ خاصا واقف ہے اِن معاملات سے۔"

"اوہ۔ کچھ کہا اُنھوں نے؟" رُدا نے پُوچھا۔

"نہیں، بس خاموش ہو گیا۔"

"خیر وہ قابلِ اعتماد ہیں۔" رُدا نے کہا۔ اُس نے تصوّر کو فون کیا مگر وہ نہیں مِل سکا تھا۔ رات کو اُس نے پھر تصوّر کو فون کیا۔ تو ڈاکٹر نعمان مِلا۔

"ہیلو رُدا باجی۔"

"ہیلو نعمان تصوّر صاحب کہاں ہیں؟"

"سوئیڈن گئے ہوئے ہیں"
"کیا؟"
"جی ہاں! کوئی سرکاری ایمرجنسی تھی بڑی بھاگ دوڑ کر کے پونے سات بجے ایک فلائٹ سے جا سکے ہیں" نعمان نے کہا اور وہ اوہ کر کے رہ گئی۔

❀

سہ پہر ساڑھے تین بجے کا وقت تھا احسان احمد کی کوٹھی میں معمولاتِ زندگی جوں کے توں جاری تھے۔ آج شام یہاں کا پروگرام تھا اور باورچی وغیرہ کچن میں مصروف تھے کہ اچانک کوٹھی کے گیٹ سے ایک شخص اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے نُدرت نے اُسے دیکھا تھا اور پھر وہ طفیلی بیگم کے پاس دوڑ گئی تھی۔
"خالہ جان! رشید بھائی آگئے" طفیلی بیگم ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ پھر وہ اس طرح دوڑیں کہ گرتے گرتے بچیں۔ رشید ماں سے لپٹ گیا تھا اور طفیلی بیگم روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھیں۔
ذرا سی دیر میں گھر کے سارے لوگ جمع ہو گئے۔ رشید نے ذکیہ بیگم سے کہا "خالہ جان کیا خالو جان گھر آگئے ہیں؟"
"نہیں رشید میاں۔ ابھی نہیں"
"انھیں فوراً فون کر کے بلا لیں۔ ابھی کچھ دیر کے بعد یہاں کچھ اور لوگ آنے والے ہیں"
"کون؟" ذکیہ بیگم نے پوچھا۔
"بس آپ خالو جان کو فون کر دیں۔ مجھے بتانے سے منع کر دیا گیا ہے"
"میں فون کئے دیتی ہوں" ذکیہ بیگم نے کہا اور پھر خود احسان صاحب کو فون کرنے چلی گئیں۔
"خیریت؟" احسان صاحب فون پر بولے۔
"وہ رشید واپس آگیا ہے اور اُس نے کہا ہے کہ آپ کو فون کر کے بلاؤں کچھ اور لوگ آنے والے ہیں"
"رشید!"
"جی!"
"ابھی آرہا ہوں" احسان احمد نے کہا۔ باہر ہنگامے جاری تھے طفیلی بیگم ہوش میں آگئی تھیں۔ لوگ رشید کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔
"آخر تم چلے کہاں گئے تھے رشید میاں" دادی جان نے پوچھا۔
"بس دادی جان! جو کیا تھا اُس کا نتیجہ بھگت رہے تھے" رشید میاں نے کہا۔ احسان احمد ہانپتے کانپتے گھر پہنچے تھے رشید سے ملے اور وہی سب کچھ وہ بھی پوچھنے لگے "خالو جان! آپ سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنی ہیں خالہ جان اور دادی اماں بھی آجائیں تو کوئی حرج نہیں ہے"
تینوں افراد رشید کے ساتھ کمرے میں آگئے۔ رشید نے کہا "کچھ لمبی کہانی ہے خالو جان!"
"کیا بات ہے رشید میاں جو کچھ ہے کھل کر کہو۔ یہ بتاؤ اِس دوران تم تھے کہاں؟"
"جیل میں"
"کیوں؟" احسان احمد نے پوچھا۔
"شہاب بھائی کی مہربانیاں تھیں۔ اُنھوں نے اپنے ساتھ مجھے دھندوں سے لگا لیا تھا پھر ہم دونوں پکڑے گئے" لمبا معاملہ ہے! رشید نے کہا اور احسان احمد ساکت رہ گئے، رشید بولا "یہ ویسے تو کہانی بہت لمبی ہے بس مختصر یہ ہے خالو جان کہ میں شہاب کے ساتھ اُن کے کام میں شریک ہو گیا۔ ہمارے پیچھے سی آئی ڈی لگ گئی تھی۔ اور سی آئی ڈی کے ایک بڑے افسر نے ہمارے گھر میں نوکری کر لی تھی۔"
"یہاں کوٹھی میں؟"
"ہاں خالو یہاں۔ خیر دین پولیس کا بہت بڑا افسر تھا، بڑا خطرناک آدمی ہے وہ اُس کا اصلی نام تصور بیگ ہے، بس جی! ہانگ کانگ میں گرفتار ہو گیا خیر دین میرا مطلب ہے تصور بیگ مجھے یہاں لے آیا، پھر اُس نے آسٹریلیا میں شہاب بھائی کو پکڑ لیا اور سوئیڈن سے تفسیر احمد بھی گرفتار ہو گیا، اُن لوگوں نے بہت لمبا چکر چلایا تھا میں تو اَن پڑھ آدمی ہوں تصور بیگ نے بڑی مہربانی کی اور سارا کیس تفسیر پر بنا دیا۔ ورنہ ہمارا تیا پانچہ ہو گیا ہوتا۔ تصور بیگ نے آپ کا سارا روپیہ بھی نکلوا لیا اُس نے بڑی محنت سے یہ کیس دُنیا کے تین ملکوں میں لڑا گیا۔ ہم دونوں کو بس تفسیر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے سزا ہو گئی اور یہ بھی تصور بیگ کی مہربانی تھی کہ وہ تگ و دو کر کے ہم دونوں کو یہاں لے آیا۔"
"یہاں؟" احسان احمد پھر اُچھل پڑے۔
"ہاں ہم دونوں یہیں کی جیل میں تھے"
"شہاب بھی؟"
"ہاں جی، ہماری سزا تو کچھ زیادہ تھی مگر تصور بیگ مسلسل ہماری مدد کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ہماری باقی سزا ختم کرا دی"
"شہاب کہاں ہے؟" دادی اماں نے بے قراری سے پوچھا۔
"آنے والے ہیں" رشید نے بتایا اور دادی اماں پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگیں۔ احسان احمد کے گالوں پر بھی آنسو لڑھک رہے تھے۔ رشید نے کہا۔
"یہ بھی تصور بیگ کی مہربانی تھی کہ اُنھوں نے سارا روپیہ نکلوا لیا جو شہاب بھائی گنوا چکے تھے۔ سارا جال تفسیر کا پھیلایا ہوا تھا اور اُس نے شہاب بھائی کو بھی اُلو بنا دیا تھا"
اندر یہ گفتگو ہو رہی تھی اور باہر دوسرے ہنگامے جاری تھے۔ طفیلی خالہ سجدے میں پڑی تھیں دوسرے لوگ آپس میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، پھر ایک پولیس جیپ کوٹھی کے گیٹ پر رُکی، اُس کے بعد اندر آگئی چونکہ تمام لوگ رشید کی آمد کی وجہ سے باہر ہی موجود تھے اِس لئے ہر منظر اُن کے سامنے تھا۔ پولیس جیپ سے تصور بیگ پولیس کی وردی میں نیچے اُترا پھر شہاب احمد نیچے آئے اور ثنا کی چیخ نکل گئی۔ دو اجنبی چہرے بھی نیچے آئے تھے، جن میں ایک غیر ملکی تھا۔ شہاب صاحب بہت کمزور ہو گئے تھے، اور کسی سے نظر ملائے بغیر آگے بڑھ رہے تھے، یہ دن کوٹھی میں کہرام کا دن تھا۔ ثناء تو راستے میں ہی روتی ہوئی شہاب صاحب سے لپٹ گئی تھی۔
"ہائے چچا جان آپ کہاں چلے گئے تھے" شہاب صاحب کوئی جواب نہ دے سکے بس خاموشی سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اندر چلے گئے تھے، پھر جب وہ اُن لوگوں کے ساتھ اندر پہنچے تو ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔ پہلے طفیلی خالہ پر غشی طاری ہوئی تھی۔ دادی اماں کی وہی کیفیت تھی اور سب لوگ اُنھیں سنبھال رہے تھے۔ شہاب صاحب چپکے چپکے مجرموں کی طرح آنسو بہا رہے تھے۔
"احسان احمد صاحب! یہ مسٹر ڈائمنڈ ہیں سوئیڈن سے آئے ہیں اور یہ انٹرپول کے مقامی سربراہ مسٹر احتشام برقی ہیں۔ بس کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں آپ سے"
"جی بیٹھے!"
"رشید کو میں نے اِس لئے کچھ دیر پہلے آپ کے پاس بھیج دیا تھا کہ وہ تمام صورتِ حال آپ کو بتا دے کیا رشید نے تفصیلات بتا دی ہیں آپ کو؟"
"ہاں کافی حد تک!"
"مختصراً عرض کر رہا ہوں، تفسیر نے جو فراڈ کیا تھا میں نے اُس کے بخئے اُدھیڑ دیئے ہیں وہ مکمل طور سے ایکسپوز ہو چکا ہے اِس سلسلے میں کئی ملکوں کی انٹرپول نے مجھ سے تعاون کیا ہے۔ اور یہ سب برقی صاحب کی مہربانی ہے مسٹر ڈائمنڈ سوئیڈن بینکنگ کونسل کے سیکریٹری ہیں اور وہ تمام رقومات جو مختلف ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں، جمع کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ہماری بھرپور مدد کی ہے، آپ کے اثاثوں میں سے جو رقومات نکالی گئی تھیں، اُن کی مالیت تقریباً ساڑھے اُنیس کروڑ روپے بنتی ہے، مسٹر ڈائمنڈ نے یہ تمام رقومات اپنی تحویل میں لے لی ہیں اور اُس کے بعد میری درخواست پر اُنھوں نے اُنھیں مقامی بینکوں میں منتقل کر دیا ہے، مسٹر ڈائمنڈ آپ اپنے مُبارک ہاتھوں سے جناب احسان احمد صاحب کو وہ تمام کاغذات پیش کر دیں جو اُن کی ملکیت کے سلسلے میں ہیں۔ تفسیر نے جو رقم خُرد بُرد کی ہے اُس کے حسابات اُس کی فرم کے نام منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ توقیر احمد صاحب اِن رقومات کو اکٹھا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ آپ کا یہی سرمایہ ہمارے علم میں آچکا تھا جو شہاب صاحب کے ذریعے یہاں سے منتقل ہوا تھا۔ براہِ کرم اپنی یہ رقم قبول فرمائیے، مسٹر ڈائمنڈ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس میں سے وہ کاغذات نکالے۔ جن کے تحت احسان احمد صاحب کا ساڑھے اُنیس کروڑ روپیہ دوبارہ اُن کی تحویل میں آگیا تھا۔ احسان احمد صاحب کا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا وہ اِس خوشی کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ لرزتے ہاتھوں سے اُنھوں نے کاغذات وصول کئے اور پھر رُندھی ہوئی آواز میں بولے "اِن احسانات کا ہم کوئی صلہ دے سکیں گے تصور بیگ؟"
"جی ہاں! میں اپنا انعام آپ سے ضرور وصول کروں گا ویسے بھی طویل عرصے آپ کا نمک کھایا ہے اور آپ کا مجرم بھی ہوں۔ وہ اِس سلسلے میں کہ میں نے ایک بدلے ہوئے نام سے آپ کے خاندان میں وقت گزارا ہے۔ اور یہ وقت بغرض جاسوسی مجھے گزارنا پڑا۔ اِنہی معاملات کی چھان بین کے لئے میرا تقرر کیا گیا تھا"
"مُبارک ہیں وہ لمحات جو تم نے ہمارے ہاں گزارے تصور بیگ اُنھیں لمحات کی بدولت آج مجھے یہ نئی زندگی ملی ہے"
"خُدا کا شکر ہے کہ کچھ نمک حلال بھی ہوئی۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں" تصور بیگ اُن لوگوں کے ساتھ اُٹھ گیا۔ احسان احمد اور دوسرے لوگ اُنھیں چھوڑنے باہر تک آئے تھے اور جب پولیس جیپ باہر نکل گئی تو احسان احمد بے اختیار ہو کر غلام احمد کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
"غلام احمد! میری عزت کے رکھوالے میرے بھائی، میرے حقیقی بھائی تو نے جس گرتی ہوئی عمارت کو اپنے کندھے کا سہارا دیا تھا وہ پھر سے بنیادیں پکڑنے میں کامیاب ہو گئی ہے"
غلام احمد بے چارے پریشان انداز میں احسان احمد کو

سنبھال رہے تھے انھیں کچھ معلوم نہیں تھا میرے دوست میرے بھائی۔ احسان احمد غلام احمد کو چومے جارہے تھے۔ اور پوری صورتِ حال سے واقف ہو گئے تھے وہ خود بھی احسان احمد کی کیفیت پر آبدیدہ تھے۔

ذکیہ بیگم نے صورتِ حال محسوس کر کے فوراً ہی عادل حسین کو فون کیا۔ اور رابطہ قائم ہونے کے بعد چہکتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"عادل بھائی جلدی سے آجایئے۔ خدا کے لئے جلدی آجایئے، دیر نہ کیجئے عادل بھائی"

"ارے ذکیہ بہن۔ خیریت تو ہے؟"

"شہاب واپس آگئے۔ ہمارا سارا پیسہ مل گیا اُن کی حالت بہت خراب ہے جلد آجایئے"

"شہاب آگئے پیسہ مل گیا۔ اچھا میں آرہا ہوں" عادل حسین نے فون بند کر دیا اور باقی صورتِ حال انھیں یہاں آکر معلوم ہوئی تھی۔ خوشی سے اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ اور احسان احمد غلام احمد پہ نثار ہوئے جارہے تھے۔ آج انھیں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ غلام احمد بھی صورتحال جان کر شرمندہ ہو رہے تھے۔

غرض یہ کہ آج سرِ شام ہی یکے بعد دیگرے تمام لوگ پہنچ گئے احسان احمد کے ہاں عید کا سا سماں تھا پھر جلد ہی رُدا اور آفندی صاحب بھی اور ثاقب، میر بینا اور یوسف کے ساتھ پہنچ گئے۔

رُدا کو صورتِ حال معلوم ہوئی تو وہ مسرت سے احسان احمد سے لپٹ گئی تھی۔ رُدا نے ثناء کو بھینچ لیا تھا۔ حالات کا سبھی کو علم تھا کس سے چھپایا جاتا۔ دادی اماں شہاب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر احسان احمد کے پاس آئیں اور اُنھوں نے روتے ہوئے کہا۔

"احسان احمد! کیا تو میری ممتا کے طفیل میرے بیٹے کو معاف کر سکتا ہے۔ اس کا گناہ معاف کر سکتا ہے؟"

"میں نے معاف کر دیا اسے اماں بی، خدا کی قسم میں نے اسے معاف کر دیا" احسان احمد نے شہاب صاحب کو گلے لگا لیا اور وہ رو پڑے، پھر اس بارات کا دُولہا شہ بالا کے ساتھ آگیا یہ تصور بیگ اور ڈاکٹر نعمان تھے۔ سب نے خصوصی طور پر اُن کا استقبال کیا تھا۔ احسان احمد نے تصور بیگ کا شکریہ ادا کیا تھا اور کہا تھا کہ اس خاندان کو اس نے نئی زندگی دی ہے۔

رُدا نے موقعہ ملتے ہی تصور بیگ سے کہا "جناب مجھ سے ملے بغیر ہی سویڈن بھاگ گئے؟"

"محترمہ! ہمارا آپ کا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ آپ ہی کی ایک خوشی کے لئے ہم سویڈن سے تارے توڑنے گئے تھے"

"بہت دُور نکل گئے ہیں آپ" رُدا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب نکل گئے سو نکل گئے۔ اس اُمید کے ساتھ کہ آپ دوبارہ ہمیں نیچے نہیں پھینکیں گی" تصور بیگ نے کہا۔ اور دُور کھڑی ہوئی ثناء نے نُدرت سے کہا۔

"اللہ رکھی! دیکھ اللہ رکھی۔ تجھے میری قسم اب بتا" دونوں کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی ہے۔

"سو فیصدی۔ خدا کی قسم سو فیصدی۔ رٹ لوں گی اِس مونالیزا سے چھپکے چھپکے عشق کرتی رہی اور ہمیں ہوا بھی نہ لگنے دی" دوسری طرف ڈاکٹر نعمان نے تنویر سے کہا۔

"مس تنویر!"

"جی!"

"آپ مجھ سے شادی کریں گی؟"

"کیا؟" تنویر چیخ پڑی۔ اور ڈاکٹر نعمان بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر بولا۔

"کر لیجئے۔ خدا کے لئے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے گا" اس سے پہلے کہ تنویر کچھ بولتی اجمل میاں سر پر پہنچ گئے۔

"وہ نعمان بھائی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آج شاید ہونے پٹنے کا دن ہے، یہ کون سی تقریب ہوتی ہے دراصل میں کچھ کچھ واقف ہوں"

"ارے بھاگو یہاں سے۔ کباب میں ہڈی" ڈاکٹر نعمان نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ اور اجمل میاں آگے بڑھ گئے۔ شاید کسی اور سے پوچھنے کے لئے۔

ختم شد